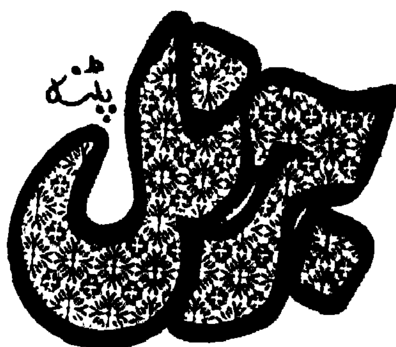
جنوری تا جون ۱۹۹۱ء

۵۷-۶۲

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

خدا بخش لائبریری





۵۷ — ۶۲



خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر :	۲۳۴۲۴/۷۷	قیمت فی شمارہ :	پچیس روپے
شمارہ :	ستاون تا باسٹھ	سالانہ :	۳۰۰ روپے ہند
قیمت :	ڈیڑھ سو روپے		۶۰ ڈالر ایشیا۔ ۱۲۰ ڈالر دیگر ممالک

مصطفے کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)، دہلی میں چھپواکر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا۔

خدابخش لائبریری
جرنل
پٹنہ

تقسیم کی طرف:

مشرقی کتب خانے:

کتابخانہ خدا بخش:

حصہ انگریزی:

حرفے چند

کسی اچھے قاری نے کبھی کچھ ایسی بات کہی تھی کہ جب کوئی نئی کتاب چھپ کے بازار میں آتی ہے تو میں پڑھنے
لیے کوئی پرانی کتاب اٹھا لیتا ہوں۔ پوری تو نہیں لیکن کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیت ہم لائبریری کے خادموں پر
گزرتی رہی ہے اور جی چاہتا ہے کہ پڑھنے والے نئی چیزیں پڑھیں تو کبھی کبھار پرانوں پر بھی نظر ڈالتے چلیں۔
ے جرنل کو کچھ ایسا ہی موڑ دینے کی کوشش جاری ہے۔

اس احوال کے پس پردہ اصل منشا یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو وہ سب کچھ مل سکے جو انھیں نہیں مل پا رہا ہے،
ں سے وہ کچھ حاصل کر سکیں جو ابھی تک نہیں کر پائے۔ ایڈیٹر کو اس پرچے کے مشمولات سے بہت کچھ فائدہ
ں کا جی چاہا کہ وہ اس فائدہ کو صرف اپنے لیے سینت کے نہ رکھ لے۔

—— عرب

نعت

جگر کی یہ نعت محترمی یونس سلیم صاحب
کا تحفہ ہے۔ شاعر نے یہ نعت یونس صاحب کے
والد مرحوم یوسف صاحب کو اپنے ہاتھ سے
لکھ کر دی تھی۔ ہم اس کے موجودہ مالک کے ممنون
ہیں کہ انھوں نے یہ نعت اب تک ہمارے
لیے اٹھا رکھی تھی۔ غالباً یہ اب تک چھپی نہیں۔
اور عکس تو یقیناً نہیں!



نعت سرور کونین علیه [illegible]

ای از لب صادق تو شنیده [illegible]

[illegible] آرد جهان نگاهی — نادیده [illegible]

ای آنکه به امتزاج کاف و نون [illegible] — [illegible] نعمات [illegible]

[illegible] حسن ذات [illegible] — [illegible] رسیده

ای [illegible] — ای از [illegible] — [illegible] گزیده

آن [illegible] در زمانت — [illegible] نادیده

در عشق و وفا [illegible] — [illegible] دیده [illegible] شنیده

امروز ببین اگر مردان را

[illegible] گفته [illegible] رسیده

ای آنکه [illegible] — از خوشی [illegible] خویشتن [illegible] رسیده

[illegible] — [illegible] ره [illegible] بریده

[illegible] گروه [illegible] — [illegible] رسیده

ای آنکه [illegible] — [illegible] آنکه [illegible]

[illegible] — [illegible] رسیده

[illegible]

[illegible] جان [illegible] رسیده

[illegible]

[illegible] رسیده

[illegible]

نادر مطبوعات

توارِیخ نادرالعصر

منشی نول کشور

مقدمہ



ڈاکٹر انوارالحسن

شعبہ علوم شرقیہ (عربی و فارسی)

لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ



مشرقی علوم و فنون کی دنیا میں منشی نولکشور کی ذات محتاجِ تعارف نہیں کیوں کہ انھوں نے انیسویں صدی کے ہندوستان میں اپنی انتھک کوششوں اور بے پناہ خداداد صلاحیتوں سے نہ صرف علوم و فنون کی ایک دیرپا شمع روشن کی بلکہ اس ملک کی صنعتی ترقی کی طرف بھی بنیادی اور تعمیری قدم اٹھایا۔ ان کے مشہورِ عالم نولکشور پریس کی شاخیں نہ صرف ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں بلکہ لندن میں بھی قائم تھیں۔ لکھنؤ میں ان کا قائم کردہ "اپر انڈیا پیپر مل" شمالی ہندوستان میں کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ تھا۔ ان کی صنعتی اور تعمیری صلاحیتیں بڑی ہمہ گیر اور ہمہ جہتی تھیں۔ ان کا دار التصنیف ہندوستان میں اپنی نوعیت کا ایسا واحد ادارہ تھا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ کتنی ہی ساہتیہ اکادمیاں مل کر بھی مدتوں میں وہ کام انجام نہیں دے سکتیں جو ان کی دار التصنیف سے انجام پا چکے۔ عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، ہندی اور پنجابی زبانیں اُن کے پریس کی رہینِ منت ہیں۔ انھوں نے ان زبانوں کے قیمتی ادبی سرمایوں کو زمانہ کی دستبرد سے بچا کر لوگوں تک پہنچایا، اور اس طرح اشاعتِ علم کی عظیم خدمت انجام دی۔ لائبریریوں، اسکولوں، کالجوں، مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کا قیام اور ان کی امداد منشی جی بڑی فیاضی اور دریا دلی سے کرتے تھے۔ غریبوں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کی اعانت اور اہلِ علم کی قدر دانی، عزت اور ان کے مرتبہ کا احترام کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رہا۔ پیشِ نظر کتاب "تواریخ نادر العصر" اگرچہ ان کی ایک مختصر تالیف ہے لیکن کئی اعتبارات سے اس کی افادیت اور اہمیت مسلّم ہے۔ انھوں نے قدیم ماخذوں اور عینی شہادتوں کی بنیاد پر اودھ کی یہ مختصر تاریخ مرتب کی ہے۔ ابتدا میں پس منظر کے طور پر ہندو مذہب اور ہندوستانی باشندوں کے بارے میں بھی مختصر بحث کی گئی ہے۔ ہندوستانی سدینات کا ذکر مفید اور معلومات افزا ہے۔ لکھنؤ کی قدیم عمارتوں، سڑکوں، گلیوں، بازاروں کا بیان بہت کچھ عینی شہادتوں پر مبنی ہے اور اس لحاظ سے اسے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

منشی نولکشور نے ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں نولکشور پریس کی داغ بیل ڈالی تھی اور ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ ہی میں واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی لڑی گئی۔ بیگم حضرت محل کا کردار ایک تاریخی حقیقت ہے۔ انگریز حکمرانوں نے واجد علی شاہ کی فوجوں کو شکست دی، انھیں تخت و تاج سے محروم کیا۔ مٹیا برج کلکتہ میں لے جا کر بند کر دیا اور اودھ کی خوش حال ریاست پر خود قبضہ کر لیا۔ منشی جی موصوف نے لکھنؤ کی تباہی، زبوں حالی اور بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ یہاں کی تاریخی عمارتوں کی مسماری ۱۸۵۷ء کے بعد عرصہ تک جاری رہی اور منشی جی موصوف ان کے چشم دید گواہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے بیانات میں بڑا وزن اور وقار ہے۔

لکھنؤ کی تاریخی عمارتیں کب اور کہاں اور کتنے سرمایہ سے تعمیر ہوئی تھیں ان کی تفصیل اس کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے۔ ان دنوں اتر پردیش کی پیداوار کتنی تھی، بازار کا نرخ کیا تھا! اور صوبہ کی اہم تاریخی چیزیں کیا تھیں؟ ان بیانات سے معاصرین کی کتابیں خالی ہیں۔ اس اعتبار سے بھی "نادر العصر" درحقیقت "نادر العصر" ہے جو اگرچہ اس غرض سے نہیں لکھی گئی تھی لیکن اب اس کی اہمیت اور ندرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۱۰ء میں مولانا عبدالحلیم شرر کی ایک کتاب "گذشتہ لکھنؤ" شائع ہوئی تھی جو لکھنؤ کے بارے میں ان کی بے شمار یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ ساہتیہ اکیڈیمی ہند دہلی نے اس کا TRANSLITERATION ہندی میں شائع کیا ہے۔ اسی طرح بعض اور زبانوں میں گذشتہ لکھنؤ کے ترجمے چھپ چکے ہیں لیکن "نادر العصر" کو اس سلسلہ میں جو اولیت حاصل ہے وہ صرف اسی کا حصہ ہے۔

منشی جی کے طرز تحریر پر اس دور کی چھاپ بہت نمایاں ہے۔ وہ عربی و فارسی الفاظ کے بے تکلف استعمال پر قادر ہی نہیں عادی تھے۔ اس وقت کی اردو نثر میں عام طور پر وہ صفائی، روانی اور سادگی نہیں جو بعد میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کی جدوجہد سے رفتہ رفتہ پیدا ہوئی۔ اسی لیے "نادر العصر" کی عبارتوں میں بھی کھردرا پن موجود ہے اور ۱۸۶۳ء کی تصنیف میں آپ اس سے زیادہ کیا امید کر سکتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ اور صوبہ اودھ کے بارے میں سماجی و تاریخی بیانات جتنے اچھے معتبر اور مستند "تاریخ نادر العصر" میں ملتے ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں نظر آتی ہے۔ اس ضرورت کے تحت "نادر العصر" کی پرانی شراب کو نئے پیمانے میں پھر سے پیش کیا جا رہا ہے۔

○

حضرت امیر حسن نورانی نے اس سلسلے میں جو معتبر و مفید سطور رقم فرمائی ہیں ان کے مطالعہ سے منشی نولکشور کا مرتبہ متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔ ان کی تحریر درج ذیل ہے:-

کسی انسان کی اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا نام اور علم و دانش لازم و ملزوم سمجھے جائیں اور ا
کے ساتھ دوسرے کا خیال غیر ارادی طور پر آ جائے۔ ایسا خیال جو مختلف علوم و فنون کی ہزاروں کتابوں کے تصور
تبدیل ہو کر دل و دماغ کو روشن کر دے، اور ایک انبساط انگیز کیفیت کا احساس پیدا ہو جائے۔ ایسی ہستیاں شاذ و
ہوتی ہیں اور صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ منشی نولکشور ایک ایسی ہی ہستی کا نام ہے، جس کا تعارف کرانا مقصود ہے۔
نولکشور مشرقی علوم و فنون کے محافظ، اور اردو زبان و ادب کے بڑے محسن تھے۔ انھوں نے اسلامی علوم و فنون کی جو
کی اتنی انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ ان کا مطبع علمی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور

ردج ان کا رہین منت ہے۔ انھوں نے اردو زبان وادب کی آبرو بڑھائی اور اس کے خزانے میں اتنا اضافہ کیا
۔ وہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل ہو گئی۔"

تجارتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو انھوں نے طباعت و اشاعت اور ان کی متعلقہ صنعتوں کو اس وقت فروغ
ا جب صنعت و حرفت جمود و تعطل کا شکار تھی۔ کتابوں کی تجارت کو ہندوستان میں پہلی بار انھوں نے بڑے پیمانہ پر جدید
مولوں اور منظم طریقوں سے ترقی کی راہ پر چلایا۔ کتابوں کی تجارت میں درآمد و برآمد کا سلسلہ شروع کیا۔ ایران، افغانستان، چین،
لستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک میں ان کے مطبع کو شہرت حاصل ہوئی۔ یورپ اور امریکہ کے مستشرقین نے ان کی عظیم
دمات کا اعتراف کیا۔ ان کی بدولت ایسی نادر و نایاب کتابیں منظر عام پر آئیں جن کی مدد سے علوم و فنون کے سلسلہ ارتقا
ی تاریخی کڑیوں کو مربوط کرنے میں مدد ملی۔ اودھ اخبار کا اجرا ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ فنِ خطاطی کو انھوں نے نئی زندگی
شی۔ ملک کی صنعتی ترقی میں ان کی خدمات قابلِ قدر ہیں، وہ اپنے عہد کی ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ ان کی
سرگرمیوں نے آنے والے زمانہ پر گہرا اثر ڈالا۔

منشی نولکشور جنوری ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں ثانوی تعلیم کے لیے آگرہ کالج میں داخلہ لیا
پانچ سال تعلیم حاصل کی، دو سال اخبار سفیر آگرہ میں صحافت کی تربیت حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں اڈیٹر کوہ نور کی
عوت پر لاہور گئے اور چار سال اخبار کوہ نور اور اس کے مطبع میں کام کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد لاہور
سے آگرہ واپس آئے۔ اور ۱۸۵۸ء کے آغاز میں لکھنؤ پہنچے اور مطبع قائم کیا۔ ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو اودھ اخبار جاری کیا
س وقت وہ اکیس برس کے ہو چکے تھے۔ ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر انسٹھ سال تھی
ن کو صرف ۳۷ سال کام کرنے کا موقع ملا، یہ زمانہ مسلسل جہد عمل کا زمانہ تھا۔

۳۷ سال کی مختصر مدت میں منشی نولکشور نے اودھ اخبار کو ۴ صفحات سے ترقی دے کر ۲۴ صفحات تک
پہنچایا اور خاص نمبر ۴۸ صفحات پر شائع ہوتے تھے۔ اردو کے بلند پایہ ادیب الشاہر دار اودھ اخبار سے وابستہ
تھے اور بہت سے اہلِ ذوق اس ادارے میں زیر تربیت تھے جو مستقبل میں نامور ہوئے۔

مطبع کو انھوں نے اتنی ترقی دی کہ سارے ایشیا میں اس کا کوئی مقابل نہ تھا۔ ۳۷ سال میں عربی فارسی
سنسکرت اور اردو کی چار ہزار سے کچھ زیادہ کتابیں شائع کیں۔ بعض کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ان کی زندگی میں
صرف مطبع کے اندر بارہ سو آدمی کام کرتے تھے۔ تین سو مشین میں تین سو ہینڈ پریس چلاتے تھے۔ کانپور کے مطبع میں

دسو آدمی کام کرتے تھے۔ بیس ہزار روپیہ کا کاغذ ہر ماہ صرف ہوتا تھا۔ مطبع کا سالانہ ڈاک خرچ پچاس ہزار روپیہ تھا۔ ملازمین کی تنخواہ پندرہ ہزار ماہوار تھی۔ اس کے علاوہ بیواؤں یتیموں اور غریب طالب علموں کی امداد کے لیے کئی سو روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ جب منشی نولکشور کی وفات ہوئی اس وقت ان کی جائداد کی قیمت ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ تھی[1] اور جب کام شروع کیا تھا اس وقت سرمایہ کی کمی کے باعث صرف ایک ہینڈ پریس پر کام شروع کیا تھا۔ وہ پنے ریٹائر ہونے والے ملازمین کو پنشن دیتے تھے یہ طریقہ ان کے وارثوں نے بھی باقی رکھا۔ وہ عالموں پنڈتوں اور سب ہی دانشوروں کا احترام کرتے تھے۔ سنسکرت کی تعلیم کے لیے لکھنؤ میں ایک پاٹھ شالہ قائم کیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے علمائے نے ان کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے ان کی علمی خدمات اور امداد کے لیے شکریہ ادا کیا ہے۔ مدرسۃ العلوم (محمڈن کالج علی گڑھ) کو انھوں نے گرانقدر عطیات اور کتابیں تحفہ میں دیں۔ مطبع نولکشور کے سب سے بڑے عالم و مترجم طویل عرصہ تک مطبع میں کام کرنے کے بعد اپنے تجربات اور مہارت علوم اسلامیہ کے باعث مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے اور اس کے کچھ عرصہ بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس حدیث کے سند پر فائز ہوئے اور دارالعلوم کے مہتمم مقرر ہوئے۔ منشی نولکشور نے مشرقی تہذیب کو مغربی تہذیب کی یلغار سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور بڑے پر آشوب دور میں مشرقی علوم کے اثاثہ کی حفاظت کی۔ اگر وہ اس طرف توجہ نہ کرتے تو ہمارا قیمتی سرمایہ ضائع ہو جاتا۔ ان کی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر کیا گیا۔ ان کی سرگرمیوں کا اثر قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ اتحاد و اتفاق کے لیے بہت خوشگوار ثابت ہوا۔

منشی نولکشور کو بجا طور پر مشرقی علوم و فنون کا محسن اعظم کہا جاتا ہے۔ اگر انھوں نے ہر علم و فن کی غیر مطبوعہ کتابیں نہ شائع کی ہوتیں تو یقیناً مختلف علوم کی تعلیم و ترویج میں دشواری پیش آتی ترقی تعلیم میں تیز رفتاری اور بیداری پیدا ہونا بہت مشکل تھا۔ انھوں نے ایک طرف مذہبی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر معیاری مذہبی کتابیں طبع کرائیں، ان میں وہ سب ہی مذاہب و مسالک شامل ہیں، جن کے پیرو ہندوستان میں آباد ہیں، خاص طور پر ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں سنسکرت زبان میں تھیں۔ ان کے قدیم مستند مخطوطے حاصل کر کے طبع کرائے اس کے بعد ان کے ہندی میں ترجمے کرائے جن میں مہابھارت راماین، اپنشد، وید وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی اشاعت کے ساتھ سنسکرت کے ان فارسی ترجموں کی طرف آ

---

[1] اودھ ریویو بابت ماہ فروری ۱۹۶۵ء تاریخ ادب اردو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔

ی جو بیشتر مغلیہ دور کے فضلاء نے کیے تھے۔ فیضی کا ترجمہ مہابھارت بہت مشہور ہے۔ اس کے اٹھارہ حصے
ہیں جن کو مطبع نے نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ اس کے ساتھ رامائن کے متعدد فارسی تراجم طبع ہوئے جن میں
رامائن مسیحی، رامائن امر پرکاش وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ منشی نولکشور نے اسی پر اکتفا نہیں کیا انھوں نے ہندو مذہب
کی کئی سو چھوٹی بڑی کتابوں کے اردو زبان میں ترجمے شائع کیے کیوں کہ اس زمانہ میں اردو ہی ایک ایسی زبان تھی
جو سارے ملک میں رائج تھی، خاص طور پر شمالی ہندوستان کے باشندوں کی اکثریت اسی زبان کو ذریعہ اظہار
خیال بنائے ہوئے تھی، بول چال کی زبان بھی اردو تھی۔

مسلمانوں کا مستند مذہبی لٹریچر زیادہ تر عربی میں اور کچھ فارسی زبان میں تھا۔ منشی نولکشور نے پہلے عربی
زبان میں مطبوعہ کتب کے نسخے حاصل کیے اور اس کے بعد غیر مطبوعہ مخطوطات تلاش کیے، اور ان کو ماہرین فن کے
سپرد کیا تاکہ اگر کوئی کمی بیشی یا خامی ہو تو درست کر دیں۔ اس طرح ہر کتاب صحت کی کرا کے شائع کی بلکہ اکثر کتابوں پر
مفید حواشی کا اضافہ کرایا۔ ان عربی کتب کے فارسی ترجمے بھی طبع کرائے۔ یہ ترجمے 'ایران اور ہندوستان میں بہت
عرصہ قبل ہو چکے تھے مگر طباعت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ان کے مسودات مختلف کتب خانوں اور عالموں کے
پاس محفوظ تھے ان سے ضمناً یا عاریتاً حاصل کر کے طبع کرائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ تمام مستند کتابوں کو اپنے
شعبۂ تصنیف و ترجمہ کے دانشوروں کے ذریعہ اردو زبان میں منتقل کرایا۔ اس کے لیے بہت بڑا سرمایہ صرف
کیا۔ حدیث، تفسیر، اور فقہ کی شاید ہی کوئی مستند کتاب ہو جس کا ترجمہ اردو میں شائع نہ کیا ہو بعض مشہور کتابوں
کی شرحیں بھی لکھوائیں۔ اس کے علاوہ اسلامیات پر کئی اچھی کتابیں خود مرتب کرائیں۔ ان میں سب سے بڑی اور اہم
کتاب "تفسیر مواہب الرحمٰن" ہے۔ جو قرآن شریف کی اردو زبان میں سب سے بڑی تفسیر ہے اور ۳۰ ضخیم جلدوں
پر مشتمل ہے۔ اتنی بڑی تفسیر عربی اور فارسی زبانوں میں بھی شاذ و نادر نظر آئے گی اس کے بعد اسلامی علوم کے ہر
فن کی صدہا کتابیں شائع کیں۔ جو پہلے عوام و خواص کی دسترس سے باہر تھیں۔

منشی نولکشور نے علامہ فیضی کی مشہور عالم بے نقط تفسیر قرآن شائع کی جس کا نام سواطع الالہام ہے۔ اس
کا مستند نسخہ ان کو کلکتہ کے کسی تاجر نوادرات سے حاصل ہوا تھا۔ اسی طرح عربی زبان میں تاریخ کی مستند کتاب
طبری کا فارسی زبان میں ترجمہ کئی سو سال پہلے ایران کے سامانی حکمرانوں کے زمانہ میں ہوا تھا۔ اس کی مستند قلمی نقلیں
مختلف کتب خانوں میں موجود تھیں۔ لیکن اس کو پہلی بار منشی نولکشور نے اپنے مطبع سے شائع کیا اس میں ان کو شرف اولیت

انھوں نے عربی، فارسی اور اردو میں تمام اسلامی علوم و فنون کی نادر و نایاب کتابیں بکثرت شائع کیں۔ ان کا مدارس اور مکاتب کی رونق میں اضافہ ہوا۔ نصابی کتابوں کی کثرت نے تحصیل علم کا شوق رکھنے والے طلبا کے ہمت میں اضافہ کیا۔ مصنف "اردو کے ہندو ادیب" نے لکھا ہے کہ:

ہندوستانی مسلمان اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرسکتے اور نہ اس گراں بہا احسان سے کبھی عہدہ برآ ہوسکتے ہیں کہ اسلامی درسیات اور اردو ادبیات اور دیگر مذہبی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت میں منشی نولکشور سی آئی اے کی جو درخشاں خدمات مسلم ہیں وہ بحیثیت مجموعی کوئی مسلمان (انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے) سرانجام نہ دے سکا۔[1]

منشی نولکشور اسلامی تہذیب و ثقافت سے بہت متاثر تھے۔ اور ان کے دل میں اس کے لیے نہایت محبت و عقیدت کا جذبہ کارفرما تھا۔ شاید اسی لیے انھوں نے اپنے مطبع کو اسلامی علوم کا عظیم مرکز بنا دیا تھا جہاں تفسیر، حدیث اور فقہ میں مہارت رکھنے والے علما بیٹھ کر کتابوں کی صحت، ترجمہ اور حاشیہ نویسی کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اور جہاں تفسیر مواہب الرحمن، صحاح ستہ، فتح الباری، فتاویٰ عالمگیری، فتح القدیر، ہدایہ اور احیاء العلوم جیسی بلند پایہ کتابیں شائع ہوئیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

سب سے آخر میں لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی زندگی اب اسی برس کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اس سے میری مراد نولکشور کا مشہور پریس ہے۔ یہ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی علوم و فنون کی جتنی ضخیم اور اکثر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں ان کا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کرسکتا۔ ہماری زبان کی اکثر ادبی اور علمی کتابیں اسی مطبع سے چھپ کر نکلیں۔ شعرا کے دواوین، مثنویاں، قصائد، قصے، افسانے اور داستانیں اور درس کی عام کتابیں سب اس کی کوششوں کی ممنون ہیں۔[2]

اسلامی علوم پر مطبع نولکشور نے عربی، فارسی اور اردو میں جو کتابیں شائع کی ہیں ان کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ اس کی شائع کی ہوئی کتابوں کے باعث اسلامی ممالک میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ عربی اور فارسی کی کتابیں چین، ترکستان، افغانستان، ایران، عراق، حجاز اور مصر و شام میں بکثرت منگوائی گئیں۔ ان ممالک کے کتب خانوں میں نولکشوری مطبوعات موجود ہیں اور ان ممالک کا تعلیم یافتہ طبقہ منشی نولکشور اور ان کے مطبع سے واقف ہے۔ فارسی زبان کے ممتاز محقق ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے لکھا ہے کہ:

---

[1] اردو کے ہندو ادیب از ناظر کاکوروی صفحہ ۱۸۴ مطبوعہ انوار بک ڈپو لکھنؤ [2] [illegible]

یونیورسٹی، اسکول اور کالج کے طلبا کو شاید منشی نولکشور جی کی خدمات کا پورا اندازہ نہ ہوگا۔ مگر جن لوگوں نے درس نظامی حاصل کیا ہے اور عربی مدارس میں تعلیم پائی ہے ان کو پورا احساس ہوگا کہ نحو، صرف، منطق، فلسفہ، فقہ، اصول، ادب، ہیئت، لغت، عروض جیسے سبھی علوم کی بے شمار کتابیں مطبع نولکشور نے شائع کر کے استادوں اور شاگردوں، دونوں کی مشکلوں کو حل کر دیا۔[1]

پروفیسر موصوف نے اپنے مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

دنیا کے جس ادارے یا یونیورسٹی میں مشرقی علوم کا چلن ہوگا وہاں مطبع نولکشور کی مطبوعات بھی ضرور ہوں گی۔ مجھے ایران، افغانستان، ترکی جیسے ممالک کے کتب خانے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور سب مجھے اندازہ ہے کہ اس مطبع کی کتابیں کس اہتمام سے محفوظ رکھی جاتی ہیں۔۔۔۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ عربی، فارسی اور اردو میں جتنی کتابیں نولکشور پریس سے شائع ہوئی ہیں، اتنی غالباً کسی ملک میں شائع نہ ہوتی ہوں گی۔۔۔۔ اس پریس سے اس وقت فارسی کی کتابیں شائع ہو رہی تھیں، جبکہ خود فارسی بولنے والے ملکوں میں شاید پریس کا رواج بھی نہ تھا۔[2]

منشی نولکشور نے ہندی، سنسکرت، گورمکھی اور مرہٹی زبان کی کتابیں بھی شائع کیں۔ ہندو مذہب کی سب ہی اہم کتابوں کو نہایت اہتمام سے شائع کیا جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں درج کی جا چکی ہے۔ وہ سب ہی مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ قرآن مجید کی طباعت واشاعت کے سلسلہ میں وہ طہارت کا اتنا خیال رکھتے تھے قرآن کے بوسیدہ پتھروں کو یا تو دریا کے کنارے دھلواتے تھے یا ان کے دھوئے ہوئے پانی کو ایک پاک حوض میں جمع کر کے دریا میں ڈلوا دیتے تھے۔ طباعت کا کام مسلمان کارکن انجام دیتے اور ان کے لیے پاک اور باوضو ہونا ضروری تھا۔ کاغذ رکھنے کی جگہ عرق بید مشک اور گلاب کا چھڑکاؤ کراتے تھے۔ ان کے اس احترام واہتمام سے لکھنؤ کے عوام وخواص سب ہی واقف تھے۔ آج بھی قدیم علمی گھرانوں میں یہ روایت مشہور ہے۔ راقم الحروف نے دو معتبر سن رسیدہ ملازمین مطبع کی زبان سے سنا ہے۔ مؤلف اردو کے ہندو ادیب، نامر کاکوروی نے بھی لکھا ہے اسی طرح وہ عالموں کا بے حد احترام کرتے تھے۔

منشی نولکشور نے سکھوں کی سب سے بڑی اور مقدس کتاب گرنتھ صاحب اور جنم ساکھی بھی طبع کرائیں۔ اکا رسا توریت انجیل (عہد نامہ قدیم وجدید) کے اردو ترجمے طبع کرائے۔ لیکن ان کتابوں کی بازار میں مانگ کم تھی جیسے

---

[1] ماہنامہ نیا دور "نولکشور نمبر" بابت ماہ نومبر ودسمبر ۱۹۸۰ء صفحہ ۹۸۔ [2] مرزا لطیف بیگ مہتمم دفتری خانہ مطبع نولکشور متوفی ۱۹۶۴ء
[illegible]

ان کی اشاعت محدود رہی۔ قومی یک جہتی کے لیے اس وقت عوامی اداروں کے علاوہ حکومت نے بڑے پیمانہ پر جو تحریکیں چلائی ہیں ان پر لاکھوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن منشی نولکشور نے تن تنہا اس سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ سب پر بھاری ہیں۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے مختلف طریقوں سے کوشش کی۔ دونوں مذاہب سے ایک دوسرے کو واقف کرانے کے لیے دونوں کی مذہبی کتابیں ان کی پسندیدہ زبانوں میں طبع کرائیں۔ کاروبار کے سلسلہ میں دونوں مذاہب کے کارکن شانہ سے شانہ ملاکر کام کرتے تھے کبھی کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ وہ علماء اور صوفیا کا بے حد احترام کرتے تھے۔ بقول ناظر کاکوروی مرحوم:

چند ممتاز ہندو بزرگوں کی زبانِ مبارک سے یہ بھی سنا ہے کہ جو احترام بزرگانِ دین کا منشی نولکشور کرتے تھے وہ بہت سے مسلمان بھی نہیں کر سکتے تھے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ کلامِ پاک کی اشاعت میں منشی نولکشور کی خدمات آئینہ درخشاں ہیں۔[1]

اودھ اخبار کے ذریعہ انھوں نے ملک و قوم کی بہت خدمت کی ہندو مسلم اتحاد اور یک جہتی کے لیے جو تحریک ہوتی تھی اودھ اخبار اس کی خوب تشہیر کرتا تھا۔ دونوں قوموں کے تہواروں کے موقع پر خاص نمبر شائع ہوتے تھے۔ مضامین اور نظمیں لکھنے والے ادیب و شاعر ہندو بھی ہوتے اور مسلمان بھی۔ اس اخبار کے اڈیٹر ہندو بھی رہے اور مسلمان بھی۔ سب سے زیادہ مشہور و مقبول اڈیٹر رتن ناتھ سرشار تھے جن کے زورِ قلم کا نتیجہ فسانۂ آزاد کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ اس ضخیم فسانہ کو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ اودھ اخبار نے اردو زبان و ادب اور صنفِ صحافت کی جو خدمت کی اسے کسی دور میں بھلایا نہیں جا سکتا ہے۔

منشی نولکشور نے پہلی بار مضامین کا معاوضہ دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اخبار کے نامہ نگار اور نمائندے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں متعین کیے، اس میں بھی ان کو اوّلیت کا شرف حاصل تھا۔ انھوں نے خدمتِ خلق اور احیاءِ علوم، طباعت و اشاعت وغیرہ کے جو منصوبے بنائے تھے ان کو اپنی زندگی میں تکمیل تک پہنچایا۔ وہ کاروباری آداب سے بھی خوب واقف تھے، اور ملک کی تہذیبی اور ثقافتی ضروریات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی دلچسپیاں کاروباری زندگی تک محدود نہ تھیں، وہ علم دوست و عالم شناس تھے۔ صاحبِ کمال فنکاروں کے بڑے قدرداں تھے ان کے مطبع میں ہر علم و فن کے ماہرین کا اجتماع تھا۔ سب کے ساتھ ان کا برتاؤ اچھا تھا۔ سب کو فکرِ معاش سے آزاد رکھ کر ان کی خدمات سے استفادہ کرتے تھے۔ انھوں نے سماجی خدمات نہایت خلوص سے انجام دیں۔ ان کی کوشش سے لکھنؤ میں جلسۂ تہذیب کا قیام عمل میں آیا تھا جو ہندو مسلم اتحاد کا مرکز بن گیا۔ اس انجمن

[1] اردو کے ہندو ادیب حاشیہ صفحہ ۱۸۴۔ مطبوعہ انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

جلسوں میں وہ تقریریں کرتے تھے، اور حق بات کہنے میں حکومت کی خفگی کو بھی نظرانداز کر دیتے تھے۔ اس کا اندازہ
دھ اخبار میں ان کی شائع شدہ تقاریر و تبصروں سے ہوتا ہے۔ حکومت یو پی کے حکام خاص طور پر ان کے مشوروں
ے فائدہ اٹھاتے تھے۔ ملک کے متعدد والیانِ ریاست اس بات کے خواہش مند ہوئے کہ ان کو وزارت اعلیٰ کی کرسی
ویض کر دیں لیکن انھوں نے اپنے لیے خدمت ملک و قوم کا جو منصوبہ بنایا اور جس پر عمل پیرا تھے اس کو کسی قیمت پر
بوڑنا گوارہ نہ تھا۔ مہاراجہ جے پور کی پیش کش کا ذکر ان کے سوانح نگاروں نے کیا ہے۔

علمی و ادبی حلقوں میں بھی ان کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ مرزا غالب سے ان کے تعلقات کا حال علیحدہ عنوان سے
یا جا چکا ہے۔ غالب ان کو کس نظر سے دیکھتے تھے اس کے لیے ایک خط کا اقتباس پیش نظر ہے جو غالب نے مرزا ان علی
ں رعنا کے نام لکھا تھا کہ :

"منشی نولکشور صاحب یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملے بہت خوبصورت، اور خوش سیرت، سعادت مند اور
معقول پسند آدمی ہیں۔ تمہارے وہ مداح اور میں ان کا ثنا خواں"۔

ھنؤ کے علما، اہلِ دانش اور شعرا سے بھی ان کے مراسم تھے۔ اور ادبی محفلوں اور مشاعروں میں ذوق و شوق سے شرکت
رتے تھے۔ میر انیس کی مجالس میں خاص طور پر شریک ہوتے تھے۔ خود مطبع میں انھوں نے مشاعرے کی محفلیں منعقد
رائیں۔ ان کے مشاعروں میں نواب مظفر علی خاں اسیر "سابق وزیر دربار اودھ" بھی شریک ہوتے تھے۔ لکھنؤ اور اودھ
ے دوسرے نوابین اور رؤسا سے خوشگوار مراسم قائم تھے۔ اور ان میں سے بعض کی مدد سے نادر و کمیاب کتابوں کے
لوطے حاصل کرتے تھے۔ علماء فرنگی محل سے بھی روابط قائم تھے، مذہبی کتابوں کی طباعت کے سلسلہ میں ان کے مشوروں
ے استفادہ کرتے۔ بعض علماء ان کے مطبع سے بھی وابستہ رہے۔ مولانا فخر الدین فرنگی محلی سے خاص دوستانہ رسم و راہ
ھی انھوں نے امام غزالی کی مشہور تصنیف کیمیائے سعادت کا ترجمہ اردو میں کیا تھا جس کا دیباچہ خود منشی نولکشور نے تحریر کیا تھا۔

منشی نولکشور چاہتے تھے کہ علوم و فنون کے بیش بہا ذخیروں اور قدیم تہذیبی یادگاروں کو
زندہ رکھا جائے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں سرکاری اور نجی کتب خانوں کو جو نقصان پہنچا تھا
س کو انھوں نے خود دیکھا تھا۔ وہ انتزاع سلطنت اودھ اور شاہی خاندانوں کے مصائب سے بہت متاثر
تھے۔ جب مطبع کا کاروبار شروع کیا تو ان کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ مختلف ذرائع سے نادر و کمیاب مخطوطات تلاش
کرکے ان کی اشاعت کا انتظام کریں، خاص طور پر ان مذہبی، اخلاقی اور تاریخی غیر مطبوعہ کتابوں پر زیادہ توجہ کی،

طلبا پریشان رہتے تھے عام طور پر کسی ایک استاد یا طالب علم کے پاس کوئی قلمی نسخہ ہوتا تو دوسرے حسب ضرورت کی نقل کر لیتے تھے۔ جس میں بہت وقت صرف ہوتا تھا۔ منشی نولکشور نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے قدیم مخطوطات و مسوّدات حاصل کرنے کے لیے جد و جہد شروع کی اس سلسلے میں ان کو شاہان اودھ کے پس ماندگان اور بعض علمائے کرام کے ذریعہ بہت سے مسوّدات ملے جن کو انھوں نے خرید لیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر جہاں کسی اہم مخطوطے کا پتہ چلا اس کے حصول کے لیے اپنا کوئی نمائندہ بھیج کر اس کو خرید لیا۔ بعض اہل علم نے عوام کے فائدے کے خیال سے بلا معاوضہ اپنے مخطوطات دے دیے۔ مؤلف جیون چرتر نے لکھا ہے کہ:

"اس سمے (وقت) چھاپہ خانہ کم ہونے سے پرانی کتابیں ہر علم و فن کی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی تھیں۔ آپ نے ان کا کھوج کرنا شروع کیا اور بڑے بڑے امرا متوسلان خاندان شاہی کے کتاب خانوں اور جہاں سے مل سکیں ہزاروں روپیہ خرچ کر کے بہم پہنچائیں...... تن من دھن لگا کر اپنے مطبع میں چھپوائیں جن کے ناموں کی فہرست ایک بڑی کتاب ہے۔"[1]

منشی نولکشور کی اس جد و جہد کی بدولت نادر و نایاب مسودے ضائع ہونے سے محفوظ رہے اور طبع ہو کر شائقین علم اور تشنگان علوم کو آسانی سے دستیاب ہوئے۔ منشی نولکشور کے فراہم کیے ہوئے بیشتر مخطوطات ان کی زندگی میں شائع ہو گئے تھے اور کچھ ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ ان میں سے بعض طباعت و اشاعت سے محروم رہے اور مطبع کے محافظ خانہ کی زینت بن گئے۔[2]

وہ اودھ اخبار کے بانی اور مدیر اعلیٰ تھے۔ اردو زبان کا یہ پہلا اخبار تھا جس نے صحافت کے معیار کو بلند کیا۔ حق گوئی اور بے باکی اس کی اہم خصوصیت تھی۔ خطرہ مول لے کر منشی نولکشور حکومت کے غلط کاموں پر تنقید کرتے تھے۔ اودھ اخبار کے صفحات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ انھوں نے ہر شعبہ کے لیے کام کرنے والا مقرر کر لیے تھے۔ اسی وقت اس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ کتب خانے اور مطبع کی کارگزاری دیکھنے کے بعد اودھ اخبار کے لیے کافی وقت صرف کرتے۔ ان کے علاوہ اپنی دیہاتی اور شہری جائداد کے معاملات بھی دیکھا کرتے تھے۔ خیال کرتے تھے کہ کام زیادہ اور آرام کم۔ یہ ان کا معمول تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں تقریباً پچیس فنون پر چار ہزار کتابیں طبع کرا کے شائع کیں۔

---

[1] جیون چرتر منشی نولکشور صفحہ ۸، مطبوعہ نولکشور پریس۔ [2] اودھ ریویو، ماہ فروری ۱۸۹۵ء۔ و تاریخ ادب اردو

تحفۂ کرنیل ایبٹ

TOHFAH COLONEL ABBOTT.

یعنی واسطے یادگار نامی جناب کرنیل ساؤنڈرس الکسس ایبٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنؤ کے

منشی نول کشور پروپرائیٹر مطبع نے مختصر کیفیات ہند تواریخ اودہ تا عہد واجد علی شاہ مسمی

تواریخ نادر العصر

مع حالات تعمیرات شاہی و نقشہ خاص شہر لکھنؤ مرتبہ کرنیل صاحب ممدوح الیہ جس سے محلے محلے کے حدود اور بعد مسافت

سڑکوں اور عمارات کا بامر دریافت ہو بعجلت تمام واسطے پیشکش صاحب ممدوح الیہ کے تالیف و ترتیب کیا

مقام لکھنؤ مین

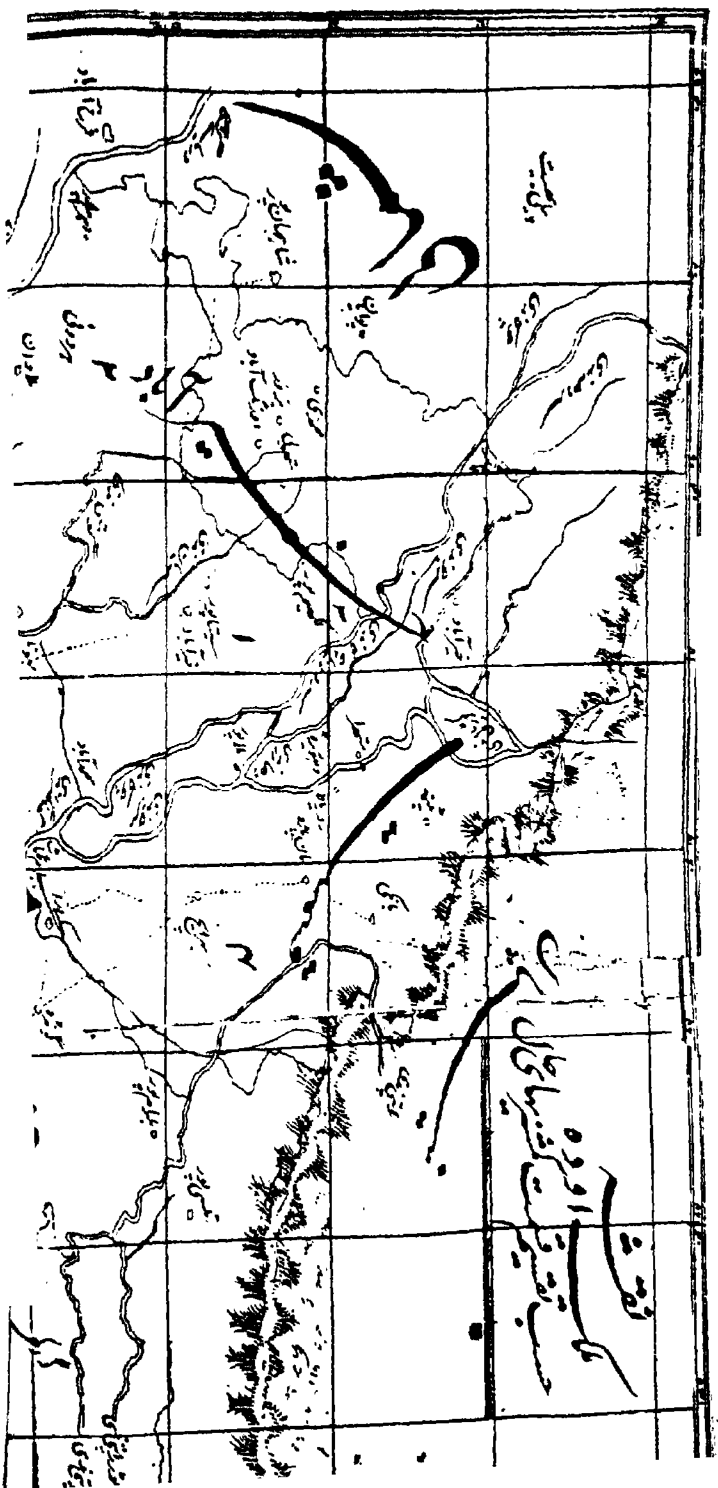
کارگزاران مطبع منشی نولکشور مؤلف نسخہ ہذا کے اہتمام سے چھپا

سنہ ۱۸۶۳ء

فہرست مطالب تواریخ نادر العصر

فہرست مطالب تواریخ نادر العصر

فہرست مطالب تواریخ نادر العصر



تقسیم قسمت اضلاع

قسمت	نمبر	ضلع
خیرآباد	۱	سیتاپور
	۲	ہردوئی
	۳	کھیری
	۴	بہرائچ
لکھنؤ	۵	لکھنؤ
	۶	دریاباد
	۷	رائے بریلی
	۸	اوناو
فیض آباد	۹	فیض آباد
	۱۰	گونڈہ
	۱۱	سلطان پور
	۱۲	پرتاب گڈھ



تبت
بھوٹان

هو المستعان

این نامه که خامه کرد بنیاد

توقیع قبول روزیش باد

راقم الحروف ہیچمیرز نول کشور جامع اوراق ناظرین اولی الابصار کی
خدمت مین گزارش کرتاہی کہ جب غدر ۱۸۵۷ء کے بعد یہ ہیچمدان
ملک پنجاب سے شہر اکبراباد مین پونہچا بعد چندے یعنی اخیر ۱۸۵۸ء
لکھنو کا اتفاق ہوا یہان جناب فیضماب کرنیل ایبٹ صاحب بہادر کی
ملازمت کیمیا خاصیت سے جو ہوشیارپور متعلقہ پنجاب کی ڈپٹی کمشنری
سے عہدہ جلیلۂ کمشنری و سپرنٹنڈنٹی قسمت لکھنو متعلقہ صوبۂ اودہ پر تشریف
لاے تھے ساعت سعید مین عزت و امتیاز حاصل کی بسکہ پنجاب مین
مطبع متعلقہ راقم کا حسن اہتمام قدردانی حکام سے مشہور تھا فرط عنایت
جناب صاحب ممدوح سے باوجود کم بضاعتی کے اسباب و آلات
کلکتے سے یہان لایا اوسوقت سے آج تک باوجود نشیب و فراز زمانہ
خاص خاوندی جناب محتشم الیہ کے سبب سے یوماً فیوماً ترقی رہی بلکہ
موقع احتمال ضرر مین برعکس فائدے حاصل ہوئے اب کہ ۱۸۶۳ء مین
صاحب محتشم الیہ پانچ برس کے بعد آسایش روحانی و صحت بدنی کے
لیے پندرہ مہینے کی رخصت لیکر عازم ولایت ہونے لگے صاحب

موصوف سے کے احباب کیا صاحبان ذوی رتبہ کیا روسا و عمائد شہر کو
جدائی اونکی بہت شاق گذری اس تقریب مین سپاس نامے پڑھے
گئے دعوتین ہوئین لہذا بقول آنکہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست حقیر نے
بھی موقع مناسب سمجھکر ہفتے عشرے کے اندر یہ عجالہ تالیفات قدیمہ
سے انتخاب کرکے اور کچھ اپنی یادداشت سے بڑھاکر اس بضاعت
مزجات کو پیشکش خدام عالیمقام کیا کہ تا تشریف آوری بطور یادگار تعوذ
بازوی روزگار رہے اور اس نام نامی سے مجکو اور میرے مطبع کو
تبرک حاصل ہو۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف ؎ چنانچہ قبل اظہار مطلب
اولا حالات تشریف آوری صاحب محتشم الیہ کے ہندوستان مین اور
کارگزاریہای عظیمہ بعد اسکے ذکر سپاس نامونکا جو روسا و عمائد نے
جس عنوان سے کے ساتھہ پیش کیے بگذارش حقیقت حال اور اخیر مین
قصائد و قطعات جو صاحب ممدوح کی مدح مین اس مطبع کے متوسلون نے
موزون کیے ہین سلکھے اگرچہ یہ ہدیۂ مختصر استحسان کے قابل تھا لیکن

کند ہر کس بقدر خویشتن منت گزاریہا
زیاران تحفۂ دیگر ز مظہر جانسپاریہا

کرنیل ایس اے ایبٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنو



LIEUT.-COLL. S. A. ABBOTT,

COMMISSIONER, LUCKNOW DIVISION.

Health, long life and prosperity may attend his retirement now and ever.

حال ابتداے آمد جناب کرنیل ایس ای ایبٹ صاحب بہادر کا ہندوستان مین

سنہ ۱۸۲۳ع مین کرنیل صاحب موصوف بعہدۂ انسائین ولایت سے داخل کلکتہ ہوے
دوسرے سال اسی عہدے پر مقرر ہوکر ہمراہ ۴۲ رجمنٹ ہندوستانی پیدل کو
بھیجے گئے چند روز کے بعد وہانسے تبدیل ہوکر ۵ رجمنٹ ہندوستانی مین مقرر ہوے
اور اسی فوج کے ساتھ ۱۸۲۴ و ۱۸۲۵ع مین شیخاواٹی کی لڑائی مین موجود
رہے جب سمبرلاھی گڑھی فتح کی گئی اوسوقت صاحب موصوف چند کمپنی کے
افسر تھے بعد اس لڑائی کے صاحب ممدوح رسالے مین پہلی رجمنٹ کے مترجم ہوے ۱۸۳۱ع
مین ماتحت کرنیل سر ہنری لارنس صاحب مرحوم کہ اوسوقت مین کپتان تھے
محکمۂ پیمائش کے اسسٹنٹ مقرر ہوے چنانچہ اسیوقت سے تا وفات کرنیل لارنس صاحب
دونون صاحبون مین دوستی چلی آئی صاحب موصوف نے جنکو عہدہ لفٹنٹ کا ملا
ضلع گورکھپور والہ آباد کی پیمائش کی ۱۸۳۳ع مین بندوبست کا محکمہ اونکے
تعلق ہوا اور اونھون نے ضلع کانپور و جونپور و کسیقدر ضلع بنارس و ضلع جالون
واقع بندیل کھنڈ کو پیمائش کیا اور جب ۱۸۴۲ع مین تخفیف مصارف کے
سبب سے گورنمنٹ نے کل پیمائش کے محکمے کی تخفیف کی صاحب موصوف نے اوسوقت
مین عہدۂ کپتان پایا تھا افسر کمسریٹ باختیار مجسٹریٹی ہمراہ کیمپ گورنر جنرل کے
واسطے بلخ اوس فوج کے جو کابل سے لوٹی آئی تھی فیروزپور کو جاتا تھا مقرر

ہوسے ۱۸۴۳ع مین جب کپتان ٹو نا صاحب موصوف بعہدۂ ایڈیکانگ
یعنی مصاحب لارڈ ایلن برا صاحب گورنر جنرل کی مقرر ہو کی ہمراہ محتشم الیہ
کلکتہ کو گئے ماہ اکتوبر سنہ مذکور مین صاحب موصوف ماتحت کرنیل
رچمنڈ صاحب بہادر سی بی اجنٹ گورنر جنرل اضلاع غربی و شمالی کے
اسسٹنٹ مقرر ہوی اور ماہ جون ۱۸۴۴ع تک ضلع لدھیانا و فیروزپور
اونکی تعلق رہا اس ۱۸۴۴ع مین ادن سپاہی پلٹن نی جو سندہ کو جاتی
تھی بغاوت کی اور خوف اس بات کا ہوا کہ سکھونکا ارادہ حملہ کرنیکا
ہی دہنے کنارے دریاے ستلج کے ایک فوج خالصہ کی جاکر مقیم ہوئی
تھا چونکہ رات کیوقت اونکی سردار مارے گئے وہ لوگ لاہور کو اپنے
بغاوت سی پھیری ہوے واپس آئے چند روز بعد صاحب موصوف کو حکم
پیمایش و بندوبست ضلع کیتھل کا ہوا مگر اختتام اسکا ہونہ سکا بوجہ
حملۂ ثانی سکھون کے کہ جو ماہ دسمبر ۱۸۴۵ع مین ہوا اوسوقت براڈفٹ
صاحب نے خاص چٹھی لکھکر صاحب موصوف کو طلب کیا کہ آسکے
انصرام رسد فوج جو جمع ہورہی تھی کرین صاحب بہادر سب انتظام
اسکا کرکے پچاس کوس گھوڑے پر سوار ہو جناب گورنر جنرل بہادر
سے انبالے مین جاملی اوسوقت خبر پہونچی کہ سکھونکی فوج دریاے
ستلج کے پار اوتر آئی ہے تب صاحب موصوف کو حکم ہوا کہ کسولی

پہاڑ پر جاکے فوراً ۹۲ رجمنٹ اور ایک نمبر فیوزیلیرس پلٹنیں لے آوین اوسیوقت بہ تعمیل حکم صاحب موصوف گھوڑے پر سوار ہوکر شام کسولی پہاڑ پر جو ۵۴ میل تھا پہونچے اور دوسری صبح فوج کو ہمراہ لیکر روانہ ہوے اور تھوڑے عرصے مین کمپ گورنر جنرل مین داخل ہوے اس بروقت مدد فوج سے ہارڈنگ صاحب بہادر نے دشمن کا مقابلہ مقام فیروزپور مین کیا اور میجر براڈفٹ صاحب وصاحب موصوف بھی لڑائی پر مصروف رہے مگر ایڈیکانگ یعنی مصاحب گورنر جنرل کہلایا کیے تبکی اور فیروزپور کی لڑائی مین منجملہ ۱۳ افسر ۵ مصاحب گورنر جنرل کے جو لارڈ ہارڈنگ صاحب کے ہمرکاب تھے کام آئے اور میجر براڈفٹ صاحب بھی اونمین سے ایک مصاحب تھے جو مارے گئے اور ۵ مصاحب گھایل ہوئے کہ منجملہ اونکے صاحب موصوف بھی ایک زخم رسیدہ تھے یعنی صاحب موصوف کو ایک گولی بائین ہاتہ سی ہوکر نکل گئی اور ایک کاندھی کی تلی سی پیٹ کی پسلی مین جا گڑی چھہ ہفتے تک صاحب موصوف اس درد و تکلیف مین فیروزپور مین مقیم رہے جب صحت ہوئی تب حکم ملا کہ دیہات مین جاکر تدبیر رسد کی کرین اس کارگزاری کی تعریف کی رپورٹ ولایت مین ہوئی اور تب کپتان صاحب بہادر کو عہدہ بریوٹ میجر کا ملا صاحب موصوف کو لارڈ ہارڈنگ

گورنر جنرل نے ایک تمغہ اور لقب انریری ایڈیکانگ یعنی
انریری مصاحب کا عطا فرمایا اور وہ لقب آج تک سب صاحبان
گورنر نے جو بعد لارڈ ہارڈنگ مقرر ہوئے برقرار رکھا۔
ابعد انصرام بندوبست ضلع کتھیل و لڈوا ایجر صاحب سنہ ۱۸۴۶ع
مین ضلع انبالہ مین مقرر ہوئے جب سکھون کی دوسری لڑائی
ہوئی صاحب موصوف اسی ضلع مین معتمد رہتے وہ بھی وقت
نہایت آزمایش و بیدارمغزی و بہادری کا تھا کہ سنہ ۱۸۴۹ مین ہوشیارپور
کے عہدہ صاحب ضلع کیواسطے مقرر ہوئے اور اس ضلع مین عرصہ تک رہے
صاحب موصوف نے کمال رفاہ و آسایش رسانی خلائق سے
نئے انتظام انگریزی کو اوسی ضلع مین جمایا یہ صاحب ہی کا کام تھا
اور وہان سے تھوڑے دنون کے بعد بوجہ ناسازی مزاج
پندرہ مہینے کی رخصت لیکر ولایت کو تشریف لیگئے ماہ فروری
سنہ ۱۸۵۲ع مین مراجعت فرمائی سنہ ۱۸۵۷ع مین بلوہ ہوا چنانچہ سنہ ۱۸۵۷
و سنہ ۱۸۵۸ کی بابت صاحب ممدوح کی مفصل کارگزاریان پنجاب کی رپورٹ
مین مندرج ہین اوس ایام غدر کا انتظام ایسا عمدہ کیا کہ نہ آسایش
رعایا مین خلل آیا نہ دست تصرف باغیان سے اوس ضلع کو ضرر پہنچا
کمال بیدارمغزی و بہادرانہ طریق سے ضلع ہوشیارپور کا انتظام

برقرار رکھا کہ آنزوے ستلج کے سب ضلعون مین آتش فساد
و نائرہ بلوہ مشتعل تھی اور گرد و پیش مین غدر کے نتیجے یعنے
لوٹ مار و خون خرابے سے حشر بپا تھا مگر صاحب موصوف کے
انتظام و اخلاق و غریب پروری سے جون تک نہ مری کرنیل
سر ہنری لارنس صاحب بہادر چونکہ چیف کمشنر اودہ تھے
میجر ایبٹ صاحب بہادر کو قائم مقام کمشنر لکھنؤ فرما کر تار برقی کی
خبر بھیجی تھی لیکن تار کو باغیون نے متصل شہر دہلی ہنگامۂ غدر
مین کاٹ ڈالا تھا اس سبب سے خبر نہ پونہچی جبکہ ۱۸۵۸ء مین
سر رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر چیف کمشنر ہوے اوسی
عہدہ کمشنری لکھنؤ پر مستقل فرمایا اور ماہ اپریل مین لکھنؤ
تشریف لائے اب لکھنؤ مین تشریف لائے ہوے پورے
پانچ برس ہوے اور اسی جگہ عہدہ کرنیلی کا حاصل کیا
اُس زمانۂ پرآشوب غدر مین اس عہدے پر لکھنؤ مین وارد
ہوے تھے کہ شہر اوجاڑ پڑا تھا اکثر مقامات پر آدمیونکی
لاشون کی بو سے دماغ سڑتا تھا خلق اللہ رمیدہ بھی
اپنے ڈر سے کانپتے تھے نواح مین باغیون کی لوٹ مار
غدر سے حشر بپا تھا اور آواز توپ و تفنگ سے افسران انگریزی

شب و روز مستعد بجنگ رہتے تھے چنانچہ خاص تدابیر صاحب موصوف نے اس قسمت کی قسمت کو بیدار کیا رفاہ پسندی اور آرام دہی سے رعایا کو تسکین دی اور آبادی مین توجہ فرمائی غرض عدل و رحم صاحب موصوف کا بیان کی حد سے باہر ہے لوگ خوف و خطر اپنے وطن کو آ کے خانہ آباد و دولت روز افزون سے آبادی شہر ہوئی شہر کی لوٹ اور ڈاکہ اور چوریون کا انسداد کیا گیا غرض پانچ برس رفاہ و آسودگی خلائق مین ایسی توجہ کی کہ آج کے دن صاحب موصوف کے محامد و صاف کو یاد کر کے فرط جدائی کا قلق سہا نہین جاتا۔

غرض ابتدا سے آمد ہندوستان مین اس ۱۸۶۳ء تک ۴۴ برس ہندوستان مین رہے خدا آسائش روحانی و جسمانی نصیب کرے اب سن شریف صاحب محتشم الیہ کا ۶۲ برس کا ہے اس بیان سے جانا چاہیے کہ صاحب محتشم الیہ نے کیسی کیسی دشواریان سہین ابتدای آمد ہندوستان سے اہم کامون کی انجام دہی یادگار اس ۴۴ برس مین جس جس مقام پر رہے رفاہ خلائق و کار سرکاری کو اپنی آسائش پر مقدم سمجھے اور خصوص اس پانچ برس کی کمشنری مین ۱۰ لاکھ آدمیونکو الطاف و رحم دلی و انصاف صاحب ممدوح نے یادگار رہیگا فقط

کرنیل ایبٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنؤ کا رخصت پر ولایت کو تشریف لیجانا

ای خرم از فروغ رخت لالہ زار عمر باز آ کہ رفت بی گل رویت بہار عمر

مارچ کی ۲۴ تاریخ سہ شنبہ کو ۳ بجے چتر منزل مین تقریباً ای سپاس (جناب معلی القاب کرنیل ساندرس الکسس ایبٹ صاحب بہادر کمشنر قسمت لکھنؤ) کے مجلس شاہزادون نوابون امیرون ساہوکارون اور نامی گرامی رئیسون اور صاحبان جلیل القدر کی منعقد ہوئی مگر چونکہ انعقاد مین عجلت ہوئی اسلیے ہزارون امرا و روسا کو عدم صحت تحقیق روز کے سبب سے خبر نہ پہنچی بکمال حسرت ہی اسپر بھی سب صاحب قریب ایکہزار کے تشریف فرما تھے مکان کی عالیشانی اور فضا اور سامان کے بیان کی یہان گنجایش نہین ہے عقیدت و ارادت جناب محتشم الیہ سے شہر کے جملہ روسا و عمائد و عوام الناس کا دل بکمال تمنا شاکر تھا سبب محتشم الیہ آسایش دہی و رفاہ رسانی و فراغ بخشی و عدالت نوشیروانی کا ہر متنفس مداح تھا چنانچہ آرزومندون نے ذریعہ اس حصول ملازمت و ادای شکریہ کا نواب محسن الدولہ بہادر کی تحریک سے پاکر اپنی اپنی تمنا پر کامیابی حاصل کی اور جلسہ عام مین سپاسنامہ مندرجہ ذیل پڑہا گیا

نقل سپاسنامہ از جانب شہزادگان

و روسا و عمائد شہر لکھنو

سپاسنامہ بخدمت کرنیل سانڈرس الکسس ایبٹ صاحب بہادر کمشنر
قسمت لکھنو و انریری ایڈیکان جناب مستطاب معلی القاب نواب گورنر
جنرل بہادر ویسراے کشور ہند خلد اللہ ملکہ از طرف جملہ شاہزادگان و
عزیزان خاندان شاہی و رئیسان و مہاجنان وغیرہ ساکنان شہر لکھنو
خاص کے نواب محسن الدولہ بہادر نے پیش کیا +

جو کہ بعد فتح لکھنو و دفع باغیان و تسلط سرکار دولت مدار گورنمنٹ انگلشیہ
در روز اجلاس فرمائی آپکے عہدۂ کمشنری لکھنو پر جو جو اخلاق و محبت و قدردانی
و شفا رپروری و عدل گستری نسبت ہم لوگون کے آپ کی جانب سے
ظہور مین آئین اداے شکریہ مین اوسکے ہم لوگون کی زبان قاصر ہے
آپ کی بیدارمغزی و معاملہ فہمی کی نسبت تعریف و توصیف کرنے کی کیا
حاجت انفصال مقدمات سے ظاہر ہے آپ کے انصاف و عدل سے
کوئی شخص شاکی کسیطرح کی حق تلفی کا نہین ہے بلکہ واضح ہے بعد ایام غدر کے
اس شہر تباہ و برباد کو اپنی عنایت سے اور ہم لوگونکی قدردانی
و دلجوئی سے از سر نو آباد کیا ہر فرد بشر آپ کی محبت و اخلاق سے راضی

و ثنا کرے ہے آپ کے عہد معدلت مہد مین ہر طرح کا چین و آرام رہا اس خطۂ جلیلہ کا بخوبی بندوبست و انتظام رہا جابجا باشندگان شہر کو آپ نے ترقی ز ضبطی سے بچایا مظلومون کو ظالمون کے پنجے سے چھوڑایا حق سے باطل کو جدا کیا عدل گستری و رعایا پروری سے ہر کہ و مہ کو مطمئن و دلشاد کیا جس سے ہم سب آپ سے بدل راضی و ممنون و شاکر ہین ہم لوگون کو آپ کی مفارقت سے بوجہ تشریف بری ولایت کے بتقریب رخصت کے جو کچھ رنج و ملال ہے زبان قلم تحریر مین اوسکے لال ہے لیکن کچھ اختیار نہین بجز اسکے کہ حق سبحانہ و تعالے ہمیشہ آپ کو اپنے حفظ و امان مین رکھے و بخیر و عافیت تمام منزل مقصود کو پونہچاوے اور جلد آپ کی ملاقات مسرت آیات بترقی جاہ و حشم پھر ہم لوگون کو مسرت اندوز کرے ترصد کہ تا زمان مفارقت بدستور مثل سابق کے شفقت و محبت و عنایت و عاطفت بہ نسبت ہم لوگون کے مرعی و مبذول رہے فقط مرقوم ۴ مارچ ۱۸۶۲ء روز سہ شنبہ

اوسکو ساعت فرما کر جناب معلی القاب صاحب بعزۃ الیہ نے موافق رسم مستمرہ استادہ ہو کر جواب باصواب اسنامہ مین فصاحت بغداد اد سے حوالہ زبان گوہر فشان کر کے آویزہ گوش ہوش اہل دربار فرمایا وہ بھی برج درج گوہر بار ہے بسکہ ہجوم خلائق سے فضاے جلسہ پر اوسکی سننے کی تمنا بدل رہی اسواسطے حسب الایما صاحب محتشم الیہ میر منشی مطبع نے باواز بلند سنایا

جواب سپاسنامہ از جانب کرنیل ساندرس الکسن ایبٹ صاحب بہادر کمشنر لکھنؤ مخاطب بنواب محسن الدولہ بہادر و شاہزادگان و امرایان و رئیسان شہر لکھنؤ

ای صاحبو پانچ برس کا عرصہ گذرا کہ راقم حسب الطلب صاحب نیک صفات سر رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر جنکی یاد یقین ہے کہ آپ سب صاحبون کو ہوگی بعہدۂ جلیلۂ کمشنری قسمت لکھنؤ کے پنجاب سے اس جگہہ آیا اسی عرصے مین شہر لکھنؤ باغیان سے صاف ہوا یہ باغیان ایسے نمکحرام تھے کہ سرکار گورنمنٹ سے جسنے سو برس تک انکی پرورش کی برخلاف ہوے اور تمام ملک ہندوستان مین علم بغاوت بلند کیا شہر لکھنؤ مین بکثرت مورچہ ہونا کہ بندیان جو ویرانگی تھی رعایا اے شہر فرار ہو گئی اور شہر بعد فتح فوج سرکاری کے ہاتہ بدمعاشان و ڈکیتان سے غارت ہوتا رہا بلکہ یہ صورت عرصے تک رہی اور بعد واپسی رعایا بدقت و مشکل تمام امن و انتظام ہوا الوٹ ویر تک موقوف نہوئی اسنے صاحبان جو آپ سے نسبت ہمارے سپاسنامے مین تحریر فرمایا ہے کہ ہاتہ ظالمون سے بچایا اوس سے آپ کی یہی مراد ہے جو بالا لکھا گیا آپ شاہزادگان و امرایان و رعایای شہر لکھنؤ نے جو توصیف محنت راقم انتظام و انصاف گستری مین فرمائی ہے مین نہایت خوش ہوا اور یہ امر

جو آپ صاحبان فرماتے ہین کہ ہمنے راستی کو باطل سے علیحدہ کیا ایسین ہمارے فہم کی بہت زیادہ توصیف ہوئی یقین ہے آپ صاحبان کو کہ سبب نہونے رعایا کے راستبازی کے انصاف گستری مین نقصان عظیم واقع ہے علاج یہ ہے کہ ہر ایک آپ صاحبان مین سے اولاد خاص و عام کو ترغیب تعلم علوم دین و نیک راہی و شوق راست گفتاری مین کوشش و امداد فرماتے ہین اور بڑی امداد یہ ہے کہ آپ صاحبان خود بجاے کارندگان و مختاران کے اپنے امورات و کاروبار مین اپنی اوقات و توجہ مبذول کرین اکثر آپ صاحبون مین سے اہالیان کمیٹی صفائی مین نہایت بہتر ہوگا اگر آپ سب صاحبان واسطے فوائد مشترکہ عام کے توجہ بلیغ فرماوین اور تدابیر نیک واسطے صحت و آسائش و رفاہ کے تجویز کرین کہ یہ امر منتج فوائد عظیم ہوگا و انتظام دادانصاف ہی مین بھی آپ کی امداد و کوشش سے فوائد و بہتری ہو سکتی ہے آپ صاحبان اگر واسطے تقرر اسیسری یا جوری وغیرہ کے طلب فرمائے جاتے ہین تو اوسکو تکلیف تصور کرتے ہین ہمارے راے مین یہ تجویز باعث بہتری آپ صاحبان کا ہے کیونکہ اس وسیلے سے آپکو اپنی راے پر اعتماد و بھروسا حاصل ہوگا اور ظاہر ہوگا کہ انتظام عدالت نہ صرف بطور ضابطہ ہے بلکہ واسطے گواہی دینے خاص و عام کو کہ صاحبان مجسٹریٹ و جج بہادر انصاف و درستی فرماتے ہین اور اسلیے کہ آپ اونکو تجویز منصفانہ مین امداد فرماوین کہ

یہ مفید ہر ایک صاحبون وخاص وعام کے ہوگا ہماری نہایت خوشی ہے
کہ آپ صاحبان مین سے جتنے صاحب آنریری مجسٹریٹ مقرر کیے جاوین
چند عرصہ گذرا کہ یہ امر تجویز ہوا تھا یقین ہے کہ آسواسطے ملتوی رہا کہ اسکا
انتظام پنجاب مین جہان اجرا ہوا امتحان دیکھا جاوے ہمکو یقین ہے
کہ پنجاب مین یہ انتظام بہت مفید ہوا ہو امید ہے کہ ہمکو موقع مبارکبادی
دینے کا درباب جلد بننے سڑک آہنی کے آپ صاحبون کو ملے کہ اس
سڑک سے شہر لکھنو وکانپور ودہلی وکلکتہ ایک ہو جاینگے اور اس سڑک
سے آپ صاحبون کو نہایت فائدہ ہوگا کہ آپ قدر ومنزلت زمانہ مین کے
اور دور آرایش سامان مین کوشش تمام پیش قدمی کرینگے اور پیچھے تر رہینگے
ای شاہزادگان ونواب صاحبان ورئیسان لکھنو مین شکر دلی ادا کرتا ہون
کہ آپ نے اس طرز شائستہ سے مجھے دعای بہبودی دی اور میری
مراجعت کی آرزو فرمائی یقین رہے آپ صاحبان کو کہ ہمارا دل لکھنو مین
ہے اور ہم نہایت رنج سے واسطے گوشہ آرام لیتے اپنے وطن کے
شہر سے جدائی کرتے ہین الا ہماری آرزو ہے کہ اگر زندہ رہے اور
اس عرصہ پندرہ یا بیس مہینے مین صحت حاصل ہو گئی تو ایک مرتبہ آپ
صاحبان کے پاس مراجعت کرینگے اور اس سپاسنامے مین جو آپ نے
بیانات مہربانی آمیز تحریر فرمائے ہین اسکا ہم بہت شکر ادا کرتے ہین

اور ہماری دعا ہے کہ آپ سب صاحبان تندرست و کامیاب ترقی دولت کرین

از مولف

صاحب ممدوح کے محامد ذاتی و صفاتی عدل و قابلیت و خلق و حلم و قدردانی
ہرگز محتاج بیان نہین +

چلتے چلتے اونکی توجہ مربیانہ اور رفاہ پسندی اور عنایت جو عائد حال
خاص و عام رہی تمہ اوسکا دنکے سپاسنامے سے آشکار ہے یعنی جو
امور کہ مفید اور باعث انتظام و بہتری خاص و عام کے ہین اونکی یاد پیرایہ
پند و نصائح مین دلائی جسپر عمل فرمانا نتیجہ آسودگی و بہبود خاص و عام ہے +
یہ سب دلسوزی اور توجہ اونکے عہدے سے بڑھکر محض نیکذاتی خلقی کا
موجب ہے سرکار کا کام ایسا کیا کہ انصاف مین نوشیروان پر سبقت لیگئے
رعایا پروری ایسی کہ ماں باپ بہی کرتے حفظ مراتب وسادہ کہ قیامت تک
اونکو نہ بہولینگے +

ملک اودہ کے زہے طالع کہ یہان سب حکام عادل اور رعاپرور
اور نیکنام ہین حسن خلق مین یکتای روزگار ممدوح خاص و عام ہین دیکھو
آسمان پر بہت ستارے منور ہین قدرت خالق سے ہر ایک سے
فائدے مقرر ہین لیکن دن کو آفتاب کا جواب نہین رات سکے نہ
نامی ماہتاب نہین شعاع مہر سے میوون مین پختگی آتی ہی چاندنی اثمار کا

رس بڑھاتی ہی اسیطرح صاحب موصوف اپنے صفات مین انجاب ہین
زر بہروزی کے آفتاب شب امید کے ماہتاب ہین ـــ

الغرض بعد رسم سپاس کے صاحب والاشان سوار ہوے اور مجلس
برخاست ہوئی اوسوقت کے افسوس اور حسرت کا حال لوگون کے
دل سے پوچھنا چاہیے مگر ان صاحب ممدوح الوصف کے امید
بازآمد سے البتہ تسکین قلق مہاجرت ہے ـــ

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور کلبۂ احزان شود روزی گلستان غم مخور

۲۰ مارچ کو بتقریب رخصت صاحب ممدوح کی جناب فیضماب نواب
محسن الدولہ بہادر رئیس اعظم لکھنؤ نے روشنی و آتشبازی کے ساتھ
بڑی دہوم دھام سے دعوت کی سبحان اللہ نواب صاحب کا
کیا کہنا شہر کی آبرو ہین سرکار کے دولتخواہ حکام کے رضا جو ہین
الحاصل صاحب معزی الیہ کی جدائی کا قلق ایک زمانے کو ہے
اور سب دست بدعا ہین کہ مع الخیر والمراد بعد اتمام رخصت کے
پھر اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس خطے کو غیرت ارم
اور دیدار فیض آثار سے منور فرمادین آمین ـــ

بسفر رفتنت مبارکباد بسلامت روی و باز آئی

قطعہ حسب حال عقیدت مؤلف از نتائج طبع سلیم مرزا اسیم

ای فلک افسوس کیون کرتا ہی ہم سی امتحان — سوچ اتنا او ستمگر تو کہان او ہم کہان

کونسا احسان کیا تہا جسکی یہ پاداش ہے — اپنے محسن سی جو آئی لفظ رخصت بر زبان

وائی قسمت ہم نے بہی تہی یہ جو دیکہنگی قدم — ہائی ناکامی یہ کیا سامان نظر آیا یہان

جوش بیتابی یہ کہتا ہی کہ ہو غفلت گزین — جب نہ آئی گل نظر کیا ہی سیر بوستان

آرزو ایما یہ کرتی ہی کہ جیتی ہی تو تابہ — ورنہ لطف زندگی ہوجائیگا خواب گران

عالم ایجاد مثل گوشۂ تاریک ہے — رنج فرقت سی نظر مین دن ہی شام ہجران

وہ زمان جسمین مری محسن کی ذات پاک تہی — کس طرح بہولین کہ جوش غم سی اوٹہتا ہی دہوان

یاد آتی ہین ہمین وہ روز آغاز ورود — جبکہ تہا ملک اودہ ممنون احسان خزان

آدمی ناپ گہر تہا رنج ویران ملک دشت — ہر در و دیوار سی پیدا صدای الامان

داد دی ہمت کہ آباد دیکہکر دل مین جو رحم — کر دیا جو اجڑی ہوئی بستی کو گلزار جنان

ہر غریب عاجز و محتاج پر بخشش ہوئی — بچ گئین جانین ہوا دلشاد خلق بیکسان

ہر امیر و صاحب عسرت نی پایا اک عروج — خوش ہوی سینون مین دل آئین دعائین بر زبان

عمل جو اصاحب کمشنر کی زیادہ عمر ہو — یعنی وہ کرنیل ایبٹ رونق ہندستان

مل گئی جاگیر جو جویان تعلقدار تہا — فیصلہ ہونی لگی ہر سونکی جہگڑی ہر زمان

تہی جو ظالم اونکو پاداش عمل اپنی ملی — عاجزونکی شکر کرنی کو ہوئی گویا زبان

کثرت سامان راحت سی تہا یہ وقت یاد — یعنی اکدن اس چمن پر آئی گی باد خزان

دفعتاً [illegible] — سنتی رہ جاتی [illegible]

آئی اشک چشم استقبال مہمان کے لیے
لب ہوے اندوہ سے مصروف فریاد و فغان

بہر سیر دوست آیا بہر استفسار حال
یون کہا صاحب نے تہا کس لیے آئے یہان

اس لیے چندی براے سیر بنیا عزم ہے
جلد آئین گے بشرط خیریت ہم پہر یہان

بسکہ تہا اک مین بہی صید دل غمہاے گہر
دل ہوا مانند بسمل سوز فرقت سے تپان

بے تامل بر زبان آئے یہ اشعار دعا
یاالٰہی تا کہ ہے بنیاد کاخ آسمان

یاالٰہی تا کہ ہے بنیاد ہستی کو بقا
یاالٰہی تا کہ ہے سر پر یہ نیلی سائبان

اقتدار و عزت و اقبال صاحب کا رہے
مدعی ہون زرد رو جیسے طرح برگ خزان

جلد پہر تشریف لائین تا یہ غم جاتا رہے
اے پہر پابوس کو کو سوئے خیل دوستان

لکہنؤ مین دہوم ہو ہر سو مبارکباد کی
ہو سلامی در پہ ہر ہر طفل و ہر ہر نوجوان

مین قصیدہ مدح کا لکہ کر پڑہون با طبع شاد
دیکہون ان آنکہون سے لطف بزم خیل دوستان

اے قلم بس رنج فرقت سے نہین دل کو قرار
جوش غم کثرت پہ ہے کر اختصار داستان

الیضا

دریغا کہ یہ دور لیل و نہار
نہین ایک صورت پہ رکہتا بہار

کبہی کچہہ کبہی کچہ کبہی کچہ ہے رنگ
زمانہ نہین قابل اعتبار

اگرچہ ہی دن کو بلبل ہنسے ہین
تو ہے شب کو شبنم کی چشم اشکبار

کوئی چشم تر یاد احسان سے ہے
کسی جا ہے عزم سفر آشکار

غرض تا کجا شکوۂ انقلاب — گذر اس سے ای خامہ کر اختصار

رقم کر مضامین رخصت بہی چند — کہ دل مثل سیماب ہے بیقرار

وہ محسن کہ جس سے ملین راحتین — وہ حاکم جو تہا عادل روزگار

وہ سردار جسکی کہ در سے کبھی — نہ محروم اوٹہا کوئی امیدوار

غریبون پہ احسان امیرون پہ لطف — اب ایسا کہان صاحب باوقار

اور وہ بعد تاراج اک دشت تہا — ہوا فیض سے اوسکے پہر نو بہار

وہ مجرم جو مایوس تہی زیست سے — قصور اونکے بخشے گئے بار بار

رہا کون باقی وہ صاحب غرض — نہین جسکے نخل تمنا مین بار

فدا اون پہ اور اونکی الطاف پر — یہ کرنیل ایبٹ ہین جو نامدار

الہی رہے عمر و دولت سدا — یہ جب تک کہ ہے ہستی روزگار

بڑہی اور بھی اوج اقبال مین — ملی دشمنون کو دل داغدار

کہانتک بیان لطف و اوصاف ہون — زیادہ ہی قید سخن سے شمار

مری پرورش کا جو آیا خیال — ہوئی صورت مطلع نامدار

وہ احسان کیی جنکی کچہ حد نہین — کہانتک اوا شکر ہو بار بار

تمنا تو یہ تہی کہ تا زندگے — جدا اسلئے کسی دم نہو آشکار

رہین یون ہی ممنون احسان سدا — مگر حیف ای گردش روزگار

وہ دل جسمین لبریز تھا جوش آرزو
وہ جان تھی محبت سی جو بیقرار

اونہین یہ نظر آئی شکل سفر
بجز آہ و افسوس کیا اختیار

الٰہی بس اب ہی یہی آرزو
کہ جسدم چلین صاحب باوقار

ترا سایہ فضل اونپر رہے
سبھی سونپتا ہون مری کردگار

بر آئین مرادین جو کچھ دلمین ہین
موافق رہے دور لیل و نہار

بہت جلد تشریف لائین یہان
کہ دل دوستون کی ہون پربہار

رئیس و مصاحب سبھی نذر دین
سنین کو شادی کی غل بار بار

قدم سے ملین آنکھین احباب دوست
خوشی سی ملین صاحب نامدار

تھہری قلم ختم مطالب ہوا
دعا لکھہ ہمیشہ رہے اقتدار

قصیدہ از نتائج طبع شاعر سحر بیان شیرین زبان منشی غلام احمد صاحب شایان

گلستان سی ہوتی ہی رخصت بہار
خزان نکہت گل سی کہاتی ہی خار

یکایک شاہ گل کی رخصت ہی آج
کہ بلبل ہی گل کی روش دلفگار

گلون کو ہی کیا ای صبا بیکلی
دل عندلیب آج سے داغدار

پریشان ہین قمریان باغ مین
رخ سرو سی ہی عیان انتشار

بنا غمکدہ گلشن لکھنؤ
اوتارا عروس چمن نی سنگار

بہت تنگ ہی یوسف گل کا حال
گریبان و دامن ہین سب تار تار

ری غنچۂ دل کو تھی بستگی — یہ بول اوٹھا اک بلبل بیقرار
شایان اوڑا کیون ہی پھر یکا رنگ — ہاک دل یہ پاین آج صدمی ہزار
یان کیا کرون حال نیرنگ چرخ — کہ ہی اسکی ہاتھون سی سینہ فگار
ہن کا تہا جو باعث رنگ و بو — ملا جسکی گلگشت سی افتخار
ہسی دیکھکر نو عروسان باغ — سماتی نہ جامی مین تہی زینہار
ہی ہوتیا کر لگا یا جو ہاتہ — ملی اوسکو آب و رشا ہوار
نا ہاتہ ملتی ہی اوسکی سیے — ولایت کو ہوتی ہین وہ اب سوار
بیعت جو ہی اندنون کچہ علیل — اسی سی وہ رخصت کی ہین خواستگار
ہا بخش عالم اونہین دی شفا — عروسانہ صحت رہی ہمکنار
سنکر گل افشانی عندلیب — مین کو یا ہوا اوس سی بی اختیار
نا ہی آویزۂ گوش ہو — وہ نام مبارک جو ہی ذی وقار
متی ہی بلبل ہوا نغمہ سنج — وہ کرنیل ایبٹ ہین عالی تبار
عازم ہین لندن کی اسکا ہی غم — اونہین جلد پھر لائی پروردگار
سنکر کہا مین نی ای مشت پر — تری گلفشانی پہ دل ہی نثار
ہی یہی فکر لائی یہان — نہین تجسی بہتر کوئی غمگسار
ی جب سی یہ لکھنؤ مین خبر — یہ آنکھون تی اشکو نکا باندہا ہی تار
ی مر رہا ہین ہر طرف مرح خوان — یہ صاحب حقیقت مین ہین نامدار

ریا وہ ریاض عدالت کو رنگ
خلش کر سکا گل سے ہرگز نہ خار

وہ م عدل عیسائی اہل ہند
کسی مین تفاوت نہ تھا زینہار

رقم لوح دل پر ہین ساری علوم
ہنر سب طرح کی ہین اونپر نثار

ریاضی کو اونسی بہت رنگ و بو
ستارون کا ہی اونگلیون پر شمار

بھلا کیا ہو وصف تکلم بیان
نفس رشک موج نسیم بہار

زمین پر ہی پیش نظر سیر چرخ
نظر کی ہین سیار و ثابت نگار

شرف اونسی حاصل ہی ہر علم کو
دبیر فلک عقل پر ہی نثار

عجب علم پیمایش اونکو ہی یاد
حساب زمین جسکے قلم آشکار

بنایا ہی نقشہ جہان کا عجیب
کہ آئینہ سے حال آئینہ وار

کیی ہین قوانین نو اختراع
سند ہی ہر اک قول ہی پایدار

سخاوت مین حاتم کا ہی ذکر کیا
لحد مین ہی قارون کا سینہ فگار

مروت مین نہ فر شجاعت مین فرد
ملا اونسی دونون کو ہی اقتدار

دل افواج دشمن کا چورنگ ہو
جو تلوار کھینچین وہ م کارزار

ہرن بنکی شیر فلک آئی پیش
اگر عزم فرماوین کہسر شکار

صفت اونکی گھوڑونکی اب ہو رقم
صبا ہر قدم پر ہی جنکی نثار

نہایت ہین شایستہ خوش قدم
زمین پر جھمکتی ہین وہ برق وار

ہوا سی ہین سرعت مین چالاک تر
نہ سایہ کو پہونچی پری زینہار

نہین اونکی کچھ بھی ہوا پرسا ہی تخت — سلیمان کا حاصل ہی عز و وقار

زبان لائق مدح شایان کہان — کرون اونکی تعریف کیا آشکار

خدا اونکو پہر لائی با عز و جاہ — دعا ہی یہی اپنی پروردگار

پہر آباد ہو گلشن لکھنؤ — پہر آئین ولایت سی مثل بہار

قلم دی نہ مضمون فرقت کو طول — مناسب دعا پر ہی اب اختصار

فلک پر ہی جبتک مسیحا کا در — زمین پر مہ و مہر ہین نوربار

یہ جبتک کہ قائم ہی ارض و سما — نمایان ہین دنیا مین لیل و نہار

یہ کرنیل ایبٹ بہادر مدام
رہین زندہ با دولت پایدار

قطعہ تاریخ

رخصت کرنیل ایبٹ صاحب بہادر
کمشنر لکھنؤ منکلام محمد مردان علیخان
رعنا اہلکار سرکار کپورتھلہ

ہین فخر فرنگ کرنیل ایبٹ صاحب — گلگشت وطن کو ہند سے پا در رکاب

تھی قسمت لکھنؤ کے فرمان فرما — عدل و کرم و خلق سے وہ عرش جناب

باندھی ہی ہوا عدل نے اونکی ایسی — مقدور نہین توڑ سکی ایک حباب

ایسی ہین وہ سیر چشم عدد در — خاتم کو رہا اونسی سدا چشم حباب

خلقت مین ہی اونکی اسقدر خلق عمیم — مداح غریب ہین سبے تا نواب

اب اونکی فراق مین ہی رے مردم چشم — دریا کوزی مین ہی کہ ہی چشم پر آب

دلسوز رعیا کی جدائی مین آج — دل آتش دوری سی ہی ہر رنگ سیماب

اسدرجہ مشایعت ہوئی عالمگیر — قدسی بھی چلی آئے پئے حمد ارباب

جبتک ہی جہان مین رسم مدحہ آمین — فرمانده خلق رہ رہین یا وہاب

رعنا کی دعائیہ سے ہے تاریخ سفر
بالخیر کہ لکھنؤ مین وہ آئین شتاب

۱۸۶۴



ابتدای عالم

بقول اہل ہند خدای تعالی نے اول برہما کو ابو البشر پیدا کیا اور کل مخلوق برہما سے عالم ظہور مین آئے اور تمام عالم برہما سے شائع ہوے جن سے ہر چار بید ملو ہین تفصیل اونکی اور کتابون مین بشرح موجود ہی

ہندوستانکے ہندو راجون کا سلسلہ

اس ملک کی سلطنت ہندو راجاؤن کی ہمیشہ سے سورج بنسی اور چندر بنسی راجاؤن کے خاندان مین رہی لیکن اگلے زمانے کے ہندو راجاؤن کا حال ٹھیک ٹھیک پتہ وار معلوم نہین ہوتا اور اونکے سال سمبت ومدت سلطنت کا کچھ پتہ نہین اور نہ کبھی کسی زمانے مین ہندو راجاؤن مین سے ایک خاندان ایسا رہا کہ کسی زمانے تک اقسام تحریری وکوائف پایا جاے اور ہند مین طوائف الملوکی ابتدا سے معلوم ہوتی ہی یہ بات ضرور مان سکتے ہین کہ ہر ایک راجا چھوٹی چھوٹی

کومت پر دولت و حشمت ہند سے متمکن و قانع تھا اور کسی نوع کی
محتاجی نتھی ــــ اگرچہ اس ملک کے رہنے والے عموماً ہندو کہلاتے رہے
ور کہلاتے ہین لیکن اختلاف طریقے مذہبی و عقائد سے صدہا مذہب
جداجدا بن گئے اور اسی وجہ سے بھی ایک فریق نے تعصب سے
دوسرے فریق کے ذکر کو اپنی تصنیفات مین دخل نہ دیا بلکہ خلاف ہی
لکھتے رہے اس سبب سے بھی مغالطہ عظیم واقع ہوتا ہی علاوہ اسکے
مت کچھ ذخیرے علوم کے ضائع ہو گئے رہا سہا جو کچھ کہین بنا بگڑا ملتا ہی
وسکے سمجھنے کا علم دشوار اس ہندوستان مین دو بڑے مذہب نے
رواج پایا ایک مذہب برہمنون کا جو اسوقت مین ہندوستان مین
وسکے اصول پر عموماً عقائد اور پابندی ہی دوسرا بدھ کا ان دونون
ذہب والون مین حد کے مرتبہ تعصب ہا بدھ کے مذہب والون نے
برہمنون کی کتابین خاک مین ملائین اور برہمنون نے بدھ والون کی
تھیان غارت کین یہان تک کہ مسلمانون نے دونون کو نیست و نابود
کردیا مثل چھاپے کے آگے کوئی حکمت ایسی نتھی کہ ایک ایک ہزار برس
جلد باقی رہین اب کوئی حال ٹھیک ٹھیک نہین معلوم ہوسکتا مگر مختصر یہ
ہند کا پہلا دار السلطنتہ کونسل دیس یعنی اجودھیا عرف اودھ جہان
راجہ رام چندر اوتار فرمانروا تھے اونکا حال تصریح رامائن وغیرہ کتابون سے

مشہور ہی اوسکے بعد اب تک ہند مین دو خاندان راجاؤن کے مشہور
اور معتبر ہین اول سورج بنسی دوم چندر بنسی سلسلہ ان دونون کا برہماجی
منتھی ہوتا ہی سورج بنسی مین برہما سے ایک طبقے کے ۸۰ راجہ اور دوسرے
طبقے کے ۳۵ راجہ ہوے اور چندر بنسی کا برہما سے مختلف سلسلے کے
۱۳۱ راجہ کا شمار ہی اور دارالحکومتہ ہر ایک کا اپنے اپنے زمانے مین مختلف
مقامات پر رہا راجگان دہلی یعنی اندر پرست ہستناپور کا خاندان راجہ پانڈو
سے ہی جنمین راجہ نامی اول جدشٹر ہوے اونکا کارنامہ مہابھارتھ مین
مشہور و موجود ہی اور زمانۂ راجہ جدشٹر کو تخمیناً پانچ ہزار برس گذرے راجۂ
موصوف سے راجہ کھیمن تک ۸ پشت حکومت اس خاندان مین رہی
بسر ورنام وزیر راجہ کھیمن کو قتل کرکے مالک سلطنت کا بنا ملک اجودھیا
سب اوسکے قبضہ تصرف مین تھا پسر راجہ بسر ور سے بکرماجیت تک مختلف
۲۴ راجاؤن نے راج کیا راجہ بکرماجیت فرمانروای ہند تھا تختگاہ اوسکی
اوجین تھی عدل اور نیکنامی اور رعایا پروری اور بخشش مین ضرب المثل
اور سمبت اوسکا آج تک رائج ہی اس راجہ سے راجہ پتھورا تک ۷۴ راجہ
گذرے یہ راجہ پتھورا ہند کا اخیر راجہ تھا عہد راجہ جدشٹر سے زمانۂ راجہ پتھورا
تک پانچ ہزار چار سو آٹھ سال مین ایک سی بیس برس راجاؤن نے
حکمرانی کی اور راجہ پتھورا کے بعد علاء الدین غوری ہند پر تسلط ہوا فقط

راجہ رام چندر جی کے بعد راجہ جدشٹر داسی دور کلجگ مین بکرماجیت و
بھوج ہندوستان کے راجاؤن مین یادگار ہین

علم کا بیان

سب مورخون کا اسپر اتفاق ہی کہ تمام علوم پہلے ہند مین موجود تھے اور ایسے
اہل یونان و مصر نے اور اونسے اہل یورپ نے حاصل کیے باوجود
کثرت حکما کے سکندر بھی ایک حکیم ہند سے لیگیا تھا سب علم نادر اور
طرح طرح کی حرفت اور صنعت پران اور بیدون مین بھری ہوئی تھی
مگر زبان اونکی شنشکرت مشکل اور دقیق ہی فقط اور اس زمانے مین بھی
اکثر علوم کا چرچہ بنارس اور کشمیر وسوای ریاست ہندوستانی مین قدیم ایسے
سنسکرت کا استعمال ہی مگر تعلیم و تعلم باقاعدہ کم

ہنود کے مذہب کا طریق

مدت دراز سے ایک ایک کا مذہب اور طریق اہل ہند کا چلا آتا ہی اور یہ اونکے
سخت پابند ہین ہندو اگر دوسرا مذہب اختیار کرے ہو سکتا ہی لیکن مذہب
ہنود مین نہین آسکتا ہی اور دوسرا مذہب والا ہرگز ہندو نہین ہوتا ہی
رسوم و عبادت ہزارون برس سے ایک طرح پر چلی جاتی ہی منجملہ اونکے

ں باتین قابل ذکر کے ہین سلہ اس مذہب والے ایک شادی کے سوا
دوسری شادی جبتک کہ زوجہ اوسکی زندہ ہو نہین کرتے ہین سلہ کھانا
ہی کے ساتھ غیر برادری کے اور بے نہائے نہین کھاتے شراب اور
گوشت بکری کا کچھ ہندو کھاتے ہین اور کل گوشت کو تمام ہندو نہین کھاتے
سلہ سواے ہندو کے جو اپنے طریق کا ہوتا ہی غیر مذہب والے سے شادی
نہین کرتے سلہ مردے کو آگ مین جلاتے یا دریا مین بہاتے ہین ۵
ب رشتہ یعنی زنار اکثر اور سر پر چوٹی کل ہندو رکھتے ہین سلہ شوہر کی لاش
کے ساتھ عورت خوشی خوشی ستی یعنی جل جاتی ہی مگر یہ رسم سرکار نے بالکل
بند موقوف کروادی غرض ایسی ایسی بہت سی خصوصیتین رسمی و مذہبی ہین جنکے
وہ ایک طور پر پابند ہین یہان عام اہل ہنود کا ذکر نہین اونمین بعضے ایسے
بھی ہین جو بے نہائے کھانا کھاتے ہین اور راجہ کئی کئی شادی بھی کرتے
ہین اگرچہ اڑھائی ہزار برس پیشتر ہند مین ایک مذہب بدھ کا تھا
مگر یہ بھی مذہب ہنود سے تھا اور اب اس مذہب بودھ سے چین اور برہما
کا ملک آباد ہی اور خال خال ہندوستان مین بھی ہین لیکن وہ بودھ
مین سراوگی و چینی بودھ مذہب ہی کے پیرو ہین اور اس مذہب والے
معتقد ہم ۲ اوتار کے ہین اس زمانے کے ۱۲ اوتار کے قائل ہین جسمین سے
دسوان اوتار کا کلنکی کہ جسکا سنبھل مراداباد مین قرار دیتے ہین ظہور باقی ہی

مدت ناتمام اور دنیا کی عمر کروڑون برس بتلاتے ہین اور کسی نبی اور کتاب آسمانی اور طوفان نوح کے قائل و مقر نہین لیکن چارون بید کتاب آسمانی ہین فقط پرانے وقت کی رسم وراہ علم و ہنر مذہب کی پابندی سے کے عہد سے زیادہ تر میان دوآب یعنی گنگا و جمنا کے درمیان ہین شمار ہو سکتے ہین

ہند کا حال

ہند دنیا کے ملک کا مجموعہ ہی پہاڑ سرد ہین میدان گرم ہی جانور چرند پرند ہین پیدا ہوتے ہین میوے نباتات اور معدنیات طرح طرح کے بکثرت ہین جنس غلہ ہر قسم کی پیدا ہوتی ہی اور ہر شی بہ نسبت اور ملکون کے ارزان ہوتی ہی موسم جاڑا گرمی برسات مقرری ہی مگر کوہستان ہین جاڑا اور برسات بہت اور میدان ہین خصوص دکھن ہین پورب تک گرمی بشدت امراض وبائی اور فصلی بخار ولرزہ اور ہیضہ برسات ہین اور بخار وغیرہ موسم گرما ہین شائع ہوتا ہی مگر طبیب بھی ویسے ہی اور دوائین ہر قسم کی جابجا ملکون ہین مہیا ہین سرکار کے دار الشفا بھی موجود فقط اور دریاؤن کی کثرت اور شادابی سے یہ سرزمین تمام دنیا ہین باغ ہمیشہ بہار ہی

باشندہ

ہند کے باشندے ۱۴ اکثر آرام طلب اور کاہل عیش دوست خود پسند

ہوتے ہین اور اس عادت کے سوائے یہ بھی صفت ہی کہ مہمان نواز خلیق صاحب علم
صاحب علم وہیر دستکار بھی اکثر ہوتے ہین مگر تمام ہندوستان مین مدہ دیس
جو بنارس سے دہلی اور ہمالے سے اگرہ تک ہی اسلئے عمدہ مشہور ہی کہ
بہ نسبت اور ملک کے یہان علم و ہنر آدمیت رونق تکلفات زیادہ ہین
عموما باشندے ہند کے راہ و رسم ملاقات اور احسان سے جلد آشنا
ہوجاتے ہین غربت اور انکسار بھی اونکی طبیعتون مین ہی یہان اون
حرامزادون اور بدذاتون کا ذکر نہین ہی کہ جنھون نے غدر مین اپنا منہ
کالا کیا ہی یا جو وحشی اور جنگل کے باشندے ہین اور ہند کے ہر خطے اور
ملک کی وضع لباس اور زبان ایسی جدا ہی کہ ایک دوسرے کی بولی اکثر
سمجھ نہین سکتے

جدول معدنیات ہند

نمبر	جنس	تعداد	تفصیل مقامات
۱	آہن مع فولاد	۲۴	آشام[۱] اسلام نگر[۲] اودے پور[۳] بیر بھوم بہار[۵] بندیل کھنڈ[۶] نرمل علاقہ اندور دکن سندھ[۹] سلہٹ[۱۰] سکیت[۱۱] مندی[۱۲] سیام[۱۳]

نمبر شمار	جنس	تعداد	تفصیل مقامات
			کمہار کچھ کوٹ کھاری شملہ گوالیر محال باج گزار شرقی منی پور میسور مندراس ناگپور خرد ناگپور کلان نیپال
۲	ابرک	۳	بہار محال باج گزار شرقی ناگپور خرد
۳	بلور	۲	بہار کشمیر
۴	پھٹکری	۳	جی پور کالاباغ کچھ
۵	جست	۱	اودے پور
۶	رانگ	۲	سیام نیپال
۷	زبرجد	۲	نیپال ناگپور خرد
۸	سیسہ	۵	جودھپور سیام مارواڑ ناگپور خرد نیپال
۹	سرمہ	۲	گورنگی جہلم پنجاب ناگپور خرد
۱۰	شورہ	۴	اودے پور پٹیالہ ترہت سارن
۱۱	طلا	۹	آشام اٹک سیام کناٹ کوہ کماؤن محال باج گزار شرقی ناگپور خرد ناگپور کلان نیپال
۱۲	عقیق	۳	بہار برودہ علاقہ جمو

جنس	تعداد مقام	تفصیل مقامات
کورنڈینگ	٦	بیربھوم رانی گنج بنگالہ کشمیر محال باج گزار شرقی نربدا ناگپور خرد
گندک	٢	اودے پور نیپال [illegible]
مس	٨	اودے پور جےپور سیام کماؤن کشمیر مندراس نیپال نلور مندراس
مروارید	٢	نوگیوان مندراس سورت
مومیائی		سننے مین آتا ہے کہ بعض لوگون نے دریای اٹک وجھلم مین خود زمین و پہاڑ سے نکالی اور مفید پائی
نمک	٤	جےپور پنڈدادن خان پنجاب سکیت منڈی کالاباغ
نیلم	١	سیام
ہرتال	١	نیپال
ہیرا	٦	بیراگڑہ سیام شاہ آباد بہار کنتور مندراس کرپ ایضاً ناگپور خرد
یشب	١	سیام
یاقوت	١	ایضاً

شاہان اسلام

ہند مین اول سکندر بادشاہ آیا پھر ۱۳ سنہ ہجری مین عمر خلیفہ دوم کا سردار
سندھ اگر پھر گیا اور بعضی تاریخ سے معلوم ہوتا ہی کہ فتح کرکے چلا گیا
۹۳ سنہ ہجری مین حجاز کا سردار آیا ۱۰۰۱ سنہ ع سے محمود غزنوی نے
پچیس سال مین ۱۲ مرتبہ ہندوستان پر یورش کیا اکثر شہرون کو
تباہ اور تاراج کیا ۱۱۹۰ سنہ ع سے قطب الدین غلام شاہ علاء الدین
غوری ہند پر متسلط ہوا اوسی سے سلطنت شاہان اسلام کی ہند مین
مستقل ہوئی قطب الدین سے ابراہیم لودی تک ۲۸ پادشاہ مختلف
ہوے اور ناصر الدین بیسوان پادشاہ تھا اوسکے ایام سلطنت مین
۱۳۹۸ سنہ ع مین امیر تیمور دہلی کو فتح اور غارت کرکے صوبہ چھوڑکر پھر گیا
۱۵۲۵ سنہ ع مین بابر شاہ تیمور کے پروتے نے ابراہیم لودی پر فتحیاب
ہوکر ہند مین سلطنت کی بنیاد ڈالی فقط مسلمانون کی سلطنت مین یہ
خاندان تیموریہ سب سے پچھلا تھا امیر تیمور گورگان صاحب قران
ولد امیر طراغان نسل چنگیز خان سے تھے ۷۳۶ سنہ ہجری کو شہر
مردار ترکستان مین پیدا ہوے ۷۷۱ سنہ ہجری مین بمقام بلخ تخت پر
بیٹھے ۳۵ برس ۱۰ مہینے ۲۵ دن ایران و خراسان و ترکستان و
بخارا و روم و شام و تاتار و ہندوستان مین تنہا شہنشاہی کرکے

۷۲ سال کی عمر مین وفات پاکے سمرقند مین دفن ہوے بہادر شاہ ۲۳ پشت
مین ۱۲ سال برائے نام تخت نشین رہکر بالزام غدر ۹۹ برس کی عمر مین بمقام
جزیرۂ رنگون سرکار برطانیہ کی قید مین زندان ہستی سے نجات پائی
عاقل اور خدا شناس کو یہ مقام عبرت کا ہی امیر تیمور سے
بہادر شاہ تک ۲۳ پشت مین پورے پانچ سو برس سلطنت رہی
ہندو راجاؤن مین جیسا بکرماجیت راجہ باہمہ صفت موصوف ونیکنام
ہوا ہی ویسا ہی اس خاندان مین موافق زمانے کے اکبر بادشاہ بھی نہایت
نیک و نامی ہوا اس بادشاہ کے فیلخانے مین پانچ ہزار ہاتھی اور اصطبل
مین دس ہزار گھوڑے خاصے کے بندھتے تھے اور اوسکا ڈیرہ دو تیسرا
کمخواب کے فرش اور موتی ٹکا ہوا پردون کا سفر کے وقت اڑھائی
کوس کے گھیرے مین کھڑا ہوتا تھا ہر سالگرہ کو سونے کا تلادان
کرتا اور اوسوقت سونے کا باوام اپنے دربار مین لٹاتا جسپر بھی وہ عیت
کے ساتھ سیدھا سادہ تھا آٹھ پہر مین ایک وقت کھانا کھاتا
گوشت سے پرہیز کرتا کسی جاندار کے آزار کا روادار نہین تھا صرف نام
کا مسلمان تھا لیکن دل وجان سے وہ آفتاب کی پرستش کرتا تھا
اتوار کے روز اوسکی ساری عملداری مین جانور کی جان مارنے کی منا ہی
تھی رعیت اوسکو اسقدر چاہتی تھی کہ لوگ جیتے جی اوسکی درگاہ پر نشستین

انتے اور نذرین چڑھاتے تھے اُسکی سلطنت مین ایکسو نمائیس برس گیہوں بکتا تھا اور دو من چودہ سیر جو اس ریاست کا آخر زمانہ بہادر شاہ ابوظفر رحتا تمہ ہو

قطعات تاریخ بہادر شاہ از محمد مردان علیخان صاحب عنا الکار سرکار کپورتھلا

بپرس احوال این دنیا که چون است
چه آغازش دگر هم دیگر انجام

کجا اسکندر و جمشید و ضحاک
کجا اسفندیار و رستم و سام

مگر از نیک و بد باقیست نامی
تو خواهی نیکنامی شو که بدنام

بچرخ نیلگون رنگ وفا نیست
مگر معکوس و خالی صورت جام

غنیمت دان دو روز عمر نادان
بسر گردد گرت با عیش و آرام

شہ تیمور چنگیزی زتر کان
شنیدستی که بودش بخت و درام

همه در سایهٔ صیت جلالش
ز چین و هند و فارس روم و شام

هنودان هند و شش بود و ندو را مش
همه ترسا و گبر و اهل اسلام

بترکستان سمند شاهی او
نزده در هفصد و هفتاد و دو گام

ز تیمور ابتدا بر بو ظفر ختم
بهند آمد شمار بست و سه نام

شمار سال عمر سلطنت گشت
ازین رو پنج صد ای نیک فرجام

ز ابراهیم لودی باز چون کرد
ظهیر الدین بابر هند را رام

هزار و پانصد و بست و شش از سال
چه سال از سال عیسی بود هنگام

غرض سه صد و سی یکسال زین رو
شمار کام رانی گشت ایام

بعهد شاه عالم عهد شاهی
هزار و یکصد و هفتاد و سه بود
ز تخت و تاج شاهی ماند تا هم
مگر چون صد فزود آخر شد آخر
۱۲۷۳
شد از آب جفا کشت غدر سبز
هزار و دو صد و هفتاد و سه بود
پس از یک سال شاه انگلستان
هنوز آن شاه شاهان حکمرانست
بگیر آمد بهادر شه چو در رزم
دلاوری که شد شوریده و شوره
گرت واگوش شنوا چشم بیناست
شده طالع ز مغرب شد بمشرق
مقام ترس و عبرت خوف و بیم است
من و تو هر دو را کار از قضا است
دگر مخروش ای رعنا که آمد
چه دید نگون شه بیکس قضا کرد

بعهد کمپنی چون کرد انعام
مذهب بادی هر خاص و هر عام
نشان نام باقی با صد اکرام
نشان شاهی هم از کمپنی نام
برنگ سبزهٔ بیگانه ناکام
که گشته از بغاوت شاه بدنام
گرفت از کمپنی احکام حکام
که حکمش باد در هر ملک مادام
برنگون رفت آخر با صد آلام
شده آغاز شورش را چه انجام
شنو نظمم ببین احوال ناکام
شد این روز شهی را زود تر شام
که آغاز آن شود این باشد انجام
دگر خواب و خیال فکر و اوهام
بگوش از بحر شورم شور کهرام
بهادر شاه غازی بو ظفر نام
۱۲۷۹

ایضاً

شاہ بیکس چو رفت از دنیا | بیکسی کرد بر سرش ماتم
دید رعنا چو دشت را خالی | گفت بشتافتہ غزال ارم
۱۲۷۹

ایضا

بہادر شاہ چون سوی ارم رفت | کہ بروی نام شاہی گشت اتمام
چنین رعنا رقم زد سال فوتش | بہادر شاہ غازی خلد خدام
۱۲۷۹

ایضا

چون ز دنیا رفت سوی خلد از حکم قضا | یادگار شاہ ترکان چغتا کج کلہ
کرد رعنا بہر تاریخ وفاتش این خطاب | بوظفر غازی بہادر شہ بہشت آرامگہ
۱۲۷۹

ایضا

رفت از دہلی سوی رنگون چو شاہ بوظفر | شادمان گشتند بہر دعوتش ارباب خلد
رخت بست از ملک مشرق چون سوی خلد برین | گفت رعنا سال فوتش بہر مشرق باب خلد
۱۲۷۹

ایضا

رہی بست و سہ سال تک بادشاہی | گرو تھی کہ تھی وہ برات چغتہ
ہوا خاتمہ بوظفر پر تو گویا | ہوئی سلطنت سے نجات چغتہ
۱۸۶۲ع

ایضا

دار فانی مقام عبرت ہے | کیا کوئی اوس سے آ دل کو لگائے
دیکھ رعنا سرای فانی سے | شاہ بیکس نے رخت باندھا ہائے
۱۲۷۹

جدول حال اورنگ نشینان عہد تیمور تا بہادر شاہ

نام بادشاہ	ولدیت	تاریخ ولادت	محل ولادت	مقام جلوس	تعداد عمر روز جلوس	تاریخ جلوس	مرض الموت	تاریخ وفات	محل دفن	مدت عمر	مدت سلطنت
امیر تیمور	ولد امیر طراغای اولاد چنگیز خان	۲۵ شعبان ۷۳۶ سہ شنبہ	شہر سبز دار خطہ کش نزد گوہند	شہر بلخ	۳۵ سال ۲۷ یوم	۲۲ رمضان ۷۷۱ چہارشنبہ	تپ محرقہ ہفت روز ماندہ	۱۷ شعبان ۸۰۷ شب چہارشنبہ	سمرقند	۷۱ سال ۱۱ شہر ۲۰ یوم	۳۵ سال ۱۰ شہر ۲۵ یوم
جلال الدین میران شاہ	ابن تیمور	۱۴ ربیع الآخر ۷۶۵ پنجشنبہ	سمرقند	میان سمرقند آذربایجان	۴۰ سال ۴ شہر ۳ یوم	۱۷ شعبان ۸۰۷	در جنگ مرزا	۲۴ ذیقعدہ ۸۱۰	تبریز	۴۱ سال ۷ شہر ۱۰ یوم	۳ سال ۳ شہر ۷ یوم
سلطان محمد مرزا	ابن میران شاہ	۳ ذی حجہ ۸۰۰	نامعلوم	سمرقند	۹ سال ۲ شہر ۲۴ یوم	۲۴ ذیقعدہ ۸۱۰	عارضہ جسمانی	۳۰ ذیحجہ ۸۵۵	خطہ کش	۵۵ سال	۴۵ سال ۱ شہر ۵ یوم
سلطان ابو سعید مرزا	ابن سلطان محمد مرزا	۱۳ رجب ۸۳۰	سمرقند	غزنین	۲۵ سال	۳۰ ذیحجہ ۸۵۵	در جنگ حسن بیگ شہید شد	۱۲ رجب ۸۷۳ شنبہ	نواح سمرقند	۴۳ سال	۱۷ سال ۶ شہر ۱۲ یوم
عمر شیخ مرزا	خلف چہارم سلطان ابو سعید	۳ ذیحجہ ۸۶۰	سمرقند	ولایت اندجان فرغانہ	۱۲ سال ۶ شہر ۳ یوم	۱۲ رجب ۸۷۳ دوشنبہ	از بام افتاد و مرد	۴ رمضان ۸۹۹ دوشنبہ	سمرقند	۳۸ سال ۹ شہر ۴ یوم	۲۶ سال ۱ شہر ۲۲ یوم

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ	ابن سلطان عمر شیخ مرزا	۶ محرم ۸۸۸	ولایت فرغانہ	خطاکش	۱۱ سال ۸ شہر ۱۹ یوم	۲۵ رمضان ۸۹۰ شنبہ	تپ	۶ جمادی الاولی ۹۳۷	کابل	۴۹ سال ۴ شہر	۳۷ سال ۸ شہر ۱۱ یوم
نصیر الدین محمد ہمایون	ابو بابر بادشاہ جنت آشیانی	۴ ذیقعدہ ۹۰۲	ارک شہر کابل	آگرہ	۲۲ سال ۶ شہر ۱۴ یوم	۶ جمادی الاولی ۹۳۷	از بام افتاد	۱۳ ربیع الاول ۹۶۳	در مقبرہ ہمایون	۴۹ سال ۴ شہر ۹ یوم	۲۵ سال ۱۰ شہر ۵ یوم
ابو النصر جلال الدین محمد اکبر شاہ	ابن محمد ہمایون	۵ رجب ۹۴۹ یکشنبہ	در حصار امرکوٹ	کلانور	۱۳ سال ۹ شہر ۲۰ یوم	۲ ربیع الآخر ۹۶۳ جمعہ	عارضہ جسمانی	۱۲ جمادی الآخر ۱۰۱۴	مقبرہ سکندرہ	۶۴ سال ۱۱ شہر ۷ یوم	۵۱ سال ۲ شہر ۹ یوم
نور الدین محمد جہانگیر	ابن محمد اکبر شاہ	۷ ربیع الاول ۹۷۷ چہار شنبہ	فتح پور سیکری	اکبر آباد	۳۷ سال ۲ شہر ۱۴ یوم	۱۴ جمادی الآخر ۱۰۱۴ یکشنبہ	ضیق النفس	۲۸ صفر ۱۰۳۷ یکشنبہ	باغ نور جہاں واقع لاہور	۵۹ سال ۱۱ شہر ۱۱ یوم	۲۲ سال ۸ شہر ۱۴ یوم
محمد شہاب الدین شاہجہان	ابن جہانگیر بادشاہ	سلخ ربیع الاول پنجشنبہ	لاہور	لاہور	۳۷ سال ۲ شہر ۲۲ یوم	۲۲ جمادی الاولی ۱۰۳۷ دوشنبہ	درد گردہ و تپ محرقہ	۲۶ رجب ۱۰۷۶ دوشنبہ	اکبر آباد روضہ تاج گنج	۷۴ سال ۴ شہر ۲۶ یوم	۳۱ سال ۲ شہر ۲۴ یوم
محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ	ابن شاہجہان	۲۵ ذیقعدہ ۱۰۲۸ یکشنبہ	صوبہ گجرات	نواح اکبر آباد	۳۹ سال ۶ شہر ۵ یوم	غرہ جمادی الآخر ۱۰۶۸	عارضہ جسمانی	۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ جمعہ	مقبرہ زین الدین شاہ در اورنگ آباد	۹۰ سال ۳ یوم	۵۰ سال ۵ شہر ۲۷ یوم

اعظم شاه	بن عالمگیر پادشاه	۱۲ شعبان ۱۰۶۳	دکن	متصل اورنگ آباد	۵۵ سال ۳ شہر ۶ یوم	۱۲ ذی حجہ ۱۱۱۸	در جنگ بہادر شاه در چاجو مرد	۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹	مقبره ہمایون پادشاه	۵۵ سال ۷ شہر ۶ یوم	۳ شہر ۱۰ یوم
بہادر شاه شاه عالم خلد منزل	بن عالمگیر پادشاه	سلخ رجب ۱۰۴۳	دکن	کابل	۶۵ سال ۶ شہر ۱۰ یوم	۱۰ محرم ۱۱۱۹	عارضه جسمانی	۱۸ محرم ۱۱۲۴	درگاه خواجه قطب الدین	۸۰ سال ۲ شہر ۱۸ یوم	۵ سال ۸ یوم
معز الدین جہاندار شاه	بن بہادر شاه	غره شوال ۱۰۷۲ چہارشنبہ	دکن	لاہور	۵۲ سال ۳ شہر ۱۰ یوم	۱۸ محرم ۱۱۲۴ جمعہ	فرخ سیر قید گشت	۲۹ محرم ۱۱۲۵	مقبره ہمایون پادشاه	۵۳ سال ۳ شہر ۲۵ یوم	۱۱ شہر ۵ یوم
فرخ سیر پادشاه	پسر عظیم الشان بہادر شاه شہید	غره محرم پنجشنبہ ۱۰۹۸	دکن	نواح اکبرآباد	۲۶ سال ۱۱ شہر ۲۳ یوم	۲۳ ذی حجہ ۱۱۲۴ جمعہ	سید حسین علی خان اسیر کرده کشت	۹ رجب ۱۱۳۱	مقبره ہمایون پادشاه	۳۲ سال ۳ شہر ۹ یوم	۶ سال ۳ شہر ۱۶ یوم
ابو البرکات شمس الدین	پسر رفیع الشان بن بہادر شاه	۱۷ رمضان ۱۰۸۳	دہلی	اکبرآباد	۲۴ سال ۶ شہر ۲۳ یوم	۹ ربیع الآخر ۱۱۳۱	تپ دق	۹ رجب ۱۱۳۱	مقبره ہمایون پادشاه	۲۴ سال ۱۰ شہر ۲ یوم	۳ شہر ۹ یوم
رفیع الدولہ	پسر رفیع الشان بن بہادر شاه	۲۰ رمضان ۱۰۸۳	نواح اکبرآباد	اکبرآباد	۲۴ سال [illegible]	۶ رجب ۱۱۳۱	خلل کوکنار	۱۷ ذیقعده ۱۱۳۱	ایضاً	۲۸ سال ۱ شہر ۲۲ یوم	۳ شہر ۲۸ یوم

Name	Parentage	Birth date	Birthplace	Place of accession	Age at accession	Accession date	Cause of death	Death date	Burial place	Age at death	Reign length
محمد شاه پادشاه	ابن بهادر شاه	[illegible] ۱۱۱۴	[illegible]	اکبرآباد [illegible]	۷ شهر ۲۰ یوم	۱۱۳۱	عارضه	۱۱۶۱	نظام الدین	اشهر ۲۴ یوم	۵ شهر ۱ یوم
ابو النصر مجاهد الدین احمد شاه	بن محمد شاه بادشاه	۱۷ ذی حجه ۱۱۳۸	شاهجهان آباد	پانی پت	۲۲ سال ۴ شهر ۱۳ یوم	غره جمادی الاولی ۱۱۰۶	بسبب کشیدن میل در چشم	۱۰ شعبان ۱۱۶۷ روز سه شنبه	مقبره همایون پادشاه	۴۸ سال ۲۳ یوم	۴ سال ۴ شهر ۱ یوم
محمد عزیز الدین عالمگیر ثانی	بن معز الدین جهاندار شاه	غره محرم ۱۰۹۹	صوبه ملتان	دهلی	۶۸ سال ۷ شهر ۱۰ یوم	۱۰ شعبان ۱۱۶۷	از قلعه فیروز آباد افتاد	۱۸ ربیع الآخر ۱۱۷۳	ایضاً	۷۴ سال ۳ شهر ۱ یوم	۵ سال ۸ شهر ۸ یوم
علی گوهر شاه عالم پادشاه	بن عالمگیر ثانی	۲ جمادی الاولی ۱۱۳۱	دهلی	کهتولی متصل عظیم آباد	۴۲ سال ۳ یوم	۴ جمادی الاولی ۱۱۷۳	عارضه جسمانی	۷ رمضان	درگاه خواجه قطب الدین	۹۰ سال ۴ شهر ۶ یوم	۴۸ سال ۴ شهر ۳ یوم
ابو النصر معین الدین محمد اکبر شاه		۲۸ رجب ۱۱۷۳	ریان کهن	دار الخلافه شاهجهان آباد	۴۸ سال اشهر ۹ یوم	۷ رمضان ۱۲۲۱	اسهال دودم	۲۷ جمادی الاخری ۱۲۵۳	ایضاً	۸۰ سال	۳۱ سال اشهر ۱۹ یوم
ابو المظفر سراج الدین محمد بهادر شاه		۱۱۸۰	شاهجهان آباد	ایضاً	۶۳ سال	۱۲۵۳		۱۲۷۹	رنگون	۹۹ سال	۲۶ سال

خاتمه بالخیر

تسلط سرکار کمپنی انگلسیہ کا بیان

زمانہ اکبر شاہ مین یوروپ سے اس ملک مین پہلے پہل پرتگالی اور فرانسس بطریق سوداگری آتے جاتے تھے انگریزون نے جب دیکھا کہ پرتگال اور فرانسیس وغیرہ فرنگستانی آدمی ہندوستان مین جاتے ہین اور یہان کی تجارت سے بڑا فائدہ اوٹھاتے ہین تو پھر ان آفت کے پرکالون سے کب چپ چاپ رہا جاسکتا تھا ان لوگون نے بھی اپنے مال کے جہاز روانہ کیے اور ۱۵۹۹ء مین لندن شہر کے اندر بہت سے انگریزون نے آپس کے ساجھے مین روپیہ اکٹھا کرکے اس ملک مین سوداگری کرنے کیواسطے ایک کوٹھی مقرر کی اور دوسرے ہی سال وہان کے بادشاہ سے کئی شرطون پر اس بات کی اپنے نام سند لکھوالی کہ سوا ہم ساجھیون کے دوسرا کوئی انگریز ہندوستان مین جاکر سوداگری نہ کرنے پاوے لیکن جب اس ملک مین ان لوگون نے اپنا عمل اور دخل کرنا شروع کیا تب ۱۸۱۳ء مین انکو تجارت کرنے کی منا ہی ہوئی بلکہ تجارت کا اذن عام ہوگیا روک ٹوک جاتی رہی اور یہ کمپنی ایک سرکار کہلانے لگی انگریزی زبان مین ساجھیون کو کمپنی کہتے ہین اسلیئے ان ساجھی سوداگرونکا نام بھی ایسٹ انڈیا کمپنی رکھا گیا

جب انگلستان مین یہ کمپنی کھڑی ہوئی تو اوسوقت یہان اکبر بادشاہ تخت
پر تھا ہندوستان مین پہلے پہل انگریزون کی کوٹھیان سنہ ۱۶۱۱ع
مین سورت احمدآباد کھمبھات اور گھوگھے مین جاری ہوئین اور سنہ ۱۶۵۲م
مین بنگالے کے اندر ہلیشور مین اور اوسکے دو برس کے بعد مندراج
مین بھی جاری ہوگئی سنہ ۱۶۶۴ع مین پرتگال کے بادشاہ سے بمبئی کا
ٹاپو لیا گیا اور سنہ ۱۷۰۰ع مین بنگالے کے صوبے دار نے کلکتہ گوبندپور
اور چھوٹا نٹی یہ تینون گانو انگریزون کو دیدیے اور کلکتے مین ایک قلعہ
بھی جسکا نام اب فورٹ ولیم ہی بنانے کی اجازت ملی اوس زمانے مین
یہ کلکتہ کل شہر جھونپڑونکا ایک گانو تھا سنہ ۱۷۵۶ع مین بنگالے کے
صوبے دار نواب سراج الدولہ نے اس بات پر کہ انگریزون نے
ہمارے ایک آدمی کو جو ڈھاکے سے کچھ خزانہ لیکر بھاگا تھا پناہ دی
ناخوش ہوکر کلکتہ چھین لیا اور ایک سو چھیالیس انگریز کو جو اوسوقت
وہان موجود تھے ایسی ایک تنگ و تاریک کوٹھری مین جسکی وسعت
بیس فٹ مربع سے زیادہ نہین تھی اور جسکو اب تک یہ لوگ بلیک ہول
یعنی کالی بل پکارتے ہین بند کردیا کہ دوسرے دن اون مین سے کل
تیئیس ۲۳ جیتے نکلے تب آخر کو یہ خبر سنتے ہی کرنل کلائو صاحب مندراج
سے نو سو گورے اور پندرہ سو تلنگے لیکر کلکتے مین آئے کلکتہ بھی لیا

اور پھر مرشدآباد پر چڑھا و کر دیا تب ۱۷۵۷ء کی ۲۳ جون کو مقام پلاسی

کی لڑائی مین سراج الدولہ کی فوج نے جو ستر ہزار سے کم نہین تھی

شکست کھائی نواب بھاگا اور اُسی روز گویا ہندوستان مین انگریزی

عملداری کی نیو جم گئی پھر تھوڑے دن پیچھے ۱۷۶۵ء مین شاہ عالم بادشاہ

نے جو اُسوقت دلی کے تخت پر تھا صوبہ بہار بنگالا اور اُڑیسہ ان تینون

صوبون کی استمراری دیوانی کا پروانہ کمپنی کے نام لکھدیا کہ جس سے دو

کرور روپیہ سال کی آمدنی کا ٹھکانا ہوگیا اور وزیر اصف الدولہ نے رہیلون

کی لڑائی مین مدد لینے کیواسطے ۱۷۷۵ء مین بنارس کا علاقہ بالکل اُنکے

حوالے کیا اُس زمانے مین ہندوستان کی بادشاہت کا عجب حال تھا

آپس کی پھوٹ اور ہمیشہ کی لڑائی جھگڑائی کے باعث تیمور کا خاندان

تحس نحس ہورہا تھا بادشاہ شطرنج کے مُہرے کیطرح لوگون کے ہاتھ

مین بٹکرمات ہوچکا تھا یہانتک کہ ۱۷۳۹ء مین ایران کے بادشاہ

نادرشاہ اور پھر تھوڑے روز بعد احمد شاہ درانی نے جو پہلے نادرشاہ کے

امیرون مین تھا ایسے ایسے سخت حملے اس ملک کے اوپر پے در پے کیے

کہ رہا سہا زور بھی دلی کے بادشاہ کا جاتا رہا سلطنت مین کچھ ذرہ دم نہین

باقی تھا صوبے دارون نے بادشاہ کی اطاعت بالکل چھوڑ دی سلطنت

اپنی سمجھی جسکے باپ دادا نے کبھی چپا بھر زمین پر دخل نہ پایا تھا اُسنے بھی

ہندوستان کی بادشاہت پر دل ووڑایا الغرض ادھر تو دکھن کے
صوبے دار نظام الملک نے حیدرآباد مین اپنی حکومت جمائی اور اُدھر
نواب وزیر نے اودھ کے صوبے کو اپنا ملک سمجھا اگرے تک مرہٹون
نے لوٹ مار مچار کر دھینگا دھینگی سے چوتھ لینا شروع کیا اور سکھون کا
حملہ سرہند تک ہونے لگا بھرتھ پور کے جاٹ بھی ہیکڑ بنے ہوسے تھے
رہیلکھنڈ کے رہیلے جدا خود مختار ہو گئے تھے بادشاہ اگرچہ براے نام دلی
کے قلعے مین پڑا تھا لیکن وہان بھی اُسے کوئی بیٹھا رہنے نہین دیتا تھا
یعنی اُسکی یہ نوبت تھی کہ آج ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا کل کسی دوسرے
نے اُسکا سر کاٹ کر سکہ خطبہ اپنے نام جاری کر لیا ابھی تلوار کا لہو نہین
سوکھنے پایا کہ تیسرے نے اُسکو بھی موت کا جامہ پہنایا اور تاج بادشاہی
اپنے سر پر رکھا کبھی بادشاہ مرہٹون کی قید مین پڑ جاتا تھا اور کبھی رہیلون
کے پنجے مین گرفتار رہتا غرض ۱۷۰۷ء تک کہ جب اکبر کے پوتے کا بیٹا
اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ مرا ۱۷۵۹ء تک یعنی شاہ عالم کے روز اول
جلوس تک ترپن ۵۲ برس کے اندر بادشاہ اور احمد شاہ چھڑا کے چودہ بادشاہ
دلی کی تخت پر بیٹھے اور اگر انمین سے محمد شاہ کی سلطنت کے تیس برس
نکال ڈالو تو صرف تیئیس برس مین تیرہ بادشاہ گذر گئے پس اب سوچنا
چاہیے کہ جہان براے نام تخت اور تاج کے لیے ایسی چھین جھپان اور

نوچ کھسوٹ سے بچے کی وہان کی سلطنت کسطرح قائم رہیگی اسلیے سدا سے یہ
دستور چلا آیا ہی کہ جب خالق رب العالمین دیکھتا ہی کہ اب بادشاہ بیچارے
بندون کی پرورش اور نگہبانی نہین کر سکتا اور جس کام کے لیے اسکو
مقرر کیا تھا اُسے چھوڑ کر یہ عیش و عشرت امورِ ظلم و بدعت کرنے لگا تب
اوس بداقبال بادشاہ کو دفع کرکے جو کوئی اس کام کی لیاقت رکھتا ہی
اوسکو اپنی قدرت اور طاقت کے زور سے تخت کے اوپر بٹھا دیتا ہی اسمین
کچھ شک نہین کہ جو اس حالت مین انگریز لوگ ہندوستان کو نہ لیتے تو
فرانسیس یا فرنگستان کا کوئی دوسرا بادشاہ اس ملک کو اپنے قبضے مین
کر لیتا اور اگر شاید وہ بھی نہ لیتا تو پھر کوئی دوسری قوم سندھ پار سے
آکر اس ہندوستان کی بادشاہ بن جاتی اور اپنے خاندان کی نیو جماتی
تیمور کی اولاد سے بادشاہت نکل چکی تھی ملک کے فضل و کرم سے ہندوستانیون
کے دن اچھے تھے جو انگریز یہان آئے گویا سوکھے ہوئے کھیت پھر
لہلہائے الغرض پہلے تو حیدر علی کے بیٹے ٹیپو نے ان انگریزون
کے ساتھ دشمنی پر کمر باندھی اور بیٹھے بٹھائے لڑائی اُٹھائی حیدر علی
میسور کے راجا کا نوکر تھا موقع پاکر اُسکا سارا ملک لے بیٹھا ٹیپو کا یہ ارادہ
ہوا کہ انگریزون کو دکھن سے نکال دیوے اور اُبھارا اُسکو فرانسیسون نے
تھا کئی برس کی لڑائی مین آخر کو ۱۷۹۹ع مین شری رنگ پٹن کے

حملے کے درمیان وہ انگریزی سپاہیون کے ہاتھ سے مارا گیا اور ملک
اُسکا بہت سا سرکار کے اختیار مین آیا اُنھین دنون مین سرکار کو مرہٹون
کی طرف سے کھٹکا پیدا ہوا فرانسیسون کو وہ بھی نوکر رکھنے لگے تب لارڈ
ولزلی صاحب نے جو اُسوقت یہان کے گورنر جنرل تھے اُنکے پیشوا
باجی راو سے دوستی کرنا چاہا اُسنے اُسوقت تو دولت راو سیندھیا کے
بہکانے سے نمانا لیکن جب جسونت راو ہلکر نے اُسپر چڑھاو کیا تب سرکار
سے قول و قرار کر لیا اور بندیل کھنڈ کا علاقہ بھی دے دیا یہ سنکر سیندھیا
بگڑا اور اُسنے چاہا کہ ناگپور والے سے ملکر کچھ فساد اُٹھاوے لیکن ادھر تو
لارڈ لیک صاحب نے ڈیک اور لسواری اور دلی اور اُدھر جنرل ولزلی نے
اسائی اور ارگانو کی لڑائیون مین ہلکر اور سیندھیا کے دانت ایسے کھٹے
کیے کہ آخر کو ۱۸۰۳ع مین ناگپور کے راجا نے تو کٹک کا ضلع اور سیندھیا نے
بالکل اتر بید یعنی گنگا اور جمنا کے بیچ کا ملک انگریزون کو دیکے اپنا پیچھا
چھڑایا پھر تو اس نئے ملک کے ہاتھ لگنے سے انگریزون کی عملداری
دلی تک پہنچ گئی وہان اس زمانے مین شاہ عالم بادشاہ قلعے کے اندر سیندھیا
کی قید مین پڑا تھا لارڈ ولزلی نے اُسکو قید سے چھڑا کر گذارے کیواسطے
ایک لاکھ روپیہ مہینے سے کچھ اوپر اُسکی تنخواہ مقرر کر دی پھر تھوڑے
روز بعد نیپالیون نے اپنی حد سے قدم باہر نکالا اور بڑھتے بڑھتے و

کا انگریزی تک پہنچ گئے سبب پہاڑ سے اتر کر ترائی مین آ کر ہمیشہ رعیت کو تنگ کرنے لگے تو سرکار نے انکو بھی نصیحت دینا مناسب سمجھا سنہ ۱۸۱۴ع مین ملکون سے حملے پر انکی فوج کو شکست دیکے کالی ندی سے پچھم طرف کے پہاڑ تو اپنے دخل مین کر لیے اور پورب طرف کے انکے پاس رہنے دیے اگرچہ باجی راو نے اپنی مصیبت کے وقت مین انگریزون سے قول قرار کر لیا تھا لیکن دل مین انکے ساتھ دغا کی نرد کھیلا چاہتا تھا یہان تک کہ اسنے تاریخ ۶ نومبر سنہ ۱۸۱۷ع کو پونا کے درمیان رزیڈنٹی مین آگ لگا دی اور انگریزی سپاہی جو تھوڑے سے وہان رہتے تھے انکا مقابلہ کیا اور ادھر سے سیندھیا کا بھی ایک خط نیپال کے راجا کے نام لکھا پکڑا گیا کہ جس سے اوسکی جانی دشمنی انگریزون کے ساتھ ثابت ہو گئی پنڈارون نے بھی قریب پچیس ہزار سوار کے اکٹھا ہو کر سارے ملک مین لوٹ مار مچا رکھی تھی بلکہ کے کاردار بھی سرکار کے مخالفون کی طرفداری کرتے تھے امیرخان ٹونک والا اپنے پٹھانون کے ساتھ راجپوتانے کو تباہ کر رہا تھا یہان دیکھا چاہیے خدا کی قدرت اور مرضی کو کہ اگرچہ اسوقت مین ہر ایک طرف ہل چل پڑ گئی تھی اور سارے ہندوستان مین فساد کی آگ بھڑکتی چلی تھی مگر لارڈ ہیسٹنگ صاحب جو اس زمانے مین گورنر جنرل تھے انھون نے اس ہوشیاری کے

ساتھ سبکا بندوبست کرلیا اور اپنی فوج کو چارون طرف اس ڈھب سے
دوڑادیا کہ ادھر تو سیندھیا کو جو کچھ سرکار نے فرمایا سب مان کر راجپوتانے
سے اپنا اختیار بالکل اٹھا لینا پڑا اور اُدھر امیر خان نے اپنا توپخانہ
سرکار کے حوالے کر دیا باجی راو پیشوا نے بھی سرکاری خزانے سے
آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ پنشن لیکر بٹھور مین گنگا کو سینا اختیار کیا اور ہلکر کی فوج نے
مہیدپور مین شکست کھا کر سرکار کی اطاعت دل وجان سے قبول کی پھر تھی
ناگپور کا راجا اپنے قصور کے ڈر کے مارے اپنا ہی ملک چھوڑ کر بھاگ گیا
چنانچہ سرکار نے اسکا کچھ تھوڑا سا ملک لیکر باقی اسکے وارثون کو دے ڈالا
پنڈارے اسقدر قتل ہوے کہ نام کو بھی باقی نرہے جو کچھ جیتے بچے وہ لوٹ مار
چھوڑ کر کھیتی باری کرنے لگے الغرض ۱۸۱۹ء مین مرہٹون کی لڑائی بالکل
فتح کے ساتھ ختم ہوگئی اور سب طرف سے امن چین کی راہ کھلی کابل کی لڑائی
کے وقت سندھ کے امیرون نے کراچی اور ٹھٹھا سرکار کو دے ڈالا تھا
اور سندھ ندی کی راہ سے محصول اٹھا لینے کا اقرار کئی باتون کے
ساتھ سرکار سے کیا تھا لیکن دغا کر کے اپنے قول قرار سے پھر گئے تب
۱۸۴۳ء مین سرکار نے انکو بھی اُس ملک سے خارج کر کے وہان بالکل اپنا
عمل دخل کر لیا بعد اسکے ۱۸۴۵ء کے اخیر مین سکھون نے ستلج پار اتر کر
سرکار پر چڑھائی کر دی لیکن آخر کو جیسا کیا ویسا پھل پایا پہلے تو سرکار نے

۱۸۴۶ء میں انکا صرف جالندھر دوآب اور ستلج کے اس پار کا ملک ضبط کر لیا
اور قصور معاف کر کے دلیپ سنگھ کو لاہور کی گدی پہ بحال رکھا لیکن پھر بھی
جب یہ لوگ لڑائی بھڑائی سے باز نہیں آئے اور بہت عرصے تک لڑتے
رہے تب ۱۸۴۹ء میں سرکار نے بالکل انکا ملک ضبط کر کے اپنی عملداری میں
شامل کر لیا اور دلیپ سنگھ پنجاب سے نکالکر گذارے کے لیے دس ہزار روپیہ
مہینا اوسکا مقرر کر دیا اب اس دم اٹک سے کٹک تک بالکل انگریزی عملداری
ہی اور ہمالیہ سے سمندر تک انھیں کا ڈنکا جاری ہی بلکہ پورب اور پچھم میں
ہندوستان کی اصلی سرحد سے بھی زیادہ انکی عملداری بڑھتی چلی

غدر کا حال

سبب برپا ہونے غدر ۱۸۵۷ء کے بہت کچھ صاحبان انگریز بہادر نے لکھے ہیں
اور خلاف آن باتفاق انکے اہل ہند نے بھی اسباب اسکے تحریر کیے ہیں
غرض تقدیر الٰہی ہونہار بات تھی جو ہوئی مگر غدر میں تین قسم کے لوگ تھے
۱ عام لوگ بانی غدر کے اور باغی سرکاری فوج کے تھے ۲ سرداران
باغی مثل شاہ دہلی اور بیگم اودھ اور ناناپیشوا مع لواحقین وغیرہ کے جو
اپنے اسلاف کے ملک و مملکت سے محروم اور اسکے مدعی تھے ۳
بیکار اور نوکری پیشہ اوباش اور وہ لوگ جنکا پیشہ رہزنی تھا فقط

لیکن سرکار کی قدرت اور نیت سے اس مواد فاسد کو جڑ سے ایسا دفع کیا کہ اب ہندوستان مین اسکا اثر باقی نہین ہی

ذکر عہد دولت ملکۂ معظمہ شہنشاہ انگلند و ہند خلد اللہ ملکہا

سنہ ۱۸۵۸ء مین ملکۂ معظمہ یعنی کوئین وکٹوریا نے اس ملک کا انتظام کمپنی سے لیکر اپنے ایک وزیر کے سپرد کر دیا اور اُنکے مددکیواسطے بارہ صاحبان جلیل الشان کی ایک کونسل بھی مقرر کر دی اسی وزیر کا لقب سکرٹری اف اسٹیٹ فار انڈیا ہی سارا انتظام وزیر کے اختیار مین ہی وہی صاحبون کو اس ملک کے عہدون پر مقرر کرکے وہان سے بھیجتا ہی اور یہان پر گورنر جنرل کو باتفاق رای کونسل اختیار دے رکھا ہی گورنر جنرل کے تحت مین مندراج و بمبئی کے گورنر اپنی اپنی کونسل سمیت اور آگرہ اور پنجاب کے لفٹنٹ گورنر اور بنگالے کے ڈپٹی گورنر اور اودھ اور ناگپور کے چیف کمشنر مقرر ہین اور پھر سوائے پنجاب کے چارون گورنرون کے زیر حکم چار چار صدر دیوانی اور صدر نظامت عدالت اور چار بورڈ ریونیو اور اُنکے تابع ہر ایک ضلع مین کمشنر و جج مجسٹریٹ کلکٹر وغیرہ اپنا اپنا کام کرتے ہین پنجاب اور اودھ اور ناگپور کے صوبون مین صدر دیوانی و نظامت کی جگہ جوڈیشل کمشنر اور بورڈ کی جگہ فنانشل کا تقرر ہی

اور کمشنر کے نیچے اکثر ضلعون مین حاکم ضلع ڈپٹی کمشنر کہلاتے ہین کلکتہ
مندراج بمبئی مین انگریزون پر نالشات سننے کے واسطے عدالت
سپریم کورٹ مقرر ہی کلکتہ مندراج بمبئی ان تین احاطون کیواسطے کمانڈرانچیف
ولایت سے مقرر ہوکر آتے ہین لیکن کلکتہ والا کمانڈرانچیف دونون پر غالب
ہی اسوقت ہندوستان مین فوج گورہ اسی ہزار سے کم نہین ہی فقط

رونق تازہ

سرکار کے عمل سے جابجا سڑک اور ریل اور تار برقی اور چوکی تھانہ اور ضلعبندی
اور آمدورفت بلا مزاحمت اور اجرائے کشتی وجہاز ونہر اور انتظام ملک
کے امین اور دارالشفا و مطابع اور اخبار اردو زبان اور انگریزی اور
مدرسہ اور ڈاک اور معافی محصولات اکثر اشیا سے اب ہند مین
رونق اور امن و آسایش بدرجہا زیادہ ہی زراعت کی بھی ترقی ہی مگر یہ
کیفیت سرکاری علاقون تک ہی رجواڑون کا حال کم کم بدلا ہی اور اب
روز بروز بدلتا جاتا ہی چونکہ اکثر تجارت اہل یورپ کے ہاتھ مین ہی اور
اشیای ولایتی کے آگے اشیای ہند بیقدر ہو گئین سوا اسکے ہند
مین نوکری پیشہ بہت لوگ ہین جو اکثر بیکار ہین اسی وجہ سے تمام باشندے
ہند کے صورت آسودگی کما حقہ نہین رکھتے مالدار اور امرا الگ تو ہر روز اپنی

اور عیاشی کے سبب اپنے دخل و خرچ کا انتظام کم رکھتے ہیں اس وجہ سے جلد تباہ ہو جاتے ہیں فقط

جدول ریاستہای ہندوستانی

نمبر	نام ریاست	وسعت میل مربع	آمدنی سالانہ	کیفیت
۱	اودیپور	۱۱۶۰۰	۱۲ لاکھ ۵۰ ہزار	یہ ریاست قدیم ہے نوشیروان نے اپنی بیٹی یہیں بیاہی تھی واقع راجستان
۲	الور	۳۵۰۰	۱۸ لاکھ	والی ریاست جوان سرکار سے اس سال مسند نشینی و اختیار عطا ہوئے واقع راجستان
۳	اندور	۸۰۰۰	۱۲ لاکھ	انتظام اچھا والی ہوشیار
۴	اجی گڑھ	۰	۳ لاکھ ۲۵ ہزار	واقع بندیل کھنڈ
۵	ارچھا	۰	۷ لاکھ	ایضاً صدر ٹہری ہے
۶	بانسوارہ	۱۵۰	۲ لاکھ	جنوب اودے پور
۷	برودھہ	۲۴۰۰۰	۷۰ لاکھ	ملک زرخیز اور آباد والی عاقل و صاحب اختیار
۸	بسہر	۰	۱ لاکھ	
۹	بجاور	۰	۱۲ لاکھ ۲۵ ہزار	واقع بندیل کھنڈ
۱۰	بوندی	۲۲۰۰	۱۰ لاکھ	شہر لاکھ دیہی اور کٹاری یہاں کی مشہور ہے
۱۱	بہاولپور	۲۰۰۰۰	۲۵ لاکھ	انتظام خیریت والی حال بیدار مغز

نمبر	نام ریاست	وسعت میل مربع	آمدنی لاکھ	کیفیت
۱۲	بھوپال	۷۰۰۰	۲۵ لکہ	والیہ بڑی عاقل و ہوشیار انتظام قابل تعریف
۱۳	بھرت پور	۲۰۰۰	۲۰ لکہ	ملک آباد والی صغیر سن
۱۴	بیکانیر	۱۷۰۰۰	۲۰ لکہ	والی مہذب اور لائق و نام آور
۱۵	پٹیالا	۵۰۰۰	۲۵ لکہ	ملک آباد رعیت آسودہ اہلکار بڑے لائق والی ہوشیار
۱۶	پنا	۰	۴ لکہ	ہیرے کی عمدہ کان یہین ہے
۱۷	پرتاب گڑھ	۱۵۰۰	۳ لکہ	شجر کمیاب آب سراب
۱۸	ترہوانکور	۵۰۰۰	۴ لکہ	ملک سیر حاصل زر ریز ہے
۱۹	ٹونک	۱۸۰۰	۱۰ لکہ	حاکم حال بہت دیندار و متشرع
۲۰	جودھپور	۳۵۰۰۰	۱۷ لکہ	باشندے یہان کے افیونی اور والی شوقین خوش اوقات انتظام اہلکار رسمی
۲۱	جی پور	۱۵۰۰۰	۸۵ لکہ	والی عاقل بیدار مغز اہلکار لائق انتظام غنیمت
۲۲	جیسلمیر	۱۲۰۰۰	۱ لکہ	شہر اجاڑ باشندے کم
۲۳	جیند	۰	۵ لکہ	والی مدبر و منتظم اہلکار اچھے
۲۴	چارکھاری	۰	۴ لکہ	عرف چرکھری والی صغیر سن
۲۵	چھترپور	۰	۳ لکہ	
۲۶	چمبا عرف سنگیت سندری	۰	۵ لکہ	آب و ہوا اصل علی

نمبر	نام ریاست	وسعت میل مربع	آمدنی سالانہ	کیفیت
۲۷	دتیا	۰	۱۰ لاکھ	واقع بندیل کھنڈ
۲۸	دھارا	۱۰۰۰	۴ لاکھ ۵۰ ہزار	دارالحکومت راجا بھوج و باجی راو پیشوا والی پونا
۲۹	دھولپور	۱۶۲۵	۷ لاکھ	انتظام و اہلکار رسمی والی فاضل ولیعہد قابل
۳۰	دیواس	۰۰	۴ لاکھ	محلات قلعہ و مسجد و تالاب معتبر و حسین تماشا قابل دید
۳۱	دونگرپور	۱۰۰۰	۴ لاکھ	جھیل پر بند سنگ مرمر قابل دید
۳۲	ریوان	۱۰۰۰	۲۰ لاکھ	انتظام ضعیف اہلکار کم والی عالی فرش مجاز مرد
۳۳	رامپور	۷۰۰	۱۱ لاکھ	ملک سیراب سیر حاصل انتظام چست والی قابل ستائش
۳۴	ساونت واڑی	۱۰۰۰	۲ لاکھ	ملک کوہ و جنگل و بیہڑ تسلط سرکار کا راجا کو بعد منہائی صرف کے باقی ملتا ہی
۳۵	سروہی	۲۰۰۰	۱ لاکھ	سروہی کی تلوار مشہور ہی
۳۶	سمتھر		۴ لاکھ ۲۵ ہزار	واقع بندیل کھنڈ
۳۷	سکم	۱۶۰۰	۰	کوہ دارجلنگ مشہور مذہب بدھ آدمی بلا [illegible]
۳۸	فرید کوٹ	۰	۲ لاکھ	قریب فیروزپور پنجاب ہی
۳۹	قرولی	۱۹۰۰	۵۰۰۰۰	والی صاحب حوصلہ
۴۰	کہلوار	۱۶۰۰	۱ لاکھ	صدر بلاسپور رہالہ پنجاب کوہ پر فضا و دلکشا
۴۱	کپورتھلا	۰	۱۰ لاکھ	ملک آباد تربیت شاہ اہلکار خبردار [illegible]

نمبر	نام ریاست	وسعت میل مربع	آمدنی سالانہ	کیفیت
۴۲	کچھ	۲۰۰۰	۸ لکھ	چکل بھیل آب شور برسات کم آب بیگیرہ
۴۳	کشمیر جمبو	۲۵۰۰۰	۵۰ لکھ	والی عاقل اطاعت سرکار مرحوم ملک آباد جا
۴۴	کشن گڑھ	۷۰۰	۳ لکھ	
۴۵	کوٹا	۴۵۰۰	۲۵ لکھ	ثمت ملا و ظالم سنگھ کو جسنے نابالغی راجہ کیا سرکار نے دلا دیا وہ جھالرا پاٹن ہے
۴۶	کوچی	۲۰۰۰	۵ لکھ	عرف کوچین اب تحت سرکار ریہ شہراو کے محلات عمدہ
۴۷	کولاپور	۳۵۰۰۰	۵ الکھ	کوہستان مین لب دریا ہی
۴۸	گوالیر	۳۳۰۰۰	۸۰ لکھ	علاوہ جاگیرات کے تاتو نہ یہ کھیا آسودہ ملک آباد جم والی مدبر جرار شمس الامرا صاحب فوج مثل
۴۹	گڑھوال	۴۵۰۰۰	۱ لکھ	ملحقہ بسار و کوہستان
۵۰	مالیر کوٹلہ		۲ لکھ	قدیم خاندان ہی
۵۱	منی پور	۷۵۰۰	۱ لکھ	باشندہ معتقد دیوی برہنہ و جنگلی کو کثیر تسا
۵۲	میسور	۲۷۰۰۰	۷۰ لکھ	تسلط سرکار
۵۳	نابھہ	۵۵۰۰	۷ لکھ	والی عاقل بے راج پنجاب مین ہی
۵۴	نیپال	۸۰۰۰۰	۳۲ لکھ	سرکار سے عہد نامہ و آشتی ہی

اودہ

تواریخہاے ہندو عموماً کتب سنسکرت سے مستنبط ہے کہ قدیمی نام اسکا اوتر کوشل ہے اور ابتداے آبادی منوجی موجد اصول دہرم شاستر سے بتاتی ہین اور دفتر شاہی اور انگریزی مین صوبہ اودہ لکھا جاتا ہے اور قدیم سے اودہ یعنی مقام اجودہیا دار الامارة وحاکم نشین رہا اور ہندو لوگ مولد و دار السلطنت مہاراجہ رام چندر جی سے خاص اودہ اور اوسکے مضافات کو ایک مہاتیرت جانتے ہین عہد سلطنت مہاراجہ رام چندر مین اودہ کا دار السلطنت اجودہیا تھا کہ جسکا طول ایک سو اٹہائیس کوس اور عرض چھبیس کوس تہا یہ ملک بسبب کثرت دریا اور ندیون کے ہندوستان کا گویا ایک باغ تہا کثرت آبادی و زراعت و مردم شماری و پیداواری و آمدنی مین ہندوستان کی اور بلاد سے جو اکثر مقابلہ ہوا سب باتون مین صوبہ اودہ کو ترجیح رہی پہاڑ بالکل نہین زمین ہموار اس ملک مین لاجورد کی کان ہے اور یہان کا لاجورد نہایت عمدہ اور صاف ہے —

زراعت یہانکی نیشکر چانول افیون تو مشہور ہے باقی ہر قسم کی پیداوار اور پہول پہل فرد ان اور زائد اب انگریزی زمانے مین نیل روئی افیون کی زراعت کثرت سے ہو چلی ہے قبل تسلط اہل اسلام بطور خود یہانکے لوگ اپنا گذران قناعت سے کرتے تہے انقلاب عملداریون سے

کچھ کچھ چل چل ہوتی رہی تھی بخصوص اخیر زمانہ تیموریہ مین بہت بڑا نشیب و فراز
ہوا جو تواریخون سے خود معلوم ہوگا اب عہد انگریزی مین ہر ضلع تعلقہ داری
مین ایسا بندوبست ہوگیا ہے کہ سرکار کو اب کسی نوع کا دغدغہ نہین اور
ہمیشہ سے اس ملک مین معافی اور شنکلپ بہی بہت سے ہے کہ اوس سے
گذارہ یہان کی خلائق کا ہوتا تہا دعاگو حاکم وقت رہتے تہے اور اپنی قسمت
کے کمالات حاصل کرتے تہے اب اکثر معافیان اور جاگیرین حین حیات
ہین بڑے دریا و ندیان اس ملک کے بیشمار کیے گئے ہین گنگا گہاگرا
گومتی راپتی سرجو وجوکا اور بہی بعض ندیان ہین جو بارہون مہینے روان
رہتی ہین مالگزاری کا بندوبست عہد شاہی مین اور اس زمانے مین
بہی نصفی کا ہے اور اب بندوبست پختہ بہی کئی ضلعون مین ہوگیا تو بہی
قریب قریب سے ہے بندوبست بحال ہے رعایا اور ملک کی آبادی
اور بہتری ملائم بندوبست کے سبب سے متصور ہے۔ محاصل یہان کا
اگرچہ پختہ ڈیڑہ کرور کا عہد شاہی مین مشہور ہے مگر کبہی ایک کرور بہی داخل
خزانہ نہوا اگر اب جو مالگزاری کا بندوبست سرسری کیا گیا ہے البتہ قریب
ایک کرور ۲ لاکہ ہے سوائے اسکے اور آمدنی ملاکر کل مبلغ یک کرور ۲۵ لاکہ
اسقدر ہین اس ملک مین اب سرکاری فوج بہی اکثر ہے اور پولس کے
بندوبست سے جنگی سپاہ کو زیادہ تر امداد اور کام کے دینے کی ضرورت

مین ہوتی ـ اس زمانے مین دار الحکومت لکھنؤ کی حدود بیان اوتر
طرف نیپال کی ترائی ہے اور دکن گنگا اور راو سپار کانپور کا ضلع جانب
شرق گورکھہ پور اور جونپور اور غرب فرخ آباد اور شاہجہان پور ب اس ملک
مین قبل ۱۸۶۳ء چار کمشنری تہین اب صرف تین کمشنری رہ گئین لکھنؤ
خیرآباد فیض آباد ان تینون کمشنری کے ضلع ضلع کی مختصر یہہ کیفیت
ہے قسمت لکھنؤ کا پہلا ضلع

لکھنؤ

یہہ ضلع دار الحکومت اس صوبے کا ہے یہ شہر لب گومتی دکن رویہ
آباد ہے گومتی کی دونون طرف آبادی ہے تخمیناً تین لاکھہ آدمی کی
بستی ہے ۲۶ درجہ ۵۱ دقیقے امتنرعرض ۸۰ درجہ ۵۰ دقیقہ پورب طول
مین دار الامارۃ کلکتے سے گوشہ شمال اور مغرب کی طرف بسا ہوا ہے ـ
اصل نام اسکا لکش ناوتی بتلاتے ہین ـ اور بعضے لوگ ایسا ہی کہتے
ہین کہ نمیشارن جہان سوت جی ساٹھہ ہزار منیتون یعنی زاہدون کے
ساتھہ جلسے مین پران سناتے تھے اسی مقام پر تھا اصلی نام اسکا لکش
ناوتی ہے ـ اور بعضے لچھمن پور کہتے ہین اصل دونون کی ایک ہی ہے
یعنی مہاراج لچھمن برادر خرد راجہ رام چندر جی نے بسایا شہر لکھنؤ کی دار الحکومت
ہونیکا دعوی ہر چند جلوس نواب آصف الدولہ نے ہے جسکو عرصہ اتنی برسکا

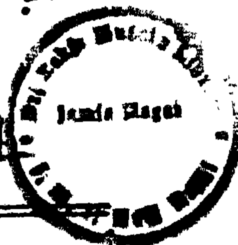
ہوا ہے مگر مدت مدید سے یہ شہر زبس معظم اور مشہور شہروں سے اودھ کے
تھا فی زمانا جہان شہر لکھنو آباد ہے اوس مقام پر ۴۲ دیہات آباد تھے
جنکے نام اسماے محلات سے جو اونکی جگہ آباد ہین معلوم ہوتے ہین
اور ما بقی دیہات کے نام و نشان مفقود ہو گئے ہین او ر بجز کتب قدیمہ
اور کسی علامت سے اونکے نام دریافت ہو نہین سکتے تا ہم شہر لکھنو وہ
بلند مقام متصل پل پختہ کے ہے جہان ایک مسجد نامزد شاہ پیر محمد صاحب
موجود ہے اور جسکو بنام لچھمن ٹیلہ مشہور کرتے ہین اس جانب یعنی بجانب
ٹیلہ مذکور کے ایک گانون بنام لچھمن پور آباد تھا اور اوسی گانون کے
نام سے یہ شہر لکھنو مشہور ہوا۔ ایک قدیم روایت ہے کہ شہر اجودھیا
جبکہ خاندان راجپوتان سورج بنسی اس شہر مین حکمران تھے ایسا بڑا
وسیع شہر تھا کہ آبادی شہر اجودھیا سے جو اب آباد ہے شہر لکھنو تک
بلا فاصلہ آباد تھا۔ یہ روایت اس وجہ سے قرین قیاس ہو سکتی ہے
کہ لچھمن جی جو آباد کنندہ لچھمن پور کے تھے بھائی سری رام چندر کے تھے
جنھون نے اجودھیا کو آباد کیا تھا اور یہ دونون بھائی کبھی جدا نہوتے
تھے اس نظر سے ظن غالب ہے کہ دونون نے آبادی اپنے اپنے
شہر کی بھی متصل ایک دوسرے کی ہو غالب ہے کہ آبادی لچھمن پور
کی برہمنون کی تھی اور چند خاندان شیخ جو سنہ ۶ ۱۰ ۱۱ع مین ہمراہ فوج سالار

غازی میان برادرزادۂ محمود غزنوی اونکو مغلوب کرکے خود اونکے ملک پر
متسلط ہوگئے تہے اوس وقت مین اہل اسلام اس ملک مین آئے تہے
گواب ہر ایک خاندان اہل اسلام بیان کرتا ہے کہ وہ ہمراہ فوج سپہسالار کے
یہان آئے ظاہرا اونکی آمد اور قیام اس ملک مین بتدریج ہوا ہوا ور غالب
کہ سو برس کے عرصے سے آبادی اونکی یہان قرار پائی ہو یہ خاندان شیخ
جو ہمراہ سپہسالار کے آیا تہا اونہون نے ملک مین بڑی عظمت و شان
پیدا کی یہانتک کہ فوج مین سے اونکے خاندان کے کئی شخص علاقہ صوبہ داری
پر ممتاز ہوگئے تہے اول ان لوگون نے تجویز تعمیر قلعے کی کری اور یہ
قلعہ استحکام مین بہت مشہور ہوا اور یہ قلعہ اوس مقام پر تعمیر کیا گیا تہا جہان اب
قلعہ مچھی بہون مشہور ہے ــ اور روایت اسطرح پر مشہور ہے کہ اوسکی تعمیر ایک
اہیر کے ذمے تہی جسکا نام لکہنا تہا اس وجہ سے اوسکو قلعہ لکہنا کہتے
تہے اور چونکہ یہ خاندان شیخ بہت ذی رتبہ تہا اور کثرت اشخاص اوسمین
تہی اسلیے اوسکے گرد و پیش مین اکثر آبادی ہوگئی اور یہ دونون آبادی
کے نام یعنی لچھمن پور اور لکہنا کے نام سے مخلوط ہوکر لکھنؤ ہوگیا اب یہ امر
تحقیقاً معلوم نہین ہوتا کہ یہ نام لکھنؤ اس آبادی کا کب کہا گیا مگر اسمین شک
نہین کہ یہ آبادی قبل از عہد اکبر شاہ بنام لکھنؤ مشہور تہی شیخان لکہنا ایک قصہ
اثبات بزرگی اس شہر کا بیان کرتے ہین کہ جب ۹۴۶ھ مین ہمایون بادشاہ

واسطے جنگ شیر شاہ بادشاہ جونپور کے جو بعد ازان شہنشاہ دہلی ہو لیا تھا
اور اثنائے راہ مین بمقام لکھنو چار گھنٹے استراحت فرمائی تہی باوجودیکہ
فوج شکست خوردہ و دل شکستہ تہی اور ایسے وقت مین کہ جا بجا بہی فرمانبردار نہیں
رہتی مگر تاہم اس عرصے قلیل مین فوج مذکور سے واسطے شہنشاہ کے دس ہزار
روپیہ اور پچاس راس اسپ بہم پہنچائے تھے اس قصے مین ہرچند مبالغہ
مگر یہ بات ظاہر ہے کہ اوس زمانے مین بہی شہر لکھنو آباد و مالدار تہا غرض کہ
زمانہ آصف الدولہ سے تا عہد واجد علی شاہ آبادی بڑہتی گئی بلکہ کسی زمانے
مین آدمیون کا بن مشہور تہا اور عہد سلطنت مین پانچ لاکہ سے زیادہ سکونت
بتاتے ہین اس شہر مین کتنی سڑکین بہت سے کٹڑے اور ٹولے اور
محلے آباد ہین جس محلے مین شیخ مینا صاحب کی درگاہ تہی اب وہ محلہ تو مسمار
ہو گیا لیکن درگاہ موجود ہے اکثر لوگ شب پنجشنبے کو فاتحہ کے واسطے وہان جاتے ہین
سوا اسکے اور بہی زیارت گاہ اہل ہنود و اہل اسلام کی ہین جسکی تفصیل طول ہے
باغات اس شہر مین اکثر اور میوہ جات ہر قسم کے نہایت تحفہ انبہ و خربزہ
اور کوسلے مشہور ہین کوچے یہان کے تنگ اور غلیظ مگر اب صفائی
شہر کے لیے کیسی ہی سے تدارک ہوتا جاتا ہے اور اب سڑکین بہی وسیع اور
فراخ نکلی ہین اور نکلتی جاتی ہین اور اب بہی اس ٹوٹی پہوٹی حالت پر شہر کو
کسی بلند مقام سے دیکھا جاوے تو جہانتک نظر جاوے وہانتک درخت

ع مینار گنبد اور عالی شان مکانات اور بعض جگہ بنی ہوئی سنہری حسیا
لر ہوتی ہین ۔ حسین اباد اور چوک مین ابھی رونق ہوتی ہے ۔ عہد
ہی مین حجاموں تک کے بدن پر دو شالے اور حلال خوروں کے
ون مین ٹاٹ بانی جو بی موجود تھی جنکے گھر مین جو سلیپر تو ابھی زنہار
ی بازار مین سب نے پہرتے تھے لفافہ تو اس شہر کا مشہور ہے اب بھی تک
ان کے امرا اور رؤسا اور اہل ثروت سے شہر کی شان و شوکت کچھ
شتے نمونہ از خروارے باقی ہے ۔ ہر قسم تجارت کی جنس موجود ہے مگر یہ
لداری سے پہلے بادشاہی مکانات کے بڑی طیاریان رہتی تہین
زینہ اور سجاوٹ دیکھکر انسان کی عقل دنگ ہو جاتی تھی جھاڑ کنول شیشہ
ور دیگر تکلفات کا کیا بیان ہو قصر جمشیدی کی شان و شوکت اوس سے
یان ہو فرح بخش مبارک منزل بارہ دری موتی محل شیش محل حسین اباد
ست خانہ لائق دید تھے اب بھی جو کچھ مسماری و منہدمی سے محفوظ رہی
جسکا بیان آخر مین زیر کیفیت مکانات کے درج ہو گا قابل دید ہین
محرم یہان کا مشہور عالم ہے امام باڑے ایام محرم مین نور کے تختے نظر
تے ہین خصوصاً حسین اباد ۔ لوگ لکھنو کے تراش و خراش بول چال
مین اور شہرون کی زبان کو اپنے برابر نہین جانتے بلکہ عموماً اتفاق ہے
ہ جیسا یورپ مین فرنچ ویسا ہی ہند مین لکھنو ہے ۔ میلے بھی بہت کثرت

سے ہوتے ہین مثل عیش باغ اشنو کا میلہ سورج کنڈ زچندی ابیر باقی حال
باشندون کا آخر مین لکھا جائیگا اس ضلع مین اگرچہ چھوٹے چھوٹے
قصبے بہت ہین مگر کاکوری کرسی ملیح آباد کاکوری کے مسلمان رئیس
بڑے نامور خدمات سرکاری پر اکثر جگہ ممتاز اور عموماً اس قصبے کے
لوگ فارسی عربی مین مہارت کمال رکھتے ہین نواح شہر کی زمینداری مین
البتہ فائدہ آمدنی ترکاری و سبزی کی بہت زیادہ اور ہر موسم کی چیزین
فصل سے آگے اس شہر مین اکر فروخت ہوتی ہین دار الحکومت عمل
انگریزی مین بدستور لکھنو ہی قرار پایا صاحب چیف کمشنر بہادر اسی
جگہ پر تشریف رکھتے ہین اس ضلع کے تعلقہ دار بھی اکثر شہر کی نزدیکی کے
سبب سے خوش وضع و پر تکلف ہین —— زمین اس ضلع کی اوسط
درجے کی ہے۔ حضور تحصیل لکھنو کرسی موہن لال گنج ملیح آباد
یہ چار تحصیل ہین۔



دوسرا ضلع دریا باد

اسکا صدر مقام لکھنؤ سے ۱۰ میل نواب گنج بارہ بنکی مین ہے یہ ایک قصبہ مختصر سا ہے اب ایک سرا سے پختہ نئی زیر اہتمام اہلکاران سرکاری تعمیر ہوئی ہے آب و ہوا اس ضلع کی بہت اچھی زراعت پر فلاحت ہے تعلقدار بھی اس ضلع کے نامی گرامی رعایا خوش اور اکثر تعلقہ دار اہل اسلام سے ہین جنگل کم ندیان اور جھیل سے سارا ضلع سیراب اور مقام ستر کھہ مین ایک میلہ بھی ہر سال ہوتا ہے اور اب لکھنؤ سے نواب گنج ہوتے ہوسے فیض آباد تک سڑک پختہ طیار ہو گئی ہے اور ایک اسکول بھی زیر اہتمام ضلع کے جاری ہے اور اس ضلع مین تحصیل ہاے مفصلۂ ذیل یہ ہین نواب گنج حضور تحصیل رودلی دریا باد رام نگر +

تیسرا ضلع راے بریلی

یہ مقام لکھنؤ سے ۴۵ میل جانب مشرق مائل جنوب واقع ہے قصبہ پرانا مکانات کہنہ اور یہ ضلع قبل از تجویز جدید مقام کمشنری بیسواڑہ بھی رہا ہے زمین عموماً اچھی اور ہر طرح کی قابلیت زراعت اور تعلقہ دار بڑے بڑے ہین اور آسودہ اور مرفہ الحال ہین لیکن ہنود خصوص

راجپوت کثرت سے ہین شاہزادہ سہدیو سنگہ خلف سردار شیر سنگہ
مہاراجہ پنجاب کو اس ضلع مین جاگیر عطا ہوئی ہے اسلیے وہ بھی
یہان رہتے ہین اور بعض بعض انگریز جو اس ضلع مین تعلقدار
ہین اونھون نے نیل اور پنبہ کی زراعت مین توجہ کی ہے
راے بریلی دلمئو مہارا جگدیسپور حیدرگڑہ یہ چار تحصیل ہین +

چوتھا اونام

لکھنؤ سے ۱۰ میسل جنوب اسکے گنگا اوسکے پار کانپور ہے
صدر مقام اسکا اونام ہے بندوبست پختہ سے رفاہ رعایا برایا
ہوا ہے تعلقہ داری بہت کم ہندو مسلمانکی آبادی ہے برہمن اور
راجپوت زیادہ ہین عموماً اوسط درجہ کی زمین خاص مقام اونام
شیخون کا آباد کیا ہے شاید یہ پرانے خاندان شیخون سے ہین اور
اب بھی اونکے خاندان سے لوگ موجود ہین اس ضلع کا انتظام
بہت اچھا اور رعایا کمال خوش حضور تحصیل اونام نوابگنج
پورسا صفی پور یہ چار تحصیل ہین +

قسمت خیرآباد

ضلع ہردوئی

مقام ضلع کا خاص ہردوئی گہمرنے سے ۸ میل ہے یہ ضلع بہت وسیع ہے
حدود غربی ملحق ہین فرخ آباد اور جنوبی حد گنگا سے ملتی ہے اس ضلع
کی زمین متوسط آدمی بھی عموماً اچھے اور بانگر جہان کے چور مشہور
ہین اسی ضلع مین واقع ہے اس ضلع مین اچھے اچھے قصبے
بلکہ بطور شہر آباد ہین سندیلہ بلگرام شاہ آباد گوپامئو کٹیاری
لیکن ضلع کا دار الحکومتہ بہت خراب موقع پر آباد ہے اہل محلے
کو بوجہ نہونے گہرونکے تکلیف ہوتی ہے لیکن اب آباد ہوتا
جاتا ہے جنگل بھی اکثر واقع ہین اور بہت کچہ نیلام بھی ہوگئے
اور اوزمین آبادی ہوتی جاتی ہے ہندو مسلمان دونون مذہب
کے رئیس آعظم تعلقہ دار ہین چودہری حشمت علی رئیس سندیلہ
اور راجہ ہردیو بخش کٹیاری کے بڑے عالی نژاد اور ناموراہین
سوا انکے اور اور بھی رئیس تعلقہ دار خصوصاً اہل اسلام سے
زیادہ تر با وضع اور پُر تکلف ہین اب اس ضلع مین مدرسہ
حاکم ضلع کے اہتمام سے اجرا ہے اور ترقی پر ہے ہیڈ ماسٹر
اور مدرسون کی لیاقت قابل تعریف ہردوئی حضور تحصیل
شاہ آباد سندیلہ بلگرام یہ چار تحصیل ہین +

دوسرا سیتاپور

مقام دارالحکومۃ کمشنری و ضلع کا ہے خیرآباد سے جانب شمالی
۴ میل لکھنؤ سے ۶۰ میل ہے حکام کی نیک نیتی سے اس ضلع
مین یوماً فیوماً برکت ہے تعلقدار اور رئیس قدیمی سے یہ ضلع
گلزار ہے زمین بہت اچھی گنجایشی کئی قصبہ نامی مثل خیرآباد
باڑی بسوان رامپور اور ضلع کے صدر مقام سے کچھ فاصلے
پر مصرکھ اور اوسکے قریب نیمسار مین یہ دونون مقام متبرک
اور پرانے ہین اور نیمسارن وہ مقام ہے جہان سوت جی نے
پوران سنایا گومتی اوسکے تلے بہتی ہے اسکے نزدیک ایک حوض
برہماورت نام کا ہے اسکا پانی اندر ہی اندر جوش کھاکر ایسا چکر
کھاتا ہے کہ آدمی کو مقدور نہین کہ اوسمین غوطہ لگا سکے یہی
وہ مقام ہنود کے نزدیک ہے کہ انقلابات زمانہ سے جب بید
اور پوتھیان علوم و فنون کی جو ضائع ہوگئین تھین اس مقام
پر اونکی ازسرنو ایجاد ہوئی اور حضرات ریاضت کش پاک باطنون
کی رہنمائی سے پھر علوم اور پرانی سنسکرت کی پوتھیون کا ظہور
ہوگیا اوسکے قریب ایک سرچشمہ ہے کہ وہ گومتی مین ملتا ہے
ایک گز چوڑا اور چار انگل گہرا ہے جب برہمن پوجا کرتے جانور

ہون کا سامان اوسمین چھوڑرکھے ہین اوسکا نشان نہین ملتا
ہر بھی اکثر عقائد مذہبی کی وجہ سے باتین مشہور ہین نمیسارن
صرکھہ کا ہرسال مین جب کوئی پرب ہوا میلہ ہوتاہے اور
عمولی میلہ ہرسال بڑی دھوم سے ہوتاہے کئی سال سے
حاکم ضلع اور صاحب کمشنر کی عنایت سے خیرآباد کے مقام پر ایک
میلہ ہوتاہے اس مین گھوڑے اور مویشی کثرت سے بکنے کو
آتے ہین اور یہ قصبہ خیرآباد بہت قدیمی اور اکثر رئیس یہانکے
مامور اور سرکاری خدمتون پر مامور ہین مکا خیاط کا امام باڑہ
مشہور ہے نیشکر کی زراعت بہت اور کئی مقامون پر کھنڈسال
بھی ہے بسوان مین قالین بنائے جاتے ہین اور تماکو بھی اچھا
ہوتاہے اور محمود آباد کی ریاست اس ضلع مین بڑی ہے یہ
چار تحصیل کے مقام ہین حضور تحصیل سیتاپور بسوان
باڑی مصرکھہ ✤

ضلع کھیم پور

لکھنؤ سے فاصلہ تخمیناً ۶۰ میل سیتاپور کے اوتر ۲۴ میل پر
دارالحکومۃ ضلع ہے شمال اور غرب مین بہت بڑی حد اسکی
پیلی بھیت اور شاہجہان پور اور بریلی اور مشرق مین بہرائچ

اور دریاباد کا ضلع ہے تعلقدار اور راجہ پور اسنے پور بسنے ہین
زمین متوسط جنگل بکثرت اور شکاری جانور اس جنگل مین بہت
اور جانب شمالی ضلع مین بیماری ہمیشہ رہتی ہے اور گوکرن ناتھ
مہادیو کا مقام اس ضلع مین بہت متبرک گناجاتا ہے دو میلے بہی ایک
سال مین ہوتے ہین اور معتقد صدہا کوس سے آتے ہین
حضور تحصیل لکھیم پور علی گنج محمدی یہ تین تحصیل ہین +

چوتھا بہرایچ

لکھنؤ سے ابفاصلہ ۸۰ میل اوتر کی جانب ہے اس ضلع مین
بڑا علاقہ تعلقہ داری راجہ کپورتھلہ یعنی علاقہ بونڈی و درگاپور
اور بھی بڑے بڑے تعلقدار ہین حد و شمالی اس ضلع کی نیپال سے
ملتی ہوئی ہین یہ ضلع گھاگھرا اور راپتی ندیون کی وجہ سے
بالکل سیراب جنگل کی کثرت وگرنٹ بھی بہت ہے اور پیداوار
سب قسم کی ہے لیکن دھان بکثرت پیدا ہوتا ہے سرجو
اس ضلع کے تلے بہتی ہے سید سالار مسعود غازی کی درگاہ اور
رجب سالار کا مقبرہ اسی جگہ ہے سنتے ہین کہ رجب سالار
تغلق شاہ کے بھائی تھے اور سید سالار مسعود غازی کے حال مین اختلاف
ہے صحیح قول یہ ہے کہ قوم کے سید لیکن سلطان محمود غزنوی سے

قرابت رکھتے تھے اور بعض کا یہ قول ہے کہ پٹھان تھے لیکن شہید
غرض درگاہ اونکی اہل عالم کی زیارت گاہ ہے سال مین ایک بار بڑا
میلا ہوتا ہے دور دور سے لوگ مینا نی کے ہمراہ آتے ہین کتنے ہی
باج بیوپاری بھی آتے ہین اقوام ارزال لال لال نیزون کے ساتہ
بازارون قوالی گاتے بجاتے ساتہ لیکر اپنی اپنی بستیون سے نکلتے
ہین غرض جیٹھ کا پہلا اتوار اس میلے کا دن ہے عقائد مذہبی و جہالت
سے معتقدین انواع و اقسام کی حرکات سے اس میلے مین شریک
ہوتے ہین صدر تحصیل بہرائچ حسام پور نان پارہ یہ تین
مقام ہین +

تیسری کمشنری فیض آباد

پہلا گونڈہ

دار الحکومتہ ضلع کا ہے لکھنؤ سے فاصلہ ۷۶ میل فیض آباد سے
۲۴ میل شمالی ہے — گھاگرا کے کنارے کنارے یہ ضلع گورکھپور
تک آباد ہے پیداوار ہر قسم روئی و نیل کی زراعت کے لائق
زمین بہت ہے مہاراجہ دگبجے سنگہ صاحب بہادر بلرام پور کا
تعلقہ اسی ضلع مین اور ایک حصہ تعلقداری مہاراجہ مانسنگہ صاحب
بہادر قائم جنگ یعنی علاقہ تلسی پور بھی ہے — جنگل افتادہ بھی ہے

بڑے بڑے علاقہ سوائے مہاراجہ بلرام پور و مہاراجہ مانسنگہ صاحب
بہادر کے بہت کم ہین آب و ہوا اچھی و مفرح ہے ۔ یہ مقامات
تحصیل ہین حضور تحصیل گونڈہ اوترولہ سعد اللہ نگر طرگنج

فیض آباد

لکھنؤ سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر ضلع کا دار الحکومتہ لب گھاگھرا
واقع ہے پرانا شہر دار الامارتہ اودہ مقام بنگلہ کے نام سے
۴ کوس کے فاصلہ پر آباد ہے یہ مقام ہندؤن کے عقائد مین
بڑا متبرک ہے دیس دیس کے مذہبی معتقد اس مقام پر آتے
ہین کیونکہ مولد و دار الحکومتہ مہاراجہ رام چندرجی کا ہے مرتاضون
کی اب بھی کثرت ہے ہنومان گڑھی اسی مقام پر ہے اب سرکار
سے مذہبی امور مین مراعات ہین ہر سال رام نومی یعنی چیت
کی نومی کو بڑا ھی میلا ہوتا ہے مہاراجہ مانسنگہ صاحب بہادر قائم جنگ
اور اونکے خاندان سے اکثر مقامات گھاٹ اور دیو استھان
یادگار ہے انھون نے بھی مہاراجہ صاحب کی اعانت سے اسکول
اور ایک مدرسہ آموزش مذہبی فرائض کا جاری ہے جسکا مصارف
ہزار روپیہ ماہواری مہاراجہ موصوف نے اپنی ہمت عالی پر لیا ہے
فیض آباد کے قریب دو بڑی قبرین ہین طول اونکا سات سات

آٹھ آٹھ گز سے کم نہین عوام اونکو حضرت شیث اور حضرت نوح سے منسوب کرتے ہین اور ہر پنجشنبہ کو اکثر لوگ وہان جا کر فاتحہ پڑھتے ہین ۔ اور بعضون کے نزدیک رتن پور مین کبیر جولاہے کی قبر ہے یہ شخص سلطان سکندر لودی کے عہد مین تھا بنارس کے مقام مین عقائد ہنود مین عبادت کرتا رہا فقرا کے نزدیک موحد صاحب کمال تھا چنانچہ اوسکے طبعزاد اکثر دوہرے اہل مذاق کے وردزبان ہین ۔ شجاع الدولہ کے عہد کی آبادی بہت تباستے ہین اور اب لکھنؤ سے اوتر کر صوبہ اودہ مین یہ شہر ہے ملک سیراب اور ہر قسم کی پیداواری وزراعت ہوتی ہے مہاراجہ مان سنگہ بہادر کا صدر علاقہ اس ضلع مین ہے اور یہ چار مقامات تحصیل ہین فیض آباد اکبر پور دوست پور بیرتی پور +

سلطان پور

یہ ضلع شرقی وجنوبی حد فیض آباد سے بفاصلہ ۴۰ میل اور لکھنؤ سے بہ فاصلہ ۸۰ میل واقع ہے متوسط کیفیت ضلع ہے اور اشخاص ورعایا اچھے اور بڑے تعلقدار اس ضلع کے راجہ مادھو سنگہ صاحب بہادر گرہ امیٹھی کی ہین زمین بہت اچھی قابلیت ہر قسم کی گومتی اور کئی ندیان اس ضلع مین ہین اور مقامات تحصیل

یہ ہین حضور تحصیل سلطان پور امیٹھی اعونا مدمن گنج

پرتاپ گڑہ

یہ ضلع لکھنؤ سے بفاصلہ ۱۲ میل واقع ہے ضلع کا دار الحکومتہ بیلا گھاٹ ہے جنوب الہ آباد شرق جونپور حد اپنی بلکہ صوبہ اودہ کی شرقی حد اس ضلع کی حدون پر ختم ہے یہ ضلع سب طرح سے اچھا رعایا آباد تعلقدار شریف وخوش اور بندوبست پختہ ہوتا جاتا ہے اور یہ مقامات تحصیل ہین حضور تحصیل بیلا گھاٹ پٹی بلکھر بہار سلون +

انتباہ

یہ کیفیت نہایت ہی مختصر ہے دوسری کتاب مفصل حالات ملک اودہ مین عنقریب طبع ہونے والی ہے اوس سے مشرح معلوم ہوگا — عہد شاہی مین یہ انتظام اضلاع تھا صرف سرسری طور پر نظامت کبھی چار کبھی پانچ اور اون کے نیچے کے چکلہ دار ہوتے رہے اور مالگذاری کا انتظام تو کبھی تھا اب سرکاری عملداری مین ہر جگہ آبادی وزراعت کی کثرت اور فضل الٰہی سے تولید وتناسل حضرت بنی آدم کی بھی افزایش اللھم زدفزو مزید +

نواب سعادت خان برہان الملک

صوبہ داران اودہ کی ریاست کا موث اعلی یہہ نواب ہو گذرے ہین کہ اصلی نام اس
نواب کا میر محمد امین ہے یہ نیشاپور سے زمانہ دولت بہادر شاہ ۱۱۲۲ع شاہجہان آباد
مین آیا اور عہد دولت محمد شاہ ۱۱۳۰ع مین جبکہ دہلی مین ہنگامہ نادر شاہی ہوا تہا
اوسوقت مین اتفاقات و انقلابات سے مقرب درگاہ پادشاہ ہو گیا بلکہ
خدمتین پسندیدہ اس سے ایسی وقوع مین آئین کہ مترصد عہدہ وزارت کا تہا
چنانچہ اوسوقت مین عملداری اودہ مین ہر مقام پر بے انتظامیان ہو رہین تہین یہ
واسطے انتظام صوبہ اودہ کے مامور ہو کر آئے اور عہدہ سابق بہی بدستور بحال
رہا اس صوبے مین اوسوقت پشتہا پشت سے خاندان شیخ نواب عبدالرحیم خان
جو عہد اکبر مین صوبہ دار تہے زمیدارانہ اس صوبے پر قابض و متصرف تہے
بلکہ اس صوبے کی آمدنی بالکل خورد و برد تہی اور زمانہ کا رنگ دیکہکر در پردہ
سرکش ہو رہے تہے جبکہ نواب برہان الملک اس صوبے مین پہونچا تو لکھنو
مین آکر ٹھہرا اور بوجہ سدراہ ہونے شیخزادونکے کنارہ شہر مین بہی دخل
نہو سکا اور کئی مہینے تک ناکہ مونسے اکبری دروازے کی جنوبی جانب
خیمہ زن رہا اور کوئی تدبیر موافق حال نہوئی تو عیاری کو کام مین لایا شیخزادونسے
ربط اتحاد بڑہایا کہ خیال عداوت بکلم مخالفون کے دل سے مٹایا بعد چند

سعادت خان برہان الملک



ایک جشن مین شیخزادونکی دعوت کا اذن عام دیا چنانچہ وہ جمعیت کثیر سے سات
ہزار آدمیون کے ساتھ مہمان ہوے یہ موقع اور قابو پا کر کمین گاہ سے معہ
افواج سوارون کے حملہ آور ہوا اور ساری جماعت کو مع اونکے سردارون کے
اوسی جگہ ہنگامے نے لگایا اور پھر سارے صوبے مین قابض ہو کر انتظام مہمات
مین نام آور ہوا - ایک روایت ہے کہ شیخون نے داب حکومت اور سیاست
دکھلانیکے واسطے محلہ مین دروازے پر شمشیر برہنہ لٹکا دی تھی کہ جب بادشاہ
کا صوبہ دار یا حاکم صوبہ داری ادا و یر مختار ہو مامور ہو کر آتا تھا تو اپنی دلیری و
شجاعت سے اوسکو تنگ کرتے تھے اور اوس سے اوس تلوار کا
سلام لیا کرتے تھے +

+ جب برہان الملک کا قبضہ اور تصرف شہر مین کماحقہ ہوا فوراً اوس تلوار
کو پھکوا دیا اور بعد اوسکے سب کہنگے اس صوبے پر مسلط رہا اوس زمانے
مین پچاس لاکھ روپیہ محاصل صوبہ تھا اور عہد برہان الملک مین صوبے کی
یہ حدین تھین - دکھن گنگا - شمال دریاے رپتی و ترائی نیپال
- شرقی محو عظیم اباد - مغربی شاہ اباد محتہ فرخ اباد سنہ ۱۱۵۱ ہجری مین
شاہ جہان اباد دہلی مین بعد ہنگامہ نادر شاہ وفات پائی اور شاہجہان اباد
تا بیج محلہ میدان لکھنو مین شیخزادونکی حکومتگاہ تھی شاید بھون کے متصل
واقع تھا اب تو نام بھی نہ نشان ——

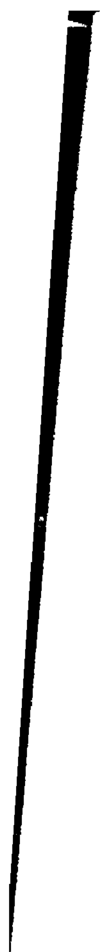
مین فن اور راجہ جی شاکہ اسکے زمانے مین کا پرداز تہا **قطعہ تاریخ**
ہوئی جسد دم کتاب امجد عمر ادب مرگ کی ہاتہہ سے ابتر پی تاریخ کی جو فکر شایان
ہوا سال اسم بہی اوکا ہی اظہر قلم نے ڈال ملفوظی کو ہعداد کئی اسم سعادتخان سے باہر

مرزا محمد مقیم ملقب بلقب نواب صفدر جنگ

باپ اس نواب کا نواب جعفر علی خان داماد ہمشیرزادہ نواب برہان الملک کا تہا
نواب برہان الملک کی صوبہ داری نسبت اور صوبہ دارون کے اودہ مین زیادہ استحکام
سے رہی اسواسطے اونکے خاندان مین اس صوبہ نے زیادہ تر قیام
پکڑا اور اپنا نقشہ جمالیا بعد انتقال برہان الملک کے ۱۱۵۱ ہجری مین
نواب صفدر جنگ قائم مقام برہان الملک کے حضور بہادر شاہ شاہجہان آباد
سے ہوا اور وزارت کا منصب بہی حاصل کیا یہ نواب بڑا ہی دلیر اور صاحب
تدبیر تہا اور مقرب بادشاہ دہلی رہا جب احمد خان ابدالی کی شورش ہندوستان
مین ہوئی اور مثل نادر شاہ کے ہندوستان مین آکر ایک تہلکہ ڈال دیا تہا
ہمراہ لشکر شاہی برفاقت شاہزادہ احمد صفدر جنگ نے وہ داد شجاعت دی
کہ اور بہی مقرب درگاہ ہوا اور بعد فتحیابی کے شاہزادہ موصوف معہ صفدر جنگ
دہلی کی جانب روانہ ہوا کہ راستے مین خبر وفات محمد شاہ کی معلوم ہوئی یہ خبر
اخفا رہی تہی کہ صفدر جنگ نے چتر شاہی احمد شاہ کے سر پر رکہا اور

نواب منصور علیخان صفدر جنگ





ساتھ ارکین درگاہ جو ہر کاب شاہزادہ تہے بہون سنے نذرین تخت و تاج کی دین

کہ اس جلدو مین عہدۂ وزارت حاصل ہوا لیکن اکثر امرا و ارکین سلطنت کہ جو

پشتہا پشت سے مقرب درگاہ تہے اس خدمت وزارت صفدر جنگ سے

ناخوش ہوسے اور درپی استیصال صفدر جنگ تہے لیکن صفدر جنگ کا

عروج تہا کسی دشمن کی پیش نگئی بلکہ ۱۱۶۱ ہجری مین کمال اولوالعزمی سے

مخالفان پٹہانونکو فریب سے قتل کرا اپنا قبضہ اور دخل کر لیا راجہ نول راے کو

اپنا نائب مقرر کر کے اس جگہہ پر چہوڑ کر خود صفدر جنگ روانہ شاہجہان اباد

ہوا چند روز کے بعد پٹہانون سنے یورش کی اور راجہ نولراے اوسی

ہنگامے مین کام آ ئے اور یورش کی خبر پاتے ہی صفدر جنگ سنے

باعانت سورج مل جاٹ راجہ بہرتپور و مرہٹہ وغیرہ کی جمعیت کثیر کے ساتھہ

پہر مقابلہ پٹہانون کا کیا پٹہانون کے افسر احمد خان و رستم خان برادر

قائم جنگ کے تہے اس ہنگامے مین لاکہون آدمی کا کشت و خون ہوا

اور رستم خان مارا گیا اور صفدر جنگ سلامت کو جا کر شاہجہان اباد کو پہر گیا

اور بقیہ فوج مشکل سنے جانبر ہو کر روانہ الہ اباد ہوئی پہر اودہ اور فرخ اباد ان

دونون صوبون مین روہیلہ گردی سے روز حشر نمودار تہا سارا ملک تاراج

ہو گیا شہر بنارس بچ گیا وہان کے مہاجنون سنے شہر کی حفاظت

اور بچانیکے واسطے دو کرور روپیہ پیشکش کیا کہ روہیلون کی بدانتظامی اور

طمع نفس سے لکھنو کا انتظام جاتا رہا اور شیخ معز الدین نے اپنے قبضے اور تصرف مین کر لیا
ساکنان لکھنو اور نواح اوسکے نے آکر پٹہانون کو تہ تیغ کیا اور عمارات قیات پر بخوبی
مسلط ہو گئے اور صفدر جنگ کو اطلاع دی کہ یہ وقت ہے کہ روہیلون سے
عوض لیجے چنانچہ صفدر جنگ نے باجی جی بہاو و مہاراو کہ جمعیت کثیر اسی ہزار آدمی
مین تہی اونکی معیت سے احمد خان وغیرہ روہیلون فرخ اباد کے اس پار گنگا یا ادہر کر
خوب ہی خبر لی اور مرہٹون نے کہ معاون صفدر جنگ تہے اور واسطے صلح کرا دینے
احمد خان روہیلے کے صفدر جنگ سے دونون طرفسے دو کرور روپیے نقد پائے اور اپنے
ملک کو لوٹ گئے اور الہ اباد اور اودہ کے صوبے کا انتظام و تسلط خاطر خواہ کر کے صفدر جنگ
پہر شاہجہان اباد کو لوٹ گیا بسکہ ارکین سلطنت و امرای حضوری بادشاہ نے صفدر جنگ
کیطرفسے بادشاہ کو آشفتہ کر رکہا تہا صفدر جنگ تنگ ہو کر اپنے ملک مقبوضہ مین چلا آیا
اور ۵ برس تک اس صوبہ اودہ مقام فیض اباد دار الحکومت کی سیر کی ۱۱۶۷ھ مین
وفات پائی اور فیض اباد مین لاش اوسکی سپرد زمین ہوئی اور وہان سے شاہجہان اباد مین
درگاہ شاہ مردان کربلا کے دفن کی گئی اور استخوان اونکی کربلا بہجوائی گئی تاریخ وفات الاتی
وفات منصور علیخان آہ ای مدت پاست بیس برس **تنبیہ** صفدر جنگ
زمانے مین سلطنت اسلام ہند کا زور روز بروز گہٹتا گیا ہر ایک صوبہ دار بجای خود حاکم
و نواب ہو بیٹہا مرہٹون و رجاٹون اور سکہون نے بہت اشور شرین کین تمام ہندوستان
پامال بے انتظامی ہو گیا اور بہتیرے لاکہون بندگان خدا کا کشت و خون ہوا تہا جب

بیان جنگ میر قاسم خان ناظم بنگالہ با انگریزان

نواب شجاع الدولہ بہادر کو جو سرکوبی سرکشان بندیل کھنڈ کیطرفون سے لگی ہوئی
تہی اس مرتبہ باحسن الوجوہ عمل مین آئی یعنی وہ سرکوب ہوچکے اوسوقت ناگاہ
میر قاسم خان ناظم بنگالہ نے کہ انگریز کے ہاتہون سے شکست پائی تہی اور مسے
نواب شجاع الدولہ بہادر کو اپنا مددگار اسطرح سے بنالیا کہ اگر آپ میری دستگیری
کرین لاکہہ روپیہ کوچ اور پچاس ہزار مقام دونگا اور بعد فتح کے یہہ مستدعی ہوا
تہا کہ صوبہ عظیم اباد کہ ۹۰ لاکہہ کی جگہہ ہے مع ایک کرور روپیہ نقد تواضع مین صاحب الدولہ
بہادر تمہارے فرزند کی بخوشی دونگا نوابصاحب بہی اس معاملے پر راضی ہوکر مستعد
دستگیری حال ہوے حاصل مدعا تو درکنار تمامی سرمایہ و جواہرات نقد و جنس کروڑہا
روپیہ کے نوابصاحب کے تصرف مین آئی اور میر محمد قاسم خان اونکی سختیون
سے یہانتک تنگ ہوے کہ حصول مدعا اور مال متاع سے دست بردار ہو
اور بواسطہ فتح علیخان اپنی گلو خلاصی کرکے پریشان روزگار رہتے ہیلے کے ملک
مین چلے گئے نواب شجاع الدولہ نے اوسوقت چاہا کہ ملک بنگالہ اپنے قبضہ
تصرف مین آجاوے فوج بہی کثیر ہمرکاب تہی شجاعت سے ہاتہہ پاؤن نکالے
انگریزون نے بصلاح وقت نواب ممدوح سے پیغام صلح کا دیا کہ عالیجاہ بنیاد
اویزش و فساد کا تمہارے درمیان سے گیا تمہارے اور ہمارے درمیان خیر انجوا ہستہ

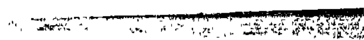
وئی امر کہ مبنی فساد یا عناد کا ہو نہین ہے اصورت مین مناسب ہے کہ سلسلہ
رسم اتحاد و محبت کا جاری ہے قول و اقرار کی پاسداری ہے دوست و
دشمن جانبین سے طرفین مین دوست و دشمن سمجھے جائین اور صوبہ عظیم آباد
کا جو عالیجاہ سے نامزد صاحبزادہ عالی مرتبت سے کیا ہے اوس سے
ہمکو بھی کسیطرح دریغ و انکار نہین ہے چنانچہ راجہ بینی کہ اسوقت مین کارپرداز و مدار المہام
اس سرکار کا تھا بنظر خیر خواہی طرح مصالحہ و رفع فساد کی ڈالی لیکن نواب سالار جنگ
و مرزا علیخان و میر نعیم خان وغیرہ کہ ہواخواہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے تھے
برہم زن اس معاملہ اور مصالحہ کے ہوے نوبت توپ و تفنگ کی آئی اور شعلہ
آتش جدال و قتال آسمان سے گذرا منصور خدا شکست تھی نوابصاحب نے
عین معرکے مین یہ چاہا کہ ہاتھی سے اوتر کر گھوڑے پر سوار ہون ہاتھی کو
فیلبان نے بٹھلا دیا فوج کو بلا تامل یہہ ذہن نشین ہوا کہ نواب ممدوح نے
زخم کاری کھایا قدم میدان سے ہٹایا اور ہر راجہ بینی بہادر دل شکستہ نے پہلے تو
دس بارہ ہزار فوج ہمراہی اپنی سے خوب میدان کارزار گرم کیا مگر اوسوقت
یہہ خیال مین آیا کہ شجاعت پٹھانونکی دیکھا چاہیے کہ وہ اسوقت خاص معرکہ
کیا کار نمایان کرتے ہین اور شجاعت دکھاتے ہین جنگ سے کنارہ کش
ہوا کہ فوج افغان وغیرہ نے عین وقت پر دغا دے آپکو بے سردار سمجھکر
بھاگ گئے اور اپنے ولی نعمت کا خزانہ جو رتھ پر تھا خوب لوٹا ع مال حرام بود بجای

حرام سفت دآخرکار شکست فاش نصیب نواب ہوئی شجاعت اور تدبیر سب خراب
ہوئی پانچ سو ابراہیم خان سے تھے کہ دونا مک وہیلہ ہوسے اور انگریز مظفر و منصور
لکہنو مین آئے تاریخ اس معاملہ کی مرزا رفیع متخلص بسودا نے کیا خوب کہی ہے
کل مغل پوڑن ۱۱۷۷ القصہ نواب شجاع الدولہ بادر ملک وہیلہ مین جسے آئے
سواے حافظ رحمت خان کے کسیکو غمخوار نہ پایا وہان سے بمشورہ خان کو
فرخ آباد مین لے آئے احمد خان بڑے اعزاز و اکرام سے پیش آیا استقبال کیا
اپنے گہر مین لایا تواضع اور مدارات موافق مزاج اور لائق مرتبہ ظہور مین آئی
اور بصلاح عماد الملک بہادر پینتالیس ہزار مرہٹہ واسطے کمک اور امداد نواب
موصوف حسب الطلب آیا تہا چالیس ہزار کوچ اور بیس ہزار بمقام روپیہ تھا
تہا المختصر پہر کوڑہ جہان اباد مین انگریزون سے نوبت صف آرائی کی
آئی بعد کشت و خون بسیار انجام کار وہی ون پیش آیا وہ زبردست رہے
یہہ زیر بار شکست ہوسے ناچار نواب ممدوح بصلاح وقت دو انگریزون کو
کہ پہلی لڑائی مین ہاتہہ آگئے تہے اونکو قید سے آزاد کرکے بہت سے گہوڑے
ہاتہی اور جواہر گران بہا اور اشرفیان نقد دیگر احسانمند کیا اور بدرخواست
مصالحہ طرف لشکر مقابل کے روانہ کیا اور آپ بہی چند سوار سمیت جانب
لشکر انگریزی قدم زن ہوسے اونہون نے جو خبر پائی کہ نواب صاحب آپ
لشکر مین تشریف لاتے ہین باستقبال پیش آئے اور بڑے اعزاز و اکرام سے

اسنے مقام پر ادیے یہ صورت مصالحے کی قرار پائی کہ ایک روپیے مین
چہہ آنے حاصلات ملک سے داخل خزانہ انگریزی ہوا کرین اور ملک پر بہے
نواب صاحب بہادر بدستور قابض او رمتصرف ہین القصہ نواب صاحب بہادر
راضی وخوشی کشتیان جواہرات غیرہ بطریق تواضع سرکار انگریزی سے لیکر
داخل لشکر ہوے اسپنے قلمرو پر بدستور اختیار حاصل ہوا یہہ معاملہ ۱۱۷۹ ہجری
مین گذرا لیکن اس معرکے مین بہت مال نقد وجنس عماد الملک بہادر کا تلف
اور ضایع ہوا تہا اوسکی عوض مین نواب صاحب بہادر نے گیارہ لاکہہ کا
ملک اپنی قلمرو سے جدا کرکے سند اوسکی عماد الملک بہادر کو ارسال کی تہی
اونکی ہمت نے قبول نکیا پہیر دی اور بخوشی خاطر روانہ شاہجہان آباد کو
ہوئے نواب صاحب بہادر باغواے بعض مشیران ناعاقبت اندیش رجہ
بینی بہادر کی طرف سے دل مین ملال رکہنے لگے اور استیصال اوسکا
منظور نظر تہا چنانچہ بعد چندے لکہنو مین تشریف لاے اور بہادر نے
سکو اپنے ہمراہ لیا اور بصلاح ایلچ خان کاربرداز کہ اوس ریاست مین نہایت
ذی مرتبہ وصاحب اقتدار رہتا بلکہ لکہنو مین آج تک ایلچ خان کا میدان ومسجد
مشہور ہے ۱۱۸۱ ہجری مین سلائی اوسکی آنکہون مین پہیری گئی تاریخ ضیا
چشم وا ہی اور اوسی سن مین شادی آصف الدولہ بہادر یحیی خان عرف مرزا ما
کی ساتہہ شمس النسا بیگم دختر خانخانان خلف قمر الدین خان وزیر محمد شاہ کے

نواب شجاع الدولہ بہادر



ہوئی جو بیس لاکھ روپیہ اس شادی مین صرف ہوا تھا۔

نواب شجاع الدولہ بہادر

مخاطب جلال الدین محمد شجاع الدولہ بہادر ابو المنصور خان ہاشم جنگ فدوی
احمد شاہ پادشاہ ۱۱۶۷ ہجری مین ۲۴ برس کی عمر مین مسند نشین صوبہ اودہ مقام
فیض آباد مین ہوے مادۂ تاریخ مسند نشینی ۔ رونق مسند ماہ وزارت
اسی نواب کے زمانے مین انگریزونکی قدرت و اقتدار نے ترقی پائی
جوانی عمر و نشۂ حکومت کے تقاضے سے ابتدا مین عیاشی و تن پروری
مین مشغول تہا اور اسی سبب سے بعض عمائد و اراکین کی یہہ مشورت
ٹہری کہ اس نواب کو حکومت سے خارج کر کے نواب علی قلیخان برادرزادۂ
صفدر جنگ کو کہ الہ آباد مین مقیم تہا لاکر مسند حکومت پر نصب کرین نواب
بہو بیگم صاحبہ نے کہ اونکا اقتدار بہت تہا اس ارادۂ بیجا سے اراکین
ریاست کو باز رکہا اور اوسوقت سے نواب شجاع الدولہ نے آئین
ریاست داری کو کار فرمایا اور پردۂ غفلت کا گوش ہوش سے اوٹہایا
اور اسی زمانے مین سلطنت دہلی مین فتور پر فتور برپا ہوتے جاتے تہے
ملازمان درگاہ اور اراکین سلطنت نے نالائقی سے سلطنت کو ایک کہیل
بنا رکہا تہا جسکا ذرا بہی قابو ہوا پادشاہ کو نیچا سے پہرسے چنانچہ عماد الملک
و دیگر وزراے سلطنت وغیرہ نے شاہزادۂ علی گوہر شاہ عالم کو عداوت سے

خارج کرنا چاہا اور اس سبب سے شاہزادہ مذکور الہ آباد مین مقیم رہتے تھے کہ اس

عرصے مین احمد شاہ درانی بادشاہ دہلی کی امداد کے لیے مرہٹہ بہاؤ راؤ وغیرہ

کے مقابلے کیواسطے پھر ہندوستان مین پہنچا واضح ہو کہ ان مرہٹون نے

بجمعیت کثیر و جم غفیر قریب بیس پچیس لاکھ کے دہلی کو گھیر لیا تھا اور مرکوز

خاطر تھا کہ دہلی کو فتح کر کے تخت و تاراج کرین کہ احمد شاہ درانی بارادہ کمک

و امداد شاہ دہلی کے آیا اور حسب ایماے احمد شاہ درانی دپاس ناموس

اسلام کے شجاع الدولہ و دیگر صوبہ داران شاہی احمد شاہ کے

لشکر مین پہنچے اور باتفاق یکدیگر ان سب نے خوب ہی مرہٹون کا

پانی پت کے مقام پر مقابلہ کیا آخر مرہٹون کی گس ٹ پڑا سے کچھ نہو سکا اور جم غفیر

نے راہ فرار لی اس فتح نمایان سے احمد شاہ درانی و شجاع الدولہ بہادر کی خدمت بریس سپہ پڑ

ہوئی بلکہ سلطنت کو کچھ استحکام ہو گیا۔ بعد اس ہنگامے کے بادشاہ سے

رخصت ہو کر نواب مذکور اپنی دارالریاست صوبہ اودہ مین لوٹ آیا اور راستی

سے دادگستری و معدلت پژوہی مین ہمعصران مین مشہور تھا یہ نواب نیکاردو

اور دلیر و شجاعت مین اسم بامسمی تھا رفاہ خلائق مین حتی الوسع کوشش کرتا

اور اس نواب کے عہد مین صوبہ اودہ بالکل خرخشہ مخالفون سے پاک

ہو گیا اور ریاست بالاستقلال سمجھی گئی اوس زمانے مین اقبال نواب سے

پہ مرہٹون کی لڑائی اور ہنگامہ و مرکشی کی کیفیت دیگر سوانح مین مفصل تحریر ہے

اس صوبے کی حد زیادہ بڑھ گئی غرب اٗوده و شرق مین مرزاپور اور
الہ آباد کا صوبہ بھی شامل صوبۂ اوده ہو گیا اس نواب کے عہد ریاست مین
چند لڑائیان و فتوحات تازہ بر روی کار آئی جس سے ریاست مین روز بروز
زوال و تنزل ہوتا گیا اور یہی سبب ہوا کہ ریاست جدید بھی جسقدر
محفوظ رہی غنیمت سمجھتے رہے لیکن اسمین شک نہین کہ یہ نواب دلیر و باہمت
اور اوس زمانے کا مدبر سمجھا گیا تھا

ریاستہای بندیل کھنڈ کی شورشین

اس صوبے کی چھوٹی چھوٹی ریاستین تھین زمانہ کا رنگ دیکھکر ہر ایک
رئیس خود سر ہو گیا سارے صوبے مین غدر ہو گیا اور بعضے بعضے رئیسو نسے
خود لشکر نواب شجاع الدولہ سے ہنگامہ کارزار گرم ہوا کہین سے فتح اور کہین
شکست ہوئی لیکن انتظام قرار واقعی نہو سکا اس لیے راجہ ہمت بہادر گوشائین +
کو مع سرداران دیگر اصلاح بغاوت بندیل کھنڈ کیواسطے معین کیا بعد کشت
وخون بسیار نواب کی فوج کو ہزیمت ہوئی اور بہت سے سردار کام مین
آئے اور ہمت بہادر شکست کھا کر اوده مین لوٹ آیا یہ معرکہ ۱۱۸۶ سنہ ہجری
مین ہوا اور اس سے کسی قدر اقتدار نواب کا کم ہوتا گیا ۔

+ یہ شخص مشہور رئیسون اور ارکان شاہی سے تہا ۔

وقائع احمد خان بنگش فرخ آبادی و نواب شجاع الدولہ

یہہ احمد خان وہی روہیلہ ہے جسنے نائب نوالرائے صفدر جنگ کو تیغ کرکے فرخ آباد مین اپنا عمل و تصرف کرلیا تہا جسکے استیصال کے واسطے نواب صفدر جنگ نے بمعیت مرہٹون کے بہت سی کوششون کے بعد کامیابی حاصل کی لیکن برای نام اطاعت قبول کرکے جگڑا طے ہوتا مگر درحقیقت وہ اپنی ریاست پر قابض تہا - زمانہ صفدر جنگ تا عہد شجاع الدولہ رسم وراہ و اتحاد و اخلاص فیمابین سرکارین رہا جبکہ نواب شجاع الدولہ سے بعضے بعضے سرداراوسکے سرکش ہوگئے تو ایک سردار مسمی امراو گر گوشائین نواب سے منحرف ہوا احمد خان بنگش نے اوسی سردار کو اپنے پاس جگہہ دی یہ بات نواب شجاع الدولہ بہادر کو ناگوار گذری اونہونے امراو گر کے نکال دینے کو لکھا اوسنے درجواب اسکے لکھا کہ وہ طلبیدہ نہین آیا اوسکا دینا خلاف مروت و مردبت کے ہے نواب شجاع الدولہ نے لشکر کشی کی اور قنوج مین فوج کا جماو ہوتا گیا اور فریقین کی سپاہ اور دوستون کی جمعیت سے دونون طرف کی جمعیت لاتعد تہی نجابت تہے کہ آتش ہنگامہ مشتعل ہوکر نواب نجیب الدولہ بہادر شجاع الدولہ سے

+ یہہ شخص مدبر شاہ دہلی تہا -

لشکر کا ممد و معاون ہوا اور اس عزیمت جنگ اور بحالت بیجا کو اصطلاح
فرو کر دیا کہ اطوا کو فرخ آباد سے الگ کرے بحوا دیا اور جو جو سردار افاغنہ رامپور
وغیرہ سے واسطے کمک احمد خان بنگش کی آئی تہی لوگوں کو اپنی اپنی ریاست
پر رخصت کرا دیا اور لشکر نواب شجاع الدولہ خیریت سے اپنی دار الریاست
اودہ کو پہر آیا ع رسیدہ بود بلائی ولی بخیر گذشت ایسے ایسے
بہت سے ہنگامہ ہوئے اور کئی مرتبہ انگریزون سے بہی شکست
پائی آخر کو حسب قرار داد جو آمنے انگریزون کو دیتے تہے اور باقی
نوابصاحب کا حصہ تہا اور روہیلون سے بہی ہمیشہ تا خین حیات نوابصاحب
کی نوک جہوک ہوتی رہی اور اکثر لڑائیون مین انگریزی سپاہ نے مدد
دی چنانچہ حافظ رحمت خان کی لڑائی مشہور ہے ۱۱۸۸ھ ہجری مین
انگریزون کی مدد سے فتح پائی اور حافظ رحمت خان کا سر کا آگیا او
اوسی سال مین غازی الدین حیدر تولد ہوئے۔
اس نواب کے عہد حکومت مین سپاہ کا انتظام اچہا نہ تہا اور سردار بہی
بعض بعض بیدل ہو گئے مگر ماتحت شاہ دہلی کے سارے صوبون مین
مشہور تہا اور ہر ایک ارکین اور سردارون خود سر سے میل ملاپ بہی تہا
یوم مسند نشینی سے ایسے جہگڑے اور خرخشے رہے کہ ایکدن بہی آسایش
نپائی انگریزون کے مددگار ہونے سے اودہ کی ریاست کمزور ہوتا گیا

بلکہ موروثی اور خود اختیاری ہوگئی اور دشمنان اندرونی و بیرونی سے نجات پائی سپاہ مین اکثر سپہ سالار خواجہ سرا ہوے کہان شجاعت کلاونت اور کہان فسری خواجہ سراؤنکی اور اوسی عہد سے عیاشی کی کثرت اس ریاست اور ارکان مین ہوتی گئی اخرزمانہ شجاع الدولہ مین اٹھارہ ہزار سوار بافسری شیخ احسان علی خان بہریچ و خواجہ اسد خان بخشی و یوسفی ان قندہاری آبرو کل آمدنی اس صوبے کی جب کسی وقت مین فرخ اباد بہی صوبہ صوبہ اودہ کے شریک تہا دو کرور ستر لاکہہ کی تہی جسمین تراسی لاکہہ روپیہ بابت بہدا آمدنی کے سرکار انگریزی مین جاتا تہا - نواب شجاع الدولہ کے عہد ریاست تک بیچ محلے کا کرایہ شیخون کو دیا جاتا تہا شاید دو سو روپیہ ماہوار تہا ۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ ہجری مین وفات پائی مدت ریاست ۱۹ سال راجہ بینی بہادر کار پرداز تہا اور بعدہ یحیی خان —

مدت ریاست نواب آصف الدولہ بہادر

۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ ہجری مین نواب آصف الدولہ فرزند شجاع الدولہ بہادر بہر بزرجنگ مقام فیض آباد مین ۲۷ برس کی عمر مین مسندنشین صوبہ اودہ ہوا قطعہ تاریخ جلوس گشت از پای آصف الدولہ رونق مسند وزارت ہند یہی نواب ہے کہ عہد حکومت مین دار الحکومت لکہنو قرار دیا گیا فیاضی اس نواب کی مشہور ہے

نواب آصف الدولہ بہادر





ومعروف ہے جسکو دے مولی اوسکو دے آصف الدولہ ابتک لوگونکی
زبان پر جاری ہے نواب آصف الدولہ نے حکومت اطمینان کے ساتھہ کی
اور کوئی مخالف اونکا زبردست خلل انداز ریاست نہ تہا لکھنؤ کی آبادی اور فیاضی
وسخاوت زبان زد خلایق ہے عزل و نصب نائبون کا انگریزی کا اقتدار ہونا
بنارس وغیرہ کا ملک صاحبان انگریز کے قبض و تصرف مین آیا - امام باڑہ
رومی دروازہ کی بنا سنہ ۱۱۹۹ ہجری مین دریای گومتی کا پل باندہنا سنہ ۱۲۰۱ھ
مین مرزا وزیر علیخان کی شادی کا ہونا یہ شادی اوس شرح ملنے مین ایسی کی
کہ شاید ہندوستان مین کسی نے نہین کی ہوگی تفصیل اس اجمال کی یہہ ہے
کہ اگرچہ قبل از دار الحکومت ہونیکے لکھنؤ ایک اوسط قصبہ شمار تہا لیکن
نواب آصف الدولہ کے عہد حکومت مین ازبس فیاضی و فیض رسانی کا آوازہ
بلند ہوا ہر ملک کے سوداگر عالم فاضل پیشہ ور امیدوار اس شہر مین
کثرت سے آنے جانے لگے جو کہ وہ زمانہ غدر تنزل و انقلاب خاندان
تیموریہ کا تہا روزگار و معاش کی قلت سے ہندوستان مین سراسیمگی چہا گئی
تہی اور ادہر دکہن مین چڑہائی ہنگامہ مرہٹون اور ٹیپو سلطان کا تہا
راجستان مین ہلکر اور نواب ٹونک نے زلزلہ ڈال رکہا تہا پنجاب مین
سکہونکی شورشون سے تعصب مذہبی کا جوش تہا اس گھڑی اودہ مین
کچہہ عافیت اور امن تہی ادہر نواب آصف الدولہ کی فیاضی اور فیض رسانی

اور شہر کی آبادی اسقدر چیرہی کہ اتنا بڑا شہر اب تک سے ہے کہ ہندوستان مین نظیر
نہین رکھتا ۔ رومی دروازہ و امام باڑہ آصف الدولہ کا بنایا لائق دیکھنے او تعریف
کے ہی جسکا ذکر خود تذکرۂ تعمیرات پر آئیگا ۔ پل اب تک یادگار ہے آصف الدو
کے زمانے مین سردار ہمت بہادر گوسائین کے حوالے میان دوآبہ کا ملک تہا
اسکی رانی اب تک بندرابن ضلع متہرا مین موجود ہے ۔ اگرچہ آصف الدولہ کی
مسند نشینی کے ذریعے سے مختار الدولہ نائب تہا اور اس وجہ سے نہ خود نواب صاحب
کی نظر اور دیگر ارکان سلطنت کی وقعت اوسکے مزاج مین تہی آخر الامر ارکان سلطنت
باہم سازش کرکے سعادت علیخان کو مسند وزارت پر بٹہانا چاہتے تہے خصوص
بسنت علیخان کا دلی ارادہ یہی تہا کہ سعادت علیخان مسند وزارت پر بیٹھے
لیکن مختار الدولہ کے غرور و تکبر سے ہر ایک سردار ناراض تہا اور بسنت علیخان
تو دل او س سے ناراض تہا آخر الامر قابو پا کر بسنت علیخان نے جبکہ لشکر
نواب آصف الدولہ کا اٹاوہ مین تہا مختار الدولہ کا کام تمام کیا اور ارادہ تہا کہ
او سی طرح نواب آصف الدولہ بہادر کا بہی کام تمام کرے لیکن اتفاقاً ہواخواہون کے
خبر لینے سے بچ گئے ۔ نواب آصف الدولہ کو او س سے بدگمان تہا او سکے
قتل کا حکم دیا راجہ نواز سنگہ نے فوراً ہاتہہ صاف کیا اسی مقام جہان بسنت
خواجہ سرا قتل کیا گیا سعادت علیخان بہی تہا لیکن اوسطرف سے بہی نواب آصف الدولہ بدگمان ہوے
اس وجہ سے سعادت علیخان عہد نواب ممدوح مین کبہی بنارس اور کبہی آگرہ

اور کبھی کلکتے مین رہتے اور اسی فکر مین ستے کہ موقع پاکر خود ہی وارث ریاست ہو بیٹھیے لیکن نواب آصف الدولہ کی زندگی تک کوئی تدبیر مفید نہین ہوئی — بعد انتقال نواب ممدوح خان جبکہ آگرے سے سعادت علیخان کا بنا یا ہوا لکھنؤ مین پونہچا خلعت نیابت ملا لیکن زندگی نے وفا کی سات دن کے بعد مرگیا پھر نیابت کا شور ہوا ابوطالب خان لندنی اسمعیل بیگ خان اور مرزا جعفر یہ تین آدمی تجویز ہوے تھے لیکن تقدیر کی کسکو خبر حیدر بیگ خان کہ نہایت افلاس زدہ تہا متوقع نوکری سو پچاس روپے کا رزیڈنٹ صاحب بہادر کی خدمت مین جایا کرتا تہا اونکی عنایت سے خلعت نائب حاصل ہوا اور خطاب اوسکا نواب امیر الدولہ بہادر ہوا دیوانی کی خدمت راجہ ٹکیت رای کو مفوض ہوئی اس شخص کا اقتدار اور نام ابتک مشہور ہے تالاب ٹکیت رای پر اب بھی ہر سال میلہ ہوتا ہے اور جنرل مارٹین صاحب فرانسیس صاحب عمارت عجیبہ اور رفیعہ رزیڈنٹ میجر سلر صاحب کی تہی ایک نیکنامی انکی مشہور ہے عہد آصفی مین انکا بہی مسکن لکھنؤ مین تہا امیر الدولہ سے بہت موافق تھے عہد و پیمان معاملہ دوستی و اتحاد نے فیمابین مین استحکام پایا تہا اوسی وجہ سے عزل و نصب رزیڈنٹ کا حسب استدعای امیر الدولہ ظہور مین آتا تہا اون دنون مین امیر الدولہ کا اقتدار فرصت و کار گزاری جمی ہوئی تہی اگرچہ راجہ ٹکیت رای دانشمند تھے لیکن ایک معاملہ خفیف مین دشمنون سے مل گئے اسی وجہ سے طبیعت انکی جب

بہادر کی راجہ ٹکیت راے سے پہلی نظرون سے بہی گر گئے تو نہ راجہ جہاؤ
کو سپرد ہوا اب نواب صاحب ممدوح نے پیش خود یہہ تجویز فرمائی کہ راجہ جہاؤلال
کو بجاے امیر الدولہ نائب سرفراز الدولہ کا کیا جاے ہے لیکن بمقتضای عاقبت اندیشی
مصلحتاً سرفراز الدولہ کو اس بات پر کہا کہ آپ نیابت راجہ جہاؤلال کہ آدمی چالاک
ہے قبول نہ فرمائین انجام کو یہہ راجہ کچہہ ہاتہ پاؤن نکالنے لگا المختصر سرفراز الدولہ
کو یہہ مشورہ پسند آیا بسبب نائب کے کام کرنا گوارا نتہا رفتہ رفتہ بواسطہ صاحب
رزیڈنٹ کے پہر خلعت دلوانیکا راجہ ٹکیت راے کو سرکار عالی سے دلوایا
چونکہ یہہ امر خلاف طبیعت نواب ممدوح کے تہا بعد ایک مہینے کے پہر معطل
کردیا نواب ممدوح کے دل مین راجہ جہاؤلال کی کمال جگہہ تہی سنہ ۱۲۱۱ ہجری
مین لوگون نے وہ تدبیر نکالی کہ راجہ جہاؤلال کو کسی طرح یہان سے
نکالا چاہیے کہ انکا اخراج وعزل باعث ممنونی راجہ ٹکیت راے ہوگا یہانتک
عرق ریزیان اسباب مین کین کہ نواب گورنر جنرل بہادر لکہنؤ مین تشریف لائے
اور جہاؤلال کو آپ سے جدا کرکے عظیم آباد مین بہیجا لیکن اس امر کے ظہور سے
مزاج آصف الدولہ بہادر نہایت برہم اور مکدر ہوا اور یہہ بات زبان پر لاے کہ
تغیر لباس کرکے واسطے زیارت کے اسکے طرف کربلاے معلی یا نجف اشرف کی چلا جاؤنگا
اور زمین و آسمان اپنے مقام سے گو ٹل جائین لیکن عہدہ نیابت کا حسن رضاخان
اور ٹکیت راے کو ہرگز نہ دونگا آخرکار یہہ تجویز نیابت کی بنام الماس علیخان قرار پائی

اوسی زمانے مین گورنر جنرل لکھنؤ مین تشریف فرما تھے کا ورمقدمہ کی کئی چیٹھی
ملاتش فرماتے تھے کہ ایک چیٹھی نواب گورنر جنرل مارکوئس کارنوالس بہادر
کی بمضمون جدم تفویض عہدہ نیابت الماس علیخان کو نکل آئی اس وجہ سے
وہ صورت جو کہ قرار پائی تھی مل گئی تفضل حسین خان نے خلعت نیابت پایا نقل ہے
کرتے ہین کہ امیر الدولہ اس سرکار کا بڑا خیر خواہ تھا اتفاق کلکتہ جانیکا ہوا
اہالی گورنمنٹ نے حال سبب برہمی مزاج آصف الدولہ کا استفسار فرمایا امیر الدولہ
نے بیان کیا کہ آمدنی کی صورت قلت پر ہے اور خرچ بکثرت تیئیس لاکھ روپیہ
بابت جمعیت آپکے سرکار کو بھی دینا پڑتا ہے اور جو صاحبان انگریز بہادر نووارد
رونق افزاے لکھنؤ ہوتے ہین اونکی مہمانداری اور تواضع اور روشنی مین
لاکھون کا صرف ہوتا ہے اور انگریزی سوداگرون سے مال کا محصول نہین
لیا جاتا ہے ہزارونکا اسمین بھی نقصان ہوتا ہے اور سواے اسکے جو سوداگر
مال ولایتی لاتے ہین نوابصاحب سے یہ عرض کرتے ہین کہ یہ اشیاے
بیبہا خاص ولایت سے آپہی کیواسطے لائے ہین چارناچار مول لینا پڑتا ہے
قیمت بھی انکی خاطر خواہ دینی پڑتی ہے المختصر جمعیت تو نے سے دو تہائی معاف
ہوئے اور انگریزی سوداگرون سے محصول لینے کی اجازت ہوئی اور یہ
بھی حکم رزیڈنٹ کا نافذ ہوا کہ کوئی انگریز بدون واسطے رزیڈنٹ کے ملاقات
کو نواب آصف الدولہ کے پاس نہ جایا کرے چنانچہ امیر الدولہ نے اس بات کی

کامیابی کی عرض سے کلکتے مین ایسی افشانی کی کہ آج تک مشہور ہے اب حال راجہ

جہاؤلال کا سنیے کہ انکے جانے سے نواب آصف الدولہ بہادر کو کمال غم و رنج

پیدا ہوا یہانتک ضبط کیا کہ بیماریون نے ہجوم کیا اور دوا سے انکار محض کی

کہتے ہین کہ راجہ جہاؤلال کے فراق مین ۲۴ ربیع الاول ۱۲۱۲ ہجری مین جمعہ کے

دن انتقال کیا اور بہرات مے گئے اپنے امام باڑہ کلان مین کہ تعمیر فرمایا تہا دفن

ہوے تاریخ وفات کلام ملا محمد ندیم اصفہانی استاد نواب وزیر علیخان سے

یہہ لوح مرقد پر کندہ تہی + گلشن عشرت بتاراج خزان رفت ای ندیم + شاہ استغنام

حسرت مینا یادگار سیم + لکہنوئی آصفست و آسمان بی آفتاب + شہر نویان بی مسیح

و طور سینا بی کلیم + وارد آصف عشرتی در صحن آصف باغ خلد - انبیا ہمدم سلیمان

ہمنشین آصف ندیم + نقد رحمت در کنار فرد بخشش در بغل + عاصیان اینبن

غفار بیست اعطای کریم + نقش بند کاف و نون بر تربت آصف نوشت

ہہنا روح و ریحان و جنات نعیم

۱۲۱۲ھ

یہ نواب ۵۱ سال کئی مہینے کی عمر مین دنیا سے گذرے ۲۳ برس کئی

مہینے ریاست کی مدت ہوئی جناب مغفور و مبرور کا عدن مقام لقب تہا

امیر الدولہ حیدر بیگخان مختار الدولہ وایلچ خان و سرفراز الدولہ حسن رضا خان و

تفضل حسین خان نائب رہے مہاراجہ تکیت رائے کو عہدہ دیوانی سپرد تہا

خطاب راجہ یہہ تہا معتمد الدولہ مشیر الملک مہاراج الدہراج بہادر مہاراجہ تکیت رائے

وزیر علیخان





مناجان





بہادر صلابت جنگ یہ نواب شاعر بھی ستے آصف تخلص یہ رباعی یون کہکر

دل مین تجہے سو لگی ہے ۔ پر شرط یہی کہ اودہر لگی ہے ۔ ملنے نہ ملنے کا

تو وہ مختار آپ سے ہے ۔ پر تجکو چاہیے کہ تنگ و دلگی ہی ؎

مرزا وزیر علیخان بہادر

بعد وفات نواب آصف الدولہ بہادر مرزا وزیر علیخان ۲۹ ربیع الاول ۱۲۱۲ ہجری

مین مسند نشین وزارت ہوے خصلتیں ابہ سعادتین نہ یون تہین تفضل حسین خان درمیان تحسین

علیخان وغیرہ کارندون سے صورت بگاڑ کی پیدا ہوئی یہ لوگ اپنی حفظ جان

اور آبرو کیواسطے دشمن وزیر علیخان کے بن گئے اودہر نواب سعادت علیخان

سے صاحبان صدر سے اقرار فرمایا تہا کہ بعد وفات نواب آصف الدولہ کے

مسند وزارت تمہارے سے نامزد ہوگی اودہر اراکین وزارت مرزا وزیر علیخان کے

دشمن ہی ستے درپے تخریب ہوے صورت ابطال فرزندی کی بخوبی

نکالی یعنی محضر بموا ہیر بہو بیگم و ارکان دولت و افسران فوج وغیرہ اسی مضمونکا

تیار کروایا کہ مرزا وزیر علیخان فرزند نواب آصف الدولہ بہادر کا نہین ہے آخرکار

سرجان شور صاحب نے حسب قاعدہ اونکو کوٹہی بہا بیو رین دربار عام کرکے

نظر بند کیا اور چند روز کے بعد اپنی ذاتی نقد و جنس کے ساتہہ بنارس کو روانہ

کیے گئی وہان مطلق العنان ہے تین لاکہہ روپیہ اسی سرکار سے اونکے معاش

کے لیے مقرر ہوا لیکن ذاتی شرارت اور جبلی فتنہ انگیزی سے راجہ علی بہادر

رئیس ہنڈیل کنندہ اور گوشائین ہمت بہادر اور سرکار سیندھیا وغیرہ سے

نوشت خواند رکھتا تھا اس سے اوسے کلکتے جانیکا حکم ہوا ایک دن کا ذکر ہے

کہ چیری صاحب کہ وہان کا بڑا صاحب تھا اوس سے باتون باتون میں چل گئی جانسے

ہلاک کیا جب تک سپاہ انگریزی اوسکا محاصرہ کرے بھاگا انگریزی فوج نے

اوسکا تعاقب کیا بعد سرگردانی اور پریشانی بسیار والی جیپور کا پناہ گزین ہوا

اوسنے مصلحت وقت اور دبدبے سرکار انگریزی سے مخوف ہوکر حوالے

کر دیا وہان سے بحراست سرکار انگریزی کلکتے مین گیا قید مین مرگیا وہین دفن

ہوا اور اوسوقت سے زیادہ تر اقتدار سرکار رہو گیا القصہ مرزا وزیر علیخان

کو کچھ لطف مسند نشینی وزارت کا اس کشمکش مین حاصل نہوا اور نہ رعایا

کو کچھ کیفیت اونکی عدالت اور سخاوت وغیرہ کی کھلی سچ ہے چاکر بدل

دشمن جان ہوتا ہے اگر ارا کین مرزا وزیر علیخان سے نہ پھر جاتے

تو یہ صورت ظہور مین نہ آتی یہ شخص اپنے عہد وزارت مین جواہرات بہت

لکھوکہا روپیہ کا پیش از گرفتاری کوٹھون سے نکال کر ساتھ لے گیا

تھا کارپردازون نے بہو بیگم سے اس معاملے کا اظہار کیا انھون

نے یہ جواب دیا کہ وہ جو کچھ اسباب نقد و جنس وغیرہ ہمراہ

اپنے یہان سے لے گیا ہے سب مینے اوسکو معاف کیا فقط

نواب سعادت علیخان بہادر





ریاست نواب سعادت علیخان بہادر

جب یمین الدولہ ناظم الملک نواب سعادت علیخان بہادر مبارز جنگ لکھنؤ سے رونق بخش بنارس ہوئے اور وہان بطرح اقامت کی بموجب حکم آصف الدولہ بہادر کے دائی تین لاکھ روپیہ سالیانہ واسطے خرچ کے اس سرکار سے پاتے تھے لیکن سبحان زمان اور ارسطو روزگار تھے اپنی فکر سے ایکدم غافل نہ تھے کلکتے مین جاکر صاحبان کونسل سے دعویدار ریاست آبائی کے ہوئے انھون نے بھی انکے دعوی کو تسلیم کیا اور امیدوار وقت معلومہ کا رکھا آخر نواب سعادت علیخان نظر بفضل الٰہی کرکے کلکتے سے پھر آئے ایام شماری مین عمر بسر کرتے تھے رفتہ رفتہ اوس دن کی نوبت پونہچی کہ جس کی تمنا مین جیتے تھے یعنی بعد ایک مدت کے خبر وفات آصف الدولہ اور مسند نشینی وزیر علیخان کی مسند وزارت پر سُنی نہایت ملال ہوا اوسی بیتابی مین بجرے پر سوار ہوکر پھر کلکتے کو روانہ ہوئے ابھی نواب صاحب راج محل تک پونہچے تھے کہ تحریر تفضل حسین خان کی بنام مولوی علی اس مضمون کی پونہچی کہ نواب بہادر یہان تشریف لائین کام دشمن کا تمام ہوا یہ سنتے ہی نواب سعادت علیخان اوسلئے قدمون راج محل سے پھرے اور ہوا کے مانند کانپور مین ہوتے ہوا جہ شب کو وزیر علیخان

گرفتار ہوئے اور اسکے دوسرے دن صبح کو یکم جنوری سنہ ۱۷۹۸ء مطابق

سوم ماہ شعبان سنہ ۱۲۱۲ ہجری بسنت کے دن بڑے تجمل و شان سے

نواب سعادت علیخان داخل لکھنؤ ہوئے پہلے دولتخانے مین تشریف

لائے بہو بیگم صاحبہ کو نذر دی پھر مسند وزارت پر بآئین ترری بٹھائے

تاریخ تشریف آوری بنارس سے لکھنؤ مین اور تاریخ جلوس مسند وزارت کی یہ ہے

بنارس سے آنا لکھنؤ مین

از بلدۂ بنارس با جاہ و کامرانی	در لکھنؤ چو با اوج وزارت آمد
تاریخ مقدمش را جستم زپیر دانش	گفتا بگو سعادت با صد سعادت آمد

جلوس فرمانا مسند وزارت پر

خداوند امین الدولہ در دہر	حکومت را صد و یک سال باشد
خرد سال جلوس مسندش گفت	بجاہ و حشمت و اقبال باشد

صورت تقسیم ملک اودھ کہ انگریزون کو حسب اقرار نواب سعادت علیخان

نے مسند آرا ہونے کے بعد دیا اسطرح ہے

اول تفصیل ملک کہ انگریزونکو تقسیم مین ملا

فرخ آباد [illegible] لک	محالات ریہڑ [illegible] لک	چکلہ کوڑہ و کڑہ اماوہ [illegible]	کھیری گڑھ [illegible]
اعظم گڈھ و پتہ [illegible] لک	بتیبول [illegible]	گورکھپور [illegible] لک	صوبہ الہ آباد [illegible]

چکلہ بریلی	باندہ وغیرہ	بابل سوای تعاقبہ ادھر	
[illegible]	[illegible]	[illegible]	

دوسری تفصیل ملک کا بعد تقسیم اس سرکار مین باقی رہا

چکلہ گرمن	چکلہ بسوارہ	چکلہ بانگرمو	چکلہ پکھم راٹھہ
محال	محال	محال	محال
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
چکلہ جلدیس پور	چکلہ خیرآباد	دیوا سرکھہ	دریاآباد وغیرہ
محال	محال	محال	محال
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
رام نگر	چکلہ محمدی	چکلہ سلطانپور	گوپتا مین گنج
محال	محال	محال	محال
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
سندیلہ مع متعلقات	مانک پور بہار	املاک نواب صفدر جنگ در شاہجہان آباد	املاک نواب شجاع الدولہ
محال	محال		
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
حضور تحصیل اتفاقات			
[illegible]			

جب اس تقسیم ملک سے نواب صاحب نے فرصت پائی [illegible] کا سن مبارک تھا ایک سال کامل ہر ایک شخص کی چال ڈھال دیکھتے رہے کیونکہ بعد معزولی اپنے متقدم سے کے اہلکارون کو بڑی قدرت ہو گئی تھی کسی اہلکار وغیرہ سے کسیطرح خبر نہوئے جو جسکا جی چاہتا تھا وہ کرتا تھا

مگر دوست دشمن کا خیال ملحوظ خاطر عالی تھا زبان پر نہین لاتے تھے
کہ ایسا نہو وزیر علیخان کا سا معاملہ پیش آئے فراست اور دانائی مین ارسطوی
وقت تھے نواب سعادت خان سے واجد علی شاہ تک ایسا بیدار مغز
عالی فہم عقیل کوئی صاحب مسند و تخت نہین ہوا جب سب طرف سے
طبیعت اونکی مطمئن ہوئے تفضل حسین خان کو بعہدۂ وکالت کلکتہ ٹالا
اور اس انداز سے نکھراون کو جنسے دل کھٹکتا تھا آہستہ آہستہ سزا کو
پہونچایا نواب نصیر الدولہ بہادر جو ملقب بہ محمد علی شاہ ہوئے اور نواب
شمس الدولہ بہادر مرشدزادے کام نیابت کا کرتے تھے امیر الدولہ
بشراکت راجہ تکیت رای کار سرکار کو انتظام دیتے تھے اور نواب
سرفراز الدولہ براے نام شریک ہوتے تھے خطاب ناظم الملک کہ
مہر مین کندہ تھا وہ بموجب حکم حضور پر نور بافتخار الملک مبدل ہوا راے
رتن چند کہ ملازم قدیم تھا صورت انصرام جملہ امور کی اوسکے تعلق تھی
اوسی آدھے ملک سے جو انگریزون کو دیا تھا یہ صورت قرار پائی

شاہزادہ ہای دہلی مقیم بنارس کی تنخواہ	حافظ رحمت خان کی اولاد کا سالیانہ	نواب مرحمت احمد خان بنگش کی اولاد	معافیداران جاگیرداران وروزینہ داران
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
جاگیر نواب سید ابراہیم پچھ شہ	جاگیر الماس علیخان [illegible]	جاگیر تفضل حسین خان [illegible]	آئمہ اشرف علیخان وغیرہ کی جاگیرین مقرر ہوئین

انکے عہد مین پرچون کی دہوم تھی ہرکارون کو حکم ناطق تھا کہ وہ روبرو
جا کر خبر زبانی عرض کرتے تھے دن رات مین اختیار تھا جب چاہین
سوتے جاگتے مین عرض کرین انکے ملانے مین ہرکاران اخبار کے بڑے
کارخانے تھے رای رتن چند اخبار نویس تہا بلا کا آدمی تھا ارکان
دولت کم عزائیں سے نہین جانتے تھے بظاہر بابت شورت بند تھا
دستخط نواب سعادت علیخان کے مشہور ہین جب نواب نے
اپنے عہد وزارت مین عدالتین مقرر فرمائین عدل و انصاف نے
رونق پائی ایک دن پرچہ کچہری عدالت کا ملاحظۂ عالی مین گذرا دستخط
اوسکے یہ ہین کہ فلان صاحب عدالت مثل ماکیان بچہ دار است خود
نمیخورد بچگان را میخوراند تمام کاروبار وزارت پرچہ ہای اخبار پر تھا
کیا مجال تھی ہرکارہ یا اخبار نویس کچہ خبر خلاف تحریر کرتا اگر کوئی بات خلاف
لمعو مین آتی تھی سزا پاتے تھے عمارات عالی بھی اس شہر مین بہت تعمیر فرمائے
ہین کہ باعث آرایش و رونق لکھنو اب تک ہین تفصیل اوسکی مکانون کے
ساتہ لکھی جاویگی ایک روایت تازہ یہ ہی کہ نواب سعادت علیخان کو
تقسیم کردینا ملک کا نہایت ناگوار و شاق ہوا لیکن کیا کرین فکر اسکی
ہر طرح سوہان روح تھی اسی تصور مین تھے بدون زور شمشیر تدبیر وہ ملک
اپنے قبضے مین آئے بہت سی خاک اوڑائی اور عرق ریزیان عمل مین

آئین یہان تک کہ وکیل لندن کو روانہ کیا اور درخواست مستاجری مالک قلمرو
سرکار کی مانند سرکار کمپنی انگریز بہادر کے گذرانی اور سوال جواب نے رونق
پائی یعنی بادشاہ لندن نے درخواست نواب ممدوح کی قبول فرمائی سماعی
ہے کہ یہ شرط اوس اقبال مین لگی تھی کہ اٹھارہ کرور روپیہ پیشگی اگر داخل سرکار
فیض آثار ہوگا یہ صورت ظہور مین آئیگی ۔ نواب سعادت علیخان نے جو
ان دستخطون کی خبر پائی بہت متفکر ہوے کہ اسقدر زر کثیر خزانے مین
نہین اور اجتماع اوسکا سردست دشوار کمال لیکن مرد صاحب ہمت و
تدبیر تھے درپی تدبیر فراہمی زر سے ہے جسطرح ہو سکا بہزار تدبیر سترہ کرور
روپیہ سترہ برس کی مدت مین جمع کیا تھا فقط ایک کرور کی تدبیر باقی
تھی وہ بھی قریب ممکن تھی مگر طالع سرکار کمپنی کا یاور تھا جس سے تدبیر اور
کوشش نواب کی مراد پر نہ پہونچی کہ یہ روایت ہے لیکن یہ نواب بڑا
اولوالعزم اور صاحب ہمت و منتظم تھا دوسری یہ بات مشہور ہے کہ
نواب سعادت علیخان بیماری سرطان مین مبتلا ہوے مصلحتاً تبدیل
مکان کے واسطے ایک کوٹھی جنرل مارٹین صاحب سے مول لیکر دولتخانے
سے اوٹھ آئے اور شفا پائی نام اوس کوٹھی کا فرح بخش قرار پایا اسطرح
ایک مدت گذری جب اسانا گورنر ولیزلی صاحب کہ نواب سعادت علیخان کے
دوست و مصاحب خاص تھے رخصت لیکر ولایت کو گئے یہ بات

اونکو بدل منظور تھی کہ کوئی ایسی بات مجھے بہتر ظہور مین آسے کہ مقدمات
نوابصاحب درست ہوجاوین اسی خیال وفکر مین تھے کہ یہ بات تازہ
ہاتہ اگئی کہ لارڈ ہیٹنگ صاحب بہادر بادشاہ وقت یعنی جارج چہارم کا بڑا
رفیق ہی آج کل بوجہ بے زری سکے تمام املاک اوسکی بیع ہوگئی ہے
اگر اسوقت مین نواب سعادت علیخان اونکے ساتہ کوئی سلوک نمایان
فرماوین خالی مطلب سے نہوگا چنانچہ اس معاملہ سے نواب صاحب کو
آگاہ کیا اونھون نے بھی اونکی تحریر پر عمل کیا تحفہ اور تحائف بے بہا
سے باحسن الوجوہ لارڈ صاحب بہادر سے مسلوک ہوسے کہ اونکو
نواب پر نظر عنایت ہوئی اتفاقاً صاحب ممدوح گورنر کلکتہ کے ہوئے
اور براہ رسم محبت سکے نواب سعادت علیخان بہادر کو یہ اسطہ تحریر فرمایا
کہ ہم ہندوستان مین اسی واسطے آئے ہین کہ تمہارے مقدمون کو
بخوبی درست کرین بمقام شکر اور خوشی کا ہی نواب ممدوح اس مضمون سے
بہت محظوظ ہوسے سمجھے کہ اب مدعای دلی بخوبی کرسی نشین ہوا لیکن
شدنی سب پر افضل ہی اکثر صحبت خاص مین یہ سخن زبان پر عالم نشین
آجاتے تھے کہ گورنر جنرل بہادر انشاءاللہ قریب تشریف لاتے ہین
حوصلہ دل بخوبی اونکی عنایت سے نکل جائیگا اور نمک حرامون کو
سزا دیجائیگی کہ بہت یاد کرینگے جن لوگون کو خوف سزا تھا دلون مین

کھلے کہ اب آفت سر پر آئی نواب ممدوح کے دشمن جان ہو گئے
ایکدن نواب صاحب تھوڑے مصاحبون کے ساتھہ بسواری نجابن
دروازۂ دلکشا تک بہلے چنگے جا کر دولتخانے مین پھر آئے پہر رات
گذرے تک بخوبی عیش و عشرت کا جلسہ گرم رہا ناچ رنگ مین مصروف
تھے جواہر علیخان خواجہ سرا یا رمضان علیخان اپنے ساقی کے ہاتہ
سے گرشت کی یخنی معمولی پی کر پلنگ پر آرام فرمایا ہنوز آنکہ خواب سے
آشنا نہولی تھی کہ کیبار کچہ ہونک اوٹھے تین بار حضرت عباس علمدار کا
نام زبان مبارک پر آیا اور ایک بڑے مرزا یعنی غازی الدین حیدر کو
بھی پکارا بہر صورت حالت غیر تھی وہ یخنی سم کا کام تمام کر گئی
اسمین روایتین بہت کچہ ہین مصلحت وقت سے زبان قلم پر نہین
آسکتین واللہ اعلم بالصواب ۲۳ ماہ رجب ۱۲۱۱ ہجری مطابق
۱۷۹۸ء کو منگل کے دن پہر رات گئے چراغ حیات کا گل ہوا ۲۳ برس
نو مہینے کی عمر تھی اور مکانمین خلف ارشد اپنے کے دفن ہوئے
جنت آرامگاہ اوس دن سے لقب ہوا

قطعۂ تاریخ وفات جنت آرامگاہ

آہ چون رحلت ازین عالم نمود	زینت افزا شد بفردوس برین
من شنیدم سال تاریخش زغیب	آہ شد گنج سعادت در زمین

۱۲۱۲ھ

غازی الدین حیدر بادشاہ





بعد وفات کے کئی برس تین مہینے دو دن گذرا تیا ہوا صاحبان رزیڈنٹ اس عہد مین یہ تھے بلیندن صاحب بہادر کرنیل ولیم اسکاٹ صاحب بہادر کرنیل کالنس صاحب بہادر کرنیل جان بیلی صاحب بہادر اور نواب شمس الدولہ نائب اور نواب منصیر الدولہ یعنی محمد علیشاہ دیوان تھے ۲۲ پلٹن اور پانچ ہزار سوار بعد بر طرفی ملازم تھے مدت ریاست کی ۱۷ سال ۹ مہینے فقط

تاریخ وفات راجہ ٹکیت رای

راجہ ٹکیت رای سخا پیشہ زمان	چون جان پاک خود بجہان آفرین سپرد
رفتم بجستجوی تاریخ سال او	آمد ندا زغیب کہ فیاض عہد مرد

حال ریاست نواب غازی الدین حیدر

جب نواب سعادت علیخان جنت آرامگاہ ہوئے نواب غازی الدین حیدر نے کرنیل جان بیلی صاحب بہادر کو اس سانحے سے آگاہ کیا اونھون نے حسب ضابطہ شتر سوار بھیجکر بندوبستون سے پلٹن واسطے بندوبست کے طلب کین اور مرزا جعفر اور مرزا حاجی کو بلایا اور آپ مع ڈاکٹر ڈبلس صاحب اور کپتان فارخن صاحب کو ہمراہ لیکر نواب صاحب کے مکان مین تشریف لائے اور جابجا پہرے واسطے حفاظت کے مقرر کیے اور حکم دیا کہ کوئی بدون اجازت کے قدیم اندر مکان کے

رکھنے پائے محمد غلام عباس نے یہ خبر نواب غازی الدین حیدر کو پہونچادی
وہ بلباس فاخرہ ولایتی کمر مین لگائے نواب خاص محل کے مکان سے
بارہ دری مین داخل ہوئے آغا میر بھی کسیطرف سے راہ پیدا کر کے
پہونچا کرنیل صاحب بہادر نواب سعادت علیخان کے سرہالین آئے
دوشالہ کہ اوپر پڑا تھا اوٹھایا اور ڈاکٹر صاحب نے واسطے رفع شک
دونون کنپٹیون مین نشتر دیا ایک طرف سے تھوڑا خون اور دوسری
جانب سے اندک چربی نکلی یہان کیا تھا باقی طبیعت مطمئن ہوئی
گفتگو رئیس بنانے کے باب مین ہوئی شمس الدولہ کا بھی نام آیا تھا
لیکن غازی الدین حیدر بہادر کا طالع ور یاور تھا ۴۴ برس کی عمر مین کرنیل
بیلی صاحب بہادر اونکو کمرۂ فرح بخش مین لائے اور مسند وزارت پر
حسب آئین بٹھا کر حکم شلک کا دیا ارکان دولت نے نذرین گذرانین

تاریخ وزارت

وزیر غازی دوران ورستم آفاق — رہی جلوس وزارت ہمو بادل شاد
ندا رسید زہاتف بمن کہ تاریخش — بگو سعید متو دائما وزارت باد

مرزا جعفر و مرزا حاجی کا بھی دور رہا اب آغا میر کی نیابت اور عہدہ کی مشہوری سے
آغا میر نواب غازی الدین حیدر خان بہادر کے خواصون مین منسلک تھا
رفتہ رفتہ قسمت نے صورت ترقی کی دکھائی کاروبار خانگی متعلق ہوا

طبیعت چالاک تھی رنگ زمانے کا دیکھکر منشی علی نقی خان منشی رزیڈنٹ بہادر سے رسم اتحاد بڑھائی یہان تک کہ اونکو اپنا پدرخوانده کیا اس درمیان مین لارڈ ہیسٹنگ صاحب بہادر بھی لکھنؤ مین تشریف لاے وفات سعادت علیخان سے نہایت ملول تھے اور کمال افسوس فرماتے تھے اور ایسی مرضی مبارک معلوم ہوئی کہ درستی معتدبات کی حسب نخواستہ نواب سعادت علیخان جنت آرامگاہ کی منظور تھی قریب تھا کہ صورت ولخواہ غازی الدین حیدر بہادر کی ظہور مین آئے لیکن آغا میر نے بطمع نیابت نواب غازی الدین حیدر کو اس وادی مین نہ آنے دیا بلکہ یہ بات بر عکس ذہن نشین کی کہ ایسا نہو کہ ریاست طرف شمس الدولہ کے منتقل ہو جاسے جو حق نمک تھا وہ ادا کیا آیندہ نوابصاحب بہادر کو اختیار ہی انکو وجہ یہ تھا کہ جو نواب سعادت علیخان کو تھا کہان تھا بہ دام فریب مین آگئے اقرار نامہ جدید پیش کر کے کرنیل بیلی صاحب رزیڈنٹ سے دستخط کر دیے دوسرے دن خلعت نیابت آغا میر کو نصیب ہوا اور معتمد الدولہ خطاب پایا مرزا حاجی کی صحبت برہم ہوئی گھر بیٹھے منتظم الدولہ حکیم مہدی علیخان منتظم خیر اباد ہوے نو مہینے کے بعد معتمد الدولہ ساتھ نصیر الدین حیدر کے لارڈ ہیسٹنگ صاحب بہادر کی ملاقات کو گیا تھا اوسپر سب حال روشن تھا معتوب ہوا بلکہ ابعد مراجعت فرخ اباد سے

گرفتاری معتمد الدولہ کی ظہور مین آئی اسنتنے دنون کے بیچ مین مرزا جعفر مر گئے

قطعہ

میرزا جعفر کہ دائم از امام جعفرش | حب دردل بود این بہر دو عالم ظاہر است
بہر تاریخ وفاتش چون تامل شد مرا | آمد از ہاتف ندا جعفر بنزد جعفر است
۱۲۴۳ھ

نواب غازی الدین حیدر خان بہادر نے پھر نظر مہربانی مرزا حاجی کو بلا کر اپنا مقرب بنایا اور محمد آفرین علیخان خواجہ سرا کا بھی اس زمانے مین ستارہ چمکا بڑا دو رہوا میر خدا بخش انکا کارندہ تھا اوسنے کربلا بنائی بہت مشہور ہے۔

قطعہ

در ایام غازی دستور مند | کہ ہمنام حیدر بجود و عطا است
زہی رکن اقبال او ناظر ست | جہان آفرین خوان اوندائما ست
بدربار او سید با وفا | خدا بخش نامش بفضل خدا است
بنا کرد چون کربلا کربلا | بچشم جہان خاک او طوطیا ست
زروی بشارت خرد سال او | بگفتا کہ این نقشہ کربلا ست

القصہ مرزا حاجی اور محمد آفرین علیخان یہ دونون نواب غازی الدین حیدر کے مشیر ہوئے کچہ دنون محبت نے رنگ کہایا پہرین سے گذرنی باہم شیر و شکر سے تھے یکایک بچہ فلک سے لے کروٹ لی نواب ممدوح نے

معتمد الدولہ کو بھی خلعت نیابت سے سرفراز فرمایا مرزا حاجی اور محمد آفرین علیخان
خانہ نشین ہوئے بعد کچھ زمانے کے محمد آفرین علیخان مر گئے تاریخ ان کی
وفات کی زیب قلم ہوتی ہے۔

قطعہ

چون محمد آفرین رحلت ازین عالم نمود	مدفن او شد بخاک آستان شاہ زمن
چون شدم فکر سال تاریخ وفات	ہاتفی گفتا کہ ہی ہی کرد رحلت آفرین ۱۲۳۳

میر خدا بخش کو معتمد الدولہ نے قید کیا بیچارے نے بڑی مصیبتیں اوٹھائیں
مرزا حاجی جو مستند تھے مع گھر بار کانپور کو نکالے گئے۔

تاریخ

میرزا حاجی کہ آن از سالہا در قید بود	ناگہان او را برون از شہر کردہ این فلک
سال حال سرگذشتش چون زہاتف جستم	گفت مرزا حاجی بیچارہ رفتہ یک بیک

بسکہ مرکوز خاطر سرکار نہ اور گورنر جنرل کو بھی منظور تھا کہ اودہ کی ریاست
آباد و شاد رہے اسواسطے ارکان دولت انگلشیہ نے نواب غازی الدین حیدر
کو تاریخ ۵ ماہ ذیحجہ ۱۲۳۴ہجری مطابق ۱۸۱۹ء تخت شاہی پر جلوہ افروز
کیا بخطاب شاہ زمن شہرت پائی۔ تاریخ یہ ہے

بحمد اللہ کہ با اقبال و دانش	بہ تخت شہ جلوس شاہ گردید
زمین و آسمان یکسر بعیش ست	زماہی حسن می تا ماہ گردید

مبارک باد ای آفاق و عالم	طلوع آفتاب جاه گردید
آمد بگوشم زود یارب	اگر شاه امروز شاہنشاہ گردید

اور سکہ اونکا یہ جاری ہوا

زد بر سیم و زر از فضل رب ذوالمنن   غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن

نواب معتمد الدولہ کا خطاب وزیر اعظم ہوا تاریخ وزارت یہ ہے

ن شاہ زمن صاحب جود و احسان	شد مرا و زنگ مرصع جا بش
وزیر اعظمش شمیم خنک	اگر ہست بشمار فراست فارس
بصفت شاہ شد قوی پر سلیم	وز جنبہ وزیر شد غنی ہر مفلس
از قدم شاہ خرف را یا قوت	وز خاک در وزیر زر گردد مس
تاریخ سعید کرد ناسخ تحریر	شاہ اسکندر وزیر ارسطاطالس

۱۲۳۴ھ

الم اقتدار وزارت بڑھا اپنے پرائے حساد اور اعدا کو یہ سمجھنے لگا کشر

شخاص مخالفان کو کانپور پہنچایا کہ ایک چھوٹی سی بات یہ ہے کہ

بادشاہ بیگم اور ولیعہد کے بیچ مین بڑے بڑے فساد اٹھے لیے میر فضل علی

داروغہ اور فیض النسا مغلانی کو سرکار بادشاہ بیگم سے نکلوایا بڑے ظلم و ستم

ہور مین آئے نوبت کشت و خون کی پہونچی تھی کہ صاحب ریذیڈنٹ بہادر

اسطہ امن کے بہو سے اونکو فتح آباد مین پہونچایا وہان جاکر منتظم الدولہ

سے رابطہ اتحاد کا پیدا کیا درمیان بادشاہ بیگم اور ولیعہد بہادر کے

وہ آتش افروزیان کین کہ جسکا بجھانا آب تدبیر سے دشوارتر تھا بنا جان جب
پیدا ہوے دھوبن کے شکم سے قرار دیا پادشاہ کے کئی بھائی اسکے
ہاتھ سے غریب الوطن ہوگئے بہت شہر مین نظربند رہے اور یہ بھی بیان
اوسکا ہی کہ معتمد الدولہ لیاقت اور مروت اور اور صفتون مین بی نظیر تھا
مگر ہر کسی کو اپنی اپنی زندگی اسکے وقت مین دوبھر تھی غریبون پر جور تعدی
اوسکے ظلم و ستم کرتے تھے وہ کسی کی فریاد نہین سنتا تھا مکانات
رعایا کے بجبر چھین لینا ایک بات تھی اوسنے زمین جبریہ پر بڑے بڑے
وسیع وسیع مکان بنوائے مگر رہنا بھی نصیب نہوا غرض اسنا رب کی
بیدار مغزی اور معاملہ فہمی کی تعریف ہی لیکن سلوک اسکا چہ عام وچہ خاص
اچھا تھا اسکے عہد عنایت مین زمانہ اچھا عیش و دست رہا لکھنؤ مین
آبادی ہوتی گئی اور یہ شخص شعرا کا دوست تھا اب اسکے خاندان سے
کانپور مین کئی رئیس موجود اور وثیقہ دار سرکار ہین۔

تفضل حسین کہ بعہدہ وکالت کلکتے مین تھا متوفی ہوا لیکن معتمد الدولہ
نے پھر عرق ریزی کرکے محمد خلیل الدین خان کو کہ مقبول سرکار مین تھا
وکیل کرنا تقریباً کروڑ روپیہ سرکار شاہی کا سرکار کمپنی انگریز بہادر مین بمنافع
فی ہزار پانچ روپیہ داخل کرکے وثیقہ کرالیا جسکا سود دیڑھ سو سال سے ۵
حسب تفصیل ذیل وثیقہ جاری ہوا۔

نواب مبارک محل	سلطان مریم بیگم	ممتاز محل	سرفراز محل
۔ ۔	ا ۔	ا ۔ ۔	ا ۔
ملازمان متعلقان مع اسامیہائے ازواج	خرچ امام باڑہ نجف اشرف	نواب بیگم زوجہ معتمد الدولہ	امین الدولہ
۔ ۔	ا ۔	۔ ۔	ا ۔
معتمد الدولہ وزیر اعظم	وزیر بیگم وعالیہ بیگم دختران معتمد الدولہ	معلوم	۔
۔ ۔	ا ۔	ا ۔	۔

یہ پادشاہ بھی بہت نیک نیت تھا عادل در نصف اور سخی کمال تھا نظم و نسق سلطنت عام متعلق معتمد الدولہ کے تھا جو روپیہ کہ نواب سعادت علیخان جنت آرامگاہ نے خون جگر کھا کھا کر بڑا تدبیرون سے جمع کیا تھا نصف سے بھی زیادہ صرف عمارات شاہی مین در آیا اور ناچ رنگ تماشا مین کوڑیون کیطرح خرچ ہوا یہ کلام سعدی کا سچ ہے ہر کہ آمد عمارت نو ساخت رفت و منزل بدیگرے پرداخت ۲۷ ربیع الاول ۱۲۳۳ ہجری مطابق ادوا اکتوبر ۱۸۲۷ء ۵۶ برس کی عمر مین بعارضہ اسہال خونی محل مین وفات پائی امام باڑہ نجف اشرف مین کہ لب دریا بنوایا تھا دفن ہوسے لقب خلد مکان ہوا

تاریخ وفات کی شیخ ناسخ کہی ہے	
از وفات جناب شاہ زمن	گو ہمہ عالمی ہلاک شدہ
دہر گردید بہر ما دوزخ	بہ بہشت آن جناب پاک شدہ

نصیرالدین حیدر بادشاه





دیدہ ہا شد بآتش نمناک	سینہ ہا آہ دردناک شدہ
رفت داماں صبر از دستم	جیب صبر و شکیب چاک شدہ
گشت تاریخ مصرعہ استاد	ای ربا آنکہ در کہ خاک شدہ

۱۲۴۳ھ

کرنیل جان بیلی صاحب استریچی صاحب جنرل ریپر صاحب مین صاحب مارٹونٹ ریکٹس صاحب اس عہد مین رزیڈنٹ رہے معتمد الدولہ نائب سردار قمر الدین احمد خان مرزا حاجی محمد آفرین کارپرداز تھے اسوقت مین سات ہزار سوار اور اکتالیس پلٹن تھیں ملک کی آمدنی ایک کروڑ اسی لاکھ مدت سلطنت قریب ۱۵ برس کے

بیان ریاست نصیر الدین حیدر بادشاہ

بعد خلد مکان کے ابوالنصر قطب الدین سلیمان جاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ پچیس برس کے سن مین ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ہجری دیوالی کے دن شمع افروز کاشانہ تخت سلطنت ہوئے تاریخ اونکے جلوس کی یہ ہے

قطعہ

بر تو ای پادشہ فیض رسان عالم	تخت این مملکت ہند مبارک باشد
سال تاریخ جلوس طرب افزا بشنو	جاودان سلطنت ہند مبارک باشد

۱۲۴۳ھ

اس بادشاہ کے دو سکے جاری ہوئے پہلا سکہ یہ ہے

سپہر مرتبہ شاہ جہان سلیمان جاہ	بہ مہر سکہ شاہی زدہ ز لطف الہ

بعد چند روز کے یہ سکہ یون بدلا گیا

سکہ زد بر سیم و زر از فضل حق ظل الٰہ	نائب مہدی نصیر الدین حیدر پادشاہ

اب تک اس سلطنت مین معتمد الدولہ وزیر تھے نقیر محمد خان اور سیدو خان وغیرہم رسالدار مع افسران سوار و پیادہ اس نائب سکے مطیع و فرمان بردار تھے رسالہ فقیر محمد خان مین ایک ہزار آٹھ سو سوار اور رسالہ سیدو خان مین ایک ہزار سات سو سوار تھے اور افسران پیادہ سوای انکے سبحان علیخان قوم کنبوہ سا مشیر تھا بڑا صاحب عقل و نیک تدبیر تھا تاج الدین حسین خان کنبوہ عمدۂ سفارت پر مامور تھا ہر ایک اپنے وقت کا ارسطو تھا لیکن بادشاہ حرکات معتمد الدولہ سے کھٹکتے تھے اسقدر قدرت بخیال برپا ہونے فتنہ و فساد فوج سکے حاصل نہ تھی کہ معتمد الدولہ پر دفعۃً ہاتھ صاف کرین ہر چند ذکی و عاقل تھے بھائی آغا بھائی آغا ہر وقت زبان پر جاری تھا مگر دل مین دشمن خاندان اپنا تصور کرتے تھے ظاہر مین روز بروز صورتین ترقی کی نظر مین آتی تھین ایک دن پچاس ہزار روپے نقد گشت خزانہ سلطانی سے بحکم بادشاہ معتمد الدولہ کو ملا سبحان علیخان نے کہ مرد کنبوہ اور عاقبت اندیش مشیر و سکا تھا مزاج مین بہر حال دخل تھا معتمد الدولہ سے بخیال دور اندیشی یہ بات بیان کی کہ نواب صاحب یہ عنایات شاہی خالی علت سے نہین کچھ دال مین کالا ہے باعث تباہی کی ہوگی خبر شرط ہی

آپ دانا ہین عالم عیاری سے دو سد ہیے کا قریب ہی کہ کوئی گل تازہ کھلے
ایسا نہو کہ ان روپیون کے لینے کے عوض دینے پڑجائین وہ لڑکا
قیامت کا ہی مجکو اوسکا کلام یاد ہی کہ ایکدن کہتا تھا کہ وزیر علیخان سے کچہ
کہتے نہبن پڑا بہت جلدی گرگذرا آغا میر نے فی الجواب اوسکے بکشادہ پیشانی
یہ کہا کہ تم عبارت کا لکھنا خوب جانتے ہو اس مضمون سے خبر نہین ہم
خوب اس مطلب کو سمجہتے ہین پادشاہ کی اگر تدبیر اور چال چل گئی نوبت آئی
حساب کی آوے گی اسکے سدباب مین یہ روپیہ صرف کرونگا جہان
کرورونکا محاسبہ میرے ذمہ ہوگا یہ کون سا گران ہی کہ نہ اوٹھے گا اور
اگر یہ گمان بہ تمہارا ظہور مین نہ آیا در اصل بخوشی عنایات سلطانی سے
سرفراز ہوا ہون شیر مادر ہی فکر بے سود سے دل کو پریشان کرنا بیجا
ہی القصہ پادشاہ اور معتمد الدولہ بظاہر شیر وشکر تھے ایکدن بے تکلف
پادشاہ نے وزیر سے قلفیان برف کی طلب فرمائین اس سخاوت پیشہ سے
پانچ چار حاضر کین مشہور ہی کہ پادشاہ دیجاہ اسکی سرد مہری سے اپنے
دلمین بہت گرم ہوے اور طلب فرمائین ناظرین کیفیت ملاحظہ فرمائین
کہ کیا نشۂ شراب نخوت آنکھون مین جما تھا کہ عوض برف کے یہ حرف
زبان پر آیا کہ اسوقت اور قلفیان تیار نہین ہین واللہ اعلم بالصواب
یہ روایت سنی ہی اب آغا میر کی فراست اور دانائی دیکھیے کہ وہ تدبیر

مناسب فتنہ رفتہ عمل مین لایا کہ رزیڈنٹ لکھنؤ سے ایکر صاحبان سے تک
نہ رسم اتحاد بڑھایا کہ وہ سب نام اسکی محبت کا بھرنے لگے مین مددگار
تھے بہرصورت مطمئن تھا یہ بات ذہن نشین تھی کہ ہم چاہین آج پادشاہ
بنادین آخرکار غرور دولت وتدبیر نے یہ دن دکھایا نصیر الدین حیدر
پادشاہ کہان تک ضبط کرتے اسکے عزل کے درپے ہوئے چونکہ
امور خانگی مین مختار تھے رزیڈنٹ بہادر کو اس بات پر آمادہ کر لیا اور انھوں نے
یہ فرمایا کہ تم معتمد الدولہ کو ہماری کوٹھی مین بھیجدو ہم گرفتار کر دینگے آپ
اس امر مین مبادرت نہ فرمائین کہ شہر مین ناحق کو فساد اوٹھے گا
مختصر یہ تجویز جب قرار پائی نصیر الدین حیدر نے معتمد الدولہ کو ایک دن
دوپہر کے وقت خوشی کوٹھی رزیڈنسی میں بھیجا کہ تمھین بڑے صاحب نے یاد کیا ہے
چونکہ آمد و رفت جاری تھی اور شدنی درپے گرفتاری تھی راز پنہان سے
آگاہ نتھا دانائی کام نہ آئی بڑی شان و تزک سے کئی ہزار سوار و پیادہ
ہمرکاب تھا کوٹھی رزیڈنسی مین پہونچا صاحب کلان حسب سررشتہ رسم
و آئین مقررہ پیش آئے کوٹھی خاص مین جگہ دی فقیر محمد خان وغیرہ حسب قاعدہ
باہر تھے تھوڑی دیر کے بعد کچھ باتین مناسب وقت ادھر اودھر کی کرکے
اس مقام سے باہر آئے معتمد الدولہ وہان بیٹھا تھا کہ دوسرے دروازے
سے دو انگریز ہمکمین گاہ مین کھڑے تھے کہ حسب ضابطہ بر ہنہ

لیے ہوئے مانند عزرائیل کے اوسکے سر پر آپہونچے اور یہ حکم سنایا
کہ آپ بموجب حکم بادشاہ سلیمان جاہ کے قید ہوئے ہتھیار رکھدیجیے
یہ سنتے ہی چہرہ زرد ہوا روح قبض ہوئی بس کیا تھا قید ہوا کہ ایک ساعت
کے بعد صاحب کلان بہادر بھی تشریف لائے اور بہت تشفی اور دلداری
کی کہا کہ نواب صاحب یہ مقام شکر ہے جا نیے اضطراب نہ کیجیے ہمنے آج آپکی
عزت و آبرو بچائی کہ بادشاہ کے پنجۂ قید و قہر سے چھوڑا کر اپنے پاس
رکھا و گرنہ بادشاہ تمھارا دشمن تھا بہت بری طرح پیش آتا اب جو بات کہ
تمکو منظور ہوا ور بہتر سمجھو وہ کہو کہ وہ صورت عمل مین آئے معتمد الدولہ اوسوقت
آنکھون مین آنسو بھر کے اسطرح بولا کہ خیر جو کچھ ہوا وہ ہوا اب اس بات کا
میزان عدالت سے امیدوار ہون کہ شۂ آبرو مین نہ آنے پائے صاحب کلان
بہادر نے بہت اطمینان فرمایا کہ خاطر جمع رکھو ایسا نہوگا اب فیتون کا
حال سنیے جنکو دعوی تھا کہ جہان پسینا نواب صاحب کا گریگا وہان اپنا
خون گرائینگے ہر ایک باہر اپنے مقامون پر بیٹھے تھے کہ یہ حال اونپر
آشکارا ہوا نہایت دست پاچہ ہوے ادہر اودہر بغلین جھانکنے لگے
ساری رفاقت اور بہادری بھول گئے ہراسان اور پریشان اپنی اپنی جان
اور مال کی خیر مناتے تھے یہان تو یہ معاملہ گذرا وہان نصیر الدین حیدر
بادشاہ خوش کہ معتمد الدولہ گرفتار ہو گیا اوسیوقت یہ حکم جاری فرمایا ابھی

متوسلان معتمد الدولہ گرفتار ہون اوسدن شہر مین عجب ہنگامہ برپا تھا
کہ چوبدار سلطانی پہرے لیے ہوے ہر طرف کوچہ و برزن مین تھے
جہان کچھ بھی پتا پاتے تھے کہ یہ شخص آغا میر سے سروکار رکھتا تھا اوسکو
بلا تامل گرفتار کرتے تھے مکان پر چوکی پہرہ بٹھاتے تھے القصہ اوسدن
اس معاملے مین بہت لوگ گرفتار ہوے زیادہ تصریح اسکی بیکار ہے
سارے شہر مین کھلبلی مچ گئی اکثرون کے گھر مین سامان شب عاشور تھا
اب سنیے صاحب کلان بہادر نے معتمد الدولہ کو قید کرکے اجازت دی
کہ سواری فیل اپنے گھر جاے اوسوقت کا عالم کیا بیان کیا جاے دروازہ
بیلی گارد سے آغا میر کے مکان تک ایک ازدحام تھا کچھ افسوس اور کچھ
خوشی صورت قید کی مکان پر یہ تھی کہ ایک کمپنی انگریزی واسطے حفاظت
آبرو کے مامور تھی ہنڈیا وان سے آتی تھی اور ہر ہفتہ مین اوسکی بدلی بھی
ہوا کرتی تھی لیکن قید ہونے کے بعد مہاجن اور بیوپاری وغیرہ کہ جنکا
روپیہ اوسکے ذمے کثیر تھا رات دن دروازہ گھیرے رہتے تھے
اوقات خراب و خوار آغا میر کی اونکے ہاتھون سے تنگ تھی یہ معاملہ
کچھ سرکاری نہ تھا صاحب کلان بہادر نے حکم دیا کہ جلد زر قرضہ کہ لازم الادا
ہی ادا کریے اور ایک انگریز بھی مامور تھا کہ اوسنے میر برشن علی کے
ہاتھون سب کا قرضہ ایک کے چار حسب دلخواہ تنخواہون سے کے دلوانے

بعد عرصے کے آغا میر عزت و آبرو معیت تصدق صاحب کلان بہادر کے
مع زن و بچہ و مال و اسباب لکھنو سے کانپور کو گیا تیس لاکہ روپیہ بابت
ضمانت اور تنخواہ کے جو خزانہ رزیڈنٹی مین جمع تھے اور بہ جملہ املاک کہ لکھنو مین
بنوائی تھی محاسبہ شاہی مین محسوب ہوئی مگر یہ کون بڑی بات ہوئی راوی بیان
کرتے ہین کہ اسباب اور جواہرات وغیرہ کے سوای چالیس پینتالیس
چھکڑے فقط اشرفی اور روپیون کے یہان سے اپنے ساتھ لیگیا
چنانچہ کانپور پہونچتے پہونچتے ایک چھکڑہ اشرفیون کا اعظم علی داروغہ نے
راہ سے گم کیا اور اسیوجہ سے باہم صورت ملال کی پیش آئی خلاصہ
اس تحریر کا یہ ہی کہ باوجود اس خرابی اور بربادی کے آغا میر نے کانپور
جاکر پچیس ہزار روپیہ کا وثیقہ تازہ سرکار انگریزی سے اپنے نام کا جاری
کروایا وہ آج تک اوسکی اولاد کو ملتا ہے اور رستے مکان میدان جو وہی مین
تعمیر کروائے اب یہ روایت سنیے کہ جب آغا میر قید ہوا فیض النسا خانم نے
اور میر فضل علی جو فرخ آباد مین نکالے ہوئے تھے خفیہ پھر اس شہر مین
آئے اور بواسطہ بادشاہ بیگم کے میر فضل علی نے وزارت پائی اور
اعتماد الدولہ خطاب ہوا منتظم الدولہ اور مرزا حاجی بھی بامید وزارت کانپور
سے شہر لکھنو مین آئے تھے لیکن منتظم الدولہ اور اعتماد الدولہ مین موافقت
نہوئی مایوس پھر گئے لیکن مرزا حاجی رفاقت منتظم الدولہ سے کنارہ

کر کے رفیق اعتماد الدولہ کے بنے پر لکھنؤ کا رہنا غنیمت جانتے تھے

اعتماد الدولہ مدار المہام تھے اس درمیان مین رتبہ اقبال الدولہ کپتان کے

سبب سے کا زیادہ ہوا عہدہ جرنیلی کا پایا کاروبار سلطنت مین بھی دخل کامل ہوا

طبیعت بادشاہ کی اعتماد الدولہ کیطرف سے پھر گئی لوگون سنے یہ

ذہن نشین کردیا کہ یہ شخص معتمد الدولہ سے در پردہ ساز رکھتا ہی معزول تو

کیا لیکن ایسا مضیق مین ڈالا کہ وہ خود خانہ نشین ہوا اور تھوڑے عرصے

مین چار ہو کر دنیا سے گذرا اور لاش اوسکی کربلای خدا بخش مین دفن

ہوئی یہ بادشاہ جمجاہ بڑا ہی صاحب حشم و دریا دل تھا سخاوت مین بی نظیر ہوا

چار روپیہ کا نوکر تک اس عہد سلطنت مین امیر ہوگیا مہینون تنخواہ نہین

پاتے تھے لیکن سب طرح فارغ البال تھے اپنے محلون کو اس بادشاہ

سنے بڑے بڑے مرتبے اور رتبے بخشے وثیقہ اور مشاہرہ مقرر کیا

نواب ملکہ زمانیان — مخدرہ علیا — تاج محل — سلطان عالیہ [illegible]

بادشاہ محل —
بیگم [illegible]

اس بادشاہ کے زمانے مین محلات مین قدسیہ محل کا اقتدار

بہت تھا اور اس محل سنے بڑی سخاوت کی اور کروڑون روپیہ کا صرف

کیا سارا شہر اب تک اس محل کی سخاوت کا قائل مگر وہ بھی کسی

وجہ سے آخر کو ہیرا کھا کر قضا کر گئین۔

اس زمانے مین منتظم الدولہ حکیم مہدی علیخان کانپور سے بلا کر عہدۂ وزارت پر سرفراز ہوئے تھے نظم و نسق ملک سب دنگے تعلق قدر و منزلت کمال پیش نظر تھی حضور خطاب دیا یہ شخص منتظم اور معاملات مالی مین اپنا ثانی نرکھتا تھا اور اسکی بہت سے لوگ دشمن تھے خصوص قدیمی خائن و بے ایمان اس شخص سے جلتے تھے یہ نائب منتظم اور کفایت شعار تھا خوب ہی انصرام خدمت نیابت کیا اور اسی عہد مین حضرات کنبوہ بھی بڑے معززاور صاحب اقتدار تھے تاج الدین حسین کی لیاقت و معاملت مشہور ہی لیکن تاج الدین حسین اسی فکر مین رہتا تھا کہ حکیم مہدیعلیخان منتظم الدولہ کو اس عہدۂ وزارت سے گرادے چنانچہ پادشاہ بیگم سے ملکہ پادشاہ کی خاطر مین حکیم صاحب کیطرف سے شک ڈالا اور آخر کار وہ معتوب و معزول ہوئے جسکی تاریخ معزولی شیخ امام بخش ناسخ سے یہ ہے ؎

قطعۂ تاریخ

افتاد حکیم از مراتب	تاریخ بطرز نو رقم کن
از جای حکیم ہشت بر گیر	ستہ مرتبہ نصف نصف کم کن

رعزل اسکا باعث برہمی مزاج صاحب رزیڈنٹ ہوا اخلاف مابین انکے
بات ظہور مین آئی تھی کچھ کچھ کدورت سنے دلمین گھر کیا چونکہ بادشاہ
ہم اور عقیل کمال تھا بڑہنے ندیا لیکن بادشاہ بیگم اور داروغہ حسین علیخان
درامانی بیگم کی صلاح سے روشن الدولہ محمد حسین خان فرزند نواب
ہرف علیخان سنے خلعت وزارت پایا یہ وزیر بھی سخی تھا اکثر عمارات
ی اپنی وزارت مین تعمیر کرائین اب تک کوٹھی روشن الدولہ کی
روف بہ قیصر پسند مشہور ہی تاریخ بنیاد یہ ہے
کیا رشک ارم ہے کوٹھی
ں سلطنت مین راجہ درشن سنگہ راجہ بختاور سنگہ بڑے
ی عزت و ذی اختیار تھے جنکی یادگار اسوقت مہاراجہ مانسنگہ
ادرہین وعلی ہذا راجہ درشن سنگہ غالب جنگ قوم کورمی جسکا بیٹا
جہ جی لال سنگہ بغاوت کے جرم مین بمقام لکھنو پھانسی دیا گیا
اصاحب اختیار تھا اکثر عمارت شاہی زیر اہتمام راجہ بختاور سنگہ
ہوئین نواب سعادت علیخان سنے جو روپیہ جمع کیا تھا اور بعد
ت غازی الدین حیدر بادشاہ کے باقی رہ گیا وہ مع آمدنی ملک کے
ہ نشینی جو کچھ روپیہ رکابی ملا وہ سب اس بادشاہ سنے صرف کیا
ی سخاوت سنے خیرات وہمت عالی کروفر کی بو دماغ مین سمائی تھی

مزاج نہایت برق تھا آخر مین بعض بعض نمک حراموں کی سازش
سے بادشاہ بیگم اور بادشاہ مین ملال ہوا اور نوبت بفساد بھی پہنچی
اسلیے بادشاہ بیگم نے منا جانکو لیکر الماس باغ مین اقامت اختیار کی
تخم عناد کا دلون مین پڑگیا روز بروز ترقی رہی کئی ہزار آدمی جنگاخ
بادشاہ بیگم نے نوکر رکھے نگاہداشت جاری کی اس بات پر بادشاہ نے
اور بھی منا جان کے فرزند ہونے سے انکار محض کیا اور آیندہ بالغیب عند اللہ
اشتہار دیا کہ وہ فرزند میرا نہین ہی اور انواع انواع کے معاملے پیش
آئے کہ اوسی زمانے مین بادشاہ نے بھی فرح بخش چتر منزل چھوڑ کر
دلکشا مین رہنا اختیار کیا اسکے بعد بادشاہ نے اپنی عمر عیش و نشاط
مین بسر کی کوئی دشمن اندرونی و بیرونی بر سر عداوت نرہا صاحبان انگریز بھی
اس بادشاہ سے موافق رہے عیاش و شکار دوست بشدت تھا اگرچہ بحد
نازک مزاج تھا لیکن سخی و قدردان تھا اندوختہ سابق کروڑون روپیہ صرف مین
لایا اسکے عہد سلطنت مین خاص صنعتین یہ تھین کہ اہل تجارت کو رفاہ ہوا آمدنی
بھی نہین گھٹی ملک بھی آباد رہا رعب سلطنت و اب سیاست بھی بہت تھا و
اچھے اچھے شعرا اس زمانے مین تھے اپنے مذہب امامیہ کا بہت پابند تھا بلکہ
اونھین کے عہد دولت سے اس مذہب نے لکھنؤ مین ترقی پکڑی نائب اول یہی حکیم مہدی
ہی کئی مرتبہ عہدہ وزارت سے سرفراز اور معزول ہوا بعد اسکے زمانہ روشن الدولہ کا تو

قریب تھا اسی بادشاہ کے عہد مین کوٹھی بادشاہی تعمیر ہوئی اور
بھی اچھی اور عمدہ عمدہ تعمیرات طیار ہوئین اوپر صاحب رزیڈنٹ سے
دوستی رہی گومتی کے کنارے بکثرت مکانات تعمیر ہوئے
وقت مین اکثر اوس سلطنت کے کارپرداز اور دیکھنے والے موجود
ین اور بہت کچھ بالتفصیل ہمکو معلوم ہی لیکن اختصار مین گنجایش تفصیل
ن آخر مین بیگمات مین نے اس شاہ جم جاہ کے ساتھ دغا کی زہر دلوادیا اور یہ
بھی زبان زد خلائق ہی کہ دھنیا مہری نے زہر دیا اور بعضے کو یہ عقل رای
ذہن کیے بعض حرکات ایسکی ناپسند یہ صاحب رزیڈنٹ کو ہوئین اسواسطے اسکے
الئے مین مشہور ہوا العلیم عند اللہ ۲۰ ربیع الثانی ۱۲۵۳ ہجری مطابق ۱۸۴۷ء
کے دن ۴۵ برس کے سن مین وفات پائی اپنی کربلا مین کہ اوسنے
ایک گومتی کے تعمیر کی تھی دفن ہوئے خلد منزل لقب مشہور ہے
ت سلطنت ۱ برس ۵ یوم تاریخ وفات یہ ہی
ت شاہ جہان سلیمان جاہ سوی جنت زبارگاہ اودہ
تفے گفت از سر افسوس بارم رفت پادشاہ اودہ
۱۲۵۳ھ
ل جان لو صاحب بہادر رزیڈنٹ تھے معتمد الدولہ اعتماد الدولہ
الملک سید فضل علیخان بہادر سیادت جنگ روشن الدولہ نیر الملک
بین خان بہادر قائم جنگ رکن رکین خلافت جہانداری عضد سلطنت

وشہریاری متیم جنگ مدار المہام وزیر الملک منتظم الدولہ مہدی علیخان بہادر

جلادت جنگ اقبال الدولہ بہادر پسر ظفر الدولہ بہادر منظم الملک کپتان

فتح علیخان ہیبت جنگ منشی الملوک فخر الدولہ دبیر الملک مہاراجہ

رتن سنگہ بہادر ہوشیار جنگ متخلص بزخمی ظہیر الدولہ صلح الملک

غلام یحیی خان متیم جنگ منیر الدولہ بہادر بعد اسکے شرف الدولہ مظفر الملک

محمد ابراہیم خان بہادر مستقیم جنگ بعد اسکے رکن رکین خلافت جہاندار

اعتضاد سلطنت شہریاری امیر الامرا مدار المہام وزیر الممالک یمین الدولہ سپہ سالار

رستم ہند نواب امین الدولہ عمدۃ الملک امداد حسین خان بہادر ذوالفقار جنگ

یہ سب مدار المہام اور کارپرداز سلطنت تھے —

بیان حال ریاست رفیع الدین حیدر محمد مہدی افریدون بخت بہادر عرف منا جان

صاحب رزیڈنٹ خبر وفات کی پاتے ہی بارگاہ پادشاہ مین تشریف

لائے بنظر تقدم بالحفظ پہلے ہزار سپاہی مع توپون کے واسطے

حفاظت خزانہ وغیرہ کے مامور کیے اور ممانعت آمد و رفت دوست و

دشمن کی عمل مین آئی بعد اسکے محل مین جہان نصیر الدین حیدر بادشاہ

جان بلب تھے گئے دیکھا کہ حضرت نے حسرت سے آہ سرد کھینچکر

جان بحق تسلیم کی اسوقت ہاتہ کی فصد بھی کھولی گئی مگر افاقہ نہین کیا باقی تھا

اب سنیے جب کرنیل جان لو صاحب بہادر کو یقین کامل ہوا کہ نصیر الدین حیدر
ناگاہ دنیا سے گذر گئے ایک کاغذ دست آویز کا مشتمل اس مضمون سے
کہ جو کچھ نواب گورنر جنرل بہادر ارشاد فرمائین گے ہم عہدنامہ جدید پر
دستخط کر دینگے پاس نصیر الدولہ کے بھیجا مزین بدستخط منظوری
ہو کر آگیا ابھی یہ گفتگو کرسی نشین مطلب ہوئی تھی کہ بادشاہ بیگم مع مناجان
کے کہ بفاصلہ چار میل بارگاہ سلطانی سے الماس باغ مین تھین باوجود
ممانعت رزیڈنٹ بہادر کے با فوج کثیر بعد گذرنے تین پہر رات کے
دولت پر آپہونچین کرنیل جان لو صاحب بہادر کہ مہیا کرنے سامان
جلوس مین سرگرم تھے یہ خبر سنتے ہی سخت متحیر ہوئے اور کپتان جمس پاٹن
کو اجازت دی کہ محافظان دروازہ بیرونی کو حکم محکم دو کہ کوئی یہان بدون
اجازت نہ آنے پائے اور روشن الدولہ بہادر سے تاکید فرمائی کہ تم
در باب مقابلہ بادشاہ بیگم کا کرو اور لفٹنٹ مکیسر صاحب کو یہ فرمایا کہ تم جلد
سپاہ انگریزی منڈیاؤن سے لاؤ کپتان جمس پاٹن صاحب بہادر حسب الحکم
دروازے پر آئے اور گفتگوے ملایم مقابل سے نمایش کرنے لگے
یہ حرکت تمھاری باعث بربادی مطلب ہوگی یہ کب سنتے تھے ہا کے
ہودون پر سوار تھے بزور فیل دروازہ توڑ کر مکان سلطانی مین اپنے
لی طرح در آئے ہا کہ کپتان جمس صاحب اس چپقلش مین مجروح بھی ہوئے مگر

بتیغ زبان وہ بھی کام کرتے رہے گفتگو سے نہ باز آئے کہ دیکھو انجام اس
آجار کا بہت برا پیش آئیگا بہرکیف یہ تو گرفتار ہوئے سپاہی بادشاہ بیگم
کے یک قلم شمشیرین کھینچے ہوئے اور توڑے بندوقون کے شیر اندرون
حجرے کے پہونچے کرنیل جان لو صاحب کو اپنے قبضے مین کیا اور
نصیر الدولہ اور امجد علیخان انکا فرزند اور عظیم اللہ خان اور رفیق الدولہ
اور روشن الدولہ وغیرہ ایک مکان مین نظربند تھے اور یہ لوگ ایوان شاہی مین
ہر جانب پھرتے تھے اور ہتیارون کو بدلتے تھے قریب دو ہزار آدمی
کے تھے اس شور وغل سے بادشاہ بیگم نے مناجان کو لاکر تخت سلطنت پر
بٹھادیا اب ہر طرف ناچ رنگ کا ہنگامہ شروع ہوگیا سلامی توپون کی
حسب قاعدہ ظہور مین آئی اوس جگہ مشعلین بیشمار روشن تھین کشمکش
حد سے زیادہ تھی کرنیل جان لو صاحب بہادر پر ایک یورش کا ہنگامہ
نازل تھا یہ کہتے تھے کہ تم حسب آئین وضابطہ کے اپنی زبان سے
مناجان کی سلطنت کا اقرار کرو مگر انکی زبان سے کب یہ کلمہ نکلتا تھا
ہرگز نہ کہا خداوند کریم نے اوسوقت صاحب بہادر کے حال پر رحم فرمایا
کہ اور لوگون نے آکر حسب الحکم بادشاہ بیگم کے اس گروہ کے پنجہ سے نجات
دلوائی اور سب مقید رہے اب جان لو صاحب بہادر جو اونکے ہاتھو سے
حاضر ہوئے بادشاہ بیگم سے سوال و جواب شروع ہوا کہنے صاحب بہادر کے

یہ سمجھے کہ اگر سر مو ہمارے کہنے سے انکار کروگی تو انجام نہایت برا بن دیکھوگی اپنے ہاتھون آپ گرفتار غضب ہو یہ باتین تھین کہ فوج انگریزی طلب فرمودہ صاحب ممدوح کی منڈیاؤن سے آپہونچی ہنگامہ حرب وضرب گرم ہوا میگنس صاحب کہ سرکارشاہی کا ملازم تھا اسکے رسالے کی توپین واسطے سلامی ہمارکبادکے آئی تھین برعکس پیش آئین بوچھار چھرون کی لال بارہ دری پر پڑنی شروع ہوئی ۔ ۴۰ آدمی بادشاہ بیگم کیطرف کے مجروح اور مارے گئے اور تین سپاہی انگریزی زخمی ہوئے ظہیرالدولہ غلام یحیی خان نے کہ اون دنون مین مقید تھے کیا جرات کی کہ اس معرکے مین کوٹھی فرح بخش کی پشت پر سے لب دریا کود پڑے یا دن مین جو بہا آئی کشتی مین جا چھپے بادشاہ بیگم مع مناجان کہ ۱۴ برس کا سن اسوقت مین تھا مع امام بخش کا زندہ کے گرفتار ہوئین جو ذلت کہ انکے پیش آئی زبان پر لانے مین غیرت اور شرم آتی ہی آخرکار چلی گار مین اگر مخافظت تمام مقید ہو مین جسقدر اس بادشاہ نصیرالدین حیدر کے جوان مرنے اور حسرت سے جان دینے کا بعد افسوس چرچا ہی اوسیقدر مناجان کی بدنصیبی کا اور بادشاہ بیگم کی کم قسمتی کا بیان زبان خلائق پر ہی یعنی یہ فرزند بادشاہ کا بخطاب نجم الدین حیدر محمد مہدی مرزا فریدون بخت بہادر جو خاص شاہزادہ ہوتا ہی معروف تھا اور حیات بادشاہ کے بے شفقت مراتب اور بیانات

محمد علی شاہ





رہتا تھا اسوجہ اس بات سے کہ پادشاہ کو انسے ملال کمال حاصل تھا پادشاہ بیگم
کے ساتھہ تھا وہ پرورش کرتی تھین پادشاہ نے طیش مین آکر
مغضوب اور عاق کرکے باجرای اشتہار فرزندی سے خارج کردیا اوسکی
سلطنت کے حق مین یہ وجہ سرکار کو چشم پوشی کی ہوئی یہ انقلاب بہت
بڑا ہوا فقط

بیان حال ریاست نصیر الدولہ محمد علی شاہ پادشاہ

ابو الفتح معین الدین سلطان زمان نوشیروان عادل محمد علی شاہ پادشاہ بیگم یعنی حقیقی
پاشاہ مغفور یعنی فرزند نواب سعادت علیخان جنت آرامگاہ کو صاحب کلان بہادر
نے بعد دستخط کاغذ مذکورہ کے نظر بندی سے نکال کر تشفی تمام اپنے
پاس بھیجایا اور حکم دیا کہ وہ مکان تخت گاہ شاہی جلد صاف و آراستہ ہو
معاً کارپردازان نے لاشین تو دریا مین پھینک دین اور مہجورون کو وہانسے
دور کرکے ایوان شاہی کو پاک کیا ۵ ہ ربیع الثانی ۱۲۵۳ ہجری کو پہر دن
چڑھے صاحب کلان بہادر نے روبرو افسران فوج کے محمد علی شاہ کو
۶۰ برس کے سن مین تخت نشین سلطنت فرمایا اور تاج شاہی حسب آئین
سر پر رکھکر پادشاہ اودہ اپنی زبان سے کہا توپین مبارکبادی کی حسب ضابطہ
سر ہوئین نذرین گذرین خلعت ہوئے خاص و عام کو طمانیت حاصل ہوئی
تاریخ تخت نشینی یہ ہے

شہ عرش تمکین ملک اقتدار چو گردید پشت و پناہ ...
سروش از سر دولت آواز داد محمد علی گشتہ پیشاہ ...
۱۲۵۳ھ
اور سکہ بھی اس بادشاہ کا تاریخی ہی
بجود و کرم سکہ زد در جہان محمد علے بادشاہ ...
۱۲۵۳ھ
جس وقت دربار برخاست ہوا محمد علی بادشاہ کرنیل جان لو صاحب بہ...
خلوت مین لائے اور فرمایا کہ رہنا بادشاہ بیگم کا شہر لکھنو مین مناسب...
نہین ہے کسواسطے کہ یہ عورت بڑی فتنہ انگیز ہی ہر دم اسکی ...
فساد تازہ ایجاد ہوگا صاحب بہادر نے کہنا اونکا قبول کیا ۱۲ تاریخ...
آدھی رات کے وقت بحراست سوار و پیادہ ہای انگریزی کانپور ر...
ہوئین وہان ایک مکان مین بکمال حفاظت نظر بند ہین اور وہان ...
قلعہ چنار گدہ مین پونہچین دو ہزار چار سو روپے ماہانہ واسطے صرف کے خزانہ بادشاہ...
۱۲ محرم سنہ ۱۲۶۲ ہجری مطابق سنہ ۱۸۴۶ ع کو مناجان نے انتقال کیا
وہین دفن ہوئے (زہے حق رفت) تاریخ وفات کی ہی دو ... کو ...
چھوڑ گئے ۳ صفر سنہ ۱۲۶۳ ہجری پنجشنبہ کے دن بادشاہ بیگم نے اس
جہان فانی سے کوچ کیا (آن قضا کرد آہ) تاریخ وفات ہی
اس بادشاہ نے خوب سر انجام جز و کل امور سلطنت کا کیا اسوجہ سے کہ
تربیت یافتہ نواب سعادت علیخان کے تھے سن اور کار آزمودہ تھے

برادرپروری اور رفقا نوازی سے رونق پائی انتظام فراست ملک کا بھی بحسن الوجوہ
ظہور مین آیا آمدنی کا بھی انتظام ہوا زر کثیر اپنے عہد سلطنت مین جمع کیا
اور باوجود ضعف پیری اور کثرت امراض کے ہر جزو کل کار سلطنت کا خود
کرتے تھے اس بادشاہ کے وقت مین صورت برہمی کار سلطنت مبدل
بخوش اسلوبی ہوئی لیکن باوجود اس بیدار مغزی کے نمک حرامون نے
وہ کام کیا کہ باہم متفق ہو کر تنخواہ رسالون اور پلٹنون کی دو دو اور تین تین
جگہ وصول کی اوسی رسالہ و پلٹن کی تنخواہ جمع خرچ سلطانپور مین مندرج اوسی رسالے
پلٹن کی تنخواہ کاغذ خیرآباد مین اور اوسی کی تنخواہ علاقہ گونڈہ و بہرایچ مین
اور اوسی کی تنخواہ بخشیگری لکھنؤ مین پڑتی تھی لاکھون کا تغلب ہوتا تھا
ہیچ ہیچ جب کارپردازی یہ کام کرین بادشاہ کیا کرے خلاصہ یہ کہ بادشاہ
بہت نیک نیت تھا کسی کام خیر کے انتظام مین بند تھا لاکھون روپے
درگاہ حضرت عباس کی ترمیم مین صرف کیے اور درستی نہر اور روضہ
حضرت کی طیاری مین خرچ کیے اور ہزار روپیہ مہینا اون ہندی لوگون
کے واسطے مقرر کیا کہ جو کربلا مین زیارت کو جاتے ہین اور متوسلون کو
بواسطہ صدریہ وثیقہ بطور وظیفہ مقرر کیا

صاحبان عالی محل نواب ملکہ جہان مخدرۂ زمانہ — شہزادے اور اون کے محل
سلطان آرا بیگم
بڑے اسم ... — چھوٹے اسم ...

شرف الدولہ محمد ابراہیم خان ـــــــ عظیم اللہ خان ـــــــ

۱۱۱۲ء ـــ ۱۱۳۰ء ـــ اسی چار

شہزادیان ـــــــ متفرقات ـــــــ

اسے ـــ ۶۲ء ـــ ملے

ایضاً نوٹ واسطے امام باڑہ حسین آباد ـــــــ

مدے ـــ

اور بہت سا زر وزیورا اور مکانات اپنے عزیزون کو تقسیم کیے یعنی ہرایک کو صاحب مال اور اہل دل کردیا محتاج دوسرے کا نرکھا کرم پروری انکی مشہور ہی کمینون سے کمال نفرت تھی روش امدا کو نیا بہت نصیب نہوئی اسی تمنامین مر گئے کیا وجہ کہ سبحان علیخان دوست انکے کارپرداز تھے منتظم الدولہ کو فرخ آباد سے بلاکر اپنا وزیر بنایا اور منور الدولہ کو اونکی جرنیلی دی صاحبان صدر انکی روش نیک سے بہت راضی اور محظوظ تھے ہر خواہش صدر مین مقبول ہوتی تھی عمارت حسین آباد وغیرہ جو کچھ تعمیر کروائی عمدہ یادگار ہی فصل مکان مین مفصل بیان ہوگا مگر موت نے پنچھوڑا تپ محرق سے ۶۸ برس کے عمر مین کام تمام کیا ۵ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ ہجری روز سہ شنبہ کو وقت رات کے انتقال فرمایا اور حسین آباد مین دفن ہوے فردوس منزل کہلائے ـــ

امجد علی شاہ



جنرل جان لو صاحب بہادر اور کرنیل کالفیلڈ صاحب بہادر رزیڈنٹ تھے
نائب روشن الدولہ اور منتظم الدولہ اور ظہیر الدولہ اور منور الدولہ اور پیشدست
شرف الدولہ محمد ابراہیم خان اور انکے عہد مین فوج ۳۲ ہزار پیادہ اور
تین ہزار سات سو سوار اور ملک کی آمدنی ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ
کی تھی تاریخ وفات رفت شاہ اودہ بملک قدس ۱۲۵۸ھ
لیکن کبرسنی کی وجہ سے حواس مین خلل تھا سارے کاروبار صاحب رزیڈنٹ
کے مشورے سے طی ہوتے تھے اور انکی سلطنت مین کوئی بات
جدید نہین ہوئی۔

بیان حال ریاست امجد علی بادشاہ

ابو المظفر مصلح الدین ثریا جاہ سلطان عادل خاقان زمان محمد امجد علی بادشاہ
۳۴ برس ۶ مہینے ۲۰ دن کے تھے ۵۔ ربیع الثانی ۱۲۵۸ ہجری منگل کے
دن تخت نشین ہوئے رسمین معمولی عمل مین آئین تاریخ جلوس کی رحجب
الفت رای بخشی سنے کہی۔

شاہ فلک مرتبہ امجد علی	مہر سما شرف انجم سپاہ
داد وہ عدل چو نوشیروان	ثانی دارا و سکندر بجاہ
ناسر دین دافع کفر و ظلام	داد رس عالم و ظل الہ
پنجم از ماہ ربیع دوم	ساعت فرخندہ بوقت پگاہ

ساختہ بر تخت خلافت جلوس | از مدد سبط رسالت پناہ
ساختہ الفت پی تاریخ فکر | تا بود ش بار دران بارگاہ
مصرعہ برجستہ ز ہاتف شنید | تاج و اورنگ مبارک بشاہ
۱۲۵۸ھ

اور سکہ اس پادشاہ کا یہ جاری تھا

زد بجہان زر سکہ شاہی بتائید الٰہ | ظل حق امجد علی شاہ زمین عالم پناہ

یہ پادشاہ کمال دیندار خداپرست اپنے مذہب کی ترقی بہت مدنظر تھی عدالت کا کام سلطان العلما اور سید العلما کو سونپا اور انکے عہد مین سلطان العلما کا کمال دور دورہ تھا اہل ہنود اور سنت جماعت کے عروج پر حسد کرتے تھے کتنے ہندو مسلمان اور کتنے سنی شیعہ ہوگئے بازار اس امر کا گرم رہا زر زکوۃ شاہی ہر برس سلطان العلما کو سرکار شاہی سے ملتا تھا وہ اپنی راے پر جسکو چاہتے تھے تقسیم کرتے تھے مخنث یعنی ہجڑے نکار نگرین اور جہان جہان اس شہر مین بستے تھے انکے حکم سے نکالے گئے انکے قتال کے بعد بیچارے خانمان برباد آباد ہوئے اور مدرسہ شاہی کی بنیاد ڈالی وعدہ جناب کی سال انکی سلطنت مین ہوئی پل آہنی بنوایا شرف الدولہ کہ عہد ولیعہدی مین نظرون سے گرے تھے انکو بعد تین مہینے کے عہدہ وزارت سے موقوف کیا اور امین الدولہ امداد حسین خان کو خلعت نیابت دیا اور منشی سے کے عہدے پر اکبر علی خان نواب امیر الدولہ

بیٹے کو مامور کیا اور دیوانی مشیر الدولہ بہادر کی چلی آتی تھی وہی بدستور
اور سید عنایت علیخان معین الدولہ جو پادشاہ کے ماموں تھے انکو
کی نظامت اور امور سلطنت کے مشورے کیلئے مقرر کیا بعد وفات
علیخان قطب الدین حسن خان کو پیشدستی وزارت کی ملی اور بعد انکے
امین الدولہ کو یہ عہدہ نصیب ہوا لیکن امین الدولہ اور معین الدولہ میں بصورت
موافقت کی ظہور میں آئی لوگون نے بادشاہ کا دل امین الدولہ کی
طرف سے باتون مین پھیر دیا کہ مدت سے یہ دن دکھایا کہ امین الدولہ
بیزار ہوکر مستعفی ہوئے اور گھر بیٹھے مگر معین الدولہ کو عہدہ وزارت
نصیب ہوا منور الدولہ بہادر کانپور میں تھے بلا آئے خلعت وزارت کا
بلو دیا گیا کئی مہینے معین الدولہ کاروبار سلطنت میں مصروف رہے
چاہ کندہ را چاہ در پیش یہ بھی بادشاہ کی نظروں سے گرے و لمین
آیا یہ بھی گھر بیٹھے اب منور الدولہ تنہا کاروبار سلطنت کا کرتے رہے
لہ آرام طلب تھے محنتیں رات دن کی گوارا نہ ہوئین عہدے سے
معزول ہوئے پھر امین الدولہ بہادر اپنے عہدۂ وزارت پر بدستور
قائم ہوئے نواب حامد علیخان اعتماد الدولہ کے خویش کو سررشتہ
پیشدستی کا ہوا اسکے بعد سعید الدولہ علی محمد خان فرزند میر بندہ علی کے
پیشدست ہوئے سعید الدولہ عجب مرد چالاک تھا ایکدن جلسۂ بار مین

جملہ کلاہی تعلقداران و زمینداران کو طلب کر کے بہت بجوئی اور استمالت
بیان کی کہ جس کسی کو ضرورت روپیہ کی بصیغہ تقاوی وغیرہ درپیش ہو وہ
وہ معروضے اپنے مہری تحصیلی مچلکے لکھدین اور مفت خورونکا لیا تھا
حسب لیاقت اپنی اکثرون نے دفعۃً استین لکھکر حوالہ کین اس شخص کی ہمت [illegible]
دیکھا چاہیے کہ وہ سب کاغذ دربار شاہی مین پیش کرکے زر کثیر
حاصل کیا اور اپنے تصرف مین لایا یہ بیچارے سب روپیہ سے محروم
رہے یہ مکان اللہ کیا محل عالیشان تھا کہ ہزارون محتاج نواب بن گئے
کوٹھی بابی ڈھاری وغیرہ راجہ اور دولہ اور بہادر ہوگئے سچ ہے یہ شہر لکھنؤ
چراغ شبستان ہند کا تھا اور جو سامان امارت یہان اس آخری وقت مین تھا
وہ کسی ریاست مین نہوگا ایک بیان بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۲۵۰ ہجری مین
انھین کے عہد سلطنت مین نواب صمصام الدولہ بہادر فرخ آباد کے
نواب لکھنؤ مین واسطے ملاقات بادشاہ ممدوح کے آئے تھے جن بہ تمکین
جو کہ نہایت عمدہ اور باغ پر فضا تھا اور جو حسب الحکم شاہی فروکش ہوئے
بلکہ وہ باغ خاص اسی واسطے مقرر تھا کہ جب کسی والی امیر جلیل القدر کی خاندان
شاہی مین سے کسی شادی ہوتی تھی اسکو یہ باغ عنایت ہوتا تھا چنانچہ
شادی مرزا نصیر الدین حیدر بادشاہ کی اور مرزا عالیجاہ اور مرزا والا جاہ
پسران وزیر الدولہ مرزا حیدر بادشاہ کی بھی اسی مین سرانجام پذیر ہوئی تھی

شرایط عمائد کو عنایت ہوتا تھا اور ریس تا زندہ بار دیمی اوسمین اوتارا
نا تھا چنانچہ کارن صاحب بہادر سوداگر جاگیر دار کو ٹیا کاس گنج سے کے یہی
زمانہ نصیر الدین حیدر مین نامدو شہر ہوئے اونکو بھی بسبب اعزاز و اقتدار
کے بذریعہ پرچہ پام یمجرجان لیصاحب بہادر کے یہ باغ عنایت ہوا تھا
اسی باغ مین صاحب موصوف نے لاکھہ روپی صرف کر کے محرم مین
تعزیہ داری بڑی دھوم سے کی تھی وجہ اس تعزیہ داری کی یہ ہی کہ انکی
بی بی مسلمان تھی اونکو کمال چاہتے تھے لہذا یہ خرچ گوارا کیا تھا
اور وہ بی بی بنت مرزا سلیمان شکوہ بہادر پسر محمد شاہ بادشاہ کی تھی اور
سبب اس بی بی کا انکے پاس آنے کا یہ ہوا کہ مرزا سلیمان شکوہ شاہزادہ دہلی
تھے زمانہ بادشاہ غازی الدین حیدر خلد مکان مین یہان تشریف لائے
تھے بادشاہ نے کمال اونکا اعزاز کیا اور مکان رہنے کو اونکے واسطے
متصل ملی گارد تا نکیہ جمع سرشرک لب دریا کئی لاکہ روپیہ صرف کر کے
بنوا دیا تھا دس ہزار روپیہ ماہواری اور دو ہزار روپیہ میوہ خوری کے لیے
مقرر کر دیا تھا بعد دلجوئی اور خاطر داری کے اپنے فرزند ولیعہد نصیر الدین حیدر
کی شادی کا اونکی لڑکی کے ساتھ پیغام دیا چنانچہ بعد شرائط مرزا سلیمان شکوہ
نے وہ شادی منظور کی چنانچہ بڑی بیٹی سلیمان شکوہ کی عقد نصیر الدین حیدر
مین آئی اس شادی ہونے سے غازی الدین حیدر بادشاہ نے

پچیس لاکھ روپیہ کے نقد و جنس سے اوسکے ساتھ سلوک کیا تھا بعد
چندروز کے نواب معتمد الدولہ وزیر بادشاہ نے دوسری بیٹی کے واسطے
اپنے فرزند کے ساتھ پیام شادی کا دیا مرزا سلیمان شکوہ بسبب طمع دولت
کے راضی ہو گئے شادی قرار پا گئی یہ خبر بادشاہ غازی الدین حیدر کو پہونچ
آگ ہو گئے اور دونوں سے اسقدر آزردہ ہوئے کہ جسکی شرح حد سے باہر
ہی یہانتک کہ مرزا سلیمان شکوہ کو اوسی دن شہر سے نکال دیا اور مکان
بھی اونکا کھدوا ڈالا بار بار یہ فرماتے تھے کہ ہم اس شاہزادے کو لائق
ایسا سمجھتے تھے کہ محکو بیٹی دیکر میرے نوکر کو اپنی بیٹی دیگے
سلیمان شکوہ جو یہاں سے نکالے گئے قریب شاہجہان آباد کے پہونچے
اوس زمانے مین اکبر شاہ ثانی کا دور تھا اونھون نے جو یہ حال سنا
حکم دیا کہ ایسے شخص کا یہان آنا مناسب نہین چنانچہ سلیمان شکوہ وہان سے
پھر کر کوڑیا کاس گنج مین آئے طرح اقامت کی ڈالی گارن صاحب موصوف
نہایت دولتمند تھے اسکے دام طمع مین آکر شاہزادہ موصوف نے نوش
اوس لڑکی کی اوس صاحب کے ساتھ کر دی اس عرصے مین غازی الدین
بادشاہ نے قضا کی اور سلیمان شکوہ نے وفات پائی یہان نصیر الدین
بادشاہ کو بھی اوس بی بی کے یہان آنے کی کمال تمنا تھی بذریعہ

سنہ [illegible] ہجری کو مع اوس بی بی کے لکھنؤ میں تشریف لائے تھے اور [illegible]
حسن باغ میں وارد ہوے اور تعزیہ داری کی التماس اوس باغ میں مع [illegible] سامان
رونق افروز ہوئے اور دوسرے دن بادشاہ کی ملاقات کو گئے بطریق
تحفہ ایک تھالی جوڑہ مع انجورہ سنگ یشب کے مع کار مطلا بہت عمدہ
و بہتر سے گئے تھے اور اپنے نزدیک اوسکو نایاب جانتے تھے
بادشاہ کو دیا بادشاہ نے بھی بپاس خاطر اونکے بہت خوش اور محظوظ ہو کر
اوسکو قبول کیا اور تعریفیں بہت زبان مبارک پر آئیں یہان دستور تھا
کہ جس کسی سے بادشاہ ملاقات کرتے تھے روز اول باہم رسم تحفہ دہی
ادا ہوتے تھے عطردان اور کشتی وغیرہ موافق رسم کے دی جاتی تھین
دوسرے روز سامان دعوت کا ہوتا تھا اسمین خواہ انگریز ہو خواہ ہندوستانی
چنانچہ نواب مسبوق الذکر کی تین دعوتین قرار پائین اور دوسرے ہی
دن سے مقرر ہوئین اور یہان کی شان و شوکت اور انداز دعوت جیسا ہی
بڑے کھانے کا یہ تھا کہ ایک عالیشان مکان میں کہ وہ سب طرح عجیبہ آلات وغیرہ
سے آراستہ ہوتا تھا اوسمین تیس گز کا لانبا اور بارہ گز کا چوڑا میز بچھتا
تھا اور اسکے گرد ایک سو پندرہ کرسیان بچھتی تھیں اوس پر بادشاہ اور اعزہ
بادشاہ اور سرکار پرداز ممتاز اور ریذیڈنٹ بہادر مع صاحبان عالی شان
جلوہ افروز ہوتے تھے قصہ کوتاہ اوسی ہنر پر روز دعوت [illegible]

برتن سا پیش رکھے ان و حوض زمرد وغیرہ سب سنگ یشب کے
مطلا جواہر نگار تھے اور کھانوں کا کیا وصف بیان ہو کہ بادشاہی
تھا وہ نواب اور سب حکام عالیشان یہ سامان دیکھکر حیرت میں تھے دو
دوسرے مکان میں سامان ضیافت کا مہیا ہوا اسمین بھی اسیقدر
جملہ برتن اسی انداز سے جواہر نگار سنگ یشب کے صورت مین ا
لگائے گئے تیسرے دن بھی اسیقدر سامان اوتنے ہی بڑے بڑے
برتن اسی مقدار برابر اور رنگ رنگ سے نہایت تحفہ عمدہ بعجوبہ
کا جواہر نگار سنگ یشب کے مہیا تھے نواب ممدوح یہ سامان دیکھ
اپنے دلمین سخت محجوب اور شرمندہ ہوتے تھے شان خدا کو یاد
تھے حاصل کلام بعد برخاست جلسہ پانی اور کھانے اور بعد رخصت
نواب ممدوح کے امجد علی شاہ بادشاہ نے مجد الدولہ بہادر مہتمم خزانہ
کو شاباش بوجہ اس حسن انتظام کے نہایت خوش اور محظوظ ہوئے
اور زبان مبارک سے بہت تعریفیں کین خلعت گرانبہا سے خلعت
اوسوقت مجد الدولہ بہادر نے دست بستہ ہو کر عرض کیا کہ غلام قبلہ
بادشاہ سے تیس دن تک کا اقرار کرتا ہے کہ اگر حکم ہو تو اسیطرح
ہر روز سنگ یشب کے برتن طرح طرح کے صورت مین سے لگایا کرے
اس عرض و بیان پر دوسرا خلعت اونکے رتبے سے کہین زیادہ

یانت و امانت مین عنایت ہوا فضول فیاضی ہمیشہ سے اس سرکار مین
ہی کچھ نئی نہین ہی۔ امد خرام اسکو مقتدائی امر دوراہ کے مفتر
ہد لوٹ کھایا کارخانہ خدا ہین کہ اب بخیین امجد علی شاہ کے فرزند
ر احمد علی شاہ بادشاہ کو ایک پشت کے بعد شاید ایک پھول دان بھی
سنگ یشب کا میسر نہوگا مگر ان اون یشب خانون مین عوض ان ظروف
شب کے اینٹ نکا ڈھیر البتہ نظر آتا ہی اس انقلاب و زوال پر تخت حرکا
غام ہی فقط۔ اس زمانہ امجد علی شاہ من ولیہ الدولہ مدار الملک مرزا
سید علیخان بہادر فیروز جنگ یعنی والد اعلی جاہ رالاجاہ کا بڑا اقتدار
اس ملک انگریزی مین قضا کر گئے مشہور بلقب مرزا حیدر تھے اونکے
ذیشان کا ذکر اوپر آچکا ہی عمدہ رئیس ستھے۔
امجد علی بادشاہ کا حال کیا لکھا جاوے اس بادشاہ کے عہد دولت مین
ئی جدیدیات نہین ہوئی اور مجتہد کا زمانہ رہا اور یحییٰ ان بادشاہ کا
رتاریخ ۱۲۶۳ ہجری مین ۲۶ ماہ صفر یوم شنبہ پانچ بجے ۴۰ برس
بچ مہینے ۳ روز کے سن مین بعارضہ سرطان آٹھ دن کے درمیان مین
ان فانی سے گذر گئے اور سید محمد خان رسالدار کی چھاونی مین دفن
ہے جنت مکان لقب پایا تاریخ وفات کی منشی مظفر علی اسیر
شاگرد مولف سے یہ ہی

شاہ عادل نیک خصلت نیک سیر نیک خو	ترک دنیا کرد و دلہا یافت غم
از سروش غیب پرسیدم چو تاریخ وفات	گفت شد امجد علی جنت مکان پس کن

۱۲۶۳ھ

لاکھ روپیہ اودھ کے مقبرے کی تعمیر اور امام باڑے کے خرچ کے واسطے تجویز ہوئے اور بہ معیشت نوشت کے کاغذات تفصیل سے مقرر کیے گئے۔

دفعہ اول روپیہ کے کاغذ — نواب [illegible] — مرزا جواد علی [illegible] — نواب [illegible]

[illegible]

معین الدولہ — نواب [illegible] — نواب تاجدار بہو — جعفر [illegible] بیگم

[illegible]

[illegible] الدولہ — حسین علیخان — دفعہ دوم روپیہ کے کاغذ — نواب تاج [illegible]

[illegible]

جناب عالیہ [illegible] — نواب [illegible] — دفعہ سوم روپیہ کے کاغذ — نواب [illegible] اور متعلق

جو ذریعہ ان صاحب کے عہد میں [illegible]

[illegible]

بیان ریاست واجد علی شاہ

۲۶ صفر ۱۲۶۳ ہجری مطابق ۱۸۴۷ء کو اورنگ نشین خلافت ہو تاریخ جلوس

شہ عدل پرور سلیمان حشم	غزنوی رتبہ بہ تخت شاہی نمود
زینت ملک بین صد شاہ ابن شد	ملک رونق تاج شاہی نمود

واجد علی شاہ



ابتدای خلافت مین نواب امین الدولہ وزارت پر ممتاز تھے لیکن عہد
ولیعہدی سے بادشاہ کا مزاج انسے درپردہ مکدر تھا اسواسطے عہد وزارت مین گوشہ نشینی
سے خیال تھا کہ کسی دوسرے کو خلعت وزارت دیا جاوے اس بادشاہ
کی عہد حکومت مین کئی باتین ظہور ہوئین جواب تک یادہین نواب امین الدولہ کا
سانحہ مولوی امیر علی کا شہید ہونا ہنومان گڈھی کا دنگا اور فساد عیاشی
غفلت نالائق اہلکارون کا دخل تعمیر قیصر باغ امین الدولہ کا قصہ کہ
بہت مشہور ہے کہ بسواری بگھی دردولت پر آتے تھے وقت صبح
شیخ فضل علی احمد خان غلام غوث خان وغیرہ پانچ جوان بدمعاش
سرک گولا گنج مین زیر دیوار امام باڑہ نواب ملکہ زمانیان زوجہ نصیر الدین حیدر
بادشاہ بگھی سے نواب کی لپٹ گئے اور انمین سے دو شخصون نے
چالاکی امین الدولہ کو بگھی سے اوتار کر زمین پر گرا دیا اور چھری سینہ پر
رکھدی اور تین آدمی قرابینین لیے ہوئے اونکے سر پر کھڑے
تھے اور یہ کہتے تھے کہ جو کوئی پاس آئیگا ہم نواب کا کام تمام کر دینگے
اسوجہ سے کوئی دست اندازی نکر سکتا تھا اس عرصے مین یہ خبر
عام ہوئی افسران فوج شاہی مع ارکین موقع واردات پر پہونچے
بڑے صاحب بہادر اور چھوٹے صاحب بہادر وغیرہ وہان آئے
سوای تالیف قلوب اور طمع زر کے کچھ بن نہ آئی ۵۰ ہزار روپیہ پر

صاحب کلان بہادر نے اونکو رہنی کیا ذمہ دار ٹھہرے منگوایا مگر
اصل مطلب اونکا معدوم ہوا دام طمع مین آ گئے نواب مجروح کو راکیا
کہ امین اباد گئے تاریخ اوسکی تدبیر الدولہ منشی مظفر علی اسیر سے یہی
بوقت کینہ او باشش چند با نواب   زمانہ گفت کہ یارب ذوالجلال بخیر
اسیر سال وقوع فساد کرد رقم   رسیدہ بود بلای ولی مآل بخیر
۱۲۶۴
چنانچہ وہ سب دیہہ ہاتہوں پر رکھکر پانچون بدمعاش سوار ہوئے اور
صاحب کلان بہادر کے ساتہ بیلی گارد مین سے گئے بحکمت عملی ہتہیار
اونسے لیے گئے گرفتار ہوئے جو تہے دن چار بجے کے بعد
اونکو اپنی کوٹھی سے نکال دیا دروازے پر ازدحام تھا اور سپاہی
سرکار شاہی جوق جوق جمع تہے جیسے وہ باہر نکلے گرفتار ہوئے
مارے گئے قید خانہ دیکھا اور نواب مجروح کا علاج ڈاکٹر لوکن صاحب
نے اس حسن تدبیر سے فرمایا کہ ۱۴ دن مین غسل صحت کیا دربار شاہی
مین آئے نذر دی خلعت عملی سے سرفراز ہوئے خویش خوش گہر
گئے دوسرے دن چوبدار سلطانی نے زبانی انجم الدولہ کے حکم پہنچایا
کہ آپ عہدے سے معزول ہوئے سوار نہو جیے گا اور انتظام اور
کاروبار وزارت پر بدیوان عطائی خلعت نواب نقی علیخان چچیا سسر
بادشاہ کے مامور ہوئے بعد تین مہینے کے خلعت وزارت پایا

جو کہ یہ بادشاہ نوجوانی مین بادشاہ ہوا دو آئین متقی کہا ئین تقاضائے

شباب سے طبیعت مائل عیش ہوئی رفتہ رفتہ صحبت گانے بجانے

اور طوائف اور میراثی کی گرم ہوئی انجام افراط و تفریط عیش و عشرت کا

یہ ہوا کہ سوای محلات ممتازہ کے کئی بیگمین اور ہیپان درمرہ متعہ اور نکاح

مین داخل اونکے سوا بہ طوائف گانے بجانے کی خدمت پر مامور

تھین رو بوجہ ایجاد پسندی اور اختراعات شاہی سے کے ملقب بہس اور

پریون سے کے نام رد ہوئین ایک عالیشان عمارت بنا کے موسوم بقیصر باغ

کی جسمین سب بیگمات بڑے بڑے سامان اور ٹھاٹھہ سے بعیش و

عشرت رہتی تھین ہر ایک بیگم کا انوکھا اور نرالا خطاب اور لقب ہوتا رہا

اور نام دلربا تھا اسیطرح بھڑوے اور میراثی بھی خوشامد اور لگاوٹ سے

دخل اور قرب پیدا کرکے دولہ اور نواب اور بہادر کے خطاب سے

مخاطب ہوے اور انکو لہا رو پیہ پیدا کرکے مالامال ہو گئے مگر یہ سب

کمینے اور نالائق تھے چند خواجہ سراؤن سنے موافق اسلاف شاہی کے

عروج اور مرتبہ بلند پایا اونمین سے مثل حاجی دیانت الدولہ و حاجی امیر الدولہ

کئی خواجہ سرا لائق اور وفادار بامنش تھے اور علاوہ عیش و مستی

اور ایجاد پسندی اور تکلفات کے اس بادشاہ کو کچھہ مرض مثل مالیخولیا و غیرہ

بھی تھا معہذا بقول حافظ عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو نفی حکمت مکن از بہر دل عامی چند

چنداوصاف اس بادشاہ کے قابل ذکر کے بھی ہین گو یہ بادشاہ اسقدر

عیاش تھا مگر موافق مذہب شیعہ کے سب عورتین نکاحی او رمتاعی تھین

بے اسکے کسی عورت نامحرم سے اس بادشاہ نے مقاربت نکی اور

نکسی کو جبر سے بیگم بنایا اُس کثرت عیش و عشرت اور عالم جوانی اور

سلطنت پر نماز پنجگانہ مین سے کوئی نماز قضا نہین ہوئی یہ حکم رہا اور

اب بھی ہر کہ اگر صبح ہوتے بھی ہم سوجائین تو بھی وبردستی سے بیخوف

خطر آپنے پاس ان ب جگادینا چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہی اور کبھی نماز اور تلاوت قضا

اور ترک نہین ہوتی ہی — این کار از تو آید و مردان چنین کنند —

یہ بادشاہ اسقدر رحم دل و رقیق القلب ہی کہ باوجود اس قدرت سلطنت

او رزور روزر کے اس سن شباب مین کسی پر طیش اور بیرحمی نہین کی بلکہ

گالی تک بھی زبان پر نہین آئی نہ کسی کو ناحق اور مخالف کو ظلم سے ستایا

نکسی کی جان لی — باوجود اس سلطنت اور جاہ و حشمت اور شباب کے

اس بادشاہ مین غرور و نخوت جس سے ہزارون مین بھی کوئی امیر خالی

نہین ہوتا نام کو نہ تھا مصرعہ کر دولت بر سی ست نگر دی مردی — جیسے

یہ ٹہ بڑی صفتین خداداد تھین ویسے ہی غفلت او عیش کا عیب بھی تھا

مگر وہ اپنی ذات کے واسطے تھا بے عیب ذات خدا کی ہے چنانچہ

اب بسبب اعتدال قوام جوانی اور سن کے بہ نسبت سابق بہتر بھی ہے اور

وہ باتین خواب و خیال بھی ہوتی جاتی ہین - یہ بادشاہ عادل تھا کسی موافق
اور مخالف یا امیر یا بیگانے کی عدل مین رعایت نہین کی یون ہندستانی
سرکار کے اہلکار جو اپنے کام کے مالک اور مختار معین ہوتے تھے
اگر اونمین سے کوئی حق تلفی کی تو اونکے غضب ایک عدل بادشاہ کا
ہو۔ مقدمہ پر الٰہی بخش خان میر مہدی حسن متخلص شمشیر داروغہ عمارت سلطانی
بمقابلہ امانی بیگم داروغہ سرکار نواب مخدرہ عظمیٰ ظہور مین آیا اور بادشاہ نے
عدالت فرمائی وہ مثنوی درة التاج مین نظم ہی - اول سال جب یہ بادشاہ
تخت نشین ہوئے یہ منظور تھا کہ تمام علاقجات تحصیل سلطانی تحصیل
ہوجائین زمیدار اور تعلقدار اپنے قلا کی معرفت زرآمدنی داخل خزانہ
سلطانی کیا کرین ناظم اور چکلہ دار موقوف ہوجائین کہ یہ علاقون پر جاکر
زیادہ ستانی اور تنگ طلبی کرتے ہین رعیت تباہ اور نقصان سرکار بھی
ہوتا ہی لیکن اہلکارون نے کہ اونکی حاصلات لاکھون روپے کی جاتی تھی
اس حکم کو جاری نہونے دیا آغاز مین دو تین تقریبی تیرون پر بنام شعلہ
ہمراہ رکاب سرکار بادشاہ رہتے تھے مستغیث اپنی عرضداشتین اوسمین
ڈالدیتے تھے اور اوسکو بادشاہ اپنے ہاتھ سے کھولکر حکم لکھتے تھے
اور طبیعت بھی نہایت رسا اور چالاک تھی ترتیب فوج بھی آئین تازہ ہوتی
تھی یعنی قانون رزمیہ زبان فارسی مین موجد طبع عالی تھا ترتیب چھپے

بانکے دور رسالے اور اختری اور نادری دو پلٹنیں تلنگوں کی بموجب

ہدایت اور تعلیم بادشاہ کے کام کرتی تھیں بادشاہ آپ قواعد لیتے تھے

اور روش اور بول چال سکھاتے تھے ایکدن نواب علی نقی خان نے

عرض کی کہ یہ امر خلاف مزاج صاحب رزیڈنٹ بہادر کے ہی لہذا بادشاہ

نے بالکل اس طرف سے کنارہ کیا اور ایک میلہ قیصر باغ میں بپوشاک جوگیا

بحکم سلطانی تھا ماہ ذیقعدہ ۱۲۶۹ ہجری کو ہوتا تھا لہذا چھوٹے بڑے

لڑکے بوڑھے امیر غریب جوگیا لباس پہنے ہوے شریک میلہ ہوتے تھے

وجہ یہ تھی کہ سفید پوش اندر قیصر باغ کے جانے نہ پاتا تھا انگریز امیر ہو گئے

تاریخ میلہ

بقیصر باغ چون سلطان عالم	نمود این میلۂ رنگین و نادر
پئے تاریخ این فرخندہ جلسہ	ندا آمد نشاط افزای خاطر ۱۲۶۹

اس میلے کا سامان اور تکلفات اور آرایش قیصر باغ اور چہل پہل

کسیطرح بیان میں نہیں آسکتے جسطرح کا بازار وہ کاندار ابھی زنگ

سکتے تھے اور بنیاد اس میلے کی یہ تھی کہ واجد علیشاہ کی چھٹی کی آرزو تھی

اونکی ماں نے لڑکپن میں جوگیا لباس پہنایا تھا اونکی سالگرہ اس

لباس سے ہوتی تھی بادشاہ نے عہد سلطنت میں میلہ قرار دیا اور اس

بادشاہ کا تخلص اختر تھا افسانۂ عشق دریای تعشق بحر الفت اور چند دیوان

اور مثنویات اور رسالہ موسیقی وغیرہ تصنیف اور تالیف پادشاہ کی مطبع سلطانی میں چھپی تھی اور پادشاہ کے پانچ شاہزادے تھی اس طرح سے

ملکہ قدسیہ عظمیٰ نواب بادشاہ محل حسینہ عرف خاص محل سے
سہ فرزند
اول مرزا نوشیروان قدر محمد حیدر علی بہادر
دوم فلک قدر مرزا جاوید علی بہادر جو دریا [illegible] تھے
سوم کیوان قدر مرزا محمد حامد علی بہادر

چہارم ملکہ آفاق تاج النسا نواب [illegible] بیگم صاحبہ سے
یک فرزند
فریدون قدر مرزا [illegible] علی بہادر

پنجم نواب حضرت محل صاحبہ سے
یک فرزند
برجیس قدر مرزا محمد رمضان علی بہادر

پہلے مرزا جاوید علی بہادر ولیعہد ہوئے ڈھائی برس کے بعد پھر مرزا محمد حامد علی ولیعہد ہوئے اور مرزا محمد [illegible] علی بہادر جرنیل سے ہے ان بادشاہ کو نواب صاحب سے کمال محبت تھی اکثر گو گھاٹ میں نواب صاحب کے مکان پر تشریف لیجاتے تھے اور دو دو دن چار چار دن وہاں رہتے اور نواب صاحب کی کتخدا بیٹیاں تھیں ایک بیٹی کی شادی نواب محسن الدولہ بہادر کے فرزند کے ساتھ بڑی دھوم سے ہوئی اور دوسری بیٹی کا

کہ نواب اختر محل صاحبہ خطاب سے بادشاہ کے ساتھ عقد ہوا تھا بڑی دھوم
اور رونق تھی روشنی نواب کے مکان تک کہ تخمیناً چار میل کا فاصلہ
ہی دو رویہ ٹٹر روشنی کے بندھے تھے اسکے پیچھے آتشبازی جابجا چھوٹے بڑے
بڑے دروازے روشنی کے سڑک پر برج کھڑے اور گملے پیچھے
سے بندھے تھے اور عمدہ عمدہ کشتیان آرائش ابرک کی برنگ رنگ
گلکاریان بنی ہوئی لگی تھین کہ جس سے وہ عالیشان پر تکلف معلوم
ہوتا تھا اور نواب صاحب کے مکان عالیشان مین ہر چہار طرف مع دریا کے آس پار
اور اس پار کمال روشنی کی دھوم تھی اور آتشبازی ہر قسم کی آرائش سے
زیادہ امیرون کے خیمے خانہ باغ مین جابجا نصب تھے محفل رقص و سرود و شیرینی
اور خیمون مین گرم تھی سامان ہر جا جلسہ شاہانہ قابل دید تھا کہ جسکا شمہ بیان سے
باہر ہے ۱۸۴۸ء مین عہد سلطنت واجد علی شاہ مین نواب گورنر
جنرل لارڈ ڈینگ صاحب بہادر بعد فتح ملک پنجاب جب لکھنؤ مین تشریف فرما
ہوئے تو بادشاہ کی ملاقات سے البتہ خوش ہوئے اور ملک کی
بے انتظامی سے شاکی ہو کر بادشاہ سے فرمایا کہ کرنیل جان لو صاحب
سابق رزیڈنٹ نے اس ریاست سے عہد کیا تھا کہ درصورت فتور
و بے انتظامی اہالی سرکار انگلشیہ اس ملک کو قبضہ تصرف مین لاوینگے
اور جو منافع کہ بعد اخراجات بچیگا حوالہ خزانہ شاہی ہوا کریگا لیکن

حکام ولایت کے نزدیک یہ تجویز ناپسندیدہ ہوئی اور اوسکو عرصہ دراز

ہو چکا اب تک سرکار انگریزی کو انواع و اقسام کی مراعات اس ریاست کے

خاندان کی تھی باوجود اسکے اب تک کچھ بندوبست نہو سکا اسپر بادشاہ

نے عذر کیا کہ اور دو برس کی مہلت چاہیے باایں ہمہ یہان تو وہی عید

شب برات خواب غفلت بدستور رہا دو برس کیا کئی برس

نکل گئے پھر ولایت سے تحریک ہوئی کرنیل سلیمن صاحب بہادر رزیڈنٹ

اول نے اس باب کا حال مفصل بہ شرح تحریر فرمایا چنانچہ حسب تحریک

گورنمنٹ امر اعلیٰ بادشاہ کرنیل سلیمن صاحب بہادر نے دورہ فرماکر ایک

رپورٹ گورنمنٹ کو بھیجی اور سنہ وقت سے اس بارہ مین متواتر تحریرات

جیا بین گورنر جنرل بہادر امرشاہ اودہ کے رہین چنانچہ اوسی رپورٹ

کے معاینہ سے سب بے سر و سامانی معلوم ہوئی حکام ولایت کو ایما ہوا

کہ شاہ اودہ اور اوسکے خاندان کے وظائف مقرر ہون اور انتزاع

سلطنت عمل مین آوے چنانچہ کارپردازان گورنمنٹ نے بجا آوری

اس حکم کی کی بعد سلیمن صاحب کے جنرل اوٹرم صاحب رزیڈنٹ لکھنو

ہوئے اونھین کے زمانے مین مولوی امیر علی صاحب شہید ہوے

اس معرکے کا بہت طول بیان ہے مختصر یہ کہ بیٹھے بٹھاے حمیت

مذہبی سے مولوی صاحب آمادہ استیصال ہنودان گڑھی کے ہوے

اور اکثر اشتعالک اور امداد اشخاص جو ضلع اور شہر کے نا عاقبت اندیشون
کی تھی حالت مذہبی تو مشہور ہی ہر چند ارکین سلطنت شاہی نے بہت کچھ
سمجھایا نہ مانا آخر کار ضلع دریاباد کے مقام ہنسوال ہندو اور مسلمانون کا معرکہ
ہوا کہ جسمین فوج شاہی نے واسطے فرو کرنے اس بلوے کے سعی
موفورہ کی آخر کار جب مولوی صاحب نے نمانا فوج شاہی نے
قافیہ تنگ کیا اور ادہر ہندو کچہ بتعمیل حکم اور کچہ بمصلحت وقت اکثر مذہبی
تعصب سے جو بجمعیت کثیر مجتمع تھے مقابلے مین ورانے اور مولوی صاحب
اور بہت سے اونکے پیرو اور ہمراہی اس معرکے مین شہید ہوے
آخر زمانہ بادشاہ مین یہ معرکہ بھی انکی بے انتظامیون پر قوی
دلیل ہو گیا غرض تقدیر کے لکھے کو امکان نہین ہی دہونا آخر الامر
۷ فروری ۱۸۵۶ء حسب الایماء حکام ولایت موجب حکم گورنمنٹ ہند کے
سپاہ جرار گورہ و ہندستانی کانپور سے آکر لکھنو کا محاصرہ کیا اور
جنرل اوٹرم صاحب بہادر نے دولت سرای سلطانی پر جاکر بادشاہ کو
منشاء حکم سے اطلاع دی بادشاہ نے مصلحتا حکم سرکاری کو تسلیم
کیا اوسیوقت احکام قلمرو مین جاری کرائے گئے کہ آج کی
تاریخ سے اس ملک پر قبضہ سرکار انگلشیہ ہوا غرض باطاعت شاہی
جملہ ارکین و توابع و راجگان و زمینداران وغیرہ نے فرمان طاعت کی تعمیل کی

اس شہر کے رؤسا۔ و امرا بلکہ اکثر اراکین سلطنت اسوقت تک خواب
غفلت میں بعض بیخبر تھے جبکہ فوج سرکار نے لکھنو کا محاصرہ کیا اگرچہ
بادشاہ کو غدیت گورنمنٹ سے اطلاع تھی بلکہ اہلکاران نالایق نے
والی ریاست کے دل پر یہہ بات نقش کالحجر کی تھی کہ سلطان عالم ہم
خیر خواہوں نے ولایت میں سب بندوبست کر لیا ہی گورنر جنرل
اور دیگر حکام کیا ہین غرض ہمیشہ سبز باغ تزویر دکھاتے رہے
بوقت انتزاع سلطنت محلات شاہی مین جو کہرام مچا وہ بیان نہین
ہو سکتا شہر مین گھر گھر ماتم تھا سارے شہر مین زلزل پڑ گیا تھی کہ کیا سے
کیا ہو گیا عبرت وحسرت کے سوا کیا تھا۔ مادہ تاریخ یہی

مرگ انبوہ بہ از جشن نشاطی دارد

غرہ جمادی الثانی سنہ مذکور کو کہ ابتدای برہان الملک سے آتک
ایک سو چالیس برس ہوتے ہین عمل انگریزی اودہ مین ہوا۔
القصہ جملہ اراکین سلطنت کے دلون مین خداوند تعالی
نے یہ ولولہ ڈالا کہ رہا سہا جو کچھ باقی ہی اوسکا بھی خاتمہ بالخیر ہو
سب اہلکارون نے بادشاہ کو صلاح دی کہ ولایت مین تشریف بیجا کر
حضور ملکہ معظمہ سے داد جوئی کیجاوے ہر چند اس امر کے واسطے
بادشاہ کے عزیزون اور اراکین سے ولایت جانے کے واسطے

کیا کم سے تھے لیکن تقدیر کا اتفاق ایسا ہی تھا کہ لکھنؤ کی رونق اہلبیت کا
نام بھی مٹ جاے عزیمت عجم ٹھہر گئی بالآخر مرزا محمد جواد علی بہادر برادر خرد
و مرزا ولیعہد بہادر و جناب عالیہ و محلات وغیرہ بامید استرداد ملک موروثی
بمعوابدید نواب منور الدولہ بہادر روانۂ کلکتہ ہوے مہاراجہ ایشر سنگھ بہادر
رئیس بنارس بگذرانیدن نذر لائقہ اور مہمانداری سے جو شایان عہدیت
اور ریاست کے تھا انسے پیش آئے کہ قیامت تک یادگار رہیگا اور
وہانسے بادشاہ بعد طی راہ دریا ۴ شوال سنہ ۱۲۷۲ کو کلکتے مین پہونچکے
کو ٹھی راجہ بردوان واقع مٹیا برج مین مقیم ہوئے اور اکثر وابستگان
شاہی مثل نجم الدولہ بہادر و حسام الدولہ و فتح الدولہ محمد رضا بیگ بتدریج
پہونچے ۴ شہر ذیقعدہ کو جناب عالیہ متعالیہ اور مرزا سکندر حشمت بہادر اور
مرزا ولیعہد بہادر و شیخ مسیح الدین خان ساکن کاکوری وغیرہ واسطے دادرسی
بالگذشت سلطنت کے بسواری جہاز روانہ لندن ہوے اور بعد طے
منازل راہ دریای شور منزل مقصود پر پہونچے بھی گوہر مقصود ہنوز ہاتھہ
نہ آیا تھا کہ آتش فساد بغاوت فوج باغی سرکاری مشتعل ہوئی اسی عرصہ مین
مرزا سکندر حشمت و جناب عالیہ متعالیہ بتقضاے الہی ابصد حسرت ناکامی پیرس مین
راہی ملک عدم کے ہوگئے۔

	قطعۂ تاریخ	

جناب عالیہ رشک مریم و بلقیس   بہم سکندر حشمت بہادر نجباہ

چہار سال بنمودند در سواد فرنگ   دو چند گشت بعالم ظہور حسرت آہ

دو بارہ مغفرت تاریخ سال او میخوانم   دو بارہ قلب ہمہ از دو صد مہ جاہ

بعد گذرنے اس سانحے کے ایک نیم سال کے مرزا ولیعہد بہادر حسب الطلب بادشاہ

۷ صفر ۱۲۷۳ ہجری کو ولایت سے کلکتے کو پھرے بقول حافظ —

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل   کہ خضر از آب حیوان تشنہ می آرد سکندر را

بیان تفصیل سرگذشت سفر ولایت کی محمول بشکایت اور خالی از عبرت نہ تھی

لہذا بطول لاطائل جانے کے قلم انداز کی ۔ وہ ہی لاکہ روپیہ مشاہرہ شاہ موصوف کو تاحین حیات

ملتا ہی جو مقرر ہوا تھا اور کل مال و اسباب و جایداد ضبط سرکار رہی مگر

نیک نیت سر ہنری لارنس صاحب بہادر نے تخمیناً بیس لاکھ کا جواہرات

منجملہ مال شاہی سے بچا رکھا تھا جو انکو کلکتے مین دیا اور اوس سے جو

بادشاہ پر قرض تھا کچھ ادا ہوا ایک سال پانچ مہینے گیارہ دن لغایت آخر

ذیقعدہ ۱۲۷۲ ہجری عملداری انگریزی بخوبی رہی کرنیل اوٹرم صاحب بہادر

چیف کمشنر اور میجر گلین صاحب بہادر اور کرنیل سر ہنری لارنس صاحب بہادر چیف کمشنر

تھے کہ ناگاہ نمکحرامی و حق فراموشی سے سپاہ سرکاری نے نشان بغاوت

بلند کیا چنانچہ اودھ مین بھی ماہ جون ۱۸۵۷ع مین بغاوت فوج ہوئی

۱۱ ذیقعدہ ۱۲۷۳ ہجری برجیس قدر مرزا محمد رمضان علیخان کو مسند حکومت پر

بٹھا کر اپنا بادشاہ بنایا اور بدستور سلطنت قائم کی۔ تاریخ یہ ہے

رکن دین کیوان مکان بر جلیس قدر انجم سپاہ

شرف الدولہ محمد ابراہیم خان نائب تھے اور مموخان بخطاب علی
داروغہ دیوان عام ہوے اسطرح سے بہت لوگون کو خدمتین ہوئین
اور چکلہ دار علاقون پر بدستور مامور ہوے گورکھپور بھی شامل اس ملک
ہوگیا تھا آٹھ مہینے فوج سرکار محصور بیلی گارد سے مقابلہ رہا
باقی رئیس شہر کے سرکار سے موافق رہے جنکے سبب سے جا
دیگر کار ضروری جاری تھے آخر فوج سرکاری کانپور سے آکر
استقلال تمام انکو نکال کر کنہ عالم باغ مین لے گئی مفصل ذکر
دیگر تالیفات مین لکھا جائیگا مگر سبب ثمرہ مہوانگی اور حسن انتظام سر ہنری لارنس صاحب
چیف کمشنر کا تھا جنھون نے شجاعت اور وفاداری مین آپ کو
نثار کیا دوسری بار فوج سرکار مع کمک راجہ جنگ بہادر سرحا
یورش کرکے سرحد لکھنؤ مین پونہچی اور ناکہ ہنڈولا سے حسین
اور حضرت گنج مین کہ شہر سے پورب طرف واقع ہی در آئی
عبور دریاے گومتی محاصرہ مکان شاہی کا ہوا ۲۰ رجب ۱۲۷۴
اندر مکان سب کے در آئی سلخ رجب ورغرہ شعبان سنہ مذکور تمام
عمل دخل ہوگیا صاحب عالم نوشیروان قدر بہادر فرزند کلان واجد علی

جو نیو اسی مشہور تھے ممدوحہ گولی سے کہ اونکے مکان سکونت
مین برستی تھین مارے گئے اور شرف الدولہ جو نائب تھے درگاہ
حضرت عباس مین ملے کے اوپر مردان احمد اللہ شاہ کے
ہاتھون سے باشتباہ سازش سرکار مارے گئے

تاریخ دیا کرشن ریحان

بولا کہ وہ سب شرف ملا مٹی مین	بے گور و کفن رہی جو لاش اوسکی سر شام

لکھنو مین عجب ہنگامہ محشر بر پا تھا کہ تمام رعیت امیر غریب پادش اعمال سے
گھر بار اپنے چھوڑکر بخوف جان یک بینی و دو گوش خوف سرکار سے
بے سامان خانہ بدوش ہوکر جنگل اور بیرونجات مین چلے گئے وہ
وقت تھا کہ شہزادیون کو سواری ایک ڈولی کی بھی غنیمت تھی
اس سبب سے یہ شہر خوب لوٹا گیا اور مرزا برجیس قدر اور حضرت محل صاحبہ
مان اونکی ۹ مہینے ۱۸ دن کی حکومت کرکے لکھنؤ سے کنارہ کرکے
پار پہونچے وہان مرزا برجیس قدر کی اس لقب سے برجیس قدر
محمد رمضان علی سکندر جاہ اقبال شاہ خلد اللہ ملکہ کندہ ہوئی وممو خانکو
عہدہ وزارت اس خطاب سے ملا ناصر الدولہ نصیر الملک علی محمد خان بہادر
منصور جنگ ناظم وعامل بھی باقی ضلعون پر مقرر ہوگئے مگر محاربے اور
مجادلے مین بسر ہوئی انجام کار جمادی الاول ۱۲۷۵ھ ہجری صاحبان

عالیشان بہادر اوتر سے مطمئن ہوکر اوس پار گھاگرہ کے پہونچے
و سے مہینے چند روز یہان بھی مرزا برجیس قدر اور اونکی مان حکومت کرکے
نواح ملک نیپال مین سے گئے اور کل ملک پر قرار واقعی بدستور
تسلط سرکار ہوا الملک سے جلد آشوب کا رفع ہونا اور آسودگی و اطمینان
سے رعایای پریشان کا آباد ہونا یہ سب نتیجہ سرکار کی چشم پوشی و استحکام
شاہی کا تھا —

یہ عجب بات ہی اس محل پر ثابت ہو رہی کہ واجد علیشاہ نواب سے عیاش
اور کاہل و آرام طلب ہون اور اونکی ایک خادمہ حضرت بیگم نام اور دہ سالہ
فرزند ایسا بیباک اور جری نکلے جنکا ناکہ توپ تلوار سے بھی نہ جھکی
اور بدعوی سلطنت سرکار سے مقابلہ اور تخالف کیا اور اب حوالی
بھوٹ مین سلامت بنی جا بیٹھی اگرچہ بیجا بائی اور رانی جھانسی نے
مردانگی مین اور سکندر بیگم والی بھوپال تال نے رسوخ اور انتظام مین
اور رانی چندہ مادر والی لاہور نے چالاکی مین اور زینت محل بیگم شاہ
باغی دہلی نے دغابازی مین نام نکالا مگر اس بیگم لکھنؤ نے کہ یہان کے
مرد عیاش و آرام طلب ہوتے تھے ایسی باتون کا ظہور مین آنا تعجب
سے ہے ازبس ؎

ہر زن نہ زنست و نہ ہر مرد مرد — خدا پنج انگشت یکسان نکرد

تعمیرات لکھنؤ

بنا و نقش عمارات شہریاران مین — کہ این سپہر جفا پیشہ چون شکست و ریخت

اس شہر مین عہد نواب آصف الدولہ بہادر سے ہر ایک کی عہد
حکومت و سلطنت مین مکانات عمدہ عمدہ تعمیر ہوتے رہے
شہر کے اوتر کی طرف گومتی کے کنارے کنارے کثرت سے
مکانات شاہی موجود تھے ہنگامہ بلوہ سے کچھ پہلے بعض بعض بسبب
بیکاری کے کام مین آگئے پھر ایام غدر مین توپ کی زد مین
جو مکانات رہ گئے گرے اور گولیون سے بالکل مسمار
اور شکستہ ہو گئے چونکہ بعد انتظام موجودہ مرمت مین صرف
کثیر ہوتا اس سبب سے اکثر مکانات مسمار کیے گئے
اون سبھی کی احوال عبرت نشان بخیال طوالت کتاب قلم انداز کیا گیا۔ شعر

ہر بنا افتادہ مبنی خشت و ویرانہ — ہست فرد دفتر احوال صاحب خانہ

اب جس قدر تعمیرات مشہور مشہور باقی ہین حد شرقی سے بسلسلہ
اوس کا شروع ہو کر حد غربی تک تمام کیا جاتا ہے

کوٹھی بیبیاپور

جسکو نواب آصف الدولہ نے سیرگاہ و شکارگاہ کے طور پر تعمیر
کروایا تھا اور وہان جا کر سیر و شکار کیا کرتے تھے مگر جنرل صاحب

رزیڈنٹ بہادر سابق لکھنو سے تبدیل ہوکر روانہ ہوے اور دوسرے
صاحب بجاے اونکے کارفرما ہوے تو دوسرے نواب مقلم پر نواب زیر
بڑے تزک و شان سے واسطے ملاقات صاحب رزیڈنٹ بہادر
کے تشریف لاے وبر وقت رخصت صاحب بہادر کو اپنے ساتھ ہاتھی
پر سوار کروا کر کوٹھی رزیڈنٹی مین لیگئے اور اس امر کا تصفیہ ہوا کہ وزیر علی
کو مسند سے برخاست کرکے سعادت علیخان پسر متبنی آصف الدولہ
کو بجاے اونکے مسند نشین کرین اور یہ بات مشہور عام ہے کہ اسی مقام
مین جناب لاٹ صاحب ٹلین ہوتہ بہادر نے دربار اہالیان دربار شاہی
کا فرمایا تھا اور اسی جلسے مین وزیر علی کو حکم معزولی مسند کا سنایا تھا
اور اسی مقام سے اونکو روانہ شہر بنارس کیا تھا جو جگہہ
اونکے قیام کیواسطے سرکار سے تجویز ہوئی تھی

کوٹھی دلکشا

اس کوٹھی کو سعادت علیخان نے اپنے سیر شکار کیواسطے بنوایا تھا
اور جنگل گرد و پیش کو صاف کرا کر ایک چراگاہ مقرر اور اوس مین
جانوران شکاری مثل ہرن وغیرہ چھوڑوا دیے تھے اس کوٹھی مین
اکثر بیگمات بھی سیر کے واسطے آیا کرتی تھین

ولایتی باغ

اس باغ کو بادشاہ نصیر الدین حیدر نے تیار کیا تھا اور اوسمین اکثر ولایتی
درخت لگائے تھے اسی وجہ سے اوسکا نام ولایتی باغ مشہور ہوا واجد علی
شاہ نے اوسکی چار دیواری کو وہ بلندی بخشی جواب موجود ہی کیونکہ اونکے
محلات اکثر وہان جاکر سیر کیا کرتے تھے اور اسکے واسطے یہ مکان ضرور تھا

کوٹھی مارٹین

جسکو کنسٹین شیا بھی انگریزی زبان مین کہتے ہین اوسکو جنرل کلاڈ
مارٹین صاحب نے تعمیر کیا تھا صاحب نے اوسکی تعمیر شروع کی
اور نقشہ نواب آصف الدولہ بہادر کو دکھلایا نوابصاحب نے نقشہ
کو پسند فرماکر خواہش اوسکی خرید فرمانے کی ظاہر کی اور دس لاکھ روپیہ
اوسکی قیمت قرار پائی مگر نوابصاحب کہ مرگئے اس معاملے کو
انجام نہونے دیا اور بعد چند روز کے جنرل مارٹین صاحب بھی فوت
کر گئے اور یہ تعمیر ناتمام تھی مگر صاحب موصوف نے بنظر اسکے کہ کوئی حکمران آئندہ
اوسکو ضبط کرلے یہ حکم دیا تھا کہ اوسکی لاش اسی مکان مین دفن ہو
اور روپیہ اوسنے واسطے ترتیب مدرسہ کے جمع کیا ہی اوسکے سود
کی آمدنی سے یہ تعمیر اختتام کو پونہچی بیچ ہنگام مفسدہ کے سپاہ مفسد نے
نے صاحب کی قبر کھود کر اوسکے استخوان وغیرہ جو باقی تھے اونکو
پاش پاش اور پریشان کر دیا تھا مگر بعد فرو ہونے مفسدہ سے کے جسم

استخوان صاحب کے جو دستیاب ہوے دوبارہ قبر مین رکھے گئے

نہر گنگ

اس نہر کی کھدوائی نصیرالدین حیدر کے وقت مین شروع ہوئی تھی اور زر کثیر اوس مین صرف ہوا اور علت غائی اس مطلب سے بہت مفید اور کارآمد تھی راجہ بختاور سنگھ نے یہ امر شاہ اودہ کے گوشگزار اور عرض کیا کہ اس نہر سے پانی گنگا کا لکھنو تک آویگا اور اوسکے سبب سے تجارت اور زراعت کو بہت فائدہ ہوگا بلکہ اونکو ترغیب و تحریص دیکر شروع کروایا تھا مگر چونکہ یہ امر علم سے تعلق رکھتا ہے اور کسی صاحب انجنیر کی صلاح اور مشاورہ اسمین نہ تھا اسلیے یہ امر اختتام کو نہین پہونچا اور اکثر ٹھیکہ داران کو جنھون نے ٹھیکہ کندہ گی کا لیا تھا متمول کر دیا یعنی وہ لوگ روپیہ لیکر بھاگ گئے اور اس نہر کو ناتمام چھوڑا ہنگام بلوہ مفسدین نے اسی نہر کو اپنا اول مورچہ قائم کیا تھا

تعمیرات عہد نواب سعادت علیخان

تعمیرات مفصلہ ذیل سعادت علیخان نے تعمیر کروائی تھین تاکہ شہر غربی جانب سے ویسا ہی آراستہ ہو جیسا کہ اوسکی بھائی غلاقی نے شرقی جانب کو درست کیا تھا کوٹھی حیات بخش جسمین صاحب کمشنر بہا

رونق افروز ہین کوٹھی دار الشفا جس مین صاحب بکرتر بہادر
تشریف رکھتے ہین کوٹھی بنیگم جس مین توپخانہ اب قائم ہے
کنکڑ والی کوٹھی جس مین برگیڈیر صاحب قیام فرما ہین کوٹھی نور بخش
جس مین صاحب ڈپٹی کمشنر فروکش ہین بادشاہ منزل جس مقام
پر اب قیصر باغ طیار ہوا ہے یعنی بازار اور ٹیڑہی کوٹھی ان مکانات
مین اکثر صاحبزادے رہا کرتے تھے اور جو خالی تھے وہ نوابصاحب
کے سیر و تماشا کیواسطے آراستہ رہا کرتے تھے جس مکان مین اونکے
ولیعہد آتا تھا اوس مین سیر و تماشا کرتے تھے اور ٹیڑھی کوٹھی
واسطے سرانجام امور ملکی کے تیار ہوئی تھی جو کام ملکی ہوتا تھا
وہ وہان درپیش ہوتا تھا ان مکانات مین سے اکثر مکانون کے
نام بلوے مین مشہور ہوگئے یعنی کوٹھی حیات بخش مین میجر ہوبرٹ صاحب
جو نہایت دلیر و شجاع تھے جان بحق تسلیم ہوے اور بیگم کی کوٹھی مین
بہت سے سپاہیان شجاعت شعار نے ہاتھ مفسدین سے
شربت ممات پیا کوٹھی نور بخش کے بالاخانے سے سرہنری
ہولک صاحب تیسری مورچال مفسدین پر گولہ مارتے تھے اور
راستا قیصر باغ کا نکالا تھا اور اس کوٹھی پر مفسدین کے گولے
اسقدر لگے تھے کہ اب تک نشان گولونکا اوسکی دیوار پر موجود ہے

اور اسقدر کثرت سے ہے کہ گویا دیوار چھلنی ہو گئی ہے

سبطین آباد یعنی مقبرۂ امجد علی شاہ چہارم بادشاہ اودہ

جس مین اب گرجا گھر قرار پایا ہے اورجسکو عوام غلطی سے جھنجہ امام باڑہ بھی کہتے ہین

مادۂ تاریخ

آرامگاہ ظل اللہ
۱۲۶۴

سکندر باغ

تعمیر کردۂ واحد علی شاہ جو شاہ ممدوح نے سکندر بیگم کو عطا کیا تھا اور اسی سبب سے بنام سکندر باغ مشہور ہوا اس مین کوئی چیز قابل تعریف نہین مگر یہ کہ اس مین ہنگام بلوہ سپہ سالار بہادر افواج سرکاری نے قریب دو ہزار سپاہ مفسدین کو سزا دی تھی اور اونکی لاشین بہتیری اوسی مین دفن ہوئی تھین اور بہت اوس آستی مین پڑی رہین جو شمالی اور مشرقی جانب باغ کی جاتا تھا

قدم رسول

ایک مذہبی مقام اہل اسلام کا جسکو غازی الدین حیدر نے ایک مقام بلند تیار کروا کر تعمیر کیا تھا اوس مین ایک سنگ پارہ ہے جو عرب سے ایک حاجی لایا تھا اور جسپر نقش قدم پیغمبر کے تہین ہنگام بلوہ سنگ پارہ مذکور گم ہو گیا اگر کوئی اوسکا لیجانے والا معلوم نہوا

نجف اشرف

جو بنام شاہ نجف مشہور ہی اوسکو غازی الدین حیدر نے اپنا
مقبرہ بنوایا تھا اور اوسی مین دفن بھی ہوے ہین اس مقام کو
یہ نام اسواسطے دیا گیا تھا کہ ایک مقام کوہ نجف ہی جسپر قبر
حضرت علیؑ داماد حضرت محمد پیغمبر کی تعمیر ہی اور مشہور یہ ہی کہ یہ
مقبرہ اوسکی نقل بنا ہی اور غازی الدین حیدر نے کچھ روپیہ
واسطے مصارف اس مقبرے کے سرکار مین جمع کر دیا تھا
جسکے سود سے خرچ اس تعمیر کی مرمت کا اور تنخواہ عملہ مقبرہ کی مثل
سید وغیرہ ہوتا ہی اس مقام پر بھی سپہ سالار افواج سرکاری
کو بمقابلہ مفسدین بڑی تکلیف اوٹھانی پڑی تھی اور مفسدین نے
یہان نہایت سخت مقابلہ کیا تھا اس مقام پر ہنگام جنگ مسندر
سر ولیم پیل صاحب کی بھاری توپین آئی تھین اور دو گھنٹے تک
اونکے گولے اسپر گرتے رہے اور اسی مقام پر جو گنبد پر بوٹ صاحب
نے کار نمایان کیا تھا یعنی تنہا واسطے تلاش چور راستے کی گئے تھے
اور ایک کھڑکی دریافت بھی کی تھی مگر اسی عرصے مین اتفاقاً گولہ
کے صدمے سے دیوار شق ہو گئی تھی اور سپاہ سرکار اوس
شق کے راستے سے اس مکان مین داخل ہو گئی تھی ۔

تاریخ

باحسن عقیدت نجف اشرف ا	فرمود بنا بہمند نواب وزیر
تاریخ مبارکش چو جستم از عقل	ہاتف گفتا عجب نجف شد تعمیر

۱۲۴۲ ہجری

تعمیرات موتی محل

تعمیر کردہ سعادت علیخان شمال کی جانب احاطی کے ہی اور موتی محل اسواسطے نام رکھا گیا تھا کہ اس مین ایک برج بنا تھا جو بشکل موتی کے تھا مگر اب وہ مسمار ہو گیا ہی دوسرے مبارک منزل اور تیسرے شاہ منزل مبارک منزل غازی الدین حیدر نے کنارہ دریا پر تعمیر کیا تھا اور شاہ منزل جہان اب پل کشتیونکا ہی اور اس منزل سے مبارک منزل بجانب شرق تھا شاہ منزل واسطے لڑائی حیوانات کے تعمیر ہوا تھا چھوٹے چھوٹے جانورونکی لڑائی اندر احاطہ شاہ منزل کے ہوا کرتی تھی اور شیر وغیرہ کی لڑائی بھی اوسی احاطے مین ہوتی تھی اسواسطے مشبوط کٹہرے اوستکے سامنے تماشا دیکھنے والونکے لیے تعمیر ہوئے تھے مگر لڑائی ہاتھی اور گینڈے کی دریا پار سے ان مین جنوبی باغ کے سامنے ہوا کرتی تھی کیونکہ ایسے حیوانات کی لڑائی کی سیر کے واسطے فاصلہ بہت ضرور ہی اور شاہ اور دیگر ارکان سلطنت بر امدہ شاہ منزل پر سے دیکھا کرتے تھے

خورشید منزل

اس تعمیر کو سعادت علیخان نے شروع کیا تھا اور غازی الدین حیدر نے ختم کیا مگر کسی خاص مطلب کیواسطے یہ عمارت نہین بنی تھی اور بعد تسلط ملک اوس مین سکونت ۳۲ رجمنٹ کا قرار پائی تھی ۔

تارا والی کوٹھی

اس تعمیر کو نصیر الدین حیدر نے بہدایت اکر سر براہکاری کرنیل دلکوکس صاحب کی جو منجم شاہی تھے تعمیر کروایا تھا اور آلہ نجوم بھی اوس مین نہایت اچھے رکھے گئے تھے ۱۸۴۷ء مین کرنیل صاحب ممدوح مر گئے اور واجد علی شاہ نے عملہ صاحب مرحوم کو برخاست کر دیا اور آلہ نجوم بحفاظت رکھے گئے مگر مفسدے مین گم ہوگئے کہین انکا پتا نہ ملا اس سے گمان کیا جاتا ہے کہ مفسدین نے اونکو توڑ ڈالا ہوگا مولوی فیض آباد احمد اللہ شاہ نے جنکو ڈنکہ شاہ بھی کہتے تھے اس سبب سے کہ جب وہ سوار ہوتے تھے تو انکے آگے ڈنکہ بجا کرتا تھا ہنگام بلوہ اس مقام کو قیام گاہ اپنا قرار دیا تھا اور کونسل مفسدین کی اکثر اسی مقام مین جمع ہوا کرتی تھی

میدان

جو درمیان کوٹھی مذکور اور قیصر باغ کے

واقعہ اس میدان کی تحفہ از بس حیرت آمیز باقی ہی یعنی اس میدان مین
دو گروہ صاحبان عالیشان کے جسکے ایک گروہ مین تو وہ صاحب
لوگ تھے جو راجہ دہبوریہ سے بھیجے تھے اور وہ لوگ جو ملی گارد سے
بھاگ کر شہر مین گرفتار دام مفسدین ہوئے تھے اور اس مین مس
جیکسن صاحبہ اور میم گرین صاحبہ اور میم ر جرز صاحبہ اور کیر و صاحب اور
سلیون صاحب بتاریخ ۴ ستمبر ۱۸۵۸ء اور دوسرے گروہ مین بابیان
احسان مندی و مہمان نوازی راجہ تہولی کی جس مین سر جیکسن صاحب
اور کپتان آرم صاحب اور لفٹننٹ بریز صاحب سرجنٹ مورٹن صاحب
بتاریخ ۱۶ ماہ نومبر ۱۸۵۸ء تھی قصہ بیماری و قید و ہجر میتی و نا امیدی کو ختم
کر کے مفسدون کی بیرحمی سے راہی ملک بقا ہوے اور واسطے
یادگاران امور قبیحہ کے ایک عمارت مقابات واردات پر بنائی
گئی ہے دونون یہ واردات باعث غصہ سپاہیان مغلوب کے واقع ہوئی
تھین جب اونسے مقابلہ فوج ظفر موج جنرل ہیولاک صاحب اور سپہ سالار
بہادر افواج ہند کی کوئی بات بن نہ پڑی مگر دونون مین ترغیب اور
تائید سرگرو ہان مفسدین اور رئیسان اودہ کی تھی ایک ان میں سے تھین
سی یعنی راجہ جی لال سنگہ جو ایک بڑا رئیس ملک تھا اور جسکی خاطر داری
درمیان مفسدونکی بہت تھی اور جو ساتھ گروہ اول کے قتل گاہ تک

گیا تھا اور ایک دروازہ قیصر باغ پر جواب منہدم ہو گیا ہی اس مراد
سے پڑھا تھا کہ دیسر اس واقعہ قبیحہ کا اچھی طرح دیکھے کہ کیونکر تڑپ
تڑپ کر یہ لوگ جان دیتے ہین اور کارگزاری اپنی سپاہ کی کہ کسطرح
اونپر ہاتھہ صاف کرتے ہین دو برس بعد اس واقعہ کے وہ بھی
ذیل عاطفت سرکار مین آیا اور اوسکی سرکشی پر بھی چشم پوشی کی گئی
اور اوسکی دل مین یقین واثق ہو گیا کہ تحسر و تکدر واقعہ معلومہ کا
اب صاحبون کے دل سے دور ہو گیا اور گویا اب وہ اپنی موت
مریگا اور سب سے ملاقات ہوگی مگر انصاف نے مجرم کا پیچھا
نچھوڑا اگو مدعا مطلب بر آیا مگر اتفاقاً اور یکایک اوسکے سر پر آفت آ پڑی
اور اوس طرف سے آئی جسطرف سے اوسے بالکل اطمینان
حاصل تھا یعنی اوسکے معتمد ملازم اوسکے مخالف ہو گئے اور ثبوت
پر ثبوت اس امر کا بخلاف اوسکے ظاہر ہوتا گیا اور اوسکے سر پر
بوجھہ اس گناہ کا بھاری کرتا گیا کہ بتاریخ یکم اکتوبر ۱۸۵۹ع
اوسی مقام پر کہ جہان یہ واقعہ ہوا تھا اس راجہ نے سزاے
پھانسی پائی اور بعد ازان بتاریخ ۱۲ ماہ مذکور بندہ حسین اور فتح علی کو بھی
جو چند صاحبان کو اور مقامات سے گرفتار کرلائے تھے سزای پھانسی ہوئی

ایک نہایت عمدہ تعمیر عہد واجد علی شاہ کی ہے یہ تعمیر ۱۸۴۸ء مین
شروع ہوئی تھی اور ۱۸۵۰ء مین ختم ہوئی اور مع اسباب سامان
آرایش کے اس مین اسّی لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا وجہ تسمیہ
اس نام کی یہ ہی کہ بادشاہان اودہ اپنی مہر وغیرہ مین لقب قیصر
کا لکھا کرتے تھے کیونکہ قیصر خطاب بادشاہ روم کا ہے اور شاہ
روم بڑا بزرگ اور نامی بادشاہ اہل اسلام ہے اس تعمیر کے بیان کرنے
مین لازم ہے کہ ایک جانب سے بیان شروع ہو اور بہتر یہ ہے
کہ دروازۂ شمالی اور شرقی سے شروع ہو جو دروازہ روبرو اوس میدان
کے واقع ہے جو سامنے تاراوالی کوٹھی کے تعمیر کیا گیا ہے اسی دروازے
مین سے اور بعد ازان ایک کھڑکی مین سے جواب بند ہے
یہان گرفتار شدہ اپنے قید خانے مین پونہچاے گئے تھے اس
دروازے سے آگے جاکر ایک صحن وسیع روبرو دو دروازہ چلا جاتا ہے
کہ اس صحن مین سواری اور جلو شاہی تیار ہوکر آراستہ ہوا کرتی تھی
یہانسے آگے جاکر ایک دروازہ ہے اوس پر پردہ پڑا تھا اوس سے
گذر کر چینی باغ ہے اسکا نام چینی باغ اسواسطے تھا کہ اوس مین
اسباب چینی کا باغ کی آرایش کیلیے تھا وہانسے آگے جاکر
اور ایک دروازے سے گذر کر حضرت باغ ہے اس باغ کی جانب ا[illegible]

چاندی والی بارہ دری ہی اوس بارہ دری مین فرش چاندی یعنی نقرہ کا تھا
اور اوسی جانب خاص مقام اور پادشاہ منزل ہی جس مین خاص پادشاہ
رہا کرتی تھی اس پادشاہ منزل کا بیان پیشتر ہو چکا ہی کہ اوسکو سعادت علیخان
نے تعمیر کیا تھا اب واجد علی شاہ نے اوسکو اپنے نقشہ قیصر باغ مین شامل
کرایا تھا اوس دروازے پر جس سے گذر کر حضرت باغ کو آتے ہین
نواب علی نقی خان وزیر اس مراد سے رہتا تھا کہ ہمیشہ قریب پادشاہ
کے رہتے اور ہر وقت پادشاہ کی حرکات سے خبر لیا رہے بجانب
جنوب اس مکان سے کے تعمیرات جو لکھی ہی یہ تعمیرات عظیم اللہ خان حجام
شاہی نے بنوائی تھین اور پادشاہ کے ہاتھ چار لاکھ روپیے کو بیچ
ڈالی تھین ان تعمیرات مین خاص خاص محلات شاہی اور خاص محل صاحبہ رہتی تھین
اور بیگم نفسہ بھی انھین تعمیرات مین رہتی تھی اور ایک اصطبل مین
جو متصل ہے قیدیان انگلشیہ کے ہفتے تک مقید تھی یہان سے
آگے چلکر ایک درخت ہی جسکے نیچے سنگ مرمر کا فرش کیا گیا ہے
اور اس درخت کے نیچے واجد علی شاہ زرد کپڑے شل فقیران ہر جو
گیا میلے کے دنون مین بیٹھا کرتے تھے یہانسے آگے بڑھکر لکھی دروازہ
ہی جسکی تعمیر مین لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا اور اوسکے آگے چوک خاص قیصر باغ
کا ہی جسکے گرد بقدر مکانات ہین سب مین حرم شاہی رہا کرتی تھین

بجاہ گست یہان ایک بڑا میلہ ہوا کرتا تھا اور اوس سیپ شہر والے
بغیر مزاحمت کے بار پاتے تھے اس سے آگے پتھر والی بارہ دری ہے
جس مین اب تماشا گاہ مقرر ہوا ہی اور لکھی دروازہ مغربی سے غرب
کیطرف قیصر پسند ہی جسکے گرد نصف دائرہ ملمع طلا کا بنا ہوا ہی اسکو
روشن الدولہ وزیر نصیر الدین حیدر نے تعمیر کیا تھا اور واجد علی شاہ
نے ضبط کر کے معشوق السلطان اور محل خاص کو عطا کیا تھا یہ دروازہ
بھی اوسی مقام کا سا ہی جیسا مغربی لکھی دروازہ ہی اور اس تعمیر کے نیچے کے
مکانات مین جنتی انگلشیہ جو دہورہرے سے آئے تھے مقید تھے
اور یہانسے قتل گاہ کو پہنچائے گئے تھے بجانب راست اس مکان
کے ایک اور جلوخانہ اوسی قسم کا جیسا بجانب مشرق بیان کیا گیا ہی
اسمین سے محلات مین گذر کر اور اوسکے نیچے کی جانب چلکر باہر حدود
قیصر باغ کے جو روبرو شیر دروازے کے ہی آتے ہین اس شیر دروازہ
کو نیل دروازہ بھی کہتے ہین کیونکہ اسی دروازے مین جنرل نیل صاحب
گراب کے گولے سے جو قیصر باغ کے دروازہ کی توپون سے
آیا تھا جان بحق ہوے تھے

تاریخ

چو قیصر باغ را تعمیر فرمود	دل رضوان بہ جنبش گفت باز ک

بعد کاوش بهارش کلک شمشیر | نوشته سال آن باغ مبارک

تاریخ نهر سنگین قیصر باغ که خطاب او چشمهٔ حسن است ۱۲۶۹

حضرت سلطان عالم ابر جود و بحر عدل | ساحل دریای رحمت قلزم حسن صفات

نهر سنگ ابیض از حکمش بنا شد بات و تاب | صورت عین کرم شد چشمهٔ نهر التفات

سال طیاری سروش غیب از شمشیر گفت | چشمهٔ حسن آمده یعنی منبع آب حیات

تاریخ باره دری سنگین واقع قیصر باغ ۱۲۶۹

چون حضرت سلطان عالم شاه اختر دین پناه | واجد علی شاه زمن خاقان جم قیصر حشم

فرمود این باره دری سنگین بصد خوبی بنا | از بهر تشریف آوری مقدم شاه امم

از حسن نیت چونکه شد تیار در عهد شهم | نظارهٔ عتبات عالیها شگرد هیم

آید چو کس نهر بارت اندر آن عنوان در هم | آواز طبتم فادخلوها خالدین در هر قدم

شمشیر چون تاریخ آن پرسید از روح الامین | گفتا مکرر از ادب قیصر ارم قیصر ارم

تاریخ باره دری نگینه واقع حضرت باغ ۱۲۶۹

زهی قصر صفا شد بحضرت باغ تعمیر | از امکان هیولا شد نماز زر جلد برین هند

پی سالش چو جستم کلک شمشیر این رقم کرد | شد از باره دری با نگین زرنگین هند

تاریخ دروازهٔ اول قیصر باغ ۱۲۶۹

ساخت قیصر باغ چون شاه زمان | شد درش رشک در باغ جنان

زد رقم شمشیر بر محراب آن | سال دروازه در باغ جهان

تاریخ دروازہ دوم

در باغ قیصر بلند در بیع	کہ پایندازان کیف زبادو رند
در نیاب قمشیر گرد چو فسک	ندا داد رضوان در باغ ہند

۱۲۶۶ ہجری

مقبرہ سعادت علی خان

درمیان گوشۂ قیصر باغ اور چینی بازار کے دو قبرین ہین ایک تو سعادت علیخان کی جنکو بعد مرگ جنت آرامگاہ کہتے ہین دوسری اونکی بیگم مرشدزادی کی یہ دونون قبرین ان دونونکی وفات کے بعد غازی الدین حیدر نے تعمیر کرائی تھین اس سے محبت ملبشری ظاہر ہی اس مقام پر اول ایک مکان تھا جس مین غازی الدین حیدر بزمانہ خود صن حیات رہتے تھے اور ایک بات مشہور ہے کہ جب غازی الدین حیدر تخت پر بیٹھے تو ظاہر کیا کہ جب مین سعادت علی خان کے تخت اور محل پر قابض ہوا تو مجھے لازم ہی کہ اپنا مکان اون کو دون اسی خیال سے فوراً حکم دیا کہ جس مکان مین وہ رہتے تھے اوسکو مسمار کرکے ایک قبر سعادت علیخان کی تعمیر ہو + +

مکان چھتر منزل

جسکو نصیر الدین حیدر نے واسطے سکونت محلات حرم کے تعمیر کیا تھا اور جسکے متصل کوٹھی فرحت بخش اپنے رہنے کیواسطے بنوائی تھی

اس مکان کا نام چھتر منزل اسواسطے قرار پایا تھا کہ اوسکے اوپر چھتر طلائی
بنے تھے اور نہ اس لحاظ سے یہ نام اوسکو دیا تھا کہ وہ چہار منزلہ ہے
جیسے بعضے بعضے تصور کرتے ہین اس مکان کے ایک جانب
کچہری صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی ہے اس مکان کی وہ طرف جو جانب
دریا ہے اور جسپر نشان گولہای باتواپ جنرل اوٹرم صاحب کے موجود ہین
واسطے دربار عام اور دیگر امور عامہ کے تیار ہوتا ہے

کوٹھی فرحت بخش

یہ کوٹھی عہد سعادت علیخان سے محل شاہی تھا اور واجد علی شاہ
کے اوس عہد تک مقام قیام شاہ رہا جب تک قیصر باغ تیار
نہین ہوا تھا اس کوٹھی کی وہ جانب جو بطرف دریا ہے اوسکو جنرل
مارٹین صاحب نے تعمیر کر کے نواب وزیر کے ہاتھ فروخت کیا تھا
باقی عمارت جو اس سے ملحق ہین اور تختگاہ سب سعادت علیخان
نے بنوائی تھین ان عمارات مین تختگاہ جسکو قصر السلطان کہتے تھے
اور اب یہ مکان یادگارانہ مرمت ہوکر خالی پڑا ہے وہ صرف واسطے دربار شاہی
کے آراستہ ہوا تھا اور جب کبھی نیا بادشاہ جلوس کرتا تھا تو اوسکو
صاحب رزیڈنٹ اس محل مین تخت نشین کرتے تھے اور نذر
دیتے تھے اس نذر سے مراد یہ تھی کہ سرکار گورنمنٹ نے اسکی تخت نشینی

کو منظور فرمایا اسی کوٹھی مین بادشاہ بیگم نے مناجان کو تخت پر بٹھانے
کا ارادہ کیا تھا اور جسکا حال مسٹر بابو سلیمن صاحب نے اپنی تواریخ
اودہ کی دوسری جلد مین تحریر کیا ہی اور اسی کوٹھی مین اوسوقت
جبکہ بیگم ہمراہی بادشاہ بیگم نے کرنیل لو صاحب رزیڈنٹ پر ارادہ
جبریہ نذر دلوانے مناجان کا کیا تھا بدین لحاظ کہ اگر نذر گذر جاویگی
تو تخت نشینی مناجان کی صدر گورنمنٹ تک ثابت ہوجاے گی

کوٹھی رزیڈنسی

یہ کوٹھی بہت مشہور ہی اور اسکا بیان مفصل ضروری ہی جب نواب
آصف الدولہ بہادر دولتخانے مین رہتے تھے جسکا حال
دفعہ ۴۶ مین درج ہی صاحب رزیڈنٹ بہادر اوسکے ایک مکان
مین تشریف رکھا کرتے تھے لیکن جب نواب سعادت علی خان نے
کوٹھی فرحت بخش اپنے رہنے کو بنوائی تو اوسکے نزدیک ایک
کوٹھی صاحب رزیڈنٹ کیواسطے بھی تعمیر ہوئی اور اول مین اس
کوٹھی رزیڈنسی مین کوئی پہرہ جنگی نہین رہتا تھا مگر جب کرنیل سلی صاحب
رزیڈنٹ مقرر ہوے تو اونکے ہمراہ ایک گارد تعینات ہوا اتفاقاً
اور ایک مکان بھی دروازہ احاطہ رزیڈنسی کے نزدیک اونکے واسطے
سعادت علیخان نے بنوا دیا تھا اور یہ دروازہ تمام بنا ہوا بنام

دروازہ بیلی گارد مشہور ہوگیا اس تعمیر کا نقشہ اور بیان گنس صاحب نے
اپنی کتاب مین اور دیگر کتب مین تفصیل بیان کیا ہے اور اب بیان
اوسکا اس مختصر مین موجب طوالت ہے

پل آہنی

یہ پل حسب الحکم بادشاہ غازی الدین حیدر کے ولایت انگلستان
سے طلب ہوا تھا مگر قبل آنے پل مذکور کے وہ آپ شتابا در نجر
بقا ہوے اور اونکے لڑکے نصیر الدین حیدر نے بعد تخت نشینی
کے سنگار صاحب کو جو اونکا ملازم تھا اوسکی درستی کا ٹھیکہ کردیا
صاحب موصوف نے کچھہ کوٹھیان واسطے اوسکے برپا کرنے
کے روبروی کوٹھی ریذیڈنسی کے بہان ایک چھوٹا سا گھاٹ
اور شوالہ ایرپوی دریا واقع ہے گلا ئین اور یہ کوٹھیان ابتک نمودار
ہین مگر اوس سے اسکی درستی نہو سکی اور اسی سبب سے
پل مذکور برپا نہوا تا وقتیکہ امجد علی شاہ بعد محمد علی شاہ کے
تخت نشین ہوئے اور اس بادشاہ نے ارادہ کیا
اور اپنے عزم کو ختم بھی کیا یعنے پل آہنی قائم ہوگیا

تاریخ پل آہنی از منشی ظفر علی اسیر

ان بادشاہ عادل کز حکم محکم او	گردید آہنی پل بر گومتی نمودار

فرمود حکم سلطان تاریخ نظم کردم	چون حکم شاہ محکم چون عدل شاہ ہوا

۱۲۴۲

پل پختہ

نواب آصف الدولہ بہادر نے قریب شاہ مینا کے تعمیر کیا تھا

تاریخ

پل نو بنا گشت بر گومتی	بتدبیر نیک و بعقل رزین
چو از ہمسر خود سال از خواستم	بگفتا پل استوار و متین

۱۲۲۶

قلعہ مچھی بھون

یہ قلعہ جسقدر سابق مین تھا جسکا نام اصل مچھی بھون ہے اوس سے زیادہ وسیع ہو گیا ہے سابق مچھی بھون صرف اوسقدر تھا جسقدر بروج پختہ سڑک کے جنوب کی جانب موجود ہین اور یہی قائدہ لکھنو تھا اور بہت سستی قلعہ دو سو برس پیشتر مشہور تھا ایک مثل قدیم مشہور ہے کہ جسکے پاس قلعہ مذکور ہوگا وہی مالک شہر لکھنو ہوگا اس سالے کے شروع مین جو مختصر حال لکھنو لکھا ہے اوسمین احوال اور نام اس قلعے کا درج ہے اور وہ ٹیلہ جو راستے کے بیچ مین درمیان گھونگھٹ قلعہ سے واقع ہے اور جسکے اوپر مسجد بنی ہوئی ہے وہ لچھمن ٹیلہ مشہور ہے اور اسی جگہ سابق لچھمن پور آباد تھا عقب مچھی بھون خاص کے سوا خوب

ر مغرب ایک میدان ہے جس مین توپخانے کا گودام ہی اوس مقام
پر رنگ محل اور ہیچ محلہ آباد تھے اور یہ ہیچ محلہ نہایت قدیم مکانات
شہر لکھنو کے تھے جنکو خاندان شیخان نے جو سابق حاکم اس
جگہ کے تھے تعمیر کیا تھا جب سعادت خان جو مورث اعلے
خاندان شاہی اس ملک کے تھے ۱۷۳۲ء مین صوبہ دار ہوکر یہان آئے
تو یہ مکانات بکرایہ جاوے ماہانہ مالکان مکانات سے
لیے تھے اور روپیہ کرایے کا اونکے عہد تک ادا ہوتا گیا مگر اون کے
وارثون نے بباعث تخلف آرای پادشاہان لکھنو کے اونکو
مال سرکار تصور کیا اور صفدر جنگ اور شجاع الدولہ نے تو البتہ
اس عمل کو جاری رکھا کہ زر کرایے کا مالکان مکانات مذکورہ کو دیا
مگر زر کرایہ ادا نہین کیا لیکن آصف الدولہ نے یہ عمل بھی ترک کیا
اور مکانات کو بالکل ضبط سرکار کر لیا یہ بات محتاج بیان کی نہین
بلکہ مشہور عام ہی کہ یکم جولائی ۱۸۵۷ء مین جو فوج سرکاری اوسمین
تھی اوسنے کسطرح اس قلعے کو خالی کیا تھا اور کیونکر بیلی گارد
کی جاکر شامل ہوئی تھی اور کس حکمت و مطلب آرای سے اس قلعے کو
فوج سرکاری نے بروقت یہانسے نکل جانیکے اڑا دیا تھا۔

بڑا امام باڑہ

یہ عمارت گویا تعمیرات لکھنو مین ازہمہ بہتر و اعظم ہی اور نواب آصف الدولہ کی سلطنت کے کارہای عظام مین سے عظیم تر مشہور ہی کہ نواب ممدوح نے بیشمار روپیہ اسکی تعمیر مین صرف کیا ہی اور عوام مین مشہور ہی کہ اس مین دس لاکھہ روپیہ خرچ ہوا ہی شاید اس مین کچھہ مبالغہ بھی ہو کیونکہ قول ہندیان ایسے مقام مین ہمیشہ ساتھہ مبالغہ کے ہوا کرتا ہے کارگیر اس کام کیواسطے بہت دور دور سے طلب ہوے تھے اور سبکو حکم ہوا تھا کہ اپنی اپنی رای سے نقشجات واسطے اس مکان کے پیش کرین صرف تاکید یہ تھی کہ کسی عمارت کی نقل نہو اور یہ مکان ایسا تیار ہو کہ کبھی ایسا پیشتر نہ بنا ہو اور جتنی تعمیرات مشہورہ ہین سب سے زیادہ خوش قطع اور خوش اسلوب ہو کفایت اللہ ایک شخص تھا جسکی تدبیر سے یہ تیار ہوا ہے اور جیسا وہ اب موجود ہے اوس سے ظاہر ہے کہ جو شرائط نواب کی تھین اونمین کمی نہین ہوئی ہی یہ عمارت اوسیقدر مضبوط ہی جسقدر خوبصورت اور خوش قطع ہی بنیاد اسکی بہت عمیق ہے اور ساری عمارات مین لکڑی کا کام بالکل نہین ہے اوسکی در وسعت ۱۶۷ فٹ سے ۵۲ فٹ تک ہی اور نواب آصف الدولہ بہادر بعد وفات کے اسی مقام مین دفن ہوے ہین *

تاریخ امام بارہ کلان

کرد نواب آصف الدولہ	چون بنا جای غم حسین بن
داد ہاتف خبر ز تاریخش	روضۂ امجد امام دین

۱۲۲۵

جامع مسجد

یہ عمارت متصل امام باڑے کے ہے اور لائق تعریف نہیں
یہ مسجد نقل ہے اوس جامع مسجد کی جو شہر دہلی مین ہے

رومی دروازہ

یہ دروازہ بھی نواب آصف الدولہ کے وقت مین تعمیر ہوا ہے اور
مشہور ہے کہ نقل دروازہ روم کی ہے مگر جو لوگ روم کو
دیکھہ آئے ہین وہ بیان کرتے ہین کہ ایسا دروازہ کوئی
شہر روم مین نہین ہے غالب ہے کہ نواب کو کسی شخص نے
مغالطہ دیا ہو کیونکہ اگر وہ چاہتا کہ نقل دروازہ روم کی بنے
تو اس مین شک نہین کہ دو صد نقشہ دروازہ ہای روم
دوسرے ہی روز اوسکے سامنے پیش ہوتے یہ دروازہ
اور امام باڑہ کلان دونون اوس زمانے مین بنا شروع
ہوے تھے کہ جب لکھنو مین قحط سالی تھی اور اسی لحاظ سے
یہ عمارات عالی شروع ہوئی تھین کہ جس سے غربا باشندہ شہر و شرفا پرگنہ

دولتخانہ

اس دروازے سے جو غرب کو چلو تو دولتخانہ یا محل قدیم لکھنو بجانب راست رہتا ہی یہ تعمیر یعنی دولتخانہ مشتمل ہے اور متعدد مکانات کے جو متصل ایک دوسرے کے ہین مگر اونمین کچھ ہنر معمارونکا صرف نہین ہوا ہی ان مکانات مین نواب آصف الدولہ اور اونکے عملے رہا کرتے تھے جب نواب نے فیض آباد کو چھوڑکر لکھنو کو اپنا دار القرار ٹھہرایا تھا اور خاص محل نواب کا اوسیکے نام سے مشہور تھا یعنی جس مکانمین وہ آپ رہا کرتے تھے اوسکو آصفی کوٹھی کہا کرتے تھے مگر جب سعادت علی خان بعد اونکے مسند نشین ہوے اور مقام اپنا اونھون نے فرحت بخش مین مقرر کیا تھا تو یہ مکانات خالی رہے اور اسی سبب سے خستہ اور شکستہ ہو گئے

امام باڑہ حسین آباد

صرف یہ عمارت محمد علی شاہ سوم بادشاہ کے زمانے مین تیار ہوئی تھی اور ہرچند اس مین کچھ کاریگری صرف نہین ہوئی ہے مگر خوش اسلوبی مین کسی اور عمارت لکھنو سے کم نہین اسکا باغ جو مربع ہی اوسکی خوشی وعمدگی کو اون عمارات نے جو اوسمین بطور نمونہ تاج روضہ کے بنی ہین اور چھوٹی چھوٹی عمارات جو اوسمین ہین اونھون نے

خراب کر دیا ہی اس حسین آباد مین بڑی رونق معلوم ہوتی ہی جب او میں
شبکور روشنی ہوا کرتی ہی اور جب لکھنو مین سلطنت تھی تو محرم میں
بڑی دھوم ہوا کرتی تھی محمد علی شاہ نے اپنی والدہ کی نعش کو اوسمین دفن
کیا ہے اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ اونکا جنازہ بھی اوسمین دفن ہو اور
زر کثیر واسطے تزئین و رونق اس امام باڑے کے نام نہاد
کیا تھا جو داروغہ مہتمم اس امام باڑہ کا قبل از بلوے کے تھا اور
باعث اوسکے عکس کی تصویر اونچینے کے اکثر صاحب لوگون سے
اوسکی ملاقات تھی مگر وہ اس بلوے مین جب لوجان تنفق مفسدین
کے ہوا تھا اور ایک گروہ کا جرنیل ہو گیا تھا اور اوسکی ملاقات
نہ ہونے صاحب لوگونکے کسیطرح مانع اوسکے شامل ہونیکی نہوئی

تاریخ امام باڑہ

جناب محمد علی بادشاہ	پسندیدہ بارگاہ اِلٰہ
بصدق و صفا تعزیہ خانہ ساخت	بلند از سما تعزیہ خانہ ساخت
خرد سال جاے عزای حسین	بگفتا مزار شہ بیشہ قیر

۱۲ ۵ ۳

تاریخ دروازہ امام باڑہ

شاہنشہ زمانہ ہو نوشیروان عصر	فرمانروای عالم امکان بود مدام
باب امام باڑہ والا بنا نمود	یارب بود قبول امام فلک مقام

ف بگفت مصرعہ سال تاریخ — باب امام بارہ سلطان خاص و عام

۱۲۵۳

تاریخ سبیل

شیران عصر ابو الفتح شاہ ہند — مقبول بارگاہ شہ مشرقین ہے

بھوائی ہے سبیل تو تاریخ یہ ہوئی — اب یہ سبیل نذر جناب حسین ہے

۱۲۵۴

تاریخ چاہ

ب این چاہ ز شیرینی خود — شربت قند و نبات پاک ست

ہست تر مصرع تاریخ رسید — چشمہ آب حیات پاک ست

۱۲۵۴

تاریخ حمام

سلطان جہان خدیو عادل — سرای زمانہ شاہ عادل

حمام لطیف کرد تعمیر — تاکید نمود بہر تطہیر

تاریخ سعید ہست ظاہر — حمام لطیف حوض طاہر

۱۲۵۴

تاریخ سڑک

خسرو ہند ابو الفتح معین الدین — رشک شاہان جہان بادشہ ہندستان

چون سڑک ساخت بنا مصرع تاریخ بگفت — ہست این نوع سڑک جادۂ راہ ایمان

۱۲۵۴

تاریخ ضریح

عرش آئین ہی کہیں عالی مقام ہے — یہ روضہ حسین علیہ السلام ہے

تاریخ اس ضریح کی مطلوب جب ہوئی — بوسہ ملک ضریح قبول امام ہے

۱۲۵۴

تاریخ سرای بن با

ابو الفتح منصور شاہ زمانا	محمد علی سایہ حق تعالے
رضا گفت تاریخ از حکم سلطان	سرائی ابو الفتح شاہ معلے

تاریخ رصد حسین آباد ۱۲۵۵

چو محمد علی شہ دوران	ساخت در لکھنو رصد تیار
مکر وسالش رستم ہندس گو	این رصد شد بحکم شہ تیار

تالاب نہ کھنڈہ حسین آباد ۱۲۵۴

متصل حسین آباد کی محمد علی شاہ نے ایک بڑا تالاب تیار کیا تھا جو اب سر راہ ہوگیا ہے اور متصل امام باڑہ کی تعمیر ایک مسجد کی شروع کی تھی جسکو اونھون نے چاہا تھا کہ جامع مسجد سے بہتر بنے مگر اونکی حیات نے وفا نکی اور قبل اوسکے ختم ہونے کے وہ خود ختم ہوگئے یہ مسجد ناتیار اب تک موجود ہے مگر چونکہ اوس وقت سے اب تک مرمت بھی نہین ہوئی اور اب عرصہ اٹھارہ برس کا ہوا اسواسطے اب وہ بہت خستہ وشکستہ ہوگئی ہی اسسال ۱۸۶۳ء مین نماز عید الفطر کی بہی اسی جامع مسجد مین ادا ہوئی پہلے شرف الدولہ غلام رضا خان کی کاظمین مین ہوا کرتی تہی اس بادشاہ نے ایک اور تعمیر شروع کی تہی جسکو نہ کھنڈہ کہتے ہین اور

اور ارادہ تھا کہ اسکو سات منزل کا بنوا کر اوسکے اوپر سے سیر
تمام عمارات شاہی کی جو اوسنے میان شہر پایل بنوائی تھی کیا کرے
مگر یہ تعمیر بھی ناتیار رہگئی اور صرف چار منزل اوسکی پوری ہوئی

تاریخ جامع مسجد

شاہ ہندوستان معین الدین ‌‌ فخر کسرا و قیصر و فغفور
نام نامی حضرت اعلے ‌‌ بمحمد علی شدہ مشہور
مسجدے بی نظیر کرد بنا ‌‌ سجدا ہست رہبری منظور
ہر منارہ عماد گردون شد ‌‌ پیش گنبد نماند رفعت طور
مہتمم گشت اعظم الدولہ ‌‌ جان نثار حضور شد مامور
برق موزون نمود تاریخش ‌‌ مسجد جامع جدید حضور

۱۲۵۶

موسی باغ

یہ باغ نواب آصف الدولہ نے تیار کروایا تھا اور جو تعمیرات
اوسمین ہین اونکو سعادت علی خان نے واسطے سیرگاہ
خاص کے بنوایا ہے اونکے وقت مین لڑائی حیوانات کی اوس
مین ہوا کرتی تھی اس نام کی روایت مشہور یہ ہے کہ ایک روز
آصف الدولہ سوار اوسطرف جاتے تھے اور سب ہمراہی پیچھے تھے
کہ وہان ایک چوپایہ مثل موش نکلا اور نواب کے گھوڑے کی

ناب ہے وہ مرگیا اوسکے مرنے سے کچہ دلمین اوسکے رنج آیا اور
اس لیے حکم دیا کہ ایک قبر اوس موش کی اوس مقام پر تیار
ہو اور باغ بہی بنے اور اوسی موش کے نام سے یہ تعمیر مشہور
ہوئی کیونکہ موش کو ہندی مین موسا کہتے ہین مگر ایک اور
روایت بہت قرین قیاس یہ ہے کہ سعادت علی نے یہ تعمیر
باہتمام ایک فراسیس کے تیار کروائی تہی اوسکا نام تو بھول گئے
مگر اوسکے اول کا حرف یعنی موسیو یاد رہا جسکی کثرت استعمال سے تخفیف ہوکر رہگیا

مکانات اراکین شہر

شہر لکہنو مین کوئی تعمیر ایسی نہین جسکی خوش وضعی قابل تعریف کی ہو
یا جو ایسا قدیم ہو جسکا ذکر کرنا واجب آوے

آج کل شہر کا نواب آصف الدولہ کے وقت مین تیار ہوا تھا
اور جو دو دروازے اوسکے دونون جانب ہین اونمین سے ایک
دروازہ جو جانب جنوب ہی اوسکو بہت قدیم بتلاتے ہین اوسکا
نام اکبری دروازہ ہی اور مشہور ہے کہ جب اکبر شاہ نیپال پر گئے تھے
شہر لکہنو ہوکر گئے تھے اور جب نیپال فتح کرکے آئے
یہ دروازہ یہان تعمیر کیا تہا مگر اس روایت کی صداقت
کسی کتاب تاریخ سے نہین ہوتی اور غالب ہی کہ غلط ہو کیونکہ

ایک آدمی کے نام کے سبب سے اوسکی تعمیر قرار دینا موجب تامل مگر ایک روایت قرین قیاس ہو کہ کسی صوبہ دار اوده نے اوسکو بنوایا تھا اور جس بادشاہ کے وقت مین کہ اول صوبہ داری اس علاقی کو قرار پائی تھی اوسکے نام سے اوسنے اس دروازے کو مشہور کیا جو کہ سے اگر سجانب کانپور چلو تو دو عجیب درگاہین ملتی ہین ایک کو کاظمین کہتے ہین جسکو شرف الدولہ نے بنوایا تھا اور مشہور ہو کہ یہ نگاہ نقل مقبرۂ امام موسی کاظم ہے اور دوسری کربلا دیانة الدولہ کی نقل مقبرۂ امام حسین کی ہی جو کربلا مین بنی ہے

تاریخ کاظمین شرف الدولہ

مشہد اقدس بنا چون شرف الدولہ کرد	سایہ بفرقش شدہ فضل شہ خافقین
از شرف شہ سپہ اش گشتہ منور زمین	گنبد گردون از ان یافتہ صد زیب و زین
واہ چہ شرف النسا کرد اعانت در آن	ہر دو شرف یافتند از قدم آن شہ فقیر
رابکہ در داشتم در شرف از بہر شعر	صحت نفظی مگر آمدہ از نجمتین
نکتہ نشتہ شبیر شدہ چون پی تاریخ سال	گفت سروش فلک گوحرم کاظمین

۱۲۶۹

یہ دونون درگاہین جب تک اونمین روشنی چراغان نہو کسیطرح لائق تعریف کے معلوم نہین ہوتین اور قابل دیکھنے کے نہین بلکہ اونسی صاف ظاہر ہوتا ہی کہ ایسی بد وضع عمارت بھی انسان بنوایا کرتی ہین

درگاہ حضرت عباس

ایک اور درگاہ متبرک اہل اسلام مین ہے ایک روایت مشہور ہے کہ سعادت علیخان اپنی مقام مین یتی (؟) نہ دیکھا ایک جونک اوسپہ تھے اور اوس روز سے وحشت و بدمزاجی جو اون کے مزاج مین سابق تھی اوسکو چھوڑ کر بہت رحم دل اور ضعف دل ہو گئے تھے مگر یہ روایت متعصبی لوگون کی مشہور کی ہوئی معلوم ہوتی ہے

تاریخ درگاہ حضرت عباس

این گنبد جدید بنائے سعادت ست

ملکہ زمانیان کا امام باڑہ

یہ امام باڑہ گولہ گنج مین بسبب وسعت اور فراخی کے مشہور ہے یہ گویا ایک شہر ناف شہر مین واقع ہے مگر اوس مین کوئی تعمیر لائق تعریف کے نہین

وینلفلڈ منزل

یہ عمارت عالیشان تعلقہ دارون کی طرف سے یادگار جناب سر وینگفیلڈ صاحب بہادر چیف کمشنر اودہ بحسن اہتمام راجہ درگبجی سنگہ صاحب بہادر و راجہ مانسنگہ صاحب بہادر طیار ہوگئی ہے اسکے طیاری مین قریب دو لاکہ روپیہ کی صرف ہوئے ہین

شہر لکھنو کے باشندون کا حال

آدمی را بچشم حال نگر
از خیال پری و دیو بگذر

بڑا خاندان شاہی ہی لگلے نواب و بادشاہون کی نسل سے اونکے بیوی اور نواسا اور بیگمات وغیرہ بکثرت ہین سبکا علی قدر مراتب وثیقہ ہی عیش وعشرت سے گذران کرتے ہین

شاہ دہلی کی نسل سے اولاد جہاندار شاہ و مرزا سلیم سے بہی یہان چند شاہزادے ہین اسی سرکار سے اونکو وثیقہ و پنشن سے قوت لایموت ملتا ہی

عزیزان برہان الملک سعادتخان سے شاہزادہ ہای نیشاپوری کا بہی عالی خاندان ہی اونکے وثیقے بہی اچہے اچہے ہین سب چین کرتے ہین مگر بعض بیچارون کا وثیقہ غدر کی چپقلش مین بند ہوگیا اوس سے یک لخت فقیر ہو گئے - مقام افسوس ہی و عبرت

اونکے بعد امرای شاہی ہین جنکی نسل بلا واسطہ وارہی اکثر وثیقہ دار اور صاحب معاش و نوبت وغیرہ سے خوش گذران ہین اونمین ہندو بہی ہین اور مسلمان بہی تو اونکے ہندو مسلمان سوداگر تاجر مہاجن بہی کروڑپتی لکہ پتی سے لے کر ہزار پتی تک اکثر ہین اور سپاہگری اچہی مگر نسبت عہد شاہی کے روزگار اونکا سست اور معاش واجبی ہی مگر غنیمت

بعد اونکے لوگ روزگار پیشہ ہین جو اسی شہر یا بیرونجات اور راور ملک مین نوکری کرکے بسر اوقات کرتے ہین

علم کی کثرت ملا فاضل اکثر عربی فارسی کا درس اور علم بیان کا شہرہ اور طلبہ کی کثرت اور یہ شہر علم کی ٹکسال ہر علم وفن کا آدمی یہان ہر اور طبیعت اردو کی خوشنویس بہی ہر خط کے صاحب علم حافظ خوش الحان ایک سے ایک اعلی

پہر اہل حرفہ اہل حرفہ ہر قسم کے دستکار صناع موجود بکثرت ہر کام مین کمال رکہتے ہین اور بہ نسبت اور شہرون کے یہان کے صناع غنیمت اسی طرح دوکاندار بہی کہ وہ بہی ایک فرقہ ہی یہان بسبب شیعہ مذہب کے مسلمان بقال اور حلوائی وغیرہ دوکاندار بہی اکثر ہین

اس شہر کا جوتا اور کلاہ زری وکارچوب کامدانی اور خمیرہ تماکو اور زیور مرصع وزیور وظروف طلا ونقرہ وکمہار ونقاش وآتشباز وچکن ساز عمدہ سے عمدہ شہرہ دیار وامصار وساور ہی دور دور رمال جاتا ہی مگر بہ نسبت عہد شاہی کے سب کام اب کم ہی صرف بہی کم ہی

ہندو مسلمان کے میلے بارہ مہینے اس شہر مین بکثرت اور دہوم سے ہوتے رہتے ہین مگر بڑی دہوم دہام محرم کے عشرے مین ہوتی ہی غرۂ محرم سے روز رنگ اور کہین پندرہ دن بہی ہزارون گہر مین روزمرہ مجلس تعزیت ہوتی ہی رات ہوتی شیعہ پلنگ پر نہین سوتے شادی کی رسم نہین کرتے زیور خوش پوشاک

سین پہنتے پان نہین کہاتے تعزیہ داری ہر گہر مین ہوتی ہی امام باڑے بڑے
اور اونمین آرایش اور روشنی کثرت اور مرثیہ خوانی سوز راگ اور تحت لفظ
جہان مین بی نظیر کتاب خوانی و ماتم کی انتہا — عیش باغ اور علی گنج او
سورج کنڈ کا میلہ بہی مشہور تہو

واجد علیشاہ کے جانے سے ہزارون آدمی اور اکثر امرا و وزیر و بیگمات بہی
اوسکے ساتہ کلکتے چلے گئے اسلیے رونق شہر کی بالکل کم ہی جو بہی
کلکتے مین اونکی ایک علحدہ آبادی تکلف اور سامان کی دلچسپ خوش
معلوم ہوتی ہی ع صد رہ رہا کہ نشبند صد دست

مرد یہان کے تماشا بین عیاش تن پرور خوش باش اکثر ہین اسلیے یہان کی
عورت کا چلن بہی کم پسندیدہ ہی کسبی ہانے مین لونڈے بازی یہان کی
مشہور ہی کہی رنڈی بازی کبہی جوا کبہی نشا کبہی چوری مگر اب بہی جسقدر
خیرات اور علم یہان ہی اور جگہ کم ہی — ہزارون اونمین حاجی ہین جو کربلا
اور حج ہو آئے ہین اور ہر سال صدہا ہزارہا آدمی کا قافلہ جاتا ہی

موسم یہان کے سب غنیمت مگر برسات مین فضا اور سبزہ زیادہ خوشنما ہوتا ہی
اور ہوا دلچسپ شہر کی آب وہوا ذرا اچہی نہین پانی بہی کہاری ہی جا بجا نشیب
فراز و نالہ وغیرہ مگر اب صفائی ہوتی جاتی ہی قرب دریا سے سفید پوشی
زیادہ ہی — حضرت گنج و زامیدان اور بلندی پر ہی اس لیے وہان کی

اب وہان فضا بہت خوب ہی

ہندو مسلمان مین جہان شادی دہوم سے کرتے ہین روشنی آتش بازی تخت آرایش
ناچ تماشا محفل تکلف اور سامان سے ہوتی ہی بلکہ بہی اپنے اوستار سامان سے
دہوم سے لیجاتے ہین لڑکی کی طرف سے مقدور بہر جہیز بہی دیا جاتا ہی اور
اوسکو اپنی نیکنامی جانتے ہین ہندو کی برات سے قبل سوگی نام سامان تخت کے مع
تخت آرایش وغیرہ اوٹہتا ہی وہ زیادہ تر قابل دید ہی عجیب عجیب کہلونے میوہ
لقشا ویز دکان وغیرہ ہو بہو اصل جیسے ہوتے ہین

عہد واجد علیشاہ سے پریون کا ناچ اور اوسکے بہاو بہاو کا رواج ہی ایک اندر اور
دو چار دیو اور دو چار پری بنکر فسانۂ حسن و عشق بطور قصہ کے گاتے ہین اور ایک
لطف آمیز کہانی سناتے ہین غرض گذشتہ حال عاشق و معشوق کی صورت کر
دکہاتے ہین یہ اور کسی شہر مین نہین ہی اونکا مجرا دس بیس سے سو پچاس تک ہی
انہون لباس کا رواج زیادہ ہی اور رنگین پوشاکی کا بہی اس لیے رنگریز اور حقہ والے
اور تمبولی کی دکان اکثر ہین کوئی بازار اور کوچہ اور محلہ خالی نہین نہ نیک
خاص اس شہر کی ساقن مشہور ہین اور اکثر ہر میلے مین اونکا ایک بازار ہی علیحدہ
ہوتا ہی

ساقن ایک عورت ہی جو بن سجکر دکان حقہ دبنگ چرس وگانجہ لگاتی ہی گالی
بجاتی بہی ہی تکلف سے دکان کرتی ہی اکثر بازاری بانکے اوباش فقیر لی حقہ باز

ونکی دکان ہی حقہ افیون وغیرہ کہاتے پیتے ہین کہ سکو ایک پیسے سے لیکر روپیہ تک
دیتے ہین او نمین ایسے پچاس پچاس ہزار لاکہ لاکہ تک کی ذی مقدور ہی تہین
اب بہی سو پچاس سے پانچ سات ہزار تک کی صاحب مقدور بہت ہین اونکے
لباس زیور اور انداز پر اجنبی آدمی یہی جانے کہ یہ بہی کوئی بیگم صاحب ہین
بڑے بڑے عالیشان مکان اور محلات محلہ و بازار کہد گئے اب بہی جابجا بازار
بہت ہین مگر چوک کا گذر زیادہ رونق کا ہی ہر قسم کے دوکاندار جوہری بزاز
دوشالہ فروش جفت فروش صراف ہنڈی والے داگر نان بائی حلوائی عطر فروش
گلفروش سبزہ فروش وغیرہ قسم قسم کے تکلف سے بیٹہتے ہین مگر ۲ بجے سے
شام تک خوب گرم بازاری اور رونق و کثرت ہتی ہی شہر کے امیر غریب بہی اکثر
سیر کو آتے ہین یہ بازار عہد اکبر شاہ کا بنا ہوا ہی اسی سے اکبری دروازہ مشہور ہی
عہد سرکار مین دو بازار کلان عریض بننے شروع ہوئے مگر آبادی و عمارت اونکی
ابہی ناتمام ہی

شہر بازار اکثر اور ریون ہی قوم طوائف اکثر رہتی ہین شام کو سج بنکر باہر کمرے پر
بیٹہتی ہین اونکے ٹہاٹ اور زیور و پوشاک کا تکلف بیگمات سے کم نہین گانا
بجانا بتانا یہان کا ہند مین ضرب المثل ہی کیون نہو جہان اونکے میراثی انکی بدولت
نواب وردار ہو گئے اور وہ خود اکثر بیگمات بن گئین اور خود بادشاہ سلامت
گاتے بجاتے ہون واقعی الناس علی دین ملوکہم ؞

اونکا مجامعہ رسے عشق تک ہوے انہین اکثر لکہوتی بہی ہین سیہو ۱۱ صحیح

خانگیان کی شمار ذرمن تخش کی کثرت اور رہار کم معاذ اللہ

شہرمین مسلمان اکثر ہندو اوسنے کم مگر باہم اتفاق اور سلوک اور رسم

مسلمان مین سنی کم اور شیعہ اکثر اسکی تفصیل ضرور نہین اسی قدر بس ہی کہ دونون

مسلمان ہین مگر مثل روہن کیتہلک اور پراٹسٹنٹ کے نزاع لفظی ہی بس

ہندو عورات کی وضع خاص ہوتی ہی مگر مسلمان مرد اور ہندو مرد کی وضع لباس

سب یکسان ہی داڑہی منڈانے کا رسم علی العموم اور داڑہی رکہنا معیوب ہی

نفاست نزاکت خوشخوری خوشپوشی تکلف تکان اور رسوم شادی فضول خرچی

مین یہ لکہنو ہند مین انگشت نما گویا ہند کا پارس فرانس ہی

بعد دہلی کے اردو ریختہ زبان یہان کی ہند بہر مین فصیح اور صاف و شستہ

و مستند شعر و شاعری کا چرچا بکثرت ہمیشہ جابجا مشاعرہ اب بہی ہوتا ہے ذرا ایسے

شعر ہر شاعر اکثر پڑہتا ہی بہت سے شعرا نامی گذرے اب بہی اکثر ہین اور صاحب

دیوان علی بدا مرثیہ گوئی مین انیس و دبیر نے مثل مصحفی آتشا میر جرات سوز

آتش ناسخ ذریہین کے شاعر ہین اور اب نثر مین سرور موجود و قت

جناب مولوی ہادی علی اشک تو جامع کمالات صوری و

معنوی نظم و نثر فارسی مخصوص اردو زبان ریختہ و محاورہ مین

یکتاے روزگار ہین فقط

خاتمہ

شکر و احسان خداوند حقیقی کا کہ بعجلتہ یہ چند اوراق منطبع ہوئے
تصحیح و نظر ثانی مؤلف کی نوبت نہین پہونچی اکثر غلطی غلطنامہ سے
رفع ہو سکتی ہی اور اتفاقاً اگر ناظرین با تمکین سہو و خطا کہ لازمۂ بشریت ہے
پاوین معاف فرماوین ع کہ ہیچ نقش بشر خالی از خطا نبود
منشی طوطا رام شایان کی توجہ سے یہ سحر سازی تاریخون اور تلاش مطالب
کے شایان تعریف ہے اور سلاست فکر خداداد پسندیدہ
صاحب جوہر سامنشی گوبند پرشاد متخلص فضا خوشنویس مطبع نے بدیہی

یہ ایک قطعۂ تاریخ موزون کیا

چھپا احوال شاہان اودہ کا	عبارت جسکی ہی دلچسپ و مرغوب
جو مین کرنیل ایبٹ صاحب جا	اونھین سے اُنکی ہی تالیف منسوب
خدا پھر اونکو لاوے لکھنؤ مین	یہ دن فرقت کے ہوان گھڑیونسے محسوب
فضا موزون ہوو تاریخ تالیف	کہ ہو اہل سخن کو دل سے محبوب

اودہ نے سرے کی تاریخ مقبول

کر چھاپی تواریخ اودہ خوب

۶۱۸۶۳

کیا اردو کی لڑائی میں مسلمان تنہا ہیں؟

ـــــــــــ ڈاکٹر سروپ سنگھ



اردو کی جنگ ایک بڑی جنگ کا حصہ ہے جو ۴۷ء سے ۹۱ء تک جاری ہے۔ یہ بڑی
جنگ ہندستان کو آزاد، باوقار دنیا میں سینہ تان کے سر اٹھا کے چلنے والا دیش بنانے والو
اور ہنوز غلامانہ فضا میں سانس لینے والوں کے درمیان برپا ہے۔ یہ جنگ اس مہان
دیش کو سیکولر بنانے والوں اور عہد قدیم یا عہد متوسط کے اندھیروں میں بھٹکنے والوں کے
درمیان ہر سطح پر برپا ہے۔ اردو کی لڑائی مذہب کی لڑائی یا فرقہ کی لڑائی نہیں ہے۔ یہ ایک
بنیادی سیکولر لڑائی ہے جس کی حقیقت کو ہندستان کے بنیادی شہری اچھی طرح سمجھتے ہیں
یہ آزاد ہندستان کے بنیادی شہریوں اور غلام ہندستان کے وفاداروں کے درمیان ایک
لمبی لڑائی ہے۔ ۴۲/۴۴ سال بیت چکے اتنے ہی اور بھی بیت سکتے ہیں ڈرنے کی اور ما
کی کوئی وجہ نہیں بس سمجھنا سمجھانا ہے جو بھی ہیں اپنے ہیں نا سمجھ ہیں غیر نہیں ہیں۔ یہ کتنے
اور کتنی بڑی طاقتیں اردو کے ساتھ ہیں سروپ سنگھ اور آنند نرائن ملا یا تارنگ یا رام لعل
دو چار نہیں سیکڑوں ہیں اور یہ اردو اردو اس لیے نہیں کرتے کہ آپ کو خوش کر
ہے بلکہ اس لیے کہ یہ ان کے عقیدے کا ایک جزو ہے ایمان کی ایک کڑی ہے کہ اردو کی لڑائی
ہندستان کی بقا کی لڑائی ہے ———— ادار

ڈاکٹر سروپ سنگھ
(گورنر گجرات)

کیا اردو کی لڑائی میں مسلمان تنہا ہیں

کیا اردو والوں کو اپنی لڑائی تنہا لڑنا ہوگی؟ جی نہیں ایسا



ڈاکٹر سروپ سنگھ

نہیں ہوگا۔ یہ نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہونا ہی چاہیے۔ اور اس کے کچھ وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان کے چار کروڑ اردو بولنے والے مسلمان اور دوسرے اردو کی

حمایت کرنے والے کسی ایک سیاسی پلیٹ فارم پر اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ چاہے آپ کچھ بھی کیوں نہ کریں۔ انھیں ایک جگہ اکٹھا کرنا عقل مندی بھی نہیں ہے۔ میں شہاب الدین صاحب کی اس بات سے سولہ آنے متفق ہوں کہ کوئی سیاسی محاذ، جو صرف مسلمانوں تک محدود ہو، مسلمانوں کے اپنے ہی مفاد میں نہیں ہے۔ ہمیں ان سب لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے جو ہمارے ساتھ آنے کو تیار ہیں۔ کیوں کہ یہ سوال صرف اردو کا نہیں ہے۔ ملک کے مستقبل کا ہے۔

پنڈت نہرو نے ایک بار کہا تھا:

THE CHOICE BEFORE INDIA IS NOT BETWEEN A SECULAR INDIA AND A HINDU INDIA: IT IS BETWEEN A SECULAR INDIA AND NO INDIA AT ALL.

یہ بات انھیں اس لیے کہنا پڑی کہ انہی دنوں پاکستان بنا تھا اور وہ لوگ جو آج اردو کی مخالفت کر رہے ہیں وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ چونکہ پاکستان ایک اسلامی حکومت ہے، ہندوستان کی حکومت کو ہندو حکومت ہونا چاہیے۔ پنڈت نہرو ہی نہیں بلکہ اس دور کے دوسرے سیاسی رہنما بھی اس بات سے واقف تھے کہ ایسا کرنا ملک کے لیے نہایت خطرناک ہوگا۔ اور تو اور جناح صاحب بھی اس بات سے واقف تھے اور اسی لیے انھوں نے پاکستان کو بھی اسلامی حکومت نہیں بلکہ ایک سیکولر حکومت بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ مگر ان کی بہت جلد موت ہو گئی اور پاکستان کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ایسے ہندوؤں کی تعداد ہندوستان کی ساری مسلم آبادی

سے کہیں زیادہ ہے جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر ہمیں ملک کو ایک ٹھیک راستے پر چلانا ہے تو اقلیتوں کے ساتھ ہر طرح کا انصاف کرنا ہوگا۔ ان کی تہذیبی قدروں کی حفاظت کرنا ہوگی۔ انھیں ایسے موقعے دینے ہوں گے جس سے وہ اپنے بچوں کی تعلیم اپنی زبان میں جس طریقے سے اور جس سطح تک چاہیں کرا سکیں۔ ہم سب کو یہ بھی معلوم ہے کہ بہت سے ہندی لیکھک بھی یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہندی کی مددگار اگر ملک میں کوئی زبان ہے تو وہ صرف اردو ہے اور اردو کی حفاظت کرنا دراصل ہندی کی ہی حفاظت کرنا ہے۔ اگر ہم ایسے لوگوں کو جو ہمارے ساتھ اس لڑائی میں شریک ہو سکتے ہیں بھولتے ہیں تو غلطی کرتے ہیں۔

ملک کے سامنے ایک مسئلہ ہے جس کا حل بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ پنڈت نہرو کے وقت ہی اردو کی تعلیم کا جو پرانا انتظام تھا اس میں کچھ ترمیم کر کے اسے ہی جاری رکھنا چاہیے تھا۔

میں پنجاب میں ایسے اسکول میں پڑھا تھا جہاں پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک حساب اور سائنس کو چھوڑ کر باقی سب مضمون اردو کے ذریعے پڑھائے جاتے تھے۔ کالج میں ان دنوں ذریعہ تعلیم اردو کی بجائے انگریزی تھا۔ میں نے سنا ہے کہ یو پی میں اسکول میں اردو اور ہندی دونوں زبانیں پڑھانے کا انتظام تھا جو کہ میرے اسکول میں نہیں تھا۔ اس کا مجھے نقصان یہ ہوا کہ مجھے ہندی سیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ اچھی بات یہ ہوتی کہ دونوں زبانیں آٹھویں جماعت تک لازمی قرار دی جاتیں اور پھر طالب علم کو جس زبان میں بھی وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا

[illegible]

آزادی کے بعد اردو کی تعلیم سب جگہ کیوں ختم کی گئی۔ کیوں اس وقت کے ملک کے رہنماؤں نے ایسا ہونے دیا۔ اس پر لوگ زیادہ بات چیت نہیں کرتے مگر ظاہر ہے کہ اس سے بہت بڑا نقصان ہوا۔ خاص طور پر یہاں کے مسلمان کو یہ احساس ہونے لگا کہ اب یہ میرا ملک نہیں ہے۔ سمجھدار ہندوؤں کو یہ فیصلہ کرنے میں کافی وقت لگا کہ مسلمانوں کے دل میں ایسا خیال پیدا ہونا نہ صرف ان کے لیے بلکہ ہم سب کے لیے خطرناک ہے۔ کچھ سیاسی پارٹیوں کو بھی یہ احساس ہوا مگر شاید سب کو نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ الکشن کے وقت سیاسی پارٹیاں صرف ووٹ پر نظر رکھتی ہیں۔ اور کسی قسم کے بڑے فیصلے کرنے سے جھجکتی ہیں۔ خاص طور پر یو پی کے بارے میں میرا ہلکا سا تجربہ ہے۔ میں نے پچھلے دنوں کچھ ایسے سیاسی نیتاؤں سے بات کی جو اردو کا کئی بار ذکر کر چکے تھے۔ ان میں سے کچھ جنتا دل سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے میں کیا دقت ہے۔ جواب ملا کہ ذرا ٹھہریں اپنی حکومت آجائے تو یہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ پھر ایسا کیجیے اور ہر لا کیجیے۔ جواب ملا کہ اس وقت کچھ شاید ہندو ووٹر ناراض ہو جائیں۔ میں نے جواب دیا کہ وہ تو الکشن کے بعد بھی ہو جائیں گے۔ پھر میں کانگریس کے دو نیتاؤں سے ملا۔ میں نے کہا کہ یو پی میں اس بار مسلمان ووٹ لینے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آپ اردو کو یو پی میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دیں۔ انھوں نے کہا کہ ایسا کبھی ہو سکتا ہے کہ یو پی کے کچھ حلقے پہچانے مسلمان رہتا ہو کانگریس سے تعلق رکھتے ہوں پر دھان منتری پر زور

ڈالیں۔ پھر میں نے کچھ معزز مسلمانوں سے بات کی۔ ان میں سے ایک نے پتے کی بات کہی۔ وہ یہ کہ ہم اپنے لیے ٹکٹ مانگنے تو جا سکتے ہیں مگر کسی بات پر زور دینا مشکل ہے۔ آخر میں میں نے دو ہندوؤں سے بات کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم کہیں گے اور زور سے کہیں گے۔ میں نے مذاق میں کہا کہ ٹکٹ تو خطرے میں نہیں پڑ جائے گا۔ جواب ملا کہ ٹکٹ لے کر کیا ہوگا اگر ووٹ ہی نہیں ملے۔ فیصلہ ہوا کہ کچھ یو پی کے لوگ دوست پردھان منتری سے ملیں اور انھیں اصل حالت سے واقف کرائیں۔ اگر کچھ پارٹیوں کے لوگ اکٹھا نہ ملنا چاہیں تو الگ الگ ملیں مگر ضرور ملیں۔

اس بات چیت سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کا مسلمان اپنی مشکل اکیلے حل نہیں کر سکتا۔ اسے ہندوؤں سے مدد لینی ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ہندوؤں کو غیر سمجھنا بند کیجیے۔ وہ ملک کے مستقبل کے بارے میں اتنے ہی پریشان ہیں جتنے آپ۔ اور وہ جانتے ہیں کہ یہ صرف اسی حالت میں صحت مند بن سکتا ہے جب مسلمان اور ہندو ساتھ ساتھ چلیں۔ اسی بات کا ایک پہلو اردو ہے۔ اس بات کو سب مانتے ہیں کہ یہ ہندوستانی زبانوں میں کئی لحاظ سے سب سے زیادہ خوب صورت اور سلجھی ہوئی زبان ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یو پی نہ صرف اردو کا گھر ہے بلکہ اس کا مستقبل بھی شاید یہیں پاکستان سے بھی زیادہ محفوظ رہ سکے۔ شاید کچھ پاکستانی بھی ایسا محسوس کرتے ہوں۔

ایک بات اور میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان ٹھنڈے دل سے سوچ کر اس سوال

، اپنے آپ کو دیں۔ کیا جامعہ ملیہ اسلامیہ
ن گڑھ کو زیادہ نقصان ہندوؤں نے
یا ہے یا خود مسلمانوں نے۔ میری
۔ن یونیورسٹیوں سے ہلکی سی واقفیت
۔مجھے لگتا ہے مسلمانوں کے آپس
جھگڑے انھیں زیادہ نقصان پہنچا
ے ہیں بہ نسبت ہندوؤں کی دشمنی کے۔
اب آخر میں وہی

والا سوال۔ رائے کس کو دیں۔ جیسا میں
نے اوپر عرض کیا۔ رائے دینے سے پہلے
آپ سب سیاسی پارٹیوں سے بات
کریں۔ مگر بات، ہمت اور توقع سے کریں۔
دل سے ڈر اور لالچ نکال کر کریں۔ ہو سکتا
ہے کہ یو پی کا معاملہ اس الکشن سے پہلے
ہی حل ہو جائے۔ کم سے کم ہماری تو یہی
کوشش ہونی چاہیے۔



اردو ادب

اردو ادب کدھر؟

پروفیسر سید محمد عقیل



خدابخش لائبریری نے اردو ادب کے سلسلہ میں کچھ مسئلے چھیڑ رکھے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی کہ اردو ادب کدھر جا رہا ہے کیا رخ ہے، اچھا یا برا، ساکن، صامت، جامد — یا اظہاری! اقدامی! کیا ہے، کہاں ہے، کون اسکی اچھائی برائی کے لیے ذمہ دار ہیں! کیا ہو رہا ہے۔

اردو کے سارے پروفیسروں کے علاوہ جانے پہچانے فاضلوں کو اس موضوع پر اظہار حال کے لیے مدعو کیا جاتا رہا ہے۔ پانچ سال میں پانچ صاحبوں نے اس میں شرکت کی اسی سلسلہ کا ڈاکٹر عقیل کا مقالہ پیش خدمت ہے۔

ادارہ

پروفیسر سید محمد عقیل
شعبۂ اردو
الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

اردو ادب کدھر؟

کسی بھی ادب کے متعلق ایسا سوال نہ صرف یہ کہ اس کا محاسبہ ہے بلکہ یہ بھی کہ اُس کی ارتقائی صورت
رہی ہیں، اور اب اس کے لیے جدید امکانات کیا ہیں یا یہ بھی کہ مختلف اصناف میں اُس کا آج کا فیشن کیا ہے
سمتوں میں اُس کی مختلف شاخیں پھیل رہی ہیں۔ اپنے سماجی حالات کس طرح اُس کا چہرہ بدل رہے ہیں،
ان کا اثر اس کی فکر پر کیا پڑ رہا ہے۔ بیرونی دباؤ اور اندرونی کشمکش، اس پر کس طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔ یہ
باتیں مل کر کسی ادب کے ارتقا یا تنزل کی سمتیں متعین کرتے ہیں، لیکن ان تعینات کا دائرہ کار ماضی قریب ہی کو محیط
لے بہت دور تک پھیلایا نہیں جا سکتا۔ ہم بھی اس مقالے میں تمام باتیں تیس چالیس برس کی مدت ہی کو
کریں گے کہ اسی سے اردو کی نئی سمتوں کا تعین مناسب ہے۔ پھر یہ بھی سمجھتے رہنا چاہئے کہ یہ محاسبہ حتمی اور آ
نہیں ہو سکتا کہ ادب میں حرف آخر کسی تفہیم کے لیے نہیں کہا جا سکتا اور یہ بھی ایک تفہیم ہی کی کوشش ہے۔

اردو ادب کے ساتھ ایک دلچسپ خیال ہمیشہ سے وابستہ رہا ہے کہ جب بھی ادب کی بات ہوئی۔ اُ
مفہوم پہلے شعر و شاعری ہی رہا ہے۔ شاید یہ بات اس لیے بھی ہو کہ دنیا کی تمام فکر اور تمام ادبی کاوشوں کی ابتدا
ہی سے ہوئی ہے۔ اسی لیے شاید، جتنے اصول، نظم و ضوابط کے راستے شاعری کے لیے سوچے گئے، کسی اور صنف
کے لیے نہیں۔ اردو کی شاعری، ادھر تیس چالیس برسوں میں خاصی انقلاب آگیز رہی ہے۔ ہئیت اور فکر،
طرح طرح کے تجربے کیے گئے ہیں۔ ہئیت میں تو تجربوں کا شمار بھی آسان نہیں ہاں فکر میں، خاصا انتشار رہا۔
کبھی فکر کا یک قلم انکار کیا گیا، کبھی فکر، شاعر کے نجی اور انوکھے تجربوں تک محدود ہو گئی اور کبھی اس میں عالمی
انتشار کو سمونے کی کوشش بھی کی گئی، کبھی تنہائی کا مسئلہ، کبھی بیگانگی (ALIENATION) اور کبھی بے راہ رو
لیکن کچھ ایسے بھی فکری تجربے جو وقت کی آواز ہیں جن میں تازہ کار مسائل کا دل بھی دھڑکتا نظر آتا ہے۔

جدید نظموں کی تاریخ اردو میں بہت زیادہ پرانی نہیں، زیادہ سے زیادہ سو سوا سو برس۔ جب مو

نے شاعری کو غزل کے ماحول سے نکل کر ایک عام رجحان کی صورت اختیار کرنا شروع کیا، لیکن بیسویں صدی
نزات سے ایک طرح اردو شاعری میں تقریباً نظموں کی صدی بن گئی۔ حالی کی آواز کو اقبال، عظمت اللہ خاں، جوش،
انی اسر، سرور اور چکبست نے عملی تعبیر عطا کی اور پھر ترقی پسندوں نے فکری اور اسلوبی، تمام تجربوں میں نظم کو بام
پہنچا دیا۔ موضوعاتی نظمیں وقت کی آواز لے کر ایک طرف تمام شعری فضا پر چھا گئیں تو دوسری طرف اسلوب
وں میں بھی زبردست تبدیلیاں ہوئیں، جن کے پس منظر میں انگریزی نظموں کے وہ ترجمے بھی تھے جن سے
شعری دنیا محمد حسین آزاد، نظم طباطبائی، عبدالحلیم شرر، مولوی اسماعیل، نادر کاکوروی، اقبال، طالب
لوک چند محروم، ظفر علی خاں اور دوسرے مترجمین نظم انگریزی کے ذریعہ متعارف ہوئی تھی۔ ترقی پسندوں
ساتھ جو دوسری لہر اسلوبیات اور فکری آزادی کی چلی وہ اپنا اسکول، میراجی، دین محمد تاثیر، یوسف،
ن۔ م۔ راشد کے ساتھ لے کر الگ ہو گئی اور جیسے ہی ترقی پسندوں کی مساعی اور موضوعاتی شاعری میں
کے بعد کمی واقع ہوئی۔ میراجی اور راشد کے اسلوبیاتی اور فکری آزادی کے اسکول کے بطن سے نئی شاعری
شاعری پھوٹی جو تقریباً ۱۹۸۰ء تک اردو شاعری پر حاوی رہی کیسے کیسے فکری اور اسلوبیاتی تجربے اس
کیے گئے؟ اس اسکول نے اپنا فکری سلسلہ فرانس کے زوال پسند شعرا (DECADENT POETS) سے جوڑا۔
اپنے نئے نظریات شاعری بنائے جو کچھ اس طرح تھے۔

۱۔ میراجی اور اُن کے قبل کے دوسرے شعرا نے، اردو میں پہلی بار اس بات کا احساس کیا کہ شاعری
کے علاوہ الجھانے، متحرک کرنے کے علاوہ سکتے میں ڈال دینے ۔۔۔ کے بھی کام آ سکتی ہے۔ نئی شاعری دل
وہ ذہن کو متاثر کرتی ہے ۔۔۔ نئی شاعری جذبات کے الجھاوؤں کو ٹھوس زبان میں ظاہر کرنا چاہتی ہے۔
جذبات کے اظہار سے گریز کرتی ہے۔ جذباتیت سے گریز، شاعری کے داخلی سفر کی ایک منزل ہے۔

۲۔ نئی شاعری کا عمل، اضطراب انگیزی کا عمل ہے۔ اضطراب انگیزی کے اس عمل میں وہ زبان کی
لطافت اور شیرینی کو نظر انداز کر کے ارادی طور پر ایک درشت اور بے چین اسلوب اختیار کرتا
ری کی طرف نئی شاعری کا رویّہ فدویانہ اور مولویانہ نہیں ہے ۔۔۔ اس کا لب و لہجہ تلخ اور اعلیٰ اسلوب
رتا ہے۔ (شمس الرحمٰن فاروقی ۔۔۔ نئے نام کا مقدمہ)

۳۔ اصل میں جو مسئلہ نئی نظم کے شاعر کو درپیش ہے، وہ فلسفیانہ نوعیت کا ہے اور اس سوال
ہوتا ہے کہ میں کون ہوں؟ نئی نظم کا شاعر یہ نہیں پوچھتا کہ دنیا کیا ہے؟ معاشرہ ایسا کیوں ہے؟

کیا ہے؟ وہ صرف اپنے آپ میں دلچسپی رکھتا ہے اور اپنی شناخت چاہتا ہے۔ (جیلانی کامران ۔ نئی نظم کے تقاضے)

۴۔ پرانی تعلیمات کے غیر شہتر ہو جانے سے جہاں جسم کی مرکزی حیثیت قائم ہوئی ہے، وہیں موت کا خدشہ ہے۔ اس صورت حال میں اگر میں یہ کہوں کہ نئی نظم کا شاعر، موت کے خدشے اور تقدیر مرگ کا شاعر ہے تو غلط نہ ہوگا۔

۵۔ نئی نظم کا شاعر، تقدیر مرگ کو ہلاکت جسم کی شکل میں پہچانتا ہے اور ہلاکت جسم کے علاوہ اُس کی نظر دوسری ہلاکت اپنا وجود نہیں رکھتی۔ . . . وہ جواب دیتا ہے کہ "میں فانی ہوں" اور چونکہ میں فانی ہوں ہر شے فانی ہے۔ لیکن اشیا کا فانی ہونا، میرے فنا سے بے نیاز ہے۔ میں فنا ہو جاتا ہوں، لیکن کلنڈر نہیں مرتا۔ ۔ر فانی نہیں ہے، علاوہ ازیں، زمین بھی نہیں مرتی اور نہ قیامت آتی ہے۔ (نئی نظم کے تقاضے۔ از جیلانی کامران)

۶۔ نئی شاعری، مذہبی شعور کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی، اور چونکہ پچھلے پچیس برسوں کی اردو شاعری ایسے بغیر ہے۔ (یعنی ترقی پسند شاعری) اس لیے میں نئی شاعری کی ضرورت محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔۔ ری میں شاعر، کسی ادارے کی طرف سے لائی ہوئی بشارتوں کا ذکر نہیں کرتا، بلکہ زندگی بخشنے والے اپنی فریاد کو پہنچاتا ہے۔

یہ ساری باتیں موضوعی شاعری کی طرف اشارے کرتی ہیں اور ان خیالات کے تحت ۱۹۶۰ء سے لیکر ۱۹۸۰ء تک ان خیالات سے مملو نظموں کا ایک انبار لگا ہوا ہے۔ ان میں کہیں قدیم و جدید کی ملی جلی کیفیتیں اور کہیں خالص۔ انھیں خیالات کا تاثر ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں شعرا کی ۔ہے جو متذکرہ بالا خیالات کے تحت شاعری کرتی رہی ہے۔ جن میں، وحید اختر، خلیل الرحمان اعظمی، بلراج کومل، عتیق حنفی، کمار پاشی، عادل منصوری، محمد علوی، قاضی سلیم، بلراج کرشن اشک، شمس الرحمان فاروقی، منیر نیازی، وزیر آغا، عباس اطہر، افتخار جالب، سلیم الرحمان، عزیز حامد مدنی، سلیم احمد، الی، احمد شمیم، انور شعور، کشور ناہید، ساقی فاروقی، ناصر شہزاد (اور بہت سے نام ہیں) خاص ہیں۔ ان تائید اور ان سے اختلاف میں بہت سے مضامین، مقالے اور انشائیے لکھے گئے۔ ڈاکٹر شمیم حنفی نے تائید یت کی فلسفیانہ اساس" لکھ کر اس مقالے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ راقم الحروف نے اس موضوع اختلاف کیا اور ایک کتاب "نئی علامت نگاری" پیش کی، جس میں ان تجربوں کا تجزیہ پیش کیا۔ پروفیسر ن نے "نئے تیشے، نئے کوہکن" کے نام سے ایک اختلافی معرکہ آرا مقالہ لکھا۔ اس دور کی شاعری میں جو تجربے کیے گئے، وہ کوئی خاص نہ تھے کہ سارا زور موضوعی شاعری پر تھا۔ نظم معریٰ، جس کی ابتدا محمد حسین

نے "جغرافیہ طبعی کی پہیلی" نام کی معرّی نظم سے ۱۸۸۲ء کے قریب کی تھی اور جسے اسماعیل میرٹھی اور عبدالحلیم
نے فروغ دیا تھا۔ اس کی لہر اس وقت بیٹھ چکی تھی۔ ان ترقی پسندوں اور حلقہ ارباب ذوق کے
رس کے تجربے، ان کے پاس باقی تھے اور ساتھ ساتھ تلانے (VERSIFICATION) کی صلاحیت بھی، جو
بی ختم بھی ہو جاتی ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کی شاعری میں وہی مجاہدانہ زور ہے جو ۱۹۲۵ء سے
۱۹۴۶ء تک ترقی پسندوں کے یہاں ملتا ہے۔ یہ کوشش، ترقی پسند شاعری کے مزاج سے الگ راہیں بنانے کی کوشش ہے۔

یہ تو سب ہے مگر اس کے آگے کیا ہے؟ بہت جلد یہ رنگ ماند پڑ گیا، کہ مسائل حیات، اور تجزیوں
بروں سے کب تک بہلتے۔ نظم کا نیا شاعر، علامتوں کی بھول بھلیاں سے باہر نکل آیا۔ ایسے حالات جس میں رہ رہا ہے
لی کا ہر لمحہ بدلتا سین، اس کی سانس روک رہا ہے۔ علامتوں کے بہلاوے، اس کے دل کی باتوں کو باہر آنے
ادیتے تھے۔ اور اسے جیسے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ زندگی اور حالات سے بیگانہ ہو کر تو خود میں محبوس ہو کر
جائے گا۔ پھر وہ کیا ہے؟ کیوں ہے اور انسانوں سے کیا اس کا رشتہ ہے؟۔ وہ تو انسانوں کے رشتوں کے بغیر
ہ نہیں رہ سکتا، اور اس طرح، آج کا نیا نظم نگار بیگانگی سے جیسے اکتا کر زندگی کے رشتوں، محسوسات
راور تفکیر سے کام لے کر نئی اظہاریت تلاش کر رہے ہیں۔ آج کی نظم کا کوئی بھی RANDOM جائزہ، یہ
ظاہر کر دے گا

نظم

ساری زلف کے	بیٹا، سالوں بعد
سائبان کیا ہوئے!	ولایت سے لوٹا تھا!
بن کے نیچے بیٹھ کر	اور بیٹھا یہ سوچ رہا تھا
سوچتے تھے ہم	جو سچ اس نے اپنے بارے میں پایا ہے
کل جہاں اماں میں ہے۔!	اُن کو کیسے بتلائے گا!
م شب تمہاری دسترس میں ہے!! (مہتاب حیدر نقوی)۔	اُن کو کیسے سمجھائے گا!! (افتخار نسیم)

ان کے ساتھ ہی کچھ PRODIGETS بھی اسی کیفیت کی طرف لوٹ رہے ہیں چنانچہ عادل منصوری

• ڈاکٹر حنیف کیفی کا مقالہ: "نظم معرّیٰ اور آزاد نظم" ملاحظہ ہو۔

میں حنفی اور عزیز قیسی وغیرہ کے یہاں بھی ایک طرح کی مراجعت دیکھی جاسکتی ہے۔ نئی نظم، خیالات کی واپسی
کے ساتھ ساتھ بہت سے تام جھام پیچ پھنگ اور حشو وزوائد سے بھی پاک ہوتی جاتی ہے کہ نیا نظم نگار ان تمام
صورتوں کو محض بھرتی کی چیز سمجھتا ہے۔ محمد حسن صاحب نے کہیں یہ لکھا ہے کہ نئی نظم سے فکر کا عنصر کم ہوتا جارہا ہے
راقم الحروف کا خیال ہے کہ اچھی نظمیں اور اچھے نظم نگار لفظیات کی تنزلیں تو نہیں کرپاتے کیونکہ ان کے پاس
تہذیبی الفاظ اور صحبتوں کی اشاراتی زبان، نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ مگر فکر، اچھی نظموں میں باقی ہے۔
بلکہ تہہ در تہہ پھیلی ہوئی ہے۔ مگر یہ باتیں نئی نظموں کا UNDER TONE ہیں۔ ہاں ان نظموں کا دائرہ ضرور اکہرا ہے۔
یہ بھی ہے کہ، فوری تاثر اور فوری بیان' نئی نظموں کو یقیناً لیے ہوئے ہے جس کی وجہ فکری تجذیب عام طور پر
نہیں ہے۔ فضا آفرینی اور لمحاتیت کا زور لوٹ رہا ہے۔ اور زیر لبی (UNDER TONE) کی کیفیت بڑھتی
جاتی ہے۔ نئی نظمیں خواہ ترقی پسند ہوں یا جدید، وضاحتوں سے زیادہ سوچ (MUSES) کی طرف بڑھتی
جاتی ہے اور کسی لمحاتی اثر کے تحت، نظم نگار کے اعصاب متاثر ہوتے ہیں تو بھی جوش اور سردار جعفری
کی بلند آہنگی (OVER TONE) اس میں نہیں پیدا ہوتی بلکہ نئے نظم نگار کو فیض اور ن۔م۔ راشد کے قریب کہیں دکھنا
چاہیئے۔ پھر نئے نظم نگار میں کائنات سے اپنی ذات کی طرف جھکنے کا مزاج پیدا ہوگیا ہے، جو اسے جدیدیوں سے
ملا ہے۔ مگر یہ سب اس وقت فیشن بن جاتا ہے۔ جب نظم نگار ان صورتوں کو محض اوپر سے اوڑھ لیتا ہے۔ نثری
نظم بھی آج کی نظم کا ایک رخ ہے۔ مگر ابھی اسے استقامت حاصل نہیں ہوئی اور نہ یہ طرزِ اظہار ابھی فیشن میں آیا
ہے، اس لیے نظم کے اس تجربے پر ابھی کوئی بات کہنا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔ نئی نظم میں چند شاعرات کے
تجربوں کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اردو نظم نگاری میں یہ ایک نئی ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں
اردو کی شاعرات ابھی اپنی گھٹی زندگی کی فضا سے باہر نہیں نکلی ہیں۔ کم از کم شاعری کی دنیا میں جبکہ پاکستان میں نئی
شاعرات کی ایک کھیپ کی کھیپ ہے جس میں فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید، پروین سیدفنا اور بہت
سی وہ شاعرات شامل ہیں جو پاکستان سے دوسرے یورپی ممالک کو منتقل ہوگئی ہیں۔ ان میں حمیدہ رحمان، نیر جہاں،
ونی پیگ کی عرفانہ عزیز، مانڈریال کی عذرا احمد، اور نیویارک کی رشیدہ عیاں خاص ہیں، لیکن ان میں سے زیادہ
تر ابھی تجربوں کی منزلوں میں ہیں۔ کچھ نسٹالجیا کے تجربوں میں گھری ہیں، لیکن جو زندگی کے وسیع سمندر سے ہمکنار ہوگئی
ہیں۔ ان میں تلخ، ترش و شیریں ہر طرح کے تجربے موجود ہیں۔ اردو نظموں میں فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کے ازدواجی
زندگی کے تجربے بالکل نئی صورتیں ہیں۔ ان میں تلخ نوائی بھی ہے۔ محبت کی مٹھاس بھی اور گھر سے نکل کر باہر کی فضا

ٹکراؤ اور اشتعال بھی شامل ہے۔

اب غزل کی سمت و رفتار پر بھی کچھ باتیں کی جاتی ہیں۔ غزل جو بیوۂ عالم بھی ہے، رندِ ہزار بیوہ بھی گردن زدنی بھی اور اردو شاعری کی آبرو بھی۔ شاید ہی اردو کا کوئی شاعر ہو جو غزل کی بارگاہ میں پہنچے بغیر ایوانِ شاعری میں داخل ہوا ہو۔ مجھے غزل کے سلسلے میں بہت زیادہ کچھ اس وقت نہیں کہنا ہے صرف نئی غزل کی چند صورتوں کی طرف اشارے کر سکوں گا کہ میری ایک پوری کتاب "غزل کے نئے جہات" کے نام سے زیرِ طبع ہے۔ تفصیلات اُس کتاب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ پھر اس لکچر کا کینوس بھی اتنا پھیلا ہوا ہے کہ تفصیل کی گنجائش بہت کم ہے۔ نئی غزل، اس وقت آویزش سے دوچار ہے۔ اس میں تجربے کرنے والے تو روز بروز بڑھتے جاتے ہیں۔ موضوعات بھی آج کی نئی زندگی سے برابر آ رہے ہیں۔ اُس کی لفظیات بھی تیزی سے بدل رہی ہے۔ یہاں تک کہ اُس کا پیٹرن بھی بدلنے کی کوشش آزاد غزل کی شکل میں ہو رہی ہے۔ مدراس کے علیم صبا نویدی نے "ردِ کفر" کے نام سے آزاد غزلوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کر دیا ہے، اور ایک انتخاب بھی جس کا نام "قیدِ شکن" ہے۔ شاعر بمبئی نے آزاد غزل اور نثری نظم کا ایک نمبر بھی تقریباً چار سو صفحات کا شائع کر دیا ہے، جس میں ہر طرح کے مضامین بھی ہیں اور آزاد غزل کے نمونے بھی۔ گویا غزل میں اظہار کے نئے نئے اسالیب کی کوشش، غزل کا نیا رخ ہے۔ جو لوگ، اس طرزِ غزل میں کوشاں ہیں۔ انھوں نے ابھی تک اچھے تجربے تو پیش نہیں کیے لیکن شکایتوں کے دفتر ضرور کھول دیئے ہیں کہ اس طرزِ غزل کو روایت پرست اور مقلدانہ ذہن کے لوگ قبول نہیں کر رہے ہیں

مگر نئی غزل ہر طرح کے تجربوں سے دوچار ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی مقبولیت کا دائرہ، نظم سے زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس میڈیا میں بھی غزل کی مقبولیت بڑھی ہے۔ نئے غزل گو کی اپنی زندگی، روایتی شاعر کی زندگی سے الگ ہے، اور وہ اپنی اس زندگی کو ہر طرح سے غزل میں داخل کر رہا ہے، اور اس "ہر طرح" میں اظہار کا طریقہ نئے معاملات، نئی ترکیبیں جو کبھی کبھی ہندی شاعری سے بھی اور زندگی کے نئے برتاؤ سے آ رہی ہیں۔ سب کچھ شامل ہیں۔ پھر خود 'تغزل' کا تصور، اب نئی غزل میں بدل رہا ہے۔ غزل صحیح معنوں میں 'تنگنا' سے باہر نکلی ہے۔ اس نے وہ تمام تجربے چھوڑنے کی کوشش کی ہے جو جاگیردارانہ سماج سے اس نے رکھ رکھاؤ، وصل و ہجر کے محتاط انداز اور بیان کے اشاری طریقوں سے سیکھے تھے۔ آج کی زندگی میں انتظار کی وہ فرصت کہاں جو غالب کو تصورِ جاناں کیلئے ملی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل، اب ہر شخص کے نجی اور جذباتی تجربوں کا اظہار بننے کی کوشش میں ہے۔ اب وہ صرف PRIVILEGED CLASS ہی کا تجربہ نہیں رہ گئی۔ اسی لیے اس میں عمومیت پہلے

کی بہ نسبت زیادہ آتی جاتی ہے۔ پہلے بھی عام لوگ غزلیں کہتے تھے، مگر ہمیشہ وہ CEHOSEN FEW کے معیار اور پسند و ناپسند کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ گویا، الفاظ اور فکر تو اُن کی ہوتی تھی مگر پسند و ناپسند کا فیصلہ اور حد بندی، عام غزل گو نے، خواص پر چھوڑ دیا تھا۔ نئی غزل، اس پابندی سے باہر نکل آئی ہے۔ شاید اُس کا معیار عوامی پسند اور اُس کے اپنے ہی فیصلے بن گئے ہیں۔ اس سے ایک خرابی بھی آئی ہے کہ نئی غزل کا شاعر، معیار اور زبان کی سند، محاوروں اور الفاظ کی معنویت، سب کو چھوڑ رہا ہے۔ صرف اپنے علم، اور اپنی لاعلمی کو درست مان کر چل رہا ہے۔ شاعری کے اسکول بہرحال، معیار مہیا کرتے تھے جواب کہاں رہ گئے۔ اس طرح غزل، اپنی مقبولیت تو بڑھا رہی ہے۔ مگر اس کا معیار مجروح اور مشکوک ہو رہا ہے۔ پھر تجربے، ہر طرح کی زندگی، سماج اور تہذیب سے ہو رہے ہیں۔ یہ شاعری میں ایک طرح کی توسیع کی صورت ہے۔ مگر اس میں ایک خرابی بھی ہے کہ غزل کی عام تفہیم (COMMON UNDER STANDING) باقی نہیں رہے گی۔ الفاظ، اشارے، علامتیں اور اظہاریت کی جو عام تفہیم تھی، جو تمام اردو دنیا میں سمجھ لی جاتی تھی۔ مقامی لفظیات بے حد انفرادی رویے اور مقامی زندگی کے تجربے، غزل سے یہ عام تفہیم چھین رہے ہیں۔ جس سے غزل کی تفہیم کی UNIVERSALITY چھن رہی ہے۔ اب تو یہ ہو کے ہی رہے گا کیونکہ اردو کا جو غزل گو نیو جرسی، ناروے، وینی پگ، پاکستان اور لندن میں زندگی اور اس کی صورتوں کا تجربہ کر رہا ہے، اس میں، دہلی، بنارس اور لکھنؤ کی تہذیبی صورتوں اور تنگ گلیوں کا رنگ کیونکر پیدا ہوگا۔ پھر ایک منظم زندگی میں غیر منظم زندگی کے تجربات اور کیفیات کس طرح پیدا ہو سکیں گی۔ ذرا کچھ مثالیں دیکھیں:-

کس قیامت خیز چپ کا زہر سناٹے میں ہے	میں جو چیخا ہوں تو سارا شہر سناٹے میں ہے	(افتخار عارف)
سفر ہے ختم مگر بے گھری نہ جائے گی	ہمارے گھر سے یہ بے گھری نہ جائے گی	(شاہین کنیڈا)
شہر نا پرساں میں کچھ اپنا پتہ ملتا نہیں	بام و در روشن ہیں لیکن راستہ ملتا نہیں	(حسن عابدی)
صبر کی تیغ بھی نہ پگھلے، ہے یہی ڈر لوگو	ہے سوا نیزہ جو سورج مرے سر پر لوگو	(رشیدہ عیاں)

پھر اپنے ملک میں بھی نئے ڈھنگ سے بات کہنے کی لپک، الفاظ کی نئی تہیں اور معنوی جہتیں، روایتی تفہیم اور الفاظ کے روایتی معنوں سے الگ ہو کر، نئی صورتیں بنا رہی ہیں۔ یہ صورت بڑھتی ہی جائے گی۔ غزل سے اسی لیے جاگیردارانہ دور کی تہذیب، اصول اور رکھ رکھاؤ سب کھنچتے جاتے ہیں۔ ہندی سے اچھی مزاولت، الفاظ کی نہ صرف نئی سطحیں اور سچویشنز پیدا کر رہی ہے بلکہ، تشبیہات، اور استعارات میں بھی کلاسکی روایت

ے الگ ہٹ کر اپنی دنیا بنا رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں غزل کی شکل، اپنی کلاسکی اور تہذیبی شکل سے شاید بالکل
ل ہو جائے گی۔ کم از کم موجودہ صورتِ حال کو دیکھ کر قرائن یہی نظر آتے ہیں۔

شاعری کے دوسری اصناف میں تقریباً سناٹا ہے۔ مثنوی اور قصیدہ جو دو بڑے اصناف تھے، وہ
بنا فن اور اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔ مثنوی کی جگہ تو بہت کچھ نظموں نے لے لی ہے۔ سردار جعفری اور کیفی نے
جمہور" اور" خانہ جنگی" کے نام سے، مثنوی کی روایتی موضوع کو بدل کر، ملک کی سیاسی صورت حال پر
۱۹۴۷ء میں دو مثنویاں لکھیں جن میں سارے لوازم تو مثنویوں کے نہ تھے، مگر اسلوب مثنوی کا تھا اور مثنوی ہی
ہ کر یہ مثنویاں پیش بھی کی گئیں۔ تبدیلی یہ تھی کہ ان کا موضوع کوئی کہانی نہ تھی۔ ہاں اگر بدلتے ہوئے ہندوستان
ئے واقعات اور ملک کے سیاسی حالات کو اگر عوام کی کہانی مان لیا جائے تو، یہ مثنویاں ایک نیا رنگ لے کر آئی
تھیں مگر کسی شاعر نے، ان کا اتباع نہ کیا۔ خود ان شعرا نے بھی، ان تخلیقات کے بعد، کچھ اور تجربے، مثنوی
کے سانچے میں نہیں کیے، اگرچہ بیانیہ کا یہ انداز، ہندوستان کا ایک نیا ساگا (saga) لکھنے کے لیے اچھی خاصی
منہ کر سکتا تھا اور یہ موضوع بھی نیا تھا۔ تاہم مثنوی پر زوال آ گیا۔ قصیدے کے لیے بھی یہی صورت ہوئی جن
حالات میں قصیدے لکھے جاتے تھے، وہ حالات شخصی حکومت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ سردار جعفری نے ایک سیاسی
قصیدہ لکھنے کی کوشش کی تھی جس میں ممدوح عوام تھے مگر وہ چل نہ سکا۔ یہاں تک کہ فروری ۱۹۵۰ء کے ماہنامہ
"آجکل" میں شائع شدہ یہ قصیدہ، خود سردار جعفری کے کسی مجموعے میں غالباً شامل نہیں ہوا۔ قصیدہ جس
INSENTIVE کے تحت لکھا جاتا تھا، وہ INSENTIVE ہی باقی نہ رہ گیا۔ نہ وہ تہذیبی ڈھانچہ معاشرہ کا
ہے۔ ہاں صنفِ مرثیہ میں یقیناً کچھ تجربے کیے گئے ہیں اور ایک پوری کھیپ مرثیہ نگاری کی ہندوستان میں کم مگر
پاکستان میں آ گئی ہے، جو جدید مرثیے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس جدید مرثیے کی ابتدا تو جوش نے "حسین اور
انقلاب" لکھ کر کی تھی، مگر اب نئے لکھنے والوں نے اس میں خاصہ تنوع، الفاظ اور اظہاریت کے طریقوں میں پیدا
کیا ہے۔ اب مرثیوں میں قدیم اجزائے مرثیہ کا التزام نہیں ہے بلکہ، اب جدید مرثیے کو نظم اور
مرثیہ کے بیچ کی کوئی چیز سمجھنا چاہیے، جس کے چہرے میں بھی اور درمیان میں بھی سیاسی اور سماجی
صورت حال پر تنقید بھی ملتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ واقعات کربلا کی کہیں وضاحت اور کہیں اشاریت
فوق فطری صورتیں ختم کر کے نیا مرثیہ گو عموماً۔ واقعۂ کربلا کے دوررس اثرات اور نئی زندگی کے امکانات
اسوۂ حسینی سے روشن کرنا چاہتا ہے، جو بیسویں صدی کی تعقل پسندی کا نتیجہ ہے۔

کردیا تو نے یہ ثابت اے دلاورِ آدمی — زندگی کیا، موت سے لیتا ہے ٹکّر آدمی
توڑ سکتا ہے رگِ گردن سے خنجر آدمی — لشکروں کو روند سکتے ہیں بہتّر آدمی

ہاں خود اپنے خون میں کشتی جو کھے سکتا نہیں
وہ حسینؑ ابن علیؓ کا نام لے سکتا نہیں

(جوشؔ)

فیضؔ کا مرثیہ "امام" اور "آج بازار میں پا بہ جولاں چلو" اور راہیؔ فاضلی کا مجموعہ "سرِ نینوا" اردو مرثیے کی تاریخ میں ایک بہت نیا تجربہ ہے، صفدرؔ حسین، یاورؔ عباس، ان کے علاوہ رئیسؔ احمد کا مرثیہ "داستانِ حرم" لفظ اور مفہوم کا ملاپ، از رئیس فروغ "امام علی" از کشور ناہید "جبر کی ریگ ہر سمت اڑتی ہوتی تھی" از عارف عبدالمتین "سلام تجھ پہ سلیح لبناوتوں کے امام" از فارغ بخاری "غم لازوال" از مخدوم منور۔ سب جدید مرثیے کی طرف نیا قدم ہیں۔ ان معنوں میں کہ روایتی مرثیے سے ان میں ہر طرح کی تبدیلی آئی ہے۔ یہ مرثیے، انسان کو جبر کے خلاف اقدام کے لیے تیار کرتے ہیں اور مقصدِ شہادتِ کربلا کو انسانیت کی تعمیر اور اس کے عزم و ہمت کو استوار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان میں آزادیٔ فکر کی تلاش ہے۔ یہ تمام جدید مرثیے، فن اور مقصدیت دونوں میں قدیم مرثیوں سے ایک قدم آگے ہیں۔ اگرچہ کینوس بیانیہ مرثیوں سے چھوٹا ہے۔ مگر ان میں تاثیریت ابھارنے کی بے پایاں کوشش نظر آتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو روایتی اور جدید مرثیوں کے بیچ کا تجربہ بھی کر رہے ہیں ایسے مرثیہ نگاروں میں صفدرؔ حسین، یاورؔ عباس، رئیسؔ امروہوی، زیباؔ لکھنوی، راغبؔ مرادآبادی، اطہرؔ حسین جعفری خاص ہیں۔ نئے مرثیے عقلیت کی طرف تیزی سے جا رہے ہیں۔ جو آج کے سائنسی دور کا نتیجہ ہے ان میں سے نشو و زوائد ختم ہو چکے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان میں وہ طوالت بھی نہیں رہی جو کلاسیکی دور کے مرثیوں میں تھی کہ آج واقعہ کربلا کی عظمت کردار سامنے رہتی ہے، جرأت و مردانگی سے حالات کا مقابلہ کرنا اور ثباتِ قدم کے ساتھ حقیقتوں اور سچائیوں پہ قائم رہنا ہی انسان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ گویا آج مرثیے، انسان کی عظمت کو ان راستوں سے بھی اجاگر کرنا چاہتے ہیں، جو راستے انسانی سماج کے درمیان سے بنے ہیں اور جن پر آج کا انسان چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اب نثر پر باتیں کی جاتی ہیں۔ جن میں آج کے افسانے، ناول اور تنقید کو خاص طور پر مطالعے کے لیے چنا گیا ہے۔

افسانہ پورے ہندوستانی ادب کا ایک اہم جزو ہمیشہ سے رہا ہے۔ پورے مشرق میں کہانی سے جو دلچسپی رہی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ پنچ تنتر، ہتوپدیش اور جاتک کہانیاں ہماری اس دلچسپی کی مثالیں

۔ جہاں سے لے کر آج بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی تک کہانیوں کا ایک لامتناہی اور زریں سلسلہ ہے او
مائید بیسویں صدی میں پریم چند سے ترقی پسندوں تک کا دور ابھی تک کی اردو کہانیوں کا سب سے شاندار
ور ہے ۔ اس کے بعد جدید فکر سے متاثر کہانیاں ہیں جن میں علامتوں، تجرید اور لایعنی کہانیوں کی بھرمار ہے۔ جن
، اہم ستون، انتظار حسین، خالدہ حسین، انور سجاد، احمد ہمیش، بلراج مینرا اور سریندر پرکاش ہیں باقی تقریباً
ام نئے افسانہ نگار ان افسانہ نگار کے متبعین ہیں۔ انھیں کے متوازی ترقی پسندوں کی بھی دوسری کھیپ چلتی رہی
ہے جن میں اقبال متین، اقبال مجید، عابد سہیل، کلام حیدری، غیاث احمد گدی، رتن سنگھ، ستیش بترا، رام لعل اور
دسرے لکھنے والے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے درمیان سے اپنا راستہ نکالا ہے۔ ایسے لکھنے والوں میں سلام
، رزاق، انور خاں، انور قمر، ساجد رشید، حسین الحق، احمد یوسف، علی امام، کنور سین، نور پرکار اور علی محمد
یتا ہیں۔ سرحد پار بھی بہت سے نئے افسانہ نگار ادھر آٹھویں دہائی میں سامنے آئے ہیں جن میں آغا سہیل (اگرچہ یہ
رانے افسانہ نگار ہیں) مرزا حامد بیگ، کوثر جمال، زاہدہ حنا، سائرہ ہاشمی، اختر جمال، شہزاد منظر، رشید امجد،
ن حسن خسرو، نجم الحسن رضوی، سمیع آہوجہ، غلام حسین نقوی، مشتاق قمر، محمد منشا یاد، مستنصر حسین تارڑ، منیر احمد
شیخ، مسعود اشعر، وغیرہ۔ ان میں سے کچھ ایسے ہوشیار بھی ہیں جو کہانی کی پسند و ناپسند کی سوئی پر نظر رکھتے ہیں۔
ر جس طرف اس کا جھکاؤ دیکھتے ہیں، اُسی طرح کے افسانے لکھنے لگتے ہیں۔ انھیں نہ افسانے کے موضوع سے دلچسپی
ہے نہ زندگی کے مسائل سے نہ فنِ افسانہ نگاری سے بلکہ وہ یہ دیکھا کرتے ہیں کہ کدھر تالی زیادہ دیر سے بج رہی
ہے، اُسی طرح کا مال سپلائی کرو۔ یہ بات آج کی کہانی کے سلسلے میں لکھ دینا، اس لئے ضروری ہے کہ اس صورتحال
نے آج کی کہانی، خصوصاً اردو کہانی کو بہت نقصان پہنچایا ہے کہ اب جینوین اور جعلی کہانی کار کا امتیاز کرنا مشکل
وتا جا رہا ہے۔ خیر یہ بات تو جملۂ معترضہ کے طور پر لکھ دی گئی۔

آٹھویں دہائی سے پہلے کی کہانی 'علامتی کہانی' رہی۔ اس وقت کہانی کاروں کو یہی معلوم ہوتا تھا کہ
لامتی کہانی ہی، اب اردو کہانی کی توسیع ہوسکتی ہے اور اسی کے ساتھ 'تجرید' کا رنگ بھی جڑ گیا۔ ہندوستان میں
لامتی کہانی، انتظار حسین، خالدہ اصغر (حسین) اور انور سجاد کی قیادت میں وارد ہوئی، جس کا سب سے پہلے
راج مینرا نے خیر مقدم کیا۔ کمپوزیشن "کے نام سے انشائیہ نما افسانے لکھے، بعد کو احمد ہمیش نے "مکھی" نام کا علامتی
فسانوں کا پہلا مجموعہ شائع کیا اور پھر علامتی افسانوں کی ایک لہر ہندوستان کی اردو افسانوی دنیا میں پھیل گئی
لامتی شاعری کی طرح علامتی افسانوں نے بھی، اردو ادب کی فضا کو کافی مکدر کیا۔ ایک صورت تو یہ پیدا ہوئی کہ

ہر مندی، الٹی سیدھی کہانیاں لکھنے لگا جس کا نہ سر تھا نہ پیر۔ یہ کام بہت آسان بھی تھا اس لیے کہ جو چاہو لکھو کسی مواخذے کا ڈر نہیں، کیونکہ اگر کہانی سمجھ میں نہیں آتی تو ملزم قاری ہے، لکھنے والے کا کوئی قصور نہیں۔ لایعنی کہانیوں کی پہلے تو بڑی تعریف کی گئی اور ساری لعن طعن قاری کے حصے میں آئی۔ پھر جب نئی کہانی کے ناقدین نے محسوس کیا کہ قاری نا سمجھ نہیں جتنا کہ ناقدین سمجھ رہے ہیں تو یہ کہا جانے لگا کہ لایعنیت ABSURDITY بھی ایک حسن ہے۔ اس کے تجربے مغرب میں بھی ہو رہے ہیں۔ علامتی کہانی تو ترقی پسندوں نے بھی لکھی ہے، او "غالیچہ" و "مردہ سمندر" اس کی مثال میں پیش کیے جانے لگے۔ مگر قاری اس بہلاوے میں نہیں آیا۔ پھر یہ تھیوری پیش کی گئی کہ ادب کا کوئی سچا قاری ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اگر قاری کی سمجھ میں کہانی نہیں آ رہی ہے تو قصور اُس کا ہے۔ اُسے خود کو UP TO THE MARK لانا چاہیئے۔ مگر قاری بھی ہوشیار ہے۔ اُس نے علامتی کہانی کو طاق پر رکھنا شروع کیا تو علامتی اور لایعنی کہانیاں صابن کے پھین کی طرح بیٹھنے لگیں۔ منرا اور رکھی والے احمد ہمیش کہانی کے سین سے بالکل غائب ہو گئے۔ پاکستان میں بھی خالدہ اصغر (حسین)، انور سجاد اور مرزا حامد بیگ کا چراغ بجھنے لگا۔ پھر ایک اور پھرا دیا گیا کہ علامتی افسانہ نگار سب بائیں بازو کے سیاسی لوگ ہیں۔ ہندوستان میں بلراج مینرا نے دعویٰ کیا کہ وہ C.P.M سے وابستہ ہیں، اور اُدھر یہی دعویٰ انور سجاد نے پاکستان میں کیا (یہ ساری افواہیں سرگوشیوں میں پھیلائی جاتی تھیں) مگر قاری نے علامتی کہانیوں کو طاق پر رکھنے کا عمل بند نہیں کیا کہ وہ کہانی سے پہلی شرط، تفہیم اور دوسری کہانی پن کی چاہتا تھا۔ پھر ناقدین نے بحث شروع کی کہ کہانی پن ہے کیا؟ "افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ"، "افسانے کی حمایت میں" جیسے مضامین اور کتابیں لکھی جانے لگیں۔ یہ سوال اٹھایا گیا کہ :

> "اگر کسی افسانے میں کہانی پن ہو تو کیا وہ افسانہ دلچسپ ہو جاتا ہے؟۔ اگر اس سوال کا جواب "ہاں" ہے تو کہانی پن اور دلچسپی ایک ہی شے کے دو نام ٹھہرتے ہیں . . . اگر اس سوال کا جواب "نہیں" میں ہے تو یہ کہنا ممکن ہو جاتا ہے کہ افسانہ کہانی پن کے باوجود غیر دلچسپ ہو سکتا ہے۔ اس کی دوسری شکل یہ بھی ہے کہ افسانہ غیر دلچسپ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی دلچسپ ہونا افسانے کی شرط نہیں ہے۔ اس کی تیسری شکل یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر دلچسپ چیز افسانہ ہو۔" (شمس الرحمٰن فاروقی ۔۔ افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ)

یہاں قاری بھی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ یہ سوال کس سے کیا جا رہا ہے، اور کس کی تفہیم معرض بحث میں ہے؟ جب قاری کوئی صاحب ذوق ہو ہی نہیں سکتا اور تفہیم، یا ترسیل، کی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ ایک تخلیق وجود میں ہے۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے تو پھر اوپر کے سوالوں کی ضرورت کیا ہے؟ جہاں تک "دلچسپ" اور "غیر دلچسپ" کی بات ہے۔ اس میں بھی ہماری

ودار ہوتا ہے۔ کس کے لئے کہانی دلچسپ ہے؟ ان کے لیے جو جو سوسی دنیا پڑھتے ہیں؟ شمع پڑھتے ہیں؟ ۔
یں صدی" کے افسانے پڑھتے ہیں؟ اُن کے لیے جو آستانہ، مستانہ جوگی یا سیکس میگزین پڑھتے ہیں؟ ظاہر
۔ ان کی دلچسپی اور نقوش، فنون، اور عصری ادب کے قارئین کی دلچسپیوں میں فرق ہوگا تو پھر "دلچسپ"
غیر دلچسپ" کا معیار قائم کرتے وقت قارئین کی صفیں بھی بنانی پڑیں گی۔ خیر یہ بحث خاصی طوالت چاہتی ہے، مگر
سے یہ ضرور ہوا کہ قاری نے جب علامتی کہانیوں کو REJECT کرنا شروع کیا تو کہانی کار، قاری سے کٹ گیا۔
کہانیاں صرف سیمیناروں میں ایک دوسرے کو سنانے اور منزات المومنین کے لیے صرف لمبی لمبی بحثوں کی چیز ہو کر رہ گئی
جدید رسالوں میں کہانیاں چھپ تو جاتیں مگر انھیں پڑھنے والے نہ تھے۔ سیمیناروں میں یہ بحثیں مدتوں چلا رکھیں
کہانی مجھے لکھتی ہے"۔ جدید اردو افسانے کا ڈائیلما' نیا افسانہ اور روایت سے انحراف' "کہانی مجھے نہیں لکھتی"
معلوم نہیں کیا کیا۔ ان تمام کسرتوں سے ایک بات ضرور اُبھرتی کہ اگر حالات ناسازگار ہوں تو علامتی کہانی اچھی
سکتی ہے بشرطیکہ قاری، ان حالات کی طرف اشاروں کو سمجھ سکے۔ اس میں کچھ اچھی علامتی کہانیاں بھی وجود میں
ں ہندوستان میں اقبال مجید کی کہانی "دو بھیگے ہوئے لوگ"، بلراج مینرا کی کہانی "وہ"۔ سریندر پرکاش کی
ی "بجوکا" سلام بن رزاق کی کہانی "کالے ناگ کے پجاری" انور خاں کی کہانی "کوؤں سے ڈھکا آسمان" عابد
یل کی کہانی "سوا نیزے پر سورج" رتن سنگھ کی کہانی "ڈری ڈری ہوا" وغیرہ۔ مگر پاکستان میں چند بہت
اچھی کہانیاں لکھی گئیں۔ ان میں انور سجاد کا افسانہ "کونپل" خالدہ اصغر کی کہانی "سواری اور ہزار پایہ"، زاہدہ حنا
ہانی "تتلیاں ڈھونڈھنے والی" اور بھی ایسی کہانیاں ہوں گی جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ اسی لسٹ میں کچھ
ں کی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں جن کا میں تذکرہ نہیں کر رہا ہوں۔ "مقتل" والے مینرا، "کمیں گاہ" والے شفیق اور
۔" والے شوکت حیات مجھے معاف فرمائیں کہ میرے اعصاب کمزور ہیں۔

تفہیم اور کسی کیفیت اور دلچسپی سے عاری کہانیوں کو جب زیرک اور صاحب ذوق قاری نے
REJE کرنا شروع کر دیا تو افسانہ نگار بھی خاصہ پریشان ہوا۔ چند نقادوں اور سیمیناروں کے بل بوتے پر
الک تک جیتا رہتا کہ اس کا رشتہ عوام سے کٹ گیا۔ یہ سوال بھی اس کے دل میں پیدا ہوئے کہ وہ کس
لیے کہانیاں لکھتا ہے؟۔ اگر قاری اور عوام میں ان کہانیوں کی جڑیں نہیں، اگر ان کہانیوں کا مسالہ،
ہی مسائل اور روزآنا کی زندگی سے وابستہ نہیں ہے تو یہ کہانیاں صرف نقادوں کے عجیب و غریب تجربوں
، لئے تو وہ نہیں لکھ رہا ہے اور نہ لیباریٹریوں کی بوتلوں میں بند کرنے کے لیے یہ کہانیاں ہیں، تو پھر ان کا مصرف

کیا ہوگا؟ اور یہ سوچ کر افسانہ نگار پھر تفہیم، معنویت اور عوامی مسائل کی طرف پلٹنے لگا کہ انھیں کی
وہ قاری کی دنیا میں داخل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اردو کی نو بہ نو کہانی اپنے کہانی پن، اپنی دلچسپی اور اپنے سما
مسائل کو پھر واپس لا رہی ہے۔ آج کی کہانی بہت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی ہے کہ کہیں پھر وہ کسی مکڑ جال میں گر
ہو جائے۔ ادب میں اگر زندگی کے مسئلے نہ رہے تو پھر اس میں کیا ہوگا۔ یہ مسئلے ہیں کہ اُجڑتے بنا چلے آتے ہ
بھی، دیرپا بھی اور تہذیبی شکست و ریخت کے بھی مسئلے۔ ایسے مسئلے بھی جن سے ملک ہی نہیں بلکہ پوری قوم
کے مسئلے بھی وابستہ ہیں جن کی طرف بھی کہانی کار کو متوجہ ہونا چاہیے۔ ہاں اپنے بیان کے طریقوں کو وہ جس طر
استعمال کرے لیکن اُسے اپنے قاری کی فہم اور دلچسپیوں کے نزدیک ہی رہنا چاہیے۔ آج استعارہ، معنی، گمشد
کلمات (مرزا حامد بیگ)، "پہچان" (خالدہ اصغر)، کمپوزیشن اور دوسرا آدمی کا ڈرائنگ روم، سب بیٹ
چکے ہیں۔ "اب قیدی سانس لیتا ہے" (زاہدہ حنا)، "تاس اور مٹی" (محمد منشا)، "کومنے" (تقی حسن خسرو)
دار آدمی" (احمد داؤد)، "مخبر" (سلام بن رزاق)، "نئے مکان کی دیمک" (علی امام)، "ریت گھڑی" اس
"تیئس گھنٹے کا شہر" (احمد یوسف)، "فصیل" (تسنیم زیدی) اور لہر جیسے افسانوں کا مزاج بن رہا ہے اور
زیادہ تر افسانے قاری اور اُس کے مسائل سے قریب ہیں۔ ایک لہر جو مزید نئے افسانہ نگاروں میں آ رہی
وہ یہ کہ وہ چند افسانے لکھے اور ناقدین اُسے دنیائے افسانہ کا "ایک اہم ایک معتبر نام" قرار دیں۔ یہ جذبہ
اچھا جذبہ نہیں ہے۔ یہیں تک بات نہیں ہے۔ کچھ بے صبر افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جو چند افسانے لکھنے کے بعد اپ
تک نکلوا چکے ہیں۔ میں اس موقع پر کوئی ناصح مشفق نہیں بننا چاہتا مگر سوچیے کہ پریم چند کے بعد کہانیوں کا گراف
اونچا ہوا ہے؟ نمبر نکلوانے والوں، اور اردو کہانیوں کے نقادوں کو بُرا بھلا کہنے والوں کی کتنی کہانیاں ہم
دلوں کو چھوتی ہیں؟ کیا پریم چند کی زندگی میں ان کا کوئی نمبر نکلا۔ یا پریم چند کے دور کے نقادوں نے ان کی ز
میں کتنے مضامین ان پر لکھے؟ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند کے بعد کرشن چندر، بیدی، عصمت، احمد
قاسمی اور قرۃ العین حیدر نے کہانی کے گراف کو کچھ اونچا کیا ہے، لیکن ترقی پسندوں کے بعد کہانی علامتوں میں ا
کھوئی کہ کہانی کا گراف سوائے نیچے گرنے کے قطعی اونچا نہیں اٹھا۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ اد
جن کہانیوں نے متوجہ کیا ہے، ان میں انور سجاد کی "کونپل" ، حنا کی کہانی "تتلیاں ڈھونڈھنے والی" رتن سنگ
کی کہانی۔ "وری ڈری ہوا" ہے۔ ان میں بالکل نئے تجربے ہیں۔ اور ان میں زندہ رہنے کی صلاحیت معلوم ہوتی
خصوصاً زاہدہ حنا کی کہانی ایک بار پڑھنے کے بعد مدتوں آپ کو HAUNT کرتی رہے گی۔ یقیناً میرا محاسبہ بہتوں

دلپسند نہیں آئے گا، مگر مجھے بہرحال اپنے محاسبے کا حق ہے۔

ناول کی دنیا، ۱۹۵۰ء کے بعد سے افسانوں سے بہتر ہوئی ہے۔ ادھر نئے پرانے لکھنے والوں نے ناول کے فن اور اُس کی پیشکش کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ ترقی پسندوں کے ساتھ، اردو ناول خالص رومان سے باہر نکل آیا تھا۔ ننگی حقیقتوں کے قریب ناول کو لانے میں ترقی پسندوں کی کوششیں "لندن کی ایک رات" سے شروع ہوئیں اور "ٹیڑھی لکیر" "معصومہ" "دل کی دنیا" (عصمت چغتائی)، "طوفان کی کلیاں"، "باون پتے"، "غدار" "ایک عورت ہزار دیوانے" (کرشن چندر)، "تلاشِ بہاراں" (جمیلہ ہاشمی)، "آگ کا دریا"، "سفینۂ غمِ دل" (قرۃ العین حیدر)، "اداس نسلیں" (عبداللہ حسین)، "خدا کی بستی" (شوکت صدیقی) "راہِ عمل" اور "اپنی اپنی صلیب" (صالحہ عابد حسین)، "آنگن" اور "زمین" (خدیجہ مستور) سے ہوتے ہوئے ناول کی دنیا اب نئے منطقے میں داخل ہو گئی ہے۔ ادھر ناول میں کچھ علامتی رنگ بھی نمایاں کرنے کی کوشش، جوگیندر پال اور انور سجاد نے کی۔ جوگیندر پال کا ناولٹ بیانات اور نادید۔ انور سجاد کا ناول "خوشیوں کا باغ" کی تفہیم آسان نہیں، علامتوں کے پردے خاصے دبیز ہیں۔ پھر بھی ناول یا افسانے میں، اگر تخلیق کار اپنے ساتھ بیانیہ کو لئے رہے، خواہ کسی شکل میں ہو تو، قاری، تخلیق کار کے ساتھ چل سکتا ہے، چاہے تخلیق کار علامتوں کے ساتھ ہی کیوں نہ چلتا ہو لیکن جس نے بیانیہ کا ساتھ چھوڑ کر خالص علامتوں اور احساس کے فکری اشاروں یا مصوّری کی ذہنی صورتوں کو الفاظ کے ذریعہ یہ سمجھ کر کوشش کرنا شروع کیا کہ الفاظ، مصوّر کے رنگ اور لکیروں کا بدل ہیں تو بیانیہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اظہاریت بھی باقی نہیں رہ پاتی۔ ادب اور خصوصاً کہانی یا ناول بہرحال کسی واقعے سے ہی متعلق ہوتے ہیں اور واقعے میں بیان، ایک لازمی سی شے ہے۔ انور سجاد کے دونوں ناول "خوشیوں کا باغ" اور "جنم روپ" بیانیہ سے تقریباً عاری ہیں۔ ان دونوں میں شعری اور مصوّرانہ، اختصار، اشاریت اور تہہ داریاں اپنے عروج پر ہیں۔ یہ کہنا کہ احتجاج کو پُر زور طور پر واضح کرنے کے لیے، یہ طرز اختیار کیا گیا ہے۔ ایک طرح کا بہکاوا ہے کہ احتجاج اگر دیکھنے اور سننے والوں پر واضح نہیں ہوتا تو اُس کی اہمیت کیا ہو سکتی ہے۔

ادھر اردو ناول میں تفہیم کی نئی تلاش ہوئی ہے۔ پرانے اور کچھ نئے ناول نگاروں نے، رومان اور انقلاب سے ہٹ کر بھی زندگی کے کچھ نئے روپ تلاش کئے ہیں۔ بانو قدسیہ نے ایک نئے موضوع پر ایک اچھا ناول "راجہ گدھ" کچھ سال قبل پیش کیا ہے۔ موضوع، ان معنوں میں نیا ہو جاتا ہے کہ مصنفہ نے ہیرو کے ایک خاص رجحان کو۔ POINT بنانے کی کوشش کی ہے اور انہیں صورتوں سے متاثر ہو کر گدھ' کا علامتی نام دیا ہے کہ گدھ کو ہمیشہ مُردار

ہی کھانے کو ملتا ہے۔ وہ خود شکار نہیں کر سکتا۔ راجہ گدھ کے ہیرو کو بھی ہر مرتبہ معاشقے میں یہی مسئلہ پیش آتا۔ یہاں تک کہ جب وہ ایک منزل پر پہنچ کر شادی کے لئے تیار ہوتا ہے تو وہاں پر کچھ یہی حادثہ اسے پیش آتا موضوع کے اس الوکھے پن کے ساتھ بانو قدسیہ نے جو حالات اور سیاسی و سماجی صورتوں کو لپیٹ دیا ہے۔ پاکستانی زندگی کے مطالعے میں بڑی مدد دیتی ہیں اور اس طرح یہ ناول اپنی افادیت باقی رکھتا ہے۔ شوکت صدا نے بھی جانگلوس' میں ایک نئے موضوع کو اپنایا ہے، جس میں رحیم داد اور لالی کے گرد ناول گھومتا ہے۔ جیل سے فرار مجرم۔ ہر طرح کی بدعنوانیاں سماج میں پھیلاتے پھرتے ہیں اور ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ ہر طرح فائدہ اٹھاتے ہیں، اور آزاد ہیں۔ دراصل کہانی کی دلچسپی یہ ہے کہ آج کی سیاسی فضا میں مجرم مزے کر رہے ہیں سوسائٹی اُن کی معاشی ترقی دیکھ کر، انھیں صورتوں کو خوشحالی کی کنجی سمجھتی ہے اور اس خیال کے تحت جو سماج وجود میں آئے گا، اُس کے اعمال و افکار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، اور یہ صورت، دونوں ملکوں یعنی پاکستان اور ہندوستان میں تیزی سے اُبھر رہا ہے۔ بے کرداری ہی سب سے بڑا کردار اور بے ایمانی ہی سب سے بڑا ایمان ہے، اور یہ صورت صرف ذرائع معاش کے لیے ہی نہیں بلکہ بڑھتے بڑھتے ادب کی دنیا میں بھی مختلف طریقوں سے داخل ہو گئی ہے۔

انتظار حسین نے اپنے نئے ناول "تذکرہ" میں اپنے بازیافت والے اسٹائل سے ایک قدم آگے بڑھا ہے۔ اگرچہ یہ موضوع بھی بازیافت کی ایک طرح سے توسیع ہے مگر بہر حال یہ ایک نیا مسئلہ ضرور ہے جو ہندوستان میں ختم ہو چکا ہے۔ مگر پاکستان میں روز بروز شدت پکڑتا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ ہے مہاجرین کے بسنے بسانے کا جس میں روز بروز پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں، اور جس کے باعث چالیس پچاس برس بعد بھی، یہ اکھڑے ہوئے لوگ، آج بھی اکھڑے اکھڑے پھر رہے ہیں۔ اس ناول میں اسلامی طرز پر سزائیں دینے کے جو نقشے انھوں نے پیش کئے ہیں، خصوصاً چوراہے پر پھانسی دینے کا طریقہ وہ آج کی پاکستانی سماجی زندگی پر طنز بھی ہے اور بیسویں صدی کی مہذب زندگی کے لیے عبرت انگیز بھی۔ بعض باتیں جو انتظار حسین کے ساتھ بدخوابی DELIRIUM کی طرح، اُن کی ہر تحریر میں لگی ہوتی ہیں۔ وہ اس ناول میں بھی موجود ہیں۔ یعنی بلا سبب اور بے موقع ترقی پسندوں اور اشتراکیوں پر دولتیاں جھاڑنا جس سے، ناول کی رواں دواں سنجیدگی مجروح ہو جاتی ہے، اور اس کا مصرف سوائے مخالفت برائے مخالفت کے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔

اسی تھیم کو ذرا دوسرے ڈھنگ سے دیوان بیریندر سنگھ "ظفر پیامی" نے اپنے حالیہ ناول "فرار" میں

لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ظفر پیامی کے ناول "فرار" کی فضا بھی انتظار حسین کے ناول سے زیادہ وسیع ہے اور موضوع کا میدان عمل بھی بڑا ہے اور ان کے نتیجے بھی بہتر ہیں۔ یہ ناول بھی ڈھاکہ سے ہندوستان اور پھر پاکستان جانے والے چند مہاجرین اور ہندوستان میں ان کے ہندو مسلم دوستوں اور واقف کاروں کو اس طرح لپیٹ لیتا ہے کہ حکومت الگ ہو جاتی ہے اور انسانی اخوت اور دوستیاں الگ اور یہی اس کا ایجابی (POSITIVE) رخ ہے کہ انسانی محبتیں اور لگاؤ سیاست کے بندھنوں اور فرقہ پرستیوں کے زہر کو نہیں مانتے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے دو ہم جماعت دوست افتخار حسین ہاشمی اور آفتاب چودھری اس ناول کے اصل کردار ہیں جو صحیح طور پر ایک مشترکہ تہذیب میں بندھ کر ایسے وقت میں بھی اپنی محبتوں کو نہیں بھولتے۔ جب پاکستانی فوجیں ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال چکی ہیں اور افتخار ہاشمی کس طرح اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان فرار ہو جانا چاہتے ہیں مگر ناول کا فیصلہ نوجوان لیڈی ڈاکٹر سحر ہاشمی کا فیصلہ ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی نئی نسل کا فیصلہ ہے جو کسی مزید فرار یا ہجرت کیلئے تیار نہیں بلکہ اپنے حقوق اور فرائض سب کا فیصلہ اسی سرزمین پر رہ کر کرنا چاہتے ہیں کہ یہ سرزمین سب کی مشترکہ میراث ہے۔ اسکے تمام مسئلے ہندوستان کی نئی نسل کے مسئلے ہیں۔ ناول کا یہ بالکل نیا ٹریٹ منٹ ہے۔ یہ ٹریٹ منٹ حکومت کی سیاسی قومی یکجہتی کے نعرے سے الگ چیز ہے جس میں ظفر پیامی نے نئی بنتی ہوئی سوسائٹی کے خدوخال اور ان کے نئے مسائل کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو ناول کی دنیا میں یہ ایک نیا قدم ہے، جس کے انداز دوسرے ہیں۔ ظفر پیامی چونکہ خود ایک صحافی بھی ہیں۔ اس لئے ناول میں صحافیانہ اور سیاسی مسئلے بہت زیادہ دخیل ہو گئے ہیں۔ بہرحال اردو کے نئے ناول کے لیے ابھی بہت سے میدان باقی ہیں۔ کاش پریم چند کی طرح کوئی آج کے دیہات کو اپنا موضوع بنا کر آزادی کے بعد کے دیہاتوں کو پیش کر سکتا کہ ابھی یہ ایک بڑا اور دلچسپ تھیم ہے جو اردو کے ناول نگاروں کی توجہ کا محتاج ہے۔ میری معلومات کے مطابق ہندی اور اردو، دونوں زبانوں میں اب تک ہندوستان کے نئے دیہاتوں اور ان کے نئے مسائل کو نہیں چھوا گیا۔ ابھی تک لوگ ہندوستان کے دیہاتوں کو پریم چند ہی کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ادب کے کسی مسئلے کے مستقبل پر کوئی رائے زنی مشکل ہوتی ہے۔ مگر اندازہ یہی ہے کہ اردو ناول اور افسانے، سب شہری مزاج رکھتے ہیں اور شہروں کے مسئلے، آئندہ بھی اردو ناول کے مسئلے بنیں گے کیونکہ مغربی ادب کا بھی یہی ماڈل ہمارے سامنے ہے۔ ہارڈی اور اس کا اسکول اب انگریزی ادب سے بھی غائب ہو چکا ہے اور کم از کم اردو، ہندی کے ادیبوں کے سامنے ہر وقت مغربی ادب، ادبی تحریکات اور تجربے ہی رہتے ہیں۔ اردو میں ناول

کو آنچلک بھی بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ پاکستان کے کچھ افسانوں اور ناولوں میں یہ کوشش ملتی ہے مگر ہندوستان
کے اردو ناول ابھی تک آنچلک نہیں ہو پائے۔

اب آج کی تنقید پر کچھ باتیں کی جاتی ہیں۔ ترقی پسندوں نے اردو تنقید کو ایک نیا رخ دیا تھا
وہ یہ کہ ادب کی صرف خوبیاں اور خرابیاں یا فنی نکات، سقم اور محاسن سے آگے بڑھ کر ادب کا تجزیہ اس
لیا جائے کہ کسی تخلیق کے وجود میں آنے کے محرکات کیا ہوتے ہیں۔ کیا صرف جذبوں کے فنی اور جمالیاتی احساس
کے اظہار کے لیے ادب وجود میں آتا ہے یا ادیب کے گرد و پیش کے بیرونی حالات اسے ایک خاص وقت میں
ان کی ترجمانی کے لیے مجبور کرتے ہیں اور یہ بیرونی حالات ادیب کے اپنے سماجی اور سیاسی حالات ہی ہو
ہیں جو اس کے ذہن کو ایک خاص طور پر سوچنے کے لیے مجبور کرتے ہیں اور یہ کہ عوامی زندگی کے درمیان ہی
زندگی کے مسائل آتے ہیں اور وہی مسئلے ایک بڑے گھیرے میں کسی ملک و قوم کا مسئلہ بنتے ہیں۔ بیسویں
کے سماجی اور سیاسی حالات نے پریم چند کو اپنے ناولوں اور افسانوں کے لیے مسالہ فراہم کیا۔ اس مسا
ان حالات اور سوسائٹی کی ان خاص صورتوں کے بغیر پریم چند اور ان کے تخلیقات کا وجود ممکن نہ تھا۔ ترقی
پسندوں نے سماجی حقیقت نگاری کے اظہار پر سب سے زیادہ زور دیا۔ مجنوں گورکھپوری کا "ادب او
سے لے کر آج تک ترقی پسند نقادوں کا تنقید ادب کے لیے سب سے بڑا پیمانہ یہی سماجی حقیقت نگاری رہا
سماجی حقیقت نگاری، زندگی کی حقیقتوں کی سماجی تجزیے کے اظہار کا نام ہے، جس کے گہرے نشانات تخلی
کی فکر پر پڑے ہیں۔ فن کے پرکھنے میں اس تجزیہ اور اس کے طریقوں کو ترقی پسند نقادوں نے آگے
بڑھانے کی کوشش کی۔ یہ طریق کار فن کار کے جمالیاتی تجربوں کا بھی جائزہ لیتا رہا ہے اور دوسری صورتوں کا
مگر اسے کسی جامد فارم کے طور پر ترقی پسند نقادوں نے استعمال نہیں کیا۔ نہ کسی ہئیت یا تکنیک کے طریقے
جیسا کہ اکثر ترقی پسند تنقید پر اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہوتا رہا ہے کہ تنقید میں اس صورت
پر سب سے زیادہ زور دیا گیا۔ بقیہ صورتیں بہت کچھ تشنہ رہ گئیں۔ لیکن نئی ترقی پسند تنقید اب دوسری صورتوں
کی طرف متوجہ تھے۔ ادھر دو سال پہلے مارکسی جمالیات پر اصغر علی انجینئر کی ایک اہم کتاب مارکسی جمالیات کے
نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس سے قبل بھی پروفیسر ممتاز حسین نے "نئی حقیقت نگاریاں" اور نئی جمالیات
اپنی کتاب "ادبی گوشے" اور "ادبی مسائل" میں اٹھائی تھی۔ راقم الحروف کے بھی کئی مضامین، مارکسی
جمالیات پر شائع ہوئے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن کی کتاب ادبی سماجیات، میں بھی تنقید کے جمالیاتی اور نا

پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ پھر یہ کہ صرف جمالیات ہی ادب اور تنقید کا سب کچھ تو نہیں۔ ادھر جو نئی تنقید نئی شاعری کے سلسلے میں آئی ہے۔ اس میں جمالیات اور ادب پر اس طرح بحث کی گئی ہے کہ جیسے اگر نقاد ادب کے جمالیاتی پہلو پر کچھ نہیں لکھتا تو وہ نقاد ہی نہیں پھر ادب کی ہیئتی صورتوں کو ہی اصل تنقید سمجھ لیا گیا ہے۔ اور یہی سمجھانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اس میں بہت سے چھٹ بھیئوں کو بھی مزہ ملا۔ وہ جو نہ سماجی حقیقت نگاری کو سمجھتے تھے اور نہ جمالیات کا درک رکھتے تھے، وہ بھی نئی صف میں شامل ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کی نئی تنقید، اب ہیئتوں سے بھی الگ ہو کر متنی تنقید (TEXTUAL CRITICISM) کی طرف متوجہ ہو رہی ہے۔ متن ہی کو سامنے رکھ کر تخلیق کار کی تخلیقات کا جائزہ لیا جانا چاہئے۔ اور اس پر بیرونی اثرات، وقت کا فیشن یا چلن، یہ سب فروعی باتیں ہیں۔ اس سلسلے کی باقاعدہ کتاب شمس الحق عثمانی کی کتاب "بیدی نامہ" ہے جس میں صرف کہانیوں اور ناولوں کے متن پر ہی ساری تنقید کا انحصار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ متن کی اہمیت ہے کہ وہی فن کار کا اصل کارنامہ ہے، مگر تنقید تو یہ سوال کر سکتی ہے اور اسے کرنا بھی چاہئے کہ اس متن کے وجود میں آنے کے اسباب و علل کیا رہے ہوں گے۔ آخر اس طرح کی پیشکش کا مذاق اور مسالہ، کن صورتوں اور کن حالات میں آیا ہوگا۔ کوئی تخلیق، اپنے سماجی اور تاریخی گھیرے سے باہر اپنا وجود نہیں رکھتی۔ یہ بنیادی بات مان کر جب تک تنقید نگار نہیں چلے گا۔ صرف فروعات سے بحث کسی تخلیق کا صحیح جائزہ نہ ہوگا۔ لسانیات کے مطالعے سے تنقید میں فی زمانہ ایک نیا رخ اسلوبیاتی تنقید کا بھی پیدا ہوا ہے۔ تخلیق کے موضوع اور مسالے کو چھوڑ کر، تنقید نگار، اس کے پیش کرنے کے سانچوں اور اسٹائل صوتی نظام، آہنگ وغیرہ پر بحث کرتا ہے جو ہیئتی تنقید ہی کا ایک حصہ ہے۔ اب اس میں بھی تنقید نگار جب آہنگ اور صوتی نظام کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے، حروف گننے لگتا ہے۔ اور ان حروف کی موسیقیت ہی کو صرف، فن کار کی عمدہ تخلیق کا بنیاد بتانے لگتا ہے تو یہ انتہا پسندی کی دوسری مثال ہے کہ شاعر نے حروف کا التزام کر کے غزل تخلیق نہیں کی تھی۔ یہیں سے تنقید میں ایک دوسری شاخ ساختیاتی تنقید (STRUCTURAL CRITICISM) کی بھی پھوٹتی ہے۔ اس میں وہ نقاد بھی کسی حد تک شامل ہو جاتے ہیں جو عملی تنقید کے قائل ہیں۔ اگرچہ ساختیاتی تنقید، ہیئتی تنقید ہی کے زمرے میں آتی ہے، مگر اس کا سایہ عملی تنقید پر بھی ہے۔ عملی تنقید میں اگرچہ مسالہ خاص طور پر بحث میں آتا ہے۔ پھر بہت سے نفسیاتی پہلو بھی مگر تخلیق کی بناوٹ اور بناوٹ بھی زیر بحث آتی ہے۔ عملی تنقید، اردو میں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ کلیم الدین احمد نے اس طرز کو باقاعدہ شروع کیا۔ راقم الحروف نے بھی کچھ کام اس سلسلے میں کیا ہے۔

تنقید کے نئے رخ میں تحقیق کے طریق کار کو بھی کچھ جگہ مل رہی ہے۔ یہ صورت غالباً ان درسی مقالوں سے

پیدا ہوئی ہے۔ جو یونیورسٹیوں میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں نہ اصول تنا
کی باتیں ہیں نہ نظریات تنقید کی بلکہ، تخلیق کے حسن و قبح پر ہلکی پھلکی بحثیں۔ فنی اور فکری محاسبے کے سلسلے میں کی جا
ہیں۔ مگر ان تحقیقی مقالوں کی تنقید اور ان کے نقاطِ نظر پر زیادہ بھروسہ کرنا مناسب نہیں ان میں سے تو کئے ؤ
ادھر ادھر سے لفظاً لفظاً نقل کرلئے جاتے ہیں جس کا پتہ بعد کو چلتا ہے۔ کچھ مقالہ نگار تو ایسے دیدہ دلیہ
ہیں کہ انھیں بعد کو اسی طرح شائع کر کے اردو کی اکیڈمیوں سے انعامات بھی حاصل کرلیتے ہیں۔ یہ صورت حال نا
ناگفتہ بہ ہے کہ یونیورسٹی کا استاد نقاد، بالکل جعلی، نقاد ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے شعرا، دوسروں کی غزلیں مشاع
میں اپنے نام سے پڑھ دیا کرتے تھے اب یونیورسٹی کے اساتذہ اور اردو کے نقاد، دوسروں کی تنقیدی کوشش
کو مقالے کی شکل میں اپنے نام سے پیش کر کے ڈگریاں حاصل کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کے استادوں کی تنقید اور ان کی ڈ
اب قطعی قابل اعتبار نہیں تنقید کی دنیا میں یہ ایک پُر دغل اور جعلی سکّہ ہیں۔ اچھی تنقید اور اچھی تخلیقات اب
مدرسوں اور یونیورسٹیوں سے باہر لکھی جا رہی ہیں اور تدریسی اداروں سے باہر رہ کر ہی اب اردو میں نئے
تنقیدی تجربوں کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے مدرسہ اور خانقاہ دونوں کے لیے کہا تھا کہ ؎

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک   نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

مجھے خانقاہ کا تو کوئی تجربہ نہیں، مگر میں مدرسے کے لیے آج یہ شعر ضرور پڑھ سکتا ہوں۔ کوئی چاہے تو میری ایسی
سوچ کا بھی تنقیدی تجزیہ کرسکتا ہے۔

●●

مطبوعات خدابخش لائبریری پٹنہ

۱۔ خدابخش: خدابخش لائبریری کے بانی کی ایک مختصر مگر جامع سوانح
از سر جدوناتھ سرکار اور صلاح الدین خدابخش (انگریزی) 10-00

۲۔ مصوری کا تاج محل: خدابخش لائبریری میں محفوظ عہد مغلیہ کے ایک نادر مخطوطہ تاریخ خاندان تیموریہ کا تعارف اور نمونہ کی ۱۲ رنگین تصاویر۔ (انگریزی) 15-00

۳۔ مجموعہ مقالات پروفیسر سید حسن عسکری پہلی جلد: گنج ارشدیہ شرف الدین یحییٰ منیری، زین بدر عربی اور دوسرے موضوعات پر مضامین (انگریزی) 10-00

۴۔ تدوین متن کے مسائل: خدابخش سیمینار کے مقالات و مباحثے (اردو) 15-00

۵۔ پنڈت موتی لال نہرو کا خطبہ صدارت: انڈین نیشنل کانگریس کی یوپی کی پہلی صوبائی کانفرنس (۱۹۰۷ء) میں: ایک ہندوستانی دستاویز (اردو) 10-00

۶۔ فرہنگ آصفیہ: مولوی سید احمد دہلوی پر تبصرہ عظیم محقق قاضی عبدالودود کے تبصرے (اردو) 10-00

۷۔ بہار اردو لغت جلد اول: فرہنگ کلیم الدین احمد جی (م ۱۹۷۰ء) بہار میں عام طور پر بولے جانے والے الفاظ اور محاورات کی ایک اہم لغت (اردو) 15-00

۸۔ امیر خسرو بحیثیت مورخ —— از پروفیسر حسن عسکری (انگریزی) 25-00

۹۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل: از سید حامد 30-00

۱۰۔ طب اسلامی: جنوبی ایشیائی علاقائی سیمینار: روداد و مقالات 50-00

۱۱۔ رقعات رشید صدیقی: از ڈاکٹر مسعود حسین 30-00

۱۲۔ قومی یکجہتی کی روایت: از بی۔ این۔ پانڈے 5-00

۱۳۔ مولانا آزاد کی یادیں: (ہندی) 15-00

۱۴۔ سجاد حیدر یلدرم: از ایمن ترکمان 10-00

۱۵۔ آثار آزاد: خطوط و یادداشت رکھو عظیم آبادی: انتخاب اللہ فالی 30-00

۱۶۔ ہندوستانی مسلمان عسکری دستاویزات کے آئینہ میں 50-00

ترتیب و تدوین

۱۷۔ مجمع النفائس از سراج الدین علی خان آرزو (م ۱۱۶۹ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعرا کا ایک اہم تذکرہ (فارسی) 10-00

۱۸۔ باغ معانی از نقش علی (م ۱۲۳۰ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعرا کا دوسرا اہم تذکرہ (فارسی) 10-00

۱۹۔ مثنوی تصویر محبت از میر شمس الدین فقیر (م ۱۱۸۳ھ): عظیم آباد کی ایک داستان محبت جو میر کی شعلہ عشق کا ماخذ ہے (فارسی) 10-00

۲۰۔ صحف ابراہیم از علی ابراہیم خان خلیل (م ۱۲۰۸ھ) بارہویں صدی ہجری کے شعرائے فارسی کا تیسرا اہم تذکرہ (فارسی) 10-00

۲۱۔ شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان از مرزا جان طپش (م ۱۲۲۹ھ): شاہ عالم کے عہد کی محاورات اردو کی لغت 10-00

۲۲۔ تاریخ ہائے پیدائش و وفات معاصران: قطعات حسرت از شمس العلما محمد حسرت عظیم آبادی (م ۱۳۰۳ھ) فارسی 10-00

۲۳۔ گنجینہ تواریخ: شاہ فضل یحییٰ عظیم آبادی (م ۱۳۰۲ھ) کے قطعات تاریخی (فارسی) 10-00

۲۴۔ تذکرہ کاملان رامپور: مرتبہ حافظ احمد علی خان شوق (م ۱۹۲۲ء) (عکسی اشاعت، امیر مینائی کی "انتخاب یادگار" کے بعد ایک رامپور کے مشاہیر اور رہنماؤں کی تہذیبی تاریخ کا اہم ماخذ تقریباً ۵۲۳ مشاہیر رامپور کا تذکرہ (تصحیح و اضافہ کے ساتھ) (اردو) 50-00

رسائل کے ذخیرہ سے اردو ادب کی بازیافت

۲۵۔ جلد اول: ادیب الٰہ آباد، نوبت رائے نظر کے ماہنامہ "ادیب" کے مکمل فائل (۱۹۱۰–۱۹۱۳ء) سے علمی، تحقیقی اور ادبی مضامین کا انتخاب 50-00

۲۶۔ جلد دوم: العصر لکھنؤ، پہلے سال کے ماہنامہ "العصر" لکھنؤ (۱۹۱۳–۱۹۱۴ء) کے تمام وکمال مضامین، خاص کر انگریزی ادب، علمی اور ادبی مضامین کے علاوہ فلسفہ، سائنس، صنعت و حرفت پر بھی مضامین شامل ہیں۔ مشاہیر کی نادر عکسی تصاویر کے ساتھ۔ 90-00

۲۷۔ جلد سوم: صبح امید لکھنؤ، برج نرائن چکبست کے ماہنامہ "صبح امید" لکھنؤ (۱۹۱۸–۱۹۲۱ء) کے مکمل فائل سے ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ تحریک آزادی کے معاصر نیز انقلاب روس کے ہندوستان پر اثرات کے متعلق منتخب مضامین 50-00

۲۸۔ ۱۹۳۶ء میں قاضی عبدالودود کا معیار، قاضی عبدالودود کے مشہور اردو ماہنامہ "معیار" پٹنہ (۱۹۳۶ء) کے مکمل فائل کی عکسی اشاعت، ایک بھرپور تجزیاتی اشاریہ کے اضافہ کے ساتھ 50-00

۲۹۔ جدید غزل گو: ۱۹۴۲ء کی ایک دستاویز، نیاز فتح پوری کے ماہنامہ "نگار" ۱۹۴۲ء کے خاص نمبر کی عکسی اشاعت، ۲۰۰ کے قریب غزل گو شعرا کا خود انتخاب کردہ کلام، خود نوشت سوانح، شعرا کی اس عہد کی تصاویر اور خود نوشت تحریریں۔ 35-00

۳۰۔ گوشت مکھر دلی کا رسالہ "زبان" (۱۹۲۶ء – ۱۹۲۸ء) مکمل عکسی اشاعت، مفصل اشاریہ کے اضافہ کے ساتھ، اسلام، تاریخ ہند، تہذیب، زبان و ادبیات، اردو، صحافت پر مقالات، نادر مضامین، فلسفہ، اسلامی تہذیب پر تصاویر مشاہیر 50-00

خدابخش سلسلہ خطبات

۳۱۔ عہد سلطنت (۱۲۰۶–۱۵۲۶ء) کے صوفی ادب پر ایک طائرانہ نظر از ڈاکٹر بروس لارنس امریکہ (انگریزی) 10-00

۳۲۔ عہد نبوی کی تقویم کی تشکیل نو: از ڈاکٹر ہاشم بیرلی (انگریزی) 10-00

۳۳۔ صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات: سماجی سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ پروفیسر سید حسن عسکری (انگریزی) 10-00

۳۴۔ اسلام کی چودہ صدیاں مکمل ہونے کی تقریب میں: ہندو مسلم مسئلہ اور اسلام و عصر جدید کے بارے میں چند خیالات از بدرالدین طیب جی۔ (انگریزی) 10-00

۳۵۔ فارسی ادبیات میں ہندوستان کا حصہ: جدید تحقیقات کی روشنی میں از ڈاکٹر امیر حسن عابدی (انگریزی) 10-00

۳۶۔ فکر اسلامی: بدلتی دنیا میں از پروفیسر سید وحید الدین (انگریزی) 10-00

۳۷۔ مشرق وسطیٰ: شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ: از پروفیسر علی اصغر آصف فیضی۔ (انگریزی) 10-00

۳۸۔ اسلامک اسٹڈیز: از ڈاکٹر زبیر صدیقی۔ (انگریزی) 10-00

۳۹۔ علیگڑھ تحریک: از سید حامد 5-00

۴۰۔ اسلام اور ہندوستان: از بی۔ این۔ پانڈے۔ 10-00

۴۱۔ اورنگ زیب ایک نیا مطالعہ: از ڈاکٹر اوم پرکاش (ہندی) 15-00

اردو دانشوری

سید حامد
ڈاکٹر محمد حسن



خدا بخش نے ایک مسئلہ اور بھی چھیڑا — اردو دانشوری آزادی کے بعد! بہت اچھے مفکروں نے اس موضوع کا حق ادا کیا، اور ہر طرح: کسی نے کہا۔ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے؛ کسی نے کہا دانشوری یعنی چہ! کسی نے کہا چیل کے گھونسلے میں ماٹس کہاں۔ کسی نے کہا:

ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں — بے سبب ہوا دشمن سارا آسماں اپنا

مگر بعضوں نے کہا: نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہاتھ پیر توڑ کے بیٹھ جائیں۔ ہم جو ہیں وہ ہیں، اور جو بھی ہیں کچھ تو ہیں، اور بہتوں سے آگے ہیں!

یہ مباحث آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔

ادارہ

سید حامد
ہمدرد نگر، نئی دہلی

دانشوری کی تعریف

اور

اردو میں دانشوری کی بازیابی کے امکانات

آگے بڑھنے سے پہلے اچھا ہو کہ دانشوری کے معانی، مفاہیم اور مضمرات سے بحث کر لی جائے۔

وہی لوگ دانشور ہیں جنھوں نے زندگی کی گتھیوں کو حل کرنے کی لگاتار کوشش کی ہے، جنھوں نے عالم کے بدلتے
ہوئے حالات سے خود کو باخبر رکھا ہے۔ جن کے مطالعہ کو ان کے مشاہدہ اور تجربے سے غذا ملی ہے۔ جن کا علم نرا کتابی علم
نہیں ہے۔ جن کے علم نے انھیں رائے قائم کرنے، حکم لگانے اور فیصلہ کرنے کا شعور دیا ہے؛ جن کا مطالعہ وسیع ہے
ور ملک کی ایک سے زائد زبانوں کے علاوہ جن میں مغرب کی ایک زبان بالخصوص انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور
وسی زبان پر دسترس حاصل ہے (کہ سمٹتی، پیچیدہ تر ہوتی ہوئی اور نت نئے مسائل سے لبریز دنیا سے باخبر ہونے
در رہنے کے لیے مشرق اور مغرب دونوں سے براہ راست آگاہی ضروری ہے) جو مسائل پر ٹھنڈے دل
ے غور کرنے کی عادت ڈال چکے ہیں۔ جنھوں نے اپنے ذہنوں کو اوہام، رسوم، موروثی خیالات اور تعصبات
ے آزاد کر رکھا ہے۔ جن کا مقصد حقیقت کو پالینا ہے اور جس میں اس بات کی جرأت ہے کہ سچائی سے خواہ
ہ کتنی ہی تلخ ہو۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں اور اسے برملا بغیر آنکھ جھپکائے بیان کر سکیں۔
نشور تلاش حق اور اعلان حق میں کسی مصلحت یا کسی رُو رعایت کو داخل نہیں ہونے دیتا۔ اس کا ذہن سرجن کے
تر کی طرح ہوتا ہے جس کی دھار میں بلا کی کاٹ ہوتی ہے۔ اس کے گرد نہ دھواں بھٹکنے پاتا ہے نہ دھندلکا۔
اس سورج کی شعاعیں اسی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ وہ حقیقت کی جستجو میں کسی نظام فکر کو
ل نہیں ہونے دیتا نہ ان حقائق کو چھپانے یا دبانے کی کوشش کرتا ہے جن کا اظہار اس کے محبوب نظامِ فکر کو
تہ بنا رہا ہو۔ اس کا آلہ عقل ہے، وہ عقل جس کے ساتھ سوجھ بوجھ چلتی ہے، وہ عقل نہیں جو باریک بینی اور
مگافی سے دل بہلاتی ہے۔ دانش کا مصدر دانستن ہے جس کے معنی ہیں جاننا یعنی کسی امر کی تہ تک پہنچ جانا۔
ثور کبھی سطحی نہیں ہوتا اور نہ وہ سرعت ذہن پر ناز کرتا ہے۔ سرعت فہم کے بغیر بھی انسان دانشور ہو سکتا۔

دانش اور ذہانت میں بڑا فرق ہے۔ یہ لازم نہیں کہ ہر ذہین آدمی اُمور پر گرفت رکھتا ہو یا اس سے اصابت رائے منسوب کی ہی جائے ـــــ دانش ذہانت کی بہ نسبت ادراک سے زیادہ قریب ہے لیکن دانش کے عمل میں ادراک کے عمل سے زیادہ جامعیت ہے۔ دانشور کے یہاں اشتراک مقاصد غیر ممنوعہ ہے۔ دانشور اصلاً موحد ہوتا ہے۔ اس کا واحد مقصد سچائی کو ڈھونڈھ نکالنا ہے۔ وحدت مقصد پر وہ کسی مفاد کسی مصلحت کو اثر انداز نہیں ہونے دیتا۔

دانش میں چاہے یہ مفہوم بہت واضح نہ ہو لیکن دانشور کی نگاہ ہمیشہ حال کے علاوہ مضمرات امکانات مستقبل و متوقع یا ممکن نتائج پر ہوتی ہے اور وہ ایسے اقدام سے انحراف کرتا اور کراتا ہے جو بظاہر بہت اچھا ہو لیکن جس میں امکان نتائج کے خراب نکلنے کا چھپا ہوا ہو۔ دانشوری کا ایک عنصر دور اندیشی ہوتا ہے۔

دانشوری چھوٹی چھوٹی وفاداریوں وابستگیوں اور تنگ نظریوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس کا اُفق عالم اور انسانیت کا احاطہ کرتا ہے۔ آپ کسی ایسے شخص کو دانشور نہیں کہہ سکتے۔ شہر، ریاست یا وطن جس کی حد نظر ہو یا اس شخص کو جو سیاست کے دریا کا شناور ہو۔

دانش ایک حد تک تجریدی پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے لیکن حکایت تجرید کو اتنا نہ بڑھانا چاہیے کہ دانش کی غیر معمولی عملی افادیت کو ٹھیس پہنچے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ دانش کا عقل کی موشگافی یا تخیل کی بے مقصد بلند پروازی سے کوئی تعلق نہیں۔ دانش کے پیر سدا زمین پر ہوتے ہیں۔ اس کے قدم سوجھ بوجھ اور اعتماد کے ساتھ پڑتے ہیں اس کی نگاہ سُرنگ کے اندھیرے کو چیرتی ہوئی دوسرے سرے کی روشنی سے جا ملتی ہے۔

دانش کے ایوان میں نہ تیز رفتاری بار پاتی ہے، نہ گھبراہٹ، نہ فلسفیانہ بے نیازی۔ دانش کے ناخن مبہم لکیریں نہیں کھینچتے گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔ دانشور دراصل وہی ہے جو گتھیوں کو سلجھا سکے۔

دانشور کی انگلیاں انسانی فطرت کی نبض پر ہوتی ہیں۔ وہ انسان کے ارتقا اور زندگی کے نشیب و فراز سے باخبر ہوتا ہے۔ تاریخ پر اس کی نظر گہری ہوتی ہے تاریخیں یاد کرنے کے لیے نہیں بلکہ تحریکوں کے مد و جزر اور قوموں کے عروج و زوال سے آگاہ ہونے کے لیے کسی ایک مضمون میں غیر معمولی امتیاز بھی آپ کو دانشوری کے حدود میں داخل نہیں کر سکتا۔ دانشوری کا طرۂ امتیاز آزاد انداز فکر اور مربوط نظام فکر ہے۔

اُردو زبان میں دانشور کی اصطلاح کو غیر معمولی وسعت اور تعمیم کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اگر یہ عمل روا نہ رکھا جاتا تو ہمارے دانشوروں کی تعداد آٹھ دس سے آگے نہ بڑھتی۔ اس وقت ہم وائس چانسلروں، پروفیسروں، ریڈروں، وکیلوں، ڈاکٹروں کو چھوڑتے ہی دانشوری سے متصف کر دیتے ہیں۔ ہم نے اس اصطلاح کو بے دردی

کے ساتھ ارزاں کر دیا ہے۔ دراصل دانشور کے لیے مفکر ہونا ضروری ہے ہر چند کہ بڑا مفکر ان بلندیوں کو
لیتا ہے جہاں تک دانشور کی رسائی نہیں ہوتی۔

دانشور اور مفکر میں ایک فرق یہ ہے کہ دانشوری میں عملی اطلاق اور دیے ہوئے حالات میں فیصلہ
کرنے کی صلاحیت کے پہلو اور سوجھ بوجھ کی مقدرہ کشائی آجاتی ہے۔ مفکر اپنے پر پرواز کے لیے
بندھن قبول نہیں کرتا۔ دانشوری میں ارضیت شامل ہے۔ مفکر کو اس کے برعکس فلک شگافی کی دھن ہو
مفکر جس نظامِ فکر کی تخلیق کرتا ہے یا جس کا وہ دلدادہ ہوتا ہے اس میں مربوطیت اور تجریدیت کی ادائیں
ہیں۔ دانشور دانش کو ارض کے قریب اور سماء سے دور رکھتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ آپ کسی اصطلاح کا ترجمہ کریں یا کسی مفہوم کو لفظ تراشی کے ذریعہ ایک زبان سے
دوسری زبان میں منتقل کریں یا کسی ترقی یافتہ زبان کے الفاظ کے مترادفات کسی ترقی پذیر زبان میں یا کسی ترقی یا
زبان میں ہی ڈھالیں تو آپ مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتے کہ منفعت یاب زبان نو تراشیدہ لفظ کو ان ہی معانی
میں رکھے گا جنھیں آپ نے اس میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ زبان سے زیادہ خود سر اور غیور کوئی دو
وجود شاید عالم آب و گل میں نہ ہو۔ اردو والوں نے شروع میں غالباً INTELLECTUAL کے مفہوم کیلیے دانشور
کی اصطلاح ڈھالی۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بلکہ پلک جھپکاتے ہی نقل اصل سے آگے بڑھ گئی۔ INTELLECTUAL
میں نہ وہ وزن ہے نہ وہ مرتبہ جو دانشور کو حاصل ہو گیا۔ INTELLECT کا ترجمہ کیجیے تو دانش کے مقابلہ میں وہ عقل
اور فراست کے زیادہ قریب ہوگا۔ دانش کا مفہوم WISDOM سے ادا ہوتا ہے۔ ور غالباً ورزیدن سے
نکلا ہے۔ دانشور وہ شخص ہے جس نے دانش کو دانستہ اس کے سارے مضمرات اور تمام پابندیوں پر غور کرنے کے بعد
اختیار کیا ہے۔ جس طرح پیشہ ور کسی پیشہ کو اختیار کرنے والے کو کہتے ہیں اور سخنور مشقِ سخن کو اپنانے والے کے لیے
استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح دانشور وہ شخص ہوا جس نے دانش کو اختیار کر لیا ہے اسے اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے،
جس نے دانش کے تقاضوں اس کی شرطوں اور اس کے قیود کو برضا و رغبت قبول کر لیا ہے۔

اصطلاح وضع یا ترکیب یا ساخت کے لحاظ سے دانشور کا مرتبہ انگریزی کے INTELLECTUAL سے بمراتب اونچا ہے۔
دانش سے آپ وہ مفہوم ادا ہی نہیں کر سکتے جو اسے INTELLECT سے اوپر لے جاتا ہے۔ لیکن اس وزنی اور
گرانقدر اصطلاح کو ہم نے بے دردی اور ناقدری کے ساتھ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص سرِ بازار
سو روپے کے نوٹ کو پانچ روپے کے نوٹ کے عوض استعمال کرنا شروع کر دے تو سو روپے کے نوٹ کی قدر و قیمت

میں کوئی کمی نہیں ہوگی البتہ آپ اس شخص کی سلامتی ہوش وحواس کے متعلق جو رائے قائم کریں گے وہ شاید ستائش
مبنی نہ ہو۔ ہم نے ہر خاص و عام کو دانشور کہنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ دانشور سوائے سوچی سمجھی نپی تلی بات کے کچھ
کچھ نہیں کہتا۔ اس کی فکر محتاط ہوتی ہے اور زبان پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھاتی ہے۔ اس کے ساتھ توازن
ضبط منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً کل اردو کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے میری زبان سے جوش بیان میں یہ بات نکل
گئی کہ اردو والے اردو کے لیے رتی بھر بھی کام نہیں کر رہے ہیں۔ اس بات میں تندی تھی' بے احتیاطی تھی اور مبالغہ
تھا۔ ایسا سخن کسی دانشور کی زبان سے نہیں نکل سکتا۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ جہاں تک باضابطہ تعلیمی نظام سے
الگ جتن کر کے بچوں کو گھر پر اُردو پڑھانے کا تعلق ہے اردو والوں نے غفلت برتی ہے۔ لیکن میرے الفاظ سے اس
کی تکمیل نہیں ہوئی لہٰذا اگر میرے لیے محض اس بنا پر کہ میرا تعلق ایک بڑے تعلیمی ادارے سے رہا ہے دانشور کا لفظ استعمال
کر دیا جائے تو وہ اس لفظ یا اصطلاح کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ہم نے دراصل دانشور کے لفظ کو بہت ارزاں کر دیا ہے

دانشور کے لیے ایک شئے اور درکار ہے' جس کے بغیر کوئی فکر پیشہ انسان دانشور نہیں بن سکتا۔ یہ شئے ذہانت
ہے۔ ہمارے یہاں اس شئے کی بہت کمی ہے اسی لیے فی زمانہ ہم ایسے دانشوروں کو ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ ہمارے
یہاں جذبات کے کاروبار کے علاوہ مروتوں' رعایتوں' طرفداریوں' گروہ بندیوں کا چلن ہے۔ ہمارے زیرک' ذکی ا
باخبر اشخاص میں سے کم ایسے ہیں جو یہ سکہ ہائے رائج الوقت اپنی جیب میں نہ رکھتے ہوں۔ ان پر ایک اضافہ مکتبِ فکر یا آ
کا ہو گیا ہے۔ آئیڈیالوجی اکثر دیانت' اصابت' معروضیت اور انصاف کا خون کر دیتی ہے۔ دانشور ان چھوٹی باتوں
سازشوں اور گروہ بندیوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ شخص جس کا مزاج سازشی اور جذبہ دارانہ ہوتا ہے آسمان سے
تارے توڑ کر لا سکتا ہے، دانشور نہیں بن سکتا۔ دانشوری کے لیے کڑے سیّم اور انضباط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ا
ادب میں دانشوری کی روایت کو برقرار رکھنے میں زبان کے محققین سے مدد ملی ہے۔

کشادگی اور تعمیر نو :

اُردو نے گذشتہ دس سالوں میں دانشوری کے کوئی آثار اور شواہد پیش نہیں کیے ہیں۔ فضا بھی ناسازگار ر
(۱) اُردو پڑھنے والوں کی تعداد گھٹتی رہی اور زبان کی بقا مشتبہ ہونے لگی۔ دل زندہ نے اُردو میں غور و فکر کرنے وا
کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دل بجھتے ہیں تو دانشوری کا دیا ٹمٹمانے لگتا ہے۔ (۲) فرقہ وارانہ فسادات اور تناؤ اور بدگ
کی فضا نے اہلِ اُردو کو اس یکسوئی سے محروم کر دیا جو تخلیقی اور فکری مساعی کے لیے ضروری ہے (۳) فرقہ وارانہ
اور بے اطمینانی کے دور میں کوتاہ اندیش اور قیادت طلب اشخاص ملت کو بھڑکانے کا کام کرتے ہیں۔ جذبات سے

وقت کھیلا جاتا ہے تو عقل و دانش کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ (۴) زبان مرجھانے لگے تو اس زبان میں
کی آزادیٔ فکر ختم ہو جاتی ہے۔ (۵) ملک کی عام فضا دیانت اور راست گوئی اور جرأت فکر کو راس
اہل قلم حکومت یا اس کے اداروں کے حلقہ بگوش نہیں تو رہین منت ضرور ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ا
پروانہ میں کوتاہی آنا تھی سو آئی۔

ایسا لگتا ہے کہ دانشوری کے سوتے مذکورہ بالا وجوہ سے ہمارے یہاں خشک ہو گئے ہیں۔ تو ا
ہیں جب بنیادیں وسیع ہوں۔ اُردو پڑھنے والوں کی تعداد بڑھائے بغیر دانشوری کی روایت کی بازیابی
اس سے زیادہ اہم ضرورت ہے مزاجوں کو بدلنا' انھیں سطحیت' ارزاں جذباتیت' رعایت' مروت' ع
جانبداری سے بچانا۔ عقل کا ہمسفر اگر ضمیر ہو تو دانشوری کا مرحلہ سر نہیں ہوتا۔ دانشور دشواریوں' مصیبت
سے نہیں گھبراتا' ان کا مقابلہ وہ فلسفیانہ بے نیازی کے ساتھ کرتا ہے۔ اُسے خوشی اور غم کی بے ثباتی کا
اور حوادث سے بغایت متاثر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن بظاہر بے نیاز انسان اپنے ماحول اور اپنی انس
سے ہرگز بے تعلق نہیں ہوتا۔ دانشور لکیر کا فقیر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا مقصود ہوتا ہے اصلاح اور پیش
تعلیم اور تہذیب' وہ امور کی تشریح اور تجزیہ کرتا ہے۔ اسے عوامی ڈگر پر چلانا ممکن ہی نہیں۔ چونکہ ہر نظ
کی بنا پر تجدید کا طالب ہوتا ہے' اس لیے وہ لوگ جو کسی نظام کے تحت خوب پنپتے ہوتے ہیں' دانشو
اور اس کے نقطۂ نظر کو پرخطر سمجھتے ہیں۔ چونکہ اس کا کام ایک نئے نظام' ایک نئے انداز فکر' ایک نئی دنیا کو وجو
اس لیے دانشور عام روش سے انحراف ضرور کرتا ہے یہ انحراف خواہ فروعات سے ہو خواہ اصول سے' خواہ یہ ترمیم اور تن
اختیار کرے' خواہ بغاوت کا علم بلند کرے۔ یہ انحراف نظریات سے بھی ہو سکتا ہے اور طریق کار اور فیصلوں سے'
اپنی فکر کو آزاد رکھتا ہے اور دوسروں کو آزادیٔ فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی بات پُرمغز اور فکر انگیز ہوتی ہے۔ اس
جانا ممکن نہیں۔ وہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ناانصافی کے خلاف چلے اس سے اپنے متاثر ہوں چاہے ہرگز نہ اختیا
رہ نہیں سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی دانشور میں یہ سب اوصاف جمع ہوں جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ میرا مقصد تو ان خصو
گنانا تھا جو ہم کسی دانشور سے منسوب کرتے ہیں۔ ان اوصاف میں دیانت' معروضیت' دُور اندیشی' عملی بعید
نتائج کا ادراک' بے غرضی' آزادیٔ اظہار' حق گوئی' ہمدردی' جرأت اور خواہش اصلاح شامل ہیں۔

بیانِ ملکیت سہ ماہی خدابخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات
مطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقامِ اشاعت : خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴

۲۔ وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳،۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام : مصطفیٰ کمال ہاشمی

قومیت : ہندستانی

پتا : اسسٹنٹ لائبریرین، خدابخش لائبریری، پٹنہ

۵۔ ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار

قومیت : ہندستانی

پتا : ڈائرکٹر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۔۴

۶۔ ملکیت : خدابخش لائبریری، پٹنہ ۔۴

میں مصطفیٰ کمال ہاشمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے ساتھ درست ہیں

دستخط پبلشر : مصطفیٰ کمال ہاشمی

یکم فروری ۱۹۹۱ء

ڈاکٹر محمد حسن
پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی
نئی دہلی

اردو میں دانشوری کی روایت

(تیسری اردو ریسرچ کانگریس، پٹنہ ۲۲-۲۴ جنوری ۱۹۸۹ء میں پیش کیا گیا)

عقیدۂ محض کے دائرے سے الگ ہوکر اور متعین شدہ نتائج سے قطع نظر کرکے حواس کے ذریعے حاصل ہونے
مشاہدات اور تجربات کو منطقی استدلال اور سائنسی ربط و ترتیب کے ساتھ کسی نتیجے تک پہنچانا اور اس کے ذریعے
کو بہتر بنانے کی جد و جہد میں شرکت سے دانشوری پیدا ہوتی ہے۔

اس موضوع پر ایک طویل بحث ہو سکتی ہے کہ آزادی کے بعد اردو میں بالخصوص دانش دشمن رجحانات کی
کی گئی ہے عقل پر عشق و وجدان بلکہ عقیدے کو ترجیح دی گئی ہے پاکستان کی یہ ضرورت تھی ہندوستانی مسلمان کی مجبوری
پاکستان کے اردو ادب میں دانش دشمنی کی اس روایت کا اثر ہندوستان کے اردو ادب پر بھی پڑا۔

تین قسم کی "دانش وری" اس دور میں پنپتی ہے ایک وہ جسے دانش دشمنی کی روایت کہا جا سکتا ہے۔ دوسر
دانشوری تھی ہندوستانی مسلمان کے فکری احیاء کی کوشش جو دانش نہیں عقیدے کے زیر سایہ ہوئی۔ اس طرز کی ایک
دانش وری کی روایت تھی اصغر علی انجینیر کی تحریروں کی جسے نیا علم کلام کہا جا سکتا ہے اس میں مذہب اور عقیدے کی
طرح توجیہہ کی گئی تھی کہ دقیانوسیت کے بجائے روشن خیالی اور سوشلزم کے لیے گنجائش نکالی جا سکے۔ تیسری روایت تھی لا
کی روایت جس کا رشتہ عقیدے سے زیادہ دانش سے ملتا تھا جس کا عکس عصری ادب کے صفحات پر نظر آئے گا۔

ہندوستان میں اردو کا چلن کم ہو گیا رسالوں کی پہنچ اور کتابوں کی رسائی محدود ہو گئی پبلشر کم بلکہ معدوم مکتب ا
کم بلکہ مفقود۔ ایسے میں اگر کوئی لکھنا بھی چاہے تو کیونکر لکھے اور چھاپے گا کون؟ اس صورت حال سے نکلنے کا ایک ہی راستہ

وہ یہ ہے کہ ایک اچھا پبلشنگ ہاؤس ہو اور اس کے گرد لکھنے والوں کا ایک گروہ ہو جو اسی مقصد سے کام کرے کہ
ن نظریات، علوم اور تحریکات سے اردو والوں کو واقف کرائے گا اس اشاعت گھر کے کم سے کم چار بک شاپ ہوں
ابلیشن نما رسالہ۔ گجراتی میں ایک صاحب نے یہ اہتمام کیا تھا کہ ہر جدید ترین موضوع پر مستند کتابوں کی تلخیص با ہم
سا سے گجراتی زبان کے ۲۰۰ صفحات میں کر کے الگ الگ کتابچوں کی شکل میں چھاپنا شروع کی تھی اور ہر کتابچے کی قیمت
پے ہوتی تھی اور اس سلسلے میں نیوکلر فزکس سے لے کر کرکٹ تک پر کتابچے شامل تھے اس قسم کا کام اردو میں بآسانی
سکتا ہے اب بھی اردو لکھنے والوں میں سائنس میں ڈاکٹر عبید صدیقی اور ڈاکٹر رئیس احمد سماجی علوم میں پروفیسر علی محمد خسرو
محمد رشید الدین خاں جیسے اہل قلم موجود ہیں اور خود ہمارے سانیوں میں بھی علمی موضوعات پر لکھنے والوں کی کمی نہیں
انتظام کی۔ اور یہ انتظام کیا جاسکتا ہے اور اسکا آغاز اردو کانگریس ہی سے ہونا چاہیے۔ یقین مانیے یہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔



رہی اردو اکادمیوں کی بات۔ یقیناً حکومت پانچ کروڑ روپیہ اکادمیوں پر خرچ کر رہی ہے یہ بھی درست ہے کہ
میوں سے کچھ فائدے بھی ہوئے ہیں کتابیں زیادہ چھپنے لگی ہیں اردو ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی ہے پرانی کتابوں
اڈیشن بھی چھپے ہیں مگر اردو دنیا کی ان سے صرف ایک ہی آس لگی ہوئی ہے اور وہ پوری نہیں ہوئی ہے وہ ہے اردو
م کا انتظام اور جب تک یہ نہیں ہوتا اردو کا مستقبل محفوظ نہیں اور اکادمیاں شک و شبہ کی نظر سے دیکھی جاتی رہیں گی۔
حکومت نے ان اکادمیوں کے آئین میں بہت سے حقوق دے رکھے ہیں نہیں دیا ہے تو یہی حق نہیں دیا ہے ضرورت
کی ہے کہ ان اکادمیوں کے آئین میں مناسب تبدیلی کی جائے اور ان اکادمیوں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے طور پر
سکول کھول سکیں اور اپنے ذیلی دفاتر صوبے کے مختلف شہروں میں قائم کر سکیں اور وہاں بھی اس قسم کے اردو ماڈل
قائم کر سکیں بعض اکادمیوں کے پاس اتنی گرانٹ ہے کہ وہ آج بھی یہ کام کر سکتی ہیں اور یہ ہو تو اس مقصد کے لئے خصوصی
دی جائے اس کے ساتھ جن اسکولوں یا کالجوں میں اکادمی مناسب سمجھے اپنی طرف سے اردو ٹیچر مقرر کر سکے یہ اس
لے جب تک انھیں باقاعدہ اردو ٹیچر نہ مل جائیں۔ اکادمی کے ماڈل اسکول اردو میڈیم کے بھی ہوں گے اور اختیاری
بھی اور ان میں دیگر مضامین بھی پڑھائے جائیں گے۔
اس کے ساتھ ساتھ نصاب اور اردو اساتذہ کی تربیت کا کام بھی اکادمیوں کے سپرد ہو۔ جب تک اردو تعلیم
میوں کی کارگزاری قابل اطمینان نہیں ہوتی اس وقت تک اکادمیوں پر اردو دنیا کا اعتماد بحال نہیں ہو سکتا۔

تازہ دانشوری

- ایک پل ایسا بھی آجاتا ہے ـــــ احمد ندیم قا
- تم چپ رہے ہم چپ رہے ـــــ مخمور سعید
- عصر حاضر میں ادب کا کردار ـــــ مظفر علی س



دانشوری پر بحث چلی
تو،
پھر یہ بھی سوال اٹھا کہ
دانشوری کچھ ہے
تو
کیا ہے،
نمونوں میں ہر سال کی دانشوری کے نمونے
ریسرچ کانگریس کے ہر جلسے میں پیش کیے جاتے تھے۔
آخری سال کے نمونے پیش خدمت ہیں:

احمد ندیم قاسمی

ایک پل ایسا بھی آجاتا ہے

زخم پر زخم دے جاتے ہو
نہ جھجکتے ہو نہ شرماتے ہو
زخم دینا بھی، نہ پچھتانا بھی
وار پر وار کیے جانا بھی
آمریت کی سند ہوتی ہے
تم کو معلوم نہیں ہے شاید
زخم کھانے کی بھی حد ہوتی ہے
ایک پل ایسا بھی آجاتا ہے
زخم دیتا ہوا جلاد کا ہاتھ
اُٹھ کے نیچے نہیں آپاتا ہے
ایک مفلوج کے بازو کی طرح
حشر تک کے لیے تھم جاتا ہے
آنے والی کئی نسلوں کے لیے
ایک عبرت کی علامت بن کر
صفحۂ وقت پہ جم جاتا ہے

مخمور سعیدی

تم چپ رہے ہم چپ رہے

جب حکم اک صادر ہوا، تم چپ رہے ہم چپ رہے
وہ وقت کچھ کہنے کا تھا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

اب اپنی اپنی قسمتوں پر بیٹھ کر سوچا کریں
وہ فیصلہ لکھتا رہا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

تقریر اس کی آگ تھی، شعلے فضا تک بھر گئی
اور شہر سارا جل گیا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

لٹنے لگی تھیں بستیاں، سوئے ہوئے تھے پاسباں
چاروں طرف اک شور تھا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

قاتل بنا وہ، کار بھی، ٹوکا اسے اک بار بھی
وہ جھوٹ بولا برملا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

سر پھوڑتی پاگل ہوا کہتی تھی کوئی ماجرا
روتی رہی گھایل فضا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

منظر بھرے بازار کا، گرنا در و دیوار کا
گھر گھر قیامت تھی بپا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

لفظوں کے سوداگر اٹھے، جھولی بھری چلتے بنے
سودا ہمارا ہو گیا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

مقتول، حرفِ التجا سنتا تو کیا سنتا خدا
کاٹے گئے دستِ دعا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

اے وائے بے جرم و خطا قتلِ عمد مخمور کا
بستی کے لوگوں نے کیا، تم چپ رہے ہم چپ رہے

رملی سٹیل

عصرِ حاضر میں ادب کا کردار

لام و تحیات کے ساتھ ، میرے لیے واجب ہے کہ حلقۂ اربابِ ذوق کی
ہونے والی انتظامیہ کا شکریہ ادا کروں جس نے ، اپنی ذمے داری کی
کے طور پر منعقدہ سالانہ اجلاس کی صدارت کا فریضہ میرے سر ڈال کر
موقع عنایت کیا کہ آپ سب سے مخاطب ہو سکوں ۔

ناً یہ اعزاز کسی بھی قلم کار کے لیے باعثِ افتخار ہوتا لیکن میرے
ے حیرانی کا مقام بھی ہے ۔ اس لیے کہ اپنی حیاتِ قلم کا غالب حصہ ،
کی حالت میں ، حلقے سے باہر ہی گزرا ہے ۔

سم بلاشبہ حلقے سے میرا رابطہ ، آزادی کے فوراً بعد ، ابتدائے شباب کے
ں طرح زور و شور سے شروع ہوا تھا ۔ لیکن تین ساڑھے تین برس کے
، معاملے یا مجادلے میں بقول قائم چاند پوری ، یہ کیفیت پیدا ہوگئی تھی :

نے نجھ یہ وہ بہار رہی ، اور نہ یاں وہ دل
کہنے کو ، نیک و بد کے ، اک الزام رہ گیا

، بھی تقریباً چار دہائیوں کے بعد سوچتا ہوں تو یہ الزام بھی اتنا برا
ا ۔ بلکہ اس ابتدائی رابطے کے دوران اس گمراہ نے ، مرحوم قیوم نظر
میں ، حلقے سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہی ہو گا ۔ عین ممکن ہے کہ
، ادب میں بحث و گفتگو کے آداب اور اپنے ردِعمل کو دل میں دبائے
ں بجائے ، دلیل و برہان کے ساتھ سب کے سامنے پیش کرنے کی تربیت
حاصل ہوئی ہو ، اور کسی حد تک وہ اندازِ نظر بھی جو ذرا دیر سے
کہ جن سے لگاؤ نہیں ، ان سے لاگ بھی کیوں ہو ؟ اور جن سے لگاؤ

؛ صدارت ، حلقۂ اربابِ ذوق سالانہ اجلاس منعقدہ ۲ جولائی ۱۹۹۰ء ۔

ہے ، اُن سے لاگ بھی کیوں نہ ہو ؟ جدلیاتی مطابقت کا یہ نکتہ ہاتھ لگا تو بقول حفیظ ہوشیار پوری :

پھر یہ ہنگامہ عمر بھر ہی رہا

چنانچہ اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کی متغیر صورتِ حال میں تہذیبی اداروں کو مستحکم کرنے کی اشد ضرورت ہے ، خصوصاً اُن اداروں کو جو اپنی ایک تاریخ رکھتے ہیں اور جن کا وجود ایک جمہوری بنیاد پر طے شدہ آئین کی صورت میں برقرار ہے ۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی آزاد ادبی حیثیت اس امر کی متقاضی ہے کہ ہر مکتبِ فکر کے اہلِ قلم ، پہلے کی طرح اس کے ساتھ اپنے تعاون کو مضبوط بنائیں ، روحِ تغیر کو اپنے اندر جذب کریں اور مل جل کر بلند آواز میں تہذیبی مسائل پر سوچ بچار کریں ۔

ان میں سے ایک مسئلہ آج کا موضوعِ گفتگو ہے ، یعنی عصرِ حاضر میں ادب کا کردار کیا ہو ؟ عام طور پر اس کا تعین ایسے لوگ کرتے ہیں جنہیں ادب کے ماضی ، حال یا مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ۔ اُن کے جماعتی سیاسی مفادات ، البتہ ، ادب کو ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنے کی طرف راغب ہوتے ہیں ۔ قوت حاصل ہو جائے تو اس سلسلے میں ترغیب و تحریص سے لے کر تہدید و تعزیر تک کسی بھی وسیلۂ دست اندازی کو برتنے میں دریغ نہیں کیا جاتا ۔ ظاہراً ہم ایک جمہوری دور سے گزر رہے ہیں ، لیکن جمہوریت کی روایت ہمارے معاشرے میں ابھی اتنی محکم نہیں ہونے پائی کہ تحریر کی آزادی حرص و ہوا اور خوف و خطر کے بغیر نبھائی جا سکے ۔ اصل میں جمہوری دور میں ادب کو ایک دُہری مصیبت درپیش ہوتی ہے ، ایک تو اس دور میں جلسوں جلوسوں کا اتنا شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور دے بھی جائے تو لگتا ہے سیاست ، سوقیانہ پن کی شکار ہو چکی ۔ اس بازاری سطح کے ہنگامے میں ادب کی شمولیت شرم کا مقام ہو گی ۔ دوسری طرف اس مخلوقِ خدا کو جو سوقیانہ پن کی طرف زور و زر کے ساتھ کھنچتی چلی جا رہی ہے ، کس طرح ادب اور تہذیب کی طرف مائل کیا جائے ؟

حال ہی میں اس دوسرے مسئلے پر محترم جمیل جالبی صاحب نے ایک ذاتی مکتوب میں اپنی تشویش کا یوں اظہار کیا ہے :

”لگتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ادب کی مؤثریت درجۂ صفر تک

پہنچ چکی ہے - ہمارے زمانے میں اگر کوئی ادب پڑھتا بھی ہے تو
وقت گزاری یا دل بہلاوے کے طور پر - ایسے میں ادیب کی درد ناک
آواز جو اس کے تہہِ دل سے نکلتی ہے کیسے اپنا کام کر سکتی ہے ؟
پرانے زمانے میں کہتے تھے "از دل خیزد ، بر دل ریزد" - دل سے
اٹھنے والی آوازوں میں تو کوئی کمی نہیں مگر اب یہ آوازیں کسی
دوسرے دل پر نازل ہونے سے پہلے فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں -
کتابیں اور رسالے الماریوں کی زینت بن جاتے ہیں ، اور ان کے مندرجات
کو پڑھنے والا معدوم ہوتا جاتا ہے - شاید کچھ لکھنے والے تھوڑا بہت
پڑھتے بھی ہوں مگر ان کی تعداد میں جس رفتار سے اضافہ ہوتا جاتا ہے
اور تحریر کے معیار میں جو کمی آتی جاتی ہے ، اس کی روشنی میں
دیکھا جائے تو ملکی آبادی کا غالب حصہ خواندگی کی نعمت سے
محروم ہے اور جو خواندہ ہو بھی چکے ہیں ، وہ بھی یا تو انگریزی
پڑھتے ہیں یا بہت کمال کریں تو کوئی مقبول عام قسم کا اردو روزنامہ -
سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کے - جو ایک دو فیصدی
خواندہ لوگ بچ جاتے ہیں وہ جلدی سے ادیب بن جانا چاہتے ہیں -
یعنی صاحبِ تصنیف - سوچیے تو اب میر و سودا کو ، غالب و اقبال
کو ، راشد اور فیض کو ، منٹو اور بیدی کو ، عسکری اور غلام عباس
کو کون پڑھے گا اور پڑھے گا تو ان سے کیا حاصل کرے گا ؟ کیا اس
صورتِ حال میں ہمارا ادب نشو و نما پا سکتا ہے اور کیا ہم اپنے
تہذیبی معیار سے غافل ہو کر کوئی نیا کمال پیدا کر سکتے ہیں ؟ اور
کر بھی لیں تو کون ہے جو اس سے بہرہ ور ہو ؟"

اس اقتباس میں جو قدرے طویل ہو گیا ، بہت سے سوالات اٹھائے گئے ہیں
جن میں سے چند ایک کا تعلق ہمارے موضوع گفتگو کے ساتھ بھی ہے مثلاً
موجودہ دور میں ادب کا اشیائے صرف کی طرح استعمال اور ادب کی آواز کا کارگر
نہ ہونا - دونوں کا تعلق پڑھنے کی مقدار سے نہیں ، پڑھنے کے معیار سے ہے -
خالی خولی پڑھنے یا پڑھے جانے کے بارے میں ہمیں اتنا پریشان ہونے کی
ضرورت نہیں - الم غلم کتابیں پڑھتے رہنا بھی ایک قسم کی لت ہے جو ایک بار
کسی اچھے بھلے ادیب کو لگ جائے تو پھر وہ ادب کے کام کا نہیں رہتا -
اس لیے کہ ادب ، معیار اور امتیاز اور تہذیبی شعور کا متقاضی ہے - ان پڑھ

معاشرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ معاشرتی ردِعمل کے طور پر اس میں چند ایک خود گزیں لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو ہر قسم کی کتاب کو ، چاہے کسی معیار کی ہو ، خود فراموشی کے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں ، اور منشیات کے عادی لوگوں کی طرح ہر قسم کے کام کے لیے ، بشمولِ تحریر ، مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں ۔

عسکری صاحب نے کبھی لکھا تھا کہ پڑھنا ایک سماجی فعل ہے ۔ اُن بیچاروں کو کیا خبر تھی کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جب ناخواندہ معاشرے کا دباؤ اسے بھی ایک انفرادی لت بنا کر رکھ دے گا جس کا سماج سے کوئی سمبندھ ہو گا تو محض اتنا کہ اب یہ فعل ایک ایسی سطح پر جا پہنچا ہے جسے کم از کم شعوری نہیں کہا جا سکتا ۔

پہلے اسی معاشرے میں ، جس میں خواندگی کی شرح اگرچہ کم تھی لیکن نیم خواندہ ہونا اور اپنے ادب سے غافل ہونا ، ایک تہذیبی کوتاہی کی دلیل سمجھا جاتا تھا ۔ جو لوگ لکھنے کی طرف مائل ہوتے تھے یا دوسرے لفظوں میں تخلیق ادب کو اپنا سروکار سمجھتے تھے وہ اپنے معاشرے سے مخاطب بھی ہوتے تھے اور اپنے معیارِ نظر کے مطابق اس پر کڑی سے کڑی تنقید بھی روا رکھتے تھے ۔ حیرت کی بات ہے کہ جمیل جالبی صاحب نے اپنے خط میں جو کچھ حال ہی میں لکھا ہے تقریباً یہی بات ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد امیر مینائی نے کیسے رچاؤ کے ساتھ کہی تھی ۔

محفل برخاست ہے ، پتنگے   رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر   تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ہے ان کی نمود بھی کوئی دم   وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں

کہا جا سکتا ہے کہ یہ سماں ، کلاسیکی دانشوری کے غروب کا تھا جب کہ نئی دانشوری کا ظہور علی گڑھ میں ہو رہا تھا ۔ جس سے نہ امیر مینائی کو آشنائی تھی نہ داغ دہلوی کو رغبت ۔ بلکہ لاہور تک میں نئی دانشوری کے مغربی اساتذہ کی صحبت میں بیٹھنے والے محمد حسین آزاد بھی سخت گومگو کے عالم میں تھے کہ دماغ ”نیرنگِ خیال“ کی طرف دوڑتا تھا اور دل ”آبِ حیات“ کے طلسمات میں اسیر تھا ۔ اُدھر اکبر الہ آبادی نے جدید دانشوری کے پردے میں ، ذہنی استعمار کی بازی گری کو کارفرما دیکھ لیا تھا :

جو میری ہستی تھی ، مٹ چکی ہے ، نہ عقل میری نہ جان میری
ارادہ اُن کا دماغ میرا ، خیال اُن کا ، زبان میری

ممکن ہے کسی مہربان کو حیرت ہو کہ موضوعِ سخن تو عہدِ حاضر میں ادب کا کردار ہے اور بات ہونے لگی ہے اکبر الٰہ آبادی پر جو آج سے ٹھیک ایک صدی پہلے اپنی ادبی فعالیت کا تحریری مظاہرہ کر رہے تھے ۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر میں ، اکبر نے جو کچھ کیا ، وہ بڑی حد تک بیسویں صدی کے اواخر کی صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے :

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اُڑ جائے
مطلب کی کہوں تو پالیسی میں اُڑ جائے
باقی سرِ قوم میں ابھی ہے کچھ ہوش
غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اُڑ جائے

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اکبر کا کلام آج بھی کتنا برمحل ہے ۔ اصل میں ادب کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو یوں تو ایک خاص عہد کی کوکھ سے نکلے اور اس عہد کے افکار و اقوال پر نقد و تبصرے کا حق بھی ادا کرے لیکن اس کی خصوصیت میں کچھ ایسی عمومیت مضمر ہو جو آنے والے زمانوں میں بھی ایک فعال قوت کی طرح اپنا جاودانی تہذیبی کردار ادا کر سکے ۔ اکبر کی شاعری اور ظرافت پر مفصل گفتگو کا یہ موقع نہیں ، تاہم دو ایک نکتے اور بھی ملاحظہ ہوں :

کام کی بات جو کہنی ہے وہ کہہ لو ، اکبر
دم میں چھن جائے گی یہ طاقتِ گویائی بھی

درست ہے کہ طاقتِ گویائی کا ایک دم میں چھن جانا ، جیسا کہ پروفیسر وگ پڑھاتے ہیں ، دنیاوی زندگی کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کرتا ہے لیکن جس گہرائی میں جا کر اکبر نے کہنے والے کے عدمِ تحفظ کا احساس دلایا ہے ، وہ محض صوفیانہ تصورِ فنا کی دین نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے کہ اس تصور سے "کام کی بات" کا کوئی رابطہ پیدا نہیں ہوتا ۔ اتنا تو شاید مدارس میں بھی بتایا جاتا ہو کہ اکبر کے کلام پر قدغن یا سرکاری پابندی لگائے جانے کا اشارہ ہوا تھا جس کی طرف ایک شعر میں حوالہ بھی موجود ہے :

حکم اکبر کو ہوا ہے کہ کرو ترکِ سخن
خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

شہنشاہی دور میں ایران کے ممتاز معاصر شاعر ، احمد شاملو نے مجھ سے کہا تھا کہ ''دولت از شعر وحشت می کند'' یعنی حکومت شاعری سے خوف زدہ ہے ۔ یہ بات ہم بھی اپنے تجربے کی روشنی میں جانتے ہیں کہ فیض و راشد ، منٹو اور عسکری کسی وقت بھی حکومت کے قابو میں نہیں آئے ، بعض اوقات سرکاری ملازمت میں مبتلا ہونے کے باوجود ۔ ان میں سے کسی کو نہ ریڈیو پاکستان اپنا حلقہ بگوش بنا سکا اور نہ بعد میں کوئی رائٹرز گلڈ اپنی گرفت میں لا سکا ۔ یہاں تک کہ ابھی تک اکادمی ادبیات بھی فیض کے سوا ، کسی اور کو بعد از مرگ قدر شناسی نہ دے سکی ۔ لگتا ہے کہ ادب کی دنیا میں ، سرکاری نقطۂ نظر سے ، مرحومین کو بھی غیر محفوظ نہیں سمجھا جاتا ۔

بودلیئر نے ''بدی کے پھول'' کے دیباچے میں کہا تھا کہ ''شاعر کسی پارٹی کا نہیں ہوتا ۔ اس لیے کہ یوں تو وہ ایک عام فانی انسان ہو کر رہ جائے گا ۔'' زندگی کے کسی مرحلے میں ایک آدھ ادیب کو کسی نہ کسی پارٹی سے تھوڑی بہت مشروط ہمدردی ہو سکتی ہے ، لیکن غیر مشروط غلامی ، کسی سیاسی ، نیم سیاسی جماعت کی ہو یا ترقیاتی وسائل کی ، کسی ادیب کے شایانِ شان نہیں ۔ وہ تو پہلے سے ایک ایسے معاشرتی نظام کی اسیری کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہوتا ہے جو اس کے چوگرد محیط ہے ، اور جس میں رہتے ہوئے اس کا دائمی منصب یہ ہے کہ اس معاشرتی قید خانے سے اپنے تخیل کی مدد سے باہر نکلے ، اور باہر کی دنیا کا منظر سب کو دکھاتا رہے ۔ اکبر کے ''نامہ بنام اخبار اودھ پنچ'' کا ایک شعر ہے :

کی سیرِ دو عالم اک نفس میں
پھر دیکھیے تو اسی قفس میں

اقبال نے اپنے آپ کو قافلۂ بہار کا ''طائرِ پیش رس'' کہا ہے جس نے خلوتِ قفس میں رہتے ہوئے اپنا پیغام نشر کر دیا ہو ، کسی قسم کے نشریاتی ترقیاتی وسیلے کے بغیر ۔ تاہم جب مولانا محمد علی جوہر نے انھیں اپنی خلوت سے نکل کر سیاست کے میدانِ عمل میں اترنے کی دعوت دی تو اقبال نے جواب دیا کہ ''بھائی ! میں تو قوال ہوں ، گاتا ہوں کہ آپ کو وجد میں لاؤں ۔ اگر میں بھی وجد میں آ گیا تو پھر قوالی کیسے ہو گی ؟''

ٹھیک ہے کہ اقبال نے تھوڑا بہت رابطہ اہلِ سیاست سے بھی رکھا اور مسلم قومیت کے سلسلے میں بقولِ خود ''فکر و دانش کا فریضہ'' بھی انجام دیا ۔

لیکن یہ ان کے دانشورانہ اور تہذیبی کردار ہی کی ایک توسیع تھی جو شکر خدا ہے ، عملی سیاست میں ہمہ وقت محویت تک نہ پہنچی ۔ جس چیز نے انھیں اس مشغولیت کا شکار ہونے سے باز رکھا وہ ان کا مفکرانہ اور شاعرانہ منصب تھا ، جو پاکستان نہ بھی بنتا تو اس کی حیثیت اپنی جگہ برقرار رہتی ۔ پاکستان بننے کے بعد ہم نے اقبال کو جو کچھ بنا دیا ، اس کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے متحرک وژن کو جامد بنا کے رکھ دیا جائے یعنی ان کے ادبی اور فکری کردار کو معاشرے میں جاری و ساری رہنے سے روک دیا جائے ۔ یوں بھی یہ زمانہ ایسا تھا کہ اہل قلم تک کہنے لگے تھے :

مجھ سے میرا قلم چھین لو
میرے ہاتھوں میں تلوار دے دو

اس وقت لکھنے والوں کے سامنے کوئی نہ کوئی محدود یا فوری ہدف تھا ، مثلاً تلنگانہ میں انقلاب کی امید اور اس کے نمونے پر باقی سب جگہ ایک موہوم تمنا ۔ اس پر بھی شاید کسی کو اعتراض نہ ہو ۔ لیکن خود ہی اپنا قلم چھنوانے میں کیا حکمت ہو سکتی ہے ؟ اگر یہ بار گراں آپ کے بس کا روگ نہیں تو آرام سے اسے چھوڑ دیجیے ، اور پھر جو بھی جی میں آئے سو کیجیے ۔ یوں لگتا ہے جیسے قلم کاری بھی آپ کے لیے ایک ایسی عادت بن چکی ہے جسے اپنی مرضی سے ترک نہیں کیا جا سکتا ۔ کسی نہ کسی خارجی تشدد کی ضرورت پڑی ہے ۔

معلوم ہوا کہ ادیب کے لیے ادب محض ایک میکانکی فعل ہو کر رہ جائے تو نہ زندگی کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں نہ تخلیق ادب کے ۔ سیاسی و نیم سیاسی جماعتوں کے رہبر یہ بات نہیں جانتے کہ جو ادیب ان کے حلقہ بگوش بن کر رہ جاتے ہیں ، وہ ادب کی دنیا میں ہی اپنا اعتبار زائل نہیں کرتے ، ادبی اظہار پر بھی اپنی گرفت کھو بیٹھتے ہیں ۔ تخلیقی ادب اور تبلیغائی ادب میں پہلا فرق یہ ہے کہ تخلیقی ادب اپنے تخلیق کار کی رگ رگ میں سمویا ہوتا ہے ، اور تہذیب میں رچا ہوا ، جب کہ تبلیغائی قسم کی ادب نما تحریریں کسی نہ کسی اوپری دباؤ کے تحت لکھی جاتی ہیں جو لکھنے والے کے کام و ذہن کی آزمائش سے آگے نہیں بڑھنے پاتیں ۔ ایسی تحریریں فرمائشی نہ بھی ہوں جیسا کہ بعض مبلغین کرام دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے خلوص سے لکھا

ہے ، تب بھی یہ کسی نہ کسی فارمولائی ترکیب کے تحت وجود میں آتی ہیں ، اور ان میں زیادہ سے زیادہ ، ادیب کی فراست کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے یا ایک چالاک قسم کی ہنر مندی ان میں تھوڑی بہت ظاہری کشش پیدا کر دیتی ہے جیسے ٹی ۔ وی کے ڈراموں میں ۔

تبلیغاتی تحریروں سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کہ مبلغ محترم ابھی منزل پر پہنچ چکے ہوں اور اب دوسروں کو وہاں تک لے جانا چاہتے ہوں ۔ تبلیغ یا پرچار ، آزادی کا ہو یا استعمار کا ، اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتا جب تک اس میں انسانی تجربے کی ٹامک ٹوئیاں اور شک و شبہ کی ہچکچاہٹیں شامل نہیں ہوتیں ۔ اس لیے ادیب نہ کسی حتمی بات کو قبول کرتا ہے اور نہ یقین کی اس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے جس کے بعد راوی چین لکھ دے ۔ جرمنی کے جمالیاتی فلسفی لیسنگ نے لکھا ہے :

''میں تو بس کاغذ پر قلم رکھ کے سوچتا ہوں ، اگر آخر کار میرے خیالات مجھے مطمئن کر دیں تو میں کاغذ کے پرزے کو چاک کر دیتا ہوں ۔ ورنہ اسے چھپنے کو بھیج دیتا ہوں ۔''

سیاست کی دنیا محدود اور ہنگامی مفادات کی دنیا ہے ۔ اس لیے یہاں جو بھی فیصلے ہوتے ہیں ، حتمی اور اٹل ہوتے ہیں کہ جلدی میں یہی کچھ ہو سکتا ہے ۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد پراپیگنڈا ہی پراپیگنڈا ، تبلیغ ہی تبلیغ کی مدد سے فکر و دانش کی کمی پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ جس کے لیے ادیبوں کی ضرورت پڑتی ہے ، اور ادیب بھی کسی نہ کسی بہانے ، قومی اور ملی خدمت سے لے کر عصری شعور کی نمائندگی تک ، اس کار خیر میں شامل ہو جاتے ہیں ۔ آپ ۱۴ اگست کے موضوع پر لکھی ہوئی ان گنت نظموں میں سے جو سرکاری رسالوں میں شائع ہوئیں کوئی ایک اٹھا لیجیے تو معلوم ہوگا ہر طرف بہار کا سماں ہے ، اور اب کوئی مسئلہ باقی نہیں رہا ۔ اس کے مقابلے میں فیض کا ''داغ داغ اجالا'' رکھ کر دیکھیے تو فارمولائی ترکیب اور تخلیقی تشکیل کا فرق محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ اسی طرح ۱۹۶۵ء کے جنگی ترانوں کو دیکھیے جن کی آواز جب بھی سنائی دینے لگے تو لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یا تو کوئی نئی جنگ ہمارے سروں پر مسلط ہونے والی ہے یا کوئی نیا مارشل لاء لگ چکا ہے ۔

درست ہے کہ ایسے ترانے لکھنے والوں نے اور ان سے بھی زیادہ ان کے
گانے والوں اور گانے والیوں نے ، کسی نہ کسی سطح پر اپنا ہنگامی فریضہ
انجام دیا ہے لیکن اسے ادب کا کردار انجام دینا نہیں کہہ سکتے ۔ اس لیے کہ
جنگ یا مارشل لاء کے سلسلے میں ادب کا کردار یہاں تک محدود نہیں کہ اپنی
قوم کا حوصلہ بڑھایا جائے یا جو کچھ بھی ہماری مرضی کے بغیر ہو رہا ہے اس
پر اطمینان کا اظہار کیا جائے ۔ یہ کام تو آپ نے ایک بار انجام دے دیا ، اس
بھی راگ کب تک الاپتے رہیں گے ؟ کیوں نہ ایسا شعور پیدا کرنے کی کوشش
ہو جو اس قسم کے ہنگامی حالات کو پیدا ہونے سے پہلے روک سکے ؟ ایسا تبھی
ہو سکتا ہے کہ ادب ، بکایک پینک سے بیدار ہو کر کسی وقتی نعرے میں
شامل ہونے کی جگہ ، مستقل بیدار رہے اور اجتماعی بیداری کی نشوونما میں حصہ
لیتا رہے ۔ عصری شعور میں جب تک بین الاقوامی شعور شامل نہیں ہوتا
قومی حادثات بھی عالمی پس منظر کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے اور دونوں میں
جب تک تہذیبی اور تاریخی شعور پیوست نہیں ہوتا اس وقت تک صورتِ حال
ایک ہی سطح پر نظر آتی ہے ۔ محدود سیاسی مفادات کی سطح پر ، جس کی مدد سے
ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا ، تبلیغ و تلقین البتہ جاری رکھی جا سکتی ہے ۔

آج کل تبلیغ یا پرچار کا یہی انداز ، اے آئی آر کی اردو سروس سے ہندوستا
کے بہت سے اردو ادیبوں نے اپنا رکھا ہے ۔ اس سلسلے میں اب تک علی سرد
جعفری ، اپندر ناتھ اشک ، رام لال ، ڈاکٹر محمد حسن ، انور عظیم ، راہی
معصوم رضا اور کئی دوسرے لکھنے والوں کے اپدیش نشر ہو چکے ہیں ۔ ا
سب کا پیغام یہی ہے — پاکستان کو ، بقول ان کے ، کشمیر کے دہشت گردو
اور مذہبی جنونیوں کی پشت پناہی نہیں کرنی چاہیے ۔ پشت پناہی تو خیر ،
کیا کرتے ہیں اور چاہیں بھی تو کتنی کر سکتے ہیں ، لیکن سوال یہ ہے
کشمیر میں جن لوگوں نے اپنی آواز کا پرچم بلند کیا ہے وہ جو کچھ بھی ہیں
اس کا فیصلہ کون کرے ؟ کشمیر کے عوام یا کشمیر کی عدالت ؟ بھارتی سر
یا بھارتی سرکار ؟ کیا اردو کے دس بارہ یا بیس پچاس ادیبوں کی سرکاری آواز
ادبی ضمیر کی عدالت کا فیصلہ قرار دے کر وادیِ کشمیر میں ہونے والے واقعا
کو نظر انداز کر دیا جائے ؟

انتظار حسین صاحب کو گلہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اردو کے ادبا

ں کہہ رہے ہیں ؟ آخر ہندوستان میں اور بہت سی زبانیں اور ان گنت ادیب
جود ہیں ، ان میں سے کسی کی آواز کیوں نہیں سنائی جاتی ؟ اس کا آسان
اب تو یہی ہے کہ اردو سروس کا ہدف تو ہم ہیں اور اسی لیے صرف اردو ادیبوں
تبلیغات نشر کی جاتی ہیں ۔ لیکن یہ بھی ایک دل خراش حقیقت ہے کہ
دہ تر اردو ہی کے ادیب آسانی سے قابو میں لائے جا سکتے ہیں ، باسوا
جندر سنگھ بیدی اور کنہیا لال کپور کے جو سؤرگ باشی ہوچکے ہیں لیکن جنھوں
نے کسی ایسی مہم میں کبھی حصہ نہیں لیا ۔ بلکہ بیدی کے بارے میں تو یہ
ی معلوم ہے کہ شیخ عبداللہ نے انھیں جموں ریڈیو سٹیشن کا ڈائریکٹر مقرر
یا تھا ، جس ملازمت سے انھوں نے بخشی غلام محمد کے زمانے میں استعفیٰ
ے دیا ۔ ظاہر ہے کہ اختلاف کا تعلق کشمیر کی تازہ صورتِ حال سے ہو گا
و شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد پیدا ہوئی ۔ لیکن یہ سب باتیں تاریخی ہیں ،
دبی واقعہ یہ ہے کہ راجندر سنگھ بیدی نے ، ست سری اکال کرے آن کی
مادھی پر پھول برسا کریں ؛ بعد میں ایک نازک سا افسانہ "تعطل" کے عنوان سے
لکھا جس میں مولوی فاروق کی تحریک استصواب کو پس منظر بنا کر ، ایک ہندو
سیاح کے قتل اور قتل کے بعد ڈل جھیل کے ایک ہاؤس بوٹ میں ایک ملی جلی
دعوت کا منظر کھینچا گیا ہے ، جس میں شامل لوگ "کشمیر کے ماضی و مستقبل
کے بارے میں لے دے کر رہے تھے ۔" مختلف تھیوریاں پیش کرتے ہوئے "ہر
شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ کشمیر کی جملہ بیماریوں کا علاج اس کے پاس ہے ۔"
اس ہجوم میں صرف ایک کشمیری تھا ، غلام رضا جو چپ تھا اور جو کوئی
بات کرتا "اس کی طرف خالی خولی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ، ویسے ہی خاموش
ویسے ہی جامد ، ویسے ہی ساکت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جی چاہا کہ اٹھوں اور ایک دم
چیخ کر کہوں — بولو ۔ ۔ ۔ ۔ رضا ، یا ہتز ! بولو ، تم بھی تو کچھ بولو ۔
میں نے اس کا نام ہی لیا تھا کہ اس کی نظروں کی بےرحم ٹکٹکی مجھ پر تھی ۔ ۔ ۔
میں ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا ۔ اگلے روز میں دلی میں تھا جہاں میری
طرف کوئی نہیں دیکھتا ۔"

یہ ایک حساس ادیب کا ردِعمل تھا ۔ اسی لیے آج بھی یہ افسانہ ہم سے
بہت کچھ کہتا ہے ، جب کہ مولوی فاروق ہی نہیں ، ان کے جنازے میں شرکت
کرنے والے بھی ایک نیا جلیاں والا باغ دیکھ چکے ہیں ۔ یہ کرشن چندر کا
رومانی کشمیر نہیں ، اس کی معکوس تصویر ہے اور اس زمانے کی ہے جب بیدی

؟ کہنا تھا ''بولو ، با ھتز ، تم بھی تو کچھ بولو ۔'' اور اب کہ جس وقت
پورا کشمیر بولنے لگا تو اے آئی آر کی اردو سروس یہ پرچار کرتی ہے کہ ان
کی نہ سنو ، بھارت سرکار کی آنکھ کے تارے اردو ادیبوں کی بات سنو ۔ ارے
بھائی ، اردو سروس کی آواز میں تو اس وقت کوئی وزن پیدا ہو گا جب کشمیر
کے ادیبوں کی آزاد تحریریں وہاں سے نشر ہوں گی ۔ یوں تو کشمیر میں اردو
ادیبوں کی کمی نہیں لیکن اے آئی آر کے ذریعے ان کی آواز ہم تک پہنچنے نہیں
پاتی ، بلکہ ریڈیو پاکستان کے ذریعے بھی نہیں ۔

بیدی کا افسانہ صرف ہندوستان میں لکھا جا سکتا تھا اور اسے صرف بیدی
ہی لکھ سکتا تھا ، لیکن اختر الایمان کی ایک ایسی نظم ہے جو کہیں بھی
لکھی جا سکتی تھی اور کوئی بھی شاعر ، کم از کم پاکستان میں اسے لکھ
سکتا تھا ۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ لکھی صرف اختر الایمان نے اور وہ بھی
ہندوستان میں بیٹھ کر ۔ ''سبزۂ بیگانہ'' میں ایک مریض ہے جس کا علاج کسی
کے پاس نہیں اس لیے کہ سارے معالج کسی نہ کسی طرف کے جانب دار
ہو چکے ہیں :

مریض راتوں کو چلاتا ہے ، مرے اندر
اسیر زخمی پرندہ ہے اک ، نکالو اسے
گلو گرفتہ ہے یہ ، حبس دم ہے ، خائف ہے
ستم رسیدہ ہے ، مظلوم ہے ، بچا لو اسے
مریض چیختا ہے ، درد سے کراہتا ہے
یہ ویتنام کبھی ، ڈومنیکن کبھی کشمیر

اگر یہ زخمی پرندہ صرف ویتنام اور ڈومنیکن کا نام لے کر چیختا تو
ممکن ہے اس کے خالق کو لینن انعام نہیں تو پدم شری کا خطاب ہی مل جاتا
لیکن وہ تو اپنے وقت کے مقاماتِ آہ و فغاں میں کشمیر کا نام بھی لیتا ہے ، جو
ایک انسانی تجربۂ جبر کے طور پر اب تک جاری ہے ۔ اختر الایمان کی نظم کوئی
اُپدیش نہیں دیتی ، صرف نشان دہی کرتی ہے اور تجربے کی نوعیت بتاتی ہے ۔
پھر بھی آن بہت سی تبلیغاتی نظموں سے بہتر ہے جن کی ہمارے یہاں کوئی کمی
نہیں ۔ پاکستان کے شاعروں نے نظموں پر نظمیں کشمیر کے بارے میں لکھی
ہیں ، اگرچہ ہمارے معروف شعراء اس فہرست میں شامل نہیں ۔ عجیب بات ہے

کہ انھوں نے دنیا کے ہر خطے میں ظلم کے خلاف اٹھنے والی آواز سے آواز ملائی ہے ماسوا کشمیر کے اور اس کے بعد افغانستان کے۔ کشمیر کی تاریخ کے نشیب و فراز تو پھر بھی نزاکتِ احساس کے ساتھ مرحوم احمد شمیم کی نظموں میں موجود ہیں لیکن افغانستان کے بارے میں اردو ادب تقریباً خاموش رہا ہے حالانکہ اب تو ماہنامہ "سوویٹ لٹریچر" تک میں ایسے افسانے چھپنے لگے ہیں جن میں مجاہدین کو مجاہدین کہا جاتا ہے، دہشت پسند اور مذہبی جنونی نہیں کہا جاتا بلکہ روسی سپاہیوں کو اپنے فوجی کمانڈروں، اخبار نویسوں اور سیاسی فیصلے کرنے والوں پر تنقید کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے، اور شرمندگی کے ساتھ وطن واپس جاتے ہوئے۔

ممکن ہے ہماری خاموشی کی یہ توجیہہ کی جائے کہ اپنے وطن میں مسائل کی کون سی کمی ہے اور یہ بھی کہا جائے کہ ایسے مسائل پر لکھنے کا نام ادب نہیں۔ چند ایک کو شاید خاموشی کا الزام بھی قبول نہ ہو اور وہ ایسی تحریروں کا حوالہ دیں جو تبلیغاتی انداز میں لکھی گئیں۔ لیکن ایک تو کشمیر کی طرح، افغانستان کی صورتِ حال کو بھی، احوالِ وطن سے جدا نہیں کیا جا سکتا دوسرے ایسے مسائل پر کچھ نہ لکھنے کی پابندی صرف کشمیر اور افغانستان کی حد تک کیوں ہو؟ پھر جو ادیب، ادب کو جملہ عالم کے احوال و عوالم سے پاک رکھنا چاہتے ہیں، ان کی منطق کے مطابق تو اپنے یہاں کی صورتِ حال پر بھی کچھ لکھنے کا جواز نہیں نکلتا۔ سوال یہ نہیں کہ تجرباتِ حیات سے دور رہ کر ادب کی تخلیق ممکن بھی ہے یا نہیں۔ یا فلاں فلاں تجربات پر ہمارے ادیبوں کو لکھنا چاہیے تھا اور انھوں نے نہیں لکھا، لہٰذا ان پر کوئی فردِ جرم لگانی چاہیے۔ "چاہیے" کا لفظ نقدِ ادب کے ممنوعات میں شامل ہے اس لیے کہ یہیں سے ادبی فاشزم کا آغاز ہوتا ہے جو جملہ حکومتوں کی ادبی پالیسی کا نقطۂ اشتراک ہے۔ ہماری دلچسپی اس بات سے ہے کہ ہمارے ادب میں جن تجرباتِ حیات نے کوئی دخل نہیں پایا تو اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا ہمارا اجتماعی تصورِ حیات کافی حد تک وسیع نہیں یا ہم اپنے تجرباتِ حیات کو اپنی شخصیت میں جذب نہیں کر پاتے؟ آخر کوئی وجہ تو ہوگی کہ ایک طرف ہمارا ادب زندگی سے بیگانہ ہے اور دوسری طرف ہمارا معاشرہ ادب سے بیگانہ ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں متقابل کیفیات کا آپس میں کچھ ربط ہے۔ کسی

بھی ادیب سے پوچھا جائے کہ عصرِ حاضر میں ادب کس قسم کا کردار انجام دے تو غالب اکثریت کا یک لفظی جواب ہوگا، کمٹ منٹ۔ یعنی ہمارے ادب کی کمٹ منٹ اپنے زمانے کے ساتھ ہے۔ لیکن ہمارا زمانہ کیا ہے اور اس کے ساتھ کمٹ منٹ کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ تو مولانا حالی بھی فرماتے تھے، چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ گویا مرغِ باد نما بن جاؤ۔ یہ تو کوئی کردار نہ ہوا۔ اس لیے کہ نہ تو اس میں کوئی عمل ہے نہ کسی طرح کا ڈراماٹی تصادم۔ موسم کا ایک میکانکی کھیل ہے جو ادب سے زیادہ محکمہ موسمیات سے تعلق رکھتا ہے۔ درست ہے کہ طوق و دار کا بھی ایک موسم ہوتا ہے اور صوتِ ہزار کا بھی لیکن ادیب کے لیے یہ دونوں موسم الگ الگ نہیں ہوتے، تھوڑے بہت مختلف ضرور ہوتے ہیں مگر پھر بھی یکجا ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح کمٹ منٹ کا مضمون ہے کہ زمانے کے ساتھ بھی ہے اور زمانے کے برعکس بھی۔ عصرِ حاضر کے شعور سے پیوست بھی ہے اور عصرِ حاضر کے شعور سے متصادم بھی۔

ہمارا زمانہ نئے علوم و فنون کا بھی ہے اور نئی بربریت کا بھی، تکنیکی تعمیر کا بھی ہے اور برقیاتی جارحیت کا بھی، تسخیرِ کواکب کا بھی ہے اور جنگ کو کب کا بھی، تعلیم و تربیت کا بھی ہے اور سوقیانہ مذاق کا بھی، عوامی جمہوریت کا بھی ہے اور تہذیبی فاشیت کا بھی۔ ایک طرح کے امکان سے دوسری طرح کا امکان اس انداز کے ساتھ باہم پیوست ہے کہ دونوں کو جدا کر کے دیکھنا بھی محال ہے۔ ایسے میں ادب کا کردار یک رخا نہیں ہو سکتا۔ یوں بھی کسی ڈراماٹی کردار کا تصور کیجیے: ہیملٹ یا گلیلیو۔ اب جو بھی ادا کار اس کردار کو ادا کرے گا، اسے ایک تو شخصیاتی چیلنج درپیش ہو گا اور ایک تشکیلاتی، یعنی وہ کسی نہ کسی طرح اپنی شخصیت کا مکمل اظہار بھی کرے اور کسی نہ کسی طرح ایک مجموعی تشکیل میں شامل بھی رہے۔

اسی طرح عصر حاضر میں ادب کا کردار بھی ایک دُہرا کردار ہے کہ عصری شعور کی نمائندگی بھی کرے اور عصری شعور کے مقابلے میں اپنی تہذیبی تشکیل سے بھی غافل نہ ہونے پائے۔ ظاہر ہے کہ قیامت کا مضمون ہے، اور کس کا حوصلہ ہے کہ تخلیقی فن کار کے سوا دونوں برابر کی قوتوں کو متوازن رکھ سکے؟ بظاہر حد بشر سے باہر کی بات معلوم ہوتی ہے لیکن تاریخ انسانیت

میں ادب کے کردار کی انجام دہی کبھی آسان نہیں رہی ۔ سہل پسندوں نے سہولت کے راستے بھی نکالے ہیں اور مقبول عام ادیبوں میں یہ قدر مشترک پائی جاتی ہے کہ وہ یا تو دہرے کردار کو اِکہرا بنا کر اپنے لیے .اور اپنے معاشرے کے لیے آسانیاں پیدا کر لیتے ہیں ، یا پھر دہرے کردار کو ایک وقت ادا کرنے کی بجائے باری باری ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یعنی تھوڑی دیر کے لیے یہ انداز دیکھ لیجیے اور تھوڑی دیر کے لیے یہ بھی

''مادام بواری'' میں ایک جگہ فلوبیئر نے ادب کی دو رخی کو زبان و بیان کا المیہ بنا کر پیش کیا ہے :

''زبان ایک تڑخی ہوئی دیگچی کی طرح ہے جس پر ہم ایسی دھنیں بجاتے ہیں جنھیں سن کر بھالو ناچنے لگیں ، جب کہ ہم ہر لحظہ ستاروں کا دل موم کرنے کو ترستے ہیں ۔''

ستاروں کا دل کیسے موم ہو ، یعنی انسان کی تقدیر کیوں کر بدلے ؟ اور بھالو ناچ وہ چیز ہے جسے قبول عام کہتے ہیں ۔ تڑخی ہوئی دیگچی ہمارے وسائل اظہار کی موجودہ صورت ہے جس پر کوئی دھن بج سکتی ہے تو نہایت آسان اور مسخ شدہ ۔ ادب کا کردار یہ ہے کہ وہ تڑخی ہوئی دیگچی کو ٹھونکتا رہے اور انسانی تقدیر کو بدلنے کی آرزو سے بھی دست بردار نہ ہو ۔

جمہوریت کا المیہ بھی یہی ہے کہ مقامی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ہر جگہ بھالو ناچ کا منظر دکھائی دیتا ہے اور قومیت کی تشکیل کے لیے آرزو بھی کی جاتی ہے ۔ لیکن یہ دہرا کھیل بے حد خطرناک ہے اور اس کے باوجود نہایت ضروری ۔ مشکل کے وقت ادب سے بھی تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ اجتماعی عدمِ تحفظ کی فضا میں تحفظ کا احساس پیدا کرے ۔ ادب کی اپنی مصیبت یہ ہے کہ اس کی بھی آرزو تو یہی ہے لیکن وہ یہ فریضہ ، تاریخ اور تہذیب کو درمیان میں لائے بغیر انجام نہیں دے سکتا ۔ ہر دور کا ادب ایک نئی کلاسیک تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ لیکن کوئی بھی نئی کلاسیک ، نئی بھی ہو اور کلاسیک بھی ہو ، یہ کام بہت مشکل ہے ، کیونکہ کلاسیک کہتے ہی اس ادب کو ہیں جو ہر دور میں نیا معلوم ہو ۔

خاتمۂ کلام کے طور پر میر کے آخری دیوان سے ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

رہے ہے غش و درد ، دو دو پہر تک
سرِ زخم پہنچا ہے شاید جگر تک
ہوئے ہیں حواس اور ہوش و خرد ، گم
خبر کچھ تو آئی ہے اس بے خبر تک
قیامت ہے مشتاق لوگوں کی کثرت
پہنچنا ہے مشکل ہمیں اس کے در تک
کہاں تک اسے سر سے مارا کروں میں
نہ پہنچا مرا ہاتھ اس کی کمر تک
بہار آئی ، پر ایک پتی بھی گل کی
نہ آئی اسیرانِ بے بال و پر تک
بہت میر پھر ہم جہاں میں رہیں گے
اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

اس غزل کو آج کی صورتِ حال میں ، پورے ارتکاز کے ساتھ ، بار بار پڑھنے کے بعد ، یہ محسوس ہو گا کہ انسانیت اور ادب کا مستقبل بڑی حد تک باہم مربوط ہے ، اور ادب انتہائے کمال کو چھو کر بھی ایک مشروط پیش گوئی سے زیادہ کیا کر سکتا ہے ؟ لیکن یہ پیش گوئی کتنی بڑی ہے اور شرط کتنی چھوٹی :

اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سندھ (نیو کیمپس جام شورو)

کا

شعبہ جاتی تحقیقی مجلہ

تحقیق

۴۷۶ صفحات پر مشتمل ۱۹۹۰ء میں اس کا چوتھا شمارہ نکلا ہے

چوتھے شمارہ کے مشتملات

• حالات زندگی (عفت بانو) • پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں (ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق) • مشاہیر کے خطوط بنام ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں (حبیب الرحمٰن خاں شروانی، سید سلیمان ندوی، قاری ضیاء الدین احمد، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، محمود شیرانی، ضیاء احمد بدایونی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولوی عبدالحق، احسن مارہروی، راشد برہان پوری، پیرزادہ حسن، ڈاکٹر مختارالدین احمد)

عکس تحریر:۔ • ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو پر مقالہ (ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، بخط خود) • اسٹڈیز ان لٹریچر کا دیباچہ (بخط خود)

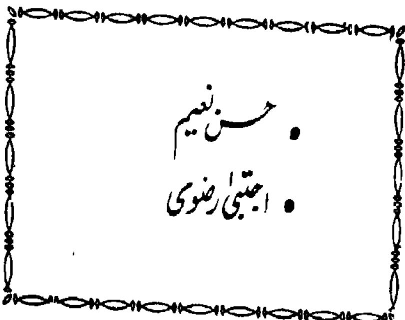
علمی کاموں کا جائزہ:۔ • ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کا مقالۂ تحقیق "سید حسن غزنوی" (ڈاکٹر نجم الاسلام) • ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی انگریزی تصانیف (ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی) • ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی چند اہم تصانیف (ڈاکٹر نجم الاسلام) • ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، زبان دانی و لغت شناسی کی ایک مثال (ڈاکٹر فرمان فتحپوری)

جام شورو کے مخطوطات (قسط دوم) • فہرست مخطوطات ذخیرہ حکیم شمس الدین احمد حیدرآبادی و ذخائر دیگر۔ (محمد شفیع بردہی)

مقالات:۔ • سفینہ نزہتہ المجالس (ڈاکٹر نذیر احمد) • خاندان جہانی (ڈاکٹر نذیر احمد) • سندھ کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی (ڈاکٹر نجم الاسلام) • اردو میں تحقیق اصول و طریق کار سے متعلق توضیحی سرمایہ (مسز رابعہ اقبال) • پاکستانی خواتین اور اردو تحقیق (مسز رابعہ اقبال) • ایلیٹ اور سرسید احمد خاں (ڈاکٹر معین الدین عقیل) • ادنام (ڈاکٹر سہیل بخاری) • دفتر امیر اللغات (سید جاوید اقبال)

اخذ و استفادہ:۔ • ملفوظاتی ادب کے لیے ایک منہاج تحقیق (ڈاکٹر ریاض الاسلام)


دانشور نغزگو


• حسن نعیم
• مجتبیٰ رضوی



تازہ ترین دانشوری سے قطع نظر،

(اور تازہ سے مطلب تھا تازہ ترین!)،

اردو غزل کے عہد نو نے بھی کتنے بڑے دانشور غزلگو دیے ہیں! انھیں بھی خدا بخش نے جمع کرنا شروع کیا۔ ان غزلگویوں کی خدمت میں درخواست کر کے ان سے ان کا احوال، اپنے خط میں ایک غزل، تصویر اور اپنا کیا ہوا انتخاب مانگا۔ انہوں نے ممنون کیا۔ کچھ نے جانے میں بہت جلد کر دی یا ہم ہی نے تاخیر کر دی۔ تصور کے اعتراف میں احباب ڈالوں کو سب سے پہلے آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

ادارہ



حسن نعیم (وفات : ۲۲ر فروری ۱۹۹۱ء)

میرے دادا سید شاہ غلام قاسم راجگیر کی درگاہ پیر امام الدین کے سجادہ نشین ہونے کے باوجود (یہ درگاہ مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیری کے نسبی سلسلے کی تھی) اس دور کے سیاسی حالات کے پیشِ نظر مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشی بقا کے لیے مغربی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے، یہاں تک کہ خود بھی انگریزی میں تھوڑی بہت استعداد حاصل کر لی تھی اور بعد میں اپنی سجادگی اپنے چھوٹے بھائی سید شاہ محمد یوسف کے حوالے کر کے کسی شعبے میں ڈپٹی رجسٹرار ہو گئے تھے۔

انھوں نے اپنے دو بیٹوں کو بغرضِ تعلیم لندن بھیجا، میرے والد سید محمد نعیم اور سنجھلے چچا سید عبد السمیع یکے بعد دیگرے بیرسٹر ہو کر لوٹے، میرے والد شہر بھاگلپور میں پریکٹس کرنے لگے اور سنجھلے ابا پٹنہ ہی میں شادی کر کے بس گئے۔ اپنی کارگزاریوں کے باعث دونوں اپنے علاقے کے عمائدین میں شمار ہونے لگے، دونوں ہی قومی اور ملی مسائل میں دلچسپی لیتے تھے۔ میرے والد غالباً ۲۶ء کے اواخر میں پٹنہ منتقل ہو گئے تھے۔ جہاں میں ۶ جنوری ۲۶ء میں پیدا ہوا اور میرا نام سید حسن رکھا گیا۔

ایک طویل علالت کے بعد ستمبر ۲۸ء[1] میں والد صاحب کا کم عمری ہی میں انتقال ہو گیا اور پھر پریشانیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوا، میری والدہ شیخ پورہ (ضلع مونگیر) چلی گئیں جہاں میری دادی کا آبائی مکان تھا اس کے علاوہ کچھ وہاں اور کچھ گیا ضلع میں ان کی جائیداد بھی تھی جس سے گزر بسر ہونے لگی۔ میں سات آٹھ سال کی عمر تک شیخ پورہ ہی میں رہا اور ابتدائی تعلیم وہیں پائی مجھ سے تینوں بڑے بھائی پٹنہ میں زیرِ تعلیم تھے اور جسٹس سید نور الہدیٰ کے یہاں رہتے تھے جو رشتے میں ہم لوگوں کے نانا ہوتے تھے۔ جج صاحب کے انتقال کے بعد والدہ خود پٹنہ آ کر رہنے لگیں اور ہم سب ساتھ رہنے لگے۔

۳۸ء میں میرا اور میرے سنجھلے بھائی سید علی کا نام رام موہن رائے سمنری پٹنہ میں لکھوا دیا گیا اسکول میں داخلے کے وقت ہم دونوں نے اپنے اپنے ناموں کے ساتھ 'نعیم' جوڑ لیا بہت دن بعد منجھلے بھائی سید محمد نے بھی یہی کیا (بڑے بھائی تاعمر سید احمد ہی رہے لیکن اپنے بچوں کے نام کے ساتھ 'نعیم' کا اضافہ کر دیا)

---

[1] میرے سنجھلے بھائی صاحب کہتے ہیں کہ میرے والد کا انتقال ستمبر میں نہیں نومبر ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا۔

مشکل سے تین برسوں تک ہم سب بھائی والدہ کے ساتھ قدرے سکون سے رہے، پھر اگست ۲۹
والدہ صاحبہ کا اچانک انتقال ہو گیا اور ہم سب یوں بکھرے کہ کبھی اکٹھے رہنا نصیب نہ ہو سکا۔

میں ۴۰ء میں اپنی چھوٹی پھوپھی بیگم یوسف حسین کے ساتھ رہنے کے لیے محلہ ٹیڑھی گھاٹ پٹنہ سٹی چ
گیا اور وہاں ۴۱ء میں میرا داخلہ محمڈن اینگلو عربک اسکول میں ہو گیا۔ وہیں سے ۴۲ء میں میٹرک پاس کر
پہلے پٹنہ سائنس کالج پھر ایک سال بعد بی۔ این۔ کالج پٹنہ میں داخل ہوا جہاں سے ۴۶ء میں آئی ایس سی پا
ٹیڑھی گھاٹ کے قیام کے دوران ہی مجھے اردو شاعری سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا۔ یہ محلہ دراصل صرف
قلعہ نما مکانوں پر مشتمل گنگا کے کنارے آباد تھا جس میں ایک ہی خاندان کے افراد مقیم تھے، اس خاندان کے سر
اس وقت نواب ابراہیم حسین تھے جو میرے نئے اسکول کے سکریٹری ہونے کے سوا انجمن ترقی اردو لائبر
پٹنہ سیٹی کے بانی بھی تھے، ان کی شادی بھی میرے والد کی پھوپھی زاد بہن سے ہوئی تھی۔ خود انھیں تو شا
سے معمولی دلچسپی تھی لیکن ان کے صاحبزادے سید اکبر حسین کو (جو بعد میں جسٹس اکبر حسین بنے) شاعری کا نہ صرف شو
تھا بلکہ خود بھی صاف ستھری غزلیں لکھ لیا کرتے تھے۔ چھوٹی پھوپھی کے دونوں لڑکوں، سید اصغر حسین اور س
احمد حسین کا مذاق سخن بھی اعلا تھا اور اساتذہ کے بہت سارے اشعار یاد تھے۔

وہاں اکثر طرحی اور غیر طرحی نشستیں منعقد ہوتیں جن میں عظیم آباد کے برگزیدہ شعرا بھی شرکت کر
ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کی غزلوں کی اس زمانے تک دھوم باقی تھی، وہ اکثر وہاں قیام فرماتے بلکہ اپنا مجم
'جلوۂ داغ' وہیں رہ کر ترتیب دیا۔ ان کے علاوہ عظیم آباد کے نامی گرامی شعرا میں بسمل عظیم آبادی (سر فروشی
اب ہمارے دل میں ہے)، بدر عظیم آبادی، محمود علی خاں صبا (شاگرد شاد) وغیرہ اکثر تشریف لایا کرتے۔ ممتاز
بسمل جو دانا پور کے ایک خوش گو شاعر تھے اور زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ میگزین کے مدیر رہ چکے تھے وہاں ب
جانے سے پہلے مستقلاً رہا کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا احسن مارہروی سے تلمذ حاصل کیا۔ سید شاہ رضی احمد
(مجموعہ: کشت خیال) تو خیر سے گھر کے داماد تھے اور وہیں قیام پذیر تھے۔

غرض ٹیڑھی گھاٹ کا شعری ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ میرا شاعری سے بچ نکلنا محال تھا، ویسے بڑے
سید احمد بھی نوجوانی میں شعر کہا کرتے تھے، تپش ان کا تخلص تھا اور نہایت دلکش ترنم میں شعر پڑھا کرتے
انھوں نے پروفیسر عبدالمنان بیدل اور ضمیر الدین عرش گیاوی (مصنف: حیات مومن) سے مشورۂ سخن بھی کیا تھا۔
غرض پانچ چھ برسوں کے قیام کے بعد جب ۴۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچا تو میرے پاس دس

پابند اور آزاد نظموں کے علاوہ پانچ سات مکمل اور نامکمل غزلیں بھی تھیں۔ لیکن ان کی موجودگی کا علم صرف چند احباب کو تھا۔
علی گڑھ شروع ہی سے اردو شعر و ادب کا مرکز رہا ہے چنانچہ میرے زمانے میں بھی مستند اور مشہور لوگوں کے علاوہ
تازہ فکر اور نوخیز ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں کا ایک قافلہ موجود تھا۔ یہی لوگ بعد میں عصری ادب کے ستونوں میں
شمار ہوئے۔ ان دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے باقاعدگی سے ہوا کرتے تھے جس میں اکثر میں بھی شریک ہوتا تھا،
ہنگامی جلسوں کی بھی کمی نہ تھی۔ ایک ایسے ہی جلسے میں میں نے اپنی ایک نظم "تشنہ لب" پڑھنے کی جسارت کی، جس میں
جاں نثار اختر اور معین احسن جذبی بھی شریک تھے۔ خلاف توقع اس کی بہت معمولی نکتہ چینی ہوئی۔ بلکہ اس نظم کو ڈاکٹر
مختار الدین احمد نے یونیورسٹی میگزین کے سالنامہ ۴۸ء میں شامل کرلیا۔ یہ میری پہلی تخلیق تھی جو شائع ہوئی۔

علیگڈھ کے دوران قیام میں نے تازہ کچھ نہیں لکھا۔ صرف قدیم و جدید ادب کا مطالعہ کرتا رہا اور ادبی بحثوں میں حصہ لیتا رہا۔ باقی وقت ٹیبل ٹینس کھیلنے اور اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی سرگرمیوں میں صرف ہوا۔

ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی اس وقت بی۔اے کے طالب علم تھے لیکن بطور شاعر اور نقاد ادب میں متعارف ہو چکے تھے۔ انھوں نے ایک بار رائے دی کہ میں غزلوں کی طرف خصوصی توجہ دوں اس لیے کہ ان کا اسلوب و مواد نھیں کچھ نیا نیا سا لگا۔ ان کی یہ بات میرے دل کو لگ گئی۔ باقر مہدی اور شہاب جعفری سے بھی ان ہی دنوں کی ملاقات ہے اور تب سے آج تک تبادلہ خیال ہو رہا ہے۔ ۴۸ء میں علیگڑھ سے بی۔ایس۔سی کرنے کے بعد جب واپس پٹنہ لوٹا تو دوبارہ چند غزلیں کہیں جو وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول ہوئیں لیکن میرے ذہن میں کچھ تخلیقی مسائل بار بار سر اٹھاتے تھے اور مجھے اپنے کلام سے بدگمان کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ اچانک جو تبدیلیاں ہمارے سماج، مزاج اور اخلاقی اقدار میں ۴۷ء کے بعد آئی تھیں انھیں ہم محسوس تو کرتے تھے لیکن ان کا اظہار رو جہ غزلوں کے سالیب اور لہجوں میں بے جان اور غیر حقیقی سا لگتا تھا۔ عصری صداقتوں سے غزل کو ہم آہنگ کرنے کیلیے اب ایسی تخلیقی زبان کی ضرورت تھی جس میں الفاظ، استعارات، پیکر اور علائم جیتے جاگتے نظر آئیں یہ کوئی سان مرحلہ نہ تھا۔ اسکے لیے غزل کی کل روایت کا تجزیاتی مطالعہ ناگزیر تھا کہ انحراف بھی اس عظیم روایت کا ہی حصہ نظر آئے۔

اس بار میرا قیام اپنے خالو رفیع الدین بلخی ایڈوکیٹ کے دولت کدے پر ہوا۔ وہ نہایت ذی علم خوش اخلاق اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔ وہ بیدل و غالب کے پرستاروں میں تھے اور ان دنوں غالب کے فن سے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کر رہے تھے۔ ان کے گھر میں اکثر شام کے وقت شہر کے ممتاز دانشوروں، شاعروں اور سیاسی شخصیتوں کا مجمع لگتا تھا اور گھنٹوں گرما گرم بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ علامہ جمیل مظہری ان کے

گہرے دوستوں میں تھے اور ان دنوں وہیں قیام فرماتے تھے، وہیں جناب شیخ فصیح الدین بلخی سے شرف نیاز حاصل ہوا، وہ ایک درویش صفت مورخ اور محقق تھے "تاریخ مگدھ" کے مصنف کی حیثیت سے تو وہ مشہور تھے۔ لیکن ان کے تنقیدی کتابچے "انشاد شاد" کی خبر صرف صاحبان نظر کو تھی۔ ان سے گفتگو کرنے پر مجھے محسوس ہوا کہ اُن کی نگاہ اُردو شاعری کے کلاسیکی سرمایہ، خاص کر غزلیہ شاعری اور اس کے رموز و نکات پر گہری اور معروضی ہے چنانچہ ۴۹ء میں سات آٹھ مہینوں تک ان کے خزانۂ علم سے فیض یاب ہوتا رہا اس وقت تک کی بیشتر شاعری کو رد کرتے ہوئے گویا ۱۹۵۰ء سے میں نے نئے شعری سفر کا آغاز کیا تب سے مسلسل لکھ رہا ہوں۔

۱۹۵۰ء میں میری شادی حشمت آرا بیگم سے ہوئی جنھوں نے شاہدہ یوسف کے نام سے کئی اچھے افسانے لکھے میری دونوں لڑکیوں میمونہ اور شہیرہ کی شادی ہو چکی ہے دو بیٹے ہیں ارشاد اور اشعر۔ ان میں سے ایک برسر روزگار ہے اور دوسرا ایم۔ اے کر چکا ہے۔

۵۱ء میں پرویز شاہدی جو میرے خلیرے بھائی بھی تھے مجھے اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے جہاں لگ بھگ ایک سال تک سی۔ ایم۔ او ہائی اسکول میں سائنس ٹیچر رہا۔ پرویز شاہدی بھی اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور مظہر امام بھی ان دنوں اس اسکول میں اُردو کے استاد تھے۔

دسمبر ۵۳ء میں کلکتہ کو چھوڑ کر قسمت آزمائی کی خاطر دلی آگیا۔ اتفاق سے اس وقت ڈاکٹر سید محمود جو مجھ سے اچھی طرح واقف تھے ہسٹری آف فریڈم موومنٹ بورڈ کے چیرمین تھے، وہ مجھ پر مہربان ہوئے اور مجھے اپنا سکریٹری منتخب کر لیا۔ ۵۴ء میں جب وہ وزارت خارجہ میں وزیر مملکت ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ بطور پرائیویٹ سکریٹری وہیں منتقل ہو گیا اور ۱۹۷۰ء تک اسی وزارت سے منسلک رہا۔

دلی میں نہ صرف میری ادبی نشو و نما ہوئی بلکہ میری زندگی کے بہترین ایام وہیں بسر ہوئے، دلی ہی دراصل وہ شہر ہے جس کی تہذیبی روایت سے آج کی غزل بھی سب سے زیادہ متاثر ہے۔

۱۹۵۵ء میں ایفرو ایشیائی کانفرنس منعقدہ بنڈونگ (انڈونیشیا) میں بطور ڈیلی گیٹ شریک ہوا اور پھر ۵۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو سعودی عرب تشریف لے گئے تو اوروں کے علاوہ میں بھی ساتھ گیا۔ میرا تبادلہ دوبار ہندستان سے باہر ہوا پہلے ساڑھے تین برسوں کے لیے (۵۸ء تا وسط ۶۱ء) جدہ میں ہندستان کا نائب قنصل رہا اور پھر کوئی چار برسوں تک (۶۴ء سے ۶۸ء تک) نیو یارک میں انڈین مشن برائے اقوام متحدہ میں بطور اتاشی کام کیا، اس کے علاوہ ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کے کوئی پندرہ بیس ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران وہاں کی طرز زندگی اور تہذیبی اقدار کو سمجھنے کا موقع ملا، اس خیال کے تحت کہ کسی ادبی ادارے سے منسلک

ہوکر باقی زندگی صرف علمی اور ادبی کاموں کو وزارت خارجہ سے مستعفی ہوکر ۱۹۷۰ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی
سے بطور ڈائرکٹر وابستہ ہوگیا، میں نے ہی اس ادارے کا باضابطہ دفتر قائم کیا، اس کے عمارت کی تکمیل کروائی
در اس کی ادبی سرگرمیاں شروع کروائیں لیکن مجلس عاملہ کے ایک ممبر کی مستقل رخنہ اندازی سے تنگ آکر جولائی ۷۳ء
میں اس سے علاحدہ ہوگیا۔ اس کے بعد مختلف ذرائع سے کسب معاش کرتا رہا ہوں اور اپنی شاعرانہ شخصیت کے
تحفظ کی خاطر بڑی آزمائشوں سے گذرا ہوں۔

میری غزلوں کا پہلا مجموعۂ اشعار ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا، اس کے بعد ۸۰ء میں ہندی رسم الخط میں دوسرا
مجموعہ 'غزل نامہ' شائع ہوا، تیسرا مجموعہ جس میں تقریباً ڈیڑھ سو منتخب غزلیں ہیں 'دلستان' کے نام سے ترتیب
پا چکا ہے، انشاء اللہ آئندہ دو تین مہینوں میں شائع ہو جائے گا۔

پابند اور آزاد نظموں کے علاوہ میں نے آٹھ نو مختصر مثنویاں بھی بطور تجربہ لکھی ہیں، جو سب کی سب شائع
ہو چکی ہیں انھیں ایک مجموعہ کی شکل میں ترتیب دینا باقی ہے، غزل ہی لیکن میری زندگی کا محور اور
ہے، ادھر تین برسوں سے بمبئی میں مقیم ہوں اور نیشنل غزل سمینری کے نام سے ایک بڑا ادارہ قائم
کرنے میں منہمک ہوں، اس ادارے کے ذریعہ غزل کے سرمائے کو سلسلہ وار دوسری ہندستانی زبانوں میں منتقل
کرنے اور غزل گائیکی کو صحیح خطوط پر رواج دینے کا کام کیا جائے گا چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع ہو چکا ہے۔

انتخاب کلام

دانشوروں کے قحط میں سید حسن نعیم ــــــ بیدل کی باؤلی پہ لگا میں سبیل کیا

وہ لوٹ آئے تو اس کی بھی کچھ انا رکھیو	فصیل قلب کا دروازہ تم کھلا رکھیو
نظر کی آنچ سے کھلتے ہیں پھول وحشت کے	کھلیں یہ پھول تو دامن کو مت بچا رکھیو
دیار فن میں جہاں منزلیں بھی فرضی ہیں	تمام عمر بھٹکنے کا حوصلہ رکھیو
وہ اک غزال ہے کب تک پہاڑ پھلانگے گا	کنار آب حسن خیمۂ وفا رکھیو
یہ اصولوں کا نشہ تھا کچھ مقدس خواب تھے	ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے
یا عدو کی جستجو میں تھا کہ اک پتھر لگا	مڑ کے دیکھا تو سناں تانے ہوئے احباب تھے
سانس لیتے ہیں ہزاروں جینے والے چند ہیں	سب دریچے آرزو کے بند دلوں پر بند ہیں
دل کا خطرہ ہے کسی نے گر مجھے سچا کہا	فوج سلطاں چار سو تھی جس نے جو سمجھا کہا

جس کو جانا ہمنوا، وہ کھو گیا بانداز میں
بن گیا اک واہمہ جس شخص کو اپنا کہا

ایک دنیا دیکھ کر لوٹا تو اب حیران ہوں
کس بنا پر میں نے ابتک قصۂ دنیا کہا

وقت ہی ناقدرے ایسا جس کو سب معلوم ہے
حرف کے پردے میں کس نے کیا کہا کیسا کہا

میں پشیماں ہوں کہ اپنی سست فہمی سے نعیم
کیسے کیسے مسخروں کو قبلہ و کعبہ کہا

سُن اس طرح کہ شور بھی نغمہ سُنائی دے
اتنی نہ آنکھ کھول کہ دنیا دکھائی دے

دیکھا نہیں ہو جس نے ترے دل کا آئینہ
کیا قیمتِ نگاہ شب رونمائی دے

گھیرے ہیں آفتاب کہ مایوسیوں میں آس
جینے کی ہو سبیل تو سب کچھ سُجھائی دے

لپٹی ہے سب کے پاؤں سے زنجیرِ غم نعیم
کس میں ہے اتنا زور کہ غم سے رہائی دے

مرے کلام میں سب حرف یوں شگفتہ ہیں
شگفت گل بھی نیا واقعہ لگا سب کو

نعیم ایک فقیری بچی ہے ورثے میں
اسے بھی مانگتی دنیا تو بخشتا سب کو

کیوں، ذرا سی بات پر چھوڑی وہ بزم دوستاں
اب ہجوم آشنا میں عمر بھر تنہا رہو

ڈھونڈتا ہوں میں پریشاں ہو کے اس درویش کو
جس نے دی تھی یہ دعا" بیٹا سدا زندہ رہو"

ایک چادر ہے، خوشی کی، ایک گٹھڑی غم کی ہے
سر پہ دونوں کو اٹھا کر یاتری بن جائیے

لمحہ لمحہ کون دیتا ہے صدا مجھ کو نعیم
"کیجیے کچھ کام ایسا اک صدی بن جائیے"

نقوشِ پا جو سنوارے گا، اک نظر دے گا
مگر جو راہ نکالے گا رہگزر دے گا

خبر نہ تھی کہ وہ اس درجہ مہرباں ہے نعیم
مجھی کو آکے مرے عیب کی خبر دے گا

بسر ہو یوں کہ ہر اک درد حادثہ نہ لگے
گزر بھی جائے کوئی غم تو واقعہ نہ لگے

اب تو میں ہوں خانقہ میں اور یہ ویراں صفیں
ہاؤ ہو کا دم کہاں ہے سینۂ دم ساز میں

کھو گیا تو آج بھی پاؤں کی زنجیر ہے
ورنہ ہر شے گرد پا تھی دشت کے آغاز میں

یوں نہ غمگیں ہو کہ آخر میں بھی تیری آس ہوں
جب سے لوٹا ہوں سفر سے دیکھ تیرے پاس ہوں

لے گئے ہمسائے سب اینٹیں در و دیوار کی
روز پردہ میرے ان کے درمیاں اٹھتا رہا

جب سے قبضہ میرے دفتر پر ہوا اک دوست کا
میری چھت گرتی رہی، اس کا مکاں اٹھتا رہا

پڑ رہے سڑکوں سے گلی سے پتھر
تم سے بچھڑے تو اٹھایا گیا گیا

مجھ کو خط لکھنا تو یہ بھی لکھنا
تم نے کھو کے مجھے پایا کیا کیا

سب نے جاں بیچ کے دیکھیں تو حسن
مال و اسباب کمایا کیا کیا

اس سے پہلے کہ دفن ہو جاؤ
وادیٔ فن میں کچھ تو بو جاؤ

میر و بیدل کی پیروی سے نعیم
کچھ تو دنیا میں تم بھی ہو جاؤ

کچھ نہ تھا اپنی گرہ میں ان کی خوشبو کے سوا
صحرا صحرا ہم گلوں کی بستیاں لے کر چلے

حسن کا دربار بھی بازارِ دنیا ہے نعیم
اپنے خوابوں کا خزانہ تم کہاں لے کر چلے

جاری ہے حکم قتل بلا مہر و دستخط
سر اپنا ہے قلم تو لہو کی رسید ہے

سب سے حسین ملک ہے خوابوں کی سرزمیں
سب سے قدیم شہر، دماغ جدید ہے

قبضے میں جس کے لفظ کا فانوس ہے نعیم
تہ خانۂ خیال کی گویا کلید ہے

یک بھی حرف نہ تھا خوش خبری کا لکھا
نامۂ وقت ملا اور کسی کا لکھا

بسے کتنے نئے لوگ مکانِ جاں میں
بام و در پہ ہے مگر نام اسی کا لکھا

و جۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم
وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

وئی جدت تو کوئی حسنِ تغزل سمجھا
مرثیہ جب بھی کوئی اپنی صدی کا لکھا

ات شیریں سی لگی فن کے طرف داروں کو
قصہ ہر چند حسن کوہکنی کا لکھا

لا نہ کام کوئی عمر بھر جنوں کے سوا
تمام عیش میسر رہے سکوں کے سوا

ی وہ آگ کہ دیوار و در بھی جل نکلے
کوئی مقیم نہیں گھر میں اب ستوں کے سوا

ڑی وہ دھوپ کہ سب رنگ پڑ گئے پیلے
بچا نہیں ہے کوئی سرخ میرے خوں کے سوا

ر ایک فن کی بنا مد و جزرِ دل ہے نعیم
کہ شعر و نغمہ ہیں کیا، موجِ اندروں کے سوا

کسے بتاؤں کہ وحشت کا فائدہ کیا ہے
ہوا میں پھول کھلانے کا قاعدہ کیا ہے

مبروں نے کہا تھا کہ جھوٹ ہارے گا
مگر یہ دیکھیے اپنا مشاہدہ کیا ہے

ن نکل جاؤں گا اپنی جستجو میں ایک دن
بزمِ یاراں میں خیال آرائیاں رہ جائیں گی

ہار باغِ تمنا ہے آرزو مندی
دگر نہ چشمۂ ویراں ہے دیدۂ تر بھی

ئی تاثیر تو فریاد کی قسمت ہو نعیم
حاکمِ وقت بدل جائے جو بہرا ہووے

دیے جلیں کہ بجھیں، آفتاب آئے گا ۔۔۔ یقیں کرو نہ کرو، انقلاب آئے گا
شبِ ستم کو اٹھالے گا جو سرِ نیزہ ۔۔۔ وہ شہ سوار مرے ہم رکاب آئے گا
نشانِ فتح کسی دن ہوا میں لہراتا ۔۔۔ مثالِ خواب، کوئی مردِ خواب آئے گا

نہ پست قد ہے، نہ کوئی بلند قامت ہے ۔۔۔ نگاہِ شعر میں ہر لفظ اک علامت ہے
چلا تھا میر کے پیچھے سخن کی وادی میں ۔۔۔ اسی کی خاک نوازی مری امامت ہے

پہن کے دوست بھی نکلے لباسِ طرزِ حسن ۔۔۔ وہ اپنی آن میں بے قاعدہ ہوا سو ہوا

یہی ایک جی میں ہے وہم سا یہی ایک سر میں ہے جنوں سا ہے ۔۔۔ تجھے اس جنم میں نہ پا سکا تو کسی جنم میں نہ پاؤں گا
تو ہزار مجھ سے الگ رہے، میں ہزار تجھ سے جدا رہوں ۔۔۔ کبھی درد بن کے جگاؤں گا کبھی نیند بن کے سلاؤں گا
ابھی اپنی خاک میں قید ہوں، ابھی تو بھی دامِ بلا میں ہے ۔۔۔ تو گلاب بن کے کھلے گا جب، میں صبا کے روپ میں آؤں گا

سچ ہے اب عشق کا وہ منصبِ اعلا بھی نہیں ۔۔۔ شاہ شمشاد قداں، افسرِ بالا بھی نہیں
آگ جتنی تھی گئی اشکِ رواں کی صورت ۔۔۔ کام کچھ شعلۂ امکاں سے نکالا بھی نہیں

وہ دیارِ جستجو کے قافلے کی جان ہے ۔۔۔ اس کی آشفتہ سری اس عہد کی پہچان ہے
کس حوالے سے اُسے پہچانیے، الجھن ہے یہ ۔۔۔ صوفیوں کی اس میں تو ہے، گل رُتوں کی شان ہے
پہلے سچ کی صف میں بھی اک فوج رہتی تھی حسن ۔۔۔ اب تو میں ہوں اور شہادت کا قوی امکان ہے

سونے میں جو دمک ہے وہی اس کی آبرو ۔۔۔ پیتل میں جو چمک ہے، وہی اس کی گند ہے
آتا ہے وقتِ شام سویرے کی سمت سے ۔۔۔ اک ایسا ماہتاب جو بوتل میں بند ہے
غزلوں کا حسن خواب کے لہجے میں گفتگو ۔۔۔ دوہوں کا حسن پیار کے لہجے میں پند ہے
میرے لہو کو جس نے جلایا تھا اے نعیم ۔۔۔ وہ زہر میرے شعر میں اب جوئے قند ہے

وہ علم ہے جو سخن کو وقار دیتا ہے ۔۔۔ وہ درد بخش، جو فن کو نکھار دیتا ہے
یہ کون دل میں جلاتا ہے آتشِ اُمّید ۔۔۔ وبالِ فکر کو سر سے اتار دیتا ہے
میں اس درخت سے کم تر ہوں مرتبے میں حسن ۔۔۔ جو دھوپ سہہ کے مسافر کو پیار دیتا ہے

کچھ سخن فہم، کچھ سیاسی ہے ۔۔۔ اپنا محبوب دلّی باسی ہے
میرے شعروں میں بس گئی آخر ۔۔۔ اس کی آنکھوں میں جو اداسی ہے

ہم گئے جس شجر کے سائے میں　　　اس کے گرنے کا احتمال ہوا
بس یہ وحشت تھی کارِ دنیا سے　　　کچھ بھی حاصل نہ حسبِ حال ہوا
جس تعلق پہ فخر تھا مجھ کو ـــــــ　وہ تعلق بھی اک وبال ہوا

دفترِ شعر میں کیا نسل و قبیلہ کی تمیز　　　نام اونچا ہے بس تازہ خیالوں کا یہاں
تیری تصویر چھپی جب تو مجھے علم ہوا ـــــــ　کتنا مجمع ہے ترے چاہنے والوں کا یہاں

زو ممکن ہے، شرحِ آرزو ممکن نہیں　　　ان سے اب تک والہانہ گفتگو ممکن نہیں
ائے ہائے کر رہے ہیں زر کی خاطر صوفیا ـــــــ　خانقہ کی اس فضا میں ہاؤ ہو ممکن نہیں

ھر اک قید سے پریوں کو لاؤں کیسے نجم ـــــــ　اڑیں پہاڑ تو پہلے، زمیں ہلے تو سہی

چھ وفا کی باس، کچھ بوئے جفا کس میں نہیں　　　ایک دنیا دیکھ لینے کی ہوا کس میں نہیں
ہ سراسر مہر ہے، اخلاص ہے، تہذیب ہے　　　کچھ اگر اس میں انا ہے تو انا کس میں نہیں
ش نصیبی ہے ہوا یوں وارثِ سوزِ حسین ـــــــ　ورنہ ماتم کے لیے اک کربلا کس میں نہیں

ہ میں کیا ہے، مری چادر میں نہاں ہیں کتنے موسم　　　تو بھی مانندِ کفِ خاک، اٹھے تو دیکھے
لم کتنا ہے گراں، روح کی قیمت کیا ہے ـــــــ　کوئی بازار میں ہر روز بکے تو دیکھے

ر پہ رکھ دیتا وہ اک تاج تو مارے جلتے　　　کم نہیں اس کا کرم، خاک بہ سر رہنے دیا
یسا دشمن تھا کہ ہر خواب کو پامال کیا ـــــــ　نور سب کھینچ لیا، دیدۂ تر رہنے دیا
یا مسائل تھے زمانے کے جو دنیا نے حسن ـــــــ　چھین کر ذہنِ رسا، کاسۂ سر رہنے دیا

رے کام آئی دعائے شب نہ جوشِ بندگی ـــــــ　حادثے جتنے بھی ہونے تھے وہ آخر ہو گئے

سمجھتا تھا جسے اک افسرِ دربار دوست ـــــــ　آ کے زنداں میں کھلا وہ شخص کس دفتر میں ہے

ر اڑان ہو اونچی تو براعظم بھی　　　ہرا بھرا سا جزیرہ دکھائی دیتا ہے
ہ شخص جس کو لطیفے ہیں سینکڑوں ازبر　　　ہنسے تو اور فسردہ دکھائی دیتا ہے
ں اپنی روح میں اس کو بسا چکا اتنا ـــــــ　اب اس کا حسن بھی پردہ دکھائی دیتا ہے

ں غزل کا حرفِ امکاں، مثنوی کا خواب ہوں　　　اپنی سب روداد لکھنے کے لیے بیتاب ہوں
ں ببولوں کی طرح پھولا پھلا ہوں دشت میں　　　ابر آئے یا نہ آئے، میں سدا شاداب ہوں

کیا سمجھ کے مجھ سے الجھے ہیں حسن لیل و نہار ____ آپ اپنا روز و شب ہوں آپ عالم تاب ہوں

مدت ہوئی غزلوں سے گیا شورِ گلستاں   اب حرفِ غزل نوکِ سناں موجۂ خوں ہے

اشکوں میں کہاں ڈوب گیا غم کا سمندر   لفظوں میں کہاں گم وہ مرا سوزِ دروں ہے

مختصر گوئی بھی اک حسنِ تمنا خوانی ہے ____ کیا ضروری ہے حسن ایک جریدہ لکھوں

دل وہ کشتِ آرزو تھا جس کی پیمائش نہ کی   سیرِ دنیا کے سوا ہم نے کوئی خواہش نہ کی

اس نے جو بھی روپ دھارا، اس نے جو بھی دکھ دیا ____ آدمی بننے کی ہم نے اس سے فرمائش نہ کی

یہ ہنر کا بھی ستارہ ہے نہایت منحوس ____ ہم کسے غیر بتائیں کسے اپنا سمجھیں

رکھنے کا جو گہر تھا اسے دل میں رکھ لیا   بکنے کا تھا جو مال، کتابوں کو دے دیا

اپنے لہو کی بوند بنا کر دمِ نشاط ____ اک سوزِ لازوال شرابوں کو دے دیا

موسمِ سیلاب آیا، ندی نالے بھر گیا   بے وطن سا اک پرندہ اڑ کے واپس گھر گیا

کیسی کالی رات بیتی، کیسا کالا دن چڑھا ____ جو بگولوں سے لڑا تھا، وہ صبا سے ڈر گیا

وحشت سرا سے ذہن میں وہ بھی تھا اجنبی ____ دل میں رہا مقیم تو اپنے مکاں میں تھا

تہذیبِ قتل گاہ نے اتنا سکھا دیا ____ مرنا کہاں کمال ہے، جینا ہے فن کہاں

دل کہ اب ہے جسم کا بے آب سا گوشہ نعیم ____ چاند کا آئینہ خانہ، بادلوں کا گھر بھی تھا

مجھے بھی ابر کسی کوہ پر گنوا دیتا   میں بچ گیا کہ سمندر کا میں خزانہ تھا

پتا چلا یہ ہواؤں کو سر پٹکنے پر ____ میں ریگِ دشت نہ تھا، سنگِ صد زمانہ تھا

کچھ خطوطِ دست میں تھا، کچھ کتابِ نجم میں   جو نہ ہونا تھا وہ اپنے پاس تھا لکھا ہوا

اس کی اپنی طول عمری کس قدر بے کیف تھی   وہ مرا تو کن دھنوں میں رات بھر باجا بجا

جب ہوا میں رقص کرتی جا رہی تھی اک پتنگ ____ جانے کس کے دل کا ٹکڑا چھت سے گر کر مر گیا

سُنے گا ہند تو اس سے کہوں گا دردِ وفا   مرے جنوں سے غرض کیا عراق و شام کو اب

عجیب پیار سے اس نے حسن کہا تھا نعیم ____ میں کس طرح سے بھلاؤں گا اپنے نام کو اب

کھڑا ہوا ہوں مثالِ گیاہ طوفاں میں   کوئی درخت نہیں ہوں کہ وہ گرا دے گا

یہی ہجوم جو گھر کو جلانے آیا ہے ____ لگا کے آگ مجھے تمغۂ وفا دے گا

ایک دریا پار کرکے آگیا ہوں اس کے پاس ____ ایک صحرا کے سوا اب درمیاں کوئی نہیں

شبیہ ماہ لیے آسماں سے اترا ہے   جدھر بھی جاؤں وہی دل نواز چہرا ہے
جو تم ملو تو یہ دنیا ہے آبشار و چمن   ملو نہ تم تو یہ دنیا سراب و صحرا ہے
نہ گفتگو، نہ عنایت، نہ کوئی رخصتِ جہاں   سرائے دل میں عجب شخص آکے ٹھہرا ہے
گذر ہی جائے گی آفات کی گھٹا بھی حسن ____ حیات خود ہی گھڑی دو گھڑی کا لہرا ہے

ایک دنیا میں اپنے اندر ہوں   اس قفس کی فضا سے باہر ہوں
حاصل صد سفر ہے بے تابی   پہلے دریا تھا، اب سمندر ہوں
خس کی مانند بے نوا، بے بس   ہر ہوائے سبک سے بے گھر ہوں
سر سے پا تک لہو ٹپکتا ہے   آپ اپنی انا کا منظر ہوں
مہر عبرت ہے یہ جنم میرا   اگلے وقتوں کا میں پیمبر ہوں
رشک عرفی تھا میں حسن آگے ____ اس زمانے میں سب سے کمتر ہوں

عر کے قالب میں کچھ سوز دروں رہ جائے گا ____ جتنا آنکھوں سے بہے گا، اتنا خوں رہ جائے گا
لتا ہوں بے گناہ میں دنیا کی آگ میں ____ اب کے حیات مانگ تو دنیا سے دوں نہ مانگ
س نے بھی جانا عشق کو تفریح، خوش رہا ____ سنجیدہ ہوکے ہم تو نہایت دکھی رہے
ے کوہ سربلند پہ تنہا کھلا جو پھول ____ سورج سے وہ نہ آنکھ لڑائے تو کیا کرے
یا خبر تجھ کو ہوا، نقش قدم سے تیرے ____ کتنے قدموں کے نشاں خاک میں مل جاتے ہیں
پنے ہی رخ سے بند ہوئے راستے تمام ____ بیدل کی ایک چال سے بے چال ہو گئے

شعار اپنے پاس تھے کاغذ کے روپ میں   ناشر نے جب چھوا تو زر و مال ہو گئے
ر فلک سے خون کی گردش بڑھی تو ہے   تھکنے لگے تھے پانو زمیں پر کھڑے کھڑے
م کو بھی لے بگولا سوئے دشت لے چلو ____ ہم خاک ہو چلے ہیں، گلی میں پڑے پڑے

کائنات ہی اس کی ہے، کوہ و دریا کیا   میں ایک کنج میں دھونی رما کے بیٹھا ہوں
جس کی کھوج میں سب کچھ لٹا کے نکلا تھا ____ اسی کو جوشِ جنوں میں گنوا کے بیٹھا ہوں

ا تو لشکرِ سلطاں سے جم کے میداں میں   بلا سے مجلس خوباں میں بے وفا ٹھہرا

فراز کوہ سے آواز دو تو آؤں بھی — میں ہر مہم میں طلب کی شکستہ پا ٹھہرا

بدل کے بھیس میں آتا رہا ہوں دنیا میں — تمہیں بتاؤ، میں تم سے کہاں جدا ٹھہرا

مری بھی ایک صفت ہے شہاب ثاقب میں — سیاہ شب میں وہی شعلۂ نوا ٹھہرا

لکھو گے کیسے حسن خود کو صرف تم زیدی ـــــ تمہارا سارے شہیدوں سے سلسلہ ٹھہرا

جبر شہی کا صرف بغاوت علاج ہے — اپنا ازل سے ایک حسینی مزاج ہے

آگے تو زہر عشق میں سب نہ رہتے گھلے — اب شاعری کی جان رگِ احتجاج ہے

کیا دی ہے لب کشائی کی قیمت اسے بھی دیکھ — اس دفتر نوا میں سبھی اندراج ہے

اقبال کی نوا سے مشرف ہے گو نعیم ـــــ اردو کے سر پہ میر کی غزلوں کا تاج ہے

جو تشنہ کاموں کو ساتھ لے کر تلاش آب رواں میں نکلا — سمندروں سے سوا ہے گہرا، وہ پربتوں سے کہیں بڑا ہے

ہزار پہلو سے دیکھتا ہے وہ اپنے شیشے میں آدمی کو ـــــ جو اس کو تھوڑا بھی جانتا ہے وہ ایک دنیا کو جانتا ہے

غم نہیں ممکن احساس جو ٹھہرا ہے دماغ — دل کے ساغر میں سوا خوں کے بھرا ہی کیا تھا

کیا ٹھہرتا کوئی صحرائے تمنا میں حسن ـــــ برگ ماضی کے سوا اس میں دھرا ہی کیا تھا

ہجر، اک یاد کی خوشبو میں ہے بستے رہنا ـــــ وصل، اک تازہ گلستاں سے شناسائی ہے

اپنی صفوں میں علم ہے جرأت ہے وقت ہے — ایسا نہیں کہ سچ کا مقدر شکست ہے

تنکے تمام چمن کے بیابان اڑی چلیں — ان جھاڑیوں کے بعد سہانا درخت ہے

اپنے جنوں کے دوست ہیں سورج بھی چاند بھی ـــــ مانا حسن نعیم ابھی دھوپ سخت ہے

جہاں پہ ایک بھی ٹیلا نظر نہ آتا تھا — وہاں سے لوگ اٹھا کر پہاڑ لائے ہیں

کٹے ہیں پاؤں تو ہاتھوں کے بل چلے برسوں ـــــ مثالِ موج ترے ہم کنار آئے ہیں

ان سے بچھڑے تو مؤذن کی صدا بھول گئے — جس کو پڑھتے تھے دمِ شب وہ دعا بھول گئے

پتے پتے کی رہی موج صبا سے یاری ـــــ پھول کب شاخ سے ہوتا ہے جدا بھول گئے

پاؤں سے لگ کے کھڑی ہے یہ غریب الوطنی — اس کو سمجھاؤ کہ ہم اپنے وطن آئے ہیں

ہم لہو روئے ہیں برسوں تو کھلی زلف خیال ـــــ یوں نہ اس ناگ کو لہرانے کے فن آئے ہیں

نگاہیں دیکھ لیتی ہیں جہاں ہیں درد کے چشمے ـــــ وہ چہرہ ڈوب جاتا ہے نعیم آنسو بہانے میں

کرو نہ دفن کہ مقتل کا نام اونچا ہو ___ لٹا دو خاک پہ لاشے کو قبلہ رو کر کے

جب تک شعورِ عشق ہے، پاسِ جمال ہے — زندانِ آرزو سے نکلنا محال ہے

ہر لمحہ اضطراب ہے، ہر لحظہ انتشار ___ دل کا وہی ہے حال جو دنیا کا حال ہے

کوئی تنہا نہیں دنیا میں بجز دردِ وفا ___ اس کے ہمدم ترے آنسو، نہ مری کوہ کنی

کوئی جیسے نوکِ سناں لیے شب و روز سر پہ کھڑا رہا ___ ہے اذیتوں کے شمار میں یہ اذیتوں کا ہراس بھی

اک مغنی کا وہ گھر تھا جس سے اٹھتا ہے دھواں — جس جگہ یہ مدرسہ ہے حسن کا بازار تھا

سر جھکا لینے سے ٹل جاتیں ہزاروں آفتیں ___ سارے ہنگامے کا باعث اپنا ہی کردار تھا

جاگے تمام عمر کہ ہر سو نگاہ تھی — دنیا مرے حبیب کی آرام گاہ تھی

یاروں کو ہر طرح کا تحفظ عزیز تھا ___ ہم نے چنی وہ راہ جو مردوں کی راہ تھی

نہ وہ ملا، نہ کوئی آرزو ہے اب اس کی ___ مری طلب کو بہر حال رائگاں کہیے

ان وفاؤں کے صلے میں کچھ جفا بھی چاہیے — مجھ کو جینے کے لیے تازہ ہوا بھی چاہیے

اس جہانِ آرزو میں زندہ رہنے کے لیے ___ آدمی کو مہرباں سا اک خدا بھی چاہیے

خیال و خواب نے افلاک سے قریں رکھا — زمیں کی سمت بھی لوٹے تو بس ہوا میں رہے

غزل تھی سب کی نوا، لیک نام میرا تھا ___ یہ مے نوازشِ دوراں تھی، جام میرا تھا

مری ہی ضد نے کیا بادباں کو چاک مگر ___ بھنور سے بچ کے نکلنا بھی کام میرا تھا

شورِ دریا نہ سنو، کتبۂ ساحل کو پڑھو — ہر سخن کا یہ تقاضا ہے مرے دل کو پڑھو

اس خبر گاہ میں اک دفترِ حیرت ہے وہی — قیمت علم لگانی ہے تو جاہل کو پڑھو

کتنے اوراق کھلیں منصف و شاہد کے لیے — قتل ثابت ہے مگر صورتِ قاتل کو پڑھو

ایک طغرا خطِ کوفی میں ہے وہ سب سے جدا ___ آنکھیں روشن ہوں جو اس زہرہ شمائل کو پڑھو

پو پھٹی تھی کہ شبِ وصل کا پیغام ملا — سو گئے خواب کی باہوں میں جو آرام ملا

ڈھونڈتے رہیے شب و روز امیدوں کے قدم — کوچۂ زیست میں لے دے کے یہی کام ملا

پا پیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی — جھک کے تعظیم سے شہزادۂ ایام ملا

ہم نے بیچی نہیں جس روز متاعِ غیرت ___ اک پیالہ بھی نہ مے کا ہمیں اس شام ملا

سارے جہاں کی سیر کا امکان مل گیا ____ بوئے چمن کو راہ میں طوفان مل گیا

روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب
میں چلا برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا
کیا بساط خار و خس تھی پھر بھی یوں شب بھر جلے ____ دوش پر بادِ سحر کے دور تک شعلہ گیا

یہ دل کہ قصبۂ گم نام سے مشابہ تھا ____ ترے قدم سے ہے معروف شہر کی مانند

اب تو آجاؤ کہ ہم نے کاٹ لی قیدِ انا
انتظار روشنی میں اپنا دیدہ بہہ چلا
کس طرح اب باندھیے گا عشق کے مضمون نعیم ____ یاں وصال یار بھی ہے "اقتصادی مسئلہ"

خواب کی راہ میں آئے نہ در و بام کبھی
اس مسافر نے اٹھایا نہیں آرام کبھی
اے صبا میں بھی تھا آشفتہ سروں میں یکتا ____ پوچھنا دلی کی گلیوں سے مرا نام کبھی

اٹھائے منت صرصر کہ ناز باد نسیم
ہر ایک حال میں صحرا شکار ہے تنہا
چہل پہل ہے بہت یوں تو میکدے میں نعیم ____ میانِ جام و سبو شیشہ دار ہے تنہا

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں یہ رات ____ نہیں ہے شرط کہ مجھ کو شریک خواب بنا

کوئی وجہ غم نہیں ہے کسی بات کا ہے غم بھی
اسی درد گم شدہ سے کبھی رو دیے ہیں ہم بھی
وہی طالب ضیا ہو جو اٹھائے ناز ظلمت ____ وہی بوسۂ سحر لے جو سنوارے شام غم بھی

شاید کہ مثل مہر کوئی آئے صبح دم ____ شام فراق تم بھی جگر کو لہو کرو

جوئے رواں کے پاس ہے سویا ہوا کوئی
جھولی میں زاد راہ نہ منزل کی گرد ہے
حیراں سا ہے برگ سبز جو سائے میں اس کے آج ____ گم صم کھڑا ہوا کوئی صحرا نورد ہے

پیکر ناز پہ جب موج حیا چلتی تھی
قریۂ جاں میں محبت کی ہوا چلتی تھی
ان کے کوچے سے گزرتا تھا اٹھائے ہوئے سر ____ جذبۂ عشق کے ہم راہ انا چلتی تھی

دل میں اتر گئے تو اک جوئے وفا پاؤ گے
موج در موج سمندر کا پتا پاؤ گے
میں تو کھو جاؤں گا تنہائی کے جنگل میں کہیں ____ تم بھرے گھر میں کہاں مجھ کو بھلا پاؤ گے

جل کے ہم راکھ ہوئے ہیں کہ بنے ہیں کندن
جوہری بن کے کسی شخص نے پرکھا ہی نہیں
گرد شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا ____ کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں

تو نے خزانہ دیکھ کے سر کیوں جھکا لیا ____ رہتا ہے سربلند جہاں شیش ناگ بھی

میرے قدموں کے نشاں راہ سے کچھ دور بھی ـــــ تم سے میں دور نہیں ہوں، مجھے آواز تو دو

یہی رشتہ درد کا کم نہیں کہ شکایتوں میں سکوں ملے ـــــ صف دل براں کا وہ تاج ور، مری گفتگو سے خفا تو ہے

گل سایہ بن کے جیا تو ہے کوئی دن کے یورش نور میں ـــــ کوئی صحن شب میں تمام شب رُخ یار بن کے جلا تو ہے

کوئی دشت مہرباں ہو تو سفر آسان ہے ـــــ ورنہ ہر پتھر ہے بھاری، ہر کنواں ویران ہے

مژدۂ صبح بہاراں ہے، میری غزلوں کا ظہور ـــــ لمس معنیٰ، بوسۂ شعلہ رخاں سے کم نہیں

ایک طوفاں ساحلوں سے دور رکھتا ہے مجھے ـــــ اس سفر میں تار دامن بادباں سے کم نہیں

اک دوسرے کو دیکھ کے حسرت سے رہ گئے ـــــ دونوں کے ارد گرد روایت کا جال تھا

ہر سخن سے گرم تر ہے سینۂ مہر و خلوص ـــــ بے ہنر لوگوں کو سینے سے لگا کر دیکھیے

دل میں نہ جانے کیا رہا، مثل شرار جستجو ـــــ جوش طلب کے وقت بھی، ترک طلب کے بعد بھی

تجھکو بتائیں کیا صبا، ہم نے جلایا کیوں چراغ ـــــ آمد نور کے باوجود، رخصت شب کے بعد بھی

سر میں اگر جنوں نہ ہو ملتا نہیں ہے تاج فن ـــــ فکر و نظر کے باوجود، نام و نسب کے بعد بھی

بام خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی صبح ـــــ خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے

اتنا دل نعیم کو ویراں نہ کر حجاز ـــــ روئے گی موج گنگ جو اس تک خبر گئی

یہ کشتیاں، یہ ہوائیں، یہ بادباں سب ہیچ ـــــ افق کے پار کوئی اور ہی اتارے گا

کچھ قربتوں میں لطف، تو کچھ دوریوں میں ہے ـــــ یاروں سے رہ قریب بھی، یاروں سے بھاگ بھی

کہاں میں، ہجرت کے مرحلوں میں، اٹھائے پھرتا غم مکاں کو
خلا سے رشتہ جڑا تو دیکھا نہ مڑ کے ساحل نہ بادباں کو

ملا نہ کوئی جو ہم نفس ہو سکوت جنگل میں ہم قدم ہو
کہیں تو لیکن ہے کوئی ایسا جو آس دیتا ہے قلب و جاں کو

کتنے برسوں میں لہو آنکھ سے ٹپکا شب بھر ـــــ قرض تھا مجھ پہ بہت کاسۂ دل داری کا

میں نے الزام کی تردید میں حق گوئی کی ـــــ نام اونچا نہ ہوا مجھ سے رواداری کا

کوئی پہاڑ نہیں تھا جو ہم نے سر نہ کیا ـــــ ملے وہ خواب کہ آرام عمر بھر نہ کیا

یہ کیوں ہوا کہ سدا اجنبی دلوں میں بسے ـــــ اسی کا دل تھا حسن جس میں تم نے گھر نہ کیا

بس یہی فکر کرو جلتی رہے آتشِ فن ____ آتشِ رشک سے محفل میں دھواں ہے تو رہے

نہ میرے خواب کو پیکر، نہ خد و خال دیا
بہت دیا تو مجھے موقعِ وصال دیا

ملا نہ روح نہ دل کا کوئی حساب مگر
یہ کارِ زیست کسی طور سے سنبھال دیا

مرے عیوب کی تصویر اس طرح کھینچی ____ مرے ہنر کو پسِ پشت اس نے ڈال دیا

قصیدہ تجھ سے، غزل تجھ سے، مرثیہ تجھ سے
ہر ایک حرف ہوا صاحبِ نوا تجھ سے

زباں کشائی غم سے کھلی کتابِ خیال
ورق ورق پہ کھلا رنگِ مدعا تجھ سے

زمیں سے پھوٹ پڑا چشمۂ جنوں ساماں
گلوں میں سرد پڑی آتشِ قبا تجھ سے

کہاں سے زود فراموشیوں کی خو سیکھی
جو دیکھیے تو نہ تھی برق آشنا تجھ سے

پہنچ تو جاتا سرِ خیمۂ وفا آباد ____ مگر ہے سست قدم عمرِ تیز پا تجھ سے

قصبہ و شہر میں ہے آگ کا طوفاں برپا
کون سی شاخ پہ چڑھ کر یہ نظارا دیکھوں

کوچہ ویراں ہے ستوں سوچ رہا ہے کب سے
کیا دھرا ہے جو مکینوں کا میں رستا دیکھوں

مجھ کو ہر رنگ میں وہ شخص بھلا لگتا تھا ____ اس کو غم دیدہ و خاموش کہ ہنستا دیکھوں

قطرۂ مے سے دبا رات نہ طوفاں طلب
مجھ پہ کیا بیت گئی رات سنا تو ہوگا

یہ بھی تسلیم کر تو مجھ سے بچھڑ کے خوش ہے ____ تیرے آنچل کا کوئی تار ہنسا تو ہوگا

میرا محبوب ہے وہ شخص جو چاہے تو نعیم ____ سوکھی ڈالی کو بھی گلشن میں بدل سکتا ہے

پتا نہیں کہ وہ چہرے کا رنگ تھا، کیا تھا
لہو نچوڑ کے جینے کا ڈھنگ تھا، کیا تھا

نکل پڑی ہے مری روح کیوں برہنہ پا
لباسِ عشق بہت دل پہ تنگ تھا، کیا تھا

پڑی ہے خاک پہ اک لاش تو چلو دیکھیں
یہ اپنے ملک کا باسی ملنگ تھا، کیا تھا

نعیم کتنے چمن اور کھل اٹھے دل میں ____ وصالِ یار رہی خوشبو تھا، رنگ تھا، کیا تھا

مکتوبِ یار ہوتا تو حرف حرف پڑھتے
تحریرِ وقت پڑھ لی، ہم نے ادھر ادھر سے

جیسے ہی شام آئی، جوڑا بطوں کا اترا ____ جس پیڑ کے تلے تھا، اک شخص دوپہر سے

کیسے بتائیں کہ غم کے صحرا کو خلدِ دانش بنایا کیسے ____ کہاں سے آبِ رواں کو موڑا، کہاں سے بادِ بہار لائے

ڈھونڈو تو صرف آنچ ہے، شعلہ کہیں نہیں
جلتا ہے دل کہ غم کا سراپا کہیں نہیں

شاعر کا ہے وہ خواب، رسولوں کی آرزو ___ تم جس کو ڈھونڈتے ہو، وہ دنیا کہیں نہیں
سامانِ صد چمن تھا اٹھائے ہوئے نسیم ___ وہ کاروانِ ابر جو اترا کہیں نہیں

میں کس ورق کو چھپاؤں، دکھاؤں کون سا باب ___ کسی حبیب نے مانگی ہے زندگی کی کتاب
گیا تھا دشت سے اٹھ کر سمندروں کی طرف ___ وہاں بھی تشنہ نصیبی، وہاں بھی مرگِ سراب

رکھیے بچا کے اپنا دفینۂ حسن نعیم ___ غم کو لٹائیے نہ زر و مال کی طرح

اب خدا جانے تجھے بھی ہے تعلق کہ نہیں ___ لوگ لیتے ہیں مرا نام ترے نام کے بعد

دشت پیمائی ہے میری عہدِ حاضر کا جنوں ___ بن چکے ہیں مجھ سے پہلے میرے قدموں کے نشاں

کتنے اشکوں کے دیے جلتے رہے، بجھتے رہے ___ یوں بظاہر چین سے میں رات بھر سوتا رہا

سچ تو یہ ہے کہ ابھی دل کو سکوں ہے لیکن ___ اپنے آوارہ خیالات سے جی ڈرتا ہے
ٹال دیتا ہوں غمِ یار ذرا سا ہنس کر ___ مسکراتے ہوئے لمحات سے جی ڈرتا ہے
جو بھی کہنا ہے کہو صاف شکایت ہی سہی ___ ان اشارات و کنایات سے جی ڈرتا ہے

وہاں یقین کہ خود ہی کھلے گا حرفِ جنوں ___ یہاں یہ فکر فضا سازگار ہو تو کہیں

●●

اجتبیٰ رضوی (وفات: ۲۶ فروری ۱۹۹۱ء)

نام :- سید اجتبیٰ حسین رضوی، تخلص :- رضوی (ابتدائی تخلص شاعری میں تپاں)، والد کا نام : سید اظہر حسین

وطن :- چھپرہ، ولادت :- ۱۹۰۸ء چھپرہ، ابتدائی تعلیم :- گھر پر ہوئی۔

اصولی تعلیم :- ۱۹۲۳ء :- راجپوت ہائی اسکول چھپرہ، ۱۹۲۵ء میٹریکولیشن، ۱۹۲۷ء آئی اے ۱۹۲۹ء بی۔ اے (جی بی بی کالج، موجودہ لنگٹ سنگھ کالج، مظفرپور)، ۱۹۳۸ء :- ایم اے (فارسی) پٹنہ یونیورسٹی

زندگی کے اہم واقعات :- ۱۹۲۶ء :- بڑے بھائی سید مجتبیٰ حسن کا ارتحال (دریائے ... میں ڈوب کے)، ۱۹۳۰ء :- والد ماجد کا انتقال، ۳۰-۱۹۲۹ء :- ضلع اسکول چھپرہ میں عارضی ملازمت، ۳۱-۱۹۳۰ء :- مدرسہ سلیمانیہ میں عارضی ملازمت، ۱۹۳۱ء :- شادی، ۱۹۳۳ء :- لڑکی کی ولادت، ۱۹۳۵ء :- لڑکے کی ولادت، ۱۸ ستمبر ۱۹۳۶ء :- اہلیہ کا انتقال، ۱۹۳۷ء :- قیام کلکتہ۔ صحافت۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبتوں میں شرکت مصریات کے مطالعے میں، ۳۹-۱۹۳۸ء :- راجندر کالج میں لکچرر (تقرری) اور تھیوسوفیکل سوسائٹی میں ممبریت ۱۹۴۳ء (اواخر) :- ترک دنیا۔ گیا کی پہاڑی کے کسی غار میں طویل مراقبہ یا اعتکاف، ۱۹۴۵ء (اوائل) اعتکاف سے واپسی، ۱۹۵۴ء :- "شعلۂ ندا" کی اشاعت، ۱۹۵۷ء :- لڑکی کی شادی، ۱۹۶۰ء :- ملت کالج کی پرنسپلی، ۱۹۶۵ء :- کالج کی عظیم الشان عمارت کی تیاری اور اس میں کالج کا منتقل ہونا، ۷۲-۱۹۷۱ء :- حج و زیارت، ۷۳-۱۹۷۲ء :- ۱۹۳۴ء کے زلزلے سے مجروح شدہ ذاتی مسجد کی تعمیر جدید، ۱۹۷۵ء :- ایل۔ این متھلا یونیورسٹی میں پرو وائس چانسلر، ۱۹۷۷ء :- یونیورسٹی کے عہدے سے سبکدوشی۔

مشاغل :- مطالعہ، تصویرکشی، باغبانی، تدریس۔ شوق :- فلسفہ، مصریات، روحانیات، مذہبیات والہیات، ادب (شاعری)، فن تعمیر، موسیقی۔ موجودہ قیام اور مشغلہ :- اپنے لڑکے مرتضیٰ اظہر رضوی، ریڈر و صدر شعبۂ مابعد الطبعیات و منطق و فلسفہ۔ ملت کالج کے ساتھ دربھنگہ میں قیام اور ان کی ذہنی و فکری تربیت، پوتوں کی ناز برداری۔

انتخاب کلام

جہاں میں حاجت روا محبت تو حسن اک نقش مدعا ہے — مصور عشق رنگ بھر دے تو حسن بے حس و بے رنگ کیا ہے

حاصل سعی موج رنگ دیکھیے لالہ زار میں — گل ہی سے آگ لگ چلی پیرہن بہار تھا

مدعیانِ ہوش و خرد سب دعا کر بیٹھتے ہی گئے — آپ کا جب دیوانہ آیا وقت کا دھارا موڑ چلا

آگ ہے بجلی آگ میں ذرے آگ ہے سورج آگ میں تارے — ہم نے نہ کی تھی شوخ نگاہی آپ نے کیوں عالم کو جلایا

ہم پہ شریعت ہم پہ طریقت ہم پہ حدودِ فکر و نظر — آپ چلے تو گلشن گلشن صحرا صحرا آپ ہوئے

جل نہیں سکتا جو پروانہ بزم سے نکل ہی جاتا ہے — رشتۂ شمع تو جلتے جلتے آخر جل ہی جاتا ہے

قیس کے بعد تو خاک اڑنے لگی تھی رونق کی — مجھ سے ویران نہ دیکھا گیا ویرانے کو

سرِ شوریدہ کو بالیں تو مل جائے — بلا سے بتکدے کا آستاں ہے

ایک دن رندوں نے مسجد میں نماز آکے پڑھی — دوسرے دن اسے میخانہ بنا کر چھوڑا

فردوس کا وہ توشہ ہی سہی، ساقی کا جگر گوشہ ہی سہی — لیکن نہ بھریں ساغر جس سے اس مینا کو مینا نہ کہو

مانا کہ سلیقہ جینے کا آتا بھی نہ ہو نادانوں کو — یہ دشتِ جنوں آباد تو ہے، اللہ رکھے دیوانوں کو

سب پہ طاری ہولِ قیامت اور خوشی دیوانوں کو — بارے اس نے حال تو پوچھا ہم سے پریشاں حالوں کا

سمیٹ لیتے بیک سجدہ کائناتِ شہود — بقدرِ حسرتِ دل وسعتِ جبیں نہ ہوئی

چکائے قرض اپنا مجھ سے لے قدرت کے سوداگر — کہ اس سینے میں دل باقی ہے، اس گردن پہ سر باقی

بازار میں آکر ناداں دل تنظر کے کھلونوں پر مچلا — اور پیرِ خرد کو کاندھے پر اپنا بارِ نظر ڈھونا ہی پڑا
ہم تخمِ محبت جنت سے سینے میں چھپا کر لے آئے — اس ریت میں کیا اُگتا وہ بھلا! ہاں لائے تھے بونا ہی پڑا

خدا پرستی کا بیج بو کر خودی کا دل میں فروغ دیکھو — یہیں سے جھوٹے خدا اُگے ہیں، بڑی خطرناک یہ زمیں ہے
فغاں کہ یہ رسمِ جبہ سائی نہیں بہ مقدارِ ذوقِ سجدہ — وہ کاش دل تک اتر کے رہتا جو داغ آسودۂ جبیں ہے

جس راہ میں پیچ و خم نہیں ہے — اس راہ میں کیوں حرم نہیں ہے
سجدہ ہے کرشمۂ تصور — مت کہہ کہ خدا صنم نہیں ہے

طلب کی ذلت و بیچارگی، معاذ اللہ — مری خودی کا تشنج ہے یہ دعا کیا ہے
ہم اٹھ کھڑے ہوئے دنیا سے جھاڑ کر دامن — کہ ان بجھے ہوئے ذرات میں دھرا کیا ہے

روا ہے کیا تری دنیا میں ناروا کیا ہے — مجھے بتا کہ "یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے"
یہ اتحادِ طبیعت یہ اختلافِ مزاج — یہ طرفہ کاریِ رفتارِ ارتقا کیا ہے
حیات جس کو کہیں اک جنونِ گرم روی — یہ کیوں ہے، اس کی غرض اس کا مدعا کیا ہے

اس دل کا تحیر تھا آئینہ اس سر کا تصور تھا مو قلم   تمثال پہ نقطے لگا کے تصویر بدلتی چلی گئی
اک حد میں شریعت کہی گئی اک حد میں طریقت کہی گئی   افسانہ جو چلتا چلا گیا سب فلسفہ بدلتی چلی گئی

قدم سے دور جبیں رہن سنگ در ہوگی   فغاں کہ بے کسی سجدہ مشتہر ہوگی
طواف بے دہ کعبہ آرزوئے نامشہود   بہت ہوئی تو یہی قسمت نظر ہوگی

جہاں ہے سر سبز کشت ارماں اجاڑ صحرا وہاں رہے گا   ادھر کو جو بہہ رہی تھیں نہریں اب ان کے رخ موڑے جا رہے ہیں
یہ رسم میخانہ کیا ہے آخر کوئی تو پیر مغاں سے پوچھے   جو کل بنائے گئے تھے کوزے وہ آج کیوں توڑے جا رہے ہیں

تکمیل زندگی کو جنوں کا ہے انتظار   اب تک خرد حریف مشیت نہ ہو سکی
قطرہ کے دل کی ہوک پہ قلزم نہیں بڑا   میری امید اس کی مشیت نہ ہو سکی

بساط بزم مے سے کم نہیں ہے کوئے دلداری   سنبھل کر پاؤں رکھیے ہر قدم اک آبگینہ ہے
ابھی تو دل کے ٹکڑے جمع کرنے سے نہیں فرصت   گریباں کی ہزاروں دھجیاں ہیں دامن کو سینا ہے

حریص جلوہ کچھ اپنی خبر ہے؟   نظر کا رخ کدھر تھا اب کدھر ہے؟
کلی کا مسکرانا دیکھ لے دیر   بہت گہرا یہ طنز مختصر ہے

اب سب کی زباں سے سن لیجے خلوت کا بیاں جلوت کا بیاں   اف کیا کیا راز نہ فاش کیے آغوش جنوں کے پالوں نے
اس دل کو راہ محبت میں جس جس نے پایا لوٹ لیا   اک تم ہی نہیں سب نے یہ کیا خاروں نے گلوں نے لالوں نے

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارا طلسم ہست و بود   اک جنون ادعا ہے مدعا کوئی نہیں
دیدہ بیدار نے توڑا طلسم آرزو   جلوہ گاہ ناز میں میرے سوا کوئی نہیں

مجبور نگاہیں تکتی ہیں قدرت کے تماشے ہوتے ہیں   بنتا ہے کوئی مٹتا ہے کوئی دس ہنستے ہیں سو روتے ہیں
ہر سمت سے خطرہ ہے دل کو مانگے نہ کوئی پوچھے نہ کوئی   مفت ایک پرانی پونجی کو ہم رستے رستے ڈھوتے ہیں

ہے اک انتشار سکوں میں بھی سر و پا کا ہوش جنوں میں بھی   کہیں بار منت سنگ ہے کہیں دام لذت خار ہے
جسے ڈھونڈتے ہو وہ میہماں کہیں اور اٹھ کے چلا گیا   جو سرائے کہنہ میں رہ گیا ہے وہ کہنگی کا غبار ہے
یہ نقوش رنگ جو دل میں ہیں گل و لالہ ان کو سمجھ نہ تو   جو بہار تھی وہ گزر گئی جو رہا وہ داغ بہار ہے
ہے کشادہ وسعت دو جہاں مگر اے مذاق لامکاں   جو بھی احاطہ جستجو ہے تو جستجو کا فشار ہے
بہمہ جمود و فتادگی ہے تمام دشت میں کھلبلی   دل رہ نوردی جرس آشنا یہ بتا تو کس کی پکار ہے

تمہاری گر جستجو نہ کرتے تو ہم جہاں تھے وہیں پہ تم تھے — ہم اپنی منزل سے بڑھ گئے ہیں برا ہو اس ذوقِ جستجو کا

طلب کے صحرا کا ذرہ ذرہ ہے خندہ زن نارسی رہگاں پر — صلا دے اب اے نسیمِ غفلت کہ تھک گیا پاؤں جستجو کا

مری محبت کی انتہا تھی مرے تخیل کی بت تراشی — بکھر گئی آرزو کی پونجی طلسم ٹوٹا جو رنگ و بو کا

ڈھونڈ لیتے تجھے ہم ہمتِ مرداں کی قسم — قید ہیں وسعتِ محدود بیاباں کی قسم

سرحدِ ذہن میں مت جا کہ ہیں طوفانِ شکوک — حل میں رہ تجھ کو چراغِ تہِ داماں کی قسم

آج اگر بچ گئی رضوی تو یہ کل ٹوٹے گی — پھر قسم کیا ہے؟ لبِ توبۂ رنداں کی قسم

اس ساز پہ نغمہ اب چھیڑو تو نالہ پیدا ہوتا ہے — موجود ہیں وہ سب تار جو تھے بس ایک نہیں ہے ٹوٹ گیا

ہم روتے ہیں اپنے پیاروں کو اور فطرت ہم سے کہتی ہے — اب اور کھلونوں سے کھیلو جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

ہاں سن کہ تجھے تھی ہم سے غرض محتاجِ نظر تھا حسن ترا — رکھی رہی شانِ استغنا آخر کو یہ بھانڈا پھوٹ گیا

دل ہے اور خود نگری ذوقِ دعا جس کو کہیں — بے خودی چاہیے ہم کو کہ خدا جس کو کہیں

ہے ترے کیسۂ پندار میں ایسی کوئی چیز؟ — دل کی بے تاب محبت کا صلہ جس کو کہیں

تم سے رضوی کئی منزل ہے زمانہ پیچھے — راہرو اس کو کہو راہنما جس کو کہیں

اونچی تھی نظر ہی جب تو بھلا ارماں تماشا کیا کرتے — ذرے کے جگر تک جا نہ سکے ہم ہمتِ صحرا کیا کرتے

رات اس نے نقاب الٹی جو ذرا سب بندِ تعین ٹوٹ گئے — وہ، وہ نہ رہا ہم، ہم نہ رہے اے شوق تماشا کیا کرتے

تم نے ہی چمن کو لوٹ لیا تم نے ہی نشیمن پھونک دیا — ہم شکر کی ہمت کر نہ سکے شرما گئے شکوہ کیا کرتے

جلووں سے نہ آنکھ جھپکتی ہے جلووں کو نہ آنکھ ترستی ہے — ہم نے وہ پیالہ پی ہی لیا جس میں نہ خمار نہ مستی ہے

کچھ لمحے ہیں جن لمحوں میں احساس لیے پھرتا ہے — عالم ہے ادھر جو عالم ہے ہستی ہے ادھر جو ہستی ہے

ہے روح کی حالت کندن کی جتنا ہی تپے گی نکھرے گی — غم ایک کسوٹی ہے جس پر یہ فطرت ہم کو کستی ہے

چھیڑا ہی کیوں ہوائے رہِ کوئے یار نے — اندھیر کر دیا مری مشتِ غبار نے

افسردگی بھی حسن ہے تابندگی بھی حسن — ہم کو خزاں نے تم کو سنوارا بہار نے

اس دل کو شوقِ دید میں تڑپا کے کر دیا — کیا استوار وعدۂ نا استوار نے

جلوے کی بھیک دے کے وہ ہٹنے لگے تھے خود — دامن پکڑ لیا نگہِ اعتبار نے

گیسو غبارِ راہِ تمنا سے اٹ نہ جائیں — صحرا میں آپ نکلے ہیں ہم کو پکارنے

دونوں جہاں کی ساری پونجی نثار ہوئی جو حق ناتواں پر — بر دگدا کے ہاتھ میں کیونکر ان ناتوں کی بہاریں آئیں
تیرے فقیر کو رستا چلتے عزت و ذلت میں الجھانے — منہ سے پوجا کیا مندروں میں مسجد سے پھٹکاریں آئیں
گوشۂ عرش کا بوسہ لینے دہر سے اٹھ کر ساری یاریاں — کافر کی فریادیں آئیں غازی کی للکاریں آئیں

نامہرباں بنے تھے، مگر مہرباں رہے — چھپ چھپ کے خود وہ رہنے لگے ہم جہاں رہے
میرا دل گلستہ علائق ہے اک سوال — یعنی جو پھول شاخ سے ٹوٹے کہاں رہے
اف! یہ درازدستی ارمان مشت خاک — محمل میں گرد پڑتی ہے لیلےٰ کہاں رہے

ہائے اس کالبد خاک سے پیوند حیات — کس طرح ملتی ہے، کس طرح جدا ہوتی ہے
کوئی اس رہرو غربت کی خبر لادیتا — آہ جو دل سے نکلتی ہے وہ کیا ہوتی ہے
اک عجب عالم آئینہ ہے سیمائے شہود — کہ جہاں ایک نظر لاکھ ادا ہوتی ہے

دریائے بے کنار کا ساحل بنادیا — اب جستجو کو شوق کے قابل بنادیا
صحرائے جستجو میں فریب نگاہ نے — اپنے غبار شوق کو محمل بنادیا
جو وسعتیں سما نہ سکیں کائنات میں — ان کو سمو سمو کے مرا دل بنادیا

اسی امید پہ تھی لغزش رنداں ساقی — تھام لے گا کوئی گرتے ہوئے بازو اپنا
تند و سرشور و تنک طبع یہ فطرت جس سے — ان کو ارماں کہ نکالیں کوئی پہلو اپنا
ہم تو آشفتہ سری سے نہ سنورنے پائے — آپ سے کیوں نہ سنوارا گیا گیسو اپنا

سب اپنی آنکھ کا آنسو کسی کو سونپ کر آئی — نگاہ واپسیں اک زندگی کا قرض بھر آئی
تجلی نے کیا شرمندہ اس کو اہل ہمت سے — حقیقت کیوں جھجکی اتنی کہ تا حد نظر آئی
یہ کیسا ماجرا ہے ہر مصور نقش حیرت ہے — تری تصویر جب کھینچی مری تصویر اتر آئی

سکوت منظر کے زیر دامن بہت سے طوفان پل رہے ہیں — حباب ہے آرزو سے ساحل ہوا چلی اور حباب ٹوٹا
ادا سے تعمیر کہہ رہی ہے جفائے تخریب کا فسانہ — بہت سے تارے چھٹک کے نکلے کہیں کوئی آفتاب ٹوٹا
ہم اور میخانے کی امانت وہاں پہنچ جائے دل سلامت — خدا نہ کردہ جو اپنے ہاتھوں یہ شیشۂ ناجواب ٹوٹا
نظر نہیں ہے تو کون دیکھے حجاب کیسا نقاب کیسی — ادھر کھلی اپنی چشم بینا ادھر طلسم نقاب ٹوٹا
کسی کی رعنائیوں کو برہم کیا مری شوخی نظر نے — تجلیاں تلملا کے نکلیں جلال آیا حجاب ٹوٹا

زباں سے دل کا فسانہ ادا کیا نہ گیا — یہ ترجماں تو بنی تھی مگر بنا نہ گیا

ہم ان کے وعدۂ فردا کو لیکے بیٹھے ہیں — کہ جن سے آج کا وعدہ وفا کیا نہ گیا

دمِ اخیر وہ دینے لگے حیاتِ دگر — پھر ایک عمر کا احسان تھا لیا نہ گیا

زندگی نغمۂ بیداریِ احساس بھی ہے — اور وہ لوری بھی ہے جو دل کو سلا دیتی ہے

کارواں فکر کا ہے منزلِ آخر پہ تو کیا — زندگی منزلِ اول سے صدا دیتی ہے

بات بگڑے کہ بنے یہ مری بےتابیِ شوق — تیری آواز سے آواز ملا دیتی ہے

نمودِ بیکسی صحرا میں ہے صرف اک نشاں میرا — غبارِ کارواں ہوں دور نکلا کارواں میرا

رسائی مرگِ شوق، افتادگی ننگِ تن آسانی — بلا کی کشمکش ہے اور غبارِ ناتواں میرا

مجھے گھبرا کے دوشِ ہستیِ جاوید پر پھینکا — کوئی دم بھی نہ اٹھا موت سے بارِ گراں میرا

چمن سے اک طرف ہوں نخلِ بے برگِ تمنا پر — ارے او برقِ رہ گم کردہ! یہ ہے آشیاں میرا

چرانے کو چرا لایا میں جلوے روئے روشن سے — مگر اب بجلیاں لپٹی ہوئی ہیں دل کے دامن سے

تنوع کچھ نہ تھا، بلبل کم ذوق، ماتم کیا — اگر تعمیرِ صحرا ہو گئی تخریبِ گلشن سے

مجھے کچھ تجربے ہر رنگ کے جھولی میں رکھ چلنا — مسافر ہوں غرض کیا ہے مجھے صحرا و گلشن سے

مذاقِ جذبِ باطن گم ہے اب تزئینِ ظاہر میں — یہ طفلِ دشتِ ایمن گھٹ گیا تہذیبِ گلشن سے

بخشی ہیں اس خودی کو پئے امتحانِ ظرف — پروردگاریاں مرے پروردگار نے

کب سے کیا ہے باندھ کے احرامِ بےخودی — میرا طواف گردشِ لیل و نہار نے

ہمت یہ میری پیار سے اُمڈا ہے قلبِ بحر — دھوئے ہیں پاؤں گریۂ ابرِ بہار نے

صحنِ مجاز میں یہ ہزاروں ہزار ناز — کھیلی ہے مجھ سے آنکھ مچولی بہار نے

چندیں ہزار عالمِ آشفتگی بہ دوش — اترا ہے ناز خود مرے گیسو سنوارنے

اس جامِ دل کو اپنی ہتھیلی پہ لے کے خود — چھلکا دیا ہے ساقیِ کوثر نثار نے

رشکِ دوئی سے وسعتِ آغوش کر کے تنگ — بھینچا ہے مجھ کو وحدتِ کثرت شکار نے

میں کافرِ مجاز پرستِ حق آشنا — سمجھا کہاں کہاں سے صدا دی ہے یار نے

دیوانہ وار کفر کو ایماں کیے ہوئے — دوڑا تو ساتھ چھوڑ دیا اعتبار نے

کچھ بات تو کرتا چل اے مانجھی تو ہی اک سہارا ہے
اب کتنی دور کنارا ہے؟ اب کتنی دور کنارا ہے!

وہ کون ہے جس کو ظلم تمہارا پیار سے اپنے پیارا ہے
یہ عاشق اپنے شوق کے ہیں سب عاشق کون تمہارا ہے

جب تک نہ حریم ناز سے تم درویش کی کٹیا میں اترو
ہم تم کو پکارے جائیں گے جب ہم نے تم کو پکارا ہے

ہے شام جھما جھم تاروں سے، ہے صبح جھکا جھک کرنوں سے
یہ کس نے بال سنوارے ہیں؟ یہ کس نے روپ نکھارا ہے

برباد یہاں ناموس نظر اے دیدۂ بینا کون کرے
اقرار تماشا کون کرے، انکار تماشا کون کرے

ہم کو نہ ہو گریہ دربدری تو خدمت صحرا کون کرے
بکھرے نہ کرن تو ذروں کو سورج کا شناسا کون کرے

پردیسی جلووں کی خاطر یہ آگ کا سودا کون کرے
جو شتِ خسِ صحرا نے کیا رہی سے وہ سکھا کون کرے

اس حرص و ہوس کے میلے میں ہم جنسِ محبت لائے ہیں
سب سستے مال کے گاہک ہیں یہ مہنگا سودا کون کرے

خرد کی تیرگی میں آپ کا جلوہ بس ایسا تھا
کہ آدھی رات کو جیسے یکایک صبح ہو جائے

یونہی تاریخ فطرت میں ہیں تحریکاتِ روحانی
کہ مستِ خواب کوئی چونک کر پھر جیسے سو جائے

وہی ریگ درشتِ دہر میں لالے اگاتا ہے
جو دل کے خون سے سینچے زمیں اور جان بو جائے

ادھر رکتا ہے خامہ کاتب تقدیر کا چل کر
ادھر یہ اپنا تیور ہے کہ جو ہونا ہے ہو جائے

حسن کو دی گئی حیا عشق کو آن دی گئی
تم سے نہ دل لیا گیا ہم سے تو جان دی گئی

دشت نے الحذر کہا، موجِ ہوا نے الحفیظ
بخشش قہر! الاماں! خاک کو جان دی گئی

پچھلے پہر مزار پر آکے نقاب الٹ گئے
چادرِ نرمِ ماہتاب قبر پہ تان دی گئی

وعدۂ دید روز حشر سنتے ہیں تو نے کر لیا
تجھ سے بھلا غرورِ ناز کیسے زبان دی گئی

تماشا آسماں تک ہے، تصور آستاں تک ہے
مگر شوقِ دلِ بے تاب کیا جانے کہاں تک ہے

دلِ غاراں کی گرمی سینۂ ہندوستاں تک ہے
کہاں بھڑکے تھے شعلے اور بے تابی کہاں تک ہے

سنا ہے کاروانِ آرزو اب آستاں تک ہے
ہوائے شوق! میری خاکِ سرگرداں کہاں تک ہے؟

بھرے گا کون رنگِ خون دل نقشِ حقیقت میں
تمہاری داستاں بھی بس ہماری داستاں تک ہے

اندھیرے جا مئے مینا گداز جلوہ اے ساقی
کہ ضبطِ تندیٔ صہبا اسی رطل گراں تک ہے

صلہ بے تابیوں کا مل گیا میں نے یہ خود دیکھا
کہ میرے دل کی دھڑکن اس دلِ نامہرباں تک ہے

تماشا اور تحیر میں کوئی نسبت نہیں رضوی
کہ وہ ہے آستاں تک یہ خدا جانے کہاں تک ہے

ہر مذہب بے روح جسد ہے جذبے کی قلاشی ہے — راکھ کے تودے بجھتے ہیں، یہ کعبہ ہے وہ کاشی ہے
شرع کی قیل و قال سنی، افسانہ وجد و حال سنا — ذہن کی وہ عیاشی ہے اور روح کی یہ عیاشی ہے
دل مردہ مفلوج ہیں رد میں کون جلے اور کون جلائے — اس ٹھنڈے ماحول میں بجا شوق کی اخگر پاشی ہے
صانع قدرت تیرے قلم کا کیا کہنا لیکن یہ بتا — نقش بنانا نقش مٹانا یہ کیسی نقاشی ہے

اور پھر کون سی اب ہوگی ملاقات کی رات — بھیگی بھیگی یہ گنہگار سی برسات کی رات
گھومتے کٹتا ہے کوچے میں ترے دن کا دن — بیٹھے کٹ جاتی ہے چوکھٹ پہ تری رات کی رات
یوں ہیں برہم تری گھنگھور گھٹا سی زلفیں — جیسے بکھری ہوئی بھری ہوئی ظلمات کی رات
ایسی آباد تری بزم ہے اے جان نشاط — جیسے کعبہ کی سحر جیسی خرابات کی رات

نہیں سہی مرے نالوں میں کچھ اثر نہ سہی — نظر کچھ آپ کی بے چین ہے ادھر نہ سہی
ہم الجھنوں میں پڑے عقل نارسا لے کر — وہ عیش بے خبری خوب تھا خبر نہ سہی
ادا فروشیٔ بازار طور اور حضور — خبر بھی تو ہے مشہور معتبر نہ سہی
فدا ہو تاب بشارت مری بصیرت پر — نظر نے جو تو لیا طاقت نظر نہ سہی

کعبہ نہیں ہوا کہ کلیسا نہیں ہوا — دل آپ کے طفیل میں کیا کیا نہیں ہوا
اف وہ قمار خانۂ روز ازل کی دھوم — جیتے ہیں وہاں، مگر اچھا نہیں ہوا
اس کی شگفتگی کو تو فصل چاہئے — دل ہے وہ فتنہ جو ابھی برپا نہیں ہوا
تحلیل ہو گیا نگہ آفتاب میں — وہ ذرہ حقیر جو صحرا نہیں ہوا

خار کچھ پھول سے کم اے چمن ایجاد نہیں — کہ خلش دل کے لئے لطف ہے بیداد نہیں
نغمہ و نالہ باندازۂ تاثیر اے دل — ہے ابھی خام وہ آہنگ جو فریاد نہیں
آپ کا گھر جسے انسان کا دل کہتے ہیں — کون کہتا ہے کہ آباد ہے، آباد نہیں
ہم کو کہتے ہیں جو آلودۂ لذت طلبی — کیا وہ آلودۂ صد لذت ایجاد نہیں
گھونگھٹ الٹو کہ تمہیں پوج کے کافر ہو جائے — دلِ بدبخت جو ایمان سے بھی شاد نہیں
پیچ در پیچ ہے زنجیرِ نظامِ صحرا — ایک ذرہ بھی یہاں ذرۂ آزاد نہیں
فارغِ کشمکشِ سود و زیاں ہوں رضوی — عاشقی کیا ہے اگر گنج خداداد نہیں

دلوں کو آ کے دیکھو تو یقیں نہیں گماں ہو تم
لبِ فسانہ ساز پر برائے داستاں ہو تم

غبار بن کے آرزو رواں دواں ہے کو بکو
کہیں سے کچھ صدا تو دو کہاں ہو تم کہاں ہو تم

رہِ درازِ زندگی میں رہرووں کی خیر ہو
کہ ناقہ بد قدم ہے اور شریرِ ساربان ہو تم

جبیں نے کھینچ تو لیا تمہیں ضمیرِ سنگ سے
ہجومِ سجدہ کی قسم مگر ابھی نہاں ہو تم

زبانِ گل و گیاہ کی ہے شکوہ سنج بے دلی
یہی تمہارا باغ ہے اسی کے باغباں ہو تم

ہ چلی بن کے اک بگولا ہجومِ گرد بیاں سے آگے
جو گرد تھی کارواں سے پیچھے وہ بڑھ گئی کارواں سے آگے

ہر شہرِ شوقِ لاابالی چلا کہاں آستاں سے آگے
یہیں ہے اک محشرِ تماشا نہ جانے کیا ہو یہاں سے آگے

ود بے اختیار ہستی خود اپنی قسمت سے بے خبر ہے
کہ منزلِ کارواں ہے اب تک تخیلِ کارواں سے آگے

ارتی رہ گئی حقیقت پڑا رہا جستجو کا صحرا
ٹھہر گئے ہم خدا کی مسجد بنا کے دیرِ بتاں سے آگے

کون مطلق کہاں کہ ہم نے ٹھہر کے منزل پہ بھی یہ دیکھا
کہ گردِ آشفتگی رواں ہے حریمِ آسودگاں سے آگے

نوں کی کون سی بیتابیاں جہاں میں نہیں
وہ ہوک صوتِ جرس میں ہے جو اذاں میں نہیں

زل سے دل میں مشیت کے جیسے رہا ہوگا
وہ راز جو ابھی تقدیرِ رازداں میں نہیں

جب نہیں کہ وہی اک ہو مردِ راہ شناس
ابھی جو رہروِ گم گشتہ کارواں میں نہیں

ہمارے خوف کی خلاقیاں خدا کی پناہ
وہ بجلیاں ہیں نظر میں جو آسماں میں نہیں

لکھا ہوا انہی ذرات کے صحیفوں میں
مرا فسانہ ہے لیکن مری زباں میں نہیں

وچھ مجھ سے کہ کیا ہوا رہِ جستجوئے دراز میں
دلِ پاش پاش کو دیکھ لے جو پڑا ہے کوئے نیاز میں

پرستشوں کی بھی چھیڑ سے ترا شکوہ لب پہ نہ آ سکا
کہ بہت رچی ہوئی گونج ہے یہ سکوتِ سینۂ ساز میں

گئی بس دشت و در ہمہ گیر و محکم و مستتر
وہ خود آگہی جو تڑپ رہی تھی حریمِ ناز و نیاز میں

جلوہ ڈھال بھی ساقیا تجھے فکرِ شیشہ نہیں روا
کہ ہے جان شیشہ لگی ہوئی اسی آبِ شیشہ گداز میں

سانۂ سرِ رہ گذر سرِ حشر مجھ سے نہ پوچھئے
جو گزر گئی سو گزر گئی غمِ دہر و راہِ مجاز میں

انقلاب مگر ہے پھر بہ نصیبِ کوچۂ عاشقاں
کہ میں پڑھ رہا ہوں نئے فسوں تری چشمِ فتنہ طراز میں

ود سے ہے لطیف تر کہیں گم نہ ہو دلِ شہود میں
کہ مشاہدوں سے ہے رنگ ابھی نگہِ مشاہدہ باز میں

نے چند بچ گئے وہ بنے ہیں فتنۂ آرزو
جو پگھل گئے سو پگھل گئے نگہِ کرشمہ گداز میں

گھرا ہی طوفان کی زد میں حرم و دیر و کنشت
ان مزاروں پہ تو مدت سے چراغاں بھی نہیں

کس نے اس انجمنِ شوق کو تاراج کیا
دل گزرگاہِ خیالاتِ پریشاں بھی نہیں

جلوہ آبادِ تصور یہ اداکاریٔ شوق
اب تو مرہونِ فسوں سازیٔ جاناں بھی نہیں

کائنات ابھی ہمیں دے کے بھی فارغ نہیں آپ
ہم تو کچھ مدعیِ وسعتِ داماں بھی نہیں

کب سے میخانے میں رضویؔ نہیں آیا ہے نظر
اس خزاں دوست کو کچھ شرمِ بہاراں بھی نہیں

زہد کی آستین ٹٹول، دیکھ کہاں صنم نہیں
سنگِ سیاہ ناگزیر ورنہ حرم حرم نہیں

محنتِ شوق و خودسری شیوۂ سعیِ ناتمام
مجھ پہ کرم نہ کر کہ میں گدیہ گرِ کرم نہیں

گم بھی تو ہو کہ جستجو لطفِ حیات بن سکے
اہلِ طلب وہ راہ کیا جس میں کہ پیچ و خم نہیں

وجہِ گناہ و کفر و شر وجہِ خرابیٔ نظر
تم کو گماں کہ تم نہیں ہم کو یقیں کہ ہم نہیں

شانۂ فکرِ خردہ گیر! حسن کی یوں رگیں نہ توڑ
تجھ میں مزاج دانیٔ گیسوئے خم بہ خم نہیں

فتنے جگا کے دہر میں آگ لگا کے شہر میں
جا کے الگ کھڑے ہوئے کہنے لگے کہ ہم نہیں

حدیں پھیلیں نظر کی پھر بھی کم بینی نہیں جاتی
کہ ہر صورت ابھی اک آنکھ سے دیکھی نہیں جاتی

زمینِ دل بہت کچھ نرم کر دی بے قراری نے
مگر "ہم ہیں" اسی احساس کی سختی نہیں جاتی

حیاتِ جامہ زیب اور لو یہ نوحہ گر کیا ہے؟
کہ اس برباد ساماں کی تنک رختی نہیں جاتی

مرا ذکرِ وفا لکھ کر مورخ یہ بھی لکھتا ہے
یہ اک رسمِ کہن تھی اب کہیں برتی نہیں جاتی

میں کیا منہ لے کے آؤں آپ کے آئینہ خانے میں
یہ صورت ایسی بگڑی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

تصور سے بھی آگے جستجو کی راہ جاتی ہے
وہاں کی بات لیکن پھر یہاں لائی نہیں جاتی

ہیں یہ اُس در کا پیار بھی ہے، مگر یہ اس گھر کا بار بھی ہے
ادھر کے چکتے نہیں تقاضے، اُدھر سے پیہم پکار بھی ہے

ھا کے پی تھی مئے جوانی غضب تھا شیریں وہ شور بانی
اسی کا دو دن سرور بھی تھا، اسی کا اب تک خمار بھی ہے

راہِ دور و دراز مجھ کو دکھاتی لائی یہی تماشا
قدم قدم اجتماع بھی ہے نفس نفس انتشار بھی ہے

رے ان کے بس اک محبت خدائی کیا بندگی کہاں کی
بہت ہی نازک ہے گو یہ رشتہ مگر یہی استوار بھی ہے

سوزنِ فکر جس نے اک دن یہ رختِ تہذیب سی دیا تھا
اسی کی کاوش سے آج دیکھو یہ پیرہن تار تار بھی ہے

ں فقط باؤلی نگاہیں، ظہور خود ہے خرامِ مستی
سکونِ محمل نشیں کا دشمن یہ ناقۂ بے مہار بھی ہے

رخانے میں مہر و مہ کے بہت بھیانک ہے نقشِ آدم
بلا کا سرکش، ازل کا باغی، مگر یہی شاہکار بھی ہے

دلِ محرم کا دکھ اس چشمِ نامحرم سے نہ پہچانا
یہیں سے بات جب پھوٹی تو اک عالم نے پہچانا

انھیں ہونا تھا رسوا ہو چکے تا حدِّ رسوائی
نہ اُس عالم نے پہچانا نہ اِس عالم نے پہچانا

نگاہِ مہر یکساں سب پہ تھی مبہم سا تیور تھا
یہ ذرے دیکھتے ہی رہ گئے شبنم نے پہچانا

دلِ آدم ہی اک سرچشمۂ رحمت ہے عالم میں
یہ راز آسودگی بھولی ہوئی تھی غم نے پہچانا

یہ کبر و ناز اب کیا جب سرِ بازار تم نکلے
مگر ہاں یہ کہو بہتوں نے دیکھا کم نے پہچانا

ملک محوِ تجلی، مطمئن رمزِ تجلی تھا
کہ یہ مٹی کا پتلا اُٹھ کے بولا "ہم نے پہچانا"

تجھے کس کس طرح اے نقطۂ مایوسیِ بینش
دلِ بیتاب کی بیتابیِ پیہم نے پہچانا

تری غیرت کو آخر کیا ہوا اے نازِ خود بینی
ہے اک غوغا کہ تجھ کو عقلِ نامحرم نے پہچانا

اب اس آئینے سے آئینے روشن ہوتے جاتے ہیں
تمہیں جب دل نے پہچانا تو اک عالم نے پہچانا

جو بیگانۂ طپش ہے وہ رہ شناسِ اثر بھی ہوگی؟
شجر سے جو شاخ کٹ چکی ہے وہ کیا کبھی بار ور بھی ہوگی

کہاں نہیں ہے اب تک تری تجلی ہے اور غیرت
وہ پردہ پوش چمن رہی ہے وہ پردہ دارِ نظر بھی ہوگی

طریقِ آرزو ہے ادھی تم اس پہ کرتے ہو کیا بھروسا
تمہارے جلوے کی جو امیں ہے وہی نظر پردہ در بھی ہوگی

نظر نیستی سے باہر نکل چکی وہ نئی تجلی
یقیں مانو کہ اک نہ اک دن نصیبِ شمس و قمر بھی ہوگی

کریں مجھ سے اہلِ خلوت کہ میں اب اک شعلۂ نوا ہوں
جو لَو چراغِ حرم ہے اب تک وہ مشعلِ رہ گزر بھی ہوگی

مقامات ہیں سفر کے انھیں کوئی کیا بدل سکے گا
جسے پہنچنا ہے ان کے در تک وہ آرزو دربدر بھی ہوگی

رشتۂ سوزِ پاک جاناں دلوں کی پونجی بھی بن سکے گا؟
ازل سے جو رائگاں ہے اب تک وہ ضربِ غم کارگر بھی ہوگی

ایزداں جہاں ہوتا تجلّی لازوال ہوتا
بہت ہی دشوار یہ مہم ہے مگر کسی روز سر بھی ہوگی

میں کچھ نرم و گرم رضوتیں ہمارے دل پر چمک رہا ہیں
ابھی تو گویا سحر ہوئی ہے چڑھے گا دن، دوپہر بھی ہوگی

خرد کو خانۂ دل کا نگہباں کر دیا ہم نے
یہ گھر آباد ہوتا اس کو ویراں کر دیا ہم نے

گھٹے جاتے تھے تم مینائے قلبِ اہلِ خلوت میں
تمہیں جامِ کفِ صحرا نشیناں کر دیا ہم نے

انیسِ خوبچگاں تم تھے، جلیسِ خانگاں تم تھے
مگر تم کو نصیبِ کم نصیباں کر دیا ہم نے

حریمِ ناز سے تم کو چرا لانے کے مجرم ہیں
یہ صحرا تھا اسے بھی کوئے جاناں کر دیا ہم نے

زمینِ خاکستر یک شعلہ و یم آبِ یک گریہ
یہی وہ آب و گل ہے جس کو انساں کر دیا ہم نے


اقبال


بخط اقبال



اقبال کی تحریریں بعض دوسرے اکابر کی تحریروں کی طرح جب مدوّن کر کے پیش کی جاتی ہیں تو کئی بار دیکھنے میں آیا ہے کہ عجلت میں یا خط واضح نہ ہونے کے سبب (یا پڑھنے میں (پوری طرح) نہ آنے کے باعث کچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں۔ اقبال بخطِ اقبال کی پیشکش کا یہی مقصد ہے کہ ہر اسکالر براہ راست اصل تک پہنچ کے خود دیکھ سکے کیا چیز کیا ہے۔ پہلی تحریر مشہور محقق اور ہمارے کرم فرما ایرج افشار کا تحفہ ہے۔ یہ محمود افشار کی کتاب "گفتارِ ادبی" جلد دوم ص ۶۹۶ پر موجود ہے۔ دوسری تحریر پاکستان کے درجۂ اول کے پرچے طلوعِ افکار سے ماخوذ ہے اور تیسری کتاب نمائش۔ آخر الذکر کی اصل خدا بخش میں محفوظ ہے ———— • ادارہ

دکتر محمد اقبال لاهوری

در سال ۱۳۱۴ هـ ش (۱۹۳۶م) که به بمبئی و (اگره) رفته
قصد رفتن به لاهور نیز داشتم کـه دکتر محمد اقبال لاهوری
فارسی زبان هندی را که در آنجا سکونت داشت به بینم، ولی
نشدم. بوسیله دکتر محمد اسحاق استادزبان فارسی دانشگاه
ه کتباً بهم معرفی شده بـودیم. نامـه‌ای با انگلیسی بـمن
ته، دعوتم کرده وکتاب (پیام مشرق) حاوی اشعار خودرا برای
فرستاده بود. با اظهار تشکر اشعار زیر راگفتم و فرستادم،
نامه او که بخط خودش میباشد، بواسطه شخصیت مهم ادبی،
اعی و سیاسی وی کلیشه میشود. تعجب نکنید که به‌انگلیسی
ته با اینکه به‌فارسی شعر میگفته است. نامـه‌های پرفسور
اق هم تمام به‌انگلیسی میباشد. عجب‌تر آنکه پرفسور براون
یسی با من به‌فارسی مکاتبـه میکرد. یك نامه او هم بـرای
ظه خط و انشای‌فارسی وی کلیشه میشود. اسحاق و اقبال،
هنـدی و دیگری پاکستانـی، از کشورهـای «استعمارزده»
شند وبراون از یك‌کشور آزاد. اینست نشانه‌آزادی واسارت.

شه داشتم چو ز هندوستان روم
سوغاتی سفر چه بر دوستان برم
ال) روی کرد و فراز آمد از درم
گلهای نوظهور که زی بوستان برم.
سرا شوند همه بلبلان پارس
زین نغز چامه‌ها که ز هندوستان برم.

ترجمه نامه دکتر محمد اقبال پاکستانی

ریه ۳۶

دکتر افشار عزیزم

هم‌اکنون نامه‌ای از آقای اسحاق از کلکته دریافت کردم مشعر
نکه شما برای گردش هندوستان در بمبئی هستید. بـرای
ه‌جوئی در وقت بجای اینکه توسط ایشان به شما بنـویسم،
میخواهم که مستقیماً این نامه را بنویسم. لازم بـه‌گفتن

نیست که من مسرور از ملاقات شما خواهم بود وقتی که از لاهور میگذرید. خواهشمندم بمن اطلاع دهید کی خواهید آمد. نظر باینکه من بزودی بایدبه (بهپال) بروم خیلی مایل هستم‌که تاریخ تقریبی مسافرت شما را به‌لاهور بدانم.

مخلص صمیمی شما محمد اقبال

Sir Mohd Iqbal, Kt.
M.A., Ph.D. LL.D.
Barrister-at-Law

Lah[ore]

Dated

24th Jan. 1936

Dr. Afschar,

I have just received a letter from M. Ishaque Calcutta intimating that you are in Bombay on a visit to India. Instead of writing to you through him I take the liberty of doing so direct in order to save time. It is hardly necessary for me to say that I shall be delighted to meet you when you pass through Lahore. Please do let me know when you will be coming. As I shall have to go to Bhopal soon I should like very much to know the approx date of your visit to Lahore.

Yours sincerely
Mohammad Iqbal

(بشکریہ ایرج افشار، تہران)

تنہائی

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موج بیتابی – ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلی داری ؟
ہزار لؤلؤی لالاست در گریبانت – درون سینہ چو من گوہر دلی داری ؟
تپید و از لب ساحل رمید و ہیچ نگفت

بہ کوہ رفتم و پرسیدم این چہ بیدردی است – رسد بگوش تو آہ و فغان غم زدہ ؟
اگر بسنگ تو لعلی ز قطرۂ خون است – یکی در آ بسخن با من ستم زدہ
بخود خزید و نفس در کشید و ہیچ نگفت

رہ دراز بریدم ز ماہ پرسیدم – سفر نصیب ! نصیب تو منزلی است کہ نیست ؟
جہان ز پرتو سیمای تو سمن زار است – فروغ داغ تو از جلوۂ دلی است کہ نیست ؟
سوی ستارہ رقیبانہ دید و ہیچ نگفت

شدم بحضرت یزدان گذشتم از مہ و مہر – کہ در جہان تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہان تہی ز دل و مشت خاک من ہمہ دل – چمن خوش است ولی در خور نوایم نیست
تبسمی بلب او رسید و ہیچ نگفت

محمد اقبال

طلوع افکار (نومبر ۱۹۹۰) کے شکریہ کے ساتھ

Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M.A., Ph.D. LL.D.
Barrister-at-Law

Lahore

Dated ______ 193

20th Dec. 1934

My dear Lady Imam,

Here are a few verses. You can select one of the passages.

Yours sincerely
Muhammad Iqbal

(۱)

برون زین گنبد در بسته پیدا کرده ام راہے
کہ از اندیشہ برتر می پرد آہ سحرگاہے
[illegible]
ز منزل دل نمیرد گرچہ باشد منزل ماہے!

(۲)

دل فرمانروا بر جسم و جان است
[illegible]
چو عالم گر یک جہان گم شد ز چشمم
ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است!

(۳)

نگردد زندگانی خستہ از کار جہانگیری
جہانے در گرہ بستم جہان دیگرے پیش است!

(۴)

[illegible]

(۵)

[illegible]

(۶)

[illegible]

محمد اقبال

شائستہ خان (کتاب نما نومبر ۱۹۸۹ء) کے شکریے کے ساتھ

ابوالکلام آزاد

- تقدیم اول ـــــــــ محمود واجد
- تقدیم ثانی ـــــــــ پروفیسر وہاب اشرفی
- خطوطِ آزاد بخط آزاد بنام زکریا بھاگلپوری
  ـــــــــ ابوالکلام آزاد
- زکریا بھاگل پوری کے بارے میں
  ـــــــــ جناب محمود واجد
- کچھ اپنے کچھ مولانا آزاد کے بارے میں
  ـــــــــ زکریا بھاگلپوری
- دارالارشاد (کلکتہ) میں مولانا آزاد کا درس قرآن
  ـــــــــ زکریا بھاگلپوری



اقبال کی طرح آزاد بھی ہماری متاع گراں بہا ہیں۔ آزاد کے یہ خطوط حال ہی م
خدا بخش کے ذخیرہ میں اضافہ ہوئے ہیں۔ پہلے ملک زکریا بھاگلپوری صاحب نے محمود
صاحب کو دیئے، انھوں نے کسی اور کو، کسی اور نے کسی اور کو؛ اور بالآخر وہاب اشرف
نے بکمال عنایت خدا بخش کو! محمود واجد صاحب اور وہاب اشرفی صاحب نے ان خ
مکتوب نگار کا سیر حاصل تعارف کرایا ہے۔ محمود صاحب نے مزید ایک تحفہ زکریا جا
کے مترجمہ درس قرآن کے نوٹس بھی عنایت کیے ہیں جو ترجمان القرآن کے نقش اول کے
دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ یہ خطوط ہمارے کرم فرما ابو سلمان شاہجہاں پوری نے کرا چ
شائع کر دیے ہیں۔ اس ترتیب کا ابتدائی مسودہ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۱ء کے عرصہ میں تیار ہ
مراحل سے گزرا، اس کے بعض حصے ہند و پاک کے چند ادبی رسائل میں بھی آئے اور اب تیس
سال بعد مکمل شکل میں شائع ہونے کی نوبت آئی ہے۔ ہمارے ایڈیشن میں کچھ تعارف
کی بیشی کے ساتھ ایک اہم اضافہ یہ کر دیا گیا ہے کہ اصل خط بھی عکساً پیش کر دیے گئے

ادارہ ————

تقدیمِ اوّل

محمود واجد



یہ خطوط زیادہ تر ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء کے درمیانی وقفہ کے ہیں۔ چند خطوط اس کے بعد کے ہیں مگر ان کی حیثیت ویسی تاریخی نہیں جیسی اس محدود وقت کی جسے میں نے ان خطوط کی مدد سے متعین کیا ہے۔ تاریخ کے ساتھ سال سبھی خطوط میں درج نہیں۔ اس لیے سلسلہ وار ان کی ترتیب ممکن نہ تھی مگر لفافہ پر ڈاک کی مہر سے کہیں کہیں تاریخیں ملیں اور کہیں ایک آدھ تفصیل اور اس سلسلہ کی [illegible] مثلاً جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے دستخط سنسر کی تاریخ وغیرہ۔ لیجیے جو کچھ ہے حاضر ہے۔ مسٹر صاحب کے قول کے مطابق خطوط کا ایک ذخیرہ مسٹر احمد محمد نور سابق وزیر حکومت بہار مطالعہ کے لیے لے گئے مگر واپس نہیں کیا

تقدیم ثانی

پروفیسر وہاب اشرفی
شعبۂ اردو
رانچی یونیورسٹی، رانچی



اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد کے ان مکاتیب کا مطالعہ مقصود ہے - ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں - یہ وہ خطوط ہیں جو مولانا آزاد نے رانچی سے اپنی نظر بندی کے زمانے میں مولوی محمد ابراہیم زکریا متوطن بھاگلپور کے نام لکھے ہیں یہ تعداد میں ۲۴ ہیں۔ ۱۹ خطوط ملفوف بھیجے گئے ہیں اور ۵ پوسٹ کارڈ ہیں - ان خطوط کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ ان سے مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گہری روشنی پڑتی ہے' ان کی دردمندی اور دلسوزی' غریب پروری' نکتہ سنجی' علمی و دینی شغف' اور اس معاملے میں کچھ کر گذرنے کی حکمت عملی' تدبر اور متعینہ فکر' یہ سارے امور رانچی اور اس کے نواح سے متعلق مولانا کی مختلف علمی و دینی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے سے سامنے آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولوی محمد ذکریا کو مولانا آزاد بہت عزیز رکھتے تھے - ان کی علمی حیثیت سے آگاہ تھے - ان کی تنگ دستی سے ملول اور ان کی خدمت کرنے اور ان سے خدمت لینے کے باب میں خاصے متفکر تھے۔ مولانا مولوی زکریا کے نام ایک خط میں چھوٹا ناگپور خصوصاً رانچی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"... چھوٹا ناگپور ڈویژن ایک وسیع خطہ ہے لیکن علم و ہدایت سے یکسر محروم' چونکہ ایک گوشے میں واقع ہے۔ اس لیے علما کی آمد و رفت بھی کمتر ہوئی اور جہل و افلاس نے اور زیادہ حالت خراب کر دی اب ادھر دو سال کے میرے قیام سے حالات متغیر ہوئے ہیں اور اللہ نے جس قدر توفیق دی دعوت و تبلیغ کا فرض ادا کرتا رہا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ... غیر مترقبہ زندگی پیدا ہو گئی اور لوگوں نے اپنی حالت کو محسوس کیا' اب شدید ضرورت یہاں اس کی ہے کہ ایک عالم صالح مستقل طور پر قیام کرے اور جو تبدیلی ہوئی ہے وہ آئندہ ضائع نہ جائے۔ اگر ایک شخص نے یہاں قیام کیا تو پورے خطے کی دینی پیشوائی و ریاست اسی کے ہاتھ میں رہے گی اور بالاطمینان مسلمانوں کے ایک گروہ عظیم کی ہدایت و ارشاد میں مشغول رہے گا۔ دوسرے مقامات میں علماء سو کی کثرت اور دواعیٔ فساد و جہل کی مقاومت سے ہدایت و اصلاح کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے اور کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا' یہاں

یہ بات بالکل نہیں ہے اور ابتدا سے بنیاد وصالح پڑ چکی ہے اور اب جتنی عمارت بنائی جائے اور جیسی بنائی جا سکتی ہے۔

"پس ہدایت و دعوت کے عمومی پہلو سے تو ایک گروہ عظیم اتباع و اعتقاد کے لیے موجود ہے بلا شرکت غیرے۔"

واضح رہے کہ مولانا آزاد کی نظر مولوی محمد زکریا پر تھی چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "آپ کمر ہمت چست باندھیں اور عزم راسخ کر کے اس زندگی کے لیے طیار ہو جائیں آپ کے لیے بہترین موقع حاصل ہے" بہرطور اہالیان رانچی اور نواح کی تعلیمی ضرورتوں کے تحت مولانا نے ۱۵ اگست ۱۹۱۷ء کو انجمن اسلامیہ رانچی کی بنیاد ڈالی اور اس جدوجہد میں البلاغ پریس کی تمام رقم صرف کر دی۔ مولانا نے اسی انجمن کے ذریعہ بہت کچھ کرنا چاہا تھا۔ ایک مثالی مدرسے کا قیام وقت کی ضرورت تھی ان کے پیش نظر ایک غیر معمولی نصاب کا خاکہ بھی تھا مولانا کیا سوچ رہے تھے، دیکھیے:

"اب رہی دوسری چیز یعنی مسئلۂ درس و تدریس تو اس کا حال یہ ہے کہ جب انجمن اسلامیہ کی یہاں بنیاد ڈالی اور مدرسے کا خیال ہوا تو سوچا کہ اپنی قوت کو چھوٹے چھوٹے مقصدوں پر خرچ کرنا بہتر نہیں۔ آج برسوں سے اصلاح نصاب کا مسئلہ مصر و ہند میں درپیش ہے اور عملاً طے نہیں ہوتا اگر یہاں ایک کالج قائم ہو جائے اور اولین تجربہ پیش نظر نصاب اصلاح یافتہ کا کیا جائے تو یہ ایک عظیم الشان کام ہوگا۔"

مولانا آزاد سے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے اصلاح نصاب کے سلسلے میں ڈائرکٹر تعلیم بنگال نے رجوع کیا تھا مولانا نے ایک جامع نصاب مرتب کیا تھا اس کی تفصیل وہ یوں درج کرتے ہیں:

"مدرسہ کا نصاب جونیئر اور سینیئر دو درجوں میں منقسم اور پوری مدت تعلیم چودہ سال ہے پہلا درجہ آٹھ سال کا ہے اس میں صرف و نحو عربی بالکل ختم، ادب شروع، فارسی مکمل ختم، حساب و ہندسہ ختم، ترجمۃ القرآن کامل، تاریخ ہند، تاریخ اسلام ۔۔۔ اور انگریزی ادب ہے، دوسرا درجہ چھ سال کا ہے اور تکمیل ادب مع نحو و اسلوب قدما، علوم القرآن، علوم حدیث، فقہ حنفی، فقہ جامع، اصول، توحید، علم اسرار الدین، علم اخلاق تاریخ اسلام، تاریخ علوم عربیہ، تاریخ مذاہب طوائف اسلامیہ، معقولات قدیم ۔۔۔ اور انگریزی علم ادب ہے اس کے بعد درجہ تکمیل کے دو سال کسی ایک فن یا صرف انگریزی کا ہیں۔"

مولانا اس نصاب کو صرف رانچی یا کلکتے کے مدرسے میں رائج نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کے سامنے پورا ہندستان اور مسلمان معاشرہ تھا، وہ چاہتے تھے کہ ایسا نصاب مرتب ہو کر تمام علاقے میں مقبول ہو جائے، وہ اس کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتے ہیں: "اب چونکہ یہ مدرسہ مسئلۂ اصلاح تعلیم اسلامی پر مبنی ہے اس لیے صرف رانچی کا مقامی مسئلہ نہیں بلکہ تمام ہندوستان کا مسئلہ ہے"۔ افسوس اس کا ہے کہ مولانا کی قائم کردہ انجمن اور مدرسہ اسلامیہ زندہ تو ہیں

لیکن آب و تاب سے خالی ان کے نام پر انجمن ہی کی عمارت میں ایک کالج بھی ہے لیکن بے روح۔ مولانا کا مرتب کردہ نصاب موصوف کے خط کی زینت ہے اور بس! انجمن کے قیام کے بعد مولانا ایک وسیع پیمانے کی کانفرنس بھی کرنا چاہتے تھے جس کے لیے اشتہارات، دعوت نامے، پوسٹر بڑی لگن اور محنت کے ساتھ تیار کیے تھے۔ اس ضمن میں ان کی بھاگ دوڑ، محنت اور کاوش کا اندازہ لگائیے۔ زکریا صاحب کو لکھتے ہیں:

"۱۔ جلسہ کے دعوتی خطوط اردو، انگریزی کارڈ، چسپاں کرنے کے پوسٹر رجسٹرڈ بھیجے جاتے ہیں۔ ۲۔ بھاگلپور میں جو لوگ ان چیزوں سے ذوق رکھنے والے ہوں ان کے نام حسب حال یا کارڈ یا خطوط پر لکھ کر بالمشافہ تقسیم کیجیے اور از جانب انجمن ترغیب شرکت جلسہ۔ اور اس امر پر زور دیجیے کہ یہ محض مقامی جلسہ نہیں بلکہ صوبے کا ایک عام تعلیمی اجتماع ہے... پوسٹر شہر کی مساجد و نمایاں مقامات پر چسپاں کرا دیے جائیں، ۳۔ اس کے بعد فوراً بانکی پور جائیے اور مسٹر مظہر الحق اور ڈاکٹر محمود بیرسٹرایٹ لا سے ملیے... بانکی پور کے علاوہ دیگر مقامات کے نام بھی ان سے دریافت کیجیے... ۴۔ وہاں سے آپ گیا اور آرہ بھی جا سکتے ہیں، نیز مظفر پور اور مونگیر وغیرہ... مظفر پور میں مولوی ریاض احسن صاحب رئیس شہر ہیں ان سے مدد ملے گی ۵۔ ہر مقام پر گروہ علماء و تعلیم یافتہ دونوں کو دعوت دینی چاہیے۔ علماء پر ظاہر کرنا چاہیے کہ مدرسہ انگریزی و عربی ہے اور آخری درجہ تعلیم تکمیل نصاب علوم دین پر مبنی ہے... یہ اجتماع صوبۂ بہار کی تعلیمی اصلاح و ترقی کا اجتماع ہے اور ستم ہے اگر خود اسی صوبے کے علماء و اصحاب رائے اس میں حصہ نہ لیں... اس جلسے میں صوبہ بہار کے واعظ و مقررین کی خاص ضرورت ہے، یہ جلسہ تین دن تک ہوگا..."

گویا اپنی تعلیمی اسکیم کے نفاذ سے پہلے مولانا آزاد اپنے موقف کو بہار کے ذی علم حلقوں پر واضح کرنا چاہتے تھے اور ان کی رائے جاننے کے لیے بے تاب تھے: ان کی خواہش تھی کہ خواص ان کے مرتب کردہ نظام نصاب پر تنقید و تبصرہ کریں تاکہ ان کی روشنی میں وہ ایک واضح تعلیمی مشن پورے ہی صوبے میں رائج کر سکیں، یہ کانفرنس تو ضرور منعقد ہوئی ہوگی لیکن اس کے نتائج کیا نکلے؟ کچھ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا قدیم اہالیان رانچی متعلقہ کانفرنس کے بارے میں کوئی روشنی نہیں دیتے اس ضمن میں میری تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ بہر طور یہ تو وہ باتیں ہیں جن کا تعلق مولانا کے اسی خواب سے ہے جو انھوں نے چھوٹا ناگپور کو زیور علم سے آراستہ کرنے کے بارے میں دیکھا تھا، یہ تو سچ ہے کہ ان کا خواب کلی طور پر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ لیکن رانچی میں آج بھی جتنی کچھ ملی سرگرمیاں ہیں دراصل ان کی بنیاد کی عقبی زمین میں مولانا کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔

خیر یہ تو وہ امور ہیں جن کا تعلق چھوٹا ناگپور یا رانچی سے ہے مولوی زکریا صاحب کے نام دوسرے خطوط میں چند اور بھی پہلو ہیں جو ہماری توجہ کے مستحق ہیں ایک خط میں مولانا نے علما یا ذی علم افراد کے عمومی شغف پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

"... آپ کے لیے بہترین زندگی علمی زندگی ہے اور اس شکل وطرز کی جس کا نمونہ سلف صالح کے حالات میں ملتا ہے علمائے اسلام کے حالات پڑھیے، درس وتدریس، وعظ وارشاد اور تصنیف وتالیف تینوں چیزوں کو بیک وقت کرتے تھے اور اس طرح ایک ہی زندگی بیک وقت تین عظیم الشان خدمت انجام دیتی تھی، عوام کی اصلاح، وعظ وتذکرے، مستقبل کے لیے طیاری درس وتدریس سے اور علم ومذہب کی خدمت دائمی تصنیف وتالیف سے ابن جوزی مصنف مستنصریہ کے صدر مدرس ہیں اور جامعہ رصافہ کے واعظ غزالی مدرسۂ طوس کے معلم، سو کتابوں کے مصنف اور جامع طوس کے واعظ علمائے اسلام کی زندگی کے لیے تو یہ چیز طبیعت ثانیہ ہو گئی تھی۔ ایک شخص آپ کو نہیں ملے گا جو اپنی زندگی میں یہ تینوں مشغلے نہ رکھتا ہو..."

بعض لوگ بعض شہروں یا مقاموں کے بارے میں یہ شکایت کرتے ہیں کہ تصنیف وتالیف کے لحاظ سے وہ بنجر ہیں لائبریریوں اور کتابوں کے فقدان کا رونا بار بار رویا جاتا ہے اس طرح گویا وہ بہانہ جوئی سے کام لے کر تساہل کا شکار ہو جاتے ہیں اور تصنیف وتالیف کی طرف سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ مولانا آزاد کے سامنے یہ عذر بے سود ثابت ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں:

"آخری چیز مشغلۂ تصنیف وتالیف ہے اور یہ بہت ضروری بھی ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ بلحاظ مقام کے بجنور (کذا) اور رانچی اور دیگر مقامات سب یکساں ہیں ہندستان میں اسکے اسباب وسامان کا بطرز یورپ کہاں سامان ہے؟"

حالانکہ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ علمی، ادبی کاموں کے لیے بعض جگہیں بعض جگہوں پر فوقیت رکھتی ہیں مثلاً یہ کہ اردو، عربی و فارسی کے کسی موضوع پر کچھ لکھنے کے لیے رانچی سے بہتر جگہ عظیم آباد ہوگی پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ رانچی کے لوگ محض اس بنا پر تصنیف وتالیف سے باز آجائیں گے مولانا کا مقصود یہ ہے کہ تمام تر نامساعد حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے شرط یہ ہے کہ کام کرنے کی لگن ہو ورنہ تن آسانی تو بہانے ڈھونڈھنے پر اصرار کرتی ہی ہے۔

بہر حال مولوی زکریا کے نام کچھ ایسے بھی خطوط ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بعض نکات معلومات عامہ کے سلسلے میں مولانا سے رجوع کرتے تھے، ایک خط میں جواباً وہ نکتہ وار اس طرح لکھتے ہیں:

"۱۔ اکبر کا ان پڑھ ہونا کوئی غلط فہمی نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ ہے، کچھ ضروری نہیں کہ اسے تعلیم یافتہ ثابت کیا جائے اس کی فطری ذہانت اور ترقی استعداد کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ باوجود ان پڑھ ہونے کے ملک داری کی حکمت وسیاست کی سب سے بہتر مثال قائم کر گیا۔"

۲۔ جنوبی اور وسطی امریکہ کے آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایک زمانے میں اس کا تعلق قدیم براعظموں سے رہ چکا ہے لیکن جہاں تک تاریخی وثائق کا تعلق ہے ... نہیں کہا جا سکتا کہ کولمبس سے پہلے کسی سیاح نے اسے دریافت کیا ہو ... دو عرب بھائیوں کی داستان ضرور بیان کی گئی ہے کہ ... امریکہ پہنچ گئے تھے لیکن یہ محض قیاسی ہے۔

۳۔ ریڈ انڈین کا اطلاق امریکہ کی وطنی اقوام پر کیا گیا ہے اور ان کی تاریخ اس وقت تک تاریکی میں ہے۔"

۴۔ مذہب کا مقصود انسان کی روحانی سعادت و نجات اور ایک خالق کائنات کے رشتۂ عبودیت سے تمام افراد انسانی کو باہمدگر متحد کر دینا ہے۔"

ان چار جوابات میں تین کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن چوتھا جواب مذہب کے مقصد سے متعلق ہے۔ مولانا نے چند لفظوں میں مذہب کی غایت سمجھا دی ہے، مذہب افتراق کا نام نہیں ہے، نہ ہی افراد کو ٹولیوں میں تقسیم کرنا اس کا مدعا ہے، افراد انسانی کو باہمدگر متحد کرنا اس کا مقصود اعظم ہے، یہ وہ تصور ہے جس نے مولانا کو ہمیشہ مذہبی تنگ نظری اور فرقہ پرستی سے دور رکھا اور نئے ہندستان میں قومی اتحاد کی مشعل کو بلند کرنے میں ان کا جو رول رہا ہے وہ ان کے تصور مقصد مذہب پر دال ہے۔

جی تو یہ چاہتا ہے کہ مولانا کے تمام غیر مطبوعہ خطوط کا تعارف کراؤں خصوصاً جن سے مولوی ذکریا سے ان کے بے پایاں خلوص کا پتہ ملتا ہے، اکثر خطوط میں ان کی دل دہی کی گئی ہے، مختلف طریقوں سے ان کی اعانت کا حال معلوم ہوتا ہے خصوصاً ان کی علالت کے دنوں مولانا کی پریشانی، علاج کے لیے پیسے فراہم کرنا۔ لیکن یہاں اس کا موقع نہیں کہ سارے خطوط یا ان کے اقتباس درج کیے جائیں ہاں ایک قدرے تفصیلی خط توجہ طلب ہے کہ اس سے مولوی ذکریا کی غیر معمولی نفسی کیفیت کا حال بھی روشن ہوتا ہے اور اسی تعلق سے مولانا آزاد کے دل کے نہاں خانے میں بھی جھانکا جا سکتا ہے مسئلہ ذکریا صاحب کے بوڑھاپے کے عشق کا ہے، اس وقت جب کہ ان کی شریک حیات بقید حیات ہیں، اولاد کی کثرت ہے اور مفلسی دامن گیر ہے۔ ذکریا صاحب بڑی معصومیت اور صفائی سے اپنے ہمدرد اور رازداں مولانا ابوالکلام آزاد سے اپنے دل کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں اور عقد ثانی کے بارے میں مشورہ کے طالب ہیں مولانا کا جواب نہایت دلچسپ، مدلل ہے اور خود ان کی ازدواجی زندگی کا آئینہ ہے اس لیے انتہائی اہم اور قیمتی ہے۔ ملاحظہ ہو مولانا کس طرح جواب دیتے ہیں: "پس اصلی و حقیقی اور ایمانی و احسانی راہ تو یہی ہے کہ اللہ سے دل لگائیے .. اگر آپ کی جانب سے عزم ہوا تو توفیق الٰہی ضرور مساعد ہوگی اور ان شاء اللہ ایک جہاد اکبر کا اجر عند اللہ۔ غور کیجیے متاہل ہیں مجرد نہیں پھر صاحب اولاد اور حقوق اہل و عیال کی کشاکش سے درماندہ کوئی ضرورت شرعی و اخلاقی ازدواج ثانی کی

باعث نہیں۔ پھر ایک طرف افلاس و معیشت کی بے سر و سامانی دوسری طرف عوائم و معالی امور و عمل کا ولولہ ان حالات میں اگر یہ معاملہ انجام پایا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ بلاشبہ ابتدا میں مسرت حصول مطلوب کا ہیجان تمام محسوسات پر غالب آجائیگا لیکن بہت تھوڑی دیر کے لیے اس کے بعد قدرتی کشاکش و کشمکش مشکلات و صعوبات کا سلسلہ شروع ہوگا اور جیسا کہ اکثر حالتوں میں ہوا ہے عجب نہیں کہ خود اس معاملے سے دل برداشتہ ہو جائے۔ یہ کشمکش زندگی کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے' ابھی ایک لمحہ کے لیے اس کا احساس نہیں ہو سکتا یہ عام قاعدہ ہے لیکن جب حالت پیش آئے گی تو کوئی علاج سودمند نہ ہوگا سب سے زیادہ یہ کہ پوری امانت داری کے ساتھ خود اس شخص کے مصالح پر غور کرنا چاہیے جس کی محبت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے' وہ ایک معصوم لڑکی ہے' دنیا اور دنیا کے مصائب سے بے خبر کیا یہ بہتر ہوگا کہ اس کو ایک ایسی زندگی میں لایا جائے جس کے مصائب و مشکلات کا ہم کو ابھی سے علم ہے؟ اور ہم جانتے ہیں کہ عیش و آرام حیات اس کے لیے مہیا نہ کر سکیں گے۔ پھر اپنی بیوی کا خیال کیجیے' جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کو کوئی شکایت نہیں کیا محبت و وفا کا یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ بلا وجہ اسکی تمام بقیہ زندگی تلخ کر دی جائے۔

"میری شادی کو دس سال ہو گئے یقین کیجیے میرے لیے ایک نہیں متعدد وجوہ و لواعت شرعاً و عقلاً ایسے موجود ہیں کہ اگر ان میں سے ایک باعث بھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہوتا تو وہ دوسرا نکاح کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتا' بایں ہمہ میں نے ایک صبح و شام کے لیے بھی اس کا قصد نہیں کیا اور نہ کروں گا' پھر ساتھ ہی دونوں کی جانب سے اس کے بارے میں اس قدر مجبور کن ترغیبات پیش آتی رہیں کہ عزم کا باقی رہنا بہت مشکل تھا تاہم میری رائے میں تزلزل نہ ہوا۔"

صداقت حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کر سکتے تو پھر نہ دنیا میں محبت ہے نہ سچائی اور نہ انسان۔

"آپ کہیں گے دل کسی کے بس میں نہیں؟ ہاں لیکن جو چاہیے اس کے بس میں ہے ۔ ۔ ۔ (۲) لیکن اگر ضعف عزم ساتھ نہ دے ۔ ۔ ۔ اس کے والدین کو راضی کر کے نکاح کر لیجیے ۔ ۔ ۔ یہ بات پھر بھی ہزار درجہ موجودہ اضطراب نفس سے بہتر ہوگی۔"

کیا اب اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے کی تحلیل کی جائے؟ ہاں اسی خط کی روشنی میں مولانا کی اپنی زندگی کے بارے میں بہت سارے نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔

●●

(۱)

(۱۹۱۵ء کلکتہ)[1]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

یہ آپ نے بہرحال اچھا کیا کہ بارکپور کے تعلق سے دست بردار ہو گئے۔ حالات معلومہ کے ساتھ وہاں کا قیام بے سود تھا۔ اب آپ چند دنوں توقف کیجیے کہ میں مطمئن ہو کر اپنے کاموں سے فارغ ہوں اور اس معاملہ کو مجھ پر چھوڑ دیجیے میں بوقت مناسب آپ کو بلا لوں گا۔

فقیر ابوالکلام

۲، شوال

جواب کے لیے جوابی خطوط کی ضرورت نہیں۔ آئندہ اس سے احتراز کیجیے۔

۱۔ ڈاک کی مہر سے سن اور جگہ کا تعین کیا گیا (م۔د)

(۲)

۱۹۱۵ء کلکتہ

السلام علیکم و نفعنا اللہ وایاکم لما یحبہ و یرضاہ

افسوس ہے کہ آپ آئے اور ملاقات نہیں ہوئی جہاں تک فقیر کو یاد ہے اس اثنا میں آپ کے آنے کی بالکل اطلاع نہیں ملی غالباً عدم موجودگی میں آپ آئے ہوں گے۔

دارالارشاد کا افتتاح بوجوہ ابتک معرض تاخیر میں ہے اور نظر بہ حالات غالباً بعد رمضان سلسلۂ درس شروع ہو سکے۔

آپ کے متعلق فقیر نے غور کیا ہے چاہتا ہوں کہ کوئی صورت کلکتہ میں قیام کی پیدا ہو لیکن میرا حال یہ ہے کہ ایک فکر و دماغ اور صدہا معاملات سامنے ہیں بہرحال جب طلب صادق اور فکر مستقیم ہے تو امید ہے کہ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ سر دست تو چندے وہاں قیام ناگزیر ہے تا آنکہ یہاں کوئی صورت قرار پائے۔ فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

(۳)

عزیزی السلام علیکم

خط پہنچا اللہ تعالیٰ پریشانیوں سے نجات دے اور طمانیۂ خاطر کا سامان مہیا فرمائے۔ جو کچھ میرے امکان میں ہے اس کے لیے کسی یاددہانی کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ جونہی کوئی مناسب موقع ملے گا آپ کو اطلاع دوں گا۔ بالفعل صورت حال ایسی نہیں ہے کہ آپ کو آنے کے لیے لکھوں۔ فقیر ابوالکلام کلکتہ

(۴)

۲۶ ۱۹۳۰ء دہلی

عزیزی خط پہنچا۔ ترجمان القرآن کے لیے منیجر صاحب کو کہہ دیا ہے۔ غالباً مل گیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فہم و مطالعہ قرآن کی توفیق عطا فرمائے۔ میں ضرور آپ کے لیے کوئی راہ نکالتا بشرطیکہ بحالت موجودہ اس کی صورتیں موجود ہوتیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ بالفعل کوئی ایسا کام میرے ہاتھ میں نہیں۔ اگر آپ کو بلاؤں تو کون سا کام سپرد کروں؟ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا سامان کر دیا کہ آپ کے لیے موزوں صورت نکل سکی تو یقین رکھیے میری جانب سے کوتاہی نہ ہوگی۔ والسلام علیکم ابوالکلام

(۵)

عزیزی بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی کہ آرڈر کی تعمیل کی گنجائش ہے۔ کتاب اسی لیے چھپی ہے کہ جو خواہشمند

ہوں منگوائیں۔ کتاب مینیجر دفتر ترجمان القرآن عنہ دریا گنج دہلی سے مل سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات کو دور کرے اور بہتر سروسامان فراہم فرمائے۔ والسلام علیکم۔ فقیر ابوالکلام ۵ ۴۴ء دہلی

(۶)

عزیزی السلام علیکم صبحکم اللہ بالخیر

کل میں رکھشا کے لیے کہنا بھول گیا۔ یا تو خود یا بذریعہ موذن وغیرہ اس کا انتظام کیجیے کہ آج رکھشا ٹھیک گیارہ بجے یہاں پہنچ جائے۔ ابوالکلام

(۷)

عزیزی اپنے رقعہ میں جس امر کی نسبت لکھا ہے دراصل اس کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔ آج شام کو حاجی رفاقت حسین صاحب سے گفتگو ہوگی۔ انشاء اللہ کل حسب مرضی معاملہ صاف ہو جائے گا۔ حاجی صاحب کا بھی یہ مقصد نہ تھا وہ آپ کی مخلصانہ خدمات انجمن کے پوری طرح معترف اور قدر دان ہیں۔ اصل معاملہ سے وہ بے خبر تھے اس لیے ان کو غلط فہمی ہوئی۔ مولوی قاسم صاحب وطن میں تھے۔ ان کا نام بل میں دیکھ کر وہ اصل حقیقت نہ سمجھ سکے۔ قطع نظر اس کے آپ کا تعلق تو مجھ سے ہے پس آپ کو اس قسم کے امور سے دلگرفتہ نہ ہونا چاہیے۔

افسوس کہ اسوقت مسجد سے آتے ہی میرے سر میں کل کی طرح سخت درد شروع ہو گیا ہے۔ ارادہ کرتا ہوں کہ کھانا نہ کھاؤں اور جلد نماز عشاء سے فارغ ہو کر سو جاؤں۔ آپ کا سبق انشاء اللہ کل بعد نماز جمعہ ہو جائیگا اور پھر شام کو اس طرح آئندہ ناغہ ہونے نہ دوں گا۔

(۸)

باسمہ تعالیٰ صدیقی العزیز السلام علیکم

تبریک عید کے لیے ممنون ہوں۔ آپ سے غافل نہیں۔ کئی کوششیں کی ہیں۔ اللہ نتیجہ خیز ثابت کرے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کا میں خود بھی ممبر ہوں اور مجھ کو معلوم ہے کہ وہاں کوئی کام نہیں۔ سہروردی کو لکھنا بے سود ہے۔
فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ رانچی ۸ شوال ۳۴ھ

(۹)

باسمہ تعالیٰ عزیزی و صدیقی السلام علیکم

آپ کے لیے ایک صورت نکلی ہے۔ کلکتہ میں اسلامی یتیم خانہ ہے اس میں بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم

کے لیے میں روپیہ کی ایک جگہ ہے وہ آج کل خالی ہے میں نے سکریٹری کو کہ کر آپ کے لیے گنجائش نکالی ہے
اور بیس کی جگہ پچیس منظور کرایا ہے۔ مکان بھی رہنے کو مفت ملے گا۔ بقیہ وقت میں اور اشغال جاری رکھ
سکتے ہیں۔ اگرچہ اس جگہ کے لیے انگریزی کی شرط نہیں ہے لیکن مجھ کو ایسا یاد پڑتا ہے کہ آپ نے انگریزی بھی پڑھی
ہے چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا منتظمین یتیم خانہ مذہبی اعتقادات میں ناواقف ہیں اور حنفیت کے عاشق، سابق معلم
کو اس جرم میں نکالا گیا کہ وہ مولود اور قیام کے مخالف تھے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ پکے حنفی اور نقشبندی طریق میں
بیعت کردہ ہیں۔ بس ان جزئیات کا خیال رہے۔ آپ فوراً بھاگلپور سے روانہ ہو کر سیدھے کلکتہ پہنچیں اور مرزا احمد علی
سکریٹری یتیم خانہ کمیٹی نمبر ۲ لوچیت پور روڈ سے جاکر ملیں اور میرا خط دکھلائیں۔

بحالت موجودہ یہ جگہ غنیمت ہے اسے منظور کر لیجیے اس کے بعد انشاء اللہ عجب نہیں کہ فقیر کا بھی کلکتہ جانا
ہو اور تمام امور عمل میں آئیں۔ والامر بیدہ سبحانہ وتعالیٰ فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ رانچی بہار ۲۲ ذیقعدہ ۴۳ھ

(۱۰)

ڈاک بنگلہ۔ رانچی ۷، اپریل ۱۹۱۵ء ۷۸۶

برادرم السلام علیکم

اپنے ارادہ اور قیام سے اطلاع دیجیے۔ ابھی کچھ دنوں رہئےگا یا جانے کا قصد ہے؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ کے شامل حال رہے۔ فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۱۱)

رانچی ۱۹۱۶ء

السلام علیکم

افسوس کہ آج شام کو بھی آپ حضرات سے ملاقات نہ ہو سکےگی شام کو بیگم نے کھانے کی دعوت دے دی ہے۔ مجبوراً وہیں رہونگا
اس لیے آپ حضرات آج زحمت نہ فرمائیں اور دلشاد کو کھانے کیلیے بھیج دیں انشاءاللہ کل ملاقات ہوگی۔ ابوالکلام

(۱۲)

باسمہ تعالیٰ عزیزی الاجل السلام علیکم

تاخیر اسلیے ہوئی کہ کلکتہ سے جواب کا انتظار تھا۔ آپ کی علالت کا حال پڑھ کر نہایت قلق ہوا۔ اللہ تعالیٰ فضل و کرم
فرمائے اور اس کے سوا چارہ سازِ بیکساں کون ہے کہ "یجیب المضطر اذا دعاہ"
میں نے بہت کوشش کی کہ زیادہ عرصہ تک جگہ خالی رہے مگر امیدواروں کا ہجوم شاید عید کے بعد وہ کوئی

انتظام کرلیں۔ بہرحال صحت مقدم ہے اور خدا کے خزانوں میں رزق کی کمی نہیں۔ انشاء اللہ وہ کوئی اور صورت پیدا کردے گا۔
حکیم صاحب کو لکھ دیا ہے نیز دواخانہ کو لکھ دیا کہ دوا آپ کو بھیجدے اور قیمت فقیر سے وصول کرلے۔ موجود
حالت سے مطلع کیجیے۔ خدایار و یاور باد!

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ رانچی

(۱۳)

حبی فی اللہ السلام علیکم

خاموشی بلا وجہ نہ تھی چاہتا تھا کہ اس موقعہ پر آپ کی پریشانیوں کے لیے کچھ نہ کچھ باعث تخفیف ہوں بعض
اسباب کی بنا پر اس کی امید بھی تھی لیکن سوء اتفاق سے اب تک اسباب مطلوبہ فراہم نہ ہوئے و ماتشاؤن الا ان یشاء
اس بات سے نہایت خوشی ہوئی کہ بحمد للہ آپ کی طبیعت روبہ افاقہ ہے اللہ تعالیٰ صحت کامل عطا فرمائے۔
میں اس موقع پر آپ کو ضرور رانچی بلالیتا مگر جب آپ کے تمام مصالح پر غور کرتا ہوں تو سردست توقف اولیٰ
انسب نظر آتا ہے پس بالفعل توقف کیجیے اور منتظر رہیے کہ آئندہ کیا صورت حال پیش آتی ہے؟ شاید بہت جلد
اللہ تعالیٰ بہتر صورت پیدا کردے بالفعل آپ کا یہاں آنا چنداں سود مند نہ ہوگا انشاء اللہ وقت مناسب دیکھ کر
میں خود آپ کو مطلع کروں گا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کچھ عرصے آپ مونگیر میں قیام کریں؟ اور آپ کے متعلقین اپنے گھر
میں رہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ کوئی مناسب صورت پیدا کرے؟

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۱۴)

۱۷-۴-۱۲ (یہ خط جیل سے چیک ہو کر بھیجا گیا ہے)

حبی فی اللہ السلام علیکم

خط پہنچا۔ غلطی سے پڑا رہا اور خیال یہ ہوا کہ جواب لکھ چکا ہوں۔ لیکن آج دیکھنے سے معلوم ہوا کہ غالباً جواب نہیں گیا
الحمد للہ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اب آپ بصحت و عافیت ہیں۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ رانچی ۱۸/ اپریل ۱۷ء

(۱۵)

(نوٹ: اب طویل اور تفصیلی خطوط کا حصہ ہے —— ان میں ایک آدھ چھوڑ کر سبھی میں تاریخ اور مقام ندارد ہیں۔)

حبی فی اللہ السلام علیکم

خط پہنچا۔ کلکتہ کے اس تعلق کی نسبت میں نے اس لیے رائے دی کہ رانچی میں قیام کی کوئی صورت نہ تھی اور

آپ سے دریافت کیا تو آپ کے وطن و اطراف میں بھی کوئی صورت سامنے نہ آئی۔ مجبوراً خیال کیا کہ بیکاری سے بہرحال کچھ نہ کچھ معاش کی صورت کا ہو جانا بہتر ہے۔ چونکہ آپ نے بھی رضامندی ظاہر کی اسلیے میں نے مسٹر فضل دین کو لکھ دیا۔

باقی رہا ان کا مزاج، تو آپ جانتے ہیں کہ آج کل طبائع کا کیا حال ہے اور پھر اختلاف طبائع ناگزیر۔ لہذا کسی کی ذاتی حالت و طبیعت سے ہمیں کیا مقصود ہے۔ معاوضہ پر کام کر دینا ہے اور بس۔ یہ معلوم ہے کہ دوستی و محبت کا تعلق نہیں۔

البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ صبح سے لے کر شام تک کی حاضری دفتر میں کیوں ہو؟ کام تو بظاہر کچھ بھی نہیں ہے آپ صاف صاف ان سے کہہ دیں کہ یا تو بلا قید وقت میں کام کر دوں گا یا پھر دس سے چار تک یا پانچ تک کام کروں گا۔ ان امور میں سکوت کسی طرح بہتر نہیں یہ تو معاملہ کی بات ہے ایک لمحہ میں صاف ہو جائے گی اسکو اسقدر اہمیت کیوں دی جائے

باقی رہا تنخواہ کا معاملہ تو بلاشبہ کم ہے اور واللہ اس سے زیادہ کا سامان کرے۔ لیکن سامان ہونا چاہیے۔ آپ نے کلکتہ کے میمنوں وغیرہ کی نسبت لکھا ہے میمنوں میں کون ایسا شخص ہے جس کے یہاں اس قسم کی ملازمت کی گنجائش نکل سکتی ہے ان کے یہاں تو غالباً صرف تجارتی کام ہوتا ہے۔ لہذا آپ تجسس میں رہیں اگر کوئی ایسی جگہ نظر آئے تو مجھے لکھیں۔ میں پوری سعی کروں گا۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ یہ تعلق آپ کا شخصاً مسٹر فضل دین سے ہے۔ مجھے اس خاص معاملہ کو کوئی تعلق نہیں یعنی یہ میرے کاموں میں سے نہیں ہے۔ آپ اس خیال سے اس کام کو اپنے لیے ضروری نہ سمجھیں کہ میرا کام ہے۔ میں نے تو بیکاری سمجھ کر اس کو غنیمت سمجھا یہ بات نہیں ہے کہ اس کے ترک کو میں پسند نہ کروں گا۔ آپ دیکھ لیں موافق طبع ہو تو کریں ورنہ بلا تامل ترک کر دیں۔ میں دونوں حالتوں میں خوش ہوں۔ یہ تمام معاملات امور میرے علاقہ کے دائرہ سے خارج ہیں۔ میرا علاقہ تو صرف اللہ کی راہ میں ہے لیکن ہاں اگر دنیوی امور میں کچھ کر سکوں۔ شخصاً تو اس کے لیے بھی طیار ہوں۔ بہرحال میرے پیش نظر کوئی صورت اسوقت نہیں ہے آپکے سامنے ہو تو لکھیے۔ ابوالکلام

(۱۶)

عزیزی و حبی فی اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ادھر عرصہ سے مبتلائے آلام معنوی و صوری ہوں۔ علائق قلبیہ رسل و رسائل پر موقوف نہیں۔ آپ کی طرف سے نہ کبھی غفلت ہوئی ہے اور نہ انشاء اللہ ہو گی۔ افسوس کہ اب تک آپ کا زمانۂ ابتلاء و محن ختم نہیں ہوا، اور سلسلۂ علالت جاری۔ جب بھاگلپور کے علاج سے اتنے عرصہ میں بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو بجز اس کے چارہ نہیں کہ جلد سے جلد سفر دہلی کا تہیہ کیا جائے۔ اس سفر کے لیے بعض ضروریات کی فراہمی ناگزیر اور جواب میں اسی لیے تاخیر ہوئی کہ ان

کی فکر در پیش تھی۔ انشاء اللہ امید ہے کہ عنقریب سامان ہو جائے گا۔ بعض اسباب سے ادھر یکے بعد دیگرے مجبوریاں پیش آتی رہیں اور بعض تازہ عادثے نے دل کی طرح جیب کو بھی خالی رکھا۔

دوسرے خط میں آپ نے اپنے گھر کے طرز عمل کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر سخت قلق ہوا، وہذا اشد من ذاک۔ غالباً آپ کے ابتلاء آزمائش کی تکمیل اس معاملہ پر موقوف تھی۔ جب تک الم جسمانی کے ساتھ الم قلبی مکمل طور پر جمع نہ ہو، صبر کی پوری آزمائش نہیں ہوتی۔ یہ دوسرا معاملہ انسان کے لیے علائق و مؤثرات حیات دنیوی میں آخرترین الم ہے اور اب یہ بھی آلام جسمانیہ کے ساتھ جمع ہوگیا۔ جب آزمائش یہاں تک پہنچ چکی ہے تو یہ اس کی علامت ہے کہ اب اختتام کا وقت آگیا اور انشاء اللہ آپ کا اجر صبر بھی آخری درجہ تک پہنچ کر رہے گا۔ کام جتنا سخت ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ مزدوری بھی ملا کرتی ہے۔ گو یہ معاملہ نہایت ہی دردانگیز ہے مگر کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کچھ مزید تعیین و تفصیل کریں؟ قلب انسانی کے لیے مجرد تذکرہ و حکایت آلام میں بھی بہت بڑی تسکین رکھی گئی ہے خصوصاً جبکہ کسی غمگسار کے سامنے ہو۔

ولابد من شکوی الی ذی مروۃ　　یواسیک او یسلیک او یتوجع

آپ نے اپنے آنے کی نسبت بھی لکھا ہے۔ میں خود کب اس کو پسند کرتا ہوں کہ جتنا بھی آپ مجھ سے دور رہیں لیکن علاج سب پر مقدم ہے اور اس کے لیے دہلی جانا لازم و الزم۔ بس اسی کا تہیہ کیجیے۔ جس طرح بھی ممکن ہو۔ اور میں بھی انشاء اللہ بجز دعصیان۔ اول حصول اس کیلیے کوشش کرونگا۔ فیاللہ معکم اینما کنتم وحسبنا اللہ ونعم الوکیل ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

ادھر اتفاقاً ایک ضرورت سے بعض کتب طب کی ورق گردانی کا اتفاق ہوا تو گردہ کی بحث نکل آئی۔ ضعف گردہ کے جس قدر آثار و حالات لکھے ہیں وہ سب آپ میں موجود ہیں۔ یہ مرض بجز ضعف گردہ کے اور کچھ نہیں ہے اور جو شے خارج ہوتی ہے وہ گردہ کی چربی ہے۔ وہاں کے اطبا سے اس کا ذکر کیجیے۔

(۱۷)

حبی فی اللہ السلام علیکم

اللہ تعالیٰ اس عزم کو صادق و کامل فرمائے۔ آپ نے اللہ کی راہ میں محتاجوں کا انفاق کیا۔ یہ عمل عظیم الشان ضائع نہ ہوگا۔ باقی رہا انفاق قوت و عمر اللہ کی راہ میں تو اس کے دو مرتبہ ہیں۔ پہلا عزم و نیت سے تعلق رکھتا ہے دوسرا عمل سے۔ پہلی چیز ہر وقت و آن مطلوب اور ہر وقت ہمارے اختیار میں۔ ـــــ اس میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ رہا عمل کام تو اس میں انتظار وقت ناگزیر۔ شوق طلب کا تقاضہ یہی ہونا چاہیے کہ ایک لمحہ کی تاخیر بھی شاق گزرے لیکن فہم و فکر کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ انتظار کے بغیر چارہ نہیں۔ سردست آپ کے لیے مسئلہ معیشت بھی ضروری ہے۔ اور حقوق اہل و

اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کلکتہ میں ملتے جلتے رہیے۔ سعی و کوشش کیجیے کہ کوئی گنجائش کہیں دوسری جگہ نظر آئے اور مجھ کو مطلع کیجیے۔

(۲) مسٹر فضل دین کے جو حالات لکھے ہیں وہ پیشتر سے معلوم ہیں مگر چارۂ کار کیا؟ باقی رہا تذکرہ تو اصل حقیقت یہ ہے کہ اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ انھوں نے اسے چھاپا ہے اور اس کی تمام خرید و فروخت انہی سے متعلق ہے۔ نفع نقصان وہ جانیں۔ اگر عقل و دانش سے کام لیتے اسراف میں نہ پڑتے اپنی نادان بیوی کی پرستش نہ کرتے حالت کے مطابق خرچ رکھتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ حتی الوسع مشورہ و فہمائش میں کمی نہیں کی۔ لیکن افسوس کہ کلکتہ کا قیام غیر ضابطہ طبائع کے لیے موجب ابتلا ہے۔ اب وہ جانیں اور ان کا کام۔ قانوناً پریس پر کوئی ڈگری جاری نہیں ہو سکتی گو زحمت پریشانی کا موجب ہو سکتی ہے۔ آپ ان کے معاملات کو انہی پر چھوڑ دیں۔ اس بارے میں میری فہمائش بالکل بے اثر رہ چکی ہے نتیجہ کام صرف اتنا ہوا کہ بند رہنے کی جگہ پریس کا مکان کھلا رہا اور کچھ لوگ اس میں رہے۔ اور مجھے کوئی اس سے نفع نہ ہوا۔ اور نہ ہوگا۔ نقصان جس قدر ہو خلاف امید نہیں۔ دنیا کا یہی حال ہے اس کو آپ ہم بدل نہیں سکتے۔

ایک کام ضروری ہے۔ ایک نسخہ تذکرہ درجۂ اول مکمل بہ رقم ایڈیٹر مشرق گورکھپور کے نام رجسٹرڈ بھیج دیجیے۔ انھوں نے شاید مشرق میں اشتہار چھپوایا تھا۔ اجرت اب تک نہیں دی وہ کہتا ہے کہ کم سے کم ایک نسخہ تو بھیجدو وہ بھی نہیں بھیجا جاتا۔ خط پر خط آ رہے ہیں۔ بہرحال آپ بھیجدیں۔ بھیجنے سے پہلے غلط نامہ دیکھ کر قلم سے غلطیاں درست کر دیجیے گا اور غلط نامہ اگر شامل جلد نہیں تو جلد کے اندر رکھ دیا جائے۔ ابوالکلام

(۱۸)

۲۵ر نومبر ۱۹۱۹ء

یہ معلوم کر کے سخت قلق ہوا کہ آپ کی طبیعت پھر خراب ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ لطف فرمائے۔ معلوم نہیں اب کیا حال ہے؟ آپ کو وہاں رکوانے سے مقصود یہ تھا کہ قبل از جلسۂ انجمن مقامات مشہورۂ بہار میں ایک دورہ کیا جائے اور دعوتی خطوط و کارڈ بالمشافہ لوگوں کو دیے جائیں۔ نیز اشتہارات مناسب مقامات پر چسپاں کرائے جائیں لیکن اگر آپ کی طبیعت درست نہیں تو پھر یہ تمام معاملات مہمہ کیونکر انجام پائیں گے؟

اس صورت میں وہاں بھاگلپور کا کوئی اور مستعد شخص کیا اس کام کے لیے فوراً مل سکتا ہے؟ اگر آپ کے شناسا لوگوں میں کوئی ہو تو تمام مصارف انجمن ادا کرنے کے لیے طیار ہے و اجرہ علی اللہ اس کے علاوہ۔

بہرحال اس خیال سے کہ وقت کم ہے، خواہ خود آپ انجام دیں خواہ کسی اور ذریعے، اصل کار کو لکھ دیا جاتا ہے۔

(۱) جلسہ کے دعوتی خطوط اردو، انگریزی کارڈ، چسپاں کرنے کے پوسٹر رجسٹرڈ بھیجے جاتے ہیں۔

(۲) بھاگلپور میں جو لوگ ان چیزوں سے ذوق رکھنے والے ہوں ان کے نام حسب حال یا کارڈ یا خطوط پر لکھ کر لٹ انہ تقسیم کیجیے اور از جانب انجمن ترغیب شرکت جلسہ۔

اور اس امر پر زور دیجیے کہ یہ محض مقامی جلسہ نہیں بلکہ صوبے کا ایک عام تعلیمی اجتماع ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کارڈ کم ہیں اور صرف ان لوگوں کو دیے جائیں جو انگریزیت میں بشدت غرق ہوں ورنہ اردو خطوط۔ بھاگلپور کے لیے دس خطار کھے گئے ہیں اور دس پوسٹر۔ لیکن حسب ضرورت زیادہ صرف کر سکتے ہیں۔ پوسٹر شہر کی مساجد و نمایاں مقامات پر چسپاں کرا دیے جائیں۔

(۲) اس کے بعد فوراً بانکی پور جائیے اور مسٹر مظہر الحق اور ڈاکٹر محمود بیرسٹرایٹ لا سے ملیے۔ ڈاکٹر محمود ایک جونیر بیرسٹر اور مسٹر مظہر الحق کے داماد ہیں۔ ان دونوں صاحبوں سے کہیے کہ صرف اس قدر زحمت دینا مقصود ہے کہ بزرگان بانکی پور کی کوئی فہرست یہاں موجود نہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے نام بتلایے تاکہ ان کو خطوط و کارڈ خاص طور پر دیے جائیں اور شرکت جلسہ کے لیے اصرار کیا جائے اور آپ کی نسبت تو شرکت کا پورا یقین ہے۔ بانکی پور کے علاوہ دیگر مقامات بہار کے نام بھی ان سے دریافت کیجیے اور ان تک پہنچایے۔

اس کے بعد پوسٹر بانکی پور پٹنہ میں بھی مناسب مقامات پر چسپاں کرانا چاہیے اور عام طور پر لوگوں سے ملنے اور دعوت دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۳) وہاں سے آپ گیا اور آرہ بھی جا سکتے ہیں نیز مظفر پور و مونگیر وغیرہ۔ مظفر پور میں مولوی ریاض الحسن صاحب رئیس شہر میں ان سے مدد ملے گی اگر یہاں کا ذکر کر دیا جائیگا۔ اس بارے میں بھی ڈاکٹر محمود سے مشورہ کر لینا چاہیے۔

(۴) ہر مقام پر گروہ علماء و تعلیم یافتہ دونوں کو دعوت دینی چاہیے۔ علماء پر ظاہر کرنا چاہیے کہ مدرسہ عربی انگریزی سے مرکب اور آخری درجہ تعلیم تکمیل نصاب علوم دینیہ پر مبنی۔

(۵) وقت کم ہے اس لیے تعجیل مطلوب۔ یہ اچھا ہوگا کہ اثنائے سفر میں خط و کتابت "بذریعہ پوسٹ ماسٹر" ہو۔ یعنی یہاں سے آپ کے نام کے خطوط وغیرہ ہر شہر کے پوسٹ ماسٹر کے ذریعہ جائیں۔ آپ کو ہر جگہ پوسٹ آفس میں جا کر خود دریافت کر لینا ہوگا اور اپنے نام کی ڈاک لے لینی ہوگی۔

(۶) چونکہ آپ کی علالت کی وجہ سے اشتباہ پیدا ہو گیا اس لیے روپیہ نہیں بھیجا گیا۔ بصورت مستعدی آپ فوراً اطلاع دیں تا مل سفر شروع کر دیں اور خط میں پتہ لکھیں۔ مصارف کے لیے روپیہ بھیج دیا جائے گا یا مثل سابق آپ مصارف کا پرچہ بھیجتے رہیں گے اور روپیہ جاتا رہے گا۔

(۶) مزید دعوتی خطوط وغیرہ مطلوب ہوں گے تو طلب کر لیجیے گا۔

(۷) جناب مولانا محمد علی صاحب کی عدم شرکت پر کمال افسوس مگر واقعی ان کی معذوری واضح۔ لیکن شن نلاؤ واعظین جوان کی خدمت میں رہتے ہیں، ان کی شرکت تو نہایت ضروری ہے۔ اگر جناب موصوف امر رمائیں تو وہ ضرور شریک ہوں گے پس اس کے لیے کوشش کیجیے۔ یہ اجتماع صوبہ بہار کی تعلیمی اصلاح و ترقی کا اجتماع عام ہے اور ستم ہے اگر خود اس صوبے کے علماء و اصحاب رائے اسمیں حصہ نہ لیں۔

(۸) بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ زبانی بھی ان کو خاصتاً آمادۂ شرکت کیا جا سکتا ہے۔ بلاسم ابلاغ رقعہ و کارڈ۔

(۹) اس جلسہ میں صوبہ بہار کے وعاظ و مقررین کی خاصتاً ضرورت ہے۔ جلسہ تین دن ہوگا۔

(۱۰) بانکی پور میں حافظ محب الحق صاحب کا پتہ دریافت کر کے ان سے بھی خاص طور پر ملیے اور کہیے کہ آپ کی شرکت نہایت الزم و امید مزید سعی و تناصر و تعاون۔

(۱۱) ایک شخص مولوی سعیر الدین صاحب ہیں۔ ان سے بذریعہ مسٹر محمد بیرسٹر ٹ ناملہ دریا پور پٹنہ ملاقات ہو سکتی ہے۔ یہ وہی شخص ہیں جو رمضان میں یہاں تھے از ہمراہیان مولوی شرف الدین اور جمعہ کے دن اکثر آتے تھے۔ ان سے آپ کو بہت مدد ملے گی۔ بلکہ بہتر ہے کہ سب سے پہلے ان ہی سے ملیے اور ان ہی کی مشورہ سے لوگوں کے نام حاصل کیجیے۔ اور سب کو دعوت دیجیے اور کہیے کہ انجمن آپ کو اپنا قائم مقام سمجھتی ہے اور امید کرتی ہے کہ خود آپ انجمن کی جانب سے یہاں لوگوں سے ملیں گے اور دعوت دیں گے اور جلسہ میں لائیں گے۔

میرا ذکر کیجیے کہ اس کو اس بارے میں آپ پر خاصتاً اعتماد ہے اس جلسہ میں کلکتہ سے تمام معززین و ممبران کونسل وغیرہ شرکت کے لیے آئیں گے حتیٰ کہ ڈھاکہ سے کس قدر افسوس کی بات ہو اگر خود صوبہ بہار کے لوگ نظر نہ آئیں؟ حالانکہ جو کچھ ہے انہی کے گھر کا کام ہے۔

ضروری خدانخواستہ اگر آپ مجبور ہوں تو فوراً بذریعہ تار مطلع کیا جائے اور رقعہ وغیرہ فوراً واپس کر دیے جائیں۔

(۱۹)

حبی فی اللہ السلام علیکم خط پہنچا، اخلاص احمد صاحب وغیرہ کا تار آیا تھا۔ لیکن چونکہ اس میں پتہ نہ تھا جواب نہ دے سکا۔ بہر حال حالت میں تبدیلی تو ہوتی ہی ہے جب اللہ کو منظور ہوگا ہو رہے گا۔ اس میں کاوش بے سود ہے آپ نے لکھا ہے کہ جب تمہارا جلد کلکتہ آنا مظنون ہے تو پھر مولوی اکرم کے یہاں تعلق کیوں کروں؟ بلاشبہ میرے لیے نہایت خوشی کا موجب ہو اگر براہ راست آپ کے لیے کسی بہتر سامان کا ذریعہ ہو سکوں لیکن یہ چیزیں اصل کار و مقصد

ہیں داخل نہیں ہیں محض وسیلہ معیشت ہیں جہاں ہو ایک ہی حکم میں داخل ہے۔ علاوہ بریں بالفرض اگر میں کلکتہ آ بھی گیا تو وہاں آپ کے لیے بالفعل کوئی اچھی صورت ذہن میں نہیں۔ پریس میں کوئی ایسا کام نہیں جس کو آپ کے لیے منتخب کروں نہیں کہا جا سکتا کہ پریس کے کام کی حالت کیا ہوگی۔ موجودہ حالت میں صرف ایک تذکرہ کے لیے فضل دین نے آپ کو بلایا چونکہ وہ اپنے طور پر کام کرتے ہیں اس لیے میں نے دخل نہیں دیا ورنہ تو آپ کے لیے یہ کام کوئی کام تھا نہ دفتر کے لیے واقعی ضرورت تھی۔ برخلاف اس کے مولوی اکرم اخبار روزانہ نکال رہے ہیں کام اور ترقی کا بہت اچھا موقعہ ہے۔ آدمی ہم مشرب اور خوش خیال ہیں۔

بحالت موجودہ آپ کے لیے اس سے بہتر کلکتہ میں اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ تنخواہ بھی امید ہے کہ مناسب ہوگی۔ آپ کو ذاتی طور پر اخبار کے کام سے دلچسپی بھی ہے۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر کسی طرح مناسب نہیں کہ اس عمدہ موقعہ کو ہاتھ سے دیں۔ فوراً اختیار کر لیں۔ انشاء اللہ موجب فلاح ہوگا۔ میں اگر کلکتہ چلا بھی گیا جب بھی بحالت موجودہ امید نہیں کہ اخبار وغیرہ کا کوئی کام پریس میں شروع ہو مجھ کو دوسری مشغولیتیں درپیش ہوں گی اور مالی مشکلات کی وجہ سے پریس میں کوئی گنجائش ایسی نہ نکلے گی کہ مختلف قسم کے کام پیش آئیں پس جو صورت سامنے ہے اسے ضائع نہ کیجیے۔ بڑی اچھی بات اس میں یہ ہوگی کہ آپ کا قیام کلکتہ ہی میں رہے گا۔ چونکہ المستشار مؤتمن۔ اس لیے جو اصلیت تھی لکھ دی گئی۔

ابوالکلام رانچی ۲ر جنوری ۲۰ء

(۲۰)

کلکتہ[1] ۲۰ر فروری ۳۰ء

حبی فی اللہ السلام علیکم

آپ کی پریشان حالیوں سے بے خبر نہیں ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ زمانہ بے مہر ہے اور دار بات کی جیب خالی ہے۔ بہرحال جونہی کوئی ایسی صورت پیدا ہوئی کہ آپ کیلیے سودمند ہو آپ کو اطلاع دوں گا۔

(۱) اکبر کا آن پڑھ ہونا کوئی غلط فہمی نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ اسے تعلیم یافتہ ثابت کیا جائے۔ اس کی فطری ذہانت اور قدرتی استعداد کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ باوجود ان پڑھ ہونے کے ملک داری کی حکمت و سیاست کی سب سے بہتر مثال قائم کر گیا۔

(۲) جنوبی اور وسط امریکہ کے آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایک زمانہ میں اس کا تعلق قدیم براعظموں

[1] اس خط کا عکس ماہنامہ "آجکل" دہلی کے "ابوالکلام نمبر" میں آ چکا ہے۔

سے رہ چکا ہے، لیکن جہاں تک تاریخی وثائق کا تعلق ہے قطع وجزم کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کولمبس سے پہلے کسی
سیاح نے اسے دریافت کیا ہو۔ اندلس کی تاریخ میں دو عرب بھائیوں کی داستان ضرور بیان کی گئی ہے اور بعض
کا خیال ہے کہ یہ دونوں بھائی امریکہ پہنچ گئے تھے لیکن یہ محض ایک قیاس ہے تاریخی حیثیت سے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) ریڈ انڈین کا اطلاق امریکہ کی وطنی اقوام پر کیا گیا ہے۔ اور ان کی تاریخ اس وقت تک تاریکی میں ہے۔

(۴) مذہب کا مقصود انسان کی روحانی سعادت و نجات اور ایک خالق کائنات کے رشتۂ عبودیت سے
تمام افراد انسانی کو باہم دگر متحد کر دینا ہے۔ یہ سوال ایسا نہیں ہے کہ مختصر جواب پا سکے بہت زیادہ تفصیلی بحث کی ضرورت

ابوالکلام

(۲۱)

کلکتہ۔ ۴/ ۳۴ء

عزیزی آپ کے خطوط مجھے ملتے رہے لیکن میں آپ کو لکھتا تو کیا لکھتا کوئی صورت ایسی
موجود نہیں کہ اس پر اعتماد کر سکوں اور آپ کو لکھوں کہ اسے اختیار کیجیے۔ کئی ماہ تک پچھلے دنوں آپ کلکتہ میں
رہے اور کوشش میں کمی نہیں ہوئی لیکن کوئی صورت نہ نکل سکی۔ اب جو صورت اخبار کی وہاں نکل آئی ہے
جیسی کچھ بھی ہو، بہرحال ایک صورت ضرور ہے، جب تک کوئی دوسری صورت نہ نکلے اسے غنیمت تصور
کرنا چاہیے اور جاری رکھنا چاہیے۔ کم سے کم بیکاری تو نہیں ہے۔

اگر میں نے دیکھا کہ یہاں کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے جو آپ کے لیے کام دے سکے تو ان شاء اللہ
تغافل نہیں کروں گا۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

(۲۲)

سب سے پہلے یہ واضح ہونا چاہیے کہ آپ کی نسبت یہ خیال مجھے کیوں پیدا ہوا۔ زندگی کی کامیابی کے لیے
سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ایک دائمی مستقل پروگرام تجویز کر لیا جائے اور اپنے اشغال و اعمال کو محض حوادث و وقت
کے حوالے نہ کر دیا جائے۔ بہت سے لوگ باوجود صلاحیت و قابلیت کے اپنی زندگی میں کوئی بڑا کام مدۃ العمر
نہ کر سکے، صرف اس لیے کہ کوئی مستقل نظام عمل ان کے سامنے نہ تھا۔

آپ کے لیے جس قدر میں نے غور کیا اخبار نویسی کی زندگی موزوں نہیں بلکہ ہلاکت وقت و ضیاع قوۃ ہے۔

اخبارات بلاشبہ دعوۃ و تذکیر کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ لیکن جب تک ایک نہایت ہی نمایاں اور غیر معمولی شکل میں ان سے کام نہ لیا جائے اور نہایت وسیع پیمانے پر اسباب و وسائل مہیا نہ ہوں، مطلوبہ اثر پیدا نہیں کر سکتے اور محنت بکسر رائیگاں جاتی ہے۔ اوّل تو ایسا اہتمام چند در چند وجوہ سے متعذر، ثانیاً بصورت حصول، اس درجہ مشکلات و عوائق حائل کہ ان پر عبور و غلبہ شخص واحد سے ممکن نہیں جب تک جماعت نہ ہو۔

علاوہ بریں اس مشغلہ میں سارہ کر صرف سیاسیات کیلیے وقف ہونا پڑتا ہے اور علمی ذوق کو ہمیشہ کیلیے ترک کر دینا پڑتا ہے۔ آپ کے لیے بہترین زندگی علمی زندگی ہے اور اس شکل و طرز کی جس کا نمونہ سلف صالح کے حالات میں ملتا ہے۔ علماء اسلام کے حالات پڑھیے۔ درس تدریس، وعظ و ارشاد، اور تصنیف و تالیف تینوں چیزوں کو بیک وقت کرتے تھے اور اس طرح ایک ہی زندگی بیک وقت تین عظیم الشان خدمات انجام دیتی تھی۔ عوام کی اصلاح وعظ و تذکرے سے، مستقبل کے لیے طیاری درس و تدریس سے اور علم و مذہب کی خدمت دائمی تصنیف و تالیف سے، ابن جوزی مصنف ہیں، مستنصریہ کے صدر مدرس ہیں، اور جامع رصافہ کے واعظ، غزالی مدرسہ طوس کے معلم، سو کتابوں کے مصنف اور جامع طوس کے واعظ۔ علماء اسلام کی زندگی کے لیے تو یہ چیز طبیعت ثانیہ ہو گئی تھی۔ ایک شخص آپ کو نہ ملے گا جو اپنی زندگی میں یہ تینوں مشغلے نہ رکھتا ہو۔ جس کو درس دیا، اس کیا اوقات میں تصنیف و تالیف اور مجامع و جوامع میں وعظ و تذکیر کا سلسلہ جاری جب سے یہ چیز مفقود ہو گئی اور ان تینوں اجزاء کو الگ الگ کر دیا گیا، واعظوں کا طبقہ الگ، مصنفین کا الگ اور معلمین کا الگ، اسوقت سے سلسلۂ ہدایت حقیقی و نشو و نمائے علم مفقود و معدوم ہو گیا۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ کمر ہمت چست باندھیں اور عزم راسخ کر کے اس زندگی کے لیے طیار ہو جائیں۔ آپ کے لیے بہترین موقع حاصل ہے۔ چھوٹا ناگپور ڈویژن ایک وسیع خطہ ہے لیکن علم و ہدایت سے یکسر محروم۔ چونکہ ایک گوشہ میں واقع ہے اس لیے علماء کی آمد و رفت بھی کمتر ہوئی، اور جہل و افلاس نے اور زیادہ حالت خراب کر دی۔ اب ادھر دو سال کے میرے قیام سے حالات متغیر ہوئے ہیں اور اللہ نے جس قدر توفیق دی دعوۃ و تبلیغ کا فرض ادا کرتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک غیر مترقبہ زندگی پیدا ہو گئی اور لوگوں نے اپنی حالت کو محسوس کیا۔ اب شدید ضرورت یہاں اس کی ہے کہ ایک عالم صالح مستقل طور پر قیام کرے اور جو تبدیلی ہوئی ہے، وہ آئندہ ضائع نہ ہو جائے۔ اگر ایک شخص نے یہاں قیام کیا تو پورے خطہ کی دینی پیشوائی و امامت اس کے ہاتھ میں رہے گی اور باطمینان مسلمانوں کے ایک گروہ عظیم کی ہدایت و ارشاد میں مشغول رہے گا۔ دوسرے مقامات میں علماء سوء کی کثرت اور جاہلانہ فساد و جہل

کی مفادت سے اصلاح و ہدایت کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے اور کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ بات بالکل
ہے اور ابتدا سے بنیاد صالح پڑ چکی ہے اور اب جتنی عمارت بنائی جا سکا ورنہ جیسی بنائی جائے بن سکتی ہے۔
پس ہدایت و دعوت کے عمومی پہلو سے تو ایک گروہ عظیم اتباع و اعتقاد کے لیے موجود ہے بلا شرکت
اب رہی دوسری چیز یعنی مشغلہ درس و تدریس تو اس کا حال یہ ہے کہ جب انجمن اسلامیہ کی یہاں بنیاد ڈالی اور
کا خیال ہوا تو سوچا کہ اپنی قوت کو چھوٹے چھوٹے مقصدوں پر خرچ کرنا بہتر نہیں۔ آج تیس برس سے اصلاح
کا مسئلہ مصر و ہندوستان در پیش ہے اور عملاً طے نہیں ہوتا اگر یہاں ایک کالج قائم ہو جائے اور اولین تجربہ پیش
نصاب اصلاح یافتہ کا کیا جائے تو یہ ایک عظیم الشان کام ہوگا۔

اسی اثنا میں مدرسہ عالیہ کے اصلاح نصاب پر ایک تعلیم کمیٹی کو توجہ ہوئی اور اس کمیٹی نے
مجھ کو ایک نصاب جامع مرتب کرنا پڑا اس بات سے مزید تحریک ہوئی اور مدرسہ کو اسی اصول پر
قائم کیا کہ مدرسہ کا نصاب جونیر اور سینیر دو درجوں میں منقسم اور پوری مدت تعلیم نو دس سال ہے۔ پہلا درجہ آٹھ سال
ہے۔ اس میں صرف و نحو عربی بالکل ختم ادب شروع فارسی مکمل ختم حساب و مبادی ختم ترجمۃ القرآن مع ...
اسلام بالاجمال اور انگریزی ادب ہے۔ دوسرا درجہ چھ سال کا ہے اور تکمیل ادب ... قدیم علوم القرآن
علوم الحدیث فقہ حنفی فقہ جامع اصول توحید علم اسرار الدین علم اخلاق تاریخ ... تاریخ اسلام تاریخ قدیم
تاریخ مذاہب و طوائف اسلامیہ معقولات قدیم مسائل العلم ... اور ... انگریزی علم و ادب
اس کے بعد درجہ تکمیل کے دو سال کسی ایک فن یا صرف انگریزی تھا۔

ابھی مدرسہ کی ابتدائی جماعتیں کھول دی ہیں عمارت آخر اپریل تک مکمل ہو جائیگی اور پھر کوشش کی
تمام جماعتیں شروع ہو جائیں۔ اب چونکہ یہ مدرسہ مسئلہ اصلاح تعلیم اسلامی پر مبنی ہے اس لیے صرف رانچی ہی کا معاملہ
نہیں بلکہ تمام ہندوستان کا مسئلہ ہے۔ اس کا انتظام ہمیشہ میرے ہاتھ میں رہے گا اور مصارف وغیرہ کے طرف سے پورا اطمینان

آخری چیز مسئلہ تصنیف و تالیف ہے اور یہ بہت ضروری ہے اس کا حال یہ ہے کہ بلحاظ مقام کے
اور رانچی اور دیگر مقامات سب یکساں ہیں۔ ہندوستان میں اس کے اسباب و سامان کا بجز یورپ کہاں سامان
صورت یہی ہے کہ کوئی ایک مستقل تصنیف پیش نظر رکھ لی جائے اور اس کے مواد و سامان کو فراہم کیا
اس کے لیے میں موزوں ہوں جب تک رانچی میں ہوں کتب خانہ بھی موجود ہے اور اگر کلکتہ چلا گیا جب بھی
رانچی سے قریب، نیز مشورہ و مواد کے لیے ہر طرح آمادہ و مستعد۔

یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ کیا چندہ کی فراہمی کے لیے دورہ کرنا پڑے گا؟ تو اس کا کوئی سوال نہیں ہے۔ انجمن کے چندہ کی فراہمی کے جھگڑے سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں اور نہ اس کے لیے دورہ میں تضیع وقت۔ آپ کا قیام تو یہیں رہے گا۔ لفظ وعظ سے مقصود یہ تھا کہ ایسے شخص کی ضرورت ہے جو وعظ ہدایت کا سلسلہ بھی جاری رکھے اور جمعہ کی امامت وخطابت وغیرہ اس سے متعلق ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری موجودگی میں ایک شخص یہاں آجائے اور لوگوں کو اس سے شناسا کر دیا جائے۔ اس کی حیثیت یہاں ایک عالم، مفتی، قاضی، امام جمعہ اور ہر طرح مقتدائے شہر کی ہوگی اور تمام شہر صرف اسی کی طرف رجوع کرے گا۔

یہ بات دوسرے مقامات میں بآسانی میسر نہیں آسکتی۔ چونکہ ابھی عمارت کا کام ختم نہیں ہوا اس لیے مصارف دائمی میں تخفیف پیش نظر ہے اور سر دست انجمن علاوہ مکان واکل وشرب کے ۳۰ کے لیے طیار ہے مگر افتتاح عمارت مدرسہ کے بعد یہ رقم قطعاً ۵۰ ہو جائیگی۔

بہتر یہ ہے کہ آپ سر دست ایک ماہ کے لیے وقت نکالیں اور رانچی چلے آئیں۔ یہاں چند دنوں رہ کر تمام حالت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اگر کسی وجہ سے آپ کی طبیعت نہیں لگی تو آمد ورفت کے مصارف انجمن کے ذمہ ہونگے اور آپ واپس چلے جائیے گا۔

(۲۳)

عزیزی! السلام علیکم

جو حالت اپنی آپ نے لکھی ہے تخصیص وتعین کے ساتھ تو اس کا علم نہ تھا لیکن یہ معلوم تھا کہ اس طرح کے حالات میں ضرور آپ مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری ہر حالت کو موجب صلاح وفلاح فرمائے۔ یقین کیجیے کہ دنیا میں انسان کے تمام قوای وفضائل کے لیے اصلی آزمائش گاہ یہی حالات ہیں۔ تلوار اور آگ میں کوئی آزمائش نہیں۔ سب سے بڑی آزمائش نفس وجذبات ہی کی ہے۔ اگر عزم راسخ اور قوت ایمانی واحسانی سے کام لیا جائے تو اس آزمائش میں کامیابی کچھ مشکل نہیں۔ والذین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔ میں اپنی دعاؤں میں کبھی اس معاملہ کو نہیں بھولوں گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس آزمائش میں کامیابی کی توفیق عطا فرمائے۔

موجودہ حالت میں بجز دو راہوں کے تیسری راہ کوئی نہیں:

(۱) عزم صادق اور ہمت کامل سے کام لیجیے اپنے اندر عزم پیدا کیجیے اور دعا اللہ سے مددگاری طلب کیجیے۔ زندگی چند روزہ ہے اور سارے مطلوبات نفس وہم وخیال سے زیادہ نہیں۔ کب تک اس بند وقید میں گرفتاری رہیگی؟

جو دل فاطر السماوات والارض کے عشق کا متحمل ہو سکتا ہے اس کو فانی و وہمی الفتون میں لگانا انسانیت وحیات کو ذلیل کرنا ہے۔ طلب مفرط جس چیز کو بھی ہے انداد وطواغیت میں داخل ہے۔ فلا تجعلوا للہ انداداً وانتم تعلمون اور یحبونہم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حباً للہ۔ محبت الٰہی کا دعویٰ ہے تو سب سے زیادہ احب چیز کو اس کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ حتیٰ تنفقوا مما تحبون۔ پس اصلی وحقیقی اور ایمانی واحسانی راہ تو یہی ہے کہ اللہ سے دل لگائیے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب اور ایک مرتبہ پوری قوت وعزم کے ساتھ انی وجہت وجہی للذی فطر السماوات والارض حنیفاً اور لا احب الافلین کی صدا لگا کر اس خیال کو دل سے نکال دیجیے۔ اگر آپ کی جانب سے عزم ہوا تو توفیق الٰہی ضرور مساعد ہوگی اور انشاء اللہ ایک جہاد اکبر کا اجر عند اللہ۔ غور کیجیے آپ متاہل ہیں مجرد نہیں۔ پھر صاحب اولاد اور متوقع اہل وعیال کی کشاکش سے درماندہ۔ کوئی ضرورت شرعی واخلاقی ازدواج ثانی کے لیے باعث نہیں۔ پھر ایک طرف افلاس وقلت معیشت کی بے سر وسامانی دوسری طرف عوازم ومعالی امور عمل کا ولولہ۔ ان حالات میں اگر یہ معاملہ انجام پایا تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ بلاشبہ ابتداء میں مسرت حصول مطلوب کا ہیجان تمام محسوسات پر غالب آجائے گا۔ لیکن بہت تھوڑا دیر کے لیے۔ اس کے بعد قدرتی کشاکش وکشمکش اور مشکلات وصعوبات کا سلسلہ شروع ہوگا اور عجب نہیں کہ اکثر حالتیں پیدا ہو کہ عجب نہیں کہ خود اس معاملہ سے دل برداشتہ ہو جائے۔ یہ کشمکش زندگی کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے۔ ابھی ایک لمحہ کے لیے اس کا احساس نہیں ہو سکتا۔ یہ عام قاعدہ ہے لیکن جب یہ حالت پیش آئے گی تو کوئی علاج سود مند نہ ہوگا۔ سب سے زیادہ یہ کہ پوری امانت داری کے ساتھ خود اس شخص کے مصالح پر غور کرنا چاہیے جس کی محبت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔ دنیا اور دنیا کے مصائب سے بے خبر۔ کیا یہ ظلم نہ ہوگا کہ اس کو ایک ایسی زندگی میں لایا جائے جس کے مصائب ومشکلات کا ہم کو ابھی سے علم ہے؟ اور ہم جانتے ہیں کہ عیش وآرام حیات اس کے لیے مہیا نہ کر سکیں گے۔ پھر اپنی بیوی کا خیال کیجیے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ کو ان سے کوئی شکایت نہیں۔ کیا محبت و وفا کا یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ بلا وجہ ان کی تمام بقیہ زندگی تلخ کر دی جائے ؟

میری شادی کو دس سال ہو گئے۔ یقین کیجیے کہ میرے لیے ایک نہیں متعدد وجوہ وبواعث شرعاً وعقلاً ایسے موجود ہیں کہ اگر ان میں سے ایک باعث بھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہوتا تو وہ دوسرا نکاح کرنے میں ذرا بھی پس وپیش نہ کرتا۔ بایں ہمہ میں نے ایک صبح وشام کے لیے بھی اس کا قصد نہیں کیا اور نہ کروں گا۔ پھر ساتھ ہی دوسروں کی جانب سے اس بارے میں اس قدر مجبور کن ترغیبات پیش آتی رہیں کہ عزم کا باقی رہنا بہت مشکل تھا تاہم میری رائے میں تزلزل نہ ہوا۔ صداقت حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی خواہشوں کو قربان نہیں کر سکتے تو پھر نہ دنیا

میں محبت ہے نہ سچائی اور نہ انسان۔ آپ کہیں گے دل کس کے بس میں ہے؟ ہاں لیکن جو چاہے اس کے بس
میں ہے۔ دل سے اوپر بھی ایک طاقت ہے۔ اس کو جگا دیجیے سونے نہ دیجیے وہ دل کی لگام جس طرف چاہے گی موڑ دے گی
اس بارے میں کثرت سے عواقب و نتائج پر غور و فکر، مغلوبات نفس کی ہیچ مائگی اور بے حاصلی کا تصو
کثرت استغفار، دعا، اور مشغولات دینیہ انشاء اللہ نہایت سود مند ہوں گے۔ اگر ایک دعا بھی پورے اضطر
التہاب کے ساتھ نکل گئی تو پھر کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ صرف اس حقیقت کی ضرب اگر ایک مرتبہ پوری طرح لگ
جائے کہ طلب عشق اور اضطراب قلب و اشک چشم جیسی نعمتیں ایک وہمی و خیالی مطلوب کے لیے کس طرح ضائع ہو
ہیں اور اگر یہ سب کچھ اللہ کے لیے ہو جائے تو پھر یہی وجود فانی کیا کچھ نہیں کر سکتا تو پھر اس آزمائش سے نکل جانے میں ذ
رکاوٹ پیش نہ آئے گی۔

(۲) لیکن اگر ضعف عزم ساتھ نہ دے اور اس راہ کی قوت نہ ملے تو پھر دوسرا مشورہ یہ ہے کہ تمام خیالات چھو
فوراً مجاگل پور چلے جائیے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس کے والدین کو راضی کر کے نکاح کر لیجیے۔ اور جس قد
مشکلات و مہالک پیش آئیں گے ان کو گوارا کر لینے کا قطعی فیصلہ کر لیجیے۔ یہ بات پھر بھی ہزار درجہ موجودہ اضط
نفس سے بہتر ہوگی۔ اولاً بہت سے انتہائی نقصانات مفقود ہو جائیں گے۔

غرض کہ یا فوراً بلا تاخیر اس خیال کو بالکل دل سے نکال ڈالیے یا فوراً بلا تاخیر جا کر کسی نہ کسی طرح نـ
کر لیجیے۔ تیسری حالت کوئی نہیں۔ اور اگر اختیار کی جائے گی تو سخت مضر ہوگی۔

والعاقبۃ للمتقین

ابوالکلام

INDIA POST CARD

THE ADDRESS ONLY TO BE WRITTEN ON THIS SIDE

REPLY.

M. E. Zacharias.

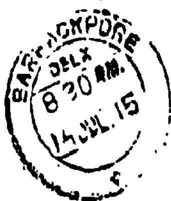
Tatarpur,

Bhagalpur City

INDIA

POST CARD

WRITING SPACE REPLY POSTCARD



M. E. Zacharia,
Head master,
Anjuman Tanwirul
Islam
Sadar bazar,
Barrackpur,
Cant.

(۱۲)

عزیزہ السلام علیکم خط ملا [illegible] رات سونے

[illegible] ورنہ خط لکھنے کی [illegible]

[illegible] کسی [illegible]

[illegible] ایمان [illegible] ہے [illegible]

[illegible] خوبی [illegible]

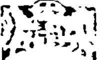
[illegible] حال ایسی [illegible] ہے کہ

[illegible] صورت [illegible]

[illegible]

ابوالکلام

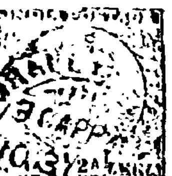
کلکتہ

POST  CARD

INDIA

WRITING SPACE

ADDRESS ONLY



INDIA POST CARD

WRITING SPACE

ADDRESS ONLY

عزیزی مولوی محمد زکریا صاحب

محلہ تاتار پور

بھاگلپور

(بہار، انڈیا) Bhagalpore

INDIA POST CARD

WRITING SPACE

ADDRESS ONLY

مولوی محمد ذکریا صاحب

محلہ تاتار پور

بھاگلپور سٹی

عزیزی — سلام مسنون وسلمکم اللہ بالخیر

کل میں ٹکٹ کے لیے کہہ آیا ہوں ۔

یا تو خود یا بذریعہ موذن وغیرہ اس کا انتظام کیجیے

کہ آج ٹکٹ ٹھیک گیارہ بجے یہاں پہنچ جائے ۔

ابوالاعلیٰ

عزیزی اپنے رقعہ میں جس امر کی شکایت کی ہے در اصل اسکا تعلق
غلط فہمی سے ہے آج شام کو خواجہ رفاقت حسین صاحب سے گفتگو ہوگی ان شاء اللہ
کل حسب مرضی معاملہ صاف ہو جائیگا۔ حاجی صاحب کا بھی یہ مقصد نہ تھا
وہ آپکی مخلصانہ خدمات انجمن کے پوری طرح معترف اور قدردان ہیں
دراصل اصل معاملہ سے وہ بیخبر تھے اسلیے انکو غلط فہمی ہوئی مولوی کاظم
صاحب وطن میں تھے انکا نام بل میں دیکھکر وہ اصل حقیقت
نہ سمجھ سکے۔ قطع نظر اسکے انکا تعلق تو کچھ ہے بس آپ کو اس قسم کے
امور سے دلگرفتہ نہ ہونا چاہیے

افسوس کہ اسوقت مسجد آنے سے پیشتر سیر میں [illegible] کی طرح بخوشی
درد شروع ہوگیا ہے ارادہ تھا کہ ہوں کہ کھانا نہ کھاؤں اور
جلد نماز عشاء سے فارغ ہوکر سو جاؤں۔ اسکا شوق ... رہا ہے
کل بعد نماز جمعہ ہو جائیگا اور پھر شام کو۔ والسلام

ندوہ ناغہ ہونے نہ دونگا

بجامعہ

عزیزی العزیز	السلام علیکم

بریلہ عیدگیلہ - مضمون - ہوں ۔۔۔۔۔ ایسے فاضل ہیں - انکی کوشش

اللہ نتیجہ خیز ثابت کرے	شاید ہو سکتی تما ہیں خود بھی

اور ٹکہ معلوم ہے کہ وہاں کون کام میں - سہروردی کو لکھا

ابوالکلام آزاد
۳ ۔ ۔ سنہ ۱۹۵۸

عطیہ : ایم ۔ اے ۔ ذکریا ۔۔۔ بھاگلپور
بتوسط : محمود واجد

[illegible]

عزیزی و صدیقی السلام علیکم آپکے لئے ایک صورت نکلی ہے

کلکتہ میں اسلامی یتیم خانہ ہے اسمیں بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کیلئے بیس روپیہ

کی ایک جگہ ہے وہ آجکل خالی ہے میں نے سکریٹری کو لکھکر آپکے لیے گنجائش

نکالی ہے اور بیس کی جگہ پچیس (۲۵) منظور کرایا ہے - مکان بھی ملنے

کی صورت ملیگی - بقیہ وقت میں آپ اپنے اشغال جاری رکھ سکتے ہیں -

اگرچہ اس جگہ کیلئے انگریزی کی شرط نہیں ہے لیکن مجکو ایسا یاد پڑتا

ہے کہ اپنے انگریزی بھی پڑھی ہے چنانچہ میں نے یہ بھی کہدیا تھا -

منتظمین یتیم خانہ مذہبی اعتقادات میں ناواقف ہیں اور ضعیف

کے عاشق سابق معلم کو اسی جرم میں نکالا گیا کہ وہ مولود اور قیام

کے مخالف تھے - میں نے کہدیا ہے کہ آپ بھی حنفی اور نقشبندی

طریق میں بیعت کردہ ہیں پس ان جزئیات کا خیال رکھیے -

آپ فوراً بنگلور سے روانہ ہوکر سیدھے کلکتہ [illegible] پہنچیں اور

مرزا احمد علی کارکن یتیم خانہ لیتی نمبر ۳۰ لوور چیت پور روڈ
سے جا کر ملیں اور میرا خط دکھلائیں ۔

بالفعل موجودہ جگہ غنیمت ہے، اسے منظور کرلیجیے ۔

اس کے بعد ان شاء اللہ عجب نہیں کہ فقیر کا بھی کلکتہ جانا ہو، اور
تمام امور عمل میں آئیں ۔ [illegible]

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

۲۲ ذیقعدہ ۱۳۴۱ھ

رانچی

۳۰۰

۵ ڈورک گنج – رانچی

۲۸۶

۲۰ اپریل –

برادرم السلام علیکم

اپنے ارادہ اور قیام سے اطلاع دیجیے – اب کچھ دنوں رہیں گے یا آنے کا قصد ہے ؟

اللہ تعالیٰ کی رحمت آپ کے شامل حال رہے –

ابوالحسن علی ندوی

فوری

صدیق مکرم

افسوس ہے آج شام کو بھی ایک ضروری کام نکل آیا

سے ملاقات نہ ہو سکیگی -

دعوت دینی پڑی ہے مجبوراً وہیں رہوں گا -

~~انشاء~~ اسلیے آپ حضرات آج

زحمت نہ فرمائیں اور دوشنبہ کو

انشاء اللہ کل ملاقات

کیلیے تشریف لائیں -

ہو سکیگی -

ابوالکلام

[illegible]

عزیز الالباب السلام علیکم

[illegible] خیریت اپنے [illegible] کہ [illegible] جواب [illegible] رکھا

آپکی علالت کا حال پڑھکر نہایت قلق ہوا اللہ تعالیٰ فضل کرے

فرماتا ہے اور آپکا سوا چارہ سازی کیا کر سکتا ہے کہ [illegible] المصطفیٰ [illegible]

[illegible] پیٹ کوشش کی کہ زیادہ عرصہ تک [illegible] خالی رہے

گو رسید وارثوں کی ہوں شاید [illegible] بعد دو کو [illegible]

بہرحال صحت مقدم ہے اور خدا کے خزانوں میں

رزق کی کمی نہیں ان شاء اللہ وہ کوئی اور صورت پیدا

کردیگا۔ ملک صاحب کو لکھدیا ہے نیز

دوا خانہ کو لکھدیا کہ دوا آپکو بھیجدے اور قیمت

مجھ سے وصول کرلے بہرحال [illegible] سے تکلیف [illegible]

خدا آپکو [illegible] [illegible] محمد اقبال ١٢ جولائی [illegible]

[illegible]

[illegible]

۳۱۴

[illegible]

[illegible] نہیں آج

دیکھ کر معلوم ہوا کہ [illegible] جواب نہیں آیا ۔

الحمد للہ [illegible] کا معاملہ تو طے ہو گیا ہے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی

کہ اب آپ [illegible]

[illegible]

۱۸-۱-[illegible]

[illegible]

[illegible] ضمون [illegible]

[illegible] میں کون [illegible] ہے [illegible] بیان [illegible]

[illegible] اگر بیان [illegible]

[illegible] اگر [illegible]

[illegible] میں [illegible] کرو گا

[illegible] ہے کہ یہ [illegible]

[illegible] اس [illegible]

[illegible] نہیں [illegible] میں [illegible]

[illegible] اس کا [illegible] اپنے لیے ضرور [illegible]

[illegible] ہے - میں [illegible] اس کو [illegible]

یہ بات نہیں ہے کہ [illegible] میں [illegible] کرو گا [illegible]

[illegible] طبع [illegible] ورنہ [illegible]

ہے دونوں حالتوں میں خوش ہوں - [illegible]

علاقہ کے دائرہ سے خارج ہیں - [illegible]

میں ہوں [illegible]

عزیزہ رضیہ سلمہا اللہ — السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ [illegible] اور [illegible]

[illegible] معنوی و صوری ہوا — [illegible] رسائل و [illegible]

[illegible] اور نہ انشاء [illegible]

[illegible] افسوس کہ اب تک آپ کے [illegible] نہیں ہوا [illegible]

[illegible] جاری — جب [illegible] سے [illegible]

[illegible] نہیں نکلا [illegible] کہ جلد سے جلد [illegible]

[illegible] ہے — اس کو [illegible] اور

[illegible] اسی لیے [illegible] کہ آپ کی [illegible] درپیش تھی —

[illegible] انشاء اللہ امید ہے کہ [illegible] ہو جائے گا — بعض [illegible]

[illegible] بعد دیگرے [illegible] اور بعض تازہ حالات کے

دل کی طرح [illegible] خالی [illegible]

[illegible] آپ نے اپنے [illegible] جو کچھ لکھا ہے

[illegible] ملتوی ہوا [illegible] خدا [illegible] ذرا دیر سے [illegible]

[illegible] آغاز [illegible] کی تکمیل [illegible]

[illegible] آخر [illegible]

[illegible]

[illegible] السلام

وقت آگیا - اور اب وہ بار آگیا اجر صبر بھی آخری درجہ

[illegible] کلام خدا سخت ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ

[illegible] ہے -

[illegible] ورد اگر ہے مگر کیا ممکن ہے کہ

[illegible] تو عمل کریں ؟ [illegible]

[illegible] السلام [illegible] رکھی گئی ہے [illegible]

[illegible]

[illegible] بھی لکھا ہے - میں فوراً اسکو

[illegible] پسند کرتا ہوں کہ جتنا بھی [illegible] دور رہیں لیکن

علاج سب پر مقدم ہے اور اسکے لیے [illegible] لازم [illegible]

[illegible] اسکا [illegible] کسی طرح بھی ممکن ہو - اور میں

بھی اب [illegible] بمجرد حصول [illegible] اول حصول اسلیے

[illegible] ولا حول

[illegible]

[illegible] ضعف [illegible] حالات لکھیں

[illegible] مرض [illegible] ضعف [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] متانت [illegible] اور فنون اہل وعیال [illegible] انکو [illegible]

[illegible] گفتگو میں ملتے رہیے [illegible]

[illegible] دوسری جگہ نکل آئے اور مجرد [illegible]

[illegible] فضل [illegible] جو حالات [illegible] وہ [illegible]

[illegible] تذکرہ [illegible] اصل [illegible]

[illegible]

دلی سے فصل ہے - نفع نقصان وہ جانیں - اگر عقل و دانش [illegible]

[illegible] اسراف میں نہ پڑتے [illegible] پرورش نہ کرتے

[illegible] بہتر تھا - شمس الوسع [illegible]

[illegible] - لیکن افسوس کہ [illegible]

[illegible] - اب وہ [illegible]

[illegible] نہیں ہو سکتی

[illegible] ہو سکتی ہے - آپ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اور کچھ

[illegible] - اور [illegible]

[illegible] حال ہے

[illegible]

[illegible] - ایک نسخہ تذکرہ [illegible] اول [illegible]

[illegible]

[illegible] آپ کی طبیعت [illegible]

[illegible] مقصود [illegible]

[illegible] اور [illegible]

[illegible] لوگوں [illegible]

[illegible] طبیعت درست [illegible]

[illegible] تمام [illegible]

اس صورت میں [illegible]

[illegible] لوگوں میں

[illegible] تمام [illegible] واجبہ

[illegible] علاوہ

[illegible] خواہ خود آپ

[illegible] خواہ کسی اور ذریعہ سے ہو اصل [illegible]

[illegible] جیسا کہ

(۱) جلسہ کے دعوتی قطعات [illegible]

[illegible]

(۲) [illegible] ان چیزوں سے [illegible]

انکے نام حسب ذیل [illegible] بالمشافہ

تقسیم کیے اور [illegible] انجمن ترقی [illegible] شرکت جلسہ [illegible]

[illegible] ایک

[illegible]

خان صاحب محمود ان کا خیال رہے کہ تار دئیے ہیں اور صرف ان مرکزوں کو

ارسال نہ کیے [illegible] جو انگریزیت [illegible] شدہ غرض سے [illegible] ورنہ

اردو خطوط [illegible] منگلور کیلئے دس خط [illegible] انگریزی میں

لیکن حسب ضرورت زیادہ صرف کر سکتے ہیں

اور دس میسور [illegible] پیشرفت [illegible] یونیورسٹی شہر کا صاحب وسایان

[illegible] نامزد کر دیے جائیں ۔

(۳) اس کے بعد ضروری [illegible] ہوا [illegible] منگلور [illegible] اور

ڈاکٹر محمود ایک [illegible] پیشرفت الہ سے ملے ۔

[illegible] منگلور [illegible] کے دانا دشمن ۔ ان

دونوں صاحبوں سے ایسے [illegible] رحمت [illegible] مقصود ہے

کہ بزرگان بانکی پور کی کوئی [illegible] ایسا ہو تو [illegible] ۔

اس قسم کے لوگوں [illegible] تاکہ ان کو خطوط [illegible] وکالت

حاصل [illegible] کر دیے جائیں اور شرکت جلسہ کیلئے اصرار

کیا جائے ۔ اور ان کی نسبت تو شرکت کا پورا یقین ہے ۔

بانکی پور کے علاوہ دیگر مقامات [illegible] ایسے افراد

دیکھیے اور [illegible] ان تک پہنچا دیجیے [illegible] مقامات

[illegible] بعد [illegible] بانکی پور [illegible] میں [illegible] اور

پر [illegible] کرنا چاہیے ۔ اور عام طور پر لوگوں کو [illegible] سے ملیے

علاوہ [illegible] کوشش کرنا چاہیے

[illegible] آپ گیا اور [illegible]

[illegible] مولوی ریاض [illegible] صاحب [illegible] مولوی [illegible] وغیرہ [illegible]

[illegible] ذکر کردہ [illegible] اسے مدد [illegible]

[illegible] ڈاکٹر محمود [illegible] کر لینا چاہیے [illegible] اس بارے میں بھی [illegible]

[illegible] علماء [illegible]

[illegible]

[illegible] انکی شرکت [illegible]

[illegible] خدمت میں رقعہ [illegible]

(۵) اگر [illegible] امر [illegible] تو وہ [illegible] شریک ہوگا

[illegible] کوشش کیجیے [illegible] اتباع [illegible]

[illegible] اور [illegible] ہے کہ اگر [illegible]

(۶) [illegible] اصحاب [illegible] حصہ [illegible] لیں

(۷) [illegible] ہے [illegible]

[illegible] شرکت [illegible] بلکہ [illegible] اطلاع رقعہ [illegible]

(۸) [illegible] کے [illegible]

ضرورت [illegible] ہوگا

(۹) [illegible]

[illegible] اور [illegible] کہ آپکی شرکت [illegible]

[illegible] وناصر [illegible]

(۱۰) ایک شخص [illegible] محمد [illegible]

[illegible] ملاقات ہو [illegible] شخص [illegible]

[illegible] الدین [illegible] اور جمعہ کے

[illegible] بلکہ

[illegible] اور [illegible] مشورہ [illegible]

[illegible] اور لکھیے کہ انجمن [illegible]

[illegible]

میرا ذکر کیجیے کہ انکو ان تاروں میں بجز آپ پر خاص حصہ اعتماد ہے
اس جانب میں کلکتہ سے تمام معززین و ممبران کونسل وغیرہ
شرکت کیلیے آ گئے تھے کہ ڈھاکہ ہے — کس قدر افسوس
کی بات ہو اگر خود صوبہ بہار کے لوگ نظر نہ آئیں ؟
حالانکہ جو کچھ ہے انہی کے گھر کا کام ہے —

ضروری

خدانخواستہ اگر آپ مجبور ہوں تو فوراً
بذریعہ تار مطلع کیجیے اور رقعہ وغیرہ دوسروں
واپس کر دیجیے گا بس

میں فی الفور اسلامیہ کالج [illegible] فضل حسین [illegible] اخلاص احمد صاحب وغیرہ کا تار آیا

لیکن چونکہ انہیں تیقن نہ تھا جواب نہ دیا گیا ۔ بہرحال حالت میں تبدیلی تو ہوئی ہے ۔ جو
اللہ کو منظور ہوگا ہو رہیگا ۔ انہیں کا وطن بے سود ہے ۔

آپ نے لکھا ہے کہ جب تمہارا جلد کلکتہ آنا ناممکن ہے تو پھر یوں ہو کر
یہ بیان مشتہر کیوں کروں؟ علاوہ بریں ہے آپ خوشی کا موجب ہوا
ارادہ ظاہر [illegible] آپکا ہے کہ بہتر ملازمت کا ذریعہ ہو سکوں ۔ لیکن یہ چیزیں
کاروبار و مقصد میں داخل نہیں ہیں ۔ بعض وسیلہ معیشت ہیں جو جائز ہو
حکم میں داخل ہے ۔ علاوہ بریں بالفرض اگر میں کلکتہ آ بھی گیا تو [illegible]
بالفعل کوئی ایسی صورت ذہن میں نہیں ۔ ذریعہ میں کوئی اس کا
مجکو آپکے منتخب کروں ۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر شے کے کام کی حالت [illegible]

موجودہ حالت میں صرف ایک تذکرہ ہے ۔ مسٹر فضل [illegible] آپکو
چونکہ وہ اپنے طور پر کام کر رہے ہیں اسلیے میں بھی دخل نہیں دے
ورنہ تو آپکے لیے یہ کام خوب کام تھا ۔ نہ دفتر کیلیے [illegible]
برخلاف اسکے سوسائٹی اخبار روزانہ نکال رہے ہیں ۔ کام اور
کا بہت اچھا موقعہ ہے ۔ آدمی ہم مشرب و ہم خیال ہیں ۔
بابت موجودہ آپکے لیے انکا بہتر کلکتہ میں لوگوں کا نہیں ہو سکتا ۔ تنخواہ
وعدہ ہے کہ مناسب ہوگی ۔ آپکو ذاتی طور پر اخبار کے کام سے دلچسپی بھی

ان تمام وجوہ کی بنا پر کسی طرح مناسب نہیں کہ ان عہدہ

[illegible] کو [illegible] دیں [illegible] فوراً [illegible] اختیار کر لیں - ان شاء اللہ موجب

بہتر ہوگا -

میں آج کل کلکتہ جلد جاؤں گا [illegible] جب [illegible] حالات معلوم ہوں

[illegible] نہیں کہ [illegible] وغیرہ کا کوئی کام [illegible] میں شروع [illegible]

[illegible] دوسری مشغولیتیں [illegible] ہوگئی ہیں اور تمام مشکلات کی وجہ

میں [illegible] ہوگا [illegible] مختلف قسم [illegible] پیش آتی ہیں

[illegible] جو [illegible] ہے [illegible] -

[illegible] کہ آپ [illegible]

[illegible] -

ابوالکلام

رانچی ۳۰ ستمبر

(۲۰)

عطیہ : ایم اے ذکریا، علیگ
بتوسط : محمود واحد

کلکتہ
۲۰ - فروری ۳۰ء

جناب من السلام علیکم آپکی پریشان خاطری سے بے خبر نہیں ہوں، لیکن مشکل یہ زمانہ بے مہر ہے اور ارباب درد کی جیب خالی ہے۔ بہر حال اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہوئی کہ آپ کیلئے سود مند ہو، آپکو اطلاع دونگا

(۱) اکبر کا ان پڑھ ہونا کوئی غلط فہمی نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعہ ہے۔ اسے کچھ ضرورت نہیں کہ اُسے تعلیم یافتہ ثابت کیا جائے۔ اسکی فطری ذہانت اور قدرتی استعداد کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ باوجود ان پڑھ ہونے کے ملک داری کی حکمت و سیاست کی سب سے بہتر مثال قائم کر گیا۔

(۲) جنوبی اور وسطی امریکہ کے آثار سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ ایک زمانہ میں تعلق قدیم براعظموں سے رہ چکا ہے، لیکن جہاں تک تاریخی وثائق کا تعلق ہے، قطعی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کولمبس سے پہلے کسی سیاح نے اسے دریافت کیا ہو۔ اندلس کی تاریخ میں دو عرب بھائیوں کی داستان ملاحی بیان کی گئی ہے، اور بعض لوگوں کا خیال ہے یہ دونوں بھائی امریکہ پہنچ گئے تھے، لیکن یہ محض ایک قیاس ہے۔ تاریخی حیثیت سے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا

(۳) ریڈ انڈینز کا اطلاق امریکہ کی وحشی اقوام پر کیا گیا ہے — اور انکی تاریخ اس وقت تک تاریکی میں ہے۔

(۴) مذہب کا مقصود انسان کی روحانی سعادت و نجات ہے اور ایک خالق کائنات کے رشتۂ عبودیت سے تمام افراد انسانی کو باہمدگر متحد کر دینا ہے — یہ سوال ایسا نہیں ہے کہ مختصراً جواب دیا جا سکے۔ بہت زیادہ تفصیل و بحث کی ضرورت ہے

ابوالکلام

کلکتہ

۲۰ / ۳۱ء

عزیزم! آپ کے خطوط مجھے ملتے رہے، لیکن میں
اب تک کوئی قطعی صورت ایسی موجود نہیں کہ اس پر
اظہار کر سکوں اور آپ کو لکھوں کہ اسے اختیار کر لیجیے۔ گذشتہ ماہ
جب کچھ دنوں آپ کلکتہ میں رہے اور کوشش میں کمی نہیں کی مگر
کوئی صورت نہ نکل سکی۔ اب جو صورت اختیار کی گئی ہے
عمل آرہی ہے۔ جیسی کچھ بھی ہو بہرحال ایک صورت ضرور ہے
جب تک کوئی دوسری صورت نہ نکلے اسے غنیمت تصور کرنا
چاہیے اور جاری رکھنا چاہیے۔ کم سے کم بیکاری تو نہیں ہے۔
اگر مجھے دکھائی دیا کہ یہاں کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے جو
آپ کے لیے کام دے سکے تو ان شاء اللہ تغافل نہیں کروں گا۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

سب سے پہلے یہ واضح ہونا چاہیے کہ حقیقتاً آج کل یہ سوال مجھ میں کیوں پیدا ہوا

~~... زندگی کی اجتماعی ...~~ ہے

کہ آیا دائمی مشغل پروگرام کو ترک کر دیا جائے اور اپنے اشغال و اعمال کو محض حوادث

و واقعات کے حوالے نہ کر دیا جائے۔ بے شک بوجود صلاحیت و قابلیت کے اپنی زندگی

میں کوئی بڑا کام انجام نہ دے سکے۔ صرف اسلئے کہ کوئی مشغل زندگی عمل ان کا

سامنے نہ تھا۔

آج بھی ہندوستان میں اخبار نویسی کی زندگی موزوں نہیں بلکہ

علاوہ وقت و صلاحیت ضائع ہوتی ہے ... بیسیوں نوجوانوں کو آگے بڑھا دیا

... اور غیر معمولی مشغل میں اپنے کام نہ پایا اور

... اسباب و وسائل پیدا ہوں ... بہت سی ... نہیں کر سکے

اور ... اول تو ایسا اہتمام چند در چند دقتوں سے

... بصورت ... شکلات و ... حاصل کر

... ممکن نہیں ...

~~... مسودہ ...~~

مسودہ ... صرف سیاسیات کیلئے وقف ہو جاتا ہے

اور ... کیلئے ترک کر دینا ہے۔

آپ کی بہترین زندگی علمی زندگی ہے اور اس شغل [illegible]

کا بہترین نمونہ سلف صالح کی حالات میں ملتا ہے (علم و اسلام)

حضرت کی [illegible] و ارشاد اور تصنیف و تالیف

کے حالات پڑھیے۔ درس و تدریس کا وعظ و ارشاد [illegible]

وقت گزرتا ہے اور اس طرح آپ کی زندگی ہر ایک

مضمون حضرت [illegible] کو ہر ایک [illegible] ۔ عوام کی اصلاح

وقت میں علم اور [illegible] خدمت انجام دیتی تھی

درس و تدریس [illegible] مستقبل [illegible]

وعظ و تذکیر [illegible] اور علم [illegible] و مذہب کی

[illegible] اپنی ضرورت [illegible] تصنیف

ہے ۔ تصنیف و تالیف

خدمت دائمی [illegible] اور جامع [illegible] کے

مدرس ہیں

میں مستعد [illegible] سلوک [illegible] تصنیف

والمطالب غزالی مدرسہ [illegible] مسلم

زندگی [illegible] اسلام کی [illegible] علمائے

اور [illegible] جامع [illegible] واعظ [illegible] ایک [illegible]

[illegible]

کیلئے [illegible]

جو اپنی زندگی میں ان تینوں شغل [illegible] رکھتا ہو ۔

[illegible] صبح کو درس دیا، بقیہ اوقات میں تصنیف و تالیف، اور مجالس
وعظ میں وعظ و تذکیر کا سلسلہ جاری۔ جب یہ چیز مفقود ہوگئی اور ان
تینوں اجزاء کو الگ الگ کر دیا گیا، واعظوں کا طبقہ
الگ ہو گیا، مصنفین کا الگ، اور معلمین کا الگ، اس وقت
سے [illegible] سلسلۂ ہدایت منقطع، وعظ و ارشاد کا عمل مفقود ہو گیا۔
میں چاہتا ہوں کہ آپ کمر ہمت مضبوط [illegible] اور
عزم راسخ کر کے اس زندگی کیلئے تیار ہو جائیں۔ آپ کے لیے پہلے سے موقع
حاصل ہے۔ [illegible] چھوٹا سا گاؤں [illegible] ایک وسیع حلقہ ہے
لیکن علم و ہدایت سے یکسر محروم۔ چونکہ ایک گوشہ میں واقع
ہے اسلیے علماء [illegible] کی آمد و رفت بھی کمتر ہوئی، اور جہل و ضلال
نے اور زیادہ [illegible] ڈال رکھا ہے۔ آپ ادھر دو سال کے عرصہ
[illegible] سے [illegible] حالات تبدیل ہوئے ہیں اور اللہ نے حقیقی شوق دل
[illegible] وطن و [illegible] کا قرض ادا کر رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک
[illegible] غیر معمولی زندگی پیدا ہوگئی اور لوگوں
نے اپنی حالت کو محسوس کیا

۲ ب شدید ضرورت یہاں اس کی ہے کہ ایک عالم صالح مستقل طور پر قیام کرے
اور جو تبدیلی ہوئی ہے وہ ناشنیدہ ضائع نہ جائے۔ اگر ایک شخص
یہاں قیام کرکے ~~[illegible]~~ پورے خطہ کی دینی پیشوائی و رہنمائی
اپنے ہاتھ میں رکھے گا اور باقاعدگی سے مسلمانوں کے ایک گروہ عظیم
کی ہدایت و ارشاد میں مشغول رہے گا۔ دور دراز علاقوں میں
غلط رسوم کی کثرت اور دعا جلسہ فساد و جہل کی معاونت سے
اصلاح و ہدایت کا کام بہت مشکل ہوجاتا ہے اور کوئی نظام
قائم نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ بات بالکل نہیں ہے اور ابتدا سے
بنیاد صالح پڑ گئی ہے اور اب جنس عبادت بنا کر
اور جنس بنائی جا سکتی ہے
بس ہدایت ~~[illegible]~~ و دعوت کے ~~[illegible]~~ عمومی سلسلہ سے
یہ ایک گروہ عظیم اتباع و اقتدا کے لیے موجود ہے بلا
شرکت غیرے۔ اب ~~[illegible]~~ ضرورت ہے یعنی مستقل
درس و تدریس تھوڑے حال یہ ہے
[illegible] صاحب انجمن اسلامیہ کا بیان

نقصان و دشواری اور مدرسہ کا قیام ہوا تو ہر ایک کو اپنی سمجھ کے موافق چھوٹے چھوٹے نقشے دور پر [illegible]
کرنے پیش نظر ہیں ۔ آج تک نسیس مدرسے اصلاح نصاب کا سلسلہ [illegible]
مد نظر درپیش ہے اور سکھ کا سنی ہوا اگر یہاں ایک کامل قائم ہو
اور اوسنی تجربہ پیش نظر نصاب اصلاح یافتہ کا کیا جاتا تو
یہ ایک عظیم الشان کام ہوگا
اسکا اثر تو ملک میں مدارس لینے کے اصلاح نصاب پر پڑے گا ادارہ [illegible]
تعلیم مدارس کی کو توجہ ہوئی اور اسکے لیے مسکوا آیا نصاب جامع مرتب
کرنے کی طرح اس بات سے مشہد کو ایک ہوئی اور مدرسہ کو اسی اصول
پر قائم کیا گیا ۔
مدرسہ کا نصاب جونیر اور سینیر دو درجوں میں منقسم
اور پوری مدت تعلیم چودہ سال ہے ۔ ~~[illegible]~~ حرف و نحو اب
~~فارسی~~ پہلا درجہ آٹھ سال کا ہے جس میں حرف و نحو عربی مکمل قسم ادب
پشتو ۔ فارسی مکمل قسم حساب و ہندسہ قسم ترجمۃ القرآن کامل
تاریخ ہند تاریخ اسلام بالاجمال اور انگریزی ادب ۲ ہے دوسرا درجہ
چھ سال کا ہے اور تکمیل ادب بہ نحو و اسلوب قدماء علوم القرآن علوم [illegible]

۷ فقہ حنفی، فقہ جامع، اصول، توحید، [illegible] کلام، اسرار

الدین، علم اخلاق، تاریخ عام، تاریخ اسلام، تاریخ ملوک

مسلمین، تاریخ مذاہب و طوائف اسلامیہ، معقولات

قدیم (علم الکلام [illegible] اور [illegible]) اور انگریزی علم ادب ہے

اسکے بعد درجہ تکمیل کے دو سال کسی ایک فن یا چند فن پر [illegible]

انگریزی میں ہے

اعلیٰ مدرسہ کی ابتدا [illegible] کھولدیا گیا ہے عمارت

اخیر اپریل تک مکمل ہو جائیگی اور پھر کوشش کی جائیگی کہ تمام درجات

شروع ہو جائیں۔

اب چونکہ یہ مدرسہ انجمن اصلاح تعلیم اسلامی [illegible]

اسلئے [illegible] [illegible] شمالی [illegible] بلکہ تمام ہندوستان [illegible]

کا [illegible] ہے اسکا نام [illegible] تجویز رکھا اور

[illegible] و ہند کے طرف سے اطمینان ہے

آخری چیز شغل تصنیف و تالیف ہے اور یہ بہت ضروری ہے کیونکہ
حال یہ ہے کہ علمی کام کے لئے [illegible] اور ذرائع اور دیگر تمام [illegible]
میں ہندوستان میں اسکے اسباب و سامان کی [illegible]
کہاں سامان ہے؟ صورت یہی ہے کہ کوئی ایک شغل تصنیف
پیش نظر رکھا جائے اور اسکے مواد و سامان کو فراہم کیا جائے۔ اسکا یہ
میں موجود [illegible] جب [illegible] کتب [illegible] نہ [illegible]
ہے اور اس [illegible] ترتیب
[illegible] و مواد کیلئے [illegible]۔
یہ جو آپ نے سوال لکھا ہے کہ [illegible] چندہ کی فراہمی کیلئے
کیا طریقہ ہو؟ تو میرا کوئی جواب نہیں ہے۔ اگرچہ کہ چندہ کی
فراہمی کے جھگڑے سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں اور نہ اسکے لئے دورہ
میں تضییع وقت ہے۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں رکھیں۔ [illegible]
سے مقصود یہ تھا کہ [illegible] ضرورت ہے [illegible] وعظ و ہدایت
کا سلسلہ بھی جاری رکھئے اور جماعت کی اصلاح و تربیت [illegible]

میں چاہتا ہوں کہ میری موجودگی میں ایک کمیٹی بنا دی جائے اور
بزرگوں کو اس میں شامل کیا جائے۔ اس کمیٹی
میں ایک عالم، مفتی، قاضی، امام جمعہ اور ایک
دو سکھ [illegible] تعداد مشیر ہوں گے۔ اور تمام شعبے صرف اسی
کمیٹی کی طرف رجوع کریں گے
[illegible] میں [illegible] انتہائی
[illegible] دور [illegible] میں [illegible]

چونکہ ان کی حالت کا علم [illegible] ہوا اس لیے معارف دائمی میں
کمیٹی [illegible] اور سیکرٹریٹ ان کی [illegible] واقف [illegible]
[illegible] کے لیے چاہیے [illegible] مگر [illegible] بعد یہ [illegible]
[illegible]

بہتر ہے کہ آپ سیکرٹریٹ ایک ماہ کے لیے وقف کر دیں اور [illegible]
[illegible] مگر [illegible] اندازہ ہو جائے گا۔ اگر کوئی
[illegible] ان کی [illegible] نہیں [illegible] معارف [illegible]
اور [illegible] واپس [illegible] جائے گا۔ ایم-اے-ز[illegible]

بسم اللہ

عزیزہ ... سلام مسنون۔ جو حالت اپنی آپ نے لکھی ہے تشخیص و تعیین کیا تو
ہر ایک علم نہ تھا لیکن یہ معلوم تھا کہ اس قسم کے حالات میں ضرور آپ مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ
ہمارے حالات کو موجب صلاح و فلاح فرمائے۔ یقین کیجئے کہ دنیا میں انسان کے تمام
قویٰ و فضائل کیلئے اصلی آزمائش گاہ یہی حالات ہیں۔ تلوار اور آگ میں
کوئی آزمائش نہیں۔ سب سے بڑی آزمائش نفس و جذبات کی ہے۔ اگر عزم راسخ اور
قوت ایمان و جانان سے کام لیا جائے تو اس آزمائش میں کامیابی کچھ مشکل نہیں۔ والذین جاہدوا
فینا لنہدینہم سبلنا و ان اللہ لمع المحسنین۔ میں اپنی دعاؤں میں کبھی اس معاملہ کو نہیں بھولوں
گا۔ اللہ تعالیٰ آپکو اس آزمائش میں کامیابی کی توفیق عطا فرمائے۔

ہمارے نزدیک موجودہ حالات میں بجز دو راہوں کے تیسری راہ کوئی نہیں:

(۱) عزم صادق اور ہمت کامل سے کام لیجئے۔ انشاء اللہ عزم پیدا کیجئے اور اللہ سے
مددگاری طلب کیجئے۔ زندگی چند روزہ ہے اور سارے مطلوبات نفس وہم و خیال سے زیادہ نہیں۔
کیوں اس بند و قید میں گرفتار رہئیے! جو دل فاطر السموات والارض کے
عشق کا متحمل ہو سکتا ہے اسکو فانی و وہمی آرزوؤں میں گنوانا اور نیت و حیات
کو ضائع کرنا ہے۔ قلب مومن جس چیز کو بھی ہے انداد و طواغیت میں داخل ہے
فلا تجعلوا للہ اندادا و انتم تعلمون۔ اور یحبونہم کحب اللہ والذین آمنوا اشد حبا للہ۔
محبت اسی کا حق ہے۔ تو سب سے زیادہ محبوب چیز کو اسکے لیے چھوڑ دینا چاہیے
حتی تنفقوا مما تحبون۔

پس اصل و حقیقی اور ابدی و جاودانی راہ تو یہ ہے کہ اللہ سے دل لگا ہے الا بذکر اللہ
تطمئن القلوب اور ایک مرتبہ پوری قوت و عزم کے ساتھ انی وجہت وجہی للذی فطر السموات
والارض حنیفا اور لا احب الآفلین کا صدا لگا کر اس خیال کو دل سے نکال دیجیے -
اگر آپکی جانب سے عزم ہوا تو توفیق الٰہی ضرور عطا ہوگی - اور انشاء اللہ
ایک جاں داکر کا اجر عنداللہ - غور کیجیے - آپ متاہل ہیں - مجرد نہیں -
پھر صاحب اولاد اور حقوق اہل و عیال کی کشمکش سے دوچار ہیں - کوئی ضرورت شرعی و اخلاقی
ازدواج ثانی کیلیے باعث نہیں - پھر ایک طرف اولاد و تعلق معیشت کی بے سروسامانی
دوسری طرف لوازم و مصارف اور اہل و عیال کا ولولہ - ان حالات میں اگر یہ معاملہ انجام پایا تو
کیا نتیجہ نکلیگا ؟ ممکن ہے ابتدا میں مسرت حصول مطلوب کا ہیجان تمام مشکلات پر غالب
آ جائیگا لیکن بہت تھوڑی دیر کیلیے - اسکے بعد فوراً کشاکش و کشمکش اور مشکلات
و صعوبات کا سلسلہ شروع ہوگا اور جیسا کہ اکثر حالتوں میں ہوا ہے تعجب نہیں
کہ خود اس معاملہ سے دل برداشتہ ہوجائے - یہ کشمکش زندگی کیلیے سب سے بڑی مصیبت ہے -
ابھی ایک گھر کیلیے گزارا احساس نہیں ہوسکتا - یہ عام قاعدہ ہے لیکن جب حالت پیش آگئی
تو کیوں علاج سود مند ہوگا - سب سے زیادہ یہ کہ پوری اطاعت داری کے ساتھ خود
اس شخص کے مصالح پر غور کرنا چاہیے جس کی محبت میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے - وہ ایک معصوم
لڑکی ہے - دنیا اور دنیا کے مصائب سے بے خبر - کیا یہ بہتر ہوگا کہ آپ اسکو ایک
ایسی زندگی میں ڈال دیں جسکے مصائب و مشکلات کا ہم کو ابھی علم ہے ؟ اور ہم جانتے
ہیں کہ طمانیت و آرام حیات جو اسکے لیے ہے نہ کر سکینگے

پھر اپنے چہرہ کا خیال کیجیے - بے شک مجھے معلوم ہے آپکو
گو یہ شکایت نہیں کہ محبت و وفا کا یہ تقاضا ہونا چاہیے
کہ بلا وجہ اُسکی تمام بقیہ زندگی تلخ کر دی جائے؟

میری شادی کو دس سال ہوگئے - یقین کیجیے کہ میرے لیے ایک نہیں
متعدد وجوہ و بواعث شرعاً و عقلاً ایسے موجود ہیں کہ اگر ان میں ایک باعث
بھی کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہوتا تو وہ دوسرا نکاح کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ
کرتا - مگر باوجود ہمہ میں نے ایک لمحہ و ثانیہ کیلیے بھی اسکا قصد نہیں کیا اور
نہ کرونگا - پھر ساتھ ہی دوسروں کی جانب سے اس بارے میں اسقدر مجبور کن ترغیبات
پیش آتی رہیں کہ عزم کا باقی رکھنا بہت مشکل تھا تاہم میرے ارادے
میں تزلزل نہ ہوا -

صداقتِ حیات بجز قربانی کے اور کچھ نہیں ہے - اگر ہم اپنی
خواہشوں کو قربان نہیں کر سکتے تو پھر نہ دنیا میں محبت ہے نہ سچائی
اور نہ انسان

آپ کہینگے دل کسی کے بس میں ہے؟ کون کسی پر جو جاتا ہے
جو کسی کے بس میں نہیں ہے - دل سے اوپر بھی ایک طاقت ہے آنکھوں کو جگا دیجیے
سونے نہ دیجیے - وہ دل کی نگاہ جس طرف چاہیگی موڑ دیگی

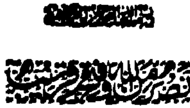
(۱) اس بات میں کثرت کے ساتھ عواقب و نتائج پر غور و تفکر، مطلوبات نفس کی حیثیت کو
اور بے حاصلی کا تصور، کثرت استغفار و دعا، اور مشغولات دینیہ ان شاء اللہ
نہایت سود مند ہوں گے۔ اگر ایک دعا بھی پورے اضطراب و التہاب کے ساتھ
نکل گئی تو پھر کوئی خطرہ باقی نہیں رہ گیا۔ صرف اس حقیقت کی ضرب اگر ایک دفعہ
پوری طرح لگ جائے کہ طلب و شوق اور اضطراب طلب و اشک چشم جیسی نعمتیں ایک
وہمی و خیالی مطلوب کیلئے کس طرح ضائع جا رہی ہیں، اور اگر یہ سب کچھ اللہ کیلئے
ہو جائے تو پھر یہ وجود خاک کیا کیا کچھ نہیں کر سکتا، تو پھر اس آزمائش
سے نکل جانے میں ذرا بھی رکاوٹ پیش نہ آئیگی۔

(۲) لیکن اگر ضعف عزم ساتھ نہ دے اور اس راہ کی قوت نہ ملے تو پھر
دوسرا مشورہ یہ ہے کہ تمام ملازمت چھوڑ کر فوراً بنگلور چلے جائیے
اور جس طرح بھی ممکن ہو اُس کے والدین کو راضی کر کے نکاح کر لیجیے۔
اور متعدد مشکلات و مہالک پیش آئیں گے، انکو گوارا کر لینے کا قطعی فیصلہ
کر لیجیے۔ یہ بات پھر بھی ہزار درجہ موجودہ اضطراب نفس سے
بہتر ہوگی۔ اقلاً بہت سے روحانی نقصانات مفقود ہو جائیں گے۔
غرضیکہ یا فوراً بلا تاخیر اس خیال کو بالکل دل سے نکال ڈالیے۔ یا فوراً بلا تاخیر
جا کر اس سے نکاح کر لیجیے۔ تیسری حالت کوئی نہیں۔ اور اگر اختیار کی جائیگی تو نہایت مضر ہوگی۔
والعاقبۃ للمتقین۔
ابوالکلام

Reference No..............

TELEGRAPHIC ADDRESS
"KHILAFAT"







تار کا پتہ "خلافت"　　**مجلس خلافت صوبہ بنگال**　　۱۹۲ء　　کلکتہ

Bengal Provincial Khilafat Committee

...lam Azad.	*President.*	12 ZAKARIA STREET,
...ned B. L.		
... Vakil High Court		
...n B. L., Burdwan	*Secretaries*	*Calcutta*.............................192
...m Khan.		
...madi & Zamana.		

محبی الجلیل　　السلام علیکم

مولوی محمد زکریا بھاگلپوری ایک نہایت مخلص و صالح
قومی خدمات میں سرگرم رہتے ہیں۔ اب انہیں تحصیل طب کا
شوق ہوا ہے اور طبیہ کالج میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔
امید ہے کہ جناب پرنسپل صاحب کے نام کوئی ایسی تحریر عنایت
فرما دیجئے جس میں ممکن رعایتوں کی سفارش ہو

مخلصکم الوفی
ابوالکلام

یہ خط زکریا بھاگلپوری کے نام تو نہیں لیکن ان سے متعلق ضرور ہے۔ لہٰذا ان کے تعارف سے قبل مولانا آزاد کے قلم سے ان کا تعارف پیش خدمت ہے

ادارہ

زکریا بھاگلپوری کے بارے میں

محمود واجد



صوبہ بہار اور خصوصاً بھاگلپور کی سرزمین سے کسی علمی اور ادبی پودے کا جنم لے کر کامیابی سے پھلنا پھولنا حیرت سے کم نہیں۔ یہی حشر اس پودے کا ہوا جسکا ذکر یہاں کرنا چاہتا ہوں۔ بہر حال اس نے کسی طرح اپنے قدم یہاں جمائے۔ اس کے سائے میں کتنوں کو پناہ ملی تشنگانِ علم و تحقیق کی پیاس بجھتی رہی۔ وہ ایک مشعل بنا رہا جس سے دوسرے کسب ضیا کر کے روشنی کا مینارہ بن گئے لیکن وہ شخص اپنی ذاتی زندگی میں "چراغ تلے اندھیرا" کے مصداق رہا اس نے اپنے علم و فضل سے کوئی بھی معاشی یا معاشرتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہاں خود پریشان حال رہ کر دوسروں پر خوشحالیاں بکھیریں۔ اوروں نے شہرت اور مرتبے پائے اور اسے گمنامی اور بے کسی ملی۔ اس شخص کو کم و بیش چودہ سال مولاناؒ کی معیت میں رہنے کا فخر حاصل رہا ہے۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ایک بڑے شخص سے رشتہ جوڑ لینا ایک عام سی روش بن گئی ہے۔ یہ شخص بذاتِ خود نصف درجن بیرونی اور چوتھائی درجن ملکی زبانوں کا ماہر ہے۔ علم، ادب، فلسفہ، تاریخ اور مذہب جیسے متنوع موضوعات کے سلسلہ میں بڑی اچھی بصیرت رکھتا ہے۔ کسی زمانہ میں مشہور صحافی رہ چکا ہے۔ اس کی خطابت نے کافی شہرت پائی ہے، مولانا محمد علی، مولانا آزاد، مولانا آزاد سبحانی، خواجہ حسن نظامی اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ساتھ مل کر ملی اور ملکی کام کرنے کا اسے فخر حاصل رہا ہے۔ ملک دشمن عناصر کو وطن کی سرزمین سے اکھاڑ پھینکنے میں اس نے کافی حصّہ لیا ہے۔ سراغرسانی، تحریک، مجادلہ اور پھر قید و بند کی اذیتیں برداشت کی ہیں۔ الغرض وہ سب کچھ کیا ہے جو اس وقت کی سچی ملکی خدمت کے لیے ضروری تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ارباب بست و کشاد جن کے ساتھ یہ ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے، اہل علم جنھوں نے ان کے آگے زانوے ادب تہ کیا اور وہ سارے لوگ جو ان کے زیر بار احسان ہیں ان کے آڑے وقت میں کبھی کام نہ آسکے۔ کسی کی نظر اس دیے پر نہیں پڑتی جس نے کبھی اپنی ضیا سے ذہنوں کے چراغ روشن کیے تھے اور آج تنہا نحیف و نزار کاندھوں پر سارے کنبے کا بوجھ سنبھالے حالات کے تند جھونکوں کے خلاف لڑ رہا ہے۔ اس شخص کا نام مسٹر ابو عمر

محمد ابراہیم رکھا ہے۔ انھیں عرف عام میں مسٹر صاحب[1] کہتے ہیں۔ ان کی حیثیت مولانا کے عزیز دوست، شاگرد اور کئی طرح کی ہے جیسا کہ ان خطوط سے ظاہر ہوگا جن کا ذکر میں آگے کروں گا۔ ان کا اور مولانا کا ساتھ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء تک رہا ـــــ کلکتہ، رانچی اور پھر کلکتہ میں ایک ساتھ رہے۔

مسٹر صاحب اپنی خودنوشت سوانح عمری[2] (غیر مطبوعہ) میں فرماتے ہیں ـــــ "میں آٹھ برس کا تھا کہ ۱۸۹۷ء میں پہلا زلزلہ ہوا۔ میرے والد جناب شیخ دیانت اللہ احمد صاحب رئیس انگریزی آباد مالدہ (بنگال) کے ملک التجار اور جامع مسجد کے امام تھے۔ آپ مع بال بچوں کے ہجرت کر کے بھاگل پور (بہار) آئے۔ محلہ تاتار پور میں زمین خرید کر مکان بنوایا... میری شادی بتیس برس کی عمر میں بمقام راج محل ضلع سنتھال پرگنہ (بہار) میں رئیس شہر حاجی رستم کی دختر خوردے ہوئی۔ خاکسار کو تین لڑکیاں اور تین لڑکے ہیں (اس وقت دو لڑکیاں۔ ایک بیوہ دوسری شادی شدہ اور ایک لڑکا ہے جو میٹرک پاس کر کے برسوں سے بیکار ہے)۔ میری تعلیم ابتداءً مقامی مدرسہ نور الہدیٰ میں ہوئی۔ فارسی ہر سہ دفتر ابوالفضل وغیرہ اور عربی میں منطق، فلسفہ، ادب، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں انتہا تک رہی ہے۔ سند بھی موجود ہے۔ فن مناظرہ کی تعلیم مدرسہ الہیات کانپور میں رہی۔ اس وقت اس تعلیم گاہ کے پرنسپل مولانا آزاد سبحانی تھے۔ تفسیر قرآن کی تعلیم دارالارشاد کلکتہ جس کے پرنسپل حضرت علامہ ابوالکلام آزاد تھے۔ اس خاکسار کو عیسائی، آریا، قادیانی کے رد میں خانقاہ رحمانیہ مونگیر (بہار) میں ایک عرصہ تک کام کرنا پڑا۔ تصوف میں حضرت علامہ محمد علیؒ سے شرف تلمذ رہا اور آپ ہی سے بیعت کی نعمت حاصل ہوئی... آپ کے بعد عنایت و کرم فرمائی کی نظر حضرت علامہ ابوالکلام آزاد کی رہی ـــــ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء تک حضرت علامہ کے ساتھ کلکتہ رانچی پھر کلکتہ میں رہنا پڑا۔ مولانا کے قائم کردہ مدرسۃ العلوم رانچی کا ایک عرصہ تک صدر المدرسین رہا.... ۱۹۱۱ء سے بذریعہ خطابت و صحافت تا ایں دم جہاد کر رہا ہوں ـ خلافت، کانگریس اور دیگر انجمن اور پبلک اجتماع میں لاکھوں سامعین کے درمیان تقریریں کرنی پڑتی تھیں۔ اخبار زمانہ" کلکتہ "جمہور" کلکتہ "مسلم گزٹ" کلکتہ اور دیگر اخبارات کے ایڈیٹوریل میں کام کرتا رہا۔ "الہلال" اور "البلاغ" کے اسٹاف میں بھی علمی خدمت انجام دے کر شرف و عزت حاصل کرتا رہا۔ "البشیر" پٹنہ کے ایڈیٹوریل میں میرے مضامین شائع ہوا کیے ہیں۔ "مومن گزٹ" کانپور کا ڈھائی سال تک چیف ایڈیٹر رہا۔ ٹیگور کے شانتی نکیتن سے اور بنگال اسٹنڈرڈ پر کئی تمغے حاصل کیے۔ بھاگل پور لوکل کالج کے پروفیسروں کو قدیم اسلامی تاریخ کی تعلیم دیتا رہا۔ مکھن لال رائے[3] چودھری اللہ شاستری ایم اے، بی ایل، پی آر ایس کو میں نے شروع سے اردو، فارسی، عربی، تاریخ، قرآن اور اسلامک کلچر وغیرہ کی تعلیم دی

1۔ مسٹر صاحب کا اگست ۶۴ء میں انتقال ہوگیا حالانکہ کرانچہ تکمیلی مراحل تک وہ زندہ تھے۔ م۔ د 2۔ اس کا مسودہ میرے پاس موجود ہے۔ 3۔ ابھی کئی سال ہوئے کہ مکھن لال رائے چودھری کا انتقال ہوگیا۔ م۔ د

اور میری ہی سعی موعود سے "دین الٰہی[1]" انگریزی میں لکھی گئی اور پی آر ایس کی ڈگری اور سونے کا تمغہ بابو صاحب کو ملا۔
میری پوری سعی سے "اسلامی فی الاسلام[2]" کی کتاب انگریزی میں لکھی۔ پھر "اسٹیٹ ریلیجنس آف دی مغل[3]" لکھا۔ پھر اسلامک کلچر کی
تعلیم کو مکمل کرنے مصر بھیجے گئے۔ ان دنوں کلکتہ یونیورسٹی کے اسلامک ہسٹری اینڈ کلچر کے صدر ہیں۔ ڈاکٹر کے۔ کے بوس
نے دکن کی تمام فارسی تاریخیں مجھ سے پڑھ کر "تاریخ بیجاپور[4]" لکھی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے علاوہ اور

لوگوں نے بھی بہت کچھ پڑھا اور سیکھا ——!

کانگریس کی شرکت سے پہلے سودیشی تحریک میں بابو شیام سندر چکرورتی ایڈیٹر "سرونٹ" بابو سریندر ناتھ بنرجی
ایڈیٹر "بنگالی" اور بابو بپن چندر پال بانی بم کے ساتھ کام کرتا رہا۔ یہ ۱۹۰۴ء کی بات ہے۔ ۱۹۰۶ء میں سودیشی تحریک
میں اہم سے اہم خفیہ کام انجام دینا پڑا۔ بج بج کے گولی کانڈ میں ماخوذ ہوا۔ رانچی کے ڈورنڈہ برٹش فوجی کیمپ میں
انگریزوں کے خلاف کام کرتا رہا۔ کلکتہ، رانچی، کانپور وغیرہ میں تحریر و تقریر کے ذریعہ سیاسی کام انجام دیتا رہا۔ پھر
راشٹرپتی راجندر پرشاد کی ہدایت سے مسلم ماس کنٹاکٹ کیلئے پٹنہ اور بھاگل پور میں کام کیا۔ ۱۹۴۲ء میں بسہ پور (بھاگل پور)
جو بہرحال نوجوں کے حلقہ قید میں تھا وہاں صدر کانگریس کمیٹی کی ڈاک آغا صاحب بن کر لے جایا کرتا تھا۔ اسی سال
پولیس کی تلاشی سے میری تمام کتب مثلاً "پورانی انسائیکلوپیڈیا" "بک آف نالج" دس جلدیں "ہسٹری آف نیشنز" دس جلدیں
وغیرہ کمرہ سے ہنگامہ انگریزی کتب ضبط کرلی گئیں۔ اس کے قبل ۱۹۱۱ء میں جلیان والا باغ کے ہنگامے میں بھی پکڑا گیا
تھا نارنگی اور ہفتہ بھر جیل میں رہا۔ ۱۹۲۳ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں بھی برسرکار رہا"

یہ تھی داستان اس منحنی سے شخص کی جس کی ہستی معدوم سی نظر آتی ہے۔ جو پتھر کا جگر چیر کے جوئے شیر لانے چلا
تھا مگر جوئے شیر اوروں کو مل گیا اور اسے تیشہ بھی نہ مل سکا کہ رسم عاشقی نباہتا۔ اب تو نہ جینا ہے نہ مرنا ہے زندگی
ایک بے برگ شجر ہے جس سے درد کی کونپلیں موسم گل میں بھی پھوٹتی ہیں! یہ حضرت مسٹر زکریا بھاگلپوری مقامی اسکول
(لڑکیوں کے اسکول) میں ہیڈ مولوی ہیں —— اور مولوی آپ جانیں محض مولوی ہوتا ہے چاہے اس نے کتنے ہی علوم
کے خزینے انڈیل دیے ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے ان سے جب میری پہلی پہلی ملاقات بھاگل پور کے ایک کتاب فروش
کی دکان پر ہوئی تھی تو وہ کسی سے محو گفتگو تھے۔ ان کے ایک جملے نے مجھے چونکا دیا —— "جب تک ہم یہ نہ جانیں
گھر سے اسکول تک جو چیزیں ملتی ہیں ان کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے تو علم کیا ہوا!" پھر میں اکثر ان کے یہاں
آنے جانے لگا اور جب ان کے لڑکے کو پڑھانے کا ذمہ لیا تو مجھے اور قریب سے ان کے ماحول کو دیکھنے کا موقع ملا

---

[1] دین الٰہی۔ ایم ایل رائے چودھری [2] ریفارمز ان اسلام ایم ایل رائے چودھری [3] اسٹیٹ ریلیجن آف مغل۔ ایم ایل رائے چودھری [4] ہسٹری آف بیجاپور
کے۔ کے۔ بوس۔

جس میں گھٹن زیادہ تھی اور شگفتگی کم ——!

ادب، تاریخ، مذہب، فلسفہ، زبان، سائنس پر اکثر نادر کتب ان کی مختصر سی ذاتی لائبریری میں جمع ہیں۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں وہ شخص غریب کیسے ہو سکتا ہے جس کے پاس اتنا بڑا خزانہ ہو لیکن پچھلے دس برسوں سے سنگین معاشی حقیقت کسی نہ کسی شکل میں انھیں اپنا شکار بنائے ہوئے ہے اور اب تو یہ عالم ہے کہ اکثر باتیں ان کے ذہن سے اترتی جا رہی ہیں۔ ہاں ان کی پرانی علمی زندگی کا ذکر آتا ہے تو آنکھوں میں غیر معمولی چمک آ جاتی ہے۔ جانے یہ چمک بھی نئی نسل کو وہ دے سکیں گے یا نہیں! ایک لڑکا ہے محمد تقی جو برسوں سے میٹرک پاس کر کے بیٹھا ہے عمدہ افسانوی ادب کا مطالعہ کرتا ہے عمدہ افسانے لکھتا ہے اور پھاڑ دیتا ہے یہاں تک کہ ایک دن اپنی تعلیمی سرٹیفکیٹ کو بھی پھاڑ بیٹھا —— اس منظر سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ اُس خاندان کا حال ہے جس کا ماضی قوم کی بھٹی میں جل گیا اور اسے منتشر راکھ کے ڈھیروں کے علاوہ کچھ نہ مل سکا——!

لیجیے میں کہاں سے کہاں نکل گیا —— آپ سوچیں گے اس سے مولانا کی زندگی کا کیا تعلق ہے —— تعلق ہے میرے بھائی! ورنہ مولاناؒ کی شفقت کا دریا یوں جوش نہیں مارتا ——! پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ مولاناؒ نے ان کے لیے کیا کیا؟ اس کا جواب خود مسٹر صاحب کی زبانی سنیئے۔ ایک دن میں نے مسٹر صاحب سے کہا —— آخر اب مولانا آپ کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتے؟ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا ——

"بھائی مولانا کی مثال اکبر کے دربار کے ابوالفضل اور فیضی جیسی ہے جن سے ان کی قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا! اور میں بے بس سا ہو گیا —— یہ اس مولاناؒ کا ذکر ہے جو ہندستان کے صف اوّل کا سیاستداں رہا۔ اور میرے موضوع کے دائرہ میں وہ مولانا ہیں جو ایک عام آدمی ہیں، ایک بزرگ ہیں، ایک دوست ہیں ——!! ———

---

[1] چند سال قبل حضرت عزیز منعمی مرحوم وزیر ریاست بہار کی سعی مشکور سے انھیں ایک ہزار کی رقم سرکار سے مکان بنانے کو ملی۔ مگر یہ مختصر رقم بیکاری اور بیماری کی نذر ہو گئی۔ (م۔ ن)

DANESH

QUARTERLY JOURNAL

Chief Editor:
Cultural Counsellor Islamic Republic of Iran

Editor:
Dr. Syed Sibte Hasan Rizvi

Honorary Advisor:
Dr. S. Ali Raza Naqvi

Published by:
Office of The Cultural Counsellor
EMBASSY OF THE ISLAMIC
REPUBLIC OF IRAN
House No. 25, Street No. 27, F/6-2
Islamabad, Pakistan.
✆ 818204/818149

کچھ اپنے، کچھ مولانا آزاد کے بارے میں



مولانا آزاد کے مکتوب الیہ

زکریا بھاگلپوری

کے قلم سے

مولانا محمد علیؒ سجادہ نشین خانقاہ رحمانیہ مونگیر (بہار) بڑے بزرگ اور صوفی گذرے ہیں۔ میں نے ان سے بیعت حاصل کی تھی اور وہیں رہا کرتا تھا۔ ان کے حکم اور دعا سے آریہ اور قادیانی عقائد کی رد میں تقریریں کیا کرتا تھا اور برملا مقبول تھا۔ بعدہٗ انھوں نے مجھے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے نام تعارفی خط لکھا اور الہلال جو انھیں دنوں شروع ہوا تھا اس میں رکھ لینے کو کہا۔ حضرت مولانا آزادؒ خط لے کر کھڑے ہو گئے اور احتراماً کھڑے کھڑے سارا خط پڑھا۔ بڑے تپاک سے مجھ سے ملے، بٹھایا اور شفقت سے رکھا۔ بہت مانتے تھے۔

"الہلال کے ابتدائی دور کلکتہ سے رانچی میں نظر بند ہونے اور رہا ہونے تک گہرا تعلق رہا۔ رہائی کے بعد مولاناؒ دہلی گئے، تو میں الگ ہو گیا۔

ان کے والد ہجرت کر کے مکہ تشریف لے گئے۔ وہاں شادی کی۔ دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ بڑے لڑکے غلام یٰسین آہ جامعہ ازہر (مصر) کے پڑھے ہوئے تھے۔ عالم اور شاعر تھے۔ مولانا ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ بہنوں میں سب سے چھوٹی آبرو خانم ملکہ بھوپال کی سکریٹری تھیں۔ بڑی تعلیم یافتہ عمدہ مقرر اور مضمون نگار تھیں۔ بڑی بہن کی شادی کلکتہ کے کسی تاجر کے یہاں ہوئی تھی۔ مولانا کے والد مکہ سے بمبئی واپس آئے اور پھر کلکتہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے والد صوفی تھے۔ مولاناؒ میں بچپن سے بڑوں کی طرح بولنے کا سلیقہ آ گیا تھا۔ جہاں تہاں تقریر کرتے تھے۔ ایک بار لوگوں نے ان کے والد سے اس بات کی شکایت کی۔ انھوں نے مسکرا کر فرمایا۔ یہ تو ایک دن کی بات ہے ابھی کھیلنے کے دن ہیں۔ چنانچہ ایک دن پکڑ کر مولاناؒ کو بٹھایا اور توجہ کی۔ سارے بچکانہ خیالات یکسر ختم ہو گئے اور سنجیدہ ہو گئے۔ پھر مطالعہ کیا۔ ذہن قدرتی طور سے کھل گیا تھا۔ آج کی بہت سی تصانیف میں اکثر غلط باتیں مولانا سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ کسی نے مولانا کی تعلیم جامعہ ازہر (مصر) بتائی ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولاناؒ نے باضابطہ تعلیم کہیں بھی حاصل نہیں کی۔

مولانا بڑے باذوق آدمی تھے۔ عمدہ پوشاک تو ہوتی ہی تھی لیکن کھانے کا خاصا امتیازی ذوق رکھتے تھے۔ ارزانی کے دنوں میں بھی ان کا دسترخوان ایک وقت میں تیس روپے کا ہوتا تھا۔ کھانا اکیلے کبھی نہیں کھاتے تھے۔ میں مستقل تھا اور اکثر لوگوں کا روزانہ تانتا بندھا ہوتا تھا۔ خانساماں بہترین قسم کا رکھا گیا تھا جو بقول خود کبھی نواب واجد علی شاہ کے یہاں نوکر تھا۔ نواب کی گرفتاری کے بعد مارا مارا پھرتا تھا کہ مولاناؒ نے رکھ لیا۔ مولانا کی افرا

ے بعد وہ کہیں نہ رہ سکا۔ مولانا عمدہ کھانا، عمدہ ناشتہ اور عمدہ کافی پیتے تھے۔ سگریٹ قسطنطنیہ کا ہوتا تھا۔ ایک

ر میں نے کافی پینے کا سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ کافی پینے سے نیند نہیں آتی اور تصنیف کا کام کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

مولانا کہتے تھے کہ اُردو مشکل زبان ہے اور اسے سیکھنے کے لیے اہل زبان کو پکڑنا چاہیے۔ چنانچہ کچھ دنوں تک

مولانا نے دہلی کے لال کنواں کے چوراہے پر ایک چائے کا ہوٹل کھول رکھا تھا جس میں دو نوکر چائے بنانے کو رکھ

چھوڑ رکھا تھا۔ خود کاغذ قلم لے کر ایک جگہ بیٹھ رہتے۔ جہاں کوئی بوڑھا شخص ادھر سے گذرا اور آواز دی ——

ے مزاج! اجی حضرت ذرا چائے تو پیتے جانا۔" چائے پلاتے گپیں کرتے ڈھلے ڈھلائے محاورے بے تکلفی سے سنتے

ر فوراً نوٹ فرما لیتے، چائے کے پیسے بھی نہیں لیتے اور رخصت کر دیتے۔

میرے بعد عبدالرزاق ملیح آبادی آئے تھے اور وہ بھی ساتھ ہوئے۔ یہاں پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک

ن مجھ میں اور ملیح آبادی میں ایک لفظی بحث چھڑ گئی۔ میں کہتا لفظ 'بَل' صحیح ہے اور ملیح آبادی کہتے 'بُھل' صحیح ہے۔

خر میں مولانا کو ثالث بنایا گیا۔ مولانا پہلو بچا گئے کہنے لگے 'دونوں صحیح ہے۔ بھئی ابھی تو اردو بن رہی ہے!' میں نے یہ

سوال اودھ پنچ کو بھیجا۔ جواب آیا، 'ملیح آباد آم کے لیے مشہور ہے زبان کے لیے نہیں'۔

کلکتہ الہلال کے دفتر رپن لین کے اوپری منزل میں مولانا اور نیچے دفتر تھا جو میری رہائش گاہ بھی تھا۔ رپن لین

نا بھی انگریز رہا کرتے تھے سامنے کے مکان کی ایک میم مولانا پر فدا تھی۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگی۔ آپ کا مولانا

ہت بڑا پادری ہے۔ اس لیے مجھے ہر وقت تانک جھانک کرنا پڑتا ہے!

مولانا بڑے پاکباز تھے۔ ان کے عقیدت مندوں کی تعداد بیرون ہند بھی بہت زیادہ تھی۔ افغانستان کے ایک

عالم سر پر قرآن پاک رکھ کر ننگے پاؤں رانچی پیدل آئے تھے۔ یہ "الہلال" پڑھ کر مولانا کے معتقد ہوئے تھے۔ بہرحال

ہ نو وارد شخص پہلے عبدالکریم ٹھیکیدار سے ملا جو مولانا کے معتقد اور مرید تھے۔ عبدالکریم نے مجھ سے کہا میں نے خفیہ طور سے

ولانا سے ملوایا۔ ایک انسپکٹر سی آئی ڈی سامنے کی بلڈنگ میں ٹھہرا تھا جو ہر شخص کا حلیہ، آنے کا مقصد وغیرہ لکھا کرتا تھا یہ انگی کی

طر ہنسی کا دور رہتا۔ کلکتہ میں بھی ان کا ایک دستور العمل تھا بلد نماز مغرب (عشا تک) قرآن پاک کا درس دیتے تھے (ایک نعیدکی تفسیر

نے کئی مہینوں میں مکمل کیا) پھر عشا کی نماز پڑھنے جاتے۔ چلتے وقت دونوں ہاتھ پیچھے بندھا ہوتا اور سر نیچے ہوتا۔ مجھ سے راہ

ر باتیں کرتے جاتے۔ مسجد میں پہنچ کر نماز خود پڑھاتے۔ کوئی آگے نہیں بڑھتا تھا۔ تفسیر پاک کے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ

رمایا وہ میرے 'دارالارشاد' میں لیے گئے نوٹس میں ہے۔

دارالارشاد (کلکتہ) میں

مولانا آزاد کا درس قرآن



زکریا بھاگلپوری

قرآن پاک کی تفسیر کے سلسلے میں مولانا کا نام ایک مستند بلکہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ان چند سطور کی جھلکیاں
"شرح و بیان" کے تحت پیش کر رہا ہوں شان نزول کا ہلکا اشارہ میں ابتدا میں دے چکا ہوں۔ یہ دراصل کلاس نوٹس ہیں
اسے سیناپسس یا خلاصہ ہی کہہ لیجیے! قرآن کریم کی شرح پاک اور مولانا آزاد کا انداز بیان معرفان کے پیمانوں سے
لبریز دو آتشہ کے صحیح معنی کچھ ہو سکتے ہیں تو شاید یہی ہیں۔ ان پر میری رائے سے زیادہ آپ کے فہم کی ضرورت ہے۔
دارالارشاد کے بانی اور پرنسپل مولانا تھے جو نمبر ۴۵ رپن لین کلکتہ میں کھولا گیا۔ ۵ فروری ۱۹۱۶ء سے اس کی ابتدا ہوئی اور
۲۸ مارچ ۱۹۱۶ء کو اس کا خاتمہ اپنوں ہی کی ایک سازش کے نتیجہ میں ہو گیا۔ یہ مسٹر صاحب کے کلاس نوٹس ہیں جو انھوں نے
ایک متعلم کی حیثیت سے مولانا کے لکچر سن کر لکھے۔ ان جواہر پاروں کو میں بغیر کسی حذف و اضافہ اور تغیر و تبدل بعینہٖ
پیش کر رہا ہوں تاکہ اہل علم کو اپنی رائے قائم کرنے میں سہولت ہو ——— محمود واجد



۵ر فروری ۱۹۱۶ء　　**(السورۃ الفاتحۃ)**

استعانت: تحفظ خود عمل فطری ہے۔ انسان اپنی محنت کا قائم مقام پیدا کرتا ہے۔

صنعت: ترکیب و انتخاب کو کہتے ہیں۔ ہر تلاش جو انسان نے کی ہے محض فطرت کی تحریک پر ہے۔ فطرت حدود اللہ ہے اور اسی کو اسلام کہتے ہیں۔　　کونٹ ٹالسٹائی: روسی فلاسفر، ماہر علم الاخلاق

طغیان: پانی کا اوپر اٹھنا۔　　گوش: جرمن فلاسفر، ماہر علم الاخلاق۔

فطرت کی برباد کن قائم مقام صنعت ہے۔ تمدن کی بربادی کا سبب پیدا کرنے والا تمدن ہے۔ صنعت کی زیادتی برباد کن فطرت تمدن ہے۔ قوت فطری پر اعتماد کرنا اور صنعت سے اعتراض کرنا ترقی کا سبب ہے۔ فطرت کی مخالفت جرم ہے۔ صنعت غیر فطری بھوک پیدا کرنے والی چیز ہے۔ کونٹ ٹالسٹائی حامی اسلام تھا۔ اسلام کو دنیا میں پیش کیا تاکہ قوت فطری کو دنیا میں قائم کرے۔ ہر فطری ولولہ پر نماز مقرر ہے۔

مرعوبیت صنعت: برباد کن عالم اسلام ہے اور یہی ایک علت ہے جو عالم اسلام میں چھائی ہوئی ہے۔ جذباتِ ایمان ہی سبب ترقی ہے اور غلبہ و فتح۔

ایاک نعبد و ایاک نستعین ہی سے عربوں نے ساری دنیا پر فتح و نصر پایا۔ جو اللہ پر اعتماد کرے گا اس میں انتہائی

وت وزور موجود ہوگا ایاک نعبد کی طرح ایاک نستعین بھی ایک مستقل چیز ہے۔ بقول ابن قیم۔

۷ فروری ۱۹۱۶ء

مسلمانوں میں تنزلی کا سبب یہ ہے کہ وہ مسئلہ استعانت کو چھوڑ بیٹھے استعانت بلا محنت و کوشش محض لغو ہے۔
ہمت اور کوشش ہی جذبات ہیں اور صبر برداشت بھی شامل ہے۔ ہر قوم جذبات ہی سے قوم بنی ہے۔
اعتقادات تو ذہنی ہیں جذبات سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ترقی جذبات ہی سے ہوتی ہے ترقی و تنزلی کو محض جذبات سے تعلق ہے۔

ترقی و کامیابی میں استعداد و کوشش کرو۔

فتح و نصرت محض جذبات میں ہے۔

فوج کی کامیابی سپاہی کے بدن و جسم پر نہیں ہے بلکہ جذبات اور استطاعت میں ہے۔ تم جتنا کر سکتے ہو کرو باقی میں کر لوں گا۔ استطاعت تک استعداد کر کے خدا پر بھروسہ کرو یعنی استعانت۔ تدبیر درفع ایک بدترین اور توفی عجز کا نام ہے، بچاؤ علامت ہے بزدلی کی، درفع کا ظہور تنزلی میں ہوتا ہے۔
وسائل پر بھروسہ کرنا جو بربادی کا نتیجہ ہے استعانت اس کو مٹا کر اقدام کی راہ دکھاتی ہے۔
اعتقادات کو ذہنیات و دماغ سے تعلق ہے ترقی و تنزلی کو محض جذبات سے لگاؤ ہے مقصد نزول قرآن درفع وسائل ہے۔

۸ فروری ۱۹۱۶ء

انسان یا قوم کی ترقی و عزت صرف احساس میں ہے۔ احساسات کا مٹنا ہی بربادی ہے۔
سورہ فاتحہ ایک ایسی قوم بنا رہا تھا جو ساری دنیا اور اقوام کا فرمانروا ہو اور سب کے لیے چراغ ہدایت ہے۔ سورہ فاتحہ کا ارادہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی قوت و احساس پیدا کر دے جو کسی مشکل و سختی میں کبھی نہ دبے اور اپنی خواہش میں بھی کامیاب ہو اور تمام جہاں میں تنہا سید الرؤس ہے۔ جب انسان کل مشکل طے کر چکا تو اس کو اب کیا کرنا چاہیے اس لیے ایک نصب العین ہونا ضروری ہے۔
بسم اللہ انقطاع کل خدا کا توسل پیدا کر کے سب سے الگ کر دے۔ تخلقوا باخلاق ہ (اوسط اخلاق پیدا کرو)
بسم اللہ اور الحمد میں یہ ربط ہے کہ وہ عالم میں ایک حس رفیع پیدا کر دے جو سوائے اللہ کے اور کوئی چیز اسکی نظر میں نہ ہو۔
مشکلات حیات مالک یوم الدین کے اقرار سے درفع ہو گئے۔

(السورۃ الفاتحہ)

۹ فروری ۱۹۱۶ء

راستہ، مسافر، منزل مقصود ــــــ یہی نصب العین ہے۔ جب انسان صراط المستقیم کا متمنی ہوتا ہے معاً منزل طواغیت وضلالت کی طرف بھی نظر پڑتی ہے اور ایک تحقیر آمیز نگاہ اس پر ڈالتا ہے۔ بغض وحسد کوئی مستقل چیز نہیں ہے بلکہ محبت کے ذیل میں یہ آجاتے ہیں۔ بالخاص یا فتنہ کا کوئی دوست نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ مغضوب علیہم سے دشمنی نہ پیدا کریں۔ قرآن کریم نے ہمکو جو مخصوص چیز بتلائی ہے وہ یہ ہے کہ ایک کی دوستی کے واسطے دوسرے کی دشمنی پیدا کرنا ہوتا ہے۔

آمین

۱۰ فروری ۱۹۱۶ء

یہ لفظ عبرانی ہے۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ اللہ ایسا ہی ہے یہ وہ لفظ ہے کہ سب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کو دیا گیا۔

سورہ فاتحہ میں آمین ضرور کہنا چاہیے کیونکہ آنحضرت صلعم برابر پڑھتے تھے۔

سورہ فاتحہ کو کیوں نماز میں شرط کیا گیا۔ چونکہ یہ دستور العمل ہے۔ خدا نے مسلمانوں کو عطا کیا ہے۔ دن میں ۳۰ مرتبہ اس کو یاد کرایا جاتا ہے۔ نماز سریہ میں تو سورہ فاتحہ کو امام کے پیچھے ضرور پڑھنا چاہیے۔ بوجہ نہیں سننے کے ورنہ سننا چاہیے کیونکہ یہ دستور العمل ہے۔ اور جہریہ میں امام چونکہ زور سے پڑھتا ہے۔ مقتدی کے لیے یہی کافی ہے اگر سن رہا ہو ورنہ پڑھے۔

لفظ سورہ، چہار دیواری ــــــ اطلاق فی القرآن الشریف۔ چونکہ قرآن سورتوں سے گھیرا ہوا ہے۔ سورتوں کی ترتیب آنحضرت صلعم نے خود کی ہے۔

سورۃ بقرہ

۱۱ فروری ۱۹۱۶ء

مکی سے مراد آغاز عہد کا نزول اور مدنی سے مراد آخری نزول ہے۔

تورات بخت نصر کے زمانہ میں زائل ہوگئی۔ حضرت عزیر علیہ السلام نے اپنے حافظہ کی بدولت مرتب کیا پھر ٹیٹس کے حملہ میں برباد ہوگئی۔ دنیا کی یہ حالت ہے کہ وہ کمزوروں کو زائل کر دیتی ہے اور جسمیں سلامتی وصحت ہے وہ تو باقی رہتی ہے باصول علم ارتقاء۔

دنیا ہر بہتر اصلح چیز کو باقی رکھتی ہے اور معیوب کو برباد کر دیتی ہے۔ بقاء اصلح ہی قرآن کو سلامت رکھتی ہے۔ اسی قاعدہ کی رو سے زبانیں بھی جو اصلح نہ ہوں فنا ہو جاتی ہیں اور ہو گئیں۔ باطل کیسے رہ سکتا ہے؟ کیونکہ وہ تو مٹنے والی شے ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ قرآن کی ایک ایک چیز بدستور موجود ہے قرآن پاک خود موجود ہے۔ کیونکہ وہ اصلح ہے اور موجود رہے گا اور یہی صداقت ہے۔ بخت نصر نے حملہ کیا اور تورات کو برباد کر دیا۔ ہلاکو خان آیا کل کتابیں جلا کر دجلہ میں ڈال دیا جس سے پانی سیاہ ہوگیا ہے۔ پر قرآن پاک کو کچھ نہ کر سکا۔ دنیا کو جس چیز کی

ضرورت ہے اس چیز کو فطرت چھوڑ دیتی ہے۔ باتفاق کل سورہ بقرہ مدنی ہے بعض اختلاف کرتے ہیں کہ وہ مکی ہے۔
عموماً مجمل ہے برخلاف مدنی کے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں سب اجمال و تفصیل ہیں کیونکہ یہ ارتقاء کا اصول ہے۔
اچہ قرآن میں بھی اجمال و تفصیل ہے۔ اس قیاس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منجانب صاحب فطرت ہے نزول
آن ہی شاہد ترتیب ہے جس قدر سورتیں ہیں وہ ضرورت پر نازل ہوئی ہیں اسلیے بادی النظر میں اختلاف باب معلوم ہوتا ہے۔

(السورۃ البقرۃ)

۱۱ر فروری ۱۹۱۶ء

تمام تعلیم میں خدائی اصول یہ رہا ہے کہ ایک جماعت تیار ہو جو تبلیغ دین الٰہی کی کیا کرے۔ نبوت انبیاء
کام کر کے چل دی۔ اب وہ جماعت جو اس کے قائم مقام میں ہے نبوت کی جگہ کام کرتی ہے۔

نزول قرآن کا دو کام ہے۔ ایک تو وہ جماعت تیار کرنا جو نبوت کی جگہ کام کرے۔ دوسرا کام یہ تھا کہ وہ نسل
جو آنے والی ہے اس کی صلاحیت کی جائے۔

فطرت جب کوئی چیز بناتی ہے تو وہ ابتدا میں اجمال کے ساتھ ہوتی ہے بعدہ تفصیل وار ہوتی ہے۔
خدا کا کوئی کام بلا نظم کے نہیں۔ اللہ کا کوئی کام بلا ربط نہیں ابتدا میں جس طرح حالت گذرتی ہے اور انتہا میں جس طرح
مکمل ہوتی ہے۔ بعینہ قرآن پاک کی ۲۳ سالہ زندگی میں گذاری تعلیم باقاعدہ تدریجاً استعداد کے موافق ترقی کرتی ہے۔

ترتیب قرآن استعداد مخاطبین کے موافق ہے اور نزول تو نزدیک بنا جماعت۔

تعلیم کی اولین بنیاد وجدان وجذبات ہے۔ الجماد قوی دماغی ابتدائی مرحلہ ہے اور وجدان سے یہ مرحلہ
طے ہو جاتا ہے اس کے بعد مرتبہ ذہن و عقل کا آتا ہے۔

جتنی ابتدائی چیزیں ہوتی ہیں وجدانیہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ چونکہ مکی سورتیں ابتدائی سورتیں ہیں اس لیے وہ
وجدان سے تعلق رکھتی ہیں۔ فطرت مقتضئ وجدان ہے۔

۱۴ر فروری ۱۹۱۶ء

۲۷ سورتیں مدنی ہیں اور باقی مکی ہیں بروایت ابن عباس سورہ بقرہ سے لغایت سورہ ۵ تک کل مدنی ہیں
باتفاق۔ انفجار۔ یک بیک جلدی سے قوت کا ابھرنا ــــ پھٹ جانا سورہ مکی میں کثرت سے تو ذیب وصلاۃ کا ذکر آیا
ہے۔ بقول مل سب سے پہلے ترقی کے واسطے پولیٹیکل ترقی بعدہٗ اور ترقیاں ہو جائیں گی جب انسان آزاد ہوا اور قید سے باہر
ہوا تو وہ اب ہر قسم کی ترقی کر سکتا ہے۔

قرآن نے سب سے پہلے دعوت فکر عمومی دی ہے یعنی پہلی منزل قید سے نکلنا ہے جب وہ قید سے نکل چکا تو

اب بار کی دعوت دی جاتی ہے یعنی فلاح و بہبودی۔ سورۂ مکی میں بھی تدریجی فرق موجود ہے۔ اجمال و تفصیل میں بھی فرق ہے۔ مکی میں بھی پہلی سورہ چھوٹی ہے۔ یونس، ہود، رعد، ابراہیم، نحل وغیرہ بڑی ہیں اور مکی ہیں۔ مکی میں عموم کم اور خصوصیت زیادہ ہے۔

مکی سورتوں میں سب سے زیادہ سہولیت ہے اور مدنی میں برعکس مثلاً نزول میں سب سے چھوٹی سورتیں جیسے پارہ عم مقدم و متوسط و متاخر۔ اس میں کوئی حکم حلال و حرام نہیں ہے۔ اس میں اصولی اور عمومی بحث ہے نبا عظیم میں فتح مکی کی خبر ہے۔ اللہ جس چیز کی سب سے پہلے دعوت عمومی دیتا ہے وہ اس کی صنعت کاری وغیرہ ہے۔ پھر تکذیب کا بیان ہے۔ جزا و سزا کا ذکر جداگانہ ہے۔

۱۵ فروری ۱۹۱۶ء

(سورۂ بقر)

مَنْ حَرَّمَ ... کے بیان سے مذمت دنیا، رہبانیت وغیرہ کو رد کیا ہے۔ غرض جو کچھ بیان کیا گیا ہے مختصر کیا ہے۔

سورہ نحل میں زیادہ دلچسپ بیان ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں دین الٰہی کے بڑے بڑے نتائج مندرج ہیں۔

سورہ رعد میں مظاہر فطرت کا خلاصہ ہے اور یہ تمام مکی ہیں۔

سورۂ بقرہ مدنی ہے اور یہ سب سے پہلے کیوں رکھی گئی اگرچہ اور بھی مدنی سورتیں تھیں؟ شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا ہے کہ جب سورہ بقر اتری تو اس وقت کون کون مذہب جزیرۂ عرب میں تھے۔ (تفصیل کے واسطے دیکھیے فوز الکبیر)۔

اللہ نے عرب ہی کو مرکز برائے اصلاح عالم کیوں مقرر کیا؟

قرآن کریم نے منکر کو منکر صرف اسلیے نہیں کہا ہے کہ وہ خدا کا ماننے والا نہیں تھا بلکہ اس کو جو اپنے عمل اعتراف خدا کو ظاہر نہیں کیا۔ جس وقت قرآن نے نزول کیا اس وقت بھی منکرین خدا موجود تھے۔ یہ مقابلہ نیا نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ تھے کہ خدا کو جانتے تھے تو ضرور لیکن ہستی خدا سے منکر تھے۔

قرآن شریف میں اہل کتاب سے کون مراد ہے؟ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کے وقت میں بھی اختلاف ہوا تھا کہ اصحاب زندوا وستا بھی اہل کتاب ہیں بعض کی رائے میں قریش عرب بھی اہل کتاب ہو سکتے ہیں کیونکہ جب صحف ابراہیم کا لفظ قرآن شریف میں وارد ہوا ہے اور قریش بھی اپنے کو متبع ابراہیم کہتے ہیں۔ بہرکیف یہود و نصاریٰ کو تو قرآن پاک نے اہل کتاب کہا ہے اور مشرکین عرب کا صرف دعوی ہی تھا کوئی کتاب موجود نہ تھی ـــــ لہذا مشرکین عرب کو اہل کتاب نہیں کہہ سکتے۔ یونان میں مدون کتاب "ہیروڈوٹس کی تاریخ" ہے۔ اس وقت یہودی سب سے زیادہ "اعلم" سب سے زیادہ معلومات کا خزانہ رکھنے والے تھے۔ سب سے زیادہ مذہبی معلومات رکھنے والے بھی یہود ہیں۔ مخاطب اگر سب سے زیادہ اعلم ہے تو اس کی تفہیم کے واسطے کلام بھی زیادہ افصح اور پُر از اشارات ہونگے یہی اصول مدنظر رکھا گیا ہے۔

۱۶ر فروری ۱۹۱۶ء (السورۃ البقرۃ)

حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ ہم نے دو سال میں سورہ بقر پڑھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب انھوں نے سورہ بقر ختم کی تو اس خوشی میں لوگوں کو دعوت دیا اور ایک بقرہ قربانی دی۔ سورہ بقرہ میں یہ خصوصیت ہے کہ اس کا عامل دنیا اور دین دونوں کا حاکم ہوتا ہے۔ اس کے پڑھنے والے دنیا کی اصلاح کرتے ہیں۔ دنیا سے صرف ظلمت و ضلالت ہی نہیں دور کرتے بلکہ ظلم و تعدی، بطالت و استبداد کو جڑ سے اکھیڑ پھینکتے ہیں۔ اس کی تلاوت دل میں صادق جذبات و حقیقی وجدان پیدا کرتی ہے۔ سورتوں کا نام آنحضرتؐ ہی نے مقرر کیا تھا کیونکہ مسلم شریف میں آیا ہے کہ بعض مراتبہ دو دو سورتیں بھی اتری ہیں اور آپ نے کاتب سے فرمایا ہے کہ فلاں سورت کو فلاں جگہ اور فلاں سورت کو فلاں جگہ لکھ لو۔ نظر بریں روایت یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی کہ سورۂ قرآن اور اسمائے سور آنحضرت صلعم کے عہد ہی میں مرتب ہو چکے اور ربط مقرر ہو چکا تھا، ہاں رکوع و اوقاف قرآن حجاج نے مقرر کیا تھا۔

حروف مقطعات: عربی کے جمیع حروف ابجد بامعنی ہیں۔ لہٰذا کل حروف کے اسما بھی ہیں مثلاً الف جس کے معنی ا اور ایک کے ہے لیکن قرآن پاک میں جس قدر حروف مقطعات ہیں ان کے معنی آج تک فہم میں نہیں آئے۔ جمیع فہم معنی سے عاجز ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا ہے کہ ان کے معنی خدا ہی جانتا ہے۔ لہٰذا جس کے معنی مجھ کو یقینیت کے ساتھ معلوم نہیں اس کی تاویل کرنا نہیں چاہیے۔ اگر سورتوں کا نام کہا جائے تو چنداں غیر مفید نہیں۔

ذالک الکتاب لاریب فیہ۔ قرآن کے اندر جو کچھ ہے بیان کرنے کے قبل ہی سچائی کا دعویٰ کرتا ہے۔ قرآن پاک حقیقتاً مدون شدہ کتاب ہے۔ خدا اپنے علم میں اس کی تدوین کر چکا تھا۔ اب بحالت نزول بھی کتاب یہی وجہ ہے کہ نزول سورت ہی میں وہ الکتاب کہلایا۔

۱۹ر فروری ۱۹۱۶ء

قرآن شریف نے سب سے پہلی چیز جو دنیا میں پیش کیا وہ لاریب فیہ ہے۔ قرآن کی یہی سب سے پہلی صفت ہے۔ تمام تعلیم الٰہی تمام صفت لامتناہی جو خدا کی کتاب میں ہونا چاہیے وہ لاریب فیہ۔ اب دعویٰ پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے مشاہدہ چیزوں کو دکھلا کر وجود کی موجودگی کا یقین دلا دیتا ہے۔ مگر اس کی حقیقت نہیں تبلا سکتا ہے۔ جتنی چیزیں تجربہ کی ہیں ان میں یقین کو اس لیے دخل نہیں کیونکہ حقیقت حاصل نہیں ہے۔ جب حقیقت تو یقین نہیں ہے پس سب میں شک ہے۔ یورپ کے مشہور فلاسفر ہیوم نے کہا ہے کہ جس قدر چیزیں نظر آرہی ہیں کوئی یقین کا درجہ نہیں رکھتی ہیں۔ سب میں شک ہے۔

بیکن نے فلسفہ اور علم طبعی کو علاحدہ کیا ہے۔ ۲۷ مذہب فلسفہ جدید میں پیدا ہو چکے ہیں۔ بعد تمام دلائل کے یہ امر پایۂ ثبوت کو یوں پہنچی۔ غیب وہ ہے کہ جس کو حواس خمسہ سے دریافت نہ کر سکیں۔

۱۲ فروری ۱۹۱۶ء ذالک الکتاب لاریب فیہ

ہر نوع انسان جس چیز کا متلاشی ہے وہ یقین ہے۔ اور یہی کامیابی ہے۔ یونانی اسکول سوفسطائی کی تعلیم اب بھی یورپ کے بہتر سے بہتر اسکول میں موجود ہے اور وہ تعلیم شک دیتی ہے۔

ڈاکٹر سی۔ بان بھی وجود کا قائل نہیں وہ شک بتلاتا ہے۔ یقین کا خاصہ عدم تزلزل، عدم تغیر، عدم تذبذب ہے۔ یقین انمول ہے۔ سوائے شک کے دنیاوی ترقی کچھ نہیں دیتی۔ انکار کی پیدائش فطرت کے خلاف اور نیچر مخالف ہے۔ وہ انکار خواہ کسی میں ہو انکار تو عدم علم کا ثبوت ہے۔ انکار محض جہل ہے۔ ارباب علم نے کبھی انکار خدا نہیں کیا۔ اگر کیا تو چند اراذل وسفہا نے۔ جب کسی کو کسی چیز میں یقین نہیں ہوتا تو عزم و محنت بھی مفقود ہوتا ہے۔ جب سپاہی کے اندر یقین نہیں ہے تو وہ ضرور شکست و ناکام رہے گا۔ کامیابی یقین و عمل صالح پر منحصر اختلاف نتیجہ شک ہے اور یہ جہل ہے۔ یقین تو علم ہے جب علم ہوگا تو اختلاف کبھی نہ ہوگا۔ شریعت علم و یقین اس لیے اس میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کو ہم محسوس نہیں کر سکتے وہ غیب ہے۔ دنیا میں وحی الٰہی ہے چونکہ خوف میں شک رہتا ہے جب شک یعنی خوف زائل ہو جاتا ہے تو امن بھی قائم رہتا ہے۔ ہے اور یقین ہی ایمان ہے۔ دوسرے الفاظ میں علم ایمان ہے، جہل کفر ہے۔ اگر یقین کا کوئی منتہا درجہ ہے تو ہے۔ تقلید نتیجہ ہے جہل کا۔ علم کبھی بھی تقلید نہیں۔ تقلید تو محض ظن ہے جو شک ہے۔ شریعت کا نام علم رکھا کے بعد تو جہل ہے۔ اہل علم و اہل جہل بصیر و اعمیٰ۔ شب زندہ دار کو چونکہ خداوند کریم پر پورا یقین ہے جب تو رات کو کھڑا رہتا ہے۔ لہٰذا اوّل بنیاد کامیابی کی یقین ہے اور شک زوال کامیابی ــــــ!

۲۳ فروری ۱۹۱۶ء ھدی... مفلحون

راغب اصفہانی: متقین کا مادہ وقا ہے۔ کسی چیز کی حفاظت کرنا۔ اذیت سے اب اس کا اطلاق خوا یعنی خوف اس بات کا کرنا اذیت و مضر سے بچا رہے۔ قرآن نے جو جماعت تیار کی ہے اس کا اوّلین نام متقی ہیں انسان نے خدا کو خوف میں ڈھونڈھا۔ موسیٰؑ کے وقت میں اللہ و بندہ کا تعلق مانن تعلق زوجہ و ز بعدۂ قہریت کا وزن کم کرنے کے لیے مسیحؑ نے باپ بیٹے کا تعلق بتایا۔ اور اب محبت کی ارتقائی نسبت اس لیے اب کل تعلق دوری کو چھوڑ کر ملا دیا اور ربوبیت کا تعلق پیدا کر دیا تاکہ کوئی غیر تعلق نہ رہے۔ اب خدا

تعلق براہِ راست پیدا ہو گیا کیونکہ اب بندہ صاحبِ استعداد ہو چکا ــــــ !

سورہ فاتحہ میں اللہ نے جو پہلا حُسن دکھایا وہ یہ ہے کہ پہلے نام بتایا بندہ رب کہا جو غایت درجہ کی مہربانی ہے۔ اللہ کا خاص تعلق محبت سے ہے۔ انسان کی اصلی فطرت نیکی ہے۔ انبیا کا کام صرف زنگ کو جو فطرت میں چھا گیا ہے دور کرنا ہے۔ بدنیکی کا عدم ہونا ہے۔ عدل پر چلنا ہی خیر ہے۔ گمراہی و مضرت سے بچانا فطرت و قلب کو یہی ارتقا ہے۔

۲۳ر فروری ۱۹۱۶ء

نزول: لغوی، اوپر سے نیچے آنا۔

آخر، لغوی یعنی وہ جو سب کے بعد آوے۔

قرآن نے جزا و سزا کا نتیجہ دنیا و قیامت دونوں میں ہونا ظاہر کیا ہے۔ قانون مکافات دونوں جگہ ہے۔

الغیب: نظر سے پوشیدہ ہونا، غیر محسوس ہونا۔

دعویٰ کے صدق و کذب کی جانچ یہ ہے کہ دعویٰ کو کر کے دکھاوے۔ مثلاً حکیم کا دعویٰ حذاقت میں فرد ہونا یہ ہے کہ وہ مریض کو لاوے اور اچھا کرے۔ دیگر دعویٰ کی لیاقت ہے یا نہیں۔

قرآن نے جو دعویٰ کیا ثابت کر دکھایا بیماری دفع کی اور جماعت متقی تیار کر دی۔ جو تندرستی حاصل کرتا ہے وہ ایمان الغیب پر یقین رکھتا ہے۔

الغیب: ذات الٰہی چونکہ حواس سے غیر محسوس ہے، وہ قرآنی جماعت جس کے اندر اللہ تعالیٰ کے وجود پر اس قدر یقین ہو جائے جس قدر محسوسات میں بھی نہیں ہو سکتا ہو۔ اس طرح یقین کرنا کہ بالکل زوالِ شک ہو جائے۔ کمال درجہ پر یقین رکھنا ہی ایمان ہے۔ مثلاً عبادت الٰہی اس طرح کرنا گویا اللہ کو نظر سے دیکھ رہا ہو۔

الصلوٰۃ: ایامِ جہالت میں اس کے معنی تھے گھوڑے کے پیچھے گھوڑا کا دوڑنا، تالی بجانا یعنی عرب جاہلیت میں عبادت کے وقت عبادت میں کچھ موسیقی کا استعمال کرتے تھے۔ اصل معنی جو شعراء عرب نے استعمال کیا ہے وہ بلند دعا کے ہے۔ متقی تو خود ہدایت یافتہ ہوتا ہے پھر متقی کی ہدایت کیسی؟ یہ اتفاق جو اس کو ملا ہے وہ قرآن شریف کا ہے۔ اس کو جو تندرستی ملی ہے وہ اسی علاج سے۔ وہ گروہ جو اپنی بیماری کو اچھی طرح سمجھا اور علاج کرایا وہی لوگ متقی ہیں۔ قرآن کریم کی یہ عادت ہے کہ پہلے وہ وجدان بیان کرتا ہے بعدہٗ ذہنیات۔ سورہ بقرہ میں زیادہ تر یہود ہی کے بیان ہیں۔

۲۶ر فروری ۱۹۱۶ء

ایمان بالغیب، یہ صفت متقی کی ہے جو قرآن کے ذریعہ بنی، مومن خیر البریہ ہے۔ یہ دنیا میں اعلم ہے۔ یہ علمی بحث

ہے۔ اور باعتبار عمل کے غیب پر یقین رکھنے والا ہے۔ قرآن نے جس جماعت کو تیار کیا ہے گو دنیا ایمان بالشہود پر چل رہی ہے مگر یہ جماعت وہ ہے کہ اللہ نے جو چیز پر پیدا کر دیا اس کے تسلیم میں کچھ شک نہیں کرتے جو رسولؐ نے کہہ دیا اس کو بن دیکھے مان لیا متقی مومن کی یہی پہچان ہے۔ مومن و غیر مومن میں یہی فرق ہے کہ مومن اللہ اور رسولؐ کی بات میں شک نہیں کرتے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ تم آگ میں کود جاؤ اس میں تمہاری فلاح ہے وہ بلاشک و جھجک آگ میں کود جائیں گے۔ غیر مومن تو حواس خمسہ پر زندہ ہے ماگر اس کو روٹی ملی تو زندہ ہے اگر یہ گم ہو گئی تو وہ مر گیا۔ اور اللہ کے بندۂ مومن کا یقین تو اللہ ہی کے فرمان اور رسولؐ کے حکم ہیں۔ وہ حواس پر یقین رکھتے ہیں جو اس پر بھروسہ نہیں کرتے۔ مومن تو ایمان بالغیب فطرۃً ساتھ لیتا آتا ہے کیونکہ ایمان بالغیب تو ذوق سلیم ہے اور جب ہی تو کافر کو مریض کہا ہے۔ کیونکہ مرض ہی کی وجہ سے ایمان کی حلاوت معلوم نہیں ہوتی محض تلخ معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات کس قدر بوالعجب ہے کہ وہ امر جو ہماری نظر سے گم ہے جس کو ہم نہیں دیکھ سکتے اس پر پورا یقین ہے اس کی فرماں روائی پر زندگی منحصر ہے۔ اگر ایمان بالغیب نہیں ہے تو وہ ہرگز مومن نہیں ہے۔ جب ایمان بالغیب پر یقین رکھتا ہے تو وہ سنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ تمکو تمام دنیا کی خلافت دی جائے گی اور وہ ایمان بالغیب کا متوالا فوراً یقین کر لیتا ہے آخر وہی ہوا جو وعدہ ہوا تھا۔ جس نے ایمان بالغیب پر یقین کر لیا اب وہ کبھی بھی شک نہیں کرتا چنانچہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم کو ایران کے تخت کسریٰ کا تاج ملے گا گو چہ ان سے وطن چھوٹتا ہے عزیز سے عزیز چیزیں چھوٹتی ہیں مگر وہ ہے کہ اس یقین پر پورا بھروسہ کیے ہے آخر وعدہ کے موافق نائز المرام ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے یہی جماعت تیار کی اور وہ جو کچھ کہا اس پر وہ اس طرح یقین کر لیا کہ اس کے خلاف ذرہ بھر بھی شک نہ ہوا گرچہ اس پر کیسا ہی ستم ہو۔

۲۸ر فروری ۱۹۱۶ء

بغیر دیکھے ہوئے معنی ہے بغیر دلائل کے۔ مومن ایک وجود ہے جس کا سر رشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو کہا وہ یقین ہو گیا۔ سبب تنزل صرف ایمان بالغیب کا گم ہونا ہے۔

اور ترقی جو قرون اولیٰ میں حاصل ہوئی تھی وہ ایمان بالغیب کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ چونکہ اس میں ایمان بالغیب تھا اس لیے ثمرہ پایا۔ ساری دنیا پر حکومت کی وہ صرف ایمان بالغیب تھا ورنہ اور کیا تھا؟ اس لیے تعداد کا مسئلہ ان میں سے جاتا رہا تھا۔۔۔۔ یقین کا ثبوت اعضاء جوارح سے ہونا چاہیے۔ اللہ جو کچھ فرمادے اس کو مان لینا اور اس پر یقین کرنا۔ اُمت آخرہ کو اُمت اولیٰ پر اسی لیے فضیلت ہے چونکہ یہ آنحضرت صلعم پر بن دیکھے

یمان لایا ہے۔ اور وہ آنکھ دیکھا ایمان رکھتے تھے۔ ایمان بالغیب ہی کی فضیلت میں اُمّتِ آخرہ کی تعریف کی گئی ہے۔
ایمان بالغیب میں دل و دماغ شامل ہیں اور اعضائے جوارح میں صوم و صلوٰۃ شامل ہیں جس قدر مطلوبات ہیں وہ شامل جوارح سے ہیں۔ تیسری چیز ثمرہ اعمال ہے یعنی تلاش رزق۔ تلاشِ رزق صرف تنازع للبقا ہے۔ مال نتیجہ جد و جہد اور یہی بڑی چیز ہے۔ جیسے دل و دماغ: ایمان بالغیب، اعضائے جوارح: صلوٰۃ، مال و دولت: رزق مما تحبون۔
خدا کا مسافر جب سفر طے کرے گا تو پہلی منزل دل و دماغ ہے۔ دوسری منزل اعضائے جوارح اور تیسری منزل مال و دولت۔ انھیں تین منزلوں کا مرکب صراط مستقیم ہے۔

۲۹ فروری ۱۹۱۶ء — والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک

اب کسی ایک پر خصوصیت نہیں ہے بلکہ وہ ایسا گروہ تیار ہوا ہے جو کسی ایک صداقت پر دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ یہ تو ایسی جماعت ہے کہ اب اور ماقبل کی کل صداقتیں اسمیں موجود ہیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ ہم نے ایک ایسی جماعت تیار کر دی ہے جس میں صداقتِ موسوی و مسیحائی سب موجود ہے۔ متقی میں آخری درجہ وما انزل من قبلک ہے۔ وبالآخرۃ ھم یوقنون (مفصل بیان سورہ فاتحہ میں دیکھو) الی مفلحون۔
فلاح یافتہ وہ ہے جس کے یقین و عزم و عمل اس قدر مضبوط ہوں کہ وہ کبھی کبھی کسی نقصان سے دب نہیں سکتا۔ ان الذین کفروا — کفر بمعنی چھپانا۔

یکم مارچ ۱۹۱۶ء

جب کبھی راستی پیش کی جائے تو بلحاظ قبول کون جماعت اور کون نوع ہو گی۔ ایک جماعت وہ نظر آئے گی جو حق پسند یعنی متقی۔ وہ پہلی جماعت ہے نیز اس میں استعداد بھی قبول حق کی موجود ہے یہ وہ جماعت جس میں رشتۂ قبولیت موجود ہے۔ واولٰئک ھم المفلحون ۵
قرآن نے گمراہوں کو دو جماعت میں تقسیم کیا ہے۔ چونکہ یہ بحث مذہبی ہے اور قرآن مذہبی کتاب ہے۔ دنیا میں دو گروہ ہیں اصولاً ایک وہ جس نے حق کو نہیں پہچانا۔ اور جو روشنی حق کی اور ہدایت کی آتی ہے وہ اس سے فیض حاصل نہیں کرتا بلکہ آنکھوں کو اس سے بچاتا ہے چونکہ اس میں استعدادِ اخذ فیض نہیں ہے۔ چونکہ بطالت اس کے قلب میں پوری طرح تسلط کر چکی ہے، قوت احساس فنا ہو چکی ہے۔ وہ جس حال میں ہے قانع ہے۔ قوتِ تمیز مفقود ہے۔ کفر تکذیب رسول ہے یعنی انکار حقیقت۔ دوسری نسل اسی کے ضمن میں پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ باوجود معرفت حق کے حق سے اعراض — وہ تو جانتا ہے کہ اس میں حق کی روشنی ہے مگر اس کے تسلیم میں فقدانِ غرض کی وجہ پیدا ہوتی

ہے۔ بعوض قبولیت کے وہ اصرار حق میں پوری طرح کوشاں رہے گا۔ وہ حق کو اس لیے دفع کرتا ہے کہ اس کی قبولیت میں
اسکی غرض فوت ہوتی ہے تجارت میں کمی واقع ہوتی ہے تو صرف قبول ہی نہیں کرے گا حق کو مٹانے کی پوری کوشش کرے گا۔
اب تیسری جماعت وہ ہے جس میں کچھ دعویٰ تو حق کا معلوم ہوتا ہے مگر محض جاہل ہے۔ مذہبی جماعت ہونے کا
حریفانہ دعویٰ تو کرتا ہے مگر حقیقت سے ہے بے علم۔ وہ دوسرے کو دھوکا دیتا ہے۔ اپنے نفس کو بھی دھوکا دیتا ہے۔
یہ دنیا میں بوسیع ساری ہے۔ خادع مخادع کا عامل ہے۔ چونکہ علم مذہب ہے اس لیے مفسد ٹھہرتے ہیں۔

ان الذین کفروا... سواءٌ علیھم انذرتھم ام لم تنذرھم ——

وہ اس لیے نہیں دیکھیں گے۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم ——

اس کی ضرب پہلی یہود پر پڑتی ہے۔

ومن الناس من یقول ——

۲ر مارچ ۱۹۱۶ء

عمل صالح سے بقاء ہے اور غیر صالح سے فناء ہے یہی قانون الٰہی ہے۔ کوئی تعمیر بلا تخریب کے ہو ہی نہیں سکتی۔
تعمیر کثیر تخریب قلیل پر فوقیت رکھتی ہے۔ مذہب اگر تعمیر ہے تو شمشیر سے اس کی مضبوطی منحصر ہے۔ قانون بقاء
اصلح کے مطابق مذہب کا تلوار چلانا نہایت بہتر کام ہے اور یہی سنت اللہ اور اس میں تبدیلی محال ہے۔

ختم: ڈھانک لینا قلب: عقل

یخادعون اللہ۔ یعنی وہ جس عمل کو کرتے ہیں حقیقت میں وہ عمل نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ان میں ہے
حالانکہ ان میں نہیں ہے۔ وہ دراصل اپنے نفس کو دھوکا دیتے ہیں وہ تخلف الٰہی کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اپنے نقصان میں پڑے ہوئے ہیں۔

فی قلوبھم مرض۔ سے مراد تعطل عقول تعطل تفہیم ہے کمال ضعف۔
فزادھم اللہ مرضا۔ اب امر الٰہی ظاہر ہوگا اور ان کے تعطل تفہیم و بصارۃ کا نتیجہ نکلے گا جسکی زیادتی پردکھ کی زیادتی ہوتی ہے۔

۴ر مارچ ۱۹۱۶ء ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم فزادھم اللہ مرضاً

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ ہی مرض بڑھانے والا ہے تو پھر جزا و سزا کیا؟ یہ خیال محض غلط ہے۔
صحابہ کرام جو بہترین قرآن سمجھنے والے تھے کبھی بھی اس کے متعلق ایسا خیال نہیں کیا اور نہ شبہ کیا ——
یہ تو اس جماعت کی حالت ہے جو نسلاً بعد نسل اپنی سہل انگاری سے ایسی بری کرلی ہے۔ اب خواہ ڈراؤ یا نہ
ڈراؤ وہ تو اس کی طرف خیال نہیں کرنے والے۔ وہ تو اللہ کی دی ہوئی چیز سے کام نہیں لیتے تو قانون الٰہی یہ ہے کہ

ایسا مریض ضرور مر جائے گا۔ جس قوت سے کام نہ لیا جائے تو لامحالہ وہ قوت زائل ہو جائے گی کیوں کہ یہ قوانین قدرت ہیں اور اسی قانون کو اپنی قدرت کی طرف نسبت دیتا ہے اسی لیے ختم اللہ۔۔۔ فرمایا۔ کیونکہ یہ طریقہ تعبیر ہے اسی مسئلہ کو بعض مسئلہ قضا و قدر کہتے ہیں محض غلط اور صریح غلط۔ فزادہم اللہ مرضاً سے مراد شریعت حقہ کا نزول ہے کیونکہ وہ تو اس سے اعراض کرتے ہیں۔ حق کے آنے سے ضرور دکھ بڑھے گا۔ واذا قیل لہم لاتفسدوا۔۔۔ جب اس سے کہا جائے کہ فساد مت کرو جواباً کہتے ہیں کہ ہم تو مصلح ہیں فساد سے کیا علاقہ بعض کہتے ہیں کہ اصلاح سے مراد صلح؟ درمیان قریش و مسلمان کے کیونکہ کافر کہتے تھے کہ ہم تو ان دونوں کو ملا دینا چاہتے ہیں اور اللہ کہتا ہے کہ نہیں، یہی فسادی ہے۔

فساد سے مراد کفر ہے۔ اصلاح سے مراد ہے شریعت اسلامیہ کا قائم ہونا۔ مصلح سے مراد جو شریعت الٰہی پر چلے اور مفسد سے مراد جو شریعت الٰہی کا مخالف ہو۔

ملاء فرعون نے بھی جماعت موسیٰؑ کو مفسدین فی الارض کہا مگر اللہ جانتا ہے مفسد اور مصلح کون ہے؟ سب جانتے ہیں کہ مفسد ہلاک ہوا اور مصلح وہ تھا جو فتح و نصرت کا مالک ہوا۔ مفسدین کا ایک یہ بھی فساد ہے کہ جب کبھی اس کے سامنے حق پیش کیا جائے تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو محض فساد ہے۔ واذا قیل لہم آمنوا۔۔۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم سفہا کی طرح ایمان لائیں گے۔ اس میں ان کی حقارت عملی المومنین معلوم ہوتی ہے۔ اخلاص سے ایمان لانا گویا ان کے نزدیک یہ فعل سفیہوں کا ہے۔ فی الحقیقت جو جماعت ایمان لے آئی وہی تو عقلمند ہے جو دائمی آرام و عزت و عظمت حاصل کر رہا ہے، عقلمند تو ضرور ہے جو ایک مٹھی خاک دے کر سونا خریدتا ہے ——!

۶، ۷ رمارچ ۱۹۱۶ء

دوسری جماعت وہ ہے جو خادع ہے۔

قانون قدرت یہ ہے کہ ہر چیز جو ضعیف ہے فنا ہو جائے گی اور قوی باقی رہتی ہے۔ صحیح موجود رہتا ہے بیمار فنا کو پہنچتا ہے اس طرح جس کی روح قوی ہے وہ موجود رہتی اور کمزور فنا کو پہنچتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حق قائم رہے گا اور باطل مٹ جائے گا۔ لہٰذا سنت اللہ بدلیل (۱) استعداد (۲) التہاب (۳) انفجار یہ تینوں اصلاح وافساد میں بھی موجود ہیں ——!

قانون اہمال (یہ قرآنی اصطلاح ہے بعوض استعداد کے) یہ خدا کے قوانین ہیں۔

قانون مکافات ہے۔ جیسا جرم ہو گا عذاب بھی ویسا ہی ہو گا۔ دیکھو سر سید نے جیسی یورپ کی پوجا کی

یسی ہی تعلیم یورپ نے انھیں برباد کیا۔ دنیاوی سزا کا غیر موافق ہے مگر خدا معصیت کے موافق سزا دیتا ہے۔ سب سے بڑا ظلم تو یہ ہے کہ ہے تو باطل مگر دعویٰ حق کا کرتا ہے۔ دنیا حق پرستوں کے لیے ہے بطالت کے واسطے نہیں کیونکہ دنیا خیر الآخرہ ہے، جب کبھی حق منجانب خدا آتا ہے تو کوئی کبھی بھی قبول نہیں کرتا ہے جب تک کہ وہ قربانی نہیں دے۔

سچائی کا معجزہ یہ ہے کہ جب کبھی حق ظاہر ہوا ہے تو ضعفاء سے ہوا ہے، غربت سے ہوا ہے، جھونپڑی سے ہوا ہے، سچائی ہر موقع پر قربانی چاہتی ہے جس طرح ایک دہقان اپنی جھولی آئندہ امید پر خالی کرتا ہے۔ بعینہ ایک حق پرست بھی اپنی جھولی کل کی امید پر خالی کرتا ہے۔ مصلحت پرستی ایک شیطان لعین ہے۔ مومن پر استہزا کرنے والے ہی منافق اور دنیا میں فساد پھیلانے والے ہیں۔ واذا لقوا الذین آمنوا۔۔ یہ آیت منافق کے واسطے ہے۔ یعنی درمیانی راہ نکالنے والے ہیں۔ خارجی چیز کا احساس اندر کی لیاقت سے ہوتا ہے قرآن کا قول ہے کہ ہم کو لے لو جو کچھ ہے وہ ہم میں ہے۔ قرآن ایک قاعدہ کلیہ ہے ترقی کے واسطے قرآن کو قبول کرو۔ دنیا میں حکومت قرآن ہی سے پھیلی ہوئی ہے۔ نفاق تنزل ہے۔ انسان کے لیے دو درجے ہیں ایک تو اعلیٰ دوسرا ادنیٰ، تیسرا درجہ کوئی نہیں اگر ہو تو وہ نفاق ہے۔ شیاطین بمعنی سردار۔

تبلیغ ——— ہجرت

وہ تو استہزا کرتے ہیں مگر وہ خود اپنے اوپر استہزا کرتا ہے۔

۸ مارچ ۱۹۱۶ء

جب تک ایمان و عمل صالح نہ ہوگا کبھی بھی نجات نہیں پا سکتے۔ وہ چیز جو بین بین ہوتی ہے وہ راہ محض خلع کی ہے اس کی تعریف نفاق ہے۔

واذا خلوا الی شیاطینھم۔۔ ان کے رؤسا سردار شیطان کی اصل شیطنت ہے جس کے معنی ہیں دوری یعنی جس میں حق سے دوری ہو وہ شیطان ہے۔ جب کبھی سچائی ظاہر ہوتی ہے تو ایک جماعت شیطان کی مخالفت میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ شیطان انسان و جنات دونوں میں ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے شیطان فرعون کی مخالفت ہوئی۔ ابراہیمؑ سے شیطان نمرود کا مقابلہ ہوا۔

اللہ یستھزئ بھم ویمدھم فی طغیانھم ——— حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ یمدھم بمعنی (کذا) فرصت پہنچا جانا۔ مدومت، پھیلاؤ، طوالت۔

قانون امہال، کسی مواد کے دور و تکمیل میں جو وقت ہوتا ہے وہی یہ ہے جو قانون تینوں کا مجموعہ ہے

یعنی استعداد، التہاب، انفجار، معصیت کی پیدائش استعداد ہے۔ ان کے انضمام و اجتماع کا نام التہاب ہے اور ان کا پھٹ جانا انفجار ہے۔ انفجار ہی عذاب الٰہی ہے۔

قرآن پاک میں عذاب بھی چند اقسام میں منقسم ہے ـــ سورہ عنکبوت میں ہے اللہ تعالیٰ کی شہادت انفجار ہے جو مخالف کو بتا دیتی ہے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے۔ اللہ تعالیٰ دکھا دے گا کہ یہ عذاب کیا اور کب آجائے گا۔ سورہ نحل میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو چاہتا تو فوراً عذاب میں ڈالتا اور پھر کون تھا جو ان کو بچاتا۔
چونکہ اللہ نے وقت مقرر کر دیا اب وقت پر عذاب ظاہر ہوگا ـــ معصیت کا انفجار کثرت معصیت ہے۔

اللہ کا وعدہ بالیقین سچ۔ مشاہدہ شاہد ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص نماز پڑھ کر کبھی بھی مرض خبیثہ میں نہیں مبتلا ہوا اور زانی برابر مبتلا ہوتا ہے۔ کفر اور ارباب کفر کو مہلت ان کی بھلائی نہیں ہے بلکہ اور بھی بلا ہے۔
اشترا کے معنی بعض نے استدلال کہا ہے ـــ اولئک ـــ الضلالۃ بالھدیٰ

اہل کتاب کے پاس تو خود ہدایت تھی مگر انھوں نے ہدایت کو تاراج کر دیا اور گمراہی کو بالعوض خرید۔
تمثیل عرب میں یہ دستور تھا کہ جس چیز سے تمثیل دی جاتی تھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر جز میں ملتا ہو۔ دوسری یہ ہے کہ ایک جز کا دوسرے جز سے ممثل ہونا۔

۹ر مارچ ۱۹۱۱ء

ہر دو مثال ہر دو جماعت کے واسطے ہیں۔ تمثیل مرکب کے کل جز دوسرے کے کل جز سے نہیں مل سکتے۔
تمثیل مفصل کے کل جز دوسرے سے ملتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کو جب مدینہ والے اپنے وطن میں لائے اور بباعث حصول ہدایت ہوئے مگر بعض نے نفاق کیا اور ایمان سے محروم رہ گئے۔ یہ مثال اول کی ہے۔ یہی ختم اللہ علیٰ ... کے مصداق ہیں۔ وترکہم فی ظلمات ... یک بیک روشنی سے محروم کر دینا۔ تو بھلا خیال کرو تو اس کی کیا حالت ہوگی۔
دوسری تمثیل کصیب من السماء ... یہ تفسیر تمثیل مفصل ہے ـــ فیہ ظلمات و رعد و برق ... بارش میں بجلی کی چمک اور کڑک دونوں موجود ہوتے ہیں۔ جب انسان کسی چیز سے ڈرتا ہے تو اسکو تو مٹا نہیں سکتا بلکہ اپنی ہستی کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے تو وہ موت کے ڈر سے کانوں میں انگلی ڈال لیتا ہے اور آنکھیں چھپا لیتا ہے اور یہی تو بارش کے اجزا ہوتے ہیں۔ حصول بارش میں ان کی برداشت بھی ضروری ہے لیکن وہ کہاں بچ سکتے ہیں کیونکہ اللہ تو محیط ہے اور وہ ایسا ہی کرے گا۔ جس قدر بارش محبوب و مطلوب ہے اسی قدر اس کے اندر رعد و برق کا خوف و ڈر بھی ہے۔ اگر تم بارش چاہتے ہو تو تم کو لازم ہے کہ بجلی کی کڑک و چمک کو برداشت کرو۔ گرچہ بجلی

کوندے سے کچھ جانیں بھی ہلاک ہوتی ہیں یا کم سے کم تا بزدل اس خوف و ڈر سے بارش کی رحمت باری سے محروم رہتے ہیں

۱۱،۱۲ مارچ ۱۹۱۶ء

تشبیہ و تمثیل ——— اللہ تعالیٰ نے دو جماعتوں کے بارے میں دو تمثیل دی ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو اس میں دیکھتا ہے کہ بجلی گرتی ہے ہلاکت بھی ہوتی ہے اور امید کی روشنی بھی چمکتی ہے۔ بارش جو حقیقت میں محمود و محبوب ہے۔ تاہم اس میں بعض اجزا نہایت ہولناک و دہشت ناک ہیں۔ اگر بارش کی طلب ہے تو بجلی و رعد کے برداشت کی قوت بھی دل میں پیدا کرنا چاہیے۔ تمہارے واسطے بارش اپنی جبلت نہیں چھوڑ سکتی۔ علیٰ ہذا القیاس۔ ہدایت و رشد کی بھی یہی حالت ہے بعینہ۔ طالب بارش ورود بارش کو دیکھ کر ہمہ تن تیار ہو جاتا ہے تخم ریزی پوری مستعدی کے ساتھ کرے گا۔ جو لوگ بجلی سے ڈرنے والے ہیں جو لوگ رعد سے خوف کھاتے ہیں ان کو پیغام مل جانا چاہیے کہ ان کا بارش میں کچھ حصہ نہیں ہے۔

بارش ہدایت میں جو رعد و برق ہے وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ وہ انفاق ہے ہجرت ہے۔ اللہ نے دو قسم کے امثال بیان کیے ہیں ایک نوری دوسری ناری۔ قرآن پاک نہایت مربوط و منتظم ہے۔ ہر سورت کا ایک موضوع ہے۔ یہی دو اصول فہم قرآن کی جان ہیں۔ قرآن پاک کی ترتیب بمطابق خطبۂ عرب العربا کی ہے۔ سامع کو سمجھانے کے واسطے تمہید ضروری ہے تاکہ مضمون الیہ کے فہم میں آسانی ہو۔ مخلص و گریز شاعری میں مضمون کے فہم کے واسطے اصلی مطلب کی طرف رجوع کراتا ہے۔ گویا گریز تمہید کو اصلی مطالب کی طرف ملا دیتا ہے اگر سامعین پہلے ہی سے مضمون الیہ کے سننے کے واسطے موجود ہوں تو تمہید کی ضرورت نہیں۔ اگر مطالب اصلی سے ناواقف ہیں تو تمہید کی ضرورت ہوتی ہے۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ تک کی تو تمہید ہے اس کے بعد اصل مطالب آئیں گے بلفظ تخاطب یا ایہا الناس۔

۱۴ مارچ ۱۹۱۶ء

یا ایہا الناس ——— اس میں سب سے پہلی چیز تخاطب ہے۔ اس تخاطب سے مقصود اہل مکہ ہیں اور یا ایہا الذین آمنوا... سے مقصود اہل مدینہ ہیں۔

از ابن عباسؓ۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سورہ مدنی میں بھی یا ایہا الناس کا لفظ موجود ہے جس سے قول بالادب جاتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ حیات مکی محض ایام ابتدائی ہے جس سے تخاطب کفر ہے اسلیے لفظ یا ایہا الناس استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں سات قسم کے خطاب موجود ہیں۔ پہلا خطاب مدح[1] مثلاً یا ایھا النبی وغیرہ۔ دوسرا ذم[2] یعنی خطاب تذلیل مثلاً یا ایھا الکافر وغیرہ۔ تیسرا خطاب[3] اضافی ہے مثلاً یا عبادی وغیرہ۔ یعنی بپہلو رحمت و شفقت۔ چوتھا خطاب[4] اسمی ہے مثلاً یا عیسیٰ وغیرہ۔ پانچواں[5] جنسی مثلاً یا ایھا الناس وغیرہ۔ چھٹا ندائے[6] نسبت مثلاً یا بنی اسرائیل وغیرہ۔ ساتواں[7] ندائے شفقت مثلاً یا ایھا المزمل وغیرہ۔

پیغمبروں میں جو اضطراب پیدا ہوتا ہے وہ کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ کمال بلوغ نبوت کا سبب ہے۔

اس وقت ایک غیر یقینی (زندہ) عشق ہوتا ہے۔ مثلاً کوہ حرا کی سیر اور کوہ طور کی سیر ——

انسان بعض وقت اپنے بڑوں کو جو گذر چکے ہیں ان کی اس قدر تعظیم و تکریم کرتا ہے جس سے بت پرستی کی بنیاد پڑتی ہے۔ آہستہ آہستہ تماثیل پرستی بھی جاری ہو جاتی ہے۔ اس خیال کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے زمانے کے لوگ ہی اس قسم کی فضیلت و تقدیس کے لائق ہیں۔ جب یہ تعظیم مذہب میں آتی ہے تو وہ عظیم الشان نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ ان کی تو پرستش شروع ہو جاتی ہے اور خلفا کی ترقی معدوم۔ تقلید کا غلام ہو جاتا ہے۔ یہی چیز ہے جس نے خدا سے مہجور کر دیا۔ لہذا قرآن پاک نے جہاں کہیں کہا ہے تو وہ یہ کہ کتاب اللہ کو قائم کرو۔ صرف زمانہ قدیم میں ہونا ہی شرف نہیں ہے بلکہ عمل و غور و خوض تعلیم اعلیٰ بہترین معلم ——— نہ کہ تقدم زمانی۔ اپنے بڑوں کی تقدیس حد شرعی سے زیادہ یہاں تمہارا خیال ایک لمحہ کے واسطے بھی پیدا ہو جائے کہ وہ سب سے زیادہ بہتر ہے ہم کو اسی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے تو کتاب اللہ چھوٹ جاتی ہے اور یہی شرک ہے۔ آیت یہ ہے کہ والذین من قبلکم . . . اللہ جس نے تم کو پیدا کیا بس اسی طرح تمہارے اگلے کو بھی پیدا کیا۔ یہ کیا بوالعجبی ہے کہ تم ان کو پوجتے ہو یا محض ارباب من دون اللہ بنا رکھی ہے محض اس بنا پر کہ تم سے پہلے تھے۔ اسی وجہ سے کہا ہے کہ سیروا فی الارض فانظروا ——— یعنی یہ جو تم سے پہلے گذرے ہیں وہ کیسے ہیں اور کیا حالت ان پر گذری۔ یہی وجہ ہے کہ تم کو پوری طرح متنبہ کیا۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی مساوات تخلیقی بیان کی ہے۔

۱۵ مارچ ۱۹۱۶ء

ربوبیت میں دو تعلق ہے۔ روح وغیرہ چند چیزیں علوم متعارفہ کی طرح ہم کو مان لینا چاہیے۔ کیونکہ کسی علم پر بحث کرنے کے واسطے چند چیزوں کو مان لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ مبحث فیہ کی بنیاد ہے۔ ایک عالم ارضی ہے جہاں تمہاری جتنی ضرورت پوری کی جاتی ہے۔ فہکذا عالم سماوی ہے جہاں ضروریات روحانی پوری کی جاتی ہے۔ اور یہ تقسیم

بلحاظ عالم کے ہے۔ قرآن پاک چونکہ کتاب فلسفہ نہیں ہے لہٰذا وہ چیز کے ماہیت سے بحث نہیں کی ہے صرف چیز کا ذکر کر دیا کیونکہ اس چیز کی ضرورت ہے فقط اتنی کہ انسان اس سے تعلق رکھتا ہے ــــ طبقۂ محدثین اس سے محترز رہا گر کچھ تفسیر میں ذکر آ گیا ہے تو اس کو متاخرین نے فلسفۂ یونان سے لیا۔

بناءً: کسی چیز کو اس طرح رکھنا کہ صورت پیدا ہو جائے مثلاً سیارگان و ثوابت کی خوبصورت نظام کا قیام۔

انداد: مماثلت و تشابہت پیدا کرنا۔

شہداءکم: سے مراد تمہارا خدا یعنی تمہارے الٰہ انداد حق کو کہیں بھی ناکامی نہیں ہے کبھی اس کو شکست نہیں۔ اس پر پورا یقین ہو اور اس کا ثبوت عملی ہونا چاہیے۔ صرف قرآن پاک کا دعویٰ پیشکش امر حق ہے اور حق کو یقیناً فتح ہے ــــ طاقت بمعنی حق کمزوری بمعنی بطالت۔

۱۲ مارچ ۱۹۱۶ء

تاریخ اعجاز قرآن ــــ پہلا دور صحابہ کرام کا ہے جس میں عجز ثابت ہوا اور کوئی بھی نہیں پیش کر سکا۔ دوسرا دور جس میں علوم فنون نے ترقی کیا۔ ہاں دور اول میں فصاحت و بلاغت کی ترقی معراج ترقی پر پہنچی ہوئی تھی وہ اس کو ئی سے عاجز ہو گئے اور کلام خدا تسلیم کر لیا۔ غیر عرب پر معنوی دعویٰ ہے۔ باقلانی کی کتاب جس میں قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کے دلائل بیان کیا ہے اگرچہ وہ بھی چنداں مفید نہیں۔ قدما کی تصنیفات غائب ہو گئیں۔ سورۂ قصص میں دعویٰ اعجاز قرآن موجود ہے۔ سورۂ ہود میں موجود ہے کہ تم قرآن کی طرح ایک آدھ سورہ لے آؤ۔ کلام الٰہی کو قطعاً بلیغ ہونا چاہیے جو فوراً دل میں اتر جائے۔ جب کلام الٰہی میں دعویٰ ثبوت مقابلہ کے واسطے طلب ہوتا ہے تو اس میں ہدایت کا ہونا بھی یقینی ہے۔ قرآن پاک کا دعویٰ نہیں تو صرف قرآن کی مثل لاؤ ہے اور کہیں تو ایک سورہ بھی اس کی مثل لاؤ ــــ اگر ضمیر آنحضرت صلعم کی طرف رجوع کریں تو دعویٰ نبوت کا ہوگا مگر اس سے قرآن کا اعجاز اضافی رہ جاتا ہے مگر اس کی چنداں وقعت نہیں۔ مگر توراۃ کی شمولیت نے واضح کر دیا ہے کہ مثال سے مراد اعجاز قرآن ہے اور شمولیت میں قرآن پاک ہے توراۃ بھی ہے۔ دعویٰ جو دراصل ہے وہ کلام الٰہی کے ہونے میں ہے جو اس کو جھٹلاتا ہے وہ ایک ایسا ہی کلام بنا لائے اور ایسا نہیں ہوا۔ پس قرآنی دعویٰ اپنے تمام اعجاز قرآن میں ہے یعنی جمیع اجزاء میں یہ دعویٰ شریک ہے۔ قرآن نے دعویٰ کیا ہے کہ میں کلام الٰہی ہوں اور فصاحت و بلاغت اور ہدایت و حکمت بھی ہے۔ سورۂ قصص میں جو دعویٰ ہے وہ یہ ہے کہ ایک مثل بھی قرآن و توراۃ جیسی لاؤ۔ اس میں معلوم ہوتا ہے کہ صرف بلاغت ہی معیار صداقت نہیں ہے کیونکہ توراۃ میں یہ صفت نہیں ہے بلکہ یوں کہو کہ دعویٰ صرف کلام الٰہی

ہے اور ہے بھی یہی۔ کوئی بھی اس کا مقابل نہیں لاسکتا کیوں کہ اللہ تو مدعی کے ساتھ ہے مفتری کے ساتھ خدا کہاں!
کوئی چیز کتاب میں نہیں ہے بلکہ کل میں ہے اور جمیع اوصاف جمع ہیں آ گئے بلاغت تو بدرجہ اولیٰ ہے۔

مارچ ۱۹۱۶ء

اعجاز قرآن ــــ معتزلہ کا دعویٰ ہے کہ قرآن کا دعویٰ فصاحت و بلاغت میں نہیں ہے بلکہ دعویٰ رشد و ہدایت ہے اور اشاعرہ کی دلیل ہے کہ قرآن کا دعویٰ صرف حکمت میں نہیں ہے بلکہ فصاحت و بلاغت میں ہے کیونکہ اہل عرب دعویٰ فصاحت ذاتی میں تھا اسلئے تحدی فصاحت میں کی گئی ختم اصل دعویٰ تو تعلق الٰہی میں ہے۔ آخری فیصلہ درمیان حق و باطل میں ہے حق کے مقابل ایک ایسی ہی قوت لاؤ اور اعانت بھی اپنے مددگار سے طلب کرو اسکے مقابل ایک نمونہ پیش کردو جیسا کہ فیصلہ کن جیسا کہ قرآن پیش کر رہا ہے۔ دیگر خصائص یہ ہیں کہ اس آیت میں خصوصیت کیا ہے؟ ایک چھوٹی سے چھوٹی سورۃ لو مثلاً والعصر۔
عصر سے مراد ہے عموماً زمانہ۔ اور زمانہ شہادت دیتا ہے کہ انسان خسران میں مبتلا ہے اس کی حالت تاریخ میں دور و مندرج ہے۔ عموماً ہر حالت میں انسان خسران میں ڈوبا ہوا ہے، یاس غالب ہے بمقابلہ فوز و کامیابی کے۔ عام تباہی میں عام سعادت کا حاصل کرنا ہی کامیابی ہے۔ ہر وہ شے بمقابلہ خرابی کے بمقابلہ گھاٹے ٹوٹے کے آتی ہے وہ کامیابی ہے۔ یہی عام سعادت والعصر نے پیش کیا ہے۔ یعنی چار چیزیں عصر کی پیش کردہ ہیں۔ ایک یقین جس کو قرآن نے ایمان کہا ہے۔ شے دیگر عمل صالح ہے یعنی ہر وہ عمل جو عدل ہو، او فق ہو، حقیقت و واقعیت کو ساتھ ہو۔ ایمان اور صالح عمل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں کہیں ایمان ہوگا عمل صالح کا ہونا ضروری ہے اگر یہ نہیں ہے تو ایمان ہرگز نہیں ہے۔ ثالث حق ہے۔ جتنے اعمال غیر صالح ہیں ان کو فنا ہے اور یہی قدرت کی سنت۔ زمانہ گواہ ہے غیر صالح کا انفجار عذاب الٰہی ہے۔

چوتھا صبر۔ توصیہ حق باہم دیگر۔ اسی توصیہ کو قرآن نے امر بالمعروف کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کا اسوۂ حسنہ انبیاء کرام نے پیش کیا۔ توصیہ حق میں بڑی بڑی تکلیفیں ہوتی ہیں۔ اقدام میں سدراہی ہوتی ہے۔ مصیبت اور بلا کے انبار سر آتے ہیں تو اس کے دفع کے واسطے صبر ہے۔ یعنی قربانی اور قربانی کو طے کرنا بلا صبر کے محال ہے۔ جب کبھی حق آئے گا تو صبر بھی شامل آئے گا۔ اگر صبر تمہارے ساتھ نہیں ہے تو گویا حق نہیں ہے۔ ہاں ہر کامیابی کے واسطے یہ چار صفتیں ہوتی ہیں ــــ یہی اعجاز ہے جو بیان ہوا۔

۲۸ مارچ ۱۹۱۶ء استاذ مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ کی اخراج کا حکم جانسوز کا واقع ہونا اور دارالارشاد کا خاتمہ طلبہ کی رخصتی، اختتام امید ــــ

••

دریابادی

مولانا عبدالماجد دریابادی کا اپنی تصنیف سے انکار

مراسلات

عبدالماجد دریا بادی کا اپنی تصنیف سے انکار

راقم نے استفسار کیا تھا کہ فلسفۂ اجتماع کہاں ملے گی۔ مصنف کتاب مولانا عبدالماجد دریا آبادی صاحب نے جوابی مکتوب لکھا اس میں مولانا نے اپنی تصنیف "فلسفۂ اجتماع" کو اپنی تصانیف سے خارج کرنے کا اعلان کر دیا۔

پروفیسر مکرم سید محمود کمال الدین حسین ہمدانی

مکرم گسترا وعلیکم السلام

فلسفۂ اجتماع میری بالکل نوعمری کی تصنیف ہے، ۱۹۱۴ء کی۔ جب میں نشۂ الحاد میں سرشار تھا۔ دو ہی چار سال بعد جب توفیق توبہ ہو گئی تو پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اس کتاب کو اپنی فہرست تصانیف سے خارج کر دیا اور اس کی اشاعت قطعاً روک دی۔ چنانچہ اب وہ کتاب کہیں بھی نہیں مل سکتی۔ پچاس برس سے زائد ہوئے کہ کتاب اپنے مرگھٹ پر پہنچ چکی۔

والسلام دعاگو

عبدالماجد

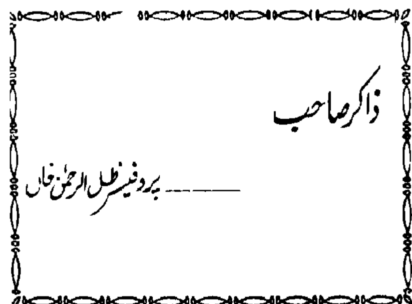
بسم اللہ

صدق

دریاباد ضلع بارہ بنکی

مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۷۰ء


ذاکر حسین


ذاکر صاحب
—— پروفیسر ظل الرحمٰن خاں



ذاکر صاحب : خدا بخش خاں کے بعد اس لائبریری کے سب سے بڑے محسن تھے
بہت کچھ انہوں نے اسکے لیے کیا۔ دسنہ جیسے بڑے کلکشن کے علاوہ اور متعدد ذخیروں کا اضافہ
کرایا اور صوبائی حیثیت سے بلند کر کے اس ادارہ کو مرکز سے وابستہ کر قومی اہمیت کا ادارہ بنوایا۔
ذاکر صاحب کی یادیں ان کے قریبوں اور عزیزوں سے انکی ذاتی یادیں بطور ذاکر
خطبات پیش کرانے کا اہتمام خدا بخش لائبریری پچھلے کئی برسوں سے کرتی رہی ہے۔ اس سلسلے
میں خورشید عالم خاں صاحب، محمد شبیر خاں صاحب، رحمت اللہ خاں صاحب شیروانی، محترمہ
صالحہ عابد حسین، عبد اللطیف خانصاحب اعظمی وغیرہ کی یادیں اس جرنل میں پیش کی جا چکی ہیں
ظل الرحمٰن خانصاحب کا یہ خطبہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ادارہ ●———————

ذاکر صاحب

پروفیسر ظل الرحمٰن خاں

پروفیسر ظل الرحمٰن خاں (پ ۱۹۳۵ء، نقد) شاہجہاں پوری پٹھان ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شعبہ طبیعات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی پھر اس شعبہ کے چیرمین ہوئے۔ ہاشم علی صاحب کے جانے کے بعد یونیورسٹی کے کارگزار وائس چانسلر بھی رہے فی الحال شعبہ طبیعات میں پروفیسر ہیں۔ علیگڑھ کے طویل قیام کے باوجود شاہجہانپوری پختون ہونا ایک لمحے کیلیے بھی کبھی نہیں بھولے۔ ذاکر صاحب کے خویش ہونے کے ناتے ذاکر صاحب پر ان کا فرمایا ہوا سب سے زیادہ مستند ہوگا۔



ان کا وطن قائم گنج، ضلع فرخ آباد تھا۔ ان کے والد فدا حسین خاں صاحب وکالت کے سلسلے میں حیدرآباد دکن چلے گئے تھے، لیکن آبائی وطن ہمیشہ آتے جاتے رہے۔ وہاں کوٹھی بھی بنوائی۔ اس طرح ان کا تعلق یوپی اور حیدرآباد دونوں سے ہے۔

ابتدائی تعلیم اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں حاصل کی جہاں وہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین صاحب اور رفیع مولوی بشیر الدین سے بہت متاثر ہوئے۔ اسکول کے زمانے سے ہی ان کو تحریک خلافت سے گہری دلچسپی پیدا ہوگئی۔ وہ تحریک کی حمایت میں تقریریں کرتے اور چندہ جمع کرتے۔ میں نے سنا ہے کہ ان کے ہونے والے خسر نے ان کی تقریر سن کر اپنی بیٹی کی ان سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہائی اسکول پاس کرکے انھوں نے علی گڈھ میں ایم۔ اے۔ او کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں ان کے خاص دوستوں میں رشید احمد صدیقی، حبیب الرحمٰن صاحب اور اقبال احمد خاں سہیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سنا ہے ذاکر صاحب کورس کی چیزیں تو کم پڑھتے تھے لیکن علمی اور ادبی محفلیں گھنٹوں چلا کرتی تھیں۔ کھیل کے میدانوں کے پاس تماشائیوں میں بھی دیکھے جاتے تھے۔

زمانہ طالب علمی میں ہی انھوں نے فلاطون کی کتاب "ریاست" کا اردو میں ترجمہ کیا جو بہت مقبول ہوا۔ علی گڈھ کی طالب علمی کے دور میں وہ صوبہ سرحد کے اورنگ زیب خاں سے الیکشن جیت کر یونین کے نائب صدر رہے۔ اس زمانے میں طالب علم صدر نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں اقبال احمد خاں سہیل نے ایک "تہنیت نامہ" فارسی میں لکھا جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

چو بینم رفعتِ اورنگ زیب از جا بر آرم — چو افتد دیدہ بر ذاکر نگہ را پر فشاں دارم

مرا زیبد اگر مد نغمہ بر لب چوں ہزار آمد — کہ در گلزارِ دانش باز فصلِ نو بہار آمد

بیاید ذاکرِ فرخندہ طالع با ہوا داراں — کہ با خیلِ عزیزاں کارواں سالار می آید

نگارِ یونین را ساعتِ صد زیب و زیں آید — کہ اکنوں سروِ گلزارِ ہنر ذاکر حسین آمد

آخری شعر ملاحظہ ہو :۔

الٰہی دورِ جامِ مہر تا بر آسماں باشد — دریں میخانۂ دانش ہمیں پیرِ مغاں باشد

جب اورنگ زیب خاں شاید اگلے سال الیکشن جیتے تو اس موقع پر بھی سہیل صاحب نے ایک تہنیت نامہ فارسی میں لکھا۔

ذاکر صاحب کا کہنا تھا کہ اورنگ زیب خاں کے خلاف ان کا الیکشن اس بات کا اعلان تھا کہ علی گڈھ میں اب چھوٹے آدمی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے پہلے بڑے بڑے جاگیرداروں کی اولادیں چھائی ہوئی تھیں۔ چھوٹے آدمی کی زبان کھولنے کی ہمت نہیں تھی اور اِکّا دُکّا جنھوں نے کھولی ہوگی انھوں نے نقصان اٹھایا ہوگا۔ لیکن چھوٹے آدمی کی یہ جیت عارضی تھی کیونکہ شاید اگلے سال ہی بڑا آدمی کرسیِ صدارت پر براجمان ہوگیا۔ اب جاگیردار تو باقی نہیں رہے مگر دس سال سے جو کھیل ہو رہا ہے اس کی اہمیت تھوڑی بہت اب بھی ہے، گو کہ فرق ہوا ہے۔

جب گاندھی جی کی تحریک ترک موالات شروع ہوئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علی گڈھ میں اس کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوگی لیکن بالآخر ایسا نہ ہوا۔ مایوسی کے دور میں جب آخری بار علی برادران نے ایم۔ اے۔ او کالج میں تقریر کی تو ذاکر صاحب اور ایک دوسرے کسی صاحب نے تحریک میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ جس پر سب کو بہت تعجب ہوا کیونکہ ذاکر صاحب کا بظاہر کوئی رجحان اس طرف پہلے نہیں معلوم ہوا تھا اور دوسرے اس وقت تحریک علی گڈھ میں دم توڑ چکی تھی۔ رشید صاحب کا بیان ہے کہ ذیل کے شعر کا جو محمد علی جوہر نے پڑھا تھا ذاکر صاحب کے دل پر بہت گہرا اثر پڑا ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را　　　تو دانی حساب کم و بیش را

چنانچہ وہ جامعہ پہنچ گئے جو پہلے علی گڈھ میں قائم ہوئی اور پھر وہاں سے دہلی منتقل ہو گئی۔ پہلے قرول باغ میں رہی اور پھر وہاں سے اپنی موجودہ جگہ پر پہنچی۔

چونکہ جامعہ کے زمانے کے حالات سے لوگ عام طور پر واقف ہیں اس لئے اس زمانے کے زیادہ تر حالات کا ذکر صرف اشارۃً کیا جائیگا۔ شدید مالی مشکلات سے تو لوگ واقف ہی ہیں۔ اسی زمانے میں ایک روایت کے مطابق دہلی کارپوریشن کی ایک نشست کے لیے ان کا الکشن نواب زادہ لیاقت علی خاں سے ہوا اور دوسری روایت کے مطابق لیاقت علی خاں صاحب کے کسی قریبی رشتے دار سے ہوا، جس میں لیاقت علی خاں صاحب نے سرگرم حصہ لیا۔ دونوں روایتوں کے مطابق ذاکر صاحب الکشن جیتے۔

گو وہ علی گڑھ چھوڑ کر چلے آئے تھے، ان کا علی گڑھ سے اس زمانے میں برابر تعلق رہا۔ وہ اس زمانے میں وہاں کی کورٹ، اکیڈمک کونسل یا ایگزیکیٹو کونسل کے برابر ممبر منتخب ہوتے رہے۔ ان BODIES میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا۔

جامعہ کے زمانے میں ان کو برابر چندے جمع کرنے کا کام کرنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ وہ مسجد کے لیے چندہ لینے میرے وطن شاہجہانپور بھی آئے۔ ہمارے شہر کے مشہور تاجر اور رئیس حاجی سعید خاں صاحب مرحوم نے جامعہ میں مسجد بنانے کے لئے شاید بیس ہزار روپئے دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے لئے ذاکر صاحب خود آئے۔ حاجی صاحب نے بتایا کہ وہ چاندی کے سکے دیں گے۔ علی گڑھ کے زمانے میں والد مرحوم کی ذاکر صاحب کے بڑے بھائیوں سے اچھی دوستی رہی تھی اور وہ ذاکر صاحب کے یونین کے الکشن میں ان کے خاص طرفداروں میں تھے۔ شاید ان کے نام کی طرف ہی اقبال سہیل صاحب کے تہنیت نامے میں اشارہ ہے۔ چنانچہ ذاکر صاحب والد مرحوم سے ملنے ہمارے گھر آئے اور ان سے یہ چاہا کہ جب حاجی صاحب رقم ادا کریں تو وہ سکے لیکر انھیں بیس ہزار روپئے کے نوٹ دیدیں کیوں کہ سکوں کے بوجھ ڈھونے میں پریشانی

اور خطرہ دونوں چیزیں تھیں۔ لیکن اس سب کی نوبت نہیں آئی کیونکہ کوئی فقہی مسئلہ ایسا حائل ہو گیا کہ حاجی صاحب نے چندہ نہیں دیا۔ ذاکر صاحب نے معاملے کی تفصیل مجھے بتائی تھی مگر بد قسمتی سے مجھے اب یاد نہیں ہے ورنہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا۔ چندہ جمع کرنے کے کام میں انکو اکثر تلخ تجربے ہوئے۔

گاندھی جی کی دعوت پر ایک کمیٹی کی مدد سے ابتدائی تعلیم کی وردھا اسکیم انھوں نے مرتب کی۔ اس کی دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ابتدائی تعلیم بچّے کی مادری زبان میں ہونا چاہیے اور دوسری یہ کہ تعلیم کو بالکل سیکولر رکھا گیا۔ البتہ پرائیویٹ اداروں کو یہ آزادی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے خرچ پر جن بچوں کے والدین اجازت دیں ان کو مذہبی تعلیم دیں۔ یہ اور دیگر اصول قومی سطح پر اصولاً مانے گئے اور قومی پالیسی کا حصّہ بن گئے۔ یہ دیگر بات ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان میں سے زیادہ تر کی ابتدائی تعلیم اردو میں نہیں ہو رہی ہے۔ گو کہ بنیادی تعلیم کی اسکیم عملاً ناکامیاب ہو گئی مگر ان دو اصولوں کو اصولاً مان لیا گیا۔ اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اس سے کانگریس میں خصوصاً اور ملک میں عموماً جو لوگ سیکولر پالیسیوں کو عمل میں لانے کی کوشش کر رہے تھے، ان کے ہاتھ مضبوط ہوئے اور آئندہ کے آزاد امیدوار کی سیکولر پالیسی بنانے میں مددگار ثابت ہوا۔ اس لئے ذاکر صاحب کو سیکولرازم کا معمار کہا گیا ہے۔ مگر یہ بات قابلِ بیان ہے کہ مجموعی طور پر ملک کی فضا اس لحاظ سے سیکولر تھی کہ لیگ اور جناح تک نے کبھی بھی آزادی سے پہلے اسلامی حکومت کی بات نہیں کی۔ بلکہ عام طور پر لوگوں کو یہ اندازہ تھا کہ جناح اس طرح کی سیاست کو وجود میں لانے کے خلاف ہیں۔ اس کا بالکل صاف اندازہ جناح کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ کو ڈھاکہ میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے سامنے کی۔ کانگریس میں سیکولر خیالات کے لوگ بھاری اکثریت میں تھے گو کہ مخالف خیال کے لوگوں کی تعداد بھی نہ کے برابر نہیں تھی۔ پھر بھی کانگریس میں کوئی گروہ اعلانیہ طور پر ہندوستان کو ہندو ریاست بنانے کی بات نہیں کرتا تھا۔ شاید صرف ہندو مہاسبھا ایسی گفتگو کرتی رہی ہو گی، مگر اس کی کوئی طاقت نہیں تھی۔ گاندھی جی رام راج کی بات کرتے تھے جس سے غلط فہمیاں پھیلانے کا لوگوں کو موقع ملا، مگر وہ بلاشبہ سیکولر ہندوستان کے حامی تھے۔ ان کا کوئی ذرا سا بھی تعلق ہندو راشٹر کے فلسفے سے نہیں تھا۔

لہٰذا ابتدائی اور بنیادی تعلیم کو سیکولر رکھنا کوئی جدت نہیں تھی۔ یہ ہماری تحریک آزادی کی روایات ملک کے مزاج، اور ضروریات کے عین مطابق تھا۔

کم از کم ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اتنی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، اتنے مختلف رسم و رواج ہیں، اتنے مختلف دھارے ہیں کہ ایر IYER اور آئینگر IYENGAR تضاد کی حد تک مختلف ہیں گو کہ دونوں جنوبی

ہند کے برہمن ہیں، پھر مختلف خطوں کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی تجربات اتنے مختلف ہیں کہ سیکولرازم کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ کم از کم ہندوستان میں مذہب کی بنیاد پر ریاست اور حکومت نہیں چلائی جا سکتی۔ اقلیت کی طرف سے تو شاید مذہبی حکومت کی مخالفت اتنی شدید نہ ہو، جتنی اکثریت کے مختلف طبقوں، مزدوروں، اچھوتوں، عورتوں اور نوجوانوں کی طرف سے ہوگی۔ برہمن کی برتری کو آج کون مانے گا جب کہ باپ کی برتری کو جوان مان نہیں رہے ہیں۔

ہم تو آزادی سے پہلے کے ہندوستان کی بات کر رہے تھے۔ اس وقت ملک کا مزاج کم از کم لاشعوری طور پر سیکولر تھا۔ پھر بھی اخلاقی بنا پر بہت سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ بچوں کو مذہبی تعلیم ملنا چاہیے۔ اس لیے ابتدائی تعلیم کو سیکولر کہنے کی تجویز عام طور سے جو سوچنے کا ڈھنگ تھا اس سے الگ تھی۔ کمیٹی میں اس بات پر کافی اختلاف رہا۔ ملک کے پیمانے پر مسلمانوں میں اس پہلو کی خاص طور پر بہت مخالفت ہوئی۔

جمہوریت، سیکولرازم، اور سوشلزم پچھلے دو سو سال کی دین ہے، اور یہ یورپ سے ہمارے پاس آئے۔ میری رائے میں ان کو پرانی تاریخ میں ڈھونڈنا گمراہ کن ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت کو تو ہم نے جوں کا توں لے لیا، مگر سیکولرازم اور سوشلزم میں ہم نے ترمیمیں کی ہیں۔ مثلاً یورپ میں سیکولرازم کے ارتقاء میں ایک ہلکا سا عنصر مذہب کی مخالفت کا بھی ملتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔

اب دو طریقے ممکن تھے۔ ایک تو یہ ہو سکتا تھا کہ ریاست اور حکومت مذہب کی تقریباً بالکل بات ہی نہ کرتی یا سب مذاہب کی برابر سے بات کرتی۔ بظاہر آخرالذکر طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا جھکاؤ اکثریت کی طرف بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح سے سیکولرازم مسخ ہو گئی ہے۔

صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کو ان خطروں کا احساس بہت پہلے سے تھا۔ یا تو اس صدی کی دوسری دہائی کے اواخر میں یا تیسری دہائی کے شروع میں انھوں نے کچھ اس طرح سے کہا ہے کہ کچھ لوگ اس وقت بہت اچھی نیت سے مذہب کو سیاست میں استعمال کر رہے ہیں۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ یہ کہیں بہت نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ میں نے اسے خود کہیں پڑھا ہے مگر مجھے یاد نہیں کہ کہاں۔ اس کو ڈھونڈ کر نکالنا چاہیے۔ لہٰذا انھوں نے یہ بہتر سمجھا کہ ریاست اپنے آپ کو مذہب سے بالکل الگ رکھے۔ مگر یہ بات صاف رہنا چاہیے کہ ان کی سیکولرازم میں مذہب کی مخالفت کا ذرا سا بھی عنصر نہیں ہے ——————— چونکہ سیکولرازم پر میں نے اتنی گفتگو کی ہے تو میں اتنا اور کہہ دوں کہ میری رائے میں اس وقت ہندوستانی ریاست تو سیکولر ہے۔ مگر حکومت پوری طرح نہیں ہے۔

جامعہ کے آخری دور کی قابل ذکر بات سلور جوبلی ہے جو ۱۹۴۶ء میں منائی گئی۔ اس کی خاص بات یہ

تھی کہ مختلف قومی پارٹیوں کے لیڈر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ اس سے جامعہ کے کام کا ملک بھر میں چرچا ہوا۔ لیڈروں نے ایک پلیٹ فارم پر آکر اس بات کی توقع اصولاً پیدا کی کہ مختلف الخیال لیڈر مل جل کر ملک کے مسائل پر تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں اور ایک CONSENSUS پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ توقعات پوری نہ ہو سکیں کیونکہ ملک کی فضا بہت مکدر ہو چکی تھی اور اب کسی تصفیہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی سلور جوبلی کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

۱۹۴۶ء میں انتخابات کے بعد پنڈت نہرو کی قیادت میں جب عبوری حکومت INTERIM GOVERNMENT قائم ہوئی تو ذاکر صاحب کو وزیر تعلیم بننے کی دعوت دی گئی جس کو انھوں نے قبول نہیں کیا۔ چونکہ یہ بات عام طور پر معلوم ہے، اس لئے میں کوئی اور تفصیل بیان نہیں کروں گا۔

آزادی اور تقسیم ملک کے فوراً بعد جب ذاکر صاحب ریل سے کشمیر جا رہے تھے تو جالندھر اسٹیشن پر ان کو بلوائیوں نے گھیر لیا اور بڑی مشکل سے ایک سکھ افسر کی وجہ سے ان کی جان بچی۔ یہ واقعہ تفصیل سے اور لوگوں نے بیان کیا ہے، اس لئے میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہوں گا کہ اس طرح کے تجربے کے باوجود ان کے خیالات اور رویے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔

جب کشمیر کا تصفیہ طے کرنے کے لیے یو۔ این (U.N) کی طرف سے ایڈمرل نمٹز ADMIRAL NIMITZ آئے تو ایک شاید چودہ نکاتی پروگرام ذاکر صاحب نے ان کے سامنے پیش کیا۔ اس سب کے علاوہ انھوں نے اس دور میں ہندوستان اور بیرون ملک کے سفر کئے اور مختلف اہم کمیٹیوں کے ممبر رہے۔ فساد سے متاثر لوگوں کی مدد کرنے کی مہم میں شدومد سے لگے رہے۔

ذاکر صاحب اور دیگر جامعہ والوں کی مالی مشکلات کا اندازہ ذیل کی باتوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک صاحب جن کا تعلق عرصے تک جامعہ سے رہا۔ بعد میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے، دو تین سال قبل ان سے جامعہ میں میری ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو انھوں نے کہا کہ میں سب بڑے بڑے کمیونسٹ لیڈروں سے واقف ہوں، اور میں نے ذاکر صاحب کو بھی جامعہ کے دور میں دیکھا ہے، میں یہ پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ رہن سہن کے اعتبار سے ہندوستان کے سب سے بڑے کمیونسٹ گاندھی جی اور ذاکر صاحب تھے۔ جامعہ میں ان کے گھر کی حیثیت ایک COMMUNE کی تھی۔

دوسری بات بہت دلچسپ ہے۔ قرول باغ کے ایک بنیے نے جب ذاکر صاحب صدر تھے، ان کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کی خواہش ظاہر کی۔ ذاکر صاحب راضی ہو گئے۔ اوپر سے ان کو روکا گیا کہ وہ اس بنیے کے ساتھ فوٹو

کھنچوایں کیونکہ اس کی خراب شہرت ہے۔ انھوں نے یہ بات نہ مانی اور فوٹو کھنچوایا۔ جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو ان کو یہ انکشاف کرنا پڑا کہ ان کے قرول باغ کے زمانے میں وہ بنیا ان کو اُدھار دیتا تھا ورنہ فاقے ہوتے۔

پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے بہت اصرار پر انھوں نے علی گڈھ کا وائس چانسلر ہونا قبول کرلیا اور سنہ ۱۹۴۸ء میں علی گڈھ پہنچ گئے۔ اس سلسلے میں اور باتیں تو لوگ جانتے ہیں مگر شاید ایک اہم بات زیادہ لوگوں کے علم میں نہ ہو اس لئے میں اسے مختصراً بیان کروں گا۔ یہ معلومات مجھے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب مرحوم سے حاصل ہوئی تھی۔ جب ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہوئی تو اکثریت میں مسلمانوں کے خلاف بہت سخت ناراضگی پیدا ہوئی جو دشمنی کی حد تک پہنچ گئی۔ اس وقت پنڈت گوبند بلبھ پنت یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان یوپی میں رہیں اور بڑے پیمانے پر ہجرت نہ ہو مگر فضا کو دیکھتے ہوئے ان کو اس میں بڑی دشواری نظر آتی تھی چنانچہ انھوں نے یہ سوچا کہ تقسیم ملک کی ذمہ داری مسلمانوں سے ہٹا کر اردو اور مسلم یونیورسٹی پر ڈال دی جائے۔ آپ کو یہ یاد رہے کہ علی گڈھ کے طلبا اور اساتذہ نے مسلم لیگ کی حمایت میں زبردست حصّہ لیا تھا۔ اس سب کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ تقسیم ملک کی ذمہ داری مسلمان اور ہندوؤں پر برابر کی ہے۔ میں یہ مزید کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری آزادی کی جنگ میں بہت سی کمزوریاں تھیں، مثلاً یہ طے نہ ہو سکا کہ گؤکشی کے مسئلہ پر کیا کرنا چاہیئے۔ بابری مسجد رام جنم بھومی اور کرشن جنم بھومی وغیرہ قسم کے مسائل پر قومی تحریک کا کیا رویہ ہونا چاہیئے تو پھر تقسیم تو ہونا ہی تھی۔ مسلمانوں پر ذمہ داری کیوں رکھ دی جائے۔ خیر، ان باتوں پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ ہم پنت جی کی بات پر واپس آجائیں۔ انھوں نے یہ سوچا کہ غصّہ کو مسلمانوں سے ہٹا کر اردو اور علی گڈھ یونیورسٹی پہ منتقل کردیا جائے اور اس طور سے ان دونوں کا مکمل طور سے خاتمہ کردیا جائے۔ اس طرح مسلمانوں کو یوپی اور ہندوستان میں باقی رکھا جا سکے گا۔ اس پالیسی کو سمپورنانند جی کی پوری حمایت حاصل تھی۔ اس پس منظر میں ذاکر صاحب کا علی گڈھ کا وائس چانسلر بننا خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکز نے ذاکر صاحب کو علی گڈھ بھیجنے کا فیصلہ پنت جی کی رائے کے خلاف کیا۔ شاید پنت جی کو ذاکر صاحب سے اس وجہ سے کچھ ناراضگی پیدا ہوگئی، جس کا ویسے تو کوئی ظاہری اظہار نہیں ہوا لیکن ہم آئندہ صفحات میں بتائینگے کہ شاید یہ ناراضگی آگے چل کر بہت اثر انداز ہوئی۔

علی گڈھ جو بالکل ختم ہوتا ہوا معلوم ہو رہا تھا اسے ذاکر صاحب کے آنے سے ایک نئی زندگی ملی۔ شروع میں کچھ لوگوں کو جنھوں نے پاکستان کی مہم میں نمایاں حصّہ لیا تھا۔ ان کو ذاکر صاحب سے خطرہ تھا کہ ان سے بدلے لیے

جائیں گے، لیکن ذاکر صاحب نے ایسا نہیں کیا اور ہر اس آدمی کو جو یونیورسٹی کے لیے کسی بھی طریقے سے مفید ہو سکتا تھا، انھوں نے اس کو اپنا تعاون دینے کا وعدہ کیا اور یہ رویہ اختیار کیا کہ جو کچھ ہوا اس کو بھلا دیا جائے بشرطیکہ آئندہ کام خوش اسلوبی سے ملک کے آئین اور قانون کے مطابق ہو۔

انھوں نے تحقیق کے کام پر زور دیا جو علی گڑھ میں اس سے پہلے صرف خال خال ہو رہا تھا۔ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے انھوں نے باہر کے لوگوں کا بڑی تعداد میں تقرر کیا، اور جہاں کوئی اچھا آدمی ملا، اس کو بلا امتیاز مذہب و ملت وخیالات، تقرر کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ علی گڑھ میں اس کی روایت نہیں تھی۔ سرسید نے خود یہی پالیسی رکھی تھی، ان کے بعد ان کے پوتے سر راس مسعود نے بھی بالکل یہی پالیسی اختیار کی تھی۔ مگر پچھلے پندرہ سولہ سال میں لوگ اس پالیسی کو بھول گئے تھے۔ لہذا بہت سے لوگوں کو غیر مسلموں اور ترقی پسند خیالات کے لوگوں کا خاصی بڑی تعداد میں لیا جانا برا لگا۔ لیکن ذاکر صاحب اپنی پالیسی پر قائم رہے۔ پھر انھوں نے وہاں کے اساتذہ کو بڑی تعداد میں باہر کے ملکوں میں پڑھنے اور تحقیق کا کام کرنے بھیجا۔ یونیورسٹی کا بجٹ کئی گنا بڑھا۔ تحقیق کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ پڑھائی لکھائی کا معیار بڑھا۔ یونیورسٹی نے نام پیدا کرنا شروع کر دیا۔ کھیلوں کا معیار بھی جو تقسیم ملک کے بعد بہت گر گیا تھا، آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہو گیا اور اپنی پرانی سطح پر آ گیا۔ اس کا ذکر زیادہ تفصیل سے آگے چل کر ہوگا۔ ڈرامے آئے دن ہونے لگے۔ سنگیت اور نغمے سنائی دینے لگے۔ غرضیکہ کلچرل سرگرمیاں زور و شور سے ہونے لگیں۔ علی گڑھ کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہاں ایک نابینا اسکول پہلے سے تھا۔ وہ خیرات زکوٰۃ پر چلتا تھا جس سے وہاں کے بچوں پر بہت برا اثر پڑتا تھا۔ ذاکر صاحب نے اس کو گرانٹ پر لے لیا جس سے اسکول کی کارکردگی اور وہاں کے بچوں کی زندگی پر بہت اچھا اثر پڑا۔

علی گڑھ میں جو لوگ میرے طالب علمی کے زمانے میں رہے ہیں، وہ یہ جانتے ہیں کہ مارچ سے لے کر جون تک ایسی دھول اڑتی تھی کہ سڑک پر چلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ ذاکر صاحب نے بڑے پیمانے پر وہاں درخت لگائے اور لان تیار کرائے۔ اس سے خوبصورتی میں اضافہ ہوا اور دھول اڑنا بند ہو گئی۔

ذاکر صاحب نے علیگڑھ کے اقامتی کردار میں کچھ تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی مگر اس میں ان کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ذاکر صاحب کے زمانے میں بہت سی اہم شخصیتیں مثلاً پنڈت نہرو، بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر رادھا کرشنن، راج گوپال اچاریہ، پنڈت گوبند بلبھ پنت اور مولانا آزاد وغیرہ علیگڑھ آئے۔ ان کے علاوہ بیرون ملک کی کئی اہم شخصیتیں بھی علیگڑھ آئیں، جن میں شاہ سعود اور شہنشاہ ایران خاص طور قابل ذکر ہیں۔ مولانا آزاد، ذاکر صاحب کے شروع زمانے میں آئے۔ اس موقع پر خاصی بدمزگی ہوئی اور مولانا ناخوش واپس گئے۔

ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کی طرف ذاتی توجہ دی۔ طالب علموں کے لیے وظائف کا انتظام کیا۔ اپنی جیب سے بھی خاصی رقم دی۔ ہالوں میں خود جا کر طالب علموں کی ہمت افزائی کرتے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں فضا بالکل بدل گئی اور یاس کے بجائے نوجوان ہر طرف پر امید نظر آنے لگے۔ سیکولرازم اور جمہوریت کی قدریں نوجوانوں کے ایک بڑے طبقے میں ہر دلعزیز ہو گئیں۔ علم کی پیاس پیدا ہو گئی اور نوجوانوں میں جدوجہد کر کے آگے بڑھنے کی امنگیں پیدا ہوئیں۔ بعد میں سب کو یہ اعتراف ہوا کہ ذاکر صاحب کے آنے سے یونیورسٹی بڑے خطروں سے بچ گئی اور اس نے بڑی ترقی کی۔

ذاکر صاحب کے دور میں جب نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کو پاکستان میں قتل کر دیا گیا تو علی گڈھ میں اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے معاملات کو بگڑنے سے روکا۔ ایگزیکٹو کونسل یہ رزولیوشن پاس کر چکی تھی کہ کسی کی موت پر بھی یونیورسٹی سائرن نہیں بجایا جائے گا۔ لڑکوں کا اصرار تھا کہ سائرن بجایا جائیگا ذاکر صاحب نے لڑکوں کے موڈ کو بھانپ لیا تو انھوں نے یونین میں جا کر یہ کہا کہ اگر یونین بغیر کسی اختلاف کے یہ رزولیشن پاس کر دے کہ سائرن بجایا جائے تو میں اسے مان لوں گا۔ اس پر دو لڑکوں نے ہاتھ اٹھانا چاہے کہ ان کو اس بات سے اختلاف ہے۔ ایک تو رضی الدین احمد جو بعد میں تروپتی یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہوئے۔ اور ایک صاحب گلکرٹ تھے جن کا پورا نام مجھے یاد نہیں ہے۔ بعض طبہت تھی لڑکوں نے ان کا ہاتھ نیچے دبا دیا۔ لیکن ذاکر صاحب کو شبہ ہو گیا کہ کچھ لوگوں کو خلاف رائے دینے سے روکا جا رہا ہے تو انھوں نے کہا کہ چونکہ اس پر اختلاف ہے۔ اس لئے سائرن نہیں بجایا جا سکتا۔ لڑکوں نے کہا کہ ان کو غلط فہمی ہے۔ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ بات صاف تھی کہ اس پر اختلاف تھا۔ جب لڑکوں نے ذاکر صاحب کی بات نہیں مانی اور جس کمرے میں سائرن تھا اس کا دروازہ توڑنے لگے اور بالکل داخل ہونے والے تھے تو انھوں نے کہا۔ "میں حکم دیتا ہوں کہ سائرن بجایا جائے۔"

علی گڈھ کے دور کی ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ سائنس کے ایک غیر مسلم پروفیسر صاحب کی بہت مخالفت پیدا ہو گئی۔ ذاکر صاحب ان سے دل میں شاکی تھے۔ مگر برابر ان کی حمایت کرتے تھے۔ یہ ضرور صحیح تھا کہ ان پروفیسر صاحب کا رویہ ڈکٹیٹروں جیسا تھا۔ مگر ان میں بہت خوبیاں بھی تھیں۔ علاوہ ازیں وہ اپنے مضمون میں کافی شہرت کے مالک تھے اور ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اپنے مضمون کے سب پروفیسروں سے زیادہ اعلا مقام رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں مجھ سے ذاکر صاحب نے کہا کہ دوسرے آدمی میں یہ سب خرابیاں جو ان میں ہیں وہ تو ہوں گی اور مضمون اتنا بھی نہیں آتا ہوگا۔ اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات مجموعی طور پر صحیح ہے۔ ان کی

کہنا تھا کہ ہمارے نوجوانوں کو لوگوں کے ساتھ نباہ کرنا سیکھنا چاہیے کوئی ABSOLUTE JUDGEMENT دیے جا سکتے۔ جیسے آدمی ہیں ان ہی سے کام نکالنا ہوگا۔ وہ آدمی جیسا لوگ چاہتے ہیں کہاں سے آئے گا۔

ایک اور دلچسپ بات مجھے حسین علی کاظمی مرحوم نے سنائی۔ یہ علی گڑھ میں بعد میں ناظم Director PHYSICAL CULTURE ہوئے۔ اپنے علیگڈھ کے شروع کے دور میں ذاکر صاحب نے حسین علی صاحب کو بلایا اور ان سے کہا کہ یونیورسٹی کا اہم کام تو علم اور تحقیق کے کام کو بڑھانا ہے لیکن عام مسلمان علیگڈھ کو اس کی ہاکی ٹیم کی کارکردگی سے جانتا ہے۔ لہٰذا میری خواہش ہے کہ آپ ہاکی کوچ کی حیثیت سے کام کرنا قبول کریں اور ایک ایسی ٹیم بنا کر دیں جو علی گڈھ کی ہاکی کی پرانی عظمت کو دوبارہ زندہ کر دے، مجھ سے جو مدد ہو سکے گی وہ میں کروں گا۔

ڈاکٹر نورالحسن صاحب کو بلا کر ان سے کہا کہ وہ ان کو ہاکی کلب کا پریسیڈنٹ بنانا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہکر معذرت کی کہ وہ کبھی ہاکی نہیں کھیلے ہیں اور نہ ان کو اس سے کچھ واقفیت ہے۔ وہ اس میں کیا کر سکیں گے۔ ذاکر صاحب نے ان سے کہا کہ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور یہ کام آپ کو قبول ہی کرنا ہے کیونکہ جو صلاحیتیں آپ میں ہیں ان سے آپ اس کام کو اور سب سے بہتر کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر نورالحسن صاحب نے اس کام کو قبول کیا اور ایک ایسی ٹیم بنائی کہ شاید اس جیسی ٹیم علیگڈھ نے پہلے بھی بہت مشکل سے بنائی ہوگی۔ یہ سب کی متفقہ رائے ہے کہ نورالحسن صاحب جیسا کامیاب ہاکی کا پریسیڈنٹ کوئی نہیں ہوا ہے۔

اس کے علاوہ نورالحسن صاحب کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شعبۂ تاریخ کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور اس کے کام کو آگے بڑھایا۔ اس سلسلے میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم اور شیخ عبدالرشید مرحوم نے وہاں بہت پہلے سے صحت مند روایات قائم کی تھیں، اور شعبے کی آئندہ ترقی کیلیے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ شعبۂ تاریخ کے کام کو آگے بڑھانے میں دیر لگی، تو مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ سیاست لڑانے کے سوا کوئی علمی اور تحقیق کا کام وہاں نہیں ہو رہا ہے اور سب ایک FRAUD ہے۔ مجھ سے تو ذاکر صاحب نے کبھی اس سلسلے میں کوئی بات اشارتاً بھی نہیں کہی مگر میں نے اڑتی پھرتی یہ بات سنی ہے کہ وہ بھی شاکی ہو گئے تھے کہ ان کی توقعات پوری نہیں ہوئی ہیں۔ مجھ کو اس میں ذرا شک ہے، کیونکہ ان کی زندگی ہی میں کچھ نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ذاکر صاحب اب زندہ ہوتے تو شعبۂ تاریخ کے کام سے نظریاتی اختلافات رکھنے کے بعد بھی بہت خوش ہوتے۔ ان میں وہ بات تھی کہ وہ متضاد دھاروں میں ایک ساتھ خوبیاں دیکھ سکتے تھے۔ (اس کی اور مثالیں بھی میں پیش کروں گا) چنانچہ اگر آج ذاکر صاحب زندہ ہوتے تو وہ بیک وقت

فیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر عرفان حبیب، پروفیسر اطہر علی، پروفیسر اقتدار عالم خاں صاحب اور کئی لوگوں
ر جو ستائش کرتے اور پروفیسر محمد حبیب اور شیخ رشید کے علاوہ نورالحسن صاحب کی خدمت کا اعتراف کرتے۔
پنڈت نہرو کی علی گڑھ آمد کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس موقعہ پر ذاکر صاحب نے جو تقریر کی اس
یک چھوٹی سی بات مجھے یاد رہ گئی جو اکثر میں اپنے طالبعلموں کو بتاتا رہتا ہوں۔ وہ میں یہاں اس لئے بتا رہا
ں کہ ذاکر صاحب کا اسی طرح قصے سنا کر چیزوں کو بتانے اور سمجھانے کا طریقہ تھا۔ کہنے لگے کہ اکثر ایجاد
ت چھوٹی سی بات سے ہوتی ہے۔ مثلاً ریل کی پٹری پہلے سے تھی۔ اس پر گھوڑا گاڑیوں سے کوئلہ کی کانوں میں کوئلہ
ھویا جاتا تھا۔ اسٹیم انجن کانوں میں جو پانی بھر جاتا تھا اسکو نکالنے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ جارج اسٹیفنس
رف یہ کیا کہ اسٹیم انجن کو پٹریوں پر رکھ دیا۔ اس طرح ریلوے کی ایجاد ہوئی۔

علیگڑھ کے زمانے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ رادھا کرشنن کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ ہندوستان
اعلیٰ تعلیم کی تاریخ میں اس کمیشن کی رپورٹ کی بہت اہمیت ہے۔

علی گڑھ سے قیام کے دوران انھوں نے ملک اور بیرون ملک کے کئی سفر کیے۔ اسی زمانے میں انھوں نے
ردو کی حمایت میں دستخطوں کی مہم چلائی۔

ویسے تو علی گڑھ میں ان کو طلباء اور اساتذہ کی بڑی اکثریت کا اعتماد اور تعاون حاصل رہا مگر آخر میں کچھ
ساتھیوں سے شاکی ہو گئے اور دل برداشتہ رہنے لگے۔ چنانچہ بغیر TERM پورا کئے ہوئے ۱۹۵۶ء
یں علی گڑھ چھوڑ دیا۔

کچھ ہی عرصے بعد بہار کے گورنر مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد پہلے وائس پریسیڈنٹ اور پھر پریسیڈنٹ
کے عہدے پر فائز رہے۔ دو سال ہی پریسیڈنٹ رہے تھے کہ قلب کا دورہ پڑنے سے ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو انتقال ہو گیا۔

<u>خیالات، مسائل اور شخصیتوں کی طرف رویہ:</u> ذاکر صاحب نے تحریک خلافت سے زندگی شروع کی
لیکن جب وہ ایم، اے، او، کالج آئے تو وہاں کے تجربات سے ان میں جاگیردارانہ نظام کی قدروں کے خلاف
فکر شعوری طور پر پیدا ہوئی، اور میرے خیال میں اس نے ان کی مستقبل کی زندگی کا راستہ متعین کر دیا۔ شاید یہی
ان کو گاندھی جی کے ساتھ لے گئی، اسی سے آگے چل کر انھوں نے سیکولرازم، نیشنلزم، اور جمہوریت کے راستے
ڈھونڈے، اور پھر زندگی بھر ان کو نہ چھوڑا۔

ان باتوں کے ساتھ ساتھ ان میں تکمیلیت پسندی بدرجۂ اتم تھی۔ اسی نے ان میں جمالیاتی حس پیدا کی۔

مندرجہ بالا کی روشنی میں ہم ان کی فکر پر مختصراً ایک نظر ڈالتے جا رہے ہیں:

جاگیردارانہ نظام مخالف رویہ: جیسا کہ ذکر آچکا ہے، اس کی شروعات علیگڈھ سے ہوتی ہے۔ جب وہ علیگڈھ کے وائس چانسلر ہوئے تو انھوں نے کوشش کی کہ وہاں کے اقامتی کردار میں ایسی تبدیلیاں پیدا کریں جس سے جاگیردارانہ قدریں کمزور ہوں، لیکن اس میں ان کو زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ ایک چھوٹی سی تبدیلی جو ہوئی وہ مجھے یاد ہے۔ پہلے بالوں میں نائی بال کاٹنے اور شیو بنانے کے لیے مقرر تھے۔ انھوں نے اس طریقے کو ختم کر دیا۔

ذاکر صاحب کے آنے کے بعد مولانا آزاد کی رائے اور مشورے سے ۱۹۲۰ء کے یونیورسٹی ایکٹ کی جگہ ۱۹۵۱ء کا ایکٹ لایا گیا۔ اس سے پہلے کے ایکٹ نے یونیورسٹی کو روٴسا اور جاگیرداروں کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔ نئے ایکٹ میں یہ اثرات بہت کم کر دیے گئے اور یونیورسٹی کو ایک صحت مند راستے پر ڈالا گیا۔

علاوہ ازیں ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں جو دو ایک باتیں سیکولرازم کے منافی تھیں وہ ختم کر دی گئیں۔ مثلاً غیر مسلم اب کورٹ کے ممبر ہو سکتے تھے۔ ایک تبدیلی اس ایکٹ کی رو سے یہ کی گئی کہ اگر کوئی مسلمان طالب علم چاہتا تو دینیات کے بجائے HISTORY OF CIVILIZATION لے سکتا تھا۔ اس کا استعمال تو دو چار سال میں کہیں ایک دو بار ہی ہوتا ہے، مگر اصولاً یہ امکان اس ایکٹ کی رو سے پیدا کر دیا گیا۔

سیکولرازم: بنیادی تعلیم کی سفارشات کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اگر MINUTES دیکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ اگر ذاکر صاحب ذرا ڈھیلے پڑ جاتے تو سیکولرازم کا خاتمہ بہت پہلے ہو گیا ہوتا۔ ابھی تو سانس چل رہی ہے، ہو سکتا ہے کہ مریض جانبر ہو جائے۔ غالباً اسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اچاریہ کرپلانی نے ذاکر صاحب کے لیے کہا ہے کہ وہ ہماری سیکولرازم کے معمار تھے۔ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ملک میں عام طور پر ایک سیکولر مزاج تھا۔ لیکن چیزیں واضح اور صاف نہیں تھیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ مذہبی تعلیم دینے کی سفارش کر دی جاتی۔ کمیٹی میں تو یہ رائے اکثریت میں معلوم ہوتی تھی۔

ایک بات جو مجھے اچھی طرح یاد پڑتی ہے، مگر مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے کہاں دیکھا، اور جس کا ذکر آچکا ہے یہ ہے کہ کیا تو اس صدی کی دوسری یا تیسری دہائی میں ذاکر صاحب نے اس بات کے خطرے کا اظہار کیا کہ مذہب کو سیاست سے نہ ملایا جائے۔ اس کو ڈھونڈا جائے۔ اگر یہ مل جاتی ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی سیاسی بصیرت ان کے

...

ان کا سیکولر رویہ اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ جب وہ نائب صدر اور صدر تھے تو گو کہ وہ سب نمازیں پڑھتے تھے اور قرآن شریف کی تلاوت برابر کرتے تھے۔ وہ جمعہ کی نماز پڑھنے نہیں جاتے تھے۔ کبھی ان سے اس پر بات نہیں ہوئی مگر یقیناً اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا یہ خیال تھا کہ ایک سیکولر ریاست کے نائب صدر یا صدر کو DEMONSTRATIVE WAY میں RELIGIOUS نہیں ہونا چاہیئے۔[1]

ایک دفعہ کچھ مسلمانوں نے یہ سوچا کہ کانگریس کے سب مسلمان ایم۔ پی ایک گروہ بنالیں اور کسی ایک طرف سودا BARGAIN کرکے ہو جائیں تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔ ذاکر صاحب نے اس کی سختی سے مخالفت کی جس کی وجہ سے یہ پلان ناکامیاب ہوگیا۔

۱۹۴۷ء میں جامعہ کا حال بہت ہی خراب ہوگیا۔ کوئی طالب علم نہیں رہا۔ ہر طرف آگ لگ رہی تھی اور قتل و غارتگری ہو رہی تھی اور کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شاید کوئی مسلمان مع ذاکر حسین خاں کے ہندوستان میں نہ رہ سکے گا۔ تو وہاں کے استادوں نے ذاکر صاحب سے پوچھا کہ ہم لوگ ایسے میں کیا کریں؟ تو انھوں نے کہا کہ ہم پھول بوئیں تاکہ ہم اپنے بعد کے آنے والوں کو خوبصورتی کا سبق سکھائیں۔ اس سے پہلے ان کے جالندھر کے حادثے کا ذکر آچکا ہے۔ ایسے تجربات کے بعد اپنا توازن قائم رکھنا ہر آدمی کے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہ وہی کرسکتا ہے جو سیکولرازم کے عظیم ترین معماروں میں سے ہو۔

کبھی انھوں نے پرائیوٹ گفتگو میں بھی ذرا سی دیر کے لیے بھی کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو سیکولرازم سے ہٹ کر ہوتی۔ میں تو کہوں گا کہ پنڈت نہرو کے لیے سیکولر ہونا آسان رہا ہوگا کیونکہ انھوں نے مذہب قریب قریب ترک کر دیا تھا۔ ذاکر صاحب نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ ان کو مذہب عزیز تھا اور ملک کی فلاح و بہبود کے ساتھ مسلمانوں کی فلاح و بہبود بہت عزیز تھی۔ کبھی لغزش ہو سکتی تھی۔ کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ کبھی بہت غصے میں یہ ایک دفعہ کہا ہے کہ اگر اس طرح کا دشمنانہ رویّہ رکھا گیا تو میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ شاید مسلمانوں نے پاکستان ٹھیک بنایا۔ باقی وہ برابر سیکولرازم کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ ان کو مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی اور ہمدردی تھی۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ میں ایک بہت دلچسپ واقعہ سناتا ہوں:

"یہ بات ۱۹۶۷ء کی ہے جب وہ صدر تھے۔ میں کشمیر سے قریب ایک ماہ بعد واپس آیا۔ اس دوران عرب اسرائیل جنگ ہو چکی تھی جس میں عربوں کو شکست فاش ہوئی تھی۔ میں بھی اس سے متاثر تھا۔ میں سفر سے آتے

---

[1] ۔ جماعت اسلامی کے حضرات سید صاحب کو ذاکر صاحب نے سمجھایا کہ مسجد میں نماز ادا کرنے کی وجہ گھٹنے کی تکلیف تھی جس کی وجہ سے وہ چوکی پر بیٹھ کر یا دل لٹکا کر نماز ادا کرتے تھے۔ عید بقرعید میں عیدگاہ میں نماز ادا کرنے تو بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ (دیکھئے جرنل ۱۰-۲۲-صفحہ ۸۴) ادارہ

ہی سو گیا تھا۔ جیسے ہی اٹھا تو دیکھا کہ ذاکر صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ ایسا واقعہ پہلی اور آخری بار ہوا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ملازمین سے کئی بار پوچھ چکے تھے کہ میں اٹھا یا نہیں۔ آتے ہی بولے کہ "جنگ ہوئی تھی۔۔۔" اتنا کہا تھا کہ آنسو نکل آئے اور وہ ویسے ہی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر واپس چلے گئے۔

یہ PAN-ISLAMISM نہیں تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہماری تحریک آزادی نے، خاص طور پر گاندھی جی نے ہمیشہ واضح طور پر عربوں کا ساتھ دیا تھا۔ ان کو امپیریل ازم کے خلاف جدوجہد کرنے والی سب قوموں سے ہمدردی تھی۔ عربوں سے یقیناً کچھ زیادہ رہی ہوگی۔

تکمیلیت: وہ چاہتے تھے کہ جو کام کریں وہ بہترین کریں ورنہ نہ کریں۔ دوسرے درجے کا کام کرنے کو وہ برا سمجھتے تھے۔ اسی لئے ان کو تقریر لکھنے میں بڑی الجھن ہوتی تھی اور وہ اس سے بہت کڑھتے تھے، ان کا موڈ خراب رہتا تھا کیونکہ وہ بہترین چیز لکھنا چاہتے تھے۔ ان کی تقریر بالکل آخر وقت تیار ہو پاتی تھی۔

تکمیلیت پسندی کے فلسفے کی وجہ سے ہی انھوں نے نسبتاً بہت کم تحریری مواد چھوڑا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرؔ نے اپنے ذیل کے شعر میں ان کے فلسفے کی خاصی ترجمانی کی ہے:

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں   عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

مذہبی افکار: ان کے فلسفۂ حیات میں خاص دخل قرآن، صوفی، لبرل فلسفی، شاعر، آرٹسٹ اور گاندھی جی کو ہے۔ ان کے یہاں خوبصورتی مذہبی عقیدے کا ایک خاص عنصر ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ خدا عظیم ترین خوبصورتی ہے۔

وہ خوبصورتی کے سچے دلدادہ تھے۔ وہ ان کی روحانی غذا تھی۔ وہ خوبصورتی آرٹ، سنگیت، رقص، رنگین پتھروں، پھولوں اور عمدہ لانز وغیرہ میں دیکھتے تھے۔ لان پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ راجی میں ان کے ساتھ لان میں ٹہل رہا تھا۔ میں لان کی خوبی کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں جانتا تھا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا یہ لان کیسا ہے۔ میں نے اپنے خیال میں مصلحتاً کہا کہ اچھا خاصا ہے، تو اس پر انھوں نے جھنجھلاہٹ سے کہا کہ اگر یہ اچھا خاصا ہے تو پھر اچھا کیا ہے۔

ان کے اسلام کے تصور میں ڈرامہ، سنگیت، اور رقص وغیرہ حرام نہیں تھا۔ شاید ان چیزوں کی خوبصورتی ان کا خدا سے سلسلہ ملاتی ہے۔ ان کے مذہبی افکار یقیناً عام لوگوں سے مختلف تھے گو کہ وہ مجموعی طور پر پابند شرع

تھے۔ ان کو FULLY PRACTICAL MUSLIM کہنے میں مجھے ذرا سا بھی تامّل نہیں ہے۔ مجیب صاحب نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ ان کو نہ تو کٹر کہا جا سکتا ہے نہ غیر کٹر۔ ان کی شخصیت اور افکار ایسے نہیں ہیں جنکو دو چار الفاظ میں مروّج اصطلاحوں کی مدد سے بیان کیا جا سکے۔ اکبر کے ذیل کے شعر ان کے افکار کو سمجھنے میں کسی قدر مددگار ہوں گے :

ہیں ہر ایک مذہب میں کچھ کافر بھی کچھ دیندار بھی　　یاد رکھ تو بات یہ اک محرمِ اسرار کی

میں کب کہتا ہوں اے واعظ کہ میں نے راز دیں سمجھا　　فقط اتنا ہی سمجھا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا

یہ بات ظاہر ہے کہ اس طرح کی مذہبی فکر رکھنے والا آدمی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔

قوم وملت اور ہندوستانی نیشنلزم کا ان کا تصور : علما میں سب سے پہلے مولانا حسین احمد مدنی نے مدلل اور واضح طور پر یہ کہا کہ قوم اور ملت دو الگ چیزیں ہیں اور قوم کی بنیاد وطن پر ہے۔ اس بات کی بنیاد تو پہلے سے شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے رکھی تھی مگر مدنی صاحب نے اس کو پرزور طریقے پر پیش کیا اس نقطۂ نظر سے سر محمد اقبال کو سخت اختلاف ہوا اور انھوں نے ایک بہت سخت نظم بہ عنوان "حسین احمد" لکھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس کا اس سے سخت جواب مولانا اقبال سہیل خاں نے لکھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ذاکر صاحب کے قوم وملت کے بارے میں خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس لیے چند اشعار پیش خدمت ہیں :

گفت وخوش گفت برسرِ منبر　　ملت از دیں و قوم از وطن است

ہم روایت دلیل ایں معنی　　ہم ز آیت ثبوت ایں سخن است

آگے چل کر حب الوطنی پر کہتے ہیں :

گر نیاید بہ ملت آسیبے　　عین ایمان محبت وطن است

قوم ما ہست ہر کہ ہست بہ ہند　　خواہ شیخ است و خواہ برہمن است

. . . .

مسلم و ہندو و مجوس و یہود　　گل و نسرین و لالہ و سمن است

ہر کہ گفتہ خلاف ایں معنیٰ　　راہبر نیست بلکہ راہزن است

ہر کہ خاک افگند بہ دیدۂ حق　　خاک برسرو خاک در دہن است

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، اقبال سہیل خاں علیگڈھ میں ذاکر صاحب کے ساتھی رہے تھے اور ذاکر ؒ

ان کی لیاقت، ذہانت اور قابلیت کے بہت قائل تھے۔ ذاکر صاحب نے کہا ہے کہ "علی گڑھ میں شعر اور تنقید و ادب کے امام سہیل تھے۔" رشید احمد صدیقی نے ان کے لئے کہا ہے "۔۔۔ اس زمانے میں علی گڑھ کی ادبی فضا پر ذوق چھائے ہوئے تھے، لیکن سہیل نے وقتاً فوقتاً ذوق پر ایسی کڑی اور کبھی استہزائی اور تفریحی تنقید کی اور غالب کی شاعرانہ عظمت کا ایسا سکہ بٹھلایا کہ کالج میں ذوق کا کوئی حمایتی نہ رہا۔"

کہا جاتا ہے کہ سہیل صاحب کا جواب پڑھ کر سر محمد اقبال نے مولانا حسین احمد سے لکھ کر معافی مانگی اور ان اشعار کو مجموعہ سے خارج کرنے کی ہدایت کی، مگر اس پر عمل نہ ہوا۔ لیکن جیسا میں نے کہا ہے، اگر ایسا ہوا تو صرف تین چار اشعار نہیں بہت کچھ اور بھی خارج کرنا پڑے گا۔

انڈین نیشنلزم پر ذاکر صاحب بالکل صاف طور پر UNITY IN DIVERSITY کے قائل تھے۔ اس کو حال میں میں نے ای۔ کے۔ گجرال کی ایک تقریر سے واضح طور پر سمجھا۔ مختصراً عرض ہے:

انگریزوں کے آنے سے پہلے ہندوستان بہت سی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک بڑا حصہ مغلوں کے پاس تھا، لیکن دور دراز کے علاقے خود مختار تھے صرف مختصر عرصے کے لیے اشوک اور اورنگزیب کے زمانے میں تقریباً پورا ہندوستان ایک حکومت میں تھا۔ اس طرح ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ مختلف مذاہب تھے، مختلف زبانیں تھیں بلکہ مختلف علاقوں کے تاریخی تجربات اور معاشی حالات بھی مختلف تھے۔

انگریزوں کے آنے کا جو ردِ عمل ہوا اس سے دو مکتبِ خیال پیدا ہوئے۔ ایک تو وہ تھے جنھوں نے DIVERSITY کا اعتراف کیا اور UNITY IN DIVERSITY کی بات کی۔ دوسرا مکتب وہ تھا جس نے ان فرقوں کو نظر انداز کیا اور پورے ملک کے سب خطوں کو یکساں ایک بنانے کی کوشش کی۔ ان دو مکاتب میں شروع سے رسہ کشی چلی آ رہی ہے۔ کانگریس میں بھی دونوں مکاتب رہے ہیں، لیکن اوّل الذکر مکتب حاوی رہا ہے۔ اسی مکتب کے علمبردار گاندھی جی، پنڈت نہرو، ذاکر صاحب اور بہت سے اور لوگ ہیں۔

دوسرے مکتب کے لوگ اقلیتوں سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ کیا تم اپنی ملت کو مقدم سمجھتے ہو یا ملک کو۔ اس سے بدمزگی اور ناراضگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ سوال بالکل ایسا ہے جیسا کہ بعض لوگ نا سمجھی میں بچوں سے پوچھتے ہیں کہ آیا ان کو ماں سے زیادہ محبت ہے یا باپ سے۔ اس سے بچے کی نفسیات پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ بچہ دونوں سے محبت کرتا ہے یہی قدرتی بات ہے۔

قاضی عبدالودود

- ارمغان بہار (عکس) مع مقدمہ
———— علی حیدر نیر
- یادداشتہائے ودود



قاضی صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے اردو دانشور تھے اور اب سب دانشوران کی مشترکہ وراثت ہے۔ اپنے پیچھے انھوں نے جو کچھ غیر منضبط ترکہ چھوڑا ہے اس میں ان کی بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو چھپیں تو لیکن آج تک چھپی رہی ہیں۔ "ارمغان بہار" کے نام سے ایک گلدستہ انھوں نے ۱۹۶۳ء میں ترتیب دیا تھا۔ ڈاکٹر علی حیدر نیر نے اسے از سر نو پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے ہم ان کے ممنون ہیں۔

آخر زمانے میں قاضی صاحب کا یہ عالم تھا کہ لکھتے تھے اور پھر اُدھر ڈال دیتے تھے کبھی کبھی اسی چیز کو سامنے میسر نہ رہنے کے سبب دوبارہ سہ بارہ لکھتے تھے۔ مختلف موضوعات پر ان کی یادداشتیں ہزاروں چھوٹے بڑے پرزوں کی شکل میں موجود ہیں۔ ان میں سے وقتاً فوقتاً پیش کیا جاتا رہے گا شاید کوئی چیز کسی کے کام آ جائے۔ ان یادداشتوں میں کئی ایسی ہیں جو کسی نہ کسی مضمون کی شکل میں آ چکی ہیں، کچھ بالکل نئی چیزیں ملیں گی۔

—— ادارہ

ارمغان بہار (عکس)، مع مقدمہ

سید علی حیدر نیّر
استاد ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی
پٹنہ، بہار

ارمغانِ بہار

مرتبہ، قاضی عبدالودود مع تعارف

"ارمغانِ بہار" صوبہ بہار کے گذشتہ تیئس ۲۳ شعرا کے اشعار کا انتخاب ہے۔ اس کو قاضی عبدالودود نے حسب فرمایش جناب انوار الحسن عظیم آبادی مرتب کیا، اور جب ڈاکٹر ذاکر حسین (گورنر بہار) جو سبکدوش ہو کر دہلی جا رہے تھے، ان کے وداعی دعوت کے موقع پر ادارۂ تحقیقاتِ اردو پٹنہ کی جانب سے بطور یادگار بتاریخ ۲ مئی ۱۹۶۲ء پیش کیا گیا۔

مذکورہ انتخاب میں یہ اصول پیش نظر رہا کہ وہ بیرونی اصحاب جو کم عمری میں بہار آئے اور یہیں اقامت گزیں ہو گئے، انھیں بہاریوں میں محسوب کیا گیا جیسا کہ مرتب نے ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب نے حسبِ ذیل ارکان پر مشتمل ایک مجلسِ مشورت تشکیل دی تھی:

۱۔ جناب کلیم الدین احمد، ۲۔ جناب عطا کاکوی، ۳۔ جناب جمیل مظہری، ۴۔ جناب سید حسن، ۵۔ جناب ذوارکا داس شعلہ، ۶۔ راقم الحروف (سید علی حیدر نیّر)۔

اس انتخاب کے سلسلے میں عملی طور پر یہ اصول کارفرما تھا کہ مذکورہ اشخاص سے جو اشعار یا شعرا کے متعلق واقفیت حاصل ہوتی۔ قاضی صاحب کی پسند اور تصدیق کے بعد ہی اسے اس انتخاب میں داخل کیا جاتا۔ بالخصوص شعرا کی سنہ پیدایش، وفات اور تلمذ کے سلسلے میں قاضی صاحب کا فیصلہ حرفِ آخر ہوتا۔

انتخاب کا آغاز راسخ عظیم آبادی کے منتخب اشعار سے ہوا جو قدما میں سب سے عظیم شاعر تھے۔ بعد ازاں کسی خاص قاعدے کی پابندی کیے بغیر اسے مرتب کیا گیا۔ عنوانات میں بطور اشاریہ "ش" سے شاگرد اور "م" سے متوفی مراد ہے۔

"ارمغانِ بہار" میں جن تیئس ۲۳ شعرا کا انتخاب درج ہے۔ ان میں راسخ، ضیا، باقر، حسرت، امین، ثابت، رضا، سلطان، سلیم، کمال اور مبارک کے سال وفات کی تعین ہے۔ نیز اصغر بہاری، ضیا، رضا، رضا عظیم آبادی، حیران، تمنا، مبارک (شاہ مبارک حسین) اور مبارک (ڈاکٹر مبارک تلمیذ داغ) کے تلمذ کی

نشاندہی کی گئی ہے۔

"ارمغان بہار" گرچہ ایک مختصر انتخاب ہے، لیکن اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس سے قاضی عبدالودود کے ذوق شعری اور طریقۂ انتخاب پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتابچہ گرچہ مطبوعہ ہے لیکن کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ قاضی صاحب کی علمی خدمات کے سلسلے میں اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ قاضی صاحب کا ارادہ تھا کہ اس کا سلسلہ جاری رہے اور جہاں تک ممکن ہو مختصر انتخابات منظر شہود پر لائے جائیں، لیکن یہ منصوبہ تشنۂ تکمیل ہی رہا۔ اور اس سلسلے کا یہ پہلا اور آخری انتخاب شائع ہوا۔

چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش ہیں جن سے ذوق انتخاب کا اندازہ ہو سکتا ہے:

تمہاری بات اے راسخ سمجھ میں کس طرح آئے — کہ ہنسی بھی کیا کرتے ہو اور روتے بھی جاتے ہو

(راسخ)

صبح سے بیتاب ہے دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے — دیکھیے کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہے

(سعید)

سیر کر چمن چمن فصل بہار دیکھ کر — دام بچھے ہیں جا بجا بلبلِ زار دیکھ کر

(اثر)

ہمیں تو عمر دو روزہ عذاب ہے اے خضر — بلائیں تم نے ہی عمر جاوداں کے لیے

(اختر بہار)

پوچھا جو کسی نے اے اختر کیوں مشق سخن کو چھوڑ دیا — بولے کہ گیا جب موسم گل بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا

(سید حفیظ الدین بلخی)

سرکار نامۂ زندگی مری حسرتوں کے سوا نہیں — یہ کیا نہیں وہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں وہ رہا نہیں

(مضطر مظفرپوری)

جو ٹپکے راز کھل جائے نہ ٹپکے آگ لگ جائے — تری یہ کشمکش اے دیدۂ پرنم سمجھتے ہیں

(ضیا)

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے — ہم راتوں کو رویا کرتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

(باقر)

ویراں ہو خزاں سے چمن یاں تلک کہ ہائے — چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

(حسرت)

سنا ہے آج میخانے میں جام مے پرستوں نے — لٹا یا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں

(ابن خواجہ ابن العین)

دن گیا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی — عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی

(دل)

گر یار نے آنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا — اب تک دل مضطر نے کیا کیا نہ کیا ہوتا

(جوشش)

ہزار پیار کرے گا ہزار چاہے گا — مری طرح نہ کوئی تجھ کو یار چاہے گا

(ثابت)

زلف و رخ سے دور پڑے ہیں کہ ملا ہے کیا کام کریں — شام سے رو رو صبح کریں یا صبح سے رو رو شام کریں

(رضا اشمیر ضیا)

رضا کا اب خدا حافظ ہے یارو — یہی مجنوں کو بیماری ہوئی تھی

نکہت گل کو لیے گوشش پہ پھرتی ہے صبا ـــــ رشک آتا ہے ہمیں دیکھ سبکباروں کو (فیق)

یاد آگیا کسی کا کہنا وہ بے رخی سے ـــــ بولے کوئی نہ ہم سے بولیں نہ ہم کسی سے (سلطان)

چلے جب روٹھ ہم زنداں کے در کی توڑ کر کڑیاں ـــــ تو زنجیریں منانے کو وہیں پاؤں کی آپڑیاں (سلیم)

پاس جب آپ کو نہیں پاتے ـــــ آپ میں آپ کو نہیں پاتے (رضوان)

جی دھڑکتا ہے مرا ہجر کی پھر رات آئی ـــــ ہائے جس بات کو ڈرتے تھے وہی بات آئی (حیران)

دشت میں خاک بسر پھرتے ہیں غم کرتے ہیں ـــــ لوگ جس بات کو ہنستے ہیں وہ ہم کرتے ہیں (تمنا)

وہ جو نامور تھے زمانے میں ذکر سن لو فسانے میں ـــــ مجھے دیر ہوگی بتانے میں یہی نام ہے کہ نشاں نہیں (مبارک شہ وحید)

اڑتا پھروں ہوں دشت میں جوں گرد کارواں ـــــ منزل کہیں ہے، راہ کہیں، راہبر کہیں (کمال)

مینا بھی بھرا جام بھی لبریز ہمارا ـــــ پیتے نہیں اللہ رے پرہیز ہمارا (مبارک شہ وحید)

شمع سے پروانہ لپٹا اور جل کر رہ گیا ـــــ یہ تماشا جس نے دیکھا ہاتھ مل کر رہ گیا " " "

یہ غم کدہ ہے اس میں مبارک خوشی کہاں ـــــ غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے " " "

خدا کے سامنے اے محتسب سچ بولنا ہوگا ـــــ مرے شیشے میں مے دیکھی ہے یا خوناب دیکھا ہے (مبارک شہ وحید)

ارمغان بہار

ARMAGHAN-I-BIHAR



جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار

۲ مئی سنہ ۱۹۶۲ء

IDARA-I-TAHQIQAT-I-URDU

ادارۂ تحقیقاتِ اُردو، پٹنہ

ارمغانِ بہار

صوبۂ بہار کے شعرای گذشتہ کے اشعار کا انتخاب

از

قاضی عبدالودود

جناب انوارالحسن عظیم آبادی کی فرمایش سے

لبیل لیتھو پریس، رمنہ روڈ، پٹنہ نے چھاپا۔

عرضِ حال

ارمغانِ بہار صوبۂ بہار کے شعرائے گذشتہ کے اشعار کا انتخاب ہے۔ وہ بیرونی اصحاب
جو کمعمری میں یہاں آئے اور توطن پذیر ہو گئے، بہاریوں میں محسوب ہوئے ہیں۔
انتخاب کے ذمہ دار جناب قاضی عبدالودود ہیں۔ ادارہ اصحابِ ذیل کا
جن سے اشعار کے جمع کرنے یا چھنٹنے میں مدد ملی ہے نہایت ممنون ہے: جناب کلیم الدین احمد،
جناب عطا کاکوی، جناب جمیل مظہری، جناب سید حسن، جناب دوارکا داس شعلہ،
جناب سیّد علی حیدر نیّر۔
ابتدا لاتیخ سے کی گئی ہے، جو غالباً شعرائے قدیم میں سب سے بڑے تھے۔
ان کے بعد ترتیب میں کسی خاص قاعدے کی پابندی نہیں کی گئی۔ شعرا کی فہرست
آخر میں ملیگی، عنوانات میں ش سے شاگرد اور م سے متوفیٰ مراد ہیں۔
ارمغانِ بہار کی اشاعت کے اخراجات جناب انوار حسن حیرت
ذاداکیے ہیں۔ ادارہ ان کا بغایت شکرگذار ہے۔

راسخ، غلام علی، م ۱۲۳۸ھ

اپنی جانب تھا کشاں ہر عضو تیری درد کو
ہای ری لذت کہ جھگڑا جس کا ہمدیگر رہا

تمہاری بات ای راسخ سمجھ میں کس طرح آئی
گلہ بھی یار کا کرتی ہو اور روتی بھی جاتی ہو

صبح سی بیتابی ہی دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہی
دیکھیے کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہی

ہونٹ ہیں سوکھی تر ہیں آنکھیں زرد ہی چہرہ راسخ آہ
بندی سی صاحب حال تمھارا اب نہیں دیکھا جاتا ہی

نہیں ہوش والوں پہ کچھ حسد مجھی رشک ہی تو انھوں پہ ہی
جنھیں تیری جلوی کی سامنی مری طرح بیخبری رہی

ضبط گریہ تو ہی پر دل پہ جو ایک چوٹ سی ہی   قطرۂ آنسو کی ٹپک پڑتی ہیں دو چار ہنوز

چشم کیا کیا تھی یہ دیکھا ہی نہ ان نی ہاتھ اٹھا
اک نگاہ سرمگیں کی میں تو حسرت ہیں رہا

اگر کچھ درد رکھتا ہی تو راہ عشق یوں طی کر
کہ نی کانٹا کوئی ٹوٹی نہ پھوٹی آبلہ پا کا

مجھ تو زندگی سی تھی میں اس کو کیا جانوں   تمھیں کہو کہ لیا تم نی کس ادا سے دل

ہُنر مستغنی اس سے ہے کہ قدر افزا میسر ہو
شناسا گو نہ ہو تیرا کوئی پر تو تو گوہر ہو

الٰہی دے وہ آتش دل کے اندر | کہ جس سے شعلۂ دوزخ رہے تر
جگر وہ جس میں ہووے داغ پر داغ | ہزار آتشکدے ہوں زیر ہر داغ
رہے سوزش سے سینہ رشک گلخن | نفس آتش پہ دل کی مارے دامن
لبوں سے آشنا ہو نالۂ گرم | رہے جوں موم آتش دیدہ دل نرم
دھواں آہوں کا پہنچے آسماں تک | محبت آتش افگن ہووے یاں تک
مزے سے درد کے جو آشنا ہو | الٰہی اب مجھے وہ دل عطا ہو
شکست تازہ سے ہر دم رکھے ساز | رہے باب شکست اس پر سدا باز
شب لگ کے گلے مرے بلا فصل | روئی تا صبح حسرت وصل
دشمن ہوئی میرے جی کی ہیہات | افزونی خواہش ملاقات
گھٹنے لگی ہائے طاقت صبر | پہنچی نزدیک رخصت صبر
اشکوں نے کہ دل تھا ان کا مسکن | پھیلائے پاؤں تا بدامن
دریا بہا آنکھ سے لہو کا | ٹپکا خوں ہو دل آرزو کا
بیتابی سے بس کہ سر اُٹھایا | سینے سے جگر لبوں تک آیا
تھا یہ دل داغ داغ کا حال | ہو باد میں جوں چراغ کا حال

سعید محمد عباس عرف ابو صاحب

سیر نہ کر چمن چمن فصل بہار دیکھ کر
دام بچھے ہیں جا بجا بلبل زار دیکھ کر

اثرؔ، امداد امام

جنگل جنگل صحرا صحرا مارے مارے پھرتے ہیں
آہو وحشی جان کے ہم کو ساتھ ہمارے پھرتے ہیں

نہ کر شکوہ ہمارے بے سبب کی بدگمانی کا
محبت میں تری سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

خزاں زندگی ہے تفرقہ اہل محبت کا — مزا دنیا میں جینے کا بہار دوستاں تک ہے
ہمیں تو عمر دو روزہ عذاب ہے اے خضر — بلائیں تم نے سہیں عمر جاوداں کے لئے
اثر مطلب کا ہوا کرتا ہے دیوانہ بھی — قیس صحرا کو گیا کوچۂ لیلیٰ ہو کر
سمجھایا بہت دل کو سمجھانے کو کیا کہیے — دیوانہ ہے دیوانہ دیوانے کو کیا کہیے
آتے ہی چلے جانا کیا آنا ہے کیا جانا — اس آنے کو کیا کہیے اس جانے کو کیا کہیے
خدا کی خدائی ہمیشہ رہے گی — جو ہوتا رہا ہے سو ہوتا رہیگا

احقرؔ بہاری ش ازل لکھنوی

پوچھا جو کسی نے اے احقر کیوں مشق سخن کو چھوڑ دیا
بولے کہ گیا جب موسم گل بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا

سیّد حفیظ الدین بلخی

مرا کارنامۂ زندگی مری حسرتوں کے سوا نہیں
یہ کیا نہیں وہ ہوا نہیں یہ ملا نہیں وہ رہا نہیں

کچھ نہ تھا سب کچھ ہوا پھر کچھ نہیں — رنگ ہے آغاز کا انجام میں
جن کو ہے آداب مجلس کا لحاظ — خاک اڑتی ہے انھیں کے جام میں

مضطر مظفرپوری

جو ٹپکے راز کھل جائے نہ ٹپکے آگ لگ جائے
تری یہ کشمکش اے دیدۂ پرنم سمجھتے ہیں

ضیاؔ ش شوق نیموی م ۱۳۱۹ھ

کچھ کہا جاتا نہیں حال پریشانی دل — کہنے بیٹھینگے تو دل اور پریشاں ہوگا
تصویر ہوں میں غم کی کچھ سننا نہ کچھ کہنا — تانے ہوئے اک چادر خاموش پڑے رہنا

بڑھتی چلی ہے جی کی الجھن دل کو سنبھالے جاتے ہیں
دیکھیے آگے عشق میں کیا ہو لوگ بہت سمجھاتے ہیں

اک ٹیس جگر میں اٹھتی ہے اک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو رویا کرتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

کبھی دکھے ہوئے دل سے جو آہ کی ہوتی — پکار چار طرف سے پناہ کی ہوتی
ضیاؔ تری لاش پہ کرتی ہے ماتم — تری جامہ زیبی تری نوجوانی

کو چے سے نکلواتے ہو عبث ہم ایسے وطن آوارہ کو
رہنے دو پڑے ہیں ایک طرف دکھ دیتے ہو کیوں بیچاروں کو

حزیںؔ د ظہور، میر محمد باقر، م قبل ۱۱۶۶ھ

ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ ہائے
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

حسرت، ہیبت قلی خاں، م ۱۲۱۰ھ

عجب طرح کا عشق حسرت نے ٹھانا — کبھی اس کے کوچے میں آنا نہ جانا
ترا غرور مری عجز کے مقابل ہے — ادھر پہاڑ ادھر ایک شیشۂ دل ہے

سنا ہے آج میخانے میں جام مے پہ مستوں نے
لٹایا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں

امین، خواجہ امین الدین، م ۱۱۹۹ھ

کیا فائدہ ہے رونے سے اے اہل درد پھر — آتا ہے بعد مرنے کے یاں کوئی مرد پھر
ہم کو کیا گر بہار آتی ہے — دل وہ غنچہ نہیں کہ وا ہوگا

دن گیا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی

دل، محمد عابد، معاصر امین

بدنام ہوئے عشق میں حاصل نہ ہوا کچھ — فرہاد کی نسبت تو خموشی میں اثر تھا

گر یار نے آنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا
اب تک دل مضطر نے کیا کیا نہ کیا ہوتا

دل مضطر کو مارے درد و غم ناحق جدائی میں
یہی انصاف ہے کیا اے خدا تیری خدائی میں

جوشش، برادر محمد عابد دل

وہ زمانہ کیا ہوا جو مری گریہ میں اثر تھا — یہی چشم خونفشاں تھی یہی دل یہی جگر تھا

ہر ایک خار بیاباں رکھی ہی نوک زباں — یہ ماجرا ہی ہماری برہنہ پائی کا

ہزار پیار کریگا ہزار چاہیگا — مری طرح نہ کوئی تجھ کو یار چاہیگا

چمن میں یار بن رہنی کو تو کیا ہی رہا کیجے
ولیکن جی نہیں لگتا ہمارا اس کو کیا کیجے

اختیاری کیا ہی یہ آوارگی — وہ مثل ہی بندگی بیچارگی

جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ — رہتا ہی مدام آب دیدہ

ماتمکدۂ جہاں میں جوں ابر — رونی کہ لیے ہوں آفریدہ

گر آلندہ ہی دل میں اتنا ہی آرزو ہی — تاراج بی نیازی اقلیم آرزو ہو

گلزار محبت میں نہ پھولی نہ پھلی ہم — مانند چنار آگ میں اپنی ہی جلی ہم

ثابت، اصالت خاں، م ۱۲۰۸ھ

بگولی کا کبھو صدمہ کبھو صرصر کی زحمت ہی
ہماری خاک یوں اڑتی پھری ای ابر رحمت ہی

زلف و رخ سی دور پڑی ہیں کہ دل اب کیا کام کریں
شام سی رو رو صبح کریں یا صبح سی رو رو شام کریں

رضا، ش میر ضیا، م ۱۲۱۶ھ

دل کی بیتابیوں سی عشق چھپایا نہ گیا — نام کس نی لیا تیرا کہ میں پایا نہ گیا

جفای عشق کا جب بزم میں بیان ہوا — رضا کی سن کی خرابی ہمیں بھی کان ہوا

شکوہ کریں کسی سی ہم ہای کیا کسی کا — اپنا ہی دل ہوا ہی دشمن ہماری جی کا

یارب یہ کس کی غم میں آنکھیں بھر آئیاں ہیں
دامان و آستیں میں کل سی لڑائیاں ہیں

مجھ آگر گرفتاری ہوئی تھی   نہ اتنی زندگی بھاری ہوئی تھی
رضا کا اب خدا حافظ ہی یارو   یہی مجنوں کو بیماری ہوئی تھی

گر خوش نہ کیا مجھ کو نہیں اس کا تو غم ہای
ہوتی مری غیروں پہ ستم ہای ستم ہای
آنکھوں میں کس کی زلف سیہ فام چھاگئی
چاروں طرف جو دیکھوں ہوں اب شام چھاگئی
کیا کہیے اب ای یاراں اس عشق کی رسوائی
جس کے لیے سودا ہو سو ہی کہے سودائی

فیض، ش مصحفی

نہیں معلوم زندانی موئے یا قید سے چھوٹے
کھلا در تھا پڑا سنسان اس دم قید خانہ تھا

پھر رہا نظروں میں میری جو سماں رات کا ہی
دن پہ بھی جوشش تصور سے گماں رات کا ہی
روز و شب ایک سا عالم ہی جدائی میں تری
دن کا آرام کہاں اور کہاں رات کا ہی
لطف گلشن نہیں جب تازہ گرفتاروں کو
توڑ کے پھینک دو گل پھونک دو گلزاروں کو
نکہت گل کو لیے گوشش پہ پھرتی ہی صبا
رشک آتا ہے ہمیں دیکھ سبکباروں کو
دیکھا زنداں میں جو آ کہنہ اسیروں کا حال
زندگی موت ہوئی تازہ گرفتاروں کو

سلطان، خواجہ سلطان جان، م ۱۲۷۶ھ

پڑا جلتا ہوں حسرت سے لبوں پہ ہر گھڑی اُف ہے ۔۔۔ تصور بھی نہیں اس دلربا سے بے تکلف ہے

کیوں کے وہ خوشدلی کا زمانے میں نام لے ۔۔۔ جو سانس لیتے آہ کلیجے کو تھام لے

مرے نالوں کی ہے کچھ اور ہی راہ ۔۔۔ نہ اس کی پیروی تو اے جرس کر

کسی سے دل کی حقیقت میں آہ کیا کہتا ۔۔۔ جو کچھ کہ رنج و الم ہے سو میرے جی پر ہے

میں کیا بتاؤں کہ اس گل سے ربط کیسا تھا ۔۔۔ نہ فرق عاشق و معشوق میں تھا، ایسا تھا

دام بلائے عشق میں ہم بے سبب پڑے ۔۔۔ کم بخت دل پہ ہائے خدا کا غضب پڑے

وہ میرے پاس نہیں مفت میں جان جاتی ہے ۔۔۔ الٰہی مجھ کو شب ہجر کاٹے کھاتی ہے

آگ دل میں لگ گئی شمعِ رُخِ جانانہ سے ۔۔۔ جب بنا پتلا مرا خاکستر پروانہ سے

کہیں خوشی ہے کہیں رنج ہے زمانے میں ۔۔۔ یہی ہے کسوت عالم کے تانے بانے میں

لاکھ تدبیریں کیں پر تجھ سے نہ اے جان بنی ۔۔۔ ہائے کیا بات کروں جان پر اب آن بنی

نہ پھر ہو جائے کچھ کھٹکا مرا دل اس سے ڈرتا ہے ۔۔۔ تصور اس کا اس دم مجھ سے ہنس کر بات کرتا ہے

دل کو کس طور سے بہلاؤں میں ۔۔۔ میرے اللہ کدھر جاؤں میں

سارا زمانہ چھوڑا اب جن کی دوستی میں ۔۔۔ قدرت خدا کی ہم سے وہ بیر رکھیں جی میں

میری جرأت کو نہ اپنے عشق میں بدنام کر ۔۔۔ میں نے کس دن آہ کی سینے کو ظالم تھام کر

جو آج سمت فلک میری آہ جاتی ہے ۔۔۔ ہے ایک شعلہ جہاں تک نگاہ جاتی ہے

صدموں سے غم عشق کے جی چھوٹ گیا ہے ۔۔۔ کھائی ہے وہ چوٹ آہ کہ دل ٹوٹ گیا ہے

کیا ہوئے یارانِ ہمدم ہائے وہ محفل کہاں ۔۔۔ وہ طبیعت کدھر ہے وہ جی جو وہ دل کہاں

دلِ مرحوم کا یاں ذکر سے سینہ بھر آتا ہے ۔۔۔ نہ اس کا نام لے تو اے زباں مر بار جانے دے

یاد آ گیا کسی کا کہنا وہ بے رُخی سے ۔۔۔ بولے کوئی نہ ہم سے بولیں نہ ہم کسی سے

ہمیں کیا کام ہے اس سے جو خوش سارا زمانہ ہے ۔۔۔ ہمارے تو مقدر میں فقط افسوس کھانا ہے

تجھے معلوم کچھ اس کی خبر ہی ای دفا دشمن | جب آدھی رات ہوتی ہی تو کوئی اللہ کی کہتا ہی
اسی کا ذکر اب ساری جہاں کی زندگانی ہی | وہ کیا نام خدا ہی جس کی یہ افسانہ خوانی ہی
ہوئی عید اس کو آئی سی مرادیں سب ملیں دل کی | مکاں کا حسن ہی اپنی عجب زینت ہی محفل کی
غضب اس وقت تم نی اپنی جانی کی سُنائی ہی | کلیجہ پھک رہا ہی آگ کیا دل میں لگائی ہی
مرا پہلو کبھی خالی نہیں رہتا ہی ای ہمدم | نہیں آتا ہے وہ جبتک تو دل میں درد رہتا ہی
وہ دن ہیں یاد جب اُٹھو کا میں نی نام لیا | تو تم نی چھپ کے ہیں دامن کو میری تھام لیا
پڑا ہوں غم کی بس میں کوئی میری بیکسی دیکھو | یہ دن بھر سوچ میں کٹنا یہ شب کی بیکلی دیکھو

سلیم، میر محمد سلیم، م عشرۂ آخر ماۃ دوازدہم

چین بستی میں ہی اس دل کو نہ ویرانی میں | ہی عجب طرح کی وحشت تری دیوانی میں

چلی جب روٹھ ہم زنداں کی در کی توڑ کر کڑیاں
تو زنجیریں منانی کو وہیں پاؤں کی آ پڑیاں

رضواں عظیم آبادی، ش سلیم و مجرم

یاس جب آپ کو نہیں پاتی | آپ میں آپ کو نہیں پاتی
کشور دل میں آج لوٹ پڑی | فوج غم کس کی ہای ٹوٹ پڑی

حیران، ش جوشش

جس وقت یار آ کی ہم آغوش ہو گیا | شکوہ جو دل میں تھا سو فراموش ہو گیا
جی دھڑکتا ہی مرا ہجر کی پھر رات آئی | ہای جس بات کو ڈرتی تھی وہی بات آئی

نہیں رہتی ہو تم ہرچند میں کہتا ہوں رہنی کو
چلی جاؤ بھلا رہ جائیگی یہ بات کہنی کو

روئیے کس کے لیے اور کس کا ماتم کیجیے
عمر جاتی ہے چلی کچھ اپنا ہی غم کیجیے

تمنا، علی رضا، ش جوشش

لوگ جس بات کو ہنستے ہیں وہ ہم کرتے ہیں
دشت میں خاک بسر پھرتے ہیں غم کرتے ہیں

تمنا جنس دل بازار میں جس سمت تو رکھے
خریداروں کا پھر ادھر گذر ہووے تو میں جانوں

نہ آئی خوشی پاس ہم غم سے خوش ہیں
گئی ہے تو جب سے اسی دم سے خوش ہیں

مبارک، شاہ مبارک حسین، ش وحید الہ آبادی

لاکھ ساماں ہیں دل کسی میں نہیں
وہ جو اس جشن خسروی میں نہیں

جو مزا غم میں ہے خوشی میں نہیں
ہنس کے بھی دیکھا رو کے بھی دیکھا

وہ جو نامور تھے زمانے میں کہیں ذکر سن لو فسانے میں
مجھے دیر ہوگی بتانے میں یہی نام ہے کہ نشاں نہیں

کمال، شاہ کمال علی دیوروی، م ۱۲۱۵ھ

کہیں کسی کا محبت میں ننگ و نام رہا
تو ننگ و نام کی کیا بات پوچھے ہے زاہد

منزل کہیں ہے راہ کہیں راہبر کہیں
الٹا پھروں ہوں دشت میں جوں گرد کارواں

زمیں پہ کیوں نہ ستم ہو جو آسماں یہ ہے
کبھی خطا نہ کرے تیر گر کماں یہ ہے

احوال خرابی کا مری تم پہ عیاں ہے
اس دل کے تئیں درد سوں کب تاب بیاں ہے

مبارک ؔشاہ داغ، م ۱۳۷۷ھ

مینا بھی بھرا جام بھی لبریز ہمارا   پیتے نہیں اللہ رے پرہیز ہمارا
ہم کو معلوم ہے انجام محبت کیا ہے   ایک دن موت کی اُمید پہ جینا ہوگا
شمع سے پروانہ لپٹا اور جل کر رہ گیا   یہ تماشا جس نے دیکھا ہاتھ مل کر رہ گیا

یہ غمکدہ ہے اس میں مبارک خوشی کہاں
غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے

خدا کے سامنے اے محتسب سچ بولنا ہوگا
مے شیشے میں مے دیکھی ہے یا خوناب دیکھا ہے



ارمغان بہار

ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ کی طرف سے
جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو
وداعی دعوت کے موقع پر بطور یادگار
بتاریخ ۲ مئی سنہ ۱۹۶۲ء پیش کیا گیا۔

مطبوعہ لیبل لیتھو پریس - رملہ روڈ - پٹنہ ۔ ؁

یادداشتہاے ورود



سلیمان شکوہ شاہ عالم کے بیٹے اور بہادر شاہ (ظفر) کے حقیقی چچا تھے۔
یہ ۱۲۰۵ھ میں باپ کی اجازت کے بغیر عازم اودھ ہوگئے تھے اور وہاں مدت
تک مقیم رہے تھے۔ یہ صاحب دیوان شاہزادے شعراء کے مربی تھے اور جیسا کہ عام
طور پر معلوم ہے کہ بعض وقت و ضرورت پر یہ انکے دامن دولت سے وابستہ رہے تھے
غازی الدین حیدر کے تخت شاہی پر جلوس کرنے کے بعد انکی ایک بیٹی کی شادی
نصیر الدین حیدر سے ہوگئی تھی لیکن جب باپ کی موت کے بعد نصیر الدین حیدر
تخت نشین ہوا، تو اسکی بدسلوکی کی وجہ سے سلیمان شکوہ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ آخر عمر
اور بعض دوسرے مقامات میں قیام کے بعد یہ آگرہ میں مستقل طور پر سکونت
پذیر ہوگئے، جہاں ۱۲۵۳ھ میں انکی وفات ہوئی۔ "گلشن بیخار" میں جس
وقت انکا ترجمہ لکھا گیا ہے اس کے چند سال بیشتر یہ دہلی بھی گئے تھے
اس کا امکان ہے کہ غالب لکھنؤ یا دہلی میں انکی خدمت میں حاضر ہوئے ہوں۔
بہرحال، انکا ایک رقعہ غالب کے نام آیا تھا جسکے جواب میں نوشتہ
"فرمان پذیرفت" انھوں نے لکھی تھی کلیات نثر ص۱۰۵ میں موجود ہے۔ یہ
رقعہ غالب نے قاسم علی خان کی معرفت بھیجا تھا، جو سلیمان شکوہ
کے کسی کام کے لئے عالم (دہلی کے کوچۂ انگریزوں) سے جس کا
غالب سے تعلقات بھی ملاقات کرنا چاہتی تھی۔ غالب لکھتے ہیں کہ
عالم منزل اور دہلی سے باہر گیا ہے اس میں تو ہم بارکاب ہوں۔ لیکن عالم

عطاء ناسبرے شروع کرنے کے باوجود حاکم کی تلاش میں پانی پت تک گئے، مگر
حاکم وہاں نہ ملا۔ پھر انھیں کا سرکاری کچھ طریقہ بتایا ہیں ان
پر محمول کیا ہے اغلب ہے کہ کام حسب دلخواہ انجام پایا۔ غالب کے
خط میں یہ عبارت ہے: "سید قاسم علیخاں [illegible] بندہ گردہ اند کہ خانہ
زاد را با غم و اندوہ چہ مایہ آویزش بودہ است۔۔ یا در رکاب و
فردای این رنگا رنگی گام سنج بادیہ آوارگی میشوم" یہ خبر نہیں کہ
کس سفر کی طرف اشارہ ہے۔

سہرا لکھنے اور غالب کے سہرے کو ایک مستقل صنف سخن اور غالب کو اس کا
موجد قرار دیتے ہیں۔ غالب کا سہرا جو دیوان اردو میں ہے غزل
سے الگ بھی ہے لیکن غالب نے کلیات نثر میں اسے "غزل" کہا ہے
۱۲۵۵ھ۔ ذوق کا سہرا تو غالب کے سہرے کے جواب میں ہے لیکن
حکیم آغا جان عیش دہلوی معاصرین غالب کا بھی ایک سہرا ہے
جسکے زمانۂ تصنیف کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے لیکن مضامین فرصت
حالہ [illegible] یہ تو ممکن ہے غالب کے سہرے کی پیروی ہو لیکن عبارات
کلیان سنگھ عاشق کا سہرا جو انکی مثنوی "تاریخ زیبا" میں ہے
غالب کے سہرے سے بہت ملتا ہے، گو یہ قریب بہ یقین ہے کہ غالب کو
اسکی خبر بھی نہ ہوگی کہ عاشق نے سہرا کہا تھا۔

سید حفیظ الدین (متوفی ۱۲۵۴ھ) ناسخ کے برادر عم زاد [illegible] اور
حاضر جواب تھے۔ غالب بچپن زمانے میں لکھنؤ گئے ہیں وہ کمسن تھے، ایک مشاعرے
میں انکی غزل پر ہنگامہ غالب نے پوچھا کہ "یا بالشتا کی سینہ شدید ہے؟" انھوں
نے جواب دیا کہ "قبلہ رد [illegible] غالب آمدہ [illegible]"
اور [illegible] "وہ زندہ باد" کہتے ہوئے انھیں اپنے پہلو میں بٹھایا (تذکرہ
فارسی گویاں مطبوعہ ناسخ)۔

تسلیم

کلیات آفرین جلد ا کا ایک نسخہ جس وقت موصول ہوا تھا، جیسے ہی اس کا بالاستیعاب
مطالعہ ممکن نہ تھا، اور چاہتا تھا کہ اس کے متعلق مفصل طور پر اظہار رائے کروں ... نواب
... نہیں کہہ سکتا کہ اس کا لفظ لفظ غور سے پڑھ جاؤں لیکن اس کی ورق گردانی از ابتدا تا
انتہا ضرور کی ہے اور سرسری مطالعہ سے تسامحوں کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانی
ضرورت محسوس ہوئی ہے ان کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے مگر اس سے پیشتر آپ
... پہلے کا شکریہ ادا کرنا چاہیے

"دو عالم بوی گل بگرفت و نشنیدم" ص ۲ — حافظ کی ایک غزل کا مطلع
خوش ... "شنید" اسی غزل کی بیت ہے
... از گلشن ... "نشنیدم" کی جگہ "شنیدم" چاہیے
... "شنیدم" نہ ... ہوگا

[illegible] مفہوم میری سمجھ میں نہ آیا
... ص ۳ ... بالغرض ...
... ایران میں ... فاصلہ نہ ...
... ص ۱۲ ... لکھنا چاہیے ... ص ۱۴ ... بہت
... ص ۱۴ ... شادان ص ۱۵ ...
... ص ۱۷ ... ص ۳۱ ...
... منکل ...
... ص ۵۱ ...
... ص ۶۳ ...
... ایران میں ... ص ۶۵ ...
بیخودی در ... ص ۱۱۷ ... معلوم ہوتا ہے

آئینہ ص ۱۱۶ [illegible]

حال رندی الخ ص ۶ تا [illegible] ۹۶ پیرکار ص ۱۲۹ ۳ ۔ پیرکار [illegible]

سہ داب ص ۴۷۲ = خاتمہ جواز [illegible] ۳۱ بادشاہ ص ۳۶۲ ۵ و پارنہ

نخیر الشاعر ص ۳۷۴ نخیر الشعرا ہمزہ ملفوظ میں آئی تو مصرع ناموزوں ہے

سے آئینہ ص ۴۷۲ ۔ سہ آئینہ

املا کا طریقہ مقرر ہوا ہے یہ کہ کون لفظ کن حروف سے لکھا جائیگا ۔ یہ فیصلہ بھی ہونا چاہیے کہ مرکبات کس طرح لکھے جائیں گے ۔

آپ نے اچھی اچھی کتابیں شائع کی ہیں جو میرے پاس ہیں کچھ یہاں کچھ یہاں ہر لائبریری

اب آپ گزارشات ملاحظہ کرا دیں ۔ [illegible]

فہرست مکمل ہو گی تو بیش قیمت کتابوں کی فہرست ہو سکے گی ۔

تو اجب ناصح نے کیوں مسجد یہ بتخانہ کیا   تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

یہ مطلع میر حسن نے میر امانی علی بن میر ولایت اللہ خاں دہلوی کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ انھیں کا ہے لیکن یہ ذرا مختلف شکل میں سید محمد خاں رند سخن آتش کدہ

ماہنامہ "نگار" کے "ریاض" (جنوری فروری ۱۹۴۳ء) میں ریاض کی کچھ قدیم تحریریں جناب سید مقبول احمد جعفری نے بعنوان "ریاض کے بعض استادی مباحث" جمع کر دی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے "جناب ناسخ مرحوم پر ایک سخت چوٹ قومی تعصب کے پردے میں چکبست نے کی ہے جس کا کسی تذکرے میں ذکر نہیں ہے اور نہ کوئی اور ثبوت چکبست اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں:

مشاعرہ شروع ہونے سے قبل شیخ ناسخ نے نسیم سے مخاطب ہو کر کہا: پنڈت صاحب ایک مصرع کہا ہے، دوسرا نہیں سوجھتا، انھوں نے جواب دیا "فرمائیے" - ناسخ نے ~~مصرع پڑھا: "شیخ نے مسجد بنا مسمار بتخانہ کیا"~~ ... ان کے منہ سے مصرع نکلتے ہی نسیم نے کہا: "تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا"، سب پھڑک اٹھے۔ شیخ ناسخ نے مذہبی چوٹ کی تھی مگر نسیم نے ٹھنڈا کر دیا"

اس کذب دلفریب بیان میں چند باتیں قابل غور ہیں: (۱) ناسخ کی غیور طبیعت اور شاعری کے دعوے ایسے نہ تھے جو وہ نسیم کو قابل خطاب سمجھتے اور ان کو اس تعظیم و تکریم کے ساتھ مخاطب کرتے جو آتش کو بھی کبھی خیال میں نہ لاتے تھے (۲) ناسخ ایسے متعصب شخص نہ تھے کہ وہ ایک ہندو کو (اور پھر اپنے محبوب ہندو کو) مخاطب کر کے اس دن کا مصرع پڑھتے (۳) نسیم چاہے لاکھ حاضر جواب سہی مگر ناسخ کا دبدبہ اور طنطنہ ایسا تھا کہ وہ ان کو ناسخ کے سامنے زبان نہ کھولنے دیتا (۴) دراصل نسیم نے کوئی مصرع لگایا نہ ناسخ نے کوئی مصرع پڑھا، نہ اس حکایت کا ذکر کسی اور مقام میں دیکھا گیا - یہ صرف غلط قومی جوش کا نتیجہ ہے جس نے بے سروپا

نگار میں اسی طرح [illegible] نسیم کا محبوب ناسخ ہونا کہیں اور نظر سے نہیں گزرا۔ اور اسی طرح سمجھنے کی [illegible] وجہ نہیں ہے

ڈاکٹر ولی الحق انصاری نے عرفی کا کلیات مرتب کیا ہے جس میں اس کی کل نظم و نثر جو انھیں ملی ہے شامل ہے۔ یہ کلیات ان کے مقدمے کے ساتھ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے پیش ہوا ہے اور میں نے ایک ممتحن کی حیثیت سے اسے از ابتدا تا انتہا دیکھا ہے۔

ڈاکٹر انصاری نے عرفی کے کلیات اور دیوان کے جن نسخوں کی مدد سے اپنا نسخہ مرتب کیا ہے ان سے متعلق ضروری معلومات ان کے مقدمے میں موجود ہیں۔ ان کی تلاش داد طلب ہے لیکن جب تک کتب خانوں کی فہرستوں کا جائزہ نہ لیا جائے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کل قابل اعتنا نسخوں کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے جن نسخوں کو دیکھا ہے ان سے کس طرح کام لیا ہے اس کے متعلق بھی کوئی رائے ان نسخوں کا مطالعہ کیے بغیر قائم نہیں کی جا سکتی۔ انھوں نے مقدمے میں لکھا ہے کہ عرفی کے دیوان قصائد کے صرف ۲ نسخوں سے انھوں نے کام لیا ہے باقی کی طرف رجوع نامناسب سمجھا گیا ہے۔ اس کی جو وجہ انھوں نے بتائی ہے وہ قطعاً ناقابل قبول ہے۔ انھیں دیوان قصائد کے کل قابل اعتنا نسخوں کو دیکھنا تھا اور قصائد کی شرحوں کا بھی مطالعہ کرنا تھا۔ شرحوں کو دیکھنے سے ایک تو صحیح متن متعین کرنے میں مدد ملتی دوسرے یہ کہ قصائد کے مشکل اشعار کے مطالب درج متن کر سکتے تھے۔ لیکن اس مقالے کی بہرے کہ مطالب سے متعلق بحث نہیں۔

کہ (یعنی امتحانی مقالہ) میں جن تذکروں سے مدد لی گئی ہے کم ہیں۔ رضی کا تذکرہ پیش نظر ہے تو یہ سمجھ میں نہ آیا کہ کلمات الشعرا، مرآۃ الخیال، سفینۂ خوشگو، خزانۂ عامرہ، مجمع النفائس، ریاض ... نشتر عشق، شمع انجمن وغیرہ کیوں ناقابل اعتنا سمجھے گئے۔ (یعنی مقالہ نگار کا) :

۲) درباب ابوالکلام آزاد" سرسید کی سیاسی پالیسی اور انگریز پرستی سے انھیں
ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ مگر [illegible] سرور آزاد نمبر اردو ادب ص ۲ ملاحظہ ہو کہ
ستمبر میں جشن تاجپوشی کا کلکتہ میں دلچسپ مشاعرہ" کے عنوان سے
ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر الہلال سے نقل ہوئی ہے جس میں عبارات ذیل
موجود ہیں۔

دو آپ (آزاد بنام آزاد) کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ "انگریز کی محکومی میں
رہنے کی صفت بڑی اعلیٰ ہے .. جن لوگوں میں یہ صفت ہوتی ہے اس طرح کی
وجہ سے لوگ ان کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ ہماری گورنمنٹ جب کہ ہم پر
آزادی کے ساتھ سلطنت کرتی ہے اور ایک مدت تک رعیتی کی صفت رکھتی
ہے تو ضرور ہے کہ ہم بھی [illegible] کی رنج اور خوشی میں شریک رہیں
رعیت کی بجز .. آزاد قومی کو گوارا ہوا اور اسلام گفتگو تک کہہ دیا ہے۔ اسی کی
اول ابتدائی عالم سے آج تک ہی ایک مختصر تاریخ بیان کی گئی
ہمارے یاد رہے [illegible] کی نظر سے [illegible] کہ باوجود اختلاف
مذہب کے [illegible] اختلاف قومیت اور اختلاف طبیعت کے [illegible] آزادی کی
سلطنت کی [illegible] گورنمنٹ کی [illegible] آزادی اور اہل ملک کی
[illegible] ص ۱۸۲
آزاد نمبر میں ایک نظم بھی ہے جو انھوں نے جشن تاجپوشی کی تقریب پر لکھی تھی
[illegible] انگریز پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ [illegible] صاحب کو [illegible] مدیر
[illegible] کے باوجود اردو ادب کے مضامین کو پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔

کہ [illegible] ضرورت کے بعد یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے
آزاد [illegible] سے [illegible] ان کے [illegible]
[illegible] ان کے [illegible]
میں [illegible] ہے کہ ان کے نزدیک انڈین نیشنل کانگریس
ایک ہندو جماعت تھی اور سید احمد خان مسلمانوں کی سیاسی نجات دہندہ
میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ یہ تحریر [illegible] کی سالگرہ میں [illegible]
سے تعلق رکھتی ہے یہ کام نہیں تھا [illegible] مذکورہ ان کی نظر سے گزرا
یا نہیں۔ بہرحال یہ آزاد [illegible] کی مقالہ شائع ہوا تھا ۔ میں نے کبیر
صاحب کی تحریر دیکھ کر [illegible] کی طرف متوجہ کیا اور یہ تحریک
کی کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کریں ۔ انھوں نے جواب میں لکھا
کہ [illegible] " واقعی غلط ہے لیکن " باوجود اس کے ہماری زبان
[illegible] ہے اور اب [illegible] آزاد [illegible] کی [illegible] شائع ہو چکی
ہیں [illegible] ان کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں
[illegible] تبدیل [illegible] کچھ برائی نہیں ہے اور اس میں کچھ
برائی نہیں [illegible] ایک [illegible] پر قائم [illegible]
[illegible] کہا کرتا تھا کہ ۵ برس کی عمر میں جو
میرے [illegible] ایک [illegible] یہ [illegible] کہا کہ ان
کی [illegible] یہ [illegible] سے اب [illegible] لڑکپن میں
[illegible]

(۸۳) ا ص۱۵ تذکرہ کا صرف نام عمدۂ منتخبہ - ۳ ص۱۲۴ زمانۂ تصنیف غالباً ۱۲۲۱ھ - صحیح عمدۂ منتخبہ جس کا سال
آغاز ۱۲۱۲ معلوم ہوتا ہے فہرست اسپرنگر صفحہ ۱ میں بھی یہی ہے یہ ختم ہوکے ۱۲۲۵ھ میں مکمل ہوگیا تھا [illegible] اختیار کرلیا ہے
لیکن جو قلمی نسخے ملتے ہیں ان میں اس کے بعد بھی بعض اضافے درج ہیں۔

(۸۴) ا ص۱۵ تذکرۂ شوق (حسن) طبقات الشعرا قدرت اللہ شوق (ص۱۱) سے مختلف مگر جلد ۳ میں جہاں شوق تخلص کے [illegible]
کا ذکر ہے جس میں تخلص یہ شوق ہو موجود نہیں حسن علی شوق ہیں مگر نہ انھوں نے تذکرہ لکھا [illegible] دتاسی ان کی طرف تذکرہ منسوب
کرتا ہے قدرت اللہ شوق کے علاوہ اس تخلص کے ایک اور شاعر کا تذکرہ ہے مگر وہ ہندو ہیں اور اس میں صرف فارسی گویوں کا حال ہے۔
(فہرست اسپرنگر ص۱۵۱)

(۸۵) تذکرۂ عشقی (عظیم آباد) دتاسی کی نظر سے نہیں گزرا لہٰذا اس کے متعلق اس کی معلومات کا مدار فہرست اسپرنگر پر ہے لیکن اسپرنگر نے مصنف
پر فقط [illegible] کا بھی نام نہیں دیا۔ دتاسی نے اپنی طرف سے وجہ الدین لکھ دیا ہے (ضمیمہ ص۱۹) صحیح وجیہ الدین ہے

(۸۶) ا ص۱۹ تذکرۂ محمد علی ترمذی کا ذکر گلزار ابراہیم میں ہے یہ بالکل غلط ہے گلزار کے متعدد نسخے میں نے دیکھے ہیں کسی میں ان کا
نام نہیں آیا۔ دتاسی نے [illegible] محمد علی ترمذی پڑھا ہوگا - جلد ۳ میں محمد علی ترمذی کا جو ترجمہ ہے اس سے اتنا
بھی ثابت نہیں کہ یہ وجود خارجی رکھتے تھے - اسی سلسلے میں یہ گزارش ہے کہ میں نے لطف اللہ ترمذی کے تذکرے کا ذکر [illegible] بلاغ معانی
میں دیکھا ہے (دیکھو تاریخ)

(۸۷) ا ص۲۰ دتاسی عیار الشعرا کا زمانۂ تصنیف اس بنا پر کہ خود مصنف اس میں ۴۳ سال عمر بتاتا ہے ۱۱۹۲ تا ۱۲۲۴
بتاتا ہے لیکن اس پر غور نہیں کرتا کہ ۱۲۲۴ صحیح ہے تو ۱۲۱۷ کی جگہ ۱۲۲۲ ہونا چاہیے۔ یہ ان تذکروں میں ہے جن کے متعلق دتاسی
کی معلومات کا مدار فہرست اسپرنگر پر ہے اسپرنگر نے لکھا ہے اس کا آغاز ۱۲۱۶ یا ۱۲۱۳ میں ہوا اور مصنف ۳۰ سال سے زیادہ
تک اس میں اضافے کرتا رہا - اس میں جو آخری سنہ ملتا ہے وہ ۱۲۴۷ ہے (ص۱۸۵) - دتاسی کو اس سے فائدہ اٹھانا تھا۔ اس کے [illegible]
ابتدا کے متعلق اسپرنگر کا قول بھی صحیح نہیں [illegible] دیباچہ [illegible] سے معلوم ہوتا ہے [illegible]
شروع کیا اور ۱۲۰۹ھ میں اس نے کتاب کی شکل اختیار کی [illegible] اضافے بعد کے ہیں۔

(۸۸) ا ص۲۵ + محمد وزیر کا (شیخ علی خان حسینی) صاحب تذکرہ - زمانۂ تصنیف ۱۱۶۵ لکھ کر دتاسی لکھتا ہے کہ مصنف کی موت
(۱۱۵۹م) کو ۱۶ برس گزر چکے ہیں - پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر یہ تذکرہ شعراے اردو کے متعلق ہے [illegible] اس کی حیثیت [illegible]
نہ ہوگی کہ یہ اردو ہندی میں [illegible] ان کا [illegible] کے خلاف [illegible] دوسری بات یہ ہے کہ یہ فارسی گو شاعر
ہیں اور ان کا تخلص حسینی ہے (گلشن عشق [illegible]) ان کا ترجمہ دستور کے مطابق تخلص کے تحت ہونا تھا۔ تیسری بات یہ ہے کہ انجام
کا تخلص ترجمے میں ہوا تھا۔ یہ تذکرہ جیسا کہ خاتمۂ [illegible] سے [illegible] ۱۱۶۲ھ میں مکمل ہوا۔

(۸۹) جلد سوم میں نواب لطف اللہ خان سلطان (گلشن بے خار وغیرہ) کا نام نواب سعادت خاں لکھا ہے [illegible] ترجمے میں بارھویں صدی
ہجری کی ایک مشہور تاریخی شخصیت علی محمد خاں روہیلہ کا نام محمد علی خاں روہیلہ لکھا ہے

(۹۰) دتاسی نے [illegible] فارسی گو مرزا فاخر مکین کا نام مرزا افخر لکھا ہے جلد ا ص۲۲۳ وغیرہ

(۹۰) [illegible] تاباں کے دیوان کا کسی نے ذکر نہیں کیا، اور یہ معلوم ہے کہ تاباں کا دیوان چھپ گیا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ حیدرآباد کے کتب خانوں میں حیدرآباد میں معلوم ہوا کہ دیوان ہے لیکن ڈاکٹر [illegible] کے نزدیک [illegible] دیوان ہونا زیادہ قرین قیاس ہے (جلد ۱)

(۹۲) جلد ۱: سال وفات کو زندہ ۱۱۰۱ھ ملا ہے جو ۱۱۹۹ھ کے بقول آرزو نہیں ہے سال معلوم ہوتا ہے۔ سفینہ خوشگو (ص) ذکاء نے آرزو کی سوانح میں [illegible] کا نام محمد عظیم لکھا ہے لہٰذا تذکرۂ شعرا کو جس میں ہر جگہ [illegible] کا قول آرزو کو معلوم ہوگا، یہی صحیح [illegible] کے دوسرے نسخے میں بھی [illegible] شامل ہیں [illegible] نسخوں کی تفصیل بتاتا ہے۔

(۹۳) جلد ۱: آبرو کے نام نجم الدین پر ملیحان کا اضافہ کیا ہے اور قیاس بتایا ہے کہ [illegible] یہ [illegible] دیوان بیدل [illegible] مخطوطہ سے کسی قسم کا تعلق ثابت نہیں۔

(۹۴) جلد ۱: چھپا بقول قاسم نواب حسین الدولہ کی ملازمت میں تھا۔ عبارت قاسم: "چھپا تخلص [illegible] مستعد [illegible] حسام الدولہ" ذکاء نے چھپا کا نام بجا لدولہ کی ملازمت [illegible] بنا دیا۔ اس کی مثالی [illegible] تحسین [illegible]

(۹۵) جلد ۱: محمد علی خاں حشمت کے نام پر میر کا اضافہ صحیح نہیں۔ [illegible] حشمت کا استاد لکھنا غلط ہے۔ ذکاء نے ان کا دیوان اردو کا ذکر کیا ہے مگر اس کا ثبوت موجود نہیں ہے۔ [illegible] خان کے کٹ [illegible] مقتول ہوا بقول ذکاء ۱۱۵۹ھ کا واقعہ ہے لیکن خان مذکور ۱۱۶۱ھ کی لڑائی میں مارا گیا تھا (سیر المتاخرین وغیرہ) – دیوان تاباں کی ایک نظم میں اس پر شعر [illegible] کی موت ۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔

(۹۶) مفتی برکت اللہ خاں برکت ساکن گوپامئو ضلع [illegible] مفتی عنایت اللہ فارسی کا دیوان [illegible] تذکرہ [illegible] اشعار سامعین [illegible] ہیں۔ اس میں مفتی محمد برکت اللہ ابن مفتی عنایت اللہ کا تخلص درج نہیں۔ [illegible] ان کے [illegible] مفتی [illegible] مگر ان کے [illegible] دو شعر ہیں۔ برکت اللہ خاں برکت [illegible] گوپامئو (گلشن بے خار میں) مقدم الذکر سے مختلف ہیں۔ یہ اردو کہتے تھے۔

(۹۷) جلد ۱: ذکاء کا یہ قول صحیح نہیں کہ صاحب دیوان ملا [illegible] کا دیوان [illegible] کے شاہی کتب خانے میں تھا۔ [illegible] میں [illegible] سے معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] ذکاء نے [illegible] لکھا ہے یہ [illegible] تو معنی ان کی [illegible] کے مطابق [illegible] میں اس کا ذکر [illegible] لیکن یہ [illegible] مگر اب [illegible] کسی کو [illegible] معترف نہیں۔ ان کا [illegible] تعلق ہے [illegible] کی نسخہ [illegible] میں ایک قصیدہ ان کی مدح میں ہے جو [illegible] پر ختم ہوتا ہے۔

(۹۸) جلد ۲ میں شیفتہ کا تذکرہ تخلص حسرتی کی جگہ حسرت لکھا ہے۔

(۹۹) جلد ۲: ان [illegible] سے قبل فوت ہوئے ہیں سال وفات [illegible] مصحفی [illegible] میں [illegible] نے لکھا ہے [illegible] سال پہلے [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ یہ بعض اضافات [illegible] ۱۱۵۰ میں لکھا گیا ہے اس کو [illegible] زمانے [illegible] صورت نکل سکتی تھی۔

(۱۰۰) [illegible] آصف الدولہ [illegible] تھی
[illegible] (دیوان [illegible]) [illegible] (سفینہ ہندی) [illegible]
[illegible] لکھا ہے۔ [illegible] سال وفات [illegible] (سفینہ ہندی) [illegible]

(۱۰۱) کلیات [illegible] ناسخ کا یہ بیان کہ اس کا ذکر [illegible] کیا ہے غلط ہے

(۱۰۲) امیر خان صوبہ کابل [illegible] (م ۱۰۸۲ھ) کا خطاب عمدۃ الملک تھا یعنی اس کی [illegible] میں [illegible] ہوا ہے۔ [illegible]
امیر خان [illegible] عمدۃ الملک [illegible] میں اس شخص [illegible] ناسخ
[illegible] (نواب عمدۃ الملک امیر خان) [illegible] (م [illegible]) نواب عمدۃ الملک [illegible]
[illegible] میں قتل ہوئے [illegible] ناسخ کا قول ہے کہ یہ تمام [illegible] - (الف) [illegible]
خان [illegible] خطاب [illegible] عالم تھا [illegible] خطاب امیر خان تھا [illegible]
(ج) [illegible] ناسخ کا قول یہ ہے [illegible]
نواب [illegible] نواب عمدۃ الملک امیر خان بہادر [illegible] عالم خان [illegible]
[illegible] نواب عمدۃ الملک امیر خان [illegible]

(۱۰۳) [illegible] - [illegible] جنرل [illegible] کا بیٹا اور [illegible] نواب
(خان [illegible]) اور [illegible] اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کا خطاب [illegible]
[illegible] بہادر [illegible] اس کی وفات ۱۲۳۲ھ میں ہوئی۔ [illegible] میں اس کی [illegible]
[illegible] صاحب کا خطاب [illegible] ممتاز الملک ہی [illegible]
[illegible] لیکن ناسخ نے [illegible] الملک لکھا ہے۔ اس وقت [illegible]
۱۲۳۲ (سال [illegible] ناسخ) سے قبل وفات پا چکا تھا۔ ممتاز [illegible]
[illegible] ناسخ میں [illegible] نام ہے [illegible] کی کتاب ([illegible]) [illegible]
[illegible] اس سے بحث کی ہے۔

(۱۰۴) [illegible] (محمد [illegible] صاحب) [illegible] میں [illegible]
[illegible] کا ذکر کیا ہے۔ [illegible]
[illegible] کا ذکر [illegible]

(۱۰۵) [illegible] یوسف (میر یوسف علی خان) [illegible] (۱۰۷۷) [illegible] فتح علی خان [illegible]
[illegible] ۱۱۹۸ [illegible] فارسی
(۱۱۸۵ تا ۱۱۹۸) [illegible]
[illegible] خان [illegible] میر یوسف علی [illegible]
[illegible] فتح علی [illegible]
[illegible] ناسخ [illegible]
[illegible]
[illegible] یوسف [illegible]

(۱۰۷) ۳ [illegible] تجلی میر محمد حسین [illegible] سخن [illegible] رسالہ میاں حاجی گمر شفتہ لکھا ہے "تجلی میر محمد حسین المشہور بحاجی"
انکا نام محمد حسین تجلی [illegible] ہے۔ انکی [illegible] کا نام ہے

(۱۰۸) ۳ [illegible] شوکت لکھنوی [illegible] گرد اصغر علی (رضا) نسیم [illegible] ہیں۔ اس [illegible]
[illegible] نسیم کی [illegible] ہیں [illegible] نہیں لکھی تھی
۲۸۹

(۱۰۹) ۳ [illegible] (محمد رفیع) [illegible] ۳ سال [illegible] فہرست [illegible] (ماخذ قاسمی) میں ۲۰ [illegible] اور اس [illegible] قاسمی [illegible]

(۱۱۰) ۳ [illegible] شرف (اشرف علی) مصطفیٰ آباد [illegible] گرد [illegible] (اصغر علی) [illegible] نسیم [illegible] اشرف (شیخ اشرف علی)
مصطفیٰ آباد [illegible] گرد اصغر علی [illegible] نسیم۔ [illegible] میں

(۱۱۱) [illegible] آگاہ [illegible] آگاہ کا [illegible] اولاد خان (بدون تخلص) کا ترجمہ جلد ۲ میں ہے۔ قاسمی نے [illegible]
[illegible] آگاہ غالباً ایک ہیں (جلد ۲ [illegible])۔ [illegible] آگاہ [illegible] شگفتہ [illegible] لکھا ہے لیکن [illegible]
نہیں بتایا کہ وہ کس کے شاگرد ہیں۔ [illegible] اس کی سند میرے علم میں نہیں۔ آگاہ [illegible]
[illegible] لطفی [illegible]۔ یہ اولاد خان [illegible] کا ذکر جلد ۲ میں ہی ایک میں

(۱۱۲) [illegible] مہر (تخلص) [illegible] مناسبت [illegible] اسی [illegible] ہے
[illegible] تخلص [illegible] کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ قاسمی [illegible] اسی [illegible] مہر (مکسور المیم)
تخلص [illegible] مہر (مفتوح المیم) لکھا ہے۔ ان میں سے ایک مرزا حاتم علی بیگ [illegible]
[illegible] مہر [illegible] تمت [illegible] ذکر ہے۔ غالب کا شعر ذیل
[illegible] ہے:

قاسمی میں بھی چاہوں از سپہر [illegible] مرزا حاتم علی مہر

(۱۱۳) جلد ۱: جعفر [illegible] والد کا نام [illegible] لکھا ہے۔ اس کی جگہ [illegible] چاہیے (تذکرہ محسن)

(۱۱۴) [illegible] گرد [illegible] (جوشش چاہیے) [illegible] عالم [illegible] صالم
[illegible] کی غلطی ہے۔ [illegible] قاسمی کی [illegible] داخل [illegible] گلدستہ میں [illegible]
اس کا ترجمہ [illegible] نکات الشعرا [illegible] صالم حاتم کا [illegible] ہے:

ماہی [illegible] تجھ کو [illegible] [illegible] لازم ہے [illegible]

(۱۱۵) ۳ [illegible] الدین کا قول [illegible] ۱۸۴۷ میں ۳۵ برس کی تھی۔ [illegible] سال [illegible] ۱۲۳۳ ھ [illegible]
[illegible] جہان [illegible] گزشت۔

(۱۱۶) ۳ [illegible] سعید (سید محمد خان) [illegible] سعید [illegible] فارسی [illegible] میں [illegible] ہندوستانی
[illegible] ثابت [illegible]

(۱۱۷) ۱ [illegible] آشفتہ (مرزا رضا علی [illegible]) [illegible] جلد ۲ میں [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] شفتہ [illegible] گرد [illegible] کا نام [illegible] الدین [illegible] آشفتہ اول کا نام مرزا رضا علی (تذکرہ [illegible])

یہ "سکیم و دل محو کمر یار ہے" پیوند شد آج ایک خط میرزا کو لکھا ہے مگر ہاں مدت ہوئی ہے یہ ممکن ہے کہ وہ دکھانا مجمل جا بیٹھی
اس کے بعد لکھا نہ لکھا جاتا ہے "مزاج کی قسمیں" نقل کا فارسی میں شعر تھا، کا سکہ چلتا ہے منتخب الحرم دکھا رہا ہوں قریب
المرگ کا ہو رہا ہوں - عبدالمجید سے شکوہ پہنچا میرا الحکم لا الہا کی تحریف اس کے بارے میں لکھنو فن کے اقوال کا مقابل فہم ہوتا
نواب الملک لوہارو والی ان کے ساتھ الحمد للہ ان کی تکلیف لکھنو ہی کی تو ہم ، جانو - ایک شخص بھیک مانگتا ہے
باپ کے اسم کا نام میر بادشاہ ہے اور کہہ دیا - اصل فارسی کو اس کمتری نے "قبلہ کعبہ" بنا لکھا ، رہا مسیحا
تو بات ہوئی - لکھ دیا ، ان کا یہی منتخب کلام ہی لا کیں جو صاحب عالم کی نظر میں انتخاب پا لیں ؟ .. اور کر رکھو نو حصل
ناسخ کی کیا ہستی بیچا رہ ادھر میں حیرت زدہ دہ مند کیا بکتا ہوں .. میرا کہنا ہے پڑھو - فوت میرزا ہی کلام ہو ، ان کلام پر
لکھنو ، سید علی ماہ پیرزادہ اگر بنیاد جاری تو ہم جانو - ہمارے شہر کا پیر اور میرزا القتہ کی نسبت پر نظر کرکے
لگا ہو - یہ نہیں کہتا کہ تم ہی کنواسی میری تحریر کو مانو ، مگر اس کمتری سے کچھ بھی اور اس کلام سے تجھ کو کمتر نہ جانو ..
غالب کا حرف اور بی اور فارسی کا قاعدہ اور سمجھو یا نہ سمجھو .. اختیار ہے تحمل کرو کام ورنہ غور کرو سمجھو
عبدالکریم میں شعر تمثیل ہو رہا تھا ، واقف محروم الاوقات شعر میں پیر پیدا ہیں - سمجھ لیں .. مانو نہ مانو
تم جانو " اس مطلع و حسن مطلع کو کیا سمجھوں اور اس کا شکر کیونکر بجا لاؤں ؟ خدا کی بندہ نوازیاں ہیں
کہ تجھ ننگ خلق بیکس کو .. خاندان درگاہ ہی بھلا ہوتا ہے وہاں عام میں نہ مرنا ظاہر اس لیے تھا کہ نہ سعادت عظمیٰ
میری تقدیر میں تھی - خدا کا دیے اب اور اشعار نہ کہیں ورنہ سنو [illegible] میں بی بی مانہ کرے گا - خط میں
بعض الفاظ میں کچھ کلام پڑھے گئی - پہنچ کے بارے میں بھی آپ نے کچھ لکھا ، "لسخہ مطبوعہ بہت غلط ہے لیکن مطلوب ہو تو
بھیج دوں - ۲۲ ربیع الاول ماہ مقبول عالم کی شادی کی مبارکباد - قاطع کی نقل آگئی تو جانیں - خطوط اسی طرح سے آپ کی اور
شیفتہ کی ملاقات سے دل بہت خوش ہوا "معاملہ یابندگی پر کسی طرح نہ ہی بنتی ہے " کوئی وجہ آپ کی یہاں تشریف کی نہیں
پیرا کرنا ممکن ہے مگر گفتگو میں تامل ہے "رباعی کے باب میں مختصر بیان" یہ ایک شعر کمال گستاخی سے کلام ذکر

کہتا ہوں اور یہ بھی کہتا کہ کیوں لکھا ہے ہوں؟ مرا بجز ریگ جنس در شمار آمد دہقان کہ بہ نسبت زر پیدا شد فرق تا متّقی، می
ہندیوں میں خسرو کے سوا سب کا منکر ہوں۔ لے "صاحب دستگاہ رشک گرد" کا کلام لطف آور۔ غیاث الدین کا کلام حدیث لکھا
آپ ہی غور فرمائیے اور انصاف کیجئے" شاہ دیوان فارسی آپ کے پاس ہو، دستنبو میں نے بھیجی ہے۔ بیچ آپ ذرا طلبی اور نیز فرد
آپ کے پاس ہے یا نہیں؟ فتنہ و فساد" کے بعد ۲ قصیدے، ایک قطعہ "بہ آدم زن بہ شیطان طوق لعنت الخ" اور ایک رباعی کہ
"دنیا بجیت ولی او فرض بجیت اللہ" کے سوا کچھ نہیں کہا۔ سنا ہے آپ نے ان کی جو مستعار مانگو تو بھیج دوں گا میرے
مرا اعتقادی کے خط میں لکھا کہ آرزو ہوں کہ آپ روز روانی کے تعزیت نامے چاہتے ہیں؟ قدمبوسی کی تمنا حد سے زیادہ
ہے مگر ایسا جانتا ہوں کہ یہ آرزو گور میں لے جاؤں گا۔ اگر چہ بندہ پیرزادہ کی اولاد سے خوشنود ہوں گا معلوم ہے آپ کہ جناب ملا
نے تحریک کی تھی کہ والی دکن کی مدح میں قصیدہ لکھیں غالب کہتے ہیں کہ میں ملک کش اور محسن ذرہ بھی اس سے کم
کہوں تو اس کا دل و دماغ کہاں ہے؟ غرض یہ بھی کہ قصیدہ لکھ کر آپ کو بھیجوں آپ دکن روانہ کریں متوسط نہ جانے کر
پیش کرنے کا توقع ہائے پیش کریں یہ کیا پیش کرو گے۔ ان مراحل ...

جاف عربی ہے اور فرہنگ محمد معین اس پر شاہد ہے کہ یہ ایران میں اسی طرح مستعمل ہے۔ اس میں تصرف نہیں ہوا۔ اس کا مشدد سنجاف با علان نون ہے۔ کلیاتِ جرأت (جلد ۲)

دیدۂ رگِ جاں میں مری واں جو نہاں ہیں کٹ کے وہ سوزنی کی سنجاف میں پوشاک کو دیں ہے

فرہنگِ آصفیہ میں یہ ہندی، اور بہ سنجاف میں فارسی۔ سنجاف لگانا کی سند میں رشک کا ایک شعر ہے جس میں سنجاف با علانِ نون آیا ہے۔ مصحفی کے دیوان اول (مرتبہ نقوی) میں بھی گوٹی سنجاف آیا ہے۔ اسے سنجاف کر دیا ہے اور شعر ذیل کے حاشیے میں لکھا ہے "سنجاف داماں" = دامن پر لگی ہوئی گوٹ :

زلف وغیرہ کو تعرض کر رہی ہے کٹ کٹ تا قطع کر دیجیے اس کی سنجاف ریماں

مثالیں ہیں "ہم تو سنجاف کی طرح سے کچھ کم نہ تماشا ہیں ہیں" مخطوطات دیوان اول کے جو نسخے میری نظر سے گزرے ہیں، ان میں سنجاف بغیر نون ہے۔ سنجاف بہ نونِ غنہ کی کوئی سند میرے علم میں نہیں اور میں نے کسی کو اس طرح بولتے ہوئے بھی نہیں سنا۔

- صوفیانہ (غلط) / صوفیانہ (صحیح) - صوفیاء جمع ہے صوفی کی۔ ایک ہی قاعدے کے مطابق اس پر "انہ" کا اضافہ ہو سکتا ہے "یانہ" کا نہیں۔ فرہنگ محمد معین میں صرف اسی طرح۔ اردو میں سند صرف اسی کی ملتی ہے۔ جرأت اسیر ہے :

غضب سادہ رویوں کی ہے سادگی بھی کہ پہنے مجھے صوفیانہ بندھی ہیں

صوفیانہ قافیہ ہے دوسرے قوافی لسانہ، نشانہ وغیرہ۔ صوفیہ بدرجہا صوفی کا اسم مجرد ہے جو اسرار التوحید میں ملتا ہے اور فرہنگ محمد معین میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر اضافۂ "انہ" کا سوال ہی نہیں۔

- افعی، افعٰی (غلط) - عربی لفظ افعٰی ہے۔ ایران میں اس کی معمول شکل افعی ہے۔ افعی کی کوئی سند میرے علم میں نہیں۔ اردو میں مظفر علی اسیر کے دیوان قصائد کا ایک شعر جس میں یہ بطور قافیہ آیا ہے۔ افعی کا اردو کی مستند اشعار میں آیا ہے۔ اس کی حمایہ شعر غالب :

یہ زمرد بھی حریف دمِ افعی نہ ہوا

کسی طرح ایک اچھا مادّۂ تاریخ نہیں کہا جا سکتا، زمانۂ وفات کو
- درکس کی بیلنٹی موت کا باعث ہوئی
متعلق اپنی رائے پر اب بھی قائم ہوں
ایلیٹ نے جو ایک مسرّت آور فنکار اور نقاد تھا، پرانے متنوں کی ترتیب کو بڑا اہم
کام سمجھتے ہیں اور اس کو کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ریسرچ سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اہمیت سے انکار نہیں
کیا جا سکتا، لیکن یہ کام ان لوگوں کو اپنے ذمے لینا چاہیے اور جو اس کا اہل ہوں اس کی سنت ادا کی
خود وہ کس شکل میں ہو، ایک اخلاقی جرم ہے۔ اردو کی بدقسمتی ہے ہندوستان و پاکستان میں اکثر یہ
اس کام کو انجام دینے والوں میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو نااہل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق کی مرتبہ کی ہوئی کتابوں پر میرے تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ تذکرہ گردیزی کے متعلق
اب تک میں نے کچھ نہیں لکھا۔ اس کا حال دیکھیے۔ پاکباز کی ترجمے کے بعد اپنی روش کے مطابق ان کے اشعار
پیش کیے ہیں جن میں سے ایک کے متعلق لکھا ہے کہ یہ خوشحال خان کا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے
اور اس کو پاکباز کے جتنے شعر ہیں قزلباش خاں کی طرف منسوب کر دیے ہیں۔ اسی جگہ [illegible]
[illegible] اور فہرست شعرا میں بھی یہ داخل ہیں
حالانکہ اگر مصنف گردیزی کو یہ منظور ہوتا تو الف یا قاف میں ان کا ترجمہ مع اشعار
یا صرف اشعار مع نام و تخلص درج کرتا۔ نہ معلوم ڈاکٹر عبدالحق خوشحال کو کیا سمجھے
گردیزی نے اس پسندیدہ کی جگہ استعمال کیا ہے

[illegible]

مارچ ۱۹۳۶ء کے معیار میں میرا ایک مضمون ہے جس میں تذکرۂ خوشگو (اس وقت تک طبع نہیں ہوا تھا) کا نسخۂ کتب خانۂ خدا بخش سے ترجمۂ آبرو تین فارسی اشعار کے ساتھ نقل ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آبرو کی تاریخ ان ہی کے ۱۱۳۳ھ مدحت اس کے بعد اس کے دو مصرعوں کا اشارہ دیتی ہے جو ۱۱۴۸ھ کی معتقد کتب میں بھی [illegible] میں ان دیوان کا ذکر اپنے اسی مضمون میں کر دیا۔ ایک مدت کے بعد دیوان ناجی مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق میں بار [illegible] صاحب مرتب کا قطعہ کہا ہے:

یہاں میں سنگدل تاریخ کا مصرع تو پڑھ ناجی — کہ بیلطفی سیں اون کی آبرو نے جی دیا مر کر

مصرع آخر سے ۱۱۵۷ نکلتا ہے۔ خوشگو آبرو کے استاد بھائی تھے اور آبرو کی طرح دہلی میں مقیم۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ انھیں صحیح سال وفات معلوم نہ ہو۔ میرا قیاس ہے کہ مصرع آخر دراصل یوں ہے "کہ بیلطفی سیوں اوس کی آبرو نے جی دیا مر کر" واو نکل جانے سے مصرع ۱۱۴۶ پر منتشر ہو جاتا ہے۔ مرتب کا تب کی غلطی کی تصحیح کر سکتا یا نہ کر سکتا۔ انھیں اس اختلاف کا ذکر ضرور کرنا تھا

۲۔ مرتب دیوان ناجی نے اپنے مقدمے میں اس کا ذکر نہیں کیا کہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی نے "نقوش سلیمانی" [illegible] میں، جو انھوں نے میری استدعا پر لکھا تھا "ناجی کو عظیم آبادی شعرا میں شمار کیا ہے" مجھے حیرت تھی کہ سید صاحب کو یہ بات کس طرح لکھی۔ ایک مدت کے بعد ان کے فرزند سید نجیب اشرف صاحب سے معلوم ہوا کہ پہلے پہل ناجی کا عظیم آبادی ہونا انھوں نے لکھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیوں لکھا کہ ناجی کو انھوں نے [illegible] جواب دیا کہ عنفوان شباب کا زمانہ تھا، حب وطن اس کا باعث تھا ورنہ مجھے بھی ناجی کا عظیم آبادی ہونا دکھانا نہ تھا

۳۔ مرتب دیوان ناجی نے ناجی کے زمانۂ ولادت کے متعلق میرا قیاس کر لیا ہے لیکن زمانہ [illegible] کے بارے میں میرے قیاس کو اس لیے تسلیم نہیں کیا کہ دیوان ناجی میں امیر خان انجام مقتول ۱۱۵۰ھ کی وفات کا قطعۂ تاریخ نہیں۔ ناجی کے دیوان میں صرف ایک مادۂ تاریخ ہے جو غزل کے ایک مشہور مصرع میں ہے اور اس بنا پر کہ کاف بیانیہ جس سے مصرع آخر شروع ہوتا ہے مادے میں شامل ہے اور مصرع آخر بجائے خود سال مذکور پر مشتمل ہو مگر اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ

ناسخ دبستان لکھنؤ کے بانی کی ایک مثنوی "سراج نظم" ہے جو ۱۲۵۴ھ میں تمام ہوئی نام تاریخی
ہے۔ اسی سال ناسخ کی وفات ہوئی۔ اس میں ایک ورق کتاب کے مطالب نظم ہوئے ہیں۔ اس
میں بکثرت عربی الفاظ ہیں جنھیں اردو نے قبول نہیں کیا۔ بطور نمونہ کچھ یہیں اور یہیں تو کچھ سے تا—
ہے کہ ایک لغتیہ شعر میں آیا ہے "ہیں ازل اور ابد کے مالک ملکی باقی ہیں اور سب
ہالک" یہ بات کہ سب ہالک ہیں بجز خدا قرآن میں ہے۔ ناسخ کا قول صریحاً قرآن کے خلاف ہے
— لائح "سب ہر ایک مجمل (کذا) ہیں واضح" آشکارا و واضح و لائح — تلال
"یہ جواہر جو سارے بہشت ہیں ہیں تلال و جبال میں بکھا" — لبن "فائدہ مند تھا جو
شرب لبن میں" — طالع "مشکل ہے وہ مصالح کا فتح شخص طالع کا شخص صالح" —
ادوات "ہوئی ادوات صوت سے تنبیہ ۱۲" — بلع "ہیں ہمہ وقت بلع آب و طعام
ہمکا" — اوجاع "ناخن وسوجہ ہوتے ہیں اکثر کا رنج و اوجاع ہوتے ہیں باہم"
— استیلاں "ہوا داخل میں بعد استیلا ہے ... تا ... کی تاریخ کی"
(ناقی میر کے یہاں آیا ہے) ناسا لوس عربی الفاظ سراج نظم میں اور بھی ہیں

دساتیر فارسی: "پارسیوں کی وہ مذہبی کتاب جو ان کے سب سے پہلے پیغمبر یعنی مہ آباد وخشور (آن کہ نام ہے آسمان سے آسمانی زبان میں نازل ہوئی تھی کہتا ہے)" یا یوں کہیے کہ کتاب جو مہ آباد یعنی آبادیوں کے سب سے بڑے پیغمبر پر زبان فارسی میں نازل ہوئی۔" دساتیر سولہ صحیفوں اور پندرہ نامہ سکندر پر مشتمل ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ آسمانی زبان میں ہے جو اب زمین پر نہیں بولی جاتی۔ آباد (فرزانہ فرہنگ دساتیری زبان کا لفظ) کا زمانہ بیس نسلیں یا سنکھ برس سے زیادہ بتایا گیا ہے۔ مہ آباد صاحب شریعت وہی تھا، جس کو پیغمبروں (الشمول زردشت) کو حکم ہے کہ آباد کی پیروی اور اس کی شریعت کی ترویج کریں۔ یہ شریعت ہمیشہ کے لیے اور ہر ملک کے واسطے ہے۔ دساتیر کے جو نسخے ملتے ہیں ان میں متن کے ساتھ ترجمہ و تفسیر جو آخری دساتیری پیغمبر ساسان پنجم معاصر خسرو پرویز کی طرف منسوب ہے۔ اس سے دساتیر میں خدا کا وعدہ ہے کہ اس کے اخلاف میں پیغمبر ہمیشہ رہیں گے۔ ترجمہ و تفسیر کے متعلق، جہاں تک مجھے یاد ہے کہا گیا ہے کہ زبان پارسی دری میں ہے۔ اس کا ایک نسخہ بمبئی کے ایک زردشتی، ملا فیروز کو ملا، اور انھوں نے اسے انیسویں صدی کے خمس اول میں مع ترجمہ انگریزی و فرہنگ شائع کیا۔ اس سے قبل کسی فرنگی مستشرق نے اسے نہیں دیکھا (بمبئی کے گورنر سے تو اس کا ترجمہ کروا لیے تھے بحث نہیں) مگر دبستان مذاہب میں اس کے متعلق جو کچھ ہے وہ ان کی نظر سے گزر رہا تھا۔ خود اس کتاب کے مطالعے کے بعد سب نے اسے مجعول قرار دیا، اور کچھ دن کے بعد زردشتی بھی ان کے ہمنوا ہو گئے۔ اب کوئی اسے اصلی کتاب نہیں سمجھتا مگر بعض اصحاب اسے عہد خسرو پرویز کی کتاب سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ متن ایک مصنوعی زبان میں ہے۔ ترجمہ و تفسیر عہد خسرو پرویز کی زبان میں نہیں، عہد صفوی کی فارسی میں ہے۔ اس فرق کے سوا اس میں کچھ مصنوعی الفاظ بھی ہیں۔ زردشتی عقائد کے بموجب زردشت افضل البشر اور پیغمبر ہے جس کی شریعت ہمیشہ کے لیے ہے۔ لیکن دساتیری پیغمبروں (الشمول آباد) کا ذکر ان کی مذہبی کتابوں میں نہیں۔ دساتیر میں زردشت کو اسی قسم کا پیغمبر کہا ہے جیسے شائی آباد اور پیغمبر ہیں۔ سخت حیرت کی بات ہے کہ کچھ زردشتی کچھ دنوں کے لیے اپنی کتاب مقدس سمجھتے رہے۔ مجھے یقین ہے کہ دساتیر (متن مع ترجمہ و تفسیر) کا مصنف آذر کیوان تھا جو دعویٰ کرتا ہے کہ ساسان پنجم کی نسل سے تھا۔ آخری صحیفے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ساسان پنجم کی نسل سے پیغمبر ہوتے رہیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ آذر کیوان دعویٰ پیغمبری کر سکے۔ اس کی کوئی کتاب تو ایک فارسی مثنوی کے سوا موجود نہیں، اور اس میں یہ دعویٰ بھی کہیں نہیں کہ میں پیغمبر ہوں۔ لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ میری روح جسم کو چھوڑ کر آسمانوں کی سیر کیا کرتی ہے۔ اس کے معتقد جو اس کے عہد میں تھے اسے پیغمبر سمجھتے تھے۔ رجوع کیجیے [illegible] آذر کیوان ایران سے ہند آیا تھا اور پٹنہ میں مرا، اس کی وفات [illegible] ہجری [illegible] دو تین سال قبل ہوئی۔ دبستان مذاہب کا مصنف جو کیوانیوں میں [illegible] اس کا [illegible] میں [illegible] لیکن مجھے یقین ہے کہ [illegible] دساتیر کی شکل بھی نہ دیکھی ہوگی۔ اس کے متعلق ان کی معلومات کا مدار دیباچہ گلستان [illegible] پر ہے۔ مگر اسی

[illegible]

روشناس کرایا تھا۔ انھوں نے اسے محض اسی طور پر دیکھا تھا اور وقت نکال کر شائع ہو چکا کہہ دیا۔ 'دساتیر' فارسی لفظ
کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور اس کی زبان فارسی کس طرح ہو سکتی ہے؟ خود دساتیر آسمانی زبان میں ہے۔ مؤلف کی مدد کے
ترجمہ ہو تو متن کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ "وخشور اور وخشوران کیا بلا ہے؟ صحیح وخشوران (وخشور
فارسی میں پیغمبر) وخشور یا وخشور وخشوران ہے۔ دینی کتاب جو ہو پارسیوں کی تھی، جیسے سلطنت آباد کی مذہبی کتاب
کی کتاب ہو گئی۔ ممکن ہے یہ مؤلف پارسیوں اور آبادیوں کو ایک سمجھتے ہوں مگر جس طرح انھوں نے لکھا ہے اس طرح
نہ لکھنا تھا۔ مؤلف نے دیباچے میں لکھا ہے کہ "فارسی الفاظ کا زبان ژند پاژند (بدون واو عطف) اور دساتیر
تک سے سراغ لگایا ہے۔" ممکن ہے کہ کسی لفظ کی بحث میں جو مجھ سے نظرانداز ہو گئی، دساتیر کا ذکر آگیا ہو مگر
میں یقین کر سکتا ہوں کہ کوئی بات ایسی نہ ہوگی جو دیباچہ گلستاں میں ہے۔ گو اس کا امکان ہے
کہ مسخ شدہ صورت میں ہو

دیوانِ یقین

دیوانِ یقین مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے مرتب کیا تھا اور اس پر ایک طویل مقدمہ (   ) لکھا تھا جو بعض احباب کی رائے
میں گنجینۂ قدر قیمت کا ایک شاہکار ہے۔ مرزا صاحب کی قابلیت اور زبان دانی انشا پردازی مسلّم ہے لیکن اس مقدمے میں یا اس کے بعد
تحقیق، نقد، تنقید کا حق ان سے ادا نہیں ہو سکا، اور ان کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بلند نہیں۔

- بالو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بنگال اور بہار میں زیادہ رائج ہے۔ اس
اسلاف کے ۲ شعروں میں بھی ملتا ہے' اور دو بالوں کلیات جرأت ۲ (مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن)
میں ہیں ۔ ایک مثنوی راحت وجری میں ہے اور ایک سلیمان شکوہ کی ایک غزل میں آیا ہے اور
جس کی تخمیس جرأت نے کی ہے:

کہا درویش نے آ جبھٹ بابر ۶۳ بتا مجھ کو کہاں سے آیا ہے تو
کریں ہے خلق سے رم شکل آہو ۲۵ ملے ہے عرش جب کرتے ہیں ہو
سری درشنا بڑا ہے ان کا قابو نہ سمجھو کہ کہ تم اس کو بابو
فقیروں کا ہمیشہ ہے رنگ جمالا
تجائی

بالو ایرانی فارسی میں مقابلۃ ۔ یہ نہ سمجھنا کہ ایران میں ہندوستان سے گیا ہے۔ وہاں باب = پدر
پر اضافہ "و" سے لقب ہم وہم بنا ہے۔ اسرار التوحید میں جو
صدی ہجری میں تصنیف ہوئی ہے۔ ابو سعید کے والد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بابو الخیر تھے۔
بابو فرہنگ معین میں بھی ہے۔

— بیبی۔ مدت ہوئی میں نے ایک انگریزی مجلہ میں مشرقی ترکی کے الفاظ دیکھے تھے۔ ان میں سے ایک
بیبی بھی تھا، مگر بمعنی زوجہ نہیں' دوسرے معانی کے ساتھ فرہنگ معین اس کی مصدق ہے اور اس
میں بی بمعنی زوجہ نہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں یہ فارسی ہے بمعنی مذکور لیکن معانی دیگر بغیر سند۔ قد
کتاب بیبی اسی معنی میں آیا ہے۔ فضلی کی کربل کتھا ہے۔ امام حسن اپنی زوجہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں

یس میں آئیں تو ان کا نام بھی بلا تکلف ان کو ساتھ آ گئے، جیسے ل امرود یا ناشپاتی۔ (فرہنگ
یہ ہے) قدیم ترین کتاب جو ہند میں لکھی گئی اور جس میں یہ لفظ آیا ہے تزک بابری ہے جس کا ترجمہ
رحیم خان خاناں نے کیا ہے میری نظر سے گزرا ہے۔ اس کے چوتھے یا پانچویں صفحہ میں یہ لفظ ہے۔
پروفیسر نذیر احمد کا مسلک ہے کہ عنوان امرود ہربانی اصل الشی [illegible] گلزار میں ہے) کی دیکھی
نسخہ کامل اور جبر خیال کی تصدیق کی کہ یہ اس میں ہے ایرانی شاعر لوطی جو شانی یہاں آیا تھا
دیوان میں یہ مصرع ہے "این لوتہ ناشپاتی و سیب و انار ہر ..." شعرای اردو میں سودا
کہ یہاں یہ آیا ہے کی دلیل صاحب ... تو ان کو معلوم ہوا کہ یہ ... کا
فرہنگ معین: ناشپاتی للفنا ۔ ۱۔ لغوی گلابی" درختی چهار بانها میوه‌ای الوان و زردان
ناشپاتی و بادام و فندق و گیلاس و شاه‌بلوط تاریخ بخارا ۲۴ ۔ ۲۔ میوه‌ای است مشابه امرود
فرہنگ اصطلاح سیاه ... که ... این میوه شناخته شد" گلابی
ل ہے جو عربی میں کمثری ہے اور انگریزی میں Pear - فرہنگ اصطلاح میں جس پھل کو اس
وہ کو اخا ہے جسے ہندمیں امرود کہتے ہیں (ربہ ——) شرف نامہ شرف الدین علی یزدی ...

۳۴/۱۲۶ — گزارش حاصل مصدر "گزاردن" کا ہے اور اردو میں مستعمل تھا، اور "گذارش" گذاشتن کا حاصل مصدر اردو میں مستعمل تھا نہیں۔ دونوں کے معنی مختلف ہیں (دیکھیے فرہنگ آصفیہ، لوگ گزارش کو زے سے لکھا کرتے تھے لیکن ذال فارسی کا تلفظ غالب کا بنایا ہوا طلسم ٹوٹ گیا، تو بہت سے لوگ "گزارش" کو بجائے "ز" ذ سے صحیح سمجھنے لگے

۳۵ — کاغذ کو فارسی سمجھنے کے باوجود غالب ذ سے لکھتے تھے، طور یہ تھا کہ زیادہ سے [illegible]، تو لوگ "منثورہ" بالنجگی وہ دال سے لکھتے تو مثنوی رومی کا ایک شعر سند میں پیش کر سکتے تھے ایک مصرع ہے " مثنوی نشاد تا کاغذ شود" دوسرا مصرع یاد نہیں۔ اس طرح لغت حکمت فرہنگ معین کاغذ و کاغذ دونوں۔ کاغذ دراصل ترکی لفظ ہے ترکی میں اس کی شکل بدلی

۳۶ — شکنجِ پیشانی "چین بر ابرو و غمناک" صائب:

در رکاب سبزی دارد پای حسن تو بہار   "تا گلی در باغ داری شکنج پیشانی مباش

(چراغ ہدایت مؤلفہ خان آرزو) - یہ معنی فرہنگ معین میں ہیں - کلیات میر جلد ۱ (شائع کردہ) کے دو شعروں میں آیا ہے اس قابل ہے کہ شعرای اردو اس استعمال کریں تو

۳۷ — قشعریرہ (ق مفتوح، ش مضموم) (ق مضموم، ش مفتوح، ع ساکن، ر مکسور، ی معروف، ر مفتوح، عربی میں حرف آخر ۃ) کلیات میر میں دو جگہ آیا ہے اور مصحفی نے اسے استعمال کیا ہے، دونوں کے یہاں ش ساکن، ع متحرک۔ اردو میں استعمال عیب نہیں کیا کم ہے، مولانا کی صحرائی عاشقی کی [illegible] سیروں کو اس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرہ

— چودانی ایک زیور ہے۔ اس کی جمع چودانیاں ہے، اور خاص صورتوں میں چودانیوں کلیات ذوق مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی میں یہ مصرع ہے" دیکھیں جب گہر تری چودانیہ جلد ۲، ص

علاوہ بھی تحقیق طلب ہے کہ یہ اشعار اس کے زائیدۂ طبع ہیں یا نہیں' اس کی طرف منسوب اس لیے کر دیے گئے ہیں کہ آپ پردہ نشین کی زبان سے اچھے معلوم ہوتے ہیں - ان کا اصلی مصنف حاذق فرزند ہے جس کے دیوان (نمبر ۴۴۴ صفحہ ۵۲) میں یہ اشعار غزل کے دوسرے اشعار کے علاوہ موجود ہیں - حاذق کا مقطع یہ ہے:

من کہ از خورشید حاذق را نمی بینم بچشم — ہر کہ او حلق حسن دارد حسن بیند مرا

کلمات الشعرا مصنفہ سرخوش صفحہ ۲۸ میں بھی یہ حاذق کے نام سے مندرج ہیں۔ بلکہ اس میں پہلے شعر کے متعلق یہ لطیفہ بھی ہے "روزی پیش ملا شیدا این مطلع خود را برخواندم 'بلبل الخ'، شیدا گفت صاحب این شعر را در امردی گفته باشند - حکیم (حاذق) برآشفت و اورا در حوض خود غوطہ داد" اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اشعار زیر بحث دیوان مخفی (طبع ۱۲۶۸ صفحہ ۱۱۹) میں جو ناشر کے نزدیک زیب النسا کی ملکیت ہے موجود ہیں - یہ بات تو اب ثابت شدہ ہے کہ مروجہ دیوان مخفی خواہ مطبوعہ ہو خواہ مخطوطہ زیب النسا کا نہیں بلکہ ایک غیر معروف ایرانی شاعر کا ہے - اس لیے پھر زیب النسا کی طرف سے تو دعویٰ ہو ہی نہیں سکتا۔ رہا ایرانی مخفی کا معاملہ تو اس کی بھی یہی کیفیت ہے کہ اس کے مطبوعہ دیوان میں الحاقی کلام داخل ہو گیا ہے جس سے قلمی دیوان (از آن جملہ نسخۂ م) خالی ہیں - یہ اشعار دیوان مطبوعہ میں سمجھ کر شامل کر لیے گئے ہیں کہ یہ زیب النسا کے ہیں اور دیوان بھی اسی کا ہے

۱۲ فاطمہ ۱۲) ۲ (۲ بیسری الف لیلہ و داستان
ان کی لائبریری میں ملاقات ہوئی انھوں نے بتایا کہ بچپن ہی سے پڑھنے کا شوق تھا
ہر چیز سے دلچسپی تھی اور اتنا کہ یہاں طلسم ہوشربا، الف لیلہ وغیرہ پڑھی تھیں طلسم ہوشربا کی سات
جلدیں تھیں اور میں نے یہ سب دلچسپی سے پڑھی تھیں۔ اس کے بعد ناولوں کا شوق ہوا تیرتھ رام فیروزپوری اور انگریزی
ناولوں کے ترجمے پڑھتا رہا۔ علی گڑھ جانے کے بعد انگریزی ناول پڑھنے لگا۔ انگلستان جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا
وہاں ایک برس تک میں بیمار رہا، تو ایسی کتابیں جن کے مطالعے سے دماغ پر زور پڑے پڑھنا ممنوع تھا۔ ناول، مختصر
کہانیاں اور اسی قسم کی چیزیں پڑھتا رہتا تھا۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد بھی ناولوں کا شوق رہا۔ ایک زمانے میں لائبریری
ورلڈز لائبریری سے ناول منگا کر پڑھا کرتا تھا، اور یہ فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ انگریزی اور فرانسیسی کا
کوئی قابل قدر ادب نہیں جو ۱۹۲۲ء تک شائع ہوا ہو اور میری نظر سے نہ گزرا ہو۔ ڈاکٹر سید حسن عسکری کو
ملا نہیں ہوں کہ یہ مقصود بالذات نہ تھا، مگر ادھر کئی سال سے ناولوں سے مطلقاً دلچسپی نہیں رہی ہے۔

( ) عبدالحلیم شرر کی "شہر زاد ثانی" سے کیا یہ مراد ہے کہ انھوں نے حضرت سکینہ کے پہلے بعد دیگرے کئی
شوہر کا نکاح کو شرر کا اختراع سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے جو کچھ پہلے کہا تھا، اس سے قطع نظر ایرانی
محقق کی ڈکشنری فارسی میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کا مصداق ہے۔ آیات بینات کو ر دیں جو لکھا ہے کہ
[illegible] میں نے پہلے پہل ان کا نام خاص نمبر میں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ ایسی کتابیں جو اہل تشیع اور
اہل سنت کی دل آزاری کا باعث ہوتی ہیں بلاوجہ بائیکاٹ ہونا چاہیے۔ ان سے اختلافات بڑھتے ہیں اور مسلمانوں
کو نقصان پہنچا ہے۔ ایک بار ڈاکٹر حسن عسکری اور ڈاکٹر فضل اللہ حیدر تشریف لائے تھے۔ یہاں آکے سوال کیا، میں نے
متذکرۃ الذکر سے پوچھا کہ کیا اہل تشیع کے نزدیک حضرت علی کا مرتبہ کل پیغمبروں سے باستثنائے پیغمبر اسلام
بلند تر ہے؟ ان کا جواب یہ تھا کہ پیغمبروں سے بلند تر نہیں سمجھتے اور دوسرے بلند تر سمجھتے ہیں۔ میں نے مؤخر الذکر
سے پوچھا کہ آپ کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ تو بلند تر سمجھتے ہیں۔ اس کے چند ہفتوں کے
بعد میں نے دائرۂ ادب کے جلسے میں جو اہل تشیع وہاں جمع تھے سب سے یہی سوال کیا۔ ڈاکٹر حسن عسکری نے
وہی کہا جو پہلے کہا تھا، لیکن دوسروں نے بالاتفاق ان کی تردید کی۔ ڈاکٹر حسن عسکری نے تشیع عقیدے
کے بارے میں لکھا ہے کہ خلافت کے مسئلے میں ان کی رائے عام اہل سنت کے عقیدے سے کلی طور پر شاید نہیں ملتی:
میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پیغمبر صاحب چاہتے تھے کہ ان کے جانشین حضرت علی ہوں لیکن اپنی زندگی میں اس کا
اعلان نہیں کیا اور موت کے وقت انھیں اس کا موقع نہیں دیا گیا۔ اس کے بعد جس طرح انتخاب ہوا، غلط تھا،
یہی سمجھ کر اس کا موقع دیا تھا کہ وہ لشکر میں چلے گئے۔ انتخاب بے اصل تھا، اور حضرت ابوبکر کی طرح حضرت عمر

کو نامزد کیا۔ جانشین کا انتخاب وہ خود کریں، یہ پسندیدہ نہ ہو لیکن، حضرت عمر اس کے لیے نامزد ہوں نہ تو
حضرت عمر نے حضرت عثمان اور حضرت علی کو نامزد کیا۔ ان دونوں میں کون جانشین ہوگا اس کا فیصلہ
انہوں نے جو طور کیا وہ ٹھیک نہ تھا۔ حضرت عثمان اس کے لیے بالکل موزوں نہ تھے اگر وہ حضرت
حضرت علی کو نامزد کر دیتے تو اہل السنن و اہل التشیع کا اختلاف نہ پیدا ہوتا اور اسلام کو جن
ان عظیم نقصانات سے بچ جاتے جو اس کی وجہ سے ہوئے۔ (یعنی یہ بدعت اب بھی نقصان ہو رہی)

سکینہ بنت الحسین کے بارے میں شرر کی شرر افشانی ۲۰۷ ۔ قارئین ایک معاصر ایرانی
محقق کی شرر افشانی بھی دیکھیں:
"در زنی جمیل و خوش خوی و در مصائب صبور بود۔ خانہ اش مرکز تجمع شعرا و محل مناقشہ و بحث بود
و بس شاعران بزرگ ہمچون فرزدق و جریر صلہ عطا می کرد۔ سکینہ نخست با مصعب بن زبیر در آمد
و پس از قتل او زوجہ عبداللہ بن عثمان گردید و پس از مرگ او زید بن عمرو با وی ازدواج کرد
ولی زید بتوصیہ سلیمان بن عبدالملک او را طلاق گفت۔ سکینہ در مدینہ بدرود زیست و طرہ سکینہ باو
منسوب است۔ عبداللہ معروف شہ بن عبدالحبیب دو کتاب در احوالش نوشتہ اند" (فرہنگ فارسی
دکتر محمد معین جلد ۵ ص [illegible])
کیا شرر نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس سے مختلف ہے؟ یہ بات کہ وہ ۱۰ برس کی تھیں کہ بمقام یزید میں
ان کی وفات ہوئی، ہندوستان میں گڑھی گئی کہ لڑنے کا موقع ملے۔ ڈاکٹر حسن عسکری صاحب نے لکھا ہے
کہ اس معاملے میں ان کا کیا خیال ہے۔ فرہنگ معین میں سکینہ بضم س و فتح ک ہے۔ ہندوستان میں بالا
پر بفتح س و کسرہ ک پڑھتے ہیں۔ البتہ جب کہ ان کے تو سنو لوگوں کے بابت دشمن حضرت
علی سمجھے جاتے ہیں

بازیافت

راجندر سنگھ بیدی کا اولین افسانہ 'فرشتہ'



راجندر سنگھ بیدی کی اولیں تحریر ملاحظہ ہو۔ جب وہ محسن تخلص کے ساتھ لکھتے تھے

تحریر غالباً انگریزی کے کسی ادب پارے کا ترجمہ ہے اسکے لیے ہم ڈاکٹر قمر رئیس کے ممنون ہیں

ادارہ

ربیدی محسن

فرشتہ

(۱)

...پُورے جوبن پر تھا۔ اور برف زمین پر
...نو پیش کر رہی تھی۔

...رشتہ جس کے چہرے پر معصومیت نمایاں
...ے وقت ایک تیرہ و تار گلی میں ترانہ
...بار ہا تھا۔ تکان کی وجہ سے اس کے دودھیا
...پڑے ہوئے تھے۔ اور سینہ میں اُسکا
...دھڑک رہا تھا۔

...ی نگاہیں لوگوں کے دروازوں کی
...ہیں۔

...چھپا ہوا تھا۔ اور تارے بھی اپنا منہ بادلوں
...ں چھپا بیٹھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فرشتہ
...بارگاہ تک نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ آسمان
...ے لئے جو روشنی کی سیڑھیاں تھیں۔ وہ
...ٹھالیں تھیں۔

(۲)

...زہ کھولو اور مجھے اپنی آگ کے پاس جگہ
دو...... اُف! کس قدر سردی ہے...... دروازہ
کھولو" فرشتہ نے ایک دروازہ کو کھٹکھٹاتے ہوئے
کہا۔

ساری دنیا سو رہی تھی۔ لوگوں نے اس فرشتہ
کی چیخ و پکار کو بھی اپنی نیند کے خوابوں کا ایک حصّہ سمجھا
اور اس پر کسی نے توجہ نہ دی۔

"میں تمہاری خواہش پوری کرونگا ـــ سُنا!
لالچی لوگو...... دروازہ کھول دو، آہ! تم کس قدر سنگدل
ہو گئے ہو۔ تمہارے دِل کے تاریک گھر میں رحم کی
روشنی نہیں ـــ اُف سردی...... دروازہ کھولو۔
جلدی"۔

اب برف باری پہلے سے زیادہ ہونے لگی۔
سرد ہوا کے جھونکے ہر کسی کو سامنے ٹانگوں پر کھڑا ہوتے دیکھ
کر اُسے سرنگوں کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تند ہوا کے
جھونکے دیار کے بڑے بڑے درختوں کو جن کا سر ثریا تک
پہنچا تھا۔ اک خوفناک آواز سے توڑ کر نیچے گرا دیتے
تھے۔ اور وہ درخت جو کہ تھوڑی دیر پہلے آسمان کو

چھوتا تھا اب زمین پر پڑا تھا۔

"دروازہ کھولو! میں تمہیں ایک بہت ہی اچھی
چیز دوں گا ۔ برائے خدا ...... مرا ۔ بوڑھی اماں
...... مرا" فرشتے نے ایک دروازہ کو کھٹکھٹاتے
ہوئے کہا۔

بڑھیا جس کا چہرہ گناہوں کی آلودگی سے پاک
وصاف کندن کی طرح چمک رہا تھا۔ اور جس کا نحیف
ونزار بدن اس کے دائم المریض ہونے کی علامت تھا
باہر نکلی۔

اس نے آوارہ فرشتہ کی پُرسوز اور الم انگیز
آواز سُنی۔ اور دروازہ کھول دیا۔

اس لئے نہیں کہ اُسے کوئی بیش قیم
گی ۔ مطلق نہیں ۔ وہ دکھی تھی۔ اور ست
لوگوں کے مصائب سے بخوبی واقف تھی۔
فرشتہ کو اندر بلا لیا۔ آگ جلا کر اس کے نم
جو کہ برودت کی وجہ سے سُن ہو چکے تھے۔
اور پھر اُسے سونے کے لئے نرم اور آ

جب مشرق کی طرف افق پر سرخی ک
ہوئی تو فرشتہ اُٹھا۔ اور جب آفتاب نے اپنا
اُتار کر اپنی نیلی شعاع سے دنیا کو سلام کیا تو
اُٹھ کر بڑھیا کی پیشانی کو بوسہ دیا اور آسمان ک
صبح کو لوگوں نے دیکھا۔ بڑھیا تمام دکھو
سے نجات حاصل کر چکی ہے۔

("چندن")

مشرقِ وسطیٰ کے سفرنامے

سفرنامہ قسطنطنیہ، عراق و ایران

ـــــــــــ سیّد حسن عسکری

حرفے چند

مشرق وسطیٰ، شرق اوسط، مڈل ایسٹ، مغربی ایشیا و شمالی افریقہ ـــــــ مختلف ناموں سے یہ علاقہ ہمارے لیے بڑی مانوس دنیا ہے جس میں عرب ہیں، ترک ہیں، ایرانی ہیں۔

ہندستانی سیاح اس علاقہ میں جاتے رہے ہیں اور اپنے تاثرات قلم بند کرتے رہے ہیں۔ اردو میں ایسے سفرناموں کا بہت اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ انیسویں صدی میں اور پھر ۱۹۴۷ء تک بیسویں صدی میں جو کچھ میسّر رہے اُسے وقتاً فوقتاً پیش کیا جاتا رہے گا۔

'مشرق وسطیٰ' قواعد کی رو سے صحیح نہیں لیکن، اردو نے اسے اپنا لیا ہے اس لیے عمومی عنوان یہی رکھا جا رہا ہے: مشرق وسطیٰ کے سفرنامے۔

یہ سفرنامہ ۱۹۲۲ء کے آس پاس لکھا گیا ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے ابتدائی عہد کا حوالہ اس میں ملتا ہے

ظ۔ رب

سفر نامہ قسطنطنیہ عراق و ایران

مرتبہ

سید حسن عسکری

ڈپٹی کلکٹر

فہرست



آقای رضاخان [illegible] فرمانروای ایران

سفر نامہ

قسطنطنیہ عراق و ایران

مترجمہ

سید حسن عسکری، ڈپٹی کلکٹر

سابق ترجمان قنصل خانہ بغداد و ممبر ملٹری مشن ٹو پرشیا مشہد

باہتمام سید احمد حسین۔ بی۔ اے پروپرائٹر

تعلیمی پریس لکھنؤ میں چھپا



دیباچہ

عرب کا قول ہے "دُرْ مَعَ الدَّهْرِ كَيْفَ مَا دَارْ" یعنی جسطرف زمانہ پھرے اُسکے ساتھ پھر جا، ایک شاعر نے بھی کہا ہے :-

"زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"

یہ ظاہر ہے کہ زمانہ مین ہمیشہ انقلاب رہا ہے اور قیامت تک رہے گا، تاریخ کے پڑھنے اور ہر روز کے تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے خیالات مذہب رسوم و عادات مین بھی مقتضائے وقت کے موافق انقلاب ہوا کیا ہی البتہ ہر ملک اور ہر قوم مین ہمیشہ ایسے لوگ ہوئے ہین جنھون نے زمانہ کے ساتھ چلنا اختیار نہین کیا لیکن متاسفانہ ہندوستان کے مسلمانون مین اس قسم کے اشخاص ابتک بکثرت پائے جاتے ہین اور اُنکی خام خیالی اوہام پرستی تقلید آبائی اور استبداد کا یہ نتیجہ ہے کہ مصر شام روم و ایران بلکہ دُنیا کے

تمام مسلمانون مین ہندستان کے مسلمان زیادہ ذلیل وحقیر خیال کئے جاتے
ہین حتیٰ کہ اہل عراق تک اُنکو ہندی بطّال کے لقب سے یاد کرتے ہین اور ایران
مین لفظ ہندی اُسی مفہوم مین استعمال کیا جاتا ہے جس معنی مین لفظ Native
(نیٹیو) اکثر ہندستان کے انگریز استعمال کرتے ہین۔ اسلامبول مین ہندستانی
مسلمان بہت ہی حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہین اور بہت سے تُرک
اُن سے ملنا یا معاشرت کرنا پسند نہین کرتے اگرچہ بہت سے سیاسی اسباب
کی وجہ سے ہندستان کے مسلمان اور مسلمانون کی نگاہ مین وقعت رکھتے ہون
لیکن اصلی سبب اُنکی جہالت اور قدامت پرستی ہے۔ قدیم عادات و رسوم کو
اگرچہ کیسی ہی مضر و بیہودہ ہون یہ اُن کو ترک نہین کرتے لوازم زندگانی،
آداب معاشرت لباس و خوراک وغیرہ وہی قائم رکھنا چاہتے ہین جو ہندستان
مین صدیون سے ہین ہر امر اور ہر فعل کو اسلام بیچارے کی طرف منسوب
کرتے ہین خواہ اُسے اسلام سے تعلق ہو یا نہ ہو۔ ہندوستان کے تمام مسلمان
یہان تک کہ علما بھی یورپ کا بنا ہوا کپڑا استعمال کرتے ہین کیونکہ وہ سستا
اور عمدہ ہوتا ہے لیکن انگریزی قطع کا بنا ہوا لباس مثلاً کوٹ پتلون بُرا
سمجھا جاتا ہے حالانکہ مین نے خود بہت سے مصری ترکی و ایرانی علمار کو

پتلون پہنے ہوئے دیکھا ہے۔ مشہد مقدس مین مسجد گوہر شاد کے متولی اور امام جماعت کو مین نے ہمیشہ عمامہ وقبا کے ساتھ پتلون پہنے ہوئے دیکھا، میز پر چھری کانٹے کے ساتھ کھانا مذموم بلکہ شائد حرام خیال کیا جاتا ہے اور ہاتھ سے کھانا سنت قرار دیا جاتا ہے لیکن جَو کے بغیر چھنے آٹے کی روٹی نمک یا سرکہ یا چھوارہ کے ساتھ کھانا سنت نہین سمجھا جاتا۔ تعجب ہے کہ قورمہ پلاؤ شامی کباب متنجن۔ مزعفر مرغ مسلم تو جائز بلکہ واجب موکد لیکن میز پر چھری کانٹے سے اُبلا ہوا گوشت اُبلی ہوئی ترکاری بدنما ڈبل روٹی کھانا ناجائز بلکہ حرام مؤبد ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمانون مین ظاہر پرستی بہت ہی زیادہ اور حقیقت شناسی بہت ہی کم ہے اور یہ فقط جہالت، اخلاق کی کمزوری اور اوہام پرستی کی علامت ہے۔ میرا مقصود یہ ہرگز نہین ہے کہ ہر شخص کو کوٹ پتلون ہی پہننا یا میز ہی پر چھری کانٹے سے کھانا چاہیئے لیکن اگر کوئی شخص ایسا کرنا چاہے تو اُسکے فعل کو خلاف مذہب نہ قرار دینا چاہیئے۔ ہندوستان کے مسلمانون مین یہ تنگ خیالی وظاہر پرستی زیادہ تر ہندوؤن کی معاشرت وعورتون کی جہالت سے پیدا ہوگئی ہے عورتون مین یہ ناقابل علاج جہالت اسوجہ سے ہے کہ اُن کی نانیان،

دادیان، اصلاً ہندو تھین جنکو اُن کے اجداد نے جب ہندوستان مین آئے تھے مسلمان کر کے اُن کے ساتھ عقد کر لیا تھا، وہ مسلمان تو ہو گئی تھین لیکن اُن کے خیالات، عادات، رسوم و آداب وہی رہے جو ہندؤن کے تھے۔ چنانچہ وہی قدیم خیالات و مراسم اب بھی باقی ہین اور بچے لڑکپن سے اُنھین کو سیکھ لیتے ہین۔ اسلئے مسلمانون کو اپنی عادتون کی اصلاح اور اخلاق کی تہذیب اور آداب معاشرت کی ترقی کیلئے دو باتین لازم ہین اولاً نوجوان تعلیم یافتہ مسلمانون کو چاہیے کہ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کرین اور دوسرا امر جو اُس سے بھی زیادہ ضروری ہے یہ ہے کہ عورتون کی تعلیم و تربیت مین پوری کوشش کرین۔

جو نوجوان حضرات ممالک اسلامیہ کا سفر اختیار کرین اگر وہ ناکتخدا ہون تو اُن کو چاہیے کہ کسی اسلامی ملک کی تعلیم یافتہ عورت سے نکاح کر کے اپنے ہمراہ ہندوستان لائین تاکہ اُن کے امور خانہ داری مین اصلاح و ترقی ہو اور بچون کی تعلیم و تربیت عمدہ طرح سے ہو سکے۔ اس سفر مین مجھکو یہ بھی معلوم ہوا کہ اب اُن ملکون کی عورتین ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانون کے ساتھ نکاح کرنے سے اسقدر پرہیز نہین کرتین جیسا پہلے کیا کرتی تھین۔ البتہ

یہ وہی شخص کرسکتا ہے جو اُن کے لئے گرمیون مین راحت کا سامان مہیا کرسکے اور گردش وتفریح کے لئے گاڑی یا موٹر رکھ سکے۔ وہان کی عورتین یہان کی عورتون کی طرح مکان کی چار دیواری مین قیدیون کی طرح زندگی نہین بسر کرسکین گی اور نہ اُن کی صحت کیلئے ایسا طریقہ زندگانی مفید ہوگا۔ اگر کوئی شخص اُن کو گرمیون مین پہاڑ پر بھیجنا چاہے تو بآسانی کرسکے گا۔ کیونکہ وہ زنانے بورڈنگ ہوس یا ہوٹل مین بغیر کسی زحمت کے تنہا قیام کرلین گی۔

اس مقام پر یہ بھی ذکر کردینا غیر مناسب نہین ہے کہ حتی الامکان ہر ملازم گورنمنٹ بعد پنشن لینے کے کسی اسلامی ملک مین جاکر قیام اختیار کرے۔ ہر مسلمان خصوصًا شریف طبقون کے مسلمانون کو ہمیشہ یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہندوستان انکا آبائی وطن نہین ہے اور انکے اجداد عمومًا دوسرے ملکون سے ہندوستان آکر آباد ہوگئے تھے اسلئے جب وہ تحصیل معاش سے دست کشی اختیار کرین تو انکو چاہیے کہ اپنے اصلی وطن کو واپس جائین جس طرح انگریز بعد پنشن لینے کے انگلستان چلے جاتے ہین جن لوگون نے ایسا کیا ہے مثلاً سید امیر علی صاحب نے انگلستان مین اور بعض نوابون نے عراق مین اور ایک خاندان نے طہران مین قیام اختیار کرلیا ہے وہ لوگ وہانکے اصلی باشندون کی طرح نہایت ہی اچھی صحت آرام وراحت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہین نادر شاہ نے اپنے سپاہیون کو وصیت کی تھی کہ ہندوستان مین کبھی قیام نہ کرنا ورنہ تم لوگ بھی

نسل ہندوستانیوں کے سست آرام طلب کمزور و بزدل ہوجاؤ گے افسوس ہے
کہ مسلمانوں نے اُسپر عمل نہین کیا لیکن انگریز نادرشاہ کی وصیت کے مطابق
چل رہے ہین - جن پارسیوں نے ہندوستان مین قیام اختیار کرلیا ہے وہ
بہ نسبت ایران کے باشندون کے بہت ہی کمزور و نحیف الجثہ معلوم ہوتے ہین
لیکن اگر وہ عموماً یورپین طریقہ زندگانی کا اختیار نہ کرتے تو اور بھی بدتر ہوجاتے
چونکہ اُن مسلمانون سے جو خود سن رسیدہ اور جنکے اخلاق بوسیدہ اور
عادات پوسیدہ (پرانے) اور قوائے جسمانی از کار افتادہ ہوگئے ہین کسی اصلاح
و ترقی کی اُمید نہین کی جاسکتی اسلئے میری عرض صرف نوجوان مسلمانون کی
خدمت مین ہے کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوکر خود کوشش کرین اور
دوسرون کو جگائین - میرے نزدیک بہت ہی مؤثر اور آسان طریقہ اُن کے
بیداری کا یہ ہے کہ جو اُن مین سے صاحب استطاعت ہو اُسکو چاہیے کہ تعلیم کے
تکمیل کرنے یا کسی ملازمت یا پیشہ اختیار کرنے کے بعد کم سے کم کسی ایک
اسلامی ملک کا سفر اختیار کرے تاکہ وہان کے مسلمانون کے اخلاق و عادات
و مذہبی اصلاحات کو دیکھکر فائدہ اُٹھائے اور ہندوستان واپس آکر اُن کے
جاری کرنے کی کوشش کرے چنانچہ آیہ شریفہ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ طَائِفَةٌ

لِیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ میں اسی اُمر کی طرف حکیم مطلق نے اشارہ فرمایا ہے۔

میں نے محض اسی غرض سے یہ مختصر سفرنامہ جوانوں کے لئے بطور Guide book. یعنی ہدایت نامہ کے لکھا ہے لیکن جو حضرات یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان سے باہر قدم نہ اُٹھائیں اور محض سفرناموں کو پڑھکر ممالک اسلامیہ کے متعلق اطلاعات حاصل کریں اُن کو اس سفرنامے کے پڑھنے سے چنداں فائدہ نہو گا کیونکہ اس میں عمارات و مناظر طبیعی وغیرہ کا مفصل بیان جو اکثر سفرناموں میں ہوا کرتا ہے نہیں ہے اور میں نے قصداً اُن کے ذکر کرنے سے احتراز کیا ہے۔

میرے نزدیک یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی اسلامی ملک کے سفر کرنے سے پہلے انگلستان کا سفر کرلینا نہایت ہی مفید ہو گا کیونکہ ہندوستان کے عام مسلمانوں کا لباس وطرز معاشرت وغیرہ دوسرے اسلامی ملکوں سے اسقدر مختلف ہو گیا ہے کہ اگر ایک ہندوستانی پہلی مرتبہ اُن ملکوں میں جائے گا تو اسکو بہت سی مشکلیں پیش آئیں گی نہ بہ آسانی وہاں کے لوگوں سے معاشرت کر سکے گا، نہ وہاں کی تعلیم یافتہ سوسائٹی میں عزت واحترام کے ساتھ داخل کیا جائے گا لیکن اگر اُسنے انگلستان کا سفر کرکے یورپ کے

عام طرز معاشرت سے واقفیت حاصل کرلی ہے تو اسکو ایشیا کے کسی ملک
میں زیادہ زحمت نہ اٹھانی پڑے گی۔ کیونکہ ایشیائی ممالک اور مصر اسلامبول
میں بجز بعض خصوصیات کے عام طور پر طرز معاشرت مغربی جدید طریقے کا ہوگیا ہے
وہاں کے عام مسلمانوں اعلےٰ سے ادنیٰ اور عالم سے جاہل تک کم و بیش زمانہ کی
رفتار سے واقف ہوگئے ہیں جیسا کہ سرسید احمد خاں مرحوم ہندوستان کے
زمانہ جاہلیت میں زمانہ کے رنگ کو پہچان گئے تھے اور اسلئے اسکی رفتار
کے ساتھ چلنے پر کاربند ہوئے۔

بعد اس مختصر بیان کے اب چند ضروری امور کا ذکر کرتا ہوں جنکا
سفر کرتے وقت لحاظ رکھنا چاہیئے۔

(۱) ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے پاسپورٹ یعنی پروانہ راہداری
حاصل کرلینا چاہیئے اور جن ملکوں کے لئے ویزہ (Visa) یعنی اجازت
کی ضرورت ہو اس ملک کے قونسل کے جو ہندوستان میں ہو دستخط پاسپورٹ
پر کرالینا چاہیئے یا پاسپورٹ کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہیئے کیونکہ اگر کسی
ملک میں ڈاک خانہ یا ٹامس کوک کے دفتر یا بنک میں خط یا روپیہ لینے جائیگا
تو سب سے پہلے آپکے پاسپورٹ مانگا جائیگا۔

(۲) جس ملک کا سفر کرنا مقصود ہو وہاں کے متعلق تمام ضروری باتوں کی اطلاع کسی گائڈ بک یعنی ہدایت نامہ یا سفرنامہ کو پڑھ کر یا کسی شخص سے جسنے وہاں کا سفر کیا ہو حاصل کرلینی چاہیئے

(۳) ٹامس کک اور ایسٹرن ٹرنسپورٹ کمپنی Eastern Transport Company سے جنکے دفتر بمبئی میں ہیں سفر کے متعلق کافی اطلاعات حاصل ہوسکتے ہیں اور اُنکے ذریعے سے روپیہ اور خط کے بھیجنے اور ملنے کا عمدہ انتظام ہوسکتا ہے اگر کوئی شخص بوشہر کے راستہ سے شیراز و اصفہان جانا چاہے تو روپیہ کا انتظام بنک شاہنشاہی ایران کے ذریعہ سے جسکی ایک شاخ بمبئی میں ہے بآسانی ہوسکتا ہے اور اگر کوئٹہ کے راستے مشہد مقدس کا سفر مقصود ہو تو دزداب میں اس بنک کی ایک شاخ ہے جہاں چک اور ڈرافٹ وغیرہ ملسکتے ہیں بغداد میں بھی بنک شاہنشاہی ایران کی ایک شاخ ہے اسلئے بمبئی میں بغداد کیلئے بھی ڈرافٹ ملسکتے

(۴) لباس یوروپین وضع کا ہونا چاہیئے کیونکہ اسلامی ملکوں میں بھی اسی قسم کا لباس عموماً استعمال ہونے لگا ہے لیکن یورپ میں انگریزی ٹوپی اور اسلامی ملکوں میں وہاں کی مخصوص ٹوپیوں کا پہننا زیادہ مناسب ہوگا۔ گمرک " یعنی Customs. کی زحمتوں سے بچنے کے لئے حتی الامکان تھوڑا لباس ساتھ لیجانا چاہیئے۔ سفید کوٹ پتلون کا دوسرے ملکوں میں بہت ہی کم استعمال

ہوتا ہے لیکن اگر کسی ریشمی کپڑے کا ہو تو یورپ ایشیا دونوں جگہ گرمیوں میں پہنا جاسکتا ہے۔ ایک بڑا کوٹ فراک یا مارننگ یا ٹرکش مع ایک عاریٹی پتلون کے ضرور ہمراہ ہونا چاہیئے کیونکہ ایران و اسلامبول میں معزز لوگوں کے پاس جاتے وقت ایسے لباس کی ضرورت ہوتی ہے۔

مختلف رنگوں کی ٹائی کا استعمال بہت کم ہے۔ حتی الامکان ہمیشہ سیاہ ٹائی لگانا چاہیئے۔

جوتے سیاہ اور عمدہ قسم کے ہوں کیوں کہ ایران اور دوسرے ملکوں میں لوگ عموماً اچھے قسم کے جوتے پہنتے ہیں۔ بارش کے زمانہ میں جوتے کو کیچڑ سے بچانے کے لئے گالش کی ضرورت ہوتی ہے اور اُن ملکوں میں وہ بکثرت ملتا ہے اس لئے ہندوستان سے ساتھ لیجانے کی ضرورت نہیں۔ اُن ملکوں میں کرتے پائجامے صرف سوتے وقت پہنے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی سے خالی کرتا اور پائجامہ پہنے ہوئے ملے تو نہایت ہی بدتہذیب سمجھا جائے گا۔ میں نے معمولی ایرانیوں کو دیکھا ہے کہ گھر میں تعطیل کے دن بھی کرتے پائجامے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ صبح کو ہاتھ منہ دھو کر پورا لباس پہن لیتے ہیں اور شب کو سوتے وقت تک اسی لباس کو پہنے رہتے ہیں اسلئے یہاں سے بہت سے کرتے اور پائجامے ہمراہ نہ لیجانا چاہیئے۔ ضروری کپڑوں

کے علاوہ بستر۔ گلاس۔ لوٹا۔ اور دو چھوٹے پورٹ مینٹو یا چمڑے کے دو سوٹ کیس بھی ہمراہ ہونا چاہیئے۔

(۵) ہر ملک کے گمرک یعنی (Customs) کے قواعد میں بہت تھوڑا سا فرق ہے۔ اسلئے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ لکھنا بیکار ہے۔ البتہ چند ضروری باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ سیگار اور سیگرٹ بہت کم ہمراہ لیجانا چاہیئے روزمرہ کے استعمال کے لئے جہاں چاہیئے وہیں خرید لیجیے۔ نشہ کرنے والی چیزیں افیون وغیرہ۔ اسلحہ اور خوشبودار چیزیں مثل عطر وغیرہ کے ہمراہ لیجانا ممنوع ہے البتہ سر میں لگانے کے لئے معمولی تیل مستثنیٰ ہے۔ کپڑے جوتے وغیرہ حتی الامکاں استعمال شدہ ہوں۔ اگر نئے ہوں تو اُن کو چند روز استعمال کر لینا چاہیئے۔ اگرچہ شخصی استعمال کی چیزوں پر گمرک نہیں ہے لیکن بعض وقت گمرک کے ملازمین ناواقف سیاحوں کو دھوکا دے کر کچھ لے لیتے ہیں۔ یا کم سے کم اُن کو زحمت دینے کے لئے دیر تک اُنکی ہر چیز کا معائنہ کرتے ہیں مجھ کو تمام سفر میں گمرک کے متعلق جسقدر تکلیف کراچی میں ہوئی وہ نہ بغداد نہ اسلامبول نہ شام نہ ایران نہ فرانس نہ اٹلی نہ کسی دوسرے یورپین مقام پر یہ امر نہایت ہی قابل افسوس ہے کہ ہندوستانی ملازمین گورنمنٹ دوسرے ملکوں کے

زموں سے زیادہ تر تکلیف دہ ہوتے ہیں اور اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ
بھی ہندوستان کے لوگوں میں بالکل سلف گورنمنٹ یعنی استقلال داخلی کی
اہلیت نہیں ہے۔

(۶) چونکہ ہر ملک میں مختلف سکّوں کا رواج ہے اِس لئے انگریزی
نڈ کے نوٹ یا ڈرافٹ کا ہمراہ لیجانا زیادہ مناسب ہے کیونکہ ہر ملک میں پونڈ
سانی چلجاتا ہے بعض مختلف سکوں کے نام اور اُنکی قیمت یہاں ذکر کیے دیتا ہوں
رانس میں فرانک چلتا ہے جسکی قیمت قبل از جنگ ۲۵ فرانک فی پونڈ تھی
راب ایک پونڈ کی قیمت سو فرانک سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔

اٹلی میں لیر چلتا ہے اور ایک پونڈ کی قیمت قریب ۱۲۰ لیر کے ہوگئی ہے
بلجیم و سوئزرلینڈ میں بھی فرانک چلتا ہے۔ بلجیم میں اُسکی قیمت گھٹتی
ھتی رہتی ہے لیکن سوئزرلینڈ میں اسکی قیمت قریب قریب ایک ہی
الت پر باقی ہے جہاں اُسکی قیمت ۲۵ فرانک سے کچھ زائد ہے۔

مصر میں انگریزی و مصری پونڈ دونوں چلتے ہیں اور مصری پونڈ کی
ت انگریزی پونڈ سے کچھ زیادہ ہے۔

اسلامبول میں لیرہ عثمانی و پیاسٹر چلتا ہے اور سو پیاسٹر کا ایک لیرہ ہوتا ہے

ان دنوں انگریزی پونڈ کی قیمت ۸ لیرہ عثمانی ہوگئی ہے۔ فرانک بھی یہاں بہ آسانی چلجاتا ہے۔

بیروت میں شام کے لیرہ و پیاسٹر کا رواج ہے اور یہاں کا ایک لیرہ دو لیرہ عثمانی کے برابر ہے انگریزی پونڈ و فرانک بھی یہاں بہ آسانی چلجاتا ہے دمشق میں بیروت کا لیرہ کچھ کم قیمت پر لیاجاتا ہے۔ وہاں نقد سکہ اور نوٹ کی قیمت میں بھی فرق ہے مثلاً ایک لیرہ دمشقی سو پیاسٹر کا ہوتا ہے لیکن اگر ایک لیرہ کا نوٹ بھنایا جائے تو سو پیاسٹر سے کچھ کم پر چلے گا۔ اسی شہر دمشق کو جو شام کا پایۂ تخت تھا شام بھی کہتے ہیں۔

بیت المقدس میں انگریزی پونڈ و فرانک اور دوسرے ملکوں کے بھی سکے چلتے ہیں۔

بغداد میں اب ہندوستانی روپیہ کا رواج ہے لیکن انگریزی پونڈ اور ایرانی قران بھی بآسانی بھن جاتا ہے۔

ایران میں قران چلتا ہے اور ایک پونڈ انگریزی کی قیمت ان دنوں قریب چالیس قران کے ہے اور ایک روپیہ کی قیمت تین قران ہے۔ لیکن روپیہ ایران میں نہیں بھن سکتا ہے۔ انگریزی پونڈ کے بھننے میں بھی دقت ہوتی ہے لیکن

بنک شاہنشاہی میں وہ لے لیا جاتا ہے۔ ایک تومان دس قران کا ہوتا ہے۔ لیکن
کوئی سکہ ایک تومان کا نہیں ہے۔ قران کے دو سکے ہیں ایک ایک قران کا ہے
اور دوسرا دو قران کا۔ پہلے کو ایک ہزاری اور دوسرے کو دو ہزاری بھی
کہتے ہیں۔ نصف قران اور ربع قران کے بھی سکے ہیں۔ ایک قران بیس
شاہی کا ہوتا ہے۔ شاہی کو صنار بھی کہتے ہیں جو مخفف ہے صد دینار کا۔
نیم شاہی کا بھی سکہ ہے جو ہندوستان کے ڈبل کی طرح ہوتا ہے۔

(۷) زبان کا مسئلہ بہت ہی مشکل اور ضروری ہے۔ ہندوستانیوں سے
یہ امید رکھنی کہ وہ فرنچ یا عربی جدید یا ترکی یا فارسی جدید ہندوستان میں
رہ کر سیکھ سکیں غیر ممکن ہے البتہ اگر انگریزی داں شخص فرنچ سیکھنا چاہے
تو چھ مہینے میں بقدر ضرورت کے جان سکتا ہے۔ لیکن تلفظ کرنے میں ضرور
اُسکو دشواریاں پیش آئینگی۔ اگر کوئی شخص کچھ عربی و فارسی جانتا ہو تو اُن ملکوں
میں جا کر آسانی سے وہاں کے روزمرہ بولنے کی زبان سیکھ سکتا ہے لیکن چونکہ
اب انگریزی قریب قریب ہر ملک میں وہاں کے تعلیم یافتہ لوگ کم و بیش
سمجھ لیتے ہیں اسلئے زبان کی ناواقفیت سے اسقدر دقت نہیں اُٹھانی پڑیگی
جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اسلامبول میں تعلیم یافتہ لوگ فارسی بقدر ضرورت کے

سمجھتے اور بول لیتے ہیں۔ اسلئے اگر کوئی ہندوستانی صرف فارسی جانتا ہو تو
تعلیم یافتہ لوگوں سے ملنے میں کچھ آسانی ہوجائے گی لیکن عام دکانوں اور
قہوہ خانوں میں فارسی سے کچھ مدد نہیں ملے گی۔

(۸) ہر ملک کے ضروری آداب سے بھی فی الجملہ واقفیت ہونی چاہیئے
مثلاً ایران میں سلام کرنے کا طریقہ صرف گردن کو تعظیماً جھکا کر آہستہ سے سلام علیک
کہنا ہے۔ اسلامبول وشام وعراق میں سلام کرتے وقت ہاتھ کو طرف سینہ و پیشانی
کے لیجانا چاہیئے۔ لیکن کسی ملک میں رخصت ہوتے وقت سلام علیک نہیں
کہا جاتا اِس بدعت حسنہ کا رواج صرف ہندوستان میں ہے۔ علیگڈھ کالج
میں بھی یہ طریقہ جاری ہے۔ خدا جانے اسکا رواج ہندوستان میں کیونکر ہوا۔
انگلستان وایران میں بات کرتے وقت ہاتھوں کو زیادہ حرکت دینا خلاف
تہذیب سمجھا جاتا ہے۔ ڈکارنا۔ جمہائی لینا۔ زمین پر تھوکنا یا ناک صاف کرنا۔
ہر ملک میں سوائے ہندوستان کے بہت ہی بُرا خیال کیا جاتا ہے۔
ہر شخص تھوکتے اور ناک صاف کرتے وقت رومال استعمال کرتا ہے۔ ہندوستانیوں کو
چاہیئے کہ ان امور کا ہندوستان میں خیال رکھیں اور جب دوسرے ملکوں میں
جائیں تو زیادہ تر اُنکا لحاظ کریں تاکہ حقارت وذلت کے ساتھ نہ دیکھے جائیں

مختصر یہ ہے کہ جس ملک میں انسان جائے وہاں کے آداب کو غور سے دیکھکر اُسپر عمل کرے جیسا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ اسلامی ملکوں کی سیاحت کرنے سے پہلے انگلستان کا سفر کر لیا جائے۔ وہاں کا سفر نہایت ہی آسان ہے بمبئی سے "پے اینڈ او کمپنی (P & O. Co.) کے کسی جہاز میں سکنڈ کلاس کا ٹکٹ ۵۶ یا ۶۰ پونڈ کو لیکر سیدھے لندن چلے جائیے یا مارسلیس سے اُترکر ریل کے ذریعہ سے پیرس ہوتے ہوے لندن جائیے لیکن میرے نزدیک مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کا پہلا سفر ہو اور فرنچ زبان سے بھی ناآشنا ہو اُسکو چاہیے کہ سیدھا انگلستان ہی چلا جائے اور واپسی کے وقت پیرس کو دیکھلے۔ پیرس سے اگر چاہے تو بذریعہ اکسپرس اورینٹ ریل کے تین دن میں اسلامبول چلا جائے۔ یہ ریل ہر روز پیرس سے ایک مرتبہ شب میں روانہ ہوتی ہے اور اُسمیں صرف اول درجہ ہوتا ہے اور شب کو سونے کا سامان یعنی (واگون دولی Wagon de lit.) مہیا کیا جاتا ہے۔ کرایہ قریب چودہ سو فرانک یعنی ۵۴ پونڈ کے ہے۔ خوراک کا صرفہ اِسکے علاوہ ہوگا۔ جن ملکوں میں ریل ہوکر جائے گی اُن ملکوں کا ویزہ (Visa.) پاسپورٹ پر ہونا چاہیئے۔ ان زحمتوں سے بچنے اور تین دن تک ریل میں قید رہنے سے

بہتر ہوگا کہ مارسلیس سے جہاز میں سوار ہو کر پانچ چھ روز میں اسلامبول چلا جائے اول درجہ جہاز کا کرایہ مع خوراک کے قریب بارہ تیرہ پونڈ اور سکنڈ کلاس کا قریب آٹھ پونڈ کے ہے پھر اسلامبول سے بذریعہ ریل کے حلب اور حلب سے بذریعہ موٹر کے بیروت چلا جائے لیکن دریا کا سفر زیادہ مناسب ہے۔ اسلامبول سے کسی جہاز میں سوار ہو کر چار پانچ روز میں بیروت چلے جائیے وہاں کا بھی اول درجہ جہاز کا کرایہ قریب بارہ تیرہ پونڈ کے ہے اور سکنڈ، تھرڈ کا اور بھی کم۔ بہت سے لوگ سکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں اور کافی آرام ملتا ہے۔ بیروت سے اگر دل چاہے تو یافہ (Yafa) اور یافہ سے بیت المقدس چلے جائیے اور وہاں سے بیروت واپس آکر تین گھنٹے میں موٹر کی سواری سے دمشق جائیے۔ دمشق سے اگر دل چاہے تو موٹر میں سوار ہو کر ۲۶ گھنٹہ میں صحرا کو طے کر کے بغداد چلے جائیے یا ریل کے ذریعہ سے تین چار روز میں مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہو جائیے۔ بیت المقدس سے سیدھے بغداد جانے کا راستہ بھی کھل گیا ہے اور Nairn Coy کی موٹر بتیس ۳۲ گھنٹے میں پہونچ جاتی ہے لیکن اگر شب کو راستہ میں قیام کرے تو البتہ اس سے زیادہ وقت صرف ہوگا۔ دمشق سے فرنچ کمپنی کی موٹر Palmyra

پالمیرا ٹھہرتی ہوئی بغداد جاتی ہے لیکن Nairn Coy کی موٹر سیدھے بغداد چلی جاتی ہے۔ دونوں کمپنی ۲۵ پونڈ کرایہ فی شخص لیتی ہیں۔ بغداد سے طہران تک پانچ دن میں موٹر جاتی ہے اور کرایہ بھی ۲۵ پونڈ ہے طہران سے مشہد، اصفہان و شیراز جانے کے لئے انگریزی یا فرنچ کمپنی کی موٹر نہیں چلتی۔ لیکن ایرانیوں۔ قفقازی ترکوں اور بغدادی عربوں کی موٹریں بکثرت اُن مقامات کو جاتی ہیں۔ مصر جانے کا راستہ ہر شخص کو معلوم ہے اس لئے اُس کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب میں یہاں سے اپنا سفرنامہ پیرس سے طہران تک کا چند فصلوں میں لکھتا ہوں:۔

فصل اوّل از پیرس تا اسلامبول

میں ۱۴ ستمبر روز یکشنبہ کو پیرس سے سات بج کر پچاس منٹ شب کی گاڑی سے مارسیلس کو روانہ ہوا۔ ۲۶۵ فرانک کو اوّل درجہ کا ٹکٹ لیا۔ یہ گاڑی اکسپریس تھی۔ اس میں صرف اوّل درجہ تھا۔ سکنڈ کلاس کا کرایہ

پیرس سے مارسلیس تک ۱۷۳ فرانک ہر۔ اسباب کے بک کرانے میں جو تین چمڑے
کے سوٹ کیس اور ایک بستر تھا، ۴ فرانک دینے پڑے۔ صبحکو ۸ بجے مارسلیس
پہونچا۔ اسیوقت ایک موٹر میں بندرگاہ پر گیا اور موٹر والے نے ۲۵ فرانک
لیا۔ یہ کرایہ معمول سے زیادہ تھا کیونکہ فرنچ مثل انگریزی ٹیکسی والوں کے
ایماندار نہیں ہوتے اور ایسے موقع پر اجنبی سے زیادہ لے لیتے ہیں۔ مارسلیس
سے قسطنطنیہ تک اول درجہ جہاز کا کرایہ ۱۲۸۷ فرانک۔ یا فرنچ (Pacquet
یا کے کمپنی کا جہاز تھا جسپر میں سوار ہوا۔ میرے کیبن (Cabin) میں
جواہرات کا ایک ارمنی تاجر تھا جو پیرس سے اسلامبول کو جا رہا تھا۔ جہاز
بجائے ۱۱ بجے چلنے کے ڈھائی بجے دن کو چلا۔ جہاز میں مختلف قوم کے لوگ
سوار تھے۔ منجملہ دیگر مسافروں کے اسلامبول کی سفارت انگریزی کا سکریٹری
دو تین امرکین اور دو نارویجین تھے۔ چند ترک بھی جہاز پر تھے جو مدت تک
نیویارک میں رہ کر اب اسلامبول واپس جا رہے تھے۔ ایکنے انمیں سے ایک
نارویجین عورت کے ساتھ نکاح کر لیا تھا اور اُس سے دو بچے تھے۔ جو
اُسکے ہمراہ جا رہے تھے۔ چونکہ وہ صورت اور لباس سے بالکل یورپین معلوم
ہوتا تھا اسلئے مجھے پہلے نہیں معلوم ہوا کہ وہ ترک ہے۔ دو تین روز کے بعد

اثنائے گفتگو میں اُسنے اپنا نام فتح اللہ بتلایا اور یہ بھی کہا کہ اسکی لیڈی بیوی
مسلمان ہو گئی ہے۔ ان لوگوں کے ہمراہ ایک اور عورت تھی جو یوروپین لباس پہنے
ہوئے تھی بجز اسکے کہ بجائے انگریزی ٹوپی کے اُسکے سر پر ایک عبا یہ تھا اور پردہ نہیں کرتی تھی۔
یہ مراکش سے آرہی تھی عربی اور ترکی خوب جانتی تھی۔ اور کچھ فرنچ بھی سمجھ لیتی تھی لیکن انگریزی نہیں
جانتی تھی۔ ایک جوان یہودی بھی اسلامبول جارہا تھا جو تقریباً ہر زبان بول سکتا تھا اُسنے کہا کہ اسکا
ایک دوست آگرہ بادمیں ہے جسکے پاس جواہرات کی دکان ہے۔ اور ایک اور بھی ترک اسی جہاز پر تھا جو
بالکل یوروپین معلوم ہوتا تھا اور ہمیشہ فرنچ مسافروں کے ساتھ گانے
بجانے میں مشغول رہتا تھا۔ اثنائے کلام میں معلوم ہوا کہ وہ ترک تھا اور
اُسنے مجھسے ترکی اور فرنچ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق بہت کچھ
گفتگو کی۔ وہ سینما کا فلم ادیٹر تھا اور اسلامبول فلم لینے جارہا تھا۔ ایک ڈینش
سے بھی جہاز پر ملاقات ہوئی جو ڈنمارک کے تھیوسافیکل سوسائٹی کا سکریٹری
تھا اور ڈینش گورنمنٹ کا سفیر ہوکر قسطنطنیہ جارہا تھا۔ اُسنے گاندھی اور ٹیگور
کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اُسکا ارادہ ہندوستان کی مسافرت کا ہے کیونکہ
اُسکے سوسائٹی کی ایک شاخ مدراس کے کسی شہر نوالی میں ہے۔ اسکو علم تصوف
اور علم الارواح کا بہت شوق معلوم ہوتا تھا اور اکثر مجھسے ان مسائل پر گفتگو

کیا کرتا تھا۔ اُس سے جب زیادہ بے تکلفی ہو گئی تو اُس نے مجھ سے اسٹائنر (Steinner.) کے طریقہ تصوف کے متعلق بہت کچھ گفتگو کی۔ اُس سے معلوم ہوا کہ قسطنطنیہ میں ایک سوسائٹی اسٹائنر کے تصوف کی ہے اور وہ خود بھی اُسکا ممبر تھا۔ اُسنے مجھ سے قسطنطنیہ کے ایک عالم شیخ عبدالوہاب آفندی کی بہت تعریف کی اُنکا مجھکو پتہ بتایا اور کہا کہ اُنسے ضرور ملنا۔ چنانچہ میں قسطنطنیہ میں اُنسے ملا، اُنکی ملاقات کا ذکر آیندہ کروں گا۔ اسی جہاز پر ایک یہودن سے ملاقات ہوئی جو قسطنطنیہ کے کسی وکیل کی بیوی تھی اور کئی زبانیں جانتی تھی۔ یہ عورت نہایت ہی ہوشیار و کاروباری معلوم ہوتی تھی اور ہر شخص سے اپنے شوہر کی تعریف کرتی تھی اور سفارش کرتی تھی کہ اُس سے ضرور ملو اور کہتی تھی کہ اُسکے شوہر نے قسطنطنیہ کے بڑے بڑے معزز حکام و ممبران پارلیمنٹ سے ملاقات ہے۔ اگر کسی قسم کی دشواری پیش آئے گی تو وہ ضرور مدد دے گا۔ وہ غالباً اپنے ترکوں کی طرف سے محکمہ راز میں ملازم تھی۔ اسی جہاز میں دو جوان لڑکیوں کو روز دیکھتا تھا جنسے کئی دن کے بعد کسی موقع پر گفتگو ہوئی۔ وہ انگریزی۔ فرنچ۔ جرمنی اور ترکی بول لیتی تھیں۔ مدت سے یورپ میں تعلیم پاتی تھیں دو دن کے بعد معلوم ہوا کہ وہ دو ترکن بہنیں تھیں اور اپنے والدین سے ملنے قسطنطنیہ جا رہی تھیں

بڑی بہن سے ریاضی کے کسی مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ اثنائے کلام میں میں نے علم مثلث [Trignametry] کے ایک مسئلہ پر نہایت بے اعتنائی سے اظہار خیال کیا۔ اُس نے مجھے فوراً ٹوک دیا اور ہنسکر مجھکو میری غلطی کیطرف توجہ دلائی۔ مجھکو نہایت تعجب ہوا اور میں نے دل میں نادم ہوکر اپنے مطلب کی تصحیح کی اُس سے حقوق زن و شو اور تعلیم و حقوق نسواں کے مسائل پر اکثر گفتگو ہوا کی اُسنے کہا کہ مرد چاہتے ہیں کہ عورتیں اُنکی محکوم رہیں اور اپنی معاش کو آزادانہ طریقہ پر حاصل کرنے سے محروم رہیں۔ ہندوستان کی مسلمان عورتوں کی حالت کو سنکر اُسنے بیحد اظہار تاسف کیا۔ میں نے کہا کہ اگر تعلیم یافتہ ترک عورتیں ہندوستان جائیں اور وہاں کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ساتھ نکاح کریں تو وہ ہندوستان کی عورتوں کے تعلیم و تربیت میں بہت کچھ مدد دے سکیں گی اُسنے کہا کہ جب پہلے ترک عورتیں زیادہ آزاد خیال اور تعلیم یافتہ نہیں تھیں اُسوقت ہندوستان جانے میں شاید تعرض کرتی رہی ہوں لیکن اب وہ غالبا وہاں کا جانا ناپسند نہ کرینگی۔ یہ ایک نمونہ وہانکی تعلیم یافتہ عورتوں کے عمدہ خیالات کا ہے جو یہانکی عورتوں کیلئے سبق آموز ہے

جہاز بحر میڈیٹرینین۔ بحر ایڈریاٹک اور بحر ایجین سے گذرتا ہوا چھٹے روز

۱۸ ستمبر کو شام کے وقت چناق پہونچا۔ لیکن ترک حکاموں نے جہاز کو آگے جانے
روک دیا۔ اگرچہ جہاز کے کپتان نے بہت شور و غل کیا لیکن حکاموں نے یہ
کہا چونکہ جہاز کی روانگی کا تار نہیں آیا تھا اسلئے ہم آگے جانے کی اجازت
نہیں دیسکتے۔ بہت سے مسافر اپنی جگہ پر سخت اعتراض کر رہے تھے کہ ترک
نہایت ہی سخت اور غیر منصف ہیں لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ یہ جہاز کے کپتان ہی
کی غلطی تھی کہ قلعہ چناق پر پہونچنے کی اطلاع جیسا کہ اسکو قاعدہ کی رو سے
دینی چاہیے تھی نہیں دی تھی۔ آخرکار شب کو تمام مسافر جہاز ہی پر رہے۔
دوسرے روز جہاز علے الصباح چناق سے روانہ ہوا اور گیلی پولی جزیرہ سے
گزر کر شام کو ۹ بجے قسطنطنیہ پہونچا۔ چونکہ رات ہوگئی تھی اسلئے تمام مسافر شب کو
جہاز ہی پر رہے۔ رات کے وقت قسطنطنیہ جہاز پر سے ایسا خوشنما معلوم ہوتا تھا کہ
کاش تمام عمر راتیں وہیں گزرتیں۔ صبح کے وقت ڈاکٹر اور افسر پولیس جہاز پر
آئے سب سے پہلے اول درجہ کے (Saloon) میں مجھکو بلایا قبل اسکے
کہ میں انکے پاس جاؤں میں نے قفقازی ٹوپی جو ایران میں چندارمہ پولیس کے
افسر دیتے ہیں دے لی تھی اور ڈومنین سفیر نے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے
اس قسم کی سیاہ استرخانی ٹوپی جیسی مصطفےٰ کمال پاشا استعمال کرتے ہیں پہن لی تھی

افسر پولیس نے میرا پاسپورٹ دیکھکر بہت سے سوالات مجھ سے ترکی میں کئے اور مین نے ٹوٹی پھوٹی ترکی مین جواب دیا۔ مین نے دیکھا کہ یہ افسر ہر شخص سے خواہ انگریز ہو یا فرنچ ترکی ہی مین سوالات کرتا تھا۔ اگرچہ وہ خود فرنچ خوب جانتا تھا اور غالبًا انگریزی و جرمنی سے بھی واقف تھا۔ جہاز ہی پر حمال آگیا اور میرا اسباب اُتارکر گمرک خانہ لے گیا۔ جیسا فرانس جاتے وقت کیلئے (Calais) مین حمالوں کا شور و غل سُنا تھا وہی منظر یہاں بھی سامنے تھا۔ گمرک کے افسر نے میرے تمام اسباب کا معائنہ کیا لیکن مجھے کچھ دینا نہیں پڑا۔ اگر کسی کے پاس دو۔ تین درجن سگریٹ یا تھوڑا سا عطر ہو تو ہلا مبول ایران شام و عراق مین انپر کچھ محصول نہین لیا جاتا کیونکہ ذاتی استعمال کی چیزین گمرک کے محصول سے مستثنیٰ ہین جب میرا اسباب گمرک خانہ مین معائنہ کیلئے پہونچا تو حمال نے کہا کہ تھوڑا سا انعام افسر کو دیدو تاکہ اسباب زیادہ دیر تک نہ دیکھا جائے لیکن میں نے انکار کردیا افسر گمرک نے میرے اسباب کو دیکھا لیکن نہ کسی قسم کا تعرض کیا اور نہ مجھسے انعام کی خواہش ظاہر کی۔ گمرک خانہ سے باہر آکر ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ہوکر مسرت ہوٹل گیا۔ چونکہ وہان کوئی کمرہ خالی نہیں تھا اس لئے پیرہ کے امپیریل ہوٹل (Imperial Hotel) مین گیا۔ اس کا مالک ایک مصری یا شامی مسلمان تھا

وہان ایک کمرہ ڈیڑھ لیرہ ترکی یومیہ پر بغیر خوراک کے لے لیا ممکن تھا کہ ایک لیرہ
فی یوم پر ملجاتا اگر مین زیادہ قیام کرتا یا ہوٹل کے مینجر سے کرایہ کے کم کرنے کیلئے
بہت زیادہ اصرار کرتا ۔ حمال بھی میرے ساتھ ہوٹل تک آیا اور میرا اسباب گاڑی سے
اُتار کر ہوٹل مین رکھا ۔ جب اُس سے کرایہ گاڑی اور اسکی اُجرت کے بابت دریافت
کیا تو اُسنے پچیس لیرہ ترکی یعنی تین پونڈ سے زیادہ بتایا ۔ مین نے کہا کہ یہ بہت
زیادہ ہے مین اسقدر نہین دونگا ۔ ہوٹل کے کلرک کو بلایا اور اُس سے دریافت
کیا کہ کسقدر دینا مناسب ہے ۔ اُسمین اور حمال مین بہت مباحثہ ہوا ۔ بالآخر
حمال اور گاڑی والے کو مین نے دس لیرے دئیے جسمین سے ۴ لیرہ غالباً گاڑی والے
نے اور چھہ لیرہ حمال نے لئے ہونگے ۔ حمال نے ضرور مجھہ سے زیادہ لیا ۔ لیکن
مین نے یہ غلطی کی تھی کہ اسباب حمال کو دینے سے پہلے اُس سے اُجرت طے
نہ کرلی ۔ اسمین شک نہین کہ حمال نے بہت زیادہ خدمت کی تھی کیونکہ اسباب کو
جہاز سے اُتارنے گمرک خانہ تک لیجانے اور ہوٹل تک ساتھ آکر اسباب کے
اُتارنے مین بہت کام کیا تھا لیکن جب بھی اُجرت زیادہ لی ۔ واضح رہے کہ
اندنون ایک انگریزی پونڈ کی قیمت آٹھ لیرہ ترکی تھی ۔ اسلئے دس لیرے جو
مین نے حمال کو دیے وہ ۲۵ شلنگ کے برابر ہوے جو تقریباً اُنیس روپیہ کے

برابر ہوتے ہین۔ ہوٹل کا کرایہ بحساب ڈیڑھ لیرہ یومیہ قریب چار شلنگ یعنی
تین روپیہ کے ہوا جو یورپ اور ہندوستان کے ہوٹلون سے عموماً سستا تھا۔
لوقانده یعنی ریسٹارنٹ یہان کثرت سے ہین اسلیٔے جہان دل چاہتا تھا وہان
جاکر کھانا کھالیتا تھا۔ اسلامبول مین لوقاندے بہت کثرت سے ہین اور بہایت ہی
صاف ستھرے یوروپین طور پر رکھے جاتے ہین۔ کھانے مختلف قسم کے ہر وقت
اُنمین تیار رہتے ہین اور چار پانچ قسم کے عمده کھانون مین میرا تقریباً ایک لیرہ
یعنی ۲½ شلنگ صرف ہوتا تھا۔ اندنون عبد اللہ آفندی کا لوقانده نہایت
مشہور ہے۔ مین کئی مرتبہ وہان گیا اور بہت سے یوروپین کو بھی وہان جاتے ہوئے
دیکھا۔ اِس شہر مین مٹھائی کی دکانین بکثرت ہین اور دودھ اور بالائی کے ساتھ
مختلف اقسام کی مٹھائیان بنتی ہین پیرس کے بعد شاید ہی کوئی دوسرا شہر علاوہ
اسلامبول کے ہوگا جہان اِس کثرت سے میٹھی چیزین بنائی جاتی ہوں۔ یہان
دہی کا استعمال مثل ایران کے بکثرت ہے اور ہر لوقانده مین کھانے کے بعد
دہی اور کھانے کے ساتھ مٹھا پینے کے لئے ملتا ہے۔ مٹھا پینے کا رواج اسلامبول
اور ایران مین بکثرت ہے۔ مین جبتک اسلامبول اور ایران مین رہا ہمیشہ
کھانون کے بعد مٹھا پیا کرتا تھا۔ اندنون میوے اور انگور بکثرت ملتے ہین اور

بہت ہی سستے ہین۔ یہان کی مچھلی بہت ہی بڑی اور نہایت ہی لذیذ ہوتی ہے
اور ہر لوقانڈہ مین کھانے کے لیے ملسکتی ہے۔ البتہ یہان کے لوقانڈہ مین پلاؤ یا چلاؤ
ایسا اچھا نہین ہوتا جیسا ایران مین ہوتا ہے۔ ہمین شک نہین کہ پلاؤ یا چلاؤ کا پکانا
فقط ایرانیون ہی کا حصہ ہے۔ دوسرے روز کارو انسرای والدہ خانی اس غرض
سے گیا کہ سید آغا طباطبائی تاجر سے جو میرے قدیم دوست تھے اور جن سے مجھے
ایران کے ایک شہر شاہرود (Shahroad) مین جنگ کے زمانہ مین ملاقات
ہوئی تھی جا کر ملون۔ وہان وہ نہین ملے اسلیئے خان ترکیہ گیا وہان معلوم ہوا
کہ اُنکا دفتر سلامت خانی مین ہے چنانچہ وہان جا کر اُنسے ملا۔ اُن کو جب مین نے
پہلے ایران مین دیکھا تھا تو وہ عبا پہنتے تھے اور ڈاڑھی رکھے ہوے تھے لیکن
یہان ڈاڑھی منڈی ہوئی اور یورپین لباس مین تھے۔ وہ عرصہ سے اِسلامبول مین
مقیم ہین اسلیئے اُنکے ذریعہ سے سیر و سیاحت اور دریافت حالات مین بہت مدد ملی
وہ اِسلامبول سے کچھ دور باہر رہتے تھے اور مجھے اپنے مکان پر لیگئے۔ صبح کو
اسٹیمر پر سوار ہو کر دوسرے جانب شہر کے جو ایشیائے ساحل ہے مقام حیدر پاشا
گیا اور وہان سے ریل مین سوار ہو کر گیوزپتہ جو ایک چھوٹا سا گاؤن ہے وہان
جا کر اُترا۔ جب اُن کے مکان پر گیا تو اُنھون نے اپنی بیوی اور لڑکی سے ملاقات کرائی

جب وہ آٹھ نو برس کی تھی اُسوقت اُسنے مجھے شاہرود مین دیکھا تھا۔ اُسکا نام
ماہ سلطان ہے اب اُسکی عمر ۱۵ یا ۱۶ برس کی ہوگی۔ جب مین نے اُس سے فارسی میں
دریافت کیا کہ تمنے مجھے پہچانا یا نہین تو اُس نے تھوڑی دیر غور کرکے فارسی مین
کہا کہ آقا آپ وہی تو نہین ہین جو میرے مکان پر شاہرود مین آیا کرتے تھے۔ اُسکی
اس ذہانت اور حافظہ پر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ اُسوقت ایک سن سیدہ ترک سے
فرنچ کا سبق پڑھ رہی تھی تھوڑی سی فرنچ مین بھی مین نے اُس سے گفتگو کی۔
پھر طباطبائی کے ساتھ اُنکے ہمزلف سے جو ایک ترک تبریزی تھے ملنے گیا۔
اُنھون نے اپنے دو لڑکون سے ملاقات کرائی۔ اُنکی عمر ۹ یا ۱۰ سال کی ہوگی۔
اُن لڑکون نے مجھ سے انگریزی مین گفتگو کی۔ جب مین نے پوچھا کہ اُنکی انگریزی
تعلیم کہاں اور کیونکر ہوئی تو اُن کے والد نے کہا کہ اُن کے جوار مین
پہلے ایک مدرسہ فرانسیسی پادریون کا تھا جسمین ترکی زبان کے ساتھ فرنچ
زبان کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور اُس مدرسہ مین نشان صلیب بھی لگا ہوا تھا۔ ترکی کی
جدید حکومت نے صلیب کے رکھنے پر اعتراض کیا اور کہا کہ چونکہ ہر مدرسہ مین ہر
مذہب کے بچے تعلیم پاتے ہین اسلیے جیسا کہ گورنمنٹ کے مدرسون میں کوئی خاص
علامت مذہبی نہین رکھی گئی ہے اس مدرسہ مین بھی نہین ہونی چاہیے۔

فرانسیسی پادریوں نے جب صلیب کا اٹھا لینا منظور نہین کیا تو انکو مجبوراً مدرسہ بند
کردینا پڑا۔ امریکن پادریوں نے یہ اچھا موقع پاکر اپنا مدرسہ کھولدیا اور کہا کہ ہم کوئی
نشان صلیب کا اسمین نہین لگائینگے۔ چنانچہ وہ مدرسہ اب خوب چل رہا ہے اور بہت سے
ترک کے لڑکے وہان انگریزی پڑھتے ہین۔ یہ دونون لڑکے بھی اسی اسکول مین تعلیم
پاتے ہین اور دن رات وہین رہتے ہین۔ ایرانیون اور ترکون مین یہ خاص بات
مین نے دیکھی کہ وہ اپنے بچون کے دن رات بورڈنگ ہاؤس مین رہنے کو مکان کے
رہنے پر ترجیح دیتے ہین۔ وہان سے پھر مین ایک نہایت ذی علم شخص مرزا حسین خان
دانش سے ملنے گیا وہ اصلاً ایرانی ہین لیکن انکی تعلیم و تربیت اسلامبول مین ہوئی ہے
وہ انگریزی۔ فرنچ۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی نہایت اچھی طرح سے جانتے ہیں اور بہت ہی بردست
اہل قلم ہین۔ ڈاکٹر توفیق رضا بیگ مشہور ترک مصنف کی شرکت مین بہت کچھ
تصانیف بھی کرچکے ہین۔ نہایت ہی روشن ضمیر اور آزاد خیال ہین اور اُنسے ا
ترکون کے معاشرت و سیاست کے متعلق بہت ہی صحیح اطلاعات حاصل ہوے
ترکون مین وہ نہایت ہی مشہور ادیب فاضل لکھنے والے خیال کئے جاتے ہین
انھون نے رباعیات عمر خیام کی شرح ترکی زبان میں لکھی ہے اور پہلے اسلامبول
کے دارالفنون مین پروفیسر بھی رہ چکے ہین اور بالفعل محکمہ دیون عمومیہ" یعنی

ہین (Public Debt Office) مین ایک معزز عہدہ پر ممتاز
ہین اثناے گفتگو مین اُنسے معلوم ہوا کہ میرے مشفق قدیم سید سجاد حیدر صاحب بھی
اندون مسترت ہوٹل مین ٹھہرے ہوے ہین۔ چنانچہ مین اُنکے ساتھ ہوٹل گیا اور
سجاد حیدر صاحب سے ملا لیکن اس امر کا نہایت ہی افسوس ہوا کہ دوہی روز کے بعد سجاد حیدر صاحب
سیر کو دیکھتے ہوے ہندوستان واپس چلے گئے۔ ایک روز اتفاق سے پیرہ مین
ڈنمارک کے ایک سفیر سے ملاقات ہوئی۔ اُسنے مجھ سے پوچھا کہ تم شیخ عبدالوہاب
آفندی سے ملے مین نے کہا نہین۔ وہ مجھکو اپنے سفارت خانہ مین لیگیا اور اپنے
سکریٹری کو میرے ہمراہ کرکے عبدالوہاب کی خدمت مین بھیجا۔ وہ عربی لباس
پہنے ہوے تھے اور کہا کہ مین مدینہ کے سادات مین سے ہون اور تیرہ چودہ برس
ہوے کہ مدینہ سے چلا آیا ہون۔ اُنھون نے مجھ سے اُردو مین گفتگو کرنی شروع کی۔
اُنکا سن قریب چالیس برس کے ہوگا لیکن انگریزی فرنچ۔ جرمنی روسی اطالیائی
یونانی عربی فارسی۔ ترکی اور اردو بولتے اور لکھتے ہین۔ اُنکی ذہانت اور زباندانی
پر نہایت ہی حیرت ہوئی۔ اُنھون نے کہا کہ اسلامبول ہی مین رہکر بعضے ہندوستانیون
سے اُردو سیکھ لی ہے۔ وہ بمقابل علم تصوف (Theosophy) کے
(Biosophy) کو ترجیح دیتے ہین اور انسان کی تہذیب اخلاق اور

تزکیہ روح کیلئے اُسکو زیادہ مفید و مُوثر سمجھتے ہین میرے خیال مین Steinner
کے طریقہ تصوف کی جانب بھی انکا میلان ہے۔ وہ کھانا نہایت ہی سادہ کھاتے
ہین۔ گوشت اور انڈا مطلق نہین کھاتے اور نہ کسی مشروبات یا دخانیات کا
استعمال کرتے ہین۔ اُنکے پاس عمُوماً روسی۔ جرمنی اور یونانی وغیرہ بہت آتے ہین
اور تمام یورپین جنکو علم الارواح مین کچھ دلچسپی ہے اُنسے ضرور ملتے ہین۔ وہ دوبار
پیرس اور ایک مرتبہ ماسکو Moscow بھی جا چکے ہین اور پیرس مین علم الارواح
پر ایک بہت ہی مفصل اور دلچسپ لکچر دیا تھا۔ اُنکا ارادہ ہندوستان مین آنے کا
ہے اور علوم روحانی اور طریقہ ریاضت جو ہندو تقیرن اور صوفیون مین رائج ہے
اُسکو سیکھنا چاہتے ہین اُنھون نے دو تین مرتبہ دعوت کی اور اُردو زبان مین برابر
گفتگو کی۔ جو حضرات ہندوستان سے اسلامبول جائین اُنکو چاہیے کہ مرزا حسین خان
دانش اور شیخ عبدالوھاب آفندی سے جو پروفیسر شیخ عبدالوھاب کے نام سے
مشہور ہین ضرور ملاقات کرین۔ چند دیگر تجار ایرانی۔ سفیر ایران اور بعض تعلیم یافتہ
ترکون سے ملاقات ہوئی۔ ایک ترک مجھکو ایک کلب لے گیا جو پیرہ مین واقع تھا۔
وہان ایک جوان ترک سے ملاقات ہوئی جو فرنچ خوب جانتا تھا اور ترکی راگون کو
یوروپین علم موسیقی کے رسم خط مین لکھکر پیانو پر بجاتا تھا۔ اُسنے مجھسے کہا کہ اگر علیگڈھ کالج

میں کسی پروفیسر علم موسیقی کی ضرورت ہو تو میں جانے کے لئے حاضر ہوں۔ میں نے
اپنے دل میں کہا کہ یہ بیچارہ علیگڈھ کالج کے متعلق کیسے دھوکے میں پڑا ہوا ہے، کیا
علیگڈھ کالج کو اُسنے اسلامبول یا طہران کا دارالفنون سمجھا ہے جہاں اور علوم کے ساتھ
علم موسیقی کی بھی تعلیم مسلمانون کو دی جاتی ہے۔ اُسنے مجھسے یہ بھی کہا کہ عنقریب اس
کلب میں ایک کنسرٹ (.Concert) ہونے والا ہے جسمیں تمام معزز ترک
مرد اور عورت شریک ہونگے اور اُسکے بعد بال (.Ball) بھی دیا جائیگا۔
اُسنے کہا کہ ٹکٹ کی فروخت سے جو آمدنی ہوگی وہ شہدائے جنگ کے یتیم خانہ کو دیدی جائیگی۔
میں نے کہا کہ کنسرٹ کے زمانہ تک میں اسلامبول میں نہیں ہونگا لیکن ایک ٹکٹ میں نے
۵ لیرہ ترکی پر خرید لیا۔ ایک مرتبہ سجاد حیدر صاحب کے ساتھ اور دوبارہ ایک ترک پروفیسر
کی معیت میں دارالفنون دیکھنے گیا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ترک تعلیم جدید کے ترقی کیجانب
بیحد مائل ہیں اور تمام علوم ترکی زبان میں تعلیم ہونے لگے ہین اور ترکی اب گویا ایک
مکمل علمی زبان ہوگئی ہے۔ مکاتب و نصاب تعلیم وغیرہ کے متعلق میں بالتفصیل نہیں
لکھنا چاہتا۔ جو صاحب آئندہ سفر کریں وہ خود ان امور کی تحقیق کرلیں۔ بعض اخباروں کے
نامہ نگاروں اور مدیروں سے بھی ملاقات ہوئی لیکن اُنسے گفتگو کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ
وہ لوگ سر دست اپنی آزادانہ رائے کا اظہار نہیں کرسکتے۔ سیاسی امور کے متعلق جو اخبار نویسوں

اور بعض جوان ترکوں سے گفتگو ہوئی۔ انکے اظہار کرنے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ البتہ اسقدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے ترک ہندوستان کے مسلمانوں سے بہت ہی مخالف معلوم ہوتے تھے کہ انھوں نے مسئلہ خلافت میں اسقدر کیوں کوشش کی کہ خلافت سلاطین آل عثمان کے خاندان سلاطین عثمانی میں قائم رہے۔ بہرحال میں اس مسئلہ میں اظہار رائے نہیں کرسکتا کہ اس اعتراض میں کہانتک ترک حق بجانب ہیں۔

میرے زمانہ قیام میں اتفاقاً وہ دن بھی آگیا جسدن اس سے ایک سال قبل قسطنطنیہ کو دُوَل اتحادین کی فوجوں نے تخلیہ کرکے مصطفےٰ کمال پاشا کی فوج کے حوالہ کردیا تھا۔ اُسدن تمام شہر میں جوش پھیلا ہوا تھا اور کل دُکانیں اور مکانات اور سرکاری عمارتیں اور سفارتخانے اور تمام جہاز خواہ عثمانی خواہ غیر عثمانی ترکی جھنڈوں اور پھریروں سے آراستہ تھے۔ میں نے تمام عمر میں کبھی کسی مقام پر خواہ یورپ ہو خواہ ایشیا میں اس کثرت سے بیرق اور جھنڈے کسی خوشی کے موقع پر نہیں دیکھے تھے منجملہ اور مقاموں کے پیرہ میں ایک جگہ طاق نصرت بنایا گیا تھا جہاں سے صبح کے وقت تمام مختلف فوجیں بری و بحری مع توپ خانے اور باجے وغیرہ کے گزریں۔ یہ جلوس گھنٹوں رہا اور میں صبح کا گیا ہوا دوپہر کو ہوٹل واپس آیا۔ لوگوں میں اسقدر جوش پھیلا ہوا تھا کہ بعض اسدن کا اندیشہ ہوتا تھا لیکن پولیس کا ایسا اچھا انتظام تھا کہ کسی قسم

کی بدنظمی یا فساد نہیں ہونے پایا۔

اسلامبول میں مساجد۔ مدرسے۔ تکیے دوسری عمارات عالیہ بکثرت ہیں لیکن جدید عمارتوں میں بڑے ڈاک خانہ و دیون عمومیہ کی عمارت نہایت ہی خوبصورت و عالیشان ہے۔ ایرانی سفارتخانہ کی بھی عمارت بہت ہی خوبصورت اور باب عالی کے قریب واقع ہے واضح رہے کہ روم میں تکیہ خانقاہ کو کہتے ہیں اور اسلامبول میں ہر قوم کا تکیہ علحدہ بنا ہوا ہے جہاں اُس قوم کے فقرا اور غریب مسافر آکر قیام کرتے ہیں لیکن ایران میں تکیہ امام باڑہ کو کہتے ہیں البتہ جدید فارسی میں امام باڑہ کو حسینیہ کہتے ہیں اور تکیہ کی لفظ کا استعمال بڑے شہروں میں متروک ہو گیا ہے۔

اسلامبول میں قہوہ خانے کثرت سے ہیں اور بعضے ایسے خوبصورت و عالیشان ہیں کہ پیرس کے قہوہ خانوں کا مقابلہ کرتے ہیں بعض قہوہ خانوں میں آدھی رات تک عربی و ترکی ساز بجا کرتے ہیں اور شامی مرد و عورت جو عموماً یہودی یا نصرانی ہوتے ہیں عربی و ترکی گیت گاتے رہتے ہیں۔

ترکوں کو قومی امور کی جانب نہایت ہی انہماک ہے چنانچہ جمعہ کے دن کوئی شخص کسی مذہب یا کسی سلطنت کی رعیت ہو اپنی دکان یا دفتر نہیں کھول سکتا یہاں جمعہ کا دن ویسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسا لندن میں اتوار کا دن۔ یہ دیکھکر مجھ کو ہمارے جمعہ کی

خوشی ہوئی۔ اپنے زمانہ وزارت میں سید ضیاء الدین صاحب نے ایسا ہی حکم طہران میں جاری کیا تھا لیکن اب رضا خاں کے زمانہ میں اُسپر عمل نہیں کیا جاتا۔

اسلامبول کی عمارات و مساجد و آداب معاشرت کے متعلق میں زیادہ تفصیل سے لکھنا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ بعض حضرات اُن مطالب کو اپنے سفرناموں میں مفصل لکھ چکے ہیں البتہ جن لوگوں کی یہ خواہش ہو کہ اسلامبول میں ترکوں سے معاشرت کریں اور اُنکی تمدنی حالت سے واقفیت حاصل کریں اُنکو چاہیئے کہ ترکی یا کم سے کم فرنچ زبان بقدر ضرورت سیکھ کر اسلامبول جائیں۔ اگرچہ اب انگریزی بھی اسقدر جاری ہو گئی ہے کہ بہت سے ترک اُسکو جانتے ہیں لیکن فرنچ سے عام طور پر تعلیم یافتہ ترک واقف ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص فارسی بقدر ضرورت کے جانتا ہو تو تعلیم یافتہ ترک سے گفتگو کرنے سے ضرور مدد مل سکتی ہے کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح ترک بھی فارسی ابتدا میں پڑھتے ہیں۔

ہر شخص غالباً اسکو جانتا ہے کہ اسلامبول کے ترک پہلے ہی سے دوسرے ملک کے مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھے لیکن اس جنگ عمومی کے بعد سے بہت ہی سرعت کے ساتھ مراحل تمدن و تہذیب کو طے کر رہے ہیں۔ اس امر کا ثبوت وہاں کے عورتوں کی تعلیمی و تمدنی حالت کو دیکھکر ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام متمدن قوم کا

عقیدہ بلکہ میرے نزدیک بدیہی امر ہے کہ ہر قوم کی ترقی زیادہ تر عورتوں ہی کی
تعلیم و تہذیب پر موقوف ہے ہندوستان کے تمام مسلمان تمام دنیا کے مسلمانوں
سے اسی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہیں کہ ان کی عورتیں تمام دنیا کی مسلمان عورتوں
سے تعلیم، تمدن اور آداب معاشرت وغیرہ میں بہت ہی پیچھے ہیں۔ اسلامبول
اور دوسرے اسلامی ملکوں میں عورتوں کی تعلیم عام طور پر جاری ہے اور مکان کی
چار دیواری میں محبوسانہ زندگی نہیں بسر کرتیں کہ اُن کی اور اُنکے بچوں کی صحت
خراب ہو جائے۔ ہر طبقے کی عورتیں عام طور پر باہر جاتی ہیں اور خرید و فروخت خود
کرتی ہیں بلکہ بعض بڑی دوکانوں میں مثل یورپین عورتوں کے ملازمت کرتی
ہیں۔ ترکوں نے عورتوں کے حقوق کا اسقدر خیال رکھا ہے کہ کوئی شخص بغیر
کسی عذر شرعی کے ایک سے زیادہ عورت حبالۂ نکاح میں نہیں لاسکتا اور یہ بھی
قانون وضع کر دیا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان جو کسی دوسری سلطنت کی رعیت ہو
کسی ترکن سے عقد کرے اور عثمانی ملک میں قیام کرنا چاہے تو اُسپر لازم ہوگا کہ
وہ عثمانی سلطنت کی رعیت ہو جائے ورنہ وہ ترکی سلطنت سے مع اپنی ترکن
بیوی کے نکالدیا جائیگا۔ چنانچہ دو تین ایرانی جنھوں نے ترکنوں سے عقد
کیا تھا اِس قاعدہ کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے یعنی عثمانی سلطنت کی تبعیت

قبول نہ کرنے کی وجہ سے اسلامبول سے مع اپنی بیویوں کے نکالدئے گئے۔
واضح رہے کہ یہ امر اسوجہ سے نہیں کیا گیا کہ ایرانی شیعہ تھے کیونکہ ترکوں کے نزدیک
شیعہ وسنی میں باہمی نکاح کو ناجائز سمجھا جاتا ہے جیساکہ ایران میں بھی انکا رواج
ہے۔ میں نے کئی سنی المذہب ہندوستانی وعرب کو دیکھا کہ ایران میں شیعہ عورتوں
کے ساتھ نکاح کیا۔ میں ہندوستان میں دو تین سنی مسلمانوں کو جانتا ہوں کہ جو ایران
میں شیعہ عورتوں کے ساتھ نکاح کر کے اپنے ہمراہ اُن کو ہندوستان لائے ہیں غالباً
خان بہادر مولابخش صاحب نے جو گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن افیس میں ملازم
تھے مشہد مقدس میں ایک اچھے خاندان کی شیعہ عورت سے نکاح کیا تھا۔ اسیطرح
بہت سے ایرانی مردوں نے ترکی اور مصری عورتوں سے نکاح کر لیا ہے۔

بہتر ہوگا کہ جو شخص اسلامبول جانا چاہے اُسکو چاہئے کہ امریکن اکسپرس کمپنی سے
جسکی ایک شاخ بمبئی میں اور ایک اسلامبول میں ہے ضروری امور کے متعلق خط وکتابت
کرے اسلامبول جانے کے لئے بہت ہی کم اسباب اپنے ہمراہ لیجاوے کیونکہ تمام
ضروری چیزیں وہاں ملجاتی ہیں۔ میرے خیال میں اسلامبول کا روزانہ خرچ قریب
۱۲ شلنگ کے ہوگا اسطرح پر کہ کسی اسلامی یا یوروپین ہوٹل میں ایک کمرہ لے لے اور
کھانا جس ریسٹارنٹ میں چاہے کھالیا کرے۔ البتہ اگر زیادہ قیام کرنا چاہے تو

تذرہ کوئی ۔گیوز پتہ ۔ ارن پتہ یا بیوک درہ وغیرہ میں جاکر کسی بورڈنگ ہاؤس
یا کسی ترک کے مکان میں ایک کمرہ لیکر قیام کرے ایسی صورت میں مصارف بھی
کم ہونگے اور ترکوں سے معاشرت کرنے کا بھی زیادہ موقع ملے گا۔

فصلِ دوم روانگی از اسلامبول بہ بیروت

اسلامبول سے روانہ ہونے سے دو تین روز پہلے ترکی پولیس سے اجازت نامہ
روانگی کا حاصل کیا کیونکہ کوئی شخص اسلامبول سے بغیر پولیس سے اجازت نامہ تحریری
لئے ہوئے کسی دوسرے شہر کو نہیں جا سکتا ۔لائڈ ٹریسٹینو کمپنی سے ۱۱۲ لیرہ یعنی تقریباً ۱۸ پونڈ کے
اول درجہ کا ٹکٹ بیروت تک کے لئے خرید کیا اور جمعہ کے روز اسلامبول سے روانہ ہوا۔
جہاز کے روانہ ہونے سے پہلے پولیس کا افسر جہاز پر آیا اور پاسپورٹ اور اجازت نامہ روانگی
کا ملاحظہ کیا۔ جہاز نے ساڑھے گیارہ بجے دن کو لنگر اٹھایا۔ جہاز پر ایک ترک
کامل آفندی سے ملاقات ہوئی جو مع اپنے بیٹے امین آفندی اور ایک چرکس
ملازم کے بغداد جا رہے تھے ۔ ان لوگوں سے مراسم بڑھ گئے اور ہمیشہ ہندوستان
اور یورپ کے سیاسی و تمدنی مسائل پر گفتگو ہوا کی۔ امین آفندی نہایت ہی خوبصورت
تعلیم یافتہ اور خلیق شخص تھے اور انکا سن تقریباً پچیس برس کا ہوگا ۔ ابھی تک

شادی نہیں ہوئی تھی۔ فرینچ خوب جانتے تھے مسکرات و دخانیات سے قطعی پرہیز کرتے تھے علم تاریخ کو خوب جانتے تھے اور جنگ میں بھی خدمت کر چکے تھے خلافت عثمانی کے سخت مخالف تھے اور اُنکا اعتقاد تھا کہ سلاطین دنیاوی خلافت کے مستحق نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ وہ احکام شریعت کے پابند نہوں۔ اُنکا یہ بھی خیال تھا کہ نقطہ نظر سیاست سے خلیفہ کا اسلامبول میں رہنا غیر مناسب ہے۔

دوسرے دن شنبہ کو جہاز (Smyrna) ازمیر پہونچا۔ میں ترک رفیقوں کے ہمراہ ایک کشتی میں سوار ہو کر شہر دیکھنے کے لئے کنارہ پر گیا۔ اس شہر کو یونانیوں نے زمانہ جنگ میں قبل تخلیہ کرنے کے جلا دیا تھا اسلئے وہ بہت ہی ابتر حالت میں تھا۔ یہ تجارت کا بہت ہی بڑا بندرگاہ ہے انجیر کی پیداوار اسکے اطراف میں کثرت ہوتی رہی ہے اور دوسرے ملکوں کو لاکھوں من انجیر یہاں سے جاتی ہے زمانہ جنگ میں بہت سے یوروپین تجار یہاں سے چلے گئے تھے لیکن اب دوبارہ کچھ واپس آرہے ہیں۔ اس جہاز پر ایک انگریز اور اسکی بیوی سے ملاقات ہوئی لیکن اُن لوگوں کے لہجہ سے معلوم ہوتا تھا کہ انگریز نہیں تھے اور غالبا اپنی اصلی قومیت کو چھپانے کے لئے انگریزی میں گفتگو کرتے تھے بسبب یوم ولادت حضرت پیغمبر صلعم ہونے کے تمام جہازوں اور عمارات پر پھریرے اور جھنڈے نصب

کئے گئے تھے۔ تمام شب جہاز یہاں ٹھہرا رہا۔ دوسرے روز صبح کو جہاز یہاں سے روانہ ہوا
اور تمام دن رات چلکر دوشنبہ کے دن سات بجے صبحکو مقام روڈس (Rhodes)
پہونچا۔ یہ بندرگاہ ایطالی والوں کے قبضہ میں ہے۔ جنگ بلقان کے بعد ان لوگوں نے
بدون کسی جنگ کے اِس شہر پر قبضہ کر لیا تھا اور چونکہ اسوقت کوئی ترکی فوج وہاں
موجود نہ تھی اِسلئے اُن لوگوں نے موقع پاکر شہر پر تصرف کر لیا یہاں پر یونانی اور
ایطالیائی بکثرت آباد ہیں مسلمان رعایا ایطالیائی حکام سے خوش نہیں معلوم ہوتے
یہاں کے لیمو اور نارنگی بہت مشہور ہیں اور کثرت سے پیدا ہوتے ہیں شہر نہایت ہی
صاف اور رو بہ ترقی ہے۔ یہاں سے دو بجے شب کو جہاز روانہ ہوا۔ اور دوسرے روز
صبح کو انطالیہ پہونچا۔ یہ مقام ترکوں کے قبضہ میں ہے۔ چونکہ یہاں جہاز تھوڑی ہی
دیر ٹھہرا تھا اسلئے کنارہ پر نہ جا سکا۔ جہاز دوپہر کو روانہ ہو گیا اور تمام شب چلکر
دوسرے روز صبح کے وقت جزائر سائپرس (Cypress.) کے بندرگاہ
لیموسل پر پہونچا۔ اُسکو دیکھنے کے لئے کنارہ پر گیا لیکن یہاں وہ رونق نہیں
پائی جو دوسرے بندرگاہوں میں تھی۔ بہت سے یونانیوں کو انگریزی ٹوپی پہنے ہوئے
اور پابرہنہ مزدوری کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ لوگ نہایت ہی ذلیل حالت میں تھے
اور بہت ہی کثیف اور پھٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ یہ شہر انگریزوں کے قبضہ میں ہے

اس شہر میں تقریباً ساٹھ ہزار ترک اور تین لاکھ یونانی آباد ہیں تعلیم کی بہت ہی کمی ہے بعض بندوں نے اس امر کی سخت شکایت کی۔ ایک ترک یہیں کا رہنے والا ... اہم سفر تھا اور انگریزی بول لیتا تھا۔ اسنے کہا کہ انگریزی حکومت ہمارے ملک کے لوگوں کو اعلیٰ قسم کی تعلیم دینا پسند نہیں کرتی۔ میں نے کہا کہ اگر فی الواقع ایسا ہے تو بہت ہی اچھا ہے کیونکہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا نتیجہ نہ گورنمنٹ اور نہ ہندوستانیوں کے لئے مفید ثابت ہوا تمام ہندوستانی تعلیم یافتہ عموماً اپنے پرانے مراسم بیہودہ میں باوجود تعلیم جدید کے مبتلا ہیں اور انکی تمدنی حالت میں بہت ہی کم ترقی ہوئی ہے انکی تعلیم ایسی ہے کہ بجز سرکاری ملازمت کرنے کے اور کسی قابل وہ نہیں ہوتے اسلئے اُنکے وجود سے ملک کی ثروت میں ایک کوڑی کا بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ انکی ذہنی تعلیم کا یہ نتیجہ ہے کہ تعصب مذہبی روز بروز روبہ ترقی ہے اور بہت سے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ مذہبی نزاع کے پیدا کرنے میں لیڈر بنجاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کا نتیجہ گورنمنٹ کے لئے اسوجہ سے مفید نہیں ثابت ہوا کہ جن لوگوں نے اعلیٰ تعلیم انگریزی کی حاصل کی ہے اُن کو عموماً ایسے عہدے نہیں ملتے جنکی وہ توقع کرتے ہیں اور جسکا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کی مخالفت کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں اگر اُنکو علوم تجارت و فنون صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی تو یہ نتیجہ نہ ہوتا۔ میری گفتگو سے اُس ترک کو پہلے کچھ تعجب ہوا لیکن

چونکہ زمانہ جنگ میں کچھ ہندوستانی فوج کو اُسنے سائپرس میں اکسی دوسرے مقام پر دیکھا تھا اسلئے اسنے بھی میرے خیال کی تصدیق کی کہ فی الواقع ہندوستان کے لوگ تمدنی حالت میں ابھی بہت ہی پیچھے ہیں۔ یہ عجیب بات دیکھی کہ جہاں جہاں کے لوگ زمانہ جنگ میں ہندوستان سے باہر گئے بجز اسکے کہ وہاں کے باشندوں کی نظر میں زیادہ حقیر و ذلیل ہوگئے اور کوئی نتیجہ نہیں ہوا۔ اسلامبول بیروت شام عراق و ایران میں ہندوستانی اسابق سے زیادہ مبتذل ہوگئے ہیں عراق و حجاز میں ہندوستان کے حضرات "ہندی بطال" و "ہندی بابا چورتی" کے القاب سے پکارے جاتے ہیں اور بعض ایرانیوں نے ازراہ تمسخر و استہزا ہندیوں کی شان میں یہ شعر نظم کیا ہے شعر "مامردم ہندیم دبود آں وطن ما ٭ ما کشتہ دالیم و چپاتی کفن ما"

طہران میں ایک موقع پر مجھکو بہت ہی شرم معلوم ہوئی جب ایک ایرانی نے جو محکمہ مال میں ایک اچھے عہدہ پر ممتاز تھا بہت سے تعلیم یافتہ ایرانیوں کے مجمع میں مجھ سے پوچھا کہ کیا ہندی لوگ ابھی سیگرٹ کا استعمال کرنا نہیں جانتے کہ بجاے اسکے کہ ہونٹوں سے لگاکر پیئں اُسکو مٹھی کے اندر رکھکر مثل حقے کے پیتے ہیں دوسرے صاحب نے کہا کہ میں نے اکثر ہندی سپاہیوں کو دیکھا ہے کہ وہ پائجامہ کا استعمال نہیں کرتے اور اکثر تمام جسم میں تیل لگاکر زمین پر آفتاب میں اکڑوں بیٹھے رہتے ہیں۔ ان اعتراضات کا میں نے کچھ جواب ضرور دیا لیکن فی الحقیقت وہ ایسا جواب نہیں تھا کہ وہ لوگ

قبول کر لیتے۔ اگر اچھے تعلیم یافتہ لوگ یہاں سے اِن ملکوں میں جاتے تو ممکن تھا
کہ ہندیوں کی جانب سے وہاں کے لوگوں کا خیال اچھا ہو جاتا کیونکہ میرا ذاتی تجربہ
ہے کہ وہ لوگ تعلیم یافتہ و روشن خیال ہندوستانیوں سے ملکر نہایت ہی خوش ہوتے
ہیں۔ وہاں کے لوگ ابتک نہیں جانتے کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدے یہاں
ملتے ہیں کیونکہ اُن لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستانی عموماً ابتک اس قابل نہیں ہوئے
ہیں کہ انکو انگریز اعلیٰ مرتبہ کی نوکریاں دیکیں جب میں نے ہندوستان کی ریفارم
اسکیم کا ذکر کیا تو اسلامبول و طہران میں بہت سے لوگ سنکر کہنے لگے کہ ابھی کم سے کم
تیس چالیس برس کی تعلیم کے بعد یہ حقوق اگر ہندوستانیوں کو دئے جاتے تو زیادہ مناسب
ہوتا۔ بہرحال اس سائیرس کے ترک سے بہت دیر تک مجھ سے تعلیم کے مسئلہ پر گفتگو
رہی اور اُسکے کلام میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی اولاد کو اسلامبول تعلیم دینے کیلئے
بھیجنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ جب آپکے ملک میں انگریزی حکومت ہونیکی وجہ سے
انگریزی زبان کا جاننا زیادہ مفید ہے تو آپ اپنے بچوں کو علیگڈھ کالج یا لندن کیوں
نہیں بھیجتے اُسنے کہا کہ نہ تو ہندستان کی آب و ہوا اچھی ہے اور نہ وہاں کا طرز معاشرت
مہذبانہ طریقے کا ہے اسلئے علیگڈھ میں نہیں بھیج سکتا۔ لندن بھیجنا بھی میرے
نزدیک زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ میرا ارادہ ہے کہ پہلے اُنکی ابتدائی تعلیم اسلامبول میں

اُسکے بعد انجنیری یا ڈاکٹری پڑھنے کے لیے جرمنی بھیجدونگا۔ اگر میرا مقصود گورنمنٹ
کی ملازمت دلانا ہوتا تو البتہ لندن انگریزی تعلیم کے لئے بھیجتا۔ میں شہر کی تھوڑی سی
گشت کرکے ڈاکخانہ گیا وہاں ایک ترک کلرک سے ملاقات ہوئی جو انگریزی بول سکتا
تھا اُسنے بھی کمی تعلیم کی شکایت کی اُس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں تین چار بیرسٹر
ہیں جنمیں سے دو یا تین مسلمان ہیں پھر میں کچہریوں کی طرف گیا اور وہاں معلوم ہوا کہ
عدالت دیوانی میں چیف جج انگریز اور ایک جج مسلمان اور دوسرا جج یونانی
ہوا کرتا ہے کچہریوں میں وکلوں کا اسقدر مجمع نہیں دکھائی دیا جیسا ہندوستان میں ہوا کرتا ہے
میں نے خاص طور پر اسلامبول اور طہران میں کچہریوں کو جاکر دیکھا تو وہاں ہندوستانی
کچہریوں کی سی بھیڑ کہیں نہیں دیکھی میرے خیال میں ہندوستان سے زیادہ کسی
ملک میں مقدمہ بازی کا رواج نہیں ہے اور اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی
کسی زمانہ میں سلف گورنمنٹ یعنی استقلال کامل کے مستحق نہیں ہونگے جس طرح میرا
اعتقاد خدا کے وجود کا ہے اسیطرح کی ناقابلیت کا بھی ہے۔ شہر کو
دیکھکر میں جہاز واپس پر آیا پنجشنبہ کے روز سہ پہر کو جہاز کا لنگر اُٹھا اور اسی روز شب کو
جہاز لارنکا (Lanarca.) میں جو جزائر سائپرس کا دوسرا بندرگاہ ہے
ہو نچگیا اور چونکہ یہ چھوٹا سا بندرگاہ ہے اسلئے اُسی شب کو تھوڑی دیر ٹھہر کر

وہاں سے روانہ ہوگیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت جہاز مرسین (Mersin)
پہونچگیا۔ یہ بندرگاہ ترکوں کے قبضہ میں ہے۔ یہاں تمام دن جہاز ٹھہرا رہا۔ اور
بہت سی روئی اور اُون یہاں جہاز میں لادی گئی مقام ادنہ جو یہاں سے ریل سے
ڈھائی گھنٹہ کی راہ ہے روئی کی کان ہے اور تمام ضلع میں کثرت روئی پیدا ہوتی
ہے۔ یہاں کے لوگ عربی زبان بولتے ہیں۔ یہاں سے جہاز شب کو دس بجے روانہ ہوا
اور دوسرے دن صبحکو الگزاندرٹ (Alexandretta) پہونچا۔ یہ شام کا
بندرگاہ ہے اور فرنچ کے زیر نگرانی ہے۔ جہاز تمام دن ٹھہرا رہا اور ہزاروں بھیڑ
و بکری یہاں سے سوار کی گئیں۔ یہاں کے لوگ بھی عربی بولتے ہیں۔ یہاں سے
جہاز ۵ بجے شام کو روانہ ہوا اور تمام رات چلکر صبح کو آٹھ بجے طرابلس شام میں
پہونچا۔ طرابلس شام اسکو اس وجہ سے کہتے ہیں کہ دوسرے طرابلس کو طرابلس غرب
کہتے ہیں۔ یہ بندرگاہ بھی فرنچ کے زیر نگرانی ہے یہاں سے نارنگیاں کثرت
لادی گئیں اور ۱۱ بجے دن کو جہاز روانہ ہوکر اسی روز چار بجے شام کو بیروت پہونچگیا
ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ اسلامبول سے بیروت تک آنے میں جو مختلف بندرگاہ
ملتے ہیں اُنمیں سے کوئی تو ترک کوئی ایطالی کوئی انگریزی اور کوئی فرنچ کے
قبضہ میں ہے۔ جہاز سے اُترکر ایک کشتی میں سوار ہوا اور کنارے گیا گمرک خانہ میں

اسباب کو دکھلا کر ایک ہوٹل میں جاکر قیام کیا اُسکا نام ادنہ ہوٹل تھا اور اسکا منیجر ایک یونانی تھا۔ ایک لیرہ یومیہ پر ایک کمرہ بدون خوراک لیا۔ یہاں کا ایک لیرہ دو ترکی لیروں کے برابر ہوتا ہے۔ اِس حساب سے یہاں کے ایک لیرہ کی قیمت ۵ شلنگ یعنی قریب تین روپیہ بارہ آنہ کے ہوئی۔ شب کو ایک قہوہ خانہ میں جاکر ترک رفیقوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ قہوہ خانہ بہت ہی بڑا تھا جسمیں ہر قوم کے لوگ عیسائی یہودی اور مسلمان کھانا کھا رہے تھے۔ کھانا کھا کر دوسرے قہوہ خانہ میں جو بہت ہی وسیع تھا اور جسمیں چشمہ کا فوارہ جاری تھا چائے اور نرگیلہ یعنی حقہ پیا۔ جب وہاں سے ہوٹل واپس آرہا تھا تو رستہ میں ایک اور قہوہ خانہ دیکھا جسکے بالاخانہ میں بہت ہی زیادہ برقی روشنی ہو رہی تھی اور کثرت سے مجمع تھا۔ اُسکے باہر یہ اعلان لگا ہوا تھا"

"سیدنا الشیخ عبدالقادر یغنی ھذا المساء"

"یعنی آج کی شب کو سیدنا شیخ عبدالقادر صاحب گائینگے"۔ چونکہ میرے رفقا ترک اور عربی سے ناواقف تھے اسلئے ہم لوگ وہاں نہیں گئے بلکہ سیدھے ہوٹل چلے گئے۔ بیروت میں دو ہی روز رہا اسلئے نہ کسی سے مل سکا اور نہ اچھی طرح بیروت اس مرتبہ دیکھ سکا۔ بیروت میں بہت سی پرانی عمارتیں گر گئی ہیں لیکن اُسکے بجائے بہت سی جدید دوکانیں ہوٹل قہوہ خانے اور بنک وغیرہ زیر تعمیر ہیں۔ یہاں کی علمی ترقی کی حالت سے ہر شخص واقف ہے

اسلئے اسکے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے چونکہ میں نے فرانس میں شام آنے کے لئے فرنچ گورنمنٹ کا ویزہ (Visa.) اپنے پاسپورٹ پر نہیں کرایا تھا اسلئے مجھکو فرنچ کونسل کے پاس جاکر ہ لیرہ ۲۷ پیاسٹر فیس دیکر ویزہ کرانا پڑا۔

فصل سوم از بیروت تا بغداد

دوشنبہ کے روز بیروت سے ایک موٹر بغداد جانے کے لئے کرایہ کرکے ہ بجے دن کو دمشق یعنی شام روانہ ہوگئے اور ۵ بجے دمشق پہونچگئے۔ ایک ہوٹل میں جسکا نام دَارُالفرج تھا جاکر قیام کیا۔ اس شہر میں قہوہ خانہ اور لوقانده یعنی رسٹارنٹ جسکو یہاں فرنچ زبان کے تلفظ کے لحاظ سے "راستوران" لکھتے ہیں کثرت ہیں اور کھانے اچھے اور سستے ہیں۔ انگور ان دنوں بکثرت اور نہایت ہی لذیذ تھا۔ ایسا عمدہ انگور میں نے اس سے قبل کہیں نہیں کھایا تھا۔ شام کی حالت ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی بعض بازار نہایت ہی خراب و کثیف ہیں۔ البتہ فرنچ نے چند جدید عمارتیں تعمیر کرائی ہیں اور سواد شہر میں کثرت سے باغ اور چشمے ہیں۔ بعض فرنچ افسروں سے اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ فرنچ شام سے چلے جانے کے لئے بالکل تیار ہیں کیونکہ اس ملک کی آمدنی کم اور مصارف زیادہ ہیں اسلئے فرنچ گورنمنٹ کو یہاں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جب جمعیت اتحاد الاقوام کا حکم شام کو چھوڑ دینے کا

ہوگا فرینچ فوراً اسکا تخلیہ کردینگے۔ اس افسر نے یہ بھی کہا کہ اگر برٹش گورنمنٹ عراق
کو چھوڑ دے تو فرینچ بھی فوراً شام سے چلے جائینگے۔ بادی النظر میں بالکل نہیں معلوم
ہوتا کہ یہاں فرینچ کی حکومت ہے تمام انتظام عرب حکام کرتے ہیں اور فرینچ گورنمنٹ
برائے نام نگرانی کرتی ہے۔ دوسرے روز سہ شنبہ کو اسی موٹر پر جس میں بیروت سے آئے تھے
بغداد جانے کیلئے روانہ ہوئے۔ پوری موٹر ہم چار آدمیوں نے بیروت سے بغداد
تک کیلئے چالیس پونڈ کرایہ پر لی تھی۔ یہ موٹر ایک ارمنی کی تھی اور خود مالک موٹر
ہم لوگوں کے ساتھ شام تک آیا تھا۔ یہاں سے ایک مسلمان شوفر ہم لوگوں کو لے چلا
یہ موٹر اس صحرا کے راستہ سے چلی جس راستہ سے نیرن کمپنی (Nairn Coy)
کی موٹریں جاتی ہیں۔ اس راستہ میں نہ کوئی آبادی ہے اور نہ کہیں پانی ملتا ہے۔ بجز
زمین و آسمان کے دوسری کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ شام سے بغداد تک کی مسافت قریب
۵۰۰ میل کے ہے۔ واضح رہے کہ علاوہ معمولی کرایہ کی موٹروں کے دو یورپین کمپنی کی
موٹریں بیروت سے بغداد اور بغداد سے طہران تک جاتی ہیں۔ ایک کا نام:۔
Nairn Coy اور دوسری کا نام Eastern Trans-Port
Company ہے۔ پہلی انگریزی اور دوسری فرینچ ہے دونوں کمپنیاں بیروت
سے بغداد تک کے لئے فی کس ۲۵ پونڈ کرایہ لیتی ہیں۔ اور اسیقدر بغداد سے طہران تک کا بھی

کرایہ ہے۔ انگریزی کمپنی کی موٹر شام سے بغداد تک کم سے کم ۲۶ گھنٹے میں جاتی ہے
اور صحرا میں کہیں نہیں ٹھہرتی لیکن فرنچ کمپنی کی موٹر ایک شب پالمیرا Palmyra
اور ایک شب ایک دوسرے مقام پر ٹھہرتی ہوئی جاتی ہے۔ ان دونوں مقاموں پر
کمپنی کی طرف سے مسافروں کے لئے قیامگاہیں (Rest House.)
بنی ہوئی ہیں اور خوراک اور خوابگاہ کمپنی کی جانب سے مہیا کی جاتی ہے۔ یہ راستہ
انگریزی کمپنی کی راہ سے زیادہ محفوظ ہے اور اگر کسی شخص کو عجلت نہ ہو تو اسی راہ سے
جائے۔ میری موٹر جس میں اور تین ترک سوار تھے شام سے سہ پہر کو روانہ ہوئے اور
کچھ دور چلکر شب کو دس بجے صحرا میں ٹھہر گئی اور دوسری موٹر بھی جسکا شوفر ایک
محمد علی ہندوستانی تھا ہم لوگوں کی موٹر کے ساتھ ٹھہر گئی۔ صبح ہوتے ہی موٹر روانہ ہوئی
لیکن ایک یا دو گھنٹہ چلی تھی کہ خراب ہو کر رک گئی۔ شوفر نے بہت کچھ کوشش کی
لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ہم لوگوں کے مایوسی کی حالت بڑھتی جاتی تھی اور کوئی تدبیر
سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اتفاقاً دو موٹریں Nairn Coy کی قریب
۵ بجے شام کے ہمارے قریب سے بغداد کو جاتی ہوئی گذریں۔ ہم لوگوں نے ہاتھ
اُٹھائے ایک تو ٹھہری ہی نہیں۔ لیکن دوسری ایک منٹ کے لئے رک گئی۔ ہمارے
شوفر نے اِس موٹر کے شوفر سے اپنی موٹر کے خراب ہو جانے کا حال بیان کیا۔

اِس موٹر کے مسافر یورپین تھے اور شوفر بھی فرنچ یا اٹالیائی معلوم ہوتا تھا اُسنے ہنسکر عربی میں کہا کہ تم اب یہیں مرجاؤ اور یہ کہکر چلدیا۔ چونکہ اس صحرائے خطرناک میں ہر شخص کو نفسی نفسی پڑی رہتی ہے اسلئے ایک شخص دوسرے کی مدد نہیں کرنا چاہتا۔ اب جوں جوں شام قریب ہوتی تھی ہم لوگوں کی شام غریباں خطرناک تر ہوتی جاتی تھی۔ ترک نقاریں جو امین آفندی تھے وہ محنت کرنے سے باز نہ آتے تھے اور چونکہ انھوں نے اسکول میں کچھ انجنیری پڑھی تھی اسلئے وہ کچھ نہ کچھ انجن کے بنانے کی فکر میں مشغول تھے حسن اتفاق سے قریب غروب کے انجن کچھ ٹھیک ہوا اور ہم لوگ پھر شام کو واپس ہوے۔ ایک یا دو گھنٹہ چلنے کے بعد صحرا روشنی سے بھرا ہوا دکھلائی دیا اور بدو عرب اپنے خیمے جنکی تعداد سیکڑوں کی معلوم ہوتی تھی نصب کر رہے تھے۔ یہ دیکھکر ہم لوگ بہت ہی خوفزدہ ہوے کہ کہیں بدو عرب گولی مارکر ہم لوگوں کو لوٹ نہ لیں مگر خدا نے خیریت کی اور موٹر بہت ہی سرعت کے ساتھ چلدی قریب نصف شب کے ہم لوگ صحرا میں ٹھہر گئے اور پھر علی الصباح روانہ ہو کر دوپہر کے وقت دمشق میں پہونچگئے۔ دمشق پہونچتے ہی ہم لوگوں نے پلیس میں جاکر شوفر کی شکایت کی اور کہا کہ یا تو موٹر والا ہمارا کرایہ واپس کرے یا دوسری اچھی موٹر بغداد تک کیلئے دے۔ بعد از ہزار زحمت موٹر کا مالک بیروت سے بلوایا گیا اور اُسنے دوسری

موٹر دینے کا وعدہ کیا۔ شب کو پھر دارالفرح ہوٹل میں قیام کیا اور علی الصباح جامع ہوئی
یعنی دمشق کی مشہور جامع مسجد کو جا کر دیکھا۔ اس مسجد میں وہ مقام بنا ہوا ہے جہاں
حضرت امام زین العابدینؑ نے اسیری کی حالت میں خطبہ پڑھا تھا۔ مسجد اندر تو آراستہ ہے
لیکن صحن خراب حالت میں ہے۔ اسی مسجد کے اندر حضرت یحییٰ پیغمبر کا مزار بھی بنا ہوا
ہے۔ اہلبیت کے مظالم کی یادگاریں بھی کچھ موجود ہیں۔ حضرت زینبؑ کا مزار
شہر سے باہر قریب چار میل کے فاصلہ پر بنا ہوا ہے۔

بارے جمعہ کے روز سہ پہر کو دوسری موٹر میں سوار ہو کر شام سے روانہ ہوا اور
چھ سات گھنٹے چلکر شب کو صحرا میں ٹھہر گیا۔ دوسرے روز علی الصبح موٹر روانہ
ہوئی اور تمام دن چلکر شب کو پھر صحرا میں ٹھہر گئی۔ دوسرے روز اتوار کے دن بہت
سویرے موٹر چلی اور دس بجے دن کو مقام رمادی میں پہونچ گئی۔ چونکہ یہ مقام عراق
کی سرحد ہے اسلئے کمرک خانے میں اسباب کا معائنہ ہوا۔ مفتش (انسپکٹر) جو عرب تھا
نہایت ہی غور سے اُسنے اسباب کا معائنہ کیا اور آخر میں ایک فارم بھرنے کے لئے
دیا اور کہا کہ اسکو بغداد کے کمرک خانے میں لیجا کر دینا۔ وہاں سے روانہ ہو کر
فلوجہ پہونچا اور وہاں بھی مختصر سا معائنہ کیا گیا اور ۲½ بجے دن کو بغداد پہونچ گیا
میں موٹر میں سیدھا کمرک خانہ گیا۔ ملازمین کمرک نے کہا کہ آج اتوار ہے اسباب

گمرک میں چھوڑ جاؤ اور کل آکر لیجانا جب گمرک کا انسپکٹر آیا میں نے اس سے
کہا کہ میں لندن سے آرہا ہوں اور میرے پاس کوئی اسباب قابل محصول نہیں ہے
اُسنے میرے اسباب کا معائنہ نہیں کیا اور کہا کہ تم اپنا اسباب لیجاؤ حالانکہ اُسنے میرے
رفقاے ترک کے اسباب کا بہت ہی سختی سے معائنہ کیا۔ چونکہ میں نے اس سے انگریزی
میں بات کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ میں لندن سے آرہا ہوں اُسنے میرے ساتھ
یہ رعایت کی تھی وہ بالکل ایک نوجوان عرب تھا لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسلمان
تھا یا یہودی یا نصرانی، اُسنے مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں سال آیندہ رخصت لیکر
لندن جاؤنگا۔ میں اپنا اسباب حمال سے اٹھواکر "Wellingdon
Hotel." ولنگڈن ہوٹل گیا جو یہاں کے بہت ہی اچھے ہوٹل مو ڈ
(Maude Hotel) کے مقابل میں واقع ہے۔ وہاں ایک کمرہ مع خوراک
کے دس رُپیہ فی یوم پر لیا۔ چونکہ آج اتوار کا دن تھا اسلئے کثرت سے مرد و عورت
نصرانی، یہودی اور مسلمان بازاروں میں اچھے اچھے لباس پہنے ہوے پھر رہے تھے
لیکن اس مجمع میں مسلمان عورتیں بہت کم معلوم ہوتی تھیں۔ مجھکو اپنے قدیم احباب
سے ملنے کا اسقدر شوق تھا کہ اسی روز شام کے وقت پل کے دوسرے جانب
جو بغداد قدیم کے نام سے مشہور ہے گیا اور وہاں جاکر نواب احمد حسن خانصاحب سے ملا

اُنھوں نے زمانہ جنگ میں بسبب انگریزی رعیت ہونے کے بہت مصائب اُٹھائے تھے لیکن اب بھی اُنکو ویسا ہی خلیق اور زندہ دل پایا جیسا کہ وہ بائیس برس پہلے تھے۔ شب کو آٹھ بجے اُنکے پاس سے ہوٹل واپس آیا اور سفر کی تکان کی وجہ سے کھانا کھا کر فوراً سو رہا۔ اس ہوٹل کا مالک ایک عرب تھا جو علاوہ عربی کے انگریزی اور فرنچ بول لیتا تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ عراق کا رہنے والا تھا یا شام کا۔ ہوٹل کے کل ملازم عرب تھے اور نہایت صاف کپڑے پہنے ہوے تھے۔ البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسلمان تھے یا نصرانی۔ میرے علاوہ چند انگریز، دو تین امریکائی مرد و عورت دو ایک فرنچ اور دو چار شامی و مصری عرب بھی اُس ہوٹل میں ٹھہرے ہوے تھے۔ بجز میرے کوئی دوسرا ہندوستانی نہیں تھا۔ میں دوسرے روز وہاں سے کاظمین چلا گیا اور سید ناصر خادم کے مکان پر قیام کیا لیکن ہر روز کاظمین سے بغداد تھوڑی دیر کے لئے گھوڑے کی ٹریموے پر سوار ہوکر آجایا کرتا تھا۔ بغداد میں میونسپلٹی کی طرف سے تعلیم۔ صفائی۔ اور بجلی کی روشنی وغیرہ کا کافی انتظام ہے۔ حتیٰ کہ میں نے کاظمین میں بھی دیکھا کہ تنگ کوچوں میں میونسپلٹی کا جاروب کش جاکر جھاڑو دیتا تھا اور کوڑے کو اُٹھا کر لیجاتا تھا۔ چونکہ بغداد کے باشندے صفائی وغیرہ کے خواہاں ہیں۔ اسلئے حکومت عراق بھی انگریزی گورنمنٹ کی مدد سے اُنکے لئے ہر امر کا

انتظام کر رہی ہے۔ ہندوستان کے لوگ چونکہ صفائی کے خوگر نہیں ہیں اسلئے اگر
یہاں گورنمنٹ کی جانب سے کچھ انتظام بھی کیاجاتا ہے تو عموماً لوگ اُسکو پسند نہیں کرتے
جب سے مینوسپلٹی ہندوستانیوں کو دیدی گئی ہے حالت بدتر ہوتی جاتی ہے اور
غالباً کچھ دنوں کے بعد سڑک روشنی اور صفائی وغیرہ کی حالت ویسی ہو جائیگی جیسی
ہزاروں برس سے تھی۔ یہاں کی تمدنی حالت میں پہلے ہی سے ترقی موجود تھی
اور اب تو اور بھی زیادہ ہوگئی ہے تعلیم کی جانب عام توجہ ہو رہی ہے اور بہت سے
ابتدائی مدرسے جاری ہو گئے ہیں۔ اِن مدرسوں میں چھہ درجے ہوتے ہیں اور تمام
مضامین عربی میں پڑھائے جاتے ہیں البتہ چوتھے درجہ سے چھٹے تک انگریزی
بطور زبان ثانوی (Second language.") کے پڑھائی
جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور مدارس اعدادیہ یعنی (Intermediate
Schools.) بغداد۔ بصرہ اور موصل میں قائم کردئے گئے ہیں۔ مینے ایک
ابتدائی اسکول کو جو کاظمین میں تھا جاکر دیکھا۔ وہاں کی عمارت۔ صفائی۔ فرنیچر اور
انتظام تعلیم وغیرہ کو دیکھکر نہایت ہی تعجب ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کا
ایک چھوٹا سا ہائی اسکول ہے۔ لڑکیوں کے لئے بھی چند ابتدائی مدرسے کھل گئے
ہیں اور اُنکی تعلیم روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔ بغداد میں عورتوں کا ایک کلب بھی

قائم ہوگیا ہے اور تعلیم یافتہ عورتوں نے سیاسی اور تمدنی معاملات میں حصّہ لینا
شروع کردیا ہے۔ بڑے ڈاک خانہ میں سالار خاں بلوچی سے جو اسسٹنٹ پوسٹ ماسٹر
ہیں ایک اپنے قدیم ملاقاتی فہمی آفندی کا پتہ پوچھکر اُنسے ملنے گیا۔ اب وہ بغداد
میں فہمی المدرس کے نام سے مشہور ہیں جس زمانہ میں میں مع سجاد حیدر صاحب کے بغداد
کے قونسل خانہ میں ترجمان تھا اُسوقت ہم لوگوں سے اور اُنسے بہت ہی گہرے
مراسم تھے اُسوقت وہ معمم اور ریشدار تھے اور ترکی گورنمنٹ گزٹ کے اڈیٹر تھے اب
میں نے اُنکو دیکھا تو وہ یوروپین وضع میں تھے اور چہرہ بھی صاف تھا۔ اثنائے گفتگو میں
معلوم ہوا کہ وہ جدید دارالفنون کے جسکا نام "جامعۃ آل البیت" ہے ڈائرکٹر ہیں
اور مبلغ نو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ پندرہ سو روپیہ تک ہو جائیگی
اِس دارالفنون کا نام جامعۃ آل البیت اسوجہ سے رکھا گیا ہے کہ امیر فیصل بادشاہ
عراق جو اُسکے مربی ہیں حسنی نسب کے سید ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بادشاہ کی
موٹر پر جو اُن کو لینے آئی تھی مجھے اِس دارالفنون کے دکھانے کو لیگئے اور برہان الدین
آفندی جو خاندان نقیب کے ایک تعلیم یافتہ جوان تھے اور یوروپین لباس پہنے ہوئے
تھے وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ گئے۔ یہ دارالفنون صیغۂ اوقاف کی طرف سے تعمیر ہو رہا ہے
اور کابینہ یعنی ہیئت وزراء کے زیر نگرانی ہے وزارت معارف یعنی صیغۂ تعلیمات

اُسکو کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابھی صرف شعبۂ دینیات و ہندسہ کے لئے ایک عمارت دو منزلہ نہایت ہی خوبصورت مضبوط تیار ہوئی ہے۔ نیچے کے حصہ میں دینیات کے درجے اور اوپر کے حصہ میں ہندسے کے کلاس ہیں۔ ادب، فنون، حقوق و طب کے لئے ابھی عمارتیں نہیں تیار ہوسکی ہیں۔ صرف موجودہ عمارت کی تعمیر میں قریبا ت لاکھ روپیہ کے صرف ہوچکا ہے تعلیم دینیات کیلئے فرنیچر، ریڈنگ روم، مدرسوں کے لئے میٹنگ روم وغیرہ اُسی طرح پر مہیا کئے گئے ہیں جیسا کہ یورپ کے عام کالجوں میں ہوا کرتے ہیں۔ اِن دینیات کے درجوں میں علم تفسیر واحادیث وغیرہ کی جو تعلیم ہوتی ہے وہ بطریق جدید مصر کے طریقہ پر ہوتی ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اس امر کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ ہندوستان میں بھی قدیم طریقۂ تعلیم میں اصلاح کیجائے اور جس طرح کہ علماے قدیم نے یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں اصول مذہب اسلام کے اثبات حقانیت کیلئے اور اسلام پر جو اعتراضات بروئے فلسفہ یونانی وارد ہوتے تھے انکے دفع کرنے کے لئے علم کلام ایجاد کیا تھا اسی طرح اب ضرورت ہے کہ از روئے فلسفہ اور سائنس جدید جو اسلام پر اعتراضات وارد ہوتے ہیں انکے رفع کرنے کے لئے ایک خاص قسم کے علم کلام کی ترتیب دیجائے اور اسی نقطۂ نظر سے نصاب موجودہ کی ترمیم کی جائے۔ عربوں کی اس روشن خیالی اور عالی حوصلگی کو دیکھکر جو ہمیشہ سے اُنمیں موجود رہی ہے

نہایت ہی خوشی ہوئی اور فوراً علیگڈھ اور شیعہ کالج یاد آ گیا۔ خیر علیگڈھ نے تو بہت کچھ کیا ہے لیکن دیکھیے شیعہ کالج کیا کرتا ہے فوٹ بال و کرکیٹ کا کھیلنا شرعاً جائز قرار دیتا ہے یا نہیں۔ "ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا"۔ جب کچھ دنوں کے بعد اس دارالفنون کی عمارت مکمل ہو جائے گی اسوقت یہ قابل دید کالج ہوگا۔ فہمی آفندی نے یہ بھی فرمایا کہ اس دارالفنون میں فارسی اور اردو زبان کی بھی تعلیم ہوگی۔ واضح رہے کہ یہ حضرت فہمی نہ کسی یورپ کے کالج کے تعلیم یافتہ ہیں اور نہ انگریزی جانتے ہیں اور نہ فرنچ۔ البتہ اسلامبول و مصر میں کچھ دنوں رہے ہیں۔

علاوہ تعلیم کے عراق میں تجارت و زراعت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ ریلوے نہریں بہت سی نکلی ہیں اور روئی کی کاشت کے لئے بہت زیادہ کوشش کی جا رہی ہے۔ جیسا پہلے میں نے ذکر کیا ہے عراق میں روپیہ کا سکہ جاری ہے اور بغداد میں انگریزی اردو کثرت سے لوگ جانتے ہیں اسلئے ہندوستانیوں کو یہاں اسقدر زحمت نہیں پیش آئے گی جیسی دوسرے ملکوں میں ہوگی۔ بغداد میں متعدد ہوٹل ہو جانے کی وجہ سے نہایت ہی آرام سے مسافر قیام کر سکتا ہے۔ منجملہ بہت سے ہوٹلوں کے ولنگڈن۔ موڈ۔ کانٹینٹل۔ ضیار وگراند بہت اچھے ہوٹل ہیں۔ بمبئی و کراچی سے ہفتہ وار جہاز بصرہ کو جاتے ہیں بمبئی سے بصرہ تک اول درجہ کا کرایہ ڈاک کے جہاز میں مع خوراک کے مبلغ تین سو روپیہ ہے لیکن

دوم درجہ کا کرایہ غالباً دو سو یا کچھ کم ہے۔ اگر دو تین شخص باہم سفر کرتے ہوں اور موسم جاڑے کا
ہو تو ڈک (Deck) پر بھی جا سکتے ہیں۔ ڈک کا کرایہ بمبئی سے بصرہ تک صرف
پینتیس[۳۵] روپیہ ہے۔ کھانے کا انتظام خود کرنا پڑیگا۔ دو تین طالب علم ملکر ڈک پر بہت ہی
آسانی سے سفر کر سکتے ہیں۔ جہاز بصرہ ساتویں دن پہونچ جاتا ہے اور پھر وہاں سے ریل
بغداد تک اٹھارہ گھنٹے میں جاتی ہے سکنڈ کلاس ریل کا کرایہ چوالیس روپیہ ہے۔ لیکن
تیسرے درجے میں بھی آرام سے سفر ہو سکتا ہے اور کرایہ بھی بہت کم ہے۔ علیگڑھ، اور
دوسرے کالجوں کے جوان طالبعلموں کو چاہیے کہ تعطیل کے زمانہ میں پانچ چھ ملکر کم سے کم
عراق کا سفر کر لیا کریں۔ بغداد میں معمولی ہوٹل کا خرچ مع خوراک وغیرہ کے زیادہ سے زیادہ
پانچ روپیہ فی یوم ہوگا لیکن بہتر یہ ہوگا کہ وہ کاظمین میں کسی خادم کے یہاں قیام کریں
اور جب دل چاہے بغداد آدھ گھنٹے میں ٹریموے پر سوار ہو کر چلے جایا کریں۔ جہاں دل
چاہے کھانا کھا لیا کریں زیادہ سے زیادہ دو روپیہ فی یوم صرف ہوگا جب چلنے لگیں تو خادم
پانچ چھ آدمی ملکر بیس پچیس روپیہ دیدیں۔ کاظمین سے ریل میں سوار ہو کر سامرہ کی
زیارت کر آویں۔ آمد و رفت کا کرایہ مبلغ پانچ روپیہ ہے۔ سامرہ کی آب و ہوا نہایت ہی
اچھی ہے اور وہاں کا خربزہ مشہور ہے۔ حضرت امام علی نقیؑ اور حضرت امام حسن عسکریؑ
اور حضرت نرجس خاتونؑ والدہ حضرت امام مہدیؑ وہاں مدفون ہیں اور یہ روضہ

نہایت ہی اچھا بنا ہوا ہے۔ اس روضہ کا گنبد طلائی تمام مشاہد کے گنبدوں سے بڑا ہے
اسی مقام پر مرزا محمد حسن شیرازی مجتہد رہتے تھے جو سرکار مرزا کے لقب سے مشہور تھے انیسویں
صدی میں دنیا کے کسی مذہب میں کوئی رئیس روحانی اُنسے زیادہ اپنے مذہب میں مشہور اور باثر نہیں
گذرا ہے۔ جب ناصر الدین شاہ سامرہ گئے تھے اور اُنسے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی تو نہ تو
خود شاہ کے قیامگاہ پر گئے نہ اُنکو اپنے مکان پر آنے دیا بلکہ اُنسے حرم عسکریین میں ملاقات
کی تاکہ دید و باز دید کا سوال نہ پیش ہو۔ اُنکی وفات سامرہ میں ہوئی تھی اور اُنکا جنازہ
تختِ رواں میں ہزاروں آدمی اپنے کاندھوں پر قریب ۱۰۰ میل کے نجف اشرف تک لیگئے
تھے۔ سامرہ میں چونکہ سنی المذہب عرب کی آبادی کثرت سے ہے اسلئے وہ لوگ اُنکا جنازہ
سامرہ کی سرحد یعنی دریاے دجلہ کے اُس پار تک جو شہر سے قریب تین میل کے ہے خود
اپنے ہی کاندھوں پر لیگئے اور شیعوں کو جنازہ میں شریک نہیں ہونے دیا اور اُسکے بعد
پھر شیعہ جنازہ کو لیگئے۔ بغداد و کاظمین میں تمام ترکی حکام نے مع والی پاشا کمانڈر انچیف
اور ترکی فوج کے اُنکے جنازہ کی مشایعت کی۔ کاش کہ ہندوستان میں بھی شیعہ علما کے
جنازہ کے ساتھ سنی اور سنی علما کے جنازہ میں شیعہ اسی طرح پر شرکت کرتے۔ اُن
مرحوم کے چند واقعات ہیں جو نہایت ہی حیرت انگیز اور دلچسپ ہیں لیکن بسبب طوالت کے
اُن کا ذکر نہیں کر سکتا منجملہ اور باتوں کے یہ بات خاص قابل ذکر ہے کہ جب پہلے پہل میں

ہندوستان سے سامرہ پہونچا اور انکی خدمت میں حاضر ہوا تو جب انکو یہ معلوم ہوا کہ میں انگریزی عربی کا

طالب علم ہوں تو نہایت درجہ میری قدر فرمائی اور یہ فرمایا کہ ایسے طالب علم جو انگریزی کے

ساتھ عربی بھی جانتے ہیں وہ زیادہ قابل قدر ہیں اسلئے کہ اس زمانہ میں ایسے لوگوں سے اسلام کو

بہت کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے چنانچہ میرے زمانہ قیام میں بعض طلبا نے مثل پسر جناب

مرزا حسین نوری مرحوم کے مجھسے انگریزی پڑھنی شروع کر دی تھی۔

سامرہ میں کچھ آثار خلفائے قدیم کے ابتک موجود ہیں کیونکہ بسبب خوبی آب و ہوا کے

بہت سے خلفائے بنی عباسیہ نے اپنا پایہ تخت اسی مقام کو قرار دیا تھا مسافر کو چاہیے

کہ سامرہ سے کاظمین واپس آئے اور کاظمین سے پھر ریل کے ذریعہ سے کربلائے معلی اور

وہاں سے موٹر میں سوار ہو کر نجف اشرف کی بھی زیارت سے مشرف ہو جائے نجف سے کوفہ

بہت ہی قریب ہے عبرت کیلئے اُس مقام کو بھی دیکھ لے۔

فصل چہارم از بغداد تا طہران

شنبہ کے روز کاظمین سے قریب دس بجے دنکے موٹر میں روانہ ہوا میرے ساتھ

تین اور ایرانی مسافر تھے جو طہران جا رہے تھے۔ ہم لوگوں نے مبلغ چھ سو روپیہ پر

ایک بالکل نئی فورڈ موٹر کرایہ کی تھی۔ میں نے اپنے حصے کا مبلغ ڈیڑھ سو روپیہ پیشتر ہی

دیدیا۔ اگر انگریزی یا فرنچ کمپنی کے موٹر میں جاتا تو مبلغ ۲۵ پونڈ یعنی قریب ۔ تین سو

روپیہ کے دینے پڑتے۔ اگر میرا ساتھ ان طہرانی مسافروں کا نہوتا تو میرا ارادہ انھیں
کمپنیوں میں سے کسی ایک کی موٹر میں جانے کا تھا جیسا کہ میں نے واپسی کے وقت طہران
سے کیا تھا۔ موٹر قریب ۲ بجے کے خانقین پہونچی اور بعد معائنہ گمرک کے وہیں ایک سرا
میں ایک کمرہ لیکر ہم لوگ ٹھہر گئے بغداد سے خانقین تک ریل بھی آٹھ گھنٹے میں جاتی
ہے لیکن پھر وہاں سے طہران کے لئے موٹر ملنے میں دقت پیش آتی ہے اسلئے ہملوگ
کاظمین ہی سے طہران تک کے لئے موٹر کر لی تھی

دوسرے روز اتوار کے دن صبح کو موٹر چلی اور راستہ میں دو مقام
ایک سرحد عراق اور دوسرا سرحد ایران پر گمرک کا معائنہ ہوا اور تیسرے پہر
کے وقت ہم لوگ قصر شیریں پہونچ گئے۔ وہاں بھی گمرک کا معائنہ
اور وہاں سے چلکر ایک گھنٹہ رات گئے کرماں شاہ پہونچ گئے یہاں میں نے ایک ہو
میں جسکا مالک ایک یونانی تھا قیام کیا اور ایک تومان یعنی تین روپیہ اور کچھ آ
فی شب کرایہ دیا اور شہر میں جاکر ایک رستوران میں کھانا کھایا۔ یہ شہر بہت ہی قدیم
کوچے بہت تنگ اور بازاریں چھت دار ہیں۔ شہر تو البتہ اچھا ہے وہاں بڑی عما
اور چوڑی سڑکیں ہیں۔ یہاں سے دو میل کے فاصلہ پر طاق بستان ہے جہاں
میں چند قدیم تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ رستم کا مجسمہ (Statue) ایک پتھر

گھوڑے پر نہایت ہی عمدہ بنا ہوا ہے۔ دوسری محراب میں میخی خط میں کچھ لکھا ہوا ہے لیکن
میں اسکو پڑھ نہ سکا۔ اس شہر میں ایک بہت بڑے زمیندار ہیں جو معاون الملک کے لقب
سے مشہور ہیں وہ ایک نہایت ہی شاندار خوبصورت تصاویر و نقش و نگار سے مزین حسینیہ
یعنی امام باڑہ تعمیر کر رہے ہیں اس سے عمدہ امام باڑہ غالباً تمام ایران میں کہیں نہیں ہے
ایک روز یہاں قیام کیا اور شب کو ایک ایرانی تاجر کے یہاں اپنے طہرانی رفقا کے ساتھ
مہمان ہوا۔ مہمانی نہایت ہی پر تکلف تھی اور بہت سے ایرانی تاجروں سے وہاں ملاقات ہوئی۔
دوسرے روز سہ شنبہ کی صبح کو کرمانشاہ سے روانہ ہو کر غروب کے وقت ہم لوگ ہمدان
پہونچگئے اور میں ہوٹل اقتصاد میں ایک کمرہ لیکر ٹھہر گیا۔ کرایہ ۵ قران یعنی قریب
عہ کے شب کے حساب سے دیا۔ صبحکو ایک سلمانی یعنی (Hair dresser.)
کی دوکان پر بال کٹانے گیا نائی نے بال کاٹتے وقت مسائل سیاسی پر اسطرح مجھسے
گفتگو کی جیسا ہندوستان میں ایک اخبار پڑھنے والا معمولی گریجویٹ کرتا ہے میں نے
اخبار پڑھنے کی اس وجہ سے قید لگائی کہ ہندوستان میں بہت سے گریجویٹ اور تعلیم یافتہ
اشخاص ہیں جو اخبار کو مہینوں یا مطلق نہیں پڑھتے۔ اثنائے گفتگو میں اُسنے مجھ سے
یہ بھی کہا کہ آپ یورپ کو چھوڑ کر ایران کیوں آئے کیونکہ ایران میں مسافروں کو بہت سخت
تکلیف ہوتی ہے۔ بال کاٹنے کے بعد اُسنے مجھکو چائے پلائی۔ چلتے وقت میں نے

اُسکو دو قران یعنے قریب دس آنے کے دئے اور اُسنے میرا شکریہ ادا کیا۔ سہ پہر کو بابا طاہر
کے قبر کی زیارت کرنے گیا مقبرہ بہت ہی خراب حالت میں تھا اور باوجود متوفات
کوئی سامان نہ تھا۔ وہاں کے مجاور ایک جوان سید تھے جنھوں نے اثنائے گفتگو میں کہا
اُنکے جد بزرگوار کشمیر سے آئے تھے فوراً ہی میرے دل میں خیال گذرا کہ اگر یہ حضرت کشمیری الاصل
ہیں تو وقف کو خوب کھاتے ہونگے۔ یہ شہر تجارت کا بہت ہی بڑا مرکز ہے اور یہاں کے قدیم
باشندے اکثر یہودی ہیں یہاں ہر قسم کا میوہ بکثرت پیدا ہوتا ہے اور بہ نسبت کرمانشاہ
قزوین اور طہران کے یہ زیادہ سرد مقام ہے یہاں کی آب ہوا نہایت ہی اچھی خیال
کی جاتی ہے۔ ایک روز یہاں قیام کیا اور سہ پہر کو شہر کے باہر گردش کرنے گیا۔ شہر
کے باہر کثرت سے باغ ہیں اور یہاں کا جدید سربازخانہ (Barrack.
نہایت ہی عظیم الشان بنا ہوا ہے۔ شہر کے باہر انگریزوں کا ایک قبرستان دیکھا
اُسپر "British military Cemetery" لکھا ہوا تھا جس
معلوم ہوا کہ زمانہ جنگ میں جب (Dunster force.) کی فوج
یہاں مقیم تھی اُسوقت کچھ انگریز افسر اور سپاہی اس قبرستان میں دفن کئے گئے
یہاں ایک امریکائی مریضخانہ یعنی ہسپتال بھی بنا ہوا ہے۔ پنجشنبہ کو ہملوگ ہمدان سے
روانہ ہوے اور غروب سے دو گھنٹے پہلے قزوین میں پہونچ گئے۔ یہاں میں نے ایک

ہوٹل میں جسکا نام (Grand Hotel.) ہے ایک کمرہ ۵ قران یعنی ۱۲؍ فی شب کرایہ پر لیکر قیام کیا۔ کھانا رستوران میں کھانے گیا بلکہ ہوٹل ہی میں کھا لیا۔ اور اسکی قیمت علیحدہ دی اِس شہر کے لوگ ترکی۔ فارسی اور روسی عموماً جانتے ہیں اور بہت سے لوگ انگریزی حتیٰ کہ اردو بھی بول لیتے ہیں۔ چونکہ یہاں بھی جنگ کے زمانہ میں انگریزی اور ہندوستانی فوج ٹھہری ہوئی تھی اِسلئے بازار کے کاسبوں نے انگریزی اور اُردو سیکھ لی تھی۔ سہ پہر کو میں شہر گھومنے گیا اور جامع مسجد اور مقبرہ حسین بن امام علی رضا کو جاکر دیکھا مسجد نہایت ہی قدیم اور عظیم الشان ہے لیکن بہت ہی بُری حالت میں ہے مقبرہ کی عمارت نہایت ہی خوبصورت ہے۔ مرزا علی اصغر خاں صدر اعظم نے اُسکو تعمیر کرایا تھا۔ ایران اور خصوصاً قم میں صدر اعظم مرحوم نے بہت سے مقبرے تعمیر کرائے ہیں اور تمام مقبروں کی عمارت ایک ہی سی ہے جمعہ کے روز صبح کے وقت قزوین سے روانہ ہوے اور بعد از ظہر طہران پہونچ گئے۔ جب ہملوگ شہر کے قریب پہونچے تب میرے رفقا کے اعزا و احباب اُن لوگوں کے استقبال کو آئے اور میں بھی آقا غلام حسن تبریزی کے ساتھ اُنکے مکان پر چلا گیا اور شب کو انھیں کا مہمان رہا۔ مہمانی نہایت پرتکلف تھی اور قریب ۵۰ آدمی کے دسترخوان پر موجود تھے۔ چائے اور شیرینی کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا دوسرے روز میں اپنے ایک پرانے ملاقاتی مرزا علی اصغر کاشف سے تیجۂ صدر اعظم میں

جاکر ملا۔ ایران میں تیمچہ اُس عمارت کو کہتے ہیں جہاں پر تاجروں کا آفس
اُنھوں نے چائے پلائی اور پھر میرے ساتھ وہ مکان کی تلاش میں چلے
کوئی اچھی جگہ قیام کے لئے نہ ملسکی اسلئے ہوٹل اقتصاد میں جاکر ٹھہر گیا
یعنی ایک روپیہ فی شب کرایہ طے ہوا اور کھانا جس رستوان میں دل چاہتا
کھالیا کرتا تھا۔ پہلے میں نے چاہا تھا کہ گرانڈ ہوٹل میں جاکر قیام کروں
دوستوں نے وہاں جانے سے منع کیا کیونکہ وہاں کا کرایہ کچھ زیادہ تھا
سے معلوم ہوا کہ بغیر خوراک کے تین اور پانچ روپیہ فی یوم کی شرح تھی۔
طہران میں ہیں لیکن اسقدر نہیں ہیں جتنے بغداد میں اور نہ بہت آرام
ہفتہ اس ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد ملک قاسم مرزا صابری سے
ہوئی یہ وزارت مالیہ میں کلرک ہیں اور اُن کو میں شاہرود سے
میں نے اُنسے اپنے لئے ایک مکان کی خواہش ظاہر کی تو اُنھوں نے کہا کہ
میں آکر رہو۔ میں تم کو ایک کمرہ دیدوں گا اور کھانا بھی اپنی بیوی سے پکو
چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور اُنکے یہاں جاکر مثل بورڈ کے رہنے لگا۔
روپیہ مہینہ کے میں کمرہ اور کھانے کے لئے دیتا تھا۔ صبح اور عصر چا
دوپہر اور شب کو جو کھانا اُن کے یہاں پکتا تھا اُنکے ساتھ کھاتا تھا۔

ن سے سجا ہوا تھا اور تمام ضروری چیزیں اسمیں موجود تھیں۔ اگرچہ اس قسم کا رواج
رن میں نہیں ہے لیکن انھوں نے میرے ساتھ خاص مہربانی کی تھی۔ طہران
بلکہ بہت قدیم شہر نہیں ہے اسلئے نہ تو بہت گنجان آبادی ہے اور نہ اسمیں تنگ
چے اور گلیاں ہیں۔ سڑکیں بہت ہی چوڑی اور سیدھی بنی ہوئی ہیں اور عموماً
ڑکوں کے دونوں جانب درخت لگے ہوے ہیں جیسا پیرس میں۔ ایسے مقامات کو
یاں خیابان اور فرانس میں بولوار (Baulevard) کہتے ہیں
ام ایشیائی ملکوں میں کوئی ایسا شہر نہیں ہے جہاں اسقدر خیابان ہوں جسقدر
ہران میں ہیں منجملہ بیسیوں خیابان لالہ زار۔ خیابان ناصری۔ خیابان چراغ برق
یابان حسن آباد۔ خیابان دوشن تپہ۔ خیابان نادری۔ خیابان حاجی ملا ہادی وغیرہ
بہت اچھے خیابان ہیں جس طرح لکھنؤ میں امین آباد حضرت گنج۔ و چوک ہے اسطرح
یہاں خیابان لالہ زار و خیابان ناصری سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کی آبادی صرف
قریب ڈھائی لاکھ کے ہے لیکن چونکہ عموماً مکان بہت کشادہ ہیں اور قریب قریب
ہر اچھے مکان کے اندر ایک باغ ہوتا ہے اسلئے شہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے اور
ناواقف مسافر یہ خیال کریگا کہ یہاں ۸-۱۰ لاکھ آدمی رہتے ہونگے۔ چونکہ شہر
نہایت ہی کھلا ہوا ہے۔ اسلئے یہاں کی آب و ہوا بہت ہی اچھی ہے۔

بلدیہ یعنی میونسپلٹی بہت سرگرمی سے کام کرتی ہے اور شہر کی صفائی اور برقی
روشنی وغیرہ کی جانب خاص توجہ کی جاتی ہے۔ البتہ جاڑوں میں جب برف باری
ہوتی ہے اُسوقت سڑکوں پر اسقدر کیچڑ ہوتی ہے کہ چلنا دشوار ہوجاتا ہے ابتک
گھوڑے کی ٹریموے چلتی ہے لیکن عنقریب برقی ہوجائے گی۔ گھوڑے گاڑیاں
اور موٹریں کثرت سے کرایہ پر چلتی ہیں۔

طہران میں کوئی خاص عمارت نہیں ہے جسکا خاص طور پر ذکر کیا جاوے البتہ
مسجد سپہ سالار اعظم نہایت ہی عظیم الشان ہے لیکن اسکا ایک حصہ ناتمام رہگیا ہے۔
اُمرا کے ذاتی مکان البتہ نہایت ہی عمدہ ہیں اور ہر مکان کے اندر اکثر پارک
کم سے کم بڑا سا باغ ہوتا ہے تمام مکانوں میں اتابک مرحوم کا مکان اور پارک نہایت
عظیم الشان ہے اسمیں اب روس کا سفارت خانہ ہے۔ مجلس شوریٰ و بلدیہ و وزارت
حربیہ کی بھی عمارتیں عمدہ ہیں۔ شاہی عمارتیں باہر سے تو بہت ہی معمولی معلوم
ہوتی ہیں لیکن اندر سے نہایت اچھی ہیں اور نقش و نگار سے پُر ہیں۔

تعلیم کی جانب لوگوں کا بہت ہی زیادہ خیال ہے اور لڑکے اور لڑکیوں کے
مدارس کافی تعداد میں ہیں جس خاندان میں تعلیم کا رواج ہے اسمیں لڑکے اور لڑکیوں
کو برابر تعلیم دی جاتی ہے۔ البتہ جس خاندان میں تعلیم کا چرچا نہیں ہے اسمیں لڑکے

دونوں محروم رہتے ہیں۔ ہندوستان کی طرح نہیں ہے کہ بیٹا تو گریجویٹ ہے
کی قرآن پڑھ لینے سے زیادہ کچھ نہیں جانتی اور بعض شرفا کے خاندان میں
ہی لڑکیاں ہیں کہ قرآن بھی نہیں پڑھ سکتیں۔ علاوہ ایرانی مدرسوں کے تین
ے فرانسیسیوں کے ہیں اور دو بہت بڑے اسکول امریکائیوں کے ہیں ایک
ں کے لئے اور دوسرا لڑکیوں کے لئے۔ اب امریکائی شہر کے باہر ایک بہت بڑا
میر کر رہے ہیں اور بعد تعمیر ہو جانے کے اسکا شمار ایران کی بہت بڑی عمارتوں
ہوگا۔ میرے خیال میں کئی لاکھ روپے اسکی تعمیر میں صرف ہو چکے ہیں اور اب بھی
یل میں دو تین لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

علاوہ ابتدائی و متوسط مدرسوں کے ایک دارالفنون بھی ہے جہاں فی الجملہ
علیم دی جاتی ہے۔ مدرسہ طب، مدرسہ حقوق یعنی (Law College)
پرنسپل ایک نہایت ہی قابل فرنچ ہے اور مدرسہ ارکان حرب یعنی Staff College
یہاں کے عمدہ درسگاہوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ دارالفنون میں ایک شعبہ
موسیقی کا بھی ہے لیکن تعجب ہے کہ یہاں کے علما اور خصوصاً سید حسن مدرس و
شعبہ خوئی جنکا شہر میں زیادہ اثر ہے اسکی مخالفت نہیں کرتے۔

علاوہ ان مدارس کے یہودی اور ارمنیوں کے بھی مدرسے ہیں۔ ایک کانونٹ سکول

بھی ہے جسمیں فرنچ کی راہبات یعنی (Convent school)
(Sisters) تعلیم دیتی ہیں۔ روسیوں کے بھی مدرسے ہیں جہاں اُنکے
لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ عموماً فرنچ جانتے ہیں۔
اور اب انگریزی کا بھی رواج کثرت سے ہو گیا ہے اور بالخصوص جب سے امریکائی
مستشار (Advisers.) ایران کے ادارہ مالیہ میں مستخدم ہوئے ہیں۔

اخبار یہاں کثرت سے نکلتے ہیں اور متعدد قرأت خانے یعنی (Reading
Rooms) ہیں جہاں لوگ جاکر مفت اخبار پڑھتے ہیں۔ یہ قرأت خانے
عموماً کسی ایک شخص کے یا کسی خاص حزب کے قائم کردہ ہیں اور اُن کو محکمۂ تعلیم یا
بلدیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اکثر قرأت خانہ "طوفان" میں عصر کے وقت
جاکر اخبار پڑھا کرتا تھا یا کتب بینی کیا کرتا تھا۔ میں نے اس قرأت خانہ کے ایک
کمرہ میں دنیا کے قومی لیڈروں کی تصویریں دیکھیں جنمیں مہاتما گاندھی کو بھی وہاں
موجود پایا۔ ذیل میں چند اخباروں کا نام لکھتا ہوں جس سے طہران میں زنانہ نگاری
کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ "ایران، ستارہ ایران۔ کوشش۔ میہن۔ قانون۔
وطن۔ شفق سرخ۔ حیات ایران۔ نسیم صبا۔ حلاج۔ توفیق۔ فکر آزاد۔ ناہید۔
محشر۔ شہاب۔ تجدد۔ جنت۔ آسائش۔ طلوع شمس۔ پیک۔ آواز تاجیک۔

ارمغان۔ نسیم شمال وغیرہ بعض اخبار شاید انمیں سے ایسے ہی ہوں جو کسی دوسرے شہر میں طبع ہوتے ہیں اور طہران کے قرأت خانوں میں پڑھنے کے لئے بھیجدیے جاتے ہوں لیکن بیشتر انمیں ایسے ہیں جو طہران میں شایع ہوتے ہیں۔ اگر ایران کے تمام اخباروں کا شمار کیا جاوے تو غالباً اُنکی تعداد قریب سو کے ہوگی۔ واضح رہے کہ تمام ایران کی آبادی دو کروڑ سے زیادہ نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کم ہو۔ یہاں چند کلب بھی ہیں اور سب سے اچھا فوجی کلب ہے امریکن اسکول کے طلاب کا بھی ایک کلب ہے جو مجمع جوانان ایران کے نام سے مشہور ہے اور جہاں اکثر شب میں مختلف مضامین پر لکچر بھی دیے جاتے ہیں ایرانیوں میں بسبب تعلیم اور روشن خیالی کے تعصب ہی کا نام نہیں۔ تبرا یا ایسی چیزوں کا جن سے سنیوں کے دل کو صدمہ پہونچے۔ مطلق رواج نہیں ہے اگر کسی ایرانی سے تبرا کا لفظ کہا جاوے تو وہ ہرگز نہیں سمجھیگا کہ اُس سے کیا مراد ہے۔ بجز اعیاد اسلام اور ایام ولادت ائمہ کے اور کسی دن کو وہ عید کا دن نہیں قرار دیتے۔ سنی۔ یہودی۔ پارسی اور ارمنی بالکل آزاد ہیں اور کسی دوسرے کے مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے پارلیمنٹ میں پارسی۔ یہودی اور ارمنی کے نمائندے منتخب ہوتے ہیں اور اندنوں مجلس شورے کا منتظم ایک پارسی ہے جسکا نام ارباب کیخسرو ہے اور جو طہران میں بہت ہی محترم ہے۔

ہر روز عصر کے وقت ایک فوجی بینڈ میدان سپہ میں عمارت بلدیہ کے مقابل
دوسرا میدان مجلس میں بجا کرتا ہے۔ موزیک سننے کے لئے ہزاروں مرد و زن جمع ہوا کر
مغرب کی اذان ہوتے ہی بینڈ بند ہو جاتا ہے لیکن کبھی کبھی بعد ختم اذان بجنا شروع ہوتا
مجلس شوریٰ اندنوں قاعدہ سے کام کر رہی ہے اور اکثر وکلائے مجلس پابند
کے ساتھ مجلس میں شرکت کرتے ہیں۔ ممبران مجلس میں سید حسن مدرس نہایت
با اثر و قابل شخص ہیں۔ اگرچہ وہ نجف اشرف کے تعلیم یافتہ ہیں اور جدید علوم
بالکل ناواقف ہیں لیکن اُنکی ایک تقریر جو میں نے وضع مالیات ارض یعنے
قانون مالگذاری کے متعلق سنی تھی اُس سے معلوم ہوا کہ اُن کو اکثر مسائل قتص
و سیاسی میں کافی مہارت حاصل ہے۔ مرزا حسین علائی جو اس سے پیشتر امر
سفیر تھے اور نصرۃ الدولہ فیروز مرزا جو سابق میں وزیر امور خارجہ کے عہدے
فائز تھے اور تقی زادہ جو اس سے قبل برلن میں محلہ کاوہ کے مدیر تھے مجلس کے
ممبروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اندنوں مجلس کے رئیس یعنی (Speaker
آقا موتمن الملک ہیں جو نہایت ہی قابل قانون دان اور مدبر شخص ہیں۔ اُنکے بھ
آقا مشیر الدولہ بھی مجلس کے ممبر ہیں جو نہایت ہی باعلم و تجربہ کار ہیں
نہاموشی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ بعضے واقعات مجلس شوریٰ کے میں لکھتا

اگر خیال طوالت مانع نہ ہوتا۔

ایران کی انتظامی حالت ان اوقات میں بہت ہی غنیمت ہے اور اسمیں شک نہیں آقا رضا خاں سردار سپہ نے بہت کچھ اصلاح کردی ہے محکمہ جنگ میں بہت کچھ ترقی ہوگئی ہے اور اسوقت ایران میں قریب ساٹھ ہزار فوج کے موجود ہے۔ بہت سے افسروں نے فرانس و جرمنی میں تعلیم پائی ہے اور جو یہاں کے مدرسہ حربیہ کے تعلیم یافتہ ہیں وہ بھی نہایت خوش اسلوبی سے اپنے خدمات کو انجام دے رہے ہیں۔ راستوں میں بہ نسبت پہلے کے بہت ہی اطمینان بخش امن وامان قائم ہوگئی ہے اور بجز اسکے کہ حال میں دو ایک حملے ترکمانوں نے مشہد و شاہرود کے درمیان قافلوں پر کردئے تھے اور کوئی ڈاکے نہیں پڑے۔ ایران و عرب میں عام طور پر اس قدر ڈاکے نہیں پڑتے جتنے ہندوستان میں ڈالے جاتے ہیں۔

نظمیہ یعنی پولیس کا انتظام بہت ہی قابل تعریف ہے اور زمانہ جنگ میں مجکو مشہد کی پولیس کے ساتھ بہت کچھ کام کرنے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے عموماً پولیس کو بہت ہی بادیانت پایا۔ پولیس پبلک کو بہت کم موقع شکایت کا دیتی ہے اور رشوت ستانی یا جھوٹے مقدمات بنانے کی شکایات بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اسمرتبہ طہران میں میں نے پولیس کو اپنے وظائف منصبی کے انجام دینے اور پبلک کے ساتھ تہذیب و شائستگی سے سلوک کرنے میں نہایت ہی سرگرم پایا۔

یہ پولیس کا حسن انتظام ہے کہ اکثر شہروں میں عام طور پر چوری و نقب زنی نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں جسقدر سرقہ کا جرم ہندوستان میں ہوتا ہے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہوتا۔ Finance Deptt ادارہ مالیہ میں بہت کچھ اصلاح ہو گئی ہے اور قریب دس بارہ امریکن مستشار کے اس میں مستخدم ہیں مستشار کل Administrator General ڈاکٹر ملیسپو Milispaugh امریکن ہے جسکو بہت وسیع اختیارات دئے گئے ہیں۔ خزانہ گمرک۔ ڈاکخانہ وغیرہ کے حسابات کی جانچ امریکاؤں کے متعلق ہے۔ اگرچہ کچھ دنوں اسیطرح امریکن خدمت انجام دیتے رہیں اور موانع خارجی و داخلی نہ حائل ہوں تو یہ ادارہ نہایت منتظم و مرتب ہو جائے گا۔ ہر اسلامی و مذہبی عید کے موقع پر شاہ یا ولیعہد ان دونوں شاہ کے چھوٹے بھائی ہیں دربار میں رسم سلام کے لئے تشریف لاتے ہیں اور سلام کے شروع ہوتے ہی توپ چلنے لگتی ہے اور ایک سو دس آوازیں ہوتی ہیں کیونکہ لفظ علی کا عدد بحساب ابجد ۱۱۰ ہوتا ہے۔

جو لوگ سلام کے لئے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اُن کا لباس عام سیاہ فراک کوٹ یا سیاہ سرداری جو ایک شیروانی سے مشابہ ہوتی ہے اور دھاری یا سیاہ پتلون اور سیاہ جوتا ہوتا ہے۔ جو لوگ سرداری پہنے رہتے ہیں اُنکو کا

ائی لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن فراک کوٹ والوں کو سخت کالر اور سیاہ
ائی پہننی پڑتی ہے۔ اسکے علاوہ ہر شخص پالتو یعنی اورکوٹ (Over coat]
یا عبا اوپر سے پہنکر جاتا ہے لیکن اطاق پذیرائی (Reception room)
میں داخل ہونے سے پہلے اپنے بالا پوش کو Cloak . room یعنی
بیرونی کمرہ میں چھوڑ دیتا ہے۔ جیسا تمام لوگ اُطاق پذیرائی میں جمع ہوجاتے ہیں
اُسوقت ہر شخص فرداً فرداً دوسرے کمرہ میں شاہ یا ولیعہد کی خدمت میں پیش
کیا جاتا ہے اور جاکر تعظیم کرتا ہے۔ شاہ یا ولیعہد اُس سے علی قدر مراتب کھڑے
کھڑے مزاج پرسی کرتے ہیں۔ اس طرح شاہ ہوں یا ولیعہد اُن کو گھنٹوں کھڑے رہنا
پڑتا ہے۔ میں جب عید ولادت حضرت علیؑ میں ولیعہد کی خدمت میں حاضر ہوا تو
وہ مجھ سے نہایت ہی خلق سے پیش آئے اور میرے بامحاورہ فارسی بولنے پر
بہت تعجب کیا اور اپنے مصاحبین خاص کی طرف خطاب کرکے فرمایا کہ "ایں
آقا خیلے خوب بامحاورہ حرف می زند۔ اُسکے بعد اُنھوں نے آگرہ کے تاج محل کی
بہت ہی تعریف کی میں نے بھی لکھنؤ کے دونوں امام باڑوں کا ذکر کیا۔ اُسپر
اُنھوں نے کہا کہ میں لکھنؤ اسٹیشن سے گذرا تھا اگر مجھ کو معلوم ہوتا تو میں ضرور جاکر
اُن کو دیکھتا۔

طہران اور دوسرے بڑے شہروں میں تعلیم یافتہ ایرانیوں کا لباس عام
یوروپین ہے بجز اسکے کہ سیاہ ٹوپی اور اوپر سے عبا پہنتے ہیں۔ اس امر کا خیال
رکھنا چاہیے کہ جو شخص ایران کو جائے وہاں اسکو ایک عبا خرید لینی چاہیے تاکہ
اشخاص محترم سے ملنے یا مقدس اماکن یا مذہبی جلسوں میں جائے تو اسکو ضرور پہن
ایران میں بدون عبا یا التو (Over Coat) کے ایسے موقعوں پر
نہایت ہی بدتہذیبی خیال کیا جاتا ہے۔ عورتوں کا بھی لباس یوروپین (اور
ہوگیا ہے البتہ اوپر سے وہ سیاہ ریشمی چادر یعنی برقع پہنتی ہیں۔ عورتیں عموماً
جوتے اونچی اڑیوں کے مثل فرینچ اور انگریزی لیڈیوں کے پہنتی ہیں۔ مجھکو
تیز چلتے ہوے دیکھکر نہایت ہی حیرت ہوتی تھی کہ اس خراب اور اونچی نیچی پڑی
اور برف باری کے بعد یخ بستہ کوچوں میں وہ کیونکر ایسے اونچے جوتے پہنے ہو
اس تیزی سے چلتی ہیں کہ دنیا میں کسی قوم کی عورتیں سوائے انگریزی اور امر
ایرانی عورتوں سے زیادہ تیز نہیں چل سکتیں۔ عورتیں عام طور سے ہر شریف
وضع کی اپنے گھروں سے باہر جاتی ہیں اور بازاروں میں خرید و فروخت کرتی
جمعہ اور دوسری مذہبی اعیاد میں ہزاروں عورتیں شاہ عبدالعظیم کو جو طہران
تین چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے زیارت و گردش کے لئے جاتی ہیں۔ اس

ریوں میں ہر روز کثرت سے عورتیں شمیران کو جو طہران سے چند میل کے فاصلہ پر
اقع ہے سیر و تفریح کے لئے جاتی ہیں۔

ایران میں بھی مثل دیگر ایشیائی اور یوروپین ممالک کے چند مخصوص مراسم ہیں
و دوسرے ملکوں میں نہیں ہوتے مثلاً عید نوروز جو ایرانیوں کی قومی عید ہے نہایت ہی
جشن و اہتمام سے منائی جاتی ہے۔ آفتاب کے برج حمل میں داخل ہوتے ہی خوشی کے
مراسم ادا کئے جاتے ہیں اور اسی وقت سے نیا سال شروع ہو جاتا ہے۔ ہر شخص اس روز
نئے کپڑے پہنتا ہے اور تحویل آفتاب سے پہلے ہر گھر میں تمام خاندان ایک صاف و پاکیزہ
مقام پر جمع ہوتا ہے۔ اور ایک سینی میں سات چیزیں رکھی جاتی ہیں جنکے نام حرف "س"
سے شروع ہوتے ہیں اور جنکو ہفت "س" کہتے ہیں مثلاً سرکہ۔ سبزی۔ سیب۔ سیر
سیاہ دانہ۔ سنجد۔ سمنو۔ ایک ظرف میں پانی دعا پڑھ کر رکھا جاتا ہے جسمیں سے بعد
تحویل کے خاندان کا ہر شخص کچھ پانی پیتا ہے۔ ایک ظرف میں سرخ زندہ مچھلی بھی رکھی
جاتی ہے اور انڈا۔ دودھ۔ پنیر۔ دہی۔ مچھلی پکی ہوئی اور بغیر پکی ہوئی اور مرغ پکا ہوا
اور بغیر پکا ہوا اور چاندی اور سونے کے سکے بھی رکھے جاتے ہیں۔ مختلف رنگ
کی شمع روشن کی جاتی ہیں خواہ تحویل آفتاب دن کو واقع ہو یا شب کو اور وہ خاموش
نہیں کی جاتی ہیں مگر یہ کہ خود ہی جلکر تمام ہو جائیں۔ ہر شخص جنتری سے تحویل کے وقت کو

ساعت اور دقیقہ اور ثانیہ کے ساتھ جانتا ہے اور صاحب خانہ تحویل سے پہلے
مکان کے باہر چند دقیقہ کے لئے چلا جاتا ہے اور جونہی تحویل کا وقت آ
میں داخل ہوتا ہے اور اپنے گھر کے لوگوں کو سونے کے سکے بطور عیدی کے د
تحویل کے وقت عموماً لوگ ایک مخصوص مختصر سی دعا پڑھتے رہتے ہیں۔ عید۔
دنوں پہلے لوگ اپنے گھروں میں کسی ظرف گلی یا مٹی میں جو گیہوں یا پھول وغیرہ
ہیں اور عید کے روز دسترخوان پر اُس سبزی کو بھی رکھ دیتے ہیں اور تیرھویں
تمام لوگ نحوست سال کو دور کرنے کے لئے گھروں سے باہر جاتے ہیں اور جسکو
کہتے ہیں اُس سبزی کو لیجا کر میدان میں پھینک دیتے ہیں۔ جوان ناکتخدا لڑ
سبزی پھینکتے وقت کہتی ہیں "سیزدہ بدر سال دگر۔ خانۂ شوہر بچہ بہ بغل" ا
میں جو سبزی ہوتی ہے اُسمیں گرہ لگاتی ہیں اور کہتی ہیں" زردی من از تو، و
از من" سیزدہ بدر کی ایسی رسم ہے کہ ہر شخص مرد و عورت اور بچہ ضرور اس روز
مکان سے باہر نکل جاتا ہے اور لوگ نہایت ہی جشن اور سرور میں مشغول ہوتے
بڑے شہروں میں اُس روز خاص طور پر پولیس انتظام کرتی ہے کہ کوئی شخص
عورتوں سے غیر مہذبانہ طریقہ پر نہ پیش آئے۔ بہت سے مذہبی خیال کے لوگ
منانے کے لئے عراق یا مشہد یا قم زیارت کرنے چلے جاتے ہیں۔ طہران سے ہزار

قم چلے جاتے ہیں کیونکہ بذریعہ موٹر کے طہران سے قم چند گھنٹوں میں انسان پہونچ
سکتا ہے۔ اسیطرح بہت سے لوگ شاہ عبدالعظیم چلے جاتے ہیں۔ عید کے دوسرے روز شب کے
ہر شخص مرغ مسلم کھاتا ہے یہ دیسی مرغ ہوتا ہے جو پکا ہوا دسترخوان پر تحویل کے وقت
رکھا جاتا ہے مچھلی کا صرف اُسدن اسقدر ہوتا ہے کہ ملک روس اور انزلی وغیرہ سے
مچھلیاں خشک کی ہوئی بکثرت ایران میں دوکاندار بیچنے کے لئے منگاتے ہیں۔
مٹھائی کا بھی صرف اتنا ہوتا ہے جتنا ہندوستان میں دیوالی کے زمانہ میں ہوتا
ہے۔ مراسم تحویل ادا کرانے کے بعد ہر شخص اپنے دوستوں امرا اور علما سے ملنے جاتا ہے
اور بعضے رؤسا و متمولین اُس روز لوگوں کو علی قدر مراتب عیدی دیتے ہیں عیدی
میں سونے کے سکے یا اشرفی پانچ ہزاری یا دو ہزاری دی جاتی۔ نوروز کے پہلے
کثرت سے پنجہزاری دو ہزاری کے سکے صرافوں کی دکانوں پر بکتے ہیں۔ سونے کی پنجہزاری
بقدر چونی اور دو ہزاری بقدر دونی کے ہوتی ہے۔ اصل میں پنجہزاری دو ہزاری
سکے چاندی کے ہیں جو پانچ قران اور دو قران کے ہوتے ہیں اور سونے کے صرف
عیدی دینے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ زمانہ جنگ میں ایک سال عید کے
موقع پر میں شاہرود میں تھا۔ وہاں شاہزادہ امیر اعظم حاکم شاہرود نے مجھکو دو اشرفی
ناصر الدین شاہی عیدی دی تھی اور دوسرے موقع پر مشہد مقدس میں آقا قوام السلطنہ

والیِ خراسان نے ۵ سونے کی تھجراریاں دی تھیں۔ طہران، اصفہان وغیرہ میں
بعض اُمرا عید کے دن ہزاروں روپیہ عیدی دینے میں صرف کرتے ہیں لیکن
اب اسمیں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے۔

عید نوروز ایران میں تیرہ روز تک منائی جاتی ہے اور اکثر تجار وکسبہ اس
مدت تک کام کرنا بند کر دیتے ہیں۔ عام طور پر لوگ ایک دوسرے سے ملنے جاتے ہیں
اور ہر جگہ کثرت سے مٹھائی اور چاے صرف ہوتی ہے۔ تیرھویں تاریخ کو سیزدہ
کی رسم ادا کرنے کے بعد لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں۔ جیسا یورپ کی
قوموں میں انگریز بڑے دن کو نہایت اہتمام سے مناتے ہیں اسیطرح ایشیا کی تمام قوموں
میں ایرانی اپنی قومی عید کے مراسم کو بہت ہی سرگرمی سے ادا کرتے ہیں۔ واضح
رہے جیسا ایران میں نوروز کے دن عیدی دینے کا دستور ہے اسیطرح انگریزوں میں
بھی کرسمس کے زمانہ میں ہدیہ وتحفہ دینے کا رواج ہے۔ انگلستان کے دیہاتوں میں
رات کے وقت لوگ کرسمس کی مخصوص گیت گاتے ہوے لوگوں کے دروازوں پر جاتے
ہیں اور صاحب خانہ اُنکو مٹھائی اور کچھ مشروبات دیتا ہے اور صبح کے وقت
لوگوں کے مکانوں پر جاتے ہیں اور اُن کو کچھ پیسے دیدیئے جاتے ہیں۔

●●●

مسلمان اور سائنس



ارسطو کی گاڑی کے تقلیدوں نے

کیا خود بھی کچھ کام کیا ہے؟

فلسفہ نہ منطق نہیں،

اور خاص کر سائنس نہیں!

سیزگین نے اس موضوع پر جو مفید خطبات دیے ہیں، پاکستان کے صفِ اوّل دانشور و نظر نے انھیں اپنے چند شمارے میں ترجمہ کر دیا۔ موضوع ایسا ہے جس پر بہت کم لکھا، لوگوں کو پیاس رہتی ہے اسلیے ہم نے مناسب جانا کہ "جرنل" میں پیش کر دیں۔

ادارہ

ٹر فؤاد سیزگین
مه : ڈاکٹر خورشید رضوی

تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام

مشہور معاصر ترک فاضل ڈاکٹر فؤاد سیزگین کی ذات کسی
ارف کی محتاج نہیں ۔ تاریخ علوم و کتابیات عربی پر انکی مبسوط
رمن تالیف Geschichte des Arabischen Shrifttums
اریخ التراث العربی) عالم گیر شہرت رکھتی ہے۔ تاریخ حدیث پر
، کے نتائج تحقیق خصوصیت سے اہم سمجھے جاتے ہیں ۔
,,جامعة الامام محمد بن سعود الاسلامية ،، کی دعوت پر ریاض جا
ر انھوں نے عربی میں سات خطبات دیئے جنھیں جامعہ نے ۱۳۹۹ ھ/
۱۹۷۹ ء میں ـــ (اسی سال ڈاکٹر فؤاد سیزگین کو شاہ فیصل ایوارڈ
یا گیا) ـــ ,,محاضرات فی تاریخ العلوم،، کے عنوان سے شائع کیا ۔
ن میں سے پہلے خطبے ,,مکانة المسلمین فی تاریخ العلوم،، کا اردو
جمه ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ کھڑے بریکٹ میں مختصر اضافے
اقم کی طرف سے ہیں ۔ ان اضافوں کے لئے مندرجہ ذیل مصادر سے
ستفادہ کیا گیا ہے۔

(1) Dictionary of Scientific Biography,

American Coucil of Learned Societies New York — 1981.

(2) George Sarton, Introduction to the History of Science, Carnegie
Institution of Washington 1927 onwards

Encyclopaedia Britanica, 15th ed. 1985

Wüstenenfeld Mahler Sche, Vergleichungs — Tabellen,

sbaden, 1961 .

(۵) القفطی، علی بن یوسف، إخبار العلماء باخبار الحکماء، مط
السعادة مصر ۱۳۲۶ ھ

(٦) الزرکلی، خیرالدین، الأعلام، قاموس تراجم. دوسرا ایڈی
مطبعة کوستاتسوماس وشرکاء، ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء وبعد

(مترجم

ہر چند کہ مورخین علوم کے ہاں، مختلف علوم کی تاریخ
بدلتے ہوئے منظر نامے کی اہمیت ایک حقیقت مسلّمہ ہے تاہم
علمی تاریخ کی کتابوں میں، کئی صدیوں سے ایک تصور شدت
غالب چلا آتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علوم کا ارتقاء ــ خص
ان علاقوں میں جو بحیرہ روم کے طاس میں واقع ھیں ــ دو
سیاسی مرحلوں سے گزرا ہے۔ ایک یونان قدیم کا مرحلہ دوسرے مغ
دنیا کا مرحلہ جس کا آغاز ,,تحریک احیائے علوم،، کے مظہر سے
ہے۔

تاریخ فکر انسانی کے خط و خال اجاگر کرنے کے ضمن م
گزشتہ چند صدیوں کی تحقیقات سے ایسے نتائج سامنے آ چکے
جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نتائج یقیناً اس قابل تھ
مورخین علوم کی توجہ انکی طرف مبذول ہوتی اور انکی روشنی
نسلوں سے چلا آنے والا مذکورہ بالا تصور تبدیل ہو جاتا۔
موجودہ صدی کی پہلی دو تہائیوں کے آغاز سے عملاً ڈنمارک
عالم اوتو نویگباور (OTTO NEUGEBAUER) کی اہم مساعی سامنے

کا مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ یونانیوں کو تاریخ علوم کے ضمن
اولیت حاصل نہیں بلکہ انھیں زمانہ ماقبل اسلام کی بعض اقوام
کار گزاری ورثے میں ملی تھی ۔ اس عالم کو بالآخر شاکیانہ انداز
یہ کہنا پڑا کہ :

,,ہر وہ کوشش جو یونانیوں کے کارناموں کو ان سے پہلے کی
دیگر اقوام سے مربوط کرنے کے لئے کی جاتی ہے شدید مخالفت
سے دو چار ہوتی ہے ۔ کوئی بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ یونانیوں
کی حیثیت سے متعلق جس تصور کا وہ عادی ہو چکا ہے اس
میں کوئی تبدیلی لائی جائے ۔ یہ کیفیت ان تمام تحقیقات کے
علی الرغم ہے جن سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یونانی دور سے
قبل ڈھائی ہزار برس کا زمانہ موجود ہے جس میں مختلف ایسے
کارنامے انجام دیئے گئے جن کے ہوتے ہوئے یونانیوں کا مقام،
تاریخ علوم کے وسط میں متعین ہوتا ہے نہ کہ اسکے آغاز میں،،[۱]

گذشتہ دو صدیوں کے دوران علوم عربیہ پر مستشرقین کی
قات نے تاریخ علوم کے اس غلط تصور کو متزلزل کرنے میں کچھ
کھایا ۔ مگر وہ تقریباً اس متواضعانہ اعتراف سے آگے نہیں بڑھتا
ربوں نے قدیم یونانیوں اور ، احیائے علوم کے دور میں، لاطینیوں کے
، واسطہ بننے کی خدمت انجام دی ۔

اس ضمن میں میری خواہش ہے کہ اس موضوع پر کلمۂ حق
کروں اور مجملاً امر واقع کا اظہار کروں ۔ ساتھ ہی ساتھ
ے اس امر کا اعتراف ہے کہ جدید تحقیقات کے نتائج ۔ اگرچہ ہنوز
ود ہیں ۔ بہرحال حقیقت کا سراغ پانے اور اسکا اظہار کرنے کی
ش میں ہیں ۔ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد بھی مورخین علوم ،
یوں اور احیائے علوم کے مابین ایک ایسے مرحلے کو نظر انداز کرتے
ائی دیتے ہیں جس میں بڑی تازہ کاری کا ظہور ہوا ۔

میری ان معروضات میں کلمۂ حق کا تقاضا ہے کہ میں تاریخ علوم میں عربوں کے ظہور کی مناسبت سے چند نکات کی نشان دھی کرتا چلوں :

اول یہ کہ ,,عربوں کے ہاں ابتدائے علوم کی تاریخ،، - نیز یہ کہ یہ ,,کس مرحلے کے علوم،، تھے - کے مسئلے پر ہنوز اختلاف رائے پایا جاتا ہے -

اس ضمن میں میرا نقطۂ آغاز اکثر محققین سے جداگانہ ہے - میری رائے یہ ہے کہ اسلام میں فکری و عملی نتیجہ خیزی پہلی صدی ھجری ھی میں شروع ہو گئی تھی -

میں اس بحث کے اجمال پر ھی اکتفا کروں گا اور ان تاریخی شواھد سے صرف نظر کروں گا جن کی تفصیل میں جانا یہاں ممکن نہ ہو گا -

اسلامی معاشرہ جس کی تشکیل پہلی صدی ھجری کے وسط سے مختلف منظر ناموں، متعدد ثقافتوں اور متفرق زبانوں سے مل کر ہونی شروع ہوئی ، فی الواقع مختلف مکاتب فکر اور انکے افکار کا نقطہ اتصال بن گیا - جبکہ اس سے قبل یہ سب عناصر ایک دوسرے سے جدا تھے - اور ایک دوسرے پر ان کا اثر تقریباً مفقود تھا -

یہی وہ معاشرہ تھا جس نے رابطہ پیدا کیا اور اسی میں فکر انسانی کے ایک نئے دور نے جنم لیا - ھمیں اس اُمر میں قطعاً شک نہیں کہ ابتدائی مسلمان حکام کا رویہ ، اجنبی ثقافتوں کے حاملین کی جانب سے پیش آمدہ صورت حال کے روبرو ، بے خبری کا رویہ نہ تھا -

لوگوں میں ایک گروہ ایسا ہے جس کے لئے یہ رائے قابل قبول نہیں کیونکہ ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب اس حد تک سادہ تھے کہ ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اُن نئے حالات پر کوئی ردّ عمل پیدا کر سکیں، جن سے وہ دوچار ہوئے ... ایسا تصو

رکھنے والوں کی خدمت میں ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اس بحث میں اساسی نقطہ یہ ہے کہ عرب ۔ کم از کم جغرافیائی اعتبار سے ــ بابلی آرامی اقوام کے وارث تھے ۔ اور اگر ایک اور زاویے سے دیکھا جائے تو وہ آس پاس کی متمدن اقوام سے مکمل طور پر کٹے ہوئے بھی نہیں تھے ۔

اس حقیقت کو سمجھے بغیر دور جاہلیت کی عربی شاعری کے بلند فنی ارتقاء اور دل کش صنعت گری، دوسری صدی ھجری کے نصف اول اور نصف ثانی میں علم نحو کی تیزی سے رونمائی اور اسکی وسیع پیش رفت نیز یونانی کتب کے ترجمے اور متعلقہ موضوعات پر ان سے اثر پذیری سے قبل نباتات ، حیوانیات اور موسیقی جیسے بعض علوم کی عجیب و غریب نشو و نما کا راز پانا از بس دشوار ہوگا ۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں، دیگر اقوام کے علوم و معارف کو بےتکلف اخذ کرنے کی کوشش میں ایک اہم محرک کا بہت بڑا دخل تھا ۔ اس محرک کی وضاحت فرانز روز نتھال کے اس مختصر تبصرے سے ہو جاتی ہے جو ان کی کتاب ,,اسلام میں قدیم یونانیوں کے علوم کا تسلسل (۲) « میں وارد ہوا ہے اور جس میں وہ کہتے ہیں :

,,غیر زبانوں سے کتابوں کا ترجمہ کرانے کا وسیع کام ایک ایسا مظہر ہے کہ عملی یا نظری فائدہ محض کا محرک اسکی توجیہ کے لئے کافی نہیں ۔ بلکہ ضروری ہے کہ علم کے بارے میں خود دین اسلام کے موقف کو بھی سمجھا جائے اور یہی موقف بہت بڑا محرک تھا نہ صرف زندگی کے دینی پہلو کیلئے بلکہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کیلئے ۔ اسلام کا یہی موقف علوم کی جستجو اور انسانی دانش تک رسائی کے دروازوں کو کھولنے کیلئے سب سے بڑا محرک تھا ۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ترجمے کا کام

صرف عملی زندگی کی بعض ضروری اشیاء تک محدود رھتا۔

میں یہاں اجمالاً اس بات کا اعادہ کرنا چاھوں گا کہ اجنبی علوم کا مرحلہ، تاثر کے اعتبار سے، ظہور اسلام کے بعد تھوڑی سی مدت میں شروع ہو چکا تھا ۔ اس کا ذریعہ پہلی صدی ھجری میں بعض کتب کے ترجمے کی وساطت سے اصحاب علوم سے رابطہ تھا ۔ اس کی حقیقت وہ نہیں جو بعض مورخین خیال کرتے ھیں یعنی یہ کہ یہ مرحلہ دوسری صدی ھجری کے وسط کے بعد، خلافت عباسیہ کے آغاز کے ساتھ، اور دوسری صدی کے انجام اور تیسری کے آغاز کے موڑ پر خلیفہ مامون کے قائم کردہ ,,بیت الحکمۃ،، کی تأسیس کے بعد پیش آیا ۔ اسلام کی فکری تاریخ میں اس ,,بیت الحکمۃ ،، کی اھمیت میں مبالغے سے کام لیا جاتا رہا ہے اور اسکی حیثیت کو بالکل غلط انداز میں سمجھا گیا ہے ۔

استفادے کا معاملہ ۔ جسکا آغاز بہت ابتدائی زمانے سے ہوا اور جو حیرت خیز تیزی سے ترقی کرتے ہوئے استفادے سے تقلید تک جا پہنچا ــــ تیسری صدی ھجری کے اواسط سے اختراع و تازہ کاری کے مرحلے میں داخل ہو گیا ۔

پھر اس مرحلے میں بھی کہ جسے غالب رنگ کے اعتبار سے استفادہ و تقلید کا مرحلہ کہا جاتا ہے عالم اسلام کے علماء نے عربی شعر کی پیمائش اوزان کا علم یعنی علم عروض ایجاد کیا اور علم لغت و نحو کو ترقی دی ۔ علم کلام و فلسفہ کی اصطلاحات کا وسیع ذخیرہ، اصول فقہ اور خود فقہ کا علم جو مختلف قواعد پر استوار ہے ، اس پر مستزاد ھیں ۔ اس ضمن میں عربوں کا یہ تصور بھی قابل ذکر ہے کہ الجبرا ایک مستقل چیز ہے نہ کہ اعمال حسابیہ کی ایک فرع ۔ اسی طرح ہم

ـانش کیلئے ایسا طریقہ وضع کرنے کا اهتمام کیا جو
اطوستانس [ERATOSTHENES۔ تقریباً ۲۷۶ ــ ۱۹۵ ق ۔ م]
، اس طریقے سے مختلف تھا جسے غالباً اهل بابل سے اخذ کیا
ا اور جسکی درستی کا انحصار اتفاقات کے عنصر پر تھا ۔

اسی مرحلے پر عرب علماء تیقّن کے ساتھ اس نتیجے پر
ـنچ گئے کہ بطلیموس [Ptolemy۔ تقریباً ۱۰۰ ـ ۱۷۰ء] کے
اسات اور فلکی زانچے غلطیوں پر مشتمل هیں ۔ چنانچہ انکی
ـحت کی جانچ پرکھ ، اور تصحیح و تکمیل ضروری ہے ۔
ـی طرح انھوں نے چاند دکھائی دینے کے فرق کا قیاس ایسے
ـسابی طریقوں پر قائم کر لیا جو یونانیوں کے هاں غیر معروف
ے ۔

انھوں نے جغرافیہ پر بھی قلم اٹھایا چنانچہ ایک طرف ان
ـرافیائی نتائج کو جانچا جو یونانیوں کی وساطت سے ان تک
ـنچے تھے اور دوسری طرف اس جانچ پرکھ کے نتیجے میں
ـھوں نے کرۂ ارض کی حدود معلومہ میں وسعت پیدا کی ۔

اس مرحلے میں عربوں نے علم کیمیا کو نظری و عملـی
ادوں پر استوار کیا اور اس ضمن میں ان نتائج پر انحصار کیا
ـن تک مختلف اقوام نے اسلام سے فوراً پہلے کے دور تک
ـائی حاصل کی تھی لیکن ان کے هاں رابطہ باھمی کی وہ
ورت نہ ابھر سکی تھی، جس کے ذریعے وہ ایک دوسرے سے
ـر قبول کرتے اور بالآخر ایک جامع اور مہتم بالشان امتزاج
ـک پہنچ جاتے ۔ (حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں مجھے
ـققین کی اکثریت سے اختلاف ہے جن کا خیـال یہ ہے کہ
ـلمانوں کے هاں ,,علم الصنعۃ،، کے نام سے علم کیمیا کی بنیاد
ـتھی، صدی هجری سے قبل نہیں رکھی جا سکی تھی ۔)

هم تاریخی حقائق سے انحراف کے مرتکب نہ ہوں گے اگر هم یہ تصور کریں کہ استفادہ و تقلید کا مرحلہ تیسری صدی هجری کے اواسط میں آکر اختراع و تازہ کاری کے مرحلے میں داخل هو گیا تھا ۔ اسی طرح هم اس مرحلے ۔ یعنی اختراعی مرحلے ۔ کی ابتداء کا سنگ میل اس نقطے کو قرار دے سکتے هیں جب مسلمان علماء کو اپنے بارے میں یہ شعور حاصل هوا کہ وہ اختراع و تازہ کاری پر قادر هیں اور نتیجةً اس بات پر بھی قادر هیں کہ ان حقائق تک رسائی حاصل کریں جن تک ان سے پہلے اهل یونان کی رسائی نہ هو سکی تھی ۔

اگر اس شعور کی ایک مثال مقصود هو تو هم ,,بنی موسیٰ،، کے نام سے معروف تین مشہور بھائیوں [ابو جعفر محمد بن موسیٰ ، (م ۲۵۹ ھ / ۸۷۳ء) ، ابو القاسم احمد بن موسیٰ ، الحسن بن موسیٰ] کے موقف کا ذکر کر سکتے هیں جو ارشمیدس [ARCHIMEDES ـ تقریباً ۲۸۷ ـ ۲۱۲ ق ـ م] اور ابلونیوس [APPOLONIUS ـ م ـ دوسری صدی ق.مُ کا آغاز] پر ایک مشترکہ تحقیقی مطالعے میں مصروف رہے ـ یہ تینوں بھائی ,,ﷺ،، کے یونانی عدد کی حد بندی قدماء کے مقابلے میں زیادہ باریکی کے ساتھ کرنا چاهتے تھے ـ نیز انھیں زاویے کو تین متساوی اقسام میں تقسیم کے مسئلے کا نیا حل مطلوب تھا ـ اور بسا اوقات وہ ان اغلاط کی درستی بھی کرتے تھے جو انکی رائے میں ابلونیوس کی کتاب ,,المخروطات،، [CONICS] میں سرزد هو گئی تھیں ـ

اسی طرح ریاضیات کے میدان میں هم یہ ذکر کر سکتے هیں کہ الماهانی [ابو عبداللہ محمد بن عیسی، م. تقریباً ۲۶۷ ھ ۸۸۰ ع] نے تیسری صدی هجری کے اواسط میں یہ کوشش

رازی [ابو بکر محمد بن زکریا۔تقریباً ۲۴۰/ ۸۵۴ ء ۔
۳ ھ/۹۳۵ ء]نے طب اور بصریات کے میدان میں اقلیدس
Eucli ، زمانہ،تقریباً ۲۹۵ ق م] اور جالینوس[GALEN ۔
یباً ۱۲۹ ۔ ۲۰۰ ء] کے اس قول کو رد کیا کہ اشیاء کے
ہانی دینے کا عمل بینائی کے آنکھ سے نکل کر اشیاء کی
ف جانے سے عبارت ہے۔ رازی وضاحت کرتے ھیں کہ دکھائی
ے کا عمل مادے سے آنکھ تک روشنی کی رسائی پر مبنی ہے۔
ی طرح انکی یہ رائے ہے کہ آنکھ کی پتلی، آنکھ میں
فل ہونے والی روشنی کی مقدار کی مناسبت سے سکڑتی یا
ہلتی رہتی ہے۔

ایک اور مثال الکندی [ابو یوسف یعقوب بن اسحاق
صبّاح ۔ تقریباً ۱۸۵ ھ/ ۸۰۱ ء ۔ ۲۵۲ھ/۸۶۶ء] کی ہے جو
ر علویہ (METEOROLOGY) کے میدان میں ارسطو اور دیگر
مائے یونان کے نتائج سے اختلاف کرتا ہے اور بعض نہایت اھم
اء پیش کرتا ہے جن میں سے بعض دور جدید کے نتائج سے دور
یں ۔

میری رائے میں ,,عطاء و اختراع،، کے مرحلے کے دو پہلو
یاں ھیں : ایک یہ کہ پانچویں صدی ھجری کے اواسط تک
ماء خود کو بڑی حد تک قدیم یونانیوں کے شاگردوں کی صف
ں میں شمار کرتے رہے حالانکہ وہ خود علوم کے جملہ پہلوؤں
ں شاندار جدید نتائج تک پہنچ چکے تھے ۔ دوسرے یہ کہ
کورہ بالا زمانے کے بعد سے یہ علماء خود کو ۔ دیگر اقوام سے
لع نظر ۔ صرف اپنے مسلمان اساتذہ کے کارناموں کا تسلسل
یال کرنے لگے ۔

,,عطاء و اختراع کے اس مرحلے کی آخری حدود کیا تھیں؟
ں سلسلے میں محققین کی ھاں یہ تصور غالب ہے کہ اسلام

علوم میں جمود کا آغاز ساتویں صدی ھجری سے ہوا ۔ میں یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے ان محققین کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیونکہ یہ ان حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا جن کا انکشاف بہت سی ایسی تحقیقات سے ہو چکا ہے جو ,,جمود سے متصف،، اس صدی کے بعد آنے والے علماء کی کاوشوں سے متعلق ہیں ۔

یہ ثابت کرنے کے لئے دلائل کی چنداں ضرورت نہیں کہ علوم عربیہ ، ساتویں اور آٹھویں صدی ھجری میں اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گئے تھے ۔ مثال کے طور پر دوران خون کے سلسلے میں ابن النفیس [علاء الدین ابو الحسن علی بن ابی الحزم م ۔ ٦٨٧ ھ/ ١٢٨٨ ء] کی دریافت ، چھوت کے مسئلے پر لسان الدین ابن الخطیب [محمد بن عبداللہ بن سعید السلمانی ٧١٣ ھ/١٣١٣ ء ۔ ٧٧٦ ھ/ ١٣٧٤ ء] کی وضاحت اور نصیر الدین طوسی [محمد بن محمد بن الحسن ٥٩٧ ھ/ ١٢٠١ ء ۔ ٦٧٢ ھ/ ١٢٧٤ ء] کی طرف سے علم المثلثات [TRIGONOMETERY] کو ایک مستقل علم کی حیثیت سے وضع کرنے کا ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ یاد رہے کہ اہل غرب بالعموم علم المثلثات کو مستقل حیثیت دینے کا سہرا ریجیو مونتانوس (REGIOMONTANUS) [جرمن حساب دان و ماہر فلکیات ، JOHANN MULLER کا لقب ۔ ١٤٣٦ ھ ۔ ١٤٧٦ ء] کے سر باندھتے ہیں جو پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہوا ہے ۔

مزید براں ساتویں اور آٹھویں صدیٔ ھجری کے دوران شرف الدین طوسی [المظفر بن محمد بن المظفر ۔ م تقریباً ٦١١ ھ/ ١٢١٤ ء] کی طرف سے چوتھے درجے کی مساوات کی تنظیم اور اس پر بحث ، علم ریاضیات میں غیاث الدین الکاشی [یا

تعدد اهم دریافتیں ، علم الفلک میں قطب الدین شیرازی
محمود بن مسعود بن مصلح ٦٣٣ ھ/ ١٢٣٦ ء ـ ١١> ھ/
١٣١' ء] اور ابن الشاطر [علاء الدین ابو الحسن علی بن
براهیم ـ تقریباً ۴۰۳> ھ/ ١٣٠۵ ء ـ >>> ھ/ ١٣<۵ ء] کی
نا ندار مساعی اور فلسفه تاریخ اور علم الاجتماع کی تاسیس
کو بھی ذهن میں رکھنا چاهئیے ـ

یہاں میرا مقصد یه نہیں که عربی میں لکھنے والے علماء
کے کارناموں کو شمار کرنے کی کوشش کروں ـ ایسی کوشش کے
لئے تو کئی خطبے درکار هوں گے ـ علاوه ازیں اس میدان میں
تحقیق خود ابھی اپنے سفر کے آغاز میں ہے ـ میرا مقصود صرف
تنا ہے که تاریخ علوم میں عرب مرحلے کے بعض اهم امتیازی
وصاف کا ذکر کر دوں ـ

میری رائے میں تاریخ علوم میں مسلمان علماء کے ظهور نے
یک اهم مظهر کی تشکیل کی ـ وه یه که علم و دانش کے مراکز ـ
ـن میں اسلام سے فوراً قبل کے دور تک یونانی اور بابلی
علوم کا ورثه ارتقا کے ایک خاص مرحلے تک پہنچ چکا تھا ــــ
ب ان کیلئے باهمی تاثیر و تاثر کے امکانات بڑی حد تک مفقود
ہے ـ لیکن جلد هی اسلامی معاشرے کی صورت میں ارتکاز کا
ہ عنصر میسر آ گیا جو علم و دانش کے مراکز کو باهمی تاثیر و
اثر کے امکانات فراهم کر سکتا تھا ـ

ایک اور بات بھی بہت اهم ہے ـ وه یه که ــ اسلام سے
وراً قبل کے دور میں ـ بعض علماء اپنی تالیفات کو بعض
شهور قدیم علماء کے نام سے منسوب کر دینے کا رجحان رکھتے
ہے اور اس طرح خود کو ان علماء کے پیچھے چھپا لیتے تھے ـ
اید یه خود اعتمادی کے فقدان کا نتیجه تھا یا ممکن ہے بعض

سے منسوب کرنے پر آمادہ رہتے تھے ۔

یونان کے مشہور علماء سے منسوب یہ جعلی کتابیں علم
دانش کے مراکز میں متداول تھیں ۔ بعد ازاں انھیں کو اول
مآخذ کی حیثیت حاصل ہو گئی پھر یہ ترجمے کی وساطت
مسلمانوں تک پہنچیں ۔حالانکہ اس جعل سازی یا غیر حقیقی
مؤلفین کی طرف نسبت میں ان کا اپنا کچھ دخل نہ تھ
انھی جعلی کتابوں کی وساطت سے یونانی علوم کی اھمیت
دھوم ھوئی اور لوگوں کو ان کے عظما ، یا مؤلفین کے نام مع
ھونے ۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلّق ہے سو ان کے ھاں بدیہ
علم و دانش سے استفادے کی صورت حال نے آغاز ھی
— بلا تردد اور بغیر کسی داخلی اضطراب یا نفسیاتی الج
کے — اپنے پیشرووں کے بارے میں ایک واضح موقف پیدا کر
تھا ۔ اور اس عظیم الشان موقف کی اھمیت اس وقت وا
ھوتی ہے جب ھم اسکا موازنہ لاطینیوں کے اس موقف سے
ھیں جو انھوں نے اپنے اساتذہ، یعنی عربوں کے بارے میں ا
کیا ۔

تاریخ علوم میں داخل ھونے والے جس عنصر کو ,,وض
سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کے حوالے سے ھم ایک اھم بہ
گفتگو کر سکتے ھیں اور وہ ہے عرب علماء کے ھاں
پیشرووں کی جانچ پرکھ کا عمومی انداز ۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان علماء نے اپنے پیش رووں سے
و استفادہ کیا ۔ اور پہلی تین ھجری صدیوں میں وہ ا
استفادہ پر مجبور تھے ۔ انھوں نے یونانیوں سے، ھندوؤں

ضرورت بھی تھی کہ ان پیش رووں کی کتابوں کو سمجھنے کیلئے ان کے جانشینوں سے مدد لیں کیونکہ وہ اصحاب دانش کے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو واسطے کا کام دے سکتے تھے ایک ھی معاشرے میں رہ رہے تھے - یہیں سے ھم اس سبب کو سمجھنے کے لائق ھوتے ھیں جس نے ان کے دلوں سے غیر قوم کے اساتذہ کے سامنے متکبرانہ روش اختیار کرنے کی نفسیاتی گرہ دور کر دی، انھیں ان کے روبرو تواضع کا رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا اور اپنی تنقید میں تردد یا احتیاط کا ایک خاص موقف اختیار کرنے پر مائل کیا -

اس بات کا یہ مفہوم نہ سمجھا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے پیش رووں پر مطلقاً تنقید نہیں کی یا انکے ھاں قدماء پر تنقید کا حوصلہ نہیں پایا جاتا تھا - حقیقت اسکے برعکس ہے کیونکہ انھی علوم میں مسلمانوں کی دل چسپی کی تاریخ دیکھی جائے تو انھوں نے بہت آغاز ھی میں قدماء پر تنقید کی - ھاں یہ ضرور ہے کہ انکی تنقید ایک خاص وضع پر تھی جو علمائے عرب کی اپنی ہے - مختصر ترین الفاظ میں اسکی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ تنقید کا ایک اخلاقی اسلوب ہے اور ان ناقدین کو بڑی وضاحت کے ساتھ قانون ارتقائے علوم کا ادراک حاصل تھا -

مسلمانوں کے وہ اصول ، جنکی بنیاد پیشرو اقوام کے محرک علمی کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے پر تھی ، کئی بنیادوں پر قائم ھیں - ایک یہ کہ بعد میں آنے والے اپنے پیش رووں کے منّت پذیر ھیں - اور بعض غلطیوں یا لغزشوں کے واقع ھونے سے اُن پیش رووں کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں آتی نیز یہ کہ پیش

کسر شان اور حرف گیری میں مبالغے سے کام نہ لیا جائے۔ مسلمان علماء کی رائے میں کوئی بھی عالم خواہ کتنا ھی عظیم المرتبت کیوں نہ ہو غلطی سے محفوظ اور لغزش سے مبّرا نہیں ان اصولوں نے ان کے ھاں تنقید کے اخلاقی اصولوں کی بنیاد رکھی اور ان کی تنقید کو مفید اور باثمر بنایا۔ تاھم محققین کی ایک بڑی تعداد اس حقیقت سے غافل رھی اور امر واقع کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو کر عالم اسلام کے علماء پر تنقیدی صلاحیت کے ضعف اور قدماء کی تقلید محض کا الزام عائد کرتی رھی۔

اس موقف کی ایک مثال پیش کرنے کے لئے میں ۱۹۵٦ء کی بوردو [BORDEUX] کانفرنس کے شرکاء میں سے ایک محقق کا ذکر کروں گا۔ اسلامی علوم میں جمود کے سبب پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ علمائے اسلام کی مساعی بس اسی قدر تھیں کہ انہوں نے جو کچھ اپنے اساتذہ سے سیکھا وہ تقلیدی انداز میں ٹھیک ٹھیک آئندہ نسلوں تک پہنچا دیا انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ان علماء میں خود اعتمادی کی کمی تھی۔ اور انہوں نے اپنے اساتذہ کے بعد کوئی نئی شے اختراع کرنے کی کوشش نہیں کی (۳)۔

اس قسم کی رائے کی تنقیص کو سب سے پہلے تو اتنا ھی کافی ہے کہ اس عظیم فرق پر نگاہ ڈالی جائے جو بعد کی صدیوں میں شاگردوں کے کام اور اُن سے پہلے اُن کے اساتذہ کے کام میں پایا جاتا ہے۔ یہاں بیرونی کا وہ قول نقل کر دینا کافی ہو گا جس میں تنقید کی اخلاقی بنیادوں کے خط و خال نہایت اختصار کے ساتھ نمایاں ھیں۔ بیرونی نے کہا ہے:

"میں نے وھی کیا ہے جو ھر انسان پر واجب ہے کہ اپنے فن میں

کے اجتہادات کو قبول کرے ۔ اور اگر کچھ خلل پائے تو
بےجھجھک اس کی اصلاح کر دے اور جو کچھ خود اسے
سوجھے اسے اپنے بعد آنے والے متأخرین کے لئے بطور ایک
یادداشت ، محفوظ کر جائے" (القانون ۱/۴ ـ ۵)

اسکے بعد میں اسلامی علوم کے ایک اور عنصر کو زیر بحث لانا
پسند کروں گا ۔ میرا اشارہ نظریے اور تجربے کے مابین عدل و توازن
کے اصول کی طرف ہے ۔

بہت سے لوگ جو اس میدان میں عرب علماء کے موقف سے
بےخبر ھیں اس گمان میں مبتلا ھیں کہ بجا طور پر راجر بیکن
(ROGER BACON) [م تقریباً ۱۲۹۲ ع] ایک طویل مدت سے اس منہج
علمی کا بانی شمار کیا جاتا ہے جسکی رو سے علوم طبیعی میں تجربے
کو تحقیق کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے ۔ اس عالم کی سبقت کا تصور
ھمارے آج کے دور تک باقی ہے ۔ لیکن علم منطق کے فاضل مورخ
پرانتل (C. PRANTL) [م ۱۸۹۳ ء] نے ـــ اگرچہ وہ اسلامی علوم میں
اختصاص نہیں رکھتے ـــ اس روش عام کے خلاف آواز اٹھائی ۔ (۴)
انھوں نے کہا "راجر بیکن نے وہ تمام نتائج عربوں سے اخذ کئے تھے ،
جو علوم طبیعیة میں اس سے منسوب چلے آتے ھیں " ۔

ویڈیمان (۵) (E. WIEDEMANN) اور شرام (۶) (M. SCHRAMM) جیسے
بعض ماھرین خصوصی نے بڑی وضاحت سے تجربہ و نظریہ کے قانون
کی بنیاد رکھنے میں مسلمان علماء کے مقام اور راجر بیکن اور لیو
نارڈو ڈاونسی (LEONARDO DA VINCI) [۱۳۵۲ ھ ـ ۱۵۱۹ ء] جیسے
لوگوں پر ان کے نمایاں اثرات کی نشاندھی کر دی ہے ۔ اب اس روشن
حقیقت میں بحث و اختلاف کی گنجائش نہیں رھی کہ مسلمان علماء
کی توجہ کا انحصار محض تجربے پر نہیں تھا بلکہ انھوں نے دراصل
اس مسئلے پر توجہ دی کہ تجربے سے قبل نظریے کا ھونا لازمی ہے ۔

اور ان معنوں میں گویا انہوں نے تجربے کو ایک واسطے کی شکل دی جسے تحقیق کے دوران تسلسل کے ساتھ استعمال میں لایا جاتا ہے۔

ویڈیمان پوری صراحت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ اس موضوع پر عربوں کو اولیت کا شرف حاصل ہے بلکہ جن نتائج تک راجر بیکن پہنچ سکا وہ ان معلومات کے مقابلے میں بہت کم ہیں جو قدیم عربوں کے ہاں موجود تھیں۔

علاوہ ازیں ویڈیمان نے مسلمان علماء کے ہاں تحقیق کے انداز اور اس کی پیشکش کے ایک اور اہم امتیازی پہلو پر بھی نظر ڈالی ہے اور کہا ہے (۷):

,,یونانیوں کے ہاں نتائج تحقیق ہمارے سامنے اپنی آخری کلاسیکی شکل میں آتے ہیں چنانچہ ـــ بعض استثنائی صورتوں کے علاوہ ـــ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ ہم ان کی اٹھان کا سراغ لگا سکیں۔ لیکن عربوں کے ہاں صورت حال یکسر مختلف ہے۔عرب جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اس کے قدم بہ قدم ارتقاء کی وضاحت کرتے ہیں۔ کچھ اسی طرح جیسے آج ہمارے بعض محققین کرتے ہیں۔ انکی اس وضاحت کے پیش نظر ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انکی طبعیتوں میں اپنے کام کی قدم بہ قدم پیش رفت پر اطمینان و سرور کی ایک کیفیت پائی جاتی ہے اور وہ اپنی تحقیقات میں اپنے ذوق فنی اور ان آلات کے کمال کے سبب، جن سے وہ کام لیتے تھے، کامیابی سے ہم کنار ہوئے،،۔

یہ بات محققین سے پوشیدہ نہ ہو گی کہ مسلمان علماء، مشاہدہ فطرت، مسلسل فلک بینی، دقت نگاہ اور اپنے ان آلات کے باعث جو انہوں نے ایجاد کئے، دنیا کے سامنے اپنے پیش رووں کے مقابلے میں ایک

اس امر سے قطع نظر کہ انھوں نے بعض نئے علوم کی بنیاد رکھی۔ اور بعض علوم کو نئی بنیادوں پر استوار کیا مثلاً نحو انشائی جس کا نام انھوں نے ,,علم المعانی ،، رکھا کیمیا ، بصریات، مثلثات ۔ بطور ایک مستقل علم ۔فلسفہ تاریخ اور علم الاجتماع، انھوں نے بارھا دوسری صدی سے لے کر نویں صدی ھجری تک یہ کوشش بھی کی کہ علوم کی شناخت اور تصنیف نئے زاویہ ھائے نگاہ کے مطابق کریں۔ ان تمام حقائق کے پہلو بہ پہلو ایک اور حقیقت کی تصریح بھی ضروری ہے وہ یہ کہ فلسفہ اور علوم طبیعیہ کی تاریخ اصطلاحات میں ان کا بہت بڑا مقام ہے۔ نیز یہ کہ انھوں نے صرف اتنا ھی نہیں کیا کہ جو سرمایہ دوسروں سے ان تک منتقل ھوا اسے جلا بخشی ھو بلکہ ان اصطلاحات کا بہت بڑا حصہ انھوں نے خود وضع کیا۔ تاریخ علوم میں مسلمانوں کے مقام اور لاطینی دنیا میں انکے زبردست اثر ہر بات کرتے ھوئے لازم ہے کہ ھم اس امر کو بھی زیر بحث لائیں کہ ان کا یہ اثر محض عربی کتب کے ترجمے یا صلیبی جنگوں اور مغرب و مشرق کے اتصال ھی کے باعث پیدا نہیں ھوا بلکہ بہت بڑا اثر استفادہ و تقلید کے اس عمل پر مبنی تھا جسکا آغاز دسویں صدی عیسوی میں ھوا اور تسلسل سے کئی صدیوں تک جاری رھا اس کی تکمیل تین راستوں سے ھوئی۔

ھسپانیہ، سسلی/ اٹلی ، بیزنطہ

میں یہاں اس صورت حال کی تفصیل میں نہیں جا سکتا کیونکہ یہ میرا اصل مقصود نہیں ہے۔ یہاں میرے پیش نظر چند نکات کو سامنے لانا ہے۔ ایک یہ کہ استفادہ و تقلید کا عمل لاطینیوں کے ھاں اس سے مختلف صورت میں تکمیل کو پہنچا جس میں کہ وہ عربوں کے ھاں مکمل ھوا ۔ وہ اسطرح کہ مسلمانوں کی اس تک رسائی ان لوگوں کی وساطت سے ھوئی جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ نیز اپنے ان

کے ہاں صورت حال مختلف تھی ۔ وہ ۔ یعنی لاطینی ۔ مجبور تھے کہ علوم ، مختلف اداروں کے نظام، اور جامعات کے طریقہ ہائے کار و لائحہ ہائے عمل اپنے سیاسی اور دینی حریفوں سے اخذ کریں چنانچہ جن لوگوں سے وہ اخذ کر رہے تھے ان کے لئے دشمنی اور بغض کے جذبات رکھتے تھے اور اس کیفیت کا اثر نفسیاتی الجھنوں کی صورت میں انکے ہاں عمل استفادہ پر منعکس ہوا ۔ ایسی صورت میں عین فطری تھا کہ ان کے ہاں وضاحت و صراحت کے عنصر کا فقدان ہوتا جبکہ مسلمانوں کے ہاں دوسروں سے استفادے کے عمل میں یہی دو اصلی عنصر ہیں ۔

ایک اور بات اس سے بھی بڑھ کر ہے مسلمانوں کے علوم سے لاطینیوں کے عمل استفادہ نے سرقہ و انتحال کی صورت پیدا کر لی ۔ اس کی وضاحت کئی متخصصین بہت سے تحقیقی مضامین میں کر چکے ہیں جن میں انہوں نے کھول کر دکھایا ہے کہ کسطرح لاطینی علماء نے بعض بحثیں مسلمان علماء کی کتابوں سے اخذ کر کے خود اپنی طرف منسوب کر لیں ۔ یا مکمل کتابیں اپنی زبانوں میں ترجمہ کر کے یہ دعویٰ کیا کہ یہ ان کی طبع زاد تصانیف یا انکی اپنی تالیفات ہیں ۔ اسی طرح بعض کتابیں عربی سے ترجمہ کر کے یہ کہا کہ یہ یونانی مشاہیر مثلاً ارسطو ، جالینوس ، روفوس [RUFUS OF EPHESUS پہلی صدی ق ۔ م کے اواخر سے پہلی صدی عیسوی کے اواسط تک وغیرہ کی کتابیں ہیں ۔ اس روش اور اسکے دیگر مظاہر کی بکثرت مثالوں کا ذکر یہاں ضروری معلوم نہیں ہوتا ۔

یہاں یہ صراحت لازم ہے کہ میرا مقصد لاطینی کارگزاری کی تخفیف و توہین ہر گز نہیں ۔ میں تو بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ لاطینیوں کے ہاں عربوں سے اخذ کرنے کا انداز جن محرکات پر استوار تھا وہ ان محرکات سے مختلف تھے جن کے تحت ان کے پیشرو اساتذہ یعنی عربوں نے یہ عمل اختیار کیا تھا ۔ اور ان امتیازی پہلوؤں کے ذکر

پر صرف ایک حقیقت مجھے آمادہ کرتی ہے۔ وہ ہے اس امر کی نشاندھی کہ مغربی دنیا میں علمی مرحلے کا ارتقاء مسلمان علماء سے متاثر ہے۔ اور یہی امر بہت سے لوگوں سے مخفی ہے۔

ایک اور بات جس کا اس سلسلہ کلام میں ذکر ضروری ہے،یہ ہے کہ علوم عربیہ سے استفادہ و تقلید کا یہ مرحلہ جو مسلمان علماء کے خلاف بغض و نفرت پر استوار تھا، ایک ایسے وقت میں پیش آیا جب علوم عربیہ سے استفادے کا معاملہ ابھی نامکمل تھا اور پختگی کو نہیں پہنچ پایا تھا۔

یہاں دل میں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ بھلا کیونکر ممکن ہوا کہ [علم کے]مغربی مرحلے کے احیاء پر عربوں کے اثرات سے مورخین کئی صدیوں تک چشم پوشی کرتے رہے۔ لیکن مغرب میں مسلمانوں اور ان کے علوم کے خلاف عداوت (۸) کی جو روح جاری و ساری رہی اس کی جہات کو سمجھ لینے کے بعد جواب صاف ظاہر ہے اور اس صورت حال کا پھیلاؤ غالباً راجر بیکن (۱۲۱۰ - ۱۲۹۰ ء) کے عہد تک پہنچتا ہے جس نے وہ تمام نتائج جو اس کے نام سے منسوب کئے جاتے ھیں حقیقت میں ان عربی کتب سے اخذ کئے جن کا ترجمہ لاطینی میں ہو چکا تھا۔ پھر رایموندوس لولوس (RAYMUNDUS LULLUS) کے ظہور کو لے لیجئے جس نے اپنی پوری زندگی اور تمام تر قوت ہر عرب شے کے خلاف جدوجہد میں گزار کر ۱۳۱۵ ء میں وفات پائی۔اس شخص نے علم کیمیا پر بہت سی کتابیں تالیف کیں جن کے بارے میں حال ھی میں یہ ثابت ہوا ہے کہ ان میں سے اکثر عربی الاصل ھیں۔ اسی طرح ان بہت سے لوگوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جو علوم کو عربوں کی غلامی کے جوئے سے آزاد کرانے کے داعی تھے۔ (۹)

اس میں شک نہیں کہ بعض علماء نے عربوں کا دفاع بھی کیا ان

موس اندریاس الباغوس (ANDREAS ALPAGUS) کا نام سب سے نمایاں ہے ۔ علوم اسلامیہ کا مرتبہ اس کے دل میں اس حد تک تھا کہ اس نے مشرق کا سفر اختیار کیا ۔ ڈاکٹر کا پیشہ اختیار کر کے تیس برس دمشق میں قیام کیا پھر ۱۵۱۵ ء میں پاڈوا (PADUA) واپس چلا گیا اور بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا ۔ انھی کتابوں میں ابن النفیس کی وہ مشہور کتاب بھی ہے جس کو مائیکل سروٹ (SERVET) [۱۵۱۱ ۔ ۱۵۵۳ ء] نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔

تاہم غالب رو بغض و عداوت ھی کی رھی جو سولھویں صدی عیسوی تک جرمنی . فرانس اور اٹلی میں جاری رھی ۔ اس رو میں ایک نمایاں نام لیونھارٹ فوکس (LEONHART FUCHS) [۱۵۰۱ ۔ ۱۵٦٦ ء] کا ہے جس کا تعلق ٹیوبنگن یونیورسٹی سے تھا ۔ جن لوگوں نے عربوں کے خلاف کشاکش بھی جاری رکھی اور ان کی کتابوں کو اپنے نام منسوب بھی کیا ان میں ایک مشہور نام بارا سیلسوس (PARACELSUS) [۔ ۱۴۹۳ ۔ ۱۵۴۱ ء] ۔ کا ہے ۔

ھر چند کہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے دوران جب مغرب میں عربوں کے مقام کو فراموش کر دیا گیا تھا ۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ عربی کتب سے استفادہ جاری تھا، اور ہے ۔ تاہم علوم کے مورخین نے اپنی تواریخ ترتیب دینے کا آغاز [فراموشگاری کی] اسی فضا میں کیا ۔ اٹھارویں صدی عیسوی البتہ علوم عربیہ کے حق میں ایک نیا عنصر لے کر آئی ۔ یعنی مستشرقین کا ظہور جن میں سے بہت سے اس کوشش میں مصروف رہے کہ علوم اسلامیہ کو ان کا جائز حق دلائیں اور انھیں تاریخ علوم میں صحیح مقام پر رکھیں۔اس سلسلے میں اھم ترین اور قدیم ترین شخصیت جیکب ریسکے (JAKOB REISKE [۱۷۱٦ ۔ ۱۷۷۴ ء] کی ہے اور کرٹ سپرنگل ، (KURT SPRENGEL)گوئٹے (J.W. GOETHE) [۱۷۴۹ ۔ ۱۸۳۲ ء] اور

[illegible] (ALEXANDER VON HUMBOLDT) ۱۷٦۹ ۔

۱۸۲ ء] جیسے بعض مورخین اس کے هم نوا هوئے ۔ لیکن ان لوگوں
ِ مساعی روش عام پر اثر انداز هونے کے لئے کافی نہ تھیں خصوصاً
ِ صدی میں کہ جب تاریخ علوم کا جدید زاویہ نگاہ پختہ هو رها
ا اور وہ یہ تھا کہ گیارهویں صدی عیسوی سے آگے تمام علمی نتائج
مطالعۂ علوم یونانی کی نوبیداری تصور کیا جائے ۔ اسی تصور کے
جے میں ,,احیائے علوم،، کی اصطلاح وجود میں آئی ۔

باوجودیکہ بعض علماء کی مخالفانہ روش علوم کی تاریخ
ومی کے بنیادی خطوط میں اسی صورت حال پر مصر رهی ہے اور
بھی بڑی حد تک اسکے اثر کو باقی رکھے هوئے ہے؛ تاهم بعض
تشرقین کی کوشش سے بعض میدانوں میں غلط فہمیوں کا ازالہ
کن هو سکا ہے ۔ خصوصاً ان علوم کی شاخوں میں جن پر محققین
اپنے کام کا آغاز موجودہ صدی سے قبل کیا تھا ۔ یہ [ازالہ] ان
گوں کو اسی نسبت سے حاصل رها ہے جس نسبت سے وہ روش عام
اثر سے محفوظ تھے اور انیسویں صدی عیسوی کی سوچ پر لگی
نی چھاپ ـــ جو وضعی مکتب فکر (POSITIVISM) کے نام سے
روف ہے ۔ کے شکار نہ تھے ۔

توقع رکھنی چاهئیے کہ علوم عربیہ کے مقام کا مسئلہ مستقبل
ب کی علمی تاریخ میں همارے زمانے سے بڑھ کر عدل و انصاف پر
ی هوگا ۔ اور اس توقع کو عملی جامعہ پہنانے کے لئے اس اسلامی
ے کے وارثوں پر یہ لازم ہے کہ وہ اظہار حقائق میں بھر پور حصہ
ں ۔

حواشی

۱ ۔ دیکھیئے راقم کا مقالہ ,,کتاب مہرجان افرام حبیب،، بغداد ، ۱۹۷۴ء ، ص ۳۳۷

۲ ۔ دیکھیئے : Fr Rosenthal, Das Fortleben der Antike im Islam. Stuttgart, 1965 S 18

۳ ۔ H Ritter, Hat die religiöse Orthodoxie einen
Einfluss auf die Dekadenz des Islams ausgeübt?

در کتاب ·

Klassizismus und Kulturverfall. Frank furt 1960, S 136

۴ ۔ اپنی کتاب تاریخ منطق میں (Geschichte der Logik, III, Leipzig,1927,121)

۵ ۔ اپنے متعدد مقالات میں حصوصاً دیکھیئے
Die Naturwissenschaften bei den Orientalischen Völkern
Eringer Aufsatze aus eruster Zeit ,1917, S 42 — 58

٦ ۔ اپنے بعض مقالات میں خصوصاً دیکھیئے انکی کتاب
Ibn al Haythams Weg Zur Physik, Wiesbaden, 1963

۷ ۔ اپنے متعدد مقالات میں ، حصوصاً دیکھیئے
Die Naturwissenschaften bei den Orieutalischen Völkern
Eringer Aufsatze aus ernster Zeit, 1971, S 42 — 58

۸ ۔ پروفیسر H. Schipperges نے اس موضوع پر ایک مفصلاً مضمون لکھا
ہے جس کا عنوان ہے Ideologie und Historiographie des Arabismus
دیکھیئے رسالہ Sudhoffs Archiv ، سال ۱۹٦۱

۹ ۔ ایضاً ص ۱۱ ۔ ۱۲ ، ۱۵



۲

فلکیات میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام

ہر چند کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عرب/اسلامی علم الفلک ـــ جو دسویں صدی عیسوی میں یورپ منتقل ہوا اور یورپین ممالک میں اسے جذب کرنے کا سلسلہ سولھویں صدی عیسوی کے اوائل تک جاری رہا ـ ـ ھی یورپ میں ریاضیات اور فلک بینی کی اساس پر قائم ہونے والے علم الفلک میں دل چسپی کا بنیادی محرک تھا اور اسی کے وسیلے سے یہ علم کوپرنیکس [COPERNICUS] کی

شخصیت میں پہنچ کر ایک نئے مرحلے سے روشناس ہوا۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ ہر چند کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے مگر فلکیات کی عمومی تاریخ میں اسلامی علم الفلک کے جائز مقام کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔

اس مقام کو کامل طور پر فراموش ہونے کئی صدیاں بیت چلی تھیں کہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مستشرقین نے علم الفلک کے میدان میں اسلامی ورثے پر تحقیق اور اس سلسلے کے مخطوطات کی اشاعت کی لائق تعریف مہم شروع کی۔

اس عرصے میں تحقیقات کے جو نتائج سامنے آ چکے ہیں وہ کوئی معمولی نتائج نہیں۔ تاہم وہ ہنوز اس قابل نہیں ہیں کہ ہمیں مسلمان فلک شناسوں کے کام کی حدود کا مکمّل اور ٹھیک ٹھیک تصور فراہم کر سکیں اب تک اس میدان میں محققین کی کاوشوں سے جو کچھ روشن ہو سکا ہے اس نے اس بات میں شک کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ علم الفلک کی عمومی تاریخ میں مسلمان فلک شناسوں کا حصہ بہت بڑا اور ابداعی[ORIGINAL] نوعیت کا ہے۔

اسی کا ایک خاکہ آپ کے سامنے پیش کرنا مقصود ہے۔

ہماری تازہ ترین معلومات یہ بتاتی ہیں کہ ستارہ شناسی سے متعلق قبل از اسلام عربوں کا علم بس محدود سا تھا۔ وہ چاند کی اٹھائیس منزلوں اور بارہ برجوں سے واقف تھے اور گمان غالب ہے کہ سیاروں کے نام بھی جانتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کو چپٹا اور آسمان کو اس پر ایک گُنبد کی صورت میں تصور کرتے تھے۔

اسلام سے فوراً پہلے کے زمانے تک یونان ، ہندوستان اور ایران میں عام تصور یہ تھا کہ زمین مرکزِ عالم میں واقع ہے اور تمام افلاک اپنے ثابت و سیّار اجرام کے ساتھ زمین کے گرد گھوم رہے ہیں اور اس کلّی حرکت کے نتیجے میں، جو چوبیس گھنٹے میں پوری ہوتی ہے ·

رات اور دن وجود میں آتے ھیں - پہلی صدی ھجری کے نصف ثانی میں بھی تصور عالم اسلام میں منتقل ھو گیا -

اس تصور کو اسلامی حلقوں میں منتقل کرنے والے لوگ بلاسبہ وہ تھے جو اسلامی جھنڈے تلے آ جانے والے علاقوں میں ھنوز قائم علمی مراکز کے آخری منسوبین تھے - یہ لوگ جو اجنبی ثقافت کے حامل تھے انھی کے ھاتھوں ایرانی ، یونانی ، سریانی اور ھندوستانی کتابوں کا عربی ترجمہ عمل میں آیا جن میں علم الفلک کی کتابیں بھی شامل تھیں -

میں سمجھتا ھوں کہ دوسری صدی ھجری کے اواسط تک فلکی معلومات اور اس سلسلے کی ضروری اصطلاحات کافی حد تک مسلمانوں کی رسائی میں آ چکی تھیں چنانچہ انھوں نے عباسی خلیفہ منصور کی خواھش کے مطابق فلکیات پر ھندوستان کی سب سے بڑی کتاب ,,کتاب السندھند،، کا عربی میں ترجمہ کر ڈالا اور جن دو عالموں نے یہ ترجمہ کیا تھا، یعنی الفزاری اور یعقوب بن طارق، انھوں نے خود بھی علم الفلک پر کتابیں تصنیف کرنا شروع کر دیں - یہ دونوں فلکی حسابات میں دوسرے درجے کی مساوات کے استعمال پر قادر تھے - ,,کتاب السندھند،، کے ترجمے کے تقریباً بیس برس بعد مسلمانوں کو ھندسی اور تطبیقی علم الفلک پر اس حد تک معلومات حاصل ھو چکی تھیں کہ انھوں نے ۱۶۵ - ۱۸۰ھ کے درمیان بطلمیوس [PTOLMEY]کی کتاب المجسطی [ALMAGEST]نیز اس کی ,,زیج،، یعنی جنتری کا ترجمہ کر لیا -

اس اولین مرحلے میں مسلمان فلک شناسوں کی سرگرمیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقین ھو گیا کہ وہ دوسری صدی ھجری کے اختتام سے لے کر تیسری صدی ھجری تک کے عرصے میں اس

قابل تھے کہ مجسطی کے تمام نظریات و حسابات کو سمجھ سکیں اور اسی زمانے میں وہ فلکیات کے میدان میں اخذ و جذب کا مرحلہ مکمل کر لینے کے بعد آنے والے دور میں تازہ کاری کے لائق ہو چکے تھے۔

خلیفہ مامون کے حکم سے شمّاسیّۃ بغداد اور دمشق کے نواح میں کوہ قاسیوں پر ایک ایک رصدگاہ کا قیام اس ضمن میں بہت کچھ ظاہر کرتا ہے۔ تاریخ فلکیات میں ابھی تک یہ پتہ نہیں چلایا جا سکا کہ کیا اس قسم کی رصد گاہیں اس سے پہلے بھی کبھی قائم ہوئی تھیں۔ ان دونوں رصد گاہوں کے قیام کے بعد ماہرین فلکیات اس قابل ہو سکے کہ بطلمیوس کے ہاں بہت سی باتوں کی اصلاح کریں اور پڑتال اور درستی کے بعد فلکی حسابات کی ایک جنتری تیار کریں۔ یہ دو جلدوں میں تھی۔

اس میدان میں ایک اہم بنیادی اقدام یہ تھا کہ مسلمانوں نے تدمر اور رقّہ کے مابین ایک درجے کے طول کی دقیق سائنسی طریقے پر پیمائش کی اور اسے $56\frac{2}{3}$ میل پایا اور اسی کے نتیجے میں انہوں نے خط استواء کا طول ۴۰۲۵۳ کلو میٹر برآمد کیا۔ پھر انہوں نے اپنے اس تمام حساب کو دہرایا تاکہ جغرافیۂ فلکی کے سلسلے میں ان کا نقطہ آغاز غلطی سے پاک ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری کے آغاز سے انجام تک مسلمان فلک شناسوں کی توجّہ نئے فلکی نظریات وضع کرنے سے زیادہ سیّاروں کی حرکات کا مشاہدہ کرنے اور ان کا حساب لگانے پر مرکوز رہی۔ اس میدان میں جو نتائج انہوں نے برآمد کئے وہ نہایت اہم تھے۔ غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان فلک شناسوں نے محض مشاہدے

صدی کے بعد ایجاد ہونے والے بعض جدید آلات کے بغیر ممکن ہو سکتی تھیں ۔

اس میدان میں ان کی تحقیقات کے جو نتائج اب تک پایہ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں ان سب کا شمار یہاں ممکن نہیں حالانکہ یہ مطالعہ ہنوز ابتدائی مراحل میں ہے ۔

اختراع و تازہ کاری کے مرحلے میں ان کی عظیم کامیابی کو ہم مندرجہ ذیل وجوہات پر محمول کر سکتے ہیں ۔

۱ ۔ وہ فلکیاتی مسائل کے حساب کے لئے ریاضی کو استعمال کر سکتے تھے اور ریاضی میں ان کے وسائل یونانیوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ تھے ۔

۲ ۔ وہ رصدی آلات کا استعمال بھی یونانیوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ شکل میں کر سکے ۔

۳ ۔ وہ ایسے رصدی طریقے استعمال میں لا سکے جن میں بعض یونانیوں سے بڑھ کر ترقی یافتہ تھے اور بعض ایسے تھے جن کا یونانیوں کو مطلق علم نہ تھا ۔

۴ ۔ مسلمان فلک شناسوں کے ہاں عملی تجربات کا تناسب قدماء سے بڑھ کر تھا ۔

اگر ہم جاننا چاہیں کہ فلکیاتی عمل میں ان کے ریاضیاتی وسائل کیونکر قدماء کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ تھے تو سب سے پہلے ہمیں یہ یاد کرنا ہوگا کہ انھوں نے دقیق حساب المثلثات [TRIGONOMETRY] سے کام لیا جبکہ اہل یونان کو اس کا علم ھی نہ تھا چنانچہ وہ مجبور تھے کہ اپنے فلکی اور جغرافیائی تجربات میں ایک پیچیدہ طریقۂ حساب استعمال کریں جو دائرے کی قوسوں اور اس کے نصف قطر کے باھمی نسبت تناسب کے مشاھدے پر مبنی تھا ۔

حساب المثلّثات نے اہل ہند کے ہاں بھی خاصی ترقی کی۔ چنانچہ وہ اپنے حسابات میں قائم الزاویہ مثلث کے دو ضلعوں کے تناسب کو بنیاد بنایا کرتے تھے اور ,,جیب،،[SINE]اور ,,تمام الجیب،، [COSINE]کے علم تک رسائی پا چکے تھے ۔ انہوں نے ,,جیب،، کے لئے جدول کا استعمال بھی کیا ۔ اہل ہند کے یہ علوم دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں کے ہاں منتقل ہو گئے اور ہم دیکھتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری کے اواسط سے مسلمانوں کے ہاں پہلی بار ,,جیب الضلعین،، کی جگہ ,,جیب الزاویہ،، کی اصطلاح سامنے آتی ہے۔ یہ علم المثلّثات کے ارتقاء میں ایک نئے اصول کا آغاز تھا ۔ اور یہ مسلسل ارتقاء ساتویں صدی ہجری میں جب نصیر الدین طوسی نے علم المثلّثات کو ایک مستقل علم کی حیثیت دے دی ، ۔ اپنے نقطہ کمال کو پہنچ گیا ۔

گذشتہ چند سالوں میں سامنے آنے والی تحقیقات کے نتیجے میں یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں حساب المثلّثات قریب قریب ان تمام باریکیوں کو محیط تھا جو موجودہ صدی تک اس شعبۂ علم میں معلوم ہو سکی ہیں (دیکھئے ج۵ ، ص ۵۳ ۔ ۵۸ از ,,تاریخ التراث العربی،،) اور اس میدان میں اُن کا کام اِن لوگوں[یعنی علمائے دورِ جدید] کی کار گزاری سے زیادہ دور نہ تھا ۔

عرب ماہرین فلکیات تیسری صدی ہجری کے اواسط سے اس کوشش میں مصروف رہے کہ ایسے طریقے دریافت کریں جن سے کرۂ ارض پر مختلف مقامات کے مابین فاصلے کا حساب آسانی سے لگایا جا سکے کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ان فاصلوں کے حساب کا یونانی طریقہ بہت مشکل ہے اور اس میں بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ اس میدان میں پیش رفت کا اولین قدم ثابت بن قرّہ نے اٹھایا اور

مسلسل ارتقاء بالآخر چوتھی صدی ھجری کے اواخر میں ,,اضلاع المثلّث الکُرَوی" کے حساب پر منتج ھوا۔ جس کے نتیجے میں مثلّثات کُرَویہ [SPHERICAL TRAINGLES]کا علم وجود میں آیا۔ یہاں رفع التباس کی غرض سے یہ وضاحت مناسب ھو گی کہ یونانیوں کے ھاں ھندسہ کرویہ [SPHERICAL GEOMETRY]کا علم ضرور موجود تھا لیکن مثلّثات کرویہ سے وہ ناواقف تھے۔

قدماء کے مقابلے میں مسلمانوں کے ھاں زیادہ ترقی یافتہ طریقہ ھائے حساب کے ضمن میں آخری بات یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ انھوں نے وقت گزرنے کے ساتھ فلکی قیاسات میں حسابِ تفاضلی [DIFFERENTIAL CALCULUS] اور جداول المنحنیات سے بھی کام لینا شروع کر دیا تھا۔

جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے کہ انھوں نے قدماء کے مقابلے میں بہتر رصدی آلات استعمال کئے سو اس کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اگلوں سے جو کچھ اخذ کیا اسے ترقی دی، مختلف آلات خود ایجاد کئے، انھیں حسب ضرورت بڑا یا چھوٹا کیا اور انھیں بہتر بنانے اور ان کی تفصیلات کے بیان پر بے مثال توجہ دی۔ مثال کے طور پر مراغہ اور سمرقند کی رصد گاھوں میں بعض ,,ذات الربعین" آلات کی بلندی ستر میٹر سے زائد تھی۔ ,,آلۃ السدس الفخری" * جسے حامد بن الخضر الخجندی نے ,,میل اعظم" [GREATEST OBLIQUITY OF THE ECLIPTIC]کی پیمائش کے

* ,,السدس" سے مراد دائرے کا چھٹا حصہ ہے اور ,,الفخری" فخرالدولہ کی طرف نسبت ہے جس کی سرپرستی میں الخجندی نے یہ آلہ تیار کیا۔ آلے کی شکل اور کارکردگی کی تفصیل کے لئے دیکھئے:

Dictionary of Scientific Biography, American Council of Learned Societies. New York. 1981. 7:353.

لئے بطور خاص استعمال کیا تقریباً چالیس میٹر ** اونچا تھا ۔

ان جدید طریقوں کے ضمن میں یہ بھی ذکر کرتے چلیں کہ مسلمان پہلی قوم تھے جو مسلسل رصد کا اہتمام کر سکے اور یہ ان کی تعمیر کردہ رصد گاھوں کے سبب سے ممکن ھوا ۔ علمی مآخذ میں اکثر ایسی روایات دیکھنے میں آتی ھیں کہ فلاں فلاں رصد گاہ تیس برس یا زیادہ عرصے تک مسلسل کام کرتی رھی ۔

یہاں ھم ان کی علمی رسائی کی چند مثالیں دینا چاھیں گے جو ان وسائل کے سبب ان کے لئے ممکن ھو سکی ۔

ایک مثال یہ ہے کہ تیسری صدی ھجری کے نصف اول میں انھوں نے اپنی رصدگاھوں کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی کہ رات اور دن کے مساوی ھونے کے وقت کے آگے بڑھ جانے کی مقدار جسے وہ ,,الحرکۃ البطیئۃ،، *** سست حرکت کا نام دیتے تھے ۔ سو برس میں ایک درجہ نہیں ہے جیسا کہ اھل یونان نے حساب لگایا تھا بلکہ ھر ٦٦ برس میں ایک درجہ ہے ۔ پھر وہ اس مدت کی تصحیح میں مسلسل مصروف رھے حتی کہ اسے ھر ۷۰ برس میں ایک درجہ طے کیا اور یہ تحدید دور جدید کے سائنس دانوں کی تحدید ۔ یعنیٰ ھر ۷۲ برس میں ایک درجہ ۔ سے کچھ زیادہ دور نہیں ۔

اسی طرح ھم یہ ذکر کرنا چاھیں گے کہ تیسری صدی ھجری میں مسلمان فلک شناسوں نے پہلی بار اس نکتے پر توجہ دی کہ سورج کا ,,اوج،، ــ یعنی اس کے زمین سے زیادہ سے زیادہ فاصلے کا نقطہ ۔ یکساں نہیں رھتا ۔ بعد ازاں وہ اس جنبش کی حد متعین کرنے میں مصروف رھے ۔ مثلاً ھم دیکھتے ھیں کہ پانچویں صدی ھجری میں

** قدیم اصطلاح میں چالیس ,,دراع،، دیکھئے حوالہ بالا ۔ مترجم)

*** اس سے مراد غالباً PRECESSION OF THE EQVINOXES ہے ۔

البیرونی چاروں موسموں میں چار بار کی رصد کے نتیجے میں یہ کوشش کرتا ہے کہ اس جنبش کی مقدار حساب تفاضلی [DIFFERENTIAL CALCULUS] کے ذریعے معلوم کرے ۔ اس جنبش کی آخری تعیین جو مسلمان فلک شناسوں نے طے کی وہ ۱۲،۰۹ سیکنڈ سالانہ تھی اور یہ تحدید بھی دور حاضر کی تحدید یعنی ۱۱،۳۶ سیکنڈ سالانہ سے کچھ زیادہ اختلاف نہیں رکھتی ۔

اسی طرح ایک مثال اُسی کوشش کی بھی دی جا سکتی ہے جو انھوں نے ,,میلِ اعظم،، [GREATEST OBLIQUITY OF THE ECLIPTIC] کا حساب لگانے کے لئے کی ۔ بطلمیوس اسے ۲۳ درجہ اور ۵۱ منٹ تصور کرتا تھا ۔ ہندوستانی علماء کے نزدیک یہ ۲۴ درجے سے عبارت تھا ۔ مسلمان فلک شناسوں کی توجہ تیسری صدی ھجری کے اوائل ہی میں اس امر کی طرف مبذول ہو چکی تھی کہ میلِ اعظم کی تعین کے بارے میں بطلمیوس کا بیان اصلاح طلب ہے ۔ چنانچہ انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر اپنے دقیق آلاتِ رصد کے ذریعے اس کی پیمائش شروع کی اور چوتھی صدی ھجری کے وسط میں یہ سوال اٹھانا شروع کر دیا کہ آیا یہ جُھکاؤ یکساں ہے یا متغیّر ۔ ابراھیم بن سنان بن ثابت اور ابو جعفر الخازن نے یہ مشاھدہ کیا کہ مختلف رصدی مطالعوں کے نتائج میں تفاوت، آسمان کے قطبین کی یکبارگی اور بےترتیب حرکتوں سے عبارت ہے ۔ اس سے تقریباً پچاس برس بعد حامد بن الخضر الخجندی نے یہ دریافت کیا کہ میلِ اعظم وقت کے ساتھ ساتھ کم ہو رہا ہے ۔ دور جدید میں اُس کی اِس دریافت کی تائید ہوئی مگر دور احیائے علوم اور بعد کے فلک سناسوں کو اس امر کا احساس نہیں ہوا ۔ خجندی نے میل اعظم کی جو

تعیین کی تھی وہ ۲۳ درجہ ۳۲ منٹ اور ۲۲ سیکنڈ تھی۔ جدید علم فلک سے اس کا فرق بہت معمولی ہے یعنی صرف دو منٹ۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں رصدِ آسمانی اور سیارات کی حرکت کے حساب پر توجہ مرکوز رکھنے کے بعد چوتھی صدی کے اواخر میں مسلمان فلک شناسوں نے روز بروز نئے فلکیاتی نظریاں وضع کرنے میں دل چسپی لینی شروع کی۔ مثال کے طور پر ابو العباس ایرانشھری نے یہ دریافت کیا کہ ,,بطلمیوس کی رائے کے برخلاف مکمل سورج گرہن صرف اُس بُعد میں ممکن ہے جو اَبعَد کی نسبت وسط سے قریب تر ہو،،۔ *

مسلمان فلک شناسوں نے سورج اور سیّاروں کے مدار کی سکل ر بحث کا آغاز کیا۔ اور بعض نے یہ رائے ظاہر کی کہ ان کا مدار۔ دونوں کے قطر میں معمولی فرق کے ساتھ۔ بیضوی ساخت رکھتا ہے۔ اسی زمانے میں اس مسئلے پر بحث نے بہت طول کھینچا کہ زمین ساکن ہے یا متحرک ؟ کوئی سکون کا قائل تھا اور کوئی تحرّک کا۔ جن لوگوں نے حرکت زمین کا نظریہ قبول کیا ان میں ابو سعید السجزی اور جعفر بن محمد بن جریر شامل ھیں جنھوں نے اسی بنیاد پر ایک اسطرلاب بھی تیار کی۔ بیرونی اس مسئلہ پر ساری عمر دماغ لڑاتا رھا۔ اس کے لئے کسی بھی رائے کو ترجیح دینا مشکل رہا۔ آخر میں وہ سکون زمین کے نظریے کی طرف اس لئے مائل ہو گیا کہ حرکت کا نظریہ قبول کر کے بعض طبیعیاتی سوالات کا جواب اس کے لئے بعض دشواریاں پیدا کرتا تھا اس مسئلے پر تقریباً یہی حال ابن

---

* غالباً مراد یہ ہے کہ مکمل سورج گرہن استوائی یا خط استواء سے قریبی عرض بلد میں ھی ممکن ہے جس قدر قُطبین کی جانب بڑھتے جائیں گے یہ صورت ممکن نہ رھے گی۔ (مترجم)

الہیثم کا تھا ۔

پانچویں صدی ہجری کے نصف اول میں فلکیات کی تاریخ ابن الہیثم کی سخصیت میں ایک اہم مرحلے کو پہنچتی ہے ۔ ابن الہیثم ہی وہ سخص ہے جس کے ہاں پہلی بار سیّاروں کی حرکات کی سائنسی وضاحت ملتی ہے جسے وہ ,,نظام طبیعی،، کا نام دیتا ہے جو اس کے الفاظ میں یوں ہے :

,,وہ مقدّمات جن پر کواکب، نیز عالم کے گرد حرکت کرنے والے تمام اجرام کے مداروں کی ترکیب مبنی ہے چار ہیں ۔ ایک یہ کہ جسمِ طبیعی خود ایک سے زیادہ طبیعی حرکت نہیں کرتا ۔ دوسرے یہ کہ بسیط جسمِ طبیعی کی حرکت میں اختلاف واقع نہیں ہوتا یعنی وہ گردش کے دوران ہمیشہ برابر وقت میں برابر فاصلہ طے کرتا ہے ۔ تیسرے یہ کہ جسمِ آسمانی انفعال کو قبول نہیں کرتا اور چوتھے یہ کہ خلا موجود نہیں ہے ،،

مذکورہ بالا امور کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن الہیثم پہلی بار اس امر کی نشاندھی کرتا ہے کہ بطلمیوس نے پانچ سیّاروں کی حرکات کی جو ہیئت مقرر کی تھی وہ غلط ہے اور بطلمیوس نے بھی اسے غلط ہی جانتے ہوئے مقرر کیا تھا کیونکہ اس کے لئے اسکے علاوہ اور کچھ ممکن نہ تھا ۔ (۱)

ابن الہیثم نے زیر تبصرہ مقامات کی نشاندھی یوں کی ہے ,,سو یہ مقامات جن کا ہم نے ذکر کیا باہم تناقض رکھنے والے مقامات ہیں جنہیں ہم نے کتاب المجسطی میں پایا ۔ کچھ ایسے ہیں جن میں وہ معذور ہے اور کچھ ایسے ہیں جن میں وہ کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا ۔ وہ یوں کہ کچھ مقامات تو بھول چوک کی ذیل میں آ جاتے ہیں جن سے انسان کا بچنا ممکن نہیں سو ان میں تو وہ معذور ہے

(۱) الشکوک علی بطلمیوس للحسن بن الہیثم نشر عبدالحمید صبرہ و نبیل الشہابی القاہرہ ۱۹۷۱ ص ۳۳ ۔ ۳۸

اور کچھ مقامات وہ ہیں جن میں اس نے جانتے بوجھتے غلطی کا ارتکاب کیا ۔ یعنی وہ ہیئتیں جو اس نے پانچوں سیّاروں کے لئے متعین کیں ــ سو ان میں اس کا کوئی عذر نہیں چل سکتا ۔

رہی اس بات کی دلیل کہ اس نے ان مقامات میں غلطی کا ارتکاب قصداً کیا، سو وہ نویں مقالے کی دوسری فصل میں اس کا یہ قول ہے : ... ,,اسی طرح اس مفہوم نے ہمیں ایک جگہ مجبور کر دیا کہ ہم بعض خارج از قیاس اشیاء کو استعمال میں لائیں ۔ مثال کے طور پر یہ سیّارے اپنے اپنے مدار میں حرکت کرتے ہوئے جو مجرّد دائرے بناتے ہیں ان پر دلائل قائم کریں ۔ نیز اس مضمون پر اسی نوع کی مزید گفتگو ... ''

اس قول سے اس کا یہ اعتراف سامنے آتا ہے کہ اس نے سیاروں کی حرکات کی ہیئت کے سلسلے میں کچھ خارج از قیاس اشیاء سے کام لیا ۔ اور یہی وہ اشیاء ہیں جن سے اس کے ہاں تناقض پیدا ہوا ۔ کیونکہ حرکاتِ سیّارگاں کی ہیئتوں سے متعلق اس کے ہاں تناقض کی بنیاد یہی ہے کہ اُس نے ان حرکات کو حقیقی اجسام کے بجائے چند خیالی دائروں اور خطوط میں فرض کر لیا تھا ۔ پھر جب اُنہیں حقیقی اجسام میں تصور کیا گیا تو تناقض لازم آیا ۔ سو اُس کے اعتراف سے واضح ہو گیا کہ اُس نے ان مضامین میں غلطی کا ارتکاب جانتے بوجھتے کیا ۔ رہا یہ کہ اس ضمن میں وہ کوئی عذر نہیں لا سکتا سو وہ اس لئے کہ آخر کلام میں اس نے یہ کہہ کر عذر پیش کیا کہ : ,,... یہ سمجھتے ہوئے کہ اس نوع کی کسی شے کا استعمال ــ جب تک کہ اُس سے بنیادی طور پر کوئی قابلِ ذکر فرق نہ پڑتا ہو۔ مقصد کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتا '' ۔ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ جو ہیئت اس نے فرض کی ہے اس سے سیّاروں کی حرکات میں کچھ

فرق واقع نہیں ہوتا ۔ مگر یہ بات غیر حقیقی ہیئتوں کے مفروضوں کا عذر نہیں بن سکتی کیونکہ اگر وہ ایک غیر حقیقی ہیئت کو فرض کرے گا اور وہ ہیئت اس کے تخیّل کے مطابق سیّاروں کی حرکات کو ان کے معمول پر قائم رکھے گی تو ★ (۲) ۔

اپنے ان اعتراضات میں ابن الھیثم کا ھدف وہ جدید عنصر ہے جس کا اضافہ بطلمیوس نے سیاروں کی ان ہیئتوں میں کیا جو قدماء کے ہاں معروف تھیں ۔ اس عنصر کا نام بطلمیوس نے ,,الفلک المعدّل للمسیر،،[EQUANT]رکھا ۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قدماء کے ہاں سیّاروں کی ہیئت کے دو بنیادی عناصر کا تعارف کرا دیا جائے کیونکہ انھی پر بطلمیوس نے اپنی خاص ہیئت کی بنیاد اٹھائی ۔

بات یہ ہے کہ قدماء نے جب سیاروں کا مشاہدہ شروع کیا تو دیکھا کہ زمین سے مشاہدہ کرنے والے کی نسبت سے ان میں سے ہر ایک کا فاصلہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے ۔ اُن کا نقطہ آغاز چونکہ یہ تصور تھا کہ زمین کائنات کے مرکز میں واقع ہے لہذا اُنھیں اِس مظہر کی توجیہ مہیا کرنے کی ضرورت پیش آئی ۔ چنانچہ انھوں نے یہ خیال کیا کہ سیاروں کے مداروں کے اپنے مرکز ہیں جو مرکز کائنات یعنی زمین سے الگ ہیں اور اُن مداروں کے مختلف مراکز زمین سے ہٹے ہوئے فرض کر لئے ۔ بعد ازاں جب انھوں نے دیکھا کہ یہ ترکیب ۔ یعنی ایسے مداروں کا تصور جن کے مرکز خارج میں واقع ہیں ۔ بھی زمین سے

★ تو اس سے اس امر کا امکان ختم نہیں ہوتا کہ اس نے جو ہیئت فرض کی ہے اس میں غلطی کی ہو (تکمیل اقتباس از مترجم بحوالۂ مذکورۂ ذیل)

(۲) مرجع سابق ، ص ۳۷ ـ ۳۸

سیاروں کے مختلف بُعد کی مکمّل توجیه کے لئے کافی نہیں، تو انھیں ایک اور ترکیب کرنا پڑی ـ یعنی یه مفروضه قائم کرنا پڑا که سیّاروں کی کچھ اور چھوٹی گردشیں ایسے مداروں پر بھی جاری ھیں جن کے مرکز اُن افلاک کے مداروں میں گردش کر رھے ھیں جن کے اپنے مرکز خارج میں واقع ھیں ـ اِن چھوٹے مداروں کو اُنھوں نے ,,افلاک التّداویر،، [EPICYCLES] کا نام دیا ـ

بطلمیوس نے یه کیا که سیّاروں کے لئے ایک تیسرے دائرے کا تصور قائم کیا جسے اس نے ,,الفلک المعدّل للمسیر،،[EQUANT] کا نام دیا ـ بطلمیوس کے تصور کے مطابق اس مدار کا مرکز نه تو مرکز کائنات پر منطبق ھوتا ہے اور نه مرکز فلکِ خارجی پر ـ اس نے یه مفروضه قائم کیا که اپنے اپنے ,,تداویر،،[EPICYCLES] میں گردش کرتے ھوئے سیّاروں کی حرکات اس فلکِ معدّل کے اعتبار سے منظم ہے نه که مرکزِ فلکِ خارجی یا مرکزِ کائنات کے اعتبار سے ـ

یہی بطلمیوس پر ابن الھیثم کے اعتراض کی اساس ہے که اس نے یه ھیئت قائم کر کے سیّاروں کی منظم حرکات کے اصول میں خلل ڈال دیا اور ایک نئی ھیئت پیش کر دی ـ افسوس که اِس نئی ھیئت کی تفصیل ھم تک پہنچ نہیں سکی ـ

بعد ازاں اور کئی فلک شناس آئے جنھوں نے بطلمیوسی ھیئت کو رد کیا ـ مثلاً ابو عبید الجوز جانی اور عمر خیّام ـ پھر ان کے بعد نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، اور ابن الشاطر جیسے لوگ آئے جو یکے بعد دیگرے نئے نظریات پیش کرتے رھے اور ھر ایک اپنے پیش رو کے نتائج پر تعمیر کو آگے بڑھاتا رھا ـ

بیس برس قبل بعض محققین کی توجه اس طرف مبذول ھوئی که عین ممکن ہے اِن علماء کے نظریات ھی کے نتیجے میں کوپرنیکس

COPERNICUS نے سیاروں کی ہیئت میں بطلمیوس کے داخل کئے ہوئے تئے عنصر ,,الفلک المعدّل للمسیر،، کو رد کیا ہو اور بطلمیوسی نظام کو ترک کرتے ہوئے سورج کو مرکزِ عالم میں جگہ دی ہو ۔

اس میدان میں متعدد تحقیقات کے بعد اِس امر میں کوئی شک باقی نہ رہا کہ مسلمان فلک شناسوں کے نظریات پوری تفصیلات کے ساتھ کوپرنیکس کے علم میں تھے اور اُس نے حرف بہ حرف اِنھیں اخذ کیا (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ,,تاریخ التراث العربی،، جلد ٦ پر میرا مقدّمہ)

آج جو مسئلہ اصحابِ تحقیق کو درپیش ہے وہ اِس امر کی وضاحت ہے کہ یہ نظریات کس طریق پر مغرب میں منتقل ہوئے؟ کیونکہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا ان متأخرین فلک شناسوں کی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا تھا یا نہیں ۔ اس موقع پر میں مکمل تفصیلات اور دلائل تو پیش نہیں کر سکتا تاہم جو کچھ بالتفصیل اسی کتاب کی چھٹی جلد میں لکھ چکا ہوں اس کی تلخیص پر اکتفا کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ مسلمان علماء کے یہ جدید نظریات مغربی دنیا میں عربی اور فارسی کتب کے یونانی زبان میں ترجمے کی وساطت سے منتقل ہوئے ۔ یہ کام مدرسۂ ترجمہ سے مسلک لوگوں نے انجام دیا جو تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر سے طرزون اور قسطنطینوبل کے شہروں میں قائم تھا ۔ غالباً یہ سلسلہ قسطنطینوبل کی فتح تک جاری رہا ۔ ساتھ ہی ساتھ ان دونوں شہروں کے بہت سے رہنے والوں نے زبانی روایت کے ذریعے بھی ان دونوں دنیاؤں کے مابین واسطے کا کام دیا ۔

بطلمیوس نے عالم کی جو ہیئت معیّن کی تھی اُس پر اندلسی فلسفیوں کی طرف سے بھی شک کا اظہار کیا گیا ۔ چنانچہ محمد بن

یحیی بن الصائغ المعروف به ابن باجه (المتوفی ۵۳۳ھ) نے کہا :
,,مرکز عالم کے گرد اپنے اپنے مداروں میں سیاروں کے فاصلوں کی پیمائشوں میں اختلاف کا سبب متعین کرنے کے لئے ,,افلاک تداویر,, [EPICYCLES] کے تصور کی ضرورت نہیں ۔ خارجی مرکز رکھنے والے دائروں [ECCENTRICS] کو قبول کر لینا ھی کافی ہے ,,بعد ازاں ابن طفیل (المتوفی ۵۸۱ھ) نے,, افلاک تداویر ,,نیز خارجی مرکز رکھنے والے دائروں کو بھی قبول کرنے سے انکار کیا ۔ اس کے بعد فلسفی ابن رشد (المتوفی ۵۹۵ھ) آیا اور افلاکِ تداویر نیز خارجی مرکز رکھنے والے دائروں کے انکار کی ضرورت کا نظریہ پیش کیا ۔ اور صراحت سے کہا کہ سیّاروں کے مداروں کے مرکز مشترک ہونے چاھئیں نیز یہ کہ سیاروں کی حرکات لولبی [SPIRAL] حرکات ھیں اور اسی حرکت کی بنیاد پر وہ مرکز عالم سے سیاروں کے مختلف مداری فاصلوں کی وضاحت کیا کرتا تھا ۔ اس کا عزم تھا کہ وہ عالم کی ایک نئی ھیئت متعین کرے گا لیکن موت نے اسے فرصت نہ دی ۔

اس آرزو کی تکمیل ابو جعفر البطروجی (المتوفی ۶۰۰ ھ تقریباً) کے ھاتھوں ہوئی جس نے اپنا تعارف بطلمیوسی ھیئت کی جگہ لینے والے ایک نئے علم ھیئت کے بانی کی حیثیت سے کرایا ۔ اس نے اپنی کتاب المرتعس میں اسے اس موقف کا اظہار یوں کیا ہے (۳)۔

,,..... میں یہ کہتا ھوں کہ بطلمیوس نے یہ وضعیں اس دعوے پر قائم نہیں کی تھیں کہ یہ حقیقت نفس الامری سے عبارت ھیں ۔ نہ اُس کا موقف یہ تھا کہ جو اصول اُس نے بنائے ھیں لازماً اس کے رصدی وحسّی مساھدے سے مطابقت رکھتے ھیں ۔ اُس نے تو انھیں اُن [مخصوص] حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے وضع کیا تھا تاکہ ان کے ذریعے وہ حرکات اس طرح چل سکیں کہ ایک مخصوص نظام

(۳) کتاب المرتعش، نسخه استانبول، کتب خانه احمد الثالث ، نمبر ۳۳۰۲ ، ورقه ۱۰/ب - ۱۱/أ

ور ایک ایسی ترتیب کے تابع ہوں جس میں اختلاف و تفاوت کی
بجانس نہ ہو۔ یہ بات اُس سے پوشیدہ نہ تھی کہ اُس کی قائم کردہ
ضع [در اصل] نظام میں مخل تھی اور [ہنوز] پختگی سے دور تھی
ونکہ اس کے وضع کردہ دونوں اصولوں سے، الگ الگ اور یکجا
ہی لازم آتا ہے کہ یا تو ایک خلا ہے جس میں خارجی مراکز والے یہ
لاک حرکت کرتے ہیں۔ یا پھر ان افلاک پر مستمل افلاک کسی اور
معلوم مادے سے پُر ہوں جس کے اجزاء ان میں حرکت کرنے والے
جسام کے منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ منتقل ہوتے رہتے ہوں جسا کہ
، کے نئے جگہ خالی کر کے کسی اور جگہ کو خود پُر کرتے ہوں۔ یہ
ب باتیں ناقابل قبول، سچائی سے دور اور حقیقتِ آسماں سے
طابقت نہ رکھنے والی ہیں۔ ,,بطروجی کے خیال میں بطلمیوس نے
ں سلسلے میں جو کچھ بھی کہا ہے اس کی اساس ,, توہم پر ہے نہ
، حقیقت پر (۳) ,,

یہاں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ بطروجی کے اپنے الفاظ میں
ں محرک حقیقی کا ذکر کر دیں جس نے بطروجی کو ان تحقیقات پر
آدہ کیا۔

,, کہ تمھیں بتاؤں کہ مجھے کیا سوجھا اور عمر بھر کی
معولیت اور سوچ بچار کے نتیجے میں جو متاع گراں بہا مجھے
اصل ہوئی اس کا رازِ دروں تم پر کھولوں۔ میں تم سے، اور ہر اس
شخص سے جو میری تحریر پڑھے، درخواست کرتا ہوں کہ یہ گمان نہ
ے کہ جن خیالات کا یہاں اظہار کیا جا رہا ہے ان کا مقصد قدماء
، رائے سے ٹکراؤ پیدا کر کے شہرت حاصل کرنا ہے کہ اللہ جانتا ہے
ر گواہ ہے کہ میں نے آغاز ہی سے محض اس خاطر یہ مقصد اپنایا
لزشتہ کے دور ہی میرے جب میں نے آسمانوں کی حرکت پر

---

(۳) مرجع سابق، ۸ ب

ریاضیات کا مطالعہ کیا اور اس علم کے امام بطلمیوس اور بعد میں آنے والے اسی کے متّبعین کے اقوال کا جائزہ لیا (جبکہ کرہ ثوابت کی حرکت کے مسئلے پر اس سے ابو اسحاق ابراهیم بن یحیی المعروف بالرزقالی کے سوا کسی نے اختلاف نہیں کیا) ... (۵)

بطروجی کی یہ کتاب جس میں عالم کی ایک نئی ہیئت پیش کر کے اسے بطلمیوسی ہیئت کی جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے اور جس کا ترجمہ تالیف کے چند ہی سال بعد، لاطینی اور عبرانی میں ہو گیا تھا، نہ صرف یورپ کے، فلکیاتی افکار پر اثر انداز ہوئی بلکہ سولھویں صدی عیسوی کے اواسط تک فلسفےاور طبیعیات کے افکار پر بھی اثر ڈالتی رہتی اور ان تمام میدانوں میں اس کا اثر بہت گہرا تھا اسی طرح اس کتاب نے بعد کے فلک شناسوں کی مساعی کے دوش بدوش ۔ جن میں ابن الهیثم، الزرقالی، جابر بن افلح، ثابت بن قرّة، نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی اور ابن الشاطر کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ــ علم الفلک کو اُس جدید مرحلے تک پہنچانے میں حصہ لیا جس کا ظہور کوپر نیکس کی شخصیت میں ہوتا ہے۔ چنانچہ کوپرنیکس کو اس نظر سے دیکھا جانا چاہئے کہ وہ علم الفلک کے تاریخی ارتقاء کی بہت سی کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے اور اس ارتقاء میں مسلمان سائنس دانوں کا حصہ ان کے پیش روؤں یا بعد میں آنے والوں سے کسی طور کم نہیں ۔

---

(۵) مرجع سابق، ۱/ب



۳

ربوں کے علم الفلک کا یورپ پر اثر

معصر جرمن عالم نے ۱۹۵۷ء میں ایک کتاب تالیف کی
اس سوال کا جواب معلوم کرنے کی کوسس کی گئی تھی کہ
صدی عیسوی میں یورپ میں اچانک یونیورسٹیاں کیونکر
، آ گئیں جبکہ اس سے قبل، ایسی یونیورسٹیوں کا کوئی نمونہ
ونانیوں کے ہاں ملتا ہے نہ رومیوں یا بیزنطیوں کے ہاں۔ مؤلف
و یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ یہ ادارہ ایسی چیز ہے جس کی
ں کوئی مثال نہیں ملتی اور یہ کہ یہ یورپ میں کسی خارجی
یر از خود وجود میں آ گیا۔
ب مذکور کی اشاعت کے پانچ برس بعد، میرے رفیق کار
ں (H. SCHIPPERGES) نے — جو ایک مدت سے اس مسئلے پر
کرکے قابل قدر نتائج تک پہنچ چکے ہیں کہ عربوں کا علم
پ میں کیونکر منتقل ہوا — اس پر اصلاحی نظر ڈالی اور یہ
تایا کہ مؤلف کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ از، اداروں یا ان

کے ابتدائی مرحلوں کے بارے میں یہ سراغ لگانے کہ عالم اسلام میں ان کے وجود کا کہاں تک امکان ہے۔ موضوع پر طویل بحث اور بہت سے دلائل مہیا کرنے کے بعد شپرجس نے یہ ثابت کر دیا کہ بارھویں صدی عیسوی میں یورپ کی یہ سب یونیورسٹیاں، طلیطلہ کے راستے مکمل طور پر اسلامی یونیورسٹیوں کی تقلید میں بنی تھیں۔

مغربی تحریک احیائے علوم کے تمام پہلوؤں پر اسلامی علوم اور ثقافتوں کے عمومی اثر کا یہ مظہر تین راستوں، یعنی ھسبانیہ، اٹلی اور بیزنطہ کے راستے، عمل میں آیا۔

اس خطبے میں میری کوشش ہو گی کہ یورپ میں عربوں کے علم الفلک کے اثرات سے متعلق ایک عمومی تصور آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث میں اپنی کتاب [GESCHICHTE DES ARABISCHENSHRIFFTUMS] کی چھٹی جلد میں کر چکا ہوں۔ سامعین کرام سے درخواست ہے کہ دلائل و مراجع کے لئے اس جلد کی طرف رجوع فرمائیں۔

اجتماعی رابطے کے [عمومی] اثرات سے قطع نظر، عربی سے لاطینی میں کیا جانے والا قدیم ترین ترجمہ جو اب تک معلوم ہو سکا ہے دسویں صدی عیسوی کا ہے۔ کتاب کے مؤلف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ترجمہ "ASTROLOGIA" کے عنوان سے، لوپیٹس برسلونی [LUPITUS]، نامی کسی شخص نے کیا تھا۔

عجیب بات ہے کہ اسطرلاب سے متعلق اولین کتاب بھی دسویں صدی عیسوی ہی کے اواخر میں سامنے آئی جس کا مؤلف گربرٹ(GERBERT) بتایا جاتا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جو سیلوسٹر ثانی کے نام سے پاپائے روم رہا اور اسی نے لاطینی دنیا میں عربی ہندسے متعارف کرائے۔ وہ ایک مدت تک طلیطلہ اور برشلونہ میں رہ چکا

کے ایک مورخ نے اس رائے کو رد کیا ہے کہ گربرٹ نے
اپنی کتاب کا مواد مسلمان فلک شناسوں سے اخذ کیا یا
ہ ان سے استفادہ کیا ۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر
یہ رویہ قبول عام پا رہا تھا کہ اس کتاب کے دریافت ہو
جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ۔ حقیقت واضح ہو گئی اور
ہ کے مابین ربط ثابت ہو گیا ۔ علاوہ ازیں لوبینس کے نام
یک خط بھی دریافت ہو گیا جس میں وہ کہتا ہے :

,,میں نے سنا ہے کہ آپ نے اسطرلاب پر ایک عربی کتاب
کا ترجمہ کیا ہے ۔ استدعا ہے کہ یہ ترجمہ مجھے بھجوا
دیں ۔ اس کے معاوضے کی جو شکل بھی ہو میں اس کے
لئے تیار ہوں،، ۔

بھی دیکھتے ہیں کہ فلکیات کی بعض اصطلاحیں گربرٹ
میں اپنی عربی صورت ہی میں باقی رہیں کیونکہ لاطینی
ان کے مترادفات نہ ہونے کے سبب ، ان کا ترجمہ ممکن نہ
وع سے ہٹ کر یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ یہ لوگ
ت کے ترجمے میں غلطی کا شکار ہوا کرتے تھے ۔ اس کی
، (SINUS) کا لفظ ہے جو مسلمان فلک شناسوں کے ہاں
لفظ ,,الجیب،، کے ترجمے کے طور پر برتا گیا ۔ مسلمانوں کے
صطلاح ہنود کی زبان سنسکرت سے آئی تھی ۔ انہوں نے
عربی میں ترجمہ کیا ہی نہیں ۔ تاہم لاطینی مترجم اس
حال کو نہ سمجھ سکا اور لغتوں کی ورق گردانی ؟ کے اس
مجھا کہ مراد عربی کا لفظ ,,الجیب،، ، یعنی لباس کی جیب

ر یہ جملہ معترضہ تھا ۔ میں گربرٹ کی کتاب کے موضوع کی
اس آتا ہوں ۔ اس امر میں شک کی گنجائش نہیں کہ جو

کتاب اس کی طرف منسوب ہے یا تو اس نے اسے عربوں سے اخذ ک
یا پھر وہ کسی عربی کتاب کا ترجمہ ہے جو گربرٹ سے منسوب ھ

یہاں یہ نکتہ اہم ہے کہ اسی زمانے سے لاطینی دنیا میں
تطبیقی و ریاضی علم الفلک سے دل چسپی کا آغاز ہوا ۔ اس
قبل ان کے ہاں علم الفلک سے تھوڑا بہت لگاؤ ضرور پایا جا
مگر وہ دراصل قدیم ,,کوزمولوجی،، ھی کے تسلسل سے عبارت
بطلمیوس کی ہندسی فلکیات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا ۔ م
میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ بطلمیوس اور اس کے نظام
سے واقف ھی نہیں تھے ۔ اور اگر ہوتے بھی تو اس کو سمجھ
سکتے تھے کیونکہ اس کی کتاب کو سمجھنے کے لئے علم ہندسہ
عنصر ضروری تھا وہ ان کے ہاں سرے سے موجود نہ تھا ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ گیارھویں صدی عیسوی میں اسطرلا
متعلق دو کتابیں اور تالیف کی گئیں ۔ دونوں میں اسی کتاب کو
کی گئی جو گربرٹ سے منسوب ہے ۔ یہاں یہ امر قابل لحاظ
دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی میں استفادے کا مرکز طلیط
گیارھویں صدی کے اواخر میں طلیطلہ کے ساتھ فرانس کے د
طولوز (TOULOUSE) اور شارتر (CHARTRES) بھی شامل ہو
ان کے بعد پیرس ۔

استفادے کے سلسلے کا ایک اہم کام وہ ہے جو قسطنط
افریقی [CONSTANTINE THE AFRICAN] نامی ایک عربی ا
شخص نے انجام دیا ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ الجزائر کا ایک عر
تھا جسے جنوبی اٹلی کے شہر سالرنو (SALERNÓ) جانے کا اتف
ان کے ہاں طبّ کے پست معیار کو دیکھتے ہوئے اسے خیال پیدا
اٹلی میں عربوں کے علم طب کو متعارف کرائے ۔ چنانچہ وہ اپ

اس گیا اور چند سال میں طب کی تحصیل کی۔ پھر دوبارہ اٹلی آیا
ور اپنے ساتھ طب عربی کی بہت سی کتابیں لایا۔ کہا جاتا ہے کہ
یا تو پہلے سے عیسائی تھا یا عیسائی مذہب اختیار کر گیا اور
طینی زبان سیکھی اور اسے ایک خانقاہ میں بٹھا دیا گیا تاکہ وہ
ماں علم طب پر عرب اطباء کی تالیف کردہ ستر کے قریب کتابوں کا
جمہ کرے۔ ان میں سے بعض کو اس نے یونانی اطباء سے، بعض کو
ے آپ سے اور بعض کو حقیقی مؤلفین سے منسوب کیا۔ یہ صورت
ال اس وقت واضح ہوئی جب ان میں سے کچھ کتابوں کا ازسر نو
طینی میں ترجمہ کیا گیا کہ انہی میں سے بعض جالینوس یا روفوس
(RUFU) یا ارسطو کے نام سے متداول چلی آ رہی تھیں۔

آئیے علم الفلک پر اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کریں ...
دیکھتے ہیں کہ بارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں، بتّانی کی
خم کتاب نیز فرغانی کی اور خوارزمی کی کتاب (بترتیب
نربطی*) کا ترجمہ کیا گیا۔ ان سب کتابوں کو سمجھنے کے لئے
ہی خاصی فلکی اور ہندسی معلومات درکار ہیں۔

۱۱۳۹ اور ۱۱۳۸ء کے درمیان ہم مارسیلیہ کے شہر میں ایک
خص کو دیکھتے ہیں۔ جس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ وہ اپنے
مذھبوں کے لئے، ایک جنتری تیار کرتا ہے جسے وہ ,,لاطینی
تری،، کا نام دیتا ہے۔ لیکن دراصل اس کا کام الزرقالی کی جنتری

---

* ابو جعفر محمد بن موسی الخوارزمی کی ,,زیج السند ہند،، کو ابوالقاسم مسلمہ بن احمد
مجریطی نے ۳۶۹/۹۷۹ھ کے لگ بھگ، ھجری تاریخوں اور قرطبہ کے طول بلد کے مطابق از سر نو
۔ کیا۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے:

Dictionary of Scientific Biography, American Council of Learned Societies New York — 1981, 7, 360—1, 9 :39.

(مترجم)

کے ایک عوامی سے ترجمے سے عبارت ہے جس میں عربی اصل کی تاریخوں کو عیسوی سالوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے ۔ اس نامعلوم شخص نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ الزرقالی کا پیرو ہے ۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ کلدانی اور ہنود اور عرب، اہل مغرب کو علمی قیادت فراہم کرتے ہیں ۔ اسے بطلمیوس کا نام ضرور معلوم ہے لیکن وہ علم الفلک کی تاریخ میں اس کے کام سے ہرگز واقف نہیں

صرف علم الفلک کے میدان ہی میں نہیں بلکہ علی العموم اسلامی علوم سے اکتساب کے سلسلے میں ایک اہم مظہر، بارھویں صدی عیسوی میں ایک بڑے مترجم کا ظہور ہے جس کا نام جیرارڈ کرمونی (GERARDO DE CREMONA) تھا ۔ اس نے طلیطلہ کے شہر میں عربی زبان اور اسلامی علوم سیکھے اور نوّے سے زائد عربی کی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا ۔ ان میں سے پانچ فلکیات کے میدان سے تعلق رکھتی ہیں ۔ یعنی بطلمیوس کی کتاب المجسطی پر جابر بن افلح کی اصلاح، الزرقالی کی جنتری، طلوع فجر پر ایک کتاب جو ابن الہیثم سے منسوب ہے ، نیز الفرغانی کی کتاب کا ترجمہ جو اس سے قبل بھی ایک بار ترجمہ کی جا چکی تھی، اسی طرح بطلمیوس کی کتاب المجسطی کا عربی سے لاطینی ترجمہ جس سے پہلے المجسطی لاطینی میں غیر معروف تھی ۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ جیرارڈ کرمونی نے جو ترجمے کئے ان کے ذریعے میدان فلکیات کے بعض اہم عناصر لاطینی دنیا میں منتقل ہوئے اور جس زمانے میں لاطینیوں کا تعارف بطلمیوس کی کتاب المجسطی سے ہوا اسی زمانے میں الزرقالی کی جنتری بھی ان کے علم میں آگئی جس میں مجسطی سے متعلق بعض اہم نتائج موجود ہیں ۔ اسی طرح المجسطی پر جابر بن افلح کی اصلاح کے ذریعے لاطینیوں کو مجسطی

پر شدید تنقید اور اس میں بعض اہم تصحیحات سے بھی واقفیت حاصل ہو گئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جابر بن افلح کی اسی کتاب کی وساطت سے ان کی رسائی علم المثلثات [TRIGONOMETRY] کے تفصیلی تعارف تک ہوئی جس کا وسیع اثر کوپرنیکس کے عہد تک بہت سے مؤلفین کے ہاں نظر آتا ہے۔ خود کوپرنیکس نے اس کتاب سے دور رس استفادہ کیا۔ بایں ہمہ جابر بن افلح پر یہ تہمت چلی آتی ہے کہ اس نے بطلمیوس پر غلط الزامات عائد کئے ہیں۔

الزرقالی کی جنتری اور اس کی دیگر کتب کے لاطینی و عبرانی ترجمے نے لاطینی دنیا میں علم الفلک کے آئندہ ارتقاء پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اوروں پر ان اثرات کی بات ایک طرف، اب تو یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ خود کوپرنیکس نے۔ ماخذ کا ذکر کئے بغیر الزرقالی کی جنتری سے بہت کچھ نقل کیا ہے۔ ہاں کوپرنیکس اوج الشمس [SOLAR APOGEE] کی سالانہ حرکت، جو الزرقالی کے حساب سے ۴ء ۱۲ ہے کی مناسبت سے رواروی میں اس کا ذکر ضرور کرتا ہے اگرچہ خود اسے یہ تسلیم کرنے میں تامّل ہے کہ اوج الشمس میں حرکت پائی جاتی ہے۔

بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ مشہور سائنسدان کپلر (KEPLER بھی الزرقالی کی کتاب سے متأثر ہوا مثلاً اس نے سیّارۂ مریخ کے مدا کی بیضوی شکل کے بارے میں اس کے نظریے سے اثر قبول کیا۔

ریجیومونتانوس (REGIOMONTANU S) کی کتاب میں ایک عجیب چیز ہے۔ اس نے الزرقالی کا جو ترجمہ کیا، چھاپے کی غلطی سے اس میں جہاں یہ ذکر تھا کہ چار رصدی مطالعوں کے بعد وہ ثابت کر سکا کہ اوج الشمس کا نقطہ (40 r — quattuor) ہے وہا طباعت میں یہ عدد ,,402 ،، بن گیا اور اسی کی بنیاد پر کپلر نے ایک

اس کے پاس الزرقالی کی وہ کتاب ہے جس میں اس نے یہ بتایا ہے کہ اس کے رصدی مطالعوں کی تعداد ۴۰۲ تک پہنچ گئی تھی۔

طلوع صبح کے موضوع پر جو کتاب ابن الھیثم سے منسوب ہے۔ اور درحقیقت ایک اور فلک شناس، محمد بن یوسف بن معاذ کی ہے جس کا تعلق اندلس سے تھا اور جو پانچویں صدی ھجری میں ہوا ہے۔ ـــ فضا میں شعاعوں کے ٹوٹنے کے مسئلے پر اس کے اثر کا سراغ سولھویں صدی عیسوی کے آخر تک ملتا ہے۔

اس امر کا ذکر بھی اھمیت سے خالی نہ ھوگا کہ مترجم جیرارڈ کرمونی کو یہ خیال ھوا کہ ان کتابوں کا ترجمہ کر لینے کے بعد اب وہ اس قابل ھو گیا ہے کہ نظری فلکیات THEORETICAL A STRONOMY] پر لاطینیوں کے لئے خود ایک کتاب تالیف کر سکے لیکن درحقیقت جو کچھ اس نے کیا وہ صرف اس قدر تھا کہ اس نے الفرغانی اور البتّانی کی دو کتابوں کی باھم آمیزش کر دی ۔ ھر چند کہ بعد کے زمانے میں اس کتاب کو تصحیفات نیز موضوع کے اعتبار سے ناپختگی کے سبب تنقید کا نشانہ بنایا گیا ... پھر بھی تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اس کے کچھ نہ کچھ تقلید کرنے والے پیدا ھوئے ۔ مثلاً تیرھویں صدی عیسوی میں ھم دیکھتے ھیں کہ ایک مشہور لاطینی فلک شناس آلونیس دو انسولیس (ALONIS DE INSULIS) متوفی ۱۲۰۳ء ایک کتاب ترتیب دیتا ہے جس میں جابر بن افلح اور الفرغانی کی کتاب کے علاوہ جیرارڈ کی کتاب ـــ (جو خود بھی بعض عربی مآخذ کی نقل ہے جیسا کہ ذکر ھو چکا) ـــ کا بھی چربہ اڑاتا ہے۔

لاطینی علم الفلک کی تاریخ میں ایک اہم پیش رفت یہ ہوئی کہ ولیم (GUILLAUME) * نامی ایک انگریز فلک شناس نے الزرقالی کی ,,زیج طلیطلہ،، (طلیطلہ کی جنتری)، جسے کسی گمنام شخص نے مرسیلیہ کے حالات کے مطابق ڈھال دیا تھا ، لی اور اس میں ضروری تبدیلیاں کرکے اسے لندن کے حالات کے مطابق بنا دیا ۔ یہ جنتری جو ,,لندن کی جنتری،، کہلائی، ایک طویل عرصے تک اپنے مقام کو برقرار رکھ سکی اور کئی صدیوں تک وہاں فلکی حسابات کے لئے بنیاد کا کام دیتی رہی ۔

تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل تک لاطینی حلقوں میں ــ بطلمیوس پر جابر بن افلح کی تنقید کے علاوہ ــ نظام عالم پر ابن رشد اور البطروجی کا نظریہ بھی راہ پا چکا تھا، جو بطلمیوس کے نظام عالم کی جگہ لینا چاہتا تھا ۔ یہ نظریہ لاطینی دنیا میں اس شرح کے جو ابن رشد نے ارسطو کی کتاب السماء والعالم پر لکھی تھی نیز ہیئت عالم پر البطروجی کی کتاب کے ترجموں کی وساطت سے پہنچا ۔ اسی آخر الذکر کتاب نے یورپ میں ، سولھویں صدی عیسوی کے اواسط تک، نہ صرف فلک شناسی کے میدان میں ذہنی رویے پر گہرے اثرات چھوڑے بلکہ فیزیائی فلسفے کے زاویۂ نگاہ کو بھی متأثر کیا ۔

مذکورہ بالا دونوں کتابوں کا ترجمہ انگریز عالم مائیکل سکاٹ (MICHAEL SCOTUS) نے کیا ۔ علاوہ ازیں اسنے اس غیر بطلمیوسی

---

* لفظ WILLIAM ہی کی ایک صورت ۔ دیکھئے :

Websters' New Biographical Dictionary,

Merriam — Webster Inc., Springfield M. A., U.S. A., 1983, P. 430

نیز دیکھئے : Dictionary of Scientific Biography, 14 : 399:,

"William the Englishman. .."

نظام کی ترویج کے سلسلے میں دو کتابیں خود بھی تالیف کیں ۔ یہاں میں بطور خاص اس بات کا ذکـــر کرنا چاھوں گا کہ یہ شخص البطروجی کے نظام کی توضیح پر اپنی کتاب کو نیـکولاوس دمشقـی [NICOLAUS OF DAMASCUS] سے منسوب کرتا ہے جسکا زمانہ پہلی صدی قبل مسیح کا ہے ۔ اس سے یہ مشکل پیدا ھوتی ہے کہ آئندہ نسلوں میں اس کتاب کو مشہور فلک شناسوں اور فلسفیوں کے ھاں ایک مقام حاصل ھوتا ہے مگر اس مفروضے پر کہ یہ نیکولاوس دمسقی کی کتاب ہے ۔

تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں البطروجی کی کتاب کے ترجمے کے بعد سے لاطینیوں کو دو متضاد نظاموں سے سابقہ پڑتا ہے یعنی بطلمیوسی نظام اور غیر بطلمیوسی نظام ۔ نتیجۃً ان میں ایک طبقہ ایک نظام کی پیروی کرتا ہے اور دوسرا دوسرے کی ۔ جبکہ ایک تیسرا طبقہ ان دونوں میں سے کسی ایک نظام کو قبول کرنے کے سوال پر تردّد کا شکار ھو جاتا ہے اور تذبذب میں پڑ کر عرب اساتذہ کی جانب سے وصول ھونے والی نو بہ نو معلومات کے مطابق اپنے موقف میں تبدیلی کرتا رھتا ہے میں اس آخر الذکـــر طبقے میں سے تین اشخاص کا ذکر کروں گا جو تیرھویں صدی عیسوی میں پیرس کے مکتب فکـــر کے ستون سمجھے جاتے ھیں یعنی راجر بیکن (ROGER BACON) البرٹس میگنس (ALBERTUS MAGNUS) اور رابرٹس گروسٹسٹے (ROBERTUS GROSSETESTE) ۔

رابرٹس بڑے مؤلفین میں سے تھا اور اس کا شمار ارسطو کے پیروؤں میں ھوتا ہے چنانچہ وہ اپنی کتابوں میں اس کے مسلک کا دفاع کرتا ہے۔ حال ھی میں یہ انکشاف ھوا ہے کہ ارسطو کی کتابیں مطل

رابرٹس سے منسوب ہے البتانی اور ثابت بن قرہ کی کتابوں سے منقول ہے۔ بطلمیوس کا اس نے بس سرسری سا ذکر کیا ہے۔ حقیقت میں اس کا میلان البطروجی کی طرف ہے مگر وہ متردد ہے۔ ساتھ ھی اس کی کتابوں کے قاری کو یہ بات اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ وہ بعض اور عرب فلک شناسوں کے افکار کو اخذ کرتے ہوئے یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ یہ افکار البطروجی کے اصولوں سے ٹکراتے ھیں۔ پندرھویں صدی عیسوی میں بھی کسی رابرٹس سے منسوب ایک اور لاطینی کتاب ملتی ہے اور اس کے بارے میں بھی یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ عرب فلک شناسوں ھی کے افکار سے منقول ایک مجموعہ ہے۔

رابرٹس کی ایک کتاب ,,مدوجزر،، پر ہے جو آج تک اس موضوع پر پہلی اہم کتاب تصور کی جاتی ہے۔ میں نے اس کا موازنہ الکندی کی کتاب سے کیا تو دیکھا کہ یہ اسی کا خلاصہ ہے۔ اس پر، ان شاء اللہ، میں ,,آثار علویہ،، [METEOROLOGY] پر اپنے خطبے کے دوران بات کروں گا۔ چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ بطلمیوسی مکتب فکر کے لوگ پیرس اور آکسفورڈ میں، مشاہدۂ افلاک اور سیاروں کے مداروں کے حساب پر توجہ رہے ھیں تاھم وہ کوئی نئی بات پیش کرنے سے قاصر ھیں کیونکہ وہ ہنوز اپنے عرب اساتذہ سے اخذ کردہ معلومات کو ھضم ھی نہیں کر سکے۔

البرٹس میگنس (ALBERTUS MAGNUS) اپنی زندگی کے بیشتر حصے میں البطروجی کے نظریات کا پیرو رہا لیکن جب ثابت بن قرہ کی کتاب اس تک پہنچی جو مدار سیّارگاں کی وضاحت میں اس کے خاص نظریات پر مشتمل تھی تو میگنس کا غالب میلان بطلمیوس کی طرف ہو گیا۔

جہاں تک راجر بیکن کا تعلق ہے سو اسے ان دونوں مسلکوں میں سے کسی ایک کے قبول کرنے میں سب سے زیادہ تردّد رہا اور اسی تردّد کے سبب اسے یہ شہرت حاصل ہوئی کہ وہ ناقدانہ ذہن کا مالک ہے۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ ابن الہیثم کی کتاب ہیئۃ العالم کے زیر اثر فلکی حرکات کے مشاہدے کے سلسلے میں اس کا میلان عرب بطلمیوسیوں کے مسلک کی طرف ہے۔ لیکن نظام عالم کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سمجھنے کے لئے وہ البطروجی کے نظریے کو زیادہ مناسب پاتا ہے۔

پیرس کے فلک شناس حلقے کے لوگوں نے تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام سے لے کر چودھویں صدی عیسوی تک کے عرصے میں عرب بطلمیوسیوں کی آراء قبول کرکے خود کو تذبذب سے نجات دلا لی۔ اور یہ ہیئت عالم پر ابن الہیثم کی کتاب کے ترجمے کے بعد ہی ممکن ہو سکا۔

ابن الہیثم کی کتاب کے ترجمے کے ساتھ لاطینی فلک شناس حلقوں میں ایک نیا عنصر داخل ہوتا ہے جو لاطینی فیزیائی فلکی رویّے کو بہت گہری تحریک بہم پہنچاتا ہے۔ اس نئے عنصر کا نام (IMAGINATIO MODERNORUM) یعنی ,,عالم کی نئی ہیئت،، تھا اور پہلا فلک شناس جس نے تذبذب کے موقف کو خیرباد کہنے کی جرأت کی برنا رڈوس دو ویریدینو (BERNARDUS DE VIRIDINO) تھا

چودھویں صدی عیسوی کے اوائل سے پیرس اور آکسفورڈ میں بطلمیوس مکتب۔ فکر کی بالادستی قائم ہو جاتی ہے اور یہ لوگ فلکیاتی مشاہدات و حسابات میں دل چسپی کا آغاز کرتے ہیں۔ لیکن ہنوز وہ کوئی نئی چیز پیش کرنے سے قاصر تھے کیونکہ انہوں نے جو کچھ اپنے عرب اساتذہ سے اخذ کیا تھا اس [illegible]

سکے تھے ۔ ان فلک شناسوں میں مشہور ترین لیوی بن گرسون (LEVI BEN GERSON) ہے ۔ تاهم مورّخین علم الفلک کے وہ دعوے اب همیں غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر سکتے جن کی رو سے متعدد دریافتوں کا سہرا اس شخص کے سر ہے ۔ کیونکہ آج همارے لئے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ان دریافتوں کو ان کے حقیقی دریافت کنندگان کی طرف لوٹا سکیں ۔ مثلاً اس فلک شناس کے هاں همیں بطلمیوس پر تنقید ملتی ہے جو کئی صدیوں سے اس کے نام درج چلی آتی ہے ۔ لیکن محقّق سے یہ بات مخفی نہیں رهی کہ اس نے بطلمیوس پر جابر بن افلح کی تنقید کو دهرانے سے زیادہ کچھ نہیں کیا ۔

سائنس کی تاریخ میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ بصریات کے میدان میں حجرہ تاریک [CAMERA OBSCURA] کو دریافت کرنے اور چاند کے مشاهدے کے سلسلے میں اس کو استعمال کرنے والا لیوی ہے ۔ تاهم نوے برس ہونے یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہے کہ یہ کارنامہ دراصل ابن الهیثم نے انجام دیا تھا اور اس شہرت کا زیادہ حقدار وهی ہے ۔

اس طرح مثلّثات کرویہ [SPHERICAL TRIANGLES] کی دریافت لیوی سے منسوب کر دی گئی ہے مگر تیس برس پیشتر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ سہرا ۔ چوتھی صدی هجری کے ۔ الخجندی ، ابو الوفاء البوزجانی، اور ابونصر بن عراق کے سر ہے اور همارے لئے یہ سراغ لگانا مشکل نہیں رها کہ لیوی نے یہ سب کچھ کہاں سے اخذ کیا ۔

اسی طرح لیوی سے یہ بات منسوب ہو گئی کہ اس نے رصد کا وہ آلہ ایجاد کیا جو لاطینی دنیا میں ,,عصائے یعقوب [JACOB'S STAFF] کے نام سے مشہـــور ہوا ۔ اسی آلے کی ایجاد پر پندرهویں صدی عیسوی کا جرمن عالم ریجیو مونتا نوس بھی فخر کرتا نظر آتا ہے ۔ معاصر علماء نے اس امکان پر بھی بحث کی ہے کہ ریجیو مونتانوس نے

لیوی بن کرسون کی اس ایجاد کو ناجائز طور پر خود سے منسوب کر لیا ہو۔ تاہم مشہور عالم ویڈیمان [WIEDEMANN] نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ دراصل ابن سینا اس آلے کا موجد ہے۔ مزید برآں ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ آلہ ابن سینا کے ہاتھوں جس درجہ کمال کو پہنچ چکا تھا سترھویں صدی عیسوی کے ان علماء کے ہاں اس درجے کو نہیں پہنچ سکا۔

آخری بات یہ کہ کسر اعشاریہ کی دریافت بھی لیوی بن گرسون سے منسوب کر دی گئی ہے حالانکہ اب ھمارے علم میں ہے کہ یہ سہـــرا الاقلیدسی کے سر ہے جو چوتھی صدی ھجری کے مسلمان حساب دانوں میں سے ہے۔

پیرس اور آکسفورڈ کے مکاتب فکر پر مزید گفتگو طوالت کا باعث ہوگی لہذا اسے چھوڑتے ہوئے میں لاطینی فلکیاتی حلقوں کے ایک اور مظھر کی طرف اشارہ کرنا چاھوں گا جو میری نظر میں اپنی جگہ اھم ہے اور توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔ یہ ان نئی کتابوں کا وجود ہے جو عربی کتب کے تراجم کے پہلو بہ پہلو ایک اھم حیثیت رکھتی ھیں ۔ میری مراد ان بڑی بڑی تالیفات سے ہے جو عربی مآخذ کی نقول پر مشتمل ھیں مگر جو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اصل مآخذ اور اصل اساتذہ کے ناموں کو فراموش کر دینے کا سبب بنیں ۔

مثال کے طور پر شاہ الفونس دھم (ALPHONS) قسطلیة میں علماء کی ایک بڑی جماعت کو اپنے گرد جمع کرتا ہے تاکہ وہ علم الفلک پر ان سب عربی کتابوں کے مواد پر مشتمل ایک جامع تالیف تیار کر سکیں جو اس وقت ان کے ھاں معروف تھیں۔ چنانچہ انھوں نے عملاً

يثم کی کتاب هيئة العالم بهی تهی - یه مجموعه اپنے پرتگیزی
ران سے مشہور ہوا اور یورپ میں (LIBROS DELSABER) کے نام
عام ہوا اور اسے اپنے لاطینی ترجمے کی وساطت سے یورپ میں
ت فروغ حاصل ہوا -

اسی طرح کی ایک اور کتاب ,,سیّاروں کا جدید نظریہ،،
(THEORICAE NOVAE PLANETARU ہے جس کا مولّف فلک
ناس پوائرباک (PEURBACH) تها - وہ پندرھویں صدی عیسوی کا
می ہے- اس کتاب میں اس نے عربی سے کئے ہوئے کئی تراجم یکجا
دیئے ھیں - لیکن اساسی طور پر اس کا انحصار ابن الهیثم ، ثابت
قرّہ اور الزرقالی کی کتابوں پر رہا ہے -

ایک اور کتاب ریجیومونتانوس کی تالیف ہے جس کا عنوان
بطلمیوس کی عظیم کتاب کا خلاصہ ،، ہے مگر درحقیقت یہ البتّانی
ور الزرقالی کی کتابوں کی تلخیص سے عبارت ہے - مزید یہ کہ یہ
فلک شناس ۱۳۶۴ء میں اٹلی کے شہــر پاڈووا [PADOVA] میں
الفرغانی کی کتاب پر لیکچر دیا کرتا تھا -

یہ آخر الذکر دونوں مشہور کتابیں، کوپرنیکس، گلیلیو اور کپلر
کے اہم مآخذ میں شامل تھیں -

یہاں میں خود کو مجبور پاتا ہوں کہ متأخر مسلمان فلک شناسوں
مثلاً نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی اور ابن شاطر سے
کوپرنیکس کے متأثر ہونے کے مسئلے پر چند الفاظ کہوں - یہ مسئلہ
گذشتہ بیس برس سے ماہرین علم فلک کے درمیان اہم ترین اختلافی
مسائل میں شامل ہو گیا ہے - کوپرنیکس نے سیاروں کی حرکات سے
متعلق ان علماء کے بعض نظریات اخذ کئے - اس خطبے کی حدود میں

ہوگی ۔ اپنی کتاب ,,تاریخ التراث العربی،، کی چھٹی جلد کے مقدمہ میں میں نے اس مسئلے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختصراً یہ کہ چودھویں صدی عیسوی کے دوران بحیرۂ اسود کے مشرقی ساحل پر واقع شہر طرابزون [TRABZON] میں نیز قسطنطینیہ میں ترجمے کے لئے ایک ایک مدرسہ قائم ھوا ۔ ان دونوں مدرسوں کے علماء یورپ میں اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے مذھبی جوش کے تحت عالم اسلام میں تالیف کی جانے والی تازہ ترین کتابوں کا ترجمہ کیا کرتے تھے ۔

تاریخ علوم پر اپنی تحقیقات کے دوران میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عالم اسلام سے لاطینیوں کے اکتساب کا مسئلہ اتنا پھیلاؤ رکھتا ہے کہ علماء کی ایک بڑی جماعت مل کر بھی کئی دھائیوں میں اس کی وضاحت کرنے پر قادر نہ ہو سکے گی ۔

جوں جوں انسان یورپ کے اصل مآخذ کی گہری تحقیق کرتا ہے اس کے ھاں یہ تصور قوت پکڑتا چلا جاتا ہے کہ وھاں کی نام نہاد تحریک احیاء اس بچے سے ازحد مشابہت رکھتی ہے جسے اس کے حقیقی باپ کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو۔



۴

آثار علویہ * کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام

اس موضوع کا انتخاب ـــ جس سے آپ لوگوں کی اکثریت کو واسطہ نہ رہا ہوگا ۔ میں نے اسلئے کیا ہے کہ یہ ایک ایسی حقیقی مثال سمجھی جاتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ علوم کے بارے میں ، خصوصاً مسلمانوں کے حصے سے متعلق، دور حاضر کی آراء مبنی برحقیقت نہیں ہیں ۔ نیز یہ کہ اس علمی ورثے کی تحقیق پر توجہ دینا ہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے ان آراء کو اسلامی علوم کے حق میں ہموار کیا جا سکتا ہے ۔

یہ موضوع معمولی سے معمولی مطالعے اور توجہ سے بھی محروم رہا ہے اور اس میدان میں جو کتابیں تالیف ہوئی تھیں انہیں فلکیات کی کتابوں کے ذیل میں رکھ دیا گیا ہے ۔ اس علم کے مؤرخین نے اس کے الگ الگ موضوعات پر نیز اسکی عمومی تاریخ پر متعدد تحقیقات کی ہیں ۔ عموماً وہ آغاز چھٹی صدی قبل مسیح سے لے کر ظہور اسلام تک کے علمائے یونان کے کام سے کرتے ہیں اور پھر اگلے مرحلے

کے بارے میں ، تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام یعنی اس دور کے اوائل تک کے لئے سکوت اختیار کرتے ھیں جسے وہ احیائے علوم کا دور قرار دیتے ھیں ۔

دور حاضر میں، کچھ ھی عرصہ قبل ، بعض علماء کو جب رسائل اخوان الصفا کا جرمن ترجمہ پڑھنے کا موقع ملا تو انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ ان رسائل میں ایک فصل فضائے آسمانی میں واقع ہونے والے بعض امور سے متعلق ہے ۔ اسی طرح معروف عالم ویڈیمان (E . Wiedemann) جس کی ساری علمی زندگی تاریخ علوم میں مسلمانوں کا مقام واضح کرنے کی کوشش میں بسر ھوئی ۔ نے بھی ایک مختصر مقالہ لکھا ہے جو آثار علویہ پر ان بحثوں سے متعلق ہے جو البیرونی کی کتاب ,,الآثار الباقیة عن القرون الخالیة ،، میں اس کی نظر سے گزریں ۔ تاھم یہ سب چیزیں آثار علویہ کی تاریخ میں مسلمان علماء کی مساعی کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر تصور مہیا کرنے کے لئے کافی نہ تھیں ۔

جہاں تک ,,آثار علویہ ،، کی اصطلاح کا تعلق ہے سو یہ Meteorology کی عربی صورت ہے جس کا مفہوم ہے وہ اشیاء یا تغیّرات جن کی نمود زمین سے اوپر اوپر ھوتی ہے ۔ اس اصطلاح کا آغاز چوتھی صدی قبل مسیح میں ہوا ۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ فلاسفۂ یونان فضائے آسمانی میں وقوع پذیر ہونے والے مظاہر کی توضیح میں دلچسپی لیا کرتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے ان کی مختلف توجیہات پیش کی ھیں ۔ یہ معلوم نہیں ھو سکا کہ یونانیوں نے دیگر اقوام خصوصاً اھل بابل سے کس حد تک استفادہ کیا ۔ مگر اتنا ثابت ہے کہ قدیم ھی سے ان کی رسائی اھل بابل و مصر سے منقول بعض

بھی شامل تھیں۔

یونانیوں کے ہاں اس موضوع پر پہلی مفصّل کتاب ، ارسطو کی کتاب ,,الآثار العلویہ (۱) ،، ہے۔ اس میں اس نے متقدمین کے افکار کی جمع و ترتیب کی ہے۔ یہ امر لائق توجہ ہے کہ باعتبار اہمیت متقدمین کے افکار کی درجہ بندی کرتے ہوئے ارسطو کی رائے اکثر صائب نہیں ہے۔ مؤرخین علوم کے ہاں یہ رائے غالب رہی ہے کہ آثار علویہ کا علم، ارسطو کے شاگرد تھیوفراسٹس (Theophrastos) کے ہاں ایک اہم مرحلے میں داخل ہوا۔ اس قیاس کی اساس عربی زبان میں ہم تک پہنچنے والے بعض نثر پاروں کی تاویل پر تھی کیونکہ یونانی اصل تو ضائع ہو چکی تھی۔ عربی اور سریانی میں دریافت ہونے والے کچھ ٹکڑوں پر تحقیق کی گئی اور بعض علماء نے ان سے بعض نتائج اخذ کئے۔

چار برس ہوئے رامپور (ہندوستان) میں[اس کتاب کے]عربی ترجمے کا واحد مکمل نسخہ میرے ہاتھ لگا۔ میں نے یہ دیکھنے کے لئے اس کا مطالعہ کیا کہ آثار علویہ کی تاریخ میں تھیوفراسٹس کی حیثیت سے متعلق جو قیاس آرائیاں کی گئیں ، کہاں تک درست ہیں۔ کھلا یہ کہ اس میدان میں بہت مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ مبصّر کتاب بعض عجیب و غریب توجیہات و آراء کا جواز ـــــ بشمول ان آراء کے جو خود تھیوفراسٹس نے پیش کی ہیں ـــــ محض اس مفروضے پر فراہم کرنے کی کوشش میں حق بجانب نہیں کہ دراصل یہ عرب مترجم کی کوتاہئ فہم کا نتیجہ ہیں جس نے ، بقول موصوف ، کتاب کو اچھی طرح سمجھے بغیر ہی ، اس کی تلخیص کر ڈالی ہے۔

رہی مسلمان علماء کی حیثیت سو اس کو ، کماحقّہٗ معلوم کرنا

ہی ممکن نہیں رہا کیونکہ اس میدان میں ان کی زیادہ تر اہم کتب ضائع ہو چکی ہیں مثلاً الکندی ، ابن الہیثم اور البیرونی کی وہ کتابیں جن میں اس علم کے پیچیدہ مسائل پر بھرپور بحث کی گئی تھی ۔ چنانچہ ہم مجبور ہیں کہ اپنے اس خطبے میں ان مخصوص رسائل پر، جن کا موضوع آثار علویہ کے لخت لخت مسائل ہیں نیز مسلمان سائنسدان فلسفیوں کی ان آراء پر انحصار کریں جو ان کی کتابوں میں بالواسطہ آ گئی ہیں ۔

مسلمانوں کے ہاں آثار علویہ کی تحقیق کے سلسلے میں ایک اہم دستاویز الکندی کے رسائل ہیں ۔ آثار علویہ پر الکندی کی اہم ترین عطا ,,قانون انبساط احجام،، (حجم میں پھیلاؤ کا قانون) ہے جس کی بنیاد پر اسے پہلا عالم قرار دیا جا سکتا ہے جس نے اس علم کو اس قانون کی اساس فراہم کی۔جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ارسطو اور اس سے قبل اور اس کے بعد کے لوگوں کے ہاں علم آثار علویہ کی اساس زمین سے اوپر سورج کے اثر سے دو قسم کے بخارات یعنی تر بخارات اور خشک بخارات کے جدا ہونے کے تصوّر پر قائم تھی [۲]۔ تر بخارات بارش ، برف اور اولوں وغیرہ کا مادہ تھے جبکہ خشک بخارات ہواؤں کا مادّہ تھے ۔

الکندی نے فضائی احوال کی تشکیل کے ضمن میں ,,قانون انبساط احجام،، کو بنیادی اصول کی حیثیت دی ۔ بنا بریں وہ ہمیں اس میدان میں جدید نظریات کا پیشرو نظر آتا ہے ۔ اپنے مخصوص اسلوب میں وہ اس قانون کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے ۔ [۳]

,,ہر جسم جو ٹھنڈا ہوتا ہے وہ سکڑ جاتا ہے اور ٹھنڈا ہونے سے قبل جتنی جگہ گھیرتا تھا اس سے کم اسے درکار ہوتی ہے ۔ اور ہر جسم جو گرم ہوتا ہے وہ پھیلتا ہے اور گرم ہونے سے قبل جتنی جگہ

نها اس سے زیادہ اسے درکار ہوتی ہے » ۔
م دیکھتے ہیں کہ الکندی نے نہ صرف ,,قانون انبساط» کو علم
لوبہ کی اساس بنایا بلکہ اس قانون کی اولین جامع و مختصر
بھی وہی ہے جو اس نے فراہم کی۔اگرچہ اس قانون کا علم
یونان کو بھی تھا جیسا کہ ہم بلیناس کی کتاب ,,علل الاشیاء
الخلیقة ,, (۴) میں دیکھتے ہیں ، جس کی تألیف اسلام سے فوراً
کی چند صدیوں کے دوران میں ہوئی ۔ بلیناس کی کتاب میں
انبساط کی تعریف الکندی کی جامع و مختصر تعریف سے
انداز میں یوں آئی ہے : ,,برودت کے خواص میں سکڑنا اور
ہے اور حرارت کے خواص میں پگھلنا اور پھیلنا » ۔

سی قانون کی بنیاد پر الکندی بارش کے عمل کی توجیہ میں
و سے مختلف بات کہتا ہے۔ ارسطو کا موقف یہ ہے کہ بارش ہونے
ب مرطوب بخارات کا برودت سے اتصال ہے (۵) ۔ بارش ہونے کی
حت اصولاً درست ہے لیکن ارسطو یہ نہیں بتاتا کہ جب
ب بخارات ٹھنڈے ہوتے ہیں تو ٹھنڈ کا ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔
الکندی بارش کے عمل کی آخری علّت تک پہنچتا ہے یعنی
ت کے حجم کا سکڑنا جو درجہ حرارت میں تبدیلی سے واقع
ہے۔ اس طرح اس کی توجیہ مکمل طور پر دور جدید کی توجیہ
ا ملتی ہے ۔

الکندی اور ارسطو کے مابین جو بڑا فرق ہے وہ ہواؤں کے چلنے
سلسلے میں دونوں کے نظریات سے واضح ہو جاتا ہے۔ ارسطو کے
ک ہواؤں کا مادّہ خشک بخارات ہیں، جبکہ الکندی کی نظر میں
ے ہواؤں کا مادّہ ہوائے محض ہی ہے ۔ (٦) ضروری معلوم ہوتا ہے

که هواؤں کے چلنے کی جو توضیح ارسطو نے پیش کی ہے وہ آپ کے سامنے بیان کر دوں تاکہ الکندی کے نظریات کی اہمیت کھل کر سامنے آ سکے۔ ارسطو نے ہواؤں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے: عمودی ہوائیں اور افقی ہوائیں۔ اول الذکر اس کے خیال میں خشک بخارات کے اٹھنے اور بلندی پر جا کر سردی سے ٹکرانے کے سبب پیدا ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں یہ بخارات زمین کی طرف لوٹ آتے ہیں اور یہ حرکت عمودی ہواؤں کو جنم دیتی ہے۔ افقی ہوائیں اس کی رائے کے مطابق، کرہ ارض کے گرد موجود طبقہ ہوائی کی حرکت سے عبارت ہیں جو فلک افقی کے ساتھ کلّی حرکت کی تابع ہیں۔ یہ عجیب و غریب تصوّر بہت بڑے تضادات پر مشتمل ہے۔ ایک محقق نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ,,ارسطو خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ اس نے یہاں کیا کہا ہے"۔

آئیے اب دیکھیں کہ الکندی ہواؤں کے چلنے کی کیا توجیہ کرتا ہے:

,,جب سورج شمالی جھکاؤ میں ہوتا ہے تو شمالی جانب کے مقامات گرم ہو جاتے ہیں اور جنوبی جانب کے مقامات سرد ہو جاتے ہیں۔ نتیجۃً شمالی ہوا اپنی حرارت کے باعث پھیلتی اور جنوب کی سمت رواں ہوتی ہے کیونکہ جنوبی ہوا سرد ہو جانے کے باعث سکڑ چکی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ موسم گرما کی اکثر ہوائیں شمالی اور موسم سرما کی اکثر ہوائیں جنوبی ہوتی ہیں۔ بجز ان صورتوں کے جو زیریں[یعنی زمینی]اسباب سے پیش آتی ہیں۔ مثلاً ندی نالوں کا بہاؤ، عارضی طغیانیاں، تھمے ہوئے پانی، اور چوٹیوں کی بلندی کہ یہ اور ایسے ہی دیگر اسباب ایسی وجوہ پیدا کرتے ہیں جن سے بخارات کا بہاؤ مختلف سمت اختیار کر لیتا ہے اور نتیجۃً، مقامات کی بلندی کے اعتبار سے، مختلف قسم کی ہوائیں رونما ہوتی

ی کا یہ نظریہ مکمل طور پر اس جدید نظریے سے ہم آہنگ
رھویں صدی عیسوی میں جارج ہیڈلی (George Hadley)
ل کانٹ (Immanuel kant) سے منسوب کیا جاتا ہے۔
انبساط احجام ھی کی بنیاد پر الکندی اور بھی کئی
کیلات کی وضاحت کے سلسلے میں ارسطو سے اختلاف
ثلاً برف اور اولوں کا وجود میں آنا ۔ میں یہاں اس کی
جانے کی گنجائش نہیں پاتا ۔ مگر مناسب خیال کرتا ہوں
، بخارات کے بلند ہونے کی حدود کے سلسلے میں ارسطو کی
ندی کی تنقید کا ذکر کرتا چلوں ۔ ارسطو کا خیال تھا کہ
ی بلندی سولہ (ستاڈیون) یعنی تقریباً تین ہزار دو سو میٹر
ہیں ہوتی ۔ اس پر الکندی یوں تبصرہ کرتا ہے :
ی "[ارسطو] کو کیونکر علم ہوا کہ روئے زمین سے بخارات
سولہ سٹا ڈیا سے زائد نہیں ہوتا ۔ نیز یہ کہ روئے زمین اور
ترین مقام کے درمیان ۔ جہاں بخارات منجمد ہو کر بادل
اختیار کر لیتے ہیں ۔ کس قدر فاصلہ ہے " ۔
کی آراء پر ناقدانہ بحث کے بعد وہ کہتا ہے :
کچھ ہم نے عرض کیا اس سے واضح ہو گیا کہ اس حد کا
ہ نہیں ، جہاں پہنچنے پر بخارات کثیف ہو کر پانی بن
... بسااوقات اس کے زمین سے قرب یا بلندی کے اعتبار سے
ں عوامل رونما ہوتے ہیں ۔ چنانچہ وہ مقامات جہاں
ہاڑ ہوتے ہیں بلند بخارات کو گردش کی حرکت کا اثر
سے باز رکھتے ہیں ... الخ " ۔
لویہ پر الکندی کے ہاں جو اہم نکات ملتے ہیں ان میں سے

ایک وہ رائے ہے جو اس نے فضا میں نظر آنے والے لاجوردی رنگ کا سبب متعیّن کرنے کے سلسلے میں پیش کی۔ اس موضوع کی تاریخ پر ہمارے علم کے مطابق الکندی ھی وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ رائے قائم کی کہ آسمان کا رنگ دراصل لاجوردی نہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :

,,فضا جو زمین کا احاطہ کئے ہونے سے اثر پذیر ہو کر ایک ھلکی سی روشنی دینے لگتی ہے جس کا سبب وہ زمینی ناری اجزا ھیں جو اُس حرارت کے باعث منتشر ہو جاتے ھیں جسے انھوں نے زمین سے انعکاس شعاع کے سبب قبول کیا ھوتا ہے۔ (چنانچہ) ھمارے سروں پر جو تاریک فضا ہے وہ ضیائے ارضی اور ضیائے کوکبی کے امتزاج سے تاریکی اور اجالے کے بین بین ایک رنگ میں نظر آنے لگتی ہے اور وھی یہ لاجوردی رنگ ہے،،۔

تاھم سائنس کی تاریخ میں یہ مذکور ہے کہ اٹلی کے لیونارڈو ڈاونچی اور جرمن شاعر گوئٹے وہ دو شخص تھے جنھیں پہلے پہل یہ توجیہ سوجھی۔ لیکن جب ھم الکندی کی وضاحت اور اس کی توجیہ کا موازنہ ان دونوں کی آراء سے کرتے ھیں تو ھم دیکھتے ھیں کہ الکندی کی رائے، جو سائنسی علم رکھتا ہے، ان دونوں سے زیادہ دقیق ہے جن میں سے ایک نے تو مصوّر کی نگاہ سے اس مظھر کو بیان کیا اور دوسرے نے شاعر کی نگاہ سے۔ اور ان تینوں میں جنھوں نے اس مظھر کی توجیہ پیش کی، صرف الکندی ھی ایسا ہے جس نے اس کے مقداری پہلو پر نظر ڈالی اور یہ رائے قائم کی کہ درمیانی فضا کی مقدارِ کثافت لاجوردی رنگ کے مدارج پر اثر انداز ھوتی ہے۔ اس مقداری مشاھدے سے پہلی بار بروکے (Brücke) نامی عالم نے

الکندی کا ایک مستقل رسالہ ,,مدوجزر،، کے موضوع پر بھی ہے
، انیسویں صدی عیسوی سے پہلے کے دور میں مدوجزر کے مظہر
، سب سے بھرپور اور سب سے مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔
اس مظہر کی وضاحت کی تاریخ میں ہم یہ سنتے ہیں کہ
تھوستنیز(Arathóstenes) یونانی اور سلیکوس (Seleukos) بابلی نے
سری اور تیسری صدی عیسوی میں یہ رائے قائم کی کہ مدوجزر کا
ی نہ کسی شکل میں چاند کی حرکات سے تعلق ہے۔ تاہم یہ دونوں
، مظہر کی توجیہ نہ کر سکے اور یہ گمان قائم کر لیا کہ جب کبھی
ند سمندر کے پاس سے گزرتا ہے، سمندر حیوان کی طرح سانس لیتا
۔

جہاں تک الکندی کا تعلق ہے سو وہ مدوجزر کی اقسام سے
ف ہے اور ان کو اس طرح بیان کرتا ہے جس طرح وہ آج ہماری
ودہ صدی میں معروف ہیں۔ تاہم اسے یہ علم نہیں کہ اصل سبب
ند کی کشش ہے۔ شاید، قانون انبساط احجام کے زیر اثر ہونے کے
ث اس نے یہ توجیہ قائم کی کہ چاند فضائے زمینی سے گزرتے وقت
ارت پیدا کرتا ہے جو حرارت شمسی کے علاوہ ہوتی ہے۔ اس
ارت سے ہوا کا حجم پھیلتا ہے اور نتیجۃً سمندر کا حجم جس کے
ں سے چاند گزرتا ہے، بھی پھیل جاتا ہے۔
یہ بات مجھ پر واضح ہو چکی ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے
ینی عالم رابرٹ گروسٹسٹے(Robertus Grosseteste) نے الکندی کی
ب دیکھی تھی اور اس سے وسیع پیمانے پر استفادہ کیا تھا۔ اور
وسٹسٹے کے رسالے ہی کو مدوجزر کے مظہر کا اولین مفصّل علمی
، شمار کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ الکندی کی توجیہ گروسٹسٹے
واضح نہیں ہو سکی چنانچہ اس نے اسے ایک عجیب و غریب

انداز میں سمجھا (دیکھئے میری کتاب تاریخ التراث العربی کی
ساتویں جلد) ۔

مسلمان علماء نے چاند کی کشش کے سبب سے مدوجزر کی توجیہ
تک فوراً بعد کی صدیوں میں رسائی پالی ۔ چنانچہ ایک گمنام مؤلف
کا ایک رسالہ ہم تک پہنچا ہے جو مختلف آراء کے ساتھ ساتھ ا
لوگوں کی رائے بھی پیش کرتا ہے جو چاند کی کشش کی بنیاد پر اس
کی توجیہ کرتے ہیں ۔ امکان یہ ہے کہ یہ رسالہ پانچویں صدی ہجری
میں تالیف ہوا ہو ۔ اس میں مؤلف نے کرۂ ارض پر مدوجزر کے اہ
مقامات کے نقشے بھی بنائے ہیں ۔

یہاں میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ آثار علویہ کے میدان میں
مسلمانوں نے جن جن نتائج تک رسائی حاصل کی سب کو بیان
دوں تاہم الکندی کے بعد کے بعض اہم نتائج کی طرف اشارے پر اکتفا
کرتا ہوں ۔

قابل ذکر امور میں سے ایک یہ ہے کہ النیریزی جو چوتھی صد
ہجری کے اوائل میں ہو گزرا ہے، پہلی بار بادلوں اور بخارات ک
بلندی کی پیمائش کے لئے آلات وضع کرتا ہے اور یہ آثار علویہ ک
تاریخ میں ایک نیا مرحلہ ہے ۔ چوتھی صدی ھی کے اواخر میں
ابوسهل الکوهی یہ حساب لگانے کی کوشش کرتا ہے کہ شہابیے
کن فاصلوں پر ہیں اور اس نوع کی تحقیق فضائی امور سے متعلق
تصوّر ہونی تھی ۔

تاہم آثار علویہ کی تاریخ میں عربی کی اہم ترین کتاب
ابراهیم بن سنان بن ثابت بن قرة کی کتاب ,,الابانة عن الطرق
المتعرّفة''[2] ہے ۔ اس کی وفات چوتھی صدی ہجری کے اواسط
ہوئی جبکہ اس کی عمر ابھی چالیس برس کی بھی نہ تھی ۔ ریاض

ر علم الفلک کے میدان میں اس نے حیرت انگیز دریافتیں کیں ۔
ـنیف و تالیف کا آغاز اس نے اٹھارہ برس کی عمر ھی میں کر دیا
ا۔ سورج کی حرکات پر اس کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے اچانک
جھے اس کتاب [الابانة] کی اھمیت کا احساس ھوا کیونکہ اس میں
ثار علویہ پر ارسطو کی کتاب زیر تنقید لائی گئی ہے۔ ارسطو پر اس
ی تنقید کے بعض اقتباسات دیکھ لینے کے بعد میں اس کی اس
تاب کو عربی اسلامی ورثے کی اہم ترین گم گشتہ کڑیوں میں شمار
رتا ہوں۔ سب سے پہلے اس شدید تنقید کا ذکر مناسب ہو گا جو
س نے پیروان ارسطو پر ان الفاظ میں کی ہے : (۸)

,,ان لوگوں کی مصیبت یہ ہے کہ یہ ارسطو کی تمام تر آراء کے
دفاع میں افراط سے کام لیتے ھیں اور یہ سمجھتے ھیں کہ ان میں
لغزش کا وجود ممکن نہیں حالانکہ انہیں علم ہے کہ ارسطو مجتہد
ضرور تھا معصوم و مؤیّد نہ تھا ۔اور اجتہاد میں خواہ کتنی ھی عرق
ریزی کیوں نہ کی جائے بھرحال لغزش کا اندیشہ باقی رہتا ہے۔ یہ وہ
مقام ہے جہاں ان کی ھٹ دھرمی (۹) سے شکایت پیدا ہوتی ہے اور ان
کے طور طریقے پر افسوس ہوتا ہے۔ یعنی وہ اسے اپنے لئے درست
سمجھتے ھیں کہ ارسطو کی کتاب الآثار العلویہ کی بتمام و کمال
پیروی کرتے رھیں ،، ۔

ارسطو کی کتاب پر اس کی تنقیدات میں سے صرف تین ھم تک
پہنچی ھیں :

۱ - پہلی بات جسے وہ سخت غلطی قرار دیتا ہے ارسطو کی یہ
رائے ہے کہ خط سرطان سے نیچے آبادی ختم ہو جاتی ہے اور اس سے
آگے جنوب کی سمت اس کا وجود ممکن نہیں (۱۰) کیونکہ اس کے
خیال کے مطابق شمال اور مغرب کی طرف سایہ نہیں پایا جاتا ۔

۲ ـ دوسری بات پہاڑوں کی فضا میں بخارات کے وجود کی حدود سے متعلق ارسطو کی رائے ہے ـ (۱۱) اس سلسلے میں وہ کہتا ہے : (۱۲) ,,ارسطو کا خیال ہے کہ بخارات کوہ قاقوس [Caucasus] تک بلند نہیں ہوتے اور ہوائیں وہاں تک نہیں پہنچتیں ـ اس پر اس کا استدلال یہ ہے کہ وہ لکیریں اور ہندسے جو قربانیوں اور ذبیحوں کی راکھ پر بنائے جاتے ہیں جوں کے توں باقی رہتے ہیں ـ نہ ہوائیں ان کو مٹاتی ہیں نہ بارش ختم کرتی ہے ـ [تاہم اس نے ہوا کی تاریکی کا کوئی ذکر نہیں کیا] (۱۳) حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو اس پہاڑ پر چلنے کا راستہ ہی نہ سوجھتا اور نہ وہ سب کام ممکن رہتے جو وہ اپنی قدیم جاہلیت کے دور میں وہاں جا کر انجام دیتے تھے ـ پھر وہ اس تاریکی (۱۴) کا بیان بھی ضرور کیا کرتے کیونکہ یہ باقی باتوں سے بڑھ کر اچنبھے کی چیز تھی بلکہ اس سے متعلق ایسی اساطیر گھڑ لیتے جو قربانی کے جانور لے کر اس پہاڑ پر جانے والوں اور پھر واپسی پر ان سے [وہاں کے احوال] سننے والوں کے عقائد کو تقویت پہنچاتیں ،، ـ

۳ ـ تیسری بات جو میرے خیال میں اس کا سب سے اہم اعتراض ہے اس اصول کے رد میں ہے جس پر یونانی اور بہت سے مسلمان علماء بھی نہ صرف آثار علویہ کے میدان میں بلکہ طبیعیات کے سلسلے میں بھی یقین رکھتے تھے ـ یہ اصول اہل یونان کے ہاں (Antiperistasis) کہلاتا تھا (۱۵) ـ الکندی کے الفاظ میں یہ اصول ,,متضاد عوامل مثلاً ظاہر و باطن کی کیفیات کی تقسیم ،، سے عبارت ہے ـ مراد یہ کہ حرارت اپنے آپ کو آس پاس کی برودت کے مقابلے میں سمیٹ کر رکھتی ہے ـ اور اس کے اثر سے خود کو گھٹنے نہیں دیتی اور اسی طرح بالعکس ـ ارسطو بہت سے فضائی مظاہر کی توجیہ اسی اصول کی بنیاد پر کرتا ہے ـ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ارسطو کی رائے میں

موسم گرما کی بارش گرم بخـارات کے اس برودت سے ٹکرانے کا نتیجہ ہوتی ہے جو گرم ہوا میں محبوس ہوتی ہے۔ الکندی اور بعض دوسرے مسلمان علماء مثلاً ابن العمید اسی فضائی مظہر کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ گرم بخارات فضا میں سرد ہوا سے ٹکراتے ہیں جس کے نتیجے میں گرم بخارات کا حجم سکڑ جاتا ہے اور یہی توجیہ وہ اس سلسلے میں پیش کرتے تھے کہ موسم گرما میں مصر اور جزیرہ عرب میں بارش کم کیوں ہوتی ہے اور ہندوستان میں زیادہ کیوں ہوتی ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ ہندوستان میں موسم گرما کی بارش کی جو توجیہ ابن العمید نے بیان کی ہے وہ موجودہ دور کی توجیہ سے کامل مطابقت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ اس کا سبب بحرھند سے آنے والے بخارات کی کثرت کا اس شمالی ہوا سے ٹکراؤ ہے جو سورج کے شمالی جھکاؤ کے باعث پھیل کر ادھر آ رہی ہوتی ہے۔

یہ اصول ,,جوّالأسراب،، [تہ خانوں کی فضا] کے عنوان سے چوتھی صدی ہجری میں علماء کے ہاں موضوع اختلاف بنا رہا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابراهیم بن سنان ارسطو کے اصول کو تجربے کی بنیاد پر یوں رد کرتا ہے : (۱٦)

(۱۷) ,, اور میں نے دو مساوی اور باہم مشابہ برتنوں میں اس حد تک ٹھنڈے اور گرم سادہ پانی کی ، یکساں مقدار ڈالی جسے چھونے سے تکلیف محسوس نہ ہو۔پھر دونوں کو بیک وقت خشک(۱۸) ہوا کے سامنے رکھا ، سو ٹھنڈے پانی کی سطح جم گئی جبکہ گرم پانی میں ہنوز گرمی کی کچھ رمق باقی تھی ۔ میں نے اس تجربے کو دھرایا اور گرم پانی کو خوب کھولا لیا (۱۹)۔ نتیجۃً ٹھنڈا پانی جم گیا۔ جبکہ گرم پانی ہنوز پہلے تجربے والے درجہ حرارت تک بھی نہیں آیا تھا۔
علاوہ ازیں تہ خانوں کی فضا کے بارے میں ان کی یہ رائے ہے کہ

وہ موسم گرما کی نسبت موسم سرما میں زیادہ گرم ہوتی ہے نیز بالعکس ، حالانکہ دونوں موسموں میں موم یا پگھلی ہوئی چربی کے وہاں کی فضا میں جم جانے کی مدت کا تجربہ اور پھر اس بات کا ریکارڈ کہ جسم سے متصل لباس (۲۰) کی وہ کم سے کم مقدار کیا ہے جس سے دونوں(۲۱) موسموں میں وہاں پر جسم موسم کی شدت سے بس محفوظ رہ سکے ، ان کی رائے کو غلط ثابت کرتا ہے اور اسی رائے کی تصدیق کرتا ہے کہ گرمی اور سردی ہوا کو لاحق ہونے والی دو کیفیتیں ھیں ۔ نیز یہ کہ ھوا کا جو حصہ زمین کی بیرونی سطح سے متصل ھوتا ہے وہ ان دونوں کیفیتوں سے زیادہ متاثر ھوتا ہے بنسبت اس حصے کے جو سطح زمین سے دور ھوتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ارسطو کے معتقدین میں سے ایک فاضل شخص نے مجھ سے کہا : ,, اگر اسے درست مان لیا جائے تو کیا (۲۲) ھمارے تمام علوم طبیعیات ناقص نہ قرار پائیں گے ؟ میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر ناقص ٹھہریں گے تو وہ اصول ٹھہریں گے جن پر تم نے عمارت اٹھائی ہے اور جو چیز حقیقت پر مبنی نہیں اس کے علم کو ,,علم،، کہنا ھی درست نہیں،،۔

مندرجہ بالا بحث کے تسلسل میں میں یہاں ایک شعاعی مسئلے کا بھی ذکر کرنا چاھوں گا جو (Meteorology) کے دائرے میں زیر بحث آتا رہا ہے۔ یعنی روشنی کی رفتار کا مسئلہ۔ علمائے یونان آسمانی بجلی اور گرج کی رفتار پر بحث کیا کرتے تھے اور اس ضمن میں بار بار یہ کہتے تھے کہ روشنی کے محسوس ہونے میں وقت صرف نہیں ھوتا جبکہ آواز کے محسوس ہونے میں وقت لگتا ہے ۔ مسلمان علماء بھی اسی رائے کے قائل تھے جن میں ابن سینا بھی شامل ہے۔ لیکن ابن الہیثم نے پہلی بار یہ لکھا کہ روشنی کی رفتار بھی محدود ہے اور

اخر میں اس اہم توضیح کا ذکر کرنا چاہوں گا جو مسلمان علماء
ے ہالہ اور قوس قزح کے پیدا ہونے کی توجیہ میں پیش کی ۔ اس
ضمن میں انھوں نے حیران کن نتائج تک رسائی حاصل کی ۔ یہاں ان
کی تفصیل میں جانا ممکن نہ ہو گا صرف اجمالاً ان کا ذکر کروں گا۔
ان کی دریافتوں کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہو گا کہ ہم
یہ بھی جانتے ہوں کہ یونانیوں بالخصوص ارسطو اور اس کے شاگرد
تھیوفراسٹس کے تصوّرات کیا تھے ۔ ان کے ہاں نقطۂ آغاز یہ تھا کہ
آنکھ سے نکلنے والی بصری شعاع بادل تک اور پھر منعکس ہو کر
چاند اور سورج تک پہنچتی ہے گویا اس مسئلے کی وضاحت میں
ارسطو ، صاف طور پر یہ کہتا تھا کہ بادل کا زمین سے فاصلہ اتنا
ہی ہے جتنا چاند اور سورج سے ہے (۲۳) ۔ ہالہ بننے کے سلسلے میں
تھیوفراسٹس کا تصوّر یہ تھا کہ چاند اپنی روشنی کی موجوں نیز اپنے
گرد موجود بادل اور کہرکے ساتھ دور ہٹ جاتا ہے ۔

چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں مسلمان علماء نے یہ سمجھ
لیا کہ چیزوں کا نظر آنا ان چیزوں سے آنے والی شعاع کے آنکھ میں
داخل ہونے کے سبب سے ہوتا ہے اور اسی اساس پر وہ ہالہ اور قوس
قزح کے پیدا ہونے کو زیر بحث لاتے تھے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی
توضیحات کا ارتقاء بالآخر ساتویں صدی ہجری کے کمال الدین
الفارسی کی شخصیت میں اس صحیح حل تک پہنچ گیا جو
فرانسیسی عالم ڈیکارٹ (Descartes) کے ہاں سترھویں صدی
عیسوی میں نظر آتا ہے ۔ یعنی یہ کہ قوس قزح فضائے آسمانی میں
موجود قطروں میں شعاع کے ایک یا دوبار ٹوٹنے کا نتیجہ ہے اور رنگ
اس شکستِ شعاع کے زاویوں کے اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں ۔

حواشی از مترجم

۱۔ ارسطو کی یہ کتاب چار مختصر حصوں میں منقسم ہے۔ تعارف کے لئے دیکھئے :

arton George, Introduction to the History of Science, Washington, 1950-53, 1/333.

"Meteorology" کے عنوان سے اس کے مکمل انگریزی ترجمے کے لئے دیکھئے :

reat Books of the Western World, (Britannica Great Books), Chief Ed. Hutchins R.M., Encyc. Brit. Inc. 1952, 8/445-494 (tr. by E.W. Webster)

نوٹ :

آئندہ حواشی میں اس انگریزی ترجمے کے حوالے کے لئے صرف ،،ارسطو، eteorology استعمال ہوگا۔

۲۔ دیکھئے ارسطو، Meteorology، ص ۳۶۳

۳۔ خطبے میں اقتباسات کے حوالے مہیا نہیں کئے گئے اور الکندی کے سلسلے میں تو کتاب کا نا بھی مذکور نہیں لہذا اصل تک رسائی ہمارے لئے ممکن نہ ہو سکی ۔

۴۔ Appolonius of Tyana سے منسوب کتاب

Book of Causes (or Secret of the Creation)

مراد ہے۔ دیکھئے :

Dictionary of Scientific Biography, American Council of of Learned Societies, Chief Ed. C.C. Gillispie, New York, 1981, 7/41, 13/407.

۵۔ دیکھئے ارسطو، Meteorology ص ۳۵۳۔

۶۔ چلتی ہوا (ریح ، Wind) ، ہوائے محض (ہواء، Air) اس بحث کے سلسلے میں ملاحظہ ہو ارسطو، Meteorology ص ۳۵۵ ، ۳۶۵ ۔

۷۔ مطبوعہ حیدرآباد میں ،،المحترقة ،، ہے اور فاضل محقق نے اس کی اصلاح کی ہے۔ دیکھئے : ابراهيم بن سنان ، كتاب في حسركات الشمس ، دائرة المعارف العثمانية ، حيدر آباد دکن ۱۳٦۷ هـ/ ۱۹۴۸ ع ص ۵٦ ۔

نوٹ :

آئندہ حواشی میں اس کتاب کے حوالے کے لئے صرف ،،حرکات الشمس،، استعمال ہوگا ۔

۸۔ بحوالۂ بالا ۔ خطبے میں اقتباس کی عبارت کئی جگہ لفظی فرق رکھتی ہے۔

۹۔ بحوالۂ بالا ۔ مطبوعہ میں ،،وهذا موضع شكاية آباء هم ،، ہے۔ خطبے میں بھی اسی طرح نقل کیا گیا ہے۔ تاہم ہماری سمجھ میں اس کا کچھ مفہوم نہیں آیا ۔ [illegible]

ہو گا جس میں ,,اِباء،، سے مراد ,,اباۓ حقیقت،، ہے۔ اسی قیاس کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔
بحوالۂ بالا ، نیز موازنہ کیجئے ارسطو ، Meteorology ، ص ۳٦۸ ۔
یہاں غالباً فاضل محقق کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ اصل کتاب میں اس مقام پر یہ تو پہاڑوں کی فضا میں بخارات کا مسئلہ زیر بحث ہے نہ اس سلسلے میں ارسطو کی رائے زیر تنقید ہے۔ تنقید اس روپے پر ہو رہی ہے کہ ارسطو کے متبعین اس کی اپنی آراء پر بھی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ اپنی طرف سے ان آراء پر مزید قیاسات قائم کر کے انہیں مشاہدے کا قائم مقام تصوّر کرنے لگتے ہیں ۔ اس ضمن میں احمد بن الطیّب السرّخسی کی وہ رائے زیر بحث لائی گئی ہے جو انھوں نے اپنی کتاب ,,ارکان الفلسفہ،، میں بیان کی ہے اور جس کے بموجب بہت زیادہ بلند مقامات پر ہوا کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے۔ ابن سنان اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ارسطو کی کتاب ,,الحس والمحسوس،، (Sense and the Sensible) میں ہوا کی سیاہی کا جو اشارہ ملتا ہے ، سرخسی نے اس پر مبالغے کی عمارت کھڑی کر دی ہے۔ حالانکہ کوہ پیماؤں کا تجربہ و مشاہدہ اس امر کی قطعاً تصدیق نہیں کرتا۔ اسی سلسلے میں اس نے یہ استدلال پیش کیا ہے کہ خود ارسطو کے نزدیک کوہ قافوس بلند ترین پہاڑ ہے جس تک ، بقول ارسطو بخارات اور ہواؤں کی بھی رسائی نہیں ، لیکن اس نے وہاں بھی ہوا کی سیاہی یا تاریکی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ الغرض ارسطو کا ذکر ضمناً آیا ہے اصل تنقید سرخسی کی مبالغہ آرائی پر ہے۔ دیکھئے ، حرکات الشمس ، ص ۵۳ ۔ ۵۵ ، ۵٦ ۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ارسطو کے ہاں جہاں کوہ قافوس کے بلند ترین پہاڑ ہونے کا ذکر ہے وہاں دیحوں وغیرہ کی راکھ پر اس پر سائے جانے والے نقوش کا ذکر ہمیں نظر نہیں آیا (دیکھئے ارسطو ، Meteorology ، ص ۳۵۰) ۔ اگرچہ ہواؤں کے ضمن میں ایک اور مقام پر یہ جملہ موجود ہے :

"They do not seem to blow above the level of the highest mountains"

(ارسطو ، Meteorology ، ص ۳۳۸) ۔

شاید اس کا سبب یہ ہے کہ ابن سنان (م ۳۳۵ ھ/۴۷-۹۳٦ ء) کے سامنے ارسطو کی کتاب کا کوئی قدیم تر اور زیادہ مکمل نسخہ تھا۔ معاصر مغربی دنیا میں جن مخطوطات سے اس کتاب کا متن معیّن کیا گیا ہے ان میں قدیم ترین غالباً وہ ایک نسخہ ہے جس کا تعلق دسویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے سے ہے۔ (دیکھئے : ISIS, III, 1920, p. 278)

۱۲ - حرکات الشمس ، ص ، ۵۵ ، یہاں بھی اقتباس کی عبارت اصل سے کامل مطابقت نہیں رکھتی ۔

۱۳ - فاضل محقق نے ,,لم یذکر فیه شیئاً من سواد الهواء،، کے الفاظ یہاں سے حذف کر دیئے ہیں حالانکہ ان کے بغیر وہ استدلال سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا جس کی تلخیص اوپر بیان ہوئی (دیکھئے حوالہ بالا)

۱۴ - حرکات الشمس (حوالۂ بالا) میں ,,الظلام،، ہے اور یہی بر محل معلوم ہوتا ہے۔ فاضل محقق نے اسے ,,الکلام،، بنا دیا ہے۔

۱۵ - دیکھئے : Dictionary of Scientific Biography, 9/133, 13/330

۱۶ ـ ہماری فہم ناقص کے مطابق یہاں بھی فاضل محقق کو ایک گونہ التباس ہوا ہے کیونکہ آگے بیان ہونے والی دو مثالوں میں سے پہلی کا ,,جوّ الأسراب،، سے کوئی تعلق نہیں ۔ صرف دوسری اس سے متعلق ہے ۔ پہلی مثال اسی رویے کے ضمن میں لائی گئی ہے جس پر تنقید سرخسی کے حوالے سے ہوئی ۔ اسی تسلسل میں متبعین ارسطو کا یہ قیاس زیر بحث آیا ہے کہ گرم پانی چونکہ لطیف تر ہوتا ہے اور اس کے سالموں میں باہمی فاصلہ زیادہ ہو جاتا ہے ، اس لئے وہ ٹھنڈے پانی کی نسبت جلد جم جائیگا کیونکہ ٹھنڈا پانی کثیف ہوتا ہے اور اسکے سالمے باہم پیوستگی کی حالت میں ہوتے ہیں ۔ اس کے رد میں ابن سنان نے ٹھنڈے اور گرم پانی پر اپنے تجربے کی تفصیل بیان کی ہے جس کا تہہ خانوں کی فضا سے کوئی تعلق نہیں ۔ البتہ دوسرا تجربہ جو موم اور چربی وغیرہ پر کیا گیا ، زیر زمین درجۂ حرارت سے متعلق ہے اور ایک الگ چیز ہے ۔

۱۷ ـ اس اقتباس کے متن ـ (حرکات الشمس ، ص ۵۶ ـ ۵۷) ـ میں کئی مقامات محل نظر معلوم ہوتے ہیں اور یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید ان میں ایڈیٹنگ کی کچھ خامی ہے ۔ تاہم اصل مخطوطے تک رسائی نہ ہونے کے سبب ہمارے لئے اس سے زیادہ کچھ ممکن نہیں کہ عبارت جس حد تک بھی ہمارے فہم ناقص میں آ سکے اس کی ترجمانی کر دیں ۔

۱۸ . حرکات الشمس (ص ۵۷) میں ,,النشّاف،، ہے جس کا کچھ مفہوم سمجھ میں نہیں آتا ۔ ممکن ہے کہ یہ ,,النشّاف،، ہو جس سے مراد چوس لینے والی یعنی حرارت جذب کر لینے والی ہوا ہو ۔ خطبے میں اسے ,,الحاف،، بنا دیا گیا ہے اور مفہوم کے اعتبار سے یہ بھی ,,النشّاف،، کے قریب قریب ہی ہے ۔ چنانچہ اسی کے مطابق ترجمہ کر دیا گیا ہے ۔

۱۹ ـ حرکات الشمس اور خطبے دونوں میں ,,أعلیت،، ہے ۔ ہمارے قیاس میں یہ ,,أغلیت،، ہے ۔

۲۰ ـ حرکات الشمس اور خطبے دونوں میں ,,الشباب،، ہے جو سیاق کلام میں ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے ۔ ہم نے اسے ,,الثیاب،، تصور کیا ہے ۔

۲۱ ـ حرکات الشمس میں ,,منہا،، ہے ۔ خطبے میں بجا طور پر اسے ,,منہما،، بنا دیا گیا ہے ۔

۲۲ ـ حرکات الشمس اور خطبے میں ,,لوصحّ هذا لا ینقص ما معنا من العلوم ..،، ہے لیکن سیاق و سباق نیز وزان عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ ,,لا،، کی جگہ ألا ,, ، بصیغۂ استفہام ، سمجھا جائے

۲۳ ـ موازنہ کیجئے ارسطو Meteorology ، ص ۳۷۷ .

قرآنیات

ابتدائی دور کے ہندستانی مسلمان اور قرآن پاک کے تراجم

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

چینی زبان کے الفاظ قرآن میں

ڈاکٹر مہدی حسن



قرآنیات پر عموماً اور قرآن کے مفسروں کی ۱۴سو سالہ خدمات میں خصوصاً جو […]
سیمینار ۱۹۹۰ء میں ہوا تھا۔ اسمیں ایک مقالہ ڈاکٹر انصار اللہ نے بھی پیش کیا تھا۔ وہ مقالہ
پیش خدمت ہے۔ ڈاکٹر مہدی حسن کا مختصر سا مقالہ بھی اپنے موضوع پر خاصا ہے۔
امید ہے دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

ادارہ

ابتدائی دور کے ہندستانی مسلمان

اور

قرآن پاک کے تراجم

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

۴/۵۰۵ سرسید روڈ

سرسید نگر، علیگڑھ



دکن کے علاقوں میں اس سلسلے میں، جس سے بالآخر شنکر آچارج کا تعلق ہے، ایک شخص یامن آچارج (यामुनाचार्य) ہوا ہے۔ شنکر آچارج کے زمانے پر اگر قیاس کریں تو یامن آچارج کو پہلی صدی ہجری / ساتویں صدی عیسوی کا آدمی ماننا ہوگا۔ تمل زبان میں اس کا نام آڑ وندار (आळवन्दार) ہے یعنی وہ جو حفاظت کے لیے تشریف لائے۔ مہرشی شیوبرت لال ورمن کا کہنا ہے کہ یامن آچارج مسلمان تھا۔[1] اس شخص کے ظہور کے بارے میں جو روایت مشہور ہے اس سے بھی مہرشی جی کے قول کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ یامن آچارج ہی وہ شخص ہے جس سے بھکتی کے تصور کی ابتدا ہوتی ہے چنانچہ یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان میں آنے کے بعد ہی مسلمان بزرگوں نے یہ طریقہ بنا لیا تھا کہ عبادات اور ریاضت کے معاملوں میں بھی ایسی صورت اختیار کی جائے جو یہاں کے ماحول اور مزاج سے مطابق ہو اور غیریت کا احساس پیدا نہ ہو، تاکہ یہاں کے عوام ان کے زیادہ سے زیادہ قریب آسکیں اور ان کی باتوں کو جلد از قبول کرلیں۔ اس طرح اسلامی عقائد اور تعلیمات بالواسطہ طریقے پر بتدریج رواج پاتے رہے۔ ابتدائی دور کے مسلمانوں کی اسی رواداری نے انھیں بھکتی یعنی نیازمندیِ عشق کے طریقہ کو جو خالقِ کائنات تک رسائی بلکہ اس کی ذات میں فنا ہو جانے کا عمل تھا، اختیار کر لینے کی تحریک کی تھی۔ یامن آچارج کے بعد یہ طریقہ سلسلہ بہ سلسلہ شمالی ہند میں بھی پہنچا البتہ یہاں جن لوگوں نے اس طریق کو پہنچایا تھا وہ برہمن تھے اور انھوں نے اس طریق کو اپنے مخصوص عقائد و نظریات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔

شمالی ہند کے ابتدائی زمانے کے مسلمان صوفی بزرگوں نے بھی عشق کے راستے کو اختیار کیا تھا اور ان کا مشرب یامن آچارج کے طریقے سے مطابقت رکھتا تھا اس لیے یہاں کی زبان میں وہ صوفی بھگت کہلائے۔ یہاں کے مخصوص حالات میں انھوں نے بہترین انداز سے تبلیغ و اشاعتِ مذہب کے سلسلے کو جاری رکھا۔ بتایا گیا ہے کہ حضرت معین الدین چشتی اجمیری وہ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے زبانِ ہندوی میں گیتوں کے گائے جانے کی اجازت دی۔ اجمیر میں آج تک عرس کے موقع پر استُتی (स्तुति) یعنی خدا کی حمد کے گانے کا رواج چلا آتا ہے۔ عالمگیر اورنگ زیب کے عہد کے شیخ اکھر وتی نے تو زبانِ ہندوی (اردو) کی ابتدا کا سلسلہ بھی حضرت خواجہ بزرگ اجمیری سے ہی جوڑ لیا ہے۔ انکے الفاظ یہ ہیں:

"و تو ہم نہ کنند کہ اولیاء اللہ بغیر از زبان عربی تکلم نہ کردہ، زیرا کہ جملہ اولیاء اللہ در ملکِ عرب مخصوص نبودہ۔ پس ہر ملکے کہ بودہ زبانِ آں ملک را بکار بردہ اند۔ و گمان نکنند کہ ہیچ اولیاء اللہ بزبان ہندوی تکلم نکردہ، زیرا کہ اوّل از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والدین قدس اللہ سرہٗ بدیں زبان سخن فرمودہ"[2]

---

[1] یہ بات راقم کو ڈاکٹر ڈی، اس ورون نے بتائی ہے لیکن وہ یامن آچارج کو مسلمان نہیں مانتے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ "سری راماکے بعد ان کے ایک شاگرد قریش سوامی ہوئے ہیں"۔ (ہندی ساہتیہ کا اتہاس، رام کمار ورما ص ۱۱۶) [2] کبیر جوگ مہرشی شیوبرت لال ورمن مطبوعہ نظام آباد جلد اصفہ ۱۸، ۲۶ معارضہ فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی انجمن ترقی اردو کراچی، مرتب سید عارف نوشاہی ۱۹۸۴ء ص ۱۳۶۔

بعد ازاں حضرت قطب الاسلام قدس اللہ سرہٗ وبعد ازاں حضرت گنج شکر قدس اللہ سرہٗ ...."
ت اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مسلمانوں کو دو چیزوں کی ضرورت پیش آئی ہوگی:
مسجد، دوم زبان اہل ہند۔
ملک میں جن مقاموں پر انھوں نے قیام کیا ہوگا، وہیں کسی جگہ کو مسجد کے لیے مقرر کر لیا ہوگا اور وہی جگہ بالآ
مانوں کے دینی اور تعلیمی مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی ہوگی۔ مسجدوں میں اسلامی عقائد کی تعلیم دی جاتی ہوگی اور
ہر نومسلم اور غیر مسلم سب کے لیے عام رہی ہوگی بلکہ تعلیم دینے والوں میں نومسلموں کا کردار زیادہ سے زیادہ اہم
ہوگا کیوں کہ وہ نہ صرف یہاں کی زبان بلکہ یہاں کے لوگوں کے مزاج اور انداز فکر کے بھی نبض شناس تھے۔ تعلیم
نے والوں میں اکثریت ان عوام کی رہی ہوگی جن کا تعلق غریب اور پست تر طبقہ سے ہوگا چنانچہ تدریس اور رابطہ
زبان غیر سنسکرت ہوگی اور چونکہ وہ بول چال میں رائج تھی لب و لہجہ اور مقامی اصطلاحوں کے اختلاف
باوجود ملک کے بڑے حصے میں سمجھی جاتی ہوگی۔ عوام ان پڑھ تھے۔ ان کی بول چال کی زبان کو مسلمانوں نے اپنے
رسم خط میں لکھا ہوگا۔ ایسی قدیم تحریروں کی جستجو کا ابھی سلسلہ بھی غالباً شروع نہیں ہوا ہے۔ راقم کو قرآن پاک کے
یسے دو ترجموں کا علم حاصل ہو سکا ہے جن میں سے ایک تمل اور دوسرا ملیالم زبان میں ہے اور دونوں عربی خط میں
لکھے گئے ہیں۔ یہ ترجمے بہت جدید ہیں۔ قدیم تحریروں کی تلاش جاری ہے۔
زبان ہندوی (قدیم اردو) میں اسلامی تعلیمات کی تلقین واشاعت کا ذکر سب سے پہلے تیسری صدی
ہجری نویں صدی عیسوی کے اواخر میں ملتا ہے جب بقول بزرگ بن شہریار ایک عراقی نے جو زبان ہندوی سے
واقف تھا "الرا" (ارور) کے راجا کو منصورہ (سندھ) کے بادشاہ عبداللہ کے حکم سے ۲۷۰ھ/۸۸۴ء میں وہاں
جا کر "اسلام کی شریعت کا حال ہندوی زبان" میں بتایا تھا۔ کہتے ہیں اس نے قرآن شریف کا اس زبان میں
ترجمہ کر کے بھی سنایا تھا۔ تلقین وتبلیغ کا یہ کام زبانی تھا اور تادیر اسی طور پر جاری رہا۔
سلطان محمود غزنوی پہلا بادشاہ تھا جس نے ہندستان کی مذہبی اور علمی زبان سنسکرت میں کلمۂ طیبہ
کا ترجمہ اپنے "دلی والے" سکوں پر لکھوایا اور ساتھ ہی اس پر ہجری سال بھی منقش کرایا تھا۔ ان اندراجات کے
جو دور رس اور دیرپا اثرات مرتب ہو سکتے تھے ان کا قیاس کیا جانا چاہیے۔ اس وقت سے گویا سنسکرت کا دروازہ

۔ محی صاحب علیم صبا نویدی نے تمل زبان میں اسلامی موضوعات سے متعلق حال کے مطبوعہ ایسے دس رسالے راقم کے پاس بھیجے ہیں۔ جو عربی خط میں ہیں۔ اس سے
یہ بات یقینی طور پر ہمارے علم میں آ جاتی ہے کہ تمل زبان کے لیے اب بھی عربی خط کا استعمال ہوتا ہے۔ نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۶۶ء ص ۶۷

مسلمانوں کیلئے کھل گیا تھا اور پھر تو اپنے مسلک، عقیدے اور مزاج کے مطابق وہ اس زبان میں تصنیف وتالیف کا کام بھی کرنے لگے۔ اس صورتِ حال نے اس زبان کو نئی زندگی اور ایک مختلف مزاج عطا کیا۔ مسلمانوں کے شعروں کو غالباً قدیم طرز کے "اشلوکوں" سے میز کرنے کے لیے "شرلوک"[1] کہتے تھے۔

زبان ہندوی کو تو مسلمانوں نے شروع سے اپنا لیا تھا اور اپنے معتقدات و نظریات کو اس میں زبانی پیش کرتے آرہے تھے۔ فیروز تغلق کے عہد میں مولانا داؤد نے لورک اور چاندا کے معاشقہ کی داستان کو "چندائن" کے نام سے ۷۷۹ھ / ۱۳۷۷ء میں نظم کیا اور اس داستان کے واسطے سے انھوں نے نہایت موثر اور دلگداز انداز سے اسلامی تعلیمات کو پیش کیا تھا۔ یہی زبان ہندوی کی پہلی دستیاب تصنیف ہے اور اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ:

"مطابق تفسیر بعضے از آیاتِ قرآنی ہے[2] اس کتاب میں متعدد اشعار واضح طور پر قرآن پاک کی آیتوں کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

اس ابتدائی زمانے میں لازم تھا کہ قرآن پاک کی افہام و تفہیم ہندستانیوں کے مخصوص علمی اور فکری مزاج کی مناسبت سے ہو، چنانچہ قدما خود اس کتابِ الٰہی کو بجائے قرآن کے "پُران" کہتے رہے ہیں۔ شیخ قطبن نے اپنے ممدوح مسلمان بادشاہ کی ستائش کرتے ہوئے کہا ہے ؎

پنڈت او بدھونت سیانا   پڑھے پوران، ارتھ سب جانا

یعنی وہ صاحب علم اور زیرک ہے۔ وہ قرآن پڑھتا ہے اور اس کے تمام مطالب سے آگاہ ہے۔ یہ لفظ اس معنی میں تا دیر مستعمل رہا ہے۔ ملک محمد جائسی نے بھی "پدماوت" میں کہا ہے ؎

پُن سو عثمان پنڈت بڈ گنی   لکھا پُران جو آیت سُنی

یہیں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ پنڈت کا لفظ صاحب علم کے معنی میں عام تھا۔ آج کے مروجہ اصطلاحی مفہوم میں اس کا استعمال بعد کے زمانے کی بات ہے۔

نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے ختم تک قرآن پاک کے مطالب کی پیشکش کا انداز وہی تھا جو مذکور ہوا۔ شیخ بہاء الدین باجن نے اپنے کلام میں قرآنِ پاک کی مختلف آیتوں کے مطالب کو نظم کیا۔ مثلاً سورۂ اخلاص کے مفہوم کو بھی اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

نا اُسکھ جینا، ناوہ جایا   نا اُنکھ مای باپ کہایا

---

[1] شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے رشد نامے میں ان کے شرلوک منقول ہیں اور مولانا داؤد نے بھی چندائن میں کہا ہے: ... شرلوک ... نام لکھی لائے ...

[2] منتخب التواریخ — عبدالقادر بدایونی

نا اُنھ کوں گو دِہ چڑھایا　　　با تجن سب اُنھ آپ نپایا

اسی طرح کہتے ہیں ؎

آں[1] کاسۂ زنجبیل مزاجھا کافورا　　　واں مشک لون ز بوے شراب طہورا

پہلا مصرع اس آیت کا ترجمہ ہے : اِنَّ الابرار یشربون من کاس کان مزاجھا کافورا

اور دوسرا مصرع اس آیت کا : ویسقون فیھا کاسا کان مزاجھا زنجبیلا

یہ دونوں آیتیں سورۂ دہر کی ہیں۔

دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی کے آغاز سے اسلامی تاریخ کے واقعات اور اسلامی تعلیمات کے واضح لفظوں میں بیان کیے جانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اشرف بیابانی کی نظم "نوسر ہار" میں جو ۹۰۹ھ / ۴-۱۵۰۳ء کی تصنیف ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے ایک غیر معمولی واقعہ یعنی سانحۂ کربلا کا بیان ہوا ہے اور اس کے بعد اسلامی عقائد اور مسلمان بزرگوں سے متعلق تصنیف و تالیف کا سلسلہ عام ہوگیا۔ جہانگیر بادشاہ نے تزک میں اپنے تیرھویں سالِ جلوس کا ایک واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ :

"بمشارٌ الیہ فرمودیم کہ مصحف بہ عبارتِ سلیس خالی از تکلف و تصنع ترجمہ نماید و اصلاً بہ شرح و بسط، شانِ نزول آں مقید نشدہ، بہ لغاتِ ریختہ قرآں را لفظ بہ لفظ فارسی ترجمہ کند و یک حرف بر معنی تحت اللفظ نیفزاید و بعد از اتمام آں مصحف ـــ روانۂ درگاہ سازد"

یہ نہیں معلوم کہ جہانگیر کی یہ فرمائش پوری ہوئی یا نہیں۔

یہ بات صحیح طور سے معلوم نہیں ہے کہ ہندستانی زبانوں میں قرآنِ کریم کا ترجمہ سب سے پہلے کس نے اور کب کیا تھا۔ کہا جاتا ہے[2] کہ قاضی محمد معظم سنبھلی نامی کسی شخص نے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے پہلے سالِ جلوس یعنی ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء میں یہ کام کیا تھا۔ اس کے بعد کسی مجہول الحال شخص نے دوسرا ترجمہ ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء میں بادشاہ مذکور ہی کے عہد میں کیا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں ترجموں کا کیا جانا خلافِ قیاس نہیں ہے لیکن ان دونوں ترجموں کے بارے میں کوئی بات بھی ہمارے علم میں نہیں ہے۔

قرآنِ پاک کے اردو تراجم کے نقطۂ نظر سے نابینا بادشاہ شاہ عالم ثانی کا زمانہ خاص طور سے اہمیت رکھتا ہے۔ یہی نہیں کہ اس کے زمانے میں ایک سے زیادہ لوگوں نے اس کام کو کیا، بلکہ خود اسی نے اپنی مشہور تصنیف[3] عجائب القصص

---

[1] اس کے لیے راقم پروفیسر شیخ فرید برہانپوری صاحب کا ممنون ہے [2] مقالاتِ (محمود) شیرانی جلد ۲۔ [3] قرآنِ کریم کے اردو تراجم مرتبہ ڈاکٹر احمد خاں، سید عبدالقدوس ہاشمی (مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد) ص ۱۲ [4] عجائب القصص ص ۵۶۸، ۵۷۴ وغیرہ

(آغاز ۱۲۰۷ھ/۹۳-۱۷۹۲ء) میں احادیث اور آیاتِ قرآنی کا ترجمہ کرنے کے علاوہ ان کی تشریح اور تفسیر بھی لکھوا دی ہے۔ ایسے مقاموں پر شیخ محمد واعظ الہ آبادی کی جامع المعجزات کے علاوہ کتب حدیث اور تفسیر ولا مثلاً تفسیر معالم التنزیل، تفسیر بیضاوی وغیرہ کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔

یہ بات عام طور سے تسلیم کی گئی ہے کہ قرآن پاک کا اوّلین ترجمہ وہ ہے جو شاہ رفیع الدین نے ۱۲۰۰ھ/۸۶-۱۷۸۵ء میں کیا تھا۔ اس کے بعد یہ کام شاہ عبدالقادر نے ۱۲۰۵ھ/۹۱-۱۷۹۰ء میں کیا۔ لیکن مطبوعہ صورت میں اوّلین[1] دستیاب ترجمہ مولانا لطیف اللہ لکھنوی کا ہے۔ انھوں نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھی تھی اور وہ اصل متن اور ترجمے کے ساتھ ڈاکٹر احمد خاں کے اندراج کے مطابق صدیقی پریس، بنارس میں ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء میں چھپ گئی تھی۔ اس کے کوئی چھ برس بعد حکیم محمد اشرف کاندھلوی کی سورۂ یوسف[2] کی تفسیر انقلاب اسٹیم پریس، لاہور میں ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں دو سو سولہ صفحوں پر چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن کسی نامعلوم پریس سے ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں نکلا تھا۔ ڈاکٹر احمد خاں کے اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں منظوم ترجمہ و تفسیر بھی شامل ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی محفوظ ہے۔

شاہ عبدالقادر کے ترجمے نے غیر معمولی اہمیت حاصل کی۔ وہ قرآن پاک کا مکمل ترجمہ[3] ہے اور اس کی زبان بھی نسبتاً صاف ہے۔ وہ ترجمہ ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں دہلی اور کلکتہ دونوں مقاموں سے شائع ہوا تھا۔ کلکتہ والے ایڈیشن میں مقدمہ بھی شامل ہے۔

متعدد با صلاحیت حضرات نے اپنے اپنے طور پر قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ جو حضرات اس کام کو مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے، ان میں محمد[4] نبی بخش اور محمد شمس[5] الدین شائق ایزدی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اوّل الذکر کی تفسیر نبوی منظوم کریمی اسٹیم پریس لاہور سے ۱۹۲۰ء میں اور ثانی الذکر کا منظوم اردو ترجمۂ قرآن مجید دین اسٹیم پریس لاہور سے ۱۹۲۳ء میں پہلی مرتبہ اشاعت پذیر ہوا۔

اردو نثر و نظم میں قرآن پاک کے جزوی اور مکمل جو ترجمے ہوئے ہیں ان کی تعداد کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ ڈاکٹر احمد خاں اور سید عبدالقدوس ہاشمی صاحبان نے اپنی کتاب میں ایک ہزار گیارہ مطبوعہ تراجم کا تعارف کرایا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ بہت سے ایسے مطبوعہ تراجم ہوں گے جو ان حضرات کے علم میں نہیں۔ پھر ایسے تراجم جو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکے، بے شمار ہوں گے۔

قرآن پاک کے پڑھنے والے اس زمین کے چپے چپے پر موجود ہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ انھوں نے اس کو سمجھنے کیلیے اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ بھی کیا ہوگا۔ عالم اسلام کے ممتاز ترین عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ[6] صاحب کے ذخیرۂ کتب میں کم و بیش ایک سو بیس زبانوں کے تراجم موجود ہیں لیکن وہ بھی کل نہیں ہیں۔ اس قابل فخر ذخیرے میں خود اس برصغیر میں بولی جانے والی

۱۔ قرآن کریم کے اردو تراجم، مرتبہ ڈاکٹر احمد خاں و سید عبدالقدوس ہاشمی (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۷ء) ص ۷، ۸ ۲۔ ص ۲۴۰
۳۔ ایضاً ص ۱۳۳ ۴۔ ایضاً ص ۲۴۵ ۵۔ ایضاً ص ۱۰۲ ۶۔ یہ فہرست ہمیں جناب عبداللہ (مدراس) نے عنایت کی ہے۔

زبانوں میں سے سرائیکی اور پشتو کے تراجم نہیں ملے۔ دنیا میں بولی جانے والی کتنی ہی اور زبانیں بھی ہوں گی جن کے تراجم اس ذخیرے کی زینت نہیں بن سکے ہیں۔

آخر میں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کے مطالعہ، ترجمہ اور تفسیر کا کام صرف مسلمانوں نے ہی نہیں کیا ہے۔ اس نیک کام میں غیر مسلموں نے بھی حصہ لیا ہے۔ جن عیسائی پادریوں اور عالموں نے ترجمہ مکمل کیا ان میں ریورنڈ احمد شاہ پادری، علی بخش پادری وغیرہ کے نام قابلِ توجہ ہیں۔ عیسائی پادریوں کا شائع کردہ پہلا قرآن کریم مع ترجمہ و تفسیر غالباً[1] وہ ہے جو مطبع "پیغام" دہلی سے ۱۸۴۴ء میں چھپا تھا۔ جو پادری اس کام کو مکمل نہیں کر سکے یا جنھوں نے محض کسی جز کا ترجمہ کیا ان میں جے علی بخش پادری اور سلطان محمد خاں پادری کا نام آیا ہے۔

ہندو عالموں[2] میں کنھیا لال الکھداری نے قرآن پاک کا اردو ترجمہ (بلا متن) دھرم سبھا لدھیانہ سے ۱۸۸۲ء میں چھپوایا تھا۔ اس مقام پر یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت[3] زبان میں بھی قرآن پاک کا ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ میرے ایک کرم فرما نے اطلاع دی کہ بنگلہ زبان میں بیسویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرے میں گریش گھوش نامی ایک ہندو عالم نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے اور یہ بات مشہور ہے کہ اس زبان میں اولین ترجمہ یہی ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ اس سے پہلے[4] الطافی پریس کلکتہ سے ۱۹۰۹ء میں قرآن حکیم کا بنگلہ میں مکمل ترجمہ چھپ کر شائع ہو چکا تھا اور اس کے مترجم کا نام مولانا عباس علی بتایا گیا ہے۔

تیلگو زبان میں البتہ اس نیک کام کے لیے ایک[5] ہندو عالم چلکوری نارائن راؤ کو اولیت حاصل ہے۔ اس ترجمہ کی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کے لیے محمد قاسم خاں نامی ایک مسلمان عالم نے اس کام کو از سرِ نو کیا اور ان کا ترجمہ[6] حیدرآباد سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔

اوپر جو عرض کیا گیا اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ اس کرۂ ارض پر جس پر ہم بستے ہیں علمی نقطۂ نظر سے اس کے ماننے والوں اور منکروں نے جس کتاب کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ہے وہ وہ قرآن پاک ہے جس میں خود خالقِ عالم نے یہ فرمایا ہے کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝

---

[1] قرآن کریم کے اردو تراجم، مرتبہ ڈاکٹر احمد خاں و سید عبد القدوس ہاشمی (مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۷ء) ص ۱۹۰ [2] ایضاً ص ۱۸۶ [3] ایسے ایک ترجمہ کے ایک صفحہ کا عکس جناب عبد اللہ نے عنایت کیا ہے۔ اور یہ اطلاع دی ہے کہ اصل نسخہ شرف الملک اکیڈمی، مدراس کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ [4] قرآن کریم کے اردو تراجم، مرتبہ ڈاکٹر احمد خان و سید عبد القدوس ہاشمی ص ۸۳ [5] یہ اطلاع راقم کو ڈاکٹر شیخ مستان (علیگڑھ) نے دی ہے۔ [6] بحوالہ مکتوب جناب عبد اللہ (مدراس)

قاضی عبدالودود کا قائم کردہ

ادارہ تحقیقات اردو کا علمی و تحقیقی مجلہ



اردو کے تحقیقی مقالوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ مشہور و معروف ناقدین و محققین کے قلم سے

تقریباً ایک ہزار صفحات  ڈھائی سو روپے میں

ملنے کا پتہ:

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ڈاکٹر مہدی حسن
پی ایچ۔ ڈی (جرمنی)، ایف۔ آر۔ سی۔ ایس

چینی زبان کے الفاظ قرآن میں

کرسی۔ جن محققوں نے قرآن میں غیر ملکی الفاظ کی فرہنگیں ترتیب دی ہیں ان میں اے جیفریز ([illegible]۔ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے) انھوں نے ایک لفظ بھی ایسا تلاش نہیں کیا جو چینی زبان سے مشتق ہو، بہرحال میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ طوفان Tufan (ص 22۔ J. B. B. R. A. S. 1946) یہ لفظ چینی زبان کا ہے اور Kursi (کرسی)، یہ دوسرا لفظ ہے جو چینی زبان سے مشتق معلوم ہوتا ہے۔ پلیٹز کا اُردو انگریزی لغت "کرسی" کو عربی لفظ بتاتا ہے جس کے معنی تخت یا "کرسی" ہوتے ہیں۔ یہ لفظ بہت پہلے عربی زبان میں داخل ہو گیا ہوگا اور عربی زبان میں مستعمل ہونے کے بعد ہی ہم اسے قرآن میں (۲۔ سورہ ۲۵۵۔ سطر) دیکھتے ہیں۔ عبداللہ یوسف علی کے قرآنی ترجمے میں، وہ سطر جس میں لفظ 'کرسی' استعمال ہوا ہے اس طرح لکھی گئی ہے۔ His Throne doth extend over the heavens
(اس کا تخت بہشت تک پھیلا ہوا ہے)، ظاہر ہے کہ کرسی یہاں تخت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ کسی لغت میں لفظ 'کرسی' پر اشتقاقی طریقے سے بحث نہیں کی گئی چنانچہ اس لفظ کی ساخت تک پہنچنے اور اس کے معنی کے تعین کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی بنیاد معلوم کریں۔

لاہشید Rahschied کے انگریزی چینی لغت (حصہ اول، ص ۵۰۳) میں ایک لفظ K'au-Tsz-i ملتا ہے۔ جس کے معنی آرام کرسی ہوتے ہیں۔ Wade وِہڈ کے طریقے کے مطابق لفظ 'K'au' اصل میں 'K'ao' ہے

Giles گائلس کے چینی لغت میں (نمبر ۵۹۶۴) اس کے معنی 'کرسی کی پشت پر جھکنے کے ہوتے ہیں'۔ K'au-tsz-i کے آخری لفظ 'I' کے معنی گائلس کی لغت میں (نمبر ۵۳۰۷) کرسی یا نشست کے ہوتے ہیں، درمیانی لفظ Tsz گائلس کے لغت میں 'Tsu' کی صورت میں نظر آتا ہے اور اس کے معنی 'بیٹا' یا 'آقا' ہوتے ہیں۔ یہ لفظ چینی زبان میں مستعمل ہے لیکن انگریزی ترجموں میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس لفظ کی صرفی تشریح اس طرح ہو سکتی ہے، آقا (Tsz)، کرسی (I) ـــ پشت پر جھکنا (K'au)، چینی زبان کا 'Tsz' ـ 'Tzu' ہندوستانی کے 'جی' سے مشابہ ہے اور اسی طرح 'K'au-Tsz' کی طرح ہندوستانی میں بھی 'جی' کا لاحقہ لگانے سے لفظ بنایا جاتا ہے۔

جیسے ماتاجی۔ پتاجی۔ گروجی۔ یونانی زبان میں بھی 'Eu' کے معنی 'اچھا' ہوتے ہیں۔ اسی طرح Euphrates کے حرفی معنی Good Phrates یا 'اچھا فرات' ہوں گے۔ چینی لفظ Kau-Tsz-i کی بہتر تشریح اس طرح ہوسکتی ہے۔ Tsz بمعنی اچھا۔ 'I' بمعنی نشست۔ Kau بمعنی پشت جس پر جھکا جائے۔ پوری ترکیب کے یہ معنی ہوئے، وہ پرعظمت نشست جس پر آرام سے بیٹھا جائے"۔

مہاتما بدھ چینی اور ہندوستانی مجسموں میں تخت پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور ان کے پیچھے ایک ستون نظر آتا ہے جس پر آرام کے لئے جھکا جاسکتا ہے۔ اس مجسمہ سے Kau-Tsz-i کی تشریح ہوتی ہے۔ ہندوستانی میں 'گدی' کے حرفی معنی 'تکیہ' ہوتے ہیں۔ 'گدی پر بٹھانا' ہندوستانی میں 'تخت پر بٹھانے' کے مترادف ہے۔ چنانچہ 'گدی' یہ لفظ چینی زبان کے 'Kau-I' سے بہت زیادہ قریب اور مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح 'گدی' کے معنی تکیہ اور تخت ہوتے ہیں اسی طرح چینی لفظ Kau-Tsz کے معنی بھی 'کرسی' اور 'تخت' ہوتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں Chair کا مفہوم کرسی کے علاوہ عزت وعظمت سے وابستہ ہے جیسے He occupied the chair of honour. عربی تمدن کے ان اثرات کو دیکھتے ہوئے جنھوں نے قرون وسطیٰ کے یورپ کی علمی زندگی کو متاثر کیا ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ غالباً 'کرسی' یہ لفظ انگریزی میں کچھ سایا ترمیم کے ساتھ Chair پڑ گیا ہوگا۔

۱ لفظ 'Kau-i' (Gillivray) گلیورے کے چینی لغت (ص ۴۷۵ ۳۰) میں ملتا ہے جس کے معنی ہیں "اونچی پشت والی کرسی"۔ 'اونچی پشت' سے جو اہمیت کرسی کو حاصل ہوتی ہے اس سے عظمت کا تصور پیدا ہوجاتا ہے۔ (Fenn) فین کے چینی لغت میں (ص۔ ۱۹۱) اس لفظ کے معنی صرف کرسی یا 'نشست' کے ہوتے ہیں۔ لیکن صرف نشست سے 'I-Tsu' بمعنی اچھا یا باعزت کا تصور نہیں پیدا ہوتا۔

اس تجزیہ کے بعد یہ دونوں مرکب الفاظ Kau-Tsz اور I-Tsz تیسری صورت اختیار کرتے ہیں "Kau-Tsz-I" جس کا مطلب ہوا Tsz بمعنی اچھا۔ 'I' بمعنی کرسی Kau بمعنی اونچی پشت۔ پوری ترکیب کا مطلب یہ ہوگا "اونچی پشت والی پرعظمت کرسی"۔ چین میں یقیناً باعزت و پرعظمت شخصیتوں کے لئے شاندار کرسیاں ہوتی ہوں گی جنھیں اسلام سے پہلے کے عربوں نے تخت سمجھا ہوگا۔

'ڈٹسڑ' پر مضمون لکھتے وقت میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ چینی لفظ 'Tu-Seu'

ہندوستانی بنانے کے لئے 'ر' اس حرف کا لاحقہ لگایا گیا۔ چنانچہ لفظ Tu-Szu-R یا Tussea بن گیا۔

اسی طرح چینی لفظ 'Ssu' بمعنی ریشم، یونانیوں کے پاس پہنچ کر 'ر' (R) کا لاحقہ بڑھاتے ہوئے Sua یا Sez بن جاتا ہے ___ لفظ Porcelain بھی چینی لفظ Po-Tsu-Lan سے بنا ہے۔ اس لفظ میں بھی "ر" (R) کا اضافہ ہے۔ چنانچہ "ر" کے اضافہ سے چینی لفظ Po-R-Tsu-Lan بن جاتا ہے اور لسانیاتی ترمیموں کے بعد Porcelain بنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ___ بالکل اسی طریقے سے K'au-Tsz-I عربی میں "ر" (R) کے اضافہ سے 'K'au-R-Tsz-I' بن گیا ہوگا۔ کیونکہ جب ہم (R) 'ر' کے اضافہ سے اس لفظ کا تلفظ ادا کریں تو ہمارا تلفظ 'کرسی' سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے ___ چینی زبان سے لفظوں کو بطور قرض لیتے ہوئے عجب نہیں کہ ہندوستانی، یونانی اور عربی زبان نے 'ر' (R) کا اضافہ کیا ہو۔

چینی کلاسیکی لفظ K'ao-Tsu-I جنوبی چین کی حکا بولی میں 'گائیل' (Gile) کے خیال کے مطابق اس لفظ میں 'K'au-Tsz-I' تبدیل ہو جاتا ہے۔ لاہشیلڈ Lahscheid لفظ کی اس صوتی تبدیلی سے متفق تھے۔ چنانچہ عربی لفظ 'کرسی' اس اعتبار سے 'حکا' بولی سے بہت زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے 'K'au-Tsz-I' سے Ko-R-Z-I یا اور 'K'au-TSZ-I' سے Ku-R-S-I بنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ کیونکہ حکا بولی میں 'س' (S) کا استعمال اور کلاسکی چینی زبان میں 'ز' (Z) کا استعمال لفظ کی ساخت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

خلاصہ

عربی لفظ 'کرسی' جو ہندوستان میں صرف کرسی کے لئے استعمال ہوتا ہے قرآن میں تخت کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ یہ لفظ چینی زبان سے لیا گیا ہے۔ K'au-Tsz-I جس کے عرفی معنی پُر عظمت کرسی کے ہوتے ہیں جس کی پشت اونچی ہو، یہ معنی ہندوستانی کے لفظ 'گدی' سے ہم آہنگ ہیں، جس کا مطلب اکثر تخت سے لیا جاتا ہے۔ 'K'au-Tsz-I' کا تلفظ ایک عرب کی زبان سے 'K'au-R-Tsz-I' کی طرح ہوتا ہے جو کہ بعد میں 'Ku-R-S-I' یا کرسی بن گیا۔

خزانہ۔ پلیٹز (Platts) اپنے اُردو۔ انگریزی لغت میں (ص ۴۸۹) لفظ 'خزانہ' کے معنی ذخیرہ۔ گھر، حفاظت گھر۔ یا خزانہ لکھتا ہے۔ علاوہ ازیں 'خزانہ' اس لفظ کو فارسی بتایا گیا ہے۔ پلیٹز کے مطابق اس لفظ کا بازاری تلفظ 'خزانہ' ہوتا ہے لیکن صحیح تلفظ خزانہ ہے، کیونکہ عربی میں لفظ 'خزن' ہے جس کے معنی محافظ کے ہیں۔ عربی لفظ 'خزن' سے اگر فارسی میں خزانہ بن جاتا تو یہ لفظ جدید ہونا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ قرآن میں اس لفظ کا استعمال موجود ہے، بہرحال ہندوستان میں بلا استثناء لفظ 'خزانہ' اس طرح مستعمل ہے جیسے اس کا دوسرا تلفظ ہی نہیں ہے' ۔ قرآن میں یہ لفظ صاف طور سے 'خزانہ' ہے ـــــ (سورۂ ۶ ـ ۵۰، ۱۱ ـ ۳۱، ۱۵ ـ ۲۱)۔ عبداللہ یوسف علی اپنے ترجمہ میں (حصہ ۲ ـ ص ۶۴۰) فٹ نوٹ (نمبر ۱۹۵۸) میں لکھتے ہیں Khazain خزائن کے معنی حفاظت گھر اور ایسی جگہیں ہیں جہاں قیمتی چیزیں جمع کی جاتی ہیں اور ضرورت کے وقت تقسیم کی جاتی ہیں۔ یہ مفہوم درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ بنیادی طور سے لفظ کے معنی ہیں غلہ گھر۔

لفظوں کی بنیاد معلوم کرنے کے لئے اور خصوصاً اس وقت جب تاریخ بھی خاموش ہو ترکیبی طریقہ ہی کارگر ہو سکتا ہے Synthatic - method. جس کا مقصد یہ ہے کہ لفظ (خزن) کے خاص اشارتی معنی (Connotation meanings) دریافت کرے 'خزن' کے بنیادی معنی 'حفاظت کرنا' یا (To guard) سے بھی کچھ مفہوم نکالے جا سکتے ہیں جیسے (Prison) قید خانہ وغیرہ، لاہتشیدہ Lahschuda اپنی انگریزی۔ چینی لغت میں (ص ۱۶۸۴) 'Ts'ang' کے معنی 'حکومت کا ذخیرہ گھر' Store - house اور مکش " ذخیرہ گھر' کے لئے 'Ho - Ts'ang' استعمال کرتا ہے۔ ذخیرہ گھر Store house کے لئے چینی زبان میں اور بہت سے الفاظ ہیں جس میں ایک لفظ 'Nagu' بھی ہے (Nagu) ۔ (Ho-Ts'ang) کے معنی لاہتشید کے لغت میں 'اشیا کا ذخیرہ گھر' ہوتے ہیں۔ وڈ (Wade) کے طریقے کے مطابق "Ho" 'Ho' بتایا گیا ہے۔ گائیلز (Giles) کے چینی انگریزی لغت میں (نمبر ۴۲۳۹) اس کے معنی 'اشیا یا زیور' ہوتے ہیں، دوسرا لفظ 'Ts'ang' گائیل کے لغت میں (نمبر ۱۱۵۹۱) 'Ts'ang' ہی کی شکل میں نظر آتا ہے اور جس کے معنی 'غلہ گھر' ہوتے ہیں۔ لاہتشید کا استعمال کردہ لفظ 'Ho-Ts'ang' گائیل کے لغت میں بھی ملتا ہے اور اس کے معنی 'زیور گھر' ہوتے ہیں۔ سوشان بولی Soch'uan میں اس لفظ کا تلفظ Hoa-Tsing

ہے اور (Amanese) امینز بولی میں اس کا تلفظ Hwa-Tang ہوتا ہے۔
گائیل کے لغت (کیرکٹر نمبر ۸۶) 'AO' کے معنی 'غلہ گھر' ہوتے ہیں اور سوشانی (Sochuan) اور امینز میں 'AO' کا تلفظ 'Kaga' ہوتا ہے۔ گائیل کے لغت میں بھی یہ لفظ Ts'ang-Ao ملتا ہے (کیرکٹر نمبر ۱۱۵۹۱ اور ۸۶) جس کے معنی 'مال گودام' ہوتے ہیں۔ لاہتشیہ کی لغت میں اس لفظ کے معنی کسی قدر واضح شکل میں نظر آتے ہیں۔ لاہتشیہ اس لفظ کے معنی 'حکومت کا ذخیرہ گھر' بتاتا ہے۔ چینی، ایک لفظ کے لئے دو طرح کے لفظ استعمال کرنے کے عادی نظر آتے ہیں Ts'ang-Ho اور 'Huo-Ts'ang' ان دونوں لفظوں میں سے صرف ایک ہی لفظ مفہوم ادا کرنے کے لئے کافی ہے۔ ان دونوں لفظوں میں 'Ts'ang' مشترک ہے اور ان دونوں لفظوں کے اشتراک سے بنے ہوئے تیسرے لفظ 'Huo-Ts'ang-Ao' کے معنی ہوں گے 'غلہ گھر یا گودام' امینز Amanese بولی میں اس لفظ کا تلفظ 'Hwa-Tang-Nagu' ہوگا۔ اور Huo-Tsang کا تلفظ Hwa-T'ang ہوگا۔

(یول اور برنل) Yule اور (Burnell) برنل اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ Godown انگریزی لفظ ہے اور (Malay) ملائی Ga-Dong سے مشتق ہے۔ بہت ممکن ہے کہ امینز لفظ 'Hwa-Tang' ملائی میں Ga-Dong بن گیا ہوگا۔ اس طرح انگریزی لفظ godown کی بنیاد Hua-Tsang معلوم ہوتی ہے جس کے معنی لاہتشیہ نے 'ذخیرہ گھر' بتائے ہیں۔

امینز (Amanese) لفظ Hwa-Tang-Nagu اگر (Ga-Dong-Ngau) میں تبدیل ہو جائے جس کے آخر میں ng ہو اور Ngau کے ابتدا میں ng ہو تو اس کی آسان شکل Ga-Dong-Au ہو سکتی ہے، جو ملایا یا جاوا کی زبان سے تامل میں داخل ہو کر Ki-Dang-u بن گئی ہو، یول Yule اور برنل Burnell اس لفظ کے معنی اس گھر کے بتاتے ہیں جہاں چیزیں جمع کی جائیں۔ اس طرح سے Kidongu کے معنی گودام ہونے چاہئیں لیکن تامل زبان میں گودام کے معنی Kidongu نہیں ہوتے، حیدرآباد کے ضلع پربھنی کی مقامی بولی میں لفظ Gidangi کے معنی اس گھر کے ہوتے ہیں جہاں پانی جمع کیا جائے۔ لیکن مجھے Gidangi کے ساتھ پانی کا تعلق کچھ عجیب سا لگتا ہے۔
سوشان بولی (Souchuan) میں Hwo-Ts'eng Ngau کا مفہوم

متحرک غلّہ گھر (Mobile grain establishment) ہو سکتا ہے جہاں سے شاید ریشم فروخت کرنے والے چینی قافلے اپنا غلّہ حاصل کرتے ہوں گے۔ یوسف علی کے خیال کے مطابق یا تو غلّہ ہر روز تقسیم کیا جاتا ہوگا یا پھر ضرورت کے وقت تقسیم ہوتا ہوگا۔ ریشم فروخت کرنے والے چینی قافلے آخر سفر میں (Syria) ملک شام میں ٹھہرتے تھے اور وہیں پر شاید لفظ Hwo-Tsing-Ngau عربی زبان میں Kha-zana بن کر داخل ہو گیا ہوگا۔

یہ حقیقت مسلّم ہے کہ پرانے زمانے کی اقتصادیات میں "رسم مبادلہ" (Barter system) رائج تھی اور خراج بھر اناج کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔ تمدن کے ایسے دور میں حکومت کا خزانہ سوائے غلّہ گھر کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ Giles گائیلس کے الفاظ میں اسلام سے قبل عربوں کا خزانہ کا تصور 'غلہ گھر' کا ہی ہو سکتا ہے۔

خلاصہ

چینی لفظ Huo-Ts'ang کے معنی 'گودام' ہوتے ہیں۔ ایمئی Amaui بولی میں اس کا تلفظ Hwa-T'sang ہوتا ہے۔ ملائی زبان میں اس لفظ نے Ga-Dang کی شکل اختیار کی اور انگریزی کے Godown سے قریب تر ہو گیا۔

چینی زبان میں Huo-Ts'ang Ao کے معنی 'غلہ گھر' ہوتے ہیں — ایمئی بولی میں اس کی شکل Hwa-T'sang Ngau ہو جاتی ہے جو تامل زبان میں داخل ہو کر Ki-Dang-u بن جاتی ہے، جس کے معنی 'غلہ گھر' ہوتے ہیں۔

سوشان Sau-chan بولی کا لفظ 'Hwo-Ts'ang-Ngau' غالباً چینی قافلے اپنے ساتھ شام لے گئے ہوں گے اور بہت ممکن ہے عربوں نے اسے Kha-Zana بنا لیا ہو جس کے ابتدائی معنی 'غلہ گھر' تھے چونکہ 'غلہ' ہی اس زمانہ کا خزانہ سمجھا جاتا تھا قیمتی اشیا پر لفظ 'خزانہ' کا اطلاق بعد کا تصور معلوم ہوتا ہے۔

اے گرفتارِ ابوبکر و علی

- مناقب ابوبکر بزبان علی
- مناقب علی بزبان ابوبکر

تصنیف: علامہ زمخشری

ترجمہ: احتشام الحسن کاندھلوی



پیراں کم اڑتے ہیں مریداں زیادہ اڑاتے ہیں۔ بس وہی صورت شیعہ سُنی مسئلہ کی ہے
عام شیعہ عام سُنی کا دوست رہا ہے۔ مگر دونوں کے عالم دونوں کو ایک دوسرے کا دشمن
دیتے ہیں علی اور ابوبکر میں وہ آویزش نہ تھی جو ان کے ہم جیسے نالائق پیردوں کے درمیان
اور وہ اسلیے ہے کہ مفادات بنا لیے گئے ہیں کہ اگر آویزش نہ ہو تو مفادات پر تو ضرب لگے گی نا۔

ہر آویزش میں پہل ہمیشہ بڑے بھائی کی طرف سے ہونی چاہیئے" انصاف کا تقاضا
بھی یہی ہے۔
چنانچہ زمخشری احتشام کاندھلوی (دونوں سے بڑے بھائی!) نے پہل کی۔ اس کی
ہمیں خوشی ہے۔

ادارہ

تصنیف : علامہ زمخشری

ترجمہ : احتشام الحسن کاندھلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت علیؓ کے مناقب حضرت ابو بکرؓ کی زبانی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اکثر حضرت علیؓ کے چہرے کو دیکھا کرتے تھے میں نے عرض کیا "ابا" آپ اکثر علی کے چہرے کو کیوں دیکھتے ہیں؟ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا "بیٹی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا علی کے چہرہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔"

حضرت حبشی بن جنادہؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خدمت میں حاضر تھا، آپ نے فرمایا جس شخص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی وعدہ فرمایا ہو اسے کھڑے ہو کر بیان کرے۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا۔ اے خلیفۂ رسول اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین مٹھی کھجور دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ آپ نے حضرت علیؓ کو بلوایا اور فرمایا "ابو الحسن یہ شخص کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے تین مٹھی کھجور کا وعدہ فرمایا تھا تم اس کو تین مٹھی کھجور دے دو۔

حبشی کہتے ہیں جب حضرت علیؓ اس کو کھجوریں دے چکے تو آپ نے فرمایا ان کو شمار کرو تو ہر مٹھی میں بلا کم و بیش ساٹھ کھجور آئیں۔ اس پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا صدق اللہ و رسولہ (اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا) ہجرت کی شب جب ہم غار سے نکل رہے تھے اور مدینہ کا ارادہ تھا" ابو بکر میرا اور علی کا ہاتھ شمار میں برابر ہے۔"

حضرت زید بن یثیع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ صدیق نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا حضور اقدس نے خیمہ نصب کرایا اور عربی کمان سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے۔ اس وقت خیمہ میں حضرت علیؓ، حضرت فاطمہ اور حسن و حسین تھے اور آپ نے ارشاد فرمایا اے گروہ مسلمین جو شخص ان اہل خیمہ سے صلح رکھے میں اس کے حق میں صلح مجسم ہوں اور جو ان سے

لڑائی کرے میں اس سے لڑنے والا ہوں اور جوان کو دوست رکھے میں اس کا دوست ہوں۔ ان سے وہ شخص محبت رکھتا ہے جو نیک بخت اور نیک ذات ہے اور بدبخت بدذات ان سے بغض رکھتا ہے۔

ایک شخص نے دریافت کیا، کیا زید تم نے خود حضرت ابوبکر سے سنا؟ حضرت زید نے فرمایا ہاں ربِّ کعبہ کی قسم۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چھ روز بعد حضرت ابوبکر اور حضرت علی قبرِ مبارک کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے۔ حجرہ شریف پر پہنچکر حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے کہا "خلیفہ رسول اللہ آپ پہلے اندر داخل ہوں"۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا میں اس شخص سے پیش قدمی نہیں کر سکتا جس کے متعلق میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا علی کو میرے ساتھ وہ تقرب حاصل ہے جو مجھے بارگاہ رب العزت میں حاصل ہے۔

حضرت علی روئے اور فرمایا میں اس شخص سے سبقت نہیں کر سکتا جس کے متعلق میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ نے ارشاد فرمایا ابوبکر کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں جس نے میری تکذیب نہ کی ہو۔ اور ابوبکر کے علاوہ ہر ایک کے دروازہ پر صبح کے وقت ایک قسم کی ظلمت ہوتی ہے۔

حضرت ابوبکر نے حضرت علی سے دریافت کیا کیا تم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟

حضرت علی نے جواب دیا میں نے اپنے چچازاد بھائی سے سنا ہے پھر حضرت ابوبکر نے حضرت علی کا ہاتھ پکڑا اور دونوں ایک ساتھ حجرہ شریف میں داخل ہوگئے۔

حضرت قیس بن ابی حازم سے مروی ہے ایک مرتبہ حضرت ابوبکر اور حضرت علی کی ملاقات ہوئی تو حضرت ابوبکر حضرت علی کو دیکھ کر مسکرائے۔

حضرت علی نے دریافت کیا آپ مجھے دیکھ کر کیوں مسکرائے؟ حضرت ابوبکر نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تمھارے اجازت نامہ کے بغیر کوئی شخص پل صراط سے نہ گذر سکے گا۔

حضرت قیس کہتے ہیں یہ سن کر حضرت علی مسکرائے اور فرمایا ابوبکر میں تمھیں خوشخبری سناتا ہوں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے کہ صرف اس شخص کو اجازت نامہ دوں جو تمھیں محبوب رکھتا ہو۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام آپ کے گرداگرد جمع تھے کہ حضرت علی سامنے سے آئے سلام کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑے ہو کر صحابہ کے چہروں کو دیکھنے لگے کہ کون ان کو جگہ دیتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داہنی جانب بیٹھے تھے آپ نے تھوڑا سا سرک کر فرمایا ابوالحسن اس جگہ بیٹھ جاؤ اور حضرت علی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے درمیان بیٹھ گئے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر خوشی کے آثار ظاہر ہوئے، پھر ارشاد فرمایا ابوبکر صاحبِ کمال کی فضیلت کو کمال والا ہی پہچانتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے مناقب حضرت علیؓ کی زبانی

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں مجھ سے اور ابوبکر صدیقؓ سے ارشاد فرمایا تم میں سے ایک کی دائیں جانب حضرت جبرائیلؑ اور دوسرے کی دائیں جانب حضرت میکائیلؑ ہیں۔ اور حضرت اسرافیلؑ ایک جلیل القدر فرشتے ہیں جو جہاد میں شریک ہوتے ہیں اور صفِ قتال میں شامل رہتے ہیں۔

حضرت علی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت فرمایا میرے ساتھ کون ہجرت کرے گا؟

حضرت جبرئیلؑ نے جواب دیا "ابوبکر صدیق" اسی روز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا لقب "صدیق" رکھ دیا۔

ابویحییٰ حکم بن سعد کہتے ہیں میں شمار نہیں کر سکتا کہ میں نے کتنی مرتبہ حضرت علی کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے نبی کے ذریعہ حضرت ابوبکر کا لقب 'صدیق' رکھا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ آیت وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ (اور جو سچ لے کر آیا اور جس نے اس کی سچائی کو مانا) میں سچ لانے والے سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ اور آپ کی سچائی ماننے والے سے مراد حضرت ابوبکر صدیق ہیں۔

حضرت نزال بن سبرہ ہلالی کہتے ہیں کہ ہم نے ایک روز حضرت علی کو ہشاش بشاش پاکر عرض کیا کہ امیر المومنین اپنے اصحاب کے واقعات بیان کیجئے۔ آپ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب (سابقی) میرے بھی اصحاب ہیں۔

ہم نے عرض کیا اپنے مخصوص دوستوں کے واقعات بیان کیجئے۔

آپ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر صحابی میرا خصوصی دوست تھا۔

ہم نے مکرر عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے حالات بیان کیجئے۔

آپ نے فرمایا کہ تم میرے سے نام لے کر دریافت کرو۔

ہم نے عرض کیا حضرت ابو بکر صدیق کے حالات بیان فرمائیے۔

آپ نے فرمایا یہ وہ ہستی ہیں جن کا حق سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی صدیق لقب رکھا۔ اور نماز کی امامت کے لئے رسول اللہ کا نائب بنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہماری دینی امامت کے لئے پسند فرمایا اسی لئے ہم نے ان کو اپنی دنیوی امامت کے لئے منتخب کر لیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ جعرانہ ادا کر کے مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے اور حضرت ابو بکر صدیق کو امیر حج بنا کر مکہ مکرمہ روانہ فرمایا۔ میں بھی ان کے ہمراہ روانہ ہوا جب ہم موضع عرج پہنچے اور آپ کو صبح کی نماز کی اطلاع دی گئی۔ آپ نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اچانک حضرہ کے پیچھے سے اونٹنی کی آواز سنائی دی آپ نماز پڑھانے سے رک گئے اور فرمایا یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی جدعاء کی آواز ہے۔ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج کا ارادہ ہو گیا ہو اور آپ تشریف لا رہے ہوں تو پھر ہم آپ ہی کے ہمراہ نماز ادا کریں گے۔ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت علی پہنچ گئے۔ حضرت ابو بکر نے ان سے دریافت کیا تم امیر بنا کر بھیجے گئے ہو یا محض قاصد ہو۔

حضرت علی نے فرمایا امیر نہیں بلکہ قاصد ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات برات دے کر مجھے بھیجا ہے تاکہ مواقف حج میں لوگوں کو پڑھ کر سنا دوں۔ ہم مکہ مکرمہ پہنچے جب چھٹی ذی الحجہ ہوئی تو حضرت ابو بکر نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا جس میں احکام حج بیان فرمائے جب آپ خطبہ سے فارغ ہو گئے تو حضرت علی کھڑے ہوئے اور سورۂ برات

آخر تک سنائی۔ پھر جب ہم دسویں ذی الحجہ کو عرفات سے منیٰ واپس آئے تو حضرت ابوبکر نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا جس میں طوافِ افاضہ اور قربانی وغیرہ کے احکام بیان کئے پھر حضرت علی کھڑے ہوئے اور سورۂ براءۃ آخر تک سنائی۔ گیارھویں تاریخ کو حضرت ابوبکر نے پھر خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد حضرت علی نے کھڑے ہو کر سورۂ براءۃ سنائی۔

مروی ہے کہ جب دونوں حضرات مدینہ منورہ واپس پہنچے تو حضرت ابوبکر صدیق بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے اور عرض کیا یا رسول اللہؐ میرے لئے کیا حکم ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سراسر خیر ہے تم نماز میں میرے ساتھی تھے اور حوض پر بھی میرے ساتھی ہوگے۔ لیکن براءت ؏ میں خود پہنچا سکتا ہوں یا پھر میری طرف سے میرا کوئی قریبی رشتہ دار (اسی لئے حضرت علی کو بھیجنے کی ضرورت پیش آئی)

(ف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق کو روانہ کرنے کے بعد پھر ایک دم حضرت علی کو بھیجا اس پر حضرت ابوبکر صدیق کو خیال ہوا کہ شاید بارگاہِ رسالت میں میری کوئی بات ناپسند آئی جس کی بنا پر حضرت علی کو بھیجا گیا چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ادنیٰ بے التفاتی بھی کسی صحابی کو گوارا نہ تھی اس لئے آپ نے اپنے معاملہ کی صفائی چاہی اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی تسلی اور تشفی کے لئے آپ کے چند مناقب بیان فرمائے اور حضرت علی کو بھیجنے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ قریش مکہ کے دستور کے موافق اپنے کئے ہوئے معاہدٔ کو میں خود فسخ کر سکتا ہوں یا میری طرف سے میرا قریب ترین رشتہ دار فسخ کر سکتا ہے۔ اس مجبوری کی بنا پر حضرت علی کو بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔

حضرت علیؓ کی جانب سے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی تصدیق اور تصویب

حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا خدائے پاک کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ اچانک وفات ہوئی اور نہ آپ مقتول ہوتے بلکہ آپ چند شب و روز بیمار رہے موذن روزانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور نماز کی اطلاع کرتا تھا اور آپ اس کو حکم فرماتے کہ ابوبکر کے پاس

؏ یعنی فسخ معاہدہ ۱۲

جاؤ اور ان سے کہو کہ نماز پڑھائیں آپ نے مجھ سے نماز نہیں پڑھوائی حالانکہ میں وہاں موجود ہوتا تھا اور آپ کو میری موجودگی کا علم بھی ہوتا تھا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا میرے متعلق کوئی عہد ہوتا تو کسی تیم زادے اور خطاب زادے کی یہ مجال نہ تھی کہ منبر نبوی پر کھڑا ہو کر خطبہ پڑھ سکے میں بزور شمشیر اس سے جہاد کرتا (اور اپنا حق حاصل کرتا)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہم نے اپنے معاملہ میں غور کیا تو ہماری یہ سمجھ میں آیا کہ نماز اسلام کا ستون اور دین کی اصلی بنیاد ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو ہمارے دین کی امامت کا حکم فرمایا تھا اسی کو ہم نے اپنی دنیوی قیادت کے لئے منتخب کر لیا اور حضرت ابو بکر صدیق کو اپنا امیر بنا لیا جب انھوں نے جہاد کا اعلان کیا ہم نے ان کے حکم پر جہاد کیا اور جو انھوں نے عطا کیا اس کو بخوشی قبول کر لیا اور ان کے حکم سے حدود اللہ قائم کیں کبھی کوئی اختلاف نہ رہا اور باہم ہمیشہ متحد اور متفق رہے مختصر یہ کہ اب کوئی ہمارے متعلق کسی قسم کی برائی اور گمراہی کو نہ پھیلائے۔

حضرت سعید بن مسیب رضؓ فرماتے ہیں جس روز حضرت ابو بکر صدیق سے بیعت کی گئی حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا لوگو جس شخص کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھایا ہو اب کون اس کو پیچھے ہٹا سکتا ہے۔

حضرت سعید فرماتے ہیں کہ حضرت علی نے خلافت صدیق کی تائید میں ایسی مستحکم دلیل بیان کی جو کسی کے بھی ذہن میں نہ تھی۔

(ف) حضرت علی مرتضیٰ کے استدلال کا منشا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابو بکر صدیق کو نماز کی امامت کے لئے مامور فرمایا تو معلوم ہوا کہ وہ دیگر تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں اور افضل کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو امیر بنانا درست نہیں لہذا حضرت ابو بکر کی موجودگی میں کسی کی امارت جائز نہیں ہو سکتی۔

حضرت ابو بکر کا فسخ بیعت کا اعلان اور حضرت علی کا انکار

حضرت ابو الجحاف رضؓ سے مروی ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق سے خلافت کی بیعت کی گئی اور حضرت علی مرتضیٰ نے اپنے رفقاء سمیت بیعت کر لی تو حضرت ابو بکر صدیق تین مرتبہ کھڑے ہوتے اور فرمایا اگر کسی [illegible]

حضرت علی مرتضیٰ سب سے پہلے کھڑے ہوتے اور فرماتے خدائے پاک کی قسم نہ ہم آپ سے فسخ بیعت کرتے ہیں اور نہ کبھی اس کی خواہش کریں گے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی امامت کے لئے آگے بڑھایا ہے اب کون آپ کو پیچھے ہٹا سکتا ہے۔

حضرت علیؓ کے فضائل حضرت ابوبکرؓ کی زبانی

حضرت شعبی سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت علی کے چہرہ پر نظر ڈالی اور فرمایا اگر ایسے شخص کو دیکھنا ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت در مرتبہ میں سب سے زیادہ قریب ہو اور جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے سب سے زیادہ تکالیف برداشت کی ہیں اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ عزیز اور پیارا ہو تو وہ انھیں دیکھ لے" اور حضرت کی جانب اشارہ کیا۔ حضرت علی نے فرمایا اگرچہ حضرت ابوبکر نے ایسا فرمایا لیکن وہ مخلوق خدا پر سب سے زیادہ شفیق و مہربان ہیں اور عشق الٰہی میں سرد آہ کرنے والے ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق غار ہیں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ہر قسم کی مشقت برداشت کی اور حضور پر اپنا جان و مال سب کچھ قربان کر دیا آپ اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اپنے مال میں سے خرچ کرتے تھے اور سب سے زیادہ بارگاہِ رسالت میں مقرب تھے۔

علی بن قادم فرماتے ہیں جو شخص صحابہ سے ان کے خلاف بیان کرے وہ ہرگز قابلِ قبول نہیں۔

حضرت معقل بن یسار سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا حضرت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کنبہ میں سے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق کے فضائل حضرت علی کی زبانی

ابن اذنیہ کہتے ہیں کہ میں جب کوفہ گیا تو حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا امیر المومنین مہاجرین اور انصار کو کیا ہوا جو وہ آپ کو حضرت ابوبکر سے کم گنتے ہیں حالانکہ آپ سب سے بڑھے ہوتے ہیں اور آپ کے بڑے بڑے کارنامے ہیں اور آپ کے مناقب بھی سب سے زیادہ ہیں۔

حضرت علی تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا اگر تو قریشی ہے تو شاید بنو عائذہ کے کینے میں سے ہے اور میرا خیال ہے کہ تو ذوالہ کا رشتہ دار ہے۔

میں نے جواب دیا "ہاں"

حضرت علی نے فرمایا اگر تو امن حق تعالیٰ کی پناہ میں نہ ہوتا تو میں تجھے ابھی قتل کر دیتا کم بخت ابو بکر مجھ سے چار باتوں میں بڑھے ہوئے تھے جن کو میں نہیں پا سکا ورنہ ان کے عوض کوئی اور شے پا سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہ ہجرت اور غار کی رفاقت اور نماز کی امامت اور اسلام کی اشاعت ان سب امور میں حضرت ابو بکر مجھ سے سبقت لے گئے حضرت ابو بکر ہمیشہ میرے اور مشرکین کے درمیان حائل رہتے اور سپر کا کام دیتے وہ کھلم کھلا دین کو ظاہر کرتے تھے اور میں اس وقت اپنے دین کو چھپاتا تھا قریش مجھے حقیر سمجھتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔

اگر حضرت ابو بکر لشکر کشی اور مرتدین کی سرکوبی سے درگزر کرتے تو ہمیشہ پیچیدگیاں پڑی رہتیں اور لوگ اصحاب طالوت کی طرح بے غیرت و بے حمیت ہو جاتے۔ حق تعالیٰ ابو بکر پر رحمتیں نازل فرمائے اور ان کو میرا سلام پہنچائے۔

پھر فرمایا کوئی شخص مجھے حضرت ابو بکر پر فوقیت نہ دے ورنہ میں اس کو سزا دوں گا اور اس پر مفتری کی حد جاری کروں گا۔

حضرت محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ میں نے امیر المؤمنین حضرت علی سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل کون ہے؟

حضرت علی نے فرمایا بیٹا حضرت ابو بکر صدیق ہیں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت ان کے سوا کسی سے مدد نہیں چاہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی رات کو حضرت ابو بکر کے گھر تشریف لے گئے اور میں آپ کی چادر مبارک اوڑھ کر لیٹ گیا اس لئے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام رات کے وقت بارگاہ نبوی میں حاضر ہوتے اور عرض کیا کفار آپ کے ساتھ دغا اور فریب کر رہے ہیں تاکہ آپ کو قید کر لیں یا قتل کر دیں یا شہر بدر کر دیں اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھے ہوئے باہر تشریف لاتے جو لوگ برے ارادہ سے باہر کھڑے تھے انھوں نے آپ کو دیکھ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ   اور ہم نے ان کے سامنے اور

سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا | پیچھے ایک ایک پردہ ڈال دیا۔
فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا | پس ڈھانک لیا ہم نے ان کوتاکہ
يُبْصِرُوْنَ ؀ | وہ دیکھ نہ سکیں۔

ایک مٹھی خاک پر دم کی اور ان کی طرف پھینک دی جس سے حق تعالیٰ نے ان کو اندھا اور بہرا کر دیا۔ پھر آپ حضرت ابوبکر کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا ابوبکر مجھے ہجرت کا حکم ہو گیا ہے۔ اور حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی۔ حضرت ابوبکر آپ سے آگے آگے چلتے اور زمین سے کانٹوں کو ہٹا کر راستہ صاف کرتے جاتے اسی طرح ایک غار پر پہنچ گئے۔

حضرت ابوبکر نے چلنے سے پہلے حضرت عائشہ کی بہن حضرت اسماء کو کچھ دراہم دے کر فرمایا ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانا تیار کر لینا اور چونکہ آپ کو گوشت مرغوب ہے اس لئے گوشت روٹی پکانا اور اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں آئے تو کہہ دینا میں عورت ذات ہوں اور اپنے کام میں مشغول ہوں۔

غار پر پہنچ کر حضرت ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ذرا ٹھہر جائیے اور خود غار میں جا کر اس کو صاف کیا اور اس خیال سے کہ کوئی موذی چیز حضور کو ایذا نہ پہنچائے جو سوراخ نظر پڑا اس میں انگلی ڈال کر دیکھی ایک بڑا بھٹ تھا آپ نے اپنا پیر اس میں داخل کر دیا جو ران تک اندر چلا گیا پھر باہر نکالا اور عرض کیا یا رسول اللہ تشریف لائیے میں نے آپ کے لئے جگہ صاف کر دی اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ آپ کے محافظ اور نگہبان ہیں۔

کفار قریش نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاک میں تھے کہ شیطان آیا اور ان سے کہا تم کس کام میں ہو میں بھی تمہارا ساتھی ہوں۔ انھوں نے کہا ہم محمد کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ کہہ کر وہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرامگاہ کو دیکھنے لگے تو وہاں آپ کی بجائے علی بن ابی طالب کو آپ کی چادر اوڑھے ہوئے پایا۔

اس وقت جب رسول اللہ تشریف لے گئے اللہ تعالیٰ نے ان کو بدحواس بنا دیا تھا۔
پس علیؓ اور ابوبکرؓ دونوں رسول اللہ کے جاں نثار فدائی ہیں۔

جب قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر میں آپ کی جگہ حضرت علیؓ کو پایا تو کہا آج اس جھوٹے شخص نے ہمیں خوب دھوکا دیا اور اس کا جادو ظاہر ہو گیا۔ شیطان نے ان سے کہا محمد

ابھی ابھی باہر چلے گئے اور وہ سب آپ کے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے گھر پہنچے وہاں حضرت اسماءؓ گوشت پکا رہی تھیں اور انھوں نے چراغ کو نکال کر باہر رکھ دیا تاکہ سالن کی بو محسوس نہ ہو۔
وہ سب حضرت اسماءؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت کیا کیا تمھیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خبر ہے؟
حضرت اسماءؓ نے جواب دیا میں عورت ذات ہوں اور اپنے کام میں مشغول ہوں۔ اس پر وہ لوگ وہاں سے چل دئے اور جستجو کرتے کرتے غار تک پہنچ گئے وہاں حق تعالیٰ نے ان دونوں کے نشانات قدم کو چھپا دیا اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کے قدموں کے نشانات کا پتہ نہ چلا حتیٰ کہ ایک شخص غار پر بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔ اس وقت حضرت ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر انھوں نے ہمیں نہیں دیکھا اگر دیکھ لیتے تو یہ شخص اس طرح ہمارے سامنے بیٹھ کر پیشاب نہ کرتا۔ پھر وہ لوگ وہاں سے منتشر ہوگئے۔ اور دونوں حضرات نے غار میں رات گزاری۔ حضرت ابوبکر کے ایک سانپ نے کاٹ لیا جس کی وجہ سے انھوں نے یہ رات سخت بے چینی سے بسر کی صبح کو تمام بدن پر ورم تھا اور حالت نازک تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا ابوبکر یہ کیا ہوا؟
حضرت ابوبکر نے عرض کیا "یا رسول اللہ سانپ نے کاٹ لیا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم نے اسی وقت مجھے کیوں نہ خبر کی۔
حضرت ابوبکر نے عرض کیا آپ کی نیند کو خراب کرنا گوارا نہ ہوا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک حضرت ابوبکر کے بدن پر پھیرا جس سے ان کی ساری تکلیف جاتی رہی اور بالکل خوش و خرم اور تن درست و توانا ہوگئے۔
حضرت ابوبکر کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ حاضر خدمت ہوئے تو حضرت ابوبکر نے اشارے سے ان کو بلایا اور کہا بیٹا اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرتا ہوا آئے تو کہہ دینا مجھے کیا خبر اور چرواہے سے کہنا کہ بکریوں کو ایسی طرح غار پر لائے کہ ہمارا کوئی نشان و پتہ کسی پر ظاہر نہ ہو۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حضرت اسماء دو روٹیاں لے جاتیں انھوں نے اپنی چادر کو منی کی طرح باندھ رکھا تھا جس میں ایک روٹی دائیں جانب اور ایک بائیں جانب چھپا کر لے جاتی تھیں تاکہ کسی کو ان پر شک و شبہ نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز غار میں قیام فرمایا حضرت ابوبکر صدیق نے سفر کے لئے دو اونٹوں کا انتظام کر رکھا تھا وہاں اطلاع دی گئی اور حضرت عبداللہ ایک راستہ بتانے والا اور دونوں اونٹ لے کر پہنچ گئے۔

حضرت ابوبکر صدیق کو اپنی ذرا پرواہ نہ تھی۔ البتہ یہ اندیشہ تھا کہ اگر خدانخواستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دشمنوں نے قابو پالیا تو دین اسلام ختم ہو جائے گا۔

اگرچہ حضرت ابوبکر کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کامل یقین حاصل نہ تھا اس اضطراب اور بے چینی کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر سے ارشاد فرمایا فکر نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ اسی کو حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔

ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ	دوسرا دو میں سے جس وقت وہ غار میں
إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ	تھے جس وقت آپ اپنے ساتھی سے فرما
إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔	رہے تھے غم مت کر اللہ ہمارے ساتھ ہے

انہی کے متعلق ارشاد ربانی ہے

فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهُ عَلَيْهِ	پس خدا نے ان پر اطمینان نازل فرما دیا۔

پس حضرت ابوبکر صدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء و مرسلین کے بعد سب سے افضل اور اعلیٰ ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق اسلام لائے اور سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ بیت اللہ میں علی بن ابی طالب نے نماز پڑھی۔

حضرت مسلہ بن زفر کہتے ہیں کہ جب کبھی حضرت علی کے سامنے حضرت ابوبکر صدیق کا تذکرہ ہوتا تو آپ فرماتے تم اس شخص کا تذکرہ کر رہے ہو جو ہر کار خیر میں دوسروں سے سبقت اور بازی لے گیا۔ اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ہم نے جس کار خیر میں بھی پیش قدمی کا ارادہ کیا ابوبکر اس کام کو ہم سے پہلے کر گذرتے تھے۔

حضرت علی سے مروی ہے کہ میرے باپ ابوطالب کی وفات کے تین روز بعد کفار قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادہ سے جمع ہوئے اس وقت حضرت ابوبکر کے

مہ راستہ بتانے کے لئے عامر بن فہیرہ کو ساتھ لائے جو حضرت ابوبکر کے خادم اور آزاد کردہ غلام تھے ۱۲

سوا کوئی آپ کے کام نہ آیا۔ حضرت ابو بکر تن تنہا مقابلہ کے لئے آئے اور کوشش کر کے مجمع کو ہٹاتے جاتے اور فرماتے کم بختو کیا ایسے شخص کو قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار صرف اللہ ہے اور اس پر اللہ رب العزت کی جانب سے دلائل اور براہین پیش کرتا ہے۔ خدا کی قسم یہ شخص اللہ کا رسول اور پیامبر ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق کے سر پر دو مینڈھیاں تھیں اس ہنگامہ میں ان میں سے ایک ٹوٹ گئی۔

حضرت علی نے اپنے رفقاء سے فرمایا تمھیں خدا کی قسم دے کر دریافت کرتا ہوں کہ آل فرعون کے مومن شخص اور ابو بکر میں سے کون افضل ہے؟

اس پر سب خاموش رہے پھر آپ نے فرمایا خدا کی قسم حضرت ابو بکر کا ایک ایک دن مومن آل فرعون سے افضل ہے وہ ایک شخص تھا جس نے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا اس پر حق تعالیٰ نے اس کی تعریف فرمائی اور یہ ابو بکر صدیق ہیں انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان اور اپنا خون خرچ کیا ہے۔

حضرت محمد بن عقیل بن ابی طالب سے مروی ہے کہ ایک دفعہ امیرالمومنین حضرت علی نے خطبہ پڑھا پھر فرمایا بتاؤ سب سے زیادہ بہادر کون ہے؟

ہم نے عرض کیا "امیرالمومنین آپ ہی ہیں"

حضرت علی نے فرمایا میں نہیں بلکہ ابو بکر صدیق تھے اس لئے کہ جنگ بدر میں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک خیمہ نصب کیا اور باہم مشورہ ہوا کہ یہاں کسی کو حفاظت کے لئے کھڑا ہونا چاہیئے تاکہ دشمن خیمہ تک نہ پہنچ سکے حضرت ابو بکر کے سوا کسی کی وہاں کھڑے ہونے کی ہمت نہ ہوئی۔ حضرت ابو بکرؓ اپنی تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے جب کوئی مشرک آپ کے قریب آتا آپ اس پر فوراً تلوار سے حملہ کرتے۔ ایک مرتبہ کفار قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کے پاس گھیر لیا اور آپ کو ستانا اور پریشان کرنا شروع کر دیا اور بار بار کہتے کیا تو نے ہی سب معبودوں کو ایک معبود کر دیا۔

خدا کی قسم اس وقت ابو بکر صدیق کے علاوہ کوئی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کے لئے نہ گیا (پھر تمام قصہ بیان کیا) حضرت عبد خیر سے مروی ہے کہ حضرت علی نے

فرمایا قرآن کریم کی خدمت کرنے والوں میں سب سے زیادہ اجر و ثواب کے مستحق حضرت ابوبکر صدیق ہیں۔ اس لئے کہ انھوں نے سب سے پہلے قرآن مجید کو جمع کیا ہے۔

حضرت موسیٰ بن شداد سے روایت ہے کہ حضرت علی نے فرمایا جماعتِ صحابہ میں حضرت ابوبکر صدیق سب سے افضل ہیں۔

حضرت ابوسفیان کا حضرت ابوبکر کی خلافت کو ناپسند کرنا اور حضرت علی کی تردید

حضرت ابوسفیان حضرت علی اور حضرت عباس کی خدمت میں گئے اور ان سے کہا اے علی اور عباس خلافت قریش کے چھوٹے اور ادنیٰ قبیلہ میں چلی گئی اب اس کا کیا حشر ہوگا؟ خدا کی قسم اگر میں چاہوں تو ابھی ان کے خلاف اطراف و جوانب سے پیادہ اور سوار لشکر جمع کر دوں۔ اس پر حضرت علی نے فرمایا خدا کی قسم میں اس بات کو پسند نہیں کرتا اگر ہم حضرت ابوبکر صدیق کو خلافت کا اہل نہ سمجھتے تو ہرگز ان کو خلیفہ نہ بناتے۔ ابوسفیان! مسلمان وہ قوم ہے جو ایک دوسرے کی خیر خواہ اور معین و مددگار ہو۔ اگرچہ ان کے اجسام اور اوطان دور دور ہوں۔ اور منافق وہ قوم ہے جس کا شیوہ دھوکا اور فریب ہے وہ ایک ساتھ رہ کر بھی ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں اور مکر و فریب پھیلاتے ہیں یعنی یہ بات کہ ہم ظاہر میں تو حضرت ابوبکر سے بیعت کرلیں اور دل سے اس کو ناپسند کریں۔ اسلامی تعلیمات اور مسلمان قوم کی خصوصیات کے بالکل منافی ہے یہ تو کھلا نفاق ہے اور منافقوں کی خاص علامت ہے کہ بظاہر رواداری برتی جائے اور اندرونی طور پر دھوکا اور فریب دیا جائے

مرتدین وغیرہ کے بارہ میں حضرت ابوبکر کا حضرت علی سے مشورہ

جب حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ منتخب ہو گئے تو عرب کے بعض قبیلوں نے مالِ زکوٰۃ بیت المال میں دینے سے انکار کیا اور کہا کہ ہم مال زکوٰۃ کو اپنے رشتہ داروں میں اور اپنی خواہش کے موافق خرچ کریں گے اس پر حضرت ابوبکر صدیق نے صحابہ کرام کو جمع فرمایا اور اس معاملہ میں ان سے مشورہ طلب کیا۔ بعض کی رائے تھی کہ ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے تاکہ اسلام سے دل تنفر

ہو جائیں اور اسلام ان کے دلوں میں راسخ ہو جائے۔ بعض نے کہا ان کو اپنی حسبِ منشا خرچ کرنے دیجئے بعد میں آپ اس مال کو واپس لے لیں۔ حضرت ابو بکر حضرت علی کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا ابو الحسن تمہاری کیا رائے ہے؟

حضرت علی نے فرمایا جو کچھ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے اگر آپ نے اس میں سے کچھ بھی چھوڑ دیا تو یہ طریقہ نبوی کے خلاف شمار ہوگا۔

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا جب یہ بات ہے تو اگر انھوں نے مالِ زکوٰۃ کی ایک رسی دینے سے بھی انکار کیا تو میں ان سے ضرور قتال کروں گا۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں والد ماجد اپنی سواری پر سوار ہو کر تلوار سونتے ہوئے ذو القصہ عہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ حضرت علی کو جب خبر ہوئی تو انھوں نے پہنچ کر سواری کی باگ پکڑ لی اور کہا کہ خلیفہ رسول اللہ کہاں کا قصد ہے؟ میں آپ سے اس وقت وہی بات عرض کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احد میں آپ سے فرمائی تھی کہ اپنی تلوار کو نیام میں رکھو اور ہمیں اپنا دکھ نہ پہنچاؤ۔ خدا کی قسم اگر ہم پر آپ کی مفارقت کا صدمہ پڑا تو پھر آپ کے بعد اسلام کا نظام ہرگز قائم نہ رہ سکے گا اور مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

اس پر حضرت ابو بکر صدیق لوٹ آئے اور لشکر کو روانہ کر دیا۔ حضرت خالد بن ولید نے امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیق کو اطلاع دی کہ اطرافِ عرب میں ایک شخص عورتوں کی حرام کراتا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق نے مشورہ کے لئے صحابہ کرام کو جمع فرمایا جن میں حضرت علی بھی تھے۔ حضرت علی نے فرمایا قوم لوط کے سوا یہ گناہ کسی سے سرزد نہیں ہوا پھر جو معاملہ حق تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا وہ سب کو معلوم ہے میرے خیال میں اس شخص کو آگ لگا دینا چاہیے۔ اسی پر تمام صحابہ کا اتفاق ہو گیا۔ اور حضرت ابو بکر صدیق نے حکم تحریر فرما دیا کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے۔

حضرت ابو بکر صدیق کی وفات کے بعد حضرت علی کے تاثرات

جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا اور آپ کو چادر اڑھا دی گئی تو

عہ ایک مقام کا نام ہے ۱۲

سارا مدینہ منورہ آہ و زاری سے گونج اٹھا اور وہ حالت ہوگئی جو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے وصال کے وقت ہوئی تھی۔ حضرت علی آبدیدہ رنجیدہ انا للہ پڑھتے ہوئے تشریف
لائے اور فرمایا آج خلافت نبوت ختم ہوگئی۔ پھر اس حجرہ پر پہنچے جہاں حضرت ابوبکر کا جنازہ
رکھا ہوا تھا اور دروازہ پر کھڑے ہوکر فرمانے لگے ابوبکر خدا تم پر رحمت نازل فرمائے تم رسول
اللہ کے دوست اور ساتھی تھے اور آپ کے مونس و غمخوار اور معتمد علیہ تھے تم رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کے خصوصی راز دار اور مشیر خاص تھے۔ تم سب سے پہلے اسلام لائے اور خلوص
ایمان اور شدت یقین اور خشیت خداوندی میں سب سے بڑھے ہوئے تھے تم نے دین کی حمایت
کی خاطر بہت تکالیف برداشت کیں۔ تم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی
اور اسلام کے شیدائی تھے اور اپنے دوستوں کے لئے سراسر خیر و برکت اور بہترین ساتھی تھے
تم بڑے عالی مناقب صاحب خیر بلند مرتبہ عالی حوصلہ تھے اور رشد و ہدایت اور رحمت و
فضیلت میں سب سے زائد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔ دربار رسالت
میں تمھاری قدر و منزلت سب سے زیادہ تھی اور تم سب سے زیادہ قابل اکرام اور قابل
اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ حق تعالیٰ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ
کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بمنزلہ کان اور آنکھ کے
تھے۔ اور آپ نے ایسے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی جب لوگ
حضور کو جھٹلا رہے تھے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں آپ کا لقب "صدیق"
رکھ دیا۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے وقت میں مال خرچ کیا اور غمخواری کی
جب لوگ پہلوتہی کر رہے تھے اور آپ مصائب میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ساتھی رہے جب لوگ حضور انور کو چھوڑ بیٹھے تھے آپ نے مشکلات میں رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا خوب ساتھ دیا آپ ثانی اثنین اور رفیق غار تھے آپ ہی پر سکون و طمانیت نازل
کی گئی اور آپ ہی ہجرت کے ہمراہی بنائے گئے۔ آپ دین الٰہی اور امت محمدی پر رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اور نائب منتخب ہوئے جب لوگ مرتد ہونے لگے آپ نے بہترین طریقہ
پر فرائض خلافت انجام دیئے اور وہ کارنامے کئے جن کو کسی نبی کے خلیفہ نے نہیں کیا جب لوگ
سست ہوگئے تو آپ مستعد رہے اور جب لوگ پست ہمت ہونے لگے تو آپ محو قتال کے
[illegible]

اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر کاربند ہے آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ برحق تھے اور منافقوں کی کاوش اور کافروں کی ناگواری، حاسدوں کی ناراضگی فاسقوں کی ریشہ دوانی اور باغیوں کی مساعی کے باوجود نہ آپ کی خلافت میں کوئی جھگڑا ہوا اور نہ آپ خلافت سے باز رکھے گئے۔

جس وقت لوگ سست پڑ گئے تو آپ چست رہے اور اہم امور انجام دئے اور جب وہ بول نہ سکتے تھے آپ گویا رہے، وہ بھٹک کر ٹھہر گئے تو آپ روشنی میں چلے انہوں نے آپ کی پیروی کی اور راہ یاب ہوئے۔

آپ پست آواز تھے مگر تلاوتِ قرآن اور گفتگو خوب صاف کرتے تھے۔ آپ کم گو اور راست گو تھے اور بیشتر خاموش رہتے تھے۔ آپ قدرتِ کلام، اصابت رائے۔ شجاعت بحربہ میں سب سے ممتاز تھے۔ خدا کی قسم آپ اس وقت بھی اسلام کے رئیس اور امیر تھے۔ جب لوگ اسلام سے پہلو تہی کر رہے تھے اور اس وقت بھی رئیس تھے جب لوگ جوق درجوق اسلام کی جانب مائل تھے آپ مومنوں کے رحیم باپ تھے جب وہ آپ کے عیال بن گئے تو آپ نے ان کا وہ بوجھ سنبھال لیا جس سے وہ عاجز ہو گئے تھے اور جو انھوں نے چھوڑ دیا تھا اس کی حفاظت فرمائی اور جو ضائع کر دیا تھا اس کی تلافی فرمائی ان کی ذلت اور گھبراہٹ کے وقت آپ نے اہتمام کیا اور عالی ہمتی سے کام لیا اور ان کے جزع و فزع کے وقت صبر و تحمل کیا اور ان کی جنایات کا بدلہ لے لیا۔ وہ اپنی ہدایت یابی کے لئے آپ کی طرف بڑھے اور کامیاب ہوئے اور آپ کے باعث وہ حاصل کر لیا جس کا ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ آپ معاندینِ اسلام کے لئے سراپا قہر و غضب تھے اور مومنوں کے حق میں سراسر رحمت و نعمت تھے۔ واللہ تمام امور میں آپ کی پرواز بہت بلند رہی اور آپ نے اہم امور میں ہمیشہ کامیابی حاصل کی اور اعلیٰ فضائل اور مناقب کو حاصل کیا۔ نہ آپ کی دلیل کبھی منقطع ہوئی اور نہ آپ کی بصیرت کمزور ہوئی اور نہ کبھی آپ پر بزدلی ظاہر ہوئی نہ کسی قسم کا خوف و ہراس ہوا بلکہ آپ ہمیشہ استقلال سے پہاڑ کی طرح جمے رہے جس کو نہ آندھیاں حرکت دے سکیں اور نہ اپنی جگہ سے ہٹا سکیں۔ آپ ویسا ہی تھے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے حق میں ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا مال و

[illegible]

معاملہ میں ضعیف اور حق تعالیٰ کے معاملہ میں قوی اور اپنی نگاہوں میں حقیر اور بارگاہِ خداوندی میں مقرب اور لوگوں کی نگاہوں میں صاحبِ حشمت و شوکت۔ آپ امتِ محمدیہ کی بزرگ ترین ہستی تھے نہ کسی کو آپ کی شان میں طعنہ کی گنجائش اور نہ بدزبانی کا موقع اور نہ آپ کی نسبت لالچ کا گمان اور نہ کسی کی طرفداری کا وہم۔ ایک ضعیف اور ذلیل شخص آپ کے نزدیک قوی تھا جب تک آپ اس کا حق اس کو نہ دلا دیتے اور ایک قوی باعزت شخص آپ کے نزدیک ضعیف اور ذلیل تھا جب تک کہ آپ اس سے دوسرے کا حق نہ دلا دیتے۔ دور و نزدیک اس میں آپ کے نزدیک سب برابر تھے۔ آپ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ تقرب اور عزت اس شخص کو حاصل تھی جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرماں بردار اور متقی و پرہیزگار تھا۔

آپ کی شان حق گوئی اور راست بازی اور نرم خوئی تھی آپ کا فرمان حکم محکم اور حتمی فیصلہ ہوتا تھا اور آپ کا فرمان بردباری اور استواری پر اور آپ کی رائے دانائی اور پختگی پر مبنی ہوتی تھی۔

آپ جس طرح بھی چلے راستے کھل گئے اور دشوار آسان ہو گیا۔ آپ کی بدولت باطل کی آگ بجھ گئی اور دین اعتدال پر آ گیا ایمان پھر سے قوی اور مضبوط ہو گیا اور اسلام اور مسلمان از سرِ نو تم گئے اور حکم الٰہی غالب ہو کر رہا اور معاندین سرنگوں ہوئے۔

آپ مسلمانوں کو چھوڑ کر چل دئے جس سے وہ حیران رہ گئے آپ نے بہت جلدی کی اور اپنے پسماندگان کو سخت مشکل میں پھنسا دیا۔ آپ تو پورے طور پر فائز اور کامیاب ہو گئے۔ آپ کو کسی کی آہ و زاری کی کیا حاجت۔ آپ کا تو آسمانوں میں پرتپاک خیر مقدم ہے لیکن آپ کی مصیبت نے مسلمانوں کو نامراد اور شکست کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

ہم حق تعالیٰ سے اس کے حکم پر راضی ہیں اور اس کا معاملہ اسی کے حوالہ کرتے ہیں۔ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں پر آپ جیسی کوئی مصیبت نازل نہ ہوگی اس لئے کہ آپ دین کے نگہبان اور دین کی عزت اور دین کے ملجا اور ماویٰ تھے۔ آپ مومنوں کے حق میں سایۂ عاطفت اور قلعۂ مستحکم اور بارانِ رحمت تھے اور منافقوں کے حق میں سخت اور غیظ و غضب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تو اپنے نبی سے ملا دیا اب ہمیں آپ کے اجر سے محروم نہ رکھے اور آپ کے بعد ہمیں گمراہ نہ کرے۔

حضرت علی کی بات ختم ہونے تک سب لوگ خاموش رہے پھر اس قدر روئے کہ چیخیں نکلنے لگیں اور کہا رسول اللہ کے داماد تم نے جو کچھ فرمایا بالکل سچ اور حق فرمایا۔

وہ احادیث جن کو حضرت علی نے حضرت ابو بکر سے روایت کیا

اسماء بن حاکم فزاری سے مروی ہے کہ حضرت علی نے فرمایا جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنتا تو حق تعالیٰ مجھے اس سے نفع پہنچاتے اور جب کوئی دوسرا شخص مجھ سے حدیث رسول بیان کرتا تو میں اول اس سے قسم لیتا جب وہ قسم کھالیتا تب میں اس کو سچ سمجھتا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق نے مجھ سے حدیث بیان کی اور حضرت ابو بکر سچے تھے (لہٰذا ان سے قسم لینے کی ضرورت نہ تھی)

حضرت ابو بکر نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے پھر اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے اور توبہ و استغفار کرے تو حق سبحانہٗ و تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ کے دفن کرنے میں صحابۂ کرام کی مختلف رائے تھی بعض نے بقیع کی رائے دی بعض نے موضع جنائز پسند کیا اور بعض نے صحابہ کے قبرستان کا مشورہ دیا۔ اسی دوران میں حضرت ابو بکر صدیق تشریف لائے اور فرمایا ہٹ جاؤ نبی کے روبرو موت و حیات دونوں حالت میں بلند آواز سے گفتگو نہ کرنی چاہیئے۔

حضرت علی نے فرمایا حضرت ابو بکر اپنے معمولات میں قابل اعتماد ہیں۔

حضرت ابو بکر نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کی تھی کہ جس جگہ نبی کا وصال ہوتا ہے اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے۔

(ف) چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق کا خلیفہ ہونا تقدیر الٰہی میں لکھا جا چکا تھا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے مناسب احکام خاص طور پر ان کو بتلا دیتے تھے۔ نبی کا کسی مقام پر وصال ہونا یہ گویا حق تعالیٰ کی جانب سے اس مقام کا نبی کی آرام گاہ کے لئے انتخاب ہے پس جس جگہ نبی کا وصال ہو وہی اس کا مدفن اور آرام گاہ بنے گی۔ اس قاعدہ کلیہ سے حضرت یوسف علیہ السلام مستثنیٰ ہیں

ان کا وصال مصر میں ہوا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی وصیت کے مطابق ان کے تابوت کو فلسطین لے جا کر دفن فرمایا۔ اور اس استثنار کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بارگاہِ الٰہی میں یہ تمنا اور التجا تھی کہ ان کی آخری آرام گاہ ان کے وطن میں ہو جہاں دیگر انبیاء بنی اسرائیل آرام فرما ہیں۔

حضرت علی سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا ابوبکر جب لوگوں کو دنیا کی طرف جھپٹتے ہوئے دیکھو تو تم آخرت کو مقدم رکھنا۔ اور آبادی اور ویرانہ ہر جگہ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو جب تم اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو گے تو اللہ تعالیٰ بھی تمہیں نہ بھولیں گے۔ اور کسی مسلمان کو ہرگز حقیر مت سمجھنا کیونکہ ادنیٰ مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعظمت و حرمت ہے۔

حضرت علی سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا گناہوں کے حق میں ایسا ہے جیسا آگ کے حق میں پانی (یعنی جیسا پانی ڈالنے کے بعد آگ کے تمام اثرات ختم ہو جاتے ہیں اسی طرح درود شریف پڑھنے کے بعد گناہوں کے سارے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔) اور بارگاہِ نبوی میں سلام بھیجنا غلاموں کے آزاد کرنے سے افضل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تمام نفوس سے افضل ہے۔

حضرت فاطمہؓ اور حضرت ابوبکرؓ کا تذکرہ

حضرت فاطمہ زہراؓ حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں آئیں اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باغ فدک مجھے ہبہ فرما دیا تھا لہٰذا وہ مجھے دے دیجئے۔

حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا صاحبزادی تم سچ کہتی ہو مگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ اس باغ کی آمدنی سے تمہارا روزینہ دے کر باقی کو فقیروں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ فرماتے تھے تم اسے لے کر کیا کرو گی؟

حضرت فاطمہ نے فرمایا جس طرح میرے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے، اسی طرح میں بھی کروں گی۔

حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا میں تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہوں

کہ اس کی آمدنی اسی طرح خرچ کروں گا جس طرح تمہارے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرچ کرتے تھے۔

حضرت فاطمہ نے فرمایا قسم کھاؤ کہ ایسا ہی کرو گے۔

حضرت ابوبکر نے فرمایا خدا کی قسم ایسا ہی کروں گا۔

حضرت فاطمہ نے فرمایا "اے اللہ تو گواہ رہ"

پھر ہمیشہ حضرت ابوبکر صدیق اس باغ کی آمدنی سے اہل بیت کرام کے اخراجات دے کر باقی فقیروں اور مسکینوں اور مسافروں پر تقسیم کر دیتے تھے اُن کے بعد حضرت عمر فاروق بھی ایسا ہی کرتے رہے۔ پھر حضرت علی نے بھی اپنے دورِ خلافت میں ایسا ہی کیا۔ حضرت علی سے کسی نے اس بارہ میں گفتگو کی تو آپ نے فرمایا جس کام کو ابوبکر اور عمر کرتے تھے اس کا خلاف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے۔

حضرت فاطمہ حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں تشریف لے گئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثہ کا مطالبہ کیا۔

حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا میرے ماں باپ تم پر اور تمہارے والد پر قربان ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہم انبیاء کی جماعت کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ مال و سامان ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔

(ف) حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی وراثت نہ ہونے میں چند منافع ہیں۔

اوّل یہ کہ نبی کی ذاتِ گرامی پر کسی کو دنیا طلبی اور جمع مال کا شک و شبہ نہ ہو جو اس کی گمراہی اور تباہی کا باعث بنے۔ دوسرے یہ کہ نبی کے رشتہ داروں کے دل میں کبھی یہ وسوسہ نہ آئے کہ نبی کے بعد یہ مال و متاع ہمارا ہوگا۔ یہ خیال گویا نبی کی وفات کی خواہش ہے جو موجب ہلاکت و بربادی ہے تیسرے یہ کہ نبی اپنی ساری امت کے لئے بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے اور امت نبی کی اولاد ہوتی ہے اور یہ روحانی تعلق تمام مادی تعلقات پر غالب ہوتا ہے۔ اسی لئے نبی کے ورثہ کی حق دار ساری امت ہوتی ہے۔

حضرت فاطمہ زہرا حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں تشریف لائیں اور فرمایا خلیفہ رسول اللہ! آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں یا رسول اللہ کے اہل بیت؟

حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا میں وارث نہیں، بلکہ ساری امت وارث ہیں۔

حضرت فاطمہ نے فرمایا پھر خُمس کا کیا معاملہ ہے؟

حضرت ابوبکر نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب حق تعالیٰ کسی نبی کو کچھ مال دیتے ہیں تو نبی کے وصال کے بعد وہ مال بعد والوں کا ہوتا ہے اب جب میں خلیفہ ہوا تو خیال ہوا کہ اس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دوں۔ حضرت فاطمہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تم زیادہ واقف حال ہو۔ اور واپس تشریف لے گئیں۔

حضرت ابوبکر صدیق فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت فاطمہ کا حضرت علی کے ساتھ نکاح کا ارادہ کیا تو فرمایا میری لاڈلی بیٹی میری آنکھوں کی ٹھنڈک فاطمہ کا اچھی طرح بناؤ سنگار کروا اور خوشبو خوب لگاؤ اور مہندی لگانا نہ بھول جانا۔

حضرت فاطمہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا میرے بعد ایک جماعت ظاہر ہوگی جن کو روافض کہیں گے جس جگہ تم ان کو پاؤ قتل کر دینا۔ یہ لوگ مشرک ہیں اور ان کی علامت یہ ہے کہ وہ ابوبکر و عمر کو گالیاں دیں گے۔

حضرت فاطمہ زہرا جب بیمار ہوئیں اور مرض بڑھ گیا تو حضرت ابوبکر صدیق ان کی عیادت کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔

حضرت علی نے حضرت فاطمہ سے کہا کہ حضرت ابوبکر صدیق دروازہ پر کھڑے ہیں اگر تم چاہو تو ان کو اندر آنے کی اجازت دے دو حضرت فاطمہ نے حضرت علی سے دریافت کیا کیا یہ بات تمھیں پسند ہے؟ حضرت علی نے فرمایا "ہاں"

پس حضرت ابوبکر صدیق گھر میں تشریف لے گئے اور حضرت فاطمہ سے گفتگو کی اور معذرت چاہی پھر حضرت فاطمہ ان سے راضی ہوگئیں۔

حضرت فاطمہؓ کی نماز جنازہ

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے مغرب و عشا کے درمیان انتقال فرمایا حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان غنی اور حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت زبیر ابن عوام وغیرہم حضرات جنازہ پر حاضر ہوئے جب جنازہ نماز کے لئے رکھا گیا تو حضرت علی نے فرمایا، ابوبکر آگے بڑھیئے اور نماز پڑھائیے۔

حضرت ابوبکر نے فرمایا کیا تمھاری موجودگی میں میں آگے بڑھوں؟

حضرت علی نے فرمایا ہاں خدا کی قسم آپ کے ہوتے ہوئے کوئی اور نماز نہ پڑھائے گا
پس حضرت ابو بکر صدیق آگے بڑھے اور نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت فاطمہ زہرا
رضی اللہ عنہا کو رات ہی میں دفن کر دیا گیا۔

حضرت ابو بکر نے حضرت فاطمہ کے جنازہ کی نماز میں چار تکبیریں کہیں۔

حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے مناقب حضرت ابو بکرؓ کی زبانی

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات حسن و حسین
کے متعلق ارشاد فرمایا یہ دونوں جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں۔

(ف) بعض روایات میں ہے کہ اہل جنت سب کے سب نوجوان اور ہم عمر ہوں گے
پس ارشاد نبوی کے یہ معنی ہوتے کہ انبیاء و مرسلین اور خلفاء راشدین کے علاوہ جن
کی نفضیلت یقینی اور واضح ہے۔ یہ دونوں حضرات باقی تمام اہل جنت کے سردار اور
سرتاج ہوں گے۔

حضرت ابو سعید سے روایت ہے کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے
تھے اور سجدہ میں تھے کہ حضرت حسن یا حسین آئے اور کود کر آپ کی پشت پر بیٹھ گئے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پکڑا اور آہستہ سے اتار کر سامنے بٹھا دیا میں نے ان کو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھا ہوا دیکھا ہے اور میں نے حضرت ابو بکر صدیق کو دیکھا ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی وجہ سے ان سے محبت کرتے تھے اور ان کو اپنے کندھے
پر بٹھایا کرتے تھے۔

حضرت عقبہ بن حارث بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت ابو بکر صدیق کے
ساتھ عصر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ مسجد سے واپس ہو رہے تھے اور آپ میرے اور
حضرت علی کے درمیان تھے کہ راستے میں کچھ بچے کھیل رہے تھے جن میں حسن بن علی بھی تھے۔
حضرت ابو بکر نے ان کو پکڑا اور گود میں اٹھا لیا اور فرمانے لگے میرے باپ تم پر قربان ہوں
تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہو علی کے مشابہ نہیں ہو۔

حضرت علی یہ سن کر ہنسنے لگے۔

کہا میرے والد کی جگہ سے اترو۔

حضرت ابو بکر نے فرمایا بے شک خدا کی قسم یہ تمہارے والد ماجد کی جگہ ہے میرے باپ کی جگہ نہیں۔ یہ کہہ کر ان کو گود میں اٹھالیا اور رونے لگے۔

حضرت علی نے فرمایا خدا کی قسم یہ میرے اشارہ سے نہیں ہوا حضرت ابو بکر نے فرمایا واللہ میں آپ کو متہم نہیں کرتا۔

حضرت ابو بکرؓ کا وصال اور حضرت عمرؓ کی خلافت

معیقیب بن ابی فاطمہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابو بکرؓ کے نفقات پر ملازم تھا۔ آپ جب مرض موت میں مبتلا ہوئے تو میں حاضر خدمت ہوا وہاں ایک صحابی کو آپ کے پاس تنہائی میں بیٹھے ہوئے پایا جو حضرت عمر کی خلافت کے متعلق اختلاف کر رہا تھا میں نے اس وقت لوٹنا چاہا لیکن جب آپ نے بیٹھنے کا اشارہ فرمایا تو میں بیٹھ گیا اتنے میں ان کی باہمی گفتگو زور سے ہونے لگی اور حضرت ابو بکر نے غصہ سے فرمایا خدا کی قسم یہ کام بغیر سوچے سمجھے نہیں کیا گیا بلکہ عمر تمہارے لئے تم سے بہتر ہیں اور تم اپنے لئے سراسر شر و فساد ہو۔ واللہ اگر میں تجھے حاکم بنا دوں تو تو اپنی ناک کو گدی کے پیچھے لگالے (یعنی حق سے اعراض کرکے باطل کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اپنی حیثیت سے زیادہ اپنے کو اونچا سمجھنے لگے) تو میرے پاس آنکھیں ملتا ہوا اس لئے آیا ہے کہ مجھے میری رائے سے باز رکھے اور میرے دین میں رخنہ ڈالے خدا تجھے کھڑا ہونے کی بھی توفیق نہ دے واللہ اگر مجھے معلوم ہوا کہ تو نے عمر کی تحقیر یا بدگوئی کی تو تجھے شہر بدر کرکے تلخ چراگاہوں میں بھیج دوں گا جہاں چرو گے اور سبز ہو گے۔ پانی پیو گے اور سیراب نہ ہو گے۔ اسی پر وہ شخص اٹھ کر چلا گیا پھر میں نے آپ کے قریب ہو کر سلام کیا اور کیفیت مزاج دریافت کی آپ نے سلام کا جواب دیا اور مزاج کی کیفیت بیان فرمائی اتنے میں اطلاع دی گئی کہ دروازہ پر حضرت عثمان اور حضرت علی حاضر ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ ان کو اندر آنے کی اجازت نہ دیں گے مگر آپ نے اجازت دے دی۔ وہ اندر آئے سلام کیا اور مزاج پرسی فرمائی آپ نے سلام کا جواب دیا اور کیفیت مزاج بیان فرمائی پھر فرمایا شاید تم بھی عمر کے متعلق وہی کہو گے جو فلاں شخص ابھی کہہ گیا ہے۔

انھوں نے عرض کیا خلیفہ رسول اللہ وہ شخص کیا کہہ گیا؟

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اس کے خیال میں عمر ادنیٰ گھرانے کا آدمی ہے اور بعد میں اسلام لایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت کم فائدہ پہنچا ہے۔ حضرت عثمان نے فرمایا خدا کی قسم اس نے بہت نازیبا کہا۔ اے خلیفۂ رسول اللہ عمر ویسے ہی ہیں جیسا آپ چاہتے ہیں اور آپ کی منشاء کے مطابق ہیں علاوہ ازیں وہ نہایت جری اور قوی ہیں اور مؤمنین سابقین سے ہیں۔

حضرت علی نے فرمایا اس شخص نے جھوٹ بولا اور بہت سخت کہا۔ اگر آپ نے عمر کو خلیفہ بنا دیا تو وہ آپ کے خیال اور منشا کے مطابق نکلیں گے پھر وہ آپ کے ساتھ کام بھی کر چکے، آپ ان کی رائے پر چلتے تھے اور اس کو قبول کرتے تھے آپ کا جوار اذ ہو کر گزر گئے اور لوگوں کے کہنے سننے کی پرواہ نہ کیجئے۔ اگر عمر آپ کے گمان کے مطابق نکلے اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا تو آپ کا مقصد پورا ہوگیا اور اگر خدانخواستہ آپ کے گمان کے برعکس نکلے تو مقصد خیر ہی تھا۔ پھر دونوں حضرات تشریف لے گئے اور آپ نے مجھ سے فرمایا معیقیب قریب ہو جاؤ اور بتلاؤ لوگ عمر کے متعلق کیا کہتے ہیں؟

میں نے عرض کیا اے خلیفہ رسول اللہ کچھ لوگ ان کو پسند کرتے ہیں اور کچھ ناپسند کرتے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ زائد کون ہیں؟

میں نے عرض کیا ناپسند کرنے والے۔

یہ سن کر فرطِ غم سے خاموش ہوگئے میں اپنی اس زیادتی پر بہت پشیمان ہوا اور سوچ میں رہا کہ اس کی تلافی کس طرح کروں اس لئے کہ حضرت عمرؓ میرے خصوصی دوستوں میں سے تھے کہ اتنے میں حضرت عمرؓ کے دروازہ پر حاضر ہونے کی اطلاع دی گئی آپ نے ان کو اندر بلا لیا۔ حضرت عمرؓ نے آکر سلام کیا آپ نے سلام کا جواب دیا پھر حضرت عمر نے مزاج پرسی کی آپ نے مزاج کی کیفیت بیان فرمائی اور فرمایا عمر بعض لوگ تمھیں پسند کرتے ہیں اور بعض ناپسند اور اکثر شر ہی لوگوں کو پسندیدہ ہوتی ہے اور خیر ناگوار گزرتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا اے خلیفہ رسول اللہ اس منصب خلافت کو مجھ سے علیحدہ کیجئے مجھے اس کی حاجت نہیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا لیکن خلافت کو تمھاری ضرورت ہے۔ اگر تمھارے سے کسی کی حق تلفی ہو جائے تو اس وقت تک اپنے ہاتھ کو اپنے منہ سے جدا رکھنا (یعنی کھانا نہ کھانا) جب تک کہ حق دار کا پیٹ نہ بھر جائے اور اس کا حق اس تک نہ پہنچ جائے۔ اگر ذاتی ضروریات تمھیں لوگوں کے مال میں شریک ہونے پر مجبور کر دیں تو اپنا روزینہ مقرر کر لینا لیکن اپنے کو ترجیح نہ دینا۔ اور کبھی مال جمع نہ کرنا۔ مال آنکھوں کو بھلا لگتا ہے اور دل اس طرف مائل ہوتا ہے امیر کا مال جمع کرنا اس کے خون کو بہا دیتا ہے اور اس کو ہلاک کر دیتا ہے اور اس کے دین کو ضائع اور برباد کر دیتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ کے لئے گھبرانے اور مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے لئے بہترین دن وہ ہوگا جب اللہ رب العزت سے ملاقات ہوگی۔

حضرت ابو بکر نے فرمایا میری بھی یہی تمنا ہے اور مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ اسی مرض میں پوری ہوگی، اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خواب دیکھا تھا کہ مجھ پر تین دفعہ غشی طاری ہوتی اور تیسری دفعہ تے ہو کر سب کھانا نکل گیا۔ اس کے بعد میں دو مرتبہ بیمار ہو چکا اور یہ تیسری مرتبہ ہے بس اب میں جلد ہی جانے والا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ۔

پھر حضرت ابو بکرؓ نے مجھ سے فرمایا معیقیبؓ ہمارا اور تمھارا کیا حساب ہے؟ میں نے عرض کیا میرے آپ کے ذمہ پچیس (۲۵) درہم نکلتے ہیں اور آپ ان سے سبکدوش ہیں

آپ نے فرمایا ٹھیرو جلدی نہ کرو کیوں دنیا کو ہماری ساتھ کرتے ہو۔ پھر فرمایا میرے خیال میں یہ ہمارا اور تمھارا آخری معاملہ ہے۔ سُن کر میں رونے لگا۔

آپ نے فرمایا رو مت مجھے امید ہے کہ میں خیر کی طرف جاؤں گا اور ہمیشہ خیر ہی میں رہوں گا۔

پھر حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ عائشہ کے پاس سے پچیس (۲۵) درہم لے آؤ۔ وہ دراہم لے آئی اور میں نے ان کو لے لیا۔ اس کو تھوڑی دیر بھی نہ گذری تھی کہ آپ کا وصال ہو گیا۔ بے شک آپ خیر کی طرف چلے گئے اور ہمیشہ خیر میں رہیں گے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ جب بیمار ہوتے تو آپ گھر کی ایک کھڑکی میں سے لوگوں کی جانب

متوجہ ہوئے اور فرمایا میں تمھارے سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں کیا تم اس پر راضی ہو؟
لوگوں نے عرض کیا "خلیفۂ رسول اللہ" ہم راضی ہیں۔ پھر حضرت نے کھڑے ہو کر فرمایا۔ ہم عمرؓ بن الخطاب کے علاوہ کسی دوسرے سے راضی نہیں۔

جب حضرت ابو بکر صدیقؓ مرض الموت میں مبتلا ہوتے (حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور امت محمدیہ کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے)

اس وقت آپ نے صحابہ کے پاس قاصد بھیجا اور بہترین منتخب چیدہ صحابہ کو بلایا۔ جس میں مہاجرین اولین میں سے جن میں حضرت عمرؓ بن الخطاب اور حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر وغیرہ وغیرہ جو سادات قریش تھے اور انصار میں سے حضرت سعد بن مالکؓ اور حضرت خزیمہ بن ثابت اور حضرت ابو طلحہؓ اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ اور حضرت سعد بن عبادۃ وغیرہ وغیرہ سرداران انصار تھے۔ یہ سب حضرات صحابہ کرام جمع ہو کر حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خدمت میں پہنچے۔ اس وقت آپ کو ایک چادر اڑھا رکھی تھی اور ایک چادر آپ کے نیچے بچھا رکھی تھی اور آپ کے سرہانے ایک پیالہ رکھا ہوا تھا جس میں گیہوں تھے یا کھجور اور جو کے ٹکڑے۔

جب سب حضرات بیٹھ گئے تو حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا مجھے سہارا لگا کر بٹھا دو۔ لوگوں نے سہارا لگا کر آپ کو بٹھایا جسم پر گوشت کا نام نہ تھا ہڈیوں اور کھال کے سوا کچھ نہ تھا سر اور جسم کے بال جھڑ گئے تھے صرف ایک نحیف اور ناتواں جثہ تھا۔ آپ کا یہ حال دیکھ کر سب رونے لگے۔

آپ نے فرمایا خدا تم سب پر رحمت نازل فرمائے کیوں روتے ہو؟

صحابہ نے عرض کیا آپ کی اس ظاہری حالت پر، سارا جسم دبلا ہو گیا اور بال جھڑ گئے اور ساری رعنائی اور خوب صورتی جاتی رہی۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا "جس شخص کو جہنم کی آگ میں جھونکے جانے کا خطرہ ہو جس کا عذاب دائمی ہے جس کی رسوائی بڑی رسوائی ہے جس میں رہنے والوں کا کام ہر وقت دکھ درد سے چلانا اور واویلا کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ حالت کچھ بھی نہیں اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی مدد اور رحمت اور مغفرت اور عفو و درگزر سے امید واثق ہو کہ جنت تک پہنچ جائے گا۔ اور جو اس میں پہنچ گیا وہ تمام نعمتوں سے سرفراز ہو گیا اور تمام آفتوں سے محفوظ ہو گیا ابد

ہر قسم کی تکالیف سے مامون ہوگیا اور جس کو حق تعالیٰ خوش کر دیں اور وہاں کی راحت
و فرحت سے نواز دیں تو جو حالت تم دیکھ رہے ہو ذرا بھی قابلِ التفات نہیں۔ پھر آپ
کو غش آگیا اور قریب تھا کہ آپ گر جائیں حضرت علی مرتضیٰؓ نے فوراً مڑ کر آپ کو تھاما
اور اپنے سینے سے لگا کر بٹھا دیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا "ابوالحسن جو کچھ تم نے کیا حق تعالیٰ تمھیں اس
کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ اگر تم مجھے سہارے سے بٹھانا چاہتے ہو تو گھر کی دیوار سے سہارا
لگا دو۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے آپ کو دیوار کے سہارے سے بٹھا دیا اور آپ کے پیچھے چادر
رکھ دی۔ آپ نے بیٹھ کر حاضرین کی طرف دیکھا اور نگاہ جما کر دیکھا اور دیر تک دیکھتے رہے پھر
آپ پر گریہ طاری ہوگیا آپ کو روتا دیکھ کر سب پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ بے ساختہ چیخیں
نکلنے لگیں عورتیں بھی پس پردہ بے اختیار رو رہی تھیں اور آواز باہر آرہی تھی۔

پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ضبط کر کے اپنے کو سنبھالا اور اشارہ سے عورتوں کو منع
فرمایا وہ خاموش ہوگئیں اور مرد بھی کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئے پھر آپ نے فرمایا گروہ مہاجرین
و انصار وہ سب گیا اور دھوکہ کھل گیا اور وہ وقت آگیا جس کا کوئی دفعیہ نہیں۔ جاءت سکرۃ
الموت بالحق۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کوئی شخص موت سے نہیں بچ سکتا موت کے
سوا کوئی ٹھکانا اور چارہ کار نہیں۔ جس یقینی امر سے ڈرایا گیا تھا وہ قریب آگیا۔

قیامت میں زیادہ قابلِ حسرت بدنصیب و بدحال جس کی نیکیوں کا پلڑا بالکل ہلکا
ہوگا وہ شخص ہے جو اپنی آخرت کو دوسرے کے دنیاوی منفعت کے عوض فروخت کر ڈالے اور
موت کے وقت جب کہ اپنے پروردگار کے سامنے جا رہا ہو پروردگار عالم کو دھوکہ دینا چاہے میں
اس وقت حق تعالیٰ سے اپنے لئے بہترین ٹھکانہ کا طلب گار اور امیدوار ہوں اور اخروی زندگی
کے زیادہ قریب ہوں تمھیں خدا کے حوالہ کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمھیں بہترین خلیفہ
عطا فرمائے۔

پھر فرمایا میں نے اس رات دس ہزار مرتبہ استخارہ کیا اور جناب باری سے التجا کی
کہ مجھے ایسے شخص کی جانب رہنمائی فرما جس سے تو راضی ہو تاکہ میں اپنے بعد یہ کام اس کے حوالہ
کر دوں۔ پھر آخر شب میں کچھ دیر کے لئے آنکھ لگ گئی۔ اب میں تمھیں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں
اور اپنی بات میں بالکل سچا ہوں اگر ذرا بھی جھوٹ ہو تو یہی جھوٹ میری تباہی کے لئے کافی ہوگا

جھوٹ بولنے یا اپنی طرف سے کوئی بات بڑھانے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

حاضرین نے عرض کیا "خلیفہ رسول اللہ بے شک آپ بالکل سچے ہیں"

آپ نے فرمایا میں نے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ دو سفید کپڑے پہنے ہوتے تھے جن کی آستین جڑی ہوئی تھی ایک نور چمک رہا تھا جو آنکھوں کو چکا چوند کر رہا تھا۔ آپ کے ہمراہ دو شخص اور تھے ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب اور آپ وسط میں تھے یہ دونوں بھی عمدہ پوشاک پہنے ہوئے تھے جس سے نور پھیل رہا تھا۔ میں نے ان جیسا آدمی کبھی نہیں دیکھا کوئی بلند مرتبہ معلوم ہوتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سلام کیا اور مجھ سے مصافحہ کیا پھر میرے سینہ پر اپنا دست مبارک رکھا جس سے وہ کرب و بے چینی جو میں محسوس کر رہا تھا جاتی رہی میں اب تک آپ کے دست مبارک کی ٹھنڈک محسوس کر رہا ہوں۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ابوبکر تمھاری ملاقات کا شوق بڑھ گیا کیا تم بھی ہمارے مشتاق ہو؟

میں خواب میں خوب رویا جس کی بعد میں گھر والوں نے بھی خبر دی اور عرض کیا واشوقاہ الیك یا رسول اللہ (آہ یا رسول اللہ آپ کی ملاقات کا شوق)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھوڑی دیر بعد ہماری ملاقات ہوگی۔ ابوبکر حق تعالیٰ نے تمھارے معاملہ میں تمھیں خیر کی جانب رہنمائی فرمادی اب جو کچھ تمھارے دل میں آئے کر گزرو یہ اللہ کی جانب سے ہے۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں مرنے کے قریب ہوں اب آپ کی امت کے لئے کس کو خلیفہ مقرر کروں؟ اور کس کو عوام کا حکمراں بناؤں؟ اور یہ بار کس کے گلے میں ڈالوں؟ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں نے آج استخارہ کیا ہے اور مجھے ان شاء اللہ بہترائی کی امید ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عادل صادق صاحب قوت و شوکت جن سے زمین و آسمان والے سب خوش ہیں۔ راہ راست پر چلنے والے متقی و پرہیزگار جن کا تقوی مقبول و مبرور ہے۔ عمر بن الخطاب تمام صحابہ سے افضل اور خلافت کے مستحق ہیں۔

پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ہمراہیوں نے کہا اس کے بعد خدا کا فیصلہ

اور حکم نافذ ہو کر رہے گا۔ یہ دونوں (یعنی حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما) دنیا میں آپ کے وزیر ہے اور آپ ہی کے پاس مدفون ہوں گے اور جنت میں آپ کے قریب تر ہوں گے

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا اور ان دونوں نے بھی سلام کیا اور مجھ سے کہا تم مکروہات سے محفوظ ہو گئے اور بالکل پاک و صاف ہو گئے اب زمین و آسمان اور انسانوں اور فرشتوں میں تم "صدیق" ہو۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یہ کون ہیں؟ ان جیسا آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ہیں" آپ کا اشارہ حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہ السلام کی طرف تھا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے جب میں بیدار ہوا تو آنسو میرے چہرے اور ڈاڑھی پر بہہ رہے تھے اور گھر والے میرے گرد اور سرہانے کھڑے ہوئے مجھ پر ترس کھا رہے تھے انھیں کیا معلوم کہ میں نے کیا دیکھا اور کیوں رو رہا ہوں؟ میں پھر بن دیکھی اور بے بھی خبر دینے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں اور آج تمھارے سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں کیا تمھیں یہ پسند ہے

سب خاموش رہے اور حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا ہم عمر بن الخطاب کے علاوہ کسی کو پسند نہ کرتے اب آپ کی پسندیدگی نے ہماری پسند کو اور تقویت پہنچا دی۔ حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت علی مرتضیٰ کے متعلق چند کلمات خیر فرمائے پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا میں تمھارے پر عمر بن الخطاب کو حاکم بناتا ہوں تم ان کی بات کو سنو اور ان کی اطاعت کرو اور یاد رکھو ان کی رہنمائی میں ہرگز ضائع اور رسوا نہ ہو گے۔ حضرت ابو طلحہ کے قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے سب کا خیال تھا کہ حضرت ابو بکر ان کو خلیفہ بنائیں گے جب آپ نے خلافِ توقع حضرت عمر کو خلیفہ بنایا تو انھوں نے عرض کیا خلیفہ رسول اللہ قیامت کے دن اس کا بھی آپ سے سوال ہوگا لہذا امت کے لئے اچھی طرح غور کر لیجئے۔

حضرت علی نے فرمایا "طلحہ ہم عمر بن الخطاب کے علاوہ نہ کسی کی بات سن سکیں گے اور نہ کسی کی اطاعت کر سکیں گے پھر فرمایا۔ واللہ عمر کے سوا کوئی اس بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا بلکہ عمر جیسا بھی اس کا متحمل نہیں کر سکتا۔ اور ابو بکر کے بعد عمر کے سوا کوئی بھی خلافت کے لئے موزوں نہیں۔ حق گوئی۔ راست بازی۔ پاک دامنی پرہیزگاری۔ امانت داری۔ منافقوں پر درشتی۔ مسلمانوں پر نرمی وغیرہ وغیرہ اوصاف میں عمر سب سے ممتاز ہیں۔

واللہ عمرؓ وہ شخص ہیں جو اسلام لا کر کبھی مذبذب نہ ہوئے۔ قتال کیا اور کبھی سست نہ ہوئے۔ مشقتوں کو برداشت کیا اور کبھی پشت نہ پھیری۔ اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور کبھی بخل نہ کیا۔

پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

خلیفہ رسول اللہ جس سے آپ خوش اس سے ہم بھی خوش ہیں اور جو آپ کی خواہش ہے وہی ہماری بھی خواہش ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے امت محمدی سے کسی خیر و بھلائی اور نصیحت و خیر خواہی کی بات کو کبھی پوشیدہ نہیں رکھا اللہ تعالیٰ آپ کو امت محمدیہ کی طرف سے بہترین جزائے خیر عطا فرمائے اور آپ کو آپ کی آرزو اور آپ کی تمنا اور آپ کے وہم و گمان سے بہت زیادہ الطاف و انعامات سے سرفراز فرماتے۔

پھر سب لوگ آپ سے رخصت ہو کر چلے گئے اور مجمع منتشر ہو گیا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں جب سب لوگ چلے گئے تو میں اور میری سوتیلی مائیں آپ کے پاس حاضر ہو گئے ایک چادر آپ کے لئے بچھا رکھی تھی اس پر آپ کو لٹا دیا اور دوسری چادر اُڑھا دی۔ آپ نے فرمایا میں اس وقت مرض میں کمی محسوس کرتا ہوں جی چاہتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤں پھر آپ سو گئے ہم سمجھے کہ شاید پھر غشی طاری ہو گئی اور آپ کو اسی حال میں چھوڑ کر چلے گئے۔ ابھی تھوڑی دیر بھی نہ گذری تھی کہ باہر سے ایک بلند آواز سنائی دی جس سے آپ گھبرا کر بیدار ہو گئے اور صاحبزادہ سے فرمایا "بیٹا دیکھو دروازہ پر کون ہے؟ وہ باہر گئے اور واپس آکر کہا بعض مسلمان ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا " ان کو اندر بلا لو"۔

صاحبزادہ نے ان کو اندر بلایا۔ وہ ہنستے کھل کھلاتے اندر داخل ہوتے سلام کیا اور مزاج پُرسی کی۔ آپ نے ان کے سلام کا جواب دیا پھر دیر تک حق سبحانہ وتعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا پھر فرمایا تم لوگ جمع ہو کر ہنستے کھل کھلاتے کیوں آئے تم ہوا ور کیا سرگوشیاں کر رہے ہو؟ جو تمہارے دل میں ہے صاف صاف زور سے کہو چھپاؤ نہیں وہ واضح اور کھلی بات ہے جو تم دل میں لئے ہوئے ہو۔

انہوں نے عرض کیا "خلیفہ رسول اللہ آپ نے عمر جیسے سخت مزاج کو خلیفہ بنا دیا۔

---

۵ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امور حق میں سختی اور اپنے عزم میں پختگی کے باعث بعض صحابہ کرام ان سے ڈرتے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی نرم خو سہولت پسند خلیفہ مقرر ہو۔ حضرت ابوبکر اور

اللہ تعالیٰ کے روبرو جب آپ پیش ہوں گے اور آپ سے اس کے متعلق سوال ہوگا تو آپ کیا جواب دیں گے اور کیا دلیل پیش کریں گے؟

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر یہ سن کر بہت غصہ ہوئے میں نے ان کو اس قدر غضب ناک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ مجھے ان کا یہ غصہ اچھا معلوم ہوا پھر فرمایا، پھر کیا تم مجھے میرے پروردگار کی دھمکی دیتے ہو؟ اگر اس ذوالجلال والاکرام نے مجھ سے اس کے متعلق سوال کیا تو عرض کروں گا میں نے ایسے شخص کو حاکم بنایا جو سب سے بہتر اور اعلیٰ تھا اور تیرے بندوں میں سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار تھا اور اہل زمین میں سب سے زیادہ تیری مرضیات کا شناسا تھا۔

خدا کی قسم جو کچھ ہونا تھا وہ آج مجھ سے صادر ہو چکا اور توحید اور ادائے فرائض کے بعد مجھے اپنے کسی عمل پر اتنا وثوق اور اطمینان نہیں۔ جتنا عمر کو خلیفہ بنانے پر ہے پھر تم عمر کو کسی عیب کی وجہ سے ناپسند نہیں کرتے بلکہ اس لئے ناپسند کرتے ہو کہ وہ انصاف پسند اور صلح جو ہے دھوکہ باز اور زمانہ ساز نہیں ان کا باطن نفاق سے پاک و صاف ہے اور ان کا ظاہر قوت کے ساتھ حق سے وابستہ ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق کے یہ ارشادات سن کر ان سب نے بھی حضرت عمر کی تعریف کی گویا وقتی تاثر کے باعث مشتعل چنگاریاں تھیں جن پر پانی ڈال دیا گیا پھر وہ لوگ آپ کے پاس سے چلے گئے اور سارے میں مشہور ہو گیا کہ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو خلیفہ مقرر کر دیا۔

جب یہ لوگ آپ سے رخصت ہو کر چلے گئے تو آپ نے آدمی بھیج کر حضرت عمر کو بلایا اور تنہائی میں ان سے فرمایا، عمر تمہیں ایک وصیت کرتا ہوں اور ایسی بات بتاتا ہوں کہ اگر تم نے اس کو محفوظ رکھا تو مجھے امید ہے کہ تم اس بارِ (خلافت) کی ذمہ داریوں سے محفوظ رہو گے اور اس بوجھ سے سبکدوش رہو گے۔

حضرت عمر نے فرمایا، خلیفہ رسول اللہ ضرور فرمایئے میں اس کو غور سے سنوں گا جو کچھ آپ مجھ سے مطالبہ کریں گے اس کو پورا کروں گا اور جو آپ حکم دیں گے انشاء اللہ اس کی پابندی کروں گا۔

حضرت علی چونکہ سمجھتے تھے کہ بغیر بیعت اس کے کار خلافت سرانجام نہیں ہو سکتا اس لئے وہ اپنی رائے پر

حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا اللہ وہ ذات پاک ہے جس نے مخلوق کو اپنی قدرت سے پیدا کیا اور اپنی منشا کے موافق بنایا وہ ذات وحدہ لاشریک لہ ہے اللہ تعالیٰ کا جو حکم رات کے متعلق ہوتا ہے وہ دن کو مقبول نہیں ہوتا اور جو حکم دن کے متعلق ہوتا ہے وہ رات کو مقبول نہیں ہوتا۔ اور جب تک فرائض خداوندی ادا نہ ہوں نفلی کام قبول نہیں ہوتے۔ قیامت میں ان لوگوں کی ترازو بھاری اور وزنی ہوگی جن کا شیوہ حق کی پیروی اور پابندی ہو اور حق ان کے لئے سہل اور آسان ہو جس ترازو میں حق کے سوا کچھ نہ ہو اس کا وزنی ہونا برحق اور بدیہی ہے اور ان لوگوں کی ترازو ہلکی ہوگی جو باطل کی پیروی کرتے ہیں اور باطل ان کے لئے آسان ہے جس ترازو میں باطل کے سوا کچھ نہ ہو اس کا ہلکا پھلکا ہونا کھلی بات ہے۔ اس کو ہلکا ہی ہونا چاہیئے حق تعالیٰ نے اہل جنت کا اچھے اعمال کے ساتھ ایسی طرح تذکرہ فرمایا کہ ہر شخص یہ سمجھ جائے کہ ان کے علاوہ اور کوئی بھی حق تعالیٰ کی بارگاہ میں مرغوب اور پسندیدہ نہیں اور اس رتبہ کو بغیر رحمت خداوندی اور رعایت، تقویٰ و پرہیزگاری اور اوامر خداوندی کی پابندی اور منہیات سے رستگاری کے بغیر کوئی شخص بھی حاصل نہیں کر سکتا

پھر حق تعالیٰ نے دوزخیوں کے برے اعمال کا تذکرہ فرمایا اور ان کے اچھے اعمال کو اس لئے رد فرما دیا کہ وہ خلوص سے خالی تھے اور ان کو کرنے والے منہیات سے نہ بچتے تھے تاکہ ہر ایک ان سے بہتر بننے کی خواہش کرے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے نبی صادق مصدوق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت رحمت اور آیت عذاب دونوں نازل فرمائیں چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلَىٰ ظُلْمِهِمْ — بلاشک تمہارا پروردگار لوگوں کی بخشش کرنے والا ہے ان کے ظلم کی بنا پر

دوسری جگہ ارشاد ہے

إِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ — بلاشک تمہارا پروردگار سخت گرفت کرنے والا ہے

تاکہ مومن ہر وقت رحمت خداوندی کا امیدوار بھی رہے اور عذاب الٰہی سے خوف زدہ بھی رہے اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑے اور اللہ تعالیٰ سے ناحق بات کی امید اور تمنا رکھے۔

عمر اگر تم نے میری وصیت کو محفوظ رکھا تو محبوب چیز میں موت سے زیادہ کوئی شے

تمہیں محبوب نہ ہوگی اور موت کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ اور اگر تم نے میری وصیت کو ضائع کر دیا
تو کوئی غیب دار چیز موت سے زیادہ تمہیں مبغوض نہ ہوگی اور تم موت سے کسی طرح بچ نہیں سکتے
حضرت عمرؓ نے فرمایا خلیفہ رسول اللہ میں نے آپ کی وصیت کو قبول کیا اور میں
انشاء اللہ آپ کے فرمان کو مضبوط پکڑے رہوں گا۔

پھر حضرت عمر روتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئے اور کہتے جاتے کہ بخت عمر جس
کام کو تو نے قبول کر لیا اس سے تیری خلاصی کس طرح ہوگی اور اس بار گراں کا تحمل کیوں کر ہوگا
پھر خود ہی فرمایا خلاصی پرہیزگاری میں ہے اور نجات دنیا سے بے رغبتی میں ہے۔ اے نفس خشوع
و خضوع کی کوشش کر اور بھوک پیاس پر صبر اختیار کر۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں ابو بکرؓ کی جان آفرین کی قسم ابو بکرؓ کا آخر وقت بھی رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر وقت کے مشابہ گذرا آپ درمیانی رات میں اٹھے اور فرمایا عائشہ
وہ کپڑا کہاں ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک ڈھکا گیا تھا۔ آپ نے اس کو
لیا اور اپنے چہرہ پر رکھا اس کی خوشبو سونگھی اور فرمایا اگر تم جھٹلاؤ نہیں تو مجھے اپنے حبیب صلی اللہ
علیہ وسلم کی خوشبو آرہی ہے۔ پھر اپنا چہرہ قبلہ رخ کیا اور کہا اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی سَکَرَاتِ
الْمَوْتِ وَشِدَّةِ الموت وَغفرالموت

پھر آپ کو خوب پسینہ آیا اور اس محراب پر نگاہ جم گئی جس میں آپ نماز پڑھا کرتے تھے
اور چند بار فرمایا۔

وَجَاءَتْ سَکْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ — اور موت کی سختی (قریب آپہونچی) یہ (موت)
ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ — وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا تھا۔

پھر کچھ افاقہ ہوا اور پتلی اپنی جگہ پر آگئی اور دیر تک کلمہ شہادت اور درود پڑھتے رہے
پھر صلی اللہ علیك صلوٰة طیبة مبارکة پڑھا۔ اس کے بعد نگاہ قبلہ کی طرف
پھر گئی اور بلند آواز سے کہا اللہ کے فرشتو اور میرے پروردگار کے قاصدو! السلام علیکم پھر
آہستہ سے چند بار کہا البیك لبیك من داع وسعدیك (اے بلانے والے میں حاضر
ہوں)۔ پھر منہ کھولا اور بند کر لیا اور واصل بحق ہو گئے۔ (رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

آپ کے دفن کے متعلق صحابہ کرام میں اختلاف رائے ہوا بعض نے بقیع غرقد کی رائے

دی اور بعض نے مدفن شہداء کو پسند کیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا نہیں میں اپنے گھر اپنے حجرہ میں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کردں گی اور دونوں حضرات کی قبور کی زیارت سے ان کی یاد تازہ رکھوں گی۔

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک دم سب پر نیند کا غلبہ ہوا اور اونگھ طاری ہو گئی۔ اسی حال میں ایک غیبی آواز سُنی ضمّوا الحبیب الی الحبیب دوست کو دوست سے ملا دو۔ ہم نے سر اُٹھایا تو کوئی نظر نہ آیا البتہ آواز سب نے سنی حتیٰ کہ جو لوگ مسجد میں تھے انھوں نے بھی سنی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کرنا طے ہو گیا تو جو شخص بقعہ انور پر نظر ڈالتا نگاہیں خیرہ ہو جاتیں اور قبر کا کھودنا مشکل ہو گیا۔

حضرت علی نے فرمایا رات تک ٹھیر جاؤ جب رات ہو گئی تو حضرت علیؓ نے گورکن کے چہرے پر کپڑا ڈال کر اس کو حجرہ منورہ میں داخل کیا اس نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے قبر اطہر و انور کی جانب پشت کر کے قبر کھودنی شروع کی۔

حضرت علی نے گورکن کو حکم فرمایا کہ جلدی کرو زیادہ دیر نہ لگے۔

باقی لوگ باہر کھڑے رہے جب لحد تیار ہو گئی تو آپ کے صاحبزادوں اور گھر والوں نے آپ کو قبر میں اتارا اور مٹی ڈال دی۔

اسلام اور ہندو مت

اسلام اور ہندو مت کی بعض مشترک تعلیمات

—— مناظر احسن گیلانی



ہندو مذہب بلکہ ہندی مذاہب پر ہم اچھی طرح بھرپور طور سے اولاً اردو والوں کے سامنے اور پھر عزیزانِ وطن کے سامنے وہ سب کچھ پیش کر دینا چاہتے ہیں جس سے عزیزانِ وطن کی آنکھیں کھلیں کہ اردو کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہ تو پورے ہندوستان کی زبان ہے نہ پوری پوری سیکولر! لیکن فی الحال اس مسئلہ کو چھیڑنے سے قبل بطور دیباچہ مولانا گیلانی کی ایک معرکۃ الآرا تحریر پیش خدمت ہے۔

ـــــــــــــ ادارہ

اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات

از

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

"تناسخ اور اس کے ذریعہ نجات کے عقیدے کی تعلیم آپ نے (یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے) نہیں دی، بہشت و دوزخ وغیرہ باتیں عیسائیوں اور یہودیوں کے مذہب جیسے رہنے دیں"

(ابھینو بھارت اتہاس ص ۸۸)

یہ ہے وہ علم جو اس وقت اس ملک کے آزاد ہونے کے بعد بھی ہمارے بچوں کو سکھایا جا رہا ہے، مذکورہ بالا کتاب (ابھینو بھارت اتہاس) بہار کے اسکولوں کے نصاب میں شریک ہے، مصنف کا نام بھولا داس بی اے ایل ایل بی ممبر بہار ریسرچ سوسائٹی ہے، کتاب ابھینو گرنتھا گار کی شائع کی ہوئی ہے،

جو فقرے اس کتاب کے آپ کے سامنے پیش کئے گئے ہیں، ان کو پڑھکر پہونچنے والے یقیناً ان ہی نتیجوں تک پہنچ سکتے ہیں، کہ

۱۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں جو لوگ آباد تھے، اور ویدک دھرم کے قائل تھے، ان کے اس دھرم میں صرف تناسخ کا عقیدہ پایا جاتا ہے، اور بہشت و دوزخ وغیرہ عقائد سے اس دھرم کو کوئی تعلق نہیں ہے،

۲۔ عیسائیوں اور یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد نیکی اور بدی کے نتیجے ان کے سامنے بہشت و دوزخ کی شکل میں سامنے آئیں گے،

دوسری بات یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کے ذہن میں مرنے کے بعد بہشت و دوزخ کا عقیدہ پایا جاتا ہے، اور اسلام میں بھی یہی مانا جاتا ہے، کیا یہی واقعہ ہے؟ یہودیوں کا حال تو یہ ہے کہ اُن کے دین کی بنیادی کتاب توراۃ، مرنے کے بعد جی اٹھنے کے عقیدہ سے خاموش ہے نیکی اور بدی کے صلہ میں فلسطینا کی سرزمین کا وعدہ اس کتاب میں پایا جاتا ہے جس میں بار بار دہرایا گیا ہے. کہ اسی ارض موعود میں شہد اور دودھ کی نہریں بہتی ہیں، خدا کے حکموں کو مانو گے، تو اس سرزمین پر تمہارا قبضہ قائم رہے گا، باقی عیسائی مذہب سو اس میں مرنے کے بعد کی زندگی کا ذکر ضرور کیا گیا ہے لیکن عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ نیک آدمی مرنے کے بعد فرشتہ بن جاتا ہے، اور بدکار شیطان اور بھوت بن جاتے ہیں اسی وجہ سے جو قرآن کی حیثیت پر عیسائی اس لئے چین بہ جبیں ہوئے ہیں کہ فرشتہ کی زندگی کو جنات و انہار و حور و قصور سے کیا تعلق،

باقی پہلی بات یعنی ہندوستان کے باشندے اسلام کے پیش کئے ہوئے عقیدے جنت و دوزخ سے قطعاً ناآشنا اور ناواقف تھے، اُن کے دین میں نجات کا ذریعہ صرف تناسخ کو مانا جاتا تھا، اور اُس کے سوا بھی اسلامی تعلیمات کے دوسرے اجزاء کے متعلق دیکھئے کہ ویدک دھرم کی تصریحات اس باب میں کیا ہیں،

افسوس ہوتا ہے کہ اسلام اور ہندوؤں کے ویدک دھرم کا مقابلہ صحیح علمی روشنی میں نہیں کیا گیا ایک ہندو دوان (عالم) کے تاثرات تو آپ دیکھ چکے، خود مسلمانوں کا بھی حال اس معاملہ میں یہ ہے کہ براہ راست ہندوؤں کی کتابوں کے پڑھنے کا موقع جن لوگوں کا نہیں ملا ہے. سُنی سنائی باتوں کو انتہا قرار دے کر اس قسم کی چیزیں اُن کی کتابوں میں بھی درج ہو گئی ہیں، اور تو اور محمد بن عبدالکریم شہرستانی جنھوں نے مذاہب و ادیان ہی پر اپنی مشہور کتاب ملل و نحل لکھی ہے، اس میں بعض مسلمانوں کے اس خیال کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ برہمن کا لفظ برہام اسی شخص کی طرف منسوب ہے، یہ دراصل حضرت ابراہیم کے نام کا ایک ہندی تلفظ ہے اس پر تنقید کرتے ہوئے شہرستانی نے لکھا ہے کہ یہ عجیب بات ہے اس لئے کہ برہمنوں

ملاحظہ جو ہندوستان میں پایا جاتا ہی وہ تر

المخصوصون بنفی النبوات اصلا ورأسا (ملل و نحل) نبوات کے سلسلے کا سرے سے منکر ہوا

خدا ہی جانتا ہی کہ شہرستانی نے "براہمہ" یعنی برہمن ہندوستان کے کن لوگوں کو سمجھ لیا، وہ اُن کی طرف

یہ عجیب وغریب عقیدہ منسوب کر دیا کہ وہ نبوات و رسالات ہی کے سلسلے کے سرے سے منکر تھے،

حالانکہ دنیا جانتی ہی کہ برہمنوں کے دین کی بنیادی کتاب وید کے متعلق عام عقیدہ اس کتاب کے

ماننے والوں کا یہی ہے کہ خالق کائنات کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، اور کیوں جانئے نہ بھارت جو

عام طور پر ہر ہندو کے گھر میں اب بھی پڑھی جاتی ہے، اسی میں بہ کثرت اس قسم کی باتیں آپ کو مل

سکتی ہیں، مثلاً:-

"پرمیشر (خدا) کی سانس سے وید باہر (پیدا) ہوئے"

(انولوگ پرب ادھیائے)

یا اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ یہ ہیں کہ

"تپشری (عبادت گذار) لوگ بیذ بچن (وید کے الفاظ) کو بھگوان کا وتک (کلام)

جان کر اس پر دڑہ بدھی (استقامت اختیار کرتے) رہے ہیں"

(شانتی پرب حصہ سوم ۹۰ ادھیائے)

بہرحال وید کا برہما کے منہ سے نکلنا، ہندوؤں کے سناتن دھرم کا عام عقیدہ ہے اور خواہ شہر ستانی

کو اس کا علم نہ ہو لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے سربرآوردہ علماء اور صوفیہ بھی اپنی کتابوں میں اس

قسم کی باتیں لکھتے رہے ہیں، حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور فقرہ مقامات مظہری میں پایا

جاتا ہے کہ خالق کائنات نے اپنے رحم و فضل سے

"کتابے مسمی بہ بید کہ چہار دفتر است و مشتمل بر احکام نہی و امر و اخبار ماضی و مستقبل است"

"توسط ملکے برہما نام کہ آں را جارجا یا دعالم مت فرستاد" (ص ۱۹۰)

مرزا صاحب نے برہما کو بجائے ابراہیم علیہ السلام کے ملک یعنی فرشتہ قرار دیا ہے، لیکن بہرحال اس کی توتصریح فرمائی ہے کہ وید خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، یہی ہندوؤں کا عقیدہ ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ نا واقفیت کی وجہ سے شہرستانی نے ہندوؤں کو سرے سے نبوات و رسالات کا منکر ہی ٹھہرا دیا، اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام اور ویدک دھرم کے تعلیمات میں کیا تعلق ہے؟ سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر نہ ہندوؤں میں صحیح طور پر کام کرنے والوں نے اب تک کوئی قابل ذکر کام کیا ہے، اور جیسا کہ چاہئے مسلمانوں میں بھی اس مسئلہ کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ قرار واقعی طور پر مستحق ہے، بطور ابتدائی و تمہیدی مضمون کے ایک مختصر سا مقالہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، غرض یہ ہے کہ کام کی راہ کم ان لوگوں کے سامنے آجائے جو ہندو مذہب کے مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں،

افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کے قدیم مذاہب و ادیان کے وثائق اور دانشوں کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے نہیں کیا گیا ہے، ورنہ ان ہی کتابوں میں نہیں جن کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کا عام رواج اس ملک میں باقی نہیں رہا ہے، اور اسی وجہ سے ان کے مطالب اور معانی کی صحیح یافت دشوار ہو گئی ہے بلکہ مہابھارت جیسی عام کتاب جس کا اب بھی تقریباً ویدک دھرم کے ماننے والوں کے گھر گھر میں پاٹ ہوتا ہے اور ہر کہہ و مہ چھوٹے بڑے کی رسائی خود اس کتاب تک اور اس کے مضامین تک آسان ہے، اسی میں ایسی حیرت انگیز چیزیں مل جاتی ہیں کہ آدمی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کے ذریعے جو کچھ دیا گیا ہے، اس کا بڑا حصہ اب بھی ہندوستان کے باشندوں کے اگلے بزرگوں کی کتابوں میں موجود

لہ میرا اشارہ وید اور اپنشد وغیرہ ہندوستان کے قدیم دینی سرمایوں کی طرف ہے، وید کے متعلق پنڈت سندر لال جی نے اپنی کتاب "قرآن اور گیتا" میں جو حال میں شائع ہوئی ہے لکھا ہے کہ وید کی زبان اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ صحیح مطلب کا سمجھنا بڑا دشوار ہے۔

ہے، قرآنی تعلیمات کا بنیادی مسئلہ، اور جوہری روح جیسا کہ سب جانتے ہیں، توحید ہے، یعنی بجائے مخلوقات کے عالم کے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہٗ ہی کی عبادت پر اصرار یہی قرآن کا محوری پیام ہے، اسی محور پر اس کے سارے مطالبات گردش کرتے ہیں لیکن یہ تو قرآن میں ہے، اب مہابھارت کے بن پرب کا انھیسواں ادھیائے کا ترجمہ پڑھیے، بھیم سین جو مہابھارت کی جنگ کے گویا رستم تھے، ان کا ذکر کرتے ہوئے کہ ایک دفعہ ہنومان جی نے بھیم سین کو اپنے درشن دیئے تو اس وقت قدیم ہند کے سناتن دھرم کی خصوصیت کو بتاتے ہوئے ہنومان جی نے جیسا کہ اسی کتاب میں ہے یہ کہا کہ

"کرت جگ جس کو ست جگ کہتے ہیں، اس میں سناتن دھرم جاری تھا"

سناتن دھرم جب اس ملک میں جاری تھا، تو اس کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ہنومان جی کے بیان کے مطابق کیا تھی، سنیئے ہنومان جی کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ

"اس جگ میں دھرم کا ناش نہیں ہوتا تھا، دیوتا دانو، گندھرب، یکھشا، رکشش[1] ایک پرشوتم بھگوان کی پوجا کرتے تھے" (بن پرب ادھیائے)

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ اس ملک کے آباد کاروں کے آبار اولین (اگلے آبا، اجداد) کے دین کا جوہری عنصر توحید ہی تھا، اور خالق عالم جل مجدہٗ ہی کی ذات پاک اس ملک کا واحد معبود ہنومان جی کے زمانہ میں تھی، یہ وہ زمانہ تھا، جب ملک پر رام چندر جی حکومت کرتے تھے، لیکن یہ سلسلہ کب تک جاری رہا؟ بھیشم پتامہ جن کا ذکر علم و عرفان حسن و کردار و عمل کے مثالی وجود کی حیثیت سے اس رزمیہ داستان مہابھارت میں کیا گیا ہے، جب زخمی ہو کر یہی بھیشم پتامہ تیروں کے سیج پر لٹا دیئے گئے تھے اور ان کی مزاج پرسی کے لئے آخر میں خود شری کرشن جی بھی ان کے بالین

---

[1] ملائکہ جن اور ارواح طیبہ، وخبیثہ کے متعلق ہندو ادبیات میں یہی الفاظ مستعمل ہیں، یکھش و رکشش الجن والانس کے ہم معنی الفاظ ہیں ۱۲

پہونچے، تو لکھا ہے کہ

"بھیشم جی کرائن بھگت جان کرترلوکی درشن"۔

سے سری کرشن جی نے سرفراز کیا یعنی تینوں عالم (لوک) کا مشاہدہ ان کو کرا دیا، مذکورۂ بالا فقرے میں "ائن بھگت" کا جو لفظ ہے، اس کا مطلب اسی کتاب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ

"جو کیول (صرف) نارائن (خالق عالم) کی اوسپانا (عبادت) کرتا ہو"

(مہابھارت شانتی پرب ۴۲ ادھیائے)

جس سے معلوم ہوا کہ مہابھارت کی جنگ اس ملک میں جب لڑی گئی تھی اس وقت کے دینی زندگی کی روح یہی "ائن بھگت" ہونا سمجھی جاتی تھی، اور یہ تو خیر پھر بھی ایک اجمالی بات ہوئی، مہابھارت کی جنگ میں فاتحِ اعظم ہونے کی حیثیت راجہ یدھشٹر کو حاصل ہوئی تھی، ان ہی کو ان الفاظ کے ساتھ خطاب کرتے ہوئے یعنی:۔

"ہے مہابھاگ (بڑے خوش قسمت) راجہ یدھشٹر"

منجملہ اور باتوں کے یہ اپدیش بھی ان کو دیا گیا تھا جس میں خالقِ عالم کو ان الفاظ میں روشناس کراتے ہوئے کہ

"وہی نارائن سرشٹی (عالم) کو اتپن (پیدا) کرتا ہے، اور پھر اپنے میں لے کر لیتا ہے"

(یعنی ہر چیز اسی کی طرف واپس ہو جاتی ہے انا الیہ راجعون) وہی سب دیوتاؤں، رشیوں، دانووں، گندھربوں، نشوں، کا پالن پوشن کرنے والا ہے"

آخر میں راجہ یدھشٹر کو حکم دیا گیا تھا کہ

"اسی نرگن دیوتا کا پوجن کرو"

گویا:۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ یہی اللہ ہے تمہارا پروردگار، بس اسی

فاعبدہ ،   کو پوجتے رہنا ،

کی قرآنی آیت کا جو حاصل ہے ، اسی کی تعلیم راجہ جدھشٹر کو دی گئی تھی ، اور مہابھارت کا یہ نرگن دیوتا جس کی پوجا کا مطالبہ راجہ جدھشٹر سے کیا گیا ہے جانتے ہیں ، ہندوستان کے اوتاروں کے اوپر ادیشٹ کی معرفت اس کے متعلق کن گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی ،

اسی کتاب کا وہ حصہ جسے ادیوگ کہتے ہیں ، اس کے گیارہویں ادھیائے ہیں ، ایک رشی جن کا نام سجات جی بتایا گیا ہے ، ان ہی کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہو کہ

"سجات جی بولے کہ برہم کا روپ کیا برنن (بیان) کروں نہ پرتھی (زمین) میں وسا ہے ، نہ آکاش (آسمان) میں نہ اس کا کوئی جسم ہے ، نہ وہ سمندر میں ہے ، نہ ستاروں میں ، نہ بجلی میں نہ بادل میں ، نہ چندرماں آنکھوں میں دکھائی دیتا ہے ، نہ سورج میں نہ اور کسی میں ، کنٹواس کا روپ اپار ہے ،"

اپار کا ترجمہ مترجم[1] صاحب نے "بے مثل و بے حد" کیا ہے ، نیز اسی ادیوگ کے بارہویں ادھیائے میں صراحتہً ان الفاظ کو ہم پاتے ہیں ،

" اس برہم کی صورت کسی نظیر اور مثال سے نہیں بتائی جا سکتی ، اور نہ کوئی اُس کے مشابہ ہے ،"

الغرض لیس کمثلہ شیئ کے تعبیری لباس میں قرآن نے معرفت کی جس تنزیہی شان کو

---

[1] مترجم صاحب سے میری مراد منشی شری رام صاحب ، تھرد ہلوی ہیں ، جنھوں نے چار ضخیم جلدوں میں کافی تحقیق و تدقیق کے ساتھ مہابھارت کا اردو میں کامیاب ترجمہ کیا ہے ، مطبع نولکشور میں متعدد بار یہ ترجمہ چھپا ہے ، میرے پیش نظر ۱۹۱۳ء کا مطبوعہ نسخہ ہے ، سارے حوالے مہابھارت کے اسی ترجمہ سے ماخوذ ہیں ،

دا کیا ہے کہ مہابھارت کے اس فقرے میں اس کے سوا اور بھی کچھ ہے

میرے سامنے اس وقت تفصیل نہیں ہے، صرف چند سرسری مثالوں کو پیش کر رہا ہوں، ورنہ اس

قوم کی باتیں مثلاً:-

"جس کے اوپر نارائن کرپا (مہربانی) کریں، اس کا کوئی بگاڑ نہیں سکتا، اور جس پر پرمیشر

کوپ کریں، اس کو کوئی بچا نہیں سکتا، (سبھا پرب ادھیائے ۸۱)

مَا يَفْتَحِ اللهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ	اللہ آدمی کے لیے جس رحمت کو
فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ	کھولے اسے کوئی روک نہیں سکتا
فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ ،	اور جسے روک دے اسے کوئی کھول
(صافات)	نہیں سکتا،

اور اسی مضمون کی بے شمار آیتوں کے مفہوم ہی کے اعادہ کی شکل ہے، آپ بکثرت اسی مہابھارت

میں پا سکتے ہیں، اور قدم قدم پر اسی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی

اگلی نسلوں کو جو کچھ دیا گیا تھا، جیسے دوسروں تک ان کے آبائی سرمایہ کو قرآن نے واپس کیا،

اسی طرح اس ملک کے صحیح موروثی دین کو ان کے وارثوں تک وہ پہنچانا چاہتا ہے، لوگوں کو معلوم

نہیں ہے اور نہ توجہ ہی نہیں، مذہب کی عملی زندگی اپر دھرم یعنی پاپ پن یا نیکی اور بدی کے قانون

کی تاریخ ہے، اس عام اسلامی نظریہ اور جو کچھ اس کے تفصیلات ہیں، ایک ایک جز اس کا بھی آپ کو

مہابھارت ہی میں مل سکتا ہے، اسی قانون کا ذکر ایک جگہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے، یعنی

"پاپ پن، دونوں پھل، واکے (نتیجہ خیز بار آور) ہیں، ایک سے سرگ (الجنت) اور

دوسرے سے نرک (النار) ملتا ہے (اڈیوگ ادھیائے ۱۱)

اور یہ کہ آدمی تپ اس لوک (دار دنیا) میں کرتا ہے، اور پھل اس کا دوسرے لوک (عالم آخرۃ)

ین پاتا ہے"

نیز:-

"ین سے پاپ کا ناش ہوتا ہے"

اسی کے ساتھ یہ بھی کہ

"جو کوئی منش (آدمی) پاپ کرم (گناہ کا کام) کرکے پشچاتاپ کرتا ہے (یعنی پچھتاتا اور نادم ہوتا ہے) وہ پچھلے کئے ہوئے پاپ سے چھوٹ جاتا ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ پھر اب پاپ کرم نہیں کروں گا، وہ اس کئے ہوئے پاپ کا پھل نہیں پاتا ہے"

(بن پرب ادھیائے ۹)

برادرم! نیکی اور بدی کے ان ہی کلیات پر تصدیق کی مہر ثبت کرکے موجودہ زندگی کے انجام کو قرآن مجید نے بے نقاب کیا ہے، تو پھر میں یہ کیسے مان لوں کہ ہمارے وطن کے باشندوں کی طرف بھی اس کے خطاب کا رخ نہ تھا جن کی کتابوں میں نیکی اور بدی کے قانون کے ان تمام پہلوؤں کو ہم پاتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، آخر آپ ہی بتائیے قرآنی آیات مثلاً

لها ما كسبت وعليها ما اكتسبت (البقرہ ۷)
یعنی ہر شخص کو اپنے بھلے کاموں کا نفع بھی ملتا ہے، اور برے کا وبال بھی اسی پر عائد ہوتا ہے،

یا:-

ان الحسنات يذهبن السيئات
بھلائیاں (پن) برائیاں (پاپ) کو زائل کر دیتی ہیں،

اور یہ کہ:-

وَالَّذِینَ اِذَا فعلوا فاحِشۃً اَوْ — جن لوگوں نے بے حیائی کا کام کیا یا

ظَلَمُوْا انفسھم ذکروا اللہ — اپنے اوپر ظلم توڑا، یاد آیا ان کو اللہ

فاستغفروا الذنوبھم ولم — پھر معافی چاہی اپنے گناہوں کی

یصروا علیٰ ما فعلوا وھم یعلمون — اور جو کچھ کر گذرے اس پر اڑا

اولٰئک جزاء ھم مغفرۃ من — نہ کیا، جانتے بوجھتے وہ جان رہے تھے

رَبِّھِمْ — ان کا صلہ ہے اپنے مالک کی طرف

(آل عمران) — سے آمرزش،

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر مروج غیر مستند؛ دل کتابوں ہی میں نہیں، بلکہ اسی (ہ) اتھروید
میں جب یہ موجود ہے کہ نیکی آدمی اس لوک (دنیا) میں کرتا ہے اور پھل اس کا دوسرے لوک (عالم
آخرت) میں پاتا ہے اور اس کے بعد سرگ، نرگ کا ذکر کرکے بار بار ہر طرح کے تھوڑے تھوڑے وقفے
قسم کی باتیں ملتی ہیں، مثلاً سرگ (الجنۃ) کا تذکرہ کرتے ہوئے

"سرگ اس لوک (عالم) ہے جہاں سب پدارتھ (ساز و سامان) موجود ہیں،

وہاں رہنے والوں کو بھوک پیاس سردی گرمی کچھ نہیں لگتی"[1]

بہشتی نعمتوں کی ایک طویل فہرست جس میں ملبوسات، مطعومات، مشمومات، مسموعات الغرض سارے حسی لذائذ کی تفصیل کے بعد آخر میں ہے

"اس دیہ (جسم) سے جو دیو دیہہ (نورانی جسم) کہلاتی ہے جس میں نہ بڑھاپا ہے

نہ جوانی ہے، ہمیشہ ایک حسین روپ رہتی ہے، سرگ باس ملتا ہے، وہاں سوائے سرگ کے

[1] مطلب یہ ہے کہ ہر ہر انسانی حاسہ کے ساتھ جن جن لذتوں کا تعلق ہے، سب ہی کا ذکر دید کے دھرم کے سرگ
میں کیا گیا ہے حتیٰ کہ پیراؤں (حوروں) کے ساتھ بھوگ بلاس کے پراپت ہونے یعنی وصل ہونے کا ذکر کھڑا ان کتاب میں ملتا ہے

(سرود) کے شوک پیڑا (دکھ کی تکلیف) یقین ہے"۔ (رگ وید ادھیائے ۱۱)

اور اسی کے مقابلہ میں نرک کے متعلق

گھور نرک جہاں اندھیرا ہے، اچھس (یا ملائکہ غلاظ شداد) پیڑا (تکلیف) دیتے ہیں۔

(رگ وید)

شاید ہی کوئی حصہ عبارت کا ہوگا، جو انسانیت کے اس آخری انجام یعنی الجنۃ والنار کے ذکر سے خالی ہو، پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ نقود یا موجودہ یہودیت جس کی آسمانی کتاب کو جنت اور دوزخ ہی نہیں، بلکہ اس لوک اور عالم کے بعد دوسرے لوک یا عالم کی زندگی کے ذکر سے ہم قطعی طور پر خاموش پاتے ہیں، اس دین کو تو محض یورپ والوں کی اس قسم کی مصنوعی تقسیمون یعنی سامی و آریائی، و تورانی وغیرہ حصوں میں مذہبی قوموں کو بانٹ بانٹ کر یہ فیصلہ جو کر دیا گیا ہے کہ اسلام اور یہودیت و نصرانیت دین کی سامی قلم میں شریک ہیں، اور ہندوستان وغیرہ میں جو دین اور دھرم پھیلا ہوا تھا، وہ دین کی آریائی شکل ہے، حالانکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کے متعلق چاہے کہنے والے کچھ ہی کہیں لیکن اسلامی دین جسے قرآن نے اس دعوی کے ساتھ پیش کیا ہے، کہ اصولاً دین کی یہ کوئی نئی شکل و صورت نہیں ہے، بلکہ ساری انسانی نسلوں کا جو حقیقی موروثی، اور آبائی دین اور دھرم تھا اسی کو ہر قسم کی خارجی آمیزشوں سے صاف و پاک کر کے قوموں کے حوالہ کر دینا ہی اس کا واحد نصب العین ہے، مرحوم ڈاکٹر اقبال کے الفاظ میں

از قبائے لالہ ہائے این چمن
پاک شست آلودگیہائے کہن

قرآن کے پیش کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی خصوصیت جب یہی ہو تو ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ ہندوستان جیسے عظیم ملک کے باشندوں کو قرآنی دائرے کے مذکورہ بالا

احاطہ سے خواہ مخواہ باہر سمجھا جائے۔ بلکہ تحقیق و تلاش سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی کا آبائی اور موروثی دھرم قرآن کے پیش کئے ہوئے دین سے جتنا زیادہ قریب اور نزدیک ہے، شاید یہ نزدیکی ان دینوں اور مذہبوں کی موجودہ شکلوں کو بھی بہ مشکل میسر آسکتی ہو، جن کو یورپ والوں کی مذکورہ بالا ذہنی تقسیم کے رو سے سامی ادیان کی فہرست میں ہم شریک پاتے ہیں، حالانکہ محض چند سرسری باتیں اور وہ بھی صرف ایک کتاب مہابھارت کے مختلف مقامات سے اخذ کرکے آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں لیکن قرآن کے پڑھنے والوں سے میں حق کی گواہی کی درخواست دیتا ہوں توحید فی الخلق توحید فی النبوۃ توحید فی الافعال یا قانون بردائم (نیکی و بدی) اس قانون کے نتائج الجنۃ والنار، توبہ و استغفار،

الغرض ان سارے اصولی حقائق جن پر قرآنی تعلیم کی بنیاد قائم ہے، کیا وہی ساری باتیں مہابھارت میں بھی نہیں مل رہی ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ بعض بعض فقرے مہابھارت کے مذکورہ بالا حوالوں میں ایسے بھی ہیں کہ قرآن کی عربی عبارت کے سامنے بطور ترجمہ کے ہم اُن کو بآسانی درج کر سکتے ہیں،

اور یہ قصہ صرف مبدء و معاد، نیکی و بدی ہی کے تفصیلات تک محدود نہیں ہے، بلکہ اخلاقی فضائل و رذائل کی جو فہرست اسلام میں پائی جاتی ہے، بجنسہٖ یہی فہرست ویدک دھرم کی بھی ہے، بلکہ ایسی چیزیں جو عموماً اسلام کے ساتھ مختص سمجھی جاتی ہیں، مثلاً جوا، شراب خوری، اُن کی حرمت کا بھی بار بار ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے، قمار (جوا) کی اہمیت تو اسی سے ظاہر ہے کہ مہابھارت کا موضوع ہی ایک حیثیت سے اگر سمجھا جائے تو قماربازی یعنی جوئے کے نتائج اور انجام کو بیان کرنا ہے، یہی بتایا گیا ہے کہ یہ ساری خونریزیاں جو مہابھارت کی جنگ میں ہوئیں اور جیسا کہ اسی کتاب میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ کروڑہا کروڑ[1] انسان جو اس جنگ میں مارے گئے، سب کا خون پانڈو اور کورو خاندان کے خاندان

---

[1] استری پرب دسواں ادھیائے میں جدھشٹر کی زبانی مقتولوں کی تعداد ایک ارب چھیاسٹھ کروڑ بیس ہزار بتائی گئی ہے،

کے شاہزادوں کے جذبۂ قماربازی کے سر عائد ہوتا ہے، گویا جوا بازی کے نتیجے کو دکھلانے کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب مرتب کی گئی، مگر حیرت ہوتی ہے کہ بہت سی باتیں جو ہندوستان میں عموماً مروّج ہیں، بلکہ عام تدبیر دین اور دھرم کے نام لینے والے جن اعمال کو اپنی خصوصیت قرار دیئے ہوئے ہیں، اُن کے متعلق بھی اسی مہابھارت میں وہی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے، جو اسلام کا ہے، مثلاً ادیوگ کے دسویں ادھیائے میں برہمن کا ایک طویل اپدیش کو نقل کرتے ہوئے ان فقروں کو بھی ان ہی کی طرف ہم منسوب پاتے ہیں کہ

"تلوار کا زخم بھر جاتا ہے مگر کٹھور بچن کا زخم کبھی نہیں بھرتا، جب تک انسان کی نیک نامی دنیا میں رہتی ہے تب تک وہ زندہ سمجھا جاتا ہے، قسم کھانے والے کی بات کا اعتبار نہیں رہتا"

اور اسی سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ

"سامدریک یعنی ہاتھ کا ریکھا دیکھنے والا شگون بتانے والا جوتشی"

ان سب کو

"بے شرم بھڑوا، گربھ گرانے والا، اپنی استری (عورت) کا خرچ کھانے والا، برہمن ہو کر شراب پینے والا"

کی فہرست میں شریک کیا گیا ہے، حالانکہ آج ہاتھ کا ریکھا دیکھنے والے اور شگون بتانے کا پیشہ کرنے والے ہی اس ملک میں دین کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں، یہی نہیں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ بھکشا لینا، اور بھیک مانگنا بھی برہمن کا مذہبی فریضہ ہے، لیکن اسی مہابھارت میں ہم بھکاری اور گداگر برہمن کے متعلق یہ الفاظ پاتے ہیں :

"جو برہمن سوال کرنے والا ہوتا ہے، اُس کی عزت نہیں ہوتی، ہاں اس کا ڈر ہو جاتا ہے سوال کرنے والے برہمن کا خوف چور کا سا ہوتا ہے"

اور آخر میں ہے:۔

"بھیک مانگنے والا مرتا ہے دان کرنا کبھی نہیں مرتا۔" (انوساسن پرب چودھواں ادھیائے)

اسی طرح آج "بیاج" یعنی ربا یا سود خواری اس ملک میں جس قوم کا خصوصی پیشہ سمجھا جاتا ہے اسی کی دینی کتاب میں ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ

"بیاج (سود) کھانے والا کا اَن (کھانا) بشٹا (گوہ) سمان (مانند) کہا ہے"

(شانتی پرب ۱۲۔ ادھیائے)

میرے سامنے اس وقت تفصیل نہیں ہے۔ انشاء اللہ کسی مستقل مقالہ میں اپنے معلومات کو جمع کرکے پیش کروں گا، سردست صرف سرسری باتوں کا ذکر کر رہا ہوں،

خیال تو کیجئے، پانی سے تطہیر یا پاکی تو خیر عام بات ہے لیکن ہماری فقہ کا ایک جزئیہ ہے کہ آفتاب سے بھی چیزیں پاک ہوتی ہیں، ٹھیک اسی جزئیہ کو ان الفاظ میں آپ مہابھارت میں بھی پائیں گے،

"سورج کی کرن سے سب بستو (چیزیں) پوتر (پاک) ہوتی ہیں"

(ادیپرب ۴ ادھیائے)

حد یہ ہے کہ غسل کے ساتھ قریب قریب وضو کے مسئلہ کو بھی آپ چاہیں تو پا سکتے ہیں، عبادت کرنے

---

[۱] اسی ادھیائے میں ایک فقرہ جس میں اچھے برہمن کی خصوصیتوں کو بتاتے ہوئے ایک خاص علامت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جو برہمن

"ڈاڑھی مونچھ رکھنے والے ہیں اُن کو نیوتہ دے کر اچھے پدارتھ بھوجن کراؤ" (انوساسن پرب ۹۰ ادھیائے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مونچھ ڈاڑھی ہمارے وطن میں بھی پرہیزگار انسانوں کی علامت سمجھی جاتی تھی، ۱۲

سے پہلے کیا کرنا چاہیے اس کا جواب دیتے ہوئے حکم دیا گیا ہے :

"ممکن ہو تو انسان غسل کرے نہیں تو ہاتھ پاؤں دھو کر آچمن (کلی) کرکے شدھ (پاک)

آسن (جگہ) بیٹھ کر ناراین (خالق عالم) کا سمرن (ذکر) دھیان جپ وغیرہ کرے"

(شانتی پرب ۱۹۳ ادھیائے)

اسی طرح صدقہ خیرات تو خیر مذاہب و ادیان کی عام بات ہے لیکن مہابھارت میں اطلاع

دی گئی ہے کہ سب سے پہلے منوجی نامی راجہ کو راج ملا ، اور اُن سے پرجا نے وعدہ کیا کہ آپ

"ہمارا پالن کریں ، ہم پشوؤں کا ، اور سونے کا پچاسواں بھاگ (حصہ) اور اناج کا دسواں

(حصہ) خزانہ کی ترقی کے لئے ..... تمہارے خزانے میں داخل کریں گے"

(شانتی پرب ۶۷ ادھیائے)

زکوٰۃ کے قانون کی تفصیل کہتے ہوئے پشوؤں (السوائم یعنی بھیڑ بکری گائے اونٹ وغیرہ)

اور نقرہ سے اسلام نے جس قدر زکوٰۃ نکالنے کا حکم دیا ہے ، اور عُشر یعنی دسواں حصہ زمین سے

پیدا ہونے والے اناج کا صدقہ جو طلب کیا گیا ہے ، اس کو اپنے سامنے رکھیے ، اور مہابھارت کی زکوٰۃ

اطلاع کو پیش نظر رکھئے اور غور کیجئے اُن قرآنی آیات پر جن میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے اگلے باپ دادوں

کے پاس جو کچھ آیا تھا ، کیا اس کے سوا قرآن تمہیں کچھ اور دے رہا ہے ، یا ارشاد ہوا ہے ،

يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ	تاکہ جو تم سے پہلے گذرے ہیں ، اُن کے طور
قَبْلِكُمْ ،	اور طریقوں کی طرف تمہاری راہ نمائی
(النساء)	کی جائے ،

قرآن کے ان دعووں کی تصدیق کے لئے میں نہیں سمجھتا کہ اور کیا چاہا جاتا ہے ، ذرا ملاحظہ کیجئے ،

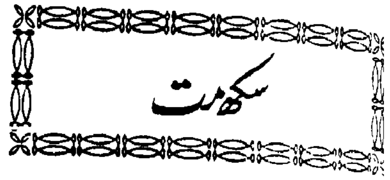
جرائم کے سلسلہ میں چوری کے جرم کی سزا قرآن میں جیسا کہ مشہور ہی ہے ، یہ مقرر کی گئی ہے کہ چور کا ہاتھ

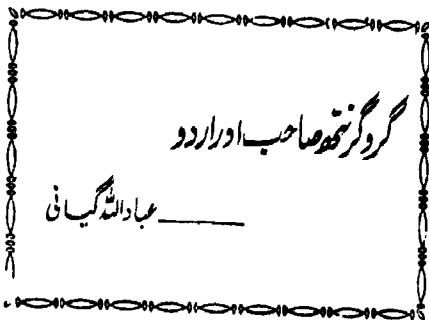
کاٹ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اصل مقصود تو چوری کا انسداد ہے، جرم کے انسداد ہی کے لئے یہ سزا مقرر کی گئی ہے، خود قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اور نہ اور حضرت یعقوب علیہ السلام جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا، اور ان ہی کی طرف منسوب ہو کر یہود بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئے، ان ہی یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں کی زبانی قرآن میں چوری کی سزا ان کے پاس مروج تھی، یہ بتایا گیا ہے کہ چوری کا مال جس کے پاس نکلے، خود اسی چور پر مال کا مالک قبضہ کرلے، سورۂ یوسف میں یہ مشہور اعتراف حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں کا منقول ہے،

قالوا جزائه لمن وجد فی	(یعقوب علیہ السلام کے لڑکوں نے) کہا کہ
رحله فهو جزائه کذلك	بدلہ اس کا یہ ہے کہ جس کے سامان میں
نجزی المجرمین	چوری کا مال ملے وہی اس کا بدلہ ہے
	ہم جرم کرنے والوں کو یونہی سزا دیتے ہیں'

جس سے معلوم ہوا کہ چوری کے انسداد کے لئے اپنے خاص حالات کے لحاظ سے بنی اسرائیل کے قطع ید (ہاتھ کاٹنا) کافی نہ تھا، کٹے ہوئے ہاتھوں کے باوجود بے شرمی کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چور چوری سے باز نہیں آتے تھے۔ اس لئے اس سے زیادہ سخت سزا ان کے یہاں غالباً مروج ہو گئی تھی لیکن آئیے اور دیکھئے، ویدک دھرم جسے شمار کرنے والے سامی مذاہب کے مقابلہ میں آریائی دین کی فہرست میں شمار کرتے ہیں، اس میں اسی چوری کے جرم کی سزا کے متعلق جو آگاہی نہا بھارت سے حاصل ہوتی ہے، اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، ایک شخص چوری کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے، اور وقت کے راجہ سودمن کے سامنے اس کا مقدمہ پیش ہوتا ہے، خود چور درخواست کرتا ہے کہ

"چور ڈنڈ (سزا) چور کو ہوتا ہے وہی ڈنڈ مجھے دو۔"


سکھ مت


گرو گرنتھ صاحب اور اردو
عباد اللہ گیانی



حکومت کی ایک بنیاد تو یقیناً توسیع خاندان ہے۔ دوسری بنیاد دار و گیر ہے۔
یہ بات پیش نظر تحریر سے قبل کسی دوسری شکل میں محمود شیرانی کہہ چکے ہیں۔

ادارہ —

عباداللہ گیانی

گروگرنتھ صاحب اور اردو

گورو گرنتھ صاحب سکھ صاحبان کی مقدس مذہبی کتاب ہے اور سب کی سب منظوم کلام پر مشتمل ہے جو اکتیس راگوں میں منقسم ہے ۔ اکثر سکھ اسے گوروگوبند سنگھ جی کے بعد اپنا علمی گورو تسلیم کرتے ہیں اور اس پر انسان گوروؤں کے سلسلے کو ختم یقین کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک گورو گوبند سنگھ جی نے اپنے بعد گوربائی کو گرنتھ اورپنتھ کے دو حصوں میں تقسیم کر کے انسان گوروؤں کا سلسلہ بند کر دیا تھا(۱) ۔ علمی گوربائی گوروگرنتھ صاحب کو اور عملی گوربائی پنتھ کو سونپ دی تھی ۔ گوروگرنتھ صاحب ، گورو ارجن جی نے ۱۶۶۱ بکرمی مطابق ۱۶۰۴ء میں مرتب کیا تھا ۔

---

(۱) سکھوں میں نام دھاری اور نرنکاری وغیرہ ایسے فرقے بھی ہیں جن کے نزدیک ہر زمانہ میں انسان نمونہ کا محتاج ہے اور انسان کے لیے کوئی کتاب نمونہ نہیں بن سکتی ۔ بلکہ یہ مقام کسی مقدس انسان ہی کو حاصل ہے ۔ وہ گورو گوبند سنگھ جی کے بعد بھی انسان گوروؤں کے اجرا کے قائل ہیں ۔ وہ گرنتھ اور پنتھ کو ان معنوں میں گورو تسلیم نہیں کرتے کہ اب کوئی انسان گورو نہیں ہو گا ۔ ان کے اپنے الگ الگ گورو ہیں ۔ چنانچہ نام دھاری فرقہ کے لوگ گوروگوبند سنگھ جی کے بعد جن بزرگوں کو اپنے گورو مانتے ہیں وہ یہ ہیں : (۱۱) بابا بالک سنگھ جی ، (۱۲) بابا رام سنگھ جی ، (۱۳) بابا ہری سنگھ جی ، (۱۴) بابا پرتاب سنگھ اور (۱۵) بابا جگجیت سنگھ جی ۔ اب ان کے گورو مؤخرالذکر بزرگ ہیں ۔ نرنکاری صاحبان کے گوروؤں کا سلسلہ اس سے الگ ہے ۔

عام طور پر مطبوعہ گوروگرنتھ صاحب خواہ وہ کسی سائز میں ہو ۱۴۳۰ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ گوروگرنتھ صاحب کے قلمی نسخوں میں اپنی بانیوں کے لحاظ سے تو کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ خاکسار نے عام مروجہ مطبوعہ گورو گرنتھ صاحب کو مد نظر رکھا ہے اور اسی سے شبد اور شلوک نقل کیے ہیں۔

سکھ تاریخ سے اس کتاب سے متعلق جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کتاب سکھوں کے پانچویں گورو ارجن جی کی تالیف ہے اور اس کی تکمیل گورو گوبند سنگھ جی کے ہاتھوں ہوئی تھی اور مروجہ گورو گرنتھ صاحب میں مندرجہ ذیل سات سکھ گورو صاحبان کا بیان کردہ کلام مختلف راگوں کے شبدوں اور شلوکوں میں ملتا ہے۔

پہلے گورو : گورو نانک جی
دوسرے گورو : گورو انگد جی
تیسرے گورو : گورو امرداس جی
چوتھے گورو : گورو رام داس جی
پانچویں گورو : گورو ارجن جی(۱)

---

(۱) گورو ارجن جی کے بعد ہونے والے چھٹے، ساتویں اور آٹھویں گورو صاحبان سے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کوئی بانی بیان نہیں کی مگر گورو گرنتھ صاحب کے بعض قدیمی اور قلمی نسخے ایسے بھی ہیں جن میں ان تینوں گورو صاحبان کے نام پر بھی کچھ بانیاں درج ہیں۔ مروجہ گوروگرنتھ صاحب میں ان کے نام کا کوئی شبد یا شلوک نہیں ہے اور جو شبد یا شلوک ان کے بیان کردہ بعض پرانے قلمی نسخوں میں ملتے ہیں ان کا رنگ ڈھنگ سکھ گورو صاحبان کے بیان کردہ کلام سا ہے اور ان میں بھی دوسرے سکھ گورو صاحبان کی طرح "نانک" لفظ بطور تخلص کے استعمال کیا گیا ہے۔

نویں گورو : گورو تیغ بہادر جی
دسویں گورو : گوبند سنگھ جی (صرف ایک شلوک)

ان سکھ گورو صاحبان کے علاوہ بعض ھندو اور مسلمان بزرگوں بیان کردہ کلام بھی گورو گرنتھ صاحب میں درج ھے ۔ جسے عرف ام میں " بھگتاں کی بانی " یا " بھگت بانی " کے نام سے موسوم یا جاتا ھے اور وہ بھگت یہ ھیں :

(۱) شیخ فرید جی ۔ (۲) بھگت کبیر جی ۔
(۳) ترلوچن جی ۔ (۴) نام دیو جی ۔
(۵) سدھنا جی ۔ (۶) جے دیو جی ۔
(۷) بینی جی ۔ (۸) راما نند جی ۔
(۹) پیپا جی ۔ (۱۰) سین جی ۔
(۱۱) دھنا جی ۔ (۱۲) بھیکھن جی ۔
(۱۳) پرما نند جی ۔ (۱۴) سورداس جی ۔
(۱۵) پرسانند جی ۔

ان بھگتوں میں اکثریت ان کی ھے جو ھندو سماج میں ادنیٰ ور اچھوت تصور کیے جاتے تھے اور یہ سارے بھگت سکھ گورو صاحبان سے بہت پہلے گزرے ھیں ۔ ان میں سے بعض بھگتوں کا زمانہ و صدیوں قبل ھے یعنی سکھ گورو صاحبان ان سے صدیوں بعد پیدا ھوئے تھے ۔

بعض سکھ مؤرخین اور مصنفین کے نزدیک بھگتوں کا جملہ کلام گوروگرنتھ صاحب کے مؤلف گورو ارجن جی نے خود اپنی مرضی سے گوروگرنتھ صاحب میں شامل کیا تھا(۱) ۔ لیکن سکھوں میں ایسے ودوان

---

(۱) مشہور سکھ ودوان پنڈت تارا سنگھ جی نروتم کا خیال ھے کہ گرنتھ صاحب میں درج شدہ بھگت بانی گورو ارجن جی نے خود ھی ان بھگتوں کے نام پر اچارن کی تھی گویا یہ کہ اس کے مصنف گورو ارجن جی خود ھی ھیں ۔

بھی موجود ھیں جن کے نزدیک سکھ گورو صاحبان کے کلام کے ساتھ ساتھ بھگتوں کا کلام شامل کرنے کی داغ بیل گورو نانک جی نے ڈالی تھی جنھوں نے اپنی زندگی ھی میں بھگت بانی کو جمع کر کے اپنے کلام کے ساتھ درج کر دیا تھا ۔ گورو ارجن جی نے گورو نانک جی کی جمع کردہ بھگت بانی ھی کو گورو گرنتھ صاحب میں درج کروا دیا تھا(۲) ۔

سکھوں میں بھگت بانی سے متعلق ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ گورو ارجن جی کی وفات کے بعد ان کے بڑے بھائی پرتھی چند جی نے (جو بعض مؤرخین کے نزدیک گورو ارجن جی کے سوتیلے بھائی اور اشد مخالف بلکہ خون کے پیاسے تھے) ھندوؤں اور مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے گورو صاحب کی منشاء کے خلاف بھگت بانی گورو گرنتھ صاحب میں درج کروا دی تھی اور گورو صاحب موصوف کے مؤلفہ گورو گرنتھ صاحب کو تلف کروا دیا تھا ۔ مروجہ گورو

---

(۲) جو لوگ اس امر کے قائل ھیں کہ بھگت بانی کے مصنف وہ بھگت ھی ھیں جن کے نام پر اسے گروگرنتھ صاحب میں درج کیا گیا ہے ۔ ان میں ایسے لوگ بھی موجود ھیں جن کے نزدیک گورو ارجن جی نے اس میں مناسب ترمیم کرنے کے بعد اسے گرنتھ صاحب میں درج کیا تھا ۔

(۱) بعض سکھوں کے نزدیک یہ بھاٹ اصل میں چاروں ویدوں کے اوتار ہے ۔ یعنی ویدوں نے انسانی شکل اختیار کر کے سکھ گورو صاحبان کی تعریف میں کلام بیان کیا تھا جسے گورو ارجن جی نے گرنتھ میں شامل کر دیا ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ بھاٹ ویدوں کے عالم تھے ۔ سکھوں میں ایسے لوگ بھی موجود ھیں جن کے نزدیک یہ بھاٹ سکھ گورو صاحبان کی گدی نشینی کے وقت مختلف اوقات میں جو کلام بیان کرتے رہے اسے گورو ارجن جی کے گوروگرنتھ صاحب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر درج کروا دیا ۔

گرنتھ صاحب میں درج شدہ بھگت بانی کا گورو ارجن جی سے کوئی
تعلق نہیں ۔ گوروگرنتھ صاحب کے بعض قلمی نسخے ایسے بھی ھیں
جن میں یہ بھگت بانی شامل نہیں ہے ۔

ان مختلف بھگتوں کے کلام کے علاوہ بعض اور لوگوں اور
بھائیوں(۱) کے نام سے بھی کافی کلام گورو گرنتھ صاحب میں درج
ہے ، جن کے نام یہ ھیں :

(۱) بھائی مردانہ جی ۔ (۲) بابا سندرداس جی ۔
(۳) رائے بلونڈ اور ستاؤدم ۔ (۴) کلسہار ۔
(۵) جالب ۔ (۶) کرت ۔
(۷) بھکنہا ۔ (۸) سل ۔
(۹) نل ۔ (۱۰) گیند ۔
(۱۱) متھیرا ۔ (۱۲) بل ۔
(۱۳) ھربنس وغیرہ ۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ گورو گرنتھ صاحب میں جن
بھگتوں کا کلام درج ہے وہ سب کے سب سکھ گورو صاحبان سے بہت
عرصہ پہلے گزر چکے ھیں ۔ بعض تو ایسے بھی ھیں جن میں صدیوں
کا بُعد ہے ۔ اور سکھ گورو صاحبان میں بھی اکثریت ایسے لوگوں
کی ہے جو اردو زبان کے نشو و نما پانے سے قبل وفات پا چکے تھے ۔
اس لیے اردو کی اس ترقی پائی ہوئی صورت کا تو ذکر ھی کیا ، جو
ھمارے زمانے میں ہے ، گورو گرنتھ صاحب کے شبدوں شلوکوں میں
تو اردو کی وہ صورت بھی نہیں مل سکتی جو اسے شاہ جہان کے عہد
میں حاصل ہوئی تھی ۔ البتہ ایسے شبد اور شلوک یا ان شبدوں او
شلوکوں کی بعض سطور ایسی ضرور مل جاتی ھیں جن میں اردو کی
جھلک نظر آ جاتی ہے اور اس سے یہ امر واضح ھو جاتا ہے کہ سک

گورو صاحبان اور ان سے قبل گزر چکے بعض بھگتوں نے ھندی کے ساتھ
ساتھ عربی اور فارسی کے ان الفاظ کو بھی اپنا لیا تھا جو آگے چل
کر اردو زبان کو وجود میں لانے کا باعث بنے اور ایک مستقل زبان
کی شکل اختیار کر گئے ۔

کلام کا ایک نسخہ گورو نانک جی کی بھینٹ کیا
تھا ۔''

سکھ ودوانوں میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جن کے نزدیک
گورو گرنتھ صاحب میں درج شدہ فرید جی کی بانی شیخ فرید شکر
گنج اور شیخ ابراھیم (فرید ثانی) دونوں کی ملی جلی ھے ۔

موجودہ مروجہ گورو گرنتھ صاحب میں شیخ فرید جی کے نا
پر جو بانی درج ھے وہ چار شبدوں اور ایک سو تیس شلوکوں
مشتمل ھے ۔ سکھ ودوان شیخ جی کے کلام کو ابتدائی پنجابی کلا
کا درجہ دیتے ھیں ۔ تاھم اس میں بھی عربی اور فارسی الفاظ کی آمیز
پائی جاتی ھے جو اردو کے ارتقائی منازل کی نشان دھی کرتی ھے
ذیل میں ھم شیخ جی کے کلام سے نمونہ پیش کیے دیتے ھیں ۔

گورو گرنتھ صاحب میں راگ آسا کے آخر میں آپ کے یہ
شبد درج ھیں :—

دلھوں مہبت (محبت) جن سیئی سچیا
جن من ھور مکھ ھور سے کانڈھے کچیا
رتے اسک کھدائے (عشق خدائے) رنگ دیدار کے
وسریا جن نام تے بھوئے بھار تھیئے
آپ لیے لڑ لائے در درویس (در درویش) سے
تن دھن جنیدی ماؤ آئے سپھل سے
پروداگار (پروردگار) اپار اگم بے انت تو

جنہاں پچھاتا سچ چوما پیر موں
تیری پناہ کھدائے (خدائے) تو بکھسندگی (بخشندگی)
سیکھ پھرید (شیخ فرید) کھیر (خیر) دیجے بندگی

[گورو گرنتھ صاحب راگ آسا شیخ فرید ص ۴۸۸]

دوسرا شبد یہ ہے :—

بولے سیکھ پھرید (شیخ فرید) پیارے اللہ لگے
ایہ تن ھوسی کھاک (خاک) نمانی گور گھرے
آج ملاوا سیکھ پھرید (شیخ فرید)
ٹا کم کوجڑیا (ں) منہہ چنڈڑیا (ں)
ہے جانا مر جائیئے گھوم نہ آئیئے
جھوٹھی دنیا لگ نہ آپ ونجائیئے
بولیئے سچ دھرم جھوٹھ نہ بولیئے
جو گور دسے واٹ مریداں جولیئے
چھیل لنگھندے پار گوری من دھیریئے
کنچن ونے پاسے کلوت چیریا
سیکھ (شیخ) ھیاتی (حیاتی) جگ نہ کوئی تھر رھیا
جس آسن ہم بیٹھے کیتے بیس گیا
کتک کونجاں چیت ڈوماون بجلیاں
سیالے سوھندیاں پر گل باھڑیاں
چلے چلنہار وچارا لیئے منو
گندھیندیاں چھ ماہ تڑلدیاں اک کھنو
جمی (زمیں) پوچھے اسمان پھریدا (فریدا) کھیوٹ کن گیئے
جالن گوراں نال الاہے جیئی سہے

[گورو گرنتھ صاحب راگ آسا شیخ فرید ص ۴۸۸]

شیخ فرید جی کے مندرجہ بالا دونوں شبدوں میں عربی اور فارسی

الفاظ کی آمیزش ہے ۔ چنانچہ محبت ، عشق ، رنگ ، در ، درویش ، پروردگار ، پناہ ، بخشندگی ، خیر ، اللہ ، گور ، خاک وغیرہ الفاظ کا تعلق عربی اور فارسی سے ہے ۔

گورو گرنتھ صاحب میں راگ سوھی میں شیخ فرید جی کے نام پر دو شبد درج ھیں ۔ ان میں بھی عربی اور فارسی الفاظ استعمال کیے گئے ھیں ، جیسا کہ :

تپ تپ لوہے لوہے ھاتھ مروڑو
باول ھوئی سو سہ (شہ) لو رو
تے سہ (شہ) من میں کیا روس
مجھ اوگن سہ (شہ) ناھی دوس
تیں صاحب کی میں سار نہ جانی
جوبن کھوئے پاچھے پچھوتانی
کالی کوئل تو کت گن کالی
اپنے پریتم کے ھوں برہے جالی
پرہے بہون کیتے سکھ پائے
جا ھوئے کرپال تاں پربھو ملائے
ودھن کھوھی منده اکیلی
نہ کو ساتھی نہ کو بیلی
کر کرپا پربھ سادھ سنگ میلی
جاں پھر دیکھاں تاں میرا اللہ بیلی
واٹ ھماری کھری اڈینٹی
کھنیوں تکھی بہت پینٹی
اس اوپر ہے مارگ میرا
سیکھ پھریدا (شیخ فریدا) پنتھ سمار سویرا

اور دوسرا شبد یہ ہے :۔

بیڑا بندھ نہ سکیو بندھن کی ویلا
بھر سروور جب اوچھلے تب ترن دوھیلا
ہتھ نہ لائے کسمبھڑے جل جاسی ڈھولا
اک آپنے پتلی سہ (شہ) کیرے بولا
دودھا تھنڑی آونی بھر ہونے نہ میلا
کہے بھرید (فرید) سہیلیو (سہیلیو) سہ (شہ) الائے سی
ہنس چلسی ڈومنڑا ایہہ تن ڈھیری تھیسی

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ گوروگرنتھ صاحب میں شیخ فرید جی کے نام پر کچھ شلوک بھی درج ہیں ۔ ان شلوکوں میں شیخ صاحب نے عربی اور فارسی الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ ذیل میں ہم شلوکوں سے بعض مثالیں پیش کیے دیتے ہیں :—

والوں نکی پرسلات (پل صراط) کنیں نہ سنٹی آئے
بھریدا (فریدا) کیڑی ہوندی نی کنپڑا نہ آپ مہائے
بھریدا (فریدا) دردرویسی (درویشی) گاکھڑی چلاں دنیا بھت
بنھ اٹھائی پوٹلی کتھے ونجاں گھت ۔ ۲

....

بھریدا (فریدا) جے تو اکل لتیپھ (عقل لطیف) کالے لکھ نہ لیکھ
آپنڑے گریوان (گریبان) مہ سر نیواں کر ویکھ ۔ ۶

....

بھریدا (فریدا) جاں تو کھٹن ویلا تاں توں رتا دنی سیوں
مرگ سوائی نیہ جاں بھریا تاں لدیا ۔ ۸

....

بھریدا (فریدا) کوکیندیاں چانگیندیاں متی دیندیاں نت
جو سیتان (شیطان) ونجایا سے کت بھیرے چت ۔ ۱۵

....

پھریدا (فریدا) خاک نہ نندئیے خاکو جیڈ نہ کوئے
جیوندیاں پیراں تلے موئیاں اوپر ہوئے - ۱۷
پھریدا (فریدا) جاں لب تاں نیہ کیا لب تاں کوڑا نیہ
کچر جھت لنگائیئے چھپر توٹے میہ - ۱۸
پھریدا (فریدا) جنگل جنگل کیا بھوہے ونٗ کنڈا موڑیہ
وسی رب ہیا لئے جنگل کیا ڈھوڈھیہ - ۱۹

....

پھریدا (فریدا) چنت کھٹولا وانٗ دکھ برہ وچھاون لیپھ (لحاف)
ایہ ہمارا جیونا صاحب سچے ویکھ - ۳۵
برھا برھا آکھیئے برھا توں سلتان (سلطان)
پھریدا (فریدا) جت تن برھا نہ اوپجے سو تن جان مسان - ۳۶

....

پھریدا (فریدا) چار گوایا ہنڈھ کے چار گوایا سم
لیکھا رب منگیسیا تو آں ہو کیہرے کم - ۳۸
پھریدا (فریدا) در درواجے (دروازے) جائے کے کیوں ڈٹھو گھڑیا
ایہہ نردوساں مارئیے ہم دوساں دا کیا ہال (حال) - ۳۹

....

ہاس دماہے چھت سر بھیری سدو رڈ
جائے سُتے جیرانٗ مہ تھیئے اتیماں (یتیماں) گڈ - ۴۵

....

پھریدا (فریدا) کھنتھڑ میکھا (میخاں) اگلیاں
جند نہ کائی میکھ (میخ)
واری آپو آپنی چلے مسائک (مشائخ) سیکھ (شیخ) - ۴۷
پھریدا (فریدا) دوہی دیوے بلندیاں ملک بہٹھا آئے

گڑہ لینا گھٹ لولیا دیوڑے گینا ہوجھائے - ۴۸

....

پھریدا (فریدا) کوٹھے منڈپ ماڑیاں ایت نہ لائے چت
مٹی پئی اتولوبی کوئے نہ ھوسی مت - ۵۷

پھریدا (فریدا) منڈپ مال نہ لائے مرگ ستانی چت دھر
سائی جائے سمال جھتے ھی تؤ ونجناں - ۵۸

پھریدا (فریدا) جنی کیں ناھیں گن تے کڑے وسار
مت سرمندا (شرمندا) تھیوھی سائیں دے دربار - ۵۹

پھریدا (فریدا) صاحب دی کر چاکری دل دی لاہ بھراند
درویساں (درویشاں) نو لوڑیئے رکھاں دی جیراند - ۶۰

پھریدا (فریدا) کالے مینڈے کپڑے کالا مینڈا ویس
گنہی بھریا میں پھراں لوک کہیے درویس (درویش) - ۶۱

....

جاں کواری تاں چاؤ ویواھی تا ماملے (عاملے)
پھریدا (فریدا) ایہو پچھوتاؤ وت کواری نہ تھیئے - ۶۳

....

پھریدا (فریدا) بھنی گھڑی سونوی ٹوٹی نا گر لج
اجرائیل (عزرائیل) پھریستہ (فرشتہ) کے گھر نائھی اج - ۶۸

....

پھریدا (فریدا) بے نواجا (بے نمازا) کتیا ایہ نہ بھلی ریت
کبھی چل نہ آئیا پنجے وکھت (وقت) مسیت - ۷۰

اٹھ پھریدا (فریدا) اجو (وضو) ساج
سبہ (صبح) نواج (نماز) گجار (گزار)
جو سر سائیں نہ نویں سو سر کپ اتار - ۷۱

جو سر سائیں نہ نویں سو سر کیجے کائے
کنے ہیٹھ جلائیئے بالن سنڈڑے تھائے - ۲ے

....

پھریدا (فریدا) من میدان کر ٹوئے ٹبے لاہ
اگے مول نہ آوسی دوجک (دوزخ) سندی بھاہ - ۳ے

پھریدا (فریدا) کھالک (خالق) کھلک (خلق) میں
کھلک (خلق) وسے رب ماہ
منداکس نو آکھیئے جاں تس بن کوئی ناہ - ۵ے

پھریدا (فریدا) جے دہ لالا کپیا جے گل کپے چوکھ
پون نہ اتی ماملے (معاملے) سہاں نہ اتی دوکھ - ٦ے

....

پھریدا (فریدا) برے دا بھلا کر گسہ (غصہ) من نہ ھڈھائے
دیہی روگ نہ لاگئی پلے سب کچھ پائے - ۸ے

پھریدا (فریدا) پنکھ پراھنٹی دنی سوھاوا باگ (باغ)
نوبت وجی سبہ (صبح) سیوں چلن کا کر ساج (ساز) - ۹ے

....

پھریدا (فریدا) مہل (محل) نسکھن رہ گئے واسا آئیا تل
گوراں سے نماٹیاں بہسن روھاں (روحاں) سل
آکہیں سیکھاں (شیخاں) بندگی چلن اج کہ کل - ۹ے

پھریدا (فریدا) سوتے دا ہناں ابوے دسے جیوں دریاوے ڈھاھا
اگے دوجک (دوزخ) تپیا سنٹیئے ہول ہوے کاھاھا
اکناں نوں سب سوجھی آئی اک پھردے بے پرواھا
امل (عمل) جے کیتا دنی وچ سے درگہ اوگاھا - ۹۸

پھریدا (فریدا) دریاوے کنے بگلا بیٹھا کیل کرے

کیل کریندے ہنجھ لو اچنتے باج (باز) پئے
باج (باز) پئے تس رب دے کیلاں وسریاں
جو من چت نہ چیتے سن سو گالی رب کیاں - ۹۹

ساڈھے ترے من دیہری چلے پانی ان
آئیو بندہ دنی وچ وت آسونی بهن
ملک‌الموت جاں آوسی سب درواجے (دروازے) بھن
تناں پیاریاں بھائیاں اگے دتا بنہہ
دیکھو بندہ چلیا چوہ جنیا دے کن
پھریدا (فریدا) امل (عمل) جے کیتے دنی وچ درگاہ آئے کم - ۱۰۰

پھریدا (فریدا) ہوں بلہاری تن پنکھیاں جنگل جناں واس
ککر چگن تہل وسن رب نہ چھوڈن پاس - ۱۰۱

....

پھریدا (فریدا) پچھلی رات نہ جاگیوہے جیوندڑو موئیوہ
جے تیں رب وساریا تاں رب نہ وسریؤہ - ۱۰۷

پھریدا (فریدا) کنت رنگولا وڈا وے مہتاج (بے محتاج)
اللہ سیتی رتیا ابہ سچاواں ساج (ساز) ۱۰۸

پھریدا (فریدا) دکھ سکھ اک کر دل تے لاہ وکار
اللہ بھاوے سو بھلا تاں لبھی دربار - ۱۰۹

پھریدا (فریدا) دنی وجائی وجدی توں بھی وجھے نال
سوئی جیؤ نہ وجدا جس اللہ کردا سار - ۱۱۰

پھریدا (فریدا) دل رتا اس دنی سیوں دنی نہ کتے کم
مسل (مثل) پھکیراں (فقیراں) گاکھڑی سو پائیے پور کرم - ۱۱۱

....

سبر (صبر) منجھ کان اے سبر (صبر) کا لیہنٹو

سبر (صبر) سندا بانْ کھالک (خالق) کھتا (خطا) نہ کری ۔

۱۱۵

سبر (صبر) اندر سابری (صابری) تن ایوے جالین

ہون نجیک (نزدیک) کھدائے (خدائے) دے

بھیت نہ کسے دین - ۱۱۶

سبر (صبر) ایہہ سواؤ جے تو بندہ دڑ کرے

ودہ تھیوے درباؤ ٹوٹ نہ تھیوے واھڑا - ۱۱۷

پھریدا (فریدا) درویسی (درویشی) گاکھڑی چوپڑی پریت

اکنے کنے چالیئے درویساوی (درویشاوی) ریت - ۱۱۸

[گورو گرنتھ صاحب شلوک فرید ص ۱۳۷۷ تا ص ۱۳۸۴]

شیخ فرید جی کے بیان کردہ مندرجہ بالا کلام سے واضح ہے کہ ان کے زمانہ میں بولی جانے والی زبان میں بھی عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال رواج پڑ چکا تھا اور اس طرح اردو زبان کی بنیاد رکھی جا چکی تھی -

بھگت نام دیو جی کے نام سے جو کلام گوروگرنتھ صاحب میں درج ہے اس میں بعض ایسے شبد ھیں جنہیں ابتدائی اردو کا نمونہ کہ سکتے ھیں ۔ آپ فرماتے ھیں کہ :

میں اندھلے کی ٹیک تیرا نام کھوندکارہ (خوندکارہ)

میں گریب (غریب) میں مسکین تیرا نام ھے آدھارا

کریما رھیما (رحیما) اللہ تو گنی (غنی)

ھادرا (حاضرہ) ھدور (حضور) در پیس (در پیش) تو منی (منیع)

درباؤ تو دھند تو بسیار تو دھنی

تو دانا تو بینا میں بیچار کیا کری

نامے چہ سوامی بکھسند (بخشند) تو ھری

[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ نام دیو ص ۷۲۷]

نام دیو جی کے اس شبد میں ہندی ، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور اس کے معنے یہ ہیں :

میں اندھا ہوں اور خداوند تو ہی میرا سہارا ہے ۔ میں غریب اور مسکین ہوں تیرا نام ہی میرے لیے سب کچھ ہے ۔ اے رحیم اے کریم اللہ تعالیٰ تو ہی غنی ہے ، تو ہی حاضر ناظر ہے اور المتکبر ہے ۔ تو دریا ہے اور تو داتا ہے تیرے خزانے ہمیشہ بھرے رہتے ہیں ۔ تیرے سوا اور کوئی دوسرا دینے اور لینے والا نہیں ہے ۔ تو ہی (حقیقی) داتا اور بینا ہے ۔ میں تیری جملہ صفات بیان کرنے سے قاصر ہوں ۔ اے نام دیو کے مولا تو ہی بخشنہار ہے ۔

نام دیو جی کا ایک اور شبد یہ ہے :

ہلے یاراں ہلے یاراں کھسکھبری (خوشخبری)
بل بل جاؤں ہوں بل بل جاؤں
لبکی تیری بیکاری آلا (اعلیٰ) تیرا ناؤں
کجا آمد کجا رپھتی (رفتی) کجا میروی
دوارکا نگری راس بگوئی
کھوب (خوب) تیری پگڑی میٹھے تیرے بول
دوارکا نگری کاہے کے مکول (مغل)
چندیں ہجار (ہزار) آلم (عالم) ایکل کھانہ (خانہ)
ہم چنیں پاتساہ (پاتشاہ) سانولے برنا
اسپت گج پت نرا نرند
نامے کے سوامی میر مکند
[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ نام دیو ص ۷۲۷]

نام دیو جی کے نام سے درج شدہ اس شبد میں بھی فارسی ،

عربی اور ہندی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں - اس سے معلوم ہو
ہے کہ ان کے زمانے میں عربی اور فارسی زبان کا اثر تمام ہندوستا
میں پھیل چکا تھا اور لوگ اپنی تحریر و تقریر میں عربی اور فارسی
الفاظ بھی بکثرت استعمال کیا کرتے تھے -

گورو گرنتھ صاحب کے ایک اور مقام پر نام دیو جی کے
سے ایک اور لمبا شبد درج ہے - اس میں بھی ہندی کے ساتھ عر
اور فارسی کے الفاظ کا استعمال مثل سابق موجود ہے - فرماتے ہیں

سلتان (سلطان) پوچھے سن بے نامہ
دیکھوں رام تمہارے کاماں
نامہ سلتانے (سلطانے) باندھلا
دیکھوں تیرا میں ہر بیٹھلا
بسمل گؤ دیؤ جیوائے
ناترگردن ماروں ٹھائے
بادساہ (بادشاہ) ایسی کیوں ہوئے
بسمل کیا جیوے نہ کوئے
میرا کیا کچھو نہ ہوئے
کرے رام ہوئے ہے سوئے
بادساہ (بادشاہ) چڑھیو اہنکار
گج ہستی دینوں چمکار
....
کاجی (قاضی) ملاں کریں سلام
ان ہندو میرا ملیا مان
بادساہ (بادشاہ) بینتی سنیہو
نامے سر بھر سونا لیہو
مال لیؤں تو دوجک (دوزخ) پرؤں

دین چھوڑ دنیا کو بھروں
پاؤں بیڑی ہاتھوں تال
نامہ گاوے گن گوپال
گنگ جمن جیوں الٹی بہے
تو نامہ ہر کرتا رہے
سات گھڑی جب بیتی سنی
اجہوں نہ آئیو تربھون دھنی
....
کبہے تو دھرنی اکوڑی کروں
کبہے تو لے کر اوپر دھروں
کبہے تو موئی گؤ دیوں جیائے
سب کوئی دیکھے پتیائے
نامہ پرنوے سیل مسیل
گؤ دوھائی بچھرا میل
دودھ دوہے جب مٹکی بھری
لے بادساہ (بادشاہ) کے آگے دھری
بادساہ (بادشاہ) مہل (محل) میں جائے
اوگھٹ کی گھٹ لاگی آئے
کاجی (قاضی) ملاں بینتی فرمائے
بکھسی (بخشی) ہندو میں تیری گائے
نامہ کہے سنو بادساہ (بادشاہ)
ایہ کچھ پتیا مجھے دکھائے
ایہ پتیا کا ایہ پروان
ساچ سیل چالہو سلتان (سلطان)
[گورو گرنتھ صاحب بھیروں نام دیو ص ۶۶ - ۱۱۶۵]

نام دیو جی کے ایک اور شبد سے بھی ہم اسی نتیجہ تک پہنچتے

ھیں کہ اس زمانے میں ھندی الفاظ کے ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال جاری ھو چکا تھا ۔ اسے ھم اردو کی ابتدائی حالت کا درجہ دے سکتے ھیں ۔ دیکھیے :

مانے نہ ھوتی باپ نہ ھوتا کرم نہ ھوتی کائیا
ھم نہیں ھوتے تم نہیں ھوتے کون کہاں تے آیا
....
چند نہ ھوتا سور نہ ھوتا پانی پون ملایا
شاست نہ ھوتا بید نہ ھوتا کرم کہاں تے آیا

[گورو گرنتھ صاحب راگ رام کلی نام دیو ص ۹۷۳]

یعنی ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ نہ ماں تھی ، نہ باپ تھا اور نہ کسی کا کوئی عمل تھا اور نہ کسی کا جسم ھی تھا ۔ ھم بھی نہیں تھے ، تم بھی نہیں تھے اور کوئی بھی نہیں تھا... اس وقت یہ چاند اور سورج بھی نہیں تھے اور پانی اور ھوا کا بھی کوئی نام و نشان نہ تھا ۔ اس وقت شاستر اور ویدوں کا بھی کوئی وجود نہ تھا ۔ اس وقت کرم (اعمال) کہاں سے آ گئے تھے ۔

ھندو قوم کا یہ نظریہ ھے کہ ھر انسان کی پیدائش اس کے سابقہ اعمال کا نتیجہ ھے اور جس قدر بھی جاندار چیزیں چرندے ، پرندے ، درندے ، کیڑے مکوڑے اور سبزیاں ، ترکاریاں ھیں یہ سب پچھلے جنم میں انسان تھے اور اپنے برے اعمال کے نتیجہ میں اب کوئی ھاتھی بن گیا ھے اور کوئی شیر ۔ کسی کو چوھے کا جنم مل گیا ھے ور کوئی بلی کی شکل میں پیدا ھو گیا ھے ۔ کوئی ٹماٹر بن گیا ھے ور کسی نے بیگن کی شکل اختیار کر لی ھے ۔ ایسے لوگوں سے نام دیو ی نے اپنے اس شبد میں سوال کیا ھے جب کہ کسی چیز کی تخلیق نہیں ھوئی تھی اس وقت یہ چاند ، سورج اور ستارے بھی موجود نہیں ہے اگر کسی ذی روح کی پیدائش اس کے پچھلے جنم کے اعمال کا یجہ ھے تو اس وقت اس کے اعمال کہاں سے آ گئے اور کس نے وہ

اعمال کیے تھے کیونکہ اس وقت تو کچھ بھی نہیں تھا ۔ موجودہ زمانے کا سائنسدان بھی اس نظریہ کا حامل ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب کہ زندگی ظہور میں نہیں آئی تھی اور یہ چاند ، سورج ، ستارے وغیرہ بھی نہیں تھے ۔

نام دیو جی کا یہ شبد بھی گوروگرنتھ صاحب میں درج ہے :

آؤ کلندر (قلندر) کیسوا
کر ابدالی بھیسوا
جن اکاس (اکاش) کلاہ سر کینی کوسے (کفش) سپت پیالہ
چمر پوس (پوش) کا مندر تیرا ایہ بدھ بنے گوپالا
چھپن کوٹ کا پیہن تیرا سولہ سہس اجارہ (آزارہ)
بھار اٹھارہ مدگر تیرا سہنک (صحنک) سب منسارا
دیہی مہجد (مسجد) من مولانا سہج نواج (نماز) گجارے (گزارے)
بی بی کولاں سو کائن (قائن) تیرا نام نرنکار آکارے
بھگت کرت میرے تال چھنانے کہ پہ کروں پکارا
نامے کا سوامی انتر جامی پھرے سگل بے دیسوا
[گورو گرنتھ صاحب بھیروں نام دیو ص ۱۱۶۷]

نام دیو جی کے اس شبد میں بھی ھندی کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں البتہ ان کی شکلیں کچھ بدل دی گئی ہیں ۔ مثلاً کفش کو کوسے ، چرم پوش کو چمر پوش ، پیراھن کو پیہن ، مسجد کو مہجد اور نماز کو نواج کی شکل دے دی گئی ہے ۔

گورو گرنتھ صاحب کے علاوہ کبیر جی کا اور کلام بھی ملتا ہے اور بعض کتابیں ’’کبیر بیجک‘‘ وغیرہ بھی ان کی طرف منسوب ہیں ۔ گورو گرنتھ صاحب کے بعض قلمی نسخوں میں تو کبیر جی کی بانیاں مروجہ گورو گرنتھ صاحب سے بھی زیادہ درج ہیں ۔

بعض ودوانوں نے کبیر جی کو گورو نانک جی کا اور بعض نے گورو نانک جی کو کبیر جی کا گورو ظاھر کیا ھے - بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ھے کہ گورو نانک جی اور کبیر جی میں کبھی ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی ، کیونکہ گورو نانک جی جب بنارس گئے ھیں کبیر جی وفات پا چکے تھے - کبیر جی کی زندگی میں گورو جی کا بنارس جانا ثابت نہیں -

بھگت کبیر جی کے کلام میں بعض ایسے شبد بھی موجود ھیں جن میں ھندی کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی الفاظ بھی استعمال کیے گئے ھیں جو اس زمانہ کی ریختہ کا نمونہ کہے جا سکتے ھیں جیسا کہ ذیل کے شبد سے ظاھر ھے :

راجہ رام لوں ایسا
نربھو ترن تارن رام رائیا
جب ھم ھوتے تب تم ناھیں ، اب تم ھو ھم ناھیں
اب ھم تم ایک بھئے ھیں ایکے دیکھت من پتی آھی
جب بدھ ھوتی تب بل کیسا اب بدھی بل نہ کھٹائی
کہ کبیر بدھ ھر لئی میری بدھ بدلی سدھ پائی
کھٹ نیم کر کوٹھڑی باندھی بست انوپ بیچ پائی
کنجی کلپھ (قفل) پران کر راکھیے کرتے بار نہ لائی
اب من جاگت رہ رے بھائی
گابھل (غافل) ھوئے کے جنم گوائیو چور مسے گھر جائی
پنچ پھروآ در میں رھتے تن کا نہیں پتی آرا

کلام میں یہ الفاظ بکثرت استعمال کرنا اس امر پر دلالت کرتا ھے کہ گو اس زمانے میں اردو زبان ابھی وجود میں نہیں آئی تھی تاھم اس کی داغ بیل پڑنی ضرور شروع تھی اور لوگ ھندی الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی الفاظ بھی بکثرت استعمال کرنے لگے تھے -

اس سلسلہ میں کبیر جی کا ایک یہ شبد بھی پیش کیا جا سکتا ہے :

ایک کوٹ پنچ سکدارا پنچے مانگیں ھالہ (حالہ)
جمی (زمیں) نہیں کسی کی بوئی ایسا دین دکھالا
ھر کے لوگا مو کو لیت ڈسے پٹواری
اوپر بھجا کر مین گور پہ پکاریا تن ھوں لیا اہاری
نو ڈاڈی دس منسف (منصف) دھاوہں رئیت (رعیت) بسن نہ دیہی
ڈوری پوری ماپے ناھیں بہ بسٹالا لیہی
بہتر گھر اک پورکھ سمایا ان دیا نام لکھائی
دھرم رائے کا دھپتر (دفتر) سودھیا باکی رجم (باقی رزم) نہ کائی
[گورو گرنتھ صاحب راگ سوھی کبیر ۷۹۳]

کبیر جی کے اس شبد میں بھی زمین ، منصف ، رعیت ، دفتر ، باقی اور رزم وغیرہ الفاظ عربی اور فارسی زبان کے ھیں ۔

ایک اور مقام پر بھی کبیر جی نے بیان کیا ہے کہ :

امل (عمل) سرالو لیکھا دینا
آئے کٹھن دوت جم لینا
کیا تیں کھٹیا کہاں گوایا
چلھو ستاب (شتاب) دیبان بلایا
ھر بھرمان (فرمان) درگاہ کا آیا
کروں ارداس گاؤ کچھ باکی (باقی)
لیؤ لبیر آج کی راتی
کچھ بھی کھرچ (خرچ) تمھارا ساروں
سبہ (صبح) لواج (نماز) سرائے گجاروں (گزاروں)
سادھ سنگ جاں کو ھر رنگ لاگا
دھن دھن سو جن پرکھ سبھاگا
ایت اوت جن سدا سہیلے

جنم بدارتھ جیت اولے
جگت سویا جھنم گوایا
مال دھن جوریا بھیا پرایا
کہ کبیر تئی نو بھولے
کھسم (خصم) بسار ماٹی سنگ رولے
[گورو گرنتھ صاحب سوھی کبیر ۹۲ے]

ایک اور مقام پر کبیر جی کا یہ شبد درج ہے :

من کر مکہ کبلہ (قبلہ) کر دیہی
بولن ہار پرم گور ایھی
کہہ رے ملاں بانگ نواج (نماز)
ایک مسیت دسے درواج (درواز)
مسمل تاس بھرم کدوری (قدوری)
بھاکھ لے لیچے ہونے سبوری (صبوری)
ھندو ترک کا ساھب (صاحب) ایک
کہ کرے ملاں کہ کرے سیکھ (شیخ)

[گورو گرنتھ صاحب]

کبیر جی کے اور بھی متعدد شبد ایسے ھیں جن میں ریختہ زبان کی جھلک ھے ۔ ذیل میں ھم ان کے چند شبد اور درج کیے دیتے ھیں :

۔ ھمرا جھگرا رھا نہ کوؤ
پنڈت ملاں چھاڈے دؤو
... ...
پنڈت ملاں جو کچھو لکھ دیا
چھاڈ چلے ھم کچھو نہ لیا
ردے اکھلاس (اخلاص) نرکھ لے میرا
آپ کھوج کھوج ملے کبیرا

[گورو گرنتھ صاحب بھیروں کبیر ۱۱۵۹]

سو ملاں جو من سیوں لرے
گور اپدیش نال سیوں جرے
کال پورکھ کا مردے مان
تس ملاں کو سدا سلام
ہے ہجور (حضور) کت دور بتاؤ
دندر بادھو سندر پاؤ۔
کاجی (قاضی) سو جو کائیاں بیچارے
کائیاں کی اگن برہم پرجارے
...　　...　　...
جوگی گورکھ گورکھ کرے
ھندو رام نام اچرے
مسلمان کا ایک خدائے
کبیر کا سوامی رھیا سمائے

ستر سے سالار ھیں جاں کے
سوا لاکھ پیکابر (پیغمبر) تاں کے
سیکھ (شیخ) جو کہئیے کوٹ اٹھاسی
چھپن کوٹ جاں کے کھیل کھلاسی (خیل خلاصی)
سو گریب (غریب) کی کو گجراوے (گزراوے)
مجلس دور مہل (محل) کو پاوے
تیتیس کروڑی ہے کھیل کھالہ (خیل خالہ)
چوراسی لکھ پھرے دیوالہ
بابا آدم کو کچھ ندر (نظر) دکھائی
ان بھی بھست (بہشت) گھنیری پائی
دل کھلہل (خلل) جاں کے جرد روبانی (زرد روبانی)
چھوڈ کیتب کرے سیتانی (شیطانی)

دنیا دوس (دوش) روس ہے لوئی
اپنا کیا پاوے سوئی
تم داتے ہم سدا بھکھاری
دیؤ جواب ہوئے بجگاری (بزہ‌گاری)
داس کبیر تیری پناہ سمانا
بھست (بہشت) نجیک (نزدیک) را کھ رھمانا (رحمانا)

[گورو گرنتھ صاحب بھیروں کبیر ص ۱۱۶۱

۴ ۔ اول اللہ نور اپایا کدرت (قدرت) کے سب بندے
ایک نور تے سب جگ اپجیا کون بھلے کو مندے
لوگا بھرم نہ بھولو بھائی
کھالک کھلک (خالق خلق) کھلک (خلق) میں کھالک (خالق)
پور رھیو سرب ٹھائی
ماٹی ایک انیک بھانت کر ساجی ساجن ہارے
نہ کچھ پوچ ماٹی کے بھانڈے نہ کچھ پوچ کمھارے
سب میں سچا ایکو سوئی تس کا کیا سب کچھ ہوئی
ھکم (حکم) پچھانے سو ایکو جانے بندہ کہیئے سوئی
اللہ الکھ نہ جائی لکھیا گور گڑ دینا میٹھا
کہھ کبیر میری سنکا ناسی سرب نرنجن ڈیٹھا

[گورو گرنتھ صاحب پربھاتی کبیر ص ۱۳۵۰

۵ ۔ اللہ ایک مسیت بست ہے اور ملک کس کیرا
ہندو مورت نام نواسی دوہ میں تت نہ ہیرا
اللہ رام جیؤں تیرے نائیں
تو کر مہراست (محراست) سائیں
دکھن دیس ہری کا باسا پچھم اللہ مقاما
دل میں کھوج دلے دل کھوجو ایہی ٹھور مقاما
براھمن گیاس (غیاث) کرہے چوبیسا

کاجی ماہ رمجانا (قاضی ماہ رمضانا)
گیارہ ماس پاس کے راکھے ایکے ماهیں ندهانا
کہاں اڈیسے مجن کیا کیا مسیت سر نائیں
دل میں کپٹ نواج (نماز) گزارهیں کیا
هج (حج) کابے (کعبہ) جائیں
اپنے اورت (عورت) مرداں ساجے ایہ سب روپ تمہارے
کبیر پونگرا رام اللہ کا سب گور پیر همارے
[گورو گرنتھ صاحب پربهاتی کبیر ص ۱۳۴۹]

۔ جب ہم ایک ایکو کر جانیا
تب لوگا کاهے دکھ مالیا
ہم اپتہ اپنی پت کھوئی
همری کھوج پرو مت کوئی
ہم مندے مندے من ماهی
سانجھ پات کاهو سیوں ناهی
پت اپتہ تاں کی نہیں لاج
تب جانوگے جب اگھرے گو پاج
کہ کبیر پت هر پروان
سرب تیاگ بھج کیول نام
[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۲۷]

۔ نگن پھرت جو پائیئے جوگ
بن کا مرگ مکت سب هوگ
کیا نانگے کیا باندهے چام
جب نہیں چنیس آتم رام
[گوروگرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۲۴]

۸ ۔ گربھ واس میں کل نہیں جاتی
برهم بندتے سب اتپاتی

کہ رے پنڈت بامن کب کے ہوئے
براہمن کہ کہ جنم مت کھوئے
جو تو براہمن براہمنی جایا
تو آن باٹ کاھے نہیں آیا
تم کت براہمن ہم کت سود
ہم کت لیہو تم کت دودھ
کہ کبیر جو برہم بیچارے
سو براہمن کہیئت ہے ہمارے

[گورو گرنتھ صاحب راگ گوڑی ص ۳۲۴]

۹ - ایسے اچرج دیکھیؤ کبیر
ددھ کے بھولے برولے نیر
ھری انگوری گدھا چرے
نت اٹھ ھاسے ھینگے مرے

[گورو گرنتھ صاحب راگ گوری کبیر ص ۳۲۶]

۱۰ - چوآ چندن مردن انگا
سوتن جلے کاٹھ کے سنگا
اس تن دھن کی کون بڈائی
دھرن پرے اروار نہ جائی
رات جے سوویں دن کریں کام
اک کھن لیں نہ ھر کو نام
ھاتھ تاں ڈور مکھ کھائیو تمبور
مرتی بار کس باندھیو چور
کہت کبیر چیت رے اندھا
ست رام جھوٹا سب دھندا

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۲۶]

۱۱ - تن من دھن گرہ سونپ سریر
سوئی سوھاگن کہے کبیر

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۲۸]

۱۲۔ سکھ مانگت دکھ آگے آوے
سو سکھ ھمھوں نہ مانگیا بھاوے

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۳۵]

۱۴۔ کون کو پوت پتا کو کا کو
کون مرے کو دے سنتاپو
ہر ٹھگ جگ کو ٹھگوری لائی
ہر کے بیوگ کیسے جیوں میری مائی

....

کہ کبیر ٹھگ سوں من مانیا
گئی ٹھگوری ٹھگ پہچانیا

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۳۱]

۱۰۔ ہر جس سنیں نہ ہر جس گاویں
باتن ھی آسمان گراویں
آپ گئے اورن ہوں کھوویں
آگ لگائے مندر میں سوویں
اورن ہست آپ ھیں کانے
تن کر دیکھ کبیر لجانے

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۳۳۲]

۱۱۔ پھرمان (فرمان) تیرا سرے اوپر پھر نہ کرت بیچار
تو ھی دریا تو ھی کریا تجھے تے نستار
بندے بندگی اکھتیار (اختیار)
ساھب (صاحب) روس دھروں کہ پیار
نام تیرا آدھار میرا جیوں پھول جئی ھے نار
کہ کبیر گلام (غلام) گھر کا جیائے بھاویں مار

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۲۲۸

۱۶ ۔ جب ہم ہوتے تم ناہیں اب تم ہو ہم ناہیں
اب ہم تم ایک بھئے ہیں ایکے دیکھت من ہتی آہیں

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۲۲۹

۱۷ ۔ ترک تریکت (طریقت) جانیئے ہندو وید پوران
من سمجھاون کارنے کچھوا ک پڑھیئے گیان

[گورو گرنتھ صاحب گوڑی کبیر ص ۲۴۰

۱۸ ۔ لنکا سا کوٹ سمند سی کھائی
نہ راون گھر کھبر (خبر) نہ پائی
کیا مانگوں کچھ تھر نہ رھائی
دیکھت نبن چلیو جگ جائی
اک لکھ پوت سوا لکھ ناتی (ناطی)
چیت سچیت چت ہونے رہ تو لے پرگس اجی آرا
نو گھر دیکھ جو کامنی بھولی بست انوپ نہ پائی
کہت کبیر نوے گھر مو سے دسویں تت سمائی

[گورو گرنتھ صاحب ورگ گوڑی کبیر ۲۲۹

گورو گرنتھ صاحب کے ایک اور مقام پر کبیر جی کا یہ ش
درج ہے :

وید کتب اپھترا (افتراء) بھائی دل کا فکر (پھکر) نہ جائے
ٹک دم کراری (قراری) جو کرو
ھاجر ھجور کہدائے (حاضر حضور خدائے)
بندے کھوج دل ھر روج (روز) نہ پھر پریسانی (پریشانی) ماہیں
ایہ جو دنیا سہر (سحر) میلا دستگیری ناھیں
دروک (دروغ) پڑھ پڑھ کہسی (خوشی) ہوئے
بے کھبر (بے خبر) باد بکاہیں

مک (حق) سچ کتھالک (خالق) کھلک (خلق) میانے
سیام مورت ناھیں
اسان لھنگ دریا گسل (غسل) کردن بوَد
کر پھکر (فقر) دائم لائے چسمے (چشمے) جہاں تہاں موجود
اللہ پاکنگ پاک ھے سک (شک) کروں جے دوسر ھوئے
کبیر کرم کریم کا اوہ کرے جانے سوئے
[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ کبیر ص ۷۲۷]

کبیر جی کے اس شبد میں افترا ، دل ، فکر ، حاضر حضور ، خدا ، بندے ، ھر روز ، پریشانی ، دنیا ، سحر ، دستگیری ، دروغ ، خوشی ، بے خبر ، باد ، حق ، سچ ، خالق ، خلق ، دریا ، غسل ، کردن ، بود ، فقر ، دائم ، چشم ، موجود ، اللہ پاک ، شک ، کرم ، کریم وغیرہ الفاظ عربی اور فارسی زبان کے ھیں ۔ کبیر جی کا اپنے

گورو گرنتھ صاحب میں جن بھگتوں کے نام سے کلام درج ھے ان میں بھگت روداس جی بھی شامل ھیں ۔

بھگت روداس جی نے اپنے کلام میں ھندی کے ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ بھی استعمال کیے ھیں ۔ آپ کے ان شبدوں کو اس زمانے کی ریختہ کا نمونہ کہا جا سکتا ھے جو ھندی اور اردو کی درمیانی کڑی ھے اور بعد کو اردو کی مستقل شکل اختیار کر گئی ۔ آپ فرماتے ھیں :

بے گم (بے غم) پورہ سہر (شہر) کو ناؤں
دوکھ اندوہ نہیں تہ ٹھاؤں
نہ تسویس کھراج (تشویش خراج) نہ مال
کھوپھ نہ کھتا (خوف نہ خطا) ترس نہ جوال (زوال)
اب موھے کھوب (خوب) وتن (وطن) گہ پائی
اوھاں کھیر (خیر) سدا میرے بھائی
کائم دائم (قائم دائم) سدا پاتساھی (پاتشاھی)

دوم نہ سیم (سوم) ایک سو آھی
ابادان سدا مسہور (مشہور)
اوھاں گنی (غنی) بسیں مامور (معمور)
تیوں تیوں سیل کریں جیوں بھاوے
مہرم مہل (محرم محل) نہ کو اٹکاوے
کہ روداس کھلاس (خلاص) چمارا
جو ہم سہری (شہری) سو میت ھمارا
[گورو گرنتھ صاحب گوڑی روداس ص ۳۴۵]

بھگت روداس جی کے اس شبد میں بے غم پورہ ، شہر ، تشویش ، حراج ، مال ، خوف ، خطا ، ترس ، زوال ، خوب ، وطن ، خیر ، قائم دائم ، پاتشاھی ، دوم ، سیم (سوم) ، ابادان ، مشہور ، غنی ، معمور ، محرم اور محل وغیرہ الفاظ فارسی اور عربی کے ھیں ۔ ھندی شاعری میں ان الفاظ کا استعمال ھند میں اردو زبان کی بنیاد رکھے جانے اور ھندی اور اردو کی درمیانی کڑی کا پتا دیتا ھے ۔

بھگت روداس جی نے اپنے کلام میں اور بھی کہیں کہیں فارسی اور عربی کے الفاظ استعمال کیے ھیں ۔ ذیل میں ھم ان کے بعض نمونے پیش کرتے ھیں :

۱ ۔ تم چندن ہم ارنڈ باپ رے سنگ تمھارے باسا
نیچ روکھ تے اوچ بھئے ھیں گندھ سو گندھ نواسا

....

تم مکھتول (مختول) سپید سپیئل ہم بپررے جس کیرا
ست سنگت مل رھیئے مادھو مدھوپ مکھیرا
جاتی اوچھی پاتی اوچھی اوچھا جنم ھمارا
راجہ رام کی سیو نہ کینی کہ روداس چمارا
[گورو گرنتھ صاحب ص ۴۸۶]

۔ جب ہم ہوتے تب تو ناہیں اب توھی میں ناھیں
انل اگم جیسے ھرنیو ددھ جل کیول جل مانہیں

[گورو گرنتھ صاحب سورٹھ روداس ص ٦٥٧]

۔ جو ہم بالدھے موہ پھاس میں ہم پریم بندھن تم بالدھے
اپنے چھوٹن کو جتن کرو ہم چھوٹے تم ارادھے

[گورو گرنتھ صاحب سورٹھ روداس ص ٦٥٨]

۔ جو تم گرور تو ہم مورا
جو تم چند تو ہم بھئے ہے چکورا
مادھو تم نہ توررو ہم نہیں توریں
تم سیوں تور کون سیوں جوریں
جو تم دیورا تو ہم باتی
جو تم تیرتھ تو ہم جاتی
ساچی پریت ہم تم سیوں جوری
تم سیوں جور اور سنگ توری
جہ جہ جاؤں تہاں تیری سیوا
تم سوں ٹھاکر اور نہ دیوا

[گورو گرنتھ صاحب سورٹھ روداس ص ٦٥٨]

۔ ماٹی کو پترا کیسے نچت ہے
دیکھیے دیکھے سنے بولے دوریو پھرت ہے
جب کچھ پاوے تب گرب کرت ہے
مائیا گئی تب رون لگت ہے

[گورو گرنتھ صاحب آسا روداس ص ٤٨٧]

۔ سہ (شہ) کی سار سوھا گن جانے
تج ابھمان سکھ رلیاں مانے
....

سوکن جانے پیر پرائی
جاں کے اندر درد نہ پائی
دکھی دوھاگن دوئے پکھ ھینی
جن ناہ نرنتر بھگت نہ کینی
پرسلات (پل صراط) کا پنتھ دوھیلا
سنگ نہ ساتھی گون اکیلا
دکھیا درد ولد در آیا
بہت پیاس جواب نہ پایا
کہ روداس سرن پربھ تیری
جیوں جانو تیوں کرگت میری

[گورو گرنتھ صاحب راگ سوھی روداس ص ۷۹۳

۷ - ناتھ کچھوآ نہ جانو
من مایا کے ھاتھ بکانو
تم کہیئت ھو جگت گور سوامی
ہم کہیئت کل جگ کے کامی
ان پنچن میرو من جو بگاریو
پل پل ھر جی کے انتر پاریو
جت دکھیو تت دکھ کی راسی
اجوں نہ پتائے نگم بھئے ساکھی

....

کہ روداس کیا کیسے کیجے
بن رگھوناتھ سرن کا کی لیجے

[راگ جیتسری روداس ص ۱۰

۸ - اونچے مندر سال رسوئی
ایک گھری پھن رھن نہ ھوئی

ایہ تن ایسا جیسے گھاس کی ٹاٹی
جل گیو گھاس رل گیؤ ماٹی
بھائی بندھ کٹنب سہیرا
کبر کی نار ارھے تن لاگی
او تو بھوت بھوت کر بھاگی
کہ روداس سبھئے جگ لوٹیا
ہم تو ایک رام کہ چھوٹیا
[گورو گرنتھ صاحب راگ سوھی روداس ص ۷۹۰]

۔ ھرا کہا کرے سنسار
سٹی ذات ھوئے دربار
[گورو گرنتھ صاحب راگ گونڈ روداس ص ۸۷۵]

۔ ایسی لال تجھ بن کون کرے
گریب نواج (غریب نواز) گو سائیں میرا ماتھے چھتر دھرے
... ...
نیچوں اوچ کرے میرا گوبند کاھو تے نہ ڈرے
[گورو گرنتھ صاحب مارو روداس ص ۱۱۰۴]

۔ پھل کارن پھولی بن رائے
پھل لاگا تب پھول بلائے
[گورو گرنتھ صاحب راگ بھیروں روداس ص ۱۱۶۷]

۔ کہ روداس بھیؤ جب لیکھو
جوئی جوئی کینو سوئی سوئی دیکھو
[گورو گرنتھ صاحب راگ بلاول روداس ص ۱۲۹۳]

۔ پنڈت سور چھتر پت راجہ
بھگت برابر اور نہ کوئے
[گورو گرنتھ صاحب راگ بلاول روداس ص ۸۵۸]

ذیل میں ہم گورو نانک جی کے کلام سے بعض ایسے شبد
پیش کیے دیتے ہیں جن میں ہندی ، عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال
کیے گئے ہیں - اسے اس زمانہ کی ریختہ کا نمونہ قرار دیا جا سکتا
ہے - راگ تلنگ میں آپ کا یہ شبد درج ہے :

یک ارج (عرض) گوپھتم (گفتم) پیس تو (پیش تو)
در گوس (گوش) کن کرتار
ھکا (حقا) کبیر کریم تو بے ایب (بے عیب) پرودگار (پروردگار)
دنیا مکام بیانی (مقام فانی) تہکیک (تحقیق) دل دانی
مم سر موئے اجرائیل (عزرائیل) گرپھتہ (گرفتہ) دل ہیچم نہ دانی
جن (زن) پسر پدر برادراں کس نیس دستگیر (دستگیر)
آخر بیپھتم (بیفتم) کس نہ دارد چوں سود (شود) تکبیر
سب روج (شب روز) گستم (گشتم) در ہوا
کردیم بدی کھیال (خیال)
گاہے نہ نیکی کار کردم مم ایں چنی اھوال (احوال)
بد بکھت (بد بخت) ہم چوں بکھیل گافل (بخیل غافل)
بے نجر (بے نظر) بے باک
نانک بگوید جن ترا تیرے چاکراں پا کھاک (خاک)
[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ محلہ ۱ - ۷۲۱]

گورو نانک جی نے اس شبد میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت
استعمال کیے ہیں - مشہور سکھ سکالر پروفیسر تیجا سنگھ جی نے بیان
کیا ہے کہ گورو نانک جی کے اس شبد کی زبان ہندی اور اردو کی
درمیانی کڑی (ریختہ) ہے -

گورو نانک جی کے کلام میں اور بھی متعدد ایسے شبد ہیں
جن میں آپ نے ہندی ، عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کیے ہیں -

---

۱ - عبرت نامہ ص ۱۶۱ -

ذیل میں ہم چند اور نمونے پیش کیے دیتے ہیں :

۱ ۔ جو تدھ بھاوے سائی بھلی کار
تو سدا سلامت نرنکار
[گورو گرنتھ صاحب ص ۴

۲ ۔ بابا اللہ اگم اپار
پاکی نائیں پاک تھائیں سچا پرودگار (پروردگار)
....
پیر پیکابر (پیغمبر) سالک سادک (صادق)
سہدے (شہدے) اور سہید (شہید)
سیکھ مسائک (شیخ مشائخ) کاجی (قاضی) ملاں
در درویس رسید (درویش رشید)
برکت تن کو اگلی پڑھدے رہن درود
[گورو گرنتھ صاحب ص ۵۳

۳ ۔ مکام (مقام) کر گھر بیسنا نت چلنے کی دھوکھ
مکام (مقام) تاں پر جانیئے جاں رہے نہچل لوک
دنیا کیس مکامے (مقامے)
کر سدک (صدق) کرنی کھرج (خرچ) باندھو لاگ رہو نامے
جوگی تاں آسن کر بہے ملاں بہے مکام (مقام)
پنڈت وکھانے پوتھیاں سدھ بہن دیو ستھان
سر سدھ گن گندھرب منی جن سیکھ (شیخ) پیر سالار
در کوچ کوچا کر گئے اور بھی چلن ہار
سلتان کھان (سلطان خان) ملوک امرے (امرا) گئے کر کر کوچ
گھڑی مہت کہ چلنا دل سمجھ توں بھی پہوچ
....
اللہ الکھ اگم کادر (قادر) کرن ہار کریم
سب دنی آون جاونی مکام (مقام) ایک رھیم (رحیم)

مکام (مقام) تس نوں آ کہیئے جس سس نہ هووی لیکھ
آسمان دھرتی چلسی مکام (مقام) اوهی ایک
دن رو چلے نس سس چلے تارکا لکھ پلوئے
مکام (مقام) اوهی ایک ہے نانکا سچ بگوئے
[گورو گرنتھ صاحب سری راگ محلہ ۱ صہ ۶۴

۴ - مہر مسیت سدک مسلا (صدق مصلے)
هک هلال (حق حلال) کران (قران)
سرم (شرم) سنت سیل روجہ (روزہ) هوهو مسلمان
کرنی کابا (کعبہ) سچ پیر کلما (کلمہ) کرم نواج (نماز)
تسبیہ (تسبیح) ساتس بہاوسی نانک رکھے لاج
[گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ صہ ۱۴۰

۵ - مسلمان کہاوں مسکل (مشکل) جاں هوئے تاں مسلمان کہاوے
اول اول دین کر مٹھا مسکل (مشکل) مانا مال مساوے
هوئے مسلم دین مہانے مرن جیون کا بھرم چکاوے
رب کی رجائے (رضائے) منے سر اوپر کرتا منے آپ گواوے
تو نانک سرب جیاں میں مہرست هوئے تاں مسلمان کہاوے
[گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ صہ ۱۴۱

۶ - راجے رئیت (رعیت) سکدار (شکدار) کوئے نہ رهسی او
هٹ پٹن باجار (بازار) هکمی (حکمی) ڈھسی او
پکے بنک دوار مورکھ جانے آپنے
درب بھرے بھنڈار ریتے اک کھنے
تاجی (تازی) رکھ تکھار (تخار) هاتھی پا کھرے (پاخرے)
باگ (باغ) ملکھ (ملک) گھر بار کتھے سے اپنے
تمبو پلنگ نوار سرائچے لالتی
نانک سچ داتار سناکھت (شناخت) کدرتی (قدرتی)

[گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۰]

ہک (حق) پرایا نانکا اس سؤر اس گائے
گور پیر ھامہ (حامہ) تاں بھرے جاں مردار نہ کھائے
گلیں بھست (بہشت) نہ جائیے چھوٹے سچ کمائے
مارن پاہ ھرام (حرام) میں ھوئے ھلال (حلال) نہ جائے
نانک گلیں کوڑی‌ئی کوڑ پلے پائے
پنج نماجاں وکھت (نمازاں وقت) پنج پنجے پنجاں ناؤں
پہلا سچ ھلال (حلال) دوئے تیجی کھیر کھدائے (خیر خدائے)
چوتھی نیئت راس من پنجویں سپھت سنائے (صفت ثنائے)
کرنی کلما (کلمہ) آکہے کے تاں مسلمان سدائے

[گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۱]

۔ بدپھیلی گیبانا کھسم (بدفعلی غائبانہ خصم) نہ جانی
۔و کہیے دیوانہ آپ نہ پچھانی
کلہے بری سنسار وادے کھپئے
بن ناویں ویکار بھرمے پچئے
راہ دوویں اک جانے سوئی سجھسی
کپھر (کفر) گوکپھرانے (کفرانے) پیا دجھسی
سب دنیا سبہان (سبحان) سچ سمائیے
سجھے در دیوان آپ گوائیے

[گوروگرنتھ صاحب وار ماجھ ص ۱۴۲]

۔ سچے کی سرکار جگ جگ جانیئے
ھکم (حکم) منے سردار در دربانیئے
پھرمانی (فرمانی) ہے کار کھسم (خصم) پٹھایا
تبل باج (طبل باز) بیچار سبد (شبد) سنایا
اک ھوئے اسوار اکناں ساکھتی (ساختی)

اکناں بدھے بھار اکناں تا کھتی (تاختی)

[گوروگرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۴

۱۰ ۔ ھم جیر جمیں (زیر زمیں) دلیا پیرا مسائکا (مشائخا) رائیا
مے رود بادساہ (بادشاہ) افجوں کھدائے (افزوں خدائے)
ایک توھی ایک توھی
نہ دیو دانوا نرا
نہ سدھ سادھکا دھرا
است ایک دگر کوئی
ایک توئی ایک توئی
دادے دھند آدمی
نہ سپت جیر جمیں (زیر زمیں)
است ایک دگر کوئی
ایک توئی ایک توئی

....

نہ رجک (رزق) دست آں کسے
ھما را (ھمہ را) ایک آس وسے
است ایک دگر کوئی
ایک توئی ایک توئی
پرندۂ نہ گرہ جر (زر)
درکہت (درخت) آب آس کر
دھند سوئی
ایک توئی ایک توئی

[گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ محلہ ۱ ص ۱۴۴

۱۱ ۔ سچا تیرا ھکم (حکم) گور موکھی جالیا
گورمتی آپ گوائے سچ پچھالیا

سچ تیرا دربار سبد (شبد) نیسانیا (نشانیاں)
سچا سبد (شبد) ویچار سچ سمانیا
من مکھ سدا کوڑیار بھرم بھولانیا
وسٹا اندر واس ساد نہ جانیا
ون ناویں دکھ پائے آون جانیا

نانک پارکھ آپ جن کھوٹا کھرا پچھانیا
سیہاں (شیہاں) باجاں (بازاں) چرگن کوھیاں اینان کھوالے گھاہ
گھاہو کھان تناں ماس کھوالے ابہ چلائے راہ
ندیاں وچ ٹبے دیکھالے تھلیں کرے اسگاہ
کیڑا تھاپ دیے پاتساہی (پاتشاہی) لسکر (لشکر) کرے سواہ
جیتے جی جیوھے لے ساھا جیوالے تا کہ اساہ
[گورو گرنتھ صاحب راگ ماجھ کی دار ص ۱۴۴]

چودھری راجے نہیں کسے مکام (مقام)
ساہ (شاہ) مربں سنجے مایا دام
میں دھن دیجیے ھر امرت نام
ریت (رعیت) مہر مکدم (مقدم) سکدارے (شکدارے)
نہچل کوئے نہ دسے سنسارے
اپھربو کال کوڑ سر مارے
نہچل ایک سچا سچ سوئی
جنی کر ساجی تنہے سب گوئی
اوہ گورموکھ جاپے تاں پت ہوئی
کاجی (قاضی) سیکھ (شیخ) بھیکھ بکھیرا (فقیرا)
وڈے کہاوے ہومیں تن پیرا
کال نہ چھوڑے بن ست گور کی دھیرا
[گورو گرنتھ صاحب راگ گوڑی محلہ ۱ ص ۲۲۷]

- مالس مورت نانک نام
کرنی کتا در پھرمان (فرمان)
گور پرسادی جانے سہان
تاں کچھ پاوے درگاہ مان

[گورو گرنتھ صاحب راگ آسا ص ۳۵۰

۱۴ - جے کو درگہ بہتا بولے ناؤں بولے باجاری (بازاری)
سترنج باجی (شطرنج بازی) بکے ناہیں کچی آوے ساری
[گورو گرنتھ صاحب راگ آسا محلہ ۱ ص ۳۵۹]

۱۵ - ھکم رجائی سا کہتی (حکم رضائی ساختی) درگہ سچ کبول (قبول)
ساھب (صاحب) لیکھیا منگسی دنیا دیکھ نہ بھول
دل دروانی جو کرے درویسی (درویشی) دل راس
اسک مہبت (عشق محبت) نانکا لیکھا کرتے پاس
[گورو گرنتھ صاحب مارو کی وار محلہ ۱ ص ۱۰۹۰

۱۶ - کہاں سو کھیل تبیلا (طویلہ) گھوڑے کہاں بھیری سہنائی (شہنائی
کہاں سو تیگ بند (تیغ بند) گاڈیرڑ کہاں سو لال کوائی (قبائی
کہاں سو آرسیاں منہ بنکے ایتھے دسہے ناھی
ایہ جگ تیرا تو گوسائیں
ایک گھڑی میں تھاپ اتھاپے جر (زر) ونڈ دیوے بھائی
کہاں سو گہر در منذپ مہلا (محلہ) کہاں بنک سرائی
کہاں سو سیج سکھالی کامنی جس ویکھ نیند نہ پائی
کہاں سو پان تنبولی ھرماں (حرماں) ھویاں چھائی مائی
اس جر (زر) کارن گھنی وگوتی ان جر (زر) گھنی کھوائی (خوار)
پاپاں باجھوں ھووے ناھی مویاں ساتھ نہ جائی
جس نوں آپ کہوائے کرتا کھس لیے چنگیائی
کوٹی ھوں پیر ورج رھائے جاں میر سنیا دھایا
تھان مکام (مقام) جلے بج مندر مچھ مچھ کوئر رلایا

کوئی مغل نہ ھؤا اندھا کنے نہ پرچا لائیا
مغل پٹھاناں بھئی لڑائی رن میں تیگ (تیغ) وگائی
اونی تپک، تان چلائی اونی ھست چڑھائی
جن کی چیری درگہ پاٹی تناں مرنا بھائی
اک ھندوانی اور ترکانی بھٹیانی ٹھکرانی
اکناں پیرن (پیراھن) سر کھرپاٹے اکناں واس مسانی
جن کے بنکے گھریں نہ آیا تن کیوں رین وھانی
آپے کرے کرائے کرتا کس نو آکھ سنائیے
دکھ سکھ تیرے بھانے ھووے کستھیے جائے رو آئیے
ھکمی (حکمی) ھکم (حکم) چلائے وگسے نانک لکھیا چائیے
[گورو گرنتھ صاحب آسا محلہ ۱ ص ۱۸ - ۴۱۷]

۔ نانک دنیا کیسی ہوئی
سالک مت نہ رھیو کوئی
بھائی بندھی ھیت چکایا
دنیا کارن دین گوایا
[گورو گرنتھ صاحب واراں تے دوھیک ص ۱۴۳۰]

۔ نانک آکھیے رے سا سنیئے مکھ سہی
لیکھا رب منگیسیا بیٹھا کڈھ وھی
تلباں (طلباں) پوسن آکیاں با کی (عاقیاں باقی) جنہاں رہی
اجرائیل پھریستہ (عزرائیل فرشتہ) ھوسی آئے تہی
آون جان نہ سوجھئی بھیڑی گلی پھہی
کوڑ نکھوٹے نانکا اوڑک سچ رہی
[گورو گرنتھ صاحب راگ رام کلی وار محلہ ۱ ص ۹۵۳]

سوئی جند چڑھے سے تارے سوئی دنی ار تہت رھے
سا دھرتی سو پون جھلارے جگ جی کھیلے تھاوکیسے
جیون تلب (طلب) نوار

هووے پروانا کرے دھنگانا کل لکھن وچار
کتے دیس نہ آئیا سنیئے تیرتھ پاس نہ بیٹھا
داتا دلن کرے تا ناھیں مہل (محل) اسار نہ بیٹھا
جے کوست کرے سو چھیجے تپ گھر تپ نہ ہوئی
جے کو ناؤں لئے بدناوی (بدنامی) کل کے لکھن ایئی
جس مکداری تسبے کنہواری (خواری) چاکر کھہے ڈرنا
جاں مکدارے پوے جنجیری (زنجیری) تاں چاکر ہتھوں
آکھیے گنا کل آئیے
نہ جگ کیرا رہیا تپاوس (تفحص) جے گن دے تاں پائیے
کل کل والی سرا (شرع) نبیڑی کاجی (قاضی) کرسنا (کرشنا
بانی برہما بید اتھرن کرنی کیرت لہیا
بت ون پوجا ستون سنجم جت ون کاٹے جنیؤ
ناوہو دھوہو تلک چڑھاوہو سچ ون سوچ نہ ہوئی
کل پروان کتیب کران (قران)
پوتھی پنڈت رہے پوران
نانک ناؤں بھیا رحمان (رحمان)
کر کرتا تو ایکو جان
نانک نام ملے وڈیائی ایدوں اوپر کرم نہی
جے گھر ہوندے منگن جائیے پھیر اولاسہ ملے تہی
[گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۱ ص ---

۱۸ - کاجی سودیں توٹا آوے
گور مکتھ وچ کرے پرنچ بھاوے
پونجی ساہت (ثابت) راس سلامت چوکا جم کا پھاھاھے
... ...
اوڑ نہ کتھنے سپھت (صفت) سمائی
جیوں تدھ بھاوے رہیں رجائی (رضائی)

ورگہ پیدھے جان سوعیلے ھکم (حکم) سچیے پاتساھا ھے (پاتشاھا ھے)
[گورو گرنتھ صاحب مارو محلہ ۱ ۳--۱۰۲۳]

۱۔ چلمل بسیار دنیا بیانی (فانی)
کالو بے اکل (قالو بے عقل) من گور نہ مانی
من کین کترین تو دریاؤ کھدایا (خدایا)
ایک چیج (چیز) مجھے دے اور جہر (زہر) چیج (چیز) نہ بھایا
پراب (پورآب) درکھام (خام) کوجے (کوزے)
ھکمت کھدایا (حکمت خدایا)
من توانا توں کدرتیں (قدرتیں) آیا
سگ نانک دیبان مستانہ لت چڑھے سوایا
آتس (آتش) دنیا کینک (خنک) نام کیدایا (خدایا)
[گورو گرنتھ صاحب وار ملہار شلوک محلہ ۱ ص ۱۲۹۱]

۷۔ نانک چنتا ست کرو چنتا تس ھی ہوئے
جل میں جنت اپائین تناں بھی روجی (روزی) دے
اوتھے ہٹ نہ چلئی نہ کو کرس کرے
سودا مول نہ ہوئی نہ کو لے نہ دے
[گورو گرنتھ صاحب رام کلی کی وار شلوک محلہ ۲ ص ۹۵۵]

۸۔ تس سیوں کیسا بولنا جے آپے جانے جان
چیری جاں کی نہ پھرے ساھب (صاحب) سو پروان
چیری جسکی چلنا میر ملک سلار
جو تس بھاوے نانکا سائی بھلی کار
... ...
سبھت (صفت) جنہاں کو بکھسیئے (بخشیئے ' سیٹی ہوتے دار
کنجی جن کو دتیا تنہاں ملے بھنڈار
[گورو گرنتھ صاحب وار سارنگ شلوک محلہ ۲ ص ۱۲۳۹]

۹۔ جیسا کرے کہاوے ایسا ایسی بنی جرورت (ضرورت)

ھووے لنگ جھنگ نہ ھووے ایسی کھیے سورت (صورت)
جے اوس اچھے سو پھل پائے تاں نانک کھیے مورت
[گورو گرنتھ صاحب وارسا رنگ شلوک محلہ۲ ص ۱۲۳۵

گورو انگد جی نے اپنے پیش رو گورو نانک جی کی تتبع میں اپنے کلام میں ھندی کے ساتھ عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کیا ہے جس سے یہ امر واضح ہے کہ اردو کے وجود میں آنے سے قبل ھندی الفاظ کے ساتھ عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کرنے کا عام رواج ھو چکا تھا اور یہ رواج ھی بڑھتے بڑھتے اردو زبان وجود میں لانے کا باعث بنا ۔

گورو انگد جی کے چند شلوک ذیل میں درج کیے جاتے ھیں

۱ ۔ جو سر سائیں نہ نویں سو سر دیجے ڈار
نانک جس پنجر میں برھا نہیں سو پنجر لے جار
[گورو گرنتھ صاحب وار سری راگ محلہ۱ ص ۸۹

۲ ۔ سئی پورے ساہ (شاہ) جنی پورا پایا
اٹھیں وے پرواہ (بے پرواہ) رھن اکتے رنگ
درسن (درشن) روپ اتھاہ ورلے پائیے
کرمی پورے پورا گورو پورا جاں کا بول
نانک پورا جو کرے گھٹے ناھیں تول
[گورو گرنتھ صاحب وار ماجھ شلوک محلہ۲ ص ۱۴۶

۳ ۔ چوتھے پہرے صبہ (صبح) کے سرتیا اپجے چاؤ
تناں دریاواں سیوں دوستی من مکھ سچا ناؤ
اوتھے امرت ونڈیئے کرمی ھوئے پساؤ
کنچن کائیاں کسیئے ونی چڑھے چڑھاؤ
جے ھووے ندر سرابی (نظر صراف) کی بہڑ نہ پائی تاؤ
ستیں پہریں ست بھلا بہیئے پڑھیاں پاس

اونہی پاپ پن ویچاریئے کوڑے گنیئے راس
اونہی کھوٹے منٹے کھرے کیجے ساباس (شاباش)
نون بہادل (فاضل) نانکا دکہہ سکہہ کہسمے (خصمے) پاس
[گورو گرنتھ صاحب راگ ماجھ کی وار شلوک محلہ ۲ ص ۱۴۰]

۰. ایہ کنیہی آسکی (عاشقی) دوجے لگے جائے
نانک آسک (عاشق) کانڈھیے سدھی رہے سمائے
چنگے چنگا کر منے مندے مندا ہوئے
آسک (عاشق) ایہ نہ آکھیئے جے لیکھیے ورتے سوئے
[گورو گرنتھ صاحب وار آسا شلوک محلہ ۲ ص ۴۷۴]

۵. سلام جواب دووہیں کرے منڈھو کہتیا جائے
نانک دووہیں کوڑیاں تھائے نہ کائی پائے
[گورو گرنتھ صاحب وار آسا شلوک محلہ ۲ ص ۴۷۴]

۶. چاکر لگے چاکری نالے گارب واد
گلاں کرے گھنیریاں کہسم (خصم) نہ پائے ساد
آپ گوائیے سیوا کرے تاں کچھ پاوے مان
نانک جس نوں لگا تس ملے لگا سو پروان
[گورو گرنتھ صاحب وار آسا شلوک محلہ ۲ ص ۴۷۴]

۷. ناؤں پھکیرے پاتساہ (فقیرے پاتشاہ) مورکھ پنڈت ناؤں
اندھے کا ناؤں پارکھو ایوے کرے گواؤ
الت (علت) کا ناؤں چوہدری کوڑی پورے تھاؤں
نانک گورسکھ جالیے کل کا ایہ لیاؤں
[(گورو گرنتھ صاحب وار ملہار شلوک محلہ ۲ ص ۱۲۸۸]

گورو انگد جی پنجابی تھے اور ان کی تمام زندگی پنجاب میں ہی بسر ہوئی ۔ اس لیے ان کے کلام میں پنجابیت غالب ہے ۔ تاہم انہوں نے اپنے ان شلوکوں میں عربی اور فارسی الفاظ بھی استعمال

کیے ہیں جیسا کہ پنجر، شاہ، بے پرواہ، صبح، دریا، نظ
صراف، شاباش، خصم، عاشق، سلام، جواب، چاکر، چاکری
روزی، سودہ، صاحب، ملک، سالار، کار، صفت، پورے دا
ضرورت، صورت، فقیر اور پاتشاہ وغیرہ۔

گورو ارجن جی کے نام سے جو بانیاں گورو گرنتھ صاحب میں در
ہیں ان میں بھی بعض ایسے شبد ہیں جن میں ہندی، عربی اور فار
الفاظ پائے جاتے ہیں، مگر چونکہ گورو ارجن جی پنجابی تو
اور ان کی تمام عمر پنجاب ہی میں گزری تھی اس لیے ان کے شبدو
سے بھی پنجابیت ظاہر ہو رہی ہے۔ ذیل میں ہم گورو جی کے دو
شبد پیش کرتے ہیں:

نکٹ جیاں کے سدھی سنگا
کدرت (قدرت) ورتے روپ ار رنگا
کرے نہ جھرے نہ من روون ہارا
اوناسی اوگت اگوچر سدا سلامت کھسم (خصم) ہمارا
تیرے داسرے کو کس کی کان
جس کی میرا راکھیے ان
جو لوڑا (لونڈا) پربھ کیا اجات
تس لوڑے (لونڈے) کو کس کی تات
وے مہتاجا (بے محتاجا) وے پرواہ (بے پرواہ)
نانک داس کہو گور واہ
[گورو گرنتھ صاحب آسا محلہ ۵ ص ۳۷۶]

کھاک (خاک) نور کردنگ (کردم) آلم (عالم) دنیائے
آسمان جمین (زمین) درکھت (درخت) آب پیدائس کھدائے (پیدائش خدائے
دنیا مردار کھردنی گافل (خوردنی غافل) ہوائے
گیبان ہیوان ہرام کستنی (غائبان حیوان حرام کشتنی)
مردار بکھورائے (بخورائے)

دل کبیج کبجه کادرو دوجک سجانے
(دل قبض قبضه قاردو دوزخ سزائے)
ولی نیامت (ولی نعمت) برادرا دربار ملک پهنائے (فنائے)
جب اجرائیل (عزرائیل) بستنی تب چه کارے بدائے
هوال ملوم (حوال معلوم) کردنگ (کردم) پا ک الله
بگو نانک ارداس بیس درویس (پیش درویش) بنده
[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ محله۵ ص ۷۲۳]

گورو ارجن جی کا اس قسم کا ایک اور شبد ہے جو اس طرح
ہے که :

مہروان (مہربان) ساهب (صاحب) مہروان (مہربان)
ساهب (صاحب) میرا مہروان (مہربان)
جیاں سگل کو دئے دان
تو کاهے ڈولے پرانیا تدھ راکھیے گا سرجن هار
جن پیدائس (پیدائش) تو کیا سوئی دے آدهار
جن اپائی میدنی سوئی کردا سار
گهٹ گهٹ مالک دلاں کا سچا پرودگار (پروردگار)
کدرت کیم (قدرت قیم) نه جانیے وڈا وے پرواه (بے پرواه)
کر بندے تو بندگی جچر گهٹ میں ساه
تو سمرتھ اکتھ اگوچر جیؤ پنڈ تیری راس
رہم (رحم) تری سکھ پایا سدا نانک کی ارداس
[گورو گرنتھ صاحب تلنگ محله۵ ص ۷۲۴]

راگ تلنگ میں گورو ارجن جی کے بعض اور شبدوں میں بهی
هندی ، عربی اور فارسی کے الفاظ پائے جاتے هیں ، جیسا که :

- کرتے کدرتی مستاک (قدرتی مشتاق)
دین دنیا ایک تو هی سب کهلک (خلق) هی نے پاک

کتھن میں تیاپ اتہاہدا اچرج تیرے روپ
کون جانے چلت تیرے اندھیارے میں دیپ
کھود کہسم کہلک (خود خصم خالق) جم
اللہ مہربان کہدائے (خدائے)
دنس رین جنے تدھے آرادھے سے کیوں دوجک (دوزخ) جانے
اجرائیل (عزرائیل) یار بندے جس تیرا آدھار
گناہ اس کے سگل آبہو (عفو) تیرے جن دیکھے دیدار
دنیا چیج بہل ھال (چیز فی الحال) سگبے سچ سکھ تیرا ناؤں
گور مل نانک بوجھیا سدا ایکس گاؤں

[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ محلہ ۵ ص ۷۲۴

۲ - میراں داناں دل سوچ
مہبتے (محبتے) من تن بسے سچ ساہ (شاہ) بندی موچ
دیدنے دیدار ساھب (صاحب) کچھ ناھیں اس کا مول
پاک پرودگار (پروردگار) تو کھود کہسم (خود خصم) وڈا اتول
دستگیری دیہ دلاور توھی توھی ایک

کرتار کدرت (قدرت) کرن کھالک (خالق) نانک تیری ٹیک
[گورو گرنتھ صاحب راگ تلنگ محلہ ۵ ص ۷۲۴

گورو ارجن جی چونکہ پنجاب میں پیدا ہوئے اور انہیں اپنی زندگی میں پنجاب سے باھر جانے کا اتفاق نہیں ھؤا اس لیے ان کے شبدوں میں جہاں عربی اور فارسی کے الفاظ ملتے ھیں وھاں ان سے پنجابیت بھی ٹپک رھی ھے ۔

گورو صاحب کے اور بھی شبد ھیں جن میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت موجود ھیں چنانچہ راگ مارو میں ان کا ایک شبد یوں ھے :

الله اگم کہدائی (خدائی) بندے
چھوڑ کہیال (خیال) دلیا کے دھندے
ہوئے پاکنپاک (پاخاک) بھکیر مساپھر (فقیر مسافر)
ایہ درویس کبول (درویش قبول) درا
سچ نواج یکین مسلا (نماز یقین مصلئے)
منسا مار نوارھو آسا
دیہ مسیت من مولانا کلم (کلمہ) کہدائی (خدائی) پاک کنورا
سرا سرئیت (شرع شریعت) لے کاوھو
تریکت (طریقت) ترک کھوج ٹولاوھو
ماربپت (معرفت) من مارھو ابدالا
ملہو ھکیکت (حقیقت) جت پھر نہ مرا
کران (قران) کتیب دل ماھیں کاھی
دس اورات (عورات) رکھہو بدراھی
پنچ مرد سدک (صدق) لے باندھو
کھیر سبوری کبول (خیر صبوری قبول) پرا
مکا (مکہ) مہر روجہ بے کھاکہ (روزہ بے خاکہ)
بھست (بہشت) پیر لپھج (لفظ) کائے انداجا (اندازہ)
ہور (حور) نور مسک (مشک) کہدایا (خدایا)
بندگی الله آلا (اعلیٰ) ھجرا (حجرہ)
سچ کاوے سوئی کاجی (قاضی)
جو دل سودھے سوئی ھاجی (حاجی)
سو ملاں ملئن (ملعون) نوارے سو درویس (درویش)
جس سبہت (صفت) دھرا
سبۓ (سب) وکہت (وقت) سبہیے کر ویلا
کہالک (خالق) یاد دلے میں مولا
تسبی (تسبیح) یاد کرھو دس مردن منت سیل بندھان برا
دل میں جانبو سب پھل ھالہ (فی الحالہ)

کھیل کہانہ (خیل خانہ) برادر هموں جنجالہ
میر سلک امرے پھانایا (فنایا) ایک مکام کھدائے (مقام خدائے)
اول سبپت (صفت) دوجی سابوری (صابوری)
تیجے هلیمی (حلیمی) چوتھے کھیری (خیری)
پنجویں پنجے اکت مکامے (مقامے)
ایہ پنج وکت (وقت) تیرے اپرا
سگلی جان کرو مودیھپہ (موضیفہ)
بد اسل (عمل) چھوڈ کرو هتھ کوجا (کوزہ)
کھدائے (خدائے) ایک بوجھ دیوهو بانگاں
برگو برکھردار (برخودار) کھرا
هک هلال بکھورو (حق حلال بخورو) کھانا
دل دریاء دھوهو میلانا
پیر پچھانے بھستی (بہشتی) سوئی
اجرائیل (عزرائیل) نہ دوج (دوزخ) ٹھرا
کائیاں کردار اورت یکیناں (عورت یقیناں)
رلگ تماسے (تماشے) مان هکینا (حقیناں)
ناپاک پاک هدور هدیسا (حضور حدیثا)
سابت سورت (ثابت صورت) دستار مرا
مسلمان موم دل هووے
انتر کی مل دل تے دھووے
دنیا رنگ نہ آوے نیڑے جیوں کسم پاٹ گھیو پاک هرا
جاں کو مہر مہر مہروانا (مهربان)
سوئی مرد مرد مردانا
سوئی سیکھ مسائک هاجی (شیخ مشائخ حاجی)
سو بندہ جس نجر (نظر) نرا
کدرت کادر (قدرت قادر) کرن کریماں
سپت سبت (صفت محبت) اتھاہ رهیماں (رحیماں)

ہک ہکم (حق حکم) سچ کہدایا (خدایا)
بوجھ نانک بند کبھلاس (خلاص) ترا
[گورو گرنتھ صاحب راگ مارو ص ۸۴-۱۰۸۳]

ایک مقام پر گورو ارجن جی کا یہ شبد درج ہے :

کارن کرن کریم
سرب پرتپال رھیم (رحیم)
اللہ الکھ اپار
کہود کہدائے (خود خدائے) وڈ بے سمار (بے شمار)
اوم بھگونت گوسائیں
کہالک (خالق) رو رھیا سرب ٹھائیں

....

مہروان (مہربان) مولا توہی ایک
پیر پیکامبر سیکھ (شیخ)
دلاں کا مالک کرے ھاک (حاق)
کران (قران) کتیب تے پاک
....

مہر دیا کر کرنے ہار
بھگت بندگی دیہ سرجن‌ہار
کہ نانک گور کہوئے بھرم
ایکو اللہ پار برہم
[گورو گرنتھ صاحب راگ رام کلی محلہ ۵ ص ۸۹۷]

دھرتی اکاس (اکاش) پاتال ہے چند سور بناسی
بادساہ ساہ (بادشاہ شاہ) امراء کہان (خان) ڈھائے ڈیرے جاسی
رنگ تنگ گریب (غریب) مست سب لوک سدھاسی
کاجی (قاضی) سیکھ مسائکاں (شیخ مشائخاں) سبھے اٹھ جاسی

پیر پیکابر (پیغمبر) اولیاء کو تھرنہ رھاسی
روجہ (روزہ) بانگ نواج (نماز) کیتب بن بوجھیے سب جاسی
لکھ چوراسی میدنی سب آوے جاسی
نہچل سچ کیداۓ (خدائے) ایک کیداۓ (خدائے) بندہ ابناسی
[گورو گرنتھ صاحب راگ سارو کی وار محلہ ۵ ص ۱۱۰۰]

۱ ۔ ورت نہ رہوں نہ ماہ رمدانا (رمضانا)
تس سیوی جو رکھیے ندانا
ایک گوسائیں اللہ میرا
ہندو ترک دوہاں نے بیرا
ھج کابے (حج کعبے) جاؤں نہ تیرتھ پوجا
ایکو سیوی اور نہ دوجا
پوجا کروں نہ نواج گجاروں (نماز گزاروں)
ایک نرنکار لے ردے نمسکاروں
نہ ھم ہندو نہ مسلمان
اللہ رام کے پنڈ پران
کہ کبیر ایہ کیا وکھانا
گور پیر مل کھود کھسم (خود خصم) پچھانا(۱)
[گورو گرنتھ صاحب راگ بھیروں محلہ ۵ ص ۱۱۳۶]

۲ ۔ انگیکار کیا پربھ اپنے بیری سگلے مادھے
جن بیری ہے ایہ جگ لوٹیا تے بیری لے بادھے

---

۱ ۔ گورو گرنتھ صاحب میں یہ شبد گورو ارجن جی اور کبیر جی کے نام پر درج ہے ۔ اس کے اوپر محلہ ۵ کا عنوان دیا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ یہ گورو ارجن جی کا بیان کردہ ہے اور آخر میں بطور تخلص نانک کی بجائے کبیر کا لفظ ہے ، جس سے یہ واضح ہے کہ یہ شبد کبیر جی کا بیان کردہ ہے ۔

ست گور پربیسر میرا
اک راج بھوگ رس مانی ناؤں جپی بھرواسا تیرا
ت نہ آوس دوجی ہاتا سر اوپر رکھوارا
بے پرواہ رہت سوامی اک نام کے آدھارا
پورن ہوئے سلیؤ سکھدائی اون نہ کائی باتا
ت سار پرم پد پایا چھوڑ نہ کتہوں جاتا
رن نہ سا کوں جیسا تو ہے سچے الکھ اپارا
اتل اتھاہ اڈول سوامی نانک خصم ہمارا

[گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۵ ص ۸۸۴]

۔ تو دانا تو ابچل توہی جات میری پاتی
تو اڈول کدے ڈولے ناہی تام کیسی تاتی
ایکے ایکے ایک توہی
ایکے ایکے تو رائیا
تو کرپا تے سکھ پایا
تو ساگر ہم ہنس تمہارے ہم میں مانک لالا
تم دیوہو تل سنک نہ مانوں ہم بھنچہ سدا نہالا
ہم بارک تم پتا ہمارے تم مکھ دیوہو کھیرا
ہم کھیلیں سب لاڈ لڈاوہو تم سد گنی گہیرا
تم پورن پور رہے سمپورن ہم سنگ اگھانے
ملت ملت ملت مل رہیا نانک کہن نہ جانے

[گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۵ ص ۸۸۵]

۶ ۔ کوئی بولے رام رام کوئی کہداۓ (خدائے)
کوئی سیوے گوسائیاں کوئی اللہ
کارن کرن کریم
کرپا دھار رہیم (رحیم)

کوئی نہاوے تیرتھ کوئی ھج (حج) جائے
کوئی کرے پوجا کوئی سر نوائے
کوئی پڑھے بید کوئی کتیب
کوئی اوڑھے لیل کوئی سپید
کوئی کہے ترک کوئی کہے ہندو
کوئی باچھے بھست (بہشت) کوئی سر گندو
کہ نانک جن ھکم (حکم) پچھاتا
پربھ ساھب (صاحب) کا تن بھید جاتا

[گورو گرنتھ صاحب رام کلی محله ۵ ص ۱۸۵

۷ - پونے میں پون سمائیا
جوتی میں جوت رل جائیا
ماٹی ماٹی ہوئی ایک
رووَن ہارے کی کون ٹیک
کون موا رے کون موآ
برھم گیانی مل کرو بیچارا ایہ تو چلت بھیا
اگلی کچھے کھبر (خبر) نہ پائی
رووَن ہار بھی اوٹھ سدھائی
بھرم موہ کے باندھے بندھ
سوپن بھیا بھکھلائے اندھ
ایہ تو رچن رچیا کرتار
آوت جاوت ھکم (حکم) اپار
نہ کو موآ نہ مرنے جوگ
نہ بنسے ابنامی ہوگ
جوا ایہ جانو سو ایہ ناہ
جانن ہارے کو بل جاؤں
کہ نانک گور بھرم چکائیا

نہ کوئی مرے نہ آوے جائیا
[گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۵ ص ۸۸۵]

کرن کراون سوئی
آن نہ دیسے کوئی
ٹھاکر میرا سگھڑ سجانا
گور مکھ ملیا رنگ مانا
ایسو رے ہر رس میٹھا
گور مکھ کنے ور لے ڈیٹھا
نرمل جوت امرت ہر نام
پیوت امر بھئے نہکام
تن من سیتل اگن نواری
آنند روپ پرگٹے منساری
کیا دیوں جا سب کچھ تیرا
سد بلہاری جاؤں لکھ بیرا
تن من جیو پنڈ دے ساجیا
گور کرپا تے نیچ نواجیا (نوازا)
کہول کوارا مہل (محل) بلایا
جیسا سا تیسا دکھلایا
کہ نانک سب پڑدہ توٹا
ہوں تیرا تو میں بن ووٹھا

[گورو گرنتھ صاحب رام کلی محلہ ۵ ص ۸۸۶]

• سفت (صفت) سلاہن بھگت ورلے دتی ان
سونپے جس بھنڈار بہر بوجھ نہ لیتی ان
جسنوں لگا رنگ سے رنگ رتیا
اونہاں اکو نام ادھار اکا ان بھتیا
اوہناں پچھے جگ بھنچے بھوگئی

اوہاں پیارا رب اوہاں جوگنی
جس ملیا گور آئے تن ہریہ جالیا
ھوں بلہاری تن جے کہسمے (خصمے) بھانیا

[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی محلہ ۵ ص ۹۵۸

۱۰ - جورتے دیدار سبئی سچ ھاک (حاق)
جنی جاتا کہسم (خصم) کیوں لبئیے تناں کہاک (خاک)
من میلا و یکار ھووے سنگ پاک
وسے سچا مہل (محل) کہلے بھرم تاک (طاق)
جسہے دکہالے سہل (محل) تس نہ ملے دھاک
من تن ھوئے نہال بندک ندر جھاک
نو ندہ نام ندھان گور کے سبد (شبد) لاگ
تسہے ملے سنت کہاک (خاک) مستک جسے بھاگ

[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی محلہ ۵ ص ۹۵۹

۱۱ - وڈا تیرا دربار سچا تدہ تکہت (تخت)
سر ساھاں (شاھاں) پاتساہ (پاتشاہ) نہچل چور چہت
جو بھاوے پار برہم سوئی سچ نیاؤں
جے بہاوے پار برہم لتہاوے ملے تہاؤں
جو کینی کرتار سائی بھلی گل
جنی پچھاتا کہسم (خصم) سے درگاہ مل
سہی (صحیح) تیرا پھرمان (فرمان) کنئے نہ پھیرئے
کارن کرن کریم کدرت (قدرت) تیرئے

[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی محلہ ۵ ص ۹۶۲

۱۲ - جاں پر اندر تاں دھن باھر
جاں پر باھر تاں دھن ماھر
بن ناویں بہ بہیر پھراھر

ست گور سنگ دکہایا جاہر (ظاہر)
جن نانک سجھے سح سماہر

[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی سلوک محلہ ۵ ص ۹٦۵]

آہر سب کردا پھرے آہر اک نہ ہوئے
نانک جت آہر جگ ادھرے ورلا بوجھے کوئے

[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی سلوک محلہ ۵ ص ۹٦۵]

وڈی ہوں وڈا اپار تیرا مرتبا (مرتبہ)
رنگ پرنگ انیک نہ جاپن کرتبا (کرتبہ)
جیاں اندر جیؤ سب کچھ جان لا
سب کچھ تیرے وس تیرا گھر بھلا
تیرے گھر آنند ودھائی تدہ گھر
ماں مہتا تیج آپنا آپ جر
سرب کلا بھرپور وسے جت کتا
نانک داسن داس تدہ اگے بنوتا

[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی محلہ ۵ ص ۹٦۵]

گورو ارجن جی کے بیان کردہ مندرجہ بالا شبدوں میں ... کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں تاہم ان پر ... نعایت کا بہت اثر ہے -

گورو گرنتھ صاحب کے راگ رام کلی میں ایک "وار" رائے بلونڈ اور ستا ڈوم کے نام سے درج ہے -

رائے بلونڈ اور ستا ڈوم کی بیان کردہ وار کا نمونہ درج ذیل ہے :

ناؤں کرتا کادر (قادر) کرے کیوں بول ہووے جوکھیوے
....

لہنے دھریون چہتر سر کر سپہتی (صفتی) امرت ہیوندے

....

گور چیلے رہراس کیتی نانک سلاست تھیوندے
سه (شه) ٹکه دتوس جیولدے

....

جھولے سو چھت لرنجی مل تکھت (تخت) بیٹھا گور ھٹیے
کرے جے گور پھرمایا (فرمایا) سل جوگ الونی چٹیے
لنگر چلے گور سبد (شبد) ھر توٹ نه آوی کھٹیے
کھرچے (خرچے) دتی کھسم (خصم)
دی آپ کھھدی کھیر (خیر) دبٹیے
ھووے سپھت (صفت) کھسم (خصم) دی
لور ارسوں (عرشوں) کرسوں جھٹیے

....

سچ جے گور پھرمایا (فرمایا) کیوں ایدوں بولوں ھٹیے
پتربں کول (قول) نه پالیؤ کر پیروں کن مرٹیے
دل کھوٹے آکی (عاقی) پھرن بنه بھار اچائن چھٹیے

....

جن کیتی سو مننا کوسال جیواھے سالی
دھرم رائے ھے دیوتا مے گلاں کرے دلالی
ست گور آکھے سچا کرے سا بات ھووے درھالی (درحالی)
گور انگد دی دوھی پھری سچ کرتے بندھ بہالی
نانک کئیاں پلٹ کر مل تکھت (تخت) بیٹھا سے ڈالی
درسیوے است کھڑی مسکلے (مصقلے) ھوئے جنگالی (زنگالی)
در درویس کھسم (درویش خصم) دے لائے سچے بانی لالی
بلونڈ کنیبوی نیک جن جس بہتی چھاؤ پترالی

لنگر دولت ونڈیئے رس امرت کھیر گھیالی

....

ہئے کبول کھسم (قبول خصم) نال جاں گھال مردی گھالے

....

پھیر وسایا پھیرواں ستگور کھاڈور
جپ تپ سنجم نال تدھ ہور موچ گرور (غرور)
لب و ناہے مانسا جیوں پانی بور
ورھیے درگاہ گورو کی کدرتی (قدرتی) نور
جت سو ہاتھ نہ لبھئی توں اوہ ٹھرور
تو ندھ نام لدھاں ہے تدھ وچے بھرپور
نندہ تیری جو کرے سو وتجے چور
نیڑے وسے مات لوک تدھ سوجھے دور
پھیر وسایا پھیرواں ستگور کھاڈور
سونکا سو پنہا سوی دیبان
پیو دادے جیوھا ہوتا پروان
جن باسک لیترے کھتیا کر بنھی تان
جن سمند ورولیا کر میر مدھان
چودہ رتن نکالیئن کیتون چانان
گھوڑا کیتو سہج دا جت کیؤ پلان
دھنکھ چڑھائیو ست دا جس ھندا بان
کل وچ دھو اندھار سا چڑھیا رے بھان
ستہو کھیت جمائیو ستہو چھاوان
نت رسوئی تیرے گھیو میدا کھان
چارے کونڈاں سوجھیوس من میں سبد (شبد) پروان
آواگون نواریو کر ندر نیسان (نشان)

....

نانک هندا چهتر سر است هیران (حیران)

....

دهن سو تیرا تهان هے سچ تیرا پیس کاربا (پیش کاربا)
نانک تو لہنا تو هے گور امر تو ویچاربا
گور ڈٹها تاں من سادهاربا

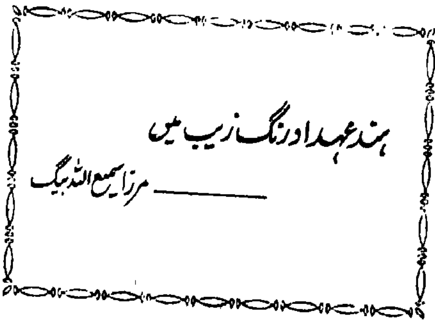
....

آپے پٹی کام (قلم) آپ آپ لکھن‌هارا هوآ
سب است آون آون جاونی آپے هی نواں نروآ
تکهت (تخت) بیٹها ارجن گورو ست گور کا کهوے چندوآ

....

دونی چونی کرامات سچے کا سچا ڈهوآ
[گورو گرنتھ صاحب وار رام کلی سته بلونڈ ص ۹۶۸-۹۶۷-۹۶۶]


اورنگ زیب


ہند عہد اورنگ زیب میں
مرزا سمیع اللہ بیگ



جسٹس حمید اللہ بیگ اور جسٹس نصر اللہ بیگ کے والد مرحوم
جسٹس سمیع اللہ بیگ کا ۱۹۲۴ء کا کارنامہ پیش خدمت ہے۔ اسکے
واقعی مخاطب تو ہندی داں عزیزانِ وطن ہوں گے جن کے لیے اسے
الگ سے ہندی میں پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن اردو والے بھی اپنی
میراث سے بے خبر نہ رہیں اس لیے اردو اصل بھی!

—— ادارہ

ہندعہداورنگ زیب میں

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

ہند عہد اورنگ زیب میں

از

مرزا یار جنگ سمیع اللہ بیگ

چیف جسٹس حیدرآباد دکن سابق ایڈوکیٹ لکھنؤ

جمادی الاول سنہ ۱۳۴۳ھ — دسمبر ۱۹۲۴ء

فہرست مضامین

باب اوّل

تمہید

نامِ نیک رفتگاں ضائع مکن   تا بماند نامِ نیکت برقرار

"زمانہ" کے مارچ و اپریل ۱۹۲۲ء کے پرچہ میں مسٹر جے۔ آر۔ راصاحب نے ایک مضمون لکھا تھا۔ جس کا عنوان یہ تھا "ہندوستان عہد مغلیہ میں" مضمون مذکور میں چند واقعات بیان کرکے اُن سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ عہدِ مغلیہ میں رشوت کا بازار بے حد گرم تھا۔ رعایا مفلوک الحال تھی اور بہت افلاس و تنگدستی میں بسر کرتی تھی عوام کی اقتصادی و تمدنی حالت سنوارنے کی کوشش نہیں کیجاتی تھی وزرائے سلطنت نیک نفس، مردم شناس و منتظم نہ تھے۔ تجارت پر ایسی تباہ کن قیود عائد تھیں کہ جن سے اوس کی ترقی دشوار تھی۔ صداقت نابود تھی، فرامینِ شاہی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ سمندر میں بحری قزاقوں کے بیڑے پھرا کرتے تھے۔ اندرون ملک راہزنوں کا بڑا زور تھا۔ مغلوں کا لشکر ایک بے قاعدہ فوج کا مجمع تھا۔ بڑا حصہ زمین کا ویران اور غیر آباد تھا۔ کالج اور تعلیم گاہوں کا قائم کرنا دشوار تھا۔

مسٹر راصاحب نے اپنے مضمون کی تائید میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کے اُن خطوط کا حوالہ دیا ہے جو کہ مختلف اوقات اور سنین میں انہوں نے ولایت کو اپنے آقا ڈائرکٹروں کی اطلاع

دینے کی غرض سے لکھے تھے اور ایک فرانسیسی سیاح کی تحریر سے بھی استدلال کیا ہے
مسٹر جے۔ آر۔ رائے جیسے اس مضمون نے پہلے مجھ کو صرف یہ خیال دلایا تھا کہ
"ہند بعہد اورنگ زیب" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جائے۔ لیکن ہندو
مسلمانوں کے آجکل کے نزاعوں سے اس اندیشہ نے کہ کہیں ایسے مضامین سے
جن میں صحیح واقعات کا اظہار نہ ہو غلط فہمی بڑھ کر ملک کے حالات بد سے بدتر نہ
ہوجائیں۔ میرے خیال کو مصمم ارادہ کردیا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ مضمون تاریخ کی
وقعت نہیں رکھتا ہے اور نہ اس میں مورخ کی حیثیت سے عہد اورنگ زیب کے تمام
واقعات پر گہری تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اسمیں زیادہ تر عہد اورنگ زیب
کے وہ چند واقعات پیش کئے گئے ہیں جنکو عہد مغلیہ اورنگ زیب کے متعلق اصحاب
رائے عموماً نظر انداز کردیتے ہیں۔ ان واقعات کا انتخاب کپتان الگزنڈر ملٹن کے
سفرنامے سے کیا گیا ہے۔ الگزنڈر ملٹن ایک انگریز سیاح و سوداگر تھا۔ یہ شخص علمی
حیثیت سے بھی معمولی شخص نہ تھا۔ یونیورسٹی میں تعلیم پا چکا تھا تقریباً ۱۶۸۰ء میں
جو اورنگ زیب کا زمانہ تھا یہ شخص بہت سا سوداگری مال واسباب لیکر معہ چند
توپوں اور تھوڑے سے فوجی سپاہیوں کے ولایت سے روانہ ہوا ہے اور تمام ساحل
افریقہ و عرب و ایران پر تجارت کرتا ہوا بالآخر ہندوستان کے ساحل پر پہنچا ہے
تخمیناً ۲۵ برس تک ہندوستان اور اس کے گرد و نواح میں اپنی زندگی بسر کی ہے
اس شخص نے اپنا ایک سفرنامہ لکھا ہے جسکی دوسری طبع ۱۷۳۹ء کی ہے۔ یہ سفرنامہ
دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اسوقت "کتب خانہ آصفیہ" حیدرآباد دکن میں موجود ہے
یہ کتاب پرانی انگریزی میں لکھی گئی ہے لیکن بہت دلچسپ ہے۔ چونکہ یہ سوداگر

ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ لہذا اکثر اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹرس اور اُن کے ملازمین کی پولیٹیکل حرکات و چالوں پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے غالباً اُس وقت کپتان صاحب کو اس کا خیال بھی نہ ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی وہ چالبازیاں جن کو انہوں نے اپنے سفرنامے میں نظرِ حقارت سے دیکھا ہے بالآخر اُن کی قوم کی حکومت اس ملک میں قائم کردیں گی۔ یہ اورنگ زیب کا زمانہ ہے جس کو ہمارے بعض مورخ ہونے کے مدعی سب سے زیادہ متعصب مسلمان مغل بادشاہ ظاہر کرتے ہیں۔ ساحل ہندوستان پر کوئی ایسا بڑا شہر نہ تھا کہ جہاں یہ مصنف گیا ہو علاوہ بریں سورت، احمد آباد، دہلی، آگرہ، کلکتہ وغیرہ کی بھی اس نے سیر کی ہے ایک موقع پر اورنگ زیب کے روبرو بھی پیش کئے جانے کی عزت اس کو حاصل ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس شخص کا علم ذاتی ہے اور اس کے بیانات بادی النظر میں بے غرض اور بے لوث معلوم ہوتے ہیں میں نے اپنے مضمون میں کپتان موصوف کی اسی عینی شہادت پر استدلال کیا ہے اور جو شہادت میں پیش کرتا ہوں اگر وہ صحیح ہے تو اُن واقعات کی بہت کچھ تکذیب ہوتی ہے جن پر مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب نے اپنی رائے قائم کرنے میں استدلال کیا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتے یا ڈائرکٹرس غلط واقعات کیوں لکھتے اس کے متعلق ناظرین اولاً اس مضمون کے باب (۹) کو ملاحظہ کریں اس کے بعد وجوہ خود ذہن میں آجائیں گے فرانسیسی سیاح کی بابت جس کی کتاب کا حوالہ مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب نے دیا ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ یہ امر قابلِ غور ہوگا کہ اُس سیاح کے ذرائع علم کیا تھے۔ اُس نے کس زمانہ میں اور کتنے روز تک اس ملک کو دیکھا۔ بالآخر ناظرین سے

یہ میں التجا کروں گا۔ کہ اگر اس مضمون کی کوئی عبارت خلافِ مزاج ہو تو معاف فرمائیں کسی کا دل دکھانا میرا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ اس مضمون کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اگر گذشتہ صحیح تاریخی واقعات سے لاعلمی یا غلط فہمی نے ہندو مسلمانوں کے دلوں پر ایک دوسرے کے مقابل کوئی غبار پیدا کر دیا ہے تو اسکے دھونے کی کوشش کروں اور اگر اس مضمون سے انکی باہمی محبت وارتباط کی زنجیر کو کچھ بھی تقویت حاصل ہو سکے تو میرا اصلی مطلب حاصل ہو جائے گا اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آمین!!

باب دوم

تعلیمی حالت

مسٹر جے۔ آر۔ راجاجبندے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ عہد مغلیہ میں کالج اور درسگاہوں کا قائم کرنا دشوار تھا تقریباً ۱۶۰۹ء میں کپتان ہملٹن خلیج فارس سے ہوتے ہوئے ساحل ہندوستان پر آئے ہیں سب سے پہلے انہوں نے اس حصہ ہند کو دیکھا ہے جو سندھ کے نام سے موسوم ہے۔ سندھ میں ایک شہر تھا جس کا نام "ٹھٹہ" تھا ہندوستان کا یہ پہلا شہر تھا جو اُن کو پہلے پہل نظر آیا وہ لکھتے ہیں۔

"ٹھٹہ شہر علوم فقہ و فلسفہ و سیاسیات کیلئے مشہور ہے ان علوم میں لڑکوں کو تعلیم دینے کے لئے تقریباً چار سو کالج یہاں ہیں" جلد اول صفحہ ۱۲

اگر ایک سندھ کے ساحل کی یہ حالت تھی تو اس زمانہ میں پایۂ تخت کے قریب قریب شہروں کی تعلیمی نظر سے کیا حالت ہوگی۔ اُسکا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے اصلیت یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں تعلیم کا نقطہ نظر ہی زمانۂ موجودہ سے علحدہ تھا۔ اور اس کے طریقے جدا تھے۔ پڑھانا ایک ایسا نیک کام خیال کیا جاتا تھا کہ اس کا معاوضہ ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ اُستاد کا درجہ والدین سے کم نہ تھا۔ پڑھانا ایک معزز پیشہ تھا۔ بہت سے لوگ اس کو باعث عزت سمجھتے تھے۔ اور اس کام کو خوشی سے انجام دیتے تھے اور آجتک اسی کا یہ اثر ہے کہ جب ہم لفظ "مولوی" کسی کے نام ساتھ سنتے ہیں تو دل میں وقار و عزت کے خیالات آجاتے ہیں علاوہ بریں ہر رئیس محلہ کے لئے اپنے دروازے پر ایک

مکتب کا قایم کرنا ویسا ہی اُسکی ریاست کے لوازمات میں سے تہا جیسا کہ گھوڑے
ہاتھی کا پالنا یا دیگر مذہبی رسم و رواج کی پابندی کرنا۔ اس مکتب میں نہ صرف اُس
رئیس ہی کے بچے پڑہتے تھے بلکہ تمام غربا اہل محلہ کے بچے مولوی صاحب کے پاس
پڑہنے کے لئے بٹہائے جاتے تھے۔ نقد کی صورت میں مولوی صاحب کو بہت کم
ملتا تھا۔ مگر اس طرح بہت سے لڑکے پڑھ جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب نہ صرف
پڑہاتے تھے بلکہ آداب بھی سکہاتے تھے۔ اگر لڑکے نے ذرا سی بد تہذیبی کی تو ماں
باپ بھی مولوی صاحب کے حوالہ سے بچہ کو ڈراتے تھے۔ لڑکے کے کیرکٹر درست
کرنے میں انکو بہت دخل تھا۔ ہم اس زمانہ کے اسکول اور کالجوں کے خلاف
نہیں ہیں لیکن ہماری رائے میں اس ملک کے واسطے ابتدائی تعلیم گاہوں کا
مکتب کی صورت میں ہونا بہترین طریقہ تھا۔ افسوس کہ رفتارِ زمانہ نے اس قسم کے
مولویوں اور مدرسین کا طبقہ ہی نیست و نابود کردیا۔ مکتبوں کے تعداد کی جو
حالت بچشم خود میں نے بچپن میں اپنے چھوٹے سے قصبہ امیٹھی میں دیکھی ہے اس سے
میں قیاس کرسکتا ہوں کہ ملک میں انکی مجموعی تعداد موجودہ پرائمری اسکولوں سے
کم نہ ہوگی۔ اِس قصبہ امیٹھی میں ایک ویرانہ سنسان مقام ہے جہاں کچھ عرصہ ہوا
چند بلا سقف صرف دیواریں کھڑی ہوئی تھیں اور اب تو شاید صرف بنیاد کے نشان
باقی رہگئے ہیں۔ پرانے لوگ اِسی کو وہ مقام بتلاتے ہیں جہاں طلباء دور دور
دراز فاصلہ سے آکر قیام کرتے تھے اور مُلا جیون مرحوم جن کو ایک زمانہ تک
اورنگ زیب کے اُستاد ہونے کا بھی شرف حاصل ہوا تھا درس دیا کرتے تھے
یہ اس قصبہ کے ان کہنڈروں میں سے ہے جسکو ہم لوگ اہل قصبہ حسرت کی نگاہ سے

سے دیکھا کرتے ہیں۔ ہم اس کو اپنے قصبہ کا پرانا کالج سمجھتے ہیں۔ اسی قسم کے مکتبوں اور کالجوں میں ہندو مسلمان لڑکے یکجا پڑھا کرتے تھے۔ یہیں پر ان دونوں مذاہب کے بچوں میں دوستی کے وہ استوار رشتے قائم ہوتے تھے جن کا آئندہ توڑنا دشوار ہوتا تھا۔ ان مکتبوں کے علاوہ جہاں عام تعلیم دیجاتی تھی مذہبی درسگاہیں بھی تھیں۔ مثلاً ہندو پاٹ شالہ یا کسی پیر طریقت یا حافظ جی کا قیام گاہ۔ کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامہ میں صرف ایک مقام "ٹھٹھہ" میں جو چار سو کالجوں کا ذکر کیا ہے غالباً وہ ایسے ہی مکتب، مدرسے اور کالج ہونگے۔ جن کا ذکر میں نے کیا ہے۔ اور جب کہ مدرسوں اور کالجوں کی کثرت کی یہ حالت ہو تو مسٹر جے۔ آر۔ راجے جا کا یہ دعویٰ کہ اس عہد مغلیہ میں درسگاہوں اور کالجوں کا قائم کرنا دشوار تہا۔ یا تعلیم کے ذرائع اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے موجود نہ تھے۔ میری رائے میں محض بلاثبوت معلوم ہوتا ہے۔

باب سوم

مذہبی رواداری

مذہبی رواداری کے معاملہ میں کپتان ہملٹن کی رائے کا پورا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو پہلے یورپ کی سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کی حالت پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہئے۔ کپتان ہملٹن اس ملک کے باشندے تھے جہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی خانہ جنگیوں نے ہزاروں نہیں بلکہ

لاکھوں بنی نوع کا خون بہا دیا تھا۔ جہاں اُس زمانہ کی رعایا اگر گورنمنٹ وحکومت کے مذہب سے اختلاف کرتی تھی تو رعایا کے واسطے بہت مہلک نتائج پیدا ہُوا کرتے تھے۔ مثلاً ۲۴ راگست ۱۵۷۲ء میں بادشاہِ فرانس نے یہ حکم دیدیا تھا کہ پیرس میں تمام پروٹسٹنٹ مذہب کی رعایا کا قتلِ عام کر دیا جائے اس عام فرمانِ قضا میں بچے، بوڑھے، مرد و عورت کا کچھ استثناء اور امتیاز نہ تھا۔ بادشاہ نے کٹی ہوئی گردنوں سے خون کے فوارے نکلنے کا نظارہ اپنے مکان سے بیٹھ کر تماشے کے طور پر دیکھا۔ اسی طرح سے جب ولایت میں شاہزادی "میری" Mary جو کہ رومن کیتھولک تھیں تخت نشین ہُوئیں تو ایک نوجوان شاہزادی کی ننھی سی خوبصورت گردن پتھر پر رکھوا کر اس بنیاد پر کٹوادی کہ وہ پروٹسٹنٹ ہونے کا علانیہ دعویٰ کرتی تھی۔ اور Rowlands کے دس بچوں اور بیوی پر رحم نہ کیا گیا۔ بلکہ اُسی مذہبی اختلاف کی وجہ سے اُن کو زندہ جلا دیا گیا۔ یورپ میں اُس وقت مذہبی رواداری کی یہ حالت تھی۔ لہذا کپتان ہملٹن کو عہد اورنگ زیب کی مذہبی رواداری دیکھکر عجیب وغریب سماں معلوم ہوا۔ بہت بڑی بات جو کہ اُن کو متحیر کرتی تھی وہ یہ تھی کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں مگر ایک دوسرے سے اس طرح مل جل کر بسر کر رہے ہیں اور وہ مذہبی تعصبات سے اس قدر بری ہیں کہ اُن میں سوائے پوشاک کے کوئی چیز ایسی نہیں نظر آتی تھی جس سے اس کا امتیاز ہو سکے کہ اُن کا مذہب کیا ہے چنانچہ اپنے سفرنامہ میں ایک مقام پر شہر ٹھٹھہ کے حالات بیان کرتے ہُوئے وہ لکھتے

"ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اکثر ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے"
"ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں"
"اور تہواروں کو اسی طرح سے مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانہ میں کرتے تھے جبکہ بادشاہت خود"
"ہندوؤں کی تھی۔ وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن انکی بیویوں کو اجازت نہیں ہے"
"کہ شوہروں کے مُردے کے ساتھ ستی ہوں" (جلد اول صفحہ ۱۲۰۔۱۲۸)

ایک دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"صرف بنیوں میں ۸۴ فرقے ہیں اور گو ایک دوسرے کے ساتھ ملکر کھانا نہیں کھاتے"
"ہیں لیکن آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ برہمن ہمیشہ لوگوں کو اسکی ترغیب دیا کرتے ہیں"
"کہ دیوتاؤں کے واسطے بڑی بڑی جائدادیں وقف کیجائیں۔"
"پارسی بھی ہیں اور وہ اپنے رسوم مذہب زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں عیسائیوں کو"
"پوری اجازت ہے کہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ"
"وہ اسمیں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں ان کے اخلاق"
"اس شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے عموماً بدترین ہوتے ہیں۔" (جلد اول ۱۵۹، ۱۶۲)

یہ سیاح و تاجر جب سورت میں پہنچا ہے تو وہاں کی مذہبی حالت حسب ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

"اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن انمیں کبھی کوئی سخت جھگڑے"
"ان کے اعتقادات وطریقہ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے۔ ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح"
"چاہے اپنے طریقہ سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔ صرف اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی کو"
"تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے۔" جلد اول صفحہ ۱۶۲

ہم اُن مورخین سے جن کی کتابیں ہم کو اسکول میں پڑھائی گئی تھیں یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ اخلاقی جرم نہ تھا کہ انہوں نے اس قسم کے واقعات اپنی تاریخ میں نہیں درج کئے۔ کیا وہ لاعلم تھے۔ یا اُن کی سیاسی اغراض اس کی متقاضی تھیں کہ وہ تمام ہندو و مسلمان بچوں کے دل میں یہ خیال قایم کریں کہ اورنگ زیب ایک متعصب مسلمان تھا جس نے ہمیشہ ہندوؤں کا گلا کاٹا۔ یہ وہی خیالات ہیں جو بعض اوقات ہمارے بعض تعلیم یافتہ ہندو برادران وطن کے دلوں میں آتش عداوت کو مشتعل کر دیتے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ اورنگ زیب کی طبیعت مذہبی واقع ہوئی تھی اور وہ جن لوگوں کو لامذہبی کے راستہ پر جاتا دیکھتا تھا ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتا تھا مثلاً جب کبھی وہ کسی مسلمان کو خلاف شرع کوئی فعل کرتا دیکھتا تو وہ اُس کو خود اُسی کی شرع کے مطابق سزا دینا فرض سمجھتا تھا۔ ملک دکھن میں اورنگ آباد کے قریب ایک مقام دولت آباد ہے۔ وہاں کی روایت ہے کہ اس عظیم الشان جلیل القدر فقیر منش بادشاہ نے اپنے ہاتھوں سے کلام مجید لکھکر اور ہدیہ سے جو رقم وصول ہوتی تھی اُس کے سرمایہ سے چند گز زمین اُسی مزار کے قدموں کے قریب خریدی تھی جس سے اُس کو روحانی بیعت تھی اور یہ وصیت کی تھی کہ اُسی زمین کو اسکی نعش سپرد کیجائے اُسپر نہ عمارت ہو نہ مقبرہ ہو۔ سبز گھاس کافی ہے۔ اور قبر ایسی بنائی جائے کہ اسکے پیر طریقت کے مزار ہونے سے جو پانی بہے وہ اس بادشاہ کی قبر سے گذرے اُسکے پاس ایک مدرسہ ہو جسمیں بچوں کو کلام مجید کی تعلیم دیجائے۔ میں نے اس مقام کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ دیکھکر یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آجتک اُس وصیت کی پابندی ہو رہی ہے۔ حال ہی میں اعلیحضرت حضور نظام دکھن نے ایک سنگ مرمر کا کٹہرہ

اس قبر کے گرد بنوا دیا ہے۔ اس سے اورنگ زیب کی مذہبی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مگر جس مذہب کا رنگ اس کی طبیعت پر چڑھا ہوا تھا وہی مذہب اسکو مذہبی رواداری کی تعلیم دیتا تھا یہی مذہب یہ پکار پکار اس سے کہتا تھا۔

لا اکراہ فی الدین

(کلام مجید پارہ سوم)

(مذہب کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں)

دولت آباد کے جس دامن کوہ پر اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے کچھ دن بسر کیے اسی کے نیچے چند قدموں کے فاصلہ پر وہ غارہائے ایلورہ واقع ہیں جہاں بدھ اور ہندو زمانہ کے مذہبی مندروں اور بتوں کی سنگ تراشی دیکھنے کے لئے آج بھی یورپ اور امریکہ کے لوگ آتے ہیں۔ اسی ضلع میں اجنٹہ کے وہ مذہبی غار ہیں جنکی نقاشی دیکھکر اس زمانہ میں بھی ایک فرانسیسی ماہر فن گویا سکتہ میں آگیا۔ اگر اورنگ زیب کا تعصب اس قسم کا ہوتا کہ وہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا تو اسوقت اس کے لئے ان آثار کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا کچھ دشوار نہ تھا لیکن سوائے ذہنی خیال کے اسکا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خود اورنگ زیب ہی نے یا اس کے محکمت کسی نے ان میں ہاتھ لگایا۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں اورنگ زیب کی طبیعت مذہبی واقع ہوئی تھی مگر اس کے یہ معنی نہ تھے کہ دوسرے مذہب کی رواداری نہ تھی ہر ہندو اپنے مذہب کے مطابق عمل کر سکتا تھا۔ ہر شخص آزاد تھا۔ ہر شخص جو مذہب چاہتا تھا اختیار کر لیتا تھا۔ جب میں ملک دکہن کے قلعہ گولکنڈہ وقلعہ کریم نگر کو دیکھنے گیا تو ایک منظر ایسا دکھائی دیا جس کا اثر میرے دل پر بہت خوشگوار تھا۔ قلعہ گولکنڈہ و کریم نگر

ہندو زمانہ کے ہیں ابھی جو ٹیلوں پر اب تک ہندو پرستش گاہیں موجود ہیں مسلمانوں نے ان قلعوں کو فتح کرنے کے بعد ہندوؤں کی ان عبادت گاہوں کو نیست و نابود نہیں کیا۔ ہندو وہاں تیرتھ کیلئے آج بھی جاتے ہیں یہ دیکھکر مجھ کو مسلمانوں کی مذہبی رواداری پر فخر ہوا ایک ہی اللہ کے بندے ایک ہی خدا کی پرستش اس عالم میں کس کس طریقہ سے کر رہے ہیں اگر مسلمان اہل ہنود کو اسکی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں کہ خدا تک پہنچنے کیلئے کسی پتھر کو واسطہ قرار دینے کی ضرورت نہیں تو اس زمانہ میں یہ مقصد ان بتخانوں کو توڑ پھوڑ کر ہرگز نہ حاصل ہو گا اگر مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر رہنا چاہتے ہیں اگر مسلمان ہندو کو اپنی مادر مشفقہ سمجھتے ہیں تو اس زمین میں جتنے بچے پیدا ہوئے ہیں برادرانہ تعلق اور مذہبی رواداری کا ہونا انکے قیام زندگی کیلئے لازمی ہے۔

یہ تاریخی واقعہ ہے کہ عہد مغلیہ میں تبلیغ اسلام کبھی نہ گورنمنٹ و حکومت کی شاخ قرار دیگئی نہ مغلیہ بادشاہوں نے تبلیغ اسلام کبھی اپنا فریضہ سمجھا البتہ یہ اور بات ہے کہ مولویوں کے اثرات اور بعض خدا پرست مسلمانوں کے طرز زندگی سے عوام الناس کے دل متاثر ہوئے اور مذہب اسلام کی سادگی اور اس کی یہ تعلیم کہ خالق کی نظر میں سب انسان برابر ہیں ہندوستان کے باشندوں کے اس حصہ کو جو ذات پات کی زنجیروں میں گرفتار تھے ایک خوشگوار منظر معلوم ہوا اور خود بادشاہ کا مذہب بھی ایک خاص وقعت رکھتا ہے ان وجوہ سے مسلمانوں کی تعداد میں کسیقدر اضافہ ہوا مگر ہندوستان میں تبلیغ اسلام کبھی اس باقاعدہ و باضابطہ طریقہ سے نہیں کیگئی جیسے کہ اسوقت مذہب عیسوی کی تبلیغ مشنری کرتے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں نے کبھی اس کا بیڑا نہیں اٹھایا۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ عہد اورنگ زیب میں مذہبی رواداری کی بابتہ

رائے قائم کرنے کی غرض سے اپنے موجودہ تمدن کو ذرا گہری نظر سے دیکھئے
اور ہندوستان کے اُن حصص میں جو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھے
کسی پُرانے شہر کے پُرانے محلے میں قدم رکھئے خواہ دہلی ہو آگرہ ہو یا لکھنؤ یا
کسی قصبے میں جائیے۔ خواہ امیٹھی ہو لکا کوری ہو یا جگوا۔ تو کیا نظر آئیگا
کہ ایک ہی دیوار کے سایہ میں ان دونوں مذاہب کے لوگ امن و امان سے
پشتہا پشت زندگی بسر کر چکے ہیں اور اسی کا اب بھی یہ اثر ہے کہ ایک ہی
بنیا۔ بزاز۔ حجام۔ مالی۔ لوہار۔ سُنار۔ دونوں کی روزانہ ضروریات
پوری کر رہا ہے۔ مسلمانوں نے علیحدہ ہٹ کر کوئی سول لائنیں نہیں قائم کیں ابھی
ہیں خاص میرے محلہ کے ہندو بچے میرے والد کو اسی طرح سے چچا یا دادا
کہکر خطاب کرتے تھے۔ جیسے کہ میرا فرض تھا کہ اپنے والد سے ملنے والے
ہندو احباب کو خطاب کروں۔ اگر قدیم سے مذہبی رواداری نہ ہوتی تو اس
تمدن کے بڑے بڑے یہ آثار اس طرح سے آج کیونکر باقی رہتے۔ اس میں شک
نہیں کہ یہ تمدن اب سُرعت سے مٹتا چلا جا رہا ہے۔ جس کے اسباب پر غور کرنے
کا یہ موقع نہیں مگر اب بھی جا بجا اُن لوگوں کی مثالیں ملتی ہیں جنھوں نے اس
مذہبی رواداری کی آب و ہوا میں پوری نشوونما پائی ہے مجھ کو امید ہے کہ
میرے معظم و مکرم راجہ راجایاں سرکشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنۃ جی
سی۔ آئی۔ ای مجھ کو معاف فرمائیں گے۔ اگر ان کی ایک خانگی تحریر کا ذکر
کر دوں ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں عید الضحیٰ کے موقع پر اپنے اہل اسلام احباب
کو مہاراجہ صاحب ممدوح نے ایک مبارکباد لکھی تھی چنانچہ مجھ کو بھی کمال عنایت سے

یاد فرمایا تھا اُس تحریر کی نقل کرتا ہوں۔

ہُوالکل مُعِینُ یا مُعین

خدا کہنے پہ کہتے ہیں نہیں پڑتا ہے کیا کہئے ۔ اگر پڑتا تُما کہتا ہو کہتے ہیں خدا کہئے

مری وحدت پرستی پر کبھی اتنا دباؤ ضعف ہے میں ۔ نہیں کچھ کہتے بنتا ہے اگر کہئے تو کیا کہئے

یہ جھگڑے تو چلے ہی جائینگے اتنا آپ دیں آؤ ۔ مُحبُوبِ نوید آمد عید الضحٰی کہئے

میں اپنے جوابی شکریہ کے خط کے چند جملے نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

"اگر ہندو مسلمان ہندوستان کے دو دریا ہیں تو آپ ان کے سنگم ہیں۔ اگر ہندو
مسلمان ایک جسم کی دو آنکھیں ہیں تو آپ اُن کا نرکس اور وہ نقطہ ہیں جہاں
دونوں کی روشنی مل جاتی ہے۔ افسوس! ہندوستان میں ایسے نفوس کم ہوتے جا رہے ہیں"

المختصر مہاراجہ صاحب اس ملک کے قدیم تمدن کے عظیم الشان نمونہ ہیں کیا اختلاف مذہب ہندو مسلمانوں میں گہری دوستی قائم ہونے کا کبھی مانع ہوا؟

میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ کبھی مانع نہیں ہوا۔

بابو شیو سہائے مرحوم لکھنؤ کے ایک محلہ "عیش باغ" میں رہتے تھے۔ طالب علمی کی حالت میں انہوں نے ایک کلب قائم کیا تھا جس میں بحیثیت طالب علم میں بھی شریک ہوا۔ ہماری دوستی کے پینگ اتنے بڑھے کہ ایک ساتھ خورد و نوش میں عار نہ رہا۔ جب جون ۱۸۹۴ء میں معلوم ہوا کہ میں امتحان بی اے میں کامیاب

ہو گیا۔ اُس وقت تک بابو شیو سہائے ایل۔ ایل۔ بی پاس کر چکے تھے مثل ایک بڑے بھائی کے انہوں نے مجھ کو حکم دیا کہ اسی سال نومبر کے مہینہ میں مجھ کو ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان میں شریک ہونا پڑیگا۔ میرا دلی رجحان طبابت و ڈاکٹری کی طرف تھا لیکن انہوں نے قانون کیلئے مجبور کیا۔ اُس زمانہ کے قواعد کے بموجب لالکچرس ایف۔ اے کے ساتھ ساتھ میں نے پورے کر لئے تھے۔ پھر بھی زمانہ بہت کم تھا علاوہ بریں ایم۔ اے میں بھی شریک تھا۔ طبیعت ہچکچاتی تھی۔ میں تو کاندھا ڈالے دیتا تھا۔ بابو شیو سہائے نے کہا نہیں۔ تم کو اسی سال شریک ہونا پڑے گا۔ میں اپنے اس ہندو دوست کی شفقت کو کبھی نہیں بھولونگا۔ دن دن بھر میرے لئے قانون کی کتابوں کے خلاصے بناتے تھے مجھے رات کو آکر پڑھاتے تھے۔ ہالینڈ جورسپروڈنس کا مشہور بابو شیو سہائے کا خلاصہ جو بعد کو انہوں نے طبع کرایا اور جس سے سینکڑوں ایل۔ ایل۔ بی کے طلبا فیضیاب ہوئے اُن کی اسی زمانہ کی تصنیف ہے۔ ۱۷ جولائی ۱۸۹۴ء کو میں نے قانون پڑھنا شروع کیا۔ ۲۶ نومبر ۱۸۹۴ء کو امتحان ایل۔ ایل۔ بی شروع ہوا جب جنوری ۱۸۹۵ء میں میرے پرنسپل مسٹر وھائٹ نے الہ آباد یونیورسٹی کے قانونی امتحان کے اشاعتِ نتیجہ کی کمیٹی سے واپس آکر مجھ کو قبل سے قبل یہ خبر پہنچائی کہ میں اول درجہ (فرسٹ ڈویژن) میں کامیاب ہوا۔

جب یہ خبر بابو شیو سہائے کے کانوں تک گئی تو ان کی مسرت کا اندازہ سوائے میرے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ بابو شیو سہائے مرحوم ہندو تھے۔ مسلمان نہ تھے لیکن کیا یہ اختلاف سچی دوستی کا مانع ہوا؟ ان باتوں کے لکھنے سے میرا یہ مقصود

نہیں ہے کہ ہندوستان میں آج کے قبل ہندو مسلمانوں میں مذہبی جھگڑے کبھی نہیں ہوئے بلکہ میرا مقصد صرف مقدر ہے کہ اس ملک کی عام حالت ہندو مسلمانوں میں مذہبی رواداری کی رہی ہے۔ عام طور سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ امن وامان کے ساتھ رہتے بستے رہے ہیں۔ یہ ہمارا اصلی تمدن اورنگ زیب کے زمانہ میں تھا اور اب بھی بہت کچھ باقی ہے جس کی نظر سے موجودہ زمانہ کے حالات مجھ کو مجبور کرتے ہیں کہ اصل مضمون سے کسیقدر ہٹ کر عام مذہبی رواداری کے متعلق اظہار رائے کروں۔ اور پہلے میں اُن اہل اسلام سے پوچھتا ہوں جو کہ اپنی زندگی میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مندروں کے پاس سے ہوکر گزرے ہیں کہ کیا ان مندروں کو دیکھ کر کبھی بھی کوئی جوش اُن کے دل میں اس قسم کا پیدا ہوا کہ وہ مندر مسمار کر دئے جائیں یا اُن کی صورت اُن کی آنکھوں کو ناگوار معلوم ہوئی اور اگر ایسا ہوا تو لاکھوں میں سے کتنے کے دلوں میں اور اسی طرح اُن اہل ہنود سے بھی پوچھتا ہوں جو ہزاروں مسجدوں کے پاس سے ہوکر روزانہ گذرے ہیں کہ کیا صرف اُن مسجدوں کو دیکھ کر کوئی مذہبی ولولہ اُن کے دل میں پیدا ہوا اور اگر ہوا تو لاکھوں میں سے کتنے کے دلوں میں؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہماری پنج وقتہ اذان اہل ہنود کے لیے ایک معمولی صدا ہوگئی ہے اسی طرح عام اہل اسلام کو ناقوس صرف ایک ایسی شئے معلوم ہوتی ہے جس میں سے سانس اور ہوا کے زور سے ایک بلند آواز نکلتی ہے اس میں اور عیسائیوں کے کلیسے کے گھنٹوں میں کیا فرق ہے؟

مسلمانوں کو نہ مندر کی عمارت سے کوئی خاص دشمنی ہے اور نہ ناقوس کی آواز سے کوئی خاص نفرت ہے۔ جو کچھ فرق ہے وہ خدا کے تصور میں ہے پتھر اور مٹی

کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آخر مسجد و مندر و ناقوس کے جھگڑے بعض اوقات ہیبت ناک صورت میں جا بجا کیوں پیش آجاتے ہیں اور اُن سے وہ ناگوار اور تکلیف دہ نتائج کہ جن کا خیال کرنا ہی ہر امن پسند صلح جو دل کو روح فرسا ہوتا ہے۔ نمودار ہوتے ہیں۔ میری دانست میں اس قسم کے تنازعات کی ابتدا میں اصلی مذہبی جوش کو اسقدر دخل نہیں ہوتا جسقدر اغراض ذاتی اور نفسانیت کو ہوتا ہے جن کی جڑ جہالت و انسانی کمزوریاں ہیں مثلاً بعض اوقات کسی مقام کے چند سربراوردہ اشخاص میں کوئی خصومت قبل سے چلی آتی ہے محض اسکی بنا پر وہ کسی مذہبی رسم کی انجام دہی کے موقع پر مذہب کی آڑ میں اس طرح کچھ امور پیش کر دیتے ہیں کہ لوگوں کو برانگیختگی ہوتی ہے اور اسکے بعد عام مسلمان اور ہندوؤں کی شرکت اور پارٹی بندی خودداری کے اصول پر شروع ہوتی ہے اور اُسوقت کسی ذاتی خصومت، غرور و خودداری سے وہ نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کو ہم صرف مذہبی جوش پر محمول کرتے ہیں بعض اوقات ہمارے اوہام بھی ایسے تنازعات کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر اہل ہنود نے عشرۂ محرم میں مسجد کے قریب باجا بجا دیا یا ناقوس پھونک دیا تو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اُس سے غرض ہماری توہین تھی خواہ دراصل یہ غرض ہو یا نہ ہو شریر النفس لوگ جاگزیں ہی کراتے ہیں کہ توہین کرنا مقصود تھا۔ پھر خودداری کا مادہ مثل باد تند کے اس شعلہ کو بھڑکا دیتا ہے بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جب ایک مقام پر ایک ہی وقت دونوں فرقے اپنے مذہبی رسم ادا کرنے میں مشغول ہوتے ہیں تب چند لوگ ایسے بھی نمودار ہو جاتے ہیں کہ جو

مذہبی جس تو کچھ نہیں ہوتا لیکن لاٹھی، تلوار، اور پتھروں کی زور آزمائی میں لطف آتا ہے ۔ یہ تو عام صورتیں ہیں کہیں کہیں شاذ و نادر مذہبی جوش کو بھی دخل ہو جایا کرتا ہے ۔ مگر یہ عالم صورتیں ایسی نہیں ہیں کہ اس ملک میں مذہبی رواداری قائم رکھنے کے لئے ایک غیر ہندوستانی قوم کا دائمی تسلط لازمی ہو ۔ یہ عام صورتیں انسانی خلقت اور کمزوریوں کے وہ شعلے اور چنگاریاں ہیں جو ہر ملک میں ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں نکلا کرتی ہیں اور جب تک انسان باقی ہے نکلا کریں گی ان کا انسداد بہت کچھ حکومت کی انتظامی قابلیت پر منحصر ہے اور ان کو مذہب سے اسقدر تعلق نہیں ہے جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے ۔ آج ایسا کون ملک ہے جہاں انسانوں کے جذبات سے بعض اوقات خونریزی کے نتائج نہیں پیدا ہو جاتے اگر ہندوستان میں کبھی کبھی مذہبی جھگڑے ان کے باعث ہوا کرتے ہیں تو یورپ کے ممالک میں آئے دن کی ہڑتال اور سیاسی امور میں اختلاف رائے اسی قسم کے فسادات کے موجب ہو جاتے ہیں ایسے ممالک جیسے جرمنی، یونان، اٹلی فرانس، آئرلینڈ، وانگلستان میں بھی وقتاً فوقتاً ان جذبات کے اظہار میں ایک دوسرے کا سر توڑنے پر لوگ آمادہ ہو جاتے ہیں جس ملک کی آبادی تخمیناً ۳۲ کروڑ ہو اس میں کبھی کبھی کہیں کہیں جھگڑوں کا پیش آنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے ۔

جیسا کہ مہاتما گاندھی نے بھی فرمایا ہے ۔ اس کا خوف نہ کرنا چاہیے کہ برٹش انڈیا میں بحالت خود مختاری ہندو مسلمانوں کو ہضم کر جائیں گے یا مسلمان ہندوؤں کے مذاہب کو نیست و نابود کر دیں گے ۔ جب کئی سو برس کی اسلامی حکومت

نہ کر سکی تو پھر اس صدی بھی مسلمان کیا کریں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے تنازعات کو مذہب سے زیادہ تعلق نہیں ہے اور ان کا انسداد کافی انتظام سے ہو سکتا ہے۔

اے بھائیو! گزشتہ صدیوں میں اپنی انتظامی قابلیت سے اس قسم کے تنازعات کا سد باب کرتے رہے ہو اور آئندہ بھی کر سکو گے۔

اگر مجموعی حیثیت پر غور کیا جاوے تو ہندوستان کی بڑی بڑی دیسی ریاستوں میں مذہبی رواداری برٹش انڈیا سے کم نہیں ہے اور اس قسم کے تنازعات کو رفع کرنے میں اُن کی انتظامی قابلیت کسی طرح برٹش انڈیا کے حکمرانوں سے کم نہیں ہے۔

اے برادرانِ وطن! مایوس نہ ہو۔ مجموعی حیثیت سے تم میں مذہبی رواداری کا کافی مادہ اب بھی موجود ہے

باب چہارم

تجارت و تموّل و فارغ البالی

اورنگ زیب کے زمانہ میں ہند کی تجارت و تموّل و فارغ البالی کی جو حالت تھی اُس کا حال پڑھ کر ہم کو اپنے موجودہ افلاس پر افسوس معلوم ہوتا ہے جبکہ کروڑ بنی نوع انسان کو سوائے ایک وقت کے دوسرے وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا ہے اورنگ زیب کے زمانہ میں تجارت سے دو طرفہ تموّل بڑھتا تھا۔ باہمی تجارت کرنے والے دونوں ملک دولت سے مالامال ہوتے تھے۔ ہندوستان کا بیشمار مال ولایت، پرتگال، ہالینڈ اور فرانس کو جایا کرتا تھا اور اسی طرح سے ان ممالک کے لوگ ہندوستان کو مال بھیجتے تھے۔ اس باہمی مساوات سے اس ملک کے تجار کی یہ حالت تھی کہ کپتان ہملٹن ایک مقام پر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ عبدالغفور نامی ایک سوداگر سورت میں رہتا ہے جس کا سرمایہ تجارتی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی کل تجارت و سرمایہ کے برابر ہے۔

"میں نے دیکھا ہے کہ ایک سال میں مال کے تقریباً (۲۰) جہاز بھر کر وہ بھیجتا ہے ہر ایک جہاز ۲۰۰ سے لیکر ۸۰۰ ٹن کا تھا۔ اور ہر ایک میں صرف اُس کا مال دس ہزار پونڈ اور بعضوں میں ۲۵۰۰۰ پونڈ کا تھا۔ اور جب یہ مال باہر روانہ ہو چکتا تھا تب بھی اُس سے زیادہ مال اس کے پاس آئندہ کے لئے باقی رہتا تھا"

جلد اول صفحہ ۱۴۷ - ۱۴۸

ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کے پاس بڑے بڑے عمدہ جہاز ہیں

ہندوستانی انگریز ملاحوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیکر بحیثیت کپتان اور میٹ لازم رکھتے ہیں۔ (جلد اول صفحہ ۲۲۴)

ملابار کے کنارے پر ایک قوم آباد تھی جو غالباً اب "ماپلا" کے نام سے مشہور ہے انکی نسبت لکھا ہے کہ یہ لوگ یورپ کے براعظم کو مچھلیاں بھیجتے ہیں عام طور سے لوگ ہندوستان سے لوا قیمتی جواہرات وچوبینہ بھیجا کرتے تھے ایک قسم کا رنگ بھی بھیجا جاتا تھا جس سے چھینٹ ایسی خوبصورت چھپتی تھی کہ بقول ہلٹن دنیا میں کہیں کا رنگ اس کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ میں نے خود بھی میسور کے عجائب خانہ میں ہندوستان کی پرانی چھینٹ دیکھی ہے جو لہسن اس ملک سے جایا کرتا تھا اسکی نسبت بھی کپتان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یورپ میں اس سے بہتر ذائقہ کا لہسن دستیاب ہونا دشوار تھا۔

ہندوستان کا کپڑا ایسا عمدہ ہوتا تھا کہ اسکی مانگ نہ صرف ولایت میں تھی بلکہ ایسے مقامات پر بھی تھی جیسے پیگو وسماٹرا وغیرہ

(جلد اول صفحہ ۲۹۶ - ۳۵۰)

جنوبی ہند کے بڑے بڑے ہندو راجہ تجارت کیا کرتے تھے۔ ساحل ہندوستان کے جنوبی حصہ سے جب کپتان صاحب کا جہاز گذرا تو اُن کو ایک مقام پر خفیف سا ٹیکس راجہ صاحب کو ادا کرنا پڑا جب کپتان صاحب راجہ صاحب سے ملاقات کرنے گئے اور غالباً ٹیکس کی شکایت کی تو راجہ نے کہا کہ یہ تو بہت معمولی بات ہے فرض کرو کہ غیر اقوام کے لوگ ولایت بغرض تجارت جائیں تو اُن سے بھی وہاں ٹیکس لیا جائے گا۔ علاوہ بریں ہم لوگ تمہاری جان ومال کی حفاظت کے

ذمہ دار ہیں لہٰذا ایسا خفیف سا ٹیکس لینا ایک واجبی بات ہے۔

(جلد اول صفحہ ۲۹۹)

شاہی ٹیکس جو تجار کو دینا پڑتا تھا وہ بھی بہت کم تھا تجارتی مال پر مسلمانوں سے (۲) فیصدی ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اور عیسائیوں سے (۳) یا (۲ ½) فیصدی لیکن مسلمانوں کو ایک اور دوسرا ٹیکس بھی اپنے مال پر دینا پڑتا تھا جو (۲) فیصدی تھا۔ کپتان ہملٹن صاحب نے اسکو "پال ٹیکس" لکھا ہے۔ یہ پال ٹیکس عیسائیوں سے نہیں لیا جاتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے ٹیکس کے معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت نہیں کیجاتی تھی۔ مزید برآں انگلستان کے تجار پر ابتداً اسقدر اعتبار کیا جاتا تھا کہ جب وہ مال ساحل ہندوستان پر اتارتے تھے تو فوراً کوئی محصول اُن سے نہیں لیا جاتا تھا۔ بلکہ آخر سال میں جسقدر مال واقعی فروخت ہوتا تھا۔ اُس پر انہیں کے خیالی عمل پر اعتبار کر کے محصول لیا جاتا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس معاملہ میں زیادہ دیانت سے کام نہیں لیا جسکی وجہ سے وہ طریقہ اختیار کرنا پڑا جو اسوقت رائج ہے یعنے جوں ہی مال سرزمین ہندوستان پر آتا جاتا تھا اس پر محصول کا حساب لگا لیا جاتا تھا۔ ہم ایک دوسرے موقع پر اُس خط و کتابت کی نقل کریں گے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اور گورنمنٹ مغلیہ کے سورت کے گورنر کے مابین ٹیکس کے معاملہ میں ہوئی ہے اُسی سلسلہ میں ہم یہ بھی دکھلائیں گے کہ اورنگزیب کے زمانہ میں گورنمنٹ نے تجار کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری اسقدر اپنے ذمہ لے لی تھی کہ اگر اُن کا مال چوری جاتا تو گورنمنٹ خزانہ شاہی سے نقصان کی تلافی کر دیتی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان کی تجارت کا مقابلہ یورپ کے بڑے بڑے ممالک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی تجارت و مال کی درآمد و برآمد کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف شہر سورت میں چنگی کی آمدنی تیرہ لاکھ روپیہ سالانہ ہوتی تھی اور احمد آباد میں ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ سالانہ چنگی کی آمدنی تھی
ملاحظہ ہو (جلد اول صفحہ ۱۲۸)

بنگال میں صرف دریائے ہوگلی سے (۵۰ یا ۶۰) جہاز مال سے بھرے ہوئے سالانہ تجارت کے لئے بیرون ہندوستان بھیجے جاتے تھے ایک ایک ہزار میل کے فاصلہ سے یہ مال کشتیوں پر لایا جاتا تھا۔ اس میں زیادہ تر افیون، مرچ، سونٹھ تمباکو اور کپڑا ہوتا تھا۔ (جلد دوم صفحہ ۲۱)

کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ تمام ساحل ہند پر ہندوستانیوں کے بڑے بڑے جہاز تجارتی مال سے لدے ہوئے چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں۔
(جلد اول صفحہ ۴۵)

آج وہ ہمارے تجارتی جہاز کہاں چلے گئے۔ آج جب کونسل میں یہ تجویز پیش کیجاتی ہے کہ ہندوستانیوں کو جہازی بیڑہ تیار کرنے کی اجازت ہو اور یہ کہ ان کو جہاز رانی سکھلانا چاہیئے تو دبی زبان میں انکو نا قابل کہا جاتا ہے لیکن افسوس ہے ہماری گزشتہ تواریخ پر نظر نہیں ڈالی جاتی ہم صرف بھولا ہوا سبق یاد کرنا چاہتے ہیں اگر ہم سبق بھولنے کے وجوہ بیان کرنے بیٹھیں گے تو یہ کام بہت رنج دہ و ملال انگیز ہوگا۔

یہاں تک تو اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان کی تجارت اور تمول کا بیان

کیا گیا ہے اب اہل ہند کی فارغ البالی کا حال سنئے اگر اشیاء مایحتاج کی ارزانی لوگوں کی خوش حالی و فارغ البالی کبھی حکومت کی کامیابی کا ثبوت قرار دیا گیا ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہندوستانی رعایا بہت فارغ البال و خوشحال تھی۔

کپتان ہملٹن صاحب لکھتے ہیں کہ بیف (گائے کا گوشت) تین فارد نگ یعنے کچھ کوڑیوں کو نصف سیر ملتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۱۶۱)

ایک ٹن یعنے کئی من نمک ایک کراؤن میں فروخت ہوتا تھا۔ جو کہ غالباً دو یا ڈھائی روپیہ کے برابر ہوتا تھا

(جلد اول صفحہ ۲۵۵)

ساحل کارومنڈل کے کنارے ساڑھے تین آنہ میں ۲۰ پونڈ مچھلی جو کہ ذائقہ میں ٹراؤٹ اور سامن کے برابر ہوتی تھی ملتی تھی۔

(جلد اول صفحہ ۲۷۹)

شہر کٹک میں مکھن ایک آنہ میں ایک پونڈ یعنے نصف سیر ملا کرتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۳۹۲)

دو آنہ میں ایک سو مچھلیاں فروخت ہوتی ہیں جو کہ اتنی اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ ان میں کی صرف دو مچھلیاں ایک آدمی کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہوتی تھیں

"شہر ڈھاکہ میں اشیاء مایحتاج اس کثرت سے اور اس قدر ارزاں دستیاب ہوتی تھیں کہ اسوقت اس کا یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے اور ملک بہت آباد تھا"

(جلد دوم صفحہ ۲۳)

میں نے ایک ایسے قابل اعتبار شخص سے سنا ہے جس نے کہ موسم سرما میں وہاں زندگی بسر کی ہے کہ پانچ سو اسی (۵۸۰) پونڈ چاول ایک روپیہ میں ملتا ہے"

(جلد دوم صفحہ ۲۵)

ہرن، بارہ سنگھے، مور، اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ لوگوں کے گھروں میں بلاخوف وخطر آجاتے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۱۲۴)

احمد آباد۔ دولت۔ ثروت اور عظمت میں یورپ کے بڑے بڑے شہروں سے کچھ ہی کم ہوگا صرف شہر سورت کی آمدنی ایک لاکھ باسٹھ ہزار پانچ سو دس (۱۶۲۵۱۰) پاؤنڈ تھی اور احمد آباد کی آمدنی اس سے دس گنی ہے۔ کپتان ہملٹن عہد اورنگ زیب کی بابت اپنی عینی شہادت دیتے ہیں کہ ہند میں یہ ترقی و ثروت تھی۔

*

(جلد اول صفحہ ۲۶۶)

کیا آج تمام یورپ کے بڑے بڑے مدبر اس میں متفق الرائے نہیں ہیں کہ ہر گورنمنٹ کی کامیابی کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ جو خدا کے بندے اسکے زیر حکومت ہوں وہ ننگے اور بھوکے نہ رہیں اسکی زیر حکومت ہر متنفس کو اگر پیٹ بھر کھانا پہننے کو کپڑا اور سر چھپانے کو مکان مل جائے تو گورنمنٹ کی اصلی غرض حاصل ہو جاتی ہے۔ آج اگر تہذیب و تمدن کی صرف سطح ظاہر پر نظر ڈالی جائے تو وہ کچھ ایسا عظیم الشان اور درخشاں نظر آئیگا کہ دیکھنے والے کی نظر خیرہ کریگی اور ایسا دلفریب و خوبصورت دکھائی دیگا کہ دل لوٹ پوٹ ہو جائے گا۔ مگر جب بنظر تعمق اس کی تہ کو دیکھا جائے تو یہ پتہ ملیگا کہ ہر یوروپین سلطنت اپنی رعایا کی صرف خورونوش کے انتظام میں منہمک ہے۔ ولایت میں لیبر گورنمنٹ اس مسلح

* شکار اس کثرت سے پایا جاتا تھا کہ جرمنی اور ولایت کے بڑے بڑے رؤساء صرف شکار کھیلنے کی غرض سے ہندوستان آیا کرتے تھے۔ (جلد اول صفحہ ۲۶۰)

کو حل کر رہی ہے۔ مجھ کو تو ۱۹۲۴ء کے یورپ کے سفر میں یہ محسوس ہوا کہ اس وقت یورپ کے باشندے روپیہ پیدا کرنے کی دھن میں ہیں نہ حق و ناحق کی پرواہ ہے نہ واجب و ناواجب کا کچھ لحاظ خصوصاً وہ جب کسی اجنبی سے معاملہ کرتے ہیں۔ خیر سفر میں میری یہ نظر تو سرسری تھی مگر کپتان ہملٹن کا سفرنامہ پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ہند کے باشندے اپنی زیست کے اسباب فراہم کرنے میں اسقدر حیران و پریشان نہ تھے جیسا کہ آج نظر آرہے ہیں بلکہ دنیا کے اس وقت کے حالات کے اعتبار سے ان کی تجارت، دولت، ثروت اور فارغ البالی یورپ کے ممالک سے اُس زمانہ میں اگر بڑھی چڑھی نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔ موجودہ افلاس کو عہد اورنگ زیب کی خوشحالی سے مقابلہ کیجئے اور پھر لوگوں کی فارغ البالی کا فیصلہ کرئے۔

باب پنجم

انصاف امن و امان

ہر حکومت کا دارومدار انصاف پر ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ہادی برحق رسول خدا کا آب زر سے لکھنے کے قابل یہ ارشاد ہے کہ انصاف و کفر کے ساتھ سلطنت کی بقا ممکن ہے مگر ظلم و اسلام کے ساتھ وہ ہرگز باقی نہ رہیگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اسلامی سلطنت اپنی رعایا کے ساتھ عام اس سے کہ وہ مسلمان یا غیر مسلمان کوئی ہو یکساں انصاف کرنا بقائے سلطنت کا موجب سمجھتی آئی ہے اور شرع اسلام میں قضا کو حکم

کہ ابن مسلم وغیرمسلم ہی وہ یہی فیصلہ کریں جو مقتضائے نصفت و عدالت ہو۔ انصاف وہ
مقدس عمل بلکہ عبادت ہے کہ جس کی بجا آوری میں ذات پات اور مذہب کو
کچھ دخل نہ ہونا چاہئے۔ انصاف صرف سلاطین اور قضاۃ ہی کا فرض نہیں ہے
بلکہ ہر شخص پر واجب ہے کہ ایک دوسرے سے انصاف کرے اور انصاف چاہے اور
جب تک انصاف نہ ہو انسانوں کا ایک ساتھ مل چلنا۔ جینا غیر ممکن ہے انصاف
ہر سوسائٹی کی جان ہے۔ اگر کسی تمدن میں انسانوں کے دل سے ایک دوسرے
کے حقوق کی پاسداری و حفاظت کا خیال نکال ڈالا جاوے تو وہ تمدن ایک
دم سے درہم برہم ہو جائے گا یوں تو انصاف رواداری اور حسن سلوک کی ہر ملک
اور قوم کو ضرورت ہے لیکن ہر تمدن میں انسانوں کے باہمی حقوق کا تخیل و تصور
مقامی عادات و رسم و رواج کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ انصاف
کا تصور بھی مختلف ہوتا ہے اور جب ہر قوم کے خیال کے مطابق انصاف ہوتا ہے
تو وہ اسکو انصاف سمجھتے ہیں ورنہ ظلم۔ چاہے عامل نے اپنی سمجھ میں کیسا ہی جائز
اور درست عمل کیا ہو۔ مثلاً دیکھئے کہ دو ہزار برس قبل ہندوستان کا ایک خاص
نوع کا تمدن تھا اس زمانہ کے حالات کے اعتبار سے اہل ہند کی خاص ضرورتیں
اسوقت کے خیالات کے تعلق سے تھیں انھوں نے پیشوں کی تقسیم کر دی تھی اور
شادی و غمی و معاشرت حتیٰ کہ خور و نوش کے معاملہ میں ذات برادری کی آہنی
دیوار و سے انسانوں کی تقسیم مختلف طبقات میں اسطرح کر دی تھی کہ اگر ہندو زمانہ
کے کسی منصف سے یہ کہا جاتا کہ معاملات کے فیصل کرنے میں اس خاص تمدن کے تصور کو
ذہن سے مثلاً ایسے امر میں نکال ڈالے کہ اگر کوئی نائر یا چھوت والے شودر نے

کسی برہمن کو چھو لیا ہے تو وہ کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوا تو غالباً وہ منصف انصاف کے اس تصور پر تمسخر کی نگاہ سے دیکھے گا یہ ہندوؤں کی کیفیت اُن کے ابتدائی تمدن میں تھی اس کے بعد جب مسلمانوں کا تمدن آیا اس نے ہند کے تمدن میں کچھ نئے عنصر داخل کئے جنکی وجہ سے انسانوں کے خیالات اور ضرورتیں بدل گئیں اور ہند کے باشندوں میں وہ خلط ملط شروع ہو گیا جو کہ تمام انسانوں کو ایک سطح پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس نئے تمدن نے انصاف کے تصور و تخیل کو بھی بدل دیا لہذا جب ہم کسی ملک کے انصاف رسانی کے طریقوں پر واجبیت یا ناواجبیت کا فتوےٰ دینے بیٹھیں تو انصاف یہی ہے کہ ہم اُس زمانہ کے تمدن و ضرورتوں کو پیش نظر رکھیں اس لئے جو انصاف عہد اورنگ زیب میں تھا اس کے متعلق فتویٰ دیتے وقت ہم کو بھی اصول پیش نظر رکھنا چاہئے۔ یعنے وہ تمدن کونسا تھا اور اس زمانہ کی ضرورتیں کیا تھیں۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں گو کہ ڈاک کا انتظام اس حد تک کر دیا گیا تھا کہ ہندوستان کے دُور دُور مقام سے دہلی تک خطوط پہنچنے میں صرف آٹھ یوم صرف ہوتے تھے۔ اور ہر پانچ میل کے فاصلہ پر ہرکارے بدل دیئے جاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۱۴۹)

پھر بھی ریل نہ تھی، تار نہ تھا، سڑکیں اس حالت میں نہ تھیں جیسی کہ آج ہیں انسان اُس حد تک خلط ملط نہیں ہوئے تھے جیسے کہ آج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کپتان ہملٹن نے اکثر مقامات پر جو تصویر اُن سزاؤں کی کھینچی ہے جو کہ قاتلوں یا

ڈاکوؤں کو دی جاتی تھیں وہ آج ہم کو ہیبت ناک معلوم ہو رہی ہیں مگر اس زمانہ
کے حالات اور ضرورتوں کے لحاظ سے وہ کچھ بھی ناواجبی نہیں تھیں۔ کپتان ہملٹن
نے اس زمانہ کی عدالتوں کا پورا دستور العمل یا تنظیم ہم کو نہیں بتائی۔ البتہ سورت کے
قاضی کی بابت یہ لکھا ہے کہ وہ راشی تھا اور اکثر زرِ ڈگری میں (۲۵) فیصدی
اپنا حصہ لیتا تھا اور امیر و دولتمند غربا کے مقابلہ میں اکثر بازی لے جاتے تھے
ممکن ہے کہ سورت کے قاضی کی یہی حالت ہو جس سے آج بھی دنیا خالی نہیں ہے
مگر ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مجموعی حیثیت سے انصاف کی کیا حالت تھی انصاف رسانی
کا پورا انتظام تھا یا نہ تھا۔ اس کا بہترین معیار یہ ہوگا کہ ملک کی اندرونی حالات
پر نظر ڈالی جائے۔ کیا وہ نشانات و اثرات بخوبی نمودار تھے جو انصاف سے عموماً
پیدا ہوا کرتے ہیں۔ کیا اہل ہند دنیا کے کاروبار کو باطمینان تمام چلاتے تھے
اگر مذہبی رواداری اس قسم کی تھی جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگر ملک میں تجارت
و تمول و فارغ البالی و صنعت و حرفت ویسی ہی پائی جاتی تھی جیسا بیان ہوا
تو پھر یہ کہنا دشوار ہے کہ عہد اورنگ زیب میں انصاف نہ تھا۔ یہ ثمرات اور
نتائج بلا امن و امان و عدل و انصاف کبھی کسی ملک کو میسر نہیں ہوتے بس
عہد اورنگ زیب کی یہ جو کچھ حالات لکھی گئی ہے یقیناً اس عہد کے امن و امان اور
عدل و انصاف کے ہی بدولت تھی۔ کیا ایک درخت میں سیب کا پھل لگا ہوا دیکھ کر
پھر بھی یہ کہنا کہ یہ درخت سیب کا نہیں ہے انصاف ہوگا؟

کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامے کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں
انصاف کا چشمہ سکون کے ساتھ جاری ہے اور گو کہ اس چشمہ کے صاف و شفاف

دھارے کو بعض اوقات رشوت کے خس و خاشاک مکدر اور گدلا کر دیتے ہیں
مگر اس عہد کی مجموعی حالت انصاف کا فیصلہ اس نقاد سیاح نے ہر معنی فقرے
سے کیا ہے۔

"لیکن سیاہ فام ہندوستانیوں میں رشوت ستانی اس سے زیادہ نہیں ہے جتنی کہ
گورے چہرے والوں میں ہے" (جلد اول صفحہ ۱۰ دیباچہ)

اس موقع پر گورے چہرے والوں کی رشوت ستانی و مظالم کے کچھ حالات بیان
کئے بغیر شاید عہد اورنگ زیب کے زمانہ کی قدر اور اس عہد کے انصاف کا
پورا اندازہ ناظرین کو نہ ہو سکے۔ لہذا کپتان ہملٹن کے سفرنامے سے چند اقتباس
کرتا ہوں:۔

ایک شخص مسٹر ولڈن Weldon نامی ایسٹ انڈیا کمپنی کے
معاملات طے کرنے کے لئے انگلستان سے ہندوستان بھیجا گیا تھا اس کے چال
چلن کے متعلق کپتان ہملٹن صاحب لکھتے ہیں:۔

"اس کا زمانہ گورنری بہت مختصر سا تھا۔ لیکن اس میں بھی اس نے لوگوں کو تنگ
کر کے اپنا خزانہ بھرنے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ اس کے مظالم کی ایک خاص مثال
یہ ہے کہ"

"ایک غریب ملاح کی ایک خوبصورت بیوی تھی جو اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں
کبھی کبھی کچھ بدعنوانیاں بھی کر گذرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس عورت نے دو آرمینیوں
کو اپنے یہاں بلایا۔ ان میں اس عورت کے متعلق رقابت ہو گئی۔ شدہ شدہ"
"اس کی خبر گورنر کے کان تک پہنچی۔ اس نے پہلے تو ان دونوں کو طلب کر کے کچھ"

سرزنش کی لیکن جب اُمین ؔ ایک نے گورنر کے ہاتھ میں پانچ سو روپیہ رکھ دیئے تو اُس کو بلا شرکت غیرے اس عورت کا مالک بنا دیا اور وہ اس کو لیکر ہوگلی چل دیا۔ یہ شخص علانیہ کہتا پھرتا تھا کہ اس سودے میں اسکو کیا خرچ کرنا پڑا اور وہ اُس گورنر کا بڑا مداح تھا۔ جب اس عورت کا بے چارہ شوہر واپس آیا تو اس کو بیوی کی مفارقت پر مجبوراً صبر کرنا پڑا باین ہمہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گویا اس گورنر کو رشوت لینے میں کچھ شرم دامنگیر تھی یا اندیشہ مانع ہوتا تھا اس لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جو لوگ اس قسم کے معاملہ کے واسطے اُسکے پاس آیا کرتے تھے اُن سے کہہ دیا کرتا تھا کہ میم صاحب اور بابا لوگ سے بات کرو اور اسکی بیوی اور اسکی لڑکی نہایت عمدگی کے ساتھ بڑی بڑی رقمیں ٹہرالیتی تھیں اور روپیہ انہیں کے ہاتھوں سے پہنچتا۔ میں یہاں اور ہندوستان کے دوسرے مقامات پر اس قسم کی حیرت انگیز رشوت ستانی کی بہت سی مثالیں پیش کرسکتا ہوں مگر پرانے زخموں کی پوست کنی نہیں چاہتا۔"

(جلد دوم صفحہ ۱۰)

یہ عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کے انصاف کا عالم تھا۔ یہ مشتے از خروارے ہے اس قسم کے بہت سے واقعات کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامہ میں لکھے ہیں۔ اب اورنگ زیب کا جو انتظام امن و امان و انصاف کے متعلق تھا اس کی بابتہ کپتان ہملٹن صاحب کی رائے کو ملاحظہ فرمائیے وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"اُس ملک کی رعایا فرامین کی اسقدر پابندی کرتی ہے کہ ڈاکہ و قتل کی خبریں بہت کم سُنی جاتی ہیں۔ ایک غیر ملک کا باشندہ اس ملک میں کہیں چلا جاوے۔ کوئی یہ بھی نہیں پوچھتا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ اور کیوں جاتا ہے" (جلد اول صفحہ ۲۰۹)

پھر بھی کہا جاتا ہے کہ فرامین شاہی کی کوئی پرواہ نہ کرتا تھا اس امن و امان کا مقابلہ اس بدامنی وظلم وستم سے کیجئے جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں نے ہندوستان کے اس خطۂ زمین پر پھیلا رکھی تھی جس کو بغرض تجارت شاہان مغلیہ نے اس کو سپرد کر رکھا تھا۔ جس کا مفصل بیان باب نہم (۹) میں کیا جائے گا۔

مسٹر جے۔ آر۔ رائے صاحب لکھتے ہیں کہ سمندر پر قزاقوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ اسکی ذمہ داری عہد مغلیہ کے انتظام پر عائد کیجائے ذرا یہ تو دیکھ لیا جاتا کہ یہ قزاق کون تھے۔ اور کیونکر ان کو قزاقی کا موقع ملتا تھا حقیقت یہ ہے کہ قزاق مخصوص ہندوستان کے ساحل کے نہ تھے بلکہ اس زمانہ میں ولایت سے لیکر ہندوستان تک و نیز دیگر مقامات کے سمندر پر چند لوگوں نے غارت گری کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا انہیں کو "پائی ریٹس" (Pirates) کہتے تھے۔ کپتان ہملٹن نے ان کا ذکر بھی اپنے سفرنامہ میں کیا ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہازوں کے افسر بھی بعض اوقات راہ میں قزاق بن جایا کرتے تھے۔ اور جو کوئی تجارتی مال راستہ میں مل جاتا لوٹ لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۳۶)

ایک انگریز مسمی کپتان گرین "Captain Green" یہ ڈینگ مارا کرتا تھا کہ جسقدر مختصر سامان لیکر وہ انگلستان سے روانہ ہوا تھا اس بے سروسامانی سے یہاں آنے کی شاید کسی شخص کی بھی ہمت نہ ہوئی ہوگی وہ بحری قزاقوں سے تجارت کیا کرتا تھا اور راستہ میں جو جہاز اسکو مل جاتا تھا اس کو لوٹ کر وہیں ڈبا بھی دیتا تھا۔ اور اسی طرح سے اپنی بسر اوقات کرتا تھا۔ (جلد اول صفحہ ۲۱۷-۲۱۸)

میں نے تجارت کے باب چہارم کے سلسلہ میں دکھلایا ہے کہ اُس وقت اہل ہند یورپ تک تجارت کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ قزاق بعض وقت راستے میں دیگر جہاز لوٹ لیتے ہوں جیسا کہ ہملٹن کے سفرنامہ کی جلد اول صفحہ ۲۱۵ سے معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اورنگ زیب اس غارتگری کے انسداد کا انتظام نہیں کرتا تھا۔ اور اس کا انسداد اُس زمانہ کے حالات کے نظر سے صرف ہند کے سمندر پر انتظام سے ناممکن تھا۔ پھر بھی بادشاہ کے فوجی جہازوں کا بیڑہ "ڈنڈا راجا پور" میں رہتا تھا۔ اس کا کمانڈر سیدی خاں تھا جس کے قبضہ میں (۳۰) یا (۴۰) ہزار آدمیوں کی فوج کا دستہ رہتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۲۴۰)

اسلئے یہ کہنا کہ سلطنت ہند کی طرف سے انسداد قزاقی میں بے پروائی کی جاتی تھی انصاف نہ ہوگا۔ رہی کامیابی و ناکامیابی وہ کہاں تک تھی اس کا فیصلہ اُس زمانہ کے حالات کی نظر سے کرنا چاہیئے خصوصاً جب کہ انسداد قزاقی کی غرض سے اُس کمانڈر کے پاس توپیں بھی تھیں ایک مرتبہ جب ضرورت پڑ گئی تو اسی کمانڈر نے آناً فاناً میں چار بڑی توپیں کروڑ گیری کی پاس عمارت پر چڑھا دیں تھیں جو کہ بمبی کے قلعہ سے صرف ۲۰۰ قدم کے فاصلہ پر تھی الغرض رعایا کی پوری طرح سے حفاظت کی جاتی تھی۔ کپتان جہانے مس چیش برس کی سیاحت میں صرف ایک موقع کا ذکر اپنے سفرنامہ میں یہ لکھا ہے کہ اُنہیں سرزمین ہند پر ڈاکوؤں سے اُن کا مقابلہ ہو گیا تھا ایک قافلہ کے ساتھ شہر سورت کی طرف کپتان صاحب موصوف اور اُن کے ہمراہی و ملازمین جا رہے تھے کہ چند قزاقوں کے گروہ نے جو کہ سرحد ہندوستان

کے باہر بلوچستان سے عموماً آیا کرتے تھے قافلہ کو روکنا چاہا۔ کپتان صاحب اور اُن کے ملازمین نے بڑی بہادری سے مقابلہ کر کے اُن کو بھگا دیا۔ قافلہ پر اس عزت کا بڑا اثر ہوا۔ یہ خبر اڑتی اڑتی شہر سورت میں پہنچی کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جب اُن کا قافلہ سورت کے قریب پہونچا تو اہالیان شہر نے مٹھائیوں اور تحفوں کے ساتھ اُن کا استقبال کیا اور جب کپتان جبانے گورنر سورت سے ملاقات کرنے کی خواہش کی تو اس نے چند گھوڑے زیور سے آراستہ و پیراستہ اور ایک باڈی گارڈ استقبال کے لئے روانہ کیا اور جب وہ قریب آئے تو آگے یہ آؤ بھگت کی کہ خلاف معمول و دستور کپتان صاحب کی سواری کو اپنے خیمے تک آنے کی اجازت دی انکے تمام مال و اسباب کا محصول معاف کر دیا اور بنفس نفیس خود فوج کا ایک دستہ لیکر اُن قزاقوں کو سزا دینے کے لئے روانہ ہوا۔

(جلد اول صفحہ ۱۱۹)

اسقدر خاطر مدارات کی غالباً یہ وجہ تھی کہ بقول کپتان صاحب بادشاہ وقت اورنگ زیب کو حفظ امن کا بیحد خیال تھا اور جب کبھی کسی مقام پر اس قسم کے واقعات ہوتے تھے تو اُن کی تمام ذمہ داری صوبہ کے گورنر کے سر ہوتی تھی ایک مرتبہ جب اورنگ زیب کو اطلاع ہوئی کہ سورت میں ڈاکہ پڑا تو بادشاہ کا حکم بدین مضمون شرف صدور لایا کہ فوراً شہر کے گرد چار دیواری بنا دی جائے۔

(جلد اول صفحہ ۱۴۵)

ایسے واقعات کا یہاں کبھی کبھی پیش آنا تعجب خیز نہ تھا اور کس زمانہ میں اور کس ملک میں ایسے واقعات نہیں پیش آتے رہتے ہیں اور یہ زمانہ کب اُن سے خالی کر

دیکھنا یہ چاہئے کہ اس زمانہ میں ملک میں امن وامان کی حالت یہ تھی کہ یہی تاجر مال واسباب لیکر ستره (۱۷) کہاروں کی پالکی میں سوار ساحل و وسط ہند میں برسوں پھرتا رہا مگر سوائے ان دو واقعات کے ہندوستان میں کوئی اور ایسا واقعہ اس کو پیش نہیں آیا جس کو وہ اپنے سفر نامہ میں درج کرتا ملک کی اس اندرونی حالت سے عہد اورنگ زیب میں انصاف وامن وامان کے متعلق رائے قائم کیجا سکتی ہے میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ عہد اورنگ زیب میں تمام عہدہ داروں کا دامن رشوت ستانی کے دھبوں سے پاک وصاف تھا یا کبھی ڈاکہ نہیں پڑتا تھا انصاف کے معاملہ میں جب کبھی دولت وغربت کا مقابلہ ہوجاتا ہے تو یہ حضرتِ زر مختلف صورتوں میں آج بھی بڑے بڑے کرشمے دکھلاتے ہیں۔ جو لوگ کہ موجودہ مقدمہ بازیوں کی اندرونی حالت سے واقف ہیں وہی اسکا کچھ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی روپیہ جھوٹی شہادت کے مہیا کرنے میں اور قانون کی امداد حاصل کرنے میں ایک دولتمند فریق کو کہاں تک مدد دیکر قوی بنادیتا ہے اور مفلس فریق مخالف کو کیسی کچھ لاچاری اور مجبوری کا سامنا ہوتا ہے اور اسطرح سے یہ حضرت زر آئے دن کیا کچھ انصاف کا خون نہیں کرتے رہتے ہیں۔ رشوت ستانی و ڈاکہ اور چوری اب بھی بند نہیں ہے ہمارے بچوں کو جو تاریخیں مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہیں انہیں ٹھگی کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ٹھگی کا انسداد ایسٹ انڈیا کمپنی کی عہد حکومت میں انیسویں صدی میں کیا گیا تھا اور اس کا فخر کمپنی مذکور کو دیا جاتا ہے مگر ان تاریخوں میں ملک کے اس امن وامان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا جو کہ قبل کمپنی کی حکومت کے تھا اور جس کا تذکرہ کپتان ہملٹن نے اپنے سفر نامہ میں کیا ہے اصلیت یہ ہے کہ اس

ملک میں ٹھگی اُسوقت آئی جب کہ حکومت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا جب اس ملک کے باشندوں نے اپنے انگریز حکمرانوں سے یہ کہا کہ عنان حکومت پھر اُن کے ہاتھ میں دیدیجائے تو بڑی کشمکش کے بعد اُن کو "ڈائی آرکی" (Diarchy) دیگئی جس کے بموجب ملکی انتظام کا ایک جزو انتخاب شدہ منسٹر یا وزیر کے سپرد ہوا اور دوسرا جزو گورنمنٹ کے سپرد رہا۔ اس طرح سے حکومت کی تقسیم ہوئی اس تقسیم کے دو ہی برس میں چل پکار مچ گئی دونوں حصوں میں اختلاف شروع ہوگیا۔ دو ہی برس میں بدامنی و بے اطمینانی کے آثار نمودار ہوگئے "ڈائی آرکی" ناکام ثابت ہوئی اور ہر دوراندیش شخص کہنے لگا کہ "ڈائی آرکی" حکومت کرنے کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ اب اُس "ڈائی آرکی" پر غور کیجئے جب ہندوستان کی حکومت شاہ مغلیہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدداروں میں تقسیم ہوئی تھی ملک کی اسوقت کیا حالت ہوگی جبکہ حکومت کا شعبۂ دیوانی کمپنی کے عہدداروں کے قبضہ میں آگیا اور دوسرا شعبہ مالگزاری شاہ مغلیہ کے سپرد رہا ایسے دو متضاد عنصر کا جمع رہنا محال تھا۔ پھر بھی سارا ملک اندازاً نصف صدی اُس عجیب و غریب "ڈائی آرکی" Diarchy کے تہلکہ میں گرفتار رہا۔ ان حالات میں ڈکیتی نہ ہوتی تو کیا ہوتا جو کچھ نہ ہوتا تھوڑا تھا۔ لیکن جب عنان حکومت کلیتاً اس ملک کے باشندوں کے ہاتھ میں تھی تب ایسی بدامنی یا ٹھگی نہ تھی اس وقت انصاف تھا اور امن و آمان تھا۔

بہ حیثیت قانون پیشہ اودھ کے بہت سے دیہات و تعلقہ جات کی واجب العرض پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا جن میں گاؤں یا تعلقہ کی گذشتہ تاریخ بھی بندوبست اول میں درج کیجاتی تھی مجھ کو اکثر یہ دیکھکر استعجاب ہوا کہ ایک گاؤں یا تعلقہ

پشتہا پشت تک ایک ہی خاندان کی ملکیت و قبضہ میں برقرار رہا یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ جس شخص نے تین سو یا چار سو برس قبل جنگل کاٹکر آباد کیا تھا اسی کی اولاد کے قبضہ میں وہ گاؤں ۱۸۵۷ء کے غدر میں بھی پایا گیا۔ اگر گزشتہ زمانہ میں انصاف و امن و امان نہ تھا تو کسی گاؤں کی مسلسل تاریخ اسطرح سے کبھی نہ ہوتی ان وجوہ سے جیسے موجودہ زمانہ کی بابتہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجموعی حیثیت سے انصاف نہیں ہے یا امن و امان قائم رکھنے کی کوشش نہیں کیجاتی ہے اسی طرح سے عہد اورنگ زیب کی بابت یہ کہنا کہ انصاف نہ تھا یا امن و امان قائم رکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی انصاف نہ ہوگا۔ یہ عہد اورنگ زیب کے انصاف او امن و امان کے نتائج تھے جو کہ ملک کی تجارت و تمول و فارغ البالی کے سلسلہ بیان میں ظاہر کیے جا چکے ہیں

باب ششم

صنعت و حرفت

تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جب کسی ملک میں انصاف ہوتا ہے تو امن و امان ہوتا ہے اور جب لوگ فارغ البال و خوشحال ہوتے ہیں اور جب تلاش معاش سے کسیقدر بے فکری ہوتی ہے تب ہی انسانی دماغ صنعت و حرفت کی جانب رجوع ہوتا ہے مفلس قوم دین و دنیا دونوں میں روسیاہ رہتی ہے۔

"الفقر سواد الوجه فی الدارین" میں کوئی شک نہیں جسطرح ہے

"پراگندہ روزی پراگندہ دل" کی مثل ایک متنفس پر صادق آتی ہے اسی طرح سے قوم پر بھی صادق آتی ہے اب آپ دیکھئے کہ عہد اورنگ زیب میں ہندوستان کی صنعت وحرفت کی کیا حالت تھی اس سے اس ملک کی خوشحالی کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں عمدہ سے عمدہ کپڑا اور بکثرت ایسا ملتا تھا جسکی مثال یورپ میں ملنی دشوار تھی پھر فرماتے ہیں کہ یہاں روئی کا ایک ایسا کپڑا بنا جاتا ہے جو بہت باریک اور ملائم ہوتا ہے اور اسقدر پائدار کہ ویسا انہوں نے کبھی اپنی زندگی میں استعمال نہیں کیا۔

(جلد اول صفحہ ۱۲۵)

غالباً یہ ڈھاکہ کی مشہور ململ ہوگی۔ اس کے علاوہ کمخواب چھینٹ اور سادے کپڑے بنانے والے اس کثرت سے پائے جاتے تھے کہ صرف ایک شہر بیجاپور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے (۵۰۰۰) پچاس ہزار کپڑا بننے والے جلاہے ملازم رکھ چھوڑے تھے لوگ پوچھیں گے کہ پھر یہ صنعت کہاں غائب ہوگئی۔

جن لوگوں کو اسکی جستجو ہو وہ رمیش چندر دت آئی۔ سی۔ ایس سی آئی۔ ای مرحوم کی کتاب "ہند کی ایکانمک ہسٹری" ملاحظہ فرمائیں۔ یہ پایۂ فخر ملک ہندوستانی ایک زمانہ میں اڑیسہ میں بہ عہدہ کمشنر ممتاز تھے اور پھر لندن کی یونیورسٹی کالج میں تاریخ ہند پر لکچرار مقرر ہوئے۔ انہوں نے ان سرکاری کاغذات کی مدد سے جو انکی نظر سے گزرے تھے یہ دکھلایا ہے کہ انگلستان کی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے لئے اور اس خوف سے کہ شاید ہندوستان کا کپڑا انگلستان کی منڈیوں تک

قبضہ کر لیوے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ دار ہندوستان کے نداف اور اُن کی
صنعت کو نیست نابود کرنے کی غرض سے مختلف اقسام کی تدابیر استعمال کرتے تھے
پہلے کچھ رقم پیشگی دیکر اُن کو ملازم رکھ لیتے تھے اور جو لوگ جانتے تھے وہ کام اُن سے
لیتے تھے اگر کسی نے کچھ بھی خلاف معاہدہ کیا تو ٹکٹکی میں باندھ کر بیدوں کی سزا
دیتے اور اُنکی انگلیوں کو مختلف اقسام کی ایذا پہنچاتے تھے۔ ۱۷ مارچ ۱۷۹۹ء
کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو حکام ماتحتین اپنے عہدہ داروں کے لئے جاری کی تہیں
ان کا پڑھنا بھی تکلیف دہ ہے۔ ہاؤس آف کامنس کمیٹی کے روبرو ۱۸۱۳ء میں جو
شہادت مسٹر منرو نے دی تھی اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کمپنی کے عہدہ داران
ندافوں کو بھیڑیوں کی طرح سے ایک مقام پر جمع کر کے کھڑا کرتے تھے اور اُن پر
پہرہ مقرر کر دیا جاتا تہا کہ جب تک وہ نداف حسب لخواہ کمپنی معاہدہ پر دستخط نہ کر دیں
اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پاویں۔ مسٹر کاکس نے شہادت دی تھی کہ اس طریقہ سے معاہدہ
کے پابند جولاہوں کی تعداد صرف اُنکے ایک کارخانہ میں پندرہ سو (۱۵۰۰) ہے
کمپنی نے جو قانون ۱۷۹۳ء میں نافذ کیا تہا اور جو ریگولیشن ایکٹس ۱۷۹۳ء کے نام سے
موسوم ہے اسکو ملاحظہ کیجئے۔ اس قانون کے بموجب جس پارچہ باف نے کمپنی سے پیشگی
رقم لے لی پھر اُس کو یہ حق نہ تہا کہ کسی دوسرے کا کام بنا دے اور اگر کوئی پارچہ باف
ایک سے زیادہ کارگاہ اپنے گھر میں رکھے گا تو بڑا تاوان دینا پڑے گا۔ فوجداری میں
مقدمہ چلایا جاویگا۔ عہدہ داران کمپنی کو اُن کے مکانوں میں بلا مرضی داخل
ہوجانے کا بھی اختیار دیدیا گیا تہا۔ ان کارروائیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب ۱۷۹۴ء میں
صرف (۱۵۶) پونڈ کا قیمتی کپڑا سالانہ ولایت سے ہندوستان کو آیا تو ۱۸۱۳ء میں

یعنے صرف دس برس کے بعد (۲۰۸۵۶) تائیس ہزار آٹھ سو چھپن پونڈ کا مالیتی کپڑا سالانہ ہندوستان کی تن پوشی کے لئے ولایت سے لایا گیا اور ۱۸۳۷ء میں یعنے تیس برس کے بعد ایک لاکھ آٹھ ہزار آٹھ سو چوبیس (۱۰۸۸۲۴) پونڈ کا کپڑا سالانہ لایا گیا۔ پھر وہ پارچہ باف یا ان کی صنعت جو عہد اورنگ زیب میں تھی اب کیسے دکھلائی دے۔ یہ تمام مواد رمیش چندر دت مرحوم کا جمع کیا ہوا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور عملاً کمپنی کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔

عہد اورنگ زیب میں اس ملک کی صنعت پارچہ بافی کو اسقدر عروج تھا کہ ہم نہ صرف اپنی پوری ضروریات کو ملک ہی کے کپڑے سے پورا کرتے تھے بلکہ غیر ممالک کے ہاتھ فروخت کر کے اپنی دولت میں اضافہ کیا کرتے تھے۔ یہ تو صرف پارچہ بافی کا ذکر تھا۔ اورنگ زیب میں تھیانان صاحب ملتان کو بھی گئے تھے تو وہاں اُن کو بہترین تیر و کمان بنانے والے ملے۔ لوہا بکثرت پایا جاتا ہے۔ کہ جہازوں کے واسطے لوہے کے لنگر بھی ڈھالے جاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۹۲)

تھیانان صاحب نے گولکنڈے کے ہیروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کسی ملک کے تمدن کو عروج ہوتا ہے تو اس کا عکس اس ملک کی عمارات و مکانات پر بھی اسی طرح پڑتا ہے جیسا کہ ملبوسات پر عیش و عشرت کے یہی سامان ہیں جنھیں انسان کی طباعی و ذہانت اکثر نمودار ہوا کرتی ہے۔ فن انجینیری کے متعلق تو صرف اس قدر کہہ دینا ہی کافی ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اہل ہند آگرہ، و دہلی و لاہور کی وہ خوشنما

عمارتیں مکمل کر چکے تھے جن میں ایک عمارت "تاج بی بی" کا روضہ ہے جو اس وقت بھی عجائبات دنیا میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے عمارات بنانے والے عہد اورنگ زیب میں موجود تھے اور ان کے دماغوں کی جھلک دکھن تک پہونچی تھی۔ دکھن میں جہاں اورنگ زیب کا قیام کچھ عرصہ تک رہا ہے اس کے قرب وجوار کی عمارتیں ملاحظہ ہوں اورنگ آباد میں اورنگ زیب کی بیٹی کا مقبرہ۔ قلعہ دولت آباد کے نیچے کی وہ مسجد وہ کھنڈر اور وہ منارے ملاحظہ ہوں جہاں اب یورپ کے سیاح سیر کے لئے لوگ جاتے ہیں اور جن کو دیکھ کر یہ شعر یاد آتا ہے:-

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدید است صنادیدِ عجم را

خود میرے قصبہ امیٹھی میں ایک مقبرہ ہے جس کے گنبد پر چینی میں دور سے چند ٹائلیس اس نمونے کے چمکتے ہوئے دیکھا کرتا تھا جیسے کہ اب یورپ سے منٹن ٹائلیس آتے ہیں اور جو وہاں کی صناعی کے نمونے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ چیز ہے کہ جسے ہم نے بہت زمانہ ہوا ایجاد کر کے رائج کر دیا تھا۔

اگر اورنگ زیب کے زمانہ کے فن انجنیری کے دوسرے شعبے کا اندازہ کرنا مقصود ہے تو دکھن میں اورنگ آباد کے قدیم واٹر ورکس کو دیکھئے۔ آج تک لوگ حیران ہیں کہ وہ کونسا چشمہ ہے اور وہ کونسی ترکیب ہے جس کے ذریعہ سے تہ زمین میں بڑے بڑے نالے بنا کر میٹھے پانی کی گویا ندی بہادی ہے جس نے اورنگ آباد کی آبادی کو صرف سیراب ہی نہیں کر دیا تھا بلکہ باغوں، نہروں، حوضوں اور فواروں سے بہشت کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ مجھ سے خود اسٹون برج صاحب نے جو سلطنت حیدرآباد میں

کے واٹر ورکس کے انجنیر تھے۔ یہ بیان کیا کہ اگر آج ہم اس سے بہتر پانی کا لیول نکالنا چاہیں تو مشکل ہے وہ مقر تھے کہ اورنگ آباد کے لئے اس سے بہتر واٹر ورکس کا انتظام کرنا اس زمانہ میں بھی دشوار ہے۔ اُن کو افسوس تھا کہ فن انجنیری جن سے ایسے واٹر ورکس بنائے تھے ہندوستان سے اب معدوم ہے۔.........

......کیفیت اس خزانہ آب کی یہ ہے کہ ایک مقام پر صرف ایک بہت عمیق کنواں ہے جس میں جھانکنے سے ایک چشمہ کا چھرا یا سوتا سا نظر آتا ہے۔ یہیں سے ایک گہرا پختہ نالہ بہنا شروع ہوا ہے۔ جوں جوں شہر کیطرف یہ نالہ بڑھتا گیا ہے اسمیں الفاروں پانی نمودار ہوتا جاتا ہے۔ شہر کے قریب جاکر اس میں سے پختہ نالیاں نکالی گئی ہیں۔ ڈھائی سو برس کے بعد آج بھی انہیں نالیوں سے شہر کو پانی ملتا ہے لیکن اسکی مرمت و صفائی کرنے میں اس زمانہ کے انجنیر بہت دشواری محسوس کرتے ہیں۔ اس قسم کے محیر العقول واٹر ورکس نہ صرف اورنگ آباد میں تھے بلکہ ہمنے اس کے آثار بیدر و بیجاپور جیسے دور دراز مقامات پر بھی دیکھے ہیں گو کہ وہاں اب وہ اسطرح سے کارآمد نہیں ہیں جیسے کہ اورنگ آباد میں ہیں۔

کپتان ہملٹن صاحب لکھتے ہیں کہ سندھ کا شہر "ٹھٹہ" دریائے انڈس سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ دریا سے بذریعہ کینالس اور نہروں کے شہر و باغات میں آب رسانی کا انتظام کیا گیا ہے۔

(جلد اول صفحہ ۱۲۱)

کیا یہ تمام واقعات اس کا ثبوت بین نہیں ہیں کہ اورنگ زیب کے عہد میں صنعت و حرفت اور دوسرے فنون پورے عروج پر تھے۔ کہ اسوقت غالباً یورپ کو

ہندوستان سے وہی رشک تھا جو کہ صنعت و حرفت کے مقابلہ میں آج ہندوستان کو یورپ سے ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں دولتِ برطانیہ کی صنعت و حرفت کی بڑی نمایش جو لندن میں ہوئی اسی ایک عمارت میں ہندوستانی صنعت و حرفت کے نمونے بھی دکھلائے گئے مجھ سے جب کسی انگریز نے ان نمونوں کی تعریف کی تو میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اس نمایش کے ہندوستانی سیکشن میں وہ کونسی چیز ہے جس کو ہمارا ہند سو برس قبل نہیں بنا سکتا تھا۔ ہم کو یہ دکھلاؤ کہ صنعت و حرفت کے میدان میں ہندوستانی دماغوں نے گذشتہ صدی میں پہلے سے زیادہ کیا ترقی کی ہے ....

............لکھنؤ کی چکن، فرخ آباد کے پردے، دہلی و آگرہ کا سنگِ مرمر کا کام، مُرادآباد کے برتن، کشمیر کی شالیں، یہ سب چیزیں جو اسوقت ہم نمایش میں دیکھ رہے ہیں وہ کچھ ان سے بہتر نہیں ہیں جو ہم سابقہ صدیوں میں بنا سکتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کشمیر میں اُن سے بہی بہتر پرانی شالوں کے نمونے دیکھے ہیں جن کے فوٹو آج ولایت کے اخبارات میں نمایش کی شہرت دینے کی غرض سے پیش کیے جا رہے ہیں۔

دیگر ممالک مثل کینڈا اور اسٹریلیا وغیرہ کا جو سیکشن دولتِ برطانیہ کی اس نمایش میں ہے اُسمیں اور ہندوستان کے سیکشن میں بڑا فرق یہ ہے کہ ان نوآبادیوں کی اگزہبیشن میں کوئی چیز ایسی نہیں نظر آتی جس کو وہ ایسی خوبی اور مقدار میں اب سے پچاس برس قبل بنا سکتے تھے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے سیکشن میں کوئی ایسی اگزبیٹ نہیں معلوم ہوتی جس کو ہندوستانی دماغ نے حال میں سیکھا ہو اور وہ

سو برس قبل نہ بنا سکتا ہو۔ اصلیت یہ ہے کہ ہم تو بہت سی صنعتیں بھول گئے یا ہم ان کے بھول جانے پر مجبور کئے گئے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں جو ململ ڈھاکہ میں بنتی تھی آج وہ کہاں ہے؟

وہ فولاد کہاں ہے جو ہندوستان کے نام سے لندن کے بازار میں بکا کرتا تھا وہ چھینٹ کہاں ہے جس کا ذکر کپتان ہملٹن نے کیا ہے۔ وہ زربفت کہاں ہے جس کا خلعت کمپنی کو گورنر سورت نے اورنگ زیب کا فرمانِ شاہی پڑھتے وقت حسب رواج ملک عطا کیا تھا اور جس کا ذکر دوسرے موقع پر کرونگا۔

ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ موجودہ گورنمنٹ سے ہم کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا کسی قوم سے جو فوائد پہنچتے ہیں ان کو نظر انداز کرنا بڑا اخلاقی جرم ہے لہذا ہم آخری باب میں ان فوائد کا اعتراف کریں گے جو موجودہ گورنمنٹ سے ہم کو ہوئے ہیں لیکن اس موقع پر ہم کو عہد اورنگ زیب کی صنعت و حرفت کا بتلانا منظور ہے اور اس سلسلہ میں مقابلہ کرنا ضروری تھا۔

بعض لوگ شاید یہ خیال کریں کہ ہندوستان میں آج ریلیں چل رہی ہیں موٹریں دوڑ رہی ہیں۔ جا بجا ہوائی جہاز بھی اڑتے نظر آرہے ہیں۔ یہ سب عہد اورنگ زیب میں کہاں تھا۔ کاش یہ چیزیں ہمارے دماغ کی ترقی کا ثبوت ہوتیں ہم تو ایسی ذری ذری سی چیزوں کے آج محتاج ہیں جیسے دیا سلائی، بوٹ کا پالش ہماری اصلی حالت اب یہ ہے کہ مختلف اقسام کے فنون و صنعت و حرفت سیکھنے کے لئے دوسری قوموں کا منہ تک رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ فرانس جاؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ جرمنی جاؤ۔ وہاں کے لوگ سکھانے میں دریغ نہیں کرتے۔ کوئی کہتا ہے کہ

شاید جاپان کو ایشیائی ہمدردی ہو، کوئی کہتا ہے کہ یہ روزی کا معاملہ ہے۔
صنعت و حرفت تم کو کوئی نہیں سکھائیگا تم خود اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرو اور
چرخہ کی الف۔ بے سے پھر شروع کرو۔ انگلستان کے ہم شکور ہیں کہ چند زبانوں
کے سکھانے کے واسطے اسنے اپنی بڑی بڑی یونیورسٹیز کے دروازے ہی ہمارے
بچوں کی ایک محدود تعداد کے لئے کھولدئے ہیں مگر ساتھہ ہی ساتھہ ہم یہ
کہنے کے لئے مجبور ہیں کہ ہمارے ملک کے طالب علموں کو اسکی عام شکایت ہے
کہ انگلستان انکو اس صنعت و حرفت کے سکھانے میں پس و پیش کررہا ہے جس سے
ملک کی وہ دولت و تمول عود کرے جو عہد اورنگ زیب میں پائی جاتی تھی
جب کہ صرف ایک ہندوستانی تاجر کا سرمایۂ تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کے کل
سرمایۂ تجارت کے برابر تھا جیسا کہ کپتان ہملٹن صاحب کے سفرنامہ سے معلوم
ہوتا ہے اور جس کا ذکر باب چہارم میں کیا جا چکا ہے۔

باب ہفتم

مہمان نوازی

کپتان ہملٹن کا سفرنامہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں مہمان نوازی کا ایشیائی شعار بہت کچھ موجود تھا۔ جہاں جہاں انہوں نے سفر کیا ہندوستانیوں کی مہمان نوازی نے انکے دل پر ایک خاص اثر پیدا کیا۔ مثلاً صوبۂ بنگال میں کسی رئیس کی سرحد سے جب انکی پالکی گذری اسوقت وہ رئیس تو شکار کو گئے ہوئے تھے مگر مقام شکار ہی سے دعوت کا رقعہ بھیجدیا۔ چنانچہ کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"جب میں وہاں پہنچا وہ رئیس صاحب شکار تو گئے ہوئے تھے۔ مجھکو سلام کہلا بھیجا"
"اور یہ پیغام بھیجا کہ وہ مجھسے ملاقات کے متمنی ہیں۔ میں نے یہ بہانہ کر دیا کہ مجھے"
"نقرس کی شکایت ہے۔ میرے اس عذر کو انہوں نے بلا تامل قبول کر لیا۔ اور"
"میرے کھانے کے واسطے چڑیوں کا مرغن سالن بھیجا۔ اور دوسرے روز شہر کے"
"اکثر معززین مجھ سے ملنے آئے اور یہ خواہش کی کہ جب تک وہاں کے رئیس شکار سے"
"واپس آئیں میں رہاں قیام کروں۔ لیکن مجھے ضروری کام تھا اسلئے مناسب الفاظ"
"میں انکا شکریہ ادا کر کے میں وہاں سے رخصت ہوا"

(جلد اول صفحہ ۳۸۷)

مغربی تمدن کے لحاظ سے بغیر اس کے کہ کوئی شناسا تعریف یعنے انٹروڈکشن کرے

بات کرنا تک معیوب ہے۔ تواضع ومدارات تو درکنار۔ ایک دوسرے مقام پر کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جب وہ کنانور کی سرحد میں داخل ہوئے تو صرف بہ خیال مہمان نوازی وہاں کے رئیس کی بیوی نے جو شاہزادی تھی اپنے ہاتھ سے پان اور شربت دیا۔

(جلد اول صفحہ ۲۹۵)

ایک دوسرے رئیس کو جب کپتان صاحب نے کچھ کپڑا، قالین، اور دو تفنگچے بطور سوغات بھیجے تو وہ اسقدر خوش ہوا کہ اسنے فوراً اپنی کلائی سے ایک زیور جو جواہرات سے مرصع تھا اُتار کر کپتان صاحب کو پہنا دیا اور یہ اجازت دی کہ اسکی ریاست کے حدود میں کپتان صاحب ہر جگہ بے تکلف سفر کر سکتے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۳۰۲ و ۳۰۳)

انصاف و امن و امان کے باب میں ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ جب کپتان صاحب ایک قافلہ کے ساتھ سورت کے قریب پہنچے تو کسطرح لوگوں نے انکی خاطر تواضع کی اور جب وہ گورنر سورت سے ملنے گئے تو کس کشادہ پیشانی سے اُسنے اِنکا استقبال کیا اور انکی دعوت کے لئے ایک گائے، پانچ بھیڑیں، پانچ بکریاں، بیس مرغیاں، پچاس کبوتر اور بہت سی مٹھائی اور پھل بھیجے۔

(جلد اول صفحہ ۱۱۸ و ۱۲۰ و ۱۹۰)

کپتان صاحب پھر لکھتے ہیں کہ اہل ہند انگریزوں کی فیکٹری کے افسروں کی بہت عزت کرتے ہیں اور بسا اوقات جبکہ یہ انگریز شکار کھیلنے جاتے ہیں تو بڑے بڑے معزز ہندوستانی اپنے ملازمین واسلحہ اور باجے گاجے کے ساتھ انکے ہمراہ جاتے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۶۳)

یہ مہمان نوازی ایشیائی خلقت میں داخل ہے اور غالباً قدیم زمانہ میں خطۂ عرب دوسرے تمام ایشیائی ممالک سے بھی سبقت لیگیا تھا۔

اَکْرِمُوا ضَیْفَکُمْ وَلَوْ کَانَ کَافِرًا اَوْ اَجْنَبِیًّا

(اپنے مہمان کا اکرام کرو چاہے وہ کافر ہو یا اجنبی کوئی ہو)

عربوں کا دستور العمل رہا ہے۔ مجھے ایک واقعہ ساحل عرب کا بہت دلچسپ معلوم ہوا جسکا ذکر کپتان صاحب نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ ساحل عرب کے کسی مقام پر جہاز میں پانی آنے لگا۔ مجبوراً کپتان صاحب کو لنگر ڈالنا پڑا دیکھا کہ ریگستان میں کچھ جنگلی عرب خیمے ڈالے پڑے ہوئے ہیں گویا وہ اس جہاز کے منتظر تھے۔ یہ عرب مدد کیواسطے فوراً ہی پہنچ گئے انہوں نے پہلے یہ طے کرنا چاہا کہ انکو کیا اجرت ملیگی۔ کام یہ تھا کہ جہاز سے کل مال نکالکر ساحل پر جمع کردیں تاکہ جہاز ہلکا ہوجائے اور جہاز کی مرمت کے بعد اسباب پھر لاد دیں۔ اور اس اثناء میں مال کی پوری حفاظت بھی کریں۔ کپتان صاحب اول تو ڈرے کہ یہ لوگ جہاز کا مال کہیں لوٹ نہ لیں مگر صاحب بہادر لنگر ڈالنے پر مجبور تھے ورنہ جہاز ہی ڈوبا جا رہا تھا۔ بالآخر تصفیہ یہ ہوا کہ کل مال دو حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ اجرت میں دیا جائے۔ جب یہ طے ہوگیا تو عربوں نے کہا کہ مزدوری کی حد تک تو معاملہ ختم ہوگیا مگر اب آئندہ سے تم لوگ ہمارے مہمان ہو۔ کپتان صاحب کو ان جنگلی عربوں کی مہمان نوازی پر تعجب معلوم ہوتا تھا۔ یہ ایشیائی مہمان نوازی کی روایات ہیں۔ کپتان صاحب کو اس پر بھی حیرت ہوئی کہ وہ اس ریگستان میں پہلے سے خیمے ڈالے کیوں پڑے تھے۔ اُن سے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ

ان عربوں کے پہنچنے سے پیشتر سے اسکی اطلاع دیدی تھی کہ فلاں مقام پر ایک جہاز کے مسافر مصیبت میں گرفتار ہونگے تم انکی مدد کرنا اور بدمعاملگی نہ کرنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے انگریزوں کا اعتقاد جادو پر تھا۔ کپتان صاحب نے اپنے سفرنامہ میں ان عربوں کی پیش بندی جادو پر محمول کی ہے خاص سندھ و بلوچستان کے متعلق جو حالات کپتان ہملٹن صاحب نے عہد اورنگ زیب کے لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسوقت اہل سندھ بھی مہمان نوازی و مسافر نوازی میں اپنے کسی پڑوسی ایشیائی ملک سے پیچھے نہ تھے یورپ کا موجودہ تمدن جہاں کچھ اچھی باتیں ہم کو سکھا رہا ہے وہاں اسکے ساتھ ساتھ ہمارے قدیم تمدن کی بعض اچھی باتیں ہم کو بھلا بھی رہا ہے منجملہ ان چیزوں کے جو اہل سندھ بھولتے جا رہے ہیں مہمان نوازی کی عادات ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ یورپ میں مہمان نوازی نہیں ہے لیکن ایشیا و یورپ کی مہمان نوازی میں فرق ہے۔ یورپ میں کنبے اور خاندان کی نسبت تصور۔ افراد خاندان کے باہمی فرائض اور ذمہ داریوں کا تخیل ذاتی آسائش و عیش و عشرت کو حتی الامکان ترجیح دینا۔ روزانہ کی ضروریات۔ طرز معاشرت۔ مکان میں کمروں کی تقسیم۔ ہوٹلوں میں رہنے کی عادت۔ زمین کی قلت۔ آبادی کی کثرت۔ مادی ترقی میں بے حد انہماک۔ روحانیت کی جانب بے توجہی۔ یہ تمام وہ چیزیں ہیں جنکے اعتبار سے ایشیا و یورپ کے طرز معاشرت و تمدن میں زمین آسمان کا فرق ہے گویا ایشیا اور یورپ ایک دوسرے سے بالکل ہی علیحدہ دو عالم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایشیا و یورپ کی مہمان نوازی میں جو فرق تھا اور ہے وہ اسی قسم کی مغائرت و فرق کیوجہ سے تھا جنکی طرف

مینے اشارہ کیا اگر جوں جوں ان باتوں میں فرق کم ہوتا جائیگا اُسی مناسبت سے
دونوں ملکوں کی عادتوں میں مشابہت ہوتی جائیگی اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے
کہ اہل یورپ میں انسانی ہمدردی کم ہے یا اُن میں نیکی کرنے کا مادہ کم ہے خلق اللہ
کو آرام پہنچانے اور انکی تکالیف کو کم کرنے کے لیئے یورپ میں جو انسٹی ٹیوشنس
شفاخانوں اور دیگر امدادی جماعتوں کی صورت میں آج بکثرت موجود ہیں وہ
اسکی دلیل ہیں کہ دنیا میں اسوقت اہل یورپ بنی نوع انسان کو مدد دینے میں
بڑا حصہ لے رہے ہیں اہل یورپ کی تحقیر کرنا ہم ایک اخلاقی جرم سمجھتے ہیں بہرحال
مہمان نوازی کے متعلق ہمارے اور اہل یورپ کے تمدن میں ہمیشہ فرق رہا ہے
مثلاً لندن کی حالت یہ ہے کہ اگر کسی کے مکان میں ایک کمرہ بھی خالی ہو گیا تو اسکو
دوبھر ہو جاتا ہے فوراً "پے انگ گسٹ" یعنے خرچہ ادا کرنیوالے مہمان کی گنجائش
کے عنوان سے روزانہ اخبار میں اشتہار دیدیا جاتا ہے۔ وہاں ہزاروں آدمی اس
قسم کے مہمانوں کی امداد پر زندگی بسر کر رہے ہیں ایسی صورت میں اگر باپ کے ہاں
اُسکا کماؤ لڑکا بھی اچانک آجائے تو گھر میں جگہ ملنا دشوار ہو جاتا ہے اور اسکو
کسی دوسرے شخص کا "پے انگ گیسٹ" (خرچہ ادا کرنے والا مہمان) بنایا جاتا ہے اس سے
یہ قیاس نہ کرنا چاہیئے کہ وہاں باپ بیٹے میں محبت نہیں ہوتی محبت بہت ہوتی ہے
مگر اُنکا تمدن، انکی روزانہ ضرورتیں اور انکی زندگی کی کشمکش اس طرز معاشرت
کے لیئے انکو مجبور کرتی ہے۔ ایشیا کا تمدن ہمیشہ اسکے خلاف رہا ہے یہاں مہمان نوازی
کو ایک قسم کے مذہبی فرض کی وقعت دیدی گئی ہے۔ ہماری سوسائٹی میں دو ایک
قصے مشہور ہیں جنکو لوگ کبھی کبھی بڑے تمسخر سے بیان کرتے ہیں ایک ہندوستانی

جج ہائیکورٹ تھے جنکی پوری تعلیم ولایت میں ہوئی تھی انکے باپ نے اطلاع دی
کہ وہ آرہے ہیں۔ جج صاحب نے فوراً تار دیا کہ مکان میں گنجائش نہیں ہے ذرا
ٹال کیجیے۔ جب انتظام ہو جائے تشریف لائیے گا۔ یا ایک ہندوستانی بیرسٹر صاحب
ولایت سے تازہ وارد ہوئے۔ باپ اسٹیشن پر لینے گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیرسٹر صاحب
ہوٹل کے قیام میں زیادہ سہولت سمجھکر اسٹیشن سے سیدھے ہوٹل تشریف لے گئے
اور اسباب وغیرہ وہاں رکھکر پھر ان سے ملنے گھر گئے۔ ممکن ہے کہ ان واقعات
میں کچھ مبالغہ ہو اور لوگوں نے حاشیہ چڑھایا ہو مگر ان دونوں مثالوں سے
میرا مقصود صرف یہ دکھانا تھا کہ تمدن بدلنے سے کسی ملک کے باشندوں کی
جبلی عادات واخلاق میں عظیم الشان فرق ہو جانا ممکن ہے کیا خوب ہوتا
اگر ہم اپنے قدیم تمدن کی اچھی باتیں ہاتھ سے نہ جانے دیتے قوموں کی
عادتیں سنوارنے میں بہت دیر لگتی ہے بگڑنے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہی
قانونِ قدرت ہے۔

بابِ ہشتم

یوروپین تجار سے اورنگ زیب کا برتاؤ

کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا
اس سوال کا جواب مسٹر جے آر ائے صاحب نے اثبات میں دیا ہے۔ اپنی رائے
کی تائید میں جہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے قوام فعل پر انھوں نے استدلال
کیا ہے اسکی نسبت ہم چند واقعات بیان کرنا چاہتے ہیں انسانوں کے صدق و
کذب پر فتویٰ دینے کے لئے ان کی نیت کا معلوم کرنا ایک اہم امر ہوا کرتا ہے
اسی نیت کی بنیاد پر بعض وقت ایک ظاہرہ قاتل بے گناہ ٹھہرایا جاتا ہے اور ظاہرہ
بیگناہ شخص قتل کا مجرم قرار پاتا ہے۔ لہذا اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو مراسلت
ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے آقا ڈائرکٹرس میں ہوا کرتی تھی اس سے گماشتوں
کی کیا نیت تھی کیا غرض اور کیا پالیسی مضمر تھی تو سارا عقدہ کھل جائیگا اور
راز فاش ہو جائے گا سردست تو جب کوئی ہندوستانی ردمیش چندر دت کی وہ
کتاب پڑھتا ہے جسمیں انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کی مراسلت
سے استدلال کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ اس ملک کی صنعت کو کس کس طریقے سے
کاریگروں کو ایذا دے دیکر تباہ کیا گیا تھا تو اسکو حیرت ہوتی ہے لیکن اگر آج وہ
تمام رازکی خط و کتابت جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں اور اُن کے

آقا ڈائرکٹروں کے درمیان ہوا کرتی تھی پیش کردئے جاتو قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اہل وطن دنگ ہو جائیں گے تم کو اس راز کی کچھ جھلک کپتان ہملٹن کے سفرنامے سے بھی ملتی ہے یہ منجملہ انہیں واقعات کے ایک واقعہ ہے جس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کے صدق و کذب کا پتہ چلتا ہے اور اُس سے انکی نیت معلوم ہوتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ انکے اقوال و افعال کیا تھے اور نیت کیا تھی جس کے بعد وہ تمام شہادت مشتبہ ہو جاتی ہے جو عہد مغلیہ کے نظم و نسق کے خلاف وہ گڑھا کرتے تھے۔ کپتان صاحب ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے اُس خط کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خود پڑھا ہے جو ولایت سے ڈائرکٹروں نے بطور ہدایت نامہ یا دستور العمل اپنے ملازمین و عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھیجا تھا۔ اُس خط میں حکومت مغلیہ سے چھیڑ چھاڑ قائم کرنے کی ایک تدبیر بتلائی تھی وہ یہ تھی کہ تم ہندی تجار و متمول اشخاص سے روپیہ قرض لو اور جب رقم کثیر ہو جائے تو کوئی ایسی لڑائی جھگڑے کی بات پیش کردو جس کی وجہ سے قرضہ کا مسئلہ تو پیچھے پڑ جائے اور وہ نزاع سامنے آجائے۔ اس طریقہ سے قرضہ بھی ہضم ہو جائے گا اور حکومت کے خلاف لڑائی کا بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایک جانب تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوگوں نے شاہی فوج کے غلہ و رسد سے بھرے ہوئے جہاز بمبئی کے قریب سمندر میں پکڑ لئے اور دوسری جانب اسی کمپنی کے گورنر و ایجنٹ مسٹر چائلڈ نے ایک لمبی چوڑی شکایتی درخواست حکومت مغلیہ کے گورنر مقیم سورت کے پاس بھیجی جس میں (۴۵) شکایتیں درج تھیں اُس پوری درخواست کی نقل کپتان جیمس ہملٹن نے

اپنے سفرنامے میں کردی ہے۔ اگر میں بھی اس کی پوری نقل کرنے بیٹھوں تو کئی صفحے اس کی نذر ہو جائینگے اور ناظرین کا وقت ضائع ہوگا تاہم اسکا اندازہ کرنے کے لیئے کہ باوجود تصنع اور بناوٹ کی سخت کوشش کے کس نوعیت کی بیجا شکایتیں کی گئیں اس درخواست کا مختصر خلاصہ پیش کرتا ہوں یہی وہ سنگین ترین شکایتیں تھیں جو ۱۶۸۹ء اورنگ زیب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کرسکی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوشش کرنے پر بھی اس سے زیادہ مواد و شہادت دستیاب نہ ہوسکی۔ ان شکایتوں کی صداقت کا تصفیہ کرتے وقت ناظرین اسکو کبھی نہ بھولیں کہ یہ محض سازشی درخواست تھی اور اس سے اصل مقصود لڑائی کا بہانہ ڈھونڈھنا تھا جس کو روشن الفاظ میں کشتی میں خاک اڑانا کہنا چاہیئے۔ اس درخواست کے فقرات ۱ و ۲ میں ایک ہندوستانی سوداگر مولا عبدالغفار کی یہ شکایت ہے کہ اس نے کمپنی کی نسبت غلط افواہیں اڑائیں جس سے کمپنی کا نام بدنام ہوگیا اور اعتبار بھی بمقابلہ سابق کے جاتا رہا۔ یہ وہی عبدالغفار تاجر ہے جس کا ذکر میں باب (تجارت) میں کرچکا ہوں اور جس کے متعلق کپتان ہملٹن کی یہ رائے تھی کہ صرف اس ایک متنفس ہندوستانی کا سرمایۂ تجارتی کمپنی کے تمام تجارتی سرمایہ کے برابر تھا غالباً یہ عبدالغفار تجارت میں کمپنی کا مقابلہ کررہا تھا!

چوتھی دفعہ میں دو انگریز ایک مسٹر پٹیٹ (Pitit) اور دوسرے مسٹر باوچر (Boucher) کی شکایت عجیب و غریب الفاظ میں لکھی ہے اس امر کے لکھنے کے بعد! وہ کمپنی کے روپیہ کا حساب کتاب نہیں سمجھاتے اور اب شاہی حکومت کی پناہ میں بمقام سورت محفوظ بیٹھے ہوئے ہیں جو مطالبہ کمپنی کی جانب سے

اِن انگریزوں کی بابتہ کیا گیا تھا اُسکا ترجمہ یہ ہے :-

"مسٹر میٹیٹ تو مر گیا اور جہنم واصل ہوا لیکن مسٹر بابو جو سورت میں بیٹھے ہوئے ہیں"
"میرا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اور اسکی بیوی بچے اور اُسکے تمام متعلقین انگریز معہ"
"اُنکے مال واسباب کے میرے حوالہ کئے جائیں تاکہ وہ سورت سے فرار نہ ہوسکے"

(یہاں تو میں اسی اقتباس پر اکتفا کرتا ہوں لیکن میں دوسرے باب میں دکھلاؤنگا کہ عہدہ داران کمپنی لوگوں کی بیوی بچوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا کرتے تھے)

دفعات ۵ و ۶ و ۷ میں یہ شکایت تھی کہ حال میں بعض اشیاء پر خفیف محصول بڑھا دیا گیا ہے وہ واپس دلایا جائے (اول تو ٹیکس ہی کیا ہوتا تھا جب کپتان صاحبان ڑیرہ پہنچتے ہیں تو کل ٹیکس جو اُن سے وصول کیا گیا (۳) شلنگ تھا جسمیں ملازمین اور کہاروںکی مزدوری بھی شامل تھی (ملاحظہ ہو جلد اول صفحہ ۳۳۸) میں پوچھتا ہوں کہ آج وہ کون دعویدار تمدن ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ کسی خود مختار سلطنت کو محصول میں رد و بدل کرنے کا اختیار نہیں ہے)

دفعہ (۸) قابلِ غور ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ بہ پابندی فرامین شاہی اس ملک کا ہمیشہ سے یہ دستور تھا کہ جب کبھی کمپنی کا کچھ مال سرقہ جاتا تھا تو اسکی تلافی خزانہ شاہی سے کردی جاتی تھی مگر سورت کے گورنر نے اب یہ طریقہ بند کردیا ہے۔

(اس کے متعلق میرا یہ سوال ہے کہ مجھے بتلایا جائے کہ دنیا بھر میں آج وہ کونسی حکومت ہے جو مال واسباب کی حفاظت کی ذمہ داری اس حد تک قبول کرتی ہے)

دفعہ (۹) میں کچھ ہندوستانی قرضداروں کی نادہندی کی شکایت ہے
دفعہ (۱۰) میں یہ شکایت ہے کہ شاہی دار الضرب میں روپیہ جلد جلد مسکوک نہیں ہوتا۔

دفعات (۱۱ و ۱۲) ذرا زیادہ قابل غور ہیں اور وہ یہ ہیں کہ کمپنی کی حسابی کتابوں پر ہمیشہ اعتبار کیا جاتا تھا اور آخر سال پر اسکے بہی کھاتے دیکھکر محصول لیا جاتا تھا لیکن اب یہ قاعدہ جاری ہوا ہے کہ جونہی مال سرزمین ہندوستان پر اتارا جاتا ہے محصول وصول کر لیا جاتا ہے (میں کہتا ہوں کہ اگر ایسا ہوتا تھا تو وہ کیا بیجا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا اور تمام یورپ یہی کر رہا ہے۔)

دفعہ (۱۳) میں یہ شکایت ہے کہ گورنر نے سرکاری قلعہ کی دیوار سیدھی کرنے کے لئے کمپنی کی کچھ اراضی حاصل کر لی ہے جسکا معاوضہ ابھی تک نہیں ملا ہے۔

دفعات ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ میں محکمہ کروڑگیری یعنے محکمۂ وصول محصول کی جزوی شکایتیں ہیں۔

دفعہ ۱۷ میں یہ شکایت ہے کہ قرضداروں سے روپیہ وصول نہیں ہوتا اور انکی نسبت دادرسی نہیں ہوتی اور استدعا تھی کہ گورنر اس کی تلافی خزانۂ شاہی سے کر دے۔

(میں پوچھتا ہوں کہ اگر آج کوئی تاجر کسی حکومت سے ایسا مطالبہ کرے تو اس کو کیا جواب ملیگا)

دفعہ (۱۸) میں یہ شکایت ہے کہ اُن کے کارندوں کو گورنر کے روبرو حاضری کا موقعہ اسوقت تک نہیں ملتا جب تک کہ نوکروں کو بخشش نہیں دیجاتی۔

دفعہ (۱۹) بدین مضمون ہے کہ تجارتی گھوڑے جو ایران اور بصرہ سے آتے ہیں انکی گردنوں پر مُہر کردیجاتی ہے اور بغیر محصول وا کئے ہوئے نہ وہ فروخت کئے جاسکتے ہیں نہ انپر سواری کی اجازت ہوتی ہے دفعہ ۲۰ میں عہدہ داروں سے قیمت وصول نہ ہونیکی شکایت ہے۔

دفعات ۲۱ و ۲۲ میں محکمہ کروڑگیری کی تعویق و دیگر جزوی شکایتیں ہیں دفعہ ۲۳ میں لکھا ہے کہ جب کمپنی اپنے اگریز ملازمین کو ہندوستان کے دور دراز شہروں میں بھیجتی ہے تو وہ شاہی نوکروں کی حفاظت میں اسطرح آجاتے ہیں کہ پھر اُن سے مطالبہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے اور اس موقعہ پر بھی وہی مسٹر پیٹ Mr. Pitet اور مسٹر باؤچر Mr. Boucheer کی مثال پیش کیگئی ہے جن کا ذکر دفعہ ۱۴ میں آچکا ہے۔

دفعہ ۲۴ میں ایک قطعہ اراضی کی بابتہ شکایت اور نیز جدید اراضی کے وصول کی درخواست ہے۔

دفعہ ۲۵ کا مضمون یہ ہے کہ حسب دستور سابق محصول وصول کرتے وقت اُن کا مال کھولکر نہ دیکھا جائے اور یہ کہ اُن کے اعتبار پر عمل ہو (گر۔ ایک عجیب و غریب شکایت تھی۔ آج بھی یورپ کے ممالک میں اسباب کھولکر دیکھا جاتا ہے)

دفعہ ۲۶ میں بھی عہدہ داروں سے قیمت وصول نہ ہونیکی شکایت ہے

دفعہ ۲۷ میں مکرر اضافہ محصول کی شکایت ہے۔

دفعہ ۲۸ میں پھر بارہ اُسی مسٹر باؤچر Mr. Boucheer کا تصفیہ میں پیش کیا گیا ہے جس کا ذکر دفعات ۱۴ و ۲۳ میں کیا جاچکا ہے دفعہ (۲۹) میں پھر بارہ

پھر اضافہ محصول کی شکایت ہے۔

دفعہ (۳۰) میں کسی ناظم کی شکایت ہے۔

دفعہ (۳۱) میں لکھا ہے کہ اُن کا لوہے کا ایک لنگر دریا میں گم ہوگیا تھا وہ مرزا معظم کے لڑکے کو ملا ہے وہ واپس دلا یا جائے اور اس کے ڈھونڈھنے میں جو خرچ ہوا ہے وہ لے لیا جائے (ذرا اس جزوی شکایت کی نوعیت پر غور کیا جائے)

دفعہ (۳۲) کی شکایت کا مفہوم یہ ہے کہ جب اُن کا جہاز ساحل ہندوستان پر پہنچتا ہے تو کروڑگیری پر اُن کے آدمیوں کی روک ٹوک بہت کیجاتی ہے۔ اس میں تعویق ہوتی ہے دفعہ ۳۳ بھی قابل غور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنگال میں کمپنی کے لوگوں نے کچھ شاہی جہاز پکڑ کر اُن میں آگ لگادی تھی اسکی بابتہ مسٹر چائلڈ بطور پیش از مرگ واویلا تحریر فرماتے ہیں کہ انکا کچھ بھی لگاؤ اس فعل سے نہیں ہے پھر اس کے متعلق مسٹر چائلڈ درخواست دہندہ سے بازپرس نہ کی جائے۔ (اس شکایت کو جو کوئی پڑھے گا ہم نہیں جانتے کہ بجز خور کی ڈاڑھی میں تنکا اور کیا کہیگا۔ اب کپتان ہملٹن کی تحریر سے معلوم ہوا کہ خود اُن حضرت کو بھی اس قسم کے افعال کرنے کی ہدایت ولایت سے ہوئی تھی اور اس شکایتی درخواست کا دینا اور سرکاری غلہ کے جہازوں کو پکڑنا سب اسی ہدایت کے بموجب تھا۔

دفعہ (۳۴) میں ہندوستانی قانون کی تحویل کا مطالبہ ہے۔ اور آخری دفعہ (۳۵) بدیں مضمون ہے کہ شام کو شہر کا دروازہ قبل از وقت بند کردیا جاتا ہے اور جب وہ شہر کے باہر سے سیر کرکے واپس آتے ہیں تو بغیر بخشش و انعام دئے اندر داخل ہونا دشوار ہوتا ہے۔

بس اب درخواست کا مضمون ختم ہو گیا قبل اس کے کہ ان شکایتوں کے متعلق کچھ لکھوں ذرا مسٹر چاپلڈ صاحب گورنر ایسٹ انڈیا کمپنی کے کیرکٹر پر نظر ڈالئے جنہوں نے یہ شکایتی درخواست مرتب کر کے شاہ مغلیہ کے گورنر سورت کے پاس بھیجی تھی۔ کپتان ہملٹن اپنے سفرنامہ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ جب مسٹر چائیلڈ ایک مرتبہ کپتان تھار برن سے ناراض ہو گئے تو انکی جائداد ضبط کرنے اور ان کو جیل خانہ بھیجنے کی غرض سے مسٹر چاپلڈ نے جعلی دستاویزات بنائیں۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۵)

مسٹر چاپلڈ جب ایک مرتبہ مسٹر بوچر (Mr. Boucher) سے ناراض ہو گئے تو مسٹر بوچر کو زہر خورانی کے جو انتظامات مسٹر چاپلڈ نے کئے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۶ - ۱۹۷)

مسٹر چاپلڈ ایک مرتبہ مسٹر پیٹ سے ناراض ہو گئے اور جب مسٹر پیٹٹ سمندر کے قزاقوں کے ہاتھ پکڑ لئے گئے تو مسٹر چاپلڈ نے قزاقوں سے کہلا بھیجا کہ مسٹر پیٹیٹ بڑا مالدار ہے اس سے خوب وصول کرنا۔ (جلد اول صفحہ ۱۹۸) یہ تو مسٹر چاپلڈ کا کیرکٹر تھا۔ یہ واقعات زیادہ تفصیل سے باب نہم میں بیان کئے جائینگے۔

جہاں تک شکایتی درخواست کا تعلق ہے۔ اب ناظرین خود سمجھ لیں گے کہ ان شکایتوں کی کیا نوعیت و اصلیت تھی۔ اگر کسی غیر ملک کا تاجر آج بمبئی کے گورنر کے روبرو ایسی درخواست پیش کر کے ویسا ہی مطالبہ کرے جو اس درخواست میں کیا گیا ہے۔ تو اس کا حشر کیا ہوگا۔ علی الخصوص جبکہ یہ معلوم

ہوجائے کہ وہ درخواست خوامخواہ لڑائی کی چھیڑ چھاڑ کی غرض سے پیش ہوئی ہے۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ عہد اورنگ زیب میں اسکا نتیجہ کیا ہوا جب یہ درخواست
گورنر سورت کے پاس پہنچی تو شیدی یعقوب کمانڈر افواج شاہی نے ایسٹ انڈیا
کمپنی کے گورنر کو اولاً عہد یانہ طریقہ سے ایک خط لکھا جس میں کمپنی کے طرزِ عمل
پر اعتراض کیا لیکن جب کمپنی کی جانب سے متمردانہ جواب آئے تو تھوڑے دانے
بالآخر یہ تحریر کردیا کہ اگر گرفتار شدہ شاہی جہاز ۱۱ر فروری تک نہ چھوڑ دئے
جائینگے تو ۱۴ر فروری کو فلاں وقت شاہی فوج بمبئی میں داخل ہوکر ہر چیز پر
قبضہ کرلیگی۔ مجھ کو اس ہندوستانی فوجی افسر کی یہ سپاہیانہ ادا بہت پسند
آئی کہ اُس نے دشمن کو پہلے سے اپنی آمد کے وقت تک کی بھی اطلاع دیدی کہ
اگر منبہ ہوکر سنبھل جائے تو بہتر ورنہ مقابلہ کے لئے تیار رہے یہ نہ کہا جائے کہ
کہ ہماری غفلت سے فائدہ اٹھایا گرمسٹر چائلڈ پر تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں
کی حمایت کا نشہ سوار تھا۔ اُس زمانہ میں یہ لوگ بغیر فوجی مدد کے سمندر میں سفر
نہیں کرسکتے تھے ولایت کے راستے بحری قزاقوں کی دست برد سے محفوظ
نہ تھے علاوہ ازیں وہ یہ عہد نہ تھا کہ کسی قوم کے ہتھیار لیکر اسکو نامرد بنایا جائے
ہر شخص مسلح رہا کرتا تھا۔ لہذا کمپنی کے پاس بھی فوج تھی توپیں تھیں خزانہ تھا
اور غالباً اسی غرہ پر انکو جنگ چھیڑنے کی جرات ہوئی تھی۔ کپتان ہملٹن لکھتے
ہیں کہ جو کچھ شیدی یعقوب شاہی فوج کے کمانڈر نے پیشتر لکھا تھا بالکل اسی
کے مطابق اس نے عمل کیا اور جو وقت اُس نے مقرر کیا تھا ٹھیک اسی وقت مع
فوج کے پہنچا۔ (جلد اول صفحہ ۲۱۰) آخر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور جب

معرکہ میں شیدی کی فوج تلواریں ہاتھ میں لیکر ملغار کرتی ہوئی انگریزی فوج پر جا پڑی۔

"تو کمپنی کا کپتان میدان سے بھاگ نکلا اور بھاگنے والوں میں یہی سب سے آگے تھا۔ پرتگیزوں کے گرجے میں پہونچکر جب ذرا اس کے حواس درست ہوئے تو اس نے پیچھے مڑکر اپنے آدمیوں کو دیکھا کہ انکا کیا حشر ہوا۔"

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۲۰)

کپتان صاحب پر یہ سب سرگزشت بیتی تھی وہ خود اسی بھنور میں گرفتار تھے اور سب معاملہ کو بچشم خود دیکھ رہے تھے۔ ازبسکہ انکی حیثیت کمپنی کے ملازم کی نہ تھی وہ ایک آزاد خود مختار تاجر تھے مگر مثل دوسرے انگریزوں کے وہ بھی کمپنی کی حفاظت میں رہتے تھے وہ کمپنی کی اس رذیل حرکت پر بہت مشتعل ہوئے اور اپنے سفرنامہ میں انہوں نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اگر راوی کا بیان راوی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا تو بہتر تھا۔ مگر وہ انگریزی میں ہے اس لئے ابتدا سے جو واقعات انہوں نے بیان کئے ہیں ان کا ترجمہ کرتا ہوں وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"کمپنی کے پاس یوں تو بہت سے بڑے بڑے جہاز تھے جن کو ملک سے باہر بھیجنے کے لئے وہ مجبور تھی لیکن ان کو کام میں لانے کے لئے چونکہ کمپنی کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا اس لئے اس نے اپنے جنرل کو اور نیز اپنے ان کارخانوں کے عہدہ داروں کو جو ہندوستان میں تھے حکم دیدیا تھا کہ وہ اپنے جہازات و ملن نے تھا سکنے لئے ہندوستانی تاجروں سے جسقدر رقم قرض حاصل کرسکتے ہوں کمپنی

"کی ذمہ داری پڑے ہیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور جو جہاز وہ اپنے
وطن کو نہ لے جاسکے انکو کرایہ پر ہندوستان میں چلایا میں نے کمپنی کے گورنر کا
ایک خط انگلستان میں دیکھا جسمیں یہ لکھا تھا کہ جب وہ مغل شہنشاہ کی رعایا سے
جسقدر روپیہ حاصل کرسکتے ہوں لے لیں تو فرضخواہوں سے جھگڑا کرکے یک لخت انکے
ساتھ لین دین موقوف کردیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ کیونکہ ۱۶۸۶ء و ۱۶۸۸ء
میں سورت کے ہندوستانی تاجروں نے سمندر کے راستے سے مغرب میں بہت بڑی
تجارت مخا۔ ایران اور بصرہ سے قائم کرلی تھی اور مشرق میں بنگال و چین اور
سیام سے بیوپار کرتے تھے وہ جنرل سب لوگوں کو انکی استدعا پر پروانہ راہداری
دیدیا کرتا تھا پھر اس کے بعد ۱۶۸۷ء کے آخر میں ایک شکایت صوبہ دار سورت
کے روبرو پیش کی اور انصاف و اطمینان کا طالب ہوا۔ اس شکایت کی ایک
مطبوعہ کاپی میں نے خود دیکھی ہے۔ وہ حسب ذیل (۳۵) فقرات پر مشتمل تھی"

(جلد اول صفحہ ۱۹۹)

سفر نامے میں اس جگہ پوری درخواست نقل کردی گئی ہے جسکا خلاصہ بیان
کیا جا چکا ہے۔ انگریزی کیرکٹر کا ایک رخ ہمیشہ ایسا رہا ہے جسکی تعریف و مدح
کرنا ہر منصف مزاج کا فرض ہے۔ جب کبھی وہ ڈپلومیسی و سیاسی اغراض سے
بلند پروازی کر جاتا ہے تب انکی آزادانہ رائے میں ایک ایسی دلکش و دلفریب
خوبی پیدا ہو جاتی ہے جس سے دوسری قوم والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ
سکتے۔ چنانچہ اس موقع پر کپتان ہملٹن نے بھی اسی انگریزی کیرکٹر کا ثبوت
دیا ہے۔ آخر تمام بنی نوع انسان ایک ہی آفتاب کی شعاعیں ہیں اور نیکی و

دبدی کی حرکات سے ہر انسان کا دل یکساں متاثر ہوا کرتا ہے۔ ان شکایتوں
کی نسبت کپتان ہملٹن نے جو رائے قائم کی تھی وہ انسان کی اصلی خلقی صداقت
پسندی کا نمونہ ہے۔ درخواست کی نقل کرنے کے بعد کپتان صاحب لکھتے ہیں

> یہی وہ شکایتیں ہیں جن کی بنیاد پر جنرل چائلڈ نے سلطنت مغلیہ کے ساتھ ایک
> جنگ کی عمارت قائم کی اور اپنی شکایات بادشاہ تک پہنچانے اور منشائے شاہی
> معلوم کرنے کے بغیر اعلان جنگ کر دیا۔ جہاں کہیں بادشاہی رعایا کے جہاز ملے انکو
> گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ جہاز خود انہیں کے عطا کردہ پروانہ جات اپنے
> پاس رکھتے تھے شکایت مذکورہ کا فقرہ (۴) ایسا ہے کہ گو وہ ایک عیسائی قلم
> سے نکلا ہے لیکن ہر مسلمان اور بت پرست بھی اسکو نفرت کی نظر سے دیکھے گا
> فقرات نمبر ۱۷ و ۲۳ و ۲۸ خلاف انصاف ہیں اور فقرات نمبر ۳۰ و ۳۱ اس
> شکایت اور جنگ کے لئے بہت ہی کمزور وجوہ ہیں جنکی وجہ سے مسٹر چائلڈ کے
> آقا اور مالکوں کے زائد از چار لاکھ پونڈ اختتام جنگ سے قبل ہی خرچ ہو گئے
> علاوہ ازیں بادشاہ اور اسکی رعایا کے نزدیک ان لوگوں کا اعتبار اسقدر گھٹ
> جاتا رہا جو آج تک پوری طرح جیسا کہ چاہئے قائم نہیں ہوا ہے۔ وہ کون قاعدہ
> اور پالیسی تھی جس کے بموجب یہ توقع کیجا سکتی تھی کہ باوجود اس کے کہ بادشاہ مغلیہ
> کے ایک حصہ حکومت میں تو مسٹر چائلڈ یا سر جوزیا (Sir Josiah Child)
> بادشاہی رعایا کو قتل و غارت کریں اور بادشاہ موصوف اپنے دوسرے حصہ حکومت
> میں کمپنی کو امن و امان کیساتھ تجارت کرنے کی اجازت دیں۔ نہیں معلوم یہ لوگ
> کسطرح اسکی امید کر سکتے تھے کہ ایسے موقع پر بادشاہ غیر جانبداری کی صورت اختیار کرتے

اِس سوال کا جواب تو وہ مدبرین کے جن کو پالیٹکس میں دخل ہے۔ میں تو صرف اصلی واقعات بیان کرتا چلا جا رہا ہوں"

(جلد اول صفحہ ۲۱۳)

معلوم ہوتا ہے کہ سر جو بیا (Mr. Holwell) وہی حضرت ہیں جو بنگال میں ایسے افعال کے مرتکب ہو چکے تھے کہ جنکی وجہ سے مسٹر جانسن پیلڈ کو بھی اپنی درخواست کی دفعہ ۲۲ میں پیش بندی کرنی پڑی۔ بہر حال جب خود ایک بے غرض اور بے لوث انگریز نے اس طرح اپنی رائے ظاہر کر دی تو اسمیں اور کچھ اضافہ کرنا غیر ضروری ہے البتہ اس سے چند نتائج ضرور اخذ کئے جا سکتے ہیں اول یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ سلطنت مغلیہ کی طرف سے پہلے بہت رعایت کیجاتی تھی مگر کمپنی مذکور بجائے اسکے کہ وہ سلطنت موصوفہ کی شکر گذار ہوتی اور خوش کرداری سے اپنے متعلق مزید مراعات شاہی کا مستحق بناتی اس نے کچھ ایسے اعمال کئے کہ اسکے اعتبار میں فرق آگیا۔ دوسرے یہ کہ عہد اورنگزیب میں محصول کے متعلق زیادہ جانچ پڑتال شروع ہوئی جو کمپنی کو بُرا معلوم ہوا عجب نہیں کہ اسکی ضرورت بھی خود کمپنی ہی کے اعمال کی وجہ سے سلطنت کو ہوئی ہو۔ تیسرے یہ کہ اُس زمانہ کی گورنمنٹ کو غیر ممالک کے تجار کی جان و مال کی حفاظت کا اسقدر خیال تھا کہ اگر انکا کوئی مال سرقہ جاتا تو خزانہ شاہی سے اسکی تلافی کیجاتی تھی اور اس ذمہ داری کی وجہ سے غالباً جانچ پڑتال میں جدوجہد کی کامل ضرورت ہوتی تھی اور یہ صحیح نہیں ہے کہ محض وصول محصول کے لیئے ایسا کیا جاتا تھا۔ محصول وصول کرنے میں جو جانچ پڑتال

کی سختی کی جاتی تھی اس کی نسبت ایک امر کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں
وہ یہ کہ جن لوگوں نے یورپ کا سفر کیا ہوا انکی نگاہ سے وہ سماں گزرا ہوگا
جب کہ ایک فرانسیسی کسی انگریز یا جرمن مسافر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال ڈالکر
بعض وقت صرف اس خیال سے کہ محصولی مال چھپا رکھا ہوا ہے طرح ٹٹولتا ہے
کہ گویا وہ مسافر چور ہے۔ غالبًا احتیاط بھی اسی کی مقتضی ہے کیونکہ مجھ سے
خود ایک یوروپین نے کہا کہ ایک مرتبہ انکی لیڈی صاحبہ بہت سے سگریٹ
اپنے انڈر رویر یعنے اندر پہننے کے کپڑوں میں چھپا کر فرانس لے گئی تھیں
گزشتہ سفر میں مجھ سے ایک صاحب نے کہا کہ پیرس میں ایک جنٹلمین صاحب
اپنا اسباب گورنس کے سپرد کر کے چلدئے اور جب محصول لینے والا آیا اور
دریافت کیا تو گورنس صاحبہ محصولی مال کے ہونے سے صاف انکار کر گئیں
مگر جب ایک بکس بطور نمونے کے کھولا گیا تو اُس میں سے محصولی مال برآمد ہوا
پھر تو ہر بکس کھولا گیا جس سے سارا اسٹیشن ایک اچھا خاصہ مینا بازار بن گیا
خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا جو موجودہ زمانہ کے حالات اور واقعات سے متعلق
تھا۔ یہاں دراصل عہد اورنگ زیب کا ذکر ہے لیکن موجودہ واقعات کے تعلق سے
ہم یہ پوچھتے ہیں کہ عہد موصوفہ میں محصولی اسباب کی جانچ پڑتال میں
کد و کاوش یا شرح محصول کی رد و بدل میں حکومت نے کیا جرم کیا تھا وہ
لوگ جن کو بادشاہ نے اپنے ملک میں تجارت کی اجازت دی تھی۔ زمینیں
عطا کی تھیں۔ جو بادشاہ کے سایۂ عاطفت میں باطمینان صرف بسر ہی نہیں
کرتے تھے بلکہ تجارت کی بدولت وہ ہندوستان کی دولت سے بھی مستفید ہو رہے تھے

انہیں لوگوں نے ایسی ناشکری اور کمینہ پن کی حرکت کی جس سے خود اُن ہی کی قوم کا ایک فرد متنفر تھا اسوقت اورنگ زیب کی قوت مسلمہ تھی اُس کو انگریزی تجار کا خوف نہ تھا اس کے قلم کی ایک گردش ان کی تجارت کا خاتمہ کر سکتی تھی عہد اورنگ زیب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حالت ایک شیر خوار بچہ کی تھی چنانچہ وہی لوگ جنہوں نے یہ شکایتی درخواست اس زور و شور سے بھیجی تھی اور جنگ کی تھی اُن کو اپنی ناعاقبت اندیشی کے خمیازہ میں اورنگ زیب کے حضور میں حاضر ہونے اور معافی حاصل کرنے کی تدبیر کرنی پڑی۔ ایک وفد تیار کیا گیا جس میں کپتان ہملٹن بھی شریک تھے اور جس ذلت آمیز طریقہ سے یہ وفد شاہجہاں آباد میں اورنگ زیب کے حضور میں پیش کیا گیا اس سے کپتان صاحب کو کسقدر تکلیف ہوئی کیونکہ وہ اُنکی قومی خودداری کے بہت ہی خلاف تھا۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں :-

"دربار میں انکی رسائی تو ہوگئی لیکن اورنگ زیب کے حضور میں وہ اس ذلت کے ساتھ پیش کئے گئے جو کسی ملک کے سفیروں کے لئے زیبا نہ تھی۔ سامنے ان کے دونوں ہاتھ ایک پٹکے سے باندھ دئیے گئے تھے اور اس حالت سے بادشاہ کے روبرو خمیدہ پشت زمیں بوس ہیئت میں پیش کئے گئے"

(جلد اول صفحہ ۲۲۴)

یہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کی کیفیت تھی اور اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ بالآخر اورنگ زیب نے کیا طرز عمل اختیار کیا۔ اورنگ زیب کا اصلی کیرکٹر جانچنے کا یہ بہت نازک وقت تھا۔ یہی وہ مواقع ہوا کرتے ہیں جن پر

ایک بادشاہ کا اصلی کیرکٹر معلوم ہوتا ہے جب مرورِ زمانہ سے انسانی جذبات کا بادل چھٹ جاتا ہے اور مورخ کے سامنے صرف سچائی اور اصلیت کا صاف مطلع باقی رہ جاتا ہے تب ایسے ہی وقت کے افعال پیش نظر ہوتے ہیں۔ آج سوا دو سو برس کے بعد ہم اس امر کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟

میری رائے میں اورنگ زیب نے جو طرز عمل ایسے موقع پر اختیار کیا اُسی سے اس امر کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کیا اس بادشاہ کا یہ مقصود تھا کہ اہل یورپ ہندوستان میں تجارت نہ کرنے پائیں؟

درخت کی ایک پتی کی حرکت سے نہیں بلکہ بعض وقت ایک تنکے کی حرکت سے سینکڑوں میل کی ہوا کا رُخ معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح بعض وقت انسان کے ایک فعل سے ہی اُسکے تمام کیرکٹر کا پتہ چل جایا کرتا ہے۔ اس موقع پر مغلوب غالب کے پاس جاتا ہے۔ عاجز قادر کے روبرو حاضر ہوتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ غالب و قادر کیا کرتا ہے۔ کپتان ہملٹن لکھتے ہیں کہ جب یہ وفد اورنگ زیب کے روبرو پیش ہوا تو بادشاہ پہلے تو بہت غیظ و غضب میں معلوم ہوتا تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ غصہ اُتر گیا تب بادشاہ نے دریافت کیا کہ تمہاری کیا درخواست ہے وفد نے پہلے قصور کی معافی مانگی اور بعدہٗ دوبارہ تجارت کرنے کی اجازت چاہی اُس وقت اورنگ زیب نے اپنے اصلی کیرکٹر کا اظہار کیا اور الطاف شاہی سے یہ دونوں درخواستیں منظور کر لیں۔ وفد کو حکم ہوا کہ وہ بمبئی واپس جائے بعدہٗ فرمان مبارک

بھیجا جائیگا چنانچہ کچھ روز بعد فرمان شاہی اُن تمام لوازمات کے ساتھ شرف صدور پایا جو ایسے موقعوں پر بطور اعزاز واکرام مبذول فرمائے جاتے ہیں۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ سورت میں ایک بڑا دربار منعقد کیا گیا۔ اس دربار میں وہ فرمان شاہی پڑھا گیا جس کا ترجمہ کپتان نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے اور جس کا اب اردو ترجمہ میں پیش کرتا ہوں۔ لوازمات فرمان شاہی یہ تھے کہ فرمان کے ساتھ ساتھ ایک عدد گھوڑا و بیش قیمت اطلس یا زربفت کا خلعت بھی جس پر کارچوبی سنہری) روپہلی گل بوٹے کاڑھے گئے تھے عطا ہوا۔ یہی فرمان وہ چارٹر (Charter) و منشور خسروی تھا۔ جو اورنگ زیب کے پیشگاہ سے کمپنی کو عطا ہوا تھا اور جسکی سند پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے پھر ہندوستان میں تجارت شروع کی تھی۔

ترجمہ فرمان شاہی
اورنگ زیب بنام ایسٹ انڈیا کمپنی

"تمہاری عرض داشت بدین مضمون با بدولت واقبال کے ملاحظہ میں آئی کہ جبقدر فتنہ وفساد پیدا ہوا اسکے قصوروار تم ہو۔ تم نے صوبہ داران متعلقہ کے خلاف متعدد شکایتیں کی تھیں جن کا ذکر بدولت نے اپنے امرائے دربار سے سنا۔ تم کو یہ شکایت تھی کہ صوبہ داروں یا ماتحت عہدہ داروں نے تمہارے ساتھ

"بدسلوکی کی تم کو لازم تھا کہ شورش برپا کرنے سے قبل ان سب باتوں کی اطلاع تم
"مجھ کو دیتے۔ لیکن اب چونکہ تم اپنی خطا کے معترف اور خواستگار معافی ہو لہٰذا
"واقعات گزشتہ کو معاف کر کے صرف تمہاری درخواست ہی منظور نہیں کی جاتی"
"بلکہ تمہارے حسب استدعا تم کو ایک فرمان بھی عطا کیا جاتا ہے اور اسد خاں"
"کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بعد از تمام تفصیلات جنکی اطلاع وہ تم کو دیگا فرمان کو"
"صوبہ دار سورت کے پاس روانہ کر دے جس وقت یہ فرمان نافذ ہو تم اس کو"
"تعظیم واحترام کیساتھ وصول کرو اور اسکی عزت و شرف کا اقبال واعتراف کرو"
"جو فرمان مذکور صادر کرکے تم کو بخشا گیا ہے جیسے تم پیشتر تجارت کیا کرتے تھے:
"اب بھی اسی طرح حسب معمول تجارت کرنیکی تم کو اجازت دی جاتی ہے۔ جن تاجروں"
"کی تم شکایت کر رہے ہو تم پر واجب ہے کہ اُن کے جہازات معہ سامان اُن کے"
"حوالہ کر دو اور آئندہ سے اس قسم کی غلطی کبھی نہ کرنا جس کے تم اس مرتبہ مرتکب ہوئے"
"ہمیشہ بدولت کی خوشنودی و رضاجوئی کے امیدوار رہو۔ اور اسکو کبھی نظر انداز"
"نہ کرو۔ اگر تم کو میرے صوبہ داروں عہدہ داروں یا میری رعایا سے کسی قسم کی"
"اذیت پہنچے تو اسکی اطلاع دینے میں کبھی فروگذاشت نہ کرو۔ بدولت نے"
"اسد خاں کو حکم دیدیا ہے کہ وہ اسی کے مطابق تحریر کرے۔ مسمی باؤجی کی
"پناہ دہی کے متعلق تم نے شکایت کی ہے کہ سابقہ صوبہ داروں نے اسکو اپنی"
"پناہ میں لے لیا ہے اور نامبردہ پر تمہاری کئی رقوم واجب الادا ہیں اور اس لئے"
"تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے سپرد کر دیا جائے۔ اس بارے میں حکم دیا جاتا ہے کہ تم اپنا دعویٰ
"(عدالت میں) بزور قانون ثابت کرو اس وقت جو مقتضائے انصاف ہوگا عمل میں آئیگا

"تسلسلہ جلوس اورنگ زیب"

(جلد اول صفحہ ۲۲۰)

یہ فرمان اورنگ زیب کے کیرکٹر کی کنجی ہے۔ اس فرمان سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟ ایسٹ انڈیا کمپنی کے رویہ کا مقابلہ اورنگ زیب کے الطاف و کرم سے کیجئے۔ وہ مورخ جسکو اصلی واقعات نہیں معلوم جو چاہے کہے یا لکھے مگر ۱۶۸۷ء میں اس انگریز کے دل پر جو اس وفد میں شریک تھا اورنگ زیب کے رحم و کرم شاہانہ کا جو اثر ہوا وہ یوں ظاہر کرتا ہے:۔

"یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ انکی اس بدسلوکی سے جو اسکی رعایا کے ساتھ کی گئی تھی"
"لاعلم نہ تھا۔ بایں ہمہ وہ جرائم اور خطاؤں کے پاداش میں کچھ سخت سزا نہیں"
"دینا چاہتا تھا اس لئے اُسنے ایک رحمدل بادشاہ کی طرح ان لوگوں کو اُن کے قصور"
"سے آگاہ کر دیا اور ان کو دانشمندانہ نصیحت کی کہ آئندہ ایسی غلطی کے مرتکب"
"نہوں۔ شاہانہ طریق سے انکو سمجھا دیا کہ وہ عنایات و عطوفات شاہی کو بنظر"
"شکر و سپاس دیکھیں اور پابندی قانون کو اپنا مسلک قرار دیں۔ غرض کہ اس بادشاہ"
"نے تمام اقوال و افعال میں پوری طرح سے تحمل سے کام لیا"

(جلد اول صفحہ ۲۲۹)

آج کلکتہ میں جس مقام پر فورٹ ولیم قلعہ بنا ہے وہ زمین کس نے اور کس کو دی تھی؟

"کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اورنگ زیب

کی رعایا پر قتل وغارتگری کیا کرتے تھے۔ اور ڈاکے مارا کرتے تھے لیکن ایک موقعہ پر اورنگ زیب نے ان خونریزیوں کو معاف کر کے کمپنی کے ایجنٹ وفائنڈ مسٹر جوزف بیخاک کو یہ حکم دیا کہ وہ بنگال میں کوئی زمین اپنے قیام گاہ و مال و اسباب کی منڈی قائم کرنے کے لئے خود منتخب کر لیں تب اس ایجنٹ نے ۱۶۹۰ء میں وہ زمین دریائے ہگلی کے کنارے انتخاب کی جس پر آج قلعہ فورٹ ولیم نظر آرہا ہے۔

(جلد دوم صفحہ)

اِن واقعات کے بعد یہ کہنا کہ اورنگ زیب تجارت کا حامی و مددگار نہ تھا سخت بے انصافی ہوگی۔ یہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حرکات کا ذکر تھا مگر ہندوستان صرف انگریزوں کا بازی گاہ نہ تھا بلکہ دوسری یوروپین قومیں بھی یہاں شکار کھیل رہی تھیں اور اُن میں قابل ذکر ڈچ ہیں جنکا ذکر باب نہم میں کیا جائیگا۔ یہ جو چند واقعات یہاں لکھے گئے ہیں یکے از ہزار و مشتے از خروارے ہیں تاہم انہیں واقعات سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ کیا اورنگ زیب نے انگریزوں اور ڈچوں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا؟ جو واقعات اس مضمون میں درج ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریزوں اور ڈچوں نے اورنگ زیب کی حکومت میں کس طرح کی دشواریاں پیدا کرنی چاہیں مگر اورنگ زیب نے اپنے الطاف شاہانہ سے انکی خطاؤں سے چشم پوشی کی اور تجارت میں ہمیشہ ان کو مدد دی جس کی وجہ سے اُن کو اور اُن کے ملک کو وہ تمول نصیب ہوا جس کا ذکر تجارت

تجارت کے باب میں کیا جا چکا ہے۔ آج ان سب باتوں کو بھول جانا سخت ناشکری ہے۔

باب ہشتم

یوروپین تجار کی پالیسی و اخلاق

اس باب میں ایک کامیاب ڈپلومیسی اور بدترین اخلاق انسانی کے عجیب و غریب اجتماع کا ذکر کیا جائیگا اور یہ دکھلایا جائیگا کہ باوجودیکہ اس ڈپلومیسی کے حاملوں کی اخلاقی حالت کیسی کچھ متبذل اور دیانت سے دور تھی مگر اس نے کیونکر ایک ہندوستانی سلطنت کو مٹا کر اپنا منشاء پورا کر دکھایا یہ قدرت کا کرشمہ ہے جس سے ایسے عظیم الشان تغیرات ظہور پذیر ہو جایا کرتے ہیں۔ جیسے ایک سلطنت کا صفحۂ ہستی سے مٹنا اور دوسری کا قائم ہو جانا چونکہ اس ڈپلومیسی کی ابتداء عہد اورنگ زیب میں ہوئی لہٰذا اس کتاب میں اسکا ذکر کرنا ضروری تھا۔ شاید یہ ہی غلطی اورنگ زیب کی دوراندیشی کے خلاف تھی کہ بادشاہ موصوف نے اپنی تمام قوت کل ہندوستان کو ایک متحد بڑی ایمپائر Empire یعنے عظیم الشان سلطنت کی صورت میں مبدل کر دینے میں صرف کر دی اور ان کیڑوں کو نہ دیکھا جو کہ نظر سے دور رہ کر ته میں اس بڑی سلطنت کی عمارت کی بنیاد کو کھود کھود کر کمزور کر رہے تھے

جس کو یہ بادشاہ اس شان و شوکت کے ساتھ بنانے کی کوشش کر رہا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اورنگ زیب نے اس دار فانی سے رحلت کی بظاہر عظیم الشان عمارت تو بنکر تیار ہوگئی لیکن چونکہ بنیاد تو کمزور ہوگئی تھی ایک تند ہوا کے جھونکے نے اسکو گرادیا جس تدبیر سے یہ بنیاد کمزور کی گئی وہ ایسی موثر ڈپلومیسی ہے جس کا نشانہ اس ملک میں کبھی خالی نہیں گیا ہندوستان کے اس حصہ تاریخ سے جو سبق ملتا ہے وہ کسی قوم و ملت کو نہ بھولنا چاہئے بلکہ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ جو انسان اپنے گزشتہ تجربہ سے آئندہ کے لئے سبق نہیں حاصل کرتا وہ اس دنیا میں ذلیل و خوار و ناکامیاب رہتا ہے اسی طرح سے جو قوم اپنی قومی سوانح عمری اور تاریخ سے سبق نہیں لیتی وہ ہمیشہ معرض خطر میں رہتی ہے بلکہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

جس ڈپلومیسی کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں اور جس سے سبق حاصل کرنا چاہئے وہ یہ تھی کہ دو قوتوں کو لڑا کر ایک قوت کا ہمدرد بننا اور اس سے سلطنت و حکومت میں کچھ حقوق حاصل کرنا پھر جب حاصل شدہ حقوق مستحکم ہوگئے تو اسی ڈپلومیسی سے آگے قدم بڑھانا اور نئے حقوق حاصل کرنا اسی طرح سے رفتہ رفتہ دونوں قوتوں کو مٹا کر خود بلا شرکت غیرے ملک کا بادشاہ بن جانا۔ انسانوں کے کسی طبقہ کے عیوب بیان کرنا کوئی خوش کن کام نہیں ہے لیکن فلسفہ تاریخ سمجھنے کے لئے اور سبق حاصل کرنے کے لئے بعض وقت ایسے واقعات کا بیان کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

بادی النظر میں سب سے پہلے اس ڈپلومیسی کی ابتداء ہندوستان میں ڈوپلے نے

کی تھی۔ ہندوستان میں ڈچوں کی پالیسی کی بابت کپتان صاحب نے ۱۸۸۰ء میں جو خیال ظاہر کیا تھا وہ حسب ذیل ہے:۔

"اس ایماندار کمپنی نے ہمیشہ سے یہ قاعدہ مقرر کر لیا تھا کہ اول تو وہ ہندوستانی رئیسوں اور حکمرانوں میں لڑائی کرا دیتی اور پھر بڑے اظہار دیانت داری کیساتھ ان کے جھگڑے قضئے چکانے کے لئے خود ثالث اور پنچ بن جاتی اور ہمیشہ میزان عدالت کا پلہ اس کے حق میں بھاری کر دیتی جس کے ملک کی پیداوار یا جس کے ہاں کا مال کمپنی کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ہوتا تھا۔ اور ہمیشہ اسی رئیس کو اسلحہ جنگ سے مدد دیتی تھی جسکو مدد دینا کمپنی کے مفید ہوتا اور جنگ ختم ہونے پر وہ غریب مفتوح کی گردن پر ان تمام مصارف کا بوجھ ڈالتے تھے جو فاتح کی مدد دینے میں عائد ہوتے تھے۔ جب یہ سب کچھ ہو جاتا اور عہد نامہ پر دستخط کرنے کا وقت آتا تو کمپنی جو کہ دوستی کا دعوٰے کرتی تھی اپنے دوست کا بہترین بندرگاہ معاوضہ میں لے لیتی۔ اس پر قلعہ بندی کرتی اور پھر سوائے ڈچوں کے دوسروں کو اس بندرگاہ پر تجارت کی اجازت نہ دیتی اور اگر اس کے خلاف کچھ ہوتا تو کمپنی کی فوج بہ شرکت کسی دوسرے دشمن کے اس کے مقابلہ پر تیار کی جاتی"

(جلد اول صفحہ ۲۲۵)

کپتان ہملٹن کی رائے میں یہ طرز عمل ڈچوں کا اس ملک میں تھا لیکن میری رائے میں صرف ڈچوں کو اس غیر مستحسن پالیسی کا الزام نہیں دیا جا سکتا ممکن ہے کہ اسکی بنیاد ڈچوں ہی نے ڈالی ہو مگر رفتہ رفتہ تمام یوروپین قومیں اسی پالیسی پر عمل کرنے لگیں۔ **من حیث الانسان**

ان پر کوئی بڑا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ دوسروں پر سیادت و فوقیت حاصل کرنے کا خیال جیسا کہ دو سو برس پہلے تھا ویسا ہی اب بھی موجود ہے ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ اُن کے حصول کے طریقہ بدل گئے ہوں مگر خیالات، جذبات حرص و ہوا اور انسانی فطرت کا تقاضا آج بھی وہی ہے اسکو مذہب و قومیت سے بھی تعلق نہیں ہے مسلمان و عیسائی۔ انگریز و فرانسیسی سب اس انسانی کمزوری کے شکار بن چکے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اسٹیٹسمین یعنے مدبرین و اہل سیاست کا اخلاقی دستور العمل ہر زمانہ میں ممبر پر بیٹھکر وعظ کرنے والوں سے بالکل جداگانہ ہوا کرتا ہے۔

۱۶۸۰ء کے قریب جو خط ولایت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدداروں کے پاس بدیں مضمون آیا تھا کہ ہندوستانیوں سے بڑی بڑی رقمیں قرض لیکر جہاز ولایت کو بھیج دو اور پھر حکومت اورنگ زیب سے کسی نہ کسی طرح سے جنگ کی وجوہ پیدا کر کے روپیہ ہضم کر لو اُس کا تذکرہ "باب ہشتم" میں کیا جا چکا ہے جس سے ثابت ہوا کہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ طرز عمل بھی اسی پالیسی پر مبنی تھا جس کا اتہام کپتان صاحب نے ڈچوں پر اس وقت لگایا تھا۔

ایک مقام پر کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۷۱۶ء میں:۔

"زومرن کے راجہ نے ڈچ کمپنی سے جنگ کی جس میں انگریزی فیکٹری کے افسر اعلےٰ نے جو راجہ زومرن کا مشیر خاص تھا۔ آتش جنگ بھڑکانے میں بہت کچھ حصہ لیا۔ اُس وقت تو ڈچوں کا قلعہ "فتح کر لیا گیا۔ لیکن پھر انگریز مشیر نے اپنا ہی جھنڈا

اُس قلعہ پر نصب کرادیا اور بالآخر نتیجہ میں اس بازی میں فریقِ فرانس ہی کی ہار ہوئی۔"

(کپتان ملسن جلد اول صفحہ ۳۱۴)

اسی طرح سے سیام میں جب انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو یہ معلوم ہوا کہ کمپنی پر قرضہ بہت ہوگیا ہے تو انہوں نے دفعۃً کارخانہ کو محض اس لئے آگ لگادی کہ شاہ سیام کی رعایا پر اس حرکت کا الزام لگا کر شاہ سے تاوان وصول کریں اور انکار کرنے پر جنگ چھیڑ دیں۔

(جلد اول صفحہ ۱۰۰)

اس قسم کے واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی میں اور ڈچوں کی پالیسی میں کچھ فرق نہ تھا اسی طرح سے عہد اورنگ زیب کے بعد ڈوپلے فرانسیسی گورنر اور کلائیو انگریزی گورنر کی سرگرمیاں اور ہر دو فریق کی فتح اور شکست ہندوستان میں بس اسی غرض وغایت سے تھی کہ اس دوڑ میں کون سبقت لیجاتا ہے اور بالآخر اس پالیسی میں ایسٹ انڈیا کمپنی گوئے سبقت لے گئی اور نتیجتاً انگریز اس ملک کے حکمراں ہوگئے۔ اس موقعہ پر مجھے خیال آتا ہے کہ تمدن ہند کے فرنچ مصنف نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ملک گیری انگلستان سے سیکھنا چاہیئے اس نے ہندوستان کی مثال پیش کرکے لکھا ہے کہ انگریزوں نے یہ ملک ہندوستانیوں ہی کے خون اور روپیہ کی مدد سے فتح کرلیا اس ملک کے فتح کرنے میں جتنی بڑی بڑی لڑائیاں انگریز لڑے اُن میں زیادہ تر ہندوستانی سپاہیوں کا خون بہا تھا اور

اخراجات جنگ اسی ملک کے روپیہ سے ادا کیے گئے تھے نہ انگریزوں کا ایسا خون بہا جو بیان کے قابل ہو اور نہ انکے ملک کا روپیہ صرف ہوا اس میں شک نہیں کہ اگر کسی ملک گیر کو ملک گیری کا مقصد اس طرح سے حاصل ہو سکتا تھا تو سیاسی حیثیت سے کوئی دوسرا طرز عمل اختیار کرنا اس کی بڑی حماقت ہوتی۔ ہندوستانیوں نے اگر اس کا مقابلہ عقل سے نہ کیا تو یہ ان ہی کا قصور تھا اور اب بھی اگر ہندوستانی اس سبق سے کر عقل سے کام لیں تو انکو کوئی منع نہیں کرتا۔

یہاں تک تو کامیاب پولیسی کی نوعیت بیان کی گئی اب ان حضرات کی اخلاقی حالت کو ملاحظہ فرمائیے جو اس پولیسی کی مدد سے ہندوستانی سلطنت کی بیخ کنی کر رہے تھے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ اس ملک سے ہندوستانی سلطنت اس وجہ سے نہیں گئی کہ اس کے دشمنوں میں کوئی خاص انصاف کا مادہ یا انسانی اخلاقی خوبیاں تھیں جنکے اثرات نے اس سلطنت کو معرض زوال میں ڈالدیا تھا۔ کپتان ہملٹن کا تمام سفرنامہ میرے اس خیال کا شاہد ہے۔ اس زمانہ میں جو پورچگیز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتے تھے ان کی بابت کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ جو شخص ان پر بھروسہ کرتا تھا اس کو دھوکہ دینے میں وہ کبھی نہیں چوکتے تھے

(جلد دویم صفحہ ۷)

شاہ بنگو نے ایک پرتگیز کو اپنی فوج کا جنرل مقرر کیا تھا وہ اسقدر مغرور اور گستاخ ہو گیا تھا کہ ایک دن جب وہ ہاتھی پر سوار کسی دولہن کے مکان میں

اُس کے والدین کو مبارکباد دینے کے لئے گیا۔ دولہن کو دیکھکر ایسا مفتون اور ازخود رفتہ ہوگیا کہ وہ اُس ایک دن کی بیاہی عروس کو زبردستی پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔ (جلد دوم صفحہ ۳۰)

سمندر کے راستوں پر لوٹ مار کرنا اُن کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ (جلد اول صفحہ ۱۶۴)

انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے دو اصل سنٹر یعنے مرکز تھے صوبہ بنگال میں کلکتہ اور صوبہ سورت میں بمبئی۔ بنگال میں مسٹر جوزف چناک ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایجنٹ تھا اس کو شہنشاہ اورنگ زیب نے اجازت دیدی تھی کہ وہ اپنی تجارت کی منڈی کے لئے کوئی جگہ خود منتخب کرلے چنانچہ ۱۶۹۰ء میں اُس نے اُس مقام کو منتخب کیا جہاں کہ اب فورٹ ولیم کا قلعہ واقع ہے کپتان ہملٹن نے اس مسٹر چناک کے بڑے کرتوت اپنے سفرنامہ میں تحریر کیے ہیں۔ ایک مقام پر لکھا ہے کہ :۔

"مسٹر چناک نے اپنی بستی بسانے کے لئے یہ موجودہ زمین لے لی تھی اور یہاں وہ "ایک والئ ملک سے بھی بڑھکر خودمختاری سے بادشاہت کرتا تھا البتہ فرق اتنا "تھا کہ سلاطین میں ہمدردی وانسانیت ہوتی ہے اور وہ اُسمیں مفقود تھی جب "کبھی کوئی غریب ناواقف ہندوستانی اسکے قوانین کی خلاف ورزی کرتا تو "لزوماً اسکو سخت سزائے بید دیجاتی اور اسکے اس حکم کی تعمیل عموماً اُس وقت "کی جاتی تھی جب وہ کھانے پر ہوتا تھا۔ کھانے کے کمرے کے پاس اس مجرم کی "گریہ وزاری میں اسکو خوشگوار سرود کا مزا آتا تھا۔ اس جگہ کے آس پاس جب پہلے

"آباد ہیں اور اُن میں مُردہ شوہر کے ساتھ بیوہ کا ستی ہوجانا مروج ہے مغلوں"
"کی جنگ سے پہلے ایک مرتبہ مسٹر چناک نے اپنے معمولی باڈی گارڈ کے ساتھ ایک جوان"
"بیوہ کو ستی ہونے کی دردناک رسم ادا کرتے ہوئے دیکھا جس کے حُسن و جمال پر وہ"
"ایسا فریفتہ ہوگیا کہ اُسنے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان جلادوں سے اس عورت"
"کو زبردستی چھین لاؤ جبکی تعمیل میں وہ حسینہ و جمیلہ زبردستی اسکے بنگلہ میں پہنچائی"
"گئی جہاں وہ دونوں بہت برسوں تک محبت کیا تہہ رہے اور اس عورت سے"
"کئی بچے بھی ہوئے۔ آخر کار مسٹر چناک کے کلکتہ میں سکونت پذیر ہونے کے بعد وہ"
"مرگئی۔ اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ عورت عیسائی"
"ہو جاتی اُس عورت نے خود مسٹر چناک کو شدھی کر لیا جس کے بعد مسٹر چناک میں"
"صرف اس قدر بات تو عیسوی عقیدہ کے موافق دیکھنے میں آئی کہ اُس نے اپنی"
"بیوی کو اچھی طرح دفن کرکے اسکی قبر پر ایک گنبد تعمیر کرادیا اور جب تک زندہ رہا"
"بُت پرستوں کے دستور کے مطابق سال بسال ایک مرغ اس عورت کی قبر پر ذبح"
"کرکے اسکی برسی کرتا تھا۔ یہ واقعہ عام طور پر مشہور ہے اور مجھے معتبر ذرائع سے"
"اطلاع ملی ہے۔ ہندو اور عیسائی جو بمقام کلکتہ چناک کے قلعہ میں آباد تھے"
"اُن سب کا بیان تہا کہ یہ واقعہ بالکل سچ ہے۔"

(جلدِ دوم صفحہ ۸ و ۹)

بنگال میں ہوگلی کے قریب جو کالونی یا نوآبادی انگریزوں کی تھی اُن لوگوں کی بابتہ کپتان صاحب بیان کرتے ہیں کہ:-

"اگرچہ کہ اس نوآبادی کے جلسۂ انتظامی کے ممبر بہت سے معاملات میں آپس میں اختلاف"

"کیا کرتے تھے مگر ان غیر شخصوں کے ستانے میں جو ان کے قابو میں آ جاتے ہیں بہت متفق
"اور یکدل ہو جاتے ہیں اُن کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ جہاں تک چاہا
حسب مرضی منافع کے ساتھ مال کی خرید و فروخت کریں بلکہ وہ مجبور ہیں کہ گورنر یا اعلا
کونسل اپنی مرضی اور صوابدید سے جو قیمت مقرر کر دیں اسی پر بیع و شری کریں بطور بیع کے طور پر یہ ہو کہ
اگرچہ بیشتر سے خرید و فروخت کی اجازت گورنر سے حاصل کر لیتے ہیں مگر یہ ایک ناقابل معافی جرم قرار
دیا گیا ہے کہ وہ ہوگلی جا کر مال کا نرخ بھی دریافت کریں" (جلد دوم صفحہ ۱۲ و ۱۳)

اگر کبھی کوئی مال فروخت کرتا یا روپیہ قرض دیتا اور پھر چاہتا کہ تقاضہ کرے تو بغیر دھکا و پھٹکار کے اسکی جان بری نہیں ہوتی۔

(جلد اول صفحہ ۲۴۸)

اور یہ تو ایک بالکل معمولی بات تھی کہ فرنگی سیاح ہندوستانیوں کے رقص و سرود کے جلسہ میں جب مدعو کئے جاتے تھے تو وہ وہاں جا کر تہذیب اور شرم و حیا کو خیرباد کہکر طوائف سے ہوسناکی کی خواہشات کی تکمیل آزادی سے کرتے

(جلد اول صفحہ ۲۶۴)

یہاں تک بنگال کے انگریزی تجار کی اخلاقی حالت بتائی گئی اب سمت بمبئی کا حال سنیئے بمبئی کے مجلس انتظامی کا صدر نشین مسٹر چائلڈ mr. child نامی ایک شخص تھا جس سے اور ایک شخص مسمی کپتان تھار برن Captan Thaburon سے بگاڑ تھی۔ صدر نشین مذکور نے اس کے خلاف جھوٹے دستاویزات اور جعلی کاغذات بنا کر اسکی سب جائداد ضبط کر لی اور اس کو جیل خانہ بھیجدیا۔ اس کپتان کی بیوی پیسے پیسے کو محتاج ہو گئی بعض

دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اِسی قسم کی جلسازیاں کی گئیں۔

(جلد اول صفحہ ۱۹۵)

یہ مسٹر چائلڈ جو کمپنی کا جنرل سمجھا جاتا تھا ایک شخص مسمیٰ بوچر Boucher سے ناراض ہو گیا اور اس نے ایک بنئے کو اس پر متعین کیا کہ کسی طرح سے مسٹر بوچر کو زہر دیا جائے۔ یہ بنیا مسٹر بوچر کے ہندوستانی باورچی سے ملا اور مسٹر چائلڈ کا مطلب حاصل کرنے کے لئے اُس کو روپیہ کا لالچ دیا۔ ہندوستانی باورچی نے بنئے سے تو وعدہ کر لیا مگر سفید سنکھیا اور روپیوں کی تھیلی جو اُس بنئے نے اسکو دی تھی وہ اس نے اپنے مالک مسٹر بوچر کے سامنے لیجا کر رکھدی۔ (کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۱۹۶ و ۱۹۷)

ایک شخص مسمی ٹپیٹ (Mr. Petit) کو بحری قزاقوں نے گرفتار کر لیا تھا اور اس کا فدیہ یعنے زر مخلصی پانچ ہزار پونڈ قرار دیا تھا۔ مسٹر پٹیٹ نے سورت میں اپنے دوستوں کو روپیہ ادا کرنے کے لئے لکھا لیکن مسٹر چائلڈ نے کسی بنئے کے زبانی قزاقوں کو کہلا بھیجا کہ مسٹر پیٹیٹ بہت مالدار آسامی ہے اس سے پچیس ہزار پونڈ لئے بغیر مت چھوڑنا اس پر قزاقوں نے زر مخلصی کی مقدار میں اضافہ کر دیا۔ یہ رقم مسٹر پیٹیٹ ادا نہ کر سکا اور چھ مہینے میں یہ بیچارہ قزاقوں کی قید میں مر گیا۔ یہ قزاق مسٹر چائلڈ کو گالیاں دیتے تھے کہ اس نے ان کو ایسی بری صلاح دی کہ انکے پانچ ہزار پونڈ بھی گئے۔

(جلد اول صفحہ ۱۹۸)

یہ حضرت وہی مسٹر چائلڈ ہیں جنکا تذکرہ باب ہشتم میں کیا جا چکا ہے

اور جن کو ڈائرکٹروں نے یہ ہدایت بھیجی تھی کہ ہندوستانی تاجروں سے خوب روپیہ اینٹھ کر جہاز ولایت کو روانہ کرو اور جنگ کی چھیڑ چھاڑ کرو۔ انہیں حضرات کی (۴۵) دفعات کی شکایتی درخواست گورنر سورت کے پاس بھیجی تھی جس کا نتیجہ بھی باب ہشتم میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اب دوسرے گورنر صاحب کے حالات

جس زمانہ میں سر جان گیر (Sir John Gayer) بمبئی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے گورنر تھے اُن دنوں ایک شخص اپنی چہاردہ سالہ بیوی کو بمبئی میں چھوڑ کر کسی کام کے لیے چین گیا ہوا تھا۔ گورنر نے اُس عورت کی شادی اپنے لڑکے سے کر دی اور سابقہ شادی محض اس بنا پر کالعدم قرار دیدی کہ بمبئی میں وہاں کے قانونِ نافذہ کی رُو سے شادی کی توثیق کے لئے گورنر کی منظوری حاصل کرنا ضروری ہے جو اس شادی میں حسب قاعدہ نہیں حاصل کی گئی۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۳۵)

کپتان ہملٹن کو اس گورنر کی نسبت یہ شبہ تھا کہ ایک مرتبہ اس نے اپنے کو اور اپنی بیوی کو عمداً کسی نہ کسی طرح سے گورنر سورت کا قیدی بنایا اور اس میں اُس کی یہ مصلحت تھی کہ سورت میں قیام کرنے کا اس کو موقع ملے پھر وہاں وہ اپنا ذاتی سرمایہ کسی تجارت میں اچھی طرح لگا سکے۔

(کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۳۶)

سر جان کے بعد سر نکولس ویٹ صاحب (Sir Nicholas Waite) گورنر مقرر ہوئے۔ یہ ایسا بدرویہ شخص تھا کہ خود کمپنی کے ملازموں نے اس کو پکڑ کر

بحیثیت ایک قیدی کے انگلستان روانہ کر دیا۔

(کپتان ہلٹن جلد اول صفحہ ۲۳۶)

یہ حالت تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کی سرزمین ہند پر تھی سمندر کی بابت کپتان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یہی یورپین تاجر بعض اوقات دریائی ڈاکو بھی بنجایا کرتے تھے اور بڑے بڑے ستم ڈہایا کرتے تھے سورت کے حالات تحریر کرتے ہوئے کپتان موصوف لکھتے ہیں :۔

"۱۶۹۵ء میں کپتان اویوسی ایک بحری قزاق نے اس شہر کی تجارت وامن میں خلل ڈالا اور چار چھوٹے جہازوں سے حملہ کر کے دولت مغلیہ کا ایک جہاز لوٹ لیا جس سے بہت سارا سونا چاندی اور ایک مسلمان خاتون لوٹ میں اس کے ہاتھ آئی جیسا کہ میں بسلسلہ انبیا تجارت بحر احمر وسیدا الاسکر تحریر کر چکا ہوں اس وقت سے اس شہر کی تجارت کو بہت صدمے پہونچے ہیں"

(جلد اول صفحہ ۱۴۶)

عہدہ داران ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام حالات کی بابت کپتان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اس کمپنی کے عمال کے ہاتھوں اسقدر ظلم و ستم ہوتا تھا کہ نہ کسی آسمانی کتاب میں اور نہ کسی انسانی قانون میں اتنی طاقت تھی کہ وہ ان لوگوں کو ان زیادتیوں سے باز رکھتا۔

(جلد دوم صفحہ ۱۰)

جب کبھی رعایا مغلیہ انگریزوں کو بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھتی تو کمپنی کے عہدہ دار یہ کہکر کہ تمہاری تنخواہیں بہت زیادہ ہیں جبراً اُن کی ماہوار میں

آدھا ساجھا کر لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۲۴)

یہاں تک تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجار کی عام اخلاقی حالت بیان کیگئی مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اخلاقی حیثیت سے پورا آوا کا آوا بگڑا ہوا تھا۔ جو لوگ کہ ان تاجروں کی اخلاقی حالت درست کرسکتے تھے یا جن کا کچھ اثر تھا وہ پادری صاحبان کا طبقہ ہوسکتا تھا لیکن کپتان ہملٹن صاحب کی رائے اس طبقہ کی بابت یہ تھی کہ جہاں کہیں انکے قدم پہونچتے تھے وہاں شراب خانے اور عیاشی کے اطوار بھی ساتھ ساتھ چلتے تھے اور وہ لوگ جو ابھی تک ان باتوں سے پرہیز کیا کرتے تھے انکو بھی ان بدعات سے بچنا بہت دشوار ہوجاتا تھا۔

(جلد دوم صفحہ ۵۵ و ۸۶)

بصرہ کی تو یہ حالت تھی کہ علانیہ گرجوں میں شراب فروخت کرتے تھے اور جو رعایت گورنمنٹ انکے ساتھ مرعی رکھتی تھی اس سے یہ بدترین اور ذلیل ترین فائدے اٹھاتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۸۴)

گوا کے مشنریز کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی شخص ایک راسی چیز مثلاً مچھلی وغیرہ بازار سے خریدے اور پادری صاحب کو دینے سے انکار کردے۔ تو وہ اس کو مرتد قرار دیکر ذات سے باہر کردیتے تھے۔ اور پھر بغیر سیاست پونڈ لئے شریک نہ کرتے۔

(جلد اول صفحہ ۲۵۲)

لوگوں کو طرح طرح کی بازیگری و افسون گری کے کرتب دکھا کر اپنا معتقد بنا لیتے تھے۔

(جلد اول صفحہ ۲۵۲)

اگر کوئی شخص گناہوں سے نجات حاصل کرنا چاہے تو وہ اسکو بہت آسانی سے خرید سکتا تھا۔

(جلد اول صفحہ ۳۲۴)

منگلوریں بعضے ایسے بے حیا تھے کہ اگر کچھ روپیہ ملتا ہو تو مسافروں کے واسطے عورتیں مہیا کرنے میں بھی ان کو کچھ عار نہ تھا۔ اور ان کا خیال ہے کہ اگر کچھ فائدہ ہوتا ہو تو چوری۔ قتل۔ یا زنا کوئی گناہ نہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۸۲)

انہیں کی بابت کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ دنیا کے ریاکاروں کے طبقہ سے ہیں۔

(جلد اول صفحہ ۲۲۷ - ۲۴۷)

ہم کو ان واقعات کے بیان کرنے میں تکلیف معلوم ہوتی ہے، لیکن ہم اس تفصیل کے ساتھ مثالیں پیش کرنے کے لئے اس لئے مجبور تھے کہ اگر صرف دو ایک واقعات بیان کئے جاتے تو ناظرین کو شاید یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ بداخلاقی کی مثالیں ہر قوم اور ہر زمانہ میں پائی جاتی ہیں لیکن جب حالت وہ تھی کہ جس کا بیان کیا گیا تو پھر اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ جو ڈپلوسی اس ملک کے فتح کرنے میں بالآخر کامیاب ثابت ہوئی اس زمین اصل

انصاف یا عمدہ اخلاقِ انسانی کو ابتدا میں کوئی دخل نہ تھا۔ یہ ڈلوسی بغیر ان اوصاف کی امداد کے کامیاب ہوئی میں نے لفظ "ابتدا" عمداً استعمال کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ ان واقعات کو انگلستان کے ان پاک نفوس سے کوئی تعلق نہیں ہے جنہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم و تعدی کا مسئلہ پارلیمنٹ اور اپنی قوم کے روبرو خود ہی پیش کر دیا یا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور کے بعد جب ہندوستانی سلطنت مٹ چکی تھی اور انگریزی حکومت مستحکم ہو گئی تھی۔ ہندوستان کو بغرض حکومت بھیجے گئے اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ظلم و تعدی کے رفع کرنے میں اور انصاف کے قائم کرنے میں کوشش کی۔ میں ظلم و تعدی کے ان واقعات کی نقل نہ کرتا لیکن کسی ملک کی تاریخ میں ایسے بڑے بڑے واقعات جن کا ذکر کیا گیا لکھنے کی ضرورت اسلئے ہوتی ہے کہ قوموں اور ان کی سلطنت کی زندگی و موت کے متعلق جو اصول قانونِ قدرت نے بنائے ہیں وہ صحیح طور سے اخذ کئے جا سکیں یا یوں کہئے کہ صحیح فلسفۂ تاریخ تیار کیا جا سکے اور یہ ثابت کیا جا سکے کہ کس طرح سے بدترین اخلاق انسانی بھی بعض صورتوں میں کامیاب ہوتے ہیں گو کہ انکا انجام کچھ ہی ہو۔

۱۸۵۶ء کی ایک معاصر شہادت

حدیقۂ شہداء

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو
تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

بابری مسجد رام جنم بھومی کا مسئلہ۔

جس رخ سے چھیڑا گیا اور جسطرح دونوں طرف سے سفلی جذبات کو بھڑکا کے طلوع مقصد حاصل کرنے کی مضحکہ خیز کوششیں کی جاتی رہی ہیں زندہ قومیں اس طور سے اپنے مسائل حل نہیں کیا کرتیں۔

یہ ایک گھرانے کا، ایک خاندان کا، ایک قوم کا اندرونی جھگڑا ہے جسمیں ایک بڑا بھائی ہے ایک چھوٹا بھائی۔ بڑے بھائی کو چھوٹا پن نہیں دکھانا چاہیے اور چھوٹے بھائی کو بڑا بننے کی ہوس نہیں کرنی چاہیئے۔

مسجد مندر مسئلہ کوئی مسئلہ تھا نہیں، اسے مسئلہ بنا دیا گیا۔ بڑا بھائی کیسے برتاؤ کرتا ہے اسکی ایک مثال قدر سے ٹھیک دو سال پہلے اودھ کی بادشاہت میں ہمیں ملتی ہے جب اجودھیا ہی کی مقدس سرزمین پر ایک اور مسجد مندر کا جھگڑا اٹھا تھا۔ اسوقت کا حاکم واجد علی شاہ اور اسوقت کا وزیر دونوں مسلمان تھے اور مندر کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا بیراگیوں، جوگیوں کا مطالبہ تھا کہ جس جگہ پر ان کا قبضہ ہے پچاس سالہ قبضہ کے بعد مسلمانوں کا مطالبہ کہ قبلاً یہ مسجد تھی اسلیے پھر ان کے حوالے کی جائے، نامناسب ہے۔ بڑا سنگھ کی گفت و شنید ہفتوں پھر مہینوں چلتی رہی ــــ اور پھر ایک دن گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمان مجاہدین اس متنازعہ جگہ پر قبضہ کے لیے ہتھیاروں سے لیس مارچ کرنے لگے اور مستقل یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ مسجد بنے گی اور مندر ٹوٹ کے رہے گا لیکن واقعتاً مندر توڑنے کے احکام لے جانے والے در اصل توپ خانے سے لیس، امیر المجاہدین اور ان کے سینکڑوں ساتھیوں پر توپ اور بندوق سے تان کر جونہی جا رہے تھے ادھر توپخانہ نصب کر دیا گیا ادھر مجاہدین آراستہ ہونے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں ادھر سے آگ اگلنے لگی۔ اور مجاہدین میں سے ایک سانس لینے والا بھی باقی نہ بچا!

اودھ کی سلطنت میں جو مسجد پچاس سال سے مندر بن چکی تھی سلطنت کی آخری سانس تک وہ مندر ہی رہا آج بھی مندر ہے ــــ بڑا بھائی اس طرح نظیر قائم کرتا ہے۔

بڑا بھائی ہونا کیسے فخر و امتیاز کا نشان ہے!

لیکن ــ کیسی بڑی آزمائش ہوتی ہے!! بہت بڑا دل کرنا پڑتا ہے بڑے بھائی کو! ایسا کہ کبھی کبھی تو دل بیٹھنے لگتا ہے!

لیکن پھر چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی میں کچھ تو فرق ہوتا ہی ہے!

بڑے بھائی کو چھوٹا پن نہیں دکھانا چاہیئے

لیکن

پھر

چھوٹے بھائی کو بھی تو بڑا بھائی بننے کی ہوس چھوڑ دینا چاہیئے۔

اصل کتاب موجود ہے لیکن سہولت کے لیے ہم نے رئیس احمد جعفری کی تلخیص لے لی ہے۔

ــــــ ادارہ

مرزا جان

۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء

حدیقۂ شہداء

کتاب کے مصنف ایک صاحب مرزا جان ہیں۔ سید امیر المجاہدین کے رفقاء میں تھے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی معلومات و مشاہدہ پر مبنی ہے۔ لہٰذا اس کے صحیح اور مستند ہونے میں کلام نہیں۔ ہم عصر مؤرخین کے بیانات یوں بھی قابل توجہ اور لائق اعتناء ہوتے ہیں پھر یہ کہ ایسا مؤرخ جو خود شریک کارزار رہا ہو لہٰذا اس کی صحت اور درستی میں کسی طرح کا شک ہو ہی نہیں سکتا۔ اصل کتاب ۷۰ صفحات کی ہے پریس کا نام نہیں۔

- ساری کتاب میں کوئی پیراگراف نہیں ہے' میں نے حسب ضرورت پیرے قائم کر دیے ہیں۔
- ضمنی اور ذیلی سرخیاں میری قائم کی ہوئی ہیں۔
- میں تو یہ چاہتا تھا کہ ضمیمہ کے طور پر پوری کتاب شامل تاریخ کر دوں اب یہ چیزیں کہاں ملیں گی؟ لیکن ایجاز و اختصار نے دامن پکڑا۔ لہٰذا میں نے تلخیص سے کام چلایا ہے لیکن تلخیص ایسی کہ بڑھایا کچھ نہیں' غیر ضروری عبارت حذف کر دی ہے' کتاب کا مفہوم پورا آگیا ہے' اصل میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔
- یہ حادثہ ۱۲۷۲ھ میں پیش آیا، اسی سال یہ کتاب لکھی گئی اور ۱۲۷۲ھ میں شائع ہوئی اتنی قریب العمر تاریخ بجائے خود ایک نادر تحفہ ہے۔ (ر-ا-ج)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد سراپا عصیان مرزاجان کی یہ عرض ہے کہ شکر پروردگار کا ہر فرد بشر پر فرض ہے جس نے کعبہ دل کو اپنا گذرگاہ بنایا اور کنشت کو نقشہ امتحان کے واسطے کھینچ کے دکھایا ہرچند دیر و حرم دونوں میں کار سنگ و خشت ہے کہیں اس کی پرستش میں دوزخ کہیں اس کی زیارت کے صلہ میں بہشت ہے۔

نعت | نعت اور نعت رسول امام الثقلین محمد بن عبداللہ نورمن نور اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہر انسان کو مناسب ہے نام کے ساتھ درود پڑھنا واجب ہے کہ باعث ایجاد کونین ہیں صاحب شہد اور جنین ہیں وما ارسلناک الا رحمۃ العالمین کی مصداق ہیں برگزیدہ آفاق راکب براق طی کندہ قصر نیلی رواق ہیں۔

سبب تحریر | جب مولوی امیر الدین علی قدس سرہ العلی نے جہاد کا قصد کیا یہاں کے علما سے مشورہ لیا۔ سب صاحبوں نے بیعت کی۔ اس جلسے میں سراپا گناہ، الراجی الی رحمۃ اللہ بھی شریک تھا۔ ہنگام نہضت ہرچند ہمراہی کا اصرار کیا لیکن حضرت نے انکار کیا اور فرمایا کہ تمہارا یہیں رہنا مناسب بلکہ واجب ہے کہ اکثر خطوط تمہارے یہاں کے عمائد کو آئیں گے تمہارے سبب سے جواب باصواب مل جائیں گے علاوہ اس کے وہ کام انصرام ہوں گے جو باعث تقویت مجاہدین نیک فرجام ہوں گے پس عاصی نے ناچار اس خادم رسول کی اطاعت قبول کی پھر کچھ نہ کہا یہیں رہا اس دن سے جو مولوی صاحب نے بذریعہ نامہ ارشاد فرمایا بسرو چشم بجالایا اور کیفیت کو قلمدان میں بھرتا گیا جب امیر المجاہدین رئیس المسلمین نے شربت شہادت پیا میں نے بھی افسردہ ہوکے قلم کو روک لیا اور اس کا نام "حدیقۂ شہداء" رکھ دیا۔

مسجد ہنومان گڑھی کی تاریخ | اب طرفہ ماجرا سنیئے جس سے دل دو نیم ہوتا ہے قطع نظر اور مسجدوں کے اودھ میں ایک ٹیلہ تھا کافروں کی پرستش کا حیلہ تھا راجہ رام چندر نے اس مقام پر ہنومان اپنے رفیق کو بٹھایا تھا بعد فتح لنکا اس کی بزرگی کا وسیلہ تھا۔ اس لیے ہنومان پرست اس کو ہنومان بیٹھک کہتے تھے۔ بالفعل اسی کا نام ہنومان گڑھی ہے حسب دستور وہاں بھی اورنگ زیب

عالمگیر بادشاہ غازی نے ایک مسجد فنائی بنوا دی تھی۔ ہندوؤں کو اس مسجد کے مٹانے میں اصرار رہا۔ بعد چندے مسلمانوں کو غافل پا کے چاہا کہ پھر ہٹا کر دروازہ بنا کے پوجا کا رنگ جمائیں اور جس پہ مورت ہنومان کی ہے یہاں وہی سنگ جمائے لیکن قاضی محمد عاقل نے جرأت کی اس مسجد کی مرمت کی اور انہی کی اجازت سے پاتی شاہ فقیر مسلمان اس میں رہتا تھا نماز پڑھتا اذان کہتا تھا جب شجاع الدولہ بہادر کبیر کو گئے۔ متصل مسجد کے چھپر ڈال لیا اور ہنومان کی مورت کو اس میں قائم کیا مگر حاصل میں فقیر کا بھی حصہ رہا۔ جب فقیر کو تسخیر کر لیا رفتہ رفتہ مکان معقول تعمیر کر لیا تو آمد بھی زیادہ ہوئی بہاری توم پوجا پر آمادہ ہوئی۔ اس عرصہ میں فقیر مذکور نے انتقال کیا۔ اس کے وارثوں نے مل تال لیا اور علیحدہ مسجد سے عقب اس ٹیکری کے کھیر دیا تالاب پر تکیہ جما لیا لیکن اتنیت مراعات کیے جاتے تھے جعوتی فقیر دیے جاتے تھے۔ بعد چندے بیراگیوں نے امتیوں کو نکالا اپنا عمل کر کے مسجد کی منبر کو توڑ ڈالا۔ اس بات پر قاضی حبیب اللہ نے بلوا کیا اور اقرار نامہ عدم تعرض مسجد لکھوا کے اور کسی فقیر مسلمان کو اذان کے واسطے مقرر کر دیا۔

بیراگیوں کی شرارت جب پھر اُدھر کا ناظم درشن سنگھ برہمن ہوا مسلمانوں کا سخت دشمن ہوا۔ اس پاس اس ٹیلہ کے احاطہ کھچوایا لڑائی کے قابل قلعہ بنوایا۔ پھر تو کیا مثل مشہور ہے کہ ایک تو کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ اس کے سبب روز بروز بیراگی زور پکڑتے گئے۔ مسجد کے آثار بگڑتے گئے۔ ہندوؤں کی نظامتیں ہونے لگیں۔ مسلمانوں کو ان کے مقابلہ کی طاقت نہ رہی۔ حکام کو خیر و شر کی لیاقت نہ رہی گرد اس مسجد کی حصار قائم کر کے ہنومان گڑھی اس کا نام رکھا۔ پرستش کا شغل صبح و شام رکھا۔ اس مسلمان فقیر کو پہلے تو کچھ دیتے رہے۔ بجبر و اکراہ اس کی خبر لیتے رہے۔ جب وہ درویش مسلمان مسجد کا جنت کو سدھارا بیراگیوں نے میدان مارا اس خانۂ خدا کو اپنا گھر سمجھ کے ہنومان گڑھی میں تو داخل کر ہی چکے تھے اب کچھ نشان باقی نہ رکھا طاق و محراب و منبر کو برابر کر کے مسجد کا گمان باقی نہ رکھا۔ جب انتہا کو درشن کی حکومت پہنچی تو پھر تو ادھر میں یہ نوبت پہنچی کہ کئی برس تک اذان اور بانگ کشی موقوف رہی۔ اطلاع اس کی اہل دربار کو ہوئی لیکن مفصل خبر نہ سرکار کو ہوئی۔

نظم حسب حال زمانہ حال

حکام کافروں کی خوشامد سے کہتے ہیں — کیا خوش نما شوالہ یہ بندہ نواز ہے
کس طرح سے اودھ میں ہو بانگ اذاں بلند — حاکم کو بت پرستوں سے راز و نیاز ہے
اختر نگر میں گاؤ کشی کیوں نہ بند ہو — گوسالہ پوجتا ہے جو پیش نماز ہے
سب کو تلاش زر ہے جو ہیں اہل کاریاں — چاندی کی جوتی کھاتے ہیں یہ حرص و آز ہے
ہندو کھلے خزانہ تعلی کے لیتے ہیں — حاصل بہ زور زر یہ انھیں امتیاز ہے
~~واں کربلا میں خیمہ جلا کر کیا غرور — یاں اب کلام حق کے جلانے پہ ناز ہے~~
اسلام کی تمیز ہو کیا کافروں کو ہائے — بلما کو مسئلے میں نہیں امتیاز ہے
خاطر سے اون کی شرع کے گھوڑے کی پھری باگ — ہر فعل کا درست یہ حکم جواز ہے
فتویٰ سے ان کے غازیوں کا خوں ہوا حلال — اس پہ بھی ان کو اپنی فضیلت پہ ناز ہے
اے خامہ ابتدا کر اب اس داستان سے — جس میں تمام سوز سراپا گداز ہے

شاہ غلام حسین کا عزم جہاد

الغرض جب یہاں تک ہنگاموں کی نوبت آئی فلک بے پیر نے نئی مہلت دکھائی کہ کافروں نے صحن مسجد میں بت خانہ بنا لیا اور سرگ دواری کی مسجد خس و خاشاک ناپاک سے پٹ گئی۔ اسلام کی قدر و منزلت گھٹ گئی تب ۱۲۷۱ھ میں کہ عہد دولت عہد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کا ہے شاہ غلام حسین صاحب کہ مرد باخدا حقیقت آشنا تھے۔ خدا کی راہ میں جان دینی فرض عین جانتے تھے اور صاحب ان کے مولوی محمد صالح اسم با مسمی صلاح و تقوی میں درست راہ خدا میں بہت چالاک و چست عالم با عمل حق پرستوں میں بے بدل دونوں صاحبوں نے باہم مشورہ کر کے راہ خدا میں سر دینے کو قدم گاڑا۔ ڈھال تلوار اٹھائی مشرکوں کی قتل پر نیت درست باندھی اور مسجد آباد اور بت خانے برباد کرنے پر مستعد ہوئے کمر ہمت چست باندھی بغرض جہاد حیدرآباد میں کہ گومتی کے پار ہے محمدی جھنڈا قائم کیا۔ سامان عفو جرائم کیا اگر سچ پوچھئے تو یہ۔ سید احمد صاحب مرحوم سے بڑے

ہیں کس واسطے کہ ان کو سب سامان میسر تھا یہ مفلسی میں اس عزم پر کھڑے ہوئے۔ احسان علی خاں رسالدار
حسن علی خاں بانکے کے بیٹے ان کے معین و مددگار ہوئے بلکہ رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی
شریک ہو کے مستعد کارزار ہوئے اس زمانے کے مسلمانوں کا حال ظاہر ہے کہ بات بات پر ایمان بدلتے
ہیں کیچڑے زیادہ ایک رکابی پر پھسلتے ہیں۔ تعمیر مسجد یا امام باڑہ یا سبیل کی تو کوئی سبیل نہیں کرتے
کوئیں مہمان سرا بنوائیں گے۔

مسلمان جہاد سے کتراتے تھے

وہ لوگ جن پر جہاد فرض تھا یعنی مال و زر رکھتے تھے۔ اشرفیاں پرکھتے تھے۔ گھر رکھتے تھے نہ کسی کا فرض تھا صاف نکل گئے
رنڈیوں کی طرح مچل گئے۔ محمدی جھنڈے کو طمعِ دنیا سے محمول کیا۔ جہاد میں حجتیں نکالنے لگے۔ جاما نہ قبول کیا
مولویوں کی خدمت میں آ آ مسئلہ پوچھتے تھے کہ جہاد کیا چیز ہے؟ جان بہت عزیز ہے اگر کسی نے کہا
جہاد فرض کفایہ ہے۔ مصدق اس کا ہدایہ ہے خوش ہو گئے اور تعریفیں کرنے لگے کہ آپ بڑے عالم ہیں
خوب آنت سے بچایا جیسا آپ کو سنتے تھے ویسا ہی پایا اور معاذ اللہ اگر کسی نے کہا جہاد فرض عین ہے۔ اس میں سعادت
دارین ہے۔ سنتے ہی جان نکل گئی رنگ بدل گئی جیتے جی مر گئے۔ ہزار حیلے نکالے کہ ہمارے گھر میں سوا ہمارے
کوئی اور نہیں جانے کا طور نہیں کوئی کہتا تھا جورو کو کس پر چھوڑیں کیونکر رشتۂ الفت توڑیں کوئی کہتا تھا کہ
علیل ہیں کوئی کہتا تھا ہندوؤں کی کثرت ہے ہم قلیل ہیں یہ بندل تو روں ہی کھچڑی پکایا کیے۔

اسلام کے مجاہد۔ مساکین

اگر بعض مساکین کہ بالفعل کچھ اسلام اگر ہے تو ان میں باقی ہے شریک اعمال اس درویش دلریش ملک خصائل کے ہوئے اور حسب ارشاد
روانہ اودھ فیض آباد ہوئے شاہ صاحب کچھ شاد ہوئے رونا ہی تک پہنچے تھے کہ لکھنؤ کا رستہ لیا اور جو
جو فیض آباد میں پہنچ گئے تھے ان کو نثار حسین نائب کوتوال اور کپتان الگزنڈر آہید خصال نے نکال دیا بھانے
سے ٹال دیا سبحان اللہ و بحمدہ آرتو انگریز تھا اس کو مسلمانوں سے عار بجا ہے لیکن نائب کوتوال کے ایمان
کو دیکھیے کہ بیراگیوں کے چیلے بنے کافروں کے جانب دار ہوئے۔

مسجد بابری میں قیام

بعد چندے فیض آباد سے پرچہ اخبار کا ہندو مسلمانوں کی تکرار کا بارگاہ حکام میں گذرا ملاحظہ کے بعد ناظم اور کوتوال کے نام پر دستخط ہوا کہ مسجد کی تحقیقات کرو اس بات کو اثبات کرو اس سہارے پر شاہ صاحب نے پھر چند مسلمان بسرکردگی قاضی نور علی ساکن مضافات اعظم گڑھ ادھر کو بھیجا وہ مردان خدا مسجد بابری میں مقیم بے خوف و بیم ہوئے۔ خدا کی شان نظر آتی ہے یہاں انسان کیا فرشتے کی عقل جاتی ہے کہ پڑھے لکھے مالدار جہاد سے کنارا کریں اور جاہل مفلس مرنے کو گوارا کریں۔ تھوڑے دنوں کے بعد شاہ صاحب بھی بنفس نفیس توکلت علی اللہ تعالیٰ کہہ کے وارد مسجد مذکور ہوئے اور مولوی محمد صالح ان کے پاس سے دم بھر نہ دور ہوئے۔ شب و روز اسی تصور اور خیال میں رہتے تھے۔ یہ تصور تھا کہ کوئی ایسا سامان یزداں کردے کہ مسجد بیراگیوں کے تصرف سے باہر آئے۔ ادھر کا کفرستان مٹ جائے۔ ترقی اسلام ہو۔ مومنوں کا بڑا آرام ہو۔

جہاد کی دعوت قبول کرنے سے مسلمانوں کا گریز

اسی خیال میں دو تین مہینے گزر گئے۔ شاہ صاحب شرکت کی جستجو میں ادھر ادھر گئے مگر کسی نے ساتھ نہ دیا ادھر رخ نہ کیا بلکہ بعضے مسلمان اس امر سے منع کرکے مانع الخیر مسجد و دیر میں مشہور ہوئے بانی فتنہ ہوئے تفصیل اس کی لکھنا مناسب نہیں۔ بیں قاضی نہیں محاسب نہیں مگر شاہ عبدالحق رودولی کے عرس میں جو بزرگوار گئے تھے علی آباد میں ان سے اور مولوی محمد صالح سے سلسلہ جہاد میں تقریر ہوئی وہ گوش زد برنا و پیر ہوئی مضمون کی نظر میں حق و باطل کی تمیز کھل گئی۔ خلاصہ یہ کہ مولوی محمد صالح درپئے ثبوت جہاد تھے اور دوسرے صاحب ایسی باتیں کرتے تھے کہ ان کے وعظ و پند سے کسی بندۂ خدا نے ارادہ جہاد کا نہ کیا رخ ادھر فیض آباد کا نہ کیا۔ سچ ہے خدا کی راہ میں جان و مال دینا بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔

کشن پرشاد مجاہد اور بیراگیوں کے حامی اور مددگار رام سنگھ اور کشن دت پانڈے چکلہ دار اور زمیندار اس قرب و جوار کے ہوئے یہاں تک کہ دس بارہ ہزار گنوار اور بیراگی نابکار اس گڑھی میں جمع ہوئے۔ مستعد کارزار کے ہوئے۔ گھاگرہ کے گھاٹ روک لیے کہ شاید کوئی مسلمان جاہل قصد بھی کرے اترنے نہ پائے۔ اسی پار سرینگ کرمر جائے اور مولوی صاحب اور شاہ صاحب کے ساتھ سو آدمی ہوں گے۔ ان کی یہ کیفیت تھی

کہ اگر کچھ ملا تو روزی نہیں تو روزہ۔ لیکن فاقہ کو اذاذ عریانی تن کو عین خدا کی مہربانی سمجھ کے وہاں اڑے رہے خدا کے گھر میں ڈیرے ڈالے پڑے رہے کہ شاید کچھ مسلمان بجرات و حمیت ایمان بہ نیت جہاد شریک معرکہ فیض آباد ہو کے کافروں کو تہ تیغ کریں اس امر خیر میں جان و مال سے نہ دریغ کریں کسی نے خبر نہ لی آخرش ۱۵ تاریخ ذیقعدہ الحرام ۱۲۷۱ھ جمعہ کے دن دو تین سو مسلمان بہ ارادہ نماز اسی مسجد میں یکجا ہوئے شاہ صاحب سب کے پیشوا ہوئے۔ یہ خبر بیراگیوں کو پہنچی فرصت کو غنیمت جانا دل میں کچھ اور ہی ٹھانا۔ سرکاری لوگوں کی طرف سے تو ہر گونہ اطمینان تھا ان میں سے کا ہے کو کوئی مسلمان تھا اور بعض جو مومن پاک تھے کافروں سے زیادہ سفاک تھے بے خوف و خطر خانۂ خدا کو گھیر لیا۔ مسلمانوں نے جو دیکھا کہ خواہ مخواہ گھیرے میں مرتے ہیں بیکار جان سے گذرتے ہیں ہم بھی کچھ کام کریں۔ اس میدان میں نام کریں مستعد اور آمادہ سب مجاہدین پا پیادہ ہوئے۔ واللہ اعلم کیا سمجھ کے کوتوال کے پیادوں اور انگریز آر کے سواروں نے متوسط ہو کے رفع شر کیا۔

مجاہد کی شان

دوسرے روز شنبہ ۱۶ تاریخ اسی مہینہ کو کہ اس کو ماتم میں عشرۂ محرم سے کم نہ جانئے جان ہرسی انگریز بھی لکھنؤ سے داخل فیض آباد ہوا بیراگیوں کا گروہ زیادہ شاد ہوا پہلے تنہا انگریز آر تھا مدد اس کا تھانہ مددگار تھا اب دوسرا ہرسی نالکار آیا۔ دونوں صاحب تثلیث نے مشورہ کیا خانہ خدا کا رستہ لیا شاہ صاحب کی خدمت بابرکت میں بکمال خیر خواہی یہ فقرہ عرض کیا کہ مسجد کے دروازے میں کواڑ نہیں کسی طرح کی آڑ نہیں مناسب ہے بلکہ واجب ہے کہ ایک جوڑی کواڑ کی قائم ہو جائے مخالف دفعتاً آنے نہ پائے۔ شاہ صاحب غافل مکر و فریب سے جھٹ پٹ دو مجاہدوں کو کواڑ لانے کے واسطے بیگم پورہ کے ایک محلہ اودھ میں سے بھیجا کسی مرد مسلمان نے ایک جوڑی کواڑ کی بہت اچھی گاڑی پر لدوا کے دونوں مجاہدوں کے ساتھ روانہ کی۔ گاڑی کچھ آگے بڑھی تھی کہ بیراگیوں نے خبر پائی خدا جانے اس میں فرنگ کا اشارہ تھا یا کوئی ہرکارا تھا کہ دفعتہً کافروں کی بھیڑ آئی ان کو گھیر لیا مار ڈالنے کا قصد کیا قریب تھا کہ ان دونوں کو باب جنت تک پہنچائیں۔ یکایک مسجد والوں کو خبر ہوئی رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی اور میاں فقیر بخش نامی اور بہادر خاں اور ایک مجاہد پھر تو اللہ رے اور بندہ لے کہاں وہ سینکڑوں کہاں یہ فقط

سات جرار لیکن خدا کی شان ساتوں نے تلوار کھینچ کے اسی دم وہ جرأت اور سینہ سپر ہو کے وہ بہادری کی کہ ساتوں طبقے زمین کے تھرانے لگے۔

کربلا کا نمونہ

جس پر ایک بار تلوار پڑتی تھی وہ ہوتا گویا برق تھی بار بار پڑتی تھی کافروں سے جہنم بھر گیا۔ میدان خالی ہوا جو شہید ہوا اس کا مرتبہ عالی ہوا جو کوئی دیکھتا تھا معرکہ کربلا یاد آتا تھا۔ ہر ایک جوان شجاعت سر میدان دکھاتا تھا جب اللہ اللہ کہہ کے تلوار لگاتے تھے۔ کافروں کے غول پیچھے ہٹ جاتے تھے بید کی طرح تھراتے تھے وہ جو ہنومان گڑھی کا پشتہ تھا وہاں کشتہ پر کشتہ تھا کسی نے نیزہ مارا کسی نے تلوار لگائی کسی نے چقماق خالی کی کسی نے تپنچہ کو آگ بتائی کوئی بھاگنے والے کو للکارتا تھا جھپٹ کے تلوار مارتا تھا یہ ساتوں سبعہ سیارہ کی طرح بڑھے چلے جاتے تھے کسی کو خیال میں نہ لاتے تھے درود پڑھتے چلے جاتے تھے جو کافر جہنم واصل ہوا سر دتھا اسی طرح لڑتے ہوئے گڑھی کے دروازے تک پہنچ مجاہدوں کے نعرے تا بہ فلک پہنچے وہاں بھی بڑا گھمسان کا رن پڑا بڑی بڑی نمود کا بیراگی نابود ہوا۔ ان تھوڑوں نے بہت کام کیا سینکڑوں کو تہ تیغ خون آشام کیا آخر جام شہادت پیا سیدھا رستہ جنت کا لیا الطمع حیات جاودانی کا پایا۔ رستم علی خاں اور بہادر علی خاں دونوں بھائی حقیقت میں رستم تھے اور میاں فقیر بخش گو نائی تھے مگر جرأت اور دانائی میں کسی سے کم نہ تھے۔ ساتوں کا شش جہت میں نام رہے گا۔ پنج تن اور چاریار حامی سر میں گے۔ گڑھی کے متصل یہ ہنگامہ ہوا مسجد کے مجاہدوں کو خبر ہوئی۔ ہتھیار باندھ کے ادھر بڑھے۔ مان سنگھ کے لوگ سد راہ ہو کے ان کے منہ چڑھے یہاں بھی ایسی تلوار چلی اور اس طرح سے لڑائی ہوئی دبن دار آمادہ ہوئے کہ فیصلہ کے بعد مقتولوں کا جو حساب ہوا تو مسلمانوں سے ہندو بہت زیادہ مقتول ہوئے۔ کافروں کو بچ کے گئے کی راہ نہ ملی مجاہد وہاں ایسے کچھ اڑ گئے زمین میں پاؤں گڑو گئے۔ مان سنگھ کے لوگ لوہا مان گئے مسلمانوں کی تلوار سے دوزخ کو بے ایمان گئے۔ شہیدوں پر باران رحمت برسا زخمی کا فر ایک بوند کو ترسا۔

غداری

پھر مل خوب گھر آئی شاہ صاحب کی جماعت پھر مسجد میں پھر آئی اسی وقت ایک طرہ فروش ملے محبت سے مدہوش معتقد خاص مُرید با اختصاص تھوڑا سا کھانا مجاہدوں کے واسطے لایا یہ دو دن سے خدا کے مہمان تھے۔ منتظر ہر آن تھے۔ دسترخوان بچھایا کھانے کا لگا لگایا۔ دونوں انگریزوں نے بھی

غازیوں سے کہلا بھیجا تھا کہ اب کمریں کھول کے بخاطر جمع اپنی مسجد میں رہو تم سے کوئی نہ بولے گا جب
تک فیصلہ نہ ہولے گا۔ وہ ان کے قول پر اعتماد کر کے مشغول طعام ہوئے ہنوز نوبت سیر ہونے کی نہ آئی
تھی کہ دونوں انگریز، اعلیٰ علی اور نثار حسن نائب کوتوال باہم کچھ قیل وقال کر کے اپنے ہمراہیوں کو نامرد
سپاہیوں کو لے کے مع چند ضرب توپ مسجد سے دور جا کے ٹھہرے۔ خدا ہی کو خبر ہے کہ اس میں کیا اشارہ
تھا کہ فوج سرکاری کے الگ ہوتے ہی ہزار دو ہزار بیراگی لاکھوں گنوار ہاتھوں میں تلوار مور و ملخ کی طرح خانہ
خدا کو گھیر لیا۔ یہ جو فوج شاہی اور کوتوال بدافعال کے ہمراہی تھے انھوں نے اسلام سے منہ پھیر لیا پھر
تو کافروں نے رجب علی شاہ کے کوٹھے پر چڑھ کے جو لوگ خدا کی راہ میں مسجد کے سپر میں تھے جسم زاران
کا گولیوں سے غربال کیا مسجد کی حرمت کا کچھ خیال نہ کیا صحن مسجد لالہ گوں ہوا۔ غازیوں نے بھی گولی برسنے
کو باران رحمت الٰہی جان کے اور بجائے سپر چھاتیاں تان کے ہتھیار نکلے ہاتھ پاؤں نکالے۔ حتی الوسع
جرأت کی داد دی۔ جب یہاں صفائی ہو گئی موقوف لڑائی ہو گئی۔

مجاہد اس طرح ذبح کیے گئے جیسے قصائی گائے کو ذبح کرتا ہے

تب دو تین سو گنوار بیراگیوں کے مددگار

بم بھا دیو اور ہر ہر کرتے مسجد کے اندر بے خوف و خطر آئے اور جیسے قصائی گائے کو ذبح کرتا ہے ۶۹
غازیوں کو جو اس وقت تک زندہ تھے شہید کیا جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کاریز بد کیا۔ پانی کی طرح مسجد
کے موری سے خون بہتا تھا اور ہر غازی دم بازپسیں اللہ اکبر کہتا تھا، مولوی محمد صالح بھی اسی وقت
شہید ہوئے خلد سے نزدیک دنیا سے بعید ہوئے لیکن عین شورش ہنگامہ جدال و قتال میں اسی ضرب و
حرب کے حال میں غازیوں نے شاہ صاحب سے گذارش کی کہ ہم ایسے طوفان میں گھرے ہیں کہ نکلنا معلوم
اور ایسے دریائے ناپیدا کنار میں گرے ہیں کہ اچھلنا معلوم۔ خدانخواستہ آپ کی زندگی میں اگر خلل آئے
گا تو اس بیڑے کا تھل بیڑا نہ ہو گا۔ نام و نشان ڈوب جائے گا کوئی ہمارا نام نہ لے گا بے گناہوں کا
انتقام نہ لے گا۔ آپ کے جینے میں فاتحہ کا سہارا ہے جہاد کی امید دوبارہ ہے اس دم چلے جانا مناسب
ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب بہ مجبوری حسب صوابدید ان کے کسی سمت کو چلے گئے اور مجاہد ستم دیدہ آسیائے

غلہ سے دبے گئے۔ جب کافروں نے مجاہدوں کا کام تمام کیا پھر یہ سرانجام کیا گیا کہ قرآنوں کو یعنی سیپاروں کو ہزار پارہ کیا دو ایک کو جلا دیا یہ بلا دیکھیے کس پر پڑتی ہے آج تک کہ ایک مہینہ ساون کا اور نو روز بھادوں کے گذرے پانی نہیں برسا ہے یہ قہر نازل ہوا ہے چاروں طرف شور عطش ہے گرمی کی شدت سے ہر شخص کو غش ہے اور وبا کی وہ شدت ہے کہ ہزاروں آدمی ہیضہ سے مرگیا

مسجد توڑی لاشیں کچل دیں اور صحن مسجد میں کھڑا تو تعمیر کھیتا کی رسوئی اور خدا کی مسجد کے واسطے حد تھا اس کو توڑا ہندؤں کی گویوں سے مسجد کے ستونوں کو ثابت نہ چھوڑا پھر مسجد سے نکل کے لاشیں کچل کے گنواروں نے گھر کی راہ لی۔ مہنتوں نے گڑھی میں پناہ لی، لاشیں شہیدوں کی بے گور و کفن چادر نہ پیرہن عریاں پڑی رہیں پلٹنیں دیکھا کیں کھڑی رہیں کوئی ایسا بھی نہ تھا کہ ان کی خبر لیتا دو گز کفن دے کے دفن کر دیتا۔ دوسرے روز نثار حسین نائب کوتوال بد افعال نے اسی مسجد کے دروازے پر گڑھا کھدوا کے توپ دیا کسی نے تاریخ ان مظلوموں کی کہی تھی مصرع تاریخ۔ بلغ العلی بکمالہ۔ ۱۲۷۱ھ

مقابر شہدا کی بے حرمتی یہاں تو حاکم ہندو ہیں سردار ہیں مسلمان مجرم گنہگار بر سردار ہیں ایسی زیادتی ہندؤں کی مسلمان دیکھیں جلے ہوئے اوراق قرآن دیکھیں اور پھر حمایت کفار ہو ایسی رعایت پر خدا کی مار ہو جائے عبرت ہے مقام حیرت ہے نہ کسی کو شرم ہے نہ غیرت ہے ظاہر میں تو مسلمانی کے ٹھاٹ ہیں باطن میں یزید علیہ اللعن کے بھاٹ ہیں بعد اس معرکہ کے بیراگیوں نے صحن مسجد میں آکے ہوم کیا سنکھ بجایا وہیں موہن بھوگ کھایا کہتے تھے ہنومان جی نے کرپا کی ملیچھوں سے پاک کیا غرض کوئی بے ادبی اٹھا نہ رکھی۔ اسلام کی توقیر ذرا نہ رکھی اس کی تفصیل لکھنے سے کچھ حاصل نہیں لکھنے کے قابل نہیں۔ متصل اسی مسجد کے ایک ٹیلہ تھا۔ مسلمانوں کی دعا کا وسیلہ تھا خواجہ مٹی اس کا نام تھا مقابر شہدا کا مقام تھا قبروں کو کھود کے نیست و نابود کر لیا اور ایک بت وہاں بھی دھر دیا بعض کہتے ہیں کہ بیراگیوں کی کیا حقیقت تھی یہ جو افعال صادر ہوئے سب مان سنگھ کے لوگوں سے سرزد ہوئے مگر ہم دم بخود

یں زبان ہلا نہیں سکتے۔ ان کا نام لب پر لا نہیں سکتے۔ کس واسطے کہ وہ سرکار کے زعم میں خیر اندیش ہیں،
سب سے زیادہ وفا کیش ہیں۔

بیگم پورہ میں مسلمانوں کی درگت

اب حال بیگم پورہ والوں کا سنیے اعلیٰ علی شقی کے حکم سے منادی نے ندا کی جو مسلمان اس کا شریک ہوگا جان سے مارا جائے گا۔ گھر لٹے گا سر اتار اجائے گا۔ یہ سُن کے وہ بیچارے ڈر کے مارے شاہ صاحب کے شریک نہ ہونے اس پر ناکردہ گناہ آفت میں پھنسے بعد فراغت کے قتل مسلمانوں سے بیراگیوں نے چار حملے ان کے مکانوں پر کیے۔ بہت زور دکھایا مگر خدا کے فضل سے دخل نہ پایا چنانچہ افضل بیگ نامی ایک شخص وہاں کا رہنے والا ان کے ہاتھ سے زخمی ہو کے اب تک صاحب فراش ہے۔ مدد رحمت شاباش ہے۔ جب ان بیچاروں نے دیکھا کہ وہ بہت ہیں اور ہم تھوڑے ہیں ناچار گھر چھوڑے فیض آباد میں آرہے۔

واجد علی شاہ کا حکم

دو چار دن پیشتر اس معرکہ کے حکام سرکار سے جب کچھ نہ بن آئی تب یہ بات ٹھہرائی کہ مولوی نہال الدین صاحب اودھ میں جا کر بطرح وصوابدید مولوی حفیظ اللہ صاحب داروغہ عدالت العالیہ دیوانی اس باب خاص میں ساکنان اودھ اور فیض آباد سے استفسار کریں بلکہ قلم بند اظہار کریں بعد تحقیقات بینفی بے رو و رعایت کیفیت واقعی بارگاہ ظل اللہ میں حاضر کریں۔ اور اگر نشان مسجد کو دیکھیں مشاہدہ اپنا ظاہر کریں چنانچہ ۱۶ ذیقعدہ الحرام ۱۲۷۱ھ قدسی کو یہاں سے روانہ ہوئے دو منزل پہنچے کہ سانحہ فیصلہ ہو گیا مگر امتثالاً للامر وہاں پہنچے ہنگام تحقیقات اور تحریر اظہارات روبرو کے مولوی صاحبین محمد وحسین اور میر سید علی صاحب مجتہد فیض آباد اکثر رئیسوں نے دیکھنا مسجد کا اور بعضوں نے اس میں نماز پڑھنا ظاہر کیا اور قاضی یار علی نبیرہ قاضی حبیب اللہ نے کئی محضر سابق کے دکھائے کہ ان سے صاف مسجد ثابت تھی اور طرفہ یہ کہ کئی ہندوؤں نے بھی مسجد پر گواہی دی منکروں کو روسیاہی دی۔ چنانچہ ان دو تین صاحبوں نے کیفیت راست براست بے کم و کاست کہ بعینہٖ مضمون اس کا موافق تحریر عاصی کے ہے بارگاہ شاہی بندہ پناہی میں ارسال کی جب ضرورت تفصیل مہر و گواہی مندرجہ کیفیت ہذا لکھی جاتی ہے۔

تحقیقاتی رپورٹ کا خلاصہ

نقول مہر و گواہی مندرجہ کیفیت مرسلہ مولوی حفیظ اللہ و مولوی نہال الدین صاحب مرقوم ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ

ابراہیم بیگ	سید بخش علی جعفری	حسین علی	مرزا جان
ساکن محلہ آباد فیض آباد سلوۃ المتن واقعی است	زمیندار محلہ پیراں پور متصلات اودھ بیان واقع است	زمیندار محلہ تفضیانہ یکے از اولاد مسمے لطف اللہ مسجد بچشم خود دیدہ ام	علاقہ دار خاص محل مسجد ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام

سید باقی علی	عبد الحسین مرزا	آغا علی	علی مرزا
مسجد بچشم خود دیدہ ام	لا ریب فیہ	لا ریب فیہ	بیان واقعی است در بودن مسجد بر گڑھی شک نیست

گواہ شد۔ چیدی این قوم بتول اظہار محمد نولیسانده است کہ بارہا مسجد را بچشم خود دیدہ ام

گواہ شد

محمد روشن خاں ساکن اودھ مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام و ہیات آں بخوبی ذہن نشین دارم فقط

گواہ شد۔ محمد علی خاں ساکن اودھ خاص بعمر کمیدہ چہار سال مسجد واقع گڑھی بچشم خود دیدہ ام فقط

احمد علی	ساکن فیض آباد سوز خوان مسجد برٹیلہ ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام و ہیات و مقام و سمت آں بخوبی یاد دارم و بر محراب آں اسم یا اللہ نقش بودہ است۔
سید محمد علی	مرثیہ خوان ساکن فیض آباد مسجد قناتی کہ برٹیلہ ہنومان گڑھی بودہ بچشم خود دیدہ ام فقط
مرزا علی	ساکن اودھ مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام و ہیات آں بخوبی یاد دارم فقط

اظہار دینی سنگھ چپڑاسی عدالت فیض آباد برائے ترقی حسب الحکم سرکار در عہد نیابت منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں بہادر بر ہنومان گڑھی رفتہ بودم مسجد واقع ہنومان گڑھی بچشم خود دیدہ ام فقط

خدا فراموش، ناحق کوش

جب یہ کیفیت بارگاہ ہندوستان پناہ میں آئی اور چھوٹے درباریوں نے ملاحظہ فرمائی، نواب کے پاس آکر عرض کرنے لگے کہ حضور عالم یہ کیفیت جو دو لون مولویوں کی دو حرفی ہے اس کا کیا اعتبار یک طرفی ہے اس پر تعمیر مسجد کا حکم لگانا اور اپنی رعایا کو ستانا ضعف عملداری ہے بلکہ رعیت آزاری ہے آپ نائب سلطان ہیں آپ کے نزدیک برابر ہندو اور مسلمان ہیں۔ انصاف

یہ چاہتا ہے کہ راجہ مان سنگھ اور آغا علی خاں ناظم کو ارشاد ہو دہ جاکے دیکھیں اس امر کو خوب چھانیں گو راجہ صاحب مدعی علیہ ہیں لیکن یہ ایمان کا مقدمہ ہے۔ نواب صاحب کو خود یہ منظور تھا نیت میں فتور تھا کیفیت کی جانب خیال نہ کیا ٹال دیا مگر مان سنگھ بے ایمان اور آغائی ننگ خاندان کو روانہ کیا۔ وہ دونوں خدا فراموش ناحق کوش جس وقت اودھ میں پہنچے مسلمانوں کو دھمکایا ہندوؤں کو سر چڑھایا کہ مسلمان بیچارے بقول شخصے قہر درویش بجان درویش صلح پر راضی ہوئے آخر آغائی اور مان سنگھ نے ایک اقرار نامہ اور صلح نامہ مفتوں سے لکھوا کے سرکار میں بھیج دیا کہ اب کسی طرح کا یہاں فساد ہندو اور مسلمانوں میں باقی نہیں ہے۔

لکھنؤ کے مسلمانوں میں اضطراب

جب اقرار نامہ اور صلح نامہ نواب نے ملاحظہ کیا مارے خوشی کے ہنس دیا اور کہا الحمدللہ جو ہونا تھا سو ہوا مگر اب فساد مٹ گیا

غرض ایسی کچھ صورت ہوئی کہ نواب کے نزدیک جو خون مسلمانوں کا ہوا تھا اس کے انتقام کی نہ ضرورت ہوئی تب بعض علماء لکھنؤ کے کان کھڑے ہوئے ان کے ساتھ کچھ مسلمان کھڑے ہوئے ہمہ دیگر یہ کلام کیا کہ یہاں کے حکام نے اسلام کو سلام کیا آج ہندوؤں نے ہنومان گڑھی کی مسجد کھودی ہے اگر ایسے ہی مسلمان بزدے ہیں تو کل لکھنؤ میں عمل کریں گے ہر خانہ خدا میں ایک ایک بت دھریں گے۔

مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی و مولانا سید امیر علی

آخر ش ارباب فرنگی محل سے مولوی عبدالرزاق صاحب کہ طفلی سے ہم ان کو ورع اور پرہیز میں کامل جانتے ہیں

عبادت میں طاق ریاضت میں مشتاق شب بیدار تہجد گذار اور مولوی امیر الدین علی صاحب ساکن قصبہ امیٹھی کہ امور مذکور میں بمراتب بڑھے ہوئے ہیں نہ دن کو آسودہ ہو کے کھاتے ہیں نہ رات کو آرام سے پاؤں پھیلا کے سوتے ہیں دونوں صاحب بعزم جہاد مستعد ہوئے اور مولوی تراب علی اور مولوی برہان الحق اور مولوی حیدر علی مدظلہ سے مشورہ ہوا۔ سب نے فرضیت جہاد کا اقرار کیا اور کہا کہ جب تک ہنود سے مقابلہ نہ ہوا تھا اور مسجد بابری میں مقاتلہ نہ ہوا تھا تب تک فرض کفایہ تھا اب بے شبہ فرض عین ہے، ہمارے نزدیک اب ہنگام نفیر عام ہے

سید امیر علی کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت

الغرض جب یہ پانچوں رکن رکین دین متین تابع شرع مبین خادم پنج تن وارث مسند رسول ذوالمنین ایک دل اور ایک زبان ہوئے۔ تب یہ خیال آیا کہ انھیں پانچوں میں ایک کو امام ٹھہرا لیجیے اس کے حکم کو بجا لائیے آخرش باوجود انکار سب صاحبوں نے مولوی امیرالدین علی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اپنا امام کیا اور کہا کہ بالفعل آپ اور مولوی عبدالرزاق صاحب روانہ ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ سامان سفر کرکے ہم بھی دو ہی چار دن میں حاضر خدمت شریک رنج و راحت ہوتے ہیں پس سلطان المجاہدین اور مولوی عبدالرزاق صاحب نے حسب تجویز ان سب صاحبوں کے یہ بات ٹھہرائی پنجشنبہ کو یہاں سے کوچ کرکے ایک دو مقام اٹھی میں کیجیے اور بعد اجماع اور سامان جہاد فیض آباد میں چل کے انتقام لیجیے۔

فرنگی محل میں کھلبلی

ادھر یہ مشورہ ہوا ادھر چہارشنبہ ہی کو شیطان کے کان بہرے کہیں سن بھاگا اور ان صاحب کو خبر پہنچائی جن کے نزدیک شہید کرنا مسلمانوں کا اور جلانا قرآن کا کچھ اصل نہ رکھتا تھا انھوں نے طرز حرکت کی تمام ہے یہ شہرت کی کہ عزم مولوی عبدالرزاق کا چھپا نہیں ظاہر ہے ہر کس و ناکس اس سے ماہر ہے کو توال نے سنا ہی ہوگا کسی نہ کسی نے کہا ہی ہوگا ظن غالب بلکہ یقین ہے کہ دو گھڑی میں دوڑ آئی اور سارا فرنگی محل بے جرم و گناہ اسیر دام بلا ہو جائے ایسی لغو حرکت کرنا اپنے ساتھ سب کو فضیحت کرنا ہے ایسی ایسی باتیں کہیں کہ سارے فرنگی محل میں ہل چل کیا کہیں بل پڑ گئے آرام کی صورت بگڑ گئی ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہو کیا ہوگا انجام اس کا برا ہوگا یا بھلا ہوگا و و صنین لونڈی باندیاں کہتی تھیں دیکھیے کیا پیش آئے گا حاکم زیر و زبر کرے گا برے دن دکھائے گا۔

مولانا عبدالرزاق فرنگی محل کا عزم مردانہ

غرض ایسا کچھ منتر پڑھا کہ انھیں کا طوطی بولنے لگا۔ چھوٹا بڑا مولوی عبدالرزاق صاحب پر زبان طعن کھولنے لگا یہا تک شور و غوغائے محشر برپا ہوا کہ یہ خدا دوست فرمانے لگے کہ یہ سب سامان فقط میرے روکنے کے واسطے ہوا ہے وہ ممکن نہیں میں خواہ مخواہ جاؤں گا۔ کافروں کو جہنم میں پہنچاؤں گا میرے نزدیک اور وقت دارالحرب ہے فرض عین حرب و ضرب ہے۔ ہاں صبح تک اگر میں نے قیام کیا پھر جانا دشوار ہوگی مجھ مجبور روکنے کو تیار

ہوگا یہ سوچ کر کہ بینی و گوش فقط ایک تیر بردوش لنگی کندھے پر عصائے پیری ہاتھ میں رمضان خدمتگار ساتھ میں محلہ نرہی کو روانہ ہوئے امیر المجاہدین وہاں اترے تھے آدھی رات گذری ان کے پاس پہنچے وہ تو ان سے زیادہ چلنے کے لیے آمادہ تھے گو سواری نہ تھی پیادہ تھے جس دم ارکیہ آراستے سپہر جیوتی ان بزرگوں کا دیکھنے مشرق سے نکل آیا یہاں کمربندی ہونے لگی خدا کی راہ میں قدم بڑھایا۔ ان علماء کی سواری کا بیان قلم کی طاقت زبان کی قدرت سے باہر ہے۔

قافلۂ مجاہدین کی روانگی بیچ میں دونوں خورشید ماہ خدا کے پیارے ایک پنس پر سوار دوسرے کی ران تلے راہوار نمازیوں کی قطار خدا کی قدرت نظر آتی تھی کہ فرما کی ہیبت سے جان جاتی تھی سب کہتے تھے اس فوج محمدی کی ایسی شان ہے کہ عقل حیران ہے ایک ایک ان میں ہزار پر بھاری ہے۔ چہروں پر نور برستا ہے جو ان سے لڑے گا وہ ناری ہے۔ اسی شان و شوکت خاص جہاد کی نیت سے بحر مواج کی طرح لہراتے ہوئے رو بہ منزل اٹھی مبارک میں داخل ہوئے سبحان اللہ وبحمدہ خدا اگر ایمان دے تو ان لوگوں کے قدموں پر انسان جانے دے حکم کی یہ منادی کہ کوئی فیض آباد اور اودھ کو حریم نہ کرے بے فائدہ رزم نہ کرے مگر ان اللہ والوں کو نہ کسی غارتگری سے غرض نہ دوڑ دھوپ سے کام فقط خدا اور رسول کی خوشنودی سے طبیعت کو چین دل کو آرام تھا۔

محمدی جھنڈا ایک طرف محمدی جھنڈا کھڑا ایک جانب لشکر قلیل بارعب و جلال پڑا نقارہ پر جس دم چوب پڑتی تھی ہیبت سے برہمن کی لڑکی کلمہ پڑھتی تھی۔ غازیوں کا جماؤ سپہ گری کا بناؤ کوئی ہیزم تانا تھا کوئی رستم کو پیر زال جانتا تھا۔

یہ تھے مجاہد اسلام خلاصہ یہ کہ اس جلسہ میں کیسا کیسا نوجوان اور کیا کیا شیخ زادہ باشوکت و شان تھا مولوی عبدالرزاق صاحب کہ افسر غازیان نامدار تھے سب کے سردار تھے ہمہ صفت موصوف دیار و جوار میں معروف ہیں ہمراہ ان کے محمد خورشید حسین مجاہدان بدر و حنین کے ہم پہلو بہادر دوسرے حسام الحق مولوی نور الحق صاحب مرحوم و مغفور کے پوتے ہیں نام سے حلادری عیاں ہے۔ تیسرے لمعان الحق مولوی برہان الحق کے فرزند دلبند جن کی پیشانی سے شجاعت کا نور چمکتا ہے ہر دم ہیرا

شہر امام کا منہ پیٹتا ہے کہ اجازت پاؤں اور ہوا کی طرح اودھ کو جاؤں چوتھے محمد شیخ سرفراز احمد کی چراغ عالی دماغ کاکوری کے رہنے والے جائیں سینے والے پانچویں عبدالغفار مولوی عبدالجامع کے نور الابصار سلیقہ شعار خوش کردار جوان صالح، جرار اور ماسوا ان کے اسی طرح کے کتنے ہی جوان نادر روزگار با وقار تھے۔

علی نقی خاں کی برہمی

اب یہاں کا حال سنیے۔ ادھر جناب امیر المجاہدین اور مولوی عبدالرزاق کا جانا ادھر سامنے لکھنؤ میں قیامت کا آنا ہر مسلمان نے جہاد پر کمر باندھی کافر کشی پر تیغ دو دم باندھی جس کو دیکھئے راہی ہے عازم نورا ہی ہے جب یہ خبر نواب علی نقی خاں کو پہنچی کہ علماء فرنگی محل بھی جہاد پر آمادہ ہوئے یہ سنتے ہی پریشان حد سے زیادہ ہوئے اور مولوی مفتی محمد یوسف کو بلا کے استفسار کیا کہ فرنگی محل میں کن کن صاحب نے یہ فساد اٹھایا ہے؟ ہم تو اس خاندان کو بہت مانتے ہیں۔ برائے خدا اور رسول جلد جائیے فتنہ خوابیدہ نہ چونکائیے ہنگامہ کو مٹائیے نشیب و فراز دکھا کے امیٹھی سے پھیر لائیے وہ جو فرنگی محل میں آئے اور غیظ و غضب نواب کی خبر لائے پھر تو گویا مولوی عبدالرزاق کے گھر پر قیامت کبریٰ آئی نصیحت اور ملامت کیا کیا نہ کی مفتی صاحب نے بھی زبانی کوئی بات اٹھا نہ رکھی ایمان کی حمیت اور جہاد فرمانہ رکھی۔ وہ تو امیٹھی پر کر کے اپنے گھر سوت ہٹی کو تشریف لے گئے۔

نفسا نفسی کا عالم

اب دوسرے صاحب کا عمل ہوا گویا دشمنوں کے دماغ میں خلل ہوا آدھی رات تک دوڑ کی خبر گرم رہی۔ دروازے کی طرف سب کی نظر رہی اور مولوی عبدالحق کے اہل و عیال کو گنہگاروں کی طرح چھپا کے اپنے گھر لے گئے مکان میں قفل دے گئے۔ ہر شخص ہمت ہارا تھا جیسی مولوی عبدالرزاق نے ڈاکہ مارا تھا اور ساباب کا عجب حال تھا اٹھنا محال تھا آدھا گھر پہنچا تو نصف راہ میں رہا اور کہیں چھپانے کا قصد کرتے تھے تو لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے رکتے تھے ہمارے گھر میں نہ لانا ہمیں اس آفت سے بچانا کیا ہمارا گھر بھی لٹوا دو گے کوئی طعنہ سے کہتا تھا کیا تم بھی جہاد کو جاؤ گے؟ قصہ کوتاہ اسی جنس بیض خوف و رجا میں اوقات گذر گئی چار پہر رات گذر گئی نہ سوار آئے نہ پیادے نظر آئے۔

شاہی پیامبر

نور کے تڑکے حسب الحکم نواب نصیر الدولہ رفیق شرف الدولہ غلام رضا ہندی الاصل بلا فصل اور میر صفدر علی چکلہ دار حیدر گڑھ امیٹھی کو روانہ ہوئے ملعون زمانہ ہوئے دیکھنے والے کہتے

ر کر مجاہدین کو پھیرنے جاتے ہیں دیکھئے کس طرح لاتے ہیں لیکن اتنی خیر گذری کہ دونوں صاحبوں نے کچھ
رائے کو دخل نہ دیا بکمال نرمی فقط ابلاغ حکم سرکار کیا کہا حضور عالم کا ارشاد یوں ہے کہ تم کو اضطراب
ں ہے؟ پہلے تدارک اس کا ہم پر واجب ہے اگر خدانخواستہ ہم اس امر دینی میں کچھ سہو تہی کریں اس
ت تم کو مناسب ہے امیر المجاہدین نے بھی بکمال لطف ان سے خطاب کیا مناسب وقت کے جواب دیا آخر
ئی امر طے نہ ہوا گو انھوں نے بہت التیام کیا ناچار فوج محمدی سے علیحدہ کسی باغ میں قیام کیا۔

کارملائی سبیل اللہ فساد اب پھر چند فقرے یہاں کے سننا چاہیئے داد سخن دینا چاہیئے کہ بعض
مولویوں نے میدان خالی پا کے نواب کے پاس جا کے سارے عالم کو برا
ر آپ کو بھلا بنا کے صاف کہہ دیا کہ جہاد فرض کفایہ ہے کتب فقہ میں یوں ہی آیا ہے جو فرض عین کہتا ہے خطا
پہ ہے شاید قتل بندگان خدا ناحق مدِ نظر ہے بلکہ یہ معرکہ جو ادھر میں گذرا ہے مطلق جہاد نہیں وہاں تو لڑنا
بھی ناروا ہے وہاں تو جہاد کی شرط نہیں پائی جاتی وہ دارالحرب کب ہے۔ بیراگی ہنومان گڑھی کے مطیع الاسلام
ہیں جس کا جی چاہے ہم سے گفتگو کرلے مناظرہ آپ کے روبرو کرے آپ ناحق تردد فرماتے ہیں کیوں غصہ
کھاتے ہیں اگر سرکار تم کو خلعت اور زادِ راہ دے کے فیض آباد کو روانہ کرے ابھی علی آباد میں جا کے رہتے ہیں ایسا
وعظ کہتے ہیں کہ لوٹ جاتا ہے ایک شخص وہاں نظر نہیں آتا ہے۔ غرض ایسا کچھ تڑاق پڑاق باتوں سے سبز باغ
دکھایا کہ نواب نے دوشالہ اور رومال کوٹھی میں پچیس روپیہ کا منگا کے اسی وقت اڑھایا اور سو روپیہ نقد چلنے کی
زبانی نہ لوادی۔ یہ تو خلعت پہن کر ایسے خوش ہوئے گویا سلطنت ملی بڑی دولت ملی۔

اصحاب فیل اپنا قلم تھراتا ہے کاغذ کا سینہ پھٹا جاتا ہے کیفیت لکھنا دشوار ہے ان کا دربار سے
نکلنا اور گھر کی طرف چلنا دم بھر میں سارے شہر میں خبر منتشر ہوئی دنیا زیر و زبر ہوئی۔
انگشت نمائی ہونے لگی۔ اشعار ہجو برملا ہونے لگے جو جس کے دل میں آتا تھا بے تکلف زبان پر لاتا تھا الغرض
ساحبِ سفر ہوا ساتھ لے جانا عزیزوں کا مدِ نظر ہوا ہاتھی تعینات ہوا اصحاب فیل بنے عقل پہ پتھر پڑے طوعاً
ابابیل بنے۔ دیاریوں سے صحت ہوئی بلا قید کے اہانت ہوئی۔ ہر روز یہ ہاتھی پر چڑھ کے جانے لگے

مولانا عبدالرزاق فرنگی محل کی واپسی

وہاں امیٹھی میں بعد قیل وقال ایک دو روز میر صفدر علی اور پڑھے نہ لکھے نام مولوی محمد فاضل نے یہ نوشتہ لکھ دیا اور زبانی بھی بحلف اقرار کیا کہ اگر مسجد ثابت ہوگئی نواب صاحب بہادر اسی وقت بنوا دیں گے اور بیراگیوں سے بے ادبیوں کا انتقام بھی لیں گے اور اگر ثابت نہ ہوئی مجبوری ہے بیراگیوں کی بے قصوری ہے شکایت نہ کیجئے گا بہادر کا نام پھر نہ لیجئے گا اس عہد پر وثوق کر کے مولوی عبدالرزاق مع اعوان وانصار اپنے گھر کو آئے مگر امیر المجاہدین تشریف نہ لائے۔ مولوی عبدالرزاق نے حسب الطلب نواب صاحب سے ملاقات کی اور بہنگام استفسار حرف وحکایات کی لیکن وہی تبدیر یہی جہاد فرض عین زبان پر رہا ایسی تقریر دل پذیر کی کہ خروج واجب ہر مسلمان پر رہا۔

مولانا عبدالرزاق کا شاہی خلعت قبول کرنے سے انکار

خلاصہ یہ ہے کہ خلعت دیتے ہیں نواب نے بہت اصرار کیا مولوی صاحب نے انکار کیا رخصت ہو کے مکان پر آئے کلمات حسرت وافسوس زبان پر گئے دو ایک بار اور دربار گئے مجبوری ناچار گئے جب نواب تعمیر مسجد میں حیل حیلے کرنے لگے تب اپنے آنے پر خود نفرین کرنے لگے جی چاہا کہ پھر عزم کریں سامان رزم کریں لیکن سردست شہر سے نکلنا دشوار تھا کہ لوہے کے پل اور ناکجات پر بندوبست سرکار تھا۔

امیر المجاہدین سے واجد علی شاہ کی ملاقات

جب مولوی عبدالرزاق کے پھر آنے پر بھی اہلکاران سرکاری کا اطمینان نہ ہوا تو منشی امیر حیدر بشیر الدولہ بہادر خواجہ سرا کو روانہ کیا کہ ایسا کچھ نشیب وفراز دکھاؤ کہ مولوی امیر الدین علی صاحب کو پھیر لاؤ چنانچہ حسب الحکم امیر حیدر نے امیٹھی میں جاکے جناب ممدوح سے عہد وپیمان کیا۔ مولوی صاحب نے بھی اصرار نہ زیادہ کیا لکھنؤ کا ارادہ کیا خلاصہ یہ کہ دو تین دن کے بعد امیر المجاہدین منشی امیر حیدر کے ساتھ ناکے تک پہنچے اور وہاں سے بشیر الدولہ بہادر کے ساتھ کہ وہ استقبال کو گئے تھے تشریف لائے اسی آن بان سے مع سپر وشمشیر اپنے مجاہدین کو ساتھ لیے ہوئے نواب صاحب کے پاس آئے۔ نواب صاحب کی مروت اور اخلاق چھپا نہیں ہے وہ خاطرداری کی کہ جتنے حضار مجلس تھے دنگ ہوگئے سب کے زرد رنگ ہوگئے۔

امیر المجاہدین کا بھی وہ رعب چھایا کہ سارا دربار تھرایا۔

امیر المجاہدین اور واجد علی شاہ کی گفتگو

پہلے کشتی خلعت کی منگائی اور اس کے ساتھ پانسو روپے کی تھیلی آئی در گفتگو باز ہوا قصہ دنیا سازی بلکہ دم بازی کا آغاز ہوا۔ نواب نے فرمایا سرکار تمھارے عزم بالجزم سے کہ ہمہ تن خدا کی راہ میں جان دینے کو موجود ہو۔ بہت رضامند ہے نہایت خرسند ہے کار مردانہ کرنے ہو خدا کی راہ میں قدم دھرتے ہو خلعت پہنیے، روپیہ لیجئے چندے بسر کیجئے انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب بشرط ثبوت تعمیر خانہ خدا ہو جائے گی جھنوں کو سزا مل جائے گی امیر المجاہدین نے کہا ہم لوگ خدا کی راہ میں جان پر کھیلے ہوئے ہیں مصیبتیں جھیلے ہوئے ہیں ہمیں خلعت اور انعام سے کیا کام ہے۔ اس خلعت کا بد انجام ہے کہیں کے عامل نہیں چکلہ دار نہیں مصاحب نہیں سپہ سالار نہیں خلعت لے کے کیا کریں آپ کو اوروں کی طرح کیوں رسوا کریں یہ خلعت اور انعام نہیں ایمان فروشی ہے دنیا کے لیے دین سے چشم پوشی ہے ہمارا خلعت یہ ہے کہ رخصت جہاد ہو۔ اجازت سفر فیض آباد ہو کہ بیراگیوں سے انتقام خون ہر فرد مسلمان اور بے ادبی ہائے قرآن لیں۔ نواب نے جیسا بعض علماء سے سنا تھا فرمایا کہ یہ جہاد نہیں۔

دربار واجد علی شاہ میں امیر المجاہدین سے مناظرہ

تھوڑی رد و قدح ہوئی تھی کہ ناگہاں وہی صاحب کہ اسی بات کا خلعت پہنے ہوئے بیٹھے تھے، باشارۂ حضور دور سے نزدیک آئے اور تائید کلام حضور زبان پر لائے کہ واقعی فرض عین ہونا جہاد کا کتب فقہ میں دیکھا نہیں خصوصاً ہندوؤں کی زیادتی کا کچھ لکھا نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا۔ سبحان اللہ آپ کو عبارت شرح وقایہ کی بھی ذہن نشین ان ھجم تخرج المراۃ والعبد بلا اذن نہیں کس طرح کہتے ہیں کہ جہاد نہیں۔ اس میں کلام چند در چند ہوئے آخر کو بند ہوئے اور کہنے لگے کہ بالفرض اگر فرض بھی ہو تو شرط امامت ہے کہ اولی الامر منکم قرآن کی آیت ہے۔ امیر المجاہدین نے پھر خطاب کیا اور یوں انھیں لاجواب کیا کہ ہمارا امیر کوئی نہیں کس واسطے کہ یہاں شرطیں امارت کی مفقود ہیں چھوٹی سی یہ بات ہے کہ بڑے صاحب موجود ہیں۔ یہ سنتے ہی دونوں صاحب کے باختہ ہوش ہوئے۔ امیر المجاہدین خاموش نہ

ہوئے بعض کہتے ہیں کہ مولوی خادم احمد صاحب نے یہ کہا کہ فرضیت جہاد سے ہم کو انکار نہیں بلکہ ہم نے ہی تو آپ سے بیعت کی تھی۔ بندہ بھی عازم ہے مگر بجا آوری حکم حاکم کی لازم ہے تھوڑے دن دیکھئے اگر باسانی تعمیر خانۂ خدا ہو گی، مشرکین کو سزا ہو گی تو پاؤں پھیلا کے گھر میں سوئیے۔

نواب نے بھی ارشاد کیا کہ آپ اتنی جلدی ــــ کیوں کرتے ہیں ہم کو آپ سے زیادہ خیال ہے واللہ کفار کی زیادتیوں کا بڑا ملال ہے مگر کیا کریں قابو نہیں "صاحب کلاں" سے مجال گفتگو نہیں۔ جب سے کلام اللہ کے جلنے کو سنا ہے دل کباب ہو گیا ہے کلیجہ پھٹتا ہے لیکن آپ کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا کلام یاد نہیں دیر آید درست آید۔ آپ تھوڑے ہی دن تامل کریں روانگی میں تساہل کریں ہم حکمت عملی سے مسجد بھی بنوا دیں گے اور انتقام بھی بے ادبیوں کا لے لیں گے۔ اس بات پر امیر المجاہدین باوجود اصرار خلعت وغیرہ سے انکار کر کے نواب کو سلام کر کے معہ مجاہدین مسجد مقبرہ امجد علی شاہ میں با انتظار حکم نواب ٹھہرے۔

امیر المجاہدین کا جوشِ جہاد

لیکن امیر المجاہدین کو عجب طرح کا جوش تھا اور ہر مجاہد بھی مٹے اشتیاقِ جہاد سے مدہوش تھا ہر دم یہی چاہتے تھے کہ جس طرح ہو آپ کو فیض آباد اودھ میں پہنچائیں اور خدا کی راہ میں جو ہر شجاعت و جوانمردی دکھائیں۔

شیعہ بھی امیر المجاہدین کے ساتھ تھے

حاجی بشیر الدولہ بہادر با این ہمہ کہ مذہب اثنا عشری رکھتے تھے دن بھر میں دس گیارہ مرتبہ مزاج کی خبر منگواتے تھے۔ آٹھ پہر انہی کی خاطر داری میں رہتے تھے اور اکثر یہ کہتے تھے کہ خدا اسلام کی آبرو اور دین کی دھوم چار سو رکھے اس خدا دوست کی عزت پر حرف نہ آوے۔ جو اس خمسہ بجا نہیں حامی خدا کے سوا دوسرا نہیں گو اکیلا ہوں گا اس بزرگ کے واسطے جان پر کھیلا ہوں اکثر خود تشریف لاتے تھے اور مولوی صاحب کی تسکین فرماتے تھے۔ بہ چاہتا تھا کہ ہاتھ میں ہاتھ دیا جائے اس امر دینی میں ساتھ دیجئے مگر چار و ناچار مسجد سے اٹھ جاتے تھے۔ ایسا ملال تھا کہ کچھ پیتے تھے نہ کھاتے تھے دنیا کے کام سے منہ پھیر لیا تھا۔ اس ملال سے آنکھوں میں اندھیرا تھا دو دو پہر اسی کا چرچا رہتا تھا۔ سلطان عالم سے بھی موقع پر ذکر آ جاتا تھا لیکن نواب کے خوف سے

زبان دیا جاتا تھا جیسا یہ ایک ہے اگر دو چار بھی اور ہوتے تو کاہے کو مسلمان مسجد کو روتے۔

عبرت انگیز واقعہ
دہم ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ قدسی کو سرشام مولوی خادم احمد صاحب کی آنت اتری عالم تہ و بالا ہوا بدنام رومال اور دوشالہ ہوا۔ دم بدم مرض بڑھتا تھا دم چڑھتا تھا۔ گھر گھر میں پیش غم تھا۔ آشنا خویش و اقربا نے دوڑ دھوپ میں کیا کیا نہیں لیکن مرض الموت کی دوا نہیں نہ نواب کام آئے نہ روپیہ پیسہ کام آیا جو کچھ کیا تھا سامنے وہ کام آیا ۱۲ تاریخ ظہر کے وقت پیک اجل کو لبیک کہہ کے سب کے سامنے کلمہ پڑھتے ہوئے سیدھے جنت الماوا کی راہ لی مورد رحمت الٰہی ہوئے گنہگار یہیں بے گناہی ہوئے سب بکھیڑا پڑا اگیا حیرت کے عالم میں کوئی بیٹھ کوئی کھڑا رہ گیا۔ اس مرگ ناگہانی سے سب کو حیرانی ہوئی عبرت کی نشانی ہوئی آخر جنازہ لے کے چلے سینکڑوں آدمی ماتم کرتا ہوا ساتھ تھا کوئی نالہ و آہ کرتا تھا کسی کی زبان پر ہیہات تھا ہندو مسلمان روتا تھا لیکن وہ بھی ذکر ہوتا تھا۔ ناچار نماز پڑھ کے پیوند زمین کیا۔

امیر المجاہدین کی دوبارہ روانگی
جب امیر المجاہدین کو مسجد میں بہت دن بسر ہوئے تعمیر مسجد کیسی نواب کو کبھی جھوٹ بھی دھیان نہ آیا کہ کسی کو ٹھہرایا ہے کیا وعدہ فرمایا ہے اور مجاہدین کا تقاضا شدید ہوا جماعت قدیم کے سوا اور بھی بہت اہل اسلام بہ نیت جہاد آئے کہنے لگے ہم ایسے جھوٹے وعدوں سے بہت گھبرائے اب مناسب ہے کہ چلیے اس منحوس شہر سے نکلیے۔ ناچار مولوی صاحب نے رخصت کے باب میں اصرار کیا۔ اب یہاں ٹھہرنا بے سود ہے۔ دینداری کارگزاروں سے مفقود ہے مسجد کے نہ ہونے کا اب تک گمان ہے کیفیت اور مختصر سلہ مولوی نہال الدین و مولوی حفیظ اللہ خاں ہے۔ بشیر الدولہ نے بھی کہا تعمیر مسجد ان لوگوں کے ہاتھ سے دشوار ہے جلد انگریزی ان کا شعار ہے چلیے انشاء اللہ تعالیٰ ہم بھی آتے ہیں بلکہ دیانت الدولہ بہادر کو ساتھ لاتے ہیں۔ گھڑی بھر میں گڑھی کو تاخت و تاراج کریں گے۔

مولوی مسیح الزماں کا انبار
تتمہ مختصر نوزدہم ذیحجہ سن مذکور کو مولوی امیر الدین علی صاحب نے اسی شان و شوکت جاہ و حشمت سے نصر من اللہ فتح القریب پڑھ کر کوچ

کیا اور مولوی مسیح الزماں صاحب ایمان صاحب اپنا کارخانہ بنا بنایا بگاڑ کے دنیا سے دل سے منہ موڑ کے بہ نیتِ خاص جہاد کان پور سے آئے تھے وہ بھی مولوی صاحب سے بیعت کر کے ہمراہ ہوئے۔ ان کی خوش بیانی اور شیریں زبانی سے گروہ مسلماں کا موج در موج آنے لگا لشکرِ اسلام دریا کی طرح لہرانے لگا۔ باہی تزک واحتشام قریب شام امیٹھی شریف میں داخل ہوئے وہاں سے بھی بہت مسلمان لشکر میں شامل ہوئے شب کے شب آرام کر کے بفضل خداوند کریم بحفظ مستقیم فیض آباد کو راہی ہوئے۔

حکم امتناعی

۱۲ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ تھی کہ اہلکاران سرکاری کو اجازت ملی کہ جاؤ اور مولوی امیر الدین علی صاحب کو لاؤ آگے بڑھنے نہ پائیں ہنومان گڑھی پر چڑھنے نہ پائیں کسی طریق سے راہ میں روکو چنانچہ میر مسند علی اور رمضان علی ان کی نائب اور رودرسن کا بیٹا نصرت جنگ نواب کا مصاحب اور محمد تہور خاں بہادر رسالدار اور میر محمد حسین کلکٹر سحر گفتار اور شیخ حسین علی کارندہ نواب علی خاں محمود آباد اس عہدے پر معمور ہوئے۔

ناحق چوٹ جولاہا کھائے

سرکاری لوگوں پر لشکر اسلام کا ایسا رعب چھایا مارے ڈر کے کوئی فوج محمدی کے گرد نہ آیا سب ٹھٹک کر رہ گئے۔ محمد حسین کلکٹر اور تہور خان اور شیخ حسین علی وغیرہ بڑے بڑے تھے نہ جا سکے۔ لشکرِ اسلام سے دو در مقام کیا کسی اور کی معرفت پیغام سلام کیا۔ اگر اجازت ہو تو ہمیں بھی آپ کی زیارت سے سعادت ہو یہ لوگ تو اسی فکر میں ہے وہ جو مثل ہے ناحق کی چوٹ جولاہا کھائے کرگہ چھوڑ تماشے جائے صادق ہوئی۔ رمضان علی اور عامل نواب گنج کہ وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ یہ دونوں آگے بڑھے غازیوں کے منہ چڑھے چاہا کہ امیر المجاہدین سے ملاقات کریں۔ لوگوں نے آنے نہ دیا آگے قدم بڑھانے نہ دیا۔ جب امام المجاہدین سے اجازت ملی ہتھیار سب کے لے لیے یہ سب نہتے روبرو پہنچے جس دم مولوی صاحب سے گفتگو روبرو ہونے لگی دم تقریر کڑے کلمے زبان پر لائے کہ سبحان اللہ آپ دو تین سو جولاہے لے کے گڑھے کھودنے چلے ہیں۔ خوب حوصلے ہیں وہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ اگلوں کی طرح جان دے دو گے اور کیا ہوگا اسلام کا ضعف عیاں ہوگا بُرا ہوگا اتنا کہنا تھا کہ آفت آئی یہ بس کہتے ہیں کہ سوائے ہشت ومشت کے زد وکوب کی نوبت

آئی۔آخر کو ذلیل و خوار ہوئے دونوں آدمی گرفتار ہوئے۔

نئی چال، نیا جال

القصہ باغی تو جب مجبور ہوئے تو عذر کرنے لگے دل میں بغاوت ظاہر میں زنانت کا دم بھرنے لگے کہ ہم لوگ ملازم سرکار ہیں لیکن ایمان سے آپ کے تابعدار ہیں۔ سرکار فیض آثار کو منظور ہے کہ آپ ایک مہینہ اندنامل فرمائیے۔ اگر اس مدت میں مسجد تعمیر ہوگئی نہ المراد ورنہ بے تکلف فیض آباد کو جائیے اور ایام موعودہ تک آپ جماعت کے ساتھ سہالی یا فتح پور میں بسر کریں جو کچھ کھانے پینے میں آپ کے صرف ہوگا وہ سرکار سے ملے گا اور ہم بھی عہد کرتے ہیں بلکہ قرآن مجید پر ہاتھ دھرتے ہیں کہ اگر اس میعاد کے اندر مسجد نہ بنوائی تو انشاء اللہ ہم بھی آپ کے شریک حال شامل جدال وقتال ہوں گے۔ جب ان سب نے کئی دن تک بہت باتیں کیں وہ ایسی غلط قسمیں کھائیں تب سلطان المجاہدین بھی سمجھے کہ حاکم سے لڑائی ضرور نہیں اور مہینہ کچھ دور نہیں بعد جینے کے سمجھ لیں گے پھر اپنا سرکار کہیں گے یہ سوچ کے حسین علی کے ساتھ سہالی میں کہ ملا قطب الدین شہید رحمتہ اللہ علیہ کا مدفن ہے رونق افروز ہوئے مشغول عبادت خدا شب و روز ہوئے اور مولوی مسیح الزماں صاحب نہور خاں کے ساتھ لکھنؤ میں تشریف لائے اور انھیں کے ساتھ دو چار بار نواب کی خدمت میں گئے آئے۔ نواب نے تعمیر مسجد کے باب میں ایسے کچھ ضمے لکھے کہ جیسے تقریر سابق تو فقط چرب زبانی جھوٹی کہانی تھی آخر مولوی تراب علی صاحب اور مولوی حسین احمد صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب سے ملاقات کر کے چلنے پر سب کو آمادہ کیا آپ سہالی کا ارادہ کیا۔

راجہ مان سنگھ کے جاسوس

سہالی میں ایک روز تین فقیر بھیک مانگتے ہوئے دستہ فوج اسلام کی طرف سے گذرے۔ غازیوں نے قرائن سے دریافت کیا کہ یہ زنار دار ہرکارے ہیں دشمن ہمارے ہیں غمازی کا جامہ پہنے ہیں۔ اس گمان سے ان بت پرستوں کو تنگ پکڑا اور تازیانہ کی اور مار نامزہ رخ کیا مارتے بھوت بھاگتا ہے اور لکڑی کے بل بندر ناچتا ہے جب خون کے فوارے بدن سے نکلنے لگے تب ہاتھ باندھ کے کہنے لگے ہم راجہ مان سنگھ کے نوکر ہیں خفیہ اخبار پر مقرر ہیں جیسا کیا تھا ایسا بھر پایا اب اگر آپ سے مخلصی پائیں گے ترقی جماعت کی دعا مانگتے چلے جائیں گے۔ اس کی خبر امیر المجاہدین کے گوش زد ہوئی فرمایا کہ کان مروڑ دو اور چھوڑ دو ہمارا خدا مددگار ہے راجہ ہمارا کیا نا بکار ہے۔

مسیح الزماں کی بے وفائی اب کی بار مولوی مسیح الزماں بعد ملاقات اہالیان سرکار جب سہالی بن گئے خدمت فیض درجت میں کچھ عجب حالت اور کیفیت میں پہنچے۔ ظاہر میں تے باطن میں خلاف ہونے لگے۔ مجاہدین کو بہکانے لگے۔ نفاق کی باتیں کرنے لگے۔ اپنا گروہ الگ جمایا لیکن وہ لوگ سیدھے سمان جلد ہوشیار ہو گئے۔ آخر جب ان کو بالکل بہکا ہوا پایا تب یہ مشورہ ٹھہرا یا کہ لشکر اسلام سے خارج کرو پھر ان کا نام نہ لو اپنا سامنہ لیے چلے آئے۔ سبحان اللہ و بحمدہ مسیح الزماں کا وہ آغاز تھا کہ ملاالمہام لشکر اسلام مشہور ہوئے۔ انجام یہ ہوا کہ لوگ نفرین کرنے لگے بے کھٹی نمک حرام مشہور ہوئے۔

مولوی تراب علی و مولوی عبدالرزاق جب مسیح الزماں کی کجروی کی خبر مولوی تراب علی صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب کو پہنچی کہ وہ اسی نیت سے سندیلہ کو تشریف لے گئے تھے۔ گو ابھی تک سامان درست نہ ہوا تھا لیکن سیدھے سہالی کو روانہ ہوئے پھر تو مجاہدین کو بڑی تقویت ہوئی بہت قوت ہوئی اور اکثر مسلمان ان صاحبوں کے باعث شریک لشکر اسلام ہوئے۔ جو کوئی سنتا تھا کہ ہمارے پیشواؤں نے حکم نفیر عام دیا ہے اور بقصد اودھ سہالی میں مقام کیا ہے چلنے کا سامان کرتا تھا اور جو کوئی جانے سے معذور تھا مگر زردار صاحب مقدور تھا وہ سلاح وغیرہ اسباب حرب حاضر کرتا تھا یوں تسکین خاطر کرتا تھا جس وقت ایام موعودہ میں دو ہی ایک دن کا باقی زمانہ رہ گیا۔ امیرالمجاہدین نے مولوی تراب علی اور مولوی برہان الحق وغیرہ سے کہا کہ اہالیان سرکار کو اب کیا عذر باقی رہا وہ ٹالتے ہیں خواہ مخواہ حیلے نکالتے ہیں۔ آمد سرما ہے ٹھنڈی ہوا ہے۔ صاحبو ہم تو بسم اللہ کرتے ہیں ان لوگوں کو عذر تھا تابعدار تھے سب کے سب کہنے کے ساتھ ہی تیار تھے۔ تاریخ روانگی مقرر ہوئی تیاری لشکر ظفر پیکر ہوئی۔

طفل تسلیاں جب خبر کوچ مشہور ہوئی پھر یہاں کے حکام کو اضطرار ہوا امیرالمجاہدین کے توقف میں اصرار ہوا پہلے ادھر مان سنگھ کو فیض آباد اودھ کی طرف روانہ کیا کہ جلد جا کے مسجد بنواؤ اور اگر کچھ مسجد کی اثبات میں شبہ ہو تو مفتنوں کو در دولت پر رہ گذری کے واسطے لاؤ۔ غرضیکہ زبانی جمعیت ساموٹ تہدید کی اور دھمکایا اور ایک دوشالہ رومال بہت بہادری منگا کے اوڑھایا اس نے بھی جی میں کہا چلو مفت میں لگا گرہ آشنان کر و حضور عالم کی مہربانی ہے، لطف زندگانی ہے اب کی اگر آؤں گا تو ایک دو پھینٹ کو بھی ساتھ لیتا

آؤں گا کیا نقصان ہے میر امامی ہو مان ہے۔ ایسی احمق سرکار کہاں رہے گی عین غصہ میں تو دو شالہ رومال عنایت
ہوا ہے ہنگام سرفرازی شاید حکومت ہندوستان ملے گی اور ادھر افسران فوج کو حکم ہوا کہ پھر مولوی امیر الدین علی
صاحب کی خدمت میں جاؤ اور بکمال تملق و چاپلوسی سمجھاؤ جس طرح بن پڑے متوقف کرو یہاں تک کہ سر بھی ان
کے قدموں پر دھر دو کہنا کہ اب عزاداری محرم سے فراغت ہوئی ہے ماتم امام علیہ السلام سے فرصت ہوئی ہے
تعمیر مسجد میں خوب اہتمام ہوگا ایک دم نہ آرام ہوگا بعض افسروں نے بطائف الحیل جانے سے انکار کیا۔

امیر المجاہدین کی مصالحت پسندی

مگر بعض افسر سہالی کو پہنچے معاذ اللہ گویا غازیوں کی گوشمالی کو پہنچے لیکن اجازت حضوری امیر المجاہدین امام الانام حاصل
نہ ہوئی بکمال عرض و معروض محمد نور خاں بہادر رسالدار اور مرزا قدرت اللہ بیگ جمعدار اور میر محمد حسین کلکٹر
اور شیخ حسین علی کارندہ نواب علی خاں کو روبرو بلوایا اور کہا اب کیا ہے جواب دیا کہ اگرچہ مقتضائے حمیت نہ
تھا کہ آپ کی خدمت میں آتے اور پھر منہ دکھلاتے لیکن کیا کریں تابعدار ہیں حاکم کے فرمانبردار ہیں کیا مشکل ہے
اگر آتے ہیں تو آپ سے شرماتے ہیں ورنہ روزگار سے جاتے ہیں اب پھر نواب صاحب بہادر نے آپ کو پیغام دیا
ہے اور یہ عذر پیش کیا ہے کہ یہ مہینہ ماہ ماتم فرزند رسول مقبول تھا ہم عزاداری محرم میں مشغول تھے۔ انشاء اللہ
تعالیٰ اب تھوڑے توقف میں بہت کام بن جائے گا بے تامل خانہ خدائے ذوالجلال والاکرام بن جائے گا چنانچہ
مان سنگھ کو سوئے اودھ بھیجا ہے اگر وہ مسجد بنواتا ہے تو بہتر نہیں تو ہمیں منتوں کو ڈالنا ہے کما ینبغی روبکاری
ہوگی بہر حال مسجد کی تیاری ہوگی اب ہرگز تامل نہ ہوگا اس امر میں کسی طرح سے تغافل نہ ہوگا۔ آپ کو بھی مناسب
ہے کہ مولوی برہان الحق صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب اور مولوی تراب علی صاحب کو بطور رسالت و
سفارت روانہ فرمائیے اب کہیں نہ جائیے ان کے سامنے بخوبی روبکاری ہوگی عیاں کیفیت ساری ہوگی۔ غرض
ایسی کچھ باتیں بنائیں نشیب و فراز کی صورتیں دکھائیں کہ امیر المجاہدین نے ان کی گفتگو بظاہر مصلحت آمیز و بباطن
فتنہ انگیز سن کے توقف کیا اور تینوں مولویوں کو فقط پانچ دن کے وعدے پر مع عرض کے روانگی کا حکم دیا۔

چار ثالثوں کا واجد علی شاہ کی طرف سے تقرر

۲۷ تاریخ محرم الحرام سنہ ۱۲۷۱ھ تینوں مولوی
لشکر اسلام سے مقام لکھنؤ میں داخل ہوئے دربار لو

میں شامل ہوئے وہ ایک مہنت بھی حسب الطلب آئے اور نواب نے احمد علی خاں اور مولوی غلام جیلانی اور مولوی غلام امام شہید اور مولوی فضل حق خیرآبادی پنچائت مقرر فرمائے۔

مہنتوں کے ساتھ شاہی سلوک

لیکن عجب یہ ہے کہ ایک دن بھی دکلائے اسلام اور مہنتوں کی روبکاری پر مواجع نہ ہوا۔ نواب صاحب نے کچھ بھی خیال نہ کیا کہ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں کس کو پیغام لائے ہیں بلکہ مہنتوں کی توقدر بھی ہوئی موہن سنگھ کپتان کی پلٹن ہی جگہ رہنے کے لیے لی۔ انھیں کے تلنگے حفاظت کے واسطے مقرر ہوئے۔

پھر حربہ کاری

ظاہرا یہ پنچایت وغیرہ ٹھہرا نقط ایام گذاری تھی مسجد بنوانا کسی طرح منظور نہ تھا چاہتے تھے کہ یہاں تک مولوی صاحب کو روکیے کہ جماعت ٹوٹ جائے۔ مسیح الزمان کو دو دن چھٹر الیا علماء کو دکالت کے بہانے سے بلالیا اب کیونکر جماعت کم نہ ہوگی۔ الغرض وردغ گو را حافظہ نباشد نہ پنچایت ہوئی نہ مسلمانوں کی حمایت ہوئی دوالے لشکر اسلام بھی نواب کی عدم توجہی دیکھ کے تھک کر بیٹھ رہے۔ پانچ دن کا وعدہ کرکے آئے تھے کئی مہینے گذر گئے مگر یہ نہ سوچے لشکر ظفر بیکر گئے ، حاکم کے خوف سے دل کچے ہوئے بعض اشخاص بر عام کہتے تھے کہ یہ لوگ اس بہانے آئے ہیں ان کا جانا دشوار ہے۔ یہ بات ہے کہ غدر کے گھوڑے دوڑائے گئے نامہ و پیام سے امیر المجاہدین کی تسکین فرمانے لگے۔ بتغیبہ کو لشکر اسلام نے سہالی سے کوچ کیا۔ زمین تھراتی تھی ہاتھی پر لشکر کا نشان ہم پہلوئے آسمان نشان ذشکوہ کوئی پیادہ کوئی سوار کرتے تھا کوئی اپنا گھوڑا کودا تا تھا کوئی پیادہ بڑی ہمت ہائے جرأت کے اکڑا جاتا تھا الغرض گاہ میں سلطان المجاہدین کی پالکی نشانی اقبال کی آگے آگے کے والہیتوں کے غول بطور نقیب قصائد مدح رسول الثقلین امام القبلتین پڑھتے چلے جاتے تھے کس ملاحظہ اور ادب سے قدم بڑھاتے تھے۔

مجاہدین کی دہشت

اجب شان دشوکت لشکر اسلام کی خبر یہاں عام ہوئی گھر گھر پہنچی کبستی لکھنؤ کی اطراف میں ہوئی۔ ہندوؤں کے ہوش باختہ ہوئے بدحواس سب الٹو کی دم فاختہ ہوئے بغیبر محبت کہنے لگے۔ حاکم سے رعایا تک ہر بشر دردمند ہوا یہ اندھیر ہوا کہ پہروں سے عمر نہ بند ہو کوتوال پر نہ حدید ہوئی تاکید شدید ہوئی کہ شہر سے خبردار رہنا اپنے کام سے ہشیار رہنا لٹ جانے کا ڈر ہے

بادشاہ کا اضطراب اگر صبح کو خبر آئی کہ ہزار مجاہد جرار ہیں تو شام کو پرچہ لگا کہ دو ہزار ہیں تب تو نواب کو کمال اضطراب ہوا کہنے لگے کہ یہ گھر خراب ہوا اب یہ انبوہ کب رکے گا صفائی ہو جائے گی۔

بادشاہ کی مجتہدوں سے گفتگو آخر اسی اضطراب میں طرفہ تدبیر عقل میں آئی یا کسی استاد نے سجھائی کہ مسئلہ جہاد میں اختلاف ہے۔ آپ کیوں بکھیڑا اپنے سر پر لیتے ہیں عالموں کو کیوں نہیں حکم دیتے ہیں وہ ابھی چلے جائیں سب کو پھیر لائیں۔ یہ سنتے ہی نواب بحال ہو گئے اور سب لال ہو گئے۔ پہلے نواب نے سلطان العلماء سید محمد اور سید العلماء میرن صاحب دونوں مجتہدوں کو بلوایا اور فرمایا کہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ باعث فروغ مذہب اثنا عشری خاندان ابو المنصور خان مرحوم ہے نیز اجتہاد اسی خاندان سے چمکا ہے یہی خاندان سبب تمہاری جاہ و حشم کا ہے خصوصاً سعادت علی خاں کی اولاد نے تمہیں سرچڑھایا ہے۔ امجد علی شاہ نے تمہارا رتبہ بڑھایا ہے اگر یہ گھر نہ ہو گا تو آپ کو یہ رتبہ میسر نہ ہو گا آپ اس گھر کو مٹاتے ہیں مولوی امیر الدین علی صاحب کو رغبت جہاد دلاتے ہیں۔ لوگ آپ کی تحریص اور ترغیب سے چلے جاتے ہیں اب آپ کو مناسب ہے کہ جائیے اور مولوی امیر الدین علی صاحب کو پھیر لائیے مجتہد نے تخلیہ کر کے جواب دیا کہ لاحول ولا آپ کا کیا خیال کدھر ہے شاید کلام عوام پر نظر ہے ہمارے نزدیک ہنود اگرچہ بت پرست ہیں لیکن ذمی مطیع اہل اسلام ہیں۔ خروج ان پر روا نہیں مذہب امامیہ میں بدون امام جہاد جائز نہیں۔ لیکن اگر ہم منع کرنے جائیں کلمات افہام و تفہیم زبان پر لائیں گمان کیا ظن غالب ہے کہ مبادا مضمون دستخط سے آگاہ ہو جائیں اور ہمیں کو ہدف تیر جہاد بنائیں۔ اس صورت میں آپ بدنام ہوں گے مطعون خاص و عام ہوں گے مناسب ہے کہ علمائے سنت و جماعت کو افہام کے واسطے روانہ کیجئے۔

علماء آلہ کار بنائے گئے غرض نواب کو ایسا معقول کیا کہ انھوں نے بے عذر قبول کیا اور اسی وقت سب عالموں کو حکم پہنچا کہ جلد جاؤ اور جس صورت سے ممکن ہو اس فتنہ کو مٹاؤ تمہارے واسطے بہت فروغ ہو گا۔

یہ حکم سنتے ہی ان لوگوں کے دل کی کلی پھول گئی علماء کو خدا کی کتاب پیغمبر اسلام کی حدیث بھول گئی کتابیں کھلیں روایات ضعیفہ کے لیے، ورق الٹنے لگے، جناب مولوی سعداللہ صاحب اور جناب مفتی محمد یوسف صاحب مدظلہما نمک خوار سرکار تھے حیلۂ شرعی بھی بھولے حکم کے ساتھ تیار رہتے مگر ان لوگوں کو دیکھئیے جن کو کسی طرح کا تعلق سرکار سے نہ تھا زیادہ ان سے امرار نہ تھا سلطان المجاہدین سے ملاقات کا پیغام کیا حسب الطلب دونوں مفتی صاحبین اور مولوی حسین احمد صاحب اور مولوی ابوالحسن صاحب لشکر اسلام میں رونق افروز ہوئے اور ملازمت امیر المجاہدین کو نذر دی اور زبان ثنا وصفت میں کھولی کہ سچ تو یہ ہے کہ آپ نے اس زمانہ آخر میں اسلام رکھ لیا دین محمدی کا نام رکھ لیا۔ ایسا صاحب ہمت اولوالعزم کہاں ہے۔ ایسی دو چار باتیں سنا کے خلق خدا کو رام کیا اپنا کام کیا کہ ہم کو آنے کی غایت نہ تھی مطلق حاکم کی رعایت نہ تھی لیکن بقول شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ ؎

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

حاکم سد راہ ہے نرغہ کیے سرکار کی سپاہ ہے اور یہ بھی عیاں ہے کہ فوج حاکم آپ سے زیادہ ہے دمدمے پاس مہیا ضرب توپ تیار گولنداز مستعد ہوشیار آپ کی طرف ٹوٹی پھوٹی دو چار بندوقیں ہیں جو کبھی نہیں۔ اس وقت میں واجب بلکہ فرض ہے کہ اودھ کو نہ جائیے یہیں عزیمت فرمائیے اور اگر خواہ مخواہ قصد کوچ کا کریں گے اور غازی فوج سرکاری سے لڑ کے مریں گے۔ اس صورت میں ثواب کہاں ہے۔ اگر آپ کو اس کا خیال ہو کہ ہم اور مولوی محمد یوسف ملازم سرکاری ہیں پابند دنیاداری ہیں تو مولوی ابوالحسن صاحب اور مولوی حسین احمد صاحب کسی طرح کا سرکار سے سروکار نہیں رکھتے ہیں۔ دولت دنیا پر مدار نہیں رکھتے ہیں۔ دنیا سے ناراض ہیں دونوں صاحب مرتاض ہیں ان سے احقاق حق کیجئے پھر نہ انکار مطلق کیجئے وہ دونوں صاحب بھی مصدق کلام ہوئے۔ امیر المجاہدین نے بھی مناسب وقت کے جواب دیا۔ اس گفتگو کے بعد صحبت برخاست ہوئی۔

عوام میں ہلچل اس وقت لشکر اسلام میں کچھ صورت اور ہوئی ہلچل فی الفور ہوئی بلکہ کچھ غازی لشکر اسلام سے اٹھ کے ظالموں کے پاس آئے علماء کی خلاف آسمان تک غل گیا۔ غنیمیوں کی دینداری ناپدید

ن کھل گیا اس پر بھی مفسدوں کو قرار نہ آیا زیادہ فتور بڑھایا مسلمانوں کو تعمیل فتوے دستخط علماء پر راضی کیا۔

فتوے پر علماء کے دستخط

زور ہے علماء پر ایسا کیا کہ سب دستخط پر آمادہ ہو گئے مفسدوں کی بن آئی جب یہ مضمون حسب دل خواہ بندھ گیا تب ان منافقوں نے جو سرکار محض فتنہ انگیزی اور تفرقہ پردازی کو جمع ہو کے مامور ہوئے تھے لبظاہر جبہ و خرقہ عبا اور قبا پٹے اسلام کے لیے ایک مسودہ فریب آمیز گانٹھ کے استفتا کیا۔ مفتیوں نے بے تکلف صاف صاف زراہ خدمت دستخط کر دے۔

استفتا اور فتویٰ

بادشاہ باعث فساد حاکم بالادست مجبور شدہ براہ مصلحت چند ایام منع روانگی مے فرماید دریں حال اگر مولوی امیرالدین علی صاحب کوچ سازند و مقاتلہ و مجادلہ از باہران و افواج سلطان اسلام بوقوع آید پس مرگ مسلمانان طرفین چگونہ خواہد بود؟ **جواب**

دریں حال جماعت مولوی امیرالدین علی را ہرگز قتل روا نیست بل درنہی قولہ تعالیٰ داخل شد نست کذا فی العالمگیری کتبہ محمد سعد اللہ عفی عنہ فی الواقع فسخ عزیمت بباید و درد نہادت و غدغہ است۔ کتبہ محمد یوسف صح الجواب حررہ حسین احمد صح الجواب کتبہ بخطہ عبید اللہ۔ اگر از حاکم بالا دست انتزاع سلطنت و اجرائے کلمۂ النصاری بظن قوی متصور متیقن باشد بحکم آنکہ من ابتلی ببلیتین فاللازم علیہ ان یختار اہونہما و ما کان تحت الامر ماجور و مثاب واللہ اعلم بالصواب و علیہ التکلان حررہ افقر العباد ابوالحسن عفا عنہ۔ سب علماء کی عبارت اسی قسم کی ہے کہ خوف حاکم سے معمہ کر دیا ہے۔

نہایت دلچسپ مادۂ تاریخ

انھیں عالموں کی شان میں تاریخ ہے کہ لاتشتروا بآیات اللہ ثمنا قلیلا اس ترکیب سے کہ لفظ شترو اکہ تحت لا میں واقع ہے بحکم لا مادہ تاریخ سے خارج ہوا اور لا شریک اعداد تاریخ ہوا۔

ایک اور دلچسپ مادۂ تاریخ

کسی نے مفتی اور مولوی برہان الحق صاحب اور مولوی تراب علی صاحب اور مولوی عبدالوالی صاحب کی بھی شان میں کہ ہر چند نواب نے شل اور علماء کے بلوایا اور کہا بھیجے کہ مولوی امیرالدین علی صاحب کے پاس جا کے افہام و تفہیم کرو مگر اپنی حق پرستی

سے نہ گئے تاریخ کہی ہے کہ لاتشتروا بآیات اللہ ثمناً قلیلا اسی ترکیب کے بشتر دن کے تحت لاہیں واقع ہے۔ وہ تاریخ ہے نا سخ ہوا اور لامشترک اعداد ہوا اور لطیفہ اس میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ صیغہ نصائح کا فرماتا ہے کہ یہ لوگ، وہ ہیں کہ جو لیتے ہیں میری آیتوں کی قیمت صیغہ مضارع کا نفی پر جو دلالت کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کمال خوشی سے ان کی مذمت کی حکایت کرتا ہے بخلاف صیغہ نہی کے۔

فوج شاہی درغلانے میں آگئی

شور رخو غا پڑ گیا چاروں طرف ایک تہلکہ پڑ گیا کہ شہادت میں شک ہے یا راس لڑائی میں دغا ہے نا حق ناروا جان دینی گوارا نہیں کیا قول علماء سے چارا نہیں۔ شہادت کے لیے جان و مال، نوکری چاکری سے ہاتھ اٹھایا تھا خوب موقع ہاتھ آیا تھا اگر اس معرکہ میں شہادت نہیں تو ہمیں لڑائی کی حاجت نہیں ہم عالموں سے اپنی تسکین کر چکے ہیں۔ ان کے کہنے پر یقین کر چکے ہیں قصہ کوتاہ فوج شاہی صاف امیر المجاہدین سے پھر گئی جہاد کی عظمت دراشک کی طرح نظروں سے گر گئی۔ علماء نے بھی وہاں سے آکے اپنے اپنے گھر کو آباد کیا حضور عالم بہادر کے دل کو شاد کیا۔

عوام پر علماء کی غلط کاری کا ردِ عمل

یہاں عجب طرح کا معاملہ علماء کے پیش آیا۔ کسی نے زبان طعن اور تشنیع کھولی کسی نے تصیدہ ہجو میں کہہ کے اکبری دروازہ میں لٹکا دیا۔ اب یہ حال ہے کہ جدھر نکلیے ہجو علماء کی نظر آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عالموں کی پھر کی چپاتی سنتے ہیں اور خاموش ہیں۔ دوسرا ہوتا زہر کھا کے مرجاتا۔

جوشِ جہاد پر کوئی اثر نہیں پڑا

مگر شکر خدائے عزوجل کہ تفرقہ جماعت کی بڑی بڑی تدبیریں ہوئیں کیا کیا تحریریں اور تقریریں ہوئیں اگر ایک بہکانے سے لشکر اسلام سے اٹھ جاتا ہے تو دوسرا آتا ہے جماعتِ مجاہدین بدستور ہے اور ہر دم زبان پر یہ مذکور ہے کہ اودھر کا چلنا ضروری ہے۔ وہی کثرت جماعت ہے وہی شان و شوکت ہے نامردِ جان کے خوف سے چلے جاتے ہیں۔ کھٹکا اتنا ہے کہ فوج شاہی گھیرے ہے۔ لشکر اسلام کی طرف توپیں پھیرے ہے لیکن ان جوانمردوں کو کچھ خیال نہیں جینے کی خواہش

رنے کا ملال نہیں ہر روز تیاری ہے اور لب پر یہ کلمہ جاری ہے کہ جب اس لشکر نے سیلاب دار کوچ کیا فوج شاہی کائی کی طرح ہٹ جائے گی۔ ایک کنارے ہٹ جائے گی۔ لشکر اسلام موجبین مارا مارا چلا جائے گا ڈنکے کی چوٹ پر برملا جائے گا اور اگر فوج شاہی لڑے گی تو آفت میں پڑے گی۔ غرض جو مشیت ایزدی میں ہوگا وقوع میں آئے گا بے کم و کاست لکھا جائے گا۔

ان اللہ قریب من المحسنین۔

کوچ کا فیصلہ

۲۰ صفر المظفر ۱۲۷۲ھ روز پنجشنبہ معلوم ہوا کہ شب کو مولوی امیر الدین علی صاحب نے فرمایا کہ علی الصباح بعد نماز فجر جانب ردولی کوچ ہے۔ لشکر اسلام میں تیاری ہونے لگی۔ تدبیر بار برداری ہونے لگی۔ یہ خبر جو افسران شاہی کو پہنچی گھبرا گئے۔ امیر المجاہدین کی خدمت میں حاضر ہو کے عذر کیا کہ ابھی کوچ واجب نہیں خلاف رائے حاکم زسب نہیں چندے اور تامل کیجئے تھوڑا اور تساہل کیجئے۔ مخدوم الانام نے فرمایا یہی حکم سنتے سنتے کئی مہینے گذر گئے۔ اب ہم رکنے کے نہیں۔ تم بھی اگر ایمان رکھتے ہو تو ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دو کا ٹھیک ہے ہمارا ساتھ دو ہمارے تمھارے درمیان بھی عہد و پیمان تھا بلکہ قرآن درمیان تھا اگر تم اپنے عہد پر مستقیم نہیں تو جو حکم تمھارے حاکم کا ہو بجا لاؤ توپیں سر کرو بندوقیں سر کرو لشکر اسلام کی خوں ریزی پر شوق سے آمادہ ہو۔

امیر المجاہدین کا نعرہ

جب صبح نمودار ہوئی اور فوج محمدی چلنے کو تیار ہوئی امیر المجاہدین نے بعد فراغت نماز فجر کمال تاسف سے ایک نعرہ اللہ اکبر کا کیا کہ سب اہل لشکر کو کیا کہیں تو یہ حال تھا کہ تمام لشکر کہتا تھا کہ یا اللہ تجھ سے فریاد کرتے ہیں ہم بر سر حق ہیں ہم پر یہ ناحق بیداد کرتے ہیں۔

امیر المجاہدین کی شرائط صلح

آخر لشکر اسلام روانہ ہوا۔ افسران سلطانی نے بہزار منت اور عذر خواہی دو تین دن کی رخصت چاہی خصوصاً تہور خان بہادر نے خدمت سراپا افادت میں عرض کیا کہ حکام کو بہر حال قتل لشکر اسلام منظور

ہے اور آپ کو ادھر جانا ضرور ہے کوئی صورت ایسی فرمائیے کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔
کسی طرح جان عذاب سے چھوٹے۔ مخدوم الانام نے کہا کہ آپ ہی تصور کیجئے کہ میرا بے جا
سوال نہیں ہیں طالب ملک، و مال نہیں اتنا چاہتا ہوں کہ ایک آدمی نواب کا اور ایک اس
خادم رسالت مآب کا ہنومان گڑھی میں چلا جائے۔ مسجد قدیم پر فقط ایک مسجد کا خط کھینچ کر
اذان کہہ کے نماز پڑھ آئے پھر شیخ کو دعویٰ نہ رہے گا۔ بہ تجویز اصلاح ہے گا اور اگر نواب
کو یہ بھی نامنظور ہو تو وہ جب تک کہیں کے ہم یہاں رہیں گے مگر امداد مصارف وغیرہ ہو اس امر میں نہ
کوتاہی ہو اور اگر یہ بھی خلاف ہو تو کہنا کہ ہم اپنے لشکر کے ساتھ عیش باغ میں مقام رہیں گے دو سپیر
اور خاطر داری لشکر اسلام کریں گے۔ اس مدت میں ایسی تدبیر ہو کہ مسجد تعمیر ہو جب مسجد بن جائے گی
ہم جدھر چاہیں گے چلے جائیں گے۔ ان کے ملک میں بھی نہ آئیں گے۔

بادشاہ کی بے پروائی

نہ درخاں مولوی صاحب کے کلام نیک انجام سن کے بہت خوش ہوئے۔ ابھی جاتا ہوں اور نواب کو سمجھاتا ہوں۔ غرض دو تین دن کا وعدہ کر کے
چلے گئے۔ ہر چند چاہا کہ نواب صاحب متوجہ ہو کے حال سنیں اور کوئی صورت نکالیں انھیں خون
ناحق سے مطلب تھا ایسی باتوں کا خیال کب تھا۔ وہ بیچارے دو دو پہر اسی قبیل و قال میں رہے
نواب صاحب مست اپنے حال میں رہے۔ نوبت ملاقات کی بھی نہ آئی اور اگر اتفاقاً ملاقات ہوئی
نواب صاحب نے توجہ نہ فرمائی۔ آخر وہ بھی خون جگر پی کے خاموش ہوئے۔ ندامت سے روپوش
ہوئے۔ اسی ہنگام میں اور افسروں نے وزیر اعظم کو عرضداشت کی کہ امیدوار ہیں کہ حکم قطعی لکھا جائے
کہ ہر فدوی بجا لائے۔

حکومت کی چال

پہلے یہ حکمت کی کہ فوج شاہی میں جو اہل اسلام تھے مثل پلٹن علی غول اور
پلٹن عسکری وغیرہ انھیں برخواست کر لیا فقط کفار کو قتل کے واسطے
چھوڑ دیا کہ مبادا مسلمانوں کو حرارت آجائے۔ مگر وہ مسلمان جو ہندوؤں سے بدتر تھے خواہ پیادے تھے
خواہ افسر تھے انھیں بدستور رکھا چنانچہ شیخ حسین علی جو بالفعل اس فوج ستم کے کمکر تھے اور

ظالموں کے رہبر تھے اور رجب خان شمر کا نشان گلابی پلٹن کے زرد رو سالار عمر سعد کی نجس یادگار اور فرزند علی امام علی داروغہ توپ خانہ کے خونخوار زمانے کے وہیں رہے اور بارلو انگریز کو یہاں سے مامور کیا۔ خوف خدا دل سے دور کیا۔

وزیر اعظم کا حکم نامہ

جب یہ سب انتظام ہو گیا قتل کا سرانجام ہو گیا تب بجواب عرضی افسران یہاں سے وہ حکمنامہ جاری کیا جس کے مضمون قتل شبخون نے عالم کو مشغول گریہ و زاری کیا کہ مولوی صاحب نے باوجود فہمایش ہمارا کہنا نہ مانا فساد کو مصلحت جانا خون ریزی پر تیغ و سپر باندھی۔ اب جس وقت کوچ کا قصد کریں ایک بھی قدم آگے دھریں، تو بے تکلف توپ سے اڑا دینا۔ اس خیرخواہی کے عوض انعام اور خلعت ملے گا۔

بے وفائی مردماں ہمراہی امیر المجاہدین

جب اس طرح کا حکم قطعی آیا بے غیرتوں نے شرم کا پردہ اٹھایا افسران فوج شاہی کمال دلیر ہوئے خصوصاً بارلو انگریز اور شیخ حسین علی گرگ باران دیدہ اس خون بے گناہ پر نہایت شیر ہوئے لیکن ہیبت لشکر اسلام دیکھ کے فوج کو قلیل پایا۔ تب ان مکاروں کے دل میں خیال آیا کہ تفریق جماعت کی تدبیر کیجئے۔ اپنے ساتھ مولوی محبوب علی اور مولوی محمد شاہ کو لیا ان ظالموں نے سب سے بڑھ کر ظلم کیا ایسا دام مکر بچھایا۔ دانا دانا مجاہدین کو بہکا دیا کہ لوگ اس بھیڑ سے چھٹنے لگے معرکہ سے قدم ہٹنے لگے جس کو مفلس پایا روپیہ کا لالچ دے کے سرکایا جس کی حیثیت ظاہری درست پائی طمع پر طبیعت سست پائی اس پر زن و فرزند کی گرفتاری، قہر و عتاب سرکاری کا زور ڈالا اور جس پر یہ دونوں زور نہ چلے اس پر یہ توڑ جوڑ ہے کہ جھوٹا نسبت بنا کے قدم رسول کی قسمیں کھا کے کسی سے کہہ یا کہ فلاں شخص تمھاری غیبت کرتا تھا بلکہ لعنت ملامت کرتا تھا۔ سننے والوں کو غصہ آیا بگڑنے لگے یہاں تک نفسانیت بڑھی کہ آپس میں لڑنے لگے۔ آخر اسی غصہ و غضب میں لشکر اسلام سے چل نکلے کسی کو یوں اپنا کیا کہ نوکر رکھ لیا۔ سب مصارف اس کا اپنے سر پر رکھ لیا۔ چنانچہ حاجی مرتضیٰ مجاہد قدیم ہمراہی سید احمد صاحب مرحوم بجبلۂ تیاری سرائی اختر نگر میں داخل ہوئے۔ ہمراہی

ان کے اپنے اپنے گھر میں داخل ہوئے اور میر عباس صاحب نخانہ دار کوتوال لشکر دیندار انہیں فساد ونں کے جہت ڈیڑھ سو مجاہدوں کو لے کے علیحدہ سرا میں مقیم ہوئے گو نیت میں فساد نہ تھا عزم عدم اشتراک جہاد نہ تھا لیکن بالفعل باعث قلت لشکر عظیم ہوئے۔ اسی طرح بہت لوگ اپنے قول و اقرار سے نکل گئے۔ جب وقت جان دینے کا آیا بدل گئے۔

میدان کربلا کا سماں ان افسروں نے دوسری یہ تدبیر کی اطراف کے ہندو زمینداروں کو یہ بات تحریر کی کہ عنقریب ہم لشکر اسلام کو لیا چاہتے ہیں بے گناہوں کو قتل کیا چاہتے ہیں تم بھی ہوشیار رہنا توپ کی آواز سے خبردار رہنا آواز کے ساتھ ہی تیر کی طرح آنا گولیاں لگانا جب سب طرف سے نشانہ ہو جائیں گے پھر دم لشکر اسلام ایک دم میں عدم کو روانہ ہو جائیں گے۔

غرض جب دیکھا کہ جماعت میں یہی خلل ہے اور ایک دل میں بھی بل ہے۔ ۲۵ صفر المظفر سہ شنبہ کی صبح سے بالکل رسد بند کردی چاروں طرف آواز بلند کردی کہ کہیں سے رسد پہنچنے نہ پائے۔ پانی تک لشکر اسلام میں نہ آئے جو کوئی اس امر میں کوشش کرے گی گنہگار ہوگا۔ سزا کا سزاوار ہوگا کافروں نے اس مقام کو میدان کربلا بنا دیا۔ سب وہی سامان دکھا دیا۔ اہل اسلام کو تمام رات اور دن بے دانہ آب رکھا اور اس پر یہ طرہ ہوا کہ افسروں کے اشارے سے گنوار ملعون کئی بار بعزم شبخون آئے۔ غازیوں نے للکارا نہر و بڑھنے نہ پائے۔ لشکر اسلام تک گذر نہ ہوا بدخواہوں نے جو چاہا تھا اس کا اثر نہ ہوا۔ شبدیز قلم جولانی پر ہے۔ جمعیت بحر مواج کی صورت طغیانی پر ہے۔ ہر چند بند در رد کتا ہوں نہیں رکتا ہے۔ بلبل خستہ قلم کی زبان سے نکلتا ہے کہ یزید بدانجام نہیں اور حسین علیہ السلام نہیں باقی سب سامان وہی ہے۔ مظلوم کشتی وہی میدان وہی ہے وہی انسداد آب و دانہ ہے جور و جفا کا کارخانہ۔ وہی لوگوں کی بے وفائی ہے وہی دین کی لڑائی ہے وہی فوج کی چڑھائی ہے۔ وہی سر دہی علم ہے وہی جور ہے وہی ستم ہے جو حسین علیہ السلام پر گذرا تھا وہی ستم عیاں ہے قدم بقدم یہ قافلہ رواں ہے فرق اتنا ہے کہ وہ امام تھے یہ غلام امام ہیں وہ پیشوائے دین تھے۔ یہ اسلام میں یہ سر نام ہیں۔

شدائد و مصائب و شہادت امیر المجاہدین

۲۶ صفر المظفر ۱۲۷۰ھ روز چہار شنبہ کو رایات ظفر آیات لشکر اسلام نے کوچ کیا منزل مقصود کا رستہ لیا لیکن امیر المجاہدین نے ہنگام روانگی یوں لشکر آراستہ کیا کہ مجاہدوں کے چار غول کیے ایک غول کو آگے بڑھنے کی اجازت دی ایک فرسخ کے فرق سے دوسرے کو رخصت دی تیسرے غول کو لے کے آپ تشریف فرما ہوئے۔ طریق خدا میں گام فرسا ہوئے۔ چوتھے غول کو ارشاد کیا کہ جب ہم ایک فرسخ کے انداز پر نکل جائیں تم چلنا اس سے پہلے نہ نکلنا۔ وقت نہضت زبان فیض ترجمان سے بے ساختہ یہ مصرعہ جس کو الہام غیبی یا القائے لاریبی کہئے کہ نکلا کہ مصرع

سر میدان کفن بر دوش دارم

اب یہاں قدرت خدا دیکھیے اسکی مشیت کا ماجرا سنیے کہ فوج شاہی کو باوجود ہوشیاری نوم غفلت سے ایسی شکست ہوئی کہ مطلق نہ خبر ہوئی جب امیر المجاہدین کا غول کچھ دور پہنچا بارلو خواب غفلت سے چونکا۔ کوچ کی خبر سنتے ہی ہوش جاتے رہے۔ حواس باختہ ہوا روانہ بے ساختہ ہوا اور شیخ حسین علی سے کہا یہی وقت عیاری اور کارگزاری کا ہے۔ غافل کیوں ہو ہنگام ہوشیاری کا ہے۔ اگر یہ لشکر محمد پور پہنچا تو سمجھ لو کہ بہت دور پہنچا پھر اگر ممالک محروسہ کی فوج جمع کرو گے تو بھی ان لوگوں کا قلع قمع نہ کر سکو گے۔ برائے خدا سے اتر دگھوڑے پر چڑھو لیکن جلد آگے بڑھو حکمت عملی سے فقط مولوی صاحب کے غول کو مقام زد پر ٹھہراؤ۔ ان کو باتوں میں لگاؤ پھر ہم سمجھ لیں گے۔ ایک دم کی فرصت آگے بڑھنے کی مہلت نہ دیں گے جب سردار کو مار لیا کسی کا قدم میدان میں نہ جمے گا۔ سب کے سب بھاگ نکلیں گے کوئی نہ ٹھہرے گا تمھارے اوپر مولوی صاحب کو اعتماد ہے یہ کام تمھیں سے بن پڑے گا۔ شیخ بھی اس وقت بڑی جرأت کر کے بادصرصر سے زیادہ سرعت کر کے چشم زدن میں گھوڑا دوڑا کر آپہنچا اور شجاع گنج کے اس پار امیر المجاہدین کے غول کو ٹھہرایا۔ ساتھ ہی بارلو بھی معہ آتش خانہ آ لگا آیا۔ حسین علی امیر المجاہدین سے باتیں بنانے لگا اور ادھر بارلو کا ہر گولہ انداز موقع سے توپیں جمانے

علی حسین کی مکاری و عیاری

ادھر شیخ نے مخدوم الانام کے آگے ہاتھ باندھ قدموں پر ٹوپی رکھ منہ بنا کے عرض کیا کہ اگر آپ ایک بار اور

ہمارا کہنا مانیں اور ردولی میں تشریف فرما کے دو تین دن مقام کریں تو بے جنگ وجدال مسجد بن جائے گی اور بندگانِ خدا پر آنچ نہ آئے گی۔ یہ بکھیڑا بے کار ہے۔ بندہ ذمہ دار ہے۔ خدا کو مانیے مجھ کو جھوٹا نہ جانیے کیسی نرم نرم ملائم ملائم باتیں کیں کہ مولوی صاحب کے دل میں اثر کر گئیں۔

ادھر انگریز نے اسی راہ پر ایک اونچا ٹیکرا دیکھ کر توپیں لگا دیں تلنگوں کی صفیں جما دیں۔

ادھر سلطان المجاہدین تاج العارفین اس دغاباز کی چرب زبانی سے رضامند ہو کے ردولی کو روانہ ہوئے اور ادھر شیخ صاحب اپنا کام تمام کر چکے تھے موضع بھیلر کو چل دئے فقط اس واسطے ناپدید ہوئے کہ جائے انکار باقی رہے کہ بندہ جا چکا تھا تب لوگ شہید ہوئے راہ لگانا اس واسطے تھا کہ نمک حرامی نہ ہو اور چلا جانا اس واسطے تھا کہ بدنامی نہ ہو لیکن اس کی خبر نہ تھی کہ جس نے یہ کلام سنا ہوگا کہ چلتے وقت انگریز سے کہہ گئے کہ میں اپنا کام تمام کر چکا تم کو اختیار ہے۔

قضائے کار لشکرِ اسلام ہمراہ امام حسب رہنمائی حسین علی اس ٹیکرے کے برابر پہنچا وہیں قابض روح کو حکم خالق اکبر پہنچا کہ مسلمانوں کو گلستانِ ارم دکھاؤ۔ رضوان اور مالک دونوں ہشیار ہوئے۔ اپنے عہدے سے خبردار ہوئے۔ موت کی گرم بازاری ہونے لگی۔ جان کا لین دین ٹھہرا سر کی سر دست خریداری ہونے لگی وہ دن روز رستاخیز سے کیا کم تھا۔ زمین و آسمان درہم برہم تھا ساکن آسمان الاماں کہتے تھے بیگناہوں کو خون بہاتے ہوئے دیکھ کر فرشتے "کل یوم ہو فی شان" کہتے تھے حشر وطیرا اس میدان کی قیامت کا گمان کرتے تھے۔ "اقرب اللناس حسابہم وہم فی غفلۃ معرضون" کا دصیان کرتے تھے۔ اشجار کو بارِ غم سے زندگی بار تھی۔ جس دم حسرت سے فرماتے تھے زبان پر یہ مصرع لاتے تھے۔

سر میدان کفن بر دوش دارم

عرش سے آواز آتی تھی۔

بیا مظلوم اکنوں در کنارم

یعنی ذلتِ شہادت بر

تقسیم کی طرف

آخری دہائی کی دستاویزات ___

خطبہ استقبالیہ ________ شیخ محمد جان



تقسیمِ ہند ———

ہندستانی مسلمانوں کے لیے ایک ناسور۔

یہ تقسیم جسے نہ ہم پسند کرتے تھے اور نہ آپ۔ صرف چند مفاد پرست لیڈران کے مفاد کی خاطر یہ سیکولر ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔

تقسیم آپ کو پسند نہ تھی، اس کا ثبوت پیش خدمت ہے۔ ایسی دستاویزات آگے بھی پیش کی جاتی رہیں گی۔ پیش نظر "خطبۂ استقبالیہ" کے لیے ہم مہر الٰہی صاحب (م۔ ندیم) علیگڑھ کے ممنون ہیں۔

——— ادارہ

تقسیم کی طرف

آخری دہائی کی دستاویزات

(۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء)

مرے طائرِ نفس کو نہیں باغباں سے رنجش
ملے گھر میں آب و دانہ تو یہ دام تک نہ پہنچے

خطبہ استقبالیہ

از

جناب خان بہادر شیخ محمد جان صاحب ایم ایل سی (بنگال)

صدر مجلس استقبالیہ تمام ہند آزاد مسلم مؤتمر

منعقدہ

۲۷ - ۲۸ - ۲۹ - اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

بمقام دہلی

جس کو مجلس استقبالیہ نے

انصاری پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادران اسلام!

اپنی اور مجلس استقبالیہ کی جانب سے میں اُن تمام دوستوں کا پرجوش خیر مقدم کرتا ہوں جو ہندوستان کے مختلف گوشوں سے دور و دراز کا سفر کرکے یہاں جمع ہوئے ہیں اور جن کا مقصد اجتماع یہ ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے سکون و اطمینان اور حزم و احتیاط کے ساتھ اُس بین الاقوامی صورت حالات پر غور کریں جس سے نہایت دور رس نتائج و اثرات برآمد ہونے والے ہیں، بالخصوص مسلمانان ہند کے مختلف نقطہ ہائے نگاہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس امر کا فیصلہ کیا جائے کہ اقوام عالم کی مجلس میں ہندوستان کے لئے ایک باوقار جگہ حاصل کرنے اور ہمارے وطن کی ترقی میں مسلمانان ہند کو واجب حصّہ دلانے کے لئے ہمیں اس وقت کیا عمل کرنا ہے۔

میں آل انڈیا مسلم لیگ کا بحیثیت ایک جماعت کے زبردست حامی رہ چکا ہوں کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ بہت سے صوبوں اور مرکز میں مسلمانوں کی اقلیت کے باعث اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کا ایک مضبوط سیاسی نظام ہو جو عظیم الشان اسلامی کلچر اور دیرینہ اسلامی روایات کے بقا و قیام کا نگراں رہے میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کا وجود بحیثیت ایک ممتاز ملت کے باقی نہ رہے اور وہ اکثریت والی قوم کے ساتھ مدغم ہو کر اپنی جداگانہ حیثیت کو ضائع کردیں جو ایک عظیم مذہب کے پیرو ہونے کی صورت میں انہیں حاصل ہے

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب مسٹر جناح نے بنگال میں آل انڈیا مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم کی ہے میں نے بلا پس و پیش، اُن کے ساتھ اشتراک عمل کیا۔ اور تمام ممکن ذرائع سے بنگال میں مسلم لیگ کی امداد کی اور اس کے موافق زبردست رائے عامّہ پیدا کرنے کیلئے جو کام کیا گیا۔ اس میں مینے اپنا پورا حصّہ ادا کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے دوسرے تمام مخلص خیر خواہوں کی طرح ایمانداری کے ساتھ میرا عقیدہ ہندو مسلم اتحاد پر بھی راسخ ہے۔ اور میں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے انتہائی دشواریوں کے باوجود حتی الامکان زیادہ سے زیادہ سعی کی ہے میری رائے یہ ہے کہ اگر ہم ہندوؤں کے ساتھ جہاں کہیں وہ اقلیت میں ہیں، مجالس مقننہ کی چند نشستوں کے متعلق مراعات کردیں بشرطیکہ اس سے ہماری اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائے تو اس طریقہ سے ہم اکثریت والی قوم کا اعتماد اور دوستی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اہم معاملات جن سے ہمارا خاص مفاد وابستہ ہے اسی صورت میں بطریق احسن محفوظ رکھتے ہیں کہ جہاں کہیں ممکن ہو ہم ایک دوسرے کے ساتھ مراعات کی اسپرٹ پیدا کریں اور اسے ترقی دیں۔ اگر ہم ایسی فضا میں کام کریں جو ایک دوسرے کیساتھ دوستانہ مراعات کی اسپرٹ سے پیدا ہوتی ہے تو ہم ایسے بہت سے مسائل حل کر سکتے ہیں جن کا نتیجہ آج تک سوائے غیر ضروری تیزی و تندی اور تباہ کن نفرت و مخالفت کے اور کچھ نہیں نکلا اور جن سے ملک کی ترقی کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں۔ وہ ترقی جس میں ہمارا حصّہ بھی ہماری ضروریات کے مطابق یقیناً شامل ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ جداگانہ انتخاب کا طریقہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے کیونکہ یہی وہ معیوب طریقہ ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ کر دیئے ہیں۔ اس طریقہ سے مسلمانوں نے ماضی میں خواہ کتنا ہی

بڑا فائدہ کیوں نہ حاصل کیا ہو، یہ حقیقت ہے کہ آج اس طریق انتخاب کا مفید پہلو بالکل ختم ہو چکا ہے اور وہ کسی طرح مناسب حال نہیں ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے ہمارے بہت سے مخلص رہنماؤں کے اخلاق پست کر دئے ہیں اور ان میں کم ہمتی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ جداگانہ انتخاب ہی کا کرشمہ ہے کہ انتخابات کے وقت اور دوسرے ایسے ہی مواقع پر ہندو اور مسلمان ایکدوسرے کو خوب دل بھر کر گالیاں دیتے ہیں اور جس قدر ایک امیدوار گالیاں زیادہ دیتا ہے اسی قدر اسکو میونسپلیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، صوبجاتی مجالس مقننہ اور مرکزی مجلس مقننہ کے لئے منتخب ہونے کا موقع زیادہ ملتا ہے۔ خدانخواستہ اگر کسی وقت دونوں قومیں صرف اُن ہی امیدواروں کو منتخب کرانے میں کامیاب ہو جائیں جن کی انتخابی بنیاد باہمی نفرت اور سب وشتم پر قایم ہو تو اُسوقت ہمارے لئے ہر لمحہ خانہ جنگی کا خطرہ یقینی ہو جائے گا اور یہ ایسی صورت حالات ہے جس کا تصور مخلص ہندو اور مخلص مسلمان کسی طرح بھی سکون قلب کے ساتھ نہیں کر سکتے۔

دسمبر ۱۹۳۷ء میں جبکہ مسٹر جناح کلکتہ ہی میں تشریف رکھتے تھے میں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر اُن سے یہ کہا کہ وہ ہر خیال اور ہر طبقہ کے مسلمانوں کی ایک نمایندہ کانفرنس طلب کریں اور جہاں تک ممکن ہو معقول اور متفقہ مطالبات مسلمانان ہند کی طرف سے مرتب کرکے اُن کی بنیاد پر کانگریس سے سمجھوتہ کی گفت و شنید کریں اور ان مطالبات کو ہندوستان کے آیندہ دستور اساسی میں داخل کرائیں مگر اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ ابھی اس قسم کی کانفرنس کا وقت نہیں آیا ہے اور جب وقت آئے گا تو میں ضرور ایسا ہی کروں گا۔ بدقسمتی سے گذشتہ دو سال کے دوران میں مسٹر جناح نے بہت سے مخلص اور ذمہ دار مسلمانوں کی انتہائی سعی کے باوجود اس کو مناسب خیال نہیں کیا کہ وہ کسی دوسرے مختلف الخیال مسلمان سے خواہ

وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کسی قسم کا مشورہ کریں یا اسے اپنے اعتماد کا اہل سمجھیں۔
حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اُن تمام مخلص مسلم کارکنون کو جو اُن کے ساتھ متفق الرائے
نہیں ہیں قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ اور نہ اُنہوں نے کبھی اسکی وضاحت کی ہے
کہ مسلمانوں کے لئے تصفیہ حقوق کی کون سی تعمیری اسکیم سب سے بہتر ہے اور وہ کون سی
ٹھوس شرائط ایسی ہیں جو اُن کو مطمئن کر دیں گی اور جن سے مسلمانوں کے حقوق محفوظ
ہو جائیں گے۔ اسلئے ایک طویل و شدید انتظار کے بعد دوسرے خیر خواہان اسلام
اور آل انڈیا مسلم جماعتوں نے جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کانفرنس
طلب کی ہے اور اب آپ حضرات ہی کا یہ کام ہے کہ آپ فیصلے کریں اور بتائیں کہ
ملکی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے اور مشترکہ مادر وطن کے باعزت فرزند ہونے کی حیثیت
سے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانے کی غرض سے مسلمانان ہند کو
کیا کرنا چاہیے۔

مجھے مجبوراً یہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں تعلیمی دائرے کے
اندر بالخصوص ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں مسلمانوں نے خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کی ہو
مگر یہ حقیقت ہے کہ اقتصادی حیثیت میں ہم نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے اور ہماری
قوم کی مالی حالت اُس سطح سے بہت زیادہ پست ہو گئی ہے جس پر ہم ایک نسل پہلے
کھڑے ہوئے تھے۔ بہت سی جائدادیں اور وسیع زمینداریاں جو کسی زمانہ میں ہماری
مملوکہ تھیں آج ہمارے ہاتھوں سے نکل چکی ہیں۔ ہم ابھی تک اپنے افلاس کے اسباب
معلوم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان اسباب میں سب سے نمایاں سبب میری حقیر رائے
میں یہ ہے کہ ہماری معاشرت کا معیار بہت بلند ہے اور ہم بہت زیادہ اسراف
میں مبتلا ہیں۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہماری زندگی کا معیار ہندوستان کی اُن
دوسری قوموں کے مقابلہ میں بہت زیادہ بلند ہے۔ جو ہم سے زیادہ متمول ہیں

اور جنہیں ملک کی تجارت کا بڑا حصہ ملا ہوا ہے۔ ہم میں بہت سے ایسے غریب ہیں جو کھدر سے صرف اسلئے نفرت کرتے ہیں کہ کانگریس نے اُسے اختیار کر لیا ہے حالانکہ اُن کی اقتصادی حالت اُنہیں ہرگز اسکی اجازت نہیں دیتی کہ وہ ایک دن کے لئے بھی کھدر کے سوا کوئی کپڑا استعمال کریں۔ بعض مسلم رہنماؤں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہندوؤں کے خلاف نفرت و حقارت کے شعلے اس طرح بھڑکائے ہیں کہ محض معمولی واقعات کو جو روزانہ کی زندگی میں بہترین ماحول کے اندر بھی پیش آتے رہتے ہیں مبالغہ کے ساتھ خوفناک بنا کر سات صوبوں میں کانگریس کے مظالم کی فرضی داستانیں وضع کر لی ہیں اور انہیں شہرت دے رہے ہیں جس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ قوم کی تمام تعمیری سرگرمیوں میں ہمارا حصہ صفر کی برابر ہے اور ہم سب سے زیادہ نقصان برداشت کر رہے ہیں۔ ذاکر حسین کمیٹی کی تعلیمی اسکیم کو اُن ہی لوگوں نے رد کر دیا ہے جو سب سے زیادہ اس کے ضرورتمند ہیں اور وجہ یہ قرار دی ہے کہ اسمیں مذہبی تعلیم کا بندوبست نہیں ہے حالانکہ اس اسکیم کے اندر عمداً یہ صورت رکھی گئی ہے کہ ہر شخص اپنی مذہبی تعلیم کے لئے خود آزاد رہے اور اس میں حکومت دخل نہ دے۔ ہم "ہندوستانی" کے متعلق نہایت زور شور کی بحثیں سنتے رہے ہیں کیونکہ ہندوستان کے بعض صوبوں میں جہاں اُردو بولی نہیں جاتی، ہندی کے الفاظ کا غلبہ ہے بعض رجحانات مسلمہ طور پر تکلیف دہ اور پریشان کن ہیں مگر ان کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ آپس میں فساد انگیز جھگڑے شروع کر دئے جائیں۔ ہم نے دیہاتی اصلاح کے کام میں محض اس لئے حصہ نہیں لیا ہے کہ اس سے کانگریس کا پرستیج بڑھے گا۔ جس کا مقابلہ کرنا ہمارا فرض اولین ہے۔ مکمل نشہ بندی کی تجویز محدود رقبوں میں بھی ہمیں گوارا نہیں ہے کیونکہ مسلم لیگ کے ایک بہت بڑے لیڈر کے قول کے مطابق یہ تجویز ابھی قبل از وقت ہے اور ملک کے اقتصادی حالات اسکی اجازت نہیں دیتے

صحیح ہے کہ بہت سے مسلمان فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل میں کانگریس کی "لیت و لعل" والی پالیسی سے پریشان ہو گئے ہیں اور اس اہم اور مشکل ترین مسئلہ کو پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ ہاتھ میں لینے سے کانگریس کے سربرآوردہ رہنماؤں کی پہلو تہی نے بے اطمینانی پیدا کر دی ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ گذشتہ دو سال کے عرصہ میں گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف سے ہندو مسلم تعلقات کو خوشگوار بنانے اور دونوں قوموں کو ایک مشترک سطح پر لانے کیلئے سنجیدگی اور اخلاصمندی کے ساتھ مسلسل کوششیں کی گئی ہیں جن کی نظیر پہلے کبھی نہیں ملتی۔ اس مقصد کے لئے ان اصحاب نے مسٹر جناح سے براہ راست خط و کتابت بھی کی ہے اور خود اُن ہی کی شرائط پر اُن سے خود جا کر ملے بھی ہیں۔ اگر مسٹر جناح نے ان پُرخلوص اقدامات کا جواب صحیح اسپرٹ میں دیا ہوتا تو آج سے بہت قبل ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دوش بدوش منزل آزادی کی طرف گامزن ہو چکے ہوتے، اور مکمل درجۂ نوآبادیات آج ہم سے بہت قریب تر ہوتا اور اسکی حیثیت محض ایک آرزو کی نہ ہوتی جس کی تکمیل کے لئے مستقبل کا کوئی زمانہ متعین ہی نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا ہم ہندوؤں کے ساتھ اپنے اختلافات کو باعزت طریقہ پر ختم کرنے کیلئے اِس سنہری موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں جبکہ خوش قسمتی سے کانگریس کو ہندوؤں کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہے اور گاندھی جی جو عملاً کانگریس کے ڈکٹیٹر ہیں اس مسئلہ کو ہمیشہ کیلئے حل کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں یا ہم نظر فریب الفاظ اور خالی خولی جملوں کے طلسم میں مبتلا ہو کر نہ صرف اپنے ملک کی ترقی کو روکنا بلکہ خود اپنے آپ کو انتہائی نقصان پہونچانا چاہتے ہیں۔ ہم آئندہ نسلوں کو یہ کہنے کا موقع دینا نہیں چاہتے کہ" اگر ہمارے آباؤ اجداد نے غیر دانشمندی سے کام نہ لیا ہوتا تو آج سے بہت قبل ہندوستان آزاد ہو چکا ہوتا۔ اور

ہندوستانی مسلمانوں کو آزاد ہندوستان میں باوقار جگہ حاصل ہو۔

مجھے یقین کامل ہے کہ مستقبل قریب میں دنیا کے اندر بڑے بڑے انقلابات برپا ہونے والے ہیں جن سے ہندوستان بھی ضرور متاثر ہوگا۔ آجکل کا ہندوستان ایک جامد ملک بن کر نہیں رہے گا۔ وہ اپنی حکومت پر قانع نہیں رہ سکتا۔ کیا مسلمانوں کو آنیوالے انقلاب میں اپنا واجب حصہ نہیں لینا چاہیئے۔؟ کیا ان کے لئے یہ طرز عمل باعزت ہوگا کہ وہ اسوقت تو کچھ نہ کریں اور جب دوسرے جنگ لڑ کر فتحیاب ہو جائیں تو وہ مال غنیمت میں برابر کا حصہ بٹانیکے لئے مستعد ہوں؟ مجھے امید ہے کہ یہ کانفرنس نہ صرف مسلمانان ہند کے جائز حقوق و مطالبات کا تحفظ کرنیکے لئے ایک مشترک فارمولا تلاش کریگی بلکہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل بھی تیار کریگی جس کے ماتحت وہ اپنے ملک کو آزاد کرانے کیلئے اپنی عظیم الشان قومی خصوصیات کے لائق قربانیاں پیش کر سکیں۔

میں صرف ایک بات اور کہوں گا اور اس کے بعد ختم کر دوں گا۔ ہندوستان کو ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم کرنے یا جداگانہ ہندو اور مسلم ریاستیں قایم کرنے کی تمام گفتگو نہ صرف نا معقول بلکہ نا قابل عمل بھی ہے کیونکہ ان اسکیموں میں سے کوئی اسکیم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی اور کروڑوں مسلمان اور ہندو دور دراز کے صوبوں سے ہجرت کر کے ہندو یا مسلم آزاد علاقوں میں نہیں جا سکتے۔ ان تجاویز کو صرف وہی دماغ پیدا کر سکتا ہے جو غصہ کی وجہ سے ماؤف ہو چکا ہو۔

جہاں تک کہ اس امید موہوم کا تعلق ہے کہ مسلم اکثریت والے صوبوں کے جداگانہ فیڈرل مسلم حکومت کے ماتحت آجانے سے ہندوستان میں امن و امان قایم ہو جائے گا۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ اسکے برعکس، دو فیڈرل حکومتوں کے درمیان جن کی سرحدوں کو صرف نفرت و حقارت

و مذہبی تعصب کے جذبات ایکدوسرے سے جدا کریں گے۔ سخت جنگ و جدال کا آغاز ہو جائیگا۔ ہمیں اس حقیقت کو فراموش نکرنا چاہیے کہ جب وہ اکثریت والے صوبوں میں مسلم لیگ "اسلام" کے نام پر اور "اسلام خطرہ میں ہے" کا نعرہ لگاکر انتھک پروپگنڈہ کرنے کے بعد بھی لیگی حکومتیں قایم نکرسکی تو ان "اسلامی" اور "آزاد" حکومتوں کی حقیقت جنہیں لیگ پیدا کرنا چاہتی ہے سوائے پانی کے خالی بلبلوں کے اور کیا ہوسکتی ہے۔ میری حقیر رائے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہمیشہ ہندوستان میں ساتھ رہنا ہے اور انہیں ایک ایسی نئی تہذیب کے بنانے میں اپنا اپنا بہترین حصہ ادا کرنا ہے جو ترقی کریگی اور پھلے پھولے گی۔ اور شاید ایک دن تمام دنیا کی رہنمائی کرے گی۔

اس سے قبل کہ میں ختم کروں آپ حضرات سے اُن کوتاہیوں کیلئے معافی چاہتا ہوں جو مجلس استقبالیہ کے انتظامات میں آپ کو محسوس ہوئی ہوں اور اس کے لئے میرے پاس صرف ایک ہی عذر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ انتظامات جس مدت میں کئے گئے ہیں وہ چند یوم سے زائد کی مدت نہیں تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر اس شہر میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں جو قدیم عمارات کے اُن شاندار کھنڈروں سے بھرا ہوا ہے جن کا سلسلہ ہمیں زمانہ ہائے ماقبل تاریخ تک لے جاتا ہے۔ اور دوبارہ امید کرتا ہوں کہ آپ نہایت فیاضی کے ساتھ ہماری کوتاہیوں کو معاف کردیں گے۔

(خان بہادر شیخ) محمد جان
(ایم۔ ایل سی بنگال)

ماہر القادری مرحوم کا

ماہنامہ

فاران

جو

تقریباً پچھلے پچاس برس سے علمی، ادبی اور مذہبی مضامین

کے ذریعہ

اردو کی خدمات انجام دے رہا ہے

اب

اسماعیل احمد مینائی

کی ادارت میں ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے

پتہ: ماہنامہ فاران، ڈی ۲۵، بلاک نمبر ۸، گلشن اقبال کراچی نمبر ۴۸

مشرقی کتاب خانے



مشرقی کتب خانوں کے تعارف کا یہ سلسلہ ہم مخطوطات میں مشرق کے سب سے زیادہ ثروت مند ملک سے شروع کر رہے ہیں۔ ترکی عالم اسلامیہ کا حاکمانہ مرکز ہونے کے سبب اور کئی صدی تک علم کا قلب ہونے کے باعث کتابوں اور خطی نسخوں کے لیے بھی مرکز کا کام کرتا رہا۔ سارے عالم اسلام کا قیمتی ذخیرہ کھنچ کھنچ کے سلطنت عثمانیہ کے قدموں میں ڈھیر ہوتا رہتا تھا، جا بجا ادھر ادھر نکل جاتا تھا۔

ترکی ذخیروں کا یہ تعارف امید ہے اس سلسلہ کو آغاز کرتے ہوئے مناسب خیال کیا جائے گا ——————— • ادارہ

پروفیسر احمد آتش

مترجمہ ڈاکٹر اکمال ایوبی

ترکی کا ایک غیر معروف کتبخانہ

قسطمونی اناطولیہ کے ان شہروں میں سے ہے جو زمانۂ قدیم سے اہم تمدنی مرکز رہے ہیں۔ یہاں مدرسوں اور خانقاہوں سے متعلق بہت سے کتب خانے تھے۔ ان مقامات کے بند ہوجانے کے بعد ان کی کتابیں ایک عرصہ تک مختلف جگہوں پر پڑی رہیں اور آخر میں قسطمونی کے کتب خانۂ عمومیہ کی عمارت میں محفوظ کردی گئیں۔ کتابوں کا موجودہ ذخیرہ تین خانقاہوں خالدیہ، مولوی خانہ اور شعبان ولی، بارہ مدرسوں اور ایک ارمنی گرجا کے کتب خانوں سے حاصل شدہ کتابوں پر مشتمل ہے یہاں مخطوطات کی مجموعی تعداد تقریباً چار ہزار ہے یہ کتابیں موضوع کے اعتبار سے زیادہ تر ان علوم سے متعلق ہیں جنکی تعلیم عام طور پر مدارس میں دی جاتی تھی۔ ان میں ادبیات سے متعلق بہت کم کتابیں ہیں اور جو ہیں وہ زیادہ تر غیر اہم۔ ذیل کی سطور میں بعض منتخب کتابوں کا ذکر کیا جائے گا جو قدیم، نادر اور بے مثال ہیں۔ کتابوں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے ان کو موضوع کے لحاظ سے الگ الگ تقسیم کرنے سے کوئی فائدہ نہ تھا اس لیے ان کی فہرست مصنفین کی تاریخ وفات کے لحاظ سے ترتیب دی گئی ہے۔

(۱) مجموعہ۔

اوراق ۲۷۰، سطور فی صفحہ ۱۷، خط نسخ، مکتوبۂ یونس بن عبداللہ تاریخ کتابت: ۲۵ شعبان ۶۱۵ ہجری۔ [قسطمونی: ۲۷۱۳]

i) کتاب الخلوه والتنقل فی العباده و درجات العابدین (ورق ۱ ـ ۵۷) مصنفۂ ابو عبداللہ الحارث بن اسد المحاسبی[1] (م ۲۴۳ / ۸۳۷) اس کتاب کا ذکر *GAL* میں نہیں ملتا ہے

آغاز: بسملہ۔ الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی ۔ باب الإجتہاد و الخلوۃ و قصر الأمل و غیر ذلک ۔

قال الإمام أبوعبداللہ الحارث بن أسد المحاسبی رضی اللہ عنہ ۔ إعلم رحمک اللہ أن أهل طاعة اللہ قدموا بین یدی الأعمال ...

اختتام: ... قال احفظ لسانک ولا تقولن إلا حقاً و اسکت فانک إذا فعلت ذلک أدخلک فی أصناف الخیر و الحمد للہ وحدہ وصلی ...

گوشہ میں: بلغ مقابلة بحمد اللہ ۔

ii) کتاب الصفات (ورق ۵۷-۶۲) مؤلفہ ابوسعید احمد بن عیسی الخراز[2] (م ۲۸۶ / ۸۹۹) ۔ اس کتاب کا ذکر *GAL* میں نہیں ہے ۔

آغاز: قال أبوسعید الخراز رحمةاللہ

الحمد للہ الذی خلق الخلق حین أراد کما أراد فأحسن خلقهم و تمت مشیئة فیهم ثم دعاهم إلی التفهم ... فآثر أقوام الدنیا ... فحجب اللہ قلوبهم عن الآخرة ...

اختتام: ... ان هذا العلم موف (؟) لأن کثیراً من العارفین یحبون اللہ لأنفسهم ویذکرونہ بأنفسهم و یریدونہ لأنفسهم ۔

iii) کتاب الضیاء (ورق ۶۲ ـ ۶۴) یہ تصنیف بھی الخراز سے منسوب ہے ۔ اس کتاب کا کوئی دوسرا نسخہ اب تک معلوم نہیں ہوسکا ہے ۔

آغاز: الحمدللہ المحتجب من الأوهام بعلوہ المنفرد عن الأفهام بعزتہ ... یعلم ما تکنہ الصدور ...

---

۱ ـ دیکھیے Carl Brockelmann, *Geschichte der Arabischen Litteratur* I, 213; Suppl. I, 351

۲ ـ دیکھیے *GAL* I, 214; Suppl. I, 354.

(iv) **كتاب الكشف والبيان** (ورق ٦٤ ـ ٧٠) یہ رسالہ بھی
الخراز سے منسوب ہے جس کے کسی دوسرے نسخے کے متعلق
کوئی اطلاع نہیں ہے. علما میں جو طویل بحثیں ہوئی تھیں کہ انبیاء کا مقام
بلند ہے یا اولیاء کا اسی مسئلہ پر یہ رسالہ تصنیف کیا گیا ہے.

آغاز : بسمله. رب یسر قال ابوسعید... الخالق البرّ الصادق ... وآثار
المناهج ... بالأنبياء الذين اصطفا ... أما بعد فان قوماً من أهل
التصوف غلطوا فی التمیز بین مقام الأنبیاء والأولیاء فجعلوا مقام الأولیاء أرفع
من مقام الأنبیاء وانما ذلك سبب حجابهم عن الحقيقة ...

(v) **كتاب الفراغ** (ورق ٧١ ـ ٧٨) یہ نادر نسخہ ہے.

آغاز : قال الشیخ أبوسعید ... إعلم أن الخلق لواشتغلوا بانفسهم فی
ذکرالمولیٰ لتفرغوا عمن دونهم ولوجدوا فی ذکر ربهم غنیة عن ذکر مادونه ...

إختتام : ... فان لم يقدر ان يخرج من عيوبها فلا يعجز عن معرفة
عيوبها متأسفا وبالله التوفيق والعون.

(vi) **كتاب الحقائق** (ورق ٧٨ ـ ٨٧) الخرّاز نے اس رسالے میں
جو ایک نادر تصنیف ہے بعض مستعمل تعبیروں کی وضاحت صوفیوں کے
نقطۂ نظر سے کی ہے عقل، خشیت، تواضع، عدل، طاعت وغیرہ
جیسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے اور صوفیوں کے نقطۂ نظر سے ان کے
معانی سمجھائے ہیں نسخے کے اختتام پر وضاحت شدہ الفاظ کی
ایک فہرست بھی مندرج ہے.

آغاز : قال أبوسعید ... الحمدلله حمد منقلب بقلبه فی ریاض منته
ومتنزه بروحه تحت أشجار كرمه ... أمابعد قد جمعت فی كتابی هذا
مسائل عن طریق الحکمة علی بیان الشریعة بلسان أهل المعرفة علی الایجاز
والاختصار ... وافتتحت ذلك بباب العقل ... قال نور فی القلب یهدی النفس
الی اصول العمل ...

(vii) کتاب معیار التصوف وماهیته (ورق ۸۸-۱۳۳) مصنف ابوسعید الخرّاز و ابو یعقوب (؟) وسہل بن عبداللہ التستری[۳] (م ۲۷۳ / ۸۸۶ یا ۲۸۳ / ۸۹۶)۔

آغاز: بسملہ۔ ذکر ماهیة التصوف، قوله عزوجل انا اخلصناهم بخالصة ذکری الدار ۔ ۔ ۔ وقیل هم أهل الصفوة وارباب الصفا قال جعفر الصادق الصافی هو محمد بن عبداللہ والصوفی ابوبکر الصدیق لقوله من کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات

(viii) کتاب معرفة الأسرار (ورق ۱۳۳-۱۴۹ اور ۲۰۴-۲۲۰) مؤلفہ ابوعبداللہ محمد بن علی الحکیم الترمذی[۴] (م ۲۵۵/۸۶۸) ۔ اس کتاب کے کسی دوسرے نسخے کے وجود کی اطلاع نہیں۔

آغاز: الحمد للہ الذی تفرد فی ازلیته وتوحد فی دیمومته ثم انا شرحنا الاحوال والاسماء التی قد خفی علی بعض الناس ... ان سبب الناظر فیه علی طریق الصفا ویدل علی اخلاق المکارم والوفا ... فصل فی صفة أسرار اللہ ... فی طبقات اهل الارادة ... فی صفة ... المرید المحقق ... فصل فاما تمزیق الثیاب فی السماع ..

اختتام: ... کذلک کونه یکون فانیا و علم اللہ باقیا وباللہ التوفیق تم کتاب معرفة الأسرار ... من کلام الشیخ ... أبی عبداللہ الترمذی۔

(ix) کتاب شکایة أهل السنه بحکایة ما نالهم من المحنه (ورق ۱۶۵-۱۷۹) مؤلفہ ابوالقاسم عبدالکریم بن هوازن القشیری[۵] (۳۷۶-۴۶۵ / ۹۸۶-۱۰۷۲ء) دولت سلجوقیہ کی تشکیل کے ابتدائی دور میں وزیر عمید الملک الکندری کی خلل اندازی اور القشیری، امام الحرمین

۳۔ دیکھیے GAL I, 204; Suppl. I, 333

۴۔ دیکھیے GAL I, 216; Suppl. I, 355; H. Ritter, Philologika xiii, Oriens I, p. 34; اور ترجمة صفحات: ۱۶۹ (استنبول، ۱۲۸۹)

۵۔ دیکھیے GAL I, 556; Suppl. I, 770; H. Ritter, Oriens III, p. 36.

اور انکی طرح کے دوسرے لوگوں کی ادبی بچتیں معلوم ہیں جو اصولی طور پر اشعری تھے اور جو علماے اہل سنت کی وجہ سے مکہ ہجرت کر گئے تھے[6]. القشیری کے اس شکایت نامے کو جو قیام مکہ کے دوران میں لکھا گیا تھا، سبکی نے اپنی کتاب "طبقات الشافعیة الکبری" میں شامل کر لیا ہے[7].

آغاز: بسمله. قال الأستاذ القشیری الحمدلله المجمل فی بلائه ..

(x) تفسیر فاتحة الکتاب العزیز (ورق ۱۸۰-۲۰۸) کتاب کے اوپر کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف ابو محمد عبدالجلیل بن موسیٰ الأنصاری[8] ہیں جن کے حالات کا صحیح طور پر علم نہیں ہے صرف ایک کتاب میں ان کے متعلق سنہ ۶۰۵/ ۱۲۰۵ سے قبل زندہ رہنا بتایا گیا ہے: یہ کتاب سورۃ فاتحہ کی مختصر سی تفسیر ہے.

آغاز: بسمله. اعلم ان الله تبارک و تعالیٰ ینزل باسمه الرحمن الرحیم الى عباده لیجذبهم إلیه برسله و کتبه ...

اختتام: و تبری من العون بالمخلوقات فانهم تهمّنا الله وایا کم بمنه ...

(ix) صفة القلوب (ورق ۲۲۰-۲۲۶) یہ حکیم ترمذی کی ایک مختصر کتاب ہے جسکا کوئی دوسرا نسخہ اب تک معلوم نہیں ہو سکا ہے. اس میں الفرق بین الصدر والقلب والفؤاد واللب[9] کی وضاحت کی گئی ہے

آغاز: بسمله. کتاب صفة القلوب قال الشیخ ابو عبدالله الترمذی رحمه الله الفؤاد اول مدینة من مدائن النور والنور سبع مدائن اولها الفؤاد ثم الضمیر ثم الغلاف ثم القلب ثم الشغاف ثم الحبة ثم اللباب ...

[6] دیکھیے M. Sheref-eddin, *Selchuklular devrinde mezahib*, Turkiyat Mejmuasi I, (Istanbul 1925) p. 101.

[7] السبکی: طبقات الشافعیة (۲: ۲۷۶-۲۸۸)

[8] دیکھیے *GAL* Suppl I, 607

[9] دیکھیے *GAL* I, 215, no. 20

(xii) **کتاب السماع** (ورق ۲۲۶ - ۲۳۲) مصنفہ القشیری۔ نسخہ منحصر بہ فرد۔ اس رسالے میں سماع اور اسکے احکام وغیرہ کا ذکر ہے۔
آغاز: الحمدلله خالق الأرواح لکشف ... هذه فصول یخبر عن حقیقة السماع و أحکامه و امارات صحته و اعلامه ذکرنا علی حد الاختصار...

(xiii) **کتاب أدب المرید** (ورق ۲۳۲ - ۲۷۰) مصنفہ ابو القاسم الحسین بن جعفر بن محمد الواعظ الوزّان جو پانچویں/نویں صدی کے صوفیوں میں سے ایک تھے[10]۔ اس تصنیف کا ایک نسخہ استنبول میں ایا صوفیہ۔ کے کتب خانے میں موجود ہے۔
آغاز: قال الحمدلله الذی خلقنا فاکمل خلقنا و أدبنا فاحسن تأدیبنا...

(۲) **کتاب الهیئة** مصنفہ ابوعلی الحسن بن الحسن بن الهیثم[11] (م ۴۳۰/۱۰۳۸) اس کتاب کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہے[12] لیکن وہ ظاہرا ناقص ہے۔ ترکی کا یہ نسخہ بھی نہیں کہ قدیم ہے بلکہ مکمل بھی ہے۔

ترقیمہ: تم القول و الحمد لله ... وکتب هذا الکتاب من النسخة التی نسخ (!) من نسخة الشیخ أبی القاسم السمیاطی بخطه ذکر انه نقلها من نسخة بخط مصنف الکتاب الشیخ أبی علی الحسن بن الحسن بن الهیثم و قابل علیها من أولها الی آخرها فی رجب من سنة ست و سبعین وأربعمایة.

سرورق پر: والنسخة المکتوب منه هذه النسخة عورض بهذه النسخة الأصل المذکور وهو بخط الشیخ أبی علی بن الهیثم و صحح والحمد لله وکتب فی رجب من السنة المذکورة.

آغاز: بسمله ... قول الشیخ الفاضل أبی علی ... إبن الهیثم فی هیئة العالم لم یزل کثیر من أصحاب التعالیم ممن أنعم النظر فی علم الهیئة ... یجردون

۱۰۔ دیکھیے GAL I, 357

۱۱۔ دیکھیے GAL I, 617; Suppl. I, 851

۱۲۔ دیکھیے O. Loth, *A Catalogue of Arabic Manuscripts in the India Office*, (London, 1877), p. 213.

ولا مرسلاً ... فنحن قائلون فی هيئة العالم قولاً يشتمل فيما نظن حلى كليات المعانی التی اليها انتهى ادراك الباحثين على حقايق العلوم التعليمية .

اوراق ٤٤ ، سطور ١٧ ، خط نسخ جلی [قسطمونی : ٢٢٩٨]

(٣) کتاب الفرائد و القلائد عام طور سے یہ ادبی کتاب[١٣] ابوالحسین محمد بن الحسین (یا حسن) الأهوازی سے منسوب کی جاتی ہے جو چوتھی / دسویں صدی میں زندہ تھے ۔ بعض حضرات اس کو الثعالبی سے اور بعض رشید الدین وطواط سے بھی منسوب کرتے ہیں ۔ موجودہ نسخہ مصنف کے بیٹے ابوالحسین أحمد بن محمد بن الحسن الأهوازی کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے ۔

آغاز : الحمد لله العلی الکبیر القوی القدیر العليم الخبير السميع البصير ...

مکتوبه علی بن جعفر بن أسد بن علی الجوهری الکاتب . دمشق رجب سنه ٥٦٤ ھ

اوراق ٧٨ ، سطور ١٠ ، خط نسخ مشکول [قسطمونی : ٧٧٤]

(٤) کتاب أسماء الله و صفاته مصنفہ ابوبکر أحمد بن الحسین البیهقی[١٤] (م ٤٥٨ / ١٠٦٦). یہ کتاب قرآن ، حدیث اور اجماع امت کو مد نظر رکھتے ہوئے ، الله کے اسماء حسنہ اور صفات کے بارے میں لکھی گئی ہے ۔ اس کتاب کے نسخے کمیاب ہیں ۔ یہ کتاب سنہ ١٣١٣ھ میں الہ آباد سے اور سنہ ١٣٥٨ھ میں قاہرہ سے محمد زاهد الکوثری کے مقدمہ اور مختصر حواشی کے ساتھ شائع ہوچکی ہے ۔

موجودہ نسخہ سنہ ٥٥٦ ھ میں لکھا گیا ہے کتاب کے سرورق پر جو سماع کی تحریر ثبت ہے اس کے بموجب یہ نسخہ الحافظ ابوالقاسم علی بن الحسن بن هبة الله الشافعی یعنی مشہور مؤرخ و محدث کی روایت کے مطابق خود ان کا پڑھا ہوا ہونا چاہیے کیونکہ ان کی وفات ١١٧٦/٥٧١

١٣- دیکھیے GAL I, 91; Suppl. I, 153

١٤- دیکھیے GAL I, 446; Suppl. I, 566.

میں ہوئی تھی[۱۵]. اس کتاب کا ایک تنقیدی ایڈیشن شائع ہونا چاہیے اور اس نسخے سے خاص طور پر مدد لینی چاہیے.

آغاز: حد ثنا الشیخ الامام الثقة الحافظ ابوالقاسم علی بن الحسن هبة الله الشافعی قال قرأت علی الشیخ ابی الحسن عبیدالله بن ابی عبدالله محمد بن ابی بکر أحمد بن الحسین بن علی البیهقی ببغداد فاقرّ به قلت اخبرکم جدک الامام ابو بکر أحمد بن الحسین البیهقی قراءة علیه فاقرّبه ثم اخبرنا الشیخ . . . ابو عبد الله محمد بن الفضل بن أحمد بن محمد الفراوی الواعظ الفقیه قراءة علیه بنیسابور قال اخبرنا الشیخ الامام الحافظ ابو بکر أحمد بن الحسین بن علی البیهقی رحمة الله علیه قراءة علیه فی شعبان سنة تسع وأربعین وأربع مایة.

قال کتاب أسماء الله . . . باب إثبات أسماء الله تعالی ذکره بدلالة الکتاب والسنة وإجماع الأمة . . .

اوراق ۳۹۱، سطور ۱۷، خط نسخ خفی [قسطمونی: ۲۱۰]

(۵) مجموعه

اوراق ۱۴۳، سطور ۱۹، خط نسخ غیر مشکول [قسطمونی: ۱۲۷]

(i) کتاب الجواهر (ورق ۱—۷) مصنفه ابو حامد محمد بن محمد الغزالی[۱۶] (م ۵۰۵ / ۱۱۱۱).

(ii) کتاب الأربعین في أصول الدین (ورق ۸—۷۰) مصنفه غزالی. مکتوبه ۴ محرم سنه ۵۴۴ھ مدرسه نظامیه نیشاپور.

(iii) کتاب قواشم الباطنیة (ورق ۷۱—۷۸) یه بھی غزالی کی تصنیف ہے. ان کی اہل سنت کے علاوہ تمام دیگر مذاہب سے دشمنی اور اسی طرح باطنیوں کے خلاف ان کا کھلا ہوا سخت فکری جہاد

۱۵- دیکھیے GAL I, 403; Suppl. I, 366

۱۶- دیکھیے GAL I, 538.

۱۷. ابھی تک اس سلسلے کی تصانیف میں صرف «کتاب المستظہری» معلوم ہے تھا جسے گولڈسیہر نے شائع کیا ہے اور جس کے متن کا دار و مدار ایک ناقص نسخے پر رکھا تھا۔

«قواصم الباطنیہ» ایک مختصر رسالہ ہے جو سات اوراق پر مشتمل ہے «المستظہری» کا خلاصہ ہے۔ ابتدا میں مؤلف کہتا ہے:

وابتدأت بتوفیق الله لاسعافک إلی ما تمسته من کلمات و جیزة جلیة تقصم ظہور الباطنیة ویستأصل دابر أباطیلہم ... یستغنی ایجازھا عما ... اودعتہ النفس فی الکتاب الملقب بالمستظہری۔

اس مختصر مقدمہ کے بعد وہ اصولوں کو بیان کرتا ہے اور باطنیوں کے خیالات کو چار عنوانات میں جمع کر کے یکے بعد دیگرے سب پر بحث کرتا ہے اور ان کو منطقی دلیلوں سے غلط ثابت کرتا ہے۔

آغاز: استوفق الله الذی لم یلذ بہ مخلص إلاّ عصمه ولم یتمرد عن موردہ جبار إلاّ قصمه ... وابتدأت۔

اختتام: ... فان جاز لک أن تعرف بنظر العقل صدقه وإن کان ذلک محال جاز لی أیضاً أن أعرف هذه المسائل نور معلم وإن کان لی فیها خلاف

(iv) المنقذ عن الضلال (ورق ۷۹—۹۶) مصنفه الغزالی[18]۔

مکتوبه سلخ ذی القعدہ سنه ۵۴۳ ھ درمدرسۂ مذکور

(v) القسطاس المستقیم (ورق ۹۷—۱۲۵) مصنفه الغزالی[19]

مکتوبه یوم الأحد ۲۶ محرم سنه ۵۴٤ ھ درمدرسۂ مذکور

(vi) کتاب الجام العوام عن علم الکلام (ورق ۱۲٦—۱٤۳) یہ بھی الغزالی کی تصنیف ہے[20]

۱۷۔ دیکھیے Islam Ansiklopedisi, Batiniye maddesi; I. Goldziher; *Streitschrift des Gazali gegen die Batinijja*-Sekte, Veroffentlichungen der De Goeje-Stifting, Leiden, 1916, Introduction.

۱۸۔ دیکھیے *GAL* I, 544

۱۹۔ دیکھیے *GAL* I, 540

۲۰۔ دیکھیے *GAL* I, 538

۶) کتاب التمهید فی معرفت التجوید اس تصنیف کے مؤلف ابوالعلا الحسن بن أحمد بن الحسن بن أحمد بن محمد العطار الهمذانی[۲۱] (م ۵۶۹/۱۱۷۳) ہیں جو عراق میں اپنے وقت کے تجوید کے عالموں میں سب سے بڑے خیال کیے جاتے تھے۔ ابن الجزری کے بقول[۲۲] العطار الهمذانی کا مرتبہ اہل مشرق کے لیے وہی ہے جو کہ مغرب والوں کے لیے علم تجوید کے میدان میں الدانی کا ہے۔ اس نادر نسخے پر مصنف کے ہاتھ کی تحریر کردہ ایک سند موجود ہے۔ اس کتاب کا ذکر ابن الجزری نے ''التجوید'' کے نام سے کیا ہے[۲۳]. اس سے ابتدائی عہد کے کچھ قراء کے متعلق اہم معلومات حاصل ہوتے ہیں۔

ترقیمه : آخر کتاب التمهید ... و فرغ من انتساخه من أصل مصنفه المکتوب بخطه محمد بن إبراهیم بن الحسین بن محمد داد الجرباذقانی یوم الإثنین ۱۷ رمضان من شهور سنة ۵۳۷ حامداً لله ...

اس کے نیچے ایک سماع کی عبارت ثبت ہے جس پر کسی نے سیاہ روشنائی پھیردی ہے : بلغ من أول هذا الکتاب سماعاً بقرائه علی صاحبه الشیخ ... کتبه الحسن بن أحمد بن أحمد [بن أحمد بن] بن الحسن ... العطار فی شهر الله الأصم رجب من سنة اثنین و خمسین [وخمس مائة].

آغاز : الحمد لله ... أما بعد فانک سألتنی أسعدک الله بطاعته أن أذکر لک جملاً فی تحقیق القرآءة وترتیلها و تجوید التلاوة وترسیلها علی ماورد عن النبی ... و صحابته .. والتابعین ... فسألتک علی ما أنا علیه من تقسم الفکر لترادف الغموم ... جاریاً علی المألوف من توخی رضاک ... وسلکت فی النهوض بعبئه ...

اوراق ۸۸ ، سطور ۲۰ ، خط نسخ [قسطمونی ؛ ۱۵۲۵]

۲۱- دیکھیں GAL Suppl. I, 724
۲۲- غایة النهایه فی طبقات القراء ؛ ۲۰۴ (قاہره ، ۱۹۳۲)
۲۳- ایضاً : ۲۰۴

(۷) عوارف المعارف مصنفہ شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد سہروردی (م ۶۳۲ / ۱۲۳۴). اس کتب خانے میں «عوارف» کے تین نسخے موجود ہیں:

(i) مکتوبہ: ابوالفتح سعید بن سعید الاصفہانی، ضحوۃ یوم الخمیس ۱۵ رمضان ۶۲۷ ھ، مکہ.

سرورق پر دوسری روشنائی اور غالباً دوسرے قلم سے: استکتبه الفقیر... کحلی (؟) بن بکمش القطبی أحد أصحاب الأمیر... شمس الدین...

«عوارف» کے قدیم نسخوں[۲۴] میں اس نسخے کا بھی شمار ہوسکتا ہے.

اوراق ۱۶۳، سطور ۲۱، خط معمولی نسخ [قسطمونی: ۱۵۶۳]

(ii) مکتوبہ: ۶۱۵ ھ (یا ۷۱۵ ھ؟)

اوراق ۳۰۳، سطور ۱۹، خط نسخ جلی [قسطمونی: ۹۰۴]

(iii) مکتوبہ: محمد بن امام، ۱۵ صفر ۷۴۸ ھ، خانقاہ السمیساطیہ، دمشق

اوراق ۳۰۲، سطور ۱۹، خط نسخ مشکول [قسطمونی: ۱۶۴۱]

(۸) مجموعہ

اوراق ۱۷۵، سطور ۱۹، خط نسخ خفی [قسطمونی: ۶۰۴]

(i) مقدمۃ عوارف المعارف (ورق ۱—۳)

(ii) تفسیر خطبۃ عوارف المعارف (ورق ۴—۱۶) کتاب پر مصنف کا نام یعقوبی دیا ہوا ہے.

آغاز: قوله الحمد لله ای الثناء لله والشکر له. قوله العظیم شأنه العظیم الزیادة.

(iii) اعلام الهدیٰ و عقیدة أرباب التقی[۲۵] (ورق ۱۷—۳۵)

مکتوبہ: علی بن محمد بن ابی بکر الساوی المعروف بالتبریزی. یوم الثلاثاء ۲۳ محرم ۷۰۷ ھ. دمشق.

۲۴۔ دیکھیے *GAL* I, 569; Suppl. I, 788; H. Ritter, Philologika IX: *Der Islam*, XXV, 1938, p. 36

۲۵۔ دیکھیے H. Ritter, no. 51 and *GAL*, no. 3

آغاز: الحمدلله الذی رفع غشاوة الغمّة عن بصایر أهل الوداد...

(۱۰) اللوامع الغیبیه (ورق ۳۵—۳٦) مصنفه سہروردی. روح کے متعلق ایک مختصر رسالہ[٢٦]

(۷) (ورق ۳۷—٤۱) سہروردی کے مختلف اقوال پر مشتمل ایک رسالہ. ہر قول لفظ «فتوح» سے شروع ہوتا ہے.

(۱۱) (ورق ٤۱—٤٤) خراسان کے بعض صوفیوں سے استفسارات کے جواب میں[٢٧] سہروردی کا رسالہ.

آغاز: وقد سألت رحمك الله وایانا هذه الأسئلة وأنا... أجیب عن بعضها...

(vii) ورق (٤٤—٤٥) روح حیوانی کے متعلق سہروردی کے کچھ اقوال[٢٨]

آغاز: قال الروح الحیوانی المجنّس المسمّی نفسا حیث تجس بورود الروح العلوی...

(viii) رسالة السیر و الطیر (ورق ٤٥—٤۷) یہ بھی سہروردی کی تصنیف[٢٩] ہے.

آغاز: قال رسول الله... سیروا سبق المفردون قیل من المفردون...

(ix) وصیت و مختصر اقوال (ورق ٤۷—۷۱)

مکتوبه: ۲٦ صفر ۷۰۷ ہجری

(x) ذکر ألفاظ تدور بین الطائف الصوفیة (ورق ۷۲—۷٦)

تصوف کی بعض اصطلاحات کا مختصر ذکر.

(۹) اس مجموعہ کا خاص حصہ مشہور فخرالدین رازی (م ٦۰٦/۱۲۰۹ء)

کی «نهایة الایجاز فی درایة الإعجاز» نامی تصنیف پر مشتمل ہے[۳۰]

مکتوبہ: محمد بن ابی بکر ۱٤ محرم ۷۰۷ ہجری

---

٢٦. دیکھیے *GAL* no. 29

٢٧. دیکھیے *GAL* I, 570, no. 11

٢٨. دیکھیے *GAL* S I, 790, no 20.

٢٩. دیکھیے H. Ritter, no. 52; *GAL*, no. 29.

۳۰. دیکھیے *GAL* Suppl. I, 924, no. 32.

(۱۰) الدرة الفريدة فی شرح القصیدة مصنفه منتجب الدین بن ابی العز بن رشید الهمذانی[31] (م ۶۴۳/۱۲۴۵). علم قراءت سے متعلق الدانی کی «التیسیر» کو شاطبی (م ۵۹۰/۱۱۹۴) نے نظم کا جامہ پہنایا تھا جس کا نام «الشاطبیہ» تھا[32]. پیش نظر کتاب جس کے کسی دوسرے نسخے کا اب تک علم نہیں ہو ہے، اسی منظوم کتاب کی شرح ہے اور یہ غالباً وہی کتاب ہے جس کا ذکر ابن الجزری نے کیا ہے[33].

اس نسخے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسے محمد بن أحمد بن ابی الفضل نے جو اناطولیہ میں سلجوقیوں کے دور کے مشہور خاندان ابوالفضل التفلیسی سے تعلق رکھتے تھے، شام میں سنہ ۶۵۲ ھ میں خریدا تھا. اس نسخے پر ان کی حسب ذیل تحریر ہے:

إنتقل بحکم الشری إلی أضعف خلق الله . . . محمد بن أحمد بن ابی الفضل الحافظ التفلیسی بمحروسة دمشق فی سنة اثنی و خمسین و ستمایة . . .

اس پر ابو عمرو عثمان بن موسیٰ الضریر المصری القرشی کی دی ہوئی ایک سند سماع بھی موجود ہے کہ سنہ ۶۵۳ ھ میں شہر سیواس میں شمس الدین محمد بن حمید (؟) بن ابی الفضل التفلیسی اور ابو یزید بن ابراهیم نے مندرجہ بالا کتاب کی جلد دوم کے کچھ حصے پڑھے.

اوراق ۲۴۷، سطور ۱۷، خط نسخ مشکول [قسطمونی: ۷]

(۱۱) کتاب معرفة أنواع علم الحدیث مصنفه ابو عمر عثمان بن عبدالرحمن بن عثمان ابن الصلاح. یہ ساتویں صدی کے مشہور محدث تھے. ان کی پیدایش ۱۱۸۲/۵۷۷ میں بمقام شہرزور ہوئی تھی. تعلیم موصل میں شروع ہوئی اور اس زمانے کے مختلف علم کے مرکزوں کی سیر کرتے ہوئے خراسان پہنچے اور وہیں ان کی تعلیم مکمل ہوئی. کچھ عرصہ بعد شام گئے جہاں انہوں نے سکونت اختیار کرلی اور جہاں وہ

۳۱. دیکھیے G.AL I, 528; Suppl. I, 726. اور ابن الجزری: غایة النهایة (۲ : ۳۱۰)
۳۲. دیکھیے G.AL I, 520
۳۳. دیکھیے G.AL II, 310

مدرسۂ اشرفیہ میں حدیث کے شیخ ہوگئے ۔ ان کی وفات سنہ ۱۲٤۳،٦٤۲
میں شام میں ہوئی[۲٤]۔

اس کتاب کا ایک بہت خوبصورت قلمی نسخہ استنبول میں موجود
ہے[۲۵]. پیش نظر نسخہ مصنف کی زندگی میں ان کے پڑھے ہوئے ایک
نسخے سے محمد بن سلیمان المقدسی نے نقل کیا ہے ۔

ترقیمہ: فرغ من نسخه من أصل مصحح متقن مضبوط مسموع على
شيخنا الإمام ... صدر الحفاظ مفتى الشام تقى الدين أبى عمرو عثمان بن
عبدالرحمن بن عثمان المعروف بابن الصلاح ... فى عشرين من شهر المحرم
سنة احدى و أربعين و ستماية و كتب العبد ... محمد بن سليمان المقدسى

اوراق ۱۰٤، خط ترکی نسخ [قسطمونی: ۲۰]

(۱۲) شرح الوافیہ مؤلفہ ابوالفداء[۳٦] (م ۷۳۲ / ۱۳۳۱) کتاب الکافیہ
مصنفۂ ابن حاجب[۳۷] (م ٦٤٦ / ۱۲٤۹) فن نحو کی مشہور کتاب ہے ۔ طلبا
کی آسانی کے لیے اسے نظم کا جامہ پہنایا گیا تاکہ نحوی مسائل حفظ
کرنے میں انہیں آسانی ہو. اس کا نام «وافیہ» رکھا گیا . اس کا ایک
نسخہ اسکوریال کے کتب خانے میں محفوظ ہے[۳۸]. پیش نظر نسخہ اس
کتاب کی شرح ہے ۔

آغاز: الحمد لله الذى علم بالقلم ... و بعد فاننى لما وجدت منظومة
الشيخ ... جمال الدين أبى عمرو بن الحاجب فى النحو المسماة بالوافية من أفضل
أراجيز نظماً ولم أجد لها شرحاً توافق غرضى آثرت أن أعلق عليها شرحاً لطيفاً

ترقيمه: كان فراغ مؤلفه العبد الفقير ... اسمعيل بن على بن محمود

---

۲٤ دیکھیے GAL I, 440; Suppl., 610

۲۵۔ دیکھیے M. Weisweiler, Istanbuler Handschriften zur arabischen Traditionsliteratur, Bibliotheca Islamica, X, (Istanbul, 1937), no. 6.

۳٦۔ دیکھیے GAL II, 55; Islam Ansiklopedisi, Ebu'l-Fida maddesi

۳۷۔ دیکھیے GAL 1, 367; Suppl. 1, 531

۳۸۔ دیکھیے Escurial, no. 146; GAL 1, 370

بن محمد بن عمر ابن شہنشاہ بن ایوب من تعلیقه فی یوم الأحد سابع عشر شعبان المکرم سنة ٧٢٣ ..... حامداً لله .....

مکتوبه بخط مصنف

اوراق ١٤٣ ، سطور ٢١ ، خط نسخ [قسطمونی : ٢٨٩٢]

(١٣) کتاب الفصول مصنفه بقراط. یه کتاب حنین بن إسحاق کی کتاب کا ترجمه ھے[٣٩].

مکتوبه ٧٠٣ ھجری [قسطمونی : ١٠٤٥]

(١٤) المنتقی فی الأحکام عن خیر الأنام مصنفه عبدالسلام بن عبدالله بن تیمیة الحرانی[٤٠] (م ٦٥٢ / ١٢٥٤).

مکتوبه ٦٥١ ھجری [قسطمونی : ٨٨٠]

(١٥) معانی الاخبار مصنفه محمد بن إسحاق الکلاباذی[٤١] (م ٣٨٠/ ٩٩٠)

مکتوبه ٧٨٥ ھجری [قسطمونی : ١٣٩٨]

(١٦) شرح الصدور بشرح حال الموتی فی القبور مصنفه جلال الدین السیوطی[٤٢].

مکتوبه بخط مصنف ١٥ جمادی الآخر ٨٨٣ ھ [قسطمونی : ١١٤٤]

(١٧) کتاب التوحید مصنفه ابو بکر محمد بن إسحاق بن خزیمة النیسابوری[٤٣] (م ٣١١/ ٩٢٣). [قسطمونی : ٣٠٢٥]

(١٨) تاریخ مصر مصنفه علی بن أحمد السخاوی. یه مصر کی مختصر تاریخ ھے جو سنه ٨٠٩ھ سے سنه ٨٨٧ ھ تک کے واقعات پر مشتمل ھے.

---

٣٩. دیکھیے GAL I, 226

٤٠. دیکھیے GAL I, 504

٤١. دیکھیے GAL I 217; Suppl. I, 360

٤٢. دیکھیے GAL II, 180, no. 30

٤٣. دیکھیے GAL I, 206

آغاز : ذكر سلطنة الملك الناصر فرج ابن برقوق الثانية لما جلس الملك الناصر فرج على تخت الملك ثانی مرّة أستنار أمره. واحتوى بأمور المملكة ...
الحوادث فی سنة ٨٠٩

اختتام : ... وقع الفراغ من جمعه على يد كاتبه علی بن أحمد السخاوی نسباً الحنفی مذهباً فی ليلة يسفر صباحها عن يوم الجمعة الثامن عشر من المحرم سنة سبع ثمانين ثمانماية يتلوه إن شاء الله أول سلطنة الأشرف قايتبای.

مکتوبه بخط مصنف

اوراق ٦٧ ، سطور ١٩، مصری نسخ† [قسطمونی : ١٢٩]

[*]

---

† International Society for Oriental Research کے ششماہی رسالہ Oriens جلد ٥ صفحات ٢٨—٤٦ کے ایک ترکی مضمون سے ترجمہ کیا گیا۔

ڈاکٹر محمد غوث، ایم اے، پی ایچ ڈی

استنبول کے کتب خانے

گزشتہ ستمبر میں استنبول میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس کا بائیسواں اجلاس منعقد ہوا، اس میں شرکت کے سلسلہ میں مشرق وسطیٰ میں چار مہینوں کے سفر کا موقع حاصل ہوا، کانگرس ختم ہونے کے بعد ترکی کے شہروں اور قصبوں میں کتب خانوں عجائب خانوں اور کتابوں کی نمائشوں کو دیکھنے کے لیے تین مہینوں کا دورہ کیا گیا، اور بروسہ، مانیسا، افیون قرہ حصار، کوتاہیہ، اسکی شہر، قونیہ اور انقرہ میں قلمی اور مطبوعہ کتابوں کے متعدد سرکاری اور غیر سرکاری ذخیرے دیکھے ترکی سے واپس ہوتے ہوئے حلب، بیروت، دمشق، بیت المقدس اور بغداد میں مکتبوں،

یونی ورسٹیون اور علمی اداروں کے کتب خانون اور عجائب خانون کو بھی دیکھنے کا موقع ملا، ہر جگہ کتب فروشون کی چھوٹی بڑی دکانین بھی دیکھین

ترکی اور دوسرے مقامون کے ذمہ دارون نے کتابون کی تنظیم، فہرستون کی ترتیب اور دوسرے نظم ونسق کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کا بڑی کشادہ دلی اور اخلاق کے ساتھ انتظام کیا،

اس سفر مین جو معلومات حاصل ہوئے، ان مین دوسرے ذوق آشنا دن کو بھی شریک کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، اور اُن کو مضمون کی شکل مین ناظرین معارف کی خدمت مین پیش کیا جاتا ہے، اس مضمون مین صرف استنبول کے کتبخانون کا ذکر کیا جائے گا، انشاء اللہ دوسرے مقامات کے کتبخانون اور دوسرے علمی و تعلیمی حالات کو دوسرے مضمون مین قلم بند کیا جائے گا، واللہ الموفق،

استنبول کے کتب خانے زمانۂ قدیم سے مشہور ہین، اور دور دور تک اُن کی شہرت ہے، یہ کتبخانے ترکون کے اعلیٰ علمی ذوق اور خدمتِ علم کی ایسی شہادت ہین جس کی تردید ممکن نہین،

ترکی کے شہرون اور قصبون مین جہان جائیے ہر جگہ ترکون کی تعمیری نابیت اور تنظیمی قوت کا نظارہ ہوتا ہے، ترکون کی قوم عملی قوم ہے، کچھ کرکے دکھانے کا شوق اس کی قومی خصوصیت ہے، یہ خصوصیت کتبخانون کے دیکھنے سے بھی ظاہر ہوتی ہے،

صدیون قبل سے استنبول کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے شہرون اور قصبون تک کے لوگ کتابین جمع کرنے اور اُن کی حفاظت کے انتظامات کے شائق رہے ہین، اور اب جب کہ ان کتابون کو قومی امانت قرار دیا جارہا ہے، اُن کی اہمیت اور قیمت سے واقف ہوتے جاتے ہین، اور خوشی خوشی اپنے بزرگون کی جمع کی ہوئی اور نادر کتابین سرکاری کتب خانون مین محفوظ کراتے چلے جارہے ہین، اور کتابون کا ایسا بیش قیمت ذخیرہ بہترین انتظامات کے ساتھ عام استفادہ کے لئے مہیا ہوتا جارہا ہے جس کے اثرات علمی دنیا مین بہت گہرے ہون گے،

استنبول میں اولاً مسجدوں اور دوسری مذہبی عمارتوں میں کتابوں کی فراہمی شروع ہوئی تھی پھر ان کے احاطوں میں مخصوص حجرے تعمیر کرکے ان میں کتابوں کو جمع کرنا شروع کیا گیا تھا، پھر بعد میں کتب خانوں کے لئے مستقل عمارتیں تعمیر ہوئیں،

پہلی دو قسموں کے کتب خانوں کے لئے کتابوں کی فراہمی سلطان محمد فاتح نے شروع کی تھی. اور مسجد ایوب میں اس کی ابتدا ہوئی. گویا ۱۴۵۲ء میں استنبول کے فتح ہوتے ہی مسجد ایوب میں کتابیں بھی فراہم ہونے لگیں،

مسجدوں سے الگ سب سے پہلا مستقل کتب خانہ استنبول میں قائم ہوا جو کوپرولو کا کتب خانہ کہلاتا ہے ۱۶۶۱ء میں یہ کتب خانہ قائم ہوا، اس کتب خانہ کی بلند و بالا نفیس اور شاندار عمارت کے ساتھ اس کی کتابیں بھی مشہور عالم ہیں،

یوں تو ہر عالم کے ہاں کارآمد اور ضروری کتابوں کا ذخیرہ ہوتا ہی تھا لیکن آگے چل کر کتابوں کو عام استفادہ کے لئے وقف کرنے کا رواج شوق کی حد تک پہنچ گیا چنانچہ کتب خانوں کے علم دوست بانیوں نے جو خود بھی بڑے عالم و فاضل ہوتے تھے، نہ صرف کتابیں وقف کیں، بلکہ ان کے رکھ رکھاؤ، اور اعلیٰ درجہ کے انتظام و اہتمام کے لئے بڑی بڑی جائدادیں بھی وقف کیں،

وقف ناموں میں کتب خانہ کے ملازمین کے تقرر وغیرہ کے علاوہ کتب خانہ کے روزانہ کھلنے اور بند ہونے کے اوقات تک کی صراحت ہوتی تھی،

ترکی کے طول و عرض میں جو بے شمار کتب خانے قائم ہوئے، ان کی عمارتوں اور کتابوں کے ذخیروں کو آگ اور زلزلوں سے بھی بہت نقصان پہنچا، ایسے اوقاف جو سلطنت عثمانیہ کے ماتحت ملکوں اور علاقوں میں قائم کئے گئے تھے، پہلی جنگ عظیم کے بعد ان سے ہاتھ دھونا پڑا،

اس لئے اس جنگ کے بعد یہ کوشش شروع کی گئی کہ کتابیں مزید حفاظتی انتظامات کیساتھ

موزون عمارتون مین جمع کی جائین، اور کتب خانون کی خاص خاص خصوصیتین بھی برقرار رکھی جائین، اور ناظرین وشائقین کو بھی زیادہ سے زیادہ سہولت وآسانی حاصل ہو

چنانچہ اس وقت سارے استنبول کے (۵۰) کتب خانون کو (۱۱) کتب خانون مین ضم کر دیا گیا ہے۔

استنبول اور مملکت ترکیہ مین جو کتب خانے موجود ہین، اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) ایسے کتب خانے جن کے اخراجات سررشتہ تعلیمات کی وساطت سے مرکزی حکومت برداشت کرتی ہے۔ ترکی حکومت مین ۹۹ ہین جن مین ۲۰ شہر استنبول مین ہین،

ان کتب خانون مین وہ کتب خانے شامل نہین ہین جن کے اخراجات گو حکومت ہی بالواسطہ یا بلا واسطہ برداشت کرتی ہے، لیکن جو یونیورسٹیون یا دوسرے سرکاری ادارون سے متعلق ہین، عجائب خانون سے ملحق کتب خانے بھی جدا ہین،

(۲) وہ کتب خانے جن کے اخراجات اضلاع کی حکومت برداشت کرتی ہے، اور وہ سررشتہ تعلیمات کی عام نگرانی مین ہین،

(۳) وہ کتب خانے اور دارالمطالعہ جو پبلک کے خرچ سے اور اُن کے انتظام کے تحت چلائے جاتے ہین، (۲۰۰) ہین،

(۴) ایسے کتب خانے جو خانگی انجمنون یا علم دوست افراد نے قائم کئے ہین، ملک بھر مین پھیلے ہوئے ہین، چنانچہ ازمیر (سمرنا) کا قومی کتب خانہ اسی نوعیت کا ہے،

(۵) علمی ادارون کے کتب خانے جن کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے، مثلاً لسانی ادارہ اور انجمن تاریخ کے کتب خانے،

اس وقت استنبول مین جو کتب خانے موجود ہین، ان کے نام یہ ہین،

۱۔ عجائب خانۂ آثار قدیمہ کا کتب خانہ،	۲۔ کتب خانۂ لطف آفندی،
۳۔ کتب خانۂ ایاصوفیا،	۴۔ کتب خانۂ جدیدہ،
۵۔ کتب خانۂ عمومی بایزید،	۶۔ کتب خانۂ مسجد فاتح،
۷۔ کتب خانۂ خسرو پاشا،	۸۔ کتب خانۂ کوپردلو،
۹۔ تت کتب خانہ،	۱۰۔ کتب خانۂ مراد ملا،
۱۱۔ نور دعثمانیہ کتب خانہ،	۱۲۔ کتب خانۂ راغب پاشا،
۱۳۔ کتب خانۂ سلیم آغا،	۱۴۔ کتب خانۂ عام سلیمانیہ،
۱۵۔ کتب خانۂ توپ قپو سرائے،	۱۶۔ کتب خانۂ انجمن ترکیات،
۱۷۔ کتب خانۂ استنبول یونیورسٹی،	۱۸۔ کتب خانۂ ولی الدین آفندی،

ان مین سے بعض کتب خانے روزانہ صبح کے ۹ بجے سے شام کے ۵ بجے تک کھلے رہتے ہین بعض کتبخانون مین ہفتہ مین ایک مرتبہ سہ شنبہ کو باری باری سے صفائی کے لئے تعطیل ہوتی ہے،

عموماً سب کتب خانون مین داخلہ کی عام اجازت ہے لیکن عجائب خانۂ آثار قدیمہ کے کتبخانہ؛ کتب خانۂ جدیدہ، توپ قپو سرائے کے کتب خانہ اور یونیورسٹی لائبریری مین داخلہ خاص اجازت سے ہوتا ہے، ان کتب خانون کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات سرکاری دفترون کے اوقات کے مطابق ہین،

اوپر جن کتب خانون کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان مین سے بعض کی کتابین کل کی کل مطبوعہ ہین مثلاً عجائب خانۂ آثار قدیمہ کا کتب خانہ، اس مین بیس ہزار کتابین ہین جو سب مطبوعہ ہین، اسی طرح ادارۂ ترکیات کے کتب خانہ مین (۲۰۰۰۰) کتابین موجود ہین لیکن یہ بھی تمام کی تمام مطبوعہ ہین،

۶۔ زمین سے بعض کتب خانون کو مطبوعہ کتابون کے ذخیرہ ہی کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے لیکن ان میں

قلمی کتابیں بھی کچھ نہ کچھ موجود ہیں، جیسے بلدیہ کا کتب خانہ، اس کتب خانہ میں (۲۲۶۲۸) کتابیں جمع ہیں لیکن قلمی کتابیں صرف (۱۰۳۲) ہیں،

بعض کتب خانوں میں اصلی ذخیرہ قلمی کتابوں کا ہے لیکن مطبوعہ کتابیں بھی موجود ہیں مثلاً کتب خانہ ایاصوفیا میں (۵۰۰۴) مخطوطات کا ذخیرہ ہے لیکن مطبوعہ کتابوں کی کل تعداد صرف (۴۴) ہے،

بعض کتب خانوں میں مطبوعہ اور مخطوطہ دونوں قسم کی کتابوں کا بڑا وافر ذخیرہ ہے مثلاً بایزید عمومی کتب خانہ میں (۴۹۷۰) مخطوطات اور (۹۱۲۱۷) مطبوعہ کتابیں ہیں، اسی طرح یونیورسٹی کے کتبخانہ میں (۱۰۹۵۱۳۵) مطبوعہ کتابیں، اور (۸۴۷۱۱) مخطوطات ہیں،

غرض استنبول کے موجودہ کتب خانوں میں (۳۴۴۱۲۳۳) مخطوطات استفادۂ عام کے لئے ہر طالب علم کی دسترس میں ہیں، اور ابھی بھی کتب خانوں اور کتابوں کو حکومت یا کتب خانوں کے سپرد کر دینے کا سلسلہ جاری ہے،

نت لائبریری میں جو کتب خانے شامل کئے گئے ہیں، اُن میں سب کو علیحدہ علیحدہ کمروں میں رکھا گیا ہے،

ان تمام کتب خانوں میں حسب ضرورت فرنیچر دوسرے ضروری سامان اور خوش اخلاق و مستعد عملہ موجود ہے، سامان ایسا ہے جس سے شان و شوکت کا بھی اظہار ہوتا ہے، صفائی اور پاکیزگی تو ایک عام بات ہے، جس کا مشاہدہ ہر جگہ ہوتا ہے،

ہر کتب خانہ میں کارڈ کیٹلاگ کو رواج دیا جا رہا ہے، قلمی کتابوں کی فہرستیں رجسٹروں میں بھی ہیں،

صرف ایک شہر میں ایک لاکھ سے زیادہ قلمی کتابوں کا بہترین انتظامات کے ساتھ استفادۂ عام

کے لئے تنہا ہونا علمی دنیا کے لئے ایک غیر معمولی بات ہے۔

یہ ساری قلمی کتابیں عربی ترکی اور فارسی کی ہیں، مگر زیادہ تعداد عربی کتابوں کی ہے۔

یورپ اور دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے کتب خانوں میں صرف چند ہزار عربی اور فارسی اور ترکی قلمی کتابیں ہیں[1] لیکن چونکہ اُن کی تفصیلی فہرستیں بڑی محنت و قابلیت اور بڑی جانکاہی سے مرتب کی گئی ہیں، بڑے اہتمام سے چھاپی گئی ہیں، اور آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں، اس لئے اُن کی عام شہرت ہو گئی، لیکن استنبول کے اس عظیم الشان ذخیرہ پر جب کچھ اصحاب علم اپنی عمریں صرف کر دیں گے، اس وقت اس کی اہمیت اور قدر کا عام اندازہ ہو سکے گا، خوشی کی بات ہے کہ اس کا اہتمام ہو رہا ہے، چنانچہ وزارتِ تعلیمات کے تحت کتب خانوں کے ڈائرکٹر کی نگرانی میں ایک خاص کمیشن استنبول کے کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کرنے کے لئے مامور ہوا ہے۔

اس مضمون میں ہر کتب خانہ کے الگ الگ حالات اور خصوصیات بیان کرنے کی گنجائش دشوار ہے، اس لئے صرف استنبول یونیورسٹی لائبریری کے متعلق کچھ وضاحت بیان کی جاتی ہے۔

اس کتب خانہ کا آغاز ۱۹۲۳ء میں ہوا، اس کی تین منزلہ عمارت یونیورسٹی کی مرکزی عمارت سے علحدہ لیکن اسی کے قریب واقع ہے، استنبول کی موجودہ یونیورسٹی کے قیام سے پہلے جو دار الفنون قائم تھا، اس کے

---

[1] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند کتب خانوں کی کتابوں کے اعداد کا بیان ذکر کر دیا جائے، اس کی تفصیل کے لئے خود ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔

پورے استناد کے ساتھ اعداد بیان کرنا مشکل ہے، اس لئے کہ اس وقت تک اس کا مستند مواد بہت کم فراہم ہو سکا ہے، جو اعداد معلوم ہیں، ۵۰، ۶۰ سال بلکہ ۷۰، ۸۰ سال قبل کے ہیں تاہم عمومی اندازہ کے لئے فی الجملہ یہ اعداد کافی ہیں۔

برٹش میوزیم میں مخطوطات فارسی کی تعداد ۲۹۱۰ ہے۔

شعبہ ہائے ادبیات، سائنس، دینیات اور قانون کی کتابین اس کتب خانہ کے لئے دے دی گئی تھین اور دوسرے خانگی کتب خانے بھی اس مین شامل کر دیئے گئے۔ حکومت نے سلطان عبدالحمید خان ثانی کا کتبخانہ بھی اس کو دے دیا۔ اس طرح کتب خانہ کے قیام کے بعد سے کتابون کے اضافہ کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ۱۹۲۳ء مین جب یونیورسٹی کی جدید تنظیم ہوئی، اور مختلف شعبون (فکلٹیز) نے اپنے لئے علیحدہ کتب خانون کا قیام ضروری سمجھا، اُس وقت سے یونیورسٹی لائبریری مین جو کتابین فراہم کی جاتی ہین اُن کی نوعیت یہ ہے،

۱- ایسی کتابین جو انسائیکلوپیڈیا یا ببلوگرافی کی نوعیت کی ہون،

(بقیہ حاشیہ ص۹۰۳) ڈاکٹر ریو نے فارسی کیٹالاگ کے دیباچہ مین لکھا ہے کہ برٹش میوزیم مین عربی مخطوطات کی تعداد ... تک نہین پہنچتی ہے، اور دوسری مشرقی زبانون کی قلمی کتابین اور بھی کم ہین، انڈیا آفس مین فارسی مخطوطات کی تعداد ۳۰۷۶ ہے،

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال مین فارسی مخطوطات کی تعداد کرزن کلکشن کو ملا کر کل ۲۳۰۵ ہے، بمبئی یونیورسٹی مین عربی فارسی اور اردو مخطوطات ۱۶۷۰، مدراس کے مشرقی مخطوطات کے کتب خانہ مین عربی فارسی اور اردو مخطوطات ۴۹۲۵، نیشنل لائبریری کلکتہ کے بوہار کتب خانہ مین عربی فارسی قلمی کتابین کل ۱۴۹۹ ہین، بانکی پور کی خدا بخش لائبریری مین ۱۵۲۲ فارسی کے اور (۲۲۶۴) عربی کے مخطوطات ہین، حیدرآباد دکن کے کتب خانہ آصفیہ مین غیر سرکاری اطلاع کے بموجب جو مجلہ نوائے ادب بمبئی مین شائع ہوئی، مطبوعہ فارسی اور اردو مخطوطات کی تعداد (۱۴۰۰۰) ہے، حیدرآباد کے کتب خانہ سعیدیہ مین قلمی کتابون کی تعداد ۲۱۵۱ یا اس سے کچھ زیادہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مین قلمی کتابین (۴۰۰۰) ہین، یہ اعداد محض اندازہ کے لئے بیان کئے گئے، ورنہ صحیح اعداد اور دوسری تفصیلات معلوم کرنے کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہے،

۲. وہ کتابین جن کا تعلق عام ادب سے ہے،

۳. وہ کتابین جو قدیم ترکی رسم الخط (عربی رسم الخط) مین لکھی گئی ہون،

۴. ۱۹۲۳ء مین یہ قانون منظور ہوا کہ مملکت ترکیہ مین جو بھی کتاب، رسالہ یا اخبار طبع و شائع ہو اس کا ایک نسخہ اس یونیورسٹی لائبریری مین محفوظ کیا جائے،

۵. تبادلہ مین بعض یورپین یونیورسٹیون سے سائنٹفک مطبوعات حاصل کیجاتی ہین،

اس کتب خانہ کا ذخیرہ کتب مطبوعات اور مخطوطات دونون پر مشتمل ہے، مطبوعہ کتابون کے بڑے حصہ کا موضوع یا مشرق ہے یا ترکی مملکت، ترکی مطبوعات کے لئے یہ کتب خانہ ساری دنیا مین خصوصی ترجیح کا حامل ہے،

اس یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطات جو کم و بیش بیس ہزار ہین، ترکی، عربی اور فارسی زبانون کے ہین، اور ان مین بے شمار ایسے نسخے بھی شامل ہین، جو خطاطی، مصوری، نقاشی، اور جلد سازی کے بے مثل نمونہ ہین، وہ ایک ایک نسخہ صناعی اور مہارت فن کا گویا ایک شاہکار ہے، جن کے دیکھنے سے آنکھون کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے،

قرآن شریف کے نسخون مین، رق پر لکھے ہوئے نمونے بھی جو ابتدائی صدیون کی یادگار رہا ہین، موجود ہین، اور عرب اور ایران، ترکستان، ہندوستان، افغانستان، اور عثمانی ترکون کی سلطنت کے مختلف علاقون کے مشہور خطاطون، عالمون اور عالمزادون کے لکھے ہوئے، مصاحف، ابتدائی کوفی خط سے لیکر اعلیٰ درجہ کے نسخ و نستعلیق تک مین یہان موجود اور باصرہ نواز ہین، ان مصحفون مین سادہ اوراق سے لے کر فن کاری کے اعلیٰ ترین دیدہ زیب اور دل نواز نمونے ع:-

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار"

کے مصداق ہین۔

اس کتب خانہ کے مقبول نسخون کی فہرست جو ناظم کتب خانہ فہمی ادہم نے مرتب کی ہے، بڑے اہتمام سے پیرس میں ۱۹۳۳ء میں چھپا ہوئی ہے،

ترکی زبان کے رسالے اور مجلے جو اس کتب خانہ مین آتے ہین، اُن کی تعداد (۳۴۰) اور اخبارات کی (۲۰۰) ہے۔[1]

چونکہ کتب خانہ کی عمارت تنگ ہے، اس لئے اس سے استفادہ بھی محدود رکھا گیا ہے، اور صرف اساتذہ اور اعلیٰ جماعتون کے طلبہ کو استفادہ کی اجازت ہے، البتہ کتب خانہ مین ایک ایسا کمرہ بھی ہے جہان طلبہ خود اپنی ذاتی کتابون کا مطالعہ کرسکتے ہین، یہ دار المطالعہ روزانہ صبح کے سات بجے سے رات کے دس بجے تک کھلا رہتا ہے،

مطالعہ اور تحقیقی کام کرنے والون کو خاص اجازت سے استفادہ کی سہولت حاصل ہو جاتی ہے، اس کتب خانہ کے لئے ایک نئی موزون عمارت کی تعمیر زیر تجویز ہے، اس کی تعمیر کے بعد کتب خانہ سے استفادہ کا دائرہ بھی وسیع ہو جائے گا،

اس لائبریری مین دو قسم کی عام فہرستین ہین، ایک ڈکشنری سسٹم پر، دوسرے اعشاری قاعدہ کی تقسیم علوم والی فہرست، عربی اور فارسی مطبوعہ کتابون کی فہرستین اُن کے رسم الخط مین علٰحدہ مرتب اور مہیا ہین قلمی کتابون کی فہرست علٰحدہ ہے۔

اس کتب خانہ کی مختلف نشریات کی تعداد ۱۹۳۵ء تک (۹۴) تک پہنچ چکی ہے، ان مین سے بعض مطبوعہ فہرستین تحفہ کے طور پر راقم کو بھی حاصل ہوئین، ان مین ایک کتب خانہ کی فارسی مطبوعہ کتابون کی فہرست ہے جو ۱۹۳۵ء مین طبع ہوئی ہے، اس کے مرتب فہمی ادہم ہین، یہ فہرست علوم اور مولفون کے نام کے لحاظ

(بقیہ حاشیہ ص ۹۰۵) علٰحدہ درکھی ہوئی ہین جن کو دیکھتے دیکھتے آدمی تھک جائے، اور کتابین ختم نہ ہون۔

[1] ان اعداد سے ترکی کی عام تعلیمی اور علمی ترقی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہے حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے، اور استنبول میں نہایت خوبصورت طبع ہوئی ہے، ایران اور ایبات پر دوسری زبانوں کی جو کتابیں کتب خانہ میں محفوظ ہیں، وہ بھی اس فہرست میں شامل کر دی گئی ہیں،

دوسری فہرست عربی کی قلمی کتابوں کی ہے، اس کے مرتب بھی فہمی ادہم ہیں، یہ نشریہ عربی مخطوطات کی فہرست کی پہلی جلد کا پہلا حصہ ہے، اس حصہ میں قرآن مجید اور اس سے متعلقہ علوم کے (۳۳۲) مخطوطات کا ذکر ہے، ان میں سے (۲۵۰) قرآن مجید میں اور باقی تجوید وغیرہ فنون کے قلمی نسخے ہیں، تصویریں بھی اس نشریہ میں ہیں، آٹھ تصویریں قرآن شریف کے مختلف نسخوں کے ایک ایک صفحہ کی اور دو تصویریں جلد بندی کے نمونوں کی ہیں،

یہ فہرست گو تفصیلی فہرست نگاری کے جاریہ طریقہ پر مرتب کی گئی ہے لیکن اختصار پیش نظر رکھا گیا ہے تاہم کوئی ضروری بات چھوٹنے نہیں پائی ہے، اس فہرست میں مختلف اشاریے اور کار آمد جدولیں بھی ہیں، ہر کتاب کا نام اور ابتدائی عبارت عربی رسم الخط میں تحریر ہے،

یہ توان کتب خانوں کے ظاہری حالات ہیں، ان کی کتابوں اور مخطوطات پر مختصر تبصرہ کے لئے بھی استنبول میں کافی قیام کی ضرورت بلکہ ساری عمر درکار ہے، اس پانچ روز میں کوئی کیا دیکھ سکتا ہے اور حسرت و افسوس کے ساتھ واپس ہونا پڑتا ہے،

اس موقع پر بے محل نہ ہوگا اگر استنبول کی ان نمائشوں کا تذکرہ کیا جائے جو کانگریس کے سلسلہ میں قلمی کتابوں کی نمائش کے لئے منعقد کی گئی تھیں[1]،

---

[1] مخطوطات اور مطبوعہ کتابوں کی نمائشوں کے علاوہ اور دوسری جو نمائشیں ہوئی تھیں، وہ یہ ہیں،

۱۔ ترکی کی یادگار عمارتوں کے نقشوں کی نمائش، استنبول کی ٹکنیکل یونیورسٹی میں۔

۲۔ ٹرکش انسٹی ٹیوٹ فار گرس نے نور بانی کی نمائش کی تھی،

مندرجہ ذیل مقامات مین قلمی کتابون کی نمایشون کا انتظام کیا گیا تھا،

۱۔ استنبول یونیورسٹی کے کتب خانہ مین،

۲۔ فتت لائبریری مین،

۳۔ کتب خانہ راغب پاشا مین،

۴۔ توپ قپو سرائے کی میوزیم کے کتب خانہ مین،

۵۔ خود استنبول یونیورسٹی کی مرکزی عمارت مین،

مخطوطات کی ان نمایشون کے علاوہ، یونی ورسٹی کی عمارت ہی مین مطبوعہ کتابون کی بھی نمایش ہوئی تھی،

مطبوعہ کتابون مین زیادہ تر جدید ترکی مطبوعات تھین اور کچھ قدیم رسم الخط کی کتابین بھی تھین، بیرونی ادارون کی کتابین بھی نمایان کی گئی تھین، ان مین حیدرآباد کے دائرۃ المعارف[لہ] کی مطبوعات بھی تھین مگر معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی ناشرون نے اس نمایش کے ذریعہ اپنی نشریات کو مشہور کرنے کی اہمیت کم محسوس کی، حالیہ ترکی مطبوعات کا موضوع ایک علٰحدہ مضمون کا متقاضی ہے،

یہ تمام نمایشین بڑی خوش انتظامی اور حسن اہتمام سے منعقد ہوئی تھین،

(بقیہ حاشیہ ص ۹۰۷) ۳۔ قدیم سرکاری دفاتر کے اہم کاغذات کی نمایش، حکومت کے کاغذات قدیم کے دفتر مین،

۴۔ معموری اور بُت تراشی کی گیلری،

۵۔ عصری ترکی پینٹنگ کی نمایش، یہ بھی یونیورسٹی کی عمارت مین تھی،

۶۔ ترکی عورتون کے لباس کی نمایش،

۷۔ تصاویر کتبون اور تعفون یا خطاطی، اور دوسری اشیاے فنون لطیفہ کی نمایش، اس نمایش کا مختصر تذکرہ مضمون مین کیا گیا ہے،

[لہ] حیدرآباد دکن کے اس ادارہ نے خاموشی کے ساتھ علم کی جو خدمت کی ہے اسکا بیرونی علمی دنیا مین بڑا چرچا ہے،

استنبول یونیورسٹی کی عمارت مین مخطوطات کی جو نمایش ہوئی تھی، اس کے لئے خاص طور سے بڑا اہتمام کیا گیا تھا، ایک وسیع مربع ہال مین جس کی وسعت ہندوستانی یونیورسٹیون کی عمارتون مین کم دیکھنے مین آتی ہے، شیشہ کے صندوقون مین یا میزون پر کھلی کتابین سارے ہال مین قرینہ سے ترتیب دی گئی تھین، ہر کتاب پر اس کا مختصر حال علیحدہ علیحدہ کارڈ پر لکھا ہوا تھا، یہ نمایش گیارہ دن صبح کے ۹ بجے سے شام کے چھ بجے تک مسلسل رہی،

اس نمایش مین استنبول کے تمام کتب خانون سے کتابین فراہم کی گئی تھین، جن کتابون کی نمایش کی گئی، اُن کی ایک فہرست بھی چھاپ کر تقسیم کی گئی تھی، اس فہرست کے مطابق (۸۹۹) عربی فارسی اور ترکی زبانون کی قلمی کتابین اس نمایش مین موجود تھین، سب سے زیادہ کوپرلو کے کتب خانہ کی کتابین (۱۶۰) کی تعداد مین تھین،

نمائش مین رکھی جانے والی کتابون کی جو فہرست چھاپ کر تقسیم کی گئی تھی، اس مین ہر کتاب کے متعلق مندرجۂ ذیل باتین تحریر تھین،

(۱) نام کتاب (۲) سنہ کتابت یا سنہ تالیف (۳) مؤلف کا نام (۴) مؤلف کا سنہ وفات (۵) فن (۶) زبان (عربی، فارسی یا ترکی) (۷) کتب خانہ کا نمبر،

فراہمی معلومات کے دو دفتر نمایش مین قائم کئے گئے تھے، ایک ان کتابون کے متعلق جو نمایش مین رکھی گئی تھین، دوسرے استنبول کے کتب خانون کے متعلق اور یہ انتظام کیا گیا تھا کہ ترکی جرمن، عربی اور فارسی چار زبانون مین یہ معلومات بہم پہنچائی جائین، دوسرے فنی معلومات بہم پہنچانے کا بھی انتظام تھا، اس نوعیت کے معلومات بھی چار زبانون، ترکی، انگریزی، عربی اور فارسی مین

(بقیہ حاشیہ ۱) جس صاحب علم سے ملاقات ہوتی تھی، وہ ضرور اس ادارہ کا حال دریافت کرتا تھا، وطن مین اس ادارہ اور اس کے ٹھوس کام کی اہمیت کا اندازہ نہین ہوسکتا،

فراہم کئے جا سکتے تھے،

چونکہ نمایش کے بڑے ہال میں کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی ممانعت تھی، اس لئے نمایش میں ہی ایک دار المطالعہ بھی قائم کر دیا گیا تھا، تاکہ اگر کوئی چاہے تو جن کتابوں کی نمایش کی گئی تھی، ان میں سے کوئی کتاب تھوڑی دیر کے لئے لیکر ضروری معلومات حاصل کر سکے، جو لوگ اپنے اخراجات سے تصویر یا فلم لینا چاہتے تھے، ان کے لئے بھی معقول انتظامات کئے گئے تھے،

دل چاہتا ہے کہ نمایش میں جو کتابیں دیکھی تھیں، ان کا مفصل تذکرہ کیا جائے، لیکن بحالات موجودہ یہ ممکن نہیں، اس لئے صرف چند کتابوں کا تذکرہ مختصر طور سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ اختلافات الائمہ، شمس الدین الاوزجندی (المتوفی سنہ ٦٤٢ھ) کی تالیف، عاطف آفندی کے کتب خانہ سے آئی تھی، زبان عربی، نمبر[1] ۳۳۳، جہاں تک علم ہے یہ کتاب ابھی طبع نہیں ہوئی ہے،

۲۔ التذکرۃ الهرویہ فی حیل الحربیہ } فنون حرب میں علی بن ابو بکر الہروی (المتوفی سنہ ٦١١ھ) کی تالیف، کتب خانہ کا یہ نسخہ مؤلف کی زندگی میں سنہ ٦٠٦ھ میں لکھا گیا تھا، تا حال غیر مطبوع ہے، عاطف آفندی کے کتب خانہ سے یہ نسخہ آیا تھا، نمبر (۲۰۱۸) زبان عربی، غالباً شمس الدین الاوزجندی، اور علی بن ابو بکر الہروی کی کوئی دوسری کتاب بھی ابھی طبع و شائع نہیں ہوئی ہے،

۳۔ المُصنّف، فن صرف میں ابو الفتح ابن جنی (المتوفی سنہ ٣٩٢ھ) کی تالیف سنہ ٥١١ھ میں لکھا ہوا نسخہ، زبان عربی، عاطف آفندی کے کتب خانہ کی نمبر ۲۹۳۲، ابن جنی کی دوسری کتابیں طبع ہوئی ہیں لیکن اس کتاب کی طباعت کا حال معلوم نہیں،

۴۔ مقدمہ ابن خلدون (المتوفی سنہ ٨٠٨ھ) یہ مقدمہ سنہ ٧٧٩ھ میں تالیف ہوا،

---

[1] یہاں اس بات کی صراحت کر دی جاتی ہے، کہ نمبر سے کتب خانہ متعلقہ کا نمبر مراد ہے،

نسخہ اسی سال کا مکتوبہ ہے، عاطف آفندی کے کتب خانہ کا نسخہ نمبر ۱۹۲۹،

۵- ادلۃ الرسمیۃ فی ..... الحربیۃ :- فنون حرب پر عربی زبان مین محمود بن شنخلی کی تالیف، ۸۸۰ھ میں یہ کتاب تالیف ہوئی، غالباً یہ نسخہ اسی سنہ کا مولف کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے، ایاصوفیہ کے کتب خانہ سے یہ کتاب نمایش مین آئی تھی، نمبر ۲۸۳۹- کتاب کی طباعت کا کوئی حال معلوم نہین ہے،

۶- اربعین فی ارشاد السالکین : ابو الفتح محمد الطائی کی تالیف، ۵۶۰ھ کا لکھا ہوا نسخہ، عربی زبان مین حدیث اور سلوک کے موضوع پر مختصر رسالہ ہے، ایاصوفیا کے کتب خانہ کا نمبر ۵۱۲، اس کتاب کے چھپنے کے حال سے کوئی آگاہی نہین ہے،

۷- اغراض السیاسۃ فی علم الریاسۃ : الخطیب السمرقندی کی فارسی زبان مین تالیف ایاصوفیا کے کتب خانہ کا نسخہ، کتاب کا نمبر ۲۸۴۴، کتاب غالباً تاحال غیر مطبوعہ ہے،

۸- کتاب الاقالیم الارضیہ علی الممالک الاسلامیہ } ابو اسحق الاصطخری المتوفی (۳۴۰ھ) کی تالیف، عربی زبان مین جغرافیہ کے موضوع پر، اصطخری کی دوسری دو کتابین صور الاقالیم اور مسالک الممالک چھپ چکی ہین لیکن یہ تالیف غالباً ابھی چھپی نہین، ایاصوفیا کے کتب خانہ کا نسخہ نمبر ۲۹۷۱،

۹- اعیان العصر و آوان النشر - عربی زبان مین اپنے ہم عصر مشاہیر پر خلیل الصفدی المتوفی ۷۶۴ھ) کی تالیف، غالباً مؤلف کا خود اپنا لکھا ہوا نسخہ ہے، (ایاصوفیہ نمبر ۲۹۶۶) حال طباعت نامعلوم،

۱۰- اظہار ضعۃ الحق القیوم فی ترتیب بلاد الفیوم } فخر الدین ابن النابلسی کی تالیف عربی زبان مین، حال طباعت نامعلوم (ایاصوفیا نمبر ۲۹۶۰)

۱۱۔ الاشراف علی معرفۃ الاطراف : ابن عساکر (المتوفی ۵۷۱ھ) کی عربی زبان میں حدیث کے موضوع پر تالیف غالباً کوئی انڈکس ہے، حال طباعت غیر معلوم نسخہ اباصوفیا نمبر ۴۵ (۵) یہ نسخہ کتاب کی دوسری جلد پر مشتمل ہے،

۱۲۔ سیر ابن اسحاق کا فارسی ترجمہ، ۶۸۴ھ میں لکھا ہوا نسخہ (اباصوفیا نمبر ۳۲۲۵) یہ امر تحقیق نہ ہوسکا کہ یہ کتاب ابن ہشام کی ترتیب دی ہوئی سیرت ابن اسحق کا ترجمہ ہے، یا اصل کتاب کا اگر اصل کتاب کا ترجمہ ہے تو علمی دنیا کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے،

۱۳۔ جغرافیہ کی کتاب العجائب کا ترکی ترجمہ : مترجم مصطفی سروری (المتوفی ۹۶۹ھ) نسخہ اباصوفیا نمبر ۳۱۵۶)

۱۴۔ المسالک والممالک : کا فارسی میں ترجمہ مترجم کا نام ابوزید احمد بلخی ہے، نسخہ اباصوفیا نمبر ۳۱۵۶)

المسالک والممالک کے نام سے عربی زبان میں ایک سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً ابن خرداذبہ (المتوفی فی حدود ۳۰۰ھ) کی تالیف، الاصطخری (نیز ۳۴۰ھ) کی تالیف اور ابن حوقل (المتوفی ۳۶۷ھ) کی تالیف، یہ تینوں کتابیں دی خویہ وغیرہ مستشرقین نے لیڈن سے طبع و شائع کی ہیں، اس بات کی تحقیق نہ ہوسکی کہ اباصوفیا کے کتب خانہ میں محفوظ المسالک والممالک کا ترجمۂ فارسی کس متن کا ترجمہ ہے،

۱۵۔ التکملہ لوفیات النقلۃ، دوسری تا دسویں جلد، الترغیب والترہیب کے مؤلف زکی الدین المنذری (المتوفی ۶۵۶ھ) کی تالیف، عربی زبان میں تاریخ و تذکرہ کے موضوع پر ۶۵۱ھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ اور غالباً تا حال غیر مطبوع، نسخہ اباصوفیا نمبر ۳۱۶۳)

۱۶۔ تلخیص المخروطات :۔ یہ کتاب عربی زبان میں فن ہندسہ کے موضوع پر ہے، مؤلف کا نام محمود بن قاسم الاصفہانی ہے، ۶۵۱ھ کا لکھا ہوا نسخہ، طباعت کا حال معلوم

یہ نسخہ ایاصوفیا نمبر ۳۲۲۰ ہے۔

۱۷۔ تاریخ اسلام وطبقات المشاہیر والاعلام: شمس الدین الذہبی (المتوفی ۷۴۸ھ ہجری) نسخہ ایاصوفیا نمبر ۳۰۰۵)

۱۸۔ تاریخ المجروحین من المحدثین: ابو حاتم البستی المتوفی (۳۵۴ھ) کی تالیف عربی زبان میں۔ ابو حاتم البستی کی ایک دوسری تالیف روضۃ العقلاء ونزہۃ الفضلاء طبع ہو چکی ہے لیکن اس کتاب کے طبع ہونے یا نہ ہونے کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ (نسخہ ایاصوفیہ ۴۹۲)

۱۹۔ روضات اولی الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب: فخر الدین بناکتی (المتوفی ۷۳۰ھ) کی تالیف فارسی زبان میں ۷۰۲ھ میں اس نسخہ کی کتابت ہوئی ہے (نسخہ ایاصوفیا نمبر ۳۰۲۲)

۲۰۔ شرح اشکال التاسیس: مولانا قاضی زادہ رومی (المتوفی ۸۱۵ھ) فن ہندسہ کے موضوع پر عربی زبان میں ۸۱۵ھ میں غالباً یہ کتاب تالیف ہوئی ہے۔ (نسخہ ایاصوفیا نمبر ۲۷۴۳)

۲۱۔ ظفرنامہ: امیر خسرو دہلوی (المتوفی ۷۲۵ھ) کی تالیف ترکی زبان میں۔ یہ نسخہ ۹۳۵ھ میں نقل ہوا ہے۔ (نسخہ ایاصوفیا نمبر ۳۱۳۳)

۲۲۔ کتاب المسافات والولایات: عربی زبان میں ابو عبداللہ المقدسی (۳۷۵ھ) کی تالیف۔ یہ نسخہ ۵۵۵ھ میں نقل کیا گیا ہے۔ المقدسی کی ایک دوسری تالیف احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم کے بعض اجزاء طبع و شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب المسافات غالباً ابھی طبع نہیں ہوئی۔ (نسخہ ایاصوفیا ۲۹۷۱)

۲۳۔ معادن النوادر فی معرفۃ الجواہر: کرکی بیہقی اس کے مؤلف ہیں۔ کتاب عربی زبان میں ہے۔ جواہرات اس کا موضوع ہے۔ ۹۱۵ھ کی تالیف ہے۔ اس موضوع پر مسلمان علماء نے بہت توجہ کی ہے۔ ترکی کے دوسرے کتب خانوں میں اس موضوع پر جو تالیفیں دیکھنے میں آئیں ان کا آئندہ تذکرہ کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ (نسخہ ایاصوفیا نمبر ۳۴۰)

۲۴۔ معرفۃ انواع علوم الحدیث : یہ رسالہ مقدمۂ ابن صلاح کے نام سے مشہور ہے، مؤلف کی وفات ۶۴۳ھ میں ہوئی، اور یہ نسخہ ۶۴۴ھ کا لکھا ہوا ہے، (نسخہ آبا صوفیا نمبر ۴۸۴)

۲۵۔ معرفۃ اصول الحدیث : محدث حاکم نیشاپوری (المتوفی ۴۰۵ھ) کی تالیف، ۴۰۵ھ میں لکھا ہوا نسخہ (آیا صوفیا نمبر ۴۴۹)

یہ چند کتابیں جو مشتے نمونہ از خروارے کی مصداق ہیں، ورنہ ایک ایک کتاب کے لئے کئی کئی صفحے درکار ہیں، اور کوئی دس بیس کتابیں نہیں ہیں، بلکہ ہزاروں نایاب اور نادر نسخے ہیں، جن کا نام شمار کرانا بھی دشوار ہے،

کانگرس کے ضمن میں جو دوسری مختلف نمائشیں ہوئی تھیں، ان سب کا تذکرہ باعث طوالت ہوگا، صرف خطاطی کی نمائش کے متعلق سرسری اشارہ کیا جاتا ہے،

خطاطی کی نمائش فنون لطیفہ کے شعبہ کا جزو تھی، پوری نمائش میں موجودہ عہد کے نمونے رکھے گئے تھے، اس ہال میں جو چیز سب پر چھائی ہوئی تھی، وہ نجم الدین خطاط کے لکھے ہوئے قطعے تھے، ان قطعوں کو دیکھ کر خطاطی میں نجم الدین کے کمال پر نمائش میں ہر شخص کی زبان سے بے اختیار ستائش اور تحسین کا اظہار ہوتا تھا، نجم الدین اپنے پیشرو باکمال ترک استادان خطاطی کے قابل فخر جانشین ہیں،

خطاطی کا یہ کمال نئے رومن رسم الخط میں پیدا نہیں ہو سکتا تھا، یہ قطعے عربی رسم الخط میں لکھے ہوئے قطعے تھے، پھر انقلاب کے بیس پچیس سال قبل کے لکھے ہوئے نہیں، بلکہ ۱۳۶۹ھ کے لکھے ہوئے یعنی نمائش سے صرف کچھ عرصہ قبل تحریر کئے ہوئے تازہ بتازہ نو بہ نو کے مصداق، پھر ان قطعوں کے مضامین رندانہ یا اس سے کم درجہ کے شاعرانہ نہیں، بلکہ خالص اسلامیاتی یعنی آیات قرآنی، حدیثیں یا راسخ العقیدہ علماء کے اقوال وغیرہ

قدیم مشرقی امور اور اسلامی روایات وشعار سے ترکوں کی یہ شیفتگی، اور والہانہ عقیدت شہر بہ شہر قریہ بہ قریہ اور مکان بہ مکان نظر آتی ہے، یہ تجربے اور مشاہدے ایک علیحدہ مضمون ہی میں تفصیل کے

ساتھ سما سکتے ہین،

اس مضمون کے آخر مین قدیم کتابون کی ایک ترکی خدمت کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا گیارہوین صدی ہجری کے ایک ترک اہل علم واہل قلم حاجی خلیفہ (المتوفی ۱۰۶۷ھ) نے اپنی مشہور عالم تالیف کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون سے علوم اسلامیہ کی جو خدمت انجام دی ہے، اس کے احسان سے عالم و متعلم کبھی عہدہ برآ نہین ہوسکتے، یہ کتاب لنڈن، قاہرہ اور آستانہ مین طبع ہوئی تھی لیکن ہر جگہ نادر و نایاب تھی، اور اگر اس کا کوئی نسخہ مل جاتا تھا، تو منہ مانگی قیمت دے کر لینا پڑتا تھا. اب استنبول مین اس کا نسخہ سرکاری اہتمام سے چھپ رہا ہے، اس کی پہلی جلد جو حرف ر تک ہے ۱۹۴۱ء مین سررشتۂ تعلیمات کے مطبع مین چھپی ہے، دو عالمون نے اس کو اڈٹ کیا ہے، ایک شرف الدین یالتقایا اور دوسرے رفعت بیگہ الکلیسی، پہلے صاحب استنبول یونیورسٹی مین پروفیسر ہین، اس نسخہ کی ابتدا مین عربی زبان مین تمہید و مقدمہ لکھا گیا ہے، حاجی خلیفہ کے حالات بھی بیان کئے گئے ہین، جدید ترکی رسم الخط مین بھی ایک پیش لفظ لکھا گیا ہے، اس نسخہ مین حاجی خلیفہ کی قبر کے فوٹو کے علاوہ کتاب کے اصل مسودہ اور مبیضہ کے ایک ایک صفحہ کا عکس بھی شامل ہے، پیش لفظ وزیر تعلیم حسن علی نے لکھا ہے. اور کتاب عصمت ا[illegible] کے نام پر منسوب کی گئی ہے،

اصل کتاب کی ایک جلد چھپنے کے بعد غالباً مناسب یہ معلوم ہوا کہ اس کا ایک ذیل پہلے چھاپ دیا جائے، چنانچہ اسماعیل پاشا بغدادی کی تالیف موسوم بہ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون کی دو جلدین چھپ چکی ہین، یہ بھی سررشتۂ تعلیم کے مطبع مین طبع ہوئی ہین، پہلی جلد ۱۹۴۵ء مین طبع و شائع ہوئی اور دوسری جلد ۱۹۴۷ء مین، طباعت کے اخراجات سررشتۂ تعلیم نے برداشت کئے تھے، [1]

[1] اس مضمون کی ترتیب مین جن مطبوعات کا حوالہ نفس مضمون مین ہے، ان کے علاوہ مندرجۂ ذیل نشریون سے جو

اقبال مرحوم نے عربی اور فارسی زبانوں کی نادر و نایاب کتابوں کو مشرقی مدارس کے طاق و ایوانوں سے نکل کر مغربی کتب خانوں اور جامعات کے رواقوں کی زینت بنی ہوئی دیکھ کر کس حسرت و افسوس سے نوحہ خوانی کی تھی کہ

گر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

انھوں نے اپنے دل کی قاش فروشی غنی کشمیری کے اس شعر کو نقل کر کے بھی نمایاں کی تھی کہ

غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

لیکن بحمد اللہ بحولہ و قوتہ اب اس یاس و اندوہ کی ضرورت نہیں، ہر طرف امید کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں درا صل تو اس زمزمہ کا وقت آ گیا کہ

صبح امید کہ بد معتکف پردۂ غیب
گو برون آئے کہ کار شب تار آخر شد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۱۵) انگریزی میں ہیں، مدد لی گئی ہے (۱) رہبر کتب خانہ ہائے استنبول، تیسرا اڈیشن از تالیف منظفر گوک نمان (۲) کیٹلاگ: کیلنڈر، استنبول یونیورسٹی (۳) ایجوکیشن ان ٹرکی،

ڈاکٹر سید نعیم الدین

بروصہ کے کتبخانوں کے چند فارسی مخطوطات

پروفیسر مجتبیٰ منیری نے اپنے ایک مقالے میں استنبول کو "شہر کتب خانہ ہا" کہا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ ترکیا کے بعض دیگر شہر بھی "کتب خانوں کے شہر" قرار دیے جا سکتے ہیں۔ قونیہ، مانیسہ، قیصریہ اور بروصہ بھی اپنے کتب خانوں کیلئے مشہور ہیں۔ بروصہ میں، جو مردم شماری کے لحاظ سے پانچواں بڑا شہر ہے، تقریباً چھ کتب خانے موجود ہیں۔ یہ کچھ صدیوں تک ترکی کا پایہ تخت بھی رہا ہے اور آج بھی فطری مناظر، حمام، مساجد اور درگاہوں کے لیے مشہور ہے۔ قدیم زمانے میں یہ شہر علم و ادب اور خاص کر صوفی طریقتوں کا بڑا مرکز رہا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں یہاں سہروردی اور رفاعی طریقتوں کے لوگوں نے کئی خانقاہیں اور زاویے بنوائے تھے۔ غرض قدیم زمانے سے یہاں مذہب و علم کا چرچا رہا ہے اور اسی لیے یہاں کے کتب خانوں میں عربی، فارسی اور ترکی مخطوطات کا بڑا عمدہ ذخیرہ ملتا ہے۔ مجھے اپنی سیاحت کے دوران میں وہاں جو اہم فارسی مخطوطات نظر آئے وہ میں نے اس وقت نوٹ کر لیے تھے اور اب قارئینِ مجلہ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

<u>دیوان انوری</u> خراج چی اوغلی لائبریری، نمبر ۹۲۵ • ابعاد ۱۵×۲۴ (۸×۱۷) سنٹی میٹر، اوراق ۳۲۰، سطور ۱۹، • خط تعلیق، عنوان "مذہّب حاشیہ زریں۔"

آغاز: مقدری انہ بآلت بقدرت مطلق کند زجرم بخاری چو گنبد ازرق

اختتام: باقی بوجود تست از پانصد سال ہم گوہر مصطفیٰ و ہم نم علی

ترقیمہ: تم الکتاب بعون اللہ الملک الوہاب فی غرۃ محرم الحرام سنۃ ثمان وثلاثین وسبعمایۃ علی ید الفقیر روح اللہ علی جمال

قصاید: ورق ۱ – ۱۶۳ب، مقطعات: ۱۶۳ب – ۲۲۳الف، غزلیات: ۲۲۳ب – ۲۸۰ب، فی الہجا: ۲۸۰ب – ۲۹۸ب، رباعیات: ۲۹۹ب – ۳۲۰۔

"دیوان انوری" کے مرتب پروفیسر سعید نفیسی کو قرن ہفتم کے صرف دو ہی نسخے ملے ہیں، زیادہ تر قرن نہم

دہم و یازدہم کے نسخے ان کے پیش نظر رہے ہیں۔ تقابلی ایڈیشن کے لیے قرن ہشتم کے لکھے ہوئے اس نسخے کی خاص اہمیت ہے۔

منطق الطیر عطار:- پبلک لائبریری نمبر ۱۱۰۲ ، ابعاد ۱۹×۲۷ ، ۲۲/ (۱۲٫۵×۱۹) اوراق ۱۴۱، سطر ۱۵، خط نسخ۔

ابتدائی صفحے پر "وقف تکیہ اشرف زادہ" کی مہر ہے۔ "دال" "ذال" کی شکل میں لکھی ہے۔ کاغذ کی علامت بھی گواہی دیتی ہے کہ یہ نسخہ غالباً تیرہویں یا چودھویں صدی عیسوی میں نقل ہوا ہے۔ آخر میں کچھ اوراق کم ہیں۔

آغاز : آفرین جان آفرین پاک را

اختتام : یاری او کردم و یارش شدم

"منطق الطیر" کے قدیم ترین نسخے سنہ ۶۸۰ھ اور ۶۹۲ھ کے لکھے ہوئے قونیہ میوزیم میں موجود ہیں۔[1]
"منطق الطیر" کے تنقیدی اڈیشن کے لیے قونیہ کے علاوہ بروصہ کا متذکرہ بالا نسخہ بھی بیحد مفید ہوگا۔

منطق الطیر عطار:- ارخان جامعی لائبریری، نمبر ۵۸ ، ابعاد ۱۵×۱۲ ، ۲۰٫۲ (۱۲٫۵×۷٫۵) اوراق ۱۶۵ ، سطور ۱۵ ، خط تعلیق ، مکتوبہ ۴ر شعبان المعظم سنہ ۹۲۰ھ۔

عنوانات سرخ روشنائی میں ہیں۔ ابتدائی دس ابیات بعد میں لکھی گئی ہیں۔ نسخے کی ابتدا اس بیت سے ہوتی ہے:-

کوہ را ہم تیغ داد و ہم کمر تا بسرہنگی او افراخت سر

اختتام: شوخی و بی شرمی ما در گذار شوخی ما پیش چشم ما میار

بوستان سعدی:- پبلک لائبریری، نمبر ۲۲۳۴ ، ابعاد ۱۰٫۵×۱۷٫۳ ، (۷٫۵×۱۱٫۲) اوراق ۱۹۲ ، سطور ۱۱۔

عنوان سرخ روشنائی میں لکھے گئے ہیں۔ ابتدائی دو اوراق کے حاشیے طلائی ہیں۔

آغاز: بنام خدائی کہ جان آفرید سخن گفتن اندر زبان آفرید

اختتام: بضاعت نیاوردم الا امید خدایا ز عفوم مکن نا امید

ترقیمہ : تمام شد ... فی تاریخ خمس وخمسین وستمایۃ نقل من خط الکرم روح اللہ روحہ وغفر اللہ لہ ولکاتبہ ولقاریہ سنہ ۶۶۰ھ۔

---

[1] ر۔ دفضر احمد آتش: "قونیہ کے کتب خانوں میں محفوظ بعض اہم مخطوطے، بلیتن جلد ۱۶، شمارہ ۶۱ (انقرہ ۱۹۵۲)

خود مولف کے نسخے سے پانچ سال بعد کا نقل کیا ہوا نسخہ ہے اس لحاظ سے اہم اور نادر ہے۔

دیوان جلال الدین رومی: پبلک لائبریری، نمبر ۹۳۹۰، ابعاد ۲۵x۱۸ (۲۱x۱۳)، اوراق ۴۰۱، سطور ۲۳، عمدہ خوش خط تعلیق۔

یہ نسخہ محمد افندی ابن المرحوم ابی بکر افندی الشہیر تخفیف زادہ کا وقف کیا ہوا ہے۔ پہلے دو ورق مذہب ہیں۔

ابتدا: ای دل چہ اندیشیدۂ در عذر این تقصیر را

اختتام: فتنہ رخ بنمود ازان زاہد را زیور افسرشدہ خلخال پا می

غزلیات: ۱ — ۳۶۸ الف

ترجیعات: (رباعیات در حاشیہ): ۳۶۸ الف — ۳۹۷ الف

رباعیات: ا — ی تک حاشیے میں ترتیب وار: ۳۶۸ الف — ۳۹۱ ب

مزید رباعیات: ۳۹۱ ب — ۳۹۷ الف، معمیات: ۳۹۷ ب — ۴۰۱ الف

ترقیمہ: (ترجیعات کے آخر میں) تم الکتاب ... بید العبد حسن بن سلغر بن حسن ... فی یوم الاحد من شہر جمادی الثانی سنۃ اربع و ثلاثین و ثمان مایۃ الہجریۃ۔

PROF. HELLMUT RITTER نے "دیوان رومی" کے قدیم نسخوں کی فہرست DER ISLAM میں شائع کر دی ہے۔ پروفیسر بدیع الزماں فروزان فر آجکل اس کا تنقیدی اڈیشن ترتیب دے رہے ہیں۔

دیوان خسرو: خواجہ چی اوغلی لائبریری، نمبر ۹۷۸، ابعاد ۲۲x۱۵ (۱۵x۸)، اوراق ۱۹۱، سطور ۱۹، خط تعلیق۔

پہلا ورق مذہب ہے، ورق ۲ (الف) پر "زاویہ نقشبندیہ" کی مہر ہے۔ حاشیوں میں حسن دہلوی کا دیوان لکھا ہے۔ "دیوان خسرو" کی ابتدا اس بیت سے ہوتی ہے:

وقت گلست نوش کن بادۂ چون گلاب را بلبل نغمہ ساز کن بلبلۂ شراب را

اختتام: گفتم کہ مسگوی کفر گفتا چہ کنم زنار شد است رشتۂ ہر اندام

سنہ ۸۲۲ھ کا لکھا ہوا بہت ہی قابل قدر نسخہ ہے۔

مجموعۂ رسائل: پبلک لائبریری، نمبر ۴۱۷۷، ابعاد ۱۸x۱۲ (۱۱x۷)، اوراق ۲۸۱، سطور ۱۹، خط نسخ۔ یہ مجموعہ تین رسائل نقد النصوص، اشعۃ اللمعات، شرح قصیدۂ میمیہ خمریہ فارضیہ پر مشتمل ہے۔

نقد النصوص ورق ۹۳ ب ـــــ ۱۰۴ الف (تاریخ تالیف ۸۶۳ھ)

اشعۃ اللمعات ۱۰۵ ب ـــــ ۲۴۲ الف (تاریخ تالیف ۸۸۶ھ)

شرح قصیدۂ میمیہ ۲۴۲ ـــــ ۲۸۱ ب (تاریخ تالیف ۸۷۵ھ)

ترقیمہ: تمت فی خامس شہر ربیع الآخر سنہ تسعۃ وثمانین وثمانمائۃ علی ید الفقیر احمد بن محمد الحرآبادی (؟)۔

نسخے میں کہیں کہیں "منہ مدظلہ العالی" اور "صح" لکھا ہوا ہے۔ جامی کی وفات (۸۹۸ھ) سے نو سال پہلے ۸۸۹ھ میں لکھے ہوئے اس نسخے کی بڑی اہمیت ہے

دیوان جامی: پبلک لائبریری، نمبر ۲۵۷، ابعاد ۱۳×۲۰ (۸ × ۲)، اوراق ۲۲۸، سطور ۱۷، خط تعلیق، تاریخ کتابت ۹۰۱ھ۔

مثنویات، غزلیات، سب اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ اس نسخے میں جامی کے اپنے دواوین پر لکھے ہوئے مقدمات بھی موجود ہیں۔

یژرمان نے اپنے مرتب کیے ہوئے "دیوان جامی" کے مقدمے میں واضح کیا ہے کہ ان کے پیش نظر دیوان کا تہرانی ایڈیشن رہا ہے۔ انھوں نے اپنے دیوان کو "از نسخہ مزبور از حیث غزل کامل تر" بتایا ہے، لیکن کن نسخوں سے استفادہ کیا ہے اس کی تفصیل نہیں دی ہے اور نہ اختلاف قراءت پیش کیا ہے۔ اس لیے "دیوان جامی" کے تنقیدی و تقابلی ایڈیشن کی آج بھی ضرورت باقی ہے۔ خوش قسمتی سے لینن گراڈ، استنبول اور قونیہ میں جامی کے خود نوشت یا زمانۂ حیات کے لکھے ہوئے نسخے مل جاتے ہیں۔

"دیوان جامی" کا ایک نسخہ مکتوبہ ۸۶۵ھ قونیہ میں ہے۔ شاعر کے زمانۂ حیات کا لکھا ہوا یہ پہلا نسخہ ہے جو اب تک معلوم ہو سکا ہے۔ اس کی وضاحت پروفیسر احمد آتش نے "بیلیتن" کے اس مضمون میں کر دی ہے جس کا ذکر ابھی گذرا۔

●●

کتابخانۂ خدابخش

خدابخش فہرست مخطوطات فارسی مرآۃ العلوم کے تسامحات

ڈاکٹر افتخار احمد مدنی



خدابخش لائبریری کے فارسی مخطوطات کی تین یک سطری بیان کی مختصر فہرستیں "مرآۃ العلوم" کے نام سے یکے بعد دیگرے ۱۹۲۵ء، ۱۹۴۲ء اور ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئیں۔ یہ ہینڈ لسٹ (H L) کہلاتی ہیں۔ ڈاکٹر مدنی باقیماندہ فارسی مخطوطات پر مشتمل چوتھی فہرست بھی تیار کر چکے ہیں لیکن ساتھ ساتھ پچھلی تینوں فہرستوں کے مسامحات پر بھی نظر ڈالی جاتی رہتی ہے اور ان میں جو کمیاں نظر آتی ہیں ان کے سامنے مختصراً اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ اس بار کی قسط میں ہینڈ لسٹ کے ساتھ ساتھ توضیحی فہرست کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔ جرنل کے پچھلے شماروں میں شاہ عطاء الرحمٰن صاحب، محبوب حسین صاحب اور خود مدنی صاحب کی تحریریں اس سلسلے میں چھپ چکی ہیں امید ہے یہ تازہ قسط بھی بہت سی غلطیاں دور کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

ادارہ

تصحیح و اضافہ

خدابخش فہرست مخطوطات فارسی مرآۃ العلوم کے تسامحات

تاریخ و تذکرہ

یہ خدابخش کے فارسی مخطوطات کی ہینڈ لسٹ "مرآۃ العلوم" کے تصحیح و اضافہ کی دوسری قسط ہے جو تاریخ و تذکرہ کے مخطوطات کا احاطہ کرتی ہے۔ تصوف کے مخطوطات کی تصحیح جو جرنل ۵۱-۵۲ میں شائع ہو چکی ہے، میں صرف ہینڈ لسٹ کو ہی سامنے رکھا گیا تھا۔ اب لائبریری کے مخطوطات کی توضیحی فہرست کو بھی، جو ۳۴ جلدوں تک انگریزی میں شائع ہو چکی ہے، سامنے رکھا گیا ہے اور ہینڈ لسٹ کی جن کمیوں کو توضیحی کیٹلاگ میں دور کر دیا گیا ہے ان کی، اور جو نہ کی جا سکی ہیں ان کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ امید ہے یہ اضافے فائدے سے خالی نہ ہوں گے۔

ڈاکٹر افتخار احمد بدنی

جلد اوّل :

تاریخ

HL.2 / No.452 تاریخ بناکتی : نسخہ کے دیباچہ میں اس کا پورا نام "روضۃ لاولی الالباب فی معرفت التواریخ والانساب" ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں اس کا نام "روضۃ اولی الالباب فی تواریخ اکابر والانساب" دیا گیا ہے۔ اور یہی نام خدا بخش لائبریری کے توضیحی کیٹلاگ میں بھی ہے اوراق ۲۹۳ نہ کہ ۲۹۵۔

HL.4 / No.449 تاریخ طبری : اس کا عنوان ترجمہ تاریخ طبری ہوگا کیوں کہ یہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری کی عربی تصنیف "تاریخ الرسل والملوک" کا فارسی ترجمہ ہے۔ اوراق ۲۴۳ نہ کہ ۲۴۵۔

HL.5 / No.450 تاریخ طبری : نام کے سلسلے میں مذکورہ بالا نمبر کے تحت تفصیل موجود ہے اوراق ۲۷۷ نہ کہ ۱۷۵۔

HL.6 / No.453 تاریخ گزیدہ : ناقص الآخر۔

HL.8 / No.470 تحفۃ الکرام : اوراق ۴۹۹ نہ کہ ۴۹۷ توضیحی کیٹلاگ میں ۴۹۸ مذکور ہے۔

HL.9 / No.478 جنات الفردوس : ہینڈ لسٹ میں کاتب کا نام محمد اسمٰعیل ابن حاجی محمد باقر شیرازی مذکور ہے نسخہ اور توضیحی کیٹلاگ میں کاتب کا نام مذکور نہیں۔

HL.10 / No.464 حبیب السیر : کتاب کا پورا نام "حبیب السیر فی اخبار افراد البشر" ہے توضیحی کیٹلاگ میں یہ نام مذکور ہے لیکن ہینڈ لسٹ میں نہیں۔

HL.11 / No.466 حبیب السیر : اوراق ۳۸۲ + ۸ نہ کہ ۳۷۸ نسخہ میں مذکور فہرست ۱۱۴۱ھ میں عبداللہ نے لکھی۔

HL.12 / No.467 حبیب السیر : اوراق ۲۱۰ نہ کہ ۲۰۸۔

HL.14 / No.480 حدیقۃ الصفا : اوراق ۲۵۱ نہ کہ ۲۵۲۔

HL.15 / No.463 خلاصۃ الاخبار : کتاب کا پورا نام "خلاصۃ الاخبار فی بیان الاحوال الاخیار" نسخہ اور توضیحی کیٹلاگ میں بھی مذکور ہے۔

HL.16 / No.456 روضۃ الصفا : کتاب کا پورا نام "روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیا والملوک والخلفا" نسخہ کے دیباچہ میں مذکور ہے توضیحی کیٹلاگ میں بھی پورا نام آگیا ہے۔ اس کے کاتب احمد بن مسعود ہیں تعداد سطور ۲۳-۲۴ نہ کہ ۲۳ نسخہ کے پہلے ورق پر قابلخان خانہ زاد بادشاد عالمگیر اور لطف اللہ خاں بہادر کی مہر کے علاوہ

عبدالحق اور دیگر لوگوں کی تحریریں بھی نہیں۔

HL.19 / No.457 روضۃ الصفا: ۳۴۶+۳ اوراق نہ کہ ۳۴۷۔

HL.20 / No.458 روضۃ الصفا: نسخہ میں مختلف مقامات پر کتب خانہ سید ولایت علی خاں اور خورشید نواب کی مہر ثبت ہے اوراق ۴۳۸ نہ کہ ۴۶۰۔

HL.23 / No.472 صبح صادق: اوراق ۵۳۹ نہ کہ ۵۳۸۔ توضیحی کیٹلاگ میں تعداد اوراق صحیح مذکور ہے

HL.24 / No.473 صبح صادق: اوراق ۵۳۸ نہ کہ ۵۴۳۔ توضیحی کیٹلاگ کے مطابق ۵۴۴ جلد دوم نہ کہ سوم ناقص الاخر۔

HL.26 / No. صبح صادق: یہ صبح صادق کے دو جلدوں کی فہرست ہے جبکہ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت میں یہ تو مذکور ہے کہ یہ فہرست ہے لیکن یہ نہیں کہ یہ صرف دو جلدوں کی فہرست ہے توضیحی کیٹلاگ میں بھی مذکور ہے کہ یہ صبح صادق کے چاروں حصوں کا انڈکس ہے حالانکہ اس کے بعد اس نے ترقیمہ کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں واضح ہے کہ یہ صرف دو جلدوں کی فہرست ہے۔

HL.27 / No.451 طبقات ناصری: ہینڈ لسٹ میں نسخہ میں مذکور مصنف کا پورا نام لکھا جانا چاہیے یعنی ابوعمر عثمان بن محمد المنہاج الجوزجانی نہ کہ منہاج بن سراج نسخہ کے ورق ۳ب، ۴ب، ۱۴ا تا ۶۰ کے حاشیہ پر حسین واعظ کاشفی کی کتاب "روضۃ الشہدا" ہے جس کا ذکر ہینڈ لسٹ میں نہیں توضیحی کیٹلاگ میں مصنف کا پورا نام دیا گیا ہے البتہ حاشیہ کی کتاب کے سلسلے میں یہ مذکور ہے۔

"ON THE MARGINS OF FOLL 3^b 4^b AND 14^a - 60^a SOME CONFUSED ACCOUNTS OF THE BATTLE OF KARBALA ARE GIVEN.'

HL.30 / No.481 مرآۃ آفتاب نما: کتاب کے خاتمہ پر محمد علی مذکور ہے قیاس یہ ہے کہ یہی کاتب ہیں۔

HL.31 / No.477 مرآۃ العالم: نسخہ کے دیباچہ میں اس کے مصنف کا نام بختاور خاں مذکور ہے جبکہ ہینڈ لسٹ میں اسے محمد بقا سہارنپوری کی تصنیف بتایا گیا ہے ایسا کیوں ہے اس کی وضاحت توضیحی کیٹلاگ سے تو ہو جاتی ہے کہ اسے بقا نے بختاور خاں کے لیے لکھا ہینڈ لسٹ میں بھی اس قسم کی وضاحت ہونی چاہیے۔

HL.33 / No.470 نگارستان: اوراق ۲۷۵ نہ کہ ۲۶۵۔

HL.34 / No.482 تاج القصص: مصنف کا نام نسخہ میں ابونصر کنیت احمد بن احمد بخاری مذکور ہے۔ ہینڈ لسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں بھی یہی نام دیا گیا ہے یعنی (احمد بن احمد بن محمد الخش لائبریری میں مصنف کی ایک اور

کتاب "انیس المریدین وروضۃ المحبین" کے نام سے موجود ہے جو تاج القصص کا ہی ایک حصہ ہے۔ قیاس ہے کہ مصنف نے "انیس المریدین وروضۃ المحبین" کو پہلے لکھا اور بعد میں اسے تاج القصص میں شامل کر دیا

اس نسخہ میں مصنف کا نام احمد بن محمد بن نصر بخاری مذکور ہے اور یہی نام صحیح معلوم ہوتا ہے۔

HL.36 / No.484 **ترجمۂ مولود النبی:** اس کا نام "ترجمۂ مولود مصطفےٰ" ہوگا توضیحی کیٹلاگ میں بھی اصل عربی تصنیف کے سلسلے میں وضاحت کے باوجود اس کا نام "ترجمۂ مولود النبی" ہی دیا گیا ہے۔

HL.37 / No.485 **درج الدرر:** کتاب کا پورا نام نسخہ میں "درج الدرر و درج الغرر فی بیان میلاد سید البشر" ہے اوراق ۲۷۲+۸ نہ کہ ۲۷۳ تعداد سطور ۲۳ نہ کہ ۱۰ توضیحی کیٹلاگ میں تعداد سطور صحیح مذکور ہے اور کتاب کا پورا نام بھی دیا گیا ہے۔

HL.39 / No.490 **معارج النبوت:** کتاب کا نام "مدارج نبوت" ہے توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کا نام صحیح مذکور ہے اوراق ۶۳۰+۱ نہ کہ ۶۳۰۔

HL.40 / No.491 **مدینۃ العلم:** کاتب کا نام نسخہ میں اور توضیحی کیٹلاگ میں بھی مذکور نہیں جبکہ ہینڈ لسٹ میں اس کا نام سلطان محمد ولد آغا عبد الکریم درج ہے۔

HL.41 / No.492 **مدینۃ العلم:** اس کے کاتب غلام سعید ہیں۔

HL.42 / No.486 **معارج نبوت:** کتاب کا پورا نام "معارج نبوت فی مدارج الفتوۃ" ہے توضیحی کیٹلاگ میں اس نام کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

HL.43 / No.487 **معارج نبوت:** اوراق ۲۰۴+۷ نہ کہ ۲۲۴۔

HL.45 / No.496 **روضۃ الاحباب:** کتاب کا پورا نام "روضۃ الاحباب فی سیر النبی والآل والاصحاب" ہے مصنف کے نام میں بھی الملقب بجمال حسینی کا اضافہ کر دیا جائے تو بہتر ہوگا توضیحی کیٹلاگ میں کتاب اور اس کے مصنف کے سلسلے میں تفصیل دیدی گئی ہے۔

HL.46 / No.497 **روضۃ الاحباب:** اوراق ۳۵۷+۷ نہ کہ ۳۵۳۔

HL.47 / No.493 **فتوح ابن اعثم:** اس کا عنوان "ترجمہ فتوح ابن اعثم" ہوگا کیونکہ یہ کتاب ابن اعثم کی عربی تصنیف "فتوح" کا ترجمہ ہے۔

HL.49 / No.495 **مناقب مرتضوی:** اس کے کاتب سید محمد ضیا ولد سید محمد اشرف حسینی ہیں اوراق ۳۵۴ نہ کہ ۳۵۵۔

HL.52 / No.509 **ترجمہ کشف الغمہ:** یہ کتاب "ترجمۃ المناقب" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے اور اس کے مصنف کا پورا نام ابوالحسن علی بن حسن زواری اصفہانی ہے لائبریری کے توضیحی کیٹلاگ میں مذکورہ باتوں کی تفصیل موجود ہے۔

HL.54 / No.501 **حیات القلوب:** یہ جلد اوّل ہی ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت میں "غالباً جلد اوّل" لکھا گیا ہے اس کے کاتب عبد الکافی بن محمد باقر خنابادی ہیں ہینڈ لسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں کاتب کا نام صرف ابن باقر خنابادی مذکور ہے۔

HL.55 / No.498 **روضۃ الشہدا:** اس کے کاتب خواجگی المنشی ہیں اور یہ نہ صرف اہل بیت کے حالات پر ہے بلکہ اس میں بعض انبیاؑ اور خود حضور صلعم کے حالات بھی درج ہیں اس کے مصنف کا پورا نام کمال الدین حسین کاشفی ہے توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کے مندرجات اور مصنف کے نام کے سلسلے میں تفصیل موجود ہے۔

HL.56 / No.499 **روضۃ الشہدا:** اوراق ۳۰۸ نہ کہ ۳۴۸ روضۃ الشہدا کے خاتمہ کے بعد ایک دوسری کتاب "روایات مصائب سید شہدا" بھی ہے یہ ۳۲ اوراق پر ناقص الآخر ہے اس کے علاوہ دو ورق پر حضرت علی کے بارے میں بتایا گیا ہے اور آخری دو ورق پر قصیدہ انوری ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں ۳۴۷ اوراق مذکور ہے کتاب کے مندرجات کی تفصیل بھی موجود ہے۔ لیکن اس میں قصیدہ انوری کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

HL.57 / No.503 **ریاض الشہادۃ:** کتاب کا پورا نام "ریاض الشہادۃ فی ذکر مصائب السادۃ" ہے اور یہ کتاب کا جلد دوم ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

HL.58 / No.508 **غایۃ الہم فی ذکر الصحابۃ والائمہ:** اوراق ۴۴۵ نہ کہ ۴۵۶ نیز اس میں ایک دوسرا رسالہ "البشارۃ فی احادیث الاشارہ" مصنف محمد علیم یحیائی الہ آبادی بھی ہے جو ۹ اوراق پر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب مصنف کے پاس رہی ہے اس رسالے کے خاتمہ کے بعد ایک ورق پر مصنف نے اپنے قلم سے اوراد لکھے ہیں اور اوراد کے خاتمہ پر اپنا نام بھی ان کی تفصیلات توضیحی کیٹلاگ میں موجود ہیں۔

Hl.62 / No.510 **تاریخ وصاف:** کتاب کا اصل نام بھی جو "تجزیۃ الامصار وتزجیۃ الاعصار" ہے کیفیت کے خانے کے بجائے نام کے خانے میں دیا جانا چاہیے۔

HL.64 / No.512 **ظفرنامہ:** تعداد سطور ۱۹ نہ کہ ۱۲ نسخہ کے آخری ۲۰ اوراق پر ۱۲ سطریں ہیں۔

HL.65 / No.513 **مطلع السعدین:** کتاب کا پورا نام "مطلع السعدین ومجمع بحرین" ہے۔

HL.67 / No.515 **ملفوظات تیمور:** یہ کتاب "توزک تیموری" ہے۔

HL.68 / No.516 **ملفوظات تیمور:** یہ توزک تیموری ہے اور اس میں صرف سات سطریں کم ہیں نسخہ کے آخر میں کاتب نے لکھا ہے کہ جس نسخہ سے یہ نقل کیا گیا ہے اس کے خراب ہونے کی وجہ سے اس حصہ کو نقل نہ کیا جا سکا ہینڈلسٹ میں ناقص الآخر لکھنے کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کر دی جاتی تو اچھا ہوتا۔

HL.69 / No.517 **کتاب المعجم فی آثار ملوک العجم:** یہ ناقص الاول ہے توضیحی کیٹلاگ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

HL.71 / No.523 **تاریخ طاہر وحید:** کتاب کے نام کا اس کے دیباچہ میں ذکر نہیں کیا گیا ہے البتہ کتاب کے پہلے ورق پر

"ریاض التواریخ طاہر وحید" مذکور ہے جو کاتب کا ہی لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

HL.71 / No.520 تاریخ عالم آرای عباسی: نسخہ میں درمیان کے دو اوراق سادہ اور غیر ضروری ہیں اس لیے اسے گنتی میں شامل نہیں کیا جائے گا اور اس طرح کتاب کے ۲۶۴ اوراق ہی ہوں گے نہ کہ ۲۶۶۔

HL.75 / No.522 تاریخ عالم آرای عباسی: ۳۶۴ اوراق نہ کہ ۳۵۳

HL.76 / No.524 تاریخ جہانگشای: سنہ کتابت ۱۲۲۱ نہ کہ ۱۲۳۰ خط شکستہ نہ کہ نستعلیق خط شکستہ ہونے کا ذکر توضیحی کیٹلاگ میں بھی موجود ہے۔

HL.77 / No.525 تاریخ ترندیہ: کتاب کا یہ نام نسخہ میں نہیں دیا گیا ہے اس کے ابتدائی ۸ اوراق کا خط نستعلیق ہے اور اس کے بعد کے اوراق شکستہ خط میں ہیں۔

HL.79 / No.526 تاریخ محمدی: مصنف کے نام کی ترتیب اسی طرح ہونی چاہیے محمد فتح اللہ ابن محمد تقی الساروی ہینڈ لسٹ میں ابن محمد تقی الساروی محمد فتح اللہ ہے اور توضیحی کیٹلاگ میں ابن محمد تقی الساروی محمد مذکور ہے۔

HL.80 / No.530 مآثر سلطانیہ: مصنف کے نام کی ترتیب عبدالرزاق ابن نجف قلی ہوگی نہ کہ ابن نجف قلی عبدالرزاق۔

HL.81 / No.531 امیر نامہ: مصنف کا نام بساون لعل متخلص شادان بن نین سکھ رائے ہوگا نہ کہ نسکہ رائے کیٹلاگ میں نسکھ رامی مذکور ہے اسکے کاتب عصا اللہ نو مسلم (عطا اللہ) ہیں اور سنہ کتابت ۱۲۵۰ھ۔

HL.82 / No.529 تاریخ خانجہان و مخزن افغانی: اوراق ۵۵۲ نہ کہ ۵۵۴ اسکے کاتب دو بیچند (دو بے چند) ہیں نہ کہ دو بچند۔

HL.84 / No.532 ہشت بہشت: کتاب کا ایک دوسرا عربی نام بھی ہے یعنی "الصفات الثمانیہ فی اخبار القیاصرۃ العثمانیہ"۔

HL.85 / No.533 ہشت بہشت: اوراق ۱۸۲ نہ کہ ۱۸۱۔

HL.86 / No.534 ہشت بہشت: اوراق ۳۱۸ نہ کہ ۲۱۷۔

HL.87 / No.544 بحر المواج: اوراق ۳۳۲+۴ نہ کہ ۳۳۶۔

HL.88 / No.545 بحر المواج: اوراق ۱۲۸+۳ نہ کہ ۱۲۸۔

HL.90 / No.538 تاریخ فرشتہ: کتاب کا اصل نام "گلشن ابراہیمی" ہے۔

HL.91 / No.539 تاریخ فرشتہ: اوراق ۴۱۲ نہ کہ ۴۱۰۔

HL.92 / No.542 چہار گلشن: اس کے مرتب چندر بھان برہمن ہیں۔ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مرتب کے نام کا ذکر بھی ضروری ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں مرتب کا ذکر کیا گیا ہے۔

HL.93 / No.543 **حقیقتہای ہندستان**: اوراق ٢٨٩ نہ کہ ٢٨٧ تعداد سطور ١٢-١٤ نہ کہ ١٢۔

HL.94 / No.540 **خلاصۃ التواریخ**: تعداد سطور ١٧-١٨ نہ کہ ١٧۔

HL.95 / No.535 **طبقات اکبری**: اس کتاب کا نام دیباچہ میں "طبقات اکبرشاہی" مذکور ہے البتہ یہ "طبقات اکبری" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں یہ بات کہی گئی ہے البتہ عنوان "طبقات اکبری" کا دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ "طبقات اکبرشاہی" اور "تاریخ نظامی" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔
اس کے کاتب محمد بخش ہیں اور سنہ کتابت ١٢٨٠ھ۔ اوراق ٥٢٩د + ٥ نہ کہ ٥٢٩۔

HL.100 / No.548 **تاریخ داؤدی**: اوراق ٢٢٤ نہ کہ ٢٢٣۔

HL.102 / No.550 **تذکرۃ الواقعات**: اس کے کاتب سید فرزند احمد صفی (صفیر) بلگرامی ہیں توضیحی کیٹلاگ میں کاتب کا نام موجود ہے۔

HL.105 / No.554 **آئین اکبری**: اوراق ٥٩٠د + ٥ نہ کہ ٥٩٠ تعداد سطور ١٩-٢١ نہ کہ ١٩-٢٠۔

HL.109 / No.559 **اقبال نامہ جہانگیری**: ناقص الاول توضیحی کیٹلاگ میں بھی وضاحت نہیں کی گئی ہے صرف SLIGHTLY DEFECTIVE مذکور ہے۔

HL.111 / No.561 **اقبال نامۂ جہانگیری**: اوراق ٣٢١ نہ کہ ٢٩٠۔

HL.113 / No.557 **جہانگیرنامہ**: بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنہ کتابت ١٠٢١ھ ہے نہ کہ ١٠٢٠ھ۔

HL.121 / No.570 **عمل صالح**: اوراق ٧٧٣ نہ کہ ٧٦٣ توضیحی کیٹلاگ میں صحیح تعداد ٧٧٣ مذکور ہے ناقص الآخر۔

HL.123 / No.568 **ملخص**: نسخہ میں مصنف کا نام اس طرح مذکور ہے محمد طاہر متخلص بہ آشنا المخاطب بہ عنایت خاں بن مظفر خاں بن خواجہ ابوالحسن ہینڈ لسٹ میں نام عنایت خاں سے شروع کیا گیا ہے توضیحی کیٹلاگ میں پورا نام مذکور ہے۔

HL.124 / No.572 **تاریخ شجاعی**: نسخہ میں مصنف کا نام محمد معصوم بن حسن بن صالح مذکور ہے۔ ہینڈ لسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں محمد معصوم بن حسن صالح۔

HL.127 / No.573 **فتحیہ عبریہ**: مصنف کا نام نسخہ میں اس طرح ہے ابن محمد ولی احمد الملقب شہاب الدین طالش اس کی ترتیب اس طرح ہو سکتی ہے۔ احمد الملقب بہ شہاب الدین طالش بن محمد ولی یا شہاب الدین احمد تالش بن محمد ولی۔

HL.128 / No.574 **فتحیہ عبریہ**: اوراق ٩٥ نہ کہ ٩٤۔

HL.129 / No.575 **فتحیہ عبریہ**: اوراق ١١٤ نہ کہ ١١٣ توضیحی کیٹلاگ میں ٢٢٦ مذکور ہے۔ نسخہ میں مختلف مقامات پر خورشید نواب اور کتب خانہ سید ولایت علی خاں کی مہریں بھی ہیں۔

HL.131 / No.579 **تاریخ ارادت خانی**: مصنف کے نام میں المخاطب بہ ارادت خاں کا اضافہ کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

توضیحی کیٹلاگ میں تفصیل موجود ہے۔ کتاب کا نام توضیحی کیٹلاگ میں تاریخ ارادت خاں مذکور ہے اور یہی صحیح ہے نہ کہ تاریخ ارادت خانی۔

HL.133 / No.581 تاریخ عالی: کتاب کا پورا نام "تاریخ عالی فی سلک اللآلی" ہے۔ اوراق ۲۳۷+۲ نہ کہ ۲۴۴ ؟ کتاب کا پورا نام توضیحی کیٹلاگ میں درج کر دیا گیا ہے۔

HL.134 / No.580 تاریخ محمد شاہ: کاتب نے ترقیمہ میں کتاب کا نام "تاریخ چغتائی لکھا ہے۔ جبکہ کسی نے پہلے ورق پر "وقائع سلطنت محمد شاہ" لکھ دیا ہے۔

HL.135 / No.582 سیرۃ المتاخرین: ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ "مشہور است کہ این نسخہ از قلم مصنف علیہ الرحمۃ است اما این بپایہ ثبوت نرسیدہ" لیکن یہ نسخہ مصنف کے قلم کا نہیں ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو ۹۵-۱۱۹۴ھ کے درمیان لکھا اور مصنف کی وفات ۱۲۰۸ھ میں ہوئی جبکہ اس نسخہ پر سنہ کتابت ۱۲۳۰ھ مذکور ہے۔

HL.139 / No.588 عبرت نامہ: تعداد سطور ۱۳-۱۲ نہ کہ ۱۳ توضیحی کیٹلاگ میں تعداد سطور صحیح مذکور ہے۔ سنہ کتابت ۱۸۸۷ء نہ کہ ۱۸۷۸ء۔

HL.140 / No.589 عبرت نامہ: اوراق ۲۸۵ نہ کہ ۲۸۱۔

HL.141 / No.585 ملخص التواریخ: اوراق ۲۲۲ نہ کہ ۲۲۱۔

HL.143 / No.593 تاریخ مظفری: اوراق ۵۱۶+۷ سات اوراق پر تتمہ تاریخ مظفری اور تصحیح نامہ ہے نہ کہ ۴۹۲ ورق ۴۹۲ اور اسکے بعد کے کاتب فیض الحق امرتسری ہیں جنھوں نے یہ حصہ مسٹر قاسم حسن صاحب بہادر سکریٹری خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے حکم سے ۱۳۶۲ھ میں لکھا۔ اس لیے اب یہ کتاب ناقص الآخر جیسا کہ ہینڈ لسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں لکھا گیا ہے، نہیں رہی۔

HL.144 / No.591 تذکرہ سلاطین چغتا: تعداد سطور ۲۱-۲۳ نہ کہ ۲۱۔

HL.146 / No.595 جام جم: اس کے کاتب سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ہیں اور سنہ کتابت ۱۲۷۶ھ توضیحی کیٹلاگ میں ۱۲۶۶ھ مذکور ہے۔

HL.147 / No.594 خلاصۃ التواریخ: اوراق ۲۲۶ نہ کہ ۲۲۷۔

HL.148 / No.592 منتخب اللباب: مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے "محمد ہاشم مخاطب ہاشم علی خاں کہ آخر مخاطب خافیخان نظام الملکی" ہینڈ لسٹ میں محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں مذکور ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں پورے نام کی وضاحت موجود ہے البتہ خافی خاں کو خوافی خان لکھا گیا ہے۔

HL.149 / No.598 **بیگ لارنامہ:** نسخہ میں اس کے مصنف کا نام موجود نہیں اور نہ ہی ہینڈلسٹ اور توضیحی کیٹلاگ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ فہرست مشترک میں اس کے مصنف کا نام ادراکی بیگلاری دیا گیا ہے اوراق ۱۳۳ نہ کہ ۱۲۲ اسکے کاتب شیخ راجی محمد ہیں نہ کہ محمد خلیل اور سنہ کتابت ۱۲۷۲ھ ہے نہ کہ ۱۲۳۳ھ۔

HL.150 / No.599 **تاریخ سند:** یہ کتاب تاریخ معصومی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ مصنف کا تخلص نامی ہے اس نے کتاب کے دیباچہ میں اپنا نام اس طرح لکھا ہے "محمد معصوم المتخلص نامی" اس لیے ہینڈلسٹ میں بھی نام کے ساتھ اس کے تخلص کا اضافہ مناسب ہوگا توضیحی کیٹلاگ میں یہ موجود ہے۔

HL.151 / No.597 **چچ نامہ:** اس کے مصنف علی بن حامد بن ابی بکر کوفی ہیں نہ کہ علی بن ابی بکر فی توضیحی کیٹلاگ میں صحیح نام مذکور ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ تلخیص چچ نامہ ہے جس کے ملخص محمد خلیل ولد مرحوم قاضی محمد ہیں جنہوں نے مراد علی خاں کے حکم سے یہ تلخیص ۱۲۲۲ھ میں کی نہ کہ چچ نامہ۔ اوراق ۱۰۷ نہ کہ ۱۰۶۔

HL.152 / No.600 **تاریخ طاہر وحید:** اس کے کاتب راجے محمد ولد شیخ میراں ہیں نہ کہ محمد خلیل ولد مرحوم قاضی محمد اور سنہ کتابت ۱۲۷۲ھ ہے نہ کہ ۱۲۲۳ھ محمد خلیل اس نسخہ کے کاتب ہیں جس سے راجے محمد نے نقل کیا ہے۔ کتاب کا نام ہینڈلسٹ میں "تاریخ طاہر وحید" مذکور ہے جبکہ نسخہ کے ترقیمہ میں "تاریخ طاہری" اس کا نام "تاریخ طاہری" ہی ہوگا توضیحی کیٹلاگ میں بھی یہی مذکور ہے۔

HL.153 / No.601 **واقعات کشمیر:** یہ کتاب "تاریخ اعظمی" کے نام سے بھی مشہور ہے اس لیے کتاب کے نام کے بعد المعروف بہ "تاریخ اعظمی" کا اضافہ مناسب ہوگا۔

HL.154 / No.602 **تاریخ بھرت پور:** اوراق ۴ نہ کہ ۲-۶ تعداد سطور ۱۲-۱۵ نہ کہ ۱۲-۱۸ صرف آخری ورق پر پہلی طرف ۱۶ اور دوسری طرف ۱۸ سطریں ہیں۔ یہ وقائع ہے مصنف نے بھی اس کے لیے وقائع کا لفظ ہی استعمال کیا ہے اس لیے اسے "تاریخ بھرت پور" کے بجائے "وقائع بھرت پور" کا نام دیا جانا چاہیے۔ تعداد اوراق توضیحی کیٹلاگ میں صحیح مذکور ہے۔

HL.155 / No.603 **گل رحمت:** یہ کتاب محمد مستجاب خاں کی تصنیف "گلستان رحمت" سے انتخاب ہے ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانے میں یہ اضافہ ضروری ہے توضیحی کیٹلاگ میں موجود ہے۔

HL.156 / No.605 **تاریخ محتشم:** یہ کتاب دو طبقوں میں ہے اور یہ طبقہ اول ہے ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانہ میں یہ درج ہونا چاہیے توضیحی کیٹلاگ میں موجود ہے۔ سنہ کتابت ۱۲۷۱ نہ کہ ۱۲۱۷۔

HL.159 / No.608 **تاریخ بنارس**: اوراق ۲۱۸ تا ۲۲۰۔ ناقص الآخر۔ نسخہ کے ابتدائی دو اوراق پر مصنف کے نواسے سبحان علی ابن حسن علی خاں کا لکھا ہوا تعارف ہے کتاب کا نام "تاریخ بنارس" نسخہ میں کہیں بھی مذکور نہیں یہ نام فہرست نگار کا دیا ہوا معلوم ہوتا ہے توضیحی کیٹلاگ میں بھی کتاب کا نام نہیں دیا گیا ہے اس کتاب میں بنارس کے راجاؤں/زمینداروں کے حالات میں اس لیے اسے "تاریخ راجگان و زمینداران بنارس" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

HL.160 / No.607 **تحفۂ تازہ**: یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور یہ کتاب کی پہلی جلد ہے توضیحی کیٹلاگ میں اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اوراق ۱۵۸ تا ۱۵۷۔

HL.161 / No.609 **مظفر نامہ**: تعداد سطور ۱۴۔ ۱۵ تا ۱۴۔

HL.164 / No.612 **بساطین السلاطین**: اس کے کاتب میر حیدر علی ہیں مصنف کے نام محمد ابراہیم البریزی ہیں المعروف بہ صاحب حضرت کا اضافہ مناسب ہوگا ترقیمہ میں بھی مصنف کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے توضیحی کیٹلاگ میں نام کے ساتھ صاحب حضرت بھی مذکور ہے۔

HL.165 / No.613 **تاریخِ محمد قطب شاہ**: کتاب کا نام اس کے دیباچہ میں "تاریخ سلطان محمد قطب شاہی" مذکور ہے توضیحی کیٹلاگ میں بھی یہ نام دیا گیا ہے۔

HL.171 / No.619 **تاریخ حمید خاں**: کتاب کا یہ نام نسخہ میں کہیں بھی مذکور نہیں البتہ یہ حمید خاں کا لکھا ہوا وقائع ہے۔

HL.174 / No.620 **روزنامچۂ شاہ عالم**: ناقص الآخر۔

جلد دوم

HL.1742 / No.1744 **تاریخ طبری**: اس کا عنوان ترجمہ تاریخ طبری ہوگا۔

HL.1745 / No.1752 **جام جہاں نما**: ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے کہ یہ کتاب مصنف کی اپنی تحریر میں ہے۔ لیکن ترقیمہ کی عبارت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی دوسرے شخص کی تحریر کردہ ہے ترقیمہ کی عبارت یہ ہے "کتاب مسمیٰ بجام جہاں نما من تصنیف افضل المتاخرین محمد مظفر حسین"۔ نسخہ کے پہلے ورق پر ظفر علی خاں کی مہر ہے ظفر علی خاں مصنف کا پوتا ہے

HL.1755 / No.1756 **ہدیۃ الشائقین**: ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ یہ کتاب خلفای راشدین کے حالات پر مشتمل ہے جبکہ ایسا نہیں ہے اس میں مناقب یا فضائل خلفای راشدین ہیں اس لیے اسے تاریخ

کی کتابوں میں رکھنا مناسب نہیں بلکہ تذکرہ میں رکھا جاسکتا ہے۔

HL.1758 / No.1759 **مجالس الائمہ** : اس کا سنہ کتابت ۱۲۶۷ھ ہے نہ کہ ۱۲۶۸ھ مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں اسکا نام کہیں "مجالس الائمہ علیہم الصلوٰۃ والسلام" لکھا ہے اور کہیں "مجلس الائمہ" اوراق ۱۹۴ نہ کہ ۱۹۳ ۔

HL.1761 / No.1762 **خلاصۃ التواریخ** : نسخہ میں کہیں بھی مصنف کا نام مذکور نہیں مرتب ہینڈلسٹ نے مصنف کا نام سبحان رائے لکھا ہے جبکہ کیٹلاگ جلد ۲ میں مختلف حوالوں سے تین نام دیے گئے ہیں اور ان میں سُجان کو صحیح مانا گیا ہے فہرست مشترک میں مصنف کا پورا نام سُجان رای سنگھ بتالوی مذکور ہے

HL.1765 / No.1766 **اقبالنامۂ جہاں گیری** : مذکورہ نمبر کے تحت جلد سوم ہے نہ کہ دوم توضیحی کیٹلاگ جلد ا (S) میں بھی جلد سوم مذکور ہے اوراق ۲۹۲ ہیں نہ کہ ۲۹۱۔

HL.17[illegible]7 / NO.1769 **(مقدمہ) سیر المتاخرین** : یہ صرف مقدمہ نہیں بلکہ سیر المتاخرین کا جلد اول بھی ہے ۔

HL.1774 / No.1775 **نشان حیدری** : اس نسخہ کے کاتب غلام نبی نہیں بلکہ میر سرفراز علی خلف میر غلام علی خاں ہیں غلام نبی اس نسخہ کے کاتب ہیں جس نسخہ سے سرفراز علی نے نقل کیا ہینڈلسٹ و توضیحی کیٹلاگ میں مذکور سنہ کتابت بھی غلام نبی والے نسخہ کی ہے سرفراز علی نے سنہ کتابت نہیں دی ہے اوراق ۲۰۲ نہ کہ ۱۹۷۔

HL.1754 / No.203 **شواہد نبوت** : کتاب کا پورا نام دیباچہ میں یہ مذکور ہے "شواہد نبوت لتقویت یقین اہل فتوت" توضیحی کیٹلاگ میں اس نمبر کے تحت کتاب کا پورا نام مذکور نہیں البتہ وہاں توضیحی کیٹلاگ نمبر ۱۸۰ کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن توضیحی کیٹلاگ نمبر ۱۸۰ پر اس نام کا کوئی رسالہ نہیں البتہ نمبر ۱۸۱ کے تحت چوتھے نمبر پر یہ رسالہ ہے اور یہاں رسالے کا پورا نام مذکور ہے ۔

HL.1757 / No.1758 **جلاء العیون** : اوراق ۴۵۴ نہ کہ ۴۵۱ تعداد سطور ۲۱ نہ کہ ۲۵۔

HL.1759 / No.1760 **قصۂ ابومسلم** : اوراق ۱۹۱ نہ کہ ۱۹۰ -

HL.1764 / No.1765 **اقبال نامۂ جہان گیری** : اوراق ۲۰۲ نہ کہ ۲۰۴ -

HL.1766 / No.1767 **مآثر عالمگیری** : اوراق ۱۳۲ نہ کہ ۱۵۵ -

HL.1768 / No.1770 **سیر المتاخرین** : اوراق ۴۸۸ نہ کہ ۴۸۷ اس نسخہ میں صرف جلد اول و دوم ہے ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانے میں اس کا ذکر ہونا چاہیے ناقص الآخر توضیحی کیٹلاگ میں جلد اول و دوم ہونے کا ذکر کر دیا گیا ہے ۔

HL.1770 / No.1772 **تاریخ تیموریان** : نسخہ میں کہیں بھی کتاب کا نام مذکور نہیں ہینڈلسٹ و توضیحی کیٹلاگ میں جو نام دیا گیا ہے

اس کے آخر میں اگر ہند کا اضافہ کر دیا جائے تو مناسب ہوگا یعنی "تاریخ تیموریان ہند"۔

HL.1775 / No.1776 وقائع مہابت جنگ: ہینڈ لسٹ میں توضیحی کیٹلاگ کی طرح کیفیت کے خانے میں اگر درج ذیل عبارت کا اضافہ کر دیا جائے تو مناسب ہوگا "کہ از عدد ہر فقرہ او سال حال بر می آید"۔

HL.1756 / No.1757 روضۃ الشہدا: مصنف کا نام ہینڈ لسٹ میں حسین بن علی کاشفی مذکور ہے مناسب ہوگا اگر حسین کا پورا نام یعنی کمال الدین حسین لکھا جائے۔

جلد سوم:

HL.263 بہجۃ التواریخ: ناقص الآخر مصنف کا نام شہاب الدین احمد ہو سکتا ہے۔

HL.2772 تاریخ ایران: نسخہ میں سنہ کتابت ۱۱۴۰ھ مذکور ہے جو بعد کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے خود مصنف نے کتاب میں ۱۱۵۴ھ تک کے حالات بیان کیے ہیں ہینڈ لسٹ میں بھی سن کتابت ۱۱۴۰ھ مذکور ہے۔

HL.2817 تاریخ خانجہانی مخزن افغانی: کتاب کے نام میں خانجہانی کے بعد اور مخزن افغانی سے قبل "و" کا اضافہ کیا جائے اس کے مصنف نعمت اللہ سامانی بن حبیب اللہ ہروی ہیں اوراق ۳۲۲ تا ۳۱۹۔

HL.3790 تاریخ رشید: اس کے مصنف مرزا محمد حیدر دوغلت گورگانی بن محمد حسین ہیں۔ ۹۵۲ھ سنہ تصنیف ہے اگر یہ سنہ کتابت بھی مان لیا جائے تو یقیناً یہ بہت اہم اور مصنف کی خود نوشت تحریر ہو سکتی ہے۔

HL.2816 تاریخ طبری: "یہ ترجمہ تاریخ طبری" ہے ناقص الآخر و کرم خوردہ اوراق ۳۵۱ تا ۳۵۰۔

HL.3854 تاریخ عالم آرای عباسی: کتاب کے نام میں لفظ تاریخ کا اضافہ غیر ضروری ہے یہ کتاب تین جلدوں میں ہے مذکورہ نسخہ صرف جلد دوم ہے اوراق ۲۸۶ تا ۲۳۸۔

HL.3092 تاریخ عرب قدیم مع سیرت عنترہ بن شداد: ناقص الاول اوراق ۱۶۶ تا ۱۶۸۔

HL.4028 تاریخ مجمل مفصل: اوراق ۱۴۵ تا ۱۴۶ اس کے کاتب درج ذیل شعر کے مطابق عنایت ہو سکتے ہیں

نوشتہ بماند بخط غریب　　نصر من اللہ فتح قریب
ای عنایت تو دست کن کوتاہ　　مژدہ یابی ز رحمت اللہ

HL.3322 تاریخ وصاف: کتاب کا نام اس کے دیباچہ میں "تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار" درج ہے اوراق ۲۸۰ تا ۲۸۷ یہ تاریخ پانچ جلدوں میں ہے جبکہ مذکورہ نسخہ جلد اول و دوم ہے۔

HL.2525 تزک تیمور: یہ توزک تیموری ہے اوراق ۲۳۸ تا ۲۲۷ قدرے کرم خوردہ۔

HL.2565 **حبیب السیر:** کتاب کا پورا نام "حبیب السیر فی اخبار افراد البشر" ہے یہ نسخہ جلد دوم کے جزو دوم تک
رہی ہے، مکمل نہیں اوراق ۴۱۹ تا ۴۲۸ کرم خوردہ ہینڈ لسٹ میں کاتب کے خانہ میں سید اسمٰعیل
درج ہے جو غلط ہے کاتب کا نام نسخہ میں جو لکھا تھا قیاس یہ ہے کہ اسے مٹا کر اس کی جگہ سید اسمٰعیل
نے اپنی حق ملکیت کا ذکر کیا ہے نسخہ کے آخری ورق پر سید اسمٰعیل علی خاں کی مہر بھی ثبت ہے۔

HL.3289 **حملۂ سکندری:** مصنف کے نام کے آخر میں عظیم آبادی کا اضافہ مناسب ہوگا "حملۂ سکندری"
دراصل نظامی گنجوی کے "سکندر نامہ" کا ترجمہ ہے جو ۱۲۸۰ھ میں کیا گیا۔

HL.2796 **روضۃ الصفا:** کتاب کا پورا نام "روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفا" ہے مصنف کا
پورا نام سید محمد بن برہان الدین خاوند شاہ بن کمال الدین محمود معروف بہ میر خواند ہے۔ اوراق
۲۲۷ تا ۶۱۹ ابتدائی اور آخری ورق بعد کے لکھے ہوئے ہیں یہ کتاب سات جلدوں میں
ہے جبکہ زیر نظر نسخہ صرف جلد اول ہے۔

HL.3639 **روضۃ الصفا:** کتاب اور مصنف کے نام کے لیے ہینڈ لسٹ نمبر ۲۷۹۶ دیکھیں اس کے کاتب شاہ محمد
بخاری ہیں کرم خوردہ اوراق ۲۲۴ تا ۲۳۱۔

HL 3769 **سارستان چہار چمن:** اوراق ۶۵۸ تا ۵۵۸ اس میں ورق کے ایک طرف ہی تحریر ہے۔
دوسرا حصہ سادہ ہے تعداد سطور ۱۵-۲۵ تا ۱۵-۱۶۔

HL.4087 **کتاب (مجہول الاسم)** مصنف کا نام نسخہ کے ورق ۵ ب پر محمد جلیل مذکور ہے اور کتاب کا نام ورق ۲۳
الف پر آئین امیر الامراء... مذکور ہے یہ کتاب امیر الامرا بہادر فیروز جنگ کے حالات پر ہے تعداد سطور ۱۲-۱۴ تا ۱۲

HL.3778 **مرآۃ العالم:** ناقص الاول تا ناقص الطرفین یہ مرآۃ العالم کے نمائش پنجم اور اس کے بعد کے حصے ہیں۔ اس
سے پہلے کا حصہ نہیں نیز یہ کتاب آرائش نہم تک ہے فہرست مشترک میں احمد منزوی نے لکھا ہے کہ
یہ کتاب سات آرائش میں ہے آٹھویں اور نویں آرائش درج ذیل ہے۔

آرائش ہشتم: "درذکر طایفہ از وزرای ازمنہ سابقہ وعہد سعادت مہد پادشاہ دین پرور و علمای عہد
کرامت مہر خدیو عدالت گستر محتوی بر دو پیرائش"۔

آرائش نہم: "درذکر مخترع صنعت کتابت واحوال طایفہ خوش نویساں و برخی از بدائع و غرائب
جہاں مشتمل بر دو پیرائش" نیز ساتویں آرائش کے لیے احمد منزوی نے لکھا ہے کہ یہ تین پیرائش ہیں

ہے جبکہ مذکورہ نسخہ میں یہ پانچ پیرائش میں ہے۔

HL.34 مہدی نامہ: اوراق ۱۸۴ نہ کہ ۱۸۵۔

HL.25 نگارستان: اوراق ۱۹۰ نہ کہ ۱۷۸۔

HL.3/3 ہیئت الافلاک: ایک ورق نہ کہ ۲ ناقص الآخر۔

HL.4 ترجمۃ الاسرار: اس کے مصنف کا نام کمال اللہ ابن محمد بہ صدیقی ہے نہ کہ کمال الدین اوراق ۲۶۴ نہ کہ ۲۶۱۔ قدرے کرم خوردہ۔

حیات القلوب: کاتب کا نام مرزا محمد رضا ولد مرزا فضل علی ہے نہ کہ افضل علی اوراق ۲۷۴ نہ کہ ۲۷۵۔

HL درج الدرر الغرفی بیان میلاد سید البشر: کرم خوردہ۔ ہینڈ لسٹ میں ہینڈ لسٹ نمبر ۳۰۹ کے تحت جلد اوّل اور ہینڈ لسٹ نمبر ۳۰۹ کے تحت جلد دوم مذکور ہے درحقیقت کتاب کی ضخامت کی وجہ سے لائبریری نے اسے دو جلدوں میں مجلد کر دیا ہے۔ ہینڈ لسٹ میں تعداد اوراق دونوں نمبروں کے لیے تقریباً دو سو (۲۰۰) مذکور ہے جبکہ جلد اوّل میں ۱۶۶ اور جلد دوم میں ۱۶۹ اوراق ہیں اس طرح کتاب کے کل اوراق ۳۳۵ ہوتے ہیں۔

رسالہ علی شیر شیرازی یعنی مناقب محمدی: رسالہ کا نام "شمس مناقب محمدی" ہے اور یہ سیدنا محمد ابن سید درویش ابو محمد شمس الدین قادری جیلانی کے حالات پر مشتمل ہے تعداد سطور ۱۱-۱۸ نہ کہ ۱۴۔

HL.2 روضۃ الاحباب: مصنف کے نام کے آگے الملقب بہ جمال الحسینی کا اضافہ سمجھا جائے کرم خوردہ اوراق ۱۹۷ نہ کہ ۱۹۶۔

HL.2 مطلع الانوار فی سیرۃ النبی المختار: کتاب کا نام "مطلع الانوار فی ترجمۃ الآثار" ہوگا۔ سنہ کتابت ۱۲۳۸ فصلی ہے نہ کہ ۱۲۲۸ اوراق ۱۵۹ نہ کہ ۱۶۰۔

HL.2 مطلع الانوار فی ترجمۃ الآثار: اس کے مصنف عفیف نور کاشانی ہیں۔

HL.2 معارج النبوۃ: یہ کتاب "قصص موسیٰ" ہے جو "اعجاز موسوی" کے نام سے بھی جانی جاتی ہے اور یہ کتاب تفسیر کے موضوع پر ہے نہ کہ تاریخ۔ اس کے کاتب عبدالرحمٰن شکارپوری ہیں۔

HL.2 معارج النبوۃ: کتاب کا پورا نام "معارج النبوہ فی مدارج الفتوۃ" ہے اور یہ کتاب کا رکن اوّل دوم ہے نہ کہ جلد اوّل اس کے مصنف معین المسکین ہیں نہ کہ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی یہ کتاب دو خط

میں ہے ابتدائی ۱۹۲ اوراق کے کاتب محمد درویش بن حاجی کرم علی ہیں بقیہ اوراق کے کاتب کا نام مذکور نہیں۔

HL. 2901 **معارج النبوة**: کتاب کا پورا نام "معارج النبوہ فی مدارج الفتوة" ہے اور یہ کتاب کا رکن سوم و چہارم ہے مکمل جلد دوم ———————— اوراق ۳۱۲ تا ۳۱۱ در اصل ہینڈ لسٹ نمبر ۲۹۰۰ اور ۲۹۰۱ ایک ہی کتاب ہے جس کو دو جلدوں میں مجلد کر دیا گیا ہے کل اوراق ۵۴۸ ہیں جس میں ۲۱۵ اوراق کے کاتب کا نام معلوم نہیں اس کے بعد کے اوراق کے کاتب محمد درویش بن حاجی کرم علی ہیں۔ کرم خوردہ نسخہ کے آخری ورق پر تین مہریں ہیں ایک عبداللہ خانہ زاد بادشاہ عالمگیر کی اور دو مہریں کن ہیں اسے کرم خوردگی کی وجہ سے پڑھنا مشکل ہے۔

HL. 2915 **معارج النبوة**: کتاب کا پورا نام "معارج النبوہ فی مدارج الفتوة" ہے اور اس کے مصنف معین مسکین ہیں نہ کہ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی اوراق ۲۶۲ نہ کہ ۶۲۳۔ اس میں صرف رکن اول و دوم ہے۔

HL. 4016 **نسخہ تولد حضرت محمد صلعم**: یہ "تولد نامہ حضرت رسالت پناہ صلعم" ہے

HL. 2790 **تحریر الشہادتین**: اس کے مصنف شاہ عبدالعزیز دہلوی نہیں بلکہ یہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی عربی تالیف سر الشہادتین کا فارسی ترجمہ ہے جسے سلامت اللہ نے "تحریر الشہادتین" کے نام سے کیا اوراق ۹۲ نہ کہ ۸۔

HL. 4017 **جنگ نامہ امیر المومنین**: اس کے مصنف ابو بکر بن احمد بن محمد علی الملقب بہ پدر ہیں اور یہ رسالہ روز عاشورہ کی فضیلت اور آخر کا حصہ حضرت حسن و حسین کی شہادت کے ذکر پر مشتمل ہے کتاب کے ترقیمہ میں کاتب نے کتاب کا نام "جنگ نامہ امیر المومنین حسن و حسین" لکھا ہے جبکہ مصنف نے خود اس کا کوئی نام نہیں دیا ہے لیکن دیباچہ میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ روز عاشورہ کی فضیلت اور حضرت حسن و حسین کے شہادت کے ذکر پر ہے اس لیے کتاب کا نام جنگ نامہ امیر المومنین مناسب نہیں بلکہ "رسالہ در فضیلت روز عاشورہ" زیادہ مناسب ہوگا۔ اس میں سنہ کتابت مذکور نہیں اس کی جگہ "در عہد اورنگ زیب غازی" مذکور ہے۔

HL. 2781 **روضة الشہدا**: اس کا سنہ کتابت ۱۲۱۷ھ ہے نہ کہ ۱۲۲۷ھ۔

HL. 3032 **روضة الشہدا**: کاتب کا نام نسخہ میں غنایت مذکور ہے نہ کہ عنایت اللہ اذا ابتدا کرم خوردہ۔

HL. 2459 **اکبر نامہ**: دیباچہ میں نہ تو کتاب کا نام ہے اور نہ ہی اس کے مصنف کا البتہ ترقیمہ میں "انتخاب اکبر نامہ" مذکور ہے۔ اوراق ۱۳۷ نہ کہ ۱۳۸۔

HL.268 اکبر نامہ: اوراق ۳۴۶ نہ کہ ۳۴۴ تعداد سطور ۱۴ نہ کہ ۱۳۔

HL.303 اکبر نامہ: اوراق ۲۲۲ نہ کہ ۲۲۱ ورق ۱۰ تک تعداد سطور ۱۵ ہے اور اس کے بعد ۲۱-۲۲ نہ کہ ۱۵
اور یہ اکبر نامہ کا صرف جلد اوّل ہے۔

HL.274 اکبر نامہ: اوراق ۲۶۹ نہ کہ ۲۶۶ سن کتابت ۱۲۲۹ھ یہ بھی کتاب کا جلد اول ہی ہے۔

HL.331 اکبر نامہ: اوراق ۲۹۴ نہ کہ ۲۹۸ ناقص الآخر تعداد سطور ۱۶-۱۷ نہ کہ ۱۷ یہ جلد دوم ہے۔

HL.172 آئین اکبری: اسے ۲۰۷ HL نہیں بلکہ ۲۷۰ سمجھا جائے۔ کرم خوردہ۔

آئین اکبری: اوراق ۱۵۷ نہ کہ ۱۵۶۔

HL.27 آئین اکبری: اسے ۲۷۱۳ HL نہیں بلکہ ۲۷۲۳ سمجھا جائے۔

آئین اکبری: از ابتدا کرم خوردہ تعداد سطور ۱۸-۱۹ نہ کہ ۱۹۔

بادشاہ نامہ: اوراق ۳۲۰ نہ کہ ۳۲۱ کرم خوردہ۔

تاریخ انگریزی: یہ دراصل بل صاحب کی انگریزی کتاب کے باب نہم و دہم کا ترجمہ ہے اور اس کے
مترجم محمد انور ہیں اوراق ۹۴ نہ کہ ۹۲۔

تواریخ جہانگیر موسوم بہ اقبالنامہ جہانگیری: اس کا عنوان صرف "اقبالنامۂ جہانگیری" ہوگا
اور یہ کتاب کا صرف جلد سوم ہے۔

HL.32 تاریخ شاہجہاں: کتاب کا نام اس کے دیباچہ میں "عمل صالح" مذکور ہے۔ اوراق ۳۳۲ نہ کہ ۳۲۹
ناقص الآخر و قدرے کرم خوردہ۔

HL.20 تاریخ عالمگیر ثانی: اوراق ۱۱۰+۶ نہ کہ ۱۱۸۔

HL.20 تاریخ عالمگیر ثانی المعروف بہ تذکرہ عماد الملک: اوراق ۱۹۸+۲ نہ کہ ۱۹۸، ناقص الطرفین۔

HL.27 تاریخ فرشتہ: نسخہ کے دیباچہ میں اس کا نام "نورسنامہ" مذکور ہے (۲ب) دراصل اس کتاب کا نام
گلشن ابراہیمی ہے نورسنامہ کے لیے احمد منزوی نے لکھا ہے کہ "نگارندہ پس از پایان کار خود بخش
تاریخ عمومی آں را گزیدہ نورس نامہ نامیدہ است"۔ اوراق ۶۳۹+۱۲ نہ کہ ۶۴۹۔

HL.27 تاریخ منتخب نامۂ ہندیہ: کتاب کے نام میں لفظ تاریخ کا اضافہ غلط ہے صرف "منتخب نامۂ ہندیہ"
اس کا نام ہے اس میں ہندستان کے مختلف صوبوں کے بارے میں اور ابتدا سے عالمگیر ثانی تک

کے بادشاہوں کے حالات مذکور ہیں۔ ناقص الآخر۔

HL. 3779 **تلخیص تاریخ مظفری**: اوراق ۱۷۷ نہ کہ ۱۷۵۔

HL. 3080 **جنگ نامۂ بہادر شاہ**: یہ کتاب جنگ نامۂ کے نام سے ہی جانی جاتی ہے کتاب کے ترقیمہ میں "جنگ نامہ بہادر شاہ اعظم شاہ" مذکور ہے اس کے کاتب مقصود علی ہیں اور یہ خط نیم شکستہ میں ہے نہ کہ نستعلیق۔ کرم خوردہ۔

HL. 2374 **جنگ نامۂ بہادر شاہ**: اسے بھی جنگ نامہ ہی پڑھا جائے اس میں بھی اختتام پر نقل جنگ نامہ محمد اعظم شاہ و بہادر شاہ" مذکور ہے۔

HL. 2999 **خلاصۃ الاحوال بادشاہان و راجگان سلف ہند**: اس کا نام صرف "خلاصۃ الاحوال" ہے اور اس کے مصنف آسارام ذوق ہیں پاکستان میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے فہرست مشترک میں احمد منزوی نے اس کے مصنف کے لیے ناشناختہ لکھا ہے۔ یہ ہندستان کی تاریخ ہے جس میں ابتدا سے لے کر ۱۱۳۸ھ تک کے حالات مذکور ہیں۔ ناقص الآخر۔

HL. 2908 **خلاصۃ التواریخ**: اس کا سنہ کتابت ۱۲۲۳ھ ہے نہ کہ ۱۲۲۲ھ اوراق ۲۲۴ نہ کہ ۲۱۷۔

HL. 3290 **خلاصۃ التواریخ**: یہ کتاب کا صرف حصۂ اول ہے ناقص الآخر اوراق ۹۸ نہ کہ ۹۶۔

HL. 4080 **خلاصۃ التواریخ**: ناقص الاول اوراق ۳۰۹ نہ کہ ۳۰۸۔

HL. 2475 **سوانح اکبری جلد اول**: یہاں جلد اول لکھنے کی ضرورت نہیں چونکہ جلد بندی میں سہولت کے لیے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کے کاتب محمد مستحسن زمان بہاری ہیں نہ کہ محسن زمان بہاری۔ اوراق ۱۳۵ نہ کہ ۱۳۲۔

HL. 2476 **سوانح اکبری جلد دوم**: یہ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۴۷۵ کا بقیہ حصہ ہے اس لیے یہاں بھی جلد دوم نہیں ہوگا۔ اس نسخہ کے خاتمہ پر مذکور ہے "تمام شد جلد اول سوانح اکبری" اس کے کاتب بھی مستحسن زماں بہاری ہیں۔

HL. 2995 **سوانح دکن**: اس کے مصنف منعم خاں الہمدانی الاورنگ آبادی ہیں اوراق ۱۱۰ نہ کہ ۱۰۹، ناقص و کرم خوردہ۔

HL. 3669 **سوانح دکن**: اوراق ۱۵۲+۶ نہ کہ ۱۵۵۔

HL. 3771 **سیر المتاخرین**: کاتب کے نام میں معروف بہ محمد بساون کا اضافہ سمجھا جائے اوراق ۴۳۶ نہ کہ ۴۳۲۔

HL. 4085 **سیر المتاخرین**: یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور مذکورہ نسخہ صرف جلد دوم ہے تعداد سطور ۱۹-۱۸ نہ کہ ۱۹

آخری ۳۴ اوراق پر "انتخاب لفظیات سیر المتاخرین" ہے۔

HL.3009 شاہنامہ منور کلام: اس کے مصنف شیو داس لکھنوی ہیں نہ کہ منور کلام۔ اوراق ۷۶ نہ کہ ۱۵۱۔

HL.261 عبرت العالم: ناقص الآخر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت ہی مکمل نہ ہو سکی۔

HL.261 عبرت مقال مع عبرت نامہ: اوراق ۱۳۱ + ۳ نہ کہ ۱۳۲۔ ابتدائی دو اوراق پر فہرست مضامین ہے اور تیسرے ورق پر کاتب کا نوٹ بہ تشریح تسطیر مجلد ہذا۔

HL.309 فیاض القوانین: اس نمبر کے تحت فیاض الانشا ہے جس کے مصنف محمود بن شیخ محمد گیلانی ہیں یہ کتاب علم انشا اور اس کے قواعد و ضوابط پر ہے۔ ناقص الآخر۔

HL.279 مرآت سکندری: اوراق ۱۸۶ نہ کہ ۱۸۵۔ ناقص الاول ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں دوسرے نسخہ کے لیے شمارہ نمبر ۱۶۳ دیا گیا ہے جو غلط ہے اس نمبر کے تحت شجرۃ الاتراک ہے جو چنگیز خاں اور اس کے آباو اجداد کے حالات میں ہے دوسرے نسخہ کا شمارہ ۱۶۳ ہے۔

HL.3573 منتخب التواریخ: اوراق ۲۲۰ نہ کہ ۲۶۱ قدرے آب و کرم خوردہ۔

HL.3690 نسخہ دلکشا: ۱۴۲ اوراق اگر ابتدائی ایک ورق جو سر ورق ہے اسے بھی شامل کر لیا جائے تو ۱۴۳ ہونگے نہ کہ ۲۸۳۔

HL.3840 واقعات کشمیر: اوراق ۱۰۸ نہ کہ ۱۰۶۔

HL.2880 واقعات جنگ شاہ عالم بادشاہ ثانی: اس کے مصنف مکھن لال ہیں (ورق ۳۲-۳۶) اس میں ۱۱۹۴ھ سے ۱۲۰۰ھ تک کے مختلف واقعات مذکور ہیں جس میں واقعات جنگ عالم شاہ بھی ہے اوراق ۵۸ نہ کہ ۵۹۔ ناقص الطرفین۔ خط نستعلیق نہ کہ شکستہ۔

(۲) "نقولات فرامین شاہی" یہ در اصل "منشات مادھو رام" ہے اور اس کے مصنف مادھو رام منشی ہیں یہ کتاب دو فصل میں ہے۔ موجودہ نسخہ فصل دوم ہے یہ فن انشا کے تحت ہوگا نہ کہ فن تاریخ۔ ناقص الآخر اوراق ۵۰ نہ کہ ۲۸ تعداد سطور ۱۲ نہ کہ ۹-۸ خط نیم شکستہ۔

HL.2869/2 واقعات عالمگیری: اس کے مصنف عاقل خاں متخلص بہ رازی ہیں اور خط نستعلیق و قدرے شکستہ لیے ہے نہ کہ شکستہ۔

تذکرہ

جلد اوّل :

HL.176 / No.650 مرآۃ القدس : اس کے مصنف کا نام پادری جیروم ہے نہ کہ زیرونیمو شویر۔ سنہ کتابت ۱۲۰۱ھ ہے۔ کتاب مکمل ہے نہ کہ ناقص الآخر۔ اوراق ۲۹ نہ کہ ۲۸۔ خدا بخش لائبریری کے توضیحی کیٹلاگ جلد ۸ میں سنہ کتابت مذکور ہے۔

HL.178 / No.652 بستان المحدثین : یہ صرف کتاب کا جز اوّل ہے۔

HL.180 / No.654 آثار الوزرا : اوراق ۲۲۸ نہ کہ ۲۲۷۔

HL.181 تذکرۂ صوبہ داران اودھ : اوراق ۱۸۴ نہ کہ ۱۴۴۔

HL.182 / No.655 مآثر الامرا : اوراق ۳۰۲ نہ کہ ۳۰۱۔

HL.183-84 مآثر الامرا : مصنف کا نام عبدالرزاق الحسینی ہے جو شاہ نواز خان کا اصل نام ہے نہ کہ عبدالحئی۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اسے ترتیب دیا ہے اور مصنف کے حالات لکھے ہیں۔

HL.185 / No.666 اخبار الاخیار : کتاب کا پورا نام "اخبار الاخیار فی اسرار الابرار" ہے اوراق ۲۱۱ نہ کہ ۲۱۰۔ توضیحی کیٹلاگ میں پورا نام دیا گیا ہے۔

HL.186 / No.667 اخبار الاخیار : کتاب کا پورا نام "اخبار الاخیار فی اسرار الابرار" ہے۔ کتاب کے خاتمہ پر کاتب کے نام کی جگہ تمام شد بقلم قادری المشرب مذکور ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس کتاب کا پورا نام دے دیا گیا ہے۔

HL.190 / No.67. تاریخ قادریہ : اوراق ۸۳+۲=۸۵ نہ کہ ۸۳، دو اوراق پر فہرست ہے اس کے کاتب محمد منیر واردی انصاری کرانوی ہیں۔ کاتب کا نام توضیحی کیٹلاگ میں مذکور ہے۔

HL.19 / No.66 تذکرۃ الاولیا : اوراق ۳۷۰ نہ کہ ۳۶۰۔ کاتب بختی شاہ بن ملتان شاہ ہیں نہ کہ بختی شاہ بن ملتانی شاہ توضیحی کیٹلاگ میں کاتب کا نام صحیح مذکور ہے۔

HL.19 / No.67 (ترجمہ) خلاصۃ المفاخر : اوراق ۱۷۴ نہ کہ ۱۵۴۔ کتاب کے خاتمہ کے بعد ۷ اوراق پر مکتوبات شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی ہے۔ جس کی تفصیل توضیحی کیٹلاگ میں آچکی ہے۔ ہینڈ لسٹ میں نہیں۔

HL.19 / No.66 توضیح الرشحات : کتاب کا یہی نام مصنف نے دیباچہ میں دیا ہے۔ اس لیے اسے قوسین کے اندر لکھنے کی ضرورت نہیں۔ توضیحی کیٹلاگ میں بغیر قوسین کے نام مذکور ہے۔

HL.199/No.674 **سفینۃ الاولیا** : اوراق ۹۱ نہ کہ ۹۰۔ سنہ کتابت نسخہ میں ۳۹ عالمگیری مذکور ہے فہرست نگار نے ہینڈلسٹ میں اسے ۱۱۰۸ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں عالمگیر کا سن جلوس ۱۰۶۸ھ ہے ایسی صورت میں ۳۹ سن جلوس ۱۱۰۶ھ/۱۱۰۷ھ ہوگا نہ کہ ۱۱۰۸ھ۔

HL.201/No.562 **صفوۃ الصفا**: کتاب کا نام دیباچہ میں "مواہب السنیۃ فی مناقب الصفویہ" ہے۔ اوراق ۴۴۴ نہ کہ ۲۴۴۔ توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کے نام کی تفصیل موجود ہے۔

HL.202/No.671 **کلمات الصادقین**: ناقص الاول۔ اوراق ۱۱۶ نہ کہ ۱۱۷۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس کے ناقص الاول ہونے کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

[illegible]/No.67[illegible] **مرآۃ الاسرار** : اوراق ۶۴۹ ہے، نہ کہ ۶۴۷۔ ۷ اوراق پر فہرست ہے اس کے کاتب شیخ رحمت اللہ ہیں۔

HL.207/No.703 **انیس الاحبا** : اوراق ۱۸۴، ۳ نہ کہ ۱۸۲، ۳ اوراق پر فہرست ہے۔

HL.209-10/No.682-83 **تحفۂ سامی** : مصنف نے کتاب میں اپنا نام یہ لکھا ہے "فقیر حقیر سام ابن اسمٰعیل الحسنی سام" کیٹلاگ میں صرف سام مرزا مذکور ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں اسکی پوری تفصیل موجود ہے۔

HL.212 **تذکرۃ الشعرا** : اس کے کاتب رحمت اللہ ابن عبداللہ ہیں۔

HL.214/No.711 **تذکرۂ فارسی** : کتاب کا نام دیباچہ میں "ریاض الفصحا" مذکور ہے جو اس کا تاریخی نام بھی ہے مصنف نے اسے ۱۲۳۶ھ میں مکمل کیا اور یہ اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۲۳۷ھ کا مکتوبہ ہے اوراق ۱۳۱+۱ نہ کہ ۱۳۱۔

HL.215/No.687 **تذکرۂ طاہر نصیر آبادی** : اوراق ۳۳۰ نہ کہ ۳۳۹ اس کے کاتب محمد مقیم ابن حاجی کمال اصفہانی ہیں۔ توضیحی کیٹلاگ میں ۳۲۹ اوراق ہے اور کاتب کے نام کی صراحت موجود ہے۔

HL.217/No.700 **خزانۂ عامرہ** : اوراق ۳۴۸+۵ نہ کہ ۳۴۹۔ کتاب کے خاتمہ کے بعد ۱/۲ ورق پر نقل رقعہ میر حسن متخلص بہ تسہیل ہے۔

HL.218/No.684 **خلاصۃ الاشعار** : کتاب کا پورا نام "خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار" ہے اور اس کے مصنف کا نام بھی مکمل شکل میں تقی الدین محمد ابن شرف الدین علی لکھا جائے تو بہتر ہے۔ اوراق ۳۹۱ نہ کہ ۳۹۵ توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کا پورا نام آ گیا ہے۔

HL.219/No.712 **خلاصۃ الافکار** : اس کے مصنف کا نام دیباچہ میں اس طرح مذکور ہے "ابو طالب ابن معفور (مرحوم) حاجی محمد بیگ خاں تبریزی الاصفہانی" جبکہ ہینڈلسٹ میں ابن کے بعد صرف محمد اصفہانی ہے۔ اوراق ۲۴۹ نہ کہ ۲۵۷ کتاب میں مختلف مقامات پر کمی و اضافہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب مصنف کی خود نوشت تحریر ہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل رسائل بھی اس میں شامل ہیں۔

• رسالہ در علم اخلاق ۲ ورق، • رسالہ در مصطلحات موسیقی ۲ ورق، • اشعار فارسی آمیز عربی ا ورق
اس کے بعد ۴ اوراق پر بیاض ہے جس میں رسالہ بھید نایکا از عبدالرحیم خانخاناں و مومن لکھنوی کے
بھاکا کے اشعار ہیں۔ مومن کی کتاب برہا ولیلا سے انتخاب بھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور عنوان "در
ذکر شعرای ہندی الاحباب کہ بزبان بھاکا سخن گویند" وغیرہ ہے مذکورہ بالا رسالہ یعنی اشعار فارسی آمیز
عربی کے بعد کے بقیہ رسالوں کا ذکر توضیحی کیٹلاگ میں نہیں ہے بلکہ صرف Some Hindi verses مذکور ہے

HL.222/No.706 (منتخب) **خلاصۃ الکلام**: اوراق ۸۰ نہ کہ ۷۹۔

HL.223/No.693 **ریاض الشعراء**: اوراق ۲۸۷+۲ نہ کہ ۲۸۸۔ آخری ایک ورق پر تھوڑے حصے میں چند سطریں "تذکرہ خزانہ عامرہ سے نقل ہوا بخط بیسہ سلطان دختر حسن علی خاں" ہے۔

HL.225/No.690 **سفینۂ خوشگو**: اوراق ۲۱۵+۴ نہ کہ ۲۱۶۔ آزاد بلگرامی نے اس نسخہ سے استفادہ کیا ہے۔ ابتدائی ورق پر "فقیر آزاد" کی مہر کے علاوہ یہ تحریر بھی موجود ہے "فقیر آزاد بلگرامی استکساب نمود ۱۱۸۲ھ" اوراق کے علاوہ بقیہ باتوں کا ذکر توضیحی کیٹلاگ میں کر دیا گیا ہے۔

HL.228/No.708 **صحف ابراہیم**: اوراق ۶۵۲+۱۱ نہ کہ ۶۵۶، ۱۱ اوراق پر جو فہرست ہے وہ کتاب کے کاتب کی تحریر نہیں بلکہ بعد کا اضافہ معلوم ہوتا ہے۔

HL.229/No.685 **عرفات العاشقین**: کتاب کا پورا نام اس کے دیباچہ میں اس طرح مذکور ہے "عرفات عرفا، عاشقین و عرصات و عارضات عارفین" اور اس کے مصنف کا نام تقی بن معین الدین محمد بن سعد الدین محمد ہے۔ ہینڈ لسٹ میں "معین الدین محمد" کا "محمد" لکھنے سے رہ گیا ہے۔ اوراق ۴۲۰+۱ نہ کہ ۴۲۱۔

HL.23/No.709 **عقد ثریا**: اس کے کاتب کا نام لودھ ہر پنڈت عرف ٹکو ہے۔

HL.232/No.688 **کلمات شعراء**: کتاب کا نام "کلمات الشعراء" ہے توضیحی کیٹلاگ میں نام صحیح مذکور ہے۔

HL.233/No.692 **گلدستہ**: اس کے مصنف عبدالوہاب عالمگیری ولد سید منصور خاں ہیں نہ کہ تقی بن معین الدین الحسینی الاوحدی اور یہ میر تقی الدین حسینی کی کتاب "عرفات العارفین" کے انتخاب "کعبۂ عرفان" سے انتخاب ہے اوراق ۲۷۱ نہ کہ ۲۴۷ کتاب کے خاتمہ کے بعد ۹ اوراق پر رباعیات عمر خیام ہے اس کے بعد ۶۷ اوراق پر مختلف عنوانات کے تحت حروف تہجی کے اعتبار سے اشعار کا انتخاب ہے جس کے اوراق بے ترتیب ہیں اور یہ ناقص الاول بھی ہے توضیحی کیٹلاگ میں کتاب

اور اس کے مصنف کے نام کی تفصیل موجود ہے البتہ رباعیات عمر خیام اور اس کے بعد کے حصے کا سرسری ذکر ہے۔

HL.234 / No.701 **گلِ رعنا**: اس کا سنہ کتابت ۱۲۰۴ فصلی ہے نہ کہ ہجری۔ کتاب کے اختتام پر سبحان علی کا ایک نوٹ ہے جس میں اس کے کاتب کا نام درج کیا گیا ہے نوٹ درج ذیل ہے جو کتاب کی تحریر سے مختلف ہے۔

"بندہ سبحان علی ایں نسخہ گل رعنا بحسب فرمائش راؤ صاحب والاقدر راؤ خوشحال سنگھ صاحب دام شفقا در مقام آرہ بخط صاحبان عزیزان کہ اسم ہر یک صاحب تحریر می آید آں تحریر اختتام یافت میر افتخار علی میر طفیل علی میر بہادر علی میر کرم علی میر غلام حیدر و بیر علی و لالہ بھوگے لال کاتھہ سکینہ واقع تاریخ پنجم جمادی الآخر ۱۲۰۴ فصلی" اوراق ۲۸۳ نہ کہ ۲۸۶۔ اوراق کے علاوہ بقیہ تفصیلات توضیحی کیٹلاگ میں آگئی ہیں۔

HL.235 / No.707 **گلزار ابراہیم**: اوراق ۲۲۶ نہ کہ ۲۳۶، اس کے علاوہ ابتدائی دس اوراق پر مجہول الاسم و مولف ایک واقعاتی مثنوی ہے جو اردو زبان میں ہے۔ توضیحی کیٹلاگ میں اس مثنوی کا ذکر آگیا ہے۔

HL.237 / No.695 **مجمع النفائس**: اوراق ۲۸۰+۱۰ نہ کہ ۲۸۰ کاتب بالمخص نے دیباچہ میں فہرست کے سلسلے میں لکھا ہے:

"فہرست اسامی شعرای کہ احوال و اشعار آنہا داخل ایں تذکرہ است در تذکرہ دستخطے جناب سراج الدین علی خاں آرزو کہ ایں نسخہ ازاں نقل کردہ شد مرقوم بود لیکن ایں نسخہ بسبب اختصار کتابت نوشتہ نشد" لیکن بعد میں کسی شخص نے اسے لکھ کر شامل کر دیا ہے۔

HL.238 / No.696 **مجمع النفائس**: اوراق ۲۷۲+۱۰ نہ کہ ۲۷۲۔

HL.239 / No.713 **مخزن الغرائب**: اوراق ۲۲۳+۱۰ نہ کہ ۲۲۲۔

HL.242 / No.717 **نشترِ عشق**: اوراق ۵۰۷ نہ کہ ۵۰۶۔

HL.243 / No.689 **ہمیشہ بہار**: اس کے کاتب سلطان علی بیگ ہیں۔

HL.244 / No.691 **ید بیضا**: ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے "پارہ ایں نسخہ متبرکہ (ص ۱۶۰ تا ۲۲۲) بخط مصنف علیہ الرحمۃ است" ص ۱۶۰ سے ۲۲۳ تک (نہ کہ ۲۲۲) دوسرا خط ضرور ہے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ یہ مصنف کے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے نیز یہ کہ ص ۱۶۰۔ ۲۲۳ جیسا خط ص ۲۵۴ کا بھی ہے۔

HL.245-46 / No.724-25 **روایح المصطفیٰ**: کتاب کا پورا نام "روایح المصطفیٰ فی من ازہار المرتضیٰ" ہے۔ مصنف

کتاب کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

”چوں ایں کتاب فقط در ذکر احوال اولاد مرتضوی کہ دران بیشتر فرع مصطفوی اند . . . .
لاجرم ایں کتاب را روایح المصطفیٰ من ازہار المرتضیٰ نامیدہ شد“ (۸ الف)

ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے ”در ذکر ائمہ و علما و مشائخ“۔ کتاب کی عبارت میں کمی و اضافہ جیسے شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب بخط مصنف ہے البتہ دیباچہ میں کتاب کی ابتدا اور اس کے اختتام کے سلسلے میں مصنف یہ کہتا ہے کہ اس نے یہ کتاب ۱۳۰۲ھ میں لکھنی شروع کی اور ۱۳۰۳ھ میں اسے مکمل کر لیا جبکہ کتاب کے اختتام پر مصنف خود ہی یہ لکھتا ہے کہ روز جمعہ ۲۸ صفر ۱۳۰۴ھ کو یہ کتاب اختتام کو پہنچی کتاب کی ابتدا ۳ شعبان ۱۳۰۲ھ (سنہ یکہزار دو صد و دو کتابت کی غلطی ہے یکہزار سہ صد و دو ہونا چاہیے) کو ہوئی اور ایک سال چھ ماہ میں یہ کتاب مکمل ہوئی ________ اوراق ۳۰۷ ہیں نہ کہ ۳۲۱۔ کتاب کے خاتمہ کے بعد ۱۶ اوراق پر شاہی اسناد کی نقول ”سند شاہی بابت در بست ایمہ لوہار“ ہے اور اس کے بعد کے سات اوراق پر فہرست کتاب ”روایح المصطفیٰ من ازہار المرتضیٰ“۔ اس کا پورا نام اور کچھ تفصیلات توضیحی کیٹلاگ میں آگئی ہیں ۔

HL.247/No.723 **مآثر الکرام:** نسخہ کے دیباچہ میں کتاب کا نام ”مآثر الکلام تاریخ بلگرام“ مذکور ہے۔ (مآثر الکلام کتابت کی غلطی ہے) صحیح مآثر الکرام ہوگا اور ترقیمہ میں ”مآثر الکرام فی احوال بلگرام“ اوراق ۱۳۴+۲ نہ کہ ۱۳۴ سنہ کتابت کی جگہ تھوڑا کرم خوردہ ہے البتہ بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۱۹۸ھ ہوسکتا ہے توضیحی کیٹلاگ میں کتاب کا پورا نام مذکور ہے۔

HL.248/No.722 **مآثر رحیمی:** اوراق ۲۵۹ نہ کہ ۲۵۸۔ ناقص الاول پہلے ورق کا ابتدائی حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ ناقص الاول ہونے کا ذکر توضیحی کیٹلاگ میں بھی کیا گیا ہے۔

HL.249/No.720 **مجالس المومنین:** یہ شیعہ مشاہیر علما، صوفیہ، سلاطین، وزرا اور شعرا کے حالات میں ہے۔

HL.250/No.721 **مجالس المومنین:** اوراق ۶۰۶+۹ نہ کہ ۶۱۶۔ توضیحی کیٹلاگ میں بھی ۶۱۶ مذکور ہے۔ ہینڈلسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے کہ ”نسخہ ہذا از نسخہ بالا نقل شدہ و تاریخ کتابت سنہ ۱۰۴۵ھ کہ در آخر نسخہ درج است نیز از نسخہ بالا نقل است“

میرے خیال میں یہ کہنا مشکل ہے کہ کس نسخہ کو کس نسخہ سے نقل کیا گیا ہے دونوں نسخوں میں مذکور ہے کہ اس کے آٹھ نسخے تیار کیے گئے اور اصل نسخہ سے مقابلہ کیا گیا ممکن ہے یہ نسخہ بھی ان ہی آٹھ نسخوں میں سے ہو اور اس کی تاریخ کتابت بھی ۱۰۴۵ھ ہی ہو۔

HL.251 / No.719 **منظر الانسان**: اوراق ۴۶۵ تا ۴۶۸۔

جلد دوم:

HL.1777 / No.1778 **اقوال حکما**: اوراق ۴۸ تا ۹۵۔

HL.1779 / No.1779 **خلاصۃ الحیوٰۃ**: اس کا نام "خاصۃ الحیوۃ" ہے۔

HL.1780 / No.1781 **رشحات**: اوراق ۲۴۳ + ۱۸ تا ۲۴۳/ ۱۸ اوراق پر فہرست ہے جو بعد میں کسی نے شامل کر دیا ہے ناقص الاول نہ کہ ناقص توضیحی کیٹلاگ جلد اول میں اس کے ناقص الاول ہونے کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

HL.1782 / No.1780 **نفحات الانس**: کتاب کا پورا نام "نفحات الانس من حضرات القدس" ہے اوراق ۲۰۴ تا ۲۷۷۔

HL.1784 / No.1789 **تذکرہ شعرائے ہندی**: کتاب کا نام نسخہ میں موجود نہیں البتہ اگر اس کے ساتھ مع تکملہ کا اضافہ کر دیا جائے تو بہتر ہوگا "تذکرہ شعرای ہندی (ریختہ گویان) مع تکملہ" یہ تذکرہ ۲۴۵ اوراق پر مکمل ہو جاتا ہے اس کے بعد کے ۱۳ اوراق پر اس کا "تکملہ" ہے۔

HL.1785 / No.1787 **تذکرۂ علی حسین گردیزی**: نسخہ کے دیباچہ میں تذکرہ کا نام مذکور نہیں البتہ خاتمہ پر "نسخہ تذکرہ فتح علی خاں گردیزی تمام شد" مذکور ہے" فہرست نسخہ خطی فارسی انجمن ترقی اردو" میں اس کا نام "تذکرہ ریختہ گویان" مذکور ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۵۔

HL.1787 / No.1788 **خزانۂ عامرہ**: اوراق ۲۲۷ + ۴ تا ۳۲۶ کرم خوردہ۔

HL.1788 / No.1786 **سفینۂ خوشگو**: تعداد سطور ۱۲ – ۱۷ تا ۱۷۔

HL.1789 / No.1785 **مراۃ الخیال**: اوراق ۳۰۲ + ۱ تا ۳۰۱ نیز خستہ و کرم خوردہ۔

جلد سوم

HL.2593 **احوال حضرت ابو مسلم**: اس کا سنہ کتابت ۱۲۲۴ھ ہے قدرے کرم خوردہ۔

HL.3903 **اشجار الجمال**: اوراق ۱۰۰ تا ۹۷ تعداد سطور ۲۵ چند اوراق پر ۱۶ – ۱۹ تا ۱۹

HL.2648 **اصول المقصود**: اوراق ۱۱۱ تا ۱۱۶۔

HL. 3246 **بستان المحدثین:** ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ " بر اول صفحہ و در میان کتاب مہر غلام صادق ۱۱۸۸ھ موجود است" لیکن نسخہ پر ایک بھی مہر موجود نہیں نیز ہینڈ لسٹ کے ہی کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ " از زبان عربی ترجمہ شدہ" لیکن میری معلومات کے مطابق یہ کتاب فارسی زبان میں ہی لکھی گئی ہے " الاعلام " میں بھی اس کتاب کا ذکر آگیا ہے ممکن ہے اسی کے ذریعہ فہرست نگار کو یہ معلوم ہوا ہو۔ کیفیت کے خانے میں لائبریری میں موجود اس کے دوسرے نسخہ کا جو حوالہ نمبر دیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے ہینڈ لسٹ نمبر ۲۰۵۹ کے تحت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی اصول حدیث پر "فقہ پر" عجالہ نافعہ" ہے البتہ مرآۃ العلوم جلد اول کے ہینڈ لسٹ نمبر ۷۸ کے تحت اس کتاب کا دوسرا نسخہ موجود ہے۔ کرم خوردہ۔

HL. 3602 **بحر الانساب:** طباعت اور ترتیب کی غلطی سے کتاب نمبر کی جگہ ۳۶۰ ہی مذکور ہے یہ دراصل ۳۶۱ ہے اور سلسلہ وار نمبر ۲۴۳ کے بجائے ۲۲۴ ہو گیا ہے۔ نسخہ میں مصنف کے نام کی جگہ محمد جعفر حسینی مکی مذکور ہے نہ کہ محمد جعفر حسینی مکی۔ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں یہ اضافہ سمجھا جائے کہ محمد جعفر حسینی مکی نے اپنے والد کی عربی تصنیف بحر الانساب کا فارسی ترجمہ کیا ہے مع متن عربی۔ ہینڈ لسٹ میں سنہ کتابت کی جگہ سن یکم جلوس عالمگیر مذکور ہے اس کی جگہ سن یکم جلوس عزالدین عالمگیر ثانی ہوگا جو ۱۱۶۳ھ ہوتا ہے۔

HL. 3533 **بحر الانساب:** کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں ہینڈ لسٹ نمبر ۳۶۱۲ دیکھیے اس کا سنہ کتابت ۱۱۴۵ھ ہے نہ کہ ۱۱۷۵ھ نسخہ میں جہاں سنہ ہجری مذکور ہے وہ قدرے کرم خوردہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی سن جلوس محمد شاہ بھی مذکور ہے جو ۱۴ ہے ایسی صورت میں اس کی سنہ کتابت ۱۱۴۵ھ یقینی تسلیم کی جائے۔

HL. 3664 **تاریخ احوال اسلام خاں:** نسخہ کے دیباچہ میں اس کا نام "نسب نامہ مختصر لشجرۂ اثنا عشر" مذکور ہے اور اس کے مصنف سید حیدر حسین خاں بن میر محمد حسین خاں شاہجہاں آبادی ہیں اوراق ۵۴ نہ کہ ۵۹ ابتدائی ۵ اوراق پر ورق کے دونوں طرف لکھا گیا ہے اس کے بعد کے اوراق پر صرف ایک طرف تحریر ہے ہینڈ لسٹ میں عدد سطور کے خانے میں ۱۷ مذکور ہے اسے ۷ پڑھا جائے۔

HL. 3011 **تاریخ حبیبی و تذکرہ مرشد:** اس کے کاتب کا نام محمد تقی الدین نعمانی ہے نہ کہ محمد تقی نعمانی نسخہ میں سنہ کتابت سنہ عیسوی کے ساتھ ساتھ سنہ ہجری بھی مذکور ہے جو ۱۲۷۱ھ ہے تعداد سطور ۲۲ نہ کہ ۱۲۔

HL.2602 **تالیف محمدی:** ناقص الاول نسخہ میں سنہ کتابت عیسوی کے ساتھ سنہ ہجری بھی مذکور ہے جو ۱۲۶۵ھ ہے۔

HL.3568 **تبصرۃ الناظرین:** اوراق ۱۱۷ نہ کہ ۱۱۶ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں یہ اضافہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ "سوانح مردم بلگرام وقائع سادات و شرفای آں مقام از تاریخ ولادت تلوی وفات"

HL.3370 **تحفہ سامی:** اوراق ۱۹۳ نہ کہ ۲۵۶ ناقص الآخر نسخہ کے ابتدائی ۱۱ اوراق پر ورق کے دونوں طرف تحریر ہے اس کے بعد کے اوراق پر صرف ایک طرف تحریر ہے۔ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے کہ "برِ اول و آخر صفحہ مہر نواب سید ولایت علی خاں و خورشید نواب" لیکن نسخہ میں کسی بھی جگہ مہر موجود نہیں۔

HL.2400-A **تحفۃ الکرام:** اوراق ۲۴۷ نہ کہ ۲۴۶۔

HL.2400-B **تحفۃ الکرام:** اوراق ۲۴۲ نہ کہ ۲۴۸۔

HL.3214 **تذکرۃ الاحوال:** اس کے کاتب کا نام مظہر حسن ہے نہ کہ مظہر حسین۔ نسخہ کے ابتدائی ۸ اوراق کی کتابت کی تحریر کسی دوسرے شخص کی معلوم ہوتی ہے۔

HL.2949 **تذکرۃ الاولیا:** اوراق ۱۶۷ نہ کہ ۱۶۶ سنہ کتابت ہینڈ لسٹ میں ۱۲۲۱ مذکور ہے جبکہ نسخہ میں سنہ کتابت والا حصہ کرم خوردہ ہے البتہ ۱۲۲۱ء میں اس کا مقابلہ کیا گیا ہے کرم خوردہ ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے "حاشیہ از محمد علی رفعت بن عتیق اللہ خاں الحسینی الواسطی" جبکہ نسخہ کے حاشیہ پر "رسالہ محمد علی رفعت" ہے جو ۲۸ اوراق پر ہے حاشیے کے کاتب مرزا غلام علی بیگ ہیں سنہ کتابت ۱۲۲۲ھ اس کے علاوہ درج ذیل رسائل بھی نسخہ کے حاشیہ پر موجود ہیں۔

- رسالہ۔ اس میں مختصر حکایات ہیں ۱۲ اوراق • صد پند لقمان ایک ورق • رسالہ شیخ شرف الدین علی قلندر پانی پتی ۱۶ اوراق سنہ کتابت ۱۲۲۲ھ • رسالہ ۲ اوراق • رسالہ بیان رگہا کہ در وجود آدمی اند خواجہ معین الدین چشتی ۴ اوراق • رسالہ ارشاد الطالبین۔ جلال محمود تھانیسری ۱۶ اوراق • رسالہ (در تصوف) ۲ اوراق • مصیبت نامہ۔ شیخ فرید الدین عطار ۸ اوراق

یہ تمام رسائل قدرے کرم خوردہ ہیں اور کہیں کہیں جلد سازی کے وقت حاشیہ کی طرف سے کاٹے گئے کاغذ کے ساتھ کٹ گئے ہیں۔

HL.2979 **تذکرۃ الاولیا:** اوراق ۳۳۲ نہ کہ ۳۳۱۔

HL.2993 **تذکرۃ الاولیا و انبیا:** اس تذکرہ کا نام "ریاض الحیات" ہے اور اس کے مصنف درویش خاں

عرف محمد حیات قادری ہیں اوراق ۲۶۱ نہ کہ ۲۶۰۔

HL.2761 **تذکرۃ الائمہ**: سنہ کتابت ۱۲۵۷ھ ہے نہ کہ ۱۲۵۲۔ اوراق ۱۷۵ نہ کہ ۱۷۴

HL.3535 **تذکرۃ الائمہ**: اوراق ۲۴۰ نہ کہ ۲۳۷۔ اس کے کاتب کا نام بہادر علی ہے ہینڈ لسٹ میں بہادر کے بعد علی واضح نہیں۔

HL.3817 **تذکرۃ الائمہ**: اس نسخہ میں خطبہ مصنف کا نہیں بلکہ نسخہ کے کاتب غلام کوثر عرف درگاہی کا ہے محمد معظم کے خطبہ کو اس نے چھوڑ دیا ہے خود کہتا ہے۔
"ناقل این نسخہ متبرکہ بسبب کم فرصتی خطبہ اصل را گذاشتہ نقل نمودہ... خطبہ از طرف خود گفتہ نوشتہ"
اوراق ۱۴۰ نہ کہ ۱۳۴، آخری ۴ اوراق پر عرضی ابن انس یعنی انیس بن خبیس ابن الیس ½ ورق اور "التماس مرزا عبداللہ اصفہانی بخدمت اہل سنت و جماعت" ہے جو شیعہ عقیدہ کے بارے میں ہے۔

HL.2603 **تذکرہ شاکر خاں**: اس میں سنہ کتابت سن عیسوی کے ساتھ سن ہجری بھی مذکور ہے جو ۱۲۶۳ھ ہے۔

HL.3858 **تذکرۂ شیخ علی حزیں**: اوراق ۹۳ نہ کہ ۹۲ تعداد سطور ۱۴-۱۷ نہ کہ ۱۵۔

HL.3320 **تذکرۂ صوفیا**: ناقص الاول و کرم خوردہ۔ اوراق ۱۰۲ نہ کہ ۱۰۴۔ تذکرہ کے خاتمہ کے بعد ۲ اوراق پر تصوف میں ایک رسالہ ہے جس کا نام "منشا چہاردہ خانوادہ" دیا جا سکتا ہے اس کے کاتب کے نام کے آخر میں جونپوری کا اضافہ کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔ کتاب کا نام "تذکرہ صوفیا" نسخہ میں مذکور نہیں۔ اس لیے اسے انڈر بریکٹ لکھا جائے۔

HL.3831 **تذکرۂ طاہر نصیر آبادی**: کتاب کا نام "تذکرۂ طاہر نصر آبادی" ہوگا اور مصنف کے نام میں بھی نصر آبادی ہی لکھا جائے گا اوراق ۳۲۷ + ۱۵ نہ کہ ۳۷۲ خدا بخش لائبریری میں اس کا مطبوعہ نسخہ بھی موجود ہے جو وحید دستگردی نے مرتب کیا ہے۔ مطبوعہ نسخہ میں تین چار سطریں کم ہیں قلمی نسخہ میں خاتمہ کے بعد ۲ اوراق پر یزد کے بعض شاعروں کا ذکر "بعضی از شعرای دار العبادہ یزد" کے عنوان سے ہے اس کے علاوہ چند منظوم تاریخیں بھی ہیں لیکن مطبوعہ نسخہ میں یہ سب چیزیں نہیں!

HL.2965 **تذکرۃ الکرام**: ناقص الطرفین و قدرے کرم خوردہ۔ اوراق ۴۲۵ نہ کہ ۴۶۰۔ اس کے مصنف مولوی محمد ابو الحیوات ہیں ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں بوسیدہ مذکور ہے اس کی ضرورت نہیں۔

HL.3213 **تذکرۂ معاصرین**: ناقص الآخر۔ اس کا آخری یعنی ۳۳ واں ورق سادہ ہے "یہ مجموعہ رسائل شیخ علی حزیں" ہے اس میں موجود دیگر رسائل کی کتابت ایک ہی شخص مظہر حسن کی ہے اس لیے اس کے کاتب بھی مظہر حسن ہی ہوں گے۔

HL. 4089 **تذکرہ**: اوراق ۵۳ سنکہ ۲۰۔ اب سنہ کتابت ۱۱۸۵ھ ہے نہ کہ ۱۱۵۸ھ یہ رسالہ اولیا و عرفا کے نکات کے
بیان میں ہے اس لیے اسے تذکرہ میں نہیں رکھا جاسکتا۔ نسخہ میں اس کے علاوہ درج ذیل عنوانات
کے تحت بھی رسالے موجود ہیں۔

• در بیان خط و اقسام آن ۲ اوراق • در بیان حروف اعراب نا الفاظ ۱½ ورق • آغاز احوال
اشعار متقدمین ۴۴½ اوراق ان تینوں رسالوں کی سنہ کتابت بھی ۱۱۸۵ھ ہی ہوگی۔

HL. 2596 **چراغ پنجاب**: ناقص الاول و کرم خوردہ کتاب کا نام "چراغ پنجاب" نہیں بلکہ "رسالہ صاحب نما"
ہے اور اس کے مصنف کا نام لالہ گنیش داس قانون گوئی گجرات ہے نہ کہ لالہ گنیش داس قنوجی اس
کے کاتب محی الدین و چراغ الدین نہیں بلکہ چراغ الدین مرید محی الدین ہیں نیز یہ کتاب تذکرہ نہیں بلکہ تاریخ کی ہے۔

HL. 2831 **حال مرزا اسعد اللہ کرمانشاہی**: کتاب کا یہ نام غلط ہے فہرست نگار کو کتاب کے آخر کی اس عبارت
"این کتاب از مال حقیر اسداللہ ولد... حاجی مہدی" سے غلط فہمی ہو گئی ہوگی اور اس نے مال کو حال
پڑھ لیا کتاب کا نام نسخہ میں کہیں بھی مذکور نہیں یہ مختلف قسم کے خطوط اور دستاویزات وغیرہ پر مشتمل ہے
اس لیے اس کا نام "منشات" دیا جاسکتا ہے اور ایسی صورت میں یہ تذکرہ میں نہیں بلکہ انشا میں ہوگا۔

HL. 3353 **حالات حضرت امام حسین و ابو القاسم**: اس میں درج ذیل رسالے ہیں مذکورہ نام کا کوئی رسالہ نہیں۔

• (کربلا کے متعلق چند سوالات اور اس کے جوابات) ۳ اوراق • امام حسین کی شہادت کے بعد یزید
کا مدینہ پر حملہ اس کی بے حرمتی اور مختار کی جانشینی کے بعد ان لوگوں کو سزا جو کربلا میں شریک یزید تھے
پھر مختار کا انجام ۴۴½ اوراق • مختلف قسم کی دعائیں ۱½ ورق • تاریخ پیدائش، وفات، مدت عمر،
مدفن، نام مادران، تعداد اولاد حضور صلعم، خلفای راشدین حضرت فاطمہ حسن حسین و امامان دیگر ۳½ اوراق
• نماز برای طلب حاجات ½ ورق یہ اردو زبان میں ہے • نسب نامہ شیخ محی الدین عبدالقادر
جیلانی و خواجہ معین الدین چشتی ½ ورق کل اوراق سطور ۱۲-۱۵ سنکہ ۱۵۔

HL. 2912 **حدیقۃ الشیعہ**: اوراق۔ ۳۸۲ سنکہ ۲۷۸۔

HL. 3439 **دوازدہ مجلس**: ہینڈ لسٹ میں کاتب کا نام محمد عسکری حسینی بلگرامی مذکور ہے جبکہ نسخہ میں کاتب کا
نام موجود نہیں کتاب کا نام بھی نسخہ میں مذکور نہیں اس کتاب میں صرف گیارہ مجلس ہے ہر مجلس کی ابتدا
میں ترکیب بند ملا محتشم کاشی ہے اور اس کے بعد مجلس لیکن بارھویں ترکیب بند کے بعد مجلس کا عنوان

نہ دے کر روایات کا سلسلہ ہے ترقیمہ کی عبارت ہے "تمام شد روایات متعددہ از کتب مختلفہ"
اوراق ۱۵ تا ۱۸۱، کتاب کے خاتمہ کے بعد ۱۸۱ویں ورق پر حضرت علی کی شہادت اور اس
سلسلے کی مختلف روایات کا ذکر ہے۔ کرم خوردہ۔

HL. 3541 دہ مجلس: اس میں درج ذیل رسالے ہیں۔

• فاتحہ (نظم) حیدری ۳ ورق یہ اردو زبان میں ہے • رباعیات فارسی برای پیشخوانی مجلس امام
علیہ السلام ۱/۲ ورق • رباعیات ہندی برای پیشخوانی مجلس امام علیہ السلام ۱/۲ اوراق •
کتاب کا نام موجود نہیں ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے خطبہ ہے پھر ملا محتشم کاشی کا ترکیب بند
اور اس کے بعد مجلس لیکن بند یازدھم و دوازدھم میں نہ تو خطبہ ہے اور نہ ہی مجلس (قیاس یہ ہے کہ
اس مجلس کے مصنف بھی حیدری ہیں) اوراق ۲۵ تا ۴۲ • من کلام میر محمد باقر داماد اوراق
۲ یہ عربی زبان میں ہے اور اس میں حضرت امام حسین سے ابتہالات (دعائیہ کلمات) کیے گئے ہیں۔

HL. 3746 ذکر حکما: کل ۵۳۴ اوراق میں سے ۱۸۶ اوراق پر فارسی متن ہے اور وہ بھی ورق کے صرف ایک طرف۔

HL. 3702 راحت الارواح: اوراق ۸۰ تا ۹۰ ہینڈ لسٹ میں سنہ کتابت ۸۴ ۱۰ھ مذکور ہے یہ سنہ کتابت
نہیں بلکہ سنہ تصنیف ہے۔

HL. 3075 رسالہ در احوال پیران و خرقہ خلافت وارشاد: اس رسالے کا نام "احوال خرقہ خلافت چہار
پیر و چہاردہ خانوادہ" ہے اور یہ "مرآۃ الاسرار" تصنیف شیخ عبدالرحمن کے مختلف مقامات سے
انتخاب ہے۔ اوراق ۸ تا ۹ کرم خوردہ۔

HL. 3304 رسالہ در احوال حضرت عبدالقادر جیلانی: کتاب کا نام "مدائح قادریہ مصطفویہ" ہے نہ کہ رسالہ
در احوال حضرت عبدالقادر جیلانی (ملاحظہ ہو نسخہ کا ورق ۱۱) اس کے مصنف کا نام حافظ غلام
مصطفیٰ ابن محمد اکبر التھانیسری الدہلوی القادری ہے مصنف نے ابتدا میں یہ کتاب عربی
زبان میں لکھی لیکن بعد میں لوگوں کی فرمائش پر خود اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تاکہ عام لوگ
بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں زیر نظر نسخہ میں عربی متن اور پھر ترجمہ کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔
اوراق ۱۳۳ تا ۱۴۲ تعداد سطور ۱۷ تا ۲۷۔

HL. 3879 رسالہ ہمیشہ بہار: کتاب کے نام میں بجائے رسالہ کے تذکرہ ہو تو مناسب ہوگا یعنی تذکرہ ہمیشہ بہار"

یا پھر "ہمیشہ بہار" ویسے یہ کتاب تذکرہ ہمیشہ بہار کے نام سے جانی جاتی ہے۔

HL.2 ریاض الشعرا : تعداد سطور ۵۲ ذکر ۳۴۔

HL.2 ریاض الشعرا : اوراق ۴۰۲ نذکرہ ۴۵۹ قدرے کرم خوردہ۔

HL.3 سفینۂ خوشگو : ناقص الآخر اوراق ۱۲۵ نذکرہ ۱۲۴۔

HL.4 سوانح جہانگیر : تعداد سطور ۹۔ ۱۱ نذکرہ ۱۱۔

HL.29 سوانح مرزا وزیر علی نواب لکھنؤ : اس کا عنوان "سوانح مرزا وزیر علی خاں بہادر" ہوگا۔

HL.30 سیرۃ مشائخین وصحابہ کرام : کرم خوردہ ناقص الاول رناقص الطرفین بھی ہوسکتا ہے کیوں کہ کتاب مکمل نہیں اگر کاتب نے مکمل نہ کی ہو) اوراق ۲۲۵ نذکرہ ۲۳۱۔

HL.40 شبستان اقامت : کتاب کا نام "شبستان امامت" ہے ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے شبستان اول تا شبستان چہارم مشتمل بر حالات آنحضرت صلعم تا شہادت امام حسن عسکری" اس میں یہ اضافہ سمجھا جائے کہ "شبستان پانزدھم در حال جناب مہدی دیں علیہ السلام و در آخر حال دجال" یعنی پانزدہ شبستان ویک خارستان۔

HL.35. شجرۂ طیبہ بلگرام : کتاب کا نام صرف "شجرۂ طیبہ" ہے ہینڈ لسٹ میں بلگرام کا اضافہ غیر ضروری ہے اس کتاب میں سید رضا نے کتاب کے مصنف سید غلام علی آزاد بلگرامی کے بعد مختلف لوگوں کے نام کا اضافہ کیا ہے اور یہ اضافہ ۱۲۵۲ھ تک کا ہے۔ ۱۰۰ ورق پر کتاب مکمل ہو جاتی ہے ۱۱۱ دیں ورق سے ۱۲۵۲ھ تا ۱۲۵۷ھ کے مختلف لوگوں کی تاریخ پیدائش، وفات، شادی وغیرہ کا ذکر ہے جو ۴ اوراق پر ہے ترقیمہ کی عبارت ورق ۱۱۰ پر یہ ہے۔

"بفضل او تعالیٰ شانہ باتمام رسید از قلم شکستہ رقم بندۂ خدا سید رضا بتاریخ غرہ جماد الاول سنہ یکہزار دوصد وپنجاہ ودو ہجری نبوی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم"۔

نسخہ کے پہلے ورق پر مہر سید رضا ۱۲۳۰ھ کے علاوہ یہ عبارت بھی درج ہے "ہذا نسخہ شجرۂ طیبہ مصنفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی است کتبہ بندہ فرزند احمد بلگرامی" کتبہ اس عبارت کے ہو سکتے ہیں اور پوری کتاب کے بھی لیکن اندازہ یہ ہے کہ فرزند علی صرف اس عبارت کے ہی کاتب ہیں اصل کتاب کے کاتب سید رضا ہی ہو سکتے ہیں۔ قدرے کرم خوردہ۔

HL.3567 **شجرۂ طیبہ بلگرام**: کتاب کا نام شجرۂ طیبہ ہے اوراق ۱۱۶ نہ کہ ۱۲۰۔ اس کے کاتب سید خورشید احمد بلگرامی ہیں

HL.3576 **شجرۂ طیبہ بلگرام**: اس کا نام بھی شجرہ طیبہ ہی ہے اور یہ ہینڈ لسٹ نمبر ۳۵۲۴ سے نقل کیا گیا ہے
سنہ کتابت ۱۲۸۲ھ ہے اور کاتب سید محمد مرتضیٰ ولد سید مصطفیٰ علی بلگرامی اوراق ۵۷ نہ کہ ۹۶
آخر کے ۴ اوراق پر وہ اضافے بھی ہیں جنکا ذکر ہینڈ لسٹ نمبر ۳۵۲۲ کے تحت کیا گیا۔

HL.2687 **صحائف شرائف**: اوراق ۲۱۵ نہ کہ ۲۱۳۔

HL.3935 **طرب القلوب**: تعداد سطور ۱۶ نہ کہ ۱۷۔

HL.3360 **عماد السعادات**: اس کا نام "عماد السعادت" ہے اور اس کے مصنف کا نام دیباچہ میں غلام علی رضوی
ابن سید محمد اکمل خاں مذکور ہے نہ کہ غلام علی رضا رضوی سنہ کتابت ۱۲۵۲ھ ہے نہ کہ ۱۲۵۴ھ۔

HL.3425 **فواتح القدس**: ناقص الآخر و کرم خوردہ اوراق ۵۳ + ۵۰۵ نہ کہ ۵۵۴۔

HL.3364 **کلمات الشعرا**: کرم خوردہ۔

HL.3380 **گلزار حال**: کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے اپنا نام بنوالی اور تخلص ولی لکھا ہے نہ کہ بنواری لعل
اوراق ۷۶ نہ کہ ۷۷ قدرے کرم خوردہ یہ ہندی کتاب "پربودھ چندرودی ناٹک" کا فارسی ترجمہ ہے
نیز یہ کہ یہ تذکرہ نہیں بلکہ داستان ہے جو صوفیانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔

HL.3894 **گلستن ابرار**: کتاب کا نام "گلشن ابرار" نہیں بلکہ "ریاض العاشقین" ہے۔

HL.3677 **مجالس الاحزان**: اس کے مصنف کا نام دیباچہ میں حکیم علی اصغر خاں مذکور ہے نہ کہ حکیم علی
اکبر خاں۔ اوراق ۲۴۵ نہ کہ ۲۴۴۔

HL.3867 **مجمع النفائس**: اوراق ۳۵۰ + ۳۲ نہ کہ ۳۷۲، ۳۲ اوراق پر فہرست ہے جس میں درمیان کے ۷ اوراق سادہ ہیں

HL.3424 **مجموعہ در احوال ولادت و شہادت**: مصنف نے باضابطہ طور پر کتاب کا کوئی نام نہیں
دیا ہے البتہ دیباچہ میں لکھتے ہیں:
"این رسالہ ایست در چگونگی احوالات حضرت ائمہ المعصومین..." اس لیے اس کا نام
"رسالہ در احوال ائمہ المعصومین" دیا جا سکتا ہے "مجموعہ در احوال ولادت و شہادت" کسی طرح بھی مناسب نہیں

HL.3975 **مرآت الابرار**: نسخہ کے دیباچہ میں اس کا نام "مرآت ابرار" مذکور ہے۔ ناقص الآخر و کرم خوردہ
اس کے پہلے ورق پر میر غلام احمد خاں بہادر کی مہر ثبت ہے۔

HL.2 **مرأت النخیال:** اوراق ۲۸۱ + ۳ نہ کر ۲۷۰۔

HL.3 **مرأت النخیال:** کرم خوردہ۔

HL.3 **مرآت النخیال:** اوراق ۲۲۸ ۳ نہ کر ۲۲۴۔

HL.3 **مرأۃ مداری:** قدرے کرم خوردہ نسخہ کے ترقیمہ میں کی ۲۲ جلوس احمد شاہی کے ساتھ سنہ ہجری بھی مذکور ہے جو ۱۱۶۵ھ ہے۔

HL.3 **مرأت مسعودی:** اوراق ۷۴ نہ کر ۹۲۔

HL. **مفید المخلصین:** ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں صرف" احوال سید شاہ رحمۃ اللہ مذکور ہے" جس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ سید شاہ کون ہیں اس کی جگہ احوال سید شاہ عزیز اللہ (معروف غریب نواز) ہونا چاہئے۔

HL. **مقتل نامہ:** کتاب کا پورا نام مقتل نامہ امیر المومنین حسین رضی ہوگا کیوں کہ کتاب کے خاتمہ پر مذکور ہے "تمام شد ہذا الکتاب مقتل نامہ امیر المومنین حسین رضی اللہ عنہ فی یوم ... ماہ صفر ۱۰۶۱ ... این کتاب را فقیر حقیر عوض بیگ نوشتہ ... در لشکر ظفر اثر اورنگ زیب بادشاہ غازی کہ ... در ملک کرن نزدیک بیجاپور" لیکن کاغذ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۰۶۱ کا نہیں ہو سکتا اوراق ۹۰ نہ کر ۱۰۸ مقتل نامہ کے خاتمہ کے بعد ایک ورق پر عالمگیر (اورنگ زیب) اور صائب کے اشعار ہیں۔ ۴ ۱/۲ اوراق پر روز عاشورہ کی فضیلت اور حضرت حسین رضی کے واقعہ کا ذکر ہے۔ ۲ ۱/۲ اوراق پر قصیدہ حضرت غوث الثقلین شاہ محی الدین عبد القادر جیلانی اور اس کی خاصیت کا بیان ہے قصیدہ کے خاتمے پر مذکور ہے" این قصیدہ را میر روح اللہ نوشتہ است بتاریخ چہارم شہر ربیع الاول سن ۴۰ جلوس عالمگیر" ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے" مہر اول ورق ۱۰۵ صفحہ میر غلام صادق ۱۱۹۸ھ موجود است" اسے اس طرح پڑھا جائے" بر ورق اول و صد و شش مہر غلام صادق ۱۱۹۸ھ ثبت است"

HL.24 **مناقب العارفین:** اوراق ۲۲۸ ۳ نہ کر ۲۲۴۔

HL.30 **منقول مرأت الاسرار:** کرم خوردہ اوراق ۴۰ نہ کر ۳۹۔

HL.41 **وفات نامہ:** اوراق ۲۹ نہ کر ۴۴ (اس میں حضرت علی، امام حسن، حضرت مسلم، فرزندان حضرت مسلم، حر، امام قاسم حضرت عباس و علی اصغر کی شہادت کا ذکر ہے) اس کے کاتب سید محمد حسن ہیں اس کے بعد ۴ ۱/۲ اوراق پر بند مقتشم (بند دہم تک) ہے پھر فاتحہ اور کربلا کے واقعات پر اشعار ۷ اوراق۔

HL. 261 **وقائع آنند رام مخلص:** اوراق ۱۹۵ تا ۱۹۸ کاتب الیس نور الحق افضلی اور سنہ کتابت ۱۹۵۱ء
اس نسخہ میں دو یا تین اشخاص کی کتابت معلوم ہوتی ہے قیاس ہے کہ آخری ۱۱ اوراق کے کاتب مذکورہ بالا
شخص ہیں نسخہ کی ابتدا میں تذکرہ وقائع آنند رام مخلص حصہ دوم مذکور ہے اس لیے ہینڈ لسٹ میں
کیفیت کے خانے میں "حصہ دوم" کا اضافہ مناسب ہوگا نیز یہ کہ اسے تذکرہ کے بجائے تاریخ میں رکھا جانا چاہئے۔

HL. 3729 **ہفت اقلیم:** اوراق ۳۰۲ تا ۳۰۹ ناقص الاول ناقص آخر چوتھے اقلیم تک اس کا ابتدائی حصہ
نہیں ہے اس کے بعد کا ہے۔

ضمیمہ:

HL. 3648/22 **اسامی شہدائے کربلا:** اس نام یا اس عنوان سے مطابقت رکھنے والا اس میں کوئی رسالہ نہیں۔

HL. 3441/2 **حالات معین الدین چشتی:** اس کے کاتب بھی عبدالستار ہی ہوں گے کیوں کہ مجموعہ میں اس سے قبل
مذکورہ کتاب کے کاتب وہی ہیں دونوں کی تحریر اور سیاہی بھی یکساں ہے۔

HL. 3922/6 **شجرہ چشتیہ:** ہینڈ لسٹ میں اس کے کاتب کا نام بشارت حسین مذکور ہے یہ کاتب نہیں ہیں بلکہ بشارت
حسین والے شجرہ سے نقل ہے اس طرح اس کی سنہ کتابت بھی ۱۲۰۷ نہیں ہوگی۔

HL. 3979/2 **رسالہ مناقب امام اعظم مع اسمای حسنی:** اس نمبر کے تحت جو نسخہ ہے وہ گنج لا یخفی۔ ملفوظات
مولانا حسین نوشہ توحید ہے دوسرا کوئی رسالہ اس میں نہیں۔

HL. 3712/2 **گلزار صابری:** ہینڈ لسٹ میں کیفیت کے خانے میں مذکور ہے" دو زبان اردو احوال حضرت
غوث الاعظم " لیکن اس میں غوث الاعظم کے حالات نہیں بلکہ غوث الاعظم کی پیدائش سے چالیس
روز قبل کا ایک واقعہ ہے جو ان کی والدہ کے ساتھ پیش آیا اور یہ واقعہ گلزار صابری کے
صفحہ ۴۰ سے منقول ہے۔ اس لیے اسے "منقول از گلزار صابری" کہا جا سکتا ہے۔

HL. 3648/5 **نسب نامہ حضرت علی:** اس نام یا اس سے مطابقت رکھنے والا اس میں کوئی رسالہ نہیں۔

HL. 3081/1 **وفات نامہ حضرت شیخ شرف الدین یحیٰی منیری:** اس کے مصنف زین بدر عربی ہیں۔ کرم خوردہ
اوراق ۱۱ تا ۱۲۔

For this purpose he persecuted the Nurbukhshiya, whom he regarded as heretics, and banned all Sufi orders, because the sufis led immoral lives, ate and drank forbidden things and spent their time interpreting dreams and prostrating themselves before one another. But Mirza Haider's rule did not last long. The Kashmiris rebelled against him on account of his narrow-mindedness and fanaticism and killed him.

Three more names deserve to be mentioned in order to complete the list of those who carried on the struggle on behalf of orthodoxy. These are Shaikh Hamza Makhdum, his disciple, Baba Daud Khaki and Shaikh Yaqub Sarfi. But their definition of un-Islamic beliefs and usages was very wide. They not only regarded Hindu beliefs and practices as un-Islamic, but also the *Shi'ite* beliefs and usages. Thus it came to pass that in opposing *Shi'ism*, which had been lately gaining ground in the Valley, they came into conflict with the chak rulers who were Shi'ites. Therefore, they approached Akbar and requested him to send Mughal troops for the conquest or Kashmir. That appeared to them the only way to restore orthodoxy.

Now, what was the result of struggle which the *Ulema* waged for over two centuries. The result was no doubt a substantial gain for orthodoxy At the same time it should not be forgotten that customs, beliefs and practices were too deeply embedded in the life of the people to be completely uprooted and replaced. The Kashmiris, no doubt, accepted the new values, but they did not forget the old. The result was a synthesis between the two. The legal system was replaced by the *Sharī'a*, but the customary law continued to exist side by side Caste and untouchability disappeared but it reappeared in a new garb. Idol worship was abolished, but the Hindu image gave place to the tomb of a Muslim saint, and the old places of worship still retained their sanctity for the Muslims. Thus the Islam which emerged in the Valley was not the same which had been introduced by the followers of the great Sufi orders. It had comprised itself and had thus become considerably transformed.

principles. Sayyid Ali was shocked to see these things and advised the Sultan to change his and his peoples' way of life. Qutubuddin accepted some of the saint's suggestions, but ignored others which were likely to antagonise his subjects. Sayyid Ali's son, Mohammad Hamadani, who also visited Kashmir, continued the work of his father, and it was under his influence that Sikandar tried to enforce the *Shari'a*, imposed *Jizya*, introduced prohibition, banned *sati* and the playing of musical instruments. Under Zainul-Abidin a number of Sufi and learned *Ulema* entered the Valley, but although the Sultan respected them he did not give up what they regarded as un-Islamic practices, Zainul-Abidin was inclined to be in favour of a more liberal interpretation of Islam.

During the later Shah Mir period there were two persons who deserve to be mentioned as revivalists. These were Mir Shamsuddin, the founder of the Nurbakhshiya sect, and Mirza Haidar Dughlat. Under Zainul-Abidin and his successors many of the un-Islamic practices, which had been discontinued by the Muslims under Sikandar, came to be revived. Mir Shihabuddin, who had arrived from Iraq in the spring of 1502, was anxious to wean the people away from such practices. He soon won over some influential nobles, among whom was Musa Raina the prime minister of Sultan Mohammad Shah, and under his patronage he began his crusade. Once while the Hindus were celebrating the spring festival on the Koh-i-Maran, Shamsuddin proceeded there and put a stop to these festivities on the ground that Muslims were participating in them and every one, including women, were drinking wine and behaving indecently. Shamsuddin even belaboured some of the persons who opposed him. When the next morning the Hindus complained to Mohammad Shah about Shamsuddin's high handed behaviour he was so angry that he wanted to put him to death, but was dissuaded by his counsellors.

Mirza Haidar Dughlat, who ruled Kashmir from 1540 to 1551, was an able ruler. But he was a great fanatic and a champion of Islamic orthodoxy, which he was anxious to revive at all costs.

Sadhus. They, in fact, represented a compromise between Hinduism and Islam. The Rishis were Muslims but, like the Hindu ascetics, and unlike the Sufi saints, they preferred a life of retirement, living in caves and jungles, away from human habitations, to pray and meditate. Like the Hindu ascetics they renounced the world, leaving their wife and children, inflicting bodily sufferings upon themselves, and regarding the world as an illusion.

The impact of Hinduism and Islam on each other led eventually to a synthesis. This, of course, does not mean that there had been no difficulties in the way, and that the process had been an easy one. Actually the first resistance that was offered was by the Hindu society itself, which felt itself on the defensive. But its resistance proved to be futile. The statements of Jonaraja and Srivara, already quoted, reveal their agony and suffering at the complete failure of Hindu Society to set up a dam against the advancing tide of Islamic beliefs and practices. But as these defences weakened and Islam began to achieve success, it found that it was itself on the defensive. For the new converts refused to break their links with the past, and carried with them their old beliefs and practices. The result was that from the 14th to 16th centuries there was a constant conflict between those who wanted to keep to their old customs and usages and those who were insistent upon introducing the Perso-Islamic way of life. The champions of the latter were the Turks and Persians, who had settled in the country in large numbers, and the *Ulema* and Sufis, both Kashmiri and foreign.

In the course of his visits to Kashmir at the end of the 14th century, the great Sufi saint Sayyid Ali Hamadani found that there was nothing to distinguish Muslims from non-Muslims in dress, manners and customs. At Alauddinpura, in Srinagar, there was a temple which was visited every morning both by the Sultan and Muslims of the town To avert famine Shihabuddin performed the *Yagna* and distributed gifts to the Brahmans. Moreover, he had two wives, who were sisters, a clear violation of Islamic

Although their religion was opposed to caste system, they continued to observe caste distinctions. Caste names were kept, marriages were arranged on caste basis and caste functions were not given up. The Sultans also, like their Muslim subjects, adopted Hindu practices. They participated in Hindu festivals, visited Hindu temples to beseech the aid of the gods, and in order to avert calamities they performed sacrifices and bestowed grants on the Brahmans. They also performed the *Homa* ceremony at the time of the coronation. The only difference was that instead of a Brahman priest and the chief minister, the *Shaikhul-Islam* applied the *tikka* to the ruler's forehead and made offerings of gold and flowers.

The mutual influences which the Hindus and Muslims exercised on each other was not confined to manners and customs, but also extended to the realm of ideas and religious beliefs. The ideas of Lalla Did, for example, were greatly influenced by Sayyid Ali Hamadani and Nuruddin Rishi. Lalla Did, who lived in the 14th century, was greatly dissatisfied with the Saivite beliefs and practices. Under the influence of Islamic ideas, which she came to know through her contact with these saints, she denounced the caste system and criticised idol worship as silly and useless. She looked upon the world as an illusion, yet she also stated that it was not necessary for a man to become a hermit in order to achieve the absorption of the individual soul into the Supreme, but that even a house-holder could obtain Ultimate Release. In this there is evidence of the influence of Sayyid Ali Hamadani, who believed that in order to be a good Sufi it was not necessary to renounce the world In fact, he denounced celibacy and asceticism. Lalla also learnt from the Sufis to use words in an esoteric sense. From them also she imbibed the idea of the Divine Love, and like them she employed the word "Beloved" to denote the Godhead.

Just as Lalla Did came under Islamic influence, so did Nuruddin Rishi and his followers accept the ideas of Hinduism. The Rishis of Kashmir stood midway between the Sufis and Hindu

influence. A rigid caste system acts as a strong cohesive force, and thus serves as a powerful defence mechanism against the infiltration of foreign ideas. But in Kashmir, under the Buddhist influence, there had been a relaxation of caste rules and, as a result, the Hindu Society's power of resistance had been undermined. Islam, therefore, did not have to face the same degree of opposition in Kashmir as it did in other parts of this sub-continent where the caste rules continued to be rigid and the society was able to set up barriers against external influences. These facts go to explain why Islam's success in Kashmir was much more rapid and complete than in any other part of this sub continent.

THE IMPACT OF ISLAM

That the impact of Islam on Kashmir was profound and far-reaching is evident from the statement of Jonaraja who complains that "as the wind destroys the trees and locusts the shali crop, so did the *Yavanas* destroy the usages of Kashmira" and that "the kingdom of Kashmira was polluted by the evil practices of the *mlecchas*." Similarly Srivara, writing in the second half of the 15th century, says that Hindus had adopted blam:able practices and given up preference for prescribed ceremonies Now what were the blameable practices which the Kashmiris began to adopt and the usages which the foreigners began to destroy. These practices were that caste rules became relaxed; foreign dress, manners and costoms began to be adopted; strange dishes began to be relished and what was most shocking was that even beef began to be liked by some Hindus.

It is necessary to poin t out here that while Kashmir was subject to foreign influences and was assimilating strange practices and usages, she herself was not slow in converting others to her own way of life Thus many Muslims, while they celebrated their religious festivals, also participated in the Hindu festivals of Gana-chakra Sripanchami and others. They regarded the Hindu places of worship as sacred, and sometimes they even worshiped idols.

successors. The conversion of Kashmiris to Islam, therefore, cannot be limited to any specific period; it was a long-drawn process extending to about 300 years. The only definite thing that can be said about it is that not until the early part of the 16th century were the great bulk of the people converted to Islam.

I have given so far a brief history of the spread of Islam in the Valley but this does not fully explain the problem of how this was accomplished. Actually rulers of Kashmir were, for the most part, indifferent to the missionary activities of Sufis and the *Ulema*. In fact, there is evidence to suggest that they discouraged these activities. The only ruler who actively took interest in them was Sikandar, but much of his work was undone by his son and successor, Zainul-Abidin. Thus it is not the Sultans but the Sufis who were mainly responsible for introducing and spreading Islam. But for this they did not use compulsion, because they were neither capable of employing it, nor did they have the sanction of the State behind them. Their methods were persuation, discussion and discourse. And they won over the hearts of the people on account of their simplicity, sincerity, piety and devotion. But we must remember that despite all these qualities, the Sufis would not have been able to make much headway, had they not been helped by certain objective conditions. Since about the 12th century society in Kashmir was in the process of social, political, and religious disintegration, caste rules had been relaxed, Brahmans had become arrogant, sectarianism was prevalent, the priests were uneducated, true spiritual values were lacking and religion consisted in nothing more than belief in superstitions and the performance of certain prescribed ceremonies. Buddhism also had become decadant and could not offer spritual satisfaction to the people. It was these conditions which had driven Rinchana into the fold of Islam, and had provoked Lalla Did to protest against the Saivite beliefs and practices.

I should mention one more cause which helped the spread of Islam. This was the laxity of caste rules resulting from Buddhist

Hindus and Buddhists, and appointed them to positions of responsibility.

The next person who carried on intensive missionary activity was Mir Shamsuddin. As a result of the liberal policies pursued by Zainul-Abidin and his successors, the Hindus had recovered some of their former position and strength. In a communal riot, which took place during the reign of Haider Shah, they caused damage to the *Khanqah-i-Mua'lla.* This provoked a reaction and Shamsuddin, protected and encouraged by some nobles, began his missionry work and achieved considerable success not only in the Kashmir valley but also in Baltistan. Those who played an important part in continuing his work after his death were Shaikh Makhdum Hamza, Baba Daud Khaki and Jamaluddin Bukhari.

Now the question arises as to when did a majority of the inhabitants of Kashmir become Muslim. There is evidence to show that in the time of the chak rulers the dominant religion of the Valley was Islam. But just as it is difficult to say with certainty as to when Islam was first introduced in the Valley, so it is not possible to specify any definite period when the process of conversion was completed. Stein's view that the adoption of Islam by the great mass of the population had become an accomplished fact during the second half of the 14th century is not borne out by facts When Sayyid Ali Hamadani visited the Valley at the end of the 14th century, he found the Muslims in a minority. Sikandar ascended the throne in 1389 and ruled till 1413. It is impossible to believe that in the course of 24 years he could have converted the whole Valley to Islam, particularly, when we remember that in the early years of his reign he was a minor, and power was exercised by his mother, who acted as Regent. Moreover, most of the work of proselytisation accomplished by him was undone by his son and successor, Zainul-Abidin, who completely reversed his religious policy. And from the accounts of Jonaraja and Srivara it is clear that there were still a large number of Hindus in the Valley and they had regained their position under Zainul-Abidin and his

meant to ameliorate the condition of all his subjects. On the other hand, Sikander introduced certain other measures whose object was certainly to secure converts. For example, he imposed the *Jizya* upon non-Muslims, and due to the economic pressure many must have become Muslims. Those who did not want to pay left the Valley. But we must remember that Sikander never compelled any one to become Muslim, if he paid the *Jizya*.

As regards the destruction of temples, Jonaraja accuses Sikander that there was no village or town left where temples were not razed to the ground. There is no doubt that Sikander destroyed temples, but not to the extent mentined by Jonarja or the Persian chroniclers This is clear from the fact that Mirza Haidar, writing after 150 years of Sikandar's death, testified that "first and foremost among the wonders of Kashmir stand her idol temples. In the rest of the world there is not to be seen, or heard of, one building like this. How wonderful that there should be 180 of them." Abul Fazl and Jahangir also mention of the lofty temples in a state of perfect preservation In reality many of the temples whose destruction has been attributed to Sikandar were destroyed by earthquakes. Some suffered due neglect, and some had already been destroyed during the pre-Sultanate period by the Rajas of Kashmir, namely, Jayapida, Saṅkaravarman, Adhimanyu II and Harsha.

When Zainul-Abidin ascended the throne he completely reversed his father's religious policy. He allowed every one full freedom of belief and worship. He recalled those Brahmans who had left the country under his father, and permitted others who had embraced Islam to return to their former faith. He banned cow-slaughter, and gave Hindus the right to perform their customs. He allowed them to repair and rebuilt temples and, in some cases, he himself had them rebuilt. He practically abolished the *Jizya* and other taxes which specially fell upon the non-Muslims. He participated in Hindu festivals, enjoyed the society of learned

was the best religion, Rinchana decided to accept the faith of the first person he saw in the morning. And since the first person he saw from his palace was Bulbul Shah, a Muslim, he embraced Islam. But this is too naive an explanation to be believed, for people do not change their religion in such a way. What actually must have happened is that Rinchana, who was spiritually restless and inquisitive and hankered after truth, failed to get any satisfaction either from Buddhism, the faith in which he was born, or from Hinduism, the faith of his subjects. It was at this time that he came into contact with Bulbul Shah who explained to him the teachings of Islam Rinchana was impressed by these teachings, which were simple and free from caste rules, priesthood, superstition and narrow formalism, and, therefore, accepted the Islamic faith. The conversion of Rinchana was a landmark in the history of Islam in Kashmir, because the example set by him was followed by a number of nobles, and according to a tradition by 10000 people. After Rinchana's death a number of sufis visited Kashmir among them Sayyid Ali Hamadani, who belonged to the Kubraviya order of Sufis, was the most prominent. He is said to have made 37,000 converts. These figures should not be taken too literally because both the Sufi accounts and the chronicles have a tendency to exaggerate. What these figures do indicate is simply this, that both Bulbul Shah and Sayyid Ali Hamadani made a number of converts. Sayyid Muhammad Hamadani, the son of Sayyid Ali Hamadani, who also visited Kashmir and stayed there for 12 years, continued the work of his father. But the next large scale conversions that took place were the result of the efforts of Sultan Sikander (1389-1413) and his minister Suhabhatta, who had become a Muslim under the influence of Muhammad Hamadani.

While studying Sultan Sikandar's religious policy, there are two things to be kept in view. First, he tried to introduce a number of social reforms like the abolition of *Sati*, the banning of gambling and the prohibition of wine and other intoxicants. These measures were not intended to persecute any community, but were

It was during the Sultanate period that Islam became the religion of the majority of the people of Kashmir, and since this had profound and far-reaching results, we must try to understand how it was introduced and it spead.

The earliest reference to Muslims in Kashmir is in Kalhana's *Rajatarangini*, where it is mentioned that Lalitaditya's son and successor, Vajraditya, who ruled in the early part of the 8th century, "sold many men to the *mlecchas*, and introduced into the country practices which befitted the *mlecchas*." These *mlecchas* were, probably, Muslims and the men whom they purchased must have been later converted to Islam. These appear to have been the first converts to Islam in the Valley. Later, Harsha employed Turkish soldiers and was influenced by Muslim fashions in dress and ornament. In the early part of the 12th century again we find a Kashmiri ruler employing Muslims in his army. From the travels of Marco Polo, it appears that by the end of the 13th century there was a colony of Muslims in the Valley, for he says that its inhabitants, the Kashmiris, do not kill animals but that if they want to eat meat they buy it from the Saracens. These Saracens were, most probably, Kashmiris who had become converts to Islam.

The first specific reference in the chronicles to conversion is that of Rinchana, a Buddhist ruler of Kashmir, which was brought about by the efforts of Sayyid Sharafuddin, commonly known as Bulbul Shah, who was a sufi saint of the Suhrawardiya order. The chronicles and the Sufi *Tazkiras* represent this event as the outcome of a miracle. They say that unable to make up his mind as to which

2

Introduction and spread of Islam in Kashmir

19. Mohibbul Hasan, op. cit., p. 360.
20. Ibid., p. 374.
21. Ibid , p. 276.
22. Ibid., p. 331.
23. Original Records, No. 16, *Tipu to Nizam* (Natiooal Archives of India).
24. Mackenzie, *A Sketch of the war with Tipu Sultan*, vol ii, pp. 72-3.
25. Mohibbul Hasan, op. cit., Appendices C & D.



REFERENCES

1. Valentia, *Travels*, xol. i, p 417.
2. Sinha, *Haidar Ali* (2nd ed.), pp. 255-56.
3. Ibid., p. 254.
4. *Mysore Archaeological Report*, 1914 and 1917.
5. Epigraphica Carnatica, vol. ix, p. 27; Khare, Itihas *Sangraha*, vol. viii, No. 3286.
6. Henderson, *The Coins of Haidar Ali & Tipu Sultan*, Mysore and Coorg, vol. i, Appendix.
7. Logan, Malabar, p. 50.
8. Sinha, op. cit. pp. 158-59; p. 254, 256.
9. Ibid., p. 257.
10. Ibid., p. 254.
11. See for details Mohibbul Hasan, *History of Tipu Sultan* (2nd ed.), Calcutta, 1971, pp. 355-55.
12. Ibid., p. 357-58.
13. Khare, op. cit., vol. viii, No. 3286.
14. *Mysore Archaeological Report*, 1916, pp. 10-1, 73-6.
15. Ibid. 1912, pp. 23-40; 1917, p. 58-59; 1940, p. 26. See also *Epigraphica Carnatica*, vol. iii, Sr. 77.
16. Baramhal Records, section xii. p. 9; *Local Records*, vol. iv, p. 280, cited in Report of the *Indian Historical Records Commission*, 1934, p. 417.
17. Mohibbul Hasan, op. cit., p. 373.
18. India office Mss Eur. C. 10, p 206; Beatson, *A view of the origid and Conduct of the war with the Tipu Sultan*, p. 317; also Kirmani, *Nishan-i-Haidari*, p. 391.

officers by admonishing them and sometimes by inflicting upon them deterrent punishments [24]

There is no evidence to suggest that Tipu tried to establish an Islamic State, for like his father, he too knew that such a thing was impossible. However, from some of his actions it appears that he wanted to play the role of a Muslim ruler. Thus, he called his state *Saltanat-i-khudadad* (God-given State) He instituted a new calender called it *Mauludi*, dating it from the spiritual birth of the Prophet instead of from his flight (*Hijrat*). And he named some of the months after the Prophet and 'Ali. The same Islamic bias is evident in the names he gave to the new coins he introduced. The gold and silver coins were called after the Prophet, the first two Caliphs and the twelve *Shi'a Imams*. The copper coins, with the exception of the double paise, which is called after the third Caliph, bear the Arabic and Persian names of stars.[25] It seems that Tipu made these innovations as a concession to Muslim orthodoxy and also to satisfy his own conscience. However this did not imply any basic change in and departure from his policy of toleration.



he tried to excite his religious sentiments by dwelling on the atrocities which the English were committing on the Muslims in India. While these religious appeals were ineffective, as in the case of the French, he made appeals to their self-interest, stressing the danger to which they were all exposed by the British designs of aggrandisement. The same appeal he made to the Marathas; but in addition, he tried to arouse their patriotic feelings [20]

There are, however, some instances in which Tipu, persecuted unlike his father, the *Mahdavites*, a Muslim sect founded by Sayyid Muhammad of Jaunpur at the end of the 15th century. Tipu imposed a ban on their religious practices; and when despite this, they ignored his orders, he exiled them from his kingdom.[21] It was a strange contradiction in his character that while he himself held superstitious beliefs and indulged in un-Islamic practices, he refused to countenance the same in some of his Muslim subjects.

It was his religious beliefs and ideals that determined the attitude towards certain social practices and customs and religious ceremonies. For example, he banned many practices during the time of *Muharram* because he regarded them as un-Islamic. He forbade prostitution, and tried to put a stop to polyandry in Malabar and Coorg. In some parts of Malabar women did not cover their bodies above the waist; so Tipu decreed that no woman should go out of her house without being properly dressed. He abolished the custom of human sacrifice which was practised in the temple of Kali Devi near Mysore city. He also banned the use of liquor and other intoxicants in his kingdom [22]

Tipu was anxious to give a moral basis to his government, for he had a high sense of duty to his office, and believed that his subjects constituted a unique trust held for God, the real master.[23] He, therefore, spared no pains, to promote the welfare of his people, and was busy from morning till evening with state affairs. He personally supervised every department of the Government, and endeavoured to check the laxity, peculation and oppression of his

Brahmins he gave a black bullock, a milch she-buffalo, a male-buffalo, a black she-goat, a jacket of coarse black cloth, a cap of the same material, ninety rupees, and an iron pot filled with oil, and previous to the delivery of these articles, he held his head over the pot in order to see the reflection of his face and thereby avert misfortune [18]

To a man who possessed such eclectic beliefs and was so catholic in his outlook, it would be a mistake to attribute either religious fanaticism or even religious motives. If he crushed the Hindu Coorgs and Nayars, he did not spare the Muslim Moplahs His forcible conversion of Coorgs and Nayars to Islam was not due to religious but political motives. He had warned them several times that they should remain peaceful. But they ignored his warnings and repeatedly rebelled. He, therefore, converted them as a punishment However the conversions were on a much smaller scale and not as large as mentioned in some of the accounts. Besides, some of the conversions were voluntary.[19]

In his relations with Indian or foreign powers also, Tipu, like his father, was not influenced by religious considerations. He sent embassies to Persia, Afghanistan and Oman to obtain military help or promote commercial relations. He sent a mission to Constantinople for military and commercial reasons as well as to legalize his position as ruler of Mysore, because he had failed to secure confirmation of the title from the Mughal Emperor due to English intrigues. He made war on the Muslim rulers of Savanur, Kurnool, Adoni, Hyderabad and the Carnatic just as he fought against the Marathas and the Raja of Travancore. However, although religious considerations did not influence his State policy. Tipu, unlike his father, did not hesitate to exploit religion if it served his purpose. In his efforts to win over the Nizam against the English he appealed to his religion, pointing out that for the good of Muslims they should forget their past differences and unite against the common enemy. Similarly, to obtain the support of the Ottoman Sultan,

Despite all this, Tipu was very strict in the performance of his obligatory prayers and keeping the *Ramazan* fasts; and throughout the day he carried a rosary in his hand. He had great reverence for 'Ali, the cousin and son-in-law of the Prophet, and inscribed on his weapons the words *'Asadullah al-Ghalib* one of 'Ali's title. He also revered the other Shi'a *Imams* and named many of the coins after them. The manuscripts of his library had the names of Fatima, Hasan and Husain stamped on them. The ambassadors he sent to constantinople were instructed to lay offerings on his behalf at the tombs of 'Ali and Husain at Najaf and Karbala, and they were to ask the Caliph's permission for constructing a canal from the Euphrates to Najaf, where there was a great shortage of water.[17] Tipu was greatly interested in Sufism, and under his patronge a number of books were written on it. Like his father, he revered Muslim saints and conferred grants for the up-keep of their tombs; he also held Hindu *sadhus*, saints and gods in high respect. Further, like his father, he was extremely superstitious, and believed that the performance of certain ceremonies could avert misfortune. Everyday he consulted the astrologers attached to his conrt about his stars. He fed Brahmins and bore the expenses of Hindu religious ceremonies performed to invoke success for his arms. On every Saturday, withont fail, according to the advice of the astrologers, he made an offering to the Seven Stars of seven different kinds of grain, of an iron pot full of sesame oil, of a blue cap and coat and one black sheep and some money All these articles were distributed among the Brahmins and the poor. On the morning of 4th May, 1799, before Seringapatam was captured by the English, Tipu had been warned by both Hindu and Muslim astrologers that, since it was an inauspicious day for him, he should remain with the army till the evening, and in order to avert disaster he should give alms. After his bath, therefore, he distributed money and cloth among the poor who had gathered there. To the chief priest of Chennapatna, he presented an elephant, a bag of oil seeds and two hundred rupees To the other

the title of an independent ruler might have created diplomatic problems. It would have had also no meaning unless confirmed by the Mughal Emperor, but this confirmation was not an easy thing to secure.

Tipu Sultan, for the most part, followed in the footsteps of his father. He appointed Hindus to high offices of State[11] He not only continued the *Inam* grants of the previous reigns to Brahmins and temples but gave fresh grants[12] In the course of the Third Anglo-Mysore War, when he visited Conjeevaram, he gave 10,000 *Huns* towards the construction of the Gopur temple whose foundations had been laid by his father,[13] and like his father, wrote letters to the Jagatguru of Sringeri Math couched in respectful and polite language. In 1791 some Maratha horsemen plundered the monastery of its valuable property, and displaced the sacred image of the goddess Sarada When Tipu came to know of this he sent the Math money, grain and other articles for the consecration of the goddess.[14] In Nanjundesvara temple at Nanjangud a jadite *linga* was installed by Tipu's orders. Tipu also gave elephants, jewels, silver and gold vessels to various other temples in the kingdom.[15]

Tipu, like his father, allowed the Hindus complete freedom of worship. The magnificent temple of Sri Ranganatha is situated within the fort of Seringapatam, about one hundred yards west of the palace, from where the Sultan heard daily the ringing of temple bells and the hymns chanted by Brahmin priests. Yet he never interfered with these The Narasimha and the Gangadharesvara are the other two big temples inside the fort and near the palace. But neither in these nor in the thousands of other temples scattered throughout his kingdom, did Tipu ever prevent Hindus from offering worship. On the contrary, he often made grants to the Brahmins to perform their religious ceremonies in the temples. He also distributed money for the performance of religious ceremonies among the Muslims.[16]

cising them and recruiting the Nayar boys into his *chela* battalion, which he had formed on the lines of the Janissarries of the Ottoman Empire. He also converted some of his European prisoners from motives which had nothing to do with religion. Since he needed Europeans as artificers, engineers and officers for his army, he hoped to persuade them to enter his service [9]

Haidar Ali was very much influenced by his Hindu environment This is evident from his belief in the efficacy of certain ceremonies. Thus, he ordered the performance of *Japam* in Hindu temples before setting out on a campaign. Similarly, buffaloes were sacrificed on the occasion in accordance with the Hindu tradition, and he usually marched against the enemy only after the Brahmins had declared that the hour and day were auspicious.[10]

It has been maintained that Haidar did not set aside the Raja of Mysore and himself assume the title of a king in deference to Hindu sentiments, and that is why every year at the annual *Dasahra* festival, he allowed the Raja to come out of his palace and show himself to his people. But the fact is that, if after he had consolidated his position, Haidar had deposed the Raja there would have been no resistance, for, on account of his benevolent rule he was extremely popular both with his Hindu officers and Hindu subjects. Later, when Tipu, his son and successor, did eventually put an end to the rule of the Wodeyars and declared himself Sultan, there was no opposition. It seems, therefore, more probable that the reason why Haidar did not think it necessary to assume the title of an independent king was first, that he possessed in practice full sovereign powers. He struck coins in his own name, received envoys of Indian and foreign powers and sent his own to them and made war and concluded peace. Secondly, he might have been influenced by the examples of the Peshwa, the Nizam, the Nawabs of Oudh, the Carnatic and Bengal, none of whom were *de jure* rulers, although in practice enjoying sovereign powers. That is why Haidar Ali also remained content with the position he occupied and did not desire for any change. Besides, the assumption of

Haidar appointed Hindus to high position in his government. At the time of his death, out of five officers in charge of different departments, three were Hindus, namely, Krishna Rao, Purniya and Shamia. In addition, his revenue officers and diplomatic agents were mostly Hindus.[2] Haidar continued the *Inam* grants of the time of the Rajas to Brahmins and temples.[3] He presented various articles to the temples in Mysore, for example a *Sankh* to the temple in Devanhulli, and some vessels to Sri Ranganatha temple in Seringapatam.[4] Although this was against the *Shari'a*, he did not care In fact, he went much further in violation of it. When the temple of Sri Ranganatha was damaged as the result of fire, he had it rebuilt in one month. He also laid the foundations of Gopur temple in Conjeevaram during his invasion of the Carnatic in 1780, but it could not be completed owing to his war with the English [5]

In the matter of coinage also he followed a policy which though un-Islamic, took into account Hindu sentiments. He allowed the retention of gold coins which had the figure of the Hindu god Siva and his consort on the obverse. Similarly, the half *pagoda* had on the reverse a figure of Vishnu with a discus in the right and a conch in the left hand; and the Ganapati *pagoda* had on its obverse the figure of an elephant with an uplifted tail [6]

Haidar's attitude towards the Christians of Malabar was also very liberal. He granted the Catholic church in Calicut 2,420 *fanams* yearly, and allowed the Catholics complete freedom of worship.[7] Later, however, this grant to the church was cancelled along with the trade privileges which the Portuguese had until then enjoyed in the Mysore kingdom, because, in 1768, when the English attacked Mangalore, the Portuguese gave them help in its conquest [8]

Similarly, Haidar Ali's harsh treatment of Hindus in Malabar was not due to religious but to political considerations. The Nayars had again and again rebelled; so Haidar punished them by circum-

According to Valentia, once a *pirzada* complained to Haider Ali that some Hindus of Seringapatam had beaten up his followers, who had attacked a Hindu procession, and demanded redress from him as head of a Muslim government. Haider Ali replied angrily : "Who told you that this was a Muslim government ?"[1] These words very vividly sum up Haider Ali's concept of government and his attitude to the relationship between religion and politics They show that he regarded religion as a purely personal matter having no connection with public affairs, and believed that in a territory mainly, inhabited by non-Muslims, it would be foolish to think of establishing an Muslim State

Haider's concept of government was the product of several factors. First, there was his family background. His forefathers had been *Sufis* attached to the shrine of Jamal-ud-Din Husaini commonly known as Gisu Daraz. Although himself not a *Sufi*, Haidar revered the *Sufis* and paid visits to their tombs Secondly, he was influenced by the tradition of religious toleration that existed both in the Muslim and Hindu States of the Deccan and South India. Thirdly, as a *pragmatic* and a statesman possessed of great *foresight* he realised that, ruling as he did an overwhelmingly large non-Muslim population, it would be suicidal to think of establishing a Muslim State. Throughout his career, therefore, he did two things. First, he did his best to win over the goodwill of Hindus; and secondly, he kept religion and politics apart, never permitting his personal beliefs to influence the latter.

KHUDA BAKHSH EXTENSION LECTURES, 1988

PROF. MOHIBBUL HASAN was educated at Lucknow and London. Worked as lecturer in Islamic History and Culture in Calcutta University (1943-1956), Reader in History in Aligarh Muslim University, (1956-1963), Professor and Head, Department of History Jamia Millia Islamia, New Delhi (963-1970), Senior Professor and Head Department of History in University of Kashmir Srinagar, member of the Executive Committee of the Regional Records Survey Committee, West Bengal (1947-1955), the Archival Legislation Committee (Government of India 1959-60), Vice President of the Iran Society, Calcutta (1952-54). Presided over the Medieval Section of the Indian History Congress in 1951 and 1967.

His well known works include : History of Tipu Sultan, Kashmir under the Sultans, Historians of Medieval India, Babur : Founder of the Mughal empire in India, Readings in Democracy, Messages by Freedom, Introduction and annotation to the Babur Nama (Part III) translated by Bacque-Grammont (Paris 1981) and Waqai i-Manazil-i-Rumi (Diary of an Indian Embassy to constantinople).

Besides, he contributed a number of articles to various Indian and foreign Journals including the Encyclopaedia of Islam. Presently he is settled at Aligarh.

1

Religion and Politics under Haider Ali and Tipu Sultan

By

Prof. Mohibbul Hasan
Aligarh

Printer : Liberty Art Press, 1528, Pataudi House, New Delhi 2

Publisher : Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone: 50109, Telex: 22-430 KBL IN)

Editor : Dr. A.R. Bedar.

Annual Subscription : Rs. 300/- (Inland) U$ 60 (Asian Countries) U$ 120 (Other Countries). Rs. 25/- Per Copy Price (this issue) Rs. 150/-.

JOURNAL NO. 57-62

CONTENTS

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL



57——62

JANUARY-JUNE 91

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA

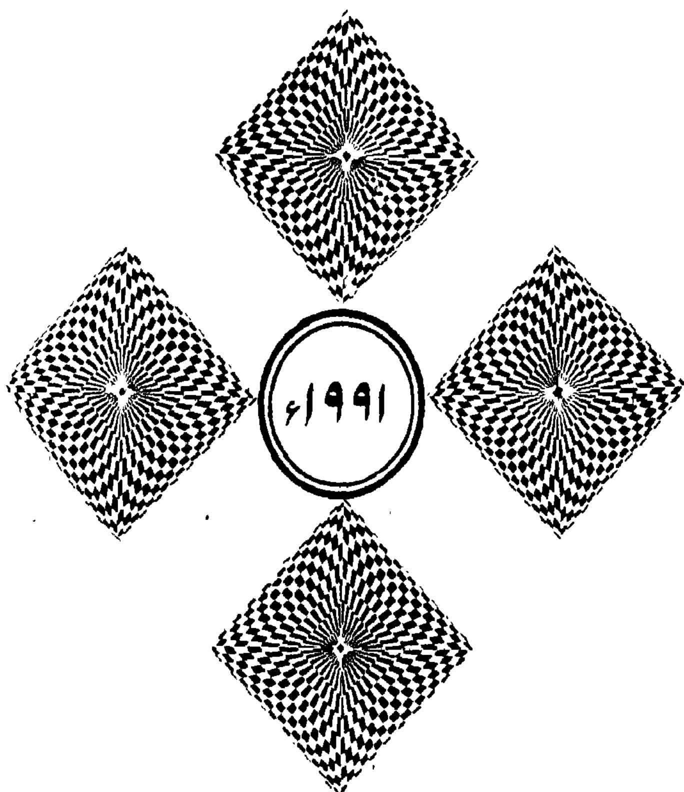


۶۳ تا ۶۸

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۳۳۴۲۲/۷۷
شمارہ: تریسٹھ تا اڑسٹھ
قیمت: ڈیڑھ سو روپے

سالانہ: ۳۰۰ روپے (ہند)
۶۰ ڈالر ایشیا، ۱۲۰ ڈالر دیگر ممالک



مصطفےٰ کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)، دہلی میں چھپوا کر خدابخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

ہندو — ہند اسلامی عہد میں

بابری مسجد رام جنم بھومی دستاویزات

اے عمر فقط ابوبکر و علی

مشرق وسطیٰ کے سفرنامے

سائنس اور مسلمان

اردو ادب

متین

اردو دانشوری

تازہ دانشوری

بازیافت

اہم رسائل کا اشاریہ

اردو اکادمیاں

مشرقی کتاب خانے

مراسلات

خدابخش نوادر

حصہ انگریزی

ہندستانی مذاہب

بابری مسجد رام جنم بھومی دستاویزات

خدابخش نوادر

●●

حرفے چند

کسی اچھے قاری نے کبھی کچھ ایسی بات کہی تھی کہ جب کوئی نئی کتاب چھپ کے بازار میں آتی ہے تو میں پڑھنے کے لیے کوئی پرانی کتاب اٹھالیتا ہوں۔ پوری تو نہیں لیکن کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیت ہم لائبریری کے خادموں پر بھی گزرتی رہی ہے اور جی چاہتا ہے کہ پڑھنے والے نئی چیزیں پڑھیں تو کبھی کبھار پرانوں پر بھی نظر ڈالتے چلیں۔
۱۹۹۱ سے جرنل کو کچھ ایسا ہی موڑ دینے کی کوشش جاری ہے۔

اس احوال کے پس پردہ اصل منشا یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو وہ سب کچھ مل سکے جو انھیں نہیں مل پا رہا ہے، تاکہ اس سے وہ کچھ حاصل کر سکیں جو ابھی تک نہیں کر پائے۔ ایڈیٹر کو اس پرچے کے مشمولات سے بہت کچھ فائدہ ہوا، اس کا جی چاہا کہ وہ اس فائدہ کو صرف اپنے لیے سینت نہ رکھے۔
لیکن ——— صرف ایڈیٹر کیوں؟ اس کار خیر میں آپ بھی برابر کے شریک کیوں نہ ہوں۔ آپ کی نظر سے بھی اچھی چیزیں گذرتی رہتی ہوں گی، اصلاً نہ سہی ان کے حوالے ہی ہمیں بھجوا دیں۔

——— ع ب

تشکر

خدا بخش لائبریری جرنل نمبر ۵۔۴۴ میں شامل کچھ مضامین کے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا جا سکا تھا۔ معذرت کے ساتھ ان رسالوں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے:

۱) کیا اردو کی لڑائی میں مسلمان تنہا ہیں؟ ـــــ ہماری زبان، ۲۲ اگست ۱۹۸۹ء

۲) عصر حاضر میں ادب کا کردار ـــــ صحیفہ، جولائی۔ستمبر ۱۹۹۰ء

۳) چینی زبان کے الفاظ قرآن میں ـــــ نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۳ء

۴) اسلام اور ہندو مت کی بعض مشترک تعلیمات ـــــ معارف، اپریل ۱۹۴۲ء

۵) ترکی کا ایک غیر معروف کتب خانہ ـــــ مجلہ علوم اسلامیہ، ۱۹۶۰ء

۶) استنبول کے کتب خانے ـــــ معارف، ستمبر ۱۹۵۲ء

۷) بروصہ کے کتب خانے ـــــ مجلہ علوم اسلامیہ، ۱۹۶۱ء

ہندستانی مسلمان

○ ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ

○ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین

ادارہ تحقیقات اردو اور خدابخش لائبریری
کے تعاون سے یہ مقالہ منظر عام پر آرہا ہے۔ مرحوم
قاضی عبدالودود دونوں کو ملانے والی سنہری کڑی تھے۔
ان کی یاد میں یہ اشتراک ہنوز جاری ہے۔

——ادارہ

انتساب

اپنے نانا مرحوم مولوی مجید حسن
مالک اخبار "مدینہ" بجنور اور نانی
مرحومہ کنیز فاطمہ کے نام جن کی آغوشِ
شفقت میں میں نے حبُّ الوطنی
کا پہلا سبق سیکھا۔



GOVERNOR OF WEST BENGAL

RAJ BHAVAN
CALCUTTA
700 062

ہندستان کی آزادی کی لڑائی میں سبھی فرقوں اور تمام ہی طبقوں نے گرم جوشی سے حصّہ لیا۔ اس جامع تحریک کے تمام پہلو ہر ایک کی نظر میں نہیں رہتے۔ محترمہ عابدہ بیگم نے بڑی محنت سے جو مواد جمع کیا ہے اس سے متعدد اہم واقعات منظرِ عام پر آسکیں گے اور بہت سی مسلم خواتین کی خدمات کا مناسب اعتراف ہو سکے گا۔

ہندستانی جنگ آزادی کے تمام طالب علموں کے لئے یہ کتاب نہایت اہم اور مفید ثابت ہوگی۔

(دستخط)

(سید نور الحسن)
۱۰ر اپریل ۱۹۹۰ء

پیش لفظ

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کی کتاب "ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصّہ" کا مسودہ پڑھنے کا موقع ملا۔ بڑی خوشی ہوئی پڑھ کر۔ اس کتاب میں ان ۲۰ خواتین کے سوانحی خاکے شامل ہیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے غدر، تحریک عدم تعاون، تحریک خلافت اور پھر قومی جد و جہد کے آخری مرحلے میں حصّہ لیا۔ یہ ایک مفید کام ہو گیا جو حوالے کی کتاب کا کام دے گا کہ، اس میں بہت سی ایسی شخصیتوں اور ایسے حقائق پر روشنی پڑتی ہے جن سے ہم بہت کم واقف تھے۔

قومی تحریک پر اردو میں یوں بھی بہت کم مواد ہے، اور اردو دانشوروں نے اس جد و جہد میں قوم کو جو کچھ دیا ہے (اور ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کے مطالعہ میں آنے والی یہ خواتین بھی اسی طرح اردو سماج سے متعلق ہیں)، خود اردو داں قارئین کو ان کے بارے میں یاد دہانی کی ضرورت بھی ہے۔ اس سے ہمارے ذہن میں قومی جد و جہد کے اس عظیم اصول کو بھی پختگی ملے گی ——— یعنی مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا اصول ——— جس پر کم فہم لوگوں کی طرف سے آج بھی اعتراض ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ خواتین کی قدم سے قدم ملا کر ہندوستان کی آزادی کے لیے شاندار جد و جہد خود بخود ان اعتراضات کا ایک مثبت جواب بن جاتی ہے۔

عرفان حبیب
پروفیسر شعبۂ تاریخ
علیگڑھ

ترتیب

ہندستان کی جنگ آزادی میں
مُسلم خواتین کا حصّہ

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین
ریڈر ویمنس کالج
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اس کے اُڑا لے گئی ہوا ایک ایک

مہاتما گاندھی نے کہا تھا "قومی جہدِ آزادی کی تاریخ ہندوستانی خواتین کے تذکرے کے بنا مکمل نہیں ہو سکتی" زیرِ نظر اوراق میں مسلم خواتین کی جہدِ آزادی میں شرکت کا ایک جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اس کا بنیادی مقصد آزاد ہندوستان کی نئی نسل میں یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ جس طرح ہماری جنگِ آزادی چند مستحکم اصولوں پر مبنی اور مشترک تھی اسی طرح ہماری آزادی بھی ایک قیمتی مشترک ورثہ ہے جس کی حفاظت ہم سب کا مقدس فریضہ ہے۔ ملک کے مختلف علاقوں اور قوموں کے گمنام مجاہدینِ آزادی کی قربانیوں کی بازیافت اور انھیں ان کا مناسب مقام دینا ہمارا اوّلیں فریضہ ہے۔ امید ہے کہ یہ بازیافت قومی یک جہتی کی جانب بھی نمایاں پیش رفت ہوگی۔

"ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصّہ" کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں ان چند محب وطن اور بہادر خواتین کا تذکرہ ہے جنھوں نے ملک کی پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں عملی طور پر حصّہ لیا۔

ہندوستان میں انگریز بحیثیت سوداگر آئے ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ان کی کوٹھیاں بنیں لیکن اس وقت ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا

آفتاب پورے جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ جیسے جیسے مغلیہ سلطنت کی چھاؤں ڈھلنے لگی سات سمندر پار کے ان مسکین صورت انسانوں کے سائے بھی لمبے ہوتے چلے گئے انیسویں صدی کے نصف اول میں دہلی و اودھ کی حکومتوں کا خاتمہ ہوا تو ملک کے طول و عرض میں ایک آگ سی لگ گئی ۱۸۵۷ء میں سارا ہندوستان انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اس انقلابی جدوجہد میں ہندوستان کا چپہ چپہ ان کے لئے دوزخ بن گیا۔ اپنے دوسرے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ مسلم خواتین نے بھی اس انقلابی دور میں غیرت و حمیت، بہادری و سرفروشی اور ایثار و قربانی کے دائمی نقوش چھوڑے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی انقلابی جدوجہد کے بعد جو ہندوستانی عوام کے غیر منظم ہونے کے سبب ناکام ہوئی، انگریزوں نے اس کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا۔ غیر مسلموں کو ان کی طرف سے بدظن کیا گیا اور نئی سامراجی حکمتِ عملی نے مسلمانوں کی سیاسی و اقتصادی حالت کو مکمل طور پر تہس نہس کر دیا۔ نتیجے میں عرصۂ دراز تک مسلمانوں پر ایک جمود و بے حسی کی کیفیت طاری رہی۔ ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں کی کم و بیش یہی حالت تھی۔

سلطنتِ عثمانیہ جیسی عظیم و پُر شکوہ حکومت بھی روبہ زوال تھی یہاں کا سارا معاشی نظام اور تجارتی کاروبار یوروپی اقوام کے ہاتھ میں تھا۔ جگہ جگہ بغاوت کی چنگاریاں سُلگ رہی تھیں خود ترکوں میں سلطان کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔

لیکن پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۹) کے بعد جب سامراجی طاقتوں نے خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے آپس میں بانٹ لئے تو اسلام کے اس زوال پذیر دور میں شیرازہ بندی کے لئے عہدِ رفتہ کی یاد ہی ایک واحد اور مضبوط رشتہ ثابت ہوئی۔ رہنمایانِ قوم نے ان جذبات کو قومی و ملی اجتماعی خدمات کے لئے تعمیری پہلوؤں سے جوڑا، مسلمانوں کو درس دیا گیا کہ وہ اپنا ملی اتحاد اور تشخص قائم رکھنے کی خاطر اپنا شاندار ماضی نگاہ میں رکھیں۔ ہندوستان میں خلافت تحریک نے برطانوی سامراج سے

زبردست مورچہ لینے کا عزم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا "مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیئے یا آزاد رہنا چاہیئے، تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں"۔ اُدھر گاندھی جی جنگ کے خاتمے پر رولٹ ایکٹ اور جلیانوالا باغ کے خونی حادثوں سے انتہائی ناامید تھے۔ مسلمانوں کا اضطراب وہ سمجھ رہے تھے ان کی دانست میں ہندوؤں و مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع کرنے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں ہو سکتا تھا۔

تحریکِ خلافت پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد غیر حقیقی مفروضے تھے نیز اس کا اصل مقصد اسلامی ممالک کی ایک عظیم فیڈریشن قائم کرنا تھا۔ اسلامی اقدار پر خصوصی زور دینے کے سبب یہ تحریک ہندو مسلم اتحاد کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ بن گئی وغیرہ وغیرہ۔ جہاں تک پہلے اعتراض کا سوال ہے گاندھی جی اور دوسرے ممتاز ملکی رہنما یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ تحریکِ خلافت کا اصل نشانہ سامراجی طاقتیں تھیں، خلافت کا مسئلہ محض علامتی تھا۔ پان اسلامزم ایک مذہبی تصور تھا، سیاسی نہیں۔ اس کا بنیادی مقصد مسلم ممالک میں مذہبی معاشرتی اور سیاسی اصلاحات کرنا تھا اور جہاں جہاں مسلم و غیر مسلم آبادی مشترک تھی وہاں ان میں اشتراکِ عمل پیدا کرنا اور انقلابی تحریکات کو منظم کرنا تھا تاکہ مغربی سامراج سے زبردست ٹکر لی جاسکے۔ یہ بات ہرگز قرینِ قیاس نہیں ہو سکتی کہ تحریکِ خلافت کا مقصد ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا قیام تھا۔ اپنے پان اسلامک مزاج کے ساتھ وہ قومی تحریکِ آزادی میں پوری طرح ضم ہو گئی تھی۔ اکثر مقامات پر مقامی کانگریس شاخیں، رضا کار جتھے، کسان سبھاؤں اور ہوم رول لیگ اور ان کی سرگرمیوں میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ پنجاب میں جس طرح پریم سبھاؤں اور انجمن اسلام نے کام کیا اس سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خاں نے کہا تھا ؎

آئی ہیں آسماں سے چل کر وہ قوتیں
جو مسلم و ہنود کو شیر و شکر کریں

یہاں یہ یاد دلانا بھی بے محل نہ ہوگا کہ کچھ پان اسلامی رہنماؤں نے کابل میں جو جلاوطن حکومت قائم کی تھی اس کے صدر راجہ مہیندر پرتاپ تھے اور ایک کابینہ درجے کے وزیر ڈاکٹر متھرا سنگھ تھے۔

یہ خیال بھی تاریخی اعتبار سے درست نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ بعد میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات تحریک خلافت کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس تحریک کے آغاز سے پہلے آرہ (بہار) میں بھیانک فساد ہوا تھا۔ گو شدھی تحریک کے اصل محرکات متعین کرنا بہت مشکل ہے تاہم ہندوستان پہونچتے ہی لارڈ ریڈنگ نے جو کردار ادا کیا اس کا جائزہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اس الکشن کا کردار بھی اہم ہے جو سوراجسٹ موتی لال نہرو اور بیرسٹر مالویہ اور چنتامنی کے درمیان ہوا۔ اس الکشن نے جس طرح ہندو مسلم منافرت کو بڑھاوا دیا اس سے متعلق کاغذات ہوم ڈیپارٹمنٹ (پولیٹیکل) میں ۱۹۲۳ء کے بعد سے موجود ہیں اور جن سے لارڈ ریڈنگ کی حکمت عملی پر مکمل روشنی پڑتی ہے۔ پنجاب میں جس حکمتِ عملی کے تحت زمینی اصلاحات کی گئیں وہ وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافرت کا بیج بونے کے لئے کافی تھیں۔

مندرجہ بالا مختصر سی بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مقصود ہے کہ تحریک خلافت قومی جنگِ آزادی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ولایتی سامان کا مقاطعہ، ترک موالات اور سامراجی استبداد کے خلاف اتحاد و یک جہتی کا جو دور شروع ہوا وہ تاریخ وطن کا ایک زرّین باب ہے۔ اس دوران ہندو مسلم اتحاد کے جو نظارے دیکھنے میں آئے وہ بڑے روح پرور تھے اس لئے تحریکِ خلافت سے وابستہ مجاہدینِ آزادی کی قربانیوں کو ایک مذہبی تحریک سے وابستہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا قافلۂ آزادی جن جن مراحل سے گزرا ہر منزل کی ایک منفرد حیثیت ہے۔ اس منزل کا ہر ایک راہی ہماری ستائش و تعظیم کا مستحق ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قومی جہدِ آزادی کے اس موڑ پر بھی مسلم خواتین نے اپنے بھائیوں

کے دوش بدوش حصہ لیا۔ تحریک عدم تعاون ہو یا انگورہ فنڈ کے لئے چندہ جمع کرنے کا کام خواتین ہر موقع پر پیش پیش رہیں، سودیشی کو عام کیا اور ولایتی کپڑوں میں آگ لگادی، خلافت فنڈ میں روپیوں اور زیور کے ڈھیر لگ گئے ملاحظہ ہو بطور نمونہ ضمیمہ (۱) جس سے پیرانہ سالی کے باوجود بی اماں (والدہ محمد علی) کے طوفانی دوروں، حکومت مخالف تقاریر اور چندے کی فراہمی کی کچھ تفصیلات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ خلافت کے ان چندوں سے گاندھی جی نے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ گاندھی جی کو عوام سے روشناس کرانے میں خلافت کے چندوں کا اہم کردار رہا ہے۔

تحریک خلافت کا بہر حال ایک منفی پہلو بھی تھا۔ ۱۹۲۴ء میں جب کمال اتاترک کی قیادت میں ترکی میں خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا تو ہندوستانی مسلمان کچھ عرصے کے لئے ششدر رہ گئے اور پھر کچھ عرصے بعد تحریک بھی سرد پڑ گئی۔ لیکن اس نے عوامی اتحاد و سیاسی بیداری کی جو فضا قائم کی اس نے کاروانِ آزادی کو ایک نئی جہت عطا کی گاندھی جی نے ینگ انڈیا میں لکھا، "اگر میں کوئی اوتار ہوتا اور میں یہ جانتا کہ تحریک خلافت کا یہ انجام ہوگا تب بھی میں خلافت کی تحریک میں اسی انہماک سے حصہ لیتا۔ خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی۔"

کتاب کا دوسرا باب اُن خواتین کے تذکرے پر مشتمل ہے جنھوں نے تحریکِ خلافت میں عملاً حصہ لیا۔ بحیثیت مجموعی یہ سبھی خواتین پردہ نشین تھیں اپنے زمانے کے معاشرتی تناظر میں ان خواتین کا بیدار سیاسی شعور اور قومی سیاسی زندگی میں اُن کی شرکت قابلِ تحسین اور ایک انتہائی جرأت مندانہ اقدام تھی جس کا تصور بھی آج کے معاشرے میں مشکل سے ہو سکے گا۔ ملاحظہ ہو ضمیمہ (۲) میں اکبری بیگم جیسی خاتونِ خانہ کے پختہ و بیدار سیاسی شعور کی ایک جھلک۔ قومی سیاست میں خواتین کے اثر و رسوخ کے بارے میں ایک برطانوی افسر سر ہرکورٹ بٹلر نے ۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنگ

کو لکھا تھا کہ علماء اور خواتین ہندوستان میں انتہائی اہم اثرات کے حامل ہیں۔ جب تک اِن دونوں کے بارے میں میری حکمتِ عملی کامیاب ہے مجھے سیاست دانوں کا کوئی خوف نہیں۔"

Butler to Lord Harding Jan. 16th, Butler Papers Mss. Eur. F 116/53/11, India Office Library, London Quoted in separate word by Hanna Papanek & Gail Minault P. 248.

کتاب کے تیسرے باب میں اُن مسلم خواتین کا تذکرہ ہے جو ۱۹۳۰ء کے نزدیک اور اس کے بعد کے زمانے میں براہِ راست گاندھی جی اور کانگریس کے دیگر رہنماؤں کے خیالات و نظریات کے زیرِ اثر قومی محاذ آرائی میں شامل ہوئیں۔ ان خواتین کی اکثریت کالج یا اسکول کی فارغ التحصیل تھی اور یہ انڈین نیشنل کانگریس کے ہمہ جہت مقاصد، ہندو مسلم اتحاد، عدم تشدد، دیہی ترقی، تعلیم بالغان، ہری جنوں کی فلاح و بہبود کے تعمیری منصوبے، عوامی رابطہ منصوبہ Mass Contact جیسے کاموں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہیں۔ وہ کھل کر عوامی جلسوں میں شریک ہوئیں، ولایتی کپڑوں اور شراب کی دوکانوں پر دھرنا دیا ان کی اکثریت قید و بند کی صعوبتوں کی تلخ چاشنی سے بھی نا مانوس نہیں ہیں۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کا واحد مقصد آزاد و متحدہ ہندوستان کا خواب تھا جو بدقسمتی سے پورا نہ ہو سکا۔ ان خواتین میں سے اکثر نے بعد میں آزاد غیر مذہبی جمہوری ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔

"ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" کے اس جائزے کو کسی بھی اعتبار سے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں ایسی دوسری مسلم خواتین رہی ہوں گی جن کی قربانیاں آج ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکی ہیں۔ خود جائزے میں جن شخصیتوں کو لیا گیا ہے وہ خاکے بی اماں اور بیگم حسرت موہانی کے علاوہ سبھی نامکمل ہیں۔ کہیں ابتدائی زندگی کے

حالات کا تذکرہ نہیں تو کہیں جنگِ آزادی میں شرکت کے کئی پہلو تشنہ رہ گئے ہیں اس کی بڑی وجہ مواد کی کمیابی رہی ہے۔ جو حضرات اس سے متعلق مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال سکتے تھے ان میں بہت سے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں پُرانے اردو قوم پرست اخبارات ان تفصیلات کی فراہمی میں بہت کچھ معاونت کر سکتے تھے۔ ملاحظہ ہو ضمیمے (۳)، (۴)، (۵) میں دی گئی چند اخباری خبریں لیکن افسوس کہ معتبر قوم پرست اردو اخبارات کے فائل ہندوستان میں بہت کم اور نامکمل ہیں، پاکستان میں موجود قوم پرست اخبارات ورسائل کے فائل ایثار وقربانی کی ان داستانوں میں اور بہت سے ناموں کی نشاندہی کر سکتے ہیں جو بہرحال ایک مشکل اور طویل کام ہے اور کافی وسائل چاہتا ہے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ اس نامکمل جائزے کی اشاعت کے بعد علم دوست اور قومی یکجہتی میں دلچسپی رکھنے والے حضرات ضرور تحریر فرمائیں گے کہ اس میں فلاں اہم شخصیتوں کے ناموں کا اضافہ ضروری تھا۔ یا فلاں خاتون کے متعلق دی گئی معلومات میں اس سے زیادہ اہم واقعات وحالات کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے اور یوں ان بکھری ہوئی کڑیوں میں سے بہت سی کڑیوں کو مربوط کیا جا سکے گا۔ یہ تمام اضافے شکریے کے ساتھ کتاب کے انگریزی مسودے میں شامل کر لئے جائیں گے۔

"ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" کی تیاری میں نہ صرف مختلف لائبریریوں سے استفادہ کیا گیا بلکہ بہت سے افراد سے بذریعہ ملاقات نیز بذریعہ خط وکتابت معلومات حاصل کی گئیں۔ کچھ اہم معلومات "جمہور" کلکتہ اور "مدینہ" اخبار بجنور کے چند پُرانے فائلوں سے دستیاب ہوئیں علاوہ ازیں Collected works of Mahatma Gandhi کی سبھی جلدوں سے بیش قیمت مواد حاصل ہوا۔

میں جناب پروفیسر نورالحسن صاحب گورنر مغربی بنگال کی انتہائی ممنون

ہوں جنھوں نے اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود کتاب کا پیش لفظ لکھنے کی زحمت فرمائی۔ میں انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کی بھی شکر گزار ہوں جس نے کتاب کی تیاری کے لئے جزوی امدادی رقم مہیا کی اس سلسلے میں جن دیگر حضرات نے مواد کی فراہمی میں معاونت کی ان میں سے چند کے اسمائے گرامی کا خصوصی طور پر تذکرہ کرنا چاہوں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ شکریے کے دو بول نہ تو اُن کے پُر خلوص تعاون کا بدل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی میرے جذبۂ تشکر کے آئینہ دار ہیں اس کام میں معاونت کے لئے جناب اصغر علی انجینئر ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز بمبئی ڈاکٹر بی این چوپڑا چیف ایڈیٹر فریڈم پروجکٹ انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ جناب پروفیسر عرفان حبیب ڈائریکٹر انڈین کاؤنسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، جناب عابد رضا بیدار ڈائریکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ، جناب شہاب الدین دسنوی معتمد شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ، جناب انعام الکبیر، نائب آرکائوسٹ، نیشنل آرکائوز دہلی۔ جناب جے این گھیرا نائب کیپر (MASS) تین مورتی میوزیم لائبریری نئی دہلی، جناب کشن ترویدی سابق ڈائریکٹر گاندھی اسمارک سنگھرالیہ ہریجن آشرم احمد آباد جناب شہاب الدین لائبریرین جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔ ڈاکٹر کے کے سکسینہ، اسٹیٹ پبلک لائبریری الہ آباد، پروفیسر نورالحسن خاں لائبریرین۔ جناب عشرت علی قریشی نائب لائبریرین، جناب ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری انچارج اردو سیکشن، ایس مقبول حسن اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب ہرالٰہی اسسٹنٹ لائبریرین کوچنگ سینٹر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب ڈاکٹر ہاشم قدوائی سابق ممبر راجیہ سبھا، جناب پروفیسر نذیر احمد پدم شری سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب پروفیسر عتیق صدیقی ڈائریکٹر سرسید اکاڈمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر شہریار، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مرحوم علی گڑھ، بیگم سکینہ عمار حسن سابق ریڈر شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب کوکب قدر ریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب عشرت علی صدیقی چیف ایڈیٹر قومی آواز نئی دہلی۔ سرخ پوش مجاہد آزادی مرحوم خان غازی کابلی اور جناب عبداللطیف اعظمی ذاکر نگر دہلی کی خصوصی طور پر شکر گزار ہوں۔ میں پروفیسر احمد سعید صاحب ایم۔ اے۔ او کالج لاہور کی علم دوستی کی خصوصی طور پر معترف ہوں۔ موصوف نے ضمیمہ الف کے لئے اخبار زمیندار کے وہ تراشے ہیا کئے جو میری دست رس سے باہر تھے۔ اس اس کتاب کی پروف ریڈنگ میں جناب آغا جعفری ریڈر شعبۂ کامرس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا جو پرخلوص تعاون مجھے حاصل رہا اس کے لئے میں تہہ دل سے اُن کی ممنون ہوں۔ کتابت کے لئے جناب حافظ عتیق احمد صاحب کی جانفشانی، لگن کا شکریہ بھی مجھ پر لازم ہے۔ میں اپنے شوہر پروفیسر سمیع الدین شعبۂ کامرس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بھی انتہائی شکر گزار ہوں جن کی معاونت کے بغیر اس کام کی تکمیل ناممکن تھی۔

مجھے امید ہے کہ میری اس ناچیز کاوش کو تحریک آزادی میں دلچسپی اور قومی یکجہتی میں اعتقاد رکھنے والے حلقوں میں سراہا جائے گا۔

عابدہ سمیع الدین

ریڈر شعبۂ سیاسیات

ویمنس کالج، مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

۷ر جون ۱۹۹۰ء

بابِ اوّل

تاریخِ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
ایک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

حضرت محل

۱۹۳۷ء میں مجاز مرحوم نے ہندوستان کی نوجوان عورت سے خطاب کرتے ہوئے نصیحت کی تھی ؎

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

لیکن ہندوستان کی ایک مایہ ناز دختر حضرت محل اس سے بہت پہلے یہ پرچم اٹھا کر قومی تاریخ میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑ چکی تھی۔ یہ بات اور ہے کہ مادرِ ہند نے طوقِ غلامی اُتار پھینکنے کے بعد بھی اپنی اس جیالی بیٹی سے نہ جانے کیوں ایسا تجاہل برتا کہ نہ کبھی برسہا برس کی پڑی تعصب کی گرد جھاڑ کر ان نقوش کو اجاگر کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کا نام جنگِ آزادی کے پروانوں اور قومی یکجہتی کے متوالوں کی فہرست میں شامل ہو کر نئی نسل کی درسی کتابوں کی زینت بن سکا۔

انیسویں صدی عیسوی کا عہدِ وسطیٰ ہندوستانی تاریخ کا وہ پُر آشوب زمانہ تھا جب سلطنتِ مغلیہ تیزی سے رو بہ زوال تھی، تاجر کی حیثیت سے آئے ہوئے انگریز کے قدم سرزمینِ ہند پر بحیثیت حکمراں پوری طرح جم چکے تھے۔ ہندوستانی راجے اور مہاراجے اپنی اندرونی ریشہ دوانیوں کے سبب لڑ بھڑ کر اتنا کمزور ہو چکے تھے کہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہے جا رہے تھے لیکن "اکثر برسے ہوئے بادلوں میں بھی کچھ بجلیاں رہ جاتی ہیں" (نظارہ لکھنؤ بیگم حضرت محل نمبر ۲۰ اگست ۶۲ء)

بیگم حضرت محل بھی انگریزوں کے لئے ایک ایسی ہی بجلی ثابت ہوئیں جو اس دورِ انحطاط میں قطعی غیر متوقع تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عوام کے سبھی طبقے ایسٹ انڈیا کمپنی کے طریقِ کار سے سخت نالاں

تھے۔ کمپنی کا حلقۂ تجارت جب بڑھا تو جو نظریات مذہب، عزت اور دولت کے سلسلے میں عام کیے گئے وہ عوام کے لیے نہ صرف نئے بلکہ قطعی ناقابلِ قبول تھے۔ جنرل بارلی کے وقت میں فوجیوں کے لیے جو نئے قانون بنے وہ ہندو مسلمان دونوں طرح کے فوجیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہونچانے والے تھے۔ انھیں کے نتیجے میں ۱۸۰۶ء میں بلور کی لڑائی ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جس طرح ریاستوں اور جاگیروں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ اس سے راجاؤں اور نوابوں میں شدید بے چینی پھیل رہی تھی۔

اعظم گڑھ کے مجاہدین کے ایک خط میں کہا گیا کہ "انگریزوں نے مال گذاری بڑھا کر انھیں برباد کر دیا ہے۔ نیچے درجے کے لوگوں کا دعویٰ کرنے پر بھی انھیں عدالتوں میں پیش ہونا پڑتا ہے جو باعثِ ذلت ہے۔ تیل، افیون، کپڑے کی تجارت پر مکمل قبضے کے سبب تاجر برباد ہو رہے تھے۔ ملازم پیشہ، دستکار، مولوی، پنڈت سبھی اپنی اپنی پریشانیوں کے سبب سرکار سے خفا تھے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی ان ہی بکھری حریت پسند جماعتوں کی انگریزی سامراج سے آخری بھرپور ٹکر تھی جسے سامراجی طاقت نے غدر کا نام دیا۔ قومی آزادی کی اس لڑائی میں ہر طبقے ہر مذہب و ملت کے افراد شامل تھے انھوں نے وطنِ عزیز کی خاطر بڑی بہادری اور خلوص سے اپنی اپنی جانیں نذر کیں۔

دس مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے بغاوت کے شعلے بھڑکے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے شمالی ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

۴ر فروری ۱۸۵۶ء میں جب انگریزوں نے اودھ کا الحاق کیا، اور کمپنی کی توج ۱۸۰۱ء اور ۱۸۳۷ء کے صلحناموں کو نظر انداز کرتی لکھنؤ میں زبردستی داخل ہو گئی اور معزول واجد علی شاہ کو کلکتہ میں نظر بند کر دیا گیا تو کچھ عرصے کے لئے تو اودھ کے عوام بھونچکے رہ گئے اور پھر برافروختہ مؤرخین نے اودھ کے الحاق کو غدر کے اسباب میں سے ایک اہم سبب مانا ہے۔ سرجان کے الفاظ میں "انگریزوں کے ہاتھوں اس آخری ہندوستانی ریاست کی ضبطی کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ اب کون محفوظ رہ سکتا ہے! اگر انگریز سرکار نے اودھ کے نواب جیسے اپنے وفادار دوست اور مددگار کی حکومت

چھین لی جس نے انگریزوں کی ضرورت کے وقت مدد کی تھی تو انگریزوں کے ساتھ وفاداری سے کیا فائدہ ؟" (بحوالہ پنڈت سندر لال بسن ستاون اردو ص ۵۵) پہلی بار اودھ کے عوام کو احساس ہوا کہ ان کے علاقے، ان کی عزت و وقار، ان کی زندگی سبھی کچھ غیر ملکی تاجروں کے ہاتھوں بک چکی ہے اودھ میں علماء اور مجاہدینِ اسلام کی منظم جماعت موجود تھی۔ ایک سردار آغا مرزا نے جو کمبل پوش کے نام سے بھی مشہور تھے دو سو مجاہدین کے ساتھ محمدی جھنڈا بلند کیا لیکن ریذیڈنٹ کے حکم سے گرفتار ہوئے اور آغا مرزا کے ساتھ چودہ مجاہدین کو پھانسی دیدی گئی۔ اس کے بعد کمپنی کی طرف سے عام معافی کا اعلان ہوا۔ پورے صوبۂ اودھ میں اشتہار تقسیم کیے گئے، اور ساتھ ہی عوام اور شاہی خاندان سے ہتھیار لینے کی پالیسی بھی عمل میں لائی گئی جس سے عوام اور بالخصوص علماء کے طبقے میں سخت ناراضگی اور نفرت کی لہر دوڑ گئی۔

اودھ کے چیف کمشنر سر ہنری لارنس نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے تمام افواج کو مچھلی بھون اور ریذیڈنسی میں جس کی تعمیر آصف الدولہ نے گومتی کے کنارے ایک اونچی جگہ پر کی تھی، جمع کر دیا۔ باغیوں کی جماعت تیزی سے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہی تھی مقابلے کے لیے لارنس نے اپنی فوجوں کو شہر سے باہر فیض آباد روڈ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ ۳۰ رجون ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ سے چھ میل دور چھوٹے سے گاؤں چنہٹ میں باغیوں اور انگریزی افواج کا مقابلہ ہوا۔ انگریزوں نے شکست کھائی اور لارنس نے اپنی فوجوں کو ریذیڈنسی کی طرف لوٹنے کا حکم دیا۔ اور پورا شہر باغیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ انقلابیوں نے مچھلی بھون کے میگزین کو آگ لگا دی اور اس پر مکمل قبضہ کر لیا۔ مچھلی بھون پر قبضے کے بعد لکھنؤ اور گرد و نواح کی ساری انگریزی طاقت ریذیڈنسی کے حصار میں قلعہ بند ہو کر رہ گئی۔ ۳۱ رمئی اور ۳۰ رجون کے درمیان صرف اس حصہ کو چھوڑ کر پورا اودھ انگریزی حکومت کے چنگل سے نکل چکا تھا۔

اودھ کی سرحد نیپال سے ملی ہوئی ہے۔ سر ہنری لارنس نے خاص سفیر بھیج کر نیپال دربار کے وزیر اعظم سپہ سالار جنگ بہادر سے درخواست کی کہ آپ اس مصیبت

میں انگریزوں کی فوج کی مدد کیجیے۔

جنگِ آزادی کے سپاہیوں کو ایک سربراہ کی تلاش تھی جو ان کے حوصلے بلند کرسکے۔ فوجی افسروں نے یکے بعد دیگرے شاہی خاندان کے چند سربرآوردہ افراد سے قیادت کی درخواست کی لیکن وہ ایک حضرت محل کی ذات تھی جس نے اس پُرآشوب زمانے میں قیادت کا بارِ گراں اپنے کندھوں پر اٹھا کر غیر معمولی جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا اور ان ہستیوں کی فہرست میں شامل ہوگئیں جن کے ہاتھوں آزادی کے شاندار قلعے کی خشتِ اول رکھی گئی۔

"۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو احمد حسین کی تحریک اور نواب محمد خاں کی تائید سے برجیس قدر حضرت محل کے بیٹے تختِ واجدی پر متمکن ہوئے۔ شہاب الدین اور سید برکات احمد رسالدار نے مندیل شاہی برجیس قدر کے سر پر رکھی۔ تمام افسروں نے تلوار نذر گذرانی۔ ۲۱ ضرب توپ سلامی کی سر ہوئیں۔ شہر میں غلغلہ مسند نشینی ہوا۔" (کمال الدین حیدر: قیصر التواریخ ص ۲۲۶)

شہزادے کو محلاتِ شاہی، اکابر فوج اور مدبرین سیاست کے مشورہ کے مطابق تخت پر بٹھایا گیا تھا لیکن چونکہ برجیس قدر کی عمر اس وقت صرف چودہ سال کی تھی (مثنوی حُزنِ اختر تصنیف واجد علی شاہ) اس لیے حضرت محل ان کی مختارِ کُل بنیں اور اس طرح ہنگامی حالات کے تحت وہ انتخاب عمل میں آیا جس میں اُمراء سے زیادہ عوام کو دخل تھا۔ حضرت محل کے دوش بدوش لکھنؤ میں تحریکِ آزادی کے چلانے والے مولوی احمد اللہ شاہ، آزمودہ جنگ راجہ بینی مادھو سنگھ، راجہ مان سنگھ مدبّر راجہ جیالال جیسی مقتدر ہستیاں موجود تھیں۔ بحیثی سرکار برجیسی کی زمرہ شناس یہ وہ تمام طاقتیں تھیں جن کا اس وقت اودھ میں دور دورہ تھا اور سوائے انگریزوں کے کوئی ایسا نہ تھا جو اس خود مختاری کا معترف نہ ہو۔ مُغلیہ تاجدار بہادر شاہ نے سفارت قبول کرکے مہر خطاب سے نوازا۔ (قیصر التواریخ ص ۲۴۲) پیشواؤں کے رہبر نانا راؤ نے پہلے وکیل بھیجا پھر خود تشریف لائے۔ گیارہ ضرب توپ سلامی ہوئی ۱۷ پارچہ خلعت قبول کیا۔ (ایضاً ص ۲۵۷) فیروز شاہ، مرزا کوچک سلطان، جنرل بخت خاں روہیلہ، شفیع اللہ خاں رئیس نجیب آباد، ولی داد خاں رئیس بالا گڑھ، مظہر علی خاں رئیس مرانہ، عنایت اللہ خاں رئیس پیلی بھیت، غلام قادر خاں رئیس شاہجہان پور، بالا راؤ پیشوا اپنے اپنے

علاقے کے رئیس و حاکم یہ وہ افراد تھے جو توسل کے خواستگار بنے اور حسب مراتب سرکار برجیسی نے سب کا خیال کیا۔ (ایضاً) اور یوں ۱۸۵۷ء کے وسط سے جنگِ آزادی کا وہ درخشاں باب شروع ہوا جس نے سرفروشی حُبّ الوطنی ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی کی ایسی بے مثال یادگاریں چھوڑیں جو نئی نسلوں کے لیے باعثِ افتخار بھی ہیں اور نمونۂ عمل بھی۔

شہر میں منادی ہوئی "خلق خدا کی، ملک بادشاہ دلی کا حکم برجیس قدر کا۔ دوسرے روز تمام اہلِ وثائق پنشن یافتہ قدیم و جدید درِ دولت پر حاضر ہوئے اور اپنے عہدوں پر بحال ہوئے۔ برجیس قدر کے نام کا سکّہ بھی جاری ہوا۔ حسب ذیل شعر اس پر کندہ تھا ؎

نصاریٰ پہ قہرِ خدائی ہوا
جواں سالِ سلطانِ لکھنؤ ہوا

(انیس فاطمہ بریلوی ۱۸۵۷ء کے ہیرو ص ۲۹)

شہزادے کے نام سے مندرجہ ذیل فرمان جاری ہوا۔

فرمانِ برجیس قدر والی اودھ ۱۸۵۷ء

"سب ہندو مسلمان یہ جانتے ہیں کہ چار چیزیں ہر ایک مانس کو بہت پیاری ہیں۔ اول دین و دھرم دوسرے عزّت و آبرو تیسرے جان اپنی و اپنوں کی چوتھے مال و اسباب۔ یہ چار چیزیں علمداریِ ہندوستان میں بچی رہتی ہیں۔ اس علمداری میں کوئی دین و دھرم کو نہیں ٹوکتا ہے۔ ہر ایک مانس اپنے دین و دھرم پر رہتا ہے۔ عزّت و آبرو ہر ایک مانس کی موافق اس کی درد کی رہی ہے۔ اشراف کسی قوم کا ہو سید اور شیخ اور مغل اور پٹھان مسلمانوں میں اور برہمن اور چھتری اور ویش اور کایستھ ہندو موافق اپنے اپنے رتبہ، عزّت و آبرو رکھتے ہیں۔ کوئی پاجی جیسے چوہڑے

چمار اور دہانک اور پاسی ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ اور کسی اشراف اور پاجی کی اِس عمل داری میں جان نہیں ماری جاتی اور کسی کا مال و اسباب بھی بغیر کسی جرم اور بڑے باپ کے چھینا نہیں جاتا اور انگریز یہ لوگ ان چار چیزوں کے بیری ہیں دین اور دھرم ہندو مسلمان سب کا کھونا چاہتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ سب لوگ کرسچن ہوں، نصرانی بن جائیں۔ ان کے عمل سے ہزاروں آدمی کرسچن ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ عزت و آبرو تمام اشراف کی اور چوہڑے چماروں کی ان کے نزدیک برابر ہے بلکہ نواب اور راجہ کو کھنچوا بلاتے ہیں اور بے عزت کرتے ہیں جہاں جاتے ہیں وہاں عزت دار لوگوں کو پھانسی دیتے ہیں اور اُن کے زن و بچے کو مار ڈالتے ہیں اور عورتوں سے ان کی فوج کے لوگ بُرا کام کر کے سب کو بے حرمت کرتے ہیں اور سب مال و اسباب سب لوگوں کا گھروں کو کھود کر سب لے لیتے ہیں۔ کچھ نہیں چھوڑتے۔ بنیئے مہاجنوں کو جان سے نہیں مارتے ان کا مال لے کر اور ان کی عورتوں کو بے عزت کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں وہاں کے سب لوگوں سے ہتھیار لے لیتے ہیں جب وہ نہتے ہو جاتے ہیں تو جس کو چاہتے ہیں پھانسی سے یا گولی یا توپ سے باندھ کر مار ڈالتے ہیں جس کو چاہتے ہیں بیدم کرتے ہیں جس کو چاہتے ہیں بے عزت کرتے ہیں۔ بعض جگہ یہ فریب کرتے ہیں کہ زمینداروں سے وعدہ پیسہ معاف کرنے کا کرتے ہیں۔ یا جمع میں تخفیف دیتے ہیں اس مطلب سے کہ جب عملداری خوب بیٹھ جائے گی اور قابو میں سب آجائیں گے پھر جو چاہیں گے ان کا حال کریں گے، یا کرسچین کرلیں گے یا پھانسی دیں گے یا بے عزت کریں گے۔ بعض زمیندار احمق ان کے فریب میں آجاتے ہیں اور جو چتر اور ہوشیار ہیں وہ فریب نہیں کھاتے ہیں۔ اس واسطے سب ہندو مسلمانوں کو جتایا جاتا ہے کہ بچانا دین دھرم اور عزت و آبرو ناموس و جان اپنی و اپنے لوگوں کی اور اپنے مال و اسباب کا جس کو منظور ہو وہ انگریزوں سے لڑنے پر بالاتفاق فوج سرکار کے مستعد رہے اور ہرگز ان کے فریب میں نہ آئے۔ سرکار سے ان کی پرورش اور تخفیف ہوگی۔"

(بحوالہ خورشید مصطفےٰ رضوی، جنگِ آزادی، اٹھارہ سو ستاون ص ۵۵۶۔۵۵۷
ہندی وار دو میں فرمان بجنسہٖ یہی ہے)

حضرت محل نے بارِ قیادت سنبھالتے ہی بھرتی کا اعلان کیا۔ تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں کے نام احکام جاری کیے کہ " ملک آبائی خدا نے ہم کو عطا کیا دفع کفار فرنگ لازم ہے باہم شریک ہوکر باقی ماندگان بیلی گارد کو قتل کردو۔ جو انکو قتل کرے گا اس کا نصف علاقہ اس کو معاف ہوگا۔ (قیصر التواریخ ۔ص ۲۲۹)

تمام امورِ سلطنت کو حضرت محل ایک مشاورتی کمیٹی کی رائے سے طے کرتیں جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ غدر کے زمانہ میں ان کا قیام چوکلھی میں تھا اور اسی عمارت میں ان کا دربار ہوتا تھا (عبدالحلیم شرر۔ گزشتہ لکھنؤ ص ۱۴۳) مجمع عام میں اور محاذ جنگ پر تلوار ہاتھ میں لیے اپنے پرجوش الفاظ سے وہ عوام اور فوج کے دلوں میں قربانی، حب الوطنی اور آزادی کا جوش بھر دیتی تھیں اور دورانِ جنگ فوجوں کی کمان خود کرتی تھیں۔ فوجی سرداروں کی ایک میٹنگ میں انھوں نے کہا تھا " دلی کی عظیم طاقتور سلطنت نے بڑے امید افزا وعدے کیے تھے اور دہلی سے جو مراسلات لکھنؤ پہنچے تھے وہ میرے دل میں خوشی کی لہریں دوڑا دیتے تھے لیکن کتنی جلد بادشاہ کو معزول کر دیا گیا۔ سکھوں اور جاٹوں کو انگریزوں نے خرید لیا ہے اور مواصلات کا سلسلہ کاٹ دیا ہے — نانا فرنویس کو بے دخل کر دیا گیا ہے اور لکھنؤ کو خطرے میں ڈال دیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں کیا ہونا چاہیئے؟ ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ لکھنؤ میں پوری فوج موجود ہے لیکن عزم و ولولے سے خالی ہے۔ اگر فوج میں جانبازی کا عزم اور حب الوطنی کا ولولہ موجود ہے تو وہ عالم باغ پر حملہ کیوں نہیں کرتی؟ کیا فوج اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ برطانوی فوج کو مزید کمک پہنچ جائے اور وہ لکھنؤ کا محاصرہ کر لے۔ مجھے جواب دو تم لڑنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

(CORNEGY'S INTELLIGENCE FOR DEPT, Secret Branch, 26th February 1858 No.223 News of 22nd December 1857, National Archives New Delhi)

حضرت محل سپاہیوں کو حوصلے سے زیادہ انعام دیتیں۔ معرکہ عالم باغ میں راجہ مان سنگھ کو ان کی غیر معمولی جانفشانی کے صلے میں علاوہ خلعت، رومال اور دوشالے کے " فرزند خاص " کا خطاب اور ملبوس خاص سے اپنا دوپٹہ عنایت کیا اور کہا کہ

بعد فتح کے بہت سارو پیہ اور جاگیر دے کر خوش کرونگی (قیصر التواریخ ص ۲۶۷)

انگریزوں کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی کے تحت انھوں نے لکھنؤ شہر کے چاروں طرف دیوار بنانے کے لیے پانچ لاکھ روپیہ منظور کیا۔ جب انھیں علم ہوا کہ نیپال کے رانا جنگ بہادر کو بعوض گورکھپور اور اودھ کے کچھ حصّوں کے خرید لیا گیا ہے تو انھوں نے فوراً رانا کو اپنی حمایت کے بدلے میں گورکھپور، اعظم گڑھ، آرہ، چھپرا اور صوبہ بنارس کی پیش کش کی۔ ان کی جنگی حکمتِ عملی سے ان کے جنگی تدبّر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے انھوں نے انڈین رجمنٹ کے ان افسروں سے بھی رابطہ قائم کیا جو کانپور کی فوج میں انگریزوں کی طرف سے شریک تھے اور اُن سے یہ طے کیا کہ پہلے وہ ہوائی فائر کریں گے اور پھر اچانک اُن کا رُخ انگریزوں کی طرف موڑ دیں گے"۔

—S.N.Chanda
(Untold Stories, P. 11)

امرت لال ناگر لکھتے ہیں کہ "بیگم حضرت محل نے بھی رانی لکشمی بائی کی طرح عورتوں کا ایک فوجی گروہ (سنگٹھن) تیار کیا تھا۔ محلوں کی باندیاں ان کی نگرانی میں قواعد کرتی تھیں انھیں عورتوں نے جاسوس عورتوں کا بھی ایک گروہ تیار کیا تھا۔ اس طرح اس آپسی نفاق کے مایوس کن حالات میں بھی ایک ایک فرد کے دل میں بغاوت کا جذبہ تقریباً پونے دو برس تک اودھ میں برقرار رکھنا بیگم ہی کا کام تھا"۔

(امرت لال ناگر۔ غدر کے پھول ص۔ ۲۶۰)

" حضرت محل کے تدبّر، اعلیٰ دماغی قابلیت اور استقامت نیز ممّو خاں اور احمد اللہ شاہ کے حسنِ تدبیر نے انقلابی تحریک کو اس کامیابی سے چلایا کہ سپاہیانہ زندگی سے علیحدگی کے سبب طبیعتوں میں جو بے حسی اور جمود پیدا ہو گیا تھا وہ یکدم رخصت ہو گیا، جو ہتھیار زنگ آلود ہو کر بیکار ہو گئے تھے وہ صیقل کئے گئے۔ ان کی جھنکار فضائے آسمانی میں گونج کر تخ لبستہ دلوں کو پھر گرمانے لگی (۱۸۵۷ء کے ہیرو ص ۳۱)

یہ وہ وقت تھا کہ پورا اودھ کوہ آتش فشاں شعلہ جوالہ بنا ہوا تھا اور عوام باوجود بے سرو سامانی اور تہی دستی کے ایک نہارو باجبروت طاقت کے مقابلے میں سر سے کفن باندھ کر میدانِ عمل میں اُتر آئے تھے۔ وہ اضلاع اودھ سے لکھنؤ میں جمع ہو رہے تھے

وہ اس تخت پر اپنی جان نثار کرنے آئے تھے جس سے ان کو بدگمان بنایا جاتا تھا۔ حاکم وقت سے ایسی عقیدت اس زمانے میں دلی کے بعد لکھنؤ میں ہی ملتی ہے جو بقول مولوی عبدالحلیم شرر ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ تھا۔ گاؤں اور قصبوں تک کی یہ حالت تھی کہ

"قصبہ اناؤ کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں جس کا رقبہ صرف پون میل تھا لڑنے والوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور گاؤں کے تمام گھروں میں ریفیاں بنی ہوئی تھیں۔

(مولوی ذکاء اللہ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۸۶۲)

انھیں مجاہدین کی ان تھک کوششوں کے نتیجہ میں صرف گیارہ دن کے اندر انگریزی عمل داری کے سارے تانے بانے توڑ کر اودھ ایک آزاد ملک بن گیا۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ صرف گیارہ روز کے اندر اودھ کے تمام اضلاع میں حکومت برطانیہ کا کوئی حاکم موجود نہ تھا اور انگریزی عمل داری محض خواب معلوم ہوتی تھی (ایضاً ص ۸۱۸)

منادی ہوئی کہ پرسوں بیلی گارد پر حملہ ہوگا۔ مسلمانوں نے قرآن شریف اور ہندوؤں نے گنگا جل اٹھا کر قسم کھائی کہ جب تک محصورین کو تہ تیغ کرکے بیلی گارد کو زمین کے برابر نہ کر دیا جائے گا کھانا پینا اور اپنا ذاتی کام کرنا سب حرام ہے۔ کل انگریز نہیں یا ہم نہیں۔

(قیصر التواریخ ؛ ص ۲۳۲)

سر ہنری لارنس نے لفٹنٹ گورنر کو لکھا کہ "سارے اضلاع ہمارے ہاتھ سے نکل گئے اور ہر روز حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ سارے تعلقہ دار مسلح ہو رہے ہیں اور بعض نے دیہات پر قبضہ کر لیا ہے" (عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۸۱۶)

بیلی گارد پر پہلا حملہ مولوی احمد اللہ کی سپہ سالاری میں ہوا۔ مولوی صاحب نے فوج میں اعلان کیا "بیگم کے حکم سے لڑنے جاتے ہو، تنخواہ بھی وہی دیں گی"۔ قیصر التواریخ ص ۲۶۰) حملے کے روز بیگم کو رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ لوگ ان کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے" (عبدالحلیم شرر : مشرقی تمدن کا آخری نمونہ۔ ص ۱۳۸)

دلی کی شکست نے تازیانے کا کام کیا اور حملوں کا زور اور بڑھ گیا۔ ایک اشتہار شایع ہوا۔ "سب خاص و عام بگوش ہوش سنیں کہ ان کافروں نے جب دلی کو ختم کیا۔ وہاں کسی کو

جیتا نہ چھوڑا۔ اِسی طرح تمہارے بال بچے مار ڈالے جائیں گے۔ مقامِ غیرت ہے کہ آنکھوں کے سامنے عورت اور بچّے مارے جائیں یا ذلیل ہوں۔ اے بہادرو یہ گورے ۵۰۰ سے زیادہ نہیں۔ اگر انھیں مار لو تو تمام عمر چین سے رہیں گے۔ (قیصر التواریخ ص ۲۶۴) ۵ ستمبر جنرل سید برکات احمد اور کپتان صوبہ سنگھ نے اپنے اپنے رسالوں کے ساتھ بیلی گارد پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ مولوی ذکاء اللہ کے بقول اس کی سب سے بڑی خندق اڑ گئی، باغی زینے لے کے آگے بڑھے اور توپ کی زدوں میں گھس گئے۔ آج وہ دلیری سے حملہ کرنے آئے تھے۔ انگریزی سپاہ کو پریشان کرنے کے لیے رات کو گھنٹوں شور و غل مچاتے۔ (عروجِ سلطنتِ انگلشیہ ص ۱۸۵)

ایک روز علی محمد خاں نے علم اُٹھایا اور قرآن شریف کو مثل جنگِ صفین اس میں باندھا اور کلماتِ یاس کہتے رہے (قیصر التواریخ ص۔ ۲۸۰) ایک فقیر منش بزرگ جنھیں عوام عقیدت میں شاہ جی کہتے تھے۔ ان کے جوش و خروش کی یہ کیفیت تھی کہ یکہ و تنہا تلوار ہاتھ میں لے کر بیلی گارد پر اشعار ذیل پڑھتے ہوئے حملہ آور ہوئے ؎

درمیانِ ایں و آں گردد بسے جنگِ عظیم

قومِ عیسیٰ را شکستِ بے گماں پیدا شود (ایضاً ص ۲۰۵)

انھیں حملوں میں سر ہنری لارنس انقلابیوں کی گولیوں کا شکار ہوا۔ لارڈ کیننگ تک کی رائے میں دوسری جگہوں پر جنگ کی نوعیت کچھ بھی رہی ہو لیکن اودھ میں ہماری حکومت عوامی بغاوت ہی سے دوچار تھی۔" (Canning Secret Committee of Court of Directors 17th June, 1858 Freedom Struggle in U.P. P. 353)

انگریز اپنی حفاظت کے لیے ریذیڈنسی میں مقیم تھے لیکن ہندوستانی سپاہی باوجود جان توڑ کوشش کے اس پر قبضہ نہیں کر سکے تھے۔ ریذیڈنسی محاصرہ میں تھی ایک بیان کے مطابق انقلابیوں نے سینتیس[۳۷] بار اسے اڑانے کی کوشش کی مگر انگریزوں کے سکھ ساتھیوں نے تمام کوششیں ناکام بنا دیں۔ پھر تناسب نہ فوج کا تھا نہ مالی بندوبست کا۔

" فیروز شاہ ناظم بخت کے لڑکے اور فرخ سیر بادشاہ دہلی کے نواسے، نانا راؤ اور جنرل بخت خاں بھی اس وقت آ گئے تھے اور حضرت محل کے یہاں بطور مہمانِ خاص مقیم تھے ان ہر سہ فدائین کی موجودگی اور حضرت محل کے استقلال نے جنگ کو مارچ تک جاری رکھا۔"

کانپور کی شکست کے بعد تانتیا ٹوپی بھی لکھنؤ آئے۔ حضرت محل نے شیش محل میں آتارا۔ گیارہ ضرب توپ کی سلامی ہوئی، ۲۵ ہزار دعوت کے دو شالے، رومال اور خلعت اس کے علاوہ عطا ہوئے۔" انیس فاطمہ ۱۸۵۷ء کے ہیروص: ۲۵-۳۷)

اگست میں لڑائی کا زور پھر بندھ گیا کیونکہ کانپور سے شکست کھا کر فوج کی کافی تعداد خدا حسین رسالدار کی معیت میں لکھنؤ آگئی تھی۔

اِدھر دوسری طرف ہیولاک زبردست فوج لے کر کانپور سے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اودھ کی زمین پر قدم رکھتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ لکھنؤ تک پہنچنا آسان نہیں۔ انقلابی کیمپ میں باغی فوجیں اور تعلقدار دور دور سے آکر جمع ہو رہے تھے۔ ۲۹ رجولائی کو اُناؤ اور بشیرت گنج کے زبردست معرکوں میں پسپائی کے بعد اس نے کلکتہ اوٹرم کے پاس مدد کے لیے پیغام بھیجا (سر جیمس اوٹرم ایران سے واپسی پر کلکتہ پہنچا تھا اور اودھ کا چیف کمشنر مقرر کیا گیا تھا) ہیولاک کے پیغام پر اوٹرم اپنی فوج کے ساتھ ۱۶ رستمبر کو کانپور پہنچا اور ۲۰ ستمبر کو لکھنؤ کی طرف کوچ کیا۔ ۲۳ رستمبر کو کمپنی کی مشترک فوجیں جس میں ایک رجمنٹ سکھوں کی بھی تھی لکھنؤ سے چھ میل دور کانپور روڈ پر واقع عالم باغ جو اس وقت شہر سے باہر کا علاقہ تھا پہونچیں۔ حضرت محل سے ان برطانوی افواج کا مقابلہ پہلے عالم باغ ہی میں ہوا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی بہت سے انگریز فوجی افسر مارے گئے۔ حضرت محل ایک گرانڈیل ہاتھی پر سوار فوج کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔ سرفراز بیگم لکھنوی نے کلکتے کی اختر محل کو اپنے خط میں لکھا تھا "میں نہیں سمجھتی کہ حضرت محل ایسی آفت کا پرکالہ ہے۔ خود ہاتھی پر بیٹھ کر تلنگوں کے آگے آگے فرنگیوں سے مقابلہ کرتی ہے ..... اور اس کو ہراس مطلق نہیں ہے۔" (بیگماتِ اودھ کے خطوط) سب سے خوفناک جنگ چارباغ کے پُل پر ہوئی لیکن بدقسمتی سے اس لڑائی میں بھی ہندوستانیوں کو شکست ہوئی جہاں تک شجاعت و ہمت کا سوال ہے اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں ع

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

زبردست جانی نقصان کے بعد انگریز ریذیڈنسی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور نو دن کی لگاتار جنگ کے بعد ریذیڈنسی کی فوجوں سے مل گئے شہر ابھی انقلابیوں کے قبضہ میں تھا۔ ریذیڈنسی کا محاصرہ جاری تھا اب ہیولاک بھی ریذیڈنسی میں قید ہو گیا تھا۔
کمپنی کی فوجوں کا نیا کمانڈر انچیف سر کالن کیمپ بل مقرر ہوا۔ کلکتہ میں مکمل تیاری کے بعد ریذیڈنسی کا محاصرہ توڑنے کی خاطر ۲ نومبر کو کانپور پہنچا اور ۹ نومبر کو عالم باغ میں جہاں انگریزی فوجوں کا پڑاؤ تھا اُن سے آملا۔ ریذیڈنسی کا ایک انگریز ہندوستانی بھیس میں ایک پرانے وفادار قنوجی لال کے ہمراہ نکل کر انگریزی کیمپ میں آگیا۔ اس انگریز کو بیس ہزار نقد کے علاوہ وکٹوریہ کراس دیا گیا اور اسسٹنٹ کمشنر کا عہدہ دیا گیا۔ قنوجی لال کو غداری کا انعام صرف تحصیل داری اور 5000 ہزار چاندی کے ٹکڑے دیئے۔ (سین: اٹھارہ سو ستاون شائع کردہ حکومت ہند ص ۲۲۸)

ان لوگوں کی رہنمائی میں سر کولن کیمبل ۱۲ نومبر کو روانہ ہوا۔ سکندر باغ، دل خوش باغ شاہ نجف اور موتی محل کی بھیانک خونریزی کے بعد انگریزی فوجیں ریذیڈنسی میں داخل ہو سکیں۔ ان معرکوں میں مردوں کے دوش بدوش کئی عورتیں بھی مصروف جنگ تھیں فوربس مچل نے ایک عورت کا ذکر کیا ہے جس نے ایک پیپل کے درخت سے بے شمار انگریز سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بنایا (ایضاً ص ۲۴۲)

لارڈ کیننگ کا اصرار تھا کہ لکھنؤ جس قدر جلد ممکن ہو سکے فتح کر لیا جانا ضروری ہے لارڈ کیننگ نے ۲۰ دسمبر کو لن کیمبل کو لکھا کہ "بالفعل فوراً اودھ کو لے لینا چاہیئے اور سب جگہوں سے زیادہ باغی وہاں جمع ہیں۔ اس کام میں اودھ کے خاندان کی طرف سب کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں کہ آیا ہم میں یہ قدرت ہے یا نہیں کہ اس پر اپنا تسلط قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس کی مثال دہلی کی سی ہے کہ لکھنؤ کا دوبارہ فتح نہ کرنا ہمارے حق میں ایسا ہی ہے جیسا کہ دہلی سے واپس چلے آنا ہوتا۔" (تاریخ عروج عہد انگلشیہ تاریخ بغاوت ہند حصہ سوم ص ۴۴) ادھر برطانوی افواج کی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ ایک زبردست گورکھا فوج بھی سپہ سالار جنگ بہادر کے ماتحت لکھنؤ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ۲۵، فروری ۱۸۵۸ء حضرت محل خود برجیس قدر کو لے کر میدان جنگ میں آئیں۔ اس سے جوش و خروش میں اضافہ تو ہوا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ۱۱ مارچ ۱۸۵۸ء گورکھا

فوج بھی انگریزی لشکر سے آکر مل گئی اور انگریزی تلواریں لکھنؤ پر مکمل اقتدار کے لیے بے نیام ہو گئیں۔ ادھر کیمبل اور اوٹرم نیپالی بندوقوں کے سائے میں اس اودھ کو ختم کرنے کے درپے ہو رہے تھے جہاں بقول گورنر جنرل سب سے زیادہ باغی جمع تھے۔ ادھر لکھنؤ کا بچہ بچہ سر سے کفن باندھ کر ملک و قوم کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو گیا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ رقم طراز ہیں "ستر اسی ہزار آدمی بہادری، استقلال اور ہوشیاری سے اپنے مستحکم مقام کو استوار کر رہے تھے جن کو قومی عزت، مذہبی دیوانگی نے جوان مرد عورت حضرت محل نائب السلطنت کے علموں کے نیچے شہر میں جمع کیا تھا۔" (ایضاً ص ۵۹) بیگم حضرت محل ناکامیوں سے دل شکستہ ہونا نہیں جانتی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس فوج نے ان پر یورش کی تھی تعداد و اہتمام میں انگریزوں نے اتنی بڑی فوج کبھی صف آرا نہیں کی تھی۔ وہ ایک مقام سے ہٹ کر دوسرے مقام پر مورچہ بندی کرتی رہیں۔ ان کی کوٹھی چوکھی پر سخت لڑائی ہوئی۔ قریب تھا کہ چوکھی پر قبضہ ہو جائے کہ عین اسی وقت خان علی خاں ایک ہزار سپاہ کے ساتھ آ گئے۔ خوب رن پڑا۔ چمن گھون کی نہر جاری تھی پیچھے سے جنگ بہادر نے باڑھ ماری سینکڑوں گر پڑے خان علی خاں بھی زخمی ہوئے یہ جانتے ہوئے بھی کہ حملہ کا رخ چوکھی کی جانب ہے حضرت محل کسی طرح بھی چوکھی چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ (قیصر التواریخ ص ۳۲۳) بقول ذکاء اللہ بیگم کی کوٹھی پر جیسی سخت لڑائی ہوئی ایسی کوئی اور لڑائی اس محاصرہ میں نہیں ہوئی۔ آٹھ نو گھنٹے تک گولہ زنی رہی تو ایک دراڑ پڑی (تاریخ بغاوت ہند حصہ سوم ص ۶) بالآخر نے پیسر نے یورش کر کے اسے لے لیا حملہ آوروں کے بیان کے مطابق ایک ایک انچ زمین پر سخت لڑائی ہوئی اور اہم مقامات بیگم کوٹھی سکندر باغ، موتی محل، شاہ نجف، قیصر باغ وغیرہ پر سپاہیوں کی لاشوں سے گذر کر قبضہ ہو سکا (مرزا علی اظہر برلاس: تاریخی شہ پارے۔ ص ۱۴۸) سکندر باغ کے ایک مقام پر زخمیوں اور مقتولین کا بھیانک ڈھیر تقریباً ایک گز یا اس سے بھی زیادہ اونچا تھا۔ (تاریخی شہ پارے ص ۲۹۸) انگریزی سپہ سالار کولن کیمپبل کے الفاظ میں "اس سے زیادہ بہادری کہیں نہیں دیکھی گئی" (علی گڑھ میگزین سنہ ۱۹۴۲ء ص ۲۸۳)

لکھنؤ کے انقلابی عوام دس دن تک لڑتے رہے شہر کے چپے چپے پر شہیدانِ وطن کے پاک خون کی گلکاریاں ہوگئیں۔ دشمن کی متحدہ تازہ دم اور نئے ہتھیاروں سے لیس فوجیں بڑھتی جارہی تھیں (خورشید مصطفےٰ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۳۹۱) اسی دوران ایک صبح کو اشارۃً دارونہ واجد علی نے حضرت محل کو بہت سمجھایا لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا لیکن بنگال اور دہلی کی طرح ریشہ دوانیوں کا سلسلہ اودھ میں بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ پسپائی کے آثار دیکھ کر ہزارہا ملازم نمک حرام ہوگئے تھے۔ مہاراجہ بال کرشن انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس کے ایماء پر بہت سے تعلقداروں کا تحصیلِ زر کے بہانے مع افواج کے چلے جانے سے تحریک میں اضمحلال پیدا ہو چلا تھا۔ انگریزی افواج جدید اسلحہ اور توپ خانوں سے لیس تھیں اور ان وجوہات کے سبب جنگ نے اب جارحانہ انداز کے بدلے مدافعانہ صورت اختیار کرلی تھی۔ اس دوران جنگ بہادر وزیر اعظم نیپال نے کالن کیمپبل اور جنرل اوٹرم کا ساتھ دے کر جنگ کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔ آخر ۱۹ مارچ ۱۸۵۸ء میں موتی باغ کی شکست کے بعد لکھنؤ کی لڑائی بالکل ہی بے جان ہوگئی۔ آخری جنگ عیش باغ پر ہوئی۔

دورانِ جنگ حضرت محل کی شخصیت میں کچھ عجیب و غریب کشش پیدا ہوگئی تھی ان کی غیر معمولی شجاعت و مستعدی کا تذکرہ کرتے ہوئے مارشمن نے اعتراف کیا "لکھنؤ میں باغیوں نے جو مقاومت کی وہ ایسی سخت تھی کہ کبھی انگریزی فوج کو سابقہ نہیں پڑا تھا حتیٰ کہ دہلی میں بھی ایسی سخت مقاومت نہیں کی گئی۔ باغیوں کا جوش بیگم اودھ کی وجہ سے بڑھا ہوا تھا جو غیر معمولی مستعد اور سرگرم عورت تھی اور تمام بغاوت کی روحِ رواں رہی۔ پورے دس دن تک لڑائی ہوتی رہی جب کہیں جاکر اس مستحکم شہر کی تسخیر مکمل ہوئی (مارشمین ہسٹری آف انڈیا ص ۵۱۷)

حضرت محل نے قریب دس ماہ بے جگری سے انگریزی افواج کا مقابلہ کیا۔ (طفیل منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۹۱) اور جنگِ آزادی کی تاریخ میں ایک روایت بن گئیں۔

دورانِ جنگ جنرل اوٹرم نے صلح کی کئی شرطیں پیش کیں جنھیں غیور ملکہ

بے نیازی سے ٹھکراتی رہی۔ جنرل اوٹرم کی پہلی پیشکش یہ تھی کہ ممالک محروسہ سرکار سے موافق عہد دولت نواب شجاع الدولہ ملے گا بشرطیکہ لڑائی موقوف کردی جائے اور ان باغیوں کو نکالنے کی تدبیر کریں گے اور مسافران کلکتہ اور لندن کو بھی بلوادیں گے۔ حضرت محل کو اپنی فوج کی کامیابی پر اعتماد تھا۔ جنرل اوٹرم کی پیش کش کو اس قابل نہ سمجھا کہ جواب دیتیں۔ یا بہ الفاظ صاحب قیصر التواریخ۔ یہاں خود آئینی غلط بات کب سنتے تھے۔ بعض نے جانا اب بہ مغلوب ہوچکے ہیں جب یہ آئینی بات کرتے ہیں خدا نے چاہا تو ہم انھیں نکالے دیتے ہیں (قیصر التواریخ۔ ج ۲ ص ۳۴۴) اوٹرم کا دوسرا صلح نامہ حضرت محل کو اس وقت ملا جب وہ قیصر باغ سے شکست کھا کر غلام رضا کے مکان پر اپنی پسپا ندہ طاقت جمع کر رہی تھیں۔ اوٹرم کی شرط یہ تھی، ہم زمانۂ واجد علی شاہ کا بدستور تمہارا ملک دیں گے جنگ سے دست بردار ہو جائیے۔ فوج مغلوبہ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ حضرت محل نے اوٹرم کی اس شرط کو نہایت حقارت سے ٹھکرا کر صلحنامہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ (ایضاً)

اوٹرم کو اپنی کامیابی کا جتنا یقین بڑھتا گیا صلح کی شرطیں بھی اتنی عامیانہ ہوتی گئیں اس کی تیسری اور آخری پیش کش جو حضرت محل کو نواب شرف الدولہ کے مکان پر ملی یہ تھی کہ صرف ۲۵ ہزار روپیہ ماہانہ ملے گا۔ (ایضاً) جس غیور دختر وطن نے عہد شجاع الدولہ و زمانۂ واجد علی شاہ کا ملک انگریزوں کا عطیہ سمجھ کر لینے سے انکار کر دیا ہو وہ ان چند ہزار روپیوں کی کیا حقیقت سمجھتی۔

جس وقت انگریزوں کی کامراں فوجیں لکھنؤ میں داخل ہوئیں شہر لکھنؤ شہر خموشاں کا منظر پیش کرتا تھا۔ ہر چہار طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ گلیوں سے کتے شہر کے معلوم نہیں کہاں چھپ رہے تھے، کوئی پرندہ آسمان پر نظر نہیں آتا تھا۔ ہر کوچے سے وحشت برستی تھی اور خون ناحق کی بو آتی تھی اور عورات پردہ نشین کو پردے کا کب ہوش رہا تھا، وارث مسلح آگے عورات چادر اوڑھے پیچھے چلی جاتی تھیں۔"

(قیصر التواریخ ج ۲ ص ۳۲۶)

لکھنؤ کے زوال کے بعد کمپنی کی فوج نے جس طرح کھلے عام لوٹ، قتل عام اور قتل سے پہلے جس طرح کی اذیت لوگوں کو پہنچائی اس کی کئی مثالیں رسل نے دی ہیں مثلاً "کچھ سپاہی ابھی زندہ تھے اور ان پر رحم کر کے انھیں مار ڈالا گیا لیکن ان میں سے ایک کو کھینچ کر مکان سے باہر رتیلے میدان میں لایا گیا۔ اسے ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچا گیا۔ ایک سہولت کی جگہ پر لایا گیا۔ وہاں اس کو لٹایا گیا کچھ انگریز سپاہیوں نے اُس کے منہ اور جسم میں سنگین بھونک کر اسے لٹائے رکھا۔ دوسرے لاش کو جلانے کے لیے لکڑی لے آئے جب سب تیار ہو گیا تو اسے زندہ بھون دیا گیا۔ اس کام کو کرنے والے انگریز تھے اور کئی افسر کھڑے دیکھتے رہے لیکن کسی نے مداخلت نہ کی۔ اس دوزخی ظلم و ستم کی خوفناکی اس وقت اور زیادہ بڑھ گئی جب اس بدقسمت ستم زدہ نے ادھ جلی اور زندہ حالت میں بھاگ کر بچنے کی کوشش کی۔ یکایک کوشش کر کے وہ چتا سے کود پڑا۔ اس کے جسم کا گوشت ہڈیوں سے لٹک رہا تھا۔ وہ کچھ دور دوڑا پھر پکڑ لیا گیا، واپس لایا گیا، پھر آگ پر رکھ دیا گیا اور جب تک راکھ نہ ہو گیا سنگینوں سے دبا کر رکھا گیا۔

(رسل نامہ نگار خصوصی اخبار لندن ٹائمز کی ڈائری ص ۲، ۳ بحوالہ سندر لال 'سن ستاون' ص ۱۹۳)

اس کے برخلاف انقلاب کے ابتدائی دنوں میں جب لکھنؤ میں انقلابیوں کا پلہ بھاری تھا کچھ انگریز مرد عورتیں لکھنؤ میں قید کر لیے گئے تھے۔ لیکن چھ ماہ تک انھیں کوئی نقصان نہیں پہونچایا گیا جس وقت کمپنی کی فوج نے شہر میں گھس کر بے قصور لوگوں کا قتل عام شروع کیا کچھ جوشیلے انقلابیوں نے محل میں جا کر بیگم سے درخواست کی کہ انگریز قیدیوں کو ہمارے حوالے کر دیجیے۔ بیگم نے سات یا آٹھ انگریزوں کو ان کے حوالے کر دیا جنھیں فوراً گولی سے اڑا دیا گیا۔ لیکن عورتوں کے بارے میں بیگم نے ان لوگوں کی مانگ کو پورا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بیگم نے فوراً محل کے زنان خانے کے اندر ان انگریز عورتوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ بیگم کا یہ اقدام عورتوں کی شان اور آن کو بڑھانے والا تھا۔

(چارلس بال۔ انڈین میوٹنی بحوالہ سندر لال، سن ستاون۔ ص، ۱۹۴)

لکھنؤ کی فتح کے بعد انگریزوں نے حضرت محل کو دشمن نمبر ایک ٹھہرایا۔ آخرکار

۱۶ر مارچ ۱۸۵۸ء کو انھیں لکھنؤ کو خیر باد کہنا پڑا، قریب شام انتہائی دل شکستہ ناکر عالم باغ سے پینس میں سواری نکلی، نواب محمد خاں اور احمد حسین کے علاوہ ایک لاکھ کا مجمع بھی ان کے ہمراہ تھا۔ مولوی احمداللہ شاہ نے ان کے بعد بھی لڑائی جاری رکھ کر برجیس قدر اور حضرت محل کیلئے آزادی کے ساتھ چلے جانے کا موقع پیدا کر دیا تھا۔" (مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، ص ۱۲۹) صبح کو بھراؤں پہونچیں۔ اب اس وقت بھی اگرچہ سوار انگریزی پہونچتے بے تکلف گرفتار کر لیتے اس کا سبب نہیں معلوم، حکام نے کیوں اس کا خیال نہیں کیا اور ایسی خبر عظیم سے کس وجہ سے غفلت کی۔ راجہ مردان سنگھ زمیندار نے ایک چوپال رہنے کو دیا اور خود حاضر نہ ہوا۔ خلاصہ یاری ہو کر خیرآباد پہونچیں، بہر کیف ناظم قسمت اول خیرآباد، مولوی عماد الدین عرف مولوی محمد ناظم بسواں باڑی جو سندیلہ میں لڑتا رہا اور بڑی نمود سے مارا گیا۔ بہ محبت سننے خبر آمد جناب عالیہ تین کوس سے استقبال کیا۔ بڑی دھوم نقارہ و شانِ جلوس سواری سے مرزا بندہ علی بیگ کے امام باڑے میں اتارا۔ راہ میں فقراء کو دو ہزار خیرات کئے۔ جب داخل شہر ہوئیں تو پیں سلامی کی چلیں۔ وہاں صلاح یہ ٹھہری کہ بریلی کو چلیں، اکثروں کا رجحان یہ ہوا کہ ابھی اپنے ممالکِ محروسہ میں توقف مناسب ہے جب اور گذر گاہ نہ رہے گی اور کہیں پناہ نہ ملے گی ملکِ غیر میں مجبوری چلے جائیں گے۔ بعد اس کے محمود آباد راجہ نواب علی خاں کے گھر میں مہمان ہوئیں پھر بھٹولی راجہ منوا کی گڑھی میں رہیں۔ وہاں وکیل راجہ ہردت سنگھ میواتی حاضر ہوا۔ عرض کی کہ ہم آپ کے بہر حال شریک و فرمانبرداری میں ہیں احتمال راجہ منوا کا انگریزوں سے ساز کا ہے۔ پھر وہاں سے وکیل کے ساتھ داخل بونڈی ہوئیں جو ضلع بہرائچ میں تھا چند روز میں جتنے لکھنؤ سے بھاگے تھے اندرونی اور بیرونی مع سپاہ جنگی سب جمع ہو گئے اور زمین قدیم و جدید مع بیگمات و محلات اور امراء و رعایا وغیرہ آپہنچے اور جتنے اہل حرفہ تھے اور اہلِ بازار مع اجناس از خود جمع ہوئے مثل لکھنؤ چوک آباد ہو گیا۔ بونڈی کی چہل پہل اور بازاروں کی رونق لکھنؤ کی یاد تازہ کرتی تھی۔" (قیصر التواریخ ص ۳۳۶ تا ۳۳۸) اس کے سوا زمینداروں و تعلقداروں

نے بے طلب زرِ تحصیل بھیجنا شروع کیا۔ اندازے کے مطابق اس وقت بھی ان کے ساتھ پورہ سولہ فرمانبردار تھے۔ یہ وہ زمیندار تھے جنھوں نے انگریزوں پر کئی حملوں کو منظم کیا تھا غدر کی پوری تاریخ میں یہ معرکے انگریزوں کے لیے سخت ترین تھے۔ حضرت محل کئی معرکے گرم کرنے کے بعد جب بونڈی میں اپنی منتشر قوتوں کو یکجا کر رہی تھیں اس اثنا میں برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی ختم کرکے ہندوستان کا نظم ونسق براہِ راست تاج برطانیہ کے تحت لے لیا۔ پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کو بمقام الہ آباد ایک پُرشکوہ دربار میں ملکہ وکٹوریہ کا فرمان پڑھا گیا حضرت محل اعلان کی خامیوں پر ہندوستانی لیڈروں کی خاموشی برداشت نہ کرسکیں۔ اپنی فرودگاہ بونڈی سے انھوں نے اس فرمان کو چیلنج کیا اور بتایا کہ اس میں حقیقت کچھ بھی نہیں۔ بیان کے تیکھے پن سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کی یہ دخترِ عظیم جنگ ضرور ہار گئی تھی لیکن ہمت نہیں۔ میدانِ جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھانے والی ملکہ کی فراست کے نکتے بھی ملاحظہ ہوں۔

"چند ناعاقبت اندیش لوگوں نے یہ خبر مشہور کر رکھی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے لوگوں کی خطائیں اور جرم بخش دیئے ہیں۔ ہماری نظر میں ایسا ہونا نہایت تعجب خیز ہے۔ کیونکہ آج تک کسی نے نہیں دیکھا کہ انگریزوں نے کسی کا قصور چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا کبھی معاف کیا ہو، اور اس میں ایسی سختی برتی گئی ہے کہ اگر کبھی کوئی چھوٹی سی غلطی بھی لاعلمی یا بے احتیاطی سے ہو جائے تو وہ کبھی معاف نہیں کرتے۔

پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کا جو اعلان ہمارے سامنے آیا ہے بالکل صاف ہے اور چونکہ کچھ نہ کچھ آدمی اس اعلان کا مطلب نہ سمجھنے کی وجہ سے گمراہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے ہم ہمیشہ سے حکومت کرتے آئے اور اودھ کے لوگوں کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر موجودہ فرمان جاری کرتے ہیں تاکہ لوگوں پر پہلے اعلان کی خاص خاص باتوں کا اصلی بھید کھل جائے اور ہماری رعایا ہوشیار ہو جائے۔

اس اعلان میں لکھا ہے کہ ہندوستان کا ملک جو ابھی تک کمپنی کے سپرد تھا

اب ملکہ نے اپنی حکومت میں شامل کر لیا ہے اور آئندہ سے ملکہ کے قانون کو مانا جائے گا ہماری حق شناس رعایا کو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ کمپنی کے قانون، کمپنی کے انگریز ملازم، کمپنی کے گورنر جنرل اور کمپنی کی عدالتیں سب جیوں کی تیوں بنی رہیں گی۔ تو پھر یہ نئی بات کونسی ہوئی جس سے عوام کو فائدہ ہوا اور وہ اس پر بھروسہ کر سکیں۔

اس اعلان میں یہ بھی لکھا ہے کہ کمپنی نے جو وعدے اور عہد و پیمان کیے تھے ملکہ انھیں منظور کرے گی۔ لوگوں کو چاہیئے کہ اس چال کو غور سے دیکھیں، کمپنی نے سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا ہے۔ اگر یہ بات قائم رہی تو پھر اس میں نئی بات کیا ہوئی، کمپنی نے بھرت پور کے راجہ کو اپنا بیٹا بنایا اور پھر اس کا علاقہ لے لیا، لاہور کے راجہ کو لندن لے گئے اور پھر کبھی اسے ہندوستان لوٹنے نہیں دیا۔ نواب شمس الدین خاں کو پہلے تو انھوں نے پھانسی پر لٹکایا اور پھر دوسری طرف اظہار افسوس کیا۔ پیشوا کو انھوں نے پونا اور ستارہ سے نکال دیا اور زندگی بھر کے لئے بٹھور میں قید کیا۔ ٹیپو سلطان کے ساتھ ان کی عیاری کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ بنارس کے راجہ کو انھوں نے آگرے میں قید کر دیا، گوالیار کی ریاست کا انتظام انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہاں انگریزی رسوم کو رواج دیا، بہار بنگال اور اڑیسہ کے راجاؤں کا انھوں نے نام و نشان تک نہیں چھوڑا۔ فرخ آباد کے رئیس کو برائے نام وظیفہ دیا اور اس کی ریاست ہضم کر گئے، شاہجہانپور، بریلی، اعظم گڑھ، جون پور، گورکھپور، اٹاوہ، الہ آباد، فتح پور وغیرہ جو ہماری قدیم مملکت میں شامل تھے انھوں نے اس وعدے پر لیے کہ فوج کو وہ خود تنخواہ دیں گے اور ہمارے ساتھ جو صلح کی (معاہدہ ۱۸۰۱ء) اس کی ساتویں دفعہ میں قسم کھائی کہ ہم آپ سے اور کچھ طلب نہ کریں گے۔ اب اگر جو انتظام کمپنی نے کر رکھے ہیں وہ سب منظور کئے جائیں تو اس سے پہلے کے حالات میں اور موجودہ حالات میں کیا فرق پڑتا ہے؟ خیر یہ سب تو پرانی باتیں ہیں۔ لیکن حال میں قسموں اور عہد ناموں کو توڑ کر اور باوجود اس بات کے کہ انگریزوں نے ہم لوگوں سے کروڑوں روپے قرض لے رکھے تھے انھوں نے بغیر کسی سبب صرف یہ بہانہ تراش کر کہ آپ کا انتظام اچھا نہیں ہے اور آپ کی رعایا خوش نہیں ہمارا ملک اور کروڑوں

روپے کا مال ہم سے چھین لیا۔ اگر ہماری رعایا ہمارے پرانے نواب واجد علی شاہ سے خوش نہ تھی تو ہم سے کیسے خوش ہو گئی۔ کبھی بھی کسی رعایا نے حکمراں کے لئے اپنا جان و مال قربان کرکے اپنی وفاداری کا ایسا ثبوت نہیں دیا جیسا ہماری رعایا نے ہمارے ساتھ کیا۔ پھر کیا سبب ہے کہ وہ ہمارا ملک ہمیں واپس نہیں دیتے۔

اعلان میں یہ بھی درج ہے کہ ان کو اپنی مملکت کی حدود بڑھانے کی خواہش نہیں ہے لیکن اس کے باوجود الحاق سلطنت کا جاری ہے۔ اگر ملکہ نے حکومت اپنی اپنے ہاتھوں میں لے رکھی ہے تو ہمارا ملک ہم کو کیوں واپس نہیں کرتے۔ جب کہ ہماری رعایا کی بھی یہ دلی خواہش ہے۔ سب جانتے ہیں کہ کسی بادشاہ یا ملکہ نے بغاوت کی سزا ساری فوج اور رعایا کو کبھی نہیں دی، سبھی کو معاف کیا جاتا رہا اور ذی فہم لوگ ہندوستان کے تمام باشندوں اور فوجوں کو سزا دینا کبھی پسند نہیں کرتے کیونکہ جب تک سزا دی جاتی رہے گی یہ فساد کبھی نہیں رک سکتا۔ مشہور مقولہ ہے کہ "مرتا کیا نہ کرتا"، یہ ممکن ہی نہیں کہ ہزار آدمی لاکھوں کا مقابلہ کریں اور سب بچ جائیں۔ اعلان میں یہ بھی مذکور ہے کہ عیسائی مذہب برحق ہے لیکن کسی دوسرے مذہب کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ اور سب کے ساتھ یکساں انصاف ہوگا۔ عدالت گستری میں کسی مذہب کے برحق یا باطل ہونے سے کیا بحث ہے؟ مذہب وہی برحق ہے جو ایک خدا کو تسلیم کرتا ہے اور اس ایک کے علاوہ کسی کو نہ ملنے، اور جب کسی مذہب میں تین خدا ہوں تو صرف ہندو اور مسلمان بلکہ یہودی اور وہ بھی جو سورج اور آگ کی پوجا کرتے ہیں اس کو صحیح تسلیم نہیں کرسکتے۔ سوئر کھانا، شراب پینا سوئر کی چربی لگے کارتوسوں کو کاٹنا، آٹے اور مٹھائی میں سوئر کی چربی ملانا، راستہ بنانے کے بہانے ہندوؤں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو منہدم کرنا، گرجے بنانا، عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے گلی کوچوں میں عیسائی راہبوں کو بھیجنا، انگریزی اسکول قائم کرنا، لوگوں کو روپے کی طرح دے کر اپنی مذہبی باتیں سکھانا جب کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے معبد کا آج تک کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ کیونکر لوگ اعتبار کریں کہ ان کا دین محفوظ رہے گا۔ بغاوت کی ابتدا ہی مذہب سے

ہوئی۔ اور اسی مذہب کے لیے لاکھوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ ہماری رعایا ہرگز دھوکے میں نہ آئے۔ شمال مغرب ہزاروں کی عاقبت برباد ہوئی اور ہزاروں نے مذہب نہ چھوڑنے کے باعث پھانسی پائی۔

اعلان میں یہ بھی لکھا ہے کہ جن لوگوں نے باغیوں کو پناہ دی ہے یا جو باغیوں کے سردار تھے یا جنھوں نے بغاوت پر لوگوں کو اُکسایا ہے اُن سے اس کا قصاص لیا جائیگا لیکن یہ کہ جب یہ ہوگا سمجھ کے کیا جائے گا اور جن لوگوں نے قتل و غارت کیا ہے یا قاتل اور خونی کی مدد کی ہے اُن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی باقی سب کو معاف کر دیا جائیگا ایک معمولی آدمی بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس اعلان کے مطابق قصوروار اور بے قصور کوئی بھی نہیں بچ سکتا سب ہی کچھ لکھا ہے اور پھر بھی کچھ نہیں لکھا۔ ایک بات اس میں کہی گئی ہے اور وہ یہ کہ کسی بھی قصوروار کو چھوڑا نہ جائے گا۔ اس لیے جس گاؤں اور علاقے میں ہماری سپاہ نے پڑاؤ کیا۔ اس کے باشندے نہیں بچ سکتے۔ اس اعلان کو پڑھ کر جس میں صاف دشمنی بھری ہے ہمیں اپنی پیاری رعایا کی حالت پر افسوس ہے۔ اب ہم یہ صاف حکم جاری کرتے ہیں کہ ہماری رعایا میں جن لوگوں نے بیوقوفی کرکے گاؤں کے چودھری کی حیثیت سے خود کو انگریزوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ وہ پہلی جنوری ۱۸۵۹ء سے پہلے ہمارے کیمپ میں حاضر ہوں۔ ان کا قصور معاف کر دیا جائے گا اور ان کی لیاقت کے مطابق اعزاز عطا ہوگا ہمارے اعلان کی صداقت اسی سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی فرمانروا، خطاپوش اور عطا شعار ہوتے ہیں۔ ہزاروں نے اس کو دیکھا ہے لاکھوں نے اُسے سُنا ہے کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا کہ کسی انگریز نے قصور معاف کیا ہو۔

اعلان میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ امن و امان ہو جانے کے بعد لوگوں کی خوشحالی کے لئے عوامی فلاح کے کام مثلاً راستے اور نہریں بنانے کا کام شروع کئے جائیں گے۔ سوچنے کی جگہ ہے کہ ان کے نزدیک ہندوستانیوں کے لئے راستہ بنانے اور نہریں کھودنے سے بہتر کوئی کام ہی نہیں اگر لوگوں کو اب بھی اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تو خدا ان کی حالت پر رحم کرے۔ ہماری رعایا میں کوئی انگریزوں کے دھوکے میں نہ آئے۔"

Foreign Political Consultations, 17th Dec. 1858 Nos. 250/54
National Archives, New Delhi

ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے بعد انگریزوں کی معافی اور پنشن کے ہر اعلان کو غیور ملکہ نے ٹھکرا دیا۔ دسمبر ۱۸۵۸ء کے آخر میں مجبور ہو کر بوندی بھی چھوڑنا پڑا۔ اب علاوہ اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ جس زمین پر حاکم بن کر رہیں اس پر غلامی کی ذلت کے بجائے کسی آزاد زمین پر مستقبل کی تلاش کریں۔ چند وفادار سپاہیوں اور جاں نثاروں کی معیت میں ہمالیہ کی ترائی کے گھنے جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے وہ نیپال پہنچیں لیکن شکست کے بعد بھی ان کے پائے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ زندگی کی آخری سانس تک وہ کبھی انگریزوں کے ہاتھ میں نہ پڑنے کے عہد پر قائم رہیں
(S.N. Chanda Untold Stories, P. 12)

نیپال میں حضرت محل کو ہر قسم کی تکالیف اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ٹبولی کی پہاڑی پر واقع آصف الدولہ کی بارہ دری میں انھیں مہاراجہ نیپال نے خبردار کیا۔
"آپ یا انگریزوں سے صلح کریں یا کسی اور طرف کو چلی جائیں۔ ہم سے توقع کسی قسم کی امداد و اعانت کی نہ رکھیے گا۔ ہم انگریزوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔" (قیصر التواریخ ج ۲ ص ۴۴۰)
حضرت محل کی طرف سے ممو خاں نے جواب دیا۔ ہم کسی طرف نہیں جائیں گے۔ یہیں رہ کر انگریزوں سے لڑیں گے۔ کچھ تمہارے بھروسے پر اُن سے نہیں بگاڑا ہے۔" (قیصر التواریخ ص ۴۴۱) اس کا جواب آیا "اُدھر سے انگریز اور ادھر سے ہم ماریں گے یہاں سے نکل جاؤ۔"
غرض یہ کہ خط و کتابت کے نتیجے میں حضرت محل، برجیس قدر اور ان کے ساتھ عورتوں و بچوں کو نیپال میں رہنے کی اجازت مل گئی اور مجاہدین کی کثیر تعداد نیپال کے پہاڑوں میں درندوں کی خوراک بن گئی۔

حضرت محل اور برجیس قدر کے قیام کی اجازت میں دو باتوں پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اول عورت ہونے کے باوجود انھوں نے اب تک جس غیر معمولی جرأت اور اولو العزمی کا ثبوت دیا تھا اس سے جنگ بہادر کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کے پاس جو کثیر تعداد میں قیمتی ہیرے اور جواہرات تھے انھوں نے ان سب کو حکومتِ نیپال کی نذر کر دیا۔"
(مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص ۱۵۵)

حضرت محل کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے سبھی رہنما یا تو اودھ چھوڑ کر چلے گئے یا مارے گئے تھے۔ ان کی لکھنؤ سے روانگی کے بعد صرف مولوی احمد اللہ شاہ تین ماہ تک مصروف کار رہے لیکن قضا و قدر کا فیصلہ ان کے خلاف ہو چکا تھا۔ شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کے ساتھ ہی جہد آزادی کا ایک اہم ستون گر گیا۔

اودھ کی جنگ آزادی ختم ہوئی لیکن ہندو مسلم اتحاد کی بے مثال یادگاریں چھوڑ گئی۔ انھیں میں سے ایک ناقابل فراموش کہانی کنور سنگھ کی ہے "جو اودھ کے جنگی محاذ آرائی کے ایک اہم رکن اور ہردوئی کے تعلقدار تھے اور فوج کے ایک حصہ کی کمانداری ان کے حصہ کی تھی۔ ہردوئی کے معرکے میں اس کی فوج گھر گئی اور فتح کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس نے اپنی فوج کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا اور اس کے حکم کے تحت سفید جھنڈے بلند کر دیئے گئے لیکن سفید جھنڈوں کے بلند ہونے کے بعد جب انگریز کمانڈر نے خود راجہ کنور سنگھ سے ہتھیار طلب کیے تو اس جواں مرد نے نہ صرف ہتھیار حوالے کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ایک ایسا جواب دیا جو بہادری، وفاداری اور حب الوطنی کی تاریخ میں رہتی دنیا تک یادگار رہیگا ہتھیار حوالے کرنے کے اصرار پر اس نے جرأت سے کہا "یہ فوجی میری ماتحتی میں تھے ان کی حفاظت اور خیر خواہی کا فیصلہ کرنا میرے اختیار میں تھا۔ انھیں ہلاکت میں ڈالنے سے میرے نزدیک کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے ان کے حاکم کی حیثیت سے انھیں حکم دیا کہ وہ ہلاکت میں نہ پڑیں لیکن میرا معاملہ تو دوسرا ہے میں ہتھیار کیسے ڈال سکتا ہوں، میں تو برجیس قدر کی ماتحتی اور ملکیت میں ہوں اور مجھے حکم دینے کے لیے وہ یہاں موجود نہیں۔ یہ کہہ کر اس جواں مرد نے تلوار کھینچی اور تنہا انگریزی فوج پر حملہ کیا اور سینکڑوں گولیوں کی باڑھ میں آناً فاناً مارا گیا۔" (جمیل مہدی نیا دور، یوم آزادی نمبر اگست ۱۹۷۳ء ص ۱۸)

اسی طرح کا ایک اور عدیم المثال واقعہ بینی مادھو سنگھ کا ہے۔ نیپال کی ترائی میں جن دنوں حضرت محل اپنی منتشر قوتوں کو یکجا کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں انھیں دنوں شنکر پور کے رانا بینی مادھو سنگھ نے جب اپنا قلعہ بغیر مزاحمت کے جنرل ہوپ گرانٹ کے حوالے کیا تو وہ سمجھے کہ مصالحت پر آمادہ ہے رانا نے جواب دیا "میں اپنے قلعہ

کی مدافعت سے معذور تھا آپ کے حوالے کر دیا لیکن میں خود کو آپ کے حوالے نہیں کر سکتا کیونکہ میری ذات میرے بادشاہ کی ملکیت ہے۔ نیپال کی ترائی میں سرگباشی رانا نے اپنے ناموس کو حضرت محل کی سرپرستی میں دیا اور اپنا مال و متاع اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھ کر اجازت دی کہ جس کا جو جی چاہے لے اور چلا جائے اور جو مردانہ وار مرنے کی آرزو رکھتا ہو ساتھ آئے۔ ڈھائی سو جوانوں میں سے صرف ۲ نے راہِ فرار اختیار کی باقی سب رانا کے ساتھ اس گھاٹی میں جان پر کھیل گئے۔ (نیا دور لکھنؤ، مارچ ۱۹۵۷ء ص ۱۶-۱۷، بحوالہ حالاتِ غدر منشی رام سہائے)

اس عرصے میں جنگ بہادر اودھ پر انگریزوں کا قبضہ کرا کر واپس آگیا تھا۔ نواب علی محمد خاں اور نیپالیوں سے روزانہ جنگی جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ آخر میں بہادر جنگ کی چالبازی ممو خاں کو گرفتار کرانے میں کامیاب ہوئی حبسِ دوام بعبور دریائے شور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی اور وہیں فوت ہوئے ان کے ساتھ ہی ان کی جماعت بھی منتشر ہو گئی۔

خدا کی قدرت ہے "کجا وہ محلاتِ شاہی جن پر بلاشبہ جنتِ ارضی کا گمان ہوتا تھا۔ کجا نیپال کی سنسان ویران پہاڑیاں۔ دیارِ غیر میں نگین کے چند تنکوں کی تلاش و جستجو اور پھر اس پر مستزاد صیاد کی برق آسا نظروں کا قیامت خیز سامنا لیکن پائے ثبات کو لغزش ہونا ممکن۔" (۱۸۵۷ء کے ہیرو ص ۷۴)

عرصے تک انگریزوں کی یہ خواہش بلکہ کوشش رہی کہ حضرت محل ہندوستان واپس آجائیں۔ ایک انگریز مصور جو برجیس قدر کی تصویر کھینچنے گیا تھا یہ پیغام بھیجا کہ "حکم سرکار ہے فیض آباد، لکھنؤ جہاں رہنا چاہیں آجائیں۔ تنخواہ کے علاوہ احترام شاہانہ کیا جائے گا۔" (قیصر التواریخ ج ۲ ص ۳۶۸) لیکن ہند کی مایہ ناز بیٹی نے نہ خود غلامی کی فضا میں جانا قبول کیا نہ اپنے بیٹے کو زندگی میں اس کی اجازت دی۔

"بیگم حضرت محل نے بعد شکست لکھنؤ اپنے لڑکے اور چند ساتھیوں کے ساتھ گورکھوں کے ملک میں رہنے کو ترجیح دی۔ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ علاوہ اس مشاہرے کے جو ان کے شوہر اودھ کے سابق بادشاہ کو دینا طے پایا تھا۔ ان کے شایانِ شان وظیفہ دیا جائے گا اور

انھیں یقین دلایا گیا کہ ان کو ان کے مرتبہ کے مطابق اعزاز کا مستحق سمجھا جائے گا لیکن بیگم کو ہندوستان بلانے میں کوئی بھی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ جنگ میں شکست کھا کر برٹش حکومت کی پنشن پانا اور اس طرح اپنے بیٹے برجیس قدر کے حق سے دست بردار ہو جانا اس غیور خاتون نے کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ اپنے آقا اور شوہر سے بہتر انسان تھیں۔"

(سین : اے ٹین نفٹی سیون ص ۳۰۰۔ شائع کردہ حکومت ہند)

انسان کی حقیقی تعریف وہ ہے جو اس کے دوست اور دشمن دونوں کریں۔ نیپال میں حضرت محل کو سیاسی پناہ دینے میں ایک بڑی وجہ جنگ بہادر کا ان کی جرائت اور اولوالعزمی سے مرعوب ہونا تھا۔ ان کی غیرت و حمیت، حب الوطنی اور قابلیت کے معترف ان کے سب سے بڑے دشمن انگریز بھی تھے۔ سر ڈبلیو۔ ایچ رسل نامہ نگار خصوصی اخبار لندن ٹائمز نے "مائی انڈین میوٹنی ڈائری میں تحریر کیا ہے"۔ بیگم میں بڑی قابلیت اور طاقت دکھائی دیتی ہے۔ بیگم نے ہم سے لا تناہی جنگ کرتے رہنے کا اعلان کر دیا ہے ان رانیوں اور بیگموں کی ہمت اور طاقت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زنان خانے کے اندر رہ کر بھی یہ کافی زیادہ عملی اور دماغی طاقت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں"۔

(رسل کی ڈائری۔ ص ۲۷۵۔ بحوالہ پنڈت سندر لال، سن ستاون ص ۱۷۲)

بادشاہ کی عیش پسند بیگمات میں سے ایک "رشیدا بیگم" نے اپنے خط میں انھیں لکھا۔

"آپ کے جانے کے بعد وہ بلوائے عام ہوئے۔ وہ وہ مصیبتیں آئیں کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ حضرت محل نے ایسی بہادری دکھائی کہ دشمن کے منہ پھر گئے۔ بڑی جی دار عورت نکلیں۔ سلطان عالم کا نام کر دیا"۔ انتظام اللہ شہابی بیگمات اودھ کے خطوط ص ۵۲)

غرض یہ کہ جنگ آزادی کے مورخ نے اپنے خزانے میں محفوظ کر لیا کہ "بیگمات اودھ نے ہندوستان کی تاریخ پہ ہمیشہ باقی رہنے والا نشان چھوڑا ہے۔ اس خاندان کے آخری زمانے میں غازی الدین حیدر کی جوشیلی بیوی بادشاہ بیگم اور باغی سپاہیوں کی جوڑ توڑ (ہیروئن) حضرت محل کا ورود ہوا جو نرم مزاج رکھنے والے واجد علی شاہ کی اور بھی اولوالعزم بیگم تھی"۔ (سر جادو ناتھ سرکار کے پیش لفظ تاریخ بادشاہ بیگم مورخہ ۱۵ جون ۱۹۳۶ء تا ترجمہ)

نیپال میں حضرت محل نے ایک محل برف باغ کے نام سے تعمیر کرایا اور آزادی ہند کے لیے درپردہ سرگرم عمل رہیں ۱۸۷۴ء میں اس برف باغ میں جس پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا یہ شمع حریت ہمیشہ کے لیے گل ہوگئی۔ نیپال پہونچ کر انھوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کا یہ اختتام نہیں آغاز ہے۔ ان کا یہ قول صحیح ثابت ہوا ۱۸۵۷ء کے مجاہدوں کی روشن کی ہوئی شمع ۱۹۴۷ء تک وطن پرستوں کے سینوں میں شعلہ بن کر بھڑکتی رہی۔

کٹھ مانڈو میں حضرت محل کی بے نشان قبر گویا فریاد کررہی ہے کہ آزاد ہندوستان نے اپنی اس عظیم مجاہدہ کو جس کی بہادری اور فراست پر خود شجاعت کو ناز تھا جس کی سیاست نے انگریزوں کی شاطرانہ سیاست سے زبردست ٹکرلی، جس کی انتظامی صلاحیت کا لوہا بڑے بڑے مدبروں نے تسلیم کیا، جس کے مقصد کی لگن نے جنرل بخت خاں روہیلہ نانا راؤ پیشوا، تانتیا ٹوپی جیسے سرداروں اور رسل، ہسین، جادو ناتھ سرکار جیسے تاریخ نویسوں کے دل جیت لئے، جو اس ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی علم بردار تھی۔ اور جس کی حریت پسندی نے پسپائی کے بعد بھی انگریزی سامراج کی تابعداری قبول نہ کی، شاید فراموش کردیا ہے۔ کیا ہندوستان اپنے اس قرض کو کبھی اتار سکے گا؟

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

عوامی انقلاب

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ایک ایسی عوامی بغاوت تھی جس میں بادشاہ بیگمات رجواڑے اور خواص ہی نہیں، عوام بھی برطانوی آمریت سے آخری بھرپور ٹکر لینے کفن بردوش میدان میں اتر آئے تھے ان بے شمار وغیر معروف قوم پرستوں نے قربانی، جرأت و شجاعت کی جو شاندار مثالیں قائم کیں اس کی مثال ہندوستان کی ہزاروں سالہ تاریخ بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ انھوں نے ایک زندہ قوم میں حرارت باقی رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھیں بھولی بسری کہانیوں میں دو کہانیاں دہلی کی "سبز پوش" خاتون اور کانپور کی "عزیزن" کی ہیں۔

سبز پوش عورت: اسی زمانے میں جرأت رندانہ اور ہمت مردانہ کی عبرت انگیز مثال ایک سبز پوش بوڑھی عورت قائم کر رہی تھی یہ دلیر بڑھیا مردانہ لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہوتی، شہر کے لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرتی۔ "آؤ چلو خدا نے تمہیں بہشت میں بلایا ہے"۔ شہر کے لوگ اس کی مجاہدانہ صدا سُن کر جوق در جوق اس کے ہمراہ ہو جاتے وہ ان کو لے کر بہادری سے انگریزوں پر حملہ کرتی، اس کا وار بے پناہ ہوتا۔ وہ تلوار اور بندوق سے دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچا دیتی۔ اگر اس کے ساتھی میدان چھوڑ جاتے تو یہ جنگ جو، اور دلیر بڑھیا تنہا جنگ کرتی اور پھر زندہ واپس آجاتی

بعض لوگ چشم دید واقعہ سناتے ہیں کہ "اس عورت میں غضب کی دلیری تھی۔ اس کو موت کا کچھ خوف نہ تھا۔ وہ گولوں اور گولیوں کی بوچھار میں بہادر سپاہیوں کی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی کبھی اس کو پیدل دیکھا جاتا، کبھی گھوڑے پر سوار، وہ تلوار اور بندوق چلانے میں ماہر تھی، اس کی جرأت و ہمت دیکھ کر شہر کے عوام میں بڑا جوش پیدا ہو جاتا تھا" (بیگمات کے آنسو ص ۱۲۶) واپس آکر وہ کہاں جاتی تھی؟ وہ کون تھی؟ کسی کو پتہ نہ چل سکا، آخر ایک دن ماہ جولائی میں (غالباً ۲۷، ۲۸) وہ جنگ کرتی ہوئی انگریزی مورچے کے قریب جا پہنچی مگر زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑی اور گرفتار کر کے انبالہ بھیج دی گئی، لفٹنٹ ہڈسن نے ڈپٹی کمشنر انبالہ کو ایک خط ۲۹ جولائی میں لکھا:

> "میں تمہارے پاس ایک مسلمان بڑھیا کو روانہ کر رہا ہوں۔ یہ عجیب قسم کی عورت ہے۔ اس کا کام یہ تھا کہ سبز لباس پہن کر شہر کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرتی تھی اور خود ہتھیار باندھ کر ان کی کمان کرتی ہوئی ہمارے مورچے پر حملہ کرتی تھی۔ جن سپاہیوں کو اس سے سابقہ پڑا وہ کہتے ہیں کہ اس نے بارہا دلیرانہ اور مردانہ حملے کئے اور مستعدی سے ہتھیار چلائے۔ اس میں پانچ مردوں کے برابر طاقت ہے جس روز گرفتار ہوئی۔ اس دن گھوڑے پر سوار تھی اور شہر کے باغیوں کو فوجی ترتیب سے لڑا رہی تھی .... یہ بہت ہی اندیشہ ناک عورت ہے"!
>
> (بحوالہ خورشید مصطفےٰ رضوی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص ۱۸۷، ۱۸۸)

انبالہ کی گرفتاری کے بعد سبز پوش خاتون پر کیا گذری کسی کو اس کا علم نہیں البتہ ہڈسن جیسا مغل شاہزادوں کا خون پینے والا شخص بھی اس اعتراف پر مجبور ہوا تھا کہ دہلی کی یہ "خاتون" ہندوستان کی "جون آف آرک"، کے نام سے منسوب کی جا سکتی ہے۔

آج بازار میں پابجولاں چلو

عزیزن

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں خواتین کی خاصی بڑی تعداد اپنے انقلابی بھائیوں کے دوش بدوش جہدِ آزادی میں شریک رہی اور جامِ شہادت نوش کیا۔ جنگِ آزادی کی تاریخ نے جن چند ایسے ناموں کو محفوظ کر لیا ہے ان میں عزیزن کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ مادرِ وطن کی خاطر بٹھور کی اس مجاہدہ کی قربانی بے لوث تھی۔ اس میں نہ تخت و تاج کی خواہش تھی اور نہ محلوں کی آرام و آسائش کا خیال۔ وہ صرف آزادیٔ وطن کی خاطر ایک غاصب و جابر حکمراں سے برسرِ پیکار رہی تھی۔

حسن و نزاکت کی مورت یہ رقاصہ ۱۸۳۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئی۔ والد حسین خاں اور والدہ حمیدہ بیگم تھیں جو اس کی ولادت کے کچھ عرصے ہی بعد دنیا سے رخصت ہو گئیں، عزیزن مشہور امراؤ جان ادا کے یہاں سارنگی محل میں رہی۔ ایک روایت ہے کہ اسے شمس الدین سے دلی محبت تھی جو پہلے برطانوی فوج میں صوبیدار تھا اور بعد میں اسے چھوڑ کر نانا صاحب پیشوا سے مل گیا تھا قرینِ قیاس ہے کہ وہ شمس الدین کی معیت میں ہی کانپور سکونت پذیر ہوئی ہو گی

عزیزن کو اپنے حکمراں نانا صاحب کی وفاداری پر ناز تھا جس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ انگریزی سامراج کی دشمن تھی۔ اس لئے زندگی کے آخری سانس تک اس کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

۴ جون ۱۸۵۷ء کانپور انقلابیوں کا پڑاؤ تھا سر جیورج ٹریولین کے مطابق ۷ جون ۱۸۵۷ء کو نانا صاحب پیشوا کی طرف سے ہندی وار دو میں ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں ہندو مسلمانوں سے مشترکہ اپیل کی گئی تھی، کہ وہ اپنے ملک و مذہب کی خاطر برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کے لئے متحد ہو جائیں اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوج میں بھرتی ہوں۔ فوجی بھرتی کا اعلان سنتے ہی یہ مجاہدہ گھر بار چھوڑ کر اپنے ساتھیوں سمیت میدانِ جنگ میں کود پڑی۔ شمس الدین کے تعاون سے اُس نے عورتوں کی ایک چھوٹی سی فوج منظم کی، وہ گھر گھر جاتی، عورتوں کو گھڑ سواری اور ہتھیاروں کا استعمال سکھاتی تھی۔ وہ خود اپنے فوجی دستے کی مخصوص وردی میں ملبوس، کاندھوں پر تمغے سجے ہوئے سوار بے خوف و خطر ادھر سے ادھر گھومتی تھی۔ عزیزن کی تنظیمی صلاحیت بھی بے پناہ تھی۔ حکومت اتر پردیش کی طرف سے شائع کی گئی آنند سروپ مصرا کی مرتبہ کتاب "نانا صاحب پیشوا اور جنگِ آزادی" میں خصوصی طور پر ذکر ہے کہ خواتین کے فوجی دستہ کا قیام اس عظیم مجاہدہ کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔

خواتین کی یہ چھوٹی سی فوج زخمی سپاہیوں کو طبی امداد پہنچاتی، سپاہیوں کے لئے گولا بارود فراہم کرتی، ان کے لئے کھانے اور کپڑے فراہم کرتی، نیز ان بہادر سپاہیوں کے لیے جو جون کی تپتی ہوئی گرمی میں برطانوی سپاہ کے سامنے سینہ سپر تھے، گھر گھر سے تازہ پھل، مٹھائی اور میوے بھی اکٹھا کرتی تھی، علاوہ ازیں اس کے اہم فرائض میں جاسوسی کرنا، جنگی اطلاعات حاصل کرنا اور ان کو مختلف اہم شخصیتوں تک پہنچانا اور ان بزدلوں کو شرم بھی دلانا تھا جو خوف کے سبب اپنے گھروں میں چھپے ہوئے تھے۔ عزیزن ایسے مردوں کو خود چوڑیاں پہناتی، اس شرمندگی سے بچنے کے لئے عوام کی بھاری تعداد نے فوج میں بھرتی ہونا شروع کر دیا۔ خواتین کا یہ فوجی دستہ اپنی مخصوص وردی میں ملبوس گھوڑوں پر سوار، ہاتھ میں تلواریں لیے جب خاص خاص شاہراہوں سے

گزرتا تو سڑک کے دونوں طرف کھڑی بھیڑ "عزیزن زندہ باد"، کے فلک شگاف نعروں سے استقبال کرتی تھی۔

عزیزن "انقلابی کمان"، کی بھی فعال ممبر تھی۔ نانا صاحب ان کے دست راست عظیم اللہ خاں اور تانتیا ٹوپی کو اس پر مکمل اعتماد تھا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے متعدد محاذوں کی مانند کانپور میں بھی انقلابیوں کی شکست ہوئی۔ کرنل ولیم نے جب باغیوں کی فہرست تیار کی تو عزیزن کا نام سر فہرست رکھا۔ شہر کے ایک تاجر جانکی پرشاد نے گواہی دیتے ہوئے کہا تھا "دوسری سپاہی خواتین کے ساتھ وہ شب و روز فوجی وردی میں جس پر تمغے سجے ہوئے تھے ملبوس رہتی تھی۔ جب آزادی کا علم بلند ہوا تو اس نے اعلانیہ جنگ میں حصہ لیا۔ پیشوا کی افواج سے اس کا براہِ راست تعلق تھا۔

ہندوستانیوں کو شکست دینے کے بعد انگریزوں کی انتقامی کارروائی شروع ہوئی جب عزیزن بحیثیت قیدی، جنرل ہیولاک کے سامنے پیش کی گئی تو اس حسین عورت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے لیے یہ تصور بھی ناممکن تھا کہ گلاب کی مانند ترو تازہ اور پھول کی پتی جیسی نازک اندام یہ لڑکی فوجی وردی میں ملبوس ہتھیار سجائے میدانِ جنگ میں اتر سکتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خواتین جنگ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہیولاک جیسے ظالم و سفّاک کا دل بھی اسے دیکھ کر پسیج گیا تھا اور وہ ہر قیمت پر اسے بچانا چاہتا تھا۔ اس نے عزیزن سے کہا کہ اگر وہ اپنے جرم کا اقرار کرلے اور رحم کی درخواست کرے تو وہ اس کے خلاف الزامات واپس لے سکتا ہے۔ وہ جنگِ آزادی کی پہلی مجاہدہ تھی جس نے اس رعایت کو حقارت سے ٹھکرادیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا یہ قدم اس کے بقیہ انقلابی ساتھیوں کے حوصلے پست کردے گا۔ ہیولاک نے پھر پوچھا آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟ ہندوستان کی اس جیالی بیٹی کا جواب تھا "ہر ممکن طریقے سے برطانی حکومت کا خاتمہ"! ہیولاک نے مجبوراً سپاہیوں

کو فائر کرنے کا حکم دیا۔ پہلے ہی فائر پر اس نے نعرہ بلند کیا "نانا صاحب زندہ باد"، تو چند لمحوں کے لئے برطانوی سپاہ کا خون منجمد ہو کر رہ گیا اور گولیاں نازک بدن کو چھلنی کر گئیں۔

اب عزیزن ایک ناقابلِ فراموش روایت بن گئی تھی۔ بتھور کے گاؤں میں اس کی شجاعت تنظیمی صلاحیت اور مادرِ وطن کی خاطر بے لوث قربانی کی کہانیاں عرصۂ دراز تک کہی اور سُنی جاتی رہیں۔

(ماخوذ

(1) (AlKabir AlKausar: Prominent Muslim Women of India. Bibliographical Dictionary PP. 3942

(2) (Muslim Women Patriots of 1857, Thomas Smith, The Statesman March, 1986)

جھانسی کی گمنام شہید:

سینٹرل انڈیا کے لئے گورنر جنرل کے ایجنٹ روبرٹ ہملٹن نے اپنی رپورٹ مورخہ ۳۰ر اکتوبر ۱۸۵۸ء میں ایڈمنسن اسٹون سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کو رانی لکشمی بائی کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "رانی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تھی۔ اس کے ساتھ اس موقع پر ایک دوسری مسلمان خاتون بھی جو عرصے سے اس خاندان سے وابستہ تھی اور ہمیشہ رانی کی مصاحبت میں رہتی تھی، سوار تھی، دونوں کو گولی لگی اور دونوں ہی ساتھ زمین پر گر گئیں۔

(Foreign Political A 31st December 1858, NATIONAL ARCHIVES OF INDIA, NEW DELHI)

اصغری بیگم:

اصغری بیگم کی پیدائش ۵ر جولائی ۱۸۱۱ء میں تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اتر پردیش

میں ہوئی۔ تھانہ بھون کے باغی رہنما قاضی عبدالرحیم کی والدہ محترمہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں برطانوی افواج کی مزاحمت کے جرم میں پکڑی گئیں اور زندہ جلادی گئیں۔

(Dr. P.N. Chopra: Who is Who India Martyrs Govt. of India Publication P 11)

جلیبہ :

ضلع مظفر نگر، یوپی کے ایک گاؤں میں ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق ایک مسلم گوجر خاندان سے تھا۔ برطانوی افواج کی مزاحمت کی پاداش میں گرفتار ہوئیں اور ۱۸۵۷ء میں پھانسی کی سزا پائی۔ (Ibid : P. 49)

رحیمی :

اس نوجوان خاتون کا تعلق ایک مسلم راجپوت خاندان سے تھا۔ پیدائش ڈسٹرکٹ مظفر نگر اتر پردیش کے ایک دیہات میں ہوئی۔ ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ برطانوی فوجوں سے مزاحمت کی پاداش میں پھانسی کی سزا دی گئی۔ اندازاً دو سو پچپن (۲۵۵) خواتین برطانوی افواج سے لڑتی ہوئی شہید ہوئیں اور گیارہ نوجوان عورتوں کو پھانسی کی سزا دی گئی (Ibid : P 118)

فوری یکجہتی کا تقاضہ ہے کہ دیس کے ان سبھی عوامی مجاہدین پر تحقیق کی جائے جن کی قربانیاں ایک نام چاہتی ہیں۔ اس 'تاریخ جنوں' کی صحیح تحقیق ہی نئی نسل کو پیغامِ عمل دے سکتی ہے۔

باب دوئم

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

بی اماں

(والدہ محمد علی)

بیسویں صدی کی دوسری دہائی اپنی نصف منزل میں تھی کہ ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک عکس ابھرنا شروع ہوا جو ایمانِ راسخ، حب الوطنی قومی یکجہتی حق پسندی و راست گوئی، آزادئ ضمیر، آزادئ فکر، بلند حوصلگی، عزم مسلسل غیر متزلزل سامراجی استبداد سے بے خوف و خطر ٹکرا جانے کی غیر معمولی جرأت و ہمت، پیرانہ سالی میں جوانوں جیسی سرگرمی عمل و کارکردگی، نہ جانے کتنے ہی خوبصورت رنگوں کا امتزاج تھا کسی ایسے ہی لطیف نقش کے تصور میں علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

نگہہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

حادثات وقت کے ساتھ ساتھ جیوں جیوں نقوش واضح ہوتے گئے۔ ان رنگوں کی دل آویز آمیزش پرستارانِ وطن و ملت پر سحر کرتی چلی گئی۔ کاروان حریت کے مسافروں نے اپنے اس میر کارواں کو "ام الاحرار" کے خطاب سے نوازا لیکن پیار میں اپنے پوتوں و پوتیوں کی "بی اماں"، ان سبھوں کی "بی اماں" بن گئیں۔

نوٹ:۔ ان کے بیٹے انہیں یوا کہتے تھے مولانا محمد علی کے نومبر ۱۹۲۴ء کے کامریڈ میں شائع شدہ مضامین بہ عنوان "ماں کی یاد" سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

بی اماں کا اصلی نام آبادی بانو تھا اور امروہہ ضلع مراد آباد کی رہنے والی تھیں۔ ان کی پیدائش اور عمر کے متعلق محمد علی نے کامریڈ میں لکھا ہے کہ بی اماں کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ البتہ مرحومہ کہا کرتی تھیں۔ اچھی طرح مجھے یاد ہے کہ غدر کے زمانے میں میری عمر پانچ چھ سال کی تھی۔ اس کی بنیاد پر مولانا نے ان کا سال پیدائش ۱۸۵۲ء اور ان کی عمر ۷۲ سال لکھی ہے (کامریڈ ۲۱ر نومبر ۱۹۲۴ء) شوہر عبد العلی کا تعلق رام پور سے تھا۔ ۲۷ سال کی جوان عمر میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں جیسا کہ سر سبرامنی آئر صدر مدراس ہوم رول لیگ کے نام اپنے ۴ر اگست ۱۹۱۷ء کے خط میں انھوں نے خود تحریر کیا ہے "میرے خاوند کی اچانک اور قبل از وقت موت نے مجھے ۲۷ سال کی عمر میں بیوہ بنا دیا۔"

آبادی بانو بیگم بڑی آن بان کی شریف زادی تھیں۔ رشتہ داروں نے جب نکاحِ ثانی پر زور دیا تو انھوں نے جواب دیا "تم میرے رتبے اور درجے کو نہیں پہچانتے۔ میں رام پور کی نہیں ہوں۔ امروہہ ضلع مراد آباد کی رہنے والی ہوں جو اعلیٰ درجے کے سیدوں سے بھرا ہوا ایک قصبہ ہے اور میرے باپ تو نہیں لیکن میرے دادا اور پردادا شاہانِ دہلی کے دربار میں وزارت کے مناصب پر فائز تھے اور میرے دادا کو ایک دفعہ بادشاہ دہلی نے امروہہ کا علاقہ جاگیر میں دینا چاہا تو میرے دادا نے اس کو لینے سے انکار کر دیا کیونکہ یہ بالکل سیدوں کی بستی تھی اور وہ سیدوں پر حکمرانی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ خبردار جو کبھی کسی نے ایسی بات منہ سے نکالی۔ یہ میرے چھ لختِ جگر مجھے کیا کم ہیں۔ میری عمر بھر کی خدمت اور جاں نثاری کے لئے یہ کافی ہیں۔ (علی برادران اور ان کا زمانہ سید محمد ہادی، ص ۱۰) سبرامنی آئر کے نام ۴ر اگست ۱۹۱۷ء کے خط میں ہی بیوگی کے بعد وہ اپنی ذمہ داریوں اور بچوں کی تربیت کے متعلق لکھتی ہیں "اس وقت میرے چھ بچے تھے جن میں محمد علی سب سے چھوٹا اور دو برس کا تھا ان کی تعلیم میرے ذمہ ہوئی۔ ماسوائے اس کے ان کی ملکیت کی نگہبانی میرے سر پڑی۔ خدا کی مدد پر پورا بھروسہ کر

کے جو نیک کام کرنے والوں کی حفاظت کرتا ہے اور اپنے اعتقاد و مذہب پر یقین رکھ کر میں کام کرنے لگی اور باوجود تکلیف و مشکلات کے مجھے اس کا صلہ مل گیا یعنی ہماری کل اولاد جوان ہو کر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئی"۔

انیسویں صدی کے مسلم معاشرے کے پیشِ نظر یہ ماننا پڑتا ہے کہ انھوں نے جس طور پر دے میں رہنے کے باوجود اپنی جائیداد کا انتظام، اپنے بچوں کی تربیت اور انھیں اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا وہ بڑی جرأت اور قدامت کا بھی کام تھا اور پرانی روایتوں سے بغاوت بھی۔ شوہر کے بعد دیور کے اصرار کے باوجود وہ جائیداد کا ایک حصّہ بھی فروخت کرنے پر رضامند نہیں ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا میں چاہتی ہوں میرے بچوں کو ان کا مکمل حق ملے تاکہ وہ اپنی ماں کو الزام نہ دے سکیں کہ وہ عورت ہونے کے سبب جائیداد کا صحیح انتظام نہ کر سکیں۔ تنگدستی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب انھیں بیٹوں کی تعلیم کی خاطر چھپ کر ملازم کی معرفت پڑوس کے ہندو بنیکہ کے یہاں زیور رہن رکھنا پڑا۔ بقول مولانا محمد علی "وہ خود معمولی کپڑا پہنتیں اور ہمارے لئے جامدانی کے کپڑے بنائیں۔۔۔۔ وہ خود چولائی کی سبزی پر گذارا کرتیں۔"

بی اماں کی ذہنی صلاحیتوں کے متعلق مولانا محمد علی فرماتے ہیں۔"اس ضمن میں یہ کہنا کافی ہے کہ اگرچہ عملی طور پر وہ بالکل اَن پڑھ تھیں لیکن جیسا کہ میں ابھی بتاؤں گا مجھے زندگی میں جن لوگوں کا بھی تجربہ ہوا ہے ان میں سے کسی ایسے شخص سے مجھے سابقہ نہیں پڑا ہے جسے میں والدہ سے زیادہ عقلمند اور یقیناً ان سے بڑھ کر خدا پرست اور روحانی کہہ سکوں۔۔۔۔

ہندوستان میں مسلم معاشرے نے اپنے زوال کے دنوں میں اپنی عورتوں کو سوائے عام جہالت کے ہر روشنی سے محروم رکھنے سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں کیا۔" (محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز۔ مرتبہ محمد سرور ص ۴۶)

مولانا محمد علی نے اپنی سوانح حیات میں بی اماں کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے شادی کے بعد اردو کیسے پڑھی اور ان کا کس بلا کا حافظہ تھا۔ مولانا

محمد علی مرحوم کے والد ایک پُرانی وضع کے انسان تھے جس کی وجہ سے ان کے گھر کا ماحول بھی بیحد رجعت پسندانہ تھا۔ مولانا محمد علی کے والد باوجود سنت رجعت پسند ہونے کے ہر قسم کی اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی کتابیں پڑھتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اردو کا کوئی ناول پڑھ رہے تھے کہ پڑھتے پڑھتے شب کی نشست برخاست ہونے کے بعد زنان خانے میں اس خیال سے لائے کہ سونے سے قبل وہ اسے پڑھ کر ختم کر دیں گے مگر وہ رات میں اسے پڑھ نہ سکے اور سویرے اُٹھے اپنے ہمراہ لیجانا بھی بھول گئے۔ دوسرے روز مولانا کے چچا زاد بھائی نے جب وہ کتاب دیکھی تو وہ ایک اردو ناول تھا۔ انھوں نے بی اماں کو اس کے بعض اقتباسات سُنائے جو بیحد دلچسپ تھے اور جو بی اماں کو بھی بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اس کے بعد رات کو جب بی اماں سو گئیں تو سوتے میں ان کے منہ سے اس کتاب کے وہی اقتباسات من وعن نکلنا شروع ہوئے۔ اتفاق سے مولانا کے والد اس وقت جاگ رہے تھے انھوں نے جب سوتے میں بیوی کے منہ سے اردو ناول کے وہ اقتباسات سُنے تو دنگ ہو کر رہ گئے۔ بعد میں بی اماں نے مولانا کے چچا زاد بھائی سے شوہر سے چھپ کر اتنی اردو پڑھ لی تھی کہ شوہر کی زندگی میں ہی ٹوٹی پھوٹی اردو لکھنے و پڑھنے لگی تھیں پھر بعد میں تو انھوں نے باقاعدہ اردو پڑھی اور تحریک خلافت میں جب وہ شریک ہوئیں تو ان کا شمار اچھے قسم کے مقرروں میں کیا جاتا تھا۔

(از فرحت کاکوروی، علی برادران مرتبہ رئیس احمد جعفری۔ ص ۷۵۔۷۶)

بی اماں کا شمار تاریخ انسانی کی ان چند معزز ہستیوں میں بہ آسانی کیا جا سکتا ہے جن کی آغوشِ تربیت میں طفلِ ناداں، عبورِ علم بردار حریت اور حقیقی معنوں میں رضا کاران ملک و ملّت بن کر اُبھرتے ہیں۔ مولانا محمد علی کی تاریخ ساز شخصیت بھی بی اماں کی تربیت کی ہی مرہونِ منت ہے جس کا اعتراف اُنھیں خود بھی ہے۔ "مجھے اپنے والدِ مرحوم بالکل یاد نہیں مگر والدہ مرحومہ

کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ۔ ۔ ۔ میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے وہ خداوند کریم نے مجھے اس مرحومہ کے ذریعے سے پہونچایا ہے (نقوش آپ بیتی حصہ اول جون ۱۹۶۴ء)

عملی اعتبار سے بی اماں کی سیاسی زندگی کا آغاز پہلی جنگِ عظیم سے ہوتا ہے "قانون تحفظ ہند" کا نفاذ دورانِ جنگ ہوا۔ یہ ایسی شمشیر برہنہ تھی جس نے صدہا حریت پسندوں کی آزادی کا خون کیا اور جس کے حربے کے سامنے تمام قانونی تحقیقات اور آئینی جوابات بیکار ثابت ہوئے۔

لندن ٹائمز کے ایک اشتعال انگیز مضمون کے جواب میں لکھے گئے مولانا محمد علی کے مضمون کو حکومت نے قابلِ اعتراض قرار دیا اور اس کی پاداش میں جب کہ ابھی قانونِ تحفظ ہند کو رائج ہوئے دو ماہ ہی ہوئے تھے۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی کو چھندواڑہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ (نظر بندی کا آخری زمانہ بیتول جیل میں گزرا) مجاہد بیٹوں کی قابلِ فخر ماں نے اپنی مرضی سے بیٹوں کی قربت کی خاطر چھندواڑہ میں ہی قیام پذیر ہونا پسند کیا۔ اُن کی نظر بندی پر اظہار فخر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا "یہ صرف ایک عزت ان ہی لوگوں کے لئے ہے۔ جن کو خدا اپنے ملک اور اپنے مذہب کی خاطر تکالیف برداشت کرنے کے لئے منتخب کرتا ہے"۔ (خط بنام سر اِمنی آئر ۱۳ اگست ۱۹۱۷ء) یہ مرتبہ بلند ملا جن کو مل گیا۔ ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں جگہ جگہ ہوم ۔ رول لیگ کا چرچا تھا۔ لوک مانیہ تلک اور مسز اینی بیسنٹ کی سرپرستی میں مہاراشٹر ہوم رول لیگ کی شاخیں سارے ملک میں تیزی سے پھیل رہی تھیں۔

مسز بیسنٹ نظر بند ہوئیں اور ہندوستانی سیاست میں ایک نئی سرگرمی کی لہر دوڑ گئی۔ بی اماں نے سر سبرامنی آئر کے نام اپنے خط میں جسے انھوں نے اس عظیم الشان جلسہ میں بحیثیت صدر پڑھ کر سنایا جو مسز بیسنٹ کی نظر بندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے مدراس میں منعقد ہوا تھا۔ تحریر فرمایا۔ "مجھے خوف ہے کہ یہ خط شاید آپ کو متعجب کر دے نہ صرف اس وجہ سے کہ یہ ایک اجنبی شخص کا

خط ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ راقم ایک مسلمان عورت ہے جس کی پرورش پُرانی وضع کے مطابق ہوئی ہے۔ جس کی رو سے عورتیں اجنبی سے بہت کم خط وکتابت کرتی ہیں اور مردوں سے تو کبھی کرتی ہی نہیں لیکن زمانہ اتنی تیزی سے بدل رہا ہے اور اس کی رفتار عجیب ہے کہ اگر مجھ جیسی پُرانی خیال کی عورت اس اصولِ قدیم کو بھلا کر ایک ایسے معزز اور محترم شخص کو خط لکھے، جن کا تمام عالم مدّاح ہے اور پھر خط کا مضمون بھی وہ ہو جو آج سب کے دلوں میں جاگزیں ہے تو کوئی تعجب خیز بات نہیں پرانے لوگ اور خصوصًا بوڑھی عورتیں عمومًا دنیا میں ردوبدل کی خواہاں نہیں۔ گو میں ضعیفہ ہوں لیکن ان تبدیلیوں کا خیر مقدم کرتی ہوں جو آج ہمارے گردوپیش وقوع میں آرہی ہیں ہوم رول لیگ کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے انھوں نے لکھا" جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ گو میں صوبہ متوسط میں رہتی ہوں لیکن مہاراشٹر ہوم رول لیگ میں جس کو اس بہادر اور صائب الرائے شخص یعنی لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک نے قائم کیا ہے شامل ہو سکتی ہوں تو میں نے مع اپنی بہو (یعنی محمد علی کی بیوی) اور اپنے گھر کے تمام دوسرے لوگوں کے اس لیگ کی ممبری کا حلف لے لیا ہے۔ اس زمانے میں محض عقائد کافی نہیں اب تو اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے عقائد کا اعلانیہ اظہار کریں اور اگر ضرورت ہو تو باآوازِ بلند اعلان کریں۔

مسز بیسنٹ سے ملاقات نہ ہو سکنے کا افسوس کرتے ہوئے ان کے متعلق اظہارِ خلوص یوں کیا۔ ان کی نظربندی میں سوائے مبارک بادیوں کے اور کوئی تحفہ نہیں بھیج سکتی، متحدہ ہندوستان میں نوجوان بوڑھے ہندو اور مسلمان سب کی دعائیں ان کے حق میں ہیں۔ یہ دعائیں ان سختیوں کی تلافی ہوں گی جو ادنیٰ لوگوں کی ایک جماعت سے انھیں مل رہی ہیں اور ہمیں بھی ۲۷ مہینوں سے نصیب ہو رہی ہیں۔ دعائیں اور مبارکبادیوں کے سوا ان کی نذر کو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ نظربندی کے متعلق جو فنڈ کھولا گیا ہے اس میں تھوڑا بہت جو کچھ ہو سکتا ہے چندہ دوں۔ ہم لوگ کبھی متمول نہیں رہے بلکہ میرے بیٹے جب سے نظربند ہوئے ہم اور بھی غریب ہو گئے ہیں۔ ان میں کوئی

بھی اِس قابل نہیں کہ کسی قسم کا کاروبار جاری رکھ سکے اور بجائے کچھ کمانے کے صرف قرض کے لئے ہزاروں روپیہ کا سود دینا پڑتا ہے۔ ان مطالبات کو پورا کرنے کی غرض سے اور ایک بڑے خاندان کے روزانہ اخراجات کے واسطے جس کی کفالت کو ہمارے بیٹوں کی تنخواہیں کافی نہیں ہوسکتیں۔ میں نے اپنی جاگیر کا بہت بڑا حصّہ فروخت کرڈالا۔ یہ جاگیر میرے خسر کی کمائی تھی جو انھوں نے غدر کے زمانے میں جب وہ نواب رام پور کی ملازمت کرتے تھے۔ روہیل کھنڈ اور کمایوں میں بہت سے انگریز باشندوں اور افسروں کی جانیں بچانے کے صلہ میں حاصل کی تھی۔ جب تک میرے بچے کمسن تھے اور مجھے ان کی پرورش کرنی تھی۔ اس وقت تک میں نے اس امر کو ایک بڑا فرض سمجھا کہ اس جائیداد کے کسی حصّے کو علیحدہ نہ کروں اور باوجود تنگ دستی کے اس کا ایک ایکڑ بھی ہمارے ہاتھ سے نہ گیا تھا لیکن کیونکہ پوتوں کی نظر بندی کی وجہ سے ۱۹۱۷ء میں اس جاگیر کے فروخت کرنے کی ضرورت ہوئی جو دادا نے ۱۸۵۷ء میں حاصل کی تھی۔ لہٰذا میں نے اپنے آپ کو اس فرض سے سبکدوش سمجھا اور مجھے اس کا مطلق غم نہیں کہ میں نے اس جاگیر کا اتنا بڑا حصّہ علیحدہ کردیا۔ رہا مستقبل تو اس کے لئے مجھے اپنے بیٹوں اور پوتوں کے متعلق کوئی فکر نہیں، میں اپنی مشرقی مثل پہ پورا اعتماد رکھتی ہوں یعنی

ملک خدا تنگ نیست۔ پائے گدا لنگ نیست

اب بھی میری یہ خواہش ہے کہ ہماری عالی مرتبہ بہن ہماری آمدنی میں شریک ہوں اور میں نہایت مشکور ہونگی اگر آپ ہم سے دس روپیہ ماہوار قبول فرمائیں گے۔ پہلے مہینے کے لئے میں منی آرڈر روانہ کرچکی ہوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی بتادوں کہ یہاں ہمارے گھر کے ہر ایک شخص نے اس رقم میں کچھ نہ کچھ دیا ہے حتیٰ کہ بچوں اور نوکروں نے بھی نہایت شوق و اصرار کے ساتھ اپنے حصّے کی قلیل رقم اس روپے میں شامل کی ہے۔"

قانون تحفظ ہند کے آہنی پنجوں میں گرفتار بدنصیب بندوں، ان کی معاشی بدحالی اور پریشان حال پسماندگان کے متعلق اس خط میں ظاہر کئے گئے جذبات ان کی

انسانی ہمدردی، وطن پرستی اور ملکی آزادی کے لئے ان کی بے قراری کی بہترین عکاسی کرتے ہیں: "میرے بیٹے جوان و تندرست ہیں۔ سارے ملک میں ان کے اتنے دوست و احباب ہیں کہ جو مدد چاہیں ان کو خوشی کے ساتھ مل سکتی ہے۔ لیکن مجھ ماں کا دل ان سینکڑوں بدنصیب بہادر لڑکوں کے غم میں خون روتا ہے جو بغیر کسی داد فریاد کے مجرم قرار دیئے گئے ہیں اور اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے روزی کمانے کی آزادی سے بھی محروم کر دیئے گئے ہیں۔ یقیناً ان کے لئے بہن بیسنٹ کا دل بھی روتا ہوگا۔ میں اپنے سوا دو برس کے تجربے سے محسوس کر سکتی ہوں کہ وہ سینکڑوں مائیں جن کے گھر تباہ و برباد ہو گئے آج کیا خیال کرتی ہوں گی اور اس سے بڑھ کر تو یہ کہ وہ نوجوان کیا محسوس کرتے ہونگے جن کی جلاوطنی میں انکے آرام و آسائش کا خیال رکھنے اور تسلّی و دلاسا دینے والی مائیں بھی نہیں ہیں۔ غم و فاقہ کشی کی دلخراش داستانیں کبھی کبھی ہمارے کانوں تک پہونچتی ہیں اور اُن سے ہم کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنے ایسے پُر درد افسانے ہوں گے جو ہمارے کانوں تک پہونچتے بھی نہیں۔ کیا ان کو قانونی مشورہ اور مالی امداد دینے کی کوئی سبیل نہیں ہو سکتی؟ اور اگر ان بدنصیب لوگوں کو ان کی آزادی سے محروم کرنے کا کوئی علاج نہیں ہے تو وہ اور ان کے متعلقین جو کبھی کسی جرم کے مرتکب اور ایسی سزا کے متوجب نہیں ہیں بھوکوں کیوں مریں؟ کیا ہماری ہوم رول کی شاخیں ان نظربندوں کے علاوہ جنھیں پبلک جانتی ہے ہر نظربند کے حالات کا ریکارڈ نہیں رکھ سکتیں اور انکو اور ان کے متعلقین کو ضروری مدد نہیں دے سکتیں؟ مجھے یقین ہے کہ اگر اپیل کی جائے تو ہر گوشۂ ہندوستان میں ہر گھر ان مقدس اغراض کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور دے گا۔ خواہ وہ مٹھی بھر اناج ہی کیوں نہ ہو۔"

ملک کے تمام حریت پسندوں کے پس ماندگان کے سلسلے میں عملی اقدامات کے تذکرے کے ساتھ اور ان کی امداد کے لئے مسز اینی بیسنٹ کے نام پر ایک فنڈ قائم کرنے کی تجویز کے ساتھ انھوں نے ایک بار پھر اپنے اس ایمان راسخ اور پختہ یقین کا اعادہ کیا کہ اللہ کی نصرت ان کے ساتھ ہے اور فتح عنقریب ہی ہے

(خط بنام مسز اینی آئرم ۳ اگست ۱۹۱۸ء چند اہم خطوط، انجمن اعانت نظربندانِ اسلام دہلی ۱۹۱۸ء ص ۹-۱۰-۱۲-۱۳-۱۴-۱۵)

مختلف اشخاص کو لکھے گئے ان خطوط سے ان کی اندرون و بیرون ملک معاملات پر وسعت نظر، مسائل سے گہری واقفیت اور ان کے حل کی تلاش میں ان کے اضطراب کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جوش وفاداری میں اکثر حکام ہوم رول لیگ کے جھنڈے گرا دیتے تھے اس سے متعلق سر سبرامنی آئر کے نام ۴ ستمبر ۱۹۱۷ء کے خط میں بی اماں نے اپنے جذبات و احساسات کا تذکرہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا۔ "اگر ایک ہوم رول لیگ کا جھنڈا زبردستی اتار دیا گیا تو کیا اس کی جگہ ہزاروں نئے جھنڈے بلند نہ ہوں گے۔ اپنے جذبات سے اندازہ کرتے ہوئے مجھے پورا یقین ہے کہ ہزاروں لاکھوں آدمی اس خوبصورت سرخ و سبز جھنڈے کو نہ صرف اپنے گھروں پر لگائیں گے بلکہ دلوں میں جگہ دیں گے۔ اپنے سارے زمانۂ بیوگی میں میں نے کبھی کوئی رنگین چیز نہیں پہنی۔ لیکن اب میں سرخ و سبز جھنڈے کو خدام کعبہ کے مقدس نشان کے نیچے اپنے سفید برقعے یا بالفاظ دیگر نقاب وار پوشش پر جو کہ میں باہر نکلتے وقت پہن لیتی ہوں لگاؤں گی۔ میں شیخی یا نمائش کے لئے ایسا نہ کروں گی بلکہ میرے اس عمل کے یہ معنی ہوں گے کہ کسی شخص کو اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہوئے شرمانا یا اس کے نتائج سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ میں آپ سے سچ کہتی ہوں مجھے تو بجائے غصے کے اس بات پر افسوس آتا ہے کہ حکام اپنی بیوقوفی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ اس قسم کے خفیف اظہار مستحکم سے سلطنت کی جڑ پختہ ہوتی ہے، کاش کہ وہ ان چیزوں کو ہماری آنکھ سے دیکھ سکتے اور معلوم کرتے کہ پردہ نشین عورتیں تک اس بات کو خوب سمجھتی ہیں کہ اس قسم کی تلون مزاجی کا اثر صرف یہی ہو سکتا ہے کہ حکومت کی بنیاد کو صدمہ پہونچے۔

چند سال گذرے کہ "بندے ماترم" کا نعرہ جو ایک بے ضرر بلکہ قابل تعریف نعرہ ہے، بنگال میں باغیانہ خیال کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے بہت سے محبان وطن کو تکلیف اور ذلتیں برداشت کرنی پڑیں۔ لیکن اس پر بھی مجھکو معلوم ہوا ہے کہ بڑے بڑے جلسوں کی کارروائیاں "بندے ماترم" کے راگ سے شروع ہوتی تھیں اور وہی بہادر نوجوان بنگالی جوان الفاظ کے زبان پر لانے سے سزائیں جھیلتے تھے۔ اب اس کو اپنی جگہ مقبول جنگی نعرہ کی طرح میدان جنگ میں اپنی جان دینے کے وقت

استعمال کرتے ہیں اور ہمیشہ کے واسطے اپنی قوم اور اپنی مردانگی کے دامن کو بدنما دھبّے سے پاک کردیتے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کو جو زبردستی ہوم رول کا جھنڈا گرا دیتے ہیں سبق لینا چاہیئے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایک روز یہ سبق سیکھ لیں گے خدا کرے کہ وہ جلد اس سبق کو سیکھیں ایک پرانے شاعر کا قول ہے ؎

ہرچہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

مہربانی کرکے میری بہن سے کہدیجئے کہ گو میں پیغمبر یا غیب داں نہیں تاہم مجھے اس کا یقینِ کامل ہے کہ انشاءاللہ وہ اور میں اپنی موت سے قبل ہوم رول کو ہندوستان میں قائم دیکھ لیں گے لیکن اگر مشیتِ ایزدی یہ ہوئی کہ ہم اپنی دل کی حسرت پوری ہونے سے قبل اس جہانِ فانی سے کوچ کرجائیں تو ہم مسرّت اور شکریہ کے ساتھ سرِ تسلیم خم کردیں گے اور اپنے بنانے والے کے سامنے بخوشی اس خیال کے ساتھ جانے کو تیار ہو جائیں گے کہ شاید ہماری وہ کوششیں جو کہ ہم اپنے مذہب، قوم اور غم زدہ بنی نوعِ انسان کے لئے کر رہے ہیں۔ ہماری دوسری خامیوں کا کفارہ ہو سکیں۔۔۔ بعض اوقات مرنا فی نفسہٖ ایک اچھی چیز ہے لیکن اس سے زیادہ بڑی چیز اور بہادری کی بات اور بعض اوقات مشکل تر شئے یہ ہے کہ آدمی اچھے مقصد کے لئے زندہ رہے اور بے انتہا مشکلات اور روز مرّہ کی ذلتوں اور تکالیف کے باوجود اس کے پورا کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔ اسی لئے میں جناب باری کی درگاہ میں دعا کرتی ہوں کہ وہ میری بہن مسز بسینٹ کو اور جناب کو جو اس جواں مردی اور بہادری سے کام کر رہے ہیں۔ بہت تندرستی، خوشی اور اس سے زیادہ کار آمد زندگی کے بہت سے سال عطا کرے۔

آج میں مبلغ ۱۰۰ روپیہ آپ کو بذریعہ منی آرڈر بھیجتی ہوں یہ بسینٹ فنڈ میں ہماری طرف سے دوسری قسط ہے۔ مجھے محمد علی کی زبانی یہ سُن کر تعجب ہوا کہ گورنمنٹ نے آپ کے نام جو میرا خط گیا تھا اس کی بابت کچھ عجیب سوال کئے اور سب سے زیادہ تعجب خیز یہ سوال تھا کہ میں یہ دس روپے ماہوار کی رقم بسینٹ فنڈ میں کس طرح دے سکتی

ہوں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ میرا خط جو آپ کے نام لکھا گیا ہے وہ غور سے نہیں پڑھا گیا۔
ایک عورت جو اپنی چالیس ہزار کی جائیداد فروخت کر کے اپنے بچوں کا قرضہ پندرہ ہزار
روپیہ سال کے اندازہ سے گذشتہ دو سال کے زمانہ نظر بندی میں ادا کرتی رہی ہو کیا یہ
قدرت بھی نہیں رکھتی کہ وہ یہ قلیل رقم فروخت کی حاصل میں سے نکال سکے۔ اور کیا دس
روپیہ ماہوار اپنی ضروریاتِ زندگی کو کم کر کے ماہوار مصارف میں سے بچا لینا کوئی غیر
معمولی بات ہے بالخصوص جب کہ یہ رقم ایک ایسے مقصد کے لئے ہو جو کہ ہمارے دلوں کو
اس قدر عزیز ہے" (چند اہم خطوط، سلسلہ حالات نظر بندانِ اسلام نمبر۲۔
انجمن اعانتِ نظر بندانِ اسلام دہلی۔ص ۱۷۔۱۸۔ ۲۱)

محترمہ بی اماں کا وہ بیان جس میں انھوں نے تفصیل سے فرمایا ہے کہ محمد علی شوکت علی
کیوں آزاد نہ ہوئے بتعدد رسائل میں شائع ہوا۔ آپ نے اس بیان میں تحریر فرمایا، ستمبر
کی صبح کو ایک غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ اس صبح کو مسٹر عبدالمجید ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ محکمہ خفیہ
پولیس جو شملہ سے آئے تھے میرے دونوں لڑکوں کے پاس آئے۔ ان کو سر چارلس کلیولینڈ
محکمہ خفیہ پولیس کے ڈائرکٹر نے بھیجا تھا۔ مسٹر عبدالمجید نے میرے لڑکوں کو ایک عہد نامہ دکھلایا
اور کہا کہ سر چارلس کلیولینڈ یہ چاہتے ہیں کہ آپ اس عہد نامہ پر دستخط کریں۔ اس عہدنامہ
کا مضمون یہ تھا۔" میں بقیہ ایامِ جنگ میں کوئی ایسا کام کرنے، ایسی تحریر لکھنے یا کسی ایسی
بات کے کہنے سے جس کا منشایہ ہو کہ دشمنانِ تاج کی ہمت افزائی ہو یا ان کو اس سے مدد
پہنچے، بچوں گا۔ میں کسی ایسے کام کرنے یا کسی ایسی بات کہنے سے بھی پرہیز کروں گا جس
سے بادشاہ کے دوستوں یا حامیوں پر حملہ ہو یا حملہ معلوم ہو۔ میں پھر وعدہ کرتا ہوں کہ میں
کوئی ایسا غیر آئینی اور سخت ایجی ٹیشن نہیں کروں گا جس سے امنِ عامہ کے خطرے میں
پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ تشریح: اور یہ وعدہ جو میں نے ابھی اوپر کیا ہے اس کا مطلب یہ
نہیں ہے کہ سیاست میں اپنی حدود کے اندر رہ کر حصہ لینے سے باز رہوں گا۔"

(دستخط سر چارلس)

پھر تحریر فرماتی ہیں کہ میرے بیٹوں نے کچھ دیر تک مطلوبہ طمانیت کی نوعیت، دائرۂ اثر کی بابت مسٹر عبدالمجید سے گفتگو کی اور بعد ازاں محمد علی مسودہ لکھنے کے لئے قلم لینے اپنے کمرے میں آیا اور اس وقت پہلی مرتبہ مجھے یہ حالات معلوم ہوئے میں نے ان کی ڈھائی سال کے بعد آزادی کی شروط سے واقف ہونا چاہا اور بہ ضرورت برقعہ اوڑھ کر اسی کمرہ میں آکر بیٹھ گئی جہاں مسٹر عبدالمجید سے گفتگو ہو رہی تھی اور جہاں تک مجھے یاد ہے حسب ذیل الفاظ سے ان کو مخاطب کیا۔

"میں سمجھتی ہوں کہ گورنمنٹ میرے بیٹوں کے آزادی بحال کر کے آخر کار ان کے ساتھ انصاف کرنا چاہتی ہے۔ قدرتی طور پر میں اس سے خوش ہوں کیونکہ مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ پچھلے ۲۸ ماہ کے اندر انھوں نے کیا کیا تکالیف اٹھائی ہیں اور ان تکلیفوں کو کس طرح برداشت کیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں گورنمنٹ ان سے کوئی عہد لینا چاہتی ہے ان کی عمر اتنی کافی ہے کہ وہ فائدہ اور نقصان کو خود سمجھ سکتے ہیں۔ آج یقینی ان کو میرے کسی صلاح و مشورے کی ضرورت نہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ میری طرف سے گورنمنٹ سے یہ کہدیں کہ میرا ایک فرض ان کے ذمہ ہے جو تمام ان فرائض سے مقدم ہے جو دوسروں کے ان کے ذمہ ہوں۔ کیونکہ میں نے نو مہینے ان کو پیٹ میں رکھا۔ ان کی ابتدائی عمر میں ان کو دودھ پلایا اور ہمارے رسول اکرمؐ نے ان کو بتایا کہ ان کی جنت میرے قدموں کے نیچے ہے (ان الجنۃ تحت اقدام امھاتکم) اپنی طویل جلا وطنی اور نظر بندی کے زمانے میں انھوں نے جتنی تکلیف اٹھائی ہے ان سے بخوبی آگاہ ہونے کے باعث یہ بھی سمجھتی ہوں کہ ان کے لئے کسی ایسی شرط کو مسترد کر دینا کیسا سخت ہوگا جن کے قبول کرنے میں زمانہ دراز کی ان تمام صعوبات کا خاتمہ ہو سکتا ہے لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ گورنمنٹ یہ جان لے کہ اگر اپنی تکالیف سے بچنے کے لئے وہ کسی ایسی بات پر اقرار کریں گے جو ان کے مذہبی احکام یا ملکی فوائد کے ذرا بھی خلاف ہو تو مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک میرے قلب کو اتنی مضبوطی اور ان سوکھے جھریاں پڑے ہاتھوں میں اتنی طاقت دے گا کہ میں اسی وقت ان دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی

گو یہ مجھے عزیز ہیں اور طاقتور اور لحیم وشحیم دکھائی دیتے ہیں۔ باقی ماندہ تمام باتوں کے متعلق میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ ہمیشہ حضور شاہ قیصر کی پابندِ قانون رعایا رہے ہیں اور آپ (مسٹر عبدالمجید) کے سامنے میں ان کو یہ حکم دیتی ہوں کہ آئندہ بھی ایسے ہی رہیں۔ اور یہی مجھے کہنا تھا اور میں آپ سے استدعا کرتی ہوں کہ جو کچھ میں نے آپ سے کہا ہے اس کو گورنمنٹ سے کہدیں۔"

اس کے بعد میں وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے آنے کو تھی لیکن میرے بیٹوں نے مجھے روکا اور اس طمانیت نامے کا جو ان سے مانگا گیا تھا... اور اس کا جواب جو مسٹر عبدالمجید کو لکھ کر دینے والے تھے تاکہ وہ اس کو بذریعہ تار سر چارلس کلیولینڈ کو روانہ کریں، ترجمہ کرکے سنایا، اس کا مضمون حسب ذیل ہے۔

"ہم دونوں ہمیشہ خدا ترس مسلمان رہے ہیں جو تمام باتوں سے فائق ان احکام الٰہی کو سمجھتے ہیں جو قرآن پاک اور ہمارے رسولِ اکرمؐ کے واقعاتِ زندگی اور اقوال کی صورت میں ہم کو پہنچائے گئے ہیں۔ اس اعتقاد کو ضرر پہونچائے بغیر ہم دونوں ہمیشہ اپنے ملک کے پابندِ قانون اور تمام غیر آئینی و شدت انگیز طریقوں کے مخالف رہے ہیں اور خواہ جنگ ہو یا نہ ہو ہم دونوں ہمیشہ ایسے ہی رہنے کے خواہش مند ہیں اور اُمید ہے کہ ایسے ہی رہیں گے۔ لہٰذا اگر اب بھی اس مضمون کی کسی طمانیت کی ضرورت ہے تو ہمیں اس کے کردینے میں کوئی اعتراض نہیں کہ اپنی اطاعت اسلام کو ضرر پہنچے بغیر ہم ایسا کوئی کام کرنے یا تحریر لکھنے، یا کوئی بات کہنے سے محترز رہیں گے جس سے حضور شاہ قیصر کے دشمنوں کو مدد پہنچانی مقصود ہو یا معقول طریقے سے مدد پہنچنے کا احتمال ہو۔ اور کوئی ایسا کام کرنے یا ایسی تحریر لکھنے، ایسی بات کہنے سے محترز رہیں گے جس سے حضور شاہ قیصر کے دوستوں اور حلیفوں پر کوئی حملہ مقصود ہو یا معقول طور سے اس کا کوئی احتمال ہو کہ اس کے حملے کے معنی لگائے جائیں گے اور ہم کسی شدت آمیز یا غیر آئینی ایجی ٹیشن سے بھی محترز رہیں گے جس سے حفظ عامہ پر اثر پڑنے کا احتمال ہو ہم سمجھتے ہیں اور مندرجہ بالا طمانیت کو اس صاف سمجھوتے پر مبنی کرتے ہیں کہ اوپر جن

احترازوں کا اقرار کیا گیا ہے ان سے ہمارے تمام مذہبی فرائض کو ملحوظ رکھنے کی آزادی کو خفیف ترین درجہ میں بھی محدود کرنا یا ہمیں آئینی حدود کے اندر سیاسیات میں حصّہ لینے سے باز رکھنا مقصود نہیں ہے۔"

میرے بیٹوں نے اپنی پوزیشن کا جو بیان دیا ہے اس نے کامل طور سے مجھے اطمینان دلا دیا ہے اور میں خیال کرتی ہوں کہ ہر شخص کو یہ مطمئن کرے گا" (مدینہ اخبار بجنور ۵ر اکتوبر ۱۹۱۷ء)

آزادی ایک نعمت ہے جس کے حصول کی خاطر انسان سبھی کچھ کر گزرتا ہے۔ اس نازک مرحلے پر بڑے بڑے قوی ہیکل مردوں کے قدم لڑکھڑا گئے۔ لیکن سرکاری مخبر کی موجودگی میں مجاہد بیٹوں کی اس عظیم ماں نے جس ثابت قدمی اور رفقید المثال جرأت مندی کا ثبوت دیا وہ ان کے ایمانِ راسخ اور غیر متزلزل عزم کی روشن مثال ہے ام الاحرار کا بیان ایک ضعیف مجاہدہ آزادی کی عظمت اور کردار کی بلندی کی ناقابلِ فراموش یادگار ہے۔

مسز اینی بیسنٹ نے اپنی نظر بندی سے رہائی کے بعد وائسرائے سے ملاقات کی، دورانِ ملاقات علی برادران کی رہائی کا مسئلہ بھی پیش ہوا جس میں انھیں ناکامی ہوئی اور جس کے نتیجے سے انھوں نے پبلک کو بذریعہ ایک گشتی مراسلے کے آگاہ کیا۔ بی اماں نے جواب میں ایک طویل خط مسز بیسنٹ کے نام لکھا جس نے بہت سی حقیقتوں پر سے پردہ ہٹایا۔ ایک اقتدار پسند جماعت کے حکام کے جبر و تشدد کی کہانی کو انھوں نے عوام کے سامنے بہ کمالِ جرأت وہمت پیش کیا ہے۔ خط کا مکمل متن حسب ذیل ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

چندواڑہ (ممالک متوسط)

۱۱ر دسمبر ۱۹۱۷ء

عزیز بہن! اگرچہ کچھ عرصے سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا ہے، لیکن عرصہ ایک

ماہ کا ہوا کہ آپ نے ہز ایکسیلینسی حضور وائسرائے سے میرے بیٹوں کی آزادی سے متعلق گفتگو کرنے کے بعد اپنی کوششوں کے متعلق پبلک کی آگاہی کی غرض سے ایک مراسلت شائع کرائی تھی جس کا جواب لکھنا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔

میں اس سے بہت پہلے آپ کو خط لکھتی لیکن میری طبیعت ناساز تھی، اور محمد علی شوکت علی اور میری ایک پوتی بھی بیمار ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ مسٹر گھاٹے مجھے خط و کتابت میں مدد دیتے ہیں۔ ایک مقامی سیاسی کام میں مصروفیت کے باعث موجود نہ تھے۔

اس معذرت کے اظہار کو میں نے اس بناء پر ضروری سمجھا کہ کہیں میری خاموشی سے غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ ہز ایکسیلینسی وائسرائے کی ملاقات کے بعد آپ کے اور اس نصیحت کی نوعیت کے متعلق جو آپ نے پبلک کو کی تھی بعض طبقوں میں افسوس ناک غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔

میں ان صعوبتوں کا جو آپ جیسی عمر و تندرستی والے شخص کو ان دو طویل سفروں میں جو آپ نے میرے بچوں کی رہائی کی خاطر برداشت کئے اٹھانا پڑی ہونگی محض رسمًا نہیں بلکہ تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس کا کوئی اثر آپ کے اس بار احسان پر نہیں پڑتا جو ہم پر ہے، نہ اس سے کوئی تبدیلی اس عقیدے میں پیدا ہوتی ہے کہ انجام کار فتح ہماری ہوگی۔

جہاں تک میرا اور میرے بیٹوں کا تعلق ہے میں کہہ سکتی ہوں کہ ہم نے اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیا ہے، اور اس کی حفاظت میں دے دیا ہے۔ ہمیں ایسی بڑی امید کا سہارا ہے جسے کوئی مایوسی توڑ نہیں سکتی، نہ دور کر سکتی ہے، مایوسی بے دینی اور بد اعتقادی سے پیدا ہوتی ہے جن کا کہ ہم وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے ہیں، چونکہ ہم کو توفیق الٰہی پر بھروسہ ہے، اسی لئے ہمیں اس کی پرواہ نہیں کہ ہمیں ہمارے احباء اور ساتھیوں سے کیا مدد پہنچی ہے نہ اس امر کا کہ ہمارے مہربانوں کی کوششیں جلد یا دیر میں بار آور ہوتی ہیں، صورت واقعات پر کچھ زیادہ اثر ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ

ہم ان کی کوششوں کو محسوس نہیں کرتے، یا ہم کو ان کی تدابیر کے موثر یا غیر موثر ثابت ہونے سے کوئی دلچسپی نہیں، جو وہ نظر بندوں کی آزادی کے لئے اختیار کریں۔

ظاہر ہے کہ مجھے اس اصلی دشواری سے جو میرے بچوں کی رہائی کے راستے میں حائل ہیں۔ سرکاری نقطۂ نظر سے سمجھنے کا وہ موقع نہیں ملا جو آپ کو ملا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گی۔ اگر میں آپ کی رائے سے پورے طور پر اتفاق نہ کروں، خصوصاً جب کہ آپ اس امر کو پیشِ نظر رکھیں کہ بحیثیت اس شخص کے جوان کا عزیز رفیق ہے مجھے ان تمام معاملات کے اپنے بچوں کے نقطۂ نظر جاننے کا بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ موقع ملا ہے، میں فی الحقیقت بڑی خوشی سے آپکی طرح اس امر کے باور کرنے کے لئے تیار ہوتی کہ اگر جنگِ موجودہ نازک صورت اختیار نہ کرلیتی، تو حضور والسرائے اور ان کی ممبران کونسل بطیب خاطر میرے لڑکوں کو رہا کر دیتے، لیکن ان وجوہ کی بنا پر جو مسٹر گھاٹے کہتے ہیں کہ وہ اپنے جداگانہ خط میں آپ پر ظاہر کرنے والے ہیں۔ میں آپکی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آسکتا کہ جب گورنمنٹ کے یہ نیک ارادے ہیں تو پھر محمد علی اور شوکت علی کو اصلاحاتِ ملکی سے متعلق وزیر ہند اور والسرائے سے ملاقات کی اجازت کیوں نہیں دی گئی، اور اس بات پر کیوں اصرار کیا گیا کہ محمد علی اُس وفد کے رکن بھی نہ ہوں جو منجانب انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ جناب وزیر ہند اور والسرائے کی خدمات میں حاضر ہونے والا تھا، آپ فرماتی ہیں "کہ مسٹر محمد علی ٹرکی کے ساتھ جو بے انتہا گو مجہول ہمدردی ظاہر کر چکے ہیں میرے خیال میں گورنمنٹ کے نقطۂ نظر کے بموجب اس خطرے سے خالی نہ تھی کہ کہیں یہ مجہولیت سے عملی صورت اختیار نہ کرلے۔

حضور والسرائے سے آپ کی ملاقات کرنے سے قبل یہ امر صاف طور سے نہیں معلوم ہوا تھا کہ ملک معظم کے کس دشمن کے ساتھ میرے لڑکوں نے آزادانہ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اب یہ بات صاف ہے کہ میرے لڑکے آسٹرین، بلغارین اور جرمنوں سے نہیں بلکہ صرف ترکوں سے ہمدردی کرنے کے الزام پر نظر بند کئے گئے ہیں

اس لئے میں جاننا چاہتی ہوں کہ آیا حقیقت میں گورنمنٹ کو ہم مسلمانوں کی حالت کا بخوبی احساس بھی ہے یا نہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو ہمارے صحیح حالات کے سمجھنے میں سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میرے لڑکوں کو ٹرکی سے اس سے زیادہ خاص ہمدردی نہیں ہے جتنی کہ انھیں چین سے ہے، لیکن مثل اور دوسرے لوگوں کے جن کا قرآنِ مجید پر ایمان ہے انھیں صاف الفاظ میں متعدد جگہ پہ تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ وہ کل مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھیں، اور ان کے ساتھ ہمدردی اور مہربانی کا اظہار کریں۔ کوئی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں کہا جاسکتا۔ جب تک کہ وہ ٹرکی کے ساتھ ویسے ہی ہمدردی کا آزادانہ اظہار نہ کرے اور اس ہمدردی کی تبلیغ کے لئے کوشاں نہ ہو جیسا کہ وہ مسلمانانِ ایران، ہندوستان وعربستان کے ساتھ کرتا ہے گذشتہ چھ سات سال کا عرصہ دنیائے اسلام کے لئے سخت مصیبت اور رنج کا زمانہ گزرا ہے اور میں فخر کرتی ہوں کہ اس زمانے میں جہاں کہیں اور جب کبھی مسلمانوں کو مصائب میں مبتلا دیکھا یا سنا، میرے بیٹوں نے اس درد کو محسوس کیا اور ان کے ساتھ رنج میں شریک ہوئے۔ چنانچہ ایران، مراقش اور طرابلس کے مسلمان ٹرکی کے مسلمانوں سے ان کی ہمدردی کے کم مستحق نہ تھے۔ سب کے ساتھ ان کی ہمدردی یکساں ہوئی۔ اس لئے کہ وہ سب مسلمان تھے اور کلام مجید کی تعلیم کے مطابق وہ سب یکساں ہمدردی کے مستحق تھے۔ یہ بات بھی ناقابل فراموش ہے کہ طرابلس اور بلقان کے ہنگامہ آرائیوں میں مظلومین کے ساتھ جو ہمدردی آزادانہ طور پر ظاہر کی گئی اور پھیلائی گئی اس کو وائسرائے و دیگر اعلیٰ حکام گورنمنٹ نے نہ صرف پسند کیا اور اس میں مدد دی بلکہ اعلانیہ اس کو پھیلایا اور مسلمانوں کی اس کے اظہار میں ہمت افزائی کی اور میرے بچوں نے بھی بوجہ سیاسی عقائد بلکہ بطور جزو مذہب کے اس ہمدردی کو آزادانہ طور پر ظاہر کیا اور پھیلایا، اور اس وقت کی بات ہے اب تک کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوئی جس سے اس مذہبی فرض کی بجا آوری کو کوئی جرم یا گناہ قرار دیا جائے۔

اسی کے ساتھ ہی اس مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ اگرچہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے ساتھ خواہ وہ کسی خطّے کے رہنے والے ہوں، ان کے برادرانِ ملّت کی ہمدردی لازمی اور ضروری ہے لیکن اعلیٰ حضرت سلطان ٹرکی کی ایک مخصوص حالت ہے۔ بحیثیت ایک دنیاوی تاجدار ہونے کے وہ دنیا کے ایک خطّے پر جو ٹرکی کے نام سے موسوم ہے ایسے ہی حکمراں سمجھے جاتے ہیں جیسے کہ شاہ کجکلاہ سرزمین فارس میں۔ اور اعلیٰ حضرت امیر افغانستان افغانستان میں سمجھے جاتے ہیں لیکن اس دنیاوی حکمراں سے جدا گانہ سلطانِ ٹرکی کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے جو دوسرے مسلم تاجداروں کو حاصل نہیں ہے۔ یہ امتیاز ان اختیارات، مرتبہ اور عظمت کی وجہ سے ہے جو خلافت کے ساتھ وابستہ ہے سلطان المعظم خلیفۃ الرسول یعنی پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور امیر المومنین ہیں، مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ کم سے کم ہماری گورنمنٹ اس بات کو محسوس کرتی ہے کہ یہ مذہبی مسئلہ (خلافت) غیر مسلمین کے اختیار سے باہر ہے لیکن عملاً اس اعتراف سے کیا فائدہ جبکہ گورنمنٹ ہندوستان کے بہترین مسلمانوں کو صرف اس جرم میں آزادی سے محروم کر رہی ہے کہ وہ اعلانیہ عالمِ اسلامی کے روحانی پیشوا اور اس کی مسلم رعایا سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں، حالانکہ یہ بھی اقرار ہے کہ ان لوگوں کی ہمدردی مجہول تھی یا اس کے جو کچھ بھی معنی ہوں)

میں دوبارہ اس امر پر زور دیتی ہوں کہ مسلمانانِ ٹرکی کے ساتھ ہمدردی اور ان کے حکمراں کو مذہبی پیشوا ماننا کوئی سیاسی عقیدہ نہیں ہے جس کو اپنی نجات عقبیٰ کو نقصان پہنچائے بغیر کسی کا دل چاہے تو تسلیم کرے اور نہ چاہے تو نہ تسلیم کرے نہ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جس کے تسلیم کرنے والے اس میں اپنی مرضی کے مطابق کمی بیشی کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے جو ہمارے مذہب کی روح سمجھا جاتا ہے ان کے حدود بھی مذہب میں سختی کے ساتھ قائم کئے گئے ہیں جس طرح کہ دوسرے مذہبی مسائل ہیں۔ میں کوئی مذہبی عالمہ نہیں ہوں نہ میرے لڑکے عالمِ دین ہیں۔ ہم لوگ اس مسئلے میں بھی مثل دوسرے دینی مسائل کے پیشوایانِ دین کی رہنمائی پر کاربند ہوتے ہیں

تاہم اس قدر تو ہماری طرح تمام مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ اپنے برادرانِ مذہب کے ساتھ جس ہمدردی کے برتنے کا حکم دیا گیا ہے اس کی حدود کل حالتوں میں یکساں اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ کیا میرے لڑکوں نے اس عجیب مسئلہ کو برطانیہ کے ٹرکی کے خلاف، اعلانِ جنگ کے بعد گورنمنٹ کو پریشان کرنے کے لئے تراشا ہے یا یہ مسئلہ اس مذہب کا جزو ہے۔ جو تیرہ سو برس ہوئے مکمل اور نہ بدلنے والی صورت میں ہمارے لئے چھوڑا گیا تھا۔ جاہل اور غیر معتبر شخصوں کی رپورٹوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے گورنمنٹ کو اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا اگر غور کیا تو اس فیصلہ کے نتائج پر کاربند ہونے کو تیار نہیں جس کے علاوہ سچائی سے وہ کسی دوسرے فیصلہ پر پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ کم از کم اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ میرے بیٹوں نے دشمنانِ بادشاہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار آزادانہ طور پر کیا۔ اور اسی طرح اس ہمدردی کو پھیلایا اور چونکہ یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ ہمدردی کب اور کس صورت میں ظاہر کی گئی اور پھیلائی گئی۔ اس لئے یہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے ان دعاؤں کے غلط معنی سمجھے ہیں جو تمام مسلمان ہمیشہ سے خلیفۃ المسلمین اور مسلمانوں کی افواج کے مظفر و منصور ہونے کے لئے مانگتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ صوبہ متوسط کے چیف کمشنر نے شوکت علی کو ایسی دعا مانگنے سے روکا تھا۔ چنانچہ ان دعاؤں کی نسبت جب مذہبی احکام ان کے سامنے پیش کئے گئے تب وہ حکم امتناعی منسوخ کر دیا گیا۔ اگر میرے بیٹوں نے (اس کے علاوہ) کوئی دوسرا طریقہ ہمدردی کا اختیار کیا تو صاف طور سے اس کا اظہار کیوں نہیں کیا گیا۔

ہم کو مسلمانانِ ٹرکی سے جو ہمدردی اور سلطانِ ٹرکی سے جو روحانی عقیدت ہے وہ ہمارے ناقابلِ تغیر مذہب کا ایک لازمی و ضروری جزو ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں، انھیں وجہ سے علی اور مجہول ہمدردی میں جو امتیاز پیدا کیا گیا ہے ہم مسلمانوں کے لئے ناقابلِ فہم ہو گیا ہے۔ رہی جذبات کی زیادتی تو اس کی نسبت یہ خیال کر لینا چاہیئے کہ بمقابلہ فتح و کامیابی کے ہمارے مسلمان بھائیوں کی تکالیف

و مصائب ہمارے دلوں میں ان کے لئے زیادہ ہمدردی پیدا کرتی ہیں اور میں نہیں سمجھ سکتی کہ روسی ہزیمت جس نے بقول آپ کے اگر جرمنوں اور ترکوں کے حوصلے بڑھا بھی دیئے ہوں کس طرح میکر لڑکوں کی ہمدردی اور کامل ترین قانونی آزادی پر اثر ڈال سکتی ہے۔

گورنمنٹ اس امر کی مختار ہے کہ وہ میکر لڑکوں کی رہائی کے لئے شرائط پیش کرے اور جب وہ اُن مجوزہ شرائط کو اپنے تحفظ مذہب کے ساتھ قبول کرلیں تو ان کو واپس لے لیں۔ اگر اُن کا (میکر لڑکوں کا) طرز عمل کسی سیاسی خیال پر مبنی ہوتا تو (گورنمنٹ کا یہ رویہ) اس میں تبدیلی پیدا کرسکتا تھا لیکن ان تکالیف نے جو اس ڈھائی سال کے عرصہ میں انھیں پہونچی ہیں اور جو ان کی سیاسی حماقت بخوبی دور کرسکتی تھیں ان کو اپنے اس ارادے میں اور پختہ کردیا کہ وہ کوئی ایسا فعل نہ کریں جو ان کی نجات آخری کے مانع ہو۔ اور اس معاملہ میں وہ اپنی رائے کو بلا ان تمام چیزوں کے چھوڑے ہوئے جن کو وہ نہایت عزیز اور مقدس سمجھتے ہیں ذرہ برابر تبدیلی نہیں کرسکتے اور یقین مانئے کہ یہ الفاظ ایک ماں کے منہ سے نکلے ہیں۔

میری عزیز بہن میں نے اس مسئلہ پر آپکی بہت سمع خراشی کی لیکن میں افسوس کے ساتھ یہ بتلانا چاہتی ہوں کہ چونکہ اس مسئلہ پر اس وقت تک پبلک اخبارات میں بھی کوئی ایسا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا اور میں آپکو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ باوجود اپنی عبادت اور گھر کے فرائض کی انجام دہی کے جس سے مجھے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ میں تمام اردو اخبارات پابندی کے ساتھ پڑھواتی ہوں اور اکثر انگریزی اخبارات کا بھی خلاصہ کروا کر سنتی ہوں جو مجھے اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ ہماری غیر مسلم حکومت نے ہم مسلمانوں کی مذہبی پوزیشن کو اصلی اور حقیقی صورت میں سمجھا ہے اور اس امر کا اظہار بس غصہ سے نہیں بلکہ کمال حزن و ملال کے ساتھ کرتی ہوں۔ ہماری وفاداری دنیاوی بادشاہ کے ساتھ خواہ وہ مسلمان ہو یا عیسائی یا ہندو ہماری کامل مذہبی آزادی کے ساتھ مشروط ہے اور خدا سے ڈرنے والے مسلمانوں کی حیثیت سے ہم دُنیا

کے کسی حکمراں کے ایسے احکام کی تعمیل نہیں کر سکتے جو احکم الحاکمین کے احکام کے خلاف
نافذ کیئے جایئں اس لیے کہ خدا کی اطاعت تمام اطاعتوں پر مقدم ہے خواہ وہ اطاعت
بادشاہ کی ہو یا ملک کی۔ باپ کی ہو یا ماں کی۔ بھائی کی ہو یا احباب کی۔ میری رائے
میں اگر کوئی بادشاہ یا حکومت کسی مسلمان کے اس قرار پر اعتماد کر کے حکومت کی اطاعت
کو خدا کی اطاعت پر مقدم رکھتا ہے تو وہ بادشاہ یا حکومت ٹوٹی ہوئی لکڑی کے بل پر
کھڑی ہے، میں اس کو تسلیم کرتی ہوں کہ دنیاوی حکومتوں کی ضروریات اکثر اوقات
اس بات کو گوارا نہیں کرتیں کہ خدا کی اطاعت ان کی وفاداری کے مساوی بھی جاوے اور
ہر مذہب کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے اور اس بنا پر کہ اس قسم کی رواداری
بعض اوقات دشوار ہو جاوے۔ دنیاوی حکمرانوں کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ رعایا کے حقیقی
مذہبی جذبات سے آگاہ ہوں اور اپنے طرز عمل کو اس کے مطابق طے کریں تاکہ کوئی ایسی
صورت پیدا نہ ہو کہ رعایا کی مذہبی اطاعت اس کی دنیاوی اطاعت کے متضاد ہو ہر
گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ رعایا کی اس نازک حالت کو پورے طور سے محسوس کرے جبکہ
اس کو خدا کی فرمانبرداری اور انسان، یا انسانوں کی ایک جماعت کی اطاعت شعاری
میں انتخاب کرنا ہوتا ہے خواہ وہ انسان یا جماعت کیسی ہی اعلیٰ مرتبت کیوں نہ ہو۔
ایسے انتخاب کے وقت دوسرے چاہے کچھ کریں لیکن مسلمان صرف ایک راستہ
اختیار کر سکتا ہے ملک اور بادشاہ کے لئے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیئے
کوئی شخص دوسرے سے اس کی روح کے حوالے کر دینے کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔
یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میرے لڑکوں نے کبھی اپنے مذہبی عقائد کو پوشیدہ رکھا
ہے، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے عقائد دیگر مسلمانان ہند کے عقائد سے مختلف ہیں
اس لئے کہ تمام مسلمانان ہند بالاعلان کہہ رہے ہیں کہ جو محمد علی اور شوکت علی کا
عقیدہ ہے وہ ہی ہمارا بھی عقیدہ ہے اس لئے سب بھی اگر ان سے زیادہ نہیں تو ان سے
کم نظر بندی کے سزاوار نہیں اپنی نظر بندی سے برسوں پہلے انھوں نے بار ہا
گورنمنٹ کو اپنے عقائد سے مطلع کیا ہے اس لئے ان پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا

کہ انھوں نے دفعتاً گورنمنٹ کے سامنے کوئی انوکھے خیالات پیش کئے ہیں۔ میری عزیز بہن! یہ بہت کمزور قسم کا تدبر ہے کہ پہلے تو رعایا کے مقدس عقائد کو نظر انداز کیا جائے اور پھر بعد میں ان کو ان عقائد رکھنے کے بنا پر سزا دی جائے اگر گورنمنٹ کا منشاء سات کروڑ مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرض کے ادا کرنے سے روکنے کا ہے تو چند مسلمانوں کی نظر بندی خواہ وہ کیسے ہی عزیز مذہبی اور سیاسی رہنما کیوں نہ ہوں بہت معمولی سزا ہے۔ کیا مسلمان کا ہر فرد اپنے مقدس پیغمبر کے اس عقیدے پر ایمان نہیں رکھتا ہے کہ تحقیق میری عبادت اور ریاضت حیات و موت اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے جس کا کوئی شریک نہیں میں اس کی طرف سے معمور ہوا ہوں اور اس کی اطاعت گذاری میں سب بندوں سے آگے ہوں؟ کیا باوجود اس اعتقاد کے کوئی سچا مسلمان نظر بندی زندان یا موت سے ڈر سکتا ہے؟

میں بہت کچھ لکھ چکی ہوں مگر آپ کی اس تجویز کے متعلق کہ میرے لڑکوں کا مقدمہ ہائی کورٹ میں پیش کیا جائے اپنی رائے کا اظہار کئے بغیر میں یہ خط ختم نہیں کر سکتی افسوس کہ میں قانون سے واقف نہیں نہ مجھے اس کا کچھ تجربہ ہے جو میری رہنمائی کر سکتا۔ مگر میرے لڑکوں کو اس کا کچھ تجربہ ہے اور اُن کے بعض دوست اور ہمارے مشیر قانونی مسٹر گھاٹے قانون سے بخوبی واقف ہیں اور اس کے عملدرآمد کا خاصہ تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ میرے لڑکوں کے مقدمہ کے لیے موافق پہلو پر عدالت میں بحث کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور ہائی کورٹ کا فیصلہ قانون تحفظ ہند کے جواز یا عدم جواز تک محدود رہے گا جس کو وائسرائے کی کونسل نے پاس کیا ہے۔ میں بڑی خوشی سے اس بات کو منظور کر لیتی کہ میرے بچوں کے اوپر ایک باقاعدہ عدالت میں غیر جانبدار اور منصف ججوں کے سامنے مقدمہ چلایا جائے گو کہ میں جانتی ہوں کہ محمد علی کی شکستہ تندرستی پر ایسے مقدمے کے جوش کا نہایت خوفناک اثر پڑے گا لیکن جو چاہے سو کہے قانون سے فائدہ صرف روپیہ والے اٹھا سکتے ہیں۔ اور اگر اس کے حریف کے تمام اخراجات مقدمہ

خزانہ عامرہ سے دیے جائیں تو ہمارے مالدار سے مالدار آدمی کا بھی دوالہ نکل جائے۔ آپ نے خاص ہمدردی و عنایت سے قانونی اخراجات کے لئے ایک فنڈ کھولا ہے اور ہیں اپنی جیب خاص سے بھی چندہ عنایت کیا ہے لیکن میں آپ سے صاف طور پر پوچھتی ہوں کہ کیا اس میں کوئی فائدہ بھی ہے۔ اگر ہم نے اپنے حاکموں کے خلاف کوئی فیصلہ کرا بھی لیا تو کیا آپ اُمید کرتی ہیں کہ وہ اس معاملے کو وہیں چھوڑ دیں گے۔ اور نچلے بیٹھ جاویں۔ اگر ہم آپ کی طرح یہ یقین بھی کرلیں کہ اگر جنگ کی حالت اس قدر نازک نہ ہوتی جتنی کہ آجکل ہے تو وایسرائے اور ان کی کونسل میرے بیٹوں کو بخوشی رہا کر دیتی تو کیا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جنگ اور میرے بچوں کی رہائی کے تاریخ کے متعلق اپنے موجودہ خیالات رکھتے ہوئے وہ میرے بیٹوں کی رہائی کو صرف اس وجہ سے خوشی سے دیکھ سکیں گے کہ ہائی کورٹ ہی نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اسے میرے بیٹوں کو آزادی سے محروم کرنے کا کوئی اختیار نہیں ؟ اور کیا وہ ایسی زبردست طاقت (قانون تحفظ ہند) کو اپنے ہاتھوں سے ایسی آزادی کے ساتھ نکل جانے دیں گے اور ہزاروں ہندوستانیوں کو جو اب قید میں پڑے سڑ رہے ہیں آزاد ہوتے دیکھ سکیں گے ؟ کیا اس وقت برطانوی پارلیمنٹ سے قانونِ تحفظ ہند کو جائز قرار دینے یا اسی قسم کا کوئی دوسرا قانون بنا دینے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا ؟

لیکن ان سب باتوں پر غور کرکے فیصلہ کرنے کا انحصار آپ لوگوں پر ہے جو عام حالات سے بخوبی واقف ہیں مگر میری رائے میں ان باتوں سے بدرجہا زیادہ ضروری ایک اور مقصد کیلئے چندہ کرنا ہے اور وہ مقصد اُن نظربندوں اور ان کے متعلقین کی امداد ہے جو اس نفرت انگیز قانون کی وجہ سے سخت مصائب اور آلام اٹھا رہے ہیں۔ آئے دن ان مصیبت زدوں کے دردناک قصے سُنے جاتے ہیں جن کو سُن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کو گورنمنٹ نے آزادی سے محروم کر دیا ہے اور پھر ان کو اس بات کا بھی اختیار نہیں کہ کمائی کرکے اپنے بال بچوں کا پیٹ بھر سکیں اور اس کے ساتھ ہی حکومت نے ان کی گذر اوقات یا ضروریات زندگی

کے لیۓ اپنی طرف سے کسی قسم کی امداد دینے کے خیال کو بھی فراموش کر دیا ہے۔
یہاں تک کہ ایسی حالتوں میں خودکشی کی خبریں بھی سُنی گئی ہیں۔ میں پھر وہی کہتی
ہوں جو میں نے اپنے عزیز بھائی سر سبرامنی آئر کو لکھا تھا کہ کوئی صورت ان
بد نصیبوں اور ان سے زیادہ بد نصیب ان کے متعلقین کے لیۓ جن کی معصومیت
میں قطعی کلام نہیں روپیہ مہیا ہونے کی ہو سکتی ہے؟ گزشتہ ڈھائی برس میں حکومت
کے قطعی ناکافی امدادی رقم میں گزر اوقات کرنے کا جو تجربہ مجھے ہوا ہے اس سے اندازہ
کر سکتی ہوں کہ ان لوگوں کو ضروریاتِ زندگی کے مہیا کرنے کی کن مصیبتوں کا سامنا
کرنا پڑتا ہوگا جو ہم سے بھی زیادہ بد قسمت ہیں۔ ہمارے پاس کچھ جائیداد تو ہے جو
سخت ضروریات کی حالت میں فروخت کی جا سکتی ہے (کچھ عبارت مٹ گئی ہے) جو
ہماری تکلیف کی خبر سنتے ہی اس کو رفع کرنے کے لیۓ مستعد ہوتے ہیں۔ علاوہ
مالی امداد کے یہ خیال کر کے بھی بہت ہمت بندھتی ہے کہ اگر ہم جلاوطن یا شہر بدر
ہیں تو ہمارے ان ہم وطنوں کو ہماری حالت کا احساس ہے جو آزاد ہیں اور آرام
بلکہ عیش کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نہ صرف ان بیسیوں مسلمانوں کا جس
میں زیادہ تر مذہبی رہنما یا مقدس کتابوں کے پڑھنے والے ہیں۔ جن کے متعلقین کی
مصیبتوں کا حال اُردو اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے بلکہ سینکڑوں بنگالی نوجوانوں
کا خیال کر کے میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے جو مختلف جگہ نظر بند ہیں اور جن میں سے
بعض تنہا کوٹھڑیوں میں قید ہیں اور جنھوں نے دوامی فاقہ کشی کا مستقل ارادہ
کر لیا ہے کہ یہ ہماری حبّ الوطنی پر ایک بدنما دھبہ نہیں کہ تقریبًا تین سال تک
ایک نفرت انگیز قانون پر سختی کے ساتھ عملدرآمد ہونے کے باوجود ہم نے کوئی
ایسا انتظام نہیں کیا جس سے ایک تفصیلی یادداشت تمام نظر بندوں کی رہے جس
سے یہ پتہ چل سکے کہ کون کون شخص اور کس کس جگہ نظر بند ہیں یا کس وجہ سے
نظر بند کیۓ گئے ہیں۔ اور کس قسم کی قیود ان پر عائد کی گئی ہیں اور بعد میں
اکثر بغیر کسی سبب کے ظاہر کیۓ ہوئے ان پر کس قسم کی تازہ سختیاں

عائد کی گئی ہیں۔ ان کے لئے اور ان کے متعلقین کے لئے جن کی پرورش ان پر لازمی ہے کس قدر وظیفہ مقرر ہے اور نظر بندی سے پہلے جس طریقے سے زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اس کو خیال کر کے ان کی بسر اوقات کے لئے اُن کو مقررہ امداد کے علاوہ کس قدر دیگر امداد کی ضرورت ہے اور نظر بندوں کے وظائف مقرر کرتے وقت ان امور کو بالعادات فراموش کر دیتی ہے۔ نظر بندوں کے متعلق کفالت کا انتظام ان بچوں کی مناسب تعلیم گورنمنٹ کے پاس ان کی (تحریر مٹ گئی ہے) سلسلہ میں قائم رکھنا اور نظر بندوں کو مقامی حکام کے جائز استعمال اختیارات سے بچانے کے لئے جو بعض اوقات اس حکومت سے بھی زیادہ ان لوگوں سے ناراض ہوتے ہیں جن کے حکم سے یہ لوگ نظر بند ہوئے ہیں اور جو عملی تشریحات اور شہر والوں پر خفیہ سرکاری دباؤ ڈال کر نظر بندوں کی پابندیوں کے اضافہ کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ان تمام اُمور کے متعلق یادداشت کا مرتب کرنا میرے نزدیک نہایت ضروری ہے۔ میرے خیال میں اس قسم کے انتظام کی راہ میں کوئی ایسی دشواری حائل نہیں ہے جو حل نہ ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس قسم کی تدابیر پر بھی عمل کیا جائے جو نظر بندوں کی رہائی کے لئے مناسب سمجھی جائیں خواہ وہ قانونی چارہ جوئی ہو یا سرکاری عمال سے اپیل ہو اور یا برطانوی قوم اور پارلیمنٹ سے درخواست ہو یا خود اپنی ہی قوم کو اس بات پر آمادہ کرنا ہو کہ وہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں نظر بندوں کے شریکِ حال ہوں جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ خوش قسمتی سے میرے بچوں کو ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے پوری مدد مل جاتی ہے مگر دوسرے لوگ ایسے خوش قسمت نہیں ہیں اور ان کی طرف خاص طور سے دست امداد بڑھانا چاہیئے۔ ان بچاروں نے پبلک لائف میں کوئی خاص شہرت حاصل نہیں کی اور جب کہ ہم چند مشہور لوگوں کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں جو اپنی قومی کوششوں کے باعث مصیبت میں مبتلا ہوئے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ یہ لوگ جو زیادہ مشہور

نہیں ہیں بھلا دیئے جاویں اور اگرچہ ان کی تکلیف دوسروں سے زیادہ ہیں اور ان پر کسی سے کم زیادتی نہیں ہوئی ہے۔

ایک اور امر ہے جس کے متعلق زیادہ نہیں تو سرسری اشارہ کرنا چاہتی ہوں اور وہ شاہ آباد اور گیا و پٹنہ کے اضلاع میں عید الضحیٰ کے موقع پر فسادات کے جگر خراش واقعات ہیں ان واقعات کا مسلمانانِ ہندوستان پر قدرتاً بہت گہرا اثر ہوا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ اثر اس سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ان مسلمان مردوں اور عورتوں کی خوفناک مصیبتوں اور مذہبی توہین کا آپ کو بھی اتنا ہی افسوس ہوا ہے جتنا کہ مجھے۔ میرے دل پر ان واقعات کا جیسا کہ چاہیئے بہت بڑا اثر ہوا ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ یہ واقعات ایسے وقت میں ظہور پذیر ہوئے جبکہ ان کو نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ ان حادثات نے صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ ہمیں اس مذہبی تعصب کی کتنی بیخ کنی کرنی باقی ہے جو قومی ترقی کی راہ میں حائل ہیں اور جن کو ہمارے حریف ہم کو ہمارے گھر کی ملکیت سے محروم رکھنے کا بہانہ بنائے ہوئے ہیں جو کچھ ہم کر چکے ہیں ہمیں اس پر قناعت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ دل سے کوشش کرتے رہنا چاہیئے کہ اس قسم کے ناگفتہ بہ واقعات دوبارہ ظہور پذیر نہ ہوں اور خاص کر اس وقت میں جبکہ برعکس موجودہ زمانے کے ہم خود اس قسم کے بدنظمی کے انسداد کے تمام و کمال ذمہ دار ہوں۔ یہ معلوم کر کے مجھے تسکین ہوتی ہے کہ باہمی شکوہ و شکایات کے باوجود ہماری قوم اس وقت کی شدید ترین ضرورت کو نظر انداز کر رہی ہے اور وہ ضرورت ان سے زیادہ مصیبت زدوں کی امداد کرنا ہے جن کے پاس نہ پیسہ ہے نہ روٹی نہ کافی کپڑے ہیں نہ رہنے کا جھونپڑا ہی ہے جسے وہ اپنا گھر کہہ سکیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ ان کی مدد کرنے کے لئے اور زیادہ کوشش کی جائے۔

ایک بات جس پر میں فخر کرتی ہوں اور جسے دیکھ کر مجھے مسرت ہوتی ہے یہ ہے کہ ان جگر خراش واقعات نے میرے ہم مذہبوں کے عقیدے میں کوئی فرق

نہیں ڈالا ہے کہ بالآخر ہندوستانی مفاد ایک ہی ہے نہ ان واقعات نے ان کے اس عزم میں کسی قسم کی کمزوری پیدا کی ہے کہ اقوام عالم میں جس درجہ اور مرتبہ کا ہندوستان ایک مدت سے مستحق ہے اس کو بلاتوقف حاصل کرنا چاہیئے۔ خود غرض اشخاص کروڑ ہا بے زبان ہندوستانیوں کی ترجمانی کرنے کا جھوٹا دعویٰ کر رہے ہیں لیکن وہ کتنا ہی حقیقت کو چھپانا چاہیں اور وزیر ہند صاحب سے جن کا ہم نے خوشی سے خیر مقدم کیا ہے ملنے والوں کے بجائے وزیر ہند کے خود انتخاب کرکے کتنے ہی واقعات کی پردہ پوشی کرنا چاہیں کبھی وزیر ہند صاحب اس امر کو بغیر محسوس کئے ہوئے نہیں رہ سکتے کہ باوجود اس اشتعال کے (واقعات اضلاع شاہ آباد، گیا، پٹنہ) سمجھدار مسلمانوں کی حب الوطنی مثل سابق کے ہے۔ اور وہ اس راہ سے جو انھوں نے اپنی قوم کے لئے بڑے غور و فکر کے بعد طے کی تھی منحرف نہیں ہوئے۔ ان بے انتہا پریشان کن حادثات کے صدمہ کے موقع پر وہ ثابت قدم رہے ہیں۔ اس سے بہترین طور پر ثابت ہے کہ مسلمان اپنے قومی احساسات کو محو کئے بغیر تمام ملک کے ساتھ کس قدر خیال کرتے ہیں۔ اسی لئے میں کہتی ہوں کہ مجھے ایک طرح خوشی ہے کہ یہ سانحات خاص ایسے ہی وقت میں ظہور میں آئے۔ یہ ہوم رول کا ابتدائی پھل یا مزہ نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ کا رعایا کو جواب دہ ہونے کا لوازمہ ہے۔ میں دعا کرتی ہوں اور مجھے امید ہے کہ مسلمانوں نے ان واقعات سے پریشان ہوئے بغیر اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کا جو تہیہ کر لیا ہے اس کے اجر میں امن و عافیت اور اپنے ملک کی ترقی کے لئے ان کو کامل آزادی اور پوری ذمہ داری ملے گی۔ اور یہی چیزیں امن و انتظام اور کامل رواداری کی بہترین ضمانت ہیں۔

عزیز بہن! میں اب آپ سے جدا ہوتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ کلکتہ میں قوم کے بحث و مباحثہ میں کامل غور و خوض کے بعد آپ کامیابی کے ساتھ اس کی راہ نمائی کریں۔

میں صرف یہ اضافہ کرنا چاہتی ہوں کہ یہ خط میں نے مسٹر گھاٹے کی مدد سے

لکھا ہے جو دو سال سے ہم لوگوں کے پاس آتے جاتے ہیں اور ہمارے تمام حالات سے
پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ یہ مجھے مجبوراً لکھنا پڑ رہا ہے کیونکہ گذشتہ ستمبر میں جو خط
میں نے اخباروں کو بھیجا تھا اس کے بابت سرکار نے غلطی سے یہ یقین کر لیا کہ اس کو
میرے بیٹوں نے لکھا تھا۔ اور اس بنا پر ان کو دھمکی بھی دی گئی کہ اگر ان سے وہ خطا جس
کے وہ کبھی مرتکب نہیں ہوئے دوبارہ سرزد ہوئی تو ان پر اور زیادہ قیود لگائی جاوینگی۔
اگر وہ آزاد ہوتے تو میں قدرتاً ان سے امداد لیتی لیکن جیسا کہ آپ جانتی ہیں ان کے آزاد
نہ ہونے کی وجہ سے مجھے مسٹر گھاٹے سے متعدد بار مدد لینا پڑی۔ مجھے ہنسی آتی ہے کہ
ہم غریب پردہ نشینوں کو کس قدر ناقابل خیال کیا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میرے زمانے کی
بیبیاں اسکول اور کالجوں میں نہیں جاتی تھیں لیکن تعلیم ہمیشہ سے اس قسم ہی کی درسگاہوں
میں نہیں دی گئی ہے اور آج بھی تعلیم صرف ان ہی کے ذریعہ سے نہیں دی جاتی ہے۔ میں
خود ایسی عورتوں سے واقف ہوں جن کو میری طرح کم سنی میں بیوگی میں تمام بار برداشت
کرنا پڑے جن کا تعلق مردوں سے تھا۔ اور انھوں نے ان غیر معمولی خدمتوں کو اس
عمدگی سے انجام دیا کہ جو نہ صرف ان کے لئے قابلِ تعریف ہے بلکہ ان کی اولاد کے لئے بھی
مفید ثابت ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے ستمبر کے سادہ بیان میں کونسی ایسی
بات تھی جو مسٹر گھاٹے جیسے یونیورسٹی کے قابل گریجویٹ اور تجربہ کار شخص کی قابلیت
سے باہر تھی۔ میں نے مسٹر گھاٹے کو بڑی محنت کے ساتھ وہ تمام باتیں سمجھا دی تھیں جو میں
لکھوانا چاہتی تھی۔ اور پھر آخر میں اس بات کا اطمینان بھی کر لیا تھا کہ جو میں چاہتی
تھی وہ ہو گیا۔ غالباً اس بات کو فراموش کر دیا گیا ہے کہ جب بدقسمتی سے ان معصوم
بچوں کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تو یہ غریب پردہ نشین ماں تھی جو ان کی تعلیم
کی منتظمہ و نگہبان تھی۔ اور آج بھی ان تمام گھر کی مالک ہے اور تمام اہم معاملات
میں کم از کم ان سے مشورے کئے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔

ان کی ماں جو ان کے ساتھ زبردستی کے جلا وطنی میں رہ کر خود بخود اپنے آپ
کو چھنڈواڑہ سے باہر بقیہ دنیا سے کلیتہً علیحدہ نہ کر سکی تو اس میں نہ میرا کوئی بس

ہے نہ ان کا۔ یہ خیال کرکے ان کو کچھ تسکین ضرور ہو گی کہ اگرچہ پہلی مرتبہ بغیر کسی وجہ یا سبب کے ظاہر کیے ان پر مزید قیود عائد کی گئی تھیں۔ اور ان کی تمام فکر و احتیاط حکام کے ناجائز استعمال اختیارات سے ان کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ اس مرتبہ ان کو بوڑھی ماں کی بدولت یہ تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔ ان کو یہ معلوم ہو گا کہ کس گناہ کی پاداش میں ان کو یہ سزا مل رہی ہے۔ چاہے وہ اپنے مذہبی عقیدہ کے باعث مصیبت جھیل رہے ہوں جیسا کہ سرکاری باتوں سے ہمیں صاف طور پر معلوم ہوتا ہے، یا اپنے ملک کی بدولت جس کی خدمت گزاری میں انھوں نے ان لوگوں کی ناراضگی اور کینہ کے باعث مصیبت اٹھائی جنھوں نے حکومت کا اجارہ لے لیا ہے، اور جن کے ہاتھوں میں اس بات کا فیصلہ ہے کہ ان کو آزاد کیا جائے یا نہیں۔ میں دعا کرتی ہوں اور آپ سے بھی دعا کرنے کی درخواست کرتی ہوں کہ خدایا آخر تک ان کو برداشت کی قوت دے۔ خواہ اس قید ستم کی انتہا قریب ہو یا دور میرا کامل یقین ہے کہ فتح حق و انصاف اور صداقت ہی کی ہوتی ہے۔ ہم بھروسے کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے ہیں اور جب تک وہ حاصل نہیں ہوتی اس وقت تک جیسا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ صبر و دعا سے کام لیتے ہیں۔"

آپ کی عزیز بہن	انجمن اعانتِ نظر بندانِ اسلام دہلی ۱۹۱۷ء
(آبادی بانو عبدالعلی بیگم)	(چند اہم خطوط: تذکرہ ص ۲۳۔تا ۲۸)

جب محترمہ بی اماں کو ہندوستانی خواتین کے اس وفد کا ایک رکن مقرر کیا گیا جو ۱۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کی خدمت میں باریاب ہونے والا تھا تو انھوں نے اپنی عدم شرکت کی وجوہ کی توضیح کرتے ہوئے مسز اوما نہرو الہ آباد کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

"اس کے علاوہ چند اور امور ہیں جن کو میں نہایت آزادی اور جرأت کے ساتھ آپ کو جتا دینا چاہتی ہوں اور مجھے یقین کامل ہے کہ میری تحریر کا مطلب

غلط نہ سمجھا جائے گا۔ خواہ باہر کے لوگ جو ہمارے ملک کو مشکل ہی سے دنیا کا کوئی ملک خیال کرتے ہوں گے۔ ہندوستان کی مصیبت زدہ پردہ دار عورتوں کے متعلق کچھ بھی خیال کیوں نہ کریں مگر آپ جانتی ہیں اور میں بھی جانتی ہوں کہ ہم لوگ اپنی چھوٹی سی حکومت میں کیا حیثیت رکھتے ہیں عورتیں اپنے گھروں کی ملکہ ہوتی ہیں اور ہمیں اپنے گھروں میں کس قدر وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے اور ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں اس کے حصول کے لئے نئے طریقے اختیار کریں اور یہ بھی قابلِ اجازت ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی اپیلوں کو لے کر غیروں کے سامنے بھی جائیں خواہ ہم اپنے مقصد کی کامیابی کے متعلق کتنے ہی مشتبہ کیوں نہ رہے ہوں۔ مگر کیا میں آپ سے دریافت کر سکتی ہوں کہ آیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ہم اپنی متحدہ چاردیواری کے اثرات ڈال کر اپنے بیٹوں، بھائیوں یا بابلوں سے مطالبہ کرتے بجائے اس کے کہ ہم بھکاری کے طور پر کسی دوسرے کے پاس جائیں خواہ وہ کتنی ہی اعلیٰ حیثیت کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس معاملے میں میری رائے بہت سخت ہے اور آپ کو مدنظر رکھنا چاہیئے کہ یہ ایک ایسی عورت کی رائے ہے جو پُرانے زمانے کی ہندوستانی عورت ہے مگر وہ اپنے آپ کو نئے خیالات سے بھی بہرہ ور رکھنے کی کوشش کرتی ہے:

اس کے بعد اسی خط میں آپ لکھتی ہیں کہ اگر اس قسم کا کوئی وفد پرانے ایام میں کسی ہندو یا مسلمان بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوتا تو اسے "رعایا کے باپ" سے ۹۹ فیصدی وہ ثمر مراد حاصل ہو جاتا جس کا وہ طالب ہوتا، خواہ اس کے عطیے سے مردوں کو متعدد بار بھی انکار کیا جا چکا ہوتا۔ اس کے علاوہ بادشاہ خیال کرتا کہ اس طرح اس کی غیر معمولی عزت کی گئی ہے۔ اس کے قصر کے طائر اس واقعے کے راگ گاتے اور لوگ اس باوقار کو رازِ دائم بنا دیتے۔ آپ کے وفد کے نتیجے کی نسبت میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی۔ مگر ہماری یہی بہادر بہن مسز بیسنٹ کے ساتھ ان کی اس کوشش اور جد و جہد کی وجہ سے جو

انھوں نے سلطنت برطانیہ کو دوام بخشنے کے لئے کی ہے جو کچھ برتاؤ ہوا اس کو مدنظر رکھ کر میں کچھ نہ کچھ اندازہ کرسکتی ہوں کہ بہادر اینگلو انڈین پریس کی طرف سے آپ لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا۔ کاش ہندوستانی عورتوں کی عزت کی خاطر ہی نہیں بلکہ ہندوستانی مردوں کی عزت کی خاطر کوئی ایسا وفد وزیر ہند کی خدمت میں باریاب ہونے نہ جاتا۔ بلکہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے پاس جاتا اور نہایت صفائی سے اعلان کردیتا کہ ہندوستان کی خواتین اپنے مردوں سے کیا چاہتی ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ عورتیں جو کچھ طلب کرتیں مرد جلد یا بدیر ان کے مطالبات پورے کردیتے۔ یہ تمام دنیا کی تاریخ کا ایک سبق ہے۔ یہ آخری وجہ جو آپ اپنے مدراس کے وفد میں شریک نہ ہونے کے متعلق پیش کرتی ہیں وہ ذاتی ہے۔ امید ہے کہ اینگلو انڈین حضرات اور مسٹر مانٹیگو اس کی پورے طور پر قدر کریں گے۔

تمام باتوں کے علاوہ ایک بات اور ہے کہ میں کس وجہ سے مدراس میں آپ لوگوں کے ساتھ شریک نہ ہوسکونگی اور یہ وجہ میری ذاتی وجہ ہے۔ صاحب وزیر ہند ایک آزاد ملک سے آئے ہیں اور آزاد آدمی کی حیثیت سے وہ چاہتے ہیں کہ وہ ایسے لوگوں سے ملیں اور گفت وشنید کریں جن کی حیثیت یہ ہو کہ وہ انھیں بتائیں کہ ہمارے ملک کی ضروریات کیا ہیں اور ہم اپنے ملک کی بہبودی، خوشحالی، اس کو بلند کرنے کے لئے کیا چاہتے ہیں مگر طاقت اور انگریزی سرکاری ملازمین نے جو تحقیقات خواہ ان کے کسی اہل ملک کے ہاتھوں کی جائے یا کسی ہندوستانی کے ہاتھوں سوائے کچھ کھونے کے کچھ حاصل نہیں کرتے۔ یہ مناسب خیال کیا کہ جس وقت تک صاحب وزیر ہند اس ملک میں رہیں ہم لوگوں کی طرح پردہ نشین رہیں اور ان لوگوں سے نہ ملیں جو نہایت آزادی کے ساتھ صورت حال کو ان کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہیں۔ ان لوگوں میں میرے نظر بند بچے بھی شامل ہیں اور جن کو ملنے دیئے جانے کی اجازت سے گورنمنٹ ہند نے انکار کردیا۔ یہ نہایت تعجب انگیز امر ہوگا کہ صاحب وزیر ہند جن کی رگ و پے میں ایک آزاد ملک

ہیں پرورش و نشوونما پانے کی وجہ سے آزادی کی روح ہے۔ ان کو تو مشرقی
ملک کی آب و ہوا میں رہنے کے قابل بنانے کے لیے پردہ میں رکھا جائے اور
میں جو پردہ نشین عورتوں کی طرح پلی ہوں پردہ سے نکل کھڑی ہوں۔ اگر میں
رسم و رواج کو چھوڑ کر (وفد میں شریک ہونے کو) تیار بھی ہو جاؤں تو یہ ممکن ہے
کہ اسی دوران میں صاحب وزیر ہند پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کردی جائیں کہ میں
ان سے اہم معاملات مثلاً مذہبی عزت و احترام، ہندوستانی عورتوں اور مردوں
کی زندگیوں اور آزادی کے متعلق کچھ نہ کہہ سکوں میں ان سب باتوں کو ایک ایسی
لازوال قوت کے سامنے پیش کرنے کے لئے اٹھائے رکھتی ہوں جس کی ذات
کسی التجا کرنے والے کو ناامید کرنے سے بہت اعلیٰ ہے اور جو خود لوگوں کو التجائیں
پیش کرنے کی دعوت دیتی ہے تاکہ انھیں پورا کیا جائے" (اخبار جمہور کلکتہ ۔ ۷ر جنوری ۱۹۱۸ء)
وزیر ہند کی خدمت میں باریاب ہونے والے زنانہ وفد کی فہرست میں بی اماں کا اسم
گرامی اخبارات میں دیکھ کر مدراس کے آنریبل یعقوب حسن نے آپ کو دعوتی
خط تحریر کیا کہ آپ مدراس تشریف لائیں تو میرے یہاں قیام فرمائیں جواباً جو خط
تحریر کیا گیا (۷ر دسمبر ۱۹۱۷ء) اس کا بقول ایڈیٹر اخبار "مدینہ" "ایک ایک
حرف غیوری کا نقش اور خدا پرستی کا نشان ہے"۔ وہ فرماتی ہیں ...."علاوہ ازیں میں
نہیں جانتی کہ اس وفد کی کون سی ضرورت ہے جو مطالبات ہندوستان کی عورتیں پیش
کرنا چاہتی ہیں ان میں سے چند تو ایسے ہیں جن کو ہمارے مردوں کو ہی پیش کرنا
چاہئیں۔ ہاں اگر وہ مطالبات کو مردانہ وار پیش کرنے کی ہمت
نہیں رکھتے تو ہم عورتوں کا فرض ہوتا کہ خود جاکر ان کو وزیر ہند کے سامنے پیش
کرتے اور اپنے مردوں کو غیرت دلاتے۔ مگر خدا کے فضل سے مردوں نے اب
تک ایسی کمزوری نہیں دکھائی ہے کہ ہمیں انھیں غیرت دلانے کی ضرورت پیش
آئے۔ باقی مطالبات جو عورتوں کے مخصوص حقوق سے متعلق ہیں ان کے بارے میں کیا
یہ کہنا مناسب ہے کہ انھیں اپنے مردوں کے سامنے پیش کرنے سے احتراز کریں
اور غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں جس سے مردوں اور عورتوں دونوں

کی سبکی ہے۔ خاص میرے شریک نہ ہونے کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ جب کہ وزیر ہند وائسرائے گورنمنٹ کے مشورے پر مرد ہو کر میرے لڑکوں سے پردہ کرتے ہیں تو مجھے تو عورت اور پردہ نشین ہو کر اُن سے اور بھی زیادہ پردہ کرنا چاہیئے۔ مجھے نہ اپنے لئے اور نہ اپنے بچوں کے لئے ان سے کچھ مانگنا ہے۔ میرے لئے خدا کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے اور دن ورات میں کم از کم پانچ سات بار اسی چوکھٹ پر سر جھکاتی اور ہاتھ پھیلاتی ہوں جو مجھے درکار ہے صرف وہیں سے مل سکتا ہے اور جب اس کا ملنا مناسب ہو گا آپ مل رہے گا۔ مجھے میرا خدا کافی ہے"۔ (اخبار مدینہ بجنور ۲۵ دسمبر ۱۹۱۷ء بحوالہ قومی رپورٹ)

اسی دوران علی برادران کی اسیری سے متعلق اہل وطن کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی لیکن ان کی رہائی کیلئے ملک کے مختلف گوشوں اور تنظیموں کی طرف سے اٹھائی گئی ہر آواز برطانوی سامراجیت سے ٹکرا کر واپس لوٹ رہی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے کلکتہ کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے محترمہ بی اماں ۲۵ دسمبر ۱۹۱۷ء کو کلکتہ تشریف لائیں عوام کے بے پناہ جوش وعقیدت کے درمیان وہ "اجلال سکندری اور شان جمشیدی کے ساتھ کلکتہ میں داخل ہوئیں شاید اس ملکۂ حریت کے استقبال کو شکوہ اسکندری یا جلالت جمشیدی کے ساتھ تشبیہ دینا غلط ہے کیونکہ جلوس شاہانہ ہمیشہ استبداد کا علم بردار ہے اور ظاہر داری کا منظر عام ہوتا ہے۔ عقیدت واخلاص سے شاید ایک متنفس بھی اس میں شریک نہ ہوتا۔ مگر اس بے تاج کی ملکہ حریت کے جلوس استقبال سے اس خلوص وعقیدت کی آوازیں ہمارے کانوں میں آرہی ہیں جو گدایانِ الٰہی کے سوا ملوک اقالیم کو نصیب نہیں ہوتیں"۔

(مدینہ بجنور یکم جنوری ۱۹۱۸ء)

کلکتہ میں کانگریس کا دوسرا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو بی اماں کی موجودگی میں ہوا اس میں علی برادران کی رہائی کا ریزولیوشن متفقہ رائے سے منظور

کیا گیا۔ اجلاس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے جناب قاضی عبدالغفار نے اپنے اخبار "جمہور"
میں لکھا "۲۸ر دسمبر کو ۱۲ بجے مسز بیسنٹ کے تشریف لانے کے غلغلے سے کانگریس کا پنڈال
گونج اٹھا اور اس وقت جو نظارہ مادرِ ہند کے فرزندوں نے دیکھا وہ کانگریس کی ۳۲
سالہ تاریخ میں پہلا نظارہ تھا۔ کانگریس کے سربرآوردہ فدائیوں کے حلقے میں سن رسیدہ
محترم خاتون (مسز بیسنٹ) برقعہ پوش قابلِ احترام خاتون (والدہ محمد علی)، مسلمانوں کے
ہردلعزیز اور سچے فدائیوں کی ماں کا بازو پکڑے ہوئے پنڈال میں داخل ہوئیں۔
مسٹر محمد علی وشوکت علی کی والدہ کے داخل ہونے کا صحیح خاکہ پیش کرنا سخت مشکل ہے
مگر ہم صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ آگے آگے والنٹروں کی ایک جماعت تھی اور اس کے
بعد محمد علی کی والدہ سپید برقعہ اوڑھے لکڑی کے سہارے چل رہی تھیں۔ مسز بیسنٹ
ان کا بازو پکڑے ہوئے تھیں اور ان دونوں خواتین کے جلو میں ہندوستانی سیاست
کے تاج کے درخشاں ہیرے تھے جن میں مسٹر تلک کا نام سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ
سادہ مگر دلوں پر اثر کرنے والا جلوس بندے ماترم، محمد علی، شوکت علی کی جے کی پرجوش
آوازوں میں سے ہو کر ڈائس تک پہنچا۔ محمد علی وشوکت علی کے متعلق ریزولیوشن پر
تقریر کرنے کے لئے مسٹر تلک کو مدعو کرتے ہوئے مسز بیسنٹ نے فرمایا" محمد علی
وشوکت علی کی والدہ ماجدہ آپ لوگوں کے درمیان موجود ہیں... آپ نے اپنے بچوں
کی تربیت و تعلیم اس طرح کی کہ آج وہ سچے مسلمان اور مخلص محبِ وطن ہیں۔ آپ
میں نسوانی محبت کا جذبہ ہے مگر آپ کے پہلو میں شیر کا دل ہے۔ آپ رنج وافسوس
نہیں کرتیں بلکہ آپ خوش ہیں کہ آپ کے فرزند ملک کی خدمات کے قابل ہیں۔
ریزولیوشن پر تقریر کرتے ہوئے بال گنگادھر تلک نے کہا ہم مطالبہ کرتے ہیں
کہ محمد علی وشوکت علی کو چھوڑ دیا جائے۔ یا حکومت مقدمہ چلائے گورنمنٹ کو آئینیت
کے تابع ہونا چاہیئے۔ یہ وقت عجیب و غریب ہے کہ اس ریزولیوشن کو ہم ان کی والدہ
کی موجودگی میں پاس کر رہے ہیں۔ بہادر بچوں کی والدہ ہونے کا جو اعزاز انھیں
حاصل ہے وہ بہت باوقعت ہے اس وقت ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے

کہ آپ اس سختی کو بھول جائیں جو گورنمنٹ نے آپ کے بچوں کے ساتھ کی ہے ہم سب کو آپ سے ہمدردی ہے اور میں دعا کرتا ہوں کہ ملک ایسی بہت سی بہادر مائیں پیدا کرے ... مسٹر ایس ایس سیتا مورتی نے ریزولیوشن کی حمایت کرتے ہوئے کہا" اب میں ایک بات اور کہہ کر اپنی تقریر ختم کر دوں گا۔ ہندو شاستروں میں لکھا ہے کہ قومیں دولت اور روپے سے سربلند اور سرتاج نہیں ہوتیں بلکہ اپنی قربانیوں سے، وہ قربانی جو حق و صداقت کے لئے ہو۔ نظر بند علی برادران نے قربانی کی اور ملک نہ صرف ان کے سامنے خراج وفاداری اور اطاعت پیش کرتا ہے بلکہ وہ ان کی والدہ کے سامنے بھی سرِ نیاز خم کرتا ہے"

(اخبار جمہور کلکتہ، ۸ جنوری ۱۹۱۸ء)

۳۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو کلکتہ میں ہی منعقد ہوا بی اماں کی طرف سے ایک پیام بنام مسلمانانِ ہند پڑھا گیا جس کے ولولہ انگیز الفاظ نے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی پڑھنے کے فرائض محترم قاضی عبدالغفار نے انجام دیئے۔ دہلی کے ایک صاحب کے بیان کے مطابق بی اماں کے پیغام عمل کا ایک ایک لفظ نیر و نشتر کا کام دے رہا تھا اور جس نے اجلاس لیگ کو مجلس ماتم بنا دیا۔

(سیرت محمد علی، رئیس احمد جعفری۔ ص۔ ۲۶۰)

ملک کے سبھی اخبارات نے اس کا مکمل متن شائع کیا جو درج ذیل ہے۔

"ملکۂ حریت کا پیام"

مسلمانانِ ہند کے نام

یعنی ام الاحرار مسٹر شوکت علی و مسٹر محمد علی کی والدہ مکرمہ کا پیام جو ۳۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں پڑھا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرزندانِ اسلام۔ میرے عزیزو اور بچو۔

آج کا دن جب کہ تمہاری مجلس میں پہلی دفعہ اور شاید آخری دفعہ (اس لئے کہ اب عمر کی آخری منزل آ لگی ہے) آئی ہوں۔ میری زندگی میں اس قدر عجیب نہیں جس قدر کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں عجیب اور معنی خیز ہے۔ جس محبت اور جوش کے ساتھ تم نے میرا خیر مقدم کیا اس کا اجر سوائے خدائے کریم کے اور کوئی نہیں دے سکتا لیکن تم نے اپنی محبت کا نقش میرے دل پر بٹھا دیا جو انشاء اللہ تا دم مرگ میرے صفحۂ دل سے محو نہ ہوگا۔ خدا کرے کہ تمہارا یہ جوش ہمیشہ قائم رہے اور اسلام کی خدمت میں صرف ہو۔

بیوگی اور مصیبت کے ۴۵ سال میں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کاٹ دیئے اور اس آخری وقت میں جب کہ گور کی اندھیری کوٹھڑی میں جانے کا وقت ہے نہ کہ گھر سے باہر نکل کھڑی ہونے کا۔ میں یہاں تمہارے روبرو آموجود ہوئی۔ ع

میرے دریائے بیتابی میں ہے ایک موجِ خوں یہ بھی

مسلمانانِ ہندوستان کی تاریخ میں آج کا واقعہ ایک یادگار واقعہ ہوگا۔ اس لئے نہیں کہ ایک ضعیف العمر عورت غریب الوطنی کی چادر اوڑھ کر آپ کے روبرو آئی ہے نہ اس لئے کہ آوارہ وطن ہو کر اور چھنڈواڑہ کی کوٹھی سے نکل کر میں آپ کے پاس کوئی فریاد لے کر آئی ہوں اگر میں محض اپنے بچوں کی عافیت وخیریت کی طلبگار ہو کر آئی ہوتی یا حکومت کے مظالم کی فریاد لے کر آتی یا ان مصائب کی داستان سناتی جو ہر ایک سچے مسلمان کو امتحاناً جھیلنے پڑتے ہیں، تو یقین جانو تمہارے دل غم سے بھر آتے مگر میں ان اغراض کے لئے تمہارے پاس نہیں آئی ہوں بلکہ صرف ایک پیغام عمل لے کر آئی ہوں اور یہ پیغامِ عمل نہ میری ذات سے وابستہ ہے اور نہ اسلام کے ان دو خادموں کی ذات سے جن کو خدا نے امانتاً میرے سپرد کیا اور جنھوں نے میری گود میں پرورش پائی۔ یہ سچ ہے کہ ایک ضعیف العمر ماں کا دل شوکت علی و محمد علی

جیسے بچوں کی محبت سے لبریز ہونا چاہیئے میں بھی انسان ہوں اور میرا دل بھی جذبات محبت مادری سے نا آشنا نہیں لیکن میرے عزیزو، یاد رکھو کہ تم سب اپنے ماں باپ کے فرزند ہو۔ ماں باپ سے جو تمہارا قدرتی رشتہ ہے اس رشتہ سے زیادہ مستحکم ایک اور تعلق بھی ہے جس کو تم بھول تو سکتے ہو مگر قطع نہیں کر سکتے۔

وہ رشتہ، وہ تعلق، وہ قرابت ایک ایسا جادو ہے جو مجھے گوشۂ عافیت سے نکال کر کلکتہ لے آیا اس جادو کا نام " اسلام " ہے اور وہ منتر

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

ہے۔ میرے بچو اگرچہ تم بھی ماں کی محبت بھری گود میں، اور باپ کے سایۂ حفاظت میں پلے ہو مگر یاد رکھو کہ تم سب سے پہلے اسلام کے فرزند ہو۔ دنیا کے تمام رشتے ایک سانس کے ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں مگر رشتہ مذہب تمہارے توڑے نہیں ٹوٹ سکتا۔

فرزندان اسلام تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ جس وقت میرے بچوں کی آزادی کے متعلق شملہ پر مشورے ہو رہے تھے اور خفیہ کا افسر اُن کے پاس کچھ شرائط لے کر آیا تھا اور وہ وقت شوکت علی اور محمد علی کے لئے ایک سخت امتحان کا وقت تھا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ انسپکٹر خفیہ ان سے ایک تحریری وعدہ مانگ رہا ہے تو تم نے سنا ہوگا کہ میں کس طرح وہاں گئی اور میں نے اس سے اور شوکت علی و محمد علی سے کیا کہا۔

میں نے خفیہ کے انسپکٹر سے صاف صاف کہدیا تھا کہ وہ میرا پیام حکومت کے اعلیٰ حکام تک پہنچا دے اور ان کو اچھی طرح بتادے کہ اگرچہ اس ضعیف اور سن رسیدہ عورت کا جسم خاکی اب فرسودہ اور کمزور ہو گیا ہے لیکن دل اور دل کے اندر ایمان اتنا کمزور نہیں کہ شوکت اور محمد علی کو وہ جادۂ حق سے ایک قدم باہر جانے کی اجازت دے میں نے کہدیا تھا کہ اگر آزادی حاصل کرنے کی کوئی ایسی شرط قبول کریں گے جو اسلام کی شان کے خلاف ہو یا مفاد ملک کے منافی ہوگی تو باوجود اپنی اس تمام محبت کے جو قدرتاً مجھے اپنے بیٹوں سے ہے اس سے قبل کہ وہ صراط مستقیم سے پلٹ سکیں میں انشاءاللہ

اپنے ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی۔ میرے عزیزو! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے وطن کی آسائش کو محبت مادری کی وجہ سے چھوڑا اور نظر بندوں کے ساتھ در در خاک چھانتی پھرتی ہوں تو بیجا نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی نے مجھے اتنے سبق دیئے ہیں اور میرے مذہب نے مجھے اتنے سبق دیئے ہیں اور میرے مذہب نے مجھے اتنا کچھ سکھا دیا ہے کہ میرا دل اب دنیوی تعلقات سے آزاد ہو گیا ہے۔ میرا اصلی مدعا جس وجہ سے میں مہرولی سے لینسیڈون اور لینسیڈون سے چھندواڑہ جاتے وقت ان کے ساتھ رہی صرف یہی نہیں تھا میں جانتی ہوں کہ جس راہ حق پر وہ چل رہے ہیں وہ مشکلات سے خالی نہیں ہے۔ گو میرے بچے ہمت والے ہیں پر مجھ سے زیادہ تجربے کار یا مجھ سے زیادہ گرم و سرد دیکھے ہوئے نہیں، مجھے ان کے ایمان پر بھروسہ ہے پھر بھی میں ان کے ساتھ ہوں کہ اگر ذرا بھی ان کے ارادے میں خامی، ان کے ایمان میں تزلزل، ان کے عزم میں کمزوری دیکھوں تو ٹوک دوں اور کہہ دوں کہ بس! آگے گمراہی اور ضلالت ہے۔

تم جانتے ہو کہ میں نے ڈیڑھ سال سے زیادہ خاموشی کے ساتھ اس طرح گذار دیئے کہ گویا میں خود بھی شوکت و محمد علی کے ساتھ نظر بند ہوں، لیکن اب تم پوچھو کہ اس دو سال کی خاموشی کے بعد مجھے کس چیز نے کھینچ کر یہاں بلایا، تم سوال کرو کہ میں دنیا کی رسم و رواج کو بالائے طاق رکھ کر یہاں کیوں آ گئی، کیا طاقت تھی جو مجھ کو چھندواڑے سے کلکتہ لے آئی، میں تمہیں ابھی بتاؤں گی! جس وقت تک کہ میرے لڑکوں کی آزادی کا مسئلہ معرض بحث میں نہ آیا۔ میں خدا پر بھروسہ کئے صبر و شکر کے ساتھ بیٹھی رہی اور شاید اسی طرح بیٹھی رہتی اس لئے کہ مصائب و مظالم میرے لئے خوفناک چیزیں نہیں ہیں۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

لیکن قسمت میں لکھا تھا کہ میں خود اپنا پیام لے کر نکلوں حکومت کے خود غرضی

اور انتقام پسند عمال نے جب دیکھا کہ شوکت علی اور محمد علی کی آزادی کا مسئلہ زیر غور ہے تو ان پر ایک ایسا الزام لگایا گیا جس کا جواب دینا ان پر فرض ہو گیا اور ان سے زیادہ مجھ پر اس لئے کہ میں ان سے زیادہ آزاد تھی، وہ الزام یہ تھا کہ میرے بچے ترکوں سے جن کا اس وقت حکومت کے دشمنوں میں شمار کیا جاتا ہے ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ اے فرزندانِ اسلام آج میں تمہارے سامنے کہتی ہوں کہ یہ الزام اسلام کی ایک ایسی توہین ہے ایک ایسی اہانت ہے جس کو کوئی سچا مسلمان برداشت نہیں کر سکتا اور جس کا جواب دینا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کیا رشتۂ اخوتِ اسلامی کو کسی حکومت کے بے معنی شبہات اور جابرانہ احکام کاٹ سکتے ہیں؟ کیا حمیت و غیرتِ مذہبی کی اس عمارت کو جس نے تیرہ سو برس تک زمانے کے بہت سے طوفان دیکھے ہوں حاکموں کی ناراضگی اور خفگی صدمہ پہنچا سکتی ہے۔ اے مسلمانو آج میں تم سے اپنے اس سوال کا جواب مانگتی ہوں! کیا کل مسلم اخوۃ کے کوئی معنی نہیں۔ کون ہے جس کے دل میں اپنے مسلمان بھائیوں سے خواہ وہ عرب میں ہوں یا عجم میں، ٹرکی میں ہوں یا مراقش میں افریقہ کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں ہوں یا شام کے سبزہ زاروں میں ہمدردی نہیں اگر حکومت کے نزدیک یہ ہمدردی بغاوت ہے تو صرف شوکت علی اور محمد علی ہی باغی نہیں، ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمان باغی ہیں، اور اگر حکومت نے یہ سوال پیدا کیا ہوتا اور اس عذر کو اپنے طرز عمل کے لئے پردہ نہ بنایا ہوتا تو شاید میں اب بھی باہر نہ نکلتی مگر جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں اب سوال میرا تمہارا نہیں۔ سوال اسلام کا ہے۔ اس وقت تم کو تمہارے مذہب کو ایک سخت امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ خدا تمہیں توفیق دے کہ تم اس سے کامیاب اور سرخرو نکلو۔

میری تقریر طویل ہو گئی لیکن دل میں جب درد ہوتا ہے تو الفاظ کی طوالت نگاہ میں نہیں رہتی زخم جب ہرے ہوتے ہیں تو ضرور رستے ہیں۔ ادھر تو ہندوستان کا کتنا ہی بیش قیمت خون میدانِ جنگ میں برطانیہ کے لئے بہہ گیا اور ادھر ہم کو غیر وفاداری اور بغاوت کے طعنے دیئے جا رہے ہیں پہلے تو گورنمنٹ نے وعدہ کیا کہ وہ اسلام کے مقدس مقامات میں دخل اندازی نہ کرے گی اور پھر معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ پھر

پھر یہودیوں سے بیت المقدس میں خاص مراعات کی گفت وشنید ضروری کردی اور دوسری طرف عرب کے باغی کو ایک آزاد حکمران سمجھا گیا۔ میرے عزیزو! یہ واقعات ایسے نہیں کہ کانوں سے دل تک نہ خاموش اور دل سے زبان تک نہ آئیں۔ متخاصمین کے توپوں کے گولے مقاماتِ مقدسہ اسلامی کے دیواروں کے سایہ میں گر رہے ہیں اور مسلمانانِ ہند اپنے مذہبی مقامات کے تحفظ کے متعلق حکومت کے وہ وعدے یاد کر رہے ہیں جو ابتدائے جنگ میں کئے گئے تھے۔ کیا حکومت کے عمال اب اس قدر بے خبر ہوگئے ہیں کہ وہ معاملات کی نزاکت کو سمجھ ہی نہیں سکتے! کیا مقاماتِ مقدسہ کی قسمت کا فیصلہ کروڑوں مسلمانوں کی خواہشوں اور دعاؤں اور التجاؤں کے خلاف ہوگا؟

آج اس جگہ اپنے ہندو بھائیوں اور عزیزوں کو دیکھ کر میرے دل میں باوجود غم والم کے خوشی کی ایک لہر اٹھتی ہے مگر وہ لہر شکوہ شکایت کی آمیزش سے پاک نہیں ہے۔ آرہ وشاہ آباد کے واقعات نے میری امیدوں کا خون کر دیا ہے اور میں حیران ہوں کہ وہ تعلیم یافتہ ہندو، ہندو قوم کے رہنما جو ہندوستان میں صبح سے شام تک اتحاد و اتفاق کے وعظ کہتے ہیں کہاں تھے جب کہ آرہ وشاہ آباد میں ہزاروں مسلمان ہندوؤں کے ہاتھ سے تباہ و برباد ہو رہے تھے! میں اپنے ہندو بھائیوں کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر کسی دن ہندوستان کے لئے ہوم رول کے جھنڈے کے نیچے ہم سب کو جمع کیا جائے تو انشاء اللہ وہ اس ضعیفہ کو طالبانِ ہوم رول کی صفِ اول میں پائیں گے۔ لیکن میرا اعتقاد ہے کہ کوئی شخص جو اپنے مذہب اور مذہبی حقوق کے ساتھ وفاداری نہ کرے وہ نہ اہلِ وطن کے ساتھ وفادار ہو سکتا ہے نہ حکومت کے ساتھ اگر وہ ایسا دعویٰ کرے تو وہ دعویٰ قابلِ اعتماد نہیں۔ میرے نزدیک ہر شخص کا اپنے مذہب پر غیر متزلزل ایمان کے ساتھ قائم رہنا ہوم رول کا جزو لازمی ہے۔

آخر میں میں پھر اپنے عزیزوں سے التجا کرتی ہوں کہ وہ دنیا میں سوائے خدا کے کسی طاقت سے مرعوب نہ ہوں اور اپنے ایمان پر بھروسہ کرکے یقین رکھیں کہ اگر وہ ثابت قدم رہے تو فتح ان کی ہے۔ واللہ مع الصابرین۔

میرا پیام صرف وہی ہے جو ہر مسلمان کو تیرہ ۱۳ سو برس پہلے مل چکا ہے اور جو ہر مسلمان کے قلب پر نقش ہونا چاہیئے۔ یعنی یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون ولنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات و بشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون ط اولئک علیھم صلوٰۃ من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المفلحون ط۔

(بحوالہ "مدینہ" بجنور ۵ رجنوری ۱۹۱۸ء)

"مسٹر گاندھی نے لیگ کے اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ جس دن محمد علی صاحب کی والدہ جلسے میں آئی تھیں تو میرے لڑکے نے بہت سے آدمیوں کو روتے دیکھا جب اس نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے کہا رونے کا وقت نہیں ہے کام کرنے کا وقت ہے۔ (جمہور کلکتہ ۱۲ رجنوری ۱۹۱۸ء)

بی اماں کے اس پیغام عمل، کے متعلق نیو انڈیا نے لکھا "یہ پیام ان دونوں بھائیوں کی والدہ کے شایانِ شان ہے جو ان نا انصافانہ قیود کی وجہ سے تکلیف اُٹھا رہے ہیں جو کہ گورنمنٹ کی طرف سے ان پر عائد کی گئی ہیں۔ ایک خاتون کا یہ اپنے رسم و رواج کو ترک اور پردے سے باہر آکر مردانی مجلسوں میں شرکت کرنا صورتِ حال کی افسوسناک حیثیت کو نمایاں کرتا ہے اور اس موجودہ صورتِ حال میں ترقی کے غیر متوقع طور پر تیز ہونے کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ قابلِ قدر خاتون نے فرمایا کہ میں اس لئے آئی ہوں کہ مسلمانوں سے کہوں کہ وہ میرے بچوں کے لئے نہیں اپنے مذہب اور اپنے ملک کے لئے اپنے فرائض کو انجام دیں ہمیں یقینِ کامل ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے دلوں پر بھی یہ پیام گہرا اثر کرے گا اور ان کو میدانِ عمل کی طرف آنے کی ہدایت کرے گا۔"

سروجنی دیوی نے کہا کہ "ہندوستان کی نسوانی آواز کو اس کی اجازت دینا کہ وہ اُٹھیں اور جو مطالبات مردوں کی طرف سے ہو رہے ہیں ان کی تصدیق کریں۔ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ ہم کامل اور ذمہ دارانہ سیلف گورنمنٹ کی قابلیت رکھتے ہیں۔ خواتین سابقہ روایات کے مطابق مردوں کو ان کی جدو جہد میں مدد کریں گی خدا کرے کہ ہندوستانی مرد اس طرح کام کریں کہ وہ ہندوستانی خواتین کی امداد حاصل کر سکیں"۔ (اخبار جمہور کلکتہ ۱۰ر جنوری ۱۹۱۸ء بحوالہ نیو انڈیا)

ہفتہ نظر بند ان اسلام منانے کے سلسلے میں مسٹر تاج الدین کے نام بی اماں نے جن خیالات کا اظہار کیا ان کے آئینہ میں آج بھی ہمارے ملی طرز فکر کے خدوخال کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

پیامِ عمل:

حقیقت یہ ہے کہ ہم اور قوموں کی تقلید میں انجمنیں تو قائم کرتے ہیں اور ان کی تشہیر بھی خوب کی جاتی ہے مگر افسوس ہے کہ اب تک ہم میں تقلید کی بھی پوری صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے ہم ابھی تک یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انجمنوں اور جماعتوں کے قیام کے لئے یہ بالکل کافی ہے کہ ایک اچھا نام رکھ دیا، چند سر برآوردہ اشخاص اس کے عہدے دار ہو گئے اور اخباروں اور قومی مجالس میں اس کا اعلان کر دیا گیا۔ ہم اب تک یہ نہیں سمجھے کہ یہ تمام کارروائی صرف اسی قدر اصلیت رکھتی ہے کہ ایک جسم بے روح بنا کر کھڑا کر دیا گیا لیکن کسی انجمن کے قیام سے کوئی کام لینا مقصود ہو تو ہم کو سب سے اول اس کی فکر کرنا چاہیئے کہ کام کرنے والے افراد مہیا کئے جائیں۔
تم شاید یہ سمجھو کہ میں گھر میں بیٹھنے والی عورت ہوں مشکلات کو کیا جان سکتی ہوں جو تم مردوں کو قومی کام کرنے والوں کے فراہم کرنے میں پیش آتی ہیں۔ اسی لئے میں غالباً اس کام کو آسان سمجھتی ہوں مگر عزیزی میں مسلمانوں کی قومی تحریکوں سے پردہ میں رہ کر بھی بالکل ناآشنا نہیں رہی ہوں اور شوکت و محمدؐ کی

نظر بندی کے بعد سے تو قدرتی طور پر مجھے ان قومی تحریکوں اور قومی کام کرنے والوں سے اور بھی زیادہ واقفیت حاصل ہو گئی ہے۔ گذشتہ تین سال میں مجھے کافی تجربہ ہو چکا ہے اور قومی کاموں کی مشکلات اور کام کرنے والوں کی دشواریوں اور ذمہ داریوں کا مجھے پورا احساس ہے میں خوب جانتی ہوں کہ شہرت کے طالب ہم بہت زیادہ ہیں اور محنت و مستعدی سے کام کرنے والے بہت کم۔ لیکن اس قحط الرجال کے باعث تو کام کرنے والوں کی تلاش اور ان کا فراہم کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

.... عزیزی سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی مستند اور کارگزار مرکزی جماعت اگر ہوتی تو ان تمام قیود کا کب کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ مسلمان ممبر کاؤنسلوں میں سوال کرتے ریزولیوشن پر ریزولیوشن زیر بحث آتے اور یکے بعد دیگرے قانونِ تحفظ ہند کی تنسیخ یا کم از کم ترمیم کے لئے نئے نئے قوانین کے مسودے پیش ہوتے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا عشر عشیر بھی ہے خیر ان تمام کارروائیوں کا انحصار تو چند سربرآوردہ افراد قوم پر ہے اگر وہ اپنے فرض کو نہ پہچانیں یا باوجود اپنے فرض کو پہچاننے کے اس کی ادائیگی میں پہلو تہی کریں تب بھی عامۃ المسلمین ان پر اعتراض و نکتہ چینی کر کے اپنے فرائض سے ہرگز سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ خطاب خداوندی ہم سب کے لئے یکساں ہے عوام نے بھی اگر خواص کا طرزِ عمل اختیار کیا تو سب کے سب مواخذۂ آخرت میں گرفتار ہوں گے ..... البتہ میں اس قدر ضرور کہوں گی کہ عوام ہمیشہ رہنمائی اور رہبری کے حاجتمند ہوتے ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ وہ اب بھی چلنے کو تیار ہیں مگر راستہ بتانے والے درکار ہیں۔ اور اگر زیادہ سربرآوردہ قوم اس کام کو انجام نہیں دینا چاہتے تو ان سے کسی قدر کم معروف مگر تعداد میں کہیں زیادہ قوم کے جواں ہمت و جواں سال تعلیم یافتہ کہاں ہیں جو رہنمائی نہ سہی ہم سفر ہی بن کر عامۃ المسلمین کے ساتھ چل سکیں .....

دوسروں کے پست خیالات پر معترض ہونا ضروری ہے مگر اس کا بھی خیال

رہے کہ تمہاری بلند خیالی اوروں کی پست خیالی سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی اگر تمہاری قوتِ عمل ضائع ہو چکی ہے اور تمام تر کام میں یہی رہ گیا ہے کہ اوروں کے کام پر ناک وبھوں چڑھاؤ اور کسی میں ایک عیب نکالو تو کسی میں دوسرا۔" (اُمّ الاحرار والدہ محمد علی وشوکت علی صاحبان کا خط بنام مسٹر تاج الدین اخبار "جمہور کلکتہ" ۱۰ر جولائی ۱۹۱۸ء)

پانچ برس نظر بند رہ کر جنگ ختم ہونے کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء میں یہ دونوں بھائی بھی اور لوگوں کے ساتھ آزاد کئے گئے اور لوگوں کے دل خوشی اور جوشِ مسرت سے بھر گئے۔ سبھوں نے دہلی، لاہور، بمبئی وغیرہ میں نہایت شان و شوکت سے ان کا استقبال کیا اور جلوس نکالے۔ بی اماں فطرتی خواہش کے مطابق چاہتی تھیں کہ اب دونوں بچے کچھ دنوں میرے پاس رہیں لیکن لوگ محمد علی کو صدر وفد خلافت بنا کر انگلستان بھیجنے کی تجویز کر رہے تھے اور کئی مہینوں کے لئے گھر ہی سے نہیں بلکہ وطن سے ان کا علیحدہ رہنا ضرور تھا۔ بی اماں سے کہا گیا کہ آپ انھیں ملک و قوم کی خدمت کرنے دیں تو اپنی دلی اور دیرینہ آرزو پر انھوں نے اس بات کو ترجیح دی۔ چنانچہ اس بارے میں جو پیغام انھوں نے اخباروں میں بھیجا اس کے ایک حصّے میں وہ لکھتی ہیں

"میں قدرتاً یہ چاہتی تھی کہ اب جو میرے لڑکے میرے پاس آگئے ہیں تو کچھ عرصہ پاس رہتے لیکن مجھ سے کہا گیا ہے کہ جس کام کے لئے انھوں نے اپنی زندگی وقف کی ہے اس میں ان کا مصروف رہنا میرے پاس یا اپنے خاندان میں رہنے کی بہ نسبت زیادہ ضروری ہے اور چند مہینوں کے لئے ان میں سے ایک کو یا دونوں کو باہر رہنا پڑے گا۔ اس لئے ہم بہت خوشی کے ساتھ ملک و قوم کے مطالبے کو منظور کرتے ہیں۔ ہندوستان اور اسلام کے کام کے لئے ہمیں ان کی جدائی گوارا ہے۔"

غرض انھوں نے نہ صرف انھیں اجازت دی بلکہ بہو یعنی مسز محمد علی اور چھوٹی پوتی بنتِ محمد علی کو ہمراہ لے کر خود بمبئی پہنچانے گئیں۔ (تہذیب النسواں راقمہ خاتون اکرم یکم اپریل ۱۹۲۲ء ص ۲۰۰)

۱۹۱۹ء کا زمانہ ہندوستانی جنگِ آزادی میں سیاسی سرگرمیوں اور برطانوی

استبداد کے اظہار قوت کے اعتبار سے بڑا اہم ہے ہندوستان میں برطانوی دفتری اقتدار کا ہمیشہ یہ اصول رہا کہ جب کبھی کسی اصلاح کی طرف قدم بڑھایا گیا تو ساتھ ہی تشدد کی تلوار بھی علم کی گئی تاکہ بزدل رعایا ڈر کر جلد از جلد ناقص نا کام اصلاحات کو قبول کرلیں۔ چیمسفورڈ ماٹیگو اصلاحات اسکیم شائع ہوئی تو اس کے ایک عشرہ بعد ہی رولٹ کمیشن کی تہدید آمیز رپورٹ بھی شائع کردی گئی جس کے تحت رولٹ ایکٹ (ROWLATT ACT) کا نفاذ ہوا۔ مادرِ ہند کے فرزند وفاداری کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد اپنے خون ودولت کی قیمت نہ مانگ سکیں ان کے منہ میں لگام دینے اور قلم توڑ دینے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجہ میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ کا خونچکا حادثہ پیش آیا عوام کا جوش وغضب اپنی آخری حدوں کو پہنچ رہا تھا اور صبر وضبط کا ہر بندھن سرفروشی کے طوفان میں خس خاشاک کی طرح بہہ گیا تھا۔

ادھر جنگِ عظیم کے خاتمے پر جب سلطنتِ عثمانیہ کی قطع وبرید کی گئی تو خاص طور پر مسلمانانِ ہند میں غم وغصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مولانا محمد علی نے انتہائی کوشش کی کہ ہر جگہ مسلمانوں کے ظالمانہ استحصال کے مقابلے کی خاطر انھیں ایک پلیٹ فارم پر متحد کیا جائے۔ انھوں نے خلافت تحریک چلائی جس کا مقصد تھا کہ مسلمان نہ صرف ایک بار پھر عظیم طاقت بن کر ابھر سکیں بلکہ تیزی سے ابھرتی وبڑھتی ہوئی مغربی سامراجیت سے بھی بھرپور ٹکر لی جاسکے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کو اس سے بہت تقویت ملی۔ ہندو مسلم اتحاد کا ایسا نمونہ جو تحریکِ خلافت کے دنوں میں مشاہدے میں آیا وہ قومی زندگی کا روشن ترین باب ہے۔ ترکِ موالات کی تجویز پہلے خلافت کانفرنس اور پھر کانگریس کے اجلاس میں منظور ہوئی۔ بی اماں باوجود پیرانہ سالی کے دل وجان سے شریک تحریک رہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے پنڈت سندرلال کے ایک انگریزی مضمون کے حوالے سے لکھا ہے "۱۹۱۹ء تھا کہ مرادآباد میں صوبے کی پولیٹکل کانفرنس ڈاکٹر بھگوان داس کی صدارت میں منعقد

ہوئی وہاں مہاتما جی موجود تھے۔ میں نے ترک موالات والا ریزولیوشن پیش کیا سارے پُرانے لیڈروں نے مخالفت کی۔ تین دن گذر گئے اور ریزولیوشن پاس نہ ہوسکا۔ آخر میں مولانا شوکت علی آئے اور انھوں نے مہاتما جی کی تجویز آزادی کی تائید کی۔ اس کے بعد مولانا کی والدہ بی اماں آئیں اور انھوں نے ریزولیوشن کی تائید کردی۔ اس حیرت انگیز تقریر نے پانسہ پلٹ دیا اور خود ڈاکٹر بھگوان داس نے مخالفت چھوڑ کر تائید کردی اور ووٹنگ کے وقت کہا جب خود بھارت ماتا بی اماں کے روپ میں آگئی ہیں تو میں بھی تائید کرتا ہوں"۔ (صدق جدید لکھنؤ ۲۶ جنوری ۱۹۶۹ء ص ۱۰ ر ۲)

تحریک خلافت کے سلسلے میں علی برادران ستمبر ۱۹۲۱ء میں کراچی پہنچے۔ وہاں خلافت کانفرنس میں ایک جوشیلی تقریر میں مولانا محمد علی نے کہا کہ "برطانوی فوج کی نوکری حرام ہے"۔ پاداش میں دو سال قید کا حکم دیا گیا اور ہندوستان ان کی دوبارہ طویل المیعاد جدائی پہ ماتم کدہ بن گیا لیکن بی اماں نے ان کی عارضی جدائی پر جیسا صبر وشکر کیا وہ ذیل کے خط سے واضح ہو گا جو انھوں نے آغا محمد صفدر صاحب کی گرفتاری پر ان کی بیوی کو لکھا ہے، وہ لکھتی ہیں:

"آج عزیزم صفدر کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی خدمات خداوندِ عالم کی بارگاہ میں مقبول ہوئیں۔ میں اس زمانے کو یاد کیا کرتی ہوں جب میں نے شوکت و محمد کی سزا کی خبر سن کر دو رکعت نمازِ شکر ادا کی تھی۔ تم بھی ہمت سے کام لینا اور ہمت نہ ہارنا مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ ہر حالت میں راضی برضا رہے"۔ (تہذیب نسواں تذکرہ)

علی برادران گرفتار ہوئے بی اماں خاصی نحیف ہو چکی تھیں اور کسی سہارے کے بغیر مشکل سے ہی کھڑی ہوسکتی تھیں لیکن بیٹوں کی گرفتاری نے ان میں ایک تازہ روح پھونک دی انھوں نے تحریک خلافت میں بھرپور حصہ لیا۔ بی اماں اب مکمل طور پر عوام کے سامنے آگئی تھیں وہ دور دراز کے سفر کرتیں۔ بڑے بڑے اجتماعات کو مخاطب کرتیں دورانِ سفر اسٹیشنوں پر مشتاقِ زیارت ہجوم سے ملتیں اور انھیں مخاطب کرتیں

ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے تحریک خلافت کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ جگہ جگہ انکی آواز پر ہزاروں کے عطیات خلافت فنڈ میں جمع ہوئے۔ ایوان حکومت میں کھلبلی تھی مسٹر ملکم ہیلی نے علی برادران پر لگائے گئے الزامات میں یہ الزام بھی شامل کیا تھا کہ " ان کے گھر کی عورتیں بھی عطیات جمع کر رہی ہیں "۔

جیسے جیسے ارباب حکومت کا رویہ سخت ہوتا گیا بی اماں کا لب ولہجہ بھی شدت اختیار کرتا گیا۔

وہ عوامی جلسوں میں زور وشور سے تقاریر کر رہی تھیں اور خلافت اور قومی آزادی کے حصول کی خاطر ہندوؤں و مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی ان تھک کوشش میں مصروف تھیں مشہور نظم " صدائے خاتون "

(تحریک خلافت کے ایام میں سہارنپور کے ایک گمنام شاعر منشی نور محمد نے چھ بندوں پر مشتمل ایک نظم صدائے خاتون تحریر کی جس کو محمد قادر حسین نے بی اماں کا پیام فرزند کے نام سے مدراس میں طبع کیا) (لطیف حسین ادیب، آواز دہلی بیگم اکتوبر ۱۹۸۵ء ص ۱)

بولیں اماں محمدؐ علی کی ۔۔۔۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو
تم تو جاتے ہو دو دو برس کو ۔۔۔۔ بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ پڑھ کے پھانسی پہ چڑھنا ۔۔۔۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اسی دور کی یادگار ہے اس کی صدائے بازگشت ہندوستان کے طول وعرض میں حریت پسندوں کے لئے پیغام عمل بن کر پہنچی۔

۳۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو احمد آباد میں کل ہند زنانہ کانفرنس بی اماں کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ شرکا ء اجلاس میں شریمتی کستوربا گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، شریمتی انوسیا بائی، شریمتی چودھرائن، شریمتی سرلا دیوی، محترمہ امجدی بیگم محمد علی، محترمہ شمس النساء بیگم، محترمہ بیگم ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محترمہ نشاط النساء بیگم حسرت موہانی، محترمہ بیگم خواجہ اور محترمہ بیگم سیف الدین کچلو کے نام قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ ہزاروں دوسری خواتین نے بھی کانفرنس میں حصّہ لیا جس سے ثابت

ہوتا ہے کہ غیر مسلم بہنوں کے ساتھ مسلم خواتین بھی تحریکِ آزادی میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیتی رہی ہیں۔ چند مقرر خواتین کے بعد بی اماں نے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا اس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

" پیاری بہنو، ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم خدا کے ساتھ سچے رہیں اور اپنے عقیدوں پر مضبوط و استوار، وہ شخص جو خدا کے ساتھ وفادار نہ ہو کبھی بھی کسی گورنمنٹ کے ساتھ جسے انسان نے قائم کیا ہو وفادار نہیں رہ سکتا اس کے بعد اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے مابین اتحاد و اتفاق پیدا کریں تجربے نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ ہمارے اس ملک میں جو مختلف قومیں اور فرقے آباد ہیں ان میں اتحاد و اتفاق کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے اور جس وقت تک ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں میں کامل اتحاد و اتفاق نہ ہو ہم ملک کو آزاد نہیں کرا سکتے اور نہ پر امن و باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ تاریخ سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے دورِ حکومت میں بھی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے لیکن جس وقت برطانوی تجّار ہندوستان میں اپنی تجارتی مہم پر آئے اس وقت انھوں نے یہ معلوم کیا کہ ان کی کامیابی کا انحصار ہماری پھوٹ اور تفریق پر ہے چنانچہ جس وقت سے بیرونی حکومت یہاں قائم ہوئی۔ ہماری قوم نہایت تیزی کے ساتھ تباہی و بربادی کے سمندر میں غرق ہوتی چلی جا رہی ہے ہم عیش پسندی اور کاہلی کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو دوسروں نے ہمارے لئے مہیا کی ہیں اور ہم نے یورپ کی اچھی عادتوں کے مقابلے میں بُری عادتیں سیکھی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم خداوندی قوانین اور اپنے ملکی مطالبات سے بہت جلد لاپرواہ ہو گئے۔ خدائے قادر و توانا جسے زندہ رکھنا چاہے اسے خواہ کتنا ہی زہر دیا جائے لیکن وہ نہیں مر سکتا جس روز گورنمنٹ نے ہندوستان کے رولٹ ایکٹ پنجاب کی خوں ریزی اور خلافت کی تقسیم کا تجزیہ کر کے دیا تھا۔ وہی دن بیداری اور ہندوستان کی بحالی کا وقت تھا ہندوستان کو یہ معلوم ہو گیا اس کا علاج غیر ہمدرد برطانوی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔ بلکہ خود اس کے پاس ہے اور اب ہم خود ہی جد و جہد کر کے اس کی کوشش

کر رہے ہیں تاکہ جن مختلف امراض کا ہم شکار ہو رہے ہیں ان سے آپ اپنے کو نجات دلائیں۔

بہنو! خداوندی قانون مردوں اور عورتوں پر یکساں اثر ڈالتے ہیں قومیں مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور جو فرائض مردوں پر عائد ہوتے ہیں ان سے عورتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں ہندوستان کی یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ اس کی عورتیں عیش پسندی اور آرام طلبی کی زیادہ عادی ہوگئی ہیں اور انھوں نے اپنے آپکو کل حب الوطنی کے فرائض سے علیحدہ کر لیا ہے۔ زمانہ موجودکی تاریخ پڑھنے والے کو اس بارے میں بہت زیادہ شک وشبہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا نورجہاں چاندبی بی رانی لکشمی بائی آف جھانسی زیب النسا راہلیہ بائی پاربتی ہندوستان میں پیدا ہوئی تھیں لیکن خداوند عالم کا ہزار ہزار شکر واحسان ہے کہ اس نسل میں مسز کستوربا گاندھی مسز سروجنی نائیڈو انسو بابائی سرلا دیوی چودھرانی بیگم محمد علی بیگم انصاری بیگم خواجہ بیگم حسرت موہانی بیگم کچلو وغیرہ ایسی خواتین موجود ہیں جو اپنی بہت جذبات حب الوطنی اور عزم واستقلال میں شہرۂ آفاق ہیں اور جنھوں نے سچائی اور ملک کے لئے حیرت انگیز قربانیاں کی ہیں اور مجھے اس کا پورا اطمینان ہے کہ ہندوستان کا آئندہ مورخ مہاتما گاندھی اور دیگر لیڈروں کے ساتھ ان خواتین کا نام لکھنا نہ بھولے گا جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ پیاری بہنو تمہارے درمیان میں سیتا اور حضرت زینب کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے شوہر یا شہید کر دیئے گئے ہیں یا قیدخانوں میں ڈال دیئے گئے ہیں تمہارے درمیان میں حضرت بی بی فاطمہ زہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور کنتکا کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے پیارے بچوں نے اپنے کو دھرم اور ملک کی قربان گاہ پر خوشی خوشی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

اپنے کو والنٹیروں کی حیثیت سے بھرتی کرانے کے متعلق میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب اس کا وقت آگیا ہے کہ وہ ہر مرد اور عورت جس میں ذرہ برابر ایمان اور خودداری ہے اسے اپنے کو خداوند تعالیٰ کی فوج کا سپاہی سمجھنا چاہیئے ہم ہندوستانیوں میں ہر مرد اور عورت والنٹیر ہے خواہ مصلحت اور یقین کے ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے

تم معاہدہ پر دستخط نہ کر سکو۔

میں تم پر زور ڈال کر کہتی ہوں کہ پروردگار عالم کے سوا کسی سے نہ ڈرو لیکن اس کے ساتھ اپنے کو کسی وقتی جیال سے مرعوب بھی نہ ہونے دو ہمارے ملک کی حالت اب بہت زیادہ نازک ہے اور اسی کے ساتھ ہمارا فرض بھی کچھ کم نازک نہیں ہے۔ قید خانوں سے خوف نہ کھاؤ لیکن اس کے ساتھ اپنی مذہبی اور سوشل زندگیوں کی ذمہ داری کو بھی فراموش نہ کرو۔ میں تمہیں نصیحت کروں گی کہ جذبات کو مشتعل کر کے اپنی گرفتاری کا سبب نہ پیدا کرو لیکن اسی کے ساتھ جب وہ پیش آئے تو اس سے بھاگو بھی نہیں وہ تمہاری جرات اور بے خوفی کے ایک قدرتی نتیجہ کے طور پر وقوع پذیر آئے گی تمہیں قرآن پاک اور شاستر کے احکامات کا پابند رہنا چاہیئے یاد رکھو کہ جب ہمارے کل مرد جیل خانوں میں چلے جائیں گے تو اسی وقت آزادی کے پھریرے کو اڑتے ہوئے دیکھ لوگے"

اوراق گم گشتہ۔ ترتیب و تہذیب سید رئیس احمد جعفری۔ ندوی
محمد علی اکیڈیمی۔ لاہور۔ ص ۱۸۳-۸۴-۸۵

۱۹۲۱ء میں ہی بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے بی اماں نے کہا ؛

" اس وقت ہندو مسلمان دونوں ہی پریشانی کے عالم میں ہیں۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ دونوں متحد رہیں کھدر پہنیں اور تمام دن کپڑا بنیں۔ ملکی مفاد کی خاطر دونوں کا اتحاد ضروری ہے .... آخر تم کھدر کیوں نہیں پہنتے ؟ کیا میں پہلے مہین کپڑے نہیں پہنتی تھی ؟ کیا میں اس کھدر کو موٹا جھوٹا نہیں پاتی ؟ کیا تم زمانۂ قدیم میں ہندو کھدر نہیں پہنتے تھے ؟ کیا پیغمبرؐ نے کھدر نہیں پہنا ؟ اس لئے میرے بھائیو ! میری خواہش ہے کہ تم سیدھے راستہ پر چلو اور ملک کے سپاہی بن جاؤ دلیر بن جاؤ، خدا تمہیں عزت بخشے "

گاندھی جی نے ان کی تحریکِ خلافت کی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ینگ انڈیا میں لکھا " اگرچہ سن رسیدہ تھیں لیکن ان میں نوجوانوں جیسی طاقت تھی

انھوں نے خلافت اور سوراجیہ کے حصول کے لئے مسلسل سفر کیے۔ وہ اسلام کی کٹر پیرو تھیں اور ہندوستان کی آزادی ان کے نزدیک کھدر اور ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ناممکن تھی اس لئے انھوں نے اتحاد کے لئے زبردست کوششیں کیں جو ان کے نزدیک جزوِ ایمان تھیں"۔

علی برادران کی رہائی کے بعد بھی بی اماں کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں گرچہ صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ کانگریس کے اندرونی اختلافات، ہندو مسلم نفاق جزیرۃ نما عرب میں ہونے والے واقعات بدستور ان کی توجہ کا مرکز رہے۔ ۱۹۲۳ء میں وہ مولانا شوکت علی کی رہائی کے بعد ان سے ملنے کاٹھیاواڑ گئیں، پھر بمبئی، بیجاپور اور کوکناڈہ کے سفر کئے، مولانا شوکت علی کے ساتھ کانگریس کے اجلاس کے بعد وہ سیلون بھی گئیں اور موثر تقاریر کیں۔ مولانا محمد علی نے اس سلسلے میں لکھا ہے" بھائی صاحب نے منع بھی کیا کہ ہم آگئے ہیں اور پوری ہمت و مصروفیت کے ساتھ کام کریں گے آپ کے اب دن رات کے سفر اور دورہ کی ضرورت نہیں۔ آپ آرام کیجئے اور مطمئن رہیے کہ ہم کوئی دقیقہ ملک و مذہب کی خدمت گذاری کا اٹھا نہ رکھیں گے مگر بی اماں نے نہ مانا اور فرمانے لگیں تو مجھ پر رشک کرتا ہے کہ یہ بڑھیا میرے برابر ملک و قوم کی خدمت نہ کر سکے۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ گھر پر پڑی رہوں اور اپنے ملک و مذہب کی کوئی خدمت نہ کر سکوں"۔ (ہمدرد۔ ۱۱ نومبر ۱۹۲۴ء)

عمر عزیز کے آخری لمحات میں وہ بغرض علاج دہلی آئیں اور اس کے بعد مسوری اور پھر رام پور چلی گئیں۔ وہاں جاکر طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ مولانا محمد علی لکھتے ہیں "ہم لوگ فوراً ہی رام پور گئے مگر کئی دنوں تک بوجہ امتناعی احکامات رام پور میں داخل نہ ہو سکے اور اسٹیشن پر ہی پڑے رہے۔ بی اماں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میرے بچے مجھ سے نہیں اور میں بچوں سے نہیں مل سکتی تو وہ اسی حالت میں اسٹیشن پر چلی آئیں اور اصرار کیا کہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔ مجبوراً اُن کو دلی لانا پڑا یہاں ڈاکٹر انصاری کا علاج ہوتا رہا۔

جن دنوں بی اماں دہلی میں بغرض علاج مقیم تھیں اسی زمانے میں گاندھی جی نے مولانا محمد علی کے مہان کی حیثیت سے ان کے یہاں قیام فرمایا اور دوشنبہ ۱۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو ہندو مسلم اتحاد کی خاطر یکایک ۲۱ دن کے برت کا اعلان کر دیا جس کی وجہ سے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور خاص طور پر مولانا محمد علی جو گاندھی جی کے میزبان تھے سخت پریشان ہوئے ان لوگوں نے انتہائی کوشش کی کہ گاندھی جی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ جب ان بزرگ رہنماؤں کو کامیابی نہ ہوئی تو بی اماں نے کوشش شروع کی مگر اس کا بھی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی کی دعوت پر مولانا عبدالماجد دریا بادی بھی تشریف لائے ہوئے تھے اور مولانا کے یہاں مقیم تھے وہ اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر لکھتے ہیں بی اماں نے گاندھی جی کو پیغام بھجوایا کہ "تم مجھے اپنی ماں کے برابر سمجھتے ہو، میرا حکم مانو اور اپنے اس ارادے سے باز آؤ۔ میں آنے کے ذرا بھی قابل ہوتی تو زنانہ مکان سے خود تمہارے پاس کوٹھے پر آتی۔" گاندھی جی نے کہلوایا "اگر میں اپنی سگی ماں کی اطاعت اس بات میں کر سکتا تو آپ کی بات ضرور مان لیتا۔"

(بحوالہ ہماری زبان۔ بی اماں عبداللطیف اعظمی یکم اپریل ۱۹۸۵ء)

بی اماں کا انتقال ۱۲/ ۱۳ نومبر کی درمیانی شب ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ اور یوں ۷۲ سال کی عمر سے جہاد زندگانی میں مشغول یہ مجاہدہ معظم اپنے معبود حقیقی کی آغوش رحمت میں دائمی سکون کی نیند سو گئیں۔ گاندھی جی نے کہا "یہ تصور کرنا بڑا کٹھن ہے کہ بی اماں کا انتقال ہو گیا ہے۔ کون بی اماں کی باوقار شخصیت اور عوامی اجتماعات میں ان کی آواز کی گونج سے ناواقف ہے ...... یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں موت کی رات ان کے قریب ہی تھا۔ میں اور سروجنی فوراً پہنچ گئے، تھے مولانا محمد علی رو رہے تھے مگر شوکت علی خاموش تھے وہ بہت ضبط کر رہے تھے اور اللہ کا نام لے رہے تھے کامریڈ کا پریس بی اماں کے کمرے کے قریب تھا لیکن وہاں کام ایک لمحہ کے لئے نہیں رکا نہ ہی مولانا نے اپنے مدیرانہ فرائض سے غفلت برتی۔"

ہمدرد کے ۸ رمئی ۱۹۲۵ء کے اداریے بعنوان ملّت کا خدمت گزار میں مولانا نے اس حادثے کی تفصیل میں لکھا ہے ۔

"جب بی اماں مرحومہ کا انتقال ہونے والا تھا اور چہارشنبہ کی شام کو بعد مغرب جب وہ رات کے دو بجے تک ان کی پٹی کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ جب سوا دو بجے ان کا انتقال ہو چکا اور ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں تو اٹھ کر آیا اور پریس میں بیٹھ کر پروف پڑھنے لگا۔ نماز فجر سے فارغ ہو کر فرش پر لیٹ گیا گھنٹے دو گھنٹے بعد ایک لیڈنگ آرٹیکل تھا وہ لکھتا رہا۔ ظہر کے بعد لوگوں نے اطلاع دی کہ غسل دیا جا چکا، کفن پہنا دیا گیا، تم بھی چلو، اسی وقت مضمون بھی ختم ہوا۔ قلم رکھ کر شریک جنازہ ہو گیا" (مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز، مرتبہ پروفیسر محمد سرور، ص ۷ ۲۱) تدفین سہ پہر ۱۳ ر نومبر درگاہ شاہ ابوالخیر میں ہوئی۔ ہندوستان بھر میں ان کی شاندار قومی و ملی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ مسز اینی بیسنٹ نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا:

" میں خراجِ عقیدت پیش کرنے میں خود کو دوسروں کے ساتھ شریک کرتی ہوں اس شیر دل اور انتہائی مذہبی خاتون کے تئیں جو کسی خطرے سے خوفزدہ نہیں ہوئی اور جس نے اس دھرتی پر کسی چیز کو اپنے عقیدے پر فوقیت نہیں دی .... ایسی روحیں دوسروں کو بھی باوقار بناتی ہیں اور مثال پیش کرتی ہیں..... وہ آزادی کی راہوں کو منور کرتی ہیں اور رہنما بناتی ہیں، اپنے خون بہتے ہوئے پاؤں سے جس پر قومیں چلتی ہیں انھیں ابدی روشنی میسّر ہو "۔

۱۴ ر نومبر کے پٹودی ہاؤس دہلی میں منعقد ہوئے تعزیتی جلسے میں سوامی شردھانند سرستی جی نے ہندو مسلم اتحاد کی اس علامت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ " لوگوں کو شاید خیال ہو کہ علی برادران کام کرتے تھے اس لئے ان کی والدہ صاحبہ ان کے شریک ہو گئیں لیکن میں اپنے تجربے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ایک لگن ہندو مسلم اتحاد کے لئے کسی کے دل میں تھی تو وہ بی اماں کے

دل میں بھی اور ان کا ہی یہ بھائی تھا جو مولانا محمد علی اور شوکت علی کے اندر کام کر رہا تھا۔ یہ وقت زیادہ کہنے کا نہیں ورنہ میں بتلاتا کہ اُن سے زیادہ سیاسی لیڈر بھی اس ہمت اور جوش سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر سکتے تھے جیسی وہ کرتی تھیں.... (ہمدرد دہلی ۱۶ / ۱۷ نومبر ۱۹۲۴ء ص ۲)

گاندھی جی نے پہلے علی برادران سے اپنے قریبی تعلقات کا ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح علی بھائی اور میں، ہندو مسلمان ہو کر بھی ساتھ رہ سکتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے "ایک ماں کے تین لڑکے"، پھر بی اماں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا "جیسے اپنی سگی ماں کے لئے کہنے میں مجھے مشکل ہوتی ویسے ہی بی اماں کے لئے کہنے میں ہے۔ میں نے ۱۹۱۷ء میں ان کے درشن کئے تھے اس وقت سے بی اماں کو جانتا ہوں۔ عدم تعاون کے وقت بی اماں نے ملک کا دورہ کیا تھا۔ بی اماں بحیثیت مسلمان ہوتے ہوئے بھی دورہ کر رہی تھیں کہ اسلام پر مصیبت ہے، تو جس جگہ وہ اسلام کے لئے کچھ کہتی تھیں وہاں ہندو و مسلمانوں کی ایکتا اور ہندوستان کی آزادی کے لئے بھی ضرور کہتی تھیں۔ میں ہندو مسلم جھگڑے کو مٹانے کے لئے دہلی میں ایک عرصے سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ بی اماں بھی یہیں موجود تھیں میں بی اماں سے ملتا رہتا تھا وہ ہمیشہ یہی کہتی رہتی تھیں کہ میں (۱) ہندوستان میں سوراج (۲) ہندو مسلم اتحاد کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب تک ہندو مسلمان ایک ہو کر بھائیوں کی طرح نہیں رہ سکتے، آزادی ناممکن ہے۔ ہم کو اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ایکتا کرنی چاہیئے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا ہم غلام رہیں گے (ایضاً)

مولانا عارف ہسوی نے ہمدرد کے اسی شمارے میں اپنے تعزیتی نوٹ میں لکھا:

"اس بڑھاپے اور ضعیفی کے زمانے میں ان کے اندر قومی کاموں کے لئے جو ہمت، جوش اور ولولہ تھا وہ جوانوں میں بھی نہیں پایا جاتا اور اس لحاظ

سے ان کا مقدس وجود ملک و قوم کے لئے ایک برکت تھا۔ انھوں نے گذشتہ دس سال کے اندر اپنے مجاہدانہ اعمال سے یہ ثابت کر دیا کہ اگر مذہب اور ملک کی سچی تڑپ انسان کے دل میں ہو تو ضعف و نقاہت اور عمر کا تفاوت اس میں حارج نہیں ہو سکتا اور یہ کہ اس میدان میں بوڑھے اور جوان سب کے لئے گنجائش ہے اور اگر خدائے بزرگ و برتر توفیق دے تو ستر سالہ ضعیفہ بھی بیس سالہ نوجوان سے زیادہ ہمت کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت کا مقدس فرض انجام دے سکتی ہے۔" (ایضاً ص ۴)

علی گڑھ کے ایک تعزیتی جلسہ میں سوامی ستیہ دیو جی نے بی اماں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا "بھائی ماتا جی تو ماتا جی ہی تھیں جب ہم جوان ہمت ہار جاتے تھے تو وہ آگے بڑھتی تھیں۔ ایک دفعہ ہم دکن میں دورہ کر رہے تھے ایک اسٹیشن پر لوگ ہمیں لینے آئے۔ ہم نے پوچھا تمہارا گاؤں کتنی دور ہے اور وہاں کیسے جاتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ گاؤں اسٹیشن سے تیس میل پر ہے۔ اس پر ہم نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ نہیں جا سکتے۔ وہ ناراض ہو کر جانے لگے ماتا جی کو پتا چلا تو لوگوں کو بلا کر کہا کہ بیٹا تمہارے ساتھ میں چلوں گی موٹروں پر تو سبھی جاتے ہیں بیل گاڑی میں جاؤں گی۔ بوڑھی ماتا اتر پڑیں۔ ہم جوان بھی اتر پڑے اس طرح ماتا جی ہم کو بتا گئیں کہ کام کیسے ہوتا ہے۔"

(رئیس الاحرار مولانا محمد علی سوانح و خدمات ص ۲۴۔ ۲۵)

لیکن بی اماں کو خراج عقیدت پیش کرنے والے ان گنت پیغامات میں عوام کی ان سے محبت و عقیدت کی عکاسی شاید ہی کوئی اس تعزیتی خط سے بہتر کر سکے جو پنجاب کی ایک ہندو خاتون نے مولانا محمد علی کو اس تاکید سے لکھا تھا کہ اسے ہمدرد میں شائع ہونے والے تعزیتی پیغامات میں شامل نہ کیا جائے۔ لیکن جو مولانا نے معذرت کے نوٹ کے ساتھ شائع کیا ہے اس کا ہر ہر لفظ خلوص کے آنسو میں ڈوبا ہوا ہے، ایک گہرے درد کی کسک لئے ہوئے ہے۔

مولانا کا نوٹ:

"پنجاب کا یہ مراسلہ اس شاندار مستقبل کے لئے جس کے ہم آرزومند ہیں نہایت روح پرور شگون ہے۔ بی اماں کی سب سے بہتر یادگار یہ ہوگی کہ ہندوستان کے تمام بہادر فرزند اپنے حقیر اختلافات کو بھلا دیں اور اپنے مصیبت زدہ وطن کے لئے حصول آزادی کی جدوجہد کی کامیابی کے لئے متحد ہو جائیں۔"

دہلی ۱۲ر دسمبر ۱۹۲۴ء

محمد علی
شوکت علی

پنجابی بہن کے تعزیت نامے کی نقل

نمبر ۴ پنج محل روڈ، تاریخ ۹ر دسمبر

"میرے محترم و ممتاز بھائی مولانا صاحب نمسکار

نہیں جانتی کہ کس تمہید کے ساتھ اپنا خط لکھنے کا مقصد بیان کروں۔ کانفرنس میں آپ کی اسپیچ کے اس حصّے میں جہاں آپ نے ہماری بی اماں کا ذکر کیا تھا نہایت ہی دردانگیز تھا۔ شاید ہی کوئی آنکھ ایسی ہو جس نے اس قابلِ قدر خاتون کے لئے اس وقت آنسو نہ بہایا ہو۔ اور میں تو اول دن سے ہی یعنی میں نے جب پہلی مرتبہ ان کے درشن کئے تھے۔ ان کی بہت ہی معتقد تھی۔ میں جانتی ہوں کہ ایسی روحیں دنیا میں کبھی کبھی آتی ہیں اور ابھی تک ان کی سی خاتون میری نظر سے نہیں گذری۔ مجھ کو ان کے مرنے کا اس قدر رنج ہوا کہ میں لفظوں میں اس کو بیان نہیں کر سکتی۔ وقت کے حساب سے وہ سن رسیدہ تھیں مگر غریب ہندوستان کے لئے ان کی بہت ضرورت تھی۔ اس لئے ان کا رنج ہمارے لئے بہتیری نوجوان عورتوں سے زیادہ تھا۔ میں نہیں جانتی کہ کون اس خالی جگہ کو پُر کرے گا۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ عورتیں خاص طور پر جمع ہو کر ان کے رنج و غم کا اظہار کریں لیکن آجکل حالت ہی درست نہیں۔ ان کی نیک اور بہادر عورتوں کے کارنامے تو سنہری حرفوں میں چھپنے چاہئیں اور گھر گھر پہنچنے چاہئیں اور ہر عورت

دلڑکی کو ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔

میں چاہتی ہوں کہ اپنی شردھا اور بھگتی کے پھول ان کی قبر پر چڑھاؤں۔ لیکن میرے لیئے اس وقت ممکن نہیں اگر کبھی الہ آباد آتے جاتے دہلی ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تو انشاءاللہ پورا کروں گی۔ میں خود ان کی قبر پر جاؤں گی اور وہاں کی خاک کا ٹیکہ اپنے ماتھے پر لگاؤں گی لیکن اب تو دس روپے کی ناچیز رقم آپ کے پاس بھیجتی ہوں آپ پانچ روپے کے پھول میری طرف سے ان کی قبر پر چڑھا دیجئے گا اور پانچ روپے کا پھل یا مٹھائی غریب بچوں کو ان کے نام پر کھلا دیجئے گا۔

پرماتما جانتا ہے کہ میرا دل ان کے خیال سے کتنا بھرا ہے اور میں کتنی دفعہ اپنے دل میں ان کو یاد کر چکی ہوں ہمارے لئے تو ایسی بیش بہا ہستیاں ویسے ہی بڑی ناپید ہیں لیکن اس پر جو تھوڑی سی ہیں وہ بھی ہم سے چھین لی جاتی ہیں۔ یہ ہندوستان کی کم نصیبی ہے۔ بہر حال پرماتما کے سامنے سر تسلیم خم ہے، کیا چارہ ہے"!

(ہمدرد ۱۵ دسمبر ۱۹۲۴ء ص ۴)

بے شک بی اماں ان چند خوش نصیب رہنماؤں میں تھیں جنھیں اپنی حیات میں ہی یہ دیکھنا نصیب ہوا کہ "شہرتِ عام و بقائے دوام" کے دربار میں ان کا اپنا ایک مقام ہے۔ قومی جہدِ آزادی۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی خاطر ان کی بے لوث خدمات اور ملّت کے لئے ناقابلِ فراموش ایثار کے عوض جہاں رضا کاران ملک نے انتہائی فراخدلی سے ملک کے طول و عرض میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا وہیں پرستارانِ ملت نے ٹوٹ کر ان کے قدموں میں گلہائے عقیدت نذر کیئے۔ تاہم ایک تابندہ عکسِ لطیف کو زمانے کی گرد دھندلا نہ دے اس لیے ضروری ہے کہ ؎

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

بیگم حسرت موہانی (نشاط النساء بیگم)

آج کے ہندوستان کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے والے ہم لوگوں کے لئے اس وقت جب کہ صدائے حق بلند کرنے والوں کی زبانوں پر پریس ایکٹ نے قفل ڈال رکھے ہوں، قانون تحفظِ ہند کا آہنی پنجہ انھیں اپنی گرفت میں دبوچ لینے کے لئے ہر آن مستعد ہو اور قید خانوں کی بھیانک تاریکی انھیں نگلنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہو، ان شمع حریت کے پروانوں کی اولوالعزمی وجانبازی کا اندازہ لگانا آسان نہیں جو اپنی سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی خاطر سر سے کفن باندھ کر میدانِ عمل میں اتر آئے تھے۔

حسرت و بیگم حسرت کی کہانی بھی دار و رسن کی آزمائش کی ان گنت کہانیوں میں سے ایک ہے اور ساتھ ہی ان بہت سی بھولی بسری داستانوں میں شمار کی جا سکتی ہے جن کے ساتھ آزاد ہندوستان کی تاریخ نے مناسب انصاف نہیں کیا۔

بیگم حسرت کا شمار ان خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں قومی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ مولانا حسرت سے ہی روایت منسوب ہے کہ اگر بیگم حسرت، بیگم آزاد اور کملا نہرو نہ ہوتیں تو حسرت کسی اخبار کے ایڈیٹر ہوتے مولانا ابوالکلام آزاد، الہلال و البلاغ نکالتے رہتے اور جواہر لال سے زیادہ

ایک کامیاب بیرسٹر ہوتے یہ عورتیں وفا پرست اور ایثار مجسم تھیں انھوں نے جان دے دی مگر ہم سے کبھی یہ نہ پوچھا کہ لیلائے سیاست کے پرستارو! تم جیل جا رہے ہو۔ ہمارا کیا ہو گا؟

(علیم اختر مظفر نگری۔ مقالہ مولانا حسرت موہانی شبستان اردو ڈائجسٹ مارچ ۱۹۶۸ء ص ۱۲۷)

بیگم حسرت کو ان خواتین میں پوری امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ انھوں نے حسرت کو جن کی تمام تر زندگی آزادی کی مکمل تفسیر رہی نہ صرف لیلائے حریت کے سپرد کر دیا بلکہ اپنی زندگی کو بھی قوم کے لیے وقف کر دیا۔ چکبست نے ان کی قومی خدمات کو سراہتے ہوئے "صبحِ امید" میں قوم کے جوانوں کو مشورہ دیا تھا۔

" بیگم حسرت کی زبان عام جلسوں میں پولٹیکل مردانگی کا راگ گانے کے لئے خلق نہیں ہوئی ہے مگر اس شہیدِ وفا کی زندگی کا نغمۂ خاموش، وطن پرستوں کی روح کو وجد میں لانے کے لئے کافی ہے۔۔۔۔ ہم قوم کے نوجوانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس دیوی کے قدموں کے نیچے بیٹھ کر استقلال اور ایثارِ نفس کا سبق حاصل کریں۔" (چکبست، صبحِ امید۔ ۲/۱۹۱۸ء)

پروفیسر عبدالشکور نے اپنی تالیف "حسرت موہانی"، میں رسالہ "رہبرِ نسواں" نومبر ۱۹۳۴ء کے حوالے سے نشاط النساء (بیگم حسرت کی ابتدائی زندگی کے متعلق تحریر کیا ہے:

"محترمہ نشاط النساء بیگم غالباً ۱۸۸۵ء میں موہان ضلع اناؤ (اودھ) کے ایک معزز خاندان سادات میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد سید شبیب حسن موہانی مرحوم رائچور (ریاست حیدرآباد) میں وکیل ہائی کورٹ تھے۔ چونکہ سادات موہان میں علم و کمال کا چرچا شروع سے رہا ہے اس لئے محترمہ نشاط بیگم قصبات اودھ کی عام لڑکیوں کی طرح زیورِ تعلیم سے محروم نہ رہ سکیں اور آپ کو مذہبی تعلیم کے علاوہ اردو فارسی اور عربی زبانوں کی معقول تعلیم دلائی گئی۔

زمانۂ دوشیزیت میں آپ کا خاص مشغلہ یہ تھا کہ پس ماندہ قصبے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھیں اور اگر آج موہان میں تعلیم نسواں کی جھلک نظر آتی ہے تو "محترمہ نشاط بیگم کی کوشش اور مالی ایثار کا ثمرہ ہے"۔ (حسرت موہانی، عبدالشکور اشاعت سوم۔ لکھنؤ۔ ص ۱۱۷) اور جس سے ان کے پختہ سماجی شعور کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۱۹۰۱ء میں جب وہ حسرت کی زندگی میں داخل ہوئیں تو محض کندۂ ناتراشیدہ نہ تھیں۔ گمان غالب ہے کہ قومی و ملکی مسائل سے بھی وہ کچھ نہ کچھ آشنا ضرور رہی ہونگی کیونکہ لکھنؤ سے قربت کے سبب قصبہ موہان میں بھی اردو اخبارات پہنچنے لگے تھے۔ ہر چند کہ انڈین نیشنل کانگریس کا یہ عہد طفولیت تھا تاہم لوگوں کی ملکی سیاست میں دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ "یہ دیہاتی ماحول کی پلی ہوئی لڑکی نہایت جری باحوصلہ اور ہر طرح حسرت کی رفاقت کے لئے موزوں تھی .... حسرت نے مالی اعتبار سے کبھی کسی قسم کی فراغت و اطمینان کو محسوس نہیں کیا لیکن کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہیں آیا۔ ہر کٹھن موقع پر وہ حسرت کی رفاقت کے لئے آمادہ رہا کرتی تھیں حسرت کو ہمیشہ ان کی رفاقت پر فخر رہا ہے"۔

(رابعہ بیگم، حسرت کی خانگی زندگی، اردو ادب حسرت نمبر جولائی تا دسمبر ۱۹۵۱ء علی گڑھ ۹۸-۹۹)

اور حسرت کا یہ فخر بے جا نہ تھا" اگر نشاط النساء بیگم کی مستقل مزاجی اور مولانا کے ساتھ ان کی ہم خیالی شریک حال نہ ہوتی تو مولانا حسرت اس قدر عزم ثبات کا شاید ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہتے"۔ (عارف ہسوی۔ حالات حسرت دہلی ۱۹۱۸-۱۹۱۹)

جس طرح حسرت کی سوانح عمری کے مصنف کے مطابق "مولانا کی لائف اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ بیگم حسرت کے واقعات و حالات شامل نہ کئے جائیں کیونکہ بیگم صاحبہ مولانا کی زندگی کی ہر طرح کی شریک ہیں اور مولانا کے کاروبار قومی میں ہمیشہ معاون رہیں ——" (ایضاً)

اسی طرح جدوجہد آزادی میں بیگم حسرت کے ایثار اور ان کے سیاسی شعور کے ارتقاء کا جائزہ حسرت کی سیاسی نظریات و عقاید کے تجزیے کے بغیر

ممکن نہیں۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد جب کہ حسرت ابھی علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھے وہ علی گڑھ آئیں اور اس کے مختصر سے وقفے کے بعد ہی حسرت کی دار و گیر کا وہ طویل سفر شروع ہوا جس کی داستان انھیں کی زبان میں سنیئے

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں۔ اس اک عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

علی گڑھ کی تعلیمی زندگی سے فراغت پاتے ہی حسرت نے اپنے نظریات و عقاید کی اشاعت و ترویج کی خاطر ۱۹۰۳ء میں ماہنامہ اردوئے معلیٰ جاری کیا۔ اور اس کے ذریعے شراب حریت کے جام پر جام لنڈھانا شروع کر دیئے۔ حسرت پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے علانیہ علی گڑھ تحریک سے انحراف کیا اور مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت کی دعوت دی۔ ۱۹۰۴ء میں انھوں نے کانگریس کے اجلاس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔ کانگریس میں وہ گرم دَل کی سیاست کے علمبردار تھے اس لئے ۱۹۰۶ء کے سورت اجلاس میں زرم و گرم دَلوں کے ٹکراؤ کے بعد بال گنگا دھر تلک کے ساتھ وہ بھی باقاعدہ گرم دَل میں شامل ہو گئے اردوئے معلیٰ کے اپریل ۱۹۰۸ء کے شمارے میں کالج کے ایک طالب علم کا مضمون، مصر میں انگریزوں کی پالیسی" کے عنوان سے شائع ہوا اور حسرت دفعہ ۱۲۴ (الف) کی زد میں آگئے لیکن انھوں نے طالب علم کا نام بتانے سے انکار کرتے ہوئے تمام ذمہ داری اپنے سر لی۔ مسلم معاشرہ پر سیاسی جمود کے ساتھ ساتھ برطانوی سامراج کی وحشت بھی اس قدر غالب تھی کہ انھیں ایک بھی وکیل یا بیرسٹر مقدمے کی پیروی کے لئے میسّر نہ ہو سکا اور ایک دو پیشیوں میں ہی دو سال قیدِ بامشقت کی سزا ہوئی حسرت مسلمانوں میں پہلے سیاسی قیدی ہیں یہ پہلی گرفتاری ہی نشاط النساء بیگم کی سیاسی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی اور حبس دوراں انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ شوہر کی محض چند سالوں کی رفاقت میں ہی اس دیہاتی ماحول میں پلی ہوئی لڑکی

کا شعور کتنا بیدار، کتنا پختہ ہو گیا تھا اور اب ایک واضح منزل کی طرف گامزن تھا۔ مصیبت کے اس نازک وقت میں وہ نہ صرف ہر اعتبار سے رفیق سفر ثابت ہوئیں بلکہ یہ اُن کی مستقل مزاجی، ہم خیالی ہی تھی کہ مجاہد آزادی ہر اس افتاد کو جھیل گیا جو بڑے سے بڑے رہناؤں کے حوصلے پست کرنے کے لئے کافی تھی۔ بقول حسرت "گرفتاری کے وقت راقم الحروف کی شیرخوار لڑکی نعیمہ حد درجہ علیل تھی اور اتفاق سے مکان پر والدہ نعیمہ اور ایک خادمہ کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ لیکن انکی ذات سے اس نازک وقت میں بہ بنائے سیادت و تائید ربانی حیرت انگیز حوصلہ اور استقلال کا اظہار ہوا۔ خود پریشان ہو کر راقم کو بھی مغموم کرنے کے بجائے انھوں نے دوسرے ہی دن بذریعہ سپرنٹنڈنٹ ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر جملہ کار پردازان زنداں متحیر رہ گئے۔ راقم کا دل بفضلہٖ امر حق کی پیری کے باعث یونہی توی تھا لیکن ان کی یہ تحریر کہ "تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا، خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو" تقویت مزید کا باعث ہوئی۔ بھائی صاحب کو انھوں نے تار دے کر بلوا لیا تھا جن کے ہمراہ وہ جیل میں بھی مجھ سے ملنے آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتہ آیا کیں لیکن آخر تک ان کی جرأت، ہمت میں فرق نہ آیا۔"

(مشاہدات زنداں، بحوالہ حسرت کی سیاسی زندگی عبدالقوی دسنوی ص ۱۷-۱۶)

دورانِ نظر بندی جب علی گڑھ مجسٹریٹ نے حسرت کو پڑھنے لکھنے کی اجازت دے دی تو بیگم حسرت برابران کے پسندیدہ اخبار ان تک پہونچاتی رہیں۔ حسرت کی درویشی پانچسو روپے جرمانہ کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ان کی عزیز و نایاب کتابیں حکومت کی طرف سے صرف ساٹھ روپے میں نیلام کر دی گئیں۔

دورانِ قید حسرت نے جن مصائب اور سختیوں کا سامنا کیا اس کی ہولناک داستان "مشاہدات زنداں" کے نام سے اردوئے معلی میں قسط وار شائع ہوئی جو سامراجی آمریت و بربریت کی ایک مستند تاریخ ہے۔

رہائی کے بعد حسرت کا جوشِ عمل قید فرنگ کی بنا پر مزید ترقی کر گیا۔ دوستوں نے ہزار نرم روی کا مشورہ دیا مگر یہ نشہ اُترنے والا نہ تھا۔ یہاں تو عالم یہ تھا

ع بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

"دو چار پتھر کا بندوبست کر کے اپنے مختصر سے مکان میں ہی انھوں نے کاٹھ کا ایک پریس لگایا جس کا نام اردو پریس رکھا۔ اس مطبع میں بقول عتیق صدیقی اگر اسے مطبع کا شاندار نام دیا جا سکے تو حسرت کتابت کرنے کے علاوہ پریس مین کی خدمت انجام دیتے اور نشاط النساء بیگم پیپر مین کی"

(بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، عتیق صدیقی دہلی۔ ص ۲۸)

اب صوبہ متحدہ کی جیمس مٹن کی گورنمنٹ کو اردوئے معلیٰ کھٹک رہا تھا چنانچہ ۱۳ مئی ۱۹۱۳ء کو اردو پریس سے جس کی کل کائنات ایک لکڑی کی دستی مشین اور دو پتھر تھے قانون مطابع کے تحت تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی حسرت کے پاس اردوئے معلیٰ اور پریس بند کر دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا مولانا ابوالکلام آزاد نے حکومت کی مطلق العنانی پر احتجاج کرتے ہوئے الہلال کی دو مسلسل اشاعتوں میں "اردو پریس علی گڑھ کی ضمانت" کے عنوان سے لکھا جو خصوصیت سے اس لئے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس میں انھوں نے بیگم حسرت کو حسرت کی "کوہِ عزم ثبات" بیوی سے تعبیر کیا ہے۔ (الہلال ۲۱ - ۲۸ مئی ۱۹۱۲ء)

اِسی دوران پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی ہندوستان میں سیاسی ہل چل اپنے عروج پر تھی اور ساتھ ہی برطانوی آمریت بھی۔ ٹرکی سے ہمدردی کے سبب جو اس لڑائی میں جرمنی کا حلیف تھا ہندوستانی مسلمانوں کی ہمدردیاں بھی طبعًا جرمنی کے ساتھ تھیں۔ مقاماتِ مقدسہ کے سبب مسلمانوں کی انگریز دشمنی کے جذبات بھڑک رہے تھے۔ مکمل دستورِ زبان بندی کے تحت سبھی احراری لیڈر گرفتار کر لئے گئے تھے حسرت ابھی تک آزاد تھے اور مسلم

یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی میں احرار کی سربراہی کر رہے تھے۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں انھیں بھی نظربندی کا حکم ملا جسے ماننے سے انھوں نے انکار کر دیا جس کی پاداش میں بالآخر انھیں قید کر دیا گیا۔

حسرت کی دوسری گرفتاری اور بیگم حسرت:

۱۳؍ اپریل ۱۹۱۶ء میں حسرت دوسری بار گرفتار کیے گئے نشاط النساء بیگم کی زندگی میں یہ تاریخ "ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔۔ اس کے ساتھ ہی ان کی سیاسی زندگی عملی زندگی کا آغاز ہے جب انھوں نے گھر کی چہار دیواری سے نکل کر حسرت کے مقدمے کی پیروی اپنے ذمہ لی اور یہ کام انتہائی نامساعد حالات میں بڑی دلیری اور ہمت سے انجام دیا۔ حسرت کے مقدمے کے دوران اور بعد میں ان کے اسیری کے زمانے میں بھی انھوں نے بڑی ہمت اور قابلیت کے ساتھ حسرت کے پبلک ریلیشن آفیسر کی خدمت بھی انجام دی، مقدمے کی پیروی کے ساتھ ساتھ اخبارات کی وساطت سے حسرت کے حالات سے بھی عوام کو باخبر رکھا۔

(بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط تذکرہ ص ۲۹)

اس بار حسرت کو کئی جگہ قید رکھا گیا۔ پہلے علی گڑھ جیل میں رہے پھر للت پور لائے گئے۔ وہاں سے جھانسی، الہ آباد، پرتاپ گڑھ، فیض آباد، لکھنؤ اور میرٹھ کے جیل خانوں میں رہے۔ باہری دنیا کو ان تمام حالات کا علم بیگم حسرت ہی کے ذریعہ ہوا مثلاً یہ خبر:

"ہندوستانی لکھنؤ رقم طراز ہے کہ مسز حسرت موہانی کی ایک تحریر سے جو انھوں نے ہم کو ارسال کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کو للت پور میں نظربند رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

(بحوالہ مدینہ اخبار بجنور۔ مورخہ ۱۵؍ مئی ۱۹۱۶ء)

حسرت کو ۱۹۱۶ء میں قانون تحفظ ہند کے تحت گرفتار کیا گیا تھا جس

کے مذہبی اور اخلاقی جواز کو وہ نہیں مانتے تھے۔ مولانا نے للت پور میں نظربندی کا حکم ماننے سے انکار کردیا۔ اس کا علم بھی اخبارات کو بیگم حسرتؔ ہی کے ذریعے ہوا آپ فرماتی ہیں کہ آج حسرتؔ کا خط آیا ہے۔ ان کا مستقل ارادہ ہے کہ ایسے حکم کی تعمیل سے جو بغیر اظہار جرم رموقع تردید سزا دینا ہے۔ انکار کردیں گے۔" (ایضاً)

مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد حسرتؔ کے فیصلے سے متفق نہیں تھے۔ ابتداً نشاط النساء بیگم بھی اس سے مطمئن نہیں معلوم ہوتی تھیں جیسا کہ مولانا عبدالباری کے نام ایک ذاتی خط مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۱۶ء میں انھوں نے لکھا تھا:

"کل محمد علی صاحب کا خط بھی (چھنڈواڑے سے) آیا ان لوگوں کی بھی یہی رائے ہے حسرتؔ خدا کرے راضی ہو جائیں ورنہ مصیبت تو ہی ہے"

بیگم حسرتؔ موہانی اور ان کے خطوط، تذکرہ ص ۵۸)

لیکن جب احکام نظربندی کی خلاف ورزی میں حسرتؔ پر مقدمہ چلایا گیا تو وہ پوری طرح غیر ملکی سامراجیت سے ٹکر لینے کے لئے سینہ سپر تھیں۔ مولانا کو للت پور جیل میں انھوں نے جو حوصلہ افزا خط لکھا وہ ملاحظہ ہو:

۲۸ اپریل ۱۹۱۶ء

آج کارڈ ۲۷ کا لکھا ہوا اور لفافہ بھی ساتھ ملا۔۔۔۔ تمہارے استقلال کی حد ہوگئی، میں تعریف کرتی ہوں مگر افسوس کہ تم سے علیحدہ رہنے کا خیال سخت تکلیف دہ ہے۔ ناقابلِ برداشت ہے۔ خدا تمہاری مدد کرے۔ اگر خدانخواستہ قید ہوئی اور خدا نہ کرے خیالِ غالب یہی ہے کیونکہ تم اپنی دُھن کے پکے ہو۔ اور واقعی حق سے اجتناب کرنا ایک سچے مسلمان کے لئے ناگزیر ہے ظلم خدا ہرگز پسند نہیں کرتا وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔ مگر ہم کو کیا۔ ہماری چند روزہ زندگی تو گورنمنٹ کی مہربانیوں کی نذر ہوگئی تھی دنیا میں تو انصاف نہیں رہا نہ سہی۔ خدا منصف ہے۔ وہ سب کے ساتھ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس کی

مہربانی اور مدد پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ جو ظلم کرتا ہے وہ اپنی تلوار سے اپنا زیاں کرتا ہے۔ ہم کو خوش ہونا چاہیئے کہ ہمارے ساتھ ظلم ہوتا ہے مگر ہم ظلم نہیں کرتے۔"

(بحوالہ اسلم ہندی، رازدانِ حیات سوانح حسرت موہانی، ص ۲۷، ۱۲۸)

مولانا عبدالباری کے نام اپنے خط مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۶ء میں انھوں نے لکھا:

"میں نے پہلے ہی آپ سے عرض کیا تھا کہ حسرت اپنی دھن کے پکے اور استقلال کے مضبوط ہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے اسی پر بھروسہ ہے۔ خدا حسرت کی ہمت اور حوصلے کو بلند کرے اور جلد کامیاب کرے آمین۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اگر خدا نہ کرے قید ہوئے تو مجھے بھی صبر کرنا چاہیئے اور خدا سے دعا کرنا چاہیئے کہ مجھے اتنی قوت اپنی قدرتِ کاملہ سے عطا کرے کہ کسی صورت سے میں بھی ظالموں سے حسرت کے ساتھ بے جا ظلم کرنے کا انتقام لے سکوں چاہے مجھے بھی قید یا پھانسی کیوں نہ ہو جائے۔"

(بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط متذکرہ ص ۶۱)

برطانوی استبداد کے سامنے سر جھکانا حسرت کی سرشت میں تھا نہ بیگم حسرت کی بلکہ معاملہ بالکل ہی برعکس تھا ؎

جی مانتا نہیں کہ رہوں بے خطا کیئے   تعزیر دے کے آپ نے عادت بگاڑ دی

چنانچہ جب احکام نظر بندی کی خلاف ورزی میں ماخوذ ہو کر حسرت ڈیڑھ سال کے لئے جیل چلے گئے تو اپنے اخباری بیان میں ان کی کوہِ عزم و ثبات" بیوی نے کہا:

"حسرت نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس میں ضد اور خود رائی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ میں نے ان کی اس رائے کو بے حد اطمینان اور خوشی کے ساتھ دیکھا ہے ایسی نظر بندی سے قید بہرحال بہتر ہے حسرت نے خوب کیا مجھے اُن سے یہی امید تھی۔ (بیگم حسرت اور ان کے خطوط متذکرہ ص ۲۰) واضح رہے کہ "یہ رائے کسی خوشحال گھرانے کی عورت کی نہیں۔ بیگم حسرت کی تھی۔ جو مولانا کے ہمراہ نمک روٹی کھا کر اور اُجرت پر سلائی کر کے چکی پیس کر گذر اوقات کرتی تھیں۔"

(کرشن بلدیو شرما آجکل اگست، ستمبر ۱۹۸۵ء ص ۳۲)

دورانِ مقدمہ نشاط النساء بیگم نے حسرتؔ کے مقدمے کی پیروی کا کام انتہائی ناساعد حالات میں کیا۔ ان کی زندگی کا یہی وہ دور ہے جب انھوں نے معاشرے کی مخالفت کے باوجود پردہ ترک کیا۔ "وہ چہرہ کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آتیں اور کسی کی پرواہ نہ کرتیں۔"

(سید سلیمان ندوی "نگار" لکھنؤ حسرت نمبر جنوری، فروری ۱۹۵۲ء ص ۱۱۸)

بقول پنڈت کشن پرشاد کول "یہ جرأت مندانہ اقدام انھوں نے اس وقت کیا جب نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں میں بھی پردے کی رسم شرافت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔" (ایضاً ص ۵۹)

حسرتؔ کے بیرسٹر دوستوں نے ان کے مقدمہ کی پیروی سے گریز کیا۔ اس سلسلے میں وہ جن صبر آزما مرحلوں سے گزریں اس کے کرب و بے بسی کا اندازہ مولانا عبدالباری کے نام خط کے اس جملے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے "افسوس ہے کہ کوئی وکیل بیرسٹر جھانسی تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کیسی مجبوری و افسوس کا مقام ہے۔" (بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط۔ متذکرہ ص ۵۷) تاہم باوجود اس عالم کس مپرسی کے جس ہمت و جرأت مردانہ کا انھوں نے ثبوت دیا ہے اس کا اعتراف مولانا ابوالکلام آزاد نے جو ان دنوں خود ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت رانچی میں نظربند تھے انھیں کے نام اپنے ایک طویل خط میں کیا ہے:

"اخبارات میں صوبہ جات متحدہ کی گورنمنٹ کا کیمونک نظر سے گذرا اور آپ کا خط بھی جو سنٹرل (مسلم) بیورو نے شائع کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ مولوی حسرت نے اور آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کامل انسانوں سے مسلمانوں کی بستیاں ابھی خالی نہیں ہوئی ہیں . . . .

جب میں آپ کے عزم و استقلال اور اس کے ساتھ تنہائی و کس مپرسی کو سوچتا ہوں تو کہہ نہیں سکتا قلب کا کیا حال ہوتا ہے، یہ اللہ ہی کی مدد ہے جس نے آپ کو ان مصائب و شدائد میں بھی وہ درجہ عزم بخشا ہے جو کسی مرد کو

بھی آج نصیب نہیں۔" مکتوب ابوالکلام آزاد نقوش لاہور مکاتیب نمبر ص ۱۰۰۷ء"
انھیں دنوں حسرت کے نام اپنے ایک خط میں مولانا محمد علی نے بھی جو اس وقت چھنڈواڑہ میں نظر بند تھے بعض ہم عصر لیڈروں کی روش سے اظہار مایوسی کرتے ہوئے لکھا تھا۔

" البتہ جب تمہارا خیال آتا ہے اور تم سے زیادہ بہن (نشاط النساء) کا جو نہ صرف تمہارے ناموس کو بلکہ ہم سب کے ناموس کو اس جرأت و ہمت سے سنبھالے ہیں اور ساکت و صامت نہیں بلکہ کلمۂ حق کو بآواز بلند سب کو سنا رہی ہیں تو بے اعتباری دور ہو جاتی ہے (محمد علی بنام حسرت موہانی نقوش لاہور مکاتیب نمبر ص ۲۳۶)
بیگم حسرت کے نام بھی علیحدہ ایک خط میں مولانا محمد علی نے انھیں احساسات کا اظہار کیا:

" بھائی حسرت سے کہہ دیجئے کہ برادرم! باوجود عزم و استقلال کے تمہارا مرتبہ ایک نحیف الجثہ عورت سے کم ہی رہے گا جس کے سینے میں تم سے بھی بڑا ایک دل موجود ہے اور جس نے تمہاری غیر حاضری میں مسلمانوں کو ہمت و استقلال کا وہ سبق دیا جو تم خود آزاد ہو کر بھی نہ دے سکے اور شاید قید ہو کر بھی نہ دیا۔" (احمد لاری، حسرت موہانی حیات و کارنامے، لکھنؤ ص ۱۴۶)
حسرت نے اس بار بھی قید فرنگ میں جن صعوبتوں کا سامنا خندہ پیشانی سے کیا اس کی اطلاع بھی بیرونی دنیا کو بیگم حسرت ہی کے ذریعے ملی۔ مولانا عبدالباری کے نام اپنے خط مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۱۶ء میں لکھتی ہیں:

" ۷ محرم کو دفعتاً الہ آباد جیل میں جیلر نے حسرت کے ساتھ خلاف قاعدہ سختیاں کیں یعنی ان کا سامان ضروری لوٹا، جوتا وغیرہ زبردستی لے لیا۔ قواعد جیل بھی حسرت نے دیکھا ہے جس کی رو سے پھانسی جیل میں اور اب تک الہ آباد جیل میں ان چیزوں کے رکھنے کے مجاز تھے مگر جیلر نے صاف کہہ دیا کہ میں سختی کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ شاید خفیہ پولیس رپورٹ کر دے کہ مسلمان

ہونے کی حیثیت سے میں نے قیدی کے ساتھ کوئی رعایت کی تو میری نوکری جاتی رہے گی۔ حالانکہ اس نے کوئی رعایت بجز سختی کے نہ کی تھی۔ کھانا بھی وہی جوار باجرہ کی مٹی ملی ہوئی روٹی ملتی ہے جو درد گردہ کی وجہ سے حسرت کے لئے سخت مضر ہے۔ چنانچہ حسرت نے بھی یہ عہد کرلیا کہ، محرم سے جھگڑا شروع ہے اگر جیلر یزیدی پر آمادہ ہے تو میں بھی بحمد اللہ پیروئ حسین کے لئے اچھی طرح تیار ہوں۔"

(بیگم حسرت اور اُن کے خطوط متذکرہ۔ ص ۱۱۳)

لیکن ان ایام بلا" میں بھی بیگم حسرت کی غیور طبیعت نے حسرت کے سیاسی دوستوں کی مالی اعانت کا بار اٹھانا منظور نہیں کیا۔ تفصیل کشن پرشاد کول کی ہے "غالباً ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء کی بات ہے کہ حسرت جیل میں بند تھے۔ کانگریس کے کام سے مجھے علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اپنے احباب سے میں نے سنا کہ حسرت کے گھر والوں کی زندگی بڑی مصیبت اور عسرت سے گذر رہی ہے میں نے کوشش کی کہ میں بیگم حسرت موہانی سے ملوں وہ میرے نام اور حسرت سے میرے مراسم سے یقیناً واقف تھیں۔ میں ان سے ملنے گیا۔ کچے مکانوں کے ایک احاطے میں نیم کے درخت تلے ایک کچا پکا چھوٹا سا مکان تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنا نام بتایا۔ بیگم حسرت نے دروازہ کھولا اور مجھے ایک کمرے میں جس میں ایک پرانی دری بچھی ہوئی تھی لے جاکر بٹھایا۔ اس زمانے میں بیگم حسرت اپنی بیمار بوڑھی ماں اور بچی کو ساتھ لے کر اس مکان میں رہتی تھیں حسرت کے متعلق بات چیت ہوئی وہ جیل میں حسرت کا حال اور کیفیت مجھے بتاتی رہیں۔ حسرت تو جیل میں تھے لیکن ان کے گھر کے در و دیوار سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ آخر میں نے جھجکتے ہوئے دبی زبان میں کہا اگر آپ منظور کریں تو کچھ مالی امداد کا بندوبست کیا جائے۔ انھوں نے یہ جواب دیا کہ مجھے یہ منظور نہیں کہ میرے لیے پبلک سے چندہ کیا جائے۔ میں جس حالت میں ہوں خوش ہوں آپ اس کی زحمت گوارا نہ کریں۔ لمحہ بھر کے سکوت کے بعد پھر بولیں کہ حسرت نے شعرا کے کئی دیوان چھپوائے تھے۔ ان کا یہ ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اردوئے معلیٰ

بند ہو گیا۔ یہ کاروبار ہی ابتر ہو گیا۔ اب یہ ڈھیر یہاں بیکار پڑا جگہ گھیر رہا ہے۔ اگر آپ ان دواوین کے فروخت کرانے کا کوئی انتظام کر سکیں تو البتہ کچھ سہولت ہو جائیگی میں یہ کہہ کر کہ کوشش کروں گا۔ ان سے رخصت ہوا۔ لکھنؤ واپس آکر میں نے اپنے دوست بابو شیو پرشاد گپتا کو جو راجہ موتی چند مرحوم کے بھتیجے اور بنارس کے نامی رئیس تھے، سب حال کی اطلاع کی۔ بابو شیو پرشاد گپتا علاوہ رئیس ہونے کے بڑے مخیر تھے۔ کئی لاکھ روپے انھوں نے کاشی ودیا پیٹھ کے قائم ہونے میں صرف کیا تھا۔ کانگریس کے بڑے حامی تھے۔ اس کے لئے صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔ حسرت کے مزاج اور طبیعت سے ان کو بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے مجھے پانچ سو روپیہ کا چیک فوراً بھیج دیا جو میں نے بیگم حسرت کو روانہ کر دیا۔ انھوں نے کتابوں کا پارسل مجھے بھیج دیا۔ یہ دواوین اور کتابیں عرصے تک 'ہندوستانی' اخبار کے دفتر میں پڑی رہیں۔ یاد نہیں کہ پھر کیا ہوئیں۔" (کشن پرشاد کول نگار یادگار حسرت نمبر[59])

پنڈت کشن پرشاد کول کے اس بیان کی تصدیق بیگم حسرت کے مندرجہ ذیل خط سے بھی ہوتی ہے جو کم و بیش اسی طرح کی مالی اعانت کے سلسلے میں انھوں نے ایڈیٹر "ہمدم" کو لکھا تھا۔ اسی قیدِ فرنگ کے دوران ان کے یہاں حوصلہ شکن چوری ہوئی اس کا ذکر کرتے ہوئے بی اماں نے مسٹر تاج الدین کے نام اپنے خط میں لکھا تھا: "حسرت کے واقعات سے تم مجھ سے بھی زیادہ واقف ہو۔ سرکاری پولیس اس ناکردہ گناہ کو گرفتار کرنے میں تو بے حد مستعد کار تھی مگر کسی سے اس کی دوکان کی حفاظت نہ ہو سکی جو اس غیرت مند مسلمان اور اس کی بیوی و بچی کے گذر اوقات کا ذریعہ تھی۔ کئی ہزار کا مال چوری ہو گیا مگر چور کا سراغ نہ ملا۔"

(اخبار جمہور۔ کلکتہ: ایڈیٹر قاضی عبدالغفار۔ ۱۰ جولائی ۱۹۱۸ء)

بعض ہمدرد نامہ نگاروں نے توجہ دلائی کہ بیگم حسرت موہانی کی چندہ سے امداد کی جائے عارف ہسوی صاحب کو ان کی طبیعت کے پیشِ نظر شک تھا کہ وہ یہ امداد قبول نہ کریں گی جواب میں بیگم حسرت نے جو خط ایڈیٹر "ہمدم" کو تحریر کیا اس کی نقل

مندرجہ ذیل ہے۔

" ۵ ردسمبر ۱۹۱۷ء، علی گڑھ

برادر محترم تسلیم۔ "ہمدم" میں چوری کے متعلق نوٹ عارف صاحب اور آپ کا نظر سے گزرا آپ کے اظہار ہمدردی کا دلی شکریہ۔ ہمدردی کے جواب میں عرض یہ ہے کہ آپ اس کو شائع فرما دیجئے مشکور ہوں گی۔ اپنے نقصان کا بار دوسروں پر ڈالنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم اگر لوگ ہمارے دفتر کی موجودہ کتابوں کی خریداری کے ذریعہ سے مدد کرنا چاہیں تو ضرور کریں۔ اس کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ پنڈت کشن پرشاد کول بی۔ اے ایڈیٹر ہندوستانی، کا شکریہ خاص طور پر ادا کرنا لازم ہے کہ ان کے ذریعے سے اس قسم کی اعانت پہلے بھی ملتی تھی۔ اور اب پھر ۵۰ روپے نقد خریداری کتب کے لئے وصول ہوئے ہیں کہ اس رقم کی جو جو کتابیں بہ آسانی بھیجی جاسکتی ہیں بھیج دیجئے چنانچہ شرح دیوانِ غالب اور دیوانِ حسرت وغیرہ کتابیں ان کو جلد یہاں سے روانہ کر دی جائیں گی۔ یہی طرزِ عمل اور لوگ بھی اختیار کرسکتے ہیں۔ خاکسار بیگم حسرت موہانی" (بحوالہ مدینہ اخبار بجنور ۱۲ردسمبر ۱۹۱۷ء) یقیناً ایسی ہی قابل احترام ہستیوں کے لئے علامہ اقبال نے کہا تھا۔

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

بیگم حسرت کا یہی کردار تھا جس سے متاثر ہوکر سید سلیمان ندوی نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا:

" شوہر کے قید و بند کے بعد جب ان کا کوئی مونس و مددگار نہیں ہوتا تھا ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری و استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت ان کے مقابلہ کی نکل سکے۔" (نگار لکھنؤ حسرت نمبر تذکرہ ص ۱۱۸)

حسرت ابھی قیدِ فرنگ میں ہی تھے کہ بیگم حسرت نے وزیر ہند سے ملاقات

کرنے والے ہندوستانی خواتین کے ایک نمائندہ وفد میں شرکت کی۔ اس شرکت کی اہمیت دو وجوہ سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ ایک یہ کہ نشاط النساء بیگم نے دوران ملاقات جس جرأت کا مظاہرہ کیا وہ تنہا ان کے کردار کی عکاسی کے لئے کافی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ کل ہند وفد میں ان کی موجودگی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ اس وقت تک وہ قومی سیاسی زندگی میں بہت اہم مقام حاصل کر چکی تھیں۔

۱۹۱۷ء وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ قومی آزادی کے سلسلے میں عوام کی توقعات میں اضافہ ہوا تھا جنھیں وہ اپنی جنگی خدمات کا جائزہ صلہ سمجھتے تھے۔ ادھر جنگِ عظیم اپنے فیصلہ کن موڑ میں داخل ہو چکی تھی۔ ہندوستانی امداد کی مزید توقع اور دستوری اصلاحات کے سلسلے میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے وزیرِ ہند لارڈ مانٹیگو نے ۱۹۱۷ء کے موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کے علاوہ ہندوستانی خواتین کے ایک وفد کو بھی ان سے ملاقات کرنے کے لئے مدعو کیا گیا، اس وفد میں بی اماں (والدہ محمد علی) اور بیگم حسرت کے نام بھی شامل تھے گو بی اماں نے ذاتی وجوہ کی بنا پر وفد میں شرکت سے انکار کر دیا تھا لیکن نشاط النساء بیگم اس میں شریک ہوئیں۔ اس کا ایک گروپ فوٹو آل انڈیا ویمنس کانفرنس نئی دہلی کے دفتر میں موجود ہے جس میں مسز این دلوی، بیگم حسرت موہانی، ڈاکٹر مس این جوشی، مسز جبارا داس، مسز چندر سیکرآئر۔ مسز ایس کرو سوامی چیٹی، مسز لنذ داس، مسز سروجنی نائیڈو اور مسز بیسنٹ وغیرہ شامل ہیں (حسرت موہانی ایم حبیب خاں دہلی ۱۹۸۲ء ص ۲۳)

اس ملاقات کا پس منظر اور اس کی اخباری رپورٹ درج ذیل ہے:

"مسٹر محمد علی کو صاحب وزیرِ ہند سے ملنے کی اجازت نہ ملی۔ پھر اسی لئے صاحب وزیرِ ہند کی تشریف آوری سے قبل یہ اعلان کیا گیا کہ وہ ریفارم اسکیم کے سوا کوئی ایڈریس نہ لیں گے۔ پھر اسلامی جلسہ شوریٰ لکھنؤ منعقدہ ۴ ارنومبر سے دو دن قبل لیگ کو یہی فیصلۂ آسمانی یاد دلایا گیا۔ اسی مستحکم دلیل اور قومی محبت سے

صوبہ متحدہ کی لیگ کے وفد کو مجبور کیا گیا کہ وہ بھی نظربندی کے مضمون پر سرخ نشان پھیر کر آئے ورنہ باریاب نہیں ہو سکتا۔ پھر تمام مسلمانانِ ہند کے قائم مقام وفد سے کہا گیا کہ وہ بھی نظر بندوں کے مضمون کو اپنے ایڈریس سے خارج کر دے۔ باوجودیکہ وفد کے صدر عالی جناب نواب اسحاق خاں صاحب نے بار بار عرض کیا کہ ہم ارکانِ وفد اس بارے میں مجبور رہیں لیکن دفتری اقتدار کی جانب سے جواب ملا کہ مزاجِ شاہانہ تابِ خلاف ندارد۔ آخر کار اسلامی وفد، کروڑ مسلمانان ہند کی امیدوں کا خون کر کے بے نیل و مرام واپس آگیا۔ غرض صاحب وزیر ہند پر پہرے بٹھائے گئے اور سخت سے سخت امور کا ارتکاب کیا گیا تاکہ صاحب وزیر ہند کے سمع مبارک تک نظربندوں کی فریاد نہ پہنچے مگر بیگم صاحبہ حسرت موہانی کی اس دلیری پر دفتری اقتدار انگشت بدنداں ہو گا اور یا پھر غصّہ سے ہاتھ کاٹ رہا ہو گا کہ بیگم حسرت نے صاحب وزیر ہند کے روبرو نظر بندوں کی آزادی کا پیغام پہنچا دیا۔ چنانچہ جب وہ خاتون ہند کے وفد میں ان کے سامنے پیش ہوئیں اور ان کا تعارف کرایا گیا تو فوراً ہی بلا تکلف انگریزی زبان میں کہا "جب کہ باغیانِ آئرلینڈ کو رہا کر دیا گیا ہے تو نظربندانِ ہند کو بھی آزاد فرما دیجئے"۔ اور پھر یہ کہہ کر کہ نیو ایرا (NEW ERA) کا وہ پرچہ پیش کر دیا جس میں مسٹر مانٹیگو اور مسلمان کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہو چکا ہے اور جو حال ہی میں حکومت صوبہ متحدہ نے ضبط کر لیا ہے۔

راستہ روک کے کہدوں گا جو کہنا ہو گا
کیا ملو گے نہ کبھی راہ میں آتے جاتے

ہم اپنی بہن کی خدمت میں تمام ملک کی طرف سے اس جرأت و شہامت پر صرف یہ مصرعہ پیش کرتے ہیں۔ "آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو"

(بحوالہ اخبار مدینہ بجنور ۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء)

مندرجہ بالا اخباری رپورٹ سے ایک نیا انکشاف بیگم حسرت سے متعلق یہ بھی ہوتا ہے کہ انھیں اردو فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔ یہ

استعداد انھوں نے کب اور کیوں کر بہم پہنچائی، اس پر ان کے قریبی اعزا ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔

کل ہند زنانہ وفد کی اس نمائندگی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم حسرتؔ کے کردار اور قومی محاذ پر ان کی سرگرمیوں کے سبب جدوجہد آزادی کی عظیم مجاہدہ بی اماں (والدہ محمد علی) کی نظر میں ان کے لئے کتنی وقعت و عزت تھی اسی سلسلے میں مسز اوما نہرو کے نام اپنے خط مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۷ء میں انھوں نے تحریر کیا تھا:

"اخباروں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے اور اس بہادر اور پیاری بیٹی نشاط بیگم (بیگم حسرتؔ موہانی) کے ساتھ مجھے بھی ممالک متحدہ کی خواتین کی قیادت اس وفد میں کرنا ہے جو تمام خواتین ہند کی جانب سے جناب وزیر ہند کی خدمت میں ۱۸ ماہ حال کو ملاقات میں حاضر ہونے والا ہے۔" شوکت علی و محمد علی صاحبان کی نظر بندی کے چند اہم خطوط (انجمن اعانت نظر بندان اسلام (نمبر ۲) دہلی ۱۹۱۸ء ص ۶۹)

حسرتؔ کی قید کی یہ مدت تو ۲۲ مئی ۱۹۱۸ء کو ختم ہو گئی، تاہم نظر بندی کے احکام اپنی جگہ بدستور رہے۔ نشاط النساء بیگم کی قوت ارادی کا اب پھر وہی امتحان اور عزم و استقلال کی پھر وہی آزمائش تھی۔ بوقت رہائی وہ نواب اسحاق خاں صاحب اور قاضی بشیر الدین وکیل کے ہمراہ جیل کے دروازے پر استقبال کے لئے موجود تھیں۔ رہائی کے بعد کی تفصیل ایڈیٹر جمہور کی زبانی سنیے۔

"قاضی بشیر الدین صاحب کا تار اور بیگم صاحبہ حسرت موہانی کا ایک مفصل خط ملا جس سے حسب ذیل امور معلوم ہوئے:

(۱) مولانا حسرتؔ نے گورنمنٹ کے احکام کو لینے سے انکار کر دیا

(۲) وہ آئندہ پھر پہلے کی طرح احکام نظر بندی کی خلاف ورزی کرنے پر آمادہ ہیں۔

(۳) گورنمنٹ ۶۰ روپیہ ماہوار وظیفہ دینا چاہتی تھی مگر مولانا نے اس کے

قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"

(اس کی تصدیق مسٹر تاج الدین کے نام بی اماں نے بھی اپنے متذکرہ خط میں کی ہے۔ "حسرت کی مثال اور بھی حیرت انگیز ہے حکومت نے جو دینا چاہا اسے لینے سے انکار کر دیا اس کو یاد آ گیا کہ اسی کے نانا نے تو فاطمہ کے لاڈلے کے منہ میں سے بیت المال کی کھجور کخ کخ کہہ کر نکلوائی تھی کہ صدقہ اس کی اولاد پر حرام ہے جس کا نانا ایسا ہو اس کا نواسہ بھی حسرت کی طرح غنی کیوں نہ ہو۔ سچ ہے اسی کو یہ کہہ کر حکومت کا ملتا ہوا روپیہ ٹھکرا دینا سزاوار ہے ۔

بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرت
بڑی اُمید ہے میری بڑا دل

(جمہور کلکتہ۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۱۷ء)

(۴) نواب اسحاق خاں صاحب و دیگر حضرات میموریل تیار کر رہے ہیں جو پندرہ دن کے اندر نینی تال میں پیش ہو گا۔ اگر منظور نہ ہوا تو بقول بیگم صاحبہ "وہی حالتِ سابقہ بدستور اور خود بخود قائم ہو جائے گی یعنی علانیہ قیام کٹھور کیا جائے گا اور تمام واقعات گذشتہ از سرِ نو واقع ہوں گے۔"

گو ممدوحہ کا یہ خط پرائیویٹ ہے اور ہمیں حق حاصل نہ تھا کہ ہم اس کے کسی حصّے کو شائع کرتے مگر حسرت کے ہم قوموں کے لئے اس کے اندر جو پیامِ عبرت موجود ہے اسے ان تک پہنچانے کے لئے ہم نے یہ بے ضابطگی بھی گوارہ کی۔ موصوف فرماتی ہیں "افسوس اپنا ساتھ دینے والا اس وقت کوئی نظر نہیں آتا۔ براہِ کرم آپ ہی کوشش کر دیجئے...... میں عورت ہو کر کیا کر سکتی ہوں۔ خدا مسلمانوں میں اخوتِ اسلامی اور ہمدردی پیدا کرے تو شاید بھلائی کی کوئی صورت نظر آئے ورنہ اس مرتبہ بھی خدا نخواستہ وہی ہوا تو صبر کر کے بیٹھ رہوں گی۔"

(جمہور، کلکتہ مورخہ ۲۹ر مئی ۱۹۱۷ء)

بیگم حسرت کے اس خط سے گو ایک طرح کی بے بسی اور کس مپرسی کا اظہار

ہوتا ہے جو ان کی قوتِ ارادی کی فولاد جیسی صلابت اور عزم محکم کی چٹان جیسی مضبوطی سے میل نہیں کھاتا۔ لیکن یہ کیفیت یقیناً عارضی تھی جس کا واحد سبب اپنوں کی بے حسی اور بے رُخی تھی۔ اِسی بے حسی پر طنز کرتے ہوئے مرحوم قاضی عبدالغفار نے لکھا تھا:

" بقول ہمارے نامہ نگار کے مسٹر حسن امام اور آنر یبل مسٹر سمیع اللہ بیگ کی رائے یہ ہے کہ حسرت قانون تحفظ ہند کی خلاف ورزی نہ کریں۔ مسٹر حسن امام کا تو ذکر ہی فضول ہے لیکن مرزا سمیع اللہ بیگ کو ہم ایک سمجھدار محب قوم سمجھتے ہیں اس لئے ہم صاحب ممدوح سے صرف اس قدر دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کے خیال میں مسٹر گاندھی کا طرزِ عمل بھی قابلِ اعتراض ہے؟ کیا حق کے لئے جھگڑنے کا یہ طریقہ کسی حیثیت سے نامناسب ہے؟ ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ گاندھی ایک ایسی قوم کے فرزند ہیں جو زندہ ہے اور حسرت ایک ایسی قوم کے اندر پیدا ہوئے ہیں جو عزت اور عظمت کے ساتھ ہی اپنی عصبیت اور غیرت بھی کھو بیٹھی"۔ (ایضاً)

چند ماہ میرٹھ اور موہان میں نظر بند رہنے کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء میں بالآخر حسرت کو پھر سے آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ لیکن پابندیاں ختم ہوتے ہی وہ پھر سے اپنے معمولات میں سرگرم نظر آنے لگے۔ تحریکِ خلافت کا آغاز ایک بار پھر انھیں گاندھی جی کے قریب لے آیا۔

۱۹۱۹ء کے امرتسر اجلاس میں حسرت کے ساتھ حسب معمول بیگم حسرت نے بھی شرکت کی جس کا تذکرہ عبدالمجید سالک نے اپنے مقالے حسرت موہانی میں کیا ہے۔

" مولانا سے بالمشافہ نیاز دسمبر ۱۹۱۹ء میں ہوا جب وہ امرتسر کے سیاسی اجتماعات کے سلسلے میں اسلامیہ ہائی اسکول امرتسر کی دوسری منزل پر دوسرے سیاسی کارکنوں کی معیت میں مقیم تھے اور محترمہ نشاط بیگم حسرت بھی ان کے ہمراہ تھیں۔"

(آجکل اگست ستمبر ۱۹۵۱ء ص ۲۸)

۱۹۲۰ء میں حسرت علی گڑھ چھوڑ کر کانپور منتقل ہوئے تو بیگم حسرت بھی کانپور

آگئیں۔ علی گڑھ کے دورانِ قیام ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا جس سے انتہائی نامساعد حالات میں بھی بیگم حسرت کی طبعی خوش مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پولیس تلاشی کی غرض سے علی گڑھ میں ان کی قیام گاہ پر آئی بیگم حسرت نے چپہ چپہ دکھایا مگر ایک مقفل صندوق کے بارے میں کہا کہ اسے ہاتھ نہ لگائیے گا اگر اندر کا بم پھٹ گیا اور آپ لوگ ہلاک یا زخمی ہو گئے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی پولیس انسپکٹر نے سپاہی سے کہا کہ صندوق کھول کر دیکھو اس بم کیا ہے۔
"سپاہی خوف زدہ تھا اور اس لئے اس نے اپنے افسر سے کہا کہ ذرا اور انتظار کر لیجئے اس صندوق کو مولانا سے ہی کھلوائیں گے جب ان کو واقعہ سنایا گیا کہ وہ اس صندوق کو کھولیں جب اُسے کھولا گیا تو وہ اندر سے بالکل خالی نکلا۔ مولانا کو جب سارا واقعہ بتایا گیا تو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا" بیگم نے مذاق کیا ہوگا"
(ضیاءالدین احمد برنی" عظمتِ رفتہ کراچی ص ۱۹۴)

دسمبر ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات کا آغاز ہوا۔ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ پر ہندوستانی غم و غصّہ سے بیتاب تھے۔ ناگپور کے دسمبر اجلاس میں کانگریس نے ترکِ موالات کی تحریک منظور کی۔ اس میں حسرت کی شرکت ناگزیر تھی۔ بقول گاندھی جی یہ راہ حسرت کی دکھائی ہوئی تھی۔

(My experiments with truth - M.K. Gandhi P 478-82)

حسرت پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے سودیشی تحریک کی قیادت کی علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں انھوں نے علی گڑھ خلافت اسٹور بھی قائم کیا تھا۔ بیگم حسرت نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور مسلم خواتین میں اسے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے سودیشی کپڑے کی تجارت کی۔ ایک پر شبلی نے کہا تھا "تم آدمی ہو یا جن پہلے شاعر تھے پھر پالیٹیشن بنے اور اب بنیئے ہوئے"۔ اس کا اعتراف گاندھی جی نے 'روز بروز سودیشی' کے عنوان سے اپنے مضمون " ینگ انڈیا" مورخہ ۱۹ ارمئی ۱۹۲۰ء میں کیا ہے۔ جس سے یہ بھی اندازہ

ہوتا ہے کہ تحریک کو مقبول بنانے کے لئے وہ برابر ملک میں مختلف دورے بھی کرتی رہی تھیں۔ "سودیشی کی مقبولیت کا سب سے زیادہ خوشگوار اور حیرت انگیز تجربہ شریمتی سرلا دیوی چودھری اور محاذ آزادی کے مخلص انتھک مجاہد مولانا حسرت موہانی کی بیگم کا ہوا۔ اپنے بریلی کے تجربات کے سلسلے میں سرلا دیوی نے لکھا ہے کہ بیگم حسرت کی بلائی گئی میٹنگ میں پندرہ مسلم خواتین نے سودیشی کا عہد لیا

(Collected Works of Mahatma Gandhi Vol. XVII, P 429)

۱۹۲۱ء کا سال کانگریس کی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ احمد آباد کے تاریخی شہر میں اسی سال خلافت کانگریس و مسلم لیگ کے اجتماعات ہوئے۔ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی اور پھر کھلے اجلاس میں حسرت نے گاندھی جی کی مخالفت کے باوجود مکمل سوراج کی تجویز پیش کی، جس میں کہا گیا تھا کہ نیشنل کانگریس کا مقصد جائز اور پر امن ذریعے سے ہندوستان کے لوگوں کے لئے سوراج یا مکمل آزادی حاصل کرنا ہے جو تمام بیرونی تسلط سے آزاد ہو (

(Report of thirty six Indian National Congress 1921 p 50)

اس وقت کسی فرد واحد نے بھی اس کی تائید نہیں کی مکمل آزادی کی یہ تجویز انھوں نے اسی سال خلافت کانفرنس کے اجلاس میں بھی پیش کی تھی۔ لیکن وہاں بھی کسی نے اس کی حمایت نہیں کی تاہم یہی تجویز آٹھ سال بعد کانگریس کے مقاصد میں شامل ہوئی۔ لیکن تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کا پہلا اعلان حسرت کی زبانی ہوا۔ بیگم حسرت یہاں بھی حسرت کی ہم نوا و ہم سفر تھیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی راوی ہیں "یہ بات یوں یاد رہی کہ واپسی میں ہجوم اتنا تھا کہ ریل کا سفر دشوار معلوم ہوتا تھا۔ حسرت صاحب نے ہمت دلائی کہ تم میرے ساتھ چلو۔ چنانچہ اسٹیشن پہنچا تو دیکھا کہ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں حسرت مع بیگم کے بیٹھے ہیں اور اس میں اتنا ہجوم ہے کہ سر کے سوا کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ کسی طرح سوار ہوا تو دیکھا کہ ایک مرگ چھالے پر حسرت صاحب متمکن ہیں۔ مٹی کا لوٹا اور مٹی کے برتن ساتھ ہیں اسی میں کھانا پینا ہے۔ ہجوم کی کوئی پرواہ نہیں۔ دوسری طرف دیکھا

کہ پنڈت موتی لال نہرو کا سامان فرسٹ کلاس کے ڈبے میں لگ رہا ہے اور وہ اس میں آرام سے سوار ہو رہے ہیں۔ اسی وقت میری زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ یہ سیاسی جھگڑوں کا سفر دو ہی آدمیوں کے لئے موزوں ہے۔ حسرتؔ جیسے بے نوا یا موتی لال جیسے باسرو سامان کے لئے۔"

(سید سلیمان ندوی مقالہ واحسرتا! یادگار حسرتؔ نمبر اردو اکاڈمی لکھنؤ نومبر ۱۹۸۱ء ص ۱۸۱،۱۷)

بیگم حسرتؔ کی اس بے سروسامانی کی کیفیت میں بھی دور دراز کے سفر کی صعوبتوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا انکی حب الوطنی کی روشن مثال ہے۔

کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کے اجلاس کے علاوہ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں ہی کل ہند زنانہ کانفرنس کا اجلاس بھی بی اماں (والدہ محمد علی) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں شریمتی کستوربا گاندھی، شریمتی چودھرائن سرلادیوی اور دیگر ہزاروں مسلم و غیر مسلم خواتین کے ساتھ نشاط النساء بیگم بھی شریک تھیں

(مولانا آزاد۔ ایک سیاسی ڈائری۔ اثر بن یحییٰ انصاری ص ۱۸۱)

حسرتؔ کی تیسری گرفتاری اور بیگم حسرتؔ:

خلافت اور کانگریس کے اجلاس میں تقاریر کی بناء پر حکومت بمبئی نے حسرت پر تاج برطانیہ کے خلاف اقدام جنگ اور بغاوت کے الزام میں دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت مقدمہ چلایا گرفتاری اپریل ۱۹۲۲ء میں ہوئی اور دو سال قید سخت کی سزا ہوئی۔ اس بار وہ یرودا (پونا) جیل میں رکھے گئے۔ اسی زمانے میں گاندھی جی بھی اسی جیل میں مقیم تھے۔ انھیں پہلا درجہ دیا گیا لیکن حسرت جیسے "خطرناک" قیدی کے حصے میں ہمیشہ کی طرح جیل کا تیسرا درجہ ہی آیا اور یزیدی انداز بھی حسب سابق تھا جس کی تصدیق بیگم حسرتؔ کے مولانا باری کے نام پونا سے لکھے گئے ۲۸ جنوری ۱۹۲۳ء کے خط سے ہوتی ہے "اب تک مولانا کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ جیل کا برتاؤ نہایت سخت ہے بلکہ روزانہ کوئی نہ کوئی شرارت کرتا رہتا ہے حال میں

مزید لغویت یہ کی ہے کہ برش، آئینہ، سرمہ، قرآن شریف رکھنے کا تختہ حتی کہ پانی کا گھڑا تک اٹھوالیا ہے۔ پانی کی قلت ہے۔ روٹی ایک گیہوں کی صبح کو ملتی ہے وہ بھی بند جوار، باجرہ مٹی ملی ہوئی ترکاری خراب ملتی ہے۔ یہ سب سزائیں روزانہ اس لئے دی جاتی ہیں کہ کام کیوں نہیں کرتے مگر مولانا بھی اپنی دھن کے پکے ہیں۔ برابر سے مقابلہ کرتے ہیں"۔ (بیگم حسرت موہانی اور انکے خطوط۔ متذکرہ ص ۹۷)

حسرت و بیگم حسرت کے تذکرے میں اس پس منظر کو دھیان میں رکھنا یوں ضروری ہے کہ قید و بند کی بڑی سے بڑی سختی بھی ان کو جادۂ مستقیم سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ سچا جہاد ظالم حاکم کے روبرو کلمۂ حق کا اعلان ہے۔ یہ ان کا ایمان تھا اور وہ زندگی بھر اس جہاد میں مصروف رہے۔ بحیثیت عورت طبعی نرم دلی کے باوجود بیگم حسرت ہر ہر قدم پر حسرت کی ہمنوا و دمساز رہیں۔ چنانچہ اس بار بھی وہ مع بیٹی و داماد کے پونا میں ہی مقیم رہیں اور اپنی کفیل آپ رہیں۔ اس بارے میں انھوں نے کسی کا احسان لینا قبول نہیں کیا۔

(ضیاء الدین برنی۔ بیگم حسرت عظمت رفتہ کراچی ص ۱۹۵) دوران قید حسرت کو باہر سے کتابیں منگانے اور لکھنے و پڑھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ بیگم حسرت انھیں کتابوں کے حاشیوں پر خط کا مضمون لکھ دیا کرتی تھیں۔ ضیاء الدین کے جو اس زمانے میں حکومت بمبئی کے ہوم ڈپارٹمنٹ میں تھے، استفسار پر انھوں نے بتایا تھا کہ "نہ تو میرا کوئی خط ہی مولانا تک پہنچتا ہے اور نہ مجھے ملاقات کی ہی اجازت ملتی ہے۔ اس لئے خطوں کی باتیں کتابوں کے حاشیے پر لکھ کر بھیجتی ہوں۔ (ایضاً)

دسمبر ۱۹۲۲ء میں کانگریس کے گیا اجلاس کے موقع پر گاندھی جی جیل میں تھے ان کی عدم موجودگی میں تحریک موالات کی مخالفت اور کانسلوں میں شرکت کے سوال پر زوردار بحثیں ہوئیں حسرت بھی ان دنوں قید تھے۔ نشاط النساء بیگم نے نہ صرف اجلاس میں شرکت کی بلکہ ترک موالات کی وکالت کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ "مکمل آزادی کے جو لوگ علمبردار ہیں وہ اس پروگرام کو ترک

کرنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ البتہ جزوی آزادی پر جو لوگ قناعت کرنا پسند کرتے ہیں وہ کانسلوں میں جا کر آئینی اصلاحات کی قسط وصول کر سکتے ہیں انھوں نے کہا کہ احمد آباد میں (کانگریس کے موقع پر حسرت کی پیش کردہ) مکمل آزادی کی قرارداد کی مخالفت کرنے کی جو غلطی گاندھی جی نے کی تھی، آج داخلۂ کونسل کے حامیوں کا زور اسی کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔

(انڈین اینول رجسٹر ۲۳-۱۹۲۲ء جلد اول ص ۹۱-۸۷۲)

سزا کی مدت میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا کہ حسرت رہا کر دیئے گئے اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد کانگریس سے بددلی کے سبب ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو وہ اس سے مستعفی ہو گئے۔

مولانا حسرت کے مصائب سے بھرپور اس تمام عرصے میں جس طرح بیگم حسرت نے حق رفاقت ادا کیا اس کے پیش نظر خواجہ حسن نظامی نے ان کا شمار مشاہیر ہند میں کرتے ہوئے درویش جنتری میں لکھا تھا "حسرت کی بیوی مسلمانان ہند کی عورتوں میں بڑی وفادار اور شوہر پرست عورت ہے۔ ایام بلا میں ایسی وفاشعاری اس عورت سے ظاہر ہوتی ہے جیسی سیتا جی نے رام چندر سے کی تھی۔"
(درویش جنتری ۱۹۲۳ء بحوالہ کتابی دنیا۔ کراچی جنوری و فروری ۱۹۶۷ء ص ۱۴) تاہم "ایام بلا" کے دوران اس وفاشعاری سے جو نتیجہ عتیق صدیقی نے اخذ کیا ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط میں انھوں نے تحریر کیا ہے "حسرت کے ایام بلا" ان کے قید و بند کی زندگی کا دور ختم ہوا تو نشاط النساء بھی اپنی گھریلو زندگی کے خول میں واپس چلی گئیں اور اپنی بقیہ زندگی کے دس سال اسی خول میں بسر کیے۔" (ص ۷۴)

یہ تاثر کہ نشاط النساء بیگم تمام تر سیاسی سرگرمیوں کے پس پشت محض ایک جذبۂ رفاقت تھا۔ جدوجہد آزادی میں ان کی عظیم الشان خدمات کا مناسب اعتراف نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے سیاسی شعور کا آغاز اور ارتقاء حسرت کی صحبت

میں ہوا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ارتقا کے مراحل جس تیزی سے انھوں نے طے کیے اس میں بڑا دخل ان کی اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھی تھا۔ عملی زندگی میں جوں جوں سامراجی آمریت و استبداد سے ٹکراؤ بڑھتا گیا اس کے استحصال کے حکمت عملی کے گھناؤنے نقوش بھی واضح ہوتے چلے گئے۔ اور سیاسی شعور میں پختگی کے ساتھ ساتھ آزادیٔ کامل کا یقین بھی ایمان کی شکل اختیار کر گیا جس کی خاطر وہ بڑی سے بڑی قربانی کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔

نشاط النساء بیگم کی سیاسی سرگرمیاں محض حسرت کے مقدمات کی پیروی تک ہی محدود نہ تھیں حسرتؔ کے ساتھ ہر اہم سیاسی اجلاس میں ان کی شرکت اور اس کے لیے بے سروسامانی کی حالت میں بھی دور دراز کے سفر کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا۔ سودیشی تحریک کو مقبول بنانے کی انتھک جدوجہد، کل ہند زنانہ کانفرنس میں شرکت ہم خیال سیاسی رہناؤں سے خط وکتابت، قومی اخبارات سے مسلسل ربط اور کل ہند زنانہ وفد میں مسز بیسنٹ و سروجنی نائیڈو وغیرہ کے ساتھ ان کی شمولیت جو قومی سطح پر ان کی منفرد حیثیت کی واضح نشاندہی ہے۔ اس بات کا ثبوت ہیں کہ جدوجہد آزادی میں بھی ان کی حیثیت منفرد تھی۔ کشن پرشاد کول کا یہ بیان زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ وطن پرستی ان میں بھی ایسی ہی تھی کہ جیسے حسرت میں۔ ان کے خلقی رجحانات کے علاوہ غالباً حسرتؔ کی صحبت نے ان میں چار چاند لگا دیئے تھے لیکن میرے خیال میں وہ دماغ والی عورت تھیں اور ان کا دماغ حسرتؔ کے مقابلے میں زیادہ سلجھا ہوا تھا اور میرا اندازہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہیں حسرت پر کچھ نہ کچھ اثر ان کے اس وصف کا ضرور پڑتا رہا،، (نگار، حسرتؔ نمبر تذکرہ ص ۶۰) اس بیان کا مقصد موازنہ یا حسرت کی عظمت کو کم کرنا ہرگز نہیں۔ یقیناً حسرت کی عظمت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب وہ خود انتہائی فراخدلی سے ۲۸ را پریل ۱۹۳۷ء میں بیگم حسرت کی دائمی جدائی کے بعد اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں "راقم کو بیگم حسرت کی جدائی اس خیال سے شاق ہے کہ اب کوئی اس کی کوتاہیوں پر ملامت کرنے والا نہ رہا۔ ظاہری تعلیم کو چھوڑ کر

باقی کل باتوں میں بیگم اس سے بدرجہا بہتر تھیں اس لئے انھیں ہر قسم کی تنبیہ کا حق حاصل تھا جس کا اثر بھی خاطر خواہ ہوتا تھا۔" (حسرت اردوئے معلی فروری تا اپریل ۱۹۱۳ء ص ۲)

بیگم حسرت کی جرأت و ہمت کی صفات، ان کی کارکردگی کی اہلیت و صلاحیت اور ملک کی آزادی کی خاطر جد و جہد کا تجزیہ اگر ہم اس زمانے کے مسلم معاشرے کے پس منظر میں کریں تو ان کے کارناموں کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

رہی عمر کے آخری حصے میں "گھریلو خول میں واپس چلے جانے کی بات تو میرے خیال میں عمر عزیز کے آخری دور میں صحت کے انحطاط کے ساتھ ساتھ خود مولانا حسرت کے سیاسی مسلک کی تبدیلی بھی اس کی ایک بڑی وجہ ہو سکتی ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس سے مستعفی ہونے کے بعد جو باوجود اندرونی اختلافات کے ملک کی سب سے زیادہ فعال جماعت تھی، خود حسرت کی زندگی بہت کچھ بدل گئی تھی۔ گو بعد میں وہ آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کی مجلس استقبالیہ کے صدر بھی رہے اور مزدور تحریکات میں بھی برابر حصہ لیتے رہے لیکن ان تمام کاموں میں اب وہ سرگرمی نہ رہی تھی جو اس سے پہلے کے دور میں ملتی ہے حسرت اور بیگم حسرت دونوں ایک ہی منزل کے راہی تھے اس لئے سیاسی سرگرمیوں کے نشیب و فراز میں بھی یکسانیت لازمی بات تھی۔ تاہم زندگی کے اس دور میں بھی شواہد موجود ہیں کہ ۱۹۲۵ء میں کانپور میں کانگریس اجلاس کے موقع پر مزدوروں کے ایک جلوس کی قیادت وہ دونوں مشترکہ طور پر کر رہے تھے۔ بہر حال نشاط النساء بیگم کی عوامی زندگی کا یہ آخری واقعہ ہے جس کا تحریری ثبوت ملتا ہے۔

اس تمام تر تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ قومی جنگ آزادی میں بیگم حسرت کی قربانیوں کے پس پشت جذبۂ رفاقت و جذبہ حب الوطنی دونوں ہی مساوی طور پر کارفرما تھے اور قربانی جہاں ہو جس شکل میں ہو اس کا اعتراف خود اپنی بقا کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس اعتراف کے بغیر نہ ہم میں جوشِ عمل پیدا ہو سکتا ہے نہ حسن کردار آسکتا ہے۔ نئی نسل کا یہ شعور ہی کہ قومی آزادی ہم سب کی مشترکہ میراث ہے، یہ احساس پیدا کر سکتا ہے کہ اس قیمتی ورثے کی حفاظت بھی ہم سب کا مقدس فریضہ ہے۔

امجدی بیگم (بیگم مولانا محمد علی)

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۹ء) کے دوران جب دنیائے اسلام کے مفکرین ایک نازک دوراہے پر کھڑے شش وپنچ میں مبتلا تھے کہ آیا وہ بھی وطنیت کی آگ میں کود پڑیں یا وطنیت کے دیو کو ختم کرکے بذریعہ مذہب امن وامان کا علم بلند کرنے کی کوشش کریں تو مولانا محمد علی جوہر نے ایک نسخہ پیش کیا! "جب وطن کا معاملہ ہے تو میں اول ہندوستانی بعد میں مسلمان ہوں۔ اور اسلام کا معاملہ ہے تو میں پہلے مسلمان اور بعد میں ہندوستانی ہوں"۔ بالفاظ دیگر انھوں نے یہ ثابت کرنے میں زندگی صرف کردی کہ پان اسلام ازم اور حب الوطنی میں کہیں پر کوئی تصادم نہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کے اس علمبردار نے کہا تھا: "آپ جو کہتے ہیں کہ جب تک انگریز رہیں گے پھوٹ رہے گی یہ میں نے مانا کہ درست ہے، لیکن یہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ جب تک ہم میں پھوٹ رہے گی اس وقت تک انگریز ہم پر مسلط رہیں گے"۔ (ہمدرد، ۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۵ء) اپنے اس مشن کی تکمیل میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انھوں نے قیدیوں کے کپڑے و ٹوپی پہن کر ملک و ملت کی خاطر جیل میں پتھر بھی توڑے اور زمین بھی کھودی اور جرأت و بے باکی، حب الوطنی اور مذہبی حمیت کی جو مثالیں قائم کیں وہ

جنگِ آزادی کی تاریخ کی سنہری سرخیاں ہیں۔

امجدی بیگم اسی مجاہد ملک و ملّت کی رفیقہ حیات تھیں۔ ان کا تعلق رامپور کے ایک باحیثیت اور باوقار خاندان سے تھا۔ گھر میں دینی و مذہبی کتابوں کا ذخیرہ ہونے کے سبب مذہب کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ مولانا محمد علی جوہر سے شادی کے بعد سراسر انھیں کے رنگ میں رنگ گئیں۔ طبیعت انتہائی قانع پائی تھی مولانا کی فقیرانہ و قلندرانہ زندگی بھی اپنائی اور سیاسی مسلک بھی۔

برطانوی سامراج سے بنرد آزمائی کے سبب خاندان کی مالی مشکلات کا بی اماں (والدہ محمد علی) کے اس خط سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے مولانا کی نظر بندی کے دوران "ہفتہ نظر بندی اسلام" کے سلسلے میں مسٹر تاج الدین کو لکھا تھا، "ہمارے نظر بندوں میں ایک بھی ایسا نہیں جس کی مالی حالت اس نظر بندی میں خراب نہ ہو گئی ہو اور جس کو باوجود بار بار کی یاددہانی کے حکومت کی طرف سے خورد و نوش کے لئے بھی کافی رقم ملتی ہو۔ علاوہ روزمرّہ کے اخراجات ضروری کے مالی نقصانات کا معاوضہ تو حکومت نے ایک کو بھی نہیں دیا۔ شوکت و محمد کی ہزاروں کی آمدنی یک قلم مسدود ہو گئی اور گھر سے پندرہ ہزار سالانہ سود وغیرہ تین برس سے دینا پڑ رہا ہے۔ ایک قرض خواہ نے شوکت پر بارہ تیرہ ہزار کی نالش کر دی ہے اور دوسرا ایک سکھ نالش کا نوٹس دے چکا ہے۔ روئی کا کارخانہ تین سال سے بند پڑا ہے اور اس کو چلانے کے لئے رام پور عارضی طور پر بھی جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ محمد کا پریس بھی بند ہے ہزاروں کا خانگی اور دفتر کا سامان پچیس تیس ہزار روپے کا باقی ہے۔ وہ زنگ گرد اور کیڑوں کی نذر ہو رہا ہے۔۔۔۔ نظر بندوں میں شاید سب سے بڑی رقم حکومت شوکت و محمد کو دیتی ہے۔ مگر حکومت نے خود اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو رقم ایک عرصہ تک انھیں دیتی رہی وہ ان کی ضروریاتِ زندگی کو بقدر نصف کے بھی پورا نہ کر سکتی تھی۔"

(اخبار جمہور، کلکتہ اڈیٹر قاضی عبدالغفار ۱۵ر جولائی ۱۹۱۸ء)

مولانا محمد علی اور امجدی بیگم کے خوشگوار آپسی تعلقات ہی کے سبب مولانا کی طویل مجاہدانہ زندگی قید و بند کی صعوبتیں ہنسی وخوشی جھیلتے گزر گئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی رقم طراز ہیں۔

" میاں و بیوی میں میل محبت شروع ہی سے تھا۔ آخر عمر میں تو کہنا چاہیئے عشق کی کیفیت تھی، عشق ایسا نہیں جس میں سوزش و شورش ہو اور جو تمام تر جوانی کے قویٰ کی پیداوار ہوتا ہے بلکہ ایسا عشق جس میں ٹھنڈک اور سکون ہوتا ہے اور عربی میں اس کے لئے لفظ "اُنس" ہوتا ہے "۔

(عبدالماجد دریا بادی۔ محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق ص ۲۶۹)

مولانا نے ان کی قومی زندگی کے آغاز کے بارے میں لکھا ہے " امجدی بیگم ہر جلسہ ، ہر سفر، خلافت کانفرنس میں مولانا کے ساتھ شریک رہتیں اور برابر جلسوں اور دوسری کارروائیوں میں حصہ لیتیں۔ انھوں نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں جس کے اجلاس ۲۴، ۲۵، ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں ہوئے یوپی کی نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی "۔

(A.M., S.G. Zaidi - Encyclopaedia of I N C. Vol. VIII 1921-24 p 66)

گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ کانگریس کی ستیہ گرہ تحریک اور خلافت فنڈ کے لئے بی اماں (والدہ محمد علی) اور امجدی بیگم نے اپنے دوروں سے کروڑوں کا چندہ جمع کیا۔ انھوں نے ستیہ گرہ تحریک جیسے خلافت کمیٹی اور کانگریس نے مشترکہ طور پر منظور کیا تھا۔ اس کے مقاصد انگریزی سامان کا مقاطعہ، شراب کی دوکانوں پر پکٹنگ، فوجی بھرتی حرام، انگریزی نوکریوں سے استعفیٰ کو کامیاب بنانے میں غیر معمولی کارکرگی کا ثبوت دیا۔ گاندھی جی کو عوام سے روشناس کرانے اور ان کے دور دراز کے سفر کے اخراجات کا بار اٹھانے میں تحریک خلافت کے رضاکاروں اور مولانا محمد علی کے خاندان کی خواتین کے فراہم کئے ہوئے چندوں کے اہم کردار کو نظرانداز

نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے میلکم ہیلی مبر مرحوم نے لیجلیٹو اسمبلی میں مولانا محمد علی کی فرد جرم گناتے ہوئے کہا تھا کہ "ان کے گھر کی عورتیں تک چندہ جمع کرتی اور شورش برپا کرتی پھرتی ہیں"۔

امجدی بیگم کی قومی زندگی کے آغاز کے بارے میں مولانا محمد علی نے لکھا ہے کہ انکے متعدد بار جیل کے سفر اس بات کا محرک بنے کہ آزادی کے جو چند لمحات ان کی معیت میں گذریں انھیں بیش قیمت جان کر ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا جائے"۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس نے کافی لمبا سفر کیا ہے اور پبلک مصارف پر کیا ہے کیونکہ ہوا یہ کہ جب اس نے میرے ساتھ سفر کرنا شروع کیا تو اسے میرا بیکار کا ضیعہ غنا ناگوار گزرا۔ اور چونکہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ اچھا حساب و کتاب رکھنے والی تھیں اور کم سے کم اپنے عورتوں کے حلقے میں یقیناً وہ اتنی ہی اچھی منتظم بھی تھیں۔ اس لئے انھوں نے ہندوستانی عورتوں میں بڑی سرگرمی سے پروپیگنڈا کرنا شروع کیا۔ اور خلافت فنڈ میں اتنی رقمیں جمع کیں کہ منتظمین نے انھیں اپنی طرف سے سفر کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ ہم نے کئی ماہ اس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں سفر کرتے اکٹھے گذارے۔ ہم مہاتما گاندھی اور اپنے ساتھی کارکنوں اور سیکریٹریوں کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو والیٹر ریلوے اسٹیشن پر جب کہ ہم مدراس اور مالابار کے فساد زدہ علاقے کی طرف جا رہے تھے، مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت ہم پھر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے لیکن یہ بات میرے لئے تسکین بخش ہے جس میں کہ کچھ میری حیرانی اور استعجاب بھی شامل ہے کہ اب میری بیوی بھی سفر کر رہی ہے اور وہ بھی پبلک مصارف پر"۔

(مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ و تاریخ ساز، مرتبہ محمد سرور ص ۱۸۵)

اس گرفتاری کی داستان کا گاندھی جی نے مختلف موقعوں پر تذکرہ کیا ہے اور امجدی بیگم کی قوت ارادی کو بھی جگہ جگہ خراج تحسین ادا کیا ہے۔

۲۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی نے اس گرفتاری

کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے لکھا "مولانا محمد علی کی گرفتاری اس وقت عمل میں آئی جب
ہم مدراس کے لئے سفر میں تھے۔ میں ٹرین سے ہی یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ والٹیر اسٹیشن
پر ٹرین ۲۵ منٹ سے بھی زیادہ دیر تک رکی۔ مولانا محمد علی اور میں ٹرین سے
اتر کر ایک میٹنگ کو خطاب کرنے چند قدم چلے ہی تھے کہ میں نے مولانا کو زور زور سے
وہ نوٹس پڑھتے ہوئے سنا جو انھیں اسی وقت دیا گیا تھا۔ میں ان سے چند قدم آگے
تھا۔ اس گرفتاری کے لئے ۲ دو سفید فام اور آدھی درجن ہندوستانی سپاہیوں
کی پارٹی تعینات کی گئی تھی۔ افسر انچارج مولانا کو وہ نوٹس ختم کرنے سے قبل
ہی بازو پکڑ کر لے گیا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔ میں
مطلب سمجھ گیا۔ اب اس علم کو مجھے تنہا ہی بلند رکھنا ہے خدا مجھے اس ساتھی کے
مشن کو پورا کرنے کی صلاحیت بخشے جس کے ساتھ کام کرنا میرے لیے باعث
فخر تھا ......

میں نے مجمع سے خطاب کیا اور عوام کو پُر امن رہنے نیز کانگریس کا پروگرام
کامیاب بنانے کی تلقین کی۔ بعد میں مڑ کر میں اس مقام پر گیا جہاں مولانا
کو حراست میں رکھا گیا تھا اور ان سے ملاقات کی اجازت چاہی، جواب ملا
کہ صرف ان کی بیگم اور سکریٹری ہی کو اجازت ہے۔"

(Collected works of Mahatma Gandhi, Ministry of Information
Govt. of India Vol. XXI, P. 176)

اسی سلسلے میں ۲۵ ستمبر ۱۹۲۱ء کے "نوجیون" میں بھی امجدی بیگم
کے زبردست صبر و تحمل اور جذبۂ ایثار کی تعریف میں انھوں نے لکھا "مجھے بیگم
صاحبہ محمد علی کی جرأت پر غیر معمولی حیرت ہے جب وہ مولانا سے مل کر والٹیر
اسٹیشن پر واپس ہوئیں تو میں نے اُن سے پوچھا آیا آپ کے دل میں کسی طرح
کا کوئی خوف تو نہیں؟ انھوں نے فوری جواب دیا "قطعاً نہیں، میرے شوہر
نے اپنا فرض پورا کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کیا"۔ اس گرفتاری کے بعد بھی وہ اسی

جرائت وہمت سے میرے ساتھ سفر کرتی رہیں ..... برقع میں ملبوس وہ زنانے و مردانے سبھی جلسوں میں شرکت کرتی ہیں۔ اور مختصر سی تقاریر بھی کرتی ہیں۔ جس کا براہِ راست اثر عوام کے دلوں پر ہوتا ہے۔ انھوں نے ہر شخص سے کھادی پہننے چرخہ کاتنے اور مسلم عوام سے سمرنا فنڈ میں چندہ دینے کی اپیل بھی کی ہے کچھ ہی عرصہ قبل ان کی زندگی ایک آرام و آسائش کی زندگی اور نفیس و ملائم لباس ان کا پسندیدہ لباس تھا لیکن اب وہ موٹی کھادی کا ہرا برقعہ پہنتی ہیں جبکہ ایک مسلم خاتون کو اپنی ہندو بہن کے مقابلے میں کپڑے بھی زیادہ پہننے ہوتے ہیں اور بیگم صاحبہ کا جسم بھی کچھ ہلکا پھلکا نہیں ہے لیکن وہ ان تمام تکالیف کو ملک و مذہب کی خاطر ہنسی خوشی برداشت کر رہی ہیں۔ مدراس میں میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ مسلم خواتین کے سفید موٹے لباس میں ایک طرح کا تقدس نمایاں ہے، ہندو خواتین کے رنگا رنگ ملبوسات مجھے موجودہ حالات میں پسند نہیں آئے ۔" (Ibid : P 205)

قومی لحاظ سے ہندوستانی خواتین کی خدمات کے تذکرے میں ۲۹ر نومبر ۱۹۲۱ء کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی نے امجدی بیگم کے لئے "ایک بہادر خاتون" کے عنوان سے خصوصی طور پر لکھا " بیگم محمد علی کے ہمراہ کام کرتے ہوئے مجھے جو تجربات ہوئے ہیں اپنے قارئین کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ گذشتہ سال انھوں نے پبلک کاموں میں اپنے شوہر کی مدد کرنا شروع کیا۔ ابتدا سمرنا فنڈ کے لئے چندہ کرنے سے ہوئی۔ تب سے وہ ہمارے طویل اور دشوار ترین۔ ہمارے آسام بنگال کے سفر میں بھی شریک رہیں۔ انھوں نے خواتین کے جلسوں سے بھی خطاب شروع کر دیا ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں تقریر کا ملکہ اپنے بہادر شوہر سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ ان کی تقاریر مختصر ہونے کے باوجود انتہائی پُر اثر ہوتی ہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا وہ اپنے شوہر کو بھی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہنے کا یہ آرٹ سکھا سکتی ہیں یا نہیں ؟..... ان کی سب سے بڑی آزمائش اور اس میں فتح کا وقت آیا جب اُن کے شوہر کو اسٹیشن پر ان سے

چھین لیا گیا۔ میں نے انھیں اس وقت دیکھا ہے جب وہ اس کمرے سے نکلیں جہاں ان کے شوہر کو حراست میں رکھا گیا تھا۔ وہ اسٹیشن کی طرف جمے ہوئے قدموں سے چل رہی تھیں اور جب میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے شوہر کی گرفتاری کے سبب خوش ہیں؟ ان کا فوری جواب تھا یقیناً۔ وہ اپنے ملک وملت کی خاطر جیل گئے ہیں"۔ ہم نے اپنا مدراس کا سفر جاری رکھا، سمندر ساحل پر زبردست عوامی جلسہ ہوا، سامعین اس وقت تک اُن سے واقف نہیں تھے۔ انھوں نے اونچی آواز میں بغیر کسی لڑکھڑاہٹ کے خوبصورت ہندوستانی میں عوام سے خطاب کیا اور میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ صحیح معنوں میں بہادر شوہر کی بہادر بیوی ہیں"۔ (Ibid P 218 - 219)

جیل کی اذیت ناک زندگی اور محبوب شریک حیات سے جُدائی کے لمحات میں مولانا کے لئے قومی زندگی میں امجدی بیگم کی شرکت اور دار ورسن کی آزمائش میں ان کی ثابت قدمی کا تصور نہ صرف انتہائی خوش کن تھا بلکہ نئے عزم وولولے کا محرک بھی تھا ۔

ہم میں اور تم میں ہوئے محبس وزنداں حائل
آ ؤ رویا میں کریں اپنی تمنّا حاصل

کراچی جیل سے ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو گاندھی جی کے نام ایک خط میں مولانا محمد علی نے انھیں تشکر کے طور پر لکھا:

" پیارے باپو۔ ایک عرصے سے قدرتاً طبیعت کا تقاضا تھا کہ اب آپ کو کچھ لکھوں لیکن بوجہ چند در چند تاخیر ہوتی رہی لیکن جب اخبارات میں آپکے قلم سے نکلی ہوئی بعض تحریریں میری اہلیہ کی تعریف میں ان کارروائیوں کے متعلق جو وہ والیٹر سے میری گرفتاری کے بعد کرتی رہی ہیں پڑھیں! اب تو مجھے مجبوراً آپ کو عریضہ لکھنا پڑا..... غالباً میں نے آپ سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہم میاں بیوی میں شادی سے قبل ہی عشق و محبت کی تڑپ پیدا ہو گئی تھی اور یہ ہندوستان

میں ایک غیر معمولی بات ہے لیکن ہماری متاہل زندگی کے بعد ہم ایک دوسرے سے ہر سال جدا رہے اس جُدائی نے میری اہلیہ کو پہلے سے بھی زیادہ میرے لئے محبوب اور عزیز شریک زندگی بنا دیا۔ اور گذشتہ عرصے میں جب میں نظر بند تھا اس وقت جو راہ اس نے اختیار کی تھی اس وقت سے ۱۹۱۹ء تک پُرخطر زندگی میں تھی، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہ میری نظروں میں جس قدر عزیز و محبوب تھی اس سے پہلے وہ میری نظروں میں نصف بھی نہ تھی۔ وہ ریلوے پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی اور نہایت فراخدلی سے مجھ سے کہا "ہراساں نہ ہونا، میری اور میری بچیوں کی فکر نہ کرنا"[1] مجھے الوداع کہہ کر رخصت ہو گئی اور نہایت استقلال کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر چلی گئی۔۔۔۔ آپ نے جو کچھ ہماری وکالت اور تعریف کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مسرت بخش میرے لیے یہ بات تھی کہ آپ نے میری عزیز اور جانباز اہلیہ کی تعریف کی ہے۔ حقیقتاً میں اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ اس رشک انگیز تعریف کا بھی میں خیال نہیں کرتا۔ مجھے توقع ہے کہ یہ آزمائشی امتحان بھی جلد ختم ہو جائیگا اور وہ جلد سے جلد اپنا کام آزادی سے جاری رکھ سکے گی اور آپ سے ایسی ہی رشک انگیز داد لیتی رہے گی۔" (رئیس احمد جعفری۔ علی برادران، ص۔ ۵۵)

۲۷ نومبر ۱۹۲۱ء کے "ینگ انڈیا" میں اس خط کو شائع کرتے ہوئے گاندھی جی نے نوٹ لکھا تھا کہ اس خط کی اشاعت کی مختلف وجوہ ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ایسی دستاویز ہے جس میں مولانا کے اندر کا انسان مکمل طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔"

(Collected works of Mahatma Gandhi OP. Cit. P 350)

---

[1] "نوٹ: یکم دسمبر ۱۹۲۶ء کے "ہمدرد" میں بھی مولانا نے اس مختصر ملاقات کا ذکر کیا ہے کہ دشمنانِ ملک و ملت کے سامنے انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم ہماری فکر نہ کرنا، خدا پہلے بھی رازق تھا اب بھی وہی رازق ہے تم صرف ایک واسطہ تھے، خدا بلا واسطہ بھی دے سکتا ہے اور دوسرا واسطہ بھی پیدا کر سکتا ہے رہا تمہارا کام سو اگر اجازت دو تو میں اسے کرتی رہوں۔"

والیٹر اسٹیشن پر گرفتاری کے وقت امجدی بیگم کی ثابت قدمی اور سپاہیانہ رویے کا تاثر کتنا گہرا اور مولانا کو اس پر کتنا فخر تھا۔ اس کا کھل کر اظہار انھوں نے کراچی جیل سے ہی لکھے گئے بی اماں کے نام ایک خط میں کیا ہے "میں بھی چالیس اکتالیس سال کی عمر سے یہاں داخل، گھر پر آیا کرتا ہوں۔ پہلے بیتول کی قید، پھر رہائی ہوتے ہی اس قید سے زیادہ لمبا دیس نکالا اور علی گڑھ، بمبئی اور ہم سفری سب کو ملا کر چھ سات مہینے کو چھوڑ دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جون ۱۹۱۹ء سے آج تک کا زمانہ علیحدگی میں ہی بسر ہوا اور ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو والیٹر کے اسٹیشن پر قید کی ابتدا کا خیال کیا جائے تو یہی غنیمت ہے کہ امجدی زندہ ہے اور اس دنیا میں بھی ملاقات کا دروازہ ہنوز بند نہیں ہوا ہے۔ ورنہ منی غریب کس کس کے بچوں کو پالتیں ......
آپ میرا یہ خط امجدی کو بھی دکھا دیں اور میرے کل کے رخصتی الفاظ اسے یاد دلادیں کہ خدا پر بھروسہ رکھو اور وہی والیٹر کے اسٹیشن کا سپاہیانہ رویہ جواب تک قائم رکھا ہے قائم رکھو جس نے مجھے مطمئن کر دیا تھا کہ خدا کی مدد شامل ہے تو یہ عورت اپنے مسلمان اور ہندوستانی بھائیوں کے سامنے کسی تھڑدلی کے اظہار سے نہ خود شرمندہ ہوگی، نہ مجھے اور نہ اپنے بہادر بھائی اور اپنے شیر دل ہزاروں مرنے والوں کو شرمندہ کرے گی۔" (علی برادران تذکرہ۔ ص ۵۹۴)

" مقدمہ کراچی کے دوران امجدی بیگم کراچی چلی گئیں تھیں۔ مولانا کو سزا ہو جانے کے بعد وہ واپس علی گڑھ آئیں۔ طلبا جامعہ نے ان کی ہمدردی میں ایک جلسہ محمد علی ہال میں کیا۔ نہایت دکھے دل سے اچھی زبان میں آپ نے ایک دلدوز تقریر کی۔ طلباء جامعہ زار و قطار رو رہے تھے، وہ تو ان کو کیا ڈھارس دیتے الٹی بیگم صاحبہ ہی ان کو ڈھارس دے رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا "بچو بے شک مولانا کی سزایابی سے میں سخت مغموم ہوں، لیکن خداوند قدوس پر بے حد بھروسہ رکھتی ہوں۔ آدمی کی موت و زیست کا کوئی بھروسہ نہیں ہے ٹھوکر لگی اور آدمی مرجاتا ہے۔ پھانسی لگتی ہے اور آدمی کی زندگی ختم ہو جاتی ہے یہ تو دو برس کی بات ہے

میں تو یہاں تمہارے ساتھ ہوں۔ اللہ چاہے گا تو یہ زن بھی نکل جائیں گے"!

(سید محمد ہادی: علی برادران ص ۱۱۵)

مولانا محمد علی جب تک جیل میں رہے ان کا کام جیل سے باہر ان کی والدہ اور بیوی انجام دیتی رہیں جیسا کہ یکم دسمبر ۱۹۲۶ء کے "ہمدرد" میں مولانا نے لکھا ہے۔

" ہمارے جیل میں داخل ہوتے ہی ہم پر باہر کی دنیا کا دروازہ بند ہو گیا تو میری ماں نے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں عصائے پیری کو لیا، نقاب اُلٹ کر وہی کام کرنا شروع کیا جو ہم کیا کرتے تھے مگر جسے حکومت نے خطرناک سمجھ کر ہمیں جیل میں ڈال کر ہم سے چھڑا دیا تھا۔ میری اہلیہ نے اس سے پہلے ہی عورتوں میں جن کا ذوق و شوق مردوں سے کہیں بڑھ کر تھا اس کام کو شروع کیا تھا اور وہ میری رفیق کار اور رفیقِ سفر بن گئی تھیں"! اور یہ رفاقت زندگی کے آخری سانس تک باقی رہی۔

۱۹۳۰ء میں مولانا محمد علی موت و زلیست کی کشمکش میں مبتلا تھے ایک آنکھ ناکارہ ہو چکی تھی، دوسری آنکھ کی بینائی بھی جواب دے رہی تھی، گٹھیا کے اثرات بھی تھے اور ذیابیطس کے حملے بڑی شدت سے ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر مکمل آرام و علاج کا مشورہ دے رہے تھے لیکن یہ مجاہد تھا کہ میدانِ جنگ کے لئے مچلا ہوا تھا۔ اسی شدید علالت کی حالت میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے وہ لندن روانہ ہوئے۔ حسب دستور امجدی بیگم اس آخری سفر میں بھی رفیقِ سفر تھیں۔ اس سفر کے بارے میں مولانا نے کہا تھا "میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور وہاں سلطانِ جابر اور رعایائے جابر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں تا آنکہ اس کام میں مرجاؤں اس لئے قرض دام لے کر، بھیک مانگ کر جس طرح بھی ہو سکے تین چار ہزار درہم فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو ساتھ لے چلوں گا اس لئے کہ وہ زندگی کے سارے منازل و مراحل میں میری رفیقِ سفر رہی ہیں"!

(محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند اوراق مذکرہ دوئم ص ۱۵۶)

مولانا کی شدید علالت اور وفات کے درمیانی وقفے میں امجدی بیگم نے جو خطوط ہندوستان اپنی بیٹی کے نام لکھے وہ اہم تاریخی دستاویز ہیں معالجوں کے بیہم اصرار کے باوجود ملک و ملّت کی خاطر بستر مرگ پر بھی مولانا محمد علی کے آخری سانس تک مسلسل کام کئے جانے کی لگن ان خطوط کے آئینے میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے آخری شبانہ روز کی مشغولیات کی تفصیلات کا واحد ماخذ بھی یہی خطوط ہیں مثلاً!

۹۲ مرٹن روڈ
S.W.1
۱۱ر نومبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ ...... تمہارے ابّا کی طبیعت پھر تین روز سے خراب ہے کیونکہ یہاں آنے کے بعد لوگوں سے ملنا جلنا رہتا ہے۔ کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے تھک جاتے ہیں ۷ ارسے کانفرنس شروع ہے وہاں جانا ہوتا ہے۔ صبح دس بجے وہ وہاں جاتے ہیں۔ تمہارے ابّا کی بیماری نے مجھے بھی تھکا دیا ہے چونکہ کوئی آدمی نہیں کام کرنے کے لئے اس لئے تھک جاتی ہوں، خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی...... تمہاری والدہ امجدی

(رئیس احمد جعفری، علی برادران متذکرہ ص ۶۱۴)

ہائڈ پارک ہوٹل نائٹس برج لندن
۲۷ر نومبر ۱۹۳۰ء
S.W.1

...... "تمہارے ابا کی طبیعت اچھی ہے لیکن پیروں اور رانوں پر ورم بہت زیادہ ہے اس وجہ سے دو روز سے پلنگ پر ہیں آرام کر رہے ہیں (ایضاً ص ۶۱۵)

ان خطوط میں اکثر لوگوں سے ملاقات کا تذکرہ ہے جس میں بیگم بھوپال مہاراجہ الور، مہاراجہ جام، مہاراجہ اور مہارانی بڑودہ کے نام خاص ہیں۔

ہائڈ پارک نائٹس برج لندن ۱۴ر دسمبر ۱۹۳۰ء

S. W-1

...... اس ہفتے تمہارے ابّا پلنگ پر لکھ رہے ہیں لیکن جب سے یہاں آئے ہیں لوگ بہت آتے رہتے ہیں اور ٹیلیفون پر بھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ زیادہ آرام نہیں کرتے جیسا کہ ان کی عادت ہے۔ اب چار پانچ روز سے اس ڈاکٹر کا علاج شروع کیا ہے جس کو مہاراجہ الور نے بھیجا تھا.....

...... کل تمہارے ابّا کا فاقہ تھا، سوجن ہے اس کی وجہ سے ڈاکٹر پلنگ سے نہیں اٹھنے دیتے۔ ویسے طبیعت اچھی ہے تم دعا کئے جاؤ اور پریشان نہ ہوا کرو جس کام کے لئے آئے ہیں بیماری کی حالت میں اس میں کامیابی ہو اور ہم سب زندہ و سلامت خوشی خوشی اپنے گھر واپس جائیں۔" (ایضاً ص ۶۱۶-۶۱۸)

اور وہ مشن کیا تھا جس کی خاطر موت و زیست کی کش مکش میں بھی وہ برطانوی سامراج سے نبرد آزما تھے؛ ملک و ملت کی خاطر۔ سوراج اور قومی یکجہتی کے لئے ہندو مسلم اتحاد۔

ہائڈ پارک نائٹس برج لندن ۲۶ر دسمبر ۱۹۳۰ء

S. W-1

پیاری زہرہ دعا۔ تم زندہ و سلامت و تندرست رہو۔ تم پر جو اپنے ماں باپ کی وجہ سے پریشانی گزری ہو گی اس کا مجھے بھی اندازہ ہے لیکن کیا کیا جائے اخبار والے نہیں مانتے لکھ دیتے ہیں۔ میری رائے نہیں تھی۔ اس خط میں دل کا دورہ پڑنے کے بعد کی تفصیل اور خاندان کی مالی مشکلات کا بھی ذکر ہے۔ تمہارے وہ خطوط جس میں تم نے روپے کا لکھا تھا تمہارے ابا کے نام تھا وہ ان کو نہیں دکھا سکے۔ صرف کہدیا کہ زہرہ کا خط آیا ہے، وہ خیریت سے ہے۔ تو رونے لگے کہ ارے میری بیٹی کا نہ معلوم کیا حال ہو گا۔ صاحب نے جنوری میں بھوپال سے چچا کو خط لکھدیا تھا۔ اگر میرا روپیہ نہیں بھی تھا تو کیا تھا۔ میرا روپیہ جب جمع ہوتا تھا اور

برسوں رہا تو تمام خاندان کے خرچ میں آتا تھا اور اب مجھے ضرورت ہے تو ہزار نہیں۔ چار ہزار نہیں صرف تین چار سو روپے کا ہمارا کسی کو اعتبار نہیں۔ ...... میں یہاں سے بھیج دیتی بلکہ صاحب کہہ رہے تھے میں نے بیماری کی وجہ سے نہیں بھیجا کہ ہم پردیس میں ہیں ہم کیا کریں گے"۔ (ایضاً ص ۶۲۰)

امجدی بیگم کا خط ۹ رجنوری ۱۹۳۱ء کا مولانا کی وفات کے بعد کا ہے جس میں باوجود انتہائی صبر وضبط کے ایک ماں نے بیٹی کے سامنے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔

" پیاری زہرہ۔ میں زندہ ہوں لیکن مردوں سے بدتر۔ میری قسمت میں کیا لکھا ہے کہ اب تک زندہ رہی، جس کی دنیا کو ضرورت تھی وہ مجھ کو اور تم کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اُسی کا ہر وقت خوف رہتا تھا، وہ سامنے آکر رہا۔ میری ایک بھی دُعا قبول نہیں ہوئی۔ ان کا دل ہی ہندوستان جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ جب کبھی جانے کا نام آتا تو کہتے تھے میں ابھی نہیں جاؤں گا، جب پورا کام ہو جائے اس کے بعد پیرس جاؤں گا علاج کراؤں گا اور آجاؤں گا"...... دو ڈاکٹروں کے ساتھ یہاں کے مسٹر نہرا ہیں وہ بھی آئے تھے، مجھ سے کہا کہ چائے منگاؤ۔ چائے آئی سب پیتے رہے۔ مسٹر نہرا نے کہا آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا کہ بیگم صاحبہ سے جھنڈا اٹھوانا چاہتے ہیں انھوں نے کہا بھائی ابھی ہندو مسلمانوں کا معاملہ ٹھیک ہو جانے دو۔ میں ہی تھا کہ کوکناڈا میں جھنڈا اٹھایا تھا اور میں ہی ہوں گا جو ہندوستان کا جھنڈا اٹھاؤں گا ابھی اس کا موقع نہیں ہے.... ڈاکٹر مانک نے ایک روز کہا بھائی محمد علی تمہاری حالت ایک شیشے کے گلاس کی طرح ہے اگر اس کو احتیاط سے رکھا جائے تو برسوں تک رہ سکتا ہے لیکن اگر اس کو زمین پر ماردو تو ٹوٹ جائے گا اور تمہارا علاج سوائے آرام کے کچھ نہیں ہیں تو آپ کو یہی رائے دیتا ہوں کہ آپ ہندوستان جلد چلے جائیے"۔ (ایضاً ص ۶۲۲-۶۲۵)

اور بالآخر شیشہ ٹوٹ گیا۔ مجاہد حریت لندن اس عزم کے ساتھ گیا تھا

کہ غلام ہندوستان واپس نہیں ہوگا۔ خدا نے اپنے محبوب بندے کی لاج رکھ لی۔ آخری سانس آزاد لندن ہی میں لیا اور فلسطین میں تدفین جس انداز سے ہوئی اسی کے لئے شاعر نے کہا تھا ؎

ہے رشک اک جہان کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

امجدی بیگم کے یہ غم جان لیوا تھا گو لندن سے واپسی پر کافی عرصے تک وہ خلافت کمیٹی سے وابستہ رہیں لیکن اندر ہی اندر گھلتی رہیں اور تقریباً پندرہ سال بعد سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔

آزاد ہندوستان میں مولانا محمد علی جوہر جیسے پیکرِ حریت اور شہیدِ قوم کو کبھی خراجِ تحسین پیش نہیں کیا گیا۔ نتیجے میں امجدی بیگم کی شاندار اور بے لوث اور بے مثال قربانیاں بھی تاریخ کا ایک ورقِ پارینہ بن گئیں۔ اس کی بڑی وجہ کو ہاٹ کے ہندو مسلمان فساد پر گاندھی جی اور محمد علی میں اختلاف تھا مولانا محمد علی نہرو رپورٹ سے بھی خفا تھے جو ان کی قید کے دوران تیار کی گئی تھی اور جس کے بعد انھوں نے کانگریس سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا تھا۔ اختلاف بہرکیف انڈین نیشنل کانگریس اور انقلابی رہنماؤں کے درمیان ہی نہیں، خود اندرونِ کانگریس نرم و گرم رہنماؤں کے درمیان ہمیشہ ہی رہا گو راہی سبھی ایک منزل کے تھے اور عوام کے کان ابھی تقسیمِ وطن کے تصور سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔

اچھا ہوا جو آپ نے دل سے بھلا دیا
وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

خود گاندھی جی نے ان کی موت پر کہا تھا کہ ملک ایک انتہائی نڈر عظیم "قوم پرست" سے محروم ہو گیا۔ شاید کوئی آنے والا غیر جانبدار مؤرخ ان سبھی مختلف راستوں کے مجاہدینِ حریت کی قربانیوں پر جمی گرد کو جھاڑ کر ان کے صحیح خد و خال کو نمایاں کر سکے۔ اگر ایسا ہو سکا تو یہ قومی یکجہتی کی جانب نمایاں پیش رفت اور ملک کی ایک عظیم خدمت ہو گی۔

نوٹ: امجدی بیگم زندگی کے آخری برسوں میں مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئی تھیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ

سعادت بانو کچلو

سعادت بانو کی پیدائش ۱۰ جنوری ۱۸۹۳ء میں امرتسر کے ایک متمول ومعزز اور علم دوست خاندان میں ہوئی علمیت اور قابلیت کے مختلف مدارج انھوں نے گھر پر ہی طے کئے۔ ان کے والد میاں حفیظ اللہ صاحب اور بڑے بھائی سعید اللہ صاحب نے ان کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ کی۔ سعادت بانو نے بہت جلد اردو فارسی میں کافی مہارت حاصل کرلی اور اپنے دائرہ اثر میں مختلف سماجی عیوب کے خلاف نیز دوسرے ملکی مسائل پر دکن ریویو، تہذیب نسواں، خاتون وغیرہ رسائل میں پُر زور مضامین لکھنا شروع کر دیئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تعلیم نسواں اور ان کی مضمون نگاری کو معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ سعادت بانو کا مضمون "حریت نسواں"، تہذیب نسواں میں کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں تحریر کئے گئے اس مضمون سے ان کی دور اندیشی، دور بینی اور وسعت مطالعہ کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ "حقوق نسواں بچپن۔ بے تکلفی میں تکلیف نیا فیشن، تہذیب کی جبلی، علم سے خطاب اور نئی جنتری کا ایک ورق" جیسے عنوانات سے ان کے متعدد مضامین ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء کے درمیان شائع ہوئے خصوصاً تین مضامین بعنوان "شمس العلماء مولانا آزاد مرحوم گردشِ زمانہ، اور سرسید مرحوم" اپنی نوعیت وطرز نگارش کے اعتبار سے ہی اعلیٰ

مقام نہیں رکھتے بلکہ ان سے مضمون نگار کے وسعت مطالعہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔
اسی زمانے میں انھوں نے گھر پر انگریزی تعلیم بھی شروع کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ شعر و سخن اور ادب لطیف سے بھی ان کی دلچسپی شیفتگی کی حد میں داخل ہو گئی تھی۔ انھوں نے اردو فارسی کے کلاسیکی شعرا کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور نیچرل شاعری کے سبزہ زاروں میں آزاد مرحوم کے اتباع میں ایک نئی راہ نکالی تھی۔
سعادت بانو کی تمام تر نظمیں قومیت اور حب الوطنی کے جذبات کا مظہر ہیں۔ "اسیر قفس" جو علامہ اقبال کی نظم "ایک بلبل کی فریاد پنجرے میں" کی تضمین ہے ۱۹۱۰ء میں لکھی گئی جب ان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے دل کسے سناؤں میں غم بھرا فسانہ
گلشن سے اب قفس میں میرا ہوا ٹھکانہ
رنج والم سے دل پر لگتا ہے تازیانہ
آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

پنجرے میں دیکھتا ہوں آزادیاں جہاں کی
آتی ہے یاد مجھ کو اب اپنے آشیاں کی
میں قید میں پڑا ہوں طاقت نہیں فغاں کی
وہ ساتھ سب کے اڑنا وہ سیر آسماں کی
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا

یارب کدھر گئے وہ اب دن مری خوشی کے
گلشن میں جن دنوں میں کرتا تھا اڑ کے پھیرے

گلشن کی سب بہاریں پیشِ نظر تھیں میرے
پتوں میں ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی سے
ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا

سُلگی ہے جان میری افسوس جل گیا جی
سینے میں سوزِ غم نے وہ آگ تیز پھونکی
چھوٹے سے اک قفس میں میں ہو رہا ہوں قیدی
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

کس سے کہوں میں اپنی اس بے بسی کا عالم
قسمت دکھا رہی ہے اب مجھ کو نت نئے غم
کرتا ہوں اپنے ٹوٹے پھوٹے پروں سے ماتم
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کا صبح آ کر پھولوں کا منہ دھلانا

آنکھوں میں پھر رہی ہے وہ آشیاں کی صورت
ڈھونڈھوں کہاں سے اب میں آرامِ عیش و عشرت
آتی ہے یاد دل کو ہوتی ہے سخت وحشت
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

"تاروں سے گفتگو" بھی سن ۱۹۱۰ء میں ہی شائع ہوئی۔

پُر لطف کیا سماں ہے تمہارے بہار کا
نکلا مگر نہ حیف میرے دل کا مدعا
تم سے غرض ہے مجھ کو نہ کچھ آسمان سے
مطلب ہے اپنے ملک سے ہندوستان سے
کیا وہ بھی دن خدا کبھی مجھ کو دکھائے گا
ہندوستان تمہاری طرح جگمگائیگا
اہلِ زمانہ دیکھیں گے ہندوستان کو
اس کی چمک لبھائے گی سارے جہان کو
پیارے وطن کے نام پہ جاؤں نثار میں
اجڑے چمن میں دیکھوں الٰہی بہاریں

سعادت بانو کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہی ان کا دل جذبۂ حُبّ الوطنی سے سرشار تھا۔ ایک مسلم لڑکی، زمانۂ دوشیزگی، پردے کی قیود اور توہم پرستی کے ایسے جذبات و احساسات کی حزنیہ داری آج کے زمانے میں کوئی اہم بات نہ ہو لیکن اس زمانے کے تناظر میں یقیناً وہ حیران کن اور قابلِ ستائش ہے۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں عرض کیا گیا ہے ۱۹۱۱ء سے مسلمانانِ ہند کی بیداری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جنگِ طرابلس و بلقان اور قضیۂ مسجد کانپور نے ان کے طرزِ فکر کو ایک نئی جہت عطا کی۔ ہر شخص بے چین و مضطرب تھا۔ ان واقعات نے سعادت بانو کو بھی نئے میدان تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ 'زمیندار' اور 'ہمدرد' نے انھیں دنیائے سیاست کی نئی راہوں سے روشناس کرایا اور وہ نئے انہماک کے ساتھ قومی و ملی خدمات کے لئے کمربستہ ہو گئیں۔ اپنے حلقۂ اثر میں پہلے مسلم یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کیا اور پھر ہلال احمر اور مجروحین کانپور کے لئے باوجود طویل سلسلۂ علالت کے وہ ہمدرد، وکیل اور زمیندار میں بھی گاہ بہ گاہ سیاسی مضامین لکھنے لگیں۔

۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۵ء میں سعادت بانو فدائے ملک و ملت، فخرِ قوم جناب سیف الدین کچلو بیرسٹرایٹ لا کی رفیقۂ حیات بنیں۔ ڈاکٹر کچلو کا خاندان کشمیر سے ترکِ سکونت کرکے امرتسر میں آباد ہوا تھا۔ امرتسر، آگرہ، علی گڑھ میں تکمیل تعلیم کے بعد انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ لندن سے بارایٹ لا۔ جواہر لال جی کے ساتھ کیا اور پھر پی ایچ ڈی کی ڈگری جرمنی سے حاصل کی۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو ایک عظیم محبِّ وطن اور شعلہ بیان مقرر تھے اور وکالت چھوڑ کر کانگریس اور خلافت تحریک کے لئے اپنے کو وقف کر چکے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں انھیں ایک تقریر کی پاداش میں بنگال سے نکالا گیا تھا۔ ایسے جیون ساتھی کی رفاقت میں سعادت بانو کی قومیت کے جذبات امڈ پڑے اور دبی ہوئی چنگاری شعلہ زن ہو گئی۔ دونوں شمعِ آزادی کے پروانے ایک نئے عزم و استقلال سے ملک و ملت کی خدمت میں دل و جان سے لگ گئے۔

جب آنجہانی لالہ لاجپت رائے اپنی جلاوطنی کے خاتمے پر امرتسر آئے تو سعادت بانو نے مندرجہ ذیل اشعار ان کی نذر کئے ؎

اتحادِ ہندو و مسلم خوشی کی بات ہے
قابلِ افسوس ہے گو سخت حالت قوم کی
سیکڑوں افراد گر غافل ہیں کچھ پروا نہیں
لاجپت جیون نے رکھ لی لاج اور پت قوم کی

لالہ دُنی چند جی صدر صوبائی کانگریس امرتسر جب ان کے یہاں ملاقات کی خاطر گئے تو مندرجہ ذیل رباعی ان کی نذر کی ؎

نہ ہارو ہمتیں اپنی نہ تم ملول رہو
شگفتہ گلشنِ ہستی میں بن کے پھول رہو
یہ التجا ہے سعادت کی بھول مت جانا
ہو جس طرح سے بھی تم ہوم رول لے کے رہو

رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کے درمیان انھوں نے زبان و قلم سے ہر ممکن خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی پنجاب میں ۱۹۱۹ء کا زمانہ قیامت خیز تھا۔ کونسی سختی کونسا ظلم اور کونسی بے عزتی تھی جو مارشل لا کے پردے میں جابر حکام نے مظلوم عوام پر روا نہ رکھی تھی۔ آگ تیزی سے سُلگ رہی تھی۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر کے پا بجولاں نا معلوم مقام پر لے جایا گیا۔ جلیان والا باغ آگ و خون کے دریا میں ڈوب گیا۔ سعادت بانو جیسی با وفا حوصلہ مند خاتون جانتی تھیں کہ اب ان کے فرائض کی اہمیت کتنی بڑھ گئی ہے۔ شادی کے پانچ سال بعد ہی محبوب شوہر کی طویل غمناک مدت اسیری جس پر گمان ہوتا تھا کہ اس تاریک رات کی کبھی سحر ہی نہ ہوگی۔ انھوں نے انتہائی پامردی و استقلال سے گزاری دوران مقدمہ دو بار اور دورانِ اسیری ایک بار جیل میں ان سے ملیں اور ہر بار انھیں یقین دلایا کہ "آپ کوئی فکر نہ کیجئے بچوں کی پرورش اور گزرانِ حیات میں آپ مجھے ایک ثابت قدم اور سچی قوم پرست پائیں گے۔ اس وادیٔ پُر خار میں میں جان تک دینے سے گُریز نہ کروں گی"۔ فدائے ملک و شوہر کی ہمتیں اس عزم صمیم سے نہ صرف تازہ ہو جاتی تھیں بلکہ ان پر جوش الفاظ سے قدرتی طور پر جو تشویش پیدا ہوتی تھی وہ بھی ختم ہو جاتی تھی۔ مقدمے کے بعد ڈاکٹر کچلو کو لاہور سے نکال دیا گیا اور نظر بندی کا حکم ہوا۔ حکم سزا سن کر محبِ وطن بیوی نے سجدۂ شکر ادا کیا اور بنا کسی اضطراب و اظہارِ غم کے اپنی سرگرمیوں میں مشغول رہیں۔ جب گاندھی جی بسلسلۂ تحقیقات مظالم پنجاب امرتسر آئے اور سعادت بانو سے بھی ملاقات کی تو انھوں نے مندرجہ ذیل اشعار ان کی نذر کئے ؎

بنا ہے سب کے دلوں میں ترا مکاں گاندھی
ہے تیری مدح و ثنا در دہر زباں گاندھی
ہر اک طرف ہیں عقیدت کے تیرے پھول کھلے
نہ آئے گی کبھی اس پھول میں خزاں گاندھی

پھنسے ہیں سخت مصیبت میں اہلِ امرتسر
عیاں ہے آپ پر ان کا غمِ نہاں گاندھی

یقین ہے گوہرِ مقصود ان کو مل جائے
اگر ہوں آپ حقیقت کے ترجماں گاندھی

کچھ ایسی بات کریں اپنی دست گیری سے
جو قید میں ہیں پڑے وہ چھٹیں اسیری سے

ڈاکٹر کچلو کے زمانۂ اسیری میں محترم سی آر۔ داس، پنڈت نہرو اور سوامی شردھانند جی وغیرہ متعدد قومی رہنما تسکین دہی کی خاطر سعادت بانو سے ملے انھوں نے سب سے یہی کہا "مجھے فخر ہے کہ ملکی خدمات میں ان کو قید و بند نصیب ہوئی۔ اس راہ میں جان تک دینا ہزار زندگی حاصل کرنا ہے۔" دراصل جلیانوالہ باغ کے مشہور جلسے میں وہ خود بھی حالاتِ حاضرہ پر ایک پرجوش تقریر کرنے جارہی تھیں شہر میں دھوم تھی، زبردست جوش پھیلا ہوا تھا لیکن وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر عزیز و اقارب نے جبراً روک لیا۔ اور ان کے قدم اس جلوہ گاہ شہادت تک پہنچنے سے رہ گئے۔ شاید ہی کوئی بڑا سیاسی جلسہ ہو جس میں سعادت بانو نے شرکت نہ کی ہو، خصوصاً زنانہ جلسوں میں وہ پرجوش تقاریر کیا کرتی تھیں اس بلند حوصلہ خاتون نے سول نافرمانی کی تحریک میں بھی شوہر کے دوش بدوش حصہ لیا۔ ۲۲-۱۹۲۰ء کی تحریک عدم تعاون میں ڈاکٹر کچلو کی گرفتاری کے دوران انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ سوراج آشرم کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی کام کیا۔

ڈاکٹر کچلو گرچہ تحریک آزادی کے سرگرم و فعال سپاہی کی حیثیت سے مختلف اہم منصبوں پر فائز رہے، ۱۹۲۹ء میں جواہر لال جی کے مکمل آزادی کے ریزولیوشن کی تائید بھی انھوں نے ہی کی تھی۔ لیکن آزادئ وطن کے بعد ان کا رجحان بائیں بازو کی سیاست کی طرف بڑھتا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے

اسٹاک ہالم میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی۔ وہ قومی امن کاؤنسل کے صدر اور بین الاقوامی امن کاؤنسل کے پریزیڈیم کے ممبر بھی رہے انھیں عالمی لینن امن انعام سے بھی نوازا گیا۔ سعادت بانو ان کی شروع کی گئی امن تحریک کی بھی فعال ممبر رہیں۔ وہ آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی بھی سرگرم رکن تھیں اور ۱۹۵۰ء کے وسط میں اس کی دہلی شاخ کی خازن کے عہدے پر بھی فائز رہیں۔ وہ تاحیات انجمن ترقی اردو کی بھی سرپرست تھیں۔

جنگِ آزادی میں شریک نوجوان سعادت بانو کی توجہ کا خصوصی مرکز تھے، ان کی ہر ممکن امداد اور اپنی ماں جیسی ممتا کے سبب وہ بلا تفریق مذہب وملّت ان سبھی نوجوانوں کی "آپا جی" بن گئی تھیں۔ وہ ایک سچی مسلمان خاتون تھیں۔ اپنے غیر مسلم دوستوں کی دل آزاری سے بچنے کے سبب انھوں نے کبھی اپنے گھر گائے کا گوشت پکنے کی اجازت نہیں دی۔ عمرِ عزیز کے آخری لمحات تک وہ نہ صرف خود کھادی پہنتی رہیں بلکہ اپنے بچوں کو بھی ہمیشہ کھادی ہی پہنایا۔

تقسیمِ وطن کے بھیانک طوفان میں کچلو خاندان کا بھی امرتسر میں سب کچھ لٹ گیا لیکن انھوں نے سرحد پار جانا گوارا نہیں کیا اور مسلم "پناہ گزین" بن کر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ دونوں جیون ساتھی تقسیمِ وطن کے سخت مخالف تھے قوم نے بحیثیت مجموعی ان کے ساتھ بے اعتنائی برتی اور جد و جہد آزادی میں کی گئیں ان کی تمام قربانیاں تاریخ کا ایک گمشدہ ورق بن کر رہ گئیں۔ ۹ر اکتوبر ۱۹۶۳ء کو ڈاکٹر کچلو کے انتقال کے بعد سبھی خاندان منتشر ہو گیا۔ گو کچلو خاندان نے مادرِ وطن کی خاطر ان گنت ذہنی، جسمانی اور مالی قربانیاں دیں لیکن اپنی خودداری و غیور فطرت کے سبب کبھی حکومتِ وقت کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ مرحوم ڈاکٹر کچلو کو پنڈت جواہر لال نہرو نے زبردستی اسپتال میں داخل کیا تھا لیکن پرجوش مجاہدہ آزادی، روشن خیال ادیبہ و شاعرہ اور وسیع القلب وسیع النظر سعادت بانو کچلو آزاد ہندوستان میں بے کسی و

مفلسی کی حالت میں بغیر دوا علاج کے ۱۸ اگست ۱۹۷۰ء میں اپنے مالک حقیقی سے یوں جا ملیں جیسے غالب نے اپنے لئے تمنا کی تھی ؎

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(ماخوذ: بھارت کی دیویاں مرتبہ محمد الدین فوق، لاہور ۱۹۲۱ء ص ۵۹ تا ۶۷ اور جناب طلعت کچلو (ڈاکٹر کچلو کے صاحبزادے) سے ۷ جون ۱۹۸۰ء کو تین مورتی میوزیم میں لیا گیا انٹرویو)

بیگم خورشید خواجہ

بیگم خورشید خواجہ کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں حیدر آباد میں ہوئی۔ ان کے والد سر بلند جنگ حیدر آباد ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے، ان کے دادا سمیع اللہ خاں سرسید مرحوم کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق خورشید بیگم کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں وہ مسز سروجنی نائیڈو کے افکار و خیالات سے خصوصی طور پر متاثر ہوئیں۔ ان کی شادی علی گڑھ کے مشہور بیرسٹر خواجہ عبدالمجید صاحب سے ہوئی۔ جو جنگِ آزادی کے نامور مجاہد بھی تھے۔ شادی کے بعد خورشید بیگم نے پردہ ترک کر دیا اور قومی محاذ پر قوم پرست شوہر کے شانہ بشانہ چلنے کا فیصلہ کیا نیز اس دشوار ترین راہ میں ہر قسم کی ذہنی و معاشی پریشانیوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئیں۔

خورشید بیگم ۱۹۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی ممبر بنیں اور تاحیات اسے برقرار رکھا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کی سبجیکٹ کمیٹی میں یو پی کی نمائندہ تھیں۔ ان کے ساتھ یو پی سے دوسری خواتین بیگم حسرت موہانی، بیگم محمد علی، شریمتی کملا نہرو اور شریمتی سروپ رانی نہرو بھی تھیں۔ سبجیکٹ کمیٹی کی نشستیں ۲۴، ۲۵، ۲۷ اور ۲۸ دسمبر ۱۹۲۱ء کو حیدر آباد میں ہوئیں۔

(Encyclopaedia of Indian National Congress, A.M. Zaidi & S.G. Zaidi Vol. Eight, 1921 - 24 P 66)

انھوں نے علی گڑھ میں ایک کھادی بھنڈار بھی قائم کیا اور ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ سے ہی 'ہند' نام کا ایک ماہانہ جریدہ بھی شروع کیا جس کی ادارت کے فرائض بھی انھوں نے خود ہی انجام دیئے۔ اپنے ایک پوسٹ کارڈ میں گاندھی جی نے انھیں لکھا تھا کہ وہ انھیں اردو میں اپنا سب سے پہلا خط لکھ رہے ہیں۔

تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں اس قوم پرست جوڑے کی خدمات کے تذکرے میں گاندھی جی نے بعنوان "گرفتار نہ ہونے پر افسوس" تحریر کیا تھا کہ "موجودہ حالات میں ہر اس ہندوستانی کے لئے جو عزت نفس رکھتا ہے، جیل ہی ایک مناسب جگہ ہو سکتی ہے۔ علی گڑھ میں ہر شخص مولانا شیروانی اور ان کے ساتھیوں کو رشک کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ بیگم خواجہ نے مجھے لکھا ہے کہ انھیں اپنے شوہر کے اب تک آزاد رہنے کا افسوس ہے جب کہ میدان عمل کے ان کے ساتھی جیل پہنچ چکے ہیں۔ جذبۂ صادق اسی کا نام ہے۔ سوراج تب ہی ممکن ہے۔ جب ہمارے سبھی خواتین و حضرات آزادی وطن کی خاطر جیل جانا اپنی خوش قسمتی سمجھیں"

(Collected works of Mahatma Gandhi Vol. XX April, August 1921 P 490)

"میرے نوٹس میں "ایک باعزت قابل احترام بیوی" کے عنوان سے مہاتما گاندھی نے مرحوم خواجہ عبدالمجید کے تذکرے میں لکھا تھا" میں انھیں ایک انتہائی راست باز انسان سمجھتا ہوں۔ انھیں جتنا فخر اپنے مذہب پر ہے اتنا ہی ناز اپنے وطن پر بھی ہے ان کا تعلق ایک معزز خاندان سے ہے۔ بیرسٹر کی حیثیت سے وہ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے لیکن اب ملک و ملت کی خاطر انھوں نے درویشانہ زندگی کو اپنا لیا ہے مجھے ابھی ابھی ان کی بیگم خورشید کا تار موصول ہوا ہے جس میں انھوں نے خواجہ صاحب کی گرفتاری کی اطلاع دی ہے۔ وہ لکھتی ہیں "آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میرے شوہر کو حکومت نے گرفتار کر لیا ہے۔ ان کی عدم موجودگی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ (علی گڑھ) کے انتظام سے متعلق میں ان کے سبھی کاموں کو خود انجام دینے کی کوشش کروں گی"! مجھے اس تار کی انتہائی خوشی ہے۔ خواجہ صاحب

اور دوسرے حضرات کی قربانیوں کے سبب اب کون حصولِ آزادی کو روک سکتا ہے؟ بیگم خورشید کو ان کا کام دیکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی کیونکہ جامعہ کے بہادر اور حق پسند طلباء ان کے ساتھ ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ ان کی خاطر یہ طلباً ان کاموں سے بھی گریز نہ کریں جنھیں انھوں نے خواجہ صاحب کی موجودگی میں نہیں کیا اس کے علاوہ بیگم خورشید چرخہ کاتنے کی تربیت انھیں خواجہ صاحب سے بہتر طور پر دے سکیں گی ..... جب ایک پاکباز عورت میں بہادری اور مادرانہ شفقت کی بھی آمیزش ہو جائے تو وہ ایک ایسی طاقت بن جاتی ہے جس کی برابری کوئی مرد بھی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر محمود عالم نوجوانوں کی ذہنی نشو ونما کو دیکھیں گے۔ لیکن بیگم خورشید ان کے دلوں کو تسخیر کریں گی اور انھیں کندن بنادیں گی۔"

(Collected work : Vol.XXII December, 1921, March 1922 P 46)

خواجہ عبدالمجید صاحب اس گرفتاری کے وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ تھے۔ بیگم خورشید تاحیات کانگریس کے نصب العین سے وابستہ رہیں۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے الہ آباد میں حمیدیہ گرلس سکنڈری اسکول قائم کیا جو بعد میں ہائی اسکول اور پھر انٹر کالج بنا۔ آج یہ ایک ڈگری کالج ہے۔

بیگم خورشید خواجہ کا انتقال جولائی ۱۹۸۱ء میں ہوا۔ دستند حوالوں کے علاوہ بقیہ معلومات بیگم خورشید کے صاحبزادے پروفیسر جمال خواجہ سمیع منزل نمائش روڈ، علی گڑھ کے توسط سے حاصل ہوئیں۔

زلیخا بیگم (بیگم مولانا ابوالکلام آزاد)

تحریک آزادی میں خواتین کی شرکت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس زمانے میں ان کے مجاہد شوہر جیلوں میں چکی کی مشقتیں برداشت کیا کرتے تو ان کی ہمدم و ہمساز رفقائے حیات گھروں کا انتظام ہی نہیں سنبھالتی تھیں بلکہ ہر طرح کی معاشی سختیوں، ذہنی اُلجھنوں اور دیگر پریشانیوں کے باوجود اپنے شوہروں کے حوصلے بڑھاتیں اور دوسرے اسیرانِ آزادی کے خاندانوں کی بھی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ سخت سے سخت آزمائش میں بھی کبھی کوئی شکوہ ان کے لبوں پر نہیں آیا۔ ایسی ہی بلند حوصلہ خواتین میں زلیخا بیگم آزاد کا نام بھی سرفہرست آتا ہے۔

زلیخا بیگم کی خوبصورت قلمی تصویر کھینچتے ہوئے حمیدہ سلطان نے لکھا ہے: نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لانبے بال، بوٹا سا قد، مائل بہ گداز دلاویز جسم، سفید کالی کئی کی سوتی ساری بے پروائی سے لپیٹے، مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لئے میں نے اسی دنیا کی حور کو دیکھا ہے۔ یہ پاکیزہ ہستی حضرت یوسف والی زلیخا نہیں، یوسف ہندی، حضرت ابوالکلام آزاد

کی رفیقِ حیات زلیخا بیگم تھیں!!

(حمیدہ سلطان۔ رسالہ صبح، سہ ماہی ابو الکلام آزاد نمبر ۱۹۷۰ء کا پہلا شمارہ ص ۳۲)

جنتِ ارضی کی یہ حور جو مجسم پیکرِ صبر و قناعت تھی، صرف چھ سال کی عمر میں "یوسف ہندی" کی جو تقریباً اس وقت بارہ سال کے تھے، رفیقۂ حیات بنا دی گئی اور یوں بچپن سے شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ اپنے "یوسف" کے رنگ میں رنگ گئی۔ بڑی شخصیتوں کی سوانح حیات میں اکثر ان کی خانگی زندگی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ ایسی شخصیتوں کے پیچ و خم کو سمجھنے کے لئے ان کی زندگی کے اس پہلو کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ زلیخا بیگم مولانا پر فدا تھیں۔ ان کے جذبۂ رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے حمیدہ سلطان نے لکھا ہے کہ ایک دن جب وہ مع اپنی والدہ کے مولانا کے یہاں پہونچیں تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر والدہ نے ان سے مسکرا کر کہا "کیا رتجگا کیا ہے بھاوج؟ آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں۔ وہ ہنس کر بولیں آپ کو عادت ہی ہے بنانے کی۔ آجکل مولانا قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کو ۲ بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا جھلتی ہوں۔ موسم بہت گرم ہے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں"۔ (ایضاً ص ۳۵)

یہ ایثار و وفا محض شوہر کی خدمت تک ہی محدود نہ تھا۔ مولانا کا بار بار جیل جانا، ہجر کی سختیاں جھیلنا اور معاشی مشکلات برداشت کرنا اس کو انھوں نے خاموشی سے گلے لگا لیا تھا بوجہ سیاست مولانا کی مالی حالت کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ زلیخا بیگم نے نہ اچھا کھانے و پہننے کی شکایت کی اور نہ کبھی اپنی پریشانیوں کا تذکرہ کیا بلکہ ہر طرح محبوب شوہر کو آرام پہنچانے میں لگی رہیں تاکہ گھریلو فضا کے خوشگوار ماحول میں تازہ دم ہو کر وہ نئے ولولے اور جوش سے جنگِ آزادی کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ یہی نہیں انھوں نے مولانا کے سیاسی عقائد و افکار کو بھی مکمل طور پر اپنا لیا تھا۔ مولانا ہی کی زبان میں "زلیخا بیگم نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات

کا ساتھ دے۔ اُس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت و استقامت سے ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار"

(ابوالکلام آزاد: غبارِ خاطر، تیسرا اڈیشن لاہور ص ۲۸۴)

تحریکِ خلافت کے سلسلے میں ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء میں جب مولانا کو سیاسی الزامات کے تحت کلکتہ جیل میں ڈال دیا گیا تو زلیخا بیگم نہ صرف ذہنی طور پر اس کے لئے آمادہ تھیں بلکہ ایک سال قیدِ بامشقت کی اس سزا کو وہ کم سمجھتی تھیں جو ایک طرح سے لیلائے حریت کے شیدائی کی توہین بھی تھی۔ گاندھی جی کے نام ایک برقیئے میں انھوں نے مندرجہ ذیل پیغام بھیجا۔ "میرے شوہر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمے کا فیصلہ آج سنوایا گیا۔ انھیں صرف ایک سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ یہ نہایت تعجب انگیز طور پر اس سے بدرجہا کم ہے جس کے سننے کے لیے ہم تیار تھے۔ اگر سزا و قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس معاملے میں بھی ان کے ساتھ سخت ناانصافی برتی گئی یہ تو کم سے کم بھی نہیں ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ میں آپ کو اطلاع دینے کی جرأت کرتی ہوں کہ بنگال میں جو جگہ ان کی خدمات کی خالی ہوئی ہے ان کے لئے میں نے اپنی ناچیز خدمات پیش کر دی ہیں اور وہ تمام کام بدستور جاری رہیں گے جو ان کی موجودگی میں انجام پاتے تھے۔

یہ میرے لئے ایک بہت بڑا بوجھ ہے، لیکن خدا سے مدد کی پوری اُمید رکھتی ہوں، البتہ ان کی جگہ صرف بنگال میں ہی خالی نہیں ہے بلکہ تمام ملک میں اس کے لئے سعی کرنا میری دسترس سے باہر ہے میں پہلے چار سال تک ان کی نظربندی کے زمانے میں اپنی ابتدائی آزمائش پوری کر چکی ہوں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس دوسری آزمائش میں بھی پوری اُتروں گی۔ گزشتہ پانچ سال سے میری صحت نہایت کمزور ہو گئی ہے، دماغی محنت سے بالکل مجبور ہوں۔ اس لئے باوجود میری خواہش کے مولانا ہمیشہ اس سے مانع رہے کہ میں کسی طرح کی محنت اور مشغولیت کے کام میں

حصّہ لوں، لیکن میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس سزایابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لئے وقف کر دینا چاہیئے۔ میں آج سے بنگال پراونشل خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی"۔ (مولانا آزاد قولِ فیصل۔ چمن بک ڈپو دہلی ص ۱۲۶) اسی برقیے میں بطورِ ضمیمہ اُنھوں نے گاندھی جی کو یہ بھی لکھا تھا کہ میرے شوہر نے نہایت محبت و تکریم کے ساتھ اپنی نیک خواہشات بھیجتے ہوئے مندرجہ ذیل پیغام آپ تک پہنچانے کے لئے کہا ہے۔

"حکومت اور ملک اس وقت کسی قسم کی مصالحت کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارا فرض اس وقت اپنے کو پوری طرح تیار رکھنا ہے۔ بنگال آئندہ بھی اس پیش قدمی کو باقی رکھے گا جو اس وقت اس نے قائم کی ہے۔ باردولی تعلقہ کے ساتھ اب بنگال کے نام کا بھی اضافہ کر دیجئے تو عنایت ہوگی اور اگر کوئی موقعہ مصالحت کا آتا بھی ہے تو برائے مہربانی ہماری رہائی کو کوئی اہمیت نہ دیجئے جو بدقسمتی سے اس کے ساتھ آجکل وابستہ ہو گئی ہے صرف ایک مقصد کے مدنظر، قومی مفاد و خواہشات کو سامنے رکھتے ہوئے ہی صلح کی شرائط واضح رکھئے، جس کا ہماری رہائی سے قطعی کوئی تعلق نہ ہونا چاہیئے"۔ (Collected Works of Mahatma Gandhi : Publication Division, Govt. of India Vol. XXII P. 459)

دن و رات کی گردش تیز تھی، سیاسی سرگرمیوں میں ہلچل کے سبب مولانا کی غیر معمولی مصروفیت بھی بڑھ رہی تھی۔ ان کے بار بار جیل جانے اور روز افزوں پریشانیوں کے باعث زلیخا بیگم کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں جب مولانا نینی تال جیل میں قید تھے ان کے خطوط انھیں ملتے رہے تھے جس میں علاوہ اپنی بیماری کے سبھی باتوں کا تذکرہ ہوا کرتا تھا۔ رہائی کے بعد ہی مولانا کو علم ہو سکا کہ یہ پورا زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں ہی گزرا تھا۔ رہائی کے بعد علاج اور تبدیلیٔ آب و ہوا سے کچھ افاقہ ہوا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں مولانا پھر قید کر لئے گئے اور کافی عرصے تک قید کا محل بھی پوشیدہ رکھا گیا۔

اپنے صدیق محترم نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کے نام

احمد نگر جیل سے لکھے گئے ایک طویل مکتوب ۱۱ اپریل ۱۹۴۲ء (جو رہائی کے بعد شائع ہوا) میں مولانا نے اپنی گرفتاری، زلیخا بیگم کی علالت اور وفات کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ مکتوب گرچہ طویل ہے تاہم زلیخا بیگم سے متعلق یہی واحد ماخذ ہے ملک و قوم کی خاطر اس بے مثال ایثار کی داستان کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"اس تمام زمانے میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے گذر رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی، ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی ۔۔۔۔۔ جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ بعد کلکتہ واپس ہوا۔ اور پھر چار دن کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا یہ وہ وقت تھا کہ طوفان ابھی آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف امڈنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا اور یہ بات بھی کہی جاتی تھی کہ لڑائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ زلیخا کی نظر رہا کرتی تھی اور اس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کئے اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں خلل پڑے لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کے مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳ اگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لئے

آئی۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا مقصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتیں تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گذشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول سا احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں ہماری آخری ملاقات ہے، وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی، وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصے تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصے تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعے نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا۔"

(ابوالکلام آزاد۔ غبار خاطر۔ متذکرہ ص ۲۸۱-۸۲-۸۳-۸۴)

عرصے بعد جب احمد نگر جیل کے اسیروں کو اپنے عزیزوں سے خط وکتابت کی اجازت ملی تو مولانا کو زلیخا بیگم کا ایک خط ملا جس میں بھی اِدھر اُدھر کی باتیں تھیں لیکن اپنی علالت کا انھوں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ پھر اخبارات سے ان کی شدید علالت کی خبریں ملنا شروع ہوئیں۔ آخر میں خطرناک صورتِ حال کا تار ملا

حکومتِ بمبئی کے ایما پر جیل سپرنٹنڈنٹ نے مولانا سے پیرول پر رہائی کی بات کی۔ دوستوں خصوصًا پنڈت نہرو نے لاکھ اصرار کیا کہ وہ اس پیرول کی بات مان لیں لیکن مولانا کی خودداری کب اس ٹبک سری کی متحمل ہو سکتی تھی۔ البتہ جذبات و احساسات کی جو کیفیت تھی اس کا حال خود انھیں کی زبانی سُنیے۔

"جوں ہی صورتِ حال کی پہلی خبر ملی۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی یہ جدوجہد دماغ کو نہیں جسم کو تھکا دیتی ہے اور وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔" (غبارِ خاطر متذکرہ ص ۲۸۸)

بالآخر ۱۹ار اپریل ۱۹۴۳ء کو زلیخا بیگم ان کے دیدار کی حسرت ہی لئے اس دارِ فانی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو گئیں ؎

کام تو عشق میں بہت تھے میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

اور یوں بقول مولانا "ہماری چھبیس ۲۶ برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے ...... مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں یہاں احاطے کے اندر ایک پُرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے، لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے ایک نئی طرح کا انس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔" (غبارِ خاطر متذکرہ ص ۲۹۰)

اس مرثیے کے مطلب کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

"میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگتے ہیں

تو اس نے مجھے ملامت کی اس نے کہا یہ کیا بات ہے کہ ایک اس قبر کی وجہ سے جو ایک خاص مقام پر واقع ہے تو ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے؟ میں نے کہا بات یہ ہے کہ ایک غم کا منظر دوسرے غم کی یاد تازہ کر دیتا ہے، لہٰذا مجھے رونے دے میرے لئے تو یہ تمام قبریں مالک کی قبریں بن گئی ہیں۔" (محمد اجمل خاں دیباچہ غبار خاطر مذکرہ)

پورے ملک میں زلیخا بیگم کی اس المناک موت پر ماتم کیا گیا اور سامراجی حکومت کے ظلم و استبداد پر شدید غم و غصّے کا اظہار کیا گیا جس نے مولانا کو اپنی شریکِ حیات کی خطرناک علالت کے باوجود بھی غیر مشروط رہائی دینا منظور نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مسلم لیگ نے بھی مولانا کے سیاسی عقائد و نظریات سے سخت بیزاری کے باوجود کلکتہ میں تعزیتی جلسہ کیا۔ جلسے میں ابراہیم ہوش کی تعزیتی نظم کو سن کر سبھی سامعین کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں:

اے زمیں حق ہے اگر تو اپنے سر پر خاک اُڑائے
اے فلک حق ہے اگر تو خون کے آنسو بہائے
حق ہے گیتی پر جو چھائیں یاس کی تاریکیاں
حق ہے دُنیا میں اگر شمع مسرّت جھلملائے
آج تک دیکھا نہ ہوگا عالمِ ایجاد نے
جان دی جس بے کسی میں بیگم آزاد نے

آؤ اے مرغانِ گلشن اشک افشانی کریں
آؤ اے صحرا کے ذرو مرثیہ خوانی کریں
آؤ اے اہل وطن سب مل کے ہوں ماتم گسار
آؤ ہم رو رو کے اپنے خون کو پانی کریں
باغ پر آئے خزاں اور باغباں ہو قید میں
کارواں لٹ جائے میر کارواں ہو قید میں

اس کی بیگم جان دے اور وہ سرِ بالیں نہ ہو
یا خدا ایسی کسی کی موت غم آگیں نہ ہو

مرتے دم بھی اپنے بیگانوں سے جو ملنے نہ دے
یوں کسی بھی مملکت میں جبر کا آئین نہ ہو

آہ وہ آنکھیں جو حسرت رہ گئیں دیدار کی
یہ بھی اک طرزِ عنایت تھی مرے سرکار کی

ایسی موتیں ہوتی ہیں سرمایۂ نقشِ دوام
تا ابد باقی رہے گا ہوش مرحومہ کا نام

جب مرتب ہو گی مستقبل میں تاریخِ وطن
حرف خونیں سے رقم ہو گا یہ قصّہ لا کلام

انقلاب ایسا بھی ہونے کو ہے زیرِ آسماں
ظلم خود دہرائے گا صبر و رضا کی داستاں

(رسالہ ماحول، کراچی آزاد نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۱۰۵-۱۰۶)

رہائی سے کچھ عرصے قبل مولانا کو احمد نگر قلعہ سے باکورہ منتقل کر دیا گیا تھا۔ رہائی کے بعد جب ہاوڑا اسٹیشن سے وہ کار میں روانہ ہوئے تو بنگال کانگریس کمیٹی کی صدر مسز لبابنا پربھا دتا اور دیگر مقامی لیڈر بھی ان کے ہمراہ تھے جس وقت کار پل سے گزری مولانا پر کیا گزری اسے جانے بغیر اس داستانِ غم کا خاتمہ ممکن نہیں۔ "مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا تین سال پیچھے کا وہ دن یاد آیا جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھیں۔ اب میں تین سال کے بعد واپس آرہا تھا مگر وہ قبر کی آغوش میں تھیں اور میرا گھر خالی تھا۔ مجھے ورڈس ورتھ کا یہ شعر یاد آیا۔

"مگر اب وہ اپنی قبر میں ہے اور ہائے! میری دنیا کیسی بدل گئی ہے۔"
میں نے اپنے ساتھیوں سے کار واپس کرنے کے لئے کہا کیونکہ گھر جانے سے پہلے میں ان کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔ میری کار ہاروں سے لدی ہوئی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک ہار لے کر قبر پر چڑھایا اور خاموشی کے ساتھ فاتحہ پڑھا"

(ابو الکلام آزاد۔ ہماری آزادی مترجمہ محمد مجیب اورینٹ لونگ مینس ص ۲۰۷)

مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں "مولانا کے گھر پہونچتے ہی میں بھی حاضر ہو گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے اور میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

(عبدالرزاق ملیح آبادی، ذکر آزاد، ص ۲۵۴)

اپنی سب سے قیمتی متاع بھی قوم پر نچھاور کر کے مولانا کے قدم آزادی کی منزل تک بڑھتے ہی رہے۔

آزادی کی اس منزل کو پالینے میں زلیخا بیگم جیسے کتنے ہی پیکرِ مہر و وفا و خلوص و ایثار، مادرِ وطن پر خاموشی سے پروانہ وار نثار ہو گئے۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ کیا کبھی ان کا شمار کر سکے گی؟ شاید کبھی نہیں۔

ایک خوش فکر شاعرہ، علمبردارِ حقوقِ نسواں اور باشعور محبِ وطن۔ ز۔خ۔ش

زاہدہ خاتون شروانیہ کی ولادت علی گڑھ کے قریب قلعۂ بھیکم پور میں ۸ دسمبر میں ہوئی۔ وہ نواب محمد مزمل اللہ خاں شیروانی رئیس بھیکم پور و سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صاحبزادی تھیں۔ کم سنی ہی میں والدہ کے انتقال کے سبب والد نے بڑی شفقت سے پرورش کی اور گھریلو تعلیم بھی ایک خاص اہتمام کے ساتھ دلوائی۔ انکی معلمہ آغا کمال الدین سنجر کی رشتے کی بہن فرخندہ بیگم طہرانیہ تھیں۔ صرف و نحو، حساب و فقہ کے لئے ایک دوسرے معلم حضرت مولوی محمد یعقوب اسرائیلی مقرر تھے۔ اعلیٰ عربی تعلیم مولوی سید احمد صاحب ولایتی نے دی جو فرصت کے اوقات میں انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ دس سال کی عمر میں زاہدہ خاتون نے شعر کہا تھا ؎

ایسی بنوں میں شاعرہ جیسی کوئی نہ ہو
سارا جہان نظم مری دیکھتا رہے

اور انھوں نے اس کمال کی منزل کو پا بھی لیا تھا۔ اپنی عمر کی پندرہ سولہ منازل طے کرنے کے بعد زاہدہ خاتون شروانیہ گاؤں کے ایک شریف اور امیر گھرانے کی بھولی بھالی، گھر میں پلی بے خبر، بے احساس، نازپروردہ اور الہڑ لڑکی نہ تھی بلکہ اس وقت اس کو ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال، بالغ نظر، خوش فکر شاعرہ اور ادیبہ کہا جا سکتا

تھا جس کی ذہانت اور ذکاوت لمحہ بہ لمحہ ترقی پر ہو۔" (حیاتِ ز۔خ۔ش" مؤلفہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد، دکن ۱۹۴۳ء ص ۷،۷)

زاہدہ تحصیل علم پر ٹوٹ کر گریں لیکن "والد کا منشا یہ نہ تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر چل نکلیں اگرچہ زاہدہ نے ذوقِ شعری انھیں سے ورثے میں پایا تھا، لیکن وہ کوئی سیدھا سادہ شعر بھی کبھی باپ کے سامنے لانے کی جرأت نہ کر سکی"۔

(نکتہ راز" شان الحق حقی عصری کتب کراچی ۱۹۷۲ء ص ۳۰۱)

ز۔خ۔ش کے مخفی نام سے اُن کی نظمیں مشہور ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہیں اور مشاہیر سے دادِ تحسین لیتی رہیں۔ حضرت اکبرالہ آبادی نے جن سے وہ خاص عقیدت رکھتی تھیں خواجہ حسن نظامی کے مکان پر ان کے کلام کے متعلق کہا تھا "اگر یہ اشعار کسی خاتون نے کہے ہیں تو مردوں کو دعویٰ شاعری سے ہاتھ اٹھا لینا چاہیئے۔"

(حیات ز۔خ۔ش۔ متذکرہ۔ ص ۷۷)

دراصل اس زمانے میں خواتین میں تعلیم کا ایسا فقدان تھا کہ لوگوں کا یہ باور کرنا بھی مشکل تھا کہ کوئی گھریلو لڑکی ایسی شاعری بھی کر سکتی ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام ان کے انتقال کے بعد ۱۹۲۱ء میں دارالاشاعت پنجاب سے "فردوس تخیل" کے نام سے شائع ہوا۔

زاہدہ خاتون اصلاحِ معاشرت "خصوصاً آزادیِ نسواں کی خصوصی طلبگار تھیں۔ انھوں نے عورتوں جو مردوں کو بڑی دلسوزی سے انقلاب پر اُبھارا ہے، خاص طور عورتوں کو اپنے حقوق طلب کرنے اور سیاسی شعور پیدا کرنے کی بڑی پُرجوش تلقین کی ہے۔" (نکتہ راز۔ متذکرہ ص ۲۹۲) ؎

کس طرح افراد پر واجب نہ ہو اصلاحِ قوم
فرض عین باغباں کیا باغ پیرائی نہیں (رسالہ خاتون علی گڑھ جولائی ۱۹۱۲ء)

ہندوستانی اسلامی معاشرہ میں عورت کی بے بسی کا ایک واضح خاکہ ان کا مندرجہ ذیل شعر ہے ؎

سراپا جرم ہوں کس کس خطا کا نام لوں زینت
مسلماں ہوں صداقت کیش ہوں ہندی ہوں عورت ہوں

(فردوس تخیل، ص ۱۶۲)

"ان کا طویل مسدس "آئینہ حرم" اقبال کے شکوے کا ہم رنگ وہم آہنگ ہے یہ ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا تھا جب شاعرہ کی عمر ۱۲ سال تھی ؎

دل کو ارماں کہ زنِ ہند کا کچھ حال لکھوں
طبع حیراں کہ میں الفاظ کہاں سے لاؤں

میں پریشاں کہ پشیماں نہ کرے بختِ زبوں
ہاں کہی بات پرائی ہے کہوں یا نہ کہوں

آگیا لب پہ مگر ذوقِ تکلم سے سخن
منہ پہ آئی بھی کہیں رکتی ہے اے مشفق من

(فردوس تخیل ص ۱۱۹)

مندرجہ ذیل اشعار میں عورتوں کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے بڑا پر تاثیر ہے۔ جستہ جستہ اشعار دیکھئے:

ڈاکٹر کہتے ہیں در کھولو ہوا آنے دو
سنگدل کہتے ہیں ہرگز نہیں مرجانے دو

خود بھلے بنتے ہیں اوروں کو برا کہتے ہیں
"ناقص العقل" ہمیں یہ عقلاء کہتے ہیں

پُر دغا کہتے ہیں بے مہر و وفا کہتے ہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا کہتے ہیں

جسمِ اسلام کو افگار کیا ظلم کیا
نصفِ محمود کو بیکار کیا ظلم کیا

ان کو رہ رہ کے ستاتا ہے یہ بے عقل خیال
گھر میں پڑھ لکھ کے خواتین کا رکنا ہے محال

کہیں اُٹھے نہ مساوات کا غم خیز خیال
کہیں ہو جائے نہ مردوں کی حکومت کا زوال

ہائے ان خود غرضوں کو نہیں اتنی بھی خبر
زوجۂ جاہلہ ہے آفتِ جانِ شوہر

(ایضاً ص ۱۲۲-۱۲۳)

عروجِ اسلام کے زمانے میں مسلم خواتین کے کارناموں کا ذکر یوں ہے۔

ہم تھے اس عہد ہمایوں میں نہ یوں مشقِ ستم
بے دل و روح اندھا دھند نہ کہلاتے تھے ہم

قفسِ خشت میں گھٹ گھٹ کے نکلتا تھا نہ دم
ہم نے کھائی تھی نہ یوں گھر سے نکلنے کی قسم
عضوِ مفلوج کی مانند نہ بے کار تھے ہم
قصرِ اسلام کی تعمیر میں معمار تھے ہم

(ایضاً ص ۱۲۶-۱۲۷)

بیسویں صدی کا دوسرا دہا فرسودہ جاگیردارانہ نظام کسی خاتون کو آہ کھینچنے کی اجازت بھلا کب دے سکتا تھا۔ زاہدہ خاتون بھی "زمانے کی ہوا" لگ جانے کے

طنز کا شکار ہوئیں ذہین مجاہدہ بھی ہتھیار ڈالنے والی شخصیت نہیں تھیں۔ انھوں نے اس طنز کا جرأت مندانہ جواب دیا ؎

نہ ہوتا گر اثر ہم پر زمانے کا تو حیرت تھی
اثر ہونے پہ کیوں ہے شیخ حیراں وقفِ حیرت ہوں

ان کا عقیدہ تھا کہ مذہب کی طرح عورتوں کی سیاست سے بے خبری بھی قوم کو قعرِ مذلت میں ڈھکیل دے گی اور باعثِ ادبار ہوگی۔" رسالہ استانی، بابت ماہ ربیع الاول ۳۶ھ سیاسی استانی کے عنوان سے انھوں نے لکھا" تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تمام بڑے آدمیوں کی مائیں خاص قسم کے دل و دماغ والی خواتین تھیں۔ فاتح کی ماں بہادر مصلح کی حدت طراز اور ولی کی فنا فی اللہ۔ جس طرح انفرادی طور پر ایک مرد کا اخلاق عورت ہی کا بنا یا بگاڑا ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح اجتماعی حیثیت سے ایک قوم کی اخلاقی، مادی ترقی قومی ماؤں کی دماغی حالت سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر آپ سیاسی عظمت کی ٹھیکیدار قوموں پر نظر ڈالیں گے تو ملاحظہ کریں گے کہ ان کی عورتیں سیاست کا کیسا صحیح مذاق رکھتی ہیں اور حبِ وطن کے پاک جذبے سے کس قدر سرشار ہیں۔ ان کا وجود ماں کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ فلاحِ عامہ کے ہر ایک شعبہ میں کارکن کی حیثیت سے ملک و قوم کے لئے رحمتِ الٰہی ثابت ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی مستورات کو جاہل رکھنا اور پھر تعلیم دے کر سیاست سے بے تعلق رکھنا تھی۔ قومی ماؤں کی سیاست سے ناواقفیت کے سبب افرادِ قوم میں بھی صحیح سیاسی مذاق اور سچا جوش مفقود ہے۔" اگر آپ ذلت و ادبار کی تلخ غذا سے سیر ہو چکے ہیں تو مہربانی سے گذشتہ پر صلوٰۃ بھیج کر آئندہ کے لئے احتیاط کیجئے۔ تلافی کی صرف ایک ہی صورت ہے یعنی تعلیمِ نسواں کی نشر و اشاعت میں پہلے سے زیادہ سرگرمی دکھایئے اور تعلیم کے ساتھ انھیں اصول سیاست سے آگاہ کیجئے۔"

(حیاتِ ز۔خ۔ش۔ تذکرہ ص ۷۸، ۷۹، ۸۱)

زاہدہ خاتون نزہت کے یہ افکار و عقائد آج اتنا عرصہ گذر جانے پر بھی

بھی فکر و عمل کے محتاج ہیں۔

برطانوی سامراجیت اور جاگیردارانہ نظام کے جس گٹھ جوڑ میں زاہدہ خاتون نے آنکھ کھولی اسی کی بنیادوں پر غیر ملکی حکومت و آمریت کے قلعے کی تعمیر ہوئی تھی لیکن حب قومی اور جذبۂ حریت سے سرشار وہ ایک نڈر و بے باک مجاہدہ تھیں اپنے جذبۂ بغاوت کے دفاع میں انھوں نے کیا خوب کہا تھا ؎

علم بردارِ حریت ہوں حکم شاہ عالم سے
نہ سمجھو مجھ کو باغی تابع قانونِ قدرت ہوں

اسی کی سمت چل دینے کی ٹھانی ہمت دل نے
کہا جس رہ گذر نے معرض خوف ہلاکت ہوں

(فردوس تخیل، ص ۱۶۴۔ ۱۶۵)

یہاں اس موقع پر ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال پر ایک سرسری نظر ڈالنا ضروری ہوگا۔ سیاسی اعتبار سے یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے نئی کروٹ بدلی تھی۔ ان میں قوم پرستی کی ایک نئی روح پیدا ہو چکی تھی۔ اندرون و بیرون ملک اسلامی معاملات جیسے ہندو مسلم یونیورسٹیوں کا قیام، استرداد تقسیم بنگال، ہندو مسلم اتحاد، شہادت مسجد کانپور، جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور پھر جنگِ عظیم جیسے مسائل نے اہلِ ملک اور عالم اسلامی کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ ن۔ خ۔ ش کے اشاراتِ مخفی سے زاہدہ خاتون بے تکان لکھ رہی تھیں اور ہندوستان کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ان کے دلچسپ مضامین اور پرمغز نظمیں خصوصی مقبولیت حاصل کر رہی تھیں جن کا بیشتر حصہ اخبار 'زمیندار' لاہور میں شائع ہوتا تھا۔ زمیندار لاہور کو ضمانت و قید و بند کی صعوبتوں کا اکثر سامنا رہتا تھا۔ زاہدہ خاتون ان ضمانتی چندوں میں دل کھول کر حصہ لیتی تھیں ان کے سیاسی خیالات پر اس زمانے کے قومی اخبارات زمیندار، ہمدرد اور الہلال

کا گہرا اثر تھا۔ ان اخبارات کے افکار اور تخیلات کو ان کے سیاسی معتقدات کی اساس کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار 'الہلال' ملک بھر میں بے مثال مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ زاہدہ خاتون مولانا کو اخی فی الدین مانتی تھیں۔ مسجد کانپور کے سلسلے میں ان کے ساتھ جو برتاؤ ہوا اس پر اپنے ایک خط میں وہ لکھتی ہیں "کیا تم نے اخبار 'ہمدرد' دہلی میں آزاد بھائی پر پولیس کانپور کا ظلم دیکھا؟ کیا رئیس الاحرار سلمہ الرب سے پولیس کی مخصوص اہانتیں مثلاً تمام پولیس اور افسرانِ پولیس کا ان کی شکل دیکھتے ہی پہچان لینا اور برادر ممدوح کا فوٹو ان کے پاس سے نکلنا، ان کو کسی سے عام بات کی اجازت نہ دینا۔ ٹائیلر کی سخت بدکلامی، مسجد، جیل خانہ، ہوسپٹل کے دیکھنے سے روکنا اور بالآخر کانپور سے نکلوا دینا، ان کا لیفٹیننٹ گورنر کو تار دینا، وہاں سے جواباً عدم مداخلت کا اعلان کیا جانا ان تمام باتوں پر مطلع ہو کر بھی تم عنانِ ضبط مضبوط تھامے رہو گی۔" (سوانح حیات مذکرہ ص ۱۵)

واقعہ کانپور پر ان کی متعدد نظمیں "زمیندار" لاہور میں شائع ہوئیں جنگِ طرابلس کے غمگین تاثرات کو لے کر جب علامہ شبلی نے ملک و ملت کو خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کی ؎

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

تو زاہدہ خاتون خلوصِ دل سے لبیک کہہ کر آلِ عثمان کی مدد کے لئے تیار ہو گئیں اور دامے درمے، قدمے سخنے اپنی تمام تر مساعی جمیلہ کو ان کے لئے وقف کر دیا۔ انھوں نے طرح طرح سے صرف چندہ ہی جمع نہیں کیا بلکہ اپنے قلم کا بھی بھرپور استعمال کیا۔ اسی زمانے کی ان کی مشہور مثنوی موسومہ "عالمِ خواب"، جس کے اشعار تعداد میں ستتر ہیں ۱۹۱۳ء کے رسالہ خاتون علی گڑھ میں شائع ہوئی۔ الحاقِ طرابلس اور شرائطِ صلح پڑھ کر تمام عالمِ اسلام کی مانند زاہدہ خاتون کو بھی از حد ملال ہوا اور اس واقعہ کی تاریخ مندرجہ ذیل رباعی میں نکالی ؎

کیا پوچھتے ہو آہ سراغ طرابلس
گلچیں ہوا ہے قابض باغ طرابلس
نزہت جو پوچھے حادثۂ جاں گسل کا سال
کہہ دو بکا کے ساتھ ہے داغ طرابلس

۲۳   ۱۳۳۰ھ   ۷ - ۱۳

(فردوس تخیل، ص ۳۵۷)

لیکن یہ مذہبی المیہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ دول یوروپ کی ریشہ دوانیوں کے سبب جلد ہی جنگ بلقان شروع ہوئی۔ اس بار سلطنت عثمانیہ کا مقابلہ سربیہ، بلغاریہ، رومانیہ اور جبل اسود تھا جن کی پشت پناہی یوروپین طاقتیں کررہی تھیں حکومت ہندوستانی مسلمانوں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کررہی تھی اس کے باوجود مسلمانوں نے جہاد بالمال میں دل کھول کر حصہ لیا۔ زاہدہ خاتون کے افکار و خیالات کی ملک بھر میں دھوم تھی؛" اپیل منظوم برائے امداد ہلال احمر" عید کی خوشی میں شہداء کی یاد" مرثیہ کنگ جارج والی یونان" زندہ بادا نور پاشا اور" آشوب اسلام" اس زمانے کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ بطور نمونہ ملاحظہ ہوں" آشوب اسلام" سے دو اشعار ؎

نہ ہو گی نقشہ بلقاں میں اپنے بھر ترمیم
نہ تھا ارادۂ ایفا تو کیوں قرار کیا

فلک زردوں کو ستانا یہی ہے کیا انصاف
فغاں فغاں کہ زمانے سے اٹھ گیا انصاف

("خاتون" علی گڑھ اپریل ۱۹۱۳ء ص ۱۴۱)

پہلی جنگ عظیم کے دوران اپنی مشہور نظم" موصل کا تیل" میں بھی انھوں نے کھل کر اپنے درد دل کا اظہار کیا ہے۔ اسی زمانے کی ایک اور نظم" جلوۂ شب" کے عنوان سے ۱۸ جولائی ۱۹۲۰ء کے زمیندار میں شائع ہوئی۔ جس پر اظہار خیال کرتے

ہوئے مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار نے لکھا تھا "گو نورجہاں بیگم اور زیب النساء بیگم خود تو دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کی ایک معنوی یادگار اب بھی ہندوستان کے عالم نسواں کا سرمہ بینش ہے۔" (بھارت کی دیویاں مرتبہ محمد الدین فوق لاہور ۱۹۲۱ء ص ۵۵)

قومی رہنماؤں کی شخصیتیں بھی زاہدہ خاتون کی توجہ کا خاص مرکز تھیں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی اور آنجہانی گوکھلے ان سب کی وفات کے قومی حادثے پر ان کے قلم نے کھل کر اشک فشانی کی۔ مرثیہ ہائے شبلی کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

دامن صبر کاٹ لے سوزن سے رشتہ تو
یوں چاک ہو کہ پھر نہ کبھی ہو سکے رفو
اشک گہر فشاں تو مرا ہی سپیے لہو
بہہ بہہ کے گرد ہوئے نہ دریا کی آبرو
ہاں برقِ آہ اور ذرا زور سے چمک
اُٹھ اے فغانِ دل سوئے عرش بریں لپک
ہاں گر کے خاک پر تڑپ اے رفعتِ خیال
اے قوتِ بیان تو رو رو کے ہو نڈھال
خاک اے عروسِ نظم تو تزئین مو پہ ڈال
غم اپنی بے سری کا کر اور کھول سر کے بال
قومی شرف کا آج پھٹا جامۂ حیات
پائی جناب شبلی علامہ نے وفات

(فردوسِ تخیل، ص ۳۲۹)

شمس العلماء مولانا حالی کی رحلت پر ان کے قلم نے "وائے حالی" کے نام سے اشک فشانی کی ؎

نام چمکے گا "مسدس" سے سدا جوں خورشید
مرنے دیگی کبھی اس کو نہ "حیاتِ جاوید"

(فردوسِ تخیل، ص ۳۲۵)

آنجہانی گوکھلے کی وفات پر بھی زاہدہ خاتون کا دل تڑپ اٹھا تھا ؎

کیوں یاس ہو نہ مجھ کو بہبودِ ہندیاں سے
سنتی ہوں گوکھلے بھی رخصت ہوئے جہاں سے
بڑھتی ہوئی امیدیں اٹھتی ہوئی امنگیں
مٹی میں مل گئیں سب اس مرگِ ناگہاں سے
ماتا کی پہلے سیوا صحت کی فکر پیچھے
ایسا سپوت بھارت تو لائے گی کہاں سے
حب وطن ہمیں بھی اور گوکھلے کو بھی تھی
پر تھا وہاں تعلق دل سے یہاں زباں سے
سرگوشیاں کریگی اک روز آسماں سے
ہاں ہاں یہی ادھوری تعلیم گوکھلے کی
تعلیم ابتدائی ہو کر رہے گی لازم
روشن کرے گی آنکھیں تنویر گوکھلے کی
حب وطن کو جزوِ ایماں کہا گیا ہے
واعظ سمجھ کے کیجو تکفیر گوکھلے کی
اے معترض حصار باطل ہو لاکھ محکم
کرلے گی پر صداقت تسخیر گوکھلے کی

(فردوسِ تخیل، ص ۳۲۶)

"ماتمِ شیخ الہند" میں وہ ان کی رحلت پر یوں آنسو بہاتی ہیں ؎

جس کا منہ دیکھو وہی ہے اشکِ خوں برسا رہا
جس جگہ جاؤ وہیں ہے نالۂ نا منتہا
حیرتِ دانش نے پوچھا کس کا غم ہے قوم کو
ہائے محمود الحسن کا غم ہے ہاتف نے کہا

---

۱۲ ھ ۴۹

زاہدہ خاتون علی برادران سے بھی خاص عقیدت رکھتی تھیں ان کی نظر بندی پر بھی "حبسِ مشق" کے نام سے ایک نظم "فردوسِ تخیل" میں شامل ہے۔

ز۔ خ ۔ ش۔ نے بھونرے میں پرورش پانے کے باوجود اپنے کلام میں جس بیدار مغزی اور صحتِ فکر کا ثبوت بہم پہنچایا ہے وہ بجائے خود کمال کی بات ہے وہ کہاں اور ترقی پسند تحریک کہاں لیکن اس نے اپنے ہی زمانے میں مزدور اور کسان کی دردمندی میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا تھا۔ یہ کسی تحریک کی پاسداری نہ تھی محض اس کے باشعور دل کی آواز تھی"۔ ؎
(نکتہ راز تذکرہ ص ۲۹۰)

علم و تہذیب و ترقی و شکون و تفریح
ہیں ظہورِ عمل سحر نمائے مزدور
ثبت جس پرزے پہ ہے ملکیت سرمایہ
کس کا مرہونِ کرم ہے وہ سوائے مزدور
کل جہاں اس کیلئے جیل ہے پھانسی گھر ہے
خاص کر ہند تو دوزخ ہے برائے مزدور
(فردوسِ تخیل ص ۲۳۰-۲۳۱)

ملکی سیاست کے بارے میں ان کے پختہ شعور کا اندازہ ایک مضمون کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ "ہمارا قومی جوش جس قدر اپنی خوفناک

شدت کے لئے دنیا میں مشہور ہے اسی قدر سرعت فنا میں زبان زد خلائق ہے۔ ہمارا مجموعہ سیاست کیا ہے؟ ایک طومار خرافات، ہمارا میدانِ عمل کیا ہے؟ ایک بازیچۂ اطفال ہماری متفقہ آواز کیا ہے؟ ایک قہقہہ انگیز تمسخر ہمارے رہنما سیاست کو تسخیر عوام کا چلتا ہوا جادو، عزت حاصل کرنے کا نسخہ، سونے و چاندی کا مینہ برسانے والا چشمہ سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا رعب داثر اقوام عالم کے دلوں سے بالکل اٹھ گیا ہے"۔ (حیات فرخ بخش متذکرہ ص ۸۱) کیا یہ افکار و عقائد آج بھی مسلمانوں کی خصوصی توجہ کے مستحق نہیں؟

یہ وہ زمانہ تھا جب قومی سیاست کے بارے میں زاہدہ خاتون ایک مستحکم عقیدے پر پہنچ گئی تھیں۔ گاندھی جی کی شخصیت کا سحر ان پر بھی چل چکا تھا، قومی آزادی کا مطلب، سودیشی تحریک، ہندو مسلم اتحاد، حمایت مزدور وغیرہ سبھی سیاسی تحریکات جو اس وقت ہندوستان میں اپنے شباب پر تھیں وہ ان سب کی خلوص دل سے مرید تھیں ملکی اتحاد پر ایک نظم "ترانۂ اتحاد" میں وہ کہتی ہیں ؎

جنت کی دید سے ہے دل شاداں ہمارا
شکر خدا وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کہنے کو ہم ہیں ہندی حُبّ وطن ہے ایماں
کیا پُوچھتے ہو دین و نام و نشاں ہمارا

دورِ نفاق دم الاخوین چاہتا تھا[1]
شاکر ہے قاتلوں کا آرام جاں ہمارا

روتے ہیں ہم جو مل کر گنگ و جمن کی صورت
شاداب ہو کے ہنسنا ہے گلستاں ہمارا

---

[1] جلیان والا باغ کی طرف اشارہ ہے جہاں ہندو مسلمانوں کا مشترکہ خون بہا تھا۔

ہو جائے کاش ثابت روحوں کی کوچہ گردی
بن جائے کاش گاندھی ہر نوجواں ہمارا

جاں سے بدن سے خوں سے ہندوستان کے ہیں ہم
حیرت ہے کیوں نہیں ہے ہندوستاں ہمارا

(فردوس تخیل، ص ۲۴۰)

زاہدہ خاتون سودیشی تحریک اور ترک موالات میں عملی طور پر شریک ہونا چاہتی تھیں۔ سعادت مند بیٹی اور شفیق باپ کے خیالات میں تصادم ناگزیر تھا تاہم انھوں نے دیسی کپڑے پہننے کے عزم کا اپنی ایک تحریر میں عہد کیا: "اگرچہ ترکِ موالات کے طریق عمل سے بعض صورتوں میں مجھے اختلاف ہے اور نظام تحریک میں بھی تعلیمی مقاطع کو قابلِ اعتراض سمجھتی ہوں[1] مگر اس اہم اندرا علی اقدام حریت سے اصولاً مجھے اتفاق ہے اور سودیشی تحریک پر تو میں عاشق ہوں آج سے نہیں ہمیشہ سے اب چونکہ تازہ واقعات نے بدیشی مال سے ناقابلِ برداشت نفرت پیدا کردی ہے۔ اس لئے ان تمام مشکلات پر کامل غور کرنے کے بعد کبھی بدیشی کپڑا نہ خریدوں گی۔"

(حیات ز۔ خ ش۔ متذکرہ ص ۱۰۴-۱۰۰)

"قدرت اس کشش قلم پر مسکرا رہی تھی۔ اور یہ عہد پورا کرنے کی بشارت دے رہی تھی کہ "اب کبھی بدیشی کپڑا نہ خریدوں گی" اس تحریک کے ٹھیک گیارہویں روز یہ محبِّ وطن خاتون مرض الموت میں مبتلا ہو گئیں۔ ان کے چھوٹے بھائی داؤد احمد خاں نے وہی دیشی کپڑا ان پر اُڑھا دیا جو کہ اس عہد کے وقت انھوں نے اپنے لئے خریدا تھا۔"

(ایضاً ص ۱۰۶)

اس قبل از وقت حادثے پر سجاد حیدر یلدرم نے ۱۸ فروری ۱۹۲۲ء

---

[1] آنجہانی ٹیگور نے بھی تعلیمی مقاطع پر اس طرح کا اظہارِ خیال کیا تھا۔

کے تہذیب نسواں میں لکھا: "وہ عندلیب خوش الحان جس کے عرفان پاش نغمے قفس کی تیلیوں سے نکل کر ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے۔ یکایک خاموش ہو گئی...... وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی۔ قفس میں ہی تھی اور قفس میں ہی دم توڑ دیا۔"

اپنی جواں مرگ کا ذکر وہ بڑے رجائی انداز میں اس وقت سے بہت پہلے ہی کر چکی تھیں ؎

مرے رُخ کو چھپا کر خاک سے جب اقربا نکلے
پکاری معنوی صورت کہ زندہ ہوں سلامت ہوں

(فردوس تخیل، ص، ۱۶۵)

خدیجہ بیگم

خدیجہ بیگم کا تعلق ایک معزز سرحدی خاندان سے تھا، ان کے والد ضلع بنوں میں انسپکٹر مدارس تھے۔ پردے کی قیود کے باوجود انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی صوبہ سرحد میں مسلمان بڑی اکثریت میں تھے۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب کی رہنمائی میں وہاں کی سیاسی فضا پر کانگریس پوری طرح حاوی تھی۔

۳۰ر اپریل و یکم مئی ۱۹۳۰ء کو پنجاب صوبائی کانگریس کا اجلاس راولپنڈی میں ہوا۔ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صدر جلسہ تھے۔ جگت گرو سوامی شنکر آچاریہ۔ لالہ لاجپت رائے، خان عبدالقیوم پشاوری، مولانا سید حبیب ایڈیٹر سیاست کے علاوہ خدیجہ بیگم نے بھی اس میں تقریر کی۔ کھادی کے برقعے میں ملبوس انھوں نے تقریر کے ساتھ اس عظیم الشان جلسے میں ایک نظم بھی پیش کی جس سے ان کی حب الوطنی اور آزادیٔ مادرِ وطن کی خلش کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو نظم کے چند اشعار:

مسرور گو بظاہر رہتی ہوں میں زمن میں
کٹتا ہے وقت میرا اسیرِ گل چمن میں

اغیار نے بٹھایا سکہ میرے وطن میں
اس سے نہ چین دل میں نہ شانتی ہے من میں

جا کر چمن میں سنتی بلبل کے ہوں ترانے
کوئل کی میٹھی کو کو آتی ہے دل لگانے

آتی ہوں گو چمن سے بستی میں دل لگانے
لیکن ہو شانتی کیا جی کو کسی بہانے

ملتی ہے درد و غم سے کچھ بھی ذرا فراغت
ہوتا ہے گر ذرا سا بھی کم ملال فرقت

حسرت بھری نکلتی منہ سے ہے یہ عبارت
پھر اوج پر الٰہی کب ہوگا پیارا بھارت

خدیجہ بیگم نے نہ صرف خود ہمیشہ کھدر کا استعمال کیا بلکہ بنوں میں گلی گلی اور خانہ بخانہ پھر کر خواتین کو چرخہ کاتنے، کھدر پہننے اور سودیشی تحریک کو ترقی دینے کی ترغیب دیتی رہیں۔ (ماخوذ بھارت کی دیویاں مرتبہ محمد الدین فوق لاہور ۱۹۲۱ء ص ۳۲) ان کی بقیہ زندگی کی تفصیلات نیز قومی زندگی میں سرگرمیوں کا تذکرہ آزاد ہندوستان میں ملنا ممکن نہیں۔

خدیجہ بیگم کے علاوہ صوبہ سرحد کی کچھ اور خواتین کے نام بھی اکثر قومی رہنماؤں کے کاغذات میں پائے جاتے ہیں مثلاً گاندھی جی کے خطوط میں خان عبدالغفار خاں کی بیٹی مہر تاج اور ڈاکٹر خان صاحب کی بیٹی مریم کا متعدد بار ذکر ہے۔ مہر تاج گاندھی جی کے آشرم میں بھی رہی ہیں۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں نے اپنی پشتو سوانح عمری میں خواتین رضاکار کی حیثیت سے ان کا تذکرہ کیا ہے (دیکھئے تذکرہ صوفیہ سوم جی) بادشاہ خان نے اپنے بڑے بھائی عبدالغنی خاں کے تذکرے میں خورشید بہن کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ نہایت خوبصورت و بہادر خاتون تھیں۔ کابل سے جو بادشاہ خان کے خطوط شائع ہوئے ہیں ان میں ایک خط "خورشید بہن کے نام

بھی ہے۔ احمد آباد جیل سے ۲۲ر فروری ۱۹۳۰ء کو سری رام سنگھ بنوں والے کے خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ "خورشید بہن میری ملاقات کو آئی تھی۔ اس بہادر لڑکی کی میرے دل میں بہت عزت ہے۔ اس نے جس جرأت و قربانی اور تکلیفوں کو صوبہ سرحد کے افغانوں کے لئے برداشت کیا ہے اس کی مثال نہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے اس بہادر لڑکی خورشید بہن کی طرح تکلیفیں برداشت کی ہوں گی" (مکتوب سرحدی گاندھی ص۱۲ بحوالہ خط سرخپوش مجاہد آزادی خان غازی کابلی مرحوم مورخہ ۸ار دسمبر ۱۹۸۴ء) تفصیلات نہ ملنے کے سبب قومی شرکت سے متعلق ان بکھری ہوئی کڑیوں کو مربوط کرنا ممکن نہیں۔ البتہ وہاں کی سیاسی فضا کے پیش نظر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اور بھی سرحدی خواتین تحریک آزادی میں پیش پیش رہی ہونگی۔

اب ان کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ھیں

زبیدہ بیگم داؤدی

محترمہ زبیدہ بیگم کی پیدائش پارو گاؤں، ضلع مظفر پور (بہار) میں اکتوبر ۱۸۸۵ء میں ہوئی۔ ان کے والد مرحوم سید عبدالفتح سب رجسٹرار تھے اور پارو گاؤں نیز قرب وجوار میں بڑی زمینوں کے مالک تھے۔ زبیدہ بیگم کی شادی بہار کے مشہور ایڈوکیٹ اور ممتاز قومی رہنما شفیع داؤدی سے ہوئی جو مہاتما گاندھی، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت موتی لال نہرو کے ہم عصر تھے۔ مولانا شفیع داؤدی کے سیاسی نظریات کا زبیدہ بیگم نے پورا اثر قبول کیا۔ بی اماں (والدہ محمد علی) کا ان کے یہاں قیام اور ان کی شعلہ بار تقاریر سے بھی زبیدہ بیگم خصوصی طور پر متاثر ہوئیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کی ممبر تھیں اور اپنے معزز شوہر کی سیاسی سرگرمیوں میں برابر کی شریک تھیں۔

خلافت وتحریک عدم تعاون کے دوران مولانا شفیع داؤدی نے فعال کردار ادا کیا۔ انھوں نے قانون کی پریکٹس چھوڑ دی۔ اس وقت وہ تین ہزار روپے ماہوار کی پریکٹس کر رہے تھے۔ اتنی بڑی آمدنی ایک دم ختم ہوگئی لیکن زبیدہ بیگم نے خندہ پیشانی سے ہر قسم کی مالی سختیوں کا مقابلہ کیا۔ ان کی سابقہ بچت بڑی رہائش گاہ کی تعمیر اور ولایتی کپڑوں پر پہلے ہی صرف ہو چکی تھی۔

انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس جب تحریک عدم تعاون کے دوران مولانا شفیع داؤدی کو گرفتار کرنے کی خاطر شفیع منزل پہونچا تو تین چار سیڑھی چڑھ کر ہی مولانا کے کمرے کے سامنے والے برآمدے میں لڑکھڑا گیا۔ یہ مولانا کی شخصیت اور حب قومی کا رعب تھا جس نے اسے اتنا دہشت زدہ کر دیا تھا کہ وارنٹ گرفتاری بھی بمشکل تمام دکھا سکا۔ مولانا نے اسے بڑی فراخدلی سے خوش آمدید کہا اور بتایا کہ وہ چلنے کے لئے تیار ہیں۔ وہ اُٹھ کر زنان خانے گئے اور ہدایت دی کہ زبیدہ بیگم شفیع منزل چھوڑ کر فوراً تلک میدان کانگریس کے دفتر پہونچیں اور اس وقت تک وہاں قیام کریں جب تک مولانا کے خاص رفیق کار رام دیالو مظفر پور ہیڈ کوارٹر نہ پہنچ جائیں۔" جس سے عوام میں یہ تاثر پیدا نہ ہو کہ مولانا شفیع داؤدی کی گرفتاری سے قیادت میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ بیگم زبیدہ داؤدی فوراً ہی تلک میدان پہونچیں اور کانگریس کے دفتر میں اس وقت تک قیام کیا جب تک رام دیالو بابو نے آکر قیادت کی ذمہ داریوں کو نہ سنبھال لیا۔ مولانا کو ایک سال قید کی سزا ہوئی۔

زبیدہ بیگم نے سب سے پہلے اپنے شوہر کے تمام قیمتی ولایتی کپڑے (مولانا کا شمار اپنے زمانے کے مشہور جامہ زیب حضرات میں ہوتا تھا ان کے کپڑے کلکتے سے سِل کر آتے تھے) پھر اپنے نیز اپنے خاندان کے دیگر افراد کے ولایتی کپڑے بھی کانگریس کے دفتر تلک میدان بھیج دیئے۔ جہاں انھیں ہنسی خوشی آگ لگائی گئی۔ اس طرح ولایتی کپڑوں کی ہولی جلانے میں انھوں نے بقیہ لوگوں کی قیادت کی وہ اپنے ساتھ ایک یا دو بیٹیوں کو لے کر بگھی میں سوار دوپہر کو گھر گھر جایا کرتیں اور ولایتی کپڑے اکٹھا کرتیں۔ شفیع منزل کی شاندار سُرخ عمارت کے پورٹکو میں ایسے کپڑوں کا ڈھیر لگ جاتا، ہفتے کے اختتام پر ان میں باقاعدہ رسم کے طور پر آگ لگا دی جاتی تھی۔

زبیدہ بیگم ایک پردہ نشین خاتون تھیں، شوہر کے ہمراہ وہ ہر عوامی جلسے میں شریک ہوتی تھیں اور خود بھی خواتین کے جلسے منعقد کیا کرتی تھیں۔ وہاں

سبھی خواتین کا حوصلہ بڑھانے میں ہر ممکن مدد کرتی تھیں۔ جن کے شوہر نیز دوسرے عزیز قومی آزادی کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔ کھادی کے کپڑوں میں ملبوس خواتین شفیع منزل کی شاندار احاطے میں جمع ہوتی تھیں۔ بیگم زبیدہ چرخے کی کلاس بھی وہیں پر لیتی تھیں۔ اسی عمارت کے وسیع و عریض لان میں گاندھی جی نے بھی خواتین سے خطاب کیا تھا۔

تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں جن طلبار نے گورمنٹ اداروں سے اپنے نام کٹوالئے تھے۔ ان کی تعلیم کے لئے شفیع داؤدی احاطے میں قومی اسکول و کالج قائم کئے گئے تھے۔ روپیہ فراہم کرنے کی خاطر محب وطن خواتین کھانا پکانے سے قبل ایک ایک مٹھی اناج بچالیا کرتی تھیں۔ زبیدہ بیگم طلبار کی غذا و صحت کا خاص خیال رکھتی تھیں خصوصًا ان کا کھانا وہ اپنی نگرانی میں تیار کراتی تھیں۔ ان کے بڑے بیٹے جنھوں نے خود گورمنٹ ادارے سے اپنی تعلیم منقطع کر لی تھی میزبانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ لیکن مالی مشکلات اور حکومت کی طرف سے مستقل پریشان کئے جانے کے سبب یہ ادارے زیادہ عرصے تک نہ چل سکے۔

نہرو رپورٹ سے مخالفت کے سبب مولانا داؤدی کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تھے اور ۱۹۳۷ء میں احرار پارٹی کی شکست کے بعد سیاست سے بھی کنارہ کشی اختیار کی۔ ان کی تین سال کی طویل علالت کے دوران زبیدہ بیگم ان کی تیمار داری میں مشغول رہیں اور ۱۹۴۹ء میں ان کے انتقال کے بعد بقیہ زندگی خاموشی سے گذار دی۔ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا جب زبیدہ بیگم کو اپنا رہائشی مکان کرائے پر دے کر ایک مختصر سے مکان میں منتقل ہونا پڑا۔ گذر بسر کی خاطر زبیدہ بیگم نے اپنی زمینیں بھی فروخت کیں لیکن آزاد ہندوستان میں دستِ طلب دراز کرنا کبھی گوارا نہیں کیا۔

(بشکریہ جناب عطار الرحمٰن داؤدی ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر محنت و روزگار شمالی بہار مظفر پور۔ خط مورخہ ۹ مارچ ۱۹۸۰ء)

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

کنیز سیّدہ بیگم

کنیز سیدہ بیگم کی پیدائش ۱۸۹۰ء میں چھپرہ (سارن) بہار میں ہوئی۔ آپ سید مبارک حسین کی پوتی اور بہار کے ممتاز کانگریسی رہنما سید صلاح الدین کی چھوٹی بہن تھیں۔ اردو عربی و فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی، ان کی شادی جناب ریاست حسین صاحب سے ہوئی جو بیرسٹرایٹ لا تھے۔

کنیز سیدہ بیگم مہاتما گاندھی، علی برادران اور مولانا آزاد جیسے قوم پرست رہنماؤں کے سیاسی نظریات و عقائد میں یقین رکھتی تھیں اور انتہائی قوم پرور جذبات کی خاتون تھیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کی فعال ممبر تھیں انھوں نے سودیشی اور چرخہ تحریک کے لئے خواتین کو منظم کیا۔ تحریک خلافت کے دوران خواتین کے جلسوں کو خطاب کرتی تھیں۔ ان کی تمام سیاسی سرگرمیوں میں ان کے بڑے بھائی سید صلاح الدین حسین کی ہدایات شامل ہوا کرتی تھیں۔

۱۹۲۱ء میں کنیز سیدہ بیگم کے شوہر ریاست حسین صاحب کا صرف پینتالیس ۴۵ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ اس سانحے سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے سبھی سرگرمیوں سے قطع تعلق کر لیا اور ۱۹۵۵ء میں اپنی وفات کے وقت تک ایک مذہبی خاتون کی حیثیت سے خاموشی کے ساتھ زندگی گزار دی۔

(بشکریہ جناب ڈاکٹر اقبال حسین صاحب، سابق پرنسپل پٹنہ کالج و سابق ممبر بہار پبلک سروس کمیشن۔ نمائش روڈ پٹنہ۔ بہار۔ ذاتی انٹرویو۔ ۳ مارچ ۱۹۸۸ء)

منیرہ بیگم

منیرہ بیگم بہار کے ممتاز قومی رہنما مولوی مظہرالحق کی اہلیہ تھیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بدرالدین طیّب جی کی بھتیجی تھیں۔ ان کی شادی ۱۸۹۱ء میں مولوی مظہرالحق سے ہوئی جن کا پٹنہ کے بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق تھا انھوں نے لندن سے بار ایٹ لا کیا اور وہیں وہ گاندھی جی، مسٹر علی امام اور مسٹر سچدانند سنہا کے قریب آئے۔ سیاسی عقائد کے لحاظ سے وہ جداگانہ انتخاب کے حق میں نہیں تھے۔ اور ہندو مسلم اتحاد ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ انھوں نے پٹنہ سے باہر دِگھا کے مقام پر صداقت آشرم کی تعمیر کی اور مغربی طرز کی بود و باش نیز سبھی دنیاوی عیش و آرام کو تج کر فقیرانہ زندگی اختیار کی۔ اکبر حیدری کے نام گاندھی جی کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ منیرہ بیگم نے قوم و وطن کی خاطر اس عظیم قربانی میں شوہر کا پورا ساتھ دیا۔ خط کا متن حسب ذیل ہے۔

" آرہ جاتے ہوئے

۴ر دسمبر ۱۹۲۰ء

عزیز دوست! ہم ابھی ابھی بانکی پور پیچھے چھوڑ کر آئے ہیں۔ مظہرالحق

نوٹ:۔ بیگم حیدری اور بیگم مظہرالحق دونوں بہنیں تھیں اور طیب جی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔

ہمارے ساتھ ہیں۔ میں آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ گذشتہ شب میری بلائی ہوئی خواتین کی نشست میں بیگم مظہرالحق نے اپنے چار عدد ہیرے سے مرصع بیش قیمت کنگن ہمیں بطور عطیہ دیے ہیں۔ کیا آپ بیگم حیدری کو ایک ایسی خاتون کی بہن ہونے پر مبارکباد پیش کریں گے جو ملک و قوم کی خاطر اتنی بڑی قربانی دے سکے؟ جب انھوں نے کنگن پیش کیے تو میرا دل جذبات سے بھر آیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے طیب جی خاندان سے قریب ہونے کا موقع دیا۔"

(م۔ک۔گ)

(Collected Works of Mahatma Gandhi Vol.XIX 1920 - 1921, P. 70)

نفی سیاسی دین و دنیا کا سیق نیری حیات

عصمت آرا بیگم

جھوائی ٹولہ لکھنؤ کے حکیم عبدالقوی صاحب کو ملکی سیاست سے بہت تعلق تھا۔ خلافت کمیٹی کے ایک جلسہ میں علی برادران نے چندہ کی اپیل کی لوگوں نے بہت کچھ نچھاور کیا۔ عورتوں نے زیورتک پیش کیے۔ حکیم صاحب نے گھر آ کر اپنی بھتیجی عصمت آرا بیگم سے اپنے گھر خواتین کا جلسہ منعقد کرانے کی خواہش کی اور فرمایا کہ بدیسی کپڑوں میں آگ میرے گھر پر ہی لگائی جائے۔ عصمت آرا نے جلسے کے انعقاد کا نہایت خوش دلی سے اہتمام کیا اور بی اماں (والدہ مولانا محمد علی و شوکت علی) کی موجودگی میں بڑی شان سے جھوائی ٹولہ میں جلسہ ہوا۔ عصمت آرا کے علاوہ بی اماں نے بھی تقریر کی، اس جلسے میں حکیم صاحب نے گھر کے سارے بدیسی کپڑے جلوا دیے۔ عصمت آرا بیگم نے جہیز کے کپڑوں کو خود اپنے ہاتھ سے آگ لگائی اور اپنی شادی کا زیور اسی جلسہ میں بطور چندہ پیش کیا (حکیم سید ظل الرحمن: تذکرہ خاندان عزیزی ۱۹۰۸ ص ۲۲۳)

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

صغریٰ خاتون

صغریٰ خاتون عرف بگن کی پیدائش عثمان آباد ریاست نظام حیدر آباد میں ہوئی۔ والد کا نام سید ہادی اور والدہ کا سعید النسا تھا۔ بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے سبب وہ اپنی والدہ کے ساتھ اپنے ننہال موضع بھٹولی، ضلع بارہ بنکی آ گئیں۔ وہیں تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی محمد ضمیر صاحب سے ہوئی جو صرف چھ سال بعد ایک دو سال کی بچی زاہدہ کو چھوڑ کر طاعون میں انتقال کر گئے۔ سسرال میں جائداد کی رنجشوں کے سبب صغریٰ بیگم اپنے ماموں کے پاس لکھنؤ چلی آئیں۔ لکھنؤ میں ان دنوں تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی اور پردہ نشین خواتین بھی بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لے رہی تھیں۔ صغریٰ خاتون بھی تحریک آزادی میں سرگرم عمل ہو گئیں۔ وہ سروجنی نائیڈو، شریمتی موتی لال نہرو اور دوسری خواتین کے ساتھ سبھی زنانہ جلسوں میں شریک ہوتی تھیں اور باوجود برقعہ پوشی کے ستیہ گرہوں میں پیش پیش رہتی تھیں۔ جب ولایتی کپڑوں کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو دوسری خواتین کے ہمراہ وہ بھی دکانوں کے سامنے راستے روکنے میں شریک تھیں۔ اس وقت پولیس نے خواتین پر کوڑے برسائے۔ سروجنی نائیڈو زیادہ زخمی ہوئیں۔ پھر سب خواتین کو گرفتار کر کے

گل سے جلایا گیا اور درختوں کی شاخوں سے باندھ دیا گیا لیکن صغریٰ بیگم بر تقے
، سبب چھوڑ دی گئیں ۔ انھوں نے خود اپنے سبھی ولایتی کپڑوں کو آگ لگا دی
ی اور کھدر کا چوڑی دار پاجامہ و کرتا پہنا شروع کر دیا تھا جس پر ان کے ماموں
زیبوہ ہونے کے بعد ان کے سرپرست تھے ان سے ناراض رہنے لگے تھے ، سرکاری
لازم ہونے کے سبب وہ کھدر پہننے کے سخت مخالف تھے ۔

جب خلافت کے جلسے میں شرکت کی خاطر بی اماں پہلی بار لکھنؤ آئیں تو صغریٰ
خاتون بھی بی بی آفتاب النساء بنت شیخ عبدالرحمٰن قدوائی ساکن بڑا گاؤں کے
ساتھ بی اماں کے استقبال کی خاطر فرنگی محل گئیں اور تحریک خلافت کے زنانہ جلسوں
کی روح رواں بن گئیں ۔ جب بی اماں نے لکھنؤ میں چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا تو وہ
ایک تخت پر بیٹھ گئیں اور ان کے سامنے ایک چوکور کپڑا بچھا دیا گیا ۔ سب سے پہلے صغریٰ
بیگم نے اس پر اپنا پورا زیور لاکر رکھ دیا جو تقریباً پچاس تولے سونا اور کچھ جواہرات
پر مشتمل تھا (ان کے شوہر محمد ضمیر بڑے زمیندار تھے) اس کے بعد انھوں نے
ایک پُر جوش مختصر سی تقریر کی جس کا اثر یہ ہوا کہ وہاں پر موجود سبھی خواتین نے
اپنا سب کچھ لاکر چندے میں دے دیا ۔ اس وقت صغریٰ خاتون کے بیان کے مطابق
جواہرات سے لے کر ایک چونّی تک چندے میں آئی ۔ اس واقعہ کا ذکر انھوں نے
متعدد لوگوں سے کیا ۔ ہر بار اس کو بیان کرتے وقت ان کا چہرہ شدت جذبات سے
تمتما اٹھتا تھا ۔ اور آنکھیں پُر نم ہو جاتی تھیں ۔

تحریک کے دیگر کاموں کے سلسلے میں وہ بی بی آفتاب النساء کے ساتھ بی اماں
سے ملنے رام پور بھی جاتی تھیں ۔ گنگا پرشاد میموریل ہال میں بی اماں کی آمد کے موقع
پر " جان بیٹا خلافت پہ دے دو " کے ہنگامی اجلاس میں موصوفہ رضا کاروں
میں شامل تھیں اور جلسے کا نظم و نسق سنبھال رہی تھیں ۔ چندہ فراہم کرنے کے
سلسلے میں انھوں نے بارہ بنکی ، کانپور ، الہ آباد ، اور دہلی وغیرہ کے سفر بھی کئے ۔

صغریٰ بیگم کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور قومی و بین الاقوامی حالات سے

سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے کئی اخبارات ان کے مطالعے میں رہتے تھے۔ خود ان کے مضامین 'ہمدم'، 'زمیندار'، 'ہمدرد' میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کے پاس اخبارات نیز اپنے مضامین کا بڑا ذخیرہ تھا جو ایک بار گھر میں آگ لگ جانے کے سبب سب ضایع ہو گیا۔

نہرو خاندان سے صغریٰ بیگم کے خصوصی مراسم تھے وہ تفصیل سے اس خاندان کی طرزِ معاشرت کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ ۱۹۴۲ء کی بھارت چھوڑو تحریک میں بھی انھوں نے حصّہ لیا لیکن اسی دوران انھیں کئی بار حیدرآباد جانا پڑا جس کے تحت اس میں میں کوئی نمایاں کام نہیں کر سکیں۔

آزادی سے قبل وہ اپنی بیٹی اور نواسی و نواسوں کے ساتھ حیدرآباد دکن چلی گئی تھیں۔ گاندھی جی کی شہادت پر وہ تڑپ کر روئی تھیں اور کہا تھا کہ "قوم نے اپنے ہاتھوں ملک کے سب سے مضبوط ستون کو گرا دیا ہے۔" نظام کی حکومت کے خاتمے کے بعد وہ حیدرآباد سے ایک بار پھر لکھنؤ واپس آگئیں اور وہیں ۱۹۶۸ء میں ۱۰ مئی بروز جمعہ انتقال کیا۔ وہ ایک انتہائی باوقار و خوش شکل خاتون تھیں۔

(اطلاعات محترمہ سیدہ ضیا احتشام فرحت کدہ، سرسید نگر علی گڑھ اور محترمہ نفیسہ عزیز، تاریخ کی استاد کرامت حسین کالج لکھنؤ نے مہیا کیں۔)

باب سوئم

قافلے شوق کے رُکتے نہیں دیواروں سے
سینکڑوں محبس و زنداں کے دیار آئے ہیں

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

بی بی امتُ السّلام

بی بی امت السلام پٹیالہ کے ایک رئیس، محب وطن راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے والد کرنل عبدالحمید خاں ریاست پٹیالہ میں وزیر مالیات تھے۔ ان کی پیدائش غالباً ۱۹۰۷ء میں موتی باغ محل پٹیالہ میں ہوئی۔ بی بی امت السلام نے بچپن سے ہی آزاد طبیعت پائی تھی۔ ایک بیدار ولاغر جسم، بنی نوعِ انسان کی خدمت کا بے پناہ جذبہ، ملکی حریت کی تڑپ شک وشبہ سے بھرا دماغ اور روایات سے بغاوت کا آہنی عزم ان کی شخصیت کے متضاد پہلو تھے محبت وعقیدت سے بھرپور دل لئے وہ تمام سماجی بندشوں کو توڑ کر گاندھی جی کے سابرمتی آشرم پہنچی تھیں۔ طبعاً انتہائی سادہ لوح تھیں جس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے:" یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ گاندھی جی پہلے شخص تھے جنھوں نے مسٹر جناح کے لقب "قائدِ اعظم" کو رواج دیا۔ گاندھی جی کے آشرم میں ایک سادہ لوح مگر نیک خاتون تھیں جن کا نام امت السلام تھا۔ انھوں نے کچھ اخبارات میں مسٹر جناح کے نام کے ساتھ قائد اعظم لکھا ہوا دیکھا تھا جب گاندھی جی مسٹر جناح سے ملاقات کے لئے خط لکھ رہے تھے تو انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ اردو اخبارات مسٹر جناح کو قائد اعظم کہتے ہیں۔ اس لئے آپ بھی اسی نام سے

خطاب کیجئے۔ ایک منٹ سوچے بغیر کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے۔ گاندھی جی نے مسٹر جناح کو قائدِ اعظم کہہ کر خطاب کیا۔ جب ہندوستانی مسلمانوں نے دیکھا کہ گاندھی جی بھی مسٹر جناح کو قائد اعظم کہتے ہیں تو انھوں نے سوچا کہ حقیقت میں یہی رتبہ رکھتے ہوں گے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد، ہماری آزادی مترجمہ محمد مجیب اورینٹ لونگ مینس ۱۹۶۱ء ص ۱۹۱)

سنہ ۱۹۳۰ء، مارچ ۱۹۳۰ء کی ستیہ گرہ کے دوران ۲۵ سال کی عمر میں وہ سابرمتی آشرم پہنچ گئی تھیں بطور مہمان اور بن گئیں غلام "یہ گاندھی جی کی شخصیت کا سحر تھا مگر کیسا؟

اور ہی کچھ ہے گرفتاریٔ دل کی ترکیب
سختیٔ طوق و گرانباریٔ زنجیر نہیں

ایک جاگیردار گھرانے کی مسلم لڑکی، پردے کی سخت قیود کو توڑ کر جنگِ آزادی میں خود کو ہر قربانی کے لئے تیار کرنے کی خاطر کس طرح آشرم پہنچی، یہ ایک ناقابلِ یقین کہانی ہے، سُنیئے ان کی اپنی زبانی، "باپو کے پاس"

"میری پیدائش پٹیالہ کے اس مشہور خاندان میں ہوئی جس کے ہندو سکھ سبھی خاندانوں سے انتہائی خوشگوار تعلقات تھے اور اس دوستی و خلوص کو یاد کر کے ہم سبھی محبت کے آنسو بہاتے ہیں۔ اس خاندان میں مذہبی تفریق کا کبھی سوال ہی نہیں اٹھا۔ میرے والدِ مرحوم محمد عبدالحمید خاں مجھے تیرہ سال کی عمر میں چھوڑ کر چل بسے۔ میں اپنی والدہ امتہ الرحمن کی اکلوتی لڑکی اور چھ بھائیوں کی ایک بہن تھی۔ والد کا اس دنیائے فانی سے گذر جانا میری زندگی کا پہلا حادثہ تھا جس کی چوٹ سے آج تک نہ سنبھل سکی۔

میں تیرہ سال کی عمر میں قرآن مجید مع ترجمہ اور چند مذہبی کتابیں ہی ختم کر سکی تھی۔ ہمارے خاندان میں پردے کی اتنی سختی تھی کہ صرف حقیقی بھائیوں کے سامنے ہی آنے کی اجازت تھی، اس لیے اسکول جانے کا تو سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ والدِ مرحوم مجھے علی گڑھ لڑکیوں کے اسکول بھیجنے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ ان میں سماجی بندشوں کو توڑنے اور قومی ترقی کی خاطر کوئی بھی قدم اٹھانے کی جرأت بھی تھی لیکن افسوس کہ اس کا فائدہ مجھے نہ مل سکا اور میری تعلیم اردو لکھنے پڑھنے تک ہی رہ گئی۔ والد کے انتقال کے بعد والدہ کو جلد ہی میری شادی کی فکر ہوئی میرے بڑے بھائی محمد عبدالرشید خاں جنھوں نے قومی خدمت کے لیے راستہ ہموار کرنے میں میری رہنمائی کی ۱۹۲۱ء میں بیرسٹری چھوڑ کر قومی جنگِ آزادی میں کود پڑے تھے۔ انھوں نے والدہ کو سمجھایا کہ اتنی کم عمری میں شادی میں گناہ سمجھتا ہوں۔ آپ نے ایسا کیا تو میں بہن کی شادی میں شرکت نہیں کروں گا۔ اب اس کے بعد چھوٹے بھائیوں کی جرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بچپن سے ہی مجھے دنیاوی عیش و آرام، زیورات اور کپڑوں سے دلی نفرت تھی۔ یوں میرے سامنے نہ کوئی نصب العین تھا نہ ہی مجھ میں اپنے جذبات کا ماں یا بھائیوں کے سامنے اظہار کرنے کی جرأت تھی۔ ماں اکلوتی بیٹی کے لئے ہمیشہ ریشم و زردوز کپڑے اور زیورات تیار کراتیں جو مجھے ناگوار گزرتا تھا۔ میری صحت ابتدا سے ہی خراب تھی، جسم میں کمزوری تھی اور سابرمتی آشرم جانے سے پہلے ہی میں ٹی۔ بی کا شکار ہو چکی تھی۔ اس درمیان والدہ نے پھر بڑے بھائی پر میری شادی کے لئے زور دیا۔ بھائی نے بمبئی میں ڈاکٹر بلیموریا سے مشورہ کیا۔ میں پردے کے پیچھے سے سن رہی تھی، انھوں نے کہا کہ "بخار رہتے ہوئے شادی میں جان کا خطرہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ تین سال تک بخار نہ رہے"۔ اب میں ہر ممکن طریقے سے صحت خراب کرنے پر تل گئی تھی جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہوں۔

بیس سال کی عمر میں کچھ صحت سنبھلی تو بھائیوں نے پھر میری پسند کی بات شروع کی۔ میری پسند کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ مجبوراً کہا "آپ جہاں مناسب سمجھیں میری شادی ضرور کر دیں لیکن میری طرف سے شوہر کو دوسری شادی کر لینے کی پوری اجازت

ہو گئی؛ بھائیوں کو ایک طرف میری پسند کی خواہش تھی۔ دوسری طرف دنیا کا خوف تھا کہ والد کے بعد چھ بھائی ہوتے ہوئے بھی ایک بہن کی شادی نہ کر سکے۔

۱۹۲۲ء میں بڑے بھائی عبدالرشید خاں ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے چھ ماہ کے لئے جیل گئے۔ قوم پرستی کا جوش بڑھ رہا تھا، میں نے برقعہ پہن کر انبالہ میں گلی گلی کھادی کی تبلیغ اور کھادی فروخت کرنا شروع کیا۔ میں مختلف جلسوں میں بھی شرکت کرنے لگی تھی (بیگم محمد علی جوہر اور ان کی والدہ "بی اماں" کے اکثر پنجاب کے دورے ہوا کرتے تھے ان دوروں کا بھی میرے اوپر گہرا اثر تھا۔ بھائی رشید چھ ماہ جیل رہے اس دوران گھر میں سب بچوں کے جسم پر کھادی ہی کھادی تھی، والدہ نازک مزاج تھیں، موٹی کھادی پہننے سے ان کے جسم پر زخم ہو گئے تھے۔ تحریک خلافت کے دوران ہندو مسلم اتحاد کے جو نظارے دیکھنے میں آئے انھیں بھلانا ممکن نہیں۔ باپو کے اکیس دن کے برت کا بھی میرے دل پر گہرا نقش ہے۔

میرے سامنے اب مستقبل کا سوال تھا۔ شادی نہیں کرنا تھی لیکن زندگی کا کوئی مقصد تو ہونا چاہیئے۔ اخبارات میں باپو کی مختلف تحریکات کے بارے میں تو پڑھتی ہی رہتی تھی۔ ڈانڈی کوچ میں حصہ لینے کو بے اختیار دل مچلا لیکن آزادی کی کسی تحریک میں عملاً حصہ لینے کی اس کے لئے گنجائش ہی کہاں تھی جو خود آزاد نہ تھی۔ پٹیالے میں تو پردہ تھا ہی لیکن ۱۹۲۵ء تک بمبئی میں کافی حد تک اس سے آزادی تھی۔ بھائی عبدالرشید غلامی میں بیرسٹری نہ کرنے کا عہد کر چکے تھے۔ ان کے دوست انھیں مہاراجہ اندور کا سکریٹری بنا کر اندور لے گئے۔ بھائی کی لائبریری میں باپو کی خود نوشت سوانح عمری تھی۔ میں نے ایک بار شروع کی تو ختم کر کے ہی دم لیا۔ مجھے مستقبل کے لئے نئی روشنی بنا نصب العین مل گیا تھا۔ جب بھائیوں سے کہا میں سابرمتی آشرم جانا چاہتی ہوں تو وہ ہنس کر ٹال گئے۔ میری مشکل تھی کہ کسی کو جانتی بھی نہیں تھی۔ باپو سے بھی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، میرا بہن کا نام اخبار میں پڑھا تھا، انھیں کو خط لکھا۔ جواب کافی انتظار کے بعد آشرم کے منتظم نارائن داس گاندھی نے دیا: "تمہارا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟" کچھ گھر کی حالت پوچھی تھی گھر

میں کوئی دکھ تو نہیں؟ تندرستی کا سرٹیفکٹ بھی مانگا تھا۔ اسے لینے میں نارنول سے
بمبئی ڈاکٹر بلیموریا کے پاس گئی۔ ڈاکٹر جنھوں نے میری ٹی۔ بی کا تین سال تک علاج
کیا تھا سُن کر ہلکی سی ڈانٹ سنائی "کیا بات کرتی ہے، تیری ایسی طبیعت کہاں کہ آشرم
کی سخت زندگی گزار سکے"۔ سچائی کی پرستار میں بچپن سے ہی تھی۔ نہیں تو نارنول سے
دلی بہت دور نہیں تھی وہاں سے بہ آسانی کسی ڈاکٹر کا سرٹیفکٹ لے کر بھیج سکتی تھی
میں نے ڈاکٹر بلیموریا سے کہا میں سچا سرٹیفکٹ بھیجنا چاہتی ہوں۔ آپ میری جسمانی کمزوری
سے واقف ہیں۔ چار سال سے آپ کے زیرِ علاج ہوں۔ آپ کو جو بھی لکھنا ہو لکھ دیں
میں جاؤں گی نہیں بھیج دوں گی میری قسمت ہے۔ مرحوم ڈاکٹر بلیموریا نے لکھ دیا کہ "میں چار
سال سے اس کا علاج کر رہا ہوں ٹی بی تھی لیکن اب ٹھیک ہے۔ مجھے ڈر ہے یہ آشرم
کی سخت زندگی نہیں گزار سکے گی"۔ میں نے وہی آشرم کو بھیج دیا اور لکھا کہ آنے کیلئے اجازت
کی منتظر ہوں۔ اس کا جواب آنے میں بھی کافی دیر لگی جب کہ میرے لئے ایک ایک منٹ
بھاری تھا۔ بھائی نے خط کھولا اور ہنستے ہنستے کہنے لگے، "تو تمہیں وہاں داخل کرنے
کے لئے کوئی تیار نہیں"۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی بھائی برداشت نہ کر سکے
اور خط مجھے دے دیا اس میں لکھا تھا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو داخل نہیں کر سکتے
ہاں آشرم کی زندگی دیکھنے آپ بطور مہمان یہاں آ سکتی ہیں"۔ میں خوشی سے اچھل پڑی
دل میں یہ بھی خیال تھا کہ جانے کے لئے بھائیوں پر کیوں بوجھ بنوں۔ ماں کے مجبور کرنے
پر ہاتھ، کان اور گلے میں زیور تو رہتے ہی تھے، انھیں کو فروخت کرنے بمبئی کے
جھویری بازار گئی، کچھ دلال پیچھے لگ گئے جو کچھ ہاتھ آیا وہ بس اتنا تھا کہ آشرم پہونچ
کر دودھ، گھی کے کوپن لینے کے بعد صرف پانچ روپے باقی بچے انھیں میں نے وہاں جمع
کر دیا۔ دو چار دن میں ہی باپو احمد آباد آئے وہ شام کو سابرمتی کے کنارے ٹہلنے آتے تھے
آشرم والے ان سے یہیں ملتے تھے میں نے بھی اپنی رام کہانی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں
لی تھی کیونکہ میں نہ ہندی جانتی تھی نہ گجراتی، باپو نے محبت سے استقبال کیا یوں
جیسے ہمارے برسوں پرانے تعلقات ہوں۔ میری جو کیفیت تھی اسے الفاظ میں

ممکن نہیں۔ خیر باپو نے دوسرے دن دوپہر کو شری امبالال سارہ بھائی کے گھر ملنے کا وقت دیا۔ خط میں میں نے لکھا تھا کہ "آشرم میں رہ کر آپ کے سائے میں ملک کی خدمت کے لئے تیار ہونا چاہتی ہوں لیکن جسمانی طاقت نہ ہونے کے سبب مجھے داخلے کی اجازت نہیں ملی ہے۔ آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔" باپو نے کہا "اگر حقیقت میں تمہاری یہ دلی خواہش ہے تو جسم آشرم کی سخت زندگی کو برداشت کرلے گا۔" جب چاہو مجھ سے مل سکتی ہو، داخلے کی فکر مت کرو، جسم جتنی اجازت دے اتنا ہی کام کرو بس پھر کیا تھا "گئی تھی مہمان بن کر اور بن گئی غلام"۔

میں نے بھائیوں کو لکھ دیا کہ اب آپ میری فکر نہ کریں۔ میں کتائی بنائی، دھنائی کے کورس سیکھنے میں لگ گئی دو گھنٹے باورچی خانے میں کام کرتی، کوٹھار میں رہتی، پھر کھن باڑے میں جاتی، وہاں کے بھائی بہنوں سے مجھے غیر معمولی محبت تھی۔ گنگا بہن دیو کی محبت مادرانہ شفقت جیسی تھی پیارے لال بھائی کی والدہ تو پنجابی زبان بھی جانتی تھیں۔ اپنی بچی کے مانند پیار کرتیں جس کا احسان بھلا نہیں سکتی۔ آشرم کے سبھی اصولوں کو میں مجبوراً نہیں شوق سے پورا کرتی تھی۔ علی الصبح ندی پر جاکر نہا لیتی تھی کیونکہ میں کپڑے پہن کر نہانے کی عادی نہیں تھی۔ میری ناواقفیت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کو لالٹین جلاتے نہیں دیکھا تھا۔ دوسروں سے پوچھتے ہوئے بھی شرم آتی تھی اس لئے ہوسٹل میں جب کوئی بہن لالٹین جلاتی تو چپ چاپ جاکر دیکھتی تھی کہ چمنی نکال کر کس طرح صاف کی جاتی ہے غرض زندگی محنت سے بھرپور تھی جسمانی کمزوری کو بھلا کر میں صبح سات سے دس تک دھنائی کرتی تھی۔ جوانی میں بھی تھکان تو ہوتی ہی ہے۔ مگر پسینے سے شرابور ہو کر بہت اچھا لگتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں پرانی پلوریسی پھر غالب آگئی، بخار بھی رہنے لگا تھا اس لئے پھر کام کم اور مفت خوری زیادہ تھی لیکن پھر بھی سلائی والے حصے میں جاکر میں ۱۲ آنے ایک روپیہ کی سلائی ضرور کرلیتی تھی۔ غرضیکہ آنے والی زندگی میں جو بھی مشکلات پیش ہوئیں ان پر میں باپو کی روحانی طاقت کے بھروسے

پڑھی تا پو پا سکی۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے زمانے میں باپو کی غیر موجودگی میں اپنی زندگی کے نصب العین کے لئے میں نے بہت کچھ سوچا اور ان کے ذریعے شروع کئے گئے بہت سے کاموں میں سے ایک کام "ہندو مسلم اتحاد" کو اپنے لئے چن لیا۔ باپو نے کانفرنس سے واپسی پر اس کی بھرپور تائید کی۔ وہی ان کی اپنی زندگی کا مشن بھی تھا" (باپو کے خطوط بی بی امت السلام کے نام (ہندی) مرتبہ کاکا صاحب کالیلکر نوجیون پرکاشن مندر احمد آباد ص ۱۹ تا ۲۶)

باپو نے انھیں سمجھایا "میں چاہتا ہوں آشرم میں تمہاری ذہنی و جسمانی ترقی ہو اور روحانی طاقت بڑھے۔" امت السلام شرمندہ تھیں آئی تھیں دوسروں کی خدمت کے لئے لیکن نازک مزاج ہونے کے سبب دوسروں کی خدمت کا سہارا لینا پڑا، باپو نے ہمت بندھائی صبر سے کام لو، خدا تمہیں خدمت کی طاقت بھی دے گا۔ جسمانی خدمت ہی تو سب کچھ نہیں، وقت پر ایک میٹھا بول، دل میں کسی اچھے خیال کا آجانا بھی بڑی خدمت ہے۔ ایک خط میں انھوں نے لکھا:

"تمہارے دوسروں کی سیوا کے لئے جلد باجی (بازی) نہیں کرنا چاہیئے پہلے تو تمہاری صحت اچھی کر لو پیچھے سب کچھ اچھا ہو جاوے گا۔ باپو کی دعا" ۲۸/۲/۳۳ (باپو کے خط بی بی امت السلام کے نام نہرو میوزیم لائبریری فائل نمبر ۵۴ا، جلد اول)

آشرم میں رہتے ہوئے انھوں نے ہندی و گجراتی سیکھی۔ باپو انھیں اردو میں خط لکھتے تھے کبھی کبھی انھیں پڑھنے میں ایک گھنٹہ بھی لگ جاتا مگر وہ ختم کر کے ہی چھوڑتے۔ بی بی امت السلام کے ہندی اور گجراتی سیکھ لینے کے بعد وہ کبھی کبھی ہندی و گجراتی میں لکھتے اگر بہت جلدی میں کسی اور سے گجراتی میں لکھاتے تو آخر میں "باپو کا آشیرواد"، اپنے ہاتھ ہی سے لکھتے۔ ان کو ہمیشہ بی بی امت السلام کی صحت کی فکر رہتی تھی وہ ان کا علاج کبھی ڈاکٹر سے کراتے کبھی خود مٹی، پانی کا قدرتی علاج کرتے دھن کی پکی امت السلام اکثر سر پر مٹی کی پٹی لئے اپنے کام میں ہمہ تن مشغول رہتی تھیں

خرابی صحت کی بنا پر انھیں ہمیشہ فکر رہتی کہ شاید وہ جیل نہ جاسکیں۔ باپو انھیں پرسکون رہنے کی تلقین کرتے۔ مندرجہ ذیل خط ان سے متعلق بہت سے خطوط میں سے ایک ہے۔

"پیاری بیٹی امت السلام"

تمہارا خط کل ملا سارا پڑھ لیا۔ مجھے رنج ہوا...... جیل جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ تم نے قبول کیا ہے جب تک بالکل اچھی نہیں ہوتی ہے تب تک جیل جانے کی بات نہیں کرے گی۔ یہ بھی سمجھو کہ راجہ جی کا سنگ جتنا لے اتنا ہی اچھا ہے وہاں رہ کر جو سیوا بن سکے کیا کرو۔ اب پاگل مت بنو۔ خُش (خوش) رہو۔ مجھے لکھا کرو۔" (باپو کی دعا۔ ۲ مارچ ۱۹۳۳ء (ایضاً جلد نمبر ۳)

بی بی امت السلام نے اپنی زندگی کا ہر عیش و آرام تج کر اپنے کو آشرم اور اس کے آدرشوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ بڑودہ سے گاندھی جی نے ایک خط مورخہ ۵ جون ۱۹۳۱ء میں نارن داس گاندھی جی کو لکھا تھا۔

"ہمیں امت السلام کو اگر وہ عمر بھر رہنا چاہے تو آشرم میں رہنے کی اجازت دے دینی چاہیئے۔ اسے باہر سے روپیہ منگانے کی آزادی بھی ہونا چاہیئے بالفرض اگر باہر سے کوئی روپیہ نہ بھیجے تو ہمیں اس کے اخراجات اس کے اکاؤنٹ سے برداشت کرنا چاہیئں۔"

۱۹۳۳ء میں جب باپو نے سابرمتی آشرم کو ختم کر کے جن دوسرے آشرم والوں کے ساتھ راس گاؤں کی طرف کوچ کیا تو بی بی امت السلام بھی ساتھ تھیں، آشرم کی دوسری خواتین کے ساتھ انھیں جیل بھیج دیا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں ستیہ گرہ بند ہونے پر وہ بھی رہا ہوئیں تو جیسے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ باپو کی شفقت نے انھیں مستقبل کی ایک نئی جہت عطا کی تھی۔ سیوا گرام آشرم میں باپو کی ذاتی خدمت کی خوش قسمتی انھیں کے حصے میں آئی باپو کے ملک گیر دوروں میں بھی وہ اکثر و بیشتر ان کے ساتھ رہیں ۱۲ جولائی ۱۹۳۵ء کے خط میں

انھوں نے راجکماری امرت کور کو بی بی امت السلام کی خدمت کے بارے میں لکھا تھا "امت السلام میرے نزدیک ہی سوتی ہے مجھے پنکھا کرتی ہے اور جب ضرورت ہو دُھالتی بھی ہے۔ وہی مجھے کھانا کھلاتی ہے۔"
(Collected Worksof Mahatma Gandhi, Ministry of Information Vol. LXVII. P. 165)

باپو سے ان کا پیار بیٹی سے بڑھ کر تھا اور خود باپو بھی انھیں کتنا چاہتے تھے۔ اسی کا اندازہ یکم مئی ۱۹۳۷ء کے اس خط سے ہو سکتا ہے جس میں انھوں نے "بی بی جان پیاری بیٹی امت السلام" کہہ کر انھیں مخاطب کیا ہے
(Collected Works Vol. LXV, p. 162)

بی بی امت السلام ہریجنوں کی خدمت جس انداز سے کرتی تھیں باپو کے دل میں اس کے لئے بڑی وقعت تھی۔ اس کا تذکرہ انھوں نے اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے۔
"میرا اچا ہنا کیا چیز ہے۔ آج میں کتنا پیار کر رہا ہوں اس کا تجھے پتہ نہیں۔ جتنا میں تیرے لئے کر رہا ہوں اتنا میں نے کسی لڑکی کیلئے نہیں کیا۔ یہ کوئی مہربانی کی بات نہیں ہے۔ میں دوسرا کر ہی نہیں سکتا۔ تیرا غصّہ ہر کوئی محسوس کرتا ہے۔ مگر تیری خدمت کی لگن کے آگے ہر کسی کا سر جھک جاتا ہے اور تیرے غصّے کو برداشت کر لیتے ہیں۔
(باپو کے خط بی بی امت السلام کے نام متذکرہ ص ۱۵)

سردار پٹیل کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ "امت السلام پھر بستر پر لیٹ گئی ہے اس کا دل سونا ہے مگر جسم پیتل"

ایک بار ہریجنوں کی خدمت کرتے ہوئے امت السلام دہلی میں بیمار پڑ گئیں باپو کو بڑی فکر ہوئی لکھا۔ میری بات مانو تو مہربانی۔ میرے پاس آجاؤ تمہارا سب دکھ جاتا رہے گا۔ اتنا میرا مانو گی تو میں تمہاری بڑی مہربانی مانوں گا مہربانی کر کے یہاں آجاؤ۔ یہ نہ کر سکو تو پھر مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے۔" (ایضاً ص ۹)

ایک بار بی بی امت السلام نے کاکا صاحب کالیلکر سے اپنے خاندان کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انھیں بتایا تھا کہ "جب بھائیوں نے دیکھا کہ میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کر چکی ہوں تو انھوں نے جائداد میں سے نصف جائداد مجھے دینے کیلئے طے کیا۔ ہمارے

پوچھا گیا آپ کس قانون کے تحت ایسا کر رہے ہیں تو ان کا جواب تھا کہ ہم اسے عطیہ دے رہے ہیں۔ ایک بار ماں کی بیماری کے سبب میں پٹیالہ کی طرف آئی ہوئی تھی، گاؤں پہونچی تو دیکھا کہ بسوے داری کے ٹیکس غریبوں کیلئے آفت جاں ہیں۔ میں نے مختار سے کہا سب ٹیکس معاف کر دو وہ پریشان ہوا کیونکہ دوسرے بھائیوں کے ٹیکس پر اس کا برا اثر ہونا لازمی تھا۔ بھائیوں کے پاس پہنچا، انھوں نے کہا امتل جو چاہتی ہے وہی سب کے لئے کرو۔ بھائیوں کی دلی خواہش تھی کہ کسی بھی بہانے بہن گھر واپس لوٹ آئے اس کے لئے وہ ہر ممکن قربانی کے لئے تیار تھے۔ ...... "ہزاروں ایکڑ کی زمین بٹائی کرانے میں گھوڑے پر جاتی تھی۔ گھوڑ سواری کا شوق بھی تھا اور اتنا چلنا بھی مشکل تھا ایک شام کو گھومتے گھومتے باہر گئی تو دیکھتی ہوں کہ ہریجن بہنیں لائن سے کنوئیں پر کھڑی ہیں۔ پوچھا کیا بات ہے کہنے لگیں پانی چاہیئے۔ پوچھا بھرتی کیوں نہیں جواب دیا ہمیں کون بھرنے دے گا، میں سن کر آگ بگولہ ہو گئی۔ کنواں میرے ہی نام سے تھا بسوے داری کا نشہ بھی تھا کہا ہریجن میرے ہی کنوئیں سے پانی بھریں گے خواہ دوسری ذاتیں بھلے ہی اجڑ جائیں۔ سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ برہمن ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے ہم فوراً کنواں کھود دیتے ہیں تب تک ہم خود پانی بھر کر انھیں دیں گے۔ رات بھر کام ہوا۔ چوبیس گھنٹے کے اندر پانی نکل آیا۔ اب چنائی کا سوال تھا۔ والد کا ہی ایک اینٹوں کا بھٹہ پڑا ہوا تھا۔ جس میں بھائیوں کا حصہ تھا گھوڑے پر ایک آدمی ان کے پاس گیا، جواب ملا۔ جتنی اینٹیں چاہیے لے لو۔ غریبوں کی خدمت سے میرا دل انتہائی خوش ہوتا تھا۔" (ایضاً کا کا صاحب کالیلکر ص۱۲) بنگال میں بور کامنہ کے مرکز میں بی بی امت السلام نے جو کام کیا اسے باپو نے ان کے انتہائی عمدہ کام (Excellent Work) سے یاد کیا ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے گول میز کانفرنس سے باپو کی واپسی کے بعد بی بی امت السلام نے ہندو مسلم اتحاد کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا یہی وہ مشن تھا جس کی خاطر خود انھوں نے اپنی جانِ عزیز کی قربانی دی سن۱۹۴۲ء میں سندھ کے خوفناک فرقہ وارانہ فساد کے دوران

باپو نے انھیں سندھ بھیجا۔ سندھ بھیجتے وقت آنندٹی ہنگورانی کے نام اپنے خط مورخہ ۲ر نومبر ۱۹۳۹ء میں انھوں نے لکھا "امت السلام سندھ میں ہو رہے قتل عام کو روکنے کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جا رہی ہے وہ وہاں چند مسلم دوستوں سے ملے گی، نیز حاجی پیر عبداللہ سے آپنے کام میں معاونت کی درخواست کرے گی۔ تمہیں اس کی ہر ممکن مدد کرنا ہے اسے کوئی کمی بہن سے ملا دو اور جو کچھ اس کے لئے کر سکتے ہو دریغ نہ کرو۔ تمہارا باپو۔"

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. LXXIII, P. 154)

سیوا گرام سے باپو نے اپنے خط مورخہ ۲ر نومبر ۱۹۳۹ء میں پیر عبداللہ ہارون رشید کو بی بی امت السلام سے متعارف کراتے ہوئے لکھا "اس میں بچپن سے ہند و مسلم اتحاد کی لگن ہے۔ سندھ میں جو قتل و خون ہو رہا ہے اس سے میں بھی پریشان ہوں اور امت السلام بھی۔ آپ سے زمانۂ خلافت کے پرانے تعلقات کی بنا پر اسے میں آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ میں اس وقت موجودہ حالت کے سیاسی مضمرات کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں۔ بی بی امتُ السلام نہ سیاست سمجھتی ہے اور نہ ہی اس میں دلچسپی رکھتی ہے وہ ایک سچی مسلمان ہے۔ باقاعدگی سے قرآن پڑھتی ہے اور جب بیمار نہ ہو تو رمضان کے روزے بھی پابندی سے رکھتی ہے ..... وہ بہادر ہے اور اس قتل و غارت گری کو روکنے کیلئے اپنی جان بھی دینے کو تیار ہے۔ میں نے حصول مقصد کی خاطر اس کی ہمت افزائی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ اسے اور مجھے سمجھنے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں گے۔ میرے پاس اس سے زیادہ شریف اور دُھن کا پکا کوئی مرد یا عورت نہیں ہے جب وہ ہندوؤں کی جان بچانے نیز اسلام کا وقار بڑھانے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار ہے تو میں اسے اپنی نیک خواہشات دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. LXXIII, P. 145)

خود بی بی امت السلام کو انھوں نے لکھا تھا۔ "جیوں جیوں تیرا خیال کرتا ہوں تیری قدر بڑھتی ہے مجھے اچھا لگتا ہے۔ تجھے تیرا کام اپنی ذمہ داری پر کرنا چاہیئے۔ سچ تو یہ

ہے تو یہی مشن لے کر میرے پاس آئی تھی۔ اور تیرا ہی یہی مشن لے کر سندھ گئی تھی اور جائے گی۔ سندھ کے مسلمانوں کو تجھے بتانا ہے کہ سیاسی اور دوسرے معاملات میں خون خرابے، زبردستی یا جھوٹ سے انصاف نہیں ملتا۔ تیرا سندھ جانا اور جان تک کی پروا نہ کرنا صرف قتل و غارت گری روکنے کے لئے ہے یہ میرا مقصد تجھے بھیجنے میں تھا اور اب بھی ہے۔ خدا تیرا راستہ صاف کرے۔ وہی ایک رہنما ہے۔ اور تو، میں سب اس کے بندے ہیں باقی سب جھوٹ ہے۔ باپو کی کروڑوں دعائیں۔"

(باپو کے خط بی بی امت السلام کے نام متذکرہ ص۱)

"گھنے جنگلوں سے گزرتی، گھوڑوں پر سوار بی بی امت السلام بے خوف ہو کر فساد زدہ علاقوں میں پہنچیں اور فساد ختم کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا"

(ذاتی انٹرویو) محترمہ سروجنی نائیڈو صدر ہندوستان پرچار سبھا سندھی، راجگھاٹ، نئی دھلی، ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

بی بی امت السلام بہت سے دوروں میں گاندھی جی کے ساتھ رہی تھیں۔ جب نواکھالی میں قتل و خون کا ہولناک طوفان آیا تب وہاں کے دورے میں بھی وہ اپنے باپو کے ساتھ تھیں۔ وہاں انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کیلئے برت رکھا اور حصول مقصد کے بعد باپو ہی کے ہاتھوں سے رس پی کر توڑا۔ نواکھالی میں ان کے تعمیری کاموں سے سبھی مسلم خواتین متاثر تھیں وہاں جس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر شیطانیت اور بربریت کے بھیانک طوفان میں انھوں نے اپنے کو جھونک دیا وہ باپو کی کروڑوں دعاؤں کے بل پر ہی ممکن ہو سکتا تھا اور جب سرحد میں بھی انسان وحشی بن گیا تو وہ وہاں جانے کے لئے بھی بے چین ہو گئی تھیں۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں نے انھیں خط لکھا:

شملہ ۱۰-۵-۴۶ء

پیاری امت السلام سلامت رہو۔

تمہارے دو خط مجھے دو دن پہلے ملے تھے اور ایک خط آج ملا ہے.... باقی

رہا سرحد کا معاملہ میں بھی حیران ہوں۔ یہ ایک عجیب سا معاملہ ہے۔ آپ اس کا فکر نہ کریں۔ اس کو ہم خدا پر چھوڑ دیتے ہیں اور میرا یہ ایمان ہے کہ جب اور جس وقت بھی اسے منظور ہوگا اسے کرے گا۔ ہم تو یہ سب کچھ اسی لئے کرتے ہیں۔ کوئی اپنی غرض نہیں۔ تم ایک عجیب لڑکی ہو۔ تم نے اپنے خط میں میری ناراضگی کا لکھا تھا، میں کیوں آپ سے ناراض ہو جاؤں آپ نے تو کافی کوشش کی اور اسان اگر ناراض بھی ہوتا ہے تو اپنے کام سے اور یہ کام تو کوئی میرا نہیں اور نہ میں اس کو اپنے لئے کرنا چاہتا ہوں تم ایسے فکر دل سے نکال دو بلکہ امید رکھو اگر تمہارا خیال اور ارادہ مضبوط ہے تو ضرور ایک دن تم کو مہاتما جی اس کام کی اجازت دیں گے بلکہ آپ کو سرحد کے لئے خود روانہ کریں گے۔ باقی خیریت ہے۔ فقط

"آپ کا عبدالغفار"

(کاغذات مہاتما گاندھی، گاندھی میوزیم لائبریری راجگھاٹ ص ۵۲۵)

سرحد ہی سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ سرحد کے سفر میں ایک شام پرارتھنا کے وقت انھوں نے تھوڑے زیادہ انگوروں کا رس نکال کر باپو کو دیا۔ باپو نے خدائی خدمت گاروں کی بھری سبھا میں رس کا گلاس ہی اٹھا کر پھینک دیا تھا پھر وہ آٹھ دن تک معافی مانگتی رہیں اور باپو انھیں سمجھاتے رہے وہ بڑے پیار و لگن سے ان کی شخصیت کو سنوار نکھار رہے تھے۔

غصّے میں امت السلام بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ اس واقعہ سے پہلے ایک مرتبہ جب وہ باپو کو کھانا کھلا رہی تھیں تو نہ جانے کس غلط فہمی کی بناء پر اُن کے لئے بنائی روٹی ہی پھینک دی تھی۔ باپو کا وہ خاموشی کا دن تھا۔ اس لئے انھوں نے لکھا۔

"پاگل بیٹی! آج تو نے پورا رنگ بتایا۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ اچھی طرح ثابت کیا۔ میں نے کہا تھا آج روٹی کھاؤں گا، بھاجی کھاؤنگا اگرچہ میرے لئے الگ پکے ہوئے ہیں تو بھی۔ پھر روٹی پھینک دینا۔ میں نے جو کہا اس میں تمہارے ہاتھ کی روٹی بھاجی نہ کھانے کی میرے خوابوں میں بھی

بات نہ تھی۔ اتنا غصہ کیسا گناہ، اتنا غصہ میرے جیسے غریب پر کرنے سے بھی تیرا بھلا نہیں ہو سکتا۔ اچھا ہے میرا مون برت ہے۔ کہو اب میں کیا کروں، فاقہ کروں؟"
(باپو کے خط بی بی امت السلام کے نام، مرتبہ کاکا صاحب کالیکر، متذکرہ ص ۱۱)

باپو نے بڑی محبت ولگن سے ان کی شخصیت کو بنایا سنوارا تھا، کبھی ڈانٹ، کبھی نصیحت اور کبھی پیار سے۔ ایک خط میں انھوں نے سمجھایا تھا "میرے باپ جو حکم کرتے تھے وہ مجھے واجب ہی لگتے تھے۔ زندگی بھر میں نے دلیل نہیں کی۔ ماتا نے کہا بیٹا یہ کر، میں نے کیا ہی ہے۔ میں باپ ہوں، ماں ہوں۔ میری ایک بات بھی بغیر دلیل کے تو نے مانی ہے؟ جاننے کے بعد بھی تیرا دماغ کہاں نہیں پھرا ہے۔ یہ سب وچار کرنے کے لائق ہیں۔ جب تک یہ نہیں سمجھے گی تب تک نہ میں سکھی ہونے والا ہوں نہ تو سکھی ہونے والی ہے۔ تو مجھے چھوڑ نہیں سکتی نہ میں تجھے چھوڑ سکتا ہوں۔"
(ایضاً ص ۱۲)

باپ بیٹی میں جب محبت کا ایسا اٹوٹ رشتہ ہو تو یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہے کہ باپو کی شہادت چہیتی بیٹی کے لئے کیسا صدمۂ جانکاہ رہا ہوگا۔ وہ رات بھر ان کی سمادھی پر روتے ہوئے گذار دیتیں لیکن کب تک۔ امت السلام صحیح معنوں میں ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے سیکڑوں عقیدتمندوں میں ایک ممتاز فرد تھیں۔ اپنے دل ودماغ پر قابو پاتے ہی وہ باپو کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں میں تن من دھن سے جٹ گئیں۔ مسز سبھدرا جوشی اور مس مردولا سارہ بھائی کے ساتھ انھوں نے مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لئے ناقابلِ فراموش کام کیا، اس سلسلے میں وہ کئی بار پاکستان بھی گئیں۔

کستوربا گاندھی سے بی بی امت السلام کو ماں جیسا پیار ملا تھا۔ تقسیم وطن کے بعد انھوں نے راجپورہ (پنجاب) میں ایک آشرم "کستوربا مندر" کے نام سے قائم کیا اور اپنی تمام جائیداد اس کے لئے وقف کر دی۔ پنجاب کے مختلف قصبوں اور شہروں میں اس کی شاخیں قائم کیں جس سے ہزاروں ضرورتمند لوگوں کو کام ملا۔ آشرم میں

وہ ان خواتین کو مختلف کاموں کی تربیت بھی دیتی تھیں۔ گاندھی جی کے سیوا گرام آشرم میں جو جاپانی سادھو آتے تھے انھوں نے واپس جا کر جاپان میں سرودے کا کام شروع کیا۔ بی بی امت السلام اپنے منہ بولے بیٹے سنیل کمار کو لے کر اسے دیکھنے جاپان گئیں اور وہاں سے واپسی پر اپنے راجپورہ مرکز میں ایک جاپانی بدھ مندر بھی بنوایا کستوربا مندر میں بچوں کیلئے اسکول بھی قائم کئے گئے اور خواتین اساتذ کے بچوں کے لئے نرسری بھی۔ وہاں کھیتی بھی ہوتی تھی۔ کھادی بنی جاتی تھی اور سلک کی ساڑیوں کا بھی ایک کارخانہ تھا۔ ہریجنوں کی خدمت اس آشرم کا خصوصی مقصد تھا۔ راجپورہ میں ہوائی پٹی بھی ہے۔ یہاں سے وہ ہیلی کوپٹر میں ۱۹۶۱ء ہندوستان پر چین کے حملے کے دوران نیفا فوجیوں کیلئے کھانا، کمبل، اور دوائیں لے کر جاتی تھیں ۱۹۶۵ء میں ہند و پاک جنگ کے دوران بھی وہ بلڈ پریشر کی مریض ہونے کے باوجود اسی مقصد کی خاطر لداخ جاتی تھیں۔ سرحدی گاندھی مرحوم خان عبدالغفار خان صاحب جب ۱۹۶۹ء میں ہندوستان آئے تو ان کا کھانا وہ خود بناتی تھیں اور ملک گیر دورے میں بھی ان کے ساتھ رہی تھیں۔

بی بی امت السلام کی اپنی زندگی بہت سادہ تھی۔ وہ بغیر بلیے کی کھادی کی ساڑی پہنتی تھیں۔ چٹائی پر سوتیں اور رات کو صرف ایک گول لکڑی سرہانے رکھ لیا کرتی تھیں۔ اردو تو ان کی مادری زبان تھی ہی، پنجابی اور انگریزی سے بھی بہت اچھی واقفیت رکھتی تھیں۔ آشرم میں رہ کر انھوں نے گجراتی و ہندی بھی سیکھ لی تھی پھر کیوں کہ آشرم کے مقاصد کی خاطر وہ جنوبی ہندوستان اور بنگال میں بھی رہی تھیں۔ اس لئے اڑیہ، تیلگو، تامل اور بنگالی سے بھی اچھی طرح واقف ہو گئی تھیں اور جاپانی زبان بھی وہ اچھی طرح سیکھ گئی تھیں انھوں نے راجپورہ سے 'ہندوستان' نام کا ایک اردو اخبار بھی نکالا تھا۔

(ذاتی انٹرویو بیگم کشور عابد احمد خاں صاحب علی گڑھ، بی بی امت السلام کی بھتیجی ہیں)

بی بی امۃ السلام ایک محاذ پر اپنی بیماریوں اور صحت سے لڑتی دوسرے محاذ پر ان گنت تعمیری کاموں کا بوجھ سنبھالتی اب تھک چکی تھیں۔ آخر طویل عرصے کی اس مسلسل جدوجہد کے بعد ۲۹ را کتوبر ۱۹۸۵ء کو ان کی شمعِ حیات ہمیشہ کے لئے گل ہو گئی۔ شام کو جنازہ سن ندھی (قریب راجگھاٹ) کے دعائیہ ہال میں رکھا گیا اور شب بھر کی دعاؤں کے بعد اگلے دن جامعہ ملیہ کے قریب انھیں اُن کی ابدی آرام گاہ پہونچا دیا گیا۔ اور یوں عمر بھر کی ایک بیقرار زندگی آخر قرار پا گئی ؎

سرھانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

دلا گئی بات زمانے میں وفاداروں کی

آمنہ قریشی

آمنہ قریشی ہندوستانی نسل کے جنوبی افریقہ میں مقیم امام عبدالقادر باوزیر کی چھوٹی بیٹی تھیں۔ امام صاحب گاندھی جی کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں سے تھے اور جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی پالیسی کے خلاف جدوجہد میں برابر کے شریک تھے ٹرانسوال میں مذھبی درس وتدریس کے سبب وہ امام صاحب کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ آمنہ قریشی کے جذبہ قوم پرستی اور حب الوطنی کے تجزیے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ اُن کی پرورش اور تربیت کس ماحول میں ہوئی اس لئے اس سلسلے میں ملک وملّت کی خاطر امام خاندان کی عظیم قربانی کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

امام صاحب کا جنوبی افریقہ میں عربی گھوڑوں کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر ہندوستان کی جنگِ آزادی میں شرکت کی خاطر کیوں کر آئے اس کا تذکرہ گاندھی جی کی زبانی سُنئے۔

" امام صاحب کا گھر انگلش وضع پر آراستہ کیا گیا تھا۔ حاجی صاحبہ بچپن سے اسی انداز کی عادی تھیں۔ ان کی دونوں بیٹیوں فاطمہ اور آمنہ کی پرورش بھی انگریز بچوں کی طرح ہی کی گئی تھی۔ ایسے اشخاص کے لئے ایک عیش وعشرت کی زندگی کو چھوڑ کر فقیرانہ زندگی اختیار کرلینا کوئی آسان کام نہیں لیکن امام صاحب کے لئے ایک بار عزم کرلینے کے بعد اسے نبھانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اسی لئے جب جوہانسبرگ چھوڑ کر میں نے

نونکس میں رہائش اختیار کی تو امام صاحب نے بھی میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔
ان کی اولوالعزمی سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد بھی میں حیران تھا کہ انھیں کیا
جواب دوں جس شخص نے کبھی زندگی میں تکلیف نہ اٹھائی ہو وہ کس طرح سب عیش و
آرام کو تج کر نونکس میں ایک مزدور کی زندگی گزار سکتا ہے! میں نے انھیں نونکس کی
سخت زندگی کے بارے میں بتایا اور پوچھا اگر وہ بذاتِ خود بھی یہ تہیہ کرلیں تو حاجی صاحبہ
اور فاطمہ و آمنہ کا کیا بنے گا؟ انھوں نے جواب دیا: "مجھے خدا پر پورا اعتماد ہے اور تم
حاجی صاحبہ کو نہیں جانتے۔ وہ جہاں میں رہوں، جس حال میں رہوں رہنے کے لئے
تیار ہوں گی۔ کسی کو علم نہیں ہماری جدوجہد کب ختم ہوگی۔ مجھے اندازہ ہے کہ میں اپنے
گھوڑوں کی تجارت جاری نہیں رکھ سکوں گا۔ اور نہ ہی اب کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر سکتا
ہوں۔ ایک ستیہ گرہی کے لئے تمام عیش و آرام اور دولت کی محبّت ترک کر دینا لازمی
ہے۔" مجھے اس جواب سے دلی خوشی ہوئی میں نے نونکس کے اپنے دوسرے ساتھیوں کو
بھی لکھا، ان سب نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا اور یوں امام صاحب اور ان کا خاندان
ہمارے ساتھ آگیا۔

نونکس میں مقیم حضرات کے ساتھ امام صاحب نے ہر کام میں برابر کا حصّہ لیا۔ نونکس
میں عمارتیں پہاڑی پر تھیں۔ ہر شخص کو اپنے استعمال کا پانی نیچے چشمے سے لانا ہوتا تھا۔
امام صاحب کی صحت اس وقت بھی نازک تھی لیکن ہر صبح وہ کاندھے پر پانی سے بھری
بالٹیاں لٹکائے بچاس فیٹ اوپر چڑھتے تھے۔ جو جگہ اب نونکس میں چرخہ کاتنے کے
کام آتی ہے وہاں پہلے چھاپہ خانہ تھا۔ آشرم میں مقیم سبھی لوگوں کو خواہ وہ لڑکے
ہوں یا لڑکی، نوجوان ہوں یا بوڑھے کچھ نہ کچھ کام کرنا لازمی تھا۔ امام صاحب حاجی
صاحبہ، فاطمہ اور آمنہ چاروں ہی چھاپہ خانہ میں کام کرتے تھے۔ امام صاحب نے کمپوز
کرنا سیکھ لیا تھا جو ان کے جیسے مزاج، عادتوں اور عمر رسیدہ شخص کے لئے بڑا حیرت
انگیز تھا۔ ان کا خاندان گوشت خور تھا۔ مگر مجھے یاد نہیں نونکس میں انھوں نے ایسا
کوئی کھانا پکایا ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امام صاحب کا جذبۂ ایمانی

یکجا تھا۔ ان کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی نہ ہی ان کے خاندان نے کبھی روزہ قضا کیا۔
آشرم میں مقیم دوسرے حضرات جیسی طرزِ زندگی اختیار کرکے انھوں نے اسلامی طرزِ فکر کی وسعت کا ہی مظاہرہ کیا لیکن ابھی امام صاحب کے جذبۂ قربانی کو کچھ اور منزلوں سے گزرنا تھا وہ کئی بار قید ہوئے اور مثالی قیدی ثابت ہوئے اصل امتحان کا وقت ۱۹۱۴ء میں آیا جب آشرم کے زیادہ تر حضرات نے ہندوستان لوٹنے کا قصد کیا جنوبی افریقہ امام صاحب کا وطن بن چکا تھا۔ حاجی صاحبہ فاطمہ اور آمنہ کے لئے تو ہندوستان ایک بالکل اجنبی ملک تھا۔ وہ لوگ ہندوستان کی کسی بھی زبان سے آشنا نہیں تھے اور صرف انگلش و ڈچ زبانیں ہی جانتے تھے۔ لیکن امام صاحب کو یہ فیصلہ کرنے میں ذرا بھی وقت نہیں لگا کہ وہ مع خاندان میرے ساتھ ہی ہندوستان آئیں گے۔ ستیہ گرہ اور ہندو مسلم اتحاد کی خاطر یہ ان کی عظیم قربانی تھی۔

سابرمتی آشرم کے سبھی اشخاص کو ان کی روزانہ زندگی کے بارے میں علم ہے۔ وہ دن بدن عام انسانی سطح سے اوپر اٹھتے جا رہے تھے۔ ان کا دل زیادہ پاک و صاف اور اللہ تعالیٰ سے ان کی قربت بڑھ رہی تھی۔ آشرم کے اصولوں میں بھی ان کا اعتماد دن بدن پختہ ہو رہا تھا۔ میری خواہش ہے کہ امام صاحب سے متعلق سبھی اشخاص اپنی اپنی یادداشتوں کو قلم بند کر دیں۔ اور پھر وہ یکجا کر لی جائیں۔

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. XLIX, January - May, 1932, PP. 217 - 219)

غلام ہندوستان میں بھی امام صاحب نے ہنسی و خوشی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آمنہ قریشی انھیں مجاہد آزادی کی دوسری بیٹی تھیں۔ ملک و قوم کی خاطر ایثار و قربانی کے راستے پر چلنا انھوں نے بچپن میں ہی اپنے والدین سے سیکھا تھا۔ امام صاحب اپنا کاروبار چھوڑ کر ڈربن میں فونکس آشرم میں مقیم ہوئے تو آمنہ بہت کم عمر تھیں ۱۹۱۶ء میں جب امام صاحب کو چھ رب آشرم آئے تو آمنہ مشکل سے سات برس کی رہی ہوں گی ۱۹۱۷ء میں امام خاندان سابرمتی آشرم میں منتقل ہوا۔ آشرم کی زندگی انتہائی سخت تھی

اس کے اصولوں کی پابندی بلا تفریق مذہب وملت ہر شخص کے لئے لازم تھی۔ ننھی آمنہ جوں جوں بڑی ہوتی گئیں ان کی خوش مزاجی، ذہانت اور جذبہ خدمت نے آشرم میں ہر شخص کا دل جیت لیا۔ گاندھی جی کو تو وہ حقیقی بیٹی جیسی عزیز تھیں۔ وہ بچپن سے آشرم کی سبھی مصروفیات میں پیش پیش رہیں۔ امام خاندان سابرمتی آشرم میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا تحریک آزادی میں شریک جتنی اہم شخصیتیں آشرم میں آتیں امام صاحب کی رہائش گاہ امام منزل کی مہمان ہوتیں، حب الوطنی اور جذبہ آزادی سے سرشار مجاہدین سے ملاقاتوں نے آمنہ کی نہ صرف ذہنی تربیت میں معاونت کی بلکہ انھیں زندگی کا ایک نصب العین بھی عطا کیا۔ ۳۱ مئی ۱۹۲۴ء میں ان کی شادی ایک گجراتی نوجوان غلام رسول قریشی سے ہوئی۔ جو خود بھی حریت وطن کی خاطر برطانوی سماج سے بنرد آزما تھے۔ شادی کا دعوت نامہ امام صاحب کے حقیقی بھائی کی حیثیت سے گاندھی جی کی طرف سے بھیجا گیا۔ ہندو رسم و رواج کے مطابق کنیادان بھی گاندھی جی نے ہی کیا۔

(ماخوذ: نوٹس کشن بھائی ترویدی ڈائرکٹر گاندھی اسمارک سنگرہالیہ، ہریجن آشرم احمد آباد، ۱۰ر نومبر ۱۹۸۵ء)

اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود باپو ان کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا دھیان رکھتے تھے۔ شری نارن داس کے نام اپنے خط مورخہ ۱۸ر دسمبر ۱۹۳۰ء میں انھوں نے لکھا: "آمنہ کی اُردو کی تعلیم کی ذمہ داری اب ہماری ہے۔ گری راج اسے پڑھاتے تھے انھیں اب پھر سے شروع کر دینا چاہیئے یا پھر کوئی دوسرا انتظام فوری ہونا ضروری ہے۔"

(Collected Works Vol. XLV, 1930-31, P. 25)

آمنہ قریشی کو اپنی اسکول کی تعلیم نہ ہو سکنے کا افسوس تھا جس کی شکایت انھوں نے باپو سے کی۔ باپو نے جواب دیا۔

۲۰ر نومبر ۱۹۳۲ء

فرزند۔ آمنہ۔ تمہارا خط ملا، اچھا لگا۔ میں خوش ہوں کہ تم نے مجھے صفائی سے لکھ دیا ہے۔ تمہاری صحت بہتر ہونے کا صرف وہی ایک طریقہ ہے جو میں نے تمہیں تجویز کیا

ہے۔ اگر تم تعلیم حاصل نہیں کر سکیں تو کچھ غلطی تمہاری بھی ہے۔ تھوڑا سوچو۔ زیادہ غلطی میری ہے کہ میں نے آشرم کے بچوں کی تعلیم پر مناسب توجہ نہیں دی۔ بہر حال اگر تم سنجیدگی سے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا چاہو تو میں تمہیں اسکول میں داخل کرانے کے لئے تیار ہوں۔ اگر تم بھاؤ نگر جانا چاہو تو میں تمہیں لڑکیوں کے اسکول میں داخل کر سکتا ہوں۔ امریلی میں بھی لڑکیوں کا ایک اچھا اسکول ہے دونوں ہی جگہوں میں تمہیں خصوصی توجہ ملے گی۔ میں تمہاری پریشانی دور کرنے میں مدد کر سکتا ہوں۔ لکھو تم کیا چاہتی ہو۔ نارن داس سے بھی کھل کر بات کرو۔ خدا تمہیں ذہنی سکون دے۔ باپو۔"

(Collected Works, Vol.LII, November 1932, January, 1933, P. 25)

واضح رہے یہ خط امام صاحب کی وفات کے بعد کا ہے۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے گاندھی جی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ آمنہ قریشی کی اسکول کی تعلیم نہ سہی لیکن آشرم میں جس زندگی کی تربیت ہوئی تھی، اُس نے آزادیٔ وطن کی راہ میں جینے مرنے کا ایک نیا سلیقہ عطا کیا تھا۔ امتحان کا اصل وقت ۱۹۳۰ء میں ڈانڈی مارچ کے موقع پر آیا، باپو سبھی آشرم والوں سے اپنا سب کچھ آزادی وطن کی راہ میں قربان کر دینے کی اُمید رکھتے تھے۔ آمنہ کے والد امام صاحب اور شوہر غلام رسول قریشی نے بقول باپو "پورا حق ادا کر دیا" امام صاحب نے باوجود خرابی صحت کے دھرسنا کی ستیہ گرہ کی رہنمائی کی اور پولیس کے وحشیانہ مظالم کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ غلام رسول قریشی ان دو ہراول دستوں میں سے ایک دستے کے رہنما تھے جو ڈانڈی مارچ سے ایک روز قبل روانہ کئے گئے تھے۔ امام صاحب غلام رسول قریشی دونوں گرفتار ہوئے اور سزا ہوئی۔ جوشیلی آمنہ کا جذبۂ بغاوت بھی کسی سے کم نہ تھا۔ لیکن ابھی باپو نے خواتین کو باہر آکر کام کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ آمنہ قریشی بار بار ان سے یہ اجازت طلب کر رہی تھیں۔ باپو نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

*

جمعرات، ساڑھے دس بجے شب
یکم مئی ۱۹۳۰ء

چرنجیو آمنہ۔ تم اچھی طرح اس کا سبب بھی جانتی ہو کہ میں نے تم کو گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی۔ پریشان نہ ہو تم گھر پر رہ کر جو چاہو کر سکتی ہو۔ مجھے آزادی سے لکھا کرو۔ امام صاحب جلد ہی جیل میں ہونگے۔ وہ شاید مجھ سے پہلے ہی وہاں پہونچیں کاش ایسا ہی ہو۔ باپو کی دُعائیں۔

(Collected Works, Vol. XLIII, P. 379)

باپو نے جب یہ خط لکھا آمنہ کے یہاں ولادت کے دن قریب تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل خط سے علم ہوتا ہے:۔

"۲۶ر مئی ۱۹۳۰ء

پیاری آمنہ۔ آخر کار امام صاحب جیل پہونچ ہی گئے شاید قریشی بھی اب تک جا چکے ہوں لکھو تمہاری صحت اب کیسی ہے؟ زچگی کا اب کیا انتظام کیا، بچے کیسے ہیں؟ باپو کی دعائیں۔

(Collected Works, Vol. XLIII, P. 430

باپو ان کی صحت کی طرف سے پریشان تھے اپنے خط مورخہ یکم جولائی ۱۹۳۰ء انھوں نے لکھا" یرودا مندر۔ چرنجیو آمنہ۔ میں ہر دن تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔ تمہاری زچگی اب ختم ہو گئی ہوگی۔

بچے کی پیدائش کی خبر سُن کر باپو نے مُبارک باد دی۔

یرودا مندر۔
۷ر جولائی ۱۹۳۰ء

چرنجیو آمنہ۔ میں تمہارا خط پاکر بہت خوش ہوں مجھے خوشی ہے کہ تم ایک بیٹے کی ماں بھی بن گئی ہو۔ خدا اسے طویل عمر دے اور وہ بھی بہادر و باہمت

نکلے۔ جتنا تم اور قریشی۔ کیا بچیاں مجھے یاد کرتی ہیں؟ اُمید کہ تمہاری صحت اچھی ہوگی۔ باپو کی دعائیں۔

(Collected Works, Vol. XLIV, July, December, 1930, P. 5)

نومولود بچہ ابھی صرف چند ہفتوں کا ہے۔ لیکن جذبۂ شوق ہے کہ راہ کی کسی دشواری کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جیل کے لئے بے قراری دن بدن بڑھ رہی ہے۔ باپو نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

یرودا مندر۔

۱۹ر جولائی ۱۹۳۰ء

چرنجیو آمنہ۔ تمہارا خط ملا۔ والدا ور قریشی دونوں ہی جیل میں ہیں اور تم بھی وہیں جانا چاہتی ہو۔ تم آشرم میں رہتی ہو۔ یقین جانو آزادی کی اس لڑائی میں تم برابر کی شریک ہو۔ خدا ہمیں جہاں اور جس حال میں رکھے اس پر قناعت کرنی چاہیئے۔ اپنی اردو کی تعلیم جاری رکھو۔ گری راج تمہاری مدد کریں گے۔ والدا ور قریشی جس سے بھی ملاقات ہو کہنا میرے لئے ان میں سے کسی کو بھی بھولنا ممکن نہیں۔ باپو کی دُعائیں۔ (IBID, P. 29)

باپو نے غلام رسول قریشی کے نام بھی خط لکھا کہ آمنہ جیل جانے پر مُصر ہیں۔ میرے لئے اجازت دینا مشکل ہے۔"

"۸ر دسمبر ۱۹۳۰ء ...... آمنہ کے عزم وہمت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس کا نام بحیثیت رضاکار دینے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوتا لیکن گرفتاری کی صورت میں وہ کس طرح بچوں کو جیل میں ساتھ رکھ سکے گی؟ بہتر یہی ہوگا کہ وہ آزاد رہ کر جو کچھ کرسکتی ہے کرتی رہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ جیل کے لئے بھی تیار رہے۔ یہی بہت کافی ہے۔ باپو کی دعائیں۔" (IBID, P. 151)

غلام رسول قریشی ابھی جیل ہی میں تھے اور آمنہ قریشی ان سے بار بار گرفتاری کی اجازت طلب کر رہی تھیں۔ باپو نے پھر انھیں لکھا:

چرنجیو آمنہ۔ تمہارا خط ملا۔ امام صاحب سے علم ہوا کہ تم گرفتاری کے لئے بے قرار ہو۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ خدا کو جب منظور ہوگا بغیر کوشش کے ہی تمہیں یہ موقع بھی ملے گا۔ تم اس کے لئے تیار ہو یہی بہت ہے جب تک یہ موقع آئے تم بچوں کی پرورش کرتی رہو۔ اپنی صحت اچھی رکھو اور گھر پر رہتے ہوئے جو خدمت بن سکے کرتی رہو۔ تم نے خوف وہراس پر فتح پائی ہے۔ یہی کافی ہے۔ باپو کی دعائیں۔ (IBID, P. 346)

آمنہ کے والد امام صاحب کی صحت جیل میں خاصی خراب ہو گئی تھی۔ رہائی کے کچھ عرصے بعد ہی ۹ر دسمبر ۱۹۲۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ باپو نے ان کے انتقال پر "نوجیون" (گجراتی) مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۲۱ء میں ان کے تفصیلی حالاتِ زندگی کے تذکرے میں لکھا "... ہندوستان آنے پر پہلے ان کی بیوی کا انتقال ہوا پھر بڑی بیٹی فاطمہ کا اور اب وہ خود چلے گئے۔ ان کی یادگار اب اُن کی بیٹی آمنہ اور داماد غلام رسول قریشی ہیں۔ دونوں ہی ملک و قوم کی خدمت میں مصروف ہیں۔ مجھے خود اُن کی وفات سے گہرا صدمہ ہوا ہے۔ ان کا انتقال میرے پہنچنے سے پہلے ہی ہو گیا اس کا مزید غم ہے"۔

باپو انھیں تسلی دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے لیکن مشفق باپ کی جدائی سے آمنہ کے جذبۂ حریت کی تڑپ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ آخر ان سب خواتین کی بے قراری بھی رنگ لائی جنھیں ڈانڈی مارچ میں شرکت کی اجازت نہیں ملی تھی "باپو نے گجرات کی خواتین کو شراب اور ولایتی کپڑے کی دکانوں پر پکٹنگ کرنے کا حکم دیا۔ گجرات کے کونے کونے سے خواتین نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ریحانہ طیب جی، حامدہ بہن اور آمنہ قریشی بھی ان میں شامل تھیں۔ نوساری، میں آمنہ قریشی کو گرفتار کیا گیا اور انھیں چھ ماہ کی قید ہوئی۔

(نوٹس کشن بھائی ترویدی، متذکرہ)

غلام رسول قریشی کی متعدد گرفتاریاں نھنّے منّے بچے، پھر گرفتاری

آمنہ قریشی نے مثالی ستیہ گرہی کا ثبوت دیا۔ باپو نے ایک خط میں انھیں لکھا:
چرنجیو آمنہ۔ مجھے متعدد اشخاص نے لکھا اور بتایا ہے کہ تم بے مثال جرأت اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ اگر امام صاحب کی بیٹی جس کی پرورش اور تربیت فونکس اور آشرم میں ہوئی ہو ایسا نہیں کرتی تو پھر بھلا ہم کس سے ایسی توقع کر سکتے ہیں؟

(Collected Works, Vol. LIV, P. 252)

تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے حکومت وقت نے لوگوں کی جائدادیں ضبط کرنا شروع کیا۔ باپو نے آشرم کو بھی ضبطی کے لئے پیش کیا لیکن حکومت نے اسے ضبط نہیں کیا۔ گاندھی جی نے آشرم کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا، آشرم میں مقیم حضرات نے بخوشی یہ فیصلہ منظور کیا اور قریب کے گاؤں میں ستیہ گرہ مارچ کرنے کا ارادہ کیا لیکن یکم اگست ۱۹۳۳ء کو علی الصبح مارچ سے پہلے ہی سب گرفتار کر لیا گیا۔ آمنہ بھی گرفتار ہونے والی تھیں۔ باپو کے کہنے پر وہ غلام رسول قریشی سے جو ان دنوں خود جیل میں تھے اس کی اجازت لے چکی تھیں۔ گرفتاری سے ایک روز قبل ان کے تینوں چھوٹے بچے انوسویا بین کے ہریجن آشرم میں پہونچا دیئے گئے۔ (انوسویا بین احمد آباد کی مشہور مزدور لیڈر تھیں) ولبھ بھائی پٹیل کے نام اپنے خط میں باپو نے اس کا ذکر کیا ہے۔ "آنندی اور دوسری لڑکیاں نیز قریشی کے بچے انوسویا بین کی ہریجن بورڈنگ میں ہیں۔ میں نے سوچا ہمارے بچوں کے لئے وہی ایک بہتر جگہ ہو سکتی تھی۔ بچے وہاں بہت خوش ہیں۔"

(Collected Works, Vol. LVI, September 13, 1933 - January 15, 1934 P. 405)

جب جمنالال بجاج نے گاندھی جی سے واردھا آشرم میں منتقل ہونے کا اصرار کیا تو سابرمتی آشرم کو ہریجن فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا گیا اور آشرم کے کچھ پرانے اشخاص کو اس کام کی ذمہ داری سونپی

گئی۔ غلام رسول قریشی کو باہر کے متعلقہ کام اور آمنہ قریشی کو آشرم کے اندرونی معاملات کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ آمنہ نے اپنے بچوں کے ساتھ آشرم کے سبھی بچوں کی مادر مہربان کا کردار بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا ۱۹۶۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (نوٹس کشن بھائی ترویدی متذکرہ)

آمنہ قریشی کی بیٹی سلطانہ تنہا آج بھی ہریجن آشرم میں مقیم ہیں۔ اور تیاگ و قربانی کے عہدِ رفتہ کی ایک خوشگوار یاد ہیں۔

فاطمہ عریضی

فاطمہ بیگم عریضی امام صاحب عبد القادر بادزیر کی بیٹی اور آمنہ قریشی کی بڑی بہن تھیں۔ خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ انھوں نے بھی اپنی زندگی کا خاصا عرصہ سابرمتی آشرم میں گزارا تھا۔ نیز آشرم کے مختلف کاموں میں فعال کردار ادا کیا تھا۔

لاہور سے مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۱۹ء کے ایستھر فارنگ کے نام اپنے خط میں گاندھی جی نے آشرم کی زندگی کی تشریح کرتے ہوئے ان سے معلوم کیا تھا۔ "کیا فاطمہ کتائی کا کام کر رہی ہیں؟ اگر نہیں تو فاطمہ اور آمنہ دونوں سے کہو کہ اس سے غفلت نہ برتیں انھیں یہ کام ایک مقررہ وقت پر روزانہ کرنا ہے۔ آشرم کی دوسری خواتین کے لئے بھی یہی ہدایت ہے۔"

(Collected Works : Vol.XVI, P. 343)

انھیں کے نام ایک دوسرے خط میں بتاریخ ۲۵ جنوری ۱۹۲۰ء باپو نے لکھا تھا "تمہاری سے یہ سن کر میں بہت خوش ہوں کہ تمہارا قیام امام صاحب کے ساتھ ہے۔ یہاں تمہیں زیادہ اپنائیت کا احساس ہوگا کیونکہ مستقل انگریزی بولنے کی سہولت رہے گی۔ تمہیں فاطمہ پر اپنی محبت نچھاور کرنے کا بھی

موقع ملے گا جس کے نتائج فوری ہوں گے"۔ Ibid : P. 506

فاطمہ بی بی کی شادی ستیہ گرہ آشرم سے ہی ہوئی۔ دعوت نامہ گاندھی جی کی طرف سے تھا۔ کارڈ کی پیشانی پر بسم اللہ لکھی تھی، پھر ستیہ گرہ آشرم، سابرمتی ۲؍اپریل ۱۹۲۰ء درج تھا۔ دعوت نامے کا مضمون حسب ذیل تھا۔

"عزیز دوست۔ فاطمہ بی بی میرے دوست و بھائی امام عبدالقادر صاحب کی بڑی بیٹی ہیں۔ امام صاحب اور میرا جنوبی افریقہ، ہندوستان میں آشرم اور جیل کا برسوں کا ساتھ رہا ہے۔ فاطمہ بی بی کی شادی حسین میاں عریضی کے ہمراہ بروز شنبہ ۲۶؍اپریل ۱۹۲۰ء بوقت شام ۷ بجے ہونا قرار پائی ہے۔ ساڑھے چھ بجے میلاد شریف ہوگا۔ آپ سے گزارش ہے کہ تقریب سعید میں شریک ہوکر دولھا دولہن کو اپنی نیک خواہشات سے نوازیں۔ موہن داس کرم چند گاندھی"۔ (Collected Works : Vol. XVII, P. 399

اس شادی کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے گاندھی جی نے "نوجیون" بتاریخ ۹؍مئی ۱۹۲۰ء میں لکھا تھا، "میں آشرم کی اس شادی اور باہری شادیوں میں فرق کیے بنا نہیں رہ سکتا۔ امام صاحب کا تعلق ایک دیندار اور معزز مسلم خاندان سے ہے۔ دو مختلف مذاہب کو ماننے کے باوجود ہم دونوں ابتدا سے ہی حقیقی بھائیوں کی مانند رہے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کے مذہب کا خلوصِ دل سے احترام کیا ہے۔ ان کے نماز ادا کرنے پر آشرم میں کسی کو اعتراض نہیں ہوا اور وہ ہندوؤں کے طریق عبادت پر کبھی معترض نہیں ہوئے۔ ان کی بڑی بیٹی فاطمہ کی شادی ہوئی ہے۔ فاطمہ بیس سال کی ایک ذہین لڑکی ہے۔ اس کے مشورے کے بعد ہی آشرم کے اصولوں کے مطابق یہ رسم انتہائی سادگی سے ہونا قرار پائی۔ امام صاحب، دولھا بھائی سید حسین عریضی کے عزیز نیز آشرم سے متعلق سبھی افراد مدعو کیے گئے تھے۔ ان کی تواضع گھر میں بنے شربت اور پھلوں سے

کی گئی۔ روشنی کے لئے دیوار پر صرف ایک لیمپ ٹنگا ہوا تھا۔ رسم شادی دو گھنٹہ چلی۔ آدھا گھنٹہ میلاد شریف ہوا۔ پھر قاضی صاحب نے دولھا و دلہن کی موجودگی میں نکاح نامہ لکھا وہ پڑھا گیا۔ پھر اس پر دستخط ہوئے جس میں بیس منٹ صرف ہوئے۔

بعد خطبہ و دعا مہمانوں کی تواضع شربت و پھلوں سے کی گئی۔ دولھا کا لباس بہت سادہ تھا۔ شادی کی رسم جو ساڑھے چھ بجے شروع ہوئی ساڑھے آٹھ پر ختم ہو گئی فاطمہ بی بی آشرم کے سبھی ساتھیوں سے ملنے گئیں۔ رخصت کا وقت قریب آرہا تھا۔ یہ نظارہ بڑا متاثر کرنے والا تھا۔ فاطمہ رونے لگیں۔ انھیں سمجھایا گیا کہ اب ان کا فرض یہی ہے کہ وہ اپنی آشرم کی تربیت' سچائی، حلیمی سودیشی اور قومی خدمت کے پیغام کو اپنے نئے گھر میں عام کریں"۔ Ibid

افسوس کہ فاطمہ بی بی کی زندگی نے ان سے وفا نہیں کی اور امام صاحب کی زندگی میں ہی ان کی وفات ہو گئی۔

امینہ طیّب جی

امینہ طیب جی گجرات کے ممتاز سیاسی رہنما عباس طیب جی کی اہلیہ اور بدرالدین طیب جی کی بیٹی تھیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۶۶ء اور انتقال ۱۹۴۲ء میں ہوا۔

(Natish Kumar Jain : Muslims in India, A Bibliographical Dictionary, P. 194)

امینہ طیب جی ابتدا سے ہی انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ رہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے شوہر کی متعدد گرفتاریوں میں ان کی ہمت بندھائی بلکہ قومی محاذ پر خود بھی آگے بڑھ کر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ملاحظہ ہو مہاتما گاندھی کا ایک خط جس میں انھوں نے عباس طیّب جی کی سیاسی سرگرمیوں میں ان کی اہلیہ اور بیٹیوں کے کردار کا ذکر کیا ہے۔ خط بنام عباس طیّب جی۔

" آشرم
۱۳ مئی ۱۹۲۰ء

میرے پیارے دوست۔ آپ کا خط ملا۔ بڑی مسرت ہوئی۔ میں بہت خوش ہوں کہ آپ قومی محاذ پر مزید کام کے لئے سوچ رہے ہیں۔ اس کے لئے آپ نے مجھے غلط مبارک باد دی۔ میں صرف آپ کو لاہور تک کھینچ لانے اور زبردست

ذہنی تناؤ کے باوجود آپ کو وہاں رکھنے کے لئے ضرور مبارکباد کا مستحق ہوں
آپ نہیں جانتے دوسری صورت میں ہم نے کیا کچھ کھو دیا ہوتا۔ میرا حصہ اس
مبارکباد میں آپکی بیگم اور دونوں عظیم بیٹیوں کے ساتھ برابر کا ہے۔ جنھوں نے
آپ کو لاہور کے لئے آمادہ کیا۔ پھر ہنسی وخوشی روانہ کیا اور ہمت بڑھائی۔
ان لوگوں کی تکالیف اور برداشت کے مقابلے میں میں صرف ایک چوتھائی
مبارکبادی کا حقدار ہوں"۔

گاندھی جی اور عباس طیب جی کانگریس پنجاب انکوائری کمیٹی کے
سلسلے میں ۱۹۲۰ء کے اوائل میں لاہور میں تھے۔ مندرجہ بالا حوالہ اسی کا ہے

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. XVII, February to June, 1920, P. 414-415)

قومی محاذ پر امینہ طیب جی کو نیا میدانِ عمل ۱۹۳۰ء میں ملا جب گاندھی جی
نے انھیں بیٹی کے ساتھ گجراتی خواتین کی کانفرنس میں مدعو کیا۔

"ڈانڈی!

۱۱ اپریل ۱۹۳۰ء

میری پیاری ریحانہ، میں چاہتا ہوں کہ تم اور والدہ (امینہ طیب جی)
مع دیگر افراد کے بروز اتوار یہاں آجاؤ۔ میں گجراتی خواتین کی ایک کانفرنس
طلب کر رہا ہوں جس میں شراب اور ولایتی کپڑوں کے مسئلے کا حل تلاش
کرنے کی مناسبت اور امکانات پر غور کیا جائے گا"۔

(Collected Works : Vol. XLIII, March - June, 1930, P. 238)

گجراتی خواتین کی اس کانفرنس میں امینہ طیب جی نے انتہائی اہم کردار ادا
کیا۔ ان کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر کانفرنس نے لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے
جو پانچ نفری کمیٹی بنائی انھیں اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ ملاحظہ ہو

کانفرنس کی روئداد:

"گجراتی خواتین کی یہ کانفرنس جو ڈانڈی میں ۱۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو منعقد کی گئی گاندھی جی کو سننے کے بعد یہ فیصلہ کرتی ہے کہ خواتین شراب اور ولایتی کپڑے کی دوکانوں پر دھرنا دیں گی اور دوکانداروں نیز خریداروں سے درخواست کریں گی کہ وہ ان کی خرید و فروخت سے باز رہیں۔

کانفرنس کا یہ بھی خیال ہے کہ ولایتی کپڑوں کا بائیکاٹ صرف کھادی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس لئے خواتین کا یہ اجتماع یہ عہد کرتا ہے کہ وہ صرف کھادی کا ہی استعمال کریں گی۔ جہاں تک ممکن ہو سکے باقاعدگی سے سوت کاتیں گی، اپنے پڑوس میں کھادی کی تبلیغ کریں گی۔ پڑوسیوں کو کاتنا سکھائیں گی، اور پابندی سے سوت کاتنے کی ہمت افزائی کریں گی۔

یہ کانفرنس مندرجہ ذیل ممبروں کی ایک مجلس عاملہ بھی مقرر کرتی ہے جو کام کا لائحہ عمل تیار کرے گی اور ضرورت کے لحاظ سے اُسے بدلنے کی بھی مجاز ہوگی۔

		ممبرس
مسز امینہ طیب جی	صدر	
شریمتی میٹھو بہن	سکریٹری	شریمتی منی بہن پٹیل
		شریمتی روہنی دیسائی
		شریمتی چندو بہن

(Collected Works : Vol. XLIII, P. 271)

یہ طے ہو جانے پر کہ شراب اور ولایتی کپڑوں کی دوکان پہ پکٹنگ میں خواتین بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتی ہیں، مہاتما گاندھی نے امینہ طیب جی کو لکھا۔

"۲۷ اپریل ۱۹۳۰ء

پیاری بہن۔ وائسرائے کے نام جانے والا خط بھیج رہا ہوں برائے

مہربانی دستخط کر کے ڈاک کے سپرد کرنے کے لئے واپس بھیج دیجئے۔
مخلص م۔ک۔گاندھی

(IBID : P. 347)

وائسرائے کو بھیجے گئے خط کا متن حسب ذیل ہے :

"یور ایکسی لینسی: ہم گجراتی خواتین اب یہ سمجھتے ہیں کہ ملک جس ہنگامی دور سے گزر رہا ہے۔ اس میں ہم موجودہ واقعات سے اپنے کو علیحدہ نہیں رکھ سکتے۔ ہم نمک ستیہ گرہ کے سلسلے میں چل رہی سول نافرمانی کی تحریک سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں۔ ہماری دیہاتی بہنوں نے تو پہلے سے ہی نمک پر عائد پابندی کو توڑنا شروع کر دیا ہے۔

لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم خواتین کو اپنی سرگرمیوں کے لئے ایک مخصوص میدانِ عمل تلاش کرنا چاہیئے۔ ہماری رائے میں گاندھی جی کے اس خیال میں وزن ہے کہ خواتین غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک میں فعال کردار ادا کر سکتی ہیں۔ شراب و نشیلی اشیاء نے بہت سے گھروں کو تباہ کیا ہے اور ولایتی کپڑوں کے سبب ہندوستان کی بہت سی خواتین سے ان کا فالتو اوقات کا روزگار چھن گیا ہے جس کا اوسط سال میں چار ماہ سے کم نہیں پڑتا۔ یہ دو ایسے مسئلے ہیں جن سے مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ متاثر ہیں۔ ان اشخاص سے درخواست کرنے میں جو ان چیزوں کا کاروبار کرتے ہیں اور ان سے جنھیں شراب اور ولایتی کپڑے کی چاہ کھینچ کراتی ہے ہم اپنی کوششوں میں مردوں سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہم خواتین کے کام کرنے کا مطلب ہی پُرامن طریقے پر کام کرنا ہے۔

اپنی تحریک کے آغاز پر ہم ادب سے یہ بھی گوش گزار کرنا چاہیں گے کہ شراب اور دیگر نشیلی اشیاء کی خرید و فروخت اور ولایتی کپڑوں کی درآمد پر پابندی عائد کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اول الذکر نہ صرف افراد کے جسم و ذہن

تباہ کرتی ہے بلکہ ان کے گھروں کی بربادی کا بھی باعث ہے۔ آخر الذکر اس بدقسمت ملک کے دیہاتوں میں معاشی بدحالی کی ذمہ دار ہے۔

ولایتی کپڑوں کی درآمد سے متعلق دلیل کا اطلاق کچھ حد تک ہندوستانی ملوں میں تیار شدہ کپڑوں پر بھی ہوتا ہے۔ گو ان ملوں کا پیدا شدہ مال ابھی ضرورت سے اتنا کم ہے کہ کھادی کو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ہماری خواہش تھی کہ اگر وقت اجازت دیتا تو ہم اپنی دوسرے صوبوں کی بہنوں کی خواہشات کی بھی ترجمانی کرتے۔ اس سلسلے میں ان کی رائے کا ہمیں بخوبی احساس ہے کیونکہ ہم کسی نئے مسئلے پر غور نہیں کر رہے ہیں۔ قومی تنظیم کانگریس کی وساطت سے پوری قوم کو ان مسائل کا علم ہے۔ ہمارا مقصد بہ نسبت اور دوسرے متعلقہ مسائل کے جو قومی آزادی کے سلسلے میں درپیش ہیں صرف ان دو مسائل پر ہی اپنی خصوصی توجہ مرکوز کرنا ہے اور اپنے کو اس کام کے لئے وقف کر دینا ہے۔"

ہم ہیں آپ کے تابعدار

دستخط

(Collected Works : Vol. XLIII, PP. 336 - 337)

مندرجہ بالا خط میں جو بیس خواتین کے دستخط ہیں۔ اس میں مسلم خواتین آمنہ قریشی، آمینہ طیبؔ جی اور ریحانہ طیب جی ہیں۔ ۲۰ر اپریل ۱۹۳۰ء کے "نوجیون" اور ۱۷ اپریل ۱۹۳۰ء کے "ینگ انڈیا" میں گاندھی جی نے خط پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مندرجہ بالا ریزولیوشن پاس کر کے گجراتی خواتین نے اہم ذمہ داری سنبھالی ہے اور بیگم آمینہ طیب جی اور ان کی کمیٹی نے خواتین کی طرف سے یہ ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی ہے۔ خدا ان کو طاقت دے۔"

عباس طیب جی کی وفات کے بعد گلیڈ مین اُودین کے نام اپنے خط مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۳۶ء میں گاندھی جی نے انھیں لکھا تھا: "بڑودہ میں

عباس طیب جی سے ملنے کی تم بہت خواہش مند تھیں لیکن افسوس کہ اب وہ نہیں رہے ۔ ان کا تعلق ان غیر معمولی شریف انسانوں سے تھا، جن سے ملاقات میرے لئے بڑی خوش قسمتی کی بات تھی ۔ لیکن ان کے خاندان سے ملنے کی خواہش تمہیں اب بھی ہونا چاہیئے ۔ وہ سب لوگ انھیں پرانی روایات کے علمبردار ہیں ۔"

(Collected Works : Vol. LXIII, June 1 - November 2, 1936 P. 128)

بیگم سکینہ لقمانی

بیگم سکینہ لقمانی جسٹس بدرالدین طیب جی کی بیٹی تھیں جو انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالنے والوں میں سے ایک تھے۔ ان کے شوہر مسٹر لقمانی بمبئی کے مشہور ڈاکٹر تھے۔ سکینہ لقمانی بذاتِ خود مقامی کانگریس شاخ کی صدر تھیں اور قومی سرگرمیوں میں پیش پیش تھیں۔ مہاتما گاندھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ریحانہ طیب جی کے نام اپنے خط مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۳۰ء میں ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے گاندھی جی نے لکھا۔

" لقمانی کیسی ہیں؟ طیب جی خاندان نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔"

(Collected Works : Vol. XLIV, July - December, 1930, P. 54)

ولے پارلے بمبئی میں ۸ارمارچ ۱۹۳۱ء کے ایک جلسے میں مہاتما گاندھی نے اپنی تقریر میں کہا تھا " آپ لوگوں نے جو سپاس نامہ اور رقم میری نذر کی ہے اس کے لئے میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ اس خوشی میں مزید اضافہ کا سبب چند اور بھی وجوہات ہیں۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے صدر جلسہ نٹ راجن میرے دوست ہیں سپاس نامہ مسز لقمانی نے پڑھا ہے جو طیب جی خاندان سے ہیں جس سے میں محبت کی اٹوٹ بندشوں سے جکڑا ہوا ہوں۔"

(Collected Works : Vol. XLV 1930 - 31, P. 309)

شراب اور ولایتی کپڑوں کی دوکانوں پر پکٹینگ کے سلسلے میں بیگم سکینہ لقمانی نے فعال کردار ادا کیا۔ واضح رہے گجراتی خواتین کی طرف سے جو خط وائسرائے کو بھیجا گیا تھا اس پر بیگم سکینہ لقمانی کے بھی دستخط تھے بیگم لقمانی شراب کی دوکانوں پر دھرنا دینے کے لئے پانچ سو گز کی دوری پر بیٹھی تھیں۔ ان کی صرف موجودگی کا ہی اتنا اثر تھا کہ خریدار دوکان تک پہونچنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ عاجز ہو کر دوکانداروں نے ان پر تشدد بھڑکانے کا الزام لگایا۔ سکینہ لقمانی گرفتار کر لی گئیں۔ کرلا (ضلع تھانہ) میں اُن پر مقدمہ چلا اور ۳ ماہ قید با مشقت نیز سو روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ جرمانے کی عدم ادائیگی کی صورت میں قید مزید ایک ماہ بڑھ جانے کا حکم تھا۔ بیگم سکینہ لقمانی کی عمر اس وقت پینسٹھ سال کی تھی جرم کی نوعیت سزا کی سختی اور ان کی ضعیفی، ہندوستان کے طول و عرض میں اس سزا کے خلاف احتجاج ہوا۔ ملاحظہ ہو بمبئی کرانیکل میں شائع ایک خط بنام اڈیٹر جناب

ہم دیش سیوکائیں اس معزز و محترم دیش سیوکا کی خدمت میں نذرِ عقیدت پیش کرتی ہیں جنھیں اس عمر میں ۳ ماہ قیدِ با مشقت کی سزا سنائی گئی ہے۔ مسز لقمانی کا جرم کیا ہے؟ یہ سزا ایک ایسے کام کے لئے ہے جس کام پر ہر ملک و مذہب میں اس شخص کو عزت کا تاج پہنایا جاتا ہے جس نے اپنے ہم وطنوں کو صحیح راستے پر چلانے کی کوشش کی ہو۔ یہ خاتون انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک معزز شخص کی بیٹی ہیں جو بمبئی ہائی کورٹ کے جسٹس بھی رہ چکے ہیں وہ اپنے ایک بدنصیب بھائی کو شراب سے روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دیش سیوکائیں مادر وطن کی خاطر ہر قربانی کے لئے تیار ہیں۔ اب جبکہ ماں کو کام کرنے سے زبردستی روک دیا گیا ہے۔ ان کی بیٹیاں ان کا کام آگے بڑھائیں گی۔ کل خواتین کے جلوس میں مسز لقمانی نے جو جھنڈا اٹھایا وہ امن و انسانیت کے لئے ہماری مسلسل جدوجہد کا مظہر ہے۔ آپ کی سیوکا۔"

(بمبئی کرانیکل ۱۰ر جولائی ۱۹۳۰ء)

اسی اخبار میں مسٹر جی کے۔این نے احتجاج کیا۔

وحشیانہ و ناعاقبت اندیشی: ہندوستانی عوام کا ردعمل مسز سکینہ لقمانی کے معاملہ میں وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ انھیں چار ماہ کی قیدِ با مشقت دی گئی ہے۔ شاید رپورٹ کرنے میں کہیں پر غلطی ہوئی ہے۔ سیاسی قیدیوں کے ساتھ سخت سزا کا حکم سُنائے جانے کے بعد بھی عموماً سختی نہ برتنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اپنے اصولوں پہ کاربند ایک مہذب خاتون کو جو جسٹس بدرالدین طیب جی کی بیٹی بھی ہیں ایسی سخت سزا ہندوستانی رائے عامہ کو بھڑکانے کے لئے کافی ہے... میں شراب کی دوکانوں پر پکیٹنگ اور مذہب کی آڑ میں جو کچھ کہا گیا اس کے خلاف ہوں۔ لیکن سزا کے وحشیانہ انداز کے مقابلہ میں خاتون کا جرم کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ چار ماہ کی قید بامشقت اور سو روپے جرمانے کی سزا میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی عوام کو یہ سند مانگنے کا حق ہے کہ آیا کرلا کے یہ مجسٹریٹ اس جگہ پر کام کرنے کے لئے بھی موزوں ہیں یا نہیں۔" ((IBID))

سزا کی خبر سن کر بمبئی کی خواتین نے جلوس نکالا۔ پھر ماہادیو باغ میں خواتین کی ایک نشست ہوئی۔ مسز ہنسہ مہتا نے اپنی تقریر میں کہا "ایسا نظام حکومت جس میں مسز لقمانی جیسی ضعیف خاتون کو پانچ مہینے کی قید بامشقت کا حکم سنایا جائے۔ جلد از جلد ختم ہونے کا مستحق ہے۔" اس نشست میں یہ بھی طے کیا گیا کہ خواتین کو جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لینا چاہیئے۔ مسز لیلاوتی منکر نے مسز لقمانی کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ "مسز منشی، مسز لقمانی، مسز پیرن کیپٹن کو جیل بھیج کر جو ہندو مسلمان اور پارسی فرقوں کی نمائندگی کرتی ہیں، حکومت نے یہ مان لیا ہے کہ آزادی کی لڑائی درحقیقت ایک قومی لڑائی ہے جس میں ہندوستان کے سبھی فرقے ایک ساتھ حصہ لے رہے ہیں۔"

ایک دوسری خاتون اسپیکر نے کہا "جب ہماری مسلم بہنیں جو پردے کے پیچھے زندگی گزارنے کی عادی ہیں اب میدانِ عمل میں آگئی ہیں اور آزادی کی لڑائی میں نمایاں کردار

ادا کر رہی ہیں تو ہم ہندو خواتین جو بیرونی دنیا کی عادی ہیں، پیچھے نہیں رہ سکتیں۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو شرمندگی کا باعث ہوگا۔"

(بمبئی کرانیکل جولائی ۱۹۳۰ء تاریخ مٹی ہوئی ہے)

عوامی غم و غصّے کے اظہار کے سبب چوبیس گھنٹے کے اندر گورنر (HUDGSON) کے حکم سے سزا کو آسان قید میں تبدیل کر دیا گیا نیز رہنے کے لئے بی اے (A) کلاس دیا گیا۔ بیگم سکینہ لقمانی دو ماہ جیل میں رہیں اس زمانے میں کانگریس کا کوئی شخص اپنا دفاع خود نہیں کرتا تھا۔ پھر وکلاء کی ایک جماعت نے ان کا مقدمہ لڑا اور ہائی کورٹ نے اُن کی رہائی کا حکم جاری کیا۔

گاندھی جی کی گرفتاری پر بیگم سکینہ لقمانی نے مسلم خواتین کی ایک میٹنگ بلائی یہ میٹنگ بلاواٹسکائی لوج میں بوقت شام منعقد ہوئی صدارت بیگم سکینہ لقمانی نے کی۔ متعدد مسلم خواتین کی تقاریر کے بعد مندرجہ ذیل ریزولیوشن پاس کیا گیا۔

"مسلم خواتین کا یہ جلسہ مہاتما گاندھی کے برت پر اپنی بے چینی کا اظہار کرتا ہے اور ان کی فوری و غیر مشروط رہائی کی مانگ کرتا ہے۔"

(بمبئی کرانیکل۔ بمبئی منگل ۲۳ فروری ۱۹۴۳ء)

مہاتما گاندھی کی شہادت پر بمبئی کی خواتین نے سوا میل لمبا جلوس نکالا جس کی قیادت باوجود انتہائی ضعیفی کے ہاتھ میں جھنڈا لئے بیگم سکینہ لقمانی کر رہی تھیں بیگم سکینہ لقمانی کا انتقال ۲۷ فروری ۱۹۶۰ء میں ہوا۔

(بمبئی کرانیکل کے تراشے اور بقیہ اطلاعات بیگم سکینہ لقمانی کی پوتی محترمہ یاسمین لقمانی نے مہیا کیں۔)

(154, Jolly Maker Apartments in CAFE PARADE, BOMBAY, 400005
Dated : 28.5.86)

ریحانہ طیب جی

ریحانہ طیب جی کی پیدائش ۲۶ جنوری ۱۹۰۱ء میں ریاست بڑودہ گجرات میں ہوئی۔ وہ مشہور قومی رہنما اور بڑودہ کے جج عباس طیب جی کی بیٹی تھیں۔ ان کی والدہ امینہ طیب جی کی قومی خدمات کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ مادرِ وطن کی خاطر قربانی کا جذبہ انھیں اپنے والدین سے ورثہ میں ملا تھا۔ جنگِ آزادی کی تحریک میں وہ ابتدا سے ہی پیش پیش رہیں۔ تعلیمی حیثیت سے وہ گریجویٹ تھیں۔ انگلش گجراتی اور اردو ہندی سے بہت اچھی واقفیت رکھتی تھیں۔ ریحانہ طیب جی نے اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی کام کیا تھا۔ اپنے خط میں گاندھی جی نے انھیں لکھا تھا۔ "اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تم کو جو کام مل گیا ہے سو تو بہت اچھا ہے۔ اب تو ریحانہ اسکالر کہلائے گی۔ آسمان میں اڑے گی اور ہم سب دیکھتے رہیں گے۔" (باپو کے خطوط ریحانہ طیب جی کے نام۔ گاندھی میموریل لائبریری راج گھاٹ نئی دہلی۔ ص۔ ۲۹۳)

گاندھی جی کو ریحانہ طیب جی کتنی عزیز تھیں اس کا اندازہ ان کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے جس میں گاندھی جی نے انھیں "بیٹی ریحانہ، استانی صاحبہ، پاگل ریحانہ، شریر لڑکی ریحانہ، چر بجھو ریحانہ، پریہ ریحانہ، اور بھلی بیٹی" جیسے پیار بھرے

ناموں سے مخاطب کیا ہے (ایضاً) ایک خط کے خاتمے پر لکھتے ہیں " باباجان واماں جان کو آداب اوروں کو بندے ماترم۔ تم کو تھپیڑ "۔

(ایضاً مورخہ ۲۳ رجون ۱۹۳۲ء ص ۲۳۶)

ریحانہ طیب جی نے بچپن سے صوفیانہ مزاج پایا تھا، شادی نہیں کی۔ اسلامی تصوف اور ہندو فلاسفی پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ ہر ایک مذہب کی سچائی پر انھیں کامل یقین تھا۔ ان کی عملی زندگی اور عقائد میں مکمل یکسانیت تھی۔ انتہائی روشن خیال تھیں شاردا بل کی حمایت میں پیش پیش رہیں۔ ان کے عقائد سے متعلق گاندھی جی نے لکھا تھا: " بی بی ریحانہ طیب جی کچھ دنوں کے لئے سیوا گرام میں ہمارے پاس رہنے کے لئے آئی تھیں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ ایک سچی مسلمان ہیں لیکن ان کے عظیم والد کے انتقال سے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ قرآن شریف کی اتنی اچھی قرات بھی کرسکتی ہیں۔ جب " گجراتی ہیرے " عباس طیب جی کا انتقال ہوا تو کمرے کی گہری خاموشی کو توڑتی ہوئی سسکیوں میں ریحانہ کی قرات گونج رہی تھی۔ عباس طیب جی جیسے افراد کبھی مر نہیں سکتے۔ ملک کی خاطر ان کی قربانیاں انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ بی بی ریحانہ گاتی بھی بہت اچھا تھیں اور ہر طرح کے بھجن انھیں یاد تھے۔ وہ روزانہ بھجن بھی گاتی تھیں اور قرآن کی آیتوں کی تلاوت بھی کیا کرتی تھیں۔ میں نے اُن سے آشرم میں کسی کو کچھ قرآنی آیتیں سکھانے کے لئے کہا اور انھوں نے بخوشی ایسا کیا۔

آشرم کے دوسرے افراد کی مانند وہ سب میں ایسا گھل مل گئی تھیں جیسے وہ ہمیشہ سے اپنی ہوں۔ رہائش کی مدت ختم ہونے پر ریحانہ واپس چلی گئیں لیکن اپنے پیچھے ایک ایسی مہک چھوڑ گئیں جو ہمیشہ اُن کی یاد دلاتی رہے گی "۔

(Collected Works of Mahatma Gandhi, Vol. LXXV, October 11, 1941 March 31, 1942, P. 281)

ریحانہ طیب جی گاندھی جی سے متاثر ہی نہیں تھیں وہ ان کے لئے خاندان

کے ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے تھے جن سے وہ نہ صرف دل کی بات بلکہ اپنی ہر ذہنی الجھن پر بلا تکلف تبادلۂ خیال بھی کر سکتی تھیں وہ صحت کی ہمیشہ سے کمزور تھیں گاندھی جی نہ صرف علاج کے بارے میں صلاح دیتے بلکہ ذہنی سکون کے لئے روحانی غذا کا انتظام بھی کرتے تھے۔ مثلاً ایک خط میں انھوں نے لکھا "جیون کے ساتھ مرن بھی خدا نے رکھا ہے، اس لئے ہم ایک سے خوش نہ ہوں، دوسرے سے ناخوش نہ ہوں۔ (لفظ مٹا ہوا ہے) کی دو بازو کی مانند دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ جینے کے موہ میں ہم موت کو الگ و برا مانتے ہیں"

(گاندھی جی کے خطوط ریحانہ طیب جی کے نام بتذکرہ ۲۱ جون ۱۹۳۲ء ص ۴۹)

ان کی علالت کے دوران اگر کچھ دن خیریت نہ ملے تو باپو بے چین ہو جاتے تھے یرودا جیل پونا سے خط لکھا: "پیاری بیٹی ریحانہ۔ میرا کارڈ ملا ہوگا۔ میں نے جو ڈر مانا تھا وہی ہوا۔ تم نے رواج کر رکھا ہے اس لئے جب تمہارا خط نہیں ملتا تو میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ اسی حالت میں ابا جان یا اماں جان سے بھی ایک کارڈ لکھوا سکتی ہو۔ کیسے بھی میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ بیمار ہوتے ہوئے بھی تمہارے لکھنا۔ کیوں بیمار ہو گئی بہت کام کیا تھا؟ تمہارے تو بیمار ہونا بھی نہیں چاہیئے اب اچھی ہو گی اس کارڈ کا جواب تمہارے دینے کی کوئی زورورت (ضرورت) نہیں ابا جان ایک کارڈ بھیج دیں تو کافی ہوگا" خدا حافظ باپو کی دعائیں۔

(ایضاً۔ ۱ دسمبر ۱۹۳۲ء ص ۳۲۹)

ایک اور جگہ نصیحت کرتے ہیں "کیوں تھوڑا آرام لے کر بالکل اچھی نہیں ہوتی اچھی رہے گی تو کام بہت ہے جو سیوا ہی کرنا چاہتے ہیں ان کو سیوا کی کمی نہیں ہوتی۔ باپو کی دعائیں"

(ایضاً۔ ۲۳ جنوری ۱۹۳۳ء ص ۳۲۱)

ریحانہ طیب جی بہت خوش الحان تھیں کانگریس کے اجلاس اور گاندھی جی کی دعائیہ نشستوں میں قومی گانے اور بھجن گایا کرتی تھیں

احمد آباد میں جب عدم تعاون ریزولیوشن پاس ہوا تو وہ سب سے پہلی مسلم خاتون تھیں جنھوں نے بندے ماترم گایا۔ میٹنگ کی صدارت حکیم اجمل خاں مرحوم نے کی تھی (حقیقی بہن بیگم سہیلہ حبیب، بدر باغ علی گڑھ، گاندھی جی توان کے گائے ہوئے بھجنوں کے شیدائی تھے۔ اپنے جیل سے بھیجے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں: "ریحانہ کو خدا تندرست رکھے اور مندرست (من درست) کرے اور رکھے۔ تمہارا بھجن سنے بنا اچھا نہیں لگتا۔ آکر سنا دو۔ تب بن سکتا ہے اس لئے تمہارے لڑکا بن کر جیل میں آنا ہوگا۔ دیکھتا ہوں پہادو (رہادیو) گا سکتا ہے کیا؟" (گاندھی جی کے خطوط۔ مذکرہ۔ ۴ اپریل ۱۹۳۲ء ص ۲۸۲)

ریحانہ طیب جی گاندھی جی کو اکثر بھجن اور غزل لکھ کر بھیجتی رہتی تھیں جس کا اکثر خطوط میں تذکرہ ہے۔ ملاحظہ ہو ایک خط: "پیاری بیٹی ریحانہ تمہارا خط اور بھجن ملا ہے۔ بھجن اچھا ہے آج زیادہ لکھنے کا وقت نہیں ہے۔ فاقہ کرنے کا ارادہ تم سب کو پسند آیا ہوگا۔ ابا جان کو تو یہ چیز سمجھنے میں مشکل ہی نہیں ہونی چاہیئے۔ خدا کے نام سے خدا کے کام کے لئے شروع کیا ہے۔ وہ ہی انجام پہونچا دے گا۔ مجھے اباجان کی اماں جان کی دعائیں چاہیئے تو کیا بھیجے گی؟ تجھے تو ناچنا چاہیئے کہ خدا نے باپو کو ایسی قربانی کرنے کا موقہ (موقع) دیا ہے۔ باپو کے آشیرواد" (ایضاً ۱۹ ستمبر ۱۹۳۲ء ص ۴۴)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں: "پیاری بیٹی ریحانہ بہت چالاک لڑکی ہے۔ اپنا بھجن کے لئے مجھے فاقہ کروانا چاہتی ہے۔ میں نہیں کروں گا اور بھجن تو گا کر سنائے گی تب دل کو بھائےگا۔ (بھائے گا) اگر اٹھ جاگ مسافر، میں نہ سنتا تو مجھے ایسا دلچسپ نہ لگتا اگر جیل کی دیوار کے بہار (باہر) سے بھی گائیگی (گائیگی) تو بھی تیری آواز مجھے پہونچ جائے گی۔ باپو کی بہت دعائیں" (ایضاً ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء ص ۳۳۶)

اکثر و بیشتر بھجن ان کے اپنے ہی لکھے ہوتے تھے۔ اس کا تذکرہ بھی

گاندھی جی کے خطوط میں ملتا ہے۔ مثلاً "پیاری بیٹی ریحانہ۔ فاقہ کے بعد یہ پہلا اردو خط ہے۔ تمہارے بھجن بہت اچھے ہیں۔ فاقہ شروع کرنے کے وقت جو بھجن گایا وہ تمہارا نہیں ہے تو کیا ہوا آخر ہے تو تم نے دی ہوئی عمدہ چیز۔ ہاں تمہارا ہی ہوتا تو مجھے بہت زیادہ اچھا لگتا۔ ٹھیک ہے۔ دوبارا (دوبارہ) جب فاقہ کا موقہ (موقعہ) خدا بھیج دے گا تب تمہارا ہی بنایا ہوا بھجن مجھے چاہیے۔ آج سے مجھے تیار کرو۔ باپو"۔ (ایضاً ص ۳۷۔ اس خط پر تاریخ نہیں ہے)

ریحانہ طیب جی کے گائے ہوئے بھجنوں کو یاد کرکے باپو کے دل میں پیار کا ساگر امڈ آتا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: "پیاری بیٹی ریحانہ بہت دن سے تم کو لکھنا کوشش کر رہا ہوں لیکن وقط (وقت) نہیں ملتا تو تو مجھے بھول ہی گئی ہے لیکن میں کیسے بھولوں۔ پرسو (پرسوں) ہی ناتادتی نے اٹھ جاگ مسافر گایا۔ اور تمہاری مورت میرے سامنے کھڑی ہوں"۔

(ایضاً، ۶ جولائی ۱۹۳۷ء ص ۳۵۹)

ریحانہ طیب جی گاندھی جی کو اردو سکھانے میں بھی مدد کرتی تھیں۔ گاندھی جی کے متعدد خطوط میں اس کا تذکرہ ہے جیسے ..... میں غلطیا (غلطیاں) تو بہت کرتا ہوں وہی رخ رکھنا۔ جب تھکان آوے تب درست کرنے کا چھوڑ دو ہیں تو ہر ہفطے (ہفتے) میں لکھنے کی کوشش کروں گا۔ شروع کیا ہے اسے نہیں چھوڑوں گا۔ میری استادنی کی عمر خدا دراز کرے۔

(ایضاً۔ ۹ فروری ۱۹۳۲ء ص ۲۷۶)

اسی سلسلے کا ایک دوسرا خط..... اور ریحانہ وہاں بیٹھی بیٹھی کیا کر رہی ہے کیسی استانی۔ اب حرف اچھے بنانے کے لئے کاپی بوک (بک) مگوالی (منگوالی) ہے۔ آج کل میں شروع ہو جائگی (جائے گی)، اردو کتاب تو پڑ (پڑھ) رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ بوجھ بہت اور وقت کم۔ دیکھیں خدا کے نام سے اور اسی کے کام کے لئے سب کر رہا ہوں وہ چاہے گا وہاں

ے جائے گا۔ تم نے تو گایا ہے۔

ملک نیند سے انکھیاں کھول ذرا۔ اے غافل رب سے دھیان لگا۔ جو کال کرے وہ آج تو کر۔ جو آج کرے وہ اب کرلے۔ اب کرلینے کی کوشش تو ہو رہی ہے۔ انجام پہونچانا اسی کے ہاتھ ہے (ایضاً ۹ رمئی ۱۹۳۲ء ص ۲۸۸)

یرودا جیل سے ریحانہ طیب جی کے نام ایک خط کے جواب میں گاندھی جی نے لکھا تھا "اگر میں حروف اچھے نکلے اور غلطی ایک بھی نہ رہے تو کبھی اردو نہیں لکھ سکوں گا۔ مجھے سکھاتی ہے اس کے ساتھ وقت بھی ڈاک سے بھیجے دو تو غلطیاں نہیں رہنے دوں گا۔ (ایضاً ۲۲ جنوری ۱۹۳۲ء ص ۳۲۰)

گجرات میں جب پہلی بار گاندھی جی نے شراب اور ولایتی کپڑوں پر پکٹنگ کے لئے خواتین کا اجلاس کیا تو خصوصی طور پر ریحانہ طیب جی اور ان کی والدہ جیسا کہ تذکرہ کیا جا چکا ہے امینہ طیب جی کو مدعو کیا گیا تھا۔ وائسرائے کو جو ریزولیوشن اس سلسلے میں بھیجا گیا اس پر ریحانہ طیب جی کے بھی دستخط تھے۔ وہ یوتھ لیگ (کانگریس کے نوجوانوں کی تنظیم) کی صدر بھی تھیں۔ صدر کی حیثیت سے انھوں نے پٹنہ میں ولایتی کپڑا فروخت کرنے والوں کے خلاف مظاہرے کی رہنمائی کی تھی۔

۱۹۳۲ء میں ریحانہ طیب جی کو 'ہندوستان چھوڑو' تحریک کے دوران ایک جلوس میں شرکت کی بنا پر گرفتار کیا گیا اور دیگر ساٹھ خواتین کے ساتھ ایک سال قید کی سزا ہوئی ان میں سروجنی نائیڈو بھی شامل تھیں۔ ان سب کو سینٹرل جیل ناگپور میں رکھا گیا تھا۔

ریحانہ طیب جی سیاست داں نہیں جنگِ آزادی کی مجاہدہ تھیں جیسا کہ ذکر کیا گیا۔ مزاج ابتدا سے ہی صوفیانہ تھا۔ گلیڈس اوڈین کے نام اپنے خط مورخہ ۸ رجولائی ۱۹۳۶ء، گاندھی جی نے لکھا تھا "ریحانہ روحانیت میں گہرا اعتقاد رکھتی ہیں"۔ اس لئے آزادی کے بعد بقیہ زندگی کا کاصاحب

کالیلکر، جنھیں وہ اپنے والد کے جیسا اور سروجنی نائیڈو، جنھیں وہ اپنی حقیقی بہن سمجھتی تھیں، کے ساتھ خاموشی سے گزار دی۔ آخر زندگی تک وہ نہ صرف قومی یکجہتی بلکہ عالمی بھائی چارے کے لئے کام کرتی رہیں۔ ہر روز سینکڑوں اشخاص ان سے روحانی فیض حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ ریحانہ طیب جی جنگِ آزادی کے ان ہزاروں مجاہدوں میں سے ایک تھیں جن کی قومی خدمات بے لوث اور صرف زنجیرِ غلامی کو توڑنے کے لیے تھیں۔ ریحانہ طیب جی نے ایک کتاب (THE HEART OF GOPI) کی مصنفہ تھیں اس کتاب کا ہندوستانی نیز کئی غیر ملکی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔ اور اس کی بہت شہرت ہوئی۔

ریحانہ طیب جی کا انتقال ۱۶ر مئی ۱۹۷۵ء میں ہوا۔

(انٹرویو سروجنی نائیڈو صدر ہندوستانی پرچار سبھا، سن ندھی راج گھاٹ، ۷ر جولائی ۱۹۸۰ء)

حمیدہ طیب جی

حمیدہ طیب جی گجرات کے مشہور مجاہد آزادی عباس شمس الدین طیب جی کی پوتی اور مجاہدہ آزادی ریحانہ طیب جی کی بھتیجی تھیں۔ ان کی پیدائش بڑودہ میں غالباً ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ سینئر کیمبرج کے بعد تحریک آزادی میں شریک ہونے کی خاطر کالج چھوڑ دیا۔

سیاسی خیالات و نظریات میں وہ گاندھی جی اور اپنے دادا شمس الدین طیب جی کی معتقد تھیں۔ "انڈین نشنل کانگریس اور یووک سنگھ" کی ممبر بھی تھیں۔

انھوں نے اپنے زمانے کی جنگ آزادی کی تقریباً سبھی تحریکات میں نمایاں حصہ لیا۔ مثلاً سودیشی تحریک، شراب کے خلاف ستیہ گرہ وغیرہ وغیرہ۔ حمیدہ طیب جی ایک لاٹھی چارج میں زخمی بھی ہوئیں۔ وہ خواتین کی اس ستیہ گرہ تحریک میں بھی شریک تھیں جسے منتشر کرنے کے لئے گھوڑ سواروں کی ایک ٹکڑی کا استعمال کیا گیا تھا۔ اور جس میں گھوڑ سواروں نے خواتین پر گھوڑے دوڑا دیئے تھے

تحریک آزادی کے سلسلے میں انھیں دو بار جیل کی سزا بھی ہوئی۔ ایک بار سول نافرمانی کی تحریک اور دوسری بار "ہندوستان چھوڑو" تحریک میں شمولیت کے سبب انھیں گرفتار کیا گیا اور جیل بھیجا گیا۔

سورت: مسٹر عباس طیب جی کی پوتی مس حمیدہ طیب جی اور سورت ضلع کے

پہلے ڈکیٹر کنھیا لال دیسائی کی اہلیہ مالویکا دیسائی اور بیٹی مس روہنی دیسائی کو آج خلاف قانون کارروائیوں میں شریک ہونے کی بنا پر سزا دی گئی۔ مسز ڈیسائی کو تین ماہ قید، سو روپے جرمانہ یا ڈیڑھ ماہ مزید قید کی سزا ہوئی۔ مس روہنی دیسائی اور حمیدہ طیب جی چار چار ماہ قید اور ساٹھ ساٹھ روپے جرمانہ یا چھ چھ ہفتے مزید قید کی سزا ہوئی۔ (مدینہ اخبار بجنور ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء)

گاندھی جی کے اکثر خطوط میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً مہادیو دیسائی کو اپنے خط مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۳۰ء انھوں نے لکھا" اولپاڈ مسلمان بستی ہے اس لئے حمیدہ وہاں کام کرے گی۔ کانجی بھائی کی بیٹی بھی وہیں ہے"۔

(Collected Works : Vol. LXIII, P. 250)

۲۷ اپریل ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے امینہ طیب جی کو لکھا کہ" حمیدہ اولپاڈ میں بہت اچھا کام کر رہی ہے"۔

۲۴ جنوری ۱۹۳۲ء کے خط میں انھوں نے ریحانہ طیب جی کو لکھا"۔ اب اور دو (اردو) شروع (شروع) ہوتا ہے۔ حمیدہ بہادر لڑکی ہے خدا اس سے بڑا کام لے گا اور اس کو بڑپن (بڑکپن) دے گا۔ بس خدا حمیدہ کو اومر دراج (عمر درازی) کرے۔ اس بارے میں تم کو بھی دھن دادہونا چاہیئے کیونکہ حمیدہ آخر میں تمہاری چیلی ہے نہ؟ (ریحانہ طیب جی کے نام باپو کے خطوط (گاندھی میوزیم لائبریری، راج گھاٹ ص ۲۷۵)

ریحانہ طیب جی کے نام ایک اور خط میں باپو نے معلوم کیا" سینچر کو سنا کہ حمیدہ چھوٹ گئی۔ یہ ٹھیک بات ہے کیا اگر ٹھیک ہے تو مجھے سب حال لکھے (ایضاً ۱۲ اپریل ۱۹۳۲ء ص ۲۹)

گاندھی جی کے کچھ خطوط براہِ راست بھی ان کے نام لکھے گئے ہیں لیکن ان کی نوعیت ذاتی ہے۔

حمیدہ طیب جی نے انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز کے مسٹر پر بودھ بہار (بمبئی) سے شادی کی تھی۔ آزادی کے بعد انھوں نے بقیہ زندگی ایک اچھی شہری، خاتون خانہ اور ایک اچھی ماں کی حیثیت سے گزاری (خطوط کے علاوہ معلومات محترمہ سروجنی ناناوتی، صدر ہندوستانی پرچار سبھا، راج گھاٹ نئی دہلی نے بہم پہنچائیں جو اسکول میں محترمہ حمیدہ طیب جی کی ساتھی بھی رہی ہیں اور خود ایک سرگرم مجاہدہ آزادی تھی)

کس غضب کی لو نکلتی ہے ترے پیغام سے

فاطمہ طیب علی

فاطمہ۔ ایف طیب علی کی پیدائش ۲؍نومبر ۱۹۰۲ء میں کیمبے (گجرات) میں ہوئی۔ والد کا نام عبدالعلی تھا جو طیب علی کے پوتے تھے جنھوں نے طیب جی خاندان کی بنیاد ڈالی اور بدرالدین طیب جی صدر کانگریس کے والد تھے۔ شادی بدرالدین طیب جی کے پوتے سے ہوئی ان دنوں کیمبے میں لڑکیوں کیلئے اسکول نہیں تھے اس لئے ان کی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔

فاطمہ طیب علی سیاسی نظریات وعقائد کے اعتبار سے مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل سے خصوصی طور پر متاثر تھیں۔ ابتداء سے ہی وہ انڈین نیشنل کانگریس کی فعال ممبر رہیں۔ نمک ستیہ گرہ میں بیٹویا، ضلع احمد نگر میں نمایاں حصہ لیا۔ گاؤں کی عورتوں کو کتائی کی تعلیم دی۔ اور کھادی کی تبلیغ کی۔ فاطمہ طیب علی ایک بار گاندھی جی کی انفرادی ستیہ گرہ اور دوسری بار "ہندوستان چھوڑدو" تحریک کے سلسلے میں جیل گئیں۔

فاطمہ طیب علی آزادی کے بعد سوشل ورک میں لگ گئیں۔ وڈے لا گاؤں میں صفائی ستھرائی کیلئے بہت کام کیا ان کے گاؤں کو مثالی گاؤں کے لئے احمد نگر ضلع میں پانچ سو روپیہ کا انعام بھی ملا ہے۔ اب بہت ضعیف ہیں۔ معلومات بذات خود محترمہ فاطمہ طیب علی سب پوسٹ وڈے لا ضلع احمد نگر، مہاراشٹر نے بذریعہ بیگم سہیلہ حبیب، علی گڑھ بذریعہ خط مورخہ ۲۵؍اکتوبر ۱۹۸۶ء مہیا کیں۔

صوفیہ سوم جی / سعداللہ خاں

بمبئی کی صوفیہ سوم جی ہندوستانی سیوادل میں خواتین کے شعبے کی نگراں و منتظم تھیں۔ مرحوم بادشاہ خان عبدالغفار خاں کے خطوط و تحریروں سے علم ہوتا ہے کہ صوفیہ سوم جی آل انڈیا کانگریس کی عورتوں کے شعبہ کی صدر اور رضاکاروں کی کمانڈر بھی تھیں۔ بادشاہ خان نے اپنی خودنوشت سوانح عمری (پشتو) کے صفحہ ۵۰۵ پر لکھا ہے۔

"کانگریس نگر بڑے پیمانے پر تیار تھا۔ سرحد سے کوئی نہیں آیا تھا۔ میرے ساتھ مہرتاج (میری لڑکی)، اور مریم (بڑے بھائی صاحب کی لڑکی) تھیں اور یہ سب (صوفیہ) کے ساتھ لڑکیوں کے کیمپ میں تھیں۔ صوفیہ بمبئی صوبے کی رضاکار لڑکیوں کی کمانڈر تھی اور یہ رضاکار لڑکیاں ذرا پہلے مہمانوں کی خدمت کے لئے آئی تھیں۔ میری لڑکی مہرتاج اور مریم بھی ان رضاکاروں میں شامل تھیں اور سارا دن خدمت کرتی تھیں۔"

(بحوالہ ذاتی خط، سرخپوش مجاہد آزادی خان غازی کابلی مرحوم مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۷ء)

صوفیہ سوم جی نے قومی جدوجہد آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں اور اس کی خاطر قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کی۔ جنگِ آزادی میں ان کی خدمات کا تفصیلی علم تو نہیں ہو سکا ہے تاہم دو خبروں سے ان کی دو بار گرفتاری کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ پہلی خبر ہے: "بمبئی ۱۲ مارچ۔ بمبئی کی مشہور خاتون مس صوفیہ سوم جی رہا ہو گئیں۔ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ

وہ بمبئی چھوڑ دیں۔" مدینہ" اخبار بجنور ۱۷ مارچ ۱۹۳۲ء دوسری خبر: "بمبئی کی مس صوفیہ سوم جی جو ہندوستانی سیوادل میں خواتین کے شعبے کی نگراں اور منتظم تھیں ہنگامی آرڈی نینس کی خلاف ورزی کے الزام میں کل دوپہر کو بمبئی میں گرفتار کر لی گئیں۔ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ شہر میں داخل نہ ہوں" (ایضاً ۹ مئی ۱۹۳۲ء)

صوفیہ سوم جی کی شادی ڈاکٹر خان صاحب (سرحدی گاندھی بادشاہ خان کے بھائی) کے عزیز بیٹے سعد اللہ خاں سے غالباً شری جمنا لال بجاج کے ایما پر ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو گاندھی جی کا ایک خط بنام جمنا لال بجاج مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۳۵ء

"معلوم ہوتا ہے تمہیں شادیاں طے کرانے میں خاص مہارت ہے۔ یہ شادی اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاریخی شادی ہوگی۔ غریب صوفیہ نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ وہ ایک پٹھان سے شادی کرے گی۔ نہ ہی سعد اللہ خاں کے وہم وگمان میں ہوگا کہ اس کی شریک حیات ایک غیر لڑکی ہو سکتی ہے۔ مجھے تمہارا انتخاب بہت پسند آیا دونوں خوش رہیں گے اور صوفیہ اپنی خواہش کے مطابق قوم کی زیادہ خدمت کر سکے گی"۔

شادی کے موقع پر گاندھی کی طرف سے مہادیو دیسائی نے دولھا دولہن کو مبارکباد کے خط میں لکھا: "اگر باپو کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ ذاتی طور پر آپ کو لکھتے۔ اب اس مبارک موقع پر ان کی طرف سے میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں خدا کرے یہ رشتہ آپ کی قومی لگن و قربانیوں کو مزید تقویت دے اور یہ کبھی نہ ٹوٹنے والا بندھن آپ کی ازدواجی زندگی کو زیادہ فعال اور با مقصد بنائے۔ آپ کا مخلص مہادیو دیسائی"۔

(ایضاً (IBID Vol. LXII, P. 182)

مرحوم بادشاہ خان نے اپنی مختلف تحریروں میں ان کا تذکرہ خانم سعد اللہ کے نام سے کیا ہے۔ اور متعدد مقامات پر ان کی قومی خدمات کو سراہا ہے۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری (پشتو) کے صفحہ ۳۵۶ پر انھوں نے لکھا ہے: "سعد اللہ خاں بمبئی کارپوریشن میں انجینئر تھے۔ ایک خوبصورت مکان بھی تھا۔ صوفیہ جو ان کی اہلیہ ہے بہت خوبصورت و اچھی لڑکی ہے اور بے حد قوم پرست اور محب وطن ہے میری بے حد عزت ہی نہیں

خدمت بھی کرتی تھی یہ (بحوالہ ذاتی خط مرحوم خان غازی کابلی، متذکرہ)

بریلی جیل سے "میٹھی صوفیہ" کے نام سے خطاب کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں مرحوم بادشاہ خان نے انھیں لکھا تھا:

"جیل میں ملاقات پر کوئی پابندی نہیں ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ ۲۰ یا ۲۵ منٹوں کی ملاقات کے لئے تکلیف اٹھاؤ۔ بمبئی سے یہاں تک آنے میں پیسے بھی زیادہ خرچ ہوتے ہیں۔ میں اچھا ہوں اور کسی قسم کی تکلیف مجھے نہیں ہے۔" (ایضاً)

رکھ دے ذرا سی کوئی خاکِ وطن کفن میں

شفاعت النساء بی بی

آپ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب نقشبندی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی اور رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ مولانا نے اپنی تمام زندگی جس بہادری، قوم پر مر مٹنے کے عزم اور حصولِ مقصد کی خاطر مستقل مزاجی سے سرگرمِ عمل رہنے میں گزاری وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو مولانا سے بڑی عقیدت سے ملتے اور احترام کرتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں "وہ ایک جانباز سپاہی کی حیثیت سے ہماری جنگِ آزادی کی تحریک میں یاد کئے جانے کے قابل ہیں"۔ بی بی شفاعت انھیں کی مانند محبِ قوم اور پُر جوش مجاہدۂ آزادی تھیں وہ جمعیۃ العلماء اور انڈین نیشنل کانگریس کی مخصوص و فعال رکن تھیں۔ شفاعت بی بی اور ان کے خاندان نے جنگِ آزادی میں زبردست قربانیاں دیں مولانا حبیب الرحمٰن اور ان کے صاحبزادگان کی زندگی دار و رسن کی آزمائش کی ایک داستانِ مسلسل ہے۔

مولانا نے اکثر مجلسوں میں کہا کہ "اگر مجھے اس عالی ہمت خاتون کی رفاقت نصیب نہ ہوتی تو شاید میں اتنا سیاسی کام نہ کر سکتا۔ اکثر رہنماؤں کو خانگی زندگی کی مجبوریوں سے سیاسی زندگی سے کنارہ کشی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن بعض دفعہ کچھ رہنماؤں کو خوش قسمتی

ہے ایسی رفیقہ حیات کا سہارا ملتا ہے جو ان کے سیاسی کردار کو اور بلند کر دیتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس رہنما کو اس رفیقہ کا ساتھ نہ ملتا تو ان کی زندگی اور انکا کام ادھورا رہ جاتا۔" غرض مولانا محترم کے لئے شفاعت بی بی کی رفاقت انھیں اثرات کی حامل تھی۔ مولانا اور ان کے صاحبزادگان جیل گئے۔ شفاعت بی بی نے تمام مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کئے انھوں نے ان کا سیاسی کام بھی جاری رکھا" خدا نے اس خاندان کو قوم و وطن کی محبت کی آگ بخشی ہے۔ قید و بند گرفتاریاں، خانہ تلاشیاں، حکومت کی دشمنی تیس سال تک یہی کھیل رہا۔ لیکن شفاعت بی بی کی چیتون پر کوئی بل تک نہ آیا۔ مولانا سات بار جیل گئے۔ ملاحظہ ہو ان ایام مصائب و آلام کی ایک جھلک اور اس دوران اس مجاہدہ بی بی کی صبر و استقامت کی ایک داستان۔

" مولانا حبیب الرحمٰن کو ۱۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کیا گیا اور چھ ماہ قید بامشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ ۷ر اگست ۱۹۲۲ء کو آپ کی قید کے چھ ماہ پورے ہو جاتے تھے اچانک تاریخ رہائی سے چار یوم پہلے پولیس لدھیانہ جیل میں لے آئی۔ آپ پر دوسرا کیس تیار کر کے مقدمہ چلا دیا گیا۔ اور ایک سال کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ قید کے ساتھ مولانا پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ بھی ہوا تھا آپ نے جرمانہ دینے سے انکار کر دیا۔ حکومت اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئی۔ ایک شام مغرب کے بعد پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے مولانا کے مکان کو گھیر لیا۔ اس وقت گھر میں مولانا مرحوم کی اہلیہ اور آپ کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے علاوہ کوئی بھی موجود نہ تھا۔ پولیس کے پاس گھر کے تمام سامان کی قرقی کا وارنٹ تھا جو آپ کی اہلیہ کو دکھایا گیا۔ آپ کی اہلیہ نے پولیس کو کارروائی کرنے کی بخوشی اجازت دے دی۔ پولیس نے گھر کا تمام سامان حتی کہ روزانہ استعمال کے برتن توا اور دست پناہ تک اٹھا لیا۔ زنانہ پولیس کے ذریعہ آپکی اہلیہ کا زیور اور دونوں چھوٹی بچیوں کے کانوں سے بالیاں تک اتروالیں۔ ۱۷ر اگست ۱۹۲۳ء کو آپ اپنی تمام قید ختم کر کے رہا ہوئے

لدھیانہ پہونچے، گھر کی تباہی ڈیوڑھی سے ہی نظر آرہی تھی۔ بارش سے گھر کی چہار دیواری جو کچی تھی گر چکی تھی۔ سامان ضبط ہو چکا تھا۔ دیوار گر جانے سے بے پردگی ہونے لگی۔ آپ کی اہلیہ نے رسی کھینچ کر اس پر پھٹے ہوئے کپڑے، کچھ ٹاٹ کے ٹکڑے ڈال کر دو سال گزار دیئے۔ گھر میں پہلے ہی کیا تھا۔ پھر جہاں پولیس تو ا اور آتشگیر تک اٹھا کرلے گئی ہو اس گھر میں چور کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گھر کی غربت سامان کی ضبطی آپ کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکی۔ آپ نے اپنی اہلیہ کے چہرے پر کوئی شکن نہ پائی بلکہ وہ زندگی کے آخری سانس تک آپ کی معاون رہیں۔"

(مولانا عزیز الرحمٰن جامعی ثم دہلوی: رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی در حدیث دیگراں۔ ص ۷۵، ۷۶، ۷۷)

قیام پاکستان کی مخالفت میں انھوں نے کافی کام کیا اور جمعیۃ العلماء اور کانگریس کی مختلف تحریکات سے وابستہ رہیں۔

لیکن جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو اس جلیل القدر خاندان اور اس علو ہمت خاتون پر بھی مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اگست ۱۹۴۷ء کے طوفان میں ان کا بھی کچھ نہ بچ سکا اور تمام خاندان کو انتہائی مجبوری کے عالم میں گھر چھوڑنا پڑا۔ آبائی گھر بھی چھن گیا اور مجاہدین آزادی خود پناہ گزینوں کی صف میں داخل ہو گئے۔ شفاعت بی بی پر اس صدمے کا غیر معمولی اثر ہوا اکثر کہتی تھیں "جلا وطنی ہماری خدمت کا صلہ ہے۔" انھیں لدھیانے سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ جب فسادات انتہائی شدت پر تھے تو بڑے اصرار سے مولانا سے کہا کرتی تھیں "ہم کو لدھیانہ نہیں چھوڑنا چاہیئے ہم کو یہیں مرجانا چاہیئے۔" جب وہ لدھیانے سے بہاولپور پہنچیں تو مولانا سے اکثر کہتی تھیں کہ میں کسی سکھ بہن کا بھیس بھر کر لدھیانہ جاؤں اور اپنا گھر دیکھ آؤں۔ ایک مرتبہ بہاولپور سے لاہور چلنے کی فرمائش کی۔ مولانا کے استفسار پر کہا لاہور لدھیانہ سے بہت قریب ہے۔ لیکن زندگی کے اس موڑ پر بھی انھوں نے نقل وطن کا خیال تک نہیں کیا۔ آخری دنوں میں دہلی آگئیں۔ یہاں جس مکان میں مقیم تھیں اس کی مالکہ واپس

اپنے مکان میں آگئی تھیں۔ اس خبر کو سن کر انھوں نے بڑی بے قراری سے کہا "وہ دن کب آئے گا جب ہم بھی اپنے گھر لوٹ سکیں گے"۔ لیکن افسوس ان کی زندگی میں یہ دن کبھی نہ آیا۔

۲۷ مئی ۱۹۴۸ء کو شفاعت بی بی ہیضہ میں مبتلا ہوئیں۔ اس کے بعد نمونیہ اور بخار کا دورہ ہوا۔ ان کے معالج ڈاکٹر شنکر داس نے ہزار جتن کئے لیکن مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ قدرت کا فیصلہ اٹل تھا۔ یکم جون کی رات کو وہ ہمیشہ کے لئے اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں۔ جنازے میں مسلمانوں کے علاوہ سیکڑوں ہندو سکھ بھائی بھی شریک تھے۔ نماز جنازہ مفتی کفایت اللہ صاحب نے پڑھائی اور مسجد شاہجہانی کے سائے میں انھیں ان کی آخری آرام گاہ میں پہونچا دیا گیا۔

شفاعت بی بی ایک برگزیدہ ہستی تھیں۔ ان کی دریا دلی بنی نوع انسان سے ان کی محبت جس میں ہندو مسلمان، سکھ عیسائی کی کوئی تخصیص نہیں تھی، غریب و مجبور انسانوں کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا، پروقار زندگی اور ملک و قوم کے لئے مر مٹنے کا مستقل جذبہ، ان کے کردار کی ایسی خصوصیات تھیں جن کی یادوں کے چراغ ان لوگوں کے دلوں میں آج بھی فروزاں ہیں جنھیں انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

سدا رہے نام اللہ کا (ماخوذ اخبار الجمعیۃ ۵ جولائی ۱۹۴۸ء)

(A BIBLIOGRAPHICAL DICTIONARY OF PROMINENT MUSLIM WOMEN, AL- KABIR AL-KAUSAR AE PP. 334-335)

اور رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، در حدیث دیگراں

مرتبہ: مولانا عزیز الرحمن جامعی ص ۷۵، ۷۶، ۷۷)

بیگم ماجدہ بانو

بیگم ماجدہ بانو مصطفیٰ احمد صاحب کی صاحبزادی تھیں جن کا تعلق لکھنؤ کے شیخان اودھ خاندان سے تھا۔ ماجدہ بانو کی پیدائش ۱۹۱۹ء میں حیدرآباد دکن میں ہوئی جہاں انکے والد تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ کچھ عرصہ کرامت حسین گرلز انٹر کالج میں ہوسٹل میں رہیں، پھر کشمیری محلہ میونسپل گرلز انٹر کالج میں تعلیم حاصل کی۔ دسویں کلاس کی طالبہ تھیں کہ جناب محمد صدیق ایڈوکیٹ سول لائنز بارہ بنکی سے شادی ہوئی اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ماجدہ بانو کا خاندان ابتداء سے خلافت تحریک میں شریک تھا۔ مرحوم رفیع احمد قدوائی سے تعلقات کی بناء پر کانگریس میں شرکت اختیار کی اور انھیں کی ایما پر ماجدہ بانو ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی مخالفت میں لکھنؤ کی مسلم کانسٹی ٹیونسی سے کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑی ہوئیں۔ ۱۹۳۷ء کا الیکشن ہندوستانی جنگ آزادی کی تحریک میں خصوصی اہمیت کا حامل تھا ملک گیر الیکشن کے نتائج سے یہ اخذ کرنا تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت کانگریس کی حامی ہے یا ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح نمائندہ مسلم لیگ ہے یوں تو اس الکشن میں متعدد نشستیں ایسی تھیں جن کو حاصل کرنے کے لئے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے ہی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اور نہ صرف ان کے حاصل کرنے کے لئے روپیہ

ہی پانی کی طرح بہایا جارہا تھا بلکہ ہر دو فریق کے لیڈروں نے بقول شخصے پوٹے ٹیک دیئے تھے۔ انھیں اہم نشستوں میں ایک زنانی نشست لکھنؤ کی تھی جہاں انیس احمد عباسی ایڈیٹر "حقیقت" کی سالی بیگم ماجدہ اور بیگم انعام حبیب اللہ کا مقابلہ تھا بیگم ماجدہ بانو کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑی ہوئی تھیں اور بیگم حبیب اللہ مسلم لیگ کی اُمیدوار تھیں۔ عالم یہ تھا کہ راجہ صاحب محمود آباد اور مولانا شوکت علی اور دوسرے مسلم لیگی رہنما کلام پاک ہاتھوں پر لئے جلسہ گاہ میں اور لوگوں کے گھروں پر فرداً فرداً آجاتے اور کہتے کہ اس وقت الکشن کا سوال نہیں کلام ربانی کی عزت کا سوال ہے مولانا شوکت علی مرحوم کا تو یہ حال تھا کہ وہ مولانا محمد علی کی روح کا واسطہ بھی مسلمانوں کو دیتے جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ

مجھے بھی تقریر کرنا تھی۔ جلسہ شروع ہونے سے

قبل مولانا شوکت علی بھی پہونچ گئے، ان کے گلے میں کلام پاک پڑا ہوا تھا۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے میرے بھائی تم مجھے جانتے ہو کہ محمد علی کا بڑا بھائی ہوں آج میرے چھوٹے بھائی کی روح عالم بالا سے تمہارے ووٹ کی طالب ہے۔ (از غلام احمد فرقت کاکوروی علی برادران رئیس احمد جعفری۔ ص ۷۳۔۷۴)

ماجدہ بانو نے الکشن کے دنوں میں زبردست کام کیا۔ اس الکشن کے متعلق الہ آباد کے روزنامہ اخبار لیڈر نے لکھا "ماجدہ بانو کو جو کم عمر خاتون ہیں لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علموں کی حمایت حاصل ہے۔ وہ جگہ جگہ برقعے میں جاتی ہیں اور تقاریر کرتی ہیں۔ ان کی ہر دلعزیزی متوسط کلاس اور غریب طبقوں میں برابر بڑھ رہی ہے" لیکن مقابلہ بہت سخت تھا۔ ماجدہ بیگم اکیسٹھ ووٹوں سے یہ الکشن ہار گئیں۔

۱۹۳۶ء میں ماجدہ بانو نے آزاد مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر محمد علی جناح کے خلاف مظاہرے میں بھی حصہ لیا یہ تنظیم چند قوم پرست نوجوانوں نے بنائی تھی۔

۱۲ فروری ۱۹۴۷ء میں بیگم ماجدہ بانو کا انتقال بارہ بنکی میں ہوا۔ (بشکریہ جناب عشرت علی صدیقی چیف ایڈیٹر قومی آواز مکتوب مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۸ء)

بیگم کلثوم سایانی

مسلمانوں کی خوجہ جماعت کا ایک فرقہ سنی خوجہ ہے جن کی تعداد بہت کم ہے ڈاکٹر رجب علی پٹیل کا تعلق اسی فرقہ سے تھا، ان کا خاندان قومی سرگرمیوں کے لئے مشہور رہا ہے۔ ڈاکٹر پٹیل گاندھی جی کے خصوصی رفیق کار اور معالج بھی تھے۔ گاندھی جی اکثر ان کے یہاں قیام کرتے تھے۔ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۰۰ء میں ان کی بیٹی کلثوم کی پیدائش ہوئی۔ کلثوم شروع سے ہی اپنے ماحول کے اثر سے قومی وسماجی کاموں میں حصہ لینے لگی تھیں۔ گاندھی جی سے وہ خصوصی طور پر متاثر تھیں۔ انگریزی وگجراتی بہت اچھی جانتی اور بولتی تھیں۔

انیس سال کی عمر میں کلثوم کی شادی ڈاکٹر جان محمد سایانی سے ہوئی جو انڈین نیشنل کانگریس کے صدر رحمت اللہ سایانی کے بھتیجے تھے۔ ڈاکٹر سایانی بڑے نیک دل اور مقبول ڈاکٹر تھے۔ وہ امن کمیٹی کے جسٹس، آنریری مجسٹریٹ آل انڈیا خلافت کمیٹی کے معالج خصوصی ہونے کے علاوہ دوسرے کئی عوامی اداروں سے بھی منسلک تھے۔ شادی کے بعد انھوں نے ہر طرح سے بیوی کی حوصلہ افزائی کی جس کے سبب کلثوم سایانی کو سیاسی وسماجی میدان میں عملی سرگرمیوں کے اظہار کا مناسب موقعہ ملا۔ اور وہ بڑی لگن وخلوص کے ساتھ کام میں لگی رہیں۔ ۱۹۲۰ء میں وہ ڈونگری میں چرخہ

کلاس کی ممبر بنیں۔ عوامی شعور کی بیداری کی خاطر پیری مین کیپٹن نے "یونٹی کلب" کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۰ء میں بیگم سایانی اس کی سکریٹری مقرر ہوئیں اور ۱۹۳۶ء میں جب پہلی قومی پلاننگ کمیٹی بنی تو بیگم کلثوم سایانی اس کے خواتین کے شعبے کی ممبر بنائی گئیں۔ بیگم سایانی کی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب صوبائی خودمختاری کی بنا پر بمبئی میں پہلی بار ۱۹۳۶ء میں کانگریس وزارت قائم ہوئی۔ وزیر اعلیٰ بالا صاحب کھیر نے اپنے پروگرام میں تعلیم بالغاں کو خصوصی اہمیت دی۔ بمبئی شہر کے لئے ایک کمیٹی بنی جس کے صدر خود کھیر صاحب اور بعد میں گلزاری لال نندہ صاحب رہے۔ بیگم کلثوم سایانی ۱۹۳۹ء سے اس کی رکن اور بعد میں نائب صدر رہیں یہ کمیٹی آئندہ چل کر سوشل ایجوکیشن کمیٹی میں تبدیل ہو گئی۔

بیگم سایانی تعلیم بالغاں کے پروگرام میں خاص طور سے بمبئی شہر کی مسلمان خواتین کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اس میں انھیں متعدد دشوار مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ ایک طرف مسلم خواتین اپنی ناخواندگی سے مطمئن تھیں دوسری طرف کانگریس میں مسلم لیگ کی آپسی رقابت کے سبب کانگریس کی طرف سے کئے گئے ہر کام کو مسلم لیگ شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اسی لئے تعلیم بالغان کی تحریک کو بھی عرصے تک مسلم ماس کانٹیکٹ کی ترکیب سمجھا گیا۔ سیاسی مخالفت کے سبب بعض لوگوں نے متوازی تحریک چلانے کا فیصلہ بھی کیا تاکہ "کھدر پوش" مسز سایانی کے اثرات ختم ہو جائیں لیکن بیگم سایانی نے ہر قسم کی مخالفت کا پامردی سے مقابلہ کیا۔

بمبئی شہر کے کئی علاقے ایسے ہیں جن میں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی ہے بھنڈی بازار، ڈونگری، ناگپاڑہ، مدن پورا، کرلا، ماہم وغیرہ، ان میں شمالی ہندوستان سے آئے ہوئے لوگ بسے ہیں۔ میمن، کوکنی، دکنی مقامی بولیوں کے علاوہ اردو ہی کو اپنی مادری زبان مانتے ہیں۔ ان ہی کی عورتوں میں تعلیم بالغاں کا کام کرنا تھا۔ مسز سایانی کے نزدیک سب سے پہلا مرحلہ عورتوں کو اکٹھا کر کے انھیں تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دلانا تھی۔ ان کو کسی ہال یا عام جگہ پر جمع کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے مسز سایانی نے ایسے وقت جب کہ

عورتیں نسبتاً فرصت میں ہوتی ہیں۔ بلڈنگوں کی کئی کئی منزلیں طے کر کے فرداً فرداً
ان عورتوں سے باتیں کرنا شروع کیا۔ بڑی عمر میں پڑھنے لکھنے کی جھجک دور کی۔ کتابیں
پنسل کاغذ، سلیٹ کی سہولیتں بہم پہنچانے کا وعدہ کیا اور اس طرح مسلسل کوشش
کے بعد انھیں آمادہ کیا کہ گھنٹہ دو گھنٹہ اس کام کے لئے دیا کریں۔ اس ابتدائی کام کے بعد
عورتوں کو بلڈنگوں سے باہر کہیں کلاس روم یا کسی اور جگہ لے جانے کی بجائے بلڈنگ ہی
میں جہاں کہیں کچھ بھی کھلی جگہ ملی وہیں کلاس شروع کر دی گئی۔ کہیں زینے کا چبوترہ
اور کبھی کمروں کے سامنے کا راستہ کلاس روم بن جاتا۔ یہاں تختہ سیاہ، تعلیم کے
سامان، ٹیچر وغیرہ کا انتظام کمیٹی کی طرف سے کیا جاتا۔ بمبئی کی بلڈنگیں عموماً تین چار
منزل کی ہوا کرتی تھیں۔ موسم کیسا ہی ہو موسلا دھار بارش، شدت کی گرمی، مسز سایانی،
ایک مجاہد کی طرح اونچے اونچے زینے طے کرتی ہوئی ان کلاسوں کی نگرانی کرتیں۔ ان
عورتوں کا حوصلہ بڑھاتیں۔ نوشت وخواندگی کی اہمیت سمجھاتیں، عام معلومات سے ان کے
علم میں اضافہ کرتیں۔" (سید شہاب الدین دسنوی، ایک مجاہد خاتون، کلثوم سایانی
ہماری زبان انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔ ۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

بیگم کلثوم سایانی کی مسلسل کوششوں کے سبب بمبئی میں تیس سال کے عرصے میں
پانچ لاکھ خواتین کو خواندگی کی تعلیم دی گئی جس میں برقعہ پوش خواتین کی تعداد تیس ہزار
تھی۔ انھوں نے نوآموز بالغوں کے لئے اردو میں ایک پندرہ روزہ اخبار نکالنے کا بھی فیصلہ
کیا جس کا نام "رہبر" تجویز ہوا، غالباً یہ پہلا اخبار تھا جو نوآموز بالغوں کے لئے نکالا
گیا۔" اس کی زبان گاندھی جی کے تصوّر کی ہندوستانی تھی، مضامین معلوماتی اور ہلکے
پھلکے ہوتے تھے۔" (ایضاً) بیگم سایانی نے اردو رہبر کے ساتھ دیوناگری اور گجراتی
رسم الخط میں بھی 'رہبر' نکالنا شروع کیا جو ایک انقلابی قدم تھا۔ رہبر ۱۹۶۰ء تک
پابندی سے نکلتا رہا۔ ادارت کی ذمہ داری بیگم سایانی کی اپنی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں جب
مسز ہنسا مہتا جیل گئیں تو بیگم سایانی آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی ایکٹنگ جنرل سکریٹری
مقرر ہوئیں اور ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۶ء تک اس کی باقاعدہ جنرل سکریٹری کی حیثیت سے کام

کیا۔ اس دوران انھوں نے ۶۵۰۰ ممبران سے ۲۲،۵۰۰ تک کی تعداد بڑھانے میں زبردست کارکردگی کا ثبوت دیا۔ ۱۹۴۵ء میں وہ بمبئی کی شہری ایجوکیشن کمیٹی جس سے وہ ۱۹۳۹ء کے آغاز سے ہی منسلک رہی تھیں، نائب صدر مقرر ہوئیں۔

تعلیم بالغان کے علاوہ بیگم سایانی سماجی فلاح و بہبود کی متعدد تنظیموں کی بھی فعال ممبر رہیں مثلاً ممبر مہاراشٹر سوشل ایجوکیشن کمیٹی، صدر بورڈ آف ٹرسٹیز سجن بھائی ہیرانی گرلس اسکول، ممبر انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نئی دہلی (۱۹۴۰ء میں اس کے آغاز ہی سے)، ممبر ہندوستانی پرچار سبھا (۱۹۳۶ء میں اس کے آغاز سے ہی) ممبر انڈین کانفرنس آف سوشل ورک (۱۹۴۷ء میں اس کے آغاز سے ہی) اور ممبر گاندھی اسمارک ندھی بمبئی بورڈ وغیرہ۔

آزادی کے بعد بھی نئے ہندوستان کی تعمیر میں بیگم سایانی نے ایک فعال کردار ادا کیا۔ ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر حکومت نے انھیں متعدد اہم جگہوں کے لئے نامزد کیا مثلاً جسٹس آف پیس، نوعمر ملزموں کی عدالت کی آنریری مجسٹریٹ، سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن، نیشنل کمیٹی ویمینس ایجوکیشن، قومی یک جہتی کانفرنس نئی دہلی۔ ریڈیو ایڈوائزری بورڈ بمبئی اور بمبئی بورڈ آف فلم سنسر۔

بیگم کلثوم سایانی نے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی شرکت کی جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۹۵۳ء ورکرس ورک شاپ ایجوکیشن سمینار اور ایکسپرٹ ورک شاپ فرانس (Loe Breviere)

۱۹۵۶ء ہندوستانی وفد کی رہنمائی جس نے دو ماہ تک چین کا دورہ کیا۔

۱۹۵۷ء یونسکو کی تعلیم بالغان کی مشاورتی کمیٹی میں ہندوستان کی نمائندگی پیرس

۱۹۵۹ء تعلیم بالغان پر سمینار، ڈنمارک۔

ڈنمارک سے واپسی پر بیگم سایانی لندن، پیرس، میونخ، وی آنا، قاہرہ جدہ، مکہ مدینہ، یروشلم اور کراچی رکتی ہوئی تعلیمی ادارے دیکھتی اور تعلیم بالغان پر لکچر دیتی ہوئی

ہندوستان لوٹیں۔

۱۹۷۰ء میں گاندھی جی کے صلح امن و آشتی کے پیغام کے فروغ کے لیے بیگم سایانی نے گیارہ ممالک کا دورہ کیا اور مختلف تعلیمی اداروں کو دیکھا نیز خواتین کی تنظیموں سے ملاقات کی۔ ان کے لکھے ہوئے چار مضامین "تعلیم بالغان اور میرے تجربات" "ہند و پاکستان دوستی اور میری کوششیں" "ہندوستانی جنگ آزادی میں خواتین کا کردار" "ہندوستان میں تعلیم بالغان" انڈیا ہاؤس لائبریری لندن میں موجود ہیں۔

بیگم کلثوم سایانی کی خدمات کو کئی اداروں، انجمنوں اور حکومت کی طرف سے سراہا گیا۔ ۱۹۵۹ء میں انھیں "پدم شری" کے اعزاز سے نوازا گیا اور ۱۹۶۹ء میں انڈین ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی جانب سے صدر جمہوریہ نے "نہرو لیٹرلیسی ایوارڈ" دے کر عزت افزائی کی۔

۲۸ رمئی ۱۹۸۷ء کو چھیاسی سال کی عمر میں کینسر کے موذی مرض میں یہ فعال مجاہدہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئیں۔

مندرجہ ذیل رسائل و میگزین میں بیگم سایانی کی مختلف سرگرمیوں کا تذکرہ کیا گیا۔ FEMINA ۱۰ رجون ۱۹۶۰ء۔

سنڈے ٹائمز آف انڈیا، ۲۸ رستمبر ۱۹۶۷ء

ایوز ویکلی، ۲۶ راکتوبر ۱۹۶۷ء

سنڈے اسٹینڈرڈ، ۱۴ رستمبر ۱۹۶۹ء

ٹائمز آف انڈیا، نئی دہلی، ۱۰ رمارچ ۱۹۷۰ء

ہندوستان ٹائمز۔ نئی دہلی، ۱۱ رمارچ ۱۹۷۰ء

انڈین ایکسپریس، نئی دہلی، ۱۱ رمارچ ۱۹۷۰ء

پیٹریاٹ نئی دہلی۔ ۱۱ رمارچ ۱۹۷۰ء

اسٹیٹسمین نئی دہلی، ۱۱ رمارچ ۱۹۷۰ء

نوبھارت ٹائمز ۱۶ر مارچ ۱۹۷۰ء
بھارت جیوتی ۲۹ر مارچ ۱۹۷۰ء
الاہرام قاہرہ، ۱۰ر جولائی ۱۹۷۰ء
انڈین نیوز، لندن یکم اگست ۱۹۷۰ء
فری پریس بلیٹن ۔ ۱۰ر فروری ۱۹۷۲ء

(Directory of Indian Women Today India International, 1976)

علاوہ ازیں، دیگر معلومات سید شہاب الدین دسنوی تاج منزل ٹی۔ این
بنرجی روڈ پٹنہ نے مہیا کیں۔

کوشش ذات خاص پر ناز کر اعتماد کر

فاطمہ اسماعیل

فاطمہ اسماعیل بمبئی کے ایک مشہور کچھی میمن خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ والد کا نام حاجی یوسف سوبانی تھا۔ ان کے بھائی عمر سوبانی اور عثمان سوبانی ہندوستان کی سیاسی تحریکات میں پیش پیش رہے۔ چھوٹے بھائی نے گزشتہ جنگ کے دوران میں نیوی کی بغاوت میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس خاندان کا شمار بمبئی کے متمول خاندانوں میں ہوتا تھا۔ خلافت اور کانگریس کی تحریک میں مالی امداد کے علاوہ ان لوگوں نے عملی حصہ بھی لیا۔ تحریک خلافت کے دوران ان کی والدہ مسز حاجی یوسف سوبانی نے اپنے گھر پانچ سو خواتین کے اجتماع میں گاندھی جی کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا "ہندوستانی دلوں کے بادشاہ کو خیر مقدم کہہ کر ہم بہت خوش ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک مہاتما رشی ہیں، عیسائی انھیں سینٹ کہتے ہیں اور مسلمانوں کے نزدیک حریت و مساوات اور جمہوریت کا وعظ کرتے ہیں۔ سنت رسول پر چلنے والے ہیں۔" (بھارت کی دیویاں تذکرہ ص ۳۳)

فاطمہ نے ۴ فروری ۱۹۰۳ء کو اسی قوم پرور ماحول میں آنکھ کھولی۔ ان کے گھر کی تہذیب حیدرآبادی طرز کی تھی۔ وہ نہایت شستہ اردو اور اچھی انگریزی بولتی تھیں۔ وہ ایک باوقار تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے سینئر کیمبرج اور ۱۹۲۰ء میں بمبئی یونیورسٹی سے میٹریکولیشن امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس

لئے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک دہلی آ کر میں میڈیسن کا کورس کیا جو نامکمل رہا۔ ان کے شوہر ہاشم اسماعیل صاحب کئی سال تک مشرقی افریقہ میں ٹریڈ کمشنر رہے انھیں اردو فارسی کا اچھا ذوق تھا، شعر بھی کہہ لیتے تھے۔

فاطمہ اسماعیل کی طبیعت میں فرسودہ خیالات اور رسم و رواج کے خلاف بغاوت تھی جس کا اظہار وہ برملا کرتی تھیں۔ جن دنوں سودیشی کی تحریک چل رہی تھی۔ فاطمہ اسماعیل دیسی صنعتوں کے سامان ریل کے ایک خاص ڈبے میں لے کر شہر شہر پھریں اور ان کی نمائش و فروخت سے سودیشی کا پیغام عام کیا۔

۱۹۳۴ء میں وہ انجمن اصلاح نسواں کی سکریٹری اور ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی سکریٹری مقرر ہوئیں، انھوں نے بمبئی کے مسلم محلوں میں تعلیم بالغان کے لیے بھی بہت کام کیا۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان وہ آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی پبلسٹی اور ہوسٹل سکریٹری رہیں۔ ۱۹۴۰ء میں وہ صوبہ بمبئی کی ویمنس کاؤنسل کی لیبر ذیلی کمیٹی کی صدر بنائی گئیں۔ انھوں نے ملوں کے گرد و نواح کی چالوں میں سماجی بہبود کے مراکز قائم کیے۔ وہ کل ہند دیہی صنعتوں کی تنظیم کی بنیاد ڈالنے والوں میں سے ایک تھیں۔ شملہ کی پہاڑیوں میں انھوں نے دستی ملوں کا آٹا و چاول عام کرنے میں بھی نمایاں کام کیا۔

فاطمہ اسماعیل آل انڈیا کانگریس کے ۱۹۳۴ء کے بمبئی اجلاس اور ۱۹۴۰ء کے رام گڑھ اجلاس میں شریک ہوئیں۔ اور کھادی، سودیشی نیز ہندو مسلم اتحاد کے لئے بمبئی شملہ اور مشرقی افریقہ میں مسلسل کام کرتی رہیں۔ ۱۹۴۰ء میں وہ پلاننگ کمیشن کی ویمنس کمیٹی کی ممبر مقرر ہوئیں۔ "ہندوستان چھوڑو" تحریک میں نمایاں حصہ لینے کے سبب وہ انڈر گراؤنڈ رہیں۔ اگست ۱۹۴۲ء میں ان کی سات آٹھ سال کی بچی کو پولیو ہو گیا جس کے سبب اس کا پیر مفلوج ہو گیا۔ اس کے علاج کے لئے فاطمہ اسماعیل پورے ہندوستان میں پھریں، امریکہ گئیں مگر اس کا علاج نہ جب تھا نہ اب ہے۔ البتہ اس مرحلے میں اتنا معلوم ہوا کہ اس مرض سے پیدا شدہ خرابی کا

قسم کی ورزش سے بڑی حد تک دور ہو سکتی ہے چنانچہ انھوں نے ورزش کے وہ خاص طریقے سیکھے اور خود ہی بچی کو ورزش کرانے لگیں۔ یہ کوشش انتہائی صبر آزما ثابت ہوئی مگر فاطمہ اسماعیل دھن کی پکی تھیں وہ ہار ماننا نہیں جانتی تھیں۔ جب انھیں بچی کے معاملے میں کچھ مہینوں کے بعد کامیابی کے آثار نظر آئے تو انھوں نے سیاسی نیز دوسرے کام چھوڑ کر بمبئی کے مشہور سرجن بالیگا کے ساتھ مل کر پولیو زدہ بچوں کے لئے ایک کلینک کھولا۔ گذشتہ عالمی جنگ کے دنوں میں بمبئی کے جنوبی حصے کے ایک میدان میں فوجی ضرورت کے لئے ایک شیڈ بنا تھا۔ اس کے ایک حصے میں حکومت نے ان دونوں کو کلینک کے لئے جگہ دے دی۔ اس میں ورزش کے لئے سامان مہیا کئے گئے؛ معذور بچوں کو لانے کے لئے ایک بس خریدی گئی۔ فاطمہ اسماعیل نے اپنا سارا وقت اس مرکز کے لئے مختص کر دیا۔ عطیات، چندے سرکاری و نیم سرکاری امداد غرض ہر طرح سے انھوں نے اس کے اخراجات کے لئے روپے جمع کئے۔ بیرونی ممالک کے فلاحی اداروں نے بھی مدد پہنچائی لوگوں میں بھی اسکی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ اور وہ سمجھنے لگے کہ ان معذور بچوں کو ہمیشہ کیلئے اپاہج ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔

۱۹۵۱ء میں فاطمہ نے دوسرے سماجی کارکنوں کے ساتھ مل کر پولیو زدہ بچوں کو برسرکار لانے کیلئے ایک سوسائٹی قائم کی وہ نہرو خاندان سے بہت قریب تھیں ان کی سفارش پر حکومت بمبئی نے حاجی علی کے سامنے ایک قطعہ زمین اس سوسائٹی کو دینا منظور کر لیا۔ اس پر ایک اچھی خاصی عمارت بنائی گئی جس کا افتتاح خود وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کیا۔ یہ مرکز آج بھی پولیو زدہ بچوں کو برسرکار لانے میں بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بچے آتے ہیں۔

فاطمہ اسماعیل نے آزاد ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ معذور بچوں کی بحالی، خواتین کے حقوق نیز سماج کے پچھڑے ہوئے طبقوں کی فلاح و بہبود کیلئے انکی کوششیں ہمیشہ یاد کی جائیں گی! انھوں نے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں ہندوستانی

مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔ جسمانی طور پر معذور بچوں کی بحالی کی خدمات کے عوض ۱۹۵۸ء میں انھیں 'پدم شری' کے اعزاز سے نوازا گیا اور ۱۹۷۲ء میں 'دلت متر' ایوارڈ دیا گیا۔ انھیں بیرونِ ملک کے بھی اعزاز ملے۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۵ء تک فاطمہ اسماعیل راجیہ سبھا کی ممبر نامزد رہیں۔ ملک کے مختلف رسایل میں ان پر مضامین لکھے گئے۔ پیرس سے ان کی سوانح حیات بھی شائع ہوئی۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو طویل بیماری کے بعد چھیاسی سال کی عمر میں انکا انتقال ہو گیا ایک ممتاز سماجی خدمت گار اور مجاہدہ آزادی کی حیثیت سے ان کے کارنامے نئی نسل کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے اور ان حیات بخش نقوش سے نئی نسلیں زندگی و آزادی کی قندیلیں روشن کر سکیں گی

(Directory of Indian Women Today India International, p. 461 1976, P. 383)

نوٹس: جناب شہاب الدین دسنوی معتمد شبلی اکاڈمی اعظم گڑھ)

بیگم سلطانہ حیات انصاری

بیگم سلطانہ حیات نے قوم پرستی وراثت میں پائی ہے۔ ان کے خاندان نے ہمیشہ ہی انگریزی سامراجیت سے ٹکر لی۔ ان کے پردادا کے والد قاضی ضیاء الدین صاحب مرحوم ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی کے شہر قاضی اور کسی سرکاری عہدے پر بھی فائز تھے جس سے انھوں نے بعد میں استعفیٰ دے دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں جب بخت خاں بہادر شاہ ظفر کے انکار کے بعد مایوس ہو کر ہمایوں کے مقبرے سے نکلے تو چڑھتی ہوئی جمنا کے کنارے کنارے شمال کی جانب رُخ کیا اور قاضی صاحب کو اطلاع دی۔ انھوں نے بخت خاں اور ان کی فوجوں کو اپنا بجرا بھیج کر بلایا۔ بجرے کو آگ لگوا دی تاکہ انگریزی فوجیں اسے استعمال نہ کر سکیں۔ اور پھر بخت خاں کو مع ان کی فوج کے فرار ہونے میں مدد دی جس کے سبب ہڈسن نے ان کے گھروں کو مسمار کر دیا تھا۔ کچھ افراد کو توپ سے اُڑا دیا گیا تھا۔ ان کے دادا مرحوم قاضی نجم الدین صاحب نے اپنے گھر "قاضی نجم الدین ہاؤس میرٹھ" کا ایک حصّہ کانگریس و خلافت وغیرہ کے دفتر بنانے کے لئے مفت دے رکھا تھا۔ نجم الدین ہاؤس میں یہ دفتر ۱۹۳۲ء تک قائم رہا۔ ۱۹۲۷ء تک کھادی بورڈ کا دفتر بھی اسی گھر میں تھا۔ قاضی نجم الدین صاحب عرصے تک کبھی شہر کانگریس اور کبھی ضلع میرٹھ کانگریس کمیٹی کے صدر رہے۔

بیگم سلطانہ حیات کے والد قاضی بشیر الدین احمد صاحب ۱۹۱۲ء میں ہلال احمر

میں طبی وفد کے ہمراہ اپنے ذاتی خرچ پر ٹرکی گئے تھے۔ غالباً وہ واحد شخص تھے جو انگریزی کے علاوہ فرانسیسی بھی بہ آسانی بول سکتے تھے۔ انھوں نے وفد کے مترجم کی خدمت بھی انجام دی۔ آصف علی مرحوم جب دہلی میں گرفتار ہوئے وہ اس وقت صوبہ دہلی کے کانگریس کے سکریٹری تھے انھوں نے قاضی صاحب کو دلی کانگریس کمیٹی کا سکریٹری نامزد کیا۔ ایک عرصہ تک کانگریس میں سرگرم عمل رہنے کے بعد انھوں نے کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ اور گوشہ نشین ہوگئے تھے۔

بیگم سلطانہ حیات نے جس جہد آزادی کی سرگرمیوں کے درمیان آنکھ کھولی اس کے نقوش ان کے دل ودماغ پر بچپن سے ہی بہت گہرے تھے۔ ان کے سیاسی نظریات وعقائد پر اپنے دادا مرحوم کی چھاپ تھی۔ علاوہ ازیں اس زمانے کے کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں کی بھی ان کے یہاں آمدورفت تھی۔ مثلاً موتی لال نہرو، سیٹھ چھٹانی، مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی، مسز کملا دیوی چٹوپادھیائے مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حفظ الرحمان صاحب وغیرہ، ان شخصیتوں نے انھیں ابتدا ہی سے متاثر کیا ان کے گھر کی آئے دن خانہ تلاشی ہوا کرتی تھی۔

بیگم سلطانہ حیات شروع ہی سے کانگریس کی فعال ممبر رہیں۔ جب جب کانگریس کی کوئی تحریک چلی وہ جلسے جلوس میں شرکت کرتی رہیں اور دوسری بہنوں کے ساتھ جھنڈا اونچا رہے ہمارا نظمیں بھی گاتی رہیں۔ خاصی کم عمری میں انھوں نے میرٹھ کی جامع مسجد میں بھی تقریر کی تھی۔

"ہندوستان چھوڑو" تحریک کے وقت انھوں نے لڑکیوں کی ایک تنظیم بھی بنائی تھی جس کا مقصد ہر ممکن طریقے پر انگریزی سرکار کو پریشان کرنا تھا۔ اس چھوٹی سی تنظیم نے جس میں ہندو مسلمان سبھی لڑکیاں شامل تھیں فرسٹ ایڈ کی ایک جماعت بھی بنائی تھی جس نے یہ طے کیا تھا کہ جہاں جہاں بھی مرد وعورتوں پر لاٹھیاں پڑیں گی وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے

پہونچ جائیں گی۔ یہ لڑکیاں محکمۂ ڈاک کو پریشان کرنے کے لئے ڈاک میں بغیر ٹکٹ کے خطوط ڈالتی تھیں تاکہ وہ بیرنگ ہو جائیں۔ اس وقت یہ بھی طے پایا تھا کہ سبھی لڑکیاں وخواتین اپنی عزّت وناموس کی خاطر چھوٹے چھوٹے خنجر رکھیں گی۔ سلطانہ بیگم نے اپنے دادا کی مدد سے یہ خنجر بنوا کر سیاسی سرگرمیوں میں ملوث خواتین میں تقسیم کئے تھے (حالانکہ اب وہ خودکشی حرام سمجھتی ہیں) سیاسی تحریک کا یہ وہ موڑ تھا جب تنظیم کی لڑکیاں جوش سے بھری ہوئی تھیں۔ لیکن کام کے لئے عملی اعتبار سے میدان بہت کم تھا غیر شادی شدہ لڑکیوں کو سیاست میں براہِ راست حصّہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی ایک قریبی ساتھی ویر بالاجی کا تو اسی سبب دماغ بھی خراب ہو گیا تھا۔ سلطانہ خود بھی بیمار رہیں۔ ان کا وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہوا تھا۔ لیکن کسی سبب گرفتاری عمل میں نہیں آئی ان کے اس زمانے کے احساسات اور کچھ واقعات انھیں کی زبانی سنیئے:

"جب ہمارے گھر سے بدیسی کپڑوں کی دوکانوں پر پکٹنگ کرنے کے لئے خواتین کی ٹولیاں جاتی تھیں تو میں بہت چھوٹی تھی اور جب بڑی ہوگئی تو پتہ چلا کہ مسلمان لڑکیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ہندو لڑکیاں بھی کسی طرح کی ستیہ گرہ میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں بس گھروں میں رہ کر جو کچھ بھی ہو سکتا تھا وہ کیا گیا.....

یہ کوئی ۴۳-۱۹۴۲ء کا واقعہ ہوگا کہ میرٹھ میں بیگم نواب اسماعیل خاں صاحب مرحوم نے بزمِ خواتین کے نام سے خواتین کی ایک جماعت بنائی اور اس سے ملحق لڑکیوں کے لئے خدمات ملت کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ مسوری کے ایک اسکول میں پڑھنے کی وجہ سے مجھے پی۔ ٹی۔ آتی تھی۔ چنانچہ میں بیگم صاحبہ کی خواہش کے مطابق "خادمات ملّت" کو پی۔ ٹی کراتی تھی جس میں چھوٹی بڑی سب لڑکیاں شامل تھیں۔ اسی زمانے میں عربک کالج دہلی میں مسلم خواتین کی ایک کانفرنس بہت دھوم دھام سے بلائی گئی جس میں شرکت کے لئے ہندوستان بھر سے خواتین آئی تھیں۔ مثلاً فاطمہ بیگم صاحبہ مرحومہ محبوب عالم صاحب

پیسہ اخبار" کی صاحبزادی لاہور سے، مسز حکیم صاحبہ کلکتہ اور بیگم اعزاز رسول صاحبہ لکھنؤ سے آئی تھیں، میرٹھ سے اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھے اور میری بہن زہرا بیگم صاحبہ کو بھیجا گیا تھا خیال تھا کہ یہ دو روزہ کانفرنس مسلمان خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے منعقد کی جارہی ہے مگر دہلی آکر مجھے پتہ چلا کہ اس کانفرنس میں مسلم گرلز اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی بنیاد ڈالی جارہی ہے اور یہ کانفرنس مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں کے اشارے پر بلائی گئی ہے۔ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو یقین ہے کہ بیگم اسماعیل خاں صاحبہ مرحومہ کم از کم مجھے نمائندہ بنا کر نہ بھیجتیں۔ کیونکہ میرے خیالات سے سب واقف تھے اور میں اس وقت کانگریس کے جلسوں میں برابر شرکت کرتی تھی۔ کانگریس کی والینٹیر لڑکیوں میں شامل تھی اور لاٹھی وغیرہ چلانا سیکھ رہی تھی۔

جب مسلم گرلس اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا ریزولیوشن پیش ہوا تو میں نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ جب گرلس فیڈریشن موجود ہے تو مسلم لڑکیوں کے لئے الگ فیڈریشن کی کیا ضرورت ہے۔ چند اور لڑکیوں نے بھی ساتھ دیا۔ یہ بحث پورے دن چلی۔ چاروں طرف سے اتنا زور پڑا کہ ہمارا ساتھ دینے والی لڑکیاں اور خواتین نے ہمارا ساتھ دینا چھوڑ دیا۔ بیگم اعزاز رسول صاحبہ نے سخت ترین طریقے پر ہماری مخالفت کی اور اگلے دن ہم دونوں بہنیں اکیلی رہ گئیں۔ ہماری ساری دلیلوں کا جواب یہ تھا "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"۔ چنانچہ مسلم گرلس اسٹوڈنٹ فیڈریشن بن گئی اور سارے ہندوستان کے اخباروں میں اس کا اعلان کر دیا گیا۔"

"میں کانگریس کی تحریکوں میں کھل کر تو سماجی قیود کی وجہ سے نہ آسکی مگر ہر تحریک کی جس قدر بھی مدد کی جاسکتی تھی کی۔ مثلاً ۱۹۴۱ء جب انفرادی ستیہ گرہ ہو رہی تھی میں اس وقت سیوا گرام آشرم میں تھی۔ ایک روز یہ پتہ چلا کہ باپو نے پیارے لال بھائی کو انفرادی ستیہ گرہ کرنے کی اجازت

دے دی ہے۔ اور وہ اگلے روز صبح سیوا گرام آشرم ستیہ گرہ کرنے لئے چلے جائیں گے۔ میں مسز کستوربا گاندھی کی کٹیا میں تھی جو مجھ سے ہمیشہ بہت محبت سے باتیں کرتی تھیں۔ یہ دوستی اتنی جلدی بڑھ گئی تھی کہ اپنا دکھ درد بھی بتاتی تھیں۔ اس وقت خبر آئی کہ باپو نے یاد کیا۔ میں بھاگتی ہوئی باپو کے پاس پہنچ گئی۔ باپو کے پاس چند حضرات کے علاوہ سردار وٹھل بھائی پٹیل، پیارے لال بھائی بھی بیٹھے تھے اور پیارے لال بھائی کے آگے کچھ مسودات رکھے تھے۔ پتہ چلا کہ پیارے لال بھائی نے صوبہ سرحد میں باپو کے دورے کے متعلق جو مسودہ ہندی میں لکھا تھا اس کا اردو ترجمہ بھی کر لیا ہے مگر وہ اشاعت سے پہلے کسی اردو داں کو دکھانا چاہتے ہیں اور یہ کام صبح ان کے جانے سے پہلے پورا ہو جانا چاہیئے اور یہ خواہش باپو کی بھی تھی۔ سردار صاحب بولے اردو آتی ہے۔

میں نے ہنس کر کہا "تھوڑی سی"۔

سردار صاحب بولے "رات بھر جاگ لوگی" مسودہ موٹا سا تھا۔

"پیارے لال بھائی ستیہ گرہ کرنے جا رہے ہیں ان کی یہ خواہش پوری ہونی چاہیئے" میں نے کچھ اس طرح کا جواب بڑی عقیدت سے دیا تھا۔

باپو سونے کے لئے اٹھ گئے اور جاتے جاتے فرما گئے کہ یہ کتاب کل چھپنے چلی جاتی تو اچھا ہوتا۔ جاتے جاتے مڑے اور پھر مجھ سے کہا "بہت نیند آئے تو سو جانا"۔ پیارے لال بھائی اور میں باپو کی کٹی میں ہی بیٹھ گئے کیوں کہ یہاں جو لالٹین جل رہی تھی اس میں غالباً تیل زیادہ تھا اور روشنی بھی تھی۔ پیارے لال بھائی نے مجھے اردو مسودہ دے دیا اور خود ہندی کا لے لیا۔ کبھی وہ زور سے پڑھتے تھے اور کبھی میں پڑھتی تھی۔ ہم دونوں تیزی سے کام کر رہے تھے تاکہ صبح تک یہ کام پورا ہو جائے۔ بیچ بیچ میں تصحیح بھی کی جا رہی تھی۔ نیند کا جب شدید حملہ ہوتا تھا تو باہر برآمدے میں جا کر منہ دھو لیتی تھی اور پانی پیتی تھی ایک

عجیب ولولہ تھا کہ کتاب ختم کردوں۔ ایک ستیہ گرہی کی خواہش اور باپو کا حکم۔ چنانچہ جب صبح کاذب کا وقت ہوا اور چڑیوں نے چہچہانا شروع کردیا تو مسودے کے ایک یا دو صفحے باقی تھے۔ میں تصحیح کررہی تھی تو پیارے لال بھائی اٹھ کر باہر چلے گئے باپو اپنی کٹی کے باہر ہی میدان میں سوتے تھے پیارے لال بھائی اس طرف سے گزرے تو مجھے باپو کی آواز آئی۔

"کتنا کام ہوا؟"

پیارے لال بھائی نے جواب دیا کہ کتاب پوری ہوگئی۔ پھر باپو نے یہ بھی سوال کیا کہ میں سوئی تو نہیں تھی "نہیں بہت مستعدی سے کام کیا۔" پیارے لال بھائی نے کہا اور یہ بھی بتایا کہ وہ میری تصحیح سے بہت مطمئن ہیں۔ بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی۔"

"میں نے دوسرا کام انفرادی ستیہ گرہ کے سلسلے میں یہ کیا کہ مجھے ناگپور میں اپنے دادا ابا قاضی نجم الدین مرحوم کا خط ملا کہ انھوں نے باپو کو خط لکھا ہے کہ ان کو انفرادی ستیہ گرہ کرنے کی اجازت دی جائے مگر ابھی تک اجازت نہیں ملی۔ میں اس خط کو لے کر باپو کے پاس گئی۔ باپو خوش ہوئے، بولے یہ بتاؤ کہ قاضی صاحب کی عمر کیا ہے۔ باپو نے ابا جی مرحوم کو بڑی محبت کا خط لکھا مگر ستیہ گرہ کی اجازت نہیں دی۔ میں میرٹھ واپس چلی آئی۔ اسی زمانے میں کراچی میں کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ اخبارات میں کانگریس کے ایک ریزویوشن کا ذکر تھا۔ میں نے باپو کو خط لکھا کہ کانگریس کراچی میں جو ریزولیوشن پاس کررہی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس نے ستیہ گرہ کو بطور اصول نہیں بلکہ بطور پالیسی اختیار کیا ہے تو یہ آپ کے اصول کے خلاف ہے وغیرہ۔

باپو نے جواب میں کارڈ لکھا جو میرے پاس اب تک ہے اور پھر کراچی کے اجلاس کے بعد انھوں نے کانگریس سے استعفیٰ دے دیا۔" کارڈ مورخہ ۱۶؍جنوری ۱۹۴۲ء میں انھوں نے لکھا "اس بارے میں تمہاری رائے بالکل صحیح ہے"۔

بیگم سلطانہ کے نام مہاتما گاندھی کا ایک اور خط مندرجہ ذیل ہے۔

"بی بی سلطانہ کو میں نے میرا سوت دیا ہے، اس کو وہ بیچے گی اور اس سے جو پیسے ملیں گے وہ دین بندھو معموریل (میموریل) میں دیئے جائیں گے"۔ موک گاندھی

اس زمانے میں گاندھی جی اردو میں دستخط اس طرح کرتے تھے۔

سلطانہ حیات صاحبہ نے ایک مرتبہ گاندھی جی سے شکایت کی تھی کہ آپ نے کہا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے وہ چاہے تو اسے رکھیں، چاہے تو مٹادیں وہ جس دن اُن سے ملیں وہ گاندھی جی کی خاموشی کا دن تھا۔ شکایت کا جواب انھوں نے لکھ کر دیا۔ "تم نے بحث دیکھی نہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کہا ہے۔ میں نے جو کہا تھا وہ چھپا ہے میں نکال کر بھیج سکتا ہوں"۔ اس پر سلطانہ نے کہا کہ اردو کے ہر اخبار اور رسالے میں آپ کے اس جملے کو دہرایا جارہا ہے۔ تو پھر گاندھی جی نے لکھ کر دیا۔ "کیا کیا جائے؟ اخباروں میں بہت سی باتیں غلط لکھی جاتی ہیں۔ اگر کل تک رہنا ہے تو آجاؤ"۔ کچھ بات کریں گے اور کچھ بتاؤں گا"۔

مہاتما گاندھی کے علاوہ بیگم سلطانہ حیات کی اردو کے سلسلے میں پنڈت سندر لال جی، راجکماری امرت کور اور پیارے لال بھائی وغیرہ سے بھی خط وکتابت رہی تھی۔

۱۹۴۶ء میں ان کی شادی حیات اللہ انصاری صاحب سے ہوئی جو بذات خود قومی رہنماؤں میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ بیگم سلطانہ حیات کی تعلیم بی اے تک ہے۔ نیز جرنلزم کی ٹریننگ بھی لے چکی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد سے انھوں نے سیاست سے الگ ہوکر اردو کا کام کرنا شروع کیا۔ اتر پردیش کی دستخطی مہم جس نے اردو کی حمایت میں ۲۰ ½ لاکھ دستخط جمع کئے تھے، بیگم سلطانہ حیات اس کی آفس سکریٹری بھی رہی ہیں۔ اس وقت وہ ریاستی انجمن ترقی اردو اتر پردیش کی صدر ہیں۔ انھوں نے تعلیم بالغان کے سلسلے میں بھی بہت کام کیا

ہے۔ ۱۹۵۲ء میں لکھنؤ میں انھوں نے عورتوں کی مشہور جماعت "بزم خواتین" کی بنیاد ڈالی۔ جو اب تک نہ صرف قائم ہے بلکہ اس کی شاخیں بھی دوسرے شہروں میں قائم ہو رہی ہیں۔ آزادی سے قبل انھوں نے مسلم لیگ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ اور آج بھی ہندو احیا پرستی اور مسلم فرقہ واریت سے مقابلہ میں مصروف ہیں۔

(ذاتی انٹرویو بیگم سلطانہ حیات انصاری۔ ۲۴ ویسٹرن کورٹ، جن پتھ نئی دہلی۔
۲۳ر جنوری ۱۹۸۰ء)

ہاجرہ زیڈ احمد

بیگم ہاجرہ زیڈ احمد جو عام طور پر ہاجرہ آپا کے نام سے جانی جاتی ہیں، ۲۲ر دسمبر ۱۹۱۰ء میں سہارنپور میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ریاست رام پور میں نائب تحصیلدار تھے، والدہ کا نسب روہلکھنڈ ہی کے نواب نجیب الدولہ سے ملتا ہے والد والدہ دونوں روہیلہ پٹھان تھے۔ والدہ کا بچپن میں انتقال ہو چکا تھا، والد کے ساتھ انھوں نے متعدد شہروں میں رہائش اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم قرآن شریف اور اردو فارسی میں ہوئی۔ نوابی خاندان سے تعلق کی بنا پر لاہور کے کوئینز میری کالج میں داخلہ ہوا۔ ہاجرہ بیگم ایک اچھی طالب علم تھیں انگریزی، حساب، اردو اور کھیل میں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے پنجاب سے میٹریکولیشن امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں ان کی شادی خاندان ہی میں ایک پولیس افسر کے ساتھ ہوئی جن کے ہمراہ وہ گونڈہ، رائے بریلی اور لکھنؤ رہیں۔ ۱۹۳۱ء میں وہ ایک بیٹے کی ماں بنیں اور ۱۹۳۲ء کے دسمبر میں انھوں نے شوہر سے طلاق حاصل کرلی۔ ۷ر اگست ۱۹۳۳ء میں اپنے دو سالہ بیٹے کے ساتھ بذریعہ سمندری جہاز لندن گئیں اور ۱۹۳۵ء میں مانٹی سوری کالج سے ٹیچرس کا ڈپلوما حاصل کیا۔

ہاجرہ بیگم لندن میں سجاد ظہیر اور ریہ مود داس گپتا کی رہنمائی میں قائم کردہ

طالب علموں کی تنظیم کی رکن بن گئیں۔ سی۔ جی۔ بی کے واسطے سے سالف فوکس سے رابطہ قائم کیا۔ نیز دوسرے کیمونسٹ رہنماؤں سے بھی تعلق پیدا ہوا۔ انھیں مختلف مباحثوں، لکچرس اور عوامی جلسوں میں شریک ہونے کا بھی موقع ملا۔ پارٹی کا لیٹریچر فروخت کرنے نیز چندہ جمع کرنے میں انھوں نے فعال کردار ادا کیا۔ اٹلی میں وہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہوئیں۔ ہندوستانی وفد کے ممبر کی حیثیت سے انھوں نے فاشزم اور جنگ کے خلاف برسلز میں منعقد ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی۔ ۱۹۳۵ء میں طالب علموں کے ایک گروپ کی ممبر کی حیثیت سے وہ پندرہ دن کے لئے لندن سے روس بھی گئیں غالباً وہ روس جانے والی پہلی مسلمان لڑکی تھیں۔

ہندوستان واپس آنے پر ستمبر ۱۹۳۵ء میں کرامت حسین گرلز کالج لکھنؤ میں ہاجرہ بیگم کا تقرر بحیثیت ٹیچر انچارج جونیر اسکول ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں سجاد ظہیر کے ساتھ انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے انعقاد کے لئے بہت کام کیا۔ کیمونسٹ پارٹی ان دنوں غیر قانونی پارٹی تھی۔ ہاجرہ بیگم نے پی۔ سی جوشی کے ساتھ جو ان دنوں لکھنؤ میں انڈر گراؤنڈ تھے، پارٹی کے لئے کام کرنا شروع کیا۔

۲۰ رمئی ۱۹۳۵ء میں پارٹی کی اجازت سے ان کی دوسری شادی مسٹر زیڈ احمد کے ساتھ سجاد ظہیر کے مکان پر ہوئی۔ زیڈ احمد ان دنوں سندھ میں ایک کالج کے پرنسپل تھے پارٹی کی ہدایت پر ہاجرہ بیگم لکھنؤ اور زیڈ۔ اے۔ احمد حیدرآباد سے تدریسی کام سے مستعفی ہوگئے اور الہ آباد میں پارٹی کے لئے کام کرنا شروع کیا۔ پارٹی کے فیصلے کے مطابق انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی رکنیت اختیار کی، لیکن خفیہ طور پر آر۔ ڈی۔ بھار دواج کی رہنمائی میں مسٹر زیڈ احمد۔ مسٹر سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف کے ساتھ کام کرتی رہیں۔ انھیں خصوصی طور پر خفیہ پتوں کا ریکارڈ رکھنے، لٹریچر تقسیم کرنے اور پارٹی کے اخراجات کا حساب دیکھنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں عرش دیو مالویہ۔ اوپی سنگال،

رمیش سنہا اور پی۔ ڈی۔ ٹنڈن وغیرہ کے ساتھ پارٹی کے الہ آباد سیل سے وابستہ کردی گئیں۔ ایودھیا پرشاد، ارجن اروڑہ، سنتوش چند کپور، سنت سنگھ اور دوسروں کے ساتھ یوپی کی پہلی خفیہ کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کی۔ ہاجرہ بیگم پارٹی کی صوبائی کمیٹی میں بھی رہیں اور الہ آباد میں ضلع کمیٹی منظم ہو جانے پر اس کی باقاعدہ رکن بن گئیں۔ بعد میں اس کی سکریٹری کا عہدہ بھی سنبھالا اس وقت صرف چند خواتین ہی ضلع کمیٹی کی سکریٹری تھیں۔

۱۹۳۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر بنے تو انھوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو کئی شعبوں میں تقسیم کیا۔ مسٹر زیڈ۔ اے احمد کو معاشیات کے شعبہ کا ذمہ دار بنایا گیا۔ ہاجرہ بیگم نے "ماس کانٹیکٹ (Mass Contact) پروگرام کے تحت خصوصی طور پر خواتین میں کام کیا۔ کانگریس کے سبھی فمنی الکشنوں میں نمایاں حصہ لیا۔ اور محلہ محلہ جاکر اس کے لئے کام کیا۔ ۱۹۳۷ء میں مسٹر ہری کے لئے الہ آباد میں اور ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف کے لئے فیروز آباد کے الکشن میں فعال کردار ادا کیا۔ پنڈت سندرلال کی رہنمائی میں "امن دستوں" میں شامل ہو کر فرقہ دارانہ فسادات ختم کرانے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ ہاجرہ بیگم کانگریس کے فیض پور، ہری پورا اور رام نگر کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوئیں۔ انھوں نے کچھ عرصہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے سٹی آفس کی سکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے۔

۱۹۴۰ء میں ہاجرہ بیگم اور مسٹر زیڈ۔ اے احمد کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔ کمیونسٹ پارٹی کی باقاعدہ ممبر کی حیثیت سے ہاجرہ بیگم نے متعدد عہدوں پر کام کیا۔ ٹریڈ یونین تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خواتین کی تنظیموں میں نمایاں کام کیا اور آج بھی ادبی سماجی تحریکات میں پیش پیش رہتی ہیں۔ لینن صدی تقریبات کے سلسلے میں ۱۹۷۰ء میں سپریم سوویت کے جوبلی میڈل کے اعزاز سے بھی انھیں نوازا گیا ہے۔ (تفصیلات ہاجرہ بیگم نے بذات خود مہیا کیں)

زہرہ انصاری

انڈین نیشنل کانگریس کی جہدِ آزادی میں قربانیوں کی داستان ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے اہم کردار کے تذکرے کے بنا مکمل نہ ہو سکے گی جن کے قومی جوش اور مجاہدانہ جذبے کو سیاسی نشیب و فراز قیدِ فرنگ نیز اپنے اور بیگانوں کی خفگی بھی متزلزل نہ کر سکی۔ انصاری صاحب کی غیر معمولی فعال زندگی کے پس پشت شمس النساء بیگم انصاری کا کردار بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ میدانِ عمل میں ان کی برابر کی شریک تھیں۔ گو دائرۂ کار مختلف تھے۔ محترمہ زہرہ انصاری کے بارے میں کچھ تحریر کرنے سے قبل اس ماحول کا جاننا ضروری ہو گا جس میں ان کی ذہنی تربیت ہوئی۔

ترکی ادیبہ خالدہ ادیب خانم کے مطابق بیگم انصاری ایک معزز و متمول مسلم پردہ نشین خاتون کا مثالی نمونہ تھیں۔ وہ فارسی، عربی نیز اردو کی عالمہ تھیں اس لئے فرصت کے اوقات مطالعے میں گذارتیں۔ وہ انتہائی نیک اور مخیر خاتون تھیں۔ پردے کی سخت پابندی کے باوجود مہاتما گاندھی کے سامنے آتی تھیں۔"

Halide Edib; Inside India (London, 1937) quoted in "Muslims and the Congress: p. 312

ڈاکٹر انصاری اکثر و بیشتر گاندھی جی کو پندرہ بیس منٹ کے لئے اپنے ساتھ زنان خانے میں لے جاتے تھے جہاں وہ بیگم صاحبہ سے ملاقات و گفتگو کرتے تھے۔

Zohra Ansari : Oral History Transcript Part II

Teen Murti Library, New Delhi.

گاندھی جی جب لارڈ اروِن سے گفتگو کے سلسلے میں دہلی میں مقیم تھے تو انھوں نے بعنوان "انصاری دھرم شالہ" بتاریخ ۲۹ مارچ ۱۹۳۱ء کے "نوجیون" (گجراتی) میں بیگم انصاری کے متعلق لکھا تھا۔ "مجھے ڈاکٹر انصاری کی فیاضی کا بخوبی تجربہ تھا لیکن میرے دہلی کے دوران قیام تو اس کی انتہا ہی ہو گئی ڈاکٹر صاحب نے اصرار کیا کہ ورکنگ کمیٹی کے سبھی ممبران ان کے یہاں قیام کریں گے ان کا وسیع و عریض بنگلہ بھی جب اس کے لئے ناکافی ثابت ہوا تو کمپاؤنڈ میں ہی شامیانوں کا انتظام کیا گیا۔ تقریباً سو اشخاص روزانہ ان کے یہاں کھانا کھاتے تھے۔ ان کی بہت بڑی پریکٹس بھی تھی۔ مختلف مقامات سے لوگوں کے آنے کا تانتا بھی بندھا رہتا تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے بحث و مباحثہ بھی جاری تھا۔ اس پر اتنے افراد کی میزبانی لیکن اس مصروفیت کے باوجود میں نے کبھی ڈاکٹر صاحب کو پریشان یا خفا ہوتے نہیں پایا۔ نہ ہی میں نے کبھی ان پر تھکن کے آثار پائے۔ اس غیر معمولی بندوبست کے پس پشت صرف بیگم انصاری کا ہاتھ تھا۔ ایک دن بیگم صاحبہ کی موجودگی میں ہی میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا "آپ کس طرح اپنے غیر معمولی فرائض کے ساتھ اتنی بڑی تعداد میں اپنے مہمانوں کی میزبانی کے فرائض بھی ایسی خوش دلی سے انجام دے لیتے ہیں" انھوں نے جواب دیا اس کا سہرا صرف بیگم صاحبہ کے سر ہے میں جو کچھ کماتا ہوں انھیں سونپ دیتا ہوں وہ اردو و حساب میں ماہر ہیں۔ ہر چیز کا حساب رکھتی ہیں۔

اور جس طرح چاہتی ہیں خرچ کرتی ہیں۔ اس لئے گھریلو محاذ پر مجھے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ سن کر میں نے فرطِ عقیدت سے اپنا سر بیگم انصاری کے سامنے جھکا دیا۔"

Collected Works: XLV (1930-1931), p.361.

نمبر ایک دریا گنج میں تین علیحدہ باورچی خانے تھے ایک مسلم باورچی خانہ دوسرا سبزی کھانے والے حضرات کے لئے اور تیسرا یوروپین کھانوں کے لئے مخصوص تھا بیگم انصاری سبزی والے باورچی خانے کیلئے اتنی محتاط تھیں کہ انھوں نے کبھی مسلم باورچی خانے کے برتن وہاں لے جانے کی اجازت نہیں دی ایک پنڈت جسے روزانہ کا راشن اور دیگر ضروریات کی اشیا دی جاتی تھیں وہی علیحدہ ملازموں کے ساتھ سبزی والے حضرات کو کھانا کھلاتا تھا۔ بیگم ایک اعلیٰ درجہ کی منتظم اور میزبان تھیں۔

بیگم انصاری سیاسی عقائد کے اعتبار سے بھی انصاری صاحب کی ہم عقیدہ تھیں مثلاً "دہلی ویمنس خلافت کمیٹی کی سربراہ بیگم اجمل خاں اور بیگم انصاری نے بی اماں کے دورانِ ملاقات خواتین کی آٹھ نشستوں کا اہتمام کیا اور دو ہزار سے اوپر چندہ جمع کیا۔"

Gail Minault: The Khilafat Movement, p.150.

"ڈاکٹر انصاری قومی سیاست میں جتنا سرگرم تھے اتنا ہی مشغول اپنی پریکٹس میں بھی تھے۔ اس زمانے میں ان کی ماہانہ آمدنی تیس ہزار روپے ماہوار سے کم نہ تھی بیگم انصاری نے کبھی ان کی غیر معمولی مصروفیت کا شکوہ نہیں کیا بلکہ اندرونِ خانہ انھیں ہر ممکن سکون، تعاون اور فرصت مہیا کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ ڈاکٹر انصاری نے ملک و قوم کو جو کچھ دیا اسکے پس پشت بیگم انصاری کا کتنا اہم کردار تھا اس احساس کے پیشِ نظر ڈاکٹر بدھان چندر رائے نے ان کے انتقال پر ان کی بیٹی کو دیئے گئے اپنے تعزیتی تار میں لکھا تھا "آپ کے والد نے اپنی حیات میں جو کچھ حاصل کیا وہ صرف آپ کی والدہ کے سبب ہی ممکن ہو سکا" یہ خراجِ عقیدت ایک ایسے انسان کی طرف سے تھا جو سیاست اور پیشہ دونوں ہی اعتبار سے انصاری خاندان سے انتہائی قربت رکھتا تھا۔

Zohra Ansari : Oral History transcript
Teen Murti Library, New Delhi.

بیگم انصاری کا انتقال ۱۹۳۸ء میں انصاری صاحب کے دو سال بعد ہوا۔

زہرہ انصاری ڈاکٹر انصاری کی بھانجی اور گود لی ہوئی بیٹی تھیں۔ ان کی محبت انصاری صاحب کی بڑی کمزوری تھی جس کا اعتراف انھوں نے شوکت اللہ انصاری کے نام اپنے خط مورخہ ۱۲ر مئی ۱۹۳۲ء میں بھی کیا ہے۔ خط میں انھوں نے لکھا تھا، میری غیر موجودگی میں بیگم انصاری، زہرہ اور قدسیہ کا قیام زیادہ تر دہلی میں ہی رہے گا۔ میں چاہتا تھا کہ ماہ اگست میں جب اسکول بند ہوں یہ لوگ کسی پہاڑی مقام یا کم از کم حیدر آباد دکن ہی چلی جائیں لیکن زہرہ کو اپنے اساتذہ سے اتنی لمبی رخصت ملنا مشکل ہے خصوصاً کیمسٹری اور انگریزی کے استادوں کی خواہش ہے کہ اغیں تعطیلات میں بھی اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہیئے۔ خود زہرہ کی بھی یہی خواہش ہے مجھے ان کی صحت کی طرف سے فکر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دو ماہ کی تعطیلات کے بعد وہ اپنی پڑھائی بہتر طور پر کر سکینگی لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو زہرہ میری کمزوری ہے اور میں ان کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اسی لیئے میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی اماں جان اور قدسیہ کے ساتھ اس وقت تک کے لیئے چلی جائیں جب تک تعلیم کا نقصان نہ ہو۔"

Mushirul Hasan: Muslims and the Congress, p.155.

(بعد میں بعض شوکت اللہ انصاری کے ساتھ جو ڈاکٹر انصاری کی بہن قمرالنساء کے بیٹے تھے ان کی شادی ہوئی)

" زہرہ انصاری"، دارالسلام" (ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دہلی رہائش گاہ کا نام جس کے معنی ہیں امن و سلامتی کا گھر، اسلام کا گھر) کی پروردہ تھیں اور اس کی تمام روایتیں انھوں نے وراثت میں پائی تھیں۔ ترکی کی ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے ان کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا: "ان کی زندگی میری ۳۵ سال قبل کی زندگی کا ایک عکس ہے وہ اتنی منفرد شخصیت کی مالک ہیں کہ اسے بیرونِ پردہ یا اندرونِ پردہ، کسی ایک خانے میں تقسیم کرنا ممکن نہیں۔ گو "دارالسلام" کا طرزِ معاشرت قطعاً مشرقی ہے تاہم بیگم انصاری اپنے شوہر یا دیگر افراد کے مغربی انداز میں کبھی مخل نہیں ہوئیں۔ وہ کبھی اپنی بیٹی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں۔ اسی لیئے نوجوان

زہرہ کو آزاد زندگی کے منازل طے کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی ۔ وہ کھانے میں شریک ہوتی ہیں لیکن جب مہمانِ خصوصی مدعو ہوں ۔ ساڑی پہننے میں انھیں قطعاً کسی دشواری کا احساس نہیں۔ موٹر اسی اعتماد سے چلاتی ہیں جیسے کوئی امریکن لڑکی انھیں اپنے ملک کے تمدن اور سیاسی مسائل سے انتہائی دلچسپی ہے ۔ ایک مسلمان لڑکی کو آئندہ زندگی کی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرنے میں ان کا ماحول انتہائی صحت مند ہے...... زہرہ کو میری ہی طرح تاریخ وادب سے دلچسپی ہے جو ان کی ذہنی صلاحیتوں کے لئے باعثِ شگون بھی ہے ۔ زہرہ کو یقین ہے کہ لوگ جس عبوری دور سے گذر رہے ہیں وہ ان کے لئے سبق آموز بھی ہے۔ زہرہ کو اپنے ملک کی تاریخ سے گہری واقفیت ہے۔ لیکن ایک نوجوان رومانی تخیل کے باوجود ان کے فیصلے جذبات سے متاثر نہیں ہوتے۔ شاید مسلمان ہونے کے سبب انھیں نہ احساس برتری ہے ۔ نہ احساس کمتری۔ وہ مسلمانوں کو کوئی غیر قوم نہیں سمجھتیں جس کی ایک اجنبی زمین میں پیوندکاری کی گئی ہو اور اب وہ اس کا مقدر بن چکی ہو۔ وہ ہر اعتبار سے ہندوستانی ہیں۔ ان کی زندگی میں اشوک کی اتنی ہی تاریخی اہمیت ہے جتنی ہمایوں اور بابر کی۔ میرا قیاس ہے کہ جامعہ کے اساتذہ کی قربت نے ان کے زاویۂ نظر کو متاثر کیا ہے"۔

"میں ان کی صبح کی آمد کی منتظر رہتی تھی۔ وہ اکثر دہلی کی سیاحت میں میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ دہلی کی یادگار تاریخی عمارتوں کو انھوں نے میرے لئے ایسا جیتا جاگتا روپ عطا کر دیا تھا جس کے بغیر وہ شاید میرے لئے پتھروں کا ایسا ڈھیر ثابت ہوتے جنھیں محض خوبصورتی سے ترتیب دیا گیا ہو۔ وہ ان تمام افراد سے وابستہ روایتوں سے بھی باخبر تھیں جن کی زندگی ان کھنڈرات سے منسلک تھی"۔

Halide Edib, Inside India (London, 1937) quoted in "Muslims and the Congress: p.313-314.

ملکی سیاست سے زہرہ انصاری کو گہری دلچسپی تھی۔ گاندھی جی سے ان کی قربت اوران کے مسلک کی ہم آہنگی کا اندازہ کئی خطوط سے لگایا جاسکتا ہے ملاحظہ ہو مندرجہ ذیل ایک خط :

" ۳ راکتوبر ۱۹۳۲ء

پیاری بیٹی زہرہ۔ تمہارے دونوں خطوط ملے ، خدا کے فضل سے میری صحت بہتر ہو رہی ہے۔ میرا برت خدا ہی کی طرف سے تھا، اسی نے مجھے بحفاظت بچا لیا۔ آؤ ہم سب ہندو مسلم اتحاد کے لئے دعا کریں۔ جب تک یہ مقصد پورا نہ ہوجائے مجھے سکون میسر نہیں ہوسکتا۔ مجھے ابا جان کے خطوط بھی ملتے رہے ہیں۔ تمہیں اب میری اُستاد بننا بھی قبول کرلینا چاہیئے۔ تمہارے خطوط سے میں اپنے سبق کا کام بھی لیتا ہوں۔ چند ہی افراد مجھے اردو میں خطوط بھیجتے ہیں لیکن تمہاری جیسی خوبصورت تحریر کسی کی نہیں۔ اسی لئے تمہارے خطوط بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ با اس وقت پورے دن کے لئے میرے ساتھ ہیں، سردار اور مہادیو بھی ہیں۔ ابا جان سے سلام کہنا۔ میری طرف سے ڈھیروں دعائیں۔ گاندھی "

Collected Works: Vol.LI, p.185.

ایک اور خط ڈاکٹر انصاری کے نام :

" یرودا سنٹرل جیل

۲۲ ر دسمبر ۱۹۳۲ء

پیارے ڈاکٹر انصاری! زہرہ اور میری خط وکتابت پابندی سے جاری ہے تمہیں اس کی تدریسی استعداد پر اعتبار ہو یا نہ ہو لیکن میری اردو ٹھیک کرنے کے لئے تو وہ بہت محنت کر رہی ہے۔ مجھے جتنے لوگ اردو میں خطوط بھیجتے ہیں کسی کا خط اس سے بہتر نہیں۔ مجھے ہر ہفتے اس کے خط کا انتظار رہتا ہے مجھے اس کی لفظی بندش پسند ہے ہم سب کی طرف سے پیار مخلص۔ م۔ک گاندھی۔

Ansari's Letter Vol.13. Zakir Husain Library, Jamia Millia Islamia, New Delhi.

گاندھی جی کی شخصیت نے زہرہ انصاری کو لڑکپن سے ہی متاثر کیا تھا۔ مدراس کے اجلاس ۱۹۲۷ء سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: گو میں ان دنوں خاصی کم عمر تھی تاہم اس زمانے کی اتنی یاد ضرور ہے کہ میں ہمیشہ ان والنیٹرس کے ساتھ رہتی تھی جو ہمارے خیمے سے کانگریس پنڈال میں جایا کرتے تھے۔ میں ہمیشہ وہاں اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھی رہتی تھی اور ان کے ساتھ ہی خیمے میں واپس آتی تھی۔ جہاں ہمارا قیام تھا۔"

Zohra Ansari : Oral History transcript Part II

گاندھی جی جب ورکنگ کمیٹی کے ممبران کے ساتھ دارالسلام میں مقیم تھے ان دنوں کے تذکرے کے سلسلے میں ان کا کہنا تھا "میں ان دنوں اسکولی طالبہ تھی لیکن میں جب بھی اسکول سے واپس ہوئی میں نے اپنا گھر مہمانوں سے بھرا دیکھا۔ میں نے باپو کی دعائیہ نشست کبھی نہیں چھوڑی رام دھن میں مجھے خاص لطف کا احساس ہوتا تھا۔" (Ibid)

کنچن ایم۔ شاہ کے نام واردھا سے گاندھی جی کے خط مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۹ء سے زہرہ انصاری کے آشرم میں قیام کی بھی اطلاع ملتی ہے۔

"چر بچیو کنچن! تمہارا خط ملا۔ تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ جلد آجاؤ۔ منالال ابھی واپس نہیں لوٹے۔ باورچی خانہ امت السلام دیکھ رہی ہیں۔ زہرہ ان کی مدد کرتی ہیں۔ یا دھلی ہیں۔ کانو راجکوٹ چلے گئے ہیں"۔ باپو کی دعائیں۔

Collected Works: Vol.LXXI, p.35.

زہرہ انصاری جنگِ آزادی میں جیل جانے کی بھی خواہش مند تھیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل خط سے لگایا جا سکتا ہے۔

۲۹ جون ۱۹۴۱ء

"بیٹی زہرہ! تمہارا خط ملا۔ فرید بھائی نے لکھا ہے کہ تم ان کی والدہ کی بہت اچھی تیمارداری کر رہی ہو۔ خدا تمہارے لئے بہتر ہی کرے گا۔ تھوڑا صبر سے

کام لو۔ ایک دن میں ضرور تمہیں جیل جانے کی اجازت دوں گا۔ امید کہ شوکت بخیریت ہوں گے۔ بچوں کو پیار باپو کی طرف سے دعائیں۔"

Collected Works: Vol.LXXIV, p.131.

(وہ جیل گئیں یا نہیں اس کے متعلق معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں)

" دارالسلام کے سلسلے میں بھی ان کی قربانی نظرانداز کئے جانے کے قابل نہیں۔ اس گھر کی اہم تاریخی حیثیت ہے۔ اس میں نہ صرف کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں کا قیام رہا ہے بلکہ اس زمانے کے سبھی علمائے کرام کی میزبانی کا بھی اسے شرف حاصل رہا ہے۔ کانگریس اور سوراج پارٹی کی اہم نشستیں بھی یہاں پر ہوئی ہیں۔ زہرہ انصاری صاحبہ کے بیان کے مطابق اس گھر کو اسی انداز پہ قائم رکھنا ہمارے لئے بڑا مشکل تھا۔ ہم نے ارادہ کیا کہ ایک چھوٹے مکان میں منتقل ہو جائیں اور "دارالسلام" کو کرائے پر اٹھا دیں۔ ہمارے دوستوں کا مشورہ تھا کہ اسے ہم انجمن ترقی اردو کو دے دیں۔ لیکن اچانک ۱۹۴۶ء میں الکشن کا مرحلہ درپیش ہوا۔ میرے شوہر نے محسوس کیا کہ قوم پرست مسلمانوں کے لئے یہ بڑا نازک وقت ہے مسلم لیگ سے مورچہ سخت ہے اور پیسوں کا انتظام انتہائی دشوار۔ میں نے اس وقت اپنے شوہر کی مدد کی اور ورثے میں ملے اپنے اس گھر کو جس کا رقبہ بارہ ہزار اسکوائر یارڈ تھا فروخت کر کے اس رقم سے یوپی میں الکشن کا بندوبست کرنے کا فیصلہ کیا۔"

Zohra Ansari : Oral History transcript Part I

ان کا انتقال ۲۸ جولائی ۱۹۸۰ء میں انگلینڈ میں ہوا۔ اور وہیں پر تدفین ہوئی۔

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

مائی بخت آور

مائی بخت آور ایک سندھی کسان خاتون تھیں۔ شوہر کا نام ولی محمد لاشاری تھا۔ لاشاری گاؤں ضلع تھرپارکر سندھ میں واقع ہے۔ زمینداری ظلم واستبداد برطانوی آمریت کے نظام کا ایک جزو لاینفک رہا ہے ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے، زمیندار کے آدمیوں نے لاشاری کے کسانوں کے اناج پر زبردستی قبضہ کرنا چاہا تو اور گاؤں والوں کے ساتھ مائی بخت آور نے بھی بڑی بہادری سے مزاحمت میں حصہ لیا۔ پولیس نے نہتے کسانوں پر فائرنگ کی اور ۲۲ جون ۱۹۴۶ء میں مائی بخت آور اس فائرنگ میں شہید ہو گئیں۔ ان کے آخری الفاظ تھے "دیکھو وہ ہمارا اناج نہ لے جا سکیں"۔ اس فائرنگ میں ان کے شوہر بھی زخمی ہوئے۔ لاشاری گاؤں میں مائی بخت آور کی شہادت کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ہری کمیٹی ہر سال ان کی یادگار مناتی ہے۔ اس زمانے کے مشہور سندھی شاعر شیخ ایاز نے ان پر ایک نظم لکھی تھی جو آج بھی عوام میں مقبول ہے۔ اس میں کہا گیا تھا "ہمیں موت کے سائے میں آگے بڑھنا ہے، ہماری محبوب ماں بخت آور نے اپنا خون بہایا ہے وہ فردوس بریں سے انھیں سلام بھیجتی ہے جو اس کے نصب العین پر چل رہے ہیں۔ مائی بخت آور کا خون بھی منصور کی مانند "انا الحق" پکارتا ہے۔

مشہور سندھی ادیب منیر مانک نے "شہید بخت آور" کے نام سے

۱۹۶۷ء میں ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ علاوہ ازیں برطانوی دورِ حکومت میں ۱۹۴۲ء کی "حر" تحریک میں بھی کئی سندھی خواتین شہید ہوئیں۔ ان سے متعلق تفصیلی معلومات ہندوستان میں ملنا ممکن نہیں۔

(بشکریہ سندھی ادیب جناب اے۔ جے۔ اتم۔ بی۔ ۹ ستیلادیوی روڈ، سندھی نواس، ماہم بمبئی، ذاتی انٹرویو ۲۳ر جولائی ۱۹۸۶ء)

ماجدہ حسینہ بیگم

غیر معمولی جرأت اور نصب العین میں اپنے کو جذب کر دینے والی ماجدہ حسینہ بیگم کلکتہ کے نچلے طبقے کے عوام کے حقوق کی علمبردار تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جیل گئیں رہائی کے بعد پھر پولیس کے مظالم، سماجی عدم مساوات اور مسلم لیگ کے فرقہ دارانہ تعصب کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئیں۔

(SHANTIMOY RAY : FREEDOM MOVEMENT AND INDIAN, MUSLIMS, People's Publishing House, P. 84)

ظہیرہ بیگم ۔ سلطانہ بیگم

'ابھو دایہ' نے اپنی اشاعت بتاریخ ۳۰ راگست ۱۹۳۰ء، بنگال میں پہلی بار دو مسلم خواتین کی گرفتاری کی اطلاع دی ہے۔ ظہیرہ بیگم و سلطانہ بیگم دونوں پروفیسر عبدالرحیم ممبر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صاحبزادیاں ہیں۔ انھیں شراب و ولایتی کپڑوں کی دوکانوں کے سامنے دھرنا دینے پر گرفتار کیا گیا ہے۔

Women in India's Freedom Struggle : National Archives, New Delhi P. 13

فاطمہ بیگم

فاطمہ بیگم پنجاب کانگریس کی بڑی فعال رکن تھیں۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کانگریس کے ماس کونٹیکٹ (Mass Contact) پروگرام میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ہر ضلع کانفرنس میں شریک ہوتی تھیں اور جلسوں کو مخاطب کرتی تھیں

(ڈاکٹر ہاشم قدوائی، سابق ممبر راجیہ سبھا)

تھوڑی روایتوں سے بغاوت بھی چاہئے

بیگم صفیہ عبدالواجد

۵ ستمبر ۱۹۰۵ء کو صفیہ بیگم کی پیدائش بمقام (اٹیہ) یوپی ہوئی۔ ان کی والدہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ والد ڈپٹی کلکٹر اور نانا ڈسٹرکٹ جج تھے۔ ان کا خاندان ایک روشن خیال خاندان تھا۔ سیاسی نظریات میں وہ اپنے ماموں مولوی سید عبدالودود سے متاثر تھیں۔ صفیہ بیگم نے بی۔اے ازابیلا تھوبرن کالج سے کیا اور ایم اے ایل۔ ٹی کی ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کے شوہر مولوی عبدالواجد بریلی کے مشہور وکیل اور ممتاز قوم پرست رہنما تھے۔ وہ یوپی بورڈ برائے مرکزی و صوبائی اسمبلی الیکشن" کے سکریٹری بھی تھے۔ صفیہ بیگم ان کی قومی کارکردگی میں برابر کی شریک تھیں۔ ابتدا سے ہی وہ انڈین نیشنل کانگریس کی فعال ممبر تھیں۔ ۱۹۴۲ء میں خفیہ سرگرمیوں کی سزا میں انھیں گورنمنٹ گرلز انٹر کالج کی لکچرر شپ سے برطرف کر دیا گیا۔

گاندھی جی کی خواہش تھی کہ وہ پردہ ترک کر دیں اور پبلک محاذ پر کھل کر سامنے آئیں۔ مولوی عبدالواجد چاہتے تھے کہ وہ صرف بریلی میں برقعہ استعمال کریں لیکن صفیہ بیگم کا اصرار تھا کہ اگر پردہ ترک کیا تو پھر کبھی برقعہ کو ہاتھ نہیں لگائیں گی اور انھوں نے یہی کیا بھی۔ تحریک آزادی میں ان کی خدمات کے پیش نظر ۱۹۵۲ء میں انھیں یوپی اسمبلی کے لئے کانگریس کا ٹکٹ دیا گیا۔ وہ الیکشن

میں کامیاب ہوئیں اور ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک ممبر قانون ساز اسمبلی کی حیثیت سے آزاد ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔

صفیہ بیگم بڑی پر لطف و پرکشش شخصیت کی مالک ہیں۔ آج کا ہندوستان ان کے خوابوں کے ہندوستان سے قطعی مختلف ہے اس کا انھیں شدت سے احساس ہے۔

ضعیفی کے باوجود وہ آج بھی فعال ہیں اور سماجی خدمات میں مشغول رہتی ہیں۔ وطن عزیز کے لئے اپنی نیز اپنے خاندان کی نمایاں خدمات کے باوجود ان کی خود دار طبیعت نے مجاہدینِ آزادی کو دی گئی پنشن کو قبول نہیں کیا۔

(بشکریہ مکتوب بیگم صفیہ عبدالواجد مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۸۹ء، ۶۹ آواس وکاس، سول لائنز بریلی)



ضمیمہ نمبر (۱)

ام الاحرار اور بیگم صاحبہ محمد علی پنجاب میں

دورہ کا نظام نامہ

تاریخ	مقام	روانگی از مقام	آمد بوقت
۲۹-۸-۱۹۲۲	امرتسر	لاہور ۸-۲۴ دن	امرتسر ۹.۴۹ دن ریل
۳۰-۸-۱۹۲۲	〃	قیام امرتسر	
۳۱-۸-۱۹۲۲	گجرات	امرتسر ۷.۳۹ دن	گجرات ۱۱.۴۶ دن ریل
۱-۹-۱۹۲۲	جہلم	گجرات ۷.۰۰ دن	جہلم ۹.۰۰ دن موٹر
۲-۹-۲۲	راولپنڈی	جہلم ۱.۴۲ رات	راولپنڈی ۶.۱۸ دن ریل
۳-۹-۲۲	〃	راولپنڈی قیام	
۴-۹-۲۲	پشاور	〃 ۱.۳۷ دن	پشاور ۶.۰۵ شام ریل
۵-۹-۲۲	پشاور	شام ۵.۲۰ 〃	〃 〃
۶-۹-۲۲	میانوالی	〃 〃	میانوالی ۶.۴۰ 〃

زمیندار یکم ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

شہر انبالہ میں ام الاحرار و بیگم محمد علی کا وُرودِ مسعُود

۲۴ر اگست کو دن کے ۱۲½ بجے بی اماں صاحبہ اور بیگم محمد علی شہر انبالہ پہنچیں۔ مولوی زاہد علی صاحب صاحبزادے مولانا شوکت علی ہمرکاب تھے۔ اسٹیشن پر ہزار ہا مرد و زن ان کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ عہدہ دارانِ خلافت و کانگریس و جوشں رضا کاران استقبال کے لئے حاضر تھے۔ ان کی تشریف آوری پر اس قدر جوش پھیلا کہ "اللہ اکبر" اور قومی نعروں میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور ہجوم کی وجہ سے تل رکھنے کو جگہ نہ تھی چونکہ سخت گرمی کا وقت تھا اس لئے جلوس ملتوی رکھا گیا اور ہر دو خواتین اور انکے ہمراہیوں کو خان عبدالرشید خاں صاحب بیرسٹرایٹ لا کی کوٹھی پر پہنچایا گیا جہاں تا روانگی یہ معزز مہمان قیام فرما رہے۔ سہ پہر کو ہر دو خواتین جلوس کے ساتھ امام باڑہ میر عبدالرحیم صاحب مرحوم میں تشریف لے گئیں اور وہاں زنانہ جلسہ ہوا۔ حاضرات کی کثرت سے کھڑے ہونے تک کو جگہ نہیں تھی۔ اور سینکڑوں مستورات مایوس واپس ہو گئیں۔ رات کے وقت میدان غلہ منڈی میں زیر صدارت جلسہ لالہ بینی پرشاد صاحب وکیل عام جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں بی اماں اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی کی خدمت میں اہل شہر کی طرف سے ایک عقیدت نامہ پیش کیا گیا جس کو خان محمد عبدالغفار خاں جنرل سکریٹری ضلع انبالہ کانگریس کمیٹی نے پڑھا اور بی اماں نے اور ان کے بعد بیگم محمد علی صاحبہ نے تقاریر کیں لیکن ہنوز بیگم صاحبہ نے نصف تقریر بھی نہ کی تھی کہ بارش زور سے ہونے لگی اور مجبوراً جلسہ برخاست کرنا پڑا۔

۲۵ر اگست کو مسلم ہال میں ایک اور زنانہ جلسہ منعقد ہوا۔ حاضرات کی کثرت لے

اس وسیع عمارت کو ناکافی ثابت کر دکھایا۔ سہ پہر کو انبالہ چھاؤنی تشریف لے گئیں وہاں اوّل جلسہ زنانہ اور شب کو بصدارت غلام بھیک نیرنگ وکیل صدر ضلع خلافت کمیٹی انبالہ جلسہ عام نہایت کامیابی کے ساتھ ہوئے۔ ۲۶ر اگست کو اول آپ میر غلام بھیک نیرنگ صاحب وکیل کے مکان پر تشریف لے گئیں وہاں بھی مستورات کا بہت بڑا اجتماع ہوا۔ اس کے بعد سہ پہر کو ہندو ہال میں زنانہ جلسہ اور شب کو میدان منڈی میں خان محمد عبدالغفار خاں جنرل سکریٹری ضلع کانگریس کمیٹی انبالہ کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا۔

چونکہ جلسہ سابق کے بارش کی وجہ سے منتشر ہو جانے کے باعث لوگوں کو سخت مایوسی ہوئی تھی اور اسی سبب سے سخت اشتیاق تھا۔ اس لئے اول بیگم صاحب نے اپنی تقریر دلپذیر کو مکمل کیا۔ اس کے بعد بی اماں صاحبہ نے ایک لاجواب تقریر فرمائی۔ بارش پھر آئی لیکن لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ بھیگتے رہے اور دونوں کی تقریر سنتے رہے۔

اسی شب کو ایک بجے کی ٹرین سے بی اماں اور بیگم صاحبہ معہ رفقاء لاہور تشریف لے گئیں۔

زمیندار یکم ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

نوٹ: "نیشنل آرکائوز میں بی اماں کی اس تقریر کے نوٹس ہیں جو انھوں نے لاہور میں ۲۰ر اگست ۱۹۲۲ء میں کی تھی انھوں نے کھل کر کونسلوں میں داخلے کی مخالفت کی، کھادی کے استعمال اور ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور کہا کہ بھائیوں جیل سے خوف نہ کھاؤ۔ گولیوں سے مت ڈرو، موت برحق ہے اگر گولیوں سے ہوئی تو شہید کہلاؤ گے۔"

نوٹس کے مطابق وائسرائے نے ہوم منسٹر سے ان کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ (مصنف)

اُمّ الاحرار امرتسر میں

عظیم الشان جلسہ

[از مولوی غلام ربانی صاحب]

۲۹ر اگست کی شب کو جلیان والا باغ میں کانگریس و خلافت کمیٹی کی طرف سے عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد تخمیناً ۱۵ ہزار تک تھی جلسہ کے باقاعدہ افتتاح سے قبل چند نظمیں اور تقریریں ہوئیں۔ اس کے بعد باقاعدہ جلسہ زیر صدارت ملک لعل خاں معتمد مجلس خلافت پنجاب لاہور شروع ہوا۔ ملک صاحب نے فرمایا کہ جس چیز نے بی اماں کو اپنے اس ضعف و نقاہت کے باوجود ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں صوبات سفر برداشت کرنے پر مجبور کیا وہ ان کی شفقتِ مادری اور بے مثل جذبۂ ہمدردی ہے۔ اسی طرح بیگم صاحبہ مولانا محمد علی کو بھی مسٹر لائڈ جارج کا وہ تار برسرعام لایا ہے جو مسٹر موصوف نے جنرل ایلن بی کو فتح بیت المقدس کے وقت بھیجا تھا۔

سپاسنامہ

مولوی ثناء اللہ صاحب ایڈیٹر اہل حدیث، امرتسر نے بی اماں کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا جس کا جواب اُمّ الاحرار نے حسب ذیل فرمایا۔

"جو تعریف اس سپاسنامے میں میرے اور میرے بیٹوں کے متعلق ظاہر کی ہے اس کا میں شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کرتی ہوں کہ یہ تعریف ہماری خدمات سے بہت بڑی ہوئی ہیں۔ جو کچھ میں نے اور میرے بیٹوں نے کیا وہ ہمارا

فرض تھا۔ مجھے امید ہے کہ میرے تمام ہندوستانی بچے اپنے فرض کو پہچانیں گے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکیں گے"!

بی اماں کی تقریر

سپاسنامہ کے جواب اور تقریر سے بی اماں بالکل معذور تھیں گلا بیٹھا ہوا تھا اس لئے مولوی عزیزالرحمٰن صاحب کارکن مجلس خلافت بمبئی آپکے ملفوظات مبارکہ کو دھراتے جاتے تھے۔ بی اماں نے فرمایا کہ سکھ بھائیوں پر مجھے فخر ہے پنجاب کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی یہ منحوس خبر میرے کانوں میں پہنچی کہ سکھ بھائیوں پر ظلم ہو رہے ہیں اس سے میرے دل میں سخت صدمہ ہوا لیکن ان کی مردانگی اور بہادری کو دیکھ کر اتنی ہی خوشی ہوئی۔ ان کی پابندی عدم تشدد قابلِ فخر ہے۔ اپنے مسلمان بیٹوں سے مجھے بہت شکایت ہے کہ انھوں نے میری بوڑھی ہڈیوں کی پرواہ نہ کی۔ سکھوں کا مذہب مہاتماجی کے مذہب سے مختلف ہے لیکن انھوں نے مہاتماجی کے ایک لفظ کو پکڑا اور آج تک اس پر ثابت قدم ہیں۔ انھوں نے ہر قومی کام میں صداقت سے قدم رکھا ہے اور مکمل ارادے اور عقیدے سے کیا ہے لیکن مسلمانوں نے اپنی بوڑھی ماں کی خاطر کھدر تک بھی نہ پہنا۔ مسلمانو! اپنی بوڑھی ماں کی لاج رکھو۔ اپنے خدا اور رسول کا پاس کرو۔ اگر میرے کہنے سے تم نے کھدر بھی نہ پہنا تو کل مجھ پر (خدا نخواستہ) بجلی گرے تو پانی کا چھینٹا نہ دے سکو گے۔ اب میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غلامی سے چھڑائے۔ ہندوستان کے کتے بلیاں بھی غلامی کی زنجیروں میں نہ بند رہیں۔

زمیندار - ۲/ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۵

محترمہ بی اماں کا حضرو میں ورود

راولپنڈی سے حضرو یہ خبر پہنچی کہ محترمہ بی اماں صاحبہ کچھ دیر کے لئے حضرو تشریف لے جائیں گی۔ یہ خبر آناً فاناً تمام علاقہ چھچھ میں پھیل گئی اور سرِ شام ہی ۱۵۔۲۰ ہزار عقیدت مند شوقِ دیدار سے جمع ہو گئے۔ یہاں سے حضرو تک چار میل کی وسعت میں آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ ہندو مسلمان فرطِ ارادت سے آنکھیں فرشِ راہ کرنے کو مضطرب تھے۔ ۴۰۔۵۰ تانگے، سو ڈیڑھ سو سوار اور رضا کارانِ خلافت ایک بڑی جمعیت میں جلوس کے لئے موجود تھے۔ راولپنڈی سے محترمہ بی اماں صاحبہ اور پارٹی بذریعہ موٹر روانہ ہوئیں لیکن ایک تو روانگی میں دیر ہو گئی تھی اس پر طرہ یہ کہ موٹر راستہ میں بگڑ گئی اور محترمہ بی اماں صاحبہ ۱۰ بجے سے پہلے نہ پہنچ سکیں۔ اگرچہ بہت سا وقت ہو جانے کے باعث بہت سے لوگ مایوس ہو کر چلے گئے تھے لیکن پھر بھی پانچ چھ ہزار کی تعداد موجود تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہندوستان کی واجب الاحترام ماں کے احکام و نصائح سننے کے لئے جمع تھے۔ مولانا محمد اسحٰق مانسہری صدرِ جلسہ تھے۔ ڈاکٹر محمد عالم صاحب، رانا فیروز الدین صاحب نے حالاتِ حاضرہ پر مختصر تقاریر کیں۔ پھر بی اماں نے تقریر شروع کی جسے حاضرین نے نہایت سکون و سکوت سے سُنا۔

۱۷ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

محترمہ بی اماں کی کیمبل پور میں آمد

۵ ستمبر کو ۳ بجے کے قریب بذریعہ ریل پارٹی کیمبل پور پہنچی۔ چونکہ محترمہ بی اماں صاحبہ کے داخلہ کی صوبہ سرحد میں حکومت کی جانب سے مخالفت ہو چکی تھی اور امتناعی احکام مجلس خلافت پشاور اور محترمہ بی اماں کو پہنچ چکے تھے اسلئے سرفروشانِ پشاور ہزاروں کی تعداد میں کیمبل پور پہنچ گئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ پشاور اور دوسرے اسٹیشنوں سے کیمبل پور کا ٹکٹ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ رضاکارانِ پشاور کا ایک دستہ ریلوے اسٹیشن پر کھدر کی خوش نما وردیاں پہنے ہوئے استقبال کے لیے ہلالی جھنڈا لئے موجود تھا۔ جونہی گاڑی اسٹیشن پر پہنچی اللہ اکبر کے غلغلہ انداز نعروں سے فضائے آسمانی گونج اٹھی۔ جلوس مرتب کیا گیا۔ رات کو میدان پریڈ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں حاضرین کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی صوبہ سرحد سے باوجود گوناگوں بندشوں اور رکاوٹوں کے ہزارہا حضرات شاملِ جلسہ ہوئے۔ فخرِ قوم میاں گل حمید کاکاخیل بھی تشریف لائے تھے اور مجلس نصرت الاسلام زیارت کاکا صاحب کی جانب سے سپاسنامہ بی اماں کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

شیخ محمد غوث صاحب نے کیمبل پور میں مجلس خلافت کے انعقاد کی جانب توجہ دلائی اور بی اماں نے ایک موثر تقریر کی۔ جس کا ایک ایک لفظ اثر میں ڈوبا ہوا تھا۔

میانوالی میں ورود اور اظہار جوش

۱۶ ستمبر کو محترمہ بی اماں اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی بمعیت رانا فیروز الدین صاحب معتمد مجلس خلافت پنجاب لاہور کیمبل پور سے روانہ ہو کر بوقت صبح ۸ بجے میانوالی پہنچیں۔ اسٹیشن پر کانگریس اور خلافت کے کارکنان معززین شہر اور جماعت رضاکاران استقبال کے لئے موجود تھے۔ گاڑی کے ٹھہرتے ہی قومی نعرے بلند ہوئے اسٹیشن کے باہر ہزارہا مشتاقانِ دیدار بینڈ لئے کھڑے تھے۔ شاندار جلوس مرتب کیا گیا اور شہر کے بڑے بازاروں میں سے جو جھنڈیوں سے آراستہ تھے گذر کر ملک مولا بخش صاحب وکیل کے مکان پر ختم ہوا جو مہمانان محترم کے قیام کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ ۵ بجے شام خواتین کا جلسہ ہوا۔ محترمہ اماں اور بیگم صاحبہ نے مستورات کو فرائض مذہبی اور ملک کی طرف متوجہ کیا۔ مبلغ ۵۶ روپے نقد اور دو طلائی چوڑیاں چندہ ہوا۔ ۶ بجے شام پبلک جلسہ منعقد ہوا۔ جو جامع مسجد کے وسیع میدان میں ہوا۔ حاضرین کی تعداد ۵ - ۶ ہزار کے قریب تھی۔ مجالس کانگریس و خلافت و اہلیانِ شہر کی جانب سے ملک مولا بخش صاحب نے سپاسنامہ پیش کیا۔ محترمہ بی اماں نے مناسب الفاظ میں جواب دیتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد اور کھدر پر زور دیا۔ اور حاضرین سے پُر زور الفاظ میں اپیل کی کہ سکھ بھائیوں کی قابل تقلید مثال سے سبق حاصل کریں۔

زمیندار - ۱۷ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

اُمّ الاحرار ضلع جھنگ میں

اُم الاحرار ۱۲ ستمبر کو صبح چنیوٹ روانہ ہوئیں جس میں نواب عبدالرحمن صاحب غازی اور ملک نصراللہ خاں عزیز بھی ہمرکاب تھے۔ چنیوٹ میں ایک پرجوش اور شاندار جلوس میں وفد شہر میں گھومتا ہوا جائے قیام پر پہنچا۔ بی اماں کی زیارت کے لئے مستورات کا تمام دن تانتا بندھا رہا۔ پچھلے پہر ۶ بجے مستورات کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں بی اماں اور بیگم صاحبہ نے تقریریں کیں۔ ۳ سو روپے نقد اور بہت سے چاندی سونے کے زیورات جمع ہوئے۔ رات کے ۹ بجے جھجو تھان میں ایک عام جلسہ ہوا جس میں بی اماں کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ بی اماں نے کھدر، سوراج اور اتفاق پر تقریر کی۔ ۱۳ ستمبر کی شام کو مستورات کا ایک اور جلسہ ہوا۔ بی اماں نے اپنے پند و نصائح سے محظوظ فرمایا اور چندہ جمع کیا۔ چنیوٹ کھدر کے معاملے میں پنجاب کی تمام بستیوں سے پس ماندہ ہے۔ الحمدللہ کہ بی اماں کے ورود مسعود کی برکت سے عورتوں اور مردوں میں کھدر کا شوق اور پیدا ہو گیا ہے۔

چک جھمرہ میں جلسہ

بعد شام ۱۳ ستمبر کو بی اماں چک جھمرہ تشریف لائیں۔ ۱۰ بجے رات کے زیر صدارت ملک نصراللہ خاں عزیز جلسہ منعقد ہوا جس میں بی اماں نے ملتان کے واقعات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ آپس میں جھگڑنا چھوڑ دو۔ اس سے گورنمنٹ کے گھر میں گھی کے چراغ جلتے ہیں اور ہمارے گھروں میں ماتم ہوتا ہے۔

کھدر پہنو اور پنچایتیں قائم کرو۔

مراسلہ معتمد ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی، لائل پور

(زمیندار ۱۸ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۵۔)

بی اماں فیروز پور میں

بی اماں اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی رات کے بارہ بجے چک جھمرہ سے روانہ ہو کر آج مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۲ء دن کے ۱۱ بجے فیروز پور پہنچے بارش کے باوجود اسٹیشن پر رضا کاران کانگریس و خلافت اور باشندگان شہر کا ہجوم تھا۔ قیام مولوی کمال الدین صاحب بی اے۔ ایل۔ ایل بی کے مکان پر ہوا۔ ۳ بجے عورتوں کا جلسہ ہوا جس میں محترمہ بی اماں اور بیگم صاحبہ نے حالات و ضروریات حاضرہ پر تقریر کرتے ہوئے مسلمان عورتوں سے استعمال کھدر کی درخواست کی۔ رات کو زیر صدارت چوہدری عبدالحق بیرسٹر جلسہ ہوا جس میں حاضرین کی تعداد قریباً ۸ ہزار تھی جس میں تقریباً ایک ہزار مستورات ہوں گی۔ چند نظموں کے بعد صدر صاحب کی مختصر تقریر کے بعد محترمہ بی اماں نے مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے کھدر کے استعمال و ہندو مسلم پنچایت پر زور دیا۔

زمیندار ۱۸ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۵

ضلع لائل پور میں بی اماں کا ورود مسعود

بی اماں صاحبہ اور بیگم محمد علی ۱۰ ستمبر کو صبح ۶ بجے وارد لائل پور ہوئیں۔ ایک نہایت شاندار جلوس کے ہمراہ آپ کو دفتر خلافت میں بغرض قیام پہنچایا گیا۔ مغرب کے بعد ۸ بجے گول باغ میں زیر صدارت خواجہ عبدالرحمٰن غازی بی اے صدر مجلس خلافت لائل پور ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ ملک نصراللہ خاں عزیز نے تلاوت کے بعد بی اماں کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا اور سردار کبیر سنگھ جتھہ دار اکالی دل نے اس کو بی اماں کے حضور پیش کیا۔ بی اماں نے اپنے بیٹے بھائیوں کو خطاب کر کے اتحاد، اتفاق کھدر اور پنچایتوں پر زور دیا اور کہا کہ ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ نیز فرمایا کہ آپس میں رواداری اور درگذر کے ساتھ رہو۔ میں خالصہ کو گورد کے باغ میں قربانیوں پر مبارکباد دیتی ہوں حکومت روپے کے بل پر ناچ رہی ہے اس سے روپیہ چھین لو خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ بی اماں کا ایک ایک لفظ سادگی کے ساتھ دلوں میں تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو رہا تھا۔

مورخہ ۱۱ ستمبر کو صبح ۸ بجے بی اماں نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے سانگلہ کو مشرف فرمایا۔ خواجہ عبدالرحمٰن غازی اور ملک نصراللہ خاں عزیز بھی ہمرکاب تھے بی اماں نے سادہ مگر پر اثر انداز میں غصہ کو ضبط کرنے، دشمنوں کے فریبوں سے ہوشیار رہنے اور قومی خدمت کرنے کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ بس کھدر پہنو، کھدر پہنو۔ (مراسلہ معتمد کانگریس لائل پور)

روزنامہ زمیندار ۲۲ ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

ام الاحرار اور بیگم صاحبہ کی سرگرمیاں شملہ میں جلسہ عام

لدھیانہ - ۲۲ر ستمبر -

محترمہ بی اماں اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی نے شملہ میں چار جلسوں میں تقریریں کیں مجالس خلافت کانگریس وسکھ لیگ کی طرف سے محترمہ ام الاحرار کی خدمت میں مشترکہ سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ ام الاحرار نے موزوں الفاظ میں جواب دیا اور حاضرین سے استدعا کی کہ محض زبانی اتحاد کی نہیں بلکہ حقیقی اتحاد اور دلوں کے اتحاد کی ضرورت ہے کیونکہ یہی کلید کامیابی ہے۔

زمیندار - ۲۵ر ستمبر ۱۹۲۲ء ص ۵

ہوشیار پور میں بی اماں صاحبہ کی تقریر

محترمہ بی اماں و بیگم صاحبہ مولانا محمد علی کل صبح دس بجے کی گاڑی سے ہوشیار پور پہنچیں۔ ہزارہا مرد و عورتوں نے آپ کا پرجوش استقبال کیا۔ شہر کے بازار نہایت خوبصورتی سے سجائے گئے تھے اور جگہ جگہ پتوں اور پھولوں کی محرابیں لگائی گئیں تھیں۔

چار بجے دوپہر اسلامیہ قومی پرائمری اسکول کی کھلی عمارت میں بی اماں صاحبہ و بیگم صاحبہ نے ہزارہا مستورات کے جلسے میں تقریر فرمائی۔ رات کے آٹھ بجے چوک کمیٹی گنج میں عام جلسہ منعقد ہوا۔ شیخ خان محمد صاحب صدر جلسہ منتخب ہوئے۔ شیخ محمد معراج الدین صاحب صدر سٹی کانگریس کمیٹی نے ایک مناسب موقعہ

خود ساختہ نظم پڑھی جس کا حاضرین پر گہرا اثر ہوا۔ نظم کے بعد پنڈت ہرجن داس صاحب نائب صدر ضلع کانگریس کمیٹی نے مجالس خلافت و کانگریس کی جانب سے بی اماں صاحبہ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ ڈاکٹر قومی سنگھ صاحب نے کھدر پر چھپا ہوا ایڈریس ایک ہوشیار پور کی بنی ہوئی کشتی میں رکھ کر پیش کیا جس پر ہاتھی دانت کا کام کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد بی اماں صاحبہ نے تقریر فرمائی۔ آپ نے لوگوں کو کامل استقلال، ہمت اور حوصلہ سے کام کو جاری رکھنے کے لئے زبردست اپیل کی۔ ہندو مسلم اتحاد اور کھدر پر بہت زور دیا اور اسلامیہ اسکول ہوشیار پور کا دوبارہ سرکاری یونیورسٹی کے ساتھ الحاق ہونے کے خلاف زوردار الفاظ میں فرمایا کہ ایسی کوششیں دین اسلام اور اس کے محافظوں کی صریحًا مخالفت ہے اور کفر سے کچھ کم نہیں۔ ان کے بعد بیگم صاحبہ نے تقریر فرمائی۔

آج صبح پانچ بجے کی گاڑی سے بی اماں معہ رفقاء جالندھر روانہ ہوگئیں۔

(دُرگا داس سکریٹری)

زمیندار۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۲ء ص ۷

فہرست آمدنی دورہ پنجاب بی اماں و بیگم صاحبہ محمد علی

۲۶ شوال ۱۹۲۲ء ۱۴۵ روپے ۱۳۲ بالیاں نقرئی انگوٹھیاں چھلے نقرئی ۱۳ عدد

۲۸ اگست لاہور ۱۶۰ روپیہ۔ ۳۱ اگست۔ امرتسر ۹۲ روپے لونگ طلائی کمید چوڑی نقرئی۔ ایک عدد۔ بالیاں نقرئی ۲ عدد

۳۱ اگست گجرات ۴۳ روپے ۸ آنہ بالیاں نقرئی ۵ چوڑی نقرئی ایک عدد

یکم ستمبر جہلم ۱۵ روپے ۶ آنے چوڑی ۲ بالیاں ۲ انگوٹھیاں ۲ چھلے نقرئی ۶

۲، ۳ ستمبر راولپنڈی ۱۱۵ روپے ۸ آنے بالیاں نقرئی ۲۔

۴ ستمبر حضرو ۸۳ روپے ۸ آنے چوڑیاں نقرئی ۶

۶ ستمبر میانوالی ۵۲ روپے چوڑیاں طلائی ۲

۸ ستمبر سرگودھا ۲۳ روپے انگوٹھی طلائی ۲۔ بالیاں طلائی ۲

۹۔۱۰ ستمبر جھنگ ۱۰۵ روپے ۶ آنے بالی طلائی ۱ بالیاں نقرئی ۲ چوڑی نقرئی ۱ انگوٹھی نقرئی ۳

۱۱ ستمبر لائل پور ۴۴ روپے ۵ آنے ۳ پائی چوڑیاں نقرئی ۱۰۔ بالیاں نقرئی ۲

۱۳ ستمبر چنیوٹ۔ ۶۱۵ روپے تین آنے چھلے ۲۔ بالیاں ۴ پھول ناک ۱ انگوٹھی طلائی ۱ بالیاں ۸۴۔ چھلے انگوٹھیاں ۴۲۔ چوڑیاں نقرئی ۳

۱۴ ستمبر فیروزپور ۴۳ روپے ۱۱ آنے ۶ پائی

۱۵ ستمبر رہتک ۲۴۰ روپے ۹ آنے ۳ پائی۔ بالیاں ۱۲۔ چوڑیاں ۲ چھلے انگوٹھیاں ۶۲۔ پتے ۲۱ بالے نقرئی ۲

۱۶ ستمبر مجلس خلافت پانی پت ۵۰۰ روپے متفرق ۶۸ روپے ۱۰ آنے۔ بالیاں۔
طلائی ۲۔ چوڑیاں پاؤں کی ۱۴۔ چوڑیاں دستی ۱۴۔ نونگے ہاتھ کے ۲
آرسی ۱، ہار ۲۔ بالیاں ۲۴۔ چھلے وانگوٹھی ۳۴۔ بٹن دو جوڑہ نقری
۱۷ ستمبر کالکا ۵۳ روپے ۴ آنے
۲۰ ستمبر شملہ ۲۴۴ روپے ۱۴ آنے ۳ پائی۔ پاؤں کے توڑے ۲۔ نونگے ۴
چوڑیاں ۲ بالی ۱۔ انگوٹھی نقری ۱
۲۲ ستمبر لدھیانہ ۱۵۰ روپے بالیاں طلائی ۲۔ بالیاں نقری ۱۸۔ چھلے وانگوٹھیاں نقری ۲
۲۳ ستمبر ہوشیارپور ۱۵۰ روپے چار آنے ۹ پائی۔ بالیاں نقری ۸۴
۲۴ ستمبر جالندھر شہر ۸۲ روپے ۱۰ آنے ۶ پائی۔ بالیاں طلائی ۲۔ بلاق خورد طلائی
۱ کٹرہ نقرہ
۲۵ ستمبر بستی شیخ درویشی۔ ۱۱۶ روپے ۱۰ آنے
۲۶ ستمبر گوجرانوالہ ۸۴ روپے ایک آنہ۔ بالیاں طلائی ۲ انگوٹھیاں طلائی
۲۔ انگوٹھی نقری ۱۔
وزیرآباد ۱۴ روپے ۳ آنے ۶ پائی۔ بالیاں طلائی ۲۔ انگوٹھی نقری
۲۶ ستمبر سیال کوٹ ۷۴ روپے ۱۰ آنے بالیاں نقری ۲ چوڑی نقری ۱
۳۰ ستمبر قصور ۶۰ روپے بالیاں نقری ۳۔ چوڑی نقری ۱
یکم اکتوبر مجلس خلافت بٹالہ ۱۰۰ روپے بٹالہ زنانہ جلسہ ۷۵ روپے بالیاں نقری
۵ چوڑی نقری ۱
کل نقد ۳۹۴۴ روپے ایک آنہ چھ پائی

زمیندار ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۲ء ص ۶

محترمہ بی اماں صاحبہ کا دورہ

سرمایہ طیارہ کی فراہمی کی سرگرم کوششیں

سہارن پور ۲۴ دسمبر۔ مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۲۲ء کو ام الاحرار و بیگم محمد علی صاحبہ سہارنپور دوسرے دورے پر تشریف لائیں شام کو شاہ مدار کے میدان میں خلافت کمیٹی کا جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں ام الاحرار نے زبردست تقریر فرمائی۔ تقریر کا زیادہ تر حصہ داخلہ کونسل کی مخالفت میں تھا۔ ام الاحرار نے فرمایا کہ میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے کونسل میں داخل ہو کر بے عزت ہوں۔ جلسہ عصر کے وقت برخاست ہو گیا ۱۴ دسمبر کو دونوں بہمراہی مولانا خلیل الرحمن صاحب صدر ضلع خلافت کمیٹی بابو محمد یوسف صاحب ناظم ضلع قصبہ رام پور ضلع سہارن پور تشریف لے گئیں جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ تین جلسے زنانہ و مردانہ منعقد ہوئے۔ آخری جلسہ میں خلافت کمیٹی رام پور کی طرف سے معرفت حکیم حافظ محمد احمد صاحب صدر خلافت کمیٹی رام پور (جو ایک واجب التعظیم بزرگ ہیں اور جنھوں نے تمام بار تنہا اپنے ذمہ لیا تھا) مبلغ ۱۹۴۰ روپے سوا چھ آنے طیارہ فنڈ کے ام الاحرار کی خدمت میں پیش کئے اور اشیاء موصولہ طیارہ فنڈ کو جلد فروخت کر کے ایک معقول رقم روانہ کرنے کا وعدہ کیا۔ ۱۶ دسمبر کو رڑکی تشریف لے گئیں جہاں شاندار استقبال کیا گیا اور جلوس نکالا گیا۔ خلافت کمیٹی کی طرف سے مبلغ ۶۷۶ روپے طیارہ فنڈ کے بی اماں صاحبہ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ ۱۷ دسمبر کو قصبہ منگلور تحصیل رڑکی تشریف لے گئیں۔ دو جلسے مردانہ و زنانہ ہوئے جس میں خلافت کمیٹی کی طرف سے مبلغ ۲۳۱ روپے طیارہ فنڈ آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ ۱۸ دسمبر کو قصبہ سکروڈہ تحصیل رڑکی تشریف لے گئیں جہاں پر جوش استقبال کیا گیا جس

کی نظیر قصبات میں کم ملے گی۔ خلافت کمیٹی کی طرف سے ایک زنانہ دو مردانہ جلسے ہوئے جلسے میں ۲۵۰۰ روپے دینے کا اعلان ہوا جن میں مبلغ ۲۲۰۰ روپے پیش کئے گئے اور مبلغ ۱۳۰۰ روپے کے قریب سامان ہے جس کو فروخت کرکے قیمت داخل کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ ۱۹ دسمبر کو ۱۲ بجے شب کے کلکتہ میل سے رام پور بیکانیر تشریف لے گئیں جہاں سے آپ گیا کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے جائیں گی۔

اس دورہ میں کل نقد مبلغ پانچہزار اہتر روپے پونے تین آنے اور بالی نقرہ ۳۲ عدد، آرسی نقرئی ایک عدد چھلے نقرئی ۵ عدد ہار نقرئی ایک عدد۔ کٹورہ مسی ۲ عدد کرتہ کھدر ایک عدد طیارہ فنڈ کے لئے پیش کئے گئے۔ بارہ ہزار روپے اس سے پہلے دورود میں بی اماں کی خدمت میں پیش کئے گئے تھے۔ گذشتہ رقوم کو شامل کرکے جو ضلع سہارن پور کی طرف سے وقتاً فوقتاً مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی و صوبہ خلافت کمیٹی آگرہ کو روانہ کی جا چکی ہیں چندہ کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے ہو چکی ہے۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۲ء ص ۶ + ۷

بی اماں اور بیگم صاحبہ محمد علی بیجاپور میں مولانا محمد علی سے ملاقات

۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۲ء

اُم الاحرار بی اماں صاحبہ اور بیگم صاحبہ مولانا محمد علی، مولانا محمد علی سے ملنے کے لئے بیجاپور تشریف لائیں۔ مقامی کانگریس اور خلافت کمیٹی کے ارکین نے اسٹیشن پر خیر مقدم کیا۔ انھوں نے شام کو ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کی جس میں مرد و عورت سب شریک تھے۔ بی اماں نے حالاتِ حاضرہ پر نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے تقریر کی۔ اور برطانیہ کی نازک حالت، غازی مصطفےٰ کمال کی فتوحات اور مسئلہ خلافت پر اس کے اثرات پر وضاحت سے روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ انگلستان نے

اپنی یونان نواز حکمت عملی کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ فرانس، اٹلی اور دیگر اقوام کی ہمدردی واعانت کھو دی۔ آپ نے مجمع کو نصیحت کی کہ وہ حصول سوراج اور مسئلہ خلافت کے حل کرنے کے لئے پوری قوت وطاقت سے کام کریں۔ آپ نے آگاہ کیا کہ اگر اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیا گیا تو یہ ایک عظیم ترین غلطی ہوگی اور ہمیشہ پچھتانا پڑے گا۔ بیگم صاحبہ مولانا محمد علی نے بھی ایک موثر تقریر کرتے ہوئے فصیح الفاظ میں خواتین سے استدعا کی کہ وہ اپنے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کی امداد کریں قومی معرکہ آرائی میں ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہیں۔

زمیندار۔ ۶ر نومبر ۱۹۲۲ء ص ۳

بی اماں صاحبہ سکروڈہ ضلع سہارنپور میں

جنابہ بی اماں و بیگم صاحبہ محمد علی ۱۹ر دسمبر کو یہاں تشریف فرما ہوئیں اور انھوں نے تقریر فرمائی۔ حاضرین نے بہت جوش کے ساتھ طیارہ فنڈ میں حصہ لیا اور خلافت سکروڈہ نے حسب تفصیل مبلغ ۲۲۰۰ روپے پیش کئے۔
بتوسط پروفیسر احمد سعید صاحب ایم اے او۔ کالج لاہور

زمیندار۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۲ء ص ۶

ضمیمہ (۲)

اکبری بیگم

"مئی ۱۹۲۰ء میں دہلی میں منعقد ایک نشست میں ایک ممتاز شیعہ خاتون نے جلسے میں موجود خواتین سے اپنے مذہب کے تحفظ کی تحریک عدم تعاون کی حمایت کرنے کی درخواست کی۔ اُنھوں نے کہا "کیا ہم اپنے گھروں کی حاکم و مختار نہیں ہیں؟ اگر ہاں! تو ہمیں اپنے مردوں کو تحریک عدم تعاون بطور مذہب ماننے کے لئے پابند کرنا چاہیئے ہمیں اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہیئے جو اس سے منحرف ہوں "ان کا سماجی مقاطعہ کرنا چاہیئے ہمیں اپنے مردوں کو پابند عمل بنانا چاہیئے۔ اگر آپ کے دل میں خدا اور اس کے رسول کی قربت اور بہشت میں بی بی فاطمہ کی خدمت میں حاضری کی خواہش ہے تو اپنے مذہبی عہد پر سختی سے قائم رہیے۔"

GAIL MINAULT: SEPARATE WORLD P. 235

اکبری بیگم مشہور قومی رہنما بیرسٹر آصف علی کی والدہ تھیں۔

ضمیمہ (۳)

دہلی کی پہلی مسلم خاتون کو سزا

دہلی ۲۱ر اپریل بیگم محبوب فاطمہ (مسز طاہر محمد) جن کو بہن ستیہ وتی کے ہمراہ جلیانوالہ باغ ڈے کے سلسلے میں چاندنی چوک سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کو آج مسٹر اے ایس ایڈیشنل مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ آپ کے خلاف دفعہ ۱۷۔ الف ترمیم قانون ضابطہ فوجداری کے ماتحت مقدمہ چلایا گیا تھا۔ آپ نے عدالت کی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ عدالت نے آپ کو چھ ماہ قید محض و پچاس روپے جرمانے کی سزا دی۔ عدم ادائے جرمانہ آپ کو ڈیڑھ ماہ مزید قید بھگتنی ہوگی"۔ (مدینہ اخبار بجنور۔ ۲۵ر اپریل ۱۹۳۲ء)

مدراس سٹی کانگریس کی آٹھویں ڈکٹیٹر مسز سوا بیگم کو پکٹنگ کے سلسلے میں ایک سال قید محض اور پچاس روپے جرمانہ کی سزا دی گئی"۔

(مدینہ اخبار، بجنور۔ ۲۱ر فروری ۱۹۳۲ء)

ضمیمہ (۴)

بیگم ڈاکٹر محمدؐ عالم

ڈاکٹر عالم لاہور کے مشہور رہنما اور بیرسٹر ایٹ لا تھے۔ ۱۹۳۲ء میں گرفتاری کے وقت ان کے شانے میں پھوڑا اور گردے میں تکلیف تھی۔ جیل میں جب ان کی حالت تشویشناک ہوئی تو ملک بھر میں پریشانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تمام قومی اخبارات میں ان کی شدید علالت پر اظہار تشویش کیا گیا لیکن بیگم عالم نے بڑی بہادری سے صورتِ حال کا مقابلہ کیا اور برطانوی آمریت کے سامنے سر جھکانے سے یکسر انکار کر دیا۔ ملاحظہ ہو ایک خبر:

ڈاکٹر عالم کی تشویشناک علالت، ڈاکٹر عالم کی صحت بد سے بدتر ہوتی گئی ہے۔ بخار ۱۰۴ درجے تک پہونچ گیا ہے۔ پیشاب کے ساتھ خون بھی آنے لگا ہے اور وزن نہایت تیزی کے ساتھ کم ہو رہا ہے مگر حکومت نے اپنے سیاسی مخالفین کو زیادہ سے زیادہ تکالیف پہنچانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو رہا کرنا نہیں چاہتی۔ آپ سن کر تعجب کریں گے کہ اتنی شدید تکلیف کے دوران نہ تو جیل کے کسی ملازم کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت کے لئے مامور کیا گیا اور نہ ڈاکٹر صاحب ہی کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے کسی ملازم کو خدمت کے لئے بلا لیں۔ انتہا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ کو ملاقات تک کی اجازت دینا حکومت نے گوارا نہ کیا۔ اب جب کہ ڈاکٹر صاحب موصوف تقریباً موت

کے منہ میں پہونچ گئے ہیں حکومت نے آپ کو جیل سے میو ہسپتال میں علاج کے لئے تبدیل کر دیا ہے۔ میو ہسپتال کے ڈاکٹر متشوش ہیں کہ عمل جرّاحی کیا جائے یا نہیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی کمزوری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ وہ عملِ جراحی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ ادھر تو یہ حالت ہے ادھر حکومت ابھی اسی چیز پر غور کر رہی ہے کہ بمبئی سے دو خاص ڈاکٹر طلب کئے جائیں یا نہ کئے جائیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ حکومت ڈاکٹر صاحب کو مشروط طور پر رہا کر دیتی یا کم از کم ڈاکٹر صاحب کو پرائیویٹ طور پر علاج کرانے کی اجازت دے دیتی مگر حکومت کو ان چیزوں کی نہ کبھی پرواہ ہوئی ہے اور نہ ہے"!

(مدینہ اخبار بجنور ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

بیگم عالم نے مصیبت کی اس گھڑی میں جس عزم و استقلال کا ثبوت دیا وہ قابل ستائش ہے۔ لوگوں کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بیگم محمد عالم نے حسب ذیل بیان اخبارات میں اشاعت کے لئے دیا:

"میرے شوہر کی زندگی سب سے پہلے قوم کی ملکیت ہے اور بعد کو میری یا کسی اور کی ہے۔ اس لئے قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اس کا استعمال کرے۔ بیگم عالم نے محسوس کیا ہے کہ ڈاکٹر عالم کی رہائی کا مطالبہ نامناسب ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پہلے جب ان کی حالت اس حد تک نہیں پہنچی تھی تو حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ کسی غیر سرکاری ڈاکٹر سے ان کا معائنہ کرانے کی اجازت دی جائے اور بعد کو مقامی سرکردہ ڈاکٹروں کی ایک فہرست بھی پیش کی گئی تھی کہ ان میں سے انتخاب کر لیا جائے لیکن اس کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ درخواست میں یہ گزارش بھی نہیں کی گئی تھی کہ ڈاکٹر عالم کو غیر سرکاری ڈاکٹر کے زیر علاج رکھا جائے"۔ مجھے آجکل اپنے شوہر کی خدمت کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور میرے علم میں جو ان کی حالت ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کو میں تیار نہیں ہوں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے اس اعتماد کی خلاف ورزی کی جو مجھ پر

بیگم عالم نے قوم سے اپیل کی ہے کہ وہ مجھے نیم مردہ شوہر کو واپس لینے پر مجبور نہ کرے، بہتر ہے کہ ساری ذمہ داری حکومت پر چھوڑ دی جائے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے دیا جائے، ہمیں اجازت دینی چاہیئے کہ وہ بہادری کی موت مر جائیں، قومی زندگی میں انفرادی ہستیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں قوم کے مفاد کے لئے متعدد عالم اور دیگر اشخاص قربان کئے جا سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میرے شوہر اس بیماری سے صحت یاب ہو جائیں گے لیکن میری نظر میں ایک باعزت آدمی کی لاش ایک ذلیل زندہ شخص سے بدرجہا بہتر ہے۔"

(مدینہ اخبار بجنور۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

ضمیمہ (۵)

بیگم صاحبہ مولوی ظفر علی خاں:

مولوی ظفر علی خاں صاحب ایڈیٹر اخبار زمیندار کی گرفتاری پر ان کی اہلیہ محترمہ نے عامۃ المسلمین کے نام حسب ذیل پیغام ۱۹۲۰ء کے روزنامہ ۴ ستمبر "زمیندار" میں شائع کرایا:

"میرے مسلمان بھائیو اور بہنو! آپ کو معلوم ہے کہ میرے شوہر مولوی ظفر علی خاں کو حکومت نے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا ہے اور اب ان پر مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ میرے شوہر کے عقائد و خیالات کی معلومات مجھ سے زیادہ کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ میں خوب جانتی ہوں کہ وہ مدۃ العمر اپنی زبان یا قلم سے کبھی کسی ایسے امر کے مرتکب نہیں ہوئے جس پر حکومت قانوناً گرفت کر سکے۔ چونکہ وہ میرے نزدیک بے گناہ ہیں اس لئے میں نے انھیں مشورہ دیا ہے کہ وہ عدالت میں اپنی صفائی ہرگز ہرگز پیش نہ کریں۔ نظر بندی ہو، قید ہو، حبس دوام ہو، پھانسی ہو کچھ ہو خدا اور رسول کے راستے میں ہر قسم کی کڑی مشکلات اٹھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ امتحان کی منزل بہت سخت ہے۔ خدائے بزرگ استقلال و استقامت دے کہ تمام مشکلیں آسان ہو جائیں۔ ہندوستان بھر میں جتنے بھائی اور جتنی بہنیں خدمت خلافت میں مصروف اور خدا اور رسول کے راستے پر سرگرم کار ہیں ان سب سے میری یہ التجا ہے کہ وہ حقیقی اسلامی تڑپ سے کام کریں۔

اور حکومت کے جبر و تشدد کو بے حقیقت سمجھیں۔ خلافت کی بحالی بڑی قربانی چاہتی ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کے لئے ہر وقت تیار رہے اور مصیبتوں کو ہنسی و خوشی برداشت کرے۔ ہماری فریاد سننے والا وہی ہے جو مالک الملک ہے جس کو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے، جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ذلت کے غار میں اوندھے منہ گرا دیتا ہے۔ آؤ تمام بہنیں اور بھائی مل کر اسی بارگاہ میں دعا مانگیں کہ وہ اپنی خلافت کے خادموں کو مصیبت کے عالم میں ثابت قدم اور راضی برضا رکھے اور کامیابی کی منزلیں ان پر آسان کر دے۔ آمین۔"

آپ کے اس پیغام سے ملک میں آپ کی اولوالعزمی، حب قومی اور ایثار و قربانی کا ایک غلغلہ پیدا ہو گیا۔ سہسوان ضلع بدایوں کی خلافت کمیٹی نے ایک طویل تحریر کے ذریعہ اُم الاحرار کا خطاب پیش کیا۔ اس پر آپ نے پھر ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۰ء کے زمیندار میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا:

"اگر ناعاقبت اندیش حاکموں نے ظلم و ناانصافی کا شیوہ اختیار کر لیا تو خلافت کے علمبردار صبر و رضا اور جفاکشی کا شیوہ اختیار کریں اور حق و صداقت کے لئے جیل خانوں کو بھر دیں۔ ممکن ہے حاکم اسی طرح بیدار ہوں۔ حکومت کو ہوش آئے اور وہ اس راستے پر چلنے سے پرہیز کرے جس پر گامزن ہونے کا نتیجہ یقیناً بربادی ہے۔ آج ملک و مذہب کی طرف سے ہر ہندو ہر مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ حکومت سے عدم تعاون کرے۔ ہر بچے، جوان، بوڑھے، مرد اور عورت کو چاہیئے کہ جس طرح بھی ممکن ہو عدم تعاون کا ثبوت دے۔ ایک سودیشی کی تحریک ہی کو دیکھو۔ اگر اس پر پورا پورا عمل کیا جائے تو آج ہندوستان اور خلافت کی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ میں خود آج سے عہد کرتی ہوں کہ کبھی غیر ملک کا بنا ہوا کپڑا استعمال نہ کروں گی اور جہاں تک ممکن ہوگا صرف ہندوستان کے بنے ہوئے پارچہ جات پر اکتفا کروں گی۔ خدا مجھے اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

نوٹ:۔ عبارت کی دونوں مرتبہ محمد الدین فوق، اگست ۱۹۲۱ء لاہور سے ماخوذ ص ۲۵، ۲۶، ۲۷

اعتراف

"ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ" کی ترتیب کے سلسلے میں شکر و سپاس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ میں نے مندرجہ ذیل کتابوں، رسائل، اخبارات اور اشخاص سے استفادہ کیا ہے۔

کتابیات

۱۔ ابوالکلام آزاد:۔ غبار خاطر، مکتبہ احرار لاہور (تیسرا اڈیشن) ۱۹۴۶ء۔

۲۔ ابوالکلام آزاد:۔ ہماری آزادی، مرتبہ محمد مجیب، اورینٹ لونگ مینس ۱۹۶۰ء۔

۳۔ ابوالکلام آزاد:۔ قولِ فیصل، چمن بک ڈپو دہلی۔

۴۔ اثر بن یحییٰ انصاری، مولانا آزاد، ایک سیاسی ڈائری۔ عالیہ سپلی کیشنز دھولیہ (مہاراشٹر) ۱۹۰۲ء۔

۵۔ احمر لاری: حسرت موہانی۔ حیات و کارنامے، ادبستان، گورکھپور ۱۹۷۳ء۔

۶۔ اسلم ہندی: رازدانِ حیات۔ سوانح حسرت موہانی، دانش محل لکھنؤ ۱۹۷۵ء۔

۷۔ اشتیاق اظہر و نصرت موہانی، مولانا حسرت موہانی حصہ اول ذاتی زندگی، حسرت میموریل سوسائٹی۔

۸۔ اظہر علی برلاس: تاریخی شہ پارے، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی۔

۹۔ امداد صابری: سیاسی رہنماؤں کی مائیں و بیویاں، جمال پریس، دہلی ۔۶ ۱۹۸۶ء۔

۱۰۔ امرت لال ناگر، غدر کے پھول، ایک ڈائری (ہندی) پرکاشن شاکھا سوچنا وبھاگ، اتر پردیش ۱۹۵۷ء۔

۱۱۔ ایم حبیب خاں: حسرت موہانی، ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء۔

۱۲۔ انتظام اللہ شہابی: بیگمات اودھ کے خطوط، مکتبہ ادب اردو بازار۔ دہلی ۱۹۵۷ء۔

۱۳۔ انیس فاطمہ بریلوی: ۱۸۵۷ء کے ہیرو، مسلم یونیورسٹی پریس ۱۹۲۹ء۔

۱۴۔ انیسہ ہارون شروانیہ: حیات ز۔خ۔ش، اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۳۰ء۔

۱۵۔ پنڈت سندرلال: سن ستاون (اردو)، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۷ء۔

۱۶۔ خورشید مصطفےٰ رضوی: جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون، مکتبہ برہان اردو بازار دہلی ۱۹۵۹ء۔

۱۷۔ ذکاءاللہ: تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند، شمس العلماء محمد ذکاءاللہ۔ شمس المطابع، دہلی ۱۹۰۴ء۔

۱۸۔ رئیس احمد جعفری: سیرت محمد علی، مکتبہ جامعہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۹۳۲ء۔

۱۹۔ رئیس احمد جعفری: علی برادران، محمد علی اکاڈمی لاہور۔ ۱۹۶۹ء۔

۲۰۔ رئیس احمد جعفری: اوراق گم گشتہ، محمد علی اکاڈمی لاہور ۱۹۶۹ء۔

۲۱۔ ز۔خ۔ش: فردوس تخیل (دیوان)، دارالاشاعت پنجاب، لاہور ۱۹۲۲ء۔

۲۲۔ سید ظل الرحمٰن: تذکرہ خاندان عزیزی، لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ ۱۹۷۸ء۔

۲۳۔ سید محمد ہادی: علی برادران اور ان کا زمانہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۷۸ء۔

۲۴۔ شان الحق حقی: نکتہ راز، عصری کتب، کراچی ۱۹۶۲ء۔

۲۵۔ صبح امید لکھنؤ، رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت، تیسری جلد ۱۱، ۱۹۱۵ء۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۸۰۔

۲۶۔ ضیاء الدین احمد برنی: عظمت رفتہ، تعلیمی مرکز، کراچی، ۱۹۶۱ء۔

۲۷۔ طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل (پانچواں ایڈیشن) کتب خانہ عزیزیہ دہلی ۱۹۴۵ء۔

۲۸۔ عارف ہسوی: حالات حسرت، انجمن اعانت نظربندان اسلام، دہلی، ۱۹۱۸-۱۹۱۹ء۔

۲۹۔ عبدالحلیم شرر: مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، سلطان حسن اینڈ سنز بندر روڈ کراچی ۱۹۵۶ء۔

۳۰۔ عبدالرزاق ملیح آبادی: آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۵۸ء۔

۳۱۔ عبدالشکور: حسرت موہانی، (تیسرا ایڈیشن) انوار بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۵۳ء۔

۳۲۔ عبدالقوی دسنوی: حسرت کی سیاسی زندگی کی چند جھلکیاں، حلقہ احباب، پٹنہ ۱۹۵۳ء۔

۳۳۔ عبدالماجد دریابادی: محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق، معارف پریس اعظم گڑھ

۳۴۔ عتیق صدیقی: بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی ۱۹۸۱ء۔

۳۵۔ عتیق صدیقی: حسرت موہانی قیدِ فرنگ میں، انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۸۱ء۔

۳۶۔ عزیز الرحمن جامعی: رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، کوچہ رحمان چاندنی چوک، دہلی، ۱۹۷۵ء۔

۳۷۔ کمال الدین حیدر: قیصر التواریخ، ج ر۔ ۲، نول کشور، لکھنؤ ۱۸۹۶ء۔

۳۸۔ محمد الدین فوق: چند محب وطن خواتین (بھارت کی دیویاں) ظفر برادرس، تاجرانِ کتب لاہور ۱۹۲۱ء۔

۳۹۔ محمد سرور: محمد علی بحیثیت تاریخ داں و تاریخ ساز، سندھ ساگر اکادمی، لاہور ۱۹۶۲ء۔

۴۰۔ ناصر کاظمی، انتظار حسین: سن ستاون میری نظر میں آئینہ ادب، چوک انار کلی لاہور ۱۹۵۷ء۔

۴۱۔ نعیمہ بیگم: حسرت موہانی کی کہانی نعیمہ کی زبانی، سعید آرٹ پریس حیدر آباد سندھ ۱۹۶۳ء۔

۴۲۔ "باپو کے پتر بی بی امت السلام کے نام" مرتبہ کاکا صاحب کالیلکر، نوجیون پرکاشن مندر احمد آباد۔

۴۳۔ باپو کے خطوط بی بی امت السلام کے نام" جلد اول فائل نمبر ۱۹۳۵ء نہرو، میوزیم لائبریری نئی دہلی۔

۴۴۔ باپو کے خطوط ریحانہ طیب جی کے نام، نیشنل گاندھی میوزیم و لائبریری راج گھاٹ نئی دہلی۔

۴۵۔ چند اہم خطوط، صدر دفتر انجمن اعانتِ نظر بندانِ اسلام دہلی ۱۹۱۸ء۔

رسائل

۱۔ آج کل، دہلی، مارچ ۱۹۵۹ء، اگست و ستمبر ۱۹۸۱ء، نومبر ۱۹۸۸ء (مولانا آزاد نمبر)۔
۲۔ اردو ادب، دہلی (حسرت نمبر) ۱۹۸۱ء، شمارہ ۱ تا ۴۔
۳۔ اردو ادب، علی گڑھ (حسرت نمبر)، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۱ء۔
۴۔ اردو اکادمی، لکھنؤ (حسرت نمبر)، نومبر ۱۹۸۱ء۔
۵۔ اردوے معلیٰ، علی گڑھ، کانپور، اپریل ۱۹۰۸ء، فروری تا اپریل ۱۹۳۷ء۔
۶۔ آواز (آل انڈیا ریڈیو)، دہلی، یکم اکتوبر ۱۹۸۵ء۔
۷۔ خاتون، علی گڑھ، جولائی ۱۹۱۲ء، اپریل ۱۹۱۳ء۔
۸۔ شبستان اردو ڈائجسٹ، دہلی، مارچ ۱۹۶۸ء۔
۹۔ صبح امید، یکم فروری ۱۹۱۸ء، چکبست، لکھنؤ۔
۱۰۔ صبح (سہ ماہی)، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی (ابوالکلام آزاد نمبر) ۱۹۷۰ء۔
۱۱۔ صدق جدید، لکھنؤ، ۲۶ جنوری ۱۹۶۸ء۔
۱۲۔ علی گڑھ میگزین، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۷۴-۱۹۷۳ء۔
۱۳۔ کتابی دنیا، کراچی، جنوری، فروری ۱۹۶۷ء۔
۱۴۔ ماحول (ہفت روزہ)، کراچی (ابوالکلام آزاد نمبر)، ستمبر ۱۹۶۰ء، شمارہ $\frac{17}{18}$۔
۱۵۔ نظارہ، لکھنؤ (بیگم حضرت محل نمبر)، ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء۔
۱۶۔ نظارہ، لکھنؤ (ملکہ حضرت محل نمبر)، ۷ ستمبر ۱۹۶۳ء۔
۱۷۔ نقوش (مکاتیب نمبر)، ادارہ فروغ اردو لاہور، نومبر ۱۹۵۷ء۔
۱۸۔ نقوش (آپ بیتی نمبر)، فروغ اردو لاہور، جون ۱۹۶۴ء
۱۹۔ نگار، لکھنؤ (حسرت نمبر)، جنوری، فروری ۱۹۵۲ء
۲۰۔ نگار، کراچی (سالنامہ) ۱۹۷۶ء۔
۲۱۔ نیا دور، لکھنؤ (یوم آزادی نمبر)، اگست ۱۹۸۲ء۔
۲۲۔ ہماری زبان، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، یکم اپریل ۱۹۸۵ء، ۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء۔
۲۳۔ تہذیب نسواں، لاہور، یکم اپریل ۱۹۲۲ء۔

اردو اخبارات

۱۔ **الجمعیۃ**، دہلی ۵ جولائی ۱۹۲۸ء۔

۲۔ **الہلال**، کلکتہ: ۲۱-۲۸ مئی ۱۹۱۳ء۔

۳۔ **جمہور**، کلکتہ: ۸ جنوری ۱۹۱۸ء، ۱۰ جنوری ۱۹۱۸ء، ۱۲ جنوری ۱۹۱۸ء، ۱۶ جنوری ۱۹۱۸ء، ۲۹ مئی ۱۹۱۸ء، ۱۰ جولائی ۱۹۱۸ء، ۱۵ جولائی ۱۹۱۸ء۔

۴۔ **زمیندار**، لاہور: ۲۴ ستمبر ۱۹۲۰ء، یکم ستمبر، ۲ ستمبر، ۱۷ ستمبر، ۱۸ ستمبر، ۲۳ ستمبر، ۲۵ ستمبر، یکم اکتوبر، ۲۶ اکتوبر، ۲۹ دسمبر، ۳۰ دسمبر ۱۹۲۲ء۔

۵۔ **مدینہ اخبار**، بجنور: ۱۵ مئی ۱۹۱۶ء، ۵ اکتوبر ۱۹۱۷ء، ۱۲ دسمبر ۱۹۱۷ء، ۲۵ دسمبر ۱۹۱۷ء، ۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء، یکم جنوری ۱۹۱۸ء، ۵ جنوری ۱۹۱۸ء، ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء، ۲۱ فروری ۱۹۳۲ء، ۱۷ مارچ ۱۹۳۲ء، ۲۵ اپریل ۱۹۳۲ء، ۹ مئی ۱۹۳۲ء، ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء، ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء۔

۶۔ **ہمدرد**، دہلی: ۱۱ نومبر ۱۹۲۴ء، ۱۶-۱۷ نومبر ۱۹۲۴ء، ۱۵ دسمبر ۱۹۲۴ء، ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء، یکم دسمبر ۱۹۲۶ء۔

ذاتی انٹرویو

۱۔ مجاہد آزادی **جناب غلام رسول قریشی**، امام منزل، سابرمتی ہریجن آشرم ۳۰ دسمبر ۱۹۸۳ء۔

۲۔ **بیگم ہاجرہ زیڈ احمد**، جی۔ ٹو، پارک کالونی پارک روڈ، لکھنؤ، ۱۵ مارچ ۱۹۸۶ء۔

۳۔ **جناب طلعت کچلو**، تین مورتی میوزیم لائبریری دہلی۔ ۷ جون ۱۹۸۷ء۔

۴۔ **محترمہ سروجنی ناناوتی**، صدر ہندستانی پرچار سبھا سن ندی، راج گھاٹ، نئی دہلی ۷ جولائی ۱۹۸۷ء۔

۵۔ **محترمہ بیگم کنور عمار احمد خاں** صاحبہ میرس روڈ، علی گڑھ، ۱۰ اگست ۱۹۸۷ء۔

۶۔ **محترمہ بیگم سہیلہ حبیب** صاحبہ، بدر باغ، علی گڑھ، ۵ ستمبر ۱۹۸۷ء۔

۷۔ **جناب ڈاکٹر ہاشم قدوائی** صاحب، ممبر راجیہ سبھا، ذاکر باغ، علی گڑھ، ۹ نومبر ۱۹۸۷ء۔

۸۔ **جناب ڈاکٹر اقبال حسین** صاحب، سابق پرنسپل پٹنہ کالج و سابق ممبر بہار پبلک سروس کمیشن ۲۸ جنوری ۸۸

بذریعہ خطوط فراہم کی گئی معلومات

۱۔ جناب کشن ترویدی سابق ڈائریکٹر گاندھی اسمارک سنگرالیہ، ہری جن آشرم احمد آباد مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۸۵ء۔

۲۔ محترمہ یاسمین نعمانی ۱۵۲ جولی میکرا پارٹمنٹ III کیفے پریڈ بمبئی مورخہ ۸ر مئی ۱۹۸۶ء۔

۳۔ جناب اے۔ جے، اتم، بی ستیلا روڈ، ستدھی نواس ماہم بمبئی۔ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء۔

۴۔ محترمہ فاطمہ طیب علی، سب پوسٹ وڈے لا، ضلع احمد نگر مہاراشٹر مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۶ء۔

۵۔ جناب عطاء الرحمٰن داؤدی، ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائرکٹر محنت و روزگار شمالی بہار مظفر پور مورخہ ۹ر مارچ ۱۹۸۶ء۔

۶۔ سرخ پوش مجاہد آزادی خان غازی کابلی مرحوم ۱۹۹۴ کوچہ رحمان چاندنی چوک دہلی مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۸۷ء۔

۷۔ محترمہ بیگم سلطانہ حیات انصاری، ۲۴ ویسٹرن کورٹ جن پتھ نئی دہلی مورخہ ۲۰ر دسمبر ۱۹۸۷ء۔

۸۔ جناب سید شہاب الدین دسنوی تاج منزل ٹی این بنرجی روڈ پٹنہ بہار مورخہ ۵ر اپریل ۱۹۸۸ء۔

۹۔ جناب پروفیسر جمال خواجہ سمیع منزل، علی گڑھ۔ مورخہ ۲۶ر مئی ۱۹۸۸ء۔

۱۰۔ جناب عشرت علی صدیقی چیف ایڈیٹر قومی آواز نئی دہلی مورخہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۸ء۔

۱۱۔ محترمہ صفیہ واجد بریلوی ۶۹ آواس وکاس، سول لائنز، بریلی مورخہ ۲۰ر جنوری ۱۹۸۹ء۔

۱۲۔ سیدہ ضیا احتشام، فرحت کدہ سرسید نگر، علی گڑھ، یکم فروری ۱۹۸۹ء۔

OTHER ENGLISH BOOKS

1. Chanda, S.N. : Some untold stories, Sterling Publishers, Private Ltd., 1976
2. Chopra, P.N. : Who is Who of Indian Martyrs, Ministry of education & youth services Delhi, 1969.
3. Gail Minault : Khilafat Movement, Religious symbolism & political mobilisation in India-Oxford University Press, 1982.
4. Gail Minault : The extended family-women & political participation in India and Pakistan. Chanakya Publications, Delhi, 1981.
5. Gandhi, M.K. : My experiments with truth: Navjivan Press, Ahmedabad, 1963
6. Hanna Papanek & Gail Minault : Separate Worlds-Studies of Purdha in South Asia. Chanakya Publications, Delhi, 1982.
7. Hasan Mushir : Muslims & the Congress, Manohar, 1979.
8. Jain Naresh Kumar : Muslims in India, Vols.I-II, Manohar Publications, Delhi, 1979-1983.
9. Kabir Kausar & Inam Kabir : Bibliographical Dictionary of Prominent Muslim Ladies, Lite and Light Publishers, New Delhi, 1982.
10. Marshman, J.C. : Memoirs of Sir Henry Havelock, London, 1908.
11. Ray Shantimoy : Freedom movement and Indian Muslims, People's Publishing House Private Ltd. New Delhi, 1983.
12. Rizvi, S.A. & Bhargawa, M.L. (ed.) : Freedom Struggle in Uttar Pradesh, Lucknow, 1957.
13. Rudrangsnu Mukherji : Awadh in Revolt-1857-1858. Oxford University Press, 1984
14. Savarkar, V.D. : The Indian War of Independence 1957, Bombay, 1947.
15. Sen Surendra Nath : Eighteen Fifty Seven, Publication Division, Govt. of India, New Delhi, 1957.
16. Tarachand : History of Freedom Movement in India. Vol.I-II Publication Division, Govt. of India, New Delhi, 1961-1967.
17. Zaidi, A.M. & S.G. : The Encyclopedia of the Indian National Congress, Vol.VIII, S. Chand & Company Ltd., New Delhi, 1980.

COLLECTED WORKS OF MAHATMA GANDHI, PUBLICATION DIVISION, MINISTRY OF INFORMATION AND BROADCASTING GOVERNMENT OF INDIA

Vol. XVI : August, 1919 - January, 1920.
Vol. XVII : February - June, 1920.
Vol. XIX : November 1920 - April, 1921.
Vol. XX : April - August, 1921.
Vol. XXI : August - December, 1921.
Vol. XXII : December, 1921 - March, 1922.
Vol. XLII : October, 1929 - February, 1930.
Vol. XLIII : March - June, 1930.
Vol. XLIV : July - December, 1930.
Vol. XLV : December, 1930 - April, 1931.
Vol. XLVI : April 16, - June 17, 1931.
Vol. XLVIII : September, 1931 - January, 1932.
Vol. XLIX : January - May, 1932.
Vol. LI : September 1, - November 15, 1932.
Vol. LII : November, 1932 - January, 1933.
Vol. LIV : March 6 - April 22, 1933.
Vol. LVI : September 16, 1933 - Jaunary 15, 1934.
Vol. LVIII : May 18, - September 15, 1934.
Vol. LX : December 16, 1934 - April 24, 1935.
Vol. LXII : October 1, 1935 - May 31, 1936.
Vol. LXIII : June 1, - November 2, 1936.
Vol. LXV : March 15, - July 31, 1937.
Vol. LXVI : August 1, 1937 - March 31, 1938.
Vol. LXVII : April 1, - October 14, 1938.
Vol. LXIX : March 1, 1939 - July 15, 1939.
Vol. LXXI : December 1, 1939 - April 15, 1940.
Vol. LXXIII : September 12, 1940 - April 15, 1941
Vol. LXXIV : April 16 - October 10, 1941.
Vol. LXXV : October 11, 1941 - March 31, 1942.

REPORTS, PAPER AND LETTERS

Cornegy's Intelligence, for Dept., Secret. Branch. 26th Feb., 1858 No. 228 (News of 22 Dec., 1857). National Archives, New Delhi.
Foreign Consultation 17th Dec., Nos. 250/54 National Archives, New Delhi.
Foreign Political (A) 31 Dec., 1858. National Archives, New Delhi.
Subermati Series: File No. 21, Part III, S.Letter No. 17991-19172. Gandhi Museum Library, Rajghat, New Delhi.
The Bombay Chronicle, July 10, 1930 & February 23, 1943
Comrade, Delhi November 21, 1924.
The Statesman, Delhi, March 19, 1986.
Directory of Indian Women Today, India International Publication, 1976.
Oral History Transcript Zohra Ansari Recorded on 3.11.1974 Teen Murti Library, New Delhi.

******

اقبال

○ اقبال کے کلام کی ابتدائی اشاعت
اقبال کے نام پر رسائل



اقبال کی نظمیں / غزلیں ان کی زندگی میں پہلی

بار جن رسالوں میں چھپیں، اور ——————

اقبال کے نام پر آزادی سے قبل جو رسالے نکلے،

ان کے عکس پیش خدمت ہیں۔

——————ادارہ

ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۴ء

الکاشف



ما ئیم و خلق جملہ جہان دوستدار ما

(جلد اول) مضامین کی تفصیل (نمبر اول)

ایڈیٹر و پروپرائیٹر قاضی حمید الدین احمد حمید ۔ لدھیانہ

منشی فیض علی پرنٹر پنجاب پریس سیالکوٹ سے چھپوا کر قاضی حمید الدین مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا

غزل اقبال

زمانہ کی مسلسل تفرقہ اندازیوں سے ایک مدت کے بعد ہمیں اپنے معزز ہمعصر و ہموطن اور مکرم دوست جناب شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے سے سیالکوٹ ہی میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ شیخ صاحب موصوف کا نام نامی زیادہ تعریف و توصیف کا محتاج نہیں۔ ہمیں اُنکی ایک غزل اتفاق سے ملی ہے جسے ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں:—

ایڈیٹر

جو مضمون زندگی میں حرف موزوں بن کے نکلے ہیں　　وہی طائر بھی آخر گنبد مدفن کے نکلے ہیں

سبب اے ہمنشینوں کچھ نہ پوچھو میرے رونے کا　　یہ ارماں ہیں کہ جو آنکھوں سے آنسو بن کے نکلے ہیں

تڑپایا کسی کو تیرے نظارے کے ارمان نے　　کہ سارے دیکھنے والے تیری چلمن کے نکلے ہیں

کبھی اس رہ سے بھی شاید سواری تیری گذرے گی　　کہ میرے دل میں نقش پا تیرے توسن کے نکلے ہیں

کیا حیران فرشتوں کو بھی تیرے دردمندوں نے　　خدا جانے تیری محفل سے یہ کیا بن کے نکلے ہیں

کوئی کیا جانے وسعت فزا ایسا کی ہوا کیسی　　تیری درگاہ سے ذرے بیابان بن کے نکلے ہیں

میرے بیان داستان میری کلیجہ تھام کر سننا　　کہ میری حال پر آنسو میرے دشمن کے نکلے ہیں

مسافر من چلے ہوتے ہیں کیا راہِ محبت کے　　متاعِ دل کو لیکر واسطے رہزن کے نکلے ہیں

کرامت دیکھ اے دستِ جنون بادِ محبت کی　　عرب میں جا کے پرزے میرے پیراہن کے نکلے ہیں

چلے جاتے ہیں سیدھے پھر ادھر کا رُخ نہیں کرتے　　جو شل بو نظارے چھوڑ کر گلشن کے نکلے ہیں

رفو اے بخیہ گر چاک محبت ہو تو کیونکر ہو　　میرے زخموں پہ آنسو دیدۂ سوزن کے نکلے ہیں

جو اپنی کشتِ زار دل کو میں نے اے فلک دیکھا　　ستارے بھی تیرے دانے میرے خرمن کے نکلے ہیں

تعلق پھول ہیں گویا ریاضِ آفرینش کے　　مگر دیکھا تو کانٹے بھی یہی دامن کے نکلے ہیں

برہمن روز محشر ڈھونڈتا پھرتا ہے واعظ کو		صنم جو تھے وہ پتھر وادی ایمن کے نکلے ہیں

تماشائی جو وسعت سینے اپنے دامن دل کی		ہزاروں دشت اک گوشے میں ظل حسن کے نکلے ہیں

وہ مذبوح ازل ہوں میں کہ خنجر سب حسینوں کے		پرانے آشنا میری رگ گردن کے نکلے ہیں

مجھے اقبال اُس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اُسکے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں		اقبال

(سید) شیخ صاحب موصوف نے جس خوش اسلوبی سے مقطع میں اس لفظ کو رکھا ہے اُس کا مزا کچھ واقفان راز ہی لے سکتے ہیں جناب قبلہ مولینا سید میر حسن صاحب سیالکوٹ میں ایک نہایت ہی نیک نفس اور روشن خیال خوش اخلاق عالم و فاضل بزرگ ہیں جنکے شاگردان رشید کی ایک معتد بہ جماعت گورنمنٹ کی ملکی اور مالی خدمات کے معزز عہدوں پر ممتاز ہے۔ شیخ صاحب موصوف نے بھی اپنی ابتدائی تعلیم سے لیکر ایف۔اے تک انہیں کے سایہ عاطفت میں نشوونما پائی ہے۔ اور ملکۂ شاعری بھی حضرت ممدوح کے فیضان صحبت کا نتیجہ ہے جسکا اشارہ اُنہوں نے مقطع میں کیا ہے۔

••

انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بین اخویکم

الاخوت

انجمن اخوت اسلام لاہور کا ماہواری علمی رسالہ

ماہ جنوری ۱۹۰۹ء

ایڈیٹر

بخشی حضور علی

فہرست مضامین

نثر

نظم

جملہ خط و کتابت منیجر کے نام ہونی چاہیے

مطبوعہ خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور

... منشی محمد عبد العزیز جنرل منیجر کے اہتمام سے چھپا

ہمارے خاص قلمی معاونین

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا لاہور + منشی احمد حسین خانصاحب بی۔ اے سابق مسٹنٹ کمشنر جالندھر + شمس العلما مولوی محمد ذکا اللہ صاحب دہلی + میرزا سلطان احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جالندھر + منشی نذیر محمد صاحب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر حلقہ مدارس امرتسر +

مندرجہ بالا فہرست میں جن بزرگان قوم کے اسماے گرامی درج ہیں انھوں نے نہایت فراخدلی سے الاخوت کی دائمی امداد کا مستقل وعدہ فرمایا ہے۔ اس فہرست کے کھولنے سے ہمارا یہ منشا ہے کہ الاخوت کی قلمی معاونت کے لئے چیدہ چیدہ اصحاب کی ایک خاص جماعت پیدا کر جائے۔ تا کہ اسکی دائمی زندگی کا کافی یقین ہو جائے۔ مذکورہ اصحاب کا اس قومی خدمت کو سرانجام دینے کا ٹھیکہ لے لینا ہی کافی ہے۔ مگر پھر بھی احتیاطاً ہمیں یقین ہے کہ ہم اگلے پرچے کے جاری کرنے تک اس فہرست میں معتد بہ اضافہ کرنے کے قابل ہو جائینگے۔ جو صاحب خود بخود ہی اپنے آپ کو اس قومی خدمت کے لئے والنٹیر بنانا چاہیں اُنکے اسماے گرامی کمال شکریہ کے ساتھ درج کئے جائینگے۔

گذارش

جن معزز اصحاب کی خدمت میں رسالہ کا پہلا نمبر بطور نمونہ کے بھیجا جاتا ہے براے مہربانی اپنی منظوری یا نامنظوری سے ہمکو مطلع فرمائیں اگر کوئی اطلاع نہ پہنچی تو یہ سمجھ لیا جائیگا کہ انھوں نے خریداری منظور فرمالی ہے۔ اور دوسرا نمبر ان کے نام بذریعہ وی پی ارسال کیا جائیگا۔

مینیجر

کلامِ اقبال

الاخوت کی اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ جناب ڈاکٹر اقبال دام فیضہ جیسے صاحب علم و کمال نے اسکا سرپرست ہونا منظور فرما لیا ہے۔ اس سے ہم ضرور یہی نتیجہ مستنبط کرینگے کہ اس بروا کے چکنے چکنے پات بالشبہ زبان حال سے ہونہاری کی پیشگوئی کر رہے ہیں۔ ورنہ ممکن تھا کہ ڈاکٹر اقبال شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ خان مرزا سلطان احمد صاحب اور احمد حسین خان صاحب جیسے بزرگان عالی پایہ اپنی گراں بہا عنایات کیلئے اسکی جانب توجہ ملتفت فرماتے؟۔

ڈاکٹر صاحب ابھی مستقل طور پر لاہور میں سکونت پذیر نہیں ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ ان دنوں انکے جملہ علمی مشاغل بے توجہی کا شکار بن رہے ہیں۔ یہی حال شغل شعر و سخن کا ہے تاہم بعض اوقات تقاضائے طبیعت سے مجبور ہو کر انہیں کچھ نہ کچھ لکھتے ہی بن آتی ہے۔ لیکن جو لطف فراغت اور سکون میں نظم لکھنے آتا ہے۔ ایسی حالت میں کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔

اُمید ہے کہ ہمارے دوسرے پرچے کے چھپنے تک آپ ہمیشہ کیلئے یہاں مقیم ہو جائینگے۔ اور ہمارے دامن اُمید کو جوہر مقصود سے پر کرتے رہا کرینگے۔ ذیل کی فارسی غزل جو ڈاکٹر صاحب نے ہمیں اس پرچہ کے لئے مرحمت فرمائی ہے۔ کمال شکریہ کیساتھ چھاپی جاتی ہے غزل سراپا تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔ ایڈیٹر۔

اے گل ز خارِ آرزو آزاد چون رسیدۂ		تو ہم ز خاک این چمن مانند ما دمیدۂ

اے شبنم از فضائے گل آخر ستم چہ دیدۂ		دامن ز سبزہ چیدۂ تا بہ فلک رسیدۂ

افتی اگر بدستِ ما حلقہ بگرد تو کشیم		ہنگامہ گرم کردۂ خود ز میاں رمیدۂ

شورش کعبہ یکطرف ہنگامۂ دیر یکطرف		از آفرینش جہاں درد سرے خریدۂ

ہستم گدائے تو یا تو گدائے ماستی		با ہمہ نیاز سجدۂ دلہی با دویدۂ

با من مگو که مثل گل بہار شاخ بستہ باش   مانند صبح بوم را آوارہ آفریدہ ام

اقبال غربت تو ام نشتر دل ہمہ زندہ

تو در ہجوم عالمی یک آشنا ندیدہ ام

اقبال



اللہ اکبر



تنظیم

نگران پالیسی ڈ۔ کچلو

ایڈیٹر۔ قریشی

امرتسر

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۱۱۸

(شائستہ کلیکشن)

جلد ۱ — نمبر ۲۵

تنظیم

فہرست مضامین اپریل ۱۹۲۷ء

قیمت سالانہ تین روپے (سے) — ایک نمبر کے لئے پانچ آنہ کے ٹکٹ بھیجیں

سوراج

(در حدودِ دوائرِ سلطنت)

(از ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب)

شبے بہ می کدہ پیرِ کلیسیا می گفت — کہ رندِ می کدۂ توبتے ننگِ جام است

گرفتم ایں کہ ثمر پختہ شد ولے گویم — اگر بُرید ز شاخِ نہالِ ما خام است

ترا ز پنجۂ شاہیں اماں دہد صیاد — فغاں چہ سود آزادگی تہِ دام است

من ستم زدہ ایں نکتہ را نہ فہمیدم — کہ فکرِ کہنۂ ہندی اسیرِ اوہام است

سروشِ مطلعِ میر رضی بیادم داد — چہ مطلعے کہ سراپا نوائے الہام است

"نمک شناس اسیراں چو از قفس رستند

بہ نخلِ خانۂ صیاد آشیاں بستند"

جرأت سے ... کیا ... نام ...
وہ کرے گا آپ کا اقبال ... کام

اقبال
ہفت روزہ
رام پور

ایڈیٹر حکیم مسیحا نظامی

یوم جمعہ ... ربیع الآخر ۱۳۵۷ھ مطابق ... جون ۱۹۳۸ء | پہلا سال

ڈاکٹر ... کو ... مدراس اسمبلی کا آئندہ اجلاس

خوشامد!

اے خوشامد کانپتے ہیں تجھ سے خود داروں کے دل
اعتمادِ نفس کے چھکے چھڑا دیتی ہے تو

تو رخِ جرأت پہ حائل، تو ترقی میں مخل
پائے استقلال کو ... اڑا دیتی ہے تو

جس میں لیلائے غلو بیٹھی ہو وہ محمل ہے تو
چاپلوسی کا جہاں سایہ ہو وہ منزل ہے تو

تو وہ شیشہ ہے نہاں ہو جس میں غیبت کی پری
ہے تری روباہ بازی تک تری خوش منظری

تیرے ہر عشوے پہ کٹتی ہے تیرے شیدا کی مت
قاز کا رو دفن لئے پھرتی ہے تیری شیلنت

تو لگا سکتی ہے ہر موقع پہ وہ باتوں کا باغ
مست ہو جاتا ہے جس میں خود پسندی کا دماغ

کاذبوں کو پیکرِ صدق و صفا کہتی ہے تو
اپنے متوالوں کو ... رو بڑا کہتی ہے تو

تیرا عادی خلق میں ملعون بھی مطعون بھی
چوستی ہے تو رگِ انسانیت سے خون بھی

دیکھتی ہے جب مخاطب میں کوئی شانِ حباب
تو پلا دیتی ہے کانوں کو تملق کی شراب

رہزنِ تحقیق ہیں تیری قصیدہ بافیاں
... کو تو سکھا دیتی ہے نا انصافیاں

آہ وہ نادان جو آتے ہیں تیری چال میں
تیری تعریفیں نہیں پیٹتے ہیں جوتے شال میں

شفاعت ... شفاعت ...

رامپور میں خودکشی کا سنسنی خیز واقعہ

اسٹیشن روڈ کے درخت کیوں کاٹے گئے

(مسرت حسین آزاد کلیکشن)

جلد نمبر ۱

اقبال
علی گڑھ

مدیر
ظفر احمد صدیقی
ایم۔اے (علیگ)

مقاصد

"اقبال" "حلقۂ اقبال علی گڑھ" کی آواز ہے۔
اقبال کا مقصد ہے۔
علامہ اقبال کے پیغام کی اشاعت۔
مسلمانوں کی زندگی کی تمام مشکلات کا حل اسلام کی تعلیمات میں تلاش کرنا۔
ادبی کج راہی اور بدذوقی کی اصلاح کرنا۔ "ط"

قواعد

۱۔ رسالہ اقبال ہر انگریزی مہینے کے شروع میں شایع ہوا کرے گا۔
۲۔ رسالہ میں نظم ونثر کے وہی مضامین شایع ہو سکتے ہیں جو رسالہ کے مقاصد اور پالسی کے مطابق ہوں۔
۳۔ رسالہ میں بیرونی اشتہارات حسب ذیل نرخ پر شائع کئے جا سکتے ہیں۔ ایک صفحہ ۱۰ روپیے۔
نصف صفحہ ۵ روپیے۔ ربع صفحہ ۳ روپیے۔
(نوٹ۔ صرف وہی اشتہارات شائع کئے جا سکتے ہیں جو رسالہ کی پالسی کے منافی نہ ہوں)

"منیجر"

۳۴۴

۱۸۶

ماہنامہ

اقبال

جلد ۱ اپریل ۱۹۴۰ء نمبر ۱

مدیر

ظفر احمد صدیقی

ایم۔ اے (علیگ)

شبلی روڈ ۔ علی گڑھ

قیمت سالانہ ۴ چار روپے فی پرچہ ۶ آنے

فہرست مضامین

یہ خط علامہ اقبال نے میری اُس نظم کے جواب میں ارسال فرمایا تھا جو "نذر اقبال" کے نام سے گذشتہ صفحہ پر درج کی گئی ھے۔(ظفر)

لاہور ۱۲ دسمبر ۳۶ء

جناب من – السلام علیکم

[illegible] سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] اور [illegible] [illegible] – [illegible] [illegible] [illegible] جاتا ہوں [illegible]
[illegible] کے [illegible] مسلمانوں [illegible] جس سے [illegible] اپنی آئندہ نسلوں کو [illegible]
کے [illegible] اور [illegible] سے [illegible] – [illegible] [illegible] پر [illegible]
مجبور ہو جاتا [illegible] جب [illegible] ہو جاتا ہے [illegible] قوم سے [illegible]
کو [illegible] اور [illegible] ہو –

[illegible] اسلام [illegible] جو مسلمانوں کے عقیدہ [illegible] پیش [illegible] ہے
[illegible] اور اس [illegible] مرکز [illegible] کو [illegible] ان کے عمل کے [illegible] حدود [illegible] ہے
ان حدود کے [illegible] نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے – [illegible]
قانون الٰہی [illegible] مسلمان ہو جاتا ہے – [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] مسلمانوں [illegible] آزادی کی [illegible] – قرآن [illegible] کہ عملی [illegible]
[illegible] کسی قانون [illegible] پابند [illegible] قانون الٰہی [illegible] پابند ہے – [illegible] حدود [illegible]
[illegible] نام شریعت ہے اور شریعت [illegible] ہو [illegible] کا نام طریقت ہے – جب احکام الٰہی
خودی [illegible] اس حد تک [illegible] جائیں کہ خودی کے [illegible] [illegible] باقی نہ رہیں الا
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کیفیت [illegible] اسلام نے فنا [illegible]
[illegible] [illegible] رکھا ہے – [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
کے [illegible] مسلمانوں [illegible] ہے – [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

۳۔ [illegible] ہے [illegible]

[illegible] ہے ۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] ہے (زمل) [illegible] ہے ۲۹:۹ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے [illegible]

[illegible] ۔ [illegible]

[illegible] حرام ہے [illegible] ہے

۴۔ [illegible] ہے ۔ [illegible]

[illegible] (i) [illegible] ہے [illegible] (ii) [illegible] ہے

[illegible] (iii) [illegible] ہے (iv) [illegible] ہے [illegible] ہے ۔

[illegible]

[illegible]

محمد اقبال

خدا بخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علیگڑھ میں	پروفیسر رشید احمد صدیقی مرتبہ مہر الٰہی	۲۰ روپے
رقعاتِ رشید صدیقی	مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں	۲۰ روپے
اورنگ زیب (ایک نیا زاویۂ نظر) (ہندی)	ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد	۱۵ روپے
قومی یکجہتی کی روایات	مسٹر بی۔ این۔ پانڈے	۱۵ روپے
مقدمہ طلسم ہوشربا	مرتبہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار	۲۰ روپے
طلسم ہوشربا (نو جلدیں)	منشی محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر	۸۰۰ روپے
فرہنگ زفانِ گویا	بدر ابراہیم مرتبہ پروفیسر نذیر احمد	۵۰ روپے
ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت	منشی رام پرشاد ماتھر	۳۰ روپے
جنید احمد کی آٹوگراف بک	مرتبہ جنید احمد	۲۰ روپے
ایک نادر روزنامچہ	مظہر علی سندیلوی	۲۵ روپے
دیوانِ مصحفی	منتخبہ امیر مینائی و اسیر	۵۰ روپے
من موہن کی باتیں (قرآن مجید کا ترجمہ) (ہندی)	مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی	۱۵ روپے
داستاں میری (بیسویں صدی کے بہار کی تہذیبی تاریخ)	ڈاکٹر اقبال حسین	۳۰ روپے
شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا	جنید احمد	۴۵ روپے
یادگارِ روزگار (تذکرہ کاملانِ پٹنہ)	بدر الحسن (م ۱۹۳۴ء)	۱۲۵ روپے
گیتا اور قرآن	پنڈت سندر لال	۲۵ روپے
تحفۃ السعداء	خواجہ کمال (م بعد ۱۰۲۶ھ) پیشکش حکیم حسین خاں شفا	۲۰ روپے
قطعاتِ دلدار	دلدار بیگ، مرتبہ قاضی عبدالودود	۲۰ روپے
اقبال ہندستان اور پاکستان (ہندی)	پروفیسر سید حسن احمد ترجمہ نریندر کمار چوڑی	۱۵ روپے
ایک نادر روزنامچہ	پروفیسر نورالحسن ہاشمی	۳۰ روپے
تواریخ نادر العصر	منشی نولکشور، تقدیم ڈاکٹر انوار الحسن	۲۵ روپے
دیوانِ حافظ (شاہانِ مغلیہ کے ذاتی نسخہ کی عکسی اشاعت)	———	۱۰۰ روپے
نوبت رائے نظر کے ماہنامہ "ادیب" الہ آباد (۱۲-۱۹۱۰ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے
پیارے لال شاکر کے ماہنامہ "العصر" لکھنؤ (۱۷-۱۹۱۳ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۴۵ روپے
برج نرائن چکبست کے ماہنامہ "صبحِ امید" لکھنؤ (۲۱-۱۹۱۸ء) کے مضامین کا انتخاب، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے
قاضی عبدالودود کے ماہنامہ "معیار" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے
مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ "پیغام" کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے
خوشتر منگروی کے ماہنامہ "زبان" (۲۹-۱۹۲۸ء) کی مکمل ری پرنٹ، اشاریہ کے ساتھ		۵۰ روپے

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ابوالکلام آزاد

○ یاد آزاد

○ مرتبہ: محمد حبیب (مرحوم)

عبدالسلام صاحب ابن محمد حبیب صاحب کی پیشکش

۱۹۸۷ء میں رانچی جانا ہوا تو محمد حبیب صاحب زندہ تھے جنھوں نے مولانا آزاد کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کا تفصیل سے ذکر کیا اور یہ بھی کہ انھوں نے اس وقت کی یادداشتیں بھی کہیں لکھ رکھی ہیں۔

۱۹۹۰ء میں پھر جانا ہوا تو حبیب صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، ان کے فرزند گرامی جناب عبدالسلام صاحب نے ان کے مسودات بکمال مہربانی ہمارے سپرد کیے، جو اب آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔ اس کے لیے اردو دنیا اور ابوالکلام شناسی کے طالب علم ان کے شکرگزار ہیں۔

—— ادارہ

ابوالکلام آزاد رانچی میں

رانچی نظربندی زمانے کے

ملفوظات

معمولات

متعلقات

مرتبہ

محمد حبیب

(رانچی)

کچھ محمد حبیب صاحب (رانچی) کے بارے میں

یہ خاکہ ہمیں محمد حبیب صاحب کے صاحبزادے عبدالسلام صاحب سے ملا ہے جسے ہم شکریہ کے ساتھ پیش کررہے ہیں۔

● **نام والد صاحب** :- محمد حبیب ولد عظمت علی ● **مکان** :- ڈاکٹر فتح اللہ لین، رانچی ● **تاریخ پیدائش** مطابق اسکول سرٹیفکیٹ ۱۴-۵-۱۸۹۷ ● **تاریخ وفات** :- ۹-۱-۱۹۹۰ ● ابتدائی اردو، فارسی اور دینی تعلیم گھر میں۔ بعد میں اپنی کاوش سے average standard کی عربی تعلیم حاصل کی۔

انگریزی اور اسکول کی تعلیم کے لیے مقامی St. Paul's school کے طالب علم رہے۔ ۱۹۱۹ء میں First Division سے Matriculation کا امتحان پاس کیا۔ مقامی طور پر اس زمانہ میں کوئی کالج نہیں تھا لہٰذا تعلیمی سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا۔

۱۹۲۰ء میں Inspector of school Ranchi کے آفس میں ملازم ہوگئے اور پھر وہاں سے Resign کرکے ۱۹۲۹ء میں Indian Mental Hospital, Kanke (Ranchi) کے دفتر میں بحیثیت خزانچی کے بحال ہوئے اور وہاں سے ۱۹۵۵ء کی مئی میں Retire کرگئے۔

Retirement کے بعد سکریٹری انجمن اسلامیہ رانچی کے عہدہ پر مامور ہوئے اور یہ سلسلہ ۱۹۸۲ء تک رہا۔

● **مولانا آزاد سے رابطہ** :- نظر بندی کے عالم میں مولانا اکثر ہم لوگوں کے محلے سے ٹہلتے ہوئے گذرتے تھے اور ملاقات ہو جاتی تھی۔ محمد حبیب صاحب اکثر مولانا کے ساتھ نشست میں شامل رہتے تھے۔



۷ دسمبر ۱۹۱۶ء (جمعہ) جامع مسجد رانچی

(خطبہ) برادران من

تم اس شخص کو کیا کہو گے جو معمار بنکر کسی مکان کو بنانے کے لیے گیا ہو اور بجائے اس کے کہ اس کے ہاتھ اینٹوں کے جمع کرنے اور دیواروں کو درست کرنے میں مشغول ہوتے ایک تیشہ ہے کہ دیواروں کو توڑ رہا ہے اور مکان کو ڈھا رہا ہے تو تم تعجب کی نگاہوں سے دیکھو گے۔ مگر افسوس، ظلمت کے پردے پڑے ہوئے ہیں تاریکیوں اور اندھیرے بادلوں سے گھرے ہوئے ہیں اور اس پر بھی غفلت در غفلت۔

حقیقت یہ ہے، عزیزان من، شریعت دنیا کو جس تاریکی سے بچانے کے لیے آئی تھی آج بعینہ وہی تاریکیاں مجھ پر بھی پڑی ہوئی ہیں۔ شریعت کے آنے سے قبل زمانہ جاہلیت میں لوگوں نے الگ مہینوں کے الگ الگ شگون خیالی اوہام کے بنا پر قرار دیدیا تھا۔ نہ تو ان کو کسی الہامی کتاب نے تعلیم دی تھی اور نہ کسی شریعت نے بتلائی تھی ایک مہینے کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مہینہ بہت اچھا ہے اور دوسرے مہینہ کو منحوس سمجھا کرتے تھے تو اریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ ان مہینوں کے ایک مہینہ صفر کا بھی تھا جس کو لوگ نہایت بدشگون سمجھتے تھے۔ مگر افسوس آج یہی سب چیزیں ہم میں رائج ہیں۔ اس مہینہ کے متعلق لوگوں نے طرح طرح کی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس مہینہ میں کوئی خوشی کا کام نہیں کرنا چاہیے اور اگر کریگا تو نقصان اٹھائیگا اور کوئی اس مہینہ کے آخری چہار شنبہ میں خوشی مناتا ہے کہ جس سے سال بھر تک اس کو خوشی حاصل ہو۔

اس کے علاوہ بہت سی باتیں ہیں کہ جس کو اگر تفصیل کے ساتھ بیان کروں تو دفتر کے دفتر چاہئیے میں کس کس بات کو دکھلاؤں۔ لوگ تعویذ گھول کر پیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بس اب تمام دنوں کے گناہ معاف ہو گئے حالانکہ اس میں

کوئی بات مطابق شرع کے نہیں ہے سب باطل اور لغو ہیں اس کو نہ تو قرآن نے بتلایا ہے اور نہ اس کے رسولؐ نے۔ سب برابر ہیں ہر روز سورج نکلتا ہے اور غروب ہوتا ہے اس کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں۔ تواریخ سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے قبل اس مہینہ میں بیمار ہوئے اور وہ دن چہار شنبہ کا تھا تاریخ ۲۸ صفر اس کے بعد آپ کی وفات ربیع الاول کی بارہویں تاریخ بعض روایتوں کے مطابق ہوئی۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں اور اس کے علاوہ کچھ کرنا بدعت اور ناجائز ہے۔

آخری چہار شنبہ کوئی چیز نہیں اور نہ اس کی کوئی خصوصیت ہے۔

(خطبہ کے بعد مولانا عبدالرؤف صاحب تشریف لائے جو کہ ایک عالموں میں سے ہیں دانا پور کے رہنے والے ہیں اور ان کا مطب کلکتہ میں ہے۔

۹ دسمبر ۷۸ء (یکشنبہ)

ایک آدمی دیکھنے میں بہت سیدھے مسجد میں آئے ان کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔

قبل مغرب ایک شخص نے مولانا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا حضور۔ دو بھائی تھے۔ کول ایک بھائی مسلمان ہو گیا اور دوسرا اپنے قدیم مذہب پر قائم رہا۔ کچھ دنوں بعد جو بھائی مسلمان نہیں ہوا تھا مر گیا۔ لوگوں نے اس کے بھائی سے کہا دیکھو تمہارا بھائی مر گیا ہے اب اس کا کوئی نہیں ہے لکڑی تمہارے گھر موجود ہے جلانے کے لیے دیدو اگر قیمت مانگوگے تو قیمت بھی مل جائیگی یوں تو تمہارا بھائی ہی ہے اس نے لوگوں کے اصرار پر لکڑی اس کے جلانے کے لیے بھیجدیا اب دور نزدیک کے ایک مولوی نے فتوی دیدیا کہ وہ شخص مسلمانوں سے خارج ہونے کے قابل ہو گیا ایک تو وہ نو مسلم دوسرے مذہب سے ناواقف۔ یہ سنتے ہی گھبرا اٹھا۔

مولانا نے فرمایا — بات یہ ہے میرے بھائی فتوی دینے والے کو چاہیے کہ قبل اس کے کہ وہ فتوی دے مجرم کی حالت پر بھی غور کر لے اور پھر عام اثر جو لوگوں پر ہوگا اس کو بھی سوچ لے۔ اگر مولوی صاحب کا یہ مطلب ہے کہ لوگوں کو تنبیہ کریں ایسا نہ ہو لوگ دیکھ کر دیسا ہی کرنے لگیں تو یہ عین شریعت ہے اور چاہیے بھی یہی کیونکہ حب اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دشمنی ہر مسلمان پر فرض ہے اور جو ایسا نہیں کرتا ہے وہ اپنے ایمان میں مکمل نہیں ہوا ہے ایمان کمزور ہے۔

اسلام تو ایسی تعلیم اخلاق و آداب کی غیر مذاہب کے لیے دیتا ہے جو دوسرے قوموں کو حاصل نہیں ہے۔ جنگ بدر میں جب کفار مارے گئے تو آپ کا ان کے ساتھ کیا سلوک تھا آپ نے ان لاشوں کو زمین کھود کر دفنا دیا بغیر نماز جنازہ

پڑھے ہوتے اور درحقیقت اس میں بگڑ تباہی کیا تھا ہم سے جہاں تک ہوسکے غیر مذہب والوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آویں اب فرض کر لیجئے ایک شخص جو ہندو تھا مسلمانوں کے محلے میں مر گیا اور اب اس کا کوئی نہ رہا اس حالت میں اگر ہم لاش کو چھوڑ دیتے ہیں تو وہ سڑتا ہے اور اس سے بیماری پھیلتی ہے تو اس وجہ سے چاہئے کہ اس لاش کو زمین کھود وا کر ڈال دیں۔

۱۰ دسمبر ۱۹۷۰ء (دوشنبہ)

وہ شخص جو کل مسجد میں آیا تھا مشہور کیا کہ میرے پاس کچھ زیارت کی چیزیں ہیں۔ مولانا کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے موذن ضیاء الحق سے کہلا دیا کہ اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ یہاں سے چھوڑ کر چلا جائے۔

بعد مغرب مولانا نے فرمایا:

لوگ چندے حاصل کرنے کے لیے کیسے کیسے مکر و فریب سے عام مسلمانوں کو دھوکے میں ڈالتے ہیں میں نے خود حیدرآباد میں دیکھا ہے عید کی نماز کے بعد ایک شخص لوگوں سے ایک کاغذ پر سجدہ کرا رہا تھا اور پیسے وصول کر رہا تھا۔ نہ معلوم ایسے لوگ اپنے جی کو کیونکر تسکین دیتے ہونگے کہ توبہ کرینگے۔ ایسے لوگوں کی ایک بڑی جماعت ہوتی ہے اور کسی جگہ سنٹر مقرر کر کے ان کا استاد بیٹھ رہتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ادھر اُدھر بھیجتا ہے۔ ان کے پاس ہر قسم کے سامان مہیا کرتے رہتے ہیں اور دو چار لڑکے گانے بجانے والے لگا رہتے ہیں۔ موقعہ دیکھ کر گانے بجانے لگے اور جب لوگ جمع ہو گئے تو اپنا کام شروع کر دیا۔

عام لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی چیز نسبت کی جاتی ہے تو انکے دل میں ایک طرح کی محبت ہوتی ہے اور اس حالت میں روپیہ دو روپیہ دینا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔

یہ لوگ آثار قدم اور پیراہن جسکا کوئی ثبوت نہیں لیے پھرتے ہیں اور خانہ کے اندر اس کو رکھتے ہیں نکالتے وقت لوبان جلاتے ہیں اور لوگوں سے سجدہ کراتے ہیں۔

فرض کر لیا جائے کہ واقعی یہ سب چیزیں ٹھیک ہیں تو اس آدمی کو جس کے پاس یہ چیز ہے اس سے محبت ہوتی اور اس کو اپنے جگر سے لگاتا دیرہ کر کے دو ٹکے میں ذلیل کیے پھرتا اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کو شرعی قانون کے مطابق دُرّے لگائے جاتے۔ ایک آثار قدم آگرہ میں ہے تو دوسرا حیدرآباد میں اور لطف یہ بنانے والے نے یہ سمجھا کہ چونکہ آپ ایک بڑے آدمی تھے اس بنا پر آپ کا پیر بھی بڑا ہوگا۔ ایک دو فٹ کے پیر کا نقش پتھر پر کھود دیا حالانکہ یہ بھی غلط ہے بخاری میں آپ کے وجود گرامی کا حلیہ بیان کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ آپکا ہر عضو

درمیانی حالت پہ تھا۔ نہ بہت بڑا اور نہ بہت چھوٹا

۱۱ دسمبر ۷۱ء (سہ شنبہ)

مولوی ابوالعلاء صاحب مسجد میں آئے رانچی میں ان کے چند مرید بھی ہیں۔ نماز مغرب انہوں نے پڑھائی مولانا نماز پڑھ کر چلے گئے۔

۱۲ دسمبر ۷۱ء (چہار شنبہ)

مولوی ابوالعلاء صاحب نے مغرب کی نماز پڑھائی اور مولانا ابوالکلام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ افسوس مولانا کی قدر رانچی کے مسلمان نہیں جانتے۔ اگر کچھ علم ہوتا تو آنکھیں کھل جاتیں جناب مولانا کو علماء کا طبقہ عزت کرتا ہے اور یہ محدث محقق اور ہمدرد قوم ہیں۔

۱۳ دسمبر ۷۱ء (جمعرات)

جمعدار صاحب نے مولانا سے کہا :

حضور، رانچی میں آدمی کے مرنے کے بعد لوگ قرآن شریف یا گیہوں کے قسم کا غلہ فدیہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میت نے جو کچھ فرائض یا واجبات اپنی زندگی میں جان بوجھ کر یا سہواً ترک کیا ہے تو بالعوض اس کے یہ قرآن اور اس قدر گیہوں فدیہ دیا جاتا ہے۔ مولوی صاحب قبول کرتے ہیں اور دیگر اشخاص جو تعداد میں سات ہوتے ہیں ایک دوسرے کی طرف ان چیزوں کو بڑھاتے ہیں ایسا کرنا شریعت سے جائز ہے یا نہیں مولانا نے فرمایا :

یہ صورت جو آپ نے فدیہ کی بیان کی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں سنی۔ حقیقت یہ ہے کہ فرائض یا واجبات سے کیا معنی کوئی گناہ بھی کرے اور اس کا بدلہ زمین کو سونا سے بھر کر دینا چاہے کہ معاف ہو جائے تو یہ محال ہے۔ آیت کریمہ مجکو بتلا رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ذرہ برابر گناہ کے لیے اگر تم دنیا کو سونا سے بھر دو اور چاہو کہ معاف ہو جائے تو یہ محال قطعی ہے۔ یہاں پہ یہ بات معلوم ہو گئی ہوگی کہ جب خدا نے انسانوں کو مخاطب کر کے سنا دیا تو اب عزیزان من کب ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہ صرف ایک وقت کی نماز بلکہ سوال یہ ہے کہ عمر بھر کی نمازیں اور روزے قصداً ترک کیے ہوں اور بعد مرنے کے فدیہ دیدیا جائے اور معاف ہو جائے اس کے معنی ہیں کہ آدمی عمر بھر ضلالت اور گمراہی میں مبتلا رہے اور صرف اتنا کرے کہ دس بیس روپئے چھوڑ کر مرے تو اس کے تمام ذنب و گناہ معاف ہو جائینگے۔ درحقیقت جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ شریعت اور احکام الہی سے بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ سخت معصیت کر رہے ہیں۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے اور تمام فقہا نے اس پہ بالاتفاق اجماع کیا ہے کہ کوئی شخص بوجہ مسافرت یا اور کسی مجبوری سے روزہ نہ رکھ سکا ہو

اور درمیان میں قبل روزہ رکھنے کے قضا کر گیا ہو تو اس کے وارث پر واجب ہوگا اگر وہ مسلمان ہے، اس کے ترکہ میں سے دو شام کے کھانے کے حساب سے ہر روزہ کے بدلہ فدیہ کر دے۔ بس اور یہ مسئلہ صرف روزہ ہی کے متعلق ہے نہ دیگر فرائض کے۔

گناہ معاف ہونے کی یہ صورت نہیں ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعد فدیہ ادا کر دیا جائے بلکہ اس کی صورت صرف ایک ہی ہے کہ اگر کوئی آدمی صدق دل سے توبہ کرتا ہے تو دو چار روزہ کے گناہوں کے کیا معنی اگر اس کے تمام گناہوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور زمین سے آسمان تک پہنچ جائے تو ایک لمحہ اور ایک آن میں معاف ہو سکتا ہے توبہ کرنے والے کی ایسی حالت ہو جاتی ہے جیسا کہ خدائے تعالیٰ نے اپنے آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا ہے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ اللہ ان سے رضامند ہوا اور وہ اللہ سے رضامند ہوئے۔ یہ تعبیر فرشتوں کو بھی میسر نہیں۔ پس ہر مرد انسان اور عورت پر واجب ہوا کہ وہ درگاہ الٰہی میں ہمیشہ توبہ و اجابت کا سر جھکائے رہے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہے۔

(ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد)

اگر مسلمانوں کے مقدمے، طلاق اور نکاح کے قاضی فیصلہ کرتے تو آج یہ ذلتیں جو ہم اٹھا رہے ہیں اور غیر لوگوں کے سامنے جو دشریعت سے واقف اور نہ اسلام کی خوبیوں کی خبر رکھتے ہیں جو جی میں آتا ہے فیصلہ لکھ دیتے ہیں ان کے سامنے ہمارا مقدمہ جاتا ہے۔ دراصل پہلے سے مسلمانوں نے اس کی کوشش نہیں کی حالانکہ گورنمنٹ کو کوئی عذر نہ تھا انگریزوں نے ہندستان ہندوؤں سے تو لیا نہ تھا یہ حکومت مسلمانوں کی تھی۔ گورنر جنرل نے عالمگیر سے تخت لیتے وقت یہ معاہدہ کیا تھا کہ مسلمانوں کے مقدمے ان کے قرآن اور حدیث کے مطابق فیصل کیے جائیں گے۔

گورنمنٹ کو بہت آسانی ہوتی بلکہ ایک بہت بڑا جھگڑا طے ہو جاتا۔ ایک شیخ الاسلام ہوتا جس کے صلاح کار ممبر ہوتے اور قاضی مقرر کیے جاتے مسلمانوں کا جو مقدمہ ہوتا قاضی فیصلہ کرتا۔ یہی سب حق تلفی کی سزا ہے جو آج ہم پا رہے ہیں۔

گزشتہ مردم شماری میں ایک خانہ اور بڑھا دیا گیا تھا جس میں مختلف پیشوں کے حالات خاص کر بازاری عورتوں کی تعداد کتنے دنوں سے وہ اس کام کو کر رہی ہیں اور کیا وجہ ہے، معلوم کر سکیں۔

(۱) پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کی غفلت اور سستی کی وجہ سے بھی مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھی جا رہی ہے اور ہندو دن بدن گھٹتے جا رہے ہیں۔

(۲) بہت سے مسلمانوں کی وہ عورتیں جو بازاری ہو گئی ہیں ان میں بعض ایسی ہیں جنکے شوہران سے برطرف ہو گئے اور آخر ان عورتوں کو یہ پیشہ اختیار کرنا پڑا۔

(۳) ہندوؤں میں وہ عورتیں جو لڑکپن میں بیوہ ہو گئیں اور شادی نہ ہونے کی وجہ سے اس کام کو اختیار کر لیا۔

یہ باتیں کس قدر قابل افسوس ہیں اور یہ سب نتائج عورتوں کے حق کو چھوڑ دینے کے ہیں۔ ہم جب چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے حق کو ادا کریں تو ایسا ہی ہم لوگوں پر فرض ہے کہ ہم ان کے حقوق ادا کرتے رہیں۔

آج اگر گورنمنٹ کو کوئی اس طرف متوجہ کرتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ قانون ایک بار پاس کر دیا گیا اب بدل نہیں سکتا لاکھ آپ بکا کیجئے مگر کارگر نہیں ہوتا یہ سب باتیں جب ہی قرار پا سکتی ہیں جب رعایا کو حکومت میں دخل ہو۔

۱۶ دسمبر ۱۹۰۷ء (یکشنبہ)

طاہر صاحب نے دریافت کیا۔

جس عورت کے گود میں بچہ ہو اور وہ حیضہ لڑکے کی وجہ سے پاک صاف نہیں رہ سکتی ہو تو اس حالت میں اس کے نماز پڑھنے کی کیا کیا شرائط ہیں۔

مولانا نے فرمایا۔ وہ عورت اگر اس بات سے مطمئن ہے کہ غسل کرنے سے کوئی ضرر خود یا لڑکے کو نہیں پہنچ سکتی تو اس حالت میں بہتر اور اولیٰ ہے کہ وہ غسل کرکے نماز ادا کرے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر میرے بھائی عذر کی حالت میں غسل کیے بغیر نماز ہو جاتی ہے۔ صرف اس جسم کو صاف کرے جہاں ناپاکی کا احتمال ہو اور اگر یہ خیال نہ ہو کہ کون سا عضو صاف کرے تو چاہئے کہ صرف وضو کرکے نماز پڑھے۔ شریعت میں کسی قسم کا جبر اور تشدد نہیں ہے۔ دین اسلام ایک آسان مذہب ہے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو تیمم کرے عورتیں جو مجبور ہیں اور نہیں ہو سکتا کہ پانچوں وقت غسل کر سکیں اگر اس بات کی پابندی لگائی جائیگی کہ بغیر غسل کے نماز ہی نہیں ہو سکتی تو نتیجہ یہ نکلیگا کہ نماز ہی نہیں پڑھی جائیگی۔

نماز ہر حالت میں پڑھنا چاہئے۔ غسل کرنے سے ضرر کا خوف ہو تو صرف وضو ہی کر لے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو تیمم کرے مگر نماز ضرور پڑھے۔

اب اس کو دیکھئے کہ لوگ کس قدر بیجا تشدد کرتے ہیں جس کی اک قلم ضرورت نہیں اور لطف تو یہ ہے کہ جب دیکھتے ہیں کہ کسی پر دباؤ چل سکتا ہے تو اس پر بالکل سختیوں کا حد کر دیتے ہیں نرمی کی جگہ پر سختی اور سختی کی جگہ پر نرمی مگر وہ لوگ جو ذرا قوی پنجہ رکھتے ہیں اور پیسے والے ہیں تو مفتیوں کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ اگر اس بات کی ضرورت ہوئی کہ حرام کو حلال ثابت کر دیں تو فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں صرف سوال ہے پیسوں کا اور وہ غریب بیچارے جو مسکین ہیں تو ان پر جس قدر بے جا سختیاں کی جائیں درست ہے۔

اب اس کو کیا کہئے گا۔ لوگ جھگڑا کرتے ہیں حرف ضاد پر کوئی کہتا ہے سورۂ فاتحہ میں ولا الضالین کو ولا الدالین اور کوئی کچھ غرض یہ ہے کہ نہیں پڑھنے سے گنہگار تھے اب پڑھنے سے کافر کیا خوب ایک لطیفہ گویا

کہا ہے صاحب میں نماز نہیں پڑھتا تھا اس وقت تک میں سمجھتا تھا کہ سخت معصیت کر رہا ہوں مگر جب اس بات کا پتہ چل گیا کہ حرف ضاد کو جب تک کوئی صحت کے ساتھ عربوں کی طرح نہ ادا کر سکے گا وہ نماز نہ پڑھے ورنہ کافر حالانکہ یہ سمجھنا لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔ حرف ضاد کو صرف عرب والے ادا کر سکتے ہیں دوسری زبان میں یہ حرف کا ادا کرنا عربوں ہی کی خصوصیت ہے۔ جب آپ کتب ادب عربی پڑھیں گے تو یہ معلوم ہوگا کہ منجملہ عربوں کی خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ لوگ اہل ضاد کہلاتے ہیں۔

عمر رضی اللہ عنہ، جو دوسرے خلیفہ گزرے ہیں، ان میں ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ حرف ضاد داہنے جانب منہ سے ویسے ہی صحت کے ساتھ ادا کر سکتے تھے جیسے بائیں جانب سے اور دائیں جانب سے ادا کرنا مشکل ہے کہیں نہیں بتلایا گیا کہ جب تک کوئی آدمی حرف ضاد کو عربوں کی طرح نہ پڑھ سکے گا تب تک وہ مسلمان ہی نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمان عجمی بھی تھے۔ حضرت بلال حبشی، حضرت صہیب رومی اور دیگر اشخاص جنکی زبان عربی نہیں تھی آپ نے یہ نہیں کہا، ان لوگوں کو حرف ش، ص، یا ض پڑھاؤ بلکہ آپ نے یہی کہا قرآن پڑھاؤ

حضرت بلالؓ کا واقعہ ہے کہ آپ کی زبان مبارک سے حرف ش ادا نہیں ہوتا تھا بجائے ش کے س کہتے تھے مگر جس دن اذان نہیں پکارتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذان میں مزہ نہیں آتا تھا وہاں حضرت بلالؓ کا س، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر محبوب تھا اور آج یہ حال ہے کہ ہم حرف ضاد پر کفر کا فتویٰ دیتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ میرے جنازہ کی نماز صہیب رومی پڑھائیں گے حالانکہ عشرہ مبشرہ، جنکو جنت کی بشارت وحی سے مل تھی، اور واقعہ یہ تھا کہ جب وحی آئی کہ اب بیت المقدس سے کعبہ کی طرف منہ پھیرو تو فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پھیرنے پہ اول دس صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی بغیر کسی تاخیر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا تھا تو وہ لوگ تھے، عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے مگر عمر رضی اللہ عنہ جب دنیا سے تشریف لے جاتے ہیں تو کہتے ہیں صہیبؓ میرے جنازہ کی نماز پڑھائیں گے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے۔ مسجد نبوی میں ہر ملک کے لوگ جو ایمان لائے تھے قرآن تلاوت کر رہے تھے۔ سبھوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا تو فرمایا۔ زبانیں تو مختلف ہیں مگر قرآن ایک ہے۔ ان بحثوں کا نچوڑ یہ نکلا کہ درحقیقت قرآن اس لیے نہیں آیا ہے کہ ہم صرف ض اور ظ اور ع پر ایک دوسرے کو کفر کا فتویٰ دیں بلکہ اس لیے کہ ہم اس کے مطالب پر غور کریں اپنے اندر نور ایمان پیدا کریں اور تب دنیا و دین کی سعادت و برکت حاصل ہو سکتی ہے آج ہمارا یہ حال ہے کہ ہندوستان میں کہیں عربی کی اصل تعلیم نہیں مسلمانوں نے اگر کوشش کرکے کچھ روپئے جمع بھی کیے کہ ایک مدرسہ کھولیں گے کس لیے کہ قاری پیدا کیے جائیں۔ ان سب باتوں سے

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ قرآن کے معنی سے غفلت کیے جا رہے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں جو اتنا ضروری نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ قرآن کے الفاظ کو صحت کے ساتھ ادا کرے مگر یہ مطالب کے نہیں کہ زبان سے لفظوں کو کہتے جا رہے ہیں اور معنی سے بے خبر ہیں. میری مادری زبان عربی ہے میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوا گیارہ برس عربی کی تعلیم پائی مگر حرف ضاد کے متعلق مجھے اطمینان نہیں ہوتا کہ میں صحت کے ساتھ ادا کرتا ہوں .

۱۷ر دسمبر ۱۹۱۷ء (دوشنبہ)

محمد اسمعیل شہید کو دیکھئے دہلی کی مسجد میں انکا یہ حال تھا کہ ایک گھنٹہ مصافحہ میں لگ جاتا تھا اور فرصت نہیں ملتی تھی کہ سیڑھی سے نیچے قدم رکھیں. انہوں نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کر کے شاہانہ زندگی بسر کی اور آخر میں شہید ہو گئے اسکا واقعہ یہ ہے کہ جب سکھوں نے پنجاب میں مسلمانوں پر ظلم کرنا شروع کیا تو اسمعیل نے، خدا انکو جنت نصیب کرے، جہاد کا فتوی دینا شروع کر دیا پہلے لوگوں کو تعجب معلوم ہوا کہ جہاد کا حکم بادشاہوں اور امیروں سے ہوتا ہے. کہاں اسمعیل اور جہاد. پھر لوگ بیان کرتے ہیں.

محمد اسمعیل کی زبان میں اتنی تاثیر خدا نے دی تھی کہ ان کے آدھ گھنٹہ کے وعظ میں لوگ لاکھوں روپئے کا مال چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو جاتے تھے اور یہ واقعہ لارڈ ایلگن کے زمانہ میں ہوا تقریباً ۱۸۶۲ میں. بس وہ یہی کہتے تھے اب نماز روزہ کا وقت گیا اب وقت آ گیا جہاد کا دشمنوں کی راہ میں کمر باندھو اور خدا کی راہ میں اپنے کو قربان کر دو. چنانچہ بہت سے لوگ جمع ہو گئے مگر منافقین ادھر آگ لگانے لگے اور لوگوں کو بہکانا شروع کیا. بہتوں نے اسمعیل کا ساتھ چھوڑ دیا ایک مقام پر دشمنوں کی فوج نے حملہ کر دیا. اسمعیل کے ساتھ کل گیارہ سو آدمی تھے اور دشمن پچاسوں ہزار. اسی میں ان کی شہادت ہوئی

ایک شخص مجھے اجمیر میں ملا وہ بہت بوڑھا تھا اسکا نام غنی تھا. اسکی کتابوں کی دوکان تھی. اس نے مجھ سے کہا اسمعیل کی یہ حالت تھی کہ جس وقت وہ وعظ کرتے تھے اس وقت لوگ اپنے تمام اشیاء واہل وعیال کو چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو لیتے تھے اور میرا بھی جی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ ہو جاؤں.

محمد اسمعیل سے لوگوں نے پوچھا آپ ایک بہت بڑے عالم ہیں اور آپ نے سید احمد سے بیعت کر لی. اسکے جواب میں انہوں نے کہا. نماز روزہ کے مسئلوں سے میں خوب واقف ہوں اور ایک مسئلہ پر گھنٹوں بحث کر سکتا ہوں. مگر مجھے نماز پڑھنا نہیں آتا تھا مولانا سید احمد نے مجھے نماز پڑھا دی. دراصل یہ وہ جماعت تھی، میرے بھائی، جو صحابہ کرام کے گروہ میں سے ہے. اس میں کوئی شک نہیں. اور سب سے پہلے تو آدمی کو نمونہ بننا چاہیے تاکہ اس کو دیکھ کر لوگ ویسا ہی کریں اور جب اپنے ہی میں وہ صفت نہیں ہے تو دوسرے اس کی باتوں پر کیا عمل کرینگے. ایسے کوئی کتابیں بکا کرے کیا ہوتا ہے.

ایک شخص۔ حضور یہ جو لوگ کہتے ہیں۔ فلاں شخص بڑا ولی اللہ ہے تو اس میں اور مجھ میں کیا فرق ہے وہ بھی نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں اور میں بھی۔

مولانا۔ بھائی یہ جو تم نے کہا بہت صحیح کہا ان کے پاس کوئی نئی شریعت نہیں آئی۔ وہ اسی پر عمل کرتے ہیں جس پر میرا عمل ہے۔ مگر حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر صحابہ سے ارشاد فرمایا میں ابوبکر کو دوست رکھتا ہوں نا سلئے کہ وہ بہت نماز پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ زیادہ نماز پڑھنے سے کوئی شخص خدا و رسول کا محبوب نہیں ہو سکتا بلکہ اصل چیز ایمان ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے جس کو تم بار ہا سن چکے ہو گے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے شریعت کی خدمت کرنے میں سبقت لے جائیں اب خیال کیجئے صحابہ کرام کو رشک کس کا ہوتا تھا، خدمت شریعت میں اور مال خرچ کرنے میں اور یہاں یہ حال ہے کہ ہم رشک کرتے ہیں مال جمع کرنے برے کام کرنے اور پہننے اور اوڑھنے میں۔ بہر کیف آپؐ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے، کچھ روپیوں کی ضرورت ہوئی آپؐ نے ارشاد فرمایا جس سے جو ہو سکے اس کار خیر میں حاضر کرو چنانچہ لکھا ہے، اس دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سمجھا بس اس بار میں ابوبکر سے سبقت لے جاؤنگا حضرت عمر رضی اللہ نے اپنے مال کا دو حصہ مسجد نبوی میں حاضر کیا اور ایک حصہ اپنے بی بی کے بچوں کے لیے رکھ چھوڑا کیونکہ وہ بھی ضروری تھا۔ آپ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ عمر نے اپنے مال میں سے ایک حصہ اپنے اہل وعیال کے لیے رکھا ہے اور باقی کو حاضر کیا اسی طرح دیگر صحابہ نے کیا۔ جب باری ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آئی تو آپ نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے اپنے بچوں کے لیے کیا چھوڑا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں کہا۔ یا رسول اللہ میں نے اپنے بی بی بچوں کے لیے خدا اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے۔ اس وقت عمر رضی اللہ عنہ نے سمجھا اب ابوبکر سے کوئی سبقت نہیں لے جا سکتا۔

اس بحث سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ درحقیقت زیادہ نماز اور روزہ کی گنتی سے کوئی شخص بزرگ نہیں ہو سکتا، اصل دیکھنا ہے کہ وہ کس قدر شریعت کے احکام پر عامل ہے اور اس کے انجام دینے میں کس قدر کوشاں ہے۔

وہ شخص۔ مگر حضور یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ پھر ان کو کیوں فضیلت حاصل ہوئی۔

مولانا۔ میں نے آپ سے کہا نہ۔ پہلے آدمی کو چاہئے کہ جو لفظ بولے اس کے معنی پر غور کرے۔

ولی کے معنی چاہنے کے ہیں اور یہ لفظ مشتق ہے لفظ ولایت سے تو ولی اللہ کے معنی ہوئے اللہ کا چاہنے والا۔ انکی نمازوں کا کیا پوچھنا ہے۔ وہ اپنی نماز اس طریقہ سے پڑھتے ہیں کہ اللہ کو دیکھ رہے ہیں۔ بس۔ اگر یہ کسی سے نہ ہو سکے تو وہ یہ تصور کرے کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

وہ شخص۔ بس حضور سمجھا ان میں اور مجھ میں یہی فرق ہے۔

مولانا۔ ہاں میرے بھائی اتباع رسول اور اتباع خدا یہ اصل چیز ہے۔

۱۸ دسمبر ۱۹۴۷ء (سہ شنبہ)

اکرام علی۔ حضور مجھکو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دراصل صوفی کا مطلب کیا ہے۔

مولانا۔ صوفی کے معنی کھلے لفظوں میں یہ ہوسکتے ہیں کہ وہ شخص شریعت پر عامل ہو اور ایک سنت بھی ایسی نہیں ہو جسکو وہ ترک کرتا ہو۔ اس کی مثال ایسی ہی سمجھنا چاہیئے کہ ایک آدمی ہے جو برسوں چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رہا ہے تو اس مریض کے لیے سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ اس کی تلاش کرے کہ کہیں اس کو حکیم حاذق مل جائے تو بغیر حکیم کے اسکا علاج نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد حکیم سے نسخہ لے مگر اب بھی وہ مریض نسخہ حاصل کرنے پر اچھا نہیں ہوگیا۔ اس لیے اس کو تیسری منزل طے کرنا پڑیگی اور وہ یہ ہے کہ اس نسخہ کے مطابق عمل کرے جو جو دوائیں اس میں لکھی ہیں اپنے حلق سے اتارے۔

جس طرح جسمانی تندرستی کے لیے تین مراتب طے کرنا پڑتے ہیں اسی طریقہ سے روحانی تندرستی کے لیے بھی تین منزلیں ہیں اور تینوں ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ صرف حکیم مل گیا تو محض حکیم کے ملنے سے بیماری دور نہیں ہوجاتی یا یہ کہ ایک نسخہ خواہ جالینوس کا کیوں نہ ہو۔ حاصل ہوجائے اس سے ہرگز ہرگز بیماری دفع نہیں ہوتی جبتک اس کی دواؤں کو نہ پیئے۔ اسی طریقہ سے روحانی بیماری کے لیے سب سے پہلا کام ایک مریض کو چاہیئے کہ سمجھ لے کہ حکیم کی تلاش کے بغیر اس کو تندرستی نہیں ہوسکتی تو شریعت کی اصطلاح میں اس حکیم کا نام رسول ہے اور اس دنیا میں اب سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی صحیح علاج نہیں کرسکتا اس کے سوائے جتنے علاج ہیں سب ناقص ہیں۔ اس بنا پر جب آدمی کو حکیم مل گیا تو اس کے بعد نسخہ لکھا لینا چاہیئے۔ نسخہ دنیا میں صرف ایک ہی ہے اس کو میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں مگر دقت یہ پیش آتی ہے کہ بیمار کو باوجود نسخہ مل جانے کے دوا نہیں پینا اور بظاہر نسخہ لے لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ نسخہ کے حرفوں اور لفظوں سے بیماری نہیں جاسکتی۔ اس کے لیے وہ بیمار جو مدتوں چارپائی پر لوٹ رہا ہے اور باوجود دوا آنے کے گھنٹوں پڑا منہ بنا رہا ہے مگر دوا نہیں پیتا ہے اب صرف دوا بھی کچھ کام نہیں کرتی جبتک اس کو ایسا شخص نہ ملے کہ جب جب ضرورت ہو زبردستی دوا اس کے حلق سے اتار دے گھر پر ڈاکٹر پرہیز کرنے کے لیے بول گیا مگر جہاں آواز آئی گرم گرم چنے لیلو۔ فوراً منگوا کر کھالیا کیا اس مریض کو یہ معلوم نہیں کہ چنا بیماری میں مضر ہے پھر وہ کیوں کھاتا چاہتا ہے درحقیقت اس کے اندر بات یہ ہے کہ ڈاکٹر کی دوا اور اسکا وجود بھی مریض کے لیے سودمند نہیں جبتک وہ اس کی تلاش نہ کرے کہ کوئی شخص ایسا ہوتا ہے کہ وہ زبردستی دوا اس کے حلق سے اتار دیتا

اگرچہ وہ کتنا ہی منہ بنایا کرتا اور اس کی دوا کڑوی معلوم ہوتی جب مریض کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے تو پھر وہ یہ کرتا ہے
وہ گھر سے اٹھ کر شفاخانہ میں جاتا ہے اب وہاں کی حالت دوسری ہے گھر میں تو یہ حال تھا کہ جہاں بھنے کی آواز سنی فوراً برف
کھا لیا مگر جب یہاں پہنچا تو ایک ٹکڑا برف کا نصیب نہیں ڈاکٹر آیا اور کسی کڑی نظر ڈالی کہ مریض تھر تھر اٹھے دوا
پینا پڑی ڈاکٹر کہہ گیا اسکو پانی دی جائے تو وہ اسی کو پی رہا ہے ہاں اس میں شک نہیں کہ مریض کی طبیعت گھبراتی
ہوگی کہ کیوں اس بلا میں آگیا مگر جوں جوں بیماری ہٹتی جائیگی اور وہ تندرست ہوتا جائیگا خیال کریگا جس چیز سے
میں بھاگ رہا تھا وہ عین تندرستی لانے والی ہے اس کو صوفیا کرام کی بولی میں شیخ اور پیر کہتے ہیں۔

جب سے دنیا اور انسان قائم ہیں ہمیشہ نسخہ ایک ہی رہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے ایک خدا کی پرستش
کی تعلیم دی اور جب نوح علیہ السلام کا ظہور ہوا تو اس نے اللہ واحد کو بتلایا غرض سب سے کہ خدا کی شریعت ایک ہے۔
سوال یہ ہوتا ہے کیا دنیا میں کوئی ایک متنفس ملیگا جو یہ کہے جھوٹ بولنا ثواب ہے اور چوری کرنا اچھا ہرگز نہیں پھر
کیوں وہ شخص باوجود علم ہونے کے اور نسخہ جاننے کے عمل نہیں کرتا ہے تو معلوم ہوا خواہ انسان کتنا ہی نسخہ لیکر جا تا رہے
جب سوئے اپنے سرہانے رکھے۔ جاگے تو اسکا اوڑھنے چلے تو جیب میں رکھے غرض سب کچھ کرے سود مند نہیں
ہو سکتا جب تک کوئی شخص نسخہ کی چیزوں کو اس کے حلق سے نہ اتار دے، تو دراصل جو پیر جو صوفی جو شیخ یہ کر سکتا
ہے وہ ہمارا پیر ہے اور جس سے یہ کام نہیں ہو سکتا وہ ہمارا پیر نہیں ہے۔

پیر کی اطاعت اور اسکی پیروی ہر حالت میں مفید اور بہتر ہے بغیر اس کے صحت نہیں ہو سکتی ایک مریض جب
حکیم کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے۔ حکیم صاحب جو کچھ مجھکو پینے کے لیے دینگے میں فوراً آپ کی اطاعت کرونگا اور
آپ کے حکم کو مانونگا مگر مجھکو تندرستی ملنی چاہئے تو کیا اس کا یہ کہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اگر حکیم اس کو زہر دیدے تو وہ
پی لیگا ہرگز نہیں، زہر تو اس کو اور مار ڈالیگا اس حالت میں وہ حکیم کی بات نہیں سنے گا اس لیے کہ وہ تندرست ہونے
کے لیے آیا ہے مرنے کے لیے نہیں اسی طریقہ سے جن لوگوں نے پیر کی اطاعت اور اس کے قدم بقدم چلنے کے
یہ معنی سمجھتے ہیں کہ اگر خلاف حدیث اور قرآن کے پیر تعلیم دے تو اس کو بھی کر لینا چاہئے نہیں۔ بلکہ وہ تو آیا
تھا اسلئے کہ قرآن اور حدیث کے مطالب کو سمجھے اور چونکہ وہ عمل نہیں کر سکتا ہے پیر اسلئے اس کو عامل کرا دے
نہ اسلئے کہ اس کو زہر دیدے۔

پہلا مقام حقیقت کا پیرو سنت حکیم کی تلاش۔ دوسرا معرفت کا نسخہ تلاش کرنا اس کے بعد حقیقت۔
جب دوا پی لی تندرست ہو گئے۔ تینوں ایک ہی حقیقت کی متعدد کڑیاں ہیں ایک کے بغیر دوسرا نہیں ہو سکتا وہ

صوفی جو شریعت پر عمل نہیں کرتا صوفی ہرگز نہیں کیونکہ بغیر شریعت کے کیونکر کوئی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔

۱۴ دسمبر ۱۹۱۰ء (چہار شنبہ)

مولانا ابوالعلاء۔ مرزا مظفر حسین ودیگر صاحبان قبل مغرب جامع مسجد میں جمع ہیں۔

مولانا ابوالعلاء۔ (مرزا صاحب کے طرف مخاطب ہوکر) آپ غیر مقلدوں میں سے ہیں

مرزا صاحب۔ جی ہاں

مولانا ابوالعلاء۔ آپ آمین کیوں کہتے ہیں

مرزا صاحب۔ اسلئے کہ نبی صاحب نے آمین کہنے کا حکم دیا اور رسول اللہ خود اس پر عمل رہا اور جتنے صحابہ کرام گذرے ہیں سبھوں نے اسکو کیا۔

مولانا ابوالعلاء۔ میں نے سوال کیوں کیا

مرزا صاحب۔ آپ نے کیوں کہا میں نہیں سمجھتا۔ شاید آپ کے نزدیک میں نے کچھ گناہ کیا۔

مولانا ابوالعلاء۔ آمین پر تو میرا بھی عمل ہے۔

مرزا صاحب۔ آپ ہی بتلائیے کہ آپ آمین آہستہ کیوں کہتے ہیں۔

مولانا ابوالعلاء۔ اسلئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری فعل آمین کہنے میں آہستہ رہا اور آپ نے رفع یدین نہیں کیا۔

مولانا ابوالکلام۔ اجی یہ سب غیر ضروری بحث ہیں جس کا کوئی حاصل نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ سب باتیں بھی بہت ضروری ہیں اور جس پر ہم عمل کر رہے ہیں اس کی میرے پاس دلیل موجود ہے مگر سارا دارومدار اس پر ٹھہر جاتا ہے کہ ایک کا کرنا فضیلت ہے اور دوسرے کا عدم فضیلت کچھ گناہ تو ہے نہیں اور جناب ان سب باتوں نے مسلمانوں کے اندر ایسا ضعف پیدا کر دیا ہے کہ وہی لوگ جانتے ہیں جنکو مسلمانوں کی آہ ان کے دل میں ہے۔ جو لوگ اس بات کو سمجھے ہوتے ہیں ان کو نیند نصیب نہیں ہوتی میں تو اس بات کی فکر میں رہتا ہوں کہ ان لوگوں کو ایسی باتوں کی مہلت کب ملتی ہے جب ہماری یہ حالت ہو رہی ہے۔ پچاس برس پیشتر کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں کے نزاع اور جھگڑے نے مسلمانوں کو کس قدر تباہ کر دیا ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو مسجد سے نکال دیا پھر اس کا مقدمہ کفاروں کے پاس فیصلے کے لیے گیا قرآن اور حدیث کی توہین

کی جا رہی ہے۔ لاکھوں روپے برباد کر دیا صرف اتنی بات پر کہ ایک شخص آمین زور سے کہتا ہے دوسرا آہستہ سے مولوی صاحب رانچی کے مسلمانوں میں تو آج کل اس قدر اتحاد اور میل جول پیدا ہوگیا ہے کہ شاید کوئی گمان میں بھی نہیں لاسکتا۔ ہر آدمی ایک دوسرے سے الگ تھا اور اب سب کوئی ملکر ایک سے لیے کام کر رہے ہیں اب غیر مقلد بھی آتا ہے تو وہ بے باکی سے آمین زور سے کہتا ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ خدا رانچی کے مسلمانوں کی نیک نیتی کا اجر دے۔

۲۰ دسمبر ۱۹۷۰ (پنجشنبہ)

اسداللہ شاہ نے کہا حضور۔ ایک آدمی ہے وہ ایک عورت کو تقریباً ایک برس سے رکھے ہوئے ہے ایجاب قبول سے جب نکاح ہو جاتا ہے تو اس حالت میں جبکہ طرفین راضی ہیں مسئلہ کیا ہوگا۔

مولانا نے فرمایا۔ سب سے پہلے اس چیز کو سمجھ لینا چاہیئے کہ شریعت جس چیز کو زنا کہتی ہے وہ کیا چیز ہے۔ دراصل شریعت کے کاموں میں سارا دارومدار نیت پر رکھا گیا ہے اور یہی ایک چیز ایسی ہے جسکو قرآن نے جابجا اشارہ کیا ہے۔ نیت اگر اچھی ہے تو انسان کا ہر وہ قدم جو اس کام کے لیے اٹھیگا اچھا ہوگا اور اگر نیت خراب ہے تو یقینی اس کو اس کام میں ناکامیابی ہوگی۔ اس کی مثال آپ یوں سمجھئے کہ آپ ایک مکان بنانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس میں ضرورت ہے اس بات کی کہ آپ ایک مصمم ارادہ اپنے جی میں کر لیجئے کہ کس طرح کا مکان بنائینگے جب آپ نے یہ ارادہ کر لیا تو پھر ایک کام آپ کا ہو گیا اور اگر کسی کے ارادہ میں ابھی شک ہے کبھی سوچتا ہے مکان بناؤں تو کہاں سے روپئے لاؤں اور اسی طرح کی باتیں غرض دن رات اسی وہم میں پھنسا رہتا ہے تو سمجھ لو ہرگز وہ مکان تیار نہیں کر سکتا ہے۔ یہ میں نے ایک مثال دی۔ اب اسی طریقہ سے اور مثالوں کو لاؤ اور سمجھو کہ آیا اس کی نیت کی ضرورت ہے یا نہیں۔ یہی ایک چیز بھی جسکو دنیا نے قبل ظہور شریعت گم کر دی تھی اور سوائے ناکامیابی اور بربادی کے کچھ اچھا نتیجہ نہیں نکلتا تھا مگر جب شریعت کا ظہور ہوا تو اس نے پھر اس بھولے ہوئے رہنا کو یاد دلایا اور بتلایا کہ تمہارے یہ سب اسباب کام نہیں آئیں گے جبتک تم اپنے جی میں ارادہ کامل پیدا نہ کر لو۔ تم جانتے ہو کہ قرآن کریم نے ہمکو سورۂ فاتحہ میں جو بتلایا کہو ایاک نعبد وایاک نستعین۔ یعنی اے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ یعنی ایک مسلم کی کامیابی کا ذریعہ لوہے کے ہتھیاروں پر نہیں ہے، روپئے پیسوں سے کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی کامیابی کا ذریعہ اس کا ارادہ اور خدائے واحد پر بھروسہ کرنا ہے۔

[اس کے بعد کا کاغذ ضائع ہوگیا]

۲۱ دسمبر ۴۷ (جمعہ)

(خطبہ) اگلے جمعہ میں صفر کے مہینہ کے متعلق آگاہ کیا تھا کہ لوگ جو اس مہینہ کی نحوست اور بدشگونی اپنے ذہن میں خیال کیے ہوتے ہیں وہ محض غلط ہے اور اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ جی میں آتا ہے کہ آج بھی اس پورے حدیث کے مطالب بیان کر دوں اور یہ نہایت ضروری اور اہم مسئلہ ہے صفر کے مہینہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لاصفر...... صفر کی کوئی اصلیت نہیں پھر اس کے بعد فرمایا:

شگون کوئی چیز نہیں۔ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے کام شگون کی بنا پہ کیے جائیں تو اچھا ہے مگر یہ شگون کوئی چیز نہیں صرف لوگوں کو جال اور مکر میں شگون کے ذریعہ پھنسانا چاہتے ہیں۔

نجوم کوئی چیز نہیں

مختلف جانوروں کی بولی میں کچھ دھرا ہوا نہیں ہے لوگ یہ سمجھتے ہیں اگر کوا اتنے مرتبہ آواز دیگا تو کام بن آئیگا اور اگر اس رخ بیٹھے گا تو سفر میں خلل پہنچے گا خدائے تعالیٰ نے جانوروں کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ تمہارے کام بتا دیں بلکہ اس میں جو بھید ہے اس کی تمہیں کیا خبر۔

سایہ اور بھوت کی بھی کوئی اصلیت نہیں۔ بلاشبہ جنوں کا وجود ہے اور ممکن ہے کسی جن کا اثر کسی آدمی پر ہو مگر بیماری کے لیے سایہ اور بھوت وجہ نہیں۔ [اس کے بعد کا کاغذ ضائع ہو گیا]

[اس کے پہلے کا کاغذ ضائع ہو گیا]

مولانا کا بیان۔ آج ہمارا یہ حال ہے کہ گھر لٹا جا رہا ہے اور ہمکو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ ایک خاندان ہو جس میں لوگ اپنے اپنے حق کے لیے لڑ رہے ہوں ایک بھائی کہتا ہے میرا حق چھ آنا ہوتا ہے تم نے ساڑھے پانچ آنے کیوں لائے مگر سوال یہ ہے کہ اگر ان سب کو ایک جماعت ڈاکوؤں کی نظر آ جائے اور دیکھیں کہ سب کے سب ان کے گھروں کو لوٹنے کیلئے آ رہے ہیں تو پھر گھر والے کیا کرینگے۔ کیا آپس میں لڑتے رہیں گے یا دشمنوں سے بچنے کے لیے تلوار لیکر مقابلہ کرینگے اگر ان کا گھر لٹ گیا تو پھر ساڑھے پانچ آنے اور چھ آنے کا حق آئیگا کہاں سے۔ افسوس مسلمانوں پر آج انکا گھر لٹ رہا ہے، فرشے اور بچوں کو کھانا نصیب نہیں ہوتا پہننے کے لیے کپڑا نہیں، مگر پھر یہ غفلت، ایک مسلمان دوسرے سے اب بھی لڑنے کے لیے تیار ہے، تو عزیزان من جب مسلمانوں کی یہ حالت ہے اور وہ تلوار جو دشمنوں سے مقابلہ کے لیے دی گئی تھی اب چاہیئے تھا کہ ان تلواروں سے دشمنوں کا مقابلہ کرتے آج یہ حال ہے کہ وہی تلوار اپنے بھائی کی گردن پر چل رہی ہے۔

دشمن سے کیا وہ بچنے کی کوشش کرتے آج وہی ہیں کہ اپنی تمام قوتوں کو صرف کر رہے ہیں تو اے ماتم شعار! یہ
کب ہو سکتا ہے کہ تم دشمنوں کی گرفت سے بچ سکو گے۔ ایسا سمجھنا صد درجہ کی غفلت ہے۔ دشمن چاروں طرف سے
گھیرے ہوئے ہیں اور ایک دم میں مارنا چاہتے ہیں۔ اب بھی ہوشیار ہو جاؤ ورنہ یہ سب تمہارے آمین جہر اور بے جہر
باقی نہیں رہیں گے جب اسلام ہی نہیں رہے گا تو تم کہاں ہو گے۔ دشمن تو تیغ لے کر کہے گا ہر موحد کو قتل کر دو یہ نہ
پوچھے گا تم میں کون آمین پکار کر کہتا ہے اور کون آہستہ۔ بے شک یہ سب چیزیں الگ ہونی چاہئے مگر بعد کو۔ ابھی ضرورت
حفاظت اسلام ہے اور اس کے لیے کوشش کرنا چاہئے۔ جب یہی نہیں رہے گا تو ہم کہاں رہ سکتے ہیں۔ چھوڑ دو۔ جو آدمی
زور سے آمین کہتا ہے کہنے دو اور جو آہستہ کہتا ہے وہ بھی آہستہ کہے۔

ایک شخص۔ اگر کوئی غیر مقلد نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھیں یا نہیں؟

مولانا۔ جب میرے یہاں فاسق کے پیچھے نماز جائز ہے تو ان کے پیچھے کیوں نہیں۔ جب ایسا موقعہ
ہو تو میں ان کے پیچھے نماز پڑھ لونگا

آندھرا پردیش اورینٹل ریسرچ جرنل

سابقہ آصفیہ لائبریری اور حال اورینٹل مینسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد

کا

شاندار جرنل —— دو سو (۲۰۰) صفحات

۱۹۹۰ء کا دوسرا شمارہ مندرجہ ذیل مضامین پر مشتمل ہے :-

● اپنی بات (میر کرامت علی خاں) ● اس شمارے کے قلمی معاونین (میر کرامت علی خاں) ● سلطان محمد قلی اور حیدرآباد (پدم شری عابد علی خاں) ● قطب شاہی دور کا حیدرآباد (ڈاکٹر داؤد اشرف) ● قطب شاہی عہد کی بیگمات (رفعت رضوانہ) ● قطب شاہی مساجد (ڈاکٹر کرشنا شاستری) ● قطب شاہی گنبدیں (محمد عبدالقیوم) ● ماں صاحب تالاب (محمد نورالدین خاں) ● قطب شاہی دور کے مخطوطات (میر کرامت علی خاں) ● ملا وجہی بحیثیت انشائیہ نگار (ڈاکٹر جاوید وششٹ) ● قطب شاہی دور میں فارسی شعر و ادب کی ترویج (ڈاکٹر محمد صدیق) ● مثنوی بہرام و گل اندام (ڈاکٹر نورالسعید اختر) ● محمد قلی قطب شاہ (کتابیات) (ڈاکٹر محمد علی اثر) ● دفتر ریاستی اسناد میں محفوظ قطب شاہی عہد کے مخطوطات (راجندر پرساد) ● قطب شاہی دور کے کتبات (ڈاکٹر زیب حیدر) ● قطب شاہی دور کے سکے (ڈاکٹر مفضل الدین علی خاں)

:(ملنے کا پتا):

آندھرا پردیش اورینٹل ریسرچ جرنل

۵-۸-۵۹۹، آر-ایم-بلڈنگ، عابد روڈ، حیدرآباد

اورنگ زیب

○ ہند عہد اورنگ زیب میں ح-۲

○ ——— مرزا سمیع اللہ بیگ



جسٹس حمید اللہ بیگ اور جسٹس نصر اللہ بیگ کے والد مرحوم
جسٹس سمیع اللہ بیگ کا ۱۹۲۳ء کا کارنامہ پیش خدمت ہے
اس کے واقعی مخاطب تو ہندی داں عزیزانِ وطن ہوں گے
جن کے لیے اسے الگ سے ہندی میں پیش کیا جا رہا ہے لیکن
اردو والے بھی اپنی میراث سے بے خبر نہ رہیں اس لیے
اردو اصل بھی!

حسن نظامی مرحوم نے جسٹس بیگ کا یہ کارنامہ "حکومت
اورنگ زیب کی اصلی تاریخ" کے نام سے دوسری بار ۱۹۲۵ء
میں شائع کیا تھا اور اب تیسری بار زیر بتیں قیمت تحریر آپ کی
خدمت میں پہنچ رہی ہے۔ جسٹس سمیع اللہ بیگ حیدر آباد
میں میر عدل (چیف جسٹس) تھے اور انھیں نواب سرزا یار
جنگ بہادر کا خطاب ملا تھا

—— ادارہ

ہند عہد اورنگ زیب میں-۲

مرزا سمیع اللہ بیگ



مسئلہ اتحاد پر ایک نظر

باب ہذا میں تین امور پر غور کیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ ہندو برادران وطن کو عہد مغلیہ کو کس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیئے؟ دوّم یہ کہ مسلمانوں کو عہد کس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے؟ اور تیسرا یہ ہوگا کہ ہندو مسلمانوں میں مستقل اتحاد قائم رکھنے کی بہترین تدبیر میری رائے میں کیا ہے؟

حصۂ اوّل۔ اہل ہنود کا نقطۂ نظر

خلاصہ کی استدعا

قبل اسکے کہ میں اہل ہنود کے صحیح نقطۂ نظر کے متعلق زبان کھولوں مجھ کو ناظرین معاف فرمائیں گے۔ اگر اس خاتمہ کے باب میں مختصراً ان واقعات کا اعادہ کردوں جنکے ثابت کرنے کی کوشش پچھلے ابواب میں کیگئی ہے کیونکہ دراصل انہیں واقعات کی مدد سے اہل ہنود کے صحیح نقطہ نظر کی با

رائے قائم کی جائیگی پہلے ابواب میں عہد اورنگ زیب کے ہندوستان کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسکے دو وجوہ تھے ایک تو یہ کہ عہد مغلیہ کے دور کا درحقیقت یہ آخری بادشاہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عہد مغلیہ کا یہ متعصب ترین مسلمان بادشاہ خیال کیا جاتا ہے۔

تعلیم

باب دوم میں دکھایا گیا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں صرف ایک ہی شہر ٹھٹہ میں مسٹر ہملٹن انگریزی سیاح نے چارسو درسگاہیں تحصیل اور وہ اس حیثیت کی تھیں اور وہ انکو ایسی شان کی نظر آئیں جن کو وہ کالج کہتے ہیں کیا دنیا کا کوئی دوسرا حصہ اشاعت تعلیم میں اس سے زیادہ اس وقت مصروف تھا۔؟

مذہبی رواداری

باب سوم میں یہ دکھایا جاچکا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں اس ملک کی مذہبی رواداری و بے تعصبی کی یہ حالت تھی کہ ایک انگریز سیاح کو مذہب کے اعتبار سے ہندو و مسلمانوں میں امتیاز دشوار ہوگیا تھا۔ آج بھی ہندوستان میں لاکھوں روپئے کی ایسی جاگیریں موجود ہیں جو شاہان مغلیہ نے مندروں کی امداد کے لئے عطا کی تھیں خود اورنگ زیب کے متعلق جسکو بڑا متعصب کہا گیا ہے ابھی چند دن ہوئے ایک واقف حال مسلمان نے ہندو و مسلمانوں کے بھرے مجمع میں یہ بیان کیا کہ صرف بنارس میرے ساتھ چلے چلو تو میں وہاں کے پجاریوں سے انکی اسناد نکلوا کے دکھادونگا کہ ان میں سے قریب قریب سب اسی بادشاہ کی عطیہ ہیں عیسائیوں کو بھی گرجے بنانے کی اجازت دیگئی تھی۔ اب ذرا اس زمانہ کی یورپ کی تاریخ پڑھیئے

اور وہاں کی مذہبی خونریزیوں سے ہند کی حالت کا مقابلہ کیجئے اُس وقت معلوم ہوگا کہ مذہبی رواداری کے معاملہ میں عہد مغلیہ نے اس ملک کو کہاں تک تیار کیا تھا۔

تجارت، تمول و فارغ البالی | باب چہارم میں ہند کی تجارت و تمول و فارغ البالی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ صرف ایک شخص عبد الغفار کا سرمایۂ تجارت انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کل سرمایۂ تجارت کے برابر تھا اور صرف احمد آباد و سورت کے تجارتی محصول کی آمدنی اسقدر تھی کہ اُس زمانہ کے انگریز سوداگر و سیاح کو بے اختیار رشک ہوا۔ اس زمانہ میں اشیائے احتیاج کا نرخ بھی بتایا جا چکا ہے۔ تجارت، دولت اور فارغ البالی کے اعتبار سے اُس زمانہ کی دنیا کے کسی ملک کا مقابلہ ہند سے کر لیا جائے۔ پھر دیکھا جائے کہ عہد مغلیہ میں تجارت کو کہاں تک فروغ حاصل تھا۔

انصاف و امن و امان | باب پنجم میں انصاف و امن و امان کے ضمن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک انگریز کی جسنے عہد اورنگ زیب میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں سفر کیا تھا اور وہاں کے حالات کو بغور کامل دیکھا بھالا تھا یہ رائے ہے کہ مسافر بغیر جان و مال کے کچھ خطرے کے تمام ہندوستان میں اسوقت با آسانی سفر کر سکتے تھے ڈاک کا یہ انتظام تھا کہ ہند کے دور و دراز مقامات سے دہلی تک خط پہونچنے میں صرف آٹھ روز صرف ہوتے تھے آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ایسا انتظام قائم رکھنے کے لئے نقل و حمل، سڑکوں اور راستوں کی حفاظت کے کیا کیا نہ انتظامات ہوں گے۔

صنعت وحرفت

اب صنعت وحرفت کے شعبہ کو دیکھئے۔ عہد مغلیہ نے ہند میں
یہ حالت پیدا کردی تھی کہ صرف ایک شہر کے کارخانے میں
پچاس ہزار پارچہ باف کام کرتے تھے۔ یہ قصے کہانی نہیں ہیں تاریخی واقعات
ہیں۔ المختصر یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی عینی شہادت کا حوالہ دیا گیا ہے ۱۹۲۴ء
میں جو بڑی نمائش دولت برطانیہ کے تمام ممالک کی ہوئی ہے اسمیں ہندوستان
کے سکشن یعنے حصہ میں مجھ کو ہندوستان کی مصنوعات میں سے کوئی ایک بھی
ایسی چیز نہ دکھائی دی جو عہد مغلیہ میں نہ بنتی ہو یا جسکا بنانا عہد مغلیہ کے بعد اس
ملک نے گزشتہ صدی میں سیکھا ہو۔ ان تمام واقعات اور امور کے متعلق
باب ششم ملاحظہ فرمائیے۔

یورپین تجار سے اورنگ زیب کا برتاؤ

اگر ناظرین کو یہ معلوم کرنا ہے کہ اس ملک کی تجارت وتمول کے
بڑھانے میں اور ایشیا و یورپ کو یکجا ملا دینے میں عہد مغلیہ میں
کیا کیا کوششیں کیگئی ہیں تو ذرا عہد اورنگ زیب کے وہ حالات جن کی دستاویزی
شہادت آج موجود ہے باب ششم میں ملاحظہ فرمائیں اسی باب میں انگریزی کمپنی
کی اصلی خط وکتابت واورنگ زیب کے اصلی فرمان کی نقل کی گئی ہے۔

یورپین تجار کی کم ظرفی

اگر ناظرین کو اُن مشکلات کا اندازہ کرنا ہے جنمیں عہد مغلیہ
کا آخری دور پھنسا ہوا تھا اور اگر اپنے ملک کے عہدہ داروں
کے عادات واطوار کا مقابلہ ان لوگوں کے کیرکٹر سے کرنا منظور ہے جنکی ڈپلومیسی
(حکمت عملی) اور تدبیر نے سلطنت مغلیہ کی بیخ کنی کی تو باب نہم پر ایک نظر
ڈالیں۔ یہ خلاصہ ہے اُن واقعات کا جن کا تذکرہ پچھلے ابواب میں کیا

جا چکا ہے۔

کل ہند کو ایک امپائر سلطنت بنا دیا

اب اِن تمام کوششوں کا مجموعی اثر ہندوستان پر کیا ہوا؟ میرا خیال ہے کہ اگر خدائے تعالےٰ کو یہ منظور تھا کہ بالآخر کُل ہندوستان ایک ملک ہو جائے۔ اُس کا ایک تمدن ہو جائے اُس کے بڑے بڑے پہاڑ اور دریا اسکے باشندوں کو جُدا نہ کر سکیں تو اس کی بنیاد قادر مطلق نے شاہان مغلیہ کے ہاتھوں سے ڈلوائی تھی اور اسکے فخر کا سہرا اورنگ زیب ہی کے سر پر زیب دیتا ہے کہ اسی بادشاہ اورنگ زیب کے آخری عہد میں ہند نے ایک متحدہ سلطنت وامپائر کی صورت اختیار کر لی تھی مغربی ہند، مشرقی ہند سے اور شمالی ہند جنوبی ہند سے مل گیا تھا اسکے باشندے بہت کچھ خلط ملط ہو چکے تھے۔ تمام ہند مختلف صوبوں میں تقسیم ہو کر ایک تخت دہلی سے اسطرح وابستہ ہو گیا تھا کہ گویا سارا ہندوستان ایک ہی ملک ہے۔ صوبوں کی قریب قریب اسی تقسیم ہند پر آجتک عمل ہو رہا ہے۔

قوانین بنائے

آج برٹش انڈیا میں جو قانون مال و وصول مالگزاری رائج ہے اُنکی نسبت کیا کسی کو انکار ہے کہ اسکا ڈھانچہ شہنشاہ اکبر کے عہد میں بنایا گیا تھا۔ ہمارے موجودہ حکمرانوں کو سلطنت کے ڈیزائن (Design) و نمونہ کے بنانے کی زحمت ہی نہیں برداشت کرنی پڑی بلکہ اُن کو بنی بنائی تیار عمارت مل گئی۔ البتہ حسب ضرورت وہ اسمیں ترمیم و تغیر و تبدل کرتے رہے ہیں اور مرور زمانہ اور رعایا کے تبدیلی خیالات کیساتھ ترمیم کرتی رہنی پڑیگی جیسا کہ ہر سلطنت کو کرنا پڑتا ہے سلطنت میں نصفت و عدالت

وقانونِ شہادت ودیگر علوم سائنس کے وہ اصول جن سے اسپین کے فاتح عربوں نے یورپ کو مستفیض کیا تھا ہندوستان میں اُن کے رائج کرنے والے عہدِ مغلیہ کے حکمران تھے۔

ہند کا قدیم تمدن

ہم کو اس ملک کے تمدن سے ایک خاص اُنس ہے۔ اُسنے نہ صرف روحانی تعلیم اور ترقی کے بہت سے مدارج طے کئے تھے بلکہ فنِ حکمرانی میں بھی قدیم دنیا میں ایک خاص امتیازی رتبہ حاصل کیا تھا۔ ہماری رائے میں اِس ملک کے لئے عرصہ تک وہی تمدن موزوں تھا مگر ہم یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ تمدن ہند کی معراجِ ترقی کا آخری زینہ تھا۔ انسانوں کو بلحاظ انکے پیشہ کے مختلف طبقات میں تقسیم کردینا اور پھر اُن میں طرزِ معاشرت کی ایسی آہنی دیواریں بنانا کہ آپس میں شادی بیاہ کھانا پینا تو درکنار محض چھو جانا بھی بعض اوقات معصیت میں شمار ہو یا حصولِ علم کے حق کو انسانوں کے مخصوص طبقہ یعنے برہمنوں میں محدود کردینا یا غیر مذاہب کے افراد سے امتیاز ومغایرت برتنا یا تجارت وتحصیلِ علم کے لئے ممالکِ غیر میں سفر کرنے سے احتراز کرنا۔ یا صرف یہی نہیں کہ چودہ پندرہ برس کی بیوہ کی شادی نہ کرنا بلکہ اُس کو ستی کردینا اور اسی قسم کے تمام روایات ورواج جو ہند کے قدیم تمدن میں داخل ہوگئے تھے سوسائٹی (Society) کی اُس حالت کے اعتبار سے جب اہلِ ہنود بطور آریہ قوم کے ابتداءً اس ملک میں آئے تھے شاید ضروری ولازمی ہونگے لیکن آج یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ تمدن اپنی نوعیت میں ایسا تھا کہ ہندوستان کی روز افزوں ترقی کیساتھ دائماً قایم رہ سکتا تھا۔

قدیمی تمدن میں مغلوں نے لوچ پیدا کردیا

جس قدیم تمدن کا ذکر کیا جا رہا ہے ممکن ہے کہ وہ ویدانت کی
تعلیم نہ ہو مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ تمدن ہند میں قایم ہو گیا
تھا۔ میری رائے میں اس تمدن میں جو ضروری تبدیلیاں آج سرعت کیساتھ
ہو رہی ہیں انکی ابتدا کرنے کا سہرا بھی عہد مغلیہ کے سر پر بندھتا نظر آتا ہے جب مسلمان
اس ملک میں آئے وہ بھی یہاں اسطرح بس گئے جیسے آریہ زمانہ کے اہل ہنود آباد
ہو گئے تھے لیکن یہ اپنے ساتھ ایک دوسرا تمدن لائے جسکا خمیر انہوں نے
اہل ہنود کے قدیم تمدن میں شریک کر دیا جس تمدن کی رو سے کسی زمانہ میں
ایک مسلمان کو ہندو کا چھونا تو درکنار ایک ہی ہندو مذہب کے بعض فرقے ایک
دوسرے کو نہیں چھو سکتے تھے۔ اس میں مسلمانوں نے یہاں آکر تغیر پیدا کرنا شروع
کیا۔ اور عہد مغلیہ میں بالآخر یہ عظیم الشان تغیر پیدا ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے
کے پڑوسی بنکر ایک ہی دیوار کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ہند کے کل بچوں کو
ایک سطح پر لانے کی عملی ابتدا اسی عہد مغلیہ سے ہوئی تھی۔ اسی عہد مغلیہ میں تحصیل
علم کے حق کا دائرہ وسیع کیا گیا اور کایستھوں کا شمار اہل قلم میں ہو گیا چھوت
کے رواج کے متعلق مہاتما گاندھی اور دیگر رہبران قوم کی تعلیم آج یہ ہے کہ وہ
رواج اس ملک کی ترقی کے لئے زہر قاتل ہے۔ لیکن اس سبق کی الف۔ ب
اہل ہند کو عہد مغلیہ ہی سے پڑھانا شروع کر دیگئی تھی ہر نئے رواج و فیشن کی ابتدا
کسی سوسائٹی کی چوٹی سے ہوا کرتی ہے لہذا اکبر بادشاہ نے ستی کے قدیم رواج
کو زبردستی موقوف کر کے ہندو مسلمانوں میں شادی کا رواج بھی قایم کرنا چاہا تھا
اور اسکی ابتدا خود ہی کی۔ اصلیت یہ ہے کہ ہند کے قدیم سخت تمدن میں جو لوچ

آج نظر آرہا ہے اور جسکی وجہ سے ہند جدید تمدن کی روز افزوں ترقی کا بار برداشت کرسکتا ہے وہ لوچ عہد مغلیہ ہی سے برابر پیدا کیا جارہا ہے تب کہیں یہ موجودہ حالت رونما ہوئی ہے۔ اِس لوچ کے پیدا کرنے میں اب اُن موانع اور زحمتوں کا سامنا نہیں رہا جو ابتدا میں مسلمانوں کو اُس وقت پیش آئیں اور برداشت کرنی پڑیں جبکہ انہوں نے ہندوؤں کی دیوار سے اپنی دیوار ملا کر رہنا شروع کیا تھا۔

بڑے بڑے شہر بسائے

اِس عہد مغلیہ میں سرزمین ہند پر اتنے بڑے بڑے شہر آباد کیے گئے کہ جب لارڈ کلایو (Lord Clive) یا لارڈ وارن ہیسٹنگز (Lord Warren Hastings) (دونوں میں سے کوئی ایک جسکا پورا خیال مجھ کو اسوقت نہیں آتا) شہر ڈھاکہ میں داخل ہوئے اور وہاں کی آبادی و تجارت کو دیکھا تو یہ کہا کہ لندن و ڈھاکہ میں صرف اسقدر فرق ہے کہ ڈھاکہ کی تجارت لندن کی تجارت سے کہیں زیادہ ہے۔ اُن بڑے شہروں میں سے بعض بعض آج بہت ہی پست حالت میں ہیں مثلاً شہر ٹھٹہ جو سندھ کا ایک زبردست شہر تھا جہاں چار سو درسگاہیں تھیں وہ محض ایک چھوٹا سا قصبہ اب رہ گیا ہے یا شہر شادی آباد مندو جسکے خوشنا کھنڈر علاقہ ریاست دھار میں آج اپنے بانیوں کی عظمت و جلال کا اظہار زبانِ حال سے کر رہے ہیں ایک اجڑا ہوا گاؤں ہے۔

عمدہ عمارتیں بنائیں

سرسینک آرٹ Saracenic Art کی کیسی کیسی خوبصورت خوبصورت محراب دار سنگ مرمری کی عمارتیں، وسیع سڑکیں۔

کاروانسرائیں، کیسے کیسے باغات، آبرسانی کے عجیب وغریب ذرائع اور تالاب بنا بنا کر سرزمین ہند کو خوشنما و آراستہ کرنے کی کوشش اسی عہد مغلیہ میں کی گئی۔

دریاسے تجارت برآبپاشی

ہند کے بڑے بڑے دریاؤں سے تجارت و آبپاشی کا کام لیا گیا۔ جو تجارتی جہاز ان دریاؤں میں دوڑا کرتے تھے انکا کچھ تذکرہ باب چہارم میں کیا جا چکا ہے۔

پہاڑوں کو فردوس بنایا
کشمیر کے حالات

زمین اور دریا کا ذکر ہو چکا اب اگر ناظرین کو اسکا اندازہ کرنا ہے کہ عہد مغلیہ نے بنی نوع انسان کی راحت و آرام میں اضافہ کرنے کے لئے پہاڑوں کو کسطرح زیر و زبر کیا اوران جنگلوں کو جہاں شیر، چیتے، ریچھ، وغیرہ درندے رہا کرتے تھے۔ کاٹ کاٹ کر کیسی کیسی نئی بستیاں آباد کیں تو عالم تصور میں میرے ساتھ کشمیر کی جانب رخ کریں اور جموں سے لیکر سرینگر تک ڈیڑھ سو میل کی قدیم شاہی سڑک پر سفر کریں۔ راستے میں ویری ناگ۔ اچھل۔ اسلام آباد اور دوسرے آس پاس کے مقامات پر عہد مغلیہ کے تمدن کے آثار زیر زمین تو حماموں کی دبی ہوئی ٹونٹیوں میں اور بالائے زمین پرانے باغات ٹوٹے پھوٹے فواروں اور کہیں کہیں بڑے بڑے واٹر ورکس کی صورت میں دیکھتے چلیں۔ سرینگر پہونچنے سے قبل راستے میں ان زعفران زار کی بھی سیر کرلیں جنکی جڑیں سرزمین ہند کو معطر کرنے کے لئے ایران سے لائی گئی تھیں اور اوجن کو دیکھنے کے لئے آج بھی دور دور سے سیاح جایا کرتے ہیں۔ سرینگر

پہونچکر پہلے اُس نسیم باغ کو دیکھیں جہاں صدیوں کے پُرانے چنار کے عظیم الشان
تو تنا ور درخت کھڑے ہوئے اپنے ایرانی النسل ہونے کا اظہار کر رہے ہیں
یہ چنار کا درخت جس وادئ کشمیر کو آج اس قدر فخر اور ناز ہے بلکہ وہ عزیز
ہے کہ وہاں کے قانون کے بموجب اُس کی شاخ کا ٹنا بھی جرم ہے عہد مغلیہ
ہی میں ایران سے لاکر یہاں لگایا گیا تھا۔

کشمیر کا قدیم کالج و دار الاقامہ

اس نسیم باغ میں مشرق رو کھڑے ہونے سے آپکی نظر
بار بار دور ایک پہاڑ کی چوٹی پر پڑیگی جس پر ایک
عالیشان پختہ ویران عمارت دکھائی دے رہی ہے راستوں کے نشانات
بھی نظر آئینگے۔ گر وہاں کسی آدم زاد کی صورت نہ دکھائی دیگی۔ منظر دلفریب
عمارت بہت بڑی لیکن ویران اور ہو کا عالم ہے۔ اسکے آس پاس بھی
کوئی مکان نظر نہ آئیگا۔ ناظرین کا جی چاہیگا کہ اس کو قریب سے ایک نظر
دیکھیں لیکن کشتی کا کشمیری مانجی (ملاح) یہ مشورہ دیگا کہ وہاں نہ
جائیے۔ وہاں جنات ہیں، بڑے بڑے زہریلے سانپ اور اژدہے ہر
طاق و گوشہ میں پڑے سو رہے ہیں اور شیروں کا مسکن ہے ناظرین متحیر
ہوکر دریافت کرینگے کہ آخر یہ عمارت کس غرض سے بنائی گئی تھی۔ زیادہ دریافت
سے معلوم ہوگا کہ یہ وہ کالج ہے جسمیں پڑھنے کے لئے عہد مغلیہ میں دور دراز
کے سفر طے کرکے طلبا آیا کرتے تھے۔ اور جو محرابیں نیچے نظر آرہی ہیں وہ
طلبا کا دار الاقامہ و بورڈنگ ہوس تھا۔ گھنا جنگل کاٹ کر وہ پہاڑ طلبا سے
آباد کیا گیا تھا۔ ابھی تو اس سنسان عمارت کی خاموش دیواریں عہد مغلیہ

کی کوششوں اور تمدن کے نشانات کا کام دے رہی ہیں اور زبانِ حال سے اپنے بانیوں کی عظمت و جلال کا قصیدہ اور اپنی تباہی و بربادی کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں مگر کچھ برسوں کے بعد وہ دیواریں بھی جب مسمار ہو جائینگی اسوقت میری اس کتاب کے پڑھنے والے شاید یہ کہیں گے کہ یہ شخص نہ معلوم کس عمارت کا ذکر کر گیا۔

چشمہ شاہی

جس پہاڑ پر یہ عمارت ہے اُسی کے نیچے سرینگر کا وہ مشہور و معروف چشمہ شاہی ہے جسکو شاہان مغلیہ نے ایک خوبصورت عمارت کی آغوش میں محفوظ کر کے ایک فوارے کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔ عہد مغلیہ میں کشمیر کے چشموں کی حفاظت اور قدر و منزلت کا یہ ایک نمونہ مشتے از خروارے ہے۔

نشاط باغ و شعلہ ماہ باغات

اس مقام سے دو تین میل کے فاصلہ پر عہد مغلیہ کے وہ باغات ہیں جن کو عوام الناس نشاط باغ و شالا مار (دراصل شعلہ ماہ تھا) کہتے ہیں۔ بہت زمانہ ہوا مجھے سرینگر کے ڈائرکٹر (Director) صاحب زراعت نے جنکے چارج میں وہ باغات تھے یہ بیان کیا تھا کہ جب لارڈ منٹو وائسرائے ہند کشمیر تشریف لیگئے تھے تو انہوں نے عہد مغلیہ کے یہ باغات دیکھنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا تھا۔ اسوقت یہ باغات بہت ابتر حالت میں تھے ریاست نے کچھ روپیہ صرف کر کے انکی درستی کرائی پھر بھی جا بجا کیچڑ سے انکو گزرنا پڑا تھا اب تو میں نے انکو دیکھا کہ اچھی حالت میں ہیں مگر انکے پرانے در و دیوار فوارے اور درختوں سے انکے اصلی حسن کی صرف جھلک دکھائی دے رہی ہے کیونکہ اب

بنا جامہ پہنانے کی کوشش کیگئی ہے جن ڈاکٹر صاحب زراعت کا میں نے
ذکر کیا وہ ولایت کے تعلیم یافتہ اور فن زراعت کے ماہر تھے وہ فرماتے تھے
کہ اب ایسے باغات کا بنانا تو درکنار انکا قائم رکھنا بھی دشوار ہے۔ ناظرین
کے قیمتی وقت ضایع ہونے کا خوف میرے دل پر طاری ہے مگر میں عہد
مغلیہ کے کشمیری باغات میں داخل ہو رہا ہوں اگر انکے بیان کرنے میں ذرا
طوالت ہو جائے تو معاف فرمائیں۔ ناظرین کے ذہن میں اگر ایسے ایک
باغ کی بھی صورت آجائے تو وہ حضرات جنہوں نے کشمیر نہیں دیکھا ہے
اُن تمام باغات کا تصور کر سکتے ہیں جن سے عہد مغلیہ میں وادی کشمیر اسطرح
آراستہ پیراستہ کیگئی تھی جیسے کسی دلہن کو کوئی کامل مشاطہ بناؤ سنگھار
سے سنوارتی ہے۔ نشاط باغ و شالامار باغ میں داخل ہوتے وقت سب سے
پہلے انکا پرانا پھاٹک' نقارخانہ زینہ اور دیواریں خاموشی سے اپنے
تعمیر کرنیوالوں کی شان و شکوہ اور فراخ حوصلگی کی نسبت سرگوشی کرینگی
مگر سامنے باغ کا نظارہ اتنا موقع نہ دیگا کہ اسطرف توجہ کیجائے اس منظر کا
سماں یہ ہے کہ ایک پہاڑ کو چوٹی سے لیکر نیچے سڑک تک اسطرح تراشتے چلے
آئے ہیں کہ اسمیں زینوں کی کیفیت و صورت پیدا ہو گئی ہے۔ ہر زینہ
نہایت وسیع اور بہت لمبا چوڑا ہے جس پر ایک خاص ڈھنگ سے
چمن بندی کیگئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پہاڑ پر اسکی چوٹی سے
دامن تک باغوں کے زینے بنا دئے ہیں۔ ان زینہ نما باغات کے وسط
میں اوپر سے نیچے تک چار پانچ گز چوڑی پانی کی چادر ماہی پشت تراشے ہوئے

پتھروں سے گزرتی ہوئی ہر زینے پر اسطرح گر رہی ہے گویا سبز مخمل کے فرش پر صاف و شفاف جالی کی سفید چادر بچھی ہوئی ہے۔ ہر زینے پر جہاں یہ چادر گرتی ہے ایک حوض ہے جو اس پانی کو پہلے اپنے آغوش میں لیتا ہے اور پھر گویا فرط نشاط سے اسکو گھماتا، نچاتا، اور اڑاتا ہوا بارہ بارہ پندرہ پندرہ فٹ اونچا آسمان کی طرف اچھال لیتا ہے۔ یہی اُس باغ کے فوارے ہیں۔ پھر یہ بہتا ہوا پانی دوسری چادر بناکر اس سے نیچے والے زینے کے حوض میں گرتا ہے اور اسی قسم کی اٹھکھیلیوں میں مشغول ہو جاتا ہے جیسے کہ اوپر تھا۔ چونکہ پانی برابر رواں ہے اسلئے اوپر سے نیچے تک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفاف پانی کی تمام چادریں اور فوارے ایک ہی ساتھ اوپر سے رقص کرتے ہوئے نیچے چلے آرہے ہیں اور بالآخر سب سے نیچے والے حوض سے گزر کر خدا حافظ کہتے ہوئے اُس خوبصورت وسیع ڈل جھیل میں گر کر غائب ہو جاتے ہیں جو دامن کوہ میں انکو اپنی آغوش میں لینے کے لئے منتظر کھڑی ہے۔ پانی کی اس چادر کے گرنے کی سُریلی آواز اور حوض کے فواروں کی گنگناہٹ کشمیر کے اُن خوبصورت رنگ برنگ خوش الحان طیور کو راگ سُر کا کام دیتی ہے جو آس پاس کے خوشنما خوشبودار درختوں کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے چہچہاتے ہیں اور بعض تو من و عن واقعی گاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نشاط باغ و شالامار باغ کا یہ پہلا سماں دیکھکر یقینا ہے کہ ناظرین کی زبان پر کسی اگلے شاعر کا یہ شعر ہے

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

بے اختیار آجائے اور وہ اسکی واقعیت کی صدق دل سے تصدیق کریں
اب ناظرین باغات میں تیرتے ہوئے زینہ بہ زینہ پہاڑ کی چوٹی تک قدم بڑھائیں
اگرچہ راہ میں ہر چمن اور اسکی ہر کیاری آنکھوں کو ایسی مرغوب ہوگی کہ ہر قدم
پر قدم بڑھانے کو جی نہ چاہیگا اور ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

کی کیفیت ہوگی۔ مگر اس موقع پر ہم کو تو صرف عہد مغلیہ کا تمدن دکھانا مد نظر ہے
اسلئے ہم نے پھولوں پر نظر بھی نہیں ڈالتے بلکہ جلدی سے چوٹی کے باغ
پر پہنچتے ہیں۔ یہاں پہلے اس کنجی کے انتظام کو دیکھیے جو تین سو برس قبل
اسطرح بنائی گئی تھی ایک جنبش سے باغ کے تمام فوارے اور چادریں آناً فاناً میں
بند ہو سکتی ہیں اور دوسری جنبش سے پھر رواں ہو سکتی ہیں یہ ایسی حکمت تھی جس سے
پہاڑ کی چوٹی پر پانی کے قدرتی چشمہ کو قابو میں کر لیا گیا تھا۔ اسکے بعد کچھ
اور سیرگاہوں کے نشانات و آثار پر نظر ڈالتے ہوئے پرانے سایہ دار چنار تما
جنار کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں کا لطف اٹھاتے ہوئے ان تیلی تیلی
سڑکوں پر (جو ایک بڑے حوض کو اقلیدس کی مستطیل و مربع شکلوں میں تمام شہر
اسکے اندر بنائی گئی ہیں اور جنہیں شفاف پانی کے فوارے ہر جانب طرح طرح
کے رقص کا سماں دکھا رہے ہیں) چہل قدمی کیجیے۔ بالآخر اس چھوٹی سی

عمارت میں جو وسط حوض میں بنی ہوئی ہے اور جو اپنے محرابوں چھتوں اور
مینا کاری کے کام سے سرسینک آرٹ (Saracenic Art) کا نمونہ ہے
آرام فرما ہے۔ اب اس سنگ مرمر کے تخت پر جس پر نورجہاں جلوہ افروز
ہوکر مناظر قدرت کا تماشا دیکھا کرتی تھیں مغرب تخ منہ کرکے کھڑے
ہو جائیے۔ یہ ذہن میں رہے کہ یہ پہاڑ کی چوٹی ہے سامنے اُن باغات
کے زینے ہیں جنکا ذکر ہو چکا ہے انکے بعد صرف ایک سڑک درمیان میں
ہے پھر میلوں تک اس ڈل جھیل کا پانی سطح پر انگڑائیاں لیتا ہوا
نظر آئیگا جسکی شفافی کی یہ حالت ہے کہ تہ میں مچھلیاں چلتی پھرتی نظر
آتی ہیں اور پانی کے اندر جو درخت اور بیل پھول ہیں بعض مقامات پر
انکی پتی پتی دکھائی دیتی ہے (شکارہ میں چلتے وقت اس شفاف پانی
میں آس پاس کے پہاڑوں اور باغوں کا جو عکس پانی میں لہراتا نظر آتا ہے
اکثر میں اپنی نظر اُس سے منٹوں تک نہ ہٹا سکا) خیر اس تخت شاہی سے
نظر اور آگے بڑھائیے اور سامنے دور گلمرگ وغیرہ کے برفانی پہاڑوں کو
دیکھئے جنکی سفید برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں
اگر یہ وقت طلوع آفتاب کا ہے تو تصور میں ہر جگہ پر روپہلی افشاں
چھڑکی ہوئی نظر آئیگی اور اگر غروب آفتاب کا وقت ہے تو آپ دیکھتے
ہیں۔ یہاں سے لیکر برفستان تک یہ معلوم ہوگا کہ سنہری کرنوں اور تفشں کا
مینہ برستا ہے یہ مختصر بیان اس منظر کا ہے جو میں نے اکثر نشاط باغ و شالامار باغ
جاکر دیکھا ہے۔

نورجہاں کے تمنا کا عکس

نشاط باغ و شالا مار جنکا بیان ابھی ہوا دراصل نورجہاں نے تیار کرائے تھے۔ جہاں جہاں شیریں چشمہ معلوم ہوا یا جہاں پرلطف منظر دکھائی دیا وہاں اس مغلیہ خاتون نورجہاں نے اپنے خیالات و مذاق کا عکس باغات کی صورت میں اسطرح چھوڑ دیا کہ آج تین سو برس بعد بھی ہم اُس سے لطف اٹھا رہے ہیں جب اس بڑھاپے میں ان باغات کے مناظر کا یہ عالم ہے تو جوانی میں دلفریبی کی کیا حالت ہوگی میں نے اس نمونہ کے باغات کے آثار ویری ناگ اور اچھبل وغیرہ مقامات پر بھی دیکھے ہیں۔ ان پہاڑوں سے کیا دلی تعلقات ہونگے جنہوں نے انکی یہ قدر و منزلت کرائی جسکا صرف خیال کرنے سے وجد آتا ہے غالبًا ایسے ہی وجد کی حالت میں عرفی نے کشمیر دیکھکر وہ قصیدہ لکھا ہے جسکا مطلع یہ ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

جامع مسجد

ناظرین کو عہد مغلیہ کی قدیم عمارت میں لیجائے بغیر میں سرینگر کے حالات ختم نہیں کر سکتا۔ سرینگر میں آج بھی مسلمان اُس جامع مسجد میں خدا کی عبادت کر رہے ہیں جو عہد شاہ جہاں میں بنی تھی اسکا پھاٹک اسکا صحن اور اسکی چھت کے ستون آج تک اُسکے بنانے والوں کے پاکیزہ خیالات اور اعلیٰ تمدن کا ثبوت ہیں۔ ہر ستون دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بلند دیودار درخت کا زبردست تنہ سالم کا سالم زمین میں نصب کر دیا گیا ہے

وہ کونسا جرثقیل تھا جو اُن ستونوں کو جنگل سے وہاں لایا۔ ہم گزشتہ تیس
چالیس برس سے ایسی عمارتوں میں لکڑی کے شہتیروں کے بجائے لوہے
کے گرڈر بلحاظ صفائی و سہولت استعمال کر رہے ہیں لیکن عمارت میں
ہم کو لوہے کی عمر ابھی پوری طرح معلوم نہیں ہوئی۔ تین سو برس کی پرانی
مسجد کے ان ستونوں کو دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید عمارت میں
لکڑی کی عمر زیادہ نہ ثابت ہو۔ اس مسجد کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے
کہ جب شاہ جہاں بادشاہ نے سرینگر کا دورہ کیا ہے تو وہاں کی رعایا
نے کچھ شکایتیں اُنکے حضور میں پیش کیں اُسپر ایک فرمان نافذ ہوا اور
یہ فرمان زبان فارسی میں اس پتھر پر بجنسہٖ کندہ کر دیا گیا جو مسجد کے پھاٹک
پر آج بھی نصب ہے اس کتبے میں منجملہ دیگر احکام کے ایک حکم ہے جس کا
خلاصہ بدیں مضمون ہے کہ "ما بدولت کو تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ
زعفران کی پتی چننے والوں کو اور شال پر سوئی کا کام بنانے والوں
کو بعض اوقات پوری مزدوری نہیں ملتی۔ لوگ اسکا اندازہ کر سکتے ہیں
کہ اس قسم کے کام کرنے والوں کی آنکھوں پر کسقدر زور پڑتا ہے۔ امید ہے کہ
آیندہ ایسی شکایات ما بدولت کے کانوں تک نہ پہنچینگی" ناظرین خیال کر سکتے
ہیں کہ رعایا کی رسائی اس بادشاہ تک کیونکر ہوتی تھی اور اس بادشاہ
کے دل میں اپنی رعایا کے ساتھ کس درجہ ہمدردی تھی اور اس کی تحقیقات
اور معلومات کی کیا حد تھی کہ وہ جانتا تھا کہ ان مزدوروں اور کاریگروں
کو کیسی کچھ مشقت برداشت کرنی ہوتی ہے اور اسکا انکی صحت پر کیا مضر

اثر ہوتا ہے لہذا اس نے محض کاغذ پر حکم لکھنے پر اکتفا نہ کی بلکہ رعایا کی تکلیف کے دفعیہ کے لئے اپنا حکم ایک ایسے منظر عام پر کندہ کرا دیا جو اسوقت تک اس کی بیدار مغزی کے ثبوت میں آفتاب بنکر چمک رہا ہے۔

مینے ناظرین کا بہت وقت ضایع کیا جسکی معافی چاہتا ہوں لیکن میرا اصلی مقصد بغیر اس تفصیلی بیان کے شاید نہ حاصل ہوتا۔

کشمیر کا تمدن

اب ان تمام واقعات پر فلسفیانہ گہری نظر ڈالئے۔ سائنس یہ بتلا رہی ہے کہ ہزاروں میل کے لمبے چوڑے سمندر میں ایک لکڑی چھوڑدی جاتی ہے تو گو ہماری آنکھیں نہ دیکھہ سکیں مگر اس لکڑی سے جو لہر پیدا ہوتی ہے وہ اوسوقت تک ختم نہیں ہوتی جبتک اسکو سمندر کا کنارہ نہ ملے۔ اسیطرح اگر ہوا میں حرکت کے ذریعہ سے کسی مقام پر کوئی لہر پیدا کیجائے تو اُسکا اثر اس تمام کرہ ہوا پر پڑتا ہے جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ وائرلس (wireless) یعنے بغیر تار کے خبر پہونچانے کا طریقہ سائنس کے اسی اصول پر مبنی ہے۔ انسان کے دماغ میں بہت کم ایسے خیال آتے ہیں جو اپنا کچھہ نہ کچھہ اثر اُسکی روح پر نہیں چھوڑ جاتے اسیطرح کوئی تمدن بھی کسی ملک میں وہاں کے باشندوں پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کیا ناظرین خیال کرسکتے ہیں کہ عہد مغلیہ کے بادشاہ کشمیر کو بہشت بنانے کی کوشش کریں اور اس سے وہاں کے لوگوں کا مذاق یا تمدن متاثر نہ ہو؟ میں جب کبھی نشاط باغ و شالامار کو جایا کرتا تھا تو مجھہ کو ایک بات ہمیشہ محسوس ہوا کرتی تھی کہ جمعہ کے دن سینکڑوں کشمیری معہ بال بچوں کے کشتیوں اور شکاروں

پر سوار ہو کر ان باغوں کو آتے ہوئے اور پھر وہاں دن بھر گزار کر شام کو
ڈل جھیل کے راستے میں واپس جاتے ہوئے میں دیکھا کرتا تھا۔ میرا
خیال ہے کہ یہ مذاق اسی تمدن کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر زیادہ ثبوت کی
ضرورت ہو تو اسی کشمیر کے پہاڑوں کی دوسری جانب تبت کی طرف
جا کر جہاں عہد مغلیہ کے تمدن کا زیادہ اثر نہ تھا وہاں صنعت پر لہاسا پیٹرن
(Lhasa Pattern) کے بجھ کھو پر نما ہیبت ناک جانوروں
کی صورت لکڑی یا نمدوں پر بنی ہوئی دیکھئے اور پھر اسکا مقابلہ کشمیر پیٹرن
Kashmere Pattern سے کیجئے۔ لکڑی پر، سرسی پر، شالوں پر
قالینوں پر جا بجا جہاں اہل کشمیر نے صنعت پر اپنا پیٹرن یا نمونہ دکھایا ہے
وہاں خوبصورت خوبصورت چنار کی پتیاں اور نازک نازک پھول بنے ہوئے
نظر آتے ہیں۔ انکی دستکاریوں میں وہ جھاڑ فانوس دکھائی دیتے ہیں
جو ایران کی صنعتوں میں ہوا کرتے ہیں انکی زبانوں کو ایرانی کھانوں کا
مزا عہد مغلیہ میں پڑا۔ اب کچھ ہی حالت ہو مگر کشمیر کے عمدہ باورچی کا
یہ دعوٰے رہا ہے کہ کسی دوسرے ملک کا باورچی اس سے بہتر و لذیذ کھانا
نہیں پکا سکتا۔ ذرا غور کیجئے کہ یہ ڈشز اور کھانے دراصل کس ملک کے ہیں۔
میری رائے میں کشمیری کھانے دراصل ایرانی کھانے ہیں کشمیر کی عوت پلاؤ
سے شروع ہوتی ہے۔ اب تو انگریزوں اور انکے مقلد انگریزی دانوں کے
نئے مذاق نے کشمیری باورچیوں کو فن طباخی اسطرح بھلا دیا ہے جیسے یورپ
کے مشین کے بنے ہوئے سستے جامہ واروں نے کشمیر کی سوئی کی مہین بیریا

اور خوشنما صنعت کو مٹی میں ملا دیا سرینگر ایک وہ سرینگر تھا جہاں سے ۱۸۵۵ء

تک کئی لاکھ روپیہ سالانہ کی شالیں یورپ کے بازاروں میں جاکر فروخت ہو

کرتی تھیں اور آج وہی سرینگر ہے جسکے سوداگر سوائے نمونوں کے عمدہ

شالیں بنا کر بھی اسلئے نہیں رکھتے ہیں کہ انکی مانگ نہیں ہے۔ نمونہ دیکھکر جب کوئی

شخص خاص طور پر فرمایش کرتا ہے تب کہیں مہینوں میں ایک آدھ شال بنا کر

دیدیتے ہیں۔ اب تو کشمیر میں وہ پرانا کام نظر نہیں آتا۔ میرا اصلی پوئنٹ

یہ تھا کہ عہد مغلیہ کے تمدن نے ہمالیہ کے پہاڑوں کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچایا

ہے اور کشمیریوں کی صنعت و حرفت، تجارت، دولت، پوشاک، غذا

اور انکے کل مذاق و تمدن میں بہت کچھ تبدیلیاں اسی دور مغلیہ میں ہوئی

ہیں۔ ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھکر عہد مغلیہ کا مقابلہ اس زمانہ کی

تمام دنیا کی سلطنتوں سے کر لیا جائے تو ہندوستان دنیا کے کسی حصہ سے

ترقی اور تہذیب میں کم نہ پایا جائیگا۔

ہند کو مسلمانوں کے وجود سے فائدہ

ابھی تک اُن ترقیات کا ذکر کیا گیا جو ہند کی زمین اور

دریاؤں اور پہاڑوں اور تمدن میں عہد مغلیہ نے کر دکھائیں

اب ہم اس ملک میں مسلمانوں کے وجود پر ایک سیاسی نظر ڈالنا چاہتے ہیں

کیا اس ملک میں مسلمانوں کا وجود بالآخر مفید ثابت ہوگا؟ میری رائے

یہ ہے کہ اگر ہند کی رگوں میں ترکستان۔ افغانستان و ایران و عرب کا

خون شامل ہو گیا ہے تو اس امتزاج سے ہند کی اصلی اندرونی قوت میں اضافہ

ہو گیا اور ہوتا رہیگا۔ بڑی بات جو ہند کو مسلمانوں کی آبادی سے عہد مغلیہ

حاصل ہوئی وہ یہ ہے کہ چنگیز خاں، تیمور، نادر شاہ کی طرح سیلاب کی صورت میں آکر پھر یہاں سے واپس نہیں گئے بلکہ مستقل طور سے یہیں بس گئے ہیں اور اس ملک کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا۔ انکی کوئی علٰحدہ سول لائنس (Civil Lines) اس طرح کی نہیں ہیں جیسے ہمارے موجودہ حکمرانوں کی ہیں۔ وہ ہند کے گوشت پوست اور خون میں شامل ہو گئے۔ مجھ کو تو معلوم ہو رہا ہے کہ جو جو قوت انگلستان کی اصلی سیکسن (Saxon) کو اُن کی سرزمین پر یورپ کی مختلف اقوام کے بس جانے سے بالآخر حاصل ہوئی تھی وہی قوت اہل ہنود کو سرزمین ہند پر ایشیا کے مختلف مسلمان اقوام کے امتزاج سے بالآخر حاصل ہوگی۔ علی الخصوص جبکہ ان نئی آنے والی قوموں میں سے بعض ایسی ہیں جنکے آباؤ اجداد وہی آریا تھے جنکی اولاد و اخفاد اور نسل میں ہونیکا فخر اہل ہنود کو ہے انگلستان کے باشندے اندرونی معاملات میں چاہے کتنی ہی جنگ کریں لیکن جب جرمنی کا مقابلہ پڑ گیا تھا تو انگلستان کی کل آبادی ایک سر بلکہ تھی کیونکہ غیروں کے مقابلہ میں اغراض متحد تھے انسانی خلقت کا تقاضا یہی تھا۔ میری رائے میں ہند کی آخری حالت یہی ہونے والی ہے۔ آج ہر ملک کی قوت کا معیار اُس ملک کی آبادی اور وہاں کے باشندوں کی جسمانی و دماغی قوت کا خزانہ قرار دیا گیا ہے جس اصول پر آج اسٹریلیا، کناڈا، نیوزیلینڈ وغیرہ نوآبادیات والے اپنی قوت بڑھانے کے لئے جو تدبیریں اختیار کر رہے ہیں اور یورپ کے باشندوں کو

اپنے ممالک میں لیجا کر بسانے کی کوشش کر رہے ہیں وہی مقصد ہند کو سینکڑوں برس ہوئے مسلمانوں کے آنے اور بس جانے سے حاصل ہو چکا ہے۔

پین اسلام ازم

لوگ بعض وقت میں پان اسلام ازم (Pan Islamism) کے خیال سے چونکنا ہو جاتے ہیں۔ ہم اس باب کے حصہ دوم میں دکھلا دینگے کہ پین اسلام ازم ایک خیالی چیز ہے جس سے خوف کھانا فضول ہے۔

مسلمان کیوں آئے؟ بے سود بحث

ایک اور بات بھی ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیئے وہ یہ کہ آیا مسلمانوں کو اس ملک میں آنا چاہیئے تھا یا نہیں اسطرح فضول ہوگی جیسے اس ملک کے اُن اصلی باشندوں کا جو آریا قوم کے آنے سے قبل یہاں آباد تھے یہ اعتراض کرنا کہ اہل ہنود یہاں آکر کیوں بسے اور قابض ہوئے یا یوں کہیئے کہ جیسے چھوٹے بھائی کے تولد ہو جانے کے بعد بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی کی پیدائش پر اعتراض کرنا فضول ہوگا۔ مسلمانوں کو قدرت لائی یا شمشیر لائی یا ضروریات زمانہ لائیں کسی نہ کسی طرح وہ آگئے اور ہند کے گوشت و پوست میں شامل ہو گئے دیکھنا یہ ہے کہ جب وہ آگئے تو مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے تمدن کو اُنکی ذات سے فائدہ پہنچا یا نقصان اور یہی دکھانے کی کوشش کیگئی ہے۔

مسلمانوں کے انحطاط کا اثر ہند پر

میرا خیال ہے کہ اگر کبھی مسلمان اس ملک سے نیست و نابود ہو گئے یا وہ اس قدر گر گئے کہ اُنمیں کوئی قوت باقی نہ رہی (گو کہ ایسا ہونا محال ہے) تو ہند میں بھی ایسا انحطاط پیدا ہو جائیگا

جیسے کسی شہ رگ کے ذریعے جسم کا خون نکل جانے سے ہوتا ہے دیکھ لیجئے
جب اسپین مسلمانوں سے خالی ہو گیا اور اسکی رگوں سے عرب کا خون ایک
مرتبہ ملکر پھر نکل گیا تو جو انحطاط اسپین میں پیدا ہو گیا۔ اسکا علاج یورپ
بھی آجتک نہ کر سکا۔ لیکن اگر مسلمان ہندوستان میں مثل اہل ہنود کے
یہاں پھلتے پھولتے رہے تو اس ملک کی چپہ چپہ زمین کے لئے یہ اپنا
خون بہا دینگے۔ اس پر غور کیجئے کہ جب ہند میں عہد مغلیہ کا دورہ تھا تو
وہ ہندوستان کو ہر بیرونی قوت کی مداخلت سے ہمیشہ محفوظ رکھنے میں
کوشاں رہے خواہ وہ بیرونی قوت افغانستان کی ہو یا ایران کی نادر شاہ
کی ہو یا کسی دوسرے ملک کی ہو۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انکا اصل وطن اسی
میں ہے کہ ہند پر کسی غیر ہندی کا عمل دخل نہ ہو۔ مسلمانوں کے انحطاط
سے اس ملک کی سپر کمزور ہو جائیگی۔

نقطۂ نظر وسیع ہونا چاہیے

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ عہد مغلیہ نے سرزمین ہند اور اسکے
دریاؤں اور پہاڑوں میں کیسے کیسے بہترین تغیر پیدا
کر دئیے۔ اسکی تہذیب و تمدن پر کیا کیا اثر پڑا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے ہم یہ
بھی بیان کر چکے کہ اس ملک کو مسلمانوں کے وجود سے کیا کیا فوائد
نصیب ہوئے اور کیا کیا آئندہ ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔

اب ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ
ہندو برادران وطن کے لئے عہد مغلیہ کے متعلق صحیح نقطۂ نظر کیا ہوگا۔ کوہ
ہمالیہ کے ایک غار میں بیٹھکر اگر ہم ایک چیونٹی کیطرح رینگنا شروع کریں تو ہر چیز

ہم کو تاریک و بدنما معلوم ہوگی لیکن اگر ہم کسی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اس
عظیم الشان پہاڑ کی چوٹیاں، برفستان اور اسکا کل منظر مجموعی حیثیت
سے دیکھیں تو پھر اسکی چھوٹی چھوٹی بدنمائیوں پر نظر نہیں پڑتی اور وہ
خوبصورت پہاڑ نہ صرف قدرت کا عجیب و غریب منظر معلوم ہوتا ہے بلکہ
ہندوستان کی پشت و سپر دکھائی دینے لگتا ہے۔ اسیطرح اگر ہم عہد مغلیہ
کے ٹکڑوں کو علحدہ علحدہ دیکھیں تو ممکن ہے کہ بہت سے ٹکڑے بدنما معلوم
ہونگے لیکن اگر اس کل عہد کے کارنامے جمع کئے جائیں یا اس عہد کی ایک
پوری تصویر کھینچی جائے تو عہد مغلیہ بھی تاریخ ہند میں قدرت کا عجیب و غریب
دلکش نظارہ معلوم ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اس ملک کی تاریخ میں عہد مغلیہ
اسیطرح قابل فخر ہے جیسے عہد اشوک یا چندر گپت انکے زمانہ کی حالت کے
اعتبار سے تھا۔ ویدوں کے زمانہ بلکہ اسکے بعد کی بھی مکمل صحیح تاریخ ہند مرتب
کرنا تو دشوار ہے لیکن آج ہم عہد مغلیہ کے ہر کارنامہ کو پیش کرکے ہند کی تہذیب
دولت، تجارت، مذہبی رواداری، انتظامات، عمارات، باغات، اور
کل تمدن کا مقابلہ دنیا کے تمام ملکوں سے کرنے کو موجود ہیں۔ ہم اپنے موجودہ
یورپ کے حکمرانوں کے سامنے اس عہد مغلیہ کے کارنامے اس امر کے ثبوت
میں پیش کرسکتے ہیں کہ اگر ہم کو پورا موقع دیا جائے تو ہم دکھا دینگے کہ گو
آج ہم بے بس ہیں اور موقع نہ ملنے کی وجہ سے اپنی اصلی قابلیت ظاہر
نہیں کرسکتے۔ لیکن ہم صدیوں اس ملک کی حکومت کا انتظام اوس زمانہ
کے حالات کے اعتبار سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کرچکے ہیں۔ میری

رائے میں اگر ہند کی کل تاریخ ایک مرصع زیور خیال کی جائے تو عہد مغلیہ اس کا وہ درخشاں اور شاندار کوہ نور ہیرا ہوگا۔ جسکے نکال ڈالنے سے زیور کی خوبصورتی اور جگمگاہٹ ہی جاتی رہیگی۔ یا کم سے کم یہ ہے کہ بالکل مدہم پڑجائیگی۔

اہل ہند کا صحیح نقطۂ نظر

میرے پاس اسوقت مسٹر جسٹس مہادیو گووند رینڈے کا وہ مضمون نہیں ہے جسمیں انہوں نے عہد مغلیہ کی نسبت اپنا نقطہ نظر بتایا تھا لیکن جہاں تک میرا حافظہ مدد دیتا ہے ان کا خیال یہ ہے کہ ہند کو اپنی منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے بہت سی منزلیں طے کرنی تھیں اس معراج ترقی میں عہد مغلیہ بھی ایک ضروری منزل اور زینہ تھا جسکے طے کئے بغیر ہند اپنی موجودہ حالت پر نہیں پہونچ سکتا تھا میں اس رائے سے بالکل متفق ہوں۔ عہد مغلیہ نے ہند کو اس کے نصب العین ترقی کے قریب پہنچانے میں مدد دی ہے اور کبھی اس میں ہرج نہیں ہوا عہد مغلیہ ہند کا وہ شاندار زمانہ ہے۔ جس پر اہل ہند کو فخر کرنا چاہیئے اہل ہند کو چاہیئے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان عہد مغلیہ کو اپنا عہد تصور کریں۔ یہ عہد غیر ہندی عہد نہ تھا اس عہد کا یہ مقصود نہ تھا کہ ہند کا مفاد کسی دوسرے ملک کے مفاد کا تابع ہو۔ عہد مغلیہ کی نسبت ہندو برادران وطن کا صحیح نقطہ نظر یہی ہوگا۔

باب دہم ۔ حصہ دوم

مسلمانوں کا نقطۂ نظر

تمہید اب ہم کو اس پر غور کرنا ہے کہ ہندوستان کی نسبت مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر کیا ہوگا۔

میری رائے میں فی الحقیقت اس کا فیصلہ تو اسی روز ہو گیا تھا جبکہ مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن قرار دیا تھا۔ لیکن بعض وقت کچھ تو خود مسلمانوں کے طرز عمل سے اور بعض وقت غلط فہمی سے انکی سچی حب الوطنی کی نسبت شبہات کیے جاتے ہیں شبہات پیدا کرنے والا طرز عمل عموماً ان جذبات میں مضمر ہوتا ہے جن کا اظہار وہ مسئلہ خلافت اور "پین اسلام ازم" "Pan Islamism" کے سلسلہ میں کیا کرتے ہیں۔ ایا کسی عارضی جوش میں محض زبان سے یہ کہہ گزرتے ہیں کہ ہم مسلم پہلے ہیں ہندی بعد کو ہیں۔ بس یہی ہمارے وہ نمائشی جذبات ہیں جو بعض اوقات سیاسی مطلع کو غبار آلود کر دیتے ہیں اور ہندوستان کے متعلق ہمارے صحیح نقطہ نظر پر جو ایک دوسرا مسئلہ ہے پردہ ڈال دیتے ہیں۔

لہٰذا ہم اول اسی قسم کے جذبات کی واقعیت اور قوت پر ایک نظر ڈالیں گے تاکہ اس امر پر رائے ظاہر کرنے میں کہ ہندوستان کے متعلق ہمارا نقطہ نظر

کیا ہے بالآخر ہم کو مددملے اور اس کے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "سیاسی خلافت" سے ہماری کیا مراد ہے۔

سیاسی خلافت سے مراد

"سیاسی خلافت" سے مراد ہماری ایسی خلافت ہے جو تمام دنیا کی مسلم آبادی کی (خواہ وہ کسی اسلامی سلطنت کی ہو یا غیر اسلامی مملکت کی) مرکزی قوت بنکر اسکی متحدہ قوت کو کل مسلمانوں کے سیاسی اغراض و مفاد کے لئے استعمال کر سکے اور اپنے قبض و اختیار میں رکھے جس شخص میں یہ مرکزی قوت موجود ہو وہی سیاسی خلیفہ ہوگا۔ مسلمان خلافت کیساتھ "سیاسی" کا لفظ استعمال نہیں کرتے لیکن ہم نے صرف اسی سیاسی مرکزی قوت کے خیال و تصور کو مختصر الفاظ میں ظاہر کرنے کے لئے "سیاسی خلافت" کے الفاظ استعمال کئے ہیں تاکہ بار بار مطول عبارت نہ لکھنی پڑے۔ لہذا جہاں کہیں ہم "سیاسی خلافت" کے الفاظ استعمال کریں گے ہماری مراد اسی قسم کی قوت سے ہوگی۔

سیاسی خلافت محال ہے

منجملہ اُن جذبات کے جو ہندوستان کے تعلق سے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بدل سکتے ہیں۔ سیاسی خلافت کا جذبہ بھی ہے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ اگر غیر مسلموں کے دلمیں اس کا خوف ہو کہ مسلم اندرونی طور پر کسی سیاسی خلافت کی حمایت میں اگر اپنے اصلی وطن کے سیاسی مفاد کو پس پشت ڈال دینگے یا اگر کوئی مسلمان کسی ایسی خلافت کا خیال بھی دل میں لاتا ہو تو ہماری رائے میں یہ خوف اور یہ خیال دونوں ایک خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ عملی طور سے نہ کبھی ایسا ہوا

اور نہ ایسا ممکن ہے لوگ یہ کہیں گے کہ ابھی تک جو شخص مسلمانوں کا خلیفہ تسلیم کیا جاتا رہا وہ دراصل ایک سلطنت کا حکمران رہ کر رات دن سیاسی سمندر میں غوطہ زن رہا۔ پھر یہ کیونکر کہا جاتا ہے کہ "سیاسی خلیفہ" یا "سیاسی خلافت" کا خیال نقش بر آب ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ایسا بادشاہ خلیفہ تو ضرور کہلایا گیا لیکن اس میں سیاسی خلافت کی قوت یا خلافت کے اوصاف کبھی نہیں پائے گئے۔

تاریخ اسکی شاہد ہے۔ آنحضرت کی وفات کے بعد جو چار خلفاء راشدین یکے بعد دیگرے ہوئے انکی نسبت تو کچھ شبہ نہیں کہ جو جذبات ان کے دلمیں موجزن تھے وہ صرف اشاعت اسلام کے تھے۔ دنیوی بادشاہت یا یوں کہئے کہ محض بنی نوع انسان پر حکومت کرنے کا خیال انپر غالب نہ تھا۔ مگر ان چار خلفاء کے بعد یہ حالت نہ رہی۔ جونہی اسلامی سلطنتیں بیرون حدود عرب قائم ہونا شروع ہو گئیں انہیں وہی حالت پیدا ہو گئی جو فطرت کا تقاضا تھا اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے۔ یہی پیشگوئی آنحضرت کی بھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سلطنت کے اغراض و مفاد علیحدہ علیحدہ ہو گئے اور پھر یہ محال ہو گیا کہ کسی ایک اسلامی سلطنت کا حکمران سیاسی امور میں کسی دوسری اسلامی سلطنت کی رائے و مشورہ کا محکوم اور پابند ہو۔ ایک بادشاہ خلیفہ تو کہلاتا رہا مگر اس میں سیاسی خلافت کی مرکزی قوت کبھی نہیں پائی گئی۔ یہ خلافت کبھی کسی اسلامی سلطنت کو دوسری اسلامی یا غیر اسلامی قوتوں کی دست درازی سے محفوظ نہ کر سکی

نہ کبھی یہ خیال تک ہوا کہ اُسکا زوال صرف خلافت کا (جزو ہی سہی) نقصان ہے۔ جب تاتاریوں نے بغداد کا پایۂ تخت الٹ دیا۔ مصر و اسپین تو کجا پڑوسی عرب تک امداد کو نہ پہونچے۔

جب شہزادہ فرڈینڈ اور ملکہ آئیزبیلا کے عہد میں لاکھوں مسلمانوں کے خون سے اسپین کے در و دیوار رنگین ہوئے اور اسلام کے لاکھوں نام لیوا جلا وطن کئے گئے۔ لاکھوں کلمہ گویوں کو بالجبر عیسائی بھی بنایا گیا اور بے شمار مسلمان آگ میں زندہ جلا دئے گئے اُس وقت کونسی وہ مرکزی قوت تھی جو سپر بنی؟

جب ہندوستان کے تخت تیموریہ پر یورپ کے سوداگروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے دست درازی شروع کی تب کوئی ایسی مرکزی قوت نہ پائی گئی جو اُن کو روک سکتی۔ جب یہ اسلامی قوت بھی نیست و نابود ہو گئی تب سرزمین یورپ پر خلیفۃ المسلمین کا وجود اور اُنکی حکومت یورپ کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی میدان صاف پاکر پہلے زار (۱۸۵۴ء) روس نے ابتدا کی۔ پچاس برس ہوئے جب قسطنطنیہ کے دروازہ پر آکھڑا ہوا اور خلیفہ سلطان کو خواب غفلت سے بیدار کیا اُسوقت اُن کے پاس کوئی مرکزی قوت ایسی نہ پائی گئی جس سے اُن کو کچھ بھی مدد ملتی اور اُن کو ایک حد تک یورپ سے قدم ہٹانا پڑے۔ پھر تو یورپ کی یہ مسلمہ پالیسی ہو گئی کہ "ترکی" کے قدم جس طرح جلد ہو سکے بقیہ سرزمین یورپ سے اُکھاڑ دئے جائیں جب اس پالیسی کو اس قدر

نشو ونما ہوا کہ اولاً اٹلی نے اور پھر بلقان کی پانچ متحدہ قوتوں نے یورپ کی اندرونی کمک و مدد سے خلیفۂ اسلام کے نشانِ ہلالی کو نیچا دکھانا شروع کیا تو انگلستان جیسے مدعی بے تعصبی کا وزیر اعظم بھی اپنے جوش مذہبی کو روک نہ سکا اور عام جلسہ میں اسنے اسپر اظہار مسرت کیا کہ آج اسلام مسیحی ممالک سے رخصت ہو رہا ہے لیکن پھر بھی دنیا کے مسلمان سوائے تماشہ دیکھنے کے نہ کچھ کر سکتے تھے اور نہ کیا اور سلطان میں کوئی مرکزی قوت ایسی نہ پائی گئی جو اس آڑے وقت میں کام آسکتی بالآخر خود یورپ کی قوتوں میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور خلیفہ نے جو یورپ کی پالیسی سے عاجز آگئے تھے اپنی آئندہ کی حفاظت اسیمیں ہی سمجھی کہ کسی قوت کا ساتھ دیکر خود اس جنگ میں کود پڑیں اس وقت دنیا کے مسلمانوں کی حمیت دینی دیکھکر جو کچھ سیاسی خلافت یا مرکزی قوت کی رہی سہی نمایشی ساکھ یورپ میں تھی اسکی بھی قلعی کھل گئی سب سے پہلا ملک جس نے خلیفہ کا ساتھ چھوڑا وہ عرب تھا۔ غالباً وجہہ یہ تھی کہ سیاسی خلافت تو محال تھی ہی اور ترکوں نے اپنے سیاسی مفاد سے عربوں کو ہمیشہ دبا یا بھی تھا۔ البتہ ہندوستان کے چند مسلمانوں نے غل پکار مچا کر معتد بہ رقم جمع کی مگر اس میں سے ایک جزو قلیل جنگ کے بعد ترکوں کو بھیجا اور باقی خود صرف کر لی جس نے لیپا پوتی کرنے کی کوشش کو دیکھکر اور بھی نفرت بڑھتی ہے۔

موجودہ صورت یہ ہے کہ وہ شخص جسپر سیاسی خلیفہ کے الفاظ کسی حد تک صادق آسکتے تھے اسکو خود ترکوں نے دار الخلافت سے خارج کر دیا

اور اسکی وہ سلطنت جو یورپ و ایشیا کے بر اعظم کا معتد بہ حصہ گھیرے ہوئے تھی سمٹ سمٹا کر انگورہ گورنمنٹ کی صورت میں ظہور پذیر ہو گئی الحاصل اب اس دنیا میں آج کوئی ایسا شخص بھی نہیں دکھائی دیتا جو اس معنی میں سیاسی خلیفہ کہا بھی جا سکے جسکی تعریف ہم کر چکے ہیں۔ گزشتہ تیرہ سو برس کی خلافت کی یہ مختصر حقیقت ہے اس کے ملاحظہ کے بعد کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ ابتداء کے چار خلفاء راشدین کے کے زمانہ کے بعد ان تیرہ سو برس میں جن جن بادشاہ نے مسلمانوں کے خلیفہ ہونے کا دعوے کیا انہیں واقعی تمام دنیا کے مسلمانوں کی کوئی ایسی سیاسی مرکزی قوت موجود تھی جس کو وہ سب کے فائدے کے لئے استعمال کر سکتا تھا یا اس نے کبھی واقعی اس قوت کو استعمال کیا اگر ایسا ہوتا تو اب تک تمام عالم اسلام کی قوت و تمدن سے مسخر ہو گیا ہوتا۔ ہماری رائے میں یہ قصور محض خلیفہ کا نہ تھا بلکہ یہ امر بھی محال تھا۔ کیونکہ ہر ملک کی سیاسی ضرورتیں اور اغراض علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں بلکہ بسا اوقات باہم متضاد ہوتی ہیں اور اس حال میں ہر دنیوی بادشاہ کا ہمیشہ یہی فرض ہوگا کہ وہ اپنی رعایا اور ملک کے مفاد کو بمقابلہ دیگر ممالک کے مفاد کے خواہ وہ اسلامی ہی کیوں نہ ہوں ترجیح دے۔ یہ تو خیر بادشاہ کا فرض ہے لیکن بادشاہ کو چھوڑ کر اگر کسی ملک کے مسلمان باشندے بھی اپنے سیاسی مفاد اور اغراض کسی ایسے خلیفہ بادشاہ سے وابستہ کرنا چاہیں جو اُن کے ملک کا بادشاہ نہیں ہے تو وہ مسلمان اگر

خود مختار سلطنت ہی رکھتے ہونگے تو بھی کچھ عرصہ کے بعد اسی قسم کی حالت محکومی میں گرفتار ہو جائیں گے جیسا کہ اہل عرب عرصہ تک ترکوں کے ہاتھوں میں بادل ناخواستہ رہے اور اگر وہ مسلمان کوئی اسلامی خود مختار سلطنت نہیں رکھتے بلکہ دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ اُس ملک میں آباد ہیں جیسا کہ ہندوستان میں تو ایسی صورت میں اُس ملک میں اُن کا بقاو قیام ویسا ہی دشوار و محال ہو جائیگا جیسا کہ اجتماع ضدین کیونکہ ایسی صورت میں مسلم و غیر مسلم آبادی کے اغراض و نصب العین میں بین مغائرت ہوگی ہماری رائے میں سیاسی خلافت نہ کبھی تھی اور نہ اُسکا قائم کرنا ممکن ہے اگر ہماری رائے صحیح ہے تو مسلمانوں کو سیاسی خلافت کا خیال دل سے نکال دینا چاہئیے اور ہندوستان کے متعلق نقطہ نظر قایم کرنے میں اِس خیال کو کچھ بھی دخل نہ دینا چاہئیے۔

خلافت بلا سیاست کا تصور

ہم یہاں کوئی ایسی مذہبی بحث چھیڑنا نہیں چاہتے جسکا تعلق اس کتاب کے اصل مضمون اور مقصد سے نہ ہو۔ اِس لئے ہم یہ مسئلہ اُٹھانا نہیں چاہتے کہ بغیر کسی خلافت سے وابستہ ہونے کے کوئی مسلم آیا مسلمان رہ سکتا ہے یا نہیں۔ ہم صرف اسقدر کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اگر تمام دنیا کے مسلمانوں نے کسی مذہبی خلیفہ کو کھڑا بھی کیا تو اُس کی وقعت اور حیثیت رفتہ رفتہ وہی ہو جائیگی جو مسیحی دنیا میں اب پوپ (Pope) کی ہے یا اگر وہ خلیفہ واقعی مقدس ہوا تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے اہل تشیع میں مجتہد العصر یا اہل تسنن میں کوئی پیر طریقت کہ جس سے کوئی شرعی مسئلہ پوچھ لیا جائے یا

اُن کے حلقے میں صفائی قلب کی توقع سے کچھ لیے بیٹھا جائے۔ مگر میری رائے میں مسلمانوں کو اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہ پہونچے گا۔ علاوہ بریں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں بھی ہمارے ذہن میں بڑی بڑی دشواریاں آرہی ہیں جن کے بیان کرنے میں ہم کو اندیشہ ہے کہ ایک ایسی طولانی بحث میں پڑ جائیں گے جس کا اصل مضمون سے تعلق نہ ہوگا اور یہ بحث حقیقی شاہراہ سے بھٹکا کر پیچیدگیوں کے دلدل میں پھنسا دیگی بہرکیف اول تو کوئی ایسا خلیفہ ہوگا ہی نہیں اور ہوگا بھی تو بلا کسی سیاسی قوت کے ہوگا جس کے خیال کا بھی ہماری رائے میں اک ہند کی نسبت نقطۂ نظر قایم کرنے میں دخل نہ ہونا چاہیئے۔

خلافت کا عام تصور

اس وقت خلافت کا عام تصور ہمارے برادران اسلام میں یہ ہے کہ خلیفہ ایسا مسلم بادشاہ ہو جو جزیرہ نمائے عرب پر حکمران ہو اور اسکی حدود سلطنت میں حجاز و شام۔ بیت المقدس وفلسطین وعراق وغیرہ شامل ہوں اور وہ بادشاہ حج کے موقع پر یا کسی اور طریقہ سے تمام دنیا کی مسلم آبادی سے تعلقات قائم کرے اور اپنی مرکزی قوت کو اسلام اور تمام مسلمانوں کے مفاد کے واسطے استعمال کرسکے۔ اس عام تصور میں اور ہماری اس سیاسی خلافت کے تصور میں جسکا ذکر ہو چکا ہے۔ بہت کم فرق ہے۔ یعنے صرف اسی قدر فرق ہے کہ اسمیں چند ممالک اسلامیہ کی بادشاہت جزو لاینفک ہے۔ ہماری تو یہ عین خواہش ہے کہ اُن تمام ممالک پر جو گہوارہ اسلام ہیں۔ جہاں کے

ذرّے ذرّے سے انوارِ اسلام منور اور جن کے در و دیوار سے اسلامی تمدن
کے آثار ہویدا ہیں اور جہاں مسلمانوں کے مقدس مقامات و عتبات عالیات
واقع ہیں وہاں پرچم اسلام لہرائے اور مسلمانوں کی حکومت قائم رہے
کیونکہ فی الحقیقت ان ممالک کی اصلی بہبودی کے خواہاں جس طرح قدرتاً
مسلمان ہو سکتے ہیں ویسے کسی غیر مذہب کے لوگ نہیں ہو سکتے ہمارا
یہ بھی خیال ہے کہ اسوقت انگلستان و فرانس نے ان ممالک میں اپنے
اثرات کی جو باہمی تقسیم کرلی ہے اسکا اصل مقصد اپنے ممالک کو
فائدہ پہنچانا ہے نہ کہ اُن ممالک کی رعایا کو باوجود اس تمنا و خواہش
کے ہماری رائے یہ ہے کہ ان ممالک میں جو مسلم بادشاہ یا قوت ہوگی
اسمیں وہ مرکزی قوت پیدا ہونے کی امید نہ رکھنی چاہیے جس کا محال
ہونا سیاسی خلافت کے ضمن میں ہم دکھا چکے ہیں۔ پھر بھی اگر ہمارے
برادرانِ اسلام خلافت کے اس عام تصور کو کچھ نتیجہ بخش سمجھتے ہیں تو
جہاں تک ہندی مسلم متعلق ہیں وہ اس کو عملی جامہ پہنانے میں اسی
وقت مدد دے سکتے ہیں جب خود اُن میں کوئی قوت ہو اور اُن میں
اُس وقت تک کوئی قوت نہ ہوگی جب تک وہ اپنے ملک ہندوستان
کی سیاسی حالت اُس بلند و رفیع پایہ پر نہ پہونچاویں کہ بحیثیت ہندی
ہونے کے اونکی کوئی قدر و منزلت ہونے لگے۔ لہٰذا مسئلہ خلافت کو
خواہ ہم کسی پہلو سے دیکھیں مگر اس ملک کی سیاسی ترقی میں ہمارا نقطہ نظر
وہی رہنا چاہیے جو یہاں کی غیر مسلم آبادی کا ہے۔

"پین اسلام ازم"

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں پین اسلام ازم کی ایک خطرناک قوت اسوقت پھیل رہی ہے اس کی واقعیت کے معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ "پین اسلام ازم" Pan Islamism کس قوت کا نام ہے۔

اگر "پین اسلام ازم" سے یہ سمجھا جائے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں کوئی ایسی باہمی قرارداد ہے کہ ایک مقام کے مسلمان دوسرے مقام کے مسلمانوں کو عملی مدد دیکر اس دنیا میں کوئی غلبہ حاصل کریں تو بہ حیثیت ایک مسلم کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ ہماری رائے میں جن غیر مسلموں نے پین اسلام ازم کی مہیب صورت دنیا کے سامنے پیش کی ہے یا تو وہ غلطی میں ہیں یا اسمیں کوئی سیاسی غرض اس مقصد سے مضمر ہے کہ خواہ مخواہ دنیا کو اسلام سے برگشتہ اور چوکنا رکھکر دنیا کو اسلام کی مخالفت اور اسکی بیخ کنی پر تیار رکھا جائے۔ لیکن اگر "پین اسلام ازم" درحقیقت اس کشش کا نام ہے جو کسی ہم خیال یا ہم تمدن اشخاص کے درمیان عادتاً ہوا کرتی ہے تو پین اسلام ازم کا وجود ہے کیونکہ تمام مسلمان بعض اصولی باتوں میں ہم خیال بن جاتے ہیں اور ایک حد تک انمیں کشش محبت پیدا ہوجاتی ہے۔ انسان کی موجودہ سوسائٹی مختلف قسم کی قدرتی کششوں کا نتیجہ ہے ایسی جماعتیں خواہ کلب کہئے یا کسی اور صورت میں ہوں وہ صرف مختلف

اقسام کی کششوں کی مثالیں ہیں۔ ہم مذہبی میں بھی ایک کشش ضرور ہے اور اس کشش کی قوت کا معیار اُن افراد کے مذہبی خیالات کی قوت پر منحصر ہوا کرتا ہے جو اُن سے متاثر ہوں۔ یہ عام اصول انسانی خلقت کے ہیں کچھ مسلمانوں ہی سے مختص نہیں۔ ہم نے سُنا ہے کہ یہودیوں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہم مذہبی کی کشش موجود ہے۔ اسی طرح ہم ملک ہونے کی بھی ایک کشش ہے جسمیں مذہب کو دخل نہیں ہوتا اس کشش کا پورا حِس اُسوقت ہوتا ہے جب ہم اپنے ملک سے باہر جاکر اپنے کسی ملکی فرد سے ملتے ہیں۔ ہندوستان سے یورپ کا سفر کرتے وقت جہاز میں قدم رکھتے ہی ہم نے دیکھا ہے کہ اس پندرہ روزہ سفر میں جو چھوٹی سی دنیا بحر ذخار میں چلتی نظر آتی ہے اس میں جو سوسائٹیاں فوراً بنجاتی ہیں وہ اسی ملکی کشمکش کے نمونے ہوتی ہیں۔ اس کشش کی ایک دلچسپ مثال مجھہ کو یاد آگئی۔ میں ایک مرتبہ رات کے وقت لندن کی آنڈر گراؤنڈ (زیرزمیں) ریل میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک کنڈکٹر یعنے ریل چلانے والے نے بڑے غور سے میری طرف دیکھنا شروع کیا جن لوگوں نے لندن کی انڈر گراونڈ ریلوں میں سفر کیا ہے وہی اسکا اندازہ کرسکتے ہیں کہ کنڈکٹر کسقدر عدیم الفرصت ہوا کرتا ہے اور ایک ایک دو دو منٹ کے بعد وہ کس طرح ہزاروں آدمیوں کی بہتی ہوئی زندہ دھار کے رُخ بدلتا اور موڑتا رہتا ہے لیکن ملکی کشش اُسپر اسقدر غالب تھی کہ اس عدیم الفرصتی میں بھی وہ میرے پاس آیا اور دریافت کیا کہ کیا آپ

ہندوستانی ہیں۔ جب اس کو اس خیال کی تصدیق ہوگئی تو مسکرا کر
کہنے لگا کہ میں بھی ہندوستانی ہوں۔ یہ کہکر پھر اپنے کام میں مشغول
ہو گیا۔ اس کے چہرے بشرے اور حرکات و سکنات سے ظاہر ہو رہا تھا
کہ مجھے دیکھکر اسکو ایک خاص مسرت ہوئی۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ہندوستانی
طلبہ کا علیحدہ کلب اسی کشش کے اصول پر مبنی ہے۔ خیر یہ سب مختلف قسم کی
قدرتی کششوں کی مثالیں ہیں اور یہ جذب مقناطیسی اسوقت تک
باقی رہیگی جب تک انسان کی خلقت قائم ہے۔ دیکھنا صرف اسقدر ہے
کہ جو کشش ہم مذہبی ہونے کی مسلمانوں میں ہے کیا وہ سیاسی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں
کے واسطے کچھ پر خطر ہے۔ یا مسلمانوں کے لئے ایک ایسی حبل المتین
(مضبوط رسی) ہے جس کے بھروسہ پر وہ ہند کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو
بدل سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں پین اسلام ازم کی مذہبی کشش غیر مسلموں
کے واسطے کچھ بھی پر خطر نہیں ہے۔ اور جو وجوہ ہم سیاسی خلافت کے
محال ہونے کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں انہیں وجوہ پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں
کہ یہ کشش ایسی نہیں ہے جس کے بھروسہ پر ہم اپنے وطن کی فلاح و بہبود کے
نقطۂ نظر کو بدل دیں۔

مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر

ہندوستان کی نسبت مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر یہ ہوگا
کہ وہ بلالحاظ مذہب و ملت اپنے کو تمام برادرانِ
وطن کے ساتھ ایک ہی کشتی میں بیٹھا ہوا تصور کریں۔ اور وہ کشتی
ہندوستان ہے۔

جو طوفان اہل ہنود کو ڈبانے کی قوت رکھتا ہے وہی انکو غرقاب
کریگا۔ اور جو امن وسکون اہل ہنود کو ساحل مراد پر پہونچائیگا وہی
مسلمانوں کو دنیاوی گرداب ہلاکت سے بچائیگا اگر کوتاہ نظری سے
کام نہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے ہر باشندے کی ترقی
ووقار کا عکس کسی نہ کسی حیثیت سے پلٹ کر دوسرے باشندوں پر بالحاظ
مذہب وملت پڑتا ہے ہم کو اس امر کا پورا احساس کہ ہندوستانی عزت
وذلت کا اثر ہماری ذاتی عزت وذلت پر کہاں تک پڑتا ہے اُس وقت
ہوا جب ہم نے ہندوستان کے باہر سفر کیا۔ ہم نے سنہ ۱۹۱۱ء میں ولایت
سے واپسی کے بعد ایک مضمون لکھا تھا جس میں یہ دکھایا تھا کہ حدود ہندوستان
کے باہر ہماری تمام عزت ووقار کا معیار لفظ "ہندی" ہونے میں ہے
ہر مقام اور ہر سوسائٹی میں ہم نے یہ محسوس کیا کہ غیر ممالک میں پہلے
لوگ اس کی جستجو کرتے ہیں کہ کون شخص کہاں کا باشندہ ہے اس کے
بعد اُن کی نگاہوں میں اس کا وہی وقار ہوتا ہے جو اُس کے ملک کی
سیاسی وتمدنی حالت کا ہے جہاں کا وہ مسافر اصلی باشندہ ہے اُسکی
وقعت یا تو ایک دم اُنکی نگاہوں میں بہت بڑھ جاتی ہے یا وہ نظروں
سے گر جاتا ہے۔ کوٹ، پتلون، ہیئت، صورت، وضع، قطع بلکہ
ذاتی قابلیت بھی بالائے طاق ہو جاتی ہے سنہ ۱۹۲۲ء کے سفر میں بھی
یورپ کے ہر مقام پر جہاں جہاں گئے ہم نے دیکھا کہ بہ لحاظ عزت
ہم محض اپنے ہندی ہونے کی وجہ سے کہیں تو فائدے میں رہے اور

کہیں گھاٹے ہیں۔

یہ عزت و خفت ہندوستان کی نسبت ہر شخص کے خیال پر منحصر تھی۔ اس میں مذہب کا دخل نہیں تھا۔ مجھ کو خیال ہے کہ ولایت میں ایک انگریزی خاتون نے مجھ سے یہ کہا کہ ایک مرتبہ اس کے بھائی نے ہندوستان سے لچھمی کی ایک مورت اس کو بھیجی اور یہ لکھا تھا کہ ہندیوں کے اعتقاد کے بموجب جس شخص کے پاس یہ مورت رہیگی اسکو دولت ملیگی۔ اس پر خاتون موصوفہ نے مذاقاً کہا کہ اُن کو ابھی تک کوئی دولت نہیں ملی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ اعتقاد نہیں ہے مگر کسی طرح اُنکی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ جب میں بھی ہندی ہوں تو اس عقیدہ کا قائل کیوں نہیں ہوتا۔ سر رابندو ناتھ ٹاگور نے دوسرے ممالک میں سفر کر کے جو نسکہ اپنی علمی لیاقت و انسانی وقار کا قائم کیا ہے اس کا فائدہ بلا لحاظ مذہب ہر ہندی کو پہنچے گا۔ اٹلی کے شہر وینس (Venice) میں ایک سوداگر نے اپنا قیمتی زیور بغیر فوری قیمت لئے ہوئے ہم کو اس اعتبار پر دیدیا کہ ہم ہندی تھے اور اسی شہر کی دوسری دوکانوں پر ایک سوداگر نے یہ کہا کہ ایک ہندی مسافر نے جن زیور کے خریدنے کا وعدہ کیا اُسے چھ مہینے بعد لوٹتے وقت حسب وعدہ اس نے خریدا اور ہندیوں کی اسی ساکھ کی بنا پر اُسنے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اگر آپ بھی خرید کا وعدہ کرلیں تو زیور کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کیا جائیگا۔ یہ کچھ یورپ ہی کی کیفیت نہیں ہے

بلکہ عراق اور حجاز و عرب میں بھی جو ہندوستانی مسلمان زیارات اور حج
کی غرض سے جاتے ہیں انکو تمام عراقی اور حجازی عموماً ہنودی کہتے
ہیں اور سمجھتے ہیں۔ ہمارے ایک ہندوستانی دوست نجف اشرف میں
جبکہ وہ اپنے ساتھیوں کیساتھ راستہ جا رہے تھے کچھ عربوں نے اشارہ
کر کے کہا "هذا الشيخ الهنود"

مہاتما گاندھی کی روحانیت کی شہرت سے غیر ممالک میں
ہندی بلا لحاظ مذہب فخر کرنے لگتا ہے۔ انگلستان میں آپ کتنا ہی
اکڑ جائے لیکن انگریزوں کو جب معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ ہندی ہیں تو بلا لحاظ
مذہب آپ کا وہی وقار رہ جاتا ہے جو ایک رعایا اور محکوم کا ہونا چاہیے
جنوبی افریقہ اور دوسری نو آبادیات میں آپ کتنا ہی سر پٹکیں لیکن وہاں
آپ کا شمار بحیثیت انسان وہ اپنے مساوی درجے کے لوگوں میں اس
وقت تک ہرگز نہ کریں گے جب تک کل ہندوستان کا سیاسی پایہ بلند نہ ہو
امریکہ کے ہائیکورٹ میں اس امر کے فیصلہ کرتے ہیں کہ ہندی اون کے
ملک کا کبھی سٹیزن Citizen نہیں بن سکتا یا مستقل باشندے کے
حقوق نہیں حاصل کر سکتا اس ہندی کے مذہب کا خیال ہی ان کے
ذہن میں آیا ہوگا جس کا مقدمہ ان کے روبرو پیش تھا۔ ہم کو اس وقت
کسی مذہب کی صداقت و کذب سے بحث نہیں ہے۔ یہ تمام مثالیں اس
ثبوت میں پیش کیجاتی ہیں کہ بیرون حدود ہندوستان وہاں کے باشندوں
سے ہمارا باہمی مذہب کا فرق اٹھ جاتا ہے اور غیر ہندی لوگوں کی نگاہ

"ہندی" محض "ہندی" ہی کی حیثیت سے چلتا پھرتا نظر آتا ہے خواہ وہ کسی جامے میں ہو۔ ناظرین اس خیال کو دل سے نکال ڈالیں کہ ایک ہندی مسلمان اسلامی ممالک میں جاکر دائرہ ہندی سے نکل جایا کرتا ہے۔ نہیں وہاں بھی "ہندی" ہی رہتا ہے۔ میری والدہ ہمشیرہ جب حج و زیارات سے واپس آئی تھیں تو فرمایا کرتی تھیں کہ انکے قافلہ میں جب کوئی ہندی کسی بدوی عرب کی کافی خاطر مدارات نہیں کرتا تھا یا کافی انعام نہیں دیتا تھا تو وہ "ہندی بطال" کے الفاظ بطور تکیہ کلام کے ہر ہندی کیلئے عام طور پر استعمال کرتا تھا اور اس ہندی کا مذہب اسلام اُس کو اذیت و تکلیف ہی سے بلکہ بعض اوقات قتل سے بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ اسی سال کا واقعہ ہے کہ مدینہ منورہ کے راستے میں ہزاروں حاجیوں کا قافلہ بدوی عربوں نے روک لیا اور جب انکو کافی رقم نہ پہونچی تو سارے قافلہ کو بغیر مدینہ منورہ کی زیارت کئے ہوئے واپس آنا پڑا۔ اور راہ میں ان مصائب کا سامنا ہوا کہ ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ بدویوں پر مذہب کا کوئی اثر نہ تھا۔

سال گذشتہ سلطنت حجاز عرب کو یہ گوارا نہ ہوا کہ مصری ڈاکٹروں کا وفد حاجیوں کے علاج و معالجہ کے لئے حج کے زمانہ میں زمین عرب پر قدم بھی رکھے یا خیمہ نصب کرے کیونکہ سیاسی حیثیت سے اُن کی موجودگی اُنہوں نے اپنے لئے مضر خیال کی تھوڑا عرصہ ہوا جب ہند کے وفد خلافت نے اسلامی جوش میں آکر مشورہ دینے کی غرض سے

سلطنت انگورہ میں داخلہ کی اجازت چاہی تو ترکوں نے صاف انکار
کر دیا جس سے بہت سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہونگی تین برس
کا عرصہ ہوا جب صوبہ پنجاب و صوبہ سرحدی کے ہزاروں مسلمانوں نے
ترک وطن کا خیال اس بھروسہ پر کیا تھا کہ افغانستان بحیثیت ایک
اسلامی سلطنت کے ان کا خیر مقدم اور آؤ بھگت کریگا اور اپنے ملک
میں آباد کریگا۔ لیکن اس ارادہ کو پورا کرنے میں جو جو نتائج پیدا ہوئے
وہ ہر باخبر مسلمان کو معلوم ہیں۔ ہمارے دوست خواجہ غلام الثقلین
مرحوم کو ایک مرتبہ یہ جوش پیدا ہوا کہ ایران جاکر وہاں کے مسلمانوں
کے خیالات درست کئے جائیں۔ اسلامی ہمدردی سے ایران پہنچے
مرحوم میں ایثار نفس کا بہت مادہ تھا وہ فرماتے تھے کہ ایرانیوں کو
ان پر یہ شبہ تھا کہ یہ شخص ہندوستان کی خفیہ پولیس کا کوئی رکن ہے
اور ان کو پھانسنے کے لئے آیا ہے۔ انکی ہندیت نے ایران میں بھی
ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ غرض سخت مایوس ہوکر واپس آئے اگر ایران
میں کوئی ہندی مسلمان اس طرح قتل کیا جاتا جیسے کہ ابھی چند دن
ہوئے کہ ایک امریکن سفیر کیا گیا تھا تو ہمارا خیال ہے کہ اسکی تلافی مکافات
اور اس کے خون بہا کے لئے ایران صرف مذہب کی بنیاد پر اس حد تک
تیار نہ ہوتا جیسا کہ امریکہ نے ایران کو مجبور کرکے آمادہ تلافی کیا۔ یہ
سب صرف امریکہ کی سیاسی قوت کا زور اور اثر تھا۔ ان تمام
مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندی مسلمان ممالک اسلام میں

بھی ہندی ہی رہتا ہے جس سے ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ معاملات دنیوی میں کسی ملک کی مجموعی سیاسی و تمدنی حالت کا جو اثر اس ملک کے ہر باشندے پر پڑتا ہے اس کو مذہب نہیں روک سکتا ہند کے مسلمان ہرگز خیال نہ کریں کہ کسی دوسرے مسلم یا غیر مسلم ملک کی سیاسی و تمدنی بہتر حالت ہندو ستان کے مسلمانوں کی سیاسی و تمدنی حالت کسی اسلامی مقناطیسی اثر سے درست کر سکتی ہے۔ ایسا کبھی ہوا اور نہ ہوگا۔ قصہ کوتاہ سیاسی و تمدنی معاملات میں اہل ہنود و مسلمان ایک ہی کشتی میں سوار ہیں اور ہند کی سیاسی ترقی مجموعی حیثیت سے مسلمانان ہند کے وقار و عزت اور قوت کو اسی طرح گھٹاتی اور بڑھاتی ہے جیسے غیر مسلم ہندیوں کی عظمت اور وقعت کو پس ہمیں ہندوستان کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے اور ہمارا یہی نقطۂ نظر صحیح ہوگا۔

باہمی مطالبات کی نوعیت

ہم کو اس رسالہ میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہر شخص کی نیت و غرض کا اثر اس کے افعال و معاملات پر کہاں تک پڑتا ہے۔ اس ملک میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے مقابلہ میں بعض مطالبات پیش کرتے ہیں ہم یہ نہیں کہتے کہ مطالبات نہ کئے جائیں۔ باہمی صفائی اور سمجھوتا اسی وقت کر لینا ضروری ہے۔ ہم نے اسے خوب سمجھ لیا ہے۔ باہمی مطالبات کے متعلق آج جس بات کو ہم لڑائی سمجھ رہے ہیں وہی آئندہ ہماری صفائی اور صلح کا باعث ہوگی لیکن ہماری رائے میں اگر ہندو مسلمان

ایک دوسرے کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں جس کے قائم کرنے کی
کوشش اس باب کے حصۂ اول و دوم میں کی گئی ہے تو پھر باہمی مطالبات
کا فیصلہ کرنے میں بہت کچھ سہولت پیدا ہو جائیگی اگر تمام اہل ہنود
مسلمانوں کو اس نگاہ سے دیکھنے لگیں کہ انکے عہد حکومت میں ہندوستان
کے تمدن کو بہت کچھ فائدہ پہنچا ہے یہ اس ملک کے اب جزو لاینفک ہیں
یہ ایک ایسا ذخیرہ دماغی و جسمانی قوت کا ہیں جو اس ملک کی بہتری
کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے (جیسا کہ حصۂ اول میں مفصل طور پر
بتایا گیا ہے) اور اسی طرح اگر تمام ہندی مسلمان یہ خیال کرنے لگیں کہ
اُن کا وقار و ذلت اس ملک کے وقار و ذلت کے ساتھ وابستہ ہے
اہل ہنود اس ملک کی صنعت و حرفت و دولت میں کوئی ایسی ترقی
نہیں کر سکتے جس کا فائدہ صریحی یا معنوی طریقہ سے بواسطہ یا
بلا واسطہ مسلمانوں کو بھی نہ پہنچیگا۔ خلافت و دین اسلام از مر انکی
آئندہ قسمت کا فیصلہ نہ کر سکیں گی اور اس کے جوش میں وہ کسی طرح
اس ملک کی سیاسی ترقی میں سد راہ نہ ہونگے تو پھر ہماری نیتوں اور
اغراض میں بہت کچھ یکسانیت پیدا ہو جائیگی ایک دوسرے کے
مقابل سے شبہ کا بادل ہٹنا شروع ہوگا۔ باہمی تعلقات کا مطلع
صاف ہو جائے گا اور ہم کو اپنے باہمی مطالبات کی نوعیت ایسی
معلوم ہوگی گویا دو بھائی ہیں جو گھر کو بگاڑنا نہیں چاہتے بلکہ
کچھ لینا یا سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں کہ عرصہ تک اپنی متحدہ قوت اس گھر کے

بقا و قیام کے لئے صرف کریں اسکو بجائیں اور اس کی ہم آہنگی سے دونوں بھائی منتفع ہوں۔ ہمارا یہ گھر ہندوستان ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک کے کل باشندے اپنے اپنے مطالبات کی نوعیت کو سمجھتے رہیں تاکہ اُن کا تصفیہ کرنے میں آسانی ہو۔ مطالبات اس نیک نیتی سے کئے جائیں کہ ایک کو دوسرے پر کوئی بیجا غلبہ نہ حاصل ہو دونوں کی بقا فیصلہ کی شرط رہے نہ ایک جانب ہندو راج کا خیال غالب ہو نہ دوسری جانب سیاسی خلافت کی دھن ہو اگر طبیعتیں اس رخ پر آجائیں تو بیڑا پار ہے۔ جو ہوا عالم میں آج چل رہی ہے اُسے دیکھ کر ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ملک میں ملکی قوت وجذبات تمام دوسری قوتوں اور جذبات پر غالب ہو جائینگے اور اس سے کسی شخص کے اصلی اصول مذہب پر آنچ نہ آئے گی۔ فروعات کا کچھ ہی حشر ہو مثلاً یہ باجا بجانے کا مسئلہ یا کسی جانور کے ذبح کرنے کا حق ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی ایک وقت آجائے کہ ایسے مطالبات کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ بہرکیف آج تو صرف اسکی ضرورت ہے کہ ہم اپنے مطالبات کی نوعیت کو نہ بھولیں۔

باب دہم ۔ حصہ سوم

نفاق کے نتائج و باہمی اتحاد کی تدبیر

تمہید

اگر شروع کے نو ابواب باب دہم کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں تو باب دہم کے حصہ اول و دوم کو اس آخری حصہ سوم کی تمہید سمجھنا چاہئے۔ شروع کے نو ابواب میں صرف باب دہم لکھنے کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور باب دہم کے حصہ اول و دوم میں (جن میں ہندو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے) اس آخری حصے کی بنیاد ڈالنا منظور تھا۔ اس میں اہلِ ملک کے سامنے باہمی اتحاد کی تدابیر پیش کرنا مقصود ہے۔ لہذا اس مسئلہ پر اگر ناظرین میرے خیالات پوری طرح معلوم کرنا چاہیں تو حصہ اول و دوم کو پیشِ نظر رکھیں۔

عداوت و کینہ و نفرت کے جذبات کے نتائج

عداوت و کینہ اور نفرت انسانی خلقت کے بہت بُرے جذبات ہیں اور جب یہ کسی انسان میں سرایت کر جاتے ہیں تو ان کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہ خلقتِ انسانی کے جزو یا طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں۔ انسانوں کی قومیں اور جماعتیں آخر افراد ہی سے بنتی ہیں۔ اسلئے جب کسی جماعت یا قوم میں کینہ و نفرت کا مادہ کسی دوسری جماعت اور قوم کے خلاف سرایت کر جاتا ہے

تو اُس کا دور کرنا بھی ویسا ہی سخت دشوار ہوتا ہے جیسا کہ کسی ایک فرد کے دل سے ان جذبات رذیلہ و مقتضیات ذمیمہ کا نکالنا اور جب کسی دو قوموں میں یہ صفات رذیلہ انتہا کو پہونچ جاتی ہیں تو اُس وقت اُن دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک کا فنا ہو جانا ہی اُس کا علاج ہوتا ہے ایسیں ذرا شک نہیں کہ کینہ اور نفرت کی قوت کشش ہم ملکی و ہم وطنی سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ مثلاً مسلمان و عیسائی گو صدیوں تک ایک ہی ملک اسپین میں رہے سہے لیکن اُن دونوں میں) دوسرے کی طرف سے آتشِ نفرت بھڑکتی رہی۔ اسپین کے مسلمانوں کا فنا ہو جانا اُس کا علاج ثابت ہوا۔ اگرچہ ہر مورخ تسلیم کر رہا ہے کہ اُنکے فنا ہو جانے سے جو کمزوری اسپین میں پیدا ہو گئی وہ آج تک دور نہ ہو سکی حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہو جانے کے واقعہ کو گو دو ہزار برس گزر گئے مگر جو اشخاص اس اندوہناک و ناشدنی فعل کے مرتکب ہوئے تھے اُن کی خاک کیا نام و نشان کا بھی پتہ نہ رہا ؎

پنداشت ستمگر کہ ستم بر ما کرد
بر گردن او بماند و بر ما بگذشت

لیکن آج بھی روس، جرمنی، آزاد انگلستان اور امریکہ کے عیسائیوں کے دلوں میں گھس کر ذرا یہودیوں کی طرف سے اُن کے جذباتِ نفرت کا کوئی تماشہ دیکھئے۔ اِسی سال لندن کی ذمبلی نمائیش

میں ایک انگریزی عینک ساز نے ہمارے اعتبار سے بیجا فائدہ اٹھاکر ہم سے کچھ رقم وصول کرلی۔ جب ہم لندن کی ایک دوسری بڑی دوکان سے عینک خریدنے گئے تو اس دوکان کا مالک طیش میں آکر کہنے لگا کہ افسوس ایک یہودی نے آپ کو ٹھگ لیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر یہودی ایسا ہوتا ہے لیکن یہ صرف اسکی ایک مثال ہے کہ ایک غیر یہودی انگریز کا جذبہ ایک یہودی انگریز کے مقابل میں آج تک کیا ہے اور یہ کچھ عیسائیوں ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ سے یہود کے سلوک نامحمود کا ہی یہ بھی نتیجہ ہے اور اثر ہے کہ آج عراق میں مسلمان بھی یہودیوں کو ایسا ہی برا سمجھتے اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جیساکہ یورپ میں عیسائی۔ ہم مذہب اشخاص میں بھی باہمی بغض و کینہ و نفرت نے کیا کیا گل نہیں کھلائے۔ خواہ یہ ہم مذہب عیسائی ہوں یا مسلمان۔ آخر جرمن و فرانس پڑوسی ہوکر بھی کیوں ایک دوسرے سے بیزار ہیں۔ آج یورپ کو اپنی تہذیب و تمدن پر فخر ہے لیکن وہ تمام تمدن و تہذیب اس کینہ و بغض و نفرت کے جذبات سے دب کر فنا ہو جاتی ہے۔ آئرلینڈ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے لیکن چار سو برس سے کینہ و بغض و نفرت کی جو آگ اسکے شمالی و جنوبی حصوں میں بھڑکی ہوئی ہے۔ اسکے بجھانے کی تدبیریں بڑے بڑے مدبرین کی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ مسلمانوں کے باہمی تفرقہ کی حالت بھی سب کو معلوم ہے قصہ کوتاہ ایک ہی ملک کے باشندوں کی مختلف جماعتوں میں ایک

دوسرے کے خلاف نفرت وکینہ کے جذبات کا پیدا ہو جانا اُس ملک کی بدقسمتی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ہندوستان کی گزشتہ حالت اور آئندہ کے خدشات

عہد مغلیہ میں ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی جو حالت تھی اُسکی تصویر ہمنے باب سوم میں مذہبی رواداری کے سلسلۂ بیان میں صفحات (۷) لغایتہ (۱۹) کھینچی ہے اور ہم کو خود اپنی زندگی کے اُن واقعات کا ہوش ہے کہ ہم اپنے ہم محلہ و ہمسن ہمسایہ بزرگ کا نام لیکر نہیں پکار سکتے تھے بلکہ اپنے بزرگوں کی تربیت کے اثر سے بلحاظ تفاوت عمر کسی ایسے رشتے سے منسوب کرکے مخاطب ہوا کرتے تھے۔ مثلاً چچا۔ دادا۔ بھائی وغیرہ۔ خیر یہ تو ہندوستان میں باہمی اتحاد کی گزشتہ حالت تھی۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے حال میں اسوقت تک جو لڑائی جھگڑے ہندو مسلمانوں میں ہوئے ہیں اُنکی بنا اور نوعیت کے متعلق ہم اپنی مفصل رائے باب سوم کے آخری حصے میں ظاہر کر چکے ہیں۔ ہماری رائے میں ابھی تک فتنہ وفساد چند [illegible] یا شریر النفس اشخاص کی ذات تک محدود ہے۔ ہم کو گلبرگہ دہلی یا بمبئی میں ایسے جھگڑوں سے زیادہ خدشہ نہیں ہے کہ وہ تو ہوا کے جھونکوں کی طرح آکر چلے جائینگے جس سرزمین پر کروڑوں بنی نوع انسان مختلف الاقوام والمذاہب ایک دوسرے کی دیوار کے زیر سایہ آباد ہیں وہاں کبھی کبھی ایسا ہو جانا چنداں بعید نہیں ہے لیکن اطمینان بخش اور امید افزا بات یہ ہے کہ یہ جھگڑے دیرپا اور

مستقل نہیں ہوتے بلکہ جہاں کہیں آندھی کے جھونکے کی طرح چلکر کچھ انسانی جذبات کو اُبھار کر مطلع کو غبار آلود کر دیتے ہیں وہاں بہت جلد امن وسکون قایم ہوجاتا ہے اور روزانہ کاروبار دنیوی بدستور چلنے لگتا ہے۔ ایسے جھونکوں کی روک تھام تھوڑی سی انتظامی قابلیت سے ممکن ہے اور یہ سب فروع ہیں لیکن ہم کو اندیشہ ہے تو اسکا ہے کہ کہیں یہ شعلہ بھڑک کر سوسائٹی کی تعلیم یافتہ اور بلند طبیعتوں کو مشتعل نہ کردے۔ خوف ہے تو ایسے بیج کا ہے کہ وہ دلوں میں جم کر نشوونما کرے اور اُسکی جڑیں اور شاخیں نہ معلوم کہاں تک پہنچیں۔ اگر تاریخی غلط واقعات تعلیم یافتہ طبقے کے دلمیں جاگزیں ہوگئے اور اُن کے دلوں میں اختلاف کی بارود بھر دیگئی تو پھر آگ کے بتانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ خود خیالات کی کشمکش اور جوش طبیعت شعلہ وہ ہوگی آتش فساد کو مشتعل کردیگی اور ہندوستان تباہ اور ہندوستانی جل بھنکر فنا ہوجائینگے اور یہ شعر صادق آئیگا۔ ؎

شعلے بھڑک کے اُٹھے دل کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

وہ جو ڈھانچہ انڈین نیشنل کانگریس نے پچاس برس کی محنت سے تیار کیا ہے اک دم گر جائیگا۔ ہندوستان میں اہل ہنود اور مسلمانوں کے اصلی تصادم کی لہریں سمندر کے بڑے طوفان سے کم نہ ہونگی پھر یہ کہنا دشوار ہوگا کہ پھر کشتی اُس طوفان کے تھپیڑوں سے کیونکر بچ سکیگی اور منزل مقصود یا ساحل مراد تک پہنچ سکیگی کیونکر

نصیب ہوگی ایک زمانہ میں تو یہ ممکن ہوا تھا کہ مسلمانوں نے اسپین
کو آٹھ سو برس کے بعد بھی چھوڑ دیا۔ لیکن اس زمانہ میں مسلمان اپنے
وطن ہندوستان کو نہیں چھوڑ سکیں گے۔ لہذا ہندو مسلمان دونوں
بھائیوں میں مسلسل تصادم کی حالت قائم ہو جانے سے ملک کی جو
حالت ہوگی اُسکے خیال سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر
دوراندیش ہندوستانی سمجھ رہا ہے کہ مہاتما گاندھی صلح قائم کرنے کی
کوشش میں کیوں اپنی جان تک دینے کو تیار ہیں۔ وجہ یہی ہے
کہ وہ اس تصادم کے نتائج کو خوب سمجھ رہے ہیں۔ ہماری رائے میں
اس وقت بھی کافی اتحاد موجود ہے اور جو کچھ بگڑے ہوئے تیور
نظر آتے ہیں اُنکی اصلاح بھی ممکن ہے۔ مرض لاعلاج نہیں ہے پس
ہم کو ابھی سے مؤثر تدابیر کو نہ صرف سوچنا بلکہ عمل میں لانا چاہیئے اور
ہم کو علاج واقعہ قبل از وقوع باید کرد۔ پر کاربند ہونا چاہیئے۔

مستقل اتحاد کی اصلی تدبیر

ہماری رائے میں مضبوط بنیاد پر مستقل اتحاد قائم کرنے
کی صرف ایک ہی یہ تدبیر ہے کہ ہندوستان کی
صحیح تواریخ ہمارے ہندوستانی نقطۂ نظر سے لکھی جائیں جن میں تعصب
کو دخل ہو نہ غلط فہمی کا امکان اور وہی ہمارے نونہالان مدرسہ
یعنے ہندو مسلمان بچوں کو پڑھائی جائیں کیونکہ آج اچھا ہو گا تو کل بھی اچھا ہو گا خیالات
کے جذب کرنے میں بچوں کے قلوب موم کی خاصیت رکھتے ہیں
جس سانچے میں ڈھالو ڈھل جائیں گے۔ اور وہی شکل و صورت اختیار

کرلیں گے۔ پس اس موم کے دلوں کو فولاد بنانا چاہیے جو مضبوط
ہو اور اس پر جو نقش ہو نقش کالحجر ہو۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگر
بنیاد غلط پڑ گئی تو سارا مکان ٹیڑھا ہو جائیگا۔ ؎

خشت اول گر نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اگر ہندوستان کی بہبودی پیش نظر ہے تو آئندہ نسلوں کے
خیالات کی درستی کا انتظام آج ہی سے کرنا چاہیے۔ ہم یہ نہیں کہتے
کہ کسی تاریخ میں غلط واقعات درج کیے جائیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ
سچ سچ جو واقعہ ہو وہی لکھا جائے تاکہ تاریخ کی اصلی عزت اور گزشتہ
امور سے جو بڑے بڑے نتائج برآمد ہوتے ہیں ان سے اطلاع ہو۔
مورخ کا نقطہ نظر ذرا بدل جانے سے پڑھنے والے کے دل پر اس کی
تحریر کا اثر بھی بدل جاتا ہے خاص کر بچوں کے دل پر۔ ہندوستان
کی جو تاریخیں عموماً ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں وہ ہماری رائے
میں غلط اصول پر مبنی ہیں۔ کہیں تعصب ہے اور کہیں خود ستائی
اور دوسروں کی بھلائی کی بدنمائی اور اخفائے حقیقت۔ ان
میں عموماً وہ واقعات نہیں لکھے جاتے جن کا لکھنا ہمارے نقطہ نظر
سے ضروری ہے۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہتے کہ اورنگ زیب کی انسانی
کمزوریاں نہ بتائی جائیں لیکن اعتراض یہ ہے کہ اس کے عہد کی خوبیاں
بھی کیوں نہیں بیان کی جاتیں۔ اسکے علمی مذاق اور اس کے زمانہ

کی اشاعت تعلیم کا مفصل ذکر کیوں نہیں کیا جاتا جس کے کچھ حالات
باب دوم میں لکھے گئے ہیں صرف ایک کتاب فتاوائے عالمگیری ہی
کو دیکھئے کہ کس طرح کس محنت اور کن مصارف سے تیار کرائی گئی تھی
اگر اورنگ زیب کے تعصب کا ذکر کیا جاتا ہے تو مذہبی رواداری
کے معاملہ میں ملک کی اُس حالت کا ذکر بھی کیوں نہیں کیا جاتا جس کی
کیفیت باب سوم میں مفصل بیان کیگئی ہے ۔ یہ بھی کیوں نہیں کہا جاتا
کہ اُسکا ایک وزیر راجہ جے سنگھ اور فوج کا کمانڈر ان چیف راجہ رام سنگھ
تھا اور اُس کا ایک فرزند شہزادہ اکبر ہندورانی کے بطن سے تھا اورنگ زیب
نے اس سرزمین کی تجارت و تمول و فارغ البالی کی جو حالت پیدا کر دی
تھی اور جسکی شہادت باب چہارم میں پیش کیگئی ہے اس پر کیوں مٹی
ڈالی جائے اور وہ ہمارے طلباء کو کیوں نہ پڑھائی جائے ۔ انصاف
وامن واماں کے متعلق جو حالات ہم نے باب پنجم میں لکھے ہیں اور
صنعت و حرفت کی نسبت جو مواد ہم نے باب ششم میں جمع کیا ہے اگر
یہ سب واقعات سچ ہیں تو ہم چاہتے ہیں کہ یہ اُن تاریخوں میں بھی لیا جائے
جو ہمارے بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں تاکہ اُنکو معلوم ہو کہ عہد مغلیہ کی
حکومت کیسی قابل قدر ہندوستانی حکومت تھی اُس حکومت کا
مقصد ہندوستان کا فائدہ تھا اور اس سے واقعی ہندوستان کو
فائدہ پہنچا ۔ یہ کیسا انصاف کا خون ہوگا اگر اُس شریفانہ و شاہانہ برتاؤ
کے ذکر کرنے کی بجائے جو اورنگ زیب نے ہمیشہ یورپ کے تجار کیساتھ

کیا اور جسکی تحریری شہادت کا حوالہ باب ہشتم میں دیا گیا ہے یہ کہا جائے کہ اورنگ زیب نے غیر ممالک کے سوداگروں کو تجارت کرنا دشوار کر دیا تھا۔ جیسا کہ رسالہ "زمانہ" کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہے اور جس کا حوالہ باب اول میں دیا گیا ہے اور یہ یوروپین تجار کے ساتھ اورنگ زیب کا برتاؤ دکھانے میں خود اُن تجار کی اُس اخلاقی حالت و پالیسی پر پردہ ڈالا جائے جس نے ہندوستانی بادشاہ کو ہندوستان میں بادشاہت کرنا دشوار کر دیا تھا جس کی مفصل کیفیت باب نہم میں دکھلائی گئی ہے۔ جو تاریخیں بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں اُن میں اورنگ زیب و شاہجہاں و دارا شکوہ کے باہمی دا‌ؤ پیچوں کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے حتی کہ محلات کی اندرونی زندگی بھی دکھانے کی کوشش ہوتی ہے۔ لیکن اس کی سادہ فقیرانہ زندگی اور خدا پرستی کا ذکر بالکل ہی نہیں یا اس قدر کم اور وہ بھی اس اسلوب سے کہ عدم و وجود یکساں ہو۔ کیا جاتا ہے جس نے شاہان مغلیہ کے درشن کا طریقہ موقوف کرایا۔ دربار میں رقص و سرود و عیش کے مشاغل بند کرائے۔ محکمہ احتساب قائم کرا دیا اور خود اپنے جیب خاص کے مصارف کی رقم کو بھی کم کرا دیا۔ اورنگ زیب اور مرہٹوں سے جو لڑائیاں ہوئیں اُن کا تو مفصل حال بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کا بہت کم ذکر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی رعایا کے آرام و فلاح و بہبودی و دلجوئی کے لئے کون کون ٹیکس موقوف کئے تھے اور پہرہ داروں کی نذر اور ضبطی مال کے قواعد میں کیا کیا ترمیم کی تھی

بھی ٹھگیی کا ذکر اسطرح کیا جاتا ہے کہ گویا ہندوستان ہمیشہ ٹھگی کی زد کا جولانگاہ تھا لیکن اس کا ذکر نہیں کیا جاتا کہ ٹھگی کن صورتوں میں اور کیونکر ہندوستان میں رائج ہوئی اور اسکی ذمہ داری کس پر ہے اور کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ سے پہلے بھی ان ٹھگوں کا وجود تھا۔ ہر سلطنت میں خوبیاں اور برائیاں دونوں جیسی اور جو کچھ ہوں اگر کوئی مورخ بیان کردے تو شکایت نہیں لیکن اگر کوئی مورخ کسی سلطنت کے نقائص تو بڑے زور دار اور موثر الفاظ میں پیش کرے اور فوائد کا حوالہ دبی زبان سے دھیمے لفظوں میں دیکر یا ان کو ترک کر کے آگے بڑھ جائے تو اس سلطنت کے نقائص ظاہر اور فوائد جیسا کچھ تاریخ سے جانے ظاہر نہوں گے۔ نتیجہ برعکس ہوگا۔ ہماری رائے میں جو تاریخیں نصاب تعلیم میں مقرر کیجاتی ہیں ان سے بہت کچھ نقصان پہنچ چکا ہے اور آئندہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے اور ہر شخص ادنی غور و فکر سے اس کو دریافت کر سکتا ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ ان تاریخوں میں سب واقعات غلط لکھے ہیں لیکن یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ واقعات پورے پورے نہیں لکھے جاتے اور صحیح اسلوب میں بھی نہیں لکھے جاتے۔

جسطرح عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ ہندو بچوں کو پڑھانے کی ضرورت ہے اسی طرح مسلمان بچوں کو بھی ہندو پیریڈ (عہد ہنود) کی صحیح تاریخ اور صحیح واقعات سے آگاہ کرنا لازم ہے اگرچہ اس زمانہ کے حالات کا

پورا مواد و ماخذ ہمارے پاس نہیں ہے لیکن جس قدر ہے وہ ایسا ہے کہ ہر مسلمان بحیثیت ہندی ہونے کے اُس پر فخر کر سکتا ہے۔ عہد ہنود کی دولت ثروت، تمدن، اخلاقی تعلیم و علمی ترقی وغیرہ کی نسبت صحیح تاریخی حالات ایسے پیرایہ میں لکھے جا سکتے ہیں کہ اُنکا اثر مسلمان بچوں کے دل پر خاص طریقے سے پڑے۔ مہابھارت۔ رامائن۔ بدھ اور اشوک کے زمانہ کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ تاریخ ہند کے دس پانچ صفحے میں لکھکر ختم کر دئیے جائیں۔ ہمارے لڑکوں کا کیرکٹر بھی ہندوستان کے ایسے مشہور و معروف ارواح کے حالات سے بہت کچھ درست ہو سکتا ہے۔ جو کچھ ہمنے ہندو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے متعلق حصہ اول و دوم میں لکھا ہے اگر ہماری وہ رائے صحیح ہے تو پھر جو تاریخیں ہمارے بچوں کے نصاب میں مقرر کیجائیں وہ اُسی نقطۂ نظر سے لکھی جانی چاہئیں بڑی بڑی فلسفیانہ و علمی تاریخیں سن رسیدہ اشخاص اور منتہی طلبا کے لئے خواہ کوئی مورخ کسی طرح لکھے سن تمیز و تنقید کو پہونچکر ہر شخص صحیح و غلط۔ واقعیت اور تصنع میں امتیاز کر لیگا مگر بچوں میں یہ قابلیت کہاں ہے اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہندو مسلمان بچے ایک ہی گہوارہ محبت میں پرورش پائیں اور یہ اُسی وقت ممکن ہوگا جب اس ملک کی صحیح تاریخ بچوں کو پڑھائی جائے۔ اب صیغہ تعلیم ہندوستانیوں کے سپرد ہو چکا ہے پس ہر ہندوستانی منسٹر یا وزیر کا فرض ہے کہ جو تاریخ اس کے نصاب میں مقرر ہے اُسکو خود ملاحظہ فرمائے اور باخبر اصحاب

اور انعام میں ونکتہ رس اشخاص سے اُنکی جانچ کرائے اور اگر ذرا بھی
اُس میں تعصب کی بو موجود ہو تو اُن کو نامنظور کردے بلکہ ہر صوبہ میں
ایک انعام دس ہزار روپے کا مقرر کیا جائے کہ سررشتہ تعلیم کا
متعلق یا غیر متعلق جو شخص ہندوستانی لڑکوں کے پڑھنے کے لئے سب سے
اچھی تاریخ اس نقطۂ نظر سے لکھیگا جس کو ہم اپنے ملک کی بہبودی کیلئے
اور آئندہ نسلوں کے واسطے مفید پائیں گے وہ اس انعام کا مستحق ہوگا
اور پھر چند سال تک یہی تاریخ ہمارے بچوں کو اسکول میں پڑھائی جائے
بہرکیف ہماری رائے میں مستقل اتحاد قائم کرنے کی بڑی تدبیر یہی ہے
کہ ہمارے ہندو و مسلمان بچوں کے واسطے صحیح تاریخ ہند نصاب تعلیم
میں داخل ہو۔

اتحاد کی دیگر تدابیر

ہندو مسلمانوں میں مستقل اتحاد قائم رکھنے کی اصل تدبیر
تو ہم بتا چکے۔ اب بہت سی چھوٹی چھوٹی فروعی
تدبیریں ہیں جن کے اختیار کرنے سے بھی اصلاح میں بہت کچھ مدد
مل سکتی ہے۔

اضلاع کی کانگریس کمیٹیوں پر بار ڈالنا

(۱) ہماری رائے میں اتحاد قائم رکھنے کی تدبیروں
کا کام ہندوستان کے ہر ضلع کی نیشنل کانگریس کی
کمیٹی کے سپرد کیا جائے اور اس کو اختیار دیا جائے
کہ اغراض اتحاد کے لئے وہ حسب ضرورت مقامی و غیر مقامی اشخاص کو
اپنی کمیٹی کا ممبر بنائیں اتحاد کی عملی تدابیر کرنا نیشنل کانگریس کا دینا ہی

اہم فرض ور پروپیگنڈا ہونا چاہئے جیسا کہ دوسرے سیاسی معاملات کے دستور العمل پر کاربند ہونا بغیر اتحاد کے سوراج کا حاصل کرنا محال ہے اور اگر وہ ملا بھی تو بیکار ہوگا۔ ہر ضلع کی یہ کانگریس کمیٹی اپنی مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے اتحاد بڑھانے کی تدابیر اختیار کرے گی۔ اگر ممکن ہو تو مقامی عہدہ داروں کو شر و فساد رفع کرنے میں بھی مدد دیگی۔

اتحادی لٹریچر کی بہ کثرت نقطۂ نظر کا بدلنا

(۲) افسوس ہے ابھی تک نیشنل کانگریس کا کوئی خاص اخبار نہیں ہے ورنہ اُس کا ایک کالم اس کے لئے وقف کیا جاتا تاہم ملک میں اور بہت سے اردو انگریزی اخبار ہیں۔ ان اخبارات اور رسالہ جات کے ایڈیٹر ہندو مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے بارہ میں ہماری رائے سے اگر متفق ہوں جس کا اظہار اس باب کے حصۂ اول و دوم میں کیا گیا ہے تو وہ اسی عنوان پر مسلسل مضامین اُسوقت تک شائع فرماتے رہیں جب تک کہ لوگوں کا نقطۂ نظر نہ بدل جائے اور اہل ملک کے خیالات میں تبدیلی نہ پیدا ہو۔ محض اتحاد اتحاد پکارنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ مقصد اُسوقت حاصل ہوگا جب ملک میں اس قسم کے مضامین کی بھر مار کر دیجائے۔

دہلی کی اتحادی کانفرنس کی تجاویز پر عمل کرنا

(۳) ۱۹۲۴ء کی دہلی کی اتحادی کانفرنس نے بہت کچھ کام کیا ہے۔ جو عام اصول اس کانفرنس نے قایم کئے ہیں ہم اُن سے بالکل متفق ہیں۔ کسی کی مذہبی آزادی میں ذرا سا فرق نہ آنا چاہئے

ہر شخص کو اختیار ہے کہ خدا کی پرستش کے جذبات وہ جن حرکات جسمانی سے ظاہر کرنا چاہتا ہے کرے۔ خدا اس کا نفرنس کی کوششوں کو کامیاب کرے مگر اسکے بعد کہیں پھر خواب غفلت نہ طاری ہو جائے عملی کام برابر جاری رہے۔

رکنیت کانگریس کی شرط بنانا

(۴) مہاتما گاندھی نے کانگریس کی ممبری کی ایک یہ بھی شرط قرار دی تھی کہ ہر ممبر روزانہ تھوڑا سا سوت چرخے میں کاتا کرے۔ مہاتما ممدوح غالبًا اس ملک کے پالیٹکس میں روحانیت کے جزو کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس ملک کو ایثار کا سبق سکھا کر تن پوشی کے معاملہ میں دوسرے ممالک کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے ہیں جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان خود اپنی سعی و کوشش سے اپنی ضرورتوں کو فراہم کرنے کا عادی ہو۔ اور تن آسانی کی بجائے محنتی بنے لیکن ہندوستان میں اتحاد قائم رکھنے کی اہمیت اگر اس سے کم نہ خیال کیجائے تو ہم اس حد تک بھی کہنے کو تیار ہیں کہ کانگریس کی ممبری کی ایک یہ بھی شرط ہونی چاہیے کہ ہر ممبر اتحاد پر ایک مضمون لکھکر کسی اخبار میں شائع کرائے یا کانگریس کمیٹی میں پیش کرے۔ ممکن ہے کہ بعض ناظرین اس تحریک کو مذاق سمجھیں یا مخالفین کو تسلیم وجود نفاق کی بحث کا ایک شگوفہ ہاتھ آجائے لیکن مسئلہ کی اہمیت تو اسی کی متقاضی ہے کہ قبل اسکے کہ ایسی کانگریس میں جو انڈین نیشنل کہلاتی ہے شرکت کی کوئی تمنا

درخواست پیش کریں وہ اتحاد و اتفاق کے مسئلہ پر غور فرما کر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور کم از کم یہ ہو کہ ممبری کے فارم میں اتحاد کی کوشش کرنے کا اُن سے اقرار بھی لے لیا جائے۔

یکجا تعلیم دلانا

(۵) ہم کو ہندو مسلمانوں کے علیحدہ علیحدہ مدارس کا اصول بھی ناپسند ہے۔ پہلے زمانہ میں دوستی محبت و الفت کی گرہ مکتب ہی میں دی جاتی تھی۔ ہم کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد ہے کہ اپنے ہم مکتب ہندو بچوں سے کٹ کرتے پھر کیسے خلد مل جایا کرتے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اُسی طرح یہ ہمارے بچے پھر ساتھ ساتھ پڑھیں۔ کیونکہ جو تعلقات اور روابط اس عمر میں قائم ہو جاتے ہیں اُن کا توڑنا دشوار ہوتا ہے۔ ہم نے مذہبی تعلقات سے یونیورسٹیاں علیحدہ علیحدہ قایم کرلی ہیں۔ یہ تو مجبوری تھی۔ مذہب کے نام سے ایسے بڑے بڑے دارالعلوم قائم کرنے کے لئے روپیہ لینا تھا مگر جہاں تک ممکن ہو ہماری پالیسی یہ ہی رہے کہ ہمارے ہندو مسلمان بچے ایک ساتھ تعلیم پائیں نہ الہ آباد کا یتھ پاٹ شالہ کالج کا دروازہ مسلمانوں پر بند ہو اور نہ لکھنؤ کے مسلم ہائی اسکول میں ہندوؤں کا داخلہ ممنوع ہو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اِس وقت کوئی فرق کیا جاتا ہے۔ ہم صرف یہ جتانا چاہتے ہیں کہ یہ عام اصول ہمارے ذہن نشین رہیں۔

سوشیل لائف
طرز معاشرت میں تبدیلی لانا

(۶) ہمارے قدیم تمدن میں جو ملنے جلنے کے مواقع تھے وہ تو اب معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ محلے محلے میں شام کے وقت

اکھاڑوں کو جاتے ہوئے لڑکوں کے وہ جھرمٹ اب نظر نہیں آتے ہمارے وہ کم خرچ بالانشین سستے کھیل اور ورزشیں کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ تبدیلی ترقی کی شرط ہے۔ لیکن اب کلب لائف میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کرنی چاہئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملنے جلنے کے مواقع میں جہانتک ممکن ہو وسعت دینی چاہئے۔ اجنبیت سے مغائرت بڑھتی جاتی ہے اُس کو متواتر ملنے سے محبت میں اضافہ ہونے کی غرض سے مٹانا چاہئے اگر خورد نوش میں بھی شریک ہو جاتے تو کیا کہنا تھا۔ خیر وہ وقت جلد آرہا ہے۔

جداگانہ انتخاب

(۷) اتحاد قائم رکھنے کے لئے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے حق میں ہاتھ نہ لگانا چاہئے۔ یہ بھڑ وں کا چھتہ ہے ۱۹۱۶ء کی کانگریس منعقدہ لکھنؤ میں جو قرار داد ہندو اور مسلمانوں کے درمیان قرار پائی تھی اس سے بہتر تاری سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی اس کے طے کرنے میں جو جو دشواریاں محسوس ہوئی تھیں وہ اس وقت بھی ہمارے دماغ میں تازہ ہیں۔ ہم کو اُس سال کانگریس کی استقبالی کمیٹی کے ایک سکرٹری ہونے کا فخر تھا اور کسی حد تک اندرونی کارروائیوں سے بھی ہم واقفیت رکھتے ہیں ہم کو پنجاب و بنگال کے مسلمان بھائیوں سے جنھوں نے اُس قرارداد کے خلاف کہیں کہیں آواز بلند کی ہے یہ بات کہنا ہے کہ جو اصول اسوقت طے کئے گئے تھے وہ تمام ہندوستان کی مجموعی حالت کے اعتبار سے تھے کوئی

خاص صوبہ ہمارے پیش نظر نہ تھا۔ اس فیصلہ کی عمر (۸) برس کی ہو چکی اور مرور زمانہ سے اسمیں اور پختگی پیدا ہوتی جائیگی اگر وہ کسی فیصلہ کو قطعی نہیں سمجھتے اور قدامت کی کوئی وقعت انکی نگاہ میں نہیں ہے تو ہماری رائے میں ہمارے مسلمان بھائی اپنے پانوں میں آپ کلہاڑی مار رہے ہیں ہر چیز جو آج وہ تیار کریں گے اگر وہ کل پلٹ دی جائیگی۔ تو قدیم روایات کا قایم رہنا دشوار ہو گا۔ اس سلسلہ میں ہم کو بعض ہندو برادران وطن سے بھی جو آجتک مسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کے اصول کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں کچھ کہنا ہے۔

اس وقت تمام دنیا کی کامیاب حکومتوں پر نظر ڈالی جائے کہ کیونکر وہ کامیاب ہیں۔ بطور مثال ہم انگلستان ہی کو لیتے ہیں اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ برٹش پارلیمنٹ کی تعریف کرو تو ہم یہ کہیں گے کہ انسانی متضاد قوتوں اور کششوں کو ایک جگہ جمع کرنے سے جو معتدل و درمیانی انسانی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہی برٹش پارلیمنٹ ہے اس کو ہی حکومت کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ کچھ لبرل (Liberal) اور کنسرویٹیو (Conservative) اور کچھ لیبر (Labour) ممبر ہیں جب لیبر گورنمنٹ ہو جاتی ہے تو اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ہر امر کا فیصلہ اپنی اصلی رائے کے مطابق کر سکے گی بلکہ لبرل اور کنسرویٹیو ممبروں کی متضاد کششیں اوس کو درجہ اعتدال پر قایم رکھتی ہیں ہماری رائے میں متضاد کششوں کا قایم رہنا برٹش پارلیمنٹ کی رواج روان ہے

اگر ان قوتوں کو نکال ڈالئے تو برٹش پارلیمنٹ کا تصور ہی مفقود ہو جائیگا اور جو کامیابی آج اس انگریزی حکومت کو حاصل ہے وہ ہرگز نہ رہے گی۔ اب انگلستان کو چھوڑ کر ہندوستان پر نظر ڈالئے یہاں بھی متضاد کششیں اور قوتیں موجود ہیں البتہ انکی نوعیت بدلی ہوئی ہے ہماری رائے میں ہندوستان کی حکومت اس وقت کامیاب ہو گی جب اہل ہند ان متضاد کششوں کے وجود کو تسلیم کر کے اپنا پارلیمنٹ بنائیں گے۔ اگر اس ملک نے اپنی اسمبلی (Assembly) یا پارلیمنٹ کی تنظیم ایسی کر دی کہ مسلمانوں کے مخصوص جذبات اس کو جادہ اعتدال پر قائم رکھنے کے لئے کام نہ آسکے تو وہ حکومت ہماری رائے میں نقش بر آب کی مصداق ہوگی۔ یہ تضاد ایسا نہیں ہے کہ اس سے مجموعی حیثیت سے ملک کا نقصان ہو۔ ہمارے ہندو بھائی یہ کبھی خیال نہ کریں کہ ہندی مسلمان اس ملک کے مفاد کو کسی دوسرے اسلامی ملک کے مفاد کے تابع کر دیں گے۔ یہ کبھی نہیں ہوا اور یہ محال ہے۔ اس ملک کے مسلمان اپنے اصلی فائدہ کو سمجھتے جا رہے ہیں اس مسئلہ پر ہم اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ اسی باب کے حصہ دوم میں ظاہر کر چکے ہیں البتہ ایک ہی ملک میں رہکر ہندی مسلمان اپنی ترقی کے سامان کر رہے ہیں اور دوڑ میں برابر رہنا چاہتے ہیں۔ انکی ترقی ملک کی ترقی ہے۔ ان کا تنزل ملک کا تنزل ہے۔ میں تو اگر ہندو

ہوتا تو مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کی نسبت یہی رائے دیتا کہ اس معتدل کرنے والی قوت کو قائم رکھئے۔ ہماری حکومت میں یہ عنصر فروگذاشت کے قابل نہیں ہے۔ اتحاد قائم رکھنے کی اور یہی چند دوسری تدابیر ہیں جو اس وقت میرے ذہن میں آ رہی ہیں۔

ہندو مسلمانوں میں سیاسی اتحاد ہو کر رہیگا

ہماری رائے میں ہندو مسلمان بڑے بڑے سیاسی امور میں ایک ہی نقطہ کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ گذشتہ (۲۰) برس سے جو حالات ہم خود دیکھ رہے ہیں ان سے ہماری یہ رائے قائم ہوئی ہے۔ ہم کو ۱۸۹۹ء کا ایک واقعہ کبھی نہ بھولے گا۔ اس سال کانگریس کا اجلاس لکھنؤ میں تھا۔ ہم کانگریس کی استقبالی کمیٹی کے ایک رکن تھے۔ لکھنؤ جیسے شہر میں ہماری شرکت سے مسلمانوں کو بڑا استعجاب ہوا۔ اسی زمانہ میں ایک روز جب ہم اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں داخل ہوئے تو چند بڑے معزز مسلمان احباب نے ہم کو دیکھکر ہماری شرکت پر مذاق اڑانا شروع کیا اور ہم سے طنزاً اس طرح مخاطب ہوئے۔

"آئیے جناب! ممبر کمیٹی استقبالی نیشنل کانگریس"

پندرہ برس کے بعد ہم نے دیکھا کہ انہی میں ایک حضرت کا شمار کانگریس کے بہت بڑے حامیوں اور لیڈروں میں ہو گیا اور اب یہ ایک عہدۂ جلیلہ پر ممتاز ہیں۔ ایک زمانہ سر سید احمد خاں مرحوم کا تھا جب کہ نہ صرف کانگریس بلکہ تمام سیاسی مجالس میں مسلمانوں کی شرکت

تعبیر سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد نواب مشتاق حسین وقار الملک بہادر
مرحوم کی کوشش سے "مسلم لیگ" قائم ہوئی جسکی بابتہ لوگوں کو
ابتدا میں یہ بدگمانی ہوئی کہ وہ کانگریس کی مخالف ہوگی لیکن رفتہ
رفتہ وہ ان تحریکات کی آواز بازگشت کا کام کرنے لگی جو کانگریس
کے پلیٹ فارم سے منظور ہوتی تھیں۔ آج وہ زمانہ ہے کہ مسلمان
کانگریس میں ضم ہو رہے ہیں۔ اسکی وجہ کیا ہے؟ ہماری رائے
میں وجہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت انگریزی کے مقابلہ میں ہندوؤں
اور مسلمانوں کے اغراض مشترک ہیں۔ ہندوستان کو جس قدر حقوق
عطا ہونگے اُن سے بالآخر سب ہندوستانیوں کا فائدہ ہوگا
علاوہ بریں سچ کی آخری کامیابی قانون قدرت میں داخل ہے
اگر یہ بات سچ ہے کہ بغیر سیاسی اتحاد کے ہندوستانیوں کو سیوراج نہیں مل
سکتا اور بغیر سیوراج یا ہندوستانی حکومت کے اس ملک کے
تمدن میں اصلی ترقی نہ ہوگی اور کوئی ہندی بحیثیت ہندوستانی
کے بیرون ہندوستان کوئی وقعت نہیں رکھے گا۔ جیسا کہ دوسرے
موقع پر دکھایا جا چکا ہے تو یہ سچ بات کبھی نہ کبھی روز ضرور
سمجھ میں آئیگی۔ اگر انسان سچ بات کو خود نہیں سمجھتا تو دنیا کی
مصیبتیں اسکو سکھا دیتی ہیں۔ دنیا کے تلخ تجربے سچائی کا سبق
دیدیتے ہیں اور ایک نہ ایک دن سچ ضرور غالب ہوتا ہے۔ یہ قانون
قدرت ہے اور یہی وجہ ہمارے اس اعتقاد کی ہے کہ ہندو مسلمان میں

سیاسی اتحاد ہو کر رہے گا۔ مسلم لیگ بھی رہے گی۔ کانگریس بھی رہیگی مگر ان دونوں جماعتوں کا سیاسی مرکز ایک ہی ہو جائیگا۔ اور جن باتوں میں فرق رہیگا ان کا تعلق صرف اندرونی باہمی معاملات سے ہوگا۔

ہندوستان کی تاریخ میں انگلستان کی اب کیا حیثیت و پوزیشن ہے

گزشتہ صفحات میں ہم نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ مستقل اتحاد قایم کرنے کے لئے مدارس کے ابتدائی درجوں میں عہد ہنود و عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ جو ہندوستانی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہو لڑکوں کو پڑھائی چاہئے لیکن کوئی تاریخ ہند اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک گزشتہ دوسو برس کا حال بھی اُسمیں نہ ہو یعنے جب سے عہد مغلیہ کا دَوْر ختم ہوا اور دور جدید کی بنیاد پڑی ہم نے بہت کچھ اپنے قدیم تمدن کی ثناء خوانی کی ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی چال بازیوں کو دکھایا ہے اور پچھلے ابواب میں اُن اثرات اور قوتوں پر اظہار رنج و افسوس کیا ہے جو ہماری صَنْعَتْ ۔ حِرْفَتْ ۔ دَوْلت ۔ تجارت ثروت ۔ فَارِغُ الْبَالِی ۔ آزادی ۔ خُودْدَارِی کو اڑا لے گئیں۔ اور اس غرض سے کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد قائم رہے یہ بھی بتایا ہے کہ عہد مغلیہ کی نسبت اہل ہنود کا کیا نقطۂ نظر ہونا چاہئے اور مسلمان کس نظر سے اہل ہنود کو دیکھیں لیکن قبل

اُٹھانے کے ملک ہندوستان کے مورخ کو اس کا تصفیہ بھی کرنا ہوگا کہ
کہ اس کو موجودہ حکمرانوں کو کس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے صحیح واقعات
کا لکھدینا ایک اور بات ہے اور ان واقعات کو ناظرین کے روبرو
پیش کرنے کا طریقہ امر دیگر ہے۔ کسی واقعہ کے پیش کرنے کا طریقہ ہی
وہ شئے ہے جس میں مؤرخ کے جذبات ناظرین کے دلوں پر اپنے گل
کھلایا کرتے ہیں۔ موجودہ حکمرانوں کے زمانہ کی تاریخ لکھتے وقت
اس بات کا خوف ضرور ہے کہ ہماری قومی آزادی و خودداری کے چھن
جانے سے اور صنعت و حرفت کے مٹنے سے جو جذبات و جوش پیدا
ہوں وہ کہیں صداقت کا خون نہ کردیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ صداقت
ہر چیز کی مضبوط بنیاد ہے۔ جو عمارت صداقت پر مبنی ہے وہ کبھی
منہدم نہ ہوگی یوں تو جوش اور جذبات کی لہریں سنگ صداقت
سے بہت کچھ ٹکرائیں گی مگر یہ پتھر ایسا گراں وزن ہوگا کہ اسکو بڑے
سے بڑا طوفان بھی جنبش نہ دے سکے گا۔ یہ بڑا اخلاقی جرم ہوگا
کہ ہم ان نقصانات کا تو ذکر کریں جو موجودہ حکومت سے ہم کو پہنچے
ہیں اور ان فواید کا اعتراف نہ کریں جس سے ہم مستفید ہو رہے ہیں
اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم بھی اس جرم کے مرتکب ہونگے جسکی فرد قرارداد
جرم ہم ان مورخین پر لگا رہے ہیں جو عہد مغلیہ کے صحیح صحیح واقعات
درج نہیں کرتے۔ یہ ایک اصولی بات ہے جس کا پیش نظر رکھنا ہندوستان
کے مورخ کا فرض ہوگا۔

یوں تو ہر مورخ کے خیالات علیحدہ علیحدہ ہونگے لیکن موجودہ انگریزی حکومت کی نسبت ہمارے جو خیالات ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں ہم اپنے خیال کو اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر جسٹس رینڈے کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں اور اب پھر مختصر الفاظ میں اُس کے اعادہ کی معافی چاہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان ایک منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہے جس کے بہت سے درمیانی منازل ہیں جس طرح عہد ہنود کے بعد عہد مغلیہ اُس کی ایک ضروری طے شدنی منزل تھی اسی طرح موجودہ انگریزی حکومت کی منزل کا طے کرنا بھی قادر مطلق نے ضروری کیا تھا۔

ہم موجودہ حکومت کو اصلی ڈرامے کا ایک سین یا منظر سمجھتے ہیں عہد مغلیہ کے بادشاہ کی ذات و مذہب کا جو جذب متفاطیسی اثر دل پر ہو تھوڑی دیر کے لئے اُس سے قطع نظر کر کے ہم دنیا کو دیکھنا چاہتے ہیں انسانوں کے باہمی تعلقات میں کیا کیا تغیرات ہو رہے ہیں مجموعی حیثیت انسان کا پایہ کیسا بلند ہوتا جا رہا ہے۔ جو شخص دوسرے کو چھو نہیں سکتا تھا آج وہ دوسروں کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے رہا ہے ہر حکومت میں اب جو انتظامی شاخیں قائم ہوگئیں یا قائم ہوتی جا رہی ہیں اُس کے ایک شعبہ کی نگرانی بھی ایک دماغ قابل اطمینان طریقے سے نہیں کر سکتا چہ جائیکہ کل حکومت کا انتظام پھر نقل و حمل کے ذرائع میں جو روز افزوں ترقی ہو رہی ہے اُس سے اس دنیا کی

تمام حکومتوں میں جو باہمی تعلقات منسلک ہوتے جا رہے ہیں وہ ایک مہین باریک جال کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ہر تار پر نگاہ رکھنا ایک دماغ سے ممکن نہیں ہیں۔ ان واقعات کا جو اثر ہر ملک کی طرز حکومت پر پڑا ہے وہ ظاہر ہے۔ یورپ کے ہر ملک میں حکومت کی قوت انسانوں میں اس طرح تقسیم ہو گئی کہ باید و شاید۔ کیا ایشیاء اس سے بچ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ پھر اسمیں یہ تبدیلی کیونکر نہ ہوتی؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کو پیدا کرنے کے لئے قادر مطلق نے ہر ملک کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔ دنیا امریکہ فرانس روس۔ جرمنی۔ یونان۔ چین۔ ٹرکی۔ اور ایران کے گزشتہ ڈیڑھ سو برس کے حالات پر نظر ڈالئے۔ کہیں گوشت و خون کی مدد سے کہیں اخلاقی قوتوں کے زور سے کہیں حکمت عملی سے حکومتوں کے تغیرات کا ایک ہی سین و منظر اس دنیا کے تھیٹر میں ہم کو دکھایا جا رہا ہے۔ ہم اسوقت صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک سچے مورخ کو ہندوستان میں انگلستان کی حکومت کس نقطۂ نظر سے دیکھنی چاہیئے۔ اور اسی وجہ سے یہ واقعات لکھے جا رہے ہیں۔ مورخ کا فرض ہے کہ وہ جزیات سے قطع نظر کر کے بلند پروازی کرے اور پھر قدرت کا سماں دیکھے۔

خدا کی زبان اس عالم کے واقعات ہیں اور ان واقعات میں کچھ ایسا تسلسل ہے کہ ہر منزل پر پہنچنے کے بعد جب ہم پیچھے مڑ کر

[illegible] میں تو نتائج کا ایک نیا سماں نظر آتا ہے سنہ ۱۸۵۷ء تک جو واقعات
گزرے اُن سے ہم یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ ظالم ایسٹ انڈیا کمپنی
ہندوستان میں کیونکر آئی ایک صدی کے بعد سنہ ۱۹۱۹ء میں عالم اسباب
کے عجیب و غریب ڈرامہ کا سلسلہ کچھ سمجھ میں آنے لگا اب گزشتہ چونسٹھ
برس میں جو تغیرات دیکھتے دیکھتے ہمارے سامنے دنیا میں ہو گئے
ان پر ہم غور کرتے ہیں۔ زار (Czar) روس کی نسل کا نام
و نشان نہ رہا۔ قیصر جرمنی لکڑی کی تجارت کر رہا ہے۔ سلطان ٹرکی
اپنی بسر اوقات میں دوسروں کا دست نگر ہے۔ شاہ ایران پیرس
میں کھیل تماشے میں مصروف ہے۔ یونان کا فرماں روا جلا وطن
کیا گیا۔ چین کا بادشاہ تاش کے بادشاہ سے زیادہ قوت نہیں رکھتا
یہ وہ عبرتناک واقعات ہیں جو پچیس برس قبل ہمارے خواب و خیال
میں بھی نہیں آ سکتے تھے اب ان پچیس برس کے واقعات کو اس کے قبل کے
ڈیڑھ سو برس کے واقعات کے ساتھ ملا کر دیکھئے۔ بالخصوص امریکہ و
فرانس کے واقعات مورخ کا فرض ہے کہ آئندہ کے لئے مسلمہ یا مشتبہ
واقعات سے نتیجے اخذ کرے۔ قوموں کی حیات و ممات کے متعلق
صحیح نتائج وہی ہونگے جن کی تطبیق ان واقعات عالم سے ہو جو قدرت
خدا سے دراصل ظہور پذیر ہوئے۔ خدا اپنا ارادہ اسی عالم اسباب
اور انہیں واقعات عالم کے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے۔ جب ہم نتیجہ نکالنے
اور اپنی رائے قائم کرنے کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں طریقہ حکومت کا بدلنا قادر مطلق کی اسکیم
اور پروگرام میں داخل تھا۔ پھر بھلا ہندوستان کی سلطنت مغلیہ اس سے
کس طرح مستثنےٰ کیجا سکتی تھی۔ ہماری رائے میں ہندوستان میں طریقہ حکومت
بدلنے کا مقصد حاصل کرنے کے لیے قادر مطلق نے انگلستان کو یہاں
مسلط فرمایا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سب سے بڑی چیز جو ہندوستان نے
اس دور حکومت میں سیکھی وہ یہ ہے کہ حکومت کی قوت مختلف افراد
میں تقسیم کرکے وہ حکومت زیادہ مستحکم کیونکر بنائی جا سکتی ہے انفرادی
واجتماعی حیثیت سے کام کرنے کے اصول بھی اس حکومت نے ہم کو سکھائے
یورپ وامریکہ نے جسقدر سوسائیٹیاں اور جماعتیں معاملات دنیوی کو
زیادہ مکمل طور سے انجام دینے کے لیے قائم کر رکھی ہیں انکی مثال دنیا
کے قدیم تمدن میں نہیں ملتی۔ ہم یہ چیزیں بھی انگلستان کے ذریعہ سے
سیکھ رہے ہیں۔ اس سے بھی ہمارے اُس خیال کی تائید ہوتی ہے
کہ انگلستان دراصل اسی غرض کی تکمیل کے لیے ہم پر مسلط کیا گیا ہے
ابتدا میں کچھ ہی حالت رہی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اب
تاریخ ہند میں انگلستان کی پوزیشن (Position) اور حیثیت
ایک امین یا معلم کی سی ہو گئی ہے۔

ہندوستان میں انگلستان کے کارناموں کی اصلیت

ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین ہمارا اصلی پوائنٹ
(Point) اور مقصد کو پیش نظر رکھیں اس وقت
ہم کو نہ مہاتما گاندھی کے نان کواپریشن Non Cooperation

یعنے ترک موالات سے تعلق ہے اور نہ پنڈت سرینواس شاستری کے
کوآپریشن (Cooperation) یعنے موالات سے بحث ہے۔ اس
حصے میں شروع سے ہم اپنا یہ خیال ظاہر کر رہے ہیں کہ ہندو مسلمانوں
میں مستقل اتحاد قائم کرنے کے لئے اسکی بڑی ضرورت ہے کہ ہندو زمانہ
و عہد مغلیہ کی صحیح تاریخ جس میں کچھ چھپایا نہ گیا ہو لڑکوں کو پڑھانی چاہیئے
جسکی مفصل کیفیت بیان ہو چکی ہے۔ اسی سلسلہ میں ہم اپنا خیال اس امر
کے متعلق بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ دور موجودہ میں انگلستان کے
کارنامے بھی ہمارے بچوں کے سامنے کیونکر پیش کئے جائیں ہم یہاں
بھی بحیثیت مورخ منافقت سے متنفر ہیں۔ ہم صرف اصولی طور سے یہ
بیان کر سکتے ہیں کہ بچوں کے دلوں میں پہلے سے کوئی زہر ڈالنا اور اس
سے ان کو متاثر کرنا مناسب نہیں۔ مورخ کے فرائض بہت مقدس ہیں
اسکی ذمہ داریاں اہم ہیں۔ اسکو صرف صداقت کے راستے پر چلنا چاہئے
اس راستے میں کہیں کہیں دشواری ضرور پیش آئیگی لیکن وہ ناگزیر ہے۔
مثلاً یہ سچ ہے کہ انگلستان ہم کو نیا طرز حکومت سکھا رہا ہے۔ ہندوستان
کے نقل و حمل کے ذرائع و تجارت میں روز افزوں ترقی ہے۔ بڑے بڑے
جہاز ساحل ہندوستان پر مال و اسباب سے لدے ہوئے تیار کھڑے ہیں۔
ریلیں اور موٹریں دوڑ رہی ہیں۔ ہوائی جہاز اڑتے نظر آ رہے ہیں
ہندوستان ہزاروں میل کے فاصلہ سے تار اور بے تار دونوں کے ذرائع
سے اپنے معاملات دیگر ممالک سے چند منٹ کی گفت و شنید میں طے

کر رہا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اس موجودہ دور
کے قبل ہم اپنے پیروں پر کھڑے تھے اور اپنے ہی پاؤں سے چلتے
پھرتے تھے۔ اب نئی رفتار و طرز حکومت کے سکھائے جانے کے پیرایہ
میں ہم ابھی تک انگلی پکڑا کر چلائے جا رہے ہیں۔ جہازوں میں مال
تو ہے مگر جب مال کا بنڈل اور صندوق کھول کر دیکھتے ہیں تو
اس میں ہماری دولت و صنعت و حرفت مقابلۃً بہت کم معلوم ہوتی
ہے۔ مال کسی اور کا ہے۔ ریلیں اور موٹریں تو ہیں مگر ہم انکے انجنیئر
نہیں ہیں بلکہ ابھی شوفر کا کام انجام دے رہے ہیں اور ہوائی جہاز
کا انجنیئر ہونا تو درکنار اسکے شوفر بھی ہم نہیں ہیں۔ صرف دُور سے
تماشہ دیکھنے والے ہیں۔ تار اور بے تار کی خبروں کے معاملہ میں ہم
ہمہ تن تحیر کھڑے ہیں۔ بنانا تو درکنار ابھی سمجھنے کی بھی قابلیت ہم کو
نہیں۔ ان سچی باتوں کے نہ ظاہر کرنے میں اسی قسم کی افراط و تفریط
ہوگی جو بعض عہد مغلیہ کے مورخ اُن کے عیوب دکھا کر اسکی خوبیوں پر
پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مورخ
جادۂ اعتدال و صداقت پر رہیں اور ہم ابھی انگلستان سے ناامید
بھی نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مغرب ابھی مشرق کو اچھی طرح سمجھا بھی
نہیں۔ بعض اوقات دیکھا ہے کہ جن قومی اوصاف کو ہم اپنی
خوبیوں میں شمار کرتے ہیں اُن پر مغرب انگشت نمائی کرتا ہے اور
جن باتوں کو ہم عیوب میں داخل کرتے ہیں اُن کو اہل مغرب فیشن و

تہذیب کی علامات سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے موجودہ حکمرانوں پر ابھی تک ضرب المثل صادق
آتی ہے کہ کے آدمی و کے پیر شدنی قوموں کی تاریخ اور زندگی میں ڈیڑھ سو برس
ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جیسا آدمی کی زندگی میں ایک دو سال۔ انگلستان نے ہندوستان
سے ۱۸۵۷ء کے غدر کے موقع پر ایک ملکہ معظمہ کی زبان کے ذریعہ سے
کچھ وعدہ کیا تھا اور پھر ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کی مصیبت کے وقت
اُس وعدہ کی توثیق ایک دوسرے جلیل القدر شہنشاہ کی زبان سے کرائی
اس دور کے یہ سب سے بڑے کارنامے ہیں اگر انگلستان نے یہ وعدے خود
پورے کئے تو کوئی شک نہیں کہ ہمارے بچے اور ہماری نسلیں احسان و
شکر گزاری کے بار گراں سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکینگے دنیا کی تاریخ
میں اسکی مثال ملنا دشوار ہوگی۔ ہماری دولت۔ صنعت۔ حرفت۔ خودداری
وقعت اور کیرکٹر میں حالت محکومی سے جو نقصان پہنچا ہے اُس کی تلافی
وخانہ پری ایفاء وعدہ سے جلد ہو جائیگی لیکن اگر بالآخر واقعات
وحادثات عالم کے زور نے وعدہ پورا کرایا تو اس میں شک نہیں کہ
تاریخ کا آخری فیصلہ یہی ہوگا کہ انگلستان پر خود غرضی کی انسانی کمزوریاں
غالب آگئی تھیں وہ اپنے بار امانت کو برداشت نہ کر سکا۔ یوں تو
اس دنیا کی قدرتی قوتیں عمل کر رہی ہیں۔ ہندوستان کے تیس کروڑ
بنی نوع انسان بھی ایک نہ ایک دن ضرور ٹھکانے لگینگے۔ ہماری تاریخ
میں موجودہ دور اس طرح گزر جائیگا جیسے کسی لذیذ پلاؤ کے تیار کرنے
میں بیچ کا اُبال ہوتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے مقابلہ

انگلستان کی اہلیت و قابلیت کا آخری فیصلہ تاریخ اسی بنا دیر کرے گی
کہ اس نے اپنے دور میں ہمارا پایہ بحیثیت انسان بلند کیا یا پست حق
ہماری جانب ہے اور ہم کو امید ہے کہ انگلستان کا کیرکٹر بالآخر حق کا
ساتھ دیگا۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ ہم اپنے طالب علموں کے سامنے انگلستان
کے کارناموں کا کھاتہ بند کرنا نہیں چاہتے۔ دور مغلیہ کا کھاتہ تو بند
ہو چکا ہے لیکن موجودہ دور کا کھاتہ رواں ہے۔ ہماری رائے میں ابھی
ہندوستان کے مورخ کو آخری فیصلے نہیں نکالنے چاہئے۔ موجودہ دور
کو ہم نہ شب تار سمجھتے ہیں اور نہ روز روشن۔ ہماری امیدیں ابھی
انگلستان سے وابستہ ہیں۔ ہماری رائے میں ہندوستان کے مورخ کے لئے
یہی سچا اور صحیح راستہ ہوگا۔

خاتمہ

ممکن ہے کہ اس کتاب میں کوئی عبارت ایسی موجود ہو جو
ناظرین میں سے کسی کے خلاف مزاج ہو اگر ایسا ہو تو اس
کے لئے میں معافی چاہتا ہوں۔ میری غرض اس کتاب سے اتحاد
پیدا کرنا ہے نہ کہ نفاق۔

گو اب ۱۹۱۸ء سے میں رعایا حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ
کی خدمت کرنے میں مصروف ہوں لیکن اس کے قبل کچھ عرصہ تک ہندوستان
کے پالٹیکس (Politics) کے میدان میں کچھ بادیہ پیمائی
اور خاک بیزی کر چکا ہوں۔ میں اس کو بخوبی محسوس کر رہا ہوں کہ
ہندو مسلمانوں کی نااتفاقی کا سیاسی اثر ہم پر کیا ہوگا۔ یہی اندیشہ

اس کتاب کے لکھنے کا محرک ہوا ہے۔ اگر اس مقصد کے حاصل کرنے میں عشر عشیر بھی کامیابی ہوئی تو میں یہ خیال کرونگا کہ میری کل محنت وصول ہو گئی۔ بالآخر ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم انسان تیرے بندے کمزور ہیں۔ بغیر تیری مدد کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اے خدا مدد کر۔ اور اس ملک کے تمام باشندوں میں اتفاق پیدا کر تاکہ اسکی قوت سے ہم منزل مقصود تک پہنچ سکیں فقط

سمیع اللہ بیگ

۱۰ جمادی الاول ۱۳۴۵ھ ۵ نومبر ۱۹۲۶ء

ختم شد

قطعۂ تاریخ طبع کتاب ہذا

از مولوی اسد اللہ حسینی صاحب اسد صیغہ دار مجلس عالیہ عدالت سرکار عالی

مندر میں ہندو مطمئن مسجد میں مسلم مطمئن — تھے بے الم ہندو مسلماں عہد عالمگیر میں

۱۲ف ۴۴

تاریخ لکھتے میرا اسد نواب ناظر یار جنگ — ہندو مسلماں ایک تھے یاں عہد عالمگیر میں

۴۳ ۱۲ھ

ہندو۔ ہنداسلامی عہد میں

○ ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کی کوششیں

○ —— سید سلیمان ندوی

سید سلیمان ندوی مرحوم نے 'معارف' میں کچھ
سہو کی چیزیں شائع کیں۔ 'معارف' بابت مئی تا دسمبر
۱۹۱۸ء سے ان کا یہ ایک اہم مقالہ پیش خدمت ہے۔

—— ادارہ

ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کی کوششیں

سید سلیمان ندوی

(۱)

مسلمانون کی آمد سے پہلے ہندو قوم وہ قوم تھی جو ہر غیر قوم سے اسقدر شدید نفرت رکھتی تھی کہ اسکے سایہ تک سے گریز کرتی تھی، اور اس کو ملیچھ، ناپاک، اور نجس ہستی تصور کرتی تھی، کیا اُس وقت مین کوئی یہ خیال کرسکتا تھا کہ کسی زمانہ مین ہندو قوم بھی اس قدر روادار اور وسیع الخیال ہو جائیگی کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ مل جلکر کام کرے گی، اس کی زبان سیکھے گی، اُسکے علوم و فنون پڑھے گی، اُسکے تمدن و معاشرت کو اختیار کرے گی، اور اسکے ساتھ شاگردی و استادی کا رشتہ قائم کرے گی۔ لیکن سو دو سو برس ہی کے اندر ان خیالات مین بڑا تغیر آگیا، اور اب وہ مسلمان سلاطین کی نوکریان کرنے لگے، اور دربارون مین مسلمان ارباب کمال کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے لگے، یہی ابتدائی بے تعصبی ہندون کی موجودہ تعلیمی ترقی کا زینہ ہے۔

اگر مسلمانون کا درمیانی دو ڈھائی سو دو سو برس کے اندر اندر ہندوؤن کو اپنی قدیم تنگ خیالی کے بدلنے پر مجبور کیا، اور دوسری قومون کے علوم و فنون سیکھنے کی اُن مین ترغیب پیدا کی، ہندوستان مین قائم نہوا ہوتا، تو کیا یہ ممکن تھا کہ انگریزون کی حکومت کے اول یوم سے وہ انگریزی تعلیم کا آغاز کردیتے اور ساٹھ ستر برس کے اندر اندر تمام ہندوستان مین

ایک غیر قومی زبان کی تحصیل کے لیے، مدارس، مکاتب، پاٹ شالے اور کالج کہلاتے، گوہر مقصود کی تلاش مین ہندوؤن مین بے محابا سفر کرتے، انکو سو دو سو برس تو صرف اپنی نفرت قومی اور تعصب مذہبی کے مٹانے مین صرف ہوتے، اور اس اثنا مین مسلمان کہین سے کہین جا نکلتے۔

ہندوؤن پر مسلمانون کا دوسرا سب سے بڑا تعلیمی احسان یہ ہے کہ مسلمانون سے پہلے ہندو دھرم کے مطابق، تعلیم ہندوؤن کے ایک مخصوص طبقہ تک محدود تھی، حکم تھا کہ وید کا کوئی فقرہ اگر کسی شودر کے کان مین پڑجائے تو اُس مین سیسہ پلا دیا جائے، برہمنون کے علاوہ ہندوؤن کے دیگر طبقون مین یا علم مطلق نہ تھا، یا بہت ہی کم تھا، بہ یہ کہنا چاہیے کہ مذہباً انکو تعلیم کے حاصل کرنے کی مطلقاً اجازت نہ تھی لیکن مسلمانون نے ہندوستان آکر تعلیم کو ہندوؤن کے ہر طبقہ تک عام کردیا۔ برہمنون سے لیکر کھتری، کایستھ، بنیے، اور ان سے بھی نیچے درجون تک علم اتر آیا، آج ہندوستان مین برہمنون سے زیادہ نہین تو برہمنون کے برابر غیر برہمن ہندو بھی تعلیم سے بہرہ اندوز ہین، اور مسلمانون کے عہد حکومت مین بھی یہی حال تھا کہ برہمنون سے زیادہ کایستھ اور کھتری تعلیم یافتہ تھے۔

ہندوؤن پر مسلمانون کا تیسرا سب سے بڑا تعلیمی احسان یہ ہے کہ ان مین تعلیمی علوم و فنون مین وسعت پیدا کی، قدیم ہندوستان کے شیشہ وقار کو صدمہ پہنچائے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانون کے عہد سے پہلے ہندوستان مین جن علوم کی تعلیم رائج تھی، انکی فہرست نہایت مختصر تھی۔ نصاب تاریخ سے یہان کے مدارس ہمیشہ خالی رہے، جغرافیہ کا وجود یہان برائے نام تھا، فلسفہ، حکمت، اقلیدس، ہیئت، طب، شاعری، موسیقی وغیرہ علوم ہندوستان مین پہلے سے موجود تھے، لیکن ان کی تعلیم اولاً تو مخصوص لوگون کو ہوتی تھی، دوسرے یہ کہ ان علوم

کے متعلق دنیا کی دوسری قومون کی جو تحقیقات تھی اس سے یہان سرتاپا ناواقفیت تھی،
مسلمان علما نے اسکے نصاب تعلیم کو ان فروگذاشتون سے پاک کیا،

مسلمانون مین ہندوستان کا سب پہلا علمی فاتح بیرونی ہے، وہ سلطان محمود کے زمانہ مین ہندوستان آیا، یہ مسلمانون کی ہندوستان کی عملداری کا آغاز باب تھا اور ضرورت تھی کہ ہندون نے خلافت بغداد کو دوسری صدی ہجری مین جو علمی قرض دیا تھا، وہ مع سود کے واپس کردیا جاے، بیرونی کتاب الہند کے پہلے باب مین لکھتا ہے:

"اجنبی ہونے کے سبب مجکو ہندو علماے ہیئت کی پہلے شاگردی اختیار کرنی پڑی، لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد جب میری زباندانی کی واقفیت بڑھ گئی تو میری حیثیت استاد کی ہوگئی، چونکہ ہیئت اور ریاضیات مین مجکو کامل مہارت حاصل تھی مین خود انکو تعلیم دینے لگا، پنڈتون کو یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوئی، تعجب سے پوچھتے تھے کہ تم نے یہ باتین کس پنڈت سے سیکھی ہین، انکو یقین نہین آتا تھا کہ کسی دوسری قوم کا آدمی بھی علوم وفنون مین انکا ہمسر ہوسکتا ہے، وہ مجکو جادوگر سمجھتے تھے اور "بحر العلوم" کہتے تھے"

ہندو پنڈتون کی واقفیت کے لیے، اسنے عربی زبان سے حسب ذیل کتابین سنسکرت مین ترجمہ کین۔ رسالۂ اصطرلاب۔ مجسطی۔ اقلیدس کے مقالے، علاوہ ازین ہندو پنڈتون کے سوالات کے جواب مین بھی اُسنے کئی رسالے لکھے، ہندو ہیئت دانون نے ہیئت کے متعلق سوالات کیے تھے۔ ۱۲۰ صفحون مین اسنے انکے جوابات لکھے، ایک رسالہ اُس کا اس بحث پر ہے کہ اعداد کے مدارج جو عربی زبان مین ہین وہ باعتبار ہندی کے زیادہ صحیح طریقہ پر مقرر ہین[1]۔

[1] فہرست تصنیفات بیرونی در آثار باقیہ۔

مسلمانون کے فتوحات نے ہندوستان مین جب وسعت حاصل کی تو ہندو پنڈتون کو ان کے اندرونی حالات کے دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ بھوجر برہمن نام بنارس کا ایک باشندہ قاضی رکن الدین کی خدمت مین پہنچا اور وہان سے مسلمانون کے علوم کی تکمیل کی قاضی صاحب نے بھوجر سے سنسکرت سیکھی اور اسکی مدد سے انبرت کنڈ (حوض آبحیات) نام ایک کتاب کا سنسکرت سے عربی مین ترجمہ کیا۔[1]

سلطان زین العابدین جو ۸۲۳ھ مین تخت کشمیر پر جلوہ آرا ہوا تھا اور جسکے آثار سلطنت پر شہنشاہ اکبر نے اپنی حکومت کی بنیا دین کھڑی کی تھین، اُسنے ہندوون کے لیے بہت سی عربی اور فارسی کتابون کے ترجمے ہندی مین کرائے، فرشتہ کی عبارت یہ ہے:

وفرمودتا اکثرے ازکتب عربی وفارسی بزبان ہندی ترجمہ کردند،

سری بھٹ نام ایک بید کو طبابت کی تعلیم دلا کر اپنے دربار مین یہان تک ممتاز کیا کہ وہ سیاسی معاملات مین بھی دخیل ہوگیا۔ فرشتہ لکھتا ہے:

وسلطان بجہت طبابت سری بھٹ راکہ طبیب حاذق بود تربیت کرد (صفحہ ۳۴۲)

ہندوون کو مسلمانون سے جو نفرت قلبی تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ کوئی ہندو مسلمان بادشاہون کے دربار مین نوکری تک قبول نہین کرتا تھا، رسوم و عادات کی یہ بندشین سب سے پہلے دکن مین ٹوٹین، مسلمان سلاطین نے ہندو فاضلون کی قدر افزائی شروع کی اور اس بہانہ سے وہ رفتہ رفتہ مسلمانون سے مانوس ہونے لگے۔

شہزادہ محمد تغلق کے دربار مین گنگو نام ایک برہمن حذمت منجمی پر ممتاز تھا حسن بہمنی جو

[1] جامع التقصص العربیہ فی الاخبار الہندیہ صفحہ ۱۵ مطبوعہ فرانس ۱۸۴۵ء، صفحہ ۳۴۴، نولکشور

دکن مین بہمنی حکومت کا بانی ہوا ہے، وہ اس منجم کا نہایت ممنون احسان تھا اس تقریب سے دکن کے برہمنون کو بہمنی حکومت کے ساتھ موانست پیدا ہوئی اور بالآخر تمام دفاتر سرکاری کے وہ مالک بن بیٹھے، فرشتہ مین ہے:

مشہور ہست کہ پیش ازین برہمنان، پیرامون خدمت و عمل شہریاران اسلام نمی گردیدند و در قرایا و زردایا و مواضع انبار بکسب انواع علوم خصوص علم نجوم اشتغال داشتہ۔ متوکلانہ زندگی میکردند و ملازمت اہل دنیا خصوص مسلمانان را مخل حسنات دانستہ و شقاوت ابدی تصور کردہ پیرامون خدمت و عمل نمی گردیدند اگر احیاناً بعضے از ایشان بوسیلۂ طبابت و نجوم و دعا، و قصہ خوانی در صحبت ارباب جاہ می بودند بانعام و احسان ایشان مخصوص گشتہ قلادۂ نوکری در گردن نمی انداختند اول کسیکہ از فرقۂ برہمہ در دور سلاطین اسلام نوکری کرد گانگو پنڈت بود و تا حال کہ سنہ ۱۰۱۵ھ است بخلاف سائر ممالک ہند خصوصاً دفترہا دکن و نویسندگی ولایت ایشان بہ برہمنان مرجع است (جلد ا صفحہ ۲۰۸)

شاہی دفتر کی زبان عموماً فارسی تھی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اہل کار فارسی زبان اب سیکھنے لگے تھے، ابراہیم عادل شاہ جو ۹۴۱ھ مین دکن کی عادل شاہی خاندان کا فرمانبردار رہا تھا اُسنے فارسی زبان بھی دفتر سے برطرف کر دی۔

و دفتر فارسی برطرف کردہ ہندوی کرد و برہمنان را صاحب دخل گردانید۔ (فرشتہ صفحہ ۲۹ جلد ۲)

شمالی ہندوستان کی نسبت مشہور ہے کہ سب سے پہلے سلطان سکندر لودی کے زمانہ مین، یہان ہندوؤن نے فارسی پڑھنی شروع کی، تاریخون کے پڑھنے سے یہ صاف نظر آتا ہے کہ ہندو رعایا کی تعلیم کے لیے اس سے پہلے کوئی خاص انتظام نہین کیا گیا تھا، بلکہ جو طریقۂ تعلیم، اور نصاب تعلیم ان مین مدتون سے متوارث چلا آتا تھا اُن مین کوئی دخل نہین دیا گیا۔ اپنے طور پر

درس تدریس کے جو انتظامات اُن مین جاری تھے انکو علی حالہا باقی رکھا گیا۔ مسٹر لا اپنی تاریخ پروموشن آف لرننگ ان انڈیا کے دیباچہ مین لکھتے ہین:

ابھی وہ دن دور تھا جب کہ ہم مسلمان سلاطین کو ہندو اور مسلمان دونون رعایا کی تعلیم کی برابر سرپرستی کرتے ہوے اور ایک ہی جوش کے ساتھ مسلمانون کے علاوہ دوسری قومون کے علوم کو ترقی دیتے ہوے پائین سب سے پہلے مسلمان فاتح کے ہندوستان مین قدم جمنے کے ایک صدی یا دو صدی بعد تک ہندوٗون کی تعلیم اور انکے علوم اپنے (قدیم) راستہ پر اپنے حامیون کی اعانت سے چلتے رہے۔

مگر بعض قراین سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فارسی تعلیم کا رواج ان مین اس سے پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق جو ۷۵۲ھ مین تخت نشین ہوا تھا، کانگڑہ کی فتح کے موقع پر جوالا مکھی کی سیر مین اسکو ایک چھوٹا سا کتبخانہ ملا تھا، پنڈتون کو بلا کر چند کتابون کا فارسی مین ترجمہ کرایا۔ سیر المتاخرین کی عبارت یہ ہے۔

سلطان علماے آن طائفہ را بحضور خویش طلب داشتہ مضامین آن را شنیدہ محظوظ گردید و فرمود بعضے از آن کتب را بفارسی ترجمہ کنند۔

بہرحال مورخین کا مطلب یہ ہے کہ باقاعدہ اور عمومیت کے ساتھ ہندوٗون مین فارسی تعلیم کا رواج سلطان سکندر لودی کے زمانہ سے ہوا۔ سلطان لودی نے ہندوٗون کے نمایان جگہون مین مساجد، مدرسے اور بازار قائم کئے، سپاہیون کو تعلیم پر مجبور کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوٗون مین بھی عام طور پر فارسی تعلیم رائج ہو گئی، فرشتہ شہادت دیتا ہے:

بعد فرخندہ او علم رواج یافت و امراء و ارکان و سپاہیان بکسب فضائل اشتغال نمودند و کافران بخواندن و نوشتن خط فارسی کہ تا آن زمان درمیان ایشان

معمول بود پرداختہ،

اسکے بعد شیرشاہ کا زمانہ آتا ہے، اُسنے ہندوُن کے ساتھ نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا، بہت سے ہندوؤن نے فارسی پڑھ پڑھ کر دکن کی طرح شمالی ہندوستان مین بھی دفاتر سرکاری مین نوکریان حاصل کین، راجہ ٹوڈرمل جو اکبر کے نورتن مین شامل ہے وہ شیرشاہ ہی کا تربیت کردہ تھا اور اسکی محکمہ مالگذاری کا دیوان تھا۔

تیموریون کے زمانہ مین ہندوؤن کی تعلیمی ترقی درجۂ کمال تک پہنچ گئی گو اسکی تفصیلات نہ ملین لیکن استقصاے جزئیات سے یہ نتیجہ واضح طور پر نمایان ہوتا ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم ان کے زمانہ مین گھر گھر پھیل گئی۔

فارسی تعلیم کے علاوہ سنسکرت اور دیگر مذہبی علوم کی تعلیم کے لیے ملک کے مشہور شہرون مین بڑی بڑی درسگاہین تھین، جہان دور دور سے طلبہ آکر شریک درس ہوتے تھے۔ یہ درسگاہین، ٹھٹھہ ملتان، اور خصوصاً بنارس مین زیادہ تھین[1]۔ سلاطین تیموری بھی ان علوم کی دستگیری مین کمی نہین کرتے تھے۔ دربارون مین انکو مسلمان فضلاے عہد کے پہلو بہ پہلو جگہ ملتی تھی، ابوالفضل نے آئین اکبری کے ہندو فضلا کے حسب ذیل نام لکھے ہین: مہادیو، بھیم ناتھ، نارائن، ستیوجی، مادھو، رام چندر، سری بھٹ، مادھو سرستی، مدھوسودن، بشن ناتھ، مدسودن، رام کشن، نارائن اسرم، بلبھدر، مصر، ہرجی سور، باسدیو مصر، واسو دیو بھٹ، بابن بھٹ، رام تیرتھ، بدھ نواس، نرسنگھ، گوری ناتھ، برم اندر، گوپی ناتھ، بجی سین سور، کشن پنڈت، نہال چند، بھٹاچارج، کاشی ناتھ، دیوی برہمن، دیوی برہمن نے مہابھارت کا فارسی مین ترجمہ کیا،

---

[1] آثر عالمگیری صفحہ ۱۔

اکبری دربار میں فن مصوری و نقاشی کے جو ماہرین تھے ان میں مسلمان اُستادوں کو چھوڑ کر حسب ذیل ہندو اساتذہ تھے: دسونت کہار، دساون، کیشو، لال، مکند، مادھو، جگن، مہیش، کھیم کرن، تارا، ساونولا، ہری بنس، رام۔

جس طرح اس عہد میں سنسکرت سے فارسی میں کتابیں ترجمہ کی گئیں بعض کتابوں کا عربی و فارسی سے سنسکرت میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ مرزا الغ بیگ کی زیج، علم ہیئت کی آخری اور مستند کتاب ہے، مسلمان اور ہندو فضلا کی ایک مشترک مجلس نے اس کا سنسکرت میں ترجمہ کیا، ہندو علما میں سے کشن، جوتشی، گنگا دھر، مہیش اور مہانند اس مجلس کے ممبر تھے۔

جہانگیر نے بھی ہندو فضلا کی قدردانی میں کمی نہیں کی، اس کے عہد میں جدروپ گرسائیں نہایت مشہور ویدانت تھا، وہ پاپیادہ اسکے جھونپڑے تک جاتا اور گھنٹوں اسکے پاس بیٹھا رہتا، راستہ چلتے کسی سنیاسی کا نام سنتا تو اسکے ملاقات کو اتر پڑتا، ایک دفعہ وہ سفر کر رہا تھا کہ ناگاہ ایک مقام پر اسکو بہت سے جوگی نظر آئے، تزک میں لکھتا ہے:

درہمین منزل شب شیورات واقع شد جوگی بسیار جمع آمدہ بودند..... با دانایان این طائفہ صحبتہا داشتہ شد۔

رائے منوہر لال ولد رائے لون کرن لڑکپن سے جہانگیر کے زیر سایہ عاطفت تعلیم پاکر جوان ہوا تھا۔ فارسی زبان کی شاعری اور خوشخطی میں سلیقہ خاص پیدا کیا۔[1] راجہ سورج سنگھ نے ایک ہندو شاعر کو دربار میں پیش کیا۔ جہانگیر اسکے چند ہندی اشعار سنکر نہایت محظوظ ہوا۔ اور ایک ہاتھی اسکو عطا کیا۔[2] اسکے دربار کا مشہور نقاش بشن داس تھا جسکو جہانگیر نے ایران بھیجا تھا۔[3]

دارا شکوہ کا دربار ہندو فضلا اور شعرا سے بھرا رہتا تھا، وہ خود بھی ہندوؤں کے

[1] تذکرۂ خوشنویسان [2] تزک جہانگیری [3] تزک جہانگیری صفحہ ۲۰۰

علوم و فنون مین مہارت رکھتا تھا، اسلیے ہندو علما کو عزیز رکھتا تھا، اسکے دربار کا گویا ملک الشعرا
ایک برہمن چندربھان نامی تھا۔ اس کا تخلص برہمن تھا۔ فارسی مین دلپسند شعر کہتا تھا، اس کا دیوان
فارسی اب تک موجود ہے، داراشکوہ کے قتل کے بعد بنارس مین آکر سکونت اختیار کرلی تھی جہان
اسنے ۱۰۷۳ھ مین وفات پائی،

اس مضمون مین بدنصیب عالمگیر کا نام، کسی دوستانہ حیثیت سے تو بار نہین پاسکتا
لیکن دشمنانہ انداز مین بھی کیا کسی رسم محبت کا سراغ لگ سکتا ہے، مآثر عالمگیری مین ہے

بعرض خداوند دین پرور رسید کہ در صوبہ ٹھٹھہ و ملتان، خصوص بنارس برہمنان
بطالت نشان در مدارس مقررہ بتدریس کتب باطلہ اشتغال دارند و راغبان طالبان
از ہنود و مسلمانان مسافتہاے بعیدہ طے نمودہ جہت تحصیل علوم شوم نزد آن جماعت
گمراہی آیند، احکام اسلام نظام بہ ناظمان کل صوبہ جات صادر شد کہ مدارس
ومعابد بے دینان دستخوش انہدام سازند و بتاکید اکید طور درس و تدریس و رسم
شیوع مذہب کفرانیان برانداز ند (صفحہ ۸۱)

اس عبارت سے جہان عالمگیر کی تنگدلی ظاہر ہوتی ہے، یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُس
وقت ہندوستان کے تمام صوبون مین اُنکے مدارس قائم تھے، غالبًا ان مدارس
کے توڑنے کے احکام اُسی اصول پر مبنی ہونگے، جسکی مثال ہمکو اس روشن عہد حکومت
کی تعلیمی پالیسی مین نظر آتی ہے۔

محمد شاہ کے زمانہ مین راجہ جی سنگھ والی جے پور نے، دلی، بنارس اور اوجین مین
رصدخانے قائم کرائے، ملا خیر اللہ مہندس رصدخانۂ دلی کے منتظم خاص تھے، بنارس کا
رصدخانہ اب تک موجود ہے، اور ہندوؤن کے تہوارون مین اور شادی بیاہ کی

تاریخون مین اس سے اب تک مدد لی جاتی ہے۔

جی سنگھ نے مسلمان علما کو جمع کرکے عربی زبان کی چند مشہور ہیئت کی کتابون کا ہندی مین ترجمہ کرایا[1]۔

اس تمام عہد مین ہندوؤن کی تعلیم روز بروز ترقی کرتی گئی، فارسی دانی کا ذوق علوم عربی کی تحصیل کا شوق، شاعری کا مذاق، خطاطی، خوشنویسی، حساب وغیرہ کی تعلیم نہایت عام ہوتی گئی۔ یہانتک کہ اس عہد مین یہ نظر آتا ہے کہ ہر شریف ہندو کچھ نہ کچھ لکھا پڑھا تھا، یہ تو ہم نہین کہتے کہ مسلمانون کی آمد سے پہلے ہندوستان مین کتابون کے جمع کرنے اور کتبخانون کے قائم کرنے کا شوق نہ تھا۔ کانگڑہ کی فتح مین مسلمانون کو جو کتبخانہ ملا تھا اُسکا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ لیکن اس عہد مین مسلمانون کی دیکھا دیکھی ہندو شرفا مین کتبخانون کے قائم کرنیکا شوق پیدا ہوگیا۔ تاریخی حوالون کو چھوڑ کر آج ہندوؤن کے جو قدیم شریف گھرانے موجود ہین وہان عربی اور فارسی کتابون کے چند فرسودہ جلدین کسمپرسی مین پڑی ہوئی ملین گی۔ بڑے بڑے ہندو امرا کے ایوانون مین دیگر سامان آرائش کے ساتھ ساتھ کتبخانہ کا وجود بھی لوازم ریاست سے سمجھا جاتا تھا، لاہور، دلی، لکھنؤ، پٹنہ، اور ڈھاکہ مین ایسے بکثرت گھرانے ملین گے، پٹنہ مین اسوقت دو ایک ایسے قدیم ہندو رئیس موجود ہین جنکے ان عربی کتابون کے نادر نسخے ابتک موجود ہین اور اُنکو اسقدر عزیز ہین کہ وہ اُنکو جدا نہین کرسکتے، مہاجہ شتاب رائے ناظم بہار کے خاندان مین اس قسم کا ایک نادر کتبخانہ موروثی چلا آتا ہے۔

---

[1] سبحۃ المرجان آزاد۔

۲

گذشتہ اوراق میں جو کچھ کہا گیا وہ جنوبی اور شمالی ہندوستان اور کشمیر کے متعلق تھا، ان اوراق میں اس خطۂ ہند کے متعلق ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو آج ہندوستان کا سرتاج اور مایۂ فخر و ناز ہے، یعنی **بنگال!**

بنگالی زبان آج اپنی ثروت اور تمول کے لحاظ سے تمام ہندوستان کی زبانوں میں سب سے زیادہ دولتمند ہے، لیکن یہ سنکر تعجب ہوگا کہ اسکی ترقی کا آغاز بنگال میں مسلمانوں کی ابتدائے حکومت سے ہوتا ہے، اس سے پہلے یہ زبان کاغذ کے ایک صفحہ کی بھی مالک نہ تھی، بنگالی زبان کی سرسبزی اور شادابی کی آج دھوم ہے، لیکن مسلمانوں سے پہلے اس زمین میں ایک تخم بھی بویا نہ گیا تھا،

اس دعوی کے ثبوت میں ہم اپنی تحقیقات کے بجائے، ایک فاضل بنگالی مورخ کی تاریخ "ترقی علوم در ہندوستان" کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں،

"سلاطین بنگال کی کوششیں صرف مسلمانوں کی تعلیم کی ترقی تک محدود نہیں ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنی دیرینہ بیدارمغزی کو ایک نئے راستہ پر علوم کو ترقی دینے میں جسکے ساتھ بنگالی بولنے والے لوگوں کو خاص طور سے دلچسپی ہونا چاہیئے، متوجہ کیا، ان لوگوں کو یہ

ہے جو معلوم ہوگی کہ انکی زبان اپنے علمی سطح تک پہنچنے مین خود انکی نہین بلکہ ان سلاطین کی ممنون ہے جنکی ابتدائی توجہ اسکی طرف صرف اسکی ندرت کی بنا پر اور اس بنا پر تھی کہ اسکو اُس سنسکرت زبان سے تعلق ہے جو اس وسیع ہندو آبادی کا محبوب خزانہ ہے جسکے ساتھ انکو بہت زیادہ تعلق ہے"

" سب سے پہلے مہابھارت اور رامائن کی رزمیہ نظمون نے بنگال کے مسلمان سلاطین کو اپنی طرف متوجہ کیا، جنکے اشارہ سے انکا بنگالی یعنی ملکی زبان مین ترجمہ ہوا، مہابھارت کا سب سے پہلا ترجمہ ناصر شاہ، والیٔ بنگال (۱۲۸۲ء تا ۱۳۲۵ء) کے حکم سے ہوا، جو صوبہ کی دیسی زبان کا بہت بڑا مربی تھا، اور جسکو شاعر اعظم ودیاپتی نے بھی نذر پیش کرنے والا کہا ہے، اپنی ایک نظم مین سلطان غیاث الدین کا بھی ذکر کیا ہے، جس سے غالباً غیاث الدین ثانی والیٔ بنگال (۱۳۶۷ء تا ۱۳۷۳ء) مراد ہے"

"..... یہ مشکوک ہے کہ بنگال کے کسی مسلمان بادشاہ، یا ہندو راجہ کانس نرائن[1] نے کرتی باس کو بنگالی مین رامائن ترجمہ کرنیکا حکم دیا، اگر پہلی روایت صحیح ہے تو اس مین شک نہین کیا جا سکتا کہ مسلمانون ہی کے نظیرون نے اس کارنامہ کے انجام پر اسکو آمادہ کیا"

" سلطان حسین شاہ، بنگالی زبان کا بہت بڑا مربی تھا، مالادھر باسو کو اسی نے بھاگوت پوران کے بنگالی ترجمہ پر مقرر کیا، حسین شاہ کا ایک سپہ سالار پرگل خان نامی تھا، پرگل خان اور اسکے بیٹے نے اپنے نام کو اس بنا پر بقائے دوام بخشدیا ہے کہ انھون نے مہابھارت کا ٹکڑا بنگالی مین ترجمہ کرایا"

پرگل خان روزانہ شام کو اپنے محل پر گلہور واقع فینی مین اپنے اہل دربار کو جمع

[1] معارف: مسلمانون کے عہد مین چند سال کیلئے یہ بنگال کا راجہ بن بیٹھا تھا، اسکا بیٹا تخت نشین ہوکر مسلمان ہوگیا تھا

کہتا تھا کہ مہابھارت کے بنگالی ترجمہ کو ترجم نی کویندرا پرمیشور کی زبان سے سنیں،
پرگل خان کے زیر اہتمام اس مذہبیہ نظم کا ترجمہ "استری پرو" تک پورا ہوا، اسکے بعد چھوٹے خان
جو اسکا چاٹگام کی گورنری پر جانشین ہوا اس نے سری کرن نا ندی شاعر کو مقرر کرکے
اس کام کو جاری رکھا" اور "اشومیدھ پرو" کا ترجمہ کرایا۔"

مسلمان امراء کے اشارہ سے بنگالی میں سنسکرت اور فارسی کتابوں کے ترجمہ کرنیکی
مثالیں شاذ نہیں ہیں، انھوں نے سنسکرت کے عشاق برہمن اور ہندو راجاؤن کے
اس منفور جذبہ کو جس سے وہ بنگالی زبان کو دیکھتے تھے، بدل دیا، مسلمان امراکی تقلید میں
بنگالی مصنفین کی ہمت افزائی اور دربارون مین بنگالی شعراکے رکھنے کا ہندو راجاؤن مین
عام رواج ہوگیا، اس زمانہ سے کتنے ممتاز بنگالی شعرا اور مصنفین نے ہندو راجاؤن کے
دربارون کو آراستہ کردیا، جسکے سبب سے بنگالی مقبولیت عام مین اس حد تک ترقی کرگئی اور ان
زبانون کی جو اپنے پاؤن اس صوبہ مین گاڑ رہی تھین حریف بنگئی۔[۱]"

الغرض رفتہ رفتہ عربی اور فارسی زبان کی تعلیم بنگالی شرفار کا طغرائے امتیاز بن گئی
خصوصًا ان خاندانون کے لئے جنکو حکمرانون کی نیابت اور سرکاری عہدون پر سرافرازی کا
موروثی حق ہوگیا تھا، مہاراجہ سورج کنٹرا اچارجی نا کی، مہاراجہ جتندرو موہن ٹاگور اور مہاراجہ
نادوا کرشنا کے خاندان بنگال مین عربی اور فارسی علوم وادبیات کے مربی تھے، اور اسکے
فرزند ان علوم مین عالمانہ مہارت رکھتے تھے، راجہ رام موہن رائے بانی فرقہ برہمو سماج، اور
راجہ کشب چندر سین جنھون نے آخر زمانہ مین بنگالی قوم مین مصلحین اعظم کا درجہ پایا ہے، علوم
اسلامیہ کے واقفین مین انکا شمار ہے، مولانا حبیب الرحمان خان شروانی ندوہ کے اجلاس

[۱] صفحہ ۱۰۷-۱۱۱، پروموشن آف لرننگ ان انڈیا،

مدراس (۱۹۲۸ء) کی تقریر مین فرماتے ہین:-

" بنگال کے جدید دور ترقی کا سنگ بنیاد راجہ رام موہن رائے کے قابل ہاتھون سے رکھا گیا، یہ واقعہ ہے کہ انھون نے پٹنہ مین عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، گذشتہ موسم سرما مین کلکتہ کے ایک نامور بنگالی بابو نے مجھسے کہا کہ اُنکے باپ اور چچا کے زمانہ تک کلکتہ سے بکثرت بنگالی عربی پڑھنے پٹنہ جایا کرتے تھے، چنانچہ اسکے چچا نے پندرہ برس مین علوم عربیہ کی تکمیل کی تھی،

گریش چندر گوش نے قرآن مجید، تذکرۃ الاولیا اور مشکوٰۃ کا بنگالی مین ترجمہ کیا،

انہین اسباب کا اثر ہے کہ بنگالی زبان مین عربی اور فارسی کے الفاظ خصوصاً آداب سلطنت اور کاروائی ہاے مقدمہ کے الفاظ بکثرت ہین، اور اب رفتہ رفتہ انکی جگہ انگریزی لے رہی ہے، تاہم بنگال کی ڈیڑھ دو سو برس کی انگریزی حکومت کے بعد بھی ان الفاظ کا ابتک بنگالی مین رواج پذیر رہنا، اسکے یہ معنی ہین کہ اس زبان مین ان مفاہیم کے لئے سرے سے الفاظ ہی نہ تھے،

بنگال کے بعض ممتاز خاندانون کا سرنام ابتک فارسی ہے، مثلاً ملک، مجمدار، سرکار، موزمدار، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انکو اپنے حاکم وقت کی زبان سے کس درجہ محبت تھی

مہاراشٹر کی مرہٹی زبان جو کہنا چاہیئے کہ یہ ہندوستان کی اس قوم کی زبان ہے جسکا اگر بس چلتا تو مسلمانون کی ہستی کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ ڈالتی، تم اس سے قیاس کرسکتے ہو کہ مسلمانون کے علوم و فنون اور زبان سے اسکو کس درجہ نفرت ہوگی، لیکن یہ معلوم کرکے تعجب کی انتہا نرہیگی کہ مرہٹی زبان کے بنانے مین مسلمانون کے زبان و قلم نے سب زیادہ کام کیا ہے، دہقانی اور صحرائی مرہٹون کو طرز و آداب شاہی سیکھنے کے لئے اپنے انہین

دستمنون کا دست نگر ہونا پڑا، ابتداءً مرہٹی زبان ایک وسیع ملک کی جہانداری کی قوت نہین رکھتی تھی، اسلئے ناچار انہین مسلمانون اور برہمنون کا اسکو ممنون ہونا پڑا، جنھون نے فارسی زبان پڑہی اور سیکھی تھی، مرہٹہ راجاؤن کے فرامین آج بھی تم پڑہ لو تو آدہے سے زیادہ اسمین اصلی یا بگڑے ہوے فارسی و عربی الفاظ کی آمیزش پاؤگے، تعلیم یافتہ سے تعلیم یافتہ مرہٹہ آج قدیم مرہٹی زبان کے لٹریچر کے سمجھنے سے اپنے کو عاجز پاتا ہے،

آداب و قواعد سلطنت، کاغذات سرکاری صنعت و حرفت، خانگی زندگی ہر ایک چیز مین اسکی زبان کا اصلی راس المال عربی و فارسی زبان کے الفاظ ہین، ہمارے دوست شیخ عبدالقادر صاحب ایم اے پروفیسر الفنسٹن کالج بمبی جو مرہٹی کی زباندانہ لیاقت رکھتے ہین وہ مرہٹی زبان کی ایک ڈکشنری لکھنے والے تھے، جس سے بیک دفعہ یہ نظر آجاتا کہ عدالت، کتبخانہ، مدرسہ، بازار، کارخانہ، ہر جگہ مرہٹی کے آلاتِ تخاطب عربی و فارسی الفاظ ہین، حلوائی کی دوکان سے برہئی اور لوہار کے مکان تک چلے جاؤ، آلات کے نام اور تہذیب و تمدن کے الفاظ کا ماخذ مسلمانون ہی کے زبان کو پاؤگے، تاریخ کے لئے لفظ مرہٹی مین نہ تہا، اب اسکو باکھر کہتے ہین، اس زبان کے محققین کا بیان ہے کہ یہ لفظ خبر کی تحریف ہے "کھبر" سمجھے؟ خبر!

بیسیون ہندو خاندان وہان آباد ہین، جنکا سرمایۂ امتیاز یہ ہے کہ عہد قدیم مین انکا خاندان فارسی کا خدمتگذار رہتا، اور اب تک اُن کا خاندانی سرنام وہی فارسی زبان کا لفظ ہے مثلاً "پھرنیس" یعنی فردنویس، "چٹ نیس" یعنی چٹھی نویس، "کلہ دار" یعنی قلعہ دار، "پوت دار" یعنی پوتہی دار، ایک قسم کے مرہٹہ سپاہی کا نام "سلہ دار" تہا، اسکی اصل سمجھے؟ سلحدار، "ہنگائی" تم جانتے ہو؟ تم جسکو تقاوی بولتے ہو، آجکل دکن مین مرہٹون اور برہمنون کی زبانون کی حسب ذیل

عہدون کے نام عام طور سے جاری ہین،

سب انسپکٹر	فوجدار	چودہری	مقدم
ناظر	ناجر	تحصیلدار	معاملہ دار،
سررشتہ دار	سررشتہ دار	محرر	کارکن،
. . .	. . .	سکریٹری	دیوان،

ملک دکن اور مہاراشٹر کی تقریب سے ہم نے حیدرآباد کا ذکر نہین کیا، سبب یہ ہے کہ اس مجسمۂ عدل و انصاف ریاست نے اپنی ہندو رعایا کی تعلیمی و علمی ترقی مین جو کارنامے انجام دیئے ہین وہ ایک مضمون کی ضمن مین نہین بلکہ ایک کتاب کے سیکڑون صفحات مین انکا تذکرہ ہونا چاہیئے، صرف ایک حیدرآباد کی اسلامی ریاست نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ جو کچھ کیا اور کر رہی ہے، تمام ہندوستان کی ہندو ریاستون نے ملکر بھی اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ اتنا نہین کیا، اس وقت موضوع سخن صرف علمی اور تعلیمی حالات ہین، اسلئے صرف اسی زاویہ نگاہ سے اگر دیکھا جاے تو معلوم ہوگا کہ علاوہ عام تعلیم کے جسکی بدولت ریاست کے تمام دفاتر پر ہندو اہل کار قابض رہے ہین، اعلے تعلیم کے لحاظ سے بھی ہر عصر مین یہان ہندو اہل قلم مصنفین اور شعرا موجود رہے ہین، اس بیان کی تصدیق کتبخانہ آصفیہ کی مطبوعہ فہرست کی دو جلدون مین ملیگی، منشی لچھمی نرائن شفیق مصنف بساط الغنائم و تاریخ دکن، لالہ گرودھاری لال مصنف تاریخ دکن، راے منا لال مصنف تاریخ دکن، لالہ لچھمی نرائن مصنف چمنستان شعرا، راجہ گرودھاری پرشاد، باقی صاحب دیوان و مثنوی، مہاراجہ چندو لال شادان صاحب کلیات، سندرام مصنف سیاق نامہ، جگناتھ نجومی مصنف تقویم التواریخ حکیم راے بچولال تمکین، صاحب دیوان و مصنف مجربات، رتن لال مصنف تخطیط المداد

وغیرہ کے سیکڑون نام گنائے جاسکتے ہین اور عجب نہین کہ کوئی حیدرآبادی قلم ان سے بھی بہتر اشخاص کے نام پیش کرسکے،

بہار، اودہ، صوبہ آگرہ اور دلی کے متعلق بمختصر کہنا چاہیے کہ یہان ہندوون کی تعلیم سلمانون کے برابر برابر تھی، ان ممالک کے بیشمار ہندو فضلا کے نام تذکرون مین محفوظ ہین. فقط ایک لکھنؤ مین ہندو شعرا کی تعداد سیکڑون سے متجاوز ہوئی ہوگی، لکھنؤ کے کشمیری ہندوون مین فارسی تعلیم کا رواج انتہائی عروج پر تھا لکھنؤ مین راجہ الفت رائے الفت، کالی پرشاد اخلاص، لالچند انس، راجہ گنگا پرشاد بدر، منشی خیالی رام خیالی، بھگاونسنگھ قم، سیکولال الفت، رام سہائے رونق، میڈولال زار، راجہ جیالال گلشن، راجہ کالکاپرشاد موجد، منشی لالک راجہ جوالاپرشاد وقار، دیگر اضلاع اودہ والہ آباد مین منن لال فرین، الہ آبادی، راے امرسنگھ خوشدل مانکپوری، گوکل چند ہندو فرخ آبادی، راجہ مدن سنگھ موزون اٹاوی، راے گلاب راے گلشن سندیلوی لچھمن لال موجد بدایونی لالہ بجناتھ مشتاق بریلوی، لالہ رام بخش مطیع قنوجی، لالہ بالمکند شہود مانکپوری، منشی الیشری داس ارام فرخ آبادی، اندرمن اورنگ آبادی (علی گڈہ) آگرہ مین چندربھان برہمن شیورام حیا راے منوہر ولد راے لون کرن عظیم آباد (پٹنہ) مین، لالہ اوجاگر الفت، راجہ پیاریلال الفتی، راجہ بہادر راجہ، راجہ رام نرائن موزون، بینی پرشاد دل وغیرہ فارسی زبان کے مشہور شاعر سخن فہم، انشاپرداز اور فاضل گذرے ہین،

الہ آباد کے مشہور ہندو لیڈر مالوی جی اگر اسکو یاد رکہین تو اچھا ہے کہ ممالک متحدہ کے ہندوون کا سب سے پہلا لیڈر ہوا اسی شہر الہ آباد مین آپکے ہم پیشہ تھے اور جنکی کوشش سے آپ "پالیٹکس" کے لفظ سے گوش آشنا ہوے ہین وہ عربی اور فارسی علوم کے ایک بہت بڑے

ہمہ دان فاضل تھے، یعنی پنڈت اجودھیا ناتھ! وہ ایک طرف کانگریس کے پلیٹ فارم پر لکچر دیتے تھے تو دوسری طرف اپنے گھر مین بیٹھکر متنبی اور عرفی کا درس دیتے تھے،

پنجاب بھی مسلمانون کے تعلیمی اثر سے خالی نہین، ل سیالکوٹی متخلص بہ وارستہ جو فارسی کے مشہور مصطلحات الشعرا کا مصنف ہے، واقع کھتری شاگرد ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، منشی لچھمی نرائن دبیر گنجاوی لاہوری پنجاب کے نامور ہندو فضلا مین، لچھمی نرائن کی معقولات مین بھی بہت بڑی مہارت حاصل تھی، مصطلحات فارسی کی تحقیق مین وارستہ نے ۳۰ برس ایران مین گذارے تھے،

دلی مین منشی مادھو رام منشی، رائے منوہر لال منوہر، مرزا راجہ کدار ناتھ مقیم، مرزا کوذرا دینبشکا! راجہ گوپال ناتھ غلام، پوران لال رنگین، بہادر سنگھ دلخوش، لالہ چھی داس ذرہ، شیو سنگھ بیجان، لالہ نرائن داس بیخود، سکھراج سبقت، منشی گوہر لال تفتہ وغیرہ سیکڑون فضلا گذرے ہین،[۵]

دیہاتون مین تعلیم کا طریقہ وہی تھا جو مدت دراز سے ہندوستان مین جاری ہے، گرو جی دیہات کے زمیندار کے ہان نوکر ہوتے تھے، یا تمام گاؤن کی طرف سے انکو تنخواہ ملتی تھی، لڑکے کسی کچے مکان کے برآمدہ مین یا سایہ دار درخت کے نیچے لپی ہوئی زمین پر بیٹھ جاتے تھے، ہاتھ مین لکڑی کا سیاہ رنگا ہوا تختہ ہوتا تھا، اسپر کھریا کی سفید روشنائی سے لکھتے تھے، یا کھریا مٹی کے ڈھیلے سے زمین پر لکھتے تھے، ہندی لکھنا پڑھنا اور پہاڑا اور حساب انکو سکھایا جاتا تھا، یہ گویا پرائمری تعلیم تھی،

عام تعلیم تو یہین ختم ہو جاتی تھی، جو لڑکے آگے بڑھنا چاہتے تھے، وہ یا سنسکرت یا سکھ...

---

[۵] یہ تمام نام مختلف فارسی تذکرون سے لئے گئے ہین،

سیکھتے تھے، اور پنڈت بنتے تھے، اور یا سرکاری زبان فارسی کی تعلیم حاصل کر لیتے تھے،
قصبوں مین فارسی کے مکتب ہوتے تھے، ہندو اور زیادہ تر مسلمان "میان جی" پڑھاتے تھے،
فارسی کی ابتدائی تعلیم مین بول چال، خط و کتابت اور اخلاقی حکایات کی کتابین داخل
ہوتی تھین، ہندو مسلمان لڑکے ایک ساتھ نہایت میل جول اور یکجہتی کے ساتھ پڑھتے تھے،
گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، انشاے خلیفہ، بہار دانش، اخلاق ناصری، انوار سہیلی،
سکندر نامہ، شاہنامہ وغیرہ کتابین داخل درس تھین، خوشخطی اور فارسی نویسی سکھائی جاتی تھی
فرامین اور دیگر مراسلات سرکاری اور خط شکستہ کے پڑھنے کی عادت دلانیکے لیے پورانے
لکھے خطوط کا ایک طومار "میان جی" اپنے پاس رکھتے تھے جسمین سو دو سو خط لکھے جڑے
ہوتے تھے، مکتب کے طالب العلم انکو پڑھتے تھے اسکو اسکول کی تعلیم سمجھنا چاہیے،

اسکے بعد یا تو لڑکے نوکری کر لیتے تھے اور یا تکمیل کے لیے مشہور اساتذہ کی خدمت
مین بڑے بڑے شہرون مین چلے جاتے تھے، انسے فارسی کی اعلےٰ تعلیم، شاعری، علوم،
اور کچھ عربی کی کتابین پڑھتے تھے، بعض بعض طلبہ تمام علوم مروجہ کی تکمیل کرتے تھے،

ابو الفضل نے آئین اکبری مین اپنے زمانہ کا نصاب تعلیم بتایا ہے، اخلاق، ریاضیات،
حساب، زراعت، اقلیدس، مساحت، ہیئت، رمل، قواعد مال، آئین سلطنت، طب،
طبیعیات، الہیات، اور تاریخ، ہندوؤن کو ان علوم کے علاوہ ویاکرن (سنسکرت صرف نحو)
ویدانت (ہندو تصوف و اخلاق) پاتن جلی (ہندو فلسفہ) بھی پڑھنی پڑتی تھی، ابو الفضل کا
بیان ہے کہ اس تعلیم کی بدولت تمام سلطنت آراستہ و مرصع ہو گئی تھی، اسکو اس عہد کے کالج
کی تعلیم سمجھنی چاہیئے،

سطور بالا مین تحصیل کمال اور طلب علم کے لیے جا بجا اساتذہ کی خدمت مین سفر کا جو

نقشہ مین نے کھینچا ہی، فارسی تذکرون کے پڑھنے سے یہ خود بخود سمجھ مین آجاتا ہی، ذیل مین منشی لچھمی نرائن دبیر کے حالات تعلیم کی چند سطرین ایک فارسی تذکرہ سے نقل کرتے ہین،

" جد و پدرش در دہلی بوکالت امراے عالمگیری و محمد شاہی عز امتیاز داشت ہبیرو علی از مولوی شیخ محمد گرفت، در سن دہ ماندہ سالگی بشوق نظم و نثر در مجلس استفادۂ سراج الدین علیخان آرزو جا گرفت، و براے تحصیل صرف و نحو نزد لالہ ٹیک چند بہار می رفت، بعد رشد خدمت علماے اعلام را التزام نمود مشغول اکتساب علم طب و دیگر علوم عقلیہ بود در ۱۲۰۲ھ؁ متمول"

ہندو اور مسلمان طلبہ ان اساتذہ کی خدمت مین جس محبت و یکجہتی کے ساتھ مل کر تعلیم پاتے تھے، اور استاد بھائی بنکر جو رشتۂ اتحاد باہم قائم کرلیتے تھے، وہ آجکل کے شاندار ایوانون کے تاریخی زمانہ مین مفقود ہے، محمد حفیظ خان المتوفی ۱۱۹۳ھ؁ ایک نامور استاد تھے، انکے شاگردان با اخلاص کے نام سنئے ' میر ابو الحسن، منشی لچھمن سنگھ، میر کلن، قادر بخش، پنڈت لچھمی رام، محمد اسماعیل، لالہ سکھ رام، منشی کشن سنگھ، محمد تقی، منشی محبوب راے، دیکھا! "منشی محبوب راے" کتنا پیارا نام ہے، کیا یہ ہندو مسلمانون کے اتحاد باہمی کی عملی دلیل نہین ؟

لالہ چنی داس ذرہ دلی کے ایک مشہور معلم تھے جنکے مکتب مین ہندو مسلمان لڑکے پڑھتے تھے ہندوستان کے خاتمہ العلما، مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم کے استاد فارسی، منشی سوہن لال تھے، اور مولانا ے مرحوم کے تلامذہ مین جے بہاری لال کایستھ تھے مولانا کے ایک تلمیذ رشید گواہی دیتے ہین کہ مین نے خود دیکھا ہے کہ مولانا کے دوسرے رشید تلامذہ انکے ساتھ برادرانہ برتاؤ کرتے تھے[۱]،،

---

[۱] خطبۂ صدارت ندوہ، اس ۱۹۱۶ء؁ از مولانا ے شروانی،



تمدن ہند کا مصنف موسیو لیبان اپنی کتاب کے تیسرے باب میں ہندوؤں کے
علوم و فنون پر حسب ذیل تنقید کرتا ہے :-

"ہم نے تمدن عرب میں جتنے باب علوم و فنون پر لکھے ہیں، انکی ترتیب اس کتاب میں نہیں
ہو سکتی، چونکہ عربوں نے یونان و روم کے قدیم علمی ذخیرہ کو خوب ترقی دی اور اسکے بعد اسکو
یورپ کے دار العلوموں تک پہنچایا، اسلئے ہمیں انکے زمانہ حکومت کی علمی ترقیوں میں ایک خاص
دلچسپی تھی اور اس وجہ سے ان ترقیوں کا بیان بھی تفصیل سے کیا گیا تھا، ہندوستان کے علوم کی
یہ حالت نہیں ہے، برخلاف اسکے انکے علوم کے متعلق جو قدیم رسالے تھے انمیں بہت کچھ ترمیم ہو گئی ہے
اور یہ معلوم ہو گیا ہے کہ انکے علمی خیالات ان اقوام سے لئے گئے ہیں جنکے ساتھ انکو تعلق پیدا ہوا
اور خود ہندوؤں نے انمیں کچھ اضافہ نہیں کیا، پس کسی خاص زمانہ کے ہندی علوم کی تحقیقات
کرنے کے یہ معنی ہونگے کہ ہم ان اقوام کے علوم کی تحقیق کریں جنکا تعلق اس وقت ہند سے تھا اور یہ
ایک ایسی بحث ہے جو ہماری کتاب کے مقاصد سے خارج ہے، اور چونکہ ہم ہندوؤں کے دماغی
حالت کے متعلق لکھ چکے ہیں، اس سے بآسانی سمجھ میں آئیگا کہ انہوں نے کیوں ان علوم میں جو
انہیں باہر سے حاصل ہوئے کوئی ترقی نہیں کی، ہندو دماغ جو فلسفہ میں نکتہ رس اور فنون میں

تیز فہم ہے اس خاصیت سے جسکا نام مادۂ تحقیق ہے اور جسکے اوپر علوم کا دار و مدار ہے بالکل خالی
ہیں، سے ہندوؤن مین اصلی علوم کی کمی رہی ہے، ان مین دوسرون کی تحقیقات کو حاصل کرلینے کا
تو پورا مادہ ہے، لیکن اس درجے سے یہ کبھی آگے نہ بڑھ سکے، وہ دو قومین جن سے ہندوؤن نے
اپنے علوم اخذ کئے، یونانی اور عرب معلوم ہوتے ہین، یہ نہین معلوم ہے کہ یونانی علوم ہند مین کیونکر
پہنچے، لیکن شمال و مغربی ہند کی عمارات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے تعلقات
بیکٹریا کے ساتھ مدت دراز تک قائم تھے، بہت ہی قرین قیاس ہے کہ اسی ذریعہ سے یونانی
علوم ہند مین آئے، وراہ مہر جو نہایت قدیم ہندو مہندس ہے اور جو اجین مین چھٹی صدی عیسوی
مین تھا، اپنی ہیئت کی کتاب مین یونانی اصطلاحین استعمال کرتا ہے، اور یونانیون کی طرف
اشارہ کرتا ہے، عربون کا علم کس طرح ہند مین آیا اسکا سمجھنا زیادہ آسان ہے، سنہ عیسی سے
بہت پہلے عربون کے تجارتی تعلقات ہندوستان سے قائم تھے، اور عرب ہی مشرق اور مغرب کے
باہم ملنے کے ذریعہ تھے، اسکے بعد جب مسلمانون نے تمام قدیم دنیا کو فتح کرلیا تو یہ تعلقات مثل
سابق کے قائم رہے، اور ہمین عربی مورخین سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے بغداد کے دربار مین
متعدد ہندو علما موجود تھے، اس سے بھی مابعد زمانہ مین جب مسلمانون نے ہندوستان پر حکومت
حاصل کی تو علمائے اسلام علوم کو برابر ملک مین پھیلاتے رہے، مثلاً گیارھوین صدی عیسوی مین
البیرونی نے جسکا زمانہ محمود غزنوی اول فاتح ہندوستان کا ہے، تمام ملک مین سفر کیا، اور علوم
عربی کو جو اسوقت بہت وسیع ہو گئے تھے، کیونکہ ان مین نہ صرف قدیم دنیا کے علوم موجود تھے بلکہ
خود عربون کی تحقیقات شامل ہو گئی تھی، ہندوستان مین پھیلایا، گیارھوین صدی عیسوی کے
بعد سے کہنا چاہیئے کہ ہندی علوم سے مراد عربی علوم ہین، پس ہم کہہ سکتے ہین کہ ہندی علوم جنکی
ابتدا، پانچوین صدی عیسوی مین آریہ بھٹ کی ریاضیات سے ہوئی اور پھر ساتوین صدی مین

برہم گپت نے اسپر اضافہ کیا، اس زمانہ سے لیکر آجتک انہیں مسائل سے بحث کرتے ہیں جو

ہندوں ان دو زرلیعون سے آئے اسوقت ہمارے پاس ہند علوم کی جو تصانیف موجود ہیں

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوں نے خود ان علوم میں زیادہ ترقی نہیں کی کسی زمانہ میں

خیال کیا جاتا تھا کہ ہندوں کا علم ہیئت بہت کچھ کامل ہے، مگر اب معلوم ہے لیکن اب یہ خیالات قائم

نہیں رہے، اور ان پر بحث کرنا بے فائدہ ہوگا، اگر ان تصانیف میں کوئی نیا مسئلہ بیان کیا گیا ہے

تو محض استنادًا اور بلا دلیل، مثلًا آریہ بھٹ چند سطروں میں زمین کی محوری حرکت کا ذکر کرتا ہے

لیکن کسی قسم کا ثبوت نہیں دیتا، اسی طرح بارہویں صدی عیسوی میں بھاسکر چاریہ نے اس طریقہ

حساب کی طرف جسکو کیل کیولس کہتے ہیں اشارہ کیا ہے لیکن اس سے آگے نہ بڑھا،

جو کچھ اوپر بیان ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوں نے علوم میں کسی قسم کی جدت نہیں

پیدا کی، جب انکی ذاتی تحقیقات کچھ نہیں ہیں تو پھر انکے علوم سے بحث کرنا اور محض ایسے مسائل پر

ذکر کرنا جو عربوں اور یونانیوں کی تحقیقات سے لئے گئے ہیں محض لاحاصل ہے، اگرچہ ہندو علوم میں

کم ہیں لیکن عملی طور پر انھوں نے بہت بڑی ترقی کی،،

عبارت بالا میں عربوں سے مانسیو موصوف کی مراد "مسلمان" ہیں، یہ غلط اصطلاح دوسرے

یوروپین مصنفوں کی زبان وقلم پر بھی چڑھی ہوئی ہے، ہندوستان کے ساتھ قدیم عرب تعلقات کا جو

ذکر مصنف نے کیا ہے اس سے اسکا اشارہ اس زمانہ قبل اسلام کی طرف ہے جب مشرق و مغرب یا

ہندوستان وچین اور روم ویونان کے درمیان عرب تاجر سفیر اور متوسط کی خدمت انجام دیتے تھے

یورپ کا مال وہی ہندوستان وچین لیجاتے تھے، اور وہی ہندوستان کی مصنوعات کو یورپ کے ہاتھوں

میں دیتے تھے، اسکا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ قدیم ہندوستان، قدیم عرب کے تمدن کی کسی قدر تاثیر

اس تاثر کے آثار و علامات ہندوستان کے سنگی کتبات اور تحریری اوراق دونوں میں ملتے ہیں

ہندوستان کی پرانی سے پرانی تحریر اسوقت وہ خطوط اور کتبے (انسکرپشن) ہین جو مگدھ (بہار) کے
موریہ خاندان کے راجہ اسوکا (۲۵۰ ق م) کے مذہبی فرامین کی صورت مین ہندوستان کے پورے
طول وعرض مین پشاور سے گجرات و دکن تک پہاڑون پر اور لاٹون پر کندہ ملتے ہین، محققین فن خط
(ایڈیکر کٹنر) کا بیان ہے کہ ہندوستان کا یہ قدیم خط سامی خطوط کی شاخ آرامی خط سے ماخوذ ہے لیکن
خطوط کی زبان پالی ہے، یعنی قدیم بہار کی زبان جو بودھ کی مذہبی زبان تھی،

تمام آرین تحریرین بائین سے دائین طرف لکھی اور پڑھی جاتی ہین، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ
کتبے سامی تحریرون کی طرح داہنے سے بائین طرف لکھے ہوے ہین، اور اسی طرح سے پڑھے جاتے ہین
یہ اس بات کا دوسرا ثبوت ہے کہ ہندوستان کا قدیم سرمایہ تحریری اپنے وجود و بقا مین عربون کا ممنون کرم ہے[۱]

ہمارے دعوی کے ثبوت کے لئے اس سے زیادہ عجیب تر اور نادر تر وہ دستاویز ہے جو مہابھارت[۲]
کی عدالت عالیہ سے ہمکو مل سکی ہے، ستیارتھ پرکاش کے گیارہوین سملاس مین سوامی دیانند لکھتے ہین کہ
مہابھارت مین جب کورون نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈون کو اسکے اندر پھونک دینا چاہا تو ودرجی نے یدھشٹر کو
عربی زبان مین بتایا، اور یدھشٹر نے اسی عربی زبان مین انکو جواب دیا، سوامی جی کا بیان اگر صحیح ہے تو
ہمکو نہایت خوشی ہے کہ ہم ملیچھون کی زبان کسی زمانہ مین اسقدر مقدس بھی تھی کہ دیوتاؤن کے بڑے بڑے
اوتار اسکو بولتے تھے، اور اسمین ایک دوسرے سے راز کی باتین کہتے تھے،

بہرحال یہ قصے تو تاریخ کی یاد سے پہلے کے ہین، خدا جانے ابکی بدگمان دنیا ان کہانیون کو سچ بھی
مانیگی یا نہین، اسلئے ہمکو وہ داستان چھیڑنی چاہیئے جو تاریخ کے ہوش کی باتین ہین، مسلمانون کے آفتاب
دولت نے ہندوستان کے افق سے طلوع ہوکر ملک مین جو روشنی پھیلائی ہم چاہتے ہین کہ تاریخ کے نفوذی شیشہ کے
ذریعہ سے اسکی تحلیل کردین تاکہ ہر صاحب بصیرت کو نظر آجائے کہ خاتمہ کیا ہے، مسلمانون نے ہندوستان آکر

[۱] تاریخ الادب جلد ۱ صفحہ ۵ شائع کردہ جامعہ مصریہ (ایجپشین یونیورسٹی) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲۳ صفحہ ۱۳۱ طبع ۱۱،
[۲] پہلا پرب ادھیاے ۱۴۴،

جن علوم کو پھیلایا اور جس تعلیم کو رائج کیا، ترتیب وار ہم اسکی تشریح کرنی چاہتے ہین، اسکی بہتر اور آسان صورت یہ ہے کہ اس عہد کے ہندو مصنفین کا جائزہ لیا جاے اور دکھایا جاے کہ مسلمانون کے عہد حکومت مین انکی کیا تعداد تھی، کیا حیثیت تھی، کیا نوعیت تھی، اور کسی پچھلے زمانہ کی تعلیمی حالت کی تشریح کیلیے اسکے سوا کوئی اور تدبیر نہین،

ہمکو اس سے انکار نہین کہ مسلمانون کے عہد سے پہلے ہندوستان مین مصنفین موجود تھے اور انکی خاصی تعداد ہے، انکی ابتدا بودھ مت کے زمانہ عروج سے ہوتی ہے، قدیم ہندوستان مین کہین کہین جو مدارس قائم تھے جنکا ذکر چینی سیاحون نے کیا ہے وہ اسی مذہب کی درسگاہ تھے، شنکر اچارج نے بدھ اور جین مت کو مٹا کر جب ویدک دھرم کا دوبارہ پرچار کیا، اور سنسکرت زبان نے بدھ والون کی پالی کو ہٹا کر خود اسکی جگہ لینی شروع کی تو اس جوش و ہیجان نے طبیعتون کو تصنیف و تالیف کی طرف رجوع کیا، اور سنسکرت زبان جو پہلے صرف دعاؤن بھجنون اور منترون پر مشتمل تھی وہ علوم و فنون پر بھی حکمران ہوئی، تاہم مذہبی کتابون سے قطع نظر کرکے اسکا خالص سرمایہ تحریری اتنا بھی نہین جو چند الماریون کی زینت ہوسکے، ہر علم پر تقریباً دو دو تین تین کتابین تھی، اس دعوی کی دلیل سنسکرت دان علماے اسلام[1] اور مستشرقین یورپ[2] کے بیانات ہین، اور سنسکرت کی سرزمین کی موجودہ پیمائش علمی ہے[3]،

مسلمانون نے انکو بتایا کہ افسانہ اور کہانی سے الگ کرکے علوم و فنون پر خالص علمی کتابین بھی لکھی جاسکتی ہین، اکثر قدیم تصنیفات صرف برہمنون کی ملکیت تھی، وسعت تعلیم نے برہمنون سے نکلکر ہندوستان کے دوسرے طبقون کو بھی یہ علمی آزادی بخشی گئی، اولاً جیسا کہ ہر نئی چیز کا قاعدہ ہے مسلمانون کی زبان سیکھنا برہمنون نے ناجائز قرار دیا تھا، اشلوک بناے گئے کہ مسلمانون کی زبان سیکھنا، اور جینیون کے مندر مین جانا

---

[1] بیرونی کی کتاب الہند، ابو الفضل کی آئین اکبری کا دفتر سوم، [2] تمدن ہند، انسائیکلوپیڈیا آف انڈیا، [3] دکن کالج پونہ مین سنسکرت کی مطبوعہ و قلمی کتابون کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے، مذہبی کتابون اور دیگر نسخون کو [illegible] کتابون کی تعداد ہے،

ست ہاتھی کے آگے پڑنے سے زیادہ خطرناک ہے[1]، تاہم جیسا کہ پہلے نمبر مین ہم نے بتفصیل بیان کیا ہی کہ رفتہ رفتہ یہ تعصب ہندوؤں سے کیونکر دور ہوا، اور سیکڑوں برس کے بعد سکندر لودی کے زمانے سے فارسی تعلیم نے ان مین عام اشاعت پائی،

اسلامی علوم مین سب سے پہلے تاریخ کا ذکر کرتے ہین:

تاریخ

تاریخ وہ فن ہی جسکی طرف قدیم ہندو دماغ نے کبھی توجہ ہی نہین کی، لیبان تو کہتا ہی کہ آجکے نئے ہندوؤن کا دماغ ناموزون معلوم ہوتا ہے[2]، آریہ ورت انسانیت کا ـــــــ نہایت قدیم گہوارہ ہے اگر یہان انسانون کے پچھلے تاریخی کارنامون کو محفوظ رکھنے کی لیاقت ہوتی تو بہت سے قدیم عقدے آج ہمارے لیے پیچیدہ نہ ہوتے، ہندوستان کی پرانی داستان سننے کے لئے ہمکو یونان اور چین کے سیاحوں کے پاس جانا پڑتا ہے، خود ہمارے گھر مین اپنی دنیا کی پچھلی زندگی سے واقفیت حاصل کرنیکا کوئی ذریعہ نہین ہے ویدوں کے کہنہ اوراق، منوشاستر کے قانونی دفعات، مہابھارت کے رنگین صفحات، رامائن کی پُردرد کہانیان، اور اپنشد کی پیاری پیاری باتین، ان مین سے کوئی چیز قدیم ہندوستان کی تاریخ کا ہمکو پتہ نہین دیتی،

آغاز عالم سے زمانۂ اسلام تک ہندوستان مین جو سیاسی انقلابات ہوئے، ملک کے صوبہ صوبہ پر جو حکمران فرمانروائی کرتے رہے، بڑے بڑے عالم، فاضل اور پنڈت پیدا ہوئے انکے تاریخی حالات کا آج پتہ لگانا چاہو، صحیح تاریخ ولادت، وفات اور سوانح حیات جاننا چاہو تو قیاس کے سوا کوئی روشنی تمہاری رہنمائی نہ کریگی، پرانون سے صرف رشیون اور منیون کے کچھ کچھ حالات معلوم ہوتے ہین لیکن وہ تاریخ نہین،

لیکن اسی غیر تاریخی ملک مین جب مسلمانون کا قدم آتا ہے تو یہان کا آسمان و زمین بدلجاتی ہے،

[1] ستیارتھ پرکاش، سمولاس ۱۱، [2] تمدن ہند صفحہ ۲۳۶،

آریہ ورت کا ذرہ ذرہ چمک اٹھتا ہے، مسلمان سلاطین، امرا، علما، شعرا اور دوسرے اکابر رجال کو
چھوڑ کر مسلمان مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے خود ہندو راجاؤں، پنڈتوں، شاعروں اور امیروں کے
حالات اسقدر لکھے ہیں کہ یہ بآسانی دعوی کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہزارہا سال جو
ہندو قوم برگزیدہ اس زمانہ کے (میتھالوجیکل)، تمام ہندو علما اور امرا کی فہرست جتنی طویل بنائی جا سکتی ہے
مسلمانوں کی آمد کے بعد صرف آخری ۸۰۰ برس کے عرصہ میں اس سے دوچند بلکہ سہ چند بڑی فہرست مع
احوال تاریخی پیش کی جا سکتی ہے، صرف تیموریوں کے زمانہ میں جو ہندو امرا اور علما گذرے ہیں انکے
حالات و بیانات دو تین جلدوں میں سما سکتے ہیں، ہندو فارسی شعرا کے نام و سوانح باایں ہمہ قومی
بیگانگی ہمارے فارسی تذکرے جو خاص مسلمانوں کے قلم سے نکلے ہیں اسقدر سنا سکتے ہیں کہ آپ سنتے سنتے
گھبرا اٹھینگے،

آج یورپ کے دعوی آزادی و مساوات کے شور و ہنگامہ نے دنیا کو چھا لیا ہے، ممالک مفتوحہ میں
اشاعت تعلیم کی یہ کثرت انکا بیان ہے کہ صرف ہمارے دور حکومت کی خصوصیت ہے، ہم کہتے ہیں بجا ہے،
اور درست ہے، جاؤ اور انگریزی قلم کے تصنیفی فہرست کا ایک ایک ورق پڑھ ڈالو، انکی انسائیکلوپیڈیا میں الٹ پلٹ کر
انکی تاریخ اور تذکروں کو چھان ڈالو، اس تفحص، اس تلاش، اور اس محنت کے بعد ہمکو بتاؤ کہ مغرور انگریزی قلم
آبحیات نے ہندوستان کے کتنے علما، فضلا، اور شعرا کے نام زندہ کئے ہیں، اور کتنے اس قابل سمجھے گئے ہیں کہ
حکمران قوم اپنی شاہی زبان میں اور اس پریس کے عہد میں انکے تذکرے لکھے، پھر کیا ظالم، بت شکن،
اور مطلق مسلمانوں کی یہ علمی آزادی و مساوات نہ سمجھی جائیگی کہ انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں قوموں کے
فضلا کو ایک نظر سے دیکھا اور اس حکمران قوم نے اپنی شاہی زبان کے علمی درباروں میں دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی،
علاوہ ازیں مسلمانوں کے تاریخی ذوق نے ہندوؤں میں اس فن کی تعلیم و ترقی کا وہ جوش پیدا کیا کہ
آج بھی اگر یورپ اور ہندوستان کے کتبخانوں کا جائزہ لیا جائے تو ایک بڑا گراں قیمت سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے،

۱؎ گذشتہ تاریخ سے بحث نہیں، بلکہ زمانۂ رواں کا سوال ہے۔

ہمارے سامنے تو اسوقت یورپ اور ہندوستان کے مادی کتبخانے نہین صرف حیدرآباد، بانکی پور، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، اور لندن کے کتبخانون کی فہرستون کے معلومات ہین، تاہم انھون نے ہندو زبان کے فارسی مصنفین کے (جو عہد اسلامی کے علمی و تعلیمی کوششون کے نتائج کلی ہین) حالات بہم پہنچائے ہین [illegible] ہین، سب سے پہلے ہمکو اس عہد کے ہندو مورخین کا تذکرہ کرنا ہے،

راج ترنگنی | پیش نظر مواد جہانتک ہماری اعانت کرتے ہین، معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سب سے پہلی تاریخ جو کسی ہندی قلم نے لکھی وہ کشمیر کی تاریخ راج ترنگنی ہے، یہ کتاب ہندی مین سلطان زین العابدین والی کشمیر کے زمانہ مین لکھی گئی تھی، (سلطان ۸۲۳ھ مین تخت نشین ہوا تھا) مصنف کا نام کلہانا ہے، اکبر جب کشمیر گیا ہے تو یہ کتاب اسکے دربار مین پیش کیگئی، اور اسکے حکم سے اسکا فارسی مین ترجمہ ہوا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اسمین کشمیر کے متعلق پانچ ہزار برس کا حال لکھا ہے، والیان کشمیر کے دربارون مین تاریخ نویسی کا خاص عہدہ تھا اور یہ کتاب اسی کوشش کا ثمرۂ نورس[۲] تھی،

اصل متن کتاب فرانس اور ہندوستان مین چھپ[۳] گئی ہے اور فارسی نسخہ بھی مطبوع ہے،

لال جی داس | بابا لال گرو شاہجہان کے زمانہ مین ایک عارف جوگی تھے، شہزادہ داراشکوہ انہین کا مرید تھا، لال جی داس، بابا لال گرو کا چیلا تھا، بابا کا سنہ پیدائش ۱۰۱۴ھ ہے، ۱۰۶۹ھ تک وہ زندہ تھے، لال جی داس نے ۱۱۵۵ھ مین گرو کے حالات و ملفوظات کو فارسی مین جمع کیا، گورنمنٹ کلیکشن لائبریری مین اسکا ایک نسخہ سنہ ۱۴ جلوس عالم شاہی کا لکھا ہوا موجود ہے،

بنوالی داس ولی | شہزادہ داراشکوہ کا میر منشی تھا، بعضون نے اسکا نام بھوانی داس لکھا ہے، کتبخانہ آصفیہ کے فہرست نویس نے ولی رام گوسائین (داراشکوہی) نام بتایا ہے، بنوالی اور بھوانی تو کتابت کی تصحیف ہے، ولی اسکا تخلص نام مین داخل ہوگیا ہے، اس نے شاہان دہلی کی تاریخ لکھی ہے، کتاب کا نام راجاولی ہے،

---

[۱] تاریخ فرشتہ، نولکشور جلد ۲ صفحہ ۳۳۸، [۲] آئین اکبری، نولکشور جلد ۲ صفحہ ۱۰۲، [۳] دکن کالج لائبریری کیٹلاگ صفحہ ۱۹۹،

کتاب مستند ہے، اور بہت سی معتبر کتابون مین اسکے حوالے ہین، اسکے قلمی نسخے اکثر کتبخانون مین موجود ہین،

رائے بندرابن | رائے بہارامل کا بیٹا تھا، بہارامل سنہ ۲ جلوس شاہجہانی مین حسن خدمات کے صلہ مین رائے کا خطاب پایا تھا، دارا شکوہ نے اسکو اپنا دیوان مقرر کیا تھا، اسکے بیٹے بندرابن کو عالمگیر نے ترقی دیکر ا اور رائے کا خطاب بخشا، بندرابن نے لب التواریخ کے نام سے اپنی ایک بہترین یادگار چھوڑی ہے،

ایسرداس | قوم ناگر پٹن کا باشندہ تھا، وہ خود کہتا ہے کہ بچپن سے ۳۰ سال کی عمر تک وہ قاضی شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب المتوفی ۱۰۹۹ھ کی خدمت مین حاضر ہوکر تحصیل علم کرتا رہا ہے، امراء اور اعیان دولت جو قاضی صاحب کی خدمت مین آیا کرتے تھے انکے مباحثات اور گفتگوؤن کو بغور سنتا تھا اور ان سے فوائد حاصل کرتا تھا، تکمیل علم کے بعد ایسرداس، شجاعت خان حاکم گجرات کی وساطت سے جودھپور کا امین مقرر ہوا، وہ ہاتھ جو ۳۰ برس تک صرف قلم سے مانوس رہا تھا، تلوار کے قبضہ پر بھی مضبوط تھا، اس نے میدان جنگ مین کامیابی حاصل کی، بادشاہ کی طرف سے جودھپور مین اسکو جاگیر عنایت ہوئی، اور وہ دست نیم صدی افسر مقرر ہوا، عہد عالمگیری کے ابتدائی ۳۴ سال کے واقعات کا ذکر فتوحات عالمگیری نام ایک بڑی تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے،

بھیم سین کایستھ | رگھونندن داس اسکے باپ کا نام تھا، سنہ ۲۳ جلوس شاہجہانی (۱۰۵۹ھ) برہانپور دکن مین پیدا ہوا تھا، اسکا ایک عزیز جگنداس عالمگیر کے دربار مین دیوان تھا، اور دیانت رائے کے خطاب سے ممتاز تھا، بھیم سین نے بندیلہ کے حاکم راؤ دلپت کی سرکار مین نوکری کی، راو دلپت دکن کی لڑائیون مین نہایت کارآمد سردار ثابت ہوا تھا، عالمگیر نے راؤ کے خطاب کے ساتھ تین ہزار فوج کا افسر بنا دیا،

بھیم سین گو کایستھ تھا لیکن قلعہ نالدرک کی قلعہ داری اس نے نہایت خوبی سے کی، ۱۱۲۰ھ مین نوکری سے مستعفی ہوکر اپنے وطن مین گوشہ نشین ہوگیا، اور اب موقع آیا کہ تلوار کی بجائے قلم کا حق ادا کرے، دلکشا کے نام سے عہد عالمگیری کی تاریخ لکھی جو اب تک موجود ہے،

نرائن کول عاجز | باشندۂ کشمیر اپنی تصنیف کے دیباچہ مین لکھتا ہے کہ ایک مدت سے شرفائے کشمیر کا تقاضا تھا کہ

اسنے دہلی کی ایک تاریخ لکہی، باوجود بیگانِ وطن کے اصرار سے مجبور ہو کر مین سنے یہ بار امانت اٹہالیا ہی

زمانہ مین عارف خان کشمیر کے دیوان اور نائب صوبہ دار سنے کلمب ملک حیدر سنے سنسکرت سے کچہ مواد فراہم کیا تہا

وہ میرے حوالہ کیا گیا، مین نے اسکو دیکہا تو قابل اصلاح نظر آیا، بالآخر اصل سنسکرت سے مقابلہ کرکے اسکو بہی اپنی

کتاب مین شامل کرلیا، سنہ ۱۱۲۳ھ مین تاریخ کشمیر مکمل کردی،

منشی بیربن گوبردھن | ستمر خان کے منشی تہے، ستمر خان سنے بہائیون کی لڑائی مین عالمگیر کا ساتھ دیا تہا اُن

دنون کے بعد سنہ ۱۱۰۸ھ مین وہ گوالیار کا حاکم مقرر ہوا، منشی بیربن سنے اس تقریب سے اسی زمانہ مین گوالیار نامہ

کتاب لکہی، جسمین راجہ بکرماجیت کے ۳۳۲ برس بعد سے لیکر ستمر خان کی حکومت کی زمانہ تک گوالیار کی تاریخ

مرتب کی،

جسونت رائے | ولد بہگونت رائے مولد سندر داس منشی لاہوری فارسی زبان کا فاضل اور شاعر تہا پہلے پیرول خان کے

یہان نوکر تہا، سنہ ۱۱۱۱ھ مین کرناٹک گیا اور نواب سعادت اللہ خان کے دربار مین رسائی پیدا کی اور ایک

مدحیہ قصیدہ پیش کیا، نواب سنے قدردانی کی اور جسونت رائے سنے وہین سکونت اختیار کرلی، اور سعید نامہ کے

نام سے نواب سعادت اللہ خان اور اُنکے خاندان کی تاریخ لکہی،

منشی ٹہاکر لال | ولد بہوج داس کالیستہ، ماتر ضلع برہان پور کا رہنے والا تہا، سنہ ۱۱۲۹ھ مین اس نے ایک کتاب

لکہی جسکا نام "دستور العمل شاہنشاہی" رکہا، اسمین اس نے ہندوستان اور دکن کے واقعات بطور فہرست

ترتیب دیئے ہین،

منشی سجان رائے کہتری | یہ شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ مین تہا، خلاصۃ التواریخ کے نام سے ایک نہایت ضخیم اور

مفصل تاریخ ابتدائے عالم سے لیکر شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد تک لکہی، اور اس کوشش اور محنت سے

لکہی کہ وہ مستند کتابون کی فہرست مین داخل ہے، منشی موصوف اپنے کو پٹیالہ کا رہنے والا بتاتا ہے، اس

کتاب کا قلمی نسخہ حیدرآباد اور لندن کے کتبخانہ مشرقی مین موجود ہے، سنہ ۱۱۰۰ھ مین وفات پائی،

ہندرابن داس	ہندرابن داس بہادر شاہی، بہادر شاہ اول کے دربار کے متوسلین میں تھا، سنہ جلوس

عالمگیری مطابق سنہ ۱۱۰۷ھ میں اس نے خلاصۃ التواریخ نام کتاب لکھی، اسمین ہندوستان کی تاریخ ابتدائی قدیم زمانہ سے لیکر عہد عالمگیری تک مرتب ہوئی ہے، عربی آمیز فارسی عبارت اس خوبی سے لکھی ہے کہ ایرانی قلم کا دھوکا ہوتا ہے، مقدمہ مین اپنے ماخذ گنائے ہین، واقعات کا نہایت استقصا کیا ہے، اس کتاب کا ایک نادر نسخہ سنہ ۱۲۲۶ھ کا لکھا ہوا دسنہ (بہار) کی الاصلاح لائبریری مین موجود ہے،

جگجیون داس	ولد منوہر داس، باشندہ گجرات، محمد معظم شاہ کی سرکار مین ڈاک کا مہتمم تھا، چونکہ خفیہ سرکاری کاغذات

اسکی نظر سے گذرتے تھے، اسلئے اسکو واقعات کے جمع کرنیکا شوق پیدا ہوا، سنہ ۱۱۱۹ھ مین بہادر شاہ اول نے لاہور کے دربار مین باریابی بخشی، اور وقائع نگاری کی خدمت پر اسکو مامور کیا، سنہ ۱۱۲۰ھ مین اس نے اپنی محنتون کا ثمرہ منتخب التواریخ کے نام سے لکھکر پیش کیا، اسکے صلہ مین دربار شاہی سے خطاب و خلعت و انعام حاصل ہوا،

کامراج	ولد نین سنگھ، بھپھوند ضلع اٹاوہ اسکا وطن تھا، شہزادہ محمد اعظم کی سرکار مین مالوہ مین اسکو حاضری کا

موقع ملا، اعظم الحرب کے نام سے اس نے شہزادہ کی لڑائیون کے حالات لکھے، کامراج دیباچہ مین لکھتا ہے کہ بہت سے واقعات خود شاہی وقائع نگار نے اسکے لیے بہم پہنچائے، مصنف نہایت اخلاص اور عقیدتمندی کے ساتھ اپنے کو تیموری دربار کا تین پشت سے نمکخوار بتاتا ہے،

کشن چند اخلاص کھتری	شاہجہان آبادی، شاگرد مرزا عبدالغنی قبول کشمیری، اسکا باپ جیل داس فارسی کا

شاعر تھا، کشن چند نے ہمیشہ بہار کے نام سے سنہ ۱۱۳۶ھ مین تذکرۂ شعراء لکھا، اسمین اکبر سے لیکر محمد شاہ کے عہد تک کے فارسی شعراء کے حالات و سوانح ہین یہ تذکرہ اسقدر مستند ہے کہ علامہ آزاد بلگرامی خزانۂ عامرہ کی تالیف مین اسکو اپنا ماخذ قرار دیتے ہین اور جابجا اس سے استفادہ کا اعتراف کرتے ہین اس کتاب کے نسخے بانکی پور اور حیدرآباد کے کتبخانون مین ہین،

لال رام | باپ کا نام دولہ رام اور دادا کا نام رائے کنجن، رائے کنجن عالمگیر کے عہد حکومت مین کسی عہدہ پر ممتاز اور رائے کے خطاب سے مشرف تھا، دولہ رام بھی رائے کے خطاب سے مخاطب اور عمدہ داران شاہی مین داخل تھا، خود لال رام محمد شاہ کی سرکار مین نوکر تھا، ۱۱۶۰ھ مین تحفۃ الہند ایک مستند تاریخی کتاب لکھکر دربار شاہی مین تحفہ پیش کی،

خوشحال چند | کسی زمانہ مین شاہ عالمگیر کے شاہی دربار کا دیوان تھا ۱۱۶۳ھ اسکی تاریخ وفات ہو اسکی وفات کے بعد اسکی جگہ اسکے بیٹے کو ملی "تاریخ نادر الزمانی" خوشحال چند کی بہترین تصنیف ہے،

ہیرا لال خوشدل | یہ غالبًا دکن کا باشندہ ہوگا، قطب شاہیہ دکن کی اس نے منظوم تاریخ لکھی ہے، زمانۂ وجود معلوم نہین، دسوین صدی ہجری کے آخر مین یا گیارہوین صدی کے اول مین اسکو ہونا چاہیئے قطب شاہیہ کا زمانۂ حکومت یہی ہے، یہ کتاب بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتبخانہ مین ہے،

مہاراجہ کلیان سنگھ | کلیان سنگھ کا دادا رائے بہت سنگھ دہلی کا ایک کایستھ، امیر الامراء صمصام الدولہ کی سرکار مین دیوان تھا، اسکے بیٹے شتاب رائے نے بڑا عروج حاصل کیا، دربار شاہی سے ممتاز الملک مہاراجہ شتاب رائے بہادر منصور جنگ کے نام سے مخاطب تھا، اور سلطنت کی طرف سے صوبہ بہار کا ناظم (گورنر) مقرر ہوا تھا، خود بھی فاضل تھا اور فضلاے وقت کا قدردان بھی تھا، ۱۱۸۷ھ مین اس نے وفات پائی تو اسکا بیٹا انتظام الملک ممتاز الدولہ مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر تہور جنگ کے نام صوبہ کی نظامت (گورنری) پر مامور ہوا، یہ بھی اپنے باپ کی طرح علم دوست تھا، خلاصۃ التواریخ اسکی تصنیف ہے، جسمین امیر تیمور سے لیکر اپنے زمانہ تک کے حالات اس نے لکھے ہین، اسکی دوسری تصنیف واردات قاسمی ہے جو نظامت بنگالہ کی تاریخ ہے،

شیوداس لکھنوی | شیوداس نے شاہ نامہ منور کلام کے نام سے فرخ سیر (۱۱۲۴ھ) سے محمد شاہ (۱۱۳۱ھ) کے زمانہ تک کے حالات لکھے ہین، دربار شاہی مین بہت دنون تک یہ منشی (سکریٹری) کے عہدہ پر ممتاز رہا،

روپ نرائن | ولد ہری رام کھتری، متوطن سیالکوٹ، اس نے ۱۱۹۰ھ مین ہندوؤن کے مقدس مقامات کے

حالات وکیفیات لکھے، کتاب کا اصلی نام "جامع عالم" اور تاریخی نام "مخزن العرفان" ہے،

رائے چترمن | قوم کا کایستھ سکسینہ، اس نے وزیر الملک غازی الدین خان کی فرمائش سے ہندستان کی تاریخ لکھی، اور اسکا نام چار گلشن رکھا، یہ کتاب چار گلشنون پر منقسم ہے، گلشن اول بادشاہان ہند کے حال مین، گلشن دوم صوبون کے حال مین، گلشن سوم دہلی سے چارون طرف بڑے بڑے شہرون تک جو سڑکین گئی ہین، انکی پیمائش اور ایک ایک منزل کا حال، (یہ باب اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے) گلشن چہارم مین ہندو فقیرون اور جوگیون کے حالات اور جلسے، ۱۱۶۳ھ مین یہ کتاب اتمام کو پہنچی،

درگا داس | باپ کا نام شیو ٹھکر داس، "سفینۂ عشرت" ایک فارسی تذکرہ کا مصنف ہے، ۱۱۷۰ھ مین تذکرہ تالیف پایا، عجب نہین کہ یہ حزین کا شاگرد ہو،

انند روپ | ضلع نارنول (مدراس) کا ایک برہمن تھا، مہاراجہ بھونسلا کے دربار مین کچھ دنون نوکر رہا تھا، نصیر الملک نصیر جنگ کے معاملہ مین ناگپور سے الہ آباد آیا، یہان اس نے ۱۲۰۲ھ مین "میزان دانش" لکھی جو "جنگ" کے اعتبار سے چار حصون مین منقسم ہے،

ستا لال | ولد بہادر سنگھ، اس نے شاہ عالم کے دور حکومت کی تاریخ لکھی ہے، کتاب کا آغاز ۱۱۸۴ھ سے ہوتا ہے، جب شاہ عالم نے الہ آباد سے دلی کا رخ کیا ہے،

رائے کیول رام | ولد گنگا داس اگروال، اطراف دلی مین قصبہ کشنا اسکا وطن تھا، ۱۱۸۳ھ مین اس نے تذکرۃ الامرا نام ایک کتاب لکھی دیباچہ مین بیان کیا ہے کہ یہ کتاب شاہی دفتر سے اخذ کی گئی ہے، اور قطع نامی سے ترتیب دی گئی ہے،

دلپت رائے | مخاطب بہ راؤ دلپت سنگھ اسکا مولد احمد آباد گجرات ہے، اسکا باپ گلاب رائے یہان متصدی تھا، دلپت رائے عربی، فارسی، سنسکرت، پراکرت اور بھاکا زبانون مین کامل دستگاہ رکھتا تھا، ۲۰ برس کی عمر مین جے نگر (جے پور) آیا اور مہاراجہ مادھو سنگھ کے حکم سے ملاحت مقال لکھنی شروع کی اور ۱۱۸۱ھ مین مہاراجہ کے مرنے کے بعد اسکو تمام کیا،

(۴)

گذشتہ اوراق مین ان ۲۰ ہندو فضلاء کے نام گنائے گئے ہین جو تاریخ کے فن مین ممتاز ہوے ہین باوجودیکہ تمام معلومات سامنے نہ تھے، یہ داستان اتنی بسیط کہ عہد سابق مین پوری نہو سکی، جہان سے یہ کہانی چھوٹی تھی وہین سے اب پھر شروع ہوتی ہے،

بندرابن خوشگو | قوم ویش، باشندۂ متھرا، اپنے زمانہ کے مشہور اساتذہ فن کا شرف تلمذ حاصل تھا، سراج الدین علیخان آرزو، مرزا عبدالقادر بیدل، محمد افضل سرخوش اور شیخ سعداللہ گلشن کی صحبتین اٹھائی تھین نظم و نثر دونون مین کمال حاصل تھا، سفینۂ خوشگو، و تذکرۃ المعاصرین، دو تذکرے لکھکر نواب عمدۃ الملک امیرخان کی سرکار مین پیش کئے، نواب نے قدردانی کی اور دو روپیہ روزانہ وظیفہ مقرر کیا، نواب کی وفات کے بعد ترک دنیا کر کے عظیم آباد پٹنہ مین اقامت اختیار کی، سنہ ۱۱۷۰ھ مین وفات پائی، کتبخانہ بانکی پور مین اس تذکرہ کا جو نسخہ ہے وہ علامہ آزاد بلگرامی کا مملوکہ ہے، اور انہین کی فرمائش سے سنہ ۱۱۸۳ھ مین نقل کیا گیا ہے گل رعنا کے مولف نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے،

پنڈت کرشنانند | پنڈت انندگھن کا بیٹا تھا، اس نے تاریخ شاہان ہند کے نام سے ایک کتاب لکھی اسکا متعین زمانہ نہین معلوم، لیکن سنہ ۱۱۶۳ھ یعنی تقریباً سنہ ۱۱۶۳ھ مین موجود تھا،

بدھ سنگھ | قوم کھتری، اس نے سکھ فرقہ کی تاریخ سنہ ۱۱۵۰ھ سے اپنے زمانہ تک لکھی ہے، اسکو اس کتاب کی تالیف مین لالہ عجائب سنگھ سے بہت مدد ملی، کتاب کا نام رسالہ نانک شاہ ہے، سنہ تالیف معلوم نہین،

رگھوناتھ | غالباً مرہٹہ ہے اس نے ۱۱۸۲ھ میں حالات مرہٹہ کے نام سے انکی تاریخ لکھی،

شیو پرشاد | نواب فیض اللہ خان روہیلہ کی سرکار میں نوکر تھا، ۱۱۹۰ھ میں اس نے تاریخ فیض بخش کے نام سے روہیلہ پٹھانوں کی تاریخ لکھی،

مکند راے | اس نے راجہ ہولکر کے سیاسی خطوط کا فارسی میں ترجمہ کیا، ایک نسخہ کتبخانہ آصفیہ میں ہے، خط ہولکر نام ہے، ۱۱۹۱ھ سنہ تالیف ہے،

موہن لعل انیس | ولد راے تولارام قانونگو، قوم کایستھ، باشندۂ لکھنؤ، فارسی شاعری میں مرزا فاخر مکین کا شاگرد تھا، انیس الاحبار کے نام سے ۱۱۹۲ھ میں اس نے مرزا مکین اور انکے تلامذہ کا ایک دلچسپ تذکرہ لکھا، اس تذکرہ میں مرزا مکین کے چھ ہندو شاگردوں کے بھی حالات ہیں۔

ہرنام سنگھ | ولد کوردا سنگھ ملانوہ نواح لکھنؤ کا باشندہ سرسوتی برہمن تھا، بچپن سے معین الدین خان حاکم بریلی کے زیر سایہ رہا، تاریخ سعادت جاوید اسکی بہترین یادگار ہے، معین الدین خان کا زمانہ حکومت بریلی ۱۱۹۵ھ سے ۱۲۰۰ھ تک ہے،

رنچھوڑجی | ولد امرجی دیوان، رنچھوڑجی نے ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۵ء میں تاریخ سورت لکھی، اسمیں جونا گڑھ اور ناگر قوم کے حالات درج کئے ہیں،

لچھمی نرائن شفیق | لاہور وطن تھا، اسکا دادا عالمگیر کے ساتھ مہم دکن میں گیا، اور اورنگ آباد دکن میں سکونت اختیار کرلی، اسکا باپ راے منسا رام نواب آصفجاہ کا دیوان تھا، لچھمی نرائن شفیق ان ہندو فضلاء میں سے ہے جنکی قابلیت اور علم پر زمانہ فخر کرسکتا ہے، علامہ آزاد بلگرامی کا شاگرد اور عالیجاہ بہادر کے سلک ملازمین میں داخل تھا، تاریخ کا ذوق استاد آزاد سے وراثت میں پایا تھا، چنانچہ اس فن میں اسکی متعدد تالیفات ہیں، گل رعنا اور شام غریبان دو شعراء کے تذکرے ہیں، ۱۲۱۰ھ میں حقیقتہاے ہندوستان لکھی، خلاصۃ الہند بھی اسی کی تصنیف ہے، تواریخ آصفی اسکی پانچویں تالیف ہے، لیکن سب سے بہتر اور عمدہ تر تصنیف بساط الغنائم

جسمین اس نے مرہٹون کی تاریخ لکھی ہے،

ہر سکھ رائے | جیون داس کا بیٹا، اور بسنت رائے کا پوتا، قوم کھتری، وطن لاہور، اس نے اپنے ماموں سری نارائن کے مشورہ سے سنہ ۱۲۱۹ھ مین مجمع الاخبار لکھنی شروع کی، اور سنہ ۱۲۲۰ھ مین اسکو اختتام کو پہنچایا، اس سے چند سال پیشتر سنہ ۱۲۱۵ھ مین زبدۃ القوانین نام ایک نہایت کارآمد اور پر معلومات کتاب لکھ چکا تھا اسکا ذکر آگے آئیگا

منشی منا لال | ولد منشی بہادر سنگھ، دفتر خالصہ شاہی کے منشی تھے، شاہ عالم کے روزنامچہ لکھنے پر مامور تھے، یہ روزنامچۂ شاہی کتبخانہ بانکی پور مین موجود ہے، اس سے منشی موصوف کی لیاقت تحریر اور قوت مشاہدہ ثابت ہوتی ہے روزنامچہ کا آخری ورق شاہ عالم کے صحیفۂ حیات کے اختتام پر (سنہ ۱۲۲۱ھ) تمام ہوا ہے،

رائے امر سنگھ خوشدل | ولد جیون رام کایستھ، اصلی وطن کڑہ مانکپور تھا، نواب شجاع الدولہ کے عہد مین سرکار غازیپور کا ناظم (حاکم اعلی) تھا، امر سنگھ نہایت لائق اور فاضل تھا، تعلیم سے فارغ ہوکر مہاراجہ اجیت سنگھ راجۂ بنارس کی سرکار مین نوکر رہا، اور آخر سرکار کمپنی کی طرف سے علی گڈھ کا ناظم مقرر ہوا، اس نے تاریخ فرمانروایان ہنود لکھی ہے جو آغاز سے لیکر سلطان علاؤالدین غوری کے زمانہ پر ختم ہوئی ہے، اسکی دوسری تاریخی تصنیف بزم خیال ہے جسمین خاص مشاہدات اور احوال موجودہ کی بنا پر اپنے ملک کے حالات لکھے ہین، اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سنہ ۱۲۳۱ تک ساتھ ساتھ انگریزون کے حالات بھی لکھتا گیا ہے، سنہ ۱۲۲۵ھ مین وفات پائی،

دولت رائے | منشی دولت رائے کایستھ، بہادل خان المتوفی سنہ ۱۲۳۳ھ بانی ریاست بہاولپور کے مصاحب خاص تھے بہاولپور کا خاندان عباسی ہے، اس مناسبت سے مرآۃ دولت عباسیہ کے نام سے بہاولپور کی تاریخ لکھی، سنہ ۱۸۰۸ء مین یہ کتاب چھاپی گئی تھی،

رائے بھگوان داس | کایستھ، متخلص بہ ہندی، ولد دلپت داس ساکن کالپی، تعلیم و تربیت لکھنؤ مین ہوئی ملا سید یوسف سہارنپوری سے تحصیل علم کی، نواب آصف الدولہ کی سرکار مین معزز عہدہ پر ممتاز ہوئے، پھر معتمد الدولہ مہاراجہ تکیت رائے نائب دیوان شاہ اودھ کی مصاحبون مین داخل ہوگئے، دو تذکرے انکی علمی زندگی کی یادگار ہین

حدیقۂ ہندی اور سفینۂ ہندی، حدیقہ میں گذشتہ شعرا اور سفینہ میں معاصرین کے حالات ہیں، اسکی تالیف کا زمانہ ۱۲۱۹ھ ہے،

موہن سنگھ | موہن رائے ہلکر کی سرکار میں ملازم تھا، عربی و فارسی علوم میں بہرۂ وافر رکھتا تھا، آقا کی فرمائش وقائع ہلکر کے نام سے مہاراجہ ہلکر و ریاست اندور کے حالات لکھے، ۱۲۲۳ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی،

منشی بہترمل | ولد بسے پران چند، اسکی سب سے نادر تصنیف تو دیوان پسند ہے جسمیں مالیات ہند پر اس نے بحث کی ہے، دوسری تاریخی تصنیف عمارات الاکبر ہے، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبرآباد کی عمارتون کا حال ہوگا، اسکی یہ تصنیف ۱۲۲۵ھ کی لکھی ہوئی ہے، اس سے زمانہ معلوم ہو سکتا ہے،

بساون لال شادان | بلگرام کا باشندہ، امیر الدولہ محمد امیر خان کے دربار میں نائب میر منشی تھا، اور اسی کے حکم سے ۱۲۴۰ھ میں امیر نامہ لکھی، یہ درحقیقت امیر خان کی سوانح عمری ہے۔

سندر لال کول | ولد نوبت رائے، متھرا کا باشندہ دفتر خالصہ میں میر منشی تھا، ۱۲۳۱ھ میں اس نے گلِ بیخزان لکھی، جو چار ابواب پر منقسم ہے، تین پہلے ابواب میں دہلی، متھرا اور بندرابن کے حالات ہیں، اور چوتھے میں افسانہ ہے،

منشی سدا سکھ لال | تخلص بہ نیاز، نجف خان کے زمانہ میں بہ آگرہ کے سررشتہ دار تھے، ۱۲۳۲ھ میں ۸۵ برس کی عمر میں دلی چھوڑکر الہ آباد آگئے تھے، مرزا قتیل، میر تقی و خواجہ میر درد وغیرہ کے معاصرین میں تھے، الہ آباد میں منتخب التواریخ نام ایک کتاب لکھی، سر ہنری ایلیٹ اپنی تاریخ میں اسکا حوالہ دیتا ہے،

بہادر سنگھ | ہزاری مل کا بیٹا اور لچھمی چند کا پوتا تھا، اصل وطن گو شاہجہان آباد تھا، لیکن الہ آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی، یہان عربی فارسی اور ہندی کی تاریخی کتابون سے مواد فراہم کرکے یادگار بہادری کے نام سے تمام دنیا کی تاریخ لکھی، اسکا سال اختتام ۱۲۴۹ھ ہے،

رتن سنگھ | منشی الملک فخر الدولہ دبیر الملک راجہ رتن سنگھ زخمی، جائے پیدائش لکھنؤ، قوم کا بیستھ، اسکا خاندان پشتہا پشت سے دربار اودھ میں معزز عہدون پر ممتاز تھا، رتن سنگھ بہت بڑا فاضل اور علامۂ وقت تھا، اسکے اصلی

کی لاٹ صاحب کے زیر عنوان ظاہر ہونگے، اسکا دادا راجہ بھگوان داس آصف الدولہ کا ایام شاہزادگی مین اتالیق تھا

اور عہد حکومت مین دیوان تھا، رتن سنگھ نے منجملہ تصنیفات کے سلطان التواریخ نام کتاب شاہان اودھ

کی تاریخ مین لکھی ۱۲۵۸ھ مین ساٹھ برس کی عمر مین یہ کتاب اس نے ختم کی،

رام سہائے سنگھ | تخلص بہ نکہت، اس نے منشی سیتل سنگھ بیخود کے حالات مین حقیقتہائے بیخود کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ۱۲۸۱ھ مین چھپکر شائع ہوئی،

پنڈت جیون نرائن | مولف نظارة السند فن تاریخ مین ہے، زمانہ نہین معلوم لیکن ایشیاٹک سوسائٹی مین اسکا جو نسخہ ہے وہ ۱۲۵۹ھ کا لکھا ہوا ہے،

لالہ سیتل چند | آگرہ مین رہتے تھے، غدر سے بہت پہلے مدرسۂ آگرہ مین مدرس تھے، انھون نے تعریف العمارات کے نام سے نہایت محنت کاوش اور تحقیق سے اکبرآباد آگرہ کی ایک ایک عمارت کا حال لکھا، اور اسکے نقشے شامل کیے، یہ کتاب نہایت مفید اور پراز معلومات ہے، لالہ صاحب غدر سے بہت پہلے مدرسۂ آگرہ مین مدرس تھے،

منشی مہتاب سنگھ | قوم کایستھ مستوطن کانپور، مولف تاریخ ہزارہ، اسکا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ مین ہے،

گردہاری لال | مولف تاریخ ظفرہ دکن، اسکا قلمی نسخہ کتبخانۂ آصفیہ مین ہے، سال تصنیف نہین معلوم، فلسفی کے لقب سے مشہور تھے

راجہ کندن لال | اپنے زمانہ کے مشہور فاضل تھے، فلسفی کے لقب سے مشہور تھے، دہلی وطن تھا، ۱۲۳۶ھ مین قرطاس لکھی، انکی ایک تاریخی تصنیف تنقیح الاخبار ہے جسمین زیادہ تر خود اپنے حالات لکھے ہین،

تین اور چار دو نمبرون مین ۷۴ ہندو مورخون کا تذکرہ ہوا، انکے زمانون پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ صرف ڈھائی سو برس کی مدت کے اندر پیدا ہوئے ہین، یہ تعداد ابھی بہت کچھ بڑھ سکتی ہے، کیونکہ ہندوستان کے سیکڑون ہزارون ذاتی کتبخانون کے معلومات حاصل کرنیکے ذرائع ہمارے پاس نہین ہین اور بہت سی ایسی کتابین ہین جو جاہل خاندانون کی غفلت کی نذر ہوگئی ہین، تاہم اتنی مختصر تعداد سے بھی تسکین ہوسکتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہین کہ اس اسکولون اور کالجون کے عہد مین سوا سو برس کے اندر انگریزی کے ہندو مورخین اتنے بھی پیدا نہ ہوسکے،

پھر اس نکتہ کو بھی فراموش نکرنا چاہیئے، آج انگریزی تاریخ کی کچھ کتابین جو بنگالی یا دکنی برہمن مصنفون کے قلم سے نکلی ہین، وہ صرف یونیورسٹیون کے سامنے پرکھی گئی ہین، کہ وہ کورس مین داخل ہوسکین اور انسے کچھ تاجرانہ منافع حاصل ہو، لیکن گذشتہ شاہی زمانہ کے مصنفون کی یہ حالت نہ تھی، انکا محرک یا محض شوق علمی تھا یا سلاطین اور امرائے ملک کی قدر شناسی،

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ باوجود ہمہ آجکل تاریخ کی جو کتابین ہندوستانیون نے لکھی ہین یا لکھی جارہی ہین وہ زیادہ تر کتابون کی ورق گردانی اور اگلے مصنفون کی دانائی کے ساتھ نقل صرف ہے، وہ صحیفۂ فطرت کے مطالعہ کے بعد نہین، بلکہ محض کتبخانون کی الماریون کی تلاش کے بعد لکھے گئے ہین، وہ دنیا کی وسیع فضا مین چل پھر کر نہین بلکہ بلند ایوان لائبریریون کے تہخانون مین بیٹھکر ترتیب پائی ہین، اپنی آنکھون سے مشاہدۂ حقائق اور استنباط نتائج کی بنا پر نہین لکھی گئی ہین بلکہ صرف اپنی دماغی محنت وکاوش اور کتابی تلاش و تفحص کی مدد سے لیکن جن اگلے ہند مورخون کا ہمنے تذکرہ کیا ہے انکی تصنیفات زیادہ تر مشاہدۂ فطرت، معائنۂ حقیقت، اور مطالعۂ واقعات کے نتیجے ہین،

ان مصنفین کے حالات پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان مین زیادہ تر ایسے تھے جو شاہی دفاتر کے ذمہ دار افسر تھے، ان مین بہت سے دفتر شاہی کے منشی، وقائع نویس اور دیوان تھے، انکی نگاہ سے سلطنت کا کوئی راز چھپا نہ تھا، سیاسی، انتظامی، اور مالی ایک ایک جزئی واقعہ پر انکو عبور رہتا، اسلئے وہ جو کچھ دیکھتے تھے وہی لکھتے تھے، اور یہی سبب ہے کہ انکو اپنے تاریخی اوراق کے مرتب کرنیکا سب سے بہتر موقع ملتا تھا،

۵

ہندو فارسی شعراء

محکوم قوموں کو حاکم قوم کی زبان سے کسی طرح استغنا نہیں ہو سکتا، مسلمانوں کے عہد حکومت میں فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی، اور اب انگریزی ہے، اس زمانہ کے طرز حکومت کے لحاظ سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ فارسی زبان کے سیکھنے کے لئے محکوم قوم کو کبھی مجبور نہیں کیا گیا، اور آج جس معاش کی مجبوری سے ہمکو انگریزی کا پڑھنی پڑتی ہے کل بھی یہی حالت تھی، بہرحال کسی سبب سے بھی ہو سکندر لودی کے زمانہ سے ہندوؤں کو فارسی کی جانب توجہ ہوئی اور اسمیں اس درجہ انہوں نے ترقی کی کہ ایک انگریز مورخ کے بقول "ہندوؤں اور مسلمانوں میں فارسی زباندانی میں کوئی فرق نہیں رہا"[1]

آج بھی انگریزی تعلیم اسی سرعت اور تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے جہانتک گذشتہ اور موجودہ زمانہ کے مقابلے سے ثابت ہوتا ہے بہ ظاہر ہوتا ہے کہ باایں ہمہ نظم و اہتمام، جد و جہد، سعی و کوشش اور زرپاشی و اسراف جدید تعلیم کا وہ نتیجہ نہیں پیدا ہوا، جو پہلے پیدا ہوا، یہ ممکن ہے کہ کتب اور تعداد کے لحاظ سے آجکل کی سرکاری زبان کے جاننے والے زیادہ ہوں لیکن کیفیت اور اثر کے لحاظ سے گذشتہ تعلیم زیادہ مفید کارآمد اور موثر تھی، اسکے اسباب میرے خیال میں حسب ذیل ہیں،

(۱) تعلیم مفت تھی، صرف طلب نہ تھی،

---

[1] "ہندوستان میں علوم کی ترقی مسلمانوں کے زمانہ میں" مسٹر لاء نے یہ قول نقل کیا ہے،

(۲) استاد شفیق باپ اور مرشد کی حیثیت رکھتے تھے، آجکل کی طرح "اجرت گیر" و "پیشہ ور معلمین" نہ تھے،

(۳) زبان تعلیم سے نہیں بلکہ اہل زبان کی صحبت اور مجلس سے حاصل ہوتی ہے، اس زمانہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی معاشرت، صحبت اور سوسائٹی میں کوئی امتیاز نہ تھا، دو مذہب کی صحبتیں رہتی تھیں، مجلسیں تھیں، ایک سوسائٹی تھی، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ انکو فارسی زبان باتوں باتوں میں آجاتی تھی، اسی کا یہ اثر ہے کہ اب تک اسکولوں اور کالجوں میں ہندو طلبہ فارسی کو سہل و آسان سمجھکر اختیار کرتے ہیں، اور سنسکرت کے مقابلہ میں اسکو ترجیح دیتے ہیں، مگر رفتہ رفتہ قومی تعصب کا رنگ اب تعلیمی تفریق و امتیاز بھی پیدا کرتا جاتا ہے،

بہرحال یہ واقعہ ہے، جسکی کوئی تکذیب کی جرأت نہیں کرسکتا کہ ادبی حیثیت سے فارسی تعلیم نے ہندوؤں پر جو اثر ڈالا وہ انگریزی تعلیم باایں ہمہ ہمہ گیری نہ ڈال سکی، سو ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں کتنے ایسے انگریزی کے باکمال شاعر گذرے ہیں جنکا نام تاریخ کے صفحات میں زندگی حاصل کرسکا ہے یا کریگا، جو نام کے سامنے ہیں انکی تعداد ۵ یا ۶ سے زیادہ نہیں، اور یہ بھی زیادہ ہے، لیکن دیکھو کہ صرف تیموریوں کے آخر زمانہ میں صرف دو ڈھائی سو برس کے اندر فارسی زبان کے کتنے ایسے ہندو شعراء گذرے جنکے نام اب تک ہمارے تاریخی تذکروں کے فخر و مباہات کے باعث ہیں، جنکے اشعار کو سن سن کر اہل زبان سر دھنتے تھے اور مزے لیتے تھے، آج انگریزی کے دو تین ہندوستانی شاعر جنکی اہل زبان نے کچھ تعریفیں کردی ہیں یا انکو کوئی انعام مل گیا ہے، فرنگی مدح و ستائش کے گیت گاتے گاتے ہماری زبانیں خشک ہوگئی ہیں، لیکن ذرا اپنے اسلاف کو دیکھو کہ انکے کیا کارنامے تھے؟ میں نے چند فارسی تذکروں کو سامنے رکھکر حسب ذیل اشخاص کا انتخاب کیا ہے، انکی ترتیب زمانہ اور دور پر نہیں بلکہ حروف تہجی پر ہے، ان میں سے ہر ایک نے سلاطین زمانہ اور ابنائے عصر سے اپنی زبان آوری کی داد آج سے بہتر طریقہ پر پائی تھی،

اس احتیاط کی بنا پر کہ تذکرہ نویسوں کے اصلی الفاظ محفوظ رہیں، اور زیادت و نقص اور کمی و بیشی کا شبہ نہ ہو

اصل عبارت فارسی ہی اس مقام پر نقل کرنا زیادہ مناسب ہے،

آرام | منشی ایشری داس قوم کایستھ و منصرم منشیان سرکار امیر الامرا نواب غضنفر جنگ رئیس فرخ آباد منسلک داشت

نظم و نثر فارسی بفصاحت و بلاغت مشتمل بر لطائف و صنائع و بدائع لفظی و معنوی می نگاشت، از نثرش بعض وقائع و سوانح بنظر گذشته حق آنست که بکمال لطف و خوبی می نگاشت، در مدح نواب عمادالملک نیز نظام الملک آصفجاه باستیصال سوریج مل جات گفته،

بظفر کہ بہ بخشش ممالک هند — سزد که باج ز خاقان و ز فغفور گیرند

شهان بصولت آن جم وقار آصفجاه — رکاب توسن شاهنشه زمن گیرند

جوان صاحب بخت جوان نظام الملک — که باو همت از دو مردم دکن گیرند

بریدگی سور بتیغ فتنه ساز نحست — چنانکه صبح سر شمع در لگن گیرند

آزرده تمن لال قوم کایسته، ساکن الله آباد، در رنگینی مضمون آفرینی سحرکاری می نمود،

بیا ز کعبه و مرغان چمن را — نو سنجان رنگین انجمن را

که عید بهار آمد طرب جوش — ز بوی گل کرده دامان کمن را

اخلاص کالی پرشاد قوم کایسته متوطن حوالی لکهنو بمشق نظم و نثر فارسی از مولوی احسان الله ممتاز نامی می نمود، بعد مرگش کلام منظوم و منثورش پریشان گردید، قصیده در مدح محمد علی شاه اوده برشته نظم کشیده، که بصنعت توشیح از هشت جا محمد علی شاه بادشاه زمان خلدالله ملکه برآورده و از خزانه شاهی هزار روپیه بجائزه آن برده،

الفت راجه الفت رای بخشی ممالک اوده، دستگاهش بر اصناف نظم و قصیده و غزل و رباعی و مثنوی قوی بسکه موزون طبع بود،

نیست اهل آسمان را بر درت بی اذن بار — می کند گردون طواف روضت لیل و نهار

هر چه ناممکن بود آید نتو بر روی کار — از نهار روی که گویش احترامست آشکار

الفت لاله ساجالگرام قوم کایسته عظیم آبادی است، برای اصلاح سخن بخدمت میر محمد عظیم سمرقندی می رسید،

دمادم شام غم در سینه حسرت نام مهمانی — نداغ دل کشیدم بی تکلف پیش آی دخوانی

امتی مادھو پرساد لال قوم کایسته از هندوان عظیم آباد است، مثنوی نیرنگ تقدیر و دیوان اشعارش طبع یافته
میر منشی بادشاه اکبر ثانی بود، و با اسباب کمال طریقهٔ عفت و خلق مرعی می‌نمود،

چون غنچه جز سکوت نباشد بیان ما پیچیده شد نبات سخن در دهان ما
اندیشهٔ مال نیاید زما درست در دست دیگریست چه سود و زیان ما
در دشت پر بلا چو مجنون نیست امتی جز موج ریگ و خاک روان کاروان ما

امانت لالا امانت رام از شاگردان میرزا بیدل، در سلف از سخن‌سنجی بیگانه آشنا و خوددار

می‌گردد بلند از خاک هم باد مزار ما که بخشد صبا دامن گل خوبان غبار ما
شکر که نقش پای تو بر جبین یافتم آنروز سجده می‌کرم زمین یافتم

اندرمن پسر کنول رام، مولدش قصبهٔ اورنگ آباد از اعمال علی‌گڑھ، استفادهٔ علم فارسی از شیخ نظام‌الدین سکندرآبادی کرده، در موزونی طبع و سخن‌سنجی نام برآورده، هر چند در عین جوانی نابینا شد مگر قوت حافظه‌اش چندان افزود که سائر نظم و نثر خودش نوک زبان بود،

صد جلوه دیگر تهٔ آن ماه پاره است این ماه نو نه بر سر انگشت اشاره است

انس لال چند کایسته، لکھنوی، از دیوانی مختصر یادگار، ۱۲۶۹ھ،

شوخ چشیده بود خشک بسے ز تشنگی ما کو لب یار بود مایهٔ بیهوشی ما
جائی که عام است خدا امتحان کرد هر یک است وابستهٔ تیغ تو سبکدوشی ما

انیس سوہن لال شاگرد میرزا فاخر مکین، نام پدرش رای ... رام کایسته، صاحب دیوان فارسی،
پدر ما سے گنگا پرشاد بہادر از زمرهٔ کایتهان نجیب و نجیبهٔ شهر لکھنؤ است. بحضور واجد علیشاه عهدهٔ سررشته‌داری در علم سیاق و سباق سربری آورده،

می‌کنم سہوا تہتے کہ کند ہر نفس دعوی خدائیہا

ز غم طره داشت سوز الفت   من واندیشهٔ رہا یٔیہا

بہجت | چند ربهان اگره در سرکار دارا شکوه منشی داشت، بعد قتل وے ترک نوکری نموده بشهر بنارس رفت،
سنه ۰ مرد،

کلم زساده دلی بند دیده مژگان داشت   گذشت خس نتوان بست راه طوفان ما

بهار | ٹیک چند کلاش دل پسند، تتبع زبان فارسی بدرجهٔ تحقیق رسانیده، کتاب بهار عجم نوشت، رجوا مجرد بر
برده ست اما، شد تلامذهٔ سراج الدین علیخان آرزو،

جانت بود دل بحال مضطرابم می پرد   زنده ام بیطاقتی تا آفتابم می پرد

بهجت | لچمن لال صاحب دیوان بهجت،

تحفه | منشی گوهر لال تفته، برہمن، خیلے پرگو ست، کلام منظومش بسیار. پنج دیوان شعر دارد، ابیات هر یکے از آن
قریب سیزده هزار، کل ۰ ۲ هزار،

چنگلی کرنشان نیست نعوذ من کنسان   گمر این الله که بینی زشهیدان تو نیست

تمنا | لچمن لال کایسته از شکوه آباد است، دیوان و مثنویش یکی ۱۵ هزار بیت است،

ثاقب | مهاراجه شیو پرشاد جی گوپال سنگه بهادر، از کاییتان سری باستب است، پدرش منشی بینی پرشاد سررشته دار
دیوان عام سلطانی اوده بود، شیو پرشاد کاسه بار دیوانی شهزادهٔ صاحب جنرل فریدون قدر مرزا اهربخلی اوده
تاریخ اوده که نام تاریخی اُو دفتر ثاقب و نسخهٔ تاریخ دهلی که نام تاریخش حقیقت تیموریه تالیف آن سخندان و مجموعه
کلیات الثاقب و مثنوی مجز همت از منظومات آن است،

حیا | شیو رام اکبرآبادی کایسته، پدرش بهگوتی مل از متصدیان سرکار نواب اسفان وزیر عالمگیر بادشاه،
مشق شعر و سخن از مرزا بیدل می نمود، نسخهٔ گلگشت بهار ارم بطرز چهار عنصر مرزا بیدل بستعدی تمام نگاشته، سنه ۱۱۴۳
وفات یافت،

بیاد چشم تو داریم می پرستیها — رسانده ایم بگردون دماغ مستیها

خوشدل | راے امر سنگھ ولد جیون رام کایستھ از کتره مانکپور، جیون رام در سرکار وزیر الممالک نواب ابو المنصور خان صفدر جنگ، در زمان نواب شجاع الدوله به نظامت سرکار غازیپور مامور گردید، راے امر سنگھ بعد تحصیل علوم متداوله در سرکار مهاراجه جیت سنگھ راجه بنارس تا آخر در سرکار ماگھی بدیوان جیتنکه کامران گشت، در سنه ۱۲۲۲ھ در گذشت، بهار دانش نظم، و نسخه تاریخ فرمانروایان هنود تا سلطان علاء الدین غوری، از وے یادگار ماند، دیوانش تخمینا پنج هزار است،

گرم است بسکه ناله آتش فشان ما — سوزد بسان شمع زبان در دهان ما

خیال | منشی خیالی رام لکھنوی، در نظم و نثر فارسی قدرتش علی وجه الکمال، و تالیفاتش کرنمایان یکصد و اند مجلد، شرح الهی زمسروی او در سنه ۱۲۹۹ھ بگذشت، قصیده در مدح واجد علیشاه بصنعت نو منزل نوشته که از حروف اوائل مصاریع اولی سنه هجری و از حروف اوائل الفاظ آخر سنه فصلی و از مصاریع ثانیه سنه عیسوی و سمت هندی

خاموش | رام صاحب المتوفی [illegible] کے فارسی دیوان کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے،

راقم | بختاور سنگھ لکھنوی، بشیرین گفتاری از ممتازان گروه هند، پسرش جواهر سنگھ جوهر از پدر خود خوشگو.

رحمتی | کنور سکھراج سنگھ بهادر، خلف کنور هیرالال ضمیر، پسر راجه پیارے لال الفتی،

گو بهجرش دل سودازده غمناک شود — جامهٔ صبر ز بیتابی من چاک شود

رفعت | سیکولال لکھنوی، طبعش بشعر و سخن مائل، و مشق این فن از مولوی نذیر احمد می نمود،

رفیق | داتا رام، طبعش با موزونی توام و لب و لهجه اش با خوش بیانی همدم،

نگار من برخ خویش چون نقاب گرفت — فتاد شور که امروز آفتاب گرفت

رونق | منشی رام سهاے لکھنوی، نظم شعر فارسی بلطافت می نوشت، ۱۲۹۰ھ وفات، دیوان شعر و مثنویات ازوے یادگار، غزلے نوشته در چهار بحر،

زور | منشی بیندا لال در شهر لکهنؤ، در نظم و نثر فارسی شاگرد نخش بسیار، دیوان فارسی و رسائل نثر مثل بحر عشق و هفت صحیفه بطرز پنج رقعه، و نادر بازار به تتبع مینا بازار و جاوید بهار،

ست | سکراج پدرش بملازمت عمدة الملک بهادر وزیر بادشاه عالمگیر ممتاز است، از مستعدان روزگار بود، در علوم عربیه دیگر، حساب و طب و تصوف از اقران گوی سبقت برد، بر انواع نظم و معما و تاریخ قدرت داشت شاگرد بیدل، در سرکار سید حسین علیخان کار دیوانی و میر سامانی سرانجام داده بمنصب پانصدی رسیده و جنگ نامهٔ حسین علیخان قریب هفت صد اشعار از وی یادگار،

سرمدی | رای منشی دهرم نراین بخشی الملک راجه لال جی بهادر، نظم و نثر فارسی را پیش مولوی احسان الله ممتاز تحصیل نمود

نام بیکی دسخن امروز سرمدی ست ‌‌‌‌‌ مداح آل سرو و شیدای سرورم

شادان | مهاراجه چندو لال دیوان دولت آصفیه حیدرآباد، بزمش مجمع اهل کمال و مطلع ارباب سخن، در هر شب مجلس شعر و سخن بر پا می ساخت، در فن شعر پایهٔ بلند داشت، فارسی دیوان چهپ گیا ہے۔ یہ مہاراجہ کشن پرشاد کے پردادا تھے۔ ۱۲۶۱ھ میں وفات پائی۔

شفیق | منشی لچهمی نراین کهتری اورنگ آبادی شاگرد مرزا آزاد، دو تذکرهٔ شعرا دارد، گل رعنا و شام غریبان، صانگو خوش بندش است، اصلش از لاهور است. پدرش بهوانی داس همراه عالمگیر وارد دکن گردیده در اورنگ آباد سکونت گزید، شفیق در سلک ملازمان عالیجاه، خلف نواب نظام علیخان منتظم گردید، در ۱۲۱۰ھ مرد،

شوق | منشی دولت رای نبیرهٔ راجه بهولاناته، از زمرهٔ منشیان بیت الانشاء شاهی اوده ممتاز، قصیدهٔ بلند گفته، در صنعت عکس و بسیج دروی گفت، بهمراهی شاه واجد علی مع اهل و عیال کلکته بیامد ۱۲۷۰ھ مرد،

از حسن فروغ از در حسن تو جهان را ‌‌‌‌‌ داغ تو چراغ است دل پیر و جوان را

شهیر | لاله بالمکند ناکپوری در ۱۲۲۵ھ بگذشت، طبع نکته سنجی و نظم گوی داشته،

مکن اشک مرا بیقدر ای مژگان تر هم ‌‌‌‌‌ ببین طفل غذا بیهوده خون جگر هے

صاحب رسم سخن سنج فارسی بود تاریخ گوئی ملکہ داشت، در عہد سلطنت شاہ غازی الدین حیدر علم شہرت

می افراشت، در تاریخ وفات غازی الدین حیدر بادشاہ کہ در مقام نجف شہر لکھنؤ مدفون است می گوید

چون رفت شہ زمن ز دنیا | ماتم دل خاص و عام بگرفت
اندوہ بکاؤ آہ گفتم | حیدر بہ نجف مقام بگرفت
١٢٤٣ھ

ضیائی | راجہ گوبند بخش ضیائی، المتوفی ١٢٢٥ھ، انکا نہایت عمدہ فارسی دیوان کتبخانۂ آصفیہ میں ہے،

عشرت | جی کشن اندا ہمہ کشمیری در سخن طرازی سلیقہ اش نیکو، مدتے بملازمت نواب نجم الدولہ امیر خان، دیوان

خالصۂ شریفہ بقانون گوئی تمام خطۂ کشمیر سرافراز بود،

دشت از لالہ بسکہ رنگین است | پاے دیوانہ دست گلچین است

گلشن | راجہ جیالال بہادر، خوش فکر صاحب دیوان، بدیوان انشاء ابوالفتح محمد علی شاہ اودھ سر دفتر منشیان،

گلشن | راے گلاب رای سندیلوی، شاگرد قتیل، در ریاست اودھ متعہد عہدہاے جلیلہ، در استعداد علمی بیمثل

در فنون سپہگری فائق الامثال، تذکرۂ شعرا ضخیم و دیوانے جسیم یادگار او،

آنکس کہ از زبان تو حرف جفا شنید | گویا پیام خضر ز آب بقا شنید

شائق | لالہ بیجناتھ بریلوی،

سلیم | لالہ رام بخش قنوجی

ممتاز | لالہ بیتل داس در نازک خیالی ممتاز، لب و لہجہ اہل زبان پیدا نمود،

ظفر | منشی مادہو رام شاہجہان آبادی، در سرکار نواب لطف اللہ خان بن سعد اللہ خان شاہجہانی بعہدۂ انشاء

اعتبار داشت، و رفتہ رفتہ امیر الانشاء معز الدین جہاندار بن بہادر شاہ مشرف،

نمی رسد بمیان صنم ز باریکی | ہزار بار بدقت شگافتم مو را

منشی | لالہ فتح چند برہانپوری کایستہ، طبع نظم دارد خوشگو است،

نیست آسائش بمنزل جان از خود رسته را — هر قدم دام است نقش پا شکار جسته را

بسکه از شرم تو در پرواز رنگ گلشن است — رشته نظاره بنده در جا گلدسته را

سوهر | اماے سوهر لال از امراے سلطنت اکبر بادشاه است، طبع متین و ماے رزین داشت، رباعی

روزیکه سموم حشر افزون گردد — در آتش غم چو چهره گلگون گردد

مادر دوزخ چنان بدوستے سوزم — کز رشک دل بهشتیان خون گردد

موجه | سکهن لال بدایونی،

چشیم چه کنم چون نزنم سر بر سنگ — مدتے شد که ز جانان خبرے پیدا نیست

موجه | لاله کالکا پرشاد لکهنوی بموزونی طبع و رسائی ذهن امتیاز داشت و خط نستعلیق خوش و شیرین می نگاشت

با اصطلاحات و محاورات زبان فارسی بخوبی ماهر،

رسائی نیست تا سر منزل تو کفر و ایمان را — که در بتخانه و کعبه رنگ ره برد گبر و مسلمان را

موجی | لاله موجی رام،

موزون | راجه رام نرائن عظیم آبادی، پدرش بدیوانی سرکار نواب مهابت جنگ عزت داشت، بعده باین عهده

موروثی رسید، در جنگ پا مردی نهاد، دیوان اشعارش، شاگرد شیخ محمد علی حزین، سنه ۱۱۸۰ه،

موزون | راجه ملن سنگه اٹاوی، پدرش راجه جگت سنگه دست توسل بدامن دولت نواب غازی الدین خان آویخت

و بمنصب سه هزاری و بخطاب راجگی، و بعده دیوانی نواب ممدوح، ملن سنگه در سرکار نواب آصفجاه دکن سمتی لمالک

دور بعد ناصر جنگ بمنصب دو هزاری و علم و نقاره و خطاب راجگی یافت و بصوبه داری قلعه مصطفی نگر گردید تا آنکه

افواج انگریزی محاصره اوبو تش بر آن قلعه نمود راجه تا توانست پاے برجا ماند بصدمه تفنگ بجزء سال

سنه ۱۱۶۹ه جان داد، در نظم و نثر فارسی استعداد نیکو داشت،

که گلشن جلوه رنگین یار آئینه را — می رسد عرض تو بوس از نهاد آئینه را

نقاد | پندت جی گوپال کشمیری وز آشنایان قاضی محمد صادق اختر بوده. شاگرد تحمل.

واثق | کهتری بوده به برکت صحبت مولوی عبدالله بن مولوی عبدالحکیم سیالکوتی مشرف باسلام شده بمحمد لطف خان
مخاطب گردید، در بلاغت اورنگ زیب رسید بوکالت بعضی از امرا می شناخت. نظم و نثر فارسی چنان
خوب می نوشت که اورنگ زیب زبان بتحسین و آفرین می کشود، در جوانی میل بشعر و شاعری داشت بعد ازان
بافادهٔ علوم و فنون طبیعت گماشت. سنه ۱۱۳۳ه مرد،

محتسب مے کشی نه بست تو شکال شده است　　شیشهٔ مے به بغل آبلهٔ دل شده است

وفا | پندت دیاناته ولد مت رام کشمیری شاگرد مرزا علی اکبر عارف شیرازی می نمود،

وقار | میر الدوله منشی الملک راجه جوالا پرشاد بهادر محکم جنگ، امیر الانشاء امجد علی و واجد علی شاهان اوده
باوجود چندین ابتدا دین و هستی نسبت که گفته. در نظم و نثر فارسی صاحب استعداد است دیوانش مجمع،

هندو | شیو سنگه لکهنوی،

هندو | گوکل چند قوم کهتری فرخ آبادی،

(۶)

ہندو ادبائے فارسی

ہندو ادبائے فارسی اس کثرت سے گذرے ہین کہ انکا شمار بھی حیطۂ امکان سے باہر ہے، ان مین بہت سے اچھے لکھنے والے انشا پرداز تھے، اور ایسے بھی تھے جو بعض دفتری ضرورت کے مطابق اس زبان مین نوشت وخواند کرسکتے تھے، ہندوؤن کے دوسرے فرقون کی بہ نسبت کائستھ ذات نے فارسی زبان کی تحصیل مین کثرت تعداد کے لحاظ سے زیادہ ناموری حاصل کی، لیکن اصل زباندانی اور جوہر فن کے لحاظ سے برہمنون نے زیادہ کمال پیدا کیا، خصوصاً آخر زمانہ مین کشمیری برہمنون نے جسطرح آجکل بنگالیون کی انگریزی زبان کو "بابو انگریزی" کہتے ہین، اسی طرح مسلمانون کے عہد حکومت مین کائستھون کی فارسی" اور "لالاؤن کی فارسی" مشہور تھی،

دفاتر مین زیادہ تر ہندو ہوتے تھے، محکمۂ انشاء (سکریٹریٹ) اور مال کے صیغے تمامتر ہندوون کے ہاتھ مین تھے، آخر زمانہ مین انشاء کے اعلےٰ افسر بھی ہندو ہونے لگے تھے جنکو عموماً میر منشی اور ان سے خطاب منشی الممالک کہتے تھے، ان عہدون پر جو ہندو سرفراز ہوتے تھے وہ فارسی زبان کے لائق ادیب ہوتے تھے، بادشاہ کی طرف سے ہر قسم کے احکام وفرامین انہین کی زبان وقلم سے ادا ہوتے تھے وقایع نویسی کی خدمت پر بھی زیادہ تر مامور ہوتے تھے،

ہندو ادبا کے یہ فارسی خطوط اور رقعات جب زیادہ جمع ہو جاتے تھے اور انکی مقبولیت عام ہو جاتی تھی تو وہ بطور کتاب کے یکجا جمع کر دئے جاتے تھے، ان میں سے بعض مجموعے اسقدر مقبول ہو کر درسی ہو گئے تھے کہ طالبعلموں کے نصاب تعلیم میں داخل کر لئے جاتے تھے، چنانچہ خطوط برہمن، انشائے مادھو رام، منشآت جواہر الخطوط، خیالات نادر، دستور الصبیان وغیرہ اسی قسم کی کتابیں ہیں،

اس واقعہ کا تکرار کئی دفعہ گذر چکا ہے کہ ہندؤں نے فارسی تعلیم لودہیوں کے زمانہ سے شروع کی، چنانچہ فارسی کا سب سے پہلا ہندو ادیب بھی اسی زمانہ میں ہمکو ملتا ہے،

پنڈت ڈونگر مل | ایک بزرگ کہتے ہیں کہ پنڈت ڈونگر مل سکندر لودی کے زمانہ میں تھے، انکی فارسی زباندانی پر مسلمان بھی تعجب کرتے تھے، کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہتے تھے، چنانچہ انکا یہ ایک شعر ارباب تذکرہ نقل کرتے ہیں،

دل خون نشدے چشم تو خنجر نشدے گر	صد گم نشدے زلف تو ابتر نشدے گر

ٹوڈر مل | کھتری تھا، شیر شاہ کے عہد میں فارسی تعلیم حاصل کی، اور دربار تک رسائی پائی، شیر شاہی کارخانہ کے انقلاب کے بعد اکبری نورتن میں شامل ہوا جہان مال کا صیغہ اسکے ہاتھ آیا، ٹوڈر مل فارسی کا خوشخط کاتب بھی تھا، تذکرۂ خوش نویسان میں ہے،

"نویسندۂ چابکدست دخط ما بر شغلی دیگری نوشت"

اس عہد کے دیگر ادبا کا تذکرہ اسلئے قلم انداز کرتے ہیں کہ انکا ذکر دوسرے سلسلون میں آچکا ہے،

رائے منوہر لال | رائے لون کرن کا خلف الرشید تھا، شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے آغوش تربیت میں پلکر جوان ہوا اور فارسی زبان میں یہ سلیقہ پیدا کیا کہ اہل تذکرہ اسکی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں،

چندر بھان برہمن | انکا ذکر پہلے بھی گذر چکا ہے، یہ عہد شاہجہانی کا سب سے بڑا ہندو ادیب تھا، یہ پنجابی برہمن تھا لاہور میں پیدا ہوا تھا، ملا عبدالکریم کی شاگردی میں اسکے فضل و کمال نے نشو و نما حاصل کیا تھا، فارسی زبان کا

شاعر تھا، اور برہمن تخلص کرتا تھا، اسکا فارسی دیوان اتبک کتبخانون مین موجود ہے، فارسی ادب مین بڑی دستگاہ حاصل کی تھی، افضل خان امیر الامراے شاہجہانی نے اسکی لیاقت وقابلیت کو دیکھکر اسکو اپنا منشی خاص (پرائیوٹ سکریٹری) بنایا، ۱۰۵۵ھ مین افضل خان نے وفات پائی تو وہ بادشاہی کے سلک ملازمین مین داخل ہوا اور دربار شاہجہان کا وقائع نویس یعنی شاہی تاریخ روزنامچہ کا چیف ایڈیٹر مقرر ہوا، اس عہدہ جلیلہ کے باعث وہ روزانہ بارگاہ شاہی مین حاضر ہوکر بہ دقت مرتبہ واقعات وحالات ستاتا تھا، ۱۰۶۸ھ مین چندر بہان نے چہار چمن برہمن لکھکر نوروز کے موقع پر سرہند مین دربار شاہجہانی مین نذر گذرانی، اسکی لیاقت وادب دانی کو دیکھکر شہزادہ داراشکوہ نے جو خاص طور پر ہندوؤن کے جوہر کمال کا قدردان تھا اسکو اپنے اعیان دربار مین داخل کرلیا، اور اپنا میر منشی (چیف سکریٹری) مقرر کیا، داراشکوہ کی تباہی کے بعد حوادث زمانہ سے تنگ آکر بنارس مین گوشہ گزین ہوگیا، اور یعنی ۱۰۷۳ھ مین راہی عدم ہوا، تذکرہ عمل صالح کا مصنف اسکو اپنے زمانہ کے فضلاے ادب مین شمار کرتا ہے اس نے اپنے رقعات ومنشآت کا مجموعہ بھی مرتب کیا، اسکا نام منشآت برہمن ہے، خوشنویسی مین آقا عبدالرشید کا شاگرد تھا،

هرکرن داس | ولد متھراداس، قوم کنبوہ، باشندۂ ملتان، ۱۰۳۱ھ مین زندہ تھا، فارسی علم ادب مین دستگاہ اس نے حاصل کی تھی اسکی شہادت یہ ہے کہ وہ امراے جہانگیری مین سے اعتبار خان صوبہ دار اکبرآباد کا میر منشی تھا، انشاے ہرکرن کے نام سے اس نے فارسی ادب کی ایک کتاب لکھی تھی جو اتبک بعض کتبخانون مین موجود ہے،

داس کھتری | امراے عالمگیری مین سے ایک کا وکیل (ایجنٹ) تھا، اسکے نظم ونثر ادب فارسی کی یہ دھوم تھی کہ شہنشاہ عالمگیر جو خود ایک بلند پایہ ادیب تھا، احسنت وآفرین کہتا تھا،

شیورام کایتھ | اکبرآباد کا باشندہ تھا، اسکا باپ نواب اسدخان وزیر عالمگیر کا متصدی تھا مرزا بیدل کا شاگرد تھا، مرزا کی چہار عنصر کا جواب گلگشت بہار ارم کے نام سے اس نے لکھا تھا ۱۱۲۲ھ مین وفات پائی

کنور پریم کشور | راجہ جگل کشور کا پوتا، شاعر، لطیفہ گو، سخن فہم، خوش نویس تھا، چند غزلوں کا مصنف ہے

منشی لچھمن سنگھ | قوم کے نقال تھے، نہایت ہوشمند، عاقل، اور عربی و فارسی کے ادیب تھے، ایرانیوں کی صحبتیں اٹھائی تھیں، اور مشہور ایرانی انشاپردازوں کے طرز پر لکھتے تھے، صاحب تذکرۂ خوشنویسان لکھتا ہے

> مرد دانا قابل، در علم و ہنر فارسی و عربی و عبارت پردازی خیلے مہارت داشت، و در صحبت منایان ایران بسیار مانده دل و دماغ دیگر پیدا کرده، و طرز انشا بر وتیرہ طاہر وحید و طاہر کہنی رجلا اختیار کرده،

خوشنویسی میں محمد حنیف خان کے، شفیعہ میں مرزا آغا کے، شاعری میں میر شمس الدین فقیر المتوفی سنہ ۱۱۸۱ھ کے شاگرد تھے، شعلۂ آہ وغیرہ انکی تصنیفات میں، ظہوری کے اشعار انکی نوک زبان رہتے تھے،

پنڈت لالہ لچھمی رام | ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خان (المتوفی سنہ ۱۱۹۶ھ) جو شاہ عالم کا وزیر تھا، اسکی سرکار میں یہ ملازم تھا، تذکرۂ مذکور کا مصنف انکی نسبت لکھتا ہے،

> منشی بے نظیر بود، در علم عربی و فارسی و انشاپردازی و مصوری نصیب وافر داشت، . . .
>
> این چنین انسان باسلیقہ و صاحب کمال کم پیدا می شود،

خوشوقت رائے شاداب | کھتری، یہ ایک مشہور اور معزز خاندان کا فرزند تھا، بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، آخر اس درجہ کمال حاصل کیا کہ اپنے زمانہ کے کبار علما میں سمجھا جانے لگا، تذکرۂ مذکور میں ہے،

> از ابتدائے عمر طبع را بہ تحصیل علم و ہنر راغب و مائل داشت و در اندک زمان در جمیع علم و ہنر آراستہ شد، در خصائل نیکو از ہمچشمان خود سبقت بردہ، در خوشنویسی کمال داشت، این چنین شخص درین قوم صاحب استعداد و فیاض و قدرشناس کم شدہ باشد،

رائے پریم ناتھ | اسکا خاندان ایک مدت سے شاہی دفتر کا عہدہ دار چلا آتا تھا، یہ خود شاہ عالم کی سرکاری دفتر کا مالک اکمل تھا، خوشنویسی و ادب دانی میں اپنے زمانہ کا استاد یگانہ تھا، شاگردوں کا بڑا مجمع اس نے

یادگار چھوڑا،

سکھ رام داس | ولد بیل کشن، زمانہ متعین نہین، آمدنامۂ بدیع اسکی ایک تصنیف ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اطراف لکھنؤ کا باشندہ تھا، اور عہد شاہی مین قانون گوئی کے عہدہ پر مامور تھا،

بیہ نرائن | ولد جیون داس، قوم کھتری بعرف سودھی، پنجاب کا رہنے والا تھا، فرخ سیر کے عہد مین حکم سنگھ اسکو منشی (سکریٹری) کے عہدہ پر سرفراز کرکے اپنے ساتھ مارواڑ لیگیا، اثنائے سفر مین اسکو محمد طاہر کشمیری کی کتاب ہوش افزائی، اس نے اسکو بغور پڑہا اور اسکی بنا پر اسکو قدیم ہندو عہد کے عجائبات اور مذہبی معجزانہ قصص کو فارسی زبان مین لکھنے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ راماین، مہابھارت، بھاگوت، ہری بنس وغیرہ سے انتخاب کرکے ۱۱۳۵ھ سے گلشن اسرار ربانی کے نام سے ایک کتاب لکھنی شروع کی، جو ۱۱۳۶ھ مین اختتام کو پہنچی،

منشی موہن لال شہر | اکبر ثانی کے عہد مین تھے، انکی تین مثنویان، مثنویات شہر کے نام سے فارسی مین موجود ہین بہ ترتیب انکا نام بہار عشق، شاہ رخ، اور دلبر جہان ہے، اور غالباً یہ تینون افسانے ہین، شاہ رخ اور دلبر جہان کو اس نے اکبر ثانی کے نذر کیا تھا،

کشن سنگھ | ولد رائے پران ناتھ کھتری قوم سنکل ساکن سیالکوٹ، یہ فارسی زبان کا ایک چابکدست انشا پرداز تھا، چکر روشنی اور غریب الانشا، وغیرہ کتابون کا مصنف ہے، غریب الانشا ۱۲۰۰ھ مین اس نے لکھی،

بنوالی داس ولی | تم اس سے ہندو مورخین کی بزم مین مل چکے ہو، انکا ادبی کارنامہ یہ ہے کہ سنسکرت زبان سے ایک "ناٹک" پربودھ چندرودیا کا فارسی زبان مین ترجمہ کرکے شراب شیراز کے متوالون کو ہندوستان کی ایک رنگین کاشانہ بنایا، ۱۲۰۳ھ مین یہ موجود تھا،

دونی چند | ۱۲۰۲ھ مین گیتی گوہرنامہ کے نام سے فارسی زبان مین ایک افسانہ لکھا ہو یان غلام جیلانی

جو بہادر شاہ اول کے عہد میں ایک امیر تھا اسکا مربی اور محسن تھا،

شنبھو داس یہ مہاراجہ چیت سنگھ والی بنارس کا منشی و سکریٹری تھا، سنہ ۱۱۹۶ھ میں اس نے منشآتِ خزانی نام کتاب لکھی، جو بہت سے خطوط کا مجموعہ ہے، جنمین سے بعض نہایت اہم ہین،

منشی ستوری لال تمکین بارہوین صدی ہجری کے اوائل مین فارسی کا یہ ایک مشہور ادیب تھا، اسکے پوتے پران چند سرشار ولد بخت مل نے اپنے دادا کے فارسی خطوط و رقعات کو گلدستۂ فیض کے نام سے ایک رسالہ کی صورت مین مرتب کیا، یہ خطوط سنہ ۱۲۳۹ھ کے زمانہ کے لکھے ہوئے ہین،

منشی بھن راے پوری شجاع الدولہ کے عہد مین سنہ ۱۱۷۶ھ مین راجہ راے پور کے دربار مین نوکر تھے، منشی تخلص تھا اور قلم کے بھی منشی تھے، فن انشا پر انھون نے ایک کتاب لکھی ہے، انشاے نیاز نامہ نام رکھا، کتاب کے تین ٹکڑے کئے ہین، (۱) عرائض، (۲) رقائم (۳) ثمرہاے متفرق،

منشی جسونت راے عالمگیر ثانی کے عہد مین تھے، گلشن بہار کے نام سے انھون نے ایک چمن ادب کھلایا ہے، مختلف لوگون کے خطوط اسمین جمع کئے ہین جنمین بکثرت سیاسی اور جنگی معلومات ہین شاعر بھی تھے منشی تخلص کرتے تھے، اور اسی نام سے ایک دیوان فارسی بھی چھوڑا ہے، سنہ ۱۱۷۳ھ مین تھے،

منسا رام منشی تخلص تھا، سرزمین پنجاب کے مجنون و لیلے، ہیرا اور رانجھا کا افسانۂ حسن و عشق نظم کرکے اہل فارس کو سنایا، سنہ ۱۱۵۸ھ مین یہ نغمہ سراے محبت سراے فانی سے کوچ کر گیا،

موہن راے مسرت تخلص، قصیدۂ مسرت لکھ کر شاہ عالم کے دربار مین پیش کیا، اسمین کمال یہ کیا ہے کہ ہر شعر مین بادشاہ کو نئے طور سے خطاب کیا ہے، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین اسکا قلمی نسخہ ہے،

نہال چند لاہوری یہ ایک افسانہ کا جسکا نام مذہب عشق ہے مصنف ہے، مذہب عشق مین نام و نشان ننگ ہے، اسلئے اس ادیب کے حالات نا معلوم ہین،

لالہ بھوپت راے فن بلاغت کی ایک کتاب دستور شگرف کا مصنف، تصنیف تو حیدرآباد اور بنگال

ایشیاٹک سوسائٹی مین قلمی موجود ہے، لیکن صاحب تصنیف کا تذکرہ مفقود ہے حیدرآباد کا نسخہ ۱۱۹۲ھ کا لکھا ہوا ہے،

مادھو ہوک رائے | فیض آباد کا باشندہ تھا، اس نے سعدی کی گلستان مین پھول کھلائے یعنی اسکی شرح لکھی جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین موجود ہے،

منشی امیشری داس | کایستھ، امیرالامرا نواب غضنفر جنگ والی فرخ آباد کے منشی تھے، ایک فارسی تذکرہ کا مصنف انکی نسبت لکھتا ہے،

نظم و نثر فارسی بہ فصاحت و بلاغت مشتمل بر لطائف و صنائع و بدائع لفظی و معنوی می نگاشت

از نظرش بعض وقائع و سوانح بنظر گذشتہ، حق آنست کہ بکمال لطف و خوبی می نگاشت،

منشی نیک چند بہار | انکا تذکرہ آگے آئیگا، یہان صرف اس حیثیت سے انکو جگہ ملتی ہے کہ یہ بوستان سعدی کے شارح اور بہار بوستان کے مصنف ہین،

اننذ رام | زمانہ متاخر کا ایک فارسی ادیب ہے، ۱۱۵۹ھ کے قریب مین اس دنیا سے چل بسا، لیکن اسکے چمنستان کی بہار ابتک باقی ہے، یہ ایک فارسی افسانہ ہے ۱۲۷۹ھ مین یہ کتاب چھپ چکی ہے،

ماتا پرشاد | صحیفۃ الشوق نام ایک فارسی افسانہ کا مصنف ہے اسکا قلمی نسخہ ۱۲۸۲ھ کا لکھا ہوا کتبخانہ آصفیہ مین ہے،

دین دیال | عجیب القصص معروف بہ شبستان عشرت ایک افسانہ فارسی زبان مین اس نے لکھا ہے ۱۲۹۷ھ مین یہ کتاب طبع ہوئی ہے،

امر سنگھ | رامائن امر پرکاش کے نام سے فارسی مین پاربتی، مہادیو، رام چندر جی اور راجہ دسرت کے تصون کو نظم کر گیا،

سیالکوٹی مل | انکا ذکر آگے آتا ہے، یہ زمانہ متاخر کا بہت بڑا ادیب تھا، صفات کائنات کے

نام سے فارسی علم بلاغت مین اسکی ایک کتاب ہے جو سنہ [illegible]ھ مین چھپ گئی ہے، اسکی دوسری کتاب رجم الشیاطین ہے جو سراج آرزو کی تنبیہ الغافلین کا جواب ہے، یہ دونون کتابین دلی مطابع سے شائع [illegible]

لچھمی نرائن باپ کا نام مانی رام، سراج الدین آرزو کا شاگرد تھا، لاہور اپنا وطن چھوڑ کر دلی مین آکر ڈیرے ڈالے، درانی کے حملون نے دلی سے نکال کر بریلی اور اورنگ آباد کی سیر کراتے ہوے لکھنؤ پہنچایا، یہ فارسی کا نامور انشا پرداز تھا، اسکے فارسی رقعے بہت مشہور ہین، سنہ [illegible]ھ مین اس نے ان رقعون کو ترتیب دیکر رقعات لچھمی نرائن نام رکھا،

لچھمی نرائن یہ حاجی پور (بہار) کا رہنے والا تھا، عالمگیر کے عہد مین شہزادہ بیدار بخت کی سرکار مین پیشکاری کے عہدہ پر تھا اور سہ صدی منصب رکھتا تھا، سنہ [illegible]ھ مین اس نے شاہنامہ کا انتخاب کیا اس انتخاب کے دیباچہ کا پہلا شعر یہ ہے،

شکر و سپاس و نعمت و منت خدای را   پروردگار خلق و خداوند کبریا

راجہ رام نرائن لچھمی نرائن کا بیٹا، عظیم آباد پٹنہ مین اس نے بڑا سیاسی عروج حاصل کیا تھا اور مدت تک اسکا خاندان معزز رہا، شیخ حزین کا شرف تلمذ اسکو حاصل تھا، خود صاحب ادب اور ادباے زمانہ کا مربی تھا نواب قاسم کی معرکہ آرائی کا نشانہ بنا، نہایت وسیع النظر اور کتب بینی کا شائق تھا،

کیول رام شاہ عالم کے عہد مین تھا اور راجا دوہ کے بیت الانشا مین منشی تھا، ۱۱۹۱ھ مین منشی کیول رام نے پچاس جز مین فن انشا پر ایک کتاب لکھی اور طلسمات خیال اسکا نام رکھا،

پنڈت کرپا دیال پنڈت جی کا جنم پتر معلوم نہین، مثنوی دلپسند کے مصنف ہین، بنگال ایشیاٹک سائٹی مین سنہ [illegible]ھ کا لکھا ہوا اسکا قلمی نسخہ موجود ہے،

منشی خیالی رام لکھنؤ وطن، خیالی تخلص، نظم و نثر فارسی کے استاد، واجد علی شاہ کے دربار سے تعلق تھا انکی تصنیفات کی تعداد ۱۰۰ سے زیادہ ہے، امیر خسرو کی سب سے مشکل کتاب اعجاز خسروی کی شرح لکھی،

منشی ابوالحسن | دلّی کے رہنے والے تھے، فارسی زبان کے استاد تھے، انشائے ابوالحسن انکا مجموعہ ہے جسمین بادشاہون، شہزادون اور امرا کے نام خطوط ہین، یہ پہلے نصاب فارسی مین داخل تھا،

ذیل کی سطرون مین چند منشیات کے نام نقل کرتے ہین جنکے مزید حالات سے واقفیت نہوئی،

کالی پرشاد | انشائے بے نقط کا مصنف،

منشی کالی رائے | انشائے تمیز کا مصنف، اس انشا مین ایک خاص صنعت بدیع (ترک حرف مسلسل الحروف) ہے،

دولت رام | کتاب کا نام انشائے دولت رام،

منشی جے سنگھ رائے | انشائے راحت جان کا مصنف ہے، اس کتاب مین سخاوت و عدالت وغیرہ مختلف عنوانات پر مضامین ہین،

ہر سہائے | انشائے ہر سہائے اسکی کتاب کا نام ہے، اسمین منشی گری کے قوانین نظم و نثر فارسی مین بیان ہوئے ہین،

منشی ہرنرائن | دہلی کے باشندہ تھے، خیالات نادر انکے فارسی رقعات کا مجموعہ ہے،

لالہ نرمل داس | دستور الصبیان کے نام سے فارسی مکتوبات کے جامع ہین،

لچھمی داس | بن نرائن داس، رقعات نظامیہ اسکا سرمایۂ کمال ہے، چھپ گئی ہے،

خوشحال رائے | دستور الامتیاز کے نام قوانین انشا کا مدون ہے، نسخہ موجودہ کتبخانۂ آصفیہ ۱۲۰۳ھ کا نقل کیا ہوا ہے،

سندرام | باپ کا نام سیوانند، قاموس الانشا اسکی تالیف ہے، موضوع کتاب نام سے ظاہر ہے، قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے،

رام سنگھ | گلشن عجائب الانشا مین اسکی کتاب ہے، نسخہ موجودہ آصفیہ ۱۲۲۳ھ کا چھپا ہوا ہے،

کشن جی پنڈت | شاید یہ دکنی ہون، انکی نادر الانشا قلمی آصفیہ مین ہے،

رنچھور داس | جونپور کا رہنے والا تھا، دقائق الانشا کا مولف ہے،

ہندو لغت نویس

کسی زبان کے جاننے کے صرف یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اس زبان کی عبارت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے اور انہیں لکھ پڑھ سکتا ہے، یہ تو نہایت ادنی درجہ ہے، اصلی زباندانی یہ ہے کہ وہ اہل زبان کی طرح اس زبان پر قابو رکھتا ہو، اور اسکے ذخیرۂ الفاظ کے ماخذ واشتقاق کا علم اور غلط وصحیح کی تمیز، اور خواص کے طرز ادائے ترکیب الفاظ، ادائے مطلب، اور محاورات پر اسکو دسترس ہو، ہندوستان میں جو ہندو ادبائے فارسی گذرے ہیں غور کرنا چاہیے کہ کیا انکی واقفیت زبان، ہماری آجکل کی بیرونی زبان کی واقفیت کے معیار سے کچھ بلند تر تھی یا نہیں،

اکبر کے زمانہ تک فارسی زبان کے چھوٹے بڑے ۴۴ سے زیادہ لغت موجود تھے، لیکن یہ تمامتر فارس اور اہل زبان کے لکھے ہوئے تھے، جو اہل ہند کی ضروریات کے مطابق نہ تھے، بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنکو ایک صاحب زبان لغت نویس مشکل اور قابل حل نہیں سمجھتا، حالانکہ غیر زباندان کے نزدیک وہ سخت مشکل اور قابل حل ہیں، لغات سے زیادہ محاورات کا معاملہ سخت ہے، اہل زبان انکے ایک ایک نکتہ کو سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ تمام دنیا انکو اسی طرح سمجھ لیگی، حالانکہ دوسری قوموں کو جنکی وہ زبان نہیں یہی مرحلہ دشوار نظر آتا ہے، الغرض یہی اسباب تھے کہ جنکی بنا پر ہندو ادبائے فارسی کو فارسی زبان کے لغات لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی،

ٹیک چند بہار | قوم کا کھتری، سراج الدین علیخان آرزو اکبرآبادی کے ارشد تلامذہ میں تھا، فارسی زبان کی گو وہ ہندی تھا، کامل عبور تھا، اہل زبان کی مدت تک صحبتیں اٹھائی تھیں، اس نے فارسی زبان کے کئی لغت لکھے ہیں، بہار عجم، نوادر المصادر، جواہر الحروف، زیادہ مشہور بہار عجم ہے، اسکے مقدمہ میں وہ لکھتا ہے کہ بدو طفولیت سے ۳۰ سال کی عمر تک فارسی زبان کی تحقیق وکاوش میں بسر ہوا، ۲۰ برس تک مسلسل اس نے اس لغت کی تالیف وترتیب میں بسر کیے، اور سات دفعہ خود اپنے ہاتھ سے مسودہ کاٹ چھانٹ کر

صاف کیا، یہ عمر کی آخری کمائی تھی، اور اسی پر جان دی، بہار کے شاگرد منشی آنند رام نے آٹھ برس دفعہ
مرتب کیا، اور خطبہ اور خاتمہ لکھکر شاہ عالم کے زمانہ میں ۱۱۵۲ھ میں ختم کیا، بہار عجم بہت مقبول ہوئی کہ تمام
ارباب علم میں متداول ہو گئی، اور لوگ اسکی سندیں پیش کرتے ہیں، ہر فارسی دان اُسکے نام سے واقف ہے،
محاورہ کے لئے اس نے اہل زبان کے شعر سند میں پیش کئے ہیں،

سیالکوٹی مل وارستہ | نام سے زیادہ یہ اپنے تخلص کے ساتھ مشہور ہے، شیخ حزین پر سراج آرزو نے
جو اعتراضات کئے تھے اسکے جواب میں رجم الشیاطین اُس نے لکھی تھی، سمجھ لو کہ اہل زبان اور اساتذہ
فن کے مناظرات اور ردوکد میں جو صاحب نظر حکم آزمانہ اور خصوصاً مدافعانہ حصہ لے وہ کس درجہ اس
زبان پر عبور کامل اور وقوف تام رکھتا ہوگا، وارستہ نے اسی فارسی زبان کے عشق میں ایران تک کی
خاک چھانی، اور کامل ۳۰ برس اس ملک میں بسر کئے، اس سفر کے نتائج علمی مصطلحات الشعراء اور
صفات کائنات ہیں، مصطلحات الشعراء گو صرف ۴۰۰ صفحہ کی ضخامت کا لغت ہے، لیکن پندرہ برس کی
محنتوں کا صلہ ہے، وارستہ دیباچہ میں لکھتا ہے،

اکثر محاورات فرہنگ فارسی زبانان در شمار فصاحت بار دیدم بہ تحقیق آن کمر سعی محکم بربستم
ہر چند گرد کتب لغات گردیدم نقد حل معانی بعضے از آن نفہمیدم ناچار رجوع بزبان دانان ایران دیار
آوردم و پانزدہ سال درین تلاش بسر بردم، آنچہ از زبان آن جماعت شنیدم برسم انتفاع
جمہور سخن پردازان خاطر در حیز کتابت آوردم،

پنڈت ہرگوپال | حال نہیں معلوم، اُس نے فرہنگ شیر وشکر کے نام سے عربی و فارسی الفاظ کا لغت لکھا ہے

کاشی ناتھ کھتری | لغت پنجابی کے نام سے فارسی زبان میں لغت لکھا ہے اسکا قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں ہے

گردھاری لال | دکن کا باشندہ، ۱۲۳۱ھ میں گنج اللغات فارسی لکھی، قلمی نسخہ آصفیہ میں ہے،

فرہنگ آنند راج | اس فرہنگ کا ذکر اس سلسلہ میں مناسب نہ تھا کہ وہ تو ایک مسلمان کی تصنیف ہے اور

ثانیاً اسلئے کہ مسلمانون کے عہد حکومت کے بعد لکھی گئی ہے، لیکن صرف اسلئے اسکا تذکرہ مقصود ہے کہ اس سے
دوسرے احسان کا موقع پیدا ہو، فرہنگ آنندراج چالیس پچاس برس ہوئے کہ مدراس کے ایک ہندو راجہ
آنندرام کی فرمائش سے ترتیب پائی، یہ فارسی زبان کا سب سے ضخیم اور مطول لغت ہے جو کئی جلدون مین بعد
چند ہزار بڑی تقطیع کے صفحات مین تمام ہوئی ہے، اسمین صرف خالص فارسی الفاظ نہین ہین جیسا کہ دیگر
لغت نویسون نے کیا ہے بلکہ ان عربی الفاظ کو بھی لیلیا ہے جو فارسی مین مستعمل ہین مصنف کے مقدمہ سے
معلوم ہوتا ہے کہ راجہ نے اسپر ہزارون روپے صرف کئے ہین، اسکے لئے دور دور سے کتابین منگوائین
کتبخانہ ترتیب دیا، مصنف کا وظیفہ مقرر کیا اور خود چھپوا کر شایع کیا،

اس موقع پر ایک نکتہ کی بات ہم کہنا چاہتے ہین، اگرچہ ہندوستانیون نے انگریزی پڑھکر مرہٹی
بنگالی اور اردو مین انگریزی ڈکشنریان آج بھی لکھی ہین لیکن درحقیقت انھون نے اسمین صرف مترجمی کی
خدمت انجام دی ہے یعنی کسی مستند انگریزی ڈکشنری کو سامنے رکھکر اسکے مقابل کے معنی اپنی زبان مین لکھکر
خانہ پری کردی ہے، لیکن جو خدمت ٹیک چند بہار اور وارستہ نے اپنے زمانہ کی سرکاری زبان کی
ادا کی اور مثل ایک اہل زبان کے بذات خاص تحقیق و کاوش سے شعراء کے کلام پڑھکر، ایرانیون کی
صحبتین اٹھاکر خود اہل زبان سے مطارحات اور چھیڑ چھاڑ کرکے انجام دی اسکی نظیر اب تک تو پرانے
"منشی" کے نوجوان "مسٹر" نہ دکھا سکے،

منشی کاشی پرشاد | نادان تخلص، وطن دکن ہوگا، انھون نے فارسی قواعد کی کتاب "ہفت گل" لکھی،
آصفیہ مین اسکا نسخہ ہے،

میند و لال | زار تخلص، بہار علوم کے نام سے فارسی قواعد کی کتاب تصنیف کی، قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے

مترجمین

دو مختلف قومون کے متضاد عناصر کو متحد کرنیکے لئے بہترین کیمیا دی مسالہ دونون قومون کے

لٹریچر کو ختم کر دیتا ہے، ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے صبح امید کے پہلے نمبر میں اس مقصد پر زور دیا ہے، ہم کہتے ہیں کہ ہاں اس جدید زمانہ میں سرنو کوشش کی ضرورت ہے، لیکن پہلے عہد کے بزرگوں نے اپنے دور عمل میں اس خیال کو پیش نظر رکھا اور کامیابی ہوئی، اس وقت یہ سلسلہ مضمون یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے کیا کیا، بلکہ یہ ہے کہ اس عہد کے ہندوؤں نے کیا کیا،

اس خیال کی اصلی کامیابی ملک کے مترجم طبقہ کے ہاتھ میں ہے، جو ایک قوم کے خیالات کو دوسری قوم کے سامنے پیش کرتا رہے، اور بتاتا رہے کہ ان دونوں میں کچھ بیر نہیں، بلکہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں، اگرچہ ترجمہ کا سلسلہ مسلمانوں کے آغاز عہد سے قائم تھا لیکن وہ صرف علمی ذوق کا نتیجہ تھا قوموں کی باہمی بیگانگی اور اجنبیت کا دور کرنا اسکا مقصد نہ تھا،

اکبری عہد میں حکومت کی خواہش کے مطابق مسلمان علما اور ہندو پنڈتوں نے ملکر رامائن، مہابھارت، سنگھاسن بتیسی، لیلاوتی، نل دمن، تاجک، ہری بنس، اتھرون وید وغیرہ کتابوں کا ترجمہ کیا، وہ پنڈت جو ان میں سے بعض کتابوں کے ترجمہ میں شریک غالب رہے، یہ تھے، گنگادھر، مہیش، مہانند، کشن جوشی، بہاون، افسوس ہے کہ ان ناموروں کے حالات نہیں معلوم،

اب وہ زمانہ بھی آیا جبکہ بادشاہوں کی خوشی کے لئے نہیں بلکہ اپنی خوشی کے لئے فارسی دان ہندو پنڈتوں نے اس کام کو از خود انجام دینا شروع کیا،

گردھرداس | قوم کا یستھ، متوطن دہلی، شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں تھا، ۱۰۳۶ھ میں اس نے رامائن کا ترجمہ فارسی نظم میں کیا، یہ کتاب برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے،

بنوالی داس | ولی تخلص، شہزادہ داراشکوہ کا میر منشی، (چیف سکریٹری) تھا، ۱۰۶۳ھ میں اس نے بھاکا کے پربودھ چندرودیا نام ایک افسانہ کا فارسی میں ترجمہ کیا،

چترت بھی نرائن | انھوں نے شنکر اچاری کی پوتھی اپدیش کہانوتی کا ترجمہ حدائق المعرفت کے نام سے فارسی میں کیا

منشی لچھمن داس | جہان ظفر کے نام سے رامائن کا فارسی زبان مین ترجمہ کیا،

امر سنگھ | رامائن امر پرکاش کے نام سے پاربتی، مہادیو، رامچند، راجہ دسرت کے حالات نظم فارسی کو ثنا ہے،

پنڈت امر ملتفت | شیدا تخلص، چارو ویدون کے مطابق دنیا کے جو احوال تھے وہ فارسی مین خیالات شیدا کے نام سے بیان کر گئے، یہ کتابین کتبخانہ آصفیہ مین مین،

رام پرشاد | اودھ کا باشندہ تھا، نواب ناظم محمد ارباب خان کا خزانچی تھا، اس نے سنہ ۱۲۲۶ھ مین نواب مذکور کی فرمائش سے امت چرتر کا فارسی نظم مین ترجمہ کیا، اور مخزن العرفان اسکا نام رکھا،

گوپال | خلف سری گوبند، اس نے سری بھاگوت دادھیا تم رامائن کا ترجمہ فارسی مین کیا سنہ ۱۱۹۱ھ کا لکھا ہوا نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین ہے،

اسند لچھمن گوشائین | مخلص بہ خوش اس نے پوتھی کاشی کھنڈ اس کو فارسی زبان مین منتقل کیا، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین جو نسخہ ہے وہ سنہ ۱۲۰۹ھ کا لکھا ہوا ہے،

اسند کنوار | حالات نہین معلوم، پوتھی مہرجہ دہرم گیان ساگر کا قلمی نسخہ جو اس نے فارسی مین ترجمہ کیا تھا، سوسائٹی مذکور کے کتبخانہ مین ہے،

زور آور سنگھ | اس نے پوتھی بہادار نہہ کو فارسی زبان مین منتقل کیا،

برلی دہر | پوتھی سری بھاگوت کا فارسی مین مترجم قلمی نسخہ سوسائٹی مین ہے،

مادھو پت سنگھ | اہل تاریخ کے سلسلہ مین اسکا حال گذر چکا ہے، مہاراجہ جگت سنگھ والی اودے پور کی سرکار مین نوکری کے زمانہ مین اس نے ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا، بادۂ شیراز کو سفال ہندی مین بھر کر ملک کے سامنے پیش کیا یعنی دیوان حافظ کا ہندی زبان مین ترجمہ کیا،

---

(۷)

ہندو علماے علوم عقلیہ

علوم عقلیہ سے میری مراد طبعیات، الٰہیات، ریاضی، ہیئت، طب وغیرہ جملہ علوم حکمت ہین اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ ہندوستان بھی ان ممالک مین سے ایک ہے جسکو علوم عقلیہ کا جنم بھوم کہنا چاہیئے، یہ بحث دوسری ہے کہ یہ علوم براہ راست یہین پیدا ہوے جیسا کہ اہل ہند کا دعوی ہے یا سکندر کے بعد یونانیون کے ذریعہ سے یہ علوم یہان منتقل ہوئے جیسا کہ اہل یورپ کا بیان ہے بااینہمہ یہ ماننا پڑیگا کہ اہل ہند نے ان علوم مین کافی دستگاہ حاصل کر لی تھی، اور ریاضیات وہیئت مین ایک حد تک وہ استادی کے رتبہ کو پہنچ گئے تھے،

ہندوون کے دماغ کو ریاضیات سے ہمیشہ ایک خاص مناسبت رہی ہے مسلمانون کے عہد حکومت مین علوم عقلی کے جو ہندو نامور یہان پیدا ہوے، ان مین مہندسین اور علماے ریاضیات کی تعداد زیادہ ہے،

بیرونی کے ذریعہ سے جن برہمنون نے عربون کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا تھا افسوس کہ انکے حالات ہمکو نہین معلوم، اور نیز بعد کی صدیون مین جن ہندو بزرگون نے ادہر توجہ کی انکے نام سے بھی ہم واقف نہین، تاہم اتنا معلوم ہے کہ سنسکرت مین عربون کی تحقیقات عقلی کی کافی آمیزش موجود ہے، چنانچہ تمدن ہند کا فرنچ مصنف شہادت دیتا ہے کہ گیارہوین صدی عیسوی کے

بعدسے کہنا چاہیے کہ ہندی علوم سے مراد عربی علوم ہین، پس ہم کہہ سکتے ہین کہ ہندی علوم جنکی ابتدا پانچوین صدی عیسوی مین آریہ بھٹ کے ریاضیات سے ہوئی، اور پھر ساتوین صدی مین برہم گپت نے ان پر اضافہ کیا، اس زمانہ سے لیکر آج تک انہین مسائل سے بحث کرتے ہین جو ہند مین (یونانی اور مسلمان) ان دو ذریعون سے آئے"۔

عہد اکبری کے ہندو علماے معقولات | ابوالفضل تنہا مورخ ہے جس نے اپنے بادشاہ کے عہد کے جزئی سے جزئی واقعہ کو قلم انداز نہین کیا، آئین مین دانش آموزان دولت کے عنوان سے ہر فن کے ۱۴۲ علما کے نام لکھے ہین، اس کاغذی دربار مین بلاتفریق ہندو اور مسلمان دونون قومون کے اکابر علم اور اساطین فلسفہ دوش بدوش بٹھائے گئے ہین، شناسائے عقلی کلام کے عنوان مین ابوالفضل نے اپنے زمانہ کے حسب ذیل اشخاص کے نام لکھے ہین، نارائن، مادھو بھٹ، سری بھٹ، بشن ناتھ، رام کشن، بلبھدر مصر، باسدیو مصر، باہن بھٹ، بدیا نواس، گوری ناتھ، گوپی ناتھ، کشن پنڈت، بھٹاچارج، بھاگیرت، کاشی ناتھ بھٹاچارج،

جن ہندو پنڈتون نے مرزا الغ بیگ کی زیچ جدید جو مسلمان علماے ہیئت کی تحقیقات اعلیٰ کا مجموعہ ہے، مسلمان علما کی زیرنگرانی فارسی سے ہندی مین ترجمہ کیا تھا، انکے نام یہ ہین، کشن جوتشی گنگا دھر، مہیس، مہانند،[۵]

جے سنگھ کے رصدخانے | مسلمان سلاطین نے دنیا کے ہر گوشہ مین جہان انکے تمدن نے فروغ پایا، تحقیقات فلکیہ کی تکمیل کے لئے رصدخانے قائم کئے، سنہ ۱۹۰۹ء کے الندوہ مین مین نے متعدد نمبرون مین ان رصدخانون کے حالات و تحقیقات کی تفصیل لکھی ہے، اسوقت سلسلۂ سخن کے طور پر یہ کہنا ہے کہ ہندوستان مین متعدد مسلمان سلاطین نے رصدخانے قائم کرنا چاہے،

---

[۵] آئین اکبری، آئین تصویرخانہ،

فیروز شاہ بہمنی، اور شاہجہان نے کام کو شروع کرایا لیکن مختلف وجوہ سے ناتمام چھوڑنا پڑا، یہ ہم درحقیقت محمد شاہ کے عہد حکومت کے لئے اُٹھ رہی تھی،

راجہ جی سنگھ سوائی کچھواہا، امبیر کا راجہ تھا، اورنگ زیب عالمگیر اور اسکے جانشینوں کے ایام سلطنت مین ایک فوجی افسر کی حیثیت سے نمایان عزت حاصل کی، محمد شاہ کے عہد مین وہ آگرہ اور مالوہ کا گورنر مقرر ہوا، اس نے اپنی ریاست کا نیا مرکز جے پور کے نام سے آباد کیا اور اب اسی نام سے یہ ریاست معروف ہے، جی سنگھ ایک نہایت علم دوست اور عالم راجہ تھا، عربی علوم و فنون مین وہ اچھی دستگاہ رکھتا تھا اور علم ہیئت سے اسکو ایک خاص ذوق تھا۔

راجہ جی سنگھ نے الغ بیگ کی زیج جدید، ملا چاند اکبری کی تسہیلات، اور ملا فرید شاہجہانی کی زیج شاہجہانی کے اصول پر زیج محمد شاہی ترتیب دی، اور بادشاہ کے حضور مین پیش کی، یہ وہ زمانہ تھا جب اہل یورپ کے فضل و کمال کی طرف اہل ہند کی نگاہین اٹھ رہی تھین، بادشاہ کے حکم سے مسلمان، برہمن، اور فرنگی علماے ہیئت جمع کئے گئے، اور دلی مین ایک جدید رصدخانہ کی تعمیر کا کام ۱۱۳۷ھ مین شروع ہوا، مرزا امیر اللہ مہندس اس کے مہتمم تھے، اس رصدخانہ مین بعض آلات ایسے تھے جو سمرقند کے الغ بیگی رصدخانہ مین استعمال پا چکے تھے، اور بعض بالکل نئے تھے اور خود راجہ کے ایجاد کردہ تھے،

راجہ نے اس غرض سے تاکہ رصدخانہ کی تمام تحقیقات پوری اترین اور انکی تصدیق ہوتی جائے رصدخانہ دہلی کے نمونہ پر جے پور، متھرا، بنارس، اور اُجین مین بھی رصدخانے بنواے، دلی اور بنارس کے رصدخانون کی ٹوٹی پھوٹی یادگارین تو اب تک باقی ہین، اور مین نے دیکھی ہین، باقی شہرون کا حال نہین معلوم،

بہرحال ان رصدخانون مین ہندو، مسلمان، اور فرنگی علماے ہیئت نے سات برس تک

کام کیا اور اسکے بعد کچھ لوگ پادری مینویل کی ماتحتی مین یورپ بھیجے گئے، وہان سے یہ علمی جماعت
جو معلومات لیکر آئی انکا اپنے اصول کے مطابق بیان مقابلہ کیا گیا، یہ مشرق کا پہلا رصدخانہ ہے
جس نے مغربی تحقیقات کی موافقت کی، اس رصدخانہ کی تحقیقات نکلی سے زیچ محمد شاہی تیار کیگئی
جو تین مقالات پر مشتمل ہے، اول در معرفت سنین، دوم در معرفت طالع ہر وقت، سوم در معرفت
رفتار سیارات و ثوابت[1]،

راجہ نے اس راہ مین ایک اور اہم خدمت انجام دی مغربی زبان کی مستند علم ہیئت کی
کتابون کا ہندی مین ترجمہ کرایا، اور اسپر ہزارون روپئے صرف کئے[2]،

بہار خان رائی نگاری | اعتصام الدولہ بہادر الملک راجہ خان بہادر نصرت جنگ، ہمارے اس عہد کے
ہندو دوست سمجھتے ہونگے کہ یہ کسی مسلمان امیر کا نام ہوگا، لیکن انکو سننا چاہیئے کہ یہ مہاراجہ ستر جیت سنگھ
راجہ ٹکاری (صوبہ بہار) کے فرزند ارجمند کا نام ہے، یہ راجہ خود سے ۳۰ برس پہلے تھا، راجہ مذکور
تمام علوم و فنون عربی و فارسی مین ماہر تھا، اسکا دربار مسلمان اور ہندو فضلاے عہد سے معمور رہتا تھا
اس زمانہ مین مولانا غلام حسین جونپوری ایک نامور ریاضی دان تھے، وہ بھی اس راجہ کے
دامن دولت سے وابستہ تھے، مولانا راجہ کے فضل وکمال کا ذکر ان الفاظ مین فرماتے ہین،

"چنانچہ فنی از فنون متداولہ و علمی از علوم متداولہ مسطور نشدہ اگر در ذات شریف آن
یگانہ جمع نیامدہ باشد،

راجہ نے ایک دن اپنی بزم علم مین تذکرہ کیا کہ روز بروز علم کا فقدان ہو رہا ہے، اور
اسکے متعدد وجوہ ہین جنمین سے ایک یہ ہے کہ علوم و فنون کی زیادہ تر کتابین عربی زبان مین
ہین جن سے فارسی خوان فائدہ نہین اٹھا سکتے، اسلئے مناسب ہے کہ فارسی مین ایک ایسی

[1] مقدمہ زیج محمد شاہی [2] سبحۃ المرجان آزاد بلگرامی،

جامع کتاب لکھی جاے جو ہر قسم کے اصول وفروع پر مشتمل ہو، تین سو برس ہوے کہ علامۂ عبدالعلی برجندی کے زمانہ سے اسوقت تک کوئی ایسی کتاب نہین لکھی گئی، اس تقریر کے بعد راجہ نے مولانا غلام حسین کو حکم دیا کہ اس مجوزہ تصنیف کا کام شروع کرین،

مولانا ے موصوف نے جامع بہادر خانی کے نام سے ایک ایسی کمل اور جامع کتاب ریاضیات پر فارسی مین لکھی جس سے زیادہ کمل اور جامع کتاب شاید عربی مین بھی نہوگی اسکو علوم ریاضیہ کی انسایکلو پیڈیا کہنا زیادہ موزون ہوگا، علم ہندسہ، علم الابصار، علم المناظر، علم حساب، جبر ومقابلہ، جومیٹری، علم ہیئت، علم آلات رصد وقواعد رصد وغیرہ اصولی ابواب کے تحت مین بیسیون فروعی مباحث اور فصول ہین، پوری کتاب بنی اور چوڑی تقطیع کے ۶۱۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اور ہر صفحہ مین ۲۵ لمبی اور باریک سطرین ہین ۱۲۴۹ھ میں شروع ہوئی اور ۱۲۵۰ھ مین تمام ہوئی، اکبر ثانی کا یہ زمانہ تھا، کتاب مین جہان کہین ستارون کے طلوع وغروب کا وقت دیا گیا ہے، قلعہ نکاری کے مطالع ومغارب کے حساب سے دیا ہے، مصنف جا بجا قدیم تحقیقات کو یورپ کے جدید معلومات سے موازنہ بھی کرتا گیا ہے،

راجہ رتن سنگھ زخمی

قوم کا بیتھ سکسینہ، ۱۱۹۷ھ مین لکھنؤ مین پیدا ہوا، اسکا خاندان تین پشتون سے دربار اودھ کے معزز عہدون پر ممتاز چلا آتا تھا، لکھنؤ کی درسگاہون کے آغوش مین اس کے فضل وکمال نے نشو ونما پایا، عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، اور کسی قدر انگریزی زبان سے واقفیت تھی، علم ہیئت مین اسکو استادی کا رتبہ حاصل تھا، فارسی شعر وسخن سے بھی ذوق رکھتا تھا کچھ دنون ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کی، اسکے بعد اودھ مین اپنے خاندانی عہدہ پر ممتاز ہوا محمد علی شاہ کے زمانہ مین دیوان شاہی مقرر ہوا، اور فخر الدولہ دبیر الملک ہوشیار جنگ کے خطاب سے مخاطب ہوا،

سنہ [illegible] مین محمد علی شاہ کے حکم سے ہیئت مین حدائق النجوم نام ایک جامع کتاب فارسی زبان مین لکھی جو ۴ جز مین جاکر ختم ہوئی ہے جدید مغربی تحقیقات کو پہلے پہل عربی مین اس نے پیوند دیا ہے، یہ کتاب اپنے باب مین نہایت مستند اور معرکۃ الآرا سمجھی جاتی ہے اور اب علماے اسلام مین ہیئت کی اعلی کتابون مین اسکا شمار ہوتا ہے،

مدن پال نراین سنہ [illegible] مین وفات پائی، علم ہندسہ مین شش جہات نام ایک کتاب لکھی جو ارباب فن مین نہایت وقیع خیال کیجاتی ہے، قلمی نسخہ موجود ہے،

اندرمن منشی نیکچند بہار کا شاگرد تھا، اصل وطن حصار تھا، لیکن توطن شاہجہان آباد مین اختیار کر لیا تھا، بہار عجم کو اسی نے آخر مین مرتب کیا تھا، ریاضیات مین اسکو ید طولی حاصل تھا، عربی وفارسی کا عالم تھا، سنہ [illegible] مین دستور الحساب نام کتاب، علم الحساب (میتھمیٹکس) مین تالیف کی، کتبخانۂ بانکی پور مین اسکا قلمی نسخہ ہے، کتاب ۷ اجزا مین تمام ہوئی ہے،

بیدنی مل قوم کایستھ، اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت مین تھا، علوم عقلیہ کا واقف کار تھا، سنہ [illegible] مین بدائع الفنون کے نام سے ریاضیات مین ایک عمدہ کتاب لکھی، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اور کتبخانۂ آصفیہ مین اسکے قلمی نسخے موجود ہین،

رام پرشاد عظیم آباد پٹنہ وطن تھا، علم ہندسہ مین مفتاح الناظرین اسکی تالیف ہے، سنہ [illegible] مین اسکی یہ کتاب کلکتہ مین چھپی تھی،

دیوان کانجی یہ بھی عظیم آباد پٹنہ کے باشندے تھے، ریاضیات وہندسہ مین خزانۃ العلم انکی کتاب ہے، سنہ [illegible] مین یہ کتاب کلکتہ کے چھاپہ خانہ مین طبع ہوئی تھی،

ماسٹر من لال فلسفی علوم حکمت اور فلسفہ مین ممتاز ومعروف تھے، شاعر بھی تھے، فلسفی سمجھے اور فلسفی بننے کے مدعی تھے، اسلئے فلسفی تخلص کرتے تھے، انکے بیٹے کندن لال نے اپنی

تصنیف مین اپنے خاندان کا حال لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا علم وکمال کا مطلع تھا
شاہجہان کے زمانہ سے اس خاندان مین علم و دولت ساتھ ساتھ تھا، سندیلہ کے برہمن تھے،
راے سون لال کی نسبت لکھا ہے،

"پدر فقیر راے سون لال متخلص کہ در علوم یکیہ یادگار رفقاے سلف بودند و صاحب تصانیف گشتہ"

راے سون لال پہلے نواب فیض اللہ خان کی سرکار مین تھے، اسکے بعد نواب آصف الدولہ کے
دربار مین گئے، اور یہان سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی مین آئے، اور غالبًا یہین کسیقدر انگریزی
حاصل کی، ۱۲۳۱ھ مین وفات پائی، اور گیارہ کتابین مختلف علوم وفنون مین اپنی یادگار چھوڑین
گلستان ارم، بوستان حیرت، شارستان نور، دیوان اشعار، تنقیح الاخبار، جغرافیہ، یہ کتابین
ادب وتاریخ مین ہین، خالص فلسفہ کی تصنیفات حسب ذیل ہین، سدید الاستخراج، کتاب احکام
عجائب در علم حساب، ہیئت، حکمت انگریزی، مفردات طب،

کندن لال اشکی | یہ اسی نامور باپ کا فرزند تھا، باپ اور چچا کے زیر عاطفت عربی اور فارسی علوم
کی تحصیل کی، ۲۲ سال کی عمر تک بریلی، رامپور، دہلی اور بنارس کی درسگاہون مین عمر گذاری
سنسکرت مین سری کب اندر جہا کے شاگرد تھے، کچھ سال ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت مین بسر کئے
اور آخر نواب منتظم الدولہ ناظم الملک مہدی علیخان کی وساطت سے محمد علی شاہ اودھ کے دربار
مین پہنچے، چارصدی منصب پایا، دفتر انشا مین کسی عہدہ پر ممتاز ہوے، منتظم الدولہ کی وفات کے
بعد خدمت سلطانی سے مستعفی ہوکر بنارس مین گوشہ نشینی اختیار کی،

کندن لال عربی اور نیز اسلامی علوم مین استادی کا درجہ رکھتے تھے۔ حدیث وفقہ پر بھی
اُنکی نظر تھی، فلسفہ اور ریاضیات سے اُنکو خاص ذوق تھا، ہیئت مین اُنھون نے زیج اشکی
ترتیب دی، فلسفہ مین حکمت ہندیہ، اکسیر سعادت، اور قسطاس تین کتابین فارسی زبان مین

لکھین، اخیر کتاب درحقیقت تمام علوم وفنون کی انسائیکلوپیڈیا ہے، کندن لال سنے اُسکو چار حصون پر منقسم کیا ہے، پہلے حصہ مین ہندوؤن کا فلسفہ ہے، دوسرے مین یونانیون کا، تیسرے مین عربون کے علوم، اور چوتھے مین یورپ کا جدید سائنس، کہین سے یہ نہین معلوم ہوتا کہ وہ کسی علم وفن سے بیگانہ ہے، کتاب ۱۳۲۵ھ مین مطبع محمدیہ لکھنؤ مین چھپی،

انتظاماتِ مالی

اس فن پر ہندو مصنفین کی تین کتابین ملی ہین جنکا ذکر بہ ترتیب آتا ہے، اس فن پر انکی توجہ اسلئے مبذول ہوئی کہ زیادہ تر یہ عہدے انہین کے زیر اقتدار رہتے تھے،

چھتر مل ولد رائے پران چند، اس نے اس فن مین ایک نادر کتاب یادگار چھوڑی ہے جسکا نام دیوان پسند ہے، دیوان زراعت، محاصل زراعت کے اعلیٰ عہدہ دار کو کہتے تھے، دیوان پسند یعنی وہ کتاب جو ہر دیوان کے لئے اسکے ادائے فرائض مین معین ہے، مصنف نے باب کے لئے اسمین دستور کا لفظ پسند کیا ہے، دیوان پسند چار دستورون پر منقسم ہے (۱) در بیان درستی زمین ہائے کاشتکاری وتعین جمع سرکار ودیگر حساب در پیداواری اجناس (۲) سیاق شمار در جمیع انتظام مہمات (۳) مزروعہ در بعض دست (۴) مالی وملکی آدینات معاملہ،

دیباچہ مین مصنف اپنی معاملہ فہمی اور انتظامی مہارت پر بے انتہا فخر کرتا ہے، زمانہ نہین معلوم، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین اسکی یہ تصنیف ۱۲۲۵ھ کی لکھی ہوئی ہے،

جگپت رائے حالات وزمانہ وجود نہین معلوم سیاق یعنی کاغذات وحسابات مالی کے قواعد ترتیب مین سیاق فارسی اسکی تصنیف ہے،

متامل مجموعۂ سیاق (فارسی) کا مصنف، یہ دونون رسالے قلمی کتبخانہ آصفیہ مین ہین،

نندرام سیاق نامہ (فارسی) کا مصنف، کتبخانہ آصفیہ مین ۱۲۷۹ء کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے،

نجوم

بیربل	یہ نہین معلوم کہ یہ کون بیربل ہے، رسالۂ نجوم فارسی مین اسکی تصنیف ہے،
وشنوت ماے	ولد بھوپت راے، خاص النجوم کا مصنف،
سد اسکہ کرل	باپ کا نام کیول رام کرل، کاشف الدقائق، نجوم مین اُسکی تصنیف ہے،
جواہر سنگھ	جواہر افلاک، جواہر ادراک کا مصنف،

یہ تمام قلمی رسالے کتبخانۂ آصفیہ مین ہین،

طب

ہندوؤن کے ہان مسلمانون کی آمد سے پہلے طب مین دو کتابین مشہور ہیتین، چرکا اور ششرت کی کتابین، مسلمانون کا علم طب عرب، یونان، ایران اور ہندوستان کے تجربات کا خلاصہ تھا اور خود انھون نے بہت کچھ اُسپر اضافہ کیا تھا، اِسلئے یہ نیا علم طب ہندوستان کے قدیم طب پر امتیاز خاص رکہتا تھا، ہندوستان کے علم طب مین مسلمانون کی آمد کے بعد جو ترقیان رُونما ہوئین وہ حسب ذیل ہین،

(۱) حاکم قوم اپنے علوم وفنون کو محکوم قوم کے علوم وفنون سے بہت بالا دست سمجھتی ہے، اور اس سے استغنا برتتی ہے، چنانچہ اسی علم طب کے متعلق دیکھئے کہ گذشتہ کونسل مین جب بعض ممبرون نے دیسی طب کی سرکاری حمایت اور اُسکو مستند تسلیم کرنیکا رزولیوشن پیش کیا تو نا اتفاقی کے ساتھ رد کر دیا گیا، لیکن مسلمانون نے اپنے عہد حکومت مین ایسا نہین کیا، ہندی علم طب کی بیسیون کتابین اُنھون نے اپنی زبان مین منتقل کین اور اپنا علم طب ہندوستان مین پھیلایا، خاص اہل ہند کے مزاج اور طبیعت کا خیال کرکے خود اُنہین کے علم طب کو فارسی مین منتقل کیا اور شاہی حیثیت سے اسکو مستند قرار دیا، سلطان سکندر لودی سے خواص خان ایک

درباری اہیرنے عرض کی کہ جہان پناہ! یونانی طب ہندوستان کی آب وہوا کے مناسب نہیں۔ حکم ہوا کہ سنسکرت سے ہندی طب کو فارسی مین منتقل کیا جاے، چنانچہ میان بہوہ بن خواص نے اس کام کو انجام دیا اور کتاب کا نام معدن الشفا سکندرشاہی رکھا، قاسم فرشتہ نے اکبری عہد سے پہلے اختیارات قاسمی کے نام سے ہندی علم طب کو زندہ کیا، ہندوستان مین اسوقت فارسی مین جو علم طب ہے اور خصوصاً خاندانی اطبار کے سفینون مین اور مجربات نامون مین سیکڑون نسخے اور دوائین ہندوستان زا ہین، اسی طریقہ سے بیدون نے مسلمانون کے سیکڑون نسخے، دوائین اور اصول علاج اپنے ہان لے لئے، اور اس طرح مل ملا کر ایک ایسا طرز علاج رائج ہوا جو ہندوستان کے حالات کے مطابق تہا،

(۲) پہلے بیدون مین وہ دوائین متداول ہتین جو ہندوستان مین پیدا ہوتی ہتین، طب اسلامی نے تمام دنیا کے ملکون مین جو دوائین اور جڑی بوٹیان زیر تجربہ آچکی ہتین انکو ہندوستان مین رواج دیا، انکے فواید ومنافع لوگون نے سیکھے، مفردات کے ذخیرہ کو بیحد بڑہا دیا،

(۳) دواؤن کی ترکیب مین عرق، معجون، اقبرو طلی، سفوف وغیرہ مختلف طریقون کو پہیلایا،

(۴) چیچک وغیرہ متعدد بیماریان جنکو بیان وہم پرستی سے دیوتاؤن، دیبیون اور بہوت پریت کا اثر سمجہا جاتا تہا اور اسلئے انکا طبی علاج نہین کیا جاتا تہا، انکو واقعی علاج بتایا، چیچک کی بیماری پر سب سے پہلی کتاب عربون ہی نے لکہی،



طب اور دیگر علوم متفرقہ

یہ سلسلہ اسقدر پھیلا کہ ارباب بزم گو زبان سے تو نہین کہتے لیکن تیور سے پہچانتا ہون کہ وہ گھبرا اُٹھے ہونگے لیکن بات یہ ہے کہ

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

اب اسکے بعد تکلیف نہ دیجائیگی،

پچھلی داستان مین ہم طب تک پہنچے تھے، اب ہماری کہانی کا سلسلہ آگے چلتا ہے اور عہد اسلامی کے بعض ہندو طبیبون کا حال سناتے ہین۔

دربار شاہی مین مسلمان اطبا کے ساتھ ہندو طبیبون کا رہنا بھی ضروری تھا، چنانچہ ہندو علما کے مختلف طبقون مین سے سب سے پہلا طبقہ جو شاہان اسلام کی جانب پہلے رجوع ہوا وہ بھی ہندو طبیب تھے، ہندو اطبا مین سے زمانۂ اسلام مین سب سے پہلے ہم جسکو جانتے ہین وہ سری بھٹ ہے،

سری بھٹ یہ حکیم سلطان زین العابدین (۸۴۴ھ) والی کشمیر کے دربار مین تھا، بادشاہ نے اسکی خود تربیت کی تھی، فرشتہ مین ہے،

لہ فرشتہ ذکر بہمن شاہیہ،

"سلطان بجہت طبابت سری ہٹ را کہ طبیب حاذق بود تربیت کرد"

اطباے عہد اکبری | اکبر کے عہد حکومت کے نامور ہندو اطبا کے چند نام ابوالفضل نے آئین[1] میں لکھے ہین، مہادیو، بھیم ناتھ، نرائن، سیوجی، افسوس کہ انکے حالات کچھ نہین معلوم،

سکھراج | اسکا باپ اسد خان وزیر عالمگیر کی سرکار مین تھا، سکھراج علاوہ دیگر علوم عقلیہ کے فن طب مین کامل دستگاہ رکھتا تھا، سید علی حسین خان کی سرکار مین پانصدی منصب پر تھا[2]،

منشی لچھمی نرائن گجراتی | انکا ذکر زمرۂ شعرا مین بھی گذر چکا ہے، یہ بھی مسلمان طبیبون کی درسگاہ[3] فن طب کے ماہر بنکر نکلے تھے، انکا خاندان عالمگیری و محمد شاہی دربار دارون کے متوسلین مین تھا،

منشی رام پرشاد عظیم آبادی | خلف گنگا پرشاد، گو یہ طبیب تھے، لیکن طبابت کا پیشہ نہین کرتے تھے، کمپنی کے زمانہ مین پٹنہ کی صدر امینی قبول کر لی تھی، پنڈت داتارام کی فرمائش سے ۱۲۶۳ھ مین معیار الامراض نام ایک کتاب فن طب مین تالیف کی جسمین سر کے بال سے پاؤن کے ناخنون تک کی کل بیماریون کے قوانین کلیہ لکھے ہین، یہ کتاب اسی زمانہ مین چھپ بھی گئی تھی،

راے منولال فلسفی | المتوفی ۱۲۶۰ھ، دیگر علوم عقلیہ کے ساتھ طب کا بھی ماہر تھا، مفردات طب مین اسکی ایک تصنیف ہے،

لالہ سوہن لال | سندیلوی، راے منولال کا بھائی تھا، فارسی کا ادیب اور طب مین یگانۂ عہد تھا اسکا بھتیجا کندن لال، قسطاس کے خاتمہ مین لکھتا ہے:

"عمویم لالہ سوہن لال کہ طبیب حاذق و ادیب کامل بودند،

پیوالال بیکس | حیدرآبادی، اُس نے اپنے طبی تجربات دو جلدون مین لکھے ہین، یہ دونون

[1] صفحہ ۱۷۰، نولکشور،

جلد ہین قلمی کتبخانۂ آصفیہ مین ہین،

پنڈت والہ چند | اسکی ایک تصنیف کحل الابصار کا ایک قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مخصوص آنکھ کی بیماریون کے علاج مین ہے،

دیا ناتھ | اس نے ویدک سے پاکا ہوی کالی کا فارسی زبان مین ترجمہ کیا، قلمی نسخہ آصفیہ مین ہے،

منشی مستاب رائے | مزدوری الطب کا مصنف ہے، اسکا موضوع ادویہ کے خواص ہین،

یہان طبیب مصنفون کی مختصر فہرست ہے، جنھون نے فارسی زبان کو اپنے اظہار خیال کا آلہ بنایا، بیسیون مصنفین اسکے علاوہ ہین، جنھون نے اسلامی طب کو ہندی، مرہٹی، بنگالی اور تلنگی مین منتقل کیا، تلنگی کی بعض طبی کتابون کے نام کتبخانۂ آصفیہ کی فہرست مین موجود ہین، یہ اسی وسعت کا اثر تھا کہ شہرون کو چھوڑکر دیہات اور قصبون تک کے ہندو بڑے بڑے طبی دوا ون کے بڑے بڑے عطار بنگئے، اور عرب و ایران و ترکستان کی دوائین انکی دوکانون پر بکنے لگین، اور زمانہ کی شدید مخالفتون کے باوجود انکے آثار اتبک باقی ہین،

اخلاق و تصوف

اس مضمون پر مفصل بحث تو ایک مستقل عنوان "اسلام کا اثر ہند و مذاہب" مین ہوگی، یہان علمی حیثیت سے صرف چند ہندو مصنفین کا تذکرہ مقصود ہے، جنھون نے ان مسائل پر اظہار خیال کیا ہے،

بابا نانک | جو سکھ فرقہ کے بانی ہین، وہ فارسی مین بہت اچھی دستگاہ رکھتے تھے، انکے گرنتھ مین فارسی کے سیکڑون اشعار و الفاظ ہین، اور مولوی رومی اور حافظ وغیرہ صوفی شعراء کے تو وہ دلدادہ تھے، فارسی مین انکی دو کتابین تصوف مین ہین، الٰہی نامہ اور دل طلب ایک اور مناجات بحر طویل مین انکی ہے، یہ تینون رسالے آصفیہ مین ہین،

| رس تی داس | عالمگیر ثانی کے عہد مین تھے، محیط معرفت تصوف مین انکی کتاب ہے، |

سنہ ۱۲۹۵ھ مین چھپ بھی گئی ہے،

| لال جی داس | بابا لال گرو، (دارا شکوہ کا مرشد) کا چیلا تھا، بابا لال کے ملفوظات سنہ ۱۰۶۳ مین |

اس نے فارسی مین جمع کئے ہین، گورنمنٹ کلیکشن لائبریری مین سنہ ۱۱ جلوس عالم شاہی کا

لکھا ہوا نسخہ موجود ہے،

| بھیرو مل | رسالہ علم جوگ فارسی کا مصنف، |

| بشن سنگھ | شیو پران، فارسی مین اسکی تصوف پر تصنیف ہے، یہ دونون نسخہ قلمی آصفیہ مین ہین، |

| رائے لکھن داس | اخلاق نامہ فارسی منظوم کا مصنف، اسکا قلمی نسخہ موجودہ آصفیہ سنہ ۱۱۹۲ کا لکھا ہوا ہے |

| سوامی بیاس | شارق المعرفت کے نام سے جوگ بسشٹ کا فارسی ترجمہ کیا، حال و زمانہ نہین معلوم |

ان کے علاوہ اکبری دور کے ان خدا پرستون کے نام بھی ملاو جنکو ابوالفضل نے

خدیو نشنا سین، خداوند باطن اور خوانا سے نقلی مقال کی فہرست مین جگہ دی ہے، یعنی مادھو سرتی

مدھو دن، بابا بلاس، نارائن آسرم، بابا کپور، بھان چند، ہرجی سور، دامودر پرت، رام تیرتھ،

نرسنگ، پرم اندر، آدت، رام جدر، بجی سین سور، اور جہانگیری دور مین جدروپ گسائین،

اور دوسرے ہندو صوفیا تھے جنکا ذکر تزک مین اس نے متعدد مقامات پر کیا ہے،

موسیقی

فن موسیقی کے جاننے والے اس کثرت سے اس عہد مین پیدا ہوئے ہین کہ استقصا بھی

مشکل ہے، شاہان ہند کی فیاضیون نے اس فن کو کہان سے کہان پہنچا دیا، ہندوستان مین

یہ فن نہایت قدیم زمانہ سے ہے، اور اسمین اسکی استادی مسلم ہے، لیکن مسلمانون کی آمد کے

بعد ایران و توران کی موسیقی نے ملکر ایک نیا عالم پیدا کر دیا، پٹھانون کی عہد حکومت مین بھی

اس فن کے جاننے والے ہندو موجود تھے[1] اور سلاطین دہلی کا دست کرم انکو دار الحکومت کی طرف ہمیشہ کھینچتا رہتا تھا، جہاں خسرو کے سے ہمہ دان سے انکو مقابلہ کرنا پڑتا تھا جن میں سب سے مشہور نایک گوپال تھا، اسکے ۱۲۰۰ فن موسیقی میں شاگرد تھے جو اسکے جلو میں ساتھ ساتھ چلتے تھے، گوپال اسی شان سے سلطان علاء الدین خلجی کے دربار میں آیا تھا،

کشمیر ایک مدت سے فن موسیقی کا گہوارہ ہے، لیکن ہمیں علم ہو کہ یہاں کس دایۂ کرم نے اسکی پرورش کی، سلطان زین العابدین شاہ کشمیر (۸۶۶ھ) نے، وہ خود اس فن کا بہت بڑا ماہر تھا، اور موسیقی دانوں کا مربی تھا، ایران اور ہندوستان کے موسیقی دان اسکے دربار میں کھیچے چلے آتے تھے، فرشتہ کہتا ہے:

آوازۂ جود او چون انتشار یافت، سازندہا و گویندہا کہ در علم موسیقی یگانۂ زمان بودند از اطراف و نواحی روے بکشمیر نہادند، چنانکہ کشمیر از کثرت ہندیان این فن رشک ملک زنگ شد، (۳۴۴ جلد دوم)

بودی بت (شاید صحیح دیوی پت ہو) وہ ایک طرف فارسی کا ادیب تھا، تمام شاہنامہ اسکو برزبان یاد تھا، دوسری طرف موسیقی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، بادشاہ کے نام کی مناسبت سے زین نام اس نے اس فن میں ایک کتاب لکھکر دربار میں پیش کی، بادشاہ نے اسکو نہایت پسند کیا، اور اسکے حال پر نوازش فرمائی،

ہندوستان کی موجودہ موسیقی کی نسبت میں نے کہا ہے کہ وہ تنہا ہندوستان زاہنین ہے بلکہ مسلمان بادشاہوں کی خوش مذاقی نے ایران و توران و ہندوستان کو ملاکر ایک کر دیا تھا، علاوہ قیاس کے ابو الفضل کی اس عبارت سے بھی یہ اشارہ سمجھنا چاہیئے،

[1] شعر العجم میں راگ درپن کے حوالہ سے امیر خسرو و گوپال کا حال پڑھو، جلد دوم صفحہ ۱۳۵،

نامورکاران ہندی وایرانی وتورانی وکشمیری، زمرۂ دوم نشرت افزائے بزم ایمان (آئین ۱۴۴)

دربار اکبری مین مسلمان اساتذۂ فن کے ساتھ حسب ذیل ہندو مشاہیر کے نام بھی ہم دوش بدوش پاتے ہین، باباراِم، سورداس، اور رنگ سین، میان تان سین اور میان چند جو چاہے سمجھیے، میان تان سین کی نسبت ابوالفضل نے لکھا ہے کہ ایک ہزار برس مین کوئی اسکے برابر کا پیدا نہین ہوا،

مسلمانون نے تو ہندوؤن کی موسیقی پر راگ درپن، او چندرکا اور مدھنا ایک سنگار وغیرہ کئی کتابین لکھی ہین، مگر بھوپت راے کے علاوہ جس نے ۱۹ جلوس محمد شاہی مین رسالہ علم موسیقی لکھا اس فن کے دوسرے ہندو مصنف کا نام ہمکو نہین معلوم،

ذیل مین چند نام اخیر زمانہ کے استادون کے آثار شعرائے ہنود سے اضافہ کرتے ہین،

پنڈت اجودھیا پرشاد | کشمیری لکھنوی، حیرت تخلص، استاد جرأت کے شاگرد تھے، کئی دیوان اور مثنویان اُنسے یادگار ہین، فن موسیقی مین اپنے عہد کے مسلم الثبوت استاد تھے، ۵۰ برس کی عمر مین ۱۲۳۳ھ مین وفات پائی،

لچھمن لال | دہلوی، ولد بخشی سلطان سنگھ کایستھ، فارسی و سنسکرت و طبابت و شاعری کے علاوہ موسیقی کے ماہر تھے، ایک خاص ساز کے موجد ہین،

روشن لال | شوق تخلص، موسیقی کے استاد تھے،

تلسی داس | دہلوی، صنیم تخلص، سنسکرت کے عالم تھے اور فارسی سے واقف تھے فقیرانہ بسر اوقات کرتے تھے، طبابت کے علاوہ فن موسیقی کے استاد یگانہ تھے، دلی کے شہزادہ مرزا قادر بخش صابر اپنے تذکرۂ گلستانِ سخن مین لکھتے ہین،

"زبان فارسی سے بقدر ضرورت آگاہ، و در کتب ہنود علی الخصوص فن موسیقی کی پوتھیون سے

لہ عطف بیان نو مسلم ہونیکی علامت کو ظاہر کرتا ہے،

صاحب ،تباہ، ستار بجانے مین جوش سرت اور جان تن سے نکال لیتا تھا مین نے اسکے نغزو ونواز کو اپنے کانون سے سُنا ہے اور اس کیفیت سے حظ اٹھایا ہے گاہ گاہ ریختہ کی طرف التفات کرتا تھا،

موسیقی ہندوستان کی چیز تھی لیکن مسلمانون نے اپنا سرمایہ ملاکر اسکو اپنا کرلیا ہند موسیقی دان بھی انکا تلمذ خوشی سے قبول کرتے تھے، اس اخیر عہد مین استادنا المرحوم مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی جو اپنے وقت کے ہمہ دان فاضل تھے بلکہ بعض حیثیات سے کہا جاسکتا ہو کہ ہندوستان کی خاک نے انکی نظیر نہین پیدا کی، وہ علاوہ دیگر علوم کے فن موسیقی کے بھی ماہر یگانہ تھے اور علمی حیثیت کے علاوہ عملاً بھی اسکو جانتے تھے، انکے کئی ہندو شاگرد اس فن مین اب تک موجود ہین، اور انکے نام کی عظمت کو اب تک برقرار رکھے ہوئے ہین،

مصوری

ہندوستان مین سنگ تراشی تو یقیناً قدیم زمانہ سے موجود تھی اور اسکی بہترین زندہ مثالین، بودھون اور جینیون کی عمارتون اور معبدون مین مل سکتی ہین، ایلورا اور اجنتا وغیرہ غار اب تک دنیا کے لئے تماشائے حیرت ہین، لیکن شبیہ کشی طراحی اور رنگ آمیزی مصوری کی نسبت نہین کہا جاسکتا کہ ہندوستان قدیم نے اس فن کو کہانتک سیکھا تھا اور نہ کسی ہندی مصور کا نام معلوم ہے جس نے اس فن مین کمال حاصل کیا ہو،

مسلمانون کی آمد کے بعد دیگر فنون لطیفہ کی طرح اس فن مین بھی ہندوون نے کمال پیدا کرنا شروع کیا، اور چند روز مین یہ حال ہوگیا کہ بقول ابوالفضل ہندوستان کے صنعت نگار ... مین بھی جس نقش کمال کا تصور ہوا ہوگا وہ واقعا ہوگیا، اس سے ظاہر ہوتا ہو کہ شہنشاہ اکبر

جیسے ہندپرست کے عجائب خانہ مین قدیم ہندوستان کی صنعت مصوری کی کوئی یادگار نہین
ابوالفضل کی عبارت یہ ہے،

ہندوان چہ گوئیم کہ تصویر این معنی (مصوری مین کمال) بر صفحۂ خیال ایشان بوجود نیامدہ
از اقالیم جہان کمتر نشان دہند، (صفحہ ۰۰)

یعنی جس ہندوستان کو اس فن کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا، اب دنیا مین بہت کم اس
فن مین کوئی اسکا حریف نکلیگا، دربار اکبری کے مشہور ہندو مصورین کے نام یہ ہین کیسو
لعل، مکند، مادہو، جگن، مہیش، کھیمکرن، تارا، سانولہ، ہرنبس، اور رام، بساون ایک
ہندو مصور کی نسبت ابوالفضل لکھتا ہے،

بساون در طراحی وچہرہ کشائی ورنگ آمیزی ومانند نگاری ودیگر کارہاے این فن یگانۂ
زمانہ شد، (صفحہ ۰۰)

دسونتھ ایک کمار بچہ تھا اسکو اس فن سے فطری مناسبت تھی، وہ محل شاہی کی
دیوارون پر ادہر اُدہر بچپن سے لکیرین کھینچا کرتا تھا، ایک دن اکبر کی نظر اُسپر پڑگئی جوہر قابل
پاکر خواجہ عبدالصمد شیرین قلم کے سپرد کیا، تھوڑے ہی زمانہ کی تعلیم مین وہ اس فن کا بےنظیر استاد بنگیا،
جہانگیر تمام شاہان تیموریہ مین اس فن کا سب سے بڑا ماہر اور قدردان تھا، بشن داس
اسکے دربار کا مشہور مصور تھا، خود بادشاہ تزک مین اسکی تعریف مین لکھتا ہے۔

بشن داس مصورے کہ در شبیہ کشی از یکتایان روزگار است ۱۱

سنہ جلوس مین جہانگیر نے خان عالم کو عراق بھیجا تھا، بشن داس کو بھی اسکے ساتھ بھیجا کہ
شاہ عباس صفوی اور اسکے دربار کی تصویرین کھینچکر لائے، یہ تصویرین اسقدر عمدہ کھینچی گئی تہین کہ
جن لوگون نے ان اشخاص کو دیکھا تھا وہ کہتے تھے کہ اصل سے سرِمو فرق نہین خود بادشاہ بھی

جگن داس کے اس کارنامہ کو تزک مین فخریہ لکھتا ہے اور مصور کے قلم کو داد دیتا ہے،

عبدالرحیم خانخانان کا کتبخانہ ایک عجائب خانہ تھا، اس عجائب خانہ کی سب سے حیرت انگیز چیز ایک ہندو مصور ماد ہو تھا (شاید یہ وہی ہو جسکا نام ایک دفعہ اوپر بھی آیا ہے) جسکی نسبت مآثر رحیمی کا مصنف لکھتا ہے کہ تصویر طراحی، مصوری اور شبیہ سازی مین نادرہ روزگار تھا اور اس کتبخانہ کی اکثر باتصویر کتابین اسی کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں،

محمد شاہ کے زمانہ مین گوردھن دلی مین ایک مصور تھا، انند رام مصنف مراۃ الاصطلاح[۱] اسکی نسبت لکھتا ہے کہ نرگس کی ایک پتی پر پورے شہر کی تصویر وہ کھینچتا تھا"

افسوس کہ ان استادون کو تاریخ کی زندگی نصیب نہین ہوسکتی تھی، اسلیے بجز ان لوگون کے جو سلاطین اور امرا کے دامن سے لپٹے رہتے تھے، اورون کے نام تک بھی تاریکی کے پردہ مین گم ہین، ورنہ سینکڑون اساتذۂ وقت ہونگے جنکو قسمت نارسائی ہوگی لیکن دست و دماغ کی نارسائی کے وہ شاکی نہونگے،

اخیر زمانہ کے چند ہندو طبیب

| پورن سنگھ | قوم کایستھ، دہلی وطن، سعادت یارخان رنگین کے شاگرد تھے اور پورن تخلص کرتے تھے، علم سنسکرت اور طبابت ہندی مین مہارت کامل رکھتے تھے مگر بدمزاجی اور وارستگی کے سبب بیمارون کی طرف کم التفات کرتے تھے، فارسی مین بھی دخل تھا،

| لالہ کھیم نرائن کھتری | مہاراجہ تکیت راے لکھنوی کے رفقا مین تھے، اخیر عمر مین نوابی کے بعد کلکتہ جاکر رہ گئے تھے، فارسی کے شاعر تھے طب مین بہت اچھا دخل رکھتے تھے مولوی حفیظ الله شہید کے شاگردون مین تھے،

---

[۱] قلمی نسخہ پٹنہ کے مشرقی کتبخانہ مین ہے، نہایت نادر کتاب ہے،

سُکھن لال | قوم کایستھ سکسینہ، ولد مجنی سلطان سنگھ دہلوی، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے، ایک سنت کے مصنف ہیں، طبابت میں شہرت رکھتے تھے،

تلسی داس | سادھو تھے، فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، وطن دلی تھا، قلعہ کے شہزادوں سے ارتباط رکھتے تھے، کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، حکیم تخلص تھا، طب ہندی میں امام تھے، اور مجربات بیدک سے اکثر امراض مزمنہ کا علاج کرتے تھے، کشتوں کے استعمال میں اور جذام اور درج خاصل وغیرہ کے علاج میں مہارت تامہ رکھتے تھے، موسیقی میں کمال پیدا کیا تھا، فارسی زبان سے واقف تھے،

سکھانند | قوم کایستھ، دلی وطن، شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد، شاعری کے علاوہ فن طبابت میں "وحید العصر" تھے،

تخلیقی ادب کا نمائندہ اور فکرِ نو کا ترجمان

نسیم دُرّانی کی ادارت میں کراچی سے نکلنے والا



کراچی

سہ ماہی اشاعتِ خاص، شمارہ - ۵۶ کے مشتملات

○ حمد (ضمیر اظہر، غفار بابر) ○ نعت (کرار نوری، امید فاضلی، اکرام کلیم) ○ مضامین (تھیٹر کی کہانی، فانی اور ہیڈ نگر کا تصورِ مرگ، رومانوی طرزِ احساس) ○ افسانے (ام عمارہ، رشید امجد، محمد منشا یاد، کرامت اللہ غوری، امراؤ طارق وغیرہ) ○ غزلیں (رضی اختر شوق، اختر امان، صابر ظفر، امید فاضلی، جمیل ملک، شاہد عشقی وغیرہ) ○ نظمیں (الیاس عشقی، قمر جمیل، محسن بھوپالی، جمیل عظیم آبادی وغیرہ) ○ رباعیات (صبا اکبر آبادی، سرفراز علی حسین) ○ تبصرے (تنقیدی تحریریں، مٹھی بھر ہوا، لندن لندن، تلافی، پہلی بوند سمندر، پرسپشنز، سایہ سایہ دھوپ، معادن تاریخ، دھند میں آفتاب، سنگلاب، اردو ادب میں احتجاج، خوشبو کا سفر، مرتضیٰ برلاس - فن اور شخصیت، جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی، آٹھواں آسمان بھی نیلا ہے، پرانی بات ہے، پلک پلک سمٹی رات، لمحوں کی داستان، پُل صراط، قامت، پس آئینہ، ثبات، سوا نیزے پر سورج)۔

صفحات: تقریباً ۲۰۰ — قیمت: ۳۰ روپے

چار شمارے کی قیمت : ۱۲۰ روپے مع رجسٹری

: ملنے کا پتا :

سیپ پبلی کیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲۴ — کراچی ۷۵۲۳۰

بابری مسجد، رام جنم بھومی دستاویزات

○ مسجد شہید گنج

○ ——— ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

ہم نے جب بھی چمن سنبھالا تو سنبھالا ہم کو ○ تم نے جب بھی چمن سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

مسجد مندر مسئلہ کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں، اسے مسئلہ بنا دیا گیا۔ بڑا بھائی کیسے برتاؤ کرتا ہے اس کی ایک مثال غدر سے ٹھیک دو سال پہلے اودھ کی بادشاہت میں ملتی ہے جب ہنومان گڑھی کی مقدس سرزمین پر ایک اور مسجد مندر کا جھگڑا اٹھا تھا۔ اس وقت کا حاکم واجد علی شاہ اور اس وقت کا وزیر دونوں مسلمان تھے اور مندر کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بیراگیوں / جوگیوں کا مطالبہ تھا کہ جس جگہ پر ان کا قبضہ ہے پچاس سال قبضے کے بعد مسلمانوں کا مطالبہ کہ چونکہ یہ مسجد تھی اس لیے پھر ان کے حوالے کی جائے نامناسب ہے۔ بوٹا سنگھ کی گفت و شنید ہفتوں بلکہ مہینوں چلتی رہی ——— اور پھر ایک دن گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمان مجاہدین اس متنازعہ جگہ پر قبضے کے لیے ہتھیاروں سے لیس مارچ کرنے لگے، ادھر مستقل یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ مسجد بنے گی اور مندر ٹوٹ کے رہے گا۔ لیکن واقعہ؟ مندر توڑنے کے احکام دے جانے والے دراصل توپ خانے سے لیس امیر المجاہدین، اور ان کے سینکڑوں ساتھیوں پر توپ اور بندوق سے حملہ آور ہونے جا رہے تھے۔ ادھر توپ خانہ نصب کر دیا گیا، ادھر مجاہدین کا رات چھپنے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں ادھر سے آگ اگلنے لگی۔ اور مجاہدین میں سے ایک سانس لینے والا بھی باقی نہ بچا!

اودھ کی سلطنت میں جو مسجد پچاس سال سے مندر بن چکی تھی، سلطنت کی آخری سانس تک وہ مندر ہی رہی، آج بھی مندر ہے ——— بڑا بھائی اس طرح نظیر قائم کرتا ہے۔

اس کی دوسری مثال مسجد شہید گنج ہے جو ۱۹۳۸ء کے فیصلے کے بموجب مسجد نہیں ٹھہرائی گئی، تو پاکستان بننے کے بعد آج بھی ۱۹۹۱ء میں بھی وہ مسجد نہیں ہے۔ اگرچہ آج کی اسلامی دنیا اسے مسجد شہید گنج کے نام سے ہی جانتی ہے۔

بڑا بھائی ہونا کیسے فخر و افتخار کا نشان ہے!
لیکن ——— کیسی بڑی آزمائش ہوتی ہے!! بہت بڑا دل کرنا پڑتا ہے بڑے بھائی کو! ایسا کر
کبھی کبھی تو دل پھٹنے لگتا ہے!
لیکن پھر چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی میں کچھ تو فرق ہوتا ہی ہے!
بڑے بھائی کو چھوٹا پن نہیں دکھانا چاہیے۔
لیکن
پھر
چھوٹے بھائی کو بھی تو بڑا بھائی بننے کی ہوس چھوڑ دینی چاہیے۔

یہ حصہ ہم نے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی آپ بیتی 'رو میں ہے رخشِ عمر' سے لیا ہے۔ یہ لاہور سے ۱۹۸۶ء میں چھپی ہے' ——— مصنف ۳۶-۱۹۳۵ء کی تحریک میں بطور طالب علم لیڈر پورے زور و شور سے شریک تھے اس لیے یہ چند صفحات دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں۔ ——— ادارہ

ایک عہد تحریک مسجد شہید گنج اٹھی۔ اور اس شدت سے اٹھی کہ مجلس احرار اسلام
کی ساری ہر دلعزیزی کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئی۔ اس سے پہلے کہ احرار کی رسوائی اور تباہی
کی داستان قلمبند کی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسئلے کا پس منظر بیان کر دیا جائے۔ لاہور
ریلوے سٹیشن کے قریب نولکھا بازار میں دو سو سال پہلے ایک مسجد تعمیر ہوئی، جو مسجد عبداللہ خان
کے نام سے مشہور ہوئی، کیونکہ اسے لاہور کے کوتوال عبداللہ خان نے بنایا تھا۔ جس زمانے میں
سکھوں کی شورش عروج پر تھی، پنجاب کے مغل گورنر معین الدولہ نے اُن کی سرکوبی شروع کی۔
اور مسجد کے قریب کوتوالی میں سکھ مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔ اسی عہد میں سکھوں کا ایک رہنما بھائی
تارو سنگھ یہیں مارا گیا۔ جب سکھوں کے راج کا آغاز ہوا۔ تو انہوں نے مسجد پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کے
قریب تارو سنگھ کی یاد میں ایک سمادھی بنائی۔ جون ۱۹۳۵ء میں سکھوں نے فیصلہ کیا کہ مسجد عبداللہ
خان (جو اب مسجد شہید گنج کے نام سے یاد کی جاتی تھی) کو مسمار کر کے گوردوارہ تعمیر کیا جائے۔ اس
پر مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی، مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد گورنر سے ملا، لیکن شنوائی نہ
ہوئی۔ اور برطانوی سنگینوں کی حفاظت میں سکھوں نے مسجد گرا دی۔ اس پر مسلمانوں کا ایک بہت
بڑا جلوس اندرون شہر سے دہلی دروازے کے باہر پہنچا، تاکہ مسجد شہید گنج کی حفاظت کے لیے
آگے بڑھے۔ پولیس نے صف بندی کی، لیکن جلوس صف بندی توڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اور اس طرح
پولیس اور فوج کے ساتھ مسلمانوں کا ایک خونین تصادم شروع ہوا۔ جو اڑتالیس گھنٹے تک جاری رہا
مسلمانوں کی سرفروشی اور جانبازی قابل ذکر ہے کہ جب گولی چلی، انہوں نے سینے پر کھائی۔ دو دنوں
میں دس دفعہ گولی چلی، تیرہ نوجوان شہید ہوئے۔ اور سینکڑوں زخمی۔ اس سے پہلے مولانا ظفر علی خان
کی قیادت میں مجلس اتحاد ملت کے نام سے ایک جماعت بن چکی تھی، جس میں ملک لال دین قیصر
ملک لال خان، میاں فیروز الدین احمد، سید حبیب اور دوسرے بزرگ شامل تھے۔ اس جماعت کا
واحد مقصد یہ تھا کہ مسجد شہید گنج واگزار کرائی جائے۔ جب مسجد منہدم ہوئی، تو یہ سب رہنما نظر بند
کر دیے گئے۔ اس دوران میں مجلس احرار اسلام خاموش رہی۔ اور اس نے اسے "پُر وقار سکوت"
سے تعبیر کیا، لیکن اس سے اس کا وقار مٹی میں مل گیا۔ اس خاموشی کی وجہ یہ تھی۔ کہ احرار آنے والے
عام انتخابات میں شریک ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اور انہوں نے سوچا، کہ اگر ہم گرفتار ہو
گئے۔ تو یہ سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ حکومت نے مسلمانوں کی اشک شوئی کے
لیے مال روڈ پر مسجد شاہ چراغ کو واگزار کر دیا۔ جو ایک صدی سے انگریزوں کے قبضے میں چلی آ

تھی لیکن یہ اشک شوئی شہید گنج کا داغ نہ مٹا سکی۔ مجلس اتحاد ملت کے نیلی پوش رضاکاروں نے سول نافرمانی شروع کر دی۔ اور ہزاروں رضاکار جیلوں میں چلے گئے۔ جب لیڈر قید تھے۔ کوئی ذمہ دار رہنما باقی نہ رہا۔ تو پہلے ایک نوجوان ابو سعید انور نے بادشاہی مسجد کو اڈا بنا کر کچھ دن سول نافرمانی چلائی پھر دو اور نوجوان ابھرے۔ ایک ملا بخش، دوسرا یعسوب الحسن۔ انہوں نے بھی کچھ عرصہ حکام کا ناطقہ بند کیے رکھا۔ احرار کو بڑی دیر کے بعد ہوش آئی۔ انہوں نے مسجد وزیر خان کو اڈا بنایا۔ اور سول نافرمانی کی تحریک چلا دی۔ اس کے پہلے جلسہ عام میں میں بھی شریک تھا۔ وہاں بہت جوش و خروش کا اظہار ہوا۔ لیکن احرار کے موقف کا دلچسپ پہلو یہ تھا۔ کہ وہ بار بار اعلان کرتے کہ مسجد سول نافرمانی کے ذریعے سے نہیں مل سکتی لیکن عوام کہتے ہیں کہ مل سکتی ہے۔ اس لیے ہم سول نافرمانی کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی احرار کے سرخ پوشوں اور اتحاد ملت کے نیلی پوشوں کے درمیان معرکہ آرائی کا بازار گرم ہوا۔ دہلی دروازے کے باہر سرخ رنگ کی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں، جو شخص گزرتا۔ احرار اس کی قمیض اتار کر رنگ دیتے۔ موچی دروازے کے باہر نیلے رنگ کی دیگیں تیار رہتی تھیں۔ لوگ وہاں ادھر آتے۔ اپنے کرتے نیلے رنگ میں رنگتے اور سکھا کر پہن لیتے۔ اس زمانے میں بازاروں میں سرخ پوش اور نیلی پوش کثرت سے نظر آتے تھے۔ اور "مقتدرا پالیٹکس" میں یہی موضوع عام تھا۔ ۱۹۳۶ء میں قائد اعظمؒ لاہور آئے۔ حکومت کے ساتھ گفت و شنید کی اس پر رہنما رہا کر دیئے گئے۔ اور سول نافرمانی بند کر دی گئی۔

اس دوران میں لاہور کے وکلا نے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں مسجد شہید گنج کی بازیابی کے لیے ایک مقدمہ بھی دائر کر رکھا تھا۔ لیکن یہ دعوے خارج ہو گیا۔ اس کے بعد ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ ۲۶ر جنوری ۳۸ کو یہ اپیل بھی خارج ہو گئی۔ لیکن اتفاق رائے سے نہیں، اکثریت رائے سے۔ کیونکہ چیف جسٹس ینگ اور مسٹر جسٹس بھیڑے نے یہ فیصلہ دیا۔ کہ جہاں تک قبضہ مخالفانہ کا تعلق ہے۔ وہ مستقل قانونی صورت لے چکا ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہیں رہا کہ وہ مسجد شہید گنج میں نماز ادا کریں۔ تیسرے جج مسٹر جسٹس دین محمد نے اس فیصلے کے خلاف اختلافی نوٹ قلمبند کیا۔ اور اس رائے کا اظہار کیا کہ مسجد ہمیشہ مسجد رہتی ہے اور وہ عام غیر منقول املاک سے مختلف نوعیت کی حامل ہوتی ہے۔

مسجد شہید گنج کی تحریک میں عام نوجوانوں نے تو بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن جہاں تک طلبہ کا تعلق تھا۔ انہوں نے جماعتی حیثیت میں کوئی حصہ نہ لیا۔ بہرحال جس دن ہائی کورٹ نے فیصلہ صادر کیا۔ اس سے اگلے دن اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ اور ہم نے پہلے اسلامیہ کالج گراؤنڈ میں احتجاجی جلسہ کیا۔ اور اس کے بعد جلوس نکالا۔ بندۂ عاجز نے جلوس کی رہنمائی

کا فرض ادا کیا۔ کیونکہ میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری تھا۔ اُس دن نمازِ ظہر
کے بعد بادشاہی مسجد میں ایک جلسۂ عام ہونے والا تھا۔ اور شہر کے مختلف حصوں سے جلوس
نکل رہے تھے۔ اور سب کی منزل بادشاہی مسجد ہی تھی۔ ہمارا جلوس برانڈرتھ روڈ سے دہلی دروازے
کی طرف بڑھ رہا تھا کہ نیلے کرتے میں ملبوس مولانا ظفر علی خان بیس پچیس نیلی پوش رضاکاروں کے
ہمراہ مل گئے۔ ہم نے اُنہی کو جلوس کا قائد بنا لیا۔ اس جلوس میں جہاں نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، مسجد شہید گنج
زندہ باد اور مولانا ظفر علی خان زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ وہاں ایک نعرہ انگریزی زبان
میں بھی لگتا تھا کہ

WHAT DO YOU WANT?

SHAHEED GUNJ MOSUUE. یہ جلوس دہلی دروازے میں داخل ہوا۔ کشمیری بازار، ڈبی بازار،
بزاز ہٹہ اور دوسرے بازاروں سے گزرتے گزرتے جب بادشاہی مسجد پہنچا۔ تو عجیب ہنگامہ بپا
تھا۔ مسجد بھری ہوئی تھی۔ اور ابھی دوسرے جلوس آ رہے تھے۔ چونکہ مولانا ظفر علی خان کو جلسے کی
صدارت کرنی تھی۔ اور ہمارے جلوس کے وہی قائد تھے۔ اس لیے ہم لوگ اُن کے ساتھ ساتھ مسجد
کے منبر تک پہنچ گئے۔ اور اُن کے اردگرد بیٹھ گئے۔ تلاوتِ قرآنِ حکیم کے بعد مولانا ظفر علی خان منبر پہ
کھڑے ہوئے۔ اور کہنے لگے "عزیزانِ ملت! میں تمہارے لیے ایک بشارت لایا ہوں"۔ ابھی اتنا کہا
تھا کہ چاروں طرف اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند ہونے لگے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے
سے لوگوں کو خاموش کیا۔ اور فرمانے لگے "عزیزانِ ملت! میں تمہیں بشارت دیتا ہوں"۔ کہ مسجد شہید
گنج زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ لوگوں نے یہ تاثر لیا۔ کہ شاید واقعی حکومت نے
مسجد واگزار کر دی ہے۔ اس کے بعد مولانا نے فرمایا۔ جانتے ہو، میں ایسا کیوں کہتا ہوں! آج
میری آنکھوں نے ایک روح پرور نظارہ دیکھا۔ میں نے دیکھا۔ کہ ہزاروں طلبہ ننگے سر دیوانہ وار
آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک طالب علم کہتا ہے۔ WHAT DO YOU WANT? اور سب
جواب دیتے ہیں SHAHEED GUNJ MOSQUE تو اے لوگو! جب کسی قوم کے نوجوان کوئی فیصلہ
کر لیں۔ تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اُن کی کامیابی میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے میرا ایمان ہے کہ مسجد
شہید گنج مل کر رہے گی"۔ جانے عبرت حاصل ہو کہ پاکستان بن گیا۔ لیکن مسجد شہید گنج واگزار نہ ہو
سکی۔ وہی مسجد جسے دو سو سال پہلے انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ تعمیر کیا گیا۔ جہاں مدتوں بندگانِ
خدا سجدہ ریز ہوتے رہے۔ جہاں اذان دینے کے لیے پچتالیس سال پہلے بہت سے مسلمان
انگریز کی گولیوں سے شہید ہوئے۔ اور جس کی واگزاری کے لیے ہمارے رہنماؤں نے قید و بند کی

پروفیسر ظل الرحمٰن خاں (علی گڑھ) کا گرامی نامہ (۳۱/۷/۹۰)

محترمی بیدار صاحب   السلام علیکم

مسجد شہید گنج کا قصہ مجھے قصے ہی کی طرح معلوم ہے۔ اگر کسی کو سنجیدگی سے دلچسپی ہو تو اسے پھر قانونی کتابوں میں دیکھنا چاہیے۔ والد مرحوم نے قصے کی طرح سنایا تھا۔ آپ کو بھی اسی طرح سنائے دیتا ہوں۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ کب کی بات ہے لیکن غالباً Twenties or Thirties کی بات ہوگی۔

القصہ مختصر یہ پہلے مسجد تھی جسے سکھوں نے زبردستی قبضہ کرکے گرودوارہ بنالیا۔ کسی Stage پر مسلمانوں کے اسلامی جذبے نے زور مارا اور انھوں نے سب ثبوت فراہم کرلیے جس سے یہ ظاہر تھا کہ یہ مسجد تھی مگر یہ بہت برسوں سے گرودوارہ ہوچکی تھی۔ عام چیزوں کے لیے تو قانون یہ ہے کہ اگر کسی کا قبضہ مخالفانہ (Adverse possession) ۱۲ سال سے زیادہ رہا ہے تو اسے ملکیت کے پورے حقوق حاصل ہوجاتے ہیں۔ سکھوں کا معاملہ یہ تھا کہ اگر اسے پہلے مسجد بھی مانا جائے تو قبضۂ مخالفانہ ہونے کی بنا پر اُسے گرودوارہ باقی رہنا چاہیے۔

مسلمانوں کا کہنا یہ تھا کہ مسجد چونکہ خدا کی ملکیت ہوتی ہے۔ خدا کے خلاف قبضۂ مخالفانہ کے کوئی معنی نہیں ہیں اس لیے وہ مسجد ہی رہی اور ان کو واپس ہونا چاہیے۔

مقدمہ تین ججوں کے ایک بنچ نے سنا جس میں ایک جج ہندو تھے جن کا نام Bhide تھا۔ یہ مہاراشٹری تھے اور غالباً بلگام کے رہنے والے تھے۔ ایک مسلمان جج تھے جن کا نام غالباً کچھ بخش پر تھا، شاید اللہ بخش، خدا بخش یا کچھ ایسا۔ اور ایک انگریز جج تھا۔ مسلمان جج نے مسلمانوں کی رائے سے اتفاق کیا۔ ہندو جج نے شاید کچھ اس طرح لکھا کہ بحث کچھ بھی ہو، اگر اسے مانا گیا تو سارے ہندوستان میں آگ لگ جائے گی اور یہ گڑے مردے کہاں تک اکھاڑے جائیں گے۔ انگریز جج نے جسٹس بھڈے سے اتفاق کیا اور اس طرح معاملہ سکھوں کے حق میں فیصل ہوا۔

والد مرحوم فرماتے تھے کہ اس وقت مسلمان اپنی بے وقوفی پر بہت رنجیدہ ہوئے لیکن دراصل یہ فیصلہ ان کے حق میں ہوا۔ یہ تھی کہانی جو میں نے سنی تھی۔ نہ معلوم کیوں اس کا ذکر اس زمانے میں نہیں آیا۔ آپ خدا کے واسطے لوگوں کو نہ بتائیں

اے گرفتار ابوبکر و علی

○ مناقب عمر بزبان علی — مناقب علی بزبان عمر

○ مصنف: علامہ زمخشری

ترجمہ: احتشام الحسن کاندھلوی



پیراں کم اڑتے ہیں مریداں زیادہ اڑاتے ہیں۔ بس یہی صورت شیعہ سنی مسئلہ کی ہے۔
عالم شیعہ عالم سنی کا دوست رہا ہے۔ مگر دونوں کے عالم دونوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتے ہیں۔ علی اور ابوبکر میں وہ آویزش نہ تھی جو ان کے ہم جیسے نالائق پیروؤں کے درمیان ہے اور وہ اسی لیے ہے کہ مفادات بنا لیے گئے ہیں کہ اگر آویزش نہ ہو تو مفادلت پر تو ضرب لگے گی ہی۔

ہر آویزش میں پہل ہمیشہ بڑے بھائی کی طرف سے ہونی چاہیئے، انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔
چنانچہ زمخشری اور احتشام کاندھلوی (دونوں۔۔۔ بڑے بھائی!) نے پہل کی، اس کی ہمیں خوشی ہے۔ ـــــــــ ادارہ



حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تجہیز و تدفین سے فارغ ہو کر صحابہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضرت عمرؓ پہلے جمعہ کو صوف کا موٹا کرتہ پہنے ہوئے جس میں ران پر اور مونڈھوں کے درمیان چمڑے کے پیوند لگے ہوئے تھے اور ایک چادر مونڈھوں پر ڈالے ہوئے مسجد نبوی میں حاضر ہوئے اور منبر نبوی پر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا اوّل حق تعالیٰ کی خوب حمد و ثنا کی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا تذکرہ کیا اور حضرت ابوبکرؓ کے لئے رحمت کی دعا مانگی اور بے اختیار رونے لگے حاضرین پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔ حضرت عمرؓ روتے روتے غش کھا کر منبر پر گر پڑے اور چہرے پر خراش آئی لوگ غشی کی حالت میں آپ کو اٹھا کر آپ کے گھر لے گئے چند روز آپ باہر نہ نکل سکے جب کچھ افاقہ ہوا تو گھر سے باہر جلوہ افروز ہوئے۔

حضرت عمر فاروقؓ دُرّہ کندھے پر رکھے ہوئے لوگوں کی خبر گیری کے لئے بازاروں اور گلیوں اور راستوں میں پھرا کرتے تھے۔ خدا کی قسم اُن کا دُرّہ تمہارے ان کوڑوں سے زیادہ ہیبت ناک اور خوفناک تھا۔

حضرت عمرؓ یتیموں اور بیواؤں اور مسکینوں کی خبر رکھتے تھے، اُن کے پاس بیٹھتے اور ان کے ساتھ چلتے اور بوڑھوں اور بچوں پر کھڑے ہو کر پرسش احوال کرتے تھے۔ اور غلام کا حق آزاد سے، کمزور کا حق زور دار سے، مسکین کا حق زبردست سے، چھوٹے گروہ کا حق بڑے گروہ سے دلواتے اور جو کچھ کرتے اجر و ثواب کی خاطر، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا کے لئے کرتے تھے۔ اور دینی معاملہ میں کسی کی ملامت کی ذرا پرواہ نہ کرتے تھے۔

زہد و تقویٰ کے باعث اپنے لئے جو کی تین روٹیاں روزانہ مقرر کر رکھی تھیں جن کو کبھی

چربی سے تناول فرماتے تھے اور کبھی کبھی صرف نمک کی ڈلی سے کھاتے تھے جب اس تنگی کا مزا اور خشکی کا اثر زیادہ بڑھ گیا تو زیتون اور کھجور کا استعمال بھی شروع کر دیا چند مرتبہ تھوڑا سا گھی بھی کھایا اور دودھ بھی نوش فرمایا کہیں آپ کو زیادہ پسند تھا اور اونٹ کی گردن کا گوشت کھایا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں جب حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتوحات دیں اور مال غنیمت کی فراوانی ہوئی تو حضرت عمرؓ ہر جمعہ کو کچھ اونٹ ذبح کرلیتے اور اچھا اچھا تمام گوشت مساکین، مہاجرین اور ضعفاء انصار میں تقسیم فرما دیتے تھے اور اپنے گھر والوں کے لئے گردن کا گوشت رکھتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنے سے کہا کرتے تھے کہ بھوکا رہنا اس جہنم کی آگ میں جلنے سے بہتر ہے جہاں ہمیشہ رہنا پڑے گا نہ وہاں موت ہے اور نہ وہاں سے چھٹکارا۔ اس میں راحت و خوشی کا نام نہیں اور وہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی راہ نہیں اور دوزخیوں کے لئے فرحت و خوشی کا کوئی موقع نہیں۔

جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو حقانیت چمک اٹھی اور صداقت سربلند ہوگئی نفاق کی آگ بجھ گئی اور کفر کی مشتعل چنگاریاں دھیمی پڑگئیں۔ باطل مغلوب ہوگیا اور حق غالب آگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کا طریقہ عام طور پر پسندیدگی اور شوق و رغبت کے ساتھ رواج پکڑ گیا اور شیطان ناکام و نامراد ہوگیا۔

چنانچہ حضرت حسان فرماتے ہیں ؎

"یا کارھا عمر الفاروق مت کمداً"

"قد قام خیر عباد اللہ فی العرب"

حضرت عمر فاروقؓ کے ابتداء خلافت میں قحط پڑا اور ہر شے گراں ہوگئی جس کے باعث لوگ پریشان حال ہوگئے اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے مویشی مرنے لگے۔ اس وقت حضرت عمر کو جو بھی غلہ میسر آتا تھا سب میں حصہ رسد برابر تقسیم کر دیتے تھے۔ نہ اپنے حصہ میں کبھی زیادتی کرتے اور نہ کبھی اپنے کو ترجیح دیتے جو ناداری اور تنگ حالی عام مسلمانوں کو لاحق تھی اسی میں آپ اپنے کو بھی مبتلا رکھتے تھے۔

حضرت عمرؓ ایک روز اپنا دُرّہ کندھے پر رکھے ہوئے مدینہ منورہ کے راستوں اور گلیوں

میں گھوم رہے تھے کسی کا کوئی کام ہوتا تو اس کو خود انجام دیتے تھے۔ کسی دوسرے کے حوالے نہ کرتے تھے۔ اسی دوران میں ایک انصاری بچے پر گذر ہوا جو رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا "الٰہی عمرؓ کے مقابلہ میں میری مدد فرما تو ہی اس پر ظلم کر"

حضرت عمرؓ سن کر غضب ناک ہو گئے اور دُرّہ لے کر اس کی طرف بڑھے۔ وہ خوف زدہ ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حضرت عمرؓ نے انا للہ پڑھی اور اس کے پاس کھڑے ہو کر اس کی تکلیف کے باعث رونے لگے اور فرمایا کم بخت عمر

قَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ۔ تو نے ایک پاکیزہ جان کو بلا قصاص کے
لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ۔ ہلاک کیا۔ بلاشک تجھ سے بہت برا کام سرزد ہو گیا۔

کل کو بارگاہِ خداوندی میں کیا عذر پیش کرے گا؟

پھر بچے کے سر کو زمین سے اٹھا کر اپنی ران پر رکھ لیا اور روتے رہے آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر بچے کے چہرے پر گر رہے تھے۔ اتنے میں اہل لوگ جمع ہو گئے اور حضرت عمرؓ کو اس حال میں حواس باختہ پریشان دیکھ کر رونے لگے پھر دریافت کیا امیر المومنین کیا بات ہے؟ کیا ماجرا ہے؟ اور یہ کیا حادثہ پیش آیا؟۔

حضرت عمرؓ نے بچہ کا سارا قصہ بیان کیا اور اس کو مسجد میں لے جانے کا حکم فرمایا۔

پھر جب وہ بچہ ٹھیک ہو گیا تو آپ نے اس سے فرمایا میرے پیارے بچے کیا بات ہے جو تو عمرؓ کے مقابلہ میں خدا سے مدد مانگ رہا ہے؟ کیا عمرؓ نے تجھ پر کوئی ظلم کیا ہے! یا تیرا مال غصب کیا ہے؟ یا تجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف پہنچائی ہے؟ یا مجھے کسی خیر سے محروم رکھا ہے؟

بچے نے جواب دیا خدا کی قسم ان میں سے کوئی بھی بات نہیں ہوئی بات یہ ہے کہ میں ایک انصاری بچہ ہوں میرے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ میں شہید ہوئے اور میرے چچا یوم حدیبیہ میں شہید ہوئے اور میرے ماموں بھاگ کر جنگ میں شہید ہوئے بھاگتے ہوئے نہیں مارے گئے۔ اب آپ کی خلافت میں ہیں اور میری والدہ اور دو بہنوں نے آج تین شب و روز سے کچھ نہیں کھایا بھوک اور بے چینی انتہا کو پہنچ گئی۔

امیر المومنین جو کچھ میری زبان سے نکلا اس کا باعث یہ تنگی اور سختی ہے جس کو میں نے بیان کیا۔

یہ حال سن کر حضرت عمرؓ رونے لگے حاضرین بھی رونے لگے حتیٰ کہ عورتیں بھی گھروں میں رونے لگیں پھر حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور حاضرین کو خطاب فرمایا۔

حمد و ثنا کے بعد فرمایا لوگو یہ دنیا دنیا والوں کا اصل گھر ہے نہ حقیقی قیام گاہ ہے اور آخرت اصلی ٹھکانہ ہے اور محل جزا اور سزا ہے۔ جن صحابہ کا حافظہ قوی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا سے تشریف لے گئے تو آپ کے پاس نہ کوئی تہہ شدہ کپڑا تھا اور نہ کوئی غیر مستعمل برتن تھا اور نہ کوئی دروازہ پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی میدے اور گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے اور آخر تک کبھی آپ کے دسترخوان پر دو سالن نہیں کھائے گئے باوجودیکہ آپ کو حق تعالیٰ نے تمام مخفی خزانوں کی کنجیاں عطا فرمائی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ نہ کبھی نیا کپڑا پہنا اور نہ کبھی عمدہ نفیس کپڑا استعمال فرمایا اور نہ مال و دولت ہی جمع کیا جس سے اہل و عیال گزر بسر کرتے اور نہ کبھی کوئی خادم و غلام رکھا اور دنیا سے اپنا دامن بچا کر صحیح و سالم تشریف لے گئے۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور خود آپ سے سنا آپ ارشاد فرما رہے تھے، جب فقر و تنگی کو آتے دیکھو تو کہو صالحین کی مرغوب پسندیدہ خصلت آ رہی ہے اور جب تونگری اور فراخی کو آتے دیکھو تو سمجھ لو کہ کوئی خطا سرزد ہوئی جس کی پاداش میں جلدی کی گئی ہے۔

غور سے سن لو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اس شخص میں اخوت اسلامی نہیں جو خود پیٹ بھر کر رات بسر کرے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کی ملک میں چالیس درہم سال بھر تک رکھے ہیں نہ کبھی ان کو راہِ مولیٰ میں خرچ کرے اور نہ کسی کارِ خیر میں صرف کرے اور کسی ضرورت مند محتاج سے بھی واقف ہو تو حق تعالیٰ قیامت کے دن اس کو جبارین کی صف میں کھڑا کریں گے اور ان درہم سے اس کو داغا جائے گا

لوگو خبردار ہو جاؤ تمہارا یہ مال و متاع قیامت کے دن تمہارے لئے باعث ننگ و عار ہوگا اور تمہیں دوزخ میں لے جائے گا۔

خوب سمجھ لو جو شخص اپنی ذات کے لئے مال جمع کرتا ہے اس کے اس مال ہی سے اس کی پیشانی اور پشت داغی جائے گی۔ مال تھوڑا ہو یا زیادہ۔ البتہ جو شخص اپنے مال سے حقوق خداوندی ادا کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو سچ اور حق سمجھ کر اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اور خدا

کے خوف سے ڈرتا ہے اور اسی پر بھروسہ رکھے تو مجھے امید ہے کہ نارِ جہنم سے بچ نکلے گا اور اللہ اس کے حق میں مستقل نہ ہوگی اور میں پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اب بھی اس کی نجات محض فضلِ رحمانی اور کرم ربانی سے ہوگی۔ تمہیں چاہئے کہ خیر کی طرف سبقت کرو امور خیر میں سبقت ہی باعث رشک ہے۔ مجھو ہمیں جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے وہ غلط نہیں ہو سکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے قریب ہی قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے ہاتھ آئیں گے ان کی اولاد تمہاری غلام ہوگی اور ان کی زمینوں اور گھروں اور شہروں اور مال و دولت کے تم وارث ہو گے اس وقت تم اپنے اعمال اور کردار پر قائم رہنا۔ مجھے امید ہے کہ یہ زمانہ قریب ہی آنے والا ہے انشاء اللہ پھر آپ نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور کہا

اَللّٰھُمَّ مِنْکَ الرَّجَآءُ الٰہی تجھی سے امیدیں وابستہ ہیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور دریافت کیا امیر المومنین آپ نے جو کچھ بیان کیا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ہاں"

حضرت عثمانؓ یہ سن کر روتے ہوئے مسجد سے باہر آئے اور کہتے جاتے، ابنِ عفانؓ قیامت کے روز تجھے تیرے مال سے داغا جائے گا۔

پھر تھوڑی دیر بعد اونٹ، بکری، سونا چاندی، غلہ کھجور لے کر پہنچے اور فرمایا، اللہ کی راہ میں یہ میرا ایک تہائی مال حاضر ہے۔

حضرت عبد الرحمن بن عوف بھی اسی طرح اپنا تہائی مال لائے۔ پھر اور صحابہ نے مال لانا شروع کیا حتی کہ تمام مسجد اندر اس کے اردگرد کی جگہ بھر گئی۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے اس مال کو لوگوں میں تقسیم کرا دیا اور اس بچے کو بہت سا مال عطا فرمایا اور فرمایا عمر کے گھر والوں کو بھی حصہ رسد دوسروں کے برابر دینا۔ چنانچہ اس میں سے اونٹ کی گردن کا گوشت چند مٹھی کھجور اور تھوڑا سا آٹا امیر المومنین کے حصہ میں آیا اور آپ نے گھر والوں کو حکم دیا کہ اس کو جلد تیار کر کے خبر دیں۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ گھر والوں کے بلانے کے منتظر تھے کہ اتنے میں ایک بدوی آیا امیر المومنین کو سلام کیا اور سخت سست کہنا شروع کر دیا۔

امیرالمومنین نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ ارشاد فرمایا کہ بدویوں میں غلظت اور قساوت ہوتی ہے اس لیے کہ وہ نہ کتاب اللہ کو سیکھتے ہیں اور نہ ان کو دین کی سمجھ حاصل ہوتی ہے۔

بدوی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سچ اور برحق ہے آپ صادق و مصدوق ہیں لیکن میں بدوی کیوں کر ہوگیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت کی اور آپ کے سامنے جہاد کیا اور اکثر قرآن کا حافظ ہوں اور دینی امور میں کسی کا محتاج نہیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے مجھے اس کا علم نہ تھا۔

پھر آپ اس بدوی اور دیگر حاضرین کو ساتھ لے کر گھر تشریف لے گئے۔ ایک چھوٹا سا گھر تھا لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ستونوں پر چھت پڑی ہوئی تھی اور دسترخوان کی جگہ کھجور کے پتے بچھے ہوئے تھے سب بیٹھ گئے اور کھانا لایا گیا سب نے داہنے ہاتھ سے کھایا اور بدوی نے بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کیا یہ دیکھ کر امیرالمومنین کو طیش آگیا اور فرمایا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یافتہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بائیں ہاتھ سے کھاتے دیکھا ہے تمہیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے شیطان اس کے کھانے میں شریک ہو جاتا ہے۔

بدوی نے کہا، آپ نے سچ فرمایا بات وہی ہے جو آپ نے فرمائی لیکن اگر کسی شخص کے داہنا ہاتھ نہ ہو تو پھر وہ کس سے کھائے؟ اور اپنا داہنا ہاتھ نکال کر دکھایا جو کٹا ہوا تھا۔

امیرالمومنین نے شرمندہ ہو کر دریافت فرمایا یہ ہاتھ کو کیا ہوا؟ بدوی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں کٹ گیا۔

پھر بدوی نے اپنا اسلام لانے کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ میں اپنے اونٹوں میں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر گذر ہوا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے پاس اترنے کی درخواست کی آپ نے میری درخواست کو قبول فرمایا اور میرے یہاں اتر گئے میں نے کھانا حاضر خدمت کیا آپ نے کھانا تناول فرمانے سے انکار فرمایا میں نے انکار کی وجہ دریافت کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا چونکہ تم مشرک ہو اس لئے میں تمہارے یہاں کا کھانا نہیں کھا سکتا میں نے عرض کیا اشہد ان لا الٰہ الا اللہ وانک رسول اللہ

اس کے بعد میں چند بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شریک ہوا میں نے اس بارے میں چند اشعار بھی کہے ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سنایا ہے۔

ع الا ان کفی فی رضا اللہ نالھا
ضراب العدی فی اللہ من دون احمد"

وحلیت من دین النبی الذی لہ
علی دلیل ظاہر فی کل مشہد

فما قطعت حتی رایت مکانہا
وفلقت ھامات العدی بالمھند

فان قطعت کفی فیا رب مشہد
شہدت بھا والسیف یقطر فی یدی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے پھر دریافت فرمایا تمہاری معاش کا کیا ذریعہ ہے؟

بدوی نے کہا میرے پاس ایک لادو اونٹ ہے اس پر لکڑیاں لاد کر مدینہ لاتا ہوں اور ان کو فروخت کر کے اپنے کنبہ اہل وعیال پر خرچ کرتا ہوں۔

امیر المومنین نے دریافت فرمایا تمہارا داہنا ہاتھ تو ہے نہیں پھر لکڑیاں کس طرح اٹھاتے ہو؟

بدوی نے کہا کسی مسلمان سے مدد لے لیتا ہوں داہنا ہاتھ وہ لگا دیتا ہے اور بایاں ہاتھ میرا اپنا ہوتا ہے۔ امیر المومنین خدا کی قسم پہلے میں بہت قوی تھا لیکن اب بہت کم زور ہو گیا میری ہڈیاں نرم پڑ گئیں اور جسم کا گوشت سوکھ گیا۔

ع مطلب یہ کہ میرے ہاتھ کو جو کچھ دشمن کی طرف سے پہنچا اللہ کی رضا کے لئے اللہ کی راہ میں احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں پہنچا۔ میں نے نبی برحق کے دین کی حمایت کی جس کی حقانیت ہر ہر جگہ مجھ پر واضح ہو گئی۔ میرا ہاتھ اس وقت کٹا جب میں نے اس کا مقام علی دیکھ لیا اور دشمنوں کی کھوپریوں کو ہندی تلوار سے اڑا دیا۔ اگر میرا ہاتھ جاتا رہا تو کوئی حرج نہیں میں بہت معرکوں میں شریک ہو چکا جن میں میری تلوار میرے ہاتھ میں تھی اور اس سے خون کے قطرے گر رہے تھے۔

امیرالمومنین نے اس کی تعداد فرمائی اور اس کو ایک لادہ اونٹ پر سوار کرایا اور کھانے اور کھجور کا توشہ ساتھ کیا۔

پھر ایک روز امیرالمومنین نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر بارش کی دعا کی اور جس تنگی میں مسلمان مبتلا تھے اس سے خلاصی کی التجا کی۔ دعا قبول ہوئی اور صبح ہونے سے پیشتر حق تعالیٰ نے بادل بھیجے کئی دن بارش کا سلسلہ جاری رہا اور تمام سرزمین سرسبز و شاداب ہو گئی

حضرت مثنیٰ ابن حارثہ نے جنگ فارس کی اجازت طلب کی: امیرالمومنینؓ نے اس کے لئے ایک لشکر روانہ فرمایا اور حق تعالیٰ نے قادسیہ کو فتح کرا دیا۔ پھر متواتر فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مال و دولت کی انتہائی فراوانی ہو گئی اور مسلمان خوشحال فارغ البال ہو گئے۔ رجسٹر مرتب کئے گئے اور سب کے وظائف مقرر کئے گئے۔ پھر جب حق تعالیٰ شانہ نے امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں صحابہ کرام کے ہاتھوں ملک شام ملک عراق ملک مصر فتح کرا دیا تو حضرت عمر فاروقؓ نے منتخب اور چیدہ صحابہ عظام کو امراء متعین فرما کر اطرافِ ممالک میں انتظام کے لئے روانہ فرمایا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ کے وصال کا وقت قریب آگیا تو آپ نے مجھے بلایا اور اپنے سر کے قریب بٹھا کر فرمایا جب میں مر جاؤں تو تم مجھے اپنے ان ہاتھوں سے غسل دینا جن سے تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دیا تھا۔ پھر کفن پہنا کر حجرۂ اطہر دانور پر لے جانا اگر دروازہ خود بخود کھل جائے تو مجھے جوار نبی میں دفن کر دینا ورنہ وہاں سے لوٹا کر عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔ پھر جو بھی حق تعالیٰ فیصلہ فرما دیں۔

وہ احادیث جن میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں کا تذکرہ ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سامنے سے آتے نظر آئے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

علیؓ یہ دونوں انبیاء و مرسلین کے بعد تمام اگلے پچھلے ادھیڑ عمر اہل جنت کے سردار ہیں۔

لیکن علیؓ تم ان کو اس کی اطلاع نہ کرنا۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آیت وجبریل و صالح المومنین الخ میں صالح مومنین علی بن ابی طالب اور ابوبکرؓ اور عمرؓ مراد ہیں۔ حضرت ابو صادق سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ دونوں نے بیان کیا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے ارشاد فرمایا میرے بعد میری امت میں سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں ان کے بعد پھر عمرؓ سب سے افضل ہیں۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی پر سہارا دیتے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے راستے میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے ملاقات ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "علی ان سے محبت رکھنے والا جنت میں جائے گا۔"

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہم پر کسی کو بھیجنا چاہتے تھے اس وقت آپ کے دائیں اور بائیں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ ان میں سے ایک کو بھیج دیجئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "میں ان کو کس طرح بھیج سکتا ہوں۔ یہ دونوں تو دین کے لئے بمنزلہ کان اور آنکھ کے ہیں"۔

یعنی ان دونوں حضرات کا وجود دین کے لئے خاص اہمیت اور شان رکھتا ہے جس کے نقصان سے دین میں نمایاں کمی اور خرابی محسوس ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر نبی کے کچھ خصوصی معاون و مددگار رفیق کار ہوتے ہیں اور مجھے حق تعالیٰ نے چودہ معاون و مددگار رفقاء کار عطا فرمائے جن میں سات قریشی ہیں۔ علیؓ۔ حسنؓ۔ حسینؓ۔ حمزہؓ۔ جعفرؓ۔ ابوبکرؓ۔ عمرؓ۔

اور سات انصاری ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ۔ سلمانؓ۔ ابوذرؓ۔ مقدادؓ۔ حذیفہؓ عمارؓ۔ بلالؓ۔ رضی اللہ عنہم۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے ارشاد فرمایا اگر تم ابوبکرؓ کو خلیفہ مقرر کروگے تو ان کو دنیا سے بے رغبت اور آخرت کا مشتاق پاؤ گے۔ اور اگر عمرؓ کو خلیفہ مقرر کروگے تو ان کو زور دار امانت دار پاؤ گے۔ اور اگر علیؓ کو خلیفہ مقرر کروگے تو وہ تمہیں سیدھی راہ پر قائم رکھے گا اور حق پر چلائے گا۔

(ف) ارشادِ نبوی سے خلفاء راشدین کی ترتیب خلافت اور ذاتی خصوصیات اور ان کی اہم دینی خدمات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں گے ان کے دورِ خلافت میں صحابی صحابہ کا ہر سو جلوہ ہوگا اور یہ نجوم شریعت ہر طرف رونق افروز ہوں گے، اس وقت ان کی رہنمائی اور رہبری کے لئے حضرت ابوبکر صدیق کی ضرورت ہوگی جو زہد وتقویٰ کا مجسم ہوں گے اور آخرت کے سراپا مشتاق ومنتظر اور بے قرار تاکہ ان کو دیکھ کر صحابہ کرام کا اصلی رنگ قائم رہے۔

پھر حضرت عمرؓ خلیفہ ہوں گے اسلام اور مسلمین کو عروج وفروغ ہوگا۔ فتوحاتِ اسلامی میں افزونی اور مال ودولت کی فراوانی ہوگی اس وقت ان کو قابو اور اعتدال میں رکھنے کے لئے حضرت عمرؓ کی ضرورت ہوگی جو اپنی سخت گیری اور امانت داری سے خود بھی متاعِ دنیوی سے محفوظ اور مامون رہیں گے اور دوسروں کو بھی محفوظ اور مامون رکھیں گے اور دنیا کی بہتات کے باوجود دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کا شوق قائم رہے گا۔

پھر فتنوں کا آغاز ہوگا اکثریت غیر صحابی کی ہوگی اور انھیں کو غلبہ ور قوت ہوگی جس پر قابو پانا اور حق پر قائم رہنا دشوار ہوگا۔ یہ خدمت حضرت علیؓ انجام دیں گے اور استقلال کے ساتھ خود بھی صراطِ مستقیم پر قائم رہیں گے اور دوسروں کو بھی قائم رکھیں گے۔ ارشادِ نبوی میں دورِ عثمانی کا تذکرہ نہیں کیا گیا اسی لئے یہ کلمات طیبات ارشاد فرمائے کہ تم علیؓ کو عمر کے بعد خلیفہ نہ بناؤ گے پھر جب خلیفہ بناؤ گے تو ان کی یہ خصوصیات سامنے آئیں گی۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بارہ میں حضرت علیؓ کے اقوال

ایک قریشی حضرت علیؓ کے پاس آیا اور عرض کیا۔ "امیر المومنین آپ ابھی منبر پر فرما رہے تھے اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْنِیْ بِمَا اَصْلَحْتَ بِہِ الْخُلَفَاءَ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ۔

وہ خلفاء راشدین کون ہیں؟

حضرت علیؓ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا گئے اور فرمایا تیرے حبیب اور چچا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں امام ہدیٰ اور شیخ الاسلام اور قریشی تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مقتدیٰ بنے۔ جس نے ان کی اقتدا کی محفوظ ہوگیا۔ اور جس نے ان کا اتباع کیا صراطِ مستقیم تک پہنچ گیا اور جس نے ان کا پلہ پکڑ لیا وہ حق تعالیٰ کی جماعت میں داخل

ہو گیا حزب اللہ ھم المفلحون حضرت علیؓ سے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا واللہ تم ایک واقف کے پاس آتے ہو۔ دونوں امام ہدیٰ تھے۔ اور راہِ راست اور صراط مستقیم پر چلانے والے مصلح قوم اور فایز المرام تھے۔ یہ دونوں حضرات فارغ البال صحیح و سالم دُنیا سے تشریف لے گئے۔

عبد خیر سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ قیامت تک جس قدر حکام و سلاطین آئیں گے حق تعالیٰ نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اُن کے لئے راہبر اور حجت بنا کر بھیجا ہے۔ یہ حضرات بہت پہلے تشریف لے گئے اور اپنے پسماندگان کو خوب تھکا دیا۔ ان کا تذکرہ امت کے لئے موجب رنج و غم ہے اور سلاطین کے لئے باعث طعنہ۔

حضرت علیؓ سے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا۔ یہ دونوں حضرات ان ستر آدمیوں میں سے ہیں جن کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی۔ اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرحمت ہوئے تھے۔

عبدالرحمن بن ابزی کے صاحبزادہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک جنازہ کے ساتھ تھے حضرت علیؓ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے جنازہ کے پیچھے چل رہے تھے اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ جنازہ کے آگے تھے۔ حضرت علیؓ فرمانے لگے یہ دونوں حضرات جانتے ہیں کہ جنازہ کے پیچھے چلنے والے کی فضیلت آگے چلنے والے پر ایسی ہے جیسے جماعت سے نماز پڑھنے والے کی تنہا نماز پڑھنے والے پر لیکن ان کے مزاج میں سہولت ہے لوگوں کے لئے سہولت پسند کرتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا حضرت ابو بکرؓ بہت آہ کرنے والے اور رقیق القلب تھا اور حضرت عمرؓ خالص اعتقاد رکھتے تھے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ خلوص کا معاملہ کیا۔

حضرت علیؓ نے منبر پر فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبقت کی حضورؐ کے بعد حضرت ابو بکرؓ تھے وہ بھی تشریف لے گئے تیسرے درجہ پر حضرت عمرؓ تھے وہ بھی رخصت ہوتے ان کے بعد اب فتنوں سے سابقہ پڑ گیا۔ خدا جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا میں تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہترین شخص بتاؤں۔ حاضرین نے عرض کیا ہاں بتایئے آپ نے فرمایا حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ ہیں۔

عبد خیر سے مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا سب انبیاء علیہم السلام میں بہتر طریق پر رسول اللہ صلعم کا وصال ہوا حضور کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا اور آپ کی سنت پر چلے اور باقی لوگوں میں سب سے اچھے طریق پر ان کی وفات ہوئی۔ اور آپ حضور کے بعد اس امت میں سب سے افضل تھے ان کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا اتباع کیا اور ان کی سنت پر چلے باقی لوگوں میں سب سے اچھے طریق پر وفات پائی اور حضرت عمرؓ اس امت میں حضور اور حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ سب سے افضل ہیں۔

حضرت علیؓ نے فرمایا امت محمدیہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سب سے افضل ہیں۔ اور اگر میں چاہوں تو تیسرے کا نام بھی لے سکتا ہوں۔ اور بعض روایات میں ہے کہ تیسرے درجہ میں حضرت عثمانؓ ہیں۔

حضرت علیؓ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہؓ نے پھر کہا اے باپ تیسرے درجہ میں آپ ہیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا اے بیٹے تمہارا باپ تو عام مسلمانوں میں سے ایک مسلمان ہے جو اجر اُن کے لئے ہے وہی اس کے لئے ہے اور جو مواخذہ ان سے ہوگا وہی مواخذہ اس سے ہوگا۔

حضرت علیؓ کا اُن لوگوں کی تردید کرنا جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بُرا کہتے ہیں یا حضرت علیؓ کو ان پر فوقیت دیتے ہیں

حضرت علقمہؓ نے کوفہ کے منبر پر ہاتھ مار کر کہا کہ حضرت علیؓ اس منبر پر وعظ فرما رہے تھے۔ اثناءِ تقریر میں فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض اشخاص حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ پر مجھے فوقیت دیتے ہیں اگر میں پہلے ممانعت کر دیتا تو ضرور اس کی سزا دیتا لیکن میں اعلان سے قبل سزا دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر کسی شخص نے آئندہ یہ خیالات ظاہر کئے اور میرے روبرو پیش کیا گیا تو چونکہ یہ شخص مفتری ہے لہذا اس کو مفتری کی سزا دی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں، پھر عمرؓ، پھر واللہ اعلم کون ہے۔ اس لئے کہ ان کے بعد ہم نے نئی نئی باتیں گھڑی کر دیں جن میں حق تعالیٰ جو چاہے فیصلہ فرمائے۔

محبت اور عداوت میں حد سے نہ بڑھنا چاہیئے ممکن ہے کہ دوست دشمن ہو جائے اور

دشمن دوست ہو جاتے۔ اور تمہیں اس کے باعث ندامت اور شرمندگی اٹھانی پڑے)

حضرت علیؓ کو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن سبا ان کو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ پر فوقیت دیتا ہے۔

آپ نے فرمایا میں نے اس کے قتل کا ارادہ کر لیا ہے۔ جب آپ سے کہا گیا کہ ایسا شخص جو آپ سے محبت رکھتا ہے اور آپ کو افضل سمجھتا ہے آپ اُس کو قتل کرتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا واللہ جس شہر میں میں ہوں یہ وہاں نہیں رہ سکتا اور اس کو شہر بدر کر دیا۔

حضرت علیؓ ایک دن کوفہ میں فیصلہ کر رہے تھے کہ ایک شخص نے عرض کیا اے خیر الناس میرے معاملہ میں غور کیجئے واللہ میں نے آپ سے بہتر آدمی نہیں دیکھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اس شخص کو سامنے پیش کرو۔ وہ سامنے حاضر ہوا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا۔ کیا تم نے رسول اللہ صلعم کو دیکھا ہے اس نے عرض کیا نہیں۔ حضرت علیؓ نے پوچھا۔ کیا تم نے حضرت ابو بکرؓ عمرؓ کو دیکھا ہے اس شخص نے عرض کیا نہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ تو نے رسول اللہ صلعم کو دیکھا ہے تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔ اور اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ تو نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو دیکھا ہے تو صرف تنبیہ و تہدید کرتا لیکن جب ایسا نہیں تو جو چاہے کہتا پھر۔

سوید بن غفلہ سے مروی ہے کہ میں ایک مجمع پر سے گذرا جو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی تنقیص کر رہے تھے۔ میں حضرت علیؓ کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ بعض شیعوں کے پاس سے گزر ہوا جو شیخین کا ذکر کر رہے تھے۔ اور اُن کی تنقیص کر رہے تھے۔ اگر وہ یہ نہ سمجھتے کہ آپ اُن کے ہم خیال ہیں اور اس خیال کو پوشیدہ رکھتے ہیں تو ہرگز ایسی جرأت نہ کرتے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا خدا کی پناہ میں اور ان کی نسبت خوبی اور بھلائی کے سوا کچھ بھی دل میں رکھوں۔ اُس شخص پر خدا کی لعنت جو ان کے متعلق خوبی اور بھلائی کے علاوہ کوئی خیال پوشیدہ رکھے یہ دونوں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی اور وزیر تھے۔ پھر آپ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے گھر سے نکلے اور منبر پر چڑھے۔ آپ کے آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور ڈاڑھی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی اور اس کو دیکھ رہے تھے (اور ڈاڑھی سفید ہو گئی تھی) جب لوگ جمع ہو گئے آپ کھڑے ہوئے اور ایک بلیغ مختصر خطبہ پڑھا اور فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جو سرداران قریش کو جو مسلمانوں کے لئے بمنزلہ باپ کے تھے ایسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں جن سے میں بری

ہوں جو کچھ وہ کہتے ہیں اور ان کے اس قول کی سزا دینے والا ہوں۔ اس ذات پاک کی قسم جس
نے دانہ کو شق کیا اور ہر ذی روح کو پیدا کیا۔ مومن پرہیزگار ہی ان سے محبت کرتا ہے اور فاجر بدبخت ہی
ان سے کینہ رکھتا ہے۔ ان دونوں حضرات نے صدق و وفا کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کا ساتھ دیا۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے اور سزائیں دیتے تھے۔ اور جو کچھ
کرتے تھے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے سے ہرگز تجاوز نہ ہوتا تھا۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم ان حضرات کی رائے کی برابر کسی کی رائے نہ سمجھتے تھے۔ اور ان جیسی محبت
بھی کسی سے نہ فرماتے تھے۔ حضورؐ ان سے خوش تشریف لے گئے۔ اور مسلمان بھی ان سے
خوش رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لئے حضرت ابوبکرؓ کو اپنا نائب
بنایا۔ جب حق تعالیٰ نے اپنے نبی کو بلا لیا تو مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنایا اور
زکوٰۃ ان کے حوالہ کی اس لئے کہ زکوٰۃ اور نماز کا اسلام میں ایک درجہ ہے۔ (جب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لئے اپنا قائم مقام بنایا تو زکوٰۃ لینے میں بھی آپ کے قائم
مقام ہوں گے) بنو عبدالمطلب میں میں پہلا شخص تھا جس نے ان کے لئے سہولتیں بہم
پہنچائیں۔ بعض لوگ اس کو ناپسند کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بعض کا زکوٰۃ دینا بھی کافی ہے
خدا کی قسم آپ باقی لوگوں میں سب سے افضل اور نرم دل اور رحیم اور متقی اور متقدم
الاسلام تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نرمی اور رحم دلی میں حضرت میکائیل
علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی اور عفو و وقار میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت
ابوبکرؓ آخر وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر چلتے رہے۔ اور اپنے بعد
حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنایا۔ اس معاملہ میں لوگوں سے مشورہ کیا کچھ لوگ حضرت عمرؓ کی خلافت
سے ناخوش تھے اور میں ان لوگوں میں تھا جو خوش تھے۔ واللہ حضرت عمرؓ اس وقت تک دنیا
سے تشریف نہیں لے گئے جب تک کہ ناپسند کرنے والے بھی ان کو پسند کرنے لگے۔ حضرت
عمرؓ نے ہر کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا اتباع کیا اور ان کے آثار
پر اس طرح چلے جیسے بچہ اپنی ماں کے نشانات قدم پر چلتا ہے۔ واللہ حضرت عمرؓ باقی لوگوں
میں سب سے بہتر اور نرم دل اور رحیم اور ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کی مدد کرنے والے تھے حق
تعالیٰ نے ان کی زبان پر حق بات جاری کر رکھی تھی۔ جب بولتے تو ہم سمجھتے ایک فرشتہ ہے جو
عمرؓ کی زبان سے بول رہا ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کے اسلام کی وجہ سے اسلام کو عزت

دی اور ان کی ہجرت کو دین کی مضبوطی کا باعث بنایا۔ اور مومنوں کے قلوب میں ان کی محبت اور کافروں اور منافقوں کے دلوں میں ان کی ہیبت پیدا کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن پر سختی اور بد خلقی میں ان کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی اور غیظ و غضب میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ۔ کیا تمھارے پاس ان جیسا کوئی ہے؟ کوئی شخص بغیر ان سے محبت کئے اور بغیر ان کا اتباع کئے اُن کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ جو شخص ان سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور جو شخص ان سے بغض رکھتا ہے وہ مجھ سے بغض رکھتا ہے اور میں اس سے بری ہوں۔ اگر میں پہلے اس کی ممانعت کر دیتا تو اس وقت سخت سزا دیتا۔ البتہ آئندہ جو شخص اس خیال کا میرے پاس لایا جائے گا اس کو وہ سزا ملے گی جو مفتری کو ملنی چاہیئے۔

کوفہ میں ایک شخص حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا جو شیخین کو بُرا کہتا تھا حضرت علیؓ نے اپنے غلام سے فرمایا اے قنبر اس کی گردن اڑا دو۔ اس شخص نے عرض کیا آپ میری گردن کیوں اڑواتے ہیں۔ میں تو آپ کی ہی وجہ سے ان پر غصہ ہو رہا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا یہ کیوں کر؟ اس شخص نے عرض کیا میں ایک غریب آدمی ہوں جس کو رسول اللہ صلعم کی صحبت میسر نہیں ہوئی اور نہ یہ معلوم کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا رتبہ حضور کے یہاں کیا تھا۔ اور تمھارے یہاں اُن کی کتنی عظمت ہے۔ البتہ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا جو اکثر آپ کے پاس آتے جاتے ہیں وہ آپ کو ان دونوں سے افضل بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ انھوں نے ظلماً آپ کی حق تلفی کی اور پہلے خود خلیفہ بن گئے۔ حضرت علیؓ نے پوچھا کیا تو ان لوگوں کو جانتا ہے، اس شخص نے جواب دیا نام نہیں جانتا مگر ہاں صورت دیکھ کر پہچان سکتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا واللہ خدا اور رسول کے حکم سے یہ دونوں مجھ سے پہلے خلیفہ بنے اور مجھ پر ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا۔ اور اگر تو اپنی غربت اور شیخین کی نسبت اپنی کم علمی کا اعتراف نہ کرتا تو میں اس وقت تیری گردن اڑا دیتا۔ پھر غلام سے فرمایا اے قنبر نماز کے لئے منادی کرو۔ اور ظہر کا وقت تھا لوگ جمع ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے اوّل نماز پڑھائی پھر منبر پر چڑھے اور حق تعالیٰ شانہٗ کی کما حقہ حمد و ثنا کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جیسا چاہیئے تھا درود و سلام بھیجا۔ اور مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا۔ حق عزّ و جل نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے وقت بھیجا جب کہ اسلام پرانا ہو گیا اور دین کی رونق جاتی رہی تھی اور کفر کی وجہ سے ظلمت

پھیل گئی تھی اور لوگ زمانہ جاہلیت کی گمراہیوں میں پڑے ہوئے بتوں کی عبادت اور
مورتیوں کی تعظیم کرتے تھے اور اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کا انکار کرتے تھے۔ ایسے وقت
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک اللہ ذات پاک کے سوا کوئی معبود نہیں۔
لوگوں نے حضور کو جھٹلایا اور کہا اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ
لیکن حضرت ابوبکرؓ نے آپ کی تصدیق کی اور میں اُس وقت بچہ ہی تھا اپنے آپ کو بھی
نہیں بچا سکتا تھا اور رسول اللہ صلعم کی پرورش اور آپ کے گھر میں رہتا تھا۔ اس
حالت میں حضرت ابوبکر ہمیشہ حضورؐ کے ساتھ رہے لوگوں سے لڑتے جھگڑتے رہے اور
ان کو ڈراتے دھمکاتے لیکن خود ان کے ڈرانے سے نہ ڈرتے تھے۔ اور امورِ دین کو کھلم کھلا
کرتے۔ اور اپنے ایمان کو نہ چھپاتے۔ حتیٰ کہ قریش کہنے لگے کہ ابن ابی قحافہ تو مجنوں ہو گیا۔ اسلام
کے لئے ابوبکرؓ ہی احق اور اولیٰ تھے۔ رسول اللہ صلعم کو ان سے زائد کسی سے محبت نہ تھی۔ اور
حق تعالیٰ کی بارگاہ میں حضورؐ کے بعد ان سے زائد صاحب اکرام کوئی نہیں اور نہ کوئی شخص دُنیا
و آخرت میں ابوبکرؓ سے بہتر اور افضل ہے۔ بعض لوگ مجھے شیخینؓ سے افضل کہتے ہیں ان کے
قلوب میں بقیہ نفاق ہے اور اس سے ان کا مقصود مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا اور امتِ محمدیہ میں
اختلاف پیدا کرنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا حال پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا
اور ان کے قتل کا حکم فرما دیا تھا۔ اور قریب ہی آخر زمانہ میں ان کی حکومت ہوگی جس میں
خسران و نامرادی کی آفت بڑھ جائے گی۔ اور شریر روافض کی تبلیغ کو عروج ہوگا۔ اور ان
کے مخالف ذلیل ہوں گے۔ حق مٹ جائے گا۔ اور رفض و بدعت اور گناہ و بدکاری کھلم کھلا
ہوگی۔ اور دولت سب ان کے پاس منتقل ہو جائے گی۔ عزت ان کو حاصل ہوگی اور ان کی
سوءِ حالی نرم پوشاک اور عمدہ لباس سے بدل جائے گی۔ اس وقت جو لوگ علانیہ بھائی
بھائی ہوں گے وہ باطن میں دشمن ہوں گے۔ کذب ان کے نزدیک خوبی ہوگا اور بدکاریاں
ان سے ظاہر ہوں گی۔ اور باوجود مغلظ قسموں کے عہد و پیماں کی پرواہ نہ کریں گے۔ اور نقضِ
عہد کریں گے۔ قرآن کو بغیر سوچے و سمجھے پڑھیں گے۔ اور معارف و علوم کو لغویات سے
بدل لیں گے۔ مصاحف کو معطل اور بے کار کر دیں گے۔ اور پے در پے معاصی کریں گے۔ صحابہ
رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سب و شتم ان کی بُرائی ان لوگوں کا مذاق ہوگا اور صحابہ کے اُن
واقعات کا اتباع کریں گے جن کو حق تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے۔ اس سے مقصود صحابہ

کی تعمیر اور تزئین ہوگی، باتیں چھوٹا بڑے سے سیکھے گا اور انہی عبادات میں فسود نما ہوگا پس سنت مٹ جائے گی اور بدعت کا احیاء ہوگا اس زمانہ میں جو شخص متبع سنت ہوگا وہ افضل الشہداء اور افضل العباد اور افضل المجاہدین ہے۔ ان کے لئے بشارت ہے۔ ان کی مصیبت کس قدر بڑی ہوگی۔ اس زمانہ میں ہم سے زیادہ بڑا بلا میں مبتلا ہوگا۔ حق تعالیٰ مسلمان کے ایمان کو کم کر دیا اور ان کے اعمال برے کر دیئے جس سے خدا کی زمین ان پر غضبناک ہوگی اور آسمان باوجود ناخواستہ ان کو سایہ کرے گا اور تختہ زمین پر کوئی شخص عنداللہ ان سے زیادہ مبغوض نہ ہوگا۔ ان کی علامات بہت ہیں۔ جن سے یہ پہچانے جا سکتے ہیں۔ جماعت کا چھوڑنا اور سلف صالحین میں گفتگو کرنا۔ اور نمازوں میں تاخیر کرنا اور سنت کی تردید کرنا۔ اور آثار صحابہ کو نہ ماننا۔ اور کفار سے یگانگت۔ اس وقت ان کے سلاطین کا لباس حریر و دیباج ہوگا۔ اور مغنیات کو رکھیں گے مکتوں کی خرید و فروخت کرنا اور دین کا ضائع کرنا اور زنا کو حلال سمجھنا اور سود کھانا اور آزاد کی خرید و فروخت اور دین اور طریق سنت کا مذاق اڑانا۔ اور مرگ مفاجات۔ اور بازاروں میں عورتوں کی خرید و فروخت اور راستوں کا بند ہونا۔ اور ذمیوں کا حاکم ہونا۔ اور اہل مذہب کی ذلت اور کمینوں کا سوار ہونا اور غریب کا قتل اور غلاموں کا دولت مند ہونا۔ اور مخنثوں کی کثرت اور عورتوں کا سوار ہونا۔ اور بلند و پختہ عمارتیں بنانا اور اہل ہوی اور اہل بدعت کی طرف طبیعتوں کا مائل ہونا اور صاحب ثروت کی تعظیم کرنا۔ اس زمانہ کے علماء آسمان کے نیچے رہنے والوں میں سب سے زیادہ شریر ہوں گے۔ انہی سے فتنہ و فساد نکلے گا اور ان کی طرف لوٹ جائے گا عالم ملکوت میں ان کا نام ارجاس ( ) و انجاس ( ) ہوگا۔ جب اصحاب رسول اللہ صلعم کو محفلوں اور مجلسوں اور مسجدوں میں لعنت کی جائے گی اور لوگ اس کو اپنا شغل بنائیں گے تو حکمت سینوں سے نکل جائے گی اور ایک سبز و سرخ ہوا نازل ہوگی جس سے حق تعالیٰ ان کو بندر اور سور کی شکلوں میں مسخ کر دیں گے۔

لوگوں نے عرض کیا اے امیر المومنین اگر ہم اس زمانہ کی باتیں تو کیا کریں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا ایسے رہنا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفقاء رہے اور صبر کرنا۔ اور جس راستہ پر ہم ہیں اس پر استقامت سے قائم رہنا اور حق تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت

اور صحابہ کی محبت کا حکم فرمایا ہے۔ تم اس پر جمے رہنا۔ اور روافض کے پاس اٹھنا بیٹھنا
چھوڑ دینا، ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کیا کہ جنگلوں میں چلے گئے اور مشقتوں
کو برداشت کیا۔ اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ حق اور سنت پر مرنا بدعت اور عصیان کی
حیات سے بدرجہا بہتر ہے۔ خوب سمجھ لو کہ نبی صلعم کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر
صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔ پھر عثمانؓ ذوالنورین اور پھر میں ہوں۔ میں نے تمہارے
روبرو اور تمہاری پیٹھ پیچھے یہ صاف صاف کہہ دیا اب تمہیں مجھ پر حجت کی گنجائش نہیں۔
اور میں اللہ بالا و برتر سے اپنے اور تمہارے اور تمام مسلمان بھائیوں کے لیے دعائے
مغفرت کرتا ہوں۔

وہ احادیث جو حضرت علیؓ کے فضائل میں

حضرت عمرؓ سے مروی ہیں

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں جنگ خیبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
کل ایسے شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے۔ اور اللہ اور رسول
اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ شخص حملہ آور ہے۔ پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ حق تعالیٰ اس
کے ہاتھ پر فتح دیں گے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام اس کے دائیں جانب اور حضرت
میکائیل علیہ السلام اس کے بائیں جانب ہوں گے۔ یہ شب ہر مسلمان نے اس خواہش
میں گذاری کہ وہ شخص میں ہوں۔ جب صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا علی بن ابی طالب
کہاں ہیں نظر نہیں آتے۔ لوگوں نے عرض کیا وہ آشوب چشم میں مبتلا ہیں حضور صلی
اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان کو میرے پاس لاؤ۔ حضرت علیؓ خدمت میں حاضر
ہوئے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا مجھ سے قریب ہو۔ وہ قریب ہو گئے۔ پھر حضورؐ نے
ان کی آنکھوں میں تھوکا اور آنکھوں کو اپنے دست مبارک سے ملا اور حضرت علیؓ
حضورؐ کے سامنے سے ایسے اٹھے کہ گویا آنکھ دکھنے ہی نہ آئی تھی۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تین فضیلت ہیں اگر ان میں سے ایک بھی میرے لئے ہو
تو مجھے سرخ اونٹوں (یعنی نعمت) سے زائد محبوب ہے۔ حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ سے

نکاح - اور حضرت علیؓ کا رسول اللہ کے ہمراہ مسجد میں رہنا - کہ مسجد سے حالت جنابت میں گزرنا جیسا حضورؐ کے لئے جائز تھا، حضرت علیؓ کے لئے بھی جائز تھا - اور جنگ خیبر میں حضرت علیؓ کو جھنڈا دینا -

حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو حضرت علیؓ کو گالی دیتے ہوئے سنا تو فرمایا - میرے خیال میں تو منافق ہے - رسول اللہ صلعم نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم میرے ایسے قائم مقام ہو جیسے ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قائم مقام تھے لیکن چوں کہ میرے بعد نبوت ختم ہو گئی لہذا تم نبی نہ ہو گے -

جب حضورؐ غزوۂ تبوک کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ کو عورتوں اور صغار کی خبر گیری کے لئے مدینہ چھوڑ دیا - منافقین نے طعنہ دیا کہ حضور نے بزدلی کے باعث ان کو چھوڑا - جب حضرت علیؓ کو یہ معلوم ہوا تو تلوار نیزہ وغیرہ لے کر ملّا ئے اور مقام حرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے اور عرض کیا کہ منافقین کا یہ خیال ہے - حضورؐ نے اس کی تردید کی اور فرمایا تم بمنزلہ ہارون علیہ السلام کے ہو - جب حضرت موسیٰ علیہ السلام میقات کو جاتے وقت حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا گئے تھے ایسا ہی میں تمھیں اپنا نائب بنا کر لڑائی کے لئے جا رہا ہوں - حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبت میں نبی تھے - اب چوں کہ نبوت ختم ہو چکی لہذا تم میری عدم موجودگی میں نبی نہ ہو گے بلکہ صرف میرے قائم مقام ہو گے - اور حضرت علیؓ کو واپس کر دیا - اس حدیث سے حضرت علیؓ کا مستحق خلافت ہونا معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے خلیفہ نہیں ہوئے بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال سے چالیس سال قبل ان کا وصال ہو گیا تھا - البتہ حضرت علیؓ کے خلیفہ نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جیسا حضرت ہارون علیہ السلام میقات کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ ہوئے ایسا ہی تم بھی زمانہ سفر میں میرے خلیفہ ہو - اور جیسا ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ کے بعد ان کے خلیفہ نہیں ہوئے ایسا ہی تم بھی میرے بعد میرے خلیفہ نہ ہو گے -

جب وفد ثقیف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے
ان سے فرمایا تم اسلام لے آؤ۔ ورنہ حق تعالیٰ میری طرف سے ایسا شخص بھیجے گا جو تمہاری
گردنیں اڑا دے گا اور تمہارے بچوں کو قید کرے گا اور تمہارے مال و دولت کو چھینے گا۔
حضرت عمرؓ فرماتے ہیں میں نے اس روز کے علاوہ کبھی امارت کی تمنا نہیں کی اور میں اپنا سینہ
باہر نکال کر بار بار سامنے آتا تھا کہ شاید حضورؐ یہ ارشاد فرما دیں کہ وہ شخص یہ ہے۔ لیکن
حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا "وہ شخص
یہ ہے وہ شخص یہ ہے"

دو شخص حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور پوچھا باندی کی طلاق کے متعلق آپ کی کیا رائے
ہے کچھ لوگ حلقہ بنائے ہوئے کھڑے تھے ان میں ایک شخص تھا جس کے سر کے اگلے حصہ پر
بال نہ تھے۔ حضرت عمرؓ اس کے پاس گئے اور پوچھا مملوکہ کی طلاق میں تمہارا کیا خیال ہے
اس نے جواب دیا سو دو طلاق ہوں گی۔ ان میں سے ایک شخص بولا آپ امیر المومنین ہیں
اس لئے ہم آپ کے پاس آئے اور طلاقِ مملوکہ کا مسئلہ پوچھا اور آپ نے ایک دوسرے
شخص سے پوچھ کر جواب دیا اور اس شخص نے آپ سے بات بھی نہ کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا
کم بخت جانتا بھی ہے یہ کون ہیں۔ یہ علیؓ بن ابی طالب ہیں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا اگر آسمان و زمین ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور علیؓ کے ایمان کے
ہم وزن بوجھ دوسرے میں تو علی کا ایمان جھکا رہے گا۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے حضورؐ نے حضرت علیؓ کے متعلق ارشاد فرمایا جس
کا میں آقا ہوں اس کا علی بھی آقا ہے۔

حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر کر رہے تھے۔
جب غدیر خم (نام جگہ) پر پہنچے تو حضور نے حضرت علیؓ کو بلایا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر
حاضرین سے فرمایا "کیا میں مومنوں کو ان کی اپنی جان سے زیادہ عزیز نہیں؟" لوگوں
نے عرض کیا "ہاں" پھر فرمایا یہ میرا مولیٰ ہے اور ہر اس شخص کا سردار ہے جس کا میں سردار
ہوں۔ اَللّٰھُمَّ وَالِ مَن وَالَاہُ وَعَادِ مَن عَادَاہُ (اے اللہ جو علیؓ سے دوستی رکھے
تو اس کو دوست رکھ اور جو شخص علیؓ سے دشمنی رکھے تو بھی اس کو دوست نہ رکھ)

حضرت عمرؓ حضرت علیؓ سے ملے اور کہا مبارک ہو آج تم ہر مومن مرد و عورت کے دوست بن گئے۔ (حضرت اسامہ نے کسی بات پر حضرت علیؓ سے کہہ دیا تھا کہ تم میرے آقا نہیں بلکہ میرے آقا رسول اللہ صلعم ہیں؛ اس پر حضورؐ نے لوگوں سے ارشاد فرمایا اور مقصود حضرت اسامہ کو تنبیہہ کرنا تھا)

وہ احادیث جو حضرت عمرؓ کے فضائل میں حضرت علیؓ سے مروی ہیں

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللھم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب (اے خدا اسلام کو عمر بن الخطاب کی وجہ سے قوت اور نصرت دے)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شہر مدائن کو حق تعالیٰ نے فتح کرایا تو حضرت عمرؓ نے دسترخوان کے لئے حکم فرمایا اور دسترخوان مسجد میں بچھائے گئے۔ سب سے اول حضرت حسنؓ لپک کر آئے اور کہا اے امیر المومنین مالِ غنیمت سے میرا حق دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فراخی اور کرامت کی دعا دی اور ان کے لئے ایک ہزار کا حکم دیا۔ حضرت حسنؓ لوٹ گئے، اور حضرت حسینؓ آئے اور کہا اے امیر المومنین مالِ غنیمت سے میرا حصہ دیجئے حضرت عمرؓ نے ان کو بھی دعا دی اور ان کے لئے بھی ایک ہزار کا حکم فرمایا۔ یہ بھی لوٹ گئے۔ اور حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ آئے اور کہا اے امیر المومنین مال غنیمت سے میرا حصہ دیجئے حضرت عمرؓ نے ان کو بھی دعا دی اور ان کے لئے پانچ سو کا حکم فرمایا۔ حضرت عبداللہ نے عرض کیا اے امیر المومنین میں ایک طاقتور آدمی ہوں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تلوار چلائی جب کہ حسنؓ و حسینؓ بچے ہی تھے اور مدینہ کی گلیوں میں گھسٹتے پھرا کرتے تھے۔ آپ نے ان کو ایک ایک ہزار دیئے اور مجھ کو پانچ سو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، ہاں دیئے، تو بھی جا کر ان جیسے ماں، باپ ان جیسے نانا، نانی ان جیسے چچا، پھوپی، ان جیسے ماموں، خالہ لا، تو تجھے بھی ایک ہزار مل جائیں گے) اور تو ہرگز نہیں لا سکتا۔ اس لئے کہ حضرت علیؓ ان کے باپ ہیں اور حضرت

فاطمہؓ ان کی ماں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نانا ہیں اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ ان کی نانی ہیں حضرت جعفرؓ ان کے چچا تھے اور حضرت اُم ہانی ان کی پھوپی اور حضورؐ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم ان کے ماموں تھے۔ اور حضورؐ کی صاحبزادیاں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم ان کی خالہ۔ حضرت علیؓ نے جب یہ سُنا تو کہنے لگے رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے عمر بن الخطاب اہل جنت کے لئے چراغ ہیں۔ حضرت عمرؓ کو جب اس کی خبر ہوئی تو کچھ صحابہ کو لے کر حضرت علیؓ کے گھر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضرت علیؓ گھر سے نکلے حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ عمر بن الخطاب اہل جنت کا چراغ ہے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "ہاں" حضرت عمرؓ نے کہا "مجھے ایک رقعہ لکھ دو" حضرت علیؓ نے یہ لکھ کر آپ کو دیا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ هذا ما ضمن علی بن ابی طالب لعمر بن الخطاب عن رسول اللہ صلعم عن جبرئیل عن اللہ عزوجل ان عمر بن الخطاب سراج اہل الجنۃ فی الجنۃ (یہ وہ معاہدہ ہے جو علی بن ابی طالب نے عمر بن الخطاب سے کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بواسطہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے رب العزت والجلال کا یہ ارشاد بیان فرمایا ہے کہ عمر بن الخطاب اہل جنت کا چراغ ہے۔)

حضرت عمرؓ نے اس پرچہ کو لیا اور اپنے کسی صاحبزادہ کو دے کر فرمایا میرے مرنے کے بعد جب غسل و کفن وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ تو اس کو میرے ساتھ کفن میں لپیٹ دینا۔ تاکہ میں اپنے پروردگار کے سامنے اس کو لے کر حاضر ہوں۔ جب حضرت عمرؓ کا وصال ہوا اور تجہیز و تکفین سے فارغ ہوتے تو وہ پرچہ آپ کے کفن میں لپیٹ دیا اور آپ کو دفن کر دیا۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عمر بن الخطاب کے غضب سے بچا کرو جب عمرؓ غصہ ہوتے ہیں تو اس کی وجہ سے حق تعالیٰ غضب نازل فرماتا ہے

حضرت عمرؓ کے اقوال حضرت علیؓ کے مناقب میں اور بعض مسائل میں حضرت علیؓ کی رائے کی طرف رجوع کرنا

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اثنا خطبہ میں فرمایا کہ علی بن ابی

طالب ہم سے زیادہ خوبی کے ساتھ فیصلے کرتے ہیں اور ابی بن کعب قرآن سب سے اچھا پڑھتے ہیں۔

ایک مجنونہ عورت سے زنا کیا اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر کی گئی حضرت عمرؓ نے اس کو رجم کرانا چاہا تو حضرت علیؓ نے کہا اے امیر المومنین کیا آپ نے نہیں سنا حضور نے ارشاد فرمایا ہے تین شخص مرفوع القلم ہیں۔ مجنون ہوش میں آنے تک۔ اور بچہ بالغ ہونے تک اور سونے والا بیدار ہونے تک۔ پھر حضرت عمرؓ نے اس مجنونہ کو چھوڑ دیا۔

حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک حاملہ عورت پیش کی گئی۔ حضرت عمرؓ کے دریافت کرنے پر اس نے بدکاری کا اقرار کیا جس پر حضرت عمرؓ نے اس کے رجم کا حکم فرمایا۔ راستہ میں حضرت علیؓ نے اس عورت کو دیکھ کر پوچھا اس کا کیا معاملہ ہے لوگوں نے عرض کیا کہ امیر المومنین نے اس کے لئے سنگساری کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت علیؓ نے اس کو واپس کر دیا۔ اور جا کر حضرت عمرؓ سے پوچھا کیا آپ نے اس کو رجم کا حکم کیا؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا ہاں۔ اس نے میرے سامنے بدکاری کا اقرار کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا آپ کی یہ دلیل اس عورت پر چل سکتی ہے اور اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے آپ اس کو کس دلیل سے قتل کرتے ہیں اور شاید آپ نے اس کو ڈرایا دھمکایا ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا ہاں یہ تو ہوا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا کیا آپ نے نہیں سنا حضور نے ارشاد فرمایا ہے جو شخص مصیبت اور بلا کے بعد اقرار کرے اس پر حد نہیں اور مقید اور محبوس اور مکرہ کا اقرار معتبر نہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور فرمایا عورتیں علی بن ابی طالب جیسا جننے سے عاجز ہیں۔ اگر آج علی نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔

حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک عورت پیش کی گئی جو پیاس سے بے تاب ہو کر ایک چرواہے کے پاس گئی اور اس سے پانی مانگا۔ چرواہے نے جب تک کہ اپنے پر اس کو قدرت نہ دی پانی پلانے سے انکار کیا۔ اس عورت نے ایسا ہی کیا حضرت عمرؓ نے اس عورت کے رجم کے متعلق مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا میرے خیال میں یہ مضطر ہے لہذا اس کو چھوڑ دینا چاہیئے اور حضرت عمرؓ نے ایسا ہی کیا۔

حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک عورت حاضر کی گئی جس نے عدت میں نکاح کر لیا تھا حضرت عمرؓ نے ان میں تفریق کرا دی اور مہر بیت المال میں داخل کر دیا۔ اور فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نکاح کو رد کر دوں اور اس کا مہر جائز رکھوں۔ اور فرمایا کہ آئندہ کبھی یہ دونوں

نکاح نہ کریں۔ جب حضرت علیؓ کو یہ معلوم ہوا تو فرمایا اگر یہ لوگ سنت سے ناواقف ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جس کو عورت کو حلال سمجھا ہے اس لئے مہر دینا ہوگا اور ان دونوں میں تفریق کر دی جائے گی۔ بعد انقضاء عدت دوسروں کی طرح یہ بھی پیغام دے سکتا ہے حضرت عمرؓ نے وعظ کہا اور فرمایا امور جاہلیت کو سنت کے مطابق کرنا چاہیئے۔ اور حضرت علیؓ کے قول کی طرف رجوع کیا۔

حضرت عمرؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ مملوک کس قدر نکاح کر سکتا ہے؟ اور حضرت علیؓ سے کہا اے یمنی چادر والے تمہارے ہی سے سوال کرنا مقصود ہے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا " دو نکاح کر سکتا ہے"

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ہم ایک لڑکے کے جنازہ پر تھے۔ حضرت علیؓ نے اس لڑکے کے باپ سے کہا اس کی ماں سے ابھی جماع نہ کرنا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کیوں اس کی کیا وجہ۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا تاکہ حمل نہ ٹھہر جائے پھر وہ بچہ اپنے بھائی کی میراث کا دعوی کرے حالاں کہ وہ اس کا وارث نہیں ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے خدا جس پیچیدہ مسئلہ میں حضرت علیؓ کی رہنمائی نہ ہو میں اس سے پناہ مانگتا ہوں۔

ایک شخص نے حضرت علیؓ کے ظلم کی چارہ جوئی کی اس وقت حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی طرف دیکھا اور کہا اے ابوالحسن یہاں سے اٹھو اور اپنے حریف کے پاس بیٹھو۔ حضرت علیؓ اٹھ کر اپنے حریف کے پاس بیٹھ گئے۔ جب بحث ختم ہوئی اور وہ شخص چلا گیا تو حضرت علیؓ پھر اپنی جگہ آ بیٹھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے چہرے پر ناراضگی کے آثار دیکھ کر پوچھا اے ابوالحسن کیا بات ہے تمہارا چہرہ متغیر دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ بات تمہیں بری معلوم ہوئی؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا ہاں امیرالمؤمنین۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیوں؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا اس لئے کہ آپ نے میرے حریف کے سامنے مجھے کنیت سے پکارا آپ کو میرا نام لے کر کہنا چاہیئے تھا کہ اے علی اٹھو اور اپنے حریف کے پاس بیٹھو۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کا سر پکڑا اور پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ لے کر فرمایا میرے باپ تم پر قربان تمہارے سبب سے حق تعالیٰ نے ہمیں ہدایت دی اور تمہارے ہی سبب سے ظلمات سے نکال کر روشنی میں پہنچایا۔

حضرت عمرؓ نے اثناء وعظ میں فرمایا اگر ہم تم سے نیک کاموں کو چھڑا کر منکرات

کرائیں تو بتاؤ تم کیا کرو گے۔ حضرت عمرؓ نے یہ فقرہ تین مرتبہ کہا۔ پھر حضرت علیؓ کھڑے ہوتے اور کہا اے امیرالمومنین اس وقت ہم آپ سے توبہ کرائیں گے، اگر آپ نے توبہ کرلی تو ہم اس کو قبول کریں گے۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اگر توبہ نہ کی تو کیا کرو گے، حضرت علیؓ نے جواب دیا "اُس وقت ہم آپ کو قتل کردیں گے" حضرت عمرؓ نے فرمایا الحمدللہ ابھی اس اُمت میں ایسے شخص موجود ہیں کہ اگر ہم کجروی اختیار کریں تو وہ راہ راست پر لے آئیں۔

حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے کہا اے ابوالحسن مجھے کوئی نصیحت کرو۔ حضرت علیؓ نے کہا اپنے یقین کو شک مت بناؤ اور اپنے علم کو جہل نہ بناؤ۔ اور اپنے گمان کو حق نہ سمجھو کو دُنیا میں سے تمہارا حصہ وہی ہے جو تم نے اللہ کی راہ میں دے کر چلتا کردیا اور تقسیم کرکے برابر کردیا اور پہن کر پرانا کردیا۔ حضرت عمر نے فرمایا اے ابوالحسن تم نے بالکل سچ کہا" حضرت عمرؓ نے ناشاد وعظ میں فرمایا، زیادہ ڈر مجھے اس امر کا ہے کہ ایک بےگناہ مسلمان کو پکڑ کر اس کا گوشت اس طرح جلایا جائے گا جیسے اونٹوں کا گوشت بھونا جاتا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ شخص مجرم ہے۔ لیکن وہ بالکل بے قصور ہوگا۔ حضرت علیؓ منبر کے پاس بیٹھے تھے اٹھے اور کہا اے امیرالمومنین یہ کب ہوگا۔ پھر خود ہی بولے۔ یہ اس وقت ہوگا جب آنکھیں کھٹری ہوجائیں گی اور نخوت پیدا ہوجائے گی اور فتن اس طرح پیدا کریں گے جیسے چکی دانہ کو پیستی ہے اور جیسے آگ لکڑیوں کو خاک کردیتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "اے علیؓ یہ کب ہوگا؟" حضرت علیؓ نے کہا یہ اُس وقت ہوگا جب لوگ دنیا کی خاطر تجربے کریں گے اور علم سیکھیں گے لیکن عمل کی نیت نہ ہوگی۔ اور دنیا کو آخرت کے ذریعہ سے کمادیں گے۔

سب نے سفید کپڑوں میں احرام باندھا اور حضرت عقیل بن ابی طالب نے گلابی چادروں میں احرام باندھا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا تمھیں بھی خلاف کرنے کی ہوس ہے۔ لوگ سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو آپ نے سُرخ پہنے۔ حضرت علیؓ نے کہا، کوئی ہمیں سنت کا اتباع بتانے والا نہیں رہا۔" حضرت عمرؓ نے جواب دیا "سچ کہتے ہو۔ سچ کہتے ہو"

حضرت عمرؓ حج کر رہے تھے کہ ایک شخص سامنے آیا جس کی آنکھ کسی نے پھوڑدی تھی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "تیری آنکھ کس نے پھوڑی اس شخص نے جواب دیا

"حضرت علیؓ نے" حضرت عمرؓ نے فرمایا "خیر تیری آنکھ اللہ کے واسطے جاتی رہی" اس کے سوا نہ اُس سے واقعہ پوچھا اور نہ وجہ دریافت کی۔ یہ شخص ابھی وہیں تھا کہ حضرت علیؓ آگئے اور کہنے لگے یہ شخص اثناءِ طواف میں بیت اللہ کی طرف دیکھ رہا تھا اس لئے میں نے اس کی آنکھ پھوڑ دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اے علیؓ تم نے ناحق خدا کے نور کو ضائع کیا۔

قریش کے کچھ لوگ حضرت عمرؓ کے پاس جمع ہوئے ان میں حضرت علیؓ بھی تھے۔ اور شرف و بزرگی کا ذکر تھا اور حضرت علیؓ خاموش بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے ابوالحسن تم کو کیا ہوا خاموش کیوں ہو؟ حضرت علیؓ اس وقت بولنا نہ چاہتے تھے۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں ضرور بولنا پڑے گا۔ تو حضرت علیؓ نے کہا

فی کل معترک تزیل سیوفنا — فیہا الجماجم عن فراخ الھام

اللہ اکرمنا بنصر نبیہ — وبنا اعز شرایع الاسلام

ویزورنا جبرئیل فی ابیاتنا — بفرایض الاسلام والاحکام

فنکون اول مستحل حلۃ — ومحرم للہ کل حرام

جب حضرت علیؓ کا کلام ختم ہوگیا تو حضرت عمرؓ نے کہا اے میرے بھتیجو کیا تم اس کی گواہی دو گے وہ دونوں خاموش ہوگئے۔ اور اپنے باپ (حضرت علیؓ) کی طرف دیکھنے لگے حضرت علیؓ نے فرمایا "گواہ بن جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

اہلِ نجران اپنی کتاب سُرخ چمڑے میں رکھے ہوتے حضرت علیؓ کے پاس لائے اور عرض کیا کہ ہم آپ کو اس مکتوب کی قسم دیتے ہیں جس کو آپ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے اور اس سفارش کی قسم دیتے ہیں جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی۔ کہ ہم کو ہماری اراضی واپس کردی جائیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "حضرت عمرؓ زیادہ واقف اور تجربہ کار ہیں۔"

عاصم بن جعد کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اگر حضرت عمرؓ کو کبھی کسی بات پر طعنہ دیتے تو آج دیتے۔

(ف) اہلِ نجران حضرت علیؓ کی سفارش پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جزیرہ عرب میں رہتے تھے اور ان سے ایک معاہدہ لکھا گیا تھا جس کو حضرت علیؓ نے لکھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کو جزیرہ عرب سے خارج کردیا۔ اس وقت

اہلِ نجران حضرت علیؓ کے پاس وہ پرانا معاہدہ لے کر آئے اور چاہتے تھے کہ پھر وہیں واپس ہو جائیں مگر حضرت علیؓ نے انکار کر دیا۔

شعبی سے مروی ہے کہ جب حضرت علیؓ کوفہ میں آئے تو فرمایا، جس گرہ کو حضرت عمرؓ نے باندھا ہو میں اُس کو نہیں کھول سکتا۔

حضرت علیؓ اونی چادر اوڑھے ہوئے گھر سے نکلے اور کہنے لگے یہ کپڑا میرے بھائی اور میرے دوست اور میرے ہمراز اور میرے مخلص امیر المومنین نے مجھے پہنایا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے ایک حسین لڑکے کو دیکھا جو قریب البلوغ تھا اور اس کے زلفیں بھی تھیں اور سر پر بال بھی۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس وقت شک میں تھا کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ پھر اُس سے کہیں زائد خوب صورت لڑکے پر گذر ہوا جو حضرت علیؓ کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے فلاں سے کہا خدا تمہیں اس لڑکے سے محفوظ رکھے جو تمہارے پاس بیٹھا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا یہ میرا لڑکا عثمانؓ ہے۔ میں نے اس کا نام حضرت عثمانؓ کے نام پر رکھا ہے اور میں نے اپنے بعض بچوں کے نام حضرت عمرؓ اور حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ کے نام پر بھی رکھے ہیں۔ بلکہ آقائے دو جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک پر بھی نام رکھا ہے۔ اور حسنؓ و حسینؓ اور محسن کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا ہے۔ اور حضور ہی نے ان کا عقیقہ کرایا اور ان کے سر کے بال اُتروا کر اس کے ہم وزن چاندی صدقہ کرائی۔ اور حضورؐ کے فرمان کے بموجب اُن کی ناف کاٹی گئی۔ اور ختنہ کرائی گئیں۔

حضرت علیؓ کا حضرت عمرؓ کی رائے کی طرف رجوع کرنا

قبیلہ مزینہ کے ایک آدمی نے ایک شخص کو قتل کیا پھر اقرار کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے متعلق فیصلہ کیا اور اس کے اقرار کی وجہ سے عاقلہ (کنبہ) سے دیت دلانے سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا اے امیر المومنین جب یہ تسلیم کر رہا ہے تو اس کو سچا سمجھنا چاہیئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اس کا اس وقت اقرار اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا امیر المومنین (وفقک اللہ) آپ ہم سے ہر خبر میں سبقت لے جاتے ہیں۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کہ مالک کے انتقال کے بعد ام ولد (ود

باندی جس سے مالک کی اولاد ہو آزاد ہو جاتی ہے۔ میری اور حضرت عمرؓ کی ایک رائے تھی لیکن اب میرے نزدیک وہ مملوکہ ہی رہے گی۔ عبیدہ سلمانی نے کہا۔ اختلاف کی صورت میں ایک کی رائے سے آپ کی متفقہ رائے اولیٰ ہے۔

عبداللہ بن میرزہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دن حضرت عمرؓ کے پیچھے عصر کی نماز پڑھی جب نماز ختم ہوگئی تو داہنی طرف کے لوگ کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے لگے۔ حضرت عمرؓ نے کوڑہ سے اشارہ کر کے ان کو بٹھایا۔ جب حضرت علیؓ کے پاس پہنچے (وہ بھی کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے) تو ان سے کہا اے علیؓ واللہ مجھے معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز سے منع فرمایا ہے۔

حضرت علیؓ کا اپنی صاحبزادی اُمِ کلثوم کا حضرت عمرؓ سے نکاح کرنا

حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے حضرت ام کلثوم سے نکاح کے متعلق کہا تو حضرت علیؓ نے جواب دیا میرا اسے بنی جعفر کو دینے کا خیال ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا مجھ سے نکاح کر دو۔ واللہ اس کی ددھیال میں کوئی میری برابر اس کا خیال نہ رکھے گا۔ پھر حضرت علیؓ نے ان کا نکاح حضرت عمرؓ سے کر دیا۔ حضرت عمرؓ مسجد میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے کہا مجھے نکاح کے لئے آراستہ کرو انھوں نے عرض کیا "کس سے" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ حضرت علیؓ کی صاحبزادی اور حضورؐ کی نواسی ام کلثوم سے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ بجز میرے تعلق اور نسب کے ہر تعلق اور نسب ختم ہو جائے گا۔ پس میرا دل چاہتا ہے کہ میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کوئی تعلق ہو جائے۔

حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا میں ام کلثوم کو تمھارے پاس بھیج دوں گا تاکہ تم اس کی صغر سنی کو دیکھ لو۔ اور حضرت ام کلثوم کو حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا۔ حضرت ام کلثوم نے کہا میرے باپ (حضرت علیؓ تم سے کہتے ہیں۔ کیا تمھیں یہ لباس پسند ہے) حضرت عمرؓ نے جواب دیا "ہاں پسند ہے" پھر حضرت علیؓ نے ان کا نکاح کر دیا۔ اور حضرت عمرؓ نے چالیس ہزار درہم مہر میں دیئے۔

(ف) حدیث میں لفظ حلہ (چادر) ہے اور چادر لباس میں داخل ہے اور حق تعالیٰ نے عورتوں کو ہی لباس کہا ہے۔ لہٰذا اس مناسبت سے یہاں چادر سے مراد عورت ہوئی۔

مروی ہے کہ جب حضرت ام کلثوم حضرت عمرؓ کے پاس آئیں اور حضرت عمرؓ نے ان کا نقاب اٹھانے کا ارادہ کیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے چھوڑ۔ اگر تو امیر نہ ہوتا تو ضرور چپت مارتی

مروی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے عذر کیا کہ ام کلثوم چھوٹی بچی ہے حضرت عمرؓ نے کہا اگر زندہ رہی تو بڑی ہو جائے گی۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میرے علاوہ اس کے دو بڑے اور بھی ہیں مجھے ان سے بھی مشورہ لینا چاہئیے۔ حضرت عمرؓ منتظر رہے اور حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو بلایا اور تنہائی میں لیجا کر حمد و ثنا کے بعد ان سے کہا حضرت عمر تمھاری بہن کے لئے پیغام دیتے ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میرے سوا اس کے دو بڑے اور ہیں اور میں نے بغیر تم سے مشورہ کئے نکاح کرنا مناسب نہ سمجھا جعفر حسینؓ خاموش رہے اور حضرت حسنؓ بولے اور حمد و ثنا کے بعد کہا ابا جان حضرت عمرؓ جیسا کون ملے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے خوش تشریف لے گئے۔ پھر خلیفہ ہوتے تو عدل و انصاف کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا تم سچ کہتے ہو لیکن میں نے تمھارے بغیر بات پکی کرنا مناسب نہ سمجھا پھر فرمایا۔ ام کلثوم کو بلاؤ ام کلثوم بلائی گئی۔ تو ایک بچی ایک کرتہ پہنے ہوئے آئی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا بیٹی میں عمر بن الخطاب کے پاس تھا انھوں نے مجھ سے ایک چیز مانگی اب تم ان کے پاس جاؤ۔ سلام کہنا۔ اور کہنا مجھ کو میرے باپ نے آپ کے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کی حاجت پوری کر دی۔ حضرت عمرؓ نے چاہا کہ ان کا کرتہ اتاریں لیکن انھوں نے کرتہ چھڑا لیا اور واپس ہو گئیں اور والد ماجد سے جا کر کہا تمھارا پیغام حضرت عمرؓ کو پہنچا دیا۔ تم نے مجھے اس لئے بھیجا تھا تاکہ حضرت عمرؓ مجھے خرید لیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ تمھارے لئے زیادہ مناسب ہیں۔ حضرت ام کلثوم نے کہا، آپ نے مجھ سے اجازت کیوں نہیں لی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ اگر تم بڑی ہوتیں تو تم سے اجازت لیتا۔ لیکن آج تمھارا معاملہ میرے اختیار میں ہے۔

مروی ہے کہ حضرت عمرؓ کے حضرت ام کلثوم سے ایک بچہ ہوا جس کا نام زید رکھا عبدالملک سے کسی نے کہا یہ شخص حضرت عمرؓ کا بھی صاحبزادہ ہے اور حضرت علیؓ کی

بھی اولاد ہے۔ عبدالملک کو اپنی سلطنت کا خوف ہوا اور اُس نے ان کو زہر دے دیا۔

حضرت علیؓ کا ارشاد حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد

حضرت عمرؓ کے وصال کے بعد جب ان پر چادر ڈال دی گئی تو حضرت علیؓ نے کہا حق تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں کہ میری خواہش ہو کہ اس جیسے اعمال لے کر خدائے تعالیٰ کے روبرو پیش ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو آپ کے دوستوں (حضور اور حضرت ابوبکر) سے ضرور ملائے گا۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے "میں اور ابوبکرؓ اور عمرؓ تھے" "میں ابوبکرؓ اور عمرؓ (فلاں جگہ گئے)"۔

اے عمرؓ بن الخطاب (رحمک اللہ) تم آیات اللہ کے عالم تھے۔ تمہارے سینہ میں حق کی عظمت تھی تم صرف خدا سے ڈرتے تھے اور دین میں' لومۃ لائم کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ تم حق کے لئے سخی تھے اور باطل کے لئے بخیل اور دنیا سے بھوکے اور آخرت سے سیر۔

مروی ہے کہ جب حضرت علیؓ کو حضرت عمرؓ کی وفات کا حال معلوم ہوا تو غسل کر کے گھر سے نکلے سلام کیا اور رحمہ کہا لیا۔ پھر سر اُٹھایا اور فرمایا' حضرت عمرؓ پر نوحہ کرنے والی نے کیا خوب کہا ہے" آہ عمرؓ ٹیڑھے کو سیدھا کیا اور بیمار کو شفا دی۔ (یعنی سیاست خوب کی) آہ عمرؓ پاک دصاف کم گناہوں کے ساتھ دنیا سے تشریف لے گئے۔ آہ عمرؓ سنت کو ساتھ لے گئے۔ اور فتنہ و فساد چھوڑ گئے۔ اس کو کیا معلوم محض الفاظ میں جو اس کی زبان سے نکل گئے۔ واللہ حضرت عمرؓ خیر کی طرف تشریف لے گئے اور شر و فساد سے دور ہو گئے۔

حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے فضائل میں

احادیث اور حضرت عمرؓ کا ارشاد

حضرت علیؓ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس دیکھ کر پہچان لی اور اس سے کہا یہ زرہ میری ہے فلاں دن گر گئی تھی۔ یہودی نے جواب دیا نہ معلوم تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ زرہ میری

ہے اور میرے قبضہ میں ہے۔ چلو ہمارا تمہارا فیصلہ قاضی مسلمین کریں گے اور دونوں شریح قاضی کے پاس گئے۔ جب انھوں نے حضرت علیؓ کو دیکھا تو اپنی جگہ ان کے لئے چھوڑ کر کھڑے ہوگئے حضرت علیؓ بیٹھ گئے۔ اور شریح کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا اگر میرا حریف مسلمان ہوتا تو میں اس کے ساتھ تمھارے سامنے بیٹھتا لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہود کو اپنی برابر مت بٹھاؤ۔ اور نہ ان کے مریضوں کی عیادت کرو اور نہ ان کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔ اگر تمھیں کہیں یہ مل جائیں تو ان پر راستہ تنگ کر دو۔ اگر یہ گالی دیں تو ان کو مارو۔ اور اگر یہ ماریں تو ان کو قتل کر دو۔ پھر فرمایا میں نے اپنی زرہ اس یہودی کے پاس دیکھی اور پہچان لی حضرت شریح نے یہودی سے کہا "تو کیا کہتا ہے۔" یہودی نے جواب دیا "میری زرہ ہے اور میرے قبضہ میں ہے۔" حضرت شریح نے کہا "امیر المومنین آپ سچے ہیں واللہ جیسا آپ فرماتے ہیں یہ زرہ آپ ہی کی ہے لیکن پھر بھی دو گواہ کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنے غلام قنبر کو بلایا۔ اس نے شہادت دی۔ پھر اپنے صاحبزادے حضرت حسینؓ کو بلایا۔ انھوں نے شہادت دی۔ حضرت شریح نے عرض کیا میرے نزدیک بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں قبول نہ کرنی چاہئے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا میں قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم نے حضرت عمرؓ سے یہ حدیث سنی ہے کہ حسن و حسین جوانان اہل جنت کے سردار ہیں۔ شریح نے جواب دیا "ہاں سنی ہے۔" حضرت علیؓ نے فرمایا کیا تم اہل جنت کے سردار کی شہادت قبول نہیں کرتے اس کی سزا میں چالیس دن تک تمھارا بانقیا کا تبادلہ کرتا ہوں۔ اور زرہ یہودی کے حوالہ کر دی۔ یہودی نے دل میں سوچا امیر المومنین میرے ساتھ قاضی کے یہاں آئے اور قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ کیا اور وہ اس پر رضامند ہوگئے۔ اور کہا بے شک یہ زرہ آپ کی ہے فلاں دن آپ کے خاکی رنگ کے اونٹ سے گر گئی تھی اور میں نے اٹھا لی تھی۔ اور کہا "اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمدا رسول اللہ" حضرت علیؓ نے فرمایا یہ زرہ بھی تمھاری ہے اور یہ گھوڑا بھی تمھارا اور اس کے لئے سات سو درہم وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر یہ شخص ہمیشہ حضرت علیؓ کے ساتھ رہا۔ اور جنگ صفین میں مقتول ہوگیا۔

حضرت حسینؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ منبر پر خطبہ پڑھ رہے تھے۔ میں اُن کے پاس گیا اور کہا میرے باپ کے منبر سے اُتر جاؤ۔ اُنھوں نے فرمایا خدا کی قسم یہ منبر تمھارے باپ کا

ف کوفہ کے قریب کوئی جگہ ہے۔

ہے میرے باپ کا نہیں۔ پھر پوچھا تمھیں یہ کس نے سکھایا میں نے جواب دیا "کسی نے نہیں"
اس کے بعد فرمایا۔ تم ہمیشہ ہمارے پاس آیا کرو۔ میں ایک دن اُن کے پاس گیا تو وہ معاویہ
سے تنہائی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اور ابن عمرؓ دروازہ پر تھے یہ دیکھ کر واپس چلا آیا۔ پھر ایک
دن حضرت عمرؓ ملے تو فرمایا ہم نے تم سے کہا تھا کہ ہمارے سے ملتے رہا کرو۔ میں نے عرض کیا
میں آپ کے پاس حاضر ہوا لیکن آپ معاویہ سے تنہائی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اور ابن عمرؓ
دربان تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا تم ابن عمر جیسے ہو۔ کیا حق تعالیٰ کے سوا کسی اور نے
ہمارے سر میں یہ بال اگائے۔ جب تم آؤ تمھیں اوروں کی طرح اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔

ایک مرتبہ لوگ چادریں اوڑھے ہوئے پھر رہے تھے اور حضرت عمرؓ مسجد میں حجرہ شریف
اور منبر کے درمیان بیٹھے تھے۔ لوگ آکر ان کو سلام کر رہے تھے۔ اور دعائیں دے رہے تھے
کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ لوگوں کو پھلانگتے ہوئے حضرت فاطمہؓ کے گھر سے نکلے۔
(حضرت فاطمہؓ کا گھر وسط مسجد میں تھا) دونوں حضرت عمرؓ کے سامنے تھے اور ان کے
پاس ان چادروں میں کی چادر نہ تھی۔ حضرت عمرؓ کہنے لگے۔ خدا کرے یہ کپڑے تقسیم کرنا
مجھے مبارک ہو۔ لوگوں نے عرض کیا۔ اے امیر المومنین کیوں۔ آپ نے تو اپنی رعیت کو
بہت عمدہ پوشاک پہنائی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس لئے کہ یہ دو لڑکے جو ابھی پھلانگتے ہوئے
آئے۔ اُن کے پاس ان میں سے چادر نہیں یہ بچے ہیں اور چادریں ان سے بڑی ہیں پھر داہنی
طرف جو شخص بیٹھا تھا اس سے جھک کر فرمایا۔ (حضرت) حسنؓ و حسینؓ کے لئے دو چادر بھیج
دو۔ اس نے دو چادر بھیج دیں اور آپ نے حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ کو پہنا دیں۔

جب حضرت عمرؓ نے رجسٹر مرتب کئے تو لوگوں کے وظائف مقرر کرنے کا ارادہ کیا
اور پوچھا ابتدا کس سے کروں لوگوں نے عرض کیا۔ امیر المومنین اپنے سے شروع کیجئے۔
حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے خوب یاد دلایا۔ بنو ہاشم سے ابتدا کی اور حضرت حسنؓ و حضرت
حسینؓ کے لئے پانچ پانچ سو دینار وظیفہ مقرر کئے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت زبیر سے کہا کہ (حضرت) حسن بیمار ہیں کیا ان کی عیادت
کرو گے حضرت زبیر بہانہ کرنے لگے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا معلوم بھی ہے بنو ہاشم کی
عیادت فرض ہے۔ اور ان کی ملاقات سنت ہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہؓ سے کہا تمھارے باپ کے بعد مجھے تم سے زاید
کوئی عزیز نہیں۔

حضرت عمرؓ کی شہادت اور مجلس شوریٰ کا انعقاد

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا غلام ابو لؤلؤہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا (یہ روم کا باشندہ اور نصرانی تھا) اور کہا امیر المومنین مغیرہ سے کہہ دیجئے کہ جو درہم مجھ سے لیتا ہے اُس میں کچھ کم کر دے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "تم سے کیا لیتا ہے"؟ اُس نے جواب دیا "چار درہم" حضرت عمرؓ نے پوچھا "تمہارا کیا پیشہ ہے"؟ اُس نے جواب دیا۔ "چکی چلانا"، حضرت عمرؓ نے فرمایا خدا سے ڈرو اور اپنے آقا سے خلوص کے ساتھ پیش آ۔ ابو لؤلؤہ حضرت عمرؓ کے پاس سے غصہ میں بھرا ہوا نکلا اور کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیا کہہ رہا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا "احمق ہے" حضرت عمرؓ نے (حضرت) مغیرہ کو بلایا اور فرمایا خدا سے ڈرو اور جس کو خدا نے تمہارا دست نگر کیا ہے اُن کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

اس غلام نے ایک چھری تیار کی جس کی دو نوک تھیں اور موٹھ درمیان میں تھی۔ اور حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ حضرت عمرؓ اس وقت صبح کی نماز کے لئے صفوں کو سیدھا کرا رہے تھے۔ اور فرما رہے تھے تمہارے مونڈھے آگے پیچھے نہ ہوں کہیں تمہارے قلوب میں بھی تفرقہ پڑ جائے۔ اور آپ پر تو وار کئے اور آپ کے ساتھ تیرہ[13] آدمیوں کو زخمی کیا۔ جن میں چھ وہیں مسجد میں شہید ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کتے کو پکڑو۔ اس نے مجھے قتل کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو اُٹھا کر گھر لے گئے۔ سورج نکلنے کے قریب تھا اور ابھی لوگوں نے صبح کی نماز نہ پڑھی تھی۔ اس لئے حضرت عبدالرحمن بن عوف کے پیچھے اقتدا کی انہوں نے سورج نکلنے کے خوف سے قل ہو اللہ اور اذا جاء نصر اللہ پڑھی۔

حضرت عمرؓ کے پاس سب سے پہلے حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ پہنچے حضرت ابن عباسؓ نے کہا "امیر المومنین جنت کی بشارت ہو" حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا تم اس کی گواہی دو گے (گویا آپ خرید و فروخت کر رہے تھے) حضرت ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ کے مونڈھا مار کر کہا تو بھی گواہ بن اور میں بھی گواہ ہوں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا "یہ کیوں کر" حضرت ابن عباسؓ نے کہا اس لئے کہ آپ کا اسلام باعث عزت

تھا اور آپ کی امارت انصاف تھی اور آپ کی موت شہادت سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے
فرمایا۔ واللہ اس کی وجہ سے تم مجھ کو عزیز نہ سمجھو اگر حق تعالیٰ نے اپنا رحم نہ فرمایا تو عمرؓ
ہلاک ہو جائے گا۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا سر میری گود میں رکھا تھا آپ نے فرمایا
میرے سر کو زمین پر رکھ دو۔ میں نے عرض کیا آپ کا سر نیچے رکھنا مجھ پر شاق ہے۔ آپ
نے فرمایا تجھے تیری ماں روئے رکھ دے۔ پھر فرمایا لوگوں کے پاس جاؤ اور ان سے سلام
کے بعد پوچھو کہ کیا یہ کام تمہارے مشورہ سے ہوا ہے؟ (حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں) میں باہر
گیا۔ اور لوگوں کو یہ پیغام سنایا۔ انہوں نے جواب دیا ہماری خواہش ہے کہ آپ کے بدلے
میں ہمارے ماں باپ چلے جائیں۔ رسول اللہ صلعم کے وصال کے بعد آج جیسا سخت دن
ہم پر نہیں گزرا۔ میں حضرت عمرؓ کے پاس گیا اور ان تک یہ فقرے پہنچا دیے۔ آپ نے فرمایا
دیکھو کیا میرے قاتل کا پتہ لگایا ہے۔ میں نے عرض کیا ہاں مغیرہ بن شعبہ کا غلام ہے۔ آپ
نے فرمایا الحمد للہ کوئی مسلمان میرے ظلم کا شاکی نہیں ایک مشرک ہے جس کے آقا کو میں اس
پر احسان کرنے کے لئے کہہ چکا تھا۔ لوگ اندر چلے گئے اور حضرت عمرؓ نے نبیذ مانگی آپ
کو نبیذ پلائی جو خون میں مل کر زخم سے نکل گئی۔ حرث بن کلدہ ثقفی ایک طبیب تھا وہ
آیا اور کہا دودھ پلاؤ آپ کو دودھ پلایا وہ بھی خون آلود نکلا۔ حرث نے کہا جو کچھ کہنا
ہو یا عہد وغیرہ لینا ہو وہ کہہ لیجئے۔ پھر لوگوں نے عرض کیا کہ خلیفہ مقرر کر دیجئے۔
حضرت عمرؓ نے فرمایا میں زندگی اور موت دونوں حالت میں اس بوجھ کا متحمل نہیں
ہو سکتا۔ لوگوں نے عرض کیا مسلمان عبداللہ بن عمرؓ سے راضی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے
فرمایا اگر آل عمرؓ میں سے کوئی خلافت کے قریب گیا تو تباہ ہو جائیں گے اور میں ان کے
لئے کیسے بدفالی لے سکتا ہوں۔

لوگوں نے عرض کیا آپ ہمیں مشورہ کیوں نہیں دیتے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔
مشورہ دینے میں کچھ حرج نہیں۔ قریش کے سردار جن کے جنتی ہونے کی نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے بشارت دی ہے سات ہیں (حضرت) عثمانؓ بن عفان۔ (حضرت) علیؓ
بن ابی طالب۔ (حضرت) طلحہؓ۔ (حضرت) زبیرؓ۔ (حضرت) سعدؓ بن ابی وقاص
(حضرت) عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ (حضرت) سعد بن زید (رضی اللہ عنہم اجمعین)

لوگوں نے عرض کیا " امیر المومنین ان میں سے اپنی رائے متعین کیجئے " حضرت عمرؓ نے فرمایا (حضرت) عثمانؓ سے تو اس لئے رکتا ہوں کہ وہ اپنے کنبہ کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔ اور (حضرت) علیؓ کی طبیعت میں مذاق ہے۔ اور (حضرت) زبیرؓ مومن الرضا اور کافر الغضب ہیں۔ اور طلحہؓ میں نخوۃ ہے۔ اور (حضرت) سعدؓ میں بد خلقی اور سختی ہے۔ اور عبد الرحمن بن عوف مالدار بہت ہیں گویا اس امت کے قارون ہیں۔ یہ سب ایک گھر میں تین روز تک مشورہ کریں۔ ان ایام میں صہیب نماز پڑھائے۔ اور عبد اللہ بن عمرؓ وزیر و مشیر رہے۔ اس کے ذمہ اور کوئی کام نہ ہو اور کثرت الرائے پر عمل کر لیا جائے۔ اگر پانچ کی رائے متحد ہو جائے اور ایک خلاف ہو تو اس کو چھوڑ دینا۔ اور اگر چار کی رائے متحد ہو اور دو مخالف تب بھی ان دونوں کو چھوڑ دینا۔ اور اگر تین ایک طرف ہوں اور تین ایک طرف تو عبد اللہ بن عمرؓ کو حکم بنا لینا اور جس فریق کے موافق طے ہو جائے دوسرے فریق کی رائے کو چھوڑ دینا۔ پھر حضرت ابن عمرؓ سے فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کے پاس جاؤ سلام کہنا اور کہنا کہ جو جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کے درمیان آپ نے اپنے لئے چھوڑ رکھی ہے عمرؓ اس کی آپ سے درخواست کرتا ہے۔ حضرت عبد اللہؓ کہتے ہیں۔ میں حضرت عائشہؓ کے گھر گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا پوچھا کون ہے؟ میں نے عرض کیا عبد اللہ بن عمرؓ ہے۔ پھر پوچھا کیوں آئے ہو؟ میں نے عرض کیا۔ حضرت عمرؓ کو خون آلود چھوڑ کر آیا ہوں وہ آپ سے اس جگہ کی درخواست کرتے ہیں جو آپ نے حضورؐ اور حضرت ابو بکرؓ کے درمیان اپنے لئے چھوڑ رکھی ہے۔ حضرت عائشہ نے پوچھا حضرت عمرؓ کو کیا ہوا؟ میں نے جواب دیا۔ مغیرہ بن شعبہ کے غلام نے ان کو زخمی کر دیا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا واللہ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ حضورؐ اور حضرت ابو بکرؓ کے درمیان میرے سوا کوئی اور مدفون ہو۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے مجھ سے خواہش کی ہے تو بہت اچھا۔ میں واپس چلا آیا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا ہوا؟ میں نے جواب دیا کہ انہوں نے اجازت دے دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا حق تعالیٰ جزائے خیر دے۔ لیکن میرے مرنے کے بعد پھر پوچھ لینا اگر اس وقت بھی اجازت دے دیں تو فبہا ورنہ عام مسلمانوں کے قبرستان بقیع میں دفن کر دینا۔

حضرت عمرؓ کے وصال کے بعد ہم جنازہ کو لے گئے اور حضرت عائشہؓ کے دروازہ

پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ انھوں نے پوچھا کون ہے؟ ہم نے جواب دیا کہ حضرت
عمرؓ کا جنازہ ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ وفات کے بعد پھر آپ سے پوچھ لیں۔ حضرت
عائشہؓ نے کہا واللہ جو جگہ میں ان کو دے چکی اب اس کو واپس نہ لوں گی۔ پھر اپنا ہاتھ
اپنے سر پر رکھا۔ اور کہا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اے (حضرت) ابوبکرؓ تمھارا
دوست عمرؓ تمھارے پاس زیارت کے لئے آیا ہے۔

مدینہ میں اس وقت ایسا زلزلہ آیا کہ ہمیں آبادی کے منہدم ہونے کا خطرہ ہو گیا
جب تیسرے دن عصر کا وقت ہوا تو صہیب ہمارے پاس آئے اور پوچھا تم نے کیا کیا
ہم نے جواب دیا ابھی کچھ نہیں کیا۔ صہیب نے کہا اُس ذات پاک کی قسم جس نے عمرؓ کی
روح کو قبض کیا آج مغرب سے زیادہ اس معاملہ میں دیر نہ ہوگی۔ اس کے بعد اپنے
گھر میں بیٹھ جانا۔ جب لوگ تلواریں سنبھال لیں گے تو تم کیا کر سکو گے جو کچھ کرنا ہے ابھی
کرلو۔ حضرت عبدالرحمن نے اصحاب شوریٰ سے کہا تم مجھے اجازت دو کہ میں خلافت
سے دست بردار ہو جاؤں اور تم میں سے ایک کو اللہ اور رسول کے لئے چھانٹ لوں۔

حضرت علیؓ نے کہا۔ اگر اور ساتھی راضی ہو جائیں۔ تو میں سب سے پہلے منظور کرتا
ہوں۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھارے متعلق فرمایا ہے کہ تم زمین
و آسمان میں امین ہو۔ دیگر حضرات بھی اس پر راضی ہو گئے۔

حضرت عبدالرحمن نے کہا۔ سعدؓ تم اس سے علیحدہ ہو جاؤ۔ میں اور تم اس کے اہل
نہیں۔ اور طلحہؓ اور زبیرؓ تم بھی اس کو چھوڑ دو۔ پھر کبھی آپ حضرت عثمانؓ کا ہاتھ پکڑتے اور
کبھی حضرت علیؓ کا۔ حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ سے بیعت کر لی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اصحاب شوریٰ سے فرمایا کہ
اگر تم نے گنجے؎ کو حاکم بنایا تو اگرچہ وہ تلوار گردن میں ڈالے رکھے پھر تمھیں راہ راست پر
نہیں چلا سکتا۔ میں نے عرض کیا۔ وہ خود بھی جانتا ہے۔ لہذا اس کو حاکم نہ بنائیے۔ پھر فرمایا۔
اگر میں خلیفہ مقرر کروں تو مجھ سے بہتر (حضرت ابوبکرؓ) نے خلیفہ مقرر کیا ہے۔ اور اگر میں
ایسے ہی چھوڑ دوں تو مجھ سے بہتر (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا کیا ہے یعنی
میرے لئے دونوں امر کی گنجائش ہے۔

؎ اس سے مراد آپ کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب ہیں۔

حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ زخمی ہو گئے تو انھوں نے چھ آدمیوں کی مجلس شوریٰ منعقد کی۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کو ان میں کلام ہے تو فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں مقاماتِ قیامت میں جس جگہ ہوں گا میرا ہاتھ علیؓ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور مجھ سے فرمایا۔ اے عمرؓ جب عثمانؓ بن عفان رات کو سوتے ہیں تو آسمان کے تمام فرشتے ان کے لئے دعاء مغفرت کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ صرف عثمانؓ کے لئے ہے۔ فرمایا ہاں۔ اس لئے کہ وہ گناہ اور خطا کرنے میں ربّ العالمین سے حیا کرتا ہے۔ اور طلحہؓ بن عبداللہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے اور رات ٹھنڈی تھی کہ حضورؐ کا کجاوہ گر گیا۔ آپ نے فرمایا۔ اے اللہ جو شخص اپنی سواری سے اُتر کر میری سواری کو درست کرے تو اُس سے ایسا راضی ہو جس کے بعد کبھی غصہ نہ ہو۔ میں نے دیکھا کہ طلحہؓ اُسی وقت اُترے اور حضورؐ کے کجاوہ کو درست کر کے واپس کر دیا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اے طلحہؓ یہ جبرائیل (علیہ السلام) تمھیں سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طلحہؓ سے کہہ دیجئے اُس ذات پاک کی قسم جس نے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی قیامت کی ہر مصیبت میں میں تمھارے ساتھ رہوں گا اور زبیر بن العوام ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے تھے اور چہرۂ مبارک پر مکھیاں گر رہی تھیں۔ جب تک حضورؐ بیدار ہوئے حضرت زبیر برابر مکھیوں کو ہٹاتے رہے۔ حضورؐ نے بیدار ہو کر فرمایا اے زبیرؓ یہ جبرائیل (علیہ السلام) تمھیں سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں اُس ذات پاک کی قسم جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی میں قیامت کے دن تمھارے چہرے سے دوزخ کی لپٹ کو دور رکھوں گا۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن حضرت عائشہؓ کے گھر تھے۔ کہ حضرت فاطمہؓ مع حضرت حسنؓ و حسینؓ کے حاضر ہوئیں۔ اور یہ تینوں رو رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے بچے کیوں رو رہے ہیں۔ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا "بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں"۔ حضورؐ نے دریافت کیا "اور تم کیوں رو رہی ہو" حضرت فاطمہؓ نے کہا "ان بچوں پر ترس کھا کر" حضورؐ نے دعا فرمائی۔ اے اللہ مجھے اور میرے بچوں اور میری لڑکی فاطمہؓ کو جنت کا کھانا کھلا۔ اتنے میں کسی نے دروازہ

کھٹکھٹایا۔ حضورؐ نے دروازہ کھولا تو حضرت عبدالرحمن بن عوف تھے اور اُن کے ہاتھ میں حلوے کا پیالہ اور دو روٹیاں تھیں جن کے درمیان زیتون تھا۔ حضرت عبدالرحمنؓ نے ان کو پیش کیا اور عرض کیا۔ یارسول اللہ یہ ہدیہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب نے اس کو پیٹ بھر کر کھایا۔ اور حضورؐ نے ارشاد فرمایا اے عبدالرحمنؓ جنت تمھاری طرف سبقت کر رہی ہے لیکن حق تعالیٰ تمھاری دنیا میں بھی برکت عطا فرمائے

اور سعدؓ بن وقاص۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کی لڑائی میں تیرہ دفعہ ان کو تیر ٹھیک کر کے دیا۔ پھر فرمایا۔ تیر پھینک تجھ پر میرے ماں و باپ فدا ہوں جو شخص ان کو بھی برا کہے وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔

جب حضرت عمرؓ کا وصال ہوا تو ان کی تجہیز و تکفین کے بعد حضرت ضحاک بن قیسؓ کی بہن حضرت فاطمہؓ کے یہاں اہل شوریٰ کا اجتماع ہوا (حضرت فاطمہؓ بہت نیک عورت تھیں۔ لوگ اکثر ان کے یہاں جمع ہوتے تھے)۔ حضرت عبدالرحمنؓ سب میں بڑے تھے۔ اول انھوں نے گفتگو شروع کی اور مناسب حمد و ثنا کے بعد فرمایا اے جماعت حاضرین میری ایک رائے ہے تم بھی اس پر غور کر لو۔ اول خاموشی سے سن لو تاکہ معلوم ہو جائے اور سمجھ میں آ جائے۔ ضعیف جو سیدھی راہ چلے اُس قوی سے بہتر ہے جو کجرو ہو۔ اور ایک گھونٹ پانی جو ضرورت کے وقت پیاس بجھائے اس شیریں کثیر پانی سے بہتر ہے جس سے ہیضہ ہو جائے۔ تم علماء ہو۔ قوم کے مقتدا اور ملجا ہو۔ اختلاف میں پڑ کر اپنی چھری کو کھنڈا مت کرو۔ اور اپنی تلواروں کو دشمن سے نہ روکو جس سے وہ تم پر سرکش ہو جائیں اور تمھارے اعمال میں نقصان آئے۔ ہر گھر کے لئے ایک امیر ہوتا ہے جس کے کہے پر سب چلیں۔ اور اُس کی مخالفت سے ڈریں۔ اپنے میں سے کسی کو اپنا کام حوالہ کردو اور جس پر بھروسہ ہو اپنا بوجھ لاد دو۔ نرمی سے چلو تاکہ مطلوب تک پہنچ جاؤ تمھاری نیات تمھارے علم سے تجاوز نہ کریں اور تمھارے اعمال تمھاری نیات سے متجاوز نہ ہوں۔ مختصر بات زیادہ بکواس سے بہتر ہے۔ دشمن اور بدبخت کی اگرچہ وہ قریب ہو اطاعت نہ کرو۔ اور یہ بار (خلافت) ایسے شخص کو پہناؤ جو مصائب کے وقت قوی رہے۔ اور بعید میں امانت دار ہو۔ وہ تم سے راضی ہو اور تم اس سے راضی ہو اور تم میں سے مختار اور پسندیدہ ہو اور تم مفسد ناصح کی اطاعت نہ کرو۔ اور مرشد معاون کی مخالفت نہ کرو۔ میں

اس پربات ختم کرتا ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے دعاء مغفرت کرتا ہوں۔

پھر حضرت عثمانؓ بولے فرمایا۔ جمیع محامد اُس ذات پاک کے لئے جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا اور اُن کے لئے اپنے وعدہ کو پورا کیا اور ہر قریب و بعید پر اُن کی مدد کی۔ حق تعالیٰ نے اُن کو نور بنا کر بھیجا اور ہمیں خواہشات کے تموج اور دشمنوں کے اختلاف کے وقت حضورؐ کے اتباع کی توفیق دی اور ہمیں اپنے فضل سے ائمہ بنایا اور اپنی اطاعت کے لئے امیر بنایا۔ یہ معاملہ ہم سے تجاوز نہ ہوا اور بجز ہمارے کوئی شریک نہ ہو۔ مگر جو شخص حق سے انجان ہوا اور راستہ سے بھٹک گیا ہو۔ اگر تمہاری مخالفت کی گئی۔ اور تمہاری بات رد ہو گئی تو میں سب سے پہلے تمہاری بات پر ہاں کروں گا۔ اور اس کو قبول کروں گا۔ میں اپنے اس قول پر کفیل اور ضامن ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے دعاء مغفرت کرتا ہوں۔ اور تمہاری مخالفت سے پناہ مانگتا ہوں۔

پھر حضرت زبیرؓ بولے اور حمد و ثناء کے بعد فرمایا۔ حق تعالیٰ کے لئے پکارنے والا جاہل نہیں ہوتا اور اس پر ہاں کرنے والا نامراد نہیں ہوتا۔ خواہشات کے بڑھنے کے وقت جانوں کا محافظ زبان ہے۔ اگر حدود فرمیہ متیقن نہ ہوتیں اور فرائض خداوندی متعین نہ ہوتے۔ راحت و حیات ہوتی اور موت نہ ہوتی تو امارت اور حکومت سے بھاگنا اور بچنا باعث نجات اور عصمت ہوتا۔ لیکن حق تعالیٰ نے ہم پر اجابت حق اور افشاء سنت کو واجب کر دیا ہے تاکہ ہم گمراہی میں نہ پڑیں۔ اور زمانہ جاہلیت کی طرح پھر گمراہ نہ ہوں۔ جو کچھ تم کہو گے میں اُس کو قبول کروں گا اور تمہارے حکم کا اتباع کروں گا۔ والحمد للہ رب العلمین۔

پھر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بولے کہ جمیع محامد اُس ذات پاک کے لئے ہیں جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ میں اس ذات پاک کی اس لئے حمد کرتا ہوں کہ اُس نے مجھ کو گمراہی سے نجات دی اور گمراہی پر متنبہ کیا جو شخص محفوظ رہا اُس نے ہدایتِ خداوندی کے باعث فلاح پائی۔ اور جس کی نجات ہو گئی وہ خدا کے رحم و فضل سے کامیاب ہو گیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے راستے منور اور درست ہو گئے۔ اور حق واضح ہو گیا اور باطل تمام مٹ گیا۔ اے حاضرین تم اہل کذب کی باتوں اور منکرین کی تمناؤں سے بچو۔ ان تمناؤں نے تم سے پہلے ایک قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ جس امر کے تم وارث ہوتے اور جو چیز تم کو ملی وہ بھی اُس کے وارث ہوئے تھے اور اُن کو بھی یہی ملی تھی۔ پھر

حق تعالیٰ نے ان کو اپنا دشمن بنا لیا اور اُن پر لعنت فرمائی۔

"لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داؤد و عیسی ابن مریم ذلک بما عصوا و کانوا یعتدون۔ کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون"

اور میں اپنے تیردان کو خالی کرتا ہوں اور اپنا حصہ چھوڑتا ہوں اور حضرت طلحہؓ کی نسبت میں ان کے لئے بھی وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کیا۔ اور جو کچھ اُن کی طرف سے ہوا اس پر میں کفیل اور ضامن ہوں۔ اے ابن عوف یہ معاملہ تمہارے سپرد ہے بشرطیکہ سچائی اور کوشش بلیغ سے کام لو۔ و علی اللہ قصد السبیل و الیہ الرجوع۔

حضرت علیؓ سب سے چھوٹے تھے اس لئے سب کے بعد ان کا نمبر آیا۔ فرمایا تمام محامد اُس ذات پاک کے لئے ہیں جس نے ہم میں سے محمد صلعم کو نبی اور اپنا رسول بنا کر ہمارے پاس بھیجا۔ ہم نبوت کا گھرانہ اور حکمت کی کان اور اہل زمین کے لئے امان اور طالب کے لئے نجات ہیں۔ ہمارا ایک حق ہے اگر وہ دیا گیا تو ہم لے لیں گے اور اگر اُس سے روکا گیا تو ہم اونٹوں کی پشت پر سوار ہوں گے اگرچہ طویل سفر کرنا پڑے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی عہد فرما لیتے تو ہم تاحیات اُس پر جہاد کرتے اور اگر حضور ہم سے کچھ فرما جاتے تو ہم اس کو ضرور پورا کرتے۔ اگرچہ ہمارا گمان ہی ہو لیکن مجھ سے پہلے کوئی شخص دعوت حق اور صلہ رحمی کی طرف نہیں بڑھا۔ میری بات سنو اور یہ منتظر نہ دکھائی کہ اس مجمع کے منتشر ہونے کے بعد اس معاملہ میں تلواریں چلیں اور بدعہدیاں ہوں۔ حتیٰ کہ ایک فریق تم لوگ ہو اور یا تم میں سے بعض گمراہ لوگوں کے مقتدا ہوں یا جہال کے تابع ہوں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

حضرت منسور کہتے ہیں کہ پھر یہ مجمع منتشر ہو گیا۔ حضرت عبدالرحمن میرے ماموں تھے۔ صبح کو وہ اپنی رائے ظاہر کرنے والے تھے۔ یہ رات میں نے انہی کے یہاں گزاری۔ جب کچھ حصہ رات گزری تو مجھ سے فرمایا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے پاس جا کر ان کو بلا لاؤ۔ میں نے پوچھا، "پہلے کس کو بلاؤں" حضرت عبدالرحمن نے جواب دیا "جس کو دل چاہے" میں نے پوچھا "دونوں کو ساتھ بلاؤں یا علیحدہ علیحدہ۔ حضرت عبدالرحمن نے جواب دیا "ساتھ لانا"، چونکہ مجھے حضرت علیؓ سے زیادہ محبت تھی اس لئے پہلے اُن

کے پاس گیا وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا "چلیے میرے ماموں نے آپ کو بلایا ہے"
حضرت علیؓ نے پوچھا "میرے ساتھ کسی اور کو بھی بلایا ہے؟" میں نے کہا "ہاں" حضرت
علیؓ نے پوچھا "کس کو" میں نے جواب دیا "حضرت عثمانؓ کو" حضرت علیؓ نے کہا۔
"پہلے کس کو بلایا ہے؟" میں نے کہا کہ میں نے حضرت عبدالرحمٰن سے پوچھا تھا کہ پہلے کس
کو بلاؤں انھوں نے جواب دیا جس کو دل چاہے۔ پھر میں نے اُن سے پوچھا کہ دونوں
کو ساتھ لاؤں یا یکے بعد دیگرے۔ تو انھوں نے فرمایا کہ دونوں کو ساتھ لانا۔ ہم وہاں
سے چلے اور حضرت عثمانؓ کے گھر پر پہنچے۔ حضرت علیؓ باہر بیٹھ گئے اور میں حضرت عثمانؓ کے
پاس گیا اور اُن سے کہا چلیے میرے ماموں نے آپ کو بلایا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا
میرے ساتھ کسی اور کو بھی بلایا ہے۔ میں نے جواب دیا "ہاں" حضرت عثمانؓ نے پوچھا
کس کو۔ میں نے جواب دیا حضرت علیؓ کو۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا "پہلے کس کو
بلایا ہے" میں نے کہا کہ اس کے متعلق حضرت عبدالرحمٰن سے پوچھا تھا۔ انھوں نے
فرمایا جس سے دل چاہے شروع کرنا اور دونوں کو ساتھ لانا اور حضرت علیؓ دروازہ
پر موجود ہیں۔ ہم وہاں سے چلے اور پھر دونوں حضرت عبدالرحمٰن کے پاس جا کر اُن کے
سامنے بیٹھ گئے۔

حضرت عبدالرحمٰن نے بہت دیر تک کچھ باتیں کیں پھر فرمایا تمھارے معاملہ کو میں
نے اُلٹ پھیر کیا اور اب میں تم سے پوچھتا ہوں تم مجھے مشورہ دو اور میری اعانت کرو۔
اے علیؓ کیا تم حضورؐ کے عہد و پیماں کے ساتھ کتاب و سنت پر مجھ سے بیعت کرو گے۔ حضرت
علیؓ نے کہا "اپنی طاقت کے بقدر" اور حضرت عثمان نے کہا "اے ابو محمد (کنیت حضرت
عبدالرحمٰن) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد و پیماں کے ساتھ تم سے بیعت کرتا ہوں"
حضرت عبدالرحمٰن نے کچھ اور باتیں کیں۔ پھر کہا میں نے تمھارے معاملہ کو واضح کیا اور تم
سے بحث کی تم مجھے مشورہ دو اور میری مدد کرو۔ اے علیؓ کیا تم حضورؐ کے عہد و پیماں کے
ساتھ مجھ سے بیعت کرو گے۔ حضرت علیؓ نے کہا اپنی طاقت کے بقدر اور حضرت عثمانؓ
نے جواب دیا کہ اے ابو محمد میں اللہ و رسول کے عہد و پیماں کے ساتھ کتاب و سنت پر تم سے
بیعت کرتا ہوں۔ حضرت عبدالرحمٰن نے پھر کچھ اور باتیں کیں اور کہا میں نے تمھارے معاملہ
میں غور کیا اور تم سے پوچھا تم مجھے مشورہ دو اور میری مدد کرو۔ اے علیؓ کیا تم حضورؐ کے عہد

دمیان کے ساتھ کتاب وسنت پر مجھ سے بیعت کروگے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا اپنی طاقت کے بقدر، اور حضرت عثمانؓ نے کہا۔ میں حضورؐ کے عہد و پیماں کے ساتھ کتاب وسنت پر تم سے بیعت کرتا ہوں۔ حضرت عبدالرحمٰن نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر فرمایا جو تم چاہو اور یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ چلے جاؤ۔ یہ دونوں حضرات کھڑے ہو گئے اور تشریف لے گئے۔

جب صبح کی نماز کا وقت ہوا تو حضرت عبدالرحمٰن نے اپنا عمامہ منگا کر باندھا اور تلوار گردن میں ڈالی پھر منبر کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ جب حضرت صہیبؓ نے نماز ختم کی تو حضرت عبدالرحمٰن منبر کے قریب کھڑے ہوئے۔ اور حمد وثنا کے بعد کہا۔ لوگو! تمہیں وہ کام معلوم ہے جو تم نے میرے حوالہ کیا ہے اور جس میں تم نے میری اطاعت کا عہد کیا ہے۔ چاہے میں اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مار کر خود اپنے ہی سے بیعت کرلوں۔ پھر فرمایا "اے عثمانؓ کھڑے ہو" حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے۔ اور حضرت عبدالرحمٰن نے پھر دیگر لوگوں نے بیعت کی۔

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ ٹھہر گئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ سے کہا، "اے علیؓ تم دھوکے میں آگئے" حضرت علیؓ نے کہا "کیسا دھوکا" (فاطمہ بنت قیس نے یہ سن لیا) حضرت ابن عباسؓ نے کہا "حضرت عبدالرحمٰن اپنے لئے اعتماد اور پختگی چاہتے تھے" چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اعتماد ظاہر کر دیا پس حضرت عبدالرحمٰن نے جس کو محکم اور مضبوط پایا قبول کرلیا۔ اور ایک ہی بات کو تین مرتبہ تین طریق سے بیان کی۔

حضرت ابو وائل سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عبدالرحمٰن سے پوچھا کہ تم نے حضرت علیؓ کو چھوڑ کر حضرت عثمانؓ سے کیوں بیعت کی۔ حضرت عبدالرحمٰن نے فرمایا۔ میرا کیا قصور؟ میں نے حضرت علیؓ سے ابتدا کی اور ان سے کہا کہ میں تم سے کتاب وسنت اور سیرت شیخین پر بیعت کرتا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا جس قدر مجھ میں طاقت ہے۔ پھر میں نے حضرت عثمانؓ کے سامنے اس کو پیش کیا انھوں نے منظور کرلیا۔

حضرت ابوذر سے مروی ہے جب بیعت عثمانؓ کا پہلا دن ہوا اور مہاجرین وانصار مسجد میں جمع ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن کو دیکھا ایک چادر کا عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ اور لوگوں میں اختلاف ہو رہا تھا کہ حضرت ابوالحسن (میرے ماں باپ ان پر قربان) تشریف لائے جب مجمع نے ان کو دیکھا تو سب خوش ہو گئے اور حضرت علیؓ فرمانے لگے، وہ کلام جس سے لوگ ابتدا کرتے ہیں۔ وہ بات جس کو لوگ بولتے ہیں۔ وہ گفتگو جو لوگ کرتے ہیں۔ سب سے بہتر

حق تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے اور حضورؐ اور آپ کی آل و اولاد پر درود بھیجتا ہے۔

جمیع محامد اس ذات پاک کے لئے جو یکتا ہے۔ صرف اسی کے لئے دوام و بقا ہے۔ ملک کا وہ تنہا مالک ہے۔ فرد بزرگی اور ثنا صرف اُسی کے لئے ہے۔ اُس کے جلال کے باعث سب (تمام زمانہ) معبود اُس کے زیر ہیں۔ اور اس کے خوف سے قلوب لرزاں ہیں۔ نہ کوئی اس کا مثل ہے اور نہ کوئی اس کا شریک کوئی مخلوق میں اس کا مشابہ نہیں ہم اُس بات کی گواہی دیتے ہیں جس کی خود اُس نے اور اُس کی مسلم مخلوق نے گواہی دی۔ لا الٰہ الا اللہ نہ اُس کی کسی صفت کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے اور نہ کوئی تعریف ہو سکتی ہے جس سے اُس کو سمجھایا جا سکے اُس نے بادلوں کی رَو کو دریاؤں میں بہایا اور بادلوں کو تھوڑی بارش اور زیادہ بارش کے ساتھ بھیجا۔ جس سے میدانوں اور ٹیلوں پر گھاس کا فرش بچھایا اور پھولوں اور مختلف قسم کی گھاسوں کو اُگایا۔ اور سخت پہاڑوں سے بہتے ہوئے چشمے جاری کئے جو صاف جگہ سے بہتے ہیں جن سے پرندوں اور درندوں اور حشرات الارض اور تمام چوپائے اور انسان کی حیات ہے۔ ہم ان لوگوں میں ہیں جو اُس کے دین پر چلتے ہیں کسی دوسرے دین پر نہیں چلتے۔ پاک ہے وہ ذات جس کی صفت کی نہ نعت ہے اور نہ حد۔ اور گواہی دیتے ہیں ہم کہ محمد صلعم اُن کے پسندیدہ بندے اور برگزیدہ نبی اور رسول تھے۔ ان کو ہمارے پاس ایسے وقت بھیجا جب لوگ بت پرست اور گمراہی کا مرکز تھا اور خون بہاتے تھے اور اولاد کو قتل کرتے تھے اور راہ گیروں کو ڈراتے تھے۔ ان کا عیش ظلم تھا اور ان کا امن خوف تھا اور ان کی عزت ذلت تھی۔ حماقت اور ضلالت اور نخوۃ مزید برآں۔

حق تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب ہمیں گمراہی سے بچایا۔ اور جہالت سے ہدایت دی۔ اور ہلاکت سے بچایا۔

ہم اہل عرب سب سے زیادہ تنگ معاش کم المنظر اور بدحال تھے۔ ہمارا اچھے سے اچھا کھانا پیاز اور ہمارا عمدہ لباس بالوں کے بنے ہوئے کپڑے اور کھال تھی اور بتوں اور آگ کی پرستش مزید برآں۔

حق تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلعم کے طفیل ہمیں بہتر دین کی ہدایت دی اور مورتوں کی پرستش سے بچایا۔ حق تعالیٰ نے ان کو شعلہ نور سے بنایا اور ان کے سبب سے مشرق و مغرب کو منور کیا۔ پھر حضورؐ کا وصال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ کس قدر بڑی آفت اور مصیبت تھی۔ سب مسلمان اس مصیبت میں شریک ہیں۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے۔

اے مہاجرین واللہ جب لوگ مرتد ہونے لگے میں نے اس وقت حضرت ابو بکرؓ سے اچھا تلوار پکڑنے والا نہیں دیکھا۔ حضرت ابو بکرؓ ایک ایسی بات پر جم گئے جس کے باعث حق تعالیٰ نے سنت رسول کو جو مٹ رہی تھی پھر بلند کر دیا۔ اور حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا۔ واللہ اگر ایک رسی دینے سے بھی انکار کیا تب بھی میں ان سے جہاد کروں گا۔ میں نے حضرت ابو بکرؓ کے حکم کو سنا اور ان کی اطاعت کی اور میں سمجھتا تھا کہ میرے لئے یہی بہتر ہے۔ وہ دنیا سے اس لئے فارغ تشریف لے گئے اور میں ان کے متعلق یہ خیالات کیسے ظاہر کروں وہ ثانی اثنین تھے۔ اور ان کی صاحبزادی ذات النطاقین نے اپنی چادر کا چھکا بنلیا تھا اور دو روٹیاں حضورؐ کی خدمت میں لے جایا کرتی تھیں۔ اور حضرت ابو بکرؓ نے سات شخصوں کو آزاد کیا جن میں تین عورتیں اور چار مرد تھے سب کو اللہ اور رسول کی وجہ سے تکلیف دی جا رہی تھی۔ اور انہیں میں سے حضرت بلالؓ ہیں۔ اور حضرت ابو بکرؓ نے رسول اللہ صلعم کو سامانِ سفر دیا اُن کے پاس اُس وقت چالیس ہزار درہم تھے جن کو انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا اور ان کے ساتھ مدینہ ہجرت کی۔

پھر حضرت عمرؓ فاروق اُن کے قائم مقام ہوئے وہ مستعد رہے اور اللہ کے کام میں لومۃ لائم کا خیال نہ کرتے تھے۔ ہم خیال کرتے تھے کہ گویا سکینہ اور وقار ان کی زبان پر بول رہا ہے میں کیسے ان کے متعلق یہ نہ کہوں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ پر سہارا لگا رکھا تھا اور فرما رہے تھے یہ ہم اسی طرح ساتھ زندہ رہیں گے اور اسی طرح مرنے کے بعد ساتھ رہیں گے۔ اور اسی طرح قبور سے اٹھیں گے۔ اور اسی طرح جنت میں جائیں گے۔ اور شیطان اُن کی آہٹ سے بھاگتا تھا۔ اور دنیا سے شہید ہو کر تشریف لے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب اے مہاجرین وانصار میں تم کو دیکھ رہا ہوں کہ تم سب کن انکھیوں سے دیکھ رہے ہو۔ پھر فرمایا۔ اے مہاجرین تم میں جو ایک شخص ابو عبد اللہ حضرت عثمانؓ بن عفان ہیں کیا رسول اللہ صلعم نے ان سے اپنی صاحبزادی کا نکاح نہیں کیا۔ پھر حضورؐ کے پاس جبرئیلؑ آئے اس وقت حضورؐ مقبرہ میں تھے اور کہا اے محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) حق تعالیٰ

فرماتے ہیں کہ ان کی بہن کا حضرت عثمانؓ سے نکاح کر دو۔ اور حضرت عثمانؓ نے جیش عسرۃ
کو سامان سفر دیا۔ اور حضرت عثمانؓ نے ایک روز حضورؐ کے لئے دلیا تیار کیا اور ایک
پیالہ میں لے کر حاضر ہوئے۔ وہ پیالہ بھرا ہوا تھا اور حضورؐ کے سامنے رکھ دیا۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کناروں سے کھاؤ اور چوٹی کو نہ توڑو اس لئے کہ برکت اوپر
سے اترتی ہے اور حضورؐ نے گرم کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم اس کو گھی اور شہد اور گیہوں کے آٹے کے ساتھ تناول فرما چکے تو مخلوق کے پیدا کرنے والے
کی طرف ہاتھ اٹھائے اور فرمایا۔ اے عثمانؓ حق تعالی نے تمہارے اگلے پچھلے ظاہر و باطن
سب گناہ بخش دئے۔ اے اللہ عثمانؓ کا یہ دن نہ بھولنا۔

پھر حضرت علیؓ نے فرمایا۔ میں تم کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم ہے کہ
حضرت جبرئیلؑ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کہ لا سیف
الا ذوالفقار لا فتی الا علی (تلوار صرف ذوالفقار ہے (نام تلوار) اور جوان
صرف علیؓ ہے) لوگوں نے جواب دیا "ہاں" حضرت علیؓ نے فرمایا میں تم سے قسم دے
کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضرت جبرئیلؑ حضورؐ کے پاس آئے اور کہا اے محمدؐ
(صلی اللہ علیہ وسلم) حق تعالی فرماتے ہیں کہ تم علیؓ سے محبت رکھو اور اس شخص سے محبت
رکھو جو علیؓ سے محبت کرتا ہو اس لئے کہ حق تعالی بھی علی اور ان کے محب سے محبت کرتے
ہیں۔ لوگوں نے کہا "ہاں"

حضرت علیؓ نے کہا میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم ہے کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جب مجھے ساتویں آسمان پر لے گئے تو میں نور کے پردوں
اور حجاب میں گیا۔

جب حضورؐ وہاں سے لوٹے تو ہاتف نے پردہ کے پیچھے سے کہا آپ کے باپ (حضرت
ابراہیمؑ) اور آپ کے بھائی علی کس قدر اچھے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ایسا ہوا۔ حضرت ابو محمد
(کنیت حضرت عبدالرحمن بن عوف) نے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
سنا ہے۔ اور اگر نہ سنا ہو تو میرے دونوں کان گونگے ہو جائیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ کیا
تمہیں معلوم ہے کہ میرے سوا حالت جنابت میں کوئی مسجد سے گزرتا ہو۔ لوگوں نے جواب دیا
"نہیں" حضرت علیؓ نے فرمایا۔ میں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا نہیں معلوم کہ

سوائے میرے دروازہ کے اور سب دروازے مسجد کے بند کر دیے گئے تھے۔ لوگوں نے جواب دیا "ہاں" فرمایا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب میں حضورؐ کی داہنی جانب قتال کرتا تھا تو ابوبکرؓ اُن کی بائیں جانب قتال کرتے تھے۔ پھر فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے ارشاد فرمایا تھا "ارتبہ میرے یہاں ایسا ہے جیسا حضرت ہارونؑ کا درجہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہاں تھا لیکن میرے بعد نبوۃ ختم ہوگئی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسین کو پکڑا اور فرمانے لگے "کھڑ حسن کھڑ"۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا یا رسول اللہ حسین اس سے چھوٹا ہے اور ضعیف بھی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ میں "حسن کھڑ" کہوں تو حضرت جبرئیلؑ "حسین کھڑ دو" کہیں۔ کیا تم میں سے کسی کا ایسا رتبہ ہے ہم صابر ہیں تاکہ حق تعالیٰ اس بیعت میں شدنی امر کا حکم فرمادیں۔ وصلی اللہ علی محمد وسلم

حضرت عمرؓ نے منبر پر فرمایا۔ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مرغ نے میرے تین دفعہ چونچ ماری۔ میرا خیال ہے کہ کوئی عجمی شخص میرا قاتل ہے۔ اور میں نے خلافت کا معاملہ اُن چھ آدمیوں کے حوالہ کر دیا جن سے حضورؐ خوش تشریف لے گئے۔ جس کو وہ خلیفہ بنا دیں وہی خلیفہ ہوگا۔

مشرقِ وسطیٰ کے سفرنامے

○ سفرنامہ حجاز

○ ظفر الملک علوی

ظفر الملک علوی، ایڈیٹر الناظر، کا یہ سفرنامہ "الناظر"
کے ستمبر ۱۹۲۳ء تا ستمبر ۱۹۲۶ء کے مختلف شماروں میں
بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے۔ ہم اسے اب یکجا
پیش کر رہے ہیں۔

○ ادارہ

سفرنامہ حجاز

قصبہ کاکوری (ضلع لکھنؤ) کے نامور سپوتوں میں ایک نام ظفر الملک کا بھی ہے۔ آپ کا نام اسحاق علی علوی تھا مگر دنیائے ادب و صحافت میں ظفر الملک کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام منشی حمایت علی علوی تھا جو کاکوری کے مخدوم زادگان کے اسلاف میں سے ایک ہیں۔ ظفر الملک ۱۸۸۴ء مطابق ۱۳۰۱ھ قصبہ کاکوری میں پیدا ہوئے۔ اردو عربی و فارسی کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ اسکے بعد لکھنؤ کے جوبلی اسکول میں انگریزی تعلیم کے لیے داخل کر دیے گئے۔ آپ نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد تجارت کی طرف توجہ کی۔ محکمہ ڈاک و تار میں ملازمت کی حتی کہ بیرون ملک ہانگ کانگ تک کا سفر کیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی مشغلہ انھیں پسند نہ آیا اور وہ وطن واپس آ گئے۔

پھر کچھ دنوں قیام کے بعد حیدرآباد چلے گئے، جہاں عبدالحلیم شرر، علامہ عمادی، ظفر علی خاں اور نذیر محمود علی خاں بدایونی کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ یہیں آپ کی ادبی و علمی زندگی کا آغاز ہوا۔ حیدرآباد سے بمبئی آئے۔ یہاں ایک اخبار کی ادارت سنبھالی۔ پھر لکھنؤ آکر ۱۹۰۹ء میں رسالہ "الناظر" جاری کیا۔ الناظر پریس لکھنؤ سے "الناظر" کے علاوہ مختلف انواع کی کتب وغیرہ شائع ہوتی تھیں۔ صحافتی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ ظفر الملک جلد ہی ملکی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس ہوا تو انھوں نے لیگ کاؤنسل کے رکن کی حیثیت سے اس میں شرکت کی۔ ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی جی نے علی برادران کے تعاون سے عدم تعاون تحریک چلائی تو ظفر الملک لکھنؤ کے پہلے شخص تھے جنھیں اس سلسلہ میں گرفتار کیا گیا۔

۱۹۴۲ء میں جب "ہندوستان چھوڑو" تحریک زور سے چلنے پر شروع ہوئی تو ظفر الملک نے جے پرکاش نرائن اور ارونا آصف علی کیساتھ اسمیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۱۹۴۹ء میں ظفر الملک جمعیۃ العلماء ہند کی ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے سلطان پور گئے تھے جہاں ان کا پینسٹھ سال کی عمر میں انتقال ہوا اور اپنے آبائی قبرستان کاکوری میں دفن ہوئے۔

"ظفر الملک کی صحافتی اور ادبی خدمات" از ڈاکٹر اخلاق حسین عارف
اکادمی لکھنؤ۔ مارچ تا جون ۱۹۹۰ء — تلخیص

ظفر الملک علوی





پہلی منزل

دوشنبہ ۱۶ اپریل ۱۹۲۳ء کو رات کے دس بجے جب چارباغ اسٹیشن (لکھنؤ) پر اعزا واقربا سے رخصت ہوا تو تیسرے درجے کے ایک ڈبہ میں بیٹھنے بھر کی جگہ ملی۔ دن بھر لوگوں سے ملنے اور رخت سفر باندھنے میں معروف رہا تھا اور مسلسل حرکت کے باعث خستگی و ماندگی سے بدن چور چور ہو گیا تھا۔ اِس بنا پر قدرتاً جی چاہتا تھا کہ پاؤں پھیلا کر لیٹوں اور سو جاؤں مگر درجہ میں مسافروں کی کثرت نے اِس کا موقع نہ دیا اور ناچار گھٹنوں پر سر ٹیک کر جسقدر سونے کی کوشش ممکن تھی کی گئی۔ کانپور کے اسٹیشن پر کچھ مجمع چھٹا تو میں نے فراغت کے ساتھ لیٹنے کی امید باندھی لیکن تھوڑے ہی دقفہ کے بعد نئے رنگروٹوں کی بھرتی ہونے لگی جسکے بعد پھیلے ہوئے پاؤں پھر سکڑ گئے اور اسی عالم میں رات تمام ہونے کے بعد علی الصباح نماز فجر کے وقت جھانسی پہونچا۔ سامان گاڑی پر سے اتر کر اُس چبوترہ پر پہونچا جہاں بمبئی کی گاڑی آکر ٹھہرتی تھی اور میں نے قریب کے نل سے پانی لیکر وضو کیا اور نماز فجر ادا کی۔ طلوع آفتاب کے بعد چاے کی تلاش میں اسٹیشن سے باہر نکلا تو مجلس خلافت جھانسی کے ایک کارکن ملے جو ریلوے میں ملازم ہیں اور جن سے فتح گڈھ جیل میں ایک بار نیاز حاصل ہوا تھا جبکہ وہ میرے رفیق مجلس کرمی سید محمد ہادی صاحب سکریٹری مجلس خلافت جھانسی سے ملاقات کرنے آئے تھے اور اُنھوں نے مجھے پہچان کر از راہ کرم چاے کی ضیافت فرمائی اور دیر تک اسٹیشن پر میرے ساتھ ٹہلتے اور مقامی حالات سناتے رہے۔ جب وہ اپنے کام پر چلے گئے تو مجھکو تلاوت کلام مجید کا موقع ملا۔ اِس سے فارغ ہوتے ہی بمبئی جانے والا ایکسپرس آ گیا اور ایک نہایت ہی محفوظ اور کم مسافروں والے ڈبہ میں قلی نے میرا سامان پہونچا دیا۔ قلیوں اور یکہ گاڑی والوں کی جماعت سے ہمیشہ مسافروں کو شکایت رہتی ہے اور جھانسی اسٹیشن پر اس سے قبل متعدد دفعہ مجھے کافی پریشانی اُٹھانا پڑی تھی مگر اب کی بار میں گھر سے تہیہ کر کے چلا تھا کہ ہر مقام پر منھ مانگی اُجرت ادا کر دونگا تاکہ اِس معاملہ میں کسی سے جھک جھک نہو۔ چنانچہ جھانسی میں اِسی طرز عمل کی بدولت بہت فراغت سے رہا اور

اچھی جگہ بھی مل گئی، جس ڈبہ مین مین جھانسی سے سوار ہوا یہ تیسرے درجہ کی عام گاڑیون کے مانند تھا بلکہ اس کی ساخت قریب قریب اُس قسم کی تھی جیسے ڈاک گاڑیون مین اول و دوم درجہ کے متصل ڈبے ہوتے ہین جنھین شاید ریلوے اصطلاح مین "بوگی کیریج" کہتے ہین۔ ایک طویل گاڑی مین پانچ کمرے بنے ہوئے تھے جن کے ایک جانب آمد و رفت کے لیے برآمدہ چھوٹا ہوا تھا اور بیرونی جانب چورون سے محفوظ رکھنے کے لیے پائدان نہین لگائے گئے تھے۔ ایک طرف کے کنارے کا کمرہ ذرا چھوٹا رکھا گیا تھا اور جو گنجائش اس طور سے نکلی تھی اس مین پائخانہ تھا جسکا دروازہ سب کمرون کے دروازون کی طرح برآمدہ مین تھا۔ ڈبہ مین داخلہ کے لیے کنارہ کی طرف دونون جانب دروازے لگے تھے۔ رات بھر آرام سے سونے نہ پایا تھا اس لیے ریل چلی تو تھوڑی ہی دیر مین غافل ہو کر سو گیا، کئی گھنٹہ کے بعد آنکھ کھلی تو پاس والے کمرے مین ایک صاحب نہایت فصیح انگریزی مین اور کسی قدر بلند آواز سے سیاست حاضرہ پر گفتگو کر رہے اور اپنے کم عمر مخاطب کے سامنے اہل ہند کی بدبختی۔ تحریک ترک موالات کی عدم کامیابی اور حکومت دفتری کی چیرہ دستی پر نوحہ خوان ہو رہے تھے۔ مین دیر تک استفادتاً اُن کی گفتگو کو توجہ سے سنتا رہا تا آنکہ مجھے خطرہ ہوا کہ میرا یہ فعل کہین اُن کی ناگواری کا باعث نہو اور وہ یہ شبہ نہ کرنے لگین کہ مین کوئی جاسوس ہون۔ لہٰذا مین نے اُن سے معذرت کرتے ہوئے سلسلۂ مکالمت شروع کر دیا۔ یہ صاحب اگرچہ سرکاری ملازم تھے مگر خیالات آزادانہ اور فکر بلند رکھتے تھے اس لیے حکومت کی کمزوریون اور بدعنوانیون کے اعتراف مین دراد ریغ نہ تھا۔ مہاتما گاندھی کی دل سے عظمت کرتے۔ تحریک ترک موالات کے اصولون کو بغایت پسندیدہ نگاہون سے دیکھتے اور اُسکی ناکامیابیون کے اسباب و علل کا نہایت صحیح اندازہ رکھتے تھے۔ ان سے ملکر بہت جی خوش ہوا اور دوران مین متعدد بار مختلف مباحث پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ ۲ بجے دن کو بھوپال کے اسٹیشن پر گاڑی پہونچی تو ایک عزیز بھائی سے ملاقات ہوئی۔ جن کو روانگی سے قبل تار دیدیا گیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ سے ریاست مین ایک ممتاز عہدہ پر مامور تھے مگر اب بد دل ہو کر مستعفی ہو گئے ہین اور عنقریب اپنے وطن واپس جانے والے تھے۔ تقریباً بیس منٹ تک اُن سے بات چیت ہوتی رہی۔ اسکے بعد ریل کے انجن نے سیٹی دی اور مین اُن سے رخصت ہو کر اپنے ڈبہ مین آبیٹھا۔ میرے کمرے مین دو صاحب الہ آباد کے رہنے والے جھانسی سے سوار ہوئے تھے اور بمبئی تک برابر ساتھ رہے۔ اُن کے ہمراہ ایک آٹھ نو سال کا لڑکا بھی تھا جسکو دیکھکر مجھے بار بار اپنے

بچون اور خصوصاً داؤد سلمہ کی یاد آجاتی تھی۔ بچون کے ساتھ مجھے طبعاً ایک خاص دلبستگی ہے اور یہی وجہ ہے
جو بچہ بھی مجھکو ملجاتا ہے میرے لیے سامان تفریح اور موجب راحت قلب بنجاتا ہے۔ رات کو خوب اطمینان سے
سونے کا موقع ملا اور صبح کو نماز و تلاوت سے فارغ ہونے ہی منزل پر پہونچنے کا انتظار شروع ہو گیا۔ وہ
الہ آبادی لڑکا اب چونکہ مجھسے کسی قدر مانوس ہو گیا تھا اس لیے اُسکی بچپن طبیعت کو زیادہ آزادی
ملی اور جب تک ریل وکٹوریہ ٹرمینس پر نہیں ٹھہری وہ برابر اپنی شوخیون اور اضطراری حرکتون سے
میرے اور اپنے ہمراہیون کے لیے دلچسپی کا ذریعہ بنا رہا۔ ۹ بجے کے قریب گاڑی بمبئی پہونچی اور ہم
لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہوے۔ قلی نے سامان اُتار کر چبوترہ پر رکھا تو مین اُس صندوق کو حاصل
کرنے کی غرض سے آگے بڑھا جو بریک وان مین رکھا ہوا تھا۔ چند قدم چلا ہون گا کہ ایک پولیس کانسٹبل
سے مُدبھیڑ ہوئی جس نے فوراً ہی سوالات کی بوچھار کر دی۔ آپ حاجی ہین؟ کہان سے آئے ہین؟
کہان ٹھہرئیے گا؟ ان سوالات کے مختصر جوابات دیتا ہوا مین بریک وان تک پہونچا۔ جہان معلوم ہوا کہ
میرا صندوق پچھلے بریک وان مین ہے۔ واپس ہونا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کانسٹبل صاحب سر پر
آدھمکے اور وہی سوالات اُنھون نے بھی شروع کر دیے۔ مین اس ملک کی پولیس کے کارنامون سے
بخوبی واقف ہون۔ اس لیے یہ خیال کر کے کہ مجھے اجنبی جانکر ستانا مقصود ہے مین نے کہا کہ آپ میری
فکر نہ کرین اپنی راہ لین۔ اور جب دیکھا کہ یہ بلا اس طور پر نہین ٹلی تو انگریزی مین کسی قدر ترش ہو کر
اُس سے کہا کہ مین بمبئی سے خوب واقف ہون۔ اور کسی کی رہنمائی کا محتاج نہین۔ انگریزی دانی کے
اظہار کی یہان صرف یہ ضرورت تھی کہ کانسٹبل صاحب کے یہ ذہن نشین ہو جائے کہ کسی سادہ لوح ملا سے
سابقہ نہین ہے جسے وہ لوٹ سکے گا۔ جیسا کہ میرے لباس اور چہرے بشرے سے غالباً اس نے سمجھا
ہوگا۔ چنانچہ یہ نسخہ فوراً کارگر ہوا۔ اور وہ کانسٹبل کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اور جب ایک تیسرے کانسٹبل
صاحب نے میرے حال پر توجہ فرمانی چاہی تو اُس نے اُس کو بھی روک دیا۔ خدا خدا کر کے پچھلے بریک وان
پر پہونچا اور بابو کو بلٹی حوالہ کی اور اپنا صندوق لے کے قلی پر لدوایا اور گاڑی پر سامان رکھ کے سوار ہوا۔
ٹھیک اُس وقت جبکہ گاڑی روانہ ہونے والی تھی ایک اور صاحب نازل ہوے اور پوچھنے لگے کہ یہ کیا
سامان ہے۔ کہا گیا کہ بستر، کپڑے، ناشتہ اور دیگر اشیاے خوردنی۔ حکم ملا کہ کھولکر دکھاؤ۔ مین نے پوچھا کہ
کیون آپ کون ہین جو میرا سامان دیکھین گے۔ مین متعدد بار بمبئی گیا تھا اور کبھی کسی نے میرا سامان نہ دیکھا۔

ایک دفعہ یہ بنا انداز دیکھ کر خیال پیدا ہوا کہ
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

دریافت کرنے پر اُس شخص نے اپنے کوٹ کا دامن اُٹھا کر اپنی پیٹی دکھائی جس سے ظاہر ہوا کہ محکمۂ چنگی کا سپاہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ بمبئی میں اُترنے والے مسافروں پر یہ پابندی کبھی عائد نہ تھی اور میرے لیے آسان بھی نہ تھا کہ اپنے وزنی صندوق کو جو رسی کے جال سے کسا ہوا تھا تنہا اُلٹ پلٹ کر کھولتا۔ اس لیے میں نے کہا کہ بستر اور کپڑوں کا بورہ کھلا ہوا ہے آپ شوق سے اس کا معائنہ کیجیے۔ اور ازار بند سے کنجی کھول کر پیش کی کہ بکس بھی کھول کر دیکھ لیجیے مگر اُس کو اصرار تھا کہ میں گاڑی پر سے نیچے اتروں اور سب چیزوں کو اپنے ہاتھ سے کھول کر دکھاؤں۔ میں نے کہا کہ جس وقت سامان اسٹیشن کے چبوترہ پر تھا اور قلی موجود تھا تم کو سامان دیکھنا چاہیئے تھا۔ اب تو یہ میرے بس کی بات نہیں کہ اتنا بھاری صندوق گاڑی سے نیچے اتاروں اور اُسے کھولوں۔ اگر تم کو دیکھنا منظور ہے تو ہر چند کہ یہ امر خلافِ دستور ہے مگر چونکہ مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ میرے سامان میں کوئی چیز لائقِ گرفت نہیں اس لیے بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ تم سامان دیکھ لو۔ مگر وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوا۔ اور جب گاڑی والا گھوڑا بڑھانا چاہتا تھا تو وہ [illegible] روک دیتا تھا۔ تب میں نے کہا کہ تم اپنے افسر کے پاس گاڑی لے چلو میں اُس سے بات چیت کروں گا مگر اُسے اصرار تھا کہ یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے سامان یہیں دکھانا ہوگا۔ مجبور ہو کر میں نے کہا کہ تم جو کہتے ہو اُس کی تعمیل سے میں قاصر ہوں۔ اب جو تمہارا جی چاہے کرو۔ اس پر وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ یہ گاندھی کی بات ٹھیک نہیں ہے تم سامان دکھاؤ ورنہ بہت پریشان ہو گے۔ میں نے پھر کہا کہ خیر جو کچھ ہو۔ سامان دکھانے میں مجھے عذر نہیں مگر یہ بکس میرے کھولے نہیں کھل سکتا اس لیے میں مجبور ہوں۔ تمہارا جی چاہے کنجی لیکر کھولو اور دیکھ لو ورنہ جو تمہارے اختیار میں ہو کرو۔ وہ دیر تک بکتا جھکتا رہا مگر جب اُس نے دیکھا کہ کوئی دھمکی کارگر نہیں ہوتی تو ذرا سیدھا ہوا اور پوچھنے لگا کہ کوئی نشے کی چیز تو نہیں ہے۔ میں نے کہا نہیں تب اُس نے پیچھا چھوڑا اور میں سیدھا ابو صدیق کے مسافر خانے پہونچا جو اسٹیشن سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ مسافر خانہ میں عبد القادر سکندر معلم حجاج مقیم لکھنؤ کے بیٹے حسن سکندر پہلے سے جس کمرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے اُسی کمرہ میں مجھ کو بھی ٹھہرنے کی جگہ دی گئی جس سے معلوم ہوا کہ جہاز اکبر و رحمانی دونوں پیشتر روانہ ہو چکے ہیں۔ اب ۲۱ کو ہمایوں جانے والا ہے جس کے ٹکٹ برابر فروخت ہو رہے ہیں۔ السلطان

تھوڑی دیر ٹھہر کر بازار ہوتا ہوا جناب مولوی عبد اللہ احمد صاحب حافظ حجاج کی خدمت میں حاضر ہوا وہ میرے دیرینہ کرمفرما ہیں۔ اس وجہ سے بڑے تپاک سے ملے اور فوراً ہی پاسپورٹ بنوا دیا اور اپنی کمپنی کے ایک ملازم (بابو لال) کو جو دفتر میں موجود تھا بلا کر میرے ساتھ بھیجا کہ ٹکٹ خریدنے میں میری رہنمائی کرے چنانچہ کمپنی کے دفتر میں جا کر ایک سو روپیہ کا ٹکٹ خرید لیا گیا۔

میں ۱۰۔ اپریل کی صبح کو بمبئی پہونچا تھا اور چونکہ پہونچنے کے دو ہی گھنٹے کے اندر حصول پاسپورٹ اور خریداری ٹکٹ کے مراحل سے فراغت مل گئی تھی اس لیے دو ڈھائی دن ضروری سامان کی خریداری اور دوستوں سے ملاقات کے لیے مل گئے اور جب اتفاق سے ۱۲ کے بجائے ۱۴ اپریل کو جہاز کی روانگی ہوئی تو دو دن فرصت کے اور ہاتھ لگے۔ چار پانچ دن کی اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر میں نے ضروری سامان بھی خریدا۔ مرکزی خلافت کمیٹی اور اخبار خلافت کے دفتروں میں بھی حاضری دی۔ اور اس مجلس ملی کے پیچیدہ معاملات کے متعلق معلومات بھی فراہم کی۔ اور ضمناً بمبئی کی تھوڑی سی سیر بھی ہو گئی۔ گو سابق کی طرح حقیقتاً اس کا کم موقع ملا۔ بمبئی اتنا بڑا شہر ہے کہ اسکی سیر کرنے کے لیے ہفتوں بلکہ شاید مہینوں کی اقامت درکار ہے۔ پھر آئے دن کے تغیرات کی وجہ سے ایک ایسے شخص کو جو برسوں کے بعد بمبئی آتا ہو ہمیشہ اسکی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی رفیق و رہنما سیر کے وقت ساتھ ہو میرے پاس نہ اتنا وقت تھا اور نہ کوئی ایسا راہبر۔ اس لیے بمبئی کی شہری زندگی کے متعلق کچھ کہنے کا موقع نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ بمبئی کی سابقہ چہل پہل میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اور جدید عمارتوں کو دیکھکر تو یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ شہر جو ہندوستان کا عروس البلاد کہا جاتا ہے برابر ترقی کر رہا

خلافت کمیٹی کے دفتر میں جب حاضری کا اتفاق ہوا تو دوپہر کا وقت تھا اور کوئی صاحب دفتر میں موجود نہ تھے۔ البتہ دفتر کے متعلقہ مہمانخانہ میں محترمہ بی اماں صاحبہ کے تشریف رکھنے کی خبر ملی چنانچہ میں نے اپنی حاضری کی اطلاع کر کے محترمہ موصوفہ کی قدمبوسی اور رخصتی دعائیں حاصل کیں۔ اور بعیت چودھری عبد الغنی صاحب ایڈیٹر روزنامہ خلافت اُن کے دفتر چلا گیا۔ وہاں کئی گھنٹہ ٹھہرا رہا کیونکہ اتفاق سے کرمی خواجہ غلام الحسنین پانی پتی تشریف لے آئے اور چونکہ وہ ایک سال سے زائد عرصہ تک عراق میں سفر کرنے کے بعد واپس آئے تھے اس لیے دیر تک عراق کے تمدنی و سیاسی حالات اُن سے سنتا رہا اور یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوا کہ عراق کے عربوں علی الخصوص علما و مجتہدین نے کمال تحمل

واستقامت سے برطانوی اقتدار کا مقابلہ کیا ہے اور نام نہاد شاہ عراق امیر فیصل کو ناکون چنے چبوا دیے ہین ساتھ ہی یہ دریافت کر کے بہت صدمہ ہوا کہ جیسا اندیشہ تھا انگریزی قبضہ کی بدولت عراق کی مقدّس سر زمین پر وہ تمام شیطنتین مسلط ہو گئی ہین جو گویا تہذیب جدید کے لوازم مین داخل ہین اور جنھین قرآن کریم نے مسلمانون پر مطلقاً حرام کیا ہے۔ برطانوی مدبرین و وزرا از راہ تفخر کہا کرتے ہین کہ خدا نے دنیا مین تہذیب پھیلانے کی خدمت ان کے سپرد کی ہے۔ لیکن معلمین تہذیب کے چند سالہ تصرف عراق نے اس ملک مین بداخلاقیون کی جو فراوانی کر دی ہے اُس کو دیکھ کر کوئی منصف مزاج شخص یہ کہے بغیر نہین رہ سکتا کہ

اے خدا مجھے میرے دوستون سے بچا

یہ بالکل جُداگانہ امر ہے کہ آجکل خود حق و انصاف کے معنی و مفہوم مین ایک تغیر عظیم واقع ہو گیا ہے اور جن باتون کو ہم مسلمان بداخلاقی سمجھتے ہین دانایان فرنگ کے لیے وہ روزمرہ کی معمولی باتین ہین جنپر حرف گیری کرنے والون کو وہ بڑی خوشی سے بیوقوفون اور جاہلون کی فہرست مین داخل کر دینے کے لیے تیار رہتے ہین۔

۱۸ اپریل کو جب مین مبئی پہونچکر مسافرخانہ مین ٹھہرا تو میرے کمرہ مین حسن سکندر برادر مکہ معظمہ کے ایک دوسرے مطوف کے بھتیجے سید احمد جفری پہلے سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ سامان رکھکر مین ٹکٹ لینے گیا وہان سے دو گھنٹہ کے بعد واپس آیا۔ تو اپنے بستر کے قریب ہی ایک اور صاحب کا سامان رکھا ہوا دیکھا اُس شخص کی صورت اور وضع اور اُسکے لباس اور مختصر ساز و سامان کو دیکھ کر مجھے گمان ہوا کہ یہ کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ ۱۹۱۹ء مین مہاتما گاندھی کی تحریک ستیاگرہ کی شرکت کے بعد سے برابر خفیہ پولیس جو کہ میرے حرکات و سکنات کی نگران رہی تھی اس لیے خیال ہوا کہ اس سفر مین بھی میری معیت کے لیے ایک فرشتہ معین کیا گیا ہے اور اگرچہ اس بات کا بجائے خود مجھکو اطمینان کامل تھا کہ مین کوئی مجرمانہ ارادہ نہین رکھتا تاہم کوئی وجہ نہ تھی کہ مین ایسے شخص کے مقابلہ مین کسی قدر احتیاط نہ برتتا۔ چنانچہ مبئی کے قیام مین جب کبھی رحمت شاہ نے مجھسے گفتگو کرنا چاہی یا ضروری سامان کی خریداری مین شرکت کا خیال ظاہر کیا تو مین نے ہمیشہ ٹالدیا اور حتی الامکان اس کی موجودگی مین اپنے دوسرے ساتھیون سے بھی زیادہ بات چیت نہ کی۔

۲۰ اپریل کو خبر ملی کہ دوسرے روز دوپہر کے بعد جہاز پر سب مسافرون کو سامان پہونچانا ہوگا

اس سے پیشتر جتنی دفعہ بحری سفر کا موقع ملا کبھی ایسا نہیں ہوا تھا اس لیے پہلے کسی قدر تذبذ
مگر جب معتبر ذرایع سے اُس کی تصدیق ہو گئی اور اسکی ضرورت بھی سمجھ مین آگئی تو دوسرے رو
سامان باندھنے لگا۔ چونکہ حسن سکندر رحمت شاہ کے بھی معلم قرار پا گئے تھے اس لیے اُنھون
ان کے سامان کے لیے ایک ہی بیل گاڑی والے سے طے کیا۔ جب سامان بالائی منزل
آیا اور مین اپنے صندوق کو رسیون سے باندھنے لگا تو رحمت شاہ ازراہ ہمدردی اس محنت
مین میرے معین بن گئے اسکے بعد حسن سکندر ہی کے مشورہ کی بنا پر رحمت شاہ تو بنڈی (بیل
پر سامان کے ہمراہ آئے اور مین اُن کے ساتھ ٹرم کار مین بیٹھکر گودی (ڈاک یارڈ) پہونچا۔ گو
جہاز کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو اسٹیشن کا مال گودام ریل سے تعلق رکھتا ہے۔ گودی کی وسیع
کے سامنے سمندر کی طرف جو چبوترہ تھا ہمارا جہاز اُس سے چند گز کے فاصلہ پر لنگر انداز تھا ا
بیچ دونون حصون مین زینے لگے ہوے تھے جن سے مسافر جہاز پر جا سکتے تھے، چاہیے یہ تھا کہ
حجاج آتے جاتے اپنا سامان جہاز پر پہونچاتے جاتے لیکن ایسا نہین ہوا بلکہ پہلے تو جلد جا
ڈیلے چبوترہ پر جمع ہو کر اپریل کی تیز دھوپ مین تقریباً دو گھنٹہ کامل تک سکھلائے گئے اسکے بعد
مولوی عبداللہ احمد صاحب محافظ حجاج تشریف لائے تو ایک ڈاکٹر صاحب بغرض معائنہ طلب
پھر جب مولوی صاحب موصوف نے کمپنی کے کارکن سے دریافت کیا کہ حجاج کو ٹھہرانے کے لیے گود
مین کھلوا دی جاتی تو اُن کو دھوپ کی تپش سے نجات ملتی۔ تو معلوم ہوا کہ اتوار کا دن ہونیکی وجہ سے
نہین کھولی گئی اور خود کمپنی والون نے محض اس اعتماد پر کہ جب حجاج سامان چڑھانے جاتے ہین
کھلی رہتی ہے۔ کوئی خاص تحریک نہ کی۔ بہر حال اب کیا ہو سکتا تھا لیکن آئندہ کے لیے مجھے امید ہو
کے کارکن ایسی غفلت نہ کرین گے۔ کچھ توقف کے بعد ایک ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور ا
نے کسی کا معائنہ نہین کیا لیکن اُن کا آنا حاجیون کے لیے موجب نجات ہو گیا اس لیے کہ فو
جہاز پر جانے کی اجازت مل گئی۔ اجازت پاتے ہی دفعتاً تمام حاجی دوڑ پڑے اور ہر شخص کوشش
کہ سب سے پہلے وہی جہاز پر پہونچکر اپنے لیے بہترین جگہ انتخاب کرے اور اس غرض سے کہ انتخاب
اُس جگہ پر فوراً قبضہ بھی ہو جائے لوگ اپنے ہاتھون مین چٹائیان، کمبل، دریان اور طرح طرح کے
لیے ہوے تھے۔ بعض لوگ جو اپنا سامان کسی معتبر شخص کے پاس نہین چھوڑ سکتے تھے پورا سامان

چڑھ رہے تھے غرضکہ اس وقت کا یہ ہنگامہ اچھا خاصہ تماشہ بن گیا تھا۔

میں اس وقت تک نیچے ہی کھڑا رہا جبتک زینہ پر چڑھنے والوں کا ریلا رہا جب بھیڑ چھٹ گئی تو میں بھی چٹائیاں لیکر اوپر پہونچا۔ مولوی عبداللہ احمد صاحب نے اپنے ایک ماتحت کو اس ہدایت کے ساتھ میرے ہمراہ بھیجدیا تھا کہ وہ مجھے کوئی اچھی سی جگہ تلاش کردیں مگر جو جگہ اُنھوں نے تجویز کی وہ مجھے پسند نہ آئی اور میں نے خود اپنی رائے سے ڈیک کے بالائی حصہ پر ایک جگہ منتخب کی۔ اور وہیں اپنی چٹائی بچھادی۔ تھوڑی دیر بعد جب سامان اوپر آیا تو رحمت شاہ نے بھی میرے پاس ہی اپنی چٹائی بچھالی۔ یہ امر اگرچہ میری مصلحت کے خلاف تھا لیکن پے درپے اتفاقات نے رحمت شاہ کو میرا ساتھی بنادیا اس لیے مجھے چاروناچار سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ جہاز پر سامان کی حفاظت کا انتظام بمبئی کی پولیس کے سپرد تھا جو ان معاملات میں محافظ حجاج صاحب کے تحت میں کام کرتی ہے اور جب سب حجاج کا سامان پہونچگیا تو حجاج اپنے اپنے جائے قیام پر واپس آگئے۔

دوسرے دن معائنہ طبی کا مرحلہ تھا جسکے لیے سویرے ہی سے حجاج روانہ ہونا شروع ہوئے میں رات کو ایک دوست کے یہاں مدعو تھا اور کھانے کے بعد دیر تک اُن سے بات چیت کرتا رہا۔ جسکی وجہ سے صبح کو سویرے نہ اُٹھ سکا۔ کچھ تو دیر میں اُٹھنے کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ مجھکو پھلوں کی خریدکرنا باقی تھی میں سب سے آخر میں روانہ ہوا۔ پھر بھی جب میں بھپارے کی جگہ پہونچا تو معائنہ طبی ختم نہ ہوا تھا۔ پہلے جب ہندوستان میں طاعون کسی قدر اجنبی تھا تو عموماً معائنہ طبی کے موقع پر حجاج کے کپڑوں کو بھپارہ بھی دیا جاتا تھا مگر اب کہ یہ مرض مثل بخار اور دوسرے ہندوستان کے عام امراض کی فہرست میں شامل ہوچکا ہے۔ بھپارہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ بھپارہ کا مکان ایک گودام کے مانند بنایا گیا ہے۔ مگر اس کی ساخت میں چونکہ اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اندر بند کیے جانے والے ذی روح مال کو باہر کی کافی ہوا پہونچتی رہے۔ اس لیے باہر سے کھڑے ہوکر اندر کی کارروائیوں کا تماشا دیکھنا آسانی سے ممکن ہے چنانچہ پیش آنے والے معائنہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے میں نے بھی کچھ دیر تک اس تماشہ کی سیر کی اور جب حجاج کی آخری جمعیت اندر جانے لگی تو میں بھی اُسی گودام میں داخل ہوگیا۔ اس مقام پر حجاج کے ساتھ تقریباً وہی سلوک کیا جاتا ہے جو گنتی کے وقت عموماً جیلخانوں کی بارکوں میں ہوتا ہے پہلے تو جملہ حجاج کو ایک قطار میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ پھر

کہا گیا کہ سب لوگ اپنے اپنے پیٹ کھولکر کھڑے ہون۔ اسکے بعد ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور اُنھون نے ہر شخص کی جانگھ ٹٹول کر دیکھی کہ کسی کے گلٹی تو نہین ہے۔ پھر حکم ملا کہ سب لوگ اپنے ٹکٹ اپنے سینون پر کھولکر رکھین۔ اور ایک شخص نے آکر ان ٹکٹون اور حجاج کے ہاتھون پر مہرین لگائین جسکے بعد گنتی شروع ہوئی۔ اور متعدد آدمیون نے کئی کئی دفعہ شمار کیا۔ شمار ختم ہونے کے بعد ہدایت ہوئی کہ سیدھے جہاز پر چلے جاؤ۔ اُسی گودام کے ایک گوشہ مین عورتون کے لیے ایک بند کمرہ ہے جسمین ایک لیڈی ڈاکٹر صاحب معائنہ کرتی ہین اور مجھے اپنی ایک عزیزہ سے معلوم ہوا کہ اُنھون نے اُن کو دھمکی دیکر کچھ رقم بطور زنانہ وصول کرلی۔

مین نے بعض لوگون کو لکھدیا تھا کہ بمبئی کے قیام مین اگر وہ کوئی خط وغیرہ میرے نام بھیجنا چاہین تو جنرل پوسٹ آفس بمبئی کے پتہ پر بھیجین۔ مگر سامان کی فراہمی اور لوگون سے ملاقات مین ایسا منہمک رہا کہ چار پانچ دن مین ایک دفعہ بھی ڈاک خانہ تک نہ جاسکا چنانچہ یہ معلوم کرنے کے بعد کہ جہاز کی روانگی مین کسی قدر دیر ہے معائنہ طبی سے فارغ ہوتے ہی مین ٹریم کار پر بیٹھکر ڈاک خانہ گیا اور وہان سے تقریباً نصف گھنٹہ کے اندر اندر واپس آکر جہاز پر سوار ہوا۔



دوسری منزل

جہاز پر دس بجے تک کل حجاج جن کی تعداد تقریباً پانچسو تھی سوار ہو چکے تھے لیکن بندرگاہ
کنارے پر پانی اتنا نہ تھا کہ جہاز روانہ ہو سکتا۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد جب جوار بھاٹا آیا اور پانی بڑھا
تو ایک بجے جہاز روانہ ہوا۔ اور جب تک بندرگاہ کا ارکاٹی جو جہاز کی رہنمائی کر رہا تھا جہاز کو بندرگاہ
کے باہر پہونچا کر اُتر نہین گیا جہاز کی رفتار سُست رہی اور اکثر حجاج صحن جہاز پر سے بمبئی کی عمارتوں
اور بندرگاہ کے جہازون کو دیکھتے رہے۔ ہم نے اپنے لیے جو جگہ منتخب کی تھی وہ صحن کے پچھلے حصہ
مین اُس مقام پر تھی جہان سامان اُٹھانے کے کرین cranes یا آلات جر ثقیل لگے ہوتے ہین
چونکہ یہ حصہ بالکل کھلا ہوا تھا اور روانگی کے بعد فوراً ہی پردے بھی نہین ڈالے گئے، اس لیے سوار
ہونے کے وقت سے عصر کے بعد تک آفتاب کی تپش سہے اور اُس مقام پر دوسرے بیٹھنے والون
کے لیے حد درجہ صبر آزما تھی۔ یہ مختصر جگہ قدرتی طور پر دو حصون مین تقسیم ہو گئی تھی۔ بیچ وسط مین دونون
جانب کے کرین تقریباً سطح سے پانچ فٹ کی بلندی پر آویزان تھے۔ ایک جانب میرا اور رحمت شاہ کا
بستر تھا اور دوسری جانب لاہور کے ایک ٹھیکہ دار صاحب معہ اپنی اہلیہ، صاحبزادی اور ایک کمسن
بھتیجے کے مقیم تھے۔ یہ کل رقبہ چارون طرف سے محاط تھا۔ ایک سمت مین کرین کو حرکت دینے اور
کرین کے رسون کو لپیٹنے والی کلین اس طریقہ سے لگی ہوئی تھین کہ اُن کے درمیان تقریباً ڈیڑھ گز
مربع آہنی حوض چھوٹا ہوا تھا اور ان کلون کے نیچے کے تختے جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک
مسلسل چلے گئے تھے جہان جہان کھلے ہوے تھے ہمارے لیے سامان رکھنے کی جگہ فراہم کرتے تھے۔
دوسری سمت مین وہ آہنی پشتہ تھا جس پر کرین رکھے ہوے تھے ان پشتون کے نیچے کی جگہ
خالی تھی اس لیے ہمین اپنا پانی اور سامان خوردنی رکھنے کے لیے ایک مناسب جگہ مل گئی۔ اس
پشتہ کے عقب مین لکڑی کی ایک بڑی جعفری بنی ہوئی تھی جسمین بھیڑین بند تھین۔ تیسری سمت
مین ایک طویل نل لگا ہوا تھا جسکے اندر وہ زنجیر تھی جو جہاز چلانے والے عقبی پنکھون کو مسلسل حرکت

مین دیکھتی ہے اور چوتھی سمت کی حد بندی بھی اسی قسم کی زنجیر سے تھی۔ بس فرق اس قدر تھا کہ
جس جانب کو مین نے اپنے لیے منتخب کیا تھا اُدھر اُس نل سے گے اوپر ایک فٹ چوڑا آہنی پٹرا
لگا ہوا تھا جسکے وسط مین ہم لوگون نے اپنے صندوق اور بورے ایسے طور پر رکھدیے تھے کہ دیوان
لنا سے آمد و رفت کے لیے دروازون کے مانند کھلے رہتے۔ اور دوسری جانب جدھر ہمارے لاہوری
ساتھی تھے زنجیر کے اوپر کوئی پٹرا نہ تھا۔ جب تک صحن مین دھوپ رہی (طوطق) طبقۂ اندرونی کے
حجاج اپنی اپنی جگہ پر رہے یا جس رُخ دھوپ نہ تھی وہان اپنے اپنے چولھے جلا کر کھانا پکاتے رہے مگر
جیسے جیسے دھوپ کم ہوتی گئی لوگ نیچے سے اوپر آتے گئے تا آنکہ شام تک صحن کے کسی کونے مین آمد و رفت
کا راستہ چھوڑ کر چپہ بھر جگہ نہ باقی رہی جہان کسی نے بستر نہ لگا لیا ہو۔ ہم لوگ چونکہ ایک علحدہ جگہ
مین تھے جہان ہماری چٹائیون کے بچھ جانے کے بعد صرف ذرا سی جگہ آمد و رفت کے لیے بچی تھی
اس لیے ہمارے یہان کسی نے داخلت پسند نہ کی اور ہم جتنی مدت جہاز پر رہے اس حیثیت سے نہایت
امن مین رہے۔ دن بھر تمازت آفتاب سے جو تکلیف اُٹھائی تھی شام ہوتے ہی نہایت ٹھنڈی ہوا
نے اس کی تلافی کر دی اور رات بڑے آرام سے بسر ہوئی۔ دوسرے دن صبح کو پہلے صحن دھویا گیا۔
اسکے بعد پردے باندھ دیے گئے تو پھر دھوپ کی کوئی شکایت باقی نہ رہی صحن جہاز ہر روز دھویا
جاتا ہے اور اُس وقت عموماً مسافرون کو تھوڑی سی دقت ہوتی ہے۔ بعض لوگون کا سامان ذرا سی غفلت
مین بھیگ جاتا ہے۔ میرے قریب دو جانب چونکہ سطح صحن سے تقریباً ۹ انچ بلند پٹرے تھے
اس لیے کل سامان بڑی حفاظت سے رکھا ہوا تھا اور سوا بچھونے اور متفرق چھوٹی چھوٹی اشیا
کے کسی چیز کو اُٹھانے کی حاجت نہوتی تھی۔ دو منٹ کے اندر بچھونے لپیٹ کر پن چلانے والی
کل کے اوپر رکھدیے جاتے تھے اور متفرق چیزین اسی کی خالی جگہ مین۔ اور دھلائی کے وقت
مین خود کبھی تو اونچے پٹرے پر کھڑا ہو جاتا تھا اور کبھی جہاز کے دوسرے کسی حصہ کی گشت لگانے
چلا جاتا۔ سید احمد جعفری نے جو مسافرخانہ مین میرے ساتھ تھے اور اسی جہاز پر مکہ معظمہ جا رہے
تھے اپنے مقام پر گنجایش کم دیکھکر اپنی کریچ کی آرام کرسیان میرے یہان لا کر رکھدی تھین جنمین سے
ایک تو وہ دوسرے دن لے گئے اور دوسری پر اُن سے اجازت لیکر ہم لوگ بیٹھتے رہے۔ ان ذریعہ
سے مجھکو اور بھی راحت ملی۔

حجاج کے ٹکٹ بالعموم بغیر خوراک ہوتے ہین اور اُنھین کھانا پکانے کے لیے جہاز پر جگہ بھی
دی جاتی ہے۔ اور لکڑی بھی ملتی ہے۔ ہمایون چھوٹا سا جہاز ہے اور اس سبب سے اس کے باورچی خانے
بھی چھوٹے ہین لیکن اسی نقص کو رفع کرنے کے لیے صحن کے مختلف حصون مین کنارے کے رُخ پر
تین چار انچ کے بلند چبوترے بنا دیے گئے ہین جہان لوہے کی انگیٹھیان رکھکر کھانا پکایا جاتا ہے
پہلے روز تو لوگ عموماً بمبئی سے روٹیان اور دیگر سامان خوردنی ساتھ لائے تھے مگر دوسرے روز
سے ہر طرف چولھے جلنا شروع ہوے اور صبح سے لیکر شام تک باری باری سے لوگ کھانا پکایا کرتے
تھے۔ میری جگہ باورچی خانہ کے عین مقابل تھی اور اگر برابر اسی مین کھانا پکتا رہتا تو دھوئین سے
کافی تکلیف ہوتی۔ مگر اول تو وہان گنجائش کم تھی دوسرے دھوئین سے خود پکانے والون کا دم گھٹتا تھا
اس بنا پر باورچی خانہ کے اندر پکانے کے بجاے لوگ زیادہ تر باہر کی چبوترون پر پکانا پسند کرتے تھے اور ایک دو دن
کے بعد تو باورچی خانہ بالکل ہی خالی رہنے لگا۔

مین گھر سے تنہا چلا تھا اور بمبئی سے اگرچہ رحمت شاہ کا ساتھ ہو گیا تھا مگر مین نے اُن کے ساتھ
کھانے پکانے کا انتظام گوارا نہ کیا۔ اسکے علاوہ چلتے وقت اعزا نے اس قدر ناشتہ ساتھ کر دیا تھا اور اسکے
علاوہ معقول رقم محصول ریل کی مد مین مجھے صرف کرنا پڑی جسکے بعد سواے اسکے کوئی صورت
نہ رہی کہ مین اس رقم کی وصولی اور اس ناشتہ کے انبار کو ٹھکانے لگانے کے لیے جہاز پر تازہ کھانے کے
انتظام سے قطع نظر کرون چنانچہ جتنے دنون مین جہاز پر رہا یہ ناشتہ ہی کھاتا رہا۔ اور اُسکی مقدار
اتنی تھی کہ اسکے بعد بھی ایک معقول حصّہ بچ گیا جو واپسی تک کام آتا رہا بلکہ بعض چیزین ساتھ
واپس آئین۔

جہاز پر مسافرون کو کھانے کی فکر کے سواے کوئی اشغال نہین ہے۔ عام جہازون پر لوگ عموماً اپنا
وقت گذارنے کے لیے تاش وغیرہ کھیلا کرتے ہین۔ مگر حجاج کی جماعت مین اس کا رواج عام طور پر
نہ تھا۔ جو لوگ خواندہ تھے وہ عموماً فرصت کے اوقات کتب بینی مین صرف کرتے تھے۔ ورنہ باہم بات چیت
کرکے یا لیٹے لیٹے وقت گذرتا تھا۔ کچھ عابد و زاہد لوگ بھی تھے جو زیادہ تر تسبیح و مصلیٰ سے کام رکھتے تھے
پانچون وقت اذانین ہوتی تھین اور متعدد چھوٹی بڑی جماعتون مین لوگ نمازین پڑھتے تھے۔

پینے اور کھانا پکانے کے لیے میٹھا پانی دن مین ایک بار ملا کرتا تھا۔ اس لیے ہر شخص کو اپنا اپنا

برتن لیکر پانی بھروانے جانا پڑتا تھا۔ اور لکڑی بھی کبھی روزانہ اور کبھی دوسرے دن ملتی تھی جسکے لیے بھی لوگوں کو جد و جہد کرنا پڑتی تھی۔ پانی اور لکڑی حاصل کرنے کے وقت اچھا خاصا ہنگامہ ہوجاتا تھا کیونکہ ہر شخص چاہتا کہ پہلے وہی حاصل کرلے۔ دینے والا ایک اور لینے والے بہت سے اور روہ بھی عجیب نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بعض اوقات جہاز کا منشی جو پانی اور لکڑی تقسیم کرتا تھا گھبرا کر بھاگ جاتا۔ اور تقسیم رُک جانے کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہوتی۔

مجھے کھانا پکانے کی تو کوئی فکر نہ تھی۔ اور پاتی بھی بمبئی سے اتنا لے لیا تھا کہ کئی دن تک چلتا رہا۔ لیکن میرے ساتھی رحمت شاہ کو کھانا پکانے کی وجہ سے دونوں چیزوں کی ضرورت پڑتی تھی لہذا پانی اور لکڑی کے جو ٹکٹ ہر مسافر کو دیے گئے تھے وہ میں نے رحمت شاہ کے حوالے کر دیے اور جب انھیں ضرورت ہوتی تو وہ اپنے اور میرے ٹکٹ دکھا کر لکڑی اور پانی لاتے رہتے۔ میں چائے کا عمر سے عادی ہوں اور جہاز پر تو ہر شخص کے لیے چائے کا استعمال ضروری ہے۔ اس کے لیے میں نے شروع ہی جہاز کے بھنڈاری سے انتظام کر لیا تھا اور وہ جس وقت ضرورت ہوتی کیتلی بھر پانی گرم کر دیتا تھا بھنڈار خانہ چونکہ جہاز کی پچھلی چھت کے بالائی حصہ پر تھا اس لیے مجھ کو چائے کا پانی گرم کرانے کے لیے دن میں کئی بار وہاں جانا پڑتا تھا مگر دو ہی تین دن کے بعد سے رحمت شاہ نے مجھے اس سے بے نیاز کر دیا۔ اب میرے پاس سوائے اس کے کوئی کام نہ تھا کہ دن بھر نوشت و خواند میں مصروف رہوں یا جہاز ملاقاتیوں سے بات چیت کرتا رہوں۔

جہاز پر جتنے حجاج بمبئی سے سوار ہوئے تھے اُن میں بڑی تعداد تو بنگالیوں کی تھی اور باقی مختلف صوبجات کے لوگ تھے۔ مگر ان میں یہ دیکھکر مجھے بہت تکلیف ہوئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی نہایت قلت تھی۔ انگریزی داں طبقہ کا نمائندہ تو میرے سوا کوئی دوسرا تھا ہی نہیں لیکن عربی فارسی جاننے والے بھی انگلیوں پر شمار ہو سکتے تھے۔ البتہ جاہل اور ناخواندہ لوگوں کی کثرت تھی۔ انگریزی خواں جماعت کے لیے جہاں مسجد کی حاضری اور پنجوقتہ نماز معاف ہے۔ وہیں معلوم ہوتا ہے کہ حج کا فریضہ بھی اُن کے ذمہ عائد نہیں کیا گیا۔ گویا قرآن شریف صرف جاہل مسلمانوں ہی کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے تعلیمیافتہ اور خصوصاً انگریزی خواں مسلمانوں کو اس کی حاجت ہی نہیں، اس بے نیازی کا کیا ٹھکانا ہے مذاق کے مطابق جہاں ملنے والے نہ میسر آئیں وہاں خلاف مذاق لوگوں ہی میں انتخاب کرنا پڑتا ہے اور اگرچہ میری نوشت و خواند کی مصروفیتیں کچھ کم نہ تھیں تاہم چند گھنٹے روزانہ نئے احباب کے نذر کرنا

پڑتے تھے۔ رحمت شاہ اب چوبیس گھنٹے ساتھ رہتے تھے اس لیے مجھکو اُن کے بشرے اور حرکات وسکنات پر زیادہ غور کرنے کا موقع ملا اور جب میں نے خود ان کے بیان کردہ حالات سنے اور ایک حد تک اُن کی تصدیق اُن کاغذات سے بھی ہوگئی جو اُن کے پاس موجود تھے اور جو میں نے ایک مناسب موقع پر ان سے مانگ کر دیکھے تو میری بدگمانی جاتی رہی۔ اور رفتہ رفتہ اُن کی غربت مزاج اور نیک نفسی کے باعث مجھکو اُن سے ایک طرح کا اُنس ہوگیا۔ اور اُس غریب نے حتی المقدور میری خدمت بھی کی۔

ہمارے پڑوسی نظام دین صاحب جو لاہور میں ٹھیکہ داری کا کام کرتے ہیں نیک دل اور خوش خلق آدمی تھے اور اُن کا کمسن بھتیجا غلام حسین اپنی بھولی باتوں اور بچپن کی شوخیوں سے ہم سب کا دل بہلایا کرتا تھا۔ ان لوگوں کا تو خیر ہر وقت ساتھ ہی رہتا تھا۔ مگر ان کے علاوہ اور بھی متعدد حجاج ہماری صحبت میں شریک ہوجایا کرتے تھے جنمیں ضلع پرتابگڈھ کے ایک صاحب سردار خاں سے خاص لطف ہوگیا تھا۔

۲۱ اپریل کو رات میں جہاز کراچی پہونچکر بندرگاہ میں لنگر انداز ہوگیا۔ صبح سویرے جہاز کی صفائی سے فارغ ہوکر خلاصیوں نے پردے کھولدیے اور کرمن اوپر کو اُٹھادیے اور دن بھر گیہوں اور آٹے کے بورے جو کشتیوں پر لادکر لائے گئے تھے۔ جہاز کے اندر دتی تہ خانے میں بھرے گئے اس سے اندر کے مسافروں کو بھی کسی قدر تکلیف ہوئی اور جو لوگ صحن میں فروکش تھے وہ تو دھوپ کی گرمی سے بلبلا اُٹھے لیکن چونکہ کھانے پینے کی مختلف چیزیں بیچنے والے جہاز سے متصل بہت سی کشتیوں پر سوار تھے اور اُن میں سے بعض بعض آدمی جہاز کے اوپر بھی پہونچ گئے تھے اس لیے مسافروں کو ایک اچھا شغل ہاتھ آگیا تھا اور ہر شخص خریداری میں یا اُس کا تماشا دیکھنے میں مصروف نظر آتا تھا۔ شام تک سب سامان بھی لاد دیا گیا اور کشتیاں بھی مال بیچکر چلی گئیں۔ دوسرے دن طلوع آفتاب کے بعد جہاز گودی کے کنارے پہونچا دیا گیا اور کراچی کے مسافر سوار ہونے لگے۔ میں نے جلدی جلدی چند خطوط لکھے اور ایک صاحب کی معرفت پولیس سارجنٹ کے حوالے کیے جس نے یقین ہو کر ڈاک خانہ میں ڈالدیے ہوں گے۔ صحن کی چھت پر چونکہ اب تک پردے نہیں پڑے تھے اس لیے آج بھی کافی تکلیف رہی اگرچہ نئے حجاج کی دیکھ بھال سامان کی خریداری خطوط نویسی وغیرہ مشاغل کی وجہ سے کم محسوس ہوئی ظہر کے بعد جہاز روانہ ہوا اور عصر کے وقت تک کراچی کا کوئی پتہ نشان باقی نہ رہا۔ دوسرے ہی دن صبح کو پردے پڑ گئے اور جب تک جہاز پر قیام رہا پھر اس زحمت کا سامنا نہیں ہوا۔

جہاز کراچی سے روانہ ہوا تو دوسرے دن میں نے الناظر کے لیے مضمون لکھنا شروع کیا۔ اتفاق سے
جہاز کے ڈاکٹر صاحب اس وقت میرے پاس سے ہو کر گذرے اور مجھے مصروف تحریر دیکھکر میری طرف
متوجہ ہو گئے۔ اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں ایک ناچیز قومی خادم ہوں تو دیر تک مختلف معاملات قومی و
ملکی پر گفتگو کرتے رہے اُس وقت سے وہ میرے حال پر خاص کرم فرمانے لگے اور روزانہ ملاقاتیں ہونے
لگیں۔ اُنھوں نے کراچی اور عدن میں انگریزی اخبارات خریدے اور مجھے بھی پڑھنے کو دیے۔ کراچی سے سندھ
پنجاب اور بلوچستان کے تقریباً ساڑھے چار سو حجاج سوار ہوے اور اگرچہ ان میں بعض بڑے بڑے معزز
لوگ بھی تھے۔ مگر تعلیمیافتہ لوگوں کی ویسی ہی قلت تھی۔ صرف ایک صاحب انگریزی دان تھے جو
پنجاب کے رہنے والے تھے اور بلوچستان کی ریاست لسبیلہ میں ملازم تھے۔ ان صاحب سے ڈاکٹر
واکدے کے یہاں ملاقات ہوئی اور پھر ان کے ذریعہ سے اکثر بلوچی سرداروں سے نیاز حاصل ہوا۔

کراچی سے عدن تک چھ دن کا راستہ تھا۔ جہاز ہمایون چھوٹا تھا اس کی رفتار بھی کم تھی تیز جہاز
چوتھے پانچویں ہی دن پہونچ جاتے ہوں گے۔ مجھے اس اثنا میں اپنا مضمون بھی ختم کرنا تھا اور بہت سے
خطوط بھی لکھنا تھے اس وجہ سے میں روزانہ کئی گھنٹے لکھنے میں مصروف رہتا تھا۔ فرصت کے اوقات
میں کبھی دوسرے مسافر میرے یہاں آکر جمع ہو جاتے اور کبھی میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں یا مسٹر فضل الدین
کے یہاں چلا جاتا اور بلوچی سرداروں سے اُن کے حالات سنتا رہتا تھا۔

سندھ کی ریاست میرپور خاص کے سابق رئیس کے چھوٹے بیٹے بھی کراچی سے سوار ہوے تھے
ان کو عدن پہونچنے سے قبل ایک تار بھیجنے کا خیال پیدا ہوا۔ سید احمد جعفری نے چونکہ اُن سے وعدہ
لے لیا تھا کہ وہ مکہ معظمہ پہونچکر ان کے چچا سید امین عاصم کو اپنا معلم بنائیں گے اس لیے سید احمد نے
ان کی خدمت گذاری بہیں سے اپنے ذمہ لے لی تھی۔ اور وہی میرے پاس آکر تار کا مسودہ لکھوا لیتے۔
جہاز پر بارکونی کمپنی کا وائرلس اپریٹس (بے تار کے تار بھیجنے والا آلہ) لگا رہتا ہے اور اسی کے ذریعہ یہ تار
بھیجنا مقصود تھا۔ چونکہ تار بابو انگریز تھا جو ہندوستانی زبان سے بہت تھوڑی واقفیت رکھتا تھا
اس لیے سید احمد صاحب کو ایک ترجمان کی حاجت ہوئی۔ اور وہ مجھے اس خدمت کے لیے پکڑ لے گئے
اسکے بعد جو کچھ اس انگریز سے گفتگو ہوئی تھی اُنھوں نے خواہش کی کہ میں خود چل کر پیر صاحب کو سمجھا دوں
میر نبی بخش صاحب ہندوستانی بھی سمجھتے تھے مگر فارسی میں گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتے تھے چنانچہ

تار کے متعلق ضروری بات چیت ختم ہو جانے کے بعد اُن سے دیگر امور پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ا
جب ان کو اثنائے گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں تو پھر وہ واجد علی شاہ اور اُن کی
اولاد کے حالات اور لکھنؤ کی بعض عمارتوں خصوصاً قیصر باغ کے بارہ میں مجھ سے سوالات کرتے رہے۔ لکھنؤ
کے ساتھ اُن کو اس قدر دلچسپی تھی کہ پھر جب کبھی اُن سے ملاقات ہوتی تو وہ لکھنؤ ہی کا تذکرہ چھیڑ دیتے
جیسے جیسے جہاز کراچی سے دور اور عدن سے قریب ہوتا جاتا تھا گرمی بڑھتی جاتی تھی۔ بہرحال
کو رات کے دس بجے جہاز بندرگاہ عدن میں لنگر انداز ہوا۔ تو دیر تک مسافر دور سے شہر کی روشنیوں کا
نظارہ کرتے رہے۔ صبح سویرے ہی کشتیوں پر سامان بیچنے والے آ گئے اور ہر شخص شغل خرید میں منہمک
ہو گیا۔ میں نے بھی کچھ پھل اور آلو خریدے۔ چونکہ رحمت شاہ سے اب ربط ہو گیا تھا اکثر کھانے میں بھی
شرکت ہونے لگی تھی اس لیے ترکاری پکوا لینا آسان تھا عدن میں مچھلی بہت خریدی گئی میاں
نظام دین اور رحمت شاہ دونوں نے مچھلی خریدی اور اپنے اپنے طور پر پکا کر مجھے بھی کھلائی۔ دس بجے
دن کو جہاز روانہ ہو کر دوسرے دن اُسی وقت جزیرۂ کامران کے سامنے ٹھہر گیا۔ یہاں قرنطینہ ہر
اس لیے ایک رات کے لیے جہاز چھوڑنا پڑا۔ جملہ مسافر ضروری بچھونے اور کھانے کا سامان لیے ہوئے
کشتیوں پر سوار ہو کر جزیرہ کے ساحل پر اُتر گئے۔ ساحل سے تقریباً دو سو قدم کے فاصلہ پر قرنطینہ کا
کیمپ ہے۔ نمازی کمپنی کا ایک جہاز اُسی وقت جاوا کے حجاج کو لیے ہوئے پہونچا تھا۔ پہلے ہمارے جہاز
کے مسافر اُتارے گئے پھر دوسرے جہاز کی باری آئی۔ اور دونوں جہازوں کے مسافر جداگانہ کیمپوں
میں ٹھہرائے گئے۔ کیمپ کے اندر داخل ہونے سے پہلے ایک مکان میں بلائے گئے جہاں ہر شخص سے
کہا گیا کہ اپنے کپڑے اُتار کر وہ لنگی باندھے جو قرنطینہ ہی کی ملک تھی۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں لوگ
مکان کے اندر جاتے۔ کپڑے اُتارتے۔ لنگیاں باندھتے اور پھر ایک مقام پر لیجا کر اُن کا شمار ہوتا اسکے
بعد وہ ایک ایسے کمرہ میں بھیج دیے جاتے جہاں چھت میں فوّارہ دار نل لگے ہوئے تھے اور تھوڑی دیر کے
لیے نل کھول دیے جاتے۔ بعض لوگ تو نلوں کے نیچے کھڑے ہو کر غسل کر لیتے تھے بعض پر تھوڑا ہی سا
پانی پڑ جاتا تھا اور بعض جو اِدھر اُدھر کناروں سے لگ کر کھڑے ہوتے بالکل نہیں بھیگتے تھے۔ اُتارے
ہوئے کپڑے اور بستر ہر شخص سے لے لیے جاتے تھے اور ایک بڑے آہنی ظرف میں رکھکر انھیں بھپارہ
دیا جاتا تھا غسل خانہ سے نکل کر ہم لوگ اسی بھپارہ والے کمرے میں پہونچے جہاں ہمارے کپڑے اور بستر

ہمارے حوالے کیے گئے۔ عجلت میں بعض لوگوں کے کپڑے اور جوتے گڈمڈ ہو گئے۔ چنانچہ میاں نظام دین کی ایک صدری اسی میں تلف ہو گئی۔ اشیائے خوردنی اور دیگر سامان جو ہم اُس کمرہ میں چھوڑ آئے تھے جہاں کپڑے اُتارے گئے تھے وہاں سے ملازمین قرنطینہ نے اٹھا کر باہر رکھ دیا اور جب ہم لوگ اپنے کپڑے پہن کر باہر آئے تو ہر شخص نے اپنی اپنی چیز پہچان کر اٹھا لی مگر بعض لوگوں کو شکایت رہی کہ کچھ چیزیں انھیں نہیں ملیں۔ مجھے یہاں ایک خاص واقعہ پیش آیا۔ میرے دونوں بازوؤں میں تعویذ کے طور پر سو سو روپیہ کے نوٹ بندھے ہوئے تھے۔ جس وقت میں نے کپڑے اُتارے تو دونوں تعویذ کھول کر ہینڈ بیگ میں رکھ دیے۔ کچھ دیر بعد سردار خاں صاحب نے اپنا روپیہ میرے سپرد کیا تو میں نے بیگ کھول کر اُس کو بھی رکھ دیا۔ جب غسل خانہ کی طرف جانے لگا تو مجھے خیال آیا کہ عینک اور خلال تر ہو جائے گی۔ لہٰذا پھر بیگ کھولا اور یہ دونوں چیزیں بھی رکھ دیں۔ اسکے بعد جب میں نہا کر اور اپنے کپڑے پہن کر اپنا سامان اُٹھا رہا تھا تو دفعتاً سردار خاں صاحب ایک طرف سے آئے اور ایک تعویذ دکھا کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا یہ آپ کا ہے۔ میں نے دیکھا تو کہا ہاں یہ میرا ہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے کھول کر دیکھ کر خیال کیا کہ آپ ہی کا ہوگا۔ اُسمیں پانچ سو روپیہ کے نوٹ تھے۔ خدا معلوم یہ کس وقت میرے بیگ سے نکل کر سردار خاں صاحب کے کپڑوں میں جا گرا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل کیا ورنہ غربت میں اتنی بڑی رقم ضایع ہو جائے گی اور یہ میرے لیے کافی دقتوں کا سامنا ہوتا۔ غسل سے فارغ ہو کر سب لوگ کیمپ میں پہونچ گئے۔

کیمپ کے چاروں طرف بلند جالی دار کٹہرا لگا ہوا ہے۔ اور وسط میں فوجی بارکوں کی طرح چھپرا دار ٹین کی متعدد بارکیں بنی ہوئی ہیں۔ جن کے درمیان کافی فاصلہ چھوڑا گیا ہے اور اُن کے دونوں جانب ڈھلکے ہوئے برآمدے بنائے گئے ہیں۔ اِن بارکوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں جنمیں دروازے نہیں لگائے گئے تاکہ ہوا کی کسی وقت روک نہ ہو سکے۔ بارکوں کے درمیان جو راستے بنائے گئے ہیں ان کے وسط میں جہاں چوراہے ہیں گیس کی بتیاں لگی ہوئی ہیں۔ جن سے میدان اور قریب کی بارکوں کے برآمدوں میں روشنی رہتی ہے۔ اور بارکوں کے اندر لالٹینیں روشن کی جاتی ہیں۔ احاطہ کے دو جانب آہنی جالی سے متصل پختہ پاخانے غسل خانے اور وضو خانہ بنا ہوا ہے جسمیں پانی کے نل لگے ہوئے ہیں۔ مغربی سمت میں ایک وسیع بارک نماز کے لیے بنی ہوئی ہے جسمیں چٹائیاں بھی بچھی ہیں بارک

مین کسی قسم کا فرش نہین ہو۔ جنوبی جالی کے قریب ایک پختہ بارک کسی قدر بلند کرسی کی بنی ہوئی ہو جسمین
اول درجہ کے مسافر ٹھہرائے جاتے ہین۔ اور اُس سے تھوڑے فاصلہ پر ایک کرہ مین مٹھیائی کا ذخیرہ ہو۔
جالی کے جنوبی مشرقی کونہ پر لکڑی کا ذخیرہ رکھا گیا ہو۔ اِن دونون کے درمیان مختصر سا بازار ہو جہان ضروری
اشیاے خوردنی فروخت ہوتی ہین۔ دوکانون کے باہر ایک تختی پر چیزون کا مقررہ نرخ لکھا ہوا ہے۔
روٹی۔ پراٹھے۔ چاے۔ شربت۔ لمنیڈ۔ برف۔ بسکوٹ۔ شکر۔ سگرٹ۔ تمباکو۔ دیاسلائی وغیرہ مناسب قیمتون پر فروخت
ہوتی ہین۔ بکری۔ مرغیان۔ مچھلی اور انڈے بھی ملتے ہین اور ان چیزون کی قیمتین عموماً کم ہین۔
سہ پہر کو ظہر کے وقت ہم لوگ کیمپ مین داخل ہوے۔ اگرچہ آفتاب کی تپش ناقابل برداشت تھی
لیکن سمندر کی تازی ہوا کے باعث گرمی کی تکلیف بہت کم محسوس ہوئی۔ اور رات کے وقت اس سہانی فضا
مین سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے جو لطف دیا اُس سے تو ہر شخص نہایت ہی شادان و فرحان تھا
میرے کرمفرما سردار خان صاحب تو جہاز کی قید اور گرمی سے اِس قدر تنگ آ گئے تھے کہ اگر ان کو مدتون
تک اِس قرنطینہ مین رہنے کا موقع دیا جاتا تو وہ اسے بہت خوشی سے منظور کر لیتے۔ اگرچہ فی الجملہ یہان بھی
یہ قید لگی ہوئی تھی کہ تارون کی چار دیواری کے باہر کوئی حاجی نہین جا سکتا تھا حتی کہ دوسرے جہاز کے
حجاج سے بھی ملاقات نہین ہو سکتی مگر یہ مقام ایسا صاف اور ستھرا اور ہوادار تھا کہ ہر شخص نے اُس کو
پسند کیا۔ یہ قرنطینہ ترکی عہد کی یادگار ہو اور جنگ کے زمانہ سے انگریزی قبضہ مین آ گیا ہو۔ قرنطینہ کی
بارکون سے کچھ فاصلہ پر انگریزون کی مختصر فوج کا پڑاؤ ہو۔ اور اُسکے آگے تقریباً ایک میل پر عربون کی بستی
ہو جسکا انتظام ایک ہندوستانی مجسٹریٹ سے متعلق ہو۔ یہ صاحب شام کو ہمارے کیمپ مین بھی تشریف
لائے اور اتفاق سے مجھے مل گئے تو دیر تک قرنطینہ کے انتظامات اور دیگر امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ صبح سویرے
ہی سے لوگون نے جہاز پر واپس جانے کی تیاری شروع کر دی۔ کچھ دیر مین معلوم ہوا کہ ڈاکٹری معائنہ
ہوگا چنانچہ مختلف بارکون کے لوگ بارکون سے باہر میدان مین جمع کر کے قطار در قطار بٹھائے گئے اور
جب تک کل حجاج کا معائنہ نہو لیا کوئی اپنی جگہ سے ہٹنے نہ پایا۔ گنتی اور معائنہ ختم ہوتے ہی سب
لوگ اپنا اپنا سامان لیکر کنارہ کی طرف روانہ ہوے۔ اور وہان جو بڑی بڑی کشتیان کھڑی ہوئی تھین
اُن پر سوار ہو کر تقریباً دس بجے تک جہاز پر واپس پہونچ گئے۔ کامران جانے کے لیے جہاز سے جس وقت
حجاج کشتیون پر سوار ہوے تھے تو جہاز کے کرانی (کلرک) صاحب نے زینہ کے اوپر کھڑے ہو کر کل حاجیون
سے ٹکٹ لیے اور اُس وقت پہلی دفعہ جہاز والون کو معلوم ہوا کہ آدمی بے ٹکٹ کے سفر کر رہے ہین۔ یہ

سب مدراس کے رہنے والے نوجوان تھے جنھون نے خدا معلوم کیسے بمبئی مین روانگی سے قبل جہاز کے اندر اپنے تئین چھپا دیا تھا۔ بعض لوگون کا خیال تھا کہ جہاز کے ملازمین مین سے کسی کی شرکت سے یہ کارروائی کی گئی۔ بہرحال جب حال کھلا تو جہاز کے عمال چکرائے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اپنی غفلت کو طشت ازبام کرنا اُنھین منظور نہ تھا۔ اس لیے انھون نے ان لوگون سے کچھ تعرض نہ کیا۔ جہاز پر بہت سے ایسے مسافر تھے جو اپنی غربت و مسکینی کا اظہار کرکے دوسرے حجاج سے کھانا اور خیرات حاصل کرتے تھے۔ یہ لوگ بھی انھین مین شریک رہتے تھے اور کسی کو گمان بھی نہ ہوا کہ یہ بغیر ٹکٹ سوار ہوے ہین۔ حج کا فریضہ صرف انھین لوگون پر عائد ہوتا ہے جن کو خدا نے اتنی استطاعت دی ہو کہ وہ ضروری مصارف برداشت کرسکین۔ لیکن ہندوستان سے ہر سال کثیر تعداد مین ایسے لوگ بھی حج کے لیے ضرور جاتے ہین جن کے پاس صرف جہاز کا کرایہ ہوتا ہے۔ اکثر لوگون کو تو بمبئی اور کراچی کے صاحبان خیر ٹکٹ لا دیتے ہین اگر وہ اُن ذلتون اور حقارتون کا احساس کرسکتے جو ان مساکین کی بدولت دنیا بھر کے مسلمان حجاج کی نظرون مین عموماً اور ارض حجاز کے باشندون کی نگاہون مین خصوصاً ہندوستانی مسلمانون کی ہوتی ہے اور ان دشواریون کا اندازہ کرسکتے جو اُن کی واپسی کے انتظام مین درپیش آتی ہین تو مجھے یقین ہے کہ یہ صاحب اس تھوڑے سے ثواب کو حاصل کرنا ضروری نہ خیال فرماتے اور محض جانے کا ٹکٹ دلا کر اپنی ذمہ داریون کو ختم نہ ہو جانے دیتے۔

مین ان مفلس و نادار لوگون کو الزام نہین دے سکتا جو فرض نہ ہونے کے باوجود اپنے مذہبی جوش اور مخلصانہ شوق سے مجبور ہو کر سفر حجاز کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہین۔ بلکہ حقیقتاً ان کی مذہبی دلدادگی نہایت درجہ قابل قدر ہے۔ لیکن جن لوگون نے اس سفر کو ایک قسم کی تجارت بنا لیا ہے اور جن کی تعداد کچھ کم نہین ہوتی وہ یقیناً حد درجہ قابل ملامت ہین۔ تاجران بمبئی و کراچی اور دوسرے مقامات کے جو صاحب لوگون کو حج کرانے کا ثواب حاصل کرنا چاہتے ہین اُنھین چاہیے کہ آمد و رفت کے کرایے اور زادراہ و دیگر مصارف ضروریہ کی کفالت اپنے ذمہ لین تاکہ ان غریبون کو بھی ارض مقدسہ مین جا کر ہر قسم کی مصیبتون سے نجات ملے اور ہم مسلمانان ہند بھی تحقیر و رسوائی سے محفوظ رہین۔ مین اس مسئلہ پر اخبار مین علحدہ لکھون گا مگر یہان بھی یہ عرض کیے بغیر نہین رہ سکتا کہ اس بارہ مین سب سے زیادہ علماے مذہب کو توجہ کرنا چاہیے۔

۲۰ مئی کو جب جہاز کامران سے روانہ ہوا تو اکثر حجاج نے احرام باندھنا شروع کر دیے۔ ہم لوگون نے

اس وقت تک انتظار کرنا مناسب سمجھا جب تک یلملم کی پہاڑی نہ آجائے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ العزیز اور دیگر مستند علمائے ہندوستان کی ہدایات کا یہی منشا ہے جہاز کے کپتان سے جاکر دریافت کرلیا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ، ۱مئی کو شام کے ۴ بجے یلملم کی پہاڑیاں دکھائی دینے لگیں گی اور اسی وقت جہاز سیٹی دیگا۔ اسکی اطلاع اپنے ساتھیوں اور دوسرے ملاقاتیوں کو کردی تھی اور وہ سب لوگ ظہر کے بعد سے سیٹی کے لیے ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے مگر جب عصر کا وقت تنگ ہونے لگا اور سیٹی نہ بجی تو انتظار سے تنگ آکر پھر کپتان کے پاس دوڑا ہوا گیا۔ معلوم ہوا کہ صبح سے مخالف باد تند چل رہی ہے اسکے بدولت جہاز کی رفتار کم ہو گئی ہے اور اب نصف شب میں یلملم پہونچنے کی سیٹی دی جائیگی چنانچہ سب لوگوں نے اطمینان سے مغرب کے بعد غسل سے فراغت حاصل کی۔ اور کپڑے اُتار کر احرام کی لنگیاں باندھ لیں۔ صرف سُنّت الاحرام پڑھ کر نیت کرلینا باقی رہ گیا چنانچہ ٹھیک گیارہ بجکے پچاس منٹ پر جہاز نے ایک طولانی سیٹی بجائی اور ہم لوگوں نے سوتے سے اُٹھ کر جلدی جلدی وضو کیا اور دو رکعت سنت ادا کرکے احرام کی نیت کرلی۔

ایک دن قبل سے جو ہوائے تند چل رہی تھی وہ شام ہوتے ہوتے بہت تیز ہو گئی تھی اور جہاز کو بہت حرکت دے رہی تھی۔ رات کو تو اس کا اثر چنداں نہیں محسوس ہوا مگر ۲مئی کی صبح کو جہاز کی جنبش زیادہ ہو گئی تو ہر طرف لوگ متاثر ہونے لگے۔ جس کو دیکھو دوران سر میں مبتلا اور بیٹھے اچھے خاصے بیمار کی صورت بنا لیتا ہے۔ بعض لوگوں کو متلی اور قے بھی ہو رہی تھی حتیٰ کہ اکثر جہاز کے ملازمین بھی جو عموماً بحری سفر کے عادی ہوتے ہیں پریشان نظر آتے تھے۔ چونکہ آج جہاز جدہ پہونچنے والا تھا اس لیے میں نے صبح ہی کو اُٹھ کر سامان درست کرلیا تھا صرف بستر نہیں باندھا تھا۔ یہ دن ایسا تھا کہ منزل پر پہونچنے کی خوشی میں سارے جہاز پر چہل پہل ہونا چاہیے تھی مگر جہاز کی جنبش کے باعث سب لوگ پڑ گئے تھے اس وجہ سے چہل پہل کی جگہ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میری طبیعت بفضلہ اچھی رہی گو سر کسی قدر بھاری معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال خدا خدا کرکے دوپہر کو ۱۲ بجے جہاز بندرگاہ جدہ میں لنگرانداز ہوا تو لوگوں کے دم میں دم آئے۔ نمازی کمپنی بمبئی کا وہ جہاز جس پر حاجی محمد حجاج سوار تھے اور جو کامران سے ہمارے جہاز کے بعد روانہ ہوا تھا ہماری سے پیشتر بندرگاہ میں پہونچ گیا تھا اسلیے پہلے اُسی کے مسافر اُتار کر قرنطینے پہونچائے گئے۔ توقع تھی کہ شام تک ہم لوگ بھی جہاز سے اتر جائیں گے

مگر معلوم ہوا کہ جدہ مین کشتیان زائد نہین ہین اس لیے صرف ایک جہاز کے مسافر اُتارے جائین گے اور ہمین ایک شب اور جہاز پر رہنا ہوگا۔ جن لوگون کی طبیعتین جہاز کی جنبش سے زیادہ خراب ہوئی تھی اُنھین تو خواہش سکون مین یہ تعطل چندان گران نہین گذرا لیکن مجھے کافی افسوس ہوا۔ بہرحال رضینا بالقضا کہکر رات کو سو رہے۔ ابھی صبح نہوئی تھی کہ کسی نے بیدار کردیا۔ آنکھ کھولکر دیکھا تو ایک شخص سر پر مسلط تھا۔ مین نے سفر بحری کے اثنا مین عربی کے ضروری اور کارآمد جملے یاد کرلیے تھے مگر ان کے استعمال کا ابتک کوئی موقع نہین ملا تھا اس لیے مجھے قدرتاً اس شخص سے گفتگو کرنے مین قدرے دقت محسوس ہوئی۔ بہرحال وہ میری ٹوٹی پھوٹی عربی سے خواہ کچھ نہ سمجھا ہو مگر مین نے اُس کی گفتگو کا یہ مطلب سمجھ لیا کہ وہ کشتی والا ہے اور ہم لوگون کو اپنی کشتی پر سوار کرانا چاہتا ہے۔ چنانچہ مین نے اُس سے کہا کہ بعد نماز فجر ہم لوگ سوار ہوسکین گے۔ اُس نے اپنا نام محمد بتا کر مجھسے کہا کہ جب تم نماز سے فارغ ہوجانا تو مجھے پکار لینا۔ اِس قدر بات چیت ہوجانے کے بعد مین نے اپنے دوسرے ساتھیون کو جگایا۔ ہم سب لوگون نے ساتھ وضو کرکے اول وقت نماز فجر ادا کی۔ اور محمد کو بلا کر سامان کشتی پر پہونچانا شروع کیا۔ چھوٹی چھوٹی چیزین ہم نے خود رکھدین اور وزنی اشیا محمد نے اپنے ایک ساتھی کی معیت مین اُٹھائین اور مین معہ اپنے پڑوسیون اور اُن کے ساتھیون کے کشتی پر سوار ہوگیا۔ ہم سب دس آدمی تھے یہ امر ہمکو جہاز ہی پر معلوم ہوچکا تھا کہ کشتی والے کو کرایہ ساحل پر پہونچکر اُس شرح سے دیا جائے گا جو حکومت کی طرف سے معین ہے۔ اور نیز اس امر کی بھی اطلاع ملگئی تھی کہ کشتی قرنطینہ مین ہم لوگون کو اُتار کر ہمارے سامان سمیت وہین کھڑی رہے گی۔ لہٰذا قرنطینہ مین ایک رات بسر کرنے کے لیے تقریباً اُسی قدر ضروری اشیا ہمین سے علحدہ کرلی تھین جو کامران مین ساتھ گئی تھین۔ کشتی پر سوار ہوجانے کے بعد اب فکر ہوئی کہ کشتی جلد روانہ ہو تاکہ دھوپ کے تیز ہونے سے پہلے ہم لوگ قرنطینہ پہونچ جائین۔ مگر ہمارا کشتی بان دوسرے مسافرون کی فکر مین جہاز پر جاکر غائب ہوگیا تھا۔ انتظار سے تنگ آکر مین پھر اوپر گیا تو معلوم ہوا کہ ایک کشتی پر کم سے کم بیس آدمی ہون تب کشتی روانہ ہوسکتی ہے۔ بہرحال کچھ مزید وقت گذرنے کے بعد محمد تقریباً ڈیڑھ درجن حاجیون کو لیکر آیا اور اُن کو سوار کرکے کشتی روانہ ہوئی۔

جدہ کا قرنطینہ دو مختصر جزیرون مین ہے جو شہر سے تقریباً چار اور پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہین۔ دور والے جزیرہ مین پہلے دن سے جاوی حجاج اُتارے جاچکے تھے۔ اِس لیے ہم لوگ قریب کے جزیرہ مین

اُتارے گئے کشتی کا سفر ایک گھنٹہ کے اندر طے ہو گیا۔ جزیرہ مین داخل ہوے تو وہان کوئی سرکاری میزبان
نہ نظر آیا۔ ایک ضعیف العمر شخص نے ہم لوگون کو پانی کے ٹکٹ دئے جسکی ظاہری صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ
اس تکیہ کا مجاور ہے۔ آگے بڑھے تو متعدد پختہ بارکین دکھائی دین جن کے گرد تارون کی بلند دیوارین تھین
مگر استداد زمانہ سے یہ تار زنگ آلود ہو کر بالکل کمزور ہو گئے اور جالیان جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھین۔ ہم سے
پہلے جو کشتیان پہونچ گئی تھین اُن کے مسافر اتر چکے تھے اور اُنھین کی مدد و رہنمائی سے ایک بارک پر
ہم لوگون نے بھی قبضہ کیا۔ تھوڑی دیر مین اور لوگ بھی پہونچ گئے اور ساری بارکین بھر گئین۔ ہم لوگ چونکہ
پہلے آئے تھے اس لیے ایک کونہ مین جہان تین طرف سے ہوا آتی تھی کافی جگہ پر ہمارا قبضہ ہو گیا تھا۔ اور
اپنا سامان وغیرہ رکھکر پہلا کام جو مین نے کیا وہ یہ تھا کہ سارے قرنطینہ کا ایک چکر لگایا۔ جزیرہ اتنا چھوٹا ہے
کہ شاید پندرہ منٹ کے اندر کل احاطہ اور تعمیرات کا سرسری ملاحظہ ہو گیا۔ کامران کی طرح یہان بھی ایک بھپارہ
کی جگہ بنی ہوئی تھی مگر اس جگہ کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ برسون سے یہان انسان کا گذر نہین ہوا۔
کل چار بارکین مسافرون کے قیام کے لیے تھین اور ہم لوگون کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ لہذا بارکون
مین خوب ٹھسا ٹھس بھر چکنے کے بعد جو لوگ بچے اُن کو اپنے لیے خود جگہ پیدا کرنا پڑی۔ بارکون کے شمول مین
ایک کمرہ اسپتال کا تھا۔ جو بند پایا گیا اسکے سامنے کے برآمدہ اور پاس کے خالی کمرہ مین جو لاشین چیرنے
کی جگہ تھی کچھ لوگون نے قبضہ کیا۔ کچھ بھپارہ گھر کے سامنے والے سقف برآمدہ مین ٹھہرے اور کچھ اشخاص
خود بھپارہ گھر کی عمارت مین داخل ہو گئے۔ غرض جسکو جہان جگہ ملی اپنا اپنا بستر جما دیا۔ ایک طرف ایک
دوکان تھی۔ جو پہلے تو بند تھی مگر جب تھوڑی دیر بعد کھلی تو معلوم ہوا کہ روٹی، کھجور، شکر، تمباکو، تربوز، خربزہ
وغیرہ یہان نسبتاً گران قیمت پر مل سکتے ہین۔ اور پکے ہوے چاول اور گوشت اور مچھلی بھی ملتی تھی مگر
ان کی صورت ہی دیکھ کر انسان کی بھوک بھاگ جاتی جو لوگ جنس ساتھ لائے تھے اُنھون نے تو خیر کھانا
پکا لیا۔ باقی جو لوگ بے سر و سامان تھے اُن کو اسی دوکان سے کام نکالنا پڑا۔ ہم لوگ اپنے ہمراہ ضروری
اشیا خوردنی لائے تھے تاہم کچھ روٹیان اور کھجور یہان بھی خریدی جہاز سے روانہ ہوتے وقت میرا احرام
نجس ہو گیا تھا اس لیے کہ جہان کشتی کھڑی تھی وہین جہاز کی نالی کا پانی گر رہا تھا اور اسکی چھینٹون سے سارے کپڑے
تر بتر ہو گئے تھے۔ مین نے اوڑھنے کی لنگی کو تو اُسی وقت سمندر مین دھو کر کشتی کے اندر سکھا لیا تھا مگر پھر بھی
طہارت کی طرف سے اطمینان نہوا اس لیے جزیرہ مین پہونچکر باری باری دونون لنگیان پاک کین۔ یہان
ہوا اور دھوپ دونون کے درمیان سخت مقابلہ تھا ہوا اس قدر تند و تیز چلتی تھی کہ آدمی اُڑا جاتا تھا اور

کسی دوسری جگہ ایسی ہوا چلے تو لوگ سردی کے مارے کانپ جائیں مگر یہ جگہ شہنشاہ شمس کے دار السلطنت
خط استوا سے قریب ہے اس لیے ہوا کچھ نہ چلی اور تمازت سے ریت کے ذرات گرم لوہے کے مانند
تپنے لگے۔ اور جب کبھی ہوا کے جھونکے سے ریت اُڑ کر کسی شخص پر پڑ جاتی تھی تو وہ بیتاب ہو جاتا تھا جو
لوگ بارکوں کے اندر تھے اُنھیں تو خیر ہوا اور دھوپ کی اس جنگ سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی مگر جو لوگ
برآمدوں میں پڑے ہوئے تھے اُنھیں کافی پریشانی ہوئی۔ خدا خدا کر کے دن گذرا اور شام ہوئی تو تپش آفتاب
سے نجات ملی۔ رات کے لیے سارے کیمپ کے وسط میں ایک گیس کی بتی تھی اور بارکوں کے اندر ایک ایک
لالٹین جس سے اگرچہ ساری بارک میں روشنی نہیں پہنچتی تھی تاہم بہت کچھ سہارا رہا۔ شدت ہوا کے باعث
رات ٹھنڈی تھی اس لیے بارکوں کے اندر بھی کھڑکیاں بند کر کے سونا پڑا صبح کو نماز فجر سے فراغت پاتے ہی
کشتیوں کی طرف اپنا اپنا سامان لیکر حجاج دوڑے اور مسافروں کے بیٹھتے ہی کشتیاں روانہ ہو گئیں ہماری
کشتی کسی قدر دیر میں چلی اس لیے کہ میاں نظام دین صاحب کے ہمراہ مستورات تھیں جن کو سوار کرانے
میں تھوڑی احتیاط کرنا پڑتی تھی لیکن ہمارا کشتیبان بہت ہوشیار تھا ساحل کے قریب پہنچے تو ہم ان متعدد
کشتیوں سے آگے تھے جو ہم سے پہلے روانہ ہوئیں تھیں۔ جدہ پہنچنے سے پہلے محمد نے ہم لوگوں سے بخشش
طلب کی تو ہر شخص نے خوشی خوشی اس کو انعام دیا۔

جدہ کا بندرگاہ عام بندرگاہوں کی طرح نہیں ہے عموماً ہر جگہ ساحل کے کنارے سمندر کی گہرائی
بہت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن بندرگاہ بنانے والے جہازوں کو ساحل کے متصل لانے کی غرض سے کہ مسافروں
اور مال کے اُتارنے چڑھانے میں بڑی آسانی ہو جائے۔ کناروں کی ریت کو ہٹا ہٹا کر اتنا عمیق کر لیتے ہیں کہ اگر
ہر وقت نہیں تو کم سے کم جوار بھاٹا آنے کے وقت تو جہاز ساحل تک پہنچ سکے۔ جدہ کے ترکی حاکموں نے
شاید اس سبب سے کہ حفاظت ساحل کے لیے اُن کے پاس کافی قوت موجود نہ تھی اس بندرگاہ کے کنارے
کو عمیق کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ صرف کشتیوں کی آمد و رفت بھر کا ایک راستہ بنا لیا ہے جسکی نشانی کے
لیے جگہ جگہ ستون نصب ہیں۔ چونکہ یہ راستہ بہت کشادہ نہیں ہے اس وجہ سے اکثر اوقات کشتیاں بھی ریت
میں پھنس جاتی ہیں چنانچہ چند کشتیوں کے سوا عموماً ہر کشتی ریت میں پھنستی تھی۔ اور بلیوں کی مدد سے نکالی
جاتی تھی۔ محمد کی ہوشیاری کی بدولت خود ہماری کشتی اس زحمت سے محفوظ رہی۔ ورنہ ساحل تک پہنچنے
میں بہت دیر ہو جاتی۔ بہرحال ابھی کوئی ۹ بجے کے قریب ہماری کشتی جدہ کے کنارہ پہنچ گئی الحمد علیٰ احسانہ

منزل پر پہونچنے کے بعد ہر شخص چاہتا ہے کہ جلد سے جلد معہ سامان کے اُتر جائے. عورتوں کی معیت کے باعث ہماری مختصر جماعت کو یہاں بھی تعجیل مناسب نہیں معلوم ہوئی. لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ سامان ابھی کشتی ہی پر رہے گا اور مسافروں کو اُتر جانا چاہیے تو پھر دوسروں کے ساتھ ساتھ ہم لوگ بھی اُتر گئے۔ اور وہاں حکومت نے ہر شخص سے عیر فی کس کے حساب سے کشتی کا کرایہ وصول کر کے ہمیں اپنا سامان لینے کے واسطے محصول خانے کی طرف جانے کی ہدایت کی۔



تیسری منزل

کشتی کا کرایہ دے کر ہم لوگ اپنا اپنا سامان اُتروانے کی غرض سے محصول خانہ کی طرف جانا چاہتے تھے۔ کہ دروازہ کے باہر ہی معلمین کے نمائندون کی پلٹن نظر آئی۔ اور جب مین نے اور میرے ساتھیون نے اپنے اپنے معلمون کے نام بتائے تو ایک صاحب نے جو اتفاق سے ڈزن معلمون کے وکیل تھے ہم لوگون کو علیحدہ کھڑا کر دیا اور جب تک اُن کو یقین نہین ہو گیا کہ ہم لوگون کے سوا اس جہاز پر اُن کے حاجی اور نہین ہین ہم لوگ وہین کھڑے رکھے گئے۔ جہاز اور قرنطینون کی اسیری کے بعد یہ گرفتاری زیادہ ناگوار نہین ہوئی مگر ہر شخص کو اپنے سامان کی فکر تھی اور شہر مین پہونچنے کی جلدی۔

تقریباً نصف گھنٹہ کے بعد جب ہم محصول خانہ کے کنارے پہونچے تو کشتیون پر سے سامان اُترنے لگا ہمارے وکیل صاحب کے ایک ملازم نے ہم لوگون کا سامان اتروا کر محصول خانہ مین رکھوا دیا اور یہان سرکاری عمال نے جانچ شروع کی۔ اس وقت محصول خانہ مین جو ہنگامہ مچا ہوا تھا وہ دیکھنے کے قابل تھا۔ ہر مسافر چاہتا تھا کہ اپنا سامان دکھا کر جلدی سے باہر نکل جائے۔ جن لوگون کے پاس سامان کم تھا وہ اپنے کندھون پر رکھے ہوے تھے اور زیادہ عجلت وہی کرتے تھے۔ ہم لوگون نے چھوٹی چھوٹی اشیا عورتون کے پاس چھوڑ دی تھین اور ایسی چیزین جن کو محصول خانہ مین دکھانا ضروری تھا حمالون کے ذریعہ سے محصول خانہ پہونچا دی گئین۔ جب حبشی نژاد مفتش کو جس کے سیاہ لباس کی چمک رنگت کی آب و تاب دوبالا کر رہی تھی اورون سے فراغت ہوئی تو وہ میرے سامان کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے سامان مین ایک بچھونا تھا۔ ایک کپڑون کا بورا اور ایک اشیا خوردنی کا صندوق۔ بستر اور بورے پر تو اُس نے کچھ توجہ نہین کی البتہ جب بکس کھولا گیا تو اوپر ہی دودھ کے چند ڈبے رکھے ہوے تھے۔ اُس نے ایک ڈبہ فوراً اُٹھا لیا اور جا کر قریب کے ایک گودام مین رکھ آیا اور واپس آ کر اُس بکس پر اور میرے دیگر سامان پر کھریا سے ایک نشان بنا دیا۔ یہ کل کارروائی شاید ایک منٹ کے

نذر ہو گئی اور اُس کے بعد وہ تو دوسرے اشخاص کا سامان دیکھنے کی طرف متوجہ ہوا اور وکیل صاحب
کے ملازم نے مجھسے کہا کہ چلئے سامان باندھیے اور باہر نکلیے۔ میں حیران تھا کہ معاملہ کیا ہے جب کہ یہ کہا گیا
ہے تو مجھے اپنی سادہ لوحی سے یہ خیال گذرا کہ کسی دوسرے افسر کو دکھایا جاے گا۔ لہذا جب سامان
باندھ کر باہر نکلنے کے لیے مجھ سے کہا گیا تو میں متامل ہوا اور مین نے کہا کہ میرا ڈیہ تو واپس ملجائے۔
جس پر وکیل صاحب کے ملازم نے کسی قدر نفرت و حقارت کے لہجہ میں مجھ سے کہا کہ آپ خواہ مخواہ دیر کر رہے
ہین آپ تو بہت سستے چھوٹ گئے اور جلدی جلدی میرے سامان کو خود باندھنے لگا۔ اُس وقت ہجوم
اتنا تھا کہ کسی جگہ اطمینان سے کھڑا ہونا مشکل تھا۔ لوگ سیل دریا کے مانند دوڑتے ہوے چلے آرہے تھے
اور ذرا سی غفلت مین دھکہ کھا کر گرنے کا اندیشہ تھا۔ لہذا مین بھی خاموش ہو رہا اور سامان اُٹھوا کر
باہر آیا۔ باہر نہایت تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی اس لیے کہ تقریباً دس بج گئے تھے۔ مین نے چاہا کہ چھتری
کھولکر لگا لون تو معلوم ہوا کہ محصول خانہ مین چھتری کسی کے پانون سے دب کر ٹوٹ گئی ہے اب مجھے
اپنے ساتھیون کا انتظار تھا۔ کچھ دیر کے بعد پھر محصول خانہ مین داخل ہونا چاہا تو ہجوم کی وجہ سے نہایت
بڑی مشکل سے جب اندر گیا تو دیکھا کہ مستری نظام الدین صاحب ایک کونہ مین کھڑے ہین اور لٹھے کے
ایک تھان کے لیے مفتش صاحب ان سے للعہ محصول مانگ رہے ہین۔ وکیل صاحب کے ملازم نے
ان کو مشورہ دیا تھا کہ مفتش صاحب کو کچھ نذرانہ دیکر اپنی جان چھڑا لیے مگر اسے اُنھون نے گوارا نہین کیا
لہذا جنس کے بورے اور گھی کے پیپے تو مفتش صاحب نے رکھوا لیے اور کہا کہ شام کو آکر ان کا محصول
دیکر لیجائیے گا۔ اور تھان کا محصول اسی وقت لے لیا۔ مین نے مستری صاحب سے کہا کہ جو سامان آپ سے
لیا جاتا ہے اُس کی رسید لے لیجیے تو اب کوئی رسید نہین دیتا۔ اور وکیل صاحب کے ملازم کا حکم تھا کہ گھبرانے
کی بات نہین ہے۔ میں خود آپ کے ساتھ آکر سامان لیچلون گا۔ بڑی دقت و دشواری کے بعد ایک صاحب نے
رسید لکھ کر دی تو مین اُن کو اور بقیہ سامان اور عورتون کو ساتھ لیکر باہر آیا۔ یہان کل سامان ایک چوپہیہ
ٹھیلے پر جسمین خچر جتا ہوا تھا بار کیا گیا اور ہم لوگ سامان کے ساتھ پیدل روانہ ہوے۔ وکیل صاحب کا
مکان محصول خانہ سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ دوپہر ہوتے ہوتے ہم لوگ اُن کے مکان میں
فروکش ہو گئے۔ اِس گاڑی کا کوئی کرایہ نہین دینا پڑا۔ اور وکیل صاحب سے یہ دریافت کرکے خوشی
ہوئی کہ حکومت ہاشمیہ کی ہدایت کے بموجب عمال جدہ نے یہ انتظام کر دیا ہے کہ حجاج کو جہاز پر سے

قرنطینہ لیجانے اور وہان سے ساحل تک پہونچانے کا جو کرایہ فی کس کے حساب سے کشتی والے کا مقرر ہے اسی مین جرک سے جائے قیام تک باربرداری کا صرف بھی شامل ہے۔ اس طریقہ سے حجاج کو بہت آسانی رہی ورنہ اجنبی مقام پر کشتی اور ٹھیلہ والے حاجیون کو دق بھی کرتے اور اُن سے من مانی اُجرتین بھی وصول کرتے۔

یہان بطور جملۂ معترضہ یہ بیان کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ جاپان کے مختصر قیام مین مجھے یوکوہاما سے ناگاساکی Nagasaki جاتے ہوے ریلوے اسٹیشن پر بھی اسی قسم کا تجربہ ہوا تھا اور معلوم ہوا کہ وہان ریلوے کی طرف سے سامان اُٹھانے والے قلی ملازم ہین جن کی اُجرتین مسافرون کے ٹکٹ کی قیمت سے دی جاتی ہین اور مسافرون سے سامان ریل پر رکھنے کے لیے کچھ نہین ملتا ہندوستان کے بڑے بڑے اسٹیشنون پر بھی اسی قسم کا انتظام کر دیا جاے تو اجنبی مسافرون کو بہت آسانی و راحت ہو۔

وکیل صاحب کے جس مکان مین ہم ٹھہرائے گئے اُس کی تین منزلین تھین بالائی منزل پر تو وکیل صاحب معہ اہل وعیال کے خود مقیم تھے۔ نیچے کی منزل مین دو کمرے تھے جسمین سے ایک کو وکیل صاحب نے اپنا دفتر بنا یا تھا اور دوسرا کمرہ حاجیون کے لیے تھا۔ ابتداءً اسی کمرہ مین اُنھون نے ہم لوگون کو ٹھہرایا مگر یہ دیکھ کر کہ اس چھوٹے سے کمرہ مین ہم سب لوگ معہ سامان کے اگر رہے تو بہت دقت اور کشمکش رہے گی اُنھون نے مجھے اور میرے ساتھی رحمت شاہ کو وسطی منزل کے ایک کمرہ مین ٹھہرایا جدہ کے مکانات عموماً ایک ہی نمونے کے بنے ہوے ہین۔ مربع یا مستطیل قطعات زمین پر تین یا چار منزلون کی عمارتین اس اہتمام کے ساتھ بنائی گئی ہین کہ ہر منزل مین تقریباً برابر وسعت کے کمرے نکل آئے ہین اور زینہ کے لیے جگہ چھوٹ گئی ہے۔ کل منزلون کے پاخانے تلے اوپر ہین مکان کے نیچے جو سنڈاس بنائی جاتی ہے سب فضلہ اُسمین جمع ہوتا رہتا ہے اور سال مین ایک بار باہر سے زمین کھود کر نکالا جاتا ہے۔ ہر منزل مین گنجائش کے لحاظ سے دو تین یا چار کمرہ ہوتے ہین جنمین سے کونے والے کمرون مین دو سمت سے ہوا آتی ہے اور اوپر کی منزل مین تین سمت سے۔ مغرب کی جانب چونکہ سمندر واقع ہے اس لیے ٹھنڈی ہوا اُسی رُخ سے آتی ہے مین ۱۰ مئی کو جدہ پہونچا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا روزے بمبئی ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ اور جہاز مین اکثر لوگون نے رکھے گر مجھے خلل معدہ کی حالت مین

چونکہ جہاز پر متلی ہونے لگتی ہے اس لیے مین نے قضا کیے تھے۔ صبح سویرے ہی کھانا کھانے کا عادی ہون اور جہاز پر بھی یہ انتظام قایم رکھا گیا تھا۔ چنانچہ کشتی سے اُترنے کے بعد جب سامان اتارا جارہا تھا تو مین نے وہین ایک خوانچہ والے سے کچھ خرید کر ناشتہ کرلیا اور مکان پر آتے ہی سب سے پہلی فکر پیٹ کی ہوئی۔ وکیل صاحب کے ایک ملازم چھوکرے کو ساتھ لیکر بازار گیا۔ روٹیان گرم و سرد دونون بافراط موجود تھین مگر کھانے کی سب دوکانین خالی نظر آئین۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ رمضان مین یہان دن کو کھانا نہین فروخت ہوتا۔ اگرچہ مسافرون کو اس سے تکلیف ضرور ہو مگر رمضان کا یہ احترام نہایت قابل قدر ہو۔ خداوند کریم سب مسلمانون کو اس کی تقلید کی توفیق عطا فرمائین۔ جمے ہوے دہی کے پیالے خوانچون مین بک رہے تھے اسی پر قناعت کی گئی۔ خمیری روٹیان یہان کئی قسم کی بنتی ہین اور سب ذائقہ کے لحاظ سے عمدہ ہوتی ہین۔ بلکہ ہندوستان مین جہان جہان بازار کی روٹیان کھانے کا اتفاق ہوا کہین ایسی خوش ذائقہ نہین بنتین رنگون مین جو روغنی روٹی بکتی ہو وہ بھی اچھی ہوتی ہو مگر یہان کی روغنی جسپر تھوڑی سونف بھی چپان ہوتی ہو اُس سے بھی زیادہ مزہ دار ہو اور آبی تو بہت ہی افضل ہو۔ اور قیمت کچھ زیادہ نہین۔ معمولی روٹی کی قیمت پانچ پیسے جو تنہی وزنی ہوتی ہو کہ میرے لیے ایک اور خوش خوراک لوگون کے لیے دو کافی ہین کھانے کے ساتھ ہی پانی کی فکر ہوئی۔ پانی مول لیا تو مٹی کے تیل کا ایک ٹین چار آنے مین ملا۔ اور یہ پانی بھی کچھ اچھا نہ تھا دریافت سے معلوم ہوا کہ یہان میٹھے پانی کے کنوئین نہین ہین اور نہ کوئی چشمہ ہو بلکہ حکومت ترکی کے زمانہ سے سمندر کا کھاری پانی کل کے ذریعہ سے پینے کے قابل بنایا جاتا ہو۔ مگر بسبب اس کے کہ حکومت ہاشمیہ نے یہان کا ایک انجن کہ معظمہ منتقل کردیا ہو اب کم مقدار مین پانی بنتا ہو اور عموماً شہر کے مستقل باشندون کو یا جو لوگ خاص اہتمام کرکے اُس کے خزانہ سے حاصل کرین نصیب ہوتا ہو۔ شہر کے عامۃ الناس اور مسافرون کے پینے پانی کے ذخیرے شہر سے باہر ہین۔ یہ بڑے بڑے تہ خانون کی صورت مین ہین جنمین برسات کا پانی جمع کرلیا جاتا ہو اور وہان سے سوڈانی مزدور اور غریب بدو اُونٹون یا گدھون پر اور اور بہت ہی غریب لوگ اپنے سرون پر لاد کر لاتے ہین۔ یہ پانی کل کے پانی سے گندلا ہوتا ہو۔ شہر مین جابجا کنوئین ہین جن کا پانی بالکل سمندر کے پانی کی طرح کھاری ہو۔ اور بعض اوقات پانی لانے والے بعضون کو مخلوط کردیتے ہین جس کے باعث نہایت بدمزہ پانی پینا پڑتا ہو

کھانے اور پانی کی خرید کے لیے ضرورت پڑی کہ مقامی سکّے بدل کر لیے جائین کیونکہ اگرچہ ہندوستان کی چاندی کی ریزگاری بھی چل جاتی ہے مگر جہاز ہی پر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اس مین خسارہ رہتا ہے۔ جدہ مین اُس وقت روپیہ کے پندرہ غل کے قرش ملے۔ چنانچہ حسب ضرورت قرش اور ہللے لے لیے گئے۔ ایک قرش کے چار ہللے ہوتے ہین۔

کھانے سے فارغ ہو کر مین نے وکیل صاحب سے دیر تک گفتگو کی اور جب یہ معلوم ہوا کہ جدہ سے براہ راست ینبوع جانے کی قطعاً اجازت نہین تو مین نے کہ معظمہ حاضر ہونے کا تہیہ کیا۔ وکیل صاحب کے بیان کے مطابق قافلہ سنیچر کو روانہ ہونے والا تھا اس وجہ سے مین نے خیال کیا کہ اور ذرائع سے بھی ینبوع جانے کے لیے کوشش کرون۔ روانگی کے وقت ایک دیرینہ کرمفرما کی عنایت سے بمبئی کے ایک عرب تاجر نے جدہ کے ایک معزز تاجر کے نام تعارفی خط لکھ دیا تھا اور یقین دلایا تھا کہ وقت ضرورت ہر قسم کی امداد مل جائے گی۔ اُن کا پتہ دریافت کیا تو وکیل صاحب سے معلوم ہوا کہ رمضان مین عموماً مغرب بلکہ عشا و تراویح کے بعد یہان کے معززین سے ملاقات کا وقت ہے۔ سہ پہر کو مین نے بازار کا ایک گشت لگایا۔ ضرورت بھی تھی چلتے وقت لکھنؤ یا بمبئی سے سامان تحریر تو ساتھ رکھ لیا تھا اور خطوط کے کاغذ بھی گر مضامین لکھنے کے واسطے کاغذ موجود نہ تھا۔ جہاز پر ضرورت پڑی تو خیر خط کے کاغذ سے کام چلا لیا گیا۔ اس کے علاوہ شکستہ چھتری اور ٹوٹے ہوے جوتے کی بھی مرمت کرانا تھی۔

جدہ چھوٹا سا شہر ہے۔ چارون طرف شہر پناہ کی دیوارین ہین جسمین چار دروازہ چارون جانب ہین ساحل سے آنے والون کو مغربی دروازہ سے آنا پڑتا ہے دروازہ ہی پر جانب راست ڈاک خانہ اور تارگھر ہے اور جانب چپ محصول خانہ کا دفتر۔ اسی سڑک سے چل کر شرقی دروازہ (باب المکہ) پر پہونچتے ہین جہان سے قافلے کہ معظمہ یا دیگر حصص ملک کی طرف جاتے ہین۔ سڑک کے دونون طرف بازار ہے جسمین تین چار بڑی دوکانون کے سوا سب چھوٹے چھوٹے متفرق چیزون کے دوکاندار ہین۔ قہوہ خانے تو پھاٹک مین داخل ہوتے ہی ملتے ہین اُس کے بعد کھانے کی چند دوکانین ہین اور پھر متفرق اشیا کی۔ دروازہ سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلہ پر چوراہا ہے جہان سے شمال و جنوب کے بازارون کا نظارہ ہو جاتا ہے شمالی بازار زیادہ بارونق ہے کیونکہ تقریباً تمام تھوک فروش اور بڑے بڑے تاجرون کی دوکانین اسی بازار مین ہین۔ جنوبی بازار مین صرافہ اور کھانے کی دوکانین ہین ان بازارون کے اطراف مین شہر

بسا ہوا ہو۔ شمالی بازار کے خاتمہ پر جو بڑے بڑے مکانات ہین اُسے گویا یہان کی سول لائنس سمجھنا چاہیے۔ فصیل کی شمالی سمت مین ایک دروازہ ہو جس کا نام باب الجدید ظاہر کرتا ہو کہ وہ حال ہی مین بنا ہو یہان سے ایک کشادہ سڑک نکلی ہو جو فصیل کے نیچے نیچے نصف مغربی سمت کو طے کر کے شمالی بازار کی سڑک سے جا کر ملجاتی ہو۔ اسی کے کنارے تمام قنصل خانہ ہین۔ دروازہ کے باہر سمندر کے کنارہ ایک وسیع میدان ہو جہان لوگ شام کو بغرض ہوا خوری جاتے ہین۔ اور اسی میدان مین ایک جانب شریف مکہ کے ہوائی جہازون اور مختصر فوج کی بارکین بنی ہوئی ہین۔ یہ ہوائی جہاز مشق اور ممکن ہو کہ مرعوب کرنے کے لیے بھی روزانہ صبح کو اُڑائے جاتے ہین اور گھنٹہ دو گھنٹہ تک نووارد مسافرون اور شہر کے عجائب پسند لوگون کو تماشا دکھا کر اپنی جگہ واپس جاتے ہین۔ اِس عمارت کے شرق جانب تھوڑے فاصلہ پر حضرت حوا علیہا السلام کا مزار ہو جس کی زیارت کے لیے ہر حاجی باب المکہ کی راہ سے جاتا ہے۔

بازار مین جا کر پہلے چھتری کی مرمت کرائی۔ پھر متعدد دکانون پر کاغذ کی تلاش کی۔ اول تو مرضی کے مطابق کاغذ کسی دکان پر نہ ملا۔ اور جب دو ایک کاغذ پسند کیے تو دام بہت مانگے گئے بازار مین عام طور پر اشیائے خوردنی کو چھوڑ کر کل مال یورپ کا ساختہ نظر آیا بشبہ ہوتا تھا کہ بمبئی کے کسی چھوٹے سے بازار مین کھڑے ہین۔ چند انگریز بھی دکھائی دیے جو یقیناً قنصلات سے تعلق رکھتے ہون گے۔ جوتے کی مرمت ایک بخاری سے کرائی۔ اُس کی دکان پر عمدہ قالین بچھا ہوا تھا۔ اور وہ خود گھڑی سازون کا سا ایک میز سامنے رکھے اور ایک تپائی پر بیٹھا ہوا جوتہ بنا رہا تھا اُنھون نے نہایت خوش اخلاقی سے بٹھایا اور فارسی مین دیر تک بات چیت کرتا رہا۔ شام کو بازار مین ہم لوگون نے کھانا کھایا اتفاق سے مالک دکان ایک ایسا عرب تھا جو کئی بار ہندوستان ہو آیا تھا اور اس لیے اُردو صاف بولتا تھا۔ اُس دوکان پر اور نیز دیگر دکانون پر کئی قسم کا گوشت، سبزی، اور دال موجود تھی۔ کھانا ہمارے مذاق کے مطابق تو نہ تھا اس لیے کہ نہ اس مین کافی روغن تھا۔ نہ مصالح اور نہ مرچ۔ تاہم پیٹ پالنے کے لیے غنیمت تھا۔ اور کچھ زیادہ گران بھی نہین اس لیے کہ دونون آدمیون نے کئی قسم کے کھانے سے ۱۲ ارمین پیٹ بھر لیا اور آخر مین سابودانہ کی کھیر سے مُنھ بھی میٹھا کر دیا گیا۔ اس کے بعد قہوہ خانے مین بیٹھ کر چائے پی۔ چائے قہوہ اور تمباکو کا رواج یہان بہت ہو۔ قہوہ خانون مین کافی مجمع تھا۔ اور اکثر

لوگ حقے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ یہاں کے حقے دیکھنے میں بہت شاندار ہیں کیونکہ یہاں ان کا عام طور پر رواج ہے مگر خشک تمباکو پیا جاتا ہے اس لیے اہل ہند کو اس میں مزہ نہیں مل سکتا۔

یہاں کے بازار میں تقریباً وہ تمام اجناس اور ترکاریاں ملتی ہیں جو ہندوستان میں عام طور پر مستعمل ہیں لہذا جو لوگ اپنا کھانا خود پکانا چاہتے ہیں اُن کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ نرخ نسبتاً گران ضرور ہے مگر اس ملک کے موقع پر نظر کرکے مجھ کو زیادہ گران نہیں معلوم ہوا۔ روپیہ کا تقریباً تین سیر گیہوں کا آٹا ملتا ہے خربوزے اور تربوز کے سوا بازار میں میوہ کوئی نہ تھا مگر کاغذی لیموں اور سبز پودینہ با فراط ملتا ہے۔ تربوز بعینہ اسی قسم کا ہوتا ہے جیسا فرخ آباد و کانپور میں ملتا ہے اور بہت ہی خوش ذائقہ ہوتا ہے۔

میرے دوست مسٹری نظام الدین صاحب مجھ سے جُدا ہوکر اپنے اور ہمراہیوں کے خورد و نوش کا انتظام کرنے کے بعد جمرک (محصول خانہ) گئے کہ جو سامان صبح کو رکھ لیا گیا تھا اُس کو محصول ادا کرکے لے آئیں۔ واپسی میں بازار میں ملے تو انھوں نے بیان کیا کہ چالیس روپیہ کے قریب اُن کو محصول دینا پڑا۔ اجناس اور گھی کے علاوہ اُن کے پاس تقریباً پانچ سیر تمباکوے کشیدنی بھی تھی جس کی قیمت ہندوستان میں غالباً ایک روپیہ ہوگی اُس پر آٹھ روپیہ محصول کے دینے پڑے۔ اسی طرح معمولی لٹھے کے ایک تھان پر جس کی اصلی قیمت دس گیارہ روپیہ سے زائد نہ ہوگی چار روپیہ محصول کے لیے گئے۔ اس حساب سے میں نے خیال کیا تو معلوم ہوا کہ ایک ڈبہ دودھ کا لیکر مجھے بہت سستا چھوڑ دیا ورنہ کم سے کم تیس چالیس روپیہ مجھکو بھی دینا پڑتے۔

رات کو عشا کے بعد اُن عرب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا جن کے نام خط لایا تھا۔ وہ خود تو نہیں ملے مگر اُن کے بڑے صاحبزادہ اور ایک معتمد ملازم سے ملاقات ہوئی۔ وہ دونوں بہت اخلاق سے پیش آئے اور ہر امکانی امداد و اعانت کا وعدہ کیا مگر ینبوع کے راستہ سے مدینہ منورہ جانے کے معاملہ میں صاف اپنی معذوری ظاہر کی۔ جس کے بعد مجھ کو بالآخر یہ طے کرنا پڑا کہ سیدھا مکہ معظمہ حاضر ہوں چونکہ ایام قریب الاختتام تھا اس لیے مجھے فکر ہوئی کہ اب جلد سے جلد مکہ معظمہ پہونچ جاؤں تاکہ جسقدر دن باقی رہے ہیں یہ وہیں بسر ہوں۔

دوسرے دن علی الصباح نماز فجر سے فارغ ہوکر حضرت حوا کے مزار کی زیارت کے لیے گئے۔ یہ مزار ایک وسیع ریتیلے میدان میں ہے۔ مزار کے چاروں طرف چار دیواری ہے۔ حضرت حوا جس زمانہ میں تھیں روایات مشہورہ کے مطابق اُس وقت انسان کے ارتقاء عقلی نے موجودہ جسمانی انحطاط کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔

اس لیے اُس عہد کے انسانوں کی عمریں دراز اور جسامت طویل و عریض ہوتی تھی۔ اجود صیاد فیس آباد میں ایک بڑی بھاری قبر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت شیث علیہ السلام ابن حضرت آدم علیہ السلام کی ہے۔ میں اس کی زیارت کر چکا تھا اس وجہ سے حضرت حوّا کی طولانی قبر کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ حضرت حوّا کا مزار ہندوستان کی قبور کے مطابق نہیں ہے بلکہ بیشی عرض کی وجہ سے صرف قبر کے دونوں جانب بطور نشان دیواریں بنادی گئی ہیں جن کے درمیان میں حوض سا بن گیا ہے۔ پائیں مزار میں ایک قبہ بنا ہوا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت حوّا کا فرق مبارک یہاں مدفون ہے۔ باب المکہ سے نکلتے ہی بھکاری بچوں عورتوں اور مردوں کا جم غفیر نظر پڑتا ہے جو تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کھڑے یا بیٹھے رہتے ہیں۔ اور زائرین کو دیکھتے ہی دعائیں دے دے کر اور اشعار دعائیہ و آیات قرآنیہ پڑھ پڑھ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی جیب کی وسعت محدود پر نظر کر کے یا کسی اور سبب سے اُن کو بھیک دینے میں پہلوتہی کرتے ہیں اُن کے ساتھ دور تک لگے رہتے ہیں حتیٰ کہ بعض بیباک بچے تو دامن پکڑ لیتے ہیں۔ اندھے اور معذور فقیر الگ رستہ میں بیٹھے ہوے صدائیں لگاتے رہتے ہیں اور ان کی حالت یقیناً قابل رحم ہے۔ مزار کے اندر داخل ہونے کے بعد ہی جو پہلی جگہ فاتحہ خوانی کے لیے معین ہے وہاں مجاورین کی معقول تعداد موجود تھی جنھوں نے صدر میں ایک جانب چادر بچھا دی تھی کہ زائرین اُسی پر اپنے نذرانے رکھدیں یہاں پر وکیل صاحب کے خوردسال پوتے نے جو ہم لوگوں کو زیارت کرانے لائے تھے مقررہ الفاظ میں سلام پڑھوایا اور اس کے بعد جب قبہ کے اندر جانے لگے تو باہر چند غریب بدوی عورتیں جوتے رکھنے کے لیے بیٹھی ہوئی ملیں جن کے پاس جوتے امانت رکھ کے قبہ میں داخل ہوے۔ یہاں ہجوم زائد تھا خصوصاً عورتوں کی تعداد کثیر دیکھکر افسوس ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مجمع چھٹا تو ہم لوگ اندر حاضر ہوے۔ یہاں ایک تابوت رکھا ہوا ہے جس کے ایک جانب چھوٹی سی کھڑکی لگا دی گئی ہے اور اسی میں سے شائقین کو زیارت کرائی جاتی ہے۔ میں نے باہر سے فاتحہ خوانی پر قناعت کی اور مجاوروں کو کچھ دے دلا کر رخصت ہوا۔

زیارت سے واپس آنے کے بعد ہی میں نے وکیل صاحب کے بیٹے سے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ میں آج ہی جانا چاہتا ہوں اور چونکہ ہندوستان ہی میں ایک عزیز کی زبانی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ جدہ اور مکہ معظمہ کے درمیان فاصلہ کم ہے اور گدھے پر سوار ہو کر جلد پہونچنا ممکن ہے اور ایک دن قبل بازار میں ایک صاحب سے شرح کرایہ وغیرہ بھی دریافت کر لی تھی اس لیے میں نے اُن سے درخواست کی کہ میرے لیے ایک گدھا

اور سامان کے لیے ایک اونٹ مہیا کردیں۔ اور میں نے اُن سے یہ بھی عرض کیا کہ آپ انتظام نہ کرسکیں تو مجھ سے کہدیجیے میں خود انتظام کرلوں۔ یہ اس لیے کہ ایک صاحب نے بازار میں انتظام کردینے کا وعدہ کیا تھا۔ اُنھوں نے وعدہ کیا اور دوپہر کو اکر تاکید کی کہ اپنا سامان تیار رکھوں۔ سامان باندھا تھا کہ پھر تاکیدی پیام پہونچا کہ اونٹ آتا ہو سامان تیار رکھیے۔ جمعہ کا دن تھا مگر مجھے اُس روز روانگی کے انتظامات میں نماز بھی نہ مل سکی۔ اور میری حیرت اور غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی جب عصر کے قریب وکیل صاحب کے دوسرے بیٹے نے آکر یہ اطلاع دی کہ اونٹ نہیں ملا۔ میں اسی حالت میں خود باہر نکلا اور باب المکہ تک گیا جہاں سے قوافل روانہ ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قافلہ جاچکا اور اب کوئی اونٹ نہیں ہے۔ پھر گدھے والے کے پاس گیا تو اُس نے دیر تک فضول بحث و گفتگو میں وقت ضائع کیا۔ پہلے تو سرے سے انکار ہی تھا کہ بغیر وکیل کی وساطت کے گدھا نہیں مل سکتا۔ مگر بعد کو وہ راضی ہوگیا تو اب کرایہ بہت مانگنے لگا۔ میں ہارکر گھر چلا آیا اور یہاں وکیل صاحب کے بیٹے کو بہت ملامت کی۔ میرے رنج و غصہ سے وہ متأثر ہوکر اپنے باپ کو بلالائے جو بہت چالاک آدمی ہیں اُنھوں نے مجھے سمجھا بجھا کر راضی کرلیا اور یہ طے پایا کہ میں اسی وقت گدھے پر روانہ ہوجاؤں اور سامان میرے ساتھیوں کے ہمراہ دوسرے دن بھیجدیا جائے۔ اب مجھے یکسوئی خاطر نصیب ہوئی۔ تو اپنی اس غلطی پر بہت انفعال ہوا کہ وکیل صاحب کے بیٹے کو غصہ میں بہت سخت سُست کہہ ڈالا تھا اور میں نے اُن سے اور اُن کے والد صاحب سے بہت تمام معذرت کی جس کے بعد قرارداد کے بموجب میں نماز عصر سے فارغ ہوکر اُن کے صاحبزادہ کے ساتھ گدھے والے کے یہاں گیا۔ انھوں نے چودہ روپیے کرایہ طے کیا تھا اور اگرچہ میرے اندازے سے یہ بھی زائد تھا۔ مگر میں نے مجبوراً منظور کرلیا اور مختصر سامان جو ساتھ لیجانے کی غرض سے لایا تھا دونوں جانب خرجیوں میں بھرکر ساتھیوں اور وکیل صاحب صاحبزادہ سے رخصت ہوا اونٹ کا کرایہ چودہ روپیہ آٹھ آنے بتائے گئے تھے لہذا اپنے ساتھی مستری نظام الدین صاحب کو پندرہ روپیے دیدیے کہ جب آنے لگیں تو میرے سامان کے اونٹ کا کرایہ دیدیں۔ گدھے پر عمر بھر میں کبھی سوار ہونے کا اتفاق نہ ہوا تھا اس بنا پر وکیل صاحب اور ساتھی دونوں منع کرتے تھے مگر میں نے مکہ معظمہ جلد پہونچنے کے خیال سے ان کے مشوروں کو رد کردیا۔ اور اب جو سوار ہوا تو محسوس ہوا کہ واقعی ٹیڑھی کھیر ہے۔ باب المکہ پر ایک عامل حکومت نے روک کر دریافت کیا کہ تمھارے پاس گنیاں تو نہیں ہیں۔ اور میرے انکار کے باوجود اُس نے میری کمر اور گردن وغیرہ ٹٹول کر دیکھی۔ اُس سے نجات ملی تو

لدھا لیکر تیزی سے بھاگا۔ سڑک یہان کی کسی قدر ڈھلوان تھی اور راستہ مین جگہ جگہ پتھر پڑے
ہوے تھے پہلے تو مین ڈرا کہ کہین گر نہ جاؤن پھر ہمت کرکے اور جسم کو سادھ کر بیٹھا تو تھوڑی دیر کے
بعد اندیشہ جاتا رہا۔ میرے ساتھ ایک شخص بطور رہنما کے تھا۔ تھوڑی دور آگے چلکر دو ایرانی زائرین
بھی مل گئے وہ بھی اسی قافلہ کے رکن تھے مگر ذرا پہلے روانہ ہوگئے تھے۔ اب چارون گدھون نے
ساتھ چلنا شروع کیا۔ اور تھوڑی ہی دیر مین مین نے محسوس کیا کہ مجھ کو اب کسی قسم کا خطرہ نہین ہے
البتہ راستہ مین پتھرون اور اونٹ کی ہڈیون سے جب وہ ٹھوکر لیتا تھا تو مجھے خیال ہوتا کہ کہین گر نہ جائے۔
مغرب کا وقت آیا تو ہم لوگون نے ایک مقام پر جہان قہوہ خانہ بنا ہوا تھا ٹھہر کر نماز ادا کی۔ ابتدا
مین تو ہم سب لوگ لبیک پڑھنے مین زیادہ مشغول رہے اور معمولی تعارف کے سوا کوئی بات چیت
نہ ہوئی۔ نماز مغرب کے بعد کچھ کچھ بات چیت ہونے لگی۔

دونون ایرانی قالین کے تاجر اور ایران کے اُس حصہ ملک کے باشندے تھے جو دراصل
عراق عرب کا کبھی ایک جزو تھا اور اس وجہ سے فارسی عربی دونون زبانین بولتے تھے۔ ان کے
ملک مین ریل اور پختہ سڑکین نہین ہین اس لیے گدھے اور اونٹ کا وہان بھی رواج ہے اور یہ لوگ
گدھے کی سواری کے عادی تھے۔ رات اندھیری تھی اس لیے مغرب کے تھوڑی ہی دیر بعد سے
راستہ دکھائی دینا موقوف ہوگیا اور اب مین تمام تر گدھے کے رحم و کرم پر تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر کے
تجربہ سے ظاہر ہوگیا کہ یہ گدھے اس راستے پر چلنے کے عادی ہین اور کوئی اندیشے کی بات نہین میرے
ساتھیون کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ انھون نے کرایہ کچھ زائد ہی دیا ہے مگر میرا گدھا نسبتہً تیز تھا اور عموماً
آگے ہی رہتا تھا۔ بائیسکل پر چڑھنے والے کو گدھے کی سواری آسان ہوگی کیونکہ اسمین بھی جسم کا توازن قایم رہنا چاہیے
جدہ اور مکہ کے درمیان اگرچہ پختہ سڑک نہین ہے مگر کثرت آمد و رفت کی وجہ سے ریت پس کر ہموار
ہوگئی ہے اور سوا اسکے کہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پتھر یا اونٹون کی ہڈیان پڑی ہوئی ہین۔ راستہ کی
صورت بالکل سڑک ہی کی سی ہوگئی ہے۔ راستہ کے دونون جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بدوؤن کے
جھونپڑے ملتے ہین۔ جہان قہوہ چائے اور پانی ملجاتا ہے اور راستہ اتنا پُرامن ہے کہ ایک دو آدمیون کو بھی
کسی قسم کا خوف نہین ہوسکتا۔ ایک گھنٹہ کے بعد ہم پھر رُکے میرے ساتھیون نے تو عشا کی نماز بھی
پڑھ لی مگر مین صرف چا اور تمباکو نوشی مین مصروف رہا۔ راستہ مین میرے ساتھی تو دو ایک بار گرے بھی

گر مین بچا رہا۔ چونکہ وہ گدھے کی سواری کے عادی تھے اس لیے گرے تو چوٹ ذرا بھی نہ لگی۔ تقریباً
دس بجے رات کو بحرے پہونچے رات کا وقت تھا اس لیے اس مقام کو مین دیکھ نہین سکا صرف بازار
سا نظر آیا۔ ایک قہوہ خانے مین ہم لوگ اُترے خرجیون سے سامان اُتار کر ایک کوچ پر رکھدیا گیا اور
مین وضو کر کے نماز مین مصروف ہوا۔ میرے ساتھیون نے فوراً حقہ بھروایا اور کھانا لانے کی ہدایت کی۔
نماز سے فارغ ہوکر ہم تینون آدمی کھانا کھانے بیٹھے تو تازہ تازہ خمیری روٹیان اور تلے ہوے انڈے
کھانے مین آئے۔ اُس کے بعد خربوزہ اور تربوز۔ مین اپنی خرابی صحت کی وجہ سے ہندوستان مین بھی
تربوز بہت کم کھاتا ہون۔ اور کھانے کے بعد تو تمام عمر نہین کھایا تھا۔ مگر ان صاحبون کے اصرار سے مجبور
ہوگیا اور غالباً یہ یہان کی آب وہوا کی برکت ہے کہ کچھ تکلیف نہین ہوئی کھانے سے فارغ ہوکر ہم لوگ
اپنے اپنے کوچ پر سو رہے۔ سو رہے تھے کہ گدھے والے نے آکر جگایا اور جلدی جلدی سامان خرجیون
مین رکھ کر اور قہوہ والے کا حساب چُکا کر ہم لوگ رخصت ہوے قہوہ والے کا حساب تو میرے دوستون
نے طے کیا۔ مجھے ٢٥ قرش (تقریباً ۱۲؍) دینا پڑے۔ اس وقت ٹھنڈک تھی اور چونکہ جسم پر احرام کے سوا کچھ
نہ تھا اور سر بھی برہنہ تھا اِس لیے مجھے اتنی سردی معلوم ہوئی کہ مین کانپ رہا تھا۔ مین نے روزہ کی نیت
کر لی تھی اس لیے تنباکو کے ذریعہ بھی جسم کو گرانا ممکن نہ تھا۔ گدھا اتنی دیر آرام کرنے کے بعد تازہ دم
ہوگیا تھا اور تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اندھیرے مین ٹھیک طور پر کچھ معلوم نہین ہوسکا۔ لیکن غالباً تھوڑی
ہی دیر مین کسی قدر اُتار پڑا اور ایک سمت کو راستہ مُڑا۔ گدھا تیزی سے جو مُڑا تو مین جھٹکا کھا کر گر پڑا اور گرا تو
ایسی جگہ جہان کچھ پتھر پڑے ہوے تھے۔ کہنی چھل گئی اور پانون مین خفیف سی چوٹ آئی۔ سب لوگ رُک گئے
اور مین گدھے والے کی امداد سے پھر اپنا بستر وغیرہ گدھے پر رکھ کر سوار ہوا۔ چوٹ تو کافی آئی اگر اس واقعہ کی
بدولت سردی کا اثر بھی زائل ہوگیا۔ جدہ سے چلے تو ہم صرف چار آدمی تھے مگر بحرے سے ایک شخص اور
ساتھ ہولیا۔ یہان پہونچکر وہ گدھا چھوڑ کر چلا گیا اور کوتل گدھا آگے آگے چلنے لگا۔ چونکہ اُس پر بوجھ نہ تھا
اس لیے وہ سب سے تیزی کے ساتھ چلتا تھا اور اُسی کے پیچھے پیچھے ہمارے گدھے چلتے تھے۔ گویا وہ
ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد گدھے والے نے کہا کہ ہم راستہ بھٹک گئے ہین جس کے بعد
تلاش راہ مین بہت وقت ضایع ہوا۔ کیونکہ اس صورت سے رفتار کم کرنا پڑی۔ وہ خود پیادہ پا چلنے لگا۔
تھوڑی دیر ایک طرف جاتا تھا پھر زمین پر چوپایون کی طرح لیٹ کر زمین سونگھتا اور اس طرح گویا راہ کا پتہ

چلاتا تھا۔ بہت دیر کے بعد راستہ ملا اس تلاش نے وقت بھی بہت لیا۔ اور گدھوں کو بھی بہت تھکا دیا۔
گدھے والے کے قبضہ میں اب دو گدھے تھے کبھی وہ ایک پر سوار ہوتا اور کبھی دوسرے پر اور جب ہمارے
گدھے ذرا رکتے تو اپنے لمبے بیت سے اُن کو مارتا چلتا۔ فجر کے وقت ایک قہوہ خانے میں قیام کیا
یہ ذرا بڑی جگہ معلوم ہوتی تھی کیونکہ کئی جھونپڑے بنے ہوئے تھے اور ایک جانب چھوٹی سی مسجد بھی نظر آئی۔
قضائے حاجت کے بعد نماز ادا کی اور پھر سوار ہوئے۔ رفتہ رفتہ آفتاب بھی نکل آیا بلکہ دھوپ کی تمازت
اب تکلیف دینے لگی۔ اور خستگی و ماندگی کا جو عالم تھا وہ تو بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال خدا خدا کرکے
مکہ معظمہ کی پہاڑیاں دکھائی دینے لگیں۔ مکہ معظمہ کے قریب راستہ پہاڑیوں میں سے بل کھاتا ہوا گذرا ہے جا بجا
اونچے ٹیلوں پر توپیں لگانے کے دمدمے بنے ہوئے ہیں جو حکومت ترکی نے اس غرض سے بنا دیے تھے
کہ اگر کوئی حملہ آور ہو تو مدافعت میں آسانی ہو اور اس میں ذرا شک نہیں کہ چند صد یا زیادہ سے زیادہ ایک
ہزار سپاہی اس راستے سے گذرنے والی بڑی سی بڑی فوج کو بخوبی روک سکیں گے۔ اگر اُن کے پاس
ساز و سامان جنگ وافر ہو۔ یہ پہاڑیاں گویا بلد الامین کی قدرتی محافظ ہیں۔ جدہ سے مکہ معظمہ تک جو ٹیلیفون
لگا ہوا ہے اُس کے کھمبے بار بار سامنے آتے تھے اور اس سبب سے ہر موڑ پر خیال ہوتا تھا کہ شاید اب
منزل مقصود پر پہونچ جائیں گے۔ بالآخر کچھ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں نظر آئیں۔ گدھے والے نے بتایا کہ ترکی زمانہ میں
یہاں کچھ فوج رہتی تھی۔ اب تو عمارت بھی بہت کچھ منہدم ہو گئی ہے۔ اس مقام سے کچھ پہلے ہی سے بڑی لڑکے
بچ قبول کہہ کہہ کر بھیک مانگتے ملے تھے جو اس بات کی علامت تھی کہ اب مکہ معظمہ زیادہ دور نہیں ہو سکتا۔ صبح کو
راستہ میں ایک عورت ایک سمت سے دوڑتی ہوئی ہم لوگوں کی طرف آئی اور منت کہنے لگی کہ میرے گھر میں آگ
جلانے کا کوئی بندوبست نہیں دیا سلائی ہو تو دیدو۔ اس کے ہاتھ میں ایک خالی ڈبیا تھی جسمیں کوئی دیا سلائی
نہ تھی اپنے ایرانی ساتھی کے بتانے پر میں نے اُس کو اپنی دیا سلائی کی ڈبیہ پھینک کر دیدی تھی اُس وقت
بھی یہ خیال گذرا تھا کہ منزل قریب آگئی ہے۔ اُس کے بعد مسلسل کئی گھنٹہ تک چلنا پڑا۔ اس بنا پر بدوی لڑکوں
کو دیکھکر اور گدھے والے کے بوثوق کہنے پر پوری طرح یقین نہ آتا تھا۔ تھوڑی دیر اور چلنے کے بعد ایک بڑی
عمارت نظر پڑی معلوم ہوا کہ یہ بھی ترکی فوجوں کی قیام گاہ ہے اور اب عساکر حکومت اغمیہ اسی میں رہتے
ہیں۔ یہیں سے مکہ معظمہ کی ابتدا سمجھنا چاہیے۔ آٹھ بجے کے قریب وقت ہو گیا تھا۔ دھوپ اس قدر تیز تھی کہ
کم سے کم میرا تو بھیجا گھلا جاتا تھا۔ اس لیے یہ معلوم کرکے کہ اب چند ہی منٹ کے اندر ہم مکہ معظمہ پہونچ جائیں گے

بہت مسرت ہوئی۔ چنانچہ کچھ دور آگے بڑھے تو داہنے جانب ایک سلسلہ عمارتوں اور جھونپڑیوں کا نظر
آیا۔ جن مین متعدد قہوہ خانے بھی تھے۔ اور پندرہ منٹ کے اندر ہم شہر کے حدود مین داخل ہوگئے۔ اب
دورویہ عمارات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور بازار نظر آنے لگا۔ مین نے تمازت آفتاب سے بچنے کی غرض سے
شرقی جانب کی عمارات کے سایہ مین چلنا شروع کیا۔ کچھ دیر کے بعد اپنی ساتھیون سے جدا ہونیکا وقت
آیا کیونکہ ان کے معلم کا مکان دوسرے محلہ مین تھا۔ چنانچہ گدھے والا ہم لوگون کو روک کر ایک گلی مین چلا گیا
اور وہان سے ایک اور شخص کو بلا لایا جس کی رہبری مین جلد ملاقات ہونے کی امید ظاہر کرکے ایک شب کی
رفاقت پر اظہار مسرت کرتے ہوئے وہ لوگ ایک راستہ کی طرف چلے گئے اور گدھے والے کی معیت مین
مین آگے بڑھا تا آنکہ حرم شریف کے پاس پہنچ گیا اور دور ہی سے حرم محترم کے در و دیوار صحن و عمارات کو
کمال عظمت و اشتیاق سے دیکھتا اور دل ہی دل مین دعائین مانگتا ہوا محلہ بیاد پہنچ گیا جہان ہمارے
خاندان کے مطوف عبد القادر سکندر کا مکان ہے۔ الحمد للہ علیٰ احسانہٖ



چوتھی منزل

عبدالقادر سکندر ہمارے معلّم لکھنؤ ہی میں مقیم ہیں ان کے بڑے بیٹے حسن سکندر بمبئی میں رہ گئے تھے کہ شوال میں حجاج کے ساتھ جائیں گے۔ کہ کرمہ میں اُن کی اہلیہ او راعزائے خسرالی موجود تھے اور اُنھوں نے اپنے سالے یوسف کے نام ایک خط لکھ کر مجھے دیدیا تھا گدہے والا پہلے عبدالقادر سکندر کے مکان پر گیا۔ وہاں سے حسن کے مکان کا پتہ دیا گیا اور وہیں لاکر مجھے اُتارا۔ یوسف موجود نہ تھے اس لیے خرجی کا سامان اُن کے پڑوس میں رہنے والی ایک ہندوستانی بڑھیا کے یہاں رکھدیا اور اپنی بخشش لیکر وہ تو روانہ ہو گیا۔ میں کچھ دیر اُسی بڑھیا کے یہاں بیٹھا رہا۔ اُس کے بعد معلّم صاحب کا ایک ملازم آگیا جس نے مجھکو حسن کے مکان میں سامان سمیت ہونچا دیا۔ میرے جیل کے ساتھی میر عبدالعزیز صاحب قنوجی مجھسے پہلے روانہ ہوے تھے اور حسن کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ وہی اُن کے بھی معلّم ہیں۔ چنانچہ ذرا دیر کے بعد جب اُن کو میرے آنے کی اطلاع ملی تو وہ خود مجھسے ملنے تشریف لائے وہ بیٹھے ہی تھے کہ یوسف آگئے۔ گدہے کی سواری سے اگرچہ خستگی بہت ہو گئی تھی اور پہلا روزہ بھی تھا مگر شوق زیارت نے ہمت نہ ہاری اور میں معمولی صاحب سلامت کے بعد معلّم صاحب کے ایک کارکن کے ہمراہ زیارت و طواف کعبۃ اللہ شریف کے لیے روانہ ہوا۔ اگرچہ ضروری دعائیں جہاز ہی پر یاد کر لی تھیں مگر اپنے حافظہ کی خرابی پر مطلع ہونے کی وجہ سے وثوق نہ تھا کہ ہر موقع کی دعا پوری صحت سے اور مقررہ وقت پر پڑھ سکونگا اس لیے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ العزیز کی کتاب زبدۃ المناسک جس سے میں نے دعائیں یاد کی تھیں چلتے وقت ہاتھ میں لے لی۔ اور اسی کی ہدایت کے بموجب اپنے رہبر سے درخواست کی کہ باب السلام سے لے چلیں۔ محلہ جیاد سے تقریباً ۳ سو گز کے فاصلہ پر حرم محترم اور باب السلام کچھ زیادہ دور ہے۔ چنانچہ ہم لوگ مختلف گلیوں اور بازار کو طے کرتے ہوے باب السلام پر ہونچے میں دروازہ پر داخلہ کی دعا پڑھتا ہوا حرم شریف میں حاضر ہوا۔ سامنے ہی بیت اللہ شریف پر نظر پڑی تو فوراً دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ اُس وقت جو حالت دل کی تھی اُس کا بیان دشوار ہے۔ بیت اللہ شریف

زیارت کی ایک مدت سے تمنا تھی مگر سمجھتا تھا کہ مجھ جیسے سیہ کار و بدبخت کو جس کی عمر کا بیشتر حصہ لہو ولعب
اور عصیان و طغیان میں بسر ہوا ہو یہ دولت کیسے نصیب ہوگی اور اب جو واقعتاً بیت اللہ شریف کی زیارت
سے مشرف ہوا تو اللہ تعالے کے کمال فضل و احسان اور غایت لطف و کرم کے احساس نے دل کی عجیب
کیفیت کردی۔ اس وقت میں دیر تک دعا مانگنا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر دلی امتنان ظاہر کرنا
چاہتا تھا مگر میرے رہنما نے جلدی سے ہدایت کی کہ آگے بڑھو اور ساتھ ہی کچھ دعا پڑھوانا شروع کی۔
میں گویا مسحور ہو رہا تھا اور جو حالت ایک عامل کے معمول کی ہوتی ہے بعینہ یہی کیفیت میری اپنے رہنما
کے ساتھ رہی۔ وہ مجھ کو ساتھ لیے ہوئے آگے بڑھا اور باب ابراہیم سے گذرتا ہوا حجر اسود سے کچھ فاصلہ
پر کھڑا ہو گیا۔ یہاں نیت طواف کرائی گئی۔ پھر حجر اسود کی طرف چلکر گیا۔ استلام کیا اور اپنے رہنما
کے ساتھ یکے بعد دیگرے سات بار کعبۃ اللہ شریف کا طواف کیا اور اس اثنا میں جو کچھ وہ بآواز بلند
پڑھتا رہا میں اُس کی تکرار کرتا رہا۔ طواف کی حالت میں جو ادعیہ ماثورہ ہیں وہ مجھے یاد تھیں اور
اندر سے دل یہ چاہتا تھا کہ بالکل تنہائی ہوتی۔ حتیٰ کہ کوئی دوسرا طواف کرنے والا بھی نہ ہوتا اور خوب
دل کھول کر اور پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دعا کی جاتی مگر ایک بے بسی کے عالم میں میں اپنے
رہنما کے دوش بدوش انھیں الفاظ کو دہراتا رہا جن کا بیشتر حصہ عربی سے ناواقفیت کی بنا پر میری
سمجھ سے باہر تھا۔ لہذا خاتمہ طواف پر جب ملتزم شریف سے لپٹکر دعا کرنے کا موقع ملا تو میں نے
بہت کچھ اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ اور جب تک رہنما صاحب نے کئی بار نہ پکارا میں وہاں سے
نہ ہٹا۔ باوجودیکہ تمازت آفتاب کی وجہ سے مطاف کی تابش ترقی پذیر تھی ملتزم شریف سے ہٹ کر
مقام ابراہیم کو اپنے اور کعبۃ اللہ کے درمیان چھوڑ کر دو رکعت سنت طواف ادا کیں۔ یہاں بھی رہنما
نے بہت کچھ عجلت کرنا چاہی مگر میں نے نماز کے بعد دیر تک دعا کی۔ پھر رہنما نے ایک اور دعا پڑھوائی
اور چاہ زمزم شریف پر لائے۔ در زمزم پر دعا پڑھکر دروازہ کے اندر داخل ہوا۔ آب زمزم پیا اور ہاتھوں
چہرہ اور جسم کے دیگر حصوں میں ملا۔ وہاں سے نکل کر حرم شریف کے باہر جانے کا قصد کیا۔ باب الصفا
پر ہو کر چلکر دعا کے لیے ٹھہرا۔ کچھ لڑکے چاہ زمزم سے نکلتے ہی ساتھ ہو لیے تھے۔ اب رہنما صاحب نے
ہدایت کی کہ خیرات طواف دو۔ ان لڑکوں کو کچھ دیا گیا۔ اس کے بعد رہنما صاحب نے کچھ اور لوگوں کے
نام لیے کہ اُن کا حق دو۔ چنانچہ ہلیلوں کی ایک گڈی اُن کے نذر کی اور جتنی دیر میں میں نے

دعا مانگی۔ انھون نے اس کی تقسیم خیال سے فراغت کر لی اور مجھے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرانے
کے لیے لیچلے۔ کوہ صفا کے دامن مین جو ایک بے چھت کی محراب دار عمارت ہے اُسکے زینہ اولین
پر کھڑے ہو گئے اور کعبۃ اللہ شریف کی طرف منہ کر کے دعا پڑھی اور رہنما کے ساتھ سعی کرنے کے لیے
روانہ ہوا۔ طواف کی طرح سعی کے ساتون چکرون مین بھی رہنما صاحب آواز بلند دعائین پڑھواتے
رہے اور جب ساتوان چکر مروہ پر تمام ہوا تو وہان جو متعدد حجام بیٹھے ہوئے تھے اُن مین سے ایک سے
اپنے کاکلون کی ایک جانب کی لٹین کتروا کر اور اُس کی اُجرت دیکر باب السلام کی طرف سے پھر حرم شریف
مین حاضر ہوا اور حطیم مین جا کر دو رکعت نفل ادا کین۔ اب گھر جانے کا ارادہ ہوا تو رہنما صاحب نے
باب الزیادہ پر لیجا کر ٹھہرایا اور کہا کہ آپ کے جائے قیام سے حرم شریف آنے جانے کے لیے یہی دروازہ
قریب پڑے گا اور ساتھ ہی صحن حرم مین ایک موقع دکھا کر بتایا کہ بعد عصر یہین عبدالقادر سکندر کے
حجاج جمع ہو کر روزہ کھولتے ہین اور تم بھی یہین آکر بیٹھنا اور طواف کرنا چاہو گے تو مین ساتھ چل کر
طواف کرا دون گا۔ دوپہر کے قریب مین گھر واپس پہونچا اور خستگی رفع کرنے کے خیال سے ذرا لیٹ کر
سو گیا۔ کئی گھنٹے کے بعد آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ حرم شریف مین نماز ظہر ہو چکی ہو گی۔ لہذا وضو کر کے
نماز ادا کی۔ اور میر عبدالعزیز صاحب کی معیت مین عصر کے وقت حرم شریف مین حاضر ہو کر نماز پڑھی
اور صحن حرم کے اُس کونہ مین جو باب الوداع سے قریب ہے حسین اکبر زمزمی کی جا نمازون پر اپنے
معلّم کے دوسرے حاجیون کے ساتھ جا بیٹھا۔ حسین اکبر صاحب اور بعض دیگر حجاج سے بھی ملاقات
ہوئی۔ افطار و نماز مغرب سے فارغ ہو کر میر صاحب کے ہمراہ گھر واپس آیا۔ انھون نے از راہ محبت
میرے لیے کھانے کا انتظام کر لیا تھا لہذا کھانا کھا کر اور حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کر کے پھر
حرم شریف گیا اور نماز عشا کے بعد واپس آیا۔ دوسرے دن عمرہ لینے کے لیے جانا تھا اس لیے
میر صاحب نے اپنے ساتھی ظہور کو رہنمائی کی غرض سے میرے ساتھ جانے کی ہدایت کر دی تھی چنانچہ
سحری کھا کر مین ظہور کے ہمراہ روانہ ہوا۔ اندھیرا تھا اور مین برہنہ پا۔ راستہ مین بکثرت چھوٹے چھوٹے پتھر
پڑے ہوئے تھے۔ جا بجا ٹھوکرین کھاتا ہوا نماز فجر کے وقت مسجد تنعیم کے قریب پہونچا۔ یہان جگہ جگہ وضو
کرانے والے اور قہوہ خانے نظر پڑے۔ ایک دھیلہ مین پانی کی ایک صراحی ملتی تھی چنانچہ استنجا کر کے
وضو کیا اور مسجد مین جا کر پہلے نماز فجر ادا کی پھر دو رکعت نفل پڑھکر اور تلبیہ کہکے عمرہ کی نیت کی اور

اپنے ساتھی کے ہمراہ واپس ہوا۔ حرم شریف مین حاضر ہو کر طواف کیا اور پھر وہان سے حل کر سعی کی اور فارغ ہو کر گھر واپس آیا۔ مسجد تنعیم تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر ہی اور راستہ ریتیلا اس لیے آمد و رفت ہی مین تقریباً تین چار گھنٹے صرف ہوئے اور چونکہ اس قدر پیدل چلنے کی عادت نہین کافی خستگی بھی معلوم ہوئی۔ اور رات کو سونے کا وقت بھی کم ملا تھا اس لیے آتے ہی سو رہا۔ ظہر سے قبل اُٹھا۔ نماز حرم شریف مین ادا کی اور واپس آکر پیر عبدالعزیز صاحب سے ملا اور عصر کے وقت اُنھین کی معیت مین حرم شریف مین نماز پڑھی اور پھر اُن کے ساتھ بازار چلا گیا۔ اور مغرب و عشا بدستور حرم مین ادا کی۔

رمضان المبارک مین حرم محترم کا نظارہ عجیب و غریب ہوتا ہی۔ یون تو ایام حج مین حرم شریف کے اندر ہر وقت کافی مجمع رہتا ہی اور خصوصاً نمازون کے اوقات مین ہجوم بہت زیادہ ہو جاتا ہی۔ مگر ماہ صیام کے اجتماع کی جو خصوصیات ہین وہ جُداگانہ امتیاز رکھتی ہین۔ عصر کے بعد ہی سے جدھر دیکھیے حرم شریف مین لوگ جمع ہین۔ کوئی قرآن شریف پڑھتا ہی کوئی دلائل الخیرات وغیرہ ورد کر رہا ہی۔ کوئی طواف مین مصروف ہی۔ کعبۃ اللہ شریف کا طواف یون تو تقریباً شب و روز مین ہر وقت ہوتا رہتا ہی۔ دن کو تو کبھی اوقات جماعت کے سوا کسی وقت مطاف خالی نہین نظر آتا۔ رات مین شاید کوئی وقت خالی گذرتا ہو۔ لیکن گرمیون مین ہجوم عموماً صبح اور شام ہی کو رہتا ہی۔ رمضان المبارک کے عمرون کی جو فضیلت ہی اُسکے باعث ماہ صیام مین عمرہ لانے والون کی تعداد کثیر کے لیے طواف لازم ہی اور جو لوگ دن مین تمازت آفتاب کی وجہ سے یا عمرہ لا کر خستہ ہو جانے کے باعث طواف نہین کرتے وہ عموماً سہ پہر ہی کو طواف کرتے ہین۔ عصر کے بعد جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا ہی مطاف مین اور مصلون پر ہجوم بڑھتا جاتا ہی۔ حجاج اور اہل شہر سب اپنے اپنے مذاق کے مطابق افطار کا سامان کرتے ہین۔ صاحبان خیر، ارباب ثروت اور اکثر حجاج کی طرف سے سامان افطار کی تقسیم بھی ہوتی رہتی ہی۔ کہین خرمے بٹ رہے ہین۔ کہین مٹھائیان۔ کہین تربوز کی پھانکین۔ توپ دغتے ہی لوگ باہم مِلکر یا الگ الگ افطار کرتے اور نماز مغرب ادا کرتے ہین۔ نماز کے بعد کچھ لوگ کھانا کھانے گھر چلے جاتے ہین اور وہ جو عشا کے بعد کھاتے ہین رہ جاتے ہین۔ مغرب و عشا کے درمیان گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کا فصل ہوتا ہی مغرب کے وقت ہی حرم شریف مین برقی روشنی ہو جاتی ہی۔ لیکن عشا کے وقت تک برقی روشنی کے علاوہ سارے صحن مین جگہ جگہ گیس کے لیمپ اور رنگ برنگ کی لالٹینین پہونچ جاتی ہین۔ کیونکہ نماز عشا کے بعد

حرم شریف مین جابجا تراویح پڑھی جاتی ہی مغرب کے سوا کل نمازون کے اوقات مین بالالتزام جماعتین ائمۂ اربعہ کے نام سے موسوم مصلون پر ہوتی ہین اور انھین مین لپنے اپنے مسلک یا موقع کے لحاظ سے سب لوگ شریک ہوجاتے ہین او رمغرب کے وقت صرف دو جماعتین حنفی اور شافعی مصلون پر پڑھائی جاتی ہین۔ مگر تراویح کے وقت کثیر التعداد جماعتین کھڑی ہوتی ہین۔ صحن کے اکثر حصون مین آگے پیچھے کئی کئی جگہہ تراویح ہوتی ہی۔ اور ہر جماعت کے لیے علٰحدہ روشنی کا اہتمام ہوتا ہی مین چونکہ آخری تاریخون مین پہونچا تھا اس لیے اکثر جگہہ قرآن شریف کا ختم تھا ختم کے لیے خاص اہتمام ہر جماعت کے منتظمین کی طرف سے ہوتا ہی مقام جماعت سے قریب قالین یا دری کا فرش بچھایا جاتا ہی اور اس کے گرد گیس کے فانوس اور خوشنما لالٹینین روشن کی جاتی ہین وسط مین سنگ مرمر کی میزون پر خوشنما گلدان وغیرہ رکھے ہوتے ہین۔ نماز تراویح سے فارغ ہوکر لوگ اس مقام پر جمع ہوتے ہین اور شرکاء جماعت کے علاوہ منتظمین کے دوست و احباب اور عام حاضرین حرم شریف مین سے بھی کچھ لوگ شریک ہوتے ہین پھر قاری صاحبان اور قرات کے طلبا ختم پڑھتے اور تبرک تقسیم ہوتا ہی۔ مجھے کئی ختم دیکھنے کا موقع ملا مگر مین آخر وقت تک نہ ٹھہر سکا۔ حرم محترم مین معمولاً بھی کچھ کم روشنی نہین ہوتی۔ گو رقبہ کی وسعت یا سابقہ انتظامات کے لحاظ سے کم ہی کیونکہ سوائے مطاف کے جسکے گرد برقی روشنی کا مالا جگمگا تا رہتا ہی صحن اور دالانون مین ذرا فاصلہ سے روشنی ہوتی ہی۔ لیکن ماہ صیام مین مغرب کے بعد سے ختم تراویح تک تو صحن حرم بقعۂ نور معلوم ہوتا ہی۔ گرمی کی وجہ سے دالانون مین دن کے سوا بہت کم کوئی بیٹھتا ہی اس لیے وہان روشنی کا بھی کوئی خاص اہتمام نہین کیا جاتا۔

رات کو حرم شریف مین ختم قرآن مین شرکت کی وجہ سے کافی دیر ہوگئی تھی نیز اسی صبح کو رحمت شاہ سامان کے ساتھ آنے والے تھے اس لیے مین عمرہ لینے نہ جا سکا۔ رحمت شاہ طلوع آفتاب سے پہلے ہی پہونچ گئے۔ سامان نہ آنے کی وجہ سے ابتک احرام نہین کھول سکا تھا۔ کیونکہ جدہ سے روانگی کے وقت کپڑے ساتھ رکھنے کا خیال ہی نہین آیا تھا حسن کے مکان ہی جہان مین ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم لوگون کی بسر نہین ہوسکتی تھی اور چونکہ میر عبدالعزیز صاحب سے گفتگو کے بعد یہ امر طے پاگیا تھا کہ مین اور وہ ساتھ ہی رہین اس لیے جمعیت بھی کافی ہوگئی تھی۔ کیونکہ ان کے ساتھ پانچ اور آدمی تھے جنمین دو عورتین بھی تھین سامان آنے کے بعد مکان بدلنے کی زیادہ فکر لاحق ہوئی۔ یوسف نے کئی مکان دکھلائے اور بالآخر

اُن کے مکان سے قریب ہی ایک مکان مین گئی پر ٹھہر گیا۔ مکان چھوٹا سا تھا مگر یک منزلہ ہونے کی وجہ سے اُس کی کھُلی چھت پر رات کو آرام لیٹ سکتے تھے اِس لیے غنیمت جانا۔ دو چھپر نے چھوٹے درجے تھے جن مین سے بڑی کوٹھری مین ہم لوگ رہے اور چھوٹی کوٹھری عورتون کو دیدی گئی میر صاحب کا باورچی خانہ بھی اُسی جانب رہا مین عموماً کسی دوکان ہی مین کھانا کھاتا تھا مگر جب کبھی رحمت شاہ کا جی چاہتا تو وہ ہماری کوٹھری کی صحن مین لوہے کے چولھے پر کھانا پکا لیتے۔ میر صاحب نے ازراہِ شفقت بہت اصرار کیا کہ مین اس سفر مین برابر اُنھین کا مہمان رہون اور چونکہ وہ ہندوستان سے کثیر مقدار مین جنس ساتھ لائے تھے اِس لیے اُن کا خیال تھا کہ میرے کھانے کے لیے اُن کو کوئی جنس خرید کرنا نہوگی۔ اور جو جنس وہ ساتھ لائے تھے ظاہر ہے کہ اُس کو واپس لیجانا اُن کو منظور نہ تھا لیکن مین نے اسے قبول نہ کیا۔ دوسرے دِن مین پھر عمرہ لینے گیا۔ اتفاق سے پاؤن مین موچ آگئی جس کی وجہ سے طواف و سعی کے بعد سو کر اُٹھا تو کافی تکلیف محسوس ہوئی۔ اُس پر طرہ یہ کہ نئے مکان مین سامان بھی منتقل کرنا تھا۔ خدا بھلا کرے رحمت شاہ کا کہ اُن کی وجہ سے سامان کے منتقل کرنے مین مجھکو بہت کم محنت پڑی۔ بھاری اشیا تو حمال نے پہونچا دین اور چھوٹی چھوٹی چیزین رحمت شاہ نے اور مین نے مل کر رکھوائین۔ درد کی تکلیف بڑھ رہی تھی اس لیے مین شفا خانہ چلا گیا جو حرم شریف اور ہمارے جائے قیام کے درمیان راستہ ہی مین پڑتا تھا۔ تین بار شفا خانے گیا مگر دوا نہ لگی۔ اس لیے کہ دو بار تو ڈاکٹر صاحب موجود نہ تھے اور تیسری دفعہ ملے تو فرمایا کہ اپنے ساتھ آؤ۔ رمضان المبارک کا صرف ایک دن اور باقی تھا لہذا عمرہ کے لیے جانا ضروری تھا۔ لیکن جب سحری کے وقت اُٹھا تو پاؤن کے درد کی وجہ سے پیدل جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ چنانچہ نماز فجر کے وقت ایک گدھا قرش مین کرایہ پر لیا اور اُس پر سوار ہو کر عمرہ لینے گیا واپس آ کر طواف و سعی کرکے اپنے جہاز کے ساتھی میان نظام الدین کے مکان پر چلا گیا۔ اور اُنھین کے یہان سوتا رہا۔ رمضان کی وجہ سے اِس کا موقع کم ملتا تھا کہ ان لوگون سے ملتا۔ تاہم ایک بار پہلے بھی اُن کے یہان گیا تھا۔ اہل شہر مین ابتک کسی سے ملنے کی نوبت نہین آئی۔ صرف مشہور دہلی کے تاجر حاجی علی جان کی کوٹھی تک جو حرم شریف سے بالکل متصل ہے جا سکا۔ وہ بھی اس ضرورت سے کہ میرے اور میرے ساتھیون کے پاس جو زر نقد تھا اُسے اُن کے یہان بطور امانت جمع کرانا تھا۔ یہ لوگ بڑے صاحب خیر اور خلیق ہین۔ حجاج کو ان کی ذات سے بہت آرام ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دین۔ دوسرے دن عید ہونیوالی تھی

اس وجہ سے شام کو بعد عصر تین گولے عام اطلاع کی غرض سے چھوٹنے۔ رات کو چونکہ تراویح اور سحری کی فکر نہ تھی اس لیے مغرب اور عشا دونوں نمازوں کے بعد بازار کی سیر کی۔ ایک خوانچہ والے کے پاس بالائی بالکل ہندوستان جیسی جمی ہوئی دیکھکر فوراً طبیعت راغب ہوئی۔ اور باوجودیکہ کھانا کھاچکا تھا اور صرف قہوہ خانے میں چائے پی رہا تھا لیکن ایک پیالہ لیکر چٹ کر گیا۔ مگر کھانے کے بعد جب سیری ترشی محسوس ہوئی تو بہت پچھتایا۔ معلوم ہوا کہ دہی پر سے بالائی اُتار کر جمع کی گئی تھی۔

عید کی نماز کے متعلق معلوم ہو چکا تھا کہ سویرے ہی ہو جاتی ہے اور یہ بھی خیال تھا کہ مجمع زائد ہوگا اس لیے نماز فجر سے پہلے ہی کپڑے بدل لیے گئے اور حرم شریف میں پہنچا تو اس وقت بھی کافی ہجوم تھا بہرحال مجھے بغیر کسی دقت کے مقام ابراہیم کے سامنے ممبر سے قریب ہی بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ آفتاب نکلنے کے بعد ہی خوشنما گنگا جمنی علم جس میں زرکار پھریرے لگے ہوئے تھے لاکر ممبر کے دونوں جانب لگا دیے گئے۔ ممبر تقریباً ۴۔۵ گز لمبا ہے اور نشست کے مقام پر ایک بُرجی بنی ہوئی ہے۔ اور لوگوں کا بیان ہے کہ اس کے بنانے میں ایسی صنعت کی گئی ہے کہ خواہ کوئی موسم ہو کبھی خطیب کے چہرہ پر دھوپ نہیں پڑتی۔ بُرجی سے نیچے زینہ ہے جس پر پوشش پڑی ہوئی تھی۔ ممبر کا دروازہ عموماً بند رہتا ہے۔ صرف جمعہ کے دن یا عید کے موقع پر کھلتا ہے۔ دروازہ کے قریب ہی چند خوجے کھڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر میں مجمع میں کسی قدر حرکت پیدا ہوئی۔ اور بعض لوگ کھڑے ہوگئے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ شریف مکہ اپنے مصاحبین و مقربین خاص کے ساتھ آئے۔ اس کے بعد نماز ہوئی۔ اور نماز کے ختم ہوتے ہی چاروں مصلوں کے امام ممبر پر گئے اور حنفی خطیب نے خطبہ پڑھا۔ خطیب صاحب کی آواز اگرچہ بہت بلند نہیں تھی لیکن اُن کا انداز تقریر ایسا تھا کہ ایک ایک لفظ سنائی دیتا تھا کم سے کم اُن لوگوں کو جو بہت دور نہ ہوں۔ خطبۂ اولیٰ کے بعد جب خطبۂ ثانی پڑھا جا رہا تھا تو حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ کے نام نامی لینے کے بعد خطیب صاحب نے نہایت اہتمام کے ساتھ شریف صاحب کا نام لیا اور اس موقع پر سب حاضرین کھڑے ہوگئے۔ غالباً شریف کے اشارہ سے ایسا ہوتا ہوگا۔ ورنہ تعظیم کے زیادہ مستحق اُن اصحاب کے اسمائے گرامی تھے جو شریف کے نام سے پہلے لیے گئے تھے۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ غنیمت ہے کسی نے مجھے ٹوکا نہیں۔ خطیب صاحب کے خطبہ کا پورا اثر تو عربی دان اشخاص ہی پر پڑ سکتا ہے مگر عربی زبان کی دلکشی اور خطیب صاحب کا موثر

املا ہر شخص پر کچھ نہ کچھ اثر انداز ضرور ہوتا ہوگا۔ نماز کے بعد ہندوستان کی طرح عام طور پر بغلگیر ہونے کا دستور نہین ہے البتہ اکثر لوگ باہم معانقہ کرتے ہین اور خطیبون کی دست بوسی کے لیے بھی بہت لوگ منتظر رہتے ہین۔ میرے قریب چونکہ شناسا ان مین سے کوئی نہ تھا اس لیے مین جلدی سے اُس دروازہ کی طرف گیا جدھر شریف کی نشستگاہ ہے مگر میرے وہان تک پہونچنے مین اتنی دیر لگی کہ شریف کی واپسی ہو چکی تھی۔ البتہ سڑک پر شرطون (پولس) کی جمعیت صف آرا تھی، جو تھوڑی دیر کے بعد ضابطہ فوجی کے مطابق منتشر ہو گئی۔

حرم شریف سے باہر نکلا تو دیکھا کہ بازار بند ہے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ تین روز تک عموماً بازار بند رہین گے صرف کہین کہین اشیاے خوردنی فروخت ہو رہی تھین۔ مین تھوڑی دیر پولیس کی جمعیت کے قریب کھڑا رہا اور اُن کی قواعد دیکھتا رہا۔ اور صفون کے منتشر ہو جانے کے بعد گھر آیا۔ ساتھیون سے تبادلۂ تہنیت کے بعد رحمت شاہ کے ساتھ اس جستجو مین روانہ ہوا کہ کہین کچھ کھانا میسر آئے۔ مگر ناکامی ہوئی۔ اور کلچون۔ پکوڑیون اور چٹنی پر قناعت کرنا پڑی۔ ایک شخص سے تھوڑی آئس کریم لیکر کھائی تو اگرچہ آئس کریم خود کچھ زیادہ مزے دار نہ تھی لیکن تشنگی کے عالم اور گرمی کے موسم مین بہت بھلی معلوم ہوئی۔ پہلے مجھے کسی قدر حیرت ہوئی کہ یہان جب برف نہین ہے تو آئس کریم کیسے تیار ہوتی ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ چند مشینین یہان ہین جن مین شورے وغیرہ کی امداد سے آئس کریم تیار ہوتی ہے۔ شام کو ایک مرشدزادہ سے جو مکہ معظمہ مین مقیم ہین اور طبابت کرتے ہین ملا۔ بڑے اخلاق و محبت سے ملے اور ہر قسم کی امداد کا وعدہ کیا۔ میرے پاؤن کا درد ابھی تک نہین گیا تھا۔ اُنھون نے حال سنکر دوسرے روز دوا دینے کا وعدہ کیا۔

ایک روز عصر کے بعد حرم شریف مین ایک جگہ کچھ حضرات جمع تھے۔ اتفاق سے میرے ایک ہم وطن تاجر بھی وہان بیٹھے تھے۔ مین اُدھر سے گذرا تو انھون نے یہ کہہ کر کہ تمھارا ہی ذکر ہو رہا تھا مجھے اُن اصحاب سے ملایا۔ جناب مولوی محب الدین صاحب خلیفہ جناب حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی بھی وہان تشریف فرما تھے۔ بڑی عنایت و محبت سے پیش آئے اور اپنے مصلے پر بٹھا کر دیر تک مزاج پرسی فرماتے رہے اور رخصت ہوتے وقت بہت کچھ دعائین دین۔ ایک صاحب جو وہین کے مدرسہ مین مدرس ہین اور اتفاق سے میرے ہمنام ہین بہت اخلاص سے ملے اور میرے ساتھ ہی اُٹھے اور فرمانے لگے کہ حضرت شاہ ابو سعید صاحب مجددی کے صاحبزادون کے یہان جا رہا ہون مین بھی چونکہ اسی سلسلہ کا غلام ہون اس وجہ سے اُن کے ہمراہ چلا گیا اور

صاحبزادگان سے قدمبوسی حاصل کرکے بہت محظوظ ہوا۔ اُن کے یہاں اُس وقت قرآن خوانی ہورہی تھی مجھے بھی اُس میں شرکت کا موقع ملا اور صاحبزادہ صاحب سے پھر قدمبوسی حاصل کرنے کا دعا کرکے واپس آیا۔

عید کے دوسرے دن مرشدزادہ سے مکہ پاؤں میں لگانے کی دوائی تو اُنھوں نے کہا کہ زیادہ چلنا پھرنا نہ چاہیے۔ اگرچہ اس کی پابندی مشکل تھی اس لیے کہ مدینہ منورہ کا قافلہ پرسوں کو چلنے والا تھا اور مجھے اس سے پہلے پہلے تمام ضروری انتظامات سفر کرنا تھے تاہم عید کی وجہ سے چونکہ بازار بند تھے اس لیے کسی قدر سکون کا موقع ملا۔ ظہر کے بعد اتفاق سے میرے ہمنام صاحب پھر حرم شریف میں مل گئے تو اُن کے ہمراہ اُن کے مدرسہ کے مدرس اعلیٰ کے یہاں حاضر ہوا۔ وہاں بھی قرآن خوانی ہورہی تھی۔ قرآت سے لذت اندوز ہونے کا چونکہ مجھے اپنے پیرومرشد کے طفیل میں یہاں اکثر موقع ملتا ہے اس وجہ سے میں ایسے مواقع کا شائق رہتا ہوں اور عربوں کی قرآت تو ہر بھی حد درجہ وجد آور حرم محترم میں متعدد مقامات پر چھوٹے چھوٹے لڑکے اور بعض نابینا قاری قرآت سنایا کرتے ہیں اور اگرچہ یہ امر مجھے پسندیدہ نہیں معلوم ہوا کہ وہ قرآت سنانے کو حصول خیرات کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں تاہم میں اکثر اُن کی قرآت سنا کرتا تھا۔

عید کے دنوں میں چونکہ تین دن تک برابر لوگ اپنے احباب واعزہ سے ملتے رہتے ہیں اس وجہ سے اپنے ہمنام کے ساتھ جن مدرس صاحب کے یہاں گیا تھا اُن کے یہاں بہت سے اصحاب سے ملاقات ہوئی اور یہیں پہلی بار یہ بات دیکھنے میں آئی کہ مہمانوں کے سامنے علاوہ چلے کے ایک خوشنما شیشے کے ظرف میں انگریزی مٹھائی پیش کی گئی جس میں سے ہر شخص نے ایک دو ڈلیاں لے لیں۔ یہ مٹھائی چونکہ ابتداً شام کی طرف سے آتی تھی اور غالباً وہاں بنتی بھی ہوگی اس لیے شامی مٹھائی کہی جاتی تھی حالانکہ اب عام طور پر یورپ سے آتی ہے اور بارٹن کے مشہور انگریزی کارخانہ کی بنی ہوتی ہے۔

اُسی روز اُن کرم فرما سے بھی پہلی بار ملاقات ہوئی جن کے پتہ پر میں نے اپنی ڈاک منگائی تھی اور اپنے خطوط وغیرہ پاکر بہت خوش ہوا۔ یہیں ضیاءالاسلام صاحب سے ملاقات ہوئی جو علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتہ ضلع مظفرنگر کے رئیس اور خلافت کمیٹی کے ممتاز عہدہ دار ہیں اور دونوں صاحبوں سے ہندوستان کے حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔

دوسرے روز صبح کو بازار کی طرف گیا تو اگرچہ بازار بند تھا مگر صفا اور مروہ کے درمیان جہاں سعی کرتے ہیں ایک جگہ جلسہ کا ساز وسامان دیکھ کر کچھ دیر اس خیال میں ٹہلتا رہا کہ جلسہ کی کارروائی کچھ سنوں

لیکن زیادہ دیر چلنے کی وجہ سے ٹانگوں میں درد محسوس ہوا اس لیے چلا آیا۔

عید کے ایام مسرت ختم ہو گئے اور بازار کھل گئے تو سامان سفر کی خریداری پر متوجہ ہوا چونکہ میں یہ سن چکا تھا کہ مدینہ منورہ میں قافلہ کا قیام بہت مختصر ہوتا ہے حتی کہ چالیس نمازیں بھی حرم نبوی میں نہیں پڑھنے کا موقع ملتا اور میں تو آستانۂ رسالت پناہی پر زیادہ دنوں تک جبہہ سائی کا آرزومند تھا اور متمنی تھا کہ حتی الامکان پورے چالیس روز کی حاضری کا موقع ملے اس لیے میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ میں جاؤں گا پہلے قافلہ کے ساتھ اور واپس آؤں گا سب سے آخری قافلہ کے ہمراہ لہذا اس امر کی کوشش کی گئی کہ یک طرفہ اونٹ کا انتظام ہو جائے۔ مگر جتنے اصحاب سے دریافت کیا سب نے مایوس کن جواب دیا۔ اور ہمارے مطوف صاحب کے کارکن یوسف نے وعدہ بھی کیا تو بالآخر اس کا ایفا نہ کر سکے بلکہ اُن کا بیان تھا کہ اونٹ والا اس شرط سے راضی تھا کہ نصف کرایہ سے ایک اشرفی زائد دی جائے مگر جب شیخ المطوفین کے سامنے معاملہ پیش ہوا تو اُنھوں نے اجازت نہ دی، بہر حال میں مجبور ہو گیا۔

اب دشواری یہ پیش آئی کہ میں تنہا تھا۔ ساتھیوں میں سے کسی کے اونٹ پر جگہ نہ تھی اور رحمت شاہ خرچ کی قلت کے باعث مدینہ منورہ کی حاضری کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ وہ تو اس خیال سے آئے تھے کہ ہیں مکہ معظمہ میں نوکری کر کے رہ پڑیں گے۔ مگر ایک ہفتہ کے اندر ہی زبان نہ سمجھنے کی وجہ سے نوکری سے مایوس ہو گئے۔ اس لیے اُن کا خیال ہوا تھا کہ حج کر کے ہندوستان واپس جائیں گے۔ ہمارے جہاز کے ساتھی میاں نظام دین کو جب یہ معلوم ہوا تو اُنھوں نے ازراہ فیاضی اُن سے کہا کہ جو کچھ تمھارے پاس ہے اُس سے مدینہ منورہ کی زیارت تو کر آؤ۔ واپسی کے مصارف کا انتظام وہ کر دیں گے۔ بس رحمت شاہ اس سفر میں بھی میرے ہمراہ رہے۔ اور ہم دونوں کے لیے ایک اونٹ کر لیا گیا۔

اگرچہ اس ملک کا عام سکہ چاندی کی مجیدی (ترکی روپیہ) اور رائگہ کے قرش ہیں لیکن حکومت کی طرف سے اونٹوں کا کرایہ ۱۳ گنی ۲ مجیدی مقرر کیا گیا تھا چنانچہ عہ/۱۲ کے حساب سے گنیاں اور عہ/۱ میں مجیدی لیکر میں نے کرایہ ادا کیا اور اس رقم کے علاوہ ۱۲ فی کس شغدف کا کرایہ للعہ/ فی کس حق ترجمانی اور ۱۲ منازل میں مشعل جلانے کی اجرت یعنی مجموعہ ماعہ/۱ دینا پڑے۔ رحمت شاہ نے چونکہ گنیاں بعد میں لیں اس وجہ سے اُنھیں معہ کے حساب سے لیں۔ مگر اتفاق سے حق ترجمانی اور اُجرت مشعل کی رقم سے وہ بچ گئے۔ ترجمان کی اُجرت کی یہ بنا ہے کہ ہر علم کی طرف سے ایک شخص حاجیوں کے ساتھ جاتا ہے جو سلسلہ

یعنی حجاج اور بدوؤن کے درمیان ترجمانی بھی کرتا ہے اور عام طور پر حجاج کی راحت رسانی کا سعین
رہتا ہے۔

ہم لوگون نے اپنا کل روپیہ علی جان کی کوٹھی مین جمع کرا دیا تھا۔ چلنے سے قبل اُن کے یہان سے
ایک ایک حوالہ مدینہ منورہ مین اُن کے نمائندے کے نام لے لیا اور راستہ کے مصارف کے لیے کافی روپیہ
مجیدیان اور قرش سب طرح کے سکے رکھ لیے۔ سامان سفر کچھ بہت زیادہ درکار نہ تھا اس لیے کہ ہم مین سے
ہر شخص مسافر ہی تھا۔ مگر اپنا کل سامان ساتھ لے جانا منظور نہ تھا۔ دوسرے تصدق کے لیے بعض
اشیا کی ضرورت تھی اور مدینہ منورہ تک کے لیے جنس بھی ساتھ لینا تھی۔ شفقی پیر عبدالعزیز صاحب تو ہندوستان
ہی سے جنس ساتھ لائے تھے۔ ہم لوگون کو جنس خریدنا پڑی۔ جو چند روپیہ مین فراہم ہو گئی۔ خیال تھا
کہ اشیاے خوردنی بہت گران ملین گی اور اگرچہ اکثر چیزون کا نرخ ہندوستان کے مقابلہ مین دگنا تھا تاہم
جب اس امر پر نظر کی جاے کہ یہ اجناس بالعموم ہندوستان، مصر، عراق جیسے دور دراز مقامات سے آتی ہین
تو ہرگز گران نہ معلوم ہونگی۔ اجناس کی خریداری مین ایک صاحب کی وجہ سے بہت آسانی ہوئی جو دفتر
النائب کے ایک کارکن مولوی جعفر علی صاحب کے دور کے رشتہ دار ہین اور جن کے والدین عرصہ ہوا
ہندوستان سے ہجرت کر گئے ہین۔ تصدق کے لیے ہین اشیا ذیل درکار تھین پیراہان، چٹائیان، زنبیل
اور شکیزے۔ ان چیزون کے لیے مرشدزادہ صاحب سے عرض کیا کہ کسی واقف کار شخص سے منگوا دین
اُنھون نے ازراہ محبت انتظام تو کر دیا مگر جو شخص چیزین خرید کر لایا اُس نے شرارت سے یا ممکن ہے کہ نادانی
سے تقریباً دگنے دام صرف کرا دیے۔

مکہ سے روانگی کے وقت بعض اصحاب نے کچھ رقوم خیرات میرے حوالے کردی تھین۔ جو رقوم
مخصوص لوگون کے لیے تھین ان کے متعلق تو مجھے صرف اسی قدر اہتمام کرنا پڑا کہ جلد سے جلد اُن لوگون
سے مل کر دیدون البتہ جو رقوم یہ کہکر دی گئی تھین کہ مستحق لوگون مین تقسیم کردی جائین۔ اُن کو مستحق
لوگون تک پہونچانے مین بہت تگ و دو کرنا پڑی۔ چنانچہ مکہ معظمہ مین جسقدر رقم تقسیم کرنے کی تھی اُس کا
بڑا حصہ مرشدزادہ کے ساتھ ایک ایک گھر پر جا کر دیا گیا اور بقیہ حصہ ایک دوسرے بزرگ کی معرفت اُسی
طریقہ پر صرف کیا گیا۔ مرشدزادہ ہی کی معیت مین جناب شیخ حسام الدین بخاری کی خدمت مین حاضر ہوا
آپ کا عرف شیخ سینی ہے۔ اور طریقہ نقشبندیہ کے بزرگ ہین۔ آپ کا دولت خانہ حرم محترم سے تھوڑے
ہی فاصلہ پر ہے اور جتنے لوگون سے ذکر آیا سب نے بالاتفاق آپ کی بزرگی و عظمت کا اقرار کیا۔ آپ کی عمر

بہت زیادہ ہی۔ اندازاً سو برس سے اوپر۔ مگر ضعیفی کے باوجود روزانہ نماز فجر اول وقت جماعت شافعی کے ساتھ حرم شریف مین ادا کرتے اور اُس وقت سے لیکر طلوع آفتاب تک وہین حلقہ فرماتے ہین۔

اہل عرب کی مہمان نوازی اس قدر مشہور ہی کہ یہان اس کا تذکرہ فضول ہوگا۔ مکہ معظمہ مین کسی کے یہان جایئے تو جانے کی ضیافت ضروری ہی حقہ سگریٹ بھی اکثر لوگ پلاتے ہین۔ اور سوکھے پانون کی گلوریان بھی کہین کہین ملتی ہین۔ شیخ کے یہان بھی جب کبھی حاضری کا اتفاق ہوتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ کہ جاے لوا کہات یا کھانے کے بغیر وہ رخصت ہونے دیتے۔ ناوقت اوقات مین بھی وہ اکثر اصرار فرماتے اور مجھے مجبور ہونا پڑتا۔

حرم شریف مین تو جسقدر ممکن ہوتا ہی آب زمزم پیا جاتا ہی۔ چاہ زمزم پر ہر وقت سقے موجود رہتے ہین جو صبح سے لیکر عشا کے وقت تک پانی پلاتے رہتے ہین۔ اس کے علاوہ صحن حرم مین جابجا لوگ صراحیان لیے ہوے پھرتے اور پانی پلاتے رہتے ہین اور بہت سے حجرون مین مختلف سبیلون کے منتظمین کی طرف سے پانی جمع رہتا ہی اور حجاج کے زمزمیون کی طرف سے بھی حرم شریف مین شام کے وقت پانی پلایا جاتا ہی اور گھرون پر بھی آب زمزم کی صراحیان بھیجی جاتی ہین۔ آب زمزم اگرچہ ذائقہ کے لحاظ سے شیرین نہین اور عموماً ٹھنڈا پینے کو نہین ملتا لیکن اس مین عجیب عجیب برکتین ہین اس لیے جسقدر ملتا پیا جاتا۔ شہر مین نہر زبیدہ کا پانی عام طور سے ملتا ہی جو نہایت شیرین اور لطیف ہی۔ عام صرف کیلیے اکثر لوگ کنوئین کا کھاری پانی بھی لیتے ہین۔ مین پانی عادتاً زیادہ نہین پیتا مگر مکہ معظمہ مین کچھ تو موسمی حرارت و خشکی کی وجہ سے اور کچھ اس سبب سے کہ چلنا زیادہ پڑتا تھا بکثرت پانی پیتا تھا اور بجاے اسکے کہ نقصان پہنچتا صحت کے لیے وہان کے پانی سے زیادہ کوئی چیز مفید معلوم نہین ہوئی۔ کیونکہ جسقدر غذا ناموافق ملتی تھی اُسی قدر قوت ہاضمہ اُس سے کم متاثر تھی۔ بلکہ سچ یہ ہی کہ ایسی ناموافق غذا یہان رہ کر ہضم ہی نہین ہو سکتی۔

مرشد زادہ کی معیت مین جنت المعلیٰ کی حاضری بھی دے آیا۔ پیر عبدالعزیز صاحب تو دیگر زیارتگاہون پر بھی ایک صاحب کے ساتھ حاضری دے آئے تھے۔ مگر مین نے مدینہ منورہ سے واپسی پر زیارتگاہون پر حاضری ملتوی رکھی۔

۹ شوال (۲۰ مئی) ہماری روانگی کا دن متعین تھا۔ مگر جب ظہر کے وقت تک اونٹ نہ آئے تو ہم لوگ مطمئن ہوگئے کہ آج روانگی نہ ہو سکے گی۔ شام کے قریب دفعتاً اونٹون کے آجانے کی اطلاع ملی اور جلدی جلدی شغدفون پر سامان رکھا گیا۔ سامان رکھکر ہم لوگ حرم شریف چلے گئے جہان نماز مغرب کے بعد

طواف وداع کیا اور باب الوداع کی طرف سے رخصت ہوے۔ ہمارے اونٹ حرم شریف کے باہر ہی کھڑے تھے اس لیے فوراً سوار ہوکر ایک گھنٹہ میں شہدا پہونچ گئے۔ یہ مقام کہ مکہ معظمہ کے نواح میں تقریباً دو کوس کے فاصلہ پر مسجد تنعیم سے قریب ہے۔ شہر سے تمام قوافل یہاں آکر جمع ہوتے ہیں اور ایک دن کے بعد جب قافلہ پورا اکٹھا ہوجاتا ہے تو روانہ ہوتا ہے۔ قوافل کا یہ اجتماع 'تبریز' کی اصطلاح سے موسوم ہے۔ شغدف پر پہلی بار سوار ہونے کا اتفاق ہوا تھا اس لیے یہ مختصر سفر بجاے تکلیف دہ ہونے کے بہت فرحت کا موجب ہوا۔ میرے شریک شغدف رحمت شاہ ماشاءاللہ بہت تندرست و توانا تھے لہذا شغدف کا وزن برابر کرنے کے لیے جنس کا بڑا حصہ میرے شغدف پر رکھ دیا گیا تھا جسکی وجہ سے مجھے جنبش تک کا موقع نہ تھا۔ شہدا پہونچ کر سب سے پہلے پانی کی فکر ہوئی۔ تلاش سے ایک کنواں ملا جہاں پانی بھرکر وضو کیا گیا اور نماز کے بعد شغدف کے سامنے زمین پر بچھونا بچھاکر پڑرہے۔ صبح کو میں اور دو ساتھی مکہ معظمہ واپس آئے۔ بعض ضروری چیزیں رہ گئیں تھیں اُن کو گھر اور بازار سے لیکر ساتھیوں کو تو میں نے دوپہر ہی کو رخصت کردیا اور میں نماز کے بعد اپنے مہتمم ڈاک کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتفاق سے گھر کے خطوط اور اخبارات آگئے تھے۔ عجلت میں خطوط کے جواب تو لکھدیے مگر اخبارات لینا بھول گیا اور ایک گدھا کرکے سہ پہر تک قافلہ میں آکر ملگیا۔ یہاں میدان میں دھوپ کی تمازت سے لوگ بدحواس ہورہے تھے اور پانی کی قلت مزید برستم ڈھارہی تھی۔ عصر کا وقت قریب تھا اور وضو کے لیے ساتھیوں کے پاس ایک قطرہ پانی کا نہ تھا۔ قریب ہی اگرچہ بازار بسا ہوا تھا جہاں ضروری اشیاے خوردنی ملتی تھیں مگر پانی کہیں بھی نہیں ملتا تھا۔ البتہ کنوئیں پرسقے بھررہے تھے مگر وہ بات بھی نہیں سنتے تھے۔ آخر بعد تلاش بسیار ایک کنواں ملا جہاں کوئی سقہ نہ تھا اور میں نے اور رحمت شاہ نے مل کر پانی بھرا۔ وضو کیے اور ایک ایک ٹین بھرکر اپنے مقام تک لائے۔ اس قسم کی جسمانی محنت کا میں بالکل نااہل ہوں اس وجہ سے پانی کا ٹین لانا گویا ایک عظیم الشان مہم تھی۔ اور اگرچہ بالآخر میں اس مہم کو سرکرسکا مگر پانی کا ایک معقول حصہ ضایع ہوگیا اور میرے کپڑے شرابور ہوگئے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے اگرچہ فی الجملہ اس کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی لیکن بہت پست ہوگیا۔ نماز عصر سے فارغ ہونے کے بعد روانگی کی تیاری شروع ہوئی۔ عین اُسی وقت دیکھا کہ شریف کی سواری آرہی ہے۔ سبزہ گھوڑے پر شریف سوار تھے اور ان کے پیچھے ایک دو سو آدمی اونٹوں و گھوڑوں پر سوار اور جلو میں مختصر سی جماعت خدام اور محافظین کی تھی۔ شریف ایک پہاڑی کے دامن میں

گھوڑے سے اُترے پہاڑی کے ایک حصہ پر جو زیادہ بلند نہ تھا ایک جگہ کسی قدر ہموار تھی یہاں چند اونی دریاں بچھا دی گئیں اور شریف معہ دو ایک ساتھیوں کے وہیں جاکر بیٹھ گئے اور بقیہ ہمراہیوں میں سے کچھ تو نیچے گھوڑوں کے پاس کھڑے رہے یا بیٹھ گئے اور کچھ شریف کے عقب میں پتھروں کی آڑ میں ہو گئے۔ ایک کرسی شریف کے قریب شاید اُن کے بیٹھنے کے لیے رکھی گئی تھی مگر وہ دری پر بیٹھے۔ ایک دوربین اُن کے پاس تھی اُس کے ذریعہ سے کبھی وہ قافلہ کا نظارہ کرتے اور کبھی اُس کو کرسی پر رکھ کر ساتھیوں سے بات چیت کرتے۔ میں نے اس سے قبل شریف کو نہیں دیکھا تھا اس لیے میں غور سے دیکھتا رہا اور اگرچہ فاصلہ زیادہ تھا اور میری نگاہ بھی کمزور ہے تاہم میں ان کی حرکات وسکنات کو بخوبی دیکھ سکا۔ اب قافلہ روانہ ہونے لگا اور مختلف جوانب میں شغدف اونٹوں پر کسے جانے لگے جس کی وجہ سے ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ادھر ہمارے بدوؤں نے آکر شغدفوں پر سامان رکھنے کا تقاضا کیا۔ ہمارے ترجمان صاحب ہمارے ساتھ نہیں آئے تھے بلکہ عصر کے قریب ہمارے مطوف کے وکیل عبدالرحمٰن قشاش کے ساتھ آئے۔ یہ صاحب تنہا ہمارے قافلہ کے ترجمان نہ تھے بلکہ ایک اور مختصر قافلہ دوسرے مطوف کے حاجیوں کا بھی ان کے تحت میں تھا۔ وکیل صاحب نے ہر اونٹ کے کرایہ میں سے دو دو گنیاں ہمارے پاس اس غرض سے جمع کیں کہ یہ رقم مدینہ منورہ پہونچ کر اپنے بدوؤں کو دیں۔ یہ کل رقم میر عبدالعزیز صاحب کے پاس جمع کر دی گئی کہ ہمارے مختصر قافلہ کے سردار وہی تھے۔ دوسرے شغدفوں کے مقابلہ میں میرے یہاں سامان زیادہ تھا۔ اس پر ہمارا بدو عبدالرحمٰن بہت جز بز ہوا۔ دیر تک حجت ہوتی رہی۔ میں کہتا تھا کہ راستہ میں ناقص جنس خریدنا مجھے منظور نہیں اس لیے میں نے مدینہ منورہ تک کے لیے سامان یہیں سے ساتھ لے لیا ہے۔ البتہ اگر بدو اس پر رضامند ہو کہ اُس کو راہ میں کھانا نہ دیا جائے تو مجھے کچھ عذر نہ ہوگا اگر نصف جنس یہیں چھوڑ دی جائے۔ بدو پہلے تو بہت ناراض ہوتا رہا اور جیسا کہ عموماً ان لوگوں کا قاعدہ ہے بہت قسمیں بھی کھاتا رہا لیکن بالآخر وکیل صاحب نے جب یہ تصفیہ کر دیا کہ میں ایک روپیہ اُس کو دیدوں تو وہ راضی ہو گیا۔ نماز مغرب پڑھ کر جب ہم اونٹوں پر سوار ہوئے اور ہمارا قافلہ چلا تو عبدالرحمٰن کے بجائے ایک دوسرا بدو میرے اونٹ کے ساتھ تھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ وہ عبدالرحمٰن کا بھائی ہے اور اُس کا نام عمار ہے۔ دکہ معظمہ کے حالات میں اس وجہ سے بہت اختصار کرنا پڑا ہے کہ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد زیادہ دنوں وہاں حاضر رہنے کا موقع ملا اور اُس کا مفصل ذکر انشاء اللہ آئندہ کیا جائے گا۔



پانچویں منزل

شہداسے نکلکر مسجد تنعیم کے آگے اونٹ رک گئے ۔ یہاں ایک جانب حکومت کے کارکن ڈیرہ ڈالے پڑے تھے اور گیس کی تیز روشنی میں اونٹوں کا شمار کر رہے تھے ۔

ہمارے معلم کے کارکن یوسف نے اپنے سب اونٹ شمار کرادیے اور ضروری مراسم تحریر ادا ہوگئے تو وہاں سے رخصت ہوکر آہستہ آہستہ قافلہ روانہ ہوا ۔ اور دن بھر کی ماندگی کے اثر سے فوراً نیند آگئی ۔ مگر شغدف پر مسلسل سونا اور وہ بھی پہلی رات قطعاً ناممکن تھا اس لئے کہ جمال (شتربان) بار بار میزان میزان کے آوازے لگاکر مسافروں کو اپنے اپنے شغدفوں کا توازن برقرار رکھنے کی ہدایت کرتے تھے اور چونکہ اونٹوں کی دو تین قطاریں پاس پاس چلتی تھیں اس وجہ سے کبھی آگے پیچھے کے شغدف ٹکرا جاتے تھے اور کبھی برابر برابر چلنے والے شغدف باہم الجھ جاتے تھے ۔ نصف شب کے بعد دور سے روشنی دکھائی دی تو ہم نے سمجھا کہ منزل قریب آگئی ہے ۔ چنانچہ تقریباً ۲ بجے رات کو پڑاؤ پر پہونچے ۔ جمالوں نے فوراً ہی انزل انزل کہکر اترنے کا تقاضا شروع کیا ۔ جلدی جلدی آنکھ ملتے ہوے اترے شغدفوں کو انھوں نے ہم لوگوں کی مدد سے بعجلت تمام اوتار پھینکا اور اونٹوں کو لیکر چلتے بنے ۔ ہمنے امداد باہمی سے اپنے اپنے شغدفوں کا سامان اوتارا ۔ زمین پر چٹائیاں اور بچھونے بچھائے کہ اتنے میں آواز آئی "حطب" فوراً تھوڑی لکڑی خریدی گئی اور پھر جب "مویا مویا" کی صدا لگاتے ہوے مرد عورتیں اور بچے مشکیزوں اور مٹی کے کنستروں میں پانی لائے تو ضرورت کے مطابق پانی لیا گیا وقت اتنا نہ تھا کہ سوتے لہذا تھوڑی دیر باتوں میں گذار کر نماز فجر ادا کی میں نے اپنے ساتھیوں سے طے کرلیا تھا کہ لکڑی اور پانی کی فراہمی اور بازار کے دوسرے کام میرے متعلق رہیں گے کھانا پکانا یا پکوانا اور جاے قیام پر دوسرے امور کی نگرانی

۲۷ مئی روز یکشنبہ

دو کرین گے ۔ لکڑی اور پانی چونکہ بآسانی فراہم ہو گئے تھے اور دونون چیزون کے
بیچنے والے مسلسل آتے رہتے تھے اس لئے نماز ظہر کے بعد ہی مین نے پڑاو کا گشت لگایا
اور بازار کا پتہ چلایا ۔ ہمارا حاجی قافلہ ایک بلندی کے دامن مین تھا اور دور تک شغدف ہی
شغدف نظر آتے تھے ۔ ہر معلم کے حجاج کی الگ الگ ٹولی تھی اور عموماً ان کے شغدف
پاس پاس ایسے طریقہ پر رکھے گئے تھے کہ دائرہ یا نصف دائرہ کی صورت بن جائے
درمیانی میدان مین لوگ اپنے بچھونے بچھاتے اور چولھے چڑھاتے ۔ جن لوگون کے ساتھ
راوٹیان یا نمگیرے تھے انھون نے شغدفون سے کچھ فاصلہ پر ڈیرے جمائے تھے ۔ یہ سلسلہ
بلندی کے اوپر تک چلا گیا تھا مین گھومتا ہوا ادھر پہونچا تو دیکھا کہ بلندی کے اُس
جانب نہر رواں ہے ۔ جس کے کنارے بکثرت اونٹ اور آدمی جمع ہین ۔ یہ نہر وہی ہے
جو نہر زبیدہ کے نام سے مشہور ہے اور جس کا پانی مکہ معظمہ مین پیا جاتا ہے ۔ اس کا
اکثر حصہ پٹا ہوا بیان کیا جاتا ہے ۔ مگر یہان دور تک کھلی ہوئی ہے ۔ نہر کا عرض بہت
ہی کم ہے کسی جگہ تین چار فٹ ہی ورنہ عموماً دو فٹ سے زیادہ نہین ۔ بڑے بڑے المونیم
کے تسلے اونٹون کے سامنے رکھے ہوے تھے اور جمال چمڑے کے ڈولون سے پانی
بھر بھر کر پلا رہے تھے ۔ پاس ہی سیکڑون آدمی غسل کر رہے تھے جس مین مرد و عورت
کی کچھ تمیز نہ تھی ۔ یہ لوگ عموماً ملک جاوہ کے رہنے والے تھے ۔ ان لوگون مین لحاظ حیا و
غیرت کا نام نہین ہے ۔ جس طرح ہندوستان مین دریاؤن کے گھاٹون پر ہندو
مرد و زن ملکر اشنان کرتے ہین ، بعینہ یہی حالت جاویون کی تھی ۔ بعض لوگ نہر کے
اندر نہا رہے تھے ۔ اور چونکہ نہر کا عمق بھی بہت کم ہے اس وجہ سے مرد و زن سب برہنہ
یا نیم برہنہ نظر آتے تھے ۔ نہر کے کنارہ دور تک کھیتی اور نخلستان دکھائی دیتے تھے
کنارہ سے ذرا ہٹکر ایک سمت کو بازار لبا ہوا تھا ۔ یہان اونٹ گائے ، بکری اور
دنبہ کا گوشت ، انڈے ، روٹیان ، سبزی ، خربزے ، تربوز ، جنس ، تیل ، چائے ، شکر
اور تمباکو وغیرہ ضرورت کی سب چیزین بک رہی تھین ۔ بازار جھونپڑیون کا بنا ہوا تھا
اور بیلون سے منڈھے ہونے کی وجہ سے خوشنما معلوم ہوتا تھا کھانے کی دوکانین

اور قہوہ خانے متعدد تھے۔ میں چونکہ گھومتا ہوا پہونچا تھا اس وجہ سے ذرا دیر میں پہونچا ورنہ ہمارے مقام سے ایک فرلانگ سے زائد فاصلہ نہ ہوگا۔ واپس آکر ساتھیوں کو حال سنایا اور کھانا کھانے کی فکر ہوئی۔ آفتاب کافی بلند ہو چکا تھا۔ تمازت بڑھ رہی تھی اور ہوا کی حدت ترقی پر تھی۔ دن اسی بے پناہ میدان میں بسر کرنا تھا لہذا لیٹنے۔ بیٹھنے اور نماز پڑھنے کے لئے کوئی جگہ بنانا ضروری تھی۔ مگر ناواقفیت اور پہلے سے اس کا خیال نہ آنے کی وجہ سے ہمارے شغدف بہت ناموزوں رکھے گئے تھے۔ بہرحال موقع کے لحاظ سے پانی بھرنے کی تھیلیوں اور چادر و رضائی کی مدد سے ایک جگہ ایسی بنائی گئی جہاں سایہ رہ سکے اور کھانا کھا کر سو رہا۔ ظہر کے قریب اٹھا تو ایک شخص خرمے بیچنے لایا۔ یہ خرمے بہت ہی خوش ذائقہ تھے۔

صبح ہی کو ہمارے شغدفوں سے قریب عراقیوں کی جو جماعت خیمہ زن تھی اس میں سامان غسل و کفن ہو رہا تھا۔ شام کو ہمارے سامنے کے قافلہ میں ایک حاجی نے انتقال کیا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ عصر کے وقت میں ضیاء الاسلام صاحب کے یہاں بیٹھا تھا کہ دفعۃً آندھی چلنے لگی! دن بھر کی تپش اور لو کے بعد اگرچہ اس سے بہت کچھ فرحت ہوئی مگر اس خیال سے کہ کہیں بارش نہ ہو جائے بعجلت اپنے مقام پر واپس آیا۔ آندھی دیر تک رہی۔ کچھ ترشح بھی ہوا باقی غنیمت ہے کہ بارش کی نوبت نہیں آئی۔

ہمارے قافلہ نے یہاں ایک دن مقام کیا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ بہت سے جمالوں کے گھر قریب ہی ہیں اس لئے وہ اپنے گھر والوں سے ملنے گئے ہیں شام کو ہم بعد مغرب کھانا کھا رہے تھے کہ میرا جمال عبدالرحمٰن آگیا۔ اور میری دعوت پر وہ بھی کھانے میں شریک ہوگیا اور کھانے سے فارغ ہو کر بخشش کا روپیہ جو میں نے دیا تھا لے کر چلا گیا تھا لیکر کہیں چلا گیا۔

۲۸۔ مئی روز دوشنبہ دوسرے دن چاشت کے وقت بھاگتا ہوا آیا اور مجھے کہا کہ ایک بورے میں تمام جنس اور بھاری سامان باندھ کر مجھے دو میرے پاس کوئی فاضل بورا نہ تھا لہذا اس کے ساتھ جا کر بازار سے خرید کیا اور واپس آکر بھاری اور غیر ضروری سامان بورے میں رکھ کر اس کے حوالہ کیا۔ ہمارے ساتھیوں نے بھی اپنا زائد سامان اپنے جمالوں کو

دیدیا۔ ہمارے پانچ اونٹ تھے۔ جس مین سے تین پیر صاحب کے۔ ایک میرا اور ایک ہمارے اُن پنجابی ساتھی کا جو پیر صاحب کی اجازت سے مکہ معظمہ مین ہمارے مکان کے بیرونی حصہ مین رہتے تھے۔ یہ تین آدمی تھے، دو بہنین اور ایک بھائی۔ ایک بہن جو پہلے ایک بار حج کر چکی تھی غربت کی وجہ سے شغدف کا کرایہ نہ دے سکتی تھی۔ لہذا وہ شہداے وادی فاطمہ تک جھیکر پیادہ پا چلی آئی اور یہان ہمارے قافلہ کے سردار سے گفتگو کر کے ۳ گنی مین آمد ورفت کا کرایہ طے کر لیا۔ باقی دونون نے ایک اونٹ مع شغدف کر لیا تھا۔ ان پانچون اونٹون مین سے چار کے جمال ہم قبیلہ تھے۔ مگر عبدالرحمٰن کا ان لوگون سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عبدالرحمٰن کے پاس چار اونٹ تھے جنمین ایک میری سواری مین تھا اور دو جاویون کی سواری مین تھے۔ چوتھا جو کوتل چلتا تھا جاویون ہی کے قافلہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اسی پر زائد سامان جا کر باندھ دیا گیا۔

چاشت ہی کے وقت قافلہ مین ہر طرف حیّ حیّ کی صدا بلند تھی اور مختلف ٹولیان شغدف رکھ رکھ کر روانہ ہونے لگی تھین۔ دوپہر کے قریب ہمارے جمال اونٹ لائے اور آتے ہی یہان بھی حیّ حیّ کہکر شغدف لادنے کی جلدی مچانا شروع کی۔ ہم لوگ بھی تیار بیٹھے تھے۔ لہذا ظہر سے قبل ہی روانہ ہوگئے۔ راہ مین جا بجا کہین شربت کہین تربوز کہین چاے بکتی جاتی تھی۔ بدوی دوڑ دوڑ کر شغدف سوارون کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے اونٹ سے اُترا تو میدان مین ایسی تپش تھی کہ الامان والحفیظ۔ نماز پڑھنے سے قبل اپنے شغدف سے کچھ آگے نکل گیا تھا۔ جتنی دیر مین نماز پڑھی اونٹ نے وہ راستہ طے کیا اور کچھ آگے بڑھ گیا اور مجھے اُس تک پہونچنے کے لئے ذرا تیز چلنا پڑا۔ زمین کی ریت جو چلنے مین جوتہ کے اندر بھر گئی تھی اسقدر گرم تھی کہ اُسکی وجہ سے پاؤن جھلسے جاتے تھے۔ ہواے گرم و تند کے طمانچون سے چہرہ بدحواس تھا اور آنکھون سے گویا شعلے نکل رہے تھے۔ شغدف مین پہونچکر جان مین جان آئی ادھ کئی گھنٹہ تک دم لینے کے بعد جب عصر کے وقت قدرے ٹھنڈا ہوا تو پھر نماز کے لئے اوترنا چاہا۔ رحمت شاہ پہلے اوترنا چاہتے تھے۔ اوترنے مین اُن کا تہمد شغدف مین اولجھہ گیا

اور اُن کے بوجھ سے اُن کا شغدف زمین سے جا لگا۔ اونٹ برابر چل رہے تھے۔
اس لئے جبتک جمال کو اطلاع ہو وہ دوڑ کر آئے اور اونٹ کو کھولے ہمارا ایک شغدف
زمین بوسی کی حالت میں اور ہم دونوں شغدفوں کے درمیان معلق رہا۔ یہ چند منٹ
اس قدر خطرہ کی حالت میں گذرے کہ عبدالرحمن نے دوڑ کر شغدف کو اُبھار کے درست
کردیا۔ مگر پھر بھی طبیعت کی بدمزگی اور افسردگی زائل نہ ہوئی۔ جب مغرب کے وقت
قافلہ چند منٹ کے لئے رکا تو شغدفوں کو اوتروا کر از سرنو اونٹ پر کسوایا۔ پھر بھی آرام
سے نیند نہ آئی۔ عبدالرحمن وعمار کو اس بات پر غصہ میں آکر بہت ڈانٹا کہ وہ ہمارے اونٹ کو
چھوڑ کر جاویوں کے اونٹوں سے جا ملے تھے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو ہمارے ساتھ
ہونا چاہیئے تھا۔ عبدالعزیز ہمارے ترجمان نے سمجھا بجھا کر اطمینان دلایا کہ آئندہ شغدف
بہت مضبوطی سے کسے جائیں گے اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ یہ منزل طولانی تھی اور پھر
یہ حادثہ۔ مشکیزے جو مکہ معظمہ سے ساتھ لائے تھے اُن میں وادی فاطمہ میں پانی بھرا گیا تو
معلوم ہوا کہ سب ٹپکتے ہیں۔ صرف دو صراحیاں دونوں شغدفوں پر تھیں۔ لہذا پانی چک گیا۔
رات میں سوتے سے آنکھ جو کھلی تو خشکی سے منہ میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ کسی نے
مویا مویا کی صدا لگائی تو ایک قرش دے کر ایک گلاس پانی لیا اور جلدی میں غٹ
غٹ چڑھا گیا۔ بمشکل دو حصہ پانی ہوگا باقی ریت ہی ریت تھی۔ خدا خدا کرکے صبح کو
۲ بجے قافلہ منزل پر پہونچا۔

۲۹ مئی روز شنبہ ثراوی کی زمین کسی قدر ناہموار تھی۔ بہرحال جلدی جلدی شغدف
اوتارے گئے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اونٹ پر سے پھینکدیے گئے اور شغدفوں
کے سامنے بچھونے بچھا کر ذرا دیر لیٹے ہونگے۔ نماز فجر کے بعد میں وظیفہ پڑھتا
ہوا بازار کی طرف گیا۔ طلفان کا بازار اچھا خاصہ ہے۔ یہاں غلہ بہت فروخت ہوتا ہے۔
دوکانیں عموماً بنی ہوئی ہیں۔ تربوز۔ خربزے۔ بینگن۔ ککڑی۔ لیموں وغیرہ بکثرت ملتے
ہیں۔ کھانے اور چائے کی دوکانیں بھی ہیں۔ مگر پکی ہوئی روٹی نہیں نظر آئی۔ متعدد کنویں
قریب ہی تھے۔ جن میں سے دو جو باولیوں کی وضع کے پختہ بنے ہوئے تھے بہت بڑے

اور کسی قدر بلندی پر تھے کہ اُن پر سے چڑھ کر سنا رے پڑاؤ کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر
پانی وادی فاطمہ جیسا شیرین و سبک نہ تھا اور نسبتاً گران بھی ملا۔ جمالون نے شغدف
اُتار پھینکنے کے وقت تو میری ہدایت پر چندان توجہ نہ کی تھی لیکن وادی فاطمہ تک شغدفون
کے لنگ لگ رکھے ہونیکی وجہ سے جو تکلیف ساتھیون کو ہو چکی تھی اُس کی بنا پر سب لوگون نے
بالاتفاق طے کر لیا تھا کہ آئندہ سے شغدف بالمقابل رکھے جائین۔ چنانچہ ہم لوگون
نے خود اپنے اپنے شغدف اٹھا کے مقابل مین کر لئے تھے اور بازار سے آگر جیسے ہی آفتاب
بلند ہوا اور تمازت ناقابل تحمل ہو گئی، رضائیان نکال کر شغدفون کے درمیان باندھ دی
گئین جسکے سایہ مین کھانا بھی پکا لیا گیا اور آرام سے لیٹ بیٹھ بھی سکے۔ وادی فاطمہ مین
ٹھہرنا زیادہ پڑا تھا اور یہان قیام مختصر تھا اس وجہ سے کھچڑی کھائی گئی اور شام کے لئے
روٹی پکا لی گئی۔ ظہر کے قریب قافلہ روانہ ہوا۔ منزل چھوٹی تھی۔ راہ مین شربت چائے
تربوز بکثرت فروخت ہو رہے تھے۔ ایک روز قبل کے تجربہ کی بنا پر مین نے طے کر لیا تھا
کہ اب عصر سے قبل شغدف سے نہ اُترون گا۔ کیونکہ ہوائے گرم و تند اور آفتاب کی
جھلس دینے والی تپش کے مقابلہ مین مین بہت نحیف و زار تھا۔ ہمارے اونٹون کا رُخ
اگرچہ مغرب جانب ہونے کی وجہ سے آفتاب پشت کی جانب تھا لیکن ہوائے گرم کے لپٹے
شغدف کے اندر بھی آرام سے نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ اس لئے سامنے کے رُخ پر رضائی کا پردہ
باندھا گیا اور پشت پر باوجودیکہ شغدف مین چٹائی کسی ہوئی تھی لیکن دونون شغدفون
کے درمیان جو حصہ کھلا رہتا تھا اُس سے دھوپ اور ہوا کے گذر کو بند کرنے کے لئے
بھی ایک مختصر پردہ باندھنا پڑا۔ پھر بھی ہوا کی تیزی اور اونٹ کی بے ڈھنگی چال کے
باعث جب کسی جانب کا پردہ کھل جاتا تو ہوا کا وہ تھپیڑ لگتا کہ معلوم ہوتا کسی نے
آگ سے داغ دیا ہے۔ شغدف مین پردون کے باندھ دینے کی وجہ سے جہان ہوا کے
تھپیڑون سے نجات مل گئی تھی وہان حبس بھی ہو گیا تھا جسکی وجہ سے دم گھٹنے لگتا۔ پیاس
کی شدت تھی۔ جو صراحیان سامنے کی طرف تھین اُن کا پانی پیتے رہے اِس لئے کہ پشت
کی طرف جو صراحیان تھین اُن کا پانی تمازت آفتاب سے پک گیا تھا۔ عصر کے وقت

اتنے مین کچھ لوگ آئے جو گرد و پیش کے عرب قبائل کی طرف سے چوکیداری وصول کرتے تھے۔ ۵ قرش فی شغدف کے حساب سے چوکیداری کا ادا کی گئی

جبکہ آفتاب بالکل شغدف کے اس جانب آگیا جدہر چٹائی کسی ہوئی تھی اور ہوا کی تیزی و گرمی میں بھی کمی ہوئی تو پشت کا پردہ کھولا گیا۔ شام کو روٹی اور کھجور اور وطن کا پکوان کھایا۔ اور یہی بدو کو دیدیا۔ عشا پڑھکر کچھ دیر سوئے نصف شب کو منزل پر پہونچے۔ چونکہ پورا قافلہ آگے پیچھے روانہ ہوتا۔ چلتا اور منزل پر پہونچتا ہے اس لئے جو لوگ پہلے پہونچ کر آباد ہو چکتے ہین اُن کے پڑاؤ کی مشعلوں کا نظارہ دور سے شغدف مین بیٹھکر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے پڑاؤ پر پہونچنے سے پہلے جتنی مسافت قافلہ کے گرد طے کی جاتی ہے اُس مین میلہ کی سیر کا لطف آتا اور چونکہ پانی اور لکڑی فروخت کرنے والون کی کثیر تعداد 'مویا۔ مویا' اور 'حطب میطب' کے آوازے لگایا کرتی اس لئے ایک عجیب قسم کا ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ شغدف سے اُترتے ہی فوراً پانی خریدا گیا۔ اور چند منٹ کے اندر بستر بچھا کے سو رہے۔

۲۰ مئی روز چہارشنبہ

رات کو کسی قدر شبنم پڑی جس سے سارا بستر تر ہو گیا، اور صبح کو خفیف سی خنکی بھی محسوس ہوئی۔ سویرے حسب معمول وظیفہ پڑھتا ہوا بازار گیا۔ دُفن کا بازار مختصر ہے۔ گو سفری ضرورت کی سب چیزین ملتی ہیں۔ پچھلی منزلوں میں گرمی سے پیاس کی شدت رہی تھی اس لیے آج تربوز لیکر کھایا۔ میں معدہ و جگر کے ضعف کی وجہ سے وطن میں رہکر تربوز شاذ و نادر کھاتا ہوں مگر یہاں کی گرم و خشک آب و ہوا میں تربوز کا کھانا مفید ہے۔ کوئیں یہاں زیادہ اور بڑے نہیں۔ پانی کسی قدر کھاری تھا۔ اور گراں ملا۔ وادیِ فاطمہ میں دو سے لیکر چار قرش فی ٹین پانی کی قیمت دی گئی۔ الفان میں چھ سے آٹھ قرش تک اور یہاں آٹھ سے بارہ قرش تک۔ اس قافلے میں کم و بیش چھ ہزار اونٹ تھے، جو دو ٹکڑیوں میں آگے پیچھے روانہ ہوتے تھے۔ یعنی نصف قافلہ جب ایک پڑاؤ سے گذر جاتا تو بقیہ نصف قافلہ دوسرے روز وہاں پہونچتا۔ ہم لوگ دوسرے قافلے میں تھے۔ ہر ٹکڑی میں کچھ کوتل اونٹ بھی ہوتے تھے لیکن زائرین کی مجموعی تعداد دس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ اور جمالوں، اُن کے سرداروں اور دیگر ہمراہیان کو ملا کر یہ سارا قافلہ تقریباً پندرہ ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس لیے قافلے کے دو حصوں میں منقسم ہو جانے کے باوجود بھی جب ایک حصہ پڑاؤ پر مقیم ہوتا تو وہاں

ایک اچھے خاصے قصبے کے برابر آبادی ہو جاتی۔ اس سارے مجمع کو سیراب کرنے کے لیے ایک دو کنویں کیا کافی ہو سکتے تھے۔ کنووں سے متصل بڑے بڑے حوض یا کھائی بنائے جاتے تھے تاکہ اونٹوں کو پانی پینے میں آسانی رہے۔ ہر وقت متعدد گراریوں پر بڑے بڑے چرمی ڈولوں میں پانی کھینچا جاتا تھا اور سقوں، پانی بیچنے والوں، اور غریب زائرین کا جو اپنے مقام پر پانی نہیں خرید سکتے تھے ان کنووں کے گرد ایک ہجوم رہتا تھا۔ سقے جو عموماً سوڈانی عرب ہوتے تھے صرف ڈول کھینچتے رہتے تھے۔ پانی بیچنے والے مرد، عورتیں اور بچے انھیں سے اپنی مشکیں، شنکیزے، اور ٹین بھرواتے اور دوڑ دوڑ کر پڑاؤ والوں کے ہاتھ جا کر فروخت کرتے۔ جو لوگ اپنے مقام پر پانی کی گراں قیمت نہیں دے سکتے تھے وہ اپنے اپنے ٹین یا شنکیزے لاکر انھیں سقوں سے براہ راست بھروا لیتے تھے۔ پانی کی قلت اور گرانی اور اُسکے حصول کی دشواریاں سب بجائے خود اگرچہ ہمت شکن ہوتیں مگر جب اُس ملک کے قدرتی حالات پر نظر کیجاتی تو شکوہ وشکایت کا کوئی موقع باقی نہ رہتا تھا۔ اور جب اُس نعمت عظمیٰ کی لذت کا دھیان آتا جسکے حصول کی تمنا کشاں کشاں اس انبوہ کثیر کو لیے جارہی تھی تو بے اختیار زبان سے نکل جاتا تھا کہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

چوکیداری کی فیس دو قرش ادا کیے گئے اور ٹھیک دوپہر کو قافلہ روانہ ہوا۔ گرمی کی شدت میں کوئی کمی نہ تھی مگر تربوز کی بدولت پیاس کم معلوم ہوئی۔ وقت میں تھوڑے لیموں خرید لیے تھے۔ شام کو شغدف پر بیٹھے بیٹھے تھوڑا شربت بنا کے پی لیا۔ جس سے مزید تسکین ہوئی اور راستہ بخیر و خوبی کٹ گیا۔ منزل چھوٹی تھی اس لیے جلد پہونچ گئے۔ اور نماز عشا پڑھ کے سو گئے۔

۳۱ مئی روز پنجشنبہ

خدیمہ یا خدیفہ کا بازار جو ذرا بلندی پر واقع ہے، پختہ ہے اگرچہ کچھ زیادہ وسیع نہیں۔ اسکے ایک جانب بہت سے کچے کنویں بنے ہوئے تھے۔ ان کا پانی میٹھا ہوتا تو قافلے والوں کو بہت آسانی ہوتی۔ مگر میٹھے پانی کے پختہ کنویں ذرا فاصلے پر تھے۔ ہمارا پڑاؤ دوسری جانب تھا۔ اور نہایت سطح زمین پر تھا۔ اور چونکہ دوسرے مقامات کی طرح دور تک کسی قسم کی بلندی، ٹیلہ یا پہاڑی نہ تھی اس لیے جگہ بہت کھلی ہوئی اور پر فضا معلوم ہوتی تھی۔ حسب معمول وظیفہ پڑھتا ہوا بازار گیا تو دیکھا کہ بازاروں میں کھانے کی دوکانیں بھی ہیں جہاں مچھلی کا گوشت بکثرت بک رہا تھا معلوم ہوا کہ سمندر یہاں سے بہت قریب ہے۔ اور تھوڑی دیر میں تازی مچھلیاں

بھی کھتی نظر آئیں ۔۔ آفتاب بلند ہو جانے کے بعد میں قافلے سے ذرا دور رفع حاجت کے لیے گیا تو ایک طرف
ایسا نظر آیا کہ سمندر موجیں مار رہا ہے ۔ اور دھندلے سے نشانات کشتیوں کے بھی دکھائی دیے۔ یہ خیال
کرکے کہ ساحل قریب ہے اور ابھی قافلے کی روانگی میں بہت دیر ہے' میں نے چاہا کہ ساحل کی
سیر کر آؤں ۔ پڑاؤ پر آکر ڈنڈا اٹھایا اور ساتھیوں سے یہ کہہ کر کہ ساحل قریب
ہے میں ذرا سیر کرکے ابھی آتا ہوں ' نکل کھڑا ہوا ۔ اور جس طرف سمندر کی
موجیں نظر آئی تھیں اسی طرف روانہ ہوا ۔ چلتے چلتے جب سامنے نظر کرتا تو جھلکتا ہوا پانی دکھائی
دیتا ۔ اور میں سمجھتا کہ ساحل کے قریب پہونچ رہا ہوں ۔ اور جیسے جیسے آفتاب بلند ہوتا جاتا اور
روشنی تیز ہوتی جاتی کشتیاں قریب ہوتی نظر آتیں ۔ دیر تک چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ قافلے
سے بہت دور نکل آیا ہوں اور ساحل جتنے فاصلے پر پہلے تھا اب بھی اسی قدر دور ہے ۔ میدان
میں کوئی شخص ایسا نہ نظر آیا جس سے پوچھ سکتا ۔ کہیں کہیں کوئی بدو عورت بکریاں یا اونٹ
چراتی ہوئی نظر آجاتی اور اس سے میں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں دریافت کرتا تو وہ کوئی
جواب نہ دیتی ۔ تا آنکہ میں چلتے چلتے تھک گیا ۔ اور قافلے سے اتنی دوری ہوگئی کہ مجھے اندیشہ ہوا
کہ کہیں کوئی بدو تنہا دیکھ کر حملہ آور نہ ہو ۔ ناچار واپس ہوا ۔ مگر مڑ مڑ کر بار بار دیکھتا جاتا تھا
اور عجیب بات تھی کہ جس جگہ پہلے سمندر کی موجیں نظر آتی تھیں وہاں اب پہاڑی دکھائی دیتی
تھی ۔ اپنے مقام پر پہونچ کر لوگوں سے ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ ساحل یہاں سے اتنا قریب نہیں کہ
دکھائی دے اور جو پانی کی سی چمک دکھائی دیتی تھی وہ دراصل ریت کے ذرے تھے جو آفتاب
کی کرنوں سے جگمگا اٹھے تھے ۔ اور کشتیاں جو نظر آتی تھیں وہ دراصل کشتیاں نہ تھیں بلکہ بگولے تھے کہ
ہوا پر اڑ رہے تھے

بگولہ اور سراب کی اصلیت سے تو واقفیت تھی مگر ان کے نظارے کا کبھی موقع نہ آیا تھا ۔ پہلی
دفعہ قدرت کے یہ کرشمے دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی ۔ منزل طولانی تھی لہذا چاشت ہی کے
وقت روانگی ہوگئی ۔ راستے میں ابر محیط رہا ۔ سمندر کے کنارے کنارے قافلہ چل رہا تھا اس لیے
برابر ٹھنڈی ہوا چلتی رہی ۔

اس منزل میں چوروں کی کثرت ہے ۔ اس کی اطلاع روانگی سے پہلے ہی کر دی گئی تھی
اور شام کے قریب پھر عبدالعزیز مترجان اور ہمارے بدوؤں نے آکر کہا کہ بہت ہوشیاری سے رہنا ۔

شام ہوتے ہی جمالوں نے حرامی۔ حرامی (چور۔ چور) پکار کر چلانا شروع کیا۔ ہر ایک اپنے اونٹ کے ساتھ چلتا تھا اور ذرا ذرا دیر کے بعد پکارتا جاتا تھا۔ ہم لوگوں سے بھی تاکید کی گئی تھی کہ سوئیں نہیں اور اپنے سامان سے خبردار رہیں کہ مبادا پیچھے سے کوئی چور کچھ اٹھا نہ لیجائے۔ چونکہ سب ساتھیوں کی رقوم میرے ہینڈ بیگ میں رکھی ہوئی تھیں اس لئے مجھے احتیاط ہو گیا۔ نیز کی تاکید مزید کی گئی تھی۔ یہ بیگ ڈبل ٹین کا تھا اور اگرچہ بمبئی سے اسکو ساتھ لینے کی وجہ سے مجھے بہت کچھ آرام ملا تھا مگر وزنی ہونے کی وجہ سے شغدف میں اس کا رکھنا سخت دشوار تھا۔ شروع میں تو ایک دو دن تک بہت ہی زحمت رہی۔ کبھی اونٹ کی پیٹھ پر ڈوری سے کسا جاتا تھا، کبھی شغدف کے کسی کونے میں باندھا جاتا تھا۔ کئی بار اس سے چوٹ بھی کھائی اور اس بات پر افسوس کیا کہ چمڑے کا بیگ کیوں نہ لیا۔ اس منزل پر گرمی کی تکلیف نہیں ہوئی۔ اگرچہ رات کو عموماً یہ تکلیف جاتی رہتی تھی۔ لیکن یہاں ساحلی ہوا کی وجہ سے زیادہ ٹھنڈک ملی اور باوجود جمالوں کے شور اور چوری کے خطرے کے میں گہری نیند سویا۔ اگرچہ روانگی سویرے ہوئی تھی مگر منزل اتنی طولانی تھی کہ صبح کو جب آفتاب کافی بلند ہو گیا تب کہیں جا کر رابغ پہونچے۔

یکم جون روز جمعہ — رابغ یا رابق قربِ ساحل کی وجہ سے تجارتی منڈی بن گیا ہے۔ جدہ سے کشتیوں پر سامانِ تجارت یہاں آتا ہے اور وسطِ حجاز کے بدو قبائل میں تقسیم ہوتا ہے۔ یہاں کا بازار وسیع اور پٹا ہوا ہے جس میں عام ضرورت کی ہر چیز ملتی ہے۔ مکہ معظمہ سے رخصت ہونے کے بعد اب تک جہاں جہاں قافلہ ٹھہرا تھا وہاں کسی مستقل آبادی کے نشان نہ تھے۔ مگر یہاں بازار کے علاوہ مختصر سی مستقل آبادی بھی ہے جسکے تمام مکانات دونوں جانب اور نیز کچھ فاصلہ سے ایک ٹیلہ پر بنے ہوئے ہیں۔ ایک جانب ایک سنگی مگر شکستہ قلعہ ترکی عہدِ حکومت کی یادگار ہے۔ بازار میں داخل ہونے سے پہلے ہی ایک مسجد ملتی ہے جس میں اگرچہ بلحاظ تعمیر مسجد کی کوئی خصوصیت نہیں نظر آتی لیکن اوقات نماز میں پانچوں وقت اذان ہوتی اور نمازیوں کا اچھا خاصہ مجمع ہو جاتا ہے۔ قافلے کے لوگوں کو عام طور پر مسجد کا پتہ نہیں چلا لیکن جن لوگوں کو سراغ مل گیا وہ مسجد تک پہونچ گئے۔ بازار کے ایک سرے پر قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں اور ہر قسم کے اجناس کے علاوہ پکا ہوا کھانا اور روٹی وغیرہ بھی یہاں مل سکتی ہے۔ قربِ ساحل کی بدولت تازہ مچھلی بھی ملجاتی ہے اور شلجم، مولی، لیموں وغیرہ بھی نظر آئے۔ دوکانوں پر

زیادہ تر تو اجناس ہی فروخت ہوتی ہیں اس لیے کہ بدوی زندگی کی سادگی نے ضروریات زندگی کی تعداد کو اس قدر محدود بنا دیا ہے کہ دوسری عام اشیا کی مانگ بہت کم ہے، تاہم کپڑے، بساط خانہ اور دواؤں کی دوکانیں بھی یہاں موجود ہیں۔ میرے ہمراہیوں میں سے ایک صاحب کو پیچش ہو گئی تھی لیکن راستے میں کسی مقام پر کوئی دوا نہ مل سکی۔ یہاں اسبغول خریدا گیا تو ایک روپے میں غالباً دو تین تولہ سے زیادہ نہیں ملا۔ پھر بھی غنیمت معلوم ہوا کہ مل تو گیا۔

بدوؤں کا لباس بہت سادہ ہے۔ ایک لمبا کرتہ ستر پوشی کے لیے۔ ایک رومال کمر میں اور ایک سر پر۔ اور بعضوں کے پاس ایک اُون کی عبا بھی ہوتی ہے جو کبھی کرتے کے اوپر زیب تن کی جاتی ہے اور کبھی اونٹ کی پیٹھ پر بستر کا کام دیتی ہے۔ پائجامہ پہننا یا تہ باندھنا بدوی معاشرت میں ایک شدید بدعت ہے۔ اگرچہ شہروں میں آمدورفت کی وجہ سے بعض ایسے بدو جن کو مسلسل اونٹ یا گھوڑے پر سوار رہنا پڑتا ہے کرتے کے نیچے جانگھیا پہن لیتے ہیں۔ اسی سبب سے کپڑے کی دوکانیں زیادہ بارونق نہیں ہیں۔

بساط خانہ کا بھی یہی حال ہے کہ صابن، تباکو، دیا سلائی وغیرہ چند اشیاء کے سوا اور کچھ نہیں نظر آتا۔ ہر بدو مسلح رہتا ہے۔ کم سے کم ایک تیز چھری ہر شخص کی کمر میں کھنسی رہتی ہے، ورنہ تلوار یا بندوق یا دونوں ہوتی ہیں۔ بازار میں ایک شخص دو بندوقیں اور ایک سات نل کا طپنچہ فروخت کر رہا تھا۔ قیمت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بہت کم قیمت پر بک رہی ہیں۔ ایک بندوق کی قیمت تقریباً بیس روپے دینا پڑتے۔

بازار کے عین وسط میں ایک بہت بڑا پختہ کنواں بنا ہوا ہے جس کا پانی اگرچہ دیکھنے میں بہت صاف و شفاف ہے مگر ذائقے میں بالکل تلخ۔ اس لیے قافلے والوں کے پینے کے لیے اُن چھوٹے چھوٹے کچے کنوؤں کا پانی آتا ہے جو بازار کے ایک سمت قبرستان سے قریب بنے ہوئے ہیں۔ ان کا پانی عموماً گدلا تھا اور کسی کسی کا میٹھا نکلتا ورنہ کچھ نہ کچھ کھاری پن موجود ہوتا۔ جس کی وجہ سے کھانا پکانے میں سخت دقت واقع ہوئی۔ چونکہ رابغ میں ایک شبانہ روز کا قیام تھا اس لئے خیال تھا کہ کھانا اہتمام سے تیار ہوگا۔ مگر پانی کی خرابی نے سارا انتظام برباد کر دیا۔ دن بھر نہایت تیز ہوا چلتی رہی۔ اگرچہ ہوا میں تپش کم تھی مگر گرد اس قدر اُڑتی تھی کہ الامان۔ شام کو دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں

سے ڈاک جا سکتی ہے، اس لیے رات کو دیر تک خطوط لکھتا رہا۔ بمبئی سے جو بنڈل کے بنڈل موم بتیاں
کے ساتھ لایا تھا اُنکی اب تک تو کوئی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ رات کو خط لکھنے کے واسطے روشنی کی ضرورت
ہوئی تو موم بتیاں کام آئیں۔ اب چونکہ مٹی کا تیل ہر پڑاؤ پر ملتا ہے اس وجہ سے حجاج کو چاہیے کہ موم
بتیوں کے بجائے ایک لالٹین ساتھ رکھیں۔ اور اس خیال سے کہ شغدف کی حرکت یا ٹکرے ٹوٹ نہ جائے
چمنی کے گرد تاروں کا جال بندھوالیں۔ جن جاویوں یا ہندوستانیوں کے پاس لالٹین تھی اُن کو بہت
آرام ملا۔

ڈاک کا اہتمام یہاں یہ ہے کہ ایک دوکان پر تمام خطوط جمع کر دیے جاتے ہیں۔ ضرورت ہو تو بھیجنے
کا غذ، لفافہ مول لیجیے۔ محصول ڈاک نقد جمع کرنا ہوتا ہے۔ اُس دوکان کا مالک گویا ڈاک کے مہتمم صاحب کا
ایجنٹ ہے جن کا مستقر مکہ میں بتایا گیا لیکن تلاش کے باوجود اُنکی صورت نہ دکھائی دی۔ ظاہر ہے
کہ ڈاک کا یہ انتظام کچھ قابل اطمینان نہیں مگر اس خیال سے دل کو کسی قدر تسلی ہو گئی کہ خط بھیجنے کی ذمہ داری
سے سبکدوشی تو حاصل ہوئی۔ مکتوب الیہ تک نہ پہونچے تو اسکے ذمہ دار کارکنان قضا و قدر ہیں۔

رات کو کافی خنک رہی اس لیے خوب نیند آئی۔ مگر وسط شب میں دفعۃً چور چور کا غل ہوا۔ ہمارے
ساتھ کے قافلے کی ایک عورت کا زیور رابغ کی منزل میں راستے سے اُڑ گیا تھا جسکی وجہ سے مترجم جاوی
اور اُس قافلے کے حجاج کے درمیان مسلسل تکرار و بحث ہوتی رہی۔ اس رات میں ہمارے ایک ساتھی کی
بھی ایک گٹھری غائب ہو گئی۔ راستے میں نگہبانی کے ذمہ دار تو جمال ہیں لیکن پڑاؤ پر نگہبانی کا فریضہ
اُس جماعت پر عائد ہوتا ہے جو چوکیداری وصول کرتی ہے۔ اور ہمارے مترجم صاحب نے اطمینان
دلایا کہ یہ لوگ مال تلاش کر کے یا تو واپسی پر آپ کو مال دیں گے ورنہ اُسکی قیمت ادا کریں گے۔ سب
جانتے تھے کہ یہ باتیں محض دفع الوقتی کی ہیں۔ مگر کرتے کیا۔ دنیا بامید قائم۔ غریب محروم جس کا یہ سامان
تھا صبر کر کے بیٹھ رہا۔

میرا نیا جوتہ چند ہی روز میں جواب دے گیا۔ پرانا پہلی ہی منزل میں رخصت ہو گیا تھا۔ اس لیے
اب مجھے فکر لاحق ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ یہاں ایک موچی بھی ہے۔ مگر باوجود کوشش بلیغ اُس
سے ملاقات نہ ہوئی۔ بالآخر بدووں کے پہننے کا ایک چپل خرید لیا گیا۔ بدو اس چپل کو پہن کر کس آسانی سے
ریتلی اور پتھریلی زمین پر چلتا ہے۔ مجھے تو اسکو پہنکر چار قدم بھی چلنا مشکل ہوتا تھا۔ تاہم ضرورت نے اسی کو

قناعت کرنے کے لیے مجبور بنا دیا۔

۱۰ جون ۔ روز شنبہ | رابغ میں عادت کے خلاف دونوں وقت گوشت کھایا تھا اس لیے صبح اُٹھتے ہی سوءِ ہضم کی شکایت محسوس ہوئی ۔ غذا ہضم کرنے کے خیال سے دیر تک ٹہلتا رہا ۔ چاشت کے وقت کچھ تھوڑا سا کھانا کھا کر روانہ ہوے ۔ رابغ سے نکلے تو دُور تک نخلستان میں اونٹ چلتے رہے ۔ دوپہر ہوتے ہوتے ساحل سے بہت دُور ہو گئے تو دھوپ اور لُو کے تھپیڑوں سے سامنا رہا ۔ رات کو عشا کے وقت مستورہ پہونچے ۔ شندف سے نیچے اُترے تو دیکھا کہ ساتھیوں کے اونٹ نہیں ہیں ۔ خیال ہوا کہ پیچھے آ رہے ہونگے ۔ جمال تو شندف پھینک کر الگ ہو گیا ۔ میں دیر تک انتظار کرتا رہا مگر ساتھیوں کے اونٹ نہ آئے اس لیے بہت پریشان ہوا ۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈھتا رہا مگر رات کا وقت اور چاروں طرف قطار در قطار شندف رکھے ہوے ۔ پتہ چلانا مشکل ہوا ۔ بدشواری تمام تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے تک پھرنے کے بعد میر صاحب وغیرہ ملے ۔ مترجم اور مقوم پر بہت کچھ اظہارِ غیظ و غضب کر کے میں نے چاہا کہ اپنے شندف کو بھی اُٹھوا لاؤں لیکن اب اپنا شندف تلاش کرنے میں سخت دشواری پیش آئی ۔ مترجم صاحب جو ہمراہ تھے آخر زچ آ کر واپس چلے گئے ۔ میں نے تنہا گھوم پھر کر اپنا شندف تلاش کیا اور اپنے ساتھی رحمت شاہ کو لیکر پھر اُسی جگہ آیا جہاں میر صاحب تھے ۔ شندف مع کل سامان کے جمال کے پاس چھوڑا صرف بیگ ساتھ لے لیا کہ اُس میں اپنا اور سب ساتھیوں کا زرِ نقد تھا۔

۱۱ جون روز یکشنبہ | صبح سویرے اپنا شندف بھی اُٹھوا لیا ۔ مگر جمال کی اس حرکت کی وجہ سے رات کو جس قدر زحمت ہوئی تھی اُس کا غصہ ہنوز باقی تھا ۔ اور اس غرض سے کہ جمال آیندہ ایسی کارروائی نہ کرے میں نے اُسکی مقررہ بخشش کے دینے میں تامل کیا ۔ بالآخر مترجم نے درمیان میں پڑ کر صفائی کرائی اور جمال سے پختہ وعدہ لیا گیا کہ اب کبھی میرا اونٹ ساتھیوں کے اونٹوں سے الگ نہ کریگا ۔ مستورہ میں ایک بڑی پختہ باؤلی بنی ہوئی ہے مگر اس کا پانی گندلا اور کھاری ہے ۔ کہیں فاصلے سے میٹھا پانی بھی آتا ہے مگر ہم لوگوں کو باوجود کوشش دستیاب نہ ہوا مجبوراً اسی پانی پر قناعت کی گئی لیکن دال کچی رہ گئی جسکی وجہ سے غریب رحمت شاہ کو پیچش شروع ہو گئی۔

مستورہ میں بازار بھی بہت مختصر تھا ۔ اگرچہ مدینہ منورہ کے کھجور تازہ اور عمدہ ملے ۔ میں رات کو ساتھیوں کی تلاش میں بہت خستہ ہو گیا تھا اس لیے خلافِ عادت بازار میں زیادہ نہ ٹھہرا اور تھوڑی

کھجوریں لیکر واپس آیا۔ تمازت آفتاب بھی مستورہ میں زیادہ محسوس ہوئی اور دوپہر نہ ہونے پائی تھی کہ نہایت تیز لوہ چلنے لگی۔ جسکی وجہ سے میر صاحب کی طبیعت بدمزہ ہو گئی۔ خدا خدا کر کے ظہر پڑھ کر روانہ ہوئے۔

۴۔ جون روز دو شنبہ | مستورہ سے چلے تو گرمی اور ہوا کی تیزی سے پریشان تھے۔ راستہ میں اگرچہ تپش کا وہی عالم رہا مگر ہوا کا رخ بدلا ہوا تھا اس لیے لو سے زیادہ تکلیف نہ ہوئی۔ پانی کی خرابی کا یہ علاج کیا کہ ہر دفعہ پیاس کے وقت شربت گھولا جاتا۔ نماز فجر کے وقت بیر شیخ پہونچے۔ یہاں کا بازار بھی مستورہ کی طرح مختصر ہے۔ اور کنواں بھی صرف ایک ہے مگر اس کا پانی شیریں اور صاف ہے اگرچہ ہ۔ فی ٹین کے حساب سے دام کسی قدر گراں دینا پڑے۔ بیر کنویں کو کہتے ہیں۔ دن کو یہاں بھی تپش اور لوہ سے سامنا رہا۔ مگر خوش ذائقہ پانی نے گرمی کی تکلیف زیادہ محسوس نہیں ہونے دی عصر پڑھکر روانہ ہوئے۔ راستے میں خبر ملی کہ جو قافلہ ہم سے آگے روانہ ہوا تھا اُسے اگلے پڑاؤ پر بدوؤں نے روک لیا ہے۔ نصف شب کو ہمارا قافلہ بھی بیر حسانی پہونچ گیا۔

۵۔ جون سہ شنبہ | صبح کو بعد نماز فجر حسب معمول بازار کی طرف گیا تو دیکھا کہ واقعی قافلے کا وہ حصہ جو ہم سے آگے تھا یہاں پڑاؤ کیے ہوئے ہے۔ اب گویا پورا قافلہ ایک جگہ ہو گیا۔ یہاں کا بازار بہت فراخ و وسیع ہے کچھ حصہ پٹا ہوا ہے اور کچھ ابتدائی پڑاؤ کے مانند جھونپڑوں کی شکل میں ہے۔ ترکاری کے سوا اور سب چیزیں ضرورت کی ملتی ہیں۔ کنوئیں متعدد ہیں اس لیے پانی بہت ارزاں ہے اور ذائقہ بھی اچھا ہے۔ وادی فاطمہ کے بعد سے جو لوگ نہیں ملے تھے اُن میں سے بعضوں سے اب ملاقات ہوئی۔ جن بدوؤں نے قافلے کو روکا تھا اُن سے گفتگو کرنے کے لیے جمالوں کے سردار گئے ہوئے تھے۔ دوپہر کو مترجم نے اطلاع دی کہ دو مجیدی فی شندف وینا طے پایا ہے۔ کل قافلہ روانہ ہوگا۔ ہمارے قافلے کے ایک افغانی کا یہاں انتقال ہو گیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ یوں تو ہر منزل پر کچھ نہ کچھ لوگ مرتے تھے مگر یہیں کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ تجہیز و تکفین و تدفین کا کیا انتظام ہوتا ہے۔ افغانی ساتھی کے متعلق سارے انتظامات آنکھوں کے سامنے ہوئے تو معلوم ہوا کہ قبر کھودنے کے لیے وہی تکروری جو مشکیں بھر بھر کر پانی بیچتے ہیں بلا لئے جاتے ہیں اور چند روپیوں کے خرچ سے سب کام نکل جاتا ہے۔ مکہ معظمہ میں سنا تھا کہ امیر کابل کے پیر صاحب بھی حج کے لئے آئے ہیں۔ مجھے اُنکی زیارت کا شوق تھا مگر وہاں کہیں

پتہ نہ چلا۔ اور انتظامات سفر سے فرصت ہی کب ملی۔ وادی فاطمہ پر اُن کا خیمہ دکھائی دیا تھا مگر قبل اسکے کہ میں اُنکی خدمت میں حاضر ہوں وہ روانہ ہو گئے۔ یہاں اُن کا خیمہ نظر پڑا تو مغرب کے قریب میں بھی حاضر خدمت ہوا۔ آپ کا اسم گرامی حضرت شمس المشائخ بتایا گیا۔ جوان آدمی ہیں اور صورت سے عابد و مرتاض معلوم ہوتے ہیں۔ نقشبندی ہیں۔ کچھ دیر اُن سے گفتگو رہی۔ معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اپنے بدوؤں سے طے کر لیا ہے کہ مدینہ منورہ میں دس روز قیام کریں گے۔ ....

.... اُنکے ہمراہ سترہ اٹھارہ اونٹ تھے اور ولایتیوں کی ایک جماعت ہر وقت اُنکو گھیرے رہتی تھی۔ ایک سفری پلنگ بچھا ہوا تھا اور خیمے میں دریوں اور قالین کا فرش تھا۔ جسکو دیکھکر یہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ عالتِ سفر میں ہیں۔ مغرب کے وقت جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔ امامت ایک دوسرے صاحب نے کی جو مقرب خاص معلوم ہوتے تھے۔ جب ہمارے افغانی ساتھی کے دفن کا وقت آیا تو اُنکو اطلاع دی گئی۔ اُنکی جماعت کے اکثر لوگ آکر نماز جنازہ میں شریک ہوے اور اپنے افغانی بھائی کو آخری منزل تک پہونچا آئے۔

۶۔جون روز چہارشنبہ | ہمارے قافلہ کا کچھ حصہ بیر شیخ میں یہ سنکر ٹھہر گیا تھا کہ بیر حسانی میں قافلہ رکا گیا ہے۔ آج وہ بھی اُس قافلہ سے آملا۔ میر صاحب کا جو سامان اُنکے جمال کے کوتل اونٹ پر بندھا رہتا تھا اُس میں ایک ٹین گھی کا بھی تھا۔ یہ کسی صورت سے ٹوٹ گیا اور سارا گھی بہ گیا۔ بیر حسانی میں جب اس سے آگاہی ہوئی تو میر صاحب بہت پریشان اور اپنے جمال سے ناخوش ہوے۔ مگر کرتے کیا۔ بازار میں بہت تلاش کیا کہیں گھی نہ ملا۔ ۲ مجیدی فی شغدف کے حساب سے بدوؤں کی نذر کرکے بیر حسانی سے بعد ظہر روانہ ہوے۔ قافلہ میں بعض لوگ اس زائد خرچ کے متحمل نہ ہوسکتے تھے اس لیے اُنھوں نے اپنے شغدف یہیں چھوڑ دیے اور اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہوے۔ خالی اونٹوں سے جن پر شغدف یا شبری نہ ہو بدو کچھ نہیں لیتے۔ نصف شب کے بعد ایک تنگ وادی میں جسکے دونوں جانب بلند پہاڑیاں ہیں قافلہ ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ آج بھی میرا اونٹ ساتھیوں سے الگ ہو گیا ہے۔ جمال پر غصہ تو بہت آیا مگر میدان کی تنگی اور راستے کی ناہمواری کی وجہ سے ستورہ کی طرح یہاں اس کا موقع نہ تھا کہ ساتھیوں کو تلاش کرتا۔ اس لیے مجبور ہو کر رات وہیں بسر کی۔ اس مقام کا نام شفاعیہ یا شنفیہ بتایا گیا۔

۷۔جون روز پنجشنبہ | صبح کو مترجم نے کہدیا کہ میر صاحب کے جمالوں کا مکان یہاں سے قریب ایک

دوسری سمت میں ہے اور وہیں وہ چلے گئے ہوں گے۔ اس لیے تلاش بے سود سمجھی گئی۔ یہاں کوئی بازار بھی نہ نظر آیا اس وجہ سے کھچڑی پر قناعت کی۔ مگر کھانا کھا کر جب میں نکلا تو قریب ہی میر صاحب کے شندف مل گئے۔ راستہ ایسا تنگ تھا کہ شندف وہاں نہ لایا جا سکتا تھا اس لیے خاموش ہو رہا۔ اور جمال کو بخشش دینے سے قطعًا انکار کر دیا۔ عصر کے بعد قافلہ روانہ ہوا تو ایک بلند پہاڑی پر چڑھنا پڑا۔ جب پہاڑی طے کر کے سطح میدان میں تھوڑی دیر چلے ہونگے تو یہ اطلاع ملی کہ آگے بدو راستہ روکے پڑے ہیں۔ ناچار کچھ دیر رُکے رہنے کے بعد قافلہ پھر اپنی جگہ پر واپس آیا۔ اب سب ساتھی پھر یکجا ہو گئے۔ اور رات وہیں بسر ہوئی۔ مترجم نے بہت کچھ گفت و شنید کے بعد کچھ روپے بطور قرض لیکر بدو کو دیئے۔

۸۔ جون روز جمعہ | آج معلوم ہوا کہ حوفیلہ کے قبیلہ نے ساڑھے پانچ مجیدی فی شندف طلب کیے ہیں۔ دن میں اور قافلہ والوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ خصوصًا حیدرآباد کے قافلہ میں ہمارے لکھنؤ کے ایک کرم فرما تھے اُن سے ملا۔ حیدرآباد کے قافلہ سالار ایک تونسی عرب تھے۔ وہ بہت اخلاق سے ملے۔ چائے پلائی۔ اور بہ اصرار کہا کہ جس قسم کی ضرورت ہو بے تکلف کہیے۔ رقم مطلوبہ ادا کر کے بعد نماز ظہر روانہ ہوئے۔ پہاڑی طے کر کے جب سطح میدان میں آگئے تو میرے جمال نے پھر اونٹ کو ساتھیوں کے اونٹ سے جدا کر کے اُن جاویوں کے اونٹوں سے جا ملایا جو اُسکے دوسرے اونٹوں پر سوار تھے۔ مجھے یہ امر بہت ناگوار گذرا کہ ستورو میں اور پھر شغفیہ میں پختہ عہد و پیمان ہو جانے کے باوجود جمال نے مجھے میرے ساتھیوں سے جدا کر دیا۔ چونکہ دن کا وقت تھا اس لیے مجھ کو فورًا خبر ہو گئی۔ اب میں نے اپنے جمال کے خلاف ستیاگرہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ میرے ساتھی رحمت شاہ کو چونکہ برابر پیچش ہو رہی تھی اس لیے اُنھیں تو میں نے اُترنے کا مشورہ نہیں دیا مگر میں خود اونٹ سے اُتر پڑا۔ اور اپنے ساتھیوں کے اونٹوں کے پاس پہونچ گیا۔ مترجم اور جمال دونوں نے بہت اصرار کیا لیکن میں نے کہا کہ مجھ کو پیدل چلنا گوارا ہے مگر اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بالآخر جمال کو اپنی ضد چھوڑ کر اونٹ وہیں لانا پڑا اور میں پھر سوار ہو کر روانہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد جمال نے پھر اونٹ کو جدا کر دیا۔ میں پہلی دفعہ پیدل چلنے کی وجہ سے بہت تھک گیا تھا اس لیے چپ ہو رہا۔ کچھ وقفہ کے بعد عصر کی نماز کے لیے اونٹ سے اُترا اور نماز پڑھکر جب دوبارہ اونٹ پر سوار ہونے لگا تو عجیب اتفاق ہوا۔ ہمارا اونٹ ذرا رُکا، جس سے آگے والے اونٹ کو بھی جس پر جاوی سوار تھے رُکنا پڑا۔ وہ اونٹ بدمزاج تھا، اس لیے بگڑ گیا۔ اور ایسا بگڑا

کرایا۔ وجہ وجمّال اور اُسکے بھائیوں کی کوشش سے قابو میں نہ آیا اور قافلہ سے الگ ہو کر اُس نے شغدف کو گرا دیا جس سے اُن حاجیوں کے سخت چوٹ آئی جو اُس پر سوار تھے۔ اس پر جمّال اور اُسکے بھائی مجھ سے بہت بگڑے اور غصہ میں بہت کچھ سخت و سُست کہا۔ اور ایک نے تو تلوار نیام سے ذرا باہر کر کے مجھے دھمکایا۔ حاجیوں کے جو مترجم صاحب تھے وہ بھی طیش میں آکر میری طرف وہ بڑھ کے آئے اور لگے سخت کلامی کرنے۔ تو میں نے اُن کو اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ڈانٹا۔ اور کہا کہ آپ اپنی راہ لیں مجھ سے کچھ آپ کا تعلق نہیں ہے۔ آخر اُنکے ہوش درست ہو گئے تو وہ جمّالوں پر خفا ہوئے اور انھیں مجبور کیا کہ میرے اونٹ کو کھول کر میرے ساتھیوں کے اونٹوں کے ساتھ ملا دیں۔

مغرب کے بعد قافلہ پھر رُکا۔ میر صاحب کا اونٹ ذرا آگے تھا اُنھوں نے مجھے بلوایا اور مقوم کا یہ پیام سُنایا کہ دو مجیدی فی شغدف یہاں رہتے ہیں بدوؤں کا امیر قبیلہ طلب کر رہا ہے۔ میں اسکو مقومین کی شرارت سمجھتا تھا، کیونکہ مانگنے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اسلیے میں نے رقم دینے میں عذر کیا۔ جس پر مقوم صاحب آئے اور اُنھوں نے کہا کہ جو رقم نہ دے گا اُس کا شغدف یہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ اچھا آپ میرا شغدف یہیں چھوڑ دیجیے مگر میرے پاس مجیدیاں نہیں ہیں اور یہ واقعہ تھا کہ شغفیہ میں مجیدیاں دینے کے بعد اب میرے پاس کوئی مجیدی باقی نہیں رہی تھی بہر حال میر صاحب نے ہم سبھوں کی طرف سے مجیدیاں دیدیں۔ عشا کے اول وقت کچھ فاصلہ پر روشنی دکھائی دی تو ہم سمجھے کہ منزل آگئی۔ مگر کہیں دو تین گھنٹے کے بعد ترامع یا ترّاہ پہونچے۔ معلوم ہوا کہ ہم بلندی پر تھے اور ترّاہ نشیب میں تھا اس لیے روشنی دُور سے دکھائی دینے لگی تھی۔

۹- جون روز شنبہ | صبح کو حسب معمول بازار کی طرف رُخ کیا۔ یہاں کوئی باقاعدہ بازار اگرچہ نہیں ہے تاہم ایک جانب بلندی پر بہت سی دوکانیں نظر پڑیں۔ کنواں یہاں ایک ہی ہے اس لیے پانی گراں ملا۔ رحمت شاہ کو پیچش کی شکایت تو کئی روز سے تھی لیکن یہاں پہونچکر تکلیف بڑھ گئی۔

دن بھر خوب گرمی رہی اور لُو بھی چلی۔ کچھ قافلہ پھر عباس میں ٹھہرا ہے جو ترّاہ سے شاید کوس بھر کے فاصلہ پر ہوگا۔ ہمارا جمّال عبد الرحمن کل سے جو بگڑا ہے تو اُس نے نہ شام کو معمول کے مطابق کھانا لیا اور نہ آج دوپہر کو آیا۔ کھانا نکال کر اُسکے لیے رکھ دیا گیا۔ اُس نے اپنے بھائی کو بھیجا مگر جب اُس سے کہا گیا کہ عبد الرحمن کو بھیج دو یا اپنے برتن لاؤ تو وہ بھی جا کر بیٹھ رہا۔ مجھے تمباکو پینے اور کھانے کی عادت دیرینہ ہے۔ حقہ یا چرٹ کا استعمال کیے بغیر قبض ہو جاتا ہے۔ اس واسطے برسوں کا معمول ہے

کہ صبح کو لازماً تباکو پیتا ہوں - البتہ جیل میں یہ تجربہ ہوا کہ دماغی محنت نہ کرنا ہو یا قلم پڑے اور مشق یا ورزش کرنے کا موقع ملے تو پھر تباکو کی حاجت نہیں - چنانچہ فتح گڑھ جیل میں باوجود سرکاری اجازت اور سامان کی موجودگی کے میں نے تقریباً ڈیڑھ سال تک حقہ نہیں پیا - بمبئی سے روانہ ہوتے وقت میں نے کئی بکس چرٹ کے لے لیے تھے، جو جہاز پر اور مکہ معظمہ میں برابر استعمال کرتا رہا - جب مدینہ منورہ کی روانگی کا وقت آیا تو میں نے تہیہ کیا کہ اس سفر میں چرٹ یا سگریٹ کا استعمال نہ کروں گا - مگر بعد کو اس خیال سے کہ بدو سگریٹ کے عادی اور شائق ہیں میں نے اپنے بدو کے لیے ایک پاؤنڈ تباکو اور سگریٹ بنانے کا کاغذ لیکر رکھ لیا - راستہ میں برابر عبدالرحمن اور اُسکے بھائیوں کو تھوڑا تھوڑا دیتا رہا - یہاں عبدالرحمن تو نہیں مگر اُسکا بھائی عبدالبصیر تباکو مانگنے آیا تو میں نے کہا کہ کل تو تم لوگ مجھے گالیاں دے رہے تھے آج تباکو مانگنے آئے ہو! اس پر وہ مایوس ہو کر چلا گیا - شام کو کچھ قافلہ اور آکر اُترا اور یہ خبر معلوم ہوئی کہ ان لوگوں کو بڑی حسانی سے اس وقت تک کل ۸ مجیدیاں فی شغدف دینا پڑیں - جن میں سے تین ابھی مقوموں کے پاس جمع ہیں جو یہاں دی جائیں گی - حالانکہ ہم ۹½ مجیدیاں فی شغدف دے چکے تھے - یہ بھی سننے میں آیا کہ دو حاجیوں کو راہ میں مجیدیاں نہ دینے کی بنا پر بندوق سے مار دیا -

۱۰ - جون روز یکشنبہ | آج صبح کو ضیاءالاسلام صاحب کو تلاش کیا - اُنھوں نے کہا تھا کہ اُن کے پاس دواؤں کا کافی ذخیرہ ہے اور کچھ طبابت میں بھی اُنکو دخل ہے - جب وہ نہ ملے تو حید رآبادی قافلہ میں جاکر حکیم غلام احمد مدنی کو جو اُس قافلہ کے طبیب تھے لایا اور رحمت شاہ کو دکھایا - ضیاءالاسلام صاحب کی تلاش میں مختلف پڑاؤں پر جانا پڑا - کل جو نیا قافلہ آیا تھا اُس میں بعض میرے جہاز کے بنگالی ہمراہی بھی تھے جن سے اب ملاقات ہوئی - وہ بیحد پریشان و مضطرب نظر آئے بہت سمجھایا بجھایا تب اُنکی تسلی ہوئی - حکیم صاحب نے صبح کو ایک دوا دی تھی مگر کچھ نفع نہ ہوا شام کو دوسری دوا دی - مگر رات بھر غریب کو دست آتے رہے اور سخت اُلجھن رہی -

۱۱ - جون روز دوشنبہ | آج حکیم صاحب نے رحمت شاہ کو پھر دیکھا - اب اُنکو بخار تھا - مگر حکیم صاحب نے غسل تجویز کیا - اور دوا بدل دی - غسل کے بعد سے رحمت شاہ کی طبیعت کچھ سنبھلی -

بدو کا مزاج خدا خدا کرکے اب درست ہوا - تو اُس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ دو دن کے کھانے کی قیمت دی جائے - مگر یہ خلافِ انصاف تھا اس لیے اُس نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا - اور دونوں

وقت کا کھانا لیکر روانہ ہوگیا۔ جسکے بعد پھر ہمارے تعلقات دوستانہ ہو گئے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ قبیلہ ظواہر کے لوگ ایک مجیدی فی شغدف پر راضی ہوگئے ہیں مگر احمدی قبیلہ سے ابھی تک کچھ تصفیہ نہ ہو سکا۔ اس لیے ابھی قیام رہے گا۔ وادی فاطمہ اور بیر حسانی پر ایک ایک روز زیادہ ٹھہرنا کچھ کم ناگوار نہ گذرا تھا کہ نہ صرف منزل مقصود پر پہونچنے میں دیر ہو رہی تھی بلکہ میری تمنا یہ تھی کہ آستانہ رسالت پناہی پر ایک ماہ تک حاضر رہوں۔ اور جتنی دیر راہ میں ہوتی تھی اُسی قدر میری حاضری کے دنوں میں کمی ہونے کا احتمال تھا۔ اس وجہ سے مجھ پر یہ تاخیر بہت شاق تھی۔ مگر بے بس تھا قافلہ میں ایک ہنگامہ ہوگیا۔ جس کی وجہ سے بدوؤں میں عجیب شور و غل رہا۔ کنوئیں پر جو تکروری (حبشی) پانی بھرتے تھے اُن سے اور ایک جمال سے کسی بات پر تکرار بڑھی۔ زبانی تو تو میں میں کے بعد مارپیٹ کی نوبت آگئی۔ یہاں تک کہ ایک بدوی تلوار نے اُس تکروری کو واصل بحق کر دیا بہت سے باثر بدوؤں اور متوسطوں کے درمیان میں پڑنے سے اُسوقت تو تصفیہ یہیں ختم ہوگیا مگر رفتہ رفتہ یہ خبریں گشت کرنے لگیں کہ تکروریوں کی جماعت کثیر انتقام لینے کے منصوبے کر رہی ہے۔ اب جہاں دیکھیے کچھ لوگ بیٹھے اسی کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ جمالوں کی ٹولیاں الگ اسی مبحث پر بحث گفتگو میں مصروف ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ جذبات انتقام زیادہ اُبھرنے نہ پائے اور پھر کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

اتفاق سے آج میری طبیعت بھی کسی قدر بدمزہ رہی۔ کچھڑی ذرا کچی رہ گئی تھی۔ شام کو حیدرآبادی قافلہ میں اپنے لکھنؤ کے کرم فرما فقیر محمد خاں صاحب کے پاس گیا تو اُنکے ایک دوست نے فروٹ سالٹ اور ست لیموں کا شربت پلا دیا۔ جس سے طبیعت ٹھیک ہوگئی۔

۱۲-جون روز سہ شنبہ آج اطلاع ملی کہ پندرہ مجیدی فی شغدف یہاں دینا ہونگے جن میں سے ایک مجیدی قبیلہ ظواہر کی جس کی خبر کل ملی تھی، ۱۲ مجیدیاں احمدیوں کے لیے اور ایک امانتاً مقوم کے پاس رہے گی کہ راستے میں بیر درویش اور مدینۂ منورہ کے درمیان کے بدوؤں کو دی جائے۔ ہم لوگوں کے پاس نواب مجیدیاں باقی تھیں نہ روپئے۔ حیدرآباد کے ناظم سالار عبد اللطیف تونسی نے شغدف میں چونکہ یہ کہا تھا کہ روپیہ کی حاجت ہو تو ہم قرض دیدیں گے۔ اس لیے اُن سے صورت حال بیان کی مگر اُنکے پاس صرف دو اشرفیاں نکلیں، جن سے ہمارا کام نہیں نکل سکتا تھا۔ مجبوراً جمالوں کی جو اشرفیاں مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت ہمارے معلم کے وکیل عبد الرحمن بشناس نے امانتاً میر صاحب کے پاس

رکھا دی تھیں اور جو انھیں مدینہ منورہ پہونچکر دینا تھیں اُنکو بھنا کر اس مجیدی فی گنی کے حساب سے لیں اور معتوم کے حوالہ کیں۔ ہمیں تبادلہ کے اس نرخ سے بہت نقصان پہونچا مگر کیا کرتے سوا اسکے کوئی چارہ نہ تھا۔ اور جتنے ملنے والے تھے وہ اس قافلہ میں نہ تھے۔ رحمت شاہ دوپہر تک اچھے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ اُلجھن بڑھنے لگی اور شام تک بدحواسی بہت بڑھ گئی حتیٰ کہ نصف شب کے بعد اچھی خاصی سرسامی حالت ہوگئی اور بیہوشی کے عالم میں وہیں بستر پر دست آتے رہے۔ اُن کی اس حالت کی وجہ سے رات بھر ہم لوگ سخت پریشان رہے اور میں تو بالکل نہ سو سکا۔

۱۲- جون سہ شنبہ/چہار شنبہ | آج سوت کے ایک حکیم صاحب کو بُلا کر لایا۔ اور حضرت شمس المشائخ سے جا کر اس پریشانی کا ذکر کیا تو اُنھوں نے ایک تعویذ مرحمت فرمایا۔ حکیم صاحب نے ازراہ لطف دوا بھی عنایت کی۔ صبح کو غسل کے بعد سے رحمت شاہ کی طبیعت ذرا ٹھہری ہوئی تھی۔ مگر جیسے جیسے دھوپ بڑھتی گئی طبیعت بگڑتی گئی۔ بعد ظہر جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو وہ شغدف سے باہر نکلے اور بیدم ہوکر زمین پر لیٹ گئے۔ منہ میں پانی ٹپکانے سے کچھ طبیعت اُبھری تو کئی آدمیوں نے مل کر اُنکو بمشکل شغدف پر سوار کیا۔ قافلہ روانہ ہوا اور عصر کے وقت بیر عباس پہونچ کر رک گیا۔ اب جو شغدف سے رحمت شاہ کو اُتارنا چاہا تو اُنکی حالت متغیر نظر آئی۔ لہذا اونٹ کو بٹھا کر شغدف وہیں کھلوا دیا گیا۔ اور میں ضیاء الاسلام صاحب کی تلاش میں دوڑا گیا۔ وہ ملے تو بہت متاسف ہوئے۔ مگر اب اُنکے پاس دواؤں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا اس لیے کہ سولہ سترہ دن میں بکثرت لوگ بیمار ہوئے اور وہ ہر اُس شخص کو جو اُن تک پہونچا برابر دوا دیتے رہے تھے۔ بہرحال اُنھوں نے تھوڑا سا جو اہر مہرہ دیا کہ اسکو پلانے سے طبیعت اُبھر آئے تو پھر علاج کی فکر کی جائے۔ لیکن بمشکل چند قطرے حلق سے اُترے ہونگے کہ روح نے قالبِ خاکی سے جدائی اختیار کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میرے لیے یہ تمام دن کلفت و پریشانی کے تھے۔ لیکن جب تک امید حیات باقی تھی باوجود اپنے ضعف و بے سروسامانی کے جو کچھ بن پڑا کرتا رہا۔ مگر خدا کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے۔ ہمارے مختصر قافلہ میں متعدد ایسے ضعیف، ناتوان اور مریض عورتیں تھیں جنکو حرکت کرنا مشکل تھی اور معمولی حاجات ضروریہ کے رفع کرنے کے لئے دوسروں کی مدد درکار ہوتی تھی۔ مگر موسم کی سختی اور سفر کے صعوبات سب کچھ جھیل گئیں۔ اور یہ نوجوان جو اپنی جسامت اور توانائی کے لحاظ سے ایسا نمایاں تھا کہ جہاز پر اور نیز اس سفر میں ہر شخص کی نگاہ اس پر پڑتی تھی آٹھ روز کے اندر ختم ہو گیا۔ الحمد للہ میری ہمت نے اگرچہ

فی الواقع اب جواب دے دیا تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اپنے رفیق کی لاش کو ساتھیوں کے سر چھوڑ کر میں بچو رہتا لہذا پھر ہمت اندھکر تجہیز و تکفین کے لیے اٹھا۔ ضیاء الاسلام صاحب جس قافلہ میں تھے اُسی میں ہمارے اور کے کچھ لوگ تھے جن میں دو ایک حجام بھی تھے۔ انکو بلاکر غسل دلوایا۔ ایک تکرمری نے قریب ہی قبر کھودی۔ ساتھیوں میں سے مبین خان نے کفن عنایت کیا۔ اور بالآخر عشا کے بعد غریب رحمت شاہ کو سپرد خاک کر دیا۔

۱۴- جون روز پنجشنبہ | علی الصباح پڑاؤ کا گشت لگایا اور تقریباً قافلہ کی ہر چھوٹی بڑی ٹکڑی پر نظر دوڑائی مگر نظام الدین لاہوری کی تلاش میں کامیابی نہ ہوئی۔ وسط میں ایک شکستہ قلعہ نظر آیا جسکے اطراف میں پڑاؤ کا بازار تھا۔ دوسرے مقامات کی طرح اگرچہ یہاں کوئی مستقل بازار نہیں ہے لیکن چونکہ بندرگاہ ینبوع کی طرف سے جو قافلے مدینہ منورہ جاتے ہیں اُن کا رہگذر یہی ہے اور اسوقت تو مکہ معظمہ کا تقریباً پورا قافلہ جمع ہو گیا تھا اس لیے بکثرت دوکانیں لگی ہوئی تھیں۔ گوشت اور دیگر ضروری اشیا کی فراوانی کے علاوہ جو تقریباً ہر پڑاؤ پر ملتی تھیں یہاں سبزی، پیاز اور مسالے بھی زیادہ مقدار میں نظر آئے۔

پڑاؤ چونکہ قلعہ کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اس لیے بہت دیر میں گشت تمام ہوا۔ اپنے مقام پر واپس آکر پہلا کام یہ کیا کہ میر صاحب سے ایک گنی مستعار لیکر بازار سے مجیدیاں بھنائیں اور رحمت شاہ کے مصارف تجہیز و تکفین ادا کیے۔ پھر اُنکے آلودہ بستر اور کپڑوں کو ایک پشاوری مولوی صاحب کی معرفت جو ہمارے ہمراہ تھے مساکین حجاج میں تقسیم کیا۔ عصر کے بعد ایکبار پھر نظام الدین کی تلاش کے لیے نکلا مگر اس دفعہ بھی ناکامیاب رہا۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ خبر دریافت ہوئی کہ رابغ سے حیدرآبادی قافلہ اور حضرت شمس المشائخ معہ اپنے ہمراہیوں کے اور بعض اور ٹکڑیاں ادھر نہیں آئیں بلکہ انھوں نے احمدیوں کو مجیدیاں دینے سے انکار کر دیا اور اس بنا پر غائر کا راستہ اختیار کیا جس میں ایک بلند پہاڑی پر سے گذرنے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔

۱۵- جون روز جمعہ | آج صبح سے چل چلاؤ کا سامان ہے۔ رحمت شاہ کے انتقال سے میرے شغدف میں جو جگہ خالی ہو گئی تھی میں چاہتا تھا کہ اُس پر پشاوری مولوی صاحب کو بٹھالوں جو بیرحسانی سے برابر اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو کر منازل طے کر رہے تھے۔ مگر جمال باوجودیکہ دو روپیہ کے بجائے اب اُس سے کہا گیا کہ صرف دو بخشش کے ملیں گے کسی طرح راضی نہ ہوا۔ اور میزان برابر کرنے کے لیے

خالی شغدف پر میرے زائد سامان کا بورہ لاد دیا۔ قافلہ ظہر کے قریب روانہ ہوا۔ مگر تھوڑی دور بھی نہ گیا تھا کہ ٹھہر گیا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ بدوؤں کا کوئی اور شیخ نمودار ہو گیا ہے اور حملہ کرنے کی دھمکی دیتا ہے اس لیے قافلہ آج قیام کرے گا۔ خدا خدا کر کے ایک ہفتہ کے بعد روانگی ہوئی تھی اور اب جو دوبارہ اقامت کی اطلاع ملی تو بہت ناگوار ہوئی جس مقوم کو ہم سبھوں نے مل کر گھیر لیا اور خدا مجھے معاف فرمائیں کہ میں نے اس غریب کو بہت ڈانٹا۔

۱۶۔ جون روز شنبہ | صبح کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد معمول کے مطابق تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لیے ہم نے رضائیوں کا تنبو تان لیا تھا۔ چاشت کے اخیر وقت میں تپش سے بچنے کے لیے ہمارے جمالوں کے ساتھ کئی اور بدو اور جمال ہمارے تنبو کے نیچے آ کر جمع ہو گئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بدو احمدی فرقہ کے ہیں، تو میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ان سے شکایت کی کہ تمام اہلِ عرب اپنے مہمانوں کی بڑی خاطر کرتے ہیں اور تم لوگ کیسے ہو کہ حجاج کو جو اس وقت نہ صرف اہلِ عرب کے بلکہ خدا اور اسکے رسولؐ کے مہمان ہیں پریشان کرتے ہو۔ ان میں سے ایک نے میری گفتگو سننے کے بعد فوراً ہی کہا "اور شریف کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جو حجاج سے چودہ[۱۴] گنی فی اونٹ وصول کرتا ہے اور جمالوں کو صرف پانچ چھ گنیوں پر ٹرخا دیتا ہے اور باقی خود ہضم کر جاتا ہے"۔ احمدی کی اس بات کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔ اور یقیناً امیر الحج کے اس مہمان نوازانہ طرزِ عمل کے بعد غریب بدوؤں سے یہ توقع رکھنا عبث ہی ہوگا کہ وہ اپنی روایات مہمان نوازی کو برقرار رکھنے کے لیے اس موقع پر سال بھر کا آذوقہ جمع کرنے کی فکر سے باز رہیں گے۔

بالآخر ظہر کے بعد قافلہ روانہ ہوا۔ مغرب کے وقت بیر الروحہ پر نماز کے لیے قافلہ رکا تو چار پانچ گھنٹے وہیں رکا رہا۔ معلوم ہوا کہ کچھ بدوی قبائل نے یہاں بھی روک لیا ہے۔ قافلہ چل رہا ہو تو شب کے وقت شغدف میں پڑے رہنے کے سوا چارہ نہیں مگر قافلہ رکا ہوا تھا اسلیے شغدف میں پڑا رہنا کسی طرح گوارا نہ ہوا۔ میں کچھ دور تک ٹہلتا ہوا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک مقام پر قہوہ اور چائے کی چند دوکانیں لگی ہوئی ہیں۔ ایک جمال کو ہمراہ لیکر میں بھی وہاں پہونچا اور اسکے ساتھ بیٹھ کر چائے پی۔ عشاء پڑھ کر پھر شغدف میں سوار ہو گیا۔ اور جب قافلہ چلا تو نیند آ گئی۔

۱۷۔ جون روز یکشنبہ | صبح کو قافلہ پھر ایک مقام پر رکا جس کا نام غالباً عار بتایا گیا۔ یہاں دو طرفہ

چارپائیاں تھیں ان پر سے برابر بندوقوں کے چھوٹنے کی آوازیں آتی تھیں۔ بعد کو پتہ چلا کہ سوا مجیدی کا مطالبہ ہے۔ مجبوراً یہ رقم بھی ادا کی گئی۔ تب قافلہ روانہ ہوا اور دوپہر کے قریب سویقہ میں قیام ہوا۔ یہاں کا پانی اس قدر کھاری تھا کہ دال چاول کا گلنا بھی مشکل نظر آیا۔ ہم لوگ بازار سے ہٹ کر ایک کنوئیں کے قریب ٹھہرے تھے۔ بقیہ قافلہ بازار کے قرب میں اور ہم سے کسی قدر فاصلہ پر تھا۔ ایک کنواں اُس مقام پر بھی تھا۔ یہاں ککڑیاں بہت بکنے آئیں جنکو بڑے شوق سے سب لوگوں نے خریدا۔ رات بہت ٹھنڈی ہوئی۔ سردی کی وجہ سے اس قدر چھینٹے نکل آئے کہ نصف شب کے بعد سونا دشوار ہوگیا۔ آخر پریشان ہو کر شغدفوں کے اندر پناہ لی۔

۱۸۔جون روز دوشنبہ سویرے ہی سے روانگی کا اہتمام ہوا۔ عجلت میں صرف چاول پکائے اور شکر یا پیاز کے ساتھ کھائے گئے۔ ایک مجیدی آج اور طلب کی گئی تھی مگر مطوفین نے نہیں دلائی بلکہ قافلہ کو چاک سے لیجانا پسند کیا۔ ظہر پڑھ کر سوار ہوئے۔ عصر کے بعد ایک جگہ ایک پتھر نظر پڑا جس پر اُس خط میں کچھ عبارت منقوش دیکھی جو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ جات سے مشابہ تھی۔ بے اختیار جی چاہا کہ قافلہ روک کر یہاں قیام کیا جائے اور اس تحریر کو کسی سے پڑھوا کر دیکھا جائے شاید یہ کوئی اہم آثار ثابت ہو۔ مگر قافلہ کا روکنا بس کی بات نہ تھی۔ مغرب کے قریب جب ٹھنڈا ہوگیا تو جی چاہا کہ قمری مہینہ کی ابتدا ہے آج کچھ دیر شب ماہ میں اونٹ کی کھلی پیٹھ پر سوار ہونا چاہیے۔ لہذا نماز مغرب سے فارغ ہو کر جمال کو اپنی جگہ شغدف میں بٹھایا اور اسکے کوتل اونٹ پر تقریباً ایک گھنٹہ تک بیٹھا رہا۔ مگر اتنی ہی دیر میں ہچکولوں نے خستہ کر دیا۔ اس منزل پر اگرچہ تمام تر پتھریلی اور ناہموار زمین سے سابقہ رہا مگر مغرب کے بعد ہی پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوگئی تھی اور عشاء کے وقت سے تو ایک نہایت ہی دشوار گذار گھاٹی میں چل رہے تھے۔ پہاڑی زیادہ بلند نہ تھی مگر راستہ نہایت ناہموار تھا جسکی وجہ سے اکثر اونٹ چلتے چلتے اگلے گھٹنوں کے بل گر پڑتے۔ الحمد للہ کہ مجھے اس قسم کی کوئی افتاد نہیں پڑی لیکن جب تک پہاڑی کے اوپر نہیں پہونچ گئے، ایک منٹ کے لیے بھی چین سے بیٹھنا نہیں نصیب ہوا۔ نصف شب کے بعد پہاڑی راستہ تمام ہوا اور مسطح میدان آگیا۔ جہاں پہونچکر دفعۃً خنکی بڑھ گئی۔

چھٹی منزل

علی الصباح جو آنکھ کھلی تو ہوائے سر چل رہی تھی۔ گویا بارگاہ رحمۃ للعالمین کی طرف سے زائرین مدینہ منورہ کو خوش آمدید کہنے کے لئے نسیم سحر مقرر ہوئی تھی۔ جیسے جیسے اجالا ہوتا جاتا تھا، گنبد خضرا کے نظارہ کی امیدیں مبدل بہ اشتیاق ہوتی جاتی تھیں۔ آہ انتظار کی اس گھڑی کا سماں دکھانا اور اس کا نقشہ کھینچنا امکان میں نہیں ہے جب ہر چند ساعت کے بعد زیارت روضۂ اطہر کی تمنا میں آنکھیں بار بار حد نظر کی طرف دوڑائی جاتیں اور پھر اس خیال سے دل بیتاب کو تسلی دی جاتی کہ ابھی فاصلہ بہت ہے۔ یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا۔ آفتاب ہر روز نکلتا تھا اور نہایت آب و تاب سے چمکتا تھا۔ مگر اُسکی نمود کا جیسا انتظار آج کیا گیا اور اُسکی روشنی کا جس طرح آج استقبال کیا گیا یہ بالکل نئی بات تھی۔ اب ہر اُس شے پر جو دور سے نظر کے مقابل آجاتی گمان ہونے لگتا کہ گوہر مراد یہی ہے اور جب وہ شے قریب آجاتی اور معلوم ہوتا کہ کوئی درخت ٹیکری یا پتھروں کا ڈھیر ہے تو مایوس نہ ہونے والی آنکھیں پھر کسی دوسری شے پر نگاہ اُمید جما دیتیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ اسی حالت میں گذر گیا۔ بالآخر دور سے مسجد شریف کے میناروں کی زیارت نصیب ہوئی۔ اور میں شغدف سے کود کر درود شریف اور دیگر ادعیہ پڑھتا ہوا پا برہنہ شغدف کے قریب قریب گنبد خضرا کی تمنائے زیارت میں سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے چلتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد یہ دیرینہ آرزو بھی پوری ہوگئی۔ میں نے توقف کرکے ضروری دعائیں پڑھیں اور پھر روانہ ہوا۔ مکہ معظمہ کے قریب جس قسم کی پہاڑیاں ہیں بعینہ ویسا ہی پُرپیچ و خم یہ بقیہ راستہ نظر آیا کہ ہر موڑ کے بعد خیال ہوتا تھا کہ اب مدینۃ الرسول کی زیارت نصیب ہوگی۔ ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ کم عرصہ تک چلنے کے بعد جب ایک مقام پر ریل کی پٹری عبور کی تو معلوم ہوا کہ اب منزل مقصود بالکل قریب ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد باغیچوں اور اجڑی ہوئی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور کہیں کہیں عبا پوش انسان بھی ملنے لگے۔ آگے بڑھے تو ان عبا پوش اصحاب کا ایک معقول مجمع نظر آیا۔ جنہوں نے نہایت خندہ پیشانی

اور خوش خلقی سے استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب مزوروں کے کارکن ہیں۔ سلام ومصافحہ کے بعد اپنے مزور صاحب کو دریافت کیا تو ایک صاحب نے اپنے تئیں اُن کا کارندہ بتایا۔ دوپہر کے قریب مدینہ منورہ کی فصیل سے ملحق ایک میدان میں جسکو مناخہ کہتے ہیں شقدف اُتارا گیا۔ اور مجھے یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ میر عبدالعزیز صاحب اور ہمارے دوسرے ساتھیوں کے اونٹ ہمراہ نہیں ہیں۔ پہلے تو کچھ دور تک میں نے اُنکو تلاش کیا مگر جب اُن کا پتہ نہ چلا تو میں نے اپنا شقدف مع سامان کے وہیں جمال کے پاس چھوڑا۔ اور اُن صاحب کے ہمراہ مولوی عبدالباقی صاحب فرنگی محلی سے جا کر ملا۔ جنھوں نے نہایت شفقت وکرم سے میرا استقبال کیا۔ اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو اپنے مکان میں ٹھہرانے کا وعدہ فرمایا۔ مناخہ واپس آکر اپنا سامان اُٹھوا لایا۔ اور غسل کرکے مسجد نبوی میں حاضر ہوا۔ نماز ظہر کا وقت تھا اس لیے پہلے نماز ادا کی پھر روضۂ اقدس پر حاضری سے مشرف ہوا۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ۔ اس وقت کی شادمانی وانبساط کا بیان ناممکن ہے۔ میں اپنی خوش بختی پر باغ باغ تھا اور رواں رواں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے اس لطف عمیم پر شکرگزار کہ مجھ جیسے فاسق وفاجر کو دربار رسالت میں جبہ سائی کا افتخار بخشا گیا۔

حضورؐ کا روضۂ اطہر مسجد نبوی کے اندر شمالی ومشرقی کونے پر واقع ہے۔ نماز کے بعد مزور صاحب کے عامل نے مجھے اور دیگر زائرین کو پہلے کچھ فاصلہ پر قبلہ رُخ کھڑا کیا اور ایک دعا پڑھی۔ سب لوگ اُس کی تکرار آہستہ یا باآواز کہتے رہے۔ بعدازاں رُخ بدل کر روضۂ اطہر کی جانب متوجہ ہوئے اور بارگاہ والا میں سلام پڑھا۔ سلام پڑھ کر روضۂ اطہر کی جالی کے قریب حاضر ہوئے جس میں تین گول سوراخ اس اندازہ سے رکھے گئے ہیں کہ روضۂ اطہر کے غلاف پر جہاں سنہرے حروف میں حضور انورؐ کا اسم گرامی منقوش ہے ایک سوراخ اس مقام کے مقابل ہے اور بقیہ دو سوراخ ذرا ہٹ کر حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اسمائے گرامی کے مقابل واقع ہیں۔ اکثر لوگ ان سوراخوں کے اندر ہاتھ ڈال کر مصافحہ کرتے ہیں۔ اسوقت ہجوم بہت تھا۔ کیونکہ قافلہ کی تمام ٹکڑیاں اپنے اپنے مزورین کے ہمراہ سلام خوانی وزیارت کے لیے جمع تھیں۔ آستانۂ عالی پر صرف چند ساعت کے لیے قیام ہو سکتا تھا۔ لہٰذا جلدی جلدی لوگوں نے مصافحہ کیا، درود وسلام پڑھا یا دعائیں مانگیں اور گھوم کر شمالی جانب گئے جہاں دیوار پر ایک روشندان ہے جس کی راہ سے بتایا گیا کہ جبرئیل امین علیہ السلام

حجرۂ عائشہؓ یا مسجد نبوی میں حاضر ہو کر وحی سناتے تھے۔ یہاں بھی ایک دعا پڑھوائی گئی۔ پھر پائین روضۂ مبارک کی طرف بڑھے اور ایک دوسری جالی کے قریب کھڑے ہو کر جسکے اندر ملگجا گوشۂ رسولؐ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مزار بتایا گیا، سلام پڑھا۔ حضرت فاطمۂ زہراءؓ کی جائے دفن کے متعلق ارباب سیر میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ جنۃ البقیع میں قبۂ اہلبیت کے نیچے آپ دفن کی گئیں تھیں اور بعض کے نزدیک حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے پائین روضہ آپ دفن ہوئیں۔ اس اختلاف کا نتیجہ ہے کہ دونوں جگہ آپ کے نشانات مزار بنے ہوئے ہیں جہاں زائرین حاضر ہو کر نذر عقیدت پیش کرتے ہیں۔ صحن مسجد میں حضرت فاطمہؓ کی کیاری بنی ہوئی ہے اور اُسی سے ملحق ایک کنواں ہے جسکے پانی کو آب کوثر کا لقب ملا ہے۔

مزور صاحب کے عامل سید زین العابدین نے ہم لوگوں کو ہدایت کی تھی کہ عشاء کے سوا جملہ نمازوں کے بعد وہ یا اُنکا کوئی مددگار روضۂ اطہر کے قریب سلام پڑھوانے کے لیے موجود رہے گا۔ اس لیے سب لوگ نماز پڑھ کر یکجا ہو جاتے اور سلام پڑھتے۔ مجھے لکھنؤ سے روانگی کے وقت ہدایت ہوئی تھی کہ روضۂ اطہر کے قرب میں مودب رہوں اور باواز بلند صلوٰۃ و سلام نہ پڑھوں، مگر جو طریقہ یہاں رائج ہے وہ اسکے بالکل منافی تھا۔ لیکہ نماز کے بعد جب زائرین کی مختلف ٹکڑیاں جمع ہوتی تھیں تو ان کے صلوٰۃ و سلام سے مسجد گونج اُٹھتی تھی۔ بہرحال میں حتی المقدور اہتمام کے ساتھ اس ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ البتہ ہجوم کی وجہ سے مجھے کسی قدر وحشت ہوتی تھی اور میں قافلہ کی واپسی کا بیصبری سے انتظار کر رہا تھا کہ سکون کے ساتھ روضہ اطہر پر حاضری سے سعادت اندوز ہو سکوں۔ عصر کے بعد پھر مناخہ گیا۔ میر عبدالعزیز صاحب معہ دیگر ہمراہیوں کے اُسی وقت پہونچے اور اپنا سامان وغیرہ دیکھ بھال رہے تھے۔ میں سب کو ہمراہ لے آیا۔ اور نماز مغرب کے بعد مولوی سید احمد صاحب ایجنٹ علی جان کمپنی سے ملا اور حوالہ کا کاغذ دکھا کر روپیہ لیا۔

دوسرے روز جنۃ البقیع میں حاضر ہو کر سب ہمراہیوں کے ساتھ بزرگوں کے مزارات پر فاتحہ پڑھا۔ تیسرے دن سب ساتھیوں نے طے کیا تھا کہ سید زین العابدین کی معیت میں جبل احد پر جا کر سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار مبارک پر فاتحہ پڑھیں گے مگر میں نہ جا سکا۔ ساتھیوں کی واپسی سے قبل میں ڈاکخانہ گیا اور وہاں سے خطوط لایا۔ اور چونکہ یہ معلوم ہوا تھا کہ اُسی روز ڈاک

جانے والی ہے اس لیے جلدی جلدی وطن کے خطوط لکھے اور عصر سے پہلے پوسٹ (ڈاک خانہ) کے حوالہ کیے۔ منگل کو قافلہ پہونچا اور منیجر کو واپسی کی اطلاع دی گئی تھی۔ میں چونکہ پہلے ہی سے یہ سوچ کر آیا تھا کہ اس قافلہ کا ساتھ چھوڑ دوں گا اور مدینہ منورہ میں اُس وقت تک حاضر رہوں گا کہ حج کے لیے وہاں سے آخری قافلہ روانہ ہو۔ اس لیے بے فکر تھا۔ مگر احباب اور ساتھیوں کو واپس جانا تھا اس لیے وہ لوگ جلد جلد زیارتوں سے فراغت کرکے تبرکات اور سفر کے لیے اشیا خوردنی وغیرہ کی خریداری میں مصروف تھے۔ جمعہ کو بعد نماز مغرب جنۃ البقیع میں فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا۔ عم مکرم منشی اطہر علی صاحب مرحوم و مغفور کی قبر یہیں ہے۔ پہلی بار چونکہ نشان دریافت نہیں کیا تھا اس لیے باوجود تلاش نہ ملی۔ اب کی مولوی عبدالباقی صاحب سے پوچھ کر آیا تو ملی کہ قبۂ اہلبیت کے بالکل پشت پر واقع ہے۔ وہاں فاتحہ پڑھ کر کچھ دیر قبر کو دیکھتا رہا۔ قبر کی مرمت اور کتبہ میں سیاہی بھرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پہلے چاہا کہ میں خود اس کا انتظام کر دوں پھر یہ سوچ کر رُک گیا کہ مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے عزیز از جان انور علی سلمہٗ بھی بعد ادائے حج یہاں پہونچیں گے اس خدمت کے وہی زیادہ مستحق ہیں۔

قافلہ کی واپسی کا وقت قریب آیا تو ہمارے معلم، ترجمان اور جمال سب کی خواہش پر میں نے ایک تحریر اپنے معلم کے نام اس مضمون کی لکھدی کہ ان اصحاب کے طرزِ عمل سے شاکی ہونے کی وجہ نہیں بلکہ میں نے برضا و رغبت اپنا اونٹ چھوڑ دیا ہے اور شغدف رکھ لیا ہے جو بعد واپسی مکہ معظمہ میں داخل کر دیا جائے گا۔ تمام ساتھی صبح کو ناشتہ روانہ ہو گئے تھے میں بعد عصر وہاں اس غرض سے گیا کہ قافلہ روانہ ہو گیا ہوگا اپنا شغدف مکان پر اُٹھوا لاؤں۔ مگر شغدف نہ ملا جس کی اطلاع سید زین العابدین کو کر دی۔ اُنھوں نے اطمینان دلایا کہ شغدف مل جائے گا۔

جب تک قافلہ اور ہمراہی موجود رہے مسجد نبوی میں ہجوم کی وجہ سے اطمینان کی حاضری نہ ہو سکی اور ہمراہیوں کی وجہ سے مدینۂ منورہ کے مقیم اصحاب میں سے سوا مولوی سید احمد صاحب اور حافظ شبراتی صاحب کے کسی سے نہ مل سکا۔ مولوی صاحب تو گویا زائرین کے لیے بمنزلہ بنک کے ہیں اس لیے اُن سے ملے بغیر چارہ نہ تھا۔ حافظ صاحب قدیم تعلقات کی بنا پر پہلے ہی روز آ کر ملے اور روز ملتے رہتے۔

قافلہ جا چکا تو حافظ شبراتی صاحب کی وساطت سے مولوی ضیاء الدین سیالکوٹی سے نیاز حاصل ہوا جو مسجد نبوی کے قریب ہی ایک رباط میں مقیم ہیں۔ رباط سے مراد وہ موقوفہ مکانات ہیں جو صاحبانِ خیر کی طرف سے ساکین، مسافرین اور درویشوں کے لیے بنا دیئے گئے ہیں۔ مولوی ضیاء الدین صاحب ایک نوعمر بزرگ ہیں جو وطن سے ہجرت کر کے یہاں مقیم ہیں۔ ہندوستان کے حالات سے آپ کی دلچسپی کم نہیں ہوئی ہے اور اخبارات وغیرہ کے ذریعہ سے جملہ ممالک اسلامیہ کے حالات سے آپ باخبر ہیں اس لیے آپ سے مل کر میں بہت محظوظ ہوا۔ دوسرے روز مولوی عبد الباقی صاحب کے ہمراہ حضرت شیخ احمد شمس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شیخ کی عظمت و بزرگی بہت مشہور ہے۔ مدینہ منورہ میں آپ سے زائد کسی شخص کی عظمت نہیں کی جاتی حتیٰ کہ عہد ترکیہ سے والی مدینہ کے سوا صرف آپ ہی کو اس بات کا شرف حاصل ہے کہ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کی جالی کھلوا کر روضۂ اطہر کے قریب حاضر ہو سکتے ہیں۔ تمام عرب اور بدوی قبائل آپ کا اس درجہ احترام کرتے ہیں کہ جب آپ اپنے مختصر قافلہ کے ساتھ حج کرنے کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو راہ میں کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہوتا بلکہ آپ کا قافلہ پانچوں وقت نماز با جماعت ادا کرنے کے لیے راہ میں ٹھہرتا ہے۔ نیز یہ کہ عام راستوں کے علاوہ آپ کا قافلہ جس راستہ سے جانا چاہے جاتا ہے۔

حضرت شمس مغربی الاصل ہیں اور شاذلی (قادری) سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کی عمر اسّی برس کے قریب ہوگی اور ضعف اتنا ہو گیا ہے کہ آپ کا مکان اگرچہ مسجد نبوی سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے مگر سوائے جمعہ کے آپ عام طور پر کسی روز مسجد نبوی میں حاضر نہیں ہوتے۔ مجھے آپ کی زیارت کا بھی اشتیاق تھا اور چونکہ آپ کی ہمرکابی میں مکہ معظمہ واپس جانا چاہتا تھا اس لیے اسکی اجازت بھی حاصل کرنا تھی۔

میں ہندوستان میں بھی بعض بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں مگر حضرت شمس کے حُسنِ اخلاق سے بہت متاثر ہوا۔ آپ مکان کے اندر تشریف رکھتے تھے۔ صدر دروازہ پر اطلاع کرنے کے بعد ایک خادمہ نے ہم لوگوں کو اندر لیجا کر مجلس میں بٹھایا اور کہا کہ شیخ تشریف لاتے ہیں۔ چند لمحوں میں شیخ تشریف لائے تو چلتے نہایت تپاک سے مصافحہ فرمایا اور مزاج پرسی فرمائی۔ اسکے بعد ایک چھینکہ پر سے کھجوریں اتارے اور باصرار کھلائے گئے۔ پھر چائے پلائی گئی۔ اور جب اثنائے گفتگو میں مولوی

عبدالباقی صاحب نے میرا تعارف کرایا تو یہ سن کر بہت مسرت کا اظہار فرمایا کہ میں حضرت محمد بن حنفیہ کی اولاد میں سے ہوں۔ اور میری اس درخواست پر کہ مجھے ہمرکابی کی عزت بخشی جائے نہ صرف بخوشی اسے منظور فرمایا بلکہ وعدہ فرمایا کہ جب قصد روانگی ہوگا تو آپ کو اطلاع دیدی جائیگی۔ حضرت شیخ کے نصف چہرہ پر ایک سفید رومال پڑا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کی گفتگو جو یوں ہی آہستہ ہوتی ہے بمشکل سمجھ میں آتی ہے۔ اثنائے گفتگو میں میں نے عرض کیا کہ آپ میری ہندوستانی نہیں سمجھتے اور میں آپ کی عربی نہیں سمجھتا البتہ لسان قلب سے اگر گفتگو ہو تو یہ دشواری رفع ہو جائے۔ اس جملے سے بہت محظوظ ہوئے اور دیر تک مختلف امور کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ رخصت حاصل کرتے وقت میں نے پھر حاضری کی اجازت چاہی اور اندیشہ ظاہر کیا کہ اوقات میں حرج ہوگا تو بڑی خندہ پیشانی سے فرمایا کہ نہیں جب چاہو بے تکلف آؤ۔ چنانچہ اسکے بعد ایک بار تنہا اور ایکبار مولوی ضیاءالدین صاحب کے ہمراہ حاضری کی نوبت آئی اور ہر دفعہ نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ چلتے وقت دروازہ تک پہونچانے آتے۔

میرے ساتھی میر عبدالعزیز صاحب قنوج میں عطر کا بیوپار کرتے ہیں۔ وہ بہت سی شیشیاں اپنے ہمراہ لائے تھے اور چلتے وقت میرے سپرد کر گئے تھے کہ کچھ روضۂ اطہر پر اور مسجد نبوی میں خاص خاص مقامات پر صرف کی جائیں اور بقیہ تقسیم کردی جائیں۔ میر صاحب نے اُنکی جانب سے جہاں اور بزرگوں کو دیں وہاں دو شیشیاں حضرت شمس کی خدمت میں بھی پیش کیں۔ خوش ہو کر قبول فرمائیں اور دیر تک مجھے اور میر صاحب کو دعائیں دیتے رہے۔

قافلہ کی روانگی کے بعد مسجد نبوی میں ہجوم کم ہو گیا۔ صرف نماز کے اوقات میں مجمع ہو جاتا تھا۔ اس لیے مجھ کو اب اطمینان سے نماز کے بعد ٹھہر کر تلاوت کرنے اور درود شریف پڑھنے کا موقعہ ملا۔ نیز سید زین العابدین کی وساطت سے خوجوں کے سردار سے اس بات کی بھی اجازت حاصل ہو گئی کہ رات کو بھی مسجد نبوی میں حاضر رہ سکوں نماز عشاء کے بعد ہی حرم نبوی کے دروازے بند کر لیے جاتے ہیں اور جن چند آدمیوں کو رات کی حاضری کی اجازت ہوتی ہے اُنکے سوا کوئی رہنے نہیں پاتا۔ ایسے تمام لوگ سنگین کٹہرے کے پیچھے جمع ہو جاتے ہیں جو منبر شریف سے تھوڑے فاصلہ پر قد آدم بلند بنا ہوا ہے۔ ہمارے قافلہ میں جنوبی امریکہ کے ایک میمن تاجر بھی تھے جنہوں نے زر کثیر صرف کرکے اپنے اور اپنے

ساتھیوں کے اونٹ مدینہ منورہ میں روک لیے تھے۔ انھیں میں حکیم محمد قاسم سورتی بھی تھے جنھوں نے
ازراہ ہمدردی اسلامی تراوہ میں رحمت شاہ کا علاج کیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں مجھے اُن کی خدمت
میں نیاز حاصل ہوگیا تھا۔ شب دوشنبہ کو جب میں نے پہلی بار حرم نبوی میں حاضری شبانہ
کا ارادہ کیا اور نماز عشا کے بعد حسب ہدایت کبہ کے نیچے جا کر بیٹھ گیا تو دو سیٹھ مع حکیم صاحب اور
چند دیگر رفقا کے وہیں نظر آئے۔ اِنکے علاوہ ایک بدوی عرب بھی تھا۔ غرضکہ ہم سب نصف
درجن آدمی تھے۔ مسجد نبوی کے دروازے بند ہوگئے تو ایک خواجہ صاحب نے مجھے اپنے ہمراہ لیجا کر
حرم شریف کے مغربی دروازے متصل وضوخانہ اور استنجے خانہ دکھایا۔ اس اثنا میں اکثر جگہ
سے روشنی رخصت ہوئی تھی صرف کہیں کہیں ایک ایک بتی رہ گئی تھی۔ روضہ مطہر کے اندر بھی
صرف چند موم بتیاں رہ گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سب خواجے بھی چلے گئے جن میں سے بعض
صحن مسجد میں بستر بچھا کر لیٹ رہے۔ صرف دو ایک جو مشغول عبادت تھے رہ گئے۔ اب حرم نبوی
میں کامل سکون ہوگیا۔ جس کے ہم غلامان رسول مشتاق تھے اور ہم میں سے ہر ایک نے اپنے
اپنے خیال کے مطابق بارگاہ رسالت پناہی کے قریب کوئی گوشہ منتخب کر لیا۔ کہ یہی ہماری کامرانیوں
اور دلی مرادوں کا منتہا معراج تھا۔ دوسروں کا حال مجھے کیا معلوم مگر میں اپنے متعلق کہہ سکتا
ہوں کہ زندگی کی وہ تمام ساعتیں جو کسی قسم کی مسرت وانبساط میں گزری ہوں اس رات کے
مقابلہ میں بے تکلف قربان کر دی جاسکتی تھیں۔ اور میں حیران تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا
کیسے شکریہ ادا کروں کہ مجھ جیسے فاسق و فاجر کو بارگاہ رسالت پناہی میں یہ سرافرازی نصیب ہوئی۔
شب کا حصہ وافر اسی عالم سکون میں بسر ہوا۔ اور غلس کے وقت حرم نبوی کا دروازہ
کھلتے ہی جب نمازیوں کی آمد شروع ہوگئی تو میں بائیں جانب کے دالان میں جا کر تھوڑے وقفہ کے
لیے لیٹ رہا۔ اور نماز فجر ادا کر کے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتا ہوا اپنے مقام پر واپس آیا۔

مکہ معظمہ کی طرح مدینہ منورہ کے لیے بھی میرے پاس کچھ امانت اور خیرات کی رقوم تھیں۔ امانت کو
بحفاظت پہونچا دینے میں تو بحمداللہ جلد کامیابی ہوگئی مگر تقسیم خیرات کا کام بہت دشوار ثابت ہوا۔ مکہ معظمہ
میں بھی رقوم کے تقسیم ہوجانے کے بعد میرا دل مطمئن نہیں ہوا تھا اور یہاں جب اسی طریقہ پر ابتدا کی گئی تو
میں برداشت نہ کر سکا اور میں نے تہیہ کیا کہ بقیہ چیزیں اور رقمیں خود مستحقین کو تلاش کر کے پہونچاؤں اس

غرض کے لیے مدینہ منورہ کے فقرا و مساکین تک پہونچنے میں میرا بہت سا وقت صرف ہوا جس کی وجہ سے مسجد نبوی میں خلافِ اوقاتِ نماز زیادہ وقت تک حاضری سے محروم رہا۔ قافلہ کی واپسی کے بعد سے تقریباً ہر روز صبح کو ظہر سے قبل تک اور کبھی کبھی سہ پہر یا رات کو بھی فقرا و مساکین کی تلاش میں وقت گزرتا۔

ایک روز نمازِ ظہر کے بعد سید زین العابدین صاحب مجھے اور میرے تاجر کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں کو حرم شریف سے باہر لائے اور شہدائے عثمانؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مکان، دیارِ حضرت حمزہؓ، حضرت عبداللہ (حضورؐ کے پدرِ محترم) اور حضرت مالک ابن سنان علیہم اور غزوۂ اُحد کے مزارات کی زیارت کرائی۔

عشاء کے بعد ایک دفعہ حرم نبوی سے گھر جا رہا تھا۔ طبیعت پر کسی قدر حزن طاری تھا۔ راہ میں ایک درویش صورت شخص سے ملاقات ہوئی جو حرم شریف میں پانچوں وقت نماز ادا کرنے آتے تھے۔ میں نے اپنی قلبی کیفیت کا اُن سے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں ذکر کیا۔ پہلے وہ سمجھے نہیں بلکہ ایک مسافر خیال کر کے اپنے گھر لیجانے اور کھانا کھلانے پر آمادہ ہوئے۔ جب مزید گفتگو سے اُنھیں معلوم ہوا کہ طالبِ دنیا نہیں ہوں تو دوسری طرح پیش آنے۔ گھر ساتھ لے گئے۔ اور باوجودیکہ کھانا کھائے ہوئے تھا، باصرار دودھ اور نان خطائیوں سے میری ضیافت کی اور دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ اُن کا نام شیخ حسین ہے، فرقہ شاذلیہ (تامسری) سے تعلق رکھتے ہیں اور رباط (مراکش) کے رہنے والے ہیں۔ جب میں گھر جانے کے لیے رخصت ہوا تو میری استدعا والتجا کے باوجود ہمراہ تشریف لائے اور میرے گھر کے قریب تک پہونچا گئے۔ سبحان اللہ کیا اخلاق ہیں۔

دوسرے دن سید زین العابدین صاحب کی معیت میں مسجد قبا کی زیارت کرنے گیا۔ ایک درجن سے زیادہ عورتیں اور مرد ساتھ تھے۔ مسجد قبا شہر سے باہر تقریباً ڈھائی کوس کے فاصلہ پر ہے۔ اور چونکہ راہ غیر محفوظ ہے اسلیے حکومت کی طرف سے گاڑیوں کے ہمراہ مسلح بدو ساتھ گئے تھے۔ مسجد قبا کی زیارت کے بعد مسجد سیدنا عمرؓ، سیدنا علیؓ و سیدنا ابوبکرؓ اور حضرت فاطمہ زہراؓ کی چکی کی زیارت کی اور وہاں سے ہر خاتم پر آکر پانی پیا جس میں حضورؐ کی انگشتری مبارک گر گئی تھی۔ واپسی میں شہر کے اندر سیدنا عمرؓ، حضرت بلالؓ اور سیدنا ابوبکرؓ کی مسجدوں کی زیارت کی۔ سیدنا علیؓ کی مسجد بند تھی اسلیے باہر ہی سے زیارت کر لی گئی۔ زیارات کے موقعوں پر ہر جگہ سید زین العابدین صاحب کچھ دعائیں عربی زبان میں باوازِ بلند پڑھتے تھے اور سب لوگ اُن الفاظ کی تا بامکان تکرار کرتے جاتے تھے۔ مسجد قبا میں نماز پڑھنے کا خاص ثواب ہے اسلیے وہاں تو جتنی دیر قیام ہوا میں نوافل پڑھتا رہا باقی اور سب مقامات پر بھی کم سے کم دو رکعت نفل ضرور پڑھ لی۔

مسجد قبا کا راستہ ناہموار تھا۔ بزرگوں کی گاڑیوں پر ہم لوگ گئے تھے ان میں کمانیاں نہ تھیں۔ اسلیے آمدورفت کی مسافت زیادہ نہ ہونے کے باوجود تکلیف اور تھکن بہت ہوئی۔ بعد ادائے نماز ظہر حسب وعدہ شیخ حسین ناصری کے یہاں حاضر ہوا۔ فوراً قہوے سے ضیافت کی اور تقریباً دو گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے۔ اور چلتے وقت میرے حزن کو دفع کرنے کی ترکیب بتائی۔

آج ایک بہار کے رہنے والے نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام عبدالرسول ہے۔ اور یہ جنگ بلقان کے زمانہ میں ڈاکٹر انصاری صاحب جو طبی مشن لیکر گئے تھے اسکے ایک رکن تھے۔ اب ہجرت کرکے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور طبابت کرتے ہیں۔ ان سے دیر تک عام حالات پر تبادلہ خیال ہوا۔ رات حرم شریف میں بسر ہوئی۔ الحمد للہ

چونکہ زیارت حرمین شریفین کے سلسلہ میں مجھے اسکی فکر بھی تھی کہ مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ میں بقیہ عمر گذارنے کی صورت پیدا ہو اسلیے مدینہ منورہ میں جن حضرات سے موقع ملتا اس بارہ میں گفتگو کی جاتی۔ مہاجرین میں سے جو اصحاب متوکلین میں ہیں اور حصول معاش کے لیے کوئی کام نہیں کرتے انکی تابعیت ایک دنیا کے کتے سے نہیں ہو سکتی۔ اسلیے ایسے اصحاب کے مشورہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جو وہاں کسی قسم کا کاروبار کرتے ہیں۔
مولوی سید احمد صاحب سے تو تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ مگر جب تک مہمانوں کا ہجوم رہا اس بارہ میں گفتگو کا موقع نہ ملا۔ اب انکو فرصت تھی تو صبح ہی کو میں انکے یہاں حاضر ہوا اور دیر تک اس بارہ میں بات چیت ہوئی۔ وہ خود متعدد قسم کی تجارتوں میں مشغول ہیں اور کافی تجربہ یہاں کی زندگی کا رکھتے ہیں۔ اسلیے ان کی رایوں سے مجھے بہت مدد ملی۔

ظہر کے بعد شیخ حسین ناصری کے یہاں حاضر ہوا۔ پہلے انہوں نے گرم گرم کبابوں اور عمدہ مکی روٹی سے ضیافت کی۔ پھر دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ اور اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ رات کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں ہوئی تو منہ چھپائے ہوئے تھے اسلیے کچھ عرض نہ کر سکا۔ یہ گویا میرے حزن کے رفع نہ ہو سکنے کی طرف اشارہ تھا۔

حافظ شبراتی صاحب سے روزانہ کئی کئی دفعہ ملاقات ہوتی اور جب ضرورت پڑتی تو وہ میرے ساتھ ہی اپنا وقت گذارتے۔ ان کا قیام میاں مظہر کی رباط میں ہے۔ میاں مظہر صاحب حضرت مجدد سرہندی کی اولاد میں ایک بزرگ کامل گزرے ہیں جن کا مدینہ منورہ میں غیر معمولی ادب و احترام کیا جاتا تھا۔ جو رباط انہیں کی بنائی

وتی ہے اور اب اُنکے صاحبزادہ میاں احمد کے زیرِ اہتمام ہے۔ حافظ شیرازی صاحب نے از راہِ محبت میری
دعوت فرمائی۔ اکیلا، پہلے انکی ہمراہی میں اُن کا جائے قیام دیکھ گیا تھا۔ اب دعوت کھانے اپنے میزبان
جناب مولوی عبدالباقی صاحب کے ہمراہ گیا۔ اور وہاں دیر تک ٹھہرا اور رباط کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا یہ مربع
ان قطع کی دو منزلہ عمارت ہے جس میں چاروں طرف برآمدہ کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمرے ٹھہرنے والوں کے
لیے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں طلبا و مہاجرین رہتے ہیں۔ مکان کے ایک قطعہ میں خود میاں احمد صاحب کے
اہل و عیال رہتے ہیں۔ صاحب موصوف کے دو بیبیاں ہیں۔ ایک رباط میں رہتی ہیں اور دوسری حرم
نبوی کے قریب ایک مکان میں۔ اس رباط کے رہنے والوں کو آپ کے حلقہ میں بھی حاضری دینا ہوتی ہے۔ میرا
خیال تھا کہ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے بزرگ عموماً اور حضرات مجددین خصوصاً پیرزادگی کے عام طریقوں پر عمل پیرا
نہیں ہوتے مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ خواص اور صاحبانِ دل تو مزہر ان باتوں سے بچتے ہیں ورنہ عام طور پر
اُن میں بھی وہی سب کمزوریاں موجود ہیں جو دیگر سلاسل و طرق میں پائی جاتی ہیں۔

میاں احمد صاحب اُسوقت موجود نہیں تھے اس لیے اُنکی قدمبوسی کا شرف حاصل نہ ہوا۔ بلکہ ان سے
ملنے کے لیے ایک دن اُنکے بازار والے مکان پر حاضر ہونا پڑا۔

آج خبر ملی کہ ڈاک آئی ہے۔ ڈاک خانہ گیا تو معلوم ہوا کہ ڈاک بازار میں تقسیم ہونے کو دی گئی ہے۔
رباط مظہری میں ایک طالب علم یسین نامی رہتے ہیں جو مولوی عبدالباقی صاحب سے پڑھتے ہیں اور ہر روز سب کے
خطوط لا دیا کرتے تھے۔ انکی زبانی معلوم ہوا ایک ہندوستانی عبدالرزاق نامی ہیں جو ڈاکخانہ سے خطوط لاکر
تقسیم کرتے ہیں۔ انکی تلاش میں کئی بار گیا۔ شام کو اُن سے ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے کہا کہ دوسرے روز
ڈاک دیکھکر بتائیں گے۔

رات مسجد نبوی ہی میں بسر ہوئی۔ آج شب جمعہ تھی اس لیے حرم شریف میں حاضر رہنے والوں کی
تعداد میں کچھ اضافہ ہوا اور ایک بخاری بزرگ سے جن کا اسم شریف محی الدین اور طریقہ نقشبندیہ تھا۔
ملاقات ہوئی۔ چونکہ فارسی میں گفتگو ہوسکتی تھی اس لیے میں نے اُنکو جلد اپنی طرف متوجہ کرلیا اور اُنسے
اپنے حزن کا تذکرہ کیا۔ اُنھوں نے بھی رفع حزن کی ایک ترکیب بتائی۔

دوسرے دن جمعہ تھا خبر ملی کہ شیخ شمس کا قافلہ دوشنبہ کو روانہ ہوگا۔ لہذا صبح کو بازار جاکر کھجور
خریدی۔ بعد نماز جمعہ مولوی ضیاءالدین کے ہمراہ رباط مغربی میں گیا جو حرم شریف سے قریب ہی واقع ہے اور

ناظر یا ہستمر رباط سے کچھ دیر بات چیت ہوتی رہی۔ پھر دار الضیافۃ میں جاکر مولوی فخر الدین بخاری کی قدمبوسی حاصل کی۔ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ عصر کے وقت شیخ حسین ناصری حرم شریف میں ملے تو فرماتے تھے کہ جب تک تنبا کو مطلقاً ترک نہ کروگے تمہارا حزن دفع نہ ہوگا۔ نماز مغرب کے بعد حکیم حامد رسول کے ساتھ خرقا شومی کے یہاں گیا۔ یہی صاحب بار ے مزور ہیں۔ عرصے سے شدید علالت میں مبتلا ہیں اس وجہ سید زین العابدین صاحب کو اپنی طرف سے یہ خدمت سپرد کر رکھی ہے۔

سال میں دو دفعہ روضۂ اطہر کو غسل دیا جاتا ہے۔ غسل کی رات کو روضۂ اطہر پر حاضر ہو کر لوگ مرادیں مانگتے ہیں اور اس غرض کے لیے کہ غسل کرنے میں شرکت ہو جائے پاک کپڑے میں مرادیں صندل وغیرہ رکھکر اور پوٹلی بنا کر روضۂ اطہر کی جالی میں ڈالدیتے ہیں اور غسل کے بعد غسل کا پانی تقسیم ہوتا ہے۔ میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ میری حاضری کے زمانہ میں غسل ہونے والا تھا۔ سید زین العابدین صاحب نے وعدہ کیا کہ غسل کا پانی لادیں گے۔ دوسرے روز کہ یوم غسل تھا صبح کو میں دیر تک روضۂ اطہر پر حاضر رہا۔ اسی حالت میں ایک صاحب جو ہندوستانی ہیں تشریف لاکر مجھ سے ملے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ ایک خاتون کو ہندوستان بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے ہمراہ لیجاؤں۔ مجھے اس میں تامل ہوا تو فرمانے لگے کہ کم سے کم مکہ معظمہ تک پہونچا دینا۔ مجھے منظور کرنا پڑا۔

میرا شغدف بیرونی مناخہ سے اٹھ گیا تھا۔ سید زین العابدین صاحب نے اطمینان دلایا تھا کہ مل جائیگا۔ اب جو واپسی کا زمانہ آیا تو مجھ کو اسکی فکر ہوئی۔ کئی بار سید زین العابدین صاحب سے کہا۔ کبھی انھوں نے اپنے کسی کارکن کو میرے ساتھ جانے کی ہدایت کی کبھی خود وعدہ کیا۔ بالآخر ایک دن میں انکی معیت میں اندرونی مناخہ گیا تو دیکھا کہ شغدف تو کھلا پڑا ہے اور چٹائی جو اوپر چڑھی تھی اور صراحیوں کی زنبیلیں وغیرہ غائب ہیں۔ غنیمت ہے کہ شغدف کا پتہ چل گیا۔

شام کو اُسی طرف پھر نکلا۔ ایک جگہ تازہ انجیر فروخت ہو رہے تھے۔ وہ قرش کے سولہ سترہ مٹے خوش ذائقہ معلوم ہوے اور میں سب کھا گیا۔ دن میں اتفاق سے ایک جگہ بہت سے کباب اور ایک ہندوستانی مٹھائی والے کے یہاں سے کچھ مٹھائی لیکر کھائی تھی۔ ان بدعنوانیوں نے طبیعت خراب کردی۔ گرانی سر اور نزلہ پیدا ہوگیا۔ اور دوسرے دن بخار آگیا۔ اتفاق سے ایک شخص عبد الرحمن خیاط سے اُس روز ملنے کا وعدہ تھا اُسی حالت میں اُنکے یہاں چلا تو گیا مگر بخار کے کرب کی وجہ سے بہت بےچین رہا۔ اور نماز مغرب کو بھی کافی پریشانی

ہوئی۔ مغرب کے وقت تک تو خیر نماز کے لیے حرم شریف جاتا رہا مغرب کے بعد اس قدر الجھن بڑھی کہ حرم شریف جانے کا کیا ذکر نماز تک کا ہوش نہ رہا۔ زیادہ رات گزرنے پر کچھ بخار میں کمی ہوئی تو نیند آئی۔ دوسرے دن اہلیہ مولوی عبدالباقی صاحب کے مشورہ سے ایک مسہل دوا جسکو شگو یا سنتوح کہتے ہیں۔ اسکے اثر سے دن بھر پتلے پتلے دست آتے رہے مگر دستوں کا سلسلہ شام تک بند نہ ہوا۔ نصف شب کے بعد کہیں جاکر دستوں کا سلسلہ موقوف ہوا۔ جس سے بہت ضعف پیدا ہو گیا۔

دستوں سے طبیعت مضمحل ہو رہی تھی، اسی حالت میں اطلاع ملی کہ حضرت شمس کا قافلہ دوسرے دن روانہ ہونے والا ہے۔ میں نے بھی سید زین العابدین کو اونٹ کا کرایہ دیدیا، اور حافظ شبراتی اور مولوی یٰسین کی معرفت ضروری چیزیں خریدی گئیں۔ حافظ شبراتی نے چونکہ ہمراہ چلنے کا تہیہ کیا اسلیے مجھے دوسرے ساتھی کی فکر بھی نہ رہی۔ راستہ بھی انشاء اللہ لطف سے کٹے گا۔ ظہر تک طبیعت اتنی سنبھل گئی کہ ہمت کرکے لباس تبدیل کیا اور عصر کی نماز ادا کرنے حرم شریف میں حاضر ہوا۔ اور عشا تک برابر احباب سے رخصتی ملاقاتیں کرتا رہا۔

دوسرے دن سویرے ہی سے رختِ سفر درست کیا گیا۔ شغدف پر چٹائیاں اور کمل منڈھا صراحیوں کے لیے زنبیلیں بندھوائیں، اور سامان بھی تیار ہو رہا تھا کہ سید زین العابدین آئے اور یہ خبر سنائی کہ جس اونٹ کا کرایہ دیا گیا تھا وہ نہیں آیا۔ قافلہ باب السنبریہ پر پہونچ گیا تھا جو تبریز کا مقام معین کیا گیا تھا۔ لہذا دوڑتا ہوا وہاں گیا کہ کوئی دوسرا اونٹ خالی ہو تو اسپر جانے کا انتظام کروں۔ وہاں جو پہنچکر پہلے تو کورا جواب ملا۔ پھر ایک صاحب نے اطلاع دی کہ ایک جگہ خالی ہے اگر تنہا جانا ہو تو کرایہ طے کر لو۔ مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ حافظ شبراتی کو چھوڑ دوں، اسلیے ناچار تھکا ماندہ واپس آیا۔ مگر حضرت شمس کی ہمراہی میں نہ جاسکنے کا بہت رنج ہوا۔ اور جب سید زین العابدین سے سہ پہر کو ملاقات ہوئی تو غصہ کی وجہ سے بہت درشت گفتگو کی اور اُن سے صاف کہدیا کہ آپ کرایہ کا روپیہ واپس لادیں میں اب خود انتظام کروں گا۔ وہ شام کو روپیہ لانے کا وعدہ کرکے گئے مگر وقت معینہ پر نہ آئے تو مجھے تشویش ہوئی۔ دوڑا ہوا مولوی سید احمد کے پاس گیا اور اُنکے بھائی سید محمود کے مشورہ سے ایک درخواست عربی زبان میں لکھوا کر احمد بن منصور قائم مقام شریف کے پاس لے گیا۔ قائم مقام صاحب اپنے حوالی موالی سمیت بڑی بڑی لگنوں میں اُبلا ہوا پلاؤ اُڑا رہے تھے۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تب مجھے باریابی کا موقع ملا۔ درخواست

لیکر رکھ لی اور دوسرے دن صبح کو مع مترجم کے حاضر ہونے کی ہدایت کی۔ واپس آکر سب کیفیت سید محمود سے بیان کی اور اُنھوں نے ازراہ محبت مترجم کا انتظام کردینے کا وعدہ کیا۔

صبح ہوئی تو سید محمود کے پاس پھر گیا اور وہیں سے مترجم کو لیکر قائم مقام صاحب کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ یہ صاحب بدوی ہیں اور اپنی تمام قوم کی طرح جہالت کو مایۂ افتخار جانتے ہیں۔ شریف مکہ نے چونکہ بدویوں ہی کے بل بوتے پر ترکی حکومت سے بغاوت کی اور انھیں کی قوت سے حجاز پر تسلط حاصل کیا، اسلیے قائم مقامی یعنی گورنری جیسے ذمہ دار عہدہ پر بھی بدوہی مقرر کیے ہیں۔ قائم مقام صاحب اپنے ملاقات کے کمرہ یا مجلس میں لیٹے ہوے حقہ نوش فرمارہے تھے۔ میں حاضر ہوا تو آپ نے میری درخواست ایک اردلی سے منگائی اور مترجم صاحب سے پڑھوا کر سنی۔ سید زین العابدین پہلے ہی طلب کیے جا چکے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی ہانپتے کانپتے پہونچے تو اُن سے کسی قدر درشت لہجہ میں بازپرس کی گئی اور فوراً مجھے روپیہ دلا دیا گیا۔ ساتھ ہی مترجم کے ذریعہ سے مجھے اطمینان دلایا گیا کہ حکومت کی طرف سے اونٹ کا بندوبست کردیا جائے گا۔ اور میں دوسرے قافلہ کے ساتھ روانہ ہو سکوں گا۔ چنانچہ ایک بدو میرے ساتھ کیا گیا جو باب المصری کے باہر لبدیہ (میونسپلٹی) کے دفتر میں مجھے لایا۔ یہاں میں نے کرایہ جمع کیا اور رسید حاصل کی۔ تب جان میں جان آئی، ورنہ اندیشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں وقت پر مکہ معظمہ نہ پہونچا تو حج رہ جائے گا۔ عصر کے بعد پھر لبدیہ گیا اور مقوم کو ساتھ لاکر اپنا مکان دکھایا تاکہ اونٹ یہیں بھیجا جائے۔ میرے ساتھ دو بیبیاں بھی تھے جنھیں مجبوراً ورفاقت شفا بھی۔ چاہتا تھا کہ مقوم کی معرفت مناسب کرایہ پر ان بیبیوں کے ساتھ چلنے کا بندوبست ہو جائے مگر مقوم نے کرایہ بہت مانگا لہذا اس بارے میں بھی مولوی سید احمد صاحب سے رجوع کرنا پڑا۔ اُنھوں نے ازراہ ہمدردی وعدہ کیا کہ بیبیاں اُن کے ذریعہ براہ راست جدہ پہونچا دیے جائیں گے۔

حضرت سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر فاتحہ خوانی نہیں کر سکا تھا۔ اتفاق سے ٹھہر گیا تو سید زین العابدین کے ہمراہ گاڑی پر سوار ہو کر اُس بارگاہ عالی میں حاضری دے آیا۔ وہاں سے واپس آیا تو جمّال کی صورت دکھائی دی اور معلوم ہوا کہ فوراً روانگی کا سامان کرنا چاہیے۔ وضو کر کے حرم شریف حاضر ہوا۔ اور حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ مبارک پر سلام ودعائے وداع پڑھی اور چاشت کے وقت روانہ ہوا۔ اونٹ تھوڑی دور چل کر مسجد سیدنا حمزہ

کے سامنے رُکا اور شغدف وہیں اُتار دیا گیا۔ ظہر تک وہیں رہنا ہوا، ظہر کے بعد جمال اونٹ لیکر آیا تو روانگی ہوئی۔ روانگی کے وقت سید زین العابدین اور اُنکے شرکاء سب رخصت کرنے کے لیے موجود تھے۔ اُن کا حق مزدوری ۲ مجیدی تو پہلے ہی ادا کر دیا گیا تھا۔ کچھ خدمت اسوقت بھی کی گئی بلکہ اس خیال سے کہ اونٹ کے بارے میں اُن سے کافی ناگواری کا اظہار کیا گیا تھا اُنکو اُنکی توقع سے زائد دیا۔ جس سے وہ بہت خوش خوش رخصت ہوئے۔

مدینہ منورہ میں کوئی بڑی آبادی نہیں ہے۔ لوگوں کے بیان سے معلوم ہوا کہ ترکی حکومت کے زمانہ میں ساٹھ ستر ہزار کی آبادی تھی۔ جنگ کے ابتدائی ایام میں حکومت نے مدینہ منورہ کو جنگی مستقر قرار دیا۔ اور اس خیال سے کہ اہالی مدینہ منورہ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو تمام شرفاء معززین کو حکومت کے خرچ سے ریل پر سوار کرکے دمشق بھیجدیا۔ حضرت شیخ احمد شمس سے بھی دمشق تشریف لیجانے کے لیے کہا گیا۔ آپ نے پہلے عذر کیا، جب اصرار زیادہ ہوا تو آپ نے آستانۂ نبوی پر حاضر ہو کر استخارہ فرمایا۔ اور عامل مدینہ کو اطلاع دی کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ مگر گورنر نے کچھ نہ سُنی اور آپ کو بجبر جانب دمشق روانہ کر دیا۔ دمشق کے حاکم نے آپ کی بہت تکریم کی اور پھر مدینہ منورہ واپس پہونچا دیا۔ مدینہ منورہ کی مستقل آبادی میں کچھ تو اس سبب سے کمی ہوئی تھی، باقی جب شریف حسین کا یہاں تسلط ہوا تو بدوی فوج کے مظالم نے ہزاروں باشندوں کو خانماں برباد کر دیا۔ بہت سے لوگ جان و آبرو بچانے کے خیال سے بھاگ گئے۔ اب بمشکل دس ہزار کی آبادی ہوگی۔ آبادی کی کمی کے ساتھ جو لوگ رہ گئے ہیں اُنکی مالی حالت بھی خراب ہوگئی ہے۔ کیونکہ ترکی حکومت کی طرف سے جو وظیفے اور انعام ملتے تھے وہ سب بند ہوگئے۔ صرف زائرین ذریعۂ آمدنی رہ گئے۔ اور جنگ کے بعد سے انکی تعداد بھی بہت قلیل ہوگئی تھی۔ اب صلح کے بعد سے خیر پھر یہ سلسلہ جاری ہوا ہے مگر ترکی کے دولتمند زائرین اب بھی نہیں آتے۔

آبادی کا بیشتر حصہ قدرۃً حرم نبوی کے اطراف میں آباد ہے۔ اسلیے یہاں آبادی گنجان ہے شہر پناہ کے باہر جو مکانات بنے ہوئے ہیں وہ تو اب بالکل ہی غیر آباد رہتے ہیں۔ شہر کے اندر بھی جب تک زائرین کے بڑے قافلے رہے، کچھ چہل پہل تھی، اُنکے جانے کے بعد ہر طرف سناٹا معلوم ہوتا تھا۔ حرم نبوی کے جنوبی دو پھاٹکوں کے سامنے دو رویہ بازار ہے۔ اصلی بازار باب السلام کے سامنے ہے جہاں سے روضۂ مبارک کے پاس حاضر ہونے کا راستہ ہے۔ اس بازار کے ختم

باب المصری ہے جسکے باہر مدینہ کے مقابل غلہ، کھجور اور دیگر اشیائے خوردنی کا بازار ہے جب
ریل جاری تھی تو باب العنبریہ سے جہاں اسٹیشن بنا ہوا ہے ریل کی ایک پٹری حرم شریف کے قریب
تک بچھا دی گئی تھی - جو اب تک علیٰ حالہ ہے - ریل جنگ کے زمانہ میں بند ہوگئی تھی - مگر اب
پھر جاری ہونیوالی ہے - شہر پناہ کی شمالی دیوار کے حصۂ زیریں میں باب الکا ہے جس میں داخل
ہوتے ہی داہنی جانب ایک مختصر سا قلعہ ہے - شریف علی حاکم مدینہ جب یہاں آتے ہیں تو اسی میں
رہتے ہیں - آجکل شریف علی یہاں نہیں ہیں - قلعہ کے مقابل پوسٹ آفس ڈاکخانہ ہے - اور
جوانب میں اندر اور باہر مسافرخانہ ہے جہاں قوافل آکر اترتے ہیں - باب الکہ سے جبل اُحد تک جسکے
دامن میں حضرت سید الشہداء کا مزار مبارک ہے کوئی ایک کوس کا فاصلہ ہوگا - مگر امن کا یہ عالم
ہے کہ سوائے چہار شنبہ کے جبکہ کثیر تعداد میں لوگ وہاں زیارت کے لیے جاتے ہیں یا ایسی صورت میں کہ
زائرین کی معقول تعداد ہو عام طور پر بغیر سرکاری محافظ کی ہمراہی کے کوئی شخص وہاں تک نہیں جا
سکتا - اسی راستہ میں ایک جانب ترکی حکومت کے زمانہ کا بے تار کی تار برقی کا اسٹیشن بنا ہوا ہے
جس پر اب شریف صاحب متصرف ہیں - شہر پناہ کی شمالی دیوار کے بالائی حصہ میں ایک دروازہ
ہے جسکے باہر "جنۃ البقیع" ہے - یہ مشہور قبرستان بہت وسیع ہے - اس سے متصل ہی ایک نخلستان ہے
جہاں ایک جلیل القدر صحابی کا مزار مبارک ہے میں وہاں فاتحہ خوانی کے لیے جانا چاہتا تھا مگر معلوم
ہوا کہ راستہ محفوظ نہیں ہے - حالانکہ یہ جگہ شہر پناہ سے غالباً دو فرلانگ بھی دور نہیں -

شریف علی جو یہاں کے مستقل گورنر ہیں عموماً یہاں رہتے نہیں ، اسلیے قائم مقام صاحب ہی
کو یہاں کا گورنر یا عامل سمجھنا چاہیے - شریف حسین کو مدینہ منورہ سے کس قدر دلچسپی ہے ، اسکا اندازہ
اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ خاص حرم نبوی کے مجاوروں اور خدمتگاروں کو پندرہ پندرہ مہینے تنخواہ
نہیں ملتی - حرم نبوی کی تعمیر پر شاہان آل عثمان نے جس قدر بے دریغ روپیہ صرف کیا اسکا اندازہ
ہر شخص حرم شریف کی زیارت کے بعد کر سکتا ہے - مگر آج یہ عالم ہے کہ حرم شریف کی شمالی دیوار
عین اُس مقام پر جسکے نیچے عورتوں کی جالی ہے شق ہوگئی ہے اور اُسکی مرمت نہیں ہو سکتی - مسجد
نبوی کے وسیع دالان کے سنگین ستون ، محرابیں ، اور ساری چھت خوشنما پھول بوٹوں سے منقش ہے
مگر اب جہاں کہیں چونہ اُکھڑ گیا ہے اُسکی درستی نہیں کی جا سکتی - مسجد نبوی کے اندر جو چٹائی کا فرش
ہے کہیں کہیں وہ بھی شکستہ نظر آیا -

مسجد نبوی، حرم کعبۃ اللہ کے خلاف مستطیل بنی ہوئی ہے۔ وسیع دالان کے جنوبی گوشے پر حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۂ اطہر ہے۔ جس کا سبز گنبد سقف مسجد سے باہر نمایاں ہونے کی وجہ سے
زائرین کو دُور سے زیارت کا موقع دیتا ہے۔ روضۂ مقدس سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ممبر شریف ہے۔
اور درمیان میں وہ مبارک جگہ ہے جسے روضۃ من روضات الجنان کا لقب ملا ہے۔ روضۂ اطہر
کے گرد کسی وجاہت کی وسیع جالی لگی ہوئی ہے جس پر گنگا جمنی پھیری ہے۔ اس جالی کے اندر
بائیں کی جانب ایک پردہ کی جالی ہے جسکے قریب ہی حضرت فاطمہ زہرا کا مزار مبارک بنا ہوا ہے۔
جالی میں متعدد دروازے ہیں مگر مغربی سمت کے دروازہ سے عموماً افواطا یا خوجے صفائی اور روشنی
وغیرہ کے لیے اندر حاضر ہوتے ہیں۔ مسجد نبوی کے اندر رات کو عموماً برقی روشنی ہوتی ہے جو عشا کے
بعد بجھادی جاتی ہے البتہ روضۂ اطہر کے اندر رات بھر شمعیں روشن رہتی ہیں۔ روضۂ مبارک کی
جالی کے بائیں میں کچھ فاصلہ پر ایک چبوترہ خوجوں کی نشست کے لیے بنا ہوا ہے۔ اور اسکے بعد ایک
درجہ کا شمالی دالان ہے جو عورتوں کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے۔ اس دالان کا اگلا حصہ تو کھلا ہوا ہے
مگر پیچھے نصف سے زائد دالان میں لکڑی کی جالی لگی ہوئی ہے۔ جنوبی دالان میں جب مجمع زیادہ
ہوتا ہے تو مرد نماز پڑھتے ہیں۔ مغربی دالان کی پشت پر طہارت خانہ اور وضو خانہ ہے اور دروازہ
سے متصل ایک مدرسہ ہے جس میں ابتدائی تعلیم ہوتی ہے۔ مسجد نبوی کے پانچ دروازے ہیں شمال و
جنوب میں بالمقابل دو دو اور ایک مغرب میں۔ مشرق میں ایک کھڑکی مین روضۂ اطہر کے مقابل ہے۔

مدینہ منورہ میں پانی بافراط ملتا ہے اور اس میں جتنی خوبیاں ہونا چاہیے سب موجود ہیں
میں نے اس سے قبل ایسا خوش ذائقہ پانی کہیں نہیں پیا، جو صراحی میں رکھنے کے تھوڑی ہی
دیر بعد ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور اس قدر سبک ہے کہ خواہ کتنی ہی مقدار میں پیا جائے کسی قسم کی گرانی
محسوس نہیں ہوتی۔ یہ اُس پانی کی خصوصیت ہے جو نہر کے ذریعہ باہر سے آتا ہے۔ ورنہ کنوؤں
کا پانی عموماً کھاری ہے۔ البتہ مسجد نبوی کے کنوئیں کا پانی کھاری نہیں، گو تازہ پیا جائے تو
ٹھنڈا نہیں ہوتا۔

یہاں جملہ اشیاے خوردنی بھی بافراط ملتی ہیں اور بمقابلہ مکہ معظمہ کے اچھی اور ارزاں ہیں۔ عموماً
سب چیزیں باہر سے آتی ہیں۔ ہر قسم کی ترکاریوں کے علاوہ خربوزے، تربوز، کھجور، انگور، انار
اور انجیر وغیرہ زراع میں ہوتے ہیں۔ کھجور تو یہاں کا مشہور ہی ہے مگر میری حاضری کے زمانہ میں کھجور کی

فصل نہیں اسلیے تازہ پھل نہ ملے۔ اور رکھے ہوئے بھی نسبتاً گراں ملتے تھے۔ دودھ، دہی وغیرہ بھی عمدہ اور ارزاں ملتا ہے۔ قہوہ خانوں کی کثرت ہے۔ اور کھانے کی دوکانیں بھی جگہ جگہ ہیں۔ اگرچہ زائرین کے رخصت ہو جانے پر ان میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔ یہاں ہر شخص تنوری روٹی کھاتا ہے۔ جو لوگ بازار سے نہیں مول لیتے وہ اپنا آٹا بھیجکر پکوا لیتے ہیں۔ یہاں کی روٹی ذائقہ میں مکہ معظمہ اور جدہ کی روٹیوں سے بھی بہتر ہوتی ہے۔

یہاں کی آبادی ویسی مخلوط نہیں جیسی مکہ معظمہ کی۔ کچھ بخاری اور ہندوستانی ہیں اور باقی سب عرب۔ البتہ عربوں میں مغربی خاصی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ مکہ معظمہ کی طرح یہاں بھی اصل باشندے بہت کم ہیں۔ بدوؤں کے سوا تقریباً سب بیرونی لوگ ہیں۔ کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طریقے بھی عموماً وہی ہیں جو مکہ معظمہ میں برتے جاتے ہیں، مگر اخلاقی حیثیت سے یہاں کے لوگوں کا مرتبہ بلند معلوم ہوتا ہے۔ ایک نمایاں فرق تو لب و لہجہ کی نرمی اور شیریں گفتاری میں نظر آتا ہے۔ اسکے علاوہ میخواری اور دیگر فواحش بھی یہاں عام نہیں۔

تعلیم کی بہت کمی ہے۔ حرم شریف میں بعض علما درس دیتے ہیں یا اپنے گھروں پر کچھ لوگوں کو پڑھاتے ہیں۔ ایک مکتب بھی ہے جس میں ابتدائی تعلیم ہوتی ہے مگر یہ بالکل ناکافی ہے۔

مدینہ منورہ کوئی تجارتی منڈی نہیں۔ گو گرد و نواح کے قبائل یہیں سے احتیاج زندگی حاصل کرتے ہیں۔ ینبوع کی راہ سے جملہ اشیائے ضرورت یہاں آتی ہیں۔ ترکی وظائف و انعامات کی بندش، اور حکومت ہاشمیہ کی بے اعتنائی کے باعث ہر طرف غربت و افلاس کے آثار نظر آتے ہیں اور مخصوص طبقات کے سوا عام طور پر مذہبیت یہاں بھی زیادہ نمایاں نہیں۔ سب سے زیادہ اُن فقرا و مہاجرین کو دیکھ کر حسرت معلوم ہوتی ہے جو یہاں رہ کر طرح طرح کے جسمانی مصائب و تکالیف برداشت کرتے ہیں مگر اتنی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ پانچوں وقت حرم نبوی میں نماز باجماعت ادا کریں۔ جب تک زائرین کے بڑے قافلے رہے مسجد اوقاتِ نماز میں بھری رہتی تھی لیکن نوافل کے جانے کے بعد جمعہ کے دن بھی اتنا مجمع نہیں ہوتا تھا کہ صدر دالان پُر ہو سکے۔



ساتویں منزل

۸- جولائی کو مدینہ منورہ سے قافلہ روانہ ہوا تھا، جس راہ سے آنا ہوا تھا اُسکے بجائے قافلے نے دوسری راہ اختیار کی۔ جب تک حوالیِ شہر کے قریب قافلہ رہا، دور سے مدینہ منورہ کی عمارتیں، مسجد نبوی کے مینار اور روضۂ اطہر کا سبز گنبد منظر فروز ہوتا رہا، تا آنکہ مغرب تک ایک ایک کرکے سب نشانات نظر سے اوجھل ہوگئے۔ جس راستہ پر قافلہ جا رہا تھا، ناہموار اور پتھریلا تھا، کچھ تو اس سبب سے اور کچھ اس لیے کہ مسلسل چڑھائی تھی شغدف میں بیٹھنا زیادہ آرام دہ نہیں معلوم ہوا، لیکن تازہ دم اونٹ ذرا تیز رفتاری سے چل رہے تھے اور ضعف کا اثر بھی بہت کچھ موجود تھا، لہذا نمازیں بھی شغدف ہی پر پڑھی گئیں۔ منزل چھوٹی تھی اس لیے جلد طے ہوگئی اور عشا کے وقت بیر الماشی پہونچ گئے۔

دوشنبہ ۹-جولائی

بیر الماشی کا پانی مدینۂ منورہ کی طرح نہایت شیریں اور ٹھنڈا تھا، ہوا بھی یہاں خوب ٹھنڈی چل رہی تھی، جسکی وجہ سے تمازتِ آفتاب سے ذرا تکلیف نہیں ہوئی۔ کنوئیں سے کچھ فاصلہ پر خرمے کے درخت لگے ہوئے تھے۔ بازار بہت مختصر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ عارضی طور پر محض قافلہ کی آمد سنکر کچھ دوکاندار جمع ہوگئے ہیں، کیونکہ سبزی ترکاری، تربوز، خربوزہ اور گوشت کے سوا یہاں کچھ نہیں بکتا تھا۔ قریب ہی ایک قلعہ کی عمارت بنی ہوئی تھی جو بالکل اُجڑا ہوا سا تھا۔ سہ پہر کو عصر کے قریب قافلہ یہاں سے اُٹھا۔ اب راستہ ہموار اور ریتلا تھا۔ گو دونوں جانب قریب قریب پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ عصر کے وقت نماز کے لیے اُترا، عینک شغدف پر رکھدی تھی، اسلیے نماز کے بعد اپنے شغدف کو نہ پہچان سکا، اور آگے نکل گیا، دور تک چلتا رہا اور ہر شغدف کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا، کمزور پہلے ہی سے تھا، دیر تک پیدل چلنے کی وجہ سے بہت خستہ ہوگیا۔ ایک بدو سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ میرا اونٹ قافلہ کی جس ٹکڑی میں ہے وہ پیچھے ہے۔ لہذا وہیں رُک گیا۔ کچھ دیر میں شغدف ملا تو اُس پر سوار ہوا۔ خستگی سے حد درجہ طبیعت نڈھال ہوگئی تھی۔ مگر اس راہ میں چوروں کی کثرت ہے، اس لیے عادت

کے خلاف قافلے کے ساتھ ساتھ مشعلیں روشن رہیں اور بدو برابر شور کرتے رہے اور ہوشیار رہو،
جاگتے رہو، کا شور مچاتے رہے۔ جسکی وجہ سے اچھی طرح نیند نہ آئی۔ تھوڑی ہی رات سے
ٹھنڈک بڑھ گئی تھی، جیسے جیسے رات بڑھتی گئی ہوا سرد ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ رضائی اوڑھنے
پر بھی سردی معلوم ہو رہی تھی۔ اوڑھنے کا مزید سامان ساتھ نہ تھا اس لیے بہت تکلیف ہوئی۔
اور سردی سے بخار آ گیا۔ قافلہ رات ہی میں نائرہ پہنچ گیا تھا، جلدی جلدی شغدف اُتارا اور
اوڑھ لپیٹ کر سو رہا۔ منزل پر کچھ سردی کم تھی۔ کرب کی وجہ سے نیند اچھی طرح نہیں آئی، لیکن
تمام جسم میں درد تھا جسکی وجہ سے ہلنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ نماز فجر کے بعد پھر سونے کے خیال سے لیٹا
اور تقریباً ۹ بجے تک کروٹیں بدلتا رہا۔

شنبہ ۱۰۔ جولائی

صبح کو کھانا پکانے کا وقت تھا، ضرورت تھی کہ حاجی شبراتی صاحب کو ضروری
سامان بازار سے لاکر دیا جاتا، مگر میری خرابی طبیعت پر لحاظ کرکے اُن غریب
نے سارا کام خود ہی کر لیا۔ اور جب کھانا تیار کر چکے تو مجھے بھی اُٹھایا۔ میں نے پہلے تو تھوڑا سا
خمیرہ بنفشہ کھایا۔ اسکے کچھ دیر بعد کھانا، مگر منہ کا مزا خراب تھا اس لیے اچھی طرح کھانا نہ کھایا گیا۔
بیر الماشی پر تو کچھ دینا نہیں پڑا تھا، مگر یہاں ۵ قرش چوکیداری کے دینا پڑے۔ قافلے کے
روانگی کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ پہاڑ سے پیدل اُترنا پڑے گا، کیونکہ راستہ بہت پیچیدہ اور خطرناک
ہے، اونٹ سواریاں لیکر نہیں چل سکتے۔ میں بہت نحیف ہو رہا تھا اسلیے مجھے اس میں تامل ہوا۔
مگر کوئی چارہ نہ تھا۔ عورتیں تک شغدفوں پر نہیں بٹھائی گئیں۔ آگے آگے اونٹ اور پیچھے پیچھے
حجاج۔ تھوڑی راہ طے ہوئی تھی کہ میں تھک کر بیٹھ گیا۔ لاچار ہو کر جمال نے ایک خالی اونٹ
پر مجھے بٹھا دیا۔ مگر تھوڑی ہی دور چلے ہونگے کہ راستہ میں ایک موڑ پر ایک اونٹ گرا پڑا تھا،
جسے بدوؤں نے وہیں ذبح کر ڈالا تاکہ راستہ سے لاش ہٹا کر نیچے کھڈ میں ڈال دیں۔ شتربانوں نے
یہ حالت دکھا کر مجھ سے اُتر پڑنے کی خواہش کی، مجبوراً مجکو پھر اُترنا پڑا۔ اونٹ پر چڑھتے وقت
میں نے اپنی سلیپر حاجی شبراتی کو دیدی تھی، کیونکہ اُنکا جوتہ شغدف پر رہ گیا تھا اور ننگے پاؤں چلنے میں
اُنھیں تکلیف ہو رہی تھی، اب خود مجھے ننگے پاؤں چلنا پڑا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تمازتِ آفتاب سے
پتھریلی زمین تپ رہی تھی، ۔۔۔۔۔ تلوے بھُنے جاتے تھے، مگر مجبوری تھی۔ حاجی شبراتی شغدف
کے ہمراہ آگے جا چکے تھے۔ بہزار خرابی و تکلیف یہ راستہ طے ہوا۔ اُتار ختم ہو جانے اور ہموار راستہ
آجانے کے بعد بھی کسی سبب سے اونٹ نہیں رُکے۔ یہاں تک کہ کچھ دور آگے چل کر میں ماندگی کے

باعث گر پڑا۔ میری بیچارگی کو دیکھ کر ایک بدو کو رحم آیا اور اُس نے میرے جمال سے جاکر اعلان کیا تب کہیں شندف پر سوار ہونے کی نوبت آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں منزل پر پہونچ گئے، خستگی کی وجہ سے رات بھر غفلت کی نیند آئی۔

چہارشنبہ۔ ۱۱- جولائی

پیر الاشہب میں قافلہ پورے چوبیس گھنٹے رہا۔ پژمردگی اور کمزوری کے باعث میں تو دن بھر شندف کی آڑ میں لیٹا رہا۔ بیچارے حاجی شیرازی سارا کام کرتے رہے۔ پانی یہاں بھی نہایت اچھا تھا۔ اگرچہ غائر کی سی سردی نہ تھی۔ عصر کے وقت قافلہ روانہ ہوا۔ راستہ میں کسی مقام پر شب میں قافلہ بہت دیر تک رُکا رہا۔ میں شندف سے اترا نہیں مگر بیٹھے بیٹھے بدووں سے دریافت کیا کہ قافلہ کیوں رُکا کھڑا ہے۔ کوئی معقول جواب تو ملا نہیں لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ جن قبائل نے پہلے راستہ کا ٹیکس وصول کیا تھا اُنہیں میں سے کسی نے روکا ہوگا۔ اور جب اُنھیں یہ اطمینان ہوگیا کہ جاتے وقت معقول رقم دی جا چکی ہے، تب قافلہ کو آگے بڑھنے دیا۔ راستہ میں رُکے رہنے کی وجہ سے خواہ مخواہ منزل کھوٹی ہوئی اور بیر حسانی پہونچتے پہونچتے آفتاب نکل آیا تھا۔

پنجشنبہ ۱۲ جولائی تا پنجشنبہ ۱۹- جولائی

بیر حسانی سے مکہ معظمہ تک اُسی راہ سے واپسی ہوئی جس راستہ سے قافلہ آیا تھا اور جسے سلطانی راستہ کہا جاتا ہے۔ جاتے وقت گرمی بہت تھی۔ مگر واپسی میں گرمی بہت کم رہی اور ٹھنڈی ہوائیں برابر چلتی رہیں، جس سے اندازہ ہوا کہ موسم میں تبدیلی ہو گئی ہے ورنہ احرام بندھ ہونے کی وجہ سے زیادہ تکلیف ہوتی۔ طبیعت کی کمزوری کے باعث میں عموماً منزل پر لیٹا رہتا، اور سارا کام کاج حاجی شیرازی کیا کرتے۔ ضعف کے دفعیہ کی غرض سے میں نے کھچڑی کھانا موقوف کر دی تھی، بلکہ ہر منزل پر گوشت لیکر شوربہ تیار کرتا تھا۔ شوربہ کے مسلسل استعمال سے ضعف میں خاطر خواہ کمی ہوئی۔ راستہ میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا، البتہ مستورہ میں سابقہ تجربہ کے خلاف میٹھے پانی کے ملنے سے بہت خوشی ہوئی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ کچھ فاصلہ پر برساتی پانی جمع ہے وہیں سے مشکیزے بھر لاتے ہیں۔ اس پانی کی قیمت ضرور زائد تھی۔

مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت راستہ جس قدر دیر میں اور دشواری سے طے ہوا تھا، واپسی پر اُسی قدر جلد اور آسانی سے تمام ہوا۔ موسم بھی نسبتاً خوشگوار تھا، اور باوجودیکہ حاجی شیرازی کے سوا کوئی اور رفیق سفر نہ تھا، طبیعت بھی ناساز تھی، لیکن کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہونچی۔ ہمارا جمال محسن بھی بہت شریف اور نیک تھا، اگرچہ اُسکا نوجوان لڑکا کبھی کبھی تقاضائے عمر بہ باعث شرارت

سبب پریشانی بنجاتا تھا، لیکن جہاں باپ کو بیٹے کی غفلت یا شرارت کا حال معلوم ہوتا وہ بچارہ
فوراً رفع شکایت کی کوشش کرتا - مکہ معظمہ پہونچنے کے بعد جب اپنے مقام پر اطمینان سے بیٹھ کر اُس
سامان کی جانچ کی جو اس سفر میں ہم لوگوں کے ساتھ تھا تو پتہ چلا کہ حاجی شبراتی کے کچھ کپڑے غائب
ہیں - جمال اپنا بقیہ کرایہ لینے کے لیے آیا تو اُس سے کہا گیا، اور اگرچہ اُسکو اور اسکے لڑکے کو کپڑوں
کی تلاش میں بہت کافی دوڑ دھوپ کرنا پڑی اور سوا ایک کے سب چیزیں مل بھی گئیں، پھر بھی وہ
غریب اس بات پر نادم و متاسف رہا کہ ایک کپڑا ضایع ہوگیا - اور جب اُسکو بقیہ اُجرت دی گئی تو
بہت خوش ہوا، اور مزید بخشش کا قطعاً کوئی مطالبہ نہیں کیا - تجربہ سے معلوم ہوا کہ بدوؤں کی وحشت
اور تیزی شہر میں داخل ہونے کے بعد بہت کچھ قابو میں آجاتی ہے - جمال کا لڑکا جو راہ میں بہت شوخ
و شریر نظر آتا تھا، مکہ معظمہ پہونچکر حلم و اطاعت شعاری کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا - اس تبدیلی کا باعث غالباً
حکومت کے تعزیری قوانین قرار دیے جا سکتے ہیں، جنکی وجہ سے ذرا سی شکایت پر فوراً گرفتاری
ہو جاتی ہے -



آٹھویں منزل

۱۹- جولائی کو ظہر کے وقت مکہ معظمہ پہونچے - احباب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ جب قافلہ مدینہ منورہ سے واپس آئے اور شریف صاحب تک شکایت پہونچی کہ راستہ میں حجاج سے بہت روپیہ بدوقبائل نے لے لیا ہے، تو اُنھوں نے اکثر حجاج کو بلا کر نصف رقم واپس دلائی۔ میرے لیے بھی روپیہ مجیدیاں وصول کر لی گئی تھیں جو شفقتی میر عبدالعزیز صاحب سے مل گئیں۔ عبدالستار مرحوم کے بیٹے حسن سکندر بھی اس اثنا میں آ گئے تھے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ بجو صاحبہ، اُنکی صاحبزادی اور عزیزی انور علی سلمہٗ خلف اصغر منشی اطہر علی صاحب مرحوم و مغفور بھی آ گئے ہیں۔ اور حرم شریف کے قریب ہی مقیم ہیں۔ یہ سب لوگ میرے ہمراہ آنے والے تھے، مگر بعض اسباب سے رُک گئے تھے اور عید بعد وطن سے روانہ ہوے۔ عصر کے بعد میں ان لوگوں سے جا کر ملا، اور شام کو بعد مغرب طواف و سعی سے فراغت کر کے سر کے بال ترشوائے اور احرام اُتارا۔

دوسرے روز جناب مولانا محمد سعید صاحب کے یہاں جا کر ہندوستان کی آئی ہوئی ڈاک وصول کی۔ بعد نماز جمعہ حکیم موسیٰ سے مل کر کچھ دوا لی، کیونکہ بخار اگرچہ اب نہ تھا مگر نزلہ کا زور باقی تھا پھر عبدالستار عبدالجبار کی کوٹھی پر جا کر حاجی شیرانی کو اُس تحریری حوالہ کی بنا پر جو وہ مدینہ منورہ سے اپنے ہمراہ لائے تھے روپیہ دلایا۔ اور گھر آ کر اخبار ہمدم کے پرچے اور ان پر نظر پڑھتا رہا۔ خطوط لکھنے کے ارادہ سے سویرے ہی ناشتہ وغیرہ سے فراغت کر کے بیٹھا تھا کہ حاجی برہان الدین صاحب تاجر لکھنؤ آ گئے، جو معہ نذیر حسین صاحب تاجر پارچہ اور مولوی عبدالرشید صاحب فرنگی محلی کے قریب کے ایک مکان پر ٹھہرے ہوے تھے۔ اُنکی معیت میں حکیم موسیٰ کے یہاں گیا اور اُن سے کچھ اور دوا لی اور وہاں سے رباطِ بھوپال جا کر الطاف حسین صاحب سے ملا، اور علی میاں صاحب کا خط جو مدینہ منورہ سے لایا تھا، اُنکو دیا۔ پھر بجو صاحبہ کے یہاں حاضری دیتا ہوا مکان واپس آیا، اور بعد نماز ظہر خطوط لکھے۔ شام کو بازار جا کر مجیدیاں وغیرہ کُنائیں، کیونکہ دوسرے دن حج کے لیے منا جانا تھا۔

مکہ معظمہ میں رویت کے مشتبہ رہنے کی وجہ سے تعین تاریخ میں دقت پیش آئی، اور جب بالآخر یہ طے پا گیا کہ ۲۳- جولائی دوشنبہ کو حج ہوگا، تو اب اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ اطمینان سے پورا ایک دن منیٰ میں بسر کر سکیں۔



نویں منزل

حسن سکندر نے وعدہ کیا تھا کہ علی الصباح اونٹ آجائیں گے تاکہ ٹھنڈے ٹھنڈے روانہ ہو جائیں اور منا میں پہونچکر مسجد خیف میں پانچ وقت کی مسنون نماز ادا کرسکیں، لیکن اونٹوں کے آنے میں بہت دیر ہوئی اور ظہر پڑھ کر روانگی ہو سکی۔ چونکہ راستہ زیادہ فراخ نہیں بلکہ مکہ معظمہ کے بازاروں میں اور بھی تنگ ہے، اور بکثرت اونٹ منا کی طرف جا رہے تھے اسلیے اونٹ جا بجا رکتے بھی تھے اور چلتے بھی نسبتاً آہستہ آہستہ تھے۔ منا کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ ہماری جائے قیام سے دو ڈھائی کوس کا فاصلہ ہوگا مگر تقریباً نصف مسافت شہر کے اندر ہے اسوجہ سے منزل کسی قدر دیر میں طے ہوئی اور جب ہم منا میں پہونچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ مسجد کی چار دیواری سے بالکل متصل ایک احاطہ میں ہمارے اونٹ ٹھہرائے گئے۔ حاجی عابد شندت اُتار کر اور سامان رکھ کر نماز کے لیے مسجد خیف میں گئے۔ مسجد کا صحن اور نیز کعبہ شریف کے رخ پر جو درجہ کا دالان ہے سب کی زمین کچی ہے۔ اور چونکہ بعض حجاج منٰی میں قیام کرنا پسند کیا اور جا بجا کھانا پکایا تھا اس لیے مسجد کی حالت ایک کاروان سرائے کے مانند ہو گئی تھی اور صحن کہیں بھی صاف ستھرا نہ تھا۔ بہرحال اپنی اپنی جانماز بچھاکر نماز ادا کرلی گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر پیٹ کی فکر پڑی۔ منا میں دو رویہ پختہ بازار بنا ہوا ہے۔ جس میں دوکانیں بھی ہیں اور بعض حصوں میں لوگ ٹھہرتے بھی ہیں۔ جس وقت ہم پہونچے ہیں اُسوقت بازار زائد رونق پر اگرچہ نہ تھا پھر بھی روٹی گوشت کی متعدد دوکانیں موجود تھیں۔ گرم گرم تنوری روٹیاں لیکر میں اور حاجی شبراتی، جو مکہ معظمہ سے منا تک پیدل آئے تھے، شکم سیر ہوئے میرا ادرعزیز انور علی سلمہٗ کی ران میں ایک گلٹی نکل آئی تھی جسکی وجہ سے انکو سخت تکلیف تھی اور وہ ساتھ کی مستورات کی کوئی خدمت نہ کرسکتے تھے، مکہ معظمہ سے میں نے انکو اپنے اونٹ پر بٹھالیا تھا تاکہ انھیں میرے ساتھ آرام مل سکے۔ مغرب کی نماز کے بعد میں نے بعض دیگر حجاج سے مشورہ کرنے کے بعد حسن سکندر سے کہا کہ رات ہی کو عرفات کے لیے روانگی ہو جائے

چونکہ دیر میں پہونچنے کی وجہ سے مسجد خیف میں پانچ نمازوں کے پڑھنے کا وقت نہیں رہا تھا۔
سب لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور نماز عشا سے فراغت پاتے ہی کوچ کر دیا۔ حاجی صاحبہ وغیرہ
کو سوار کرانے اور اُن کا سامان قرینے سے بندھوانے کی خدمت چونکہ میرے متعلق ہو گئی تھی اسلیے
ہمارے اونٹ ذرا رُکے رہے اور جب عورتیں سوار ہو چکیں تو سب سے آخر میں میں بھی اپنے شغدف میں
جا کر بیٹھ رہا۔ دن بھر میں کافی خستگی ہو گئی تھی اسلیے باوجودیکہ شب ماہتابی تھی مجھے قافلہ حجاج یا
منا سے عرفات تک کی منزل کا نظارہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جلد ہی آنکھ لگ گئی اور جب تک
نماز فجر کے اول وقت میدان عرفات میں نہ پہونچ گئے آنکھ نہ کھلی۔ ہمارے اونٹ اُس پہاڑی
سے تقریباً چند فرلانگ کے فاصلہ پر رُکے جسکا نام جبل رحمت بتایا گیا اور جہاں امام خطبہ پڑھتا ہے۔
قریب ہی بازار سجا ہوا تھا جہاں تمام ضروری سامان خورد و نوش ملتا تھا۔ نہر زبیدہ جو مکۂ معظمہ میں ہے وہی
منا اور عرفات میں بھی ہے۔ بلکہ یہاں شاید کھلی ہوئی ہے جس میں اکثر لوگوں نے جا کر غسل بھی کیا۔
میر عبد العزیز صاحب کو مکۂ معظمہ ہی میں پیچش کی کچھ خلش ہو گئی تھی۔ یہاں تک آتے آتے اور
زیادتی ہو گئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ بازار میں جا کر کھانا کھایا اور پھر اپنے شغدفوں میں
آ کے بیٹھ رہے۔ دھوپ بہت سخت تھی، اور پھر تیز لو چل رہی تھی اور احرام کی وجہ سے نہ سر ڈھک
سکتے تھے نہ سینہ کا تحفظ ممکن تھا۔ اس لیے عافیت اسی میں معلوم ہوئی کہ شغدفوں میں پڑے رہیں۔
نماز ظہر کے بعد امام مع شریف صاحب کے مسجد نمرہ سے جو مزدلفہ کے قریب ہے ظہر اور عصر کی نماز ساتھ
ادا کر کے اس پہاڑی پر جو جبل عرفات کے پائین میں واقع ہے آتے ہیں اور یہیں اونٹ پر سوار ہو کر امام
خطبہ پڑھتا ہے۔ حجاج میں سے جو لوگ اتنی ہمت رکھتے تھے کہ دھوپ اور لو کی تاب لا سکیں وہ پہلے
ہی سے جا کر اس پہاڑی پر بیٹھ گئے تھے۔ فاصلے سے لوگوں کی صورت تو نہ دکھائی دیتی تھی مگر احرام کی
سفیدی اور چھتریوں کی سیاہی ضرور نظر آتی تھی۔ مسجد نمرہ میں نماز ادا ہوتے وقت یا بعد چلنے
کے وقت توپوں کے چھوٹنے کی آواز آئی۔ جس کے بعد ہی حسن سکندر کے سادہ یوسف
اور اُنکے چھوٹے بھائی نے اپنے حاجیوں کو حج کی مبارکباد دینا اور اُن سے نذرانے وصول کرنا شروع
کر دیے۔ عصر کے وقت تک امام صاحب اُس پہاڑی پر پہونچ گئے۔ اور اُنکے پہونچتے ہی پہاڑی کے
لوگوں میں ایک عام جنبش معلوم ہوئی۔ گویا لوگ اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ یا امام سے قریب ہونے
کے لیے بڑھے۔ ہم لوگوں نے پہاڑی کا رخ کر کے زمین پر چٹائی بچھائی اور وہیں بیٹھ گئے۔ یہ معلوم ہو گیا تھا
کہ جس وقت امام خطبہ پڑھتا ہے اور لبیک اللھم لبیک پڑھتا ہے تو جو لوگ پہاڑی پر ہوتے ہیں وہ

حاجیوں کی اطلاع کے لیے اپنے اپنے رومال ہلاتے ہیں۔ چنانچہ جب رومال ہلنے لگے تو ہم لوگوں نے
بھی خوب ذوق و شوق سے لبیک پڑھی۔ جیسے جیسے آفتاب ڈھلتا گیا پہاڑی زیادہ صاف نظر
آنے لگی مگر صورتیں اب بھی نظر نہ آتی تھیں۔ یوں تو ظہر اور عصر کے درمیان ہی قوافل کی واپسی شروع
ہو گئی تھی مگر جب خطبہ تمام ہو گیا اور لوگ پہاڑی سے اُترے تو عام طور پر کوچ کی تیاری ہونے لگی۔ عرفات
کے وسیع میدان میں جہاں صبح کو چاروں طرف خیمے، چھولداریاں اور شغدف نظر آ رہے تھے اس وقت
سوائے اونٹوں کی آوازوں یا شغدفوں سمیت اونٹوں کی قطاروں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہمارے
جمالوں نے بھی عصر کے بعد ہی سے مچی (چلو چلو) کا ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ جب تک
آفتاب غروب نہ ہو جائے میں یہیں رہوں گا۔ جمالوں کی اُس وقت کی بیتابی اور بار بار دوڑنے کے لیے
کو نہایت ناگوار معلوم ہوا۔ حالانکہ وہی وقت خضوع و خشوع کے ساتھ دعائیں مانگنے کا تھا جب
جمالوں نے بہت تنگ کیا تو میں نے کہہ کہ اور لوگ سوار ہو کر چلیں میں پیدل چلا آؤں گا۔ اور اپنا
آہنی بیگ اُتار کے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور غروب آفتاب تک برابر مصروف دعا خوانی رہا۔ اور جب
آفتاب بالکل غروب ہو گیا تب وہاں سے اُٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک جمال نے جو میرے پاس
ٹھہر گیا تھا اونٹوں تک پہونچا دیا اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوا میں شغدف میں سوار ہو گیا۔ جبل عرفات سے
مزدلفہ تک کوئی ڈیڑھ کوس کا فاصلہ ہو گا۔ اور راستہ اتنا وسیع و عریض ہے کہ چار چار پانچ پانچ
قطاریں اونٹوں کی ساتھ ہی چلتی ہیں۔ جن کی وجہ سے اس قدر گرد اُڑتی ہے کہ بمشکل راستہ میں کچھ سجھائی
دیتا ہے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں بازار آ گیا جو لالٹینوں اور چراغوں کی کثرت سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔
یہ بازار مسجد نمرہ کے قریب سے شروع ہوا تھا اور شاید میلوں تک چلا گیا تھا۔ مگر دوکانیں عموماً ایک
ہی سمت میں یعنی مسجد کے جانب تھیں۔ ہمارے اونٹ مزدلفہ میں ایک مقام پر اُتار دیے گئے۔ رات
کے وقت اسکا اندازہ نہیں ہو سکا کہ مسجد نمرہ سے کتنے فاصلہ پر تھے۔ البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے مقابل
کے سمت میں پڑاؤ ہے۔ نماز عشا پڑھنے کے بعد اسی مقام پر کنکریاں چُنی گئیں۔ اسکے بعد اگرچہ رات
بہت ہو چکی تھی اور اس کا بھی اندیشہ تھا کہ رات کی تاریکی میں کہیں راستہ نہ بھول جاؤں، مگر ہمت
کر کے میں بازار گیا اور وہاں کھانا کھا کر چائے پی اور کچھ مٹھائی وغیرہ ناشتہ کے لیے لیتا آیا۔ حاجی
شبراتی صاحب چونکہ پیدل تھے اس لیے ہمارے ساتھ نہیں رہ سکے۔ بازار سے واپسی میں اپنے
مقام تک پہونچنے میں کافی وقت ہوئی۔ اس لیے کہ ہر جانب شغدفوں کی قطاریں تھیں۔ چاندنی رات
تھی۔ اس لیے شغدفوں کے ساتھ عموماً روشنی نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ ہر قافلہ میں ایک روشنی تھی۔

شغدفوں کی یکسانیت کے باعث امتیاز مشکل تھا۔ بہرحال کئی جگہ ٹھوکریں کھا کر بالآخر ایک بار اپنے
شغدفوں تک رسائی ہو گئی۔ شغدفوں کے آگے ہمنے بچھونا پہلے ہی بچھا لیا تھا۔ انور سلمہٗ سو گئے تھے
اس لیے انکو جگانا مناسب نہ معلوم ہوا اور جو کچھ کھانے کا سامان خرید کیا گیا تھا شغدف میں رکھکر میں
بھی سو رہا۔ نماز فجر کے وقت اٹھے اور نماز سے فارغ بھی نہ ہوسکے تھے کہ جمال آ گئے اور جلدی جلدی
شغدف کسے گئے اور آفتاب نکلتے نکلتے منیٰ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اسوقت بھی اونٹوں کی کثیر تعداد
کے چلنے سے گرد بہت اڑ رہی تھی، پھر بھی آفتاب کی تیز روشنی میں راستہ اور گرد و پیش کا منظر صاف
دکھائی دیتا تھا۔ اب بازار کا کہیں نام و نشان نہ نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں دکانوں کا سامان اٹھ نہیں
چکا تھا تو وہاں کچھ آثار رات کے بازار کے معلوم ہوتے تھے۔ دونوں جانب کچھ فاصلہ پر پہاڑی سلسلے
تھے۔ بائیں جانب گو ہمارے اونٹوں کے پیچھے مسجد نمرہ دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اس مسجد میں جا سکنے
کا افسوس رہا۔ کوئی دو گھنٹے میں قافلہ پھر منیٰ پہونچ گیا۔ اور اپنے مقام پر پہونچنے سے پہلے ہی ہم نے
دیکھ لیا کہ راستہ ہی میں ایک جگہ مذبح ہے جہاں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ اور دوسری جانب ایک
چبوترہ پر شریف صاحب اور انکے ساتھیوں کے خیمے ڈیرے لگے ہوئے ہیں۔ جس احاطہ میں پہلے
قیام تھا اب بھی ہمارے شغدف وہیں اتارے گئے۔ سامان خورد و نوش ساتھ موجود تھا اس لیے اونٹ
پر بیٹھے ہی بیٹھے ہم لوگوں نے کھانا کھا لیا تھا۔ شغدف رکھنے کے بعد پہلی فکر یہ ہوئی کہ جمرۃ العقبیٰ
کے کنکریاں مار آویں۔ چنانچہ ایک ایک دو دو کرکے سب ساتھی اس غرض سے گئے۔ منیٰ کے بازار
کی سڑک کے درمیان میں دو جمرے ہیں۔ مکہ معظمہ کی جانب جاتے ہوئے سرے پر داہنی سمت میں
ایک جمرہ ہے جسکی صورت ایک بھدی لاٹ کی سی ہے۔ لاٹ کوئی قد آدم بلند ہوگی انکے گرد ذرا اونچی
منڈیر کے تھالے سے بنے ہوئے ہیں جن میں کنکریاں گرتی ہیں۔ جو کنکریاں مزدلفہ میں چنی تھیں انہی
سے یہاں جمرہ کو مارا۔ مجمع بہت ہوتا ہے اس وجہ سے بازار میں چلتے وقت بھی کندھے سے کندھا چھلتا
ہے اور جہاں جمرہ ہے وہاں تو ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں اور بغیر دھکم دھکا کے رمی جمار انجام
نہیں پا سکتی۔ عورتوں اور ضعیفوں کیلیے یہ مرحلہ کافی دشوار ہے۔ رمی جمار سے فراغت پائی تو دھوپ
کافی تیز ہو چلی تھی اسلیے تھوڑی دیر آرام کیا اور تازہ دم ہو کر قربانی کے لیے مذبح کی جانب روانہ
ہوئے۔ چونکہ سب ساتھیوں کی طرف سے قربانی کرنے کی خدمت میرے متعلق تھی، اسلیے تقریباً
چالیس راس خرید کر ذبح کرنا پڑیں۔ ہمراہیوں میں سے دو تین آدمی میرے ساتھ تھے جنکی مدد سے
جانور خریدے گئے۔ مذبح جس مقام پر ہے وہاں بڑے بڑے گڑھے اس غرض سے کھدے ہوئے

ہیں کہ قربانی کے بعد کھالیں اور اوجھڑی وغیرہ اُن میں ڈال دیں۔ مگر اکی پابندی کم کی جاتی ہے بلکہ زیادہ تر ہوتا یہ ہے کہ اُس سے ملحقہ وسیع میدان میں جہاں دور تک بکری، بھیڑ، دُنبوں اور گایوں وغیرہ کے جھنڈ کھڑے ہوتے ہیں۔ لوگ جانور خرید کرکے وہیں ذبح کردیتے ہیں اور غریب عربوں کی کثیر تعداد وہاں موجود رہتی ہے اوہر قربانی کرنے والے کو گھیرے رہتی ہے، ذبح شدہ جانور دیدیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی یہی کیا کہ سوائے دو دُنبوں کے جنکا گوشت ساتھ لیجانا منظور تھا باقی کُل راسوں کو ذبح کرکے وہیں تقسیم کردیا۔ جانوروں کی قیمت اگرچہ کسی قدر زیادہ دینا پڑی لیکن مجھے تو اُس میدان میں اُنکی اس قدر کثیر تعداد میں فراہم ہو جانے پر تعجب معلوم ہوتا تھا۔ میں تین چار روپیہ سے لیکر گیارہ گیارہ بارہ بارہ روپیہ تک کی مختلف مدارج کی بکریاں، بھیڑیں اور دُنبے خریدے گئے اور تقریباً تین چار گھنٹے میں قربانی کے مرحلہ سے فراغت پائی۔ نماز ظہر کے وقت وہیں پانی لیکر وضو کیا گیا اور نماز ادا کی گئی۔ جو غریب چھوکرے ذبح ہونے کے بعد راسیں مانگ لیتے تھے۔ اُنکے پاس عموماً چھریاں موجود تھیں اور اُنھیں چھریوں سے جانور ذبح کیے گئے۔ بعض وقت یہ چھوکرے کسی جانور کو پسند کرکے چاہتے تھے کہ اُنکو دیا جائے۔ اور ایک جانور کے کئی کئی گاہک ہوتے تھے تو دشواری پیش آتی تھی۔ کیونکہ وہ آپس میں بھی لڑنے لگتے تھے اور ذبح کرنے والے سے بھی اُلجھ جاتے تھے بلکہ کبھی کبھی چھین جھپٹ کرنے لگتے تھے۔ چنانچہ ایک بار اسی چھین جھپٹ میں ایک چھوکرے کے ہاتھ میں چھری لگ گئی اور خون نکل آیا۔ اب کیا تھا وہ میرے ابھر گیا اور اصرار کرنے لگا کہ مجھے کچھ بخشش دو نہیں تو تم کو پکڑوا دوں گا۔ میں نے ہر چند سمجھایا مگر نہ مانا۔ اور بالآخر ایک مسلح عرب کو جو غالباً فوجی تھا بُلا لایا۔ وہ مجکو اپنے ہمراہ ایک راؤٹی میں لگیا جو مذبح سے بالکل ہی قریب تھی اور جس میں پولیس کے کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ایک پولیس افسر نے اُسکا بیان سنکر مجھسے کہا کہ اس لڑکے کو کچھ بخشش دیدو۔ میں نے بھی یہ دیکھ کر کہ بہت سا وقت فضول ضائع ہو چکا ہے اور اگر اب بھی تامل کرونگا تو ممکن ہے کہ اور وقت رائیگاں جائے اُس لڑکے کو چونی دیکر اپنی جان چھڑائی۔

جن جانوروں کو بنوا کر گوشت اپنے ہمراہ لیجانا تھا اُنکی قربانی سب سے آخر میں مذبح میں کی گئی اور ایک ایک روپیہ دیکر قصاب سے گوشت بنوایا۔ اُس نے صرف کھال اُتار کے آلائش نکالدی اور جانور ہمارے حوالہ کردیا۔ گوشت کے بنانے کی وہاں کسی کو فرصت نہیں اور دو تین روپے دیے جاتے تو شاید بنا دیتا۔

گوشت لیکر چلے تو ایک پولیس والے نے پھر روکا اور دوسری بار افسر پولیس کے یہاں

چھٹی ہوئی۔ مگر اب تک کچھ دینا نہیں پڑا۔ بلکہ یہ دریافت کیے کہ گوشت کہاں جائے گا چھوڑ دیے
گئے۔ عصر کی نماز میں نے اسی افسر کی راوٹی کے ایک جانب ادا کی اور اپنے مقام پر ہو کر ذرا
سستایا۔

مغرب سے کچھ پہلے کھانے کی فکر میں بازار گئے، اتفاق سے اُسی وقت شریف صاحب کی
سواری مکہ معظمہ کی طرف جا رہی تھی۔ تھوڑے سے سوار آگے اور تھوڑے سے پیچھے تھے۔ بیچ میں
ایک فٹن پر شریف صاحب سوار تھے، جس کے پیچھے ایک شخص خوشنما چھتر لگائے ہوئے تھا۔ دوسرے
دن سنا کہ آگے بڑھ کر کسی مقام پر یہ چھتر گر گیا۔ اور لوگوں نے اسکو فال بد قرار دیکر یہ نتیجہ نکالا کہ
شریف کا نیر اقبال عنقریب غروب ہونے والا ہے۔

رات کو خنکی کے باعث نیند بہت آئی۔ صبح کی نماز بھی قضا ہوئی۔ نماز ادا کر کے حاجی
برہان الدین، حاجی نذیر حسین اور حاجی سلیمان صاحبان تاجران لکھنؤ کی معیت میں طواف کعبہ
کے لیے روانہ ہوا۔ گدھے کرایہ پر بہت ملتے ہیں اور کرایہ بھی زیادہ نہیں۔ آمد و رفت کے لیے
صرف ایک روپیہ دینا پڑا۔ مکہ معظمہ کے حدود میں داخل ہوئے تو ایک مقام پر ستانے کے لیے
ٹھہرے۔ ساتھیوں نے ناشتہ اور میں نے کھانا کھایا۔ حرم شریف میں حاضر ہو کر باطمینان تمام طواف
کیا، زمزم پیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔

شہر میں عام طور پر سناٹا تھا۔ نہ راہگیر چلتے تھے نہ دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی
دوکان کھانے یا قہوہ کی کھلی ملتی تھی۔ طواف و سعی سے فراغت پاکر اُس گھر میں آیا جو
مکہ معظمہ میں کرایہ لیا گیا تھا۔ کپڑے بدلے۔ کچھ دیر آرام کر کے چاروں آدمی منا واپس گئے۔ منا کا
بازار حج کے بعد خوب رونق پر ہوتا ہے۔ کھانے پینے کی تمام اشیا کے سوا ہر قسم کی چیزیں اس
بازار میں فروخت ہوتی ہیں۔ شام کو تو راستہ چلنا دشوار تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ عصر کے بعد
پہلے تینوں جمروں پر رمی کی پھر مغرب تک مذبح کے میدان میں قربانی کرتا رہا۔ دُنبہ جو ایک دن
قبل ذبح کیا گیا تھا اسی کا گوشت آج کھایا گیا۔ بہت لذیذ تھا۔ دوسرے دن سویرے ہی سے روانگی
کی فکر شروع ہو گئی تھی۔ کیونکہ مستورات اور ساتھی مریضوں کو طواف زیارت کرنا تھا میں نے ایک قربانی
تیسرے دن کے لیے باقی رکھی تھی لہذا سویرے ہی مذبح میں جا کر ایک عمدہ دنبہ مول لیا، قربانی کی
اور گوشت بنوا کر ساتھ لایا۔ چونکہ تیسرے دن بھی رمی کرنا ہوتی ہے۔ اس لیے طے پایا کہ جو لوگ مریض
ہیں وہ رمی کر کے جائے قیام پر واپس نہ آئیں بلکہ بازار کے سرے پر مل جائیں۔ اور وہیں اپنے

شغدفوں میں سوار ہوں - اس خیال سے جو لوگ رمی کرکے واپس آ گئے تھے اُنکے ہمراہ خالی اونٹ روانہ کر دیئے گئے - اور اُنکو ہدایت کی گئی کہ بازار کے سرے پر ٹھہر جائیں - مریضوں کو روانہ کرکے میں بھی روانہ ہوا - اور رمی کرکے اور اپنے ساتھیوں کو بٹھا کر شغدف پر سوار ہو گیا -

چونکہ اُس دن کثرت سے حجاج مکہ معظمہ واپس جا رہے تھے اس لیے راستہ بہت دشوار گذار تھا - اور باوجودیکہ ظہر سے بہت قبل ہم روانہ ہوئے تھے مگر کہیں عصر کے وقت مکہ معظمہ پہونچے - حرم شریف کے پاس پہونچتے ہی اونٹ روک کر انور سلمہٗ کو طواف و زیارت کے لیے اُتار دیا اور میں سامان کے ہمراہ گھر آیا



سہ ماہی مجلہ

فکر و نظر

جس میں

● علوم قرآن و حدیث ● فقہ ● کلام ● تصوف ● اسلامی تاریخ

● تعلیم و تدریس ● فلسفہ/سائنس ● ادبیات ● معاشیات ● عمرانیات

● سیاسیات ● ثقافت و تمدن ● قانون و اصول قانون

پر

اسلامی نقطۂ نظر سے مقالات شائع کیے جاتے ہیں

ادارۂ تحقیقات اسلامی

اسلام آباد (پاکستان)

سائنس اور مسلمان

- مسلم علم الہیئت کا اجمالی جائزہ

— شبیر احمد خاں غوری

- تاریخ طب میں عربوں اور مسلمانوں کا مقام

— ڈاکٹر فواد سیزگین

غوری صاحب کے مضامین خدابخش لائبریری کی
طرف سے کتابی شکل میں زیر اشاعت ہیں، ان میں سے
ایک مجلہ 'معارف' بابت جون ۱۹۶۵ء سے لیا گیا ہے۔
پیش خدمت ہے۔

دوسرا مضمون فواد سیزگین کے فاضلانہ سلسلۂ مضامین
کی ایک اور کڑی ہے جو فکر و نظر' اسلام آباد' بابت
جنوری تا مارچ ۱۹۹۱ء سے لیا گیا ہے
ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

—— ادارہ

جناب شبیر احمد خاں غوری
علی گڑھ

مسلم علم الہیئت کا اجمالی جائزہ

مسلمانوں میں علم ہیئت کا آغاز

مسلمانوں میں نجوم و ہیئت کی باقاعدہ ابتدا دوسرے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (۱۳۶ھ - ۱۵۸ھ) سے ہوئی۔ وہ پہلا خلیفہ ہے جس نے منجمین کو تقرب بخشا۔ اس کا منجم خصوصی نوبخت تھا۔ نوبخت کے علاوہ دربار کے ہیئت دانوں میں دو اور مشہور شخص تھے: محمد بن ابراہیم الفزاری اور یعقوب بن طارق۔ ان کے علاوہ ایک اور مشہور نجومی بھی تھا جس کا نام ماشاء اللہ تھا۔ نوبخت اور ماشاء اللہ ہی نے بغداد کی بنیاد ڈالنے کی صورت نکالی تھی بسنہ ۱۵۲ھ۔ نیاز اور بقول البیرونی ۱۵۴ھ میں) ہندوستان کا ایک علمی وفد "برہم سدھانت" کا نسخہ لیکر منصور کے دربار میں حاضر ہوا، جسے اس کے حکم سے محمد بن ابراہیم الفزاری اور یعقوب بن طارق نے عربی میں منتقل کیا۔ یہی ترجمہ بعد میں "السند ہند الکبیر" کے نام سے مشہور ہوا۔

منصور کے بعد مہدی (۱۵۸ھ - ۱۶۹ھ) خلیفہ ہوا۔ اس نے بھی نجوم و ہیئت کی سرپرستی جاری رکھی۔ اس کا منجم خصوصی تھوفیل بن توما الرہاوی تھا۔

مہدی کے بعد پہلے ہادی اور پھر ہارون (۱۷۰ھ - ۱۹۳ھ) خلیفہ ہوا۔ ہارون کا عہد برامکہ

کا عہد مترجمین کے لیے مشہور ہے اسی کے حجاج بن مطر اور ابو حسان سلمان نے بطلیموس کی کتاب المجسطی کا عربی میں ترجمہ کیا، اسی کے زمانہ میں عہد اسلام کی پہلی رصدگاہ شہر جندی ساپور میں قائم ہوئی۔ اس کا متولی احمد النہاوندی تھا، جس نے اپنے فلکی مشاہدات کو الزیج المشتمل میں قلمبند کیا،

ہارون کے بعد پہلے امین تخت نشین ہوا مگر کچھ دن بعد چھوٹے بھائی مامون سے لڑ بیٹھا اور اسی خانہ جنگی کے نتیجہ میں تخت و تاج کے ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

مامون اور اس کے جانشین | امین کے بعد مامون (۱۹۸ھ۔۲۱۸ھ) سریر آرائے خلافت ہوا، وہ بالطبع عقلیت کا دلدادہ تھا، اور قیام خراسان کے زمانہ ہی میں فضل بن سہل کے زیر اثر نجوم اور جوتش کا معتقد رہ چکا تھا، اس نے یونانی علوم کے نشر و اشاعت پر خاص طور سے توجہ کی اور اس تحریک کو منظم طور سے چلانے کے لیے ہارون کے "خزانۃ الحکمۃ" کی "بیت الحکمۃ" کے نام سے تجدید کی، علم الہیئت کی ترقی کے سلسلے میں اس نے بغداد اور دمشق کے نزدیک رصدگاہیں قائم کرائیں، اس کی سرپرستی میں آلاتِ رصدیہ میں قابل قدر اصلاح ہوئی اور ان کی مدد سے اسکے ہیئت دانوں نے آفتاب کے "میل کلی" ([illegible]) "خروج مرکز" (Eccentricity) اور "نقطہ اوج" (Apogee) کو متعین کیا لیکن ان سب سے اہم کارنامہ محیط ارضی کی پیمائش ہے، اس سے پہلے صرف یونانی حکیم ایراتوستھنیس نے شہر اسکندریہ میں تخمینی طور پر اسکا اندازہ لگایا تھا لیکن مامون نے اصلاح شدہ آلات اور ماہرین ہیئت کی مدد سے اسے تحقیقی طور پر دریافت کرایا۔

عہد مامونی کے منجمین میں یحییٰ بن ابی منصور، خالد بن عبد الملک المروزی، عباس بن سعید الجوہری اور سند بن علی زیادہ مشہور ہوئے، لیکن ان سے بھی زیادہ مشہور محمد بن موسیٰ الخوارزمی (بانی علم الجبر و المقابلہ) ہے، اس نے محمد بن ابراہیم الفزاری کے "السندھند الکبیر" کو مختصر کر کے "المجسطی" اور "زیج شہریار"

کی مدد سے اس ہیئتی نظام کی بنیاد ڈالی جو "السند ہند" کہلاتا ہے اور علم ہیئت کی اصل سمجھا جاتا ہے، اس نئے نظام میں اس نے "اوساط کواکب" کے باب میں "سدھانت" کا تتبع کیا، "تعدیلات" کے باب میں "زیج شہریار" کا اور "میل آفتاب" کے باب میں "المجسطی" کا اتباع کیا اور عرصہ تک لوگ خوارزمی ہی کی زیج پر اعتماد کرتے رہے۔

مامون کے بعد معتصم (۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ) پھر واثق اور اس کے بعد متوکل (۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ) خلیفہ ہوئے۔ اس زمانہ کے مشہور ہیئت داں حبش الحاسب، الکندی اور بنو موسیٰ ہیں۔

حبش الحاسب اجرام فلکی کی گردش کے حساب میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ وہ "الزیج الممتحن" کا مصنف ہے، اس کے علاوہ اس نے "زیج السند ہند" کی بھی اصلاح کی اور "جدول الدقائق" کے نام سے ایک مثلثاتی جدول بھی مرتب کی تھی، جس میں "اوتار" (Chords) کے بجائے "جیوب" (Sines) پر عمل کیا ہے۔

الکندی دنیا کے بارہ جینیئسوں میں سے ایک ہے اس نے ریاضی و ہیئت پر سو کے قریب کتابیں لکھیں اور "متوسطات" (وہ کتابیں جو اصول اقلیدس اور المجسطی کے درمیان پڑھی جاتی ہیں) میں سے بعض کتابوں کا ترجمہ کیا تھا، اس کی ایک نجی رصدگاہ بھی تھی، جہاں وہ اجرام فلکی اور مظاہر جو کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ ۲۲۲ھ کے اس قسم کے ایک مشاہدے کو اس نے ایک مستقل رسالہ میں قلمبند کیا تھا، کندی عام حکما کے برخلاف عناصر کو تین مانتا تھا اور آگ کے بارے عنصر ہونے کا منکر تھا۔

بنو موسیٰ نے سامرا میں ایک رصدگاہ قائم کی تھی جو رصدگاہ مامونی کے بعد اسلامی تاریخ کی دوسری مشہور رصدگاہ ہے، وہاں انھوں نے "آفتاب کے میل کلی" کے علاوہ سال شمسی کی مدت کو بھی دریافت کیا تھا اور اسی دریافت کی بنیاد پر کتاب "سنۃ الشمس" لکھی تھی۔ عام عام ہیئت دانوں کے برخلاف بنو موسیٰ نو کے بجائے آٹھ آسمان مانتے تھے۔

متوکل کو اس کے بیٹے منتصر کے ایما سے ترکوں نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد خلفا کا عزل و نصب ترکوں کے ہاتھ میں آگیا۔ مگر جب ۲۵۶ھ میں معتمد خلیفہ ہوا، تو اس کے بھائی الموفق نے بڑی حد تک حالات پر قابو پا لیا۔ معتمد کی وفات پر اس کا بھتیجا معتضد (۲۷۹ھ۔ ۲۸۹ھ) خلیفہ ہوا اس نے اپنے حسن تدبیر سے خلافت کے گرتے ہوئے وقار کو سنبھال لیا۔ اس زمانہ کے مشہور ہیئت داں ثابت بن قرۃ الحرانی، ابومعشر البلخی، النیریزی اور البتانی ہیں۔

ثابت بن قرہ نے "المجسطی" کا از سر نو ترجمہ کیا اور بعض مقالات کی شروح لکھیں۔ اس نے فلکیاتی مشاہدات پر بھی کئی کتابیں لکھیں، اور تاؤن الاسکندرانی سے جو کوتاہیاں ہوئی تھیں، ان کی اصلاح کی۔ (Trepidation) کا مفروضہ بھی اسی کی طرف منسوب ہے۔ "علم المثلثات الکرویہ" پر "کتاب فی الشکل الملقب بالقطاع" لکھی جو اس موضوع کی مہمات کتب میں محسوب ہوتی ہے۔

ابومعشر البلخی نجوم میں الکندی کا شاگرد تھا۔ وہ اس فن میں متعدد کتابوں کا مصنف ہے۔ اس نے ایران اور ہندوستان کے نجومی لٹریچر سے بہت زیادہ استفادہ کیا تھا۔ وہ قدیم نجوم کی تاریخ کا مستند ماہر سمجھا جاتا ہے۔

ابوالعباس النیریزی نے "المجسطی" کی شرح کے علاوہ "السند ہند" کے انداز پر بھی ایک زیج مرتب کی تھی، اس کے علاوہ ایک اور زیج (زیج معتضدی) معتضد باللہ کے نام پر معنون کی تھی جو البیرونی کے زمانہ تک اپنے فن کی معتمد علیہ تصنیف محسوب ہوتی تھی۔ اس نے "علم المثلثات الکرویہ" میں "شکل قطاع" کے بارے میں بھی تحقیقات کی تھیں۔

البتانی کا دنیا کے منتخب روزگار ہیئت دانوں میں شمار ہوتا ہے۔ قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے کہ میں تاریخ اسلام میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو رصد و کواکب کی تصحیح اور ان کی حرکات کے امتحان میں اس کے مرتبہ کو پہنچا ہو۔ البتانی نے ۲۶۴ھ سے ۳۰۶ھ تک مشاہدات

کیے۔ رویت ہلال ہیل کلی، مدت سال، اختلافات قمری، کسوف و خسوف اور اختلاف المناظر کے حسابات کو اس نے بعد کے ہیئت دانوں سے زیادہ صحت و دقت نظر سے بیان کیا ہے۔ البتانی نے "اوتار" کے بجائے "جیوب" کو استعمال کیا اور مثلثاتی نسبتوں کو مقبول بنایا۔

اس عہد کے دیگر مشاہیر ماہرین علم ہیئت میں محمد بن علی نیشاپوری، الماہانی، محمد بن احمد ابن یوسف السمرقندی، سلیمان بن عصمہ اور ابو حنیفہ الدینوری قابل ذکر ہیں۔

محمد بن علی نیشاپور کی مشہور رصدگاہ کا متولی تھا، جسے طاہری خاندان کے امیر طاہر بن عبداللہ نے قائم کرایا تھا۔ ابن یونس نے اس رصدگاہ کی ایک دریافت کا حوالہ دیا ہے: یہ ۲۳۰ھ میں "استواء خریفی" کے وقت کا تعین تھا، جو ۲۰ ربیع الاول کو دوپہر کے وقت واقع ہوا تھا۔

الماہانی ہندسہ کے ساتھ ہیئت میں بھی دستگاہ رکھتا تھا۔ ابن یونس نے اس کے فلکی مشاہدات کا ذکر کیا ہے، جو اس نے ۲۳۹ھ سے ۲۵۲ھ ہجری تک کیے تھے۔

محمد بن احمد بن یوسف السمرقندی رصدگاہ سمرقند کا متولی تھا، جہاں حسب تصریح ابن یونس اس نے ۲۵۰ھ میں "وسط شمس" کی تحقیق کی تھی۔

سلیمان بن عصمہ بلخ کی رصدگاہ کا متولی تھا، جہاں اس نے ۱۱۶۵ سکندری (مطابق ۲۵۲ھ) میں فلکی مشاہدات کرکے ان کو "زیج النیرین" میں مدون کیا تھا۔ اس نے علم المثلثات میں "ساحۃ ذوات المزامی" کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا تھا، اور ایک رسالہ (اس نے یا شاید ابوجعفر الخازن نے) ان مسائل پر بھی تحریر کیا تھا، جو "حل تعدیلات" میں کام آتے تھے۔

ابو حنیفہ الدینوری: اپنے عہد کا بڑا فاضل تھا۔ ادب، مذہبیات، حساب اور ہندسہ وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتا تھا، وہ عربوں کے دیسی علم النجوم کا ماہر خصوصی تھا اور اس موضوع پر اس کی کتاب "الانواء" بقول عبدالرحمٰن الصوفی بڑی مستند سمجھی جاتی تھی۔ اس کی رصدگاہ اصفہان میں تھی، جہاں اگلی صدی میں عبدالرحمٰن الصوفی نے بویہی وزیر ابن العمید کی معیت میں اسے دیکھا تھا۔

معتضد باللہ کے جانشینوں کے زمانہ میں حکومت کا ضعف و انحلال شروع ہو گیا، یہاں تک کہ ۳۳۴ھ میں عراق میں آل بویہ کا اقتدار قائم ہو گیا، اور خلفاء کی حیثیت محض وظیفہ خواروں کی سی رہ گئی۔
لیکن اس عہد زوال میں ایک مشہور ہیئت داں خاندان کی ہیئتی سرگرمیوں کا تذکرہ ملتا ہے، یہ خاندان بنو اماجور کا تھا، جنھوں نے ۲۸۵ھ سے ۳۲۱ھ تک فلکیاتی مشاہدات کیے تھے، اور انھیں اپنی زیچ میں قلمبند کیا، جس کا نام "بدیع" تھا۔

قرامطہ اور نجوم و ہیئت کی ترقی: خلافت کے ضعف و انحلال میں سب سے زیادہ حصہ قرمطی یا باطنی تحریک نے لیا، جس نے نصف صدی تک پوری اسلامی دنیا میں اپنے ظلم و ستم اور قتل و غارت سے تہلکہ ڈال دیا تھا، بایں ہمہ اس کی وجہ سے فلسفہ و حکمت کو عموماً اور نجوم و ہیئت کو خصوصاً غیر معمولی ترقی ہوئی، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

باطنیت ایک خفیہ تحریک تھی، جو اسلام کی بیخ کنی اور ایرانی سلطنت کے بحال کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی، مگر اس میں اور بھی اسلام کے مخالف عناصر مثلاً یہود، صابئہ حران، اور فلاسفہ بھی شامل ہو گئے تھے، اس لیے شروع ہی سے باطنیوں کا رجحان فلسفہ و حکمت کی طرف تھا، اس طرح ان کی آئیڈیالوجی فلسفیانہ بنیادوں پر استوار ہوتی رہی، چنانچہ اس تحریک کے اولین بانی عبداللہ بن میمون القداح، محمد بن الحسین زیدان، حمدان قرمط اور ابوسعید الجنابی وغیرہم فلسفہ اور نجوم کے ماہر تھے۔

لیکن نجوم و ہیئت کے ساتھ باطنیوں کے غیر معمولی شغف کا سبب یہ افواہیں تھیں کہ ستاروں کی پیشین گوئی کے مطابق اب (تیسری صدی ہجری کے خاتمہ پر) مسلمانوں کا دین اور عربوں کی حکومت ختم ہونے والے ہیں، اور ان کی جگہ ایرانی سلطنت اور مجوسی مذہب بحال ہوں گے۔ مجوسیت پسند نجومیوں نے اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت تیسری صدی کا اختتام بتایا تھا، اور یہی وہ وقت ہے جب معتضد کے نالائق جانشینوں کے زیر حکمرانی عباسی خلافت دم

توڑ رہی تھی، اس لیے اسلام بیزار حلقوں میں اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا، پہلے محمد بن الحسین زیدان کو اپنے متعلق مغالطہ رہا کہ وہ اس انقلاب کو برپا کرنے کا رلائٹ گو، اس کے مرنے پر ابو سعید الجنابی اس خوش فہمی کا شکار ہوا، مگر ۳۱۵ھ بخیر وخوشی گزر بھی گیا اور یہ پیشین گوئی جو پوری ہونا تھی، نہ پوری ہوئی۔

ان پیہم مایوسیوں کے دو ہی نتیجے ہو سکتے تھے۔ یا تو احکام نجوم کی اصابت سے یقین اٹھ جائے، یا ان مسلسل تکذیبوں کو نجومی حساب کی غلطی کا نتیجہ سمجھا جائے، چنانچہ ایران کی نجوم پرست طبیعت نے اسے نجومی حساب کی غلطی ہی پر محمول کیا، اور ہیئتی مشاہدات وحسابات میں صحت اور دقتِ نظر کی ضرورت کا احساس بڑھنے لگا۔ اور اسی احساس نے چوتھی صدی ہجری کو اسلامی علم ہیئت کا عہدِ زرین بنا دیا۔

اسلامی ہیئت کا عہدِ زرین چوتھی صدی

چوتھی صدی کے سیاسی انتشار نے ایک بغداد کے متعدد "بغداد" بنا دیے تھے۔ اور ہر "بغداد" نجوم وہیئت کی سرپرستی میں سرگرم کار تھا:

۱۔ سامانیۂ خراسان (۲۶۱ھ–۳۸۹ھ) اس دربار کے مشاہیر فضلائے ریاضی وہیئت میں ابو جعفر الخازن اور محمد بن عبد العزیز الہاشمی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ابو جعفر الخازن (زمانہ قریب ۳۵۰ھ) "الزیج الصفائح" کا مصنف تھا، جو علم ہیئت کی مشہور اور اہم کتابوں میں شمار ہوتی تھی، اس نے "المجسطی" کی شرح بھی لکھی تھی، اور علم المثلثات الکرویہ میں "شکل قطاع" کے بارے میں بھی تحقیقات کی تھیں۔ ممکن ہے حل تعدیلات پر بھی رسالہ لکھا ہو۔

محمد بن عبد العزیز الہاشمی نے "زیج خوارزمی کی تعلیل" لکھی تھی۔

۲۔ بویہیۂ فارس۔ آل بویہ تین بھائی تھے، بڑا بھائی عماد الدولہ فارس میں تھا، اس نے مرتے وقت (۳۳۸ھ) اپنے بھتیجے عضد الدولہ کو اپنا جانشین بنایا، عضد الدولہ ۳۳۸ھ میں باپ کی وفات کے بعد بغداد پر بھی قابض ہو گیا۔ جہاں ۳۶۷ھ میں وہی ملک بنا ہوا۔ وہ نجوم میں عبد الرحمٰن الصوفی اور ابن الاعلم کا شاگرد تھا۔ اس کے دربار کے مشہور ہیئت داں حسب ذیل تھے۔

کوشیار بن لبان: "زیج بالغ" "زیج جامع" اور "مجمل الاصول" کا مصنف ہے۔
علم المثلثات الکرویہ میں وہ پہلا شخص ہے جس نے شکل ظلی کو اس نام سے موسوم کیا۔

احمد بن عبدالجلیل السجزی۔ مسلمانوں میں پہلا شخص ہے جو بطلیموس کے ارض مرکزی
نظریہ کے بالمقابل گردش ارضی کا قائل ہوا۔ اسی اصول پر اس نے اپنا "اصطرلاب زورقی"
بنایا تھا۔ علم المثلثات الکرویہ میں اس نے شکل قطاع پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی۔

شریف ابن الاعلم: عضد الدولہ کا منجم خصوصی تھا، وہ اسی کے کہنے کے مطابق کام
کرتا تھا اس کی زیج ابن الاعلم (بلکہ قاضی زادہ رومی شارح چغمینی) کے زمانہ تک اس
فن کا شاہکار سمجھی جاتی تھی۔

عبدالرحمن الصوفی (المتوفی ۳۷۶ھ) "صور الکواکب" کا مصنف ہے۔ جو آج بھی
علم الثوابت کی مہات کتب میں شمار ہوتی ہے۔

۲۔ بویہیہ بغداد۔ عضد الدولہ کے بعد پہلے اس کا بیٹا صمصام الدولہ اور پھر دوسرا شرف الدولہ
تخت نشین ہوئے۔ شرف الدولہ نے ۳۷۸ھ میں کواکب سبعہ کی سیر و گردش کا مشاہدہ کرنے
کے لیے رصدگاہ مامونی کے انداز پر بغداد میں ایک اور رصدگاہ بنوائی۔ رصدبندی کا کام ختم
ہونے پر دو محضر تیار کرائے گئے جن پر ہیئت دانوں کے علاوہ اعیان دربار نے بھی دستخط
ثبت کیے تھے۔ مشہور ہیئت داں حسب ذیل تھے۔

ابوسہل ویجن بن رستم الکوہی: شرف الدولہ کی رصدگاہ کا منتظم اعلیٰ تھا۔ علم ہیئت کے علاوہ
وہ آلات رصدیہ کی تیاری سے بھی واقف تھا۔

ابوحامد الصاغانی: شرف الدولہ کی رصدگاہ میں جو آلات استعمال کیے گئے تھے ان میں
سے اکثر ابوحامد صاغانی ہی کے بنائے ہوئے تھے۔ اس نے ربع مشرقی کی مدت دریافت
کرکے اس کا ثبوت دیا تھا کہ اوج شمس متحرک رہتا ہے۔

ابوالوفا البوزجانی (المتوفی ۳۸۸ھ) علم ہیئت میں دنیا کے مشاہیر فضلا میں

شمار ہوتا ہے۔ قمر کے "اختلاف ثالث" کی دریافت جس کا شرف ٹیکو براہے کو دیا جاتا ہے، درحقیقت ابوالوفا ہی کا کارنامہ ہے۔ علم المثلثات الکرویہ میں وہ متفقہ طور پر "شکل ظلی" کا موجد ہے۔ اور شاید "شکل مغنی" (Sine Theorem) بھی اسی کی دریافت ہے۔

۴۔ بویہیہ رے: رے کا پہلا بویہی تاجدار رکن الدولہ تھا، اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوتی رہی تا آنکہ عضد الدولہ کی وفات پر فخر الدولہ یہاں کا بادشاہ ہوا۔ ہیئت و نجوم کی سرپرستی میں رے کا دربار بھی دوسرے درباروں سے پیچھے نہ تھا۔ اس کے مشہور ہیئت داں یہ ہیں:

ابن العمید: پہلے بویہی تاجدار رکن الدولہ کا وزیر تھا۔ مختلف علوم کے ساتھ علم الہیئت میں بھی کمال رکھتا تھا۔ جب تصریح البیرونی اس نے آفتاب کا میل کی دریافت کرنے کی کوشش کی تھی۔

ابو محمود الخجندی: فخر الدولہ کے دربار کا سب سے مشہور ہیئت داں تھا۔ اس نے "سدس فخری" نام کا ایک Sextant بنا کر فخر الدولہ کے نام پر معنون کیا تھا۔ علم المثلثات الکرۃ کے سلسلے میں اس نے امیر ابو نصر بن عراق کی کوششوں سے واقف ہوئے بغیر "شکل مغنی" کو دریافت کیا تھا، اور اس کا نام "قانون الہیئۃ" رکھا تھا۔

۵۔ بویہیہ اصفہان: فخر الدولہ کی بیوی سیدہ نے اصفہان کی حکومت اپنے ماموں زاد بھائی ابو جعفر کاکویہ کو دی تھی، جو بڑا متعصب شعوبی تھا۔ اس میلان کی بنا پر شیخ بو علی سینا جو اسمٰعیلی تحریک کا خاموش مگر سرگرم کارکن تھا، اس کے دربار میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

شیخ بو علی سینا فلسفہ اور طب کے علاوہ ہیئت میں بھی کمال رکھتا تھا، کتاب الشفا کے جزو ہیئت میں "اختلاف منظر" کی بحث میں اس نے دس شکلوں کا اضافہ کیا اور آخر فن میں ایسی چیزیں بڑھائیں جن کا اس سے پہلے کسی کو خیال بھی نہیں آیا تھا۔ علاء الدولہ کے ایما سے اس نے اپنے شاگرد ابو عبیدہ جوزجانی کے زیر اہتمام ایک رصدگاہ بھی قائم کی

جن کے ذریعہ بہت سے نئے انکشافات کیے، مگر کثرت اسفار کی وجہ سے رصدگاہ جلد جلد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی تھی، اس لیے خاطرخواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے طول البلد دریافت کرنے کا ایک طریقہ بھی معلوم کیا تھا۔

۲۔ **شاہانِ خوارزم**: اس وقت خوارزم کے دو حصے تھے، مشرقی حصہ میں قدیم شاہی خاندان جو اس زمانہ میں آلِ عراق کہلاتا تھا، حکمراں تھا، مغربی حصہ کے حکمراں امیر کہلاتے تھے، مگر بعد میں وہ لوگ مشرقی حصہ پر بھی قابض ہو گئے اور یہاں کے فضلا جرجانیہ (مغربی خوارزم) ہی میں چلے گئے۔ ان میں دو فاضل بہت زیادہ مشہور ہیں:

امیر ابونصر بن عراق، آلِ عراق کا شاہزادہ تھا۔ وہ مہندسین و منجمین اسلام میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ابونصر بن عراق البیرونی کا استاد تھا جس کے لیے اس نے متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ مگر اس کا مشہور کارنامہ "اکرمانالاؤس" کی اصلاح ہے۔ علم المثلثات الکرویہ میں اس کی سب سے درخشاں دریافت "شکل مغنی" ہے، جو عہد حاضر میں Sine Theorem کہلاتی ہے۔ ہیئت میں اس نے "المجسطی الشاہی" تصنیف کی تھی اور ابوجعفر الخازن کی "زیج الصفائح" کی تصحیح بھی کی تھی۔

ابوریحان البیرونی: مسلمان ہیئت دانوں میں جو شہرت البیرونی کو نصیب ہوئی شاید ہی کسی دوسرے کو ہوئی ہو۔ "کتاب الہند" کے علاوہ جو نویں دسویں صدی عیسوی کے ہندستان کی مذہبی و معاشرتی اور علمی و فکری تاریخ کا واحد ماخذ ہے۔ وہ "قانون مسعودی" اور "کتاب التفہیم" کا بھی مصنف ہے۔ ان کے علاوہ بھی اس نے متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ البیرونی کی "قانون مسعودی" اسلامی علم الہیئت کا نمائندہ شاہکار ہے۔

البیرونی جوانی میں عبدالجلیل السجزی کے اصطرلاب سے متاثر ہو کر گردش ارضی کے نظریہ کی جانب میلان رکھتا تھا، مگر بعد میں اپنے استاد ابونصر بن عراق کے رسالہ "فی القسی الفلکیہ" کو پڑھ کر پھر ارض مرکزی نظریہ کی جانب رجوع کر لیا، جیسا کہ "قانون مسعودی" سے ظاہر ہوتا ہے۔

البیرونی ہی نے ہندوستان کی تاریخ میں سائنٹفک علم الہیئت کا آغاز کیا۔ اس نے

یہاں کے بہت سے شہروں کا طول البلد اور عرض البلد دریافت کیا۔ لیکن سب سے زیادہ اہم میدا ارضی کی پیمائش ہے، جو سرزمین ہند میں اپنی نوعیت کا پہلا اور دنیا میں تیسرا تجربہ تھا۔ (دوسرا تجربہ مامون الرشید نے کرایا تھا)

۷۔ اسمعیلیہ مصر: مصر کے اسماعیلی خلفا، باطنیہ فلسفہ و حکمت بالخصوص نجوم و ہیئت کے دلدادہ تھے، چنانچہ العزیز باللہ کے ایما سے ابن یونس نے فلکیاتی مشاہدات کرنا شروع کیے اور اس کے بیٹے الحاکم بامراللہ کے عہد میں انھیں ختم کر کے "الزیج الکبیر الحاکمی" کے نام سے مدون کیا جو دنیا کی مشہور ترین زیجوں میں سے ہے۔

اسی زمانہ میں مصر کا دوسرا مشہور ہیئت داں ابن الہیثم تھا۔ اس نے ہیئت اور اعمال رصد پر بھی متعدد کتابیں لکھیں مگر وہ علم المناظر کے لیے زیادہ مشہور ہے۔

۸۔ اندلس بھی علم و حکمت اور نجوم و ہیئت کی سرپرستی میں پیچھے نہیں رہا۔ یہاں کے فضلائے ہیئت میں سب سے جلیل القدر مسلمہ بن احمد المجریطی تھا، جو بقول قاضی صاعد اندلسی اپنے وقت میں اندلس کے ریاضی دانوں کا امام اور فلکیات میں سرآمد فضلائے روزگار تھا۔ اس نے البتانی کی زیج کے ابواب متعلقہ تعدیل کواکب کا اختصار کیا تھا، اور خوارزمی کی زیج کو ازسرنو مرتب کیا تھا، اور یہاں نے فارسی تاریخ کے عربی تاریخیں استعمال کی تھیں۔ اس کے شاگردوں میں ابن السمح اور ابن الصفار مشہور تھے، یہ دونوں سدھانت (السند ہند) کے پیرو تھے۔

۹۔ لیکن نجوم و ہیئت کے اس عہد زریں میں صرف ایک دربار، اس علم کی سرپرستی سے خالی ملتا ہے، وہ محمود غزنوی کا دربار ہے، حالانکہ بقول ابن الاثیر وہ علما و فضلا کو گھیر گھیر کر اپنے دربار میں لاتا تھا۔ اس کی وجہ اس کا سیاسی حزم و احتیاط تھا: نجوم و ہیئت کے ساتھ اعتقاد قرامطہ کا مخصوص شعار تھا، جن کی تخریبی سرگرمیوں سے پورا عالم اسلام لرزہ براندام تھا، محمود بھی ان سے غافل نہ تھا۔ اس لیے وہ کس طرح ان گہواروں کی سرپرستی کر سکتا تھا جو قرمطی تخریب پسندوں کے مرکز تھے۔ محمود کی اسی قرامطہ بیزاری کا نتیجہ تھا کہ اس نے فردوسی کو اس کی امید کے مطابق شاہنامہ

کا صلہ نہیں دیا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے البیرونی کو صحیح پیشین گوئی کرنے پر کوٹھے سے نیچے پھنکوا دیا۔ لیکن اس کی وفات پر اس کے بیٹے مسعود نے اس فن کی سرپرستی کی۔ چنانچہ البیرونی نے قانون مسعودی مسعود ہی کے نام پر معنون کی ہے۔

پانچویں صدی۔ عہد سلاجقہ مسعودی کے آخری زمانہ میں سلاجقہ اس کے ملک اور علم خراسان پر قابض ہو گئے۔ ۴۴۷ھ میں انھوں نے بغداد پر بھی قبضہ کر لیا اور بویہی خاندان کو ختم کر کے خود امیر الامراء بن گئے۔ گو سلجوقیوں کو نہ تو ایرانیوں کی احیائیت پسندی (Romanticism) سے ہمدردی تھی اور نہ وہ اتنے متمدن تھے کہ علم ہیئت کی سرپرستی کرتے۔ بایں ہمہ انتظامی ضرورتوں کے پیش نظر انھیں بھی ہیئت کے ساتھ اعتنا کرنا پڑا۔

یہ ضرورت خراج کی ادائیگی کے وقت تعین کی تھی۔ معتضد باللہ عباسی نے تیسری صدی کے آخر میں نوروز کی اصلاح کی تھی، جسے دو سو سال ہو رہے تھے۔ اس لیے اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، اس لیے ۴۶۷ھ میں ملک شاہ سلجوقی اور اس کے وزیر نظام الملک کے حکم سے اصفہان میں ایک رصدگاہ قائم کی گئی جس میں ملک کے مشاہیر ہیئت داں جمع ہوئے۔ مثلاً عمر خیام (جو بقول زکریا قزوینی اس رصدگاہ کا متولی تھا) ابوالمظفر اسفزاری، میمون بن نجیب الواسطی، ابوالعباس اللوکری، محمد بن احمد المعموری وغیرہم۔ اس رصدگاہ کا سب سے بڑا کام نوروز کا تعین تھا، جو ۴۷۱ھ میں ۱۰ رمضان کو واقع ہوا۔ اس کے علاوہ تقویم شمسی کی بھی اصلاح کی گئی اور اسی کی بنیاد پر ہندوستان میں عہد اکبری میں خراجی سال کا تعین کیا گیا۔

رصدگاہ ملک شاہی بقول ابن الاثیر ۴۸۵ھ میں ختم ہو گئی مگر ابھی عمر خیام اور ابوالمظفر اسفزاری وغیرہ زندہ تھے، ان کے فیض تربیت سے دوسرے لوگوں نے ہیئت و فلکیات کے کام کو بعد میں جاری رکھا۔ ان میں دو شخص زیادہ مشہور ہیں۔

عبدالرحمن الخازن: جو اسکونیات کی مشہور کتاب "میزان الحکمہ" کا مصنف ہے، علم ہیئت میں اس نے "زیج سنجری" تصنیف کی تھی۔

بہاءالدین ابومحمد خرقی: حسب تصریح بیہقی، اس نے علم ہیئت میں متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ جن میں "التبصرہ" زیادہ مشہور ہے۔

ساتویں صدی ہجری۔ یورش تاتار | ساتویں صدی ہجری تاریخ اسلام کا انتہائی پرآشوب دور ہے۔ اس زمانہ میں تاتاریوں نے تنہا قصر خلافت ہی کو منہدم نہیں کیا، بلکہ علم وحکمت کے اس چراغ کو بھی بجھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جو چھ سو سال سے جنوبی مغربی ایشیا میں روشن تھا۔

مگر اس ثقافت بیزاری کے باوجود تاتاریوں کو نجوم و ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی اور انکے خاندان میں منگو قاآن اس فن کا بڑا شائق تھا۔ اسے رصدگاہ قائم کرنے کا بھی شوق تھا، چنانچہ اس نے جمال الدین محمد بن طاہر بن محمد الراوندی کو بلاکر یہ کام سپرد کیا۔ مگر اس سے اس کی تکمیل نہ ہوسکی، کچھ دن بعد خواجہ نصیرالدین طوسی کے فضل وکمال کی شہرت سنی، اس لیے جب اس نے ہلاکو کو الموت کی تسخیر کے لیے بھیجا تو اس سے خواہش کی کہ محقق طوسی کو رہا کرا کے دربار میں بھیجدے مگر ہلاکو نے ان کے علم وفضل سے متاثر ہوکر انھیں اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ جب ۶۵۶ھ میں ہلاکو تسخیر بغداد سے فارغ ہوا تو محقق طوسی نے اسے مراغہ (تبریز) میں رصدگاہ قائم کرنے کی ترغیب دی اس کام کے لیے فضلائے مہندسین و ماہرین ہیئت جیسے موید الدین عرضی، نجم الدین کاتبی، فخرالدین مراغی، فخرالدین اخلاطی، محی الدین مغربی اور قطب الدین شیرازی وغیرہم بلائے گئے اور شہر مراغہ کے شمال میں ایک بلند ٹیلے پر مجوزہ رصدگاہ قائم ہوئی۔

رصدگاہ کا کام ۶۵۷ھ میں شروع ہوا، طوسی کے مشورے سے ہلاکو نے اس رصدگاہ پر بیدریغ روپیہ خرچ کیا۔ لیکن ابھی کام مکمل نہیں ہونے پایا تھا کہ ہلاکو نے وفات پائی۔ (۶۶۳ھ)۔ اس کے بعد بھی کام جاری رہا تا آنکہ ۶۷۲ھ میں محقق طوسی نے بھی وفات پائی۔

مگر وہ زیج (زیج ایلخانی) کو اپنی زندگی ہی میں مرتب کر چکا تھا۔ زیج ایلخانی کے علاوہ اس نے "المجسطی" کو بھی "تحریر المجسطی" کے نام سے ایڈٹ کیا۔ اور بھی کتابیں ہیئت میں لکھیں جن میں "تذکرہ"، "رسالہ معینیہ" اور "بست باب" زیادہ مشہور ہیں۔

محقق طوسی کے رفقائے کار میں سب سے بڑے ماہر فن ان کے شاگرد قطب الدین شیرازی تھے، وہ بھی اس فن میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں دو کتابیں زیادہ مشہور ہیں، "نہایۃ الادراک فی درایۃ الافلاک" اور "تحفۂ شاہیہ"۔

اگلی دو صدیوں میں کوئی بڑا ہیئت داں پیدا نہیں ہوا، اگرچہ اس زمانہ میں بھی ہیئت کے ساتھ اعتنا باقی رہا، مگر یہ "تحریر المجسطی" اور "تذکرہ" کے شرح و تحشیہ تک محدود تھا۔ ان میں نظام الدین اعرج کی شرح مشہور ہے۔ البتہ اسی زمانہ میں محمود بن عمر الجغمینی نے "ملخص فی الہیئۃ" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا جس کی شرح قاضی زادہ رومی نے کی۔ بعد میں یہ "شرح جغمینی" ہیئت کی درسی کتاب کی حیثیت سے عرصہ تک ہندوستان و ایران کے اندر متداول رہی۔

نویں صدی۔ رصدگاہ سمرقند | تاتاریوں کی طرح تیموری مغلوں کو بھی نجوم و ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی۔ تیمور (المتوفی ۸۰۷ھ) کا درباری منجم عبداللہ بن مولانا لسان الدین تھا، شاہرخ کے دربار میں استاد قوام الدین معمار نجوم میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے لیکن بذات خاص اس علم سے دلچسپی شاہرخ کے بیٹے الغ بیگ (ﻣ ۸۵۳ھ) کو تھی، اس نے اپنے زمانہ شہزادگی ہی میں ۸۲۳ھ میں سمرقند میں ایک عظیم الشان رصدگاہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس رصدگاہ کا پہلا متولی اس نے غیاث الدین جمشید کاشی کو مقرر کیا، ان کی وفات پر قاضی زادہ رومی کو اسکی تولیت سپرد ہوئی۔ اور ان کے انتقال پر رصدگاہ کا انتظام بادشاہ نے اپنے شاگرد رشید مولانا علاء الدین علی قوشچی کے سپرد کیا،

رصدگاہ سمرقند کے مشاہدے کو "زیج جدید سلطانی" (زیج الغ بیگ) میں مدون کیا گیا۔

غیاث الدین جمشید کاشی نے لکھا ہے کہ "خسوفات قمر کو ہم نے خود رصد کیا ہے۔ اور انہی مشاہدات کی بنا پر قمر کے اوساط و تعدیلات کی تصحیح کی ہے۔ باقی کواکب کے باب میں ہم نے محقق طوسی کی "زیج ایلخانی" پر اعتماد کیا ہے۔ جمشید کاشی نے "زیج جدید" کے علاوہ اصطرلاب پر بھی ایک رسالہ "طبق المناطق" لکھا جس کی بعد میں "نزاہۃ الحدائق" کے نام سے شرح کی۔

قاضی زادہ رومی کی "شرح چغمینی" کا ذکر اوپر آچکا ہے جو اس صدی کے ثلث اول تک ہمارے مدارس کے نصاب میں شامل تھی۔

مولانا قوشجی نے رصد گاہ الغ بیگ کی تولیت کے فرائض انجام دینے کے علاوہ "اشکال قمریہ" پر بھی ایک رسالہ لکھا تھا۔ اور فن ہیئت میں ایک رسالہ بعنوان "رسالہ فتحیہ" لکھا، جو ہمارے ملک میں عرصہ تک "رسالہ قوشجیہ" کے نام سے داخل درس رہا ہے۔ اکثر علماء نے اس پر شروح لکھیں جن میں مولانا وجیہ الدین گجراتی کی شرح مشہور ہے۔

عہد آخر | عجم میں الغ بیگ کے بعد کسی بادشاہ نے نجوم و ہیئت کی سرپرستی کی اور نہ کوئی صف اول کا ہیئت داں پیدا ہوا، صرف درسی طور پر ہیئت کا رواج رہا۔ یا بعض علماء نے پچھلی کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ ان شراح میں عبدالعلی برجندی کا نام خاص طور سے مشہور ہے، انھوں نے "تحریر المجسطی"، "تذکرہ" اور "زیج الغ بیگ" کی شروح لکھیں۔ ان کے علاوہ "آلات رصدیہ" پر بھی ایک مبسوط رسالہ لکھا۔

گیارھویں صدی کے علمائے ایران میں شیخ بہاء الدین عاملی کا نام مشہور ہے، وہ ایک شیعی عالم تھے اور ریاضی و ہیئت میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انھوں نے ہیئت میں ایک مختصر رسالہ "تشریح الافلاک" کے عنوان سے لکھا، یہ رسالہ اس حیثیت سے اہم ہے کہ بعد میں اسکے ساتھ ہندوستان میں خاصہ اعتنا کیا گیا۔

عجم میں تو ہیئت و فلکیات کی ترقی بند ہو گئی مگر ہندوستان میں اٹھارھویں صدی تک بڑی شان سے جاری رہی لیکن اس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہے۔

••

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
RECENT PUBLICATIONS

Title	Price
Collected Works of Prof. S. H. Askari	10 00
Amir Khusrau : as a Historian (Second Volume of Prof S H. Askari's collected works)	25·00
Islam & Muslims in Medieval Bihar (Third volume of Prof S. H. Askari's collected works)	25 00
Medieval Bihar—Sultanate and Mughal Period (Fourth Volume of Prof S. H Askari's collected works).	25 00
An Overview of Sufi Literature in the Sultanate Period by Dr. Bruce B Lawrence	10 00
Maktub and Malfuz Literature, as a Source of Socio-Political History . by Prof S H. Askari	10 00
The Hindu-Muslim Syndrome; Islam & the Modern World (Problems & Prospects) : by Badr-ud-Din Tyabji	10·00
Islamic Studies by Dr Md Zubayr Siddiqi	10 00
Muslim Thought in a Changing World : by Prof S Vahiduddin	10 00
The Middle East by Prof Asaf Ali Asghar Fyzee	10·00
Interfaith Dialogue by Dr A Roest Crollius S J	5·00
Islam and Indian Culture by Mr B N Pande	15·00
An Introduction to the Khuda Bakhsh Oriental Public Library by V C Scott O'connor	10 00
Khuda Bakhsh (Biography) : by Mr S. Khuda Bakhsh & Sir Jadunath Sarkar	10 00
Mughal Art of Miniature Painting, at its Climax : Reproduction of a few Paintings of Akbar's period (from Tarikh-i-Khandan-i-Timurya)	15·00
India's Rich and V[illegible]able Contribution to Persian Literature by Prof S A H. Abidi	10.00
Tolerance, Democracy & Economics in Islam ; by Prof Jamal Khwaja	20·00
Reconstruction of Islamic Chronology : by Dr Hashim Amir Ali	10 00
Book Publishing in India : by Mr Abul Hasan	10 00
Malfuz Literature as a Source of Political, Social & Cultural History, Gujarat & Rajasthan in 15th Century ; by Dr Z A Desai	15·00
क़ौमी एकता की परम्पराएं : विशम्भर नाथ पाण्डे	5·00
औरंगज़ेब एक नई दृष्टि : ओम प्रकाश प्रसाद	15·00
राष्ट्रीय आन्दोलन और मौलाना आज़ाद : [illegible]	60 00
भाषा के मुग़लकालीन कवि [illegible] के बारे	10·00
18वीं शताब्दी के हिन्दुस्तानी मुहावरों का एक दुर्लभ कोष : [illegible] देहलवी	10·00
[illegible] का यू० पी० कांग्रेस में उद्घाटन भाषण 1907	15·00
मौलाना अबुल कलाम आज़ाद की याद में :	15·00

ڈاکٹر فواد سیزگین
ترجمہ : ڈاکٹر خورشید رضوی

تاریخ طب میں عربوں اور مسلمانوں کا مقام

غالباً نادرست نہ ہو گا اگر ہم کہیں کہ تاریخ طب تاریخ علوم کا سب سے پرانا شعبہ ہے۔ چونکہ قدماء اور متأخرین سب یہ بات کہتے چلے آئے ہیں لہذا یہ ایک امر معروف ہے۔ تاہم تاریخ طب کی محض قدامت اس مفروضے کی صحت کی ضامن نہیں کہ تاریخ علوم میں یہ شعبہ صحت و انصاف کے بھی قریب تر رہا ہے۔ بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس کی قدامت ، حقیقت سے اور بھی انحراف نیز اس

شعبے میں پیدا ہونے والی غلطیوں کوتاہیوں اور تعصبات کی تصحیح میں مشکلات کا باعث بنی ہے۔

تین اصول ایسے ہیں جو آغاز ہی سے تاریخ طب کو بنیادی رنگ فراہم کرتے چلے آ رہے ہیں اور ان کے اثرات ہم آج تک محسوس کرتے ہیں وہ یہ ہیں :

۱ ۔ دریافت میں اوّلیت کا اصول جسے یونانیوں نے πρώτης εὑρετής کا نام دیا

۲ ۔ غلط تاریخ ، خواہ سہواً ہو یا ازروئے تعصّب۔

۳ ۔ اسلاف سے نادرست احکام اخذ کرنا اور پھر اُن کی تکرار۔

پہلی صدی عیسوی میں یونانیوں کے ہاں آغاز سے ، نیز یورپ میں چودھویں صدی عیسوی سے لے کر سترھویں صدی کے اواخر تک، تاریخ طب کا یہی حال رہا ہے۔

علم طب کو تمام اقوام کی مشترک میراث تصور کرتے ہوئے اس کے ارتقاء سے متعلق اوّلین حقیقت پسندانہ اور بےلاگ موقف ساتویں صدی ہجری کے ابن ابی اصیبعہ کی ,,کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطباء،، کی صورت میں ملتا ہے کہ اسی نے طب کے ماضی کا بنی نوع انسان کی عمومی تاریخ کے تناظر میں جائزہ لیا اور وضاحت سے کہا کہ طب وہ میراث ہے جو کل بنی آدم کی مطلوب و مقصود ہے اور ہر قوم کا اس میں حصہ ہے۔ (۱)

طب کی عمومی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا اس میراث میں جو حصہ طے کیا گیا ہے اسے قرین صواب و انصاف تصور نہیں کیا جا سکتا آج کی گفتگو میں اس سے زیادہ کچھ ممکن نہ ہو گا کہ ماضی میں مسلمانوں نے علم طب کے میدان میں جس قدر رسائی حاصل کی اس میں سے چند امور کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اس

سے ایک تاثر ضرور مل سکے گا کہ مسلمانوں نے جس طرح دیگر سب علوم میں اپنا کردار ادا کیا اسی طرح اس میدان میں بھی ان کا کردار اہم رہا ۔

اس خطبے میں میری کوشش یہ ہو گی کہ پہلے ان کے بنیادی کام سامنے لاؤں اور پھر ان کے انجام دیئے ہوئے عمومی کاموں کی مثالیں پیش کروں جن کی فروع بہت وسیع ہیں ۔

مسلمانوں نے جب دیگر اقوام کے طبّی سرمایۂ علمی کو اخذ کرنا شروع کیا تو ابتدائی طور پر یہ صرف دو شعبوں تک محدود تھا : دوا سازی اور وہ عملی طب جو بحیرہ روم کے طاس کی حدود میں مہذب حلقوں میں رائج تھی کیونکہ اسلام کی آمد سے قبل نظری طب عمومی طور پر اپنا مقام کھو چکی تھی خصوصاً لاطینیوں کے ہاں ۔ اور یہ نتیجہ تھا عوامی اور اساطیری طب کے غالب آ جانے کا ۔

اس اعتبار سے ہمیں نظری طب کے احیاء کو قرون وسطیٰ کی تاریخ طب کا سب سے اہم مظہر تصور کرنا ہو گا ۔ کیونکہ نظری طب کا احیاء ۔ جو ایک طرف جالینوس کی کتابوں میں اور دوسری طرف بقراطی طریق علاج کو اپنانے کی صورت میں (جس کی اساس اس امر پر تھی کہ مریض کے بستر کے پہلو میں بیٹھ کر اس کا مشاہدہ کیا جائے) ، نقطۂ عروج کو پہنچا ۔ میری رائے میں بذات خود ، تاریخ طب میں مسلمانوں کے لئے ایک باعزت مقام کے اعتراف کے لئے کافی تھاخواہ ان کا کام صرف اسی [احیــاء کے] مظہر تک محدود ہوتا ۔ تاہم منصّۂ تاریخ پر جلوہ گر ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کسی قوم کے ہاں ایسے مظہر کا وجود ہی یہ بشارت دینے کے لئے کافی ہے کہ اگر وہ قوم فوری طور پر بعض تاریخی حوادث کا شکار نہ ہو گئی تو اس میدان میں اور بہت سے اہم نتائج بھی ظاہر ہو کر رہیں

گے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میدان کی اہم ترین کامیابی جسے مسلمانوں کے حق میں ریکارڈ پر آنا چاهئیے یہ ہے کہ وہ طب کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کی شناخت کر سکے اور بہت جلد انہوں نے دونوں کے درمیان توازن کا ایک عنصر مقرر کر لیا اور پھر اس اصول کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھایا ۔

اس ضمن میں دوسری صدی ھجری کے اواخر کے ایک عرب طبیب کا یہ قول لائق توجّہ ہے :

„ دوا اسی وقت ممکن ہے جب مرض کو سمجھ لیا جائے ۔ مرض کی نشاندھی وہ اولین سبب مطلوب ہے ، جس کے حصول سے منتہائے مقصود یعنی شفائے امراض کا حصول ممکن ہوتا ہے اور یہی فن طب کی غرض ، غایت ہے ۔ اگرچہ طب ان فنون میں سے ہے جو علم کے ساتھ ساتھ عملی پہلو پر بھی مشتمل ہے ۔ اور جب کوئی فن ان دونوں پہلوؤں ۔ یعنی علمی و عملی پہلو ۔ پر مشتمل ہو تو لازم ہے کہ علمی پہلو عملی پہلو پر مقدّم ہو کیونکہ علم کے بغیر عمل ممکن نہیں “ (۲)

یہ اہم اصول جو صرف طب تک محدود نہیں بلکہ دیگر علوم کو بھی محیط ہے تسلسل کے ساتھ نشوونما پاتا رہا اور „نظریہ اور تجربہ “ کی ارتقاء پذیر اصطلاحات کے تحت علم طب کا ایک اساسی رکن بن گیا ۔ (۳)

اکثر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ عرب اطباء ، اھل یونان کے سعادت مند شاگردوں سے زیادہ کچھ نہ تھے نیز یہ کہ یونانی اطبا کے رسوخ سے آزاد ہونا یا ان پر تنقید کی جسارت کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہو سکا ۔

اس طرح کا حکم جو بار بار لگایا جاتا ہے نہ صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا جو تحریری سرمایہ ہم تک پہنچا ہے اس کا تتبع نہیں کیا گیا بلکہ ایک اہم اصول سے ناواقفیت کا بھی پتہ دیتا ہے جو تاریخ علوم میں بحثیت عمومی مسلمان اور عرب علماء کی وساطت سے متعارف ہوا ۔ یہ تنقید میں اخلاقی رویے کا اصول ہے۔ مراد یہ ہے کہ ارتقائے علوم کا واضح تصور رکھنے کے سبب وہ لوگ تنقید میں انصاف ، راست بازی اور احتیاط کے پابند رہے ۔

رہا تنقید کا وہ پہلو جو قدماء کی فروگزاشتوں کی تصحیح سے عبارت ہے سو وہ مسلمان علماء کے ہاں ، مختلف میدانوں میں ، دوسری صدی ھجری ھی سے نظر آتا ہے۔ یہاں میں طب کے میدان میں بعض مثالوں کی طرف اشارہ کروں گا ۔ ایک مثال وہ[تبصرہ] ہے جو دواؤں کی قوتوں کے سلسلے میں جالینوس کی مقرر کردہ ترتیب سے متعلق جابر بن حیان کے ہاں ملتا ہے۔

چنانچہ جابر نے کہا ہے کہ جالینوس کے ہاں دواؤں کی قوتوں کی ترتیب نامعتبر ہے۔ کیونکہ اس نے فقط حس پر بھروسہ کیا ہے جبکہ کیفیت غالبہ یا کمترین قوت کی تعیین محض احساس کے ذریعے ممکن نہیں ۔ خواہ تمام اعضائے حس اس سلسلے میں یکجا ھی کیوں نہ ہو جائیں ۔ دواؤں کی قوتوں اور اثرات کو دقیق ریاضیاتی سطح پر ضبط میں لانا ضروری ہے ۔ (۴) مسلمانوں کی علمی تاریخ کے اس ابتدائی دور میں جالینوس اور دیگر علماء سے جابر بن حیان کی تنقید (۵) بعض اوقات ایسی شدت بھی اختیار کر جاتی ہے جس سے متأخرین نے پرہیز کیا ۔ جابر کے بعض اقوال یہ ھیں :

,,اور جالینوس نے اس سلسلے میں سخت غلطی کی ہے ،،

,,یہ سخت اور زبردست ناواقفیت کی بات ہے جیسا کہ

جالینوس نے اپنی کتاب ,,منافع الاعضاء ،، میں بیان کیا ہے ۔

,,جالینوس نے مسئلہ نفس پر ایسی ہی رائے کا اطلاق کیا ہے ۔ وہ التباس و تخلیط کا شکار ہے اور نہیں سمجھ سکا کہ اس سلسلے میں کیا کہا جائے ۔ ،،

,,جالینوس نے اس مقام پر وہ غلطی کی ہے جو ضرب المثل بن گئی ہے ،، (٦)

تقریباً ایک صدی بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اسلوب تنقید نے ایک کامل ، پختہ اور معتدل صورت اختیار کر لی ہے اور مسلمانوں نے متعدد ایسی کتابیں تالیف کر لی ہیں جن کا عنوان ہی فلاں یا فلاں پر ,,شکوک،، ہے ۔ مثلاً الرازی کی ,,کتاب الشکوک ،، میں ہم جالینوس کے متعلق اس کا موقف دیکھ سکتے ہیں ۔ رازی طب کو ایک فلسفیانہ علم کی حیثیت دیتا ہے جس میں ۔ بالخصوص اساتذہ کی جانب سے ۔ محض اٹکل سے ٹامک ٹوئیاں مارنے کی گنجائش نہیں ہے ۔ اور اخلاقی و فلسفیانہ آداب کا تقاضا یہ ہے کہ اساتذہ کے احترام کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات پر شک کا موقف بھی اختیار کیا جائے ۔ رازی ارسطو سے منسوب اُس قول سے استشہاد بھی کرتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمیں افلاطون اور حقیقت دونوں عزیز ہیں لیکن جہاں دونوں میں اختلاف پایا جائے وہاں حقیقت ہمیں عزیز تر ہے ۔ رازی کہتا ہے کہ جہاں تک جالینوس کی غلطیوں کا تعلق ہے ، ممکن ہے کہ ان میں سے بعض بے احتیاطی یا بھول چوک یا ظن و تخمین کے سبب سے ہوں ۔ لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جنہیں قانون ارتقائے علوم کے باعث قبول نہیں کیا جا سکتا ۔ اور جو شخص کسی نئی شے کا اضافہ کر سکتا ہے وہی اسلاف کی علمی رسائی سے مکمل واقفیت رکھتا ہے ۔ (٧) اس سلسلے میں بہترین بات علی بن العبّاس

المجوسی نے اپنی کتاب ,,کامل الصناعة ،، کے مقدمہ میں کھی ہے جو اس کے ھاں قانون ارتقاء کے واضح تصور نیز ان توقعات سے متعلق ایک تاثر مہیا کرتی ہے جو اساتذہ سے وابستہ کی جانی چاھئیں ۔ وہ بقراط اور جالینوس پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بقراط کی کتابیں ابہام کی حد تک مختصر ھیں اور جالینوس کی کتابوں میں اس کے برعکس طول کلام اور بہت زیادہ تکرار ہے ۔ بعد کے یونانیوں مثلاً اریباسیوس[Oribasius/Oriebasius] اور باولس [Paulus](8) کی کتب میں بہت کچھ نقص و خلل ملتا ہے ۔ رھیں رازی کی کتابیں جو اپنے زمانے کا سب سے بڑا طبیب تھا وہ بھی اپنی کتاب ,,الحاوی ،، میں تکرار سے دامن نہیں بچا سکا ۔ یہ کتاب بحیثیت مجموعی عملی طب سے متعلق ہے اور جمع و تالیف سے عبارت ہے جس میں بسا اوقات ربط کا فقدان ہے ۔ الغرض علی بن العباس کی رائے میں کوئی بھی کتاب ایسی نہیں ملتی جسے کامل کہہ سکیں اور اپنے دور تک اسے کہیں مناسب علمی طریق کار نظر نہیں آیا ۔

ان کے ھاں (۹) عمل ارتقاء کے سعور ، علم طب ہر ان کے مسلسل کام ، اور اس کام میں صدیوں تک اطباء کی ایک بڑی تعداد کی سرکت کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہوں نے کئی بار علم طب کا تعارف پیش کیا ، اس کے مختلف شعبوں کی درجہ بندی کی اور ایسی حوالے کی کتابیں تالیف کیں جو اسلاف کی کتب سے بہتر تھیں ۔ یہاں قدرتی نتائج کی طرف بھی ایک اشارہ مناسب ھو گا جو انہوں نے اس میدان میں حاصل کئے مثلاً مکمل اور باقاعدہ شفاخانوں نیز فن دوا سازی کی تنظیمات کی تشکیل و ترویج جن کی تفصیل میں میں نہیں جانا چاھوں گا ۔ اس وقت میں مسلمان اور عرب اطباء کے چند ایسے کارنامے پیش کرنا چاھوں گا جو تحقیق سے ثابت ھو چکے ھیں ۔

دوسری اقوام کے ہاں جو کچھ علم طب موجود تھا اسے اخذ کرنے کا عمل مسلمانوں کے ہاں پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا۔ ان کے اولین ترجمے طب عملی اور دواسازی سے متعلق تھے۔ دوسری صدی ہجری کے اواسط میں انہوں نے اہم طبی کتب مثلاً بقراط اور جالینوس وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ شروع کیا۔ عرب اطباء کی کتابوں کے مطالعے نیز دیگر مآخذ کی معلومات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ دیگر اقوام کے علم طب سے اخذ و اکتساب کا عمل تیسری صدی ہجری کے وسط تک مکمل ہو چکا تھا۔ اب ہمارے لئے یہ جاننا ممکن نہیں کہ اس دور میں عرب اطباء کو کس حد تک یہ احساس تھا کہ وہ اپنے یونانی اساتذہ کے بعد طب نظری میں کوئی نئی چیز پیش کرنے پر قادر ہیں۔ غالباً اس زمانے میں اس میدان میں ان کی تمام تر کوششیں قدماء کی کتابوں کی ترتیب و تلخیص، تنظیم اور انہیں بہتر انداز میں پیش کرنے تک محدود تھیں۔ حنین بن اسحاق کی کتابیں اس عمل کی بہترین مثال تصور کی جاتی ہیں۔

آج نظری طب کے میدان میں مسلمانوں کے جو اہم ترین اور واضح ترین اضافے ہمارے علم میں ہیں، جن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب اطباء تازہ کار اور تعمیری کردار رکھنے والے تھے، وہ آنکھوں کے علاج سے متعلق ہیں۔

اس میدان میں دو تصورات جن کی بڑی اہمیت ہے ابوبکر رازی (وفات تقریباً ۳۰۰ ہجری) کے ہاں ملتے ہیں۔ رازی پہلا طبیب تھا جس نے یہ رائے قائم کی کہ آنکھ کی پتلی اس میں داخل ہونے والی روشنی کی نسبت سے سکڑتی اور پھیلتی ہے۔ اس سے بھی اہم اس کی یہ دریافت تھی کہ دیکھنے کا عمل کسی شعاع کے آنکھ سے نکل کر دیکھی جانے والی چیز کی طرف جانے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اصل

صورت حال اس کے عین برعکس ہے کیونکہ شعاع اس چیز سے آنکھ
کی طرف آتی ہے۔ یہاں وہ اقلیدس [Euclid] کو رد کر رہا ہے (۱۰) طب
کے میدان میں بصارت کے مسئلے پر آخری تصحیح جس میں جالینوس
کے خیالات کو رد کیا گیا ، ابن سینا کے ہاں سامنے آئی ۔ تاہم وہ
شخص جس نے بصارت کی ان جدید توضیحات کا فیزیائی سطح پر
ثبوت فراہم کیا ، پانچویں صدی ھجری کے اوائل میں ، ابن الھیثم تھا۔

بینائی کے مسئلے کو سلجھانے کے ضمن میں مسلمانوں کے ہاں اس
کے بعد جو پیش رفت ہوئی وہ بہت دور رس تھی ۔ خصوصاً ساتویں
صدی ھجری میں کمال الدین الفارسی کے ہاں کیونکہ یہ شخص
بینائی کے مسائل حل کرتے ہوئے بعض ایسے نتائج تک پہنچ گیا جن
تک رسائی کہیں انیسویں صدی عیسوی میں آ کر ہوئی ہے۔

تاریخ طب پر بعض کام کرنے والے جو حقیقی تاریخی ادراک سے
محروم ھیں ، تاریخ پر روایتی زاویہ نگاہ سے حکم لگاتے ہوئے ، عربوں
کو یونانیوں کی تقلید کا الزام دیتے ھیں اور دلیل یہ لاتے ھیں کہ عرب
اطباء نے چار اخلاط پر قائم پیتھالوجی کے اصول کو برقرار رکھا ۔
یعنی سودا صفرا ، بلغم ، خون کی ہم آہنگی اور امتزاج ۔ یہ درست ہے
کہ عرب اطباء نے یہ بقراطی نظام اخذ کیا اور اس پر قائم رہے لیکن
ھمیں یہ بھی دیکھنا چاھئیے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ان
اطباء نے بہت سے امراض کی خصوصی توجیہات تک رسائی حاصل
کر لی تو عملاً اس نظام کی اھمیت ختم ہو گئی ۔ یہاں میں اس کے
شواھد کے طور پر چند حقائق پیش کرتا ہوں۔ ابو الحسن الطبری نے
چوتھی صدی ھجری میں یہ دریافت کیا کہ خارش کا سبب خارش کا
کیڑا ہوتا ہے۔ رازی چھوت سے لگنے والے فحمی بخار :,,ایرانی بخار،،
(؟) سے واقف تھا اور اس نے اس ,,دود مدنی ،، (؟) کی مکمل طور

پر نشان دھی کی ہے جو جلد کی داخلی بافت پر قابض ہو جاتا ہے[11]
ابن سینا کا قول تھا کہ مقامی سرطان ، جملہ اعضاء پر مسلط ہونے والے عام سرطان کا پتہ دیتا ہے۔ اس کی رائے تھی کہ تپ دق متعدی مرض ہے اور ممکن ہے کہ سورج کی شعاعیں تپ دق کے مریض کے لئے نقصان دہ ہوں۔ سوزش دماغ کے ضمن میں اس کا خاص نظریہ نہایت اہم تصور کیا جاتا ہے کیونکہ وہ پوری صحت و وضاحت کے ساتھ سوزش دماغ کو سمجھتا ہے نیز اس میں اور دیگر سوزشوں میں فرق کرتا ہے۔

چوتھی صدی هجری میں ابوالقاسم الزهراوی کے هاں همیں دموی امراض کا ایک مفصّل بیان ملتا ہے اور هم دیکھتے هیں که وہ جوڑوں کی سوزش اور ریڑھ کی هڈی کی دق پر بھی توجّه دیتا ہے۔

آئندہ صدی یعنی پانچویں صدی هجری میں هم دیکھتے هیں که عبدالملک ابن زهر وضاحت کے ساتھ ان اورام سے واقفیت رکھتا ہے جو سینے کو تقسیم کرنے والے پردے (۱۲) کو لاحق هوتے هیں اسی طرح غلاف قلب کے اورام [Pericarditis] (۱۳) سے بھی اسے واقفیت ہے۔ ابن زهر پہلا طبیب تھا جس نے غذا کی نالی [Gullet] کے مفلوج هو جانے کی صورت میں سانس کی نالی کو کھولنے نیز غذا کی نالی یا مبرز [Rectum] کی راہ سے مصنوعی طور پر غذا رسانی کی تجویز پیش کی۔ وہ بہت سے اور امراض کی بھی بڑی وضاحت سے نشان دھی کرتا ہے جن میں معدے کا سرطان بھی شامل ہے۔ (۱۴)

شاید پیتھالوجی یعنی علم اسباب الامراض میں سب سے اعلی مرحله جس تک عربوں نے رسائی حاصل کی چھوت کا قانون دریافت کرنے کا مرحله تھا ۔ اس ضمن میں لسان الدین ابن الخطیب (المتوفی ۷۷٦ھ) اپنی کتاب ,,مقنعة السائل عن المرض الهائل،، (۱۵) میں کہتا ہے :

,,سو اگر کہا جائے کہ ہم چھوت کے دعوے کو کیونکر تسلیم کر لیں جبکہ شرع میں اس کی نفی آتی ہے تو ہم کہیں گے کہ چھوت کا وجود تجربہ ، استقراء ، حِس ، مشاہدہ اور مسلسل اطلاعات سے ثابت ہے اور ان سب پر اس دلیل کی بنیاد ہے۔جو کوئی اس مسئلے پر غور کرتا ہے یا اسے اس کا ادراک حاصل ہے اس سے مخفی نہیں رهتا کہ جو بھی اس مرض کے مریض سے براہ راست رابطہ رکھتا ہے اکثر و بیشتر ہلاک ہو جاتا ہے اور جو نہیں رکھتا وہ بچ جاتا ہے اسی طرح کسی کپڑے یا برتن کے سبب سے پورے گھر یا محلے میں مرض پھیل جاتا ہے حتی کہ کان کی بالی جس نے پہن لی اس نے اسے ختم کر دیا اور پورے گھر کا صفایا کر دیا اِسی طرح یہ کہ مرض کسی سہر کے ایک گھر میں پیدا ہوتا ہے اور پھر اکا دکا ملنے جلنے والوں اور پھر ان کے پڑوسیوں میں پھیل جاتا ہے ... (۱٦)

ایسا ھی تاثر اس کے معاصر احمد بن علی بن خاتمہ نے قائم کیا۔ ابن الخطیب اس بات سے بھی واقف تھا کہ چھوت کے اثر نیز اس کی تیزی کا درجہ جسم انسانی کے احوال پر منحصر ہے۔

غلط نہ ہو گا اگر ہم یہ کہیں کہ چھوت کے اس قانون کی دریافت مسلمانوں کے ھاں عملاً اس یونانی پیتھالوجی کے مکمل زوال سے عبارت تھی جس کا انحصار تصور اخلاط پر تھا ۔ K. Sudhoff نے یورپ میں وباء و طاعون کے مظاہر پر تحقیق کر کے جب یہ وضاحت کی کہ چھوت کا تصور یورپ میں چودھویں صدی عیسوی سے پھیلنا شروع ھوا تو بیسویں صدی کے اوائل سے مورّخین علمِ طب چھوت کے قانون کی دریافت کو تاریخ طب کا ایک اھم مرحلہ تصور کرنے لگے۔ یہاں اس بات پر حیرت نہ کرنی چاھئیے کہ تاریخ طب کا ایک

مؤرخ (۲۲) ۱۹۲۳ء میں اس موضوع کو پیش کرتے ہوئے اس بات سے کیونکر ناواقف ہے کہ مستشرق M. Müller نے ابن الخطیب کی کتاب کا ترجمہ کر کے ۱۸۶۳ ء میں شائع کر دیا تھا ۔ نیز یہ کہ یوروپین اطباء نے بلاشبہ یہ تصور اپنے عرب اساتذہ سے اخذ کیا جیسا کہ اور بہت سے افکار اور معلومات کا حال ہے۔

اگر ہم چند الفاظ میں مسلمان اور عرب اطباء کے ہاں تشریح الاعضاء کے موضوع کا جائزہ لینا چاہیں تو ہمیں سب سے پہلے اس غلط رائے کا ذکر کرنا ہو گا جس کی رو سے اسلام نے انسانی بدن کی چیر پھاڑ کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اور اس میدان میں مسلمان علماء نے جو کچھ پیش کیا وہ دیگر اقوام کے پیش روؤں سے ماخوذ تھا ، خود انہوں نے اس سلسلے میں کوئی نئی چیز پیش نہیں کی ۔ کئی ایک محقّقوں نے اس پُرانے موقف کا جو علم طب کے اکثر مورخین کے ہاں ملتا ہے ، جواب دیا ہے اور علم التشریح پر رازی ، علی بن العباس المجوسی ، اور ابن سینا وغیرہ کی تحریروں کی طرف بطور خاص اشارہ کیا ہے۔

معاصر محققین میں سے H. Shipperges کو ہی لیجئے ، اس نے ابوبکر رازی کی کتاب ,,الطب المنصوری ،، کو علم التشریح پر اوّلین مکمل کتاب قرار دیا ہے۔ اس کتاب کا کئی بار ترجمہ ہوا اور کئی شرحیں لکھی گئیں اس کتاب کے بعد علی بن العبّاس المجوسی کی کتاب ,,کامل الصناعة ،، سامنے آتی ہے۔ اس میں علم التشریح پر سینتیس باب ہیں جن کی پیشکش انتہائی منظم و مرتب ہے۔ یہ کتاب حسن ترتیب نیز موضوع کے دائرے کی وسعت میں رازی کی کتاب پر فوقیت رکھتی ہے۔ علم التشریح پر علی بن العباس کی اس پیشکش سے قبل ابن سینا کی کتاب ,,القانون ،، میں بھی اس موضوع

پر کچھ مواد ملتا ہے سابق کی یہ سب کوششیں وہ بنیاد تصور کی جاتی ھیں جس پر ابن النفیس نے اپنی تحقیقات کو آگے بڑھایا ۔ کیونکہ وہ ,,القانون ،، کی شرح کرتے ہوئے کمال کو پہنچا اور دوران خون صغیر [Lesser Circulation of Blood.] دریافت کر کے اس نے چوٹی تک رسائی حاصل کر لی ۔

وہ سارا قصہ تو یقیناً آپ کے علم میں ہو گا کہ دمشق میں طویل اقامت کے بعد اطالوی عالم Andreas Alpagus ابن النفیس کی شرح کو پاڈوا [Padua] لے گیا اور اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا ۔ ھسپانیہ کے Michel Servetus نے اسی ترجمے پر انحصار کیا اور شہرت حاصل کی ۔ اس کی ,,دریافت ،، اسی مواد تک محدود تھی جو اسے ابن النفیس کی کتاب میں ملا ۔ موجودہ صدی کے ربع اول کے اختتام سے لے کر ربع ثالث تک صورت حال یہی رہی ۔

عبداللطیف البغدادی کو لیجئے جس کی وفات ۶۲۹ هجری میں ہوئی اور جس کا زمانہ ابن النفیس سے تقریباً نصف صدی پہلے کا ہے ۔ اس نے قاھرہ کے نواح میں استخوانی ڈھانچوں پر تحقیق میں شہرت پائی ۔

یہ حقیقت اس پر واضح ہو چکی تھی کہ جالینوس اور دیگر اطبا کا نچلے انسانی جبڑے کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں کہ وہ دو ٹکڑوں سے عبارت ہے ۔ یہ جبڑا ایک ھی ھڈی پر مشتمل ہے جس میں کوئی جوڑ نہیں ۔ عبداللطیف بغدادی نے وضاحت کی ہے کہ اس نے حقیقت حال کا ثبوت فراھم کرنے کے لئے تقریباً دو ہزار کھوپڑیوں کا معائنہ کیا ۔ اسی طرح اس نے یہ ثابت کیا کہ کلائی کی اگلی ھڈی ایک ھی ٹکڑے سے عبارت ہے اس سے زیادہ نہیں جیسا کہ جالینوس نے خیال ظاھر کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ جو دلائل ھم نے اپنے خاص اور

ذاتی ذرائع سے حاصل کئے ہیں وہ مشہور قدماء کے اقوال پر انحصار کرنے سے زیادہ شرح صدر کا باعث ہیں۔

فطری سی بات تھی کہ علم التشریح میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام، علم جراحت [Surgery] پر بھی ان کے عبور کی راہ ہموار کرتا۔ اس شعبے میں بھی یونانی اطباء کی معلومات نیز ان کے ہاں مستعمل آلات کی تفصیل ان تک پہنچی۔ لیکن مسلمان جرّاح و طبیب اس میدان میں طریق کار، عملی تجربے، نیز آلات کی تعداد، اقسام اور ترقی کے اعتبار سے اپنے اساتذہ پر سبقت لے گئے۔ ابو القاسم الزہراوی جس کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا ہے اپنے زمانے تک علم جراحت کے بلند ترین مرحلۂ ارتقاء کی نمائندگی کرتا ہے، اگرچہ عمومی اعتبار سے وہ اس میدان میں مسلمانوں کے نقطۂ عروج کا نمائندہ نہیں تیس ابواب پر مشتمل اس کی کتاب ,,التصریف،، کا تقریباً نصف حصہ جراحت سے مخصوص تھا۔ یہ کتاب بارھویں صدی عیسوی میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئی اور اس کا وہ حصہ جو جراحت سے خاص تھا وسعت پا کر ایک مستقل کتاب کی شکل اختیار کر گیا۔ اسی لاطینی ترجمے کی بنیاد پر عصر حاضر میں تاریخ طب کے لئے یہ معلوم کرنا ممکن ہو سکا کہ چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں کے ہاں طب کس اعلی سطح تک پہنچ چکی تھی۔

تاریخ طب نے الزہراوی کی کتاب کے جو امتیازات قرار دیئے ہیں میں انہیں شمار نہیں کرنا چاھتا۔ صرف یہی کہنے پر اکتفاء کرتا ہوں کہ بعض اہم جراحی عمل جو بعض بڑے ڈاکٹروں سے منسوب کئے جاتے ہیں، زہراوی کی کتاب میں موجود تھے۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک، بڑی نسوں سے خون بہنے کی روک تھام کا عمل ہے جس میں سولھویں صدی کے فرانسیسی جرّاح [Ambroise Pare] نے

شہرت پائی ۔ اسی طرح فن تولید [Obstetrics]میں وہ طریقہ جو جرمن طبیب Walcher (المتوفی ۱۹۳۵ء) سے منسوب ہے اور ,,وضع والھر ،، Walcher Position کہلاتا ہے ۔ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ وہ زخموں کی سلائی کے مختلف طریقوں سے واقف تھا اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ جو طریقہ Freiedrich Trendelenburg (المتوفی ۱۹۲۴ء) کی نسبت سے ,,ٹرنڈلنبرگی،، کہلاتا ہے وہ بھی ابوالقاسم الزّھراوی کے ھاں معروف تھا ۔

یورپ کا پہلا نمایاں جرّاح جو یورپ میں زھراوی اور دیگر جرّاحوں کے پیرو کی حیثیت سے سامنے آیا اور وھاں عربی فن جراحت کو فروغ دیا ، Guy de Chauliac ہے جس کی وفات ۱۳۶۳ ع میں ھوئی۔ یہاں میں حود پر لازم سنجھتا ھوں کہ مختصراً جراخت چشم کے میدان میں مسلمان اور عرب اطباء کے مقام کی طرف اشارہ کروں کیونکہ ھمیں اکثر تاریخ طب میں ایک ایسی رائے سے سابقہ پڑتا ہے جو سراسر غلط ہے ۔ اور وہ یہ کہ عرب اطباء صرف جراحت چشم میں ترقی یافتہ تھے ۔ یہاں غلط ھونے سے میری مراد بحیثیت مجموعی علم الجراحت میں عرب اطباء کے مقام کا اعتراف نہ کرنا ہے ۔

جراحت چشم میں عرب اطباء کی مہارت نے جو شہرت پائی اس کا حقیقی سبب اس شعبے کی خوش نصیبی تھی کہ اسے Julius Hirschberg جیسا زبردست عالم میسر آ گیا جس کا شمار طب چشم کے مشہور ترین مورخین میں ھوتا ہے اور جس کو عربی/اسلامی طب کے اس شعبے کا مطالعہ گہرائی اور انصاف کے ساتھ کرنے کی توفیق نصیب ھوئی ۔ پھر اس نے اس کا اھل یونان کی معلومات نیز آخری چند صدیوں میں طب کی اس شاخ کی کیفیت سے ٹھوس موازنہ کیا ۔

Hirschberg نے جو اہم تحقیقات پیش کیں ان کی تفصیل میں جانا
یہاں ممکن نہ ہو گا ـ اسی پر اکتفاء کرتا ہوں کہ بعض ایسی معلومات
کی طرف اشارہ کرتا چلوں جن تک چوتھی صدی ھجری کے عمّار
الموصلی نے رسائی پائی ـ Hirschberg کا کہنا ہے کہ : ,,عمّار کی کتاب
میں جو پہلو سب سے زیادہ قابل داد ہے وہ اس کے چھ مختصر
بیانات ھیں جو بڑے مکمل اور زندگی سے بھر پور انداز میں دیئے گئے
ھیں اور اس کے خاص جراحی تجربوں سے متعلق ھیں ـ یہ بہت بڑی
حد تک جدید قاری کی دل چسپی کا باعث بنتے ھیں ـ یونانی ورثے
میں ھمیں اس سے مشابہ کوئی شے قطعاً نہیں ملتی ـ بعد کی صدیوں
میں ایسے دل نشین بیانات جو کمال اہتمام اور باریکی کے ساتھ
عمل جراحی کا بیان فراہم کریں ، انیسویں صدی کی ابتداء سے قبل
کہیں نہیں ملتے ،، (۱۸) Hirschberg اس موقع پر ذکر کرتا ہے کہ عمّار
الموصلی ھمیں ایسے عمل ھائے حراجی کا بیان فراہم کرتا ہے جو اس
نے مختلف علاقوں میں انجام دیئے اور ان علاقوں میں امراض چشم کی
کیفیات پر روشنی ڈالتا ہے ـ Hirschberg ، عمّار کے ان کارناموں کا ذکر
جغرافیہ کتا راکتیبہ (۱۹) (Star — Geographic) مرتّب کرنے کی کوشش کے
دوران کرتا ہے ـ

,,اہم ترین چیز جو ھمیں عمّار الموصلی کے ہاں ملتی ہے وہ دھات
کی بنی ہوئی اُس کی ایک خود ساختہ ، اندر سے خالی ، سوئی کے
ذریعے چوس پھینکنے کے طریقے سے موتیا بند کا مکمّل آپریشن ہے
اس کی کتاب میں ایک اور اہم بات ، بینائی کو محفوظ رکھتے ہوئے
قزحیّہ چشم [Iris] کو نکال دینا ہے ـ حقیقت یہ ہے کہ اھل یونان اور
عمّار کے عرب پیش رو یہ آپریشن کر چکے تھے لیکن انہوں نے اسے
خوبصورتی پیدا کرنے کی غرض سے استعمال کیا تھا ، بینائی کے لئے

نہیں " ۔ Hirschberg عمّار کی شخصیت کی مدّاحی میں کہتا ہے کہ
"وہ ان اطباء میں سے ایک تھا جن کی مثال تاریخ میں بہت کم پیدا
ہوتی ہے " ۔

اب تک میری کوشش یہ رہی ہے کہ بعض شعبوں میں ، عالم
اسلام کی سنہری تاریخ میں ، علم طب کا جو معیار رہا ہے اس کی
چند مثالیں پیش کروں حفظان صحت کے شعبے نیز طب ، ادویہ اور
مریضوں کی غذاؤں سے متعلق تصانیف میں عرب اطباء کے ہاں جو
معیار ملتا ہے ، اس کی طرف یہاں اشارہ نہیں کیا گیا ۔ تاہم اتنا کہہ
دینا کافی سمجھتا ہوں کہ پیش رفت عمومی نوعیت کی تھی اور طب
کے تمام شعبوں میں تھی ، یہ مزید عرض کر دوں کہ مسلمانوں کے ہاں
علمی پیش رفت صرف طب تک یا علم کی کسی اور شاخ تک محدود
بھی نہ تھی بلکہ قانون ارتقائے علوم ـــ یعنی یہ کہ علم کا کسی ایک
معیّن شعبے میں ترقی کرنا ممکن نہیں جب تک کہ علوم کے دیگر
شعبوں کی ترقی اس کے پہلو بہ پہلو جاری نہ ہو ـــ کے مطابق علوم
کے تمام گوشوں پر محیط تھی ۔

یہی وہ علم طب ہے جو بیزنطہ [Byzantium]، اٹلی اور سسلی ، کی
راہ سے نیز باہمی انسانی روابط کے ذریعے چوتھی صدی ہجری سے
لاطینی دنیا میں پہنچنا شروع ہوا ۔ عربی کتابیں لاطینی دنیا میں
ترجموں اور سرقوں کے ذریعے نیز بعض حالات میں مشاہیر اہل یونان
سے منسوب ہو کر ، پھیل گئیں ۔ اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں
چنانچہ حنین بن اسحاق کی "کتاب العین " ، اسحاق بن عمران کی
"کتاب المالینخولیا " اور ابن الجزار کی "کتاب الباہ " وہ کتابیں
ہیں جو صدیوں تک یورپ میں جالینوس روفوس اور سکندر طرالیسی
[Alexander of Tralles] کی تصانیف کی حیثیت سے متداول رہیں ۔

تاریخ کی نیرنگیوں میں سے ایک یہ ہے کہ الجزائر کے ایک عرب تاجر نے طب کی عربی کتب کو لاطینی دنیا مین منتقل کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ۔ یہ معروف شخص جس کا نام قسطنطین الافریقی تھا ، اس کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا وہ عیسائی تھا یا اپنے راھب دوستوں کی مدد سے ستّر کے قریب طبّی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کرنے کے بعد عیسائی ہو گیا ۔

یہ وسیلہ گویا طبّ جدید کا سر چشمہ تھا جو اھل یورپ کے لئے پھوٹ پڑا ۔ اس کام کی تکمیل اٹلی کی ایک خانقاہ میں ہوئی جہاں بہت سی کتابوں کو جو عرب اطباء کی تالیف تھیں اھل یونان سے یا خود قسطنطین سے منسوب کر دیا گیا ۔

یہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ تاریخ طب کا یہ مرحلہ شاید سب مراحل سے بڑھ کر تصحیح کا محتاج ہے ۔ یعنی یہ کہ طب کا جو مرحلہ ، مرحلۂ احیاء کہلاتا ہے وہ عربی و اسلامی علوم سے اخذ و اکتساب کے عمل کو یونانی کتب کا ترجمہ قرار دینے کے علاوہ بہت سے تاریخی حقائق سے انکار اور چشم پوشی کا بھی مرتکب ہوتا ہے۔

اسی غلط تاریخ نویسی کی ایک مثال یہ ہے کہ مؤرخین طب تیرھویں یا چودھویں صدی عیسوی کی بعض شخصیات کو یورپ میں طب جدید کے اوّلین علمبردار خیال کرنے کے عادی ہو چکے ھیں حالانکہ درحقیقت یہ لوگ اپنے عرب پیش رووں کے مقابلے میں کوئی بھی نئی چیز پیش کرنے سے قاصر رھے ۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ بس اتنا تھا کہ موٹی موٹی نئی کتابیں تالیف کر دیں جن کا مواد انھوں نے عربی کتابوں کے ترجموں سے نکالا تھا ۔

مستشرقین میں سے بعض محقّقین نے اس حقیقت کا بیان ایک اصولی قدم کے طور پر کر دیا ہے ۔ اب لازم ہے کہ عربی/ اسلامی

تہذیب سے نسبت رکھنے والے اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کریں۔ تاہم یہ کام ایک بلند علمی اور معروضی سطح پر انجام دیا جانا چاہئے جو تعصّب اور سرسری پن سے پاک ہو۔

حواشی

۱۔ EDITH HEISCHKEL, Die Geschichte der Medizingeschichtsschreibung, in: W. ARTELT, Einführung in die Medizinhistorik, Stuttgart 1949, 205.

۲۔ كتاب السموم لجابر بن حيان . ۱۹۵۸م فيسبادن . ۷۷/أ۔ ۷۷/ب۔

۳ H. SCHIPPERGES, Die arabische Medizin als Praxis und als Theorie, in: Sudhoffs Archiv 43/1953/ 317-328.

۴۔ مراجع کے لئے دیکھئے:
F. SEZGIN, Geschichte des arabischen Schrifttums III, Leiden 1970, 214-215.

۵۔ جابر بن حیان: کتاب البحث . نسخه جار الله . ۹۷/ب۔

۶ P. KRAUS, Jabir b. Hayyan, Cairo 1943, II, 326-330.

۷ S. PINES, Razi critique de Galien, in: Actes du 7e Congres International d'Histoire des Sciences, Paris 1954, 480-487.

۸-"Paul of Aegina" مراد ہے (مترجم)

۹۔ یعنی مسلمانوں/عربوں کے ہاں (مترجم)

۱۰ F. SEZGIN, Geschichte des arabischen Schrifttums, III, Leiden 1970, 277.

۱۱۔ اصل عبارت یوں ہے ,,وكان الرازى يعرف الحُمّى الفحمية المعدية : الحمّى الفارسية و عرف الدود المدنى الذى تسلط على سبج الأئمة الدّاخليّة تعريفا كاملا ،،۔ خاصی کوشش کے باوجود اس کا مفہوم واضح نہیں ہو سکا ,,الحُمّى الفحمية ،، سے مراد غالباً Anthrax ہے (مترجم)

۱۲۔ غالباً Diaphragm مراد ہے (مترجم)

۱۳۔ اصل خطبے میں جرمن اصطلاح "Herzbeutelentzündung" دی گئی ہے (مترجم)

۱۴ G. COLIN, Avenzoar, sa Vie et ses Œuvres, Paris 1911 (Bull. de corr. afr. 44).

نیز اس کا مقالہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (بزبان المانوی) میں ج ۲ ، ص ۹۵۸ ، اور ابن زہر پر R. Arnaldez کا مقالہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (بزبان انگریزی) میں ج ۳ ، ۹۷۸ .

۱۵ - اسے M.MULLER نے Sitzungsberichte der königlich-bayerischen Akademie der Wissenschaften, München. 2/1863/1-34.

میں شائع کیا ۔

۱۶ - مرجع سابق ، ص ٦

وہ مزید کہتا ہے ۔

جو شخص چھوت کے دعوے کا اس بنیاد پر انکار کرتا ہے کہ مریضوں سے رابطہ رکھنے والے بہت سے لوگ باوجود یکہ بہت سے مریضوں سے ان کا قرب اور مستقل ساتھ رہا ، بچ گئے جبکہ کچھ اور لوگ جن کا مطلق رابطہ نہ تھا یا بہت کم رابطہ رہا ، ہلاک ہو گئے اس کا جواب یہ ہے کہ عوام کو یہ معلوم نہیں کہ قدرت الٰہی کے تحت سلامتی یا ہلاکت کا سبب [مرض کی] استعداد کا ہونا یا نہ ہونا ہے ۔ چنانچہ لوگ اس میّت کی آگ کے قرب میں بتیوں کے مانند ہوتے ہیں جو سرکنڈوں میں جلتی ہوئی آگ کے قریب لائی جاتی ہیں ۔ جس بتی کا جلنے تیل اور دھواں دینے سے تازہ تعلق ہوتا ہے اسے فی الفور آگ لگ جاتی ہے اور یہ اس شخص کی مثال ہے جس میں استعداد مرض وافر ہے ۔ جو بتی خشک ہوتی ہے اور آگ سے اس کا ماضی قریب میں تعلق نہیں رہا ہوتا وہ پہلی بتی کی نسبت زیادہ وقت میں نرم ہو کر کے آگ پکڑتی ہے ۔ یہ اس شخص کی مثال ہے جس کے ہاں استعداد مرض کا آغاز ہو چکا ہے ۔ اور جو بتی گیلی اور پانی کا اثر لئے ہوئے ہوتی ہے وہ بہت دیر میں جلتی ہے ۔

۱۷ P. DIEPGEN, Die Bedeutung des Mittelalters, in: Essays on the History of Medizine, London 1924, 108-112.

۱۸ - دیکھئے :
SEZGIN, Geschichte des arabischen Schrifttums III, 331.

۱۹ - ایضاً ، ص ۳۳۰



اردو ادب

اردو ادب کدھر؟

پروفیسر وہاب اشرفی



خدابخش لائبریری نے اردو ادب کے سلسلہ میں کچھ مسئلے چھیڑ رکھے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی کہ اردو ادب کدھر جا رہا ہے، کیا رخ ہے، اچھا یا برا، ساکن، صامت، جامد —— یا اظہاری، اقدامی، کیا ہے، کون اس کی اچھائی برائی کے لیے ذمہ دار ہیں، کہاں کیا ہو رہا ہے۔

اردو کے سارے پروفیسروں کے علاوہ جانے پہچانے فاضلوں کو اس موضوع پر اظہار حال کے لیے مدعو کیا جاتا رہا ہے۔ پانچ سال میں پانچ صاحبوں نے اس میں شرکت کی۔ اسی سلسلہ کا پروفیسر وہاب اشرفی کا مقالہ پیش خدمت ہے۔

—— ادارہ

پروفیسر وہاب اشرفی
صدر شعبۂ اردو
رانچی یونیورسٹی رانچی

اردو ادب کدھر؟

اردو ادب کدھر؟ میرے نزدیک اس سوال کے تین جواب ممکن ہیں۔ جمود کی طرف، زوال کی طرف، ارتقاء کی طرف۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ اردو ادب اپنی تمام صنفوں میں جامد و ساکت ہے، نئے خیالات، نئے تصورات، نئے تجربے اور نئی معنویت سے یکسر عاری ہے، تو پھر یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہوگا کہ اس کے مزاج میں تعطّل اور جمود کی کیفیت عیاں ہے۔ اگر اردو ادب زوال کی طرف مائل ہے تو اس کا یہ مفہوم ہوا کہ اس کی اکثر صنفیں نہ صرف یہ کہ اپنا معیار قائم نہ رکھ سکیں بلکہ ان سے متعلق فنکاران کی رہی سہی ساکھ بھی اکھاڑنے کے درپے ہیں۔ اس طرح کہ ان کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اردو ادب کی متعلقہ صنفیں یا ان صنفوں میں سے چند نہ صرف یہ کہ نئی اور تازہ بہ کار جہتوں سے آشنا ہو رہی ہیں بلکہ تخلیقی، فکری اور معنوی اعتبار سے ان کے اندر ایسی قوت پیدا ہو رہی ہے جو انھیں ارتقاء کی منزلوں سے ہمکنار کر رہی ہے۔ بحث کا ایک نکتہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک صنف پامال ہو گئی ہے تو دوسری نت نئے کیف و کم کے ساتھ اُبھر رہی ہے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ کوئی ایک فنکار تو بلندیوں کی طرف مائل بہ پرواز ہے لیکن مجموعی طور پر دوسرے افراد صرف خوشہ چینی میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے اندر نہ فکری بلندی ہے نہ تخلیقی قوت، نہ تجربے کا میلان۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اردو ادب مجموعی طور پر مائل بہ ارتقاء ہے۔ سوچ کی نئی لہریں اُبھر رہی ہیں۔ تخلیقی سرچشموں میں وسعت آ رہی ہے۔ تجربات اپنی متنوع شکل میں سامنے آ رہے ہیں۔ اس طرح کہ اردو ادب کی کئی صنفیں آفاقی حیثیت حاصل کرنے کی طرف راجع ہیں۔ میری یہ رائے کسی Hypothesis پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں ٹھوس دلائل دیے جا سکتے ہیں۔

سب سے پہلے شعری روایات کو سامنے رکھا جائے۔ ہماری ممتاز صنف غزل کئی پہلوؤں سے اپنے اندر وسعت اور ہمہ گیری سے ہمکنار ہو رہی ہے۔ ترقی پسندوں نے غزل کو ایک نئی سمت ایک نیا 'Dimension' ضرور عطا کیا تھا۔ یہ وہ روایت تھی جو حالی اور اقبال کے توسط سے ترقی پسند شعرا کے یہاں آئی تھی۔ اب ہم یہ کہنے لگے تھے کہ غزل نے عمومی طور پر اپنی اس روایت سے ناطہ توڑ لیا ہے، اور محض عشق و عاشقی کے فرضی قصّے اور تشبیہ و استعارے کے گھسے پٹے

انداز سے باہر نکل آئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ تنقید بھی کی جاتی رہی کہ غزل پر خارجی کیف کا دباؤ بہت زیادہ ہے اور یہ کہ ترقی پسند اپنے محور سے الگ نہیں ہوتے، دروں بینی ان کے یہاں خال خال ہے۔ جدلیاتی تصور ان پر اتنا حاوی تھا کہ وہ تصورات جنھیں ہم ذاتی اور نجی کہہ سکتے ہیں غزل میں بار نہیں پاتے۔ ہر چند کہ ایسی تنقید یک طرفہ ہے اور حقیقت پر مبنی نہیں لیکن اتنا تو سبھی تسلیم کریں گے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ممتاز شعرا نے غزل کے دامن کو فکر و آگہی کے نئے سبق بھی دیے اور اس کے کینوس کو وسیع بھی کیا۔ میری باتیں اور بھی واضح ہو سکتی ہیں اگر ہم فیض جیسے شاعر کی مثال سامنے رکھیں یا دوسری سطح پر پرویز شاہدی ہماری نگاہ میں ہوں۔ یہ دو نام میں نے یقینی دو سطح کے شاعروں سے Random samples کی طرح چن لیے ہیں۔ ایک طرف فیض احمد فیض ہیں جن کی عظمت، شہرت اور رفعت کے بارے میں بہت کم اختلاف ہے تو دوسری طرف پرویز شاہدی ہیں، جن کے فن کی تحسین ابھی تک نہیں ہو پائی ہے۔ یہاں ٹھہر کر ان دونوں شعرا کے کچھ اشعار دیکھ لیے جائیں تو بہتر ہے۔

فیض

آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے — رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں — دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

نہ خیالِ وصل نہ عرضِ غم نہ شکایتیں نہ حکایتیں — ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

دست صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی — بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

پرویز شاہدی

ان پڑھ آندھی گھس پڑتی ہے توڑ کے پھاٹک ملوں کے — "اندر آنا منع ہے" لکھ کر لٹکانے والا کیا

زلف کی طرح اس کو بس سنوارتے رہیے — زندگی کو فطرت نے خم بہ خم بنایا ہے

ان اشعار کے مطالعے سے اتنی بات تو بہت واضح ہے کہ فیض ہوں یا پرویز شاہدی لفظوں کو ان کے لغوی معنی میں استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس حد تک کہ ہر لفظ ایک تخلیقی عمل سے گزرا ہوا نیا سانچہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان دونوں شعرا نے یکسر روایت سے اپنے آپ کو الگ کر لیا ہے۔ بلکہ روایت اور انفرادیت کے ادغام سے ایک واضح شعری رویے کی تشکیل کی ہے۔ ممکن ہے کہ ان شعروں میں ذاتی آلام یا نجی انبساط کا مظاہرہ نہ کیا گیا ہو، لیکن ان میں ذاتی تجربے کی آنچ یقینی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم ترقی پسند منشور کو سامنے رکھیں تو ان کی معنویت ایک رخ اختیار کرے گی، پر اگر اس سے احتراز کریں تو پھر تفہیم کا ایک نیا باب کھل سکتا ہے۔ اچھی اور سچی شاعری کی پہچان بھی یہی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعری رویہ صرف ان دو شاعروں ہی کے لیے نہیں بلکہ دوسرے ترقی پسند غزل گو شعرا مثلاً سردار جعفری، جذبی، مجروح، تاباں، جاں نثار اختر اور کیفی اعظمی کی بھی یکساں میراث ہے۔ مجروح سلطانپوری کا یہ

خیال درست ہے کہ:

"ترقی پسندانہ تغزل ترقی پسند شاعری بلکہ ادب کے دائرے سے باہر کی چیز تو نہیں ہے بلکہ جو ذمہ داریاں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے دوسری اصناف ادب کے سلسلہ میں لے رکھی تھیں تقریباً وہی ذمہ داری اس شاعری کی بھی ہے جو ترقی پسند غزل لکھ رہا ہے۔ اس وقت ہمارے ذہنوں میں یہی بات تھی کہ وہ شعر جو ظلم کے خلاف احتجاج بلکہ کسی حد تک آویزش اور مظلوم کی طرفداری کے احساس اور شعور کے نتیجہ میں لکھا جائے، ترقی پسند شعری روایت کا حصہ ہوگا۔ یہ شعر نظم کا بھی ہو سکتا ہے اور غزل کا بھی۔ اگر نظم میں آ رہا ہے تو نظم کے صنفی لوازمات کے ساتھ آنا چاہیے اور اگر غزل میں ہے تو غزل کی ایمائیت اور استعاراتی دروبست کے ساتھ۔ ترقی پسند تغزل اس کے سوا کچھ نہیں کہ عصری احساس کا غزل کی روایت میں سمو کر اظہار کیا جائے۔ کوئی ایسا موضوع کوئی ایسا جذبہ یا احساس نہیں ہے جو ترقی پسند غزل میں نہ آیا ہو۔"

اس کے بعد غزل گوئی کا جو منظر ہمارے سامنے ہے وہ کچھ دوسری کہانی سنا رہا ہے۔ جدید یا جدید تر غزل گویوں کا مطالعہ بعض حلقوں میں ایک خاص تعصب کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تعصب زیادہ تر روایت پسند اور محدود نظریے کے حامل بعض ترقی پسند اصحاب کی فکر کا نتیجہ ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ جدید یا جدید تر غزل نے اس روایت کی توسیع کی ہے جو ترقی پسندوں کا حصہ تھی۔ کہہ سکتے ہیں کہ فکری اور معنوی سطح پر ترقی پسند ایک Satiety کی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ ان کے الفاظ کے دروبست تکرار کے باعث اپنی معنویت کھونے لگے تھے۔ یہ تکرار لفظی سطح پر بھی تھی اور فکری سطح پر بھی۔ لہٰذا اس حد سے دوسرے شاعروں کو آگے جانا ہی تھا ورنہ ان کا تخلیقی سوتا خشک ہو جاتا، اور نئے شعری رویے کی کوئی صورت ہی نہیں نکلتی۔ نیز سے زندگی کے نئے مطالبات سامنے تھے۔ یہ مطالبے فکری سطح کے بھی تھے اور تجرباتی حیثیت کے بھی۔ ایسے میں نئے سانچے کی تلاش ایک لازمی نتیجہ تھی۔ لیکن غزل کا سانچہ تو Fix تھا اب دو صورتیں ممکن تھیں۔ ایک یہ کہ شاعر غزلوں میں ان ہی استعاروں، پیکروں اور علامتوں سے کام لے جو ترقی پسندوں کے لیے مخصوص تھے یا ماضی کی طرف لوٹ جائے جہاں پہلے ہی سے یہ تمام شعری صورتیں اپنا دم خم Exploit کر چکی تھیں۔ نئے شاعروں کے لیے ظاہر ہے یہ کوئی مستحسن چیز نہ ہوتی۔ یہ بھی تھا کہ نئے شاعروں کے اپنے غم تھے، اپنی آرزوئیں تھیں، اپنے کو پہچاننے کا بھی عمل تھا، اور زمانے نے انھیں جو کچھ دیا تھا اسے آئینہ بھی کرنا تھا۔ رشتے ناطوں کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی تھی جو کبھی صالح قدر کی حیثیت رکھتی تھی۔ اجتماعی منظر نامہ بے کیف ہو چکا تھا

معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور تمدنی حقائق بدل چکے تھے۔ صنعتی اور مشینی دور نے مثبت قدروں کو پامال کر رکھا تھا Urbanization کا عمل تیز ہو چکا تھا۔ وقت کی رفتار وہ نہیں تھی جو پہلے تھی۔ ان سب کا نتیجہ یہ تھا کہ شاعر فکر کے اعتبار سے الگ ہو اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لیے لفظوں کو ایک بار پھر نئی معنویت سے ہمکنار کرے۔ نئی غزل ان ہی امور سے عبارت ہے۔ اب جب الفاظ ٹکسالی معنویت سے الگ کر دیے جائیں، استعارے کی نئی دوکان سجائی جائے، نئے تجربوں کو نئے محاوروں کی تلاش میں غلطاں کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ان کی تفہیم میں بھی ایسی آسانی نہ ہوگی جو یک لخت معنی کے سب در کھول دے۔ یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا گیا۔ اس حد تک کہ کہیں کہیں ابہام کا پردہ خاصا دبیز ہو گیا۔ ابہام کی اپنی منطق ہے، غزل کی ایمائیت تفہیم کے کڑے کو ہی طے کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ غالب جب انفرادی امتیازات کے حصول میں سرگرداں تھے تو اپنے گنجینۂ معنی کو طلسم کی سرحدوں تک لے جانے میں غیر معمولی قوت تخلیق کا مظاہرہ کر رہے تھے، جدید اور جدید تر شاعروں کے لیے بھی ضروری ٹھہرا کہ وہ اپنے امتیازات واضح کریں لہٰذا انھیں بھی اپنی قوت تخلیق کو امتحان کے مرحلے سے گزارنا تھا۔ اب جو نئی غزل سامنے آئی تو نئے نقوش کے ساتھ آئی، نئی سج دھج کے ساتھ۔ ایک طرف تو دروں بینی اس کا شیوہ بنی تو دوسری جانب خارجی امور کے احاطے کے لیے کچھ کھردرے انسلاکات بار پا گئے۔ نئی غزل نشانۂ ہدف انھیں کھردرے مظاہر کی بنا پر بنی اور بنتی ہے۔
یہ عام احساس ہے کہ کوئی بھی صنف شاعری کرختگی کی متحمل نہیں ہو سکتی، لیکن یہ بھی بات سوچنے کی ہے کہ وہ احساسات جو سبک نہیں، نازک نہیں، ان کے لیے وہی لب و لہجہ اختیار کرنا پڑے گا جو ان کی حقیقی تصویر پیش کر دے۔ غالباً بعض شعرا کے یہاں کرخت لب و لہجے کا یہی جواز ہے۔ چند اشعار دیکھیے ؎

اتار پھینکوں بدن سے پھٹی پرانی قمیض
بدن قمیض سے بڑھ کر کٹا پھٹا دیکھوں (محمد علوی)

چاروں طرف بریکیں لگیں ہارن بج اٹھے
رستوں کے بیچوں بیچ وہ لڑکی ٹھہر گئی (بشیر بدر)

ہر لمحہ خوفناک ہے، ہر وقت حادثہ
ہم لوگ کر رہے ہیں سفر بائدان پر (احمد تبسم)

چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں کچھ بولتے نہیں
بچے بگڑ گئے ہیں بہت دیکھ بھال سے (عادل منصوری)

سڑک پہ چلتے پھرتے دوڑتے لوگوں سے گھبرا کر
کسی چھت پر مزے سے بیٹھے بندر دیکھ لیتا ہوں (محمد علوی)

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے (پروین شاکر)

کردار قتل کرنے لگے لوگ یوں کہ ہم
اپنے ہی گھر میں بیٹھ کے آوارہ ہو گئے (شمس الرحمٰن فاروقی)

دیکھیں تو ہاتھ باندھے کھڑے تھے نماز میں
پوچھو تو دوسری ہی طرف اپنا دھیان تھا (عادل منصوری)

یہ آوازیں مانوس نہیں ہیں۔ لہجے کا کھردرا پن نمایاں ہے۔ ایسے افراد جو غزل کی خاص نغگی پر جان چھڑکتے ہیں۔ ان کے لیے انھیں سہن کرنا آسان نہیں لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارے سماج نے جن پتھروں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے ان سے ہمیں ٹکرانا ہی ہے۔ چاہے اس میں نغگی اور رومانی لوچ بھی موسیقی کو ضرب ہی کیوں نہ لگ جائے۔ لیکن نئی غزل کا یہ عمومی مزاج نہیں ہے۔ نہ ان اشعار سے نئی غزل کا پورا مزاج سامنے آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غزل کا دھیما اور نازک انداز آج بھی پایا جاتا ہے۔ نئی لفظیات کے ساتھ نئے Images کی صورت میں نئی ایمائیت کے حوالے سے ضرورت اس بات کی ہے کہ مزید کچھ اشعار پیش کئے جائیں ؎

بہت عجیب ہیں یہ درد و غم کے رشتے بھی	کہ جس کو دیکھئے اپنا دکھائی دیتا ہے	(خورشید احمد جامی)
کوئی منظر ہے نہ عکس اب کوئی خاکہ نہ خواب	سامنا آج یہ کس لمحۂ خالی کا ہے	(باقی)
جب نیند آ چکی ہو صدائے جرس کو بھی	میری خطا یہی ہے کہ کیوں جاگتا ہوں میں	(خلیل الرحمٰن اعظمی)
شاید کوئی چھپا ہوا سایہ نکل پڑے	اجڑے ہوئے بدن میں صدا تو لگائیے	(عادل منصوری)
روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انسان کا قرب	میں چلا برسوں تو اک جسم کا سایہ گیا	(حسن نعیم)
کوئی ہے جو مجھے دو چار پل کو اپنا لے	زبان سوکھ گئی یہ صدا لگاتے ہوئے	(شہریار)
جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں شہروں کے فقیہ	کیا درختوں سے بھی چھن جائے گا عالم وجد کا	(وہاب دانش)

سماج کی ناہمواریوں کا ایسا احساس نئے تیور ہی سے پیش کیا جا سکتا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ نئی غزل محض کھردرے اور سخت لہجے سے عبارت ہے درست نہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہر دور نئے تقاضے لے کر آتا ہے۔ ان تقاضوں کو برتنے کے لیے نئے شعری نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جدید غزل کے شاعروں نے نیا لب و لہجہ بنانے کی کوشش کی ہے تو اسے سمجھنے کی ضرورت ہے نہ کہ پست اشعار کی مثالوں سے انھیں بیک قلم رد کرنے کی۔

نظم میں یہ صورت واقعہ اور بھی نمایاں ہے۔ کلیم الدین احمد نے ترقی پسند شاعری کے جائزے میں زیادہ تر ہیئت کی بنیاد پر اسے معمولی اور سطحی ٹھہرایا تھا۔ پھر انھیں ترقی پسند شعراء کے مرکزی اور بنیادی تصورات سے بھی اختلاف تھا۔ چنانچہ نظموں کے سلسلے میں عضویاتی تکمیل کے عنقا ہونے اور خیالات کی تکرار کی بنیاد پر بڑے ہی سخت لہجے میں ترقی پسند نظموں کی تنقید کی تھی حالانکہ فیض کی چند نظمیں ایسی تھیں جن میں غنائیت تجربے کی شدت کے ساتھ ساتھ ایک مربوط ہیئتی اور تکنیکی نظام بھی تھا۔ بہر حال وہ تو جارحیت کے اصولوں پر کاربند تھے۔ اور اچھی نظموں میں بھی کیڑے نکالنے کے درپے، لیکن ان کی تنقید سے اتنا کچھ ہوا کہ بعض نظم نگار قدرے سنبھلے۔ انھوں نے

اپنی نظموں میں عضویاتی تکمیل کا نہ صرف پاس رکھا بلکہ تجربوں کو تجریدی طریقے پر آراستہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ جدید اور جدید تر نظم نگار بڑی چابک دستی سے اظہار کے طریقے میں کھنگال رہے ہیں۔ اب ان پر تنقید خالص فکری انداز سے ہوتی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ موضوعی اعتبار سے ہماری نگاہ میں سماج کا جو ڈھانچہ ہے وہ سرتاسر ناہموار ہے۔ ایسی ناہمواری کو تجربے سے گذار کر ایک ساخت دینے میں نئے شعرا نے کمال فن کا ثبوت دیا ہے۔ میں اپنی گفتگو معیاری نظموں کو ذہن میں رکھتے ہوئے کر رہا ہوں، اس لیے کہ نہ تو کسی شاعر کی ساری نظمیں تجربے اور فن کے اعتبار سے معیاری ہو سکتی ہیں اور نہ ہی ہر تخلیق شاہکار ہو سکتی ہے۔ بہرحال چند اچھے نمونے پیش ہیں۔

۱۔ بسوں کا شور، دھواں، گرد، دھوپ کی شدت　　بلند و بالا عمارات، سرنگوں انساں
تلاش رزق میں نکلا ہوا یہ جم غفیر　　لپکتی بھاگتی مخلوق کا یہ سیل رواں
ہر اک کے سینے میں یادوں کی منہدم قبریں　　ہر ایک اپنی ہی آواز پا سے روگرداں
یہ وہ ہجوم ہے جس کا خدا فلک پہ نہیں　　(نظم شب چراغ از محمود ایاز)

۲۔ سڑکوں پہ بے شمار گل خوں پڑے ہوئے　　پیڑوں کی ڈالیوں سے تماشے جھڑے ہوئے
کوٹھوں کی سب چھتوں پہ حسیں بت کھڑے ہوئے　　سنسان ہیں مکان کہیں در کھلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستہ نہیں　　ویراں ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں　　(نظم میں اور شہر از منیر نیازی)

۳۔ ہم سب اپنی اپنی لاشیں، اپنی انا کے دوش پہ لادے
اک قبرستان کی پرہول اداسی سے اکتائے ہوئے
ایک نئے شمشان کا رستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔
منتظر مرگ انبوہ ہجوم آنکھوں کے خالی کاسے کھولے ہر سو دیکھ رہا ہے!
جانے کب کوئی آئے گا جو اپنے دامن کی ہوا سے / بھوتوں کا جلنا دیکھے گا!
اور بھیانک سائے گلے مل مل کر کھوکھلی آوازوں میں روئیں گے۔ (نظم کھنڈر، آسیب اور پھول از وحید اختر)

نئی تہذیب نے شہروں کی زندگی کو جو نیا روپ دیا ہے وہ ان نظموں کے پیکر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ سڑکوں پہ بظاہر چلتے پھرتے انسان مردہ لاشوں کی مانند ہیں، احساسات و جذبات سے عاری، جیسے بس زندہ رہنے کے لیے زندہ ہوں۔ خوف پورے ماحول پہ طاری ہے اور ہر شخص اپنی ذات کے خول میں سمٹا ہوا ہے یا سمٹتا چلا جا رہا ہے یہ احساسات

ایسے ہیں جن کا تجربہ ایک عام آدمی بھی کرتا ہے یا کر سکتا ہے۔ لیکن تجربوں کو تخلیقی عمل سے گذارنے میں جن وسیلوں کی ضرورت ہے، میرے خیال میں متعلقہ شعرائے انھیں اپنایا ہے اور اس طرح کے حالات اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان میں قنوطیت کا جو پہلو ہے وہ بہت نمایاں ہے۔ کسی رجائی ذہن کے مالک شخص کے لیے یہ سب باتیں پژمردہ ذہنیت کی عکاس ہو سکتی ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ صورت واقعہ یہی ہے۔ شہروں کے ہنگامے میں زندگی کی ساری مثبت قدریں جس طرح پامال ہو رہی ہیں، اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یا تو فنکار ان سے آنکھیں موند لے یا پھر احتجاج کرے۔ میں ایسی شاعری کو احتجاج ہی سمجھتا ہوں لیکن یہ احتجاج نثری نہیں ہے، غیر تخلیقی نہیں ہے بلکہ نہایت درجے کی تخلیقی قوت کا مظہر ہے۔ یہاں بہت سی باتیں سائنس ٹکنالوجی، مادہ پرستی، کرب، تنہائی، علیحدگی اور زندگی کی بے معنویت کے حوالے سے کہی جا سکتی ہیں، لیکن مجھے فی الحال ان امور سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج کی زندگی شاعر کے لیے ایک Feeding ground ہے۔ اس لیے بھی کہ اس سے تخلیق کار ہر لمحہ نبرد آزما ہے۔ ظاہر ہے نئے تجربوں کے لیے نئے استعارے کی ضرورت ہے۔ اگر شاعر اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی بوطیقا کی تشکیل کرتا ہے تو یہ غیر ضروری نہیں بلکہ اس کے لیے ایک جائز مطالبہ ہے۔

ان باتوں کو سمیٹتے ہوئے میں واضح طور پر اس کا احساس دلانا چاہتا ہوں کہ نئے شاعروں نے جس طرح اپنی بوطیقا کی تشکیل کی ہے وہ ہر لحاظ سے مستحسن ہے۔ اس سے ایک طرف ہماری شاعری نئے رنگ و آہنگ سے دوچار ہوئی ہے تو دوسری طرف ہمارے وہ الفاظ جو تکرار استعمال سے اور اکہری معنویت سے کھوٹا سکہ بن گئے تھے، وہ نئے لسانی مظاہرے سے تازہ کار اور تازہ دم ہو چکے ہیں۔ یہ ایک واضح سمت ہے جس سے ہم پہلے آشنا نہ تھے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری مجموعی طور پر نئے علاقے تلاش کرنے پر راجع ہے۔ یہاں کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ اینٹی غزل، آزاد نظم، ابہام اور اہمال سے شرابور جدید شاعری کس خانے میں رکھی جائے گی۔ میں یہاں صرف یہ کہوں گا کہ ہر وہ تجربہ جو حقیقی طور پر شعر میں ڈھل جائے وہ آج نہ سہی کل لائق ستائش ہوگا۔ یہاں تجربہ اور نقل تجربہ میں فرق کرنا چاہیے۔ جدت برائے جدت، ابہام برائے ابہام اور لایعنیت برائے لایعنیت کسی کے یہاں ہو کبھی نہ تو تنقید کی کسوٹی پر پوری اترے گی اور نہ ہی معیاری شاعری کی تخلیق کا سبب ہوگی۔ سچا تجربہ حقیقی تخلیقی کرب اپنی نکاس کا راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ فنکار اگر بے ریا ہے تو وہ نہ کسی منشور میں بند ہے اور نہ کوئی شعری ہیئت اس کے تجربے کے لیے حتمی بنتی ہے۔ ہر تجربہ اپنی ہیئت کے ساتھ وجود پذیر ہوتا ہے۔ نئے شاعروں کے یہاں جذبے کی شدت بھی ہے اور سچائی بھی۔ ان کے یہاں ہیئت کے تجربوں کو ان کے مخصوص

جذباتی کیف سے مربوط کرنے کے بعد یہاں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ویسے فیشن پرستی میں جو شاعر بھی نیا بننے کی کوشش کر رہا ہے، جس کے تجربے مانگے کے ہیں جو یونہی توڑ پھوڑ کو خارجی طور پر برتنے پر کمربستہ ہے، اس کا کسی شعری فلسفے سے رشتہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سچ ہے کہ جدید شاعروں میں بھی بہت سارے ایسے ہیں جو جدیدیت اور ردِ جدیدیت کو فیشن کے طور پر برتنا چاہتے ہیں۔ انھیں پہچاننا مشکل نہیں ہے۔ میں نام گنوانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

اردو شاعری پر گفتگو تو خاص ہوتی آئی ہے، فکشن بھی آج کے نقادوں کے لیے ایک ایسی فضا ہے جس پر کثرت سے خیال آرائی کی جارہی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ افسانہ کون سا رخ اختیار کر رہا ہے۔ اس باب میں جو روایت بنی ہے، اس سے ہم ناآشنا نہیں ہیں۔ ترقی پسند روایات کے تحت افسانے نے یقینی نہایت ہی ارفع مقام حاصل کرلیا ہے۔ صنفِ افسانہ کی عظمت اور اس کے وقار کا جواب ہمارے مستند اور معروف افسانہ نگاروں کے یہاں مل جاتا ہے۔ پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی اور بہت سارے دوسرے لکھنے والوں نے اس صنف کو معراجِ کمال تک پہنچانے میں جو سعی کی ہے اس پر خاک ڈالنے کی ہر کوشش تشدد پسندی کی مثال ہوگی، دانشوری کی نہیں۔ ابتدا میں اردو افسانہ سرکے بل کھڑا تھا۔ ترقی پسندوں نے اسے پاؤں پر کھڑا کیا۔ یہ ایک بہت بڑا فنی ریاض تھا جسے ہمارے معروف افسانہ نگاروں نے اختیار کیا اور عوام و خواص دونوں ہی کے دلوں میں عزت و احترام کا جذبہ پیدا کیا۔ اور دیکھتے دیکھتے یہ صنف ارتقا کی کئی منزلیں طے کرگئی۔ یہ بھی ہوا کہ مختلف لکھنے والوں نے علم کے مختلف جہات کی طرف رخ کیا۔ معاشی، سیاسی اور جنسی افکار خاص طریقے پر افسانے کے خدوخال بنے۔ پھر یہ بھی ہوا کہ وہ صورتیں جنھیں ہم وقتی کہہ سکتے ہیں انھیں بھی ان افسانہ نگاروں نے برتنے کی کامیاب کوشش کی۔ فسادات پر لکھے جانے والے افسانے اس کی ایک مثال ہیں۔ تب افسانہ فنی لحاظ سے ایک خاص ڈگر پر گامزن تھا۔ ماجرا سازی اور دوسرے قیود سے بری نہ تھا، افسانہ نگار کہانی بن پر خامہ ماز و صرف کرتا تھا۔ اس طرح کہ ایک عام قاری بھی ان حقائق سے آشنا ہو جاتا تھا جن کا اظہار متعلقہ افسانہ نگار کا منشا ہوتا تھا۔ نئے افسانہ نگاروں کے یہاں مسئلہ یہ تھا کہ آیا وہ اپنے عظیم افسانہ نگاروں کی راہ پر چلیں یا موضوعات کے اعتبار سے ایسا سانچہ یا ہیئت اختیار کریں جس میں گریز کا پہلو بھی ہو اور اظہار کی نئی صورت بھی ابھرے۔ ان احساسات کو ایک صاحب نے یوں بیان کیا ہے :

"نیا افسانہ دراصل ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اس کو خود معلوم نہیں کہ اس کی اگلی منزل کیا ہے۔ وہ ایک ایسے آئینے کے روبرو ہے جو شکستوں سے چور ہے۔ آزادی کے بعد جو نسل سامنے آئی

تھی اس کے پاس روایات کی تقدیس آگ بھی تھی اور عزم و حوصلے کا وہ تیشہ بھی جو رسمیات کے ستونوں کو
کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ ادب کی کائنات میں منظر نامہ تو آئے دن بدلا جا سکتا ہے لیکن مزاج کہیں صدیوں میں بدلا
کرتا ہے۔ آزادی کے بعد شاعری کی طرح افسانے میں بھی پرے ہٹ کر دیکھنے، زندگی کے تمام مناظر میں رکھنے،
اس کے سیاہ و سفید پہلو کو پرکھنے اور خارجی اور باطنی تمام تقاضوں کو سمونے اور انسان کو ایک معنوی وحدت
ایک محشر خیال اور ایک جہانِ آرزو کے طور پر دیکھنے اور دکھانے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ اسلوب و اظہار کی
سطح پر لفظ کی معنیاتی کائنات، اس کے تہہ در تہہ رشتوں، علامتی، تجریدی اور تمثیلی پہلوؤں اور منطقی معنی
سے قطع نظر معنی کے معنی اور ان کے معنیاتی انسلاکات کے تخلیقی امکانات کی جستجو ذہنی سفر کا حصہ بن گئی۔ لیکن
اس زبردست ذہنی سفر نے بعض بنیادی سوال بھی پیدا کیے، یعنی نئی کہانی نے نہایت بے رحمی سے فرسودہ
ڈھانچے سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کیا نئی کہانی جس حد تک وہ نئی ہے، کہانی نہیں ہے؟ یا جس
حد تک وہ کہانی ہے، وہ نئی نہیں ہے؟ کیا کہانی کا کہانی پن فرسودہ ڈھانچے کا ایسا عنصر ہے جس کا رد لازم ہے؟

اس میں جو Rehtoric ہے اس کو منہا کرنے کے بعد وہی سوال سامنے آتا ہے کہ نئی کہانی کی شکست و
ریخت ایک جانے بوجھے منصوبے کے تحت کی گئی یا فنی تقاضے کے طور پر۔ یہ بڑا اہم سوال ہے جس کے بغیر نئی کہانی کا کوئی
مطالعہ بھی سودمند نہیں۔ جسے فاضل نقاد نے فرسودہ ڈھانچہ کہا ہے کیا وہ واقعی اتنا فرسودہ ہو چکا تھا جس
میں نئے خیالات کی سمائی ممکن نہ تھی۔ میری رائے میں اس کا جواب اس طرح ہے کہ ہمارے مستند افسانہ نگار اپنی
حدوں میں وہ کام کر چکے تھے جس سے آگے نکلنا محال نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ پھر مغرب میں افسانے کے نئے فنی تقاضے
کے تحت جو کچھ ہو رہا تھا اس کی خبر نئے افسانہ نگاروں کو مل چکی تھی۔ اتنا ہی نہیں بعض ایسے نئے پہلو بھی سامنے آچکے
تھے جن کا اثر ہمارے افسانہ نگاروں کے ذہن پر خاصا گہرا تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر نئے افسانہ نگاروں نے سب سے
پہلے وہ راستہ اپنایا جو ابہام و اہمال کی منزلوں کی طرف لے جاتا تھا۔ اس کی زد میں کہانی پن کی منطقی صورت بھی
آئی۔ علامتی لے تیز ہوئی اور افسانے کو شعر کی طرح برتنے کی کوشش کی گئی۔ اس عمل میں لازمی طور پر قاری سے اس کا
رشتہ ٹوٹ گیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس عمل میں سارے افسانہ نگار ناکامیاب ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض علامتی افسانے
خاصے کی چیزیں ہیں جن کی تحلیل ہونی چاہیے۔ لیکن علامت اور تجرید کے نام پر جس طرح رطب و یابس کا ڈھیر سامنے
آیا وہ بھی اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کہانی اگر کہانی پن سے بنتی ہے تو اس سانچے کے اندر بھی علامتی افسانے
تخلیق کیے جا سکتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہم سررئیلزم اور دادازم کی روش اپنائیں یا شعور کی رو اور

کو نئے خیال سے جو ساخت فنی جہاں کی اوسط ہے ہر جگہ لیکن عام طور سے ہوا یہی۔ مغرب کے Poison plot تصور
کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور اس کے اثر کے تحت کہانی سے کہانی پن کو زبردستی نکال پھینکنے کی آرزو چھوٹے
سے چھوٹے نئے افسانہ نگار کے یہاں پیدا ہو گئی۔ یہ بھی ہوا کہ ہر علامتی افسانے کو تجریدی بھی کہا گیا حالانکہ دونوں
قسم کی تحریروں میں آسمان و زمین کا بعد ہے۔ تجرید مصوری کی راہ سے نمایاں ہوتی ہے جب کہ علامت معنوی
تہہ داری سے عبارت ہے۔ ان امور کے باوجود اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کے یہاں ایک خاص قسم
کا tension Academic. تھا اگر Tension جب Academic: بن جاتا ہے تو اسے عوام سے الگ ہونا
ہی ہے۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا کہ افسانہ نگار اور قاری کے درمیان تفہیم کے بارے میں کوئی رابطہ نہیں، اس لیے کہ تفہیم
کی الگ الگ سطحیں ہو سکتی ہیں۔ کوئی بھی تخلیق کار یہ کہہ سکتا ہے کہ اپنی تخلیق کی ترسیل کے لیے ذہن کی کون سی سطح
سامنے رکھے۔ خالق کو ذہنی طور پر آزادی ہونی چاہئے کہ اپنے تجربے کو اپنے مزاج کے مطابق فن کی شکل دے نہ کہ وہ کسی
قاری کو ذہن میں رکھ کر تخلیقی عمل میں مصروف ہو۔

نئے افسانے کے رشتے سے قدروں کی شکست و ریخت، تنہائی، علیحدگی، بے سمتی اور لایعنیت
وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ سب موضوعی اور Thematic باتیں ہیں۔
بحث تو فنی اصول و ضابطے کی ہونی چاہئے۔ میں نے یہ کہا کہ نئے افسانہ نگار نئے سانچوں کی تلاش میں نکلے تو ان کے
سامنے کچھ اسطوری سہارے تھے تو کچھ داستانی وسیلے تو کہیں کہیں فقہی حکایتی اور متصوفانہ ذرائع۔ جن افسانہ نگار
دانشوروں نے اپنے مخصوص تجربوں کو اعلیٰ فنی کارکردگی کے ساتھ اپنایا، وہ تو ڈوبنے سے بچے لیکن جبراً جن لوگوں نے
ان صورتوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو برتنے کی کوشش کی، وہ نامعتبر بھی ٹھہرے اور افسانوی دنیا میں
مقبول بھی نہ ہو سکے۔

افسانے میں نت نئے تجربے کی جو شدت اور آرزو تھی، وہ یقیناً اب کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے نئے افسانہ
نگاروں نے یہ محسوس کر لیا کہ اصل حقیقت تجربے کی سچائی بھی ہے اور اظہار کی سچائی بھی۔ نتیجے کے طور پر نئے افسانہ
نگاروں کے یہاں ایک خاص قسم کے توازن کا احساس پیدا ہونے لگا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارے جدید افسانہ
نگاروں نے اپنی راہیں بدل لی ہیں۔ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ چند افسانہ نگار فکر اور ساخت دونوں ہی میں ارتقائی
منزلوں سے گذر رہے ہیں۔ میں اپنے ہی صوبے کی مثال دوں تو شاید کافی ہو۔ کلام حیدری ہوں کہ احمد یوسف
یا شوکت حیات، حسین الحق ہوں یا عبدالصمد ان سبھوں کے یہاں تخلیقی سطح پر وزن و وقار پہلے بھی تھا اور اب

بھی ہے۔ کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شوکت حیات کی ہر دوسری کہانی معنوی، فکری اور ہیئتی لحاظ سے ہر طرح جامع ہوتی ہے۔ مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ ہر وہ افسانہ نگار جو فکر و آگہی کے نئے تناظر کو اپنے ہر پہلو تخلیقی جوہر سے اظہار کی سطح پر لاتا ہے۔ وہ کامیاب بھی ہوتا ہے اور ہر سطح کے لوگوں کے لیے قابل قبول بھی۔ سارے نئے افسانہ نگاروں یا نئی افسانہ نگاری کو ایک لاٹھی سے ہانکنا درست نہیں۔ عمومی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ اپنے مطالبات کی توسیع کرتا ہے۔ یہاں بھی ہمیں مایوس ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔

اردو ناول نگاری کی سمت و رفتار کا جائزہ لیجیے تو ہندوستان کی حد تک ایک طرح کی مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے جو کچھ اس ضمن میں کیا ہے وہ ہم سبھوں کے سامنے ہے۔ انھوں نے اپنی بہترین تخلیقی قوت "آگ کا دریا" پر صرف کر دی۔ ان کے نئے ناول اس بلندی کو نہیں چھوتے۔ وہ ورجینیا وولف کے اثرات سے وہ اب تک آزاد نہیں ہو سکی ہیں۔ انھوں نے انسائیکلوپیڈیائی ذہن پایا ہے جس کا پرتو ان کی تخلیقی کاوشوں میں نظر آتا ہے۔ لیکن جس طرح پاکستان میں اچھے اور معیاری ناول لکھے جا رہے ہیں، اس کی روایت معلوم نہیں کیوں ہندوستان میں بن نہیں پاتی۔ ہاں حیات اللہ انصاری، جیلانی بانو اور ظفر پیامی کے ناول بس اس حد تک اہم ہیں کہ وہ ناول ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تاریخی ناول لکھنے کے معاملے میں قاضی عبدالستار کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ان کا اسلوب کئی لحاظ سے ممتاز و منفرد ہے اور ان کی تحریروں کو ادب عالیہ کا درجہ دینے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ انھوں نے جن موضوعات کو اپنے ناولوں میں نشانہ بنایا ہے، وہ بھی اہم ہیں اور جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ لیکن اس سے اردو ناولوں کے ارتقائی سفر کا حال پوری طرح روشن نہیں ہوتا۔ نہ جانے کیوں پاکستان میں نئے ناولوں کا اچھا خاصا سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔ اس باب میں انتظار حسین کے ناول "بستی" "نشیب" اور "تذکرہ"، انور سجاد کے "خوشیوں کا باغ" اور "جنم روپ"، بانو قدسیہ کے "راجہ گدھ" اور ایوب مرزا کے "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کا خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر صلاح الدین پرویز کی [illegible] کو زیر بحث لانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں جن کا بیان یہاں ضروری نہیں۔ جوگندر پال کو میں ناولٹ نگاروں کی صف میں رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ "بیانات" اور "نادید" دونوں ہی ناولٹ ہیں ناول نہیں۔

تنقید و تحقیق کے سلسلے میں میرے دو طویل مضامین کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ایک "اردو تنقید کی نئی صورت" اور دوسرا "اردو تحقیق کی نئی صورت"۔ ان دونوں مضامین میں میں نے تنقید و تحقیق کی

رفتار کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہاں ان مباحث کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تنقید کے باب میں صرف اتنا کہوں گا کہ ایک طرف تو نقادوں کا وہ گروہ ہے جو ترقی پسند کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ محمد حسن نے کوشش یہ کی ہے کہ اپنی تنقید میں ان نئے افکار کو بھی پیش کریں جو کبھی ترقی پسندوں کے لیے گوارا نہ تھے۔ سید عقیل رضوی اپنے موقف پر آج بھی ڈٹے ہوئے ہیں۔ نئے ادب کی تفہیم کے سلسلے میں ان کے مضامین، جدیدیت کے حامی نقادوں کے یہاں سخت بحث و تمحیص کا دروازہ کھولتے ہیں۔ لیکن میں یہاں اس بات کو اصرار کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے موقف پر پوری طاقت سے، پوری توانائی سے ایک محاذ بنا کر قائم رہنا میرے نزدیک بذات خود ایک اہم بات ہے۔ اسی ڈگر پر چلنے والوں میں قمر رئیس اور اصغر علی انجینیر بھی ہیں۔ ہر چند کہ مجھے ترقی پسندوں کے افکار سے خاصا اختلاف رہا ہے لیکن میں ان کی مساعی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے تنقیدی عمل میں نظریہ سازی بھی کی ہے اور ایک Trend Set بھی کیا ہے۔ چونکہ ان کا علاقہ امریکہ کی نئی تنقید کے زمرے میں آتا ہے، اس لیے ان کے ذہن کو سمجھنے کے لیے نئی تنقید کے اصول اور ضابطوں کو سمجھنا پڑے گا، جس کی تفصیل میرے متذکرہ مضمون میں آچکی ہے۔ چونکہ جدید تنقید پر ان کے اثرات خاصے گہرے اور دور رس ہیں، اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ جدید تنقید کی تاریخ میں ان کی جگہ محفوظ ہے۔ محمد حسن عسکری نے علامت نگاروں سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور مشرق کی بازیافت میں لگ گئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاروقی کے یہاں بھی یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ میری رائے میں ان کا یہ قدم بھی مستحسن ہوگا۔ ظاہر ہے میں یہاں اردو تنقید کے ارتقا کا کوئی خاکہ پیش نہیں کر رہا ہوں۔ اس لیے تمام تر نقادوں کی تخلیقات کا جائزہ فی الحال میرے دائرہ عمل سے باہر ہے، لیکن ان امور سے اتنا تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے کہ اردو تنقید کے دو واضح اسکول اپنے امکانات کی تلاش میں پیہم لگے ہوئے ہیں۔

تحقیق کی رفتار بھی جامد و ساکت نہیں ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ قدیم ادب کی بعض ایسی شقیں جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا، ہمارے محققین کی کوششوں سے ابھر رہی ہیں۔ قاضی عبدالودود اور دوسرے بڑے محققین نے جو راہیں استوار کی ہیں ان پر چل کر نئے محقق اپنا وقار قائم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سامنے کی مثال رشید حسن خاں کی ہے جن کے یہاں معروضی تحقیق کے کتنے ہی پہلو ابھر رہے ہیں۔ تحقیق و تنقید کے حوالے سے ہی بعض دانشورانہ ادبی کام ہمارے سامنے آئے ہیں، جن کا تذکرہ ایک طولانی عمل ہے۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ "سب رس" کے سلسلے میں منظر اعظمی کی وقیع تحقیق سامنے آکر خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ تمثیل کے اجزا و عوامل پر بھی مغربی تصور کو سامنے رکھتے ہوئے تجزیہ و تحلیل ان

کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

"سب رس" کا ذکر ہو تو دکنیات پر لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ذہن میں آرہی ہے تو قدیم دکنی ادب کی تفہیم کا جو سلسلہ عبدالحق، زور اور سروری وغیرہ نے شروع کیا تھا اسے ہمارے نئے لکھنے والوں نے نہ صرف آگے بڑھایا ہے۔ بلکہ وزن و وقار بھی عطا کیا ہے۔ تاہم اس لیے نہیں گنوا رہا ہوں کہ یہ فہرست کبھی مکمل نہ ہوگی۔

اخیر میں، میں لسانیات کے تعلق سے بھی چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ادھر لسانی مباحث بڑی توانائی سے ہمارے ماہر لسانیات کی طرف سے سامنے آئے ہیں۔ اردو زبان کے ڈول اور گنڈے پر مسلسل لکھا جا رہا ہے، اور کافی عرق ریزی کا مظاہرہ ملتا ہے۔ لسانیات کے نظری پہلو پر بھی روشنی ڈالی جا رہی ہے اور متعلقہ اصطلاحات کی کلی پر تعیین ہوتی جاتی ہے۔ یہ بات بھی بڑی خوش آئند ہے کہ ہمارے شعرا اور ادبا کو محدود لسانی پس منظر میں لکھنے اور سمجھانے کی ایک بھرپور روایت تشکیل پا رہی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب مسلسل ارتقا کی طرف راجع ہے۔ فکری و دانشورانہ سطح پر بھی اور فنی اور تجرباتی لحاظ سے بھی۔

●●

اردو دانشوری

- آزادی کے بعد ہندستان میں اردو دانشوری
  - پروفیسر محمد محسن
- آزادی کے بعد برصغیر میں اردو دانشوری کا جائزہ
  - واثق جونپوری



خدا بخش نے ایک مسئلہ اور بھی چھیڑا — اردو دانشوری آزادی کے بعد! بہت اچھے مفکروں نے اس موضوع کا حق ادا کیا، اور ہر طرح: کسی نے کہا۔ کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے؟ کسی نے کہا دانشوری یعنی چہ؟ کسی نے کہا چیل کے گھونسلے میں دانش کہاں۔ کسی نے غالب کی ترمیم کرکے کہا۔

ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں
بے سبب ہوا دشمن سارا آسماں اپنا

مگر بعضوں نے کہا: نہیں ایسا ہو سکتا کہ ہاتھ پیر توڑ کے بیٹھ جائیں۔ ہم جو ہیں وہ ہیں اور جو بھی ہیں کچھ تو ہیں، اور بہتوں سے آگے ہیں!

یہ مباحث آپ کے سامنے آتے رہیں گے۔

——— ادارہ

پروفیسر محمد محسن
پٹنہ

آزادی کے بعد ہندستان میں اردو دانشوری

کسی علمی یا ادبی اصطلاح کو بحث و مباحثہ کا موضوع قرار دینے سے پہلے اس کی تعریف کا تعین ضروری ہے یعنی اس کی وضاحت کہ وہ اصطلاح کس خاص معنی میں استعمال کی جارہی ہے تاکہ مباحثہ میں حصہ لینے والوں کے سامنے اس کا ایک مشترک اور متفقہ مفہوم ہو، اور ہر شخص اسی مفہوم کی نسبت سے گفتگو کرے۔ یہ تعریف ایسی ہونی چاہئے کہ ہر اہل الرائے کو اس سے اتفاق ہو، اسی صورت میں یہ تعریف معروضی سمجھی جائے گی ورنہ اس کی حیثیت موضوعی ہو جائے گی اور بحث و مباحثے کے نتیجے میں کوئی منصفانہ اور مفید فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔ جس کے بغیر بحث و مباحثہ کا حقیقی مقصد فوت ہو جائے گا۔ میرے اس مختصر مضمون کی غرض و غایت یہی ہے۔

دانش کا مصدر دانستن ہے جس کا لغوی معنی 'جاننا' ہے۔ اس اعتبار سے علم اور دانش مترادف الفاظ سمجھے جاسکتے ہیں۔ لیکن دانش کا لغوی معنی صرف اتنا ہی نہیں ہے، اس میں عقلمندی، دانائی، سمجھ بوجھ جیسے معنرات بھی شامل ہیں جس کی تصدیق دانشمند کے لفظ سے ہوتی ہے۔ جس طرح ہر عالم کا دانشمند ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح ہر عالم کا دانشور ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ لیکن ہر دانشمند کا عالم ہونا ضروری نہیں ہے مگر ہر دانشور کو عالم ہونا لازمی ہے۔ میرے خیال میں دانشور کی اصطلاح اتنی ہی بلیغ ہے اور تقریباً وہی مفہوم ادا کرتی ہے جو عہد قدیم میں عربی لفظ حکیم سے ادا ہوتا تھا۔ حکیم کا لغوی معنی بھی وہی ہے جو دانشور کا ہے یعنی عقلمند، دانا، اہل علم۔ اس کے علاوہ حکیم کا لفظ ایک وسیع معنی بھی رکھتا ہے، سب علموں کو جاننے والا۔ اس اعتبار سے فلاسفر کی مغربی اصطلاح کا مفہوم حکیم کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔ چنانچہ بعض مستند لغات میں حکیم کے معنی فلاسفر بھی پایا جاتا ہے۔ فلاسفر کا ابتدائی معنی علم و عقلمندی کا متلاشی تھا۔ لیکن بعد میں فلاسفر کے لقب سے اسی کو سرفراز کیا جانے لگا جو اپنے عہد کے مروجہ علوم پر کامل دسترس رکھتا ہو۔ انگریزی کا لفظ Intellectual جب دانشور کا مترادف سمجھا جاتا ہے تو اس کا مفہوم بھی محض عالم کے لفظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔

حکیم سے مراد سب علموں کا جاننے والا اس وقت تک حقیقت پر مبنی تھا جب علم کے شعبے محدود تھے، ان کی شاخیں

بھی کم ہی تھیں اور کسی ایک شخص کے لیے اپنے عہد کے علوم سے پوری آشنائی ممکن تھی، مثلاً بو علی سینا کو حکیم بو علی سینا
صرف اس لیے نہیں کہا جاتا تھا کہ وہ طب کا ماہر تھا۔ اس وقت کے سارے علوم منطق، فلسفہ، تاریخ، ادب، دینیات، علم
نجوم و ہیئت وغیرہ ان سب پر اسے عبور حاصل تھا۔ اس عہد کے علوم کے اکثر شعبوں پر اس کی تصنیفات تھیں۔ یہی حال
یونان کے فلسفیوں سقراط، افلاطون، ارسطو وغیرہ کا بھی تھا۔ یہ جب سب اپنے عہد کے علوم کے کم و بیش ہر شعبے پر اپنا
انفرادی نقش چھوڑ گئے ہیں۔ عہد قدیم میں ماہر طب کو بھی اسی معنی میں حکیم کہتے تھے اور یہ روایت آج بھی باقی ہے۔ گو آج کا
حکیم صرف طبیب ہوتا ہے۔ اس دور کا طبیب فلسفہ، تاریخ، ادب، دینیات، علم نجوم و ہیئت، حیاتیات کی مختلف شاخوں
ان سے کماحقہ آشنا ہوا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی علمی، عقلی، فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کے بل پر ان علوم کی
سرحدوں کو آگے بڑھانے میں اپنا انفرادی رول بھی ادا کیا کرتا تھا۔ آج ہم اس کے کسی خصوصی وصف کی بدولت اسے
اہل عقل و دانش یا دانشور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

حکیم کی اصطلاح کی طرح فلسفی کی اصطلاح بھی ویسی ہی ہمہ گیر تھی۔ فلسفی صرف اسی کو نہیں کہا جاتا تھا جو
محض فلسفہ یعنی مابعد الطبیعاتی مسائل کا علم اور ان کا بیان و تشریح، تجزیہ اور حل سے تعلق رکھتا تھا بلکہ طبیعات، علم کیمیا
علم ہندسہ اور دوسرے سائنسی علوم سے بھی اسے سروکار رہا کرتا تھا۔ فلسفی کی روایتی اصطلاح کا عکس آج بھی ڈاکٹر آف فلاسفی
کی سند میں قائم ہے۔ اس کی سند یافتہ کے لیے فلسفے کا عالم ہونا ضروری نہیں ہے۔ سائنس، طب، ادب، سماجیات، معاشیات
یعنی علم کا شاید ہی کوئی شعبہ ہوگا جس کا فارغ التحصیل پی ایچ ڈی کی سند سے فائز ہونے کا اہل نہ سمجھا جاتا ہو۔

دانشور، حکیم، فلسفی کے جس قدیم مفہوم کی وضاحت سطور بالا میں کی گئی ہے اس کا اطلاق آج کے دانشور پر
نہیں کیا جا سکتا۔ حیوانی زندگی کا ارتقا اور علم کی ترقی ان دونوں میں گہری مماثلت ہے۔ علم آدمی کا طرۂ امتیاز ہے
اور آدمی حیوانی تخلیق کا شاہکار۔ جس طرح حیوانی ارتقا یا اعضائے جسمانی کی انفرادی بالیدگی تشکیلی تفریق
Differentiation of Structure اور تخصیصی فعلیت Specialisation in Function کے اصول
پر کاربند ہے، علوم کی ترقی میں بھی اسی اصول کی کارفرمائی ہے۔ ابتدا میں علم کی قسمیں ہی نہیں بلکہ ہر علم کی شاخیں بھی
محدود تھیں۔ چنانچہ ایک شخص کا ہر علم پر دسترس رکھنا ممکن تھا لیکن جیسے جیسے علم کی ترقی ہوتی گئی صرف اس کے شعبے ہی نہیں
بلکہ ہر ایک شعبے کی شاخیں بھی کثیر ہوتی چلی گئیں اور آج علم کا ہر شعبہ اس کی نت نئی شاخوں میں بٹ گیا ہے۔ چنانچہ
کوئی شخص غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود علم کے کسی شعبے کی ہر شاخ پر قدرت رکھنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے آج ہم کسی
شخص کو اس معنی میں دانشور، حکیم یا فلسفی نہیں کہہ سکتے جس معنی میں یہ اصطلاحیں ابتدا میں استعمال ہوتی تھیں۔ اس

کے باوجود جو شخص کسی ایک شعبۂ علم کی کسی ایک شاخ پر مکمل مہارت رکھتا ہو لیکن کسی دوسرے شعبۂ علم سے بالکل
کی بھی شناسائی نہ ہو ہمارے عالم بھلے کہلائے، دانشور نہیں کہلائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا دانشور موجودہ علوم اور ان کی
گوناگوں شاخوں سے پوری طرح بہرہ ور نہیں ہو سکتا پھر بھی اس سے توقع کی جاتی ہے کہ اسے دوسرے علوم کی کم از کم مبادیات
سے ایک گونہ آشنائی ضرور ہوگی۔ اس کے بغیر اس کا ذہن کشادہ نہیں ہو سکتا۔ جو شخص حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ سمجھا
جائے گا اس کی تعریف انگریزی زبان میں اس طرح کی گئی ہے One who knows everything of
something & something of everything. یعنی وہ جو ہر شے کے متعلق کچھ
نہ کچھ جانتا ہو اور کسی شے کی ساری کنہیات سے بخوبی واقف ہو۔ اسی طرح دانشور بھی وہی کہا جائے گا جو اپنے عہد کے دیگر
علوم سے کم از کم متعارف ہو اور ساتھ ہی کسی ایک علم کی کسی ایک شاخ پر اس کی پوری طرح دسترس ہو۔ انگریزی کی اصطلاح
Liberal Education سے متصف ہونا ایک دانشور کے لیے لازمی ہے۔ اس کے بغیر کسی کی ذہنی اور فکری
صلاحیتوں میں بالیدگی، لچکیلا پن اور تنوع پیدا نہیں ہو سکتا۔ فکر کی بلندی اور گیرائی، نظر کی وسعت اور دقت رسی دانشوری
کی اساس ہیں۔ کسی علم سے حقیقی وابستگی کا ثبوت اس شخص کے علمی کارناموں میں مل سکتا ہے جس کا اس علم کی ترقی و فروغ میں
کچھ نہ کچھ دخل رہا ہو۔ اس کے فکری اور استدلالی صلاحیتوں کی بلوغت اور بلاغت نہایت ضروری ہیں۔ اور یہی اس شخص
کی دانشوری کی صحیح علامت بھی ہوگی۔

دانشوری کی اس تشریح و تعریف کے پس منظر میں جب ہم آزادی کے بعد اردو علم و ادب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو
ہمیں سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک علمی تخلیقات اور کارناموں کا تعلق ہے ہمیں ان کا فقدان نظر آتا ہے۔ آزادی
کے بعد حالیہ علوم سے متعلق کوئی ایسی تخلیق شاید اردو میں ڈھونڈنے پر بھی نہیں مل سکے گی جو کسی اہمیت کی حامل سمجھی جائے
خواہ وہ علوم سائنسی یا غیر سائنسی ہوں۔ ہندستان کی مختلف اردو اکیڈمیاں نئی کتابوں پر انعام دیتی ہیں لیکن ان کتابوں
میں شاید ہی کوئی علمی کتاب بھی شامل ہوتی ہے۔ سب ہے ادبی کارنامے۔ ہمارے بیشتر ادیبوں کا مبلغ علم صفر کے برابر ہوتا ہے
ان کا مطالعہ اس صنف ادب سے آگے نہیں بڑھتا جس سے انہیں شغف رہ گیا ہے۔ انہیں صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ کہنا بھی شاید
روا نہ ہوگا۔ چہ جائیکہ انہیں دانشوروں کے زمرے میں داخل کیا جائے۔ ہمارے آج کے اردو ادب کے کارنامے عموماً چار صنفوں
میں بانٹے جا سکتے ہیں۔ غزل، افسانہ، ادبی تحقیق اور ادبی تنقید۔ جہاں تک مروجہ غزل گوئی اور افسانہ نگاری کا تعلق ہے
ان میں دانشوری کا نشان ڈھونڈنے کی کوشش شاید رائیگاں ثابت ہوگی۔ علم و دانش سے بہرہ مند ہوئے بغیر بھی محض
مشق اور لگن کے نتیجے میں ایک شخص کامیاب غزل گو اور افسانہ نگار بن سکتا ہے۔ ادبی تحقیق و تنقید میں البتہ دانشوری کے

خیالات مل سکتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے کہ تحقیق اور تخلیق سے زیادہ تنقید سب کے بس کی بات نہیں ہوتی، آج یونیورسٹیاں اور کالجوں میں اردو کا ہر لکچرر محقق اور نقاد بننے کی ہوس کا شکار ہے چنانچہ آج کے دور میں تحقیق اور تنقید کے میدان میں گھوڑے دوڑانے والے کہاں تک اپنے وقت کے علوم سے دور کی بھی شناسائی رکھتے ہیں یہ خود ایک تحقیق کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اور بقول تحقیق کے سلسلے کی چھان بین میں ناامیدی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اب رہیں اردو تخلیق کی دوسری صنفیں یعنی نظم گوئی اور ناول نگاری ایک دانشور ناول نگار یا نظم کا شاعر وہی ہوگا جس نے موجودہ علوم سے دور کا بھی تعلق رکھا ہے اور ان کی کچھ نہ کچھ خوشہ چینی کی ہے۔ وہ موجودہ سائنس کی چلتی پھرتی دنیا، نئی نئی اکتشافات اور معروف کارناموں، علم النفسیات، سماجیات، اقتصادیات، تاریخ وغیرہ کی مبادیات، اور ملکی اور غیر ملکی ادبی تخلیقات کے جواہر پاروں سے کم از کم متعارف ہے۔ آزادی کے بعد اردو میں سیکڑوں ناول لکھے گئے ہوں گے اور کتنی نظمیں سپرد قلم کی گئی ہوں گی لیکن ان میں مشکل ہی سے دانشورانہ سمجھ بوجھ اور دانائی، دقت رسی اور بصیرت، جدت طرازی اور انوکھا پن، ذاتی نظریۂ حیات اور انفرادی انداز فکر و نظر کے نشان مل سکیں گے۔ آج اردو کا فن کار اور اردو کا قاری دونوں ہی کو علوم حاضرہ سے جیسے الرجی ہوگئی ہے۔ اس صورت میں اردو میں دانشوری کا فقدان کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اردو کی دنیا آزادی کے بعد دانشوروں سے خالی ہوگئی۔ کتنے ایسے دانشوروں کے نام گنوائے جاسکتے ہیں جن کی پیدائش اور نشوونما گو آزادی کے بہت پہلے ہوئی تھی لیکن آزادی کے بعد بھی ایک عرصے تک وہ دانشوری کی شمع سے ہمیں بصیرت افروز کرتے رہے۔ مثلاً ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر غلام السیدین، قاضی عبدالودود، پروفیسر کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، کرشن چندر، بیدی، فراق، فیض وغیرہ وغیرہ جو اب دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ چند ایسے دانشور آج بھی ہمارے درمیان بقید حیات ہیں جن کی شخصیت اور کارنامے دانشوری کا جیتا جاگتا مفہوم واضح کرنے میں معاون ہوں گے۔ مثلاً آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، مالک رام، صباح الدین، عطاء اللہ پالوی، پروفیسر سید حسن ان کے علاوہ چند ایسے اور نام بھی گنوائے جاسکتے ہیں جن سے یا تو میں ناواقف ہوں یا جس کی اس وقت بازیافت کرنے میں ناکام ہو رہا ہوں لیکن انھوں نے بھی آزادی کے پہلے سے ہی اپنی دانشوری کا چراغ جلانا شروع کر دیا تھا اور اب ان میں سے اکثر چراغ سحری کی طرح ہماری نئی نسل کو تا دیر بصیرت افروز نہ کرسکیں گے۔ البتہ مجھے کوئی ایسا دانشور نظر نہیں آتا جس نے آزادی کے بعد ہماری توجہ کا مرکز بننا شروع کر دیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا سبب میری کم علمی اور شاید کم نظری ہو۔

••

جناب وامق جونپوری

کجگاؤں - جونپور - یو - پی

آزادی کے بعد برصغیر میں اردو دانشوری کا جائزہ

اس وسیع و عریض موضوع گذشتہ ایک کم چالیس برس کی مدت میں راسکماری سے کلکتہ اور کراچی سے ملا کام تک کے طول و عرض پر پھیلا ہوا ہے ان چند صفحات اور سیمینار کی قلیل مدت میں جائزہ لینا کافی دشوار کام ہے اور دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہے۔

یوں تو ہر مبصر کے ذہن میں کسی نہ کسی زاویہ سے اس کا نامکمل خاکہ ضرور موجود ہے تاہم جائزہ کی اصطلاح نے موضوع کو دشوار تر بنا دیا ہے۔ دوسری اصطلاح اردو دانشوری کی ہے جو تفصیلات میں جانے کے بعد اردو تک محدود نہیں رہ سکتی جائزہ لیتے ہوئے خود اس کے ماضی اور دوسری زبانوں سے اس کے رشتے کو توڑنا ممکن نہیں اردو کی دانشوری سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا مگر آزادی کے سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ دانشوری نے جس طرح ما قبل آزادی اپنی صلاحیتوں کا پورا استعمال کیا ویسا مابعد آزادی نہ کر سکی۔ آپس کے نظریاتی یا ذاتی اختلافات پر اس نے اپنی پوری قوتیں صرف کر دیں اور دانشوری کے دشمن عناصر سے متصادم ہونے سے گریز کیا۔ اور عصری تقاضوں سے شعوری یا لاشعوری طور پر بے اعتنائی برتی۔ اس لیے ہم آج intellectual thinking کے بہت کم ایسے نمونے پیش کر سکتے ہیں جن پر ملک و قوم فخر کر سکے۔ اس دور میں دانشوری برسر اقتدار قوتوں سے بچ بچ کر کام کرتی رہی ہے جس کی وجہ سے اس کی پوری صلاحیتیں پنپنے نہ پا سکیں۔

ذیل میں اپنے حافظہ سے چند ایسی مثالیں پیش کروں گا جن سے اندازہ لگایا جا سکے گا کہ عصری دانشوری کن کن حالات، تغیرات ایجادات اور تحریکات سے متاثر ہوتی رہی ہے اور ان سے کیا نتائج برآمد ہوئے میری نظر میں intellectual thinking اور creative thinking فکر کی دو مختلف سمتوں کی نشاندہی کرتے ہیں اول الذکر اپنے پورے شعور اور علمی صلاحیتوں کا کام لیتی ہے جبکہ creative thinking میں شعور اور علمی صلاحیت کے علاوہ ایک تیسری صلاحیت ضروری ہے۔ جس کو عام فہم زبان میں Sixth sense یا وجدان کہا جا سکتا ہے جب کہ علمی صلاحیت محض عرفان تک محدود ہوتی ہے۔

حصول آزادی اور تقسیم برصغیر کے بعد ہندوستان کی قومی سرکاری زبان ہندی اور پاکستان کی اردو

زرا بیا گی۔ یہ چھپا ہوا دکھی تبدیلی تھی جس نے عوام اور دانشوروں کے ذہنوں پر اپنا بہت گہرا اور دور رس اثر چھوڑا۔
نتیجہ میں ہر چند کہ ہندوستان میں اردو کو ایک علاقائی حیثیت دی گئی تھی بہت سے اردو دانشوروں نے
اردو کو ترک کر کے ہندی میں لکھنا شروع کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی تحریریں بالنفس ہندی
کے مقابلہ میں اردو سے زیادہ قریب رہیں۔ ہندوستان کے لاتعداد خانوادے جن کی مادری زبان اُردو
تھی روزی روٹی کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر اپنے بچوں کو ہندی کی تعلیم دلوانے لگے۔ اور اس طرح اب تک
دو نسلیں اردو سے نابلد ہو چکی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر کا رسم الخط بھی بدل چکا ہے۔ دوسری طرف ان
خاندانوں نے جن کے یہاں نجی طور پر اردو کی تعلیم کی سہولتیں میسر تھیں، گھر والے بچوں کو اردو کی بھی تعلیم
دلوائی اور جنھوں نے اپنی روایات کی مدد سے اُردو ادب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور چند نے نام بھی پیدا کیا۔
مگر زیادہ تر اردو والے اردو کا ساتھ نہ دے سکے جس سبب سے وہ اردو کے ادب عالیہ اور تخلیقی ادب کے فنی
اور ثقافتی نکات سے رفتہ رفتہ بے بہرہ ہوتے گئے، جس کا مظاہرہ مشاعروں اور ادبی اجتماعات میں واضح طور
پر ہوتا رہتا ہے۔ ان کی اردو دانی کی سطح اس درجہ انحطاط کا شکار ہو چکی ہے کہ وہ دوسرے تیسرے درجہ کی مزاحیہ شاعری،
حکومت کو بھونڈی طرح کرنے والی سیاسی نظموں یا ترنم سے پڑھی جانے والی ذو قافیہ غزلوں کی سطح سے اوپر
اٹھ نہیں سکتے۔ معیاری ادب جب الفاظ کے ترجموں کے ساتھ دیوناگری میں شائع ہوتا ہے تو کسی حد تک وہ
ان کے ڈھانچوں سے لطف اندوز ہو لیتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندی کے لیکھک اردو ادب سے بہت زیادہ
دلچسپی رکھتے اور استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ عام فہم اُردو غزل اس لیے بہت زیادہ popular ہوئی ہے کہ
اس کے اچھے گانے والے بھی پیدا ہو گئے ہیں جب کہ کلاسیکی موسیقی سے وہی لوگ دلچسپی رکھتے ہیں جو اس فن
سے کچھ نہ کچھ واقف ہوتے ہیں۔ مگر اب حکومت اور ہندی دانشوروں کی طرف سے اردو کی تعلیم پر اس لیے
زور دیا جا رہا ہے کہ ملک و قوم کا وہ عظیم سرمایہ اور حسین روایت ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہو جائے جس نے جنگ
آزادی میں بہت بڑا حصہ لیا تھا اور جو ہمیشہ اچھے ہندی ساہتیہ کیلیے Freedom اور Tonic کا کام کرتی رہی ہے۔

دوسری طرف پاکستان کے چند دانشوروں نے اردو کو بھی تقسیم کر کے اس کو اسلامی اردو کا لقب دینا چاہا
جس کے سربراہ اردو کے مشہور نقاد اور "پھسلن" افسانہ کے خالق حسن عسکری تھے مگر ان کا یہ Racket
بہت دنوں تک نہ چل سکا۔ آج کے پاکستان میں اردو میں دوہے لکھے جا رہے ہیں اور ہائیکو کا زور ہے۔ جمیل الدین
عالی اور دوسرے پاکستانی شعرا کے دوہے جس زبان میں لکھے جا رہے ہیں اس کو ہندی، پوربی بولی، اودھی

اور برج کے دوہے کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ جتنے کومل، کتنے سندر اور تخیل کے اعتبار سے یہ دوہے کتنے معیاری ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبیر، تلسی، میرا اور نظیر پھر سے زندہ ہو گئے ہیں۔ اصلیت تو یہ ہے کہ تقسیم ملک سے زبان نہیں تقسیم ہو سکتی۔ مثال کے طور پر عالی کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

جیا پایا مانگے پھول ناگے پنچھی سا مزدور   عالی تیری کویتا ایسی جیسے پیڑ کھجور

چھوٹی موٹی سا بجے سندر اور پھر نٹ کھٹ   مزدور اور کسان سے مل جا جیسے مانا جوڑ

ان سے ناتا جوڑ کے رکھیو اتنا یاد   جھوٹے لے اب تک کیسے کیسے کاج برباد

پاکستان میں چند اچھے اردو دانشور صوبائی عصبیت Provincialism کے شکار ہوئے اور اردو ترک کر کے اپنی اپنی صوبائی زبانوں میں ادب تخلیق کرنے لگے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے بلکہ ضروری بھی ہے مگر اردو سے یک لخت ناتا توڑ لینا ایک قسم کے جنون کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ پنجابی ادیبوں نے فیض احمد فیض پر بھی زور ڈالا تھا کہ وہ پنجابی میں شاعری کیا کریں مگر ان کو اس کوشش میں کامیابی نہ ہو سکی۔

ہندوستان کے چند اردو دانشوروں نے یہ تجربہ بھی کر دیکھا کہ اردو ادب کا دیوناگری لپی میں ایک رسالہ نکالا جائے جس کے محرک خواجہ احمد عباس تھے اور راقم الحروف بھی ان کے ہمنواؤں میں تھا مگر اس پیش کش کو دونوں ہندی اور اردو والوں نے ٹھکرا دیا باوجود اس ناکامی کے اب اردو ادب پہلے سے کہیں زیادہ ہندی رسالوں میں شائع ہو رہا ہے۔ یعنی پہلی بس چھوٹ جانے کے بعد دوسری تیسری بس میں کشمکش کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ یہیں پہ بات ختم نہیں ہوتی۔ اردو کا تمام کلاسیکی اور مسلمانوں کا مذہبی ادب بڑی تیزی سے دیوناگری میں منتقل ہو رہا ہے اور گھروں میں اس سے استفادہ بھی کیا جا رہا ہے۔ اس کام کو سب سے پہلے سردار جعفری نے کیا تھا۔ دیوان غالب اور انتخاب میر آمنے سامنے فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں ایک ساتھ شائع کروایا تھا۔ برخلاف اس کے سرکاری Media آکاش وانی نے ہندی اور اردو خبروں کی زبانیں اتنی کلشٹ اور معرب اور مفرس کر دیں کہ دونوں میں زیادہ سے زیادہ دوری ہوتی گئی اور دونوں کے عام سننے والوں کو اپنے جہل کا احساس ہونے لگا تھا۔ اردو خبروں کی زبان ابھی اسی ڈھرے پر چل رہی ہے جبکہ ہندی خبروں میں باوجود سنسکرت کی آمیزش کے عربی اور فارسی کے الفاظ اور اصطلاحیں کثرت سے آنے لگی ہیں۔ آکاش وانی کو ہندی میں یہ تبدیلی اس لیے لانا پڑی کہ B.B.C. کی ہندی سروس ہندوستانی News اور Talks کے لیے ایک چیلنج کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

پاکستانی دانشوروں نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بننے سے پہلے کتنا سمجھا؟ نتیجہ میں پاکستان کو مشرقی پاکستان سے ہاتھ دھونا پڑا اور وہ آج بنگلہ دیش ہے۔ ہندوستان کے جنوبی صوبوں میں اسی طرح ہندی کو عوامی زبان بنانے کی کوشش کی جارہی ہے نتیجہ میں مدراس تامل ناڈو ہو گیا اور آندھرا پردیش میں تیلگو دیشم پارٹی بن گئی۔

پاکستان میں جوش کی نظموں کا پس منظر پہلے سے زیادہ دانشورانہ ہو گیا تھا۔ اب تک اردو کی سب سے اچھی خود نوشت جوش کی "یادوں کی برات" ہے گو اس میں جب ان کا خالص پٹھانی انداز فکر سر اٹھاتا ہے تو وہ اپنے معاشقوں میں نہایت اچھوتے بازاری نمائش میں نظر آتے ہیں اور دوسروں کو ننگا کر دینے میں بھی عار نہیں محسوس کرتے۔ اگر ان حصوں کو یادوں کی برات سے خارج کر کے دیکھا جائے تو اردو کی خود نوشتوں میں وہ ایک اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں نثری ادب کا کوئی قابل ذکر نمونہ کتابوں کی درآمد بند ہونے کی وجہ سے میری نظر سے کم گزرا ہے۔ شاعری میں البتہ نظم میں کم اور غزل میں اچھے تجربے کیے گئے ہیں۔ فیض احمد فیض کے بعد ابھرتے ہوئے شعری منظر میں افتخار عارف کا نام آجکل زبانوں پر ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "مہر دو نیم" اردو دانشوری میں ایک Break through کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک شعر یاد ہے سن لیجیے ؎

یہی معیار تجارت ہے تو کل کا تاجر   برف کا باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

آزادی کے بعد ہندوستان میں نثر کے کئی اچھے نمونے دیکھنے میں آئے۔ خواجہ غلام السیدین کی کتاب "آندھی میں چراغ" قرۃالعین کا ناول "آگ کا دریا" مولانا ابوالکلام آزاد کی جنگ آزادی کی دستاویزی تاریخ جو مدتوں صیغۂ راز میں رہی، ڈاکٹر اعجاز حسین کی کتاب "اردو ادب کا سماجی پس منظر" سجاد ظہیر کی کتاب "روشنائی" عصمت چغتائی کا ناول "ایک قطرۂ خون" کالی داس گپتا رضا کی تلاش و تحقیق "بیاض غالب" ڈاکٹر مجاور حسین کی "قومی یکجہتی" کلام حیدری کی کتاب "ادب اور تصوف" ڈاکٹر عقیل کی "نئی علامتی شاعری" معصوم رضا راہی کا ناول "آدھا گاؤں" جس کو اردو میں تو کوئی جگہ نہ مل سکی البتہ اس کا شمار ہندی کے بہترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی کی کتاب "نظیر اکبر آبادی" ظ۔ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن اور جگن ناتھ آزاد کے اقبال پر تحقیقی مقالے صالحہ عابد حسین کی کتاب "یادگار حالی" ڈاکٹر صبیحہ اختر کی "اردو میں خود نوشت سوانح حیات کی تاریخ" ڈاکٹر روشن کاظمی کی کتاب "طویل نظم نگاری کی روایات اور ارتقاء" آزادی کے بعد سجاد ظہیر کا نثری شاعری کا پہلا مجموعہ "پگھلا نیلم" ہے اور معصوم رضا راہی کی غدر پر نظم "۱۸۵۷ء" اس عہد کی سب سے اچھی نظم ہے۔ طنز و مزاح میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح کو حرف آخر سمجھنا کم احمد جمال پاشا اور مجتبیٰ حسین وغیرہ نے اس فن کو آگے بڑھایا۔

طویل نظموں کی کمی اپنی جگہ مسلم مگر دور حاضر میں اردو دانشوروں نے غزلوں میں بہت اچھے تجربے کیے ہیں۔ نئی علامتیں اور
نئی اصطلاحات وضع کی ہیں۔ اختراعات اور اجتہادات نے بھی قبول عام کی سند حاصل کی۔ ان کے علاوہ چند
دانشوروں نے غزل میں Neo-classicism کی بنیاد رکھی۔ عام طور پر اس دور میں غزلیں بہت کہی
جا رہی ہیں۔ اور تین چار مصرعوں کی مختصر نظمیں بھی۔ اس کا سبب بھی تاریخی حقائق سے جڑا ہوا ہے۔ زندگی تیز رفتار
ہو گئی ہے۔ آج جو ہے کل نہیں رہے گا۔ آج جو کہا جائے، وہ وقتی طور پر آج کے لیے بہت اہم ہے۔ کل نہ معلوم
کیا ہو اس لیے آج کی بات آج کہہ کر دل ہلکا کر لو۔ اور اس کے لیے غزل سے زیادہ مناسب ترسیل کا کوئی ذریعہ نہیں
ایک شعر میں پوری بات مکمل ہو جاتی ہے۔ نظم کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اس کے لیے طویل مدت درکار ہے جو آج میسر نہیں۔
تاہم اس دور میں جو نظمیں منظر عام پر آئی ہیں ان کو بھی دانشوری کا افشردہ ہی کہنا چاہیے مثلاً جاں نثار اختر کی گھر
آنگن، کیفی اعظمی کی نظموں کا مجموعہ "آوارہ سجدے" اور راقم الحروف کی نظمیں۔ نیلا پرچم، سرزمین، فن، وقت، سفر ناتمام
اور غزل در غزل۔ اس دور میں پرانے افسانہ نگاروں نے جو افسانے لکھے وہ ان کے Pre-independence
افسانوں پر کوئی نیا اضافہ نہیں کرتے۔ نئے لکھنے والوں نے کافی تجربات کیے ہیں جن کی حیثیت کا تعین ابھی
نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ جیلانی بانو نے حیدرآبادی کردار اور حیدرآبادی بولی (Dialect) سے پورا استفادہ کیا اور آج
وہ نئے افسانہ نگاروں میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلوب بھی نیا ہے۔ مسائل پرانے ہیں مگر حیدرآبادی
مسائل کی شکل اختیار کر کے وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اردو کے انحطاط کے بعد دانشوروں کا وہ طبقہ جن کو
Scientific thinkers کہنا چاہیے ہندوستان میں شدت سے یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اردو میں فارسی
رسم الخط کے حروف تہجی ہیں۔ سے علم لسانیات اور صوتیات کے اعتبار سے زوائد کو خارج کر کے اردو رسم الخط کو نیا
بنایا جائے تاکہ اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے اس کا سیکھنا بیجا مشکلات سے چھٹکارا پا جائے۔ اردو
میں چونکہ عربی کی طرح قرأت اور مخرج تو ہوتا نہیں اس لیے اردو کے ہم آواز حروف تہجی میں قطع و برید کی جائے
مثلاً الف اور ع میں سے ع نکال دیا جائے۔ "ت اور ط" میں ت کافی ہے۔ "ث، س اور ص" میں سے ث اور ص
خارج کر دیے جائیں۔ "ذ، ز، ض اور ظ" میں صرف ز باقی رکھی جائے۔ "ہائے ہوز اور حائے حطی" میں سے حطی
نکال دینے سے کوئی دشواری نہیں پیدا ہوتی۔ مزید یہ کہ اب اردو جاننے کے لیے عربی کون پڑھتا ہے اور کون پڑھاتا
ہے۔ اور پوری لغت کو رٹنا آسان کام نہیں۔ اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ زیادہ تر عربی کے حروف تہجی کے خارج کرنے
سے ہم آواز الفاظ کے معانی کا تعین کس طرح ہو سکے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم آواز الفاظ کے معانی کا تعین سیاق

سیاق عبارت سے ہوگا۔ آخر ہم کس طرح جان جاتے ہیں کہ ایک جگہ "سہارا" کا مطلب مدد ہے اور دوسری جگہ سہارا ایک ریگستان ہے۔ اردو میں اعراب بھی مشترک ہیں اس لیے ایک جگہ سمندر سے مراد خشکی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے گہرے پانی سے لی جاتی ہے اور دوسری جگہ سمندر کا مطلب آگ کے کیڑے کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قَلق، قُلق، مَرد، مُرد، دَور، دُور، دَونہ، دُونہ، سَیل وغیرہ وغیرہ دوسری طرف تبدیل شدہ املا کے الفاظ کو دیکھیے "باز ایک شکاری پرندہ ہے۔ ز الف سے (بعض) باز (رہنا) ہائے ہوز سے حالتوں میں سختی سے کام لینا ہی پڑتا ہے

Intellectual thinking یا دانشوری اب پہلے سے زیادہ سائنٹفک ہو گئی ہے اور Science Oriented بھی یعنی سائنسی حقائق پر بھی تحقیق اب پیدا ہو رہا ہے۔

جوہری توانائی اور خلائی سائنس نے دانشوری کا انداز فکر بدل دیا ہے۔ وہ ایک زیادہ ترقی یافتہ ثقافت اور فن کی طرف قدم اٹھا رہی ہے۔ نیوکلیائی جنگ کی تباہ کاریوں سے اب ایک دانشور ان ہوا بازوں سے زیادہ واقف ہے جنھوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر جوہری بم گرائے تھے پہلے وہ زمین کو حقیر اور اسفل سمجھتا تھا اور اب وہ اس کے گیت گاتا ہے۔ پہلے دانشوری روایت پرستی کو سینے سے لگائے رکھتی تھی اور اب روایت شکنی اور اجتہاد پر زیادہ زور دیتی ہے۔ شکست و ریخت کا بھی سبق اس نے سائنسی تجربوں سے سیکھا ہے۔

آزادی کے بعد دانشوروں نے دانشوری کو بروئے کار لانے کے لیے مختلف سمتوں میں چھلانگیں لگائی تھیں۔ اقتدار، شہرت یا اپنی پوری ذہنی دیانت داری کے ساتھ خدمت قوم و وطن کی خاطر وہ عملی سیاست میں حصہ لینے گئے اور چند نے ان میں بحیثیت ماہر تعلیم، ماہر علوم یا بحیثیت بیورو کریٹس یا ڈپلومیٹس کافی نام بھی پیدا کیا مگر وہ یہ بھول گئے کہ قانون سازی، پالیسی میکنگ اور انتظامیہ کی نگرانی اور ان کا جائزہ اور مناسب دانشورانہ رہنمائی اور تنقید باہر سے کر کے بہتر نتائج برآمد کیے جا سکتے ہیں۔ جب دانشوری کسی مشین کا پرزہ بن جائے گی تو اس کو خود بھی مشین کے ڈھانچے، رفتار، پالیسی اور اس کے کام کرنے کے انداز کا پابند ہو جانا پڑے گا۔ اور خود اس کی فطری صلاحیتیں عضو معطل ہو کر رہ جائیں گی۔ ایک مثال جس کو لطیفہ بھی کہا جا سکتا ہے ملاحظہ ہو۔ مسز سروجنی نائیڈو مجھ کو بہت عزیز رکھتی تھیں اور میں بھی ان کی خدمت میں تہذیب کے دائرہ میں رہ کر ان سے گستاخ بھی تھا۔ ایک بار جب وہ لکھنؤ گورنمنٹ ہاؤس کے سبزہ زار پر آرام کرسی میں بیٹھی ہوئی اپنی الیسیشین کتے سے گیند کھیل رہی تھیں تو میں مخل ہوا اور ان سے دریافت کیا کہ آپ کو گورنر بننے سے کیا حاصل ہوا۔ بس یہی کہ یہاں وہاں افتتاح کرتی پھرتی ہیں جس سے بلبل ہند کا گلا رندھ کر رہ گیا ہے۔ تو محترمہ نے فرمایا تھا د

Young man that you are an idealist horrible, you have gone home with my دکھتی رگ. At this age I need only three things: Comfortable living, even more comfortable travelling and best medical aid in easy reach.

تقریباً یہی بات میں نے ماضی قریب میں اُردو کے ایک بہت بڑے دانشور سے بھی کی تھی جو خود کراچی اور اسلام آباد میں اپنی بے پناہ علمی صلاحیتوں کو عصری تقاضوں کی روشنی میں قرآن حکیم کا نیا اردو ترجمہ اور نئی تفاسیر لکھنے میں صرف کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر احمد علی کراچی اور اسلام آباد کے عظیم مستشرق ماکان علی علی کے اسما سر فہرست آتے ہیں۔

برصغیر میں آزادی کے بعد دانشوری تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک وہ جو انسانوں کے اجتماعی حقوق کے تحفظ اور فرائض کی ادائگی پر قلمی جد و جہد کو اپنی تخلیقات کی اساس سمجھتے رہے خواہ ارباب حل و عقد سے تصادم ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔ دوسرے گروہ نے اپنے دانشورانہ فرائض کو بھلا دیا اور ذاتی مفاد پرستی سے مفاہمت کر لی۔ تیسرا گروہ جس نے فرد کو اجتماعیت پر ترجیح دی اور نتیجہ میں بجائے مشکلات اور مسائل کا اجتماعی طور پر مقابلہ کر کے اس کو حل کرنے اور شکست دینے کے پوری طرح یاسیت کا شکار ہو گیا، اور اس میں لذت لینے لگا۔ شتر مرغ کی طرح اپنے کو خطرے سے بچانے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے دیے۔ اور بجائے تعمیری قوتوں سے دست و گریباں ہونے اور انحراف کرنے کے اپنے ہی سے منحرف ہو گیا۔ اور جھنا جھن ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگا۔ یعنی خودکشی کر لی مگر خودکشی تو مسئلہ کا حل نہیں ہوا کرتی۔ جد و جہد میں بڑی طاقت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی جد و جہد کا حاصل مجاہد کو نہ ملے مگر آنے والی نسلیں تو اس کا صلہ ضرور پائیں گی۔ بزرگ باغ لگاتے ہیں اور بیٹے پوتے اس کا پھل کھاتے ہیں۔ افسوس کہ ایسے انداز فکر کو دانشوری نہیں کہا جا سکتا۔ ابابیلیں اڑانا تو دانشوری نہیں ہے۔ بے سر و پا باتیں کرنی دانشوری نہیں ہے۔ اس طرح اپنی صلاحیتوں سے کھیلنے والوں کو Pseudo Intellectual ہی کہا جائیگا۔ بقول پروفیسر ممتاز حسین کے T.S.Eliot نے پوری ایک نسل کو بیوقوف بنانے کے لئے اپنے رومن کیتھولک عقیدہ پر ایک طویل مقصدی نظم لکھ ڈالی۔

رہی لہجہ کی بات تو اس کا تعلق دانشورانہ Thinking سے نہیں ہے۔ لہجہ کا بدلتا رہنا زبان و ادب کا ایک فطری اور ارتقائی خاصہ ہے جو وقت، مذاق اور ضرورتوں کے ساتھ بتدریج بدلتا رہتا ہے۔ اس کا تعلق تاریخی حالات سے بھی ہے۔ آزادی کے بعد پوری زبان و ادب کا لہجہ بدلا۔ اور یوں ہی متواتر بدلتا رہے گا۔

کی تحریک ہے سمجھا جائے تو زندگی دانشوری کا موضوع ہے اور یہی اس کا اسلوبی جامہ۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ کا یہ سلسلہ بھی Post Independence Intellectual Thinking کا

ایک شاخسانہ ہے۔ Mass Communication Research Centre, Jamia, N.Delhi

جو اس وقت Education through mass media پر کام اور تجربات کر رہا ہے Audio

عملی دانشوری کا Visual science oriented way of Intellectual thinking ہے

اور تعلیم بذریعہ مراسلات بھی ضرورتِ وقت کی ایجادات اور آزادی کے بعد Intellectual thinking

کے نتائج ہیں مگر ان کو مزید وسعت دینا اور عام بنانے کی ضرورت ہے۔ نوجوان دانش جویانِ قوم کی تعداد بہت زیادہ

ہے اور ابھی تک ان سب کی کھپت نہیں ہو سکی ہے۔

باوجود ان سب دانشورانہ مساعی کے ہم میں ایک دانشورانہ جہل بھی ہے اور جو کہنہ (Chronic)

ہوتا جا رہا ہے۔ ہم من حیث القوم Make belief یعنی اپنے کو مکمل یقین دہانی کا عادی بنا چکے ہیں

جس کے نتیجہ میں نہ ہم تنقید برداشت کر سکتے ہیں نہ نئی نسلوں کو صحت مند ترقی یافتہ اندازِ فکر کے راستہ پر لگا سکتے ہیں۔

مگر دانشوری کو اس بنیادی کمزوری سے بالاتر ہونا چاہیے۔ اپنے مکان اپنے شہر اور اپنے وطن سے ہر شخص کو محبت

ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے کہ یہ جبلی اندازِ فکر ہے مگر کیا باوجود وطن سے محبت ہونے کے موجودہ حالات میں

اپنے وطن کو بہترین اور حرفِ آخر کہنا درست ہے۔ ہم کو اپنا گھر بہت پسند اور بہت عزیز ہے درانحالیکہ وہ

کئی جگہ سے ٹپکتا ہے اور ہر موسم میں تکلیف دہ ہے۔ ہم کو اپنے شہر سے ایک قلبی لگاؤ ہے درآں حالیکہ وہ بہت گندہ

ہے۔ سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں اور محلے سیلن سے تر رہتے ہیں۔ ہم کو اپنے ملک سے ایک جذباتی وابستگی ہے درانحالیکہ

اس میں غربت، بیکاری اور مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، ملک کی دولت کی تقسیم بہت ناقص ہے اور لاقانونیت

اپنے شباب پر ہے تو کیا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" آزادی سے پہلے

غیر ملکی حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی تھی کہ تم نے ہمارے ملک Intellectual thinking

کو برباد کر رکھا ہے تم یہاں سے چلے جاؤ اور اس کو جانا پڑا۔ آج آزادی کے تقریباً چالیس برس ہو رہے ہیں

اور ہمارا آزاد ہندوستان کا خواب چکنا چور ہو کر رہ گیا ہے۔ اور ہم کو برصغیر میں وہ دانشوری نہیں ملتی جو اسباب علل و معلول

سے دو بدو یہ کہہ سکے کہ پراچین کال میں ہمارا پیارا وطن سارے جہاں سے اچھا رہا ہوگا مگر پہلے انگریزوں نے اور اب

تم نے اسکو انگریزوں سے بھی زیادہ خراب بنا رکھا ہے۔ تم گوتم بدھ، اشوک، چشتی، گرو نانک اور گاندھی کے

حوالے دے کر ہماری جبین پر پسینہ کو یاد دلا کر ہمالیہ کو دلہن کا سندور کہہ کر اور ان سب کے گیت سنوا کر لوریاں
دے کر خواب غفلت میں مبتلا کرنا چاہتے ہو سے ایک وقت آتا ہے جب آتا ہے تاریخ کو ہوش!
اس وقت کا خیال کرو اور ڈرو۔ محض دکھاوے کی لیپا پوتی سے وطن کے مصائب ختم نہیں ہو سکتے۔

ہم کو ایک عظیم اقتصادی۔ سماجی اور دانشورانہ انقلاب کی ابھی ابھی ضرورت ہے تاکہ اس تاتیر یجا کا سبب کیا ہے؟
کس کے مفاد کے تحفظ کے لیے اس عظیم انقلاب کو صدیوں پر ٹالا جا رہا ہے ہنصف صدی تو ہونے کو آئی۔ ہم
کب تک اس کا انتظار کرتے رہیں گے ایسے وقت ہم کو Quite flows the Don, Spartacus اور
For whom the bell tolls جیسے Powerful ناولوں کی ضرورت ہے۔ اقبال کی نظم "خانہ خدا"
جیسی شاعری کی ضرورت ہے۔ کرسٹوفر کوڈویل کی تنقیدوں جیسی تنقید کی ضرورت ہے۔ پیبلو پکاسو کی گورنیکا جیسی مصوری
کی ضرورت ہے۔ پال روبسن کی موسیقی جیسی موسیقی کی ضرورت ہے۔ یعنی اس وقت برصغیر کو ایک Dynamic
یا متحرک اور جرأتمند دانشوری کی ضرورت ہے۔ آخر میں سمع خراشی کی Intellectual thinking
معذرت چاہتے ہوئے ایک نکتہ کی طرف آپ حضرات کی توجہ مزید مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ Intellectual
thinking اور Computerised thinking کا مسئلہ ہے مگر ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ انسانی دماغ
سے زیادہ مکمل اور بڑا کمپیوٹر ابھی تک ایجاد نہیں ہوا ہے۔ Computer سے ضروری معلومات اور اعداد
و شمار تو بغیر وقت برباد کیے ہوئے حاصل کیے جا سکتے ہیں مگر کوئی تخلیقی کام اس سے نہیں لیا جا سکتا۔ اس
وقت تو یہی صورت ہے آئندہ کیا ہوگا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ تحقیقی کاموں میں اس مشین کی مدد سے کسی
اطلاع یا مدد کی صحت یا عدم صحت دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ یوں تو دانشوروں نے Scientific
fiction میں یہاں تک Wishful intellectual thinking کی ہے کہ افسانوں کی دنیا میں Robots
کی صنعت قانوناً اس وقت ممنوع ہو جائے گی جب اس مشینی انسان میں محبت، نفرت، پیار، طیش کے جذبات اور
سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جا سکیں گی اور جس کو آسانی سے مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا۔

نیوکلائی جنگ کے متعلق دانشوری کی بے اعتنائی کا احساس ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر کا عام آدمی سوچتا
ہے کہ مرگ انبوہ جشن دارد۔ مرنا تو ہے ہی وہ چاہے غربت کا شکار ہو کر مرے یا جنگ سے نیوکلائی جنگ میں اس کو
تسکین بخش یہ پہلو نظر آتا ہے کہ اس کے ساتھ vested interest والا بھی فنا ہوگا۔ عوام کے اس جذبہ کو
دور کرنے کی کوئی وقیع کوشش اردو دانشوری نے اب تک نہیں کی ہے۔

●●

تازہ دانشوری

 دکھ کا دودھ —— ڈاکٹر سعید اختر درانی

 صم —— ضیا جالندھری



یہ دو نظمیں ہم احمد ندیم قاسمی کے شاندار رسالہ "فنون" کے تازہ نمبر بابت جنوری ۱۹۹۱ء سے نقل کر رہے ہیں۔

— ادارہ

ڈاکٹر سعید اختر دُرّانی

دُکھ کا دُودھ

مَیں ہوں گوالا ، میں ہوں گوالا
دُکھ کے دُودھ کی دھاریں
میرے ہاتھوں جاری

ہے کوئی پینے والا ؟
دُکھ کے دُودھ کا امرت ، مورکھ

تیرے سارے سُوکھے پَودے
پھر سے کرے شاداب
تیری سوکھی دھرتی اُگلے
موتی موتی پھول چنبیلی
لعلوں لعل گُلاب
دُکھ کے رس سے سُوکھی مٹی
ہردے کی سیراب
دُکھ کے باج ہیں نیناں اندھے
اور کُل جگ سُنسان
دُکھ کا امرت پی کر چھُوٹیں
کوی کے مُکھ سے سوتے

میٹھے میٹھے ، بھیجے بھیجے
دُکھ کا امرت پی کر جب وہ آنکھیں مُوند کے کھولے
دھنک کے ساتوں رنگ دکھائے چتر کار بدوالی
دُکھ سے پُھوٹے گیان دھیان کی گنگا
دُکھ سے اس کے شوبھا گیان جوان

مَیں ہوں گوالا ، مَیں ہوں گوالا ——
دُکھ کے دُودھ کی دھاریں

میرے ہاتھوں جاری

ہے کوئی دُودھ آدھاری ؟
میں ہوں گوالا ، میں ہوں گوالا
ہے کوئی پینے والا ؟

••

جناب ضیا جالندھری

ہم

بچھی ہوئی ہے بساط کب سے
زمانہ شاطر ہے اور ہم
اس بساط کے زشت و خوب خانوں میں
دستِ نادیدہ کے اشاروں پہ چل رہے ہیں
بچھی ہوئی ہے بساط ازل سے
بچھی ہوئی ہے بساط جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے
بساط ایسا خلا ہے جو وسعتِ تصور سے ماورا ہے
کرشمۂ کائنات کیا ہے
بساط پر آتے جاتے مُہروں کا سلسلہ ہے

بساط ساکت ہے وقتِ مطلق

بساط بے جنبش اور بے حس ہے
اپنے مہروں سے لاتعلق ہے
اس کو اس سے غرض نہیں ہے
کہ کون جیتا ہے
اور کس نے شکست کھائی

وجود حادث، وجود ٹھہرے

بساطِ ساکت کی وسعتوں میں
زمین، اہلِ زمین، افلاک، اہلِ افلاک
اپنی اپنی معینہ ساعتوں میں ایسے گزر رہے ہیں
کہ جیسے آنکھوں سے خواب گزریں

بساط پر جو بھی ہے
وہ ہونے کی مہلتوں میں اسیر
پیہم بدل رہا ہے
وجود وہ مدتِ رواں ہے
جو نت نئی ہیئتوں میں باقی ہے
اور اس کو فنا نہیں ہے

جہاں پہاڑوں کے آسماں بوس سلسلے ہیں
وہاں کبھی بحر موج زن تھے
جہاں بیاباں میں ریت اُڑتی ہے
بادِ سموم گونجتی ہے

وہاں کبھی سبزہ زار و گلگشت کا سماں تھا
بلند و بالا، حقیر و ہیچ
اس شکست و تعمیر کے تسلسل میں بہہ گئے ہیں
شکست و تعمیر کے تسلسل میں تو ہے، میں ہوں

ہم ایسے مُہرے
جنھیں اراٹے دیے گئے ہیں
یہ جن کی توفیق پر حدیں ہیں
جنھیں تمنا کے رنگ دکھلا دیے گئے ہیں
مگر وسیلوں پہ قدغنیں ہیں
جنھیں محبت کے ڈھنگ سکھلا دیے گئے ہیں

یہ دست و پا میں سلاسل زر ہو
تو گردن میں طوق پہنا دیے گئے ہیں

جو ہے جواب تک ہوا ہے، جو ہو رہا ہے
اُس سے نکلے مُعجزہ ہے
کوئی جو چاہے
کہ عہدِ رفتہ سے ایک پل پھر سے لوٹ آئے
کہا ہوا لفظ اَن کہا ہو سکے
تو اُس آرزو کا حاصل وہ جانتا ہے

بہت سہی اختیار و امکاں
مگر ہواؤں کے سامنے
برگ و خس کی تابِ مجال کیا ہے

تو نے غنچہ میں اُس کا اپنا کمال کیا ہے

تری نگاہوں میں تیرا قُم کرہ سے گراں تر ہے
تو سمجھتا ہے
تیرے سینے کے سُرخ لاوے سے
شہر و قریہ پگھل رہے ہیں
خزاں زمستاں تری اُداسی کے آئنے ہیں
تو مشتعل ہو تو زلزلوں سے زمین کانپے
تجھے گماں ہے
کہ پھول کھلے ہیں ترے تبسم کی پیروی میں

یہ پھول کو اختیار کب تھا
کہ کون سی شاخ پر کھلے
کون کنج میں مسکرائے
اور کن فضاؤں میں خوشبوئیں بکھیرے
نحیف شعلہ جمال کونپل
جو دستِ نازک کی نرم پوروں سے دھیرے دھیرے
دریچۂ شاخ کھول کر
صبح کی سپیدی میں جھانکتی ہے
یہ سوچتی ہے
کہ باغ سارا اُسی کے دم سے مہک رہا ہے
اُسی کے پرتو سے گوشہ گوشہ دمک رہا ہے
اُسی کے دیدار میں مگن

خوشبوؤں سے بوجھل ہواؤں میں
شوخ تتلیاں رقص کر رہی ہیں

وہ بے خبر ہے
کہ شاطرِ وقت کی نظر میں
کوئی اکائی
شجر حجر ہو کہ ذی نفس ہو
نظامِ کُل سے الگ نہیں ہے
وہ یہ نہیں جانتی کہ ہستی کے کارخانے میں
اس کا ہونا نہ ہونا بے نام حادثہ ہے
اور اس کے حصے کا کُل اثاثہ
وہ چند لمحے، وہ چند سانسیں ہیں
جن میں وہ خواب دیکھتی ہے
سلیقۂ ذات سے چمن کو سنوارنے کا
بہارِ جاں کو نکھارنے کا

(۲)

بجا کہ ناپائدار ہے یہ وجود میرا
میں غیر فانی حیات کے سلسلے میں
اک بیچ کی کڑی ہوں
رہینِ گردش بھی، مرکزِ کائنات بھی ہوں
جو میں نے دیکھا ہے، وہ مرے خوں میں رچ
گیا ہے

جو میں نے سوچا ہے، مجھ میں زندہ ہے
اور جو کچھ سنا ہے مجھ میں سما گیا ہے
ہوا کی صورت ہر ایک احساس
میری سانسوں میں جی رہا ہے
ہر ایک منظر مرے تصور میں بس گیا ہے
میں ذات محدود اپنی پہنائیوں میں
اک کائنات بھی ہوں

مری رگوں میں وہ جوششِ جاوداں رواں ہے
جو شاخ میں پھول کی نمو ہے
جو بحر میں موج کی تڑپ ہے
پرِ کبوتر میں تابِ پرواز ہے
ستاروں میں روشنی ہے
میں اپنے ہونے کے سب حوالوں میں رونما ہوا
میں جا بجا صورتِ صبا ہوں
غزالِ خوش چشم کی کُلیلوں میں کھیلتا ہوں
ہمکتے بچے کی مسکراہٹ ہوں
پیرِ شب خیز کی دُعا ہوں
میں لہر میں، ماہتاب میں ہوں
یہ کیسی چاہت ہے جس سے میں
ایک مستقل اضطراب میں ہوں
وہ کون سی منزلِ طلب تھی
کہ رانجھا رانجھا پکارتی ہیر

آپ ہی رانجھا ہو گئی تھی

فلک سے انوار
کوہ سے چشمے
شاخ سے پھول پھوٹتے ہیں
گر ہر اک پھول میں نمی بھی ہے روشنی بھی

زباں میں الفاظ،
آنکھ میں دید،
دل میں احساس رکھ دیے گئے ہیں
یہ لفظ، احساس، دید اک دوسرے کا پیوند ہو گئے ہیں
نمود و تخلیق کے عمل بار بار دہرائے جا رہے ہیں
جمالِ ارض و سما کی تکمیل ہو رہی ہے
محبت اعجازِ سرمدی ہے

تمہاری آنکھوں کی مسکراہٹ میں
میری چاہت کی روشنی ہے
یونہی تنکوں کے پاس بیٹھی رہو
شعاعوں کو عارض و لب سے کھیلنے دو
ہوا کے ہاتھوں کو اپنے گیسو بکھیرنے دو
بہار کی ساری خوشبوئیں
اپنے بازوؤں میں سمیٹ لو
میرے چشم و دل کو یقیں دلاؤ
کہ تم فقط خواب ہی نہیں ہو

گزرتے بادل کا کوئی عکسِ رواں نہیں ہو
تم اک حقیقت ہو، محض وہم و گماں نہیں ہو
مرے قریب آؤ اور مری ذات کو مٹا دو
مجھے تم اپنے جمال کی ضو میں جذب کر لو
وصال میں فرد کی فنا ہے
وصال میں فرد کی بقا ہے
بہار کی دید عارضی ہے
بہار تجدید دائمی ہے

وداع کے وقت آنسوؤں میں
وہ سارے منظر جھلک رہے ہیں
جو شاخِ جاں پر گلوں کی صورت کھلے ہوئے تھے
وہ سارے امکاں جھلک رہے ہیں
جو کرچی کرچی بکھر گئے ہیں
بکھرنے والوں کو اپنے مرکز کی آرزو ہے

نہیں مجھے اس طرح نہ دیکھو
کہ جیسے نظروں میں روح تک اُڑی آ رہی ہو
یہ ہاتھ کچھ دیر اور رہنے دو میرے ہاتھوں میں
کچھ نہ بولو
کہ میں یہ نایاب لمحے آنکھوں میں جذب کر لوں
یہ ثانیے روح میں چھپا لوں
ہر ایک لمحہ اک ارمغاں ہے

تمھاری چاہت کا ارمغاں ہے
یہ ثانیے ایسے پھول ہیں
جو کھلتے رہتے ہیں دل ہی دل میں
شگفتہ رہتے ہیں رہتے دم تک

یہ چند لمحے کسی کسی کے نصیب میں ہیں
مگر نہ عمریں
غموں کے کانٹے نکالنے میں گزر گئی ہیں

(۳)

وہ شام ہوٹل میں اس طرح آئی
جیسے دشمن کی فوج اُترے
جگہ جگہ جست اور کانسی کے برتنوں جیسے چہرے
جھم جھم کھنک رہے تھے
تمام ہوٹل جگر جگر جگمگا رہا تھا
میں کنجِ تنہائی میں تحیّر سے دیکھتا تھا
کہ کیسے خوش باش ہیں جنھیں یہ خبر نہیں ہے
کہ ان کی بنیاد اکھڑ چکی ہے

ہوائیں مسموم ہو چکی ہیں
شجر پھلوں سے لدے ہیں لیکن
جڑوں کا زہر ان پھلوں کے ریشوں تک آ گیا ہے

جو حال اب ہے کبھی نہیں تھا
حیات خوار و زبوں تو تھی لیکن اتنی خوار و زبوں نہیں تھا

وہ دیر سے انتظار گہ میں
ہر آنے والے کو نظروں نظروں میں ناپتی تھی
لباس کی شوخی و جسارت
سنگھار کی جدّت و مہارت کے باوجود
اس کا گوشۂ چشم عمر کی چغلی کھا رہا تھا
نگاہ نو وارد اجنبی پر پڑی تو اس طرح مسکرا دی
کہ جیسے اُس کی ہی منتظر تھی
اُٹھی، قریب آئی اور بولی
میں ایک مدّت سے خدمتِ خلق کر رہی ہوں
دُکھے دلوں کا علاج کرتی ہوں
رنگ اور روشنی کے شہروں میں
شامِ تنہائی کی دل افسردگی سے واقف ہوں
آپ اکیلے ہیں تو کوئی انتظام کر دوں
یہاں سے میں دُور دُور ملکوں کو
ہر طبیعت کے گاہکوں کی پسند کا مال بھیجتی ہوں
وفا، محبت پرانی باتیں ہیں اب انھیں کون پوچھتا ہے
بڑے بڑے اونچے اونچے لوگوں سے رات دن میرا واسطہ ہے
یہ صاحبانِ وقار و نخوت
خریدنا اور بیچنا خوب جانتے ہیں
یہ دام دیتے ہیں اور راحت خریدتے ہیں

بجا ہے یہ بھی کہ بے بسوں کی اُخوت خریدتے ہیں
مگر جب آتے ہیں بیچنے پہ
تو بے تکلف ضمیر تک اپنا بیچ دیتے ہیں
جاہ و ثروت کی منڈیوں میں
میں کہہ رہی تھی کہ آپ چاہیں تو
آج کی رات کا کوئی انتظام کر دوں

وہ شام کے وقت خوں میں لت پت
سڑک کنارے پڑا ہوا تھا
گزرنے والوں سے کہہ رہا تھا
ہمیں ہمارے محافظوں سے
نجات کا راستہ بتاؤ
وہ خواہشِ اقتدار و دولت میں
ہم کو نیلام کر رہے ہیں
اخوت و اتحاد کا درس دینے والے
خود اپنے بچوں کے خوں سے
حرص و ہوس کی شمعیں جلا رہے ہیں
ہماری اقدار
آج متروک فیشنوں کے لباس کی طرح
ان کی نظروں سے گر چکی ہیں
اب اُن کی اولاد اُن کی ریشہ دوانیوں سے پناہ
تازہ بتازہ نشوں میں ڈھونڈتی ہے
انھی کی شہ پا کے نسلِ نو

اپنی پیاس ایک دوسرے کے خوں سے بجھا رہی ہے
یہ مقتل جشنِ مرگِ انبوہِ بے گناہاں منا رہے ہیں
کوئی ہمیں ان عجیب صورت
حریص و بے مہر کرگسوں سے
نجات کا راستہ بتاؤ

یہ نغمۂ کائنات کی بے سُری صدائیں ہیں
کوئی ان سے نجات کا راستہ بتاؤ

(۴)

ہم اپنے خوابوں میں جی رہے ہیں
ہم اپنے صبح و مسا سے تنگ آ کے
خواب بُنتے ہیں اور خوابوں میں جی رہے ہیں

بساطِ ساکت سے کوئی شکوہ
نہ شاطرِ وقت سے گلہ ہے
ہمیں شکایت ہے آدمی سے
کہ آدمی آدمی کا دوزخ بنا ہوا ہے

عجب تضادات کا مرقع ہے آدمی بھی
یہ اہرمن بھی ہے اور یزداں جمال بھی ہے
صداقت و حسن کا طلب گار بھی وہی ہے
بہیمیت اور وحشت و جبر کا پرستار بھی وہی ہے

زمیں پہ قابیل کے قبیلے کی رسمِ بیداد اوج پر ہے
مگر ہمارا عذاب اُس سے بھی تلخ تر ہے
کہ ہم جو ہابیل کے حواری تھے
عہدِ ہابیل میں بھی زنجیری رہے ہیں
شباہتوں کے فریب خوردہ تھے، یہ نہ جانا
نقاب پوشوں میں کون کیا ہے
ہمیں تو غم تھا کہ نشۂ اقتدار
قابیل ہو کہ ہابیل
جس کسی کو چڑھا
وہ انسانیت کو تاراج کر گیا ہے

ہمارے خوابوں سے ڈر رہے ہیں
وہ ڈر رہے ہیں کہ خواب الفاظ میں ڈھلے تو
دروغ کے پردے چاک ہوں گے
اور ان کے چہروں کا غازہ اُترا
تو آئنے بھی عذاب ہوں گے

ہم ایسے ٹھہرے
جنہیں ادارے دیئے گئے ہیں
پہ جن کی توفیق پر حدیں ہیں
ہمیں شکستیں ہوئیں مگر ہر شکست مہمیز ہو گئی ہے
ہمارے ساتھی گرے پہ رفتار اور کچھ تیز ہو گئی ہے

یہاں کی شگیں بے حسی میں
ہماری کوشش کا حال یہ ہے
کہ جس طرح کوئی تیتری
اِک خزاں زدہ باغ بے نمو میں
بھری بہاروں کی جستجو میں
تبسمِ گل کی آرزو میں
شجر شجر شاخ شاخ بے تاب پھر رہی ہو

ہمارے ہوتے بہار آئے نہ آئے لیکن
ہمیں یہ تسکین ہے کہ ہم نے
حیاتِ ناپائدار کی ایک ایک ساعت
چمن کی ہیئت سنوارنے میں گزار دی ہے
فضائے ہستی نکھارنے میں گزار دی ہے

بازیافت

○ مولینا مودودی کی دوسری قدیم ترین تحریر
—————— حادث سمنا



مودودی صاحب کی دو قدیم تحریریں آپ ملاحظہ فرما چکے، ایک 'جزل نشہ' میں اور دوسری 'معیار و تحقیق' نمبر ا میں۔ وہ دونوں ۱۹۱۹ء کی تحریریں تھیں۔

پیش نظر کتابچہ پر اکتوبر ۱۹۲۱ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس تحریر کا بڑا حصہ ترجمہ ہے، لیکن یہ ملاحظہ فرمائیے کہ ترجمہ بھی کیسا اور مکمل لگتا ہے۔ آخری صفحہ خالص ان کی اپنی تصنیف/تحریر ہے۔

——— ادارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حوادث سمرنا

کے متعلق

اتحادی کمیشن کی رپورٹ

مترجمہ

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

یہ رپورٹ اتحادی حکومتوں (امریکہ، برطانیہ، فرانس اور اٹلی) کے مقرر کردہ کمیشن کی تحقیقِ واقعاتِ مظالم کا نتیجہ ہے جو لوزین کی انجمن عثمانی نے شائع کی ہے

ناظم دار الاشاعت سیاسیات شرقیہ نے

بماہ اکتوبر ۱۹۲۱ء

عبد الحمید [illegible] جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کے شائع کی

بار اول

قیمت [illegible]

باسمہ تعالیٰ

حوادث سمرنا

کے متعلق

اتحادی کمیشن کی رپورٹ

ذیل کی رپورٹ اتحادی حکومتوں (امریکہ، برطانیہ، فرانس اور اٹلی) کے مقرر کردہ کمیشن کی تحقیقات واقعات مظالم کا نتیجہ ہے یہی وہ رپورٹ ہے جس کی اشاعت کو برطانوی حکومت نے مناسب نہیں خیال کیا چنانچہ دار العوام میں جب ایک ممبر نے اس رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ کیا تو جواب میں خود مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے یہ کہا کہ سردست حکومت اس کی اشاعت کو مناسب نہیں سمجھتی، کیونکہ اس کی اشاعت سے سمرنا کے تصفیہ یا مصالحت ممکن ہے کہ خطرہ میں پڑ جائے اور اس میں پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں لیکن لوزین د مسٹر ریشا کی انجمن عثمانی نے ترکی و اطالوی حکومت کے ذریعہ سے اس کو حاصل کر کے یورپ میں شائع کر دیا ہے ہم جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رکن اعلیٰ وفد خلافت کے ممنون ہیں کہ انکی عنایت و کرم سے یہ رپورٹ ہمیں ہاتھ آئی۔

ناظم دار الاشاعت سیاسیات مشرقیہ دہلی

تحقیق نے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ التوائے جنگ کے بعد سے ولایت سمرنا کے عیسائیوں کی حالت بالکل قابل اطمینان تھی اور انکی مذہبی و تمدنی زندگی کے

نے تری حکومت میں کوئی خطرہ نہ تھا پس اگر اسی خطرہ کی بنا پر مجلس صلح نے سمرنا کو یونان کی حکمبرداری میں دینے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ ایک غلطی تھی اور اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے یہ غلط واقعات مجلس تک پہنچائے ہیں،

۲۔ ان افسوسناک واقعات کی حقیقت مذہبی تعصب میں ڈھونڈی جا سکتی ہے، یونانی حکام نے ان لوگوں کی روک تھام میں کچھ نہیں کیا جو عام یونانیوں میں مذہبی جنون کو ترقی دیتے رہے ہیں بلکہ بہت جلد ان کے طرز عمل نے ثابت کر دیا کہ ان کا قبضہ قیام امن کے لیے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اپنے زعم میں ایک صلیبی فاتح کی حیثیت سے سمرنا میں داخل ہوئے تھے

۳ جو واقعات شہر سمرنا میں ۱۵ اور ۱۶ مئی کو اور اس کے بعد دوسرے مقامات میں پیش آئے ان تمام کی ذمہ داری یونان کے سپہ سالار اور چند دیگر ذمہ دار فوجی افسروں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے اپنے فرائض کیطرف سے پوری غفلت برتی خود یونانی حکومت نے اس ذمہ داری کو تسلیم کیا ہے،

کچھ تھوڑی سی ذمہ داری سمرنا کے ترک افسروں پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے یونانی قبضہ سے پہلے ان قیدیوں کا کوئی تدارک نہیں کیا جو قیدخانوں سے بھاگ کر مسلح ہو گئے تھے۔

۴۔ سمرنا کی آبادی پر جو ہولناک مظالم ہوئے اور جنکی بدولت ساری ولایت کی سرزمین خون سے سرخ ہو رہی ہے اس کی پوری ذمہ داری حکومت یونان پر عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ

(الف) اس نے مجلس صلح کی ان ہدایات پر عمل نہیں کیا جو اس کو بذریعہ تار بھیجی گئی تھیں،

(ب) اس نے اتحادی نمایندوں سے استمزاج کئے بغیر جن کو نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا تھا اپنے سپہ سالار کو اجازت دیدی کہ ایدان، قصابہ اور نزمہ کی طرف فوجیں بھیجے، حالانکہ یہ علاقے اس رقبہ میں داخل نہیں جو یونان کی حکمرداری میں دیا گیا،

(ج) اس نے مقبوضات کی توسیع کے شوق میں باشندوں کی حفاظت اور آسایش کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں زبردست جوش پھیل گیا اور حاکمانہ قوت سے ٹکرا گیا،

۵ - سمرنا کی یونانی گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام ان حرکات کے بھی ذمہ دار ہیں، جو مسلح یونانی عوام نے کی ہیں، کیونکہ انہوں نے ان عوام کو باقاعدہ فوج کی طرح استعمال کیا اور تمام ملک میں انہیں پھیلا دیا۔

۶ - ولوی مینندرس میں جو مصائب نازل ہوئے ان کی سب سے بڑی وجہ یونانیوں کا غیر منصفانہ قبضہ تھا، یونانی فوج کا ہر قدم جو آگے بڑھتا تھا خوفناک حوادث اس کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے، صدیوں سے جو نفرت و عداوت یونانیوں اور ترکوں میں قایم ہے اس نے ظلم و ستم کی آگ کو اور بھڑکا دیا ہے، لیکن انصاف کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو صرف یونانی اس کے ذمہ دار نہیں ہیں [1]

برغامو، منیسہ، اور یو میش کی بربادی کے بھی تقریباً یہی وجوہ ہیں،

---

[1] شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف یونانی ہی نہیں بلکہ اتحادی بھی ہیں،

۷۔ گر صرف یونانی ہی (اور یونانی کمانڈر خصوصیت کے ساتھ) امینین کے قتل عام کے ذمہ دار ہیں جو برفامو کے واقعات سے متاثر ہو کر یونانی فوجوں نے کیا ہے یونانی کمانڈر کا فرض تھا کہ برفامو کی مدافعت سے برافروختہ سپاہیوں کو اپنے قبضہ میں رکھتا، مگر اس نے انہیں بے لگام چھوڑ دیا،

۸۔ اگرچہ موجودہ حالت نسبتاً ساکن ہے، لیکن ولایت ایدان میں ابھی تک امن قائم نہیں ہو سکا، سب سے زیادہ یہ بات کہ اندرون ملک سے تجارتی تعلقات بالکل منقطع رہیں،

یہ سب کچھ بلاشبہ نتیجہ ہے یونان کے فوجی تسلط کا اور اس حالت جنگ کا جو بے قاعدہ ترک سپاہیوں اور باقاعدہ یونانی افواج کے درمیان قائم ہے،

ارکان مجلس

برسٹل :- نمائندۂ امریکا

بناؤسٹ :- نمائندۂ فرانس

ہیسر :- نمائندۂ برطانیہ

ڈال اولیو :- نمائندۂ اٹلی

کمیشن کی دُوسری رپورٹ

اور اسکی تجاویز

ا ولایت سمرنا میں جو صورت حالات پیدا ہو گئی ہے۔ وہ صد سے زیادہ افسوسناک ہے۔ کیونکہ :-

(الف) یونان کا عارضی قبضہ جس کا مقصد محض امن قایم کرنا تھا درحل یک دوامی الحاق کی سی شکل اختیار کر گیا ہے۔ یونانی حاکم اعلیٰ نے حکومت کی باگ کلیتہً اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ترک حکام سے تمام انتظامی و دفتری اختیارات لے لیے گئے ہیں۔ ان کے تعلقات قسطنطنیہ کی مرکزی حکومت سے منقطع کر دیے گئے ہیں اور ترکی پولیس اور جندارمہ کو منتشر کر دینے کی وجہ سے وہ اب بالکل بے دست و پا ہو گئے ہیں،

(ب) سمرنا پر قبضہ قایم رکھنا یونان کے لیے بے شمار مالی و جانی قربانیوں کا باعث ہو گا جن کو اگر محض ایک غیر ملک میں امن قایم کرنے کے لیے وہ پیش کرنے کے لیے تیار ہے تو اس کی بساط سے بہت زیادہ ہے اور اس کو اس قدر قربانیوں پر مجبور کرنا صریح ناانصافی ہے،

(ج) یونانی قبضہ اپنی موجودہ شکل میں امن قایم کرنے کی بجائے مخطوط باشندوں کے لیے ایک مصیبت ثابت ہو رہا ہے،

۲- پس ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں، کہ:-

(الف) اگر سمرنا پر یونانی فوجی قبضہ کا مقصد باشندوں کی حفاظت و قیام امن ہی ہے، تو یہ کام یونانی فوج سے بہتر اتحادی افواج کر سکتی ہیں پس مناسب ہوگا کہ اتحادی فوجیں ایشیائے کوچک میں انتظام کرنے کے لئے یونان کی بجائے خود اپنی فوجیں بھیجدیں،

(ب) یونان کا قبضہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ مجلس صلح سمرنا کو یونان سے کامل طور پر ملحق کردے،

(ج) مگر سمرنا کے دوامی الحاق کا فیصلہ حقوق قومیت کے مسلمہ اصول کے خلاف ہوگا کیونکہ ساری ولایت میں سوائے شہر سمرنا اور ایوالیق کے ترکی آبادی کو زبردست اکثریت حاصل ہے، ہم اس بات کو صاف طور سے ظاہر کردینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ترک کبھی اس الحاق کو پسند نہ کریں گے وہ صرف ایک زبردست فوجی قوت کے آگے سر تسلیم خم کر سکتے ہیں سو یہ ظاہر ہے کہ اتنی قوت مہیا کرنا یونان کے بس کی بات نہیں،

(۳) ان حالات میں ہم حسب ذیل تجاویز پیش کرتے ہیں،

(الف) جس قدر جلد ممکن ہو یونانی افواج سے سمرنا خالی کرالیا جائے اور انکی جگہ صرف اتنی افواج اتحادی افسروں کے ماتحت بھیجی جائیں جو انتظام کے لئے کافی ہوں،

(ب) یونانیوں کی تسلی کے لیے مناسب ہوگا کہ ان کے چند دستے رہنے دیئے جائیں مگر ان کو سخت حکم ہو کہ ترکوں سے کوئی واسطہ نہ رکھیں،

(ج) اتحادی افواج کے ملک میں داخل ہوتے ہی قسطنطنیہ کی مرکزی حکومت سے درخواست کی جائے کہ وہ اتحادی افسروں کے ماتحت اپنی جندارمہ کو دوبارہ مرتب کرے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ملکی انتظام اس جندارمہ کے ہاتھ میں دے کر اتحادی فوجیں واپس بلالی جائیں

(۴) ہر لر اناطولیہ نے بارہا اس کا اعلان کردیا ہے کہ ہماری تحریک صرف یونانیوں کے مقابلہ میں ہے۔ پس انکی فوجی تیاریاں روکنے کے لیے ضروری ہے کہ انکی شکایات کو رفع کیا جائے اور سمرنا کو قسطنطنیہ کی مرکزی حکومت کی جانب منتقل کردیا جائے ورنہ بصورت دیگر خود اتحادی سمجھہ سکتے ہیں کہ ترکی حکومت یا ترک لیڈروں کی خاموشی بلکہ اظہار وفاداری کی تہ میں کیا ہے۔

دستخط

برسٹل بناوسٹ

ھیمر ڈال اولیو

انجمن عثمانی کا نوٹ

اس سے پہلے دنیا سن چکی ہے کہ یونان کو ولایت سمرنا میں امن قایم کرنے کا مقدس کام سپرد کیا گیا ہے جہاں صدیوں سے کبھی بدامنی کی معمولی علامتیں بھی نہیں دیکھی گئیں۔ اب ہم اس سے زیادہ ستم ظریفانہ ایک اور تجویز سن رہے ہیں جو دراصل شرافت اور کمینگی کی جنگ میں شرافت کی ہولناک شکست کا ایک نیا نتیجہ ہے۔ اس تجویز کا ماحصل یہ ہے کہ مجلس اقوام اناطولیہ کی "باغیانہ تحریک" کے استیصال پر یونان کو مامور کردے۔ اسکے صاف و صریح معنی یہ ہیں کہ یونان کی تمام سفاکیوں کی ناپاک ذمہ داری مجلس اقوام اپنے اوپر لے لے۔

جانتے ہو یہ "باغیانہ تحریک" کیا ہے؟ یہ وہ مقدس تحریک ہے جس کا مقصد ایک مظلوم قوم کے لیے اپنے حدود قومیت میں آزادی طلب کرنا ہے جسے ہر قوم کا جائز حق تسلیم کر لیا گیا ہے۔

اس غیر معقول تجویز کے متعلق لوزین کی انجمن عثمانی مہذب دنیا کے سامنے چند اہم پہلو روشن کر دینا چاہتی ہے،

اول ونیزلوس کی فوج کو ولایت سمرنا میں امن و سکون پیدا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مگر اس نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک ٹھیک اس کے برعکس تھا۔ اس نے آبادیوں کی آبادیاں جلا ڈالیں خاندان کے خاندان تباہ کر دیے اور ساری ولایت میں ادھر سے ادھر تک خونریزی اور غارتگری کا بازار گرم کر دیا۔

اتحادیوں کی مجلس صلح نے ایک کمیشن اس مقصد کے لیے بھیجا تھا کہ ان واقعات کی تحقیق کرے جو سمرنا کے متعلق مشہور ہیں۔ اس نے طویل تحقیقات کے بعد ان تمام واقعات کی تصدیق کی اور وینزیلوس کی فوج کو ان کا ذمہ دار قرار دیا۔ ہم اس اپیل کے ساتھ اس رپورٹ کو بھی شایع کرتے ہیں، جو متحدہ کمیشن نے مرتب کی تھی،

۲۔ مجلس صلح نے اپنے متحدہ کمیشن کی سفارشوں پر عمل کرنے کی بجائے یونانیوں کے عارضی قبضہ کو قائم رہنے دیا، اور صرف یہی نہیں بلکہ یونانی سفاکیوں کی تصدیق کے بعد بھی اس نے وینزیلوس کی اس تجویز کو ٹھنڈے دل سے سنا کہ جنوبی یورپ کے سفاکوں کو ایشیا میں اپنی خونریزیوں کا حلقہ وسیع کرنے کا موقعہ دیا جائے

۳۔ سمرنا کے اندوہناک واقعات کے بعد وینزیلوس کے لیڈروں کو اندرون ملک میں بڑھنے کی اجازت دینا صاف طور سے یہ معنی رکھتا ہے کہ اب تک جو کچھ ہوا وہ اتحادیوں کی مرضی سے ہوا اور اب وہ اس سے کچھ زیادہ چاہتے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کس ظلم کا ایک انسان تصور کر سکتا ہے۔

۴۔ سمرنا کے "عارضی" قبضہ ہی سے ترکوں میں ایک زبردست قومی جوش پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اگر یونانی درندوں کو اس سے آگے بڑھنے کی اجازت دی گئی تو یقیناً ترک جان سے ہاتھ دھو کر تلوار نیام سے نکال لیں گے اور پھر یہ اندازہ کرنا مشکل ہوگا کہ اس وقت کتنی خونریزی ہوگی،

۵۔ آج کل سارے عالم اسلامی میں ایک زبردست مذہبی جوش پیدا ہے جس کی وجہ محض ترکی کے مصائب ہیں پس اگر یونانیوں کی ہمت افزائی کرکے

ان کے مصائب کو اور زیادہ کیا گیا تو نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمانانِ عالم کس شدت
مشتعل ہو جائیں گے۔

۶ - سمرنا میں یونانی فوج کا مسلسل قیام اور زیرِ تجویز ہوشیا تشددی ایسی خوفناک
صورتِ حال پیدا کر دے گی کہ ہمیشہ کے لیے ترکوں اور یونانیوں کے درمیان صلح
کا قیام ناممکن ہو جائے گا، جو دنیا کے امن کے لیے بہت مضر ہے

اگرچہ امید نہیں کہ مجلس صلح ونیزلوس کی تجویز کو منظور کر لے گی[۹۱] تاہم
موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ہم اس تجویز کی شدید مخالفت کرتے
ہیں، اور مجلس صلح کو پھر آگاہ کرتے ہیں کہ مشرق میں امن کا قیام اس وقت تک ناممکن
ہے، جب تک تھریس اور سمرنا میں ایک ہی یونانی سپاہی موجود ہے۔

ترکی قوم کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ جو چیز ہے وہ دولت برطانیہ
کی وہ خفیہ اعانت ہے جو مسلمانوں کے جانی دشمن یونان کو دی جا رہی ہے، کیا
یہ سچ نہیں کہ برطانی حکومت کی عظیم الشان عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے
ان کا بڑا حصہ اسلامی ہے۔

حسن علیچہ

معتمد انجمن عثمانی لوزین (سوئٹزرلینڈ)

---

۹۱ اگرچہ مجلس اعلیٰ نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا، لیکن اس معاملہ میں اپنی کامل غیر جانبداری کا اعلان کر دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اتحادی یونان اور ترکی کو ان کے خیال پر چھوڑ دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ مظلوم کی بے بسی کو جانتے ہوئے ظالم کے حرکات سے چشم پوشی کرنا در حقیقت ظالم کی اعانت کرنا ہے

انگلستان کی مزدور پیشہ جماعت

کے جذبات

ترکوں کو اس وقت ایسے بے رحم سرمایہ داروں کی جماعت نے گھیر لیا ہے جو اپنے زبردست حلقۂ استبداد کو عالمگیر وسعت دینے کے لیے حیوانی قوتیں استعمال کر رہے ہیں، اس جماعت کی سرداری کا فخر برطانیہ عظمیٰ کو حاصل ہے جو ۳۲ کروڑ ہندوستانیوں اور ڈیڑھ کروڑ مصریوں کو غلام بنانے کے بعد بھی شکم سیر نہیں ہوئی، اور اب دولت کی بھوک اسے عراق و فلسطین کی طرف لیجا رہی ہے تاکہ اپنے اسیران بلا کی طویل فہرست میں ان کو بھی شامل کر دے۔

ضرورت نہیں کہ اس نہب و سلب کے وجوہ پر ہم کوئی بحث کریں دنیا کو معلوم ہے کہ انگریزوں نے "ہمدردی بنی نوع انسانی" سے مجبور ہو کر ملکوں اور قوموں کو مہذب بنانے کا مقدس کام اپنے ذمہ لیا ہے، امرتسر میں ڈائر کی گولیاں اور اسکندریہ میں العتبانی کے بم یہی خدمت کو انجام دے چکے ہیں، اب یہی سبق مشرق و مغرب کے دوسرے ملکوں کو بھی سکھانا ہے، وہاں ہمدرد کے انصاف کو اصلی رنگ میں دیکھنا ہو تو اس فسانۂ خونیں کا مطالعہ کرو

مسلمانوں کو یونانی جن ہولناک طریقوں سے برباد کر رہے ہیں، انکی

ذمہ داری انگلستان کی سرمایہ دارانہ ہوسناکی ہی پر عائد ہوتی ہے بلاشبہ کیونکر
ممکن تھا وہی یونان جسکو بحری ناکہ بندی سے مجبور کرکے انگریزوں[1] نے جرمنی کی
طرفداری سے باز رکھا تھا آج اتحادی قوتوں کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے
بنا حصہ مانگتا ہے اور ایشیائے کوچک کی ایک زرخیز سرزمین پر بلاوجہ اس کا
حق تسلیم کرلیا جاتا ہے،

آج ہم پھر دنیا کو بتلانا چاہتے ہیں کہ اس "انصاف" سے مسلمانوں کو
کیسے کیسے مہتم بالشان فائدے حاصل ہوئے ہیں، سمرنا کے ساحل پر قدم رکھتے
ہی یونانی عیسائی مسلمانوں کو مہذب بنانے کے مقدس کام میں مشغول ہوگئے
کس طرح؟ گھروں کو لوٹ کر، اور لوٹنے کے بعد جلاکر، عورتوں کو بے حرمت
کرکے اور بے حرمت کرنے کے بعد قتل کرکے، جہاں جہاں وہ گئے غارتگری کا
بازار گرم کیا،

آبادیوں کے لیے مشکل تھا کہ انکی گولہ باری سے بچ جائیں، زمینداروں
کی خوش قسمتی تھی اگر انکی کھیتیاں پامالی سے محفوظ رہیں، بوڑھوں اور بچوں
کے لیئے ان کے قانون میں امان نہ تھی، اور مسجدیں اور خانقاہیں انکی نشانہ بازی
کی مشق سے کسی طرح نہ بچ سکتی تھیں

---

[1] اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ سب سے پہلے جس یونانی ڈویژن
نے سمرنا پر قدم رکھا تھا وہی ڈویژن تھا جس نے جنگ کے زمانہ میں ایتھنز پایہ تخت یونان کے
سامنے انگریزی اور فرینچ تحت البحر کشتیوں کو گولہ باری کرکے ڈبو دیا تھا،

ان حرکات کے مقابلہ میں اگر مسلمان بھی عیسائیوں کے ساتھ ایسے ہی ھیمانہ برتاؤ کریں تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں، مگر واقعات بتلاتے ہیں کہ انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔

جنرل ٹاؤنشنڈ سے پوچھو کہ عراق کی جنگ میں جب وہ اور ان کے ساتھی گرفتار ہو گئے تھے تو ان کے ساتھ ترکوں نے کیسا سلوک کیا تھا

سمرنا کے انگریزوں سے دریافت کرو کہ جب سمرنا کی فضا میں ایک ترکی ہیرو طیارے نے دو انگریزی ہوائی جہازوں کو گرا دیا تھا تو ترکوں نے ہوابازوں کا جنازہ کس شان سے نکالا تھا۔

مگر یہ اتحادی اپنے طرز عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے اب تک اگر حیوانیت سے اجتناب کیا ہے، تو یہ انکی بے وقوفی تھی بنی نوع انسان کی ایک شریف ترین قوم پران وحشیانہ مظالم کے سلسلہ کو جاری رکھنا دنیا کے اشتراکیت کے لئے ایک بدنما داغ ہے جس کو جلد سے جلد مٹا دینا تمام اشتراکیوں کا فرض ہے خصوصا برطانیہ عظمٰی کی مزدور پیشہ جماعت پر اس ذمہ داری کا سب سے زیادہ بار ہے،

ہم کو معلوم ہے کہ ایک زبردست نظام تبلیغی کے ذریعہ مزدور پیشہ جماعت کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ ترکوں نے آرمینیا میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا ہے، اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب ان کے گناہوں کی سزا ہے مگر ہم تمام مزدوروں کو بتلا دینا چاہتے ہیں کہ وہ سب قصہ افسانہ تھا، جو کچھ اب تک دنیا کو سنایا گیا ہے، اب دنیا کو اسے بھول جانا چاہئے، آرمینیا میں

اگر کبھی خونریزی ہوئی ہے تو اس کی تمام ذمہ داری ہنار کی قنات شدہ عادت پر عائد ہوتی ہے جس نے اپنی مرکزیت کو مضبوط کرنے کے لئے خفیہ انجمنوں کے ذریعہ ایک طرف ارمنوں کو شورش اور اضطراب کی جانب مائل کیا اور دوسری جانب تمام ترکوں اور کردوں کو ارمنوں کے خلاف بھڑکایا۔ تاہم اگر غارتگری کی ذمہ داری ترکوں پر عائد کر دی جائے تو اس کے لئے یہ سزا کافی ہے کہ ان کو غیر قوموں پر حکومت کرنے کے حق سے محروم کر دیا جائے،

ہم تمام ایسے لوگوں کو جو انسانیت کو حیوانی اثرات سے آلودہ نہیں دیکھنا چاہتے "دی گرین سپر الڈ لیگ کی شرکت کے لئے دعوت دیتے ہیں جسکا مقصد اقوام عالم کو غلامی سے نجات دلانا ہے۔ عیسائیوں کے بنیادی اصولوں میں ایک زرین اصول یہ بھی ہے، کہ

"دوسروں کے ساتھ وہی برتاؤ کرو جو تم اپنے لئے چاہتے ہو"

لیکن کیا یہ عیسائی رو؟ پسند کریں گے کہ ان کو آگ میں جھونک دیا جائے ان کے بچے قتل کئے جائیں، اور انکی بیٹیوں کی عصمت دری کی جائے،

جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ سب حرکات ان لوگوں سے سرزد ہوئی ہیں جن کے ایک ہاتھ میں بائبل ہے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار تو ہم کو ایسے عیسائیوں کی ایمانی حالت پر سخت افسوس ہوتا ہے،

"برٹرینڈ ڈی کولونا"

مسلمانو

فرصت کی آخری گھڑیاں ہیں اور دنیا میں کچھ کر دکھانے کے لیے اللہ کی طرف سے تم کو چند گنی ہوئی ساعتیں دی گئی ہیں اگر انکو تم نے محض جلسہ بازی اور شور و شغب میں گذار دیا تو یقین رکھو کہ پھر تمہارے لیے دنیا میں زندگی کا کوئی حق باقی نہ رہیگا۔

ایشیائے کوچک میں اسلامی حمیت کی آخری نمائش ہے، اور ایک تھکا ہوا ہاتھ دین الٰہی کے مقدس علم کو سربلند کیے ہوئے ہے اگر تم نے جلدی اس کی مدد نہ کی تو پھر تم کو اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھنا پڑے گا جس کا ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے تم تصور ہی نہیں کر سکتے۔

پس وقت ہے کہ جہاد بالقلب و باللسان سے چند قدم آگے بڑھاؤ، دنیا کے تمام عیسائی یونانیوں کی مدد کر رہے ہیں، پھر یہ کیا بے غیرتی ہے کہ تم نے ترکوں کو تنہا چھوڑ رکھا ہے، اگر اپنی جانیں تم کو عزیز ہیں اور میدان شہادت سے بھاگتے ہو تو کم از کم اتنا تو کرو کہ ان کو روپیہ سے مدد دو اور انکے زخمیوں کے لیے ایک طبی وفد بھیجو!

"ابو الاعلیٰ"

سلہ تمام چندہ مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی کو ارسال فرمائیے، اور جو صاحب [illegible] مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی سے خط و کتابت کرنی چاہیے۔

اہم رسائل کا اشاریہ

○ اقبالیات (دوینگر) کے مشتملات کا اشاریہ

○ جاوید اشرف



خدابخش لائبریری سے 'العصر' (الٰہ آباد)، 'ادیب' (فیروزآباد)، 'ادیب' (لکھنؤ)، 'معیار' (پٹنہ)، 'زبان' (منگرول)، 'عصری ادب' (دہلی)، 'صبحِ امید' (لکھنؤ)، 'تحریر' (دہلی) کے اشاریے پیش کیے جا چکے ہیں۔

اس شمارے میں 'اقبالیات' (سری نگر) کا اشاریہ ملاحظہ فرمائیں، ساتھ ہی 'اقبالیات' کے ان شماروں میں اقبال کے جو نوادر شائع ہوئے ہیں وہ بھی یکجا دیے گئے ہیں۔

ادارہ

جاوید اشرف
لائبریری اسسٹنٹ
خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔۴

اقبالیات (سرینگر) کے مقالات کا اشاریہ

۱۹۸۱ء ——— ۱۹۸۹ء

اقبال شناسی کی تعلیم و تربیت، اقبال کی حیات اور فکر و فن پر تحقیق کے لیے ۱۹۷۹ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی (سرینگر) میں قائم ہوا۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام ستمبر ۱۹۸۱ء میں "اقبالیات" کا پہلا شمارہ زیر ادارت پروفیسر آل احمد سرور شائع ہوا، جس کے اب تک پانچ شمارے منظر عام پر آچکے ہیں جو اپنی نوعیت میں تخصیص اقبال تحقیق و تنقیدی مضامین پر مشتمل گرانقدر دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتدائی تین شماروں کی ادارت پروفیسر آل احمد سرور نے فرمائی، چوتھا پانچواں شمارہ پروفیسر امین احمد اندرابی کی ادارت میں شائع ہوا۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ہر سال ۲۱ اپریل، اقبال کے یوم وفات کے موقع پر خصوصی بزم مقالات کا اہتمام ہوتا ہے۔ اب تک اقبال اور تصوف، اقبال اور مغرب، اقبال کی شاعری اور شعریات، تشخص کی تلاش اور اقبال، جدیدیت کے متعلق اقبال کا رویہ، اقبال کی بہترین نظم یا غزل، جیسے عنوانات پر سمینار ہو چکے ہیں۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے تحت اقبالیات پر تحقیق کا کام بھی چل رہا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر چمن لال رینہ نے "اقبال اور گوتم بدھ" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ نیز سات اسکالروں کو اقبالیات پر ایم۔ فل۔ کی ڈگریاں بھی تفویض ہو چکی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔
"اقبال اور سیو مزم" (شفیقہ رسول) ۱۹۸۱ء، "اقبال کے خطوط کا تنقیدی مطالعہ" (امین اندرابی) ۱۹۸۱ء، "حالی، اکبر اور اقبال کی پیامی شاعری، تقابلی مطالعہ" (نصرت اندرابی) ۱۹۸۱ء، "اردو نظم میں اقبال کا کارنامہ" (بلقیس سراج) ۱۹۸۱ء
"اقبال پر غالب کے فکر و فن کا اثر" (زاہدہ پروین) ۱۹۸۲ء، "اقبال کی اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ" (زرینہ بٹ) ۱۹۸۲ء۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ سے اب تک نصف درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "اقبال کے مطالعے کے تناظرات" (پروفیسر آل احمد سرور)، "اقبال اور تصوف" (آل احمد سرور)، "اقبال اور مغرب" (آل احمد سرور)، "اقبال اور مغربی فکر" (پروفیسر حمید اللہ)، "اقبال مصلح قرن آخر" (علی شریعتی / ترجمہ کبیر احمد جائسی)، "اقبال کے شاعرانہ فلسفے کے چند پہلو" (پروفیسر عالم خوندمیری)، "ٹیگور، سری اروبندو اور اقبال" (اس۔ کے۔ گھوش)۔ ان مطبوعات کے علاوہ مزید گیارہ کتابیں زیر طبع ہیں جو مستقبل قریب میں منظر عام پر آجائیں گی۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کے اس مختصر لیکن وقیع مجلہ "اقبالیات" ۸۹-۱۹۸۱ء کے مشمولات کا موضوعاتی اشاریہ ترتیب
دے کر پیش کیا جا رہا ہے۔ گو بظاہر یہ مختصر ہے لیکن بلحاظ اہمیت و افادیت بیش قیمت ہے۔ اس اشاریے سے ایک اور بات
یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ ادارے نے اپنے مجلے کو محض اقبالیات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اقبال کے سوا جوش، حسرت، فانی
اور فراق جیسے شعرا کے لیے بھی مجلہ اقبالیات میں ایک گوشہ رکھ چھوڑا ہے۔ یہ گوشہ دراصل ادارے کے وسعت ظرف، وسعت
نظر اور وسعت فکر کا پتہ دیتا ہے جو اقبال کا خاصہ تھا۔

اقبالیات

ابلیس۔ اقبال اور گوئٹے کی نظر میں (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● احوامن کے
افکار پر اقبال کا اثر (بدرالدین بٹ) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اسلوبیات اقبال (گوپی چند نارنگ)
اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● اداریہ/ اقبالیات (آل احمد سرور) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● ایضاً
(آل احمد سرور) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● ایضاً (آل احمد سرور) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● ایضاً
(محمد امین اندرابی) اقبالیات ۴ اپریل ۱۹۸۸ء ● ایضاً (محمد امین اندرابی) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ●
اقبال، استعارہ، امیج، علامت (شکیل الرحمٰن) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ
کی رفتار (ادارہ) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات (ادارہ) اقبالیات ۱
ستمبر ۱۹۸۱ء ● ایضاً (ادارہ) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال اور آزاد (ریاض الرحمٰن شروانی) اقبالیات
۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال اور جوش (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال اور
فانی (آل احمد سرور) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال اور گوئٹے (مسعود حسین خاں) اقبالیات ۵ اپریل
۱۹۸۹ء ● اقبال اور مذہبی حسیت (شکیل الرحمٰن) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کا اسلوب بیان
(اسلوب احمد انصاری) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط (مسعود حسین خاں) اقبالیات ۲
۱۹۸۲ء ● اقبال کا شعری لہجہ (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال کا عروضی نظام (شمس الرحمٰن
فاروقی) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال کا نظریہ زبان (اکبر حیدری) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ●
علامہ اقبال کا نعتیہ کلام (مرزا کمال الدین شیدا) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● اقبال کا فن ایک عمومی جائزہ
(آل احمد سرور) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال کا نقش باز آفرینی (سید مہدی مغزوی) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء
● اقبال کی ایک تکنیک۔ مسجد قرطبہ کی روشنی میں (قاضی غلام محمد) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● اقبال کی ایک غزل

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● علامہ اقبال کی بہترین اردو غزل
(مرغوبہ کاشمیری) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۸ء ● اقبال کی بہترین اردو نظم (آل احمد سرور) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۸ء
● اقبال کی سیاسی فکر (آل احمد سرور) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۸ء ● اقبال کی شاعری اور پیکر تراشی (حامدی
کاشمیری) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کی شعری زبان (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ●
اقبال کی فارسی شاعری کی معنویت (آصف نعیم) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کی کثیر الجہت شخصیت (مرغوب
بانہالی) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● اقبال کی مذہبی فکر کی معنویت (محمد امین اندرابی) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء
● ایضاً (غلام رسول ملک) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کی معنویت (آل احمد سرور) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء
● اقبال کی نظم "بوئے گل" کا تجزیہ (آصف نعیم) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال کے دو خطوط بنام [illegible]
(اقبال) ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال کے علائم فارسی میں (آصف نعیم) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● اقبال
کے علائم (شمیم حنفی) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۷۸ء ● حضرت اقبال کے مذہبی افکار کے متعلق میرے افکار (مفتی
جلال الدین) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال کے ہیئتی تجربے (رحمٰن راہی) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ●
بزم انجم — ایک تجزیہ (غلام رسول ملک) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● کرنل بشیر حسین زیدی کا ایک خط آل احمد سرور
کے نام بسلسلہ اقبال (کرنل بشیر حسین زیدی) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● پیام مشرق کی ایک نظم "[illegible]" کا مطالعہ
(مرغوب بانہالی) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● تسخیر فطرت ایک مختصر جائزہ (رحمٰن راہی) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء
● تنہائی — ایک سرسری جائزہ (رحمٰن راہی) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● جاوید نامہ کی تکنیک (غلام رسول ملک)
اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء ● جبریل و ابلیس (آل احمد سرور) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● ایضاً (شکیل الرحمٰن)
اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۸ء ● حسرت موہانی اور اقبال (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● حضرت
میر سید علی ہمدانی کی مدح علامہ اقبال کے قلم سے (سید محمد کمال الدین) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● دو غزلیں
(قاضی غلام محمد) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● رمزیت اقبال کا فن (کبیر احمد جائسی) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۶ء
● ساقی نامہ ایک اسلوبیاتی جائزہ (پی۔ این۔ پشپ) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● ساقی نامہ (قدوس جاوید)
اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۸ء ● سلطان — (نظم اقبال) (مفتی جلال الدین) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ●
شاعری — اقبال کی پہلی شناخت (مظہر امام) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● شاعری، قرآن اور اقبال
(مفتی جلال الدین) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● شعاع آفتاب (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۳ اپریل ۱۹۸۸

● شمارہ امید، نظم اقبال (مسعود حسین) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● شعر اقبال کی تفہیم میں معنی مرید ہندی کی اہمیت (وارث علوی) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● ضرب کلیم کا اسلوب (آل احمد سرور) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● عصر حاضر کے ایران میں اقبال کی معنویت (کبیر احمد جائسی) اقبالیات ۲ ۱۹۸۸ء ● کیا اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۲ ۱۹۸۸ء ● محاورہ مابین خدا و انسان (غلام رسول ملک) اقبالیات ۲ اپریل ۱۹۸۸ء ● مسجد قرطبہ عالم نوند میری اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء ● مناظر فطرت اور اقبال (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۱ ستمبر ۱۹۸۱ء۔



اقبال اور جوش (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● جوش شاعر یا صحافی (غلام رسول ملک) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● جوش کی شاعری (مظہر امام) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء ● جوش کی شخصیت اور شاعری (آل احمد سرور) اقبالیات ۵ اپریل ۱۹۸۹ء۔



حسرت موہانی اور اقبال (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● حسرت، شخصیت اور شاعری (آل احمد سرور) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● حسرت کا تصور عشق (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● حسرت کی غزل کا نشان امتیاز (مظہر امام) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● حسرت کے چند اشعار (قاضی غلام محمد) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● تغزل حسرت (کبیر احمد جائسی) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء۔



اکبر یا فانی (زبیر رضوی) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● اقبال اور فانی (آل احمد سرور) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ ● فانی کا تخلیقی ذہن (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء ● فانی کا شعری کردار (شمیم حنفی) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ ● فانی کی غزل گوئی ایک نفسیاتی مطالعہ (غلام رسول ملک) اقبالیات ۲ ۱۹۸۲ء۔



روپ کی عشقیہ شاعری (شکیل الرحمن) اقبالیات ۴ اپریل ۱۹۸۸ء ● غیر متوازن، متوازن شاعر (فراق) (کبیر احمد جائسی) اقبالیات ۴ اپریل ۱۹۸۸ء ● فراق کا شعری ادراک (حامدی کاشمیری) اقبالیات ۴ اپریل ۸۸ء ● فراق کی غزل (تسکین فاضل) اقبالیات ۴ اپریل ۸۸ء ● کچھ فراق کے بارے میں (جگن ناتھ آزاد) اقبالیات ۴ اپریل ۸۸ء ● مقام فراق (مسعود حسین خان) اقبالیات ۴ اپریل ۱۹۸۸ء۔

پروفیسر آل احمد سرور

علامہ اقبال کے دو غیر مطبوعہ خطوط

اقبال کے دو غیر مطبوعہ خطوط شائع کیے جا رہے ہیں۔ یہ اب تک پردۂ خفا میں تھے۔ ہم پروفیسر منظور الامین صدر شعبہ ماس کمیونکیشن کشمیر یونیورسٹی کے شکرگذار ہیں کہ انہوں نے ان خطوط کی نقلیں ہمیں مرحمت فرمائیں۔ پروفیسر منظور الامین جب دھارواڑ میں ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر تھے تو وہاں کے ایک کارکن نے اُن سے اُن خطوط کا ذکر کیا جو اقبال نے اُن کی والدہ کو لکھے تھے۔ منظور الامین صاحب اُن کے گھر گئے اور وہاں جا کر انہوں نے ان خطوں کو نقل کر لیا۔ وہ اصل خط بھی حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے یہ سوچا کہ یہ خط کسی قومی ادارے مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہونے چاہئیں۔ نقلیں اُن کے پاس محفوظ ہیں اور انہوں نے اپنے پرانے کاغذات میں سے ہمارے لیے مہیا کی ہیں۔ ہم اس کے لیے بقول اقبال سراپا سپاس ہیں۔ خطوں کی صحت اور استناد کا ہمیں یقین ہے۔ ویسے ہم اصل خطوط حاصل کرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ دونوں خطوط بی بی آمنہ کے نام ہیں اور جمال الدین صاحب ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس بیجاپور کی معرفت بھیجے گئے ہیں۔ پہلے خط میں اقبال نے ایک اہم بات یہ کہی ہے کہ رومی کا ترجمہ انگریزی میں منظوم نہ کرنا چاہیے تھا۔ عام طور سے دوسری زبانوں کے ترجمے نثر میں بہتر ہوتے ہیں۔ اقبال نے نہایت انکسار سے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ انگریزی عروض کی ٹکنیک سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں حالانکہ وہ انگریزی ادب کے استاد رہ چکے تھے، خود بھی انگریزی لکھتے تھے اور انگریزی کے ادب عالیہ سے اُن کی واقفیت گہری تھی۔ ملٹن اور انگریزی کے رومانی شعرا خصوصاً ورڈس ورتھ سے انہوں نے بہت اثر قبول کیا ہے۔ ایک اور اہم بات جو اس خط سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ رومی کے شارحین کے مقابلے میں اقبال رومی کی روح سے زیادہ آشنا تھے اور اس وجہ سے وہ رومی کی ترجمانی ان شارحین سے مختلف کرتے تھے۔

دوسرا خط بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے صاف کہا ہے کہ وہ صوفی نہیں ہیں۔ پھر بھی واضح کر دیا ہے کہ ہندستان میں جس روپ میں تصوف اس دور میں ملتا ہے اُس سے انہیں اختلاف ہے اور وہ اسے ہندستان میں اسلام کے اخلاقی زوال کے اسباب میں سے ایک خاص سبب سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اقبال کا اشارہ یہاں ان صوفیوں کی بے عملی اور مزاج خانقاہی کی طرف ہے۔ انہوں نے ایک اہم بات یہ بھی کہی ہے کہ جدید دور کی تشکیک اور دہریت کے زہر کا تریاق رومی کے یہاں مل جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اقبال رومی کا ایسا انتخاب چاہتے تھے جو جدید ذہن کو اپیل کر سکے۔ [دونوں خطوط کے عکس اگلے صفحات میں پیش ہیں۔]

A-Y

DR. SIR MOHD. IQBAL KT.
M. A., Ph. D. LL. D.,
Barrister - at - Law

Lahore
Dated 23rd June 1934

Dear Madam,

Judging from what you say of the opportunities you have had of learning the English language your progress is indeed remarkable.

I fear however that it was a mistake to try a verse translation of Rumi I am very sorry to say that I cannot undertake to correct your work, partly because I am not very (well) acquainted with the technique of English verse, and partly because my health is indifferent and I have got a good deal of private literary work of my own to do. Moreover my understanding of Rumi is very much different to the interpretations of his commentators.

Yours Truly
Sd/-
(Mohd. Iqbal)

DR. SIR MOHD. IQBAL KT. ٣٠٢

M. A., Ph. D. LL. D.,
Barrister - at - Law

Lahore
Dated 3rd July 1934

Dear Madam,

Thanks for your letter. I regret very much to say that I am not a Sufi and do not believe in the ways of modern Indian Sufism which I regard as one of the main causes of the moral decay of Indian Islam. But I do regard Rumi's Mathnavi as a kind of antidote to the poison of modern Scepticism and Atheism. For this reason I think the book should be made known to the modern educated Muslims. But the busy man of our times cannot manage a book which comprises 26000 verses. Selections will have to be made with due regard to the needs of our times, and notes will have to be added in the light of modern thought and enterprises. Selections of the Mathnavi have been made in all ages, but these are of no use or of very little use to us moderns. We shall have to make our own selections. To a certain extent this work has been done by Qazi Talamuz Husein M. A., of the Usmania University, Hyderabad in a book recently published and called Maratal Mathnavi. The Book, however, is of use only to the man who knows Rumi already. I have long cherished the desire of making a selection, but my health has gone down during the year so that, I shall have to abandon many of my projects now. I have told my clerk to send you a copy of my 'Javeed Nama' which I hope, will give you some idea of my attitude towards Rumi and to the bigger problems which confront modern Islam. I am only a Barrister and not a judge of the High Court. Please do not address me as such.

Bibi Amina Sahiba,
C/o Jamaluddin Sahib,
Retd. Sub-Inspector of Police
BIJAPUR
(Stamped 3rd July 1934) Naulakha

Yours Sincerely
Sd/-
(Mohd. Iqbal)

پروفیسر مسعود حسین خاں

علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط

علامہ اقبال کے شائع شدہ خطوط کی تعداد اب سینکڑوں تک پہنچ چکی ہے لیکن ہنوز اس سلسلے میں باب مفتوح بند نہیں ہوئے ہیں۔ اینگلو عربک کالج دہلی (موجودہ ذاکر حسین کالج) کے میرے ایک پرانے ساتھی سید خلیل احمد صاحب حال ہی میں سری نگر تشریف لائے تھے۔ [illegible] اس ملاقات کے دوران ان سے کالج کے بیتے ہوئے دنوں کی بات آ گئی۔ "غالب ڈے" کا تذکرہ آگیا اور پھر اس دعوت نامے کا جو اس سلسلے میں علامہ اقبال کو بھیجا گیا تھا۔ اتفاق سے علامہ کا جواب ان کے پاس تبرک کے طور پر محفوظ رہ گیا تھا۔ میرے اصرار پر انہوں نے اس خط کی فوٹو کاپی بھیجنے کا وعدہ کیا اور بعد میں اسے ایفا کیا۔ یہ اب ہدیۂ ناظرینِ "اقبالیات" ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

سید خلیل احمد

آنریری ٹرسٹی باغ والا دالان

جامع مسجد ـ دہلی

۳۰ جولائی ۱۹۶۲ء

ڈیر مسعود صاحب

السلام علیکم! مزاج گرامی

آپ کے علم میں ہے کہ اینگلو عربک کالج اینڈ اولڈ بوائز سوسائٹی کا آپ سب اشخاص نے مجھے وائس پریزیڈنٹ منتخب کیا تھا۔ ہم لوگوں نے غالب ڈے شاندار منایا تھا۔ ہز ہائی نس سر آغا خان نے غالب کی تصویر کی نقاب کشائی کی تھی۔ مشاعرے کے لیے صدارت کی دعوت سر اقبال کو دی گئی تھی۔ چوں کہ موصوف علیل تھے اس لیے شرکت نہ کر سکے اور خط تحریر کیا تھا جس کی فوٹو کاپی ارسال ہے۔ بعد میں خط و کتابت جاری رہی۔ چند خطوط مزید ہیں لیکن فائل جس میں سر اقبال کے علاوہ دیگر نامور اشخاص کے خطوط بھی ہیں اس وقت نہ مل سکی۔

فقط

نیاز طلب

خلیل احمد عفی عنہ

Dr. Sir Mohd Iqbal Kt.
M.A. Ph.D. [illegible]
[illegible]

لاہور ۲۹ اکتوبر ۳۰ء

جانِ من — آپ کا والا نامہ ابھی مجھے ملا ہے
جس کے لیے سراپا سپاس ہوں —
میں قریباً دو سال سے علیل ہوں گو دو ماہ سے
جسمانی صحت بہتر ہے مگر تکلم کی تقریر سے معذور ہوں گا — میں اس رسم
کو ادا کرنے سے اپنے آپ کو قاصر پاتا ہوں اگر
افسوس ہے کہ میری علالت [illegible] نے ایسا موقع ہاتھ سے لے لیا
مانگتی ہے — بہرحال آپ کی [illegible] کا شکریہ ادا کرتا
قدرشناسی پر مبارکباد کہتا ہوں —

محمد اقبال

اقبال ۱۹۲۵ء کے علی گڑھ میں

کرنل بشیر حسین زیدی کا خط سرور صاحب کے نام

۲۵، جون

آپ نے علامہ اقبال کے میرے یہاں دوپہر کے کھانے پر آنے کے متعلق پوچھا تھا۔ ۲۲ نومبر ۱۹۲۹ کو وہ میرے یہاں تشریف لائے تھے۔ سر راس مسعود وائس چانسلر اور خواجہ غلام السیدین بھی کھانے پر شریک تھے باقی حضرات کے نام یاد نہیں۔

کھانے کے بعد میں نے ان سے عرض کیا آپ جہاں جاتے ہیں لوگ آپ سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتے ہیں میری ایک مختلف درخواست ہے اور وہ یہ کہ آپ میرے اسکول میں تشریف لاکر میرے بچوں سے اپنا کلام سنیں۔ انھوں نے مسکرا کر اس درخواست کو قبول فرمایا۔ میں نے کئی دن تک بہت محنت کر کے چند لڑکوں کو علامہ کی کئی نظمیں ترنم کے ساتھ پڑھنا سکھائیں۔ ان میں مرثیہ سسلی خاص طور قابلِ ذکر ہے، اس کی لے کس پُر اثر اور درد ناک تھی کہ علامہ اقبال روتے رہے۔ دیگر حاضرین پر بھی بہت اثر ہوا۔ یہ جلسہ بہت کامیاب تھا...

پس نوشت!

آپ نے اور ملاقاتوں کے متعلق بھی پوچھا ہے۔ اقبال اور میں ۳۲ء کے آخر اور ۳۳ء کے شروع میں لندن میں مقیم تھے میں تھرڈ راونڈ ٹیبل کانفرنس میں رامپور کے نمایندے کی حیثیت سے شرکت کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اکثر لوگ سیاسی لیڈروں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ علامہ شام کو کئی مرتبہ تنہا ہوتے تھے میں بہت دفعہ انھیں اپنے ساتھ کسی تفریح کے مقام پر لے جایا کرتا تھا۔ راونڈ ٹیبل ختم ہوئی تو انھوں نے ایک دن فرمایا کہ میں اسپین جانا چاہتا ہوں، تم میرے ساتھ چلو۔ میں نے معذرت کی کہ نواب صاحب رامپور میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ وہاں جا کر مسجد قرطبہ لکھیں گے۔ آج تک افسوس ہے کہ نواب صاحب کی ذرا سی ناراضگی کا خیال کر کے میں نے سنہری موقع ضایع کر دیا۔

●●

اردو اکادمیاں

○ مہاراشٹر اردو اکادمی

مہاراشٹر اردو اکادمی

یہ اکادمی بھی ملک کی بعض دوسری اکادمیوں کی طرح اردو زبان و ادب کی مفید خدمات انجام دے رہی ہے۔ مرحوم خواجہ عبدالغفور اور مرحوم م۔ ن۔ انصاری اپنے اپنے وقت میں اسے مضبوط کرتے ہوئے آگے بڑھاتے رہے۔ اب یوسف ناظم صاحب کی سکریٹری شپ میں یہ ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ اس اکادمی کا رسالہ "امکان" دہلی، بہار، بنگال، اڑیسہ، راجستھان، کشمیر، کرناٹک اور یوپی اردو اکادمیوں کے پرچوں کی مانند معیاری تحریریں پیش کرتا رہا ہے۔ یہ رسالہ سہ ماہی ہے، ۱۹۸۰ء میں نکلا۔ "امکان" میں شامل بعض تحریریں جو بہت اہم تھیں، باقی رہنے والی تھیں، اور مہاراشٹر سے نکلنے والے پرچے کی نمائندہ تحریریں تھیں، انھیں بافادۂ مزید کی خاطر خدا بخش جرنل میں نقل کیا جا رہا ہے۔

—— ادارہ

بقلم خواجہ عبد الغفور

مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادمی

ایک جائزہ

مہاراشٹر کے سرحدی علاقے دولت آباد پر علاء الدین خلجی کے کئی اثرات نمایاں ہوئے جو ان علاقوں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی پر دور تک اثر انداز ہوئے اس کا ایک پہلو ان علاقوں کی بولی تھی جہاں پر حملہ آوروں کی زبان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے جو آگے چل کر دکنی کہلائی ــــ اس عہد کے مہاراشٹری صوفیوں اور سنتوں جیسے گیانیشور، تکا رام، سنت نام دیو، ایکناتھ، سمرتھ رام داس اور امرت رائے وغیرہ کی ملفوظات اور اشعار میں اردو الفاظ کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔

یہ چند نقوش ہیں جو ریاست مہاراشٹر میں اردو کی ترویج و اشاعت میں معاون ثابت ہوئے مہاراشٹر اور اردو کا یہ خوبصورت اور تاریخی رشتہ آج بھی سرسبز و شاداب ہے آج ریاست میں مراٹھی کے بعد اردو بولی اور لکھی جانے والی دوسری بڑی زبان ہے اردو کے کئی سرکردہ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے مہاراشٹر کو اپنا وطن ثانی بنایا اور یہاں رہ کر اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں اس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ فلم نے اس میں بڑا اہم بلکہ بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

اس پس منظر میں مہاراشٹر اردو اکادمی کا قیام ریاست میں اردو کے مفاد، تبلیغ اور اشاعت کے لئے ایک مثبت اور مفید اقدام تھا چنانچہ ۱۹، اپریل ۱۹۷۵ء کو اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ۲۰، اپریل ۱۹۷۵ء کو اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند عالیجناب فخر الدین علی احمد کے دست مبارک سے اس کا افتتاح انجام پایا تقریب کی صدارت کے فرائض گورنر مہاراشٹر عالی جناب علی یاور جنگ مرحوم نے انجام دیئے۔

مہاراشٹر اردو اکادمی کے پیش نظر اردو کے فروغ اور ترقی کے لئے باقاعدہ لائحہ عمل اور نصب العین ہیں ان کی ایک طویل فہرست ہے مگر چند اہم اور بنیادی مقاصد کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

ریاست مہاراشٹر میں اردو زبان کی ہمہ جہتی ترقی۔

تراجم اور دیگر ادبی سرگرمیوں کے ذریعہ ریاستی زبان مراٹھی اور اردو کے درمیان تخلیقی خیالات کے تبادلہ کا فروغ۔

اردو میں جرائد و رسائل اور کتب کی اشاعت کی ذمہ داری اور ایسے کاموں کی امداد۔

مہاراشٹر میں مقیم ادبا و شعرا کو بورڈ کی منظوری سے ان کی تخلیقات کی اشاعت کے لئے مالی امداد۔

اردو کی ادبی تنظیموں اور ادبی سرگرمیوں کو مالی امداد۔

ریاست میں اردو کی حوصلہ افزائی کے لیے سیمینار، سمپوزیم، مذاکرے، ورکشاپ اور مشاعروں کا انعقاد اور علمی سرگرمیوں کی مدد
لائبریریاں اور ریڈنگ روم کے لئے کتابیں اور رسائل کی فراہمی
ریاست میں رہنے والے ادبا اور شعراء کو ان کی ادبی خدمات میں اعانت سالانہ ہر عنوان اور مطبوعات پر شائع شدہ تخلیقات پر انعامات ۔
بورڈ کی سرگرمیوں نیز اردو بولنے والوں کی ضروریات سے وقتاً فوقتاً حکومت کو آگاہ کرنا۔
اردو کے فروغ کے سلسلے میں پالیسیوں کی تشکیل میں حکومت کو مشورہ نیز ان پر عمل درآمد میں مدد۔
ان خطوط کی روشنی میں اب یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اپنے آٹھ سالہ مختصر مدت اکادمی نے اُن تمام مقاصد پر مناسب عمل کیا ہے اور مہاراشٹر میں اردو کی فضا کو خوش گوار بنایا ہے۔

کتابیں مخصوصاً ادبی کتابوں کی اشاعت ہمیشہ سے اردو قلم کاروں کے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی اس کی وجہ اردو میں ایسے پبلشرز یا اداروں کی کمی ہے جو ادبی کتابوں کو اہتمام سے شائع کر سکیں۔ اس سلسلے میں مہاراشٹر اردو اکادمی نے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی اشاعت کے لئے مالی امداد دینے کی اسکیم مرتب کی ایک اندازے کے مطابق اب تک مسودوں کو اشاعت کے لئے منتخب کیا گیا اور امداد دی گئی پہلے سال یعنی ۸۲-۱۹۸۱ء میں کل ۲۱ مسودوں کو ۵۸،۰۵۰/- کی مجموعی رقم سے نوازا گیا جن میں گیارہ مسودے تادم تحریر کتابی صورت میں شائع ہو چکے اور ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران ۱،۱۵،۸۰۰/- کی رقم ۲۲ مسودوں کی اشاعت کے لئے دی گئی ۔

غیر اردو داں حلقوں میں اردو لکھنے پڑھنے کی کافی دلچسپی اور اشتیاق پایا جاتا ہے ۔

سال ۸۲-۱۹۸۱ء کے دوران ۱۷ اداروں کو غیر اردو داں حضرات کے لئے کلاسوں کے لئے ۲۰،۳۰۰/- کی رقم منظور کی گئی جبکہ ۸۳-۸۲ء میں مزید ۳۸ کلاسوں (3) کے لئے ۵۰،۳۰۰/- رقم منظور کی گئی اور ریڈرشپ اور قارئین کے دائرے کو وسعت دینے کے لئے اردو اکادمی نے مہاراشٹر کی منتخبہ لائبریریوں، کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو اردو کتابیں، رسائل کی امداد مہیا کی گئی۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں حکومت کی منظور شدہ ۳۰ لائبریریوں کو کتابیں اور رسالے فراہم کئے گئے جبکہ سال ۸۳-۸۲ کے دوران ۲۵ لائبریریوں کو خطیر رقم کی کتابیں اور رسالے دیئے گئے، اس کے علاوہ خانقاہ نقش بندی، ٹرسٹ لائبریری، پھلواری، دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ پونہ، انجمن ترقی اردو (مراٹھواڑہ) انجمن اسلام کریمی لائبریری بمبئی، نایاب مخطوطوں، قلمی کتابوں اور مسودوں کے تحفظ کے لئے مزید ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کا دل دیئے گئے۔ طلبا کی حوصلہ افزائی اور ان میں اردو کے شوق کو جگائے رکھنے کیلئے ادبی سرگرمیوں مثلاً مضمون نویسی، تقریری مقابلے، مشاعرے، نمائش اور دیگر اداروں کو ۵۰۰/- سے ۸۰۰/- تک کی رقم فراہم کی جاتی ہے، ۸۳-۸۲ء میں کل ۱۷ کالج سوسائٹی اور والی اداروں کو ۳۲۰۰/- کی مالی امداد دی گئی اس کے ماسوا دھولیہ کی ایک اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن کو سیمینار کے انعقاد کے لئے ۵۰۰/- دیئے گئے۔

طلبہ کی ہمت افزائی کے لئے ایس ایس سی، ایچ ایس سی، بی اے اور ایم اے کے اردو میں امتیازی نمبر حاصل کرنے والے طلبا کو مخصوص انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں پونے ڈویژن اور اورنگ آباد ڈویژن، ناگپور ڈویژن کے علاوہ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، شری شیواجی یونیورسٹی، ناگپور یونیورسٹی، پونا یونیورسٹی اور بمبئی یونیورسٹی کے طلبا کو انعامات سے نوازا

جاتا ہے۔ تعلیمی خدمات کے سلسلے میں یہ کہنا شاید مناسب ہو کہ اردو اکادمی کے مالی تعاون اور کوششوں سے بمبئی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا نام عظیم افسانہ نگار کرشن چندر سے منسوب ہونے کے طور پہل میں آچکا ہے۔ ریاست مہاراشٹر میں مقیم ادیبوں شاعروں اور فنکاروں کی ادبی اہمیت اور حیثیت کے مطابق انعامات سے نوازا جاتا ہے انعامات کے لئے مختلف موضوعات مثلاً شاعری، ناول، افسانہ، کہانی، سائنس و ٹیکنیکل ادب، ترجمہ، تنقید و تحقیق، بچوں کا ادب اور صحافت کے تحت انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں اس کے سوا ممتاز ادبی شخصیتوں کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر خصوصی اعزاز عطا کئے گئے ہیں۔ اور مستحق، معذور، خستہ حال فنکاروں کو بھی خصوصی امداد دی جاتی ہے۔

اردو تھیٹر اور ڈرامہ آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کھوتا گیا اس لئے اردو اکادمی نے اردو ڈراموں کے فروغ اور لوگوں میں اس کی دلچسپی پیدا کرنے کے خیال سے کل مہاراشٹر سطح پر اردو ڈراموں کے انعامی مقابلے منعقد کئے گئے۔ جس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے ہیں اور لوگوں میں اردو ڈراموں سے دلچسپی اور شوق بڑھتا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ اردو اکادمی کے زیر اہتمام سہ ماہی رسالہ 'امکان' شائع کیا جاتا ہے جس نے اپنے معیاری ادبی مضامین اور انتخاب نظم و نثر کی وجہ سے بہت جلد اہل علم و ادب میں اپنا منفرد مقام بنا لیا ہے امکان کو ہند و پاک کے بیشتر ممتاز اہل قلم کا تعاون حاصل ہے اپنی شاندار خوبصورت طباعت کے لئے اسے دو بار صدر جمہوریہ کا انعام بھی مل چکا ہے۔

فی الحال علامہ اقبال کی بانگ درا کا مراٹھی ترجمہ اور مشہور مراٹھی مصنف سنت تکارام کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے آئندہ کے پروگرام زیر غور ہیں مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے ریاست مہاراشٹر کے مختلف علاقوں میں سیمینار اور حسب موقع دیگر پروگرام مثلاً ممتاز ادیبوں شاعروں کی یاد میں اور استقبالیہ تقریب و اعزازی نشستوں کا انعقاد کیا جاتا ہے چنانچہ گذشتہ چند برسوں میں مخدوم محی الدین، جلیل مانک پوری، فانی بدایونی، آغا حشر کاشمیری، پریم چند، حسرت موہانی، اردو صحافت، تعلیمی کانفرنس، اردو کی ترویج میں اہل برار کا حصہ، اردو ادب میں طنز و مزاح، جنگ آزادی میں اردو کا حصہ اور برج نرائن چکبست کی شخصیت اور شاعری پر سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ ملک کے مشہور اہل قلم نے اپنے مقالات سے سامعین کو نوازا۔

اس کے علاوہ رام لال، شہریار، کنہیا لال کپور، گوپی چند نارنگ، علی جواد زیدی، احمد ہمیش، انتظار حسین، فیض احمد فیض، قتیل شفائی، رئیس امروہوی، احمد فراز اور شان الحق حقی کی بمبئی میں آمد پر استقبالیہ منعقد کئے گئے۔ اردو اور مراٹھی کا لسانی و تہذیبی رشتہ، اردو بولنے اور سیکھنے والوں کو رسم الخط سکھانے کے مسائل اور ان کے حل، مراٹھواڑہ کا اردو کو فروغ دینے میں حصہ اور ایسے ہی دلچسپ و اہم عنوانات پر مزید سیمینار کا انعقاد ہو رہا ہے۔

اس مختصر وقت میں ممکن نہیں ہے کہ کسی بھی اردو اکادمی کی تمام سرگرمیوں کا احاطہ اور اس کی کارگزاریوں پر کما حقہ روشنی ڈالی جا سکے مگر اس چھوٹے سے خاکہ کے ذریعہ جتنی اور جس قدر بھی روشنی پڑ سکتی ہے اس کو دیکھتے ہوئے پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مہاراشٹر اردو اکادمی ایک فعال اور سرگرم ادارہ ہے جو ریاست مہاراشٹر میں اردو زبان و ادب کا چراغ جلائے ہوئے ہے۔

سید یحییٰ نشیط

اردو مراٹھی کے مسلم شعرا کا ہندوی رجحان

سرزمین ہند میں اسلامی تمدن فاتح قوم کا تمدن تھا۔ اس شجرِ ہمہ رنگ و بار اور تمدن کی جڑیں عرب کے ریگستانوں میں گہری اتری ہوئی تھیں اور اس کی شاخیں سواحل روم و یونان سے لیکر مشرق الہند تک سایہ فگن، اُن علاقوں کی تہذیبی فضاؤں میں پھل پھول رہی تھیں۔ ہمارے یہاں کی دیہاتی تہذیب کی پیوند کاری سے اس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹیں اور یہ درخت نہایت گھنا اور چھتنار ہو گیا۔ اس کے زیر سایہ ادب کی تخلیق کرنے والے ہندو و مسلم شعرا کا اس ملی جلی تہذیب سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مسلم شعرا ہندو مت سے برابر متاثر ہوتے گئے اور اپنی تحریروں کے نادر تحفوں سے ہندو مذہبی ادب میں اضافہ کیا۔

ان شعرا نے گو کہ مذہب کی توسیع، ترویج اور تبلیغ کے حق دعوے نہیں کیے، لیکن مذہب کی تکریم و تبریک ہی کو وسیلۂ نجات تسلیم کیا اور عوام کے ذہن سے مطابقت رکھتے ہوئے مذہبی قصص و روایات کو اس طرح شعری پیکر میں ڈھالا کہ عوام و خواص ان کے گرویدہ ہو گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ رامائن و مہابھارت، امرائی، انیس اور داماس کے بھگتوں کو ایسے لوگ بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں، جن کا اس معاشرت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

برادرانِ وطن کی مذہب کو مسلم شعرا نے بنظرِ استحسان اور احترام و اکرام سے دیکھا ہے۔ انھوں نے دیوی دیوتاؤں کی حمد و ثنا کے ترانے گا کر اپنی وسیع المشربی، صلح کل طبیعت اور کشادہ قلبی کا ثبوت دیا ہے۔ اسلامی روایات و اصطلاحات کے علاوہ ہندو اساطیر و علامات اور تمثیلات و تلمیحات کا سہارا لیکر انھوں نے انسانیت کی اصلاح کی۔ اخلاق کا تصفیہ اور نفوس کا تزکیہ کیا۔ بہرنگ تعمیر باطن کی تطہیر، روح کی بیداری اور اخلاق کی استواری کے لئے انھوں نے جو ادب پارے پیش کیے ان کا مرجع و مصدر مذہبی کتب رہے ہیں۔

یہاں اردو اور مراٹھی کے چند ایسے مسلم شعرا کا تعارف اور ان کے کلام کا جائزہ مقصود ہے جن کی تخلیقات میں ہندو مذہبی رجحان بہت گہرا ہے۔ اس اعتبار سے پہلا نام حسین عنبر خاں کا لیا جا سکتا ہے۔ مراٹھی کی قدیم صوفیانہ شاعری میں ان کی معتبر آواز ہے۔ ان کے والد یاقوت عنبر کو دولت آباد میں ایک اونچے عہدے پر فائز رہتے ہوئے مشہور ہندو سنت جنار دن سوامی، اناجی پنت اور چاند صاحب بودلے کی مصاحبت نصیب ہوئی۔ جن کے زہد و عرفان اور روحانیت کا دور دور تک چرچا تھا۔ حسین عنبر خاں کی اسی ماحول میں نشو و نما ہوئی، ان حضرات ثلاثہ سے انھوں نے فیضان حاصل کیا۔ روحانی تعلیم سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے اور دھیرے دھیرے اُسی رنگ میں رنگ گئے۔ ان کی لکھی ہوئی گیتا کی تفسیر गीता भावार्थ दीपिका مراٹھی کے مذہبی ادب میں معروف ہے۔ اس میں ۱۸۷ ابیات ہیں۔ وجہ تصنیف بتاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ ——

[illegible] वन [illegible] । [illegible] ।
[illegible] । [illegible] ।।

اپنی اس تصنیف کے لئے انھوں نے شنکر اچاریہ کے بھاشیہ اور شری دھر سوامی کے ویاکھیانوں سے استفادہ کیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

[illegible] । [illegible] ।
[illegible] । [illegible] ।

حسین عنبر خاں کم سے کم الفاظ میں مطلب بیان کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں جس سے ان کی زبان دانی، ہنرمندی اور فنی چابکدستی کا پتہ چلتا ہے۔ گیتا کے نویں ادھیائے کے پہلے شلوک کا یہ ترجمہ دیکھئے۔

"چونکہ تو نکتہ چینی نہیں کرتا۔ اس لئے میں نہایت خفیہ انسانی اور خدائی علم بتاتا ہوں۔ جسے جان لینے کے بعد تو برائی سے آزاد ہو جائے گا"

اس خیال کو حسین عنبر خاں یوں نظم کرتے ہیں۔

मिळा न [illegible] सुख । [illegible] अत्यंत दुःख ।
[illegible] सहित आत्मराजा । ते [illegible] मुक्त होती ।।

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مرہٹی کے اس مسلم شاعر نے بھگوت گیتا میں جو اپنی زندگی کا سرمایہ پایا تھا، تاحیات اسی کی زمزمہ خوانی میں وہ مشغول رہا۔

اسی عہد میں حسین عنبر خاں کے معاصر سید امین، کشن گیتا، میں گیتا لکھ کر اردو میں گیتا کے ترجمے اور تفسیر کی بنا ڈالتے ہیں۔ سخاوت مرزا نے اپنے ایک مضمون میں سید امین کا سلسلۂ ارادت شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری (م ۱۰۹۲ھ) کے سلاسل کے ایک بزرگ حضرت خواجہ عارف گنج بخش سے جوڑا ہے۔ یہ اورنگ آباد کے باشندے تھے۔ زور مرحوم نے سید امین کی ایک کتاب "مجذوب السالکین" کا تذکرہ اردو مخطوطات کی فہرست میں کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ہندو، مسلمان سنتوں اور صوفیوں کے اقوال جمع کر دیے ہیں۔ کتاب کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ مذکور کروں صوفیاء ہر دو قوم کا بیچ دکھنی زبان کے ۔۔۔
یوں ہر ایک قوم اپنی اپنی زبان میں علیحدہ علیحدہ نانوں رکھے ہیں تو میرے جیو میں
آیا کہ مسلمانی ہور ہندوی مذہبی لفظاں جمع کر کر واسطے صوفیانِ ہر دو قوم کے
ایک رسالہ بناؤں تا کہ صاحب منصوبوں کے کام آوے۔"

(تذکرہ مخطوطات اردو جلد اول ص ۲۱۹)

کتاب کے اختتام پر سید امین یوں گویا ہیں۔

"لیکن اگر مسلمانی ہور ہندوی کتابوں کا ہور بیدوں کا مذکور کرتا تو عبادت دراز ہوتی۔ اس واسطے اب مختصر کیا۔"

مجذوب السالکین میں درج شدہ ان بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سید امین کو برادرانِ وطن سے اور ان کے مذہب سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ زیرِ تذکرہ کتاب میں جگہ جگہ مرہٹی اقوال، دوہرے اور اشعار درج ہیں، جن میں اخلاقی و مذہبی درس دیا گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ امین کی کشن گیتا کے اقتباسات میں پیش نہیں کر سکا۔

سترھویں صدی عیسوی کے آخری حصے میں ایک اور شاعر شیخ سلطان مرہٹی میں شاعری کیا کرتے تھے۔ کرلا کے قریب کا ردے گاؤں ان کا آبائی وطن تھا۔ وہ اگرچہ کرجنی تخلص، مرہانی و فارسی اور عربی زبان پر ملکہ رکھتے تھے، اپنی مثنوی میں عموماً محاورہ استعمال کرتے تھے، لیکن علم سادھو کے ایک ملنگ گوپال ناتھ کی صحبت اختیار کرنے سے بعد ان کی کایا پلٹ گئی، مجازی عشق کی جگہ عشق حقیقی سے قلب معمور ہوگیا اور لاابالی کرنے والا شاعر کیرتن کرنے لگا۔ گوپال ناتھ کے ہندو تلامذہ میں یہ سلمان شاگرد "آبا صاحب" جیسے معزز لقب سے یاد کیے جانے لگا۔ آرہ سی ڈھیرے کے مطابق شیخ سلطان کی ۵ تصانیف (۱) ستی الوسیا (۲) گپتی پیم (۳) بنوسنت ختم (۴) کولہاپور چترا اور (۵) بھوپالی کتھا مراٹھی کے قدیم ادب میں دستیاب ہیں۔ آخر الذکر کتب میں مختلف تمثیلوں کے ذریعہ روحانی سلوک بیان کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ سنگرت کی حمد و ثنا بھی کی ہے، جس میں تقدس و عقیدت کا رنگ بہت گہرا ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ ان کی دو آرتیاں اور تین مراٹھی پد بھی ملتے ہیں۔

شنکر جی کی توصیف بیانی میں اردو کے شعراء بھی رطب اللسان رہے ہیں۔ سترھویں صدی کے دو دکنی شاعر شاہ غنی دریوں سے کا خوب ہوا ہونے سے پہلے کہ وقت شاعری کرنے بھی کمال کیا کرتے تھے ان میں سے ایک ابراہیم عادل شاہ جگت گرو (م ۱۰۳۷ھ) ہیں۔ اپنی کتاب نورس میں انھوں نے کئی دیوی دیوتاؤں کی ستائش کی ہے۔ ایک نظم میں شنکر کی شکل تصویر ملاحظہ کیجیے۔

بھیروکر پر گورا بھال تلک چندرا
تری نیترا، جٹا مکٹ گنگا دھرا
ایک ہست منڈرا ترسول جھنگ کرا
باگھامبر و دھ سپنت جات گسائیں ایشورا
کاس کت کنٹھ پر ساڑے چرم ویاگھرا
سرپ سنگار نیشن پر چایئں کپ ترا
رمن داونت مردنگ دھام گیاستن مدہرا
ابراہیم اکبت لچھمن لگ بھیرو جاتم سندرا

دوسرے شاعر عادل شاہ ثانی شاہی (م ۱۰۸۳ھ) نے اپنے دادا ابراہیم کی پیروی کرتے ہوئے شنکر کی تعریف و توصیف اس طرح کی ہے۔

بھیروں بھید یمن جات سو با سندر گوروان گھن سار
پتر لوچن، چندبیس، مکٹ مہ گنگا، سرپ سنگار
ایک ہست منڈزا، ترسول جھنگ کر، انجھی مرن چھتر سنکھا دھار
آسو انگ پر بست دیا کرم چرم رچت، پربت مند، بھوجنگ نجاست ادر

(کلیات شاہی ص ۱۰۰ - ۱۰۱)

سولھویں سترھویں صدی میں مہاراشٹر کی سرزمین پر جس قسم کے روحانی، ادبی، سماجی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی افکار اور نظام ہائے زندگی کا شجر پروان چڑھ رہا تھا اس کی آبیاری صوفی، سنتوں نے اپنی مقدس تعلیم کے ذریعہ کی تھی، اس سے انکار ممکن نہیں۔ چنانچہ مہاراشٹر کے کبیر شیخ محمد (م ۱۶۶۰ء) کی خدمات بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں۔

قادریہ سلسلے کے ایک جلیل القدر بزرگ محمد غوثؒ کے مرید راز محمد کے پوتے تھے۔ راز محمد رشد و ہدایت کی مسند عالیہ پر متمکن ہو کر زہد و ریاضت اور توحید و معرفت کے اسرار و رموز، سالکان تشنہ کام کو سمجھایا کرتے تھے۔ ان کے مریدین میں کئی نام غیر مسلموں کے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً چاند صاحب بودھلے برہمن سنت، لیکن راز محمد سے نسبتِ ارادت استوار ہوجانے کے بعد سے چاند صاحب قادری کہلائے۔ دیوگری کے دامن میں ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔

جانصاحب کے شاگردوں سے ملا جلا مذہب وحدت جیسے معروف سنت کا شعار بنا ہے ، جو ایک نئی تحریک کے گرد تھے ۔ شیخ محمد نے اس مسئلے کو ایک سنگرام میں اس طرح بیان کیا ہے ۔

[illegible]
[illegible]

شیخ محمد نرگن خدا کی پرستش کرنے کے باوجود سگن و ساکار روپ کے قائل ہیں ۔ ایک جگہ کہتے ہیں ۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ادھر اردو ادب میں شیخ محمد کے معاصر محمد نوشہ گنج بخش (م ۱۰۶۴ھ) بجستہ منزل الکے قائل نظر آتے ہیں ۔ اگرچہ آپ کا یہ تصور ہمہ اوست کے دائرے میں آتا ہے لیکن اس کی حد میں خدا کے سگن ساکار روپ کے تصور سے جا ملتی ہے ۔ اپنی ایک نظم "ندا" میں وہ کہتے ہیں ۔

دیکھ قدرت کے کھیل ، پیارے دیکھ قدرت کے کھیل
آپہ دیا ، آپہ باتی ، آپہ لاٹ اور تیل

آپ چاندن جو دکھاوے آپہ کرے اندھیر
آپہ دیا جلا کے دیکھے آپہ کرے بسیر
آپ زندگی آپ مرگی آپ دنیا بسیر
آپ سودا آپ پرکاسا آپ آپ غیر

برہان الدین جانم کے ہاں "آپیں ہنکا روپ ہنکا بیا" میں بھی یہی تصور کار فرما ہے ۔

شیخ محمد حقیقی رام کی توضیح کرتے ہوئے ایک جگہ رقمطراز ہیں ۔

رام سے مراد دسرتھ کا رام نہیں ہے ۔ اپنے والدین کو کاندھے پر بٹھا کر مقامات مقدسہ کی زیارت کرانے والے شراون کمار کو جب دسرتھ راجہ کا تیر لگا تھا تو مرتے وقت اس کی زبان پر رام کا نام آیا تھا ۔ اس واقعے کے ظہور پذیر ہونے کے وقت تو دسرتھ کا لڑکا رام عالم وجود میں بھی نہیں آیا تھا ۔ پس ثابت ہوا کہ شیخ محمد کا رام وہ ماورا الورا ہستی ہے جو دائم و قائم ہے ۔ شیخ محمد کے اسی خیال کا پرتو دکنی شاعر شاہ تراب کی مثنوی "من سمجھاون" کے ان اشعار میں دکھائی دیتا ہے ۔

صفت کر اول اوس کی جو رام ہے گا
اوسی رام سوں ہم کو آرام ہے گا

سدا نام ککم سوں کام ہے گا
جگت میان اوس کا گن ثبت ہے گا
وہی گل وری کی دو جا بام ہے گا
وہی ساقی بزم گلفام ہے گا

شاہ تراب چشتی نے رام اور رحیم کے فرق کو اپنے ان اشعار میں مٹا دیا ہے۔ کبیر داس کی یہ آواز۔

بھائی سے دو جگدیش کہاں سے آیا
اللہ رام کریم کیسو ہری حضرت نام دھرایا

ان کے یہاں سب جلاتے ہے اور صرف رام کے نام ہی میں تمام صفات الٰہیہ مدغم ہو جاتے ہیں۔ مسلم معاشرے میں یہ تصور پیش کرنے پر بڑی جرأت کی ضرورت تھی۔ شاہ تراب نے بہر حال اسے پیش کر دیا۔ مذکورہ بالا اشعار کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاہ تراب نے ہندو اساطیر اور فلسفۂ ویدانت کی شراب طہورہ کو تصوف کے جاموں میں بھر دیا ہے۔ اور اس ذات واحد ساقی بزم گلفام کو تخیل اپنی شاعری میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر مذہب کے تصور الٰہ پر وہ منطبق ہو جائے۔ یکی و مذہبی اتحاد کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

احترام مرشد اور الزام شیخ کے متعلق شیخ محمد کے یہاں نہایت خوبی سے گیا ہے۔ ان کے یہاں مرشد کے سامنے مرید کی عاجزی اور انکسار کا انتہا ہے۔

[illegible]

مرشد کے متعلق اس طرح کا تصور محمد نوشہ گنج بخش کے یہاں بھی ملتا ہے۔

مرشد کے پگ میں سو دھر، چرن کنول چت لائے
ساچے بیکھے لاسے نہیں آخر مائی کھائے ——— اور

جو مرشد کے پگ پر نوشہ دھرے دھیان
دولت دنیا دین کی پاوے سبھی کر مان

یہاں تک تو شیخ محمد اور اسد کے دیگر شعرا کا تذکرہ ہوا۔ مراٹھی ادب کی ورق گردانی کرنے پر جاور بھاوی سنہر دالے کے ایک مسلم شاعر شاہ حسین عرف شاہ منی بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ بھگوان دتاتریہ کے اپاسک [illegible] स्वामी کے ہاتھ پر شاہ منی نے بناری میں گنگا کے کنارے بیعت کی تھی اور ہندو دیوی دیوتاؤں کے بھجن میں لگ گئے تھے۔ ان کی सिद्धान्त बोध مہاراشٹر کے بھاگوتوں میں نہایت پسندیدہ نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ شاہ منی دریائے بھیما اور سرسوتی کے سنگم پر واقع پیڑگاؤں میں ۱۷۲۲ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان چار پشتوں سے دیوی دیوتاؤں کا معتقد تھا۔ گرو سے بیعت کرنے کے بعد یہ کرشن بھکتی میں لگ گئے اور ستارا ضلع کے چمار گونڈی میں اپنی تصنیف सिद्धान्त बोध سن ۱۷۸۰ء میں مکمل کی۔ مراٹھی ادب کے محقق آج گاؤں کر اس کتاب کے متعلق اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

" [illegible] "

شری کرشن کے متعلق شاہ معز کا یہ عقیدہ ہے کہ ۔

" [illegible] । "

اس عقیدے کی وضاحت کے لیے انھوں نے نارد کی ایک بہاری تمثیل بھی نظم کر دی ہے۔ یہ عقیدہ شاہ معز کے ہمعصر اسد شاہ [illegible]
[illegible] کے صوفی رسالہ [illegible] حاتم کے یہاں بھی ملتا ہے۔ [illegible] یوں کہتے ہیں۔

کنٹھ بھوگ کسکن اہری رسے گا
وہ جگ میں ل کرا جگ رسے گا
یہ سب خلق کر جس ستی کم سے گا
وہ ہے سائی بزم کنعلم سے گا

اور حاتم کا انداز ملاحظہ فرمائیے ۔

سوا ہے گوپیاں کا کان ہل برم تو جساری
یہاں دیکھ بھوگ بھوگی بھنا ہٹے گیان بجاری
کہاں تس کے نام ہتے سے گرب ہربن کاری
لوکاں یہ ست کہ [illegible] بکشن لا دھی

شاہ معز کی تمثیل انداز میں لکھی ہوئی اس نظم میں نارد کا دریا میں ڈوب کر عورت کی شکل اختیار کر لینے اور ایک مدت سے پھر اپنی اصلی [illegible] کے بعد اس حقیقت کو پہنچ جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ کم و بیش اسی طرح کا قصہ دکنی شاعر مختار، باقی اسفرائنی کے معراج نامے میں بھی [illegible] ہوا ہے۔ لیکن ان کے یہاں نارد کے بجائے ایک [illegible] کا ذکر ہے جو آنحضرتؐ کے سفر معراج کا منکر تھا۔ اس طرح کی ایک روایت کا [illegible] سب میں آ جانا تہذیبی اختلاط ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

یہاں مراٹھی کے تمام مسلم شعراء کا جائزہ لینا تو ممکن نہیں۔ صرف ان کے نام کی فہرست ہی ترتیب دی جائے تو وہ بھی کافی طویل ہو جائے گی۔ [illegible] ان چند شعراء پر اکتفا کر کے میں اپنا مقالہ ختم کرتا ہوں۔

●●

آغا جمیل کاشمیری

آغا حشر اور بمبئی

انیسویں صدی کے اواخر میں ایک بیس سالہ سرو قد نوجوان جس کے کتابی چہرے میں بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں سے ایک میں ہلکی سی کجی تھی، بنارس سے آنے والی ٹرین سے بمبئی اسٹیشن پر وارد ہوا۔ یہ نو وارد بنارس کے ایک کشمیری خاندان کا چشم و چراغ تھا، اس کی ولادت بنارس میں ۱۰ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ مطابق ۳ اپریل ۱۸۷۹ء کو ہوئی تھی۔ جس کا زائچہ خاندانی روایات کے بموجب مرزا محمد جعفر نے ۱۰ ربیع الثانی کو مرتب کیا تھا۔ جس کی تعلیم کا آغاز مکتب سے ہوا تھا۔ جس نے ۱۵ برس کی عمر میں فارسی عربی ادبیات کے مشہور استاد مولوی حافظ عبد الصمد سے درس نظامی کی تکمیل کی تھی بجز ۱۶ سپاروں کا حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ جے نرائنس اسکول بنارس میں مڈل کے درجات تک انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کر چکا تھا۔ یہ جے نرائنس اسکول کے اردو فارسی اور عربی زبان کے استاد مولوی نور الدین کی عدم موجودگی میں ان کے حسب ہدایت اسکول کے مختلف درجات میں فارسی کا درس بھی دیا کرتا تھا اور ان کی ایک شاگرد اور اسی اسکول کے پرنسپل ریورنڈ ڈیوڈ کی صاحبزادی اس نوجوان سے کبھی کبھی عربی صرف و نحو کا درس لیا کرتی تھیں — جس نے ملا غنی کشمیری کی فارسی غزلوں پر غزلیں کہی تھیں۔ اور مرزا محمد حسن فائز بنارسی سے جو ان دنوں مشن اسکول میں اردو کے استاد تھے اور بعد میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی و اردو کے صدر ہوئے، اپنے ابتدائی اردو کلام پر اصلاح لی تھی۔ جس نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں بنارس میں آئی ہوئی "جوبلی کمپنی" کی طرف سے اظہار کردہ تماشہ نہ دیکھے جانے پر مقامی ہفتہ وار "ربیع الاخبار" میں کمپنی کے ڈراموں کے خلاف مضامین لکھ کر ہندوستانی ڈرامے پر تنقید کی ابتدا کی تھی۔ جس نے جوبلی کمپنی کے مشہور ڈرامہ نگار احسن لکھنوی سے بحث کے دوران ایک دن یہ کہا تھا کہ جیسا ڈرامہ آپ کہتے ہیں، ویسا ڈرامہ میں ایک ہفتہ میں لکھ سکتا ہوں۔ اور اس دعوٰی کے عملی ثبوت کے طور پر صرف اٹھارہ برس کی عمر میں ان کے ڈرامے "چندراولی" کے مقابلے میں اپنا سب سے پہلا ڈرامہ "آفتابِ محبت" لکھ کر ۱۸۹۷ء میں جواہر ایکسپریس بنارس سے شائع کرایا تھا۔

یہ وہی صاحب قلم تھا جس کے شاعرانہ ذوق اور ڈرامے لکھنے کے شوق نے اسے مزید تعلیمی مشاغل سے بیگانہ کر دیا تھا۔ یہ وہی صاحب فکر و نظر تھا جس کو تعلیم سے بیگانہ ہوتی کو دیکھتے ہوئے والدین نے اسے بزنس کی طرف متوجہ کرنا چاہا — یہ وہی سرمستیٔ حیات کا دیوانہ تھا جس نے میونسپلٹی کی ملازمت کے لئے والد کے دیئے زر ضمانت کی آدھی رقم راستے میں دوستوں کی خاطر تواضع میں خرچ کر دی تھی اور وہ باپ کے اس مظاہرے کے بعد احساس ندامت و شرمندگی کے تحت اس کے قدم خود بخود گھر کی بجائے اسٹیشن کی جانب اٹھ گئے تھے۔ شاہراہ شعر و ادب کا یہ وہی غریب الوطن مسافر تھا جس نے بمبئی پہنچ کر اپنے ایک عزیز دوست عبد اللہ بنارسی کے یہاں عافیت کا سانس لیا تھا۔ اور شہر میں ورود کے پہلے ہی دن ایک شعری نشست میں شرکت کے بعد "بمبئی گزٹ" کے ایڈیٹر مولوی فرح

نئی جنگ کی ابتدا کردی تھی ـــــ مشاعروں میں شرکت اور بمبئی پنچ میں شائع شدہ مضامین کی وساطت سے بمبئی کے ادبی حلقوں نے شروع ہی میں اس نووارد کو آغا محمد شاہ حشر کے نام سے جانا اور پہچانا۔ اور رفتہ رفتہ آغا حشر کے نام سے شہرت کے بام عروج کا چمکتا ہوا ستارہ بنا دیا۔

فال مبارک ثابت ہوئی سرزمین بمبئی جہاں ایک دوست کی وساطت سے حشر کی کاؤس جی سے دوبارہ ملاقات ہوئی اور دوستی جذبات کے نتیجے میں وہ ان کی الفریڈ کمپنی میں ۳۵ روپے ماہانہ پر بحیثیت ڈراما نویس ملازم ہو گئے۔ اس طرح زمانے کے انقلاب کے بہتر کا ظہور ہوا جس کے اجتہادات سے اس فن کی بنا پائندہ ہوئی اور جس کی جنبش قلم سے نئے شاہکار وجود میں آئے۔ ۱۹۰۱ء میں حشر نے الفریڈ کمپنی کے لئے اپنا پہلا تجارتی ڈراما "مرید شک" لکھا۔ اس ڈرامے کا پلاٹ شکسپیر کے ڈرامے ونٹرس ٹیل (حصہ جلد ۲) سے ماخوذ ہے۔ حشر نے "مرید شک" کے گانوں کے کتابچے میں ناظرین کو یوں رجوع کیا ہے:۔

"آج میں آپ کی نکتہ بیں نگاہوں کے سامنے وہ ناچیز تصنیف پیش کرتا ہوں جس کا نام "مرید شک" ہے۔ یہ ڈراما بھی اس [illegible] ساخت کے دل و دماغ کی کوشش کا مجموعہ ہے جس کے ایک ایک صفحہ کو الہامی فرشتے کا پر یا کتاب زندگی کی تشریح کہتے ہیں۔" اس عرض داشت میں وہ مزید فرماتے ہیں۔ "کاغذ کے سادہ صفحوں پر انسان اور انسان کے جذبات کی جیتی جاگتی تصویریں لکھا ہے دوڑتی پھرتی ہیں، اس کا پورا زور دکھانا اور اس میں روح، جیسا الفت، نفرت، حیاداری، ریاکاری اخلاق، امانت، مختلف اقسام کے رنگ بھر کر جان ڈال دینا شیکسپیر کے ہی دل و دماغ کا کام تھا۔ جس کی تحریر کے طرز پلاٹ کی خوبی، سبجیکٹ کا التزام اور ان کے [illegible] رزلٹ میں گوناگوں کر دینے والی کیفیات کا احساس اس بات کی گواہی دیکر ثابت کر رہا ہے کہ یہ نامور مصنف نیچرل کالج کا پاس شدہ گریجویٹ ہے۔ اور کتاب فطرت کا شروع سے لیکر آخر تک مطالعہ کر چکا ہے۔" جس نامور اہل فن کے صریر قلم نے اس طرح اپنی دولت پر فتح پا کر عزت اور شہرت کے ڈنکے بجا رکھے ہیں، اس کی کسی تحریر کو اپنی زبان میں لینا یا اس کے حسن مذاق اور کرافٹ معاشرت کو اپنے ملک کے طبائع اور ضروریات زندگی کے ساتھ ایک پیچ پر دکھا کر دکھانا جس قدر اہم اور دشوار ہے اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ بہتر طور پر کر سکتے ہیں جنہوں نے کسی غیر زبان کے ترجمے میں دس پانچ دن اپنا خون پانی ایک کیا — وہ چار راتیں آرام کی نذر نہیں اور جلتے ہوئے لیمپ کے سامنے آنکھوں کی روشنی کھو کر صبح کی ہو۔"

"میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ اس کوشش میں اس حد تک کامیاب ہوا ہوں جس کو کمال ترجمہ کہتے ہیں مگر اس قدر کہنے کا حق ضرور رکھتا ہوں کہ میں نے شاہد فرنگ کو ایشیائی لباس و ہندوستانی مذاق کے گہنوں سے ایک ایسی نئی بنا دیا ہے جو جلوہ افروز کے وقت جان ربا تو نہیں مگر دل ربا ضرور ثابت ہوگی۔"

پانچ ماہ بعد اسی کمپنی کے لئے حشر نے "مار آستین" لکھا۔ یہ ڈرامے بمبئی کے اسٹیج پر بہت کامیاب ہوئے اب حشر کی مانگ ایک ایک کمپنی کی طرف سے ہونے لگی آخر کار وہ نیو الفریڈ کمپنی میں ڈیڑھ سو روپے ماہانہ پر بحیثیت ڈراما نویس ملازم ہوگئے جہاں ۱۹۰۳ء میں انہوں نے "اسیر حرص" لکھا۔ اسیر حرص شریڈن کے ڈرامے پزارو (۱۷۹۹ء) سے ماخوذ ہے۔ اس ڈرامے کے گانے کی کتاب میں حشر کا خود نوشتہ التماس بہت طویل ہے۔ اس کے چند اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

"اگر بجز جاہلیت کے زمانے میں کالی داس نے اس فن پر بہت روشنی ڈالی مگر اس زمانے میں اس کا نشان صرف دیہو کے سوانگوں میں نظر آتا ہے۔ غیر ممالک میں اس فن کا پھول اول اول روما کے بت خانے سے پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ روما، ایران اور یونان سے فرانس اور فرانس سے انگلستان میں اس کی خوشبو پھیل گئی۔ مگر یونان کی طرح انگلستان نے بھی ڈراما کے پاؤں میں مذہبی زنجیریں ڈال دیں۔ فرق اتنا تھا کہ وہاں ناٹک کے پردے میں دیوتاؤں کے بھجن گائے جاتے تھے۔ اور یہاں ابن مسیح کے پیدا

یہ حالت کرامات کے جلوے دکھاتے تھے۔ صدیوں تک ڈرامے کی یہی حالت رہی۔ رفتہ رفتہ زمانے کے ساتھ اس نے بھی پلٹا کھایا اور
قید عشق کی زنجیریں توڑ کر دنیاوی اسٹیج پر آزادی کی ہوا کھانے لگا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۵۶۴ء میں ڈراما نویسی کا آفتاب عالم
تاب انگلینڈ کے قصبہ اسٹریٹ فورڈ میں طلوع ہوا (شیکسپیئر پیدا ہوا) جس کے پرزور قلم نے انسان کے ہر پہلو کو جذباتِ انسانی و فلسفانہ
خیالوں سے معمور کر کے روشناسِ عالم بنایا۔ اگرچہ شیکسپیئر سے پہلے "جان لی" نے دل کش نثر اور جان ہیل نے نظم کے نمایاں
انداز پیدا کر دیے تھے۔ رابرٹ گرین نے کامیڈی اور کرسٹوفر مارلو نے ٹریجیڈی میں ایک جان پھونک دی تھی مگر ملکہ الزبتھ کے زمانہ
میں جس نے ڈرامے کو معراج کمال تک پہنچایا وہ ملک الشعرا شیکسپیئر کا قلم تھا۔" خود نوشت اقتباس میں حشر مزید فرماتے ہیں۔
"میں ۱۸۹۷ء میں الفریڈ کمپنی میں تھا جب منشی مقرر ہوا تو مالک موصوف کے حسب الارشاد WINTER'S TALE کا ترجمہ کر کے اردو میں
انگریزی ڈراما نویسی کی عمارت قائم کی جس کا بنیادی پتھر خود مسٹر کاؤس جی پالن جی کھٹاؤ اپنے ہاتھ سے رکھ چکے تھے۔ بالکل پہلے پر
اس عمارت میں "مار آستین" کی ایک منزل اور زیادہ کی۔ شکر ہے کہ وہ ترجمہ پبلک کو پسند آیا اور ہندوستانی اور
انگریزی اخبارات نے مبارک دے کر میرے حوصلے کو تقویت دی اور اس عمارت میں "اسیرِ حرص" کے نام سے ایک منزل اور
اضافہ کرتا ہوں۔ خدا کرے یہ بھی قدر داں پبلک سے قبولیت کا تمغہ حاصل کرے۔" یہ ڈراما پبلک میں بہت مقبول ہوا۔

حشر کی مقبولیت دیکھ کر کاؤس جی نے ان کو اپنی الفریڈ کمپنی میں ۱۰۰ روپے ماہانہ پر پھر واپس بلا لیا جہاں ۱۹۰۲ء
میں انہوں نے شہید ناز لکھا جو شیکسپیئر کے MEASURE FOR MEASURE سے ماخوذ ہے۔ اس ڈرامے کے گانوں کی کتاب کی
تمہید سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے اور اس بات کا اندازہ لگایئے کہ اس دور میں پبلک کا کیا مذاق تھا اور ڈرامے کس
کس مپرسی کے عالم میں تھا۔

"موجودہ زمانے کی ادہ حیرت انگیز ایجادوں میں سے ایک عجب خیز ایجاد وہ برقی شعاعیں ہیں جنکو انگریزی میں ایکسریز
کہتے ہیں، جنکی وساطت سے بند مکان کی تاریک سے تاریک کوٹھری میں رکھی ہوئی چیز کا عکس مکان کے باہر سے اتار لیا جاتا ہے۔"
آگے چل کر اسی تمہید میں حشر یوں تحریر کرتے ہیں۔

"ہندوستان کی بدقسمتی پر افسوس آتا ہے کہ ڈرامے کی تاریک حالت پر اس نئی روشنی کی ایکس ریز بھی کچھ مدد نہ ڈال
سکی۔ تصنیف و تالیف کے آسمان پر ستارۂ سحری کی ہلکی چمکیلی روشنی کی طرح چند! افسانوں اور ناولوں کی کہیں کہیں جھلک
ضرور نظر آتی ہے مگر ڈرامے کی قسمت کا آفتاب جو افق مغرب سے طلوع ہوا تھا زمین مشرق میں بالکل قریب غروب پہنچ گیا ہے۔
کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس اہم فرض کا بوجھ کس پر ڈالا گیا۔ ناٹک کے منشیوں پر جن کو علاوہ صدہا ناگفتہ بہ مشکلات
کے ایک ادنیٰ مشکل یہ بھی درپیش ہوتی ہے کہ ناسمجھ پبلک کے خوش کرنے کے لئے ہر سنجیدہ اور نتیجہ خیز سین کو ایسے
مذاق سے بدل دے کہ جس سے خواہ تماشے کی ساری خوبیاں ملیا میٹ ہو جائیں۔ مگر تماشائی ہو راگ ہوتے نکلیں کر
پیسے وصول ہو گئے۔"

بمبئی کے قیام میں ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۵ء تک اڈلجی بھائی ٹھوٹھی کی کمپنی کے لیے ۱۹۰۶ء میں "سفید خون" اور ۱۹۰۸ء
میں "صید ہوس"۔ سہراب جی اگرا کی کمپنی کے لیے ۱۹۰۹ء میں "خواب ہستی" اور ۱۹۱۰ء میں "خوبصورت بلا" لکھ
کر حشر نے اپنی شہرت میں چار چاند لگائے۔

بمبئی کے دورانِ قیام میں حشر ڈراما نویسی کی مشغولیت کے باوجود دیگر اصناف ادب سے بے تعلق نہیں رہے اپنے
قریب ترین دوست ڈائرکٹر امرت لعل کے انتقال پر جنکی وساطت سے وہ دوسری بار کاؤس جی سے ملنے گئے تھے انہوں
نے فارسی زبان میں جو مرثیہ لکھا تھا وہ ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کے نقطۂ نظر سے آپ اپنی مثال ہے۔ یہ مرثیہ رسالہ

کلیہ میں ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ علمی ادبی نشستوں کی شرکت کے علاوہ مزید تحصیل علم کے شوق سے وہ بے پروا نہیں تھے۔ ایک لائبریری بمبئی کے لائبریرین نے ایک تقریر میں ان کے ذوق کتب بینی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ آغا صاحب کا ذوق مطالعہ دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ لائبریری کا شعبہ ادب و فلسفہ لٹریچر قریب قریب صرف آغا صاحب کی علمی تشنگی کی سیرابی کے لیے بنائی گئی ہے۔

بمبئی کے قیام میں حشر انجمن ضیاء الاسلام کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ۸ فروری ۱۹۰۹ء کے جلسے کی صدارت عالی جناب منشی محمد حسن صاحب تعلقہ جے۔ پی۔ رئیس اعظم بمبئی کر رہے تھے۔ حشر نے "معجزات القرآن" کے عنوان پر ایک مبسوط لکچر دیا۔ انجمن کی فضا میں فصاحت و بلاغت کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جملے سے جملہ، جوش اور تاثیر کے دریا بہا رہے تھے۔ تقریر کے آخر نے حاضرین کے دلوں میں ہمدردی و فیاضی کو جگہ دی۔ لوگ انجمن کی امداد پر آمادہ ہوئے اور ایک معقول رقم چندے کی جمع ہو گئی۔ ۱۷ فروری ۱۹۱۰ء کے جلسے میں جس کی صدارت عالی جناب سیٹھ عبدالحسین صاحب کے صاحبزادے سر آدم جی پیر بھائی کر رہے تھے۔ حشر نے "مکارم اسلام" کے عنوان پر تقریر کی۔ تقریر کا آخری حصہ چندے کی تمہید تھی جس نے لوگوں میں عام جوش پیدا کر دیا۔ یہاں تک کہ مولانا مولوی سجاد حسین صاحب احمد آبادی نے اپنا بیش قیمت جبہ اتارا اور بہ رنگ سبز بہت عمدہ صدری۔ کہہ کر انجمن کو نذر کر دیا۔

۱۱ فروری ۱۹۱۰ء کے جلسے میں جس کی صدارت سیٹھ فضل بھائی کے صاحبزادے سر کریم بھائی ابراہیم صاحب۔ رئیس اعظم بمبئی کر رہے تھے حشر نے "اب ہم کو کیا کرنا چاہیے" کے عنوان پر ایسی تقریر کی کہ سکریٹری انجمن کے الفاظ میں "اس وقت کمال گویائی آپ کی لطف آفرینی سے متعجب اور حیران ہو رہا تھا۔" ۲۰ فروری ۱۹۱۱ء کے جلسے کی صدارت حشر نے کی اور سکریٹری جلسہ کے بقول "اپنی صدارتی تقریر میں دیگر اصحاب کی تقریروں کی تائید و توضیح میں اپنی وسیع معلومات کے خزانے سے ایسے جواہر نگار ریزے کیے جن سے ان لکچروں کے کمال کی پیشانی زیادہ آب و تاب کے ساتھ جگمگانے لگی۔" اسی سال ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں والئ افغانستان کی ہندوستان میں تشریف آوری سے قبل انجمن ضیاء الاسلام نے ایک اور جلسہ منعقد کیا جس کی صدارت مولوی رفیع الدین احمد بیرسٹر ایٹ لا نے کی تھی۔ اس جلسے میں آغا حشر نے جو تقریر کی تھی اس کی تعریف میں بجز اس کے سکریٹری انجمن اتنا ہی کہتا کافی ہے۔ "خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔" جب ہز مجسٹی ہندوستان تشریف لائے تو ان کے استقبال میں حشر نے فارسی زبان میں ایک قصیدہ لکھا جو ماہنامہ "البرید" کانپور میں شائع ہوا تھا اس کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

صبحدم چشم جا مد تا ز بینے مہ رخے — حقہ بر لب، جام بر کف، جلوہ پاش و برقبار
ماہ روئے، مشکبوئے، دلبرے، جان پرورے — خوش نظر، والا گہر، لیلیٰ ادا، شیریں وقار
ناز پرور، ناز گستر، نازنیں، ناز آفریں — گلبدن، گل پیرہن، گلگوں قبا، گلگوں عذار
عنبریں مو، یاسمیں بو، خط خو، آئینہ رو — جلوہ بخش شام غم، صبح آفرین روزگار
غمزۂ بیباک او صد نخوتِ دارا شکن — عشوۂ چالاک او پنجہ کش اسفندیار
طرفہ تیر نیش زور آور، ناوک در — خنجر چین جنبش حرب زن، فرہش گذار
جستم و دو در کشیدم از لب او سہ لوم پے بہ پے — باز پرسیدم کہ اے جان در لبم بر تو نثار
گفتمش چوں آمدی؟ خندید و با صد ناز گفت — اے فصیح کاشمر، اے شاعر معجز نثار
آنکہ از مشرق بہ مغرب نور افشانی کند — آنکہ اندر عالم ایجاد چوں شمس اشتہار
از نسیم جود او گلشن بہ داماں ہر نفس — از نسیم لطف او فردوس در ہر کوہسار

آغا حشر نے مغربی ڈرامے کے پیکر کو ہندوستانی ملبوس پہنا کر زبان و بیان کے زیورات اور آتش نوا خطابت سے آراستہ

کر کے شائقین کو ڈرامے کی افادیت کی جانب متوجہ تو کر لیا تھا مگر وہ مقصدیت جس سے معاشرے میں زندگی، خیال میں وسعت اور روح میں بالیدگی پیدا ہو مالکان کمپنی کی مداخلتوں میں بے جا دخلت سے اس نقطۂ عروج تک نہیں پہنچ سکتا تھا جہاں تک حشر لے جانا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے ملازمت کی قید سے آزادی حاصل کر کے حیدرآباد کے ایک تعلقہ دار راجہ راگھو اندر راؤ کی شرکت میں انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد ڈالی اور اپنے نظریات کی اشاعت کے لئے ڈرامے کی زمین کو ہموار کرنے کے عمل کا آغاز کیا۔ کمپنی کے ساتھ اسی زمانے میں وہ بمبئی سے ترک سکونت کر کے حیدرآباد پہنچے جہاں انہوں نے "سفید خون عرف نیک پروین" ڈراما جو شیکسپیئر کے "کنگ لیئر" سے ماخوذ ہے لکھ کر ہندوستانی معاشرے کی زبوں حالی کی طرف اشارہ کیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں "یہودی کی لڑکی" لکھ کر ہندوستانیوں کے خوابیدہ ذہنوں کو حرکت و عمل کی طرف مائل کیا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۱۴ کو جب ان کی کمپنی لاہور میں مقیم تھی انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اپنی نظم "شکریۂ یورپ" کے اس بند کو پڑھ کر ہندوستانی عوام کو اپنا کے تصور سے آشنا کیا۔ یہ بند حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔

اے زمینِ یورپ! اے معراجِ جبرائیل نواز	اے حریفِ ایشیا اے شعلۂ خرمن نواز
چارہ سازی تیری بنیادِ الم کا شانہ ہے	تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے
اشکِ حسرت زا سے چشمِ حریت نمناک ہے	خونچکاں روداد انعام گریباں چاک ہے
حرفِ تصنیف ستم ہے فلسفہ دانی تری	آدمیت سوز ہے تہذیب حیوانی تری
عظمتِ دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے	وصل گیا حسنِ قدامت خون کے چھڑکاؤ سے
جلوہ گاہِ شوکت مشرق کو سونا کر دیا	جنت دنیا کو دوزخ کا نمونہ کر دیا
اٹھ رہا ہے شورِ غم خاکستر پامال سے	کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبانِ حال سے

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزو نے صدائے بلبلے

سنہ ۱۹۱۰ء میں کلکتہ کے اسٹیج پر اپنا پہلا ہندی ناٹک "بلوا منگل" پیش کر کے ہندو ناری کے وقار کو بلند کیا۔
سنہ ۱۹۱۶ء میں کمپنی کے ساتھ ایک بار پھر انہیں لاہور جانا پڑا جہاں "انجمن حمایت اسلام" کے سالانہ جلسے میں انہوں نے اپنی نظم "موجِ زمزم" پڑھ کر ہندوستانیوں کو اتحاد کا جوہر کا تحفہ دیا فرماتے ہیں (اقتباس نظم موجِ زمزم):

آسماں ہے محفلِ ہستی میں میخانہ مرا	کہکشاں میری صراحی چاند پیمانہ مرا
ہر نفس سے بربطِ گیتی پہ ہوتا ہے غزل خواں	اضطرابِ برق ہے اک رقص مستانہ مرا
ساز ہستی میں ہیں ارتعاش صبح نور	جلوہ زارِ زندگی ہے کعبہ سے میخانہ مرا
بارشِ مستی کے جلووں سے ہے فردوس آفریں	ہے خرابِ نور سے شاداب ویرانہ مرا
نکہتِ صہبائے مستی سے ہے تعمیر حیات	دہر میں اک موجِ رنگ و بو ہے کاشانہ مرا
دولتِ صبح قدم ہے مایۂ شامِ حدوث	گلشنِ جنت ترا ہے رضواں ہے بیعانہ مرا
جرعۂ جامِ مئے توحید ہے ایک ایک حرف	بزم کن کو مست کر دیتا ہے افسانہ مرا

شعلۂ آشامِ محبت زاتشِ دیرینہ ام
ساقی ام در مشرب و میخانۂ اش در سینہ ام

اسی زمانے میں ان کی اہلیہ سخت علیل تھیں۔ اہلیہ کی مسلسل علالت سے حشر کی پریشانیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔[۱۱۵]

یہاں ان کی اہلیہ کا لاہور میں انتقال ہوا۔ دل برداشتہ ہو کر سیالکوٹ میں انہوں نے اشرف سیکشیر تھیٹریکل کمپنی بند کر دی اور کلکتہ واپس چلے آئے جہاں جے۔ ایف۔ میڈن اینڈ کو کی جانب سے ان کو دست جمع ملا اور وہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ پر کمپنی کی ڈرامانگاری کے لیے۔ یہاں انہوں نے ۱۹۱۸ء میں مدھر مرلی، بھارت رمنی، اور ۱۹۱۹ء میں جگیرت گنگا، ہندی ناٹک لکھ کر عورت کے درد کو ہندوستانی معاشرے میں ایک ناسور بتایا۔ ۱۹۱۹ء میں ہندی کے ڈرامے "پرلہاد اور زریں بھارت" میں حشر ہندوستانی سماج کی ہندوستانی ساشرے سے بڑا گڑبڑ دکھائی دیتے ہیں:-

برجانشر ۔۔۔ "بیشک۔ دیش کے پرانے ہنر اور پرانی کاری گریاں مٹ جانے کے کارن، ضرورت کی سب چیزیں مہنگی ہو جانے کے کارن، آج چاول کے بدلے دونوں وقت سوکھے چنے بھی نہ ملنے کے کارن، آج بھارت تما جو پہلے سونے کا بھارت کہلاتا تھا، لاکھوں آدمی پیٹ کے لئے بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔ لیکن بھارت ماتا کے ان بچوں کو بھکاری بننے کے لئے کس نے بادہ کیا ۔۔۔ تم امیروں نے! ان کو بھیک مانگنا کس نے سکھایا؟ دیش کے دکھ سے بے پروا تم دھنوانوں نے! ۔۔۔ اگر تم امیر لوگ دیش کی پرانی کاریگریوں کی رکشا کرتے اور تم لوگ غیر ممالک کی کاریگروں کی بنائی ہوئی چیزوں کے بدلے ملک کے کاریگروں کی بنائی ہوئی چیزوں کو مول لینا اپنا دھرم سمجھتے۔ اگر تم اپنے روپئے زمین میں گاڑنے اور بینکوں میں جمع کرنے کے بدلے انہیں روپیوں سے آرٹ اسکول اور کارخانے کھول کر اپنے دیش کے بھوکے غریبوں کو کوئی ہنر یا دھندا سکھلاتے تو آج یہ سب دیش کی گلیوں میں بھیک مانگتے اور اسٹریلیا۔ فجی، مورشش۔ کناڈا میں چنڈال پیٹ کے لئے برٹ کی ٹھوکریں کھاتے کبھی نظر نہ آتے۔"

آغا حشر یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی اخلاقی، تہذیبی، تعلیمی و مذہبی معزبیت کی تنگ نظری سے آزاد ہو کر ملک و قوم کے سامنے اپنے اصل روپ اور رنگ میں آ جائیں، مگر یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب ایک ایک گزیدہ محسوسات کی دنیا میں اپنی اپنی شکل اختیار کر کے ہر فرد کے سامنے آئے اور اپنی اپنی کارگری سے خوابیدہ فطرت ہندوستانیوں کو بے دار کرے۔ ایسے اثرات تھیٹر ہال میں انسانی ذہنوں پر ایکٹنگ اور اداکاری سے بالواسطہ پیدا ہوتے ہیں۔ حشر اپنے ڈرامے "ترکی حور" میں جو ۱۹۲۲ء میں کلکتہ کے اسٹیج پر کھیلا گیا تھا، ڈرامے کی افادیت کے متعلق اپنے نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی زبوں حالی کو رشیدہ کے ایک مکالمے میں اس طرح پیش کرتے ہیں:-

"ناٹک بھی سوتے ہوئے کو جگانے، اور گرے ہوؤں کو اٹھانے کا ایک زبردست ذریعہ ہے۔ جو ترقی کا جوش و جذبہ سیکڑوں وعظ اور ہزاروں لکچر سن کر برسوں میں پیدا ہوتا ہے، وہی جوش و جذبہ انسان کے اندر بہتر ناٹک صرف ایک رات میں پیدا کر دیتا ہے۔"

اسی ڈرامے میں رشیدہ کے مکالمے سے وہ ہندوستانیوں کے مسائل حیات کی یوں نشان دہی کرتے ہیں۔

"ہمارا ملک جو سادہ کھانا، سادہ پہننا، اور سادے طور پر زندگی بسر کرنا پسند کرتا تھا۔ آج نمود و نمائش کا بندہ، فیشن کا غلام، اور شراب کے نجس چھینٹوں کی مکھی بنا رہا ہے۔ امیر تو امیر، غریب مزدور تک اپنی دن بھر کی کمائی کا ایک حصہ چائے اور سگریٹ پر، اور دو حصے شام کے وقت شراب کی دکان پر

جینٹ چڑھا دیے ہیں ۔ معقول مزاجی اور شراب نوشی کی لہروں میں تندرستی، دولت، عزت سب کچھ تنکے کی طرح بہا جارہا ہے۔ ان برائیوں کا بیان بھی اس ناٹک کا مضمون ہے ۔ اور ان برائیوں کی اصلاح کی طرف ملک کو توجہ دلانا بھی اس ناٹک کا مقصد ہے ۔"

کلکتہ میں میڈن تھیٹر اینڈ کو کے لیے ۱۹۲۱ء میں "پہلا پیار" عرف "سنہرا چکر" ۱۹۲۲ء میں "بھیشم پتاما" ۱۹۲۲ء میں "آنکھ کا نشہ" ہندی ناٹک لکھ کر حشر نے معاشرے کی پستی کو بار بار پیش کیا۔ آغا حشر کا وطن پرست دل اور دانشور ذہن بار بار خفتہ ذہنوں کو جگانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ ہندوستان کا ذرہ ذرہ درخشاں ماضی کا آئینہ دار ہو جائے۔ اسی جذبے کے تحت انھوں نے ہندی اور اردو ڈراموں میں اپنے آس پاس کی بکھری ہوئی زندگی سے کرداروں کی تخلیق کی۔

۱۹۲۴ء میں حشر نے اپنی دوسری تھیٹریکل کمپنی (انڈین تھیٹریکل کمپنی آف کلکتہ) کی بنیاد بنارس میں ڈالی۔ جو شہر در شہر کا دورہ کرتی ہوئی جب ۱۹۲۵ء میں پٹنہ پہنچی تو اس کمپنی کو مہاراجہ چرکھاری نے خرید لیا۔ اور حشر نے اپنا ہندی ناٹک "سیتا بن باس" جو بنارس میں ۱۹۲۴ء میں لکھا گیا تھا چرکھاری کے اسٹیج پر پیش کیا۔

حشر کی باشعور سیاسی بصیرت اس وقت اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ معاشرے میں ایکھ جہتی کا مفہوم اسی وقت معنی خیز ہو سکتا ہے جب ہندوستان میں اچھوتوں کا درجہ دوسرے ہندوستانیوں کے برابر ہو۔ "سیتا بن باس" میں شنبوک سے کلام کرتے ہوئے شری رام چندر جی کے مکالمے میں حشر کے خیالات کا یوں اظہار ہوتا ہے:

شری رام چندر جی ۔۔ " کیا برہمن، کشتری، ویش کے سمان شودر، پرش اور استری سے جنم نہیں لیتے ۔۔ شش سماج میں پل کر بڑے نہیں ہوتے ۔۔ منشیوں جیسا روپ، گن سبھاؤ، ہردے، بدھی، گیان، وویک نہیں رکھتے ۔۔ امیری، غریبی، مان، اپمان، امرت، وش، شراب اور آشیرواد کا بھید نہیں سمجھتے ۔۔ پھر سکھ اور دکھ کے احساس کے سوا ان میں، اور دوسرے منشیوں میں کیا بھید ہے۔ شنبوک جس کی جڑ کھوکھلی ہو وہ درخت، جس کے استھمب کمزور ہوں وہ چھت، جس کی نیو ہل رہی ہو وہ گھر، جس کے پچھلے بھاگ میں آگ لگی ہو وہ جہاز، اور جس کا کوڑھ سے آدھیں انگ جیسے جاتی میں جنم لینے کے کارن اپنے مانو جیون کے کروڑوں بچوں کو یہ حق، لکشا، ہیں، ادھیکار ہیں، داس بنا کر سدا اپنے پیروں کے نیچے رکھنا چاہتی ہوں وہ دیش کبھی دیر تک سنسار میں سر اونچا کئے ہوئے، اپنی جگہ استھر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے شودروں کو بھی سماج کا پردھان انگ جانو ۔۔ ان کے ساتھ نیائے کرو اور ان کی پکار کو بھی ایشور کی پکار سمجھو ۔۔"

آغا حشر کی یہ عملی تحریکیں جب اتنی کامیاب نہیں ہوئیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے تو ان کے ذہن میں ہندوستان کی آزادی کا جذبہ جاگ اٹھا ۔۔ یہ شرف اسی سرزمین بمبئی کو حاصل ہے۔ جہاں آغا حشر نے "امپیریل تھیٹریکل کمپنی آف بمبئی" کے اسٹیج پر ۱۹۲۹ء میں اپنا معرکۃ الآرا ڈرامہ "رستم سہراب" پیش کیا۔ جس نے ہندوستانیوں کے ذہن میں خود اعتمادی کی سوتی ولولوں کی اور گُرد آفرید کے مکالموں کی للکار نے ان کے جذبات کو پیغامِ حریت دیا۔

گُرد آفرید ۔۔ " ایران کے دلیرو۔ یہ دوست نما منافق جس کے پاس مردانہ روح، شرم،

ایماں کچھ نہیں ہے۔ ذاتی مفاد کی نگہداشت جس کا اصول، مطلب پرستی جس کی زندگی کا معیار و معراج، اور دغا جس کا ضمیر ہے، اپنی کمائی کی دولت سے دل میں محبت کے پالنے ہوئے جذبوں کو خشک کر کے تمہیں بھی اپنی طرح مردود خلائق بنانا چاہتا ہے۔ خدا نے جس اس مکّاری و غداری سے بچا لیا ——— بیٹا، سنو۔ اب اس دنیا میں دغا سے کوئی محفوظ نہیں —— وہ بھی تمہاری طرح اپنی زندگی کی مدت اور موت کے وقت سے بے خبر ہے۔ اس لئے ٹیلے کو پہاڑ اور پہاڑ کو آسمان سمجھ کر اپنی طاقتوں کو حقیر نہ سمجھو ——— اٹھو، بڑھو ——— مست ہاتھی کی طرح جھوم کر، آندھی کی طرح جھپٹ کر، بادل کی طرح گرج کر، پھر بجلی کی طرح تلواریں کھینچ کر حفاظت وطن کے لئے آگے بڑھتے چلو —— جہاں بزدلی ہے وہیں شکست ہے —— اور جہاں جرأت ہے وہیں فتح ——

بمبئی سے کلکتہ واپس جانے کے بعد بھی حشر کلکتہ کے اسٹیج سے ۱۹۲۹ء میں "دھرمی بالک" عرف "غریب کی دنیا"، ۱۹۳۰ء میں "بھارتی بالک" عرف "سماج کا شکار"۔ ایسے ہندی ناٹکوں سے ہندوستانی ماحول کا تجزیہ کرنے میں ہندوستان کے کسی مصلح قوم سے پیچھے نہیں رہے اور ۱۹۳۱ء میں اپنا ہندی ناٹک "دل کی پیاس" لکھ کر انہوں نے اصلاح معاشرے کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

کلکتہ کی فلمی دنیا کو "شیریں فرہاد"، "محبت کا پیار"، "یہودی کی لڑکی"، ایسی شہرۂ آفاق ناطق فلمیں دینے کے بعد حشر بغرض علاج ۱۹۳۴ء میں لاہور گئے جہاں حکیم نقیر محمد چشتی نے ان کا علاج شروع کیا۔ مسلسل محنت نے حشر کی صحت کو خراب سے خراب تر کر دیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے لاہور میں ایک فلم کمپنی "حشر پکچرز" کی بنیاد ڈالی اور "بھیشم نامہ" ڈرامے کی شوٹنگ میں منہمک ہو گئے۔ مرض میں افاقہ نہیں ہوا اور صحت دن بدن گرتی چلی گئی۔ آخر کار ڈراما نویسی کا وہ آفتاب عالم تاب جو افق بمبئی سے ڈرامے کی دنیا میں طلوع ہوا تھا، اور اپنی ضوفشانی سے ہندوستانی اسٹیج کے ذرے ذرے کو درخشاں اور معاشرے کے ایک ایک سانچے کو منور کر چکا تھا، لاہور میں ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو غروب ہو گیا۔ اور وہیں ۲۹ اپریل کو میانی صاحب کے قبرستان چار برجی میں مدفون ہوا۔ مگر اس کی ڈراما نگاری کا فن، اس کی خطابت، اور حقائق آشنا کردار شاہراہ تمثیل نگاری کے لئے، ماضی میں بھی مشعل راہ تھے۔ آج بھی ہیں، اور مستقبل میں بھی رہیں گے۔

●●

ڈاکٹر ظ. انصاری

یادِ رفتگاں: کرشن چندر

عظمت آدمی کے ساتھ دفن نہیں ہوتی لیکن ۔۔ وہ دکھ وہی
روح کے اس شہرت کرشن ایک جی دیسا پھیلا ہے وجود نظر نہیں آتا۔ جو مخالف
متضاد، رنگ، رشتے پھیلے ہوئے ذہن کو دور دور نزدیک سے لپیٹ کر
بیٹھ جانے کرشن کی سب دیواریں اور سارے فاصلے ناپید ہو جاتے ہیں۔ یہ کمال
اس شخص میں تھا جس کی بڑائی تحریر و تصنیف کے علاوہ، حد درجہ خاکساری
اور وضعداری میں پوشیدہ تھی۔ ایک کرشن چندر کے اٹھ جانے سے ہماری روز
کی زندگی میں کیسی کمی ہو گئی ہے۔

عاشق آدمی تھے کرشن چندر۔ انھیں زندگی کی ہر ایک خوبصورتی سے عشق تھا،
خوبصورتی میں کہیں نہ کہیں کانٹے بھی ضرور ہوتے ہیں۔ بچے زندگی لاتے ہیں۔ مگر
شر انگیزیاں ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ عورتوں کے کانٹوں کی چبھن سے تو شاعری
بھری پڑی ہے۔ کسانوں کی سادہ زندگی کے حسن میں ان کی محرومی، افلاس اور
تنگ دستی کے علاوہ رسم و رواج کے گلے سڑے بندھن، شہر کے حسن میں دھاندلی، بے
ایمانی، ریاکاری اور ستم ظریفی کے بکھیڑے۔ کرشن چندر حسن کو کانٹوں سمیت قبول کرتے
اور آہ۔ نگاہ دونوں کو کبھی افسانوں اور ناولوں کی صورت میں، کبھی افسانہ نما
طنزیہ مضامین کی شکل میں ڈھال دیتے۔ جیسے یہ افراط و تفریط تو ہوتی ہی ہے۔ کوئی
بیش چالیس برس انھوں نے لکھا اور ان چالیس برس کی مدت میں ہماری قومی بلکہ
بین الاقوامی زندگی کا کون سا ایسا اہم واقعہ ہے جس کی لرزش ان کے قلم نے قبول نہ کی
ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ وہ ایک انتھک مصنف تھے یا اپنے وقت کے بڑے
SEISMOLOGIS۔ کہ ان کی تحریروں نے لاکھوں بندگانِ خدا کے سوتے
ہوئے شعور کو جگایا اور جاگتے شعور کو حرکت و حرارت بخشی ہے

میں نے انھیں ۴۰ء میں پہلی بار دیکھا تھا، پستہ قد، موزوں ہاتھ پاؤں،
کشادہ پیشانی، ذہین و شرمیلی آنکھیں، بھرا ہوا سرخی مائل چہرہ، بے داغ،
نفیس مگر سادہ لباس۔ تب تک ان کی افسانہ نگاری کافی شہرت پا چکی
تھی اور لوگوں میں شمار تھا، مگر وہ ادیبوں کے ایک جلسے میں آتے بھی تو
اور سوائے چند ملاقاتیوں کے کسی کو ان کی موجودگی کا علم تک نہ ہوتا وہ دور بیٹھ
ذکر ہے۔ اپنے منوانے چھپوانے کی ہر ایک کوشش سے بے نیاز تھے ... عبارت
کبھی کسی پر مسلط ہوتے نہ دیکھا، نہ سنا۔ اور تو اور اپنے تئیں گزرتے وقتوں ...
کرنے میں وہ پیش کرتے اور پیچھے ہی بیٹھ جاتے۔ بجائے خود ...
آپ چھپ جائے

مثلاً بزدلی، اور گستاخی — دونوں سے دل ہی دل میں ڈرتے تھے
ہم نے، مگر وہ ایک موقعوں کے سوا کبھی غصہ نہیں ہوتے۔ میری ...
انتہا کو پہنچی ہوئی ہے کہ بعض اوقات اجنبی کرب طبیعت کھٹکنے لگتی ہے۔ آپ
آدمی ایسے ہیں، مرا کام کھڑے کرنے بیٹھیں۔ کوئی میرے منہ پر زور زور سے ...
لگے، ایسے پر اتنا ہی تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اور میں وہاں سے ...
کرتا ہوں یا پھر تماشے کی طرح گھس کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ایک بار دو واقعے ...
سے کرشن چندر کے دو مختلف رُخ دکھا گئے۔ واقعے یوں ہیں۔

غالباً ۱۹۵۹ء کی ایک شام تھی۔ میں ماسکو سے بمبئی آیا ہوا تھا چند
روز کے لئے، اور دوسری شام کی پرواز سے باہر جا رہا تھا۔ اس روز کرشن چندر
نے اپنے چار بنگلے والے پرانے طرز کے بنگلے میں میری دعوت کی۔ ایک بڑے
عالمِ دین کی کار مع ڈرائیور لیے وہاں پہنچا۔ دس بارہ اہلِ علم موجود تھے اور
بدبخت فرشتے کا دور چل رہا تھا۔ کھڑکیاں تک بند کر رکھی تھیں کہ کہیں شراب
بندی سے اخلاق سدھانے والوں کو بو نہ مل جائے۔ اندر سے دھواں اٹھ رہا تھا اور
دھوئیں سے زیادہ جوش و خروش، ہنگامہ، ہلا گلا، پینا ایک تہذیب ہے۔
اور بدتہذیبی کا ایک بہانہ بھی، ہمارے قبیلے میں دونوں طرح کی مخلوق پائی

جاتی ہے۔ کرشن چندر ایک تو ویسے ہی نہایت مہذب اور مستعد آدمی۔ دوسرے
خود میزبان۔ تو بس بچھے جا رہے تھے۔ نشستم کرنے کے لئے مجھے بلا لیا گیا
بلاوا بھیجے چیپر گئے۔ اتنے میں ایک صاحب نے جلا کھایا۔ دوسرے نے
شہ دی۔ وقت گزرتا رہا۔ خدا بھلا کرے کس کا، کہاں کا غصہ تھا کہ ایک اجمالی
تقریر نے مجھے ٹھیک اور توہین کا تاثر سنبھالیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو لڑنے
مرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ اتنے میں باہر نامہ بر چلنے لگے کی جھلک دکھائی
دی۔ میں چپکے سے سرکا، باہر نکل کر دیکھوں کیا معاملہ ہے۔ کرشن چندر
باہر تک کھیلتے اور منانے ہوئے آئے۔ یہی وہ دوسری طرف سے
برابر معذرت کئے جا رہے تھے۔

کیا دیکھتا ہوں کہ باوردی پولس اس لمبی سی کار کو گھیرے کھڑی ہے
ڈرائیور دھواں سے۔ بونٹ اور ڈگی کھول گئی۔ تلاشی ہوئی۔ میں اندر واپس
جانے کے بجائے اسی میں بیٹھ کر واپس ہو لیا کہ مبادا کوئی اور آفت آئے۔ تھیا تکیہ
برآمد کیا کوٹ وغیرہ وہیں رہ گیا تھا اور کوٹ میں سفر کے کاغذات بھی۔

دوسرے دن پہنچا کہ سامان جو رہ گیا ہے لے لوں۔ کرشن چندر پیچھے
کی رات والے ہنگامے پر سنجیدہ تھے۔ بہت شرمندہ۔ انھوں نے کہا میں
بھی پہنچانے چلوں گا۔ باہر ادھر ہی اسٹیشن کے قریب ایک جوان سردار جی اپنے
چار پانچ لفنگوں سمیت کھڑے تھے کہ آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ کرشن
چندر گاڑی سے اتر کر سردار جی کو ایک طرف لے گئے۔ سمجھایا کہ انھیں بھی
ہوائی جہاز سے باہر جانا ہے پھر بعد میں نمٹ لیں گے۔ وہ کہاں ماننے والے تھے۔ کہ
سے ڈٹ گئے اور ہاتھا پائی پر اتر آنے لگے۔ اب جو دیکھتا ہوں تو کرشن چندر کو جلال آ
گیا۔ رات کے واقعے کا غصہ بھی ابل پڑا۔

"دیکھ بے سردار! میں بھی پنجابی ہوں۔ تو نے خود کو سمجھا کیا ہے؟"
اور آستین الٹ کر جھپٹنا ہی چاہتے تھے۔ اب معاملہ آبرو کے علاوہ ہماری جان کا تھا
میں اور ایک ہمراہی پنڈت جی بھی لڑنے مرنے کو تیار سامنے آ گئے۔ لفنگوں
کا ٹولہ پسپا ہو گیا۔ راستہ صاف ہو گیا۔ برسوں مجھے یقین نہیں آیا کہ ہم لوگ
اس قدر بے قابو بھی ہو سکتے تھے۔ اور کرشن چندر کو ایک دم اپنا "پنجابی"
یا جنگی ہونا یاد آ سکتا تھا۔

دلی میں نے ان کا کئی بار دکھایا ۔۔ اور ہر بار انجانے میں۔ مثلاً
مجھے خبر نہ تھی کہ وہ اپنے اوپر طنز کا وار مسکرا کر سہہ سکتے ہیں۔ سلمٰی صدیقی کی
طرف سوالی نوک ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ میری اور دوسروں کی نوک جھونک
ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔ ذرا کوئی بات منہ سے نکلی اور وہ بے قابو ہو گئے۔ کرسی سے
اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اپنا" پنجابی" ہونا اچانک انھیں یاد آ گیا۔

ایسے نرم گفتار، وسیع دل آدمی تھے کہ ان کا دور رفیقہ کا ساتھ
ناقابل یقین تھا۔ آدھی رات کا وقت۔ میں ان کے گھر دو روز تک ...
مکان سے رخصت ہونے کو تیار تھا کہ لڑکی پہ دستک ہوئی۔ خود ایک کم
ہو گئے۔ ایک دو سکھ نیاز مند پہ ہوئے خستہ حال کھڑے تھے۔ کرشن
چندر ننگے پاؤں واپس اپنے کمرے میں گئے۔ کمرے سے باہر کے دروازے
تک۔ ... ہوئے تھے۔ مجھے ذرا دیر کے اس سلوک پر حیرت ہی تھا
اور جلدی جلدی لے کر دیکھ نہ پاؤں۔ ظاہر ہے عام طور پر معتوبیت اور تنگ
برداشت کا ٹیس ہے کر آتے ہر لمحے۔ ایک دو نہیں۔ درجنوں ضرورت
مندوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا کرتے کہ ایک ہاتھ سے دیں تو دوسرے کو خبر نہ ہو

اور خوبصورتی کے علاوہ دسترخوان کی خوبصورتی بھی انھیں بہت عزیز
تھی۔ جو وسیع دسترخوان تھا ان کا۔ خشک و تر ہر قسم کا اہتمام رہتا تھا۔ ہندو
اور گجراتی، مراٹھی اور سندھی، ملکی اور غیر ملکی ہر قماش کا تکلف ان کے مکان
پہ روشن خیال ہو جایا کرتا تھا اور وہیں ملنے میں مزہ بھی آتا تھا۔ جیسے لوگ لطیفے
اکٹھا ... اور مستقل کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ سب کی خاطر کر رہے ہیں۔ حکومت
ہند کے ... کے زمانے میں ایک ڈاکومنٹری فلم بنانے کا مرحلہ
کے قریب تھی کہ میں بمبئی میں وارد ہوا۔ خبر سنتے ہی بلا بھیجا۔ میں نے کہا کہ خواہ مخواہ
صورت دکھانے کیا جاؤں، فلم بن چکے گی تو ملاقات کر لوں گا۔

ایک دن صبح سویرے دروازے کی گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو آپ
موجود۔ شیو تک نہیں کیا تھا۔ بس پچیس کیلومیٹر کے فاصلے تک ایسے ہی نہار منہ
چلے آئے تھے۔ چلئے میرے ساتھ، تیار ہو جائیے۔ آج اور کل میں آخری شاٹ
ہونے والے ہیں۔

مروت کیا کرتیں ... نہیں پڑھنے والا ہر بار دو ... میں
کچھ ... نہیں ملتے۔ جانتا ہوں آپ اپنی ضد سے باز آنے والے نہیں۔
پھر بھی چلنا ہے۔

میں پہنچا اور جیسے ہی کیمرے نے مجھ پر ذوم (ZOOM) کیا میں نے
پوچھا، کیوں جناب یہ کیا تماشا ہے۔ عمر بھر تو حکومت اور اس کے پرندوں کے خلاف
دل کا بخار نکالتے رہے اور اب اس سے اپنی برأت ... کا سوال تھا)
ہنس دیئے۔ جواب دیا۔ اور دوسروں کو جو فلم میں شرکت کر رہے تھے
اشارہ کیا کہ وہ کتنا مت ... وہ میرے بھی دوست تھے۔ چلنے دیا۔ سوال جواب
ہوتا رہا اور بعد میں دیکھا تو اس کا بیشتر حصہ ڈاکومنٹری میں جوں کا توں موجود تھا

بیچارے کٹے گئے۔ بھی بھی تو تبادلۂ خیال و ابستگی۔ بہت کم ملاقات
ہو جاتی۔ دس دس دن پر؟ تو قریب یا کوئی گئے؟ کبھی تو کبھی نہ
یہ مرزا صاحب ہی ساتھ تھے تو سیدھے اُس کے بیان سے کہتے
یہ ہمیشہ ماہ روز جب بھی آتے۔ شکل بدلتے۔ کرشن جی نے کہ لاشعوری
کے وقت انھیں بچپنے کی صورت نظر آتے تھے۔ یہ دونوں شخص بیماری
صرف کرشن چندر اور ان کے عزیز دوست تھے اور بہت خیال کرتے تھے۔ کرشن چندر
جب مجھ سے ملتے۔ ان کی غیرت خوب پہنچتے۔ شام کو تیر اور لگتے بعد میں
ہر گلاس تو شرابی کی حالت شروع ہو جاتی (سب مشروبات پیتے کرشن جی کے
کسی کے شب خانے تھے) پھر سارے قصے کرتے ہوئے وہ کسی نہ کسی سے
پر بھی پہنچتے۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ سب خود ہی خفا ہیں گے اس لئے کرشن کی ہمت:
ملتا ہے ایک بار بھی بیمار ہوا۔ اپنا آخری کمال کر کے دیکھا۔ انہوں نے پیچھے
ہلا۔ فن ہی ہمیشہ کچھ ہی انہیں کچھ خلل کا ساز و رقص تھا۔ عمر اپنے جانے
پہچانے غلط کر کبھی ذرا بھی کہ شاید نہیں بناتے تھے۔

کسی مٹھائی کھانے والوں میں ان کی مٹھائی ہو نا ہو۔ مثلاً برفی وغیرہ
کی طرح نگلتے تھے۔ بیرونی رکھی تھیں۔ ڈاکٹر روکتے تھے۔ سامنے قلاقند رکھے ہوں
بچوں کی طرح کسی بہانے باہر نکل کر کھاتے۔ بعد میں کہیں نہ ملے جاتی۔ دیشو کے
پاس والی دکان کو تو کنفیکشنری ہوتی ہے۔ اُدھر چلے۔ اور کہہ سکتے ہو تو ختم
کر دیتے۔ خود کھاتے ساتھ والے کو نہ روکتے

جب بھی مٹھائی کھاتا ہوں تو مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب کسی ہوٹل یا شہر
میں رخصت ہوتے وقت وہ اپنی جیبیں ٹٹولتے اور جتنے پیسے نکلتے اسی کی مٹھائی
لے کر آگے رکھ دیتے۔ ہاں بس کافی ہو گی۔ رات کو اس سے زیادہ نہیں کھانی
چاہئے"

ایک بار چھپا چھپا کر کھا رہے تھے۔ کسی منچلے نے جان لیا۔ روکنے
کے ارادے سے آگے بڑھے تو کہیں کرشن جی بچے کی طرح ہاتھ پیچھے کر کر
لئے اور چہرے پر عجیب معصومیت طاری کر لیا۔ ویسے ہی ماسکو میں ایک بیبی نے انھیں
وہسکی کی بوتل تھمانے کے بہانے جا کر دی۔ جلدی سے بغل میں چھپا لی۔ اب باقی لوگ
کے آنے ہی اچھلنے کودنے لگے گویا کچھ نہیں۔ ہنسی کی کوئی بات ہو گئی ہے۔ وہ بھی
ساٹھ برس کے اس شریر بچے پہ ایسا اچھا لگتا ہے جیسے کبھی ہندوستان میں کسی
ماحول میں پرندہ جانے قہقہے لگانے ہوں گے۔
کرشن چندر کو شاید اپنے آخری دنوں کی خبر تھی ایک بار (۱۹۷۰ء میں)
لال قلعہ دیکھنے گئے۔ دو مہینے لوٹ پوٹ کے اچھے ہو گئے۔ پھر دو برس بعد پڑ گئے

اسا اپنے بیٹے کے انتظام۔
لو جا ہو اہاں ان کے وصیت۔ مرنے کے بعد میری چتا جلائی جائے یا
گاڑا جائے: تشدد سے علیحدہ جانا تھا۔ کبھی صرف شانتی تک تھا۔
ہم ان کی بیوہ کی طرف سے صبر و شکر کرتے۔ یہ بھی اپنے کے سینکڑوں قدر شناس
ان کے افسوس سے اتنی ہی تعزیت پہنچا ہوا ہی ہے۔ وہ ایک بے فکر اور لا پرواہ
انسان تھے۔ جہالت کے اتنے خوں بہتے ان سے فرق کرنے کے قائل تھے۔ یہ بچپن سے ہی
جنت کا تصور نہیں رکھتے تھے ان کو طلب سیاست ترقی سے زیادہ بھی نہیں تھے
بیر بھی ماننے تھے۔ مزید علم کے بغیر بھی اس نے جو جانے کیا ہے ہی نہ ہوا۔
سارا اہتمام شاندار تھا۔ تقریبا اتنی بڑی تعداد نے ہیں ساتھ ہی۔ دھرم بدلتے ہی
طلبہ نے ان کی تقریر کو سامنے رکھا مگر اب بھی کوئی ستارہ ان کے نیچے،
خود کو غائب سمجھتا۔ شاعر و کرشن نے خبر سنی تو دکھ سے دل برف تھے۔
دردِ ہجر میں۔ خطاب ہوا۔ اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ حالی شان جشن منا لیا۔
میں کیا کہوں رخصت ہوگئی۔ بیٹے کے (کال) نہیں پہ وہ آواز ساری رات تقریر ہوتی جاتی
تا بہ جانا چاہا۔

بنا اتر آنے سے پہلے رک گئے تھے۔ اور اب سب کی آنکھیں نم ہیں آئے دیکھے،
تھا کچھ:

تعب کے گھر سے نکلے۔ انھوں نے بڑی تعریف انسانی کی جیت کا،
کیا نہیں۔ کچھ نہیں معلوم جنہیں جب وہ جنازہ گھر کے باہر رکھا گیا تو میں نے
کسی کے کہنے پر۔ ایک قرآن خواں حافظ جی کو بلایا۔ قرآن خوانی ہونی تو پھر کر
گیتا خوانی اور گرنتھ خوانی کا خیال آیا۔ وہ بھی ہو گئی۔ ارتھی اٹھا کے جانے لگے تو
سر پر صرف ایک ہی پگڑی تھی۔ گھر والے ساتھ چھوٹ رہا تھا۔ جنازے کے جلوس میں
ڈیڑھ دو سو آدمی شریک ہوئے۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ اردو ادب کا
مرنے والے کی زندگی میں اتنی بستیں بیشمار تھیں جتنی دکھ بھری گزری فرصت میں بھی
اکثر شکل کر رہے ہیں جیسی ہوں گی۔ مگر جب ان کا جنازہ اٹھا ہے تو دور دور تک
شریک نہ ہو سکی تھیں۔ سارے ادب کی موت تو ان کی تاریخ کا ایک واقعہ ہو کر رہ گیا۔
کرشن چندر کی تصنیفوں میں۔ گل ہیر خوانی۔ فٹ پاتھ۔ محمد ساوتری
کے افسانے ان کے تو ان سے اتنی بار دہرائے گئے ہیں کہ وہ گویا مرحوم مصنف کی
ایک شناخت بن چکے ہیں۔ ابھی ان کا آخری ناول کے ایک سال زیر اشاعت کے
موقع کی سب سے نئی سیریز۔ کرشن چندر نمبر۔ کے نام سے شروع ہوئی
اور وہ بھی دو طویل مگر لمبی سیریز۔ جو کرشن چندر کے نام سے چھپتی ہے اس پر نئے ہاتھ
بن رہا ہے اور نئے ہاتھ کے شہزادے پڑھے رہے تھے گیل۔
••

سید نعیم الدین

برار میں اردو شاعری کا آغاز و ارتقاء

اگر سلاطین دہلی نے دکن کو آباد کیا اور بہمنیوں کا تعلق ایران و توران سے تھا اس لئے یہ فطری امر تھا کہ وہ اپنی موروثی ثقافتی زبان فارسی کو فروغ دیتے لیکن یہ ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے کہ انھوں نے فارسی کے مقابلے میں بیشتر اپنے علاقے کی زبان یعنی دکنی اردو کو اہمیت دی اور خود بھی اس کو تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا اور اہل قلم کو بھی اس میں تخلیق و تصنیف کی ترغیب و تشویق کی ان کے علاوہ صوفیا نے کلام کو بھی اپنا روحانی پیغام عوام تک پہنچانے کے لئے مقامی زبان سے بہتر کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا۔ غرض دونوں طبقوں کی مساعی کے نتیجے میں دکن کے بعض مرکزی مقامات از قبیل بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ، سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی ہی میں قدیم اردو کے اہم مرکز بن گئے۔ برار دکن ہی کا جزو رہا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اٹھارھویں صدی سے ادبی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔

گو برار کی حالت ایک ادبی جزیرے کی سی تھی، تاہم برہانپور اور اورنگ آباد سے اس کے تعلقات تھے، اور شمالی ہند سے بھی اہل علم و ادب یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم برار کے مشہور شاعر غلام مصطفیٰ انسان شمالی ہند سے تشریف لائے تھے۔ ان کا انتقال ایلچپور ہی میں ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء میں ہوا۔ آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں لکھا ہے کہ وہ علوم ہندی سے اس حد تک واقف تھے کہ پنڈت اپنی مشکلات حل کرانے کے لئے ان کے پاس آتے تھے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ شعر ہندی (کبت اور دوہا) خوب کہتے تھے۔ (۱) انسان کے انتقال کے وقت دوسرے مشہور ایلچپوری شاعر آغا محمد امین وفا (پیدائش ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۰ء) تقریباً ۳۲ سال کے تھے۔ ان کی دو غزلیں تذکرہ گلشن گفتار میں مرقوم ہیں۔ وفا کے معاصرین میں نورالدین حسین خان رنگین (۱۲۰۲ھ) رسالہ ایک (۱۱۲۵ھ/) شاہ غلام حسین ایلچپوری اور دولت الٰہی کے نام سے مندرجہ ذیل نام لئے جا سکتے ہیں ان میں غلام حسین کی سربرآوردہ حیثیت رکھتے ہیں۔

غلام حسین کا زمانہ ولی کے بعد کا ہے جن کی تاریخ وفات ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ اور ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ کے درمیان مانی جاتی ہے (۲) حضرت غلام حسین کا زمانۂ حیات ۱۱۲۹ – ۱۱۳۰/۱۷۱۶–۱۷۱۶

۱) آزاد بلگرامی سرو آزاد ۱۹۱۳ ص ۶۴، ۶۵ (۲) جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو جلد اول ۔ ۱۹۷۷ ص ۵۳۹

اور ۱۲۰۱ھ/۱۷۹۵ء کے درمیان ہے۔ اس وقت شمالی ہند ہی میں نہیں دکن میں بھی سراج اورنگ آبادی (م ۱۱۷۷ھ) اور عزلت (م ۱۱۹۰ھ) کے ہاتھوں زبان نکھرنے لگی تھی، اور اس پر فارسی اسلوب حاوی ہونے لگا تھا، لیکن دیوان غلام حسین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ برار جیسے دور افتادہ علاقے

میں دکنی ایک عرصے تک اپنی قدیم ڈگر پر مڑے سے
بر اجمان رہا۔ اسد غلام حسین نے اردھونامہ، اگن نامہ،
بھرنگ نامہ، سکھی نامہ، جوبن نامہ، اور کچھ غزلیں اسی
طرح ہندویت میں ڈوبی ہوئی لکھیں کہ انہیں قدیم دکنی ادب
کے سلسلے کی آخری کڑی ماننا کتنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہاں ہمیں
ڈاکٹر پرکاش مونس کا یہ قول ملتا ہے "من سمجھاون قدیم
دکنی سلسلۂ ادب کی آخری کڑی ہے، ولی کے زمانے سے
اردو مصنفین کے یہاں ہندویت پر فارسیت کو ترجیح دینے کا
جو رجحان ہو چلا تھا۔ وہ 'من سمجھاون' میں بالکل مفقود ہے
'من سمجھاون' صحیح معنوں میں ہندی اور اردو ادب کا
مشترک سرمایہ ہے"۔ (اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر الہ آباد
۱۹۶۸ء ص ۲۰۲) لیکن ہمارے خیال میں دیوانِ غلام حسین کی
دریافت کے بعد پرکاش مونس کا یہ قول ترمیم طلب ہو جاتا
ہے۔ یعنی ہماری رائے میں شاہ تراب کی من سمجھاون کو
نہیں ان کے بعد آنے والے غلام حسین کی اردھونامہ جیسی
منظومات کو قدیم دکنی کے سلسلے کی آخری کڑیاں تسلیم کرنا چاہیئے
کلامِ غلام حسین کی لسانی اہمیت دیگر شعرائے دکن کے
مقابلے میں یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کے اشعار میں کہیں
کہیں مایا، مری، مت جیسے برج کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ اس
سے پتہ چلتا ہے کہ برج کے چیدہ منتخب الفاظ دکن کے دور دراز
گوشوں تک پہنچ گئے تھے۔ دلیپوری کے ایک اور شاعر
حضرت موسوی کے مجموعۂ کلام روضۃ الواصلین میں بھی کچھ
اشعار بزبانِ گوالیاری نظر آئے۔ برج کے الفاظ خاص طور
پر غلام حسین کی سانجھ پڑی چو دیس والی غزل میں اور دوہوں
میں ملتے ہیں۔ زیر بحث غزل کی یہ ردیف خسرو سے منسوب
اس بیت سے ماخوذ ہے۔

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ پڑی چو دیس

اس سلسلے میں معنی خیز بات یہ ہے کہ غلام حسین نے بھی یہ غزل
اپنے مرشد کی وفات پر لکھی ہے چند اشعار سنیے۔

سو وقت سہت نہیں مرے گھر آ صدقے جا جائے
چاند نہ دکھا چھپا اندھیرا سانجھ پڑی چو دیس
ہوا اندھیری رات کٹھن ہے پنتھ بکٹ سب گھات
کیوں کر پہنچوں دور ہے دریا سانجھ پڑی چو دیس
اکیلی کیسے چلنا پھر اک بھرن کو آسے
پیا گھر کا پھیرا پھیرا سانجھ پڑی چو دیس
جیسے بادل چاند کو گھیرے ہوئے گئے اندھکار
جیسے آکر میرے کو گھیرا سانجھ پڑی چو دیس
چل گھر اپنے سنگ گرو کے چھوڑا ہے حسین
پنچھی نے کیا بسیرا سانجھ پڑی چو دیس

عروض کے لحاظ سے اس کی تقطیع کی جائے تو متقارب کا سالم
رکن فعولن بھی آیا ہے اور اس کے مختلف زحافات بھی جگہ جگہ
بے ترتیب آئے ہیں۔ ہر مصرعہ سات رکن کا ہے یہ اردو
شعرا کے معمولات کے خلاف ہے اور اردو غزلوں میں عموماً
پورا شعر آٹھ رکن کا ہوتا ہے یا مضاعف ہو تو بارہ یا سولہ
رکن کا ہوتا ہے۔ اس غزل کی ہر بیت چودہ رکن کی رکھی
ہوئی ہے۔ ماہرین عروض کا اس پر اتفاق ہے کہ متقارب
ومتدارک کے یہ اوزان چھندس سے ماخوذ ہیں۔ عرب و
فارسی شعرا نے ان اوزان میں بہت کم کہا ہے، نظم طباطبائی
اپنی تصنیف "تلخیص عروض و قافیہ" میں لکھتے ہیں۔ عرب کے
اصول سے یہ بحر نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر نے خصوصاً
ہندی کے دیوان میں غزلیں کہی ہیں"۔ ان اوزان کی شیرینی کی
داد دیتے ہوئے نظم طباطبائی نے مزید لکھا ہے کہ "عروض
کے جو اوزان چھندس سے مطابقت رکھتے ہیں اردو میں زیادہ
مستحسن ہیں۔ اور ہونا ہی چاہیئے" (ص ۲۰) بہرحال یہ
ظاہر ہے کہ غلام حسین کی اس غزل میں ایک مخصوص اداسی سی
بسی ہوئی ہے جو کسی محبوب شخص کی موت پر فطری طور پر دل
میں پیدا ہوتی ہے۔ سانجھ پڑی چو دیس کی تکرار سے پیدا
ہونے والے اندھیرے کی شدت کا احساس ہوتا ہے۔ زبان
کی سادگی خلوص پر دلالت کرتی ہے اور بیان کا علامتی انداز

دل کو اپیل کرتا ہے۔ پگھٹ سے پنہا بھر بھر کر جانا، بادلوں کا چاند کو گھیر لینا، دیکھی کا اپنے آشنا کی طرف آنا، شام کے اندھیرے کا چھا جانا، یہ سب دیہاتی زندگی کی بڑی سادہ اور موثر علامتیں ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دلی اور دوسری ریاستیں فارسی غزل کے سانچے میں ڈھال چکے تھے، اور شمالی ہند میں میر، درد وغیرہ فارسی رنگ میں رنگی ہوئی غزلیں پیش کر رہے تھے۔ اس زمانے میں طریقۂ اظہار کی آئینہ داری غزل ایک نئی آواز معلوم ہوتی ہے کہ دیوان غلام حسین کی دیگر غزلوں میں ایرانی اسلوب جاری ہے۔ کہیں کہیں سعدی، رومی اور حافظ کے اثرات جھلک اٹھے ہیں۔

غلام حسین نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں لکھی نامہ ایک زمانے میں ایلچپور کی میلاد خوانوں کی مجلسوں میں پڑھی جاتی تھیں، یہ نہایت دلکش تمثیلی نظم ہے جس میں روح کو دلہن قرار دے کر اس کے اصل مقام یعنی عالم آخرت سے لو لگانے کی بات کی گئی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

تنا کو اے سہیلیاں بیٹھے بھی سناؤں
تک کان دھر سنو تو پیو سو لہا سناؤں

غلام حسین کی دوسری نادر نظم "یک جنگ نامہ" کا موضوع ہندو مسلم اتحاد ہے، یہ اس موضوع پر اردو کی سب سے قدیم نظم ہے۔ اس میں وہ کبیر کے انداز میں ظاہر پرست ہندو اور مسلمان دونوں کی خبر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

مسلمان تسبیح لبی پھرا دیں
و ہندو بھی مالا بغل کے دکھائیں
دکھاتے ہیں لوگوں کو ملنے پھرا کر
آپس من کا من کا نہ پھیریں ہرا کر
بغل میں پھیریں کر کا لیکے دفتر
نہ بھیں بہت جنتر کا ایک انچہر

اسی طرح کرشن کے دوست اودھو پر لکھی ہوئی ان کی نظم اودھو نامہ، اودھو پر مستقل حیثیت سے تصنیف سلسلہ پہلی اردو نظم ہے۔ غلام حسین نے ہندی کی مشہور صنف سخن "جھولنے" کو بھی اپنایا ہے۔ شاقی اس کے اظہار کے لئے دوہے، چوپائی اور سورٹھے کے ساتھ ساتھ جھولن بھی کار آمد مانا جاتا ہے۔ چھاؤنی شنکا کے نزدیک اس کی ۹۹ اور سفید گمراں کے خیال میں اس کی ۲۰ نزلیں ہوتی ہیں۔ اردو میں یہ صنف سخن بہت کم استعمال ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے غلام حسین کا جھولنا نامہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ غلام حسین کی موضوع بحث غزل اور ان نظموں کا تذکرہ میں ۱۹۵۷ اور اس کے بعد کے "نوائے ادب" اور "اردو ادب" کے شماروں میں منظر عام پر لا چکا ہوں۔ اس وقت مولوی مہدی کی روضۃ الواصلین کا مختصراً تعارف کرا دوں۔ اس میں دوہرے اور اور دوہے جیسی ہندی کی اصناف سخن تو ملتی ہی ہیں۔ ان کے علاوہ مولوی نے ایک نظم "فی لسان الہند" لکھی ہے اور دوسری "بزبان گوالیاری"۔ علاوہ ازیں انھوں نے ہندوستانی موسیقی کی طرز میں بھی کچھ نظمیں تخلیق کی ہیں۔ غرض روضۃ الواصلین کی بڑی لسانی اہمیت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایلچپور اور دیگر مقامات کے برادی حضرات نے قدیم اردو میں بڑی وقیع منظومات پیش کی ہیں۔ برادی فرقے ہی سے منسوب انیسویں صدی ایلچپور کے نواب خاندان کے ایک فرد نواب حامد اللہ خاں نے جرنیل کے تخلص کے ساتھ بڑی سادہ اور دلکش زبان میں شاعری کی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں انگریز کے قدم جم چکے تھے۔ چنانچہ نواب اسی احساس کے تحت کہتے ہیں۔

اپنے تئیں متابعت دل منظور ہے
تم بھی چلے چلو جہاں انگریز نے چلے

جرنیل کا دیوان ۱۲۳۱ھ میں مکمل ہوا۔ منشی حشمت رائے تخلص جانباز نے اس کی تاریخ تکمیل لکھی ہے (ورق ۱۴۳ب) دیگر علاقوں کی طرح اس وقت برار کی بھی حالت اچھی نہیں تھی

چنانچہ جرأت کا آشوب نامہ ان کی بصیرت کا آئینہ دار ہے،
بہر حال انھوں نے ان حالات میں بھی اپنی رنگین مزاجی برقرار رکھی جسے ان کی ہر طرف پر لکھی ہوئی غزلوں کا ہر نکتہ ثابت کرتا ہے۔ ان کے بعد الحاج حسین خطیب (المتوفی ۱۹۰۵) کا دور آتا ہے جنھوں نے نعت گوئی میں منفرد حیثیت حاصل کی۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ابا پرشاد طرفت ایلچپوری کے علاوہ داغ کے شاگرد منشی محمد حیات خاں منظر متخلص بہ بدرعلی (المتوفی ۱۹۲۰) نے کلاسیکی انداز کی بڑی استادانہ، ملاحت ریز غزلیں لکھیں، کچھ شعر سنیئے۔

ہنستے ہیں اگر وہ تو رُلاتا ہے مرا دل
کچھ ان کی ادا ہی میں ہے انداز جفا اور
دل میں ہے کبھی درد کبھی سوزش فرقت
اقلیم محبت کی ہے کچھ آب و ہوا اور
اضطراب دل کی صورت میں دکھاؤں کیا تمہیں
برق کے شعلے کو کھینچو تو کوئی تصویر کیا

اسی سلسلے میں مرحوم کی جلسیوں کے سرائجی کے پالوے کی طرز میں شاق کلام کو رزمی محمود، ارمان بالاپوری، افضل آکولوی وغیرہ نے گیت نما نظمیں لکھیں منظر کے شاگردوں میں آکولہ کے بشیر احمد شہید اور امراوتی کے پروفیسر منظور حسین شور نے شہرت حاصل کی۔ برار میں اردو شاعری کو عصری حقائق سے نزدیک لانے میں قیصر جعفری، مرحوم امراوتی (المتوفی) کے ساتھ پروفیسر شور کا بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے رومانی سے انقلاب تک جدید زندگی کی تقریباً ہر منزل کی بات اپنے منفرد انداز میں کی ہے۔ انہیں کسی منظر کو بصری متحرک پیکر کے ذریعے پیش کرنے میں کمال حاصل ہے۔

وہ طوفان کے بل چلنے لگے سیال کھیتی میں
وہ کشتی آکے ڈوبی گوہر قطروں کی بستی میں
وہ ابھرے موج کے سینے پہ گرداب کے پیکر
وہ رقصاں ساز طوفان پر ہوئے شاداب آنکھیں

(ملاح امراوتی ۱۹۴۶، جشن دوراں کراچی ۱۹۵۹ ص ۱۹۲)

انہیں سماعی تقریبات میں کہیں تو بجا ہوا اس لحاظ سے کہ وہ بعض ایسی نشانیوں کی آیات کو نظم کرتے واقف کار انداز میں ادا کرتے ہیں۔ نشاط وسرت کے سلسلے میں یہ ذہنی تصویر ملاحظہ کیجیے۔

کچھ لیسے زخم بھی ہوتے ہیں جن کے ایسے
جنھیں شاعرے گنگناتے جاتے ہیں چہرے
مسرتوں کے بھی جھونکوں سے کانپ جاتے ہیں
شہر طرب وقت کے ایسے کھلتے ہیں چہرے

(چہرے)

وہ غم میں بھی سرور کا پہلو دیکھ لیتے ہیں اور طوفان سے ٹکرانے کی ہمت رکھتے ہیں۔

ہیں کتنے زخم جن کو ہے سرود انگیز ہر لَے
ہیں کتنے گیت جن کی لو ہوا سے تیز جلتی ہے
کہاں ہے جن کا خدا وہ گند طوفان کے دھاروں پر
بڑی مشکل سے ان کو نیند آتی ہے کناروں پر

وہ ہندستان سے ہجرت کرنے والے تنہا پاکستانی شاعر ہیں جو وہاں رہ کر

اے ہمارے جھومتے بادل
جاکر ہندستان لیتا چل

کہنے کی جرأت رکھتے ہیں۔
شور کی طرح قیصر کی شہرت برار کی سرحد تو پار نہ کر سکی مگر ان کا پڑھنے والا ان کی اعلیٰ فنکاری پر ایمان لائے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے اکثر اشعار موسیقیت میں سرشار ہیں ذرا یہ اشعار سنیے اور ان میں لفظ اعلان اور لفظ عزم کی تکرار سے جو موسیقیت پیدا ہوگئی ہے اس کی داد دیجیے:

پھولوں کے چاک داماں غنچوں میں سوز پنہاں
گلشن بہار میں بھی ہے کیف درد ساماں
سوز دروں نہیں ہے جوشش جنوں نہیں ہے
دل ہی سے عاشقی تھی دل ہی میں خوں نہیں ہے

(طوفان و ساحل دہلی ۱۹۵۰ ص ۳۷)

وہ ایسے شاعر ہیں یعنی انہیں پڑھتے ہوئے بہت کچھ ذہن میں خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

پھر کو کبھی خدا نہ دکھائے وہ ساعتیں
دور روزہ زندگی کیلئے اشکبار ہوں
چمکتی ہے اگر اے باغباں تقدیر گلشن کی
جلائے بجلیاں برباد میرا آشیاں کردیں

قیصر تمام عمر مصائب میں مبتلا رہے لیکن ان میں بڑی ہمت و جسارت تھی چنانچہ انھوں نے ستمگار پر غم ہونے کے باوجود غم خوار بننے کی بات کی:

ہم رنج میں بھی غم خوار ہو کے چلو
جدھر جدھر کو نسیم بہار ہو کے چلو

قیصر کے مجموعہ کلام طوفان و ساحل (مطبوعہ دہلی ۱۹۰۸ء) کی تقریباً ہر نظم و غزل میں ان کی فنی دسترس کی شہادت ملتی ہے تیاس کہتا ہے کہ زبان و فن پر یہ قدرت قیصر کو اس زمانے کے مشہور شاعر و شاعر گر حضرت حبیب الرحمٰن صدیقی کی صحبت میں حاصل ہوئی۔ موصوف نے مرہٹی زبان کے مشہور شاعر مرہٹی بھٹ کو اپنا دیوان میں غزل لکھنے کا شوق بھی آپ ہی کی صحبتوں میں ہوا گورنمنٹ اُردو ہائی اسکول امراوتی کی ملازمت کے زمانے میں ایک پوری نسل کی ابتدائی تربیت کی آپ کے تربیت یافتہ اردو سخنوروں میں قیصر کے علاوہ رشید کیفی اور شارق نیازی کے اکثر اشعار ان کے لطافتِ احساس کا شاہکار ہیں بالخصوص موسیقیت کلام شارق کی بھی امتیازی خصوصیت ہے اس خوش لفظی نے ان کے یہاں خاص کر غم و اندوہ کی ترجمانی میں بڑا پر تاثیر حسن پیدا کر دیا ہے شارق کا یہ شعر ان کے احساس کی نزاکت کے ساتھ ساتھ ان کی قدرت تخیل پر دلالت کرتا ہے:

ہوا میں اڑ گئی شارق پیام شوق کی بات
ہمارے کام نہ آئی صبا کی نامہ بری
(ص ۲۲، صبح کا ساقی، آکولہ ۱۹۶۹ء)

غرض کلام شارق میں جو کلاسیکی رچاؤ اور سوز ہے وہ انہیں کا حصہ ہے

ڈاکٹر منشا کا کلام بھی اعلیٰ فنکاری کا نمونہ ہے جب وہ "راہ سے گزرتی ہستیاں" یا "ذکر خوباں" کرتے ہیں تو شاعر لا بیں چھا جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب "ذکر خوباں" کے ہی نہیں "گلشن ویران" کے بھی قائل ہیں اور یہ کام بھی انھوں نے نہایت مشاقانہ انداز میں انجام دیا ہے ان کی "تفہیمات اقبال" بھی طلب ہیں۔

دیگر شعرائے جدید جو جانے پہچانے نام ہیں، ہیں۔ خورشید آرا بیگم، بلند اوری بیگم، گل فیروان ہیر، افسر مہیزدی، شفیع اللہ خاں جوہر، منظر امراوتی، سورج خان، اثر بالاپوری، صمد خاں ہمدم، ساغر بالاپوری، مشکل انکاری، افسر آفاقی، میر عنایت علی، محمد کار نجمی، اللہ خاں فرودی، سوز شورکی، اسیر، ظریف ایلچپوری، عبد الصمد جاوید، جوش ایلچپوری، بسمل آکولوی، طالب کلوا، شاہ لقمانی، غزل ایلچپوری، منظر محمد سیابانی، متین ایلچپوری، مشتیق نوری، افسر، ثاقب شادانی، نعیم تابی، پیارے لعل، آلکین ویدی، منیر ختی، صاحب رائی، مردان علی خاں نشاط، ذاکر صدیقی، ضیا صدیقی۔

ادب کی طاقت پسندی کی تحریک کے زیر اثر دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی تقریباً ۱۹۵۰ء سے شاعری نے نئی کروٹ لی اس رجحان کے مبلغین نے شاعری کو ایک مستقل مختار فن کی حیثیت سے دیکھا اور برتا اور اپنے اشعار میں الفاظ کے تخلیقی استعمال اور محسوس پیکروں پر زور دیا اس قبیل کی نئی شاعری کے ممتاز نمائندے مرتضیٰ وارث قاضی سلیم ناگپوری مدحت الاختر اور ہمارے علاقہ برار میں سید صفدر ہیں۔ نئے قسم کے گیت لکھنے والوں میں متین ایلچپوری اور نئی طرز کو غزل لکھنے میں ضیا صدیقی نے امتیاز پیدا کیا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ برار میں شروع سے آج تک گیسوئے شعر اُردو کو سنوارنے والے موجود رہے ہیں۔ انھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں بمطابقت زمانہ قدیم و جدید صوفی و وطنی، ترقی پسند اور نئی ہر قسم کی شاعری کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ آج بھی یہ کارواں خدمت زبان و ادب کی غزل کو طرف رواں دواں ہے

ڈاکٹر سید نعیم الدین

قدیم اردو اور تہذیبی ہم آہنگی

برعظیم ہندوستان میں قدیم سے ہند مسلم ثقافت کے اختلاط کی مثالیں فن تعمیر، فن موسیقی اور ادب۔ غرض ہر شعبۂ حیات میں نظر آتی
ہیں۔ قدیم کی تعمیر میں مقبرۂ سلاطین پر شاہ ... اس کے گنبد ایرانی طرز کے اور چھت طرز کار ... مقامی اسلوب میں ... ملتی
جھلک کی کیفیت امیر خسرو (م ۱۳۲۵) اور سلطان حسین شرقی کے کارناموں کے نتیجے میں موسیقی میں پیدا ہوئی۔ باہمی ربط و ضبط کا سب سے بڑا
اور نمایاں مظہر اردو زبان کی شکل میں نظر آتا ہے۔

اردو کا مولد بھارت ہے اس کا قدیم نام ہندی ہے۔ اس میں مسلم فاتحین کی آمد کے بعد عربی، فارسی اور ترکی الفاظ داخل ہوئے اور یہ
زبان مقامی لوگوں کے ساتھ ارتباط و استحکام کا ایک اہم واسطہ بن گئی اور تیرھویں/چودھویں صدی عیسوی ہی سے شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر
(م ۱۲۶۵) اور امیر خسرو (م ۱۳۲۵) جیسے صوفیائے کرام نے اسے اظہار ذات کا وسیلہ بنانا شروع کیا۔ اس میں دوہے لکھے گئے ... بھگتی کی
... نے قلم اٹھایا۔

سائیں سیوت گل گئی ماس نہ رہیا دیہہ
تب لگ سائیں سیوسان جب لگ ہوسوں کیہہ

(گنج شکر)

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ
منجھ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

(خسرو)

چودھویں صدی کے مہاراشٹر کے ایک سنت کوی نامدیو (م ۱۳۵۰) کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کا ہندی کلام سکھوں کی مذہبی
کتاب "گرو گرنتھ صاحب" میں محفوظ ہو گیا ہے۔

اردو کی قدیم ترین مستقل تصنیف کدم راؤ پدم راؤ پندرھویں صدی میں لکھی گئی (سولھویں صدی کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ
اس صدی کے مشہور شہنشاہ بابر کی زبان پر دہلی اور یہاں کے الفاظ آئے اس نے ایک فارسی شعر میں بھی دو اردو الفاظ استعمال
کیے جن کی پہلی بار ... نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ ... میں نشاندہی کی ہے) کدم راؤ پدم راؤ نظامی بیدری نے ۱۴۳۰ اور ۱۴۳۵

درمیان لکھی۔ اس میں نفی کے اظہار کے لئے مراٹھی کا "نکو" استعمال کیا گیا ہے (ص ۹)۔ نظر آتا ہے۔ بٹ ہونے مراٹھی افعال استعمال
بھی بلاتکلف استعمال کیے ہیں۔ اس میں سنسکرت کے ساتھ فارسی الفاظ اسلام و ایمان کے ساتھ فرح و طرب کی تلمیحات بھی ملتی ہیں۔ ایک
کا موسوم بہ "نعم البدل" اور اس کے اگلے صفحات کے ایک مثنوی پیم بالا اور ایک جوگی رگھونت کی خالص ہندستانی الاصل داستان ہے۔ نظام بیدری
کے علاوہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں شمس العشاق میرانجی (م ۱۴۹۶) باجن (۱۵۰۶) محمود دریائی (م ۱۵۳۴) قاضی محمود کا کلام وصفی
(م ۱۵۰۵) اور برہان الدین جانم (م ۱۵۸۲) کے کلام میں اسلامی اور ہندی اثرات کی آمیزش ثقافتی ہم آہنگی کا بڑا واضح پس منظر
پیش کرتی ہے۔ ان اہل دل حضرات کا مشرب وسیع تھا چنانچہ انھوں نے جنتا کے دلوں کو موہ لینے کے لئے بول چال کی عام زبان میں ہندی
اور ہندو مت کے مخصوص تصورات و تلمیحات سے کام لیتے ہوئے شعر کہے مثلاً میرانجی: پنچ بھوت اور ان کے رشتے سے واقف تھے جیسا
کہ ان کے رسالہ چہار شہادت کے اس شعر سے ظاہر ہے:

پنچ بھوت دس اندریاں بھوگ
چندر سورج پاک سنجوگ

(ص ۹۹، رسالہ مغز مرغوب و چہار شہادات
مرتبہ محمد ہاشم علی، حیدرآباد ۱۹۶۶ء)

باجن، دریائی اور علی جیو گام دھنی موسیقی سے شغف رکھتے تھے انھوں نے ہندی راگنیوں کے مطابق شعر کہے اس سلسلے میں کلام باجن کی کیا جمالیاتی
قدر و قیمت کیا ہی خوب معنویت بڑی اہمیت ہے باجن درویش اور ابدال کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت، جوگی، جٹا دھاری اور اپاسی کو نہیں بھولتے:

پڑھ پنڈت پوتھیں دھریاں
سب جانے سدھ بدھ کھویاں
سب جوگیاں جوگ بسارے
یہ جیتی تپ بکارے
ایک درویش ہوئے کر آئے
ہوئے قلندر روپ پھرائے
ایک ابدال ہوئے ابد ہوتے
ایک باندھیں بابا ہوتے
ایک جنگم جٹا دھاری
ہور ہندو دس اندھیاری
ایک رہیں اپاسی راشٹ ہاگیں
ایک ہوئے بھیکاری تجی انگیں

(ص ۳۳، اول باب، فوائد رحمت
از ڈاکٹر شیخ فرید اکتوبر ۱۹۷۰ء)

یہ بات بھی حاتم کی کتاب میں نظر آتی ہے کہ ان کے نزدیک کفر اور ایمان ایک ہی حقیقت ہے وہ اپنی نظم وحدت میں کہتے ہیں ۔

کفر کے پردے میں دیکھ نور
نور کے پردے میں دیکھ کفر

تصوف اور مسائل تصوف ذکر و فکر، مشاہدہ و مراقبہ کی تشریح کرتے ہوئے بھی وہ نرگن، سرگن، نرنکار، انرودھ، اندری اور منتر جیسی ہندی اصطلاحات کا کہیں کہیں استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے شری کرشن کی سولہ ہزار گوپیوں اور ہندوستانی تیرتھوں سے راہوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ حاتم نے دعویٰ کیا ہے کہ ہر جگہ ... نظم کو سپاہی معنوی لفظوں اور ترکیبوں سے مختلف کر دیا ہے ان کے نزدیک اصحاب طریقت کی بات ہی الگ ہے :

اگلی بات ہے الادی
جگ کی پنتھوں الادی

علاوہ ازیں یہ کہنا کہ آتما شری میں اپنا پتہ بکھیڑ جو پہچان سکتا ہے اور سندر جیون رنگ کا پتہ مجھی ہی کو ہو سکتا ہے خالص ہندی تخیل ہے۔
سولہویں صدی میں بیجاپور اور گولکنڈہ اردو کے اہم ادبی مرکز تھے۔ گولکنڈہ کے سلاطین قطب شاہی میں سے ابراہیم قلی نے تلنگی شعرا کی سرپرستی کی۔
اس کے فرزند قلی قطب شاہ (م ۱۶۱۱) کو اپنے دیس کے سارے رسم و رواج اور تہوار پسند تھے اس نے بسنت اور آغاز برشگال پر مہرگ پر بڑی پر لطف نظم شاعری لکھی ہیں بسنت پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا
تمہیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
پیا نگ پر کا کر لیا لی پیاری
بسنت کھیل ہوا اگ مگ سنگارا

اسی عہد کے ایک شاعر حسن شوقی (م ۱۶۳۳) کو مکالماتی اور انسانیت کا لگاؤ ہے چنانچہ اس نے اپنی مثنوی فتح نامے میں سعدی کے ایک مصرع بنی آدم اعضائے یک دیگر اند کو اس طرح تضمین کی ہے

کہے شیخ سعدی نے عالم کو پند
بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

(ص ۸۳، دیوان حسن شوقی
مرتبہ جمیل جالبی کراچی ۱۹۷۱)

نیک رفتاری اور نیک کرداری کسی ایک قوم کی اجارہ داری نہیں

ہر ایک ملک میں نیک رفتار ہے
ہر ایک قوم میں نیک گفتار ہے

شاعر کے نزدیک مکہ اور دوارکا ، قابل احترام ہیں : (ص ۸۲)

جس شہر میں بستا ہے تو سب جگ ہے تیرا معتقد
مومن کہیں مکہ ہی کافر کہتے ہیں دوارکا

اے اپنے ملک ہند کو وطن کہنے پر ناز ہے اور وہ بنگال کی شیرینی کا معترف ہے

چمن میں گیت بار سے مدح بوستاں
کہیں جس کو وطن وہ ہندوستاں

(مہر نامہ)

تم در بستہ کے قول تھے
عمدہ بنگالہ ہوا

(دیوان ص ۱۴۱)

دولت نامہ نظام شاہ میں اپنے ممدوح کو کبھی دارا و بہرام سے تو کبھی ارجن و بھیم سے مشابہ قرار دیتا ہے اس کے سینا پتی، دید مالا، دھنور بید، اور بھیم کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں وہ دیگر شعرائے دکن کی طرح ہندی الفاظ شلوک ساریکا، گگن، آنے، [illegible] کو بلا تکلف استعمال کرتا ہے ایک غزل میں "نکو کرو" ردیف استعمال کی ہے جس سے ہندی غزل میں ہر مصرعہ ادا ہو گیا ہے۔ [illegible]
تو دھن سکی دند نکو کرو (غزل نمبر ۲۲)

شوقی کا خلاقی ذہن ایرانی طرز میں زلف کو مار قرار دینے پر اکتفا نہیں کرتا وہ صندل کا ذکر کر کے اسے ہندوستانی رنگ دے دیتا ہے اور یہی رنگ ایک شعر میں صوفیوں کے ساتھ جوگیوں کا ذکر کر کے ہندوستانی بنا دیا ہے (غزل نمبر ۸)

سترہویں صدی ہی کے اوائل میں شمالی ہند میں افضل (م [illegible] ۱۶۲۶ سے قبل) نے ہندی صنف سخن بارہ ماسا کو اپنا کر ایک بکٹ کہانی لکھی جس میں ایک بد نصیب عورت کے دلی جذبات کی ترجمانی بڑے اثر آفریں انداز میں کی گئی ہے یہ ہندی روایات میں ڈوبی ہوئی ہے اس میں پپیہا کی پی پی اور کوئل کی کو کو نے خالص بھارتی فضا پیدا کر دی ہے ساتھ ہی اس میں فارسی کے الفاظ و اشعار بھی ہیں اس طرح یہ دو تہذیبوں کی ہم آہنگی کا دلآویز نمونہ ہے۔

پپیہا پیو پیو ان پکارے
پکارے دل درد جینگر جگاوے

اسے جب کوک کوئل نے سنائی
تمامی تن بدن میں آگ لائی

سنی جب درد کی آواز بن سوں
شکیب لو دل گیا آرام تن سوں

(ص ۱۷، ۴۱ ، بکٹ کہانی مرتبہ مسعود حسین ہاشمی)
(مشمولہ قدیم اردو ، جلد اول ۱۹۶۵ء حیدرآباد)

اس عصر میں محمد بیجا پنے پر فکر و نظر کے لحاظ سے باجی کا گٹ کی ایک جھلک جیون امین الدین علی (م ۱۰۸۶ھ) کے کلام میں ملتی ہے انھوں نے عناصر اربعہ کے ساتھ ہندو فلسفے کے زیر اثر خلا کو بھی ایک عنصر مانا ہے اور ہر عنصر کے پانچ گن بتائے ہیں۔ [illegible] نصرالدین ہاشمی

غواصی، ابن نشاطی، شاہی اور ہاشمی جیسے قدیم شعرا بھی بھارتی تہذیب کے دلدادہ تھے انھوں نے جمنا کی بھاشا استعمال کی اور ہندی تلمیحات و استعارات کو اپنے کلام میں جگہ دی۔ چنانچہ ۱۶۰۳ء میں ابراہیم عادل شاہ ثانی (م ۱۶۲۷) کی مدح میں ابراہیم نامہ لکھا (۱۶۰۳) اور اپنے ممدوح کو اندر سے بھی بڑھا دیا اس نے رقص و موسیقی کی اصطلاحات بھی ماہرانہ انداز میں استعمال کی ہیں ایک مثال تصویر ملاحظہ ہو جس میں رقاصہ بھوروں میں ملبوس رنگ بھوری پر آتی ہے:

کوئی پھول ابھرن کیا سب سنگار
دیا باس بھر کر سو رنگ بجوم شمار

(بیت نمبر ۱۰۴۴، ابراہیم نامہ
مرتبہ مسعود حسین علی گڑھ ۱۹۶۹)

لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ جو مدد سفا میں اپنے ممدوح کو روایتی انداز میں حاتم سے مشابہ قرار دینے کے بجائے وہ ہندو راجا بلی اور راجا کرن سے مشابہ قرار دیتا ہے (بیت نمبر ۲۰۰)۔ دکنی کی بہترین نثر تصنیف سب رس مصنفہ وجہی میں بھی بھارتی معاشرت کی جھلکیاں مل جاتی ہیں وہ ابتدا ہی میں ممدوح کے پان دے کر مان دینے کی بات کرتا ہے جو خالص ہندوستانی تصور ہے وہ جس علاقے میں رہتا ہے اس پر اسے ناز ہے:

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں
پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

دکھن ملک بہوت خاصہ رہے
تلنگانہ اس کا خلاصہ رہے

وجہی کی طرح ہاشمی دکن کی صندلانی تہذیب کا ترجمان ہے اور اسے اس پر فخر ہے: ترا شہر دکھنی ہے دکھنی بول
ہاشمی نے ہندی شاعری کے تتبع میں عورت کی طرف سے اظہارِ عشق کیا

سترہویں صدی کے اواخر میں ولی (م ۱۷۲۰ - ۱۷۲۵ کے درمیان) نے اردو شاعری کو نکھار کر ایسا رنگ و آہنگ عطا کیا کہ شمالی ہند کے اہل سخن بھی اس کی اس کرامت کے قائل ہو گئے اس کا کلام شاہد ہے کہ اس نے ایرانی الفاظ و علامات کے ساتھ ہندی الفاظ و تلمیحات کا بھی سہارا لیا ہے بعض غزلوں کی پوری فضا ہندوستانیت سے معمور ہے مثلاً وہ غزلیں جن کے مطلعے یہ ہیں:

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں تو آگ بجھاتی جا

کوچۂ یار عین کاسی ہے
جوگی دل وہاں کا باسی ہے

ولی کو اپنے وطن سے رام اور لچھمن بھی عزیز ہیں اور کنول اور بھونرا بھی۔ ولی کے شمالی ہند کے متبعین میں آبرو (م ۱۷۳۳) اور شاہ حاتم (۱۷۸۱) کے ہاں بھی ہندیت نمایاں ہے آبرو نے بسنت کو ردیف بنا کر ایک غزل لکھی اس کا ایک شعر سنیئے:

ٹیسوے پھول بسنتی ہے دیکھتے ہیں کوئے
آئی جنوں میں آگ برہ کو لگا بسنت

ہولی میں عوام کے ساتھ ساتھ ہمارے شعرا نے بھی رنگ سے جھولی بھرلی ہے ۔ حاتم کہتے ہیں ۔

مہتاب میں جب اسباب ہولی
اٹھو یارو بھرو رنگوں سے جھولی

گلی بیچ کاریوں کی مار ہونے
ہر اک سو رنگ کی بوچھار ہونے

کوئی ہے سانوری کوئی ہے گوری
کوئی چمپا برن عمروں میں تھوری

آبرو کے معاصر فائز (م ۱۷۳۸) نے یہاں کی جوگی اور تنبولن پر نظمیں کہیں اور پنگھٹ کی تصویر بڑے دلربایانہ انداز میں کھینچی ۔ بین پنگھٹ پر کھڑا ان کو دیکھ کر ارسی ، رمبھا اور رادھکا یاد آجاتی ہیں ۔

اسی زمانے میں دکن میں شاہ تراب چشتی ، مولوی مہدی ابجوری اور غلام حسین (م ۱۸۱۷) اردان وطن کے بعض تصورات اپنے کلام میں جگہ دے کر ان سے ذہنی قربت کا احساس دلایا ۔ شاہ تراب نے اردو شعرا میں سب سے زیادہ ہندوی کو مذہبی اور فلسفیانہ اصطلاحات استعمال کی ہیں ۔ انھوں نے اپنی نظم گیان سروپ میں اپنے وطن تر کال اماس کے منڈ کا ذکر کیا ہے اور من سمجھاون میں پانچ بان اور مولانا عارف کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ ان کی تخلیقات میں من سمجھاون سب سے مشہور ہے جسے ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر سیدہ جعفر خاک الگ بڑے سلیقے سے ترتیب دیا ہے من سمجھاون دراصل مراٹھی کے سنت کی رامداس کے منا چے شلوک کا آزاد ترجمہ ہے ۔ باہمی قربت کے لیے محض ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت کافی نہیں بلکہ دوسرے کے مذہب و ثقافت کے کچھ الفاظ و اصطلاحات سے واقفیت بھی مطلوب ہے ۔ اسی طرح صحیح معنوں میں رواداری کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں اور ہم میں احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہم اصلی عام رواج سے تعلق رکھتے ہیں جہاں سعدی کا نام و نشان نہیں چنانچہ غلام حسین اپنی نظم یک رنگ نامہ میں جسے میں ہندو مسلم وحدت پر اردو کی قدیم ترین نظم سمجھتا ہوں کہتے ہیں :

دوئی سوں اس جہانت کیوں ہو سنہ آئے
یہیں آکے جھگڑا دوئی کا مٹا سے

غلام حسین نے کبیر کے انداز میں ہندو مسلم دونوں کو ان کی ظاہرداری پر لعن طعن کیا ہے :

مسلمان اللہ کا نام بولیں
وہ ہندو بھی ہر ہر کہیں رام بولیں
زبان سوں کہیں دل سوں نہ بسا ریں
وہ حاضر کو غائب سمجھ کر پکاریں

اصل تہذیب تہذیب نفس اور تزکیہ باطن سے عبارت ہے :

مسلمان سب غسل کر پاک شد ہو ویں
وہ ہندو بھی اشنان کر تن کو دھو ویں
اسی کو ہٹا کر پھریں ہو کے چھیلا
کریں تن کو اُجلا رکھیں دل کو میلا

وہ بہت کی بہت سے مثال ہیں وہ علم کرتا وہ اہمیت نہیں دیتے

مسلماں پڑھے ہیں مسلماں کتاباں
وہ ہندو کریں بید پوتھی کی باتاں
بغل میں پھریں سر کا لیکے مغز
نہ سمجھیں پرت جنتر کا ایک بچھر

بہت جنتر پڑھنے والا ہی صحیح معنوں میں برہمن ہے وہ مذہب کے نقطۂ نظر کر کے کے لیے ہر وقت تیار ہے وہ کسی کو دل آزاری کا روادار نہیں۔ حافظ نے کہا ہے

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

اور ہمارا شاعر بھی یہی کہتا ہے:

مت کسے آزار دے اور جو دل چاہے سو کر
کوئی گنہ دو جا برا اس جیسا مردم آزاری نہیں

انیسویں صدی میں ایسے ہی صلح کل مذہب کا شاعر نظیر اکبر آبادی ہے جو ہندوستانی وطن کے تہذیبی جلوؤں کا ذکر نہایت ذوق و شوق سے کرتا ہے۔ اور یہ سلسلہ آج تک قائم ہے

••

ڈاکٹر شیخ فرید

اُردو صحافت اور تحریکِ آزادی

دنیا کی صبح، محبت کی شام ہے اُردو
کہ اتحاد و وطن کا پیام ہے اُردو

اُردو زبان وادب اور صحافت نے آزادی کی جنگ میں شروع سے حصہ لیا۔ تحریک آزادی کے فروغ، اشاعت اور کامیابی میں اِس زبان اور اس کے بولنے والوں کا زبردست ہاتھ ہے۔ اِسی زبان نے
"انقلاب زندہ باد"
کا دل ریز نعرہ دیا۔ ہماری زبان کے ادیبوں، شعراء نے ۱۸۵۷ء کے پہلے، ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۴۷ء تک اور اس کے بعد بھی آج تک رائے عامہ کی تربیت اور ہمدردی میں قومی اور ملی جذبات کو ابھارنے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہے۔ ہمارے صحافیوں نے برطانوی سامراج کے خلاف اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ احتجاج کیا۔ ان کے غائر مطالعے سے آزادی کی کہانی اردو کی زبانی آسانی سے مرتب کی جا سکتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں اِس موضوع پر جو کام ہوا ہے وہ دستاویزی اہمیت رکھتا ہے۔
عبدالرزاق قریشی کی "نوائے آزادی"
خلیق انجم کی مرتبہ ـــ "ضبط شدہ نظمیں"
وغیرہ قابلِ ذکر، اہم تصانیف ہیں۔ رسائل اور جرائد کے "جنگ آزادی نمبر" بھی شائع ہوئے ہیں۔ "صحافت" پر کام کم ہوا ہے اور جو ہوا ہے وہ رسائل میں بکھرا پڑا ہے۔ مسودات کی شکل میں ہے۔
"جنگ آزادی میں اُردو صحافت کا حصہ" میرا دل اور دقت طلب موضوع ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے تمام جرائد اخبارات کا مطالعہ فرصت اور عمر کا تقاضا کرتا ہے۔ اِس راہ میں جو "ہمت شکن" مشکلات پیش آتی ہیں۔ ان سے اہلِ نظر واقف ہیں۔ جہاں اور جن کے قبضہ میں یہ متاع گراں مایہ ہے۔ وہ اُسے ہر نظر سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اداروں میں یہ سرمایہ اس طرح محفوظ ہے کہ اُسے سورج کی دھوپ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ ان سے کون کہے کہ "اس کو بچا بچا کے نہ رکھیں"۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ تمام سرمایہ یا سرمایہ کا بڑا حصہ کسی ایک جگہ دستیاب نہیں ہوتا۔
میرے مضمون کی ناکامی اور تشنگی میں، اِن مواقعات کے علاوہ، میری کم علمی، بے بضاعتی اور محدود مطالعے کو بڑا دخل ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اِس موضوع کے تفصیلی بیان کیلئے سفینہ درکار ہے۔ اور یہاں "علم" سینہ اور سفینہ دونوں میں نہیں ہے۔

صحافت۔

صحافت کیا ہے؟ حقائق اور واقعات کے بیان اور آگاہی کا صحافت ہے۔ صحافت زندگی کے حقائق کی ترجمان ہے۔

ادب زندگی کا عکاس ہے۔ ادب اور زندگی میں گہرے رشتے ہیں غالباً اسی تعبیر کے پیشِ نظر برنارڈ شا نے کہا ہے۔

ALL GREAT LITERATURE IS JOURNALISM

"تمام اعلیٰ ادب صحافت ہے"

صحافت کا زندگی اور ادب سے جو گہرا تعلق ہے وہ ظاہر ہے۔ زندگی اپنے اردگرد کے واقعات سے ناتا جوڑے ہوئے ہے۔ ان واقعات کے تانے بانے سے ادب بنتا ہے۔ ادب کے ذریعہ انسانی جذبات اور احساسات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ یہ تمام عناصر صحافت کا مواد ہیں۔

جمہوری دور میں، عصرِ جدید میں صحافت کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ صحافت میں زبردست قوت ہے۔ اگر صحافت حق و عدل، خیر و فلاح کے لئے کام کرے تو انسانیت کے لئے ایک مایہ طاقت ہے۔ وہ حاکم و محکوم کے درمیان ایک رابطہ ہے۔ عوام و خواص کے درمیان ایک رشتہ ہے رائے عامہ کو ہموار اور بیدار کرنے کا موثر ادارہ ہے صحافت معاشرتی، عمرانی اور سیاسی آثار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کو بناتی ہے۔ بدلتی ہے۔ آزادیٔ رائے کی تبلیغ و اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ قلم میں زبردست طاقت ہے۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر ابوالفضل کے قلم سے ڈرتا تھا۔

ولیم اسٹیڈ نے کہا ہے جیسا...۔ "اخبار نویس کی صورت دیکھ کر شیطانوں کا باوا ابلیس بھی کانپ جاتا ہے"

آخری زار روس نے کہا تھا جیسا...۔ "اے قلم، تو نہایت خوبصورت ہے لیکن میری سلطنت میں تو شیطان سے بھی بدتر ثابت ہوا"

جمہوریہ دینزولا (امریکہ) کے صدر کاسٹرو کا قول ہے جیسا...۔ "اگر جہنم کا بھی پھاٹک کھلا دیکھوں تو آنا نہ ڈر سکوں گا جتنا اخبار نویس کے قلم سے ڈرتا ہوں"

صحافت اور پہلی جنگ آزادی۔

۱۸۵۷ء میں پہلی جنگِ آزادی لڑی گئی۔ اس میں ناکامی نے عوام و خواص کو ایک نیا حوصلہ دیا۔ ناکامیوں کی بنیادوں پر آزادی کی جدوجہد دوبارہ شروع کی گئی۔ اس مہم نے قربانی۔ ترک (تیاگ) اور اہنسا کے ذریعہ برطانوی سامراج کے روشن آفتاب کو "گھور اندھیارے" کے غار میں ڈھکیل دیا!

اس جدوجہد میں، سیاسی، سماجی، مذہبی، قومی رہنما شامل تھے، ابتدا میں بادشاہِ دہلی بہ نفسِ نفیس اس جنگ میں شریک رہا۔ ہر قسم کے پیشہ ور تھے۔ معمولی کلرک سے لے کر اعلیٰ حاکم تک شریک تھے۔ صحافی بھی

ص۱ / ص۲ / ص۳ الہلال ۹ ستمبر ۱۹۱۲ء ص۲ (مخزونہ خدا بخش لائبریری پٹنہ)

میدان میں آ گئے رہے[1]
پہلی جنگِ آزادی کے دوران صحافت ابتدائی منزلوں سے گذر رہی تھی۔ ملک میں مختلف پرچے جاری تھے۔ ان کا
مزاج — شعر و سخن۔ ادب۔ قانون۔ مزاح۔ ہزل۔ مذہبی مباحث۔ وغیرہ امور کے دائرے میں محدود تھا
جدید علوم سے بے خبری تھی۔ اخبارات میں اداریئے (   ) نہیں ہوتے تھے۔ مرثیوں کے
نعت، مختلف شہروں کی خبر علیحدہ علیحدہ شائع کی جاتی تھیں[2]

اس عہد کے چند اخبارات یہ ہیں :-

دہلی کے اخبارات :- اردو اخبار ۱۸۳۶ء — مظہر الحق ۱۸۴۳ء — سید الاخبار ۱۸۳۷ء — صادق الاخبار
کریم الاخبار ۱۸۴۵ء۔

پنجاب کے اخبار :- کوہ نور ۱۸۵۰ء — دریائے نور — لاہور گزٹ ۱۸۵۵ء۔

سیالکوٹ کے اخبار :- ریاض الاخبار — چشمۂ فیض ۱۸۵۲ء — خورشید عالم — ہمائے بے بہار (لاہور)
نور علی نور — وکٹوریہ پیپر ۱۸۵۳ء۔

ملتان کے اخبار :- ریاض نور ۱۸۵۲ء — شعاع الشمس ۱۸۵۳ء — گلزار پنجاب ۱۸۵۰ء۔
مطلع الانوار ۱۸۵۳ء۔

بنارس کے اخبار :- زائرین ہند — باغ و بہار — بنارس گزٹ — آفتاب۔

انیسویں صدی کے نمایاں اخبار :— مہذب لکھنؤ۔ ہندوستانی (لکھنؤ) قیصر الاخبار — احسن الاخبار (الہ آباد)
اکمل الاخبار (دہلی) پنجابی اخبار (لاہور) رفیقِ ہند — آفتابِ پنجاب (لاہور)
کشف الاخبار (بمبئی) شمس الاخبار (مدراس)۔

دکن کے اخبار :— شمس الاخبار — جریدۂ روزگار — اخبارِ صبح — طلسم حیرت — عمدۃ الاخبار
یادگارِ زمانہ — ظہیر الاسلام — منظر العجائب — تحفہ — احسن الجرائد — حدیقۂ شعراء
حاکم — مخبرِ دکن — نیرِ آصفی — آفتابِ دکن۔

قاسم الاخبار — میسور اخبار — منشورِ محمدی — خورشیدِ دکن — آصف الاخبار —
ہزار داستان — اخبارِ آصفی — دکن اخبار — افسر الاخبار — ملک و ملت —

پنجاب :— اخبارِ عام — پیسہ اخبار — وکیل۔

---

[1] خطباتِ گارسن دتاسی۔ خطبہ نمبر ۹ ص ۴۱۸
[2] شعلہ طور کی ایک خبر ملاحظہ کیجیے گا۔

مذکورہ بالا اخبارات کے متعلق چند مستند معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں اردو اخبارات نے کیسا کردار ادا کیا۔ اور ان اخبارات ان کے ایڈیٹروں کو مختلف مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

اردو اخبار (دہلی) کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر کو گولی مار دی گئی۔ صادق الاخبار کے ایڈیٹر کو تین سال کی سزا ہوئی۔ کئی اخبارات نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ انگریزی سلطنت کے زوال نے چند اخبارات نکلوائے۔ بعض اخبارات میں فرقہ وارانہ مضامین شائع ہونے لگے۔ اس طرح اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اخبارات نے تحریک کا ساتھ نہ چھوڑا۔ گلشن نوبہار پر مقدمہ چلا۔ پریس ضبط کر لیا گیا۔ ریاض الاخبار پر بھی یہی قیامت گذری۔ چند اخبارات بند ہو گئے کچھ نئے اخبار سامنے آئے۔

رفتہ رفتہ بغاوت کی آگ سرد ہوئی۔ حالات سنبھلنے لگے تو زباں کی سختی کم ہوئی۔ تو کئی اخبارات نکل آئے۔ ان میں سے بعض مشہور ہوئے۔

اُس دور میں لکھنؤ ایک اہم مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اودھ اخبار، ہندوستان اور اودھ پنچ — نے ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ ان اخبارات نے ادب اور صحافت کی بڑی خدمت کی۔ اودھ پنچ مسلسل برطانوی حکومت سے برسرِ پیکار رہا۔ قومی تحریک میں اس کا خاص رول رہا ہے۔[۱]

بعض اخبارات مثلاً کوہ نور۔ ہما (لاہور) سرکار کی وفاداری کے گیت گاتے رہے۔ ان کے عنوانات "مژدۂ فتح دہلی" جیسے ہوتے تھے۔ دیکھئے! غلامی کا طوق کتنا حسین ہوتا ہے۔ جادوئے محمود سے ایاز کی بے بصر آنکھیں سے ساز رہبری تصور کرتے ہیں۔

قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے کہ "اس دور کی صحافت میں کوئی سیاست نہ تھی"۔[۲]

علامہ یوسف علی نے "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" میں لکھا ہے کہ اخبارات کی خبریں عموماً افواہوں پر مبنی ہوتی تھیں۔ باغیوں کی ترتیب و تنظیم سے ان کو سروکار نہ تھا۔

اس کے برعکس، جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے اخبار بھی تھے لکھنؤ کے سحر سامری نے واجد علی شاہ کی معزولی کا ذکر بڑے حسرت ناک انداز میں کیا ہے۔

بقول احسن مارہروی — مصنف تاریخ نثر اردو — لکھنؤ کے طلسم اخبار۔ نے واجد علی شاہ کے خلاف انگریزوں کی مفسدانہ حرکات کا پوست کندہ حال (بیان) شائع کیا ہے۔

صادق الاخبار برطانیہ کا کٹر مخالف تھا۔ اس اخبار نے شاہ نعمت اللہ کی پیشین گوئی — سلطنتِ برطانیہ کے ختم ہونے کی اطلاع۔ شائع کی تھی۔ اس کی اشاعت کی پاداش میں اسے تین سال کی سزا ہو گئی تھی۔

نوائے آزادی میں قریشی صاحب نے لکھا ہے۔ کہ

"دہلی اردو اخبار میں ہندوستانی ریاستوں اور دہلی کے دربار کی خبروں کے ساتھ ان کی بد انتظامیوں پر سنجیدگی اور آزادی کے ساتھ تبصرے ہوتے تھے۔ اس اخبار کا ایڈیٹر گرانی کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فرض

---

[۱] مثالیں ضمیمہ میں دی گئی ہیں۔
[۲] نگار ۱۹۴۱ء

سمجھا تھا اس کے ذہن میں اسیر الدغیرہ ہند مسلمانوں کا اتحاد نہ تھا۔ صلہ

اس اخبار میں انگریزوں کے ظلم و ستم کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ یا سازش ہوتی تھی مولانا امداد صابری نے لکھا ہے کہ لاہور اخبار سے واضح ہوتا ہے کہ کنور نہال سنگھ نے دوست محمد خان (والی افغانستان) کو لکھا ہے کہ تمہارے ساتھ مل کے میں مقابلہ پیاہ انگریز کا کروں اور فرزند خان مذکور کو طلب کیا ہے۔ کہ میں اسکو فوج سکھ کا سپہ سالار بناؤنگا۔ اور مشہور ہے کہ نیپالی لوگ بھی اس سازش میں شامل ہو جائیں گے۔ صلہ

ہندوستان کے علاوہ بیرونی ملکوں میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند ہو رہا تھا۔ اس قسم کی خبریں طلسم (لکھنؤ) نمایاں طور پر شائع کیا کرتا تھا۔ ہرات کے علاوہ شولا پور میں [illegible] میں بغاوت کی خبر ملاحظہ کیجئے۔

شولا پور۔ صاحب ناقص کو کسی نے خبر دی ہے۔ راقم نے اس کی یہ نقل کی ہے کہ جب سے لشکر انگریز مہم فارس کی طرف راہی ہوا ہے۔ یہاں ہر اشرار بر سر فساد ہے۔ رعایا کے درپے تباہی ہوا ہے۔ خصوص قوم روہیلہ سرکشی سے درپے آزار ہے۔ قتل و غارت ان کا شعار ہے۔ اہل شہر کا خوف . . . . . سے برا حال ہے کہ گھروں کے ساتھ گھن نہ ہے۔ یہ خیال ہے جب ۲۷ رجمنٹ نے کوچ کیا۔ غارتگروں نے موقع پا کر یہ امر پیدا کیا کہ نواح شہر کے اکثر گاؤں اور قریہ کو لوٹا۔ وہاں کے باشندوں پر تکلیف کا آسمان ٹوٹا۔ ۲۰ ویں ماہ گذشتہ (۲۰ دسمبر [illegible]) کو جب ۲۸ رجمنٹ وہاں سے روانہ ہوئی۔ تعلقہ پور کا گاؤں لوٹا۔ ظلم کیا۔ کیا دیوا۔ تب پیچھے کے سوار گرفتاری کو بڑی تیاری اور سامان سے گئے۔ اور بہت روہیلے اسیر ہوئے۔ پابہ زنجیر ہوئے مگر اس پر مفسدوں کو دشواس نہ ہوا سیاست حاکم سے ہراس نہ ہوا۔ تھوڑے دنوں کے بعد شیدپور کے متصل موضع ۔ برسلو ۔ میں ڈاکہ زنی ۔ صلہ

انیسویں صدی کے اواخر میں صحافت نے نیا موڑ اختیار کیا۔ انکار کی آزادی کی قدر فرمی۔ پنڈت گوپی ناتھ کے اخبار عالم درکراری محبوب عالم کے پیسہ اخبار اپنے مراد، کی پیش کش اور معیار کے لحاظ سے مقبول ہوتے گئے۔

[illegible] میں کانگریس کی بنیاد پڑی۔ اس زمانہ میں کانگریس کے نصب العین ۔ آزادی ۔ کی حمایت کرنے والے ۔ اودھ پنچ ہندوستان ۔ ایڈوکیٹ (لکھنؤ) اور تیمر الاخبار تھے۔

اودھ پنچ حکومت کے سخت خلاف تھا۔ حکومت پر سخت تنقید کرتا تھا۔ اس کے الفاظ سخت، تخاطب کا انداز بھی سخت ہوتا تھا۔

گلیڈاسٹون ـــ وزیر برائے ہند ـــ کو لکھا۔

• گلیڈسٹن ـــ مگر اب تو بدنامی کا ذکر اتہارے ہی سر ہے ۔ اور سچ بھی یہ ہے کہ اس کے مستحق تم ہی ہو میں نے تمہاری فارن پالیسی کبھی لائق ستائش نہیں پائی ۔ رفاہ و اصلاح، آرائش و زیبائش ظاہری نیم تمام اوپری لیپ پوت کے لئے تمہاری ذات مخصوص ہے ۔ مگر اس کے لوازم اور مسالوں کی فراہمی اور ترکیب سے تم ایسے محروم ہو جیسے ہندوستانی جودت سے تم پولیٹیکل دسترخوان کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمتگار ہو ۔ پکا پکایا کھانا اور تیار ہانڈی تم خوب چن سکتے ہو ۔ مگر ہانڈی پکانے اور چیز تیار کرنے کے نام سے خاک دھول ۔

صلہ نوائے آزادی صہ / تاریخ صحافت اردو صـ۲۵
صلہ تاریخ صحافت اردو صـ۱۲۵ صلہ اردو صحافت کی تاریخ صـ۱۲۲

بھاجی کے پھول تم نہیں جانتے۔ کہ انسان پالیسی کا مزہ فقرا ور متین کیوں کر خوشگوار چاشنی پیدا کرتا ہے۔
کہتے ہیں جو کرنا ہو گیند بازا حتا ہے۔ اس کے ہاتھ سے لذت جاتی رہتی ہے ۔ . . . . . .
تم ہرگز اس لائق نہیں کہ دونوں کتے تمہارے سپرد ہوں۔

مہاراجہ کشمیر کو تخت نشینی کے بعد ایک تہنیت خط لکھا۔

"مہاراجہ صاحب — آج کل طریقہ عالم میں یہ تماشا ہو رہا ہے کائنات میں وہ بیچ ہے کہ ہر شخص تماشائے ہندوانہ انداز نظر آتا ہے
مگر تم جانو

میری نگاہ و بلند نوازی سے آج تک کبھی نیچی پڑی ہی نہیں ۔ اور خاص کر جب عمل ہوتا دیکھتا تھا۔ اپنے مذہب میں آئی پر
چوکنا محافظ اور گناہ دونوں خیال کیا جاتا ہے۔ . . . .

آج کل ریذیڈنٹ کا تقرر بہتوں کو چکر میں ڈالے ہے۔ تمہاری جو حالت نہ ہو وہ کم ہے۔ ہر عمل کارروائی کرنے والے
نگاہ کے منتظر رہتے ہیں والیان ملک کچھ آتے دن تو مرتے نہیں۔

قابو اگر مرہے۔ پیٹا جائے۔ مگر میں تم کو ایک گر
بتائے دیتا ہوں۔ تم سب کرنا مگر اودستان نہ کھونا
قیام ریذیڈنٹ منظور کرنا مگر سمجھ کے"

یہ خط اس وقت لکھا گیا تھا۔ جب مہاراجہ کشمیر۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوئے اور ان کو ریذیڈنٹ
کے تقرر اور قیام کو منظور کرنا تھا۔

اودھ پنچ کے علاوہ، دوسرا کون ان لفظوں میں مہاراجہ کو ہدایت کر سکتا تھا۔

زمانہ [illegible] کے مختلف شماروں میں "بھارت متر" کے ایڈیٹر — بال مکند گپتا — نے اودھ پنچ کے بارے میں
لکھا۔ کہ اس میں کئی خوبیاں تھیں۔ تین خاص خوبیاں یہ تھیں

(۱) آزادی سے لکھتا تھا۔ موقع کی دل لگی کرتا تھا
(۲) وہ جانتا تھا۔ کہ اس ملک کے لئے کس قسم کی پالیسی درکار ہے۔ رعایا کا طرفدار تھا
(۳) زبان صاف تھی۔

لکھنؤ کے ہندوستان کے بارے میں گپتا کی رائے ملاحظہ کیجئے۔

"اس نے شروع ہی سے ملکی معاملات میں ہاتھ ڈالا
اور ملکی معاملات پر آرٹیکل لکھنا شروع کیا
مدراس میں کانگریس ہوتے ہی پریسیڈنٹ گھوش
کی تقریر کا پورا ترجمہ ہندوستانی کے ایک ہی نمبر میں شائع کیا۔ . . . . . . وہ جو کچھ لکھتا تھا۔ بہت آزادی سے
نڈر ہو کر لکھتا تھا:

لاہور کے رفیق ہند کی بھی یہی پالیسی تھی۔

۱؎ شارب رودولوی۔ مقالہ۔ اودھ پنچ۔ ادیب علی گڈھ ص[illegible]

بیسویں صدی سیاسی اعتبار سے تیز و تند اخبارات سے شروع ہوئی ۔ زمیندار ۔ الہلال ۔ ہمدرد ۔ ہندوستانی ۔ ان میں نمایاں ہیں ۔ وکیل (امرتسر) ۔ دیش (لاہور) ۔ اردوئے معلی (حسرت) مدینہ (بجنور) ۔ مسلم گزٹ (لکھنؤ) وغیرہ آزادی کے نقیب تھے ۔

الہلال میں مولانا آزاد نے

ــ الجہاد فی سبیل الحریت ــ

کے عنوان سے جو مقالات قلمبند کئے ۔ اس میں قوم کو انگریزوں کی شاطرانہ چال سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"ہندو مسلمانوں کا سوال بھی

ایک بازیچہ کا کھیل ہے"

مولانا جوہر نے فروری ۱۹۱۳ء کے کامریڈ میں لکھا کہ

"ہندو مسلم اتحاد کا جو مسئلہ ہندوستان کے اتحاد میں حائل ہے ۔ ان شکوک اور تلخیوں کے سوا کچھ نہیں جو دونوں طرف سے اس لئے پیدا ہوئیں کہ ان لوگوں پر ایک جعلی قسم کی قومیت مسلط کرنے کی بے سود اور احمقانہ کوششیں کی گئیں"

حسرت کے اردوئے معلٰی کا انداز ملاحظہ کیجئے ۔

"ہم لوگوں کا فرض ہے کہ امر حق کے اظہار میں باک نہ کریں اور صداقت کی آخری فتح پر یقین کامل رکھتے ہوئے راہ حق میں جو مصائب پیش آئیں ان کو بہ کشادہ پیشانی برداشت کریں اور خوب سمجھ لیں کہ آزادی کی دولت آسانی سے حاصل نہیں ہوا کرتی ۔

یہ جو حکومت کی جبروت سے بظاہر تحریک حریت کو شکست فاش ہوئی ہے ۔ اس پر افسردہ و مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ۔

سردست ہمارے نزدیک ہر محب ملک کو انگریزی تشدد کے مقابلے میں مزاحمت دفاعی یعنی Passive Resistance کی پالیسی پر کاربند ہو کر انگریزی مال کے خریدنے ۔ بلکہ انگریزوں کو کسی قسم کی مدد پہنچانے سے قطعی انکار کر دینا چاہیئے"

اردوئے معلٰی ۔ مئی ۱۹۲۰ء ص۱

بیسویں صدی کے اوائل میں خصوصاً ۱۹۱۰ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان پریس کے قوانین زیادہ سخت بنا دئے گئے تھے ۔ کئی اخبارات قانون کی گرفت میں آگئے ۔ خلافت تحریک نے کئی اخبارات ــ ہمدرد ۔ اردوئے معلٰی ــ زمیندار ــ خلافت ــ وغیرہ کی اشاعت میں اضافہ کر دیا ۔

۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کا طویل ہنگامہ خیز دور ہے ۔

"جنگ عظیم کے بعد صحافت" کے جائزہ کے پہلے اس لب و لہجہ کا اندازہ ضروری ہے جو ہمارے آزادی کے نقیب اخبارات کا خاص وصف تھا ۔ ملاحظہ کیجئے ــ

"اصلاحات کے سلسلے میں امید کی جاتی ہے کہ برٹش حکومت میں نوآبادیوں کو بھی حق دیا جائے گا ۔ اور اگر اس میں

۱؎ [illegible] صحافت ۔ پاک و ہند میں ، خورشید الاسلام ص [illegible]

ہندوستان کے حقوق کا لحاظ نہ رکھا گیا۔ تو اور زیادہ جھگڑے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ ہندوستان اس ذلت کو ہرگز برداشت نہ کریگا۔ کہ اس کی قسمت ایسے لوگوں کے تصرف میں آئے جو اس کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھیں "

خطیب جنوری [illegible]

"یورپ دول کے مطالبہ کا عام انکار ......

...... سارے ہندوستان میں غیظ و غضب

کی آگ بھڑکا دے گا"

خطیب مئی [illegible]

جنگ آزادی میں ہمارے صحافیوں نے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ سیاسی طنز نگاروں میں مولانا آزاد ۔ قاضی عبد الغفار ۔ مولانا ظفر علی اور محمد علی جوہر ممتاز مقام رکھتے ہیں ۔ مولانا ظفر علی خاں سیاسی طنز کے بادشاہ تھے۔

یہ خوبی ان کو ورثہ میں اپنے والد بزرگوار ۔ مولوی سراج الدین احمد خان ۔ مالک و مدیر ۔ زمیندار ۔ سے ملی تھی۔ انہوں نے دلچسپ اور دلکش پیرایہ ظرافت میں مختلف پولیٹکل اور سوشیل امور پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضامین زیر عنوان ان کے نام سے متفرق کتابچہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمائیں ۔

ایک سادہ کسان کی دعا ۔

زمیندار ۔ ۱۱ نومبر ۱۹۰۶ء

"اے میرے اچھے خدا ! مجھے معلوم نہیں کہ تو کون ہے ؟
کیا ہے ؟ اور کہاں ہے ؟ مگر مولوی صاحب بتلاتے
ہیں کہ تو ہے ۔ میں مانتا ہوں کہ تیرے ہونے میں شک نہیں...

اے اللہ میاں ، میں نے کبھی کوئی قصور نہیں کیا اگر کبھی کچھ کیا ہے
تو مجبوری اور لاچاری سے کیا ہے ۔ میں نے نیل والے صاحب
کی بھینس چرائی ۔ مگر نیل والا صاحب جان بوجھ کر اس بھینس کو
میرے کھیت میں چھوڑ دیتا تھا ۔ اور میری کھیتی کو برباد کرایا
کرتا تھا ۔

اے خدا ! انگریزی راج کے امن و آسائش اور ترقی نے
تمام ہندوستان بھر دیا ۔ اور سوا میرے تمام ملک کے فرقے
خوش حال اور فارغ البالی سے گذارہ کرتے ہیں ....

اے خدا ! ایک مرکھا سڑا بنیا میرے گاؤں میں اگر کبھی ترا زو

مارتا ہے۔ کبھی دھوکہ بازی کرتا ہے۔ کبھی بیچ میں جھوٹی رقمیں
دبا کرتا ہے۔ کبھی سود در سود سے پیرا لوٹتا ہے۔

دیسی ریاستوں کے متعلق ایک تجویز۔

زمیندار۔ یکم اپریل ۱۹۱۱ء

"جس طرح ہندوستان کے مختلف انتظامی شعبوں میں خرابیاں اور نقائص پائے جانے پر ہر ایک صیغہ کی اصلاح و درستی کے لئے کمیشن مقرر کئے گئے ہیں۔ اسی طرح دیسی ریاستوں کی حالت کی اصلاح کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جائے اور اس کو ہدایت کی جائے کہ جو خرابیاں دیسی ریاستوں میں بالفعل موجود ہیں ان پر ایک مفصل و مبسوط رپورٹ لکھ کر پیش کریں"

اس کام کو جس خوبی سے دیوان سنگھ مفتون نے ریاست (ہفتہ وار) میں کیا۔ وہ ہماری صحافت کا ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔

لارڈ ماسے کی آخری تجویز۔

یکم اپریل ۱۹۱۱ء

ہز ایکسلینسی لارڈ منٹو نے .....

کلکتہ کی روز افزوں آبادی کے مضرات سے متاثر ہو کر یہ فرمایا تھا۔
کہ اگر یہ آبادی اسی طرح بڑھتی گئی۔ اور ایسے اس بات کی ضرورت محسوس
ہوئی کہ پایہ تخت کلکتہ سے تبدیل کیا جائے تو میں رنگون یا کشمیر کے سوا
کسی دوسری جگہ کی سفارش کرنے کے لئے تیار ہیں۔

یہ خبر آج تک بالکل کانفیڈنشل رہی ہے اور تا حال کانفیڈنشل ہے اور
کانفیڈنشل طور پر اس وقت وزیر ہند سے خط و کتابت شروع ہو گئی ہے"

صحافت۔ جنگ عظیم کے بعد

جنگ عظیم کے بعد ایک انقلابی اور ہنگامہ خیز سیاسی دور آیا۔ اس دور کے اثرات اور تقاضوں سے کئی اخبارات — روزنامے، ہفتہ وار — منصۂ شہود پر آئے حکومت کی پابندیوں اور سختیوں کے باوجود اخبارات کا سیلاب نہ رک سکا۔

اس دور میں اخبارات کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ پریس چھین لئے گئے۔ ایڈیٹر قید و بند کی ابتلا میں پھنس گئے۔ مگر زبان اور قلم پر قدغن لگانا آسان نہ ہوا۔

۱۹۱۹ء کے بعد زمیندار نے ایک نئی کروٹ لی۔ مولانا ظفر علی کئی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ پریس ضبط ہوا۔ اس کے شعلہ بیان ایڈیٹر — عبد المجید سالک اور غلام رسول مہر تھے۔

۱۹۲۰ء کے بعد لاہور سے سیاست نکلا۔ یہ اخبار تحریک خلافت اور ترک موالات کا ترجمان تھا۔ جلیان والا باغ کے سلسلے مورد عتاب ہو کر ضمانت اور پریس کھو بیٹھا۔ ایڈیٹر گرفتار ہو گئے۔

[illegible] میں مولانا آزاد نے کلکتہ سے پیغام جاری کیا۔ اس اخبار نے تحریک خلافت اور ترک موالات کی زوردار ترجمانی کی۔ اس کے فلسفے کے تعلق سے معرکۃ الآراء مضامین شائع کیے لوگوں کو عدم تشدد (اہنسا) کی راہ پر چلنے کی تلقین کی۔
حکیم اجمل خاں کی سرپرستی میں قاضی عبدالغفار نے دہلی سے صباح نکالا۔ حکومت کی سخت گیری کے بارے میں لکھا کہ

"گو میں ایک مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ کہ دفتری اقتدار کا پنجہ خصوصیت کے ساتھ اسلامی اخباروں پر زیادہ آسانی سے چلایا جاتا ہے لیکن یہ بھی کچھ اب آنکھوں سے واقف ہو گئے ہیں کہ اگر ایک دفعہ ان کی زندگی ختم کر دی جاتی ہے۔ تو پھر دوبارہ جنم لے کر ہوئے روپ میں جلوہ افروز ہو کر اپنے عزم و استقلال کا ثبوت دیے بغیر نہیں رہتے "صبا

اس دور میں صحافت نے عوام کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی۔ تحریک ترک موالات۔ تحریک ہجرت کی تبلیغ کی۔ ان کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا۔ جلیان والا باغ اور دیگر دلخراش سانحات اور جگر خراش واقعات کی الم ناک پیرایہ میں تفصیلات بیان کیں۔
ڈاکٹر اقبال کے دو شعر ملاحظہ کیجئے۔

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ
غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

مسجد کانپور کی شہادت کے بیان میں اہل صحافت کے قلم نے جو خون کے آنسو روئے ہیں۔ ان کی سرخی سے ادب کا دامن آج تک تابناک ہے۔ شبلی کا پُر درد نوحہ اور سید سلمان کا الم ناک نثری مرثیہ — "یہ زمین پیاسی — (انسان) ...... آج بھی ہماری نظروں کے سامنے اس قیامت خیز منظر کو پیش کر دیتا ہے۔
ان تحریروں اور بیانات نے عام ذہن میں انقلاب کی جوت جگا دی۔ رائے عامہ بدل گئی۔ اخبارات نے بے باکی اور بے خوفی سے قابل تحسین انداز میں اپنے فرض کو ادا کیا۔ قربانیاں دیں۔ اس عہد کی صحافت کی سب سے بڑی خدمت عوام کے دلوں سے حکومت کے خوف کا اخراج تھا۔
اخبارات کی تعداد میں روز افزوں اضافے ہوتے گئے ان کی مقبولیت کے دو ذریعے تھے۔

۱۔ بے خوفی۔ بے باکی
۲۔ عوام کی ترجمانی

جن اخبارات نے صحافت کی آزادی کو برقرار رکھا۔ ان کو حکومت کے سخت قوانین اور دار و گیر کی بدولت قربانیاں دینا پڑیں۔ سیاسی اور صحافی حالاتِ حاضرہ پر منظومات پیش کی گئیں۔ زمیندار کے مزاحیہ کالم — "افکار و حوادث" — نے دھوم مچا دی — اس کے پہلے یہ کالم — اپریل فول — کے نام سے تھا۔
سیاست کے راز و نیاز "حریم حکومت" کے پردے اٹھا دیئے۔ اور ہر کس نا شنیدہ" راز ہو گیا۔

صحافت پاک و ہند میں ص۴۱۴

وہ دل و دماغ سے حریت کے سرمایہ دار اور آنکھیں رموز سلطنت کی آئینہ دار ہو گئیں ۔

۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک صحافت کا اہم دور رہا ۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک حقوق کے لئے جد وجہد شروع ہو گئی ۔ زمیندار اور ہمدرد کی پالیسی نمایاں تھی ۔ الہلال (آزاد) نے ایوان حکومت میں زلزلہ پیدا کر دیا تھا ۔ آزادی کے متعلق الہلال کی تحریریں اپنا اثر کرتی رہیں ۔ اس نے لکھا کہ

"جو قوم اپنے فرزندوں کا خون اس سے بہتے دیکھتی ہے
کہ وہ آزادی چاہتے ہیں اور پھر خاموش رہتی ہے
یقیناً وہ آزادی کا استحقاق نہیں رکھتی
۲ ستمبر ۱۹۱۲ء

سہ پہر شاہ زاد فضل کے اقوال کے تحت ۔

"ہمارا مطالبہ کچھ زیادہ لمبا چوڑا نہیں ہے
ہمارا مطالبہ صرف ایک لفظ ہے
"آزادی"
ستمبر ۱۹۱۲ء

۱ ستمبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں مرقوم ہے کہ

"انقلاب کا موجب نہ تنہا جماعتیں ہوتی ہیں نہ صرف
افراد ۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں
اور ایک نئی فضا تیار کرنے میں مدد دیتے ہیں ۔

الہلال کے مضامین اور طرز بیان کے عام سیاسی اثرات و نفوذ لمحالت کا باعث ہونگے ۔

اس دور کے چند خاص اخبار یہ ہیں ۔

انقلاب ۔ احسان ۔ سیاست ۔ احرار ۔ مجاہد ۔ نیشنل کانگریس ۔ زمزم ۔ پاسبان ۔ الجمعیت ۔ ہمدم ۔ پیام ۔ مصر جدید ۔ ہند ۔ خلافت ۔ ہلال ۔ ہمدرد ۔ الامان ۔ وحدت ۔ حق پیر فراز ۔ شہباز ۔ اجمل ۔ مختلف روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات قومی مسائل پر مشتمل ہے بعد میں ان میں اختلافات پیدا ہوگئے ۔ مگر تمام اخبارات بدیسی راج کے خلاف آواز بلند کئے ہوئے تھے ۔ آزادی کے خواہاں تھے ۔

۔ اس دور میں صحافت ایک دارالعلوم کا درجہ رکھتی تھی ۔ بغیر ساز و سامان کے بھی "صحافت کا سپاہی" آزادی کی لڑائی لڑتا تھا ۔

اجمل پر تبصرہ کرتے ہوئے ۔ اخبار ملت ۔ دہلی نے لکھا تھا ۔

اجمل کی زندگی اور کامیابی سے ان لوگوں کو جو یہ کہتے ہیں کہ بغیر
سرمایہ کے کوئی اخبار زندہ نہیں رہ سکتا ۔ یہ سمجھ لینا چاہئے ۔
کہ خلوص و نیک نیتی اور سچائی بھی کوئی سرمایہ ہے "

مختصر یہ بات یہ ہے کہ

• بلٹ کے کارکنوں کو بھی یہی دعویٰ ہے کہ اگر ہم ایماندارانہ
خوش معاملگی ۔ خلوص اور نیک نیتی سے کام کریں گے تو
ہمارے کام کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی ۔

[illegible] سے [illegible] تک کی صحافت تمام سیاسی مسائل ۔ حالات اور واقعات کی آئینہ دار رہی ۔ مسلم لیگ اور کانگریس
کے نظریات نے مسلم اخبارات کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ۔ ۱۔ نیشنلسٹ
۲۔ مسلم لیگی

ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی ، فسادات کے زور نے صحافت کی سطح کو بلند نہیں ہونے دیا ۔ کوئی خاص ترقی نہیں
ہوئی ۔

[illegible] کے بعد [illegible] میں عالمی جنگ شروع ہوئی ۔ جنگ کے بعد سیاسی آزادی کے دور کے آنے کی امید تھی ۔ نئی
اصلاحات کا نفاذ عمل میں آیا ۔

جوش نے کہا تھا کہ

ناز ہیں انگریز ہم ہیں کہ حاصل ہوا اتفاق
مانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے ۔

[illegible] میں کانگریس نے ستیہ گرہ شروع کی ۔ [illegible] میں کوئٹ انڈیا کا نعرہ بلند کیا ۔ تمام لیڈر گرفتار ہو گئے ۔
[illegible] میں ملک آزاد ہو گیا ۔

اس دور میں صحافت کا معیار نہیں بدلا ۔ گروہی صحافت کو عروج حاصل ہوا ۔

مختصر یہ کہ

• آزادی کی جدوجہد میں صحافت نے اہم کردار ادا کیا ۔ [illegible] سے پہلے ہمارے اخبارات لب و لہجہ میں نرمی تھی
بعد میں تیزی پیدا ہو گئی ۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اس میں تندی آ گئی ۔ آزادی سے متعلق ایک وافر ذخیرہ ہمارے پاس
جمع ہو گیا ۔ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں ایسا مواد نہیں مل سکتا ۔ جو عام و خاص ذہن کو بغاوت اور انقلاب پر آمادہ کرے ۔
اپنے مطالعہ کی بنا پر میں یہ بات یقین اور دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہمارے صحافتی محاذ میں ۔

— جیل بھرو تحریک
— عدم تعاون کی تحریک
— خلافت تحریک
— بدیسی مال کا بائیکاٹ

وغیرہ تھے ۔ اس ادبی تحریک کے زیرِ اثر عوامی تحریک پروان چڑھتی رہی ۔ برطانوی سامراج اور جاگیردارانہ تہذیب کی مسلط کی ہوئی
غلامانہ ذہنیت کا مقابلہ کیا گیا ۔ ہماری صحافت نے قومی شعور کو بیدار کیا ۔ نیشنل کانگریس وجود میں آئی تو اس کے نام اور کام سے
لوگوں کو آگاہ کیا ۔

غیر ملکی حکومت سے ٹکر تھی ۔ حاکم و محکوم کا پیچیدہ اور نازک رشتہ تھا ۔ صحافت بے باک اور بے خوف رہی ۔
نئے قوانین کے نفاذ کو بادی النظر میں محکوم قوم کے حق میں مفید سمجھا گیا ۔ مگر یہ سب سیاسی داؤں پیچ تھے ۔ حکومت

دن نے ان سے ہماری تہذیب پر، زندگی پر مہلک وار کئے۔ صحافت نے ان ضربوں کے نشانات بتلائے۔
ہم کو اپنی تہذیب سے محبت سکھائی۔ اقدار کا شعور پیدا کیا۔ ہمارے چند عمرانی، معاشرتی، اقتصادی
مسائل بھی تھے۔

ملک میں محنت کش طبقہ — کسان مزدور

متوسط طبقہ

دولت مند طبقہ

فکر و نظر کے مختلف زاویے رکھتا تھا۔ ان کا اختلاف اور پریشانیاں آزادی کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔ ہمارے
اخبارات نے ان رکاوٹوں کو بڑی عمدگی سے دور کیا۔

۱۔ عوام کے احساس کو بیدار کیا

۲۔ ان کو مقابلہ کا شعور اور ہمت عطا کی۔

کہ وہ آزادی کی جد و جہد میں شریک ہو کر اپنی درماندگی، غربت کس مپرسی اور بدحالی کو دور کریں۔
ہمارے اخبارات نے جرأت سے کام لیکر عام سماجی برائیوں پر نشتر زنی کی۔ اور اس طرح سماجی تعمیر کی مستحسن خدمت
انجام دی۔ لوگوں کی گراں خوابی کو دور کیا۔ ادیبوں اور شاعروں کو مغربی سیاست کی شاطرانہ چالوں کی پول کھولنے پر آمادہ
کیا۔

عوام میں بیداری اور زندگی پیدا کرنے میں اخبارات کا زیادہ حصہ ہے۔
مذکورہ امور پر مثالیں فراہم نہ ہو سکیں۔ ادھر ادھر سے چند اشارات دیئے گئے ہیں۔
اس مضمون کو "اعلان بیداری" اور "اعلان آزادی" کے چند منتخب اشعار پر ختم کرتا ہوں۔
اخبارِ عالم —— ۱۰ر مارچ ۱۹۴۸ء

اے ساکنانِ خطۂ ہندوستان! بڑھو! — آگے نکل گئے ہیں بہت کارواں، بڑھو!
تا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ہو — کاندھے پہ رکھ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو!
بیٹھے ہو، ہاتھ توڑ کے کیوں کنجِ غم میں تم — دیکھو ذرا نشیب و فرازِ جہاں، بڑھو!
ہم لوگ تم میں ہیں کہ جرس کارواں میں ہے — چلاّ رہا ہے طوطیِ ہندوستان، بڑھو!

۱۹۴۷ء میں ۱۵ر اگست کو جب آفتابِ تازہ، اپنی جلو میں صد گردشِ شمس و قمر لئے ہوئے "سامانِ صد ہزار بہاراں"
کے ساتھ طلوع ہوا، تو وجد نے "اہل نظر" کو یوں مبارکباد دی۔

گلشن کا، انقلاب نے نقشہ بدل دیا — شاہین شکارِ بلبلِ بے بال و پر ہے آج
سب تاجرانِ طوق و سلاسل چلے گئے — اے وجد! لطفِ عرضِ متاعِ ہنر ہے آج

معین شاکر

تحریک آزادی میں حسرت کا رول

ہندوستان کی تحریک آزادی میں حسرت موہانی کا مطالعہ صرف اہمیت کا حامل ہے ۱۹۰۳ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک ان کی تحریریں تقریریں اور عملی کارنامے جدید ہندوستان کی جدوجہد میں عام طور سے اور مسلمانوں کی سیاست میں خاص طور سے نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کی اہمیت صرف اس بات میں مضمر نہیں ہے کہ انہوں نے خلافت تحریک کے زمانے میں یا ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے اجلاس میں (احمدآباد) مکمل آزادی کی تجویز رکھی حالانکہ خلافت تحریک بہت پہلے اور ۱۹۲۱ء کے بعد بھی ان کی شخصیت کی چھاپ آزادی کی جدوجہد پر ہر موڑ پر بہت گہری تھی لیکن اس کو حسرت موہانی کی بدقسمتی پر محمول کیجئے یا مسلمانوں کی کمزور سیاسی سمجھ کا اظہار، تجزیہ اب تک نہیں کیا گیا ان پر لکھنے والوں نے زیادہ توجہ ان کی شاعری پر کی، ان کی سیاست کو غیر اہم کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا، کچھ مضامین جو ان کی سیاست اور سیاسی رول کے بارے میں لکھے گئے ہیں وہ تشنہ اور سرسری نوعیت کے ہیں ان کو پڑھنے سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ حسرت ایسے تمام سیاستدانوں سے جو ہر ایک سے اختلاف کرتے تھے یا جھگڑا کرتے تھے۔ ان تحریروں میں حسرت موہانی کی سیاسی فکر اور ان کی سیاسی بصیرت کے بارے میں شاذ و نادر ہی ذکر ملتا ہے۔

آزادی ملنے کے بعد مختلف یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں آزادی کی جدوجہد کے بارے میں اچھا خاصا کام ہو رہا ہے۔ کچھ مغربی اور امریکی محققین نے بھی اس سلسلے میں اچھی تحقیق کی ہے لیکن کسی نے اب تک آزادانہ طور پر حسرت کی سیاست کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ ان کا ذکر عام طور پر ان کے ان ساتھیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن کی سوجھ بوجھ حسرت کے مقابلے میں بلاشبہ کمتر درجے کی تھی وہ کانگریس سے وابستہ رہے لیکن کانگریسیوں نے انہیں چھوڑ دیا، وہ مسلم لیگ میں رہے لیکن مسلم لیگیوں کو بھی ان سے کوئی محبت نہیں رہی (شاید اسی لئے پاکستانی مورخین بھی حسرت موہانی کا ذکر زیادہ نہیں کرتے)

حسرت موہانی کے رول کے ساتھ اس ناانصافی کی وجوہات کئی ہیں، کچھ بنیادی نوعیت کی ہیں اس لئے ان کی وضاحت ضروری ہے۔

۱۔ ہندوستان میں ایسے مورخین اور سیاستدانوں کی کمی نہیں ہے جو مسلمانوں کے رول کو آزادی کی تحریک میں منفی اور فرقہ پرستانہ سمجھتے ہیں، یونیورسٹیوں میں اور یونیورسٹیوں سے باہر ایسے انٹلیکچول موجود ہیں جو اس وہم MYTH کو دہراتے رہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے انگریزوں کی مخالفت نہیں کی۔ کانگریس سے علیحدہ رہے۔ کانگریس کے اجلاسوں میں ان کی تعداد ہمیشہ کم رہی۔ متحدہ بند تحریک خروج کی اور پاکستان کا مطالبہ کیا یہ سب نصف سچائیاں ہیں اور مطالعہ اگر اتنا ہی سادہ ہے تو تاریخ اور تاریخ نگاری اور تاریخی تحقیق کی ضرورت ہی کیا ہے، یہ موثر پروپیگنڈہ تو ہو سکتا ہے، صحیح تاریخ نہیں ہو سکتی، موثر پروپیگنڈہ اسی لئے کہ ابھی تک تحریک آزادی کا علاقائی اور طبقاتی نقطۂ نظر سے بہت کم مطالعہ کیا گیا ہے، اگر تحریک آزادی کو کچھ رہنماؤں اور افراد کی تاریخ سمجھا جائے گا تو نتائج بہر حال گمراہ کن ہوں گے، اصل طور پر لکھی جانے والی تاریخ میں حسرت کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ دوسری وجہ تحریک آزادی کا کردار اور اس کا تجزیہ ہے یہ پیچیدہ مسئلہ ہے پہلی بات تو یہ کہ تحریک آزادی کو کانگریس کی تاریخ سے جوڑ دیا جاتا ہے یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں ۱۸۸۵ء سے پہلے ہونے والی ساری تحریکوں اور ساری قربانیوں کو تحریک آزادی سے الگ کر دینا پڑے گا دوسری غلط فہمی یہ بھی ہوتی ہے کہ کانگریس کا مخالف، قوم پرست اور کانگریس سے وفاداری قوم پرستی ہے۔ یہ مشکل یہ بھی پیش آتی ہے کہ کانگریس میں

[illegible] کانگریس کے مقصد کی وضاحت [illegible] کام لیا جاتا رہا [illegible]
طور ۱۹۲۹ء سے پہلے کانگریس کا مقصد کامل آزادی نہیں تھا بلکہ [illegible] کی بات کرتے تھے [illegible] ایک [illegible]
سمجھنے میں [illegible] کانگریس [illegible] طبقات کے افراد کا [illegible]۔ اور اس تحریک کا فائدہ کن طبقات کو ہو اور آزادی کے
بعد ہوگا۔ یہ بات [illegible] ہے کہ کانگریس [illegible] کا تعلق اعلیٰ یا متوسط طبقہ [illegible] اس کو ہمارے استحصال کرنے والے
ملکوں کی حمایت حاصل تھی [illegible] کانگریس [illegible] جیسے جیسے [illegible] بڑے زمیندار
[illegible] بڑے صنعت کار [illegible] کانگریس کی پالیسی [illegible] وغیرہ کا [illegible] ہمارے
عوام [illegible] کانگریس کا مقصد [illegible]
دولت سے محروم نہیں کیا جائے گا ذاتی ملکیت کے ادارے کا تحفظ کیا جائے گا آزاد ہندوستان میں امیر و گدا دونوں کے لئے جگہ ہوگی۔
[illegible] محنت و سرمایہ زمیندار اور کسان کے درمیان باہمی تعاون ہوگا۔ جب کسانوں کی تحریک چل رہی تھی
کانگریس کا قومی تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے [illegible] ۱۹۳۶ء کو [illegible] قرار دیا گیا
حتیٰ کہ ۱۹۳۲ء کے بعد کسانوں کی تنظیم کو کانگریس کے [illegible] استعمال نہیں کیا [illegible]
ہے [illegible] کانگریس نے ایک بھی NO TAX مہم نہیں چلائی ۱۹۳۳ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے صاف صاف اعلان کیا کہ [illegible]
[illegible] کانگریس کے [illegible] ملک کے مفاد کے خلاف ہے [illegible] کانگریس کا
مقصد [illegible] حقوق پر حملہ کرنا نہیں ہے اگر کسانوں کو زمینداروں سے کوئی شکایت ہو تو [illegible] باہمی مصالحت کے ذریعے طے کیا جانا چاہیے۔

اس کے علاوہ تحریک آزادی کے رہنماؤں کا سیاسی نقطۂ نظر اکثر صورتوں میں رجعت پرست رہا۔ اسی رجعت پرستی کی بنا پر
تحریک کا [illegible] ہندو مذہب یا قدیم ہند [illegible] تہذیب کی مفروضہ برتری [illegible] مغربی تہذیب [illegible]
[illegible] تحریک [illegible] اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے اٹھایا۔ اور اس کی رہنمائی بھی [illegible]
[illegible] ثابت ہوئی۔

یہ قومی تحریک کا غالب رجحان تھا لیکن یہ نہیں کہتے کہ اس تحریک میں دوسرے رجحانات نہیں تھے [illegible]
سینکڑوں اور ہزاروں مخلص مجاہدین کی آزادی کی تڑپ اور عمل کی صلاحیت پر کوئی شبہ نہیں ہے جن کا واحد مقصد ہندوستان کی
[illegible] اور عوام ہندوستان کے مفاد کی تکمیل تھی لیکن انہوں نے کانگریس کے سیاسی مسلک اور نظریہ کی تشکیل میں فیصلہ کن رول ادا نہیں کیا۔
ہم اس حقیقت کو [illegible] اور بہت سی چھوٹی روایتوں سے تعبیر کر سکتے ہیں، چھوٹی روایتیں اہم ہیں لیکن وہ غالب روایت نہیں تھیں
[illegible] بات [illegible] نہیں مانتا کہ قومی رہنما بڑے سرمایہ داروں کے اور بڑے زمینداروں کے ایجنٹ تھے لیکن شعوری اور غیر شعوری
طور پر ان کے نظریات [illegible] کی سیاست ان طبقوں کے مفاد میں تھی۔ حسرت موہانی کا تعلق قومی تحریک کی ان چھوٹی روایتوں سے تھا۔
[illegible] غالب رجحان اور غالب نظریہ کے خلاف شعوری جدوجہد کی [illegible] کامیاب ہوئے [illegible] کم نہیں ہے
[illegible] کچھ کم شاندار اور کم عظیم نہیں حسرت کی پوری سیاسی زندگی اسی نظریہ اور رجحان سے عبارت ہے۔

[illegible] حسرت کا تعلق ہندوستانی سیاست اور خاص طور سے یوپی کی مسلم سیاست سے بہت گہرا تھا [illegible]
[illegible] ابتدا [illegible] مسلمانوں کی سیاسی روایات [illegible] رجعت [illegible] اس روایت کے علمبردار برطانوی سامراج کا قلع قمع کرنا چاہتے
تھے اس کو صرف [illegible] سمجھنا صحیح نہ ہوگا [illegible] رہنما دوسرے طبقوں کے ساتھ مل جل کر بیرونی طاقت سے لڑنا چاہتے تھے
[illegible] مسلمانوں کی حکومتوں [illegible] سرسید کی علی گڑھ تحریک اس [illegible] کا اعتراف تھی، علی گڑھ تحریک نے [illegible]
[illegible] سلطنت برطانیہ کے [illegible] لیکن آخر [illegible] کہیں [illegible] علی گڑھ [illegible]
ایک مثال ہیں۔ [illegible] کہا تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے غلبہ کی ہمت افزائی کی جائے کیونکہ مسلمان سلطنت برطانیہ کے وفادار نہیں
ہو سکتے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ [illegible] فارسی [illegible] تحصیلدار اور ڈپٹی کلکٹروں کی ایک فہرست [illegible]
[illegible] مسلمانوں کی تعداد [illegible] ایک انکوائری کمیٹی بٹھائی گئی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ محکمہ پولیس میں مسلمان
کیوں زیادہ ہیں۔ ایسے احکامات صادر کئے کہ حکومت کے تمام شعبوں میں ہندوؤں کے مقابلے میں صرف [illegible]
[illegible] فارسی رسم الخط بدل کر دیوناگری رسم الخط [illegible] کے مطالبہ کی سرکاری طور پر ہمت افزائی ہونے لگی [illegible]

علی گڑھ تحریک کا جو حصہ سیاسیات میں حکومت کے ساتھ وفاداری پر مبنی تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ابتدائی جماعت کی
تشکیل عمل میں آئی۔ ابتدائی لیگ بڑے زمینداروں کی اہل ثروت و جاہ (men of property and influence)
سے ہاتھوں کی ترقی پسند ذہن young gentlemen of progressive tendencies کہا جاتا تھا
یہ ینگ جنٹلمین برطانیہ کے وفادار سمجھے گئے۔ یہ حکومت کے خلاف تھے۔ ابتدا میں زیادہ تر یہ وہ مسلم طلبا اور نوجوان تھے جو کالج سے فارغ
ہونے کی وجہ سے استعمار کے ترقی پسند نظریات کے قائل تھے۔ علی گڑھ تحریک کے مسلک کے خلاف اور کانگریس کے حامی تھے اور کانگریس
کے انتہا پسند گروہ extremist group کے ہمنوا تھے۔ حسرت موہانی ینگ جنٹلمین گروپ کے سب سے
پہلے رکن نہ تھے لیکن ایک جاندار اور فعال اور سب سے زیادہ articulate رکن تھے۔ اس گروہ کے دوسرے ارکان شیخ عبد اللہ،
حبیب اللہ، ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری، نواب اسمٰعیل خان، عزیز مرزا، ڈاکٹر انصاری، قاضی عبد الغفار، سید حسن بلگرامی، غلام الثقلین،
کمال الدین جعفری، خلیق الزماں وغیرہ شامل ہیں۔ اسی پس منظر میں حسرت موہانی کے نظریات اور اعمال کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

حسرت موہانی نے ۱۹۰۳ء میں اردوئے معلیٰ نکالا یہ ایک ادبی اور سیاسی جریدہ تھا جس کی سیاست دوسرے اردو جرائد سے بالکل مختلف تھی۔ حسرت موہانی کی پہلی گرفتاری تک اس میں سودیشی کی حمایت اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کے بارے میں مسلسل مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ حسرت نے ہندوستان کی آزادی پر بھی کئی مضامین لکھے، کانگریس کے بارے میں لکھتے ہوئے اعتدال پسندوں moderates and liberals پر سخت تنقیدیں کیں۔ انتہا پسندوں کی پالیسی کی حمایت کی۔ ان کا مقصد اور واحد مقصد ہندوستان کی آزادی تھا اس اصول کے لیے وہ کسی طرح کا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اردوئے معلیٰ ۱۹۰۹ء میں لکھتے ہیں:

"..... دنیا کی رفتار اور اہل دنیا کے طبائع کا میلان صریحاً حریت کی جانب ہے جنانچہ قوانین و بالعموم ایشیا میں کل ہندوستان کے سوا کوئی اور ملک صفت آزادی کی نعمت سے محروم نہیں، پھر عقل سلیم کس طرح باور نہیں کر سکتی کہ تمام عالم میں صرف ہندوستان ہی ایک بد قسمت ملک ہے جس کی قسمت میں محکومی دوام لکھ دی گئی ہو۔ یہ گمان بظاہر مشیت ایزدی کے سراسر خلاف نظر آتا ہے۔ اس لئے آخر کار یہ بات ماننی پڑے گی کہ فرنگی حکومت کا غیر طبعی نظام ہمیشہ کے لیے ہندوستان میں باقی نہیں رہ سکتا۔ اور اس کا موجودہ صورت حال میں ... سال قائم رہنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔" اعتدال پسندوں اور مسلم لیگ کی پالیسیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان حضرات کے نزدیک ہمارے انتہائی عروج کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہم غلام سے ترقی یافتہ غلام یا محکوم سے ترقی یافتہ محکوم بن جائیں۔ یہ لوگ آزادیٔ ہند کی خواہش کو خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ ان کا دائرۂ عمل بھی نہایت تنگ اور محدود ہے ان کی روش دنیا کی رفتار حریت کے خلاف ہے اور اس لیے قطعی طور پر غیر طبعی اور ناقابل قبول۔" جب پہلی بار اردوئے معلیٰ بند کرنا پڑا تو وہ مطمئن تھے کہ جو ہم نے اپنا فرض ادا کیا اس کی وجہ سے آزادی خیال اور طلب حریت کا جذبہ جمہور میں عام ہو چکا ہے، سودیشی اور بائیکاٹ کی روز افزوں ترقی کا زمانہ شروع ہو چکا ہے۔" جس فرد نے بھی کامل آزادی کی بات کی، حسرت اس کے مداح ہو گئے اور جس سیاسی جماعت نے اس اصول کی تائید کی، حسرت اس کے حامی، جو کوئی اس کی مخالفت کرتا حسرت اس پر تنقید کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس میں چھوٹے یا بڑے سیاست دان کی تخصیص حسرت نے کبھی نہیں کی، ڈاکٹر انصاری ہوں یا مظہر الحق، گاندھی ہوں یا جناح، گوکھلے ہوں یا موتی لال نہرو، سردار پٹیل ہوں یا مولانا آزاد، حسرت نے اپنی تقریر و تحریر کے ذریعہ ان کی کمزوریاں ... یہی وجہ تھی کہ حسرت موہانی کانگریس کے باقاعدہ رکن تھے لیکن جب کامل آزادی کے طرفداروں کو کانگریس چھوڑنی پڑی تو حسرت بھی کانگریس سے الگ ہو گئے جب مسلم لیگ نے اس اصول کی سچائی کو تسلیم کر لیا، حسرت اس میں شریک ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم کی ابتدا میں حسرت موہانی کو کامل آزادی کے حصول اور سلطنت برطانیہ کے خاتمے کے امکانات نظر آئے۔ ۱۹۱۸ء کی سڈیشن کمیٹی کی رپورٹ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حسرت موہانی کا گہرا تعلق "ریشمی خطوط" کی سازش سے تھا۔ اس "سازش" کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغربی سرحد سے حملہ اور اندرون ملک مسلمانوں کی بغاوت کی مدد سے برطانوی حکومت کو ختم کر دیا جائے۔ اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے مولانا عبید اللہ سندھی ہندوستان چھوڑ کر افغانستان چلے گئے، ہندوستان میں اس پر عمل آوری کے ... ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ حسرت موہانی ... ملک کی سیاست کا حصہ ہے۔ وہ مسجد کانپور کا قضیہ ہو یا یونیورسٹی کی تحریک حسرت موہانی کا شمار صف اول کے رہنماؤں میں ہوتا رہا۔ ان تحریکوں میں انہوں نے ہمیشہ برطانوی حکومت کی مخالفت اور آزادی کے حصول کے مقصد کو

سامنے رکھا۔

جب ترکی کی سالمیت اور ادارہ خلافت کے تحفظ کا سوال در پیش آیا حسرت موہانی خلافت تحریک میں شامل ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ خلافت تحریک میں کئی اعتدال پسند علماء اور مسلم رہنما شامل تھے اس کو گاندھی جی کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس تحریک نے نہ صرف کانگریس کو کئی مسلم رہنما فراہم کئے بلکہ علاقائی رہنماؤں کو کل ہند سطح کا رہنما بھی بنا دیا۔ مولانا محمد علی اور مولانا آزاد، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری کی یہاں مثال دی جا سکتی ہے لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خلافت تحریک میں کس رہنما نے کیا رول ادا کیا، اس کا تجزیہ بہت کم کیا گیا ہے اور شاید اسی لئے جو مقام حسرت موہانی اور شیخ مشیر حسین قدوائی کو ملنا چاہئے وہ نہیں ملا۔ اس کے علاوہ خلافت تحریک کے رہنماؤں کے اختلافات کانگریس اور گاندھی جی کے بارے میں رویہ، تشدد اور عدم تشدد کے اصول کے بارے میں مختلف رائے اور فرقہ واریت کو کم کرنے کے وسائل وغیرہ کے سلسلے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

حسرت موہانی اپنے مزاج اور اپنے اصولوں کی وجہ سے خلافت تحریک کو ہمیشہ زیادہ ایجی ٹیشنل اور زیادہ پُرزور بنانا چاہتے تھے خلافت کا مسئلہ مذہبی تو تھا ہی لیکن حسرت موہانی اسے سراسر سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے، ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اس تحریک کو مخالف سامراجی خطوط پر چلایا جائے اس کے لئے دستوری طریقے مؤثر نہیں ہو سکتے تھے اس لئے انہوں نے جارحانہ ([illegible]) طریقوں کو اپنانے پر زور دیا۔ گاندھی جی سے اختلافات کی شروعات یہیں سے ہوئی ۱۹۱۹ء میں جب گاندھی جی سے حسرت موہانی، شردھانند اور شنکر لال بینکر نے کہا کہ خلافت کے مسئلہ کو پنجاب کے مارشل لاء سے بھی جوڑنا چاہئے تو گاندھی جی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پنجاب مارشل لاء ایک مقامی مسئلہ ہے جب حسرت موہانی نے کہا کہ اکثریت کی بنیاد پر یہ مسئلہ ہو گا تو گاندھی جی نے دھمکی دی کہ وہ خلافت کی تحریک سے الگ ہو جائیں گے نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی کی خلافت کانفرنس میں حسرت موہانی نے برطانوی مال کے بائیکاٹ کی تجویز رکھی گاندھی جی اس کو بھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے لیکن بنگال خلافت کانفرنس (فروری ۱۹۲۰ء) نے جب اس تجویز کو مان لیا تو گاندھی جی نے مخالفت ترک کر دی اسی طرح جون ۱۹۲۱ء میں حسرت نے اعلان کیا کہ اگر برطانوی تسلط کو ختم کرنے کے لئے افغان فوج ہندوستان میں آئے گی تو وہ اس میں شامل ہو جائیں گے، اس کی تائید شوکت علی، آزاد، سبحانی اور ظفر علی نے بھی کی، شاید یہی وجہ تھی کہ حسرت موہانی نے کھل کر ۱۹۲۰ء میں گاندھی کے کھدر اور چرخے کے اصول کی مخالفت کی۔

حسرت موہانی کی سیاسی زندگی کا اہم واقعہ ۱۹۲۱ء کا احمد آباد کا کانگریس اجلاس تھا اس کی سبجکٹ کمیٹی میں حسرت موہانی نے یہ تجویز رکھی کہ کانگریس کا مقصد مناسب اور موزوں طریقوں سے کامل آزادی ہونا چاہئے کامل آزادی کے بغیر خلافت کا مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکے گا حسرت موہانی نے یہ بھی کہا کہ اگر مارشل لاء کا نفاذ عمل میں آتا ہے تو ہندوستانیوں کو بندوق کی گولیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اس لئے عدم تشدد اور ترک موالات کا اصول ناکارہ ثابت ہو گا۔ ضروری ہے کہ خود حفاظتی کے لئے تشدد کے اصول کو مان لیا جائے اس تجویز کی سب سے زیادہ مخالفت گاندھی جی کی ان کے خیال میں جب تک ہندو مسلم اتحاد کا خواب حقیقت نہیں بن جاتا کامل آزادی کے تصور کو کانگریس کے لائحہ عمل میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرے لفظوں میں گاندھی نے یہ کہا کہ مکمل آزادی کے لئے ماحول سازگار نہیں تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "حسرت موہانی کی اس تجویز سے مجھے رنج ہوا کیونکہ اس سے احساس ذمہ داری کی کمی کا پتہ چلتا ہے"۔

گاندھی جی کی مخالفت کے باوجود حسرت موہانی نے یہ تجویز واپس نہیں لی اور اس کو کانگریس کے عام اجلاس میں پیش کر دیا۔ یہی تجویز جب مسلم لیگ کی سبجکٹ کمیٹی کے سامنے آئی تو اس کی مخالفت

حکیم اجمل خان ڈاکٹر انصاری اور سید رضا علی نے کی یہ تجویز ۴۶ کے مقابلے میں ۳۲ ووٹوں سے رد کر دی گئی لیکن
اس کے بعد بھی حسرت نے کامل آزادی کے تصور کو یا برطانوی سامراج کی مخالفت کو ترک نہیں کیا۔ انہوں نے
۱۹۲۱ء میں اعلانیہ اپنی تقریر میں تشدد اور گوریلا طریقۂ جنگ کی تبلیغ کی۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں یہ
تقریر کی :

"یکم جنوری ۱۹۲۲ء کو یونائیٹڈ اسٹیٹس آف انڈیا کا اعلان کر دیا جائے۔ لیگ کے جو مقاصد ہیں وہی کانگریس اور خلافت کے بھی ہیں صرف مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت مسلم لیگ سے مخصوص ہے۔ چاہیے یہ کہ اول سوراج حاصل کیا جائے اور اس کے بعد حقوق کی حفاظت ...... اگر گورنمنٹ خلافت اور پنجاب کے مسائل طے نہ کرے تو مسلم لیگ کا مقصد کامل آزادی سے بھی زیادہ ہونا چاہیے۔"

۱۹۱۹ء کی اصلاحات سے قبل حسرت موہانی نے مشیر حسین قدوائی، آزاد سبحانی، سید ذاکر علی، سید حسین، ریاض کے ساتھ مل کر ایک آزاد سیاسی پارٹی کی تشکیل کی۔ یہ کامل آزادی کے حصول کے لئے اور ہندو مسلم اتحاد اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعاون کی یہ ایک مخلصانہ کوشش تھی۔

حسرت موہانی کی سیاسی فکر اور سیاست کا ایک اہم پہلو انتہا پسندانہ سیاست پر یقین ہے وہ مذہب کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کئے جانے کو جائز سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں انتہا پسندی کی روایت رہی ہے بال گنگا دھر تلک، آربندو گھوش اور بپن چندر پال نے ہندو مذہب کو سیاست کا جزو لاینفک بنایا قومی آزادی، اتحاد، وغیرہ کی تفسیر اور تشریح بھی مذہبی اصطلاحات میں کی۔ چونکہ انہیں اعتدال پسند گروہ سے اختلاف تھا اس لئے اپنی تحریک کو عوامی بنانے کے لئے مذہب کے استعمال کو ضروری سمجھتے تھے۔

حسرت موہانی شاید مسلم رہنماؤں میں تلک کے سب سے بڑے مداح تھے یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ہندو انتہا پسندی کے خلاف اردو اخبارات نے اور اعتدال پسند مسلمانوں نے جیسے امیر علی، محسن الملک وغیرہ نے سخت تنقید کی لیکن حسرت موہانی کے خیالات پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں پڑا۔

"پالیٹکس میں ہم معتقدانِ وطن پرستان مسٹر تلک اور مسٹر کھاپرڈے و اعزاز بابو آربندو گھوش کی پیروی کو سب سے اولیٰ اور برلازمی سمجھتے تھے چنانچہ اس حیثیت سے فیروز شاہی کانگریس سے ہم کو اتنی ہی بیزاری ہے جتنی امیری مسلم لیگ یا تراشیدہ لال چندی کانگریس سے ہے اور ہمارے خیال میں یہ بیزاری بالکل حق بجانب ہے۔"

تلک کی شخصیت ان کے لئے زیادہ پرکشش اس لئے تھی کہ وہ تلک کو حریت اور وطن پرستی کا سب سے بڑا نمائندہ مانتے تھے۔ تلک کی قربانیوں حق گوئی اور اصولِ جمہوریت پر ایقان، حسرت کے نظریات سے میل کھاتا تھا اردوئے معلیٰ کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"جو تلک اپنے ہم وطنوں کو ذلیل نہیں سمجھتے بلکہ ان کی ظاہری اور باطنی قابلیتوں پر اعتماد کرتے اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ ایک دن وہ اپنی ضائع قوت و جبروت کو یقیناً دوبارہ حاصل کر لیں گے غرض کہ جن کی عمر کا ہر لحظہ اسی فکر میں گزرتا ہے کہ کسی طرح ہندوستان اور اہل ہندوستان کو آزادی نصیب ہو۔"

حسرت موہانی بھی تلک کی طرح دستوری طریقوں سے بیزار تھے کیونکہ بیرونی سامراجی حکومت میں دستوری اور حقوق کی بات بے معنی ہوتی ہے اس لئے انہوں نے سودیشی برطانوی مال کا بائیکاٹ

اور منافی مزاحمت کی تبلیغ نہیں کی۔

"ہم نے اپنے دل میں عہد کر لیا ہے کہ ان تمام تحریکوں کی اعانت ہر حال اور ہر وقت اپنا فرض لازمی سمجھتے ہیں اگر تحریر کے ذریعہ سے ممکن نہ ہوگا تو تقریر کے ذریعہ سے اور اس سے نہ ہو سکے گا تو عمل کا اتفاق تحریر و تقریر دونوں سے زیادہ مفید اور زیادہ ضروری ہے اس سے ہم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔"۱۴

حسرت موہانی قانونی طریقوں کے کھوکھلے پن سے بخوبی واقف تھے اور جانتے تھے کہ قانون برطانوی سامراج کی ہی حمایت اور حفاظت کرے گا اور اس کو نافذ کرنے والے اسے محکوموں کے خلاف ہی استعمال کریں گے۔

"جب تک ہندوستان میں مجسٹریٹ پولیس کے ہاتھ اثر رہیں گے اور خفیہ پولیس کی ان خبروں کو جو بلا کوشش کرنے کی تردید کا بعض ملزم کو کوئی موقع نہ مل سکتا ہے بعد مقدمہ سے قبل ہی کر لیا کریں گے جب تک وہ خود ایک شخص پر الزام لگائیں گے اور وہ خود فیصلہ صادر کریں گے اور پھر خود ہی اس کا انصاف کرنے بیٹھیں گے اس وقت تک مقدمات میں عموماً پولیٹیکل مقدمات میں خصوصاً انصاف پانے کی امید کرنا اوّل درجے کی حماقت ہے کیونکہ پولیٹیکل مقدمات میں ایک اور خرابی یہ بھی ہو جاتی ہے کہ ملزم کو اکثر فرنگیوں اور فرنگی حکومت کا دشمن کہا جاتا ہے اور اس لحاظ سے یورپین مجسٹریٹ کے دل میں اس کی جانب سے بعض کدورت کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے جس کی نسبت ہم اس کو الزام نہیں دے سکتے۔"۱۶

اس خیال کے پیش نظر حسرت نے کبھی تشدد کی بات کبھی گوریلا جنگ کی بات کی اور کبھی منافی مزاحمت کی۔ در اصل منافی مزاحمت کا اصول شری آربندو نے پیش کیا تھا لیکن اس کی تائید میں حسرت موہانی نے لکھا اس پر شری آربندو کو بھی رشک ہوگا۔

"حاکم سے محکوم اپنے ملکی حقوق کو تین ہی صورتوں میں لے سکتے ہیں اوّل درخواست مرحمت کے ساتھ گدایانہ دست طلب دراز کرکے جس کا بے کار ہونا قطعی ثابت ہو چکا ہے دوسرے خون ریزی اور فساد کے ذریعے حاکم کو مغلوب اور مجبور کرکے جس کی بظاہر حالات کوئی صورت نظر نہیں آتی پس ہمارے لئے سوائے اس کے اور کوئی کاروائی مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ فی الحال نہ تو ہم گداگری کی ذلت گوارا کریں نہ جنگ و جدل کی آزمائش میں پڑیں بلکہ ان دونوں سے علاحدہ رہ کر منافی مزاحمت کے درمیانی طریقے پر چلنا شروع کر دیں جو مفید ہونے کے بجائے کبھی مضر ہو ہی نہیں سکتا اور یہی وہ بات ہے جس کی بنا پر مزاحمت کی پالیسی کو طلب کی پالیسی پر صریحاً ترجیح حاصل ہے کیونکہ بحالت ناکامی گداگر کی طبیعت مایوسی کے ایسے غار میں گر جاتی ہے جس سے دوبارہ نکلنا اس کے لئے بالکل محال ہو جاتا ہے لیکن برخلاف اس کے مزاحم اگر ناکام بھی رہے تو دوران مزاحمت میں ایسی قوت اور تجربہ حاصل ہو جاتا ہے اس کا فائدہ کسی طرح زائل نہیں ہو سکتا۔"۱۸

گاندھی جی سے اختلاف کی وجہ یہی تھی کہ حسرت نے عدم تشدد کو اصول کے طور پر کبھی بھی نہیں مانا انہوں نے باردولی پروگرام کو صرف اسی وجہ سے رد کر دیا کہ جب مذہب تشدد کی تلقین کرتا ہے

اقدام تصور کرکے مانا جانا چاہیئے۔ حسرت موہانی نے اسی شدت اور اسی خلوص کے ساتھ سودیشی کی حمایت کی۔ "ایک سودیشی اسٹور بھی کھول کر سطحیت کو رد دے" "مصنف" لکھتے ہیں کہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ "سردی کی رات حسرت نے کمبل اوڑھے بغیر گزار دی کیونکہ وہ کمبل ولایتی" تھا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت موہانی کے نظریات پر تلک کے فلسفۂ سیاست کا اثر کتنا واضح تھا؟

حسرت موہانی نے تلک سے یہ بھی سیکھا کہ ہندستان کی آزادی دراصل یہاں کے محنت کش طبقوں کی آزادی ہوگی۔ ان کی فلاح و بہبود کے لئے یہاں کی قومی تحریک، سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کو اس مقصد کے لئے جد و جہد کرنی چاہیئے۔ یہی بات حسرت موہانی کو کمیونزم کی طرف کھینچ لائی۔ انقلاب روس کے بعد ہی حسرت موہانی نے ہندستان میں بھی ایسے نظام کے قیام کے لئے اپنی شاعری اور اپنی تقریروں میں تبلیغ شروع کر دی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں اودھ خلافت کانفرنس ہوئی، اس کی صدارت مشیر حسین قدوائی نے کی، اس میں حسرت موہانی نے بھی حصہ لیا، ان کی تقریر میں بالشویک فلسفے کے خیر مقدم کا رجحان نمایاں تھا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ہی حسرت موہانی کانپور میں ایک نیشنل کمیونسٹ پارٹی قائم کرنا چاہتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں کانپور میں پہلی آل انڈیا کانفرنس ہوئی اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر حسرت موہانی تھے ان کے خطبۂ استقبالیہ کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"کمیونزم کی تحریک کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے اس تحریک کے اصول اور اغراض و مقاصد سے جمہور اہل ہند عموماً اتفاق کرتے ہیں البتہ بعض صورتوں میں غلط فہمیوں کی بناء پر کمیونزم کے نام سے بعض کمزور اور وہمی طبیعت کے لوگ گھبراتے ہیں مثلاً بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم اور خونریزی و فساد لازم و ملزوم ہیں حالانکہ اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے ہم لوگ عدم تشدد کو ضرورت و مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں اور مہاتما گاندھی کی طرح اس کو ہر حالت میں بطور اصول لازم قرار نہیں دیتے ہو"[۲۳] کمیونزم کے پرچار کو وہ آزادی کی تحریک کا ایک جز سمجھتے تھے۔

"آزادی کامل کا کل جائز طریقوں سے قائم کرنا سوراج کی ہیئت سوویت رشین کی طرح ہو جہاں کمیونزم کے اصولوں پر عمل کیا جائے سوراج کے قائم ہونے تک کاشتکاروں، مزدوروں کی فلاح اور آزادی کی ہر ممکن کوشش کرنا اور اس ضمن میں ہندستان کی سیاسی جماعت کے اس حد تک اشتراک عمل کو جائز رکھنا جس حد تک یہ جماعت ہمارے مذکورہ بالا اغراض کی تائید کرے، کمیونزم کے اصولوں کی اشاعت کا سامان کرنا اور جمہور کو اپنا ہم خیال بنانا تاکہ سوراج کے قیام کے ساتھ فوراً ان پر عمل شروع ہو سکے"[۲۴]

حسرت کمیونزم کے روح کو سمجھتے تھے اس فلسفے اور روح کی مذہب میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا تھا اپنے خطبۂ استقبالیہ میں انہوں نے کہا کہ :-

"واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ مذہب کے بارے میں انتہا درجہ کی رواداری کو مناسب سمجھتے ہیں، جو شخص ہمارے اصولوں کو نہ مانے وہ ہمارے فریق میں داخل ہے، خواہ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، عیسائی یا بودھ ہو۔ مذہبی شخص ہو یا مذہب بالفاظ دیگر ہم ہر مذہب کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں ہمارے نزدیک لامذہبی بھی ایک مذہب ہے

ہمارے بعض مسلمان لیڈر بلاوجہ کمیونزم کو اسلام کے خلاف بتاتے ہیں حالانکہ حقیقت حال اس کے خلاف ہے مثلاً کم از کم سرمایہ داری کے خلاف تو اسلام کا فیصلہ شاید کمیونسٹ عقیدے سے بھی سخت ہے اور فریضہ زکوٰۃ کا منشاء بھی زیادہ تر یہی ہے کہ خلق خدا میں جب تک ایک شخص بھی بھوکا رہے اس وقت تک مالداروں کو عیش کرنے کا کوئی حق نہیں ہے قرآن میں نماز کے بعد سب سے زیادہ زور زکوٰۃ پر ہی دیا گیا ہے [۲۳]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حسرت موہانی نے نہ صرف مزدوروں کی بات ہی نہیں کی بلکہ انہیں منظم کرنے کے لئے کوششیں بھی کیں۔ ان کی شکایات کو دور کرنے کے لئے سیاسی جماعتوں کو تیار بھی کیا اس کی ایک مثال کانپور کا یہ واقعہ ہے۔ چودھری خلیق الزماں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

"کانپور کانگریس کا اجلاس مشہور شاعرہ سروجنی نائیڈو کی زیر صدارت ہوا۔ جب سب لوگ اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو پنڈت جواہر لال نہرو نے میرے کان میں کہا "مولانا حسرت موہانی مزدوروں کے حامی ہو گئے ہیں اور یہاں آکر مزدوروں کی شکایتوں کے بارے میں کانگریس رہنماؤں کو سمجھانا چاہتے ہیں۔ انہیں دروازہ پر روک دیا گیا اور وہ دھمکی دے رہے ہیں کہ وہ دروازہ توڑ کر پنڈال میں آجائیں گے، جواہر لال میں اور عزیز انصاری یہ دیکھنے کے لئے گئے کہ کیا ہو رہا ہے لیکن جب ہم وہاں پہنچے دروازہ ٹوٹ چکا تھا اور بڑی تعداد میں مزدور ہنگامہ کرتے پنڈال میں داخل ہو گئے تھے عزیز کے ہاتھ پر لاٹھی پڑی اور سر پر میرے پڑی اور اس وقت تک کہ میں کچھ کہوں سکوں میں نے دیکھا کہ مولانا حسرت موہانی پنڈال میں جا کر صدر سے بحث کر رہے تھے لیکن بات چیت سے مولانا مطمئن ہو گئے [۲۹]

حسرت موہانی نے اپنی شاعری میں بھی کمیونزم کا اظہار کیا ہے [۳۰] حسرت موہانی مسلم لیگ کے باقاعدہ رکن رہے اور اس کی مجلس عاملہ میں بھی برسہا برس شریک ہوتے رہے اور وہ ہمیشہ کامل آزادی کے طرفدار رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک وفاقی حکومت کا بھی تصور پیش کیا۔ یہی سے ان کے سیاسی شعور کی پختگی اور سیاسی بصیرت کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے، اور اس کے بجائے وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہاں کی اقلیتوں کے مسائل کا وفاقی حکومت کے ذریعے حل ممکن تھا وہ ایسی وفاقی طرز حکومت چاہتے تھے جس کے صوبے اندرونی طور پر آزاد ہوں اگر مرکزی حکومت مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں کے مفاد کے خلاف اقدام کرے تو یہ صوبے وفاق سے بالکل باہر نکل آتے ہیں اور اگر ہندو اکثریتی صوبے تو آزاد وفاقی طرز حکومت پر قناعت کر لیں تو اسلامی اکثریت کے صوبے آزاد حکومت بنا لیں گے [۳۱] ان کے خیال میں ہندوستان میں پانچ جمہوریتیں قائم ہوں! ۔

مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان، مرکزی ہندوستان، جنوب مشرقی ہندوستان، جنوب مغربی ہندوستان ان سب کو وفاقی حکومت کا اجزائے ترکیبی ہونا چاہیے [۳۲]

بغور دیکھا جائے تو حسرت موہانی کا وفاقی حکومت کا تصور ہندو مسلم تنازعہ اقلیتوں کے مسائل اور قومیتوں کی ترقی کا بہترین حل معلوم ہوتا ہے۔ حسرت موہانی کی سیاسی ڈائری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی اسکیم جناح، گاندھی اور دوسرے رہنماؤں کے سامنے پیش کیں اور سی راج گوپال اچاری کو انہوں نے اپنا موافق بھی بنا لیا تھا [۳۳]۔ گاندھی جی نے بھی اس سے اتفاق ظاہر کیا تھا حسرت کے الفاظ میں "رات کو گاندھی جی کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا تھا"

خدا کی شان جو شخص کبھی اسٹیبلشمنٹ کا خیر اور ان آبادی کا دشمن تھا اب بالکل بدلا ہوا ہو گیا ہے ۲۰ لیکن برطانوی سامراج کو کچھ اور مقصود تھا۔

حسرت موہانی کی سیاسی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی حق گوئی بیباکی اور غیر معمولی جرأت تھی ان کی زندگی سے ایک مثال بھی ایسی نہیں دی جا سکتی جس سے یہ ثابت ہو کہ انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کیا وہ اپنے اصولوں کی قیمت دینا جانتے تھے انہوں نے کبھی برٹش حکام کے آگے سر جھکایا اور نہ ہندوستانی لیڈروں کی خوشامد کی ان کی طرز زندگی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

"مرجس مسلمان اور ان کے مانند جملہ ارباب تہور و غرور کو معلوم ہو جانا چاہیے ان کی نارضامندی دولت و جاہ کے لئے خواہ کیسی ہی مہیب اور اہم کیوں نہ ہو مگر ہم سے آزاد فقیروں کا اس سے مرعوب و مغلوب ہونا کسی صورت سے ممکن نہیں ہے ۲۱"

اس طرح جب مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۱۳ء میں آگرہ میں ہوا تو مسجد کانپور کے واقعہ کے سلسلے میں ہارڈنگ کا شکریہ کا ریزولیشن پیش کیا گیا۔ حسرت نے اس کو نہ صرف ناپسند کیا بلکہ مخالفت کی۔ ۱۹۱۹ء میں امرتسر کانگریس کے اجلاس کے بعد گاندھی جی کے مشورہ کے مطابق مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے سے ملنے گیا۔ "مگر رسمی عرض و معروض و جواب کے بعد وائسرائے سے ہاتھ ملانے کا اعزازی لمحہ آیا تو حسرت پیچھے سے اٹھ کر بے ہاتھ ملائے گزر کر اس طرح نکل آئے کہ کسی نے دیکھا بھی نہیں ۲۲"۔

جب بھی انہیں یہ احساس ہوا کہ گاندھی جی کی پالیسی بھی غلط ہے فوراً مخالفت کرنے کھڑے ہو جاتے یہی بات جناح کے ساتھ بھی جناح اپنی مقبولیت کے نقطۂ عروج پر پہنچے ہوئے تھے مسلم لیگ کے مسلم رہنما سارے اختیارات انہیں سونپنا چاہتے تھے اجلاس (الہ آباد) میں تجویز پیش ہوئی جس پر خرکاروں کی بھی یہی خواہش تھی۔ حسرت موہانی تنہا اس تجویز کے خلاف تھے اس وقت تقریر کرنا بڑی ہمت کا کام تھا حسرت موہانی بلند تھے اپنی تقریر میں کہا۔

"میں پاکستان کا موید ہوں لیکن پاکستان کا دشمن کا قائل نہیں بلکہ پاکستان جمہوریت کا علمبردار ہوں اور یہی نکتہ میرے اور قائد اعظم کے درمیان خلیج پیدا کر رہا ہے ۲۳"

حسرت موہانی کا یہ رویہ آزادی کے بعد بھی قائم رہا ہندوستانی لیڈروں کا ایک طبقہ یہ چاہتا کہ ہندوستانی مسلمان اس ملک کے ساتھ اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے پاکستان پر نکتہ چینی کرے، سردار پٹیل نے تو وفاداری کی شرط ہی لگا دی تھی حسرت موہانی خاموش رہے پاکستانی حکومت کی پالیسیوں کو ناقص سمجھنے کے باوجود کچھ نہیں کہا کیونکہ ہندوستانی حکومت کی خوشامد کی بو آتی تھی ۲۴"

حسرت موہانی دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے۔ اسمبلی کی کارروائیوں میں گہری دلچسپی لیتے تھے لیکن جب دستور میں مخصوص قسم کا وفاقی طرز حکومت کو قبول نہیں کیا گیا تو انہوں نے دستور پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا دیسی ریاستوں کے بارے میں حکومت ہند کے رویہ پر تنقید کرتے ہوئے سردار پٹیل سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تم نے وہی کیا جو ہیسٹنگز، ڈلہوزی اور کلائیو نے کیا تھا، تم نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر کمزور ریاستوں کی آزادی چھینی ہے، تمہارے محکمہ پر خدا کی لعنت ہو ۲۵"۔ حیدرآباد میں ہندوستانی افواج کی فتح پر مبارکباد دینے کے لئے یوپی اسمبلی میں تجویز پیش ہوئی تو اس کی مخالفت کرنے والے بھی تنہا حسرت تھے۔

۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو رہا کر دیا گیا۔
"۱۰ فروری ۱۹۴۸ء ...... ہم برٹش گورنمنٹ کی بدگمانیاں رفع کرنے کی غرض سے جس طرح سرسید نے مسلمانوں کو صرف تعلیمی اور سماجی امور پر زور دینے اور سیاسی وفاداریِ برطانیہ کی تلقین کی تھی بالکل اسی طرح آپ کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کو بلا شرط وفاداری سکھلاتے ہیں اور اسلامی اداروں کو سماجی امور محدود کر دینے رہے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔" آزادی کے بعد جس طرح سے مسلمانوں کے بارے میں انہوں نے جس حقیقت پسندی سے سوچا اس کی مثال ملنی مشکل ہے:
"۱۶ ستمبر ۱۹۴۸ء ...... مسلمانوں کو اظہار مایوسی کی ضرورت نہیں اگر ضرورت ہو تو انہیں حکومتِ موجودہ کے خلاف گوریلا طریق جنگ اختیار کرنا چاہیے۔"
"۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء ...... فضل الحق بھی ملنے آئے وہ انڈیا کے مسلمانوں کی مدد کا جذبہ لے کر مشرقی پاکستان سے آئے ہیں اور مخلص معلوم ہوتے ہیں میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ مگر اتنا کہہ دیا کہ بحمد اللہ کم سے کم یوپی کے مسلمان اب لوگوں کی مدد کے بغیر بھی اپنی حفاظت کر لیں گے:
۱۵ اگست ۱۹۴۹ء "آج یومِ آزادی کے سلسلے میں راجہ جی کے یہاں شب کی دعوت تھی میں بھی مدعو تھا مگر موٹر یا سواری کا انتظام نہ ہو سکا اس لئے نہ گیا علاوہ ازیں حاصل شدہ آزادی کو حقیقی آزادی سمجھنے کا ابھی میرے دل کو اطمینان نہیں ہے۔"[۲۶]

حسرت موہانی کے اس طرح کے کتنے ہی واقعات یہاں پیش کئے جا سکتے تھے۔ طوالت کے خیال سے اوپر بیان کئے گئے چند واقعات ان کی سیاسی شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ حسرت موہانی تحریکِ آزادی کے سرفروش مجاہد تھے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد حسرت موہانی جیسے رہنما نایاب اگر نہیں تو کمیاب ضرور ہیں وہ تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے ان کی سیاسی نظر بہت دور رس اور سیاسی فکر حقیقت پسندانہ اور سائنٹفک تھی، آزادی سے قبل کی ہندو اور مسلم سیاست میں شاید ہی کوئی ہو جس نے مسلسل اور پیہم کامل آزادی کی بات کی ہو۔ آزادی سے محبت اور سامراج سے نفرت کے پیچھے صرف جذبہ اور جوش کارفرما نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد ان کی سامراجیت کی گہری سوجھ بوجھ تو آبادیاتی ملکوں پر اس کے تباہ کن اثرات، انصاف اور حقوق کی پامالی اور ذہنی اور تہذیبی غلامی کی لعنت تھی، برطانوی حکومت سے نفرت اور برطانوی حکام سے بیزاری جس شدت سے حسرت کی شاعری اور تقریروں اور تحریروں اور عمل میں ملتی ہے۔ اس کی مثال شاید ہی کوئی ہو وہ بخوبی واقف تھے کہ عام ہندو اور عام مسلمان کامل آزادی چاہتا ہے لیکن رہنماؤں کی مصلحت اور بزدلی انہیں حقیقت پسند بننے سے روکتی ہے۔ احمد آباد کے کانگریس اجلاس میں بھی انہیں یہی بات دکھائی دی۔ کانگریس کے پرچوں میں شاید اس کا ذکر نہ ملے لیکن یہ صحیح ہے کہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی میں انہیں ۲۵ فیصد اور عام اجلاس میں ایک تہائی اراکین ان کے حامی تھے۔

حسرت موہانی کا تعلق ہندوستان کی انتہا پسندانہ سیاست سے تھا مسلمانوں میں وہ اس روایت کے سب سے اچھے نمائندے ہیں، لیکن ہندو اور مسلم کی تخصیص کے بغیر یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ حسرت موہانی کی سیاسی ایمانداری کسی اور رہنما میں نہیں ملے گی، حسرت موہانی تلک کا بڑا احترام کرتے تھے ان سے بڑھ کر تعریف حسرت نے کسی لیڈر کی نہیں کی لیکن ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، سامراجیت کی تاریخ شاہد ہے کہ سامراجی حکام عام طور پر نو آبادیاتی ملکوں کے استحصال کرنے

والے طبقوں سے مل کر ہی حکومت چلاتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں جاگیردارانہ سماج یا سرمایہ دارانہ نظام
کے وجود میں آنے سے قبل کے استحصال کرنے والے طبقے ہی زیادہ آسانی سے بیرونی حکام سے سمجھوتہ اور مصالحت
کرتے ہیں ان ہی طبقوں سے حسرت کی زبان میں اہل ثروت و جاہ کے افراد قومی تحریک میں بھی شامل ہو جاتے
ہیں سمجھتا ہی بن جاتے ہیں۔ شعوری اور غیر شعوری طور پر بیرونی ملکیت یا سامراج کے دشمن ہونے کے
ساتھ ساتھ اپنے سیاسی اور معاشی تعلقات میں بھی استحصال کرنے والوں کے حامی ہی رہتے ہیں ذرا سا
بھی جنہوں نے مکمل آزادی کی بات کی، ان کی نظر سے زمینداروں اور سرمایہ داروں کی یہ بربریت اور ظلم و ستم
دیا تو وہ تنگ لے کو کہا کے زمینداروں (حکومت) اور سود خوروں کے مفاد میں تھا حسرت سے کبھی اس طرح کا
سیاسی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ دوسرا فرق مذہب اور سیاست کے اتحاد کی نوعیت کا ہے تلک اور ان کے
ساتھیوں نے سیاست کو اتنا مذہبی بنا دیا تھا کہ اس میں اقلیتوں کو اکثریتی غلبہ کا گمان ہوتا تھا
کے ہیرو اور تاریخی شخصیتیں، تاریخی حقائق سے بے نیاز ہو کر گمراہ کن توہم پرستوں کو فروغ دیتے تھے تھی۔
حسرت نے کبھی ایسا نہیں کیا ان کے نزدیک سیاسی مقصد سب سے زیادہ اہم رہا مذہب کا استعمال رجعت
پرست سیاست یا احیا پسند ذہنیت کی تشکیل کے لئے کبھی نہیں کیا۔ انہوں نے مذہبی عمل اور رواداری کی ہی
جانب تلقین کی۔ ان کے اکثر ساتھی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان سماجی معاملات میں تنگ نظر رہے۔ حسرت موہانی
چونکہ سر سید کی تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں افادیت کے قائل تھے اس لئے وہ سماجی مسائل کے بارے میں
کھلا ذہن رکھتے تھے۔

کمیونسٹ پروگرام اور کمیونزم کے تئیں حسرت موہانی کی دلچسپی اتفاقیہ نہیں تھی سنہ ۱۹۰۶ء
سے ہی وہ جن حالات کا اظہار کر رہے تھے، اس کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ کمیونزم کی سمت جھکاؤ تھا کمیونسٹ
پارٹی کی دستاویزات کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ کانپور کی پہلی کمیونسٹ کل ہند کانفرنس سے
قبل ہی حسرت موہانی نے ایک نیشنل کمیونسٹ پارٹی قائم کرنا چاہتے تھے، کانپور کانفرنس کے
خطبۂ استقبالیہ میں جو باتیں انہوں نے کیں اور کمیونسٹ پارٹی کو جو پالیسی اپنانے کی تلقین کی وہ کمیونسٹ پارٹی
کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی رہیں۔ کمیونزم اور مذہب کے بارے میں ان کے تاثرات کئی غلط فہمیوں
کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوئے ایسا لگتا ہے کہ مذہب کے بارے میں حسرت کا رویہ ہی زیادہ
صحیح تھا، جو پروپیگنڈہ کمیونزم کے خلاف کیا جاتا رہا ہے وہ مذہب کو "افیون" سے تعبیر کرتا ہے، پوری
طرح صحیح نہیں ہے خود مارکس نے جب یہ لکھا ہے اس مضمون میں وہ مذہب کو مصائب اور اضطراب کا
علاج مذہب میں تلاش کرنا نہ صرف زندگی کے حقیقی مصائب کا اظہار ہے بلکہ ان کے خلاف
احتجاج بھی ہے۔ مذہب کچلے ہوئے انسان کی آہ، سفاک دنیا کا نرم دل اور بے روح حالات کی
روح ہے۔ مذہب عوام کی افیون ہے۔

مذہب کو فریب حسرت سمجھ کر ترک کرنا حقیقی مسرت کا مطالبہ ہے موجودہ حالات کے تعلق
سے فریب کے ترک کرنے کا مطالبہ دراصل اس بات کا مطالبہ ہے کہ ان حالات کو ختم کیا جائے جن کے
لئے فریب ضروری ہے اس لئے مذہب کی تنقید مختصراً آنسوؤں کا سمندر کی تنقید ہے جن کا ہالہ مذہب ہے
مزے کی بات یہ ہے کہ حسرت موہانی کی سیاسی بصیرت کو ان کی ناکامی کا سبب قرار دیا جاتا ہے اس پر الزام ہے
کہ وہ سیاست کے میدان میں "حد سے زیادہ مخلص" تھے۔ مذہبی پہلو پر ان کی تنقید اور کمیونزم
اور مذہب کے بارے میں ان کے خیالات کی بنیاد جذباتیت کو ٹھہرایا جاتا ہے[۳۹]۔ ان پر یہ الزام ہے
کہ وہ (ناپارلیمنٹ) تھے کیونکہ ان کا سیاسی شعور بغاوت کی منزل پر رک جاتا ہے اور ان کے
بہترین لائحہ عمل نہ وضاحت پائی جاتی ہے اور نہ استقامت[۴۰] کہا ہے، دراصل مذہب کے بارے

مارکس نے لکھا تھا اس کا متعصبانہ مذہب کے اس بدل کو اجاگر کرنا تھا جو استحصال کرنے والوں کی پست [illegible] ادا کرتا ہے، بینی اندر گیا کی تحریر میں بھی حسرت موہانی کے نقطۂ نظر کی ہی تائید کرتا ہوں، ہمارے خیال میں حسرت کی سیاست کے بارے میں اس طرح کا تنقیدی نقطۂ نظر مناسب ہے گاندھی اور قائد اعظم کی تنقید پر اس حق بجانب ہے اس طرح کی تنقید پنڈت نہرو اور ابوالکلام آزاد نے بھی کی تھی کیا وہ بھی جذباتی تھے؟ جس شخص کی ساری زندگی غیر مصلحت پسندی اور غیر مصلحت کوشی سے عبارت ہو اس پر اس طرح کا الزام لگانا زیادتی ہے ہاں جو عام طور پر جو مفہوم کامیابی کا لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کامیابی حسرت کو نہیں ملی۔ لیکن اپنی کامیابی سے ان کو کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی، بعض لوگ کمیونسٹوں کا یہ خیال ہے کہ حسرت کے تعمیری لائحہ عمل میں وضاحت کی کمی تھی، صحیح نہیں ہے۔ کیا ہندوستان تحریک آزادی کے کسی بھی رہنما کے لائحہ عمل میں ایسی وضاحت اور استقامت ملتی ہے؟

دراصل یہ پوری بحث ہی لغو معلوم ہوتی ہے کیونکہ وضاحت اور استقامت کا انحصار مختلف طبقات کے مفاد سے وابستہ رہتا ہے مثال کے طور پر ہر بڑے لیڈر جیسے گاندھی جی، نہرو، مولانا آزاد، ڈاکٹر امبیڈکر وغیرہ نے پارلیمانی طرز حکومت کی سختی سے مذمت کی تھی لیکن آزادی کے بعد ان سب رہنماؤں نے اسے تسلیم کر لیا، کیوں؟ گاندھی جی پورے خلوص کے ساتھ اس ملک کے اقتدار کو کسانوں کے ہاتھ سونپنا چاہتے تھے لیکن ملک سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں گیا، کیوں؟ پنڈت نہرو پورے خلوص سے اشتراکیت کے طرف دار تھے، لیکن ان کی ساری اقتصادی پالیسیوں نے امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنا دیا۔ کیوں؟ کیا ان کے تعمیری لائحہ عمل میں وضاحت اور استقامت کی کمی تھی؟

ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب نے لکھا ہے کہ:

"مرگ حسرت کا ماتم کرنے والے دیار شوق کے باشندے ہوں گے نہ کہ سیاست کے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسرت کو وجدانی طور پر اس کا احساس تھا کہ اگرچہ انہوں نے اپنی عمر سیاست کے پاپڑ بیلنے میں گزاری لیکن آئندہ نسلیں انہیں ان کے سیاسی کارناموں کے سبب سے یاد نہیں رکھیں گی"....

حسرت نے اپنے سیاسی عقائد کی خاطر مصیبتیں جھیلیں اور سیاست کی دیوی پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا لیکن سیاست بڑھتی ڈھلتی چھاؤں ہے یہ دنیا کی طرح کبھی کسی کی ہوئی اور نہ ہوگی آج دیار سیاست میں حسرت کا نام لینے والا کوئی نہیں[۱۳۲]

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے:

"کیسی پتے کی بات کسی نے کہی کہ سیاست کوئلہ کا کاروبار ہے جس میں سبھی کا ہاتھ اور منہ کالا ہوتا ہے، سوائے حسرت کے"[۳۴]

دقت یہ ہے کہ حسرت سیاست کو بڑھتی ڈھلتی چھاؤں سمجھتے تھے اور نہ کوئلہ کا کاروبار، سیاست کو ہمیشہ انہوں نے میدان عمل اور اپنے عقیدے کی تشہیر کا مؤثر ذریعہ سمجھا، حریت اور بغاوت، انصاف اور مساوات، جمہور کی خوشحالی اور بہبودی ان کے نزدیک سیاست دانوں کے یا اہل ثروت و جاہ کے ذاتی مفاد کو فروغ دینے کے لیے پرکشش نعرے نہیں تھے بلکہ ایسے اصول تھے جن کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دی جا سکتی ہے حسرت اپنے دوستوں کو بھی پہچانتے تھے اور دشمنوں کو بھی، سیاست نے انہیں دوستوں سے محبت و خلوص اور دشمنوں سے نفرت سکھائی۔

وقتی طور پر شاید حسرت کی سیاست اور سیاسی زندگی کو نظر انداز کر دیا جائے یا بھلا دیا جائے

مگر ان کے کارناموں کا [illegible] [illegible] اور [illegible] آپ کو متحرک دیتا ہے دیکھا جائے
کہ یہ عمل کب تک جاری رہے گا ممکن ہے یہ عمل برسوں جاری رہے اگر پھر زمانے کے [illegible] عصری تاریخ ہو تب
وہ حضرت مولانا کی شخصیت کا جن آثار کے حالات کے بغیر تذکرہ کیا جائے تو یہ بات مکمل کر سکے گا کہ آپ کو
آنے والی نسل کے لئے حضرت بالکل اجنبی ہوں گے اور یہ ہندوستان کے لئے اجنبی ہو گا۔ جس تہذیب کا ماحول
میں ہم سانس لے رہے ہیں اس کا تصور بھی حضرت کے ذہن میں نہیں ہو سکتا [illegible] کے بارے میں
کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن [illegible] اور ارشاد [illegible] کا ذخیرہ بن گیا ہے۔ [illegible]
آخر کو بات سمجھانے کی ہے۔ [illegible] کوئی شرم نہیں ہوتی، [illegible] مجبور [illegible]
[illegible] ہیں۔ پتہ نہیں ہم کس تہذیب کے وارث ہیں اور کس تہذیب کے علمبردار ہیں جبکہ اس
دنیا اور ایسی فضا میں حضرت مولانا حق شناس و حق پسند حق یقین و حق گوئی کو یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔

***

سید آل رسول برکاتی مارہروی

فلسفۂ عشق کے علمبردار
شاہ برکت اللہ پیمی

ہندستان ہر دور میں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا ... رہا ہے۔ تاریخ و تہذیب کے لمبے سفر میں ہندستان نے کبھی اس کثرت کو قربان کرکے وحدت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہند کے فکر و فلسفے کے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے یہ ہندستان ایک ترقی پذیر اکائی رہا ہے جس نے ایک طرف خود یہاں کے باشندوں کے مختلف رنگوں کو یک رنگ بنانے اور دوسری طرف نئے عہد کے اجنبی نظریات کو ہم آہنگی عطا کرنے کی کوشش کی۔

وحدت و کثرت کے اس صدیوں طویل سفر کے کسی موڑ پر وادی سندھ کی تہذیب کا یہ دھارا آریوں کے ملن کے بعد تروینی میں بدل گیا۔ ایک رنگ دوسرے رنگ میں یوں ملا کر سب ایک رنگ ہو گیا۔ لطف یہ کہ ہر رنگ منفرد رہا۔ جغرافیائی اصطلاح میں رنگوں کی یہ دھنک ہند کہلائی ہندو، جو سنسکرت میں سندھو اور عربی (قرآن) میں سندس ہوا۔ پھر آئے ہندوستان کے مسلمان فاتحین، جو اس دھرتی پر بسنے کے بعد یہاں کے لئے اجنبی یا غیر ملکی نہ رہے۔ ہندوستان نے زندگی کے قومی فلسفے کے دائرے میں رہتے ہوئے بہت جلد ایک ایسے اعلیٰ قومی نظریئے کو فروغ دیا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے۔ اب یہ دونوں دھارے ایک ہو کر ہندی یا ہندوستانی کہلانے لگے۔ تاریخ ہند کا یہ کارواں ایکتا کی پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ وقت کی دھوپ چھاؤں کے ساتھ اس پگڈنڈی نے شاہراہ کا روپ لے لیا۔ ہندوستان نے اپنی یک جہتی کو نئی سمتیں، نئی قوتیں اور کثرت میں وحدت کے اپنے قدیم روپ کو نت نئے زیور عطا کئے۔ ہندی یا ہندوستانی کا یہ نظریہ ہند کے باشندوں کے تمام طبقوں میں رچ بس گیا تھا۔ اسی تصور کے علمبردار تھے شاہ برکت اللہ جنھوں نے سترہویں صدی عیسوی میں صوبجات متحدہ یعنی موجودہ اترپردیش کے ضلع ایٹہ کو اپنے وجود سے مشرف فرمایا۔ یہی وہ ضلع ایٹہ ہے جس نے ہندوستان کو مہاکوی تلسی داس (مقام پیدائش سوروں) اور سلطان العاشقین امیر خسرو (مقام پیدائش پٹیالی) جیسی عظیم ہستیاں عطا کیں۔

شاہ برکت اللہ کا تعلق سادات زیدیہ سے ہے جو عراق کے واسط شہر سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے اور بلگرام ضلع ہردوئی کو اپنا مسکن بنایا۔ شاہ برکت اللہ اپنے والد میر اویس کی وفات کے بعد بلگرام میں رہ نہ پائے۔ کالپی تشریف لے گئے اور وہاں سید فضل اللہ کالپوی سے بیعت ہو کر مارہرہ، ضلع ایٹہ (یوپی) آئے۔ یہ گیارھویں صدی ہجری کے آخری دو چار برس کی بات ہے آپ کے دادا میر عبدالجلیل کوئی چالیس پچاس سال پہلے مارہرہ کو اپنا وطن بنا چکے تھے۔ شاہ برکت اللہ نے اپنے دادا کی خانقاہ ڈیرہ ڈال دیا۔ لیکن گونڈل نامی مقامی باشندوں کی شرارتوں تنگ آکر آپ دادا کی خانقاہ سے اٹھ آئے اور قصبے سے با

یہ جو بستی بسائی۔ اس کا نام پیر محمد برکت نگری رکھا۔ آج یہ میاں کی بستی یا بستی پیرزادگان کے نام سے مشہور ہے۔

شاہ برکت اللہ کی پوری زندگی اسی ہندوستانی ثقافت کا مظہر ہے جو آج سے چار سو برس پہلے ہندوستان جنت نشان کی باتیں تھیں۔ ویدانت کی تعلیمات اور مسلمان صوفیوں کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت ہندو مسلم اتحاد اور گنگا جمنی ثقافت کو فروغ ملا۔ مسلمان صوفیوں نے مذہبی اختلافات کو ایک طرف رکھ کر ایکتا پر زور دیا۔ مسلمان صوفیوں اور بھگتی تحریک سے تعلق رکھنے والے سنتوں کے اثر سے ہندوستانی سماج پر اس کا نکھار آیا۔ ہندوستان کی اس مشترکہ ثقافت کے فروغ میں شاہ برکت اللہ نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے ہندو مسلم ایکتا کو انسانیت کی نجات کی بنیاد بتایا۔ ملا کی تسبیح اور پنڈت کی مالا الگ الگ ہو سکتی ہے مگر ان میں توحید کا ڈورا ایک ہی ہوتا ہے۔

ہزاراں خانہ ویک خانہ سازست
ہزاراں شیشہ ویک جلوہ سازست

(ریاض عشق)

ہزاروں خانے بنے مگر بنانے والا تو ایک ہے۔ ہزاروں شیشے ہیں مگر جلوہ تو ایک ہی ذات کا ہے۔

آنکہ با خود آشنا شد دل گزشت از دین وکیش
ہیچ کر او را خیال سبحہ و زنار نشد

(دیوان عشقی)

آدمی خود کو پہچان کر دل سے دین دھرم کے فرق کو دور کر دے۔ ایسے آدمی کو تسبیح اور مالا میں کوئی امتیاز نہیں۔

در صنم خانہ و مسجد نگر از دیدۂ دل
عشقیا ہست عیاں جلوۂ برکات اللہ

(ترجیع بند)

دل کی آنکھ کھول کر بت خانے اور مسجد کو دیکھو۔ ہر جگہ پیدا کرنے والے کی برکتوں کا جلوہ ہی نظر آئے گا۔

شاہ برکت اللہ کا تعلق ہندی شاعری کے اس اسکول سے ہے جسے بیداد کہا جاتا ہے ان کا دور ریت کال کا دور تھا۔ ہندوستانی ہونے کے ناطے انھوں نے اپنے روحانی کیفیات کے اظہار کیلئے ہندی کا سہارا لیا۔ ان کی مثنوی ریاض عشق، دیوان عشقی، ترجیع بند، ... سوال و جواب اور عوارف ہندی کا مصنف شاہ برکت اللہ عشقی ہیں ... ہندی دیوان پیم پرکاش میں شاہ برکت اللہ پیمی کے ... پیم پرکاش ۱۶۹۸ء یعنی دور عالمگیری میں تصنیف ہوا ... حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصے میں دوہے ہیں جن کی تعداد ... دوسرے حصے میں کبت وغیرہ ہیں۔ تین سے دس مصرعوں پر مشتمل ... مختلف اوزان اور راگوں میں موزوں یہ نظمیں ایک ... حصے میں پانچ نکتے اور اس دوہے سوال و جواب کے ... پرکاش کی زبان برج بھاشا ہے۔ لیکن اس میں اودھی ... بولیوں کا رنگ بھی موجود ہے۔ شاہ برکت اللہ ... اور سنسکرت کے ماہر تھے۔ اودھی بولی کے علاقے ... چونکہ ان کے مرشدوں کا تعلق کالپی ضلع جالون سے تھا ... بندیلی بولی کا رنگ بھی چڑھ گیا۔ مارہرہ میں آکر ... میں آئے۔ لیکن چونکہ عوامی زبان برج بھاشا تھی اس لئے ... اپنے پیغام کے پرچار کے لئے اسی زبان کا سہارا لیا۔

شاہ برکت اللہ پیمی کا پیغام تھا پریم، محبت، عشق ... عشق کا کوزہ ... جس کے لئے کائنات وجود میں ... یہ اس کائنات کی روح ہے عشق ہی زندگی کی دھڑکن ہے۔ عشق ... ہے جس نے عشق کو جان لیا ... دکھ کو سکھ میں اور موت کو زندگی میں بدل لیا عشق انسانی اخلاق کی تکمیل کی بنیاد ہے عشق میں فنا ہو کر ... کو بقا حاصل ہو سکتی ہے۔ بوند جب تک الگ تھلگ رہتی ہے بوند ... ہے اور جب اپنے وجود کو فنا کر کے ساگر میں مل جاتی ہے تو ساگر ...

پیمی قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے علمبردار ہیں۔

پیمی ہندو ترک میں، ہر رنگ رہو سمائے
دیول اور مسجد میں دیپ ایک ہی بھائے

ہندو ہو یا مسلمان، ہر دو میں ایک ہی خدا کا ظہور ہے جس ... مندر ہو یا مسجد ایک ہی طرح کا چراغ دونوں جگہ جلتا ہے اور اس کی روشنی ایک ہی رہتی ہے — پاکیزگی نفس کا نسخہ

من پارا تن کی کھرلی، دھیان گیان رس ہوئے
برہ اگن سو پیو تک دے، نرمل کندن ہوئے

جوگی کہتے ہیں کہ من یا نفس پارے کی طرح ہے جسے کسی کل قرار نہیں۔ اسے دل کی شالی میں بند کر دو یعنی ریاضت اور تقویٰ کی قید میں ڈال دو پھر اس میں علم اور عبادت کا رس گھول دو۔ اب اس مکھن کو جو یعنی یادِ خدا کی آنچ پہ تپاؤ۔ تبھی نفس کندن ہو گا۔

فلسفۂ وحدت الوجود:

تو ہی، میں تو ایک ہیں، اور نہ دو جانوں رے
میں تو اپنا جب چھوڑئے، دو ہی رہیا سب ہوئے

نظریۂ اتحاد:

جلسرت جگ نسبت ہے، بچھڑن نرک سمان
بیگ مورکن جانوتے، جن بچھڑو جیہ جان

جو لوگ افتراق و اختلاف ہیں۔ الگ تھلگ رہنا۔ عداوت و منافرت دوزخ کی طرح ہے۔ جس سے جو شخص دل سے ملو، ٹوٹ کر ملو، ہی جان سے ملو۔ ایسے ملو کہ پھر کبھی الگ نہ ہو۔ جب تک انسان ایک طرف انسان کے ساتھ اور دوسری طرف خدا کے ساتھ محبت کا رشتہ منظور نہ کرے گا تب تک اسے روحانی آسودگی نہیں مل سکتی۔

دیا ہوکے اور ناہیں، لوبھ ہو کے کھورہ نہیں
یاتیں من ماہیں، جو رہت ہو لریں اریہ

—

ماپ جیسو چندرماں، سیورن دکھائی دیت
گرنے کے بدھان، بن گن کیس لریں لریں!

—

سیلھ جو کی اپمان، جبی کی کبوں ایسو!
کہا میں نلبا الی جان، سکھ کی تریا تریں

—

آجی آمرا سائی، پائی ہے کنہا ئی
سانچی کیو سو سوں، کاہے بولت بریں پایا

اس کبت میں بھی کہتے ہیں میرا مطلوب مجھ سے کیوں ناراض ہے؟ شائد اس لئے کہ میں نے سخاوت اور محبت سے اپنا منہ موڑ لیا ہے۔

اے میرے مالک! مجھے معاف کر دے کیونکہ تو ساری اچھائی اور سچائی کا سرچشمہ ہے اور میں ان اوصاف سے محروم ہوں۔ میری کشتی کو ساحل تک پہنچا دے کیوں کہ تو بڑی عظمت والا ہے۔ اور میں سراپا برائی ہوں۔ اے میرے مالک! مجھ تک اپنی آواز پہنچا۔ تیری حق ہے، تو شکتی ہے، تیری بس ہے۔

گیتا میں کامل انسان کے چار اوصاف جتائے گئے ہیں۔ یوگ، شکتی اور گیان۔ شاہ برکت اللہ نے صدق، عدل، حیا اور علم کو دل کی شخصیت کی تکمیل کی بنیاد قرار دیا ہے۔

ست جو جانت تو رہے کیا، بہت گئے سب جائے
لما بتّا گئی ہے، بن بتّا یا نہ اگے سے

انسان میں صدق و صفا کے بغیر کچھ نہیں رہ جاتا۔ نیت یعنی سچ کے نہ رہنے سے سب کچھ برباد ہو جاتا ہے۔ جس انسان میں شرم و حیا نہیں ہوتی وہ بے شرم ہو جاتا ہے اور جو آدمی علم سے محروم ہے وہ حیوان بن جاتا ہے۔

لا الٰہ او نیچے کہو، نیچے الا اللہ
آواگون نہار کے دیکھو کے اُستاد

جوگی یوگ کی مشق کی تلقین کرتے ہیں۔ صوفیائے کرام کی اصطلاح میں اسے ذکر نفی و اثبات کہا جاتا ہے۔ جب سانس چھوڑو تو علایق کی سبھی مورتیوں کو دل سے نکال پھینکو اور جب سانس اندر کھینچو رب واحد کو اپنے دل میں بٹھالو۔ سچا یوگ یہی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ، ایسیں سبھو محیط
رنگ کی تار جیوں جبریں، تیوں جگ میں جگ بیت

جوگی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کائنات کی ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ ہر جگہ اسی ربِ عظیم کا ظہور ہے۔ جس طرح کپڑے میں تانے بانے کے روپ روئی رہتی ہے اسی طرح کائنات میں اللہ کا جلوہ موجود ہے۔

تو لاجوں نیناں کرد، باٹ ہم کے کھول
کر کچھو ناگیان سوں دو من تک نت تول

جوگی کہتے ہیں کہ اگر اپنے مطلوب کا دیدار کرنا ہے تو آنکھوں کو ترازو بناؤ اور عشقِ حقیقی کو باٹ بناؤ اور جس طرح وزن کرنے والا ترازو کے پلڑوں اور کانٹے پر ایک سی نگاہ رکھتا ہے اسی طرح تم بھی یکسوئی سے مراقبے میں ڈوب جاؤ تبھی دیدار کا نگینہ حاصل کر سکتے ہو۔

من اُجھر تن پائیکا، جا وہ جیت سار
گرد سکھاوت دھیان سوں پنکت جوڑے اُجلا

دل کی مثال حرف جیسی ہے اور بدن تختی کی طرح ہے۔ یہ دونوں

پا سکتے ہیں تو وہ مکتب عشق میں جائیں۔ جہاں اللہ کا حقیقی عشق ملتا ہے۔ اگر مرشد کامل کا کرم ہو گیا تو تم بھی عشق کے علم میں کامل ہو جاؤ گے۔

نگر نگر کے جا جنگل میں پریا تب کچھ پری
تن من میں جب جگ کی آگ لگی تب کچھ پایا
سوچوں کے پھیرے جو دل پا شب بیتا
جب سینے کے جنور میں پایا تب کچھ پایا
مجھے جو ملی وہ دوگر سب چھوڑ کے
جب اپنے در میں سیس دھرا تب کچھ پایا
چھوٹ گئے جھگڑے سے من کر نسل نہ کچھ جتی
جب دل کی کلی سا جھ اری تب کچھ پری
کنج خلوت میں وصل ہوئی نکرو فہم نہ تھا
جب ہجر میں ناگ تھری تب کچھ پری
پوچھا نہ عشقیا زخرد راہ ہیم کو
جب عشق مشرہ ہُد ہرکیا تب کچھ پایا

اس ریختے میں وہی کہتے ہیں کہ دنیا کے ماسوا میں رہتے ہوئے معرفت الٰہی کی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں۔ شعور تبھی آتا ہے جب انسان اپنی انا کو فنا کر دے۔ گیان حاصل کرنے کے لئے عشق کا ہونا لازمی ہے۔ خدا کو اسی وقت پا سکو گے جب مخلوق کا ساتھ چھوڑ کر خالق سے لو لگاؤ۔ جو یا عشق وہ چیز ہے جسے فرزانگی اور عاشق بیان نہیں کر سکتا۔ یہاں سے جدا ہونے کے بعد ہی بندے کو اپنی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ خدا تک پہنچنے والے کچھ تکلیفوں اور زخم کھا کا تیار کر رکھتا ہے۔ معرفت الٰہی کے حصول کے لئے دنیا کے عیش و آرام کو ترک کرنے ہوں گے۔ معرفت الٰہی محض منطق کی گرہ کشائی یا فلسفے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے حصول کی استقامت لازمی ہے۔ محبوب سے بچھڑنے کی جو لذت ہے وہ ملن میں کہاں۔ وصل کے بعد تڑپ کہاں باقی رہتی ہے۔ عارف بننے کے لئے ضروری ہے کہ عشق عقل پر غالب آ جائے کہاں؟ کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ یہ سوال تو عقل والے کرتے ہیں۔ دل والا تو بس یہ کہتا ہے کہ جو ہے سو ہے۔

پیم پریم کے کچھ لطیف مقولے

پیا دیکھے نہیں وہ سکوں ، دیکھیں رہو نہ جائے

محبوب کی جدائی شاق گزرتی ہے اور جب وصل ہو جاتا ہے تو یہ خلش ختم ہو جاتی ہے کہ کیا ہوا ہو تا ہو گا۔ یہاں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تب اللہ نے اپنا جلوہ دکھایا تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ کچھ صوفیا کا کہنا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بے ہوشی اس لئے نہیں تھی کہ وہ اللہ کی تجلی برداشت نہیں کر سکے بلکہ وجہ یہ ہوئی کہ دیکھنے کے بعد ہجر کی خلش کے سبب تھی۔

وصل بھئی تب کے ہا ہے سب ، جو سوال جانے

جو شخص مایا موہ سے منہ موڑ کر من کی کمی طہارت کے ساتھ معبود حقیقی کی جانب متوجہ رہتا ہے اس کے سامنے کے وہ مسائل حل ہو جائیں گے۔

تھوڑا سوال سرا جھو ، اگرے نبسانے چوٹ

جو شخص دنیا کی شان و شوکت کی حرص و دولت کا تکبر کرتا ہے وہ سچے نور سے دور اور مفلس شخص ہوتا ہے۔ بہادری تو یہ ہے کہ اپنا سب کچھ حق کی راہ میں لٹا دیا جائے۔

ہم تم ایک جو تھے کہ جو ری چھوٹے یہ آپ

طالب و مطلوب کے ملن میں انانیت سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اپنے فکر کرو اللہ تک ، پر جا کا ہے جوست

انسان کو اس کے خالق نے بادشاہ بنایا ہے۔ جو خود حاکم ہو وہ محکوم کیوں بنے جیو؟

جیتی سو تن گلگت نہ پاوے ہیں کر جانے ورنے

معرفت خلاصی ہے۔ آزادی کا راز ایک ہو جانے میں چھپا ہے۔

ہم میں سیام ، سیام میں ہم ہیں ، تم میں انت بھار

ہر انسان جگران میں ، جگران انسان میں۔ وحدت الوجود کا یہ نظریہ انسان کی نجات کے لئے کافی ہے۔ باقی ساری چیزیں فضول ہیں۔

منسا تیرتھ کیوں بھٹکی سیوا سب کچی کھیس

سارے مذہبی مشاغل ایک طرف اور عشق حقیقی ایک طرف۔ ساری ریاضتیں اور سارے مجاہدے بے کار ہیں اگر دل پوری طرح معبود حقیقی میں نہ لگا ہو۔

شاہ برکت اللہ کا زمانہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ تھا جسے ہمارے تنگ نظر مورخین نے مذہبی تعصب کا زمانہ کہہ کر اچھالا ہے۔ اورنگ زیب کی حکومت علامت کیوں نہ بنایا جاتا ہے۔ کیا آج کے اس جدید دور میں نسلی منافرت کے جھگڑے نہیں ہیں؟ سب کچھ ویسے ہی سارے مسائل وہی ہیں لیکن کتنے لوگ عشقی یا بھی بننے کی کوشش کرتے ہیں؟

رفیق محمد خان

ہند قدیم کے بارے میں عرب سیاحوں کے تاثرات

عرب اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں کئی مورخین نے یہ بتایا ہے کہ ان کے رابطے اس وقت سے قائم ہیں جب سے دنیا وجود میں آئی۔ یعنی جب حضرت آدم کو خدا نے جنت سے نکال کر زمین پر بھیجا [illegible] میں تو سب سے پہلے [illegible] ہندوستان ہی کا ایک حصہ گئے تھے اور حوا عرب کی [illegible] پھر ان دونوں کا عقد ہوا اور نسل انسانی [illegible] چلی۔ اس میں شک نہیں کہ [illegible] اس روایت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کئی حوالے بھی دیئے گئے ہیں مگر پھر بھی یہ بات افسانوی معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ دو ہزار سال قبل مسیح کے قریب عرب سیاحوں کے تجارتی قافلے ہندوستان کے ساحلوں پر منڈلاتے نظر آتے تھے۔ ہندوستان اور عربوں کے تعلقات اسی زمانے سے قائم ہوئے اور ان میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ تاجروں کے علاوہ متعدد عرب مورخ اور جغرافیہ نویس بھی قدیم زمانہ میں ہندوستان آئے اور انہوں نے اپنے سفرناموں اور کتابوں میں نہ صرف ان مقامات کا ذکر کیا ہے جہاں سے وہ ہو کر گزرے یا جہاں رہے بلکہ ہندوستان کے رسم و رواج اور دوسری معاشرت کے بارے میں بھی اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ یہ تاثرات بڑے خوش گوار ہیں اور ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عرب سیاح زمانہ قدیم میں ہندوستان کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔

عرب سیاحوں کا سب سے پہلا سفرنامہ جس میں ہم کو ہندوستان کا ذکر ملتا ہے وہ سلسلۃ التواریخ ہے جسے آٹھویں صدی کے ایک مشہور عرب تاجر سلیمان التاجر نے لکھا تھا۔ بعد میں اس کتاب میں ایک دوسرے عرب سیاح ابو زید حسن سیرافی نے اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کئی مورخین کا خیال ہے کہ سلسلۃ التواریخ جس کو [illegible] نے پیرس میں [illegible] دراصل دو کتابیں ہیں جنہیں سلیمان اور ابو زید نے لکھا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ سلیمان اور ابو زید کی کسی دوسری کتاب کا پتہ نہیں چلتا۔ بعد میں آنے والے عرب سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں ہندوستان کے بارے میں جو واقعات اور روایتیں لکھی ہیں ان میں سے متعدد واقعات اور روایتیں سلسلۃ التواریخ کی روایات سے ملتی جلتی ہیں۔ اس لیے ہم پہلے سلسلۃ التواریخ [illegible] ہیں۔ سلسلۃ التواریخ جو پیرس میں شائع ہوئی ہے وہ [illegible] طرز کی کتاب ہے جس میں سلیمان نے اپنے ذاتی مشاہدات کو قلم بند کیا ہے۔ سلیمان [illegible] اس وقت [illegible] گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستان میں جن جن علاقوں پر گیا وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ لیح بالوس (چٹاگام) ۲۔ کولم ملی۔ یہ راجہ بلہرا کے زیر نگین تھا۔ ۳۔ [illegible] ابن بطوطہ نے اس مقام کو کولم لکھا ہے۔ اس سے مراد جنوبی ہند ہے۔ ۴۔ [illegible] ۵۔ [illegible] کے قریب کا علاقہ۔ ۶۔ جزر (گجرات)۔ ۷۔ طافن (دکھن) [illegible] ہے جو موجودہ [illegible] کے قریب دکن میں تھا۔ ۸۔ رہمی [illegible]

۱۔ سید سلیمان ندوی: ہند و عرب کے تعلقات

یہ سفرنامہ آج سے تقریباً گیارہ سو برس قبل (۸۵۱ء) لکھا گیا۔ اس میں سلیمان نے ہندوستانی زندگی کے ہر شعبہ اور پہلو پر بحث کی ہے۔ سلیمان کا کہنا ہے کہ ہندوستان ایک بہت وسیع ملک ہے۔ یہ چین سے کہیں بڑا ہے۔ یہاں کے دریاؤں کا پانی میٹھا ہے۔ ریگستانوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ یہاں کا سب سے بڑا سمندر ہرکند (بحرِ ہند) ہے۔ سلیمان کے بعد دوسرے عرب سیاحوں نے بھی بحرِ ہند کو ہرکند[1] لکھا ہے۔ اصل میں ہرکند سمندر کے اس حصے کو کہتے تھے جو جنوبی ہند کے کناروں سے بنتا تھا۔

لباس کے بارے میں سلیمان لکھتا ہے کہ یہ لوگ دھوتی باندھتے ہیں۔ یہ ایک موٹا دھاری دار معمولی قسم کا کپڑا ہوتا ہے جس کو کمر سے باندھ لیا جاتا ہے۔ یہاں کی عورتیں اور مرد دونوں زیور پہنتے ہیں اور سونے جواہرات کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ ہر صبح کو کھانے سے قبل غسل کرتے ہیں۔ جب مرد عبادت کرتے ہیں یا کوئی مذہبی رسم ادا کرتے ہیں تو اپنی عورتوں سے علیحدہ رہتے ہیں بلکہ ان کو دروازے کے باہر رکھتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی غذا کے متعلق سلیمان نے تحریر کیا ہے کہ ہندوستان والے چاول کثرت سے کھاتے ہیں اور روٹی کا استعمال کم کرتے ہیں۔ گوشت بھی کھاتے ہیں لیکن جانوروں کو مسلمانوں کے طور سے ذبح نہیں کرتے بلکہ ان کے سر پر اتنی زور سے ضرب لگاتے ہیں کہ وہ مر جاتا ہے۔

یہ لوگ شراب کو برا سمجھتے ہیں بلکہ سرکے سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا اعتقاد ہے کہ اگر کوئی بادشاہ شراب پیتا ہے تو اس کی بادشاہت نہیں رہ سکتی کیونکہ شراب پینے کے بعد وہ جنگ و جدال نہیں کر سکتا اور دوسرے امورِ سلطنت کو بھی بخوبی انجام نہیں دے سکتا۔

ہندوستانی شادیوں کے متعلق اس کی رائے ہے کہ یہ لوگ بالکل چینی طرز پر شادی کی رسوم انجام دیتے ہیں مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستانیوں نے اس طرز کو چینیوں سے لیا ہے یا چینیوں نے ہندوستانیوں سے۔ شادی کی رسم میں پہلے ایک دوسرے کو تحفے بھیجتے ہیں اور پھر ڈھول بجا کر خوشیاں مناتے ہیں۔ مرد بہ یک وقت جتنی بھی عورتوں سے چاہے شادی کر سکتا ہے۔

سلیمان نے سراندیپ کے راجہ کی وفات پر جو رسوم ادا کی گئیں ان کا چشم دید حال تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ راجہ کے جسم کو ایک چھوٹی گاڑی میں رکھ دیا گیا اس طرح کہ سر گاڑی کے پیچھے لٹک رہا تھا اور بال زمین کو چھو رہے تھے۔ ایک عورت ہاتھ میں جھاڑو لیے اس جنازے کے ساتھ تھی جو جنازہ پر گرد جھاڑتی چلتی تھی اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہتی تھی: "اے لوگو! یہ شخص کل تمہارا بادشاہ تھا۔ یہ تم پر حکومت کرتا تھا۔ تم اس کا کہنا مانتے تھے لیکن آج اسے اس دنیا کو چھوڑنا پڑا۔ موت کے فرشتہ نے اس کی روح نکال لی۔ تم ایسی زندگی کے فریب میں نہ آؤ۔" تین دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد اس بادشاہ کے جسم کو صندل، کافور اور زعفران سے جلا دیا گیا۔ پھر اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیا گیا۔ تقریباً سارے ہندوستان میں مُردوں کو جلایا جاتا ہے۔ اکثر راجہ کی لاش کے ساتھ اس کی بیویاں بھی جل جاتی ہیں۔

ہندوستان کے طریقِ انصاف کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ ملزم کی آزمائش مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو کسی جرم کا مرتکب سمجھا جاتا ہے تو اس کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے آزمائش دینی ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ پر پان کے سات پتے رکھے جاتے ہیں جس پر ایک جلتا ہوا سرخ لوہا رکھا جاتا ہے جس کو وہ ہاتھ میں لیے آگے پیچھے چلتا ہے۔ پھر لوہے کو پھینک دیتا ہے۔ اس کے بعد ملزم کے ہاتھ پر ایک چمڑے کی تھیلی چڑھا دی جاتی ہے اور اسے بند کر کے بادشاہی مہر لگا دی جاتی ہے۔ تین دن کے بعد اس تھیلی کو کھولا جاتا ہے اور ملزم کو دھان کوٹنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ اگر ملزم کے ہاتھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس کو آزاد کر دیا جاتا ہے اور اس آدمی کو جس نے اس پر جھوٹا الزام لگایا تھا حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ملزم کو اس تکلیف کے عوض جرمانے کے طور پر سونا دے۔

---

[1] ہرکند دریا بحرِ ہند کے لیے پہلی بار سلیمان نے استعمال کیا تھا۔ ہرکند ہندی لفظ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ سلیمان نے اپنے سفرنامے میں ہرکند اسی طرح تحریر کیا ہے اس لیے یہ خیال ہوتا ہے کہ عرب اس وقت حرف "گ" استعمال کرتے تھے۔

سلیمان نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندوستان میں بدکاری کو بہت بڑا جرم کہا جاتا ہے اور اس کی سزا بھی بہت ہولناک ہے۔ مثلاً اگر کوئی چور پکڑا جاتا ہے تو ایک لمبی نوک دار لکڑی پر اس کو بٹھا دیا جاتا ہے کہ وہ لکڑی اس کے منہ سے نکل آتی ہے اور جب تک دم نہیں توڑ دیتا اسی لکڑی میں لٹکا رہتا ہے۔ دوسرا بڑا جرم زنا ہے۔ اگر کوئی مرد کسی غیر عورت سے اس کی مرضی سے ناجائز تعلق کرتا ہے تو دونوں کو قتل کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی مرد کسی عورت پر جبر کرتا ہے اور عورت بے گناہ ثابت ہو جاتی ہے تو مرد قتل کر دیا جاتا ہے اور عورت کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اگر کسی مجرم کو زندان میں قید کیا جاتا ہے تو اس کو سات دن تک نہ کھانا دیا جاتا ہے اور نہ پانی۔

سلیمان نے ہندوستان کے فقیروں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں ایک جماعت ہے جو جنگلوں اور پہاڑوں میں گھومتی رہتی ہے اور اس کے افراد لوگوں سے نہیں ملتے۔ ان کو سنیاسی کہتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر ننگے رہتے ہیں اور گھنٹوں سورج کے سامنے منہ کرکے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ اکثر شیر کی کھال ڈالے رہتے ہیں۔ ایک سنیاسی کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک سنیاسی ایک مقام پر سورج کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا۔ جب سولہ (۱۶) سال کے بعد میں (سلیمان) وہاں واپس آیا تو وہ سنیاسی اسی جگہ پر بیٹھا تھا جہاں آج سے سولہ سال قبل میں نے اسے دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر سلیمان کو بہت تعجب ہوا۔

سلیمان نے ایک جگہ ہندوستان کے ایک راجہ بلہرا کے بارے میں لکھا ہے کہ بلہرا ہندوستان کے تمام شہزادوں میں ایک بلند اور ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ ہر شخص اس کی فضیلت اور بزرگی کا معترف ہے۔ ہندوستان کے دوسرے خودمختار حکمران بھی بلہرا کی بزرگی کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے دربار میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ جب بلہرا اپنا کوئی نمائندہ کسی راجہ کے پاس بھیجتا ہے تو وہ اس کی بڑی عزت کرتا ہے۔ بلہرا بہت سی باتوں میں عرب کے خلیفہ کی تقلید کرتا ہے مثلاً جس طرح خلیفۂ بغداد اپنی فوج کے افراد کو ماہانہ زر نقد عطا کرتا ہے اسی طرح بلہرا بھی فوجیوں کو تنخواہ دیتا ہے۔ اس کے پاس بھی بہت سے ہاتھی گھوڑے اور دولت ہے۔ یہاں پر ٹاطری درہم کا رواج ہے۔ ان سکوں پر راجہ کی تخت نشینی کی تاریخ پڑی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے عرب کے سکوں پر سن ہجری پڑا ہوتا ہے۔ بلہرا اور اس کی رعایا اہل عرب سے بہت محبت کرتے ہیں اور عرب والے بھی ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ بلہرا کی حکومت سمندر کے کنارے سے کوم کام دکن کا ان حصے تک پھیلی ہوئی ہے۔ بلہرا کا سب سے بڑا دشمن جزر کا راجہ ہے۔ ڈاکٹر ... نے اس راجہ کا نام جرز لکھا ہے۔ اس راجہ کے پاس بہت بڑی فوج ہے۔ یہ راجہ عرب کے خلیفہ کو اپنا دوست تسلیم نہیں کرتا لیکن اس کی بڑائی کا قائل ہے۔ اس راجہ کو اپنی دولت اور طاقت پر گھمنڈ ہے۔ اس کے پاس گھوڑے اور ہاتھی بہت زیادہ ہیں۔ اس کی ریاست سے ملی ہوئی ایک حکومت ہے جس کا نام طاقن ہے۔ یہاں کی عورتیں ہندوستان میں سب سے زیادہ گوری اور خوبصورت سمجھی جاتی ہیں۔ اس حکومت کا راجہ اپنے پڑوسیوں کو دوست رکھتا ہے کیونکہ اس کے پاس فوج بہت کم ہے۔ عربوں کے بارے میں اس کا عقیدہ وہی ہے جو راجہ بلہرا کا ہے۔ اس ریاست سے ملی ہوئی دوسری ریاست رہمی کی ہے۔ اس کے راجہ کے پاس کافی فوج ہے۔ جب یہ جنگ کے لیے جاتا ہے تو تقریباً ۵۰ ہاتھی اس کے ساتھ جاتے ہیں۔ اس کی فوج کا سارا دار ومدار ہاتھیوں پر ہوتا ہے اس لیے یہ صرف جاڑوں میں جنگ کے لیے نکلتا ہے۔ اس ریاست میں کپڑا نہایت عمدہ اور مہین قسم کا بنا جاتا ہے۔ کپڑے کا ایک تھان انگوٹھی کی جگہ رکھا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے راجہ خودمختار ہیں اور اپنی حدود میں بالکل آزاد ہیں۔ جب کوئی راجہ کسی دوسرے راجہ پر فتح یاب ہوتا ہے تو اس علاقے پر حکومت کرنے کے لیے اسی راجہ کے خاندان میں سے کسی آدمی کو گورنر مقرر کر دیا جاتا ہے اور یہ گورنر فاتح راجہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنا کوئی آدمی وہاں مقرر کرے تو مفتوح علاقے کے رہنے والے اس کا حکم نہیں مانتے۔ یہاں فوج میں لاتعداد سپاہی ہوتے ہیں جن کو راجہ سے تنخواہ نہیں ملتی بجز بلہرا کے، اور جب یہ لوگ جنگ کرنے جاتے ہیں تو اپنے کل اخراجات خود برداشت کرتے ہیں۔

سلیمان التاجر کے ۲۰ سال کے بعد ۲۶۴ھ مطابق ۸۷۷ء میں ابوزید حسن سیرافی نے اس کے سفرنامے کا تکملہ کیا۔ یہ عرب سیاح خلیج فارس کی

[illegible] سیراف کا رہنے والا تھا اور سیراف ہندوستان اور چین کے درمیان تجارتی سفر کیا کرتا تھا۔ ابوزید تقریباً ۳۰۰ھ میں ہندوستان آیا تھا اور مندرجہ ذیل مقامات کو اس نے دیکھا تھا ۱۔ جاوہ دیبال کا راجہ مہاراج کہلاتا تھا۔ ۲۔ قمار (راس کماری) ۳۔ جنوبی ہند کے علاقے ۴۔ ملتان۔ ملتان میں ایک سونے کا بت تھا جس کے جسم کا کمال یہ تھی اس کی دو آنکھوں کی جگہ دو لال تھے اور سر سونے کا تھا۔ 52

ابوزید ہندوستان کے بادشاہوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ہندوستان کے بادشاہوں میں کچھ بادشاہ ایسے ہیں جو تخت پر بیٹھنے سے پہلے کچھ رسم ادا کرتے ہیں۔ مثلاً جس وقت کوئی نیا بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوتا ہے تو اس خوشی میں چاول پکائے جاتے ہیں وہ کیلے کے پتوں پر لوگوں کو تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس موقع پر بادشاہ تین چار سو آدمیوں کو مدعو کرتا ہے۔ یہ سب جو خاص خاص ساتھی ہوتے ہیں وہ بادشاہ کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ بادشاہ پہلے خود کچھ پکے ہوئے چاول کھاتا ہے پھر باقی چاول دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ جو لوگ یہ پکے ہوئے چاول کھاتے ہیں ان کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اگر بادشاہ فوت ہو جائے تو یہ تمام لوگ اس بادشاہ کی چتا میں جل کر جان دے دیں۔ جب کوئی شخص آگ میں جلنے کی خواہش کرتا ہے تو اسے بادشاہی دربار سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس مقام پر جاتا ہے جہاں لکڑی کا ڈھیر لگا ہوتا ہے۔ اس کے تمام عزیز و اقارب اس مقام پر موجود ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی عزیز و اقارب آگ میں جلنے والے آدمی کے سر کے اوپر ایک ایسا تاج بنا کر رکھ دیتے ہیں جس میں جلتے ہوئے کوئلے ہوتے ہیں۔ ان جلتے ہوئے کوئلوں پر صندل چھڑکتے ہیں اور جب یہ خوب تیز دہکنے لگتے ہیں تو وہ آدمی ادھر ادھر گھومنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا سر جلنا شروع ہو جاتا ہے یہ آدمی اس تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے اور اس کی کسی بھی حرکت سے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کو کسی قسم کی تکلیف ہے۔ پھر وہ بہت اطمینان کے ساتھ جلتی ہوئی آگ میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ ابوزید نے اپنے سفرنامہ میں یہ بھی درج کیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جلنے والا آگ کے پاس پہنچ کر ایک چاقو سے اپنا پیٹ اس طرح پھاڑتا ہے کہ سینہ تک چاک ہو جاتا ہے اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ سے اپنے جگر کو نکال باہر کرتا ہے اور پھر آگ میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔

ابوزید پہلا عرب سیاح تھا جس نے ہندوستان کے شاعروں کی طرف توجہ کی۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں کے شاعر بادشاہوں کی شان میں اشعار کہا کرتے تھے اور ان کے ہاں ملازم رہتے تھے۔ شاعروں کے علاوہ مغنی بھی ہوا کرتی تھیں۔ ان شاعروں کی بدولت لوگوں کو بادشاہوں کی زندگی کے حالات اور ذاتی واقعات معلوم ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے مندروں اور بتوں کا ذکر کرتے ہوئے ابوزید نے لکھا ہے کہ ہندوستان والے مندروں پر بڑی رقم خرچ کرتے ہیں۔ ملتان میں ایک بہت مشہور بت ہے جس کی زیارت کے لیے لوگ میلوں کا سفر طے کر کے آتے ہیں۔ ان بت خانوں میں کچھ مخصوص قسم کی عورتیں ہوتی ہیں ان عورتوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی ماؤں کے جب اولاد نہیں ہوتی تو اس بت کے سامنے آکر یہ منت مانتی ہیں کہ اگر ان کے یہاں بچہ پیدا ہوا تو وہ اس کو بت کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گی۔ پھر اگر ان کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو وہ بت کی پجارن بنا دی جاتی ہے۔

ہندوستان کے لوگ اپنی نجات کے لیے فلاح عامہ کے کئی کام کرتے ہیں مثلاً وہ راستوں پر سرائے بناتے ہیں تاکہ مسافروں کو آرام ملے۔ بازار میں ہر قسم کے سامان کی دکانیں ہوتی ہیں تاکہ لوگ سامان سے اپنی ضروریات زندگی فراہم کر سکیں۔

ہندوستان کے بادشاہوں کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ یہ لوگ بڑی شان و شوکت سے رہتے ہیں۔ کانوں میں سونے کی بالیاں پہنتے ہیں جن میں قیمتی قیمتی پتھر جڑے ہوتے ہیں۔ ان کے خزانوں میں قیمتی موتیوں کا انبار ہوتا ہے اور یہی ان کی دولت سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کے زیادہ تر بادشاہ اپنی عورتوں کو پردہ نہیں کراتے۔ ان کے دربار میں ہر شخص کو خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی ان بادشاہوں کی بیویوں کے سامنے آنے کی اجازت ہے۔ درباری اور افسر بھی موتی پہنتے ہیں۔ سردار لوگوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر چلتا ہے۔ لوگ اس کے سر پر مور کے پروں کی بنی ہوئی چھتری لگائے رہتے ہیں تاکہ دھوپ نہ لگے۔

ہندوستان کے لوگ مرنے کے بعد آواگون پر عقیدہ رکھتے ہیں
ایک مرتبہ ایک جوگی ایک پہاڑی پر بیٹھا تھا جب وہ مرنے لگا تو
اس نے اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھا تو اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے لڑکے
سے کہا کہ اس دنیا میں کوئی شخص ہمیشہ نہیں رہا۔ کوئی بڑی شکل لے کر دوبارہ جنم
پیدا کرے گا۔ جس روح کو گھری دنیا سے اس کا بالکل جسم سے
نکل کر کسی اور جسم میں پہنچ جاتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ایک جلاد کو بلا کر
اپنا سر کاٹنے کا حکم دیا۔ جلاد نے اس کا سر کاٹ دیا۔ پھر اس کو جلا دیا
اس وقت ہر شخص کو یقین تھا کہ اس راہب کی روح ضرور کسی خوب صورت
جسم میں داخل ہو گئی ہو گی۔

ہندوستان کے موسموں سے بحث کرتے ہوئے ابو زید نے تحریر کیا
ہے کہ ہندوستان میں بارش کا موسم جس کو برسات کا زمانہ کہتے ہیں گرمیوں کے
تین ماہ تک رہتا ہے۔ اس زمانے میں یہاں دن رات پانی برسا
کرتا ہے۔ جاڑوں میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ برسات آنے سے
پہلے یہاں کے لوگ لکڑی کے مکان بنا لیتے ہیں اور جب برسات
شروع ہوتی ہے تو یہاں مکانوں کو بند کر کے ان کے اندر بیٹھ جاتے ہیں۔
پھر اپنے مکانوں سے باہر نہیں نکلتے جب تک کہ بہت سخت ضرورت
پیش نہ آئے۔ کاریگر اپنے گھروں میں کام کرتے ہیں۔

تیسرا جہاز راں سیاح بزرگ بن شہریار (سنہ ۳۰۰ھ) تھا جو
عراق سے ہندوستان کے ساحل ہوتا ہوا چین تک اپنے جہاز لے جایا
کرتا تھا۔ اس جہاز راں نے ہندوستان کے کچھ علاقوں کو خود دیکھا
اور کچھ مقامات کے بارے میں دوسرے جہاز رانوں سے معلومات
حاصل کر کے ایک کتاب عجائب الہند لکھی۔ اس کتاب میں کشمیر
زیریں (پنجاب)، جنوبی ہند اور گجرات کے مختلف مقامات اور واقعات
کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ بزرگ بن شہریار کی کتاب فرانسیسی
ترجمے کے ساتھ ۱۸۸۶ء میں لیڈن میں چھپی۔

چوتھا مشہور عرب سیاح، جغرافیہ نویس اور مورخ ابو الحسن المسعودی
تھا۔ اس کا زمانہ دسویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا۔ اس نے اپنی عمر کے
پچیس سال سیر و سیاحت میں گزارے۔ اس نے اپنے سفر کا آغاز اپنے
وطن بغداد سے ۳۰۰ھ (مطابق ۹۱۲ء) میں کیا۔ عراق، شام، ارمینیا
روم، مشرقی افریقہ، سوڈان، چین، تبت، ہندوستان اور
ملاکا کی سیاحت کی۔ اس وقت المسعودی کی دو کتابیں کتاب التنبیہ
والاشراف اور مروج الذہب و معادن الجواہر موجود ہیں
جن کی مدد سے ہم اس کی زندگی کے حالات اور اس کے قلم بند کیے ہوئے
اس کے سفر کے حالات معلوم کر سکتے ہیں۔

المسعودی لکھتا ہے کہ ہندوستان زمین کا وہ حصہ ہے جس کی سرحد
سندھ اور افغانستان ایک ... سے ملتی ہے۔ ہندوستان کے
لوگ ایک بادشاہ برہمن کے متعلق یہ بتاتے ہیں کہ اس نے تین سو چھیاسٹھ
سال تک حکومت کی۔ اس قوم کے لوگ جو اس زمانے المسعودی کے
وقت تک موجود ہیں جن کو برہمن کہتے ہیں۔ اس قوم کے مرد اور عورتیں
زنار کا ایک تاگا اپنے گلے میں ڈالے رہتے ہیں۔

المسعودی کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آج کل جہازوں
کی کمپنیوں اور جہازوں کے نام ملک اور شہر کے ہوتے ہیں اسی طرح جہازوں
کے مالکوں کی نسبت سے اس زمانے میں ہندوستان میں جہازوں کے نام
بھی رکھے جاتے تھے۔ یہ نام صرف انہیں جہازوں کے رکھے جاتے تھے
جو بحر ہند میں آتے جاتے تھے۔

ہندوستان کی زبانوں کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ یہاں بہت سی
بولیاں بولی جاتی ہیں اور یہاں مختلف مذاہب کے لوگ ہیں۔ یہ لوگ اپنے
مذہب کی بڑی عزت کرتے ہیں اور اپنے عقائد میں بڑے کٹر ہیں۔ ایک
مقام پر لکھتا ہے کہ سندھ کی زبان ہندوستانی زبان سے مختلف ہے۔ مکیر
کے رہنے والے، جو کہ لہراوی ریاست ہے، اکبر یا کنبر میں بھی ...
جن کو گرہ کے علاقہ کی زبان کہا جاتا ہے۔ سیمور، سوپارا اور تھانہ کے
علاقوں میں لاریہ زبان بولی جاتی ہے۔

ہندوستان کے بادشاہوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ
بادشاہت موروثی ہوتی ہے۔ اسی طرح وزارت بھی موروثی سمجھی
جاتی ہے اور قاضی کا عہدہ بھی موروثی ہوتا ہے۔ چالیس سال کی
عمر سے کم کا شہزادہ تخت پر نہیں بیٹھ سکتا ہے۔

المسعودی نے ایک مقام پر تحریر کیا ہے کہ ہندوستان کے کسی بادشاہ

شطرنج ہندوؤں کی ایجاد ہے۔ بادشاہ بلہیت کے عہد کے ساتھ شطرنج کا
پیدا کرنا تھا۔ شطرنج کے مختلف مہروں کی شکلیں حیوانات اور انسانی
شکلوں کی تھیں۔ اسلامی ممالک میں شطرنج اور دوسرے کھیلوں
کا جو رواج ہوا ہے وہ یا تو ہندوستان کے ذریعہ یا پھر فارس کے ذریعہ
ہوا۔ احمد عباسی کے شعرا نے اس شطرنج کے متعلق بہت سی نظمیں اور
قصیدے کہے ہیں۔

ہندوستان کی عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے مسعودی لکھتا ہے کہ یہاں
کی عورتوں میں رہبانیت کا درجہ سب سے بلند ہوتا ہے۔ ہر ہندوستانی
نیکی کی عزت کرتا ہے۔ یہ لوگ کسی بھی جانور کا گوشت نہیں کھاتے۔ یہ لوگ
بادہ و نبیذ بھی کا مزہ نہیں چکھتے ہیں۔

ہندوستان کی وسعت بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ خراسان سے سندھ اور
تبت تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں پر مختلف بادشاہوں کی حکومت ہے اور
مختلف حکومتوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور مختلف مذہب
پائے جاتے ہیں لیکن ہر ہندوستانی کا یہ اعتقاد ہے کہ انسان کی روح
ہمیشہ زندہ رہتی ہے اور مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے جس کو
آواگون کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے یہاں فلسفہ اور نجوم کے علم کا
پتہ چلتا ہے۔

مسعودی کے بعد مستند سیاح جو ہندوستان تک آئے یا جنہوں نے دوسروں
سے یہاں کے متعلق معلومات حاصل کیں ان کے نام یہ ہیں۔ [illegible]
([illegible])، اصطخری ([illegible])، ابن حوقل ([illegible])، مقدسی ([illegible])،
البیرونی ([illegible])، ادریسی ([illegible])، یاقوت ([illegible])، قزوینی
([illegible])، دمشقی ([illegible])، ابوالفدا ([illegible])، ابن بطوطہ
([illegible])۔ ان لوگوں کے بیانات ہندوستان کے بارے میں قریب قریب
وہی ہیں جو سلیمان، ابوزید اور مسعودی لکھ گئے ہیں۔

●●

مشرقی کتب خانے

- کتب خانہ جامع القرویین
  - میمن عبدالعزیز
- قاہرہ میوزیم میں چند گھنٹے
  - پیر حسام الدین راشدی
- حرمین کے کتب خانے
  - نور احمد فریدی

مشرقی کتب خانہ خدا بخش جرنل میں وقتاً
فوقتاً وہ مواد پیش کیا جاتا رہے گا، جو اب تک بکھرا
ہوا ہے۔

پیش نظر مقالوں میں 'کتب خانہ جامع القرویین'
معارف جولائی ۱۹۲۳ء سے اور 'قاہرہ میوزیم میں چند
نسخے' 'وحومینہ کے کتب خانے' 'الزبیر' کتب خانہ
نمبر، ۱۹۶۷ء سے لیا گیا ہے۔

اس کے لیے ہم ان کے شکرگزار ہیں۔

ادارہ

معین عبد الحق صاحب
پروفیسر عربی اورینٹل کالج لاہور

کتب خانۂ جامع القرویین

پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہمارے کرم جناب محمد شفیع صاحب ایم اے کے شغفِ علمی کی رہینِ منت ہے اگر اب یہ مطبوعات کے لحاظ سے ہندوستان کی بڑی سے بڑی لائبریریوں سے کسی طرح پیچھے نہ رہی، اے کاش ان غیر معمولی مقدار کی جرمن و فرنچ مطبوعات کی جگہ عربی کتابیں ہوتیں کہ اس کے مستفیدین بہ نسبت اون کے کہیں زیادہ ہیں، ان دنوں دو فہرستیں منگائی گئی ہیں برنامج جامع القرویین اور برنامج رباط الفتح۔ اوّل بسبب عربی ہونے کے زیادہ مفید ہو سکتی ہے اپنے ملک کو چونکہ بلادِ مغرب کے متعلقہ معارف سے عاری پاتا ہوں اس لیے ان مختصر سطور کو حوالۂ قلم کرنے کی جرأت کرتا ہوں،

یہ جامع مسجد یا یونیورسٹی[1] جس میں صرف چند سال پیشتر (۲۰۰۰) طلبہ، (۵۰۰) مدرس اور (۲۶) ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں اور اب بھی وہ (۵۰۰[2]) طلبہ اور (۱۶۲۱) کتابیں اپنے اندر رکھتی ہے، دنیائے اسلام کی قدیم ترین یونیورسٹی ہے، الجامع الازہر (مصر) جامع الزیتونہ (تونس) جامع بخاری جامع قرطبہ اور المستنصریہ (بغداد) وغیرہ سب اس سے متاخر ہیں، اس لیے پہلے پہل یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ کیا ہے،

---

[1] معجم العمران ۲: ۳۱۸ ،

[2] مقدمہ برنامج جامع القرویین ،

بنائے جامع

حسن اتفاق سے مغرب کی معتبر تاریخ الانیس المطرب القرطاس نے اخبار ملوک المغرب و مدینۃ فاس و ابن ابی زرع جو سنہ ۷۲۶ھ تک کے وقائع پر مشتمل ہے اس وقت پیش نظر ہے، مصنف نے ص ۲۲ تا ص ۴۱ نہایت بسط سے اس کے عہد بعہد کی تاریخ تغیرات و تعمیرات کا تذکرہ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سرچشمہ کو بلاد مغرب کی تعلیم و تلقین، اور تہذیب و تمدن میں کس قدر دخل ہے، مراکش میں بہت سی جوامع ہیں مگر تقدیر کے دست استحسان سے جو ناموری اسکے نصیب میں لکھی تھی، وہ اسکا عشر عشیر بھی اوروں کو نہ ملی،

الغرض ابن ابی زرع کی القرطاس سے جو مغربی[۱] رسم الخط میں چھپی ہے، اس وقت تمام کچھ حصہ پڑھکر قارئین کے پیش نظر کرتا ہوں،

امام[۲] ادریس (بانی دولت ادارسہ) کے عہد میں جامع الشرفاء میں نماز جمعہ ہوا کرتی تھی پھر ادارسہ ادریسی حکمرانوں کے عہد میں بھی یہی معمول رہا، جامع القرویین کی جگہ بالکل میدان تھا اور کچھ درخت تھے جو ایک شخص کو اپنے والد سے ترکہ میں ملے تھے، جب امام ادریس کے ہاں اطراف واکناف کے وفود آنے لگے تو ان میں ایک قیروان کا وفد بھی تھا، جس میں ایک مبارک اور نیک نہاد خاتون ام القاسم فاطمہ بنت محمد الفہری القیروانی بھی مع اپنے خاوند اور بہن وغیرہ کے تھی، یہ لوگ جامع مذکور کے قریب فروکش ہوئے اور پھر یہیں کے ہو رہے، جب فاطمہ کا خاوند اور اسکی بہن مرگئی، تو اسکو ورثہ میں بڑی جلیل القدر دولت ملی جو ہر طرح حلال و طیب تھی، فاطمہ نے اسکو

۱؎ یہ ہمارے مشرقی رسم الخط سے بہت مختلف ہوتا ہے اور اپنے اصل یعنی کوفی رسم الخط سے بنہایت قریب،

۲؎ القرطاس مطبوعہ فاس (مراکش) ص ۲۲

وجہ ویرانہ میں صرف ایک چہار دیواری میں غربی اور بروز یکشنبہ یکم رمضان ۲۴۵ھ میں اسکی بنا رکھی اور
نہایت تندہی سے اسکو تعمیر کرایا، اور یہ کنواں جو جامع میں ہے اسی نے بزمانہ تعمیر بنوایا تھا،
وہ اس طویل مدت میں روزہ رکھتی رہی، اور پھر اتمام کے بعد پہلے پہل اسی نے دوگانہ شکر
ادا کیا، اوس وقت اس میں چار صفیں اور ایک مختصر سا صحن تھا، اور مغربی اور شرقی دیواروں
کے مابین ڈیڑھ سو بالشت کا فاصلہ تھا (ذکرہ ابو القاسم ابن حسنون سنے تفسیر فی تاریخ مدینہ
فاس) بقول بعض یہ دو بہنیں تھیں، فاطمہ ام البنین اور مریم دختران محمد الفہری - فاطمہ نے جامع
القرویین بنوائی، اور مریم نے جامع اندلس، پھر زناتہ (ایک بربری قبیلہ) نے اپنے عہد حکومت
میں اسکو بہت وسعت دی جس کے حدود اب بھی نمایاں ہیں مسجد خرفا میں گنجائش نہ تھی
اس لیے ۳۰۷ھ میں جمعہ کی نماز یہیں پڑھی جانے لگی، اسکے پہلے خطیب شیخ صالح ابو محمد عبداللہ
بن علی الفارسی تھے الخ

اس اقتباس سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ قرویین منسوب بہ قیروان ہے جیسا کہ ہم اپنے
مضمون المعز اور ابن رشیق میں بھی اس سے پہلے لکھ چکے ہیں،

اہل مراکش، ان کے شیوخ، علما، اور صلحا، اپنے شغف علمی اور حفظ و ذکا کے لیے ضرب المثل
میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں، شیخ عبدالحی الکتانی شیخ الطریقۃ الکتانیہ نے جو فرانسیسی عہد سے
پہلے بھی جامع مذکور کے شیوخ اور ملک کے نامور علما میں شمار ہوتے تھے، بہت تلاش و
جستجو کے بعد اس کتبخانہ کی فہرست مرتب کی ہے. مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جب تک ہمارے
علما کرام اپنی خاص بیدار نہیں کرتے وہ بار ہمہ الیت کام سے جی چراتے ہیں، اور زاویہ خمول
سے نہیں نکلتے تعجب ہے کہ صحیح محنت تو وہ کریں اور نام ہو الفرید بیل مندوب معارف انسائیکلو محکمہ تعلقات کا

۱؎ بروایت صاحب نزہۃ ۲۴۵ھ میں ہوئی، ممکن ہے یہ سال اتمام ہو اور وہ سال آغاز۔

مراکش پر ہر چند سنتا اشر کے مطابق کئی حکومتوں کا دورہ دورہ رہا، مگر چونکہ سب اسلام کا
دم بھرتی تھیں اس لیے کسی نہ کسی شکل میں یہ کتب خانہ بھی باقی رہا، بلکہ اکثر بادشاہوں کے عہد میں کچھ
میں معقول اضافہ بھی ہوا، مثلاً سلطان ابو العباس منصور بن احمد الذہبی السعدی اور سلطان ابو
عبداللہ سیدی محمد (موجودہ شریفی حکومت کے اسلاف میں سے) کے زمانہ میں، مگر چونکہ بہت سے
زمانوں میں اس کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا اس لیے جو علماء و طلبہ کتابیں مستعار لیجاتے تھے
وہ بہت کم واپس کرتے، نیز حفاظت اور جلد بندی کا بھی کوئی انتظام نہ تھا اس لیے بہت
سی کتابیں کیڑوں کی نذر ہو گئیں، چنانچہ اسکی پرانی فہرست اس مدعا کی شاہد ہے، کیا اس سے
بھی بڑھکر کوئی ابتری ہو سکتی ہے کہ منتظم کتب خانہ کا مشاہرہ نصف دانگ (درہم) ماہوار تھا،

مگر پچھلے زمانوں میں یہ حالت نہ تھی، ابن فرحون ابو العباس احمد بن العشر الخزرجی کے
حالات کے ضمن میں لکھتا ہے،

وتولی احکام مراکش والصلوٰۃ بمسجد حامدۃ ثم احکام بلنسیۃ فنعات بها ماضیۃ ولما صار الامر الی ابی یعقوب عبد المؤمن الزمه خدمۃ الحق انه العالیۃ وکانت عندہ من الخطط الجلیلۃ التی لا یلیق بها الا علیۃ اهل العلم واکابرهم . . . .

وہ کچھ دنوں مراکش کے قاضی اور اسکی مسجد کے امام تھے پھر بلنسیہ کے قاضی بنے، مگر جب ابو یعقوب عبد المومن کا عہد حکومت آیا تو انکو کتب خانہ عالیہ کی خدمت سپرد کی جہاں کے ان بڑے بڑے مناصب میں شمار ہوتی تھی اور جس کے لیے بہترین فضلا اور ماہرین چنے جاتے تھے، . . . . . .

[1] [illegible] الدیباج المذہب [illegible]

گویا منصب ایک ہی کی خشت نرتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ کتبخانوں کتابوں سے سلطنیہ
ضخیم علمی تمرات میں تقاموکش کے ضمن میں لکھا ہے کہ مکتبۃ السلطان میں ایک ہزار قلمی کتب ہیں جو
جو مولائی حسن (موجودہ دولت شریفیہ کے ایک سلطان) نے قرطبہ و غرناطہ کے کتبخانوں سے نقل
کرائی تھین،

اب بھی اس شکست و ریخت کے باوجود یہاں ایک بڑی مقدار میں وہ وہ نوادر مخطوطات
پائی جاتی ہیں کہ شاید ہی کہیں اور ہوں، نیز علما کے خطوط، بادشاہوں کے طغرا وغیرہ۔ قدیم سے
قدیم تحریر چوتھی صدی کی ہے، پانچویں اور چھٹی صدی کی تحریریں تو بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری
کی ایک جلد ہے جس پر الطاہر بن مغوز کے ہاتھ کا اجازہ ۵۱۸ھ کا لکھا ہوا ہے، صحیح مسلم کا ایک نسخہ
ہے جو ایک ہی جلد میں ہے اور جو ایک زبردست ادیب کا نقل کیا ہوا ہے، اور جسکی ۵۶۳ھ میں
ابوبکر ابن الخیر الاندلسی نے تصحیح کی ہے، تفسیر ابن ابی زمنین کا نسخہ ۵۹۴ھ میں خود مصنف کے
سامنے پڑھا گیا ہے، اب میں اپنے استقرائے ناقص کی بنا پر اس کتبخانہ کی بعض اہم اور
نایاب کتابوں کی مختصر سی فہرست دیتا ہوں،

تفسیر

جامع احکام القرآن ابو عبداللہ القرطبی متوفی سنہ ۶۷۱ھ یہ تفسیر ۶ جلدوں میں ہے
البحر المحیط لابی حیان (چھپ گئی ہے) اس کے آٹھ قلمی نسخے ہیں،
قانون التاویل لابی بکر بن العربی المالکی
تفسیر الماوردی

قرأت

الوقف والابتداء لابی بکر بن الانباری،

حدیث

شرح البخاری لابن بطال،

" " المہلب (۱)

القبس شرح موطا مالک بن انس } قاضی ابو بکر بن العربی،
المسالک شرح موطا مالک

محاذی موطا مالک (یعنی موطا مہدی ابن تومرت بانی دولت موحدیہ) ابوری علاکار،

الاحکام الصغری والکبری عبدالحق الاشبیلی

مسند عبد بن حُمید،

کتاب الزہد والرقائق لعبداللہ بن المبارک مکتوبہ ۳۶۲ھ اسکی اہمیت بالکل ظاہر ہے،

البدایۃ والنہایۃ (مشہور محدثانہ اور نادر تاریخ) ابن کثیر

کتاب الوہم والایہام لابن القطان۔
الاکمال للامیر ابن ماکولا،
تاریخ ابن ابی خیثمہ متوفی ۲۷۹ھ
جمہرۃ نسب قریش لمصعب الزبیری
} صاحب برنامج نے انکو بذیل حدیث شاید اس لیے کہ انکے مصنفین محدث تھے درج کر دیا۔

نحو

شرح جُمَل الزجاجی،

الافصاح شرح ایضاح ابی علی الفسوی،

الافعال لابن القطاع قدیم نسخہ، رامپور میں بھی اسکا ایک نہایت عمدہ نسخہ ہے،

[illegible] معارف:- یہ کتاب چھپ گئی ہے، اور کتب خانہ دارالمصنفین میں پیرس سے خرید کرائی ہے۔ مدیر معارف [illegible]

شرح ادب الکاتب، شرح المقامات للمطرزی، اسکا ایک نسخہ کتبخانہ باد انقرہ

مین بھی ہے،

المقنع ابن عصفور،

مسئلہ ابن السید البطلیوسی جس سے سیوطی نے اشباہ و نظائر نحویہ مین بہت کچھ لیا

لغت

مختصر العین، امام زبیدی کی مشہور و نادر قاموس،

دیوان الادب، فارابی جو جوہری صاحب صحاح کے ماموں ہین

تکملۃ الفائق، سید مرتضیٰ بلگرامی خود انکے اپنے خط کا نسخہ،

کتاب الفرق فی اللغۃ، جاحظ

کتاب الالفاظ المعربۃ والالقاب المعربۃ، ابن قتیبہ

تاریخ

رحلۃ البلوی سنہ اتمام ۷۱۱ھ ہے،

ادب

خریدۃ القصر عماد اصفہانی، قسطنطنیہ مین بھی ہے،

شرح مقصورۃ حازم القرطاجنی،

شرح دیوان المتنبی للافلیلی جو اسکی بہترین شرح ہے مکتبہ رباط مین بھی اسکا ایک نسخہ ہے،

الفصوص لصاعد اللغوی، یہ بے حد نادر اور جلیل القدر تصنیف ہے،

طب

الاستقصاء والابرام فی علاج الجراحات، ابو محمد بن قرح (سرجری) جراحی کی نادر تصنیف

مراکش کے پہنچنے سے چند سال قبل کتبخانہ منتشر تھا۔ اسلئے حکومت کو ملکی کتابوں کی بابت

دولت علیہ کی طرف سے ایک باضابطہ مرتب کیا گیا جو علاوہ اس کتبخانہ کے کتبخانہ جامع

القرویین اور کتبخانہ خاص جدیدہ پر بھی مشتمل تھا۔ اس ضابطہ میں حسب ذیل دفعات ہیں نمبر

خاص طالبان کے لئے بین مستند دیوانی کتابوں کی باقاعدہ طرح کی فہرستیں مرتب کی جائیں

جو کتابیں باہر مستعار جا چکی ہیں وہ واپس منگوالی جائیں یا انکی نقل یا قیمت

حاصل کیجائے ہر ہفتہ کے دوشنبہ اور پنجشنبہ کو سابق الذکر کتبخانہ اور ہر ہفتہ میں ایک بار باقی دیگر

کتبخانے عام مسلمانوں کے فائدہ کے لیے کھولے جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ

ایک مدت تک مراکش کے کتبخانے بھی دوسرے متمدن ملکوں کے کتبخانوں کی طرح ایک باقاعدہ

نظام کے ماتحت آ رہے ہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ذاتی کتبخانوں کے مالکوں کو

اب تک یہ فکر نہیں کہ اپنے کتبخانوں کو انکا جزو بنا دیں تاکہ پبلک کو پورا استفادہ ہو۔

واللہ ولی ذلک

پیر حسام الدین راشدی

قاہرہ میوزیم میں چند گھنٹے

میں چند روز پیشتر بھی قاہرہ کے اس عظیم الشان کتب خانہ کو دیکھ چکا تھا لیکن اس موقع پر میرے ساتھ پاکستان کا ایک وفد بھی ساتھ تھا یہ قوم اقبال کی پہچان ہے۔ لکھے لکھائے تو یہ لوگ رات دن ہیں لیکن کتاب جس چیز کا نام ہے وہ کبھی پڑھتے ہیں اور شاید وہ اس لذت سے آشنا ہیں۔ چنانچہ جب ہم پندرہ بیس آدمی سب ایک ساتھ ان کمروں میں پہنچے تو ایک ہڑبونگ مچ گیا۔ جس طرح دیکھا اور ان میں دلچسپی لینا تو غیر ضروری بات تھی ان کے ذہن میں فقط کتابوں کی بینائی اور ان پر سونے چاندی کا کیا جڑاؤ کام دیکھ کر پانی بھر آیا جیسے کچھ دیکھا۔ ادھر بھاگے ادھر بھاگے۔ الغرض ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں ہی ضائع کر کے چلے گئے۔ بعض حضرات نے غیر معمولی دلچسپی دکھلانے اور اپنا شغف ظاہر کرنے کے لیے ساتھ میں کاغذ اور پنسل بھی لیا تھا کہ کچھ نوٹ کریں۔ اور ان کی تاریخی اہمیت لکھیں۔ لیکن جب کتابوں کے نام اور ان کے ہجے دیکھے۔ تو غالباً نوٹ کرنے کا خیال ترک کر دیا اور پھر کسی نے کچھ نہ لکھا۔

میں چند دن کے بعد تنہا گیا تاکہ ایک دفعہ اچھی طرح اس بیش بہا ذخیرہ کو دیکھ لوں۔ چنانچہ دروازہ پر رکھی ہوئی کتاب میں اپنا نام اور پتہ درج کیا۔ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے پہلے تو دارالکتب کی شائع کردہ کتابیں خریدیں۔ اس کے بعد اطمینان کے ساتھ میوزیم میں پہنچ کر ایک ایک کتاب دیکھنی شروع کی۔ شیشہ کی بہت سی الماریاں قرینہ سے رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر خطاطی کے نمونے اور وصلیاں آویزاں تھیں۔ تصاویر بھی دیواروں پر لٹکی ہوئی تھیں۔

میرے سامنے سینکڑوں نوادر کھلے ہوئے رکھے تھے۔ بعض کتابوں کے نوٹ لیے۔ اور پہلے تو بنگاہ غائر دیکھنا شروع کیا لیکن جب دیکھا کہ شاید وقت گزر جائے اور میں ایک بھی کمرہ ختم نہ کر سکوں گا۔ تو پھر میں نے سرسری جائزہ لینا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ خاص خاص کتابوں کی فہرست بھی مرتب کرتا گیا۔ اس سرسری مطالعہ میں بھی میرے پانچ گھنٹہ صرف ہوئے اور جب میں نیچے اترا تو اس وقت شام ہو چکی تھی کتب خانہ بند ہو رہا تھا۔ اور کلرک، کارندے اور افسر اپنا اپنا کام سمیٹ کر چکے ہاں نیچے اتر رہے تھے۔

ان مخطوطات کی فہرست مرتب کر لی گئی ہے ... بعض مخطوطوں کو بھی اس میوزیم کے نوادرات کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔

مصحف:

(۱) بخط ابی سعید الحسن البصری (کتابت ۷۷ھ)، (۲) قرآن کا ایک مصحف سیدنا عثمانؓ (یہ بہت چھوٹی تقطیع کا ہے اس کے دو صفحے ہیں)، (۳) بخط امیر ... سکون العراق (کتابت ... رمضان ...) (۴) بخط امام جعفر صادق المتوفی ۱۴۸ھ، (۵) بخط علاء الدین محمد الحسینی (کتابت ۱۰۴۹ھ)، (۶) بخط ... نسخ فارسی (کتابت ۱۲۶۷ھ) (۷) بخط محمد بن ... جعفر نسخ فارسی۔ سلطان فتح علی شاہ (قاچار کی خواہش پر لکھا) ۱۲۳۳ھ

بعض کلام مجید مطلا اور مذہب کام اور خوب تقطیع کے نہایت ہی خوش خط لکھے ہوئے ہیں جن کی کتابت کے سال یہ ہیں ... ایک کلام پاک سلطان ... شاہ کی ملکیت کا ہے اتنا ہی زیب رکھا ہوا تھا ... شاہ کا انتقال ... میں ہوا ہے۔ بعض کی کتابت حسب ذیل سنین میں ہوئی تھی۔

۶۱۳ - ۸۶۳ - ۵۷۰ - ۹۱۲ - ۹۴۴ - ۱۵۷ - ۱۹۹ - ۸۴۵ - ۹۹۴ - ۸۶۹ھ،

لاہور کے ایک مشہور خطاط حافظ فتح اللہ کے لکھے ہوئے تین کلام مجید بھی موجود تھے بعض کی تقطیع بڑے سائز اور ایک کی چھوٹی تقطیع تھی۔ حافظ کا پورا نام یوں لکھا ہوا تھا۔ حافظ فتح اللہ بن ملا محمد حسین لاہوری!

بعض کا خط موٹا اور بعض کا باریک لیکن تمام دلکش اور دیدہ زیب تھا کہ دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوتی تھیں کتابت کے سال یہ تھے۔ ۱۱۰۷ - ۱۱۰۹ - ۱۱۰۸ھ

ایک کلام مجید بخط قطب الدین، ۱۱۹۰ھ بھی اس شوکیس میں رکھا ہوا ہے جس میں حافظ فتح اللہ کے کتابت شدہ کلام مجید رکھے ہوئے ہیں۔

یہ تمام کلام مجید مختلف سائز اور مختلف قسم کے کاغذوں پر لکھے ہوئے تھے۔ خط کا حسن اور طلاکاری اور نقش سازی کی تعریف کرنے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ بس یہ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

ترک سلاطین کے کتب خانوں کے علاوہ ان کے مطالعہ کے کلام مجید بھی بڑی تعداد میں رکھے ہوئے ہیں۔ جن میں بعض کے نام یہ ہیں:-

(۱) مصحف بخط یاقوت ۶۹۰ھ، (۲) مصحف بخط یاقوت ۶۸۹ھ (۳) مصحف بخط یاقوت۔ سنہ لکھا ہوا نہیں، (۴) مصحف بخط الیاس محمد بن الیاس ۷۰۰ھ، (۵) مصحف بخط عبد الرحمن بن

بابی الفتح فرغ ۸۸۸ [illegible] (۷) مصحف [illegible] فارسی بقلم [illegible] محمد التبریزی [illegible]
(۸) سورۃ الفتح نسخ فارسی بقلم [illegible] ۱۱۱۸ھ (۹) مصحف بخط بہادر [illegible] ابی الفضل [illegible]
کتابت ۱۰۹۱ھ۔

عربی کی کتابیں:-

اگرچہ مکتوبی جن میں کلام پاک کے نسخے ہیں بعض شوکیس ایسے بھی ہیں جن کے اندر عربی زبان کی اہم کتابیں رکھی ہوئی ہیں جو یا تو مصنف کے اپنے خط میں ہیں یا پھر کسی باکمال کاتب یا مصنف کے عصر کی کتابت شدہ ہیں۔ ہم یہاں کے لیے خاص طور الماری مخصوص کی گئی ہے اس ترتیب سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خط اور کتابت کے فن نے کس طرح ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ چند کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۱) المجالسة وجواہر العلم - للشیخ ابی بکر احمد بن مروان الدینوری - بخط علی بن محمد المعروف بسنجاوی بتاریخ ۴۳۶ھ
(۲) تاریخ بغداد للخطیب - بخط عبد القادر بن ابی صالح الجیلی بتاریخ ۵۱۳ھ (۳) - مقامات حریری ابی محمد القاسم الحریری البصری بخط مصنف بتاریخ ۵۰۴ھ (۴) - مختارات اشعار العرب لابن الشجری المتوفی ۵۴۲ھ بخط مصنف۔ (۵) مختصر السنن المجانسة صحیح الامام مسلم کتب ۶۵۳ھ (۶) التحریر فی شرح الجامع الکبیر بحر السالح جمال الدین محمود بن احمد بن عبد السید الحصیری البخاری المتوفی ۶۳۶ھ بخط مصنف بتاریخ ۶۳۰ھ (۷) [illegible] النبی صلعم شیخ ابی الحکم عبد السلام بن عبد اللہ الاشبیلی بخط مصنف سال [illegible]
(۸) المختصر المحتاج الیہ من تاریخ بغداد - الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ بخط مصنف ۷۰۴ھ (۹) مصباح المجتہد وکفایة المتفرد، محمد بن الحسین المتوفی بخط مصنف سال ۷۴۹ھ (۱۰) شرح الکافیہ ابن الحاجب تالیف رضی الدین محمد بن الحسن الاسترآبادی المتوفی ۶۸۶ھ بخط عماد الدین یحیی ابن القاسم الصنعانی شارح الکشاف سال ۷۳۲ھ (۱۱) نسیم الریاض فی شرح شفاء القاضی عیاض شہاب الدین احمد بن محمد الخفاجی المصری المتوفی ۱۰۶۹ھ بخط مصنف سال ۱۰۵۸ھ، (۱۲) طبقات الکبری لابن السبکی بخط مصنف۔ (۱۳) المواہب اللدنیة بالمنح المحمدیة شہاب الدین ابی العباس احمد بن محمد القسطلانی المتوفی ۹۲۳ بخط مصنف سال ۹۰۱ھ۔ (۱۴) المنن والاخلاق فی بیان وجوب التحدث بنعمة اللہ علی الاطلاق الشیخ عبد الوہاب بن احمد بن علی المعروف بالشعرانی المتوفی ۹۷۳ بخط مصنف سال ۹۶۰ھ (۱۵) الالقاب لابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ بخط مصنف، (۱۶) الانوار من مطالع الانظار للبیضاوی المتوفی ۶۸۵ھ بخط ابی عبد اللہ محمد المعروف بابن جماعت سال ۸۰۹ھ (۱۷) مغنی اللبیب عن کتب الاعاریب جمال الدین عبد اللہ بن ہشام الانصاری المتوفی ۷۶۱، بخط حافظ ابن ہشام، شہاب الدین احمد بن عبد الرحمن بن عبد اللہ سال ۸۳۵ھ، (۱۸) مشکل القرآن ابی محمد عبد اللہ بن مسلم المعروف بابن قتیبة الدینوری المتوفی ۲۷۶ بخط محمد [illegible]

[illegible] کی کتابت [illegible] (۲) [illegible] کتابت ۱۰۸۰ھ

(۳) کتاب [illegible] (۴) الدرۃ الکبریٰ [illegible] ملک [illegible] تمام [illegible] کتابت [illegible] میں ہوئی تھی۔ یہ سب سے قدیم ترین نسخہ اس کتاب کا ہے۔ (۷) الجامع الصحیح للامام البخاری المتوفی [illegible] (۸) الجامع الصحیح للامام مسلم [illegible] حاشیوں پر [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت اس سے بہت قبل ہوئی ہے۔

فارسی ادب

فارسی ادب اور زبان کی بہت سے نادر مخطوطات الماریوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ نقش و نگار اور طلاکاری اور خطاطی کی کاریگری دور سے دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک نمائش گاہ ان چیزوں کے لیے مخصوص ہے۔ ۱۰-۱۲ شوکیس مخطوطوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر مختلف خطاطوں کی وصلیاں اور مصوری کے نمونے آویزاں ہیں۔ شاہنامہ، خمسہ نظامی، دیوان حافظ اور مولانا روم کے مثنوی کے مصور اور مطلّا نسخے رکھے ہوئے ہیں۔ بعض نسخوں کی فہرست یہ ہے۔ یہ تمام نسخے پرانے، نادر، رنگارنگ تصاویر وغیرہ سے مزین ہیں۔

(۱) دیوان حافظ مصور و مذہب، منقش ۹۷۵ھ و ۱۰۹۱ھ (۲) خمسہ نظامی کے مصور نسخے گیارہویں صدی اور اس سے پیشتر کی صدیوں کے (۳) دیوان قاسم الانوار (۴) دیوان نوائی (۵) جواہر التفسیر تحفۃ الامیر از کاشفی (۶) بوستان سعدی بخط میر علی الحسینی الکاتب السلطانی (۷) دیوان محمد اصفہانی ۱۲۳۱ھ (۸) انتخاب شعرائے فارس۔ دیوار پر لگے ہوئے شوکیس میں ایک عجیب انتخاب مزین اور منقش ہندوستان میں لکھا گیا ہے۔ ایک صفحہ پر ایک تصویر ہے جس میں چند مشہور شعراء بیٹھے ہوئے شعر و سخن ایک دوسرے کو سنا رہے ہیں۔ اس مرقع میں یہ شعراء ہیں: حسن، جامی، مشتاق، سید، نوید، نظمی، ملا عطاء اللہ، مولوی جامی، سعید، یہ خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ اسی طرح ہر شاعر کی صورت کو حسین اور جمیل بنایا گیا ہے۔ جامی کے سوا باقی شعراء جوان ہیں۔ سب کے سر پر عمامے اور سر پر کلاہیں ہیں۔ یہ نسخہ ۹۲۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ دوسرے صفحہ پر سید اور شانی کی غزلیں ہیں، ہم وزن اور ہم قافیہ۔ تمام کتاب میں انتخاب کا طریقہ یہی ہوگا۔ سید کی غزل کا مطلع یہ ہے:

ہر آں کس خاک از بہر او دن مختصر گیسرد	چو زنبور عسل از شہد راحت کام بر گیسرد

مقطع:

مبادا ہر چو خورشید جہاں تابست اے سید	چو کم گردد از دگر ذرہ را افلاک بر گیسرد

[illegible]

ملا کی نادر کتابیں [illegible] گلدستۂ [illegible]

(۱) بوستان سعدی المتوفی [illegible] بخط سلطان علی الکاتب [illegible] اس نسخہ کی تصاویر بہزاد کی [illegible] (۲) [illegible] جامی المتوفی [illegible] کتابت [illegible] (۳) دیوان عرفی المتوفی [illegible] کتابت [illegible] (۴) دیوان خسرو دہلوی المتوفی [illegible] بخط شمس الدین الادریسی [illegible] (۵) کلیات سعدی المتوفی [illegible] یہ بہت ہی بڑی [illegible] بن محمد بن ابوبکر المتوفی [illegible] مکتوبات [illegible] (۶) تحفۃ الاحرار جامی بخط علی [illegible] (۷) [illegible] حسین [illegible] بخط علی بن محمود کرمانی [illegible] (۸) تحفۃ الاحرار جامی کتابت [illegible] (۹) ہفت اورنگ جامی کتابت [illegible] (۱۰) [illegible] نظامی المتوفی [illegible] کتابت [illegible] (۱۱) خمسہ خسرو دہلوی کتابت [illegible] (۱۲) دیوان حافظ المتوفی [illegible] بخط علاء الدین [illegible] کتابت [illegible] مصور (۱۳) دیوان گلشنی شیخ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم المعروف بہ گلشنی المتوفی [illegible] (۱۴) کلیات [illegible] مصور (۱۵) مثنوی مہر و مشتری [illegible] کتابت [illegible] (۱۶) شاہنامہ فردوسی المتوفی [illegible] بخط [illegible] کتابت [illegible] (۱۷) شاہنامہ فردوسی بخط [illegible] کتابت [illegible] (۱۸) شاہنامہ فردوسی بخط [illegible] سمرقندی [illegible] (۱۹) شاہنامہ فردوسی بخط لطف بن یحییٰ شیرازی کتابت [illegible] شاہنامہ کے چاروں نسخے مصور مطلا اور دلفریب خط میں ہیں۔ (۲۰) [illegible] بہزاد کی تصاویر کے البم کی دیواروں [illegible] خوشنویسی [illegible] اور کئی خوبصورت اور خوش خط وصلیاں دیوار پر آویزاں ہیں جن میں کاتبوں نے مختلف خط کے نمونے [illegible] بعض وصلیاں آیات کی ہیں اور بعض پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ (۲۱) انتخاب [illegible] یہ انتخاب سلطان علی کے خط میں ہے اور سنہ کتابت [illegible] ہے اور یہ سلطان ابو النصر [illegible] کے لیے لکھا گیا تھا۔ انتخاب ان شعرا کا ہے۔ حافظ، امیر خسرو، خواجو [illegible] کمال خجندی، سلمان ساوجی، شاہی، عصمت بخاری، [illegible] (۲۲) منتخب کلام شاہی پہلے صفحہ کی لوح پر فتح علی شاہ قاچار کی سنہری مہر لگی ہے۔ کاتب عز الدین محمد الحسینی [illegible] سنہ کتابت [illegible] صفحہ اول پر یہ اشعار ہیں۔

ای نقش بستہ نام خطت با سرشت ما | این حرف شد ز روز ازل سرنوشت ما
کاوم بسینہ تخم وفائے تو کشتن است | خود عقل [illegible] کار و کشت ما
[illegible] شرمسار ماندہ ز تقصیر ہائے خویش | لطف تو خود [illegible] نکرد خوب و زشت ما

صفحۂ دوم:

اے شیخ شہر اگر بہ خرابات بگذری | رشک آیدت بکلبۂ [illegible] بہشت ما
بگذر ز بوسۂ تربت شاہی [illegible] | بوئے وفا ز طینت عنبر سرشت ما

بتصویر وفا بیم کن کز آب چشم من بشو نافد رہم تر و قامی سرو ید از گل
گر از گردون طلب باشد تو ز عشق اعانی کن کہ عشق آمد دریں مشکل مدد در حل مشکل

اسی کمرے کے بغل میں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس کے دروازہ کا عنوان ہے "کمرہ الاوراق البردیۃ" اس میں [illegible] پر لکھے ہوئے قدیم ترین خط اور مکاتیب شیشوں کے شوکیسوں میں رکھے ہوئے ہیں۔ بعض خط لمبے ہیں بعض بالکل بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ دو شناخت کی سہولت کے لئے ان خطوط کے سنین یہ ہیں:- [illegible] ۲۵۰، ۲۵۶ھ۔ ایک کتاب یہاں اور بھی نظر آئی ہے "الجامع الحدیث" تالیف ابی محمد عبداللہ بن وہب المصری القرشی۔ اس مصنف کی پیدائش سال ۱۲۵ھ—۱۹۷ھ میں ہوئی ہے۔ تیسری صدی کی ابتداء میں کتابت کیا گیا ہے۔ ایک خط ولید بن عبدالملک ۸۶-۹۶ھ کے زمانہ کا ہے جو یونانی اور عربی زبان میں لکھا ہوا ہے۔ ایک اور خط بھی ولید کا اس کے بھائی عبداللہ بن عبدالملک کے نام ہے جو اس وقت مصر کا گورنر تھا۔ ان خطوط کے متعلق دار الکتب المصریہ نے انگریزی زبان میں تین جلدوں کی ایک کتاب شائع کی ہے اور عربی زبان میں ایک الگ کتاب۔

بڑے کمرے میں جہاں کلام مجید کے قدیم نمونے اور مصنفوں کے اپنے ہاتھ کی لکھی کتابیں موجود ہیں وہاں چند شوکیس ایسے بھی ہیں جو ترک سلاطین کے کلام مجید دکھاتے ہیں اور ان میں ترکی زبان کے نمونے ہیں۔ میر علی شیر نوائی کے ترکی دیوان کے چند بہترین نسخے بھی شوکیسوں میں کھلے ہوئے اپنے حسن اور زینت کی بہار دکھا رہے ہیں۔

اسی کمرے کے ایک حصہ میں چند شوکیس رکھے ہوئے ہیں جن میں علامہ المرحوم تیمور پاشا کی ذاتی استعمال کی چیزیں ہیں۔ مثلاً قلمدان، فاؤنٹین پن، پیپر ویٹ، خورد بین، دوات، ہاتھ کی گھڑیاں، چائے کی پیالے، کھانے کی پلیٹیں وغیرہ وغیرہ۔ غالباً یہی قلم اور دوات ہوں گے جن کے ذریعہ اس عالم بے مثل نے عربی ادب اور تاریخ پر بیش بہا مضامین سپرد قرطاس کیے۔ علامہ تیمور پاشا کا کتب خانہ بھی دار الکتب کے سپرد کیا گیا ہے جس کی فہرست چھاپی جا رہی ہے اور خزانہ تیموریہ کے نام سے چار جلدیں اب تک چھپ بھی چکی ہیں۔

نور احمد فریدی

حرمین کے کتب خانے

۱۔ کتب خانہ مجیدیہ مکہ مکرمہ

حرم کی میں باب السلام کے اندر دائیں جانب ایک دروازے پر "مکتبۃ مجیدیۃ" کا کتبہ نصب ہے۔ یہ کتب خانہ مجیدیہ کا داخلی دروازہ ہے۔ مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران حاجی لوگ نماز اور طواف کے بعد مکہ مکرمہ کے بازاروں میں نکل جاتے ہیں اور خرید و فروخت کی گرم بازاری سے لطف اندوز ہوتے ہیں، کچھ باب الصفا کی طرف صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی والہانہ کیفیات سے ایمان تازہ کرتے ہیں۔ کچھ مصلی حنفی میں بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ اور جو علمی ذوق رکھتے ہیں ان کا اکثر وقت اس تاریخی کتب خانہ میں گذرتا ہے۔

پہلے یہ کتب خانہ مصلی شافعی میں قائم تھا۔ ایک بار مکہ مکرمہ میں شدید بارش ہوئی اور حرم شریف سیلاب کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس سے کتب خانہ کو شدید نقصان پہنچا اور ہزاروں کتابیں ناکارہ ہو گئیں۔ اب بھی بہت سی کتابوں پر اس سیلاب کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ یہ مقام خاصا اونچا ہے اور کتابیں اس جگہ مقابلتاً زیادہ محفوظ ہیں۔

اس کتاب خانے کی اکثر کتابوں پر سلطان عبدالمجید خان ترکی جنت نشاں کی مہر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں شاہی کتب خانے سے یہاں منتقل ہوئیں۔ اس لیے یہ کتب خانہ سلطان مرحوم سے منسوب چلا آتا ہے۔

کتب خانہ کافی کشادہ اور ایک بڑے ہال پر مشتمل ہے۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ الماریاں استادہ ہیں۔ درمیان میں ڈیسک اور کرسیاں رکھی ہیں جن پر بیٹھ کر اہل ذوق کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

مصلی حنفی کا دارالمطالعہ بھی اسی کتب خانہ سے وابستہ ہے۔ صبح کو یہاں سے قرآن مجید اور دینی کتب کے نسخے لیجا کر وہاں رکھوائے جاتے ہیں اور شام کو اٹھا لاتے ہیں۔ ایک ملازم سارا دن وہاں ان نسخوں کی دیکھ بھال کیلئے بیٹھا رہتا ہے۔

قرآن مجید کے نسخے یہاں دنیا بھر کے تمام رسم الخطوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ان کے سائز بھی غیر معمولی طور پر طویل و عریض ہوتے ہیں۔ کتب خانے کے ملازمین بڑے با اخلاق ہیں۔ ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتے اور چائے سے تواضع کرتے ہیں۔ کتب خانہ کا ایک ناظم اعلیٰ ہے اور ایک ان کا نائب ہے۔ دو تین ملازم ہیں یہ سب لوگ بڑی مستعدی سے مصروف کار رہتے ہیں۔

قرآن مجید، تفاسیر، احادیث، فقہ، تصوف، سیرت نبوی کی کتابیں اور مخطوطات یہاں موجود ہیں جو مختلف ڈسکوں پر بڑی ترتیب سے رکھے گئے ہیں۔ اہل علم اپنے مطالعہ کے لئے کتابوں کے نام لکھ کر دیتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

مجھے یہاں تاریخ کی چند کتابوں کے نسخے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خاص کر ابن خلدون کا وہ حصہ جو واقعات کربلا سے متعلق ہے کیونکہ ہمارے ہاں ابن خلدون کے جو نسخے ملتے ہیں ان میں حضرت امام حسین کی شہادت کے واقعات تاریخ کامل سے لکھ دیئے گئے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اصل نسخے سے یہ اوراق نکال لیے گئے تھے اور دوسرا واقعہ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی شہادت کا ہے جو درری چیزوں میں ابن خلدون کے حوالے سے ملتا ہے۔ اس کتب خانہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنفین اور مؤلفین کے اپنے قلمی نسخے یہاں ملتے ہیں اور ان پر ان کے دستخط بھی ثبت ہیں۔ مزید براں بعض نسخے سلطان عبدالحمید کی مہر سے مزین ہیں۔ چند تاریخ کی بے شمار ایسی کتابیں یہاں ہیں جو افادیت کے اعتبار سے بہت اہم ہیں مگر ابھی تک طبع نہیں ہو سکیں اور اکثر تاریخیں حشو و زوائد سے پاک ہیں۔ ہمارے ہاں خاص طور پر جو کتابیں نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی ہیں وہ تحریف سے بچ نہیں سکیں اور ایسی حرکتوں سے ہی امت مسلمہ میں انتشار پیدا کیا گیا ہے۔

ہمارے علم دوست حضرات خاص کر مؤرخین اور مصنفین اگر محنت کی عادت ڈالیں اور کسی مقدس مقام میں تشریف لے جائیں تو اس کتب خانہ سے ضرور استفادہ کریں اور متنازعہ مقامات کا ان نسخوں سے مقابلہ کریں جو دستبرد زمانہ سے تاحال محفوظ چلے آتے ہیں۔

۲۔ کتب خانہ شیخ الاسلام

یہ عظیم الشان کتب خانہ مسجد نبوی کے بالکل قریب ہے۔ باب جبرائیل سے نکل کر ایک مختصر گلی آتی ہے جس میں سنگ مرمر کا فرش کیا ہوا ہے۔ غالباً یہاں جنازے کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس کے جنوبی دروازے سے نکل کر سامنے گلی میں بائیں ہاتھ کو حضرت ابی ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مکان ہے جس پر "دار ابی ایوب انصاری" کا کتبہ نصب ہے۔ جب ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے حضرت نے اسی تاریخی مکان میں قیام فرمایا تھا۔ عشاق رسالت یہاں کھڑے ہو کر روضۂ اطہر کی طرف منہ کر کے درود شریف پڑھتے ہیں۔ اس مکان کے عین سامنے شیخ الاسلام کا عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ دراصل یہ مکان حضرت امام حسن کا ہے۔ ترکوں کے زمانے میں مدینہ طیبہ کا شیخ الاسلام اس عمارت میں رہتا ہوگا۔ آجکل کتب خانہ کا کام دے رہا ہے۔ مدینہ طیبہ کے قیام میں علمی ذوق رکھنے والے حجاج یہاں آتے اور ان نایاب کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں جب راقم کو اس کتب خانے سے استفادہ کی سعادت نصیب ہوئی تو اس کے لائبریرین شیخ ابراہیم ہمدانی تھے۔ اسی برس کے پیر مرد تھے۔ بہت خوش اخلاق اور فرض شناس بزرگ تھے۔ جونہی ہم کمرے میں داخل ہوئے وہ اہلاً سہلاً کہتے ہوئے آگے بڑھے اور بڑے تپاک سے مصافحہ کیا۔ اندر فرش پر خوشنما

پانچ بجے ہوئے تھے سلطان پر منقش مسند بچھی ہوئی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ شیخ نے ہمیں اس مسند پر بیٹھنے کا اشارہ
کیا۔ چند منٹ ہم بیٹھے رہے۔ پھر وہ دوسری مسند پر بیٹھے کتابوں کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ مجھ سے پوچھا کہ آپ کون کون
سی کتابیں دیکھنا پسند کریں گے۔

میں نے انھیں عرض کیا کہ آپ اپنے کتب خانے کے نادر قلمی نسخے دکھائیں۔ شیخ اٹھ کر ایک الماری کی طرف بڑھے اور ایک جزدان
کا لا کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ہم جانتے تھے لیکن ہماری نظر کتب خانے کا جائزہ لے رہی تھی۔ بڑی الماریاں دیواروں کے ساتھ
ایستادہ تھیں اور کتابیں جزدانوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ جزدان رنگ برنگ کے تھے۔ ایسی احتیاط آج تک کم از کم میری نظر سے کہیں نہیں گزری
تھی۔ شیخ چار پانچ جزدان اٹھا لائے۔ ایک جزدان سے قرآن مجید نکال کر آگے بڑھایا اور بتایا کہ یہ خلیفہ مامون الرشید کے اپنے ہاتھ
کا لکھا ہوا ہے۔ ایک اور جزدان سے دوسرا مصحف نکالا۔ فرمایا یہ سلطان مصطفیٰ ثانی شہنشاہ ترکی کی والدہ کا لکھا ہوا ہے۔
یہ مصاحف رنگ برنگ کی خوبصورت جدولوں کے درمیان بڑی ہنرمندی سے لکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک مصحف حضرت
محی الدین اورنگ زیب عالمگیر شہنشاہ ہند کا بھی تھا جس کا عکسی نسخہ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے طبع کرایا تھا۔ اسی طرح کئی نادر تاریخی
مصاحف شیخ نے دکھائے جن پر کاتبوں کے دستخط اور سنہ تحریر درج تھے۔ اس کے بعد شیخ نے تفاسیر، احادیث اور فقہ کے
نادر قلمی نسخے دکھائے۔ ان میں سے بعض ایسے قلمی نسخے تھے جو آج تک طبع نہیں ہو سکے تھے۔ ان سب پر شارحین، محدثین اور فقہا کے
دستخط ثبت تھے۔ میں نے شیخ سے تاریخ اور سیر کی کتابیں طلب کیں۔ حضرت شیخ اور ان کا ایک خادم برابر ہماری طرف متوجہ تھے۔ شیخ
جزدان اٹھا کر لاتے اور کتابیں نکال کر آگے بڑھاتے۔ جب ہم دیکھ چکتے تو ان کا خادم جزدان میں ڈال کر انھیں اصلی جگہ میں رکھ آتا۔

شیخ نے پہلے ہی بتا دیا کہ ایک کمرے میں کچھ مخطوطات فارسی کی رکھی ہیں ان میں اکثر شعری مجموعے ہوں گے جن کی خصوصیت یہ تھی کہ بعض
اصل نسخے تھے جو مصنفین اور مؤلفین نے خود اپنے قلم سے لکھ کر نذر کیے تھے۔ صوفیائے کرام کے تذکروں میں سے "اخبار الاخیار" اور "سفینۃ الاولیاء" شیخ نے آگے بڑھائے اور کہا کہ
حضرت محدث دہلوی اور مولانا دارا شکوہ کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے تھے۔ ان پر ان کے اپنے دستخط موجود تھے۔ مثنوی مولانا روم دیکھنے کا اشتیاق تھا کیونکہ
ہمارے ہاں مثنوی کے جو نسخے متداول ہیں جو لاہور اور نولکشور کے طبع شدہ ہیں ان پر خاصی تحریف کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک شعر میرے ذہن میں تھا

چوں صحابہ حب دنیا داشتند   مصطفیٰ را بے کفن بگذاشتند

مجھے یقین تھا کہ یہ الحاقی ہے۔ چنانچہ مثنوی کے قلمی نسخے کو جس پر حضرت مولانا روم کے دستخط ثبت تھے کھول کر دیکھا تو اس میں یہ شعر نظر نہ
آیا۔ اسی طرح چند اور اشعار بھی نظر نہ آئے جو ہمارے نسخوں میں ان بزرگوں کے لیے تضحیک کا موجب بنے ہیں۔

ہم کتابوں کے دیکھنے میں محو تھے کہ دفعۃً حرم سے اذان کی آواز آئی جس پر سب لوگ کتابیں چھوڑ سرعت سے باہر نکل آئے۔ شیخ نے بڑی
محبت سے ہمیں خدا حافظ کہا۔ اتنے میں خادم کمرے کو مقفل کر چکا تھا۔ ہم نے کتب خانے پر نگاہ واپسیں ڈالتے ہوئے حرم شریف کا رخ کیا ●●

مراسلات

- جرنل ۵۳ھ کے تسامحات

جناب عبدالرؤف خاں

- استاد احمد معمار کی ڈائری؟

جناب شبیر احمد خاں غوری

- "ہند عہد اورنگ زیب میں" کے بارے میں

جناب مصطفیٰ شروانی

جرنل کے بارے میں آپ کی تنقید، فہمائشوں
اور مشوروں کے ہم ہمیشہ منتظر رہتے ہیں۔

ادارہ

مراسلات

جرنل ۳۵ کے مسامحات

جناب عبدالرؤف خاں
مدیر لائبریری بھوپال

جرنل ۳۵ ص ۱۸۱ سطر ۱۵ پر حضرت اقدس میاں نعیم شاہؒ کا سنہ وفات ۱۲۶۳ھ رقم فرمایا ہے مگر قطعہ تاریخ "بر بہشت نعیم شاہ امام" (۲+۲۰۰، ۵۰، ۱۰، ۴۰۰، ۳۰۰، ۴۰، ۲، ۲۰۰) کے اعداد کا میزان ۱۲۶۲ھ برآمد ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ مادہ بشکل قطعہ نعیمیہ مذ طے کے ساتھ نظم ہوا ہو۔ ص ۱۸۵ پر تصنیف "گلستان رحمت" (۱۲۸۵ = ...) اصل تاریخی نام ہے جس کی طرف شاید صاحب مقالہ کی توجہ منعطف نہ ہوئی۔ مقالہ "وفات نامہ" جلد ... ص ۱۹۱ سطر ۲ میں جناب ... کشمیری کے سفر کا سنہ ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) تسوید فرمایا ہے لیکن اس کی تائید میں جو فارسی عبارت تحریر فرمائی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائے سیاحت کا سال ۱۲۹۵ھ تھا": "در اوائل موسم برسات یک ہزار و دو صد ہشت و پنج ہجری..." (سطر ۳ "عزم ایضاً") ظاہر ہے کہ کاتب کی کرشمہ سازی نے "بست" کو "ہشت" بنا دیا ہے۔ ص ۱۹۰ سطر ۲ پر "مقبول خرد" (۱۲۲۵) سے مطلوبہ اعداد برآمد نہیں ہوتے بلکہ ۱۲۲۵ کی بجائے صرف (۸۰۴+۱۷۸) ۹۸۲ ہی مستخرج ہوتے ہیں چنانچہ اس میں "گردیدہ" کے اعداد ۲۴۳ کا اضافہ کرنا چاہیے تھا یعنی "مقبول خرد" کے بعد جس میں ۱۲۲۵ ثبت فرمانے کی بجائے "مقبول خرد گردیدہ" کے بعد (۱۲۲۵ھ) ہونا چاہیے۔ ص ۱۸۳ پر حضرت خواجہ بزرگ معین الدین سجزی علیہ الرحمہ کے سال ولادت، سن مبارک نیز سنہ وفات کے سلسلہ میں حسب ذیل قطعہ:

گو نہ بود وجود شریف دو عالم	شفیع یوم جزا آمد آں ز روئے نشہ
حسب بآل عبا ہست ہم نسب بعلی	وفات یافت چو لاریب ہم بحق پوشید

میں "بحق پوشید" (۱۱۰+۳۲۲) کے اعداد کا میزان ۴۳۲ ہوتا ہے۔ جبکہ قطعہ کی تشریح فرماتے ہوئے صاحب مقالہ رقمطراز ہیں، "اور "ہم بحق پیوست" سے تاریخ وفات شریف اخذ کیا ہے" اس فقرہ کے اعداد ۶۳۳ ہی ہوتے ہیں جو "آفتاب ملک ہند" (ص ۲۰۲ سطر ۱۸) کے اعداد کے مساوی ہیں اور یہی سال وفات اکثر محققین نے تسلیم کیا ہے۔ لیکن عرض یہ ہے کہ یہ فقرہ قطعہ میں موجود نہیں۔ بہتر ہوتا کہ حضرت اجمیریؒ کی عمر شریف جو ۹۷، ۱۰۰ سال سے زیادہ از روئے تحقیق جدید نہیں پہنچتی، ۱۰۰ اعداد کی طرف سے فوٹ نوٹ ثبت فرما دیا جاتا کیونکہ مذکورہ قطعہ کی رو سے "بآل عبا" (۳+۳۲+۷۳) ۱۰۶ سال ہوتا ہے۔

• ص ۲۱۴ سطر ۱۸ پر "شیرازۂ جمعیت" (۵۴۳+۵۴۳) کے اعداد کی میزان بھی ۱۰۸۶ ہوتا ہے نہ کہ ۱۲۲۶ھ۔ ص ۲۱۴ کی

آخری سطر یہ ہے: ان خان کی وفات کے بعد "قصیدہ شافی کے اعداد کا میزان ۱۹۰۷ء ... ۱۲۹۵" جو کم ہے جیسے ۱۳۲۱ھ کے مطابق بتلایا ہے۔ "قصیدہ شافی کے اعداد سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون سا سنہ ہے جو ۱۳۲۱ھ کے معادل ہے۔

• ص ۱۰۵ پر نیز مقالہ نگار نے ص ۹ کے دیگر صفحات پر لفظ "جہاں پناہ" آیا ہے جسے محترم مقالہ نگار نے اس سے دار آخر بھیجنے والوں کے خلاف دلائل دیے ہیں لیکن خاکسار (جو ہندی کا نہایت ادنیٰ طالب علم ہے) کی اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ لفظ ہندی " [illegible] 3017 " میں جہاں پناہ (بادشاہ) کے بجائے مستعمل ہے جتنا کہ اس سلسلہ میں [illegible] کار بحث کی فوقیت نہیں۔ ص ۴۴ سطر ۲۰ پر مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے سلسلہ میں "... اس طور پر سنہ ۱۸۷۶ء کے اواخر میں مدرسۃ العلوم کے قیام ... تعین" ص ۴۹ کے برعکس ص ۴۲ سطر ۲ پر تحریر ہے۔ "۲۴ مئی ۱۸۷۵ء مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی" غالباً عرض ہے کہ پہلا سنہ (شاید) ۱۸۷۷ء ہو۔ ص ۴۳ پر جناب کاتب کی نسبت [illegible] کو "استفادہ" (سطر ۱) کر دیا ہے۔ انگریزی حصے ص ۷ سطر ۲ پر ایک اصطلاح "[illegible]"۔ "Untimly Death" استعمال ہوئی ہے (ایک اور صفحہ پر بھی) خاکسار کے نزدیک اس کے بجائے "SUDDEN DEATH" ہونا چاہیے کیونکہ موت وقت موعود ہی پر آتی ہے جیسا کہ ہمارا عقیدہ ہے البتہ اچانک ضرور واقع ہو سکتی ہے۔

جناب شبیر احمد خاں غوری
علیگڑھ

استاد احمد معمار کی ڈائری؟

محترم ضیاء الدین ڈیسائی صاحب نے کسی پوری جانکاہیت میں "تاج محل کے معمار" کے مسئلہ کو حل کرنے کی سعی مشکور فرمائی ہے اور اپنے موقف کی تائید میں خود "معمار تاج" نادر العصر استاد احمد کی ڈائری سے استشہاد کیا ہے، جس کے لیے بجا طور پر مبارک باد دی جا سکتی ہے کہ

ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اس پہیلی کو نہ تعمیرات سے دلچسپی ہے نہ دوسرے فنون لطیفہ سے۔ مجھے استاد احمد معمار سے صرف اس وجہ سے دلچسپی ہے کہ:

(۱) وہ ہندوستان کے ریاضی دانوں کے ایک عظیم المرتبت خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں جس نے کئی نسلوں تک بڑے جلیل القدر ریاضی داں پیدا کیے۔

(۲) وہ خود ریاضی و ہیئت میں دستگاہ عالی رکھتے تھے، کیونکہ انھوں نے اپنے منجھلے بیٹے لطف اللہ مہندس کا ریاضی و ہیئت میں امتحان لینے کے لیے اُسے چوتھی صدی ہجری کے مشہور ہیئت داں عبد الرحمٰن الصوفی کی کتاب "صور الکواکب" کا (جو اپنے موضوع کی ادبیات عالیہ میں آج بھی محسوب ہوتی ہے) فارسی میں ترجمہ کا حکم دیا۔

(۳) ان کے پوتے امام الدین ریاضی نے "تذکرہ باغستان" میں لکھا ہے کہ "استاد احمد معمار کے مشہور ایرانی عالم ملا مرشد شیرازی سے (جسے بعد میں شاہجہاں نے حکومت خاں کے خطاب سے نوازا) مناظرے ہوا کرتے تھے جس میں اکثر حق اُستاد احمد معمار کی طرف آتا تھا۔

یہ بھی عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ملا مرشد شیرازی وہ عبقری وقت تھا جس سے عہد شاہجہانی میں ریاضی و ہیئت کی تعلیم کی تجدید ہوئی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مناظرے سنی شیعہ مناظرے ہی نہیں تھے بلکہ علمی تھے جن کی اگر آج تفصیل مل جائے تو اس سے عہد شاہجہانی میں علوم حکمیہ بالخصوص ریاضی و ہیئت کی تعلیم کی کیفیت معلوم کرنے میں بڑی

قابل قدر مدد دے گی۔

اس لیے مجھے یقین واثق ہے کہ استاد احمد معمار کی ڈائری میں جس سے محترم ڈیسائی صاحب نے تاریخ تعمیرات کے
ایک ممتاز ماخذ سمجھ کر اس جزو کو حل کرنے میں مدد لی ہے، استاد احمد معمار کی علمی زندگی بالخصوص ریاضی و ہیئت سے متعلق
بھی بہت سے نکات و افادات مل جائیں گے۔

مجھے محترم ڈیسائی صاحب کی خدمت میں کوئی بار نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو یہ زحمت دے رہا ہوں کہ کسی طرح آپ
کی وساطت یا کسی و سفارش سے اس ہیچمداں کو بھی استاد احمد معمار کی ڈائری کی زیارت کا شرف حاصل ہو جائے۔

اگر وہ ڈائری ان کی ذاتی ملکیت ہے تو کسی طرح آپ ان سے اس عریضہ نیازمند کی خاطر اس کا زیراکس منگا لیں۔
اور اگر کسی لائبریری یا میوزیم کی ملکیت ہے تو بذریعہ نوازش کرم نامہ وہاں سے اس کا زیراکس حاصل کر لیں

مجھے یقین واثق ہے کہ ؎

برکریماں کارہا دشوار نیست

جناب مصطفیٰ الشروانی
حیات نگر، حیدرآباد

ہند عہد اورنگ زیب میں کے بارے میں

"خدا بخش لائبریری جرنل کا ضخیم شمارہ ۵۷ تا ۶۲ بمصداق "طول بود حکایت دراز ترگفتم" موصول ہوکر ہر جہت سے بھی لائق تحسین و ستائش ہوا کہ اس چھ نمبری شمارہ میں مختلف فنون ادب شعر و سخن مذہبیات تاریخ و فلسفہ کو بے حد خوبصورتی سے یکجا فرمایا گیا ہے۔

مرزا سمیع اللہ بیگ نواب مرزا یار جنگ بہادر مرحوم سابق چیف جسٹس حیدرآباد ہائی کورٹ کی تحقیقی تصنیف "ہند عہد اورنگ زیب میں" مطبوعہ دسمبر ۱۹۲۲ کا دستخطی نسخہ میرے پاس والد ماجد پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم مغفور کے خزینہ علمیہ سے موجود ہے۔ اس پر نواب مرزا یار جنگ مرحوم نے ۲۰ بہمن ۱۳۳۲ف مطابق ۱۹۲۲ء کو اپنے قلم سے والد ماجد مرحوم کی خدمت میں تصنیف پر مندرجہ ذیل عبارت تحریر فرمائی ہے:-

جناب من تسلیم

یہ کتاب در اصل برٹش انڈیا کے حالات کے لحاظ سے لکھی گئی ہے اور اسکی تفہیم برٹش انڈیا میں ہی زیادہ تر ہوگی حیدرآباد سے تعلق نہیں یہاں تو صرف چند احباب کی خدمت میں جو صاحب رائے ہیں بھیجونگا۔ مرض کا علاج اور پھر کسی قوم کے مرض کا علاج اسوقت تک نہیں ہوسکتا جب تک صحیح تشخیص نہ ہو۔ میں نے اس کتاب کے باب دہم میں تشخیص کرنے کی کوشش کی ہے مگر میں آپ کے قیمتی اور قابل قدر تجربہ و رائے سے مستفید ہونا چاہتا ہوں میری استدعا ذیل کے مطبوعہ خط میں ہے۔"

نیازمند
سمیع اللہ بیگ

مرزا کا ایک معتقد ہندو مہاراجہ سنگھ صاحب بہادر کی دستخطی تحریر کا عکس

[illegible]

اس کتاب کا صرف باب دوم ہی اصل مقصد تھا لیکن چونکہ اس کا سمجھنا بغیر کسی تمہید کے مشکل تھا یہ
کرنے ضروری معلوم ہوئی۔ لہذا باب دوم شایت اب ختم کئے گئے جن میں زیادہ تر ہندوستان کی اور
تمدنی حالات دکھائی گئی ہے جو مہاراجہ سنگھ صاحب ... ثبوت ہیں ایک ایسے انگریز ... قابو کے
سفرنامے سے اقتباسات کئے گئے ہیں جنہوں نے مہاراجہ سنگھ صاحب میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی اور جنکا
تفصیلی حال تمہید میں دیا گیا ہے۔ میں جناب کی خدمت میں یہ کتاب اس غرض سے روانہ کرتا ہوں کہ
جن مسائل پر تحقیق واقعات کی مدد سے باب دوم کے تینوں حصوں میں بحث کی ہے ان کے متعلق
جناب کا آزادانہ رائے معلوم کرنے کا مجھے شرف حاصل ہو تاکہ اپنے ہندو مسلمان ہم وطن کے
ہر طبقے کے اصحاب کے اصلی خیالات جناب سے مجھ کو آگاہی ہو جائے اور انہی مدد سے میں اپنی غلطی کی
اصلاح کرسکوں۔ میں اس کا وعدہ کرتا ہوں کہ جناب کی بلا اجازت جناب کے نام گرامی کو کبھی پبلک میں
یا آئندہ کسی مضمون یا تقریر کی اشاعت کے نسبت پیش کروں گا۔ جناب سے کی نسبت میرا ایسا بڑا
درخواست کس قدر سخت ہے اور اس سے آپکی تضیع اوقات ہونے کا اندیشہ ہے۔ لیکن میں اس
کتاب کے متعلق کوئی مفصل و مکمل تقریظ نہیں چاہتا بلکہ صرف تبادلہ و درستی خیالات مقصود ہے اسلئے
اگر ان مسائل پر کم از کم چند سطریں بھی آپ اپنی خاص انداز سے تحریر فرما دیں گے تو میرا مقصد
حاصل ہو جائیگا اور اس کے لئے کل کتاب کے پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے صرف باب دوم کے
تینوں حصوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔ میں بحیثیت ایک کمترین خادم قوم یہ درخواست کرتا ہوں اور جواب کی امید رکھتا
چاہتا ہوں۔ فقط

۱/۱/۳۱

خدا بخش نوادر

- باخرزی بخط قاضی عبدالودود

— سعید نفیسی

- باخرزی، خیام و ابوسعید ابوالخیر
- رباعیات باخرزی: نسخۂ خدا بخش کا عکس
- رباعیات: تعارف اور متن

— صلاح الدین خدا بخش



قاضی صاحب باخرزی پر گویا ایک انسائیکلوپیڈیا
مرتب کرنا چاہتے تھے، مگر ـــــ آں ساقی نماند
اس دنیا میں انھوں نے سید نفیسی کا پورا مقالہ اپنے
ہاتھ سے نقل کیا تھا۔ یہ مقالہ مجلۂ دانشکدۂ ادبیات
سال ۲ شمارہ ۴، تیرماہ ۱۳۳۴ شمسی میں شائع ہوا تھا۔

دوسرا مضمون بشیر الحق دسنوی کا ہے جو "معارف"
کے دو شماروں میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ملخص ترجمہ
پیش کیا جا رہا ہے ـــــ اور ان تعارفات کے ساتھ
رباعیات باخرزی کے نسخۂ خدابخش کا عکس بھی پیش کیا
جا رہا ہے۔

رباعیات باخرزی پر صلاح الدین خدابخش کا مضمون
Zeitschrift der Deutschen (انگریزی)
Morgenlaandischen Gesellschaft
Neunundlu Band Leipzig
1905 میں شائع ہوا تھا۔ اسکی اہمیت کے پیش نظر اسے
بھی شامل کیا جا رہا ہے۔

ـــــ ادارہ

بانخرزی بخط قاضی عبدالودود

سعید نفیسی

شیخ عالم سیف الدین ابوالمعالی سعید بن مطهر قاسمی باخرزی از بزرگان مشایخ صوفیه اواخر قرن ششم و اوایل قرن هفتم بوده و بسبب جلالت قدری که میان معاصران خود داشته او را شیخ العالم میگفتند - در باب وی در کتابهای تاریخ و تصوف از آن جمله در حبیب السیر و هفت اقلیم و نفحات الانس و طرائق الحقائق و سفینة الاولیاء و خزینة الاصفیا و مجالس العشاق تألیف کمال الدین حسین گازرگاهی کما بیش ذکری هست. وی را معاصر فریدالدین عطار و نجم الدین کبری دانسته اند و از خلفای نجم الدین کبری شمرده اند.

مولف حبیب السیر میگوید سرقوقتی بیکی مادر منکوقاآن پادشاه مغول با کمال [illegible] بود در ایام دولت پسر خود هزار بالش نقره بشیخ داد که مسکنی از جهت خود بسازد تا مدرسه ساختند و مستغلات خریدند و بر آن بقعه وقف کردند و تولیت آن مدرسه و موقوفات آن را بوی داد

برخی دیگر وی را معاصر سعدالدین حموی و نجم الدین رازی و رضی الدین علی لالا غزنوی و مجدالدین بغدادی دانسته اند.

درباره وی کراماتی آورده اند از آن جمله خواندمیر در حبیب السیر و جامی در نفحات الانس آورده اند که روزی بر سر جنازه درویشی حاضر شد، گفتند تلقین بگوی، وی پیش روی آن مرده بایستاد و این رباعی را خواند:

گر من گنه جمله جهان کردستم | عفو تو امید است که گیرد دستم
گفتی که بروز عجز دستت گیرم | عاجزتر ازین مخواه کاکنون هستم

در نفحات الانس آورده که وی پس از تحصیل و تکمیل علوم بخدمت شیخ نجم الدین کبری
رسید و [illegible] شیخ مریدان را بجا آمد و شیخ نجم الدین او را در چله نشاند و در چله دوم بدر
خلوت وی رفت و انگشت بر در خلوت زد و گفت ای سیف الدین
منم عاشق مرا غم سازوار است — تو معشوقی ترا با غم چه کار است
برخیز و بیرون آی آنگاه دست وی بگرفت و از خلوت بیرون آورد و بطرف بخارا روانه
کرد. نقل است برای شیخ نجم الدین [illegible] خوارزمی [illegible] آورده بودند. گفت زنهار با اصحاب
گفته است که ما اصحاب [illegible] استقلال خواهیم نمود [illegible] نیز [illegible] ترک
ریاضت کنید و [illegible] بسر برید. چون حضرت شیخ این بگفت شیخ سیف الدین
آن [illegible] پر آب کرد و بعد حضرت شیخ بالشان چون وقت [illegible]
وی را دید گفت: نه [illegible] ما گفته بودیم که امشب [illegible] و حضور خود مشغول باشید
چرا خود را باین ریاضت [illegible] انداختی؟ گفت [illegible] فرمودید که هر کس
[illegible] و حضور خود مشغول شود مرا [illegible] ورای آن نیست که بر آستانه حضرت
شیخ بایستم. شیخ [illegible] باد [illegible] که [illegible] در رکاب تو بروند. [illegible]
[illegible] سلاطین [illegible] شیخ سیف الدین [illegible] وقت [illegible] شیخ [illegible]
[illegible] شیخ [illegible] التماس [illegible] شیخ [illegible] فرمایند تا [illegible] خود [illegible] شیخ التماس
وی را [illegible] تا [illegible] [illegible]

[illegible] پنجاه کلمه [illegible] کتاب شیخ بهدیه شیخ [illegible] در [illegible] گفت
سرد [illegible] در [illegible] موجب [illegible] مکتوبات شیخ الکامل نجم الدین کبری [illegible] ما را
«حکمت [illegible] این [illegible] ان [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] بدو [illegible] - اکنون این [illegible] نسخه [illegible]»
این احمد [illegible] در هفت اقلیم میگوید که وی در عصر هلاکو خان بوده و برخی برآنند

گر ملکوتان با آنکه [illegible] دین [illegible] و [illegible] دولت پسر خود را با [illegible] بالش
[illegible] به بخارا فرستاد که در آنجا [illegible] [illegible] شیخ [illegible]
فرموده - پیداست که این همان نکته است که در حبیب السیر آمده و مؤلف هفت اقلیم در آن
اندکی تصرف کرده است

این سخن برمی‌آید که وی در آغاز کار جزو اصحاب نجم الدین ابوالجناب احمد بن عمر
خیوقی خوارزمی معروف به نجم الدین کبری یا طامة الکبری عارف مشهور متولد در ۵۴۰ که در
روز دهم جمادی الاولی ۶۱۸ بدست لشکریان مغول در خیوه یا خیوق کشته شده بوده است
و بدینگونه [illegible] [illegible] گذشته [illegible] نجم الدین در ۱۹ [illegible] جانب
وی به بخارا رفته و طریقه کبرویه که به او منسوب است در آنجا انتشار داده است - بدینگونه
با گروهی از بزرگان تصوف که جزو اصحاب نجم الدین کبری بوده‌اند مانند فریدالدین عطار [illegible] بوده

[illegible] ۶۴۹ ... از مریدان نجم الدین کبری است سعدالدین محمد بن المؤید بن ابی بکر بن ابی الحسن بن محمد بن حمویه معروف به ... [illegible] ... در بحرآباد ... [illegible] ... ذی الحجه ... متوفی در ۱۸ ذی الحجه ۶۴۹ ... [illegible]

علی بن محمد بن ... معروف به نجم الدین دایه ... در ۶۵۴ ... و مجدالدین البغدادی شرف بن المؤید بن ابی الفتح ... که در ۶۰۶ یا ۶۱۶ بحکم علاءالدین محمد بن تکش خوارزمشاه کشته گردید و رضی الدین علی لالا سعید بن عبدالجلیل الغزنوی درگذشته در ۶۴۲ ... از مریدان نجم الدین کبری ... زاده است -

در تاریخ رحلت وی اختلاف هست: مولف ... در ۶۵۹ و مولف نفحات الانس در ۶۵۸ و ... در ۶۵۵ و دیگران نیز در ۶۵۶ نوشته اند ... [illegible] ... در ... [illegible] ... سال ... نوشته است - حتی مولف خزینة الاصفیا این قطعه را در تاریخ رحلت وی سروده است:

قطب عالم شیخ سیف الدین — چون از جهان بخت بار [?]
کشف اسرار و شمس انوار است — سال تاریخ آن شه ابرار
بار دیگر بگو برحلت او — سیف بیباک و ... [illegible]

جمله کشف الاسرار و شمس الانوار و سیف ... [illegible] ... بحساب جمل ۶۵۸ میشود.
معتبرترین ... که در دست هست اینست که ... [illegible] ... محمد ... [illegible]

وی را در کتاب الفوائد البهیة ... نجم الدین ... کرد، چون رحلت وی
بامداد شب دوشنبه ۲۴ ذالقعده ۶۵۹ وقت نماز خفتن پس از سلطنت ...
رنجوری ... - ... سال عمر کرده باشند، در ۵۸۶ به جهان
آمده است -

در این شهر ... که ... بیابان ... آثار ... زیسته، در بخارا ...
است - مولف مزارات المتبرکه در باب مرقد وی ... " را ... ذی القعده
الحرام ... هزار و ... بجا ... اندرون ... بر ...
برای زیارت مرقد شیخ العالم طرف مشرق شهر ... را ... است ... فرخنده
وآن باغ و عمارت و خانقاه با مر امیر تیمور در سال ... داشت ...
و کاشیهای قیمتی ... و بعضی ... خراب کرده ... معمور کشته، ... از
... شیخ ... خلفا در آن ... مکان با ... "

نوشته اند که شاعر معروف رضی الدین ... متوفی در ۵۹۸ مداح وی
بود، و قصیده ... سروده که این شعر ... است -
چه کسی ... دیگر ... جواب ...
هر چند که رضی الدین ... در ما وراء النهر خصوصا در بخارا زیسته ... وی ...

بسیار دور است که جنبهٔ رجالی و سیف الدین باخرزی داشته، این نکته را دقت نمی‌نماید

زیرا که درینجا قصیده بدین وزن و قافیت در دیوان ... بنام ... ۵۹۸

درگذشته ... سیف الدین باخرزی که در ۶۴۲ درگذشت آمده و در

۵۹۶ مجد رضی الدین که درگذشته ۶۵۸ ... است و ... سیف ... باشد

سیف الدین باخرزی در نظم و نثر فارسی استاد و در تصوف ... فارسی

در معنی عشق ... از و مانده است و نیز اشعاری که ... است ... در

جای که ... رباعیات ... [illegible]

نخست ... سعد الدین حموی ... مجد الدین بغدادی

در ... آن ... کنج ... [illegible] ... شماره

۳ چاپ ۳۲۹ (ص ۶) آورده‌اند و این ... برهان الدین ... نجم الدین

... سعد الدین حمویه ... کمال الدین محمد ...

محمد ... نوشته شده ... سیف الدین باخرزی ...

... در ۷۲۶ ... است ـ

دوم مجموعه ایست ... غزلیات ... متوفی در ... و دیوان رکن الدین ...

هروی متوفی در ۷۸۵ و دیوان فصیحی متوفی در ۱۰۴۶ و دیوان ... الدین

[illegible] ۶۴۲ [illegible] متوفی در ۱۰۵۴

رباعیات سیف الدین باخرزی که در کتابخانهٔ خدابخش در بانکیپور [illegible] پتنه

در هندوستان محفوظ است [illegible] در مجلهٔ انجمن

[illegible] ۱۹۰۵ [illegible] است

Saifuddin Bakharzi by S. Khuda Bakhsh M.A. B.C.L. Zeitschrift der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft Neunundfunfzigster Band, Leipzig 1905 pp 345-354

[illegible] سیف الدین باخرزی آورده [illegible]

[illegible]

[illegible] رباعیات او را [illegible]

هر که ما را خوار دارد شاد در بر خود مباد — وانکه ما را بخجالت دارد خوشش بیمار باد
وانکه اندر راه ما خاری فکند از دشمنی — هر گلی کز باغ وصلش بشکفد بی خار باد
ای همایون مرغ بی پر چون مشرق بلندی — گر توانی بر جناب صاحب اعظم پری
مجلس عالی شهنشاه جهان قطب دین — ای کمال تو چو عقل از دهشت نقصان بری
هست دمیر نگین خاتم اقبال تو — گنبد پیروزه همچون حلقه انگشتری
راه بیرون کند نمیاید که سپهر تیز رو — از حدود عرصه جاه تو انها وری
نصرت حق دارد این دولت معین چون نبی — پس اگر نکنی بروز حشر چه کند آدمی
اندرین ملت که بادا تا قیامت پایدار — دانش دبیری گواه سلامت شرط سروری
چون جوانی بیهنر جوید سری نزدیک عقل — عاقلان پیر با عیبی بباشد بیبری
بهر تو داده دو جانی که بباشد تا بهار — عار بر حجر ما زما در عهد او بی افسری
عاقلان را تیغ بهتر چون سفیهان سر شوند — دار چون منبر شود بهتر بود بی منبری
زآفتاب زهره ای مرد فریب نقش را — آسمان بیرون نیارد زهره از بیچادری
نایب صدر قضا قاضی ظهیرالدین که هست — زیور الفاظ ما پیرایه در دری
آرزو دارم قبول خدمت تو ای کریم — تحفه کردم قند مردانه نظم از بیزری
گرچه دعوی تربیت ده نامه مرغوب گیرد ما — نیست مانع قرب و بعد از طبع گوهر پروری

ونیز رباعی منسوب باو که از نظام نقل گردآورده است:

بسکه موچون خون جگر نیست ترا ۱ دل هم کن همرکه از خطر نیست ترا

در عشق زلفت شب هجر دائم — یک ذره ز درد من خبر نیست ترا

گرفت بدست زلف چون کشش ما ۲ نگذشت همت ز سرکشی ما

اسپندی آتش بزودی شب دیر ۱۵ چشم تو لاخنک کند کشش را

آنیم که پیر برنگیرد دلت ما ۳ بر چرخ برین برنهد رشک ما

گر سگ بچه برآید از محنت ما — آن سگ بچه شیر گردد از غیرت ما

فسق و فساد در دهر بنده ما ۴ پر شد ز حرام کاسه و کوزه ما

میخندد روزگار و میگرید عمر ۳ بر طاعت و بر نماز در بنده ما

بی علم و عمل همت یزدان مطلب ۵ بی خاتم دین ملک سلیمان مطلب

چون عاقبت کار فنا خواهد بود ۳۶ آزار دل هیچ مسلمان مطلب

دانی چه بود نشاط ربات نخت ۶ اسب و کمر و کلاه در باری چست

چون هست نشین پای تو میگرد دست ۳۲ گویند نشین هنوز باقی بر تست

مستوفی عشق ضمار روز نخست ۷ تحصیل همت نام من گرد درست

آنگاه برات اشک بر وجهم داد — هم باقی کرد و گفت در عهده تست

دنیا که بهر پایه ز دستی دگر است ۸ هر روز بلندی دو پست دگر است

همچون زنان بیچاره لقمی — آرامگهش کنار دست دگر است

عشق ار چه بلای روزگار است خوش است ۹ وین باده اگر چه با خمارست خوش است

وین عشق اگر چه کار پیچ بزرگ — چون با تو نگاری سر و کار است خوش است

در صورت او نظاره کردن چه خوش است ۱۰ وز مردم بد کناره کردن چه خوش است

آن دل که ده دهر الهی نبود ۲۵ آن دل بهزار پاره کردن چه خوش است

جان در تن مرد بی ادب لرزانست ۱۱ گر زر بدهی ادب خری ارزانست

ابدا لالی کسی بجایی نرسید ۳۰ خاکه ادب تاج سر مردانست

آیت بتحقیق مثال دل ماست ۱۲ میباز بخاطر که مثالش نیکوست

گوهر نبود نهان ندارد ز تو هیچ ۴۳ ور تیره بود نهان بود هر چه در اوست

هر نقد که در دل تو قیمت دارد ۱۲ بر حاشیهٔ ملفه نیست دارد

در سینهٔ هر ذره اگر بشکافند ۱۳ دریا دریا جهان جهان رحمت داشت

بر تخت وجود هر که ما جاست ۱۴ او با سوی عالم حقیقت راست

هر نور یقین که در دل ما گاست ۱۵ از گفتن لا اله الا الله است

تا دل ز بد و نیک جهان آگاه است ۱۵ در شر ز بد و نیک جهان کوتاه است

فیض همه بیش ولی عبد هر ان لطفه — آگه ز همه لا اله الا الله است

با عشق تو چون جان ما مشتاق ۱۶ مائیم ز عشق تو تا جان باقیست

غم نقل و ندیم درد و مطرب ناله ۲۱ می خون جگر مردم چشمم ساقیست

گردی که به زیر پای هر شیدائیست ۱۷ زلف صنمی و عارض زیبائیست

هر خشت که بر کنگرهٔ ایوانیست ۱۷ انگشت وزیر یا سر سلطانیست

اندر ره عشق چون دلی پیدا نیست ۱۸ مستان شده ایم هیچ پی پیدا نیست

مردان ره عشق به همت دیده روند — تا ندر ره عشق هیچ پی پیدا نیست

این مکتب قلندری همه ناخته نیست ۱۹ وین نغمهٔ انجمن همه باخته نیست

گر کافر و مومن است بره پیش کید ۲۶ از روی نیاز با همه ساخته نیست

در عالم خاک بار پا کشیدم و رفت ۲۰ صد دشمنی دو دوست بر سر کشیدم و رفت

با نیک و بد زمانه ام کاری نیست — دامن ز ره جهان به یکسو کشیدم و رفت

بلیار [illegible] باید گفت ۲۱ با الموز بلی لا لسنی بلند گو

لا افعل و افعل نکند چندین سود — چون با عجمی کو مکن باید گفت

هر شب بمثال پاسبان کویت ۲۲ میگردم گرد آستان کویت

بالله که بر آمیدی صنم روز شمار — تا لقمه ز خبر بند گمان کویت

ما را همه ره بگوی ندانی باد ۲۳ در سوختگی هوا ما خالی باد

ناکامی ما چو هست کام دل دوست — کام دل ما همیشه ناکامی باد

زد کرده ما قبول کس کم یابد — عیش مطرب و نشاط هر دم یابد

چون جوهر روح ... میگردد ۱۴ جان در همه آفاق ... میگردد
جائی برسد مرد که ... نفسی — از زحمت سینه تنگ بیرون گردد
شبها که بخلوت نفسی یاد ... ۳۶ شب با تو دم عشق کسی یادم زد
[illegible] — [illegible] یادم بد
افسوس که عمر ... عاشقی ... نماند ۴۴ امید ... خویش و بیگانه نماند
[illegible] ۴۲ [illegible] جز افسانه نماند
آن قوم که بندگان ... کرده اند ۱۹ ... عاشقی دگرگون شده اند
[illegible] — کین رند ... بصوف زده اند
[illegible] افتادند ۲۹ [illegible] افتادند
[illegible] — [illegible] افتادند
دلهای خراب ما عمارت که کند ۳۰ وین کرده گناه ما کفارت که کند
ما بر سر خاکها زیارت کردیم ۱۶ تا بر سر خاک ما زیارت که کند
مردان ... میل هستی نکنند ۳۱ خودبینی و خویشتن پرستی نکنند
آنجا که مجردان حق می نوشند — خمها نه تهی کنند و مستی نکنند
جانا اگرم ... جان خواهد بود ۳۲ فرمان تو بر جمله روان خواهد بود
تا مرد ... ۴۰ تا بود تو در جهان [جان] خواهد بود
گرچه ز گناه ... خواهد بود ۳۳ آن یار عزیز ... خواهد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید ۳۹ خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود
با قوت ... میباید بود ۳۴ ... میباید بود
... عالم شده ۳۷ آخر نه بزیر گل میباید بود

گر ... بود ۳۵ بدبختم اگر بخت تو فیروز بود
تو ... ۴۶ ... بود

هرگز رگ [illegible] با ما در نشود ۳۷ تا صحبت [illegible] وجود با ما در نشود
پیدا نشود که آنچه سر از زیر من ۳۸ [illegible] سرگشته بود پیدا نشود
بر [illegible] عشق ما [illegible] نیاید ۳۹ از ما همه بمطلب [illegible] آید
از [illegible] کنیم ـــ دل [illegible] عمر رفته تا باز آید
ای دل [illegible] عاشق [illegible] ۴۰ کان زلف [illegible] خیره [illegible] کار
[illegible] همچو [illegible] ـــ یا [illegible] پای [illegible] بد
آن خال سیاه [illegible] ۴۱ [illegible] دست [illegible] نگر
مانند شب سیاه دلسوختگان ۴۲ [illegible] نگر
ناکس چو [illegible] ۴۳ آن [illegible] نگر
[illegible] ۴۴ هشیار [illegible] ادب [illegible] نگر
[illegible] ۴۵ [illegible] در رحمت [illegible] باز
هر کس که [illegible] ۴۶ [illegible] باز
[illegible] ۴۷ هر دم [illegible] تو جانست عزیز
[illegible] ۴۸ [illegible] عزیز
[illegible] ۴۹ [illegible] من
یاری که از [illegible] ۵۰ [illegible] من
[illegible] ۵۱ [illegible] خسته درویش
با ما [illegible] درویش ۵۲ [illegible] خویش
[illegible] درویش ۵۳ [illegible] رحمت در پیش
با ما [illegible] ۵۴ آن [illegible] رحمت خویش
ای [illegible] ۵۵ گر [illegible]
[illegible] ـــ [illegible]

[illegible] ــ چون غنچه گریبان صبر [illegible] چاک

با شاه [illegible] | [illegible] ریخته بر خاک

[illegible] | [illegible] دیده [illegible] بر سنگ

چون [illegible] بار [illegible] | بر [illegible] سنگ [illegible] دل تنگ

بگذر ز بد یار [illegible] شمال ۴۹ | بر خاک [illegible] دیده بمال

در قصه [illegible] حال ــ | حاجات من [illegible] اصحب حال

۵۰ | هر گز [illegible] زمانه [illegible]

سینا ز جفای [illegible] رشمال | چون [illegible] خیالست خیال

کین دولت [illegible] محنت [illegible] ۵۱ | هر مرکب [illegible] کشد آید دل

گر [illegible] ساز [illegible] دل ۵۱

گر دل [illegible] ند [illegible] ــ | در عشق [illegible] باشد بچه کار آید دل

دشنام [illegible] من [illegible] بهم ۵۲ | قسمت [illegible] چیزی کم

من خاک [illegible] ره چیزی کم ۱۸ | آن [illegible] شنیده [illegible] در عالم

از [illegible] عالم [illegible] ۵۳ | این [illegible] بازیچه عالم

[illegible] ــ | رندان [illegible] ما [illegible] حرام

گر من [illegible] جهان [illegible] ۵۴ | [illegible] که گردد [illegible]

[illegible] که برند [illegible] ــ | [illegible] خواهد [illegible]

آ [illegible] باشی [illegible] ۵۵ | [illegible] نه [illegible]

در وصل [illegible] ــ | چون [illegible] دولت [illegible]

با نفس [illegible] چه کنم ۵۶ ــ | [illegible] فعل خود [illegible] چه کنم

[illegible] ــ | [illegible] دیدی [illegible] کردم چه کنم

[illegible] می بینیم ۵۷ | [illegible] می بینیم

در مزرع [illegible] تخم نکو ۱۴ | [illegible] می بینیم

در چنگ [illegible] ۵۸ [illegible] شوم
[illegible] — [illegible] برد [illegible]
[illegible] بیگانه [illegible] ۵۹ [illegible] آموختی [illegible]
ناگاه [illegible] — [illegible] شوم

بر [illegible] این [illegible] ۶۰ [illegible]
چون [illegible] — باری [illegible] بار [illegible]
ما در [illegible] ساخته ایم
در راه [illegible] سمند ما چنان تیز [illegible] کرده است — [illegible] تاخته ایم
گفتیم که ما [illegible] ۶۱ [illegible] شده ایم
آن [illegible] ۶۵ [illegible] چنانکه [illegible] شده ایم
یک جو [illegible] ۶۳ [illegible]
چون [illegible] ۶۴ [illegible]
ما [illegible] ۶۴ [illegible]
آنها که بجای ما [illegible] — [illegible] نکنیم
زنجیر [illegible] مائیم ۶۵ [illegible] مائیم
از ماه [illegible] مائیم ۶۶ [illegible] مائیم
مائیم که در [illegible] مائیم ۶۷ [illegible] مائیم
[illegible] — زبان [illegible] مائیم
امروز [illegible] ۶۸ [illegible] آمد [illegible]
پیش از [illegible] دیگران [illegible] — [illegible] دیگران [illegible]
ای لطف تو [illegible] مهمان [illegible] ۶۹ [illegible] مهمان [illegible]
[illegible] ۷۰ [illegible] مهمان [illegible]

یارب تو بر این [illegible] ۲۲ [illegible] رخ [illegible] کن
با من مکن آنچه [illegible] — آنچه از کرم و لطف تو آید آن کن

ای دل [illegible] — [illegible] زلف چلیپا [illegible]

چون می [illegible] — [illegible] و تنها [illegible]
ای حراف وجود ما

ای
هر صبح با [illegible] بر [illegible] ۲۳ مقصود دل [illegible] آنگه [illegible]
احوال [illegible] ۲۴ [illegible] جهان [illegible]
امروز [illegible] با من ۲۹ از کرم تو [illegible] آن [illegible]

از دیده [illegible] بجا ماند بجز تو ۴۳ بیگانه [illegible] چه ماند بجز تو
دم در [illegible] ۹ [illegible] نماند بجز تو

ای [illegible] از غم تو ۴۴ [illegible] از غم تو
فریاد [illegible] از غم تو — در [illegible] از غم تو
سبحان الله [illegible] بجز تو ۴۵ [illegible] بجز تو
گلشن [illegible] چنین [illegible] کرد — آری بجز تو [illegible] آری بجز تو

تا کی [illegible] تو ۴۶ بیهوده [illegible] تو
[illegible] — گر [illegible] خون تو در گردن تو

عشقست [illegible] ۴۷ [illegible] اید اندر
[illegible] کند که جان [illegible] اید ۴۸ [illegible] اید از در
[illegible] ۴۹ [illegible] از همه به
[illegible] ۲۱ [illegible] از همه [illegible]

[illegible]

[illegible] ۶۷ [illegible]
[illegible] ۱ [illegible]

[illegible] ۵۰ [illegible] بودی
[illegible] — [illegible] بودی
[illegible] ۵۸ [illegible] کردی
این [illegible] ۵۰ [illegible] این [illegible] بودی
گه [illegible] ۵۴ گه با غم و درد [illegible] کردی
تا [illegible] — [illegible] کردی

ای دل [illegible] ۵۳ [illegible] پشیمان [illegible]
[illegible] ۱۳ این [illegible] مسلمان [illegible]

هر چند که [illegible] داری ۵۵ [illegible] داری
[illegible] نیست — در دولت [illegible] تا چند [illegible] داری
[illegible] ۵۶ [illegible] داری
گر با همه کس [illegible] — [illegible] داری

ای دل [illegible] اگر موافق باشی ۵۷ [illegible] باشی
با [illegible] باشی یا [illegible] ۵۸ [illegible] منافق باشی
دنیا [illegible] ۵۹ [illegible]
زین [illegible] — خواهی [illegible]
گر [illegible] ۶۰ [illegible]
آن [illegible] ۶۲ از [illegible]
ای دل چه [illegible] ۶۹ از منزل آخرت [illegible] یاد کنی
گر [illegible] — ۱۱ [illegible] یاد کنی
ای مردان [illegible] ۹۰ [illegible]
گر [illegible] — زنهار [illegible] دولت [illegible] بودی

گذشته از کتابهای چاپی و فهرستها که پیش از این یاد کرده‌ام برخی از این رباعیها

در چند کتاب خطی دیگر هم به نظر رسیده است:

۱- سفینه‌ای که در شیراز برای یکی از [illegible] قرن هشتم تاج الدین احمد گرد آمده و
نسخهٔ اصل آن در کتابخانهٔ [illegible] اصفهان است.

۲- مجموعهٔ الرباعیات بنام نزهة المجالس که جمال الدین خلیل شروانی بنام شروانشاه
علاء الدین فریبرز (۶۲۲ - ۶۴۹) گرد آورده و نسخهٔ ایشان که تاریخ ۲۵ شوال ۷۳۱
دارد جزو مجموعهٔ بشمارهٔ ۲۷۴۷ با نسخهٔ [illegible] در کتابخانهٔ جارالله
است، و عکسی از آن در کتابخانهٔ ملی [illegible] است.

برخی از این رباعیات در سفینه‌های مختلف ضبط بوده - پیداست که پاره‌ای از آنها
در کتابهای مختلف بنام سرایندگان دیگر مانند امام عمر خیام و خواجه افضل الدین کاشانی
نیز آمده است، از آن جمله رباعیهای شماره‌های ۵، ۱۶، ۲۹، ۳۱، ۳۳، ۳۶، ۳۷، ۴۱،
۴۴، ۵۱، ۵۴، ۵۹، ۶۳، ۶۹، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۷، ۸۰، ۸۱، ۸۵، ۹۰،
بنام ابوسعید ابوالخیر [illegible] نیز آمده است

خدا بخش لائبریری جرنل کا آئندہ شمارہ

مخطوطات تصوّف

کے موضوع پر ہوگا

یہ مجلہ جنوبی ایشیائی تصوف سیمینار میں پڑھے گئے مقالات پر مشتمل ہے۔

—————— (جس میں): ——————

تقریباً سو اہم مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے کتب خانوں میں محفوظ تصوف کے ایسے مخطوطات کی فہرستیں بھی شامل ہوں گی جو اب تک طبع نہیں ہو سکے ہیں۔ یہ فہرستیں ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔

تعداد صفحات تقریباً ۷۰۰ —————— آفسٹ کی معیاری طباعت

باذوق حضرات پیشگی آرڈر فرما کر اپنی کاپی محفوظ کرالیں

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

تقسیم کار: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

باخرزی، خیام و ابوسعید ابوالخیر

نیز رباعیاتش که منظور است در کتابخانهٔ خطی بخش چند، دارای ۱۵ رباعیات است بعضی از آنها به خیام منسوب می‌باشد: دیگران غالب این کلام باخرزی است نه کلام خیام. چنانکه هم محمد شیر الحق بیدل دلیری که دانش پژوه هندی گمان می‌برد و آنها چنین اند

سیف الدین باخرزی	خیام
در عالم خاک دانه‌ها پاشیدم و رفت	در عالم خاک خاک پاشیدم و رفت
صد تخم دو دست بر تراشیدم و رفت	صد تخم دو دست بر تراشیدم و رفت
با یک دو سه از ام کاری نیست	با چهره چرای تو مرا کاری نیست
داریم چنانکه بخت پاشیدم و رفت	چندانکه مباشی بپاشیدم و رفت
	(نسخهٔ بهی ز کتب و نسخهٔ چاپی ... امرتسر هندوستان)
هرگز شب سیاه نادر نشود	شب نیست که عقل در تحیر نشود
تا معصیت از وجود نادر نشود	در گریه کنار من پر از در نشود
پر می نشود کاسهٔ سر از هوس	پر می نشود کاسهٔ سر از سودا
کاسه که سرنگون بود پر نشود	کاسه که سرنگون بود پر نشود
	(نسخهٔ چاپی نولکشور و نسخهٔ چاپی روز بازار امرتسر هندوستان)
یک جو ز ایام نداریم خوشیم	یک جو غم ایام نداریم خوشیم
گر چاشت بود شام نداریم خوشیم	گر چاشت بود شام نداریم خوشیم
چون پخته به ما می رسد از مطبخ عشق	چون پخته به ما می رسد از مطبخ غیب
از کس طمع خام نداریم خوشیم	از کس طمع خام نداریم خوشیم
	(نسخهٔ چاپی امرتسر)

سیف‌الدین باخرزی

گر دهکه بزیر پای هر حیوانیست
زلف صنمی و عارض جانانیست
هر خشت که بر کنگره ایوانیست
انگشت وزیر یا سر سلطانیست

احوال بدم ز خلق پنهان میکن
دشوار جهان بر دلم آسان میکن
امروز خوشم بدار فردا با من
آنچه از کرم تو میسزد آن میکن

گر من گنه جمله جهان کردستم
لطف تو امیداست که گیرد دستم
گفتی که بوقت عجز دستت گیرم
عاجز تر ازین مخواه کاکنون هستم

خیام

خاکی که بزیر پای هر حیوانیست
زلف صنمی و عارض جانانیست
هر خشت که بر کنگره ایوانیست
انگشت وزیری و سر سلطانیست

(نسخه بسته خطی و نسخه چاپ تصحیح سلیمان ندوی)

غمهای جهان بر دلم آسان میکن
واحوال بدم ز خلق پنهان میکن
امروز خوشم بدار فردا با من
آنچه از کرم تو میسزد آن میکن

(ایضاً)

گر من گنه روی زمین کردستم
لطف تو امیدست که گیرد دستم
گفتی که بروز عجز دستت گیرم
عاجز تر ازین مخواه کاکنون هستم

(نفحات الانس)

رضاقلی هدایت صاحب ریاض العارفین میگوید که تعداد رباعیاتی که مشترک بین ابوسعید ابوالخیر و باخرزی هیچ خطا کم از کم سی عدد نیست . نمونه از عدد اسی که تصدیق این قول کند اینست .

رباعیات باخرزی

هر چند گهی ز عشق بیگانه شوم
با عافیت آشنا دمی خانه شوم
ناگاه پری رخی بمن برگذرد
برگردم از آن حدیث دیوانه شوم

رباعیات ابوسعید ابوالخیر

هر چند گهی ز عشق بیگانه شوم
با عافیت کنشت دمی خانه شوم
ناگاه پری رخی بمن برگذرد
برگردم از آن حدیث دیوانه شوم

رباعیات باخرزی

گر من گنه جمله جهان کردستم
لطف تو امیدست که گیرد دستم
گفتی که بوقت عجز دستت گیرم
عاجزتر ازین مخواه کاکنون هستم

ای ستر تو در سینهٔ هر صاحب راز
پیوسته در رحمت تو بر همه باز
هر کس که بدرگاه تو آید بنیاز
محروم ز درگاه تو کی گردد باز

دارم گنهان ز قطرهٔ باران بیش
دل بست مرا ازین عیش خسته دریش
با ما کرمی گفت بلا ای درویش
تو در خور خود کنی و ما در خور خویش

با عشق تو عهد جان ما استاقیست
ما ایم و غم عشق تو تا جان باقیست
غم نقل و ندیم درد و مطرب ناله
می خون جگر مردم چشمم ساقیست

از دیدهٔ سنگ خون چکاند غم تو
بیگانه و آشنا چه داند غم تو
دم در کشم و همه غمت نوش کنم
تا از پس من بکس نماند غم تو

رباعیات ابوسعید ابوالخیر

گر من گنه روی زمین کردستم
لطف تو امیدست که گیرد دستم
گفتی که بروز عجز دستت گیرم
عاجزتر ازین مخواه کاکنون هستم

ای ستر تو در سینهٔ هر صاحب راز
پیوسته در رحمت تو بر همه باز
هر کس که بدرگاه تو آید بنیاز
محروم ز درگاه تو کی گردد باز

دارم گنهان ز قطرهٔ باران بیش
در شرم گنه فکنده‌ام سر در پیش
آواز آمد که شاد باش ای درویش
تو در خور خود کنی و ما در خور خویش

ما عاشق و عهد جان ما استاقیست
ما ایم ز درد عشق تا جان باقیست
غم نقل و ندیم درد و مطرب ناله
می خون جگر مردم چشمم ساقیست

از دیدهٔ سنگ خون چکاند غم تو
بیگانه و آشنا نداند غم تو
دردی خورم و غمت همی نوش کنم
تا آنکه بکس دگر نماند غم تو

رباعیات باخرزی

بی علم و عمل بهشت رضوان مطلب
بی خاتم دین ملک سلیمان مطلب
چون عاقبت کار فنا خواهد بود
آزار دل هیچ مسلمان مطلب

گر روز گناه جست و خواهد بود
آن یار عزیز تند خو خواهد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید
خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود

در گفتن ذکر حق زبان از همه به
طاعت که بشب کنی نهان از همه به
خواهی ز پل صراط آسان گذری
نان ده بجهانیان که نان از همه به

با محنت و اندوه قرینم کردی
محتاج به یک نان جوینم کردی
این مرتبهٔ مقربان در تست
آیا به چه خدمت این چنینم کردی

رباعیات ابوسعید ابوالخیر

از چرخ و فلک گردش یکسان مطلب
در دور زمانه عدل سلطان مطلب
روزی که بهیچ کرد جهان خواهی بود
آزار دل هیچ مسلمان مطلب

گویند بحشر گفتگو خواهد بود
وان یار عزیز تند خو خواهد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید
خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود

در گفتن ذکر حق زبان از همه به
طاعت که به شب کنی نهان از همه به
خواهی ز پل صراط آسان گذری
نان ده بجهانیان که نان از همه به

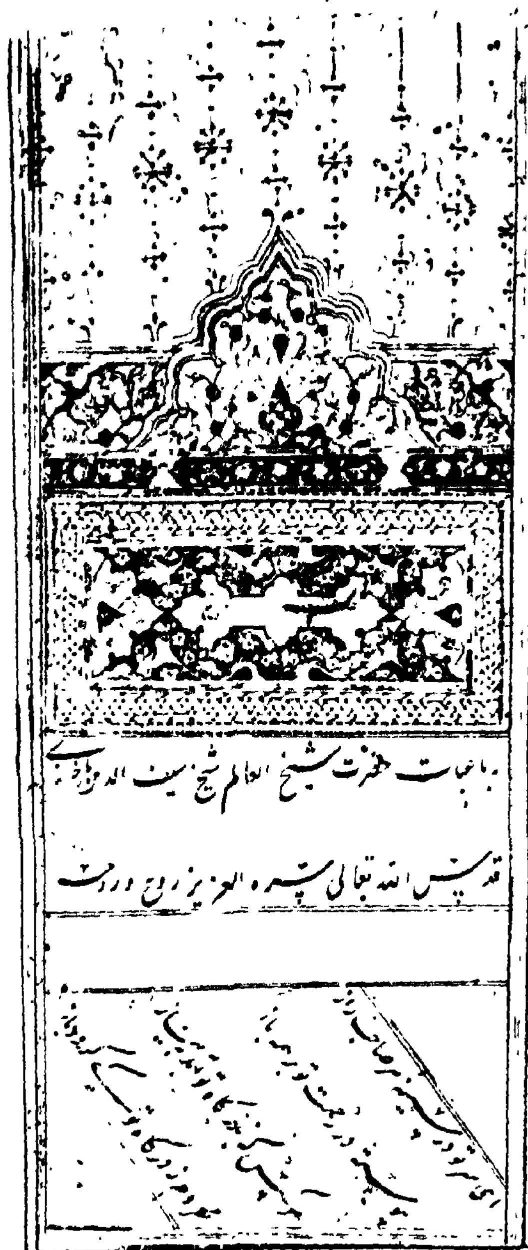
با فاقه و فقر همنشینم کردی
محتاج به یک نان شبینم کردی
این مرتبهٔ مقربان در تست
یارب به چه خدمت این چنینم کردی

(ترجمه از مقالات مطبوعه مجلهٔ معارف، اعظم گڑھ، جلد ۶۸ (۵)، ص ۳۶۲، نومبر ۱۹۵۱)

رباعیات شیخ العالم

رباعیات باخرزی

نسخۂ خدا بخش کا عکس



رباعیات حضرت شیخ العالم شیخ سیف الدین باخرزی

قدس الله تعالی سره العزیز روح و رحمت

ای لعبت [illegible]
ای طلعت [illegible]
[illegible]

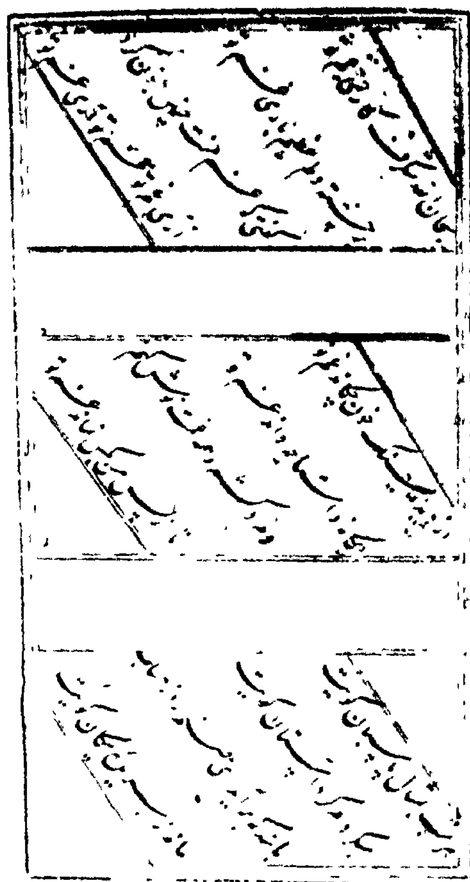
ای لعبت ترسا [illegible]
از رخ و زلف [illegible]
[illegible]

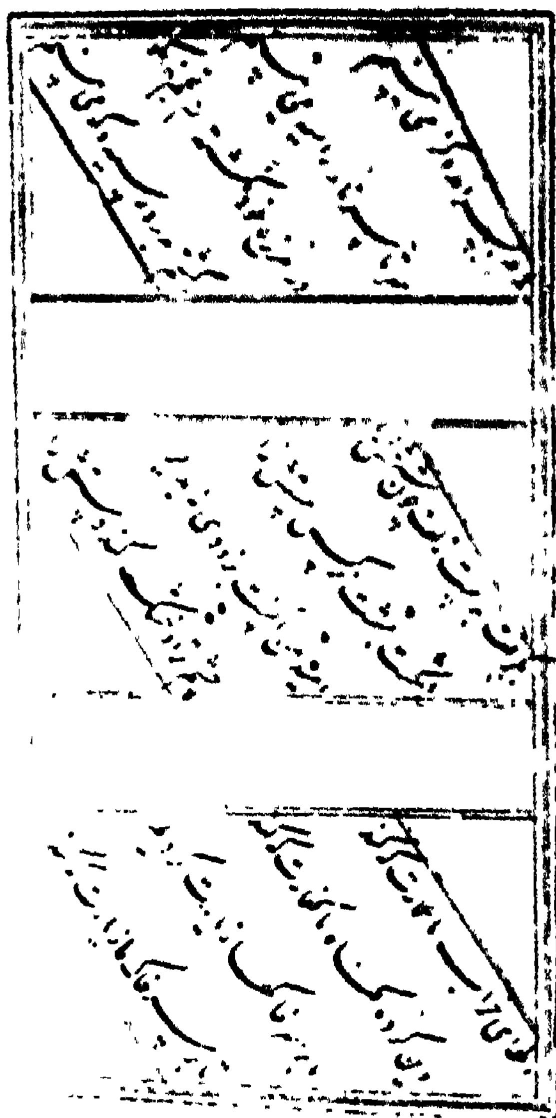
[illegible]
[illegible]
[illegible]

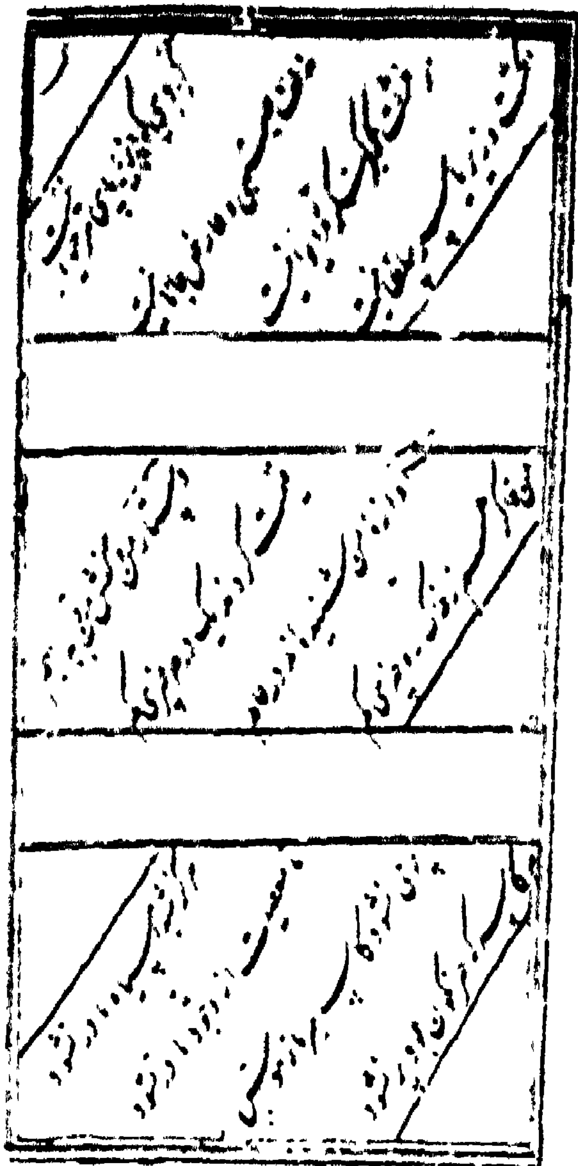
[illegible]

[illegible]

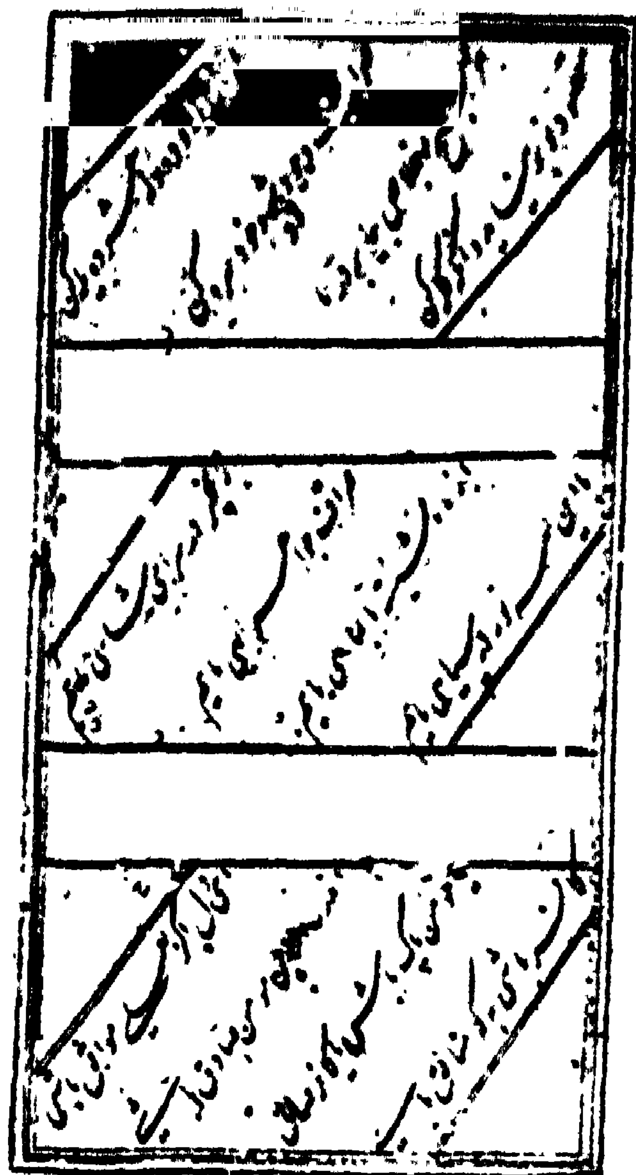
[illegible]







[illegible]



(۳)

[illegible] نهان میکنی
[illegible] میکنی
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

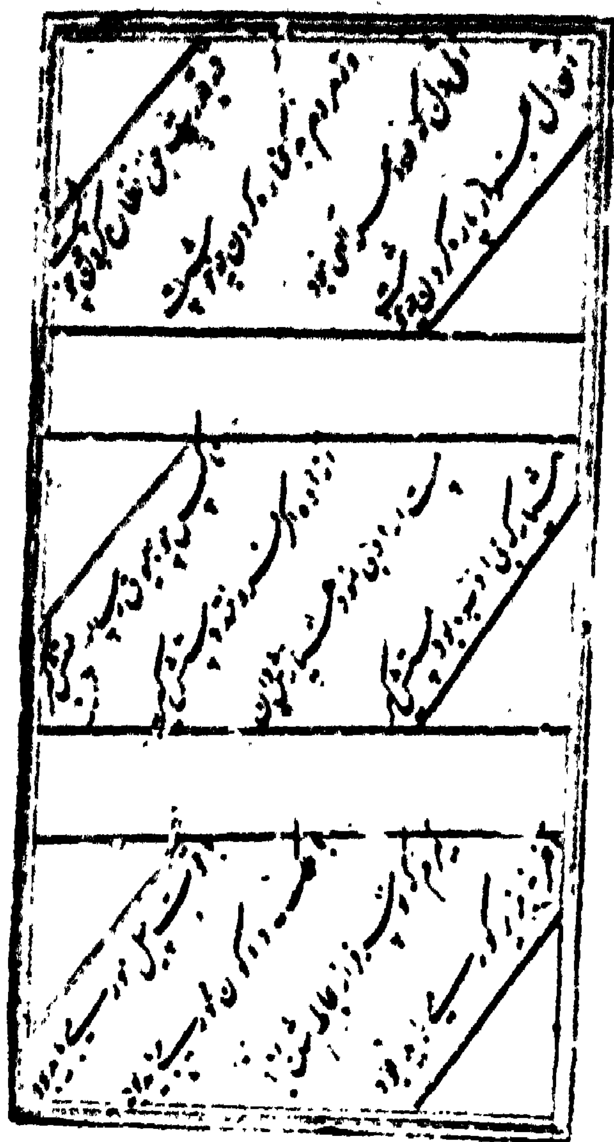
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] بر [illegible] بیکسی
[illegible] شادی کند [illegible]
[illegible] الم [illegible]
[illegible] از سال [illegible]

[illegible] کردی
[illegible] ستم کردی
[illegible] نشان
[illegible] کردی

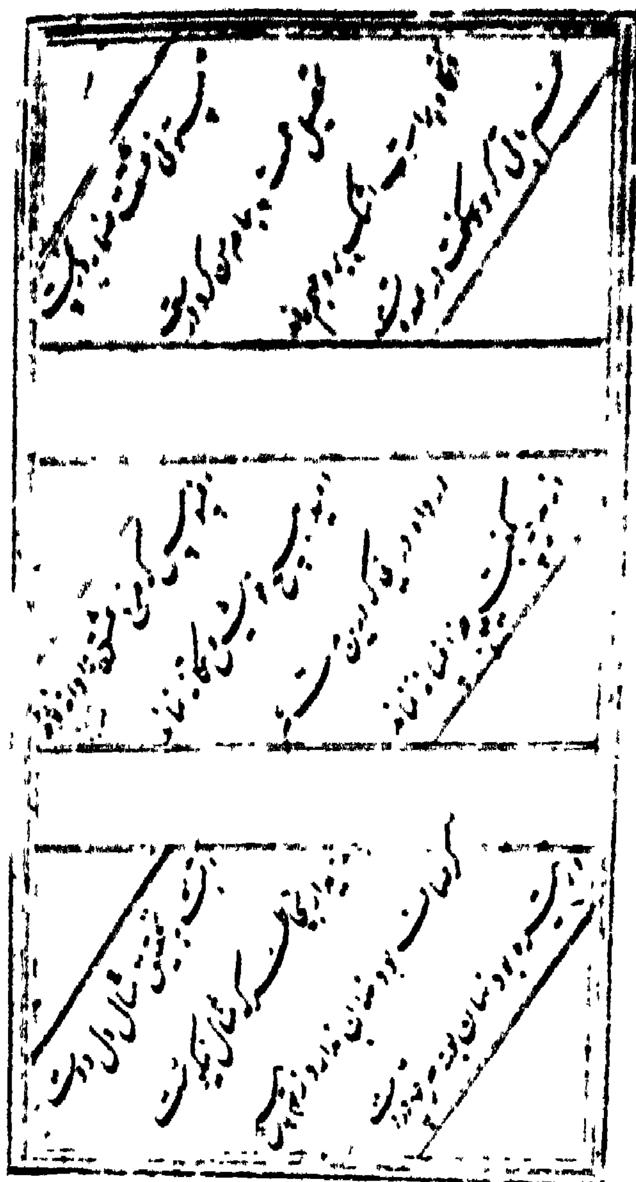
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]



جانا کرم سر [illegible] بود
[illegible] تو نبود
از خودم [illegible] شادی کردم
روی تو [illegible] بود

ای یار عجب [illegible] بود
[illegible] بود
در لطف [illegible] باید
وصلی [illegible] بود

ای دل [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]





زان پیر قلندری [illegible]
زان مرد [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] سال

[illegible]

[illegible]

تمت [illegible]

داخل کتب خانہ نواب سید فدا حسن خان دام اقبالہم

گردید بست و سوم جنوری سنہ ۱۸۶۴ع

مطابق بست و سوم شعبان سنہ ۱۲۸۰

کتبہ حامی محمد فدا حسین عفی عنہ

مقام لکھنو

50.

ا محنت و اندوه قرینم کردی　　محتاج بیک نان جوینم کردی
ین مرتبهٔ مقربان درگهست　　آن به که خدمت اینچنینم کردی

51.

ید ز جفای دهر بسیار ملال　　فکر مکن از زمنه انبار ملال
ین دولت دیگران دهن محنت تو　　چون نیک نگه کنی خیال است خیال

8. [illegible] Saifuddin Bâkharzî.

42.

افسوس که مرغ عشقبازا دانه نماند امید بهیچ خویش و بیگانه نماند
دردا و دریغا که درین مدت عمر از هر چه بگفتیم جز افسانه نماند

43.

آنست به تحقیق مثال دل دوست مپندار بخاطر که مثال نیکوست
گر صدف بود نیاز ندارد ز تو هیچ ور تمره بود نیاز بود هر چه دروست

44.

گر طلعت خود نقش کنم بر نانی وان نان بنهم پیش سگی بر خوانی
آن سگ سالی گرسنه در کیدانی از ننگ بران نان ننهد دندانی

45.

گفتم که ما از فقرائیم و نه ایم از راه روان پارسائیم نه ایم
آراسته ظاهریم و باطن نه چنان افسوس چنانکه می نمائیم نه ایم

46.

این اسپ قلندری همه تاخته نیست وین مهره آکمش همه باخته نیست
گر دهر و مومنت برو پیش آید از روی نیاز با همه ساخته نیست

47.

پیدا شده ای رفیق دوری که مپرس وز ناکس و کس رسید جوری که مپرس
یاری که ازو توقع پرسش بود پرسید مرا ولی بطوری که مپرس

48.

عشق است که شیر در زبون آید ازو کاریست که هر کار برون آید ازو
گه دوستی کند که جان افزاید گه دشمنی که بوی خون آید ازو

49.

آن خال بران روی دلافروز نگر بر هر چه مراد اوست فیروز نگر
مانند شب سیاه دل سوختگان سر بر زده از میانهٔ روز نگر

34.

دنیا گذرانست بهر بیش وکمی
خواهیش بشادی گذران خواه غمی
زین منزلت البته همی باید رفت
خواهی بهزار سال و خواهی بدمی

35.

در بذر حق نثار کردن چه خوشست
ور مردم بد کناره کردن چه خوشست
آن دل که درو مهر الهی نبود
آن دل بهزار پاره کردن چه خوشست

36.

نادان چو بعیوب رسد پستش گیر
آزاده اگر فرو فتد دستش گیر
مست از الهی نمود هشیارش دان
هشیار که بی ادب بود مستش گیر

37.

در دین بهل مور می باید بود
در ملک دوکون عور می شد بود
گیرم که تو جبار عالم شده
آخر نه بزیر گور می باید بود

38

غافل منشین که خوش زمانیست عزیز
هر دم که برآید از تو جانیست عزیز
عمریست که آمد است وخواهد رفتن
ضایع مکنش که میهمانیست عزیز

39.

گرچه زگناه جست و جو خواهد بود
آن یار عزیز تندخو خواهد بود
از خیر محض جز نکوئی نآید
خوش باش که عاقبت نکو خواهد بود

40.

جانا اگرم هزار جان خواهد بود
فرمان تو بر جمله روان خواهد بود
نامردم اگر بهیچ شادی کردم
تا بوی تو در جهان خواهد بود

41.

مستوفی عشقت صنما روز نخست
تحصیل غمت بنام من کرد درست
آنگاه برات اشک بر وجهم راند
غم باقی کرد وگفت در عهدهٔ تست

26.

بی علم و عمل بهشت یزدان مطلب   بی خاتم دین ملک سلیمان مطلب
چون عاقبت کار فنا خواهد بود   آزار دل هیچ مسلمان مطلب

27.

گر رهبر تو شمع بدآموز بود   بدبختم اگر بخت تو فیروز بود
تو خفته نبرو شب عمرت کوتاه   ترسم که چو بیدار شوی روز بود

28.

افعال بدم ز خلق پنهان میکن   دشوار جهان بر دلم آسان میکن
امروز خوشم بدار فردا با من   آنچه از کرم تو می سزد آن میکن

29.

یکچور ز ابلم نداریم خوشیم   گر چاشت بود شام نداریم خوشیم
چون پخته بما میرسد از مطبخ عشق   از کس طمع خام نداریم خوشیم

30

جان در تن مرد بی‌ادب ارزانست   گر زر بدهی ادب خری ارزانست
از بی ادبی کسی بجائی نرسید   حقا که ادب تاج سر مردانست

31.

با عشق تو عهد جان ما مشتاقیست   ساقیم و غم عشق تو تا جان باقیست
غم نقل و ندیم درد و مطرب ناله   می خون جگر مردم چشمم ساقیست

32.

دانی چه بود شرط خرابات نخست   اسپ و کمر و کلاه در بازی چست
چون مست شوی پایتو میگردد سست   گویند نشین تتوز باقی بر تست

33.

که همدم یار نازنینم کردی   • که با غم و درد همنشینم کردی
تا یافتم از گم شده خویش نشان   مشهور همه روی زمینم کردی

18.

دستار من و کفش من و جبه بهم   قیمت کردند یک درم چیزی کم
آوازهٔ من شنیده اند در عالم   من خاکرهم زخاک ره چیزی کم

19.

هرگز شبهٔ سپاه ما تر نشود   تا معصیت از وجود ما در نشود
بر می نشود کلمهٔ سر ما ز هوس   کلمه که سر نگون بود پر نشود

20.

در عالم خاک و باد چاشیدم و رفت   صد دشمن و دوست بر تراشیدم و رفت
با نیک و بد زمانه ام کاری نیست   دارنده چنانکه داشت باشیدم و رفت

21.

در گفتن ذکر حق زبان از همه به   طاعت که بشب کنی نهان از همه به
خواهی که ز پل صراط آسان گذری   نان ده بجهانیان که نان از همه به

22.

ردکردهٔ ما قبول کس کم یابد   پذیرفته ما حیات سرمد یابد
هر کس که بما کند تولا روزی   عیش و طرب و نشاط هردم یابد

23.

ای نه دله و دو دله هرزه پله کن   صراف وجود شو و خود سره کن
هر صبح باخلاص بیا بر در ما   مقصود تو بر نیابد وانگه گله کن

24.

زنجیر در سرای شاهی مائیم   صراف جواهر الهی مائیم
از ماه نشسته تا بماهی مائیم   با این همه نور در سیاهی مائیم

25.

ای دل اگر بعلی موافق باشی   اندر ره دین مومن صادق باشی
[illegible] پاک باش یا کافر صدق   کافر باشی به که منافق باشی

8. Khoda Bakhsh, Saifuddin Bâkharzî.

10.

هر شب بمثال پاسبان کوییت — میگردم گرد آستان کوییت
باشد که برآید ای صنم روز حساب — نامم ز جریدهٔ سگان کوییت

11.

ای دل چه بود که ترک بیداد کنی — از منزل آخرت یکی یاد کنی
گر نامهٔ اعمال ترا بنمایند — بعلی و هزار آه و فریاد کنی

12.

ای دل تو دمی مطیع سبحان نشدی — از خوی بدت هیچ پشیمان نشدی
درویش شدی و زاهد و دانشمند — این جمله شدی ولی مسلمان نشدی

13.

فسق است و فساد ورد هر روزهٔ ما — پر شد ز حرام کاسه وکوزهٔ ما
می خندد روزگار و میگرید عمر — بر طاعت و بر نماز و بر روزهٔ ما

14.

عمرم بسر آمد و کنه می بینم — سر تا سر نامهرا سیه می بینم
در مزرعه خود نکشته ام تخم نکو — کشتم بدرو رسید و که می بینم

15.

بگرفت بدست زلف چون شستش را — بشکست بمشت نرگس مستش را
امید من آنست بروزی نه بدیر — چشم تر او خشک کند دستش را

16.

دنیای خراب ما عمارت که کند — وین کرده گناه ما کفارت که کند
ما بر سر خاکها زیارت کردیم — تا بر سر خاک ما زیارت که کند

17.

گردی که بزیر پای هر حیوانیست — زلف صنمی و عارض جانانیست
هر خشت که بر کنگرهٔ ایوانیست — انگشت وزیر یا سر سلطانیست

8. Khuda Bakhsh, Saifuddin Bâkharzî.

2.

ای لطف عمیم تو خطاپوش همه
وی حلقه بندگیت در گوش همه
بر دار خدایا ز کرم بار گناه
در روز فرو ماندگی از دوش همه

3.

ای لطف تو امسال همان پار همان
در باغ تو گل همان بود خار همان
زان بر همه کس کشاده بادا در تو
تا مست همان آید و هشیار همان

4.

هر نقطه که در دایرهٔ قسمت اوست
بر حاشیه مایده نعمت اوست
در سینه هر ذره اگر بشکافند
دریا دریا جهان جهان رحمت اوست

5.

نستم بحضرت تو مشتی درویش
غرق گنه و امید رحمت در پیش
با ما سخنی گوی که چون گفته شود
آنرا سازی بهانهٔ رحمت خویش

6.

دارم گنهان ز قطرهٔ باران بیش
دل غست مرا ازین تپش خسته و ریش
با ما کرمش گفت هلا ای درویش
تو درخور خود کنی و ما درخور خویش

7.

بر تخت وجود هر که صاحب جاهست
اورا سوی عالم حقیقت راهست
هر نور یقین که در دل آگاهست
از گفتن لا اله الا الله است

8.

سبحان الله شگرف کاری غم تو
بر خسته دلم عظیم باری غم تو
گفتی که غم منت چنین مجنون کرد
آری غم تو غم تو آری غم تو

9.

از دیدهٔ سنگ خون چکاند غم تو
بیگانه و آشنا چه داند غم تو
دم در کشم و همه غمت نوش کنم
تا از پس من بکس نماند غم تو

and whole-souled religious belief. Throughout the Rubāiyat there runs a deep religious undercurrent which is alike refreshing and invigorating. He was permeated through and through with the divine fire which glowed clear and bright in line and which has found a noble expression in the opening Rubāiyat.

Whether he rises to the lofty conceptions of Omar Khayyam or not is a question which need not be discussed or debated here but there will hardly be two opinions upon the intrinsic worth and value of his Rubāiyat.

He does not scoff at things divine nor regard life purely from the point of view of physical pleasure or sensual gratification. But, to our mind, that which ensures his immortality is that he, like a true prophet, saw with clearness and expressed with force, that religion consists not in the repetition of set formulae or in the exercise of ordained practises, but in single-hearted love and devotion to the Almighty and in honest and straightforward dealings with one's fellow-creatures. The poet, living in a century of storm and stress and finding himself surrounded by a flood of ungodliness arrives at the unwelcome conviction of the unreality and hollowness of life and takes upon himself to preach by precept and example that true nobility of soul is attained by self-abasement and true religious life reached by sincere and genuine beliefs and not by their counterfeits.

It is possible, though we have no clear proof of it, that he spent the later portion of his life in silence and solitude brooding over things divine or mourning over things temporal, watching the gathering storm slowly rising over the Muslim horizon and adorning the title of the Shaikh-ul-Alam which his contemporaries conferred upon him in recognition of his intellectual attainments and saintly virtues.

Might we not say with Swinburne:

Shall he not win from latter days
More than his own could yield of praise?

بسم الله الرحمن الرحیم

رباعیات حضرت شیخ العالم شیخ سیف الدین باخرزی قدس
الله تعالی سره العزیز دروح روحه

I.

ای سر تو در سینهٔ هر صاحب راز پیوسته در رحمت تو بر همه باز
هرکس که بدرگاه تو آید به نیاز محروم ز درگاه تو کی گردد باز

Our Ms. of Saifuddīn's Rubāiyat is written in fine, clear nastaliq, within gold ruled columns, with an artistic heading at the beginning. It is not dated but it apparently belongs to the fifteenth century. Of the life of the author we possess the barest and vaguest outline. The notices in the biographies are provokingly short and unsatisfactory. It is all the more to be regretted as we should have liked to know the gradual growth of his intellectual power, the successive stages through which he passed bringing him ultimately into prominence, the political influence, if any, that he possessed or wielded. For the solution, however, of these questions we seek in vain in the meagre biography of our author which has floated down to us through the stream of ages. The biographers have contented themselves with recording that he was a celebrated personage of his time, that after the completion of his studies he became a disciple of Najmuddīn Kubra who sent him as his *Khalifa* to Bukhara. So far we are upon solid ground in as much as the biographers are absolutely agreed upon these points but further and beyond we are in entire darkness. Even the very date of his death is differently given by different authors. According to some he died at Bukhara in 648 A. H. but according to others in 658 A. H. Subaf (صحف Bankipur Ms. Folio 381 B) rejects both these dates and fixes 659 A. H. as the year of Saifuddīn's death. We are, however, inclined to accept 658 A. H. as the correct date and the story related in Haft Iqlim (Folio 202 A, Bankipur Library) lends colour and support to this theory.[1]) It is there stated that Saifuddin was entrusted with the charge of the madrasah which the mother of Mangu Khan had founded and endowed at Bukhara.[2]) This fact, if correct, clearly indicates that our author was not altogether unknown to fame or fortune and that he must have possessed a personality strong and powerful enough to allure and attract and rivet the attention of a court neither very spiritual nor intellectual either.

Thus much we know of our author. The Rubāiyat numbering only fifty-one consist of either splendid invocations to the Almighty or solemn elegies upon the waning glory of Islam or dignified satires upon the pharisaic artificiality of the Muslims. They are too few indeed to give us a glimpse of the life of the author or warrant us to construct a biography out of them. Possibly Saifuddīn wrote many more which have perished. Some of the Tazkiras, indeed, quote Rubāiyat of Saifuddīn omitted in our Ms.

Whatever else Saifuddīn may have been there is one thing which his Rubāiyat amply demonstrate and it is his deep-seated

1) For further authorities see Jami's Nafhāt (نفحات الانس جامی) p. 495 Cal. Ed ; Makhzan ul-Ghara'ib (مخزن الغرایب) Ms. p. 340.

2) Howorth, History of the Mongols Part I p. 188.

Saifuddīn Bākharzī.

By

S. Khuda Bakhsh, M. A., B. C. L.

Europe is familiar enough with the mystical muse of Jalal-uddin Rumi, the ripe and mellowed wisdom of Sadi, the passionate lyrics of Hafiz, the cynical and sceptical utterances of Omar Khayyam and other Persian poets of lesser note, but still there are many poets—singers of sweetest songs—whose works have not yet seen the light of day. The Khuda Bakhsh Oriental Public Library at Bankipur is perhaps the richest and finest in India in Divans. The Mss. are not merely exquisitely written and magnificently illuminated, but the Library can claim possession of some Divans which are all but unknown. This observation does not apply merely to the poetical collection but equally well to the historical and theological collections. We have already published an extract from the scarce and invaluable work of Ibn Ḥazm, entitled Jamharatu-n-Nasab and we now publish the Rubāiyat of Saifuddīn Bākharzī. We shall shortly be in possession of a complete Catalogue which is being done with great care and industry by Maulavi Muqtadir of Calcutta and the assistant Librarian Maulavi Shihābuddīn.

Before I pass on to the life of Saifuddīn, I might mention here some of the Divans and poetical works which, so far as we have been able to ascertain, are exceedingly rare.

1. Ghazaliyat of Salman of Sawa (d. 778 A. H.).
   our copy is dated 811 A. H.
2. Divan of Ruknuddin Ṣāin of Herat (d. 785). رکن الدین صائن
   our Ms. is dated 883 A. H.
3. Divan of Faṣīḥī (d. 1046) دیوان فصیحی هروی.
   This Ms. was written two years before the death of the author.
4. Divan of Mirza Kamrān (d. 964 A. H.) (Son of the Emperor Babar).
   This Ms. bears the autograph of some of the Mughal Emperors.
5. Kulliyat of Munir Lahauri (d. 1054 A. H.)

Amrik Singh

Shahidganj dispute

The Muslims claimed it (Gurdwara Shaheed Ganj in Lahore in the mid-30s) to be a mosque though it had been a gurdwara for about two centuries. The court turned down the Muslim contention and this led to a prolonged confrontation in which, as in the present case, a large number of valuable lives were lost. The British government however did not budge from the position upheld by the court.

The interesting thing is that even after 1947, when there is hardly anyone to visit the gurdwara, the character of that building has not been changed and it has not been converted into a mosque. If this can happen in Pakistan, which according to its Constitution is described as an Islamic state, can India which describes itself as a secular state act differently?

(Source Times of India Patna, dt.10/11/1990.)

difficult for Sir Sikandar to remain leader of the party.

As a last resort, the premier sought the governor's help who exercised his extraordinary powers and disallowed introduction of the bill.

In a memorable address to the assembly, the premier made three points firstly, he said that if today the Muslims got enacted a new law to get back Masjid Shahid Ganj then the Hindus too would demand restoration of their temples which had been seized during the Muslim rule; his second point was that the Muslims were in a minority in seven provinces out of the eleven in British India and if in Punjab they showed no consideration to the sentiments of non-Muslims their co-religionists in other provinces could not expect a better treatment; thirdly he said that it was not at all proper to nullify a decision of the highest court of the province on the strength of their majority in the legislature.

The Unionist Party had always been painted by the nationalist minded people as an organisation of toadies and decadent feudal lords. But looking back we find that the Unionist leaders represented a more healthier attitude on several socio-economic problems than the nationalists of those days. While making a comparison between the present-day controversy over Ram Janambhoomi in Ayodhya and that concerning the Shahid Ganj mosque in Lahore one cannot fail to notice that in accepting the high court verdict the Muslim leaders showed commendable restraint at that time.

It is also apt to remember that even after the partition nothing was done in Pakistan to reconert the Shahid Ganj monument into a mosque. There is a lesson for our present-day leaders if they care to recall the forgotten controversy of more than half a century.

(Source: The Times of India, Patna, dt.18.6.90)

parts of Punjab. So important was the matter that Mr. Jinnah announced a special session of the Muslim League to consider ways of recovering the mosque. However, the city of Lahore did not witness any large scale rioting during the period in which the controversy raged over northern India. One person who acted with restraint in the matter was Mohammad Ali Jinnah, president of the Muslim League. It should be remembered here that Jinnah, in those days, was not too fond of agitations and defiance of authority. Being a man of secular tastes in his private life he was hardly touched emotionally by disputes involving mosques and temples. But as leader of the Muslim League he could not afford to remain indifferent if such a controversy.

In February 1936 he came to Lahore Had made it clear that he would intervene in the matter only if the Muslims of the city gave an undertaking that they would abide by his decision. During his stay in the city he first met the Punjab governor and tried for the release of Muslim agitators. The governor agreed to free them if the civil disobedience movement was stopped and nothing was done to break the law for recovery of the mosque. This was agreed and the agitators were released.

Later Jinnah met the Sikh leaders also and impressed upon them the need of communal amity. They received him well and also allowed any Muslim to go anywhere near the site. Before going back to Bombay Jinnah constituted a committee for settling the issue. The committee which they called Shahid Ganj Reconciliation Board had among its members people like Dr. Iqbal, Raja Narindernath, Sardar Ujal Singh, Sardar Sampooran Singh and Pandit Nanak Chand. Unfortunately the committee could not achieve much. However, Jinnah could certainly ease the tension.

After a year and half, the Muslim leaders of Lahore again requested Jinnah to come there since their appeal in the Lahore High Court had reached a crucial stage and his assistance was considered important to plead the Muslim case. But Jinnah did not agree with the suggestion. He said that he had earlier gone to Lahore as a mediator and it would look odd if he went there to plead the case of one party. He suggested the name of another barrister, an Englishmen, who was ultimately engaged.

Looking back on these events after more than half a century one feels some admiration for Jinnah who emerges as a dignified man of moderate views, not given to communal passions and breast-beating which were characteristic of most of the Muslim politicians. This is also in sharp contrast to the role played by some of the present-day Muslim politicians who have been spearheading the movement for the recovery of Babri Masjid in Ayodhaya.

Meanwhile some of the Muslim leaders got the idea that the mosque's recovery would become legally possible if the Legislative Assembly in Punjab passed a new act to exempt mosques from the law of limitation. At the instructions of Dr. Iqbal Malik Barkat Ali, a senior advocate and an ardent suporter of the Muslim League, prepared a draft of such a Bill to be introduced in the legislature. It was to be applied with retrospective effect to make possible recovery of Masjid Shahid Ganj.

The proposed bill was publicised in such a way that many Muslim members of the Unionist Party pledged their support to it. The premier, Sir Sikandar Hayat Khan, in any case, could not remain indifferent to the goings on in the camp of Dr. Iqbal. If the trend had continued there would have been a rift in the Unionist party on communal lines, making it

Som Anand

Shahidganj dispute

IT all happened nearly 54 years ago. In India people have almost forgotten the story but in Lahore echoes of it are still heard. There had been, during the British period, innumerable disputes relating to mosques and temples but the controversy which erupted in the capital of United Punjab in 1935 was unprecedented considering the anger it generated. Recalling the events of this Lahore temple-mosque dispute of 1935 one can vary well understand the anger and tension generated by the Babri Masjid-Ram Janambhoomi controversy.

This mosque was built by one of prince Dara Shikoh's employees. There was a Kotwali adjacent to the mosque. During the Mughal period, when the Sikhs were in revolt in Punjab, this kotwali was used as a place where Sikh dissidents were brought to be punished. Thus the kotwali was witness to a lot of bloodshed.

Among the dissidents who were thus tortured to death in this kotwali was one Bhai Taro Singh whom the Sikhs revered and when they came to rule over the city in later years they constructed his smadhi at the site of the kotwali. This is how the mosque, adjacent to it, acquired the name of Masjid Shahid Ganj.

This mosque, like many other in the city, was occupied by the Sikhs often decline of the Mughal rule. Even during the British period it was not restored to the Muslims. The Sikhs used it as a community kitchen (langar) and for various other purposes. In June 1935 Sikh 'jathas' started coming to a Lahore and it was rumoured that they wanted to demolish Masjid Shahid Ganj

It seems that the British administration of Punjab was quite willing to help them in this task. This is borne out of the fact that when the Sikhs actually started demolishing the mosque and a delegation of Muslim leaders went rushing to the governor, Sir Herbert Emerson, with the request that the demolition be stopped and the mosque be given to the custody of the Archaeological Department, the governor avoided the issue.

This inflamed Muslim sentiments. The agitation continued till the beginning of 1936. In the meantime a legal defence committee was formed for the recovery of the mosque and the dispute was brought to the court of Lahore's district judge, Mr. Sale. The Muslim claim rested on the contention that according to the tenets of Islam a mosque always remained a mosque, they should be allowed to offer their prayers in Masjid Shahid Ganj.

An appeal was then made against this decision to the Lahore High Court and a full bench of the Court heard this which also rejected the appeal.

The controversy over this mosque brought communal tension to a pitch not only in the capital but also in other

history, its culture, its rituals, its tradition, *Hadis*, its law, *sharia*, its jurisprudence, *fiqh*, one always finds a non-Muslim with no sympathy with the religion and indeed in most cases no real insight into the subject, ready with his 'learned findings'. The *Encyclopedia of Islam* is full of such fallacious and incorrect observations.

This has been going on for centuries, and represent a Second Crusade against Islam, this time by the pen and not by the sword. For the most part the Muslims' own incompetence, lethargy and internecine strife and dissension, gave a golden opportunity to these anti- Muslim orientalists, who were backed by the colonialists and imperialist exploiters.

I want to tell them that times have changed and they must change their attitudes too. The modern Muslim intelligentsia is not going to put up with this intellectual arrogance and is not going to lend a passive ear to the lecturing of so called western 'authorities' on their religion, their religious practices and the history and sources of their religion. The time has come when these practices must stop, and instead of lecturing the Muslims about their own religion these 'authorities' should seek knowledge from the real sources. Cheap jibes like 'What Islam?' and 'Which sources?' do not affect the argument. One could point out that questions like these can be asked of almost any religion - Christianity, Judaism, Buddhism, Hinduism and even communism. Where will you find a monolithic, indivisible religion or 'ism' in the world adaptable to a single, indisputable interpretation? Western scholars must change their attitude to Islam or leave it alone. Enough is enough.

OO

people of Persia and indeed the people of all the countries who have preceded the advent of the last of the prophets and about whom the *shara* is silent, we should have the same attitude and belief. And to label anyone as *kafir* without any reason should not be a matter to be taken lightly at all. And the reality of idol-worship of these [Hindus] is this, they [Hindus] have carved out their images and concentrate and meditate about some angels whom by Divine decree have influence over this world, or the spirits of some perfect saints, who after relinquishing this body, have influence in this world, or some friends [of God] who in their own imagination these people [the Hindus] consider immortal like *Khizr*, Peace Be Upon him. And because of the devotion and concentration, after a lapse of time, they form a sort of relationship with the person of that image. And because of this they satisfy some of their this-worldly and other worldly needs. And this conduct [of the Hindus]has a similarity with that of the Muslim sufis' practice of *Zikr-i-rabita* (remembrance and meditation connecting one with a spiritual guide). They [Muslim mystics] try to picture their *pir* (before their mental eye) and draw spiritual benefit from this. The only difference is that they do not carve out the image of their *pir*. And in this sense they [Hindus] are not similar to the infidels of Arabia who considered their idols themselves as capable of affecting things and not consider as media of the Divine; they considered these idols as Gods of earth, and God as the God of the heavens, and this is *shirk* in the Oneness of God. And their [the Hindus]prostration is a prostration of supplication and not of worship of the Divine - just as in their custom, instead of salutation, there is prostration before their mothers, fathers, teachers and religious guides; and they call it *dandot*. It does not follow from their belief in the transmigration of the soul that this is *Kufr*."

All this discussion makes it pretty clear that Dr. Robinson neither understood the problem nor sought guidance from the writings of the relevant authorities.

And at this point it seems appropriate to speak bluntly of a general feature of Western writing on Islam.

For the past several hundred years Muslims have been addressed by self-appointed Western authorities on Islam upon what Islam is. There is hardly any field of human learning concerning Islam and the Muslims, in which the 'authoritative opinions' of non-Muslims, mostly missionaries fired with crusading zeal have not been served up to the Muslim world. Be it Islam itself, the life of the Holy Prophet, Peace Be Upon him, its customs, its

among them (in the past).] وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ

[For each nation there is a messenger]

and other verses, to India too prophets and apostles were sent an their accounts in their books are clearly mentioned and fro whatever remains of these books it is evident that [the prophets Hindus] had attained to perfection and completeness.

And Universal Divine Mercy has not overlooked the reform His servants in this vast country. And it is well known that befo the coming of the Last Prophet Peace Be Upon him, prophets we sent to each nation. And obedience to and submission to these prophets was incumbent upon those people, and obedience and conformity to the prophets of other nations was not. And after the advent of our Prophet who is the last of the prophets, Peace Be Upon him, and is sent for the whole of humanity, and his religion cancels all the religions of East and West, no one has any ground for disobeying him till the last day. Thus from the time of his advent till this day, two thousand one hundred and eighty years have passed. Anyone who does not look to him [for salvation] is a *Kafir* while the people who preceded this period [his advent] were not *Kafir* according to holy verse: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ

[We did a foretime send
Apostles before thee: of them
There are some whose story
We have related to thee,
And some whose story
We have not related to thee.. (S.XL, A.78)

[Allama Yusuf Ali in his note to this *ayah* says:

"God sends messengers of His Truth to every people. There are some whose names are known to us through the holy Quran, but there are a large number whose names are not made known to us through that medium. We must recognise the Truth wherever we find it."]

concerning most [former] prophets there is no comment; thus it is better for us to observe silence about them. Neither are we obliged to consider their followers as infidels nor are we obliged to bring about their destruction; nor we are obliged to cherish the belief of their deliverance, and it is well supported that one should think well of them and that bigotry should not enter into it. Concerning the

ised the principles of faith on that and they called the knowledge this process the laws of religions [*dharma shastra*] — in other words the art of religous beliefs which is a sort of *Ilm-i-Kalam*. They classified the human race into four groups and deriving four different codes of conduct from that book they assigned each to a particular group. And they based the details of conduct and behavior on it [*darma shastra*] and called this art as the laws of conduct [*Karma shastra*] — in other words laws governing behaviour which are like *fiqh*. They do not believe in the abrogation of religious laws, and since according to the dictates of reason and of men's temperaments changes in the man's conduct and behaviour during each period of time is inevitable, they divide the long life of the world into four periods. Each period is called *yug* and for each of the four *yug* the laws of human conduct and behaviours are deduced from these four volumes. Whatever interference and changes their predecessors have made, are without authority and without value. All their sects believe in the Unity of God [*tauhid*] and consider the world as His creation and as perishable. And they [Hindus] believe in the final annihilation of this world and in the resurrection of human beings and in the punishment and reward of bad and good actions. And these people [Hindus] have acquired an excellence in the learning of philosophical and traditional sciences, in ascetic practices and strivings and in the search for truth and reality and divine revelation, and their libraries are extant even today. And their custom of idolatry is not due to their belief in *shirk* [partnership in Divinity] but has another explanation.

The wise sages of these people [Hindus] have divided the whole span of human life into four parts. The first part is for acquiring knowledge and proper behaviour. The second is for earning a living and raising a family. The third is for learning right conduct and behaviour and for purification of the self. The fourth is for practising severance of worldly connections and leading a secluded and celibate life (which is the apogee of human achievement) and final deliverance which they call *maha mukti*. And the rules and regulations of their religion are fully codified. Thus we know that the religion was codified and now stands abrogated. And in the *shariat* [the Islamic law] no other abrogated religion is mentioned except the religions of the Christians and the Jews, though many religions are abrogated, and many religions were either confirmed or cancelled. And one should know that according to the holy verses:

وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ

[And there never was a people, without a warner having lived

such time as a man named *Vyas* was born, and at the instigation of *Satan* has completely destroyed their religion and made current idolatry and *shirk* [belief that others share in divine powers with God]. After that all the Hindus became *mushrik* [believers in *shirk*] and started worshipping the manifestations [of God] *surat parasti*. Indeed there have been different religious codes for different communities among them [castes] like Kayat [Kayasths] and Mahajan and Khatris, from ancient times. And a parallel could also be found in our ancient religious codes. For instance each branch of the Israelites adhered to a special set of commandments. Further in our own religious laws *(sharia')* Bani Hashim are entitled to *Khums* and forbidden to accept *zakat* or charity,and all the Quraish are distinguished by possession of the right of *Khilafat*; and there is no *jazia* for the *mushrikin* of the Arabs - Do not accept from them anything except (acceptance of) Islam or sword. In short the incarnations, *avatar*, of the Hindus were the manifestation of Divinity, whether it be manifested in a human being or a lion or a fish - like the staff of Hazrat Musa [Moses] or the camel of Hazrat Saleh. But the common folk among these people [Hindus]because of their lack of understanding did not distinguish between the manifestations [created beings] and the manifestor [the Creator] and made all of them the worshipped one [*ma'bud*] and thus fell into the abyss of perdition. And the same is the state of many groups of the Muslims like the people who construct *ta'zia* and the attendants at the tombs and (the followers of) *Jalaliyan* and *Madariyan*. Only God is the real knower of the truth. The End.

FATWA OF MIRZA MAZHARJAN-I-JANAN

It was asked whether the non-Muslims [*kuffar*] of India, like the Arabian *mushrik* have a baseless religion or whether they had a true religion which was abrogated; also what should be believed about their predecessors. On the basis of research and fair dealing [I] write concisely:

One should know that whatever is known from the ancient books of the Hindus is that at the time of the creation of the human race Divine Grace, for the reform and well being of their living [on this planet] and in life after death, sent a book named *Veda* in four volumes comprising decrees about right and wrong, permissible and forbidden things and information about the past and the future, through an angel named *Brahma* who is instrumental in the creation and destruction of the world. And their [the Hindus] religious guides [*mujtahid*] derived six religions from that book, and

Answer: The inference from the Quranic verse: وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (S. 35, A. 24)

[And there never was a people, without a warner, having lived among them (in the past)] is this, that to every people نذير (warner from evil) have been sent who deter people from vice and from violating [human] rights. such warners may have been prophets or learned people (*ulama*), or preachers, or saints, or gnostics (*'urafa*). And if one investigates the account of different [nations] such as Rum, Abyssinia and Turkistan and Khata and Khutan, one does not find any trace of prophets that may have been among them. On the other hand [the people of these nations] do not even understand the meaning of the word *nabi* (prophet). Belief in their [i.e. of the above-mentioned sages] greatness and the high esteem of their worship and in pious people and those who forsake the world and recluses, is quite firm in their hearts. God's dealing with each sect is different, depending upon its capacity to receive [what He sends] and upon their different sources of knowledge. In the Arab world, from Yemen to Syria and Egypt, Divine guidance was manifest in one manner. [God] appointed apostles and prophets, and bestowed upon them the power to work miracles, and gave them books. The 'knowledge of the unseen' علم غيب may have come to some of the people through some other people but because of the distance in time or in space, the people of these territories recognised the 'knowledge of the unseen' علم غيب only in this manner; a messenger comes and delivers the message verbally or brings a written espatile with him; and indeed these people demanded form the messenger a proof of the validity [of his claim]. And indeed among the present day nobles, kings, and *sultans* the same procedure is established. They despatch a *firman* or a royal decree by the hand of some trusted person and as a proof of its authenticity some things such as a palanquin, an elephant or an army accompany him. Thus for the people of these territories, that is the Arab world, the mode of guidance was established in this way. For the Hindus this mode was not a reliable one. But they reconginsed the manifestation of the Divinity in some things and also [its manifestation] in speech or words of the Divinity itself, and also in the performance of actions attributed to Divinity and miracles, and sovereignty over the population, as the viceregency of the Divinity among the people. [As such was the manner of the understanding of the Hindus] thus the dealings with them were also fashioned accordingly. Thus they were given instructions and for a long time their guidance depended on such a pattern, as is evident from the book of Yog Bashist and the Ramayan and Bhagavat [Gita] until

I have written a *tazkirah* of *Hazrat Sayyid Sahab* of Bansvi which was publish two or three years ago. In this, from page 275 for ten pages, under the caption of "The Saints of Former Times", I have discussed it in some detail (with reference) [in fact the whole chapter runs into more than twenty pages- KHQ].

To the best of my knowledge the following gentlemen in London possess a copy of "*Tazkirah Hazrat Sayyid Sahab Bansvi*" by me; if you wish to consult it yourself you may get in touch with any one of them:

1. Dr. Francis Robinson (Holloway College) 2. Prof. Ralph Russell 3. Mian Mahmud Abdul Bari Ansar (son of Maulana Jamal Mian Sahab)

I hope these few lines would be enough for your inquiry.

Are you related to Maulana Hamid Hasan Qadiri Sahab?

Praying for you,

Mohammmad Raza Ansari

(This letter is undated but the PO stamp of Lucknow gives the date 11 Nov. 1988).

Since Maulana Raza Ansari referred me to the *Tazkirah*, I proceeded to obtain a copy, and after much effort got one by the courtesy of Mahmud Mian. In the chapter to which Maulana Raza Ansari referred he has fully and exhaustively dealt with the problem under discussion, and it was a matter of satisfaction to me that he has taken the same view as I hold. He has referred to two *fatwas* of two very eminent mystics and scholars of their times, Mirza Mazhar Jan-i-Janan and Shah Abdul Aziz Dihlavi. Their famous *fatwas* on the subject - the apostles of the Hindus - have always been known to Muslim scholars and frequently referred to, but they have never been translated fully even in Urdu. In view of their importance I give here these two *fatwas* in full in English translation.

FATWA OF SHAH ABDUL AZIZ

Question: Constant reports, accounts and indications make it abundantly clear that in India there have been many (*avatar*) incarnations of God whom some Hindus have regarded as the Creator and others as their guides. And there have also been kings of great power, glory and following. From the beginning of creation, what prophets have been sent to these people? And what book has been given for their guidance, either in an Indian language or any other language? Was such a book sent to (these people) or was it not? And if the answer is in the negative then what is the reason for it?

wrote:

"Hazrat Shri Krishan ji Peace Be Upon Him, the Prophet of India"

حضرت سری کرشن علیہ السلام پیغمبر ہندستان

at another place he writes:

حضرت سری کرشن علیہ الرحمہ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر
حضرت سید عبدالرزاق بانسوی قدس اللہ سرہ کے مسلک عشق کا پیرو ہے...

[As regards to Hasrat Sri Krishan, Peace Be Upon Him, this *faqir* (Hasrat) follows the path of love of my *pir* and the *pir* of all *pirs*, Hazrat Sayyid Abdur Razzaq Bansvi...]

Can it not be deduced from all this that among all the prophets and apostles that God sent to India in ancient times, hundreds and thousands of years before the advent of Islam, according to him [Hasrat] Sri Krishanji's name is also included?

I request you kindly to give me the benefit of your august opinion.

Maulana Mufti Raza Ansari's reply:

Dear Mr. Qadiri,

Not only did the late Hasrat Mohani believe in the coming of prophets to India; every Muslim who believes in the Holy Quran does so. To every land of God an apostle or a prophet has been sent (and in this general principle the particular instance of India is also included).

In the *Quran-i-Sharif* the mention has been made numerous times of sending a *nazir* (warner) to "every hamlet" or "every nation" or"every town". After mentioning the Holy names of the glorious prophets of different lands the *Holy Quran* says:

"We have told you the names of some prophets but there are other prophets whose names we have not told you."

From these passages the only conclusion that can be drawn is that to India too, before the advent of the Last Prophet (Peace Be Upon Him and His Progeny and upon His companions), prophets and apostles were sent whose names we do not know. Elders of the *ummah* who were endowed with *kashf* (spiritual insight and revelation)and *Karamat* (non-prophetic miraculous powers) have even indicated the places where the prophets of India had their tombs, now obliterated. These include Hazrat Mujaddid Sahab, Alf-i-Sani, Maulana Shah Abdul Aziz Dihlavi, Hazrat Mirza Janjanan; and during our period, Shaikh-ul-Hadis Maulana Zakaria Sahab and Maulana Ashraf Ali Thanvi too,believed this.

Now some unkind but not unfounded observations. I may or may not be right, but I suspect that these "authorities" and "scholars" are allergic to the use of the expression the prophets of the Hindus. If some innocuous words like saint, holy person, spiritual guide or religious leader had been used for Sri Krishan instead of "prophet of India", I suspect that these susceptible "authorities" would not have raised their eye brows. They cannot reconcile their sentiments with the basic truth of the matter. If that is the case, so be it. Hasrat in his characteristic manner, without fear or favour, used just this expression, and moreover inspired readers of, and writers in, his magazine *Urdu-i-Mualla* to write a full length article using this very title. That was the measure of the strength of his conviction, a conviction which is sadly lacking in present-day 'scholars' and 'authorities'.

As the learned scholar, Dr. Robinson specifically mentioned Maulana Mufti Muhammad Raza Sahab Ansari Farangi Mahli's name and quoted his authority to 'refute' an irrefutable fact, I considered it only fair to consult the Maulana and to seek his opinion about it.

Without any previous acquaintance or introduction, I wrote a short letter simply asking the question. I must record my profound gratitude to him for very promptly replying to my letter.

Those who have had the unfortunate experience of contacting and consulting officials or scholars in South Asia will concur with me that this quality -- a prompt reply -- is not in the nature of the scholars or authorities of that part of the world. Even libraries, booksellers and publishers do not bother even to acknowledge the receipt of any letter, let alone reply to it. You direct an inquiry to them and wait until eternity, hoping for a response that never comes. Hence my gratitude to the Mufti Sahab.

I give a literal translation of both the letters here. The inquirer after the truth can make up his own mind. The truth of the matter remains unchanged; it is as I have stated it.

My letter to Maulana Mufti Raza Ansari Sahab (dated 29 Oct. 1988):

Dear Sir,

I apologise for any inconvenience and approach you with an inquiry on question of doctrine.

In connection with Maulana Sayyid Fazlul Hasan Hasrat Mohani, I have noticed in a few places in his own writings that he believed in the coming of prophets to India. For instance, at one place, while mentioning certain names in dedicating his *divan* he

certainly not only read these words but, we assume, appreciated Hasrat's verses too, because Hasrat always presented his compositions, writings and publications to his *pir khana* (the house of his spiritual guides). There is not a single word of Maulana Abdul Bari, either written or oral, expressing disapproval of Hasrat's views - either of Hasrt's own views regarding Sri Krishan or of his ascribing these views to Maulana Abdul Bari's father, Shah Abdul Wahab Sahab Farangi Mahli. Moreover, Hasrat's statement that Sri Krishan was a prophet of India and that his *pir* Shah Abdul Wahab Farangi Mahli and head of his mystic order, *pir of pirs* (Hazrat Shah Abdur Razzaq of Bansa Sharif) also held the same view appeared in 1923; and in all the sixty six years that have elapsed since then not a single person (including the Farangi Mahlis) has dared to point an accusing finger at him.

To conclude: no authority, either in the west or in the east, can alter the fact that in the light of the clear verses of the Glorious Book, *Quran-i-Majid* Muslims believe that God did send His prophets to all nations and all lands. All the mystics in the Indian subcontinent also, undeniably, believe that God did send His prophets to India. The remarkable feature of Bansa Sharif and Farangi Mahlis' mystics has been that, while other mystics stop short of naming any of these prophets, these have clearly given Sri Krishan's name. Finally it is highly significant that not a single person, throughout his long period of history, either among the mystics of other orders or even among the *ulama*, who are supposed to be more rigid, inflexible and firm in all such matters, has ever raise any objection to Shri Krishan's name being mentioned in this connection or issued any *fatwa* censuring those who have done so.

If today any person disapproves of the linking of the name of Farangi Mahal or Bansa Sharif with such ideas then he should say clearly that he is not concerned with the views of the elders of either Bansa Sharif or Farangi Mahal and he himself does not share these views. But no-one has any authority whatsoever for saying that Hasrat, his *pir* (Shah Abdul Wahab Farangi Mahli) and his *pir of pirs* (Hazrat Shah Abdur Razzaq of Bansa Sharif) did not consider Sri Krishan as *Nazir* (نذیر) sent to India.

This may or may not "transform our understanding [or misunderstanding ?] of the relationship between these representatives of the high Islamic tradition and the Hindu world in which they moved in the eighteenth and nineteenth-century Awadh." But the truth is too sacrosanct to be tampered with to meet the wishes of any scholar.

groups or individuals may differ in this practice in their own limited way; but the general statement holds true, particularly in the school of *tariqat* and *shariat* to which Hasrat and his *pirs* belonged. Thus Hasrat not only used علیہ السلام indicating that Sri Krishan was a prophet but more emphatically and clearly added the words پیغمبر ہندوستان; i.e. prophet of India.

Then again in a short preface to his seventh *divan*, as I stated on page 18 of my book, he very clearly and unambiguously says:

حضرت سری کرشن علیہ السلام کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر
حضرت سید عبدالرزاق بانسوی قدس اللہ سرہ کے مسلک عاشقی کا پیرو ہے۔

[Regarding Hazrat Shri Krishana (peace be upon him)
I am a follower of the path of love of my *pir* and *pir* of *pirs*
Hazrat Sayyid Abdul Razzaq Bansvi]

These two clear statements, taken together with other references elsewhere in his prose and poetry (to some of which I have made reference, with English translations), make Hasrat's position so clear that no discussion is needed on this point. Any statement or views, no matter how 'authoritative', that runs counter to it, is, so far as Hasrat's own views are concerned, valueless. No authority can challenge this statement of Hasrat's position. There are two more points to be taken into consideration.

Firstly Hasrat has clearly stated that his *pir* (Shah Abdul Wahab) held the same attitude towards Sri Krishan as Hasrat himself. His words can have no other meaning. How can anyone claim that Hasrat was misinformed about the opinions and attitudes of his own *pir* (Shah Abdul Wahab Farangi Mahli)? Hasrat does not content himself with speaking of the belief of his own *pir* (Shah Abdul Wahab Farangi Mahli) but goes right to the top, to the leader of spiritual order; to the ".. *pir* of all the *pirs*, Hazrat Syed Abdul Razzaq Bansvi...". Will any `authority' dare to claim that Hasrat was either unawere of or was deliberately misquoting and misjudging the attitudes of the great spiritual guide of his own mystic order, Hazrat Shah Abdur Razzaq Sahab of Bansa Sharif? One may disagree with Hasrat's position and censure him for his beliefs about Sri Krishan but that is debatable and falls outside our scope of present discussion. Though we shall see that no-one has done it.

The second point is this: when Hasrat wrote these words in the preface of his seventh *divan* in 1923, the head of Farangi Mahlis at that time, the great spiritual leader and guide of this mystic order and the illustrious son of Shah Abdul Wahab Sahab Firangi Mahli, Maulana Abdul Bari Farangi Mahli was still alive. He most

that in the early twentieth century, Maulana Abdul Bari of Firangi Mahal wrote of Shah Abdur Razzaq of Bansa inspiring Hindu *faqirs* to the extent that they succeeded in meeting Krishna (*Fuyuz-i Hasrat-i Bansa*, Lucknow, 1345 A.H.,128), but that this was far from saying that the saint of Bansa believed that Krishna was prophet. Perhaps the author has evidence for his assertions, in which case he should refer to it. As matters stand, he would appear to be trying on his authority, and no other, to transform our understanding of the relationship between the representatives of the high Islamic tradition and the Hindu world in which they moved in eighteenth and nineteenth-century Awadh. (*The Bulletin of the School of Oriental and African Studies*)

The whole problem has three facets, First is the basic question: what does Islam say about apostles being sent to India and the Indian people?

Secondly, what are Hasrat's views and what does he believe and profess?

Thirdly, what are the views of the saints of Bansa Sharif and the elders of Farangi Mahal; and indeed other saints and sufis?

The first question has been dealt with adequately in the first chapter of my book, where I have shown with reference to very clear verses of the Holy Quran that Islam clearly states that God has sent His prophets to all nations and all lands. India, obviously, is no exception. God's apostles were sent to India, and no authority can change or alter this fact. This is why sufis of all orders, without actually naming persons or places [as in the case of Hazrat Mujaddid Alf-i-Sani] have affirmed this. This point is so clear that it needs no elaboration or discussion, and is beyond dispute.

Now the second question, which is more closely relevant to our purpose. Hasrat, in his poetry and prose, has very clearly stated that he considers Sri Krishan as an apostle of God sent to India in pre-historic times, and that his (Sri Krishan's) message was that of LOVE.

In the dedication of his *divan* he has referred to Sri Krishan as

سری کرشن جی مہاراج علیہ السلام پیغمبر ہندوستان

As everybody knows different phrases like رحمۃ اللہ علیہ، رضی اللہ عنہ and so on, with slight variations, in essence mean the same thing and conventionally have come to be used for particular groups or categories of holy personages. Thus علیہ السلام conventionally and popularly is used only after the names of holy persons whom Muslims consider to be prophets of God. There may be exceptions, and minor

Ahmad Sirhindi, who is generally called the *Mujaddid Alf-i-Sani* (the Renewer of Islam at the beginning of the second millennium of the Islamic era) has written on this point. In a letter (number 259) addressed to Khwaja Muhammad Sa'id he says, '... Reviewing of the position of nations of the past, it seems evident there is hardly any land to which no apostle has been sent. Even of the territory of India, which no apostle has been sent. Even of the territory of India, which apparently lacks any such distinction, I feel that prophets have been sent here too.... And in certain cities of India it seems as if the light of the prophets gleams like a torch in the darkness of *shirk* [polytheism]; and if I wished I could name such cities...."

From this attitude the question naturally arises as to whether one should seek the prophets sent to India in the past among the figures of Indian mythology. On this point all except a few of the Muslim theologians of India are silent. They must have felt a natural reluctance to see Hindu demi-gods as prophets. But there have been some *Sahib-i-Kashf* (saints who have received spiritual illumination) who quite clearly believe that Krishna was one of the Indian apostles, and , moreover, very prominent among them.

But it seems that there are some who have failed to grasp the problem and to understand its full significance. Thus one learned scholar, an expert on Islam and its history in South Asia, Dr. Francis Robinson writes:

"There are unsupported assertions that are plain wrong. Take two examples. 'A remarkable aspect of the mystic teaching of many of the Farangi Mahal spiritual guides', we are told on page 15, 'was their attitude to the Hindu god or demi-god Krishna, whom they accepted as a true prophet sent by God in former ages to the people of India. 'If this were true, it would be of considerable significance, but there is no evidence for it in anything the *'ulama'* of Farangi Mahal have written or said. Again he asserts (p.16) that Saiyid Shah Razzaq of Bansa, to whom many Firangi Mahalis owed allegiance, held similar beliefs about Krishna and that there are several stories to this effect in his *malfuzat*, the *Manaqab-i Razzaqiyah* by Mulla Nizamuddin of Firangi Mahal (died 1748). But there is no mention of Krishna anywhere either in the original work or in the later editions of it. This understanding, moreover, is confirmed in a communication of 15 August 1986 from Mufti Muhammad Raza Ansari of Firangi Mahal, who is the leading expert on the sources for the Firangi Mahal and Bansa families, and who also goes on to say

The question of the prophets sent by God in historic and pre-historic times to the subcontinent of India has given rise some controversy, and to still more misunderstanding. The atter is adequately dealt with in Chapter I of my book, Hasrat ohani, Delhi, 1985. What I said there is as follows:

A remarkable aspect of the mystic teaching of many of the Farangi Mahal spiritual guides was their attitude to the Hindu god or demi-god Krishna, whom they accepted as a true prophet sent by God in former ages to the people of India. The idea that God had sent His prophets to India long before the coming of the Muslims was not a new one. Muslim thinkers in India had struck by such verses of the Qur'an as the following:

> And the Unbelievers say:
> "Why is not a Sign sent down
> To him from his Lord?"
> But thou are truly
> A warner, and to every people
> A guide.[1]
>
> Never did We send
> A warner to a population
> But the wealthy ones among them
> Said: "We believe not
> In the (Messenger) with which
> Ye have been sent".[2]
>
> Never did We destroy
> A population, but had
> Its warners.[3]

These are only some of the verses to this effect. In the light of these verses no Muslim thinker could fail to see that a country with so vast a population as India could not have been without its true apostles. Thus the famous 16th-17th century mystic, scholar and religious philosopher, Shaikh

1. Sura XIII, Ayah 7, trans. 'Abdullah Yusuf Ali, Lahore, n.d. pp. 604-5.
2. Sura XXXIV, Ayah 34, trans. 'Abdullah Yusuf 'Ali, Lahore, n.d., p. 1145.
3. Sura XXVI, Ayah 208, trans. 'Abdullah Yusuf 'Ali, Lahore, n.d. p. 971.

Dr. K.H. (Khalid Hasan) Qadiri

(son of famous scholar Late Prof. Hamid Hasan Qadiri)

Presently working in Deptt. of Urdu,

London School of Oriental and African Studies.

Writer of epock-making book "Hasrat Mohani".

THE PROPHETS OF INDIA

By
Dr.K.H. Qadiri,
London

Printer : Liberty Art Press, 1528, Pataudi House, New Delhi.

Publisher : Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone: 650109, Telex: 22-430 KBL IN)

Editor : Dr. A. R. Bedar

Annual Subscription : Rs. 300/- (Inland) US$ 60 (Asian Countries) US$ 120 (Other Countries) Rs. 25/- Per Copy Price (this issue) Rs. 150/-

CONTENTS

hudа Bakhsh Library

JOURNAL



63——68

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA